خاص نمبر
تخلیق

عالمی شہرت یافتہ، ممتاز ناول نگار، سیرت نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، شخصیت نگار اور کالم نگار

ابدال بیلا کی اُردو، ہندی اور انگریزی میں 30 زبانوں میں شہرۂ آفاق کتابیں

BOOKS OF ABDAAL BELA

Sang-e-Meel Publications
25 - Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore (Pakistan)
Tel: +92-423-7220100, 7228143 - e-mail:smp@sang-e-meel.com

خاص نمبر

مسلسل اشاعت
47
واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصہ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 47 — مارچ 2016ء — شمارہ : 3 — CPL نمبر 96

قیمت : 200 روپے .... 750 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر — ہندوستان کے لیے 1,200 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor) Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

فون نمبر: 04237187500، 04236671007 — موبائل فون: 03218899007 ای میل: ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

نشیر جہاں (امریکہ) — ناشی ظہیر (امریکہ) — نارنگ ساقی (انڈیا) — جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ "تخلیق" کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جانِ آفریں کے سپرد کی تو اس ماہ کا "تخلیق" شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43 ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد "تخلیق" کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آپڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود — میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا ہے اور سب سے پہلے ان کی یاد میں "اظہر جاوید نمبر" پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ عزم ہے تو "تخلیق" قائم رہے گا اور یہ "علامت"، "افکار"، "صریر"، "تجاذبے" اور "طلوعِ افکار" جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا۔ (ان شاء اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک "تخلیق" کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔ "تخلیق" کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر "تخلیق" کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے "تخلیق" کے مضامین کے انتخاب کے لیے "تخلیق پینل" تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے اور چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں "تخلیق" کی اعزازی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، تاشی ظہیر، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف 1,200 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No, E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar,
Walton Road, Lahore-Cantt.

U.S.A.
Naiyar Jahan
2740 South Barrington
AVE Los Angles
C.A. USA
Ph: [illegible]
Email: [illegible]
[illegible]

U.S.A.
Tashie Zaheer
7828 Fairfield Court Cupertino
California
U.S.A.
Ph: [illegible]
Email: [illegible]

INDIA
K.L. Narang Saqi
L-4-Connaught Circus, New
Delhi-110001, India
Ph: [illegible]
Email: [illegible]

PAKISTAN
Javed Manzoor
78-Islam Block, Azam Garden,
Multan Road, Lahore
Ph: [illegible]
Cell: [illegible]
Email: [illegible]

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

ترتیب

پہلی بات
پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

حمد و نعت
حمد باری تعالیٰ — منظور وفا — 7
نعت رسول مقبولؐ — شیخ الدین ذکی قریشی — 7
نعت رسول مقبولؐ — مشرق صدیقی — 7

تخلیق ایوارڈ 2015ء
تخلیق ایوارڈ یافتہ محترمہ صدف جہاں — ڈاکٹر انور سدید — 8

اظہر جاوید کی چوتھی برسی
رپورتاژ — ادارہ "تخلیق" — 9

مضامین
سید عاشور کاظمی کا فکری رجحان اور اقبال — ڈاکٹر خالد ندیم — 11
شبلی کی آپ بیتی — ڈاکٹر سکندر حیات میکن — 17
کربلا کی خاک پہ بہتا ہوا لہو — سید مبارک علی شمسی — 21

گوشۂ فیض احمد فیض
قطرے میں دجلہ — امین راحت چغتائی — 25
ڈاکٹر وزیر آغا کی فیض شناسی — ڈاکٹر انور سدید — 28

گوشۂ اظہر جاوید
اظہر جاوید کی یادیں — ڈاکٹر کیول دھیر (انڈیا) — 32
درویش عشق مست — ڈاکٹر انور سدید — 34
ایسا کہاں سے لائیں گے — عذرا اصغر — 37
یار عزیز... اظہر جی! — پروفیسر قیصر نجفی — 39
اظہر جاوید سے چند یادیں — غلام یحییٰ اعوان — 45
نظم گلاب ہو گئی — اظہر جاوید — 48
اظہر جاوید کی نذر — حسن عسکری کاظمی — 54
اظہر جاوید کی نذر — ابصار عبدالعلی — 54

منظومات
جلیل عالی، ڈاکٹر طاہر سعید ہارون، ایوب خاور، کرامت بخاری، رشید گوندل، توقیر عشاق، رشید عباس، ذکیہ احمد، ڈاکٹر نجمہ شاہین، عکس بشیر اظفر، پروفیسر ڈاکٹر کمال شاہ، رشیدہ قرین، اظہر جاوید — 55 تا 58

افسانے
بچھڑے — جتین احمد (انڈیا) — 59
میری کہانی کا کردار — دیپک بدکی (انڈیا) — 62
نشیمن — علی اکبر ناطق — 68
نور کا نور کہاں ہے؟ — وحشی سعید (انڈیا) — 74
ایک لامتناہی زندگی — شمع خالد — 77
احسان — جمیلہ حیات — 81
گونگا مکالمہ — اسلم سحاب ہاشمی — 84

غزلیں
خالد شریف، جلیل عالی، پروفیسر منظر نقوی، محمود شام، اکمل صابری، اسلم گورداسپوری، مرزا احمد نور طاہر، جاوید صدیقی، بسمل سرونجی، محمد اظہر، پرتپال سنگھ بیتاب، ریاض ندیم نیازی، محمد یوسف مرزا، محمد سلیم ساحر، طاہر منظور، پروفیسر صدیق شاہد، شہزاد گردیزی، واصف وفا — 88 تا 93

خاکے
قتیل شفائی اور... — حسن عسکری کاظمی — 94
میرا اعزاز — افتخار مجاز — 97
اظہر جاوید میرا مرشد — نیر وصلی — 102
مشفق خواجہ — طلعت اشرف محمود — 104
"چودھویں صدی" — یاسر نقوی — 106
حساب دوستاں — اظہر جاوید — 108

یادنگاری

باقی میر ..... ڈاکٹر رشید امجد 112

سفرنامے

سورج کے رخ پر ..... ڈاکٹر اقبال ہما 118
عرق انگ بار میں ہم ..... علی اعوان 121

انٹرویو

مرزا حامد بیگ ..... اقتدار احمد صدیقی (انڈیا) 125

طنز و مزاح

پشاوری پنجرے سے ..... ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی 131

انشائیہ

(Enzo) ..... پروفیسر جمیل آذر 136

جائزے

حسین احمد شیرازی ..... ڈاکٹر کیول دھیر (انڈیا) 138
کچھ وقت ماہنامہ "تخلیق" کے ساتھ ..... ڈاکٹر انور سدید 140
ماہنامہ "تخلیق" (دسمبر 2015ء) ..... ڈاکٹر ہارون رشید تبسم 142
پروفیسر یوسف شیدائی ..... محمد اقبال فیروز 144
[illegible] ..... [illegible] 146
قیصر تمکین، شخصیت و ادب کا شاعر ..... گوہر رحمان نوید 148

پنجاب رنگ

[illegible] 151

تبصرے انور سدید کے

تقاریر اقبال ..... (ڈاکٹر ہارون رشید تبسم) 152
شیخ ہمدم کا ادبی سفر ..... (شفیع ہمدم)
[illegible] ..... (نجمہ عثمان)
اردو ناول ..... (ڈاکٹر ممتاز احمد خان)
عالمی رنگ ادب ..... (شاعر علی شاعر)
سہ ماہی مجلہ "اسباق" ..... (نذیر فتح پوری) 158

انجمن خیال

(ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، ڈاکٹر طاہر ہارون، سید منظور حسین یاد، پروفیسر جمیل آذر، نذیر فتح پوری، مختار احمد خان، آغا گل، [illegible]، مرزا احمد طارق، [illegible]، سکندر حیات میکن، غالب عرفان، جمیل حیات، سید مبارک شمسی، [illegible]) 159–175

تخلیق کو موصول رسائل اور کتب

علمی اور غیر علمی 176

سرورق

ایس خالد

ناشر: سونان اظہر جاوید
طابع: بیدار سرمدی
قانونی مشاورت: لطیف احمد قریشی
مطبع: [illegible] پرنٹرز گنج بخش روڈ لاہور
مقام اشاعت:
H. No. E/12, Sheraz Villas, Islamnagar,
Walton Road, Lahore -Cantt

(جملہ حقوق محفوظ)

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

پہلی بات

2016 طلوع ہوا تو میں نے ''تخلیق'' کے قارئین کی فائل کھول کر ان کے پتے نئی فائل میں منتقل کر دوں۔ لیکن اس فائل کے ورق الٹتے ہوئے پر مجھے بہت سے نام کٹے ہوئے نظر آئے، اور صدمے کی بات یہ تھی کہ ''تخلیق'' کے ان قارئین اور قلمی معاونین کو قضا و قدر کے کارکنان نے ہم سے جدا کر دیا تھا۔ دنیا سے رحلت کر جانے والے ہر دوست کا نام پڑھ کر مجھے اپنے والد اظہر جاوید یاد آتے رہے جو 14 فروری 2012 کو وفات پا گئے تھے تو یہ سب لوگ ان کی رحلت کے غم میں میرے ساتھ شریک تھے۔ اور پھر ''تخلیق'' کو زندہ رکھ کر ان سب نے اظہر جاوید کی یادیں بھی تازہ رکھیں۔ مجھے افسوس اس بات کا ہوا کہ ان میں سے بیشتر مرحومین کو اب یاد بھی نہیں کیا جاتا تھا اور وہ

''ہر چراغ ساتھ یہاں سے جلائے لے گئے''

کی مثال تھے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ لاہور کے ایک ممتاز ادبی رسالے میں اردو اور پنجابی کے ایک نامور ادیب نے مرحوم ادیبوں پر تعزیتی اور یادگاری مضامین کی اشاعت پر نہ صرف اعتراض کیا ہے بلکہ اسے غیر ضروری قرار دے کر فرمایا ہے کہ تعزیتی مضامین لکھ کر مضمون نگار اپنی شہرت سمیٹ رہے ہیں۔ اس سفاک بیان پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ زندہ قومیں اپنے مشاہیر کو ہمیشہ یاد رکھتی ہیں اور ان کے کارناموں کو اپنی زندگی میں مثال بناتی ہیں، لیکن یہ حضرت کہتے ہیں کہ مرحومین کا ذکر ہی نہ کیا جائے۔ مجھے اپنے والد اظہر جاوید کی موت کا صدمہ نو عمری میں سہنا پڑا، یقین جانیے کہ یہ صدمہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ لیکن رسالہ ''تخلیق'' کی صورت میں انہوں نے اپنے مہربان دوستوں کی ایک الگ انجمن سجا رکھی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ان سب کا اظہر جاوید سے خون کا رشتہ نہیں تھا لیکن ان کی وفات کے بعد جب میں ان سے ملا تو وہ مجھ سے بھی زیادہ گہرے غم میں مبتلا تھے اور پھر ان سب نے اپنا غم پہلے ''تخلیق'' کے اظہر جاوید نمبر میں اپنے جذبات کا اظہار کر کے کیا۔ ان کی پہلی برسی منائی گئی تو سب نے اس میں شرکت کی اور تقریریں کیں۔ اظہر جاوید کی محبت میں آنسوؤں کی جھڑی لگا دی اور تقاضا کیا کہ برسی کی تقریب ہر سال منائی جائے۔ چوتھی برسی منائی جا چکی ہے اور اس میں حسبِ سابق اظہر جاوید کے خلوص کو یاد کیا گیا جس نے اردو ادب کے افق پر ستاروں کو جگمگایا۔ گمنام لوگوں کو شہرت و عظمت سے نیک نام کیا اور بابا تو آپا نے'' ''گویوں کے تحیا'' کا خطاب پایا۔ ان الفاظ کے ساتھ ہم اول الذکر ادیب کے خام خیالات کی مذمت کرتے ہیں۔ ہم 2016 کا خیر مقدم کرتے ہوئے یہ عہد بھی کرتے ہیں کہ ''تخلیق'' اپنے مشاہیر کو یاد رکھنے میں پیش پیش رہے گا۔ اور مرحومین کے فکر و فن اور شخصیت پر مضامین شائع کرنے میں خوشی محسوس کرے گا۔ یہاں اس بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ادب میں مدلل اختلافِ رائے فکر و نظر کے نئے گوشوں کو سامنے لاتا ہے اور ادبی اختلاف ..... ذاتی اختلاف نہیں

ہوتا۔۔۔ بدقسمتی سے کچھ حلقوں میں اپنی بات کو ہی صداقت کا حرفِ آخر یا الہامی صحیفہ سمجھا جانے لگا ہے۔ اس نوع کے ادیب کے ارد گرد بیٹھنے والی مخلوق اسے ایک مخصوص دانشور ہونے کی خام خیالی میں مبتلا کرنے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی۔ نتیجۃً وہ جمود ہے جو انا پرست ادیب پر طاری ہو جاتا ہے اور فکری ارتقا رک جاتا ہے۔ خوش قسمت وہ ادبائے کرام ہیں جو مدلل اختلاف کا احترام کرتے ہیں اور دوسروں کی بات سننے کے لیے گوشِ ہوش کھلے رکھتے ہیں۔ ہم اس نوع کے تنقیدی مضامین کا بھی خیر مقدم کریں گے۔

ادب کے فروغ کے لیے معاشرے کی وسیع تر سطح پر اب جو کوششیں ہو رہی ہیں ان میں تفریحی پہلو اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ادبی کانفرنسوں نے ''ادبی میلوں'' کی صورت اختیار کر لی ہے جو بڑے بڑے شہروں میں ہر سال کروڑوں روپے خرچ کر کے منعقد کیے جا رہے ہیں۔ لیکن تا حال یہ جائزہ پیش نہیں کیا گیا کہ ان میلوں سے ادب کو کیا فائدہ ہوا ہے۔ کیا یہ میلے ادب کے ارتقا میں معاون بنے ہیں؟ کیا ان سے کسی نئی ادبی تحریک نے جنم لیا ہے؟ ان جلسوں میں کوئی ایسا مقالہ پڑھا گیا ہے جس کی صدائے بازگشت پورے ملک میں سنی گئی ہو؟ صورت حال یہ ہے کہ کتاب روز بروز مہنگی ہو رہی ہے اور ادب کا قاری نایاب ہو رہا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت خالص ادبی رسائل کی سرپرستی کرے اور سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی لائبریریوں میں معیاری رسائل خرید کر بھجوانے کا اہتمام کرے۔ طلبا ادب کی طرف راغب ہوں گے تو ان کے ذوق کی تربیت بھی عمل میں آئے گی۔ ہم بلاخوفِ تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ حالیہ ''ادبی میلے'' تفریحی زیادہ ہیں اور بعض لوگ تو ان کو ''کرپشن'' کا وسیلہ بھی تصور کرتے ہیں۔

وفیات

گزشتہ چند ماہ کے دوران جناب جمیل الدین عالی، جناب [illegible] بریلوی اور پروفیسر نذیر گجراتی اس دنیا سے اٹھ گئے۔ یہ سلسلہ ابھی جاری تھا کہ اردو کے منفرد افسانہ نگار انتظار حسین کی وفات کی خبر آ گئی۔ ہم ان کی اعلیٰ ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اور ان کی وفات کو ادبی دنیا کا عظیم سانحہ تصور کرتے ہیں۔ ان کی رحلت سے چند روز بعد ایک اور ممتاز ادبی شخصیت فاطمہ ثریا بجیا دنیا سے اٹھ گئیں۔ انہوں نے ٹیلی ویژن ڈرامے کو مشرقی تہذیب کی اقدار کا آئینہ بنانے کی کاوش کی اور بے پناہ مقبولیت حاصل کی۔ بھارت کے ممتاز ادیب، شاعر [illegible] اور حفیظ انجم کریمی بھی دنیا سے اٹھ گئے۔ حق تعالیٰ ان سب کی مغفرت کرے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، پروفیسر جمیل آذر، ایوب خاور، میجر غلام نبی اعوان، ڈاکٹر اسلم فرخی اور ڈاکٹر انور سدید علالت میں مبتلا ہیں۔ قارئین ''تخلیق'' سے درخواست ہے کہ ان کی صحت یابی کے لیے دعا فرمائیں۔ ہم ڈاکٹر انور سدید کے شکر گزار ہیں کہ وہ اس عہد پیری میں بیماریوں کے باوجود ''تخلیق'' کے ساتھ سب سے زیادہ عملی تعاون کر رہے ہیں۔

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

♦♦♦

حمد

اکھڑا اکھڑا ہے یہ پیالہ آشنا تجھ سا کوئی
کیا ترے بندوں میں اچھوں سے کہیں اچھا کوئی

ہے کسی کو شک اگر قرآن کی سچائی پہ
ایک آیت لکھ کے دکھلا دے ترا بندہ کوئی

عظمتیں نبیوں کو کیسی تو نے عطا کیا کیا مگر
ماسوائے مصطفےٰ سدرہ تلک پہنچا کوئی

تو اگر چاہے تو ذرے کو بنا دے آفتاب
خلق ہونے کا کر سکتا نہیں دعویٰ کوئی

ہو چکا ہے رحمت حق سے مرا قبلہ درست
اب جہاں میں کر نہیں سکتا مجھے رسوا کوئی

ہو گئی ان عاصیوں پہ تیری چشم التفات
ان کی خوش بختی کا کر سکتا ہے اندازہ کوئی

منظر ایوبی

ooo

نعت

یارب! عطا ہے یہ مری تیری جناب میں
نعتوں کا نور ہو مری قبر و حساب میں

طاعت رسولِ حق کی اطاعت خدا کی ہے
ہے درج جابجا یہی ام الکتاب میں

ان کے گناہ صرف نظر ہو گئے سبھی
اک بار آ گیا جو نبی کی جناب میں

رہتی ہے دل کو ہر طرح کی وہ سرخوشی
جو حاضری نصیب ہو عہد شباب میں

تاریک میرا دل جو تھا پُرنور ہو گیا
دیکھا جو نور روضۂ عرش مآب میں

یارب ابھی جاگتے ہوئے پھر روضہ دیکھ لوں
اکثر جو دیکھتا ہوں میں راتوں کو خواب میں

اک بار پھر عطا ہو مجھے دید روضے کی
ہے التجا حضور کی ارفع جناب میں

لکھتا ہے تو جو نعت حبیبِ نبی کی ہے
دیدہ ذکی یہ سوچ تو ہے کس حساب میں

رفیع الدین ذکی قریشی

ooo

نعت

سرکار دو جہاںؐ کی محبت نصیب ہو
اے کاش ناتواں کو یہ قربت نصیب ہو

عزت نصیب ہو مجھے عزت نصیب ہو
مجھ کو رسولؐ پاک کی مدحت نصیب ہو

چل کر در حضورؐ پہ پہنچوں سلام کو
یثرب کے اے اسیر یہ قربت نصیب ہو

حب رسولؐ میں رہوں سرشار عمر بھر
مثل اویسؓ عشق و محبت نصیب ہو

آقائے دو جہاںؐ مرے مولائے دو جہاںؐ
تیرا کرم ہو گر تو زیارت نصیب ہو

کاش کوئے رسولؐ مری جائے مرگ ہو
ہے آرزو کہ سایۂ رحمت نصیب ہو

نسبت ہے ان جنابِ رسالتؐ مآب سے
رب کے حضور جن کی شفاعت نصیب ہو

مشرق رسول پاکؐ کا ادنیٰ غلام ہے
محشر میں آں جنابؐ کی قربت نصیب ہو

مشرق صدیقی

ooo

"تخلیق ایوارڈ یافتہ" محترمہ نیّر جہاں

ڈاکٹر انور سدید

محترمہ نیر جہاں کا پیدائشی وطن ہندوستان کا صوبہ سی پی (اب مہاراشٹر) ہے۔ پاکستان معرض وجود میں آیا تو ان کا خاندان مشرقی پاکستان ہجرت کر گیا۔ تاہم انہوں نے اپنی میٹرک تک تعلیم ہندوستان میں ہی مکمل کر لی تھی اور وہ مسلمانوں میں پہلی خاتون تھیں جنہوں نے اس امتحان میں پورے صوبے میں اول پوزیشن حاصل کی تھی۔ مشرقی پاکستان میں ان کا قیام چاٹگام میں تھا جہاں فرقہ وارانہ فسادات شروع ہوئے تو ان کے خاندان کے افراد کو بھی مکتی باہنی کے غنڈوں نے قتل و غارت کا نشانہ بنایا اور نیر جہاں کو ایک اور ہجرت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ کراچی منتقل ہو گئیں۔ انہوں نے یہ دور گردش زمانہ میں گزارا اور مصیبتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پھر تعلیم حاصل کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا اور بی۔ اے کرنے کے بعد بی ایڈ کی ڈگری حاصل کی۔ انتظامیہ کی صلاحیت کا ڈپلومہ امریکہ سے حاصل کیا اور ریڈیو پاکستان کراچی پر اناؤنسر کی ملازمت شروع کر دی۔ کچھ عرصہ پبلک سکول بیئر میں معلم کی خدمات بھی انجام دیں لیکن وہ حالات سے مطمئن نہیں تھیں۔ ادب کا ذوق انہیں ورثے میں ملا تھا۔ کتاب سے محبت بچپن میں ہی پیدا ہو گئی تھی چنانچہ طالب علمی کے زمانے میں ہی شعر کہنے لگیں اور افسانے لکھنے لگیں۔ ان کی سوچ کے مثبت زاویے اس دور کے عام انسانوں سے مختلف تھے۔ وہ تعلیم عام کرنے کے لیے روشن خیالی کو فروغ دینا چاہتی تھیں اور اردو زبان کے فروغ میں گہری دلچسپی رکھتی تھیں۔ لیکن کراچی کا کاروباری ماحول ان کے مزاج کے مطابق نہیں تھا، چنانچہ وہ امریکہ منتقل ہو گئیں۔

ان کی شادی شدہ زندگی کی اہمیت یہ ہے کہ ان کے شوہر سید ذہانت حسین بھی ادب دوست ہیں۔ انجینئر ہیں اور محترمہ نیر جہاں کے ہم ذوق ہیں۔ چنانچہ دونوں نے امریکہ کے شہر لاس اینجلز میں اردو زبان کے فروغ کے لیے اردو مرکز انٹرنیشنل قائم کیا جس نے پہلے مشاعروں کا انعقاد کیا اور پھر 1982ء میں "اردو انٹرنیشنل ایوارڈ" جاری کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہر سال مشاعرہ کے موقع پر ایک خوبصورت اردو مجلہ شائع کرنے کا اہتمام بھی کیا۔ یہ تمام سلسلے اب تک جاری ہیں۔ صرف تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ ان تقاریب اور اداروں کی کامیابی دیکھ کر کچھ اور لوگ بھی محترمہ نیر جہاں کے ساتھ شامل ہو گئے ہیں اور اب ایوارڈ کا نام "احمد ندیم ایوارڈ" رکھ دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ پانچ ہزار ڈالر کی رقم شامل کر دی گئی ہے۔ پاک و ہند کے متعدد شعراء جن میں جمیل الدین عالی، حلیم کوثر، اظہر جاوید، منظور ہاشمی، عاشور کاظمی، ظفر گورکھپوری، سرمد صہبائی، بشیر بدر، ساقی فاروقی وغیرہ شامل ہیں، لاس اینجلز میں مشاعرے پڑھ چکے ہیں۔ اردو ادب و شعر کے فروغ میں محترمہ نیر جہاں کی امریکہ اور دیگر بیرونی ممالک میں خدمات بے بہا ہیں۔ مغربی دنیا میں چھپنے والی کتابوں پر ایوارڈ دینے کا سلسلہ بھی انہوں نے جاری کر رکھا ہے اور جج بالعموم ہندو پاک سے منتخب کیے جاتے ہیں۔ محترمہ نیر جہاں کی ان غیر معمولی ادبی خدمات پر ادارہ تخلیق کے اعزازی پینل نے 2015ء کے "تخلیق ایوارڈ" کے لیے ان کا نام منتخب کیا ہے اور ہم بصد فخر یہ ایوارڈ انہیں پیش کرتے ہیں۔ نیر جہاں چونکہ امریکہ میں مقیم ہیں اس لیے اظہر جاوید کی چوتھی برسی کی تقریب میں ان کا ایوارڈ جناب مجیب الرحمٰن شامی نے [illegible] بانو قدسیہ صاحبہ کے ذریعے پیش کیا اور تمام سامعین کی موجودگی میں بانو قدسیہ صاحبہ نے وصول کیا اور ساتھ ہی ان کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو کو پورا کر دیا کیونکہ بانو قدسیہ صاحبہ کروڑوں لوگوں کی طرح نیر جہاں کی بھی آئیڈیل ہیں۔

◆◆◆

رپورتاژ

بانی ''تخلیق'' اظہر جاوید کی چوتھی برسی

(ادارہ ''تخلیق'')

اردو کے عہد ساز ادبی جریدہ ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید کچھ عرصہ عارضہ قلب میں مبتلا رہ کر 14 فروری 2012ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔ یہ خبر ''تخلیق'' کے ہزاروں قارئین اور قلمی معاونین پر بجلی بن کر گری اور اکثر لوگوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ اب ''تخلیق'' بھی اپنا چالیس سال کی اشاعت کا سفر جاری نہ رکھ سکے گا۔ لیکن ان کے فعال اور متحرک بیٹے سونان اظہر جاوید نے اپنے والد کی یادگار کو زندہ رکھنے کا عہد کیا اور اظہر جاوید کے دوستوں کے تعاون سے پہلے ''تخلیق'' کا ضخیم ''اظہر جاوید نمبر'' شائع کیا اور بعد میں ہر سال فروری میں ان کی برسی منانے کی طرح ڈالی اور اس موقع پر ''تخلیق ایوارڈ'' کا اجرا کیا۔ یہ ایوارڈ 2013ء میں ڈاکٹر انور سدید اور شفیع عقیل صاحب کو، 2014ء میں بانو قدسیہ صاحبہ کو اور 2015ء میں محترمہ نیر جہاں (امریکہ) کو پیش کیا گیا۔

حسبِ سابق اس برس (2015) بھی گارڈن ٹاؤن کے اعلیٰ پائے کے ہوٹل آپشنز (Options) میں منائی گئی۔ مجلس صدارت محترمہ بانو قدسیہ نے کی۔ مہمانانِ خصوصی میں جناب مجیب الرحمٰن شامی، عطاء الحق قاسمی، ڈاکٹر محمد زکریا، محترمہ بشریٰ رحمان، منظور حسین یاد اور ڈاکٹر انور سدید شامل تھے۔ یہ سب اسٹیج پر جلوہ فرما تھے۔ نظامت کے فرائض جناب ڈاکٹر عمر عادل نے اپنی شگفتہ زبان میں ادا کیے اور ہر مقرر کے اوصاف کے ساتھ اظہر جاوید کی گوناگوں خوبیوں کا ذکر بھی جاری رکھا۔ اس تقریب کی نمایاں خوبی یہ تھی کہ سب مہمانوں کو اظہارِ خیال کا موقع دیا گیا اور سب نے اپنے دل کا تاثر تین چار جملوں میں بیان کر دیا۔

اس سلسلے کی ابتدا ڈاکٹر تحسین فراقی نے کی۔ انہوں نے کہا ''میں جسم تھا تو اظہر جاوید میری روح تھا۔ اظہر جاوید کے بغیر اب میں'' بے روح ''جی رہا ہوں۔'' فرخ سہیل گوئندی کی رائے میں آج کے ادب کی کہکشاں رسالہ ''تخلیق'' اور اظہر جاوید کی سجائی ہوئی ہے۔ لوح قتیل کی رائے میں اظہر جاوید نے سینکڑوں لوگوں کو قلم پکڑنا اور لکھنا سکھایا۔ شاہد بخاری نے بتایا کہ اظہر جاوید غریبوں کا معاون اور یتیموں کا ہمدرد تھا۔ شعیب بن عزیز نے کہا کہ اظہر جاوید نے خواتین و مردوں کو ادب میں اعتماد سے سفر کرنے کی عادت ڈالی۔ جناب رحمت علی رازی نے کہا کہ وہ دوستوں کا ہی نہیں دشمنوں کا بھی دوست تھا۔ حسین احمد شیرازی نے اس کے ذوقِ مزاح کی داد دی۔ توقیر احمد شریفی نے کہا کہ وہ قاسمی صاحب کو عقیدت سے اور وزیر آغا کو محبت سے ملا کرتے تھے۔ ڈاکٹر امجد پرویز نے کہا کہ اظہر جاوید موسیقی کے رسیا تھے۔ ملکہ ترنم نور جہاں انہیں بڑی عزت سے ملا کرتی تھیں۔ ابصار عبدالعلی نے ان کی کالم نگاری کی تعریف کی۔ خلیل اختر نے کہا کہ وہ میرے رسالے ''مسکراہٹ'' میں اپنی ''غزل'' بھیج کر خوشی محسوس کیا کرتے تھے۔ ملک مقبول احمد نے تسلیم کیا کہ اظہر جاوید نے ہی اعلیٰ درجے کے مصنفین کی کتابیں مقبول اکیڈمی سے چھپوائیں۔ لیکن اپنی کوئی کتاب مجھے طباعت کے لیے نہیں دی۔ اس کا مزاج قلندرانہ تھا۔ جاوید منظور صاحب نے اس کی دوستی پر فخر کا اظہار کیا۔ طاہر منظور نے کہا کہ وہ جب گھر پر آتا تو کیک لے کر آتا۔ یہ اس کی عادت تھی۔ مستور سلطانہ بٹ رونے لگی ''میں اب کس کی سالگرہ منایا کروں؟'' زریں یاسر نے کہا اظہر جاوید مجھے ''بی کڑیے'' کہہ کر بلاتا تو مجھے مزا آ جاتا۔'' اس کی باتوں میں کتنی محبت تھی۔ جناب ثاقب گوندی نے کہا کہ ''میں نے اظہر جاوید

کو الطاف مشہدی کی محفلوں میں دیکھا تھا۔ سرگودھا کے اس نوجوان نے خوب نام پیدا کیا۔" بشریٰ اعجاز نے کہا "افسوس گوہیوں کا کھیا اب مٹی کی چادر اوڑھ کر دائمی نیند سو گیا۔ رضا خورسند کہتی تھیں کہ ان کا ایک سچا دوست اب اس دنیا سے اٹھ گیا تھا۔ قاضی مشتاق کی رائے میں جب تک تخلیق زندہ ہے اظہر جاوید بھی زندہ ہے۔ آفتاب احمد خان نے کہا کہ اظہر جاوید اس کی غزل پڑھ کر خوب داد دیتے اور کہتے "لکھتے رہو"۔ رزاق مسعود نے شہادت دی کہ اظہر جاوید نے قاسمی صاحب سے دل و جان سے محبت کی تھی۔ افتخار مجاز کی رائے میں ابھی اظہر جاوید کے زندہ رہنے کے دن تھے۔ وہ دنیا سے جلدی اٹھ گیا۔ سرفراز سید نے اپنی دوستی کا زمانہ یاد کیا اور کہا میں اظہر جاوید پر پورا اعتماد کرتا تھا۔ اور وہ مجھ پر اپنی سب باتیں کھول دیتا تھا۔ طاہر سعید ہارون نے کہا کہ اظہر جاوید نے ان کی دوہا نگاری کو "تخلیق" میں خصوصی فروغ دیا۔ اسلم گورداسپوری کی رائے میں اظہر جاوید اپنے باطن میں انقلابی تھا۔ ان کا ظاہر رومانی تھا۔ عظمت چودھری نے انہیں داتا صاحب سلام کرتے ہوئے دیکھا تو واقعی حیران ہوئے۔ سعدیہ سومان کہہ رہی تھیں کہ وہ گھر میں کشادہ دل بزرگ نظر آتے اور بچوں کو دعائیں دیتے۔ ڈاکٹر قیصر رفیق کی رائے میں اظہر جاوید پوشیدہ ولی تھے لیکن لوگ انہیں پہچان نہ سکے۔ ڈاکٹر عطیہ سید نے انہیں ڈاکٹر سید عبداللہ کے حوالے سے یاد کیا۔ انہیں ملنے آتے تو پہلے جھک کر ان کو سلام کرتے اور ان کے پاؤں چھوتے۔ شہر طراز نے اعتراف کیا کہ ان کے ادب نے "تخلیق" کی گود میں آنکھ کھولی۔ تسنیم کوثر نے اظہر جاوید کی محبتوں اور شفقتوں کو یاد کیا تو اشکبار ہو گئی۔ کنول صاحبہ ہی ساہیوال سے اظہر جاوید کو خراج تحسین ادا کرنے کے لیے آئی تھیں۔ وہ بھری آواز میں بولیں "ان جیسا ہمدرد ایڈیٹر میں نے نہیں دیکھا۔" ڈاکٹر عمرانہ مشتاق نے بتایا کہ وہ شاعرات کی غزلیں درست کرتے لیکن ان کو احساس نہیں جتاتے تھے۔ بشیر واحد نے ان کے ادبی مشوروں کی تعریف کی۔ سلمیٰ اعوان نے بالخصوص یہ کہا کہ وہ نئے لکھنے والوں کی خوب سرپرستی کرتے تھے کہ مستقبل کی روشنی نئے لکھنے والوں کے پاس تھی۔ تسنیم کوثر کی رائے میں اظہر جاوید نے "تخلیق" کو مکتب ادب بنا دیا تھا۔ جہاں [illegible] ادب کی تربیت دی جاتی تھی۔ خالد شریف، شاہد علی خان، رضا خورسند، سحر صدیقہ اور صبا فیصل نے بھی اظہر جاوید سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔ آگینہ سومان کو آج دادا ابو بہت یاد آئے۔ وہ جب آتے کھلونے لے کر آتے تھے۔

خصوصی مہمانانِ گرامی میں سے جناب منصور حسین یاد نے اظہر جاوید کے ذوق ادب کی تعریف کی کہ وہ ہر صنف ادب کی گہرائیوں سے شناسا تھے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے کہا کہ اظہر جاوید نے مجید امجد کے مقام اور مرتبے کا اس کی زندگی میں تعین کیا اور اس کا پہلا انٹرویو اور تصویر "تخلیق" میں شائع کی۔ انہوں نے اظہر جاوید کی دوست نوازی کی خاص طور پر تعریف کی۔ انور سدید کی رائے میں اظہر جاوید نسبتیں قائم رکھنے والے انسان تھے اور یہ نسبتیں وفات کے بعد بھی قائم ہیں اور سب گویا انہیں خراج تحسین ادا کر رہی ہیں۔ بشریٰ رحمان نے اظہر جاوید کی خاتون نوازی کی تحسین کی اور "تخلیق" کو خواتین کا پرچہ شمار کیا جس میں مرد بھی لکھ سکتے تھے۔ جناب مجیب الرحمان شامی نے "تخلیق" اور اظہر جاوید کی ادبی خدمات کا اجمالی جائزہ لیا اور دونوں کو بے پناہ خراج تحسین ادا کیا۔ بلاشبہ یہ ایک یادگار ادبی تقریب تھی۔ جس کا اسلوب مختلف اور دلنشیں تھا اور صاف معلوم ہوتا تھا کہ اظہر جاوید نے لکھنے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں گھر بنایا ہوا ہے۔ عقب میں ان کی تصویر ہم سب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ گویا ہم سے کلام کر رہی تھی۔ تقریب کے اختتام سے پہلے آشیانہ ریسٹورنٹ کے مالک ڈاکٹر قیصر رفیق نے تمام آنے والے معززین کا شکریہ ادا کیا اور انہوں نے اعتراف کیا کہ انہوں نے آج سے پہلے کبھی اتنی بڑی ادبی تقریب نہیں دیکھی۔ اس خوشی میں انہوں نے خصوصی اعلان کیا کہ آنے والے تمام معززین کے لئے ہمیشہ کے لئے گولڈ ڈسکاؤنٹ کارڈ بنائے جا رہے ہیں۔ آخر میں سامعین کی تواضع پرتکلف چائے سے کی گئی۔ یہ تقریب تین گھنٹے جاری رہی۔ سومان اظہر جاوید نے شرکائے محفل کا شکریہ ادا کیا اور دعائے خیر پر تقریب اختتام پذیر ہوئی۔

◆◆◆

مضامین

عہدِ حاضر کا فکری بحران اور اقبال

ڈاکٹر خالد ندیم

یہ بات فیشن کے طور پر بڑے تواتر کے ساتھ کہی جا رہی ہے کہ عہد حاضر میں فکرِ اقبال کا کوئی کردار نہیں رہا۔ حضرت علامہ کے افکار سے متعلق اس بیان کے پس پردہ کم فہمی کے علاوہ تعصب بھی کارفرما ہے۔ شعر و فکرِ اقبال سے بے بہرہ اور فکرِ اقبال کو تعصب کی آنکھ سے دیکھنے والے آج اقبال کو اگلے وقتوں کے لوگ محسوس کرنے لگے ہیں، اس بات پر غور و فکر کیے بغیر کہ فکر و فلسفہ کا ارتقا جاری رہتا ہے اور اس میں بڑے سے بڑا مفکر بھی خاتم المفکرین نہیں ہوتا، بلکہ ہر مفکر اور فلسفی اپنا کردار ادا کر کے علم و آگہی کی ایک نئی راہ سمجھا جاتا ہے، جس پر مستقبل کے فکری قافلے گامزن ہوتے ہیں۔ آج افلاطون، ارسطو، امام غزالی، ابن خلدون، مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ یا سرسید احمد خاں کی اہمیت اس لیے نہیں کہ وہ عہد حاضر کے تمام تر مسائل کا حل بتاتے ہیں، بلکہ اس لیے ہے کہ انھوں نے اپنے اپنے عہد کی فکری رہنمائی کے ساتھ ساتھ مستقبل کے دروازے پر بھی دستک دی تھی، لیکن جونہی اقبال کا ذکر ہوتا ہے ایک طبقہ انھیں یکسر مسترد کر دیتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جسے فکرِ اقبال کی جادوگری سے انکار نہیں، لیکن وہ اسے چھپانا ضرور چاہتا ہے، چنانچہ اس کے لیے وہ کبھی تو اقبال کی ذات پر حملہ آور ہوتا ہے اور کبھی ان کے افکار کی تردید کی کوشش کرتا ہے۔ جب دونوں محاذوں پر خود کو پسپا پاتا ہے تو وہ انھیں عہد حاضر کے لیے غیر ضروری قرار دے کر دل ٹھنڈا کرتا ہے۔

اس وقت محض عہد حاضر کے فکری بحران میں اقبال کی ضرورت کا جائزہ لیا جاتا ہے، تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ بند گلی میں پہنچ جانے کے بعد بنی نوع انسان کو فکرِ اقبال کی مدد سے کوئی راہ سجھائی جاتی ہے یا نہیں۔ 1936ء میں "ابلیس کی مجلس شوریٰ" لکھتے ہوئے اقبال نے جن خیالات کا اظہار کیا تھا، وہ عہد حاضر کی تشکیل پر پوری طرح صادق آ رہے ہیں۔ اقبال نے سرمایہ دارانہ نظام کی شان میں ابلیس کے خیالات پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

میں نے دکھلایا فرنگی کو ملوکیت کا خواب — میں نے توڑا مسجد و دیر و کلیسا کا فسوں
میں نے ناداروں کو سکھلایا سبق تقدیر کا — میں نے منعم کو دیا سرمایہ داری کا جنوں
کون کر سکتا ہے اس کی آتشِ سوزاں کو سرد — جس کے ہنگاموں میں ہو ابلیس کا سوزِ دروں

یہی وہ سرمایہ داری ہے، جس نے اول اول قوم پرستی اور پھر اس کی بنیاد پر جدید وطنیت کا پرچار کیا۔ یہی سرمایہ داری کروڑوں انسانوں کی ہلاکت کا باعث بنی، یہی سرمایہ داری نوع انسان کی وحدت کو پارہ پارہ کرتی ہے، یہی سرمایہ داری انسانوں کو مختلف سرحدوں میں مقید کرتی ہے، یہی سرمایہ داری جغرافیائی تقسیم کے بعد جنگ و جدال کا درس دیتی ہے، یہی سرمایہ داری ایک عالمی تہذیب کے نام پر اپنی

مصنوعات کے ذریعے پوری دنیا کے سرمایے کو سمیٹنا چاہتی ہے۔ یہ سرمایہ داری اپنے گماشتوں کے ذریعے کہیں جمہوریت، کہیں آمریت، کہیں بادشاہت اور کہیں شدت پسندی کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ اقبال نے ابلیس کے پہلے مشیر کی زبانی سرمایہ داری کے انھی ہتھکنڈوں کی نشان دہی کی تھی۔ وہ کہتا ہے:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس ۔۔۔ جب ذرا آدم ہوا ہے خود شناس و خود نگر

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے ۔۔۔ یہ وجودِ میر و سلطاں پر نہیں ہے منحصر

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو ۔۔۔ ہے وہ سلطاں، غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام ۔۔۔ چہرہ روشن، اندروں چنگیز سے تاریک تر

توجہ فرمایئے کہ اقبال نے مغرب کا جو کریہہ چہرہ دکھایا تھا، آج وہ پوری طرح عیاں ہو چکا ہے۔ 1917ء میں دنیا نے اشتراکیت کے دامن میں پناہ لے کر بظاہر کسی حد تک سکون کا سانس لیا تھا۔ اور اقبال نے بھی اس کا خیر مقدم کیا تھا۔ یورپی سرمایہ داری اور صنعت کاری نے بنی نوع انسان کو جس سماجی، تہذیبی، معاشی اور سیاسی ابتری سے دوچار کیا تھا، روسی انقلاب سے اس کے سدِ باب کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ اقبال ابلیس کے تیسرے مشیر کی زبان سے کارل مارکس کا تذکرہ کرتے ہیں:

وہ کلیمِ بے تجلی، وہ مسیحِ بے صلیب ۔۔۔ نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

کیا بتاؤں، کیا ہے کافر کی نگاہِ پردہ سوز ۔۔۔ مشرق و مغرب کی قوموں کے لیے روزِ حساب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد ۔۔۔ توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

لیکن اقبال اس بات کو تسلیم نہیں کرتے، کیونکہ اشتراکیت میں وہ دم خم نہیں کہ سرمایہ دارانہ نظام کا مقابلہ کر سکے اور انسانیت کو اس کے جبر سے تحفظ دے سکے۔ اقبال نے بے تجلی اور بے صلیب کہہ کر کارل مارکس کی فکری نارسائی اور ابلیس کے مشیروں کے ذریعے اشتراکیت کی عاقبت نااندیشی کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ اگرچہ ابلیس کے مشیر سرمایہ داری کے خلاف اشتراکیت کو فتنہ قرار دیتے ہیں اور اپنے نظام کی تباہی سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن ابلیس اپنی شر انگیزیوں کے لیے اسے خطرہ قرار نہیں دیتا۔ لیکن اسے اگر خوف ہے تو صرف اسلام سے:

ہے اگر مجھ کو خطر کوئی تو اس امت سے ہے ۔۔۔ جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو

جانتا ہے، جس پہ روشن باطنِ ایام ہے ۔۔۔ مزدکیت فتنۂ فردا نہیں، اسلام ہے

لیکن اسے یقین ہے کہ اہلِ اسلام اب اس قابل نہیں رہے کہ عالمی سطح پر وہ کوئی کردار ادا کر سکیں، کیونکہ خود مسلمانوں نے سرمایہ داری کو قبول کر لیا تھا۔ ان کی معاشرت پوری طرح مغربی تہذیب کے زیرِ اثر ہے۔ مغربی تہذیب و تمدن، مغربی طرزِ معیشت، مغربی طرزِ فکر ان پر غالب آ چکی ہے۔ خصوصاً مسلم حکمرانوں سے مغربی قوتوں کو کوئی خطرہ نہیں، کیونکہ وہ تو اپنی حکمرانی کے تحفظ کے لیے ان کی ہاں میں ہاں ملا رہے ہیں۔ جہاں تک مسلم عوام کا تعلق ہے، انھوں نے قرآن کے پیغامِ عمل کو بھلا دیا ہے اور اگر وہ اسے پڑھتے بھی ہیں تو محض ایصالِ ثواب کے لیے۔ اس کے باوجود ابلیس اور اس کے حواری خوف زدہ ہیں:

جانتا ہوں میں، یہ امت حامل قرآں نہیں ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
عصر حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف ہو نہ جائے آشکارا شرع پیغمبر کہیں
الحذر! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر! حافظ ناموس زن، مرد آزما، مرد آفریں

1917ء سے 1992ء تک سرمایہ دارانہ نظام کا سارا زور اشتراکیت کے خاتمے کے لیے صرف ہوا اور دونوں معاشی نظاموں کے مابین سرد جنگ نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیے رکھا۔ اس عرصے میں مسلم ممالک کے حوالے سے مغربی دنیا کا رویہ قدرے بدلا بدلا رہا لیکن جونہی سوویت یونین کا خاتمہ ہوا، اقبال کے خدشات درست ثابت ہوئے اور مغرب نے الحذر الحذر کہتے ہوئے مسلمانوں کی قوتِ ایمانی اور غیرتِ اسلامی کو نابود کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈوں کا استعمال کرنے لگے۔ مختلف انداز میں مسلمانوں کی دل شکنی کر کے ان کے ایمان کی پختگی کا اندازہ لگایا گیا۔ قرآن پاک کے حوالے سے ان کی حرارتِ ایمانی کو پرکھا گیا، حضور نبی کریمؐ سے ان محبت کو جانچنے کے لیے متعدد حربے آزمائے گئے۔ ایران اور عراق میں تصادم کے ذریعے ان کی عسکری طاقت ختم کر دی گئی، کویت پر عراقی حملے کا بہانہ بنا کر خلیجی ممالک میں دراندازی کی گئی اور باوجود سیکولر ہونے کے عراق کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ پھر خود ساختہ 11/9 کو جواز بنا کر افغانستان کو ملیا میٹ کر دیا۔ تیونس، لیبیا اور شام میں وہ قیامت برپا کی کہ الامان والحفیظ۔ ذرا غور فرمایئے، سامراجی قوتیں فلسطین، افغانستان، لیبیا، شام اور اسی طرح دیگر ممالک پر حملہ آور ہوئیں تو اس کے ہمسایہ ممالک اس کی مدد کو نہ آ سکے، بلکہ وہ کسی نہ کسی طور حملہ آوروں سے تعاون پر مجبور تھے۔ ایسے حالات میں نہ تو جمہوریت کسی کے کام آئی اور نہ آمریت۔ ہر ملک نے محض اپنے تحفظ کو یقینی بنایا اور بس۔

یورپ کے تصورِ وطنیت نے نہ صرف یورپ، بلکہ مشرق کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔ اسی نے سلطنت عثمانیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کیا۔ اسی کوکھ سے مشرق وسطیٰ کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے جنم لیا۔ اسی سے امتِ مسلمہ کا اتحاد پارہ پارہ ہوا اور اسی کی مدد سے مسلم ممالک میں جنگ و جدال شروع ہوا۔ اسی وطنیت کی بنیاد پر عرب ممالک میں اسلامی اخوت کے بجائے عرب قوم کی برتری کا احساس پایا جاتا ہے۔ 2001ء میں افغانستان پر امریکی حملے کے بعد اسلامی کانفرنس کے اعلامیے سے یہ بات پوری طرح عیاں ہوتی ہے، جس میں کہا گیا تھا کہ اگر آئندہ کسی عرب یا اسلامی ملک پر حملہ کیا گیا تو برداشت نہیں کیا جائے گا۔ عرب اور اسلامی کی تفریق سے قوم پرستی اور وطنیت پرستی کے مضر اثرات کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے۔ اقبال درست کہتے تھے:

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

ماضی میں مسلم علاقوں پر قبضے کے بعد سامراجی قوتوں نے مسلمانوں کو ان کے تہذیب ورثے اور تہذیبی تفاخر سے دور کر کے ان میں جو احساسِ کمتری پیدا کر دی تھی، وہ اب تک باقی ہے۔ آزادی جیسی نعمت پانے کے باوجود کوئی مسلم ملک اسلامی اقدار کا امین نہیں بن سکا۔ کسی مسلم ملک میں وہ خودداری پیدا نہیں ہو سکی، جو مسلمان کی پہچان تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم ممالک آزاد ہونے کے بعد بھی ذہنی غلامی سے نجات نہ پا سکے اور ایک صدی تک خود مختار رہنے سے بھی اپنی خودداری کا مظاہرہ نہیں کر سکے۔ مسلمانوں کے اس طرزِ عمل سے ابلیسی قوتیں

خوش ہیں اور وہ انھیں اسی صورتِ حال سے دوچار رکھنا چاہتی ہیں، چنانچہ ابلیس اپنے مشیروں کو کئی قسم کے طریقے بتاتا ہے:

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات — ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے — تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات
خیر اسی میں ہے، قیامت تک رہے مومن غلام — چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات

ہم نے واقعی ایسا کر دکھایا اور معاشرتی، معاشی، سیاسی یا عالمی کردار سے دستبردار ہو گئے۔ سامراج نے ہماری بے علمی اور انفعالیت کو دیکھتے ہوئے ہمیں معاشی، تعلیمی، سائنسی اور سیاسی حوالوں سے اپنے زیرِ اثر رکھنے کے لیے ہمیں قرضے دینا شروع کیا تو ہمارے حکمران بیرونی قرضوں پر انحصار کرتے چلے آ رہے ہیں۔ پیامِ اقبال کو نظرانداز کر کے گداگری تک جا پہنچے، حالانکہ اقبال یہ کہتے رہے:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں — پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت — ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

ہم اقبال کے اس پیغام کو سمجھ نہ سکے اور اس وقت وطنِ عزیز بیرونی قرضوں میں اس طرح جکڑا ہوا ہے کہ ہر پاکستانی لاکھوں روپے کا مقروض ہے۔ اب تو یہ صورتِ حال ہو چکی ہے کہ ہمیں بیرونی قرضوں پر سود ادا کرنے کے لیے بھی قرضہ لینا پڑتا ہے۔ ہماری ملی غیرت کا جنازہ نکل چکا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم کبھی سود کے خلاف شریعت کورٹ کے فیصلے کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرتے ہیں اور کبھی علمائے کرام سے سود کی گنجائش نکالنے کی درخواست کرتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ سود لینے اور دینے کو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔

اس وقت عالمی ایجنڈے کے تحت سرمایہ داری کو تحفظ دینے کے لیے تمام سرمایہ دار ممالک متحد ہو چکے ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے منافع کو زیادہ سے زیادہ کرنے اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں اپنی مصنوعات کی کھپت بڑھانے کے لیے نت نئے طریقے اختیار کرتے ہیں۔ خود متعدد مسلم ممالک تجارتی بنیادوں پر اپنے تعلقات استوار کرتے ہیں، چنانچہ کتنے ہی مسلم ممالک ہیں، جو دیگر مسلم ملکوں کے مفادات کی قطعاً پروا نہیں کر رہے۔ تجارتی مفادات نے یورپی وطنیت کی یاد تازہ کر دی ہے۔ یہ وہی وطنیت پرستی ہے، جس پر اقبال نے شدید تنقید کی ہے:

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے — غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبوی ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے، تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے — اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

لیکن ہم نے اقبال کے پیغام پر توجہ نہ دی، بلکہ اس جہانِ عمل کو دوسروں کے لیے چھوڑ کر خود گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ یہ گوشہ نشینی صوفیانہ نہیں، بلکہ اپنی ذات کے اندر گم ہونے سے عبارت ہے۔ اب ہم نہ پوری طرح دین کے رہے ہیں اور نہ دنیا کے۔ افسوس کا مقام ہے کہ جو دین "ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ" کا درس دیتا تھا اس کے ماننے والے نہ دین کو پوری طرح سمجھ سکے اور نہ دنیا کو۔ دنیا کے ہوئے تو محض ذاتی آسائشوں میں کھو گئے اور دین کے ہوئے تو اپنی نجات کو کافی سمجھ لیا، گویا ہم ذاتی خوش حالی اور ذاتی

کشمکش سے آگے نہیں سوچ سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا بھی ہمارے ہاتھ سے گئی اور دین بھی۔

بات یہیں تک نہیں رکی، بلکہ ہم نے اپنی ہر ناکامی اور ہر کامیابی کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ ذاتی ناکامی سے لے کر عالمی کردار میں اپنی ناکامی تک کو اپنی تقدیر سے تعبیر کیا اور اپنے دامن میں منہ چھپا کر بیٹھ گئے۔ تقدیر پرستی ہمارا اس وقت بھی شیوہ تھی، جب پہلی جنگ عظیم ہوئی اور آج بھی، جب تیسری عالمی جنگ کے سائے منڈلا رہے ہیں۔ ہم اب بھی تقدیر کو اپنا مقدر سمجھے بیٹھے ہیں۔ اقبال نے مسلمان کو تقدیر پرستی سے نکالنے کی جو کوشش کی تھی، اس کی آج بھی اتنی ہی ضرورت ہے، جتنی تو ان کے عہد میں مسلمانوں کو تھی۔ اقبال نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ:

آزاد کا ہر لحظہ پیام ابدیت — محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگ مفاجات

گویا آزاد کے لیے کوئی تقدیر نہیں، بلکہ وہ خود اپنی تقدیر ہے، جب کہ غلاموں کے لیے ایک قوم نہیں آتی۔ اقبال نے واضح کر دیا تھا کہ:

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے — ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

کیا یہ بات محض اقبال کے عہد تک درست تھی؟ کیا آج جرم ضعیفی کی سزا اصول بھی ہے؟ کیا آج عالمی طاقتیں کمزور ملکوں کو جینے کا حق دے رہی ہیں؟ کیا آج اقوام عالم کی کوئی تنظیم افریقہ و ایشیا کی ترقی میں ہاتھ بٹانے لگی ہے؟ نہیں، یقیناً ایسا نہیں۔ آج بھی قوموں کی کمزوری ان کے خاتمے کا اعلان کر رہی ہے۔ اسی لیے اقبال نے فرد کو خودی کا درس دیا، جس سے وہ اپنی تخلیق، اپنے خالق کی منشا اور کائنات میں اپنے کردار سے بخوبی آشنا ہو سکے اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس تکوین میں اپنی ہستی کا اثبات کرے۔ پھر ایک ایک فرد مل کر قوم بنے اور قوم اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود میں ہاتھ بٹا سکے۔ دوسری طرف یہ بھی بتا دیا کہ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ، لیکن جب ملت اپنی صلاحیتوں سے بے بہرہ ہو جائے اور فرد کی مہارتوں سے استفادہ نہ کر سکے تو جو صورت حال درپیش ہوگی، اقبال نے اس کا بھی اظہار کر دیا:

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے — کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

گویا آج ہمارے انفرادی اعمال ہمیں اس چنگل سے بچانے کے لیے کافی نہیں، ضرورت ہے ملی کردار ادا کرنے کی۔ یہ وہ وقت ہے، جب بنی نوع انسان فکری بحران کا شکار ہے، بالخصوص مسلم ممالک اور ان کے عوام تو ہنوز فکری قیادت سے محروم ہیں۔ ان ممالک میں بعض نہایت پسماندہ ہیں، بعض ترقی پا رہے ہیں اور چند ایک میں وسائل اور دولت کی فراوانی ہے، لیکن ایک بات میں ان سب میں اشتراک ہے اور وہ ان کی فکری پسماندگی، اسی کا نتیجہ ہے کہ عالم اسلام میں بے علمی نے ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ کشمیر، افغانستان، عراق، تیونس، لیبیا، یمن اور شام ہونے والے انسانی المیے نے ہمیں کسی عمل پر نہیں اکسایا، بلکہ ہم زیادہ سے زیادہ یہ کرتے ہیں کہ اللہ سے دعا کریں، وظائف پڑھیں اور بس! ہم دعاؤں کے ساتھ جنگ جیتنے کا منظر بغداد پر منگولوں کے حملے کے وقت دیکھ چکے ہیں۔ ہم دعاؤں کے ساتھ جنگ جیتنے کا منظر ڈھاکا میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ حضور سرور کائنات نے مدینے سے نکل کر دشمن کا مقابلہ کیا تھا۔ اقبال اپنے مواقع پر مذہبی رسومات پر عمل کو ناکافی قرار دیتے ہیں اور عملی کردار پر زور دیتے ہیں۔ آج مسلمان سوشل میڈیا پر یہ لکھ کر اپنا فرض ادا

کر رہا ہے کہ اے اللہ کشمیر کے مسلمانوں پر رحم فرما، اے اللہ فلسطین کے مسلمانوں پر رحم فرما، اے اللہ برما کے مسلمانوں پر رحم فرما، اے اللہ شام کے مسلمانوں پر رحم فرما۔ لیکن پوری دنیا میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ ہماری بڑھتی ہوئی تعداد بھی ہمارے کسی کام نہیں آ رہی، وجہ وہی ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا تھا:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دلگیری
ترے دین و ادب سے آ رہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالمِ پیری
شیاطینِ ملوکیت کی آنکھوں میں ہے وہ جادو
کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری

اقبال کے خیال میں رسمِ شبیری کو ترک کرنے سے ملتِ اسلامیہ اپنے وجود کے خاتمے کا اعلان کر رہی ہے۔ محض فکر و خیال کی انجمنیں سجانے سے، محض اجتماعات کرنے سے، محض کانفرنسوں کے انعقاد سے، محض مشترکہ اعلامیے سے کام نہیں چلے گا۔ ایک وقت تھا کہ مسلم سلطنت کی سرحدیں ایشیا، افریقہ اور یورپ تک پھیلی ہوئی تھیں اور ایک یہ وقت ہے کہ مسلمان چھوٹی چھوٹی جغرافیائی وحدتوں میں تقسیم ہیں اور محض اپنے اپنے مفادات کی خاطر سامراجی قوتوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ اقبال نے قوموں کی اجتماعی زندگی میں ان کے تجربات اور واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

سامراجی قوتوں اور ان کے نمک خواروں کی خواہش ہے کہ عروج و زوال کے اس دائمی کھیل سے مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال باہر کیا جائے۔ اس کے لیے وہ امتِ مسلمہ کے دلوں سے اللہ کی توحید، حضور نبی کریم کا عشق، قرآن سے تعلق اور اکابر کے افکار سے ان کا رشتہ توڑنے میں لگے رہتے ہیں۔ اقبال کو اس طرزِ عمل کا بھرپور ادراک تھا، چنانچہ انھوں نے اپنی ایک نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں اس کا ایک حل بتا دیا تھا جس سے اقبال کی عصری معنویت ختم کی جا سکتی ہے۔

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے ان کی روایات چھین لو
آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

◆◆◆

ضروری بات

ماہنامہ "تخلیق" نے جنوری 2016ء سے اپنا دفتر چند ناگزیر وجوہات کی وجہ سے تبدیل کر دیا ہے۔ "تخلیق" اپنے کرم فرماؤں سے گزارش کرتا ہے کہ اس کا نیا پتہ اپنے احباب تک پہنچا دیں جو مندرجہ ذیل ہے:

مکان نمبر E/12، شیراز ولاز، اسلام نگر، والٹن روڈ، لاہور کینٹ

شبلی کی آپ بیتی......ایک تحقیقی کارنامہ

ڈاکٹر سکندر حیات میکن

اردو ادب کے افق پر مولانا شبلی نعمانی کی چمک دمک ایک ستارے کی مانند ہے۔ ان کی خدمات اردو زبان و ادب پر گراں قدر احسان ہیں۔ شبلی کی شخصیت ایک رُخی نہ تھی بلکہ انھوں نے اپنی متنوع جہات میں اپنی تخلیقی، فکری اور تحقیقی صلاحیتوں کو بھرپور انداز میں منوایا۔ ان کا نمایاں رجحان سوانح نگاری کی طرف تھا۔ انھوں نے نامور شخصیات کی سوانح بڑی تحقیق و تدقیق کے ساتھ پیش کی ہیں۔ ان کی وفات کے سو سال بعد بھی ان کی تخلیق کردہ تمام سوانح عمریاں استفادہ کے در سے بے بہا خزانہ نظر آتی ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ سوانح نگار شبلی کی اپنی زندگی پر جم کر کسی نے بھی روشنی نہیں ڈالی۔ سید سلیمان ندوی نے 'حیات شبلی' میں ان کے شخصی گوشوں کی طرف توجہ دلائی۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے "شبلی کی حیات معاشقہ" لکھ کر ان کی شخصیت کے نفسیاتی گوشوں کو ابھارا۔ غنیمت ہے کہ ان کی وفات پر سو سال گزرنے کے بعد "شبلی شناسی" میں جو گراں قدر خراج تحسین ڈاکٹر خالد ندیم نے پیش کیا ہے، اسے ایک قابل قدر تحقیقی کارنامہ قرار دیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر خالد ندیم نے مولانا شبلی نعمانی کی آپ بیتی خود شبلی کی تصانیف، خطوط اور شاعری سے مرتب کی ہے۔ یہ کتاب شبلی صدی تقریبات کے سلسلے میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ اور نشریات لاہور سے نومبر 2014ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب سے قبل کوئی تحریر شبلی کی سوانح کا اس تفصیل سے احاطہ نہیں کرتی۔ ڈاکٹر خالد ندیم کے بقول:

> "چاہیے تو یہ تھا کہ اہل علم مسلمانانِ برصغیر کے اس عظیم محسن کی سوانح و شخصیت پر پوری توجہ دیتے، ان کے قوت ارادی، مستقل مزاجی اور مستقل نگاہی کا راز جاننے کی کوشش کرتے، مگر افسوس ہے کہ شبلی کے سوانح نگاروں کے ہاں بالعموم بعض اکابر اور اداروں کی حمایت اور مخالفت کا جذبہ کار فرما رہا، جس کے نتیجے یہ نکلا کہ کوئی سوانح عمری شبلی کی زندگی اور شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہ کر سکی۔" (ص 13)

'شبلی کی آپ بیتی' کو پہلی بار ڈاکٹر خالد ندیم نے تحقیقی طریق کار کے مطابق ترتیب دیا ہے۔ خالد ندیم نے شہد کی مکھی کی طرح مکاتیب شبلی سے قطرہ قطرہ شبلی کے شخصی کوائف اور گوشے کشید کیے ہیں۔ ایک محقق کی طرح تصانیف شبلی کو عرق ریزی سے چھانا، پھر ایک متجسس مسافر کی طرح مقالات شبلی اور خطبات شبلی میں غوطہ زن ہوگئے اور حیات شبلی کے گوہر تلاش کیے۔ خوب سے خوب تر کی جستجو میں جب ان کی تشنگی نہ بجھی تو شبلی کے اردو فارسی شعری کلام کی بھی چھان پھٹک کی۔ غرض انھیں شبلی کی زندگی کے بارے میں خود ان کا بیان جہاں بھی ملا، اس سے زیر نظر کتاب میں استفادہ کیا۔ اہم بات یہ کہ اس "آپ بیتی" میں مؤلف نے زمانی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔

1857ء سے 1889ء تک کے ابتدائی واقعات کو فرداً فرداً اور اجتماعی سنین کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے اور ہر اقتباس پر حوالہ نمبر درج کیا گیا ہے، بلکہ پاورقی حوالہ جات نے کتاب کی قدر میں اضافہ کر دیا ہے اور یوں یہ حوالے قاری کے لیے سہولت کا باعث بنے

ہیں۔ 1882ء کے عنوان کے تحت شبلی کی حالت زار انھیں کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے:

"آشفتہ سری اور شوریدہ سری کے باعث میری حالت اتنی بگڑ گئی ہے کہ آج کل مجھے کچھ نہیں سوجھتا۔ میری خوش خلقی و خوش بختی خس و خاشاک میں مل گئی ہے، بگڑ میں جانتا ہوں یا میرا اللہ کہ میں جھوٹ کو سچ بنا کر پیش کرنے کے بجائے گر جانے کو ترجیح دیتا ہوں۔ وہ چند ساتھی، جو بارگاہ ایزدی سے مجھے ودیعت ہوئی ہیں، یہ انھی کی سزا ہے کہ اس قسم کے کام کر رہا ہوں۔ دوسرے میرے بارے میں کیا سوچتے ہیں، اپنا نہیں، البتہ میں خود اپنے بارے میں یہ سوچتا رہتا ہوں کہ کیا میں وہی شبلی ہوں، جو کبھی ہوا کرتا تھا؟ قسمت نے یاوری کی تو (ان شاء اللہ) پھر وہی شبلی بن کر دکھاؤں گا۔" (ص 26)

تحقیقی اور تنقیدی حوالے سے دیکھا جائے تو زیر بحث کتاب سے مولانا شبلی کی شخصی، علمی، ادبی، مذہبی اور دیگر حوالوں سے جو شبیہ مرتب ہوتی ہے، ایک استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ قارئین کے لیے اس کتاب کی وساطت سے شبلی کی زندگی کے تمام گوشوں کو منظم صورت میں دیکھنا ممکن ہوا ہے۔ شبلی نعمانی کی محنت شاقہ کی تصویر بھی ابھرتی ہے کہ کس طرح انھوں نے اپنی تصانیف کے لیے کاوشیں کیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"امام ابوحنیفہ کی سوانح عمری (سیرۃ النعمان) کا پہلا حصہ جو قریباً ایک سو چالیس صفحوں میں ہے، ختم ہو گیا۔ دوسرے حصے میں صرف ان کے علوم و ترتیب فقہ و طرز اجتہاد کی تفصیل ہوگی۔ اخیر میں ان کے مشہور شاگردوں کا مختصر تذکرہ ہوگا، لیکن امید ہے کہ دوسرا حصہ پہلے سے ضخامت میں زیادہ ہوگا اور حقیقت میں میری محنتوں کا وہی تماشاگاہ ہوگا۔ اس کتاب کی تصنیف میں گو بڑی خاک چھاننی پڑی، بہت سے کتب خانے دیکھنے پڑے، تاہم اگر کتاب مرضی کے موافق تیار ہوگئی تو ایک نادر چیز ہوگی اور تمام محنت اور کاوش کا معاوضہ ہو جائے گا۔" (ص 51)

خالد ندیم نے شبلی کے سفرنامے سے بھی استفادہ کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"مصر کی روانگی کے ساتھ گویا میرے سفر کا بھی خاتمہ ہو گیا، کیونکہ اس کے بعد نہ کوئی نئی آبادی دیکھی، نہ کوئی جدید واقعہ پیش آیا۔ میں نے سفر کا تمام زمانہ خلاف توقع نہایت لطف، آرام، دلچسپی اور اطمینان کے ساتھ بسر کیا، لیکن اس موقع پر یہ بتانا میرا فرض ہے کہ یہ لطف و آرام مجھ کو کیوں نصیب ہوا اور کن لوگوں کی وجہ سے ہوا؟ ان سوالوں کا صرف ایک جواب ہے، یعنی عربوں اور ترکوں کے بے پایاں اخلاق۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر عربوں کی کریم الاخلاقی سے مجھ کو سابقہ نہ پڑتا تو سفر کی دلچسپیوں کا کیا ذکر ہے، زندگی دوبھر ہو جاتی۔" (ص 110)

1890ء تا 1914ء، ڈاکٹر خالد ندیم نے فرداً فرداً ہر سال کو بطور عنوان پیش کیا ہے اور اس مناسبت سے شبلی کی تحریروں سے ان کی سوانحی جھلکیوں کو مربوط صورت سامنے لائے ہیں۔ شبلی کی تصانیف کا تذکرہ بھی اس آپ بیتی میں مفصل اور معلوماتی انداز میں موجود ہے۔ شبلی

کی تصانیف کے سلسلے میں مختلف مراحل کا تذکرہ بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ شبلی نعمانی اردو کے ساتھ اپنی وابستگی کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

> ”مسٹر برن نے چند نہایت مستحکم تجویزیں اردو کے حق میں پیش کی تھیں کہ راس بھاشا انٹرنس کے امتحانات میں لازمی کر دی جائے اور اردو، جو مدارس میں ہے، وہ ایسی کر دی جائے کہ ہندی بن جائے۔ عجیب منطقی دلائل گھڑے تھے۔ تیسرے جلسے میں کامل فتح ہوئی، تمام تجویزیں اڑ گئیں۔ میں نہایت زور سے کہتا ہوں کہ نہایت ابتدائی درجوں تک ایک سادہ زبان، جو عربی اور سنسکرت دونوں سے تقریباً آزاد ہو، اختیار کی جا سکتی ہے، لیکن ہائر کلاسوں کے لیے اردو اور ہندی زبانوں کا الگ الگ قائم کرنا چاہیے اور اسی صورت میں دونوں اعلیٰ درجے تک ترقی کر سکتی ہیں۔“ (ص 267)

ڈاکٹر خالد ندیم نے 1913ء اور 1914ء کے ضمن میں بڑے مفصّل انداز میں واقعات کو ترتیب دیا ہے۔ شبلی نعمانی نے اپنی زندگی میں نامور شخصیات کی سوانح عمریاں لکھیں۔ ان سوانح عمریوں میں شبلی نے بڑی تحقیق و تدقیق سے کام لیتے ہوئے مستند معلومات فراہم کی ہیں۔ شبلی کے پیشِ نظر ابھی کچھ امور باقی تھے کہ زندگی نے وفا نہ کی۔ شبلی نے مستقبل کے محققین کے لیے نئے تحقیقی موضوعات کی نشان دہی بھی کی ہے۔ بقول شبلی:

> ”جناب امیرؑ کی عمدہ سوانح عمری کی سخت ضرورت ہے۔ نہایت نا تمام کتابیں اب تک لکھی گئیں۔ عربی میں کوئی جامع تصنیف نہیں۔ ان کے فتوحات اور محاربات کے علاوہ ان کے علمی کارنامے بہت ہیں۔ اکثر خواص میں یہ بھی خیال پھیلا ہوا ہے کہ جناب موصوفؓ کے اصول سیاسی کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کو بھی رفع کرنا ہے۔ میں حضرت عمرؓ کے بارے میں سنی اور حضرت امیرؑ کے بارے میں شیعہ ہوں۔“ (ص 244)

اس آپ بیتی میں شبلی کی زندگی کے آخری ایام کے حوالے سے بھی خاصی معلومات موجود ہیں۔ سیرت نبویؐ ان کا محبوب ترین کارنامہ ہے، جو پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اور جس کی وجہ سے وہ بہت افسردہ رہتے تھے۔ شبلی سیرت ہی کو اپنی تمام عمر کی کمائی گردانتے تھے اور آخری لمحات میں بھی سید سلیمان ندوی کو اس سیرت کی تکمیل کی ہدایت کرتے رہے۔ سیرت کے حوالے سے شبلی کی افسردگی ان کے ان بیانات سے ظاہر ہوتی ہے:

> ”افسوس یہ ہے کہ سیرت پوری نہ ہو سکی اور کوئی نظر نہیں آتا کہ اس کام کو پورا کر سکے۔ آج سلیمان آ ویں گے اور کل پرسوں چند طلبہ اور، لیکن بیماری سب منصوبے غلط کر رہی ہے۔ میں اب تک یہیں اعظم گڑھ میں رہا اور گھر، جو تین چار کوس ہے، نہ جا سکا۔ میں واقعات حال (بھائی کی وفات) سے اس قدر افسردہ ہو گیا ہوں کہ اب کسی بات سے طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی۔ وقت تو یہ تھا کہ ہم چند لوگ یکجا ہو جاتے اور کچھ کام کرتے، لیکن میری دنیا کا یہ حال ہے کہ خود بے نیاز ہو گیا ہوں، لیکن عزیزوں (یعنی حامد) کی (نوکری اور دنیا کی جاہ طلبی سے) اب سخت شاق گزرتی ہے۔“ (ص 352)

بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شبلی کی آپ بیتی میں مؤلف نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا، جب کہ دوسری طرف اس مصرعے — "کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے" — کے مصداق جاں فشانی اور عرق ریزی کے نتیجے میں اردو ادب کے اہم ستون (شبلی) کی آپ بیتی خالد ندیم کی خالص تحقیقی ریاضت کی بدولت منصۂ شہود پر آ گئی۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس ضمن میں یوں رقم طراز ہیں:

> "خالد ندیم صاحب نے اس کاوش کے ذریعے شبلی کی حقیقی زندگی کے واقعات کو خود ان کی زبان سے اس طرح پیش کیا ہے کہ یہی گمان ہوتا ہے کہ یہ شبلی کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ مؤلف کی اس ماہرانہ کاوش پر میں ان کو ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں۔ انھوں نے یہ کام کر کے نئی نسل کو ایک وقیع ادبی روایت سے جوڑنے کی کوشش کی ہے۔" (ص 8)

کتاب کے آخر میں تمام ماخذات کو کتابیات کی صورت میں پیش کیا گیا ہے اور اشاریہ مرتب کر دیا گیا ہے۔ یہ اشاریہ کتاب کی وقعت اور تحقیقی طریق کار پر دال ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تمام تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی صلاحیتیں اس کتاب پر صرف کر دی ہیں۔

ڈاکٹر خالد ندیم کا یہ تحقیقی کارنامہ ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ شبلی کی کہانی خود ان کی زبانی بیان کر کے انھوں نے اردو ادب اور شبلی شناسوں کے لیے بیش بہا معلومات ایک جلد میں مہیا کر دی ہیں، دوسری طرف انھوں نے محققین اور ناقدین کے لیے شبلی شناسی کے حوالے سے کئی در وا کر دیے ہیں۔

◆◆◆

علمی، ادبی اور تحقیقی مجلہ بانی مدیر ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی

سہ ماہی "نوادر"

مدیرہ: بیگم شاہین زیدی کی سرپرستی میں باقاعدگی سے جاری ہے

قیمت:-/400روپے   سالانہ:-/1,600 روپے

ملنے کا پتہ: 266E/1, St No. 8، پوسٹ آفس ٹاؤن شپ، واپڈا ٹاؤن، لاہور

یہ کربلا کی خاک پہ بہتا ہوا لہو...... غیر مسلموں کی نظر میں

سید مبارک علی شمسی

کربلا ایک روشن چراغ ہے، جسے حضرت امام حسینؑ نے اپنے خون سے روشن کیا اور اسی سے اسلام روشن ہے۔ کربلا اسلام اور انسانیت کے لئے عظیم قربانی اور کردار و اقدامات کے تسلسل میں اسلامی اقدار کی ایک منور مثال پیش کرتی ہے۔ حضرت امام حسینؑ ان کے اہل بیت اور اصحابؓ نے شہادت کی جو مثالیں پیش کی ہیں وہ عقول انسانی کو بالیدگی اور قلوب انسانی کو اعلیٰ و ارفع اقدار فراہم کرتی رہیں گی جو انسان کو انسانیت کے اس بلند مرتبے پر فائز کرتی ہیں جس کی اللہ تعالیٰ ایک سچے مسلمان سے توقع رکھتا ہے۔
اسلام ایک دائمی تحریک اور دائمی انقلاب کا نام ہے۔ اس لیے مسلسل قربانیاں پیش کرتا رہتا ہے۔ اس نے اپنی ابتداء سے کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لئے جاہلیت کی قوتوں اور اقدار کے مقابلے میں شہداء پیش کیے اور تکمیل دین کے بعد تحریف اور تخریب کی قوتوں کے مقابل اپنی مذکورہ کامیابی کی حفاظت کرنے کے لئے بھی مسلسل قربانیاں پیش کیں۔ ہر انقلاب کے مقابلے میں اس انقلاب کی اقدار اور اس کے مقاصد کی مخالفت ابھرتی رہی جس کا ہدف یہ تھا کہ وہ اسے اور اس کے مستقبل کو تہس نہس کر دے۔ یہیں سے انقلاب دشمنی کے خلاف شہادت کی عظمت ابھر کر سامنے آتی ہے کیونکہ یہ ان فاتحین کی شہادت ہے جو فتح و نصرت کے اعزاز کے امیدوار نہیں بلکہ فتح پا لینے کے بعد بھی اپنے موقف پر ڈٹے رہے تا کہ وہ شہادت جیسی عظیم نعمت سے سرفراز ہو سکیں۔

حضرت امام حسینؑ اسی فاتح گھرانے سے تعلق رکھتے تھے آپ فتح کے تمام اعزازات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلامی معاشرے میں پر آسائش زندگی بسر کر سکتے تھے جسے مسلمانوں کی اکثریت شاید قبول کر لیتی، کیونکہ عربوں کی تاریخ میں جاہ و حشمت کی بہت قدر کی جاتی تھی، جاہلیت کے مقابلے میں فتوحات کرنے والے کو با عظمت تسلیم کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ اسلام میں ان حکمرانوں اور جرنیلوں کی بہت تعریف و توصیف کی گئی ہے جنھوں نے فتوحات کیں خواہ ان کی جنگیں اسلام کی روح کے منافی ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن حضرت امام حسینؑ نے دیکھا کہ اسلام دشمن قوتیں اسلام ہی کے بھیس میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ اسلام فکری جمود کا شکار ہو چکا ہے۔ اور جیسا کہ رسول اکرمؐ نے مسلمانوں کو متنبہ کیا تھا کہ اسلامی خلافت قیصریت، کسرائیت اور جابرانہ شہنشاہیت میں تبدیل ہو گئی ہے تو حضرت امام حسینؑ نے اس سازش اور ظلم کی تلوار کو صبر کی ڈھال پر پاش پاش کر دیا۔ ایک طرف منافقانہ طرز فکر کی حامل اسلام دشمن قوتیں جو سادہ لوح مسلمانوں کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے سرگرم تھیں تو دوسری طرف خالص اسلامی اور ایمانی قوت جو اسلام کی بقاء کے لئے اپنا تن، من، دھن قربان کرنے کے لئے کمربستہ تھی۔

معرکۂ کربلا در اصل دو متضاد قوتوں کا ٹکراؤ نظر آتا ہے۔ واقعۂ کربلا کی وجوہات جو بھی ہوں مگر یہ بات طے شدہ ہے کہ قربانی حضرت امام حسینؑ خالصتاً اسلام کی ڈگمگاتی ناؤ کو سہارا دینے کے لئے تھی۔

61 ہجری 10 محرم الحرام کو میدانِ کربلا میں جامِ شہادت نوش کرنے والے پیارے امام عالی مقام حضرت حسینؑ کو سارا زمانہ سلام کرتا ہے۔ آپؑ نے سجدے میں سر کٹا کر دینِ اسلام کی لاج رکھی۔ امام عالی مقامؑ کی شہادت ہر مذہب، عقیدہ اور فرقے کی زنجیروں سے آزاد ہو کر حق پر مر مٹنے کا اور امن کا پیغام دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم بھی سیدنا حسین ابن علیؑ کے اس مقدس مشن کو سراہتے ہیں اور اپنا نذرانۂ عقیدت تا حشر پیش کرتے رہیں گے۔

سردار کرتار سنگھ ایڈووکیٹ ہائی کورٹ پٹیالہ لکھتے ہیں کہ "اگر امام حسینؑ کو حکومت ملتی تو ان کی حکومت زمین پر آسمانی حکومت ہوتی۔ ہم مرنے کے بعد بھی وہ ایک ایسی حکومت کر رہے ہیں جو کوئی فانی حکمران نہیں کر سکتا۔ امام حسینؑ لازوال تخت و تاج کے مالک ہیں وہ ہمارے عرفانی بادشاہ ہیں اور انہوں نے فطرتِ انسانی کو غیر محدود وسعت عطا کی ہے"۔

روپ کنواری لکھتی ہیں کہ "حضرت امام حسینؑ کی محبت و الفت نہ ہو تو زندگی فضول ہے"۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ امام حسینؑ سے بھرپور عقیدت کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں، مسدس کا ایک بند ملاحظہ کیجئے۔

ہم کسی دین کے ہوں صاحبِ کردار تو ہیں — ہم ثنا خوانِ شہِ حیدرِ کرارؓ تو ہیں
نام لیوا ہیں محمدؐ کے پرستار تو ہیں — یعنی مجبور پئے احمدِ مختارؐ تو ہیں
عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں — صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

ست ورشن سنگھ کو سانحۂ کربلا سے حوصلہ بھی ملتا ہے اور سہارا بھی اور وہ بے ساختہ بول اٹھتے ہیں کہ۔

حسینؑ حوصلۂ انقلاب دیتا ہے — حسینؑ شمع نہیں آفتاب دیتا ہے

ڈاکٹر ستنام سنگھ خمار کہتے ہیں کہ:

خمارؔ اپنے مسائل کا حل ہے کرب و بلا — غمِ حسینؑ پہ ہم انحصار کرتے ہیں

شمشیر سنگھ شیر نے امام عالی مقامؑ کو اپنا محسن تسلیم کیا ہے۔ جن کے احسانوں سے ان کی گردن خمیدہ ہے اب ایک اور احسان کی آرزو رکھتے ہیں اور امام عالی مقامؑ سے التجا کرتے ہیں کہ میری بخشش کا سامان آپؑ کے ہاتھ میں ہے وہ مجھے عطا کریں تا کہ دونوں جہانوں میں خوش و خرم رہوں وہ لکھتے ہیں کہ:

میرے مولاؑ اور اک احسان کرتے جایئے — میری بخشش کا ذرا سامان کرتے جایئے

کرشن گوپال امام عالی مقامؑ سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

غیر مسلم بھی ہیں شریکِ غمِ مسلمانوں کے ساتھ — آج ہمدردی ہے انسانوں کو انسانوں کے ساتھ

رام پرکاش ساحر کہتے ہیں کہ:

ہے حق و صداقت میرا مسلک ساحرؔ — ہندو ہوں مگر دشمنِ شبیرؑ نہیں

پرتپال سنگھ بیتاب کہتے ہیں کہ

اسلام زندہ کر کے جو رخصت ہوئے شہید — زندہ ہے ان کا نام وفا کی کتاب میں

آر ڈی گورداسپوری کہتے ہیں کہ:

کس عزم و اہتمام سے طے آپ نے کیا کانٹوں سے تھا بھرا ہوا رستہ حسینؑ کا

گوپی ناتھ امن لکھنوی امام عالی مقام سے عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

کافر کہو، مشرک کہو، جو کچھ کہو وہ ہندو ہوں مگر دشمنِ شبیرؑ نہیں

پنڈت ایشری پرشاد سیوہان گر نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ:

رکھتے ہیں جو شبیرؑ سے کاوش پنڈت ایسے تو مسلمانوں سے ہندو اچھے

بے سنگھ لکھتے ہیں کہ:

بے سنگھ پناہ مانگے گی مجھ سے نرک کی آگ میں ہندو ہوں مگر ہوں شیدا حسینؑ کا

آخر میں دعا گو ہوں کہ خالق اکبر ہمیں حضرت امام حسینؑ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے اور شہادت حسینؑ کو ہمارے قلوب میں اور مقصد شہادت کو ہمارے اذہان میں رکھے امام عالی مقام کے حضور اپنے ایک شعر کے ساتھ اپنے مضمون کا اختتام کرتا ہوں۔

تم لاکھ کوششیں کرو مگر چھپ نہ سکے گا یہ کربلا کی خاک پہ بہتا ہوا لہو

◆◆◆

معروف افسانہ نگار، ناول نگار، کالم نگار عذرا اصغر

کے فن و شخصیت پر لکھے گئے ممتاز قلم کاروں کے مضامین کا مجموعہ

لفظوں کا کھلیان (زیر طبع)

ناشر: دستاویز، بلاک نمبر 7، آفس نمبر 6، سیکنڈ فلور، میاں چیمبرز، 5۔ ٹمپل روڈ، لاہور

فون: 03334344716, 042-36280034

معروف پنجابی شاعر سلیم شہزاد کا نیا شعری مجموعہ

نیندر بھجیاں نظماں

شائع ہوگئی ہے ۔۔۔۔۔ قیمت -/300 روپے

ملنے کا پتہ: بک ہوم، بک سٹریٹ، 46۔ مزنگ روڈ، لاہور۔ فون: 042-37245072

تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیسا!
Tibet

گوشۂ فیض احمد فیض

قطرے میں دجلہ

فیض 1911ء۔1984ء کی یاد میں

امین راحت چغتائی

مجھے جناب فیض احمد فیض پر پہلی نظم کہنے کی سعادت حاصل ہے۔ یہ نظم "دستِ صبا کے نام" سے 16 فروری 1954ء کو روزنامہ "امروز" لاہور میں شائع ہوئی تھی۔ فیض ان دنوں منٹگمری جیل میں نظر بند تھے۔ انھیں ایام میں روزنامہ "امروز" کے ایڈیٹر طفیل احمد خاں مرحوم تھے۔ وہ ماہر اقتصادیات تھے اور انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ تھے۔ ادبی حلقوں میں بھی دہشت پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے نظم کا عنوان "فیض احمد فیض کے نام" رکھا تھا۔ لیکن اس عہد کی حکومت یہ نام سنتے ہی دہل جاتی تھی۔ لہٰذا طفیل مرحوم نے فیض کی جگہ "دستِ صبا کے نام" سے نظم شائع کی تھی۔ اصل مقصد نظم کی اشاعت تھا، جو پورا ہو گیا، اور سب اربابِ قلم نے سراہا۔ انھیں دنوں فیض مرحوم کی مشہور غزل "گلوں میں رنگ بھرے ۔۔۔" جیل سے باہر آئی تھی۔ یہ غزل 29 جنوری 1954ء کو کہی گئی تھی۔ میری مذکورہ نظم اظہر جاوید مرحوم اپنے پرچے "تخلیق" میں بھی شائع کر چکے ہیں۔

بہرحال ذکر تو فیض کی شاعری کا ہے۔ ادب کے جو قارئین ان کی غزلیں اور نظمیں بار بار پڑھتے تھے وہ سب اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ فیض پر ادوار کی دہشت کا اثر قطعی نہیں ہوا تھا۔ انھیں جو کچھ کہنا ہوتا تھا کہہ گزرتے تھے۔ اور قارئین اسے پڑھ کر حوصلہ پاتے تھے۔ فیض مرحوم کی تمام تر شاعری ایک جہاں بیں یا بیروں بیں کی شاعری ہے۔ دروں بینی کا دور دور تک ان کے کلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ کچھ لوگوں نے بڑی "عرق ریزی" سے ان کے کلام سے داخلیت کا رجحان تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ایسا ہو نہیں سکا۔ کچھ کم اندیشوں نے ان کا موازنہ ن م راشد کی شاعری سے بھی کرنے کی سعی فرمائی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ اول تو رشید احمد صدیقی نے بہت عرصہ پہلے سے کہہ رکھا ہے کہ کبھی کسی مضمون میں دو شاعروں کے کلام کا موازنہ یا مقابلہ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ دوم ہر بڑے شاعر کی فکر اور لب ولہجہ جداگانہ ہوتا ہے۔ ایسے میں دلائل ناقص رہ جاتے ہیں۔ ن م راشد دروں بیں شاعر ہیں۔ ان کا لب ولہجہ اور الفاظ و تراکیب تخیل اور فکر مختلف ہے۔ فیض نرم خو اور روایت کے اندر رہ کر شعر کہتے ہیں اور نرم روی ہی میں سخت سے سخت بات کر جاتے ہیں۔ وہ مدِ مقابل پر ضرب تو لگاتے ہیں لیکن اس پر ضرب کا نشان بھی پڑنے نہیں دیتے۔ پھر دونوں کے مطالعے کا میدان بھی اپنا اپنا ہے۔ فیض قطرے میں دجلہ دکھانے کے قائل اور راشد دجلہ کو بھی قطرہ دکھنے کے خوگر۔ ایک کا لہجہ اتنا ملائم کہ کسی پر طنز بھی کرے تو چاند چلے دے اور دوسرا "گراں ڈیل" الفاظ و تراکیب کا انبار لگا کر بھی ابہام سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ ایک کے اشعار زبان زدِ خاص و عام اور دوسرے کے اشعار "تشریح و ترجمہ" کے محتاج۔ ایک کہے۔

کدام قطرہ کہ صد بحر در رکاب ندارد   کدام ذرہ کہ طوفان آفتاب ندارد

اور دوسرا دیکھیے

ورش، جبر و اختیارے محیط تحقیق داشت   ز حیرت، دم نجود بیدل آ چہ سازد بندہ بود

دراصل قطرے میں دجلہ دیکھنے یا دکھانے کا تعلق فرد کے اجتماعی رویے سے ہوتا ہے۔ یہی بات رجائی بناتی ہے اور یہی قنوطی۔ رجائیت، سوچ، گفتگو یا تخلیقی عمل میں پھیلاؤ پیدا کرتی ہے اور دروں بینی، سمٹاؤ کا رویہ ہے۔ اب اس پس منظر میں فیض کے یہاں کی بلاغت اور ضرب دیکھیں

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں   وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا
چاند کو گُل کریں تو ہم جانیں

یا

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن   یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منور جاتی ہے

فیض بہت حوصلہ مند آدمی تھے۔ ان کے بڑے بھائی حاجی طفیل احمد ان سے حیدرآباد جیل میں ملنے آئے۔ یہ 18 جولائی 1952ء کا واقعہ ہے کہ صبح کی نماز پڑھتے ہوئے رحلت فرما گئے۔ انتہائی صدمہ تھا مگر فیض برداشت کر گئے۔ بعد ازاں جیل ہی کے کچھ لوگ ان سے تعزیت کے لیے آئے مگر ان کے چہرے سے اس صدمے کے آثار دھل چکے تھے۔ اور وہ بقول بیدل ع ''الف با ہر چہ آمیزد محال است این کہ نون گردد'' یعنی الف حرف میں جیسے بھی آئے خم نہیں ہوتا۔

یہ انھیں کا حوصلہ تھا کہ قید تنہائی میں بھی رہے۔ پا بہ زنجیر بھی رہے۔ مقدمے کی سماعت کے میدان میں کٹہرے میں بھی آتے جاتے رہے مگر جبیں پر بل نہیں پڑا اور کہا تو یہ کہا

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے   یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

فیض مارچ 1951ء میں گرفتار ہوئے تھے۔ ستمبر 1955ء میں بری ہوئے۔ دوبارہ گرفتاری دسمبر 1958ء میں ہوئی اور اپریل 1959ء میں رہائی عمل میں آئی اور اس کا اظہار یوں ہوا

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھی تری انجمن سے پہلے   سزا، خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرمِ سخن سے پہلے

فیض مرحوم نے ''دستِ صبا'' کا ابتدائیہ 16 دسمبر 1952ء کو مرکزی جیل حیدرآباد سے لکھا تھا اور اسی میں اربابِ قلم کو واضح طور پر بتا دیا تھا کہ ''شاعر کا کام محض مشاہدہ ہی نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے۔ گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے۔ اسے دوسروں کو دکھانا، اس کی فنی دسترس پر، اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر۔ اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جدوجہد چاہتے ہیں۔'' اور اسی جدوجہد کا نام ''ہر حلقۂ زنجیر میں زباں'' رکھنے کا عمل بھی ہے۔

فیض کے نظریات اور ادب پر مختلف اربابِ قلم کے حملے بھی ہوئے بلکہ اب تک جاری ہیں لیکن مرحوم میں کمال کا نظم و ضبط تھا۔

کسی کو جواب نہیں دیا۔ مسکرا کر رہ جاتے تھے۔ یہ بھی ان کی ایک ادا تھی کہ "جو آئے، آئے، وہ دل کشادہ رکھتے ہیں۔" وہ تیسری دنیا کے کردار پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ اپنے ملک کے حالات پر ہی نظر ڈال لیجیے۔ پارلیمنٹ میں جو سرمایہ دار، صنعت کار اور زمیندار عامۃ الناس کی نمائندگی کر رہے ہیں، کیا وہ مزدوروں یا کھیتی باڑی کے پیشے سے وابستہ افراد کے اصل مسائل سے آگاہ ہیں۔ استحصالی نظام کا نام جمہوریت رکھ دینے سے بالائی طبقے کا استحصالی کردار تو نہیں بدل جاتا۔ ہر بڑے چھوٹے زمیندار کے ذاتی بندی خانے سے اب بھی ہیں بچیں قیمت مزدور اور ان کی بیویاں، بچیاں برآمد ہوتی رہتی ہیں۔ خبر تو چھپ جاتی ہے لیکن کسی خبر میں متعلقہ زمیندار کا نام نہیں چھپ سکتا۔ اس کے خلاف بھی کوئی کارروائی بھی نہیں چھپی۔ ایسا کیوں ہے؟ "صحافتی دیانت" سے بھی تو یہ سوال کیا جا سکتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ گستاخی آج تک کسی پڑھے لکھے شخص سے بھی سرزد نہیں ہوئی۔ مگر یہ طرح بھی اسی فیض نے ڈالی جو ہر نوع کے الزامات اپنے سر لیتا رہا ___ تاہم چپ نہیں بیٹھا، اور گویا ہوا تو یوں

ضبط کا عہد بھی ہے، شوق کا پیمان بھی ہے عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

ایک اور الزام فیض پر مسلسل لگتا چلا آ رہا ہے وہ یہ کہ فیض "مارکسی شاعر" تو ضرور ہیں لیکن رومانی شاعر بھی ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی شاعری کے آغاز ہی میں کہہ چکے تھے کہ "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا" اور بیچ میں پھر محبوب کو یاد دلاتے ہیں۔

تم سے چلتی رہے یہ راہ، یونہی اچھا ہے تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں
رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

یوں تو ایسے اشعار متعدد مل جائیں گے لیکن "مارکسی شاعر" پر محبت کیا حرام ہو جاتی ہے؟ کیا اسے کسی کے ہونٹوں کو "پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے" کہنے کا حق نہیں ہے؟ کیا یہ ٹھیکہ میر ہی نے لے رکھا ہے؟ فیض تو اپنی شاعری کے آخری دور میں بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

ہم تو مجبورِ وفا ہیں مگر اے جانِ جہاں اپنے عشاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے ہمارا کیا ہے

اب آخر میں فیض کی پوری شاعری کا جائزہ لیا جائے تو ڈاکٹر محمد علی صدیقی کی یہ بات (فیض احمد فیض، درد اور درماں کا شاعر) درست معلوم ہوتی ہے کہ فیض کی درونِ زنداں اور بیرونِ زنداں کی شاعری میں فرق ہے۔ "موخر الذکر شاعری میں "پولیٹیکل اپیل" زیادہ ہے۔ میں تو اس کی یوں وضاحت کروں گا کہ اس میں علامتِ عمل پر زور دیا گیا ہے اور زوال آمادہ روایت کو پوری شدت سے چیلنج کیا گیا ہے۔ فیض کی شاعری میں جو پیغام ___ "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" سے شروع ہوا تھا، وہ "چشم نم، جان شوریدہ کافی نہیں" نیز "آج بازار میں پابجولاں چلو" اور "ہم دیکھیں گے" سے ہوتا ہوا مختصر آفتاب کے تن (غبار ایام 1983ء) تک آ پہنچا ہے۔ اور شاعری کا جمالیاتی اسلوب مزید نکھرتا چلا گیا ہے۔ تشبیہات اور استعارات میں جدت آ گئی ہے۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ فیض اپنے آخری دور میں فکری پختگی اور مضبوطی کو بام عروج پر پہنچا دیتے ہیں۔

◆◆◆

ڈاکٹر وزیر آغا کی فیض شناسی

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "نظم جدید کی کروٹیں" پڑھیں تو یہ احساس اٹل صورت اختیار کر لیتا ہے کہ انہوں نے نظم جدید کے نمائندہ شعراء ن۔ م۔ راشد، میراجی، فیض احمد فیض، مجید امجد، یوسف ظفر، راجہ مہدی علی خان، اور قیوم نظر پر "سلسلۂ خیال" کے تنقیدی و تجزیاتی مضامین لکھے تھے تو انہوں نے نئی نظم کی "بوطیقا" (شعریات) کا مطالعہ گہری نظر سے کیا تھا اور ہر شاعر کی نہ صرف انفرادیت دریافت کی تھی بلکہ اس کے فن سے محبت بھی پیدا کی اور اس کے ارتقائے فن میں دلچسپی قائم رکھی۔ فیض صاحب سے ان کی ملاقات اگرچہ 1956ء میں سرگودھا کے ایک مشاعرے میں پہلی مرتبہ ہوئی لیکن ان کی شاعری سے محبت گورنمنٹ کالج لاہور میں چودہ برس پہلے (1942ء) پیدا ہو چکی تھی۔ اس ضمن میں انہوں نے یہ واقعہ بھی لکھا ہے۔

"۔۔۔ میں ہر روز مزنگ روڈ لاہور سے چلتا ہوا کالج پہنچتا۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ شدید سردی کی لہر آئی ہوئی تھی۔ یخ کر دینے والی ہوا چل رہی تھی۔ میں صبح سویرے سائیکل پر سوار کالج جا رہا تھا کہ اخبار کا ایک پھٹا ہوا ورق سڑک پر سے اڑا اور سیدھا میرے چہرے سے آ کر چپک گیا۔ چند لمحوں کے لیے تو میری آنکھوں کے آگے اندھیرا ہی اندھیرا تھا ــــ میں نے کاغذ کو چہرے سے اتار کر غصے بے خیالی میں اپنے کوٹ کی جیب میں ٹھونس لیا ــــ شام کو جب میں نے اپنی جیبوں کی تلاشی لی تو یہ اخبار کا ٹکڑا بھی برآمد ہو گیا۔ اس ٹکڑے پر نمایاں ترین چیز ایک نظم تھی۔ نظم کا عنوان اور شاعر کا نام دونوں غائب تھے۔ وہ حصہ ہی اخبار سے جدا ہو کر کہیں اڑ گیا تھا۔ میں نے نظم کا مطالعہ کیا تو پہلی ہی لائن نے مجھے جیسے جکڑ لیا۔ پھر جیسے جیسے میں آگے بڑھا ایک عجیب پراسراری کیفیت نظم سے برآمد ہو کر مجھے اپنے طلسمی ہالے میں جکڑتی چلی گئی۔ نظم ختم ہوئی تو میں بالکل تبدیل ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ جیسے میں وہ نہیں ہوں جو اس نظم کے مطالعے سے پہلے تھا۔ میرے اندر ــــ کہیں بہت اندر ــــ کوئی شے جیسے ٹوٹ گئی اور اس کی جگہ ایک بالکل نئی چیز اگ آئی تھی۔ اس سے پہلے کسی نظم نے مجھ پر اتنا گہرا اثر نہیں کیا تھا۔ ان دنوں اٹھتے بیٹھتے یہ نظم مجھ پر ہر وقت چھائی رہی ــــ بہرحال اس واقعہ کے کئی ماہ بعد مجھے کسی رسالے میں یہی نظم دوبارہ نظر آ گئی۔ اس بار عنوان بھی درج تھا اور شاعر کا نام بھی ــــ نظم تھی ــــ "تنہائی" اور شاعر کا نام تھا ــــ فیض احمد فیض (دائرے اور لکیریں، ص 12-11)

ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے عنفوانِ شباب میں فیض کی شاعری سے غیر معمولی طور پر متاثر ہونے کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا ہے:

"ابتدا میں تو میں فیض کی شاعری سے اس قدر متاثر تھا کہ مجھے "نقش فریادی" کی سب نظمیں زبانی یاد ہو گئی تھیں۔"

فیض کی شاعری نے ان کے نوجوان ذہن پر جو گہرا اثر پیدا کیا تھا اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ فیض کے ہاں لفظوں کا استعمال طلسماتیت کا حامل تھا اور ان کی تشبیہوں میں بلا کی انفرادیت اور تازگی تھی جو وزیر آغا کو بار بار فیض کی نظموں کا مطالعہ کرنے پر مجبور کرتی۔ وزیر آغا نے فیض کی اس انفرادیت کو بھی تسلیم کیا کہ ان کے ہاں رومان اور حقیقت کا جو سنگم ابھرا تھا جو اردو شاعری میں بالکل نئی

بات تھی۔ چنانچہ انھوں نے اس لطیف سے احساس یا جذباتی دھچکے کو پوری اہمیت دی جو فیض کی جوانی میں محبت کی صورت میں وارد ہوا اور ان کی شعری کائنات کے تغیر و تبدل کا باعث بن گیا۔ وزیر آغا رقمطراز ہیں:

"یہی محبت فیض کی شاعری کا پہلا سنگ میل ہے اور یہی وہ جذباتی دھچکا ہے جس نے فیض کو شعر کہنے پر اکسایا ہے۔ اس دور میں فیض نے بعض نہایت خوبصورت نظمیں لکھی ہیں جو اس کی ذات کے اندر برپا ہونے والے طوفان کی تندی اور وحشت کی ایک جھلک پیش کرتی ہیں اور شاعر کی محبت کی کرب ناک کیفیت کو بڑے فنکارانہ انداز سے بیان کرتی ہیں۔ شاید اردو نظم کے کسی شاعر نے محبت کے جذبے کو اتنی شدت اور خلوص کے ساتھ پیش نہیں کیا جتنی شدت اور خلوص کے ساتھ فیض نے پیش کیا ہے۔" ("نظم جدید کی کروٹیں" ص 80، لاہور 2007ء)

اہم بات یہ ہے کہ وزیر آغا کو فیض کی محبت میں عشق کی روایتی داستان کا کوئی عنصر نظر نہیں آیا۔ اس کے برعکس جسمانی قرب کے واضح آثار کی نشان دہی انھوں نے برملا کی ہے اور یہ نتیجہ بھی اخذ کیا ہے کہ اس محبت کی تندی سے ہی فیض کی شاعری میں غیر معمولی حدت بھی پیدا ہوئی اور یہ حدت شاعری کے عقب میں تحریک کی صورت میں موجود ہے۔ فیض کا یہ رنگ اظہار وزیر آغا نے فیض کی متعدد نظموں میں دریافت کیا ہے اور ان کی تمثالوں، حسی تلازمات اور لفظی ترکیبوں کی ندرت اور منفرد لہجے کی تحسین کی ہے۔ چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں ("چند روز اور مری جان")

اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا ("تنہائی")

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز ("سرودِ شبانہ")

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن — تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

کوئی پکارو کہ اک عمر ہونے آئی ہے — فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے — کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

اوپر میں نے فیض کی غزل سے چند اشعار بھی اقتباس کیے ہیں اور مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ وزیر آغا نے فیض شناسی میں فیض کی نظم کو ہی اہمیت نہیں دی، ان کی غزل کا تجزیہ بھی اپنے نقطہ نظر سے کیا ہے۔ چنانچہ وہ یہ بات تو مانتے ہیں کہ فیض نے کلاسیکی غزل کی امیجری اور لفظیات کا استعمال متکلم کی صورت میں کیا ہے لیکن وہ فیض کی تخلیقی انفرادیت کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"فیض کی تخلیقی اپج نے اس امیجری کو جامد اور اسیر جبر سے رہا کرایا ہے اور یوں اس کی یبوست کو دھو ڈالا ہے۔ دوسری

بات یہ کہ جب اوّل اوّل فیض نے کلاسیکی غزل کی امیجری کو ایک نئے تناظر کے لیے استعمال کیا تو حرف کی تبدیلی کے باعث اس امیجری میں ایک نئی معنویت پیدا ہو گئی جو اردو شاعری کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھا۔“

کلاسیکی غزل میں وزیر آغا نے عاشق کو ایک مظلوم انسان کہا ہے جو ہجر، دل، محبوب کے ظلم و ستم برداشت کر رہا ہے۔ انھوں نے فیض شناسی کے تحت تجزیہ کیا کہ فیض نے اپنی غزل میں عاشق کا کلاسیکی کردار تو برقرار رکھا البتہ محبوب کی قلب ماہیت کر دی۔ وزیر آغا کے بقول:

”اس انقلابی تبدیلی کے نتیجے میں کلاسیکی غزل کے رقیب کا رول بھی یکسر بدل گیا۔ کلاسیکی غزل میں ”رقیب“ عاشق کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ ”دربان“ کو تو پھر بھی رشوت یا خوشامد سے زیرِ دام لایا جا سکتا ہے، مگر ”رقیب“ کو زیرِ دام لانا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ فیض نے یہ کیا کہ ”رقیب“ کے ساتھ اپنا رشتہ ہی بدل لیا!!! فیض کے ہاں بھی ”رقیب“ ایک متوازی قوت کی حیثیت میں موجود تھا مگر فیض نے اس سے سمجھوتہ کر لیا۔ رقیب سے فیض نے کہا، بھائی ہمارا محبوب ہم سب کے لیے ایک قدرِ مشترک ہے، لڑائی جھگڑے کی ضرورت نہیں۔ چلو ایک ساتھ اس کے آستانے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں“ ــــ فیض نے رقیب کو ”ہم رنج“ کا منصب عطا کرنے کے ساتھ ساتھ استبدادی اور استحصالی نظام کو کلاسیکی محبوب کا متبادل روپ بھی تفویض کر دیا۔ چنانچہ فیض کی نظروں میں استحصالی نظام آلاتِ حرب سے لیس بھی تھا ــــ سنگ دل بھی تھا اور سنگ گراں بھی۔“

فیض کے نظامِ فکر میں وزیر آغا نے ان کی نظم ”رقیب سے“ کو کلیدی حیثیت دی ہے اور اس میں عاشق اور رقیب، انھوں میں باہمی ولے ”معاملاتِ محبت“ میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور دونوں یکساں آزار برداشت کر رہے ہیں۔ اس نظم کا ابتدائی بند حسبِ ذیل ہے:

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے؟

اور استحصالی نظام کا ظلم نظم کے آخری بند میں سامنے آتا ہے تو شاعر کا دل درد سے کانپ اٹھتا ہے۔

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

اس مرحلے پر وزیر آغا نے فیض کے ہاں شخصیت کی تعمیر کا عمل شاعری کے ارتقا کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتار محسوس کیا جس کے نتیجے میں فیض کی شخصیت ان کی شاعری پر غالب آ گئی۔ لیکن وزیر آغا کا محبوب وہ فیض تھا جس کے ڈکشن (Diction) میں بے پناہ تازگی تھی، قوت تھی، سچائی تھی اور جس کے شعری مواد میں یک رنگی، تکرار اور اکہرا پن ہی نہیں تھا بلکہ اسلوب کی تازگی اور توانائی بھی تھی۔ وہ اس طرح کے فیض کو ان کے لازمانی معاصر غالب کے متوازی رکھ کر مطالعہ کر رہے تھے اور دونوں میں مماثلتیں دریافت کر رہے تھے۔

مثلاً غالبؔ کا ایک شعر ہے:

درد دل لکھوں کب تک، جاؤں ان کو دکھلاؤں　　انگلیاں فگار اپنی ــــ خامہ خوں چکاں اپنا

اور فیض کہتے ہیں:

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے　　کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں ہم نے

غالب کا مصرعہ ہے:

تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

فیض پر ایک مصرعہ یوں اترا:

اور بھی دکھ ہیں ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

بالفاظِ دیگر وزیر آغا فیض صاحب کو بھی غالب جیسی اہمیت دیتے ہیں اور ان کی شاعری پر غالب کے اثرات کا تذکرہ تو اکثر مقامات پر نظر آتا ہے۔

وزیر آغا نے جدید نظم میں فیض کے اجتہاد کو "نقشِ فریادی" اور "دستِ صبا" میں دیکھا تو وہ کھل اٹھے تھے۔ لیکن ن۔م۔ راشد نے تو "نقشِ فریادی" پر دیباچہ لکھا تھا تو فیض کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"فیض کسی مرکزی نظریے کا شاعر نہیں۔ صرف احساسات کا شاعر ہے۔"

دوسری طرف وزیر آغا نے فیض کی شاعری پر مضمون شائع کیا تو لکھا:

"فیض نے "نقشِ فریادی" میں ایک ایسا نقطۂ نظر پیش کیا ہے جو تین نمایاں عناصر سے مل کر مرتب ہوا ہے ــــ ان میں سے پہلا عنصر رومان سے حقیقت کی طرف پیش قدمی ہے۔ دوسرا عنصر ــــ حال کی صورتِ حال بالخصوص طبقاتی ناہمواری اور سیاسی و سماجی استبداد کا شعور ہے ــــ اور تیسرا عنصر ہے ــــ "امید" ــــ ایک روشن مستقبل کی امید ــــ فیض کی شاعری ان ہی تین عناصر کے گرد گھوم رہی ہے۔"

وزیر آغا اس نظریے کی ہمہ گیری اور افادیت کے معترف تھے لیکن ان کے نزدیک فیض کا منصب لیڈر یا مصلح کا نہیں بلکہ ایک ذہین اجتہادی تخلیقی شاعر کا تھا۔ لیکن فیض انقلابی فضا کے دائرے میں آ گئے تو وزیر آغا کے محبوب شاعر پر موضوعات کا دامن تنگ ہونے لگا اور یہ جبر تکرار عمل میں آنے لگی۔ ایک مخلص "فیض شناس" کی حیثیت میں وزیر آغا نے "نقشِ فریادی"، "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" کا تجزیاتی مطالعہ کیا اور اپنا مضمون جس کا عنوان ــــ "فیض ابہام کی ایک مثال" تھا ــــ لکھا۔ لیکن اس وقت فیض اپنے اردگرد پھیلی ہوئی خلقت کے شاعر بن چکے تھے۔ راولپنڈی سازش کیس نے انہیں سیاسی شہرت عطا کر دی تھی۔ لینن امن انعام نے ان کو بین الاقوامی شخصیت کا درجہ دے دیا تھا۔ ان کی وفات کے بعد فیض شناسی میں شخصیت کے زاویے کو زیادہ اہمیت دی گئی اور ڈاکٹر ایوب، جناب تقی عابدی، اور مظفر حسین نے ضخیم کتابیں لکھیں لیکن متذکرہ بالا تفصیل کی روشنی میں تسلیم کرنا پڑے گا کہ ڈاکٹر وزیر آغا نے فیض شناسی کے لیے فنی اور فکری زاویے کا انتخاب کیا اور ان کی شاعری کے تمام مجموعوں کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ پیش کیا۔ وزیر آغا کے مقالات یقیناً فیض شناسی پر مزید کام میں معاونت کریں گے۔

◆◆◆

گوشۂ اظہر جاوید

اظہر کی یادیں ــــ باتیں!

ڈاکٹر کیول دھیر (انڈیا)

اظہر جاوید "تخلیق" کا مدیر تھا۔ وہ شاعر، افسانہ نگار، مترجم اور نقاد بھی تھا۔
ایک عام انسان سے خاص بنانے والے بے شمار اوصاف بھی اس میں تھے،
لیکن سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ایک بڑا انسان تھا۔ دوستوں کا دوست ــــ یاروں کا یار!
اظہر میرا بھی دوست تھا۔

جسمانی طور پر اظہر کو ہم سے جدا ہوئے چار برس ہو گئے لیکن ہماری سوچ میں ہمارے خوابوں، خیالوں اور دل کی دھڑکنوں میں آج بھی وہ زندہ ہے۔ تیس برس قبل ــــ 1985ء دسمبر ماہ میں پہلی بار مجھے پاکستان جانے کا موقع ملا۔ اظہر سے لاہور میں جب میری پہلی ملاقات ہوئی تھی! شاید ملاقات نہیں، محبت کے رشتے کو پہچان ملی تھی۔ شاید ایسا بھی نہیں! بچھڑے ہوئے دو بھائی پھر سے ملے تھے۔ ایسا ہی تھا یقیناً!

قیام پاکستان کے بعد بھارت سے جناب کنور مہندر سنگھ بیدی کے زیر قیادت بھارتی ادیبوں کا پہلا (اور اب تک کا آخری) سرکاری وفد پاکستان گیا تھا اور ان میں میرا نام بھی تھا۔ وفد نئی دہلی سے کراچی اور اسلام آباد ہوتا ہوا لاہور پہنچا تھا اور میں براستہ واہگہ لدھیانہ سے لاہور گیا تھا۔ وفد ہفتہ بھر بعد بھارت واپس چلا گیا لیکن میں تین ہفتے لاہور میں ہی رک گیا۔ پاکستان میں میرا رابطہ صرف بیگم بشریٰ رحمن اور مقبول احمد دہلوی سے تھا لیکن روبرو ملاقات ان سے بھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی اور اظہر جاوید سے قلمی رابطہ ان کے جریدوں "اوراق"، "فنون" اور "تخلیق" کے حوالوں سے تھا۔

بشریٰ رحمن اس وقت پنجاب اسمبلی کی رکن تھیں۔ مجھے لینے کے لئے انہوں نے واہگہ گاڑی بھیج دی تھی اور پاکستان میں میری ملاقات ان کی قیام گاہ پہ ان سے ہی ہوئی تھی۔ یہ ملاقات بہن اور بھائی کی تھی۔ بشریٰ رحمن اور ان کے میاں رحمن صاحب نے میرے قیام کا بندوبست اپنے ہی گھر کیا تھا۔ مہمان کی طرح نہیں، گھر کے ایک فرد کی طرح میں تین روز اس گھر میں رہا تھا۔

بات اظہر کی ہو رہی تھی۔

دوسرے روز غالباً الحمرا میں ہی بھارتی وفد کے اعزاز میں ایک تقریب کا انعقاد ہوا تھا۔ سیمینار بھی تھا اور بھارتی کتابوں کی ایک نمائش بھی تھی۔ یہاں میری ملاقات فرخندہ لودھی، بانو آپا (قدسیہ بانو)، ساجدہ ہاشمی، انتظار حسین، عذرا اصغر اور بہت سے دوسرے ادیب دوستوں سے ہوئی۔ ڈاکٹر انور سدید نے مجھے ڈاکٹر وزیر آغا کا یہ پیغام دیا کہ وہ کل لاہور تشریف لا رہے ہیں۔

اظہر جاوید سے بھی روبرو پہلی ملاقات یہیں ہوئی۔ ملاقات کیسی، ملن تھا۔ پہلی پہلی باتوں میں انہوں نے مجھے بے پناہ محبت کے

ساتھ جیسے یا مدعا لیا اور کافی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے۔

عطاء الحق قاسمی، کشور ناہید، امجد اسلام امجد، انتظار حسین، منشا، احمد شیخ، جمیل ہوشیار پوری اور بہت سارے ادیب دوست تھے جن سے اس روز ہم پہلی بار ملے تھے۔ ان بھری ملاقاتوں کا سلسلہ رات کو ہوٹل ہلٹن میں بھی جاری رہا جہاں اس وقت کے پنجاب کے وزیر اعلیٰ جناب نواز شریف نے بھارتی وفد کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔

اظہر سے دوبارہ ملاقات ''تخلیق'' کے دفتر میں ہوئی۔ ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' بھی یہیں سے شائع ہوتا تھا جس کی مدیرہ صدیقہ بیگم تھیں (اب بھی ہیں) اور اظہر جاوید ان کے معاون ہی نہیں، ادبی صلاح کار بھی تھے۔ لگ بھگ نصف دن اظہر کی محفلوں، قہقہوں اور باتوں کے ساتھ گذر رہا تھا۔ اظہر کو میں صرف ''تخلیق'' کے مدیر کے طور پر جانتا تھا لیکن تفصیل سے اس روز علم ہوا کہ وہ ''ادبِ لطیف'' کا ادبی معاون بھی ہے، روزنامہ اخبار ''امروز'' میں میگزین انچارج ہیں۔ اردو اور پنجابی میں شاعری اور نثر لکھتے ہیں۔ مترجم بھی ہیں۔ چند پنجابی فلموں کی کہانیاں اور نغمے بھی لکھ چکے ہیں۔ قتیل شفائی اور مرتضیٰ برلاس سے میری ملاقات گذشتہ شب ہو چکی تھی۔ بھارت میں میرے بہت پیارے دوست پرکاش پنڈت اور نامور افسانہ نگار و ناول نگار اے۔ حمید میں گہری دوستی تھی۔ پرکاش پنڈت نے تاکید کی تھی کہ میں اے۔ حمید سے ضرور ملوں اور یہ فریضہ اظہر جاوید نے ادا کیا تھا۔ اس زمانے میں ماہنامہ ''بیسویں صدی'' میں میرے اور اے۔ حمید کے افسانے شائع ہوتے تھے اور اس طرح ہماری قلمی شناسائی پہلے ہی سے تھی۔ اظہر مجھے اے حمید کے حوالے کر کے خود غائب ہو گیا تھا۔ وہ پھر کو واپس آیا اور وہاں سے بیگم بشریٰ رحمٰن کے ہمراہ ہم سائرہ ہاشمی کے یہاں پہنچے جہاں خواتین قلم کاروں کی تنظیم ''ہم قلماں'' کا وجود عمل میں آیا تھا اور آج ''شامِ افسانہ'' منعقد کی گئی تھی اور اسے میرے نام سے منسوب کیا گیا تھا۔ اس تقریب کی صدارت بیگم حجاب امتیاز علی نے کی تھی۔ میرے علاوہ فرخندہ لودھی، مستنصر حسین تارڑ، نصرت الطاف نے افسانے پڑھے تھے۔ اظہر جاوید نے میرے بارے میں بات چیت کی تھی۔ بشریٰ رحمٰن، کشور ناہید، عبدالعزیز خالد، آغا سہیل، میمونہ انصاری، سلیم اختر، حسن رضوی، مسعود اشعر، سعادت سعید، انتظار قائم، راحت نفوی، اشتیاق دہلوی، نصرت الطاف، صابر لودھی اور فرخندہ لودھی کے علاوہ بہت سے دوسرے ادیب دوست بھی شریکِ محفل تھے۔

تاریخیں یاد نہیں کہ کب کہاں گئے۔ بس اتنا یاد ہے کہ اظہر میرا ہاتھ تھامے مجھے لئے پھرتا رہا۔ کبھی یہاں اور کبھی وہاں!

یہ قائد اعظم لائبریری ہے جہاں کتابوں کی جنت کی سیر مجھے اظہر نے کرائی۔ اسلم قریشی اور میرے بزرگ دوست خواجہ احمد عباس کے بھائی (چچازاد) خواجہ تصور علی سے ملوایا۔ لاہور کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل کی ایک ادبی نشست میں ''مہمانِ خصوصی'' بنا دیا جہاں ممتاز مزاح نگار سعید جعفری مرحوم کے شعری مجموعے ''شوقِ تحریر'' کی رسم رونمائی کا پروگرام تھا۔ اشفاق احمد، منو بھائی، انجم ایس فیض، سجاد باقر رضوی، حسن رضوی اور کشور ناہید کے علاوہ لاہور کی بہت سی نامور ادبی شخصیتوں سے ملاقات ہوئی۔

اظہر مجھے پاک ٹی ہاؤس میں حلقہ اربابِ ذوق کی نشست میں لے گئے جہاں سعادت سعید، حسن رضوی، قتیل شفائی، جیلانی کامران، اختر کاظمی اور بہت سے نئے پرانے لکھنے والوں اور بقول اظہر ''لکھنے والیوں'' سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہاں میں نے اپنا ایک افسانہ بھی پڑھا۔

(جاری ہے)

◆◆◆

درویشِ عشق مست......اظہر جاوید

ڈاکٹر انور سدید

میں اظہر جاوید کو زندگی میں جس زاویے سے بھی دیکھتا وہ مجھے عشق میں مست درویش نظر آتا۔ عشق اس کا پیشہ نہیں جبلت تھی۔ محبت کرنا اور کرتے چلے جانا اس کی فطرت تھی۔ مجھے اس کے خاندانی حالات کا بالکل زیادہ علم نہیں۔ وہ زندگی کی کڑی دھوپ میں بھاگتا دوڑتا ان کے میدانوں میں پا پیادہ ننگے سر چلتا رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرگودھا پہنچنے سے پہلے ہی اس کے بالوں میں سفیدی آ گئی اور اس کا اعتماد وقت سے پہلے پختہ ہو گیا۔ اس سے پہلی ملاقات پر ہی مجھے محسوس ہوا کہ محبت کرنے کا جذبہ اس کے ڈی۔ این۔ اے میں شامل تھا۔ تاہم ایک عظیم شاعر اظہر جاوید کی پیدائش سے پہلے ایک ایسا شعر لکھ گیا تھا جس سے زندگی کی سنگلاخ چٹان کو بکھر زم کیا جا سکتا اور پرشور جذبات کی ندی کو پرسکون بنایا جا سکتا تھا۔

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل　　　لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

اظہر جاوید نے اس شعر کے داخلی مفہوم کو دل و جان سے قبول کیا لیکن اپنا اختیار تیزی یوں برتا کہ دل کو کبھی کبھی تنہا چھوڑنے کی بجائے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا۔ اس سے میں نے قیاس لگایا کہ اس کے خاندان میں بھی ضرور کوئی میر متقی ہوگا جس نے اظہر جاوید کو بچپن میں ہی نصیحت کی ہوگی: "بیٹا عشق کرو!"

میری کم عقلی، کم نظری دیکھیے کہ میں ایک لمبے عرصے تک اظہر جاوید کو محض "ہری چگ" سمجھتا رہا اور رسالے "تخلیق" کو ایسا گلشن قرار دیتا جہاں نیلی پیلی سرخ اور سنہری کلیاں جرسِ غنچہ کی صدا سنے بغیر بھی اڑی چلی آتی تھیں۔ اس دور میں ہر بوالہوس نے حسن پرستی اختیار کر رکھی تھی اور بعض بڑے رسائل کے محترم مدیران جراید، نوعمر لڑکیوں کے کچے پکے گلابی افسانے چھاپتے تو رسالہ اور کیک لے کر ہوسٹل میں پہنچ جاتے اور افسانے کی تحسین میں اپنے جذبات کی تسکین فرماتے۔ لیکن اظہر جاوید کا اسلوب اشاعت ایسا تھا کہ گوریاں کہیاں پر اعتماد کرتیں اور بھگوان گلی میں خود پہنچ جاتیں اور افسانے کی اشاعت پر شہرت کے آسمان پر پرواز کرنے لگتیں تو اظہر جاوید اسے اپنا احسان شمار نہ کرتا۔ حالانکہ وہ ایک ایسا شخص تھا جو عشق کا بوجھ اپنے کندھے پر لادے کوہِ بے ستون عبور کر رہا تھا اور کر رہا تھا۔

یہ الٹے سیدھے مرنا تو ہے لذت تماشا ہے　　　ہمیں ہر آن جینا ہے، ہمیں اک بار مرنا ہے

اظہر جاوید کا رزق اخبار "امروز" کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ ایک دن یوں ہوا کہ اس کے چند "عقل مند دوست" جب بھارت بلڈنگ کی بالائی منزل کی منڈیر سے محو تماشا تھے جہاں سے انہیں ایک جلوس آمریت کے خلاف نعرے لگاتا نظر آیا۔ اظہر جاوید اور اس کے سرکاری اخبار "امروز" کے چند عقل مند دوستوں کی رگ حمیت جاگی اور انہوں نے بھی عوامی ہمدردی میں بالائی منزل سے

چھلانگ لگا دی اور احتجاجی جلوس میں شریک ہو گئے۔ ''امروز'' کے آمرِ اعظم نے ان سب پر رزق کا دروازہ بند کر دیا۔ اظہر جاوید پر بے خبری وقت آ پڑا۔ بالکل قحط و عشق کی صورت پیدا ہو گئی۔ لیکن اظہر جاوید نے عشق کو فراموش نہیں کیا بلکہ اس کا دائرہ کچھ اور وسیع کر دیا۔ اور وہ کثرت سے غزلیں اور نظمیں کہنے لگا میں نے سوچا ''شاید یہ بے روزگاری کی تھکن کا مداوا ہے'' لیکن جلد ہی اس کی شاعری سے وہ کسک ابھرنے لگی جو عشق کے گہرے گھاؤ کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔ اظہر جاوید مصورے کی بجائے پھول نظر آنے لگا جس کی خوشبو گلشن کی چار دیواری میں مقید نہیں کی جا سکتی۔ اب اس کا انداز سالکانہ تھا۔ چہرے پر متانت راہبانہ تھی۔ آنکھوں میں لطافت مستزاد تھی۔ زمانے کی طرف دیکھنے کا انداز ایسے تھا جیسے وہ دنیا بازار کا خریدار ہے اور دنیا اسے تخلیق پر دیوار بیٹے کی آرزو ہے۔ دوستوں اور گوپیوں میں وہ ''مسرور ازدرویش'' مشہور ہو گیا تھا جو حضرت علی ہجویری کے دربار پر روزانہ حاضری دیتا۔ اور واپس آ کر کہتا ''میں من کا زنگ اتار آیا ہوں''

میں نے ایک بے تکلف لمحے میں پوچھنے کی جسارت ''اے نوجوان بزرگ! قناعت اور اطمینان کی یہ دولت کس آستانے سے ملی؟''

اظہر جاوید نے غیر تبلیغی انداز میں جواب ''دیا میں نے پانچ وقت کی نماز شروع کر دی ہے ـــ مجھ کو بھی کبھی مانا نہیں کیا!

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

پھر ایک مختصر وقفے کے بعد بولا ''اب ندا یاد لو بھلا چاہے۔ نہ شہرت او بہ''

میں نے پوچھا ''کیا واصف علی صاحب کی مجلس نصیب ہو گئی ہے ـــ کیا اشفاق احمد کسی بابے شابے کے پاس لے گئے ہیں ـــ یا اپنی الوہی باتوں کے جادو میں لے لیا ہے؟''

اظہر جاوید فیصلہ کن لہجے میں بولا ''میں فلمی اداکار مصطفیٰ قریشی کے مسلک کا بندہ ہوں۔ اس کی فلم ہر حق ہے لیکن زندگی شاہ عبداللطیف بھٹائی کا نقش لطیف ـــ ''ہو حق'' کا کہیں نام و نشان تک نہیں۔ انکسار ہی انکسار ـــ ملامت ہی ملامت''ـــ

میں نے اظہر جاوید کی پیشانی کو تحقیق کی نظر سے دیکھا لیکن سر سجدہ کا نشان تو کہیں نظر نہ آیا۔ البتہ طمانیت اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کسی بند گلی سے کھلے میدان میں آ گیا ہوں۔ جہاں تازہ ہوا چل رہی ہے۔ خوشبو ہی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔

شاہینوں کے شہر سرگودھا کے حوالے سے اظہر جاوید میرا اولین دوست ہے لیکن جب وہ سرگودھا میں شاعر شباب الطاف مشہدی کے رسالہ ''خلوص'' کی ادارت کرتے تھے۔ میں انجینئرنگ کے پیشے سے وابستہ میانوالی اور سیالکوٹ میں محکمہ آبپاشی میں خدمات انجام دے رہا تھا۔ مختصر تعطیل پر سرگودھا آتا لیکن اظہر جاوید سے ملاقات نہ ہوتی تاہم ان کے نام اور کام کا ذکر اس شہر کی ادبی محفلوں میں ہوتا جو ریستوران، حکیم علی محمد کی سرپرستی میں میونسپل کمیٹی کے لان میں اور الطاف مشہدی کے 18 بلاک والے مکان پر اور ڈاکٹر وزیر آغا کی رہائش گاہ پر منعقد ہوتیں۔ اظہر اولاً سے معتا۔ ایک روز سجاد نقوی نے خبر دی کہ اظہر جاوید لاہور چلے گئے ہیں انہوں نے اپنا رسالہ ''تخلیق'' نکال لیا ہے جس کے ایک شمارے میں عبدالرشید اشک صاحب کا وہ مضمون شائع ہوا ہے جس میں میری نظم ''غالب پسند آم'' کی عروضی غلطیوں کو نشان زد کیا گیا تھا۔ مجھے چونکہ عروض پر عبور حاصل نہیں، اس لیے اس مضمون کی اشاعت پر میں نے اظہر جاوید کا شکریہ ادا کیا اور اللہ کا کرم دیکھیے کہ یہ ''منفی ابتدا'' مستقل دوستی میں تبدیل ہو گئی اور اب میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ''تخلیق'' سے میرا رابطہ اس کے اشاعت کے بغیر چھپنے والے دور سے شروع ہوا اور نہ صرف اظہر جاوید کی زندگی میں چھپنے والے

آخری پرچہ (فروری 2012) تک جاری رہا بلکہ ان کے بیٹے سوہان اظہر نے اپنے دورِ ادارت میں بھی قائم رکھا۔ اہم بات یہ ہے کہ اپنی ملازمتی زندگی کے چند ادوار مجھے لاہور کے قریب و جوار میں گزارنے کا موقع ملا تو دفتر ''امروز'' اور ''تخلیق'' میں اظہر جاوید سے طویل ملاقاتوں کے مواقع بھی پیدا ہوئے۔ اظہر جاوید کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا، وہ نسبتیں قائم رکھنے کا فن جانتے تھے۔ ان کی وساطت سے مجھے بھی ملک مقبول احمد، زمان کنجاہی، اصغر مہدی، تبسم رضوانی، ستار طاہر، ولی الرحمٰن ناصر، منہاج الدین، کنول فیروز، امینہ عنبرین، امر قزاسید، عذرا اصغر، سیما پیروز، تسلیم کوثر، ڈاکٹر ابدال بیلا، سلمیٰ اعوان، تسلیم منظور جہان، اور بے شمار دیگر ادیبوں سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ بیرون لاہور سے کوئی ادیب وارد لاہور ہوتا تو اظہر جاوید اس کی پذیرائی شیزان ریستوران میں کرتے۔ اور مہمان کی ملاقات لاہور کے نمائندہ ادیبوں اور بالخصوص خواتین لکھنے والیوں سے کراتے۔ اب مجھے ''تخلیق'' کی سلور جوبلی تقریب یاد آرہی ہے جو شیزان کی بالائی منزل پر منعقد ہوئی تھی۔ صدارت ملک کے مشہور ادیب، دانشور، افسانہ نگار، شاعر اور ''فنون'' کے مدیر احمد ندیم قاسمی صاحب نے کی تھی۔ کمرہ مہمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ اظہر جاوید آخری صف میں بیٹھے تھے۔ مقررین نے اظہر جاوید اور ''تخلیق'' کی ادبی خدمات کا تذکرہ شاندار الفاظ میں کیا لیکن جس خوبصورت اور جوشیلے انداز میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے اظہر جاوید کو خراجِ تحسین ادا کیا وہ حکومت کے کمالِ فن ایوارڈ سے زیادہ قیمتی اور وزنی ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے کھلے لفظوں میں اعتراف کیا کہ

''تخلیق'' معیار کے اعتبار سے کسی طرح بھی ''فنون'' سے کم نہیں، بلکہ بعض امور میں یہ ''فنون'' سے بلند تر ہے۔''

ان الفاظ پر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ لیکن سب نے دیکھا کہ آخری صف میں سے اظہر جاوید کھڑا ہو گیا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے، اور وہ قاسمی صاحب کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہہ رہا تھا۔

''قاسمی صاحب ــــ ''تخلیق'' ''فنون'' کے خاکِ پا کے برابر بھی نہیں ــــ اور اظہر جاوید آپ کا ادنیٰ نیازمند ہے۔ میں نے آپ کے پاؤں میں بیٹھ کر یہ اعزاز حاصل کیا ہے۔''

اب پھر ہال تالیوں سے گونج اٹھا ـــ

اور پھر گردشِ گردوں نے مجھے وہ دن بھی دکھایا کہ ملک کے مشہور ادیب، دانشور، افسانہ نگار، شاعر اور ''فنون'' کے مدیر احمد ندیم قاسمی نے اظہر جاوید کے خلاف ایک اداریہ لکھنے پر ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کر دیا تھا۔ ایک زیریں عدالت میں ''تخلیق'' کا مدیر ''ملزم'' کی حیثیت میں موجود تھا۔ مدیر ''فنون'' اظہر جاوید پر الزامات کی بارش کر رہے تھے۔ اور جناب اظہر جاوید کی یہ بات بمشکل اندازا گر رہا تھا کہ اس نے اداریہ آمر صدرِ مملکت کے خلاف لکھا تھا کہ اس نے قاسمی صاحب سے گورنر ہاؤس میں صحافیوں کی تقاریب میں باوقار سلوک کیوں نہیں کیا؟

اس واقعے کا اظہر جاوید نے گہرا اثر لیا۔ لاہور ہائی کورٹ نے اس کی اپیل سماعت کے لیے منظور کر لی۔ لیکن باقاعدہ کارروائی سے قبل ہی بڑی عدالت نے پہلے قاسمی صاحب کو اور پھر اظہر جاوید کو اپنے پاس بلا لیا۔ قضا و قدر کے جج نے خدا جانے کیا فیصلہ کیا ہے؟

◆◆◆

ایسا کہاں سے لائیں......

عذرا اصغر

اظہر جاوید سے میری پہلی ملاقات عجیب ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ سچ پوچھئے تو پہلے غائبانہ تعارف ارشاد حسین کاظمی صاحب نے یہ کہہ کر کرایا کہ میرا دوست رسالہ نکال رہا ہے "نرگس" کے نام سے اپنا افسانہ دیجئے۔ یہ میری افسانہ نگاری کا ابتدائی زمانہ تھا شاید 1966ء کا اوائل تھا۔ ہم سب صحن میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے ایک صاحب دروازے سے نمودار ہوئے۔ سلام کیا اور ایک رسالہ مجھے تھما کر الٹے پیروں لوٹ گئے۔ یہ اظہر جاوید تھے اور رسالہ تھا "تخلیق" جس میں میرا افسانہ "سیج" چھپا تھا۔ اس کے بعد چند سال گزر گئے۔ 1970ء میں ایک اطلاع نامہ ایڈیٹر "تخلیق" کی طرف سے جس میں مطلع کیا گیا تھا کہ اب تخلیق کا باقاعدہ دفتر میکلیگن روڈ پر ہے کبھی تشریف لائیں۔ سو میں اور نزہت ادبی لائبریری انارکلی جاتے ہوئے ایک دن دفتر "تخلیق" میں "تشریف" لے گئے۔ صوفے کے پھولوں کا اچھا خاصا ڈھیر اظہر جاوید کی میز پر کاغذوں اور کتابوں کے ساتھ دھرا تھا۔ کسی ادبی رسالے کے دفتر میں جانے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔ اس دن رسمی سی گفتگو رہی۔ ایڈیٹر "تخلیق" کو میں نے نہایت مہذب اور منکسر المزاج پایا۔ گھر آ کر اصغر صاحب کو بتایا اور پھر ہمارا آنا جانا رہا۔ اسی اثنا میں اظہر صاحب نے مجھے رسالہ میں شمولیت کی پیشکش کی۔ یہ میرا شوق بھی تھا اور ایک پرچے کا کام تھا جس کا "نورو نار" کی ایک برس تک ادارت بھی کر چکی تھی اور اپنا ذاتی پرچہ نکالنے کی آرزو مند بھی تھی۔ میں "تخلیق" کے ادارے سے منسلک ہو گئی "تخلیق" سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ علاوہ ازیں لوگوں کو جانا، پہچانا۔ سچ پوچھئے تو اظہر جاوید نے In direct way میں مجھے تربیت دی جو آگے چل کر میرے بہت کام آئی۔ اظہر کبھی احسان جتا کر بات نہیں کرتے تھے بلکہ یوں لگتا تھا جیسے وہ خود کچھ سیکھنا چاہ رہے ہیں۔ میں ہفتے میں ایک دن دفتر جاتی تھی۔ اپنے حصے کا کام گھر بیٹھ کر انجام دیتی تھی۔ اظہر کا پسندیدہ مشغلہ شاعرات کے لئے غزلیں لکھنا تھا۔ اس پر میری اکثر ان سے لڑائی رہتی تھی۔ میرا موقف تھا کہ اس طرح جینوئن لکھنے والوں کا حق مارا جاتا ہے۔ مگر بھلا وہ کب یہ بات ماننے کو تیار ہوتے بلکہ انہوں نے اصغر کو بھی اپنے اس مشغلے میں شامل کر لیا تھا۔

اظہر نہایت حساس اور دردمند دل کے مالک تھے۔ کسی کو مشکل میں گرفتار دیکھنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا۔ دامے درمے سخنے جیسے بھی ممکن ہوتا مدد کرتے۔ اگر میں کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ ملنے جلنے کے آداب بھی میں نے اظہر سے ہی سیکھے یا یوں کہہ لیجئے کہ میرے اخلاقی رویے کو تقویت ملی۔ اگرچہ اظہر ہمیشہ کہتے رہے کہ وہ مجھ سے میرے گھرانے سے سبق لے رہے ہیں۔ یہ ان کی بڑائی تھی۔ وہ از حد ملنسار تھے مگر عزت نفس پر حرف نہیں آنے دیتے تھے۔ لیکن یہ حساس شخص اندر سے بہت ٹوٹا پھوٹا ہوا تھا۔ مگر کسی سے اپنا دکھڑا بیان کرنا گوارا نہیں تھا۔ اظہر کو اپنی والدہ سے اور اپنے بچوں سے بہت پیار تھا۔ اظہر کی والدہ ماجدہ بھی بہت بلند اخلاق کی مالک تھیں انہوں نے مجھے بیٹی بنایا ہوا تھا مگر اظہر اکثر مجھے کہتے "میری ماں نے آپ کو بیٹی بنایا ہے مگر میں نے آپ کو بہن وہن نہیں بنایا۔" میں افسوس کرتی کہ جناب آپ کا ایک لفظ

ثبوت کے طور پر میرے پاس موجود ہے۔ تب کہتے۔ "ارے بے دھیانی میں لکھ دیا ہوگا۔" اگرچہ اظہر کو "تخلیق" کے مالی وسائل نے ہمیشہ پریشان رکھا دوست بھی ان کے بہت کام آئے لیکن وہ خود بھی سوالی نہیں بنے۔ "تخلیق" کی پیسٹنگ والا دن بڑا گہما گہمی کا ہوتا تھا۔ زمان کنجاہی مرحوم بھی تعاون کرتے۔ کھانا ادارتی سے آتا۔ غرض ایک جشن کی سی صورتحال ہوتی تھی۔ امجد عزیز، سعید ہاشمی عموماً موجود ہوتے تھے۔ کیا خوبصورت زمانہ تھا۔ شالاک دیکھیے۔ بہت بڑے بڑے لوگوں سے میری راہ و رسم دفتر "تخلیق" میں ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، قتیل شفائی، میرزا ادیب، عبدالحمید عدم، سیف الدین سیف ــــ خواتین سے بھی رابطے بنے بانو آپا، الطاف فاطمہ آپا اور عابدہ مسرور۔ چھپتے تو میں 1966ء سے رہی تھی لیکن "تخلیق" کی ادارت نے مجھے معتبر بنایا، پہچان دی۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ اظہر خود کو پیچھے رکھ کر دوسروں کو آگے بڑھاتے تھے۔ اس عادت نے انہیں اعتبار بخشا۔ جب میں اسلام آباد میں تھی ایک کمرشل پرچے نے اس وقت کی ایک اہم نیوز کاسٹر کا انٹرویو شائع کیا۔ جس میں محترمہ نے ایک نظم یہ کہہ کر چھپوائی تھی کہ یہ میری طالبعلمی کے زمانے کی ہے۔ اتفاق سے وہ نظم فیچھ جعفری کے ... پر اظہر نے فی البدیہہ کہی تھی۔ میں نے ایڈیٹر کو احتجاجی مراسلہ بھیجا اور فون کیا مگر اظہر جاوید نے خوش دلی سے فرمایا "او میں صدقے جاواں ایک ہور نظم کہہ دیواں۔" ان کا ایک شعر بھی اس ضمن میں ہے۔

ان کے نام سے غزلیں لکھ لکھ پرچوں میں چھپوائیں گے　　شاید وہ ایسے خوش ہو جائے شاید ایسے مان سکے

اظہر کے مزاج میں "رد ما سلوم" بھی شاید اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے پاس بلانے کے دن بھی رکھا۔ اس دن کو دیا محبت کے نام پر منانے سے بہتر "ویلنٹائن ڈے"۔ وہ ایک صاف دل اور صاف باطن انسان تھے۔ صفائی پسند "سوٹڈ بوٹڈ"۔ آخری دن بھی خود نہا دھو کر تیار ہوئے اور سب کو ہمیشہ کی طرح حیرت زدہ چھوڑ کر چلے گئے۔

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر
مگر ہم
ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

◆◆◆

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا　　سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا　(وزیر آغا)

اظہر تھا اس جہان میں "اک بے نوا فقیر"　　اپنی خودی کا نقش دکھا کر چلا گیا　(انور سدید)

سب سے پہلا پتھر اظہر اس نے مجھ کو مارا تھا　　برسوں جس کی عزت کی تھی، جس کا عقیدت مند رہا　(اظہر جاوید)

کام و نمود سے تو رہے بے نیاز ہم　　گم نامیوں میں ادب کے شہرت تلاش کی　(اظہر جاوید)

یارِ عزیز ـــــ اظہر جی

پروفیسر قیصر نجفی

کون جانتا تھا کہ میکلوڈ روڈ کے ایک گوشۂ گمنامی سے طلوع ہونے والا ادبی جریدہ "تخلیق" خورشید جہاں تاب کی طرح آفاقِ اردو پر ضوفشاں ہو گا تو آنکھیں خیرہ ہونے لگیں گی اور یہ جریدہ اس کے مدیر اظہر جاوید اردو شعر و ادب کا استعارہ بن جائیں گے ـــــ 70ء کی دہائی کو اظہر جی کے ادبی کام کی اٹھان کے دور پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔

عزم بالجزم کے جذبے سے سرشار اس مدیر سے جب ملاقات ہوئی تو ایسا لگا جیسے ہمارے سامنے ایک جوان رعنا ادیب و شاعر و صحافی نہیں بلکہ شاہراہِ ادارت پر نصب قلم و مصمم ارادوں کا ایک روشن مینار جگمگ جگمگ کر رہا ہے ـــــ آج جب ہم پند و نصیحت کی وہی روشنی عزیزم موان اظہر جاوید کے روشن دماغ سے جھانکتی ہوئی محسوس کرتے ہیں تو بقول شخصے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

میراثِ پدر خواہی علمِ پدر آموز

ساتھ ہی یہ یقین بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ "تخلیق" آج بھی اس روشن مینار کے بارے میں ہے، جسے دنیا میرے یارِ عزیز اظہر جی کے نام سے جانتی ہے۔

اظہر جی محبت کرنے والے ایک انسان تھے۔ جبکہ انا اور خودداری کے جذبات بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے ـــــ انا پسندی اور خودداری وہ خصائص ہیں، جو فی زمانہ معیوب کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ اظہر جی کی خودداری کو ہم میر تقی میر کی خودداری کے مماثل سمجھتے ہیں۔ امرِ واقعی یہ ہے کہ دونوں تخلیق کاروں کی انا و خودداری نے کسی دوسرے کو نہیں، صرف انہی کو نقصان پہنچایا۔

آگے کسی کے کیا کریں دستِ طمع دراز   وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے
(میر تقی میر)

ہم احساسِ ممنونیت کے ساتھ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اظہر جی ہمیں "تخلیق" کے باقاعدہ لکھاریوں میں شمار کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ہم نے اپنی کوئی تخلیق بروقت بھیجنے میں کوتاہی کی۔ انھوں نے فون پر رابطہ قائم کیا اور کہا:

"کی گل اے شاعری امیٹوں تے بھل گئے او، ہن "تخلیق" نوں وی بھل گئے او؟"

"سر جی غلطی ہوگئی اے، اج ای میں کج ان کج بھیج دیاں گا"

"کیہ شعر اے موقع تے فٹ آ رہیا اے، سن لو۔"

پتہ تم تھے کہ ہوئی تم سے محبت ورنہ ـ ہم وہ سرکش ہیں خود اپنی بھی تمنا نہ کریں' اور فون بند کر دیا۔ یقیناً ایسے ہی کسی بے ریا آدمی کے لئے یہ دعا از خود ہونٹوں پر آ جاتی ہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ہم نے سطور بالا میں یوں ہی رسماً یہ نہیں لکھ دیا کہ اظہر جی محبت کرنے والے ایک انسان تھے۔ ہمیں ان کے بہت قریب رہنے کا اتفاق ہوا۔ ہم نے ان کے اندر سدا بہار محبت کے ایک روشن الاؤ کو محسوس کیا۔ ان کی شعری جمالیات بھی اسی آفاقی جذبے سے عبارت ہیں۔ — اظہر جی کے واحد شعری مجموعے "تم عشق کرتے ہوتا" کے آئینے میں ان کے فن اور شخصیت کا جو تصور ابھرتا ہے، وہ کچھ یوں ہے۔

اظہر جی کے فن اور شخصیت کی متنوع جہات ہیں، مگر تین ایسی جہات ہیں جو اساسی نوعیت کی ہیں۔ اگر ان جہات کے تناظر میں دیکھا جائے تو وہ بیک وقت شاعر، ادیب اور مدیر کے طور پر ایک قد آور (اعلیٰ) شخصیت کی مثلث بناتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ان کی تینوں حیثیتیں یکساں طور پر مسلم ہیں اور معیار و مرتبے کے اعتبار سے مساوی رفعت و بلندی کا انکشاف کرتی ہیں۔ اظہر جی کی صحافت میں خدمات سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا اسی دشت کی سیاحی سے آغاز کیا۔ البتہ یہ بات تعجب انگیز ہے کہ انہوں نے عام روش کے برعکس کبھی (عمداً یا ارتجالاً) اپنی قلمکاری کے حوالے سے کسی نوع کی تعلّی سے کام نہیں لیا اور ایک مستند شاعر و ادیب ہونے کے باوصف اپنے ادبی جریدے "تخلیق" میں اپنی تخلیقات کی اشاعت کو پسند نہیں کیا۔ علاوہ ازیں عام دستور سے بے نیازی کی ایسی مثال بھی شاید و باید کہیں ملے گی کہ کم و بیش نصف صدی سے مسلسل شعری سفر جاری و ساری رکھنے کے باوجود انہوں نے عمومی رجحان کے علی الرغم مجموعۂ کلام کی اشاعت کو منزل قرار نہیں دیا۔ یہ تو بھلا ہو سلیمہ ہاشمی صاحبہ (دختر نیک) کا جنہوں نے مجموعہ ترتیب دینے پر انہیں آمادہ کیا اور ان کے بعض مداحوں نے زیورِ طبع سے آراستہ کیا اور یوں نہ صرف اپنی بلکہ ہم ایسے پرستاروں کی دیرینہ خواہش کو بھی تکمیل کا جامہ پہنایا۔

اظہر جی کے ایوانِ شعر یعنی "تم عشق کرتے ہوتا" کے دو دروازے ہیں۔ ایک دروازہ غزل کی طرف اور دوسرا آزاد نظم کی طرف کھلتا ہے۔ ہم پہلے ان کی غزل پر بات کرتے ہیں، اس لیے بھی کہ مجموعے کا معتد بہ حصہ ان کی غزلیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ اظہر جی کی غزل کا خمیر روایت کی زمین سے اٹھا ہے۔ جس کی بطورِ خاص فکرِ نو اور تازہ اسلوب سے تہذیب کی گئی ہے۔ ان کا بحیثیت ایک غزل گو اختصاص یہ ہے کہ ان کی غزل کوئی اصل میں ان رومانیت کا احیا ہے، جو اردو غزل کا بنیادی حسن اور اساسی توانائی ہے۔ تغزل کے بغیر غزل کی شاعری قافیہ پیمائی تو باور کی جا سکتی ہے، غزل تسلیم نہیں ہو سکتی۔

اظہر جی کے ہاں غزل میں روحِ غزل اپنی تمام تر تابندگی کے ساتھ موجود ہے۔ ان کے نفسی تجربات نے تازہ و شگفتہ پھولوں کی طرح ان کے چمنستانِ غزل کے نکھار میں اضافہ کیا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کی غزل کا نمایاں وصف عشق و محبت کے مضامین کا ابلاغ ہے، جو ان کی غزلیہ شاعری کی قدر و قیمت کو دوچند کر دیتا ہے۔

سجاؤ اپنے کمرے میں کبھی جب پھول نرگس کے — تو اتنا سوچ لینا منتظر کوئی تمہارا ہے

تیرے روٹھے رہنے کا شکوہ کیا کرتا — میں نے چاہت کا بھی دریا دیکھا ہے

نہ اب ڈھولک نہ ہے پائل کا چھنّا — بہت سنسان چولہا رہ گیا ہے

دن بھر کی بے ترتیبی کو پوچھنے والا کوئی تو ہو — رات کو گھر جب دیر سے آؤ روٹھنے والا کوئی تو ہو

وہ تک تیری یاد آئی تھی دیر تک میں بھی ڈگمگایا تھا

اظہر نبی کی رومان پرور فضا میں کبھی کبھی آس پاس بکھری ہوئی زندگی کے تلخ حقائق بھی در آتے ہیں۔ انھوں نے اپنی غزل میں آتشِ عشق کی سوزش ہی نہیں احیات و کائنات کے المیوں کا سوز بھی بھر دیا ہے۔ وہ عمر بھر حالات دنیائی سے زندگی کے مصائب و آلام سے دست و گریباں تھے۔ ان کے شخصی تجربات، مشاہدات کی وسعت اور تعمق کا اندازہ لگانا دشوار ہے، وہ حسن کی بدولت ان کی غزل نے دستاویزی اہمیت حاصل کر لی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ یہ غزل ذاتی جذبات و واردات کی بھی کاشف ہے اور آشوبِ زمانہ کی بھی مظہر ہے۔

شام ہوئی سب پنچھی گھر کو لوٹ چلے کاش کوئی میرا بھی گھر ہو کاش کبھی گھر جاؤں میں

جلا کے کشتیاں دریا کے ہم بھی پار گئے ہمارے ساتھ مگر یہ ہوا کہ ہار گئے

دلوں کی بے بسی ایسا بھی اک موسم دکھاتی ہے بہاریں منہ چھپاتی ہیں، خزائیں روٹھ جاتی ہیں

گلشن کیا خود بادِ صبا ہے آلودہ پھولوں کی ہمت ہے پھر بھی کھلتے ہیں

ہمدردی کی باتیں سن سن اب یہ خواہش ہوتی ہے اتنے سارے اپنوں میں اک کاش کوئی بیگانہ ہو

چھین لیتا ہے گزرتا وقت سارا بانکپن آنکھ میں جلوے نظر میں مستیاں رہتی ہیں

ساتھ چلنے والوں کا مان کیا، بھروسا کیا جانے کب کہاں کوئی راستہ بدل جائے

سکھ ہوں تو جس وجہ ہوں جب یہ لوگ بتاتے ہیں برے دنوں کے بعد ہمیشہ اچھے دن بھی آتے ہیں

اظہر نبی کسی مخصوص فکر یا نظریے کی زنجیر پائے سخن میں نہیں رکھتے۔ البتہ ان کے ہاں کہیں کہیں ترقی پسندانہ افکار و خیالات کے شواہد ضرور ملتے ہیں۔ ایسا شاید اس بنا پر ہے کہ ہر شاعر بنیادی طور پر ترقی پسند ہی ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی اپنی ترقی پسندی کی تشہیر کرنا پسند کرتا ہے اور کوئی اظہر جاوید کی طرح خاموشی اوڑھ کر ہر نوع کی خودنمائی سے گریزاں رہتا ہے۔

میں بے ادب تو نہیں پھر بھی پوچھ لیتا ہوں خدا کہاں مری تقدیر رکھ کے بھول گیا

کچھ لوگ لے گئے ہیں خدائی سمیٹ کر ہم کو تو ڈھونڈنے سے خدا تک نہ مل سکا

کیا ہے تقدیر کی تقسیم، رضا کیسی ہے بندگی چپ ہے جواب اس کا دیا جاتا نہیں

وہ محنت کش نجانے اب کہاں ہے سڑک پہ خالی تھیلا رہ گیا ہے

''نظم عشق کرنے ہوا'' میں اظہر نبی کی نظم نگاری بھی تحقیقی اعتبار سے کم اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ اس میں شاعر کا پیچ فن گرد و پیش

میں بکھری ہوئی بنجر زندگی کو زیادہ مضبوط گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ بالخصوص ان کی نظموں میں ماضی کے شاداب لمحات کی یادوں سے ہم آغوش تو طلسماتی نہایت اثر آفرین شعری فضا قائم کرتا ہے۔ یہاں الفاظ کے صوت و آہنگ کی بہار آفرینی بھی ہے اور معانی و مفہوم کا جادو بھی سر چڑھ کے بولتا ہے۔

میں پیچھے کیا کیا چھوڑ آیا/ اب اس کا کون حساب کرے/ کچھ جاڑے کی ہریالی تھی/ کچھ لمحوں کی شادابی تھی/ کچھ
وقتوں کے افسانے تھے/ کچھ آنکھوں کے پیمانے تھے/ کچھ جسم تھے جن کی خوشبو کا/ اک لمس تھا میری پوروں پر/
جب سانجھی بیاکل تھی/ جب میرے شعروں کا مرکز/ کوئی بھٹی تھی/ کوئی کوٹ تھی

احساس کی لو تیز ہو جائے تو لفظ و بیان کی حدت بھی شدید ہو جاتی ہے اور فکر و خیال کے جھروکوں سے بھی شعلے لپکنے لگتے ہیں۔ یعنی شعر حقیقت نگاری کا جدید تر اسلوب اپنا کر تخلیقات میں تقلیدی اپنائیت بروئے کار لاتا ہے اور مطلب کیفیات کو زبان دے کر اپنے عصری آواز بن جاتا ہے۔ اظہر جی کی نظم "فیصلہ" انہی کیفیات کی اسی جوار بھاٹے سے عبارت ہے۔

ہم اپنی زیست کی ناکامیاں تسلیم کرتے ہیں/ ہم اپنی بے بسی کی خامیاں تسلیم کرتے ہیں/ یہ شہرت ہے کہ ہیں
بدنامیاں تسلیم کرتے ہیں/ حقیقت مان لیتے ہیں/ پکھنے دوڑتے، بڑھتے ہمارا پاؤں رہتا ہے/ ادھر وکٹوں کے پیچھے
سے کوئی انگلی بھی اٹھی ہے/ ہماری عمر کی لمبی اننگز اب ختم ہوتی ہے/

فیض صاحب کی نظم "ہارٹ اٹیک" نازک ترین درد و کیفیات دل کی وہ نگارش ہے جس کی شاعری اردو ادب میں کوئی مثال موجود ہو۔ اظہر جی کی نظم "سی ایل آئی" میں بظاہر تو دل کے تھلے میں رومانی فضا پیدا کر دی گئی ہے۔ یہ نظم استعارہ سازی کا جو جمالیاتی رنگ سامنے لائی ہے وہ قابل داد ہے۔

دل کے تھلے نے مجھ کو یہ بات سمجھائی/ دل میں جتنے نام چھپے تھے/ ان کی بھی شاید کوئی تو حد ہوگی/ دل گلی اب
صاف ہوئی ہے/ اب دل کی سکرین پہ پھر سے نئے نئے کچھ چاند ابھارے جائیں گے/

برسوں پہلے اظہر جی کی کوئی ادا دیکھ کر ہم نے کسی ترنگ میں انہیں "درویش" قرار دیا تھا۔ لیکن بعد میں جوں جوں ان کے قریب ہوتے گئے، ان کی درویشی پر ہمارا ایمان مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ ہم روحانی اخلاص کی گہنگی کا جتنا ادراک انہیں رہا ہے، اتنا شاید ہی کسی کو رہا ہو۔ اپنی نظم "تشکیک" میں بجا طور پر انہوں نے کہا ہے کہ جب خواب کملا جاتے ہیں، گیت مرجھا جاتے ہیں لفظ کمہلا جاتے ہیں تو سوچیں منجمد ہو جاتی ہیں اور ہر طرف وہم و تشکیک اور بے یقینی کی چادر تن جاتی ہے گویا ذات کے نہاں خانے سے اندھیرا پھوٹتا ہے اور انسان گمراہی و بے خبری کے ظلمت خانوں میں محبوس ہو کر رہ جاتا ہے۔ شاید یہی وہ مرحلہ ہے جب کسی ایسے مرشد کامل کی اشد ضرورت پیش آتی ہے، جو ایک ضرب نگاہ کشف و الہام کے در کے قفل توڑ دے، علم و عرفان کے بھید کھول دے اور گیان دھیان کے پھول کھلا دے۔

کشف و الہام کے در مقفل ہوئے/ علم و عرفان کے بھید ملتے نہیں/ گیان اور دھیان کے پھول کھلتے نہیں/ دل پہ
تشکیک کی اک رداتن گئی/ بے سبب جیسے تقدیر سے ٹھن گئی/ کوئی مرشد ملے، کوئی رہبر ملے/

مرشد کی احتیاج اور اہمیت کا احساس (تمام تر روحانی اضطرار و اضطراب کے ساتھ) اظہر جاوید نے اپنی تضمین "غلام فرید ولی

او تھے دیے' میں اجاگر کیا ہے۔ پنجابی زبان کے الفاظ کی شیرینی نے نظم کے سواد میں اضافہ کر دیا ہے۔

دل جھلا ہے دل بے چارا دل بے کرماں مارا / دل نوں تو ہی چنگی دسے دے دل نوں دے ہلارا / تانی جھوٹی میں بھر
دے تو سارے عشق خزانے / اس پتھر نوں موم بناوے کر دے گرم بہانے / جو رجھاوے چھوڑ کے مرشد آئے مینوں
منانے / ہم جیسا پھر کوئی پاگل گائے نہ ایسے گانے / غلام فرید دل اوتھے دیے جتھے اگلا قدر پچھانے

اظہر جاوید کے کلام میں اختر شیرانی کی شاعری کی سی رومانی فضا انگڑائیاں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ فضا خاص کر ان کی نظموں میں نسبتاً زیادہ رچاؤ اور سبھاؤ کے ساتھ قائم ہے۔ اظہر جی کے رومانی تجربات حسّی نوعیت کے نہیں ہیں، ان میں تعمق ہے اور یہ ذات سے کائنات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ بعض اوقات ان کے یہاں عجب وعجیب سی تحلیل نفسی کے تیور ان کی نموں کے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اس تناظر میں ان کی تین نظمیں "پرانی محبوبہ کے لئے نئی نظم"، "جانم کے لئے"، "شہزادی اور غلام" بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

اسے ضد ہے کہ ماضی کا زمانہ لوٹ کر آئے / مری وارفتگی کا ہر فسانہ لوٹ کر آئے / اسے اب بھی یہ خواہش ہے / وہ
پاگل دن پلٹ آئیں، وہ جذبے پھر نمایاں ہوں / مرے ارماں غزل خواں ہوں ___ اسے کیسے میں
سمجھاؤں / رستے چھوٹ جاتے ہیں، جو رشتے ٹوٹ جاتے ہیں / کسی بندھن میں ان کو باندھنا ممکن نہیں ہوتا /
خلاؤں میں ستارے کا ٹکانا ممکن نہیں ہوتا (پرانی محبوبہ کے لئے نئی نظم)

تم جو برسوں کے بعد آئی ہو / صرف یہ تم سے پوچھنا ہے مجھے / کیا کوئی اور خواب لائی ہو / کیا ابھی تک تمہاری باتوں
میں / کچھ سرابوں کی جھلملاہٹ ہے / کیا ابھی تک تمہارے لہجے میں / خوش گمانی کی جگمگاہٹ ہے / کیا ابھی تک
تمہارے ہونٹوں پر / چاہتی بھی مسکراہٹ ہے / (جانم کے لئے)

مجھے پہلے یہی لگتا تھا کہ ہم دونوں ماضی کا حصہ بنتے ہیں / وہ رضیہ ہے وہ کوئی زیب النسا ہے / میں یاقوت ہوں
ایک ادنیٰ سا عشقی ملازم / نگاہیں جھکائے ادب سے جو بس ہاتھ باندھے کھڑا ہوں / کسی اک اشارے کی حسرت ہے
جواب / میری زندگانی کا دھارا بدل دے / مقدر کا میرا ستارہ بدل دے ___ (شہزادی اور غلام)

اظہر کی عشق میں دل کے ساتھ ساتھ دماغ سے بھی سوچتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کا عشق روایتی نوعیت کا نہیں۔ وہ اچھی صورت پر ریجھتے ضرور ہیں مگر محبوب کی نگاہ التفات کا جواز جانے بغیر اس کی محبت کا قلاوہ نہیں پہنتے۔ "نظم" میں اور "وہ" میں انہوں نے اسی قبیل کی ایک نئی سوچ سے متعارف کرایا ہے۔ ہر چند انہوں نے انکسار کا دامن نہیں چھوڑا، تاہم احتیاط و تجسس کا عنصر ان پر غالب رہا ہے۔

سوچتا ہوں اس نے کیوں چاہا مجھے / مجھ میں کیا دیکھا کہ میری ہو گئی / مجھ میں کیا پایا کہ مجھ میں کھو گئی / مجھ میں خوبی
ہے نہ ہے کوئی کمال / میں گزرتی دھوپ ہوں، شام زوال / سوچتا ہوں اور ہوتا ہوں نڈھال / ذہن و دل میں
کلبلاتے ہیں سوال / میں کہاں، اس کا کہاں قرب و وصال / کشمکش کا، سوچ کا، احساس کا / اس نے کیوں بخشا ہے
دور ایا مجھے / مجھ میں کیا دیکھا ہے، کیوں چاہا مجھے

اردو کے اکثر شعرا نے ''ماں'' کے موضوع پر نظمیں کہی ہیں۔ جن میں بعض نظمیں شہکاروں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اظہری نے بھی ''کون جانے'' کے عنوان سے ایک نظم کہی ہے۔ ہمارے نزدیک اس نظم کا پہلا مصرع ''مائیں کیوں مر جاتی ہیں'' ہی ایک مکمل نظم کا تاثر دیتا ہے۔ یہ مصرع ایک پورے مرثیے کا کرب سمیٹے ہوئے ہے۔ اظہری اگر صرف یہی مصرع لکھ دیتے تو بھی ماں کی محبت کا حق ادا ہو جاتا۔

اظہری کے ہاں کم و بیش وہ تمام استعارے ملتے ہیں، جو عصری شاعری میں مروج ہیں۔ ان کا سب سے قوی استعارہ ''گھر'' کا ہے۔ جسے انہوں نے بار بار بڑے تنوع کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ سفر، دربدری اور بے گھری کے موضوعات پر انہوں نے جتنا لکھا ہے، بڑی دلسوزی سے لکھا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم ''سفر'' ایک عمدہ مثال ہے۔

زندگی کا سفر ختم ہوتا نہیں / دربدر گھومتے، بے خبر گھومتے / اپنی راہوں کے سنگ سفر چوتے / عمر گزری مری / وقت کی
گرد پاؤں پہ جمنے لگی / راستوں کی جوانی بھی تھکنے لگی / میرے چہرے کو ویرانیاں کھا گئیں / میری آنکھوں میں
تیرگیاں چھا گئیں / منزلوں کا نشان پھر بھی پایا نہیں / اور ـــ میں لوٹ کر گھر بھی آیا نہیں

●●●

سرزمین

اجڑے دیار

سرخ میرا نام

My Name is Red

اداس دیواریں

JUMHOORI PUBLICATIONS 042-36314140
www.jumhooripublications.com

اظہر جاوید۔ چند یادیں

غلام نبی اعوان

میں یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہوا تو روزی کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ پروفیسر وارث میر مرحوم کو میرے بارے میں خوش فہمی تھی کہ میں محنتی اور لائق طالب علم ہونے کی وجہ سے اچھا اخبار نویس بنوں گا۔ وہ "نوائے وقت" میں بڑے زوردار اور فکر انگیز کالم لکھا کرتے تھے۔ ان کی سفارش پر "نوائے وقت" میں مجھے نوکری مل گئی۔ یعنی اپرنٹس شپ مل گئی۔ ان دنوں "نوائے وقت" کا طوطی بولتا تھا۔ ایوب خان کا زمانہ تھا اور یہ واحد اپوزیشن اخبار تھا جو کھل کے حکومت کے خلاف بولتا تھا۔ اس کی سرکولیشن کا یہ عالم تھا کہ فی گھنٹہ کرائے پر یہ اخبار پڑھا دیکھا گیا۔ بڑے بڑے نظریاتی قلمکار اس سے وابستہ تھے۔ میں چھ ماہ تک اس اخبار میں چائے ڈھونے والے چھوکرے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام خورشید میری دستگیری کو آئے اور ان کے طفیل مجھے "کوہستان" میں سینئر [illegible] کی جگہ مل گئی۔ خورشید صاحب میرے دور پار کے قرابت دار بھی تھے۔ ان دنوں روزنامہ "کوہستان" بھی عروج دیکھ کر زوال پر گامزن تھا۔ نسیم حجازی کے بعد اخبار بیمار صنعت کی طرح بیٹھ گیا۔ جماعت اسلامی کے ادا مرحوم نے اسے خرید لیا اور اس طرح اخبار کی پالیسیاں جماعتی نقطہ نظر کے تحت مرتب ہونے لگیں۔ بہر حال زبوں حالی کے باوجود اخبار اپنے عامل صحافیوں کی عزت نفس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب دور دراز سے نوجوان لاہور میں اپنا مقدر بنانے چلے آتے تھے۔ انہی لوگوں میں میری طرح اظہر جاوید بھی نووارد شہر تھے جہاں میں ریاست بہاولپور کے پسماندہ سے شہر صادق آباد سے آیا تھا وہاں اظہر بھی سرگودھا (غالباً [illegible]) سے آیا تھا۔ وہ بہر حال مجھ سے بہت سینئر تھے۔ میں طالب علم آیا تھا اور اظہر ایک پکے پیڈ صحافی کی حیثیت میں وارد ہوا۔ لاہور شہر کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ چند سال قبل جانا ہوا تو وہ راستے، وہ سڑکیں اور بازار نہیں پہچانے جاتے تھے جو برسوں میرے قدموں کے ہمرکاب رہے تھے۔ اگر لکشمی چوک سے میکلوڈ روڈ پر اسٹیشن کی طرف جائیں تو بائیں ہاتھ زمیندار ہوٹل تھا (مولانا ظفر علی خان کے خاندان کی ملکیت) ایک روڈ ایبٹ روڈ کی طرف نکل جاتی تھی اور دوسری ریلوے اسٹیشن کو۔ زمیندار ہوٹل کے ساتھ والی ایک بلڈنگ میں روزنامہ "کوہستان" اور ہفت روزہ "چٹان" کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ جو سڑک ایبٹ روڈ کو نکلتی تھی، اس پر ایک ہوسٹل واقع تھا جس میں ملازم پیشہ چھڑے اور طالب علم بھی رہا کرتے تھے اور شاید اس ہوسٹل کا نام کیپٹل گیسٹ ہاؤس تھا (یہ نصف صدی کا قصہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں)۔ میں اسی گیسٹ ہاؤس کا کرائے دار تھا۔ یہیں میری اظہر جاوید سے پہلی ملاقات ہوئی۔

میں "کوہستان" میں ایک ہفتہ وار کالم "زندگی دوراں" کے عنوان سے لکھا کرتا تھا۔ سوشلزم اور ترقی پسندیت کا پرچار کرنے کے سوا اخبار نے اپنے کالم نگاروں کو مکمل آزادی اظہار دے رکھی تھی۔ اخبار کے ایڈیٹر مولانا عبدالوحید خان ایک درویش اور سادہ مزاج آدمی تھے وہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ساتھ "صدق جدید" میں کام کر چکے تھے چنانچہ آزادی صحافت کو خوب سمجھتے تھے مگر اخبار کے عامل صحافیوں کو یہ آزادی اپنی ذمہ داری (At your own risk) تھی۔ اس وقت صحافت کاروبار نہیں ایک مشن ہوتا تھا۔ صحافی ساری زندگی تنگدستی اور عسرت میں گزار دیتا تھا مگر اس کے قلم کی ہیبت سے ایوان کانپتے تھے۔ میں نیا نیا میدان صحافت میں آیا تھا، بہت حوصلے اور آگے

کے حوالے سے کردار ادا کیا تھا یہ بہت کمال کے کالم ان دنوں میں نے لکھے۔ جب دوست احباب اور قارئین میری تحریر کی تعریف کرتے تو میرا "سیما کا" سمجھا جانے لگا اور قلمی سرپرستیاں بڑھتی چلی گئیں۔ سرما کی رات تھی۔ میں اخبار کے دفتر سے ڈیوٹی بھگتنے کے بعد اور بشاشت لیے پیدل لے کے پارک کو عبور کر کے ایبٹ روڈ پر پہنچا ہی تھا کہ کچھ لوگوں نے مجھے گھیر لیا۔ لاٹھیوں، پتھروں، لاتوں اور گھونسوں سے انہوں نے مجھے سڑک پر بچھا دیا۔ بس اتنا یاد ہے کہ ایک نے جاتے جاتے کہا کہ "اگلی دفعہ گولی تیرے بھیجے کے پار کریں گے۔ بڑا صحافی بنا پھرتا ہے"۔ یخ بستہ رات تھی۔ خدا جانے میں وہاں کتنی دیر بے ہوش پڑا رہا۔ قسمت اچھی تھی کہ ایک دوسرا رفیق کار مرحوم صارم برنی پہنچ گیا اور مجھے کسی طرح اٹھا کر میرے گھر لے آیا۔ دوسرے دن میرے کمرے میں آنے والا پہلا ملاقاتی اظہر جاوید تھا۔ ہاتھ میں پھولوں کا گلدستہ اور کیک کا ڈبہ۔ اظہر کو صارم نے مطلع کیا اور وہ اسی وقت صارم کو ساتھ لئے میری عیادت کو پہنچ گئے۔ ہمدردی کا یہ منظر ساری عمر میرے ساتھ چلتا رہا اور اظہر کا احترام زندگی بھر میری رگوں میں گلیلیں بھرتا رہا۔ مجھے اظہر نے مشورہ دیا کہ تمہیں یہ صحافت چھوڑ کر کسی بہتر پیشے کو اپنانا چاہیے۔ میں نے اظہر کی نصیحت پلے باندھ لی اور جب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو صحافت کو خیرباد کہنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ میری زندگی کا یہ موڑ اظہر جاوید کے مخلصانہ مشورے کا مرہون منت تھا۔

اخباری دنیا پر تین حرف بھیجنے کے بعد میں نے کچھ عرصہ ایچی سن کالج میں ٹیچرشپ کی اور پھر آرمی کی طرف لوٹ آیا۔ یوں تقریباً کے بعد ایک عشرے تک میرا تعلق علم و ادب سے منقطع رہا۔ صحافت اس دوران قیامت کی چال چل کر مشن سے صنعت میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میں نے از سر نو اظہر جاوید سے تعلق استوار کیا تو ان کے حالات وہی تھے جہاں میں چھوڑ کر گیا تھا۔ بس اتنا فرق پڑا کہ لاہور سے "امروز" کے ادبی صفحے "نقش ہائے علمی و ادبی" کو ترتیب دینے کی ترقی کر لی تھی۔ میں نے "تخلیق" میں لکھنا شروع کر دیا۔ فوج کی نوکری میں سپاہی عمر بھر کے لئے بنجارہ بن جاتا ہے۔ کوہ و دمن اور دشت و صحرا اس کا مقدر ٹھہرتے ہیں۔ وہ قریہ قریہ اور بستی بستی مسافر بن کر پھرتا ہے کچھ دن کی تھوڑی میں گذرتے ہیں تو اگلا پڑاؤ برف پوش پہاڑوں پر ہو جاتا ہے۔ زر سالانہ بھیجنے کے ایک ماہ بعد میرا تبادلہ ایسی جگہ ہو گیا جہاں ڈاک کا سرکاری نظام نہیں چلتا تھا۔ میں نے اظہر جاوید کو چٹھی لکھی حقیقت حال کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے انہیں اطلاع دی کہ "تخلیق" کی ترسیل منقطع کر دی۔ چند دنوں میں اظہر کی طرف سے مجھے زر سالانہ کے پیسے اس خط کے ساتھ واپس آ گئے کہ جب "تخلیق" کی ترسیل دوبارہ شروع ہوگی تو چندہ بھیج دینا۔ سچ پوچھا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ

ویسے تو ہر سینئر ادیب ہی اظہر جاوید کی دل و جان سے عزت کرتے تھے۔ احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، انور سدید، سلیم اختر اور منشور حسین یاد سے ان کے پیار محبت کے تعلقات تھے۔ ہفتے میں ایک دفعہ وہ ندیم صاحب کو ملنے ضرور جاتے۔ قاسمی صاحب کے پسندیدہ بکری آئسکریم کے ڈبے کے ساتھ۔ پھر اظہر کے ایک اداریے سے ایسی گڑبڑ شروع ہوئی کہ بات کورٹ کچہری تک چلی گئی۔ قاسمی صاحب کی وفات کے کچھ عرصے بعد منصورہ احمد بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ اظہر جاوید نے "تخلیق" میں خوب خوب دل کا غبار نکالا۔ پھر ڈاکٹر انور سدید تو ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ منصورہ احمد اور قاسمی صاحب کے بارے میں بہت کچھ لکھا۔ میں اظہر کو چونکہ برسوں سے جانتا تھا۔ وہ کھرا صاف گو اور منہ پر بات کہہ دینے والا شخص تھا۔ یہ تحریر اس کے مزاج کے خلاف اور غیر متوقع سی چیز تھی۔ میں نے پانچ صفحے کا ایک تفصیلی خط اسے لکھا۔ میرا زیادہ فوکس اظہر جاوید پر رہا۔ اس خط کے ارسال کرنے کے بعد میرا خیال تھا کہ اظہر صاحب سے میرا مخلصانہ سا تعلق اپنے اختتام کو پہنچ گیا ہے۔ میں مطمئن تھا کہ میں نے جو کچھ لکھا وہی سچ اور حق تھا۔ "تخلیق" کا اگلا شمارہ آیا تو اظہر جاوید نے میرا پورا خط کسی ترمیم

کے بغیر شائع کر دیا گیا لیکن اس شعر کے یا غلطی کی بھی تصحیح نہیں ہوئی تھی، حالانکہ میں نے یہ خط اشاعت کی نیت سے تحریر نہیں کیا تھا۔ مجھے تھوڑی سی پریشانی بھی ہوئی۔ میں نے اظہر صاحب کو فون کیا۔ کہنے لگے کہ اس میں جو کچھ لکھا گیا تھا وہ میرے ایک قاری کے دل کی آواز تھی۔ دیانتدارانہ صحافت کا تقاضا تھا کہ اس آواز کو دوسروں تک پہنچایا جائے۔ میری اظہر جاوید سے یہ آخری گفتگو تھی۔ کچھ دن بعد میں اپنے گاؤں میں تھا جب محترم پروفیسر ریاض زیدی اور ڈاکٹر حافظ صفوان نے مجھے اظہر جاوید کی رحلت کی خبر دی۔ خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

◆◆◆

''تخلیق'' مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہے

کراچی	**دانش کدہ** (پروپرائٹر: شوکت علی) زہرا اسکوائر، بلاک نمبر 6، گلشن اقبال (0300-2387965)
کراچی	**سٹی پریس بک شاپ** (پروپرائٹر: اجمل کمال) مدینہ سٹی مال آفس نمبر 316 تھرڈ فلور کراچی (0300-8259082)
لاہور	**ایسٹ بک ڈپو** (پروپرائٹر: محمد علیم) 6-B مال روڈ، لاہور (0320-4343588)
لاہور	**اظہار سنز** (پروپرائٹر: سید محمد علی انجم رضوی) 19 اردو بازار، لاہور (0300-4106357)
لاہور	**سنگ میل پبلی کیشنز** (پروپرائٹر: افضال احمد) 25۔ شاہراہ پاکستان، لوئر مال، لاہور (0300-8470143)
لاہور	**سلطان نیوز ایجنسی** (پروپرائٹر: محمد آفتاب) اکبر مارکیٹ، 1۔ میو ہسپتال روڈ، لاہور
فیصل آباد	**شمع بک ڈپو** (پروپرائٹر: محمد اکمل) بیرون جھنگ بازار، فیصل آباد (0300-6670134)
گوادر	**قندیل نیوز ایجنسی** (پروپرائٹر: شبیر شاکر) پشکان ضلع گوادر، بلوچستان (0322-3761579)

فلم فلاپ ہوگئی

پنجابی: اظہر جاوید

اردو ترجمہ: حنیف باوا

اسلام آباد میں دنیا بھر سے آئے ہوئے اہلِ قلم کا اجتماع تھا۔ تقدیر مجھے بھی گھیر گھار کر لے گئی۔ تقدیر کے گھیرے میں آنے والی کو میں نے جھوٹ نہیں لکھا تھا کہ اس اجتماع میں، میں اپنی مرضی سے نہیں گیا تھا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ ایسی جگہوں سے دور ہی رہوں تو بہتر ہے۔ ہر انسان کے اندر کچھ کمیاں اور کچھ خامیاں ضرور ہوتی ہیں۔ زیادہ تر لوگ اس بات کا خیال نہیں رکھتے۔ وہ وہی کچھ کرنے لگتے ہیں جو دوسرے کرتے ہیں۔ میری تربیت اور طرح سے ہوئی ہے۔ میں نے جن اہلِ دانش اور صاحبِ علم لوگوں سے جینے کا ڈھنگ سیکھا ہے انہوں نے صرف ایک بات میرے ذہن نشین کی ہے کہ میں سفید کو سفید اور سیاہ کو سیاہ کہوں اور کبھی دو چہرے نہ رکھوں اور یہ بھی نہ کروں کہ ادھر کچھ کہہ دیا اور ادھر کچھ۔ جن نظریات کا آپ پرچار کرتے اور دن رات ڈھنڈورا پیٹتے ہیں، وقت آنے پر اگر حکومتِ وقت میں آپ کی اہمیت بڑھ رہی ہو تو آپ اپنے نظریات سے دست کش ہو جائیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ جب لوگوں کی اکثریت چمک کے پیچھے بھاگ رہی ہو تو ایک تنہا بندہ اصولوں کی بات کرتا ہوا کچھ اجنبی سا لگنے لگتا ہے۔ نہ ان جیسا ہوا جا سکتا ہے اور نہ ہی ایسی بات منوائی جا سکتی ہے۔ پھر تلملانے سے فائدہ۔ مجھے معلوم ہے کہ اس طرح پیچھے ہٹتے ہٹتے میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں۔ میں شہرت، ناموری اور دنیا داری کے لحاظ سے تنہا رہ گیا ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دل شانت رہتا ہے۔

اسلام آباد میں ہونے والے اجتماع میں جب مجھے کانفرنس کا دعوت نامہ موصول ہوا تو میں نے خود سے مشورہ کیا۔ اندر سے آواز آئی کہ حسبِ سابق اس بار بھی اس کانفرنس میں شرکت نہ کروں۔ سابقہ اجتماع صرف پاکستانی اہلِ قلم کا تھا لیکن موجودہ اجتماع دنیا بھر سے آئے ہوئے دانشوروں پر مشتمل تھا۔ پھر ہوا یہ کہ میرے دیرینہ دوست جو آج کے وزیرِ باتدبیر ہیں فون آیا۔ انھوں نے ہی اس اجتماع کے انعقاد کا بندوبست کیا تھا اور انھوں نے اس وقت تک فون بند نہ کیا جب تک کہ میں نے اس میں شمولیت کے لیے رضامندی ظاہر نہ کر دی۔ ان سے وعدہ کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ اتنا فخر بھی کس کام کا؟ میری عدم موجودگی سے دنیا کا کونسا کام ادھورا رہ جائے گا۔ اگر میں وہاں نہ گیا تو انہیں کیا فرق پڑے گا؟ ان کی یہ مہربانی میرے لئے کافی ہے کہ مجھ جیسے بے کار شخص کی منتیں کر رہے ہیں۔

تقدیر کے گھیرے کی بات یہیں سے شروع ہوتی ہے۔

دنیا میں حادثات اور وارداتیں پوچھ کر نہیں آتیں۔ اور پھر اس حادثے نے تو مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا۔ خود کو سنبھالنے اور دل کو تسلی دینے کی بہت کوشش کی لیکن بات بنتی نظر نہ آئی۔ یہ درست ہے کہ جو جھٹکا مجھے اس وقت لگا تھا یا جو چوٹ اس سے آئی تھی، اس کا درد اتنا تو نہیں رہا تھا لیکن میں ابھی تک بدحواسوں کی طرح پھر رہا ہوں۔ تین چار سو کے لگ بھگ لکھنے والے دوسرے ملکوں سے مدعو تھے۔ سو دو سو

کے قریب پاکستانی بھی تھے۔ پنڈی اور اسلام آباد کے ہوٹلوں میں ادیبوں اور شاعروں کی آمد ظاہر کر رہی تھی جیسے وہ کسی شادی میں شریک ہوں۔ پہلے روز کے سیشن میں وزیر اعظم کی تقریر تھی۔ ہم کانفرنس کے ہال میں پہنچے تو وزیر اعظم تقریر کر رہی تھیں۔ ہال کچھا کھچ بھرا ہوا تھا۔ باہر لابی میں ٹیلی ویژن پر ان کا خطاب سننے اور دیکھنے والوں کی بہت زیادہ بھیڑ تھی۔ میرے کمرے کے ساتھی کی خواہش تھی کہ ہال میں جا کر بیٹھا جائے۔ ہمیں تو گیلری میں ہی جگہ مل گئی تھی لیکن فرش پر پڑی کرسیاں مختلف لوگوں سے بھری ہوئی تھیں۔ میری آنکھوں نے ڈھونڈ لیا یا پھر شاید میری نظر ادھر گئی یا پھر ایک جانی پہچانی خوشبو نے مجھے چونکا دیا۔ ایک صف چھوڑ کر دوسری میں کمرہ دائیں کرسی پر بیٹھی رخسانہ تھی۔

دل میں یادوں کا ایک سیلاب امنڈ آیا۔ ماضی کی یادوں کی تصویریں کسی فلم کے منظر کی طرح ناچنے لگیں۔ اب نہ تو میں وزیر اعظم کی تقریر سن رہا تھا اور نہ ہی میں انہیں دیکھ رہا تھا۔ میرے ارد گرد کون لوگ ہیں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں تو اپنی دنیا آباد کیے بیٹھا تھا۔ گزشتہ بیس پچیس برسوں کی کوئی ایسی بات تھی جو مجھے یاد نہیں آ رہی تھی۔ اس کا ملنا، ٹوٹ کر پیار کرنا، بچھڑنا اور پھر ملنا۔ یہ سب کچھ فلموں یا کتابوں میں لکھی کہانیوں جیسا تھا۔ جب ہم پہلی بار ملے تھے تو میں شادی شدہ تھا، وہ بھی کنواری نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی ہماری دوستی یا پیار کہانی چاروں اطراف میں پھیل گئی تھی۔ نہ تو اس نے کوئی چنتا کی اور نہ ہی مجھے کوئی پرواہ تھی۔ وقت اور سماج نہ جانے کونسا انتقام لیتے ہیں۔ وہ خود تو کھلکھلاتی ماری ضدی سی عورت تھی۔ میرا جس پیشے سے تعلق ہے وہاں بے شمار لڑکیوں سے ملاقات رہتی ہے۔ وہ بھی یہ بات مانتی تھی۔ میرے نام جو لڑکیوں کے خط آتے تھے، وہ نہ صرف پڑھتی بلکہ سنبھال کر رکھ لیتی تھی۔ "آپ نے تو انہیں پھاڑ ڈالنا ہے۔ میں اگر انہیں سنبھال کر رکھوں گی تو یہ مجھے آپ کی آپ بیتی لکھنے میں مدد دیں گے" کام کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی پھر بھی کبھی غصے سے مجھے "بھنورہ" اور "ہرجائی" بھی کہہ دیتی۔ کبھی اسے جسموں کی ہم آہنگی اچھی نہیں لگتی تھی۔ اور کبھی اسے اس بات پر فخر محسوس ہوتا کہ وہ بذات خود مجھ سے الگ بہت مشہور اور نام والی ہے۔ میں کیا کہتا۔ جب ہم کبھی لڑتے جھگڑتے تو دوسرے ہی لمحے صلح ہو جاتی۔ کبھی میں منتیں کرتا اور کبھی وہ موم کی طرح پگھل جاتی۔

پھر وہ بچھڑ گئی اور بچھڑنے سے پہلے وہ بڑی زوردار جنگ کر کے گئی۔ کہنے لگی "جو کچھ ہم نے ایک دوسرے کو دیا لیا آئے واپس کر دیں۔" میں نے گزارش کی لیکن اس کا غصہ ختم نہ ہوا۔ اس نے پھر سے اسی بات کو دہرایا۔ میں نے کہا۔ "چلو! چیزوں کو واپس کرنے کے مرحلے کو وعدوں سے شروع کرتے ہیں۔" اس بار وہ میرے مذاق سے بھی نہ پگھل سکی۔ اسی طرح غصے سے بھری رہی۔ شاید اس کے بچے بڑے ہو گئے تھے۔ کسی کمپلیکس نے اس پر دھاوا بول دیا تھا۔ یا پھر کوئی اور نفسیاتی مشکل تھی۔ اس نے اس الجھاؤ کو سلجھانے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی بلکہ جانے سے پہلے میری نئی ساتھی نفیسہ کو فون کیا اور یقین دلانے کی کوشش کی کہ میرا اس بندے کے ساتھ کوئی ایسا گہرا سمبندھ نہیں۔ پھر خود ہی خط لکھ ڈالا۔ لاہور آنے پر کبھی فون پر، کبھی کسی دوسرے بندے کو ساتھ لے کر ملنے کے لئے آ جاتی۔ اس بات کو سات آٹھ برس گزر گئے ہیں۔ اب ہمارا ملنا جلنا ایسا ہی کچا پکا سا رہ گیا ہے۔ تقریب کے گھیر کر لے آنے اور حادثے کے وقوع پذیر ہونے کی بات کا تعلق تنتی سے ملاپ سے ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایک اور چیز تھی۔

وزیر اعظم کی تقریر کے بعد چائے کا پروگرام تھا۔ اور پھر چند غیر ملکی دانشوروں کی تقریریں تھیں۔ دوپہر کا کھانا شکر پڑیاں پر تناول کرنا تھا۔

لوگ یا تو بے صبرے ہو کر کھانے کی طرف لپک رہے تھے یا پھر باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کے ساتھ ملاقاتوں کو چوکھا رنگ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ پاکستانی زیادہ تر غیر ملکی خواتین کے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ ہر کوئی ادیب پاکستانی لکھنے والی خواتین غیر ملکیوں کو اپنی پنجابی یا اردو میں چھپی کتاب پر یہ جانتے ہوئے کہ ان لوگوں کو انگریزی، فرانسیسی، عربی یا افریقی زبانوں کے علاوہ اور کوئی زبان نہیں آتی تھی، اپنی کتاب پیش کر رہا تھا۔ یہیں یہ واردات عمل میں آئی تھی۔

واردات، حادثہ یا قیامت — اسے جو چاہے اور کوئی نام دیا جا سکتا ہے، یا پھر سب کچھ کہا جا سکتا ہے۔ میں اپنی پلیٹ میں تھوڑی سی سلاد رکھ کر وقت گزاری کر رہا تھا کہ لاہور سے آیا ہوا میرا دوست مظفر میرے قریب آیا — وہ کسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ بڑا یاروں کا یار لیکن انتہا کا من موجی — وہ کسی کام بھی ریا زدہ لگانے سے باز نہیں آتا تھا۔ رسماً حال چال پوچھنے کے بعد کہنے لگا — "آپ کی محبوبہ بھی آئی ہوئی ہے یہاں —"

میں نے کہا کون؟ — کون — "عینی" — وہ ہنس کر کہنے لگا — عینی نہیں، وہ ستدہ والی۔ مجھے ایسا لگا جیسے مجھے ہولے سے واردات کا جھٹکا لگا ہو یا اتنا سخت بھونچال آیا ہو جو پاؤں کے نیچے سے زمین کھینچ لے جاتا ہو۔ میں بہت پیار کرتا ہوں۔ بالکل پوجا اور عبادت کی طرح — لیکن جب کوئی محبوبہ چھوڑ جاتی ہے یا ہجر کا دکھ دے جاتی ہے تو میں نے نہ اسے کبھی الزام دیا اور نہ ہی اسے کبھی بے وفا لکھا ہے۔ اور نہ کبھی شکایتیں کی ہیں — میں جس قدر بھرپور عشق کرتا ہوں اتنا ہی بے چارگی سے گھونگے کی طرح اپنے خول میں گھس جاتا ہوں — چپ کر خاموشی سے کبھی آنسو بہا لیے یا کچھ نظمیں اور غزلیں لکھ کر دراز میں رکھ لیں۔

عینی کے بعد ہومل میری زندگی میں آئی۔ اور مجھے سمیٹ کر لے گئی۔ چھوٹے موٹے اکا دکا عشق اپنی جگہ پر — لیکن ایک آدھ عشق توڑ کر رکھ دینے والا بھی ہوتا ہے۔ اس بات کا عینی کو علم تھا — بے شک میں ادھر ادھر پیچ لڑاتا پھروں لیکن عینی اور ہومل کو اپنے اپنے طور پر ایمان کی طرح یقین تھا کہ ان کی گرفت کمزور نہیں ہے — وہ خود چھوڑ جائیں تو الگ بات ہے — وہ جب موجود تھیں تو جب بھی میں دوسروں کے ساتھ یاری یاری دوستی نبھائے رکھتا تھا۔ میں عینی کو اپنی محبوباؤں کی خاتونِ اوّل کہتا ہوں اور ہومل کو خاتم سمجھ بیٹھتا ہوں۔ عمر ڈھل جائے تو بات ختم ہوتی نظر آنے لگتی ہے۔ میں ایک بار پھر جذباتی ہو گیا تھا لیکن دوسری جانب سے کوئی توجہ نہیں ملی اسے میں ہیر سمجھتا ہوں۔ اس نے دوستی سے آگے بات نہیں بڑھائی — ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے زندگی کا کھیل ہومل کے ساتھ ہی ختم ہو گیا ہو۔

شکر پڑیاں پر لوگ تعلقات استوار کرتے، اپنے اپنے ایڈریس بانٹتے اور کچھ لینے دینے میں مصروف ہیں۔ مظفر کے قہقہے اچھل اچھل کر بکھر رہے ہیں اور وہ مجھے بازو سے پکڑ کر اس طرف متوجہ کر رہا ہے جہاں ہومل اور اس کی سہیلی کھڑے ہیں اور کھانا کھا رہے ہیں: وہ مجھ سے کچھ کہہ رہا ہے "جائیں نا — اس سے مل آئیں —"

مظفر جذبوں کی زبان نہیں سمجھتا۔ وہ بڑا پریکٹیکل بندہ ہے۔ عشق وشق اس کے نزدیک معقول چیز ہے۔ اور ہجر کو سینے سے لگائے رکھنا کوئی بڑائی نہیں۔ میں نے اس سے گزارش کی: "یار تم مجھے اس وقت ایکسپوز نہ کریں۔ پھر کبھی سہی — فی الوقت مجھے یہاں سے نکال کر لے جائیں۔" مظفر نے مہربانی کی۔ مجھے اپنی کار میں بٹھایا اور اپنے ہوٹل لے گیا۔ سب پایا۔ ابھی ہی چائے منگوائی اور میری توجہ دیگر باتوں کی طرف مبذول کرائی۔

کچھ دیر بعد میں اپنے ہوٹل چلا گیا۔

رات کے وقت ظفر کے ہوٹل میں کھانے کے ساتھ ساتھ گانے کا انتظام بھی تھا۔ میں دوپہر کے صدمے سے نڈھال تھا۔ پرانے دوستوں اور خواتین لکھاریوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا ہے جو ایک دوسرے سے دوستی بڑھا رہے ہیں ــــ میری کیفیت ایسی تھی جیسے میں صفِ مرگ پر بیٹھا ہوا ہوں۔ کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا۔ بتاؤں تو شاید کوئی مرہم رکھنے کی کوشش کرے۔ اور ہمدردی کا پھویا رکھ دے کھانا شروع ہوا۔ میں کھانے کی طرف ایسے گیا جیسے میں نے مرگ یا قل خوانی میں شامل ہونا ہو۔ ابھی پلیٹ میں سالن ڈال ہی رہا تھا تو جیسے مندروں کی گھنٹیاں بجی ہوں اور ساتھ ہی بجلی کڑکی ہو۔ ''آخر میں نے آپ کو پکڑ ہی لیا۔ ــــ آپ صبح سے بھاگتے اور چھپتے پھر رہے ہیں ــــ یہ کیا بات ہوئی بھلا'' ــــ میرے پاس مونل کھڑی تھی۔

میں اسے تحیر زدہ دیکھے جا رہا ہوں اور وہ معمول کی طرح کھل کھلا کر ہنستے جا رہی ہے۔ اس کے لہجے اور انداز میں ہجر کی کوئی بات اور نہ ہی اتنا عرصہ لاتعلق رہنے کا ملال اور نہ ہی سال ڈیڑھ سال دور رہنے کا غم۔ میری سانس جیسے حلق میں اٹک کر رہ گئی ہو۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں لیکن میری نظریں ڈری ڈری اور کھوئی کھوئی سی لگ رہی ہیں۔ وہ اسی طرح مجھے چھیڑ رہی ہے اور چہلیں کر رہی ہے۔

''کیا بات کروں۔ بات کرنے کے قابل رہا ہی نہیں۔'' میں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں جواب دیا۔ ''آپ کا کیا حال ہے خوش ہیں آپ۔''

''آپ ــــ تو بات نہیں کرتے ــــ میرے جیسے سینکڑوں آپ سے بات کرنے کا ڈھنگ سیکھتے ہیں۔'' مونل اسی طرح چہک رہی ہے۔

شاید وہ میرے ساتھ مزید کوئی چھیڑ خانی کرتی یا میں خود کو سنبھال کر کے کوئی بات کرتا۔ یہ کیا کرشمہ ہی تو ہوتا ہے ــــ ایک برس تک عشق کا ناطہ رہا ہو، شادی کے منصوبے بن رہے ہوں اور پھر ایک ہی سانس میں سب کچھ ختم ہو جائے ــــ اور پھر دوسرے شخص کو قطعاً کوئی احساس نہ ہو ــــ جیسے صرف کوئی ایک رت بدلی ہو اور ایک رت گزر گئی ہو۔ میں دل پر ہاتھ رکھ کے کوئی بات کرنے ہی والا تھا تو اس کی یاد کی گرہ کھلی اور نہ جانے اور کون کون ادھر آ نکلا تھا۔ ــــ اب تک مجھے چھیڑ رہی تھی اور اس نے اچانک مونل سے کہا۔ ''آپ نے انہیں بہت برباد کیا ہے'' مونل نے بڑی حیرت سے پوچھا (عجیب بات ہے میں نے محسوس کیا مونل کی اس آواز میں خوشی شامل تھی اور عمل کے سوال میں ہمدردی اور مجھ پر طنز شامل تھا)۔ میں نے برباد کیا ہے ــــ ''اور پھر بات آگے نہ چل سکی۔ پھر کوئی اور شخص آ گیا جس نے مجھے باتوں میں الجھا لیا۔ میں نے پلیٹ پکڑی اور اپنی میز کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ مونل پہلے سے وہاں موجود تھی۔ میں نے حیرت سے اس سے پوچھا۔ ''کیا تجھے معلوم تھا کہ میں یہاں بیٹھا ہوں۔'' اس نے اپنی عادت کے مطابق اپنی نرم اور نازک آنکھیں جھپکیں اور کہا ''نہیں۔''

ہم مزید باتیں کرتے لیکن میز پر بیٹھے ہوئے پاکستانی اہل قلم اپنی فطرت کے مطابق ایک خوبصورت سی لڑکی کو دیکھ کر پھول کر کپا ہونے لگے۔ اور فضول ہماری باتوں میں ٹانگ اڑانا شروع کر دیا ــــ ایک تو میں گھنگھروں کی طرح بکھرا ہوا تھا۔ آخر میں نے بات کرنے کی جرأت کر ہی لی تھی تو یار لوگوں نے درمیان میں ٹوک دیا اور ساتھ ہی اس کی سہیلی بھی آ گئی۔

مجھ سے کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ کنول اس واردات کو دیکھ رہا تھا لیکن کچھ بھی کہنے سے قاصر تھا۔ ظفر بھی گیا تھا اس کے ہمراہ صدیقی

اور سومرو بھی تھے۔ ظفر پھر مذاق کے موڈ میں نظر آیا۔۔۔ اس نے صدیقی سے کہا۔۔۔ ان کی موٹی بھی یہاں موجود ہے۔۔۔ اور یہ اس سے ہو سکتے بگڑ رہے ہیں۔

اردو بولنے والوں کا اظہار کا اپنا ہی طریق کار ہوتا ہے۔ صدیقی نے اسی انداز سے حیرانی کا اظہار کیا۔۔۔ سومرو کچھ نہ سمجھتے ہوئے تر تر میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔

کھانے کے بعد گانے کا پروگرام ہوا اور منچلوں نے دھمال بھی ڈالی۔ لیکن میرے اندر تو ٹوٹ پھوٹ اور ماضی کی یادوں کی سوچوں نے میرے اندر طوفان برپا کیا ہوا تھا۔ کنول میرا بچپن کا دوست ہے۔ میں نے اسے ساری بات سے آگاہ کیا اور کہا۔ "تم بے شک یہیں پر رہو۔۔۔ میں تو ہوٹل جا رہا ہوں۔۔۔" کنول عشق کے تمام رموز سے واقف ہے۔ اس نے میرا مندا حال دیکھتے ہوئے کہا۔ میں بھی چلتا ہوں۔

اس کانفرنس نے ابھی مزید دو روز تک جاری رہنا تھا۔ ابھی نہ جانے کتنی بار موٹی سے آمنا سامنا ہونا تھا۔ اور اس نے اسی طرح اپنی بے پرواہی سے مجھے مزید تڑپاتے رہنا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ میں چلا جاؤں۔ کنول نے اپنی دوستی اور یہاں کی سنگت کا واسطہ دیا۔ میرے دکھ کی ٹیس کو محسوس کیا اور پھر ایک بلند سا قہقہہ مار کر کہنے لگا۔۔۔ "چھوڑو یار۔۔۔ کن قصوں میں پڑے ہو۔ تمہیں زی ٹی وی کے چینل پر دھمی ڈانس دکھاتا ہوں۔۔۔"

جیتے جی انسان کو نہ جانے کتنا خود کو مارنا پڑتا ہے اور کون کونسے سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں۔

دوسرے روز میں پھر کانفرنس میں موجود تھا۔۔۔ لاہور سے آئی ہوئی صفیہ سیما اسی طرح فقرے بازی سے کام لے رہی تھی۔ میں نے آج سوٹ کی بجائے کیمل شلوار قمیض پہنا ہوا تھا اور ٹائی کی جگہ سکارف باندھا ہوا تھا۔ صفیہ نے ویسے ہی ہنستے ہوئے کہا۔۔۔ "ہمیشہ کی طرح آج بھی آپ ہیرو بنے ہوئے ہو۔۔۔ ہاں جی۔۔۔ یہاں تو غیر ملکی ہیروئنیں بھی آئی ہوئی ہیں۔"

میں تو اندر سے بجھا بیٹھا تھا۔ اسے کوئی جواب نہ دیا۔ کوئی فقرہ نہ کسا۔ اس نے شاید حیرت سے فردوس کو روکا اور کہا۔۔۔ "لو پھر اس سے پوچھ لیتے ہیں کہ آپ ہیرو نہیں لگ رہے۔" "اتنے بڑے مجمعے میں کسی اور نے اتنا خوبصورت سکارف باندھا ہوا ہے کیا۔ خوبصورت تو کیا بدصورت بھی نہیں پہن رکھا۔"

کسی اور کے آنے سے بات کا رخ دوسری طرف مڑ گیا۔ جب تقریروں کا دور ختم ہوا۔ پہلا اور دوسرا سیشن دونوں اختتام پذیر ہو گئے تو لنچ کے لئے تمام لوگ کانفرنس ہال سے باہر نکلے تو موٹی پہلے ہی وہاں پر موجود تھی۔ آج بھی میں نے اسے متعدد بار دیکھا لیکن ہر بار خود ہی کترا کر ایک طرف ہو لیا۔۔۔ اب کسی طرف بھی دیکھنے کا موقع نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں اسی طرح چمک رہی تھیں۔ جیسی کہ دس سال پہلے دیکھی تھیں۔ اس کے ہونٹ گلاب کی پتیوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔۔۔ گزشتہ ان دیکھے رنگ میں رنگے ہوئے۔ میں گزشتہ کل سے دیکھ رہا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر میرے پیار کا کوئی نشان نہ کوئی نقش باقی نہیں تھا۔۔۔ اس نے دل سے ہی نہیں اپنے پورے وجود سے میرے پیار کو کھرچ دیا تھا۔

مجھے بھی لگتا تھا جیسے ہم دونوں سے چپک سی گئی تھی۔ شاید وہ بھی ظفر کی طرح لذت کشید کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے پرانے پیار کی

کشش میں تھی ۔۔۔ یا پھر مجھے گڑیا دیکھ کر اس کی ماں کو تسکین مل رہی تھی یا پھر مجھے کھینچ کر پھر سے اپنی بانہوں میں لینا چاہ رہی تھی۔

موش ۔۔۔ میں اور مثنی کھڑے تھے اور لوگ ادھر ادھر ہمیں دیکھ رہے ہمارے نزدیک سے گزر رہے تھے۔ راستے میں صفیہ بھی آ گئی ہنستی ہوئی۔ میری طرف دیکھا اور پھر اس نے طنز سے کہا۔

"آج کیا بات ہے۔ ہمارا ہیرو بڑا اداس اور ویران سا نظر آ رہا ہے ۔۔۔"

مثنی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ میں نے پہلے ہی جواب دے دیا۔

"تمہارے ہیرو کی فلم فلاپ ہو گئی ہے ۔۔۔"

"نہیں ۔۔۔ میں نہیں مانتی ۔۔۔ کسی ہیرو کی بھی فلم فلاپ نہیں ہوتی ۔۔۔ اور پھر ہمارے ہیرو کی ۔۔۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔۔۔"

صفیہ سید نے بلند آواز سے بولتے ہوئے کہا۔

"ہاں لو ۔۔۔ بی بی جان ۔۔۔ فلم فلاپ ہو گئی ہے ۔۔۔ آپ کے ہیرو کی ہیروئن کی شادی ہو گئی ہے" شاید پہلی بار صفیہ سید کو موقع کی نزاکت کا احساس ہوا ۔۔۔ مثنی کی آنکھیں بجھی بجھی سی تھیں اور موش نظریں چرا رہی تھی ۔۔۔ صفیہ نے ایک طویل سا "اف" کہا تو ساتھ ہی موش کی یادوں کا درد کھل آ گیا اور دوکوں کے ریلے نے اختر بتر کر دیا ۔۔۔ بالکل میری زندگی کی طرح ۔۔۔

◆◆◆

ڈاکٹر انور سدید کی 86ویں سالگرہ پر آغا امیر حسین مدیر ماہنامہ "سپوتنک" کا تحفۂ ادب

کثیر الجہت ادیب

ڈاکٹر انور سدید

مرتب: پروفیسر محمد شفیق کھوکھر ۔۔۔ قیمت صرف 50 روپے

"سپوتنک" کے اس شمارۂ خاص کے "آئینہ عکس" میں پروفیسر سجاد نقوی، ممتاز مفتی، ڈاکٹر خورشید رضوی اور پروفیسر مرزا محمد منور کے مضامین شامل ہیں۔ "برمحل شناسائی" پروفیسر محمد شفیق کھوکھر کی آواز دوست ہے۔ مزید مضامین حسب ذیل ممتاز ادیبوں، نقادوں اور دانشوروں نے لکھے ہیں۔ تحقیق: ڈاکٹر وزیر آغا، محسن فارانی، ناصر عباس نیر / شاعری: اقبال فیروز، ظفر علی راجا / خاکہ نگاری: منور عثمانی، سفرنامہ: سید محمد ابوالخیر کشفی / اقبالیات: ڈاکٹر سید عبداللہ / انشائیہ: ڈاکٹر ناصر عباس نیر / انٹرویو: محمد کاظم جعفری ڈاکٹر انور سدید کے فن کا اجمالی جائزہ جناب نواب دین ستگو نے پیش کیا ہے۔ ماہنامہ "سپوتنک" کا یہ شمارۂ خاص سدید شناسی کی عمدہ مثال ہے۔

ملنے کا پتہ: ماہنامہ "سپوتنک" کلاسیک بک ہاؤس، ریگل چوک، دی مال، لاہور

اظہر جاوید کی نذر

حسن عسکری کاظمی

کیسے یقیں کروں کہ وہ مجھ سے جدا ہوا
ہے گفتگو کا در تو ابھی تک کھلا ہوا

بچھڑوں فراقِ یار کا قصہ تو رو پڑوں
دیکھوں تو روبرو ہے وہ چہرہ ہنسا ہوا

سہنا پڑے گا اس کی جدائی کا غم مجھے
ڈھونڈوں کہاں کہ دل میں ہے آ کر چھپا ہوا

گھر سے لباسِ خاک میں نکلا وہ شب گئے
آئے گا صبح دم وہ مجھے ڈھونڈتا ہوا

مرنا تو خیر اپنے مقدر میں ہے مگر
جینے کا حوصلہ بھی ہے اس کا دیا ہوا

قوسِ قزح کے رنگ تھے اس کے وجود میں
تتلی پہ سرخ پھول تھا جیسے سجا ہوا

کام آ سکی نہ اس کے مری زندگی حسنؔ
جو دوستی کا حق تھا نہ مجھ سے ادا ہوا

OOO

یارنامہ...... اظہر جاوید کی نذر

ابصار عبدالعلی

ہاں بڑے ظرف کا انسان تھا اظہر جاوید
مشکلوں میں بڑا آسان تھا اظہر جاوید

آدمی آپ کہیں اس کو تو کہتے رہیے
میرے نزدیک تو انسان تھا اظہر جاوید

اس نے چاہی نہ خوشی اور نہ چاہی شہرت
اس لئے بے سروسامان تھا اظہر جاوید

آگہی و ظرافت کا تھا دلبر ہوا
اس سے بڑھ کر ابوسلمان تھا اظہر جاوید

وہ نمازی تھا، فقیر بھی تھا صاحبِ توفیق
صاحبِ توحید مسلمان تھا اظہر جاوید

کر کے احسان کسی پہ نہ جتایا اس نے
نہ جتایا گیا احسان تھا اظہر جاوید

طاقِ نسیاں پہ دھرا اس نے سدا اپنا مفاد
دوستوں کے لئے ہلکان تھا اظہر جاوید

کام یاروں کے کئے کام نہ یاروں سے لئے
اپنی دانائی میں نادان تھا اظہر جاوید

وہ قلم کار تھا بے ساختہ تحریروں کا
دانش و علم کا عنوان تھا اظہر جاوید

طرزِ اظہار میں اظہر کا قرینہ تھا جدا
حق کا سچا، کھرا اعلان تھا اظہر جاوید

اس کے کردار میں ڈھلتا تھا جو بھی سچ لکھتا تھا
سچ کے ملک کا اک پہلوان تھا اظہر جاوید

قاضی ہوں یا وزیر آقا ہوں یا اور کوئی
درمیاں سب کے ہی میزان تھا اظہر جاوید

یار سے روٹھنا ممکن جو کبھی ہونے لگے
دوستی کا قوی امکان تھا اظہر جاوید

بانکا شاعر تھا تو نثار بھی تھا پائے کا
دو زبانوں میں زباں دان تھا اظہر جاوید

حسن آزادوں کا محبوب، بطرزِ ساحر
عشق زنداں کا ایمان تھا اظہر جاوید

اس نے ریاضت کے کتنے ہی نوکِ قلم
ان کا استاد مہربان تھا اظہر جاوید

بزرگی کے طفیل اس نے ہی لوٹیں اکثر
محفلیں وہ جہاں مہمان تھا اظہر جاوید

ویسی بات اب بھی ہے تخلیق میں جانِ تخلیق
جس کا بانی تھا ہمہ دان تھا اظہر جاوید

دوڑتا ہے رگِ تخلیق میں سلطان کے سنگ
جیسے کہ فن کا دیوان تھا اظہر جاوید

یارنامے میں ہے گھر ارت اس ایک ہی نام
اب یہ دل کی بھی گردان تھا اظہر جاوید

بعد کہتا ہے ابصار تو کہتے رہیے
ہاں ادب کی تھی پہچان تھا اظہر جاوید

OOO

منظومات

جلیل عالی

ایک لطیفہ کافی ہے

اونچے سے اونچے
پربت کی چوٹی کا فخر
بادل کے اک جھونکے سے
ٹکڑے کی مار ہے
اک بے نام احساس کی ہلچل
بڑھتے سورج منصوبوں کے
گیندا ادھیڑ کے رکھ دیتی ہے
پوری حقیقت
سوچ کلاوے میں لینے کا زعم
خیالِ خام!
بڑے بڑے نظریوں والے
بھاری فلسفے
عام سے ایک لطیفے کا بھی
ترچھا وار نہیں سہ سکتے

OOO

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون

دوہے

بندہ وہ کس کام کا من میں جوگ نہ کوئے
دکھ دیکھے انسان کا آنکھ نہ جس کی روئے

دھرتی اوپر آج تو رہتا سو اترائے
کل تو اترے گور میں دھرتی اوپر آئے

منزل تیری اور ہے مانگے یہاں دوام
جیون تیرا مانگنے دو پل کا آرام

لاکھے جو آسمان جنت اس کے بھاگ
جلتی جیون بات پہ غلطی اس پہ آگ

خوش ہیں جس کے پریت ہو دنیا کے مہمان
مر دے جیو ساتھ تو وہ کیا انسان

ہونٹوں پہ جو بات ہو پہلے اس کو تول
یہ نا ہو آواز دے جیا تیرا بول

سچا رشتہ پیار کا باقی ہے سب جھوٹ
اس بودے سنسار میں ٹھگ ٹھگ رہے لوٹ

سچ ہے جوتی تم کی سچ ہے تن کا دیپ
سچ ہے موتی پیار کا جیہڑ من کے سیپ

جد جند گہرا پوئے اوبا جن کا نام
چھپ کر کے غریب کا مان جتا کام

OOO

۱ جلن

ایوب خاور

میں کہیں پہ تھا بھی یا نہیں

[illegible]

میں کہاں تھا ؟؟؟
میں کہیں پہ تھا بھی یا نہیں ۔۔۔؟؟

OOO

کرامت بخاری

یاد ہوگا تمہیں

یاد ہوگا تمہیں، جب میں پیاری پہاڑیوں کی
طرح
مہرباں جسم کو سمیٹے آتی ہوئی، مسکراتی ہوئی،
تیری جانب چلی،
تیرے گھر کو چلے سپنوں کے لیے
تیرا آنگن تجھے دل رہا تھا لگے، دیر تک رو رہے تھے،
مسکراتے رہے،
گیت گاتے رہے،
یاد ہوگا تمہیں،
جب ہر شام ہی پربتوں پر اداسی اتر آتی تھی،
وہ تنہائی میں ایک بوڑھا شجر کتنا چپ چاپ تھا
تب اسی وقت میں نے کہا تھا تمہیں
لوگ ملتے ہیں مل کے بچھڑ جاتے ہیں
پھر یہ لمحے کبھی ہاتھ آتے نہیں، مسکراتے نہیں
خواب در خواب ہوتی ہوئی ساعتیں پھر کبھی اپنا
جلوہ دکھاتی نہیں
پاس آتی نہیں
پھر یہ بچھڑے ہوؤں کو ملاتی نہیں
یاد ہوگا تمہیں

ooo

روبینہ گوندی (امریکہ)

میں رقاصہ ہوں

میں رقص کی ملکہ ہوں
میں گھنگھروؤں کی ساتھی ہوں
میرا جسم افکار کی تجسیم ہوئی لڑی ہے
میرا جسم اظہار کی سوچوں کا دریا ہے
میرا جسم تیرے ہونٹوں کی چاپ سے بے تاب
میرا جسم بھٹکے ہوئے راہی کا سایہ
میرے جسم سے تم پیار کرو یا کرو نفرت
میرا جسم تجھے قرض کے بدلے میں ملا ہے
میرے جسم تم پیار کے ہوا سے بچا لو
میرے جسم کی آغوش میں الفت کی شمع ہے
میرے جسم کی سرگوشیاں تیری پناہ ہیں
میرے جسم سے جو بنتا ہے وہ رقص کی صورت
میرے جسم سے جو بنتا ہے وہ الفت کی صورت
میرے جسم کے اظہار یہاں پر تم ہو جاؤ
میرے جسم کے اندر چھپے راز میں کھو جاؤ
میرے جسم کی سرحد کو نہیں چھو سکا کوئی
کہ میرا جسم جلتا ہے جب جب
ہوا اوپر بھی چلتی ہے
تپتی ریت ساون کا موسم
ہر طرف آگ ہی آگ
کیونکہ میرا جسم تیرے خوابوں کی
تعبیر بنا ہے

ooo

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

وہ بچہ جو ساحل پہ اوندھا پڑا ہے

(ایلان کردی اور ان تمام بچوں کے
نام جو اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں)

وہ بچہ جو ساحل پہ اوندھا پڑا ہے
اسے جا کے دیکھو
مگر کیا کرو گے
اسے اب ضرورت نہیں ہے کہ دو تم دلاسے اسے وہ
کہ اس پر کہ دنیا میں ہر کوئی صورت
مجھے بھی تو راس جنگ کوئی دے دے
کہ زندہ رہوں میں
وہ تنہا سا بچہ
کہاں تک بلا خیز موجوں سے لڑتا
جو موجوں سے بچتا تو آگے وہ سرا اس کا
تیر سے پر تھا
وہ تنہا سا بچہ

ooo

رشید عیاں (امریکہ)

روشنی کا سفر

کیسا ماحول ہے خوشی کا سا
ہے یہ ادراک زندگی کا سا

الحمدللہ ہو گیا روشن
ایک روزن تو آگہی کا سا

دوستوں کا "مزاج" بھلا
ایک جھونکا ہے سرخوشی کا سا

مڑ کے دیکھوں، کبھی تو لگتا ہے
ایک ہی شعر، میر ہی کا سا

ایک جاتا ہوا اندھیرا ہوں میں
ہے سفر جیسے روشنی کا سا

شعر گو کر چکی ہوں سالہا ہزار
کوئی رنگین نہیں کسی کا سا

لگ رہی ہوں ابھی دیر سے قیطان
میرے اللہ، اور نئی کا سا

شاعری کے عیاں ابتر سال
یہ تو جادو ہے ساحری کا سا

OOO

عمیرہ احمد

چور کی آمد پر

رات گھر میں کون تھا؟
بند دروازے کے باہر کون تھا؟
گھر کے اندر کون تھا؟
وہ جو تھیں قدموں کی چاپ اور سرسراہٹ اس
طرف
کچھ اندھیرا اور کچھ کھلی کھڑکی کے پار
اس طرف
ایک نادیدہ شخص کی بے کراں موجودگی
پھر عجب پراسرار احساس اٹھی
شب بڑی مصروفیت میں کٹ گئی
بند دروازوں کے آگے میں جاگتی
کھڑکی سے باہر جھانکتی
"کون ہے ... یہ کون ہے جو دل کے پاس؟"
آہ!
اس آواز میں بھی وہم تھا
گھر کے باہر ہے کوئی
اندر کوئی موجود نہیں
میری خاطر کوئی آواز دیتا کوئی نہیں
تیرے سوا
سارے دروازے اور دریچے بند ہیں
کوئی آہٹ نہیں

OOO

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

بہت دنوں سے

بہت دنوں سے دیواریں ہم راز ہوئیں
بہت دنوں سے یادیں بھی ناراض ہوئیں

بہت دنوں سے خیال و خد، وہ یاد نہیں
بہت دنوں سے دل بھی اپنا شاد نہیں

بہت دنوں سے دشت جنوں آباد نہیں
بہت دنوں سے زخموں کی روداد نہیں

اور قلم کی بھی کوئی فریاد نہیں
بہت دنوں سے ہم بھی خود کو یاد نہیں

OOO

بشیر جعفر

درشن

عجیب رات ہے کہ رو رہی ہے، بچھڑتے ہیں جو دل سے
ہوا دکھانے صورت کوئی ہے اس قدر کتنی کہاں سے
وہ لالہ زاروں میں حسن دیکھو اسی کی آنکھوں میں تیکھاں سے
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]

OOO

پروفیسر نور کمال شاہ

سانحہ اے پی ایس

دل کے زخم تو اب بھی ویسے تھے پچھلے سال دسمبر میں
[illegible] کے حال دسمبر میں

[illegible]
[illegible] دسمبر میں

[illegible]
[illegible] دسمبر میں

[illegible]
[illegible] دسمبر میں

[illegible]
[illegible] دسمبر میں

[illegible]
[illegible] دسمبر میں

ooo

رشید آفریں

امیر خسروؒ

[illegible] خسرو
[illegible] خسرو

[illegible]
[illegible] خسرو

[illegible]
[illegible] خسرو

[illegible]
[illegible] خسرو

[illegible]
[illegible] خسرو

[illegible]
[illegible] خسرو

ooo

اظہر جاوید

سندھیا (شام)

شام آئی تھی پہلے بھی دل میں مگر
اس قدر تو کبھی خوبصورت نہ تھی
میں بھی اب تک سویروں کا طالب رہا
دھڑکنوں کی مجھے کچھ ضرورت نہ تھی
شام آئی تو ایسے لگا اس طرح
میری سوچوں کو بھی روشنی مل گئی
عمر بھر جو اندھیروں میں بھٹکتا رہا
وہ ملی تو مجھے زندگی مل گئی
میری راتوں کو بھی چاندنی مل گئی
دھڑکنوں کو نئی راگنی مل گئی
شام آئی تو ایسے لگا اس طرح
میری باہوں میں تارے اترنے لگے
میرے ہونٹوں پہ نغمے ابھرنے لگے
میرے دن رات جیسے سنورنے لگے
میرا بیکار جیون مکمل ہوا

ooo

افسانے

چہرے

یٰسین احمد (انڈیا)

شہر میں دو دن سے کرفیو نافذ تھا۔

اس کرفیو نے شہر کی ساری رونق، ساری ہماہمی کو تہس نہس کر دیا تھا۔ جاگتا، جگمگاتا شہر، شہر خموشاں بن گیا تھا۔ بازار بند، ٹریفک کا شور و غل ساکت، انسانوں کی آمد و رفت ختم، سڑکوں پر سناٹا اور خوف۔ اس سرکاری ہسپتال میں بھی اس وقت سناٹے کی حکمرانی تھی۔ ایمرجنسی وارڈ میں بھی گہری خاموشی طاری تھی۔ بیشتر مریض بستروں پر لیٹے ہوئے کروٹ بدل رہے تھے یا آنکھیں بند کیے نیند کو منانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ان کے لواحقین بیچ فرش پر لیٹے ہوئے تھے یا کرسی پر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگے تھے۔ اعصاب پر بے یقینی اور اندرونی دباؤ، ماحول کشیدہ ہو اور ذہنوں پر بوجھ ہو تو نیند کہاں آتی ہے؟

اس ایمرجنسی وارڈ کے ڈیوٹی ڈاکٹر نے دو نرسوں کے ساتھ وارڈ کا چکر لگایا اور پھر آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دونوں نرسیں اس کے سامنے دوسری سمت رکھے ہوئے میز کے اطراف بیٹھ گئیں۔ ایک نرس نے اپنے دونوں ہاتھ میز کی سطح پر رکھے اور اپنا سر ہاتھوں پر ٹکا دیا۔ دوسری نرس نے اپنا موبائل آن کر لیا۔ اب وہ موبائل پر نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی کہ کبھی اس کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ جاتی اور کبھی اس کا چہرہ ایسا سرخ ہو جاتا جیسے بدن میں خون کے بجائے شعلے دوڑنے لگے ہوں۔

دفعتاً اس خاموش ماحول میں تیز تیز قدموں سے چلنے اور کسی کے رونے چیخنے کی آوازیں گونجیں۔ ڈاکٹر جلدی سے اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور نرسیں بھی۔ ہسپتال کا ایک ملازم اسٹریچر پر کسی زخمی لڑکی کو لا رہا تھا۔ اسٹریچر کے ساتھ ساتھ اس کے ماں باپ بھی چل رہے تھے۔ ماں دبی دبی آواز میں آہ و بکا کر رہی تھی اور باپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دونوں نرسیں اسٹریچر کی طرف لپکیں اور ڈاکٹر بھی زخمی لڑکی کے قریب آ گیا۔ لڑکی شدید طور پر زخمی ہوگئی تھی اور نیم بے ہوشی کے عالم میں تھی۔ لڑکی کے کپڑے خون میں بھرے ہوئے تھے۔ زخمی لڑکی کی ماں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ڈاکٹر کے سامنے گڑگڑانے لگی۔ ''ڈاکٹر صاحب! میری بچی کو بچا لیجئے۔ میری ایک ہی بچی ہے۔'' ڈاکٹر نے ہمت سے کام لینے کا اشارہ کیا اور پھر زخمی لڑکی کے باپ سے پوچھا۔ ''یہ کیسے ہوا؟'' زخمی لڑکی کا باپ سہمے ہوئے بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب! ہم ایک فنکشن ہال میں واچ مین ہوں۔ کرفیو کی وجہ فنکشن ہال میں کوئی پروگرام نہیں چل رہا تھا اور ہال خالی پڑا ہے۔ میری لڑکی پتہ نہیں کب کھیلتے کھیلتے اوپر چھت پر چلی گئی اور وہاں سیڑھیوں سے پھسل گئی۔''

ڈاکٹر نے ایک سکون کی سانس لی۔ کیونکہ زخمی لڑکی کو دیکھ کر ڈاکٹر کے دماغ میں یہی خیال آیا تھا کہ شاید یہ لڑکی کسی انسان نما درندے کی درندگی کا شکار ہوئی ہو۔ اس وقت سارا شہر، شہر نہیں رہا تھا۔ ایک ایسا بھیانک جنگل بن گیا تھا جہاں بھوکے بھیڑیے غراتے، دندناتے، چنگھاڑتے پھر رہے ہوں۔ اتفاقی حادثات کے آگے انسان بے بس رہتا ہے۔ صبر اور دعا کے سوا اس کے پاس اور کوئی راستہ نہیں ہوتا لیکن جن حادثات کے پیچھے انسانی بربریت اور ظلم کی کارستانی رہتی ہے وہ قابل نفرت ہے اور قابل گرفت بھی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''ہمت سے کام لو،

علاج میں ہم کوئی کمی نہیں کریں گے۔'' اس وقت تک دونوں نرسیں اسٹریچر کو دھکیلتے ہوئے آئی سی یو کی سمت چلی گئی تھیں۔ ڈاکٹر بھی ان کے پیچھے لپکا۔ زخمی لڑکی کے ماں باپ کے چہروں پر تھوڑے سکون کے آثار نظر آئے۔ لیکن آنسو بدستور ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ آس پاس کے مریضوں کے لواحقین اُن دونوں کے گرد ان کے قریب جمع ہو گئے تھے۔ ہمدردانہ نگاہوں سے ان کو دیکھ رہے تھے۔ ایک عورت آگے بڑھ کر زخمی لڑکی کی ماں کو تسلیاں دینے لگی تھی۔ وہ سب کے سب ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ ایک دوسرے سے ناواقف۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے نام کیا ہیں؟ مذہب کیا ہے؟ فرقہ کیا ہے؟ پھر بھی ایک دوسرے سے ہمدردی جتا رہے تھے۔ کیونکہ وہ سب غم زدہ تھے پریشان حال تھے۔ ان کے متعلقین کسی نہ کسی دکھ بیماری کا شکار تھے۔

بہت دیر بعد ڈاکٹر ایک نرس کے ساتھ باہر دکھائی دیا۔ ڈاکٹر زخمی لڑکی کے باپ سے بولا۔ ''زخم ہم نے صاف کر دیے ہیں۔ لیکن لڑکی کی حالت تشویش ناک ہے۔ خون کافی بہہ چکا ہے اس کو فوری خون چڑھانا ضروری ہے۔'' ''خون!'' زخمی لڑکی کے باپ کے لئے یہ اطلاع غیر متوقع تھی۔ وہ بوکھلا سا گیا۔ ایک نرس اس سے مخاطب ہوئی اور ایک پرچی اس کی طرف بڑھائی۔ ''اس میں بلڈ گروپ لکھا ہوا ہے قریب ہی بلڈ بینک ہے۔ وہاں چلے جاؤ۔ آپ کو خون مل جائے گا۔'' زخمی لڑکی کا باپ کچھ نہیں بولا اور نہ نرس کے ہاتھ سے پرچی لی۔ وہ تو شاید یہ سوچ کر یہاں آیا تھا کہ سرکاری دواخانہ ہے ہر قسم کی سہولت مل جائے گی۔ لیکن صورت حال اس کے لئے غیر متوقع تھی اور پریشان کن بھی۔

دفعتاً وہاں کھڑے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص آگے بڑھ کر بولا۔ ''آپ بلڈ گروپ بتا دیجئے اگر میرے گروپ سے ملتا ہے تو میں خون دینے کے لئے تیار ہوں۔'' سب لوگ چونک کر اس شخص کی طرف دیکھنے لگے۔ نرس نے کہا ''بی پازیٹو...!'' یہ سنتے ہی وہ شخص فوراً بولا۔ ''میرے خون کا بھی یہی گروپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب آپ میرا خون لے سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر اس شخص کی طرف دیکھنے لگا جس نے خون دینے کی پیشکش کی تھی۔ وہ ایک تیس اکتیس برس کا بہتا کٹا اور صحت مند مرد تھا۔ ڈاکٹر اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا سوائے اس کے کہ وہ ایک زیر علاج مریض کے ساتھ وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس شخص سے پہلے اس زیر علاج مریض کی دیکھ بھال ایک عورت کرتی رہی تھی لیکن کرفیو کے نافذ ہونے کے بعد عورت چلی گئی تھی اور وہ شخص وہاں آ گیا تھا۔ لگتا تھا عجلت میں وہ وہاں آیا ہے۔ کپڑوں کا ایک فاضل جوڑا بھی اس کے ساتھ نہیں تھا۔ جو کپڑے پہن رکھے تھے وہ اب میلے ہو چکے تھے۔ ہسپتال کے کینٹین میں جو بھی مل جاتا وہی کھا کر گزارہ کر رہا تھا۔ بہت کم بات کرنے کا عادی تھا۔ ہر وقت سر جھکائے اپنے متعلقہ مریض کے قریب بیٹھا رہتا۔ مگر اس وقت وہ شخص ڈاکٹر کو بہت مہان لگا۔ یہ اس کی رحم دلی اور ہمدردی ہی تھی کہ فوراً ایک لڑکی کی جان بچانے کے لئے اپنا خون دینے کے لئے راضی ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر کے دل میں اس کے لئے بیک وقت تشکر اور احترام کے جذبات ابھر آئے۔ اس نے محبت سے اس کے کندھے پر اپنا ایک ہاتھ رکھا اور کہا۔ ''آیئے میرے ساتھ...!'' پھر وہ دونوں آئی سی یو میں چلے گئے۔ زخمی لڑکی کے ماں باپ کے دل میں بھی اس کے لئے احترام اور تشکر انہ کیفیت موجزن ہو گئی تھی اور پھر ڈاکٹر نے اپنے اسٹاف کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ ضروری جانچ پڑتال کے بعد اس شخص کا خون زخمی لڑکی کے جسم میں پہنچایا جانے لگا۔ یہ عمل تقریباً چار پانچ گھنٹے جاری رہا۔

پو پھٹ رہی تھی جب وہ شخص نڈھال سا وارڈ میں دکھائی دیا۔ اس کے ساتھ ایک نرس بھی باہر نکلی۔ نرس نے پوچھا۔ ''اگر آپ

چاہیں تو میں ایک گلاس دودھ لے آؤں، پی لیں طبیعت بحال ہو جائے گی۔" اس شخص نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "ضرورت نہیں ہے میں بہتر ہوں۔" ان دونوں کو آتا دیکھ کر زخمی لڑکی کے ماں باپ تیزی سے اس کے قریب آئے اور لڑکی کے متعلق دریافت کرنے لگے۔ نرس نے کہا۔ "وہ بہتر ہے آپ ان کا شکریہ ادا کیجئے لڑکی کی جان بچانے میں انہوں نے مدد کی ہوتی تو شاید..." نرس کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ زخمی لڑکی کے ماں باپ اس شخص کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے رہے لیکن ان کے منہ سے کوئی لفظ نہیں نکلا۔ شاید شکریہ ادا کرنے کے لئے ان کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ ان دونوں کے صرف ہونٹ لرزتے رہے۔ دفعتاً لڑکی کی ماں اس شخص کے پاؤں چھونے کے لئے جھک گئی وہ شخص فوراً پیچھے ہٹ گیا اور پھر خاموشی سے آگے بڑھ گیا۔

اس وقت صبح ہو چکی تھی۔ ایمرجنسی وارڈ میں چہل پہل شروع ہو گئی۔ دونوں نرسیں فریش ہونے کے لئے باتھ روم میں چلی گئیں اور پھر باتھ روم سے نکل کر انہوں نے چائے بنائی۔ اپنے لئے اور ڈاکٹر کے لئے بھی۔ ڈاکٹر چائے پی رہا تھا کہ اس نے دیکھا کہ چار پانچ لمبے تڑنگے مرد گیلری میں سے آتے ہوئے دکھائی دیے۔ ان کی چال ڈھال اور حلیے دیکھ کر ڈاکٹر سمجھ گیا کہ ان کا تعلق پولیس سے ہوگا حالانکہ وہ سادہ لباس میں تھے۔ ڈاکٹر کے قریب پہنچ کر ایک شخص سامنے کرسی پر بیٹھ گیا اور جیب سے شناختی کارڈ نکال کر بتاتے ہوئے کہا۔ "پولیس" ڈاکٹر نے ایک اچٹتی ہوئی نگاہ شناختی کارڈ پر ڈالی اور پھر پوچھا۔ "فرمایئے۔" "ہم کو اس آدمی کی تلاش ہے۔" انسپکٹر بولا۔ اس کے ایک آدمی نے اپنی جیب سے ایک تصویر نکال کر ڈاکٹر کے سامنے رکھ دی۔ انسپکٹر بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ وہ آدمی یہاں موجود ہے۔" تصویر دیکھ کر ڈاکٹر حیران رہ گیا۔ تصویر اسی شخص کی تھی جس نے زخمی لڑکی کو اپنا خون دیا تھا۔ غیر ارادی طور پر اس نے وارڈ کی طرف اشارہ کر دیا جہاں وہ شخص موجود تھا۔ ڈاکٹر سمجھ نہ سکا تھا کہ وہ شخص پولیس کو کیوں مطلوب ہے۔ انسپکٹر نے فوراً دو آدمیوں کو وارڈ کی سمت جانے کے لئے کہہ دیا تھا۔ ڈاکٹر نے پوچھا۔ "کیوں... اس آدمی نے کیا کیا ہے؟ وہ شخص تو مجھے بے حد شریف اور رحم دل لگا ہے۔" "ڈاکٹر صاحب!" انسپکٹر تلخ لہجے میں بولا۔ "فسادات میں اس شخص نے اپنی ایک ٹولی کے ساتھ بڑا دھوم مچایا ہے۔ کئی دکانیں لوٹی ہیں، مکانات جلائے ہیں جس میں ایک شخص کی جان چلی گئی۔"

ڈاکٹر کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ "شاید آپ کو غلط اطلاع ملی ہے یہ شخص بہت ہی رحم دل اور ہمدرد ہے۔ آج ہی اس نے اپنا خون دے کر ایک لڑکی کی جان بچائی ہے۔" انسپکٹر تلخی سے مسکرایا۔ "آپ ڈاکٹر ہیں، کسی کے مرض کو پہچان سکتے ہیں لیکن کسی آدمی کو نہیں۔ ہم پولیس والے ہیں صورت دیکھ کر جان لیتے ہیں کہ آج کا آدمی کتنے چہرے لگا کر جیتا ہے۔ کہیں فرشتہ ہے تو کہیں درندہ...!" یہ کہتے کہتے انسپکٹر چپ ہو گیا کیونکہ اس کے دونوں آدمی اس شخص کو لے کر وہاں پہنچ گئے تھے۔ ڈاکٹر پر نظر پڑتے ہی اس شخص نے اپنا سر جھکا لیا تھا۔ ڈاکٹر کے دل کو ایک جھٹکا سا لگا۔ تعظیم اور توصیف کے وہ سارے جذبات جو اس شخص کے لئے ڈاکٹر کے دل میں پیدا ہوئے تھے، آہستہ آہستہ فنا ہونے لگے۔

"شکریہ ڈاکٹر اس کو آپریشن کا۔" انسپکٹر نے مصافحہ کرتے ہوئے کہا اور اس شخص کے ساتھ باہر کی طرف جانے لگا۔ ڈاکٹر خاموش رہا اور سوچتا رہا کیا واقعی آج کے انسان کا ظاہر کچھ اور ہے باطن کچھ اور ہے......!"

◆◆◆

میری کہانی کا کردار

دیپک بدکی (انڈیا)

"آپ مجھے اپنی کہانی کا کردار کب بنا رہیں گے؟" اس نے دوبارہ پوچھ لیا اور میں نے پھر تی ان سنی کر دی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کو اتنی شدت سے میری کہانی کا کردار بننے کی خواہش کیوں کر ہوئی۔ اس نے مجھ سے یہ سوال کئی بار پوچھا مگر میں ہر بار ٹالتا رہا۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ میں کس کی بات کر رہا ہوں۔ ایک پڑھی لکھی نا کتخدا لڑکی ہے جس کو شادی کے نام ہی سے چڑ ہے۔ ایسا تو نہیں ہے کہ وہ "کنواری" ہے اور شادی سے نفرت کرتی ہے۔ نہیں، ایسا بالکل نہیں ہے۔ تیس پار کر چکی ہے مگر شباب نے ابھی تک ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔ گیہواں رنگ، بھرا بھرا جسم، لمبے کالے بال، شوخ دیدہ اور بیلے ہونٹ۔ قیامت اور کیسی ہوتی ہوگی! اس کے بدن کا سب سے دلکش حصہ اس کی ابھری ابھری، گداز چھاتیاں ہیں جن پر ایک بار نظریں پڑ جائیں تو ہٹنے کا نام نہیں لیتیں۔

ہماری ملاقات ایک ہندی اردو کوی سمیلن میں ہوئی تھی جس میں ہم دونوں نے شرکت کی تھی۔ یہی کوئی چھ سات مہینے پہلے کی بات ہے۔ چائے کے وقفے پر ایک دوسرے سے تعارف ہوا۔ باتوں باتوں میں معلوم ہوا کہ کومل نے ہندی میں ڈاکٹریٹ کی سند لی ہے اور اردو بھی کچھ حد تک پڑھ سکتی ہے۔ پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے اس نے ہندی کے ایک مشہور افسانہ نگار پر مقالہ لکھا تھا۔ بعد میں جب ہمارے درمیان نزدیکیاں بڑھ گئیں تو پتا چلا کہ یہ مقالہ اس نے محض اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر کا دم چھلا جوڑنے اور اچھی سی نوکری پانے کے لیے لکھا تھا ورنہ اس کو ان چیزوں میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ آج کل کے سند یافتہ ڈاکٹروں کی طرح انگوٹھا چھاپ تھی بلکہ اس نے چار سال کڑی محنت کر کے ریسرچ کی ڈگری حاصل کی تھی جس کا احساس مجھے تب ہوا جب میں نے اس کا مقالہ پڑھ لیا اور کئی نکتوں پر اس سے بحث بھی کر لی۔

میری دیرینہ خواہش تھی کہ میرے افسانے ہندی میں شائع ہوں تاکہ ہندی قارئین بھی ان کو پڑھ سکیں۔ پریم چند، سدرشن یا اشک کی طرح مجھے ہندی رائٹر بننے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ بہت سوچ بچار کر کے میں نے کومل سے درخواست کرنے کی ٹھان لی کیونکہ وہ ہندی کے علاوہ اردو بھی پڑھ لیتی تھی۔ آخر کار میں نے ایک روز جسارت کر ہی لی۔ "کومل جی، کیا آپ میرا ایک چھوٹا سا کام کر سکتی ہیں؟"

"ہاں کیوں نہیں۔ آپ کام تو بتائیں۔" اس نے کام کی نوعیت جانے بنا ہی ہامی بھر لی۔

"میرے افسانوں کا ایک مجموعہ حال ہی میں شائع ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ مجموعہ ہندی میں بھی دستیاب ہو۔ دراصل میری کہانیوں کے ماحول اور کرداروں کے ساتھ ہندی پاٹھک زیادہ اپنائیت محسوس کر سکتے ہیں اور وہ میری کہانیوں کی زیادہ قدر کر سکتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کا ہندی میں ترجمہ کریں۔ سولہ کہانیاں ہیں۔ آپ اطمینان سے ترجمہ کر سکتی ہیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔"

چنانچہ اس وقت تک ہم ایک دوسرے کے اچھے دوست بن چکے تھے اس لیے میں نے معاوضے کی بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

سوچا جب موقع مل جائے گا تو بات کروں گا یا پھر انتقام پر کوئی اچھا سا تحفہ دے دوں گا۔

"یہ تو کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ مجھے یہ کام کرنے میں خوشی ہوگی۔" اس نے کسی پس و پیش کے بغیر میری درخواست منظور کر لی۔

"تو پھر میں اپنی کتاب کل تک آپ کے پاس پہنچا دوں گا۔ آپ ایک ایک کہانی کا ترجمہ کر لیں اور مجھے دے دیا کریں تاکہ میں اس کو پڑھ لوں اور کہیں کوئی تبدیلی کی ضرورت ہو تو بتا دوں گا۔"

"پھر تو بہت کام لگے گا کیونکہ میں اردو روانی سے نہیں پڑھ پاتی اور لکھتے ہوئے بھی زمانہ ہو گیا ہے۔ اس کے بعد کوئی واسطہ بھی تو نہ رہا۔"

"پھر ہم دونوں مل کر یہ کام کر سکتے ہیں۔ میں پڑھا کروں گا اور آپ ہندی میں ترجمہ کر کے لکھا کریں۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ آپ کا گیسٹ ہاؤس تو نزدیک ہی ہے۔ میں ہر روز گھنٹہ بھر کے لیے آیا کروں گی اور آپ ڈکٹیشن دیا کریں۔"

"بہت اچھا آپ نے تو میری مشکل حل کر دی۔ مگر ایک پرابلم ہے....."

"وہ کیا؟"

"میری اکثر کہانیاں جنسی نوعیت کی ہیں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"اس میں کوئی ڈر کی بات ہے۔ لٹریچر میں تو کئی طرح کے موضوعات ہوتے ہیں۔ میں نے نہ جانے کتنی جنسی کہانیاں پڑھ لی ہوں گی۔ آپ فیصلہ کر لیجیے کہ کس طرح یہ کام آسانی سے روبہ عمل لایا جا سکتا ہے۔ میں ترجمہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

ان دنوں میں نرائن پور میں سرکاری گیسٹ ہاؤس میں اکیلا رہتا تھا کیونکہ کورٹ میں میری طلاق کا کیس چل رہا تھا۔ دونوں بچے ہوسٹلوں میں رہتے تھے۔ کومل آدھا پون کلومیٹر دور ایک کرائے کے مکان میں رہتی تھی۔ اس لیے فیصلہ یہ ہوا کہ دفتر بند ہونے کے بعد وہ ایک گھنٹے کے لیے میرے گھر آیا کرے گی اور میں کہانی پڑھتا رہوں گا اور وہ ترجمہ کرتی رہے گی۔

انتظام اچھا تھا۔ میں کہانیاں پڑھتا گیا اور وہ ترجمہ کرتی گئی۔ ہندی، اردو اور انگریزی کے چار پانچ لغات بھی دستیاب تھے۔ کبھی کبھار کسی ٹھیٹ اردو لفظ کا متبادل لفظ نہیں ملتا تھا یا پھر کسی متبادل لفظ پر ہماری سہمتی نہیں بن پاتی تھی۔ اس وقت ان لغات کی ضرورت پڑتی تھی۔ کبھی کبھی کسی لفظ کا لغوی معنی میرے من کو نہیں بھاتا تھا۔ اس لیے ان لغات کی مدد سے مترادف الفاظ اخذ کر ایسا لفظ چننے کی کوشش کی جاتی جو میرے خیال کا صحیح ترجمان ہوتا۔ ترجمے کا یہ مرحلہ بہت کٹھن تھا۔ کہاں تو میں نے سوچا تھا کہ سولہ کہانیاں سولہ دنوں میں ختم ہو جائیں گی اور کہاں ایک ایک کہانی کا ترجمہ کرنے میں پورا ہفتہ لگ رہا تھا۔ مجھے کومل کی لگن اور اس کی دیانت داری نے بہت متاثر کیا کیونکہ اس نے کبھی تھکن یا بوریت ظاہر نہیں کی اور انہماک سے ترجمہ کرتی رہی۔

کہانیاں ترجمہ کرتے وقت وہ میری کہانیوں کے کرداروں سے اپنے وجود کی تطبیق کرنے لگی۔ اسے کہانیوں کے کئی کرداروں نے بہت متاثر کیا۔ ان کرداروں میں اسے کچھ اپنائیت سی محسوس ہو رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً میں چائے بنا کر لے آتا اور دونوں تھکاوٹ دور کرنے کے لیے چائے نوش فرماتے۔ اس دوران وہ مجھ سے ان کرداروں کے بارے میں کئی سوال کرتی جیسے وہ مخصوص کردار مجھے زندگی کے کس موڑ پر ملا تھا، دونوں ایک دوسرے کو کس حد تک جاننے لگے تھے اور پھر اس رشتے اور کردار کا کیا حشر ہوا؟ میں بھی بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اس کردار سے

ہوئی ملاقات اور رشتے کے بارے میں ساری روداد سناتا۔ اس طرح کومل کو اتنا تو معلوم ہوا کہ میں ایک شفاف شخصیت کا مالک ہوں اور میری کہانیوں کے اکثر کردار میری زندگی کے اہم جزو رہے ہیں اور پھر بچھڑ کر میرے افسانوں میں امر ہو چکے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس کے من میں خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ وہ بھی ان کرداروں کی طرح ہی قرطاس پر پھیل کر امر ہو جائے۔ وہ خود کو میری کہانیوں کے کردار کے روپ میں دیکھنا چاہتی تھی اور اس حوالے سے کئی بار سوال بھی کیے۔

"آپ مجھے کہانی کے کردار میں کب ڈھالیں گے؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔"

"میرا مطلب ہے کہ آپ کی زندگی میں جو بھی لڑکی آئی، آپ کی کہانی کا حصہ بن گئی۔ ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ میں بھی کبھی اس داستان کا حصہ بن جاؤں گی۔ ہماری دوستی میں بھی تو بہت عرصہ گزر گیا۔"

"میں نے اس طرف کبھی کوئی دھیان نہیں دیا۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آپ کے ساتھ میرے بہت اچھے تعلقات رہے ہیں۔ آپ بہت اچھی ہیں اور آپ نے یہ کام منظور کر کے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے مگر میں نے اس بارے میں کبھی سوچا ہی نہیں۔ کبھی آپ کا مشاہدہ دل وجان سے کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

"کیا میری شخصیت میں اتنی جاذبیت نہیں ہے کہ آپ متوجہ ہو سکے؟ لگتا ہے آپ نے مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ میں آپ کی کہانیوں کا کردار بن سکوں۔" اس نے سیدھا سپاٹ سا سوال کیا۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ دراصل میری کہانیوں میں آپ کو جو بھی کردار ملیں گے وہ میرے بہت قریب رہے ہیں۔ وہ میرے ساتھ بہت مدت تک وابستہ رہے۔ اٹھتے بیٹھتے رہے، گفتگو کرتے رہے اور... میں نے ان کی شخصیت کو جانچا ہے، پرکھا ہے اور پھر اپنے افسانوں میں ڈھالا ہے۔ آپ میری اچھی دوست ہیں اور دوستی کی مقدس لکشمن ریکھا میں نے کبھی پھلانگنے کی کوشش نہیں کی۔"

اس روز کے بعد وہ معمول کی طرح آتی رہی اور اپنا کام کر کے چلی جاتی۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس میں وہ والہانہ پن غائب ہو گیا تھا جو پہلے نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود کومل نے کنایۃً کئی بار اپنی آرزو کا کھل کر اظہار کیا مگر میں نے ہر بار اس کے سوال کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ انسان سماجی شعور کے باعث کبھی غیر ارادی طور پر کچھ حد بندیوں میں جکڑ جاتا ہے اور اس میں سے نکل نہیں پاتا ہے۔

ایک روز وہ نہیں آئی۔ میں بہت دیر تک انتظار کرتا رہا۔ جب انتظار کی گھڑیاں برداشت سے زیادہ بڑھ گئیں تو میرے دل کو وسوسوں نے گھیر لیا۔ میں دل میں سوچنے لگا۔ "ہو سکتا ہے بیمار پڑ گئی ہو۔ یوں بھی خواتین کو وہ تین دن پریشانی کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ مگر لگتا ہے کہ کچھ زیادہ ہی الجھن ہے ورنہ ضرور ٹیلیفون پر اطلاع دیتی۔ پھر اکیلی بھی تو ہے۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں ہے۔"

میں خود ہی اس کے گھر چلا گیا۔ وہ پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی۔ سر میں دوپٹہ باندھ رکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی۔ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"آپ کیسے آ گئے؟"

"آپ آج آئی نہیں۔ مجھے فکر ستانے لگی۔ سوچا چیک کر لوں کہ کوئی پریشانی تو نہیں ہے۔ آپ اکیلی ہیں۔ بیمار بھی تو پڑ سکتی ہیں۔ پھر

یہاں آپ کی دیکھ بھال کرنے کے لیے کوئی بھی تو نہیں ہے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہے۔ دفتر سے واپسی پر سر میں کچھ درد سا ہونے لگا اس لیے میں نے لیٹنا ہی مناسب سمجھا۔"

"کچھ دوائی شوائی لے لی ہوتی؟"

"نہیں، ابھی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔"

"تم نے کم از کم وکس مل لیا ہوتا۔ کچھ راحت محسوس ہو جاتی۔ اگر گھر میں نہیں ہے تو میں بازار سے لے آؤں۔"

"ہاں یہ ٹھیک مشورہ ہے۔ آپ ذرا میری الماری کھول کر وکس کی شیشی نکال لیں۔ شاید کچھ افاقہ ہو۔"

میں نے الماری کھولی اور وکس کی شیشی نکالی اور پھر اس سے مخاطب ہوا۔ "آپ لیٹ جائیں، میں لگاتا ہوں۔"

میں اس کے پلنگ پر چڑھ کر دوزانو بیٹھ گیا اور اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ بائیں ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی پکڑی اور دائیں ہاتھ سے بام نکال کر اس کے ماتھے پر بڑی ملائمت سے ملنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا سر بھی دباتا رہا۔ وہ آنکھیں بند کر کے یک گونہ راحت سی محسوس کر رہی تھی۔ شاید اس کو کچھ اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے بلا ارادہ میرے بائیں ہاتھ کو زور سے پکڑ لیا۔ مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ بہت دیر تک میں اس کے ماتھے اور سر کو دباتا رہا اور پھر نہ جانے کیسے میرا بایاں ہاتھ سرک کر اس کی چھاتی تک پہنچ گیا۔ وہ کچھ بھی نہ بولی۔ میرا ہاتھ بدستور تھامے رہی۔ شاید وادیوں کی اس کھوج میں اسے بھی لذت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کر کے سپنوں کی دنیا میں کھو گئی۔ دونوں کے لب خاموش تھے۔ کوئی کچھ بھی نہیں بول رہا تھا۔ وقت کیسے بیت گیا کچھ پتا ہی نہ چلا۔ اچانک میری نظر دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی پر پڑی۔ رات کے دس بج چکے تھے۔ مجھے احساس ہوا کہ اس نے ابھی تک کچھ کھایا ہی نہیں ہے۔ اس لیے بول اٹھا۔

"ڈنر کے لیے کیا انتظام ہے؟"

"ڈنر کھانے کو جی نہیں کر رہا۔ اگر آپ کھائیں گے تو ہوم ڈیلیوری سے منگوا دوں گی۔"

میں نے ہامی بھر لی۔ اور اس نے جلدی سے ٹیلی فون کر کے ہوم ڈیلیوری سے کھانا منگوا لیا۔ آج نہ جانے کیوں ڈنر کھانے میں عجیب سا لطف آ رہا تھا۔ بہت دنوں بعد کسی کے ساتھ ایسی یگانگت سے بیٹھ کر کھانے کا مزہ کچھ اور ہی لگ رہا تھا۔ پھر ڈنر ختم ہوتے ہی میں نے اجازت لے لی۔ وہ بستر سے اتر کر پیچھے صدر دروازے تک مجھے چھوڑنے آئی اور میرے قریب کھڑے ہو کر مجھے پیاسی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ بدن سے ایک عجیب سی شعاع ریزی ہو رہی تھی۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے آگے بڑھ کر اس کی کمر میں اپنے بازو حمائل کر دیے اور اس کے لب چوم لیے۔ وہ بہت دیر تک میرے ساتھ جنگلی بیل کی طرح چمٹ کر کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد میں پیچھے ہٹ گیا اور پھر بوجھل قدموں سے گیٹ کے باہر نکل گیا۔ وہ مجھے تب تک دیکھتی رہی جب تک میں آنکھوں سے اوجھل نہ ہوا۔

ہماری نزدیکیاں روز بروز بڑھتی گئیں اور ترجمہ کاری کی رفتار سست ہوتی رہی۔ ترجمہ کرتے کرتے اکثر میری آنکھیں ادھر ادھر بھٹکنے لگتیں۔ اور الفاظ حلق میں یوں اٹکنے لگتے جیسے زبان کسی خاردار جھاڑی میں پھنس گئی ہو۔ متن میں سے اس کا وجود ابھر آتا اور کانوں میں

اس کی سانسوں کا زیر و بم سنائی دیتا۔ وہ دھک دھک کرتا ہوا سینہ، وہ خمار بھری آنکھیں، وہ رس بھرے ہونٹ میرا تعاقب کرتے اور کتاب کو میز پر اتار رکھ کر میں اس کو سمجھنے کے لیے پریشان ہو جاتا۔ شاید اس کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی آنکھیں خلاؤں میں کھو جاتیں، چہرہ تمتما اٹھتا اور انگلیوں میں ارتعاش پیدا ہوتا۔ اب تو میرا اس کے گھر آنا جانا معمول بن چکا تھا۔ وہ ہر اتوار کو میرا انتظار کرتی اور میں دن بھر اسی کے پاس بیٹھا رہتا۔ کوئی توجیہ نہیں، کوئی لمبی بات نہیں۔ بس صرف باتیں۔ ادھر ادھر کی باتیں۔ مجھے نہیں آتا تھا کہ ہم کیا باتیں کر رہے ہیں۔ اپنی زندگی کے اوراق الٹ پلٹ کرتے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ کتنا پیارا وقت تھا جو ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بتایا کرتے۔ اور پھر پیزا یا برگر کبھی اس کے ہاتھ کا بنا ہوا اور کبھی ہوم ڈیلیوری کا۔ اور پھر چائے یا کوفی اور ساتھ میں بسکٹ۔ دن بھی نہ جانے کیسے چپ چاپ ان کر اڑ جاتا۔ ایک دوسرے کی باتوں میں مجھول کر وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔

مجھے اتنا تو یقین تھا کہ یہ لڑکی کچھ الگ سی ہے۔ میرے علاوہ بھی اس کے کئی دوست تھے مگر کس سے کیا رشتہ تھا میں نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اس کے خیالات سے اس کی شخصیت کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔ وہ آزاد پنچھی کی طرح اڑان بھرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اسے اپنی آزادی بہت پیاری تھی۔ اپنے دوستوں سے جب بھی وہ ٹیلی فون پر بات کرتی تھی یوں لگتا کہ وہ ان سے دل لگی کر رہی ہے، ان کو غیر ضروری ملاقات سمجھتی ہے جیسے وہ کھلونے ہوں، کھیل کر دور پھینک دیے یا پھر اپنی الماری میں مستقبل کے لیے اٹھا کر رکھنے کے لیے۔ دوستوں کے ٹیلی فون آتے تو کبھی فوراً اٹھا لیتی اور کبھی اٹھاتی ہی نہ تھی جب تک وہ بے چارہ تھک کر خود ہی اس کی تلاش بند کر دیتا۔ مجھے اس کی یہ عادت اچھی لگتی۔ اس لیے جب کبھی میں اس کو ٹیلیفون کرتا، اگر گھنٹی دو تین بار بجتی اور وہ ریسیور نہیں اٹھاتی، میں خود ہی سمجھ لیتا تھا کہ اس کو بات کرنے کا موڈ نہیں ہے یا وہ کسی دوسرے دوست کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہے۔ اس لیے چپ چاپ ٹیلی فون رکھ دیتا۔

انھی دنوں عدالت نے میری طلاق منظور کر لی۔ اس لیے میں کسی اور شریک حیات کی تلاش میں تھا۔ میں نے سوچا کہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں کول کے سامنے شادی کی تجویز رکھوں حالانکہ متوقع جواب سے بھی باخبر تھا۔ تاہم میں موقع پا کر اس سے مخاطب ہوا۔

"کول، میری طلاق منظور ہو چکی ہے۔ تم اگر مناسب سمجھو تو ہم دونوں شادی کر سکتے ہیں۔"

کمرے میں اس کا قہقہہ گونجا۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "شادی... لگتا ہے آج کچھ بھنگ پی کر آئے ہو۔"

"کیوں، کبھی تو تمھیں شادی کرنی ہی پڑے گی۔ عمر بھی بہت ہو چکی ہے۔ پھر کب کروگی۔" مجھے اپنی اور اس کی عمر کے تفاوت کا احساس تھا مگر چونکہ ہم دونوں کافی گھل مل گئے تھے اس لیے میں نے سوچا کہ شاید وہ راضی ہو جائے۔

"میں نے کبھی شادی کرنے کے بارے میں سوچا ہی نہیں۔" وہ بولی۔

"شادی تو ایک نہ ایک روز کروگی ہی۔ عورت ہو۔ کسی کے سہارے کی ضرورت تو پڑے گی۔ آخر یہ جوانی تو ہمیشہ ساتھ دینے سے رہی۔ پھر اس وقت کہاں جاؤ گی۔ کوئی تو ساتھ ہونا چاہیے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں اور ایک دوسرے کی اچھائیوں اور برائیوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔"

"تم نے بھی تو شادی کی تھی۔ کہاں ہے وہ تمھاری رفیقۂ حیات؟ اس نے بھی تو یہی سوچ کر شادی کی ہوگی کہ بڑھاپے کا سہارا مل جائے گا۔ اب طلاق کے بعد کون اس کا ساتھ دے گا۔ اور پھر تم بھی تو اکیلے پڑ گئے۔ تمھارے بڑھاپے میں کون تمھارا ساتھی ہوگا؟ جیسے تم جیو گے ویسے ہی میں بھی جی لوں گی۔ اور پھر مان لو میں کسی سے شادی کر بھی لوں اور وہ چند سال کے بعد مر جائے، پھر اس وقت میرا کیا ہوگا؟"

"جب تک تمھارے بچے ہوں گے، وہ تمھارا سہارا بنیں گے۔"

"کیا ضروری ہے کہ میرے بچے ہوں گے، اور اگر ہوں گے بھی تو کیا ضروری ہے کہ وہ میرے ساتھ ہی رہیں گے۔ کتنی مثالیں دے سکتی ہوں جہاں اولاد نے بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ دیا اور وہ تنہا رہ گئے۔ پھر کیوں میں ان چند ساعتوں کے عدم تحفظ کی خاطر اپنی جوانی کی طویل گھڑیاں قید و بند میں ضائع کراؤں۔"

"تمھارے خیالات انوکھے ہیں، نارمل لگتے ہی نہیں۔"

"نارمل ہوتی تو تم میرے ساتھ اس وقت یہاں نہیں ہوتے۔ میں کچن میں جھاڑ جھونک رہی ہوتی۔ ایک بات کہوں، حیران تو نہیں ہوگے۔"

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں، کہو۔"

"میں اپنے بیڈروم میں کسی دوسرے شخص کا تصور کر ہی نہیں سکتی۔ میں کسی کو اپنی پرائیویسی کا شریک بنانے کی سوچ بھی نہیں سکتی۔ مجھے ایسا لگے گا کہ کوئی جیلر دن رات میری رکھوالی کر رہا ہے۔ میں اپنی آزادی کھونا نہیں چاہتی۔"

میں اپنی حماقت پر پشیمان ہو گیا۔ ماحول میں عجیب سی اداسی چھا گئی۔ دل میں پچھتانے لگا کہ میں نے یہ موضوع چھیڑا ہی کیوں۔ خیر اب تو کمان سے تیر نکل چکا تھا۔ اب اس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ خفا ہوئی ہو گی اور اب جانے میں ہی میری خیر ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس نے معمول کی طرح ہوم ڈیلیوری سے کھانا منگوایا اور پھر ہم دونوں نے اسے نوش فرمایا۔ حالانکہ آج مجھے کچھ کھنچا کھنچا سا ہو رہا تھا مگر اس کے رویے میں کوئی فرق دکھائی نہیں دیا۔ وہ پہلے جیسی بے تکلف اور زندہ دل اور خوش طبع نظر آ رہی تھی۔

ہماری دوستی پرانی ڈگر پر اسی رفتار کے ساتھ چلتی رہی جب تک اس کا ٹرانسفر آرڈر آ گیا۔ اس کو ترقی مل گئی اور نہ صرف وہ بلکہ میں بھی بہت خوش ہوا۔ پھر اس کے جانے کا دن آ گیا۔ دن کیا، جانے کی ساعت آ گئی۔ کمرے میں سارا سامان پیک کر کے بکھرا پڑا تھا۔ فرنیچر، کچن کا سامان، کتابیں، ٹی وی، میوزک کا سامان وغیرہ۔ اس کو رخصت کرنے کے لیے اس کے سارے دوست ریلوے سٹیشن پر انتظار کر رہے تھے جن میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ لیکن میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ میرے بعد اس کا ایک اور دوست چلا آیا جس کو اس نے ٹرک میں سامان بھجوانے کی ذمے داری سونپی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی وہ جھنجھلا اٹھی۔ وہ یہ چند لمحے گنوانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے کچھ بہانہ بنا کر اس دوست کو دوبارہ کسی کام سے مارکیٹ بھیج دیا۔ اس کے جاتے ہی وہ جلدی جلدی کمرے کے اندر آ گئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ مجھ پر محبتوں کی برسات کرنے لگی۔ کمرے کا سماں دیکھ کر مجھے اس کی اس دلیری پر حیرت ہو رہی تھی۔ مگر وہ تھی کہ اس گھڑی کو یادگار بنانے پر تلی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد اس کا دوست لوٹ آیا اور ہم تینوں اسی کی کار میں ریلوے سٹیشن پہنچ گئے۔ وہاں دوستوں کے جمگھٹ میں ہمارے بیچ کوئی مزید بات نہیں ہو سکی۔ صرف گاڑی کے چلتے ہوئے میں بے دلی سے اپنا ہاتھ ہلاتا رہا۔

شاید اس کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے یا پھر اگر کبھی کہیں مل بھی گئے تو وہ پہلی سی بات نہیں رہے گی کیونکہ اب تک اس کو میرے کردار کی واقفیت پوری طرح ہو چکی تھی۔ البتہ اس سے اب یہ یقین ہو چلا تھا کہ اس کا کردار میرے افسانے میں ایک نہ ایک دن ضرور منتقل ہو جائے گا۔

◆◆◆

نسلیں

علی اکبر ناطق

یہ آدمی کچھ ہی دن پہلے اس پارک میں آیا تھا۔ وہی پرانی شرٹ کے ساتھ میلا چکٹ پاجامہ اور پاجامے کو کپڑے کی دھجی سے باندھا ہوا تھا۔ داڑھی اور سر کے بال جھاڑ جھنکاڑ بن چکے تھے لیکن مجھے یہ شخص پاگل نہیں لگتا تھا۔ اس کے پاس ایک بوری نما بڑا سا تھیلا تھا۔ میں یہ تو نہیں جانتا اس تھیلے میں کیا تھا مگر اس طرح کے لوگوں کے تھیلوں میں اول فول چیزیں ہی ہوتی ہیں۔

ان دنوں میں ایف ایٹ سیکٹر میں ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا اور شدید سردی کے دن تھے۔ رہائش سے چند قدم کے فاصلے پر ہی یہ پارک تھا لیکن میں وہاں چہل قدمی کے لیے نہیں جاتا تھا۔ مجھے ان سرکاری افسروں اور کلرکوں سے ہمیشہ چڑ رہی ہے، جو اپنی موٹی تازی بیویوں کے ساتھ صبح شام بدہیئت پیٹوں کی چربی پگھلانے چلے آتے ہیں اور پارکوں کی فضا کو بدبودار بنا کر دفتروں میں جا بیٹھتے ہیں۔ ان سے دور رہنے کے لیے میں رات آٹھ بجے کے بعد نکلتا اور ان جگہوں پر واک کرتا جو ایسے لوگوں سے خالی ہوتی ہیں۔ جب سے میں نے اس شخص کو دیکھا تھا، دن میں ایک آدھ چکر لگا لیتا تھا۔ یہ بعض اوقات نظر آتا لیکن اکثر وہیں پایا جاتا مگر حیرت کی بات یہ کہ مجھے قریب نہ آنے دیتا۔ میں اس کے نزدیک جاتا تو وہ فوراً آگے بڑھ جاتا۔ اس کے پاؤں میں کوئی جوتا نہیں تھا، نہ میرا خیال ہے کبھی اس نے اس کی پروا کی ہوگی۔ ایک دفعہ میں قریب کی مارکیٹ میں گیا تو وہاں ایک ہوٹل کے باہر اپنا تھیلا چھوڑ دوں کے پیچھے رکھ کر بیٹھا روٹی کا ٹکڑا کھا رہا تھا مگر جیسے ہی میں وہاں پہنچا، اٹھ کر چل دیا۔ مجھے اس کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ گویا اس نے مجھے چور اچکا سمجھ رکھا تھا، جو اس کے چیتھڑوں کا غلیظ تھیلا اٹھا کر بھاگ جائے گا۔ اب مجھے ضد ہو گئی کہ ہر حالت میں اسے پکڑوں گا۔ یہ سوچ کر بے دھڑک اس کے پیچھے لگ گیا اور پارک کی دوسری طرف پر اچانک جا لیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ کچھ لوگ پارک میں بیٹھے دھوپ سینک رہے تھے۔ بچے ادھر ادھر جھولوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنا تھیلا اٹھا کر پھر بھاگتا، میں فوراً اس پر بیٹھ گیا۔ میرے اس عمل پر اسے ایک جھٹکا سا لگا اور دیدے پھاڑ کر دیکھنے لگا، جیسے کوئی ڈرا ہوا آدمی ہو۔ میں نے خیال کیا اس کے دل میں کوئی چور یا راز ہے۔ عام آدمی کو اس طرح ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ "تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے تمام شبہات کو اپنے اندر جمع کر کے اس سے پوچھا۔

میرے سوال کو اس نے گویا سنا ہی نہیں تھا اور ٹک ٹک مجھے دیکھتا رہا۔ کچھ لمحے خاموشی کے بعد میں نے پھر پوچھا "کیا نام ہے تمھارا؟ بتاتے کیوں نہیں؟" وہ پھر بھی نہیں بولا اور میرے نیچے سے تھیلا کھینچنے لگا۔ لیکن اس بار میں ضد پر آیا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ پرے جھٹک کر تھیلے پر مزید وزن ڈال دیا اور کرخت لہجے سے پوچھا "بتاتے کیوں نہیں، کون ہو؟ اس تھیلے میں کیا ہے؟ اگر نہیں بتاؤ گے تو میں تمھیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔" اب وہ کچھ گھبرا گیا اور بولا "میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔" "یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میرے اس سوال پر وہ پھر چپ رہا اور ایک ڈرے ہوئے انسان کی طرح مجھے دیکھنے لگا۔ اتنے میں دو تین بچے کھیلتے کھیلتے

قریب آ کر کھڑے ہو گئے اور ہمیں دیکھنے لگے۔ ایک تو اس آدمی کی حالت پاگلوں کی سی تھی، اس پر ستم یہ کہ میرا اپنا حلیہ بھی بڑھی ہوئی شیو اور جسمانی کمزوری کے سبب اسی جیسا لگ رہا تھا۔ میں نے دل میں خیال کیا، یہ بچے ہم دونوں کو ایک ہی جیسے نہ سمجھ لیں۔ فوراً وہاں سے اٹھا اور دوسری طرف چل دیا۔ میرے اس طرح اچانک اٹھنے سے اس کے چہرے پر سکون سا آ گیا۔ بچے دوبارہ کھیلنے لگ گئے۔ وہ چند لمحے وہیں بیٹھا رہا۔ میں جاتے ہوئے کن آنکھیوں سے اسے دیکھتا رہا۔ جب میں اس سے کافی دور ہو گیا تو وہ بھی اٹھا، جلدی سے اپنا تھیلا اٹھایا اور پارک سے باہر کی طرف چل دیا۔ پھر یہ شخص مجھے یہاں نظر نہیں آیا۔ آٹھ دس روز گزر گئے۔ ایک دن شام کو کسی کا فون آیا کہ آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ میرے پوچھنے پر کہ آپ کون ہیں اور کیوں ملنا چاہتے ہیں، اس نے بتایا، "میرا نام قیوم ہے۔ آپ کے کچھ افسانے پڑھے ہیں، اچھے لگے ہیں، اس لیے چاہتا ہوں، آپ سے مل بھی لوں۔ سنا ہے آپ اسلام آباد ہی میں رہتے ہیں۔ اگر برا نہ لگے تو پتا اور وقت بتا دیں، میں آ جاتا ہوں۔" کہنے کو تو میں اسلام آباد میں رہ رہا تھا لیکن یہ بات صرف مجھے یہ معلوم تھی کہ کس مصیبت میں گزر ہو رہی تھی۔ سراسر دوست کے سہارے پر تھا اور نہیں چاہتا تھا، اس پر مزید بوجھ ڈالوں۔ میں نے جواب دیا، "قیوم صاحب آپ یہ دونوں چیزیں مجھے بتا دیں، میں آپ کی طرف آ جاتا ہوں۔" انھوں نے کہا، "اگر تکلف نہ سمجھیں تو ای سیون کی چونتیس سٹریٹ کے مکان 13 میں آ جائیں۔"

یہ جگہ ایف ایٹ فور سے زیادہ دور نہیں چنانچہ میں شام کو پیدل ہی وہاں پہنچ گیا۔ جیسا کہ میری توقع تھی، اس نے کافی تواضع کی اور اچھا کھانا کھلایا۔ رات دس بجے تک میں وہاں بیٹھا رہا۔ اٹھنے لگا تو اس نے گاڑی کے ذریعے چھوڑنے کا اصرار کیا لیکن میں نہیں مانا اور پیدل ہی چل پڑا۔ میں گرین بیلٹ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ گو ابھی زیادہ دیر نہیں تھی مگر سردی بہت کڑاکے کی تھی اور ہر طرف سناٹا تھا۔ مجھے یہ موسم بہت رومانوی سا لگا۔ میں کچی پگڈنڈی کے درختوں کے درمیان چلنے لگتا، جہاں سے چاند کی اساطیری روشنی چھن چھن کر ان درختوں میں اتر رہی تھی اور کبھی فٹ پاتھ پر ہو لیتا۔ تھوڑی فاصلے پر، جہاں سے ای ایٹ میں افسروں کے رہائشی مکان شروع ہوتے ہیں، مجھے ایک ویران سے کیبن میں ایک تھیلا پڑا نظر آیا۔ کیبن لوہے کے ٹین کا تھا۔ کسی وقت یہ چوکیداری کے لیے استعمال ہوتا ہوگا لیکن اب ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ چھت باقی تھی۔ وہ بھی شاید بارش میں ٹپکتی ہو۔ میں اسے نظرانداز کر کے نکل جاتا مگر میرے غور کرنے پر لگا کہ یہ وہی تھیلا ہے لیکن وہ شخص یہاں موجود نہیں تھا۔ میں نے موقع کو غنیمت جانا اور جلدی سے اس تھیلے کو الٹ دیا۔ اس میں وہی پرانے کپڑے، ٹوٹے ہوئے جوتے، ایک بڑا سا موٹا کاغذ، جو شاید بارش سے بچنے کے لیے تھا اور اسی طرح کی دوسری الا بلا چیزیں تھیں۔ اس کے علاوہ اس میں ایک کاغذوں کا پڑا اور بہت سی بچی کچی پنسلیں بھی تھیں۔ میں نے جلدی سے باقی چیزیں تھیلے میں ٹھونس کر وہ کاغذ بغل میں دابے اور مکان پر آ گیا۔ مجھے تجسس تھا، آخر دیکھوں تو اس میں لکھا کیا ہے؟ میں نے تسلی سے بستر میں لیٹ کر اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ عبارت نہایت الجھی اور خراب تھی لیکن میں پڑھنے میں ڈٹا رہا۔ تھوڑی دیر بعد تحریر سمجھ میں آنے لگی۔"

"میں اس کا اتنا گندا اور منحوس بندہ ہوں کہ میری وجہ سے گندگی وہاں پہنچ گئی تمام دعاؤں کے ساتھ لپٹ کر خدا کے پاس جائے گی اور خدا ان دعاؤں کو دوری سے رد کر دے گا اور انھیں اپنی بارگاہ میں داخل نہیں ہونے دے گا۔ حالانکہ خدا اسے پہلے بھی پسند نہیں کرتا اور مسلسل جاری رہا ہے لیکن میں جانتا ہوں میری ماں کی طرح کئی دوسرے لوگ بھی بہت سادہ

اور نیک ہیں جو اس دلپاک کے حق میں دعا کرتے ہیں۔ مجھے خطرہ ہے، کہیں خدا ان کی دعا قبول ہی نہ کر لے۔ اس لیے میں نے تہیہ کیا ہے، جب تک زندہ ہوں، میں یہ ہو پھیلاتا رہوں گا۔"

اسی طرح کی بہت سی باتیں کاغذ پر جگہ جگہ لکھی ہوئی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا یہ کیا کہنا چاہتا ہے؟ پتا نہیں کون سی جگہ تھی اور کس جگہ تھی؟ نہ کوئی نشان۔ آگے چل کر بار بار ایک ہی تحریر کا اعادہ کیا گیا تھا۔

"آج میں نے وہاں تین جگہ کے گند پھینکا اور بہت زیادہ پھینکا۔ میرا دل خوش ہو گیا۔ میرا خیال ہے میرا خدا بھی خوش ہوا ہوگا۔ اگر نہ بھی ہوا تو کوئی بات نہیں۔ وہ کون سا ہر ایک پر خوش رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے، اگر میں اس کام میں کمی نہ کروں تو ایک دن وہ میرے اس عمل صالح کی جزا ضرور دے گا اور مجھ پر خوش ہوگا کہ میں نے اس کو مراد دیے میں اس کی مدد کی اور اس کی بخشش میں پڑھی گئی دعاؤں کو قریب نہیں آنے دیا۔ کل کی طرح آج پھر مجھے بہت سکون ملا۔"

ایک اور جگہ پر لکھا تھا:

"آج میں نے وہاں دو بار پلیدی ماری۔ اس طرح میری صحت بھی اچھی رہتی ہے اور کام بھی اچھا ہو جاتا ہے۔ ایک وقت ایسا آنے کو ہے کہ سب گلی والے اور اخباروں والے میرے پاس آئیں گے اور میری چیزیں سونے میں تول کر لے جائیں گے۔ میں وہ سارے پیسے ان میں بانٹ دوں گا جو مجھے نہیں جانتے لیکن میں ان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

مجھے شبہ ہونے لگا، یہ شخص پاگل نہیں تو خبطی ضرور ہے۔ ایک تو تمام تحریریں بے ربط تھیں۔ گرامر اور جملوں کی ساخت بھی خراب تھی اس پر طرہ یہ کہ سونے میں تولی جائیں گی۔ لیکن اس سے ملنے کا تجسس بڑھ گیا۔ میں نے دل میں تہیہ کر لیا کل اسے ضرور جا پکڑوں گا اگلوا کے رہوں گا کہ وہ دراصل کون ہے؟ دوسرے دن فجر کے وقت ہی وہاں جا پہنچا مگر وہ موجود نہیں تھا۔ اس کا تھیلا بھی غائب تھا۔ میں اس کے لیے شک میں مبتلا ہو گیا۔ یعنی یہ کوئی جاسوس ہے، جس کی تحریریں دراصل کوڈ ورڈ تھیں۔ رات چونکہ میں اس کے کاغذات چرا لایا تھا اس لیے وہ رات ہی وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ لیکن میرے یہاں بے وقت آنے سے اتنا ہوا کہ مجھے صبح کا وہ بے کیف فضا اور موسم انتہائی اچھا لگا۔ کبھی بچپن میں اماں جان اس وقت نماز کے لیے اٹھایا کرتی تھی۔ ویران اور صاف ستھری سڑک، جس پر نہ کوئی آدم زاد، چہچہاتے پرندے، خوبصورت درخت، جن پر گھر کے گزرتے ہوئے غبار تھے۔ یہ سڑک سیدھی اس شہر کی سب سے بڑی مسجد کی طرف جاتی تھی، جس کے شمال کی جانب پہاڑ اور جنوب کی طرف پورا شہر آباد ہے۔ اسی مسجد کے پہلو میں ایک قبر بھی ہے۔ یہ قبر اس قومی جرنیل کی ہے جو کئی سال ہمارے ملک کا صدر رہ کر ایک حادثے میں مارا گیا تھا۔ مجھے نہ تو اس مسجد سے کچھ لینا ہے اور نہ قبر سے سروکار تھا۔ بس موسم اور منظر کی خوبصورتی کو دل میں اتارنے کے لیے اس طرف کو چل دیا۔ کافی دیر اس علاقے میں گھومتا رہا۔ جب تھک گیا تو سورج نکلنے سے پہلے واپس آ گیا۔ اس کے بعد یہ میرا معمول بن گیا۔ میں فجر کی اذان کے وقت چہل قدمی کے لیے اسی طرف جانے لگا۔ اس دوران میں نے وہ تحریریں دوبارہ پڑھنے کی کوشش کی جس میں مجھے وہی چیزیں نظر آئیں۔

"بھائی حبیب اللہ، میں نے تجھے کئی دفعہ سمجھایا تھا مگر تو نے میری ایک نہیں مانی۔ دیکھ اب صغرا اور اماں کا کوئی پوچھنے والا نہیں رہا۔ ایک دن کے بیچ آ کر تیری دوسری پاگل ہو گئی۔ لوگ تو مجھے بھی پاگل کہتے ہیں لیکن میں ان پر ہنستا ہوں۔ یہ جانتے ہی نہیں، ان کے ساتھ اور میرے ساتھ کیا ہو گیا۔ میں نے تجھے کیا نہیں تھا ایسا نہ کر؟ اب دیکھ لے۔ میرا بھی

تیرے قدم پر چلا اور وہاں مارا گیا جو ہمارا وطن نہیں تھا۔ وہ علاقہ تو ہماری پچھلی کئی پشتوں نے نہیں دیکھا تھا۔ نہ وہ لوگ ہمیں جانتے تھے۔ تیری طرح اس نے بھی میری نہیں سنی۔ اب تو فکر نہ کر۔ یہ سارے جلانے لے جا رہا ہوں، جس نے ہمارے سارے لمحے ضائع کر دیے۔"

ان تحریروں کے پڑھنے کے بعد میں نے اسے پھر ڈھونڈنا چاہا لیکن وہ مجھے نہیں ملا۔ بالآخر میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ خوف زدہ ہو کر شہر چھوڑ چکا ہے لیکن میرا اندازہ غلط تھا۔ ایک دن عصر کے وقت انتہائی شدید سردی میں ایک سیون تھری کے ایک ڈھابے پر میرا اس کا سامنا ہو گیا۔ اس دن کہر تو بالکل نہیں تھا لیکن ہلکی بارش اور تیز سرد ہوا جسم میں سوراخ کر رہی تھی۔

وہ مجھے دیکھ کر تھوڑا سا جھجکا لیکن بھاگا نہیں۔ یا آج اس میں سکت ہی نہیں تھی۔ اس کے پاؤں میں جوتے بھی موجود نہیں تھے۔ ایک بوسیدہ اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی دیسی اون کی چادر اوڑھے تھا۔ اس کے ہاتھ میں تھیلا بھی نہیں تھا۔ ٹوٹی چارپائی کے پاس ننگی اور گیلی زمین پر بیٹھا چائے بنانے والے کی طرف لالچی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پاؤں سردی سے اکڑے ہوئے تھے، جنہیں ایک ہاتھ سے دبا رہا تھا۔ سردی سے کانپ بھی رہا تھا۔ مجھے اس کی حالت پر کافی رحم آیا۔ میں ایک خالی چارپائی پر بیٹھ گیا اور ہوٹل کے مالک کو دو چائے بنانے کا آرڈر دے دیا۔ اس کے بعد اس شخص کو اپنے پاس چارپائی پر آنے کا اشارہ کیا۔ اس نے تھوڑی دیر میری طرف غور سے دیکھا پھر اٹھ کر میرے پاس آ گیا لیکن چارپائی پر بیٹھنے کی بجائے نیچے بیٹھ گیا۔ میں نے اسے دوبارہ چارپائی پر بیٹھنے کو نہیں کہا۔ وہ قریب آیا تو مجھے اس کے جسم سے سخت بدبو آئی یا یہ میرا وہم تھا، کیونکہ پہلے ملا تھا تو اس سے ایسی بدبو نہیں آئی تھی۔ شاید اس وقت میں نے اس کی تحریریں نہیں پڑھی تھیں، جن میں بار بار گند اور بدبو کے الفاظ آتے تھے۔ چائے آئی تو میں نے ایک کپ اٹھا کر اسے دیا اور گفتگو کا آغاز بھی کر دیا۔ "دیکھیں نہ تو میرا پولیس سے تعلق ہے نہ میں یہ جانتا ہوں، آپ کون ہیں اور نہ میں کوئی چور اچکا ہوں۔ اس لیے اگر مجھے کچھ اپنے بارے میں بتا دو گے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بھلا تم کہیں ڈاکیے کیوں نہ لگتے ہو؟"

میرے لہجے میں شاید ملامت تھی یا چائے کا اثر، جسے وہ سردی کی شدت میں مزے سے پی رہا تھا کہ بالآخر بول پڑا "کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟" "اپنا نام بتا دیں۔" وہ بغیر کسی توقف کے بولا "میرا نام مجیبہ ہے۔ یہ نام میرے دادا نے رکھا تھا۔" "کس شہر کے ہو؟" "مریدکے کا رہنے والا ہوں۔" "تمھارا کوئی رشتے دار نہیں ہے، اس سردی میں خوامخواہ مر رہے ہو۔ اپنے گھر کیوں نہیں چلے جاتے؟" "اب نہ کوئی رشتہ دار ہے اور نہ کوئی گھر بار۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے بغیر دم لیے کے پوچھا۔ "کام کر رہا ہوں۔" "لیکن میں نے جتنی بار بھی تمھیں دیکھا ہے، اسی کسمپرسی اور مفلسی میں۔ کام کرتے ہو تو اس کا معاوضہ کہاں خرچ کرتے ہو؟" "کچھ معاوضے کے بغیر کیے جاتے ہیں۔" وہ پھر مختصراً بولا "تو پھر کیوں کرتے ہو؟" "سکون کے لیے۔" "بھائی کیا کرتا تھا؟"

میرے اس سوال پر اس نے مجھے غور سے دیکھا پھر فوراً ہی چائے کا خالی کپ رکھ کر چل دیا۔ حالانکہ بارش اور تیز ہوا مسلسل چل رہی تھی۔ اس ملاقات کے بعد اب میں اس میں دلچسپی کھو بیٹھا تھا، جتنا پہلے اسے آسانی سے جانے دیا بلکہ اس کی بے ہودگی، بے نیازی اور جسم سے اٹھتی ہوئی بدبو کے سبب مجھے اس سے نفرت سی ہو گئی اور میں نے تہیہ کر لیا کہ جاتے ہی اس کے بے کار مسودے گندی نالی میں پھینک دوں گا۔ ان باتوں کے علاوہ "مریدکے" کے نام نے بھی مجھ پر کچھ اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔

الغرض اب کے میں نے اس پر لعنت بھیجی اور اپنے دھندوں میں لگ گیا۔ بعد میں ایک دو دفعہ میں نے اسے دیکھا بھی لیکن

تو وہاں سے چپ چاپ گزر گیا اور بالکل توجہ نہ دی۔ اس واقعے کو دو ہفتے گزر گئے۔ میری سیر اور چہل قدمی کا سلسلہ جاری رہا۔ معمول کے مطابق میں فجر سے آدھا گھنٹہ پہلے اٹھتا، ایف ایٹ سے نکل کر شاہراہِ فیصل پر آ جاتا اور سیدھا فیصل مسجد کے سامنے جا نکلتا۔ وہاں سے فوراً ہی بائیں پہلو کو مڑ کر پیچھے پہاڑوں کی طرف ہو لیتا۔ پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر وہاں رک کے پھر اسی راستے واپس آ جاتا۔ جب اپنے مکان پر پہنچتا تو سورج نکل رہا ہوتا۔ اس دوران نہ میں نے کبھی وہاں نماز پڑھی نہ مسجد کے پہلو میں قبر کی طرف جانے کی کوشش کی۔ اسے دیکھنے کے لیے لوگ خوشی خوشی شوق سے بھی چلے جاتے ہیں۔ پھر قبر کی فاتحہ بھی پڑھا لیتے ہیں۔ ایک دن جب میں پاس سے گزر رہا تھا تو قبر کی طرف سے ہلکا سا شور سنائی دیا جیسے کوئی چیخ رہا ہو۔ ابھی تک فجر کی اذان نہیں ہوئی تھی اور اندھیرا کافی تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے ٹھٹکا پھر آگے چل دیا لیکن شور شدید ہو رہا تھا۔ قبر پر موجود ایک بلب کی کمزور روشنی سے پانچ سات لوگ بھی نظر آ رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میرے قدم بے اختیار اس طرف اٹھ گئے۔ قریب پہنچا تو عجیب منظر تھا۔ شدید سردی کے عالم میں گیلی گھاس پر ایک شخص ننگا الٹا لیٹا ہوا تھا، جس کی پیٹھ پر ایک پولیس والا بید مار رہا تھا۔ ایک اور پولیس والے نے اس کی گردن اور بازوؤں کو بڑی قوت سے اپنی ٹانگوں کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا جب کہ دوسرے شخص نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں۔ ایک پولیس افسر بھی تھا۔ وہ کھڑا انہیں زور سے مارنے کا حکم دے رہا تھا۔ میں نے اس شخص کو پہچان لیا۔ یہ وہی خبطی تھا۔ اس منظر کو دیکھنے کے لیے کافی لوگ جمع ہو سکتے تھے مگر شدید سردی اور رات کی وجہ سے پانچ سات لوگ ہی ایسے تھے جنہیں یہ تماشا دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ انہی خوش قسمتوں میں ایک میں بھی تھا۔ باقی کے لوگوں میں چوکیدار اور مسجد کی انتظامیہ کے ملازم تھے۔

قبر کے پہلو میں الٹے اور ننگے لیٹے شخص کو پولیس والے کے مسلسل بید مارنے کی وجہ سے ہوا یا گالیوں اور چیخوں کا ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔ چند لمحے محظوظ ہونے کے بعد مجھ میں اس کے لیے ہمدردی پیدا ہونے لگی۔ میں نے پولیس افسر سے کہا، بھائی کیا مسئلہ ہے۔ اس بھلے آدمی کو کیوں مار رہے ہو؟'' پولیس افسر نے غصے کی کیفیت سے میری طرف دیکھ کر کہا، ''بھائی جائیں اپنا کام کریں یا جا کر نماز پڑھیں۔ میرا سر نہ کھائیں۔'' میں نے بھی اسی خشوع سے جواب دیا، ''ٹھیک ہے، سر نہیں کھاتا لیکن اس شخص کے مر جانے کی صورت میں مجھے اپنے خلاف ایک گواہ سمجھ لیں۔'' ''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' پولیس افسر کچھ گھبرا کر بولا۔ ''مطلب کا آپ کو نہیں پتا؟'' میں نے کہا، ''اس سردی میں اسے بری طرح ننگا کر کے مارنے سے کیا یہ بچے گا؟'' ''بھائی صاحب، یہ خبیث نہیں مرے گا۔ آپ بالکل چنتا نہ کریں۔ اس حرام زادے نے وہ کام کیا ہے کہ آپ کے فرشتے بھی نہیں سوچ سکتے۔'' ''کیا کیا ہے؟'' میں نے بے چینی سے پوچھا۔ ''اس نے قبر کی بے حرمتی کی ہے۔'' انسپکٹر بولا، ''اور یہ کام یہ پچھلے کئی دنوں سے کر رہا ہے لیکن آج پکڑا گیا۔ ہمیں تو یقین ہی نہیں تھی کہ کوئی شخص ایسے بھی کر سکتا ہے۔'' اب میرا دماغ فوراً ان تحریروں کی طرف پلٹا جنہیں میں پڑھ کر اور بے کار سمجھ کر پھینک چکا تھا۔ اچھا، تو یہ یہاں آ کر گند پھیلاتا تھا۔

میں دل ہی دل میں ہنسا لیکن پھر سنجیدہ ہو کر پولیس افسر سے کہا، ''جناب اگر اس نے قبر کی بے حرمتی کی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں اسے مار ہی دیا جائے۔'' ''میاں آپ کون ہیں جو مجھ سے تفتیش کرنے لگے؟'' اس نے اب مجھے گھور کر پوچھا۔ ''میں ایک ٹی وی چینل میں کام کرتا ہوں اور یہاں روز چہل قدمی کرنے آتا ہوں۔'' ٹی وی میں کام کرنے والی بات میں نے جھوٹ کہی تھی لیکن اس کا اثر بہت ہوا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کو فوراً پٹائی سے روک دیا جس کی وجہ سے شور بھی کم ہو گیا۔ اب اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور قبر کے

قبے کے پاس لے جا کر اس کی طرف اشارہ کر کے بولا: "یہ دیکھ رہے ہیں آپ؟ اس خبیث آدمی نے کیا کیا ہے؟" میں نے تمام قبے پر نظر ڈالی لیکن نہ تو وہاں کوئی گند تھا اور نہ کسی قسم کی بو آ رہی تھی البتہ قبہ اور قبے کی اردگرد کی جگہ کافی گیلی تھی۔ "مجھے تو کچھ نظر نہیں آ رہا۔" میں نے اتنا کہا۔ "جناب یہ نہیں آپ کی آنکھیں ہیں یا ماتھے پر کھینچے ہوئے ہیں۔" "مجھے تو اس کمبخت کی حرکت کو بتاتے ہوئے بھی شرم آ رہی ہے۔" انسپکٹر نے اس آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ حرامزادہ اس قبر کے قبے کے صحن اوپر بیٹھ کر مشت زنی کرتا ہے اور اپنے ناپاک نطفے کا پانی قبے پر پھینک دیتا ہے۔ اب آپ ہی بتائیں اس گھٹیا ترین اور قبیح فعل پر اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ مجھے چودہ سال پولیس نوکری میں ہو گئے۔ آج تک ایسے شیطان سے واسطہ نہیں پڑا۔ بلکہ اتنی حرامی سوچ تو شیطان کو بھی نہیں آئی ہوگی۔" میں کیا بتاتا! میں نے مڑ کر اس آدمی کی طرف دیکھا جو مار کھانے کے بعد کافی مضمحل ہو چکا تھا اور آنکھیں نیچے کیے کھڑا تھا۔

اتنے میں مسجد سے اذان کی صدا گونج اٹھی۔

◆◆◆

انتظار حسین کی یاد میں (ڈاکٹر انور سدید)

انتظار حسین کی وفات سے جدید افسانے کے علامتی اور تمثیلی رجحانات کا نمائندہ ترین ادیب اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ وہ پیدائشی کہانی کار تھے اور زندگی کے مسائل کو کہانیوں کے روپ میں دیکھتے تھے۔ ہندوستان کے صوبہ یو پی کے ایک گاؤں ڈبائی میں دسمبر 1925ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تربیت الف لیلیٰ کی داستانوں اور نانی اماں کی سنائی ہوئی کہانیوں اور قصوں پر ہوئی تھی۔ میرٹھ کالج میں پروفیسر کرار حسین کی شاگردی اختیار کی اور پھر محمد حسن عسکری کے حلقہ اثر میں آ گئے، اور عسکری صاحب کے ساتھ ہی لاہور آ گئے اور پھر لاہور کو ہی اپنا وطن بنا لیا اور صحافت کا پیشہ اختیار کیا اور افسانہ نگاری کے شوق کی پرورش کی۔ بچھڑے ہوئے وطن کی یاد ان کے افسانوں کا بنیادی موضوع تھا۔ انہوں نے ناصر کاظمی اور احمد مشتاق کے ساتھ مل کر نئی نسل کا نعرہ لگایا اور ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور میں اپنی آواز تو بلند کی۔ انتظار حسین نے روزنامہ "آفاق" اور "مشرق" میں ادبی کالم نگاری کا آغاز کیا اور اپنی منفرد سوچ کی وجہ سے پوری دنیا میں پہچانے گئے۔ ان کے افسانوں کی کتابوں میں گلی کوچے، کنکری، آخری آدمی، شہرِ افسوس، کچھوے وغیرہ شامل ہیں۔ ناول "دن اور داستان"، "بستی"، "چاند گہن"، "آگے سمندر ہے" مشہور ہیں۔ "ذرے" ان کے کالموں کا مجموعہ ہے۔ انتظار حسین کثیر الجہت ادیب تھے۔ تنقید میں ان کی کتاب "علامتوں کا زوال" شہرت سے فیض یاب ہوئی۔ "زمین اور فلک" ان کا سفرنامہ ہے۔ "چراغوں کا دھواں" اور "جستجو کیا ہے؟" ان کی یادداشتوں پر مبنی سوانح عمری ہے۔ اردو افسانے میں انہوں نے انمٹ نقوش ثبت کیے۔ ان کی رحلت اردو ادب کا نقصان عظیم ہے۔ تاہم وہ ان خوش قسمت ادیبوں میں سے تھے جنہیں پوری اردو دنیا میں عزت اور وقار سے سرفراز کیا گیا۔ ان کے ناول "بستی" کا ترجمہ انگریزی میں ہوا تو اسے "بکر پرائز" کے لیے نامزد کیا گیا۔ یہ اعزاز کسی اور پاکستانی ناول نگار کو نصیب نہیں ہوا۔ بعد میں فرانس نے انہیں اپنا اعلیٰ ترین ادبی ایوارڈ پیش کیا۔ انتظار حسین نے اپنی عملی زندگی قلم و قرطاس کی پرورش میں بسر کی اور اپنے منفرد اسلوب فکر سے اردو دنیا کو متاثر کیا۔ حق تعالیٰ اس مردِ خود آگاہ کی مغفرت کرے۔

نور کا نور کہاں ہے؟

وحشی سعید (انڈیا)

ستر (70) سال پہلے کی بات ہے جب ہمارے شہر کے اس حصے کا جنم ہوا جس کو اب شہر خاص کہا جاتا ہے۔ تنگ گلیاں، کچے مکان۔ اس کا دادا اسے اپنی بیوی کی گود میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "صراط..... اس کا نام صراط ہوگا۔" اس دن سعید دیوان خانے میں ایک ایسے ظلم نامہ پر دستخط کیے گئے جس سے ناگاساکی اور ہیروشیما دونوں کی دنیا تباہ ہوگئی اور جو نئی دنیا ابھر کر سامنے آئی اسے انتظار کی دنیا کہا جانے لگا۔ جب دنیا کا نیا نقشہ ابھر کر سامنے آ رہا تھا مصر نے سوئز نہر پر پہرا بٹھا دیا۔ یہ وہی مصر تھا جہاں ہزاروں سال پہلے فرعون شہنشاہ ہوا کرتا تھا۔ قدیم مصر کا سب سے طاقت ور شہنشاہ۔ فرعون کے محل کی دیواروں میں رنگ برنگ کے جواہرات ایسے جڑے ہوئے تھے جیسے کھلے آسمان میں بے شمار تارے چمک رہے ہوں۔ اس کے دربار کی مغربی دیوار کے ساتھ ایک بڑی قد آور سونے کی مورتی تھی جس کو وہ اپنا خدا "مرا" کہتا تھا۔ مصر کے لاجواب فنکاروں نے وہ مورتی اس طرح بنائی تھی کہ جیسے وہ اپنی پوجا کرنے والوں کو آشیرواد دے رہی ہو۔ "مرا" کے قدموں کے نیچے فرعون کا تخت زمرد کا تھا۔ اس کے دائیں اور بائیں سونے اور چاندی کی کرسیاں قطار میں ایک دوسرے کے سامنے سجی ہوئی تھیں۔ دربار کے صحن میں بلور کے کئی فانوس آویزاں تھے۔

اس دن حسب معمول فرعون کے چالیس درباری ایک ایک کر کے آئے۔ ان سب کے اکٹھا ہوتے ہی دو قد آور غلاموں نے دربار کا بڑا دروازہ کھولا۔ آواز بلند ہوئی۔ "خاموش، ہوشیار باش۔ شہنشاہوں کے شہنشاہ جہاں پناہ فرعون جلوہ افروز ہو رہے ہیں۔" فرعون اپنی خواب گاہ سے سیدھا دربار میں حاضر ہوا۔ پہلے اپنے خدا "مرا" کو سجدہ کیا اور تخت زمرد پر براجمان ہوتے ہوئے حکم دیا۔ "کارروائی شروع ہو۔" وزیر خاص کھڑا ہوا۔ "جہاں پناہ۔ موسیٰ آپ کے حکم کے مطابق حاضر ہے۔"

موسیٰ نوجوان، لمبی داڑھی کے ایک خوبصورت آدمی، دائیں ہاتھ میں عصا۔ ان کے آتے ہی فرعون کے چالیس درباری ایک ساتھ کھڑے ہوگئے۔ فرعون بولا۔ "موسیٰ، تم ہم میں سے ہی ایک ہو، پھر خدا "مرا" کے انکاری کیوں ہو۔ "مرا" کی ناراضگی نہ صرف تم کو تباہ کر سکتی ہے بلکہ سارے مصر کو نیست و نابود کر سکتی ہے۔"

موسیٰ نہایت سکون کے ساتھ بولے۔ "اے فرعون، تم خدا کو مورتی میں ڈھونڈتے ہو لیکن وہ ایسا نور ہے جس کو نہ دیکھا جا سکتا ہے نہ چھوا جا سکتا ہے۔ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔" فرعون رعونت سے بولا "لگتا ہے تم ذہنی پریشانی میں مبتلا ہو۔ ہم نے خدا "مرا" سے کہا بارش ہو، بارش ہوئی۔ دشمنوں پر فتح چاہیے، فتح ملی۔ دولت چاہی، دولت کے انبار لگے۔ کیا تمہارا خدا تمہارے عصا میں جان ڈال سکتا ہے۔" موسیٰ نے اطمینان سے جواب دیا "خدا چاہے تو پل میں تم کو شہنشاہ سے گداگر بنا سکتا ہے۔ خدا کی قدرت سب کچھ کر سکتی ہے۔" اور دیکھتے ہی دیکھتے عصا اژدہا میں تبدیل ہو گیا۔ سارے درباری حیران رہ گئے۔ خود فرعون تخت زمرد پر کھڑا ہو گیا۔

"شاباش موسیٰ شاباش۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تم اس عہد کے سب سے بڑے جادوگر ہو۔"

"اے فرعون۔ شاید تم اپنی تباہی کے بہت قریب ہو اس لیے حقیقت کے انکاری ہو۔ تم اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ایسے انسان ہو جو شیطان کی پرستش کر رہا ہے۔" زمین پر رینگتا ہوا اژدہا موسیٰ کے ہاتھ میں آتے ہی عصا میں تبدیل ہو گیا۔ وہ دربار فرعون سے شان بے نیازی کے ساتھ چل پڑے۔ فرعون اپنے سپہ سالار سے بولا "اب وقت آ گیا ہے کہ اس کی سرکشی کو ختم کیا جائے۔ اس نے ہم سے بغاوت کر کے خدا "ہرا" سے بغاوت کی۔ اس کی قسم ہے مجھے کہ میں اس کو نیست و نابود کر دوں گا۔"

سارے مصر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ موسیٰ کے پیروکار خوفزدہ ہو کر بولے ـــ

"اب ـــ؟" "خدا کا حکم ہے کہ ہمیں دریا پار کر لینا چاہیے۔"

"لیکن کیسے ـــ؟" "جو خدا پر ایمان لایا اسے کوئی خوف نہیں۔ چلو ـــ" کارواں موسیٰ کے ساتھ چل پڑا۔ ایک ایسی دنیا کی تلاش میں جہاں صرف خدا کی ثنا خوانی ہو گی۔

صراط جب شہر خاص سے ہجرت کر کے شہر جدید میں آیا تو وہاں کشادہ سڑکیں، بڑی عمارتیں تھیں۔ بڑی بڑی گاڑیاں سڑکوں پر آمد و رفت میں مصروف تھیں۔ ملیہ وارڈ میں ڈل کے کنارے صراط کا خاندانی شوروم تھا۔ ایک دن ایک سفید فام دروازے سے اندر کی چیزوں کا بڑے غور سے جائزہ لے رہا تھا۔ "اندر آ جائیے۔" "میرا نام مارک ہے۔" "میں صراط ہوں۔" اس ملاقات کے بعد صراط اور مارک کی دوستی کی داستان شروع ہوئی۔ ایک دن ڈل کے کنارے کھڑے ہو کر ہاری پربت کی جانب دیکھتے ہوئے مارک صراط سے بولا "ہم سب کچھ نہ کچھ تلاش کرتے رہتے ہیں۔ جس دن ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ ہمیں کیا چاہیے اس دن وہ تلاش ختم ہو جائے گی اور اس کی جگہ دوسری تلاش لے لے گی۔" مارک صراط کو اپنی دنیا میں لے گیا۔ وہ شہر جدید سے پہلی بار اس سے بھی تیز رفتار دنیا میں پہنچا۔ ایک مختلف دنیا جہاں سب کچھ نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی نظروں کے سامنے نہیں تھا۔

"جادو نگری" شہر جدید کے لیے واپسی پر صراط نے مارک سے یہ ایک جملہ کہا اور ـــ راستے میں اسے چارلس ہسلن، الیزبتھ ٹیلر اور نہ جانے کتنے ملے اور اس کے قدموں کو چومتے رہے۔ یونیورسل اسٹوڈیو میں اس نے موسیٰ قلوپطرہ اور فرعون کو دیکھا۔ وہ ایک دوسرے سے ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے ہزاروں سالوں سے ایک دوسرے کے دوست ہوں۔ نیوزی لینڈ جانے کے لیے وہ جس پرانے وقتوں کے ایک سمندری جہاز میں سوار ہوا اسے قزاقوں نے اغوا کر لیا۔ پاس بیٹھے ایک شخص نے صراط کے کان میں کہا "یہاں ہر روز جہاز اغوا ہوتے ہیں۔ پتہ نہیں ہم زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ اور اگر ہیں تو کہاں ہیں؟" جب جہاز آزاد ہوا تو صراط نے خود کو اس شہر میں پایا جہاں سڑکیں شکستہ تھیں۔ اسے اپنا شہر خاص یاد آیا۔ تنگ گلیاں، کچے مکان۔

ایک روشن صبح موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا۔ "میں خدا سے ہم کلام ہونے جا رہا ہوں۔ میرا انتظار کرو۔" جب وہ واپس آیا، اس کی قوم جا چکی تھی۔ موسیٰ کے ہاتھ میں کتاب تھی۔ صراط واپس شہر جدید آ گیا۔ ایک روز آدھی رات کے بعد وہ ڈل کے کنارے کنارے چلتا ہوا حضرت بل تک پہنچ گیا۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ نماز ہوئی۔ ہزاروں ہاتھ دعا کے لیے اٹھے۔ لال چوک کے پارک میں وہ لوگ جمع ہوئے اور فریاد کرنے لگے۔ "ہم کو بتاؤ، ہمارے پیارے کہاں ہیں۔" شہر خاص کا صراط شہر جدید میں گم تھا۔ ڈل سمٹ رہا تھا۔ نیوزی لینڈ میں جہاز اغوا ہو رہے تھے اور موسیٰ کی قوم جو اس کا انتظار نہ کر سکی ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹک رہی تھی۔ ایک روز اذان سحر کے وقت صراط نے ایک

نورانی شخصیت دیکھی۔ "تم شاید........" "میں نور کا نور ہوں۔" "تم سے ملنا کس طرح ممکن ہے۔" "مجھ سے ملنا بہت آسان ہے لیکن تمہاری ادھوری تلاش اس امر کو مشکل بنا دیتی ہے۔"

نور کا نور مسکراتے ہوئے دھند میں غائب ہو گیا۔ مصر لا آج تک اپنی ادھوری تلاش کے ساتھ بھٹک رہا ہے۔

"نور کے نور، تم کہاں ہو؟"

◆◆◆

کہانی

نیند کیوں نہیں آتی؟

محمد متین ندوی (انڈیا)

نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ اسے نیند آجائے لیکن آج نیند کی دیوی اس سے روٹھ کر کہیں دور جا چکی تھی۔ وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان تھا کہ اسے نیند کیوں نہیں آ رہی ہے جب کہ بجلی بھی ہے۔ A.C بھی چل رہا ہے اور بغل میں اس کی خوبصورت اور وفادار بیوی بھی ہے جو کہ نیند کی آغوش میں جا چکی ہے۔ بہت غور کرنے کے بعد بھی اسے کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دیا، اسے اپنا گھر محفوظ لگ رہا تھا پھر بھی وہ تفکرات کے سمندر میں غوطہ زن تھا اور نیند نہ آنے کا سبب تلاش کر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو دیکھا کہ تین بج چکے ہیں، جب کہ وہ دس بجے ہی سونے کا عادی تھا اور اسے بستر پر لیٹتے ہی نیند آجایا کرتی تھی لیکن آج خلاف معمول نیند کا کہیں دور دور تک پتہ نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے وہ اس طرف نکل گیا کہ کہیں فرقہ وارانہ فسادات کا خوف تو اس پر طاری نہیں ہے لیکن پھر جلد ہی اس نے اس خیال کو جھٹک دیا۔

"میں تو مسلم محلے میں ہوں، اگر فرقہ وارانہ فساد ہوا بھی تو میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیونکہ ایک تو محلہ مسلمانوں کا ہے۔ دوسرے گھر کا گیٹ بھی بہت مضبوط ہے۔ تیسری بات یہ کہ شہر کے بااثر غیر مسلموں سے ان کے تعلقات بھی بہت اچھے ہیں، دن رات انھیں میں اٹھنا بیٹھنا بھی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ کالج کے زمانے کے میرے کئی دوست R.S.S کے بااثر لوگوں میں شامل ہیں، جب بھی وہ مجھ سے ملتے ہیں تو بڑے اخلاق سے پیش آتے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے کوئی پرندہ بھی میرے گھر میں پر نہیں مار سکتا پھر دنگا کرنے والوں کی کیا مجال کہ میرے گھر کا رخ کریں۔"

وہ انھیں خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اسے ایک آواز آئی۔

"کیا جعفری، احمد، اخلاق وغیرہ کے گھروں کے دروازے مضبوط نہیں تھے؟ کیا ان کے تعلقات سیاسی مگرمچھوں سے نہیں تھے؟ کیا ان کے دوستوں میں سنتری سے لے کر منتری تک سب ہی شامل نہیں تھے۔ پھر تو کون سے کھیت کی مولی ہے؟"

اس آواز نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ آواز کس کی ہے اور کہاں سے آ رہی ہے؟

اچانک باہر سے لوگوں کے چیخ و پکار اور نعروں کی آوازیں آنے لگیں اور اسے لگا کہ شور اس کے گھر کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ٹی وی پر دیکھے ہوئے تمام مناظر ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے اور وہ اچانک چیخ اٹھا۔

"نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔"

اک لمحہ میں مقیّد زندگی

شمع خالد

وہ دونوں جب فائیو سٹار کی لفٹ میں سوار ہوئے تو تھکن کے مارے نیچے سوئمنگ پول میں نہاتی گوریوں کے کندن بدن کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے سرسری سا کوئی ٹائٹل چل رہا ہو۔ آنکھیں پول میں چمکتے بدنوں سے نکلی شعاعوں میں مقید تھیں۔ لیکن جسم و جاں میں کوئی ہلچل نہ تھی۔ بس تصور میں ٹھنڈے ٹھار کمرے میں بیرنگ والے بستر کی خواہش تھی۔ چھ کے چھ میں صرف ایک نقطے پر مرکوز تھیں اور وہ نقطہ تھا، ایک آرام دہ بستر۔

ٹھاہ ٹھاہ کر کے لفٹ رکی اور وہ دونوں اپنے جسم کی تمام کھوئی ہوئی انرجی کو یکجا کر کے کمرے میں ڈھیر ہو گئے۔ جانے چند لمحے یا چند گھنٹے نیند کی وادی میں اترے گزر رہے تھے۔ موبائل کی گھنٹی نے صور اسرافیل پھونک دیا۔ گھبرا کر موبائل کو تین وقفہ کرانے کے بعد آخر راحیل نے کان کو لگا ہی لیا۔ دوسری طرف روزینہ کہہ رہی تھی۔ "آپ لوگ کہاں ملیں گے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے کاغ روڈ پہ ستار کے تکے کھانے ہیں۔" دونوں بجلی کی پھرتی سے اٹھے اور یک زبان بولے "ہم آ رہے ہیں۔" فون بند کرنے کے بعد راحیل نے موٹی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔ "یہ عورت ہے یا جن۔" زبیر نے ہنستے ہوئے کہا "عورتیں جن نہیں چڑیل ہوا کرتی ہے اور جلدی چلو یہ ہمارے بھی ہاتھ سے نکل نہ جائے۔"

جن کی ٹہل سیوا ہم پچھلے دس دنوں سے کر رہے ہیں۔ اگر یہ بھی بھاگ گئی تو رضوان بھائی کیسے زندہ رہ سکیں گے۔ یہ دونوں گزشتہ چھ مہینے سے مختلف لوگوں کو لا کر کسی ہوٹل یا کسی رشتے دار کے گھر رکھنے کے بعد ٹیسٹ کروانے کے لیے لے کر جاتے تھے۔ کبھی کوئی ایڈوانس لے کر بھاگ جاتا۔ کبھی ٹشو میچ نہیں ہوتا۔ اور کبھی عین وقت پر ڈونر بھاگ جاتا۔ مختلف سینٹروں میں تلاش بسیار کے بعد حمیدہ ارشد نے یہ لڑکی متعارف کروائی تھی۔ جس کے خاوند نے سود خور پٹھان کے پچاس ہزار واپس کرنے تھے۔ خاوند تو چند دن ہی غیر قانونی طور ترک وطن بننے کے بعد چھتے کھا کر واپس آ گیا تھا۔ حمیدہ ارشد نے روزینہ کو دو لاکھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اور رضوان کے بھائیوں سے دو لاکھ کا سودا کرنے کے بعد وہ اسے شہر لے آیا تھا۔ ٹشو میچ ہونے کے بعد ڈاکٹر نے دس دن بعد کی تاریخ دی تھی۔ زبیر اور راحیل دونوں اس عورت کی چوکیداری پر مقرر تھے۔ اس سے پہلے بہت سارے ڈونر کچھ پیسے لے کر غائب ہو گئے تھے اور کبھی حمیدہ ارشد غائب ہو گئے تھے۔ ملک میں جانے کب سے گردوں کی خرید و فروخت کا سلسلہ جاری تھا۔ لوگ اپنے گھر والوں کی ضرورت کا ڈول بھرنے کے لیے پہلے اپنا خون بیچا کرتے تھے لیکن سائنس کی ترقی اعضاء کی پیوند کاری میں میڈیکل سائنس جوں جوں ترقی کر رہی تھی۔ توں توں لوگ اپنے گھر والوں کے پیٹ کا ایندھن بھرنے کے لیے اپنے گردے بیچنے لگے تھے۔ پہلے یہ کاروبار صرف گنے چنے ڈاکٹر کرتے تھے۔ جو مڈل ایسٹ کے شیوخ کے شراب کی زیادتی سے تباہ ہونے والے گردے تبدیل کروانے کے لیے ان لوگوں کی ضروریات خرید لیتے تھے۔ یوں ڈاکٹر اور گردہ دینے

والے کے رشتہ داروں کی یاد مدہوجایا کرتی تھی۔ میڈیا نے جب ایسے لوگوں کی نشاندہی کرنی شروع کی تو حکومت وقت بھی حرکت میں آ گئی۔ اور سر عام گردوں کی خرید و فروخت پر پابندی لگا دی۔

گردہ ہسپتال کو حکومت وقت نے سرٹیفکیٹ دے دیا تھا اور اس سنٹر نے جانے کتنے بریف کیس ہو جانے کے بعد یہ سرٹیفکیٹ حاصل کیا تھا۔ یہ گردہ سینٹر جب پلاٹ سے بلڈنگ کے مراحل طے کر رہا تھا تو بیسمنٹ (Base ment) میں خصوصی کمرے بنائے گئے تھے۔ جہاں ملک بھر سے ان ضرورت مندوں کو جمع کیا گیا تھا۔ جہاں انہیں تین وقت مفت روٹی دی جاتی تھی۔ اور جب ان کا گردہ کسی مریض سے میچ ہو جاتا تو ساتھی اس حسرت سے دیکھتے ہوئے سوچتے۔ ہمارا نمبر کب آئے گا۔ اور ہم کب نوٹوں کی گڈیاں اٹھائے گھر جائیں گے۔ اب گھر والے اپنے بچوں کو باہر بھجوانے کے لیے ٹریولنگ ایجنٹ کو تلاش نہیں کیا کرتے تھے بلکہ ایسے لوگوں کو تلاش کرتے جو ان کے پیاروں کے گردے لے کر انہیں مالا مال کر سکیں۔

یہ سب باتیں زبیر اور سہیل کو تب پتہ چلیں۔ جب اچانک رضوان کے گردے فیل ہونے کا پتہ چلا۔ رضوان ایک بڑی اچھی کمپنی میں ملازمت کرتا تھا۔ زندگی اسی ڈھب سے گذر رہی تھی۔ جیسی وہ گزارنا چاہتا تھا اور جس دن اس نے اپنی محبوبہ کو بیوی کے روپ میں پالیا۔ اسے اپنے آپ پر رشک آنے لگا۔ خوبصورت بیوی ... چمچماتی کار گول مٹول دو بچے ... سبھی کچھ تو اس کے پاس تھا۔ دوستوں کی محفل میں چند گھونٹ حلق میں اتار لیتا۔ کبھی کبھار کسی کال گرل سے قربت ... وہ جو چاہتا وہ سب کچھ اس کی جھولی میں آ گرتا ... اور پھر زندگی نامہربان ہونا شروع ہوئی۔

دفتر والوں نے اسے چند سال بیرون ممالک بھجوانے کا فیصلہ کیا تو رضوان کو اپنے آپ پر رشک آنے لگا۔ میڈیکل چیک اپ کے دوران یہ انکشاف کہ گردوں کی کارکردگی بری طرح متاثر ہوئی ہے، تو وہ پاگل ہو گیا۔ پہلے تو اسے میڈیکل رپورٹ پر ہی شک ہوا۔ جب دوسرے ڈاکٹرز نے بھی تصدیق کر دی۔ تو وہ سب کچھ بھول کر علاج کروانے لگ گیا۔ دفتر والوں نے کمال مہربانی سے تین مہینے کی چھٹی پوری تنخواہ کے ساتھ منظور کروائی۔ اب علاج کیا شروع ہوا بیماری نے جیسے پوری طرح اسے اپنے حصار میں گھیر لیا۔ آخر ڈاکٹرز نے گردہ کی تبدیلی کا مشورہ دیا۔ تو زندگی کا وہ پہلو سامنے آیا۔ جو ہم سب کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہے۔ ہم سب کے ساتھ ہنستے بستے لوگوں کی زندگی ایکدم یوں انجانی سی ساخت بن جاتی ہے جیسے یہ کسی اور سیارے کے لوگ ہوں۔ زبیر سہیل سے پوچھنے لگا۔ "یار ایک بات تو بتاؤ۔ اس خاتون اور اس کے شوہر کو اس فائیو سٹار ہوٹل میں کیوں رکھا گیا۔" زبیر نے کمزوری ہنسی کے ساتھ اعتراف کیا۔ جب رضوان بھائی نے مجھے کہا تھا "ہم ان میاں بیوی کو اس ہوٹل میں رکھیں۔ اور ساتھ ان پر نظر رکھیں تو میرے اندر کا کمینہ پن بے حد خوش ہوا تھا۔ میں تو کبھی خواب میں بھی اس ہوٹل میں ٹھہرا نہیں تھا۔ یہاں رہنا تو دور کی بات ہے میں تو کبھی ریسپشن سے آگے بھی نہیں جا سکا تھا۔ اور آج پورے ہفتے سے میں شہزادوں کی طرح رہ رہا ہوں۔"

سہیل نے سوچتے ہوئے کہا "ہاں ہمارے اندر بہت ساری محرومیاں، دکھ اور زیادہ پانے کی خواہشیں ہمیں بے حد تنگ کرتی ہیں۔ یہ اس خاتون پر حیران ہوتا ہوں۔ کل کہنے لگی مجھے بریانی کھانی ہے اور جانتے ہو میں پچاس میل ڈرائیو کے بعد اسے بریانی کھلانے لایا۔ اور آخر میں غصے میں بول ہی اٹھا ... آپ ہمیں بے حد تنگ کر رہی ہیں۔ ہم نے آپ سے ایک سودا کیا ہے۔ جس کی پوری پوری رقم ہم

نے آپ کو دی ہے۔ یہ آپ ہیں کہ آپ کی فرمائشیں ختم ہونے میں نہیں آ رہیں۔ جانتے ہو اس نے مجھے کیا جواب دیا۔ میں آپ کے بھائی کے لیے اپنے آپ کو ادھوری کر رہی ہوں۔ اور آپریشن کے دوران میں مر بھی سکتی ہوں۔ میری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ساری زندگی میں ایک گردے کے ساتھ رسک میں رہوں گی۔ پھر تم کیا جانو — شہر میں رہنے والوں کی آسودگی — اور دیہاتوں میں رہنے والوں کی محرومیاں — اگر میں چند دن اپنی مرضی کے جینا چاہتی ہوں۔ اور مجھے خدا نے وسیلہ بھی دے دیا ہے۔ آخر تم لوگوں کے پاس اتنا ہے۔ تو تب ہی ابھی تک کتنے ڈونرز کو رقم دے چکے ہیں۔ میں تو اپنی ضرورت کا ڈول بھرنے کے لیے اپنا گردہ بیچ رہی ہوں تا کہ اپنا گھر گرہستی بچا سکوں۔"

سہیل نے چند لمحوں اس عورت کو دیکھا۔ جس نے چند دنوں سے ان دونوں کو ادھ موا کر دیا تھا۔ کبھی مجھے فیصل مسجد کی سیر کرواؤ۔ کبھی شکر پڑیاں۔ کبھی پیر سوہاوہ۔ سید پور گاؤں اور مری تو آتی دفعہ سے رکی تھی کہ ان لوگوں کو مری کے نام سے ہی ابکائیاں آنے لگتی تھیں۔ بہت والی آتی تھی کہ نشو بیچ کی اذیت — بار بار خون ٹسٹ کے لیے دینے کے بعد بھی وہ ویسے ہی تر و تازہ نظر آتی۔ آخر کس مٹی کی بنی ہوئی ہے یہ عورت۔ اس نے جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا ہو۔ اور کہنے لگی — جب آپ سب کچھ کسی اور کے لیے کر لو تو رب کا یہ جذبہ بڑی سرشاری، طمانیت بخشتا ہے۔ میں یہ سب اپنا گھر بچانے کے لیے کر رہی ہوں۔ زبیر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا: "تمہیں ڈر نہیں لگتا۔" اس نے جذباتی قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: "ڈر ہم عورتوں سے ڈرتا ہے۔ درد کو صرف عورت ہی برداشت کرتی ہے۔ یہ درد پہاڑ کو سہنا پڑے تو وہ دو ٹکڑے ہو جائے۔ پھر بچہ ضائع ہونے کے چھوٹے چھوٹے آپریشن۔ ڈلیوری کے لیے آپریشن یہ ہم عورتیں ہی تو برداشت کرتی ہیں۔" سہیل اور زبیر اس عورت سے بُری طرح شاکی ہونے کے باوجود اس سے بے حد متاثر بھی تھے۔ جب ڈاکٹر نے کڈنی ٹرانسپلانٹ کا کہا، رضوان کے والدین نے پہلے اپنے گھر اور پھر رشتہ داروں سے پوچھا، کچھ لوگ تو سنتے ہی بھاگ گئے۔ انہوں نے کبھی خون کا عطیہ بھی نہیں دیا تھا۔ پھر وہ کیسے اپنا گردہ دے کر ادھوری زندگی گزارتے — ایسے وقت میں بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ پھر عورت کتنی بہادر ہے۔ جس نے صرف شوہر کا قرضہ اتارنے کے لیے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ جب یہی بات زبیر نے اس عورت سے پوچھی تو وہ کہنے لگی: "میں نے خود ہی انہیں منع کر دیا — انہوں نے باہر نکل کر روزی روٹی کمانی ہے۔ جانے کب پھر کتنے باہر جانا پڑ جائے۔ مزدوری کرنی پڑے۔ تو آپریشن کے بعد کی محتاط زندگی یہ کیسے گزار سکتے ہیں۔ میں تو گھر میں ہی ہوتی ہوں۔ میں اپنی خوراک، ادویات اور پانی کی Intake کا دھیان رکھ سکتی ہوں۔" کبھی کبھی سہیل اور زبیر اس عام سی شکل و صورت کی لڑکی کو دنیا کی خود غرض اور ظالم عورت سمجھتے۔ اور دوسرے ہی لمحے وہ عظمت کے اس بلند مقام پر کھڑی نظر آتی — جہاں فرشتوں کے پر بھی جلتے ہیں۔

رضوان نے اپنے دفتر چھٹی کے لیے جب نئی درخواست لکھی تو دفتر والوں نے اسے کمال مہربانی سے علاج کے چیک کے ساتھ یہ بھی لکھا کہ آپ صرف چھ مہینے تک دفتر کے "پے رول" پر رہ سکتے ہیں اور آج وہ تین مہینے گزارنے کے بعد اگلے تین مہینوں کی درخواست کے لیے لکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ اب یہ میری آخری درخواست ہے۔ اس کے بعد — اور یہ ادھورا جملہ چھوڑتے ہوئے اسے خیال آیا۔ زندگی بھی تو ایک بال پر گزر رہی ہے۔ ہر ڈائیلیسس کی اذیت سہنے کے بعد وہ یہی سوچتا ہے — کہ جانے کتنے اور دن —

ڈاکٹرز نے جب ایک چھوٹے آپریشن کے بعد بازو میں پلاسٹک کی نالی نکالی، تو آپس میں بات کرتے ہوئے وہ کہہ رہے

تھے" بار بار سوئیاں لگانے سے ان کی وین (Vain) رپچر (Repture) ہو گئی ہیں۔ اب یہ نالی کافی عرصہ پرابلم نہیں ہونے دے گی۔"
رضوان سوچ رہا تھا۔ "تو کیا قبر میں یہ نالی بھی میرے ساتھ ---" اس سے آگے وہ نہ سوچ سکا۔ اس کی خوبصورت بیوی صائمہ سامنے کھڑی اسے زندہ رہنے کی ہمت بندھاتی نظر آئی۔ جانے وہ کون سا خوبصورت اور خوش قسمت لمحہ تھا، جب رضوان نے صائمہ کو اپنے لیے پسند کیا تھا۔ صائمہ جس پر پورا کالج مرتا تھا، اور اس کی وجہ سے طالب علموں میں دوستی اور دشمنی کے پیمانے طے ہوا کرتے تھے۔ اسے جب رضوان نے مسخر کر لیا تو کالج میں کچھ دنوں بھونچال کے بعد حالات نارمل ہوتے چلے گئے۔ منگنی پر تمام دوست آئے۔ اور شادی پر جو بھی صائمہ کو اپنا بنانے کا اعلان کیا کرتے تھے، آج بارات کے آگے ناچتے ہوئے دوست کی خوشیوں میں شریک تھے۔

دو بچوں کے بعد بھی صائمہ اتنی ہی خوبصورت تھی۔ اور پھر جب اس بیماری نے گھر میں ڈیرے ڈالے تو صائمہ نے خدمت کے ساتھ ساتھ اس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے بھی اپنا آپ وقف کر دیا۔ رضوان کی دوا، غذا کا وہ خاص خیال رکھتی۔ بچوں کو سکول لے جاتی۔ رضوان کے ڈائلیسس کے لیے اس کے ساتھ جاتی اور جب رضوان پیاس کے ہاتھوں تڑپنے لگتا تو اسے پانی پینے سے باز رکھنے کے لیے وہ رضوان کی ڈانٹ ڈپٹ برداشت کرتی۔ رضوان ڈائلیسس مشین کے پاس لیٹا ہوا ہے۔ اپنے جسم سے نکلتے خون کو دیکھ رہا تھا۔ عام وجود سے خون نچوڑنے کے بعد اسے صاف کر کے دوبارہ جسم میں داخل کیا جا رہا تھا وہ سوچ رہا تھا" یہ اذیت ناک لمحے کب ختم ہوں گے۔" کب تک دونوں اپنے خون اور جسم کی آلودگی دور کرنے کے لیے مشینوں کا محتاج رہے گا۔ صائمہ نے پیار سے ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔ کیا سوچ رہے ہو۔" "میں کب تک ان اذیت ناک لمحوں کو سہتا رہوں گا۔ کہیں میری ہمت ہی نہ ٹوٹ جائے" --- صائمہ نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو اندر ہی اندر جذب کیا اور اپنی ہمت کو اس سے بچی کھچی توانائی کو یکجا کیا۔ صائمہ نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھتے ہوئے کہا، مایوس نہیں ہوتے ---- ابھی دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ ڈاکٹر ندیم مسکراتے ہوئے داخل ہوئے۔ "ہاں بھئی! ہفتے کو صبح چھ بجے تمہارا آپریشن ہے۔ اور ہاں دھیان رکھنا، تمہاری ڈونر کہیں غائب ہی نہ ہو جائے۔" صائمہ نے زبردستی کی مسکراہٹ طاری کرتے ہوئے کہا، "ڈاکٹر صاحب فکر نہ کیجئے۔ ہم نے خاتون کو فائیو سٹار ہوٹل میں مقید کیا ہوا ہے اور چہل قدمی کے لیے ہر وقت ایک گاڑی اور دو گارڈ تعینات رہتے ہیں۔ جہاں اس کی خواہش پوری کرنے کے لیے چراغ کا جن موجود رہتا ہے۔"

آپریشن کی رات رضوان، صائمہ، سہیل زبیر کے ساتھ وہ خاتون روزینہ اور اس کا شوہر دونوں رات بھر جاگتے رہے۔ ہر شخص اپنے اپنے لمحہ میں موجود اپنے اپنے خوف اور اپنی اپنی خواہشات لیے جاگتا رہا۔ ڈاکٹرز نے رضوان کے بازو سے پلاسٹک کی نالی نکال دی۔ رضوان نے اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ آپریشن کے بعد 48 گھنٹے بے ہوش رہنے کے بعد جب دونوں ہوش میں آئے تو رضوان کے گھر والے پیار کی دعائیں وصول کر رہے تھے۔ اور روزینہ کچھ کھو جانے کے احساس میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ڈونر کا بریف کیس وصول کرنے والا اس کا شوہر تھا اور چھ مہینے کا قرضہ وصول کرنے کے بعد دونوں میاں بیوی ٹیکسی میں بیٹھے جس کا کرایہ زبیر نے اپنی جیب سے ادا کیا۔ خدا حافظ کہتے ہوئے روزینہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ اگر میں نے تنگ کیا ہو تو معاف کر دیجئے گا۔ دراصل میری بالکنی میں جب سوا سیر پڑ گیا، تو چھلکتا لاڈ ہی تھا ناں --- گاڑی دور جا رہی تھی اور زبیر سوچ رہا تھا۔

◆◆◆

احساس

جمیل حیات

ان کا معمول تھا کہ بس سٹاپ پر جانے کی بجائے وہ تینوں گلیوں میں سے ہوتے ہوئے سیدھے موڑ پر پہنچ جاتے۔ یہاں ساتھ ہی "سچ باپ" کا مزار تھا، وہ سلام کرتے اور موڑ پر کھڑے ہو کر گاڑی کا انتظار کرتے۔ اس دن جمعہ تھا، تینوں کی خواہش تھی کہ جلد از جلد گھر پہنچ جائیں تاکہ پرسکون ہو کر وقت پر نماز جمعہ ادا کر سکیں۔ جب وہ مقررہ جگہ پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ ایک سات آٹھ سالہ بچہ سکول یونیفارم میں ملبوس بے پرواہی سے کھڑا تھا۔ اس نے اپنا بستہ موڑ پر ایستادہ واحد درخت کے ساتھ لٹکا دیا تھا اور شان بے نیازی سے سڑک کنارے کھڑے ہو کر چھوٹے چھوٹے پتھر سڑک پر ادھر ادھر پھینکنے لگا تھا۔

وہ تینوں آدمی جو موڑ پر آ کر گاڑی کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے، استاد تھے۔ گورنمنٹ کے سکول میں پڑھاتے تھے۔ ان میں سے ایک دراز قد تھا، خوبصورت نقوش کا حامل، بال نفاست سے کٹے ہوئے، سر پر پی کیپ پہنے ہوئے تھا۔ دوسرا آدمی دبلا پتلا، متوسط قد و قامت کا خوبرو تھا۔ اس کے انداز سے بے اعتنائی کا احساس ہوتا تھا۔ یوں جیسے اپنے سوا کسی کی اسے پرواہ نہ ہو۔ تیسرا آدمی پستہ قد، گول صورت تھا۔ کلین شیو لیکن اس وقت کچھ پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ اس بچے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے اس بچے کے پاس گیا اور اس سے مخاطب ہوا:

"السلام علیکم بیٹا!"

"وعلیکم السلام" بچے نے کھیلتے کھیلتے اسے غور سے دیکھا اور جواب دینے کے بعد پھر کھیلنے میں محو ہو گیا۔ اس وقت اسے صرف اس بات سے غرض تھی کہ وہ ان پتھروں کو، جو اس کے ہاتھ میں تھے، اس بھری پری سڑک پر جہاں ٹریفک رواں دواں تھی، جتنا دور پھینک سکتا تھا، پھینک دے۔ "آپ کہاں رہتے ہو؟" اس نے بچے سے پھر سوال کیا۔

"اس طرف، پہاڑی کے پاس" بچے نے معصومیت سے سامنے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ کو لینے کون آتا ہے؟"

"میرے ابو۔"

"کس وقت آتے ہیں؟" "دو بجے۔"

اب کے حیران ہونے کی باری اس کی تھی۔ آج جمعہ تھا، اس کا مطلب تھا کہ بچے کو دو گھنٹے مزید اپنے باپ کا انتظار کرنا تھا۔ اگرچہ سڑک پر ٹریفک رواں دواں تھی لیکن کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ آبادی نہ ہونے کے برابر تھی۔ چاروں اطراف کھیت ہی کھیت تھے۔ گندم اور سرسوں خوشنما لگ رہی تھیں لیکن اس وقت پستہ قد مرتضیٰ کے پاس سوچنے کے لیے اور بہت کچھ تھا۔ اس معصوم بچے کو دیکھ کر اسے کوئی اور یاد آ رہا تھا۔ "میرے ابو سوزوکی چلاتے ہیں، دو بجے آئیں گے۔" بچے نے اسے بتایا اور پھر اپنے کام میں

مصروف ہو گیا۔ ثقلین کا ذہن ماضی میں چلا گیا۔

شام کا وقت تھا۔ ثقلین نے ٹریکٹر اسٹارٹ کیا اور کھیتوں کی طرف جانے لگا۔ اس نے ملک اختر علی کے کھیتوں میں ہل چلانا تھا۔ گھر والوں کو پتا تھا کہ وہ رات کو واپس نہیں آئے گا۔ بیوی سے دروازہ بند کرنے کو کہا اور گھر سے نکل آیا۔ اس کی بیوی نے جلدی سے دروازہ بند کیا۔ اس وقت وہ تنور پر روٹیاں لگا رہی تھی۔ اسماعیل اس کا پانچ سالہ بیٹا، جو کہ اپنے باپ ثقلین سے بہت زیادہ مانوس تھا، دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ وہ اپنے بابا کو پکار رہا تھا۔ ثقلین نے اسے اپنے پیچھے آتے دیکھا تو بیوی کو آواز دی۔ "ہاجرہ! اسماعیل کو دیکھنا۔" پھر اس نے پیار سے اسماعیل کو پکارا۔ "بیٹا گھر جاؤ امی کے پاس۔" اسماعیل کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ٹریکٹر اسٹارٹ کیا اور روانہ ہو گیا۔ اسماعیل وہیں کھڑا تھا۔

ہاجرہ روٹیاں لگا کر فارغ ہوئی تو اسے گھر میں خاموشی کا احساس ہوا۔ اس نے اسماعیل کو پکارا لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے گھر کا کونا کونا چھان مارا۔ اسماعیل کو موجود نہ پا کر اس کی سانس رکنے لگی۔ گھر کے باہر بھاگا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ چاروں اور ویرانے ہی ویرانے تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی ڈھوک تھی جہاں گھر بھی دور دور تھے۔ "شاید اسماعیل باپ کے ساتھ چلا گیا ہو۔" اس نے دل کو تسلی دی اور ثقلین کو فون ملا دیا۔ جب ثقلین کو یہ پتا چلا کہ اسماعیل گھر پر نہیں ہے تو اس کے پسینے چھوٹ گئے۔ وہ وہیں سے پلٹا اور جتنی جلدی ہو سکتی تھی گھر کی طرف لوٹا۔ گھر میں رونا پیٹنا شروع ہو گیا تھا۔ سب گھر والے لالٹینیں، شمعیں اور ٹارچ لے کر اسماعیل کی تلاش میں نکلے۔ آس پاس کے گھروں سے بھی لوگ نکل آئے۔ ڈھوک کا کونا کونا چھان مارا گیا لیکن اسماعیل کا پتا نہ چلا۔ ماں نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ بہت قدر ثقلین کا وہ لاڈلا بیٹا تھا۔ اس نے اگلی صبح آس پاس کے گاؤں کی مساجد میں اعلان کروا دیا لیکن کہیں سے کوئی خبر نہ ملی۔ انہیں جہاں سے بھی اسماعیل کی اطلاع ملتی، وہ جاتے اور مایوس پلٹ آتے۔ پیروں فقیروں اور عاملوں کے پاس بھی گئے۔ جعلی عاملوں اور نام نہاد پیروں نے انہیں جی بھر کر لوٹا۔ لیکن اسماعیل کے بارے میں کوئی مثبت اطلاع انہیں نہ ملی۔ ہر کوئی انہیں اتنی تسلی دیتا کہ اسماعیل زندہ ہے اور جس کے پاس ہے وہاں مطمئن زندگی بسر کر رہا ہے۔ لیکن وہ کہاں ہے؟ یہ کوئی نہ بتا سکتا۔ ثقلین اور اس کی بیوی نہ زندوں میں تھے اور نہ مردوں میں۔ بس جی رہے تھے اس آس پر کہ کبھی تو انہیں اپنے لاڈلے اسماعیل کی خبر ملے گی۔

گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر ثقلین ماضی سے حال کی طرف پلٹ آیا۔ اس بات کو دس سال گزر چکے تھے۔ اسماعیل کا کچھ پتا نہ تھا۔ گاڑی سواریوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے دونوں دوست تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھے اور جلدی سے گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ثقلین نے اس چھوٹے سے معصوم بچے کی طرف دیکھا۔ وہ اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ بالآخر اس نے وہیں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے کنڈیکٹر کو اشارے سے بتایا کہ وہ نہیں جائے گا۔ گاڑی چل پڑی۔ اس نے بچے سے پوچھا: "بیٹا! آپ کے ابو کے پاس موبائل ہے؟" بچے نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے فون نمبر پوچھا۔ وہ اس کے باپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ بچے نے اپنے بستے میں سے ایک کاغذ نکالا اور بولا: "0345" اس نے جلدی سے موبائل نکالا اور بتائے گئے ہندسے ڈائل کر کے سوالیہ نظروں سے بچے کی طرف دیکھا۔ بچہ بولا: "3456" اس نے جلدی سے لکھا تو بچے نے آخری ہندسے بھی بتا دیے۔ "789"

جب اس نے موبائل نمبر کو غور سے دیکھا تو وہ تین سے نو تک مسلسل ہندسے تھے۔ اسے بچے پر بہت غصہ آیا کہ شاید اس نے مذاق کیا ہو۔ پھر اس نے سوچا کہ معصوم سے بچے کو فون نمبر کہاں یاد ہوگا۔ اس کے نمبر پوچھنے پر اس نے اسے گنتی سنا دی۔ بچہ اپنے کام

میں مصروف تھا۔ اس نے شاپر بیگ کو نیچے زمین پر رکھا اور پھر اس پر ہاتھ میں پکڑے پتھر سے ضربیں لگانے میں مصروف ہو گیا۔ آخر فارغ وقت اس نے کسی نہ کسی طرح کاٹنا تو تھا۔ آس پاس سے گزرتے لوگ مرطلین کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک بڑی بی اور ان کے ساتھ ایک نوجوان خاتون جب اس کے پاس سے گزریں تو انہوں نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ نوجوان خاتون نے بڑی بی کو مخاطب کیا لیکن اس کا روئے سخن مرطلین ہی تھا: ''ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو بچوں کو اغوا کرتے ہیں، جانے اس بچے کے والدین کو کیا مجبوری ہو گی جو اسے لینے نہ آ سکے اور یہ شخص اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں ہے۔'' اس کا لہجہ تحقیر آمیز تھا۔ مرطلین کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اس نے مڑ کر اس خاتون کی طرف دیکھا جس کے جسم کا ایک ایک عضو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا۔ فراک اور چست پاجامے میں ملبوس وہ لڑکی اسے ایک نظر نہ بھائی لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟

بچے نے پھر بستہ کھولا۔ اب کے اس نے ایک کاپی نکالی۔ اس نے کاپی میں سے تین صفحے نکالے اور ان کو پھاڑ کر وہ کاغذی جہاز بنانے لگا۔ مرطلین بچے کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے نہایت مہارت سے جہاز بنائے اور پھر مرطلین کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر اس نے ایک ایک کر کے جہازوں میں ہوا بھری اور ان کو اڑا دیا۔ اس کی آنکھوں میں مسرت ہلکورے لے رہی تھی۔ مرطلین نے اسے اشتیاق بھری نظروں سے دیکھا۔ اس کی گاڑی کو گزرے کافی وقت ہو چکا تھا۔ وہ دو گاڑیاں چھوڑ چکا تھا۔ اب تیسری گاڑی کے آنے کا وقت بھی ہو چکا تھا۔ اسے شدید بھوک لگ رہی تھی لیکن بچے پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ بھوک اور پیاس سے بے نیاز اپنی مستی میں مگن تھا۔ ''کتنا پیارا اور بے فکرا بچپن کا نہ کوئی غم نہ کوئی فکر۔'' اس نے سوچا اور ساتھ ہی اسے بچے کے والد پر بہت غصہ آیا۔ ''کیسا باپ ہے؟ اس کو اپنے بچے کا بھی کوئی احساس نہیں ہے۔ حالات اتنے خراب ہیں اور اس کا باپ بچے کو یوں اکیلا اس ویرانے میں چھوڑ دیتا ہے۔'' اس نے صدقِ دل سے دعا مانگی: ''یا اللہ! بچے کے والد کو جلد از جلد بھیج دے تاکہ میں بھی گھر چلا جاؤں۔ میرے دل میں تو نے جو یہ احساس پیدا کر دیا ہے تو پھر یہی احساس اس بچے کے ماں باپ کو کیوں نہیں دیا؟'' اچانک بچے نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ ''ابو آ گئے۔'' اس نے دیکھا سوزوکی آ گئی تھی۔ بچے نے جلدی سے بستہ اٹھایا۔ مرطلین نے دیکھا کہ اس کی گاڑی بھی آہستہ آہستہ آ رہی تھی۔ ابھی گاڑی دور تھی اس نے جلدی سے قریب ہو کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بچے کے والد کو سلام کیا اور مخاطب ہوا: ''بھائی جان! اگر آپ برا نہ مانیں تو چھٹی والے دن بچے کو لینے جلدی آ جایا کریں۔ بچہ تقریباً دو گھنٹے سے یہاں اس ویرانے میں کھڑا ہے اور ویسے حالات بھی خراب ہیں۔ اس بچے کے لیے میں نے دو گاڑیاں چھوڑ دی ہیں، صرف اس لیے کہ آپ آئیں، بچے کو لے کے جائیں تو میں بھی جاؤں۔''

بچے کے والد نے گاڑی کی پچھلی طرف دیکھ کے ہانک لگائی: ''اوئے! بیٹھ گیا ہے؟''

''جی ابو! بیٹھ گیا ہوں۔'' بچے کے باپ نے مرطلین کی طرف دیکھا، گاڑی کو اسٹارٹ کیا اور بولا: ''اپنی نصیحتیں اپنے پاس رکھو، بچہ میرا ہے، تمہیں اس سے مطلب؟'' مرطلین نے زخمی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران اس کی نظر گاڑی کے ساتھ لگے اشتہار پر پڑی، لکھا تھا: ''ہر جگہ کی بکنگ کے لیے گاڑی حاضر ہے، رابطہ ڈرائیور:
0345-3456789

◆◆◆

گونگا عربی

اسلم سحاب ہاشمی

انتہائی گرم ریت کے گرد اڑ سلگتے سینے پر پڑتے ہوئے بے رحم قدم آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر اونچے اونچے ٹیلوں کی اوٹ میں ایک اور بے رحم انسان اس مقامی سوداگر کے انتظار میں اپنی جیپ میں بیٹھا تھا اور لاوے کی طرح سلگتا صحرا جہاں ریت کے ذرات چنگاریاں بن کر اس کی تپش کو اور بڑھا رہے تھے۔ اس دوزخ کی وادی میں ایک معصوم فرشتہ گھسیٹتے ہوئے کھینچ کر لایا جا رہا تھا۔

آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ منہ سے نکلنے والی چیخیں دم توڑ کر سسکیوں اور آہوں میں بدل چکی تھیں۔ اس کے باوجود گلا پھاڑ پھاڑ کر مدد کے لیے بلانے کی بے سود کوشش۔ صحرا کے چاروں طرف کوسوں تک انسان، چرند پرند، کسی ذی روح کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ صرف دو بے رحم انسان وہاں موجود تھے۔ ایک بیچنے والا، دوسرا خریدنے والا۔ ان کے مابین جس چیز کا سودا ہو رہا تھا وہ بھی ان جیسا ایک زندہ انسان تھا مگر سلوک اس سے جانوروں جیسا ہو رہا تھا۔

چھتوں خان اپنی بستی کے انتہائی مفلس کسان اللہ رکھا کے چھپرے میں پہنچا۔ وہ اپنے علاقے کے غریب پرور زمیندار کو اپنے چھپرے میں دیکھ کر اتنا خوش ہوا کہ وہ وقتی طور پر اپنے گم شدہ بیٹے فیضو کا صدمہ بھی بھول گیا تھا۔ لگا اپنے ولی دے کی آؤ بھگت کرنے۔ اس کے بیٹھنے کے لیے نیم کے درخت کے نیچے چارپائی بچھائی۔ تانبے کے جگ میں کورے گھڑے سے پانی بھر کر لے آیا۔ اس دکھیارے انسان کا دل رکھنے کے لیے چھتوں خان نے ایک پانی کا آب خورہ غٹ غٹ کر کے پی لیا۔ ''واہ! کیا ٹھنڈا اور شہد کی طرح میٹھا پانی ہے۔'' ''سرکار! یہ اسی ''کھوئی'' کا پانی ہے، جو آپ کے بابا سائیں نے بستی کے لوگوں کے لئے کھدوائی تھی۔'' چھتوں خان اپنے والد مرحوم کا ذکر سن کر کچھ دیر کے لئے چپ کی بکل مار کر ماضی کے کہرے میں گم ہو گیا۔ اللہ داد خان پوری بستی میں اللہ کا ولی کے نام سے مشہور تھا۔ کئی مربع کا جاگیردار لیکن غرور و تکبر نام کی کوئی چیز اسے چھو کر نہ گزری تھی۔ مزارعین کے ساتھ ایک مہربان اور رحم دل سرپرست جیسا سلوک کرتے تھے۔ آج چھتوں خان بھی شاید اپنے بابا سائیں کی روایت کو پانی دینے آیا تھا۔

''بابا! مجھے قادر بخش نے بتایا ہے کہ تمہارا بیٹا فیضو بکریاں چرانے گیا تھا اور پھر لوٹ کر نہیں آیا۔'' چھتوں خان نے دردمندانہ لہجے میں پوچھا۔ ''ہاں سرکار! کل سے میرے فیضو کا کوئی اتا پتا نہیں چل سکا۔ اللہ جانے کہاں چلا گیا ہے؟ اور کس حال میں ہو گا؟'' ''بابا! صبر کر۔ اللہ اس کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ کسی پیر فقیر کے در پر جا کر دعا کرو، اللہ بھلی کرے گا۔'' چھتوں خان کے تسلی آمیز الفاظ سے اللہ رکھے کی ڈھارس بندھی اور مشکور ہو کر خان صاحب سے مخاطب ہوا۔ ''اللہ آپ کی زبان مبارک کرے اور جلد میرا بیٹا گھر واپس آ جائے۔ میں کل ہی خواجہ صاحب کے مزار پر دعا کے لیے جاؤں گا۔'' چھتوں خان نے بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا: ''ٹھیک ہے بابا! دکھ تکلیف میں پیر فقیر کا

''لالا'' پکڑا جا رہا ہے۔ اس دکھ کو اللہ کی آزمائش سمجھ۔ حضرت یعقوب کا بیٹا حضرت یوسف بھی اسی طرح بکریاں چراتے ہوئے گم ہوا تھا۔ اور پھر وہی گم شدہ بیٹا مصر کا بادشاہ بن گیا تھا۔''

اسی اثنا میں اس نے اپنے کارندے قادر بخش کو اشارہ کیا، جس نے ہزار ہزار کے تین نوٹ اللہ رکھے کے ہاتھ میں تھما دیے۔ تو وہ احسان مند ہو کر خان صاحب کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اور دعائیں دینے لگا ''اللہ خان صاحب کی جھولی کو آباد رکھے تو بڑے باپ کا بڑا بیٹا ہے، تیرا بابا سائیں بھی ہر دکھ درد میں ہم غریبوں کی پیچھے چھاں بن جایا کرتا تھا۔ اللہ آپ کے سائے کو ہم پر سلامت رکھے۔''

گم شدہ بچے کیا واقعی بادشاہ بنتے ہیں؟ مسجد کے مولوی سے حضرت یوسف کا قصہ سن کر کبھی کبھی اللہ رکھا اور اس کی بیوی کو یہ خیال آتا تھا مگر اگلے ہی لمحے دل میں ایک درد کا آتش فشاں پہاڑ پھٹتا۔ کھانا کھاتے کھاتے ہوئے لقمہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا۔ ہم یہاں کھا رہے ہیں، اسے کھانا نصیب ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ ٹھنڈا پانی، میٹھا شربت انھوں نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا، ان کا لال لالا نہ جانے کب کا پیاسا ہو گا۔ رات کو سوتے سوتے اچانک آنکھ کھلتی کہ ستارے کنکریاں بن بن کر آنکھوں میں اتر آتے اور بیٹے کی یاد بستر پر کانٹے بچھا دیتی تھی۔ ہوا کے شریر ہاتھ دروازے پر دستکیں دیتے تو دونوں میاں بیوی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دروازے تک جاتے۔ دروازہ کھول کر باہر دیکھتے۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے کے سوا اور کچھ نہ ہوتا مگر اب بڑھاپے نے ان کی بینائی کو بھی تو کمزور کر دیا تھا اس لیے گھر سے باہر نکل کر ادھر ادھر اندھیرے میں ٹٹولتے۔ ''لالو میرے شہزادے کہاں ہو تم؟'' ان غم زدوں کی حالت زار دیکھ کر رات کا سناٹا بھی بین کرنے لگتا تھا۔

بستی لالو شاہ نہ جانے کتنے برسوں سے بلوچوں اور ملکوں کا میدان کارزار بنی ہوئی تھی۔ زمانہ جاہلیت کے دور جیسی عداوتیں ان دو قوموں کے بیچ پل رہی تھیں۔ ایک دوسرے پر وار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ الیکشن کے دنوں میں بستی کے حالات خطرناک حد تک حساس ہو جاتے تھے۔ دوسری برادریوں کے لوگ غریب طبقہ خاص طور پر دوہرے عذاب میں مبتلا ہو جاتا تھا۔ دونوں زمیندار پارٹیوں کی طرف سے ووٹ نہ دینے کی صورت میں سنگین نتائج بھگتنے کی انھیں دھمکیاں ملتیں۔

ایک تو ان دو گروہوں نے بستی کی فضا میں کشیدگی پیدا کر رکھی تھی، دوسرا لالو کے بعد بچوں کے گم ہونے کا ایک سلسلہ ہی چل نکلا تھا۔ پچھلے پانچ سالوں میں کوئی آٹھ بچے غائب ہو چکے تھے۔ ان آٹھ گھروں میں تو گویا قیامت بپا ہو گئی تھی۔ اب تو ہر کوئی اپنے اپنے بچوں کی مکمل نگہبانی کرتا۔ مغرب کی اذان کے بعد تک اگر کوئی بچہ گھر نہ پہنچتا تو اس کے والدین دیوانہ وار گھر سے نکلتے، جگہ جگہ ڈھونڈتے، جب تک انھیں پتہ چل نہ جاتا تب تک وہ چین نہ پاتے تھے۔

بستی لالو شاہ کے بچوں کے اغوا کی خبریں اکثر میڈیا کے ذریعے ملک بھر میں گونجتی رہتی تھیں۔ شک یہی کیا جاتا تھا کہ سرحدی علاقوں میں موجود بیگار کیمپوں کے کارندے انھیں اغوا کر کے لے جاتے ہیں اور وہاں ان معصوم بچوں سے جبراً مزدوری کرواتے ہیں، شام کو پھر بیڑیوں میں زنجیریں ڈال کر قید خانوں میں بند کر دیتے ہیں۔ اس لیے موسم سرما میں جب کندھوں پر بیگ اٹھائے ہوئے پٹھانوں کے گروہ بستی میں آتے تو بستی والے انھیں مشکوک نظروں سے دیکھتے تھے لیکن نواز خان اور دوسرے بستی کے زمینداروں کی جانب سے ان کے ساتھ اچھا ہمدردانہ سلوک کیا جاتا تھا کہ وہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں اور اتنی دور سے روزی کمانے آتے ہیں۔

ایک معروف چینل کے صحافی احمد قریشی نے بستی لالو شاہ کا طویل صحرائی سفر اختیار کیا تا کہ آئے دن ہونے والی بچوں کے اغوا کی

وارداتوں کا کھوج لگا سکے۔ اونچے اونچے ٹیلوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی کالی سڑک، آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی بس کے آگے بچھی ہوئی تھی۔ بس کی کھڑکیوں کا کوئی شیشہ سلامت نہ تھا جن میں سے گرم ہوا کے جھونکے بس کے اندر آ رہے تھے۔ وہ تو بھلا ہو ڈرائیور کا جس نے کیسٹ پلیئر پر بجا رکھے نغمے لگائے ہوئے تھے۔ "چلے اک ٹھنڈی ہوا" اس عربی موسیقی نے صحرائی سفر کو خوش گوار بنا دیا تھا۔ لیکن راستے میں ایک لوکل بس سٹاپ سے ایک مولانا صاحب بس پر سوار ہوئے۔ صحافی کے ساتھ والی خالی سیٹ پر آ کر براجمان ہو گئے اور بیٹھتے ہی ڈرائیور سے مخاطب ہو کر، با آواز بلند چلائے: "او کچھ خدا کا خوف کر استاد جی! کیوں ہم سب کو گناہ گار کرتا ہے۔۔۔ قیامت کے دن موسیقی سننے والوں کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈالا جائے گا۔" بس کا ڈرائیور مولانا کی سخت اور درشت لفظوں کی تنبیہ سے خوف زدہ ہو کر، اپنے اوپر لگے سرخ بٹن کو دباتا ہے اور نور جہاں کی سریلی آواز اپنے خدائی اثر کے ساتھ صحرا میں گم ہو گئی۔ اور اب وہی گرم ریت کا صحرا تھا اور مسافر تھے کہ سفر ایک صورت اختیار کر چکا تھا جیسے وہ قافلہ کسی جہنم کی کھائی سے گزر رہا ہو۔

"مولانا صاحب! عربی کے لفظ "حدی" کے معنی تو آپ جانتے ہوں گے؟" صحافی نے مولانا سے مخاطب ہو کر دریافت کیا۔ مولانا نے مڑ کر صحافی کی طرف دیکھا اور لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے سر نفی میں ہلا دیا تو صحافی نے حدی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: "جناب مولانا صاحب! عرب کے لوگ جب اونٹوں پر سوار ہو کر صحراؤں کے لمبے لمبے سفر کیا کرتے تھے تو اس وقت ان میں جو کوئی خوش الحان ہوتا، وہ اپنی سحر انگیز آواز میں نغمے الاپتا، جس کی تاثیر سے صحرا میں ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے چلنے کا احساس ہوتا تھا اور طویل صحرائی سفر ایسے لگتا تھا جیسے ایک ہی جست میں طے ہو گیا ہو۔"

"لاحول ولا قوۃ ۔۔۔ گویا تم مجھے یہ بات بتا کر سمجھانا چاہتے ہو کہ موسیقی جائز ہے۔" مولانا کا چہرہ غصے سے لال پیلا ہو گیا تھا۔ صحافی نے قدرے تحمل سے جواب دیا: "مولانا صاحب! میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔۔۔ لیکن اس وقت ہم ان لحنوں کی بہت کو حدی خوانی کے عمل کے مترادف قرار دے سکتے ہیں۔" مولانا صاحب لاجواب تو شاید ہو گئے تھے لیکن دوسری طرف منہ کر کے بڑبڑاتے رہے۔ "توبہ توبہ! آج کل کے نوجوان چار جماعتیں کیا پڑھ لیتے ہیں کہ لگ جاتے ہیں مذہب کے معاملات میں ٹانگیں اڑانے۔ ایسے پڑھے لکھے ہونے سے تو جاہل ہونا بہتر ہے۔" صحافی نے مولانا کے ان جملوں پر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا اور جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ وہ بستی لالو شاہ کے حالات و واقعات کا جائزہ لینے آیا تھا کہ ہر آنے دن چھوٹے بچوں کے اغوا کی وارداتوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کی اصل وجہ بات معلوم کر سکے۔ اب کی بار تو خود چنوں خان کا بیٹا بھی اغوا کاروں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ بستی کے لوگوں نے کچھ اور وجوہات بھی بتائیں لیکن زیادہ تر لوگوں نے یہی شک ظاہر کیا کہ ان کی بستی میں جو پٹھان محنت مزدوری کرنے آتے ہیں وہی بچوں کو اٹھا کر لے جاتے ہیں۔

چنوں خان کی حالت بیٹے کی جدائی میں دیوانوں جیسی ہو گئی تھی۔ علاقے کے تمام لوگ خواہ کوئی دوست تھا یا دشمن سب اس موقع پر اس کے غم میں برابر کے شریک تھے۔ ہر کوئی تسلی آمیز الفاظ سے اس کی ڈھارس بندھا رہا تھا۔ اللہ رکھے نے جب چنوں خان کی حالت زار دیکھی تو اس کے اپنے زخم آج پھر سے ہرے ہو گئے تھے۔ دس سال پہلے کھو جانے والے فیضو کے غم کا آتش فشاں پہاڑ اللہ رکھے کے دل میں پھر سے پھٹ پڑا تھا۔ بے اختیار ہو کر چنوں خان کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "خان صاحب! بچوں کے بچھڑنے کا دکھ بڑا دردیلا ہوتا ہے۔ بندے کو جیتے جی مار دیتا ہے۔ بچہ اگر مر جائے تو کچھ عرصے بعد صبر آ جاتا ہے، کہ قدرت کی یہی مرضی تھی۔ لیکن خان

صاحب ایسے بچے اغوا، یہ ظلم تو بندے ہی بندوں پر کرتے ہیں۔ اس صدمے میں انسان مرتے دم تک سلگتا رہتا ہے۔ اللہ رکھے کے درد بھرے بین نے چنوں خان کے غم کو اور بڑھا دیا تھا۔ اس کا دل ایک آگ کی بھٹی کی مانند دہکنے لگا۔

اگلے ہفتے کے دوران چنوں خان دوبئی کے لیے روانہ ہو گیا۔ چونکہ اسے پورا یقین تھا کہ یہ سب کچھ بلو خان کا کیا دھرا ہے کیونکہ وہ پچھلے دس بارہ برسوں سے اپنے ملک کے بچے اغوا کر کے عربی بدوؤں کو سپلائی کرتا تھا۔ جس کے عوض اسے منہ مانگی رقم ملتی تھی۔ اس کے اس کاروبار میں چنوں خان بھی برابر کا حصے دار تھا۔ اب کچھ ماہ سے ان کی آپس میں ان بن ہو گئی تھی۔ چونکہ رقم وصول کرنے کے باوجود چنوں خان نے بچے کا انتظام نہ کیا تھا۔ اس لیے بلو نے چنوں خان کے آٹھ سالہ بیٹے کو اغوا لیا تھا۔ بلو کی جان پر اس لیے بنی ہوئی تھی کہ وہ لاکھوں ریال ایک عربی بدو سے ایڈوانس کی صورت میں لے چکا تھا اور اسے چند دنوں میں دوبئی میں اونٹوں کی دوڑ کا میلہ تھا اور اس دوڑ کے لیے اس بدو کو ایک ایسے کم سن، معصوم اور کمزور بچے کی ضرورت تھی، کہ جس کی دل دوز چیخوں سے اس کا اونٹ تیز دوڑ سکے۔

صحافی احمد قریشی کو جب چنوں خان کے ذریعے سے یہ سب کچھ معلوم ہوا تو وہ سناٹے میں آ گیا اور اس کی روح تڑپ اٹھی۔ وہ عربی جن کو اپنی زبان کی فصاحت و بلاغت پر اتنا ناز ہوتا تھا جو دوسرے غیر عرب ممالک کے لوگوں کو عجمی یعنی گونگا کہا کرتے تھے مگر افسوس کہ اب وہ خود اس قدر گونگے ہو چکے ہیں کہ انہیں اپنے صحرائی جہازوں کے لیے خریدی ہوئی معصوم بچوں کی چیخوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

◆◆◆

انڈیا کے چند معروف ادبی رسائل

سہ ماہی "انتساب"
مسلسل 33 سال سے شائع ہو رہا ہے
مدیر ڈاکٹر سیفی سرونجی کے زیر نگرانی
ملنے کا پتہ
سیفی لائبریری سرونج (ایم پی) انڈیا
رابطہ نمبر: 0091-9425641777

ماہنامہ "شاعر" بمبئی
مسلسل 86 سال سے شائع ہونے والا
مدیر افتخار امام صدیقی
ملنے کا پتہ: 202-228، پیام حق بلڈنگ
پی ڈی مارگ بمبئی انڈیا
رابطہ نمبر: 0091-9324515157

ماہنامہ "انشا" کلکتہ
مسلسل اشاعت کا 30واں سال
مدیر: ف۔ س۔ اعجاز
ملنے کا پتہ: 25-B مارکیٹ اسٹریٹ کلکتہ-700073
رابطہ نمبر 09133-22354616

دو ماہی "نگینہ" کشمیر
منفرد ادبی جریدہ
مدیر: وحشی سعید
ملنے کا پتہ: پوش کرن، سری نگر، کشمیر-190010

غزلیں

خالد شریف

○

دل بھی سوچ کر لگانا ہے
جس نے جانا ہے اس نے جانا ہے

جتنا لکھا ہے مل ہی جائے گا
آب و دانہ تو آب و دانہ ہے

احتیاط، احتیاط، یار مگر
میری جاں دیکھ یہ زمانہ ہے

دوستو آج معذرت سب سے
آج کی شام اس نے آنا ہے

تم بھی اپنی کہو، میں سن لوں گا
میں نے بھی کچھ تمہیں سنانا ہے

میری چڑیاں اداس پھرتی ہیں
ان میں اک شجر لگانا ہے

کچھ پرندے یہاں اتر آئے ہیں
کھیتی میں آشیانہ بانا ہے

اک کچھ اور اور ہو گئے ہیں
جب سے اس گھر میں آنا جانا ہے

لگے وہاں ہجوم کیا محبت کا
میں نے اک بار کہہ دیا تھا "ہے"

آخرش ہم پہ بھی کھلا، دنیا
اک توہم کا کارخانہ ہے

مجھ کو بیدار کرنے والے ٹھہر
خواب ہے اور بڑا سہانا ہے

جانے کس جنگ میں ہیں ہم خالد
آج ہم نے اسے بھلانا ہے

○○○

جلیل عالی

○

اک اپنی جان پہ سارے وبال کیا مطلب
بس اک جہاں میں ہے سچ کا مآل کیا مطلب

ازل سموں سے ہر اک سمت آندھیاں شر کی
ہوا سے تیر کہیں خال خال کیا مطلب

کبھی کسی کی محبت پہ کچھ کہا ہم نے
ہمارے عشق پہ اتنے سوال کیا مطلب

وضاحتوں میں تو کوئی کمی نہ رہنے دی
ہوا نہ پھر بھی بھروسہ بحال کیا مطلب

تم اپنی سوچ مطابق کسی حساب سہی
ہمارے خواب کریں پائمال کیا مطلب

فلاح کی بھی ہو دنیا کو اور یہ کہتے ہو
کہ جال کو نہ کہا جائے جال کیا مطلب

اک ایسا رنگ کہ اک اپنی انگ ہو عالی
کسی کے لفظ کسی کا خیال کیا مطلب

○○○

پروفیسر مظفر حنفی (انڈیا)

○

میں کہ جو خواب تھا
شہر میں سیلاب تھا

ہم بھی چلتے ہی رہے
ہم اگر مہتاب تھا

ناؤ میں سوراخ تھے
جانتے گرداب تھا

شمع پہ بجھتے چراغ
پھول زیر آب تھا

ہم کہاں تھے دستیاب
تو اگر کمیاب تھا

میری خاموشی کے گرد
اور اسباب تھا

○○○

محمود شام

O

حاکم وقت ہر اک شخص کی اجرت مانگے
اپنی اولاد سے ماں دودھ کی قیمت مانگے

پھر نیلتی ہے شب ہجر گلی کوچوں کو
شہر گھبرایا ہوا مجھ سے امانت مانگے

عشق سوئی ہوئی جھیلوں میں بھی طوفاں چاہے
حسن بچھڑے ہوئے دریا سے مروت مانگے

کیوں چمکتی ہے اجالے کو بکھر جاتے ہیں
صبح کیوں رات سے آنے کی اجازت مانگے

جبر جب حد سے بڑھے عمر بھی جب ہو دکھے
وقت مظلوم سے پھر حرف بغاوت مانگے

خامشی لاکھ سہی کان لگائے رکھو
جانے کب کس کی صدا حسن سماعت مانگے

گاؤں سے چاند کے کٹھکارو ہیں شہروں میں
شہر کیوں گاؤں کی قیمت پہ حفاظت مانگے

OOO

بسمل صابری

O

خوشیوں کو ہم سے روٹھے زمانے گزر گئے
جب حادثے کا رو تھا طوفاں بکھر گئے

سب کچھ وہی تھا شہر وہی اور مکاں وہی
لیکن محبتوں کے زمانے کدھر گئے

اصل بہار آئی مگر تم نہیں ملے
ہم تھے کہ ڈھونڈنے تمہیں شام و سحر گئے

انکی ہوئے دور تھی دنیا چل گئی
ان آنسوؤں کے ساتھ بہت سے بکھر گئے

تنہا رتجگے گزاریں شب ہجر کی طرح
پھر بھی تری تلاش میں ہم دربدر گئے

سوچا تھا ہم قریب نہ آئیں گے عمر بھر
ہر موڑ پہ ملے کے ہر جا ٹھہر گئے

تو نے تو دیکھا ہوگا ستاروں کو بار بار
ٹوٹے ہوں آسماں سے تو بسمل بکھر گئے

OOO

اسلم گورداسپوری

O

نہ بندگی کی خبر تھی نہ تھا خدا معلوم
یہ دنیا کیا ہے کسی کو بھی کچھ نہ تھا معلوم

میں چل پڑا تھا نئی زندگی کی راہوں پر
نہ منزلوں کی خبر تھی نہ راستہ معلوم

تمام عمر خدا کو تلاش کرتے رہے
خدا کے بارے میں کچھ بھی نہ ہو سکا معلوم

یہ دنیا کھیل تماشا نہیں حقیقت ہے
یہ راز ہم کو ابھی تک نہ ہو سکا معلوم

بس ایک حرف اناالحق پہ اس کو مار دیا
کیا نہ اس کا کسی نے بھی مدعا معلوم

جناب شیخ کا تو کام ہے قول فعل
کسی کی کب کیا کرتے ہیں وہ رضا معلوم

زمانہ سارا ظلم و فریب و عقیدت ہے
کریں گے حشر میں کس کس کی وہ خطا معلوم

نہ زندگی کے حقائق کا تھا کسی کو شعور
کسی عرش کی کسی کو نہ تھی ہوا معلوم

طلوع کس کی طلوع تھا کہ یہ دھواں تھا
یہ دنیا کیسے بنی یہ نہیں ہوا معلوم

تمہارا نام تو ہم نے کبھی لیا ہی نہیں
کہ جیسے کہہ دیا جاتا ہے نام نامعلوم

زمانہ جیسے اپنے پاؤں کی ٹھوکر دیا
ہوا نہ ہم کو کسی کا بھی نقش پا معلوم

تم اپنا کام رکھے ہو بیشتر اسلم
ہر ایک بات کی کرتے ہو انتہا معلوم

OOO

مرزا احمد نور طائر

○

پوچھا ہے کار سے یہ آپ نے کیا کر دیا
روشنی ممکن نہ تھی، گھر گھر اندھیرا کر دیا

ہم ایسا تھا کہ جس کا ہو سکے نہ اندمال
ہاں مگر اس کی مسیحائی نے اچھا کر دیا

جب کوئی گفتگو میں دوسرا حائل نہ ہو
میں نے اپنے آپ کو یکجا یہاں بھی تنہا کر دیا

ہاتھ سے لے کر قلم کاغذ مرے حق دار نے
صرف مشکل تنہا دے کے بچا کر دیا

آہ! اس عہدِ رواں کا یہ بھی ہے اک المیہ
زر پرستی کی وبا نے سب کو اندھا کر دیا

چاند سے لے کر ستاروں تک سبھی کچھ مستعار
کس نے میرے خانۂ دل میں اجالا کر دیا؟

خاطر آتی کیا ادائیں آپ کی اچھی نہیں
اس کو چاہا آپ نے اس کو ہی رسوا کر دیا

○○○

جاوید صدیق بھٹی

○

اس سے پہلے کہ قلم جدا ہو جائے
اک نیا ظلم پھر عطا ہو جائے

اپنے اندر کہیں میں سو جاؤں
اور تری یاد آ کے ہوا ہو جائے

دیکھ لے وہ کبھی محبت سے
دل کا موسم بھی ہرا ہو جائے

مجھ سے مل لے وہ ایک بار تو پھر
عمر بھر کے لیے جدا ہو جائے

اس سے کیسی یہ دل کی بات ظہیر
جس قدر مجھ سے وہ خفا ہو جائے

یہ بھی ممکن ہے اس محبت میں
آدمی بھی یہاں خدا ہو جائے

○○○

سیفی سرونجی (انڈیا)

○

نہیں زمانے میں آج باقی
خلوص کا اب رواج باقی

کہاں گیا وہ غرور ہمارا
نہ شاہ باقی نہ تاج باقی

لگائے سب نے ہی زخم دل پر
نہیں ہمارا علاج باقی

یہ ہمارا ہے جیتے ہم
ہے اس کا پھر بھی خراج باقی

نہیں ہے کا کسی کو احساس
تمہارا جب تک ہے راج باقی

بدن پہ کپڑے نہ آنکھ میں شرم
رہی کسی میں نہ لاج باقی

○○○

محمد اسلم

O

بھول جاؤں سارے شکوے سب گلے
میرے من کا دریچہ گر کھلا

تیرا محمل ہی نہیں تھا ورنہ تو پاس
زندگی میں کتنے گذرے قافلے

ہے ادھورا لاڈ گل کا نکھار
اس میں گر شامل نہیں ہیں آبلے

تو نہیں تو ساتھ تھا تیرا خیال
خود فریبی نے مٹائے فاصلے

اوب کر اس پار دیکھیں گے کبھی
ہم یہ کم ہیں زندگی کے سلسلے

ہے مسلسل زندگی میں اضطراب
زندگی ہے تو رہیں گے مرحلے

کیوں بتائے آپ کو یہ بات ہم
آپ جاری رکھیں اپنے مشغلے

OOO

پرتپال سنگھ بیتاب (انڈیا)

O

چشم حیرت سے دیکھتا کیا ہے
آئینہ مجھ سے چاہتا کیا ہے

لے کے کام سے پڑا کر آنکھ
کل کا اخبار دیکھتا کیا ہے

کچھ تو رکھ واپسی کی گنجائش
آگے ہی آگے دوڑتا کیا ہے

گم ہوا ہے زمیں پر تیرا وجود
آسمانوں میں ڈھونڈتا کیا ہے

ڈوب کر دیکھ راز پانی کے
اوپر اوپر ہی تیرتا کیا ہے

چھوٹ جائے گی آخری گاڑی
دیکھتا کیا ہے سوچتا کیا ہے

فاصلوں کے دیار میں بیتاب
ہر گھڑی من کو مارتا کیا ہے

OOO

ریاض ندیم نیازی

O

دے کر مجھے الفت کا یہ آزار مرے یار
کر ڈالا مری زیست کو دشوار مرے یار

یہ حادثہ پُر خار ہے، ہر گام سنبھل کر
گر جائے نہ سر سے تری دستار مرے یار

کیا سچ اس پردۂ احوال جنوں سے
کھل جائیں گے اک روز یہ اسرار مرے یار

ہو جائے گا بے لطف یہ ہستی کی مسافت
ہر شخص ہی چلنے کو ہے تیار مرے یار

ہر سمت یہاں زندگی پر مشکل میں پھنسی ہے
کوئی نہیں یوسف کا خریدار مرے یار

میں ہی تھا ندیم وہ ہستی، جو مجھے بھی
کر ڈالا ترے عشق نے بے کار مرے یار

OOO

محمد آصف مرزا

O

کسی کے درمیاں ہوں یا پانی میں گم ہوں
مگر یہ طے ہے میں دریا کی روانی میں گم ہوں

کہیں کوئی سمندر تک رواں ہے راہ میری
میں دریا ہوں اور اپنی ہی روانی میں گم ہوں

ہر پانی سے پیا تھا اس کو پھر پانی بنایا
بلا کا ہوں میں لفظوں کو اور "معانی" میں گم ہوں

ازل سے اس زمیں پر میں اتر کر آ گیا تھا
مگر اب تک لوٹ آنے کی آسانی میں گم ہوں

ادھر تیری صفات و ذات پر حیرت تحرّک
ادھر اپنے نشاں بے نشانی میں گم ہوں

مکاں و لامکاں کی تنگ دامانی سے ہٹ کر
میں اپنے اندروں کی بے کرانی میں گم ہوں

OOO

محمد سلیم ساگر

O

وہ چاند ابھی دل کے فلک پر نہیں آیا
سو موج میں اشکوں کا سمندر نہیں آیا

اللہ کرے خیر سے ہوں شہر کے سب لوگ
کب سے مری جانب کوئی پتھر نہیں آیا

وہ ہوش کی صحبت کوئی دن بھر نہیں ملی
یوں نیند کا جھونکا کوئی شب بھر نہیں آیا

کھلتا ہے تو کھلتے ہیں ترے عشق کے آداب
افلاک سے کوئی بھی چل کر نہیں آیا

ٹھہرا ہوا آنکھ میں ٹھہرا ہوا آنسو
یہ کون سا لمحہ ہے کہ آ کر نہیں آیا

تخلیق جداول ہے ترے شہر کا ہر شخص
کیا پہلے یہاں کوئی قلندر نہیں آیا

تم شکر کرو شہر سلامت ہے تمہارا
بھونچال مرے جسم سے باہر نہیں آیا

اک رقص غزالوں کے تعاقب میں گیا تھا
کہتے ہیں کہ پھر لوٹ کے ساگر نہیں آیا

OOO

طاہر منظور

O

جب کوئی تو بتاتے ہمیں بچھڑنے کا
نظر ملا کے نگاہوں کو پھیر لینے کا

میں اپنے سال گزرنے کے باوجود بھی
یہاں وہ بھول نہ پایا ترے بچھڑنے کا

سنبھل کے پیار کی موجوں سے کھیلنا یارو
وہ چار دن میں یہ دریا نہیں اترنے کا

بچھڑ کے کتنے زمانے گزر گئے پھر بھی
ابھی سلسلہ جاری ہے درد سہنے کا

تمہیں بھی یاد تو ہوگی شب وصال صنم
گمان تک نہ ہوا رات کے گزرنے کا

یہ طے ہے منزلیں خود چل کے پاس آتی ہیں
ارادہ سچا ہو دنیا میں کچھ بھی کرنے کا

ملے حیات تو بخشی ساری پی لی
قریب وقت ہے پیمانے کے چھلکنے کا

ہر ایک عشق میں جنوں کی زینت میں طاہر
مزاج چلتا رہا اور شعر کہنے کا

OOO

پروفیسر صدیق شاہد مرزا

O

غمِ حیات سے کچھ فرصتیں نکل آئیں
محبتوں کی نئی ساعتیں نکل آئیں

بصیرتوں سے تو ہم بہرہ ور ہی اچھے تھے
اداس دل پہ کئی قدغنیں نکل آئیں

انہیں ہے فخر کرم پر، ہمیں قناعت پہ
مقابلے کی بھی کیا صورتیں نکل آئیں

مسافتوں نے تھکن کا شعور چھین لیا
شکستِ جسم میں بھی راحتیں نکل آئیں

ہمارے عہد کا دکھ ہے اگر تو تنہائی
فشارِ روح کی یوں صورتیں نکل آئیں

مجھے یقین ہے مجھے ڈھونڈنے وہ آئے گا
بلند و پست میں جب قربتیں نکل آئیں

اس ایک حرفِ ملامت کی دیر تھی شاہد
درونِ دل پہ نئی کونپلیں نکل آئیں

OOO

شہباز گردیزی

O

دل نے مجھ کو زیر پانے کی ٹھان لی
میں نے بھی اپنی پیاس بجھانے کی ٹھان لی

میں روشنی کے کھیل میں ایسا تھا مبتلا
اپنے ہی گھر کو آگ لگانے کی ٹھان لی

سر سے نکال رکھ دیا آتش اجل کا خوف
میں نے کسی کا لمس جو پانے کی ٹھان لی

کھلنے لگا تھا جس گھڑی حسن و طرب کا باب
اس وقت میرے یار نے جانے کی ٹھان لی

جب خواب دیکھنے لگیں آنکھیں وصال کے
دل نے تمہارا ہجر منانے کی ٹھان لی

درپیش اک جہان تھا دونوں کے درمیاں
میں نے خلا میں پیڑ لگانے کی ٹھان لی

OOO

وصف وفا (امریکہ)

O

سونے نہیں دیتی ہیں طلب گار یہ راتیں
پھر آ کے جگا دیتی ہیں گلزار یہ راتیں

چاندنی میں پروئے ہوئے لگتے ہیں ستارے
اک لمس محبت میں فسوں کار یہ راتیں

اک کرب میں لپٹے ہوئے محسوس ہیں یہ دن
اک ہجر مسلسل میں گرفتار یہ راتیں

اک دست کرم ہاتھ مرا تھام لے ورنہ
دنیا سے ندا کر دیں مجھے بے زار یہ راتیں

دو دن میں محبتوں کا سفر ہم نے کیا ہے
اک صبح سفر دیکھ لے دشوار یہ راتیں

اس راہ کو تکتے ہوئے گزرے ہیں مرے دن
گزری ہیں تری یاد میں سرشار یہ راتیں

OOO

خاکے

قتیل شفائی اور آج کا قاری

(خودنمائی تو نہیں شیوۂ ارباب وفا)

حسن عسکری کاظمی

بہت پرانی بات ہے کہ راولپنڈی کے مرکزی راجہ بازار میں ایک روایتی ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے بائیں طرف تھوڑا جھک رہا تھا اور دائیں طرف ہوٹل کا مالک کاؤنٹر پر نظر رکھے آنے جانے والوں کی طرف پیشہ ورانہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں تاجرانہ چمک لئے توجہ کر رہا تھا۔ میں ان دنوں ویلج ایڈ (VILLAGE AID) میں بحیثیت پی آر او اپنے فرائض ادا کر رہا تھا۔ ایک کرسی پر جا بیٹھا، مجھے صرف چائے کی طلب تھی، میں بڑے سے ہال نما کمرے کا جائزہ لینے لگا، سامنے دیوار پر ایک فریم میں تصویر نظر آئی۔ قریب جا کر دیکھا اور حسرت کا اظہار کرتے ہوئے میں نے خود کلامی سے کام لیا: "اورنگ زیب" مگر یہ تو قتیل شفائی کا پورٹریٹ ہے، دوسرے اس خیال سے ہوٹل میں قتیل شفائی سے کس کی شناسائی ہے۔ ہوٹل کے مالک سے پوچھا "جی یہ مشہور شاعر اور ان کی تصویر یہاں کیسے آ گئی۔" اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے قریب آتے ہی کہا "یہ میرے رشتہ دار ہیں، ہم ہزارہ کے رہنے والے ہیں، ہم دونوں کا بچپن اکٹھے گزرا، اب یہ اورنگ زیب سے قتیل شفائی بن گیا ہے لیکن میرا تو بھائی ہے۔ مجھے کوئی جانے نہ جانے میرے بھائی کو ایک دنیا جانتی ہے۔"

مجھے اس دن معلوم ہوا کہ ہمارے قتیل شفائی کا پیدائشی نام اورنگ زیب ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ نہیں لیکن مرکز علم و ادب لاہور میں رہتے ہوئے انہیں اپنے ہمعصر ادیبوں اور شاعروں کی صحبت نصیب ہوئی۔ قدرت کی فیاضانہ شعری صلاحیتوں سے مالا مال، آسودگی ان کے مقدر میں لکھی گئی، غزل سے عشق اور محبت کی ترجمانی سے سروکار رکھا، مشاعرے پڑھے اور حصول رزق کی خاطر گیت لکھے، یہی انداز حیات اپنا کر اس مرد خود آگاہ نے اپنی عزت کو عزیز جانا۔ ان کے ہاں شاعری میں اپنے اس دل پسند رویے کی صحت صاف نظر آتی ہے۔

حالات کے قدموں پہ قلندر نہیں گرتا ٹوٹے بھی جو تارا تو زمیں پر نہیں گرتا

قتیل شفائی کو حفیظ جالندھری کی قربت میں رہ کر یہ عادت ضرور پڑی کہ وہ مشاعرہ بے معاوضہ نہیں پڑھتے تھے، البتہ دوست نوازی میں یہ خیال رکھتے کہ انفرادی طور پر کسی صورت کوئی طلب نہ ہو، انہوں نے پاکستان کے بیشتر شہروں میں سرکاری، نیم سرکاری یا بڑی معروف ادبی تنظیموں کے زیر اہتمام ہونے والے مشاعروں میں شرکت کی۔ قتیل شفائی نے کھلی آنکھوں سے پاکستانی عوام کی محرومیوں کو دیکھا، غربت و افلاس اور تنگ دستی میں مبتلا لوگوں کو دیکھ کر ان کا دل کڑھتا، احساس محرومی نے عوام کے دلوں میں جگہ بنالی لیکن انہیں حکمرانوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا یارا نہ تھا، جو صورت حالات پچھلی صدی کے آخری دنوں میں تھی وہی آج بھی ہے بلکہ حالات پہلے سے بھی بدتر ہیں۔ پہلے عوام صرف خط افلاس سے نیچے زندگی گزارنے پر مجبور تھے آج خوف جان اور دہشت کے ماحول میں زندگی کی تہمت اپنے سر لئے بیٹھے ہیں۔ قتیل شفائی نے جہاں اپنے عہد کا مرقع کھینچا وہاں آنے والے زمانے کے آلام بھی ان کی چشم تصور نے

دیکھیے، شاعر مستقبل بینی کا ملکہ رکھتا ہے اور حوادث زمانہ کا ادراک اسے پریشان کرتا ہے۔ قتیل شفائی اس سے مستثنیٰ نہیں

جب اپنے اعتقاد کے محور سے ہٹ گیا — میں ریزہ ریزہ ہو کے حریفوں میں بٹ گیا
لٹتے ہوئے عوام کے گھر بار دیکھ کر — اے شہر یار تیرا کلیجہ نہ پھٹ گیا
چوروں کا احتساب نہ اب تک ہوا قتیل — جو ہاتھ بے قصور تھا وہ ہاتھ کٹ گیا

قتیل شفائی نے غزل میں محبت جیسے پاکیزہ موضوع پر جتنے اشعار کہے شاید ہی کسی دوسرے شاعر نے نت نئے پہلوؤں اور منظر زاویوں کو پیش نظر رکھ کر ایسے رومانوی اشعار کہے ہوں۔ اس میں مبالغہ نہیں کہ انھوں نے روایت سے وابستہ رہ کر جو غزل تخلیق کی اسے ان کی زندگی میں پذیرائی حاصل ہوئی۔ ان کے شعری مجموعے ہاتھوں ہاتھ خریدے گئے مگر افسوس ہے کہ آج کا قاری قتیل شفائی سے بیگانہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے ادبی جریدوں میں ان کا ذکر کم سے کم آتا ہے۔ اسی طرح ان کے گیت ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے مختلف چینلز پہ نہ ہونے اور نہ سننے کے برابر ہیں۔ قتیل شفائی کی غزل میں غم محبت کے ذکر کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ اس غم کو سچائی قرار دے کر یہ باور کرایا گیا ہے کہ یہی وہ غم ہے جس کی معرفت دلوں میں وسعت پیدا کرتی ہے اور زندگی کو اس خوشی بسر کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح محبت میں ہر طرح کے امکانات پائے جاتے ہیں۔

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے — کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے
کیا تھا عشق جو باعث رسوائی بن گیا — یارو تمام شہر تماشائی بن گیا
بن مانگے مل گئے مری آنکھوں کو رت جگے — میں جب سے ایک چاند کا شیدائی بن گیا
اپنے ہونٹوں پہ سجانا چاہتا ہوں — تجھے میں گنگنانا چاہتا ہوں
آخری ہچکی ترے زانو پہ آئے — موت بھی میں شاعرانہ چاہتا ہوں

قتیل شفائی یوں تو شاعر محبت ہیں اور انھیں دل دردمند طرز و ہیئت سے مسائل کو غزل کی تمام تر نزاکتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ اس تمام تر غم توانائی کے باوصف تپش عشق کی لذتوں کے اظہار پر قادر ہیں۔ وہ آرزو حسرت ناکام میں جو انھوں کی طرح شام سے جلنے کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی آتش ہجراں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو کر شعلۂ عارض کا نام سے جل جانے کو موضوع گفتگو بناتے ہیں اور خود ہی اس خودشناسی کی تردید کرتے ہوئے یہ بتانا ضروری خیال کرتے ہیں۔

خود تماشائی تو نہیں شیوۂ ارباب وفا — جن کو جلنا ہو وہ آرام سے جل جاتے ہیں

قتیل شفائی نے غم خانۂ میکدے کو اپنی پسندیدہ جگہ قرار دیا۔ انھیں مرزا غالب کی طرح بادہ و ساغر سے رغبت رہی۔ شاعری میں شراب آتے اور شراب ناب سے جی بہلانے سے زیادہ ولولہ انگیز اور ورود جام سے لطف اندوز ہونے کی باتیں عمومی رویہ خیال کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ واعظ اور زاہد بھی پردۂ شب میں سر جھکائے داخل میخانہ ہونے کے قصے غزل میں در آئے۔ قتیل شفائی نے احترام آدمیت کے حوالے سے یہ موضوع بیان کر کے میکدے کو تمثیل میں پیش کیا ہے اور ایسے افراد انسانی جو واعظ و زاہد کو ٹھکرائے گئے انھیں میکدہ راس آ جاتا ہے۔

نکل کر دیر و کعبہ سے اگر ملتا نہ مے خانہ — تو ٹھکرائے ہوئے انساں خدا جانے کہاں جاتے

تمہاری بے رخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی — تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے

آج قاری کو جو غزل پڑھنے کو مل رہی ہے اسے جدت پسند غزل گو شعرا تخلیق کر رہے ہیں اس میں وہ سرمستی اور خود آگہی نہیں بلکہ آج غزل میں چونکانے کا حربہ کام آتا ہے، وہ دل میں نہیں اترتی بلکہ اسے الفاظ میں سے معانی پیدا کرنے کے سبب سراہا جاتا ہے۔ قتیل شفائی نے اسے نئی نسل سے تعبیر کیا ہے، یہ رسم چل پڑی ہے یہی وجہ ہے کہ بظاہر غزل کا مستقبل روشن ہے لیکن اگر آج غزل اپنی روایت سے بے تعلق ہو کر زندہ رہنے کی کوشش کرتی ہے تو اس کی مثال اس ہوائی قلعے کی ہوگی جو اپنی بنیاد سے محروم ہے۔ قتیل شفائی نے ٹھیک ہی کہا

مرحلہ رات کا جب آئے گا — جسم سائے کو ترس جائے گا
چل پڑی رسم جو کج فہمی کی — بات کیا پھر کوئی کر پائے گا

قتیل شفائی نے اپنے شعری مجموعوں کے نام اپنے ذوق کے مطابق رکھے، سمندر میں سیڑھی، آموختہ، گجر، رنگ، خوشبو، روشنی، گفتگو ان سب کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم ایسے جہاں دیدہ، آئینہ دل اور کھرے شاعر سے ملاقات کر رہے ہیں جس کی باتیں دل میں اتر جاتی ہیں، وہ اسے شاعر تسلیم نہیں کرتے جو کسی کی مدح و ستائش کسی انعام کے لالچ کی بنیاد پر کرتا ہے، قانون فطرت کی تعظیم اور مشاہدے جیسی عظیم نعمت سے متمتع ہو کر شرف انسانیت کی دلیل روشن ہے، ہماری آنکھ جو منظر بانٹ رہی ہے وہ خالق کائنات کا زندہ معجزہ ہے۔

گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا — لیکن کسی دریا میں سمندر نہیں گرتا
اس بندۂ خود دار پہ نبیوں کا ہے سایہ — جو بھوک میں بھی لقمۂ تر پر نہیں گرتا
انعام کے لالچ میں لکھے مدح کسی کی — اتنا تو کبھی کوئی سخنور نہیں گرتا
کرتا ہے جو سر معرکۂ زیست تو فن سے — لے بازوئے حیدر وہ خیبر نہیں گرتا

قتیل شفائی روایت کے شجر سے پیوستہ رہ کر جو بات کرتے ہیں اس میں شائستگی اور احتیاط سے کام لے کر اپنے تجربے کے اظہار کی راہ نکالنے میں طاق ہیں، اسی طرح وہ پہلے سے بیان کئے گئے موضوع کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کر دیتے ہیں، اس اعتبار سے ان کی غزل میں فکری عناصر اور نئی جہات کے امکانات کی نئی کسک اور نفسیاتی الجھنوں کو سلجھنے کا آغاز ہوا۔

تو نہ ہوگی تو پھر اے شام فراق — کون آ کر ہمیں بہلائے گا
نہ رہے جب وہ بھلے دن بھی قتیل — یہ زمانہ بھی گزر جائے گا
آسودہ جس قدر وہ ہوا مجھ کو اوڑھ کر — کل رات اس کے جسم کی چادر بھی میں ہی تھا
آئینہ دیکھئے پہ جو الزام ہوا قتیل — مطلب ضمیر کا وہ سکندر بھی میں ہی تھا

قتیل شفائی کی غزل کا حسن و جمال اور اس شاعر باکمال کو خراج تحسین کی نذر کرنے سے ہم مرکز روح غزل سے دور ہو سکتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ "گا ہے گا ہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را" مگر یہ قصہ اتنا پرانا بھی کب ہے ابھی کل کی بات ہے وہ اور ان کے دوسرے ہمعصر شاعران رومان ہمارے درمیان موجود تھے۔ وہ آج کے قاری سے مخاطب ہیں۔

میں سرمد و منصور بنا ہوں تری خاطر — یہ بھی تری امید سے کم ہے تو مجھے کیا

◆◆◆

میرا اعزاز

افتخار مجاز

قدرت نے مجھے جن اعزازات سے نوازا ہے اُن میں سے میرا ایک اعزاز یہ بھی ہے کہ اس نے مجھے اعزاز احمد آذر کا بھائی بنایا ہے۔ میں انہیں ہمیشہ سے اور ہر حوالے سے آئیڈیلائز (Idealize) کرتا آیا ہوں اور آپ کی شخصیت ہمیشہ سے میرے لیے تخلیقی تحریک (Suorce of Inspiration) رہی ہے۔ آج پہلی مرتبہ بتا رہا ہوں کہ میں جناب اعزاز احمد آذر کا (چھوٹا) بھائی ہوں وگرنہ اس سے پیشتر ہم دونوں نے بہت ہی کم تذکرہ کیا ہوگا کہ ہم دونوں سگے بھائی اور ماں جائے ہیں۔ ہم دونوں کے آپس میں بھائی ہونے کو منکشف نہ کرنے کی کوئی اور وجہ نہیں تھی سوائے اس کے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو آگے بڑھنے کی لاٹھی کا حوالہ یا کوئی مفاد حاصل کرنے کا ذریعہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ اس وضاحت کی وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے ان کی رحلت کے بعد اُن کی ذاتی زندگی کے حوالے سے ان کے برادرِ خورد ہونے کے ناطے ایک غیر ادبی سی تحریر لکھنے کا حکم دیا گیا ہے جس کی تعمیل غیر رسمی اسلوب میں کر رہا ہوں۔

یاد پڑتا ہے کہ جب میں چوتھی یا پانچویں جماعت کا طالب علم تھا تو ہم لاہور میں دریائے راوی کے اُس پار شاہدرہ ٹاؤن کی نارنگی بستی میں رہتے تھے اور یہ علاقہ "شاہدرہ پنڈ" کہلاتا تھا۔ والد صاحب نے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور گھر کے معاشی حالات اچھے نہ تھے۔ سب سے بڑے بھائی سرفراز صاحب ہی برسرِ روزگار تھے اور پورے کنبے کے کفیل تھے۔ بھائی جان سرفراز خود بھی ملازمت کے ساتھ ساتھ تعلیم جاری رکھے ہوئے تھے۔ گھر میں معاشی آسودگی میسر نہ تھی، چنانچہ آذر بھائی، جہاں اپنی تعلیم کے ساتھ ساتھ ٹیوشن پڑھا کر بڑے بھائی جان کا ہاتھ بٹاتے تھے وہیں باضابطہ نوکری کی تلاش کے لئے بھی مارے مارے پھرا کرتے تھے۔ انہی دنوں کا قصہ ہے کہ ایف اے پاس اعزاز احمد آذر کو پولیس میں اے ایس آئی بھرتی کر لیا گیا۔ معاشرتی سطح پر یہ ایک اعزاز اور گھریلو معاشی حالات کو بہتر بنانے کیلئے ایک اچھا موقع اور بہترین پیش رفت تھی مگر میرے والد محترم شریف احمد قریشی نے جو خود پولیس سروس سے ہی (قبل از وقت) ریٹائر ہوئے تھے آذر بھائی کو پولیس سروس جوائن کرنے کی اجازت نہ دی۔ آذر بھائی اگر اس وقت پولیس سروس جوائن کر لیتے تو یقیناً اپنی صلاحیتوں، چند ہم پیشہ شگفتگی اور ایک اونچے شخص ہونے کے باعث بہت ترقی کرتے اور کم از کم ڈی آئی جی تو ضرور بنتے مگر والد صاحب نے معاشی تنگ دستی کے باوجود پولیس کی ہاتھ آئی ہوئی ملازمت قبول کرنے سے منع کر دیا اور آذر بھائی نے والد صاحب کے ارشاد کے سامنے سرِ تسلیم خم کرکے تلاشِ روزگار کا سلسلہ جاری کر دیا۔ پھر مجھے یاد ہے کہ آذر بھائی کو ایک ایسے ادارے میں جاب ملنے کی امید پیدا ہوئی جو اُن کے ذوق کی بھی آئینہ دار تھی۔ یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ آذر بھائی اپنے بچپن ہی سے شعر و ادب اور فنونِ لطیفہ کے دلدادہ تھے۔ ہاں! تو میں بات کر رہا تھا ان کو ایک ایسی جاب ملنے کی امید پیدا ہونے کی جو کسی نہ کسی طور اُن کے ذوق اور دلچسپیوں کے حامل ادارے میں تھی۔ نئی ملازمت تو شاید جونیئر کلرک کی تھی مگر یہ ایک بہت ہی باوقار ادارے میں تھی جو فنونِ لطیفہ کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ یہ ادارہ تھا "بیورو آف نیشنل ری کنسٹرکشن" (یعنی بی این آر) مخفف۔ یہ جنرل ایوب خان کے عہدِ صدارت میں وزارتِ اطلاعات و نشریات کے تحت قائم ہوا تھا۔ اس ادارے کو

بعد ازاں پاکستان نیشنل سنٹرز کا نام دیا گیا۔ جب آذر بھائی وہاں انٹرویو دینے کے لئے گئے تو معروف شاعر اور ماہر تعلیم پروفیسر قیوم نظر اس کے ڈائریکٹر تھے۔ اس وقت یہ ادارہ لاہور میں مال روڈ پر چائنیز لنچ ہوم سے ملحقہ عمارت میں قائم تھا۔ وہاں آج کل ڈرائیوں کی مارکیٹ اور ساتھ ہی پاک ٹی ہاؤس ہے۔ خوش قسمتی یہاں آذر بھائی ایک مرتبہ پھر ملازمت حاصل کرنے میں ناکام رہے مگر ڈائریکٹر پروفیسر قیوم نظر نے آذر بھائی کو اعتماد میں لے کر اصل بات بتا دی "نوجوان تمہارا انٹرویو Test تو محض رسمی تھا اصل بندہ تو ہم رکھ بھی چکے ہیں۔" آذر بھائی بتایا کرتے تھے کہ یہ حقیقت بیان کرتے ہوئے قیوم نظر صاحب کے چہرے پر ایک واضح کرب لہرایا تھا۔ جسے کم عمری کے باوجود انہوں نے (آذر بھائی نے) شدت سے محسوس کیا۔ آذر بھائی یہ واقعہ سناتے تو کہتے تھے "میں جب یہاں سے بھی ملازمت کے لئے انکار سن کر دفتر کی سیڑھیاں اترتے ہوئے نیچے آیا تو میرے رخسار آنسوؤں سے تر تھے۔ گھر پہنچ کر میں تنگی ہی دہلیز پہ کھڑا یہ سوچتا رہا کہ کچن کے پاس بیٹھی منتظر ماں کو یہ کیسے بتاؤں گا کہ آج پھر نوکری نہیں ملی۔" تاہم وہ کہتے۔ اس روز وفاقی وزارت اطلاعات و نشریات کے اس ادارے میں جونیئر کلرک کی جاب نہ ملنا میرے لئے بہت مفید ثابت ہوا اگر میں اس روز مشتہر کردہ پوسٹ پر بحیثیت جونیئر کلرک فائز ہو جاتا تو پھر شاید ساری زندگی کے لیے کلرک ہی بن کر رہ جاتا۔ شاید میں سینئر کلرک یا ہیڈ کلرک بن جاتا۔ مگر قدرت کا یہ فیصلہ اتنا احسن تھا کہ پھر وقت آنے پر میں اسی ادارے میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے پوسٹ ہوا اور ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے طور پر ریٹائر ہوا۔" یہ عہدہ بلاشبہ آذر بھائی کے ذوق اور مزاج دونوں سے ہم آہنگ تھا۔ شعر و ادب، سیاست و صحافت اور ان شعبوں سے وابستہ لوگوں میں بھائی جان بہت آسودگی محسوس کرتے تھے۔ اس لیے پاکستان نیشنل سنٹر کی ملازمت کے دوران آپ ہمہ تن، ہمہ وقت ادارے کی سرگرمیوں میں مصروف اور Involve رہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انہوں نے اپنے وجود کو پاکستان نیشنل سنٹر میں ضم کیا ہوا تھا تو غلط نہ ہوگا۔ یہاں ان کے رفقاء میں سید ضمیر جعفری، احمد فراز، کشور ناہید، صدیق طاہر، زاہد ملک، خالد رشید شہباز، غضنفر مہدی، کوثر ارشاد، فرزانہ قریشی۔ جیسے لوگ شامل تھے۔ پھر آپ سیالکوٹ، لاہور، ملتان، بہاولپور، حیدرآباد اور گوجرانوالہ جہاں جہاں تعینات رہے ان علاقوں کے اہل دانش بلکہ Talented لوگوں سے ربط و ضبط، تعلق اور دوستیاں ہوئیں جن پر آپ ہمیشہ نازاں رہتے اور ان تعلقات اور دوستوں کو اپنا قیمتی سرمایہ اور اثاثہ سمجھتے اور اپنے اسی تعلق خاطر کی بنا پر وہ دوستوں کی خوشیوں اور غموں میں ضرور شریک ہوتے۔

آذر بھائی کی شخصیت کا ایک اور قابل توجہ اور باعث تحسین پہلو یہ تھا کہ جس کام میں بھی دلچسپی لیتے، اس میں انتہا کر دیتے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آذر بھائی کا بچپن اور لڑکپن زیادہ تر سیالکوٹ، شیخوپورہ، چوہڑکانہ (فاروق آباد) بیاموسیٰ اور شاہدرہ جیسی بستیوں میں گزرا مگر انہوں نے اپنی ناپختہ عمر اور اس وقت کے ماحول کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ کوئی فضول کھیل نہیں کھیلا۔ کسی منفی سرگرمی میں بھی حصہ نہیں لیا۔ مثلاً جُوا، اخروٹ، دائی، گلی ڈنڈا، کبڈی، پتنگ بازی۔ ان سب کھیلوں سے ہمیشہ دور رہے۔ البتہ کرکٹ کھیلنے کا انہیں بے حد جنون تھا اور اس حوالے سے فرسٹ کلاس لیول تک پہنچے۔ تاہم گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے اس سے آگے اپنے کرکٹ کے اس شوق کو جاری نہ رکھ سکے۔ البتہ شعر و ادب اور فن و ثقافت بلکہ فنون لطیفہ سے ان کا تعلق، وابستگی اور شغف بتدریج برقرار رہا اور یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ لاہور کی مضافاتی بستی ہونے کے باوجود شاہدرہ جو فنون لطیفہ کے حوالے سے اپنا کوئی تشخص نہ رکھتا تھا آذر بھائی اور ان کے احباب کی وجہ سے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہوا۔ جب آذر بھائی کو شعر و ادب کا چسکا تھا اور مقامی لوگ انہیں "شاعر شعور" کہہ کر ہی بلاتے

تھے۔ اپنے ذوق اور محنت کی بنا پر وہ شاہدرہ میں ایک بہت بڑی مضبوط اور متاثر کن ادبی Empire بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ شاہدرہ کو ایک بڑے ادبی مرکز کے طور پر Establish کرنے میں وہ کبھی کامیاب نہ ہوتے اگر انہیں یہاں معروف ترقی پسند افسانہ نگار، دانشور اور وکیل جناب سراب اسلم کی رفاقت میسر نہ ہوتی۔ سراب اسلم صاحب کی خدمات کے اعتراف کے طور پر آذر بھائی کے Comments بجا طور پر ان کی اعلیٰ ظرفی کا اظہار کرتے ہیں۔ پھر آذر بھائی نے سراب اسلم صاحب کی محبت کے اعتراف میں ان کے بکھرے ہوئے افسانوں کو جمع کیا اور یکے بعد دیگرے ان کی دو کتابیں شائع کرائیں جن میں سے ایک کا نام "سنگلی کی ناؤ" میرے حافظے میں آج بھی موجود ہے۔ اس ادبی جوڑی نے "مجلس احباب ادب" کے نام سے ایک تنظیم کی داغ بیل ڈال کر شاہدرہ میں ادب کی جوت جگانا شروع کر دی۔ یہ 1960 کی دہائی کے غالباً آخری برسوں کا قصہ ہے، جب آذر بھائی نے جناب سراب اسلم کی معاونت سے شاہدرہ میں میں ملک بھر کے بڑے بڑے اہل علم و دانش، ادبا، شعرا اور فنکاروں کے ساتھ خصوصی شاموں کا انعقاد کیا۔ ان میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی، عارف عبدالمتین، اے حمید، احمد بشیر، حمید اختر، ایرک سپرین، اعجاز بٹالوی، احمد فراز، اشفاق احمد، شیخ محمد اسحاق، تنویر نقوی، قرین قادری، استاد دامن، شکیل ہوشیارپوری، منیر نیازی، حبیب جالب، مرزا ادیب، قاسم محمود، ستار طاہر، انور جاوید، مولانا حامد علی خان، پروفیسر حمید احمد خان، قمر یورش، اور اسلم کمال و دیگر ممتاز شامل ہیں۔ فنکاروں میں سے اداکار محمد علی، حبیب، علاؤ الدین، قوی، ڈائریکٹر پرویز مسعود اور خورشید انور میوزک ڈائریکٹر کے نام اہم ہیں جو ان محفلوں میں تشریف فرما ہوئے۔ میرا اعزاز یہ ہے کہ میں متذکرہ بالا اہل علم و فن کو چائے پانی پیش کرتا۔ ان محفلوں میں ہی میں نے سید جعفری مرحوم، تنویر کاظمی، سی آر اسلم، آئی اے رحمان، حسین نقی، بابا عالم سیاہ پوش، حنیف الدین سیف اور دیگر دانشوروں کو پہلی مرتبہ دیکھا اور ان کی باتیں سنیں۔ میں یہاں ایک بات کا تذکرہ ضرور کرنا چاہوں گا کہ جناب احمد ندیم قاسمی، احمد فراز اور ڈاکٹر وزیر آغا زندگی بھر اس امر کا تذکرہ کرتے رہے جو ریکارڈ پر بھی ہے کہ ان کی ساتھ پہلی ادبی شام "مجلس احباب ادب شاہدرہ" کے زیر اہتمام اعزاز احمد آذر نے منعقد کی۔ یہاں مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب آذر بھائی نے آج کے معروف و مقبول مزاحیہ شاعر انور مسعود کے ساتھ شام کا انعقاد کیا تب وہ اس قدر جانے پہچانے نہیں تھے، شاید ان کی شاعری کی پہلی مقبول کتاب "میلہ اکھیاں دا" بھی ابھی شائع نہیں ہوئی تھی۔ شاہدرہ کی شام منائے جانے کے بعد انور مسعود کا ڈنکا بجنے لگا۔ مجھے یاد آ رہا کہ جناب محسن احسان، خاطر غزنوی، تاج سعید، زیتون بانو، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، واصف علی واصف، رشو بھائی، شفقت تنویر مرزا، عبدالحمید عدم، احسان دانش، حنیف رامے، ڈاکٹر مبشر حسن، شیخ رفیق احمد، کوثر نیازی، حفیظ پیرزادہ اور دیگر کئی ممتاز لوگ آذر بھائی کے لئے یا ان کے ساتھ ہمارے گھر میں آتے ہوئے میری بصارتوں اور قلب و ذہن میں اترے اور میرا ان سے براہ راست Interaction ہوا۔ اور یہ سب آذر بھائی کی شعر و ادب اور سیاست و صحافت سے وابستگی کا ہی اعجاز تھا۔ اعزاز بھائی کا ایک کرشمہ یہ رہا کہ جہاں جاتے اپنا حلقہ احباب بنا لیتے اور ان سے اپنی نسبتیں قائم رکھتے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ صنف لطیف میں ہمیشہ مقبول و پسندیدہ رہے اور متعدد معروف خواتین ہمیشہ ان کے حلقہ اثر میں رہتیں اور ان پر اعتماد کرتیں۔ یہ ہماری بھابی محترمہ مسز شمسہ آذر (جنہیں میں روز اول سے بابی کہتا ہوں) کا بھی کمال حوصلہ اور ظرف ہے کہ انہوں نے اس معاملے میں کبھی آذر بھائی کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ آذر صاحب کو گھر پر ملنے والی خواتین کی خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھتیں۔ شعر و ادب کی دنیا میں کئی ممتاز خواتین شاعرات کی شاعری میں آذر بھائی کا تخلیقی رنگ و ہنر اپنی خوبصورت جھلکیاں دکھاتا ہے۔

عملی انسان کی حیثیت میں وہ ایک ماہر الیکٹریشن اور پلمبر کے طور پر کام کر لیتے تھے۔ کک (باورچی) بہت اچھے تھے اور ہر طرح کے کھانے پکانے میں ماہر تھے اور وسیع دسترخوان پر دوستوں کو کھلانے میں بھی بڑے فراخ دل تھے اور گھر میں احباب کو مدعو کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ اور حوالہ ڈھونڈ ہی لیتے تھے۔ میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ منو بھائی، عبدالحمید عدم، قتیل شفائی، اداکار علاؤالدین، عطا شاد، استاد دامن اور کئی دوسرے اپنے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے تناول فرمانے کیلئے ہمارے گھر تشریف لا رہے ہیں۔ شعروادب میں انکا نام اور مقام کتنا ہے اور انکا Contribution کیا اور کتنا ہے یہ تو ان کا موضوع ہے جو اہم میں نے انہیں ہمیشہ سے ایک قلم مزدور کے طور پر دیکھا۔ وہ ہر موضوع پر قلم برداشتہ لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ ایک بڑے میوزک ڈائریکٹر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ آذر صاحب کے گیت، غزلیں اور دیگر کلام کمپوز کرنا بہت آسان ہوتا ہے کیونکہ ان کی ہر تخلیق اپنی کمپوزیشن ساتھ لے کر آتی ہے اور وہ خود بول رہی ہوتی ہے کہ اسے کس طرح کمپوز ہونا ہے۔ آذر بھائی نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کے لیے بہت لکھا بلکہ آخری دور میں ان کے گھر کا نان نفقہ اور رزق ہی قلم کی مزدوری سے وابستہ تھا اور انہی اداروں اور پرائیویٹ کمرشل تحریریات میں کچھ حد تک سے ان کی روٹی روزی چلتی تھی۔

کسی زمانے میں انہیں اداکاری کا بھی بہت شوق تھا۔ براڈکاسٹر تو وہ ماشاءاللہ بہت ہی "ورسٹائل" تھے ہی کہ تلفظ اور الفاظ کی نشست و برخاست پر انہیں ملکہ حاصل تھا۔ سٹیج کے علاوہ پی ٹی وی پر متعدد ڈراموں میں اداکاری بھی کی مگر یہ سب 1964 سے 1980 کے عرصہ کی باتیں ہیں اس کے بعد انہوں نے ان اداروں اور شعبوں کے لئے صرف لکھنے پر ہی توجہ مرکوز رکھی۔ ان کی تخلیقات میں مختلف چینلز کے لئے متعدد ڈرامہ سیریل اور سیریز بھی ہیں۔ جنکی کتابی صورت میں اشاعت کی بھی وہ بہت خواہشمند تھے۔ انکی 16/17 کتابوں کے علاوہ دو تخلیقات اور بھی ہیں یعنی ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ ایک مرتبہ کسی نے آذر بھائی سے انگریزی میں پوچھا

Mr. Azer! How Many Kids You Have?

آذر بھائی نے برجستہ جواب دیا:

One kid and one Kidny

لفظ "کڈ" Kid کی رعایت سے انہوں نے بچی کیلئے کڈنی کہہ کر پوچھنے والے کی بولتی بند کر دی تھی۔ آذر بھائی کی بذلہ سنجی اور برجستگی سے تو آپ یقیناً واقف ہو ہی گئے ہوں گے میں انکی آغاز شاعری کے زمانے کے دو شعر آپ کی نذر کرتا ہوں۔ ذرا اٹھان دیکھئے آذر بھائی تب 18/20 برس کے ایک نوجوان شاعر تھے۔

خالق بھی ہوں تخلیق مگر خود بھی ہوا ہوں — کھلتا ہی نہیں مجھ پہ بشر ہوں کہ خدا ہو

تو نے بکھیرا تو یہ بکھر اور بکھر جائے گی — زندگی زلف نہیں ہے کہ سنور جائے گی

ان کا ایک تازہ شعر آپ کی خدمت میں بھی پیش کرنے کا خواہاں ہوں۔

میرے دوستو میرے ساتھیو مجھے شہر سے کہیں لے چلو — میں اسیر حبس دوام ہوں میں کھلی ہوا کا سفیر تھا

کالج کے ہم جماعتوں میں سے جناب عطاالحق قاسمی پر ہمیشہ ناز کرتے تھے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی کی معصومیت و البانہ پن اور

سادگی کے مداح تھے۔ امجد اسلام امجد اور احمد فراز کی شاعری ان کے دل کو بہت بھاتی تھی۔ منیر نیازی، قتیل شفائی اور احمد ندیم قاسمی کی اپنے لئے محبت کو باعث فخر قرار دیتے تھے ملتان کے دوستوں میں سے ڈاکٹر انور احمد، اے بی اشرف، عرش صدیقی، غلام یٰسین اعوان، طاہر تونسوی، حسین سحر اور ڈاکٹر خیال امروہوی کا تذکرہ کرنا کبھی نہ بھولتے تھے۔ ادبی جرائد کے مدیران میں سے اظہر جاوید اور شاہد علی خان کی محبتوں کے اسیر تھے۔ اپنے بعد آنے والے قلمکاروں میں سے وجاہت مسعود، فرخ سہیل گوئندی، ڈاکٹر اختر شمار، ناقوشین ادا، لطیف ساحل اور بہت سے دیگر دوستوں سے بہت پر امید تھے۔

ایک زمانے میں آذر بھائی نے لاہور میں وکالت بھی کی اس زمانے میں ملک اسلم حیات، رفیق احمد باجوہ، محمود علی قصوری، ملک حامد سرفراز، احسان وائیں، اکبر لاہوری سے بہت یارانہ اور نظریاتی وابستگی رہی تاہم پیشہ وکالت میں وہ وطن پنجاب محاذ کے صدر مشتاق بٹ ایڈووکیٹ کو اپنا استاد و محسن کہتے تھے۔ جن کی محبت سے آج پنجاب میں پنجابی کا تذکرہ ممکن ہوا ہے۔ پنجابی زبان اور شعر و ادب کی جانب انکی رغبت قوی اور دلچسپی کا باعث تنویر ظہور اور فخر زمان بھی ہے جو آذر بھائی کے گہرے یار تھے اور ہیں۔

آذر بھائی ذوالفقار علی بھٹو کے بہت مداح اور قریبی ساتھی بھی رہے ہیں۔ بھٹو صاحب نے جب پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی انہی دنوں آذر بھائی پارٹی میں شامل ہوئے تھے۔ 1970ء کے انتخابات کے لئے انتخابی مہم کے دوران اور پھر 1977 میں بھی پارٹی کے لوگوں ڈاکٹر مبشر حسن، حنیف رامے، شیخ رفیق احمد افتخار تاری، ایس ایم مسعود، قیوم نظامی، اسلم گورداسپوری، عارف اقبال بھٹی اور دیگر ان کے ساتھ مل کر بہت کام کیا، انتخابات کے دوران بھٹو صاحب کے ہمراہ انھوں کے جلسوں میں گھن گرج کے ساتھ اپنی انقلابی نظمیں پڑھا کرتے تھے۔ آذر بھائی نے جتنی متحرک، فعال اور بھرپور زندگی گزاری میری خواہش تھی کہ وہ اپنی یادداشتیں ضرور لکھتے۔ لاہور کے ایک بڑے پبلشر نے بھی آذر بھائی سے یادداشتیں لکھنے کا معاہدہ کر لیا تھا۔ اور وہ چند ابواب لکھ بھی چکے تھے مگر۔۔۔۔۔۔۔

لکھی کون موڑے!

◆◆◆

پروین شیر ایک معروف شاعرہ، ادیب، مصور اور موسیقار کی ادبی خدمات کے اعتراف میں

بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اظہار اور اسلوب میں ایک ایسی جامعیت ہے جو کسی مخصوص شخص یا مخصوص علاقے کی حدود سے بہت اوپر اٹھ کر روح کے بحران کو آفاقیت اور ہمہ گیری میں تبدیل کر دیتی ہے۔ راقم الحروف اس ناقابل فراموش کتاب کا خیر مقدم کرتا ہے۔"

(پروفیسر ابوالکلام قاسمی، انڈیا)

جذباتی فنکارانہ مہارت کے ساتھ منقش توصیفی زبان اور شعری زبان کے خواب رنگ پہلوؤں کے مابین ایک ربط باہم پیدا کر دیا ہے۔"

(پروفیسر ڈاکٹر وارن کیریو، کینیڈا)

اظہر جاوید۔ میرے مرشد

فیروز علی

ایک ہوتا ہے شاعر جس کا کلام عرصہ دراز تک لوگ تسلسل سے پڑھتے رہتے ہیں اور وہ رفتہ رفتہ چاہنے والوں کے دلوں میں گھر کر جاتا ہے۔ ساحر کو ہر دم اپنی بدصورتی کا Complex تھا لیکن یہ شاعری تھی جس کی وجہ سے وہ لاکھوں دلوں میں گھر کر گیا تھا۔ یہی حال فیض صاحب کا تھا۔ یعنی فیض صاحب کے چاہنے والوں کی اکثریت دراصل ان کی شاعری پر فدا تھیں۔ دوسرے لفظوں میں بات یہ ٹھہری کہ شاعری لوگوں کو شاعر کا دیوانہ بناتی ہے۔ اب اظہر جاوید صاحب کو دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں ایسی کوئی سہولت حاصل نہیں تھی۔ وہ فیض صاحب کی طرح کوئی شاعر نہیں تھے۔ بلکہ انہوں نے تو اپنا کلام چھپنے کے قابل نہ سمجھ کر چھپا کر رکھ لیا تھا۔ اپنے پرچے تخلیق کو بھی اپنی شاعری سے آلودہ نہیں ہونے دیا تھا۔ آخر عمر میں کہیں جا کر ان کا کلام ان کے دوستوں نے زبردستی چھپوا دیا تھا۔ پس ثابت ہوا کہ چاہنے والوں تک ان کے پہنچنے کا وسیلہ شاعری نہیں تھا۔ اب سوچنے کا مقام ہے کہ ایک طرف ایک غریب ادبی پرچے کا مدیر تھا اور دوسری طرف ایک بڑا شاعر (فیض صاحب)۔ ایک ادبی رسالے کے مدیر کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ وہ مقبولیت میں ایک بڑے شاعر کے ہم پلہ ہو گیا۔ ایسی کوئی مثال ملنی ناممکن ہے۔ شاعر نہ ہونے کے باوجود اظہر جاوید صرف ایک ادبی پرچے کی ایڈیٹری کے بل بوتے پر چاہنے والوں میں ایک بڑے شاعر فیض صاحب کی برابری کر گیا۔ یہی تفریق ہے جو ان کی فوقیت کو جو فیض پر ہے، واضح کرتی ہے۔ وہ حسن پرست تھے لیکن حسینوں کے پیچھے نہیں بھاگتے تھے۔ یہاں گنگا الٹی تھی۔ وہ ایک شمع کی صورت تھے اور پروانے ان پر نثار ہوتے تھے۔ جو چیز ان کو حاصل تھی۔ وہ اتنی قیمتی تھی کہ اس کے حصول کے لئے لوگ تڑپ رہے تھے۔ رسالہ "سب رنگ" کے شکیل عادل زادہ ہر شمارے میں فرماتے تھے کہ نرگس اور فلاں فلاں میرے لئے روتی ہیں کہ تو نہ ملا تو میں خودکشی کر لوں گی مگر میں کیا کروں۔ مجھے "سب رنگ" کو نکھارنے سے فرصت نہیں ملتی (جو کم بخت تین سال میں ایک بار نکلتا تھا)۔ مستنصر تارڑ کو لیں۔ ہر سفرنامے میں لڑکیاں، وہ بھی غیر ملکی، آخر میں ان کے لئے پھوٹ پھوٹ کر روتی ہیں۔ اسے عید کو لیں اس ایک ہی لڑکی سے واسطہ ہے۔ ہر ناول میں نام کو بدل بدل کر پیش کرتے رہے۔

یہ سب لوگ اظہر جاوید کے سامنے زیرو بھی نہیں تھے۔ دل جلانے والے ناول والے، ایک عشق کی خاطر آدمی گھر چھوڑ سکتا ہے۔ یہاں ایسا نہیں تھا۔ بلکہ معاملہ عشقوں کی بھرمار کا تھا۔ بانو قدسیہ کا بیان ہے کہ وہ بھگوان اسٹریٹ کا کرشن کنہیا تھا۔ علاوہ ان کی کہانیاں افسانے جو تحریر کیے سب آپ بیتیاں تھیں۔ جو ان کے خلاف F.I.R ہے۔ یعنی گھر چھوڑنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ کسی ہند کے لئے اپنی زندگی برباد کرنے کی کوئی وجہ سامنے نہیں آتی ہے۔ پھر یہ سب کیا تھا اور کیوں تھا۔ اظہر جاوید نے اپنی شاعری میں ہمیں کیوں رلایا، گھر گھر کرتے رہے اور روتے رہے۔

"باپ بیٹا" افسانے میں ان کی بیوی کا بیان ہے کہ مار پیٹ کر لیتا مگر گھر نہیں چھوڑتا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ میرا بیٹا مجھ سے اس طرح ملتا ہے جیسے کوئی جاننے والا دوسرے جاننے والے سے ملتا ہے اور اس کو رغبت اپنی ماں سے ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ باپ کے اندر ایک عمر

ہے کہ بیٹا اسی کا اسیر ہے۔ اظہر جاوید کے نام کو جیتے کے لئے "تخلیق" کی خاطر آدھا بازی گنوا چکا ہے۔

اظہر جاوید نے ادب جیسی معمولی چیز کی خاطر کروڑوں کا پلاٹ کوڑیوں کے مول بیچ دیا۔ بے نظیر بھٹو کے لئے اتنے جو ستم اٹھائے لیکن وہ وزیر اعظم بنیں تو کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔ 250 صفحات کا رسالہ صرف 50 روپے میں فروخت کر کے نقصان اٹھاتے رہے۔ مزید آدھی سے زیادہ کاپیاں باہر کے ملکوں تک لوگوں میں مفت تقسیم کرتے رہے۔ ڈاک کا خرچ بھی خود اٹھاتے رہے۔ یہ سب کیا ہے یار۔ وہ جذباتی اور مظلوم۔ بے چارے ہوئے اور یہ چیزیں ان کے اندر قدرتی تھیں۔ وہ بہت زود حس تھے۔

انھوں نے ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ دیا۔ اپنا الگ جہاں بسا لیا۔ انھوں نے پارسائی نہیں کی، منافقت نہیں کی۔ خاکوں میں، افسانوں میں شاعری میں، اپنی بات میں، ہر سچ لکھ دیا۔ صاف لفظوں میں۔ زندگی کو رومانس کے اندھے کنوئیں میں پھینک دیا۔ گھر واپس نہیں گئے اور سارے دکھ اکیلے بھگت لئے اور وہ بہت قدم رہے۔ امر ہو گئے، ہم جیسے چاہنے والے دلوں کو ویران کر گئے۔ ساحر کی طرح ہمیں اداس کر گئے ایک اور جگہ لکھتے ہیں اپنا میں نے ایک عشق کیا پھر دوسرا پھر تیسرا عشق کیا پھر بے شمار عشق کئے۔ لیکن قربانی نہیں کی۔ "تخلیق" کا دفتر کتنا بے جان اور بے حال تھا مگر اظہر جاوید کی کشش میں ایسی مقناطیسیت تھی کہ خلقت کھنچی چلی آتی تھی۔ اور موبائل فارغ نہیں ہوتا تھا۔ جیسوں مہمان آتے رہتے تھے۔ ہر ایک کے آنے پر وہ ویسے کھل اٹھتے تھے اور کیا لپک کر استقبال کرتے تھے کہ ہر کوئی یہی سمجھتا تھا کہ وہ میرے ہی عزیز ترین دوست ہیں یہی ان کی بیقراری کو قرار دیتی تھیں۔ جس کو بھی پسند کر لیتے تھے اس میں سے ہر ایک سے ان کو ایک جیسی شدت سے پیار ہو جاتا تھا۔ (شاہ صاحب تشریف لائے ہیں۔ خیر ہوے۔ بڑی آیا نوں رب دا کھا)۔

ملک مقبول احمد صاحب نے لکھا: "موقع بھی نہیں دیا کہ میں سرپرائز دوں۔" ہارن کی آواز سن کر باہر آ جاتے تھے۔" ان کے انداز دوستوں کو رلا دیتے تھے۔ مگر اس رلانے میں انکار بھی تھا کہ رونے والے ان کی حیات میں اس بات کا ذکر کبھی عزت کے ساتھ کرتے تھے کہ۔

میر صاحب رلا گئے سب کو   کل وہ تشریف یہاں بھی لائے تھے

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2015 تک

ماہنامہ "تخلیق" اب تک چار "تخلیق ایوارڈ" دے چکا ہے

1	2012ء	جناب شفیع عقیل صاحب	(کراچی)	021-34816655
2	2013ء	جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب	(لاہور)	0334-9719278
3	2014ء	محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ	(لاہور)	0333-4221870
4	2015ء	محترمہ نثر جہاں صاحبہ	(امریکہ)	001-3109870978

ملتانی پیر

ملک راشد محمود

کیا مزے کے دن تھے جب مزے سے کالج کی آزاد فضاؤں میں گھومتے تھے۔ نہ پڑھنے کی فکر نہ لکھنے کی۔ کیوں کہ وہاں لکھنے پڑھنے کا رجحان ہی نہیں تھا۔ آخر اسی آزادی میں ہم ایم۔ اے اردو کا امتحان اعلیٰ درجہ میں پاس کر گئے۔ جب ہم نے اپنے اچھے نمبر دیکھے تو ہمارے اندر ایم۔ فل۔ اردو کرنے کی تحریک پیدا ہوئی۔ یہ جویائے علم مختلف جامعات سے گھومتا پھرتا جامعہ گجرات کے سب کیمپس سیالکوٹ پہنچ گیا۔ جامعہ کے معلوماتی ڈیسک سے پتا چلا کہ یہاں ایم۔ فل۔ اردو والوں کے لئے اردو زبان کے ماہر سرائیکی بزرگ ملتان سے تشریف لائے ہوئے ہیں۔ جن کے ادبی فیض کا ڈنکا برصغیر پاک و ہند کی سرزمین میں بج رہا ہے۔ اتنا سننا تھا کہ دل بے تاب ہو گیا اب پیر صاحب سے ملے بغیر ہم نہیں جا سکیں گے۔ چوں کہ پیر صاحب کا تعلق مدینۃ الاولیا (ملتان) سے تھا اور ہم وہاں کے پیروں کی بہت سی کرامات پہلے بھی سن چکے تھے اتنے میں پیر صاحب نے ملاقات کا شرف بخشا۔ ہماری خوش قسمتی دیکھئے کہ پیر صاحب کی جب پہلی نظر ہم پر پڑی تو انھوں نے ہماری منت سماجت کے بغیر ہی ہمیں اپنی مریدی میں قبول فرما لیا۔ ہم نے بیعت نامہ پر کر کے جمع کروایا پھر اس کے بعد ہمارے اوپر انوار کی بارش شروع ہو گئی۔ اس کے بعد دنیائے ادب کی ایسی ایسی ہستیوں سے ہمارا تعارف ہوا جن کا نام شاید ہم مستقبل بعید میں بھی دور دور تک نہ سنتے۔

ہمارے سیالکوٹ کے عوام میں کتابوں کا رواج نہیں اور نہ ہی ہمارے اساتذہ بچوں کی ایسی تربیت کرتے ہیں کہ ان کو کتاب کی طرف مائل کیا جائے۔ یہاں نوٹس کلچر نے اساتذہ اور طلبا کو اصل متن اور کتاب سے بہت دور رکھا ہوا ہے اسی لئے یہاں کے کتب فروش خاص طور پر ادبی کتابیں نہیں رکھتے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم صرف شاعر اور ادیب پیدا کرتے ہیں۔ یہاں کے قاری سے ہمیں کوئی سابقہ نہیں۔ اقبال اور فیض جیسے بلند پایہ شاعر اس مٹی نے پیدا کر دیے۔ بس یہی کافی ہے۔ اب ان کو پڑھنا اہل سیالکوٹ کے لئے ضروری نہیں لہٰذا پڑھنے والا یہ نیک کام سیالکوٹ کے علاوہ باقی علاقوں کے عوام کریں ـــــ اسی ماحول سے ہمارا بھی تعلق تھا۔ ہم سیالکوٹ کے تین مرید پیر صاحب کی زندگی کے تجربات اور ان کی ادبی گفتگو سننے کے لئے جمعہ کے دن جامعہ میں اکٹھے ہو جاتے۔ پہلے ہی دن ہمیں مغربی ناقدین سے روشناس کروایا گیا جن میں سے کچھ سے تو ہم واقف تھے چونکہ ہم ایم۔ اے میں ان کے نوٹس پڑھ چکے تھے لیکن کچھ نقاد ایسے بھی تھے کہ جن کا نام ہی زندگی میں پہلی دفعہ سن رہے تھے۔ ان میں کروچے، کرسٹوفر کاڈویل، ایڈورڈ سعید اور ٹیری ایگلٹن زیادہ اہم ہیں۔ اس بات میں میرا حسن ظن ہے کہ ان چاروں مغربی ناقدین کا جتنا تذکرہ شعبہ اقبال میں ہوا اور جیسے ان تک ان کی تحریروں کو جس قدر معتقدین سمجھ کر پڑھا گیا، شاید ہی روئے زمین پر کوئی ایسی جگہ ہو ـــــ ایک دن پیر صاحب کروچے کی جمالیاتی تنقید کے حوالے سے ہمیں مستفید فرما رہے تھے بات چلتی چلتی خورشید الاسلام کی کتاب "تنقیدیں" جس میں "امراؤ جان ادا" ان کا مضمون تھا تک پہنچی جو تخلیقی تنقید کی بہترین مثال تھا۔ پیر صاحب نے ہم سے مخاطب ہو کر پوچھا

''امراؤ جان ادا'' تو سب نے پڑھ رکھا ہوگا؟؟؟؟ ہمارے ماتھے پر لکھا ہوا تھا کہ ہم نے بس نوٹس پڑھے ہوئے ہیں، مکمل ناول تو دور دور تک دیکھا ہوا بھی نہیں۔ ہماری گردن شرم کے مارے جھک گئی۔ اسی دن ایک مرید مہینہ بھر کے بعد جماعت میں آیا۔ پیر صاحب کے پوچھنے پر موصوف نے بتایا کہ وہ عمرہ کی ادائیگی کے لئے گئے ہوئے تھے۔ اس پر پیر صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا: ''مرید اور نیک کام قبولیت کے لئے قربانیاں مانگتا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس مقدس سفر میں آپ کی اس قربانی میں یہ ناول (امراؤ جان ادا) پڑھنا لکھا ہوتا۔'' اس پر ساری جماعت ہنسنے لگ پڑی۔ خیر یہ تو ان کے مزاج کی چاشنی سے لبریز جملے ہوتے تھے جو وہ کبھی کبھار ہماری بوریت کو دور کرنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔

پیر صاحب کتابوں پر تبصرے لکھوانے کے بڑے دلدادہ تھے۔ وہ مرید جو یہ نیک کام بروقت اور زیادہ سے زیادہ کرتا تھا اس کا شمار اول درجے کے مریدوں میں ہوتا تھا۔ اور یہ اول درجہ رکھنے والے دو تین مرید ہی تھے۔ ان پر خاص دست شفقت تھا۔ ان کا وہ جملہ آج بھی کانوں میں گونجتا ہے کہ ''حضرت جی!!!!! ہم فرض کرتے ہیں کہ آپ نے یہ چیز بھی پڑھ رکھی ہوگی''۔

جس پر ہمیں ہر بار شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا۔ لیکن وہ اپنی چشم بینا سے ہمارے قلوب و اذہان کو دیکھ رہے ہوتے تھے کہ میرے یہ پرستار بالکل صاف کاغذ کی طرح ہیں۔ قربان جاؤں اپنے پیر پر کہ اس کے باوجود انھوں نے ہمیں محبت بھری نظروں سے ہی دیکھا اور یہ محبتیں بانٹنے والی ہستی ڈاکٹر انوار احمد کی ہے جو جامعہ گجرات کے سب کیمپس سیالکوٹ کے ڈائریکٹر جنرل اور صدر شعبہ اردو بھی تھے۔

انوار صاحب کی صحبت میں ہم نے بہت کچھ سیکھا سب سے بڑھ کر یہ کہ ہم نہ صرف دنیا بھر کے ادیبوں، شاعروں اور ناقدین سے آشنا ہوئے اور بلکہ انھوں نے ہمارے اندر کتاب پڑھنے کا ایک جذبہ بھی پیدا کیا۔ پورے کیمپس میں وہ ہر دل عزیز تھے جس کی وجہ سے آج بھی یہاں سب ان کو یاد کرتے ہیں۔ سیالکوٹ کیمپس میں انوار صاحب کے دو کام بہت اہمیت کے حامل ہیں جن کو شہر اقبال کے غیور اور غریب طلبا ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

ایک ''امام بی بی اظہر وحسنت فنڈ'' کا قیام ـــــ جس کے لئے انھوں نے اپنی خاکوں پر مشتمل کتاب ''یادگار زمانہ ہیں جو لوگ'' کی اشاعت سے ایک خطیر رقم اکٹھی کر کے اسے غریب اور مستحق طلبا کی تعلیمی امداد کے لئے وقف کر دی۔ شبانہ روز محنت سے انھوں نے یہ دیا جلا کر جوانان اقبال کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اللہ کرے یہ ہمیشہ جلتا رہے اور انوار کی کرنوں سے طلبا مستفید ہوتے رہیں۔

دوسرا شہر اقبال میں ایم۔فل اردو کی کلاسز کا اجرا بھی انوار صاحب کی ان تھک محنت کا نتیجہ تھا۔ لیکن افسوس کہ وہ پودا جس کو اس ملتانی پیر نے دن رات کی تگ و دو سے لگایا تھا آج یہ مرجھاتا ہوا نظر آ رہا ہے۔

یہ ہماری زندگی کا سب سے بڑا اعزاز ہے کہ ہمیں ایک سال کا عرصہ ایک ایسے شخص کے ساتھ گزارنے کا موقع ملا ہے جس نے اپنی ترقی پسندانہ سوچ کے ذریعے ہمارے اندر اردو زبان سے محبت کا انقلاب سالوں مہینوں کی بجائے دنوں میں برپا کر دیا۔ اللہ آپ کی عمر، علم اور عمل میں برکت عطا فرمائے۔ (آمین)

◆◆◆

"چودھویں صدی" کا کمال آدمی

ناصر نقوی

الحمد للہ میں اور ملک مقبول احمد 21 ویں صدی کے مزے لوٹ رہے ہیں ایک سے بڑھ کر ایک ایجادات اور سہولیات سے لطف اندوز ہونا ہمارا مقدر ٹھہرا ہے۔ چاند پر پہلے صرف بڑھیا کے چرخہ کاتنے کی کہانیاں سنتے تھے، اب ہم چاند پر حضرت انسان کے پہنچنے کے قصے بچوں کو سناتے تھے۔ پہلے ہر کہانی کا آغاز "ایک دفعہ کا ذکر ہے ایک بادشاہ" سے ہوتا تھا اب بادشاہ کی بات کریں تو بچے فوراً بول پڑتے ہیں "کس زمانے کی بات کرتے ہو؟" بات بھی وزن ہے بادشاہ نام کی چیز "دنیا" سے ناپید ہو گئی ہے۔ "نہ افغانستان میں نہ ایران میں" بچے بچے کے ہاتھ میں "موبائل فون" دنیا کے تمام کھیل تماشے دکھا رہا ہے۔ کتاب کھولنے کی کوئی زحمت نہیں کرتا کیونکہ "موبائل" کی موجودہ سہولیات سب پہ بھاری ہیں لیکن ایک زمانہ تھا جب کتاب اور اس کے مصنف کی بڑی قدر و منزلت ہوا کرتی تھی۔ کتابیں کم اور اس کے متلاشی بہت زیادہ ہوتے تھے، لوگوں کی قوت خرید بھی نہ تھی، پھر علم و ادب کے پیاسے اپنی پیاس کتاب مانگ کر بجھانے میں عار نہیں سمجھتے تھے حالانکہ اس وقت بھی یہ مثل مشہور تھی "کہ کتاب کسی کو دینا بے وقوفی اور کسی سے لے کر واپس کرنا اس سے بڑی بے وقوفی ہے" ایسے میں ایک آدم زادہ اپنی دیہی زندگی کو خیر باد کہہ کر علم و ادب کے شہر "لاہور" میں وارد ہوا اور پھر اعلیٰ کتاب کا اہتمام کیا۔

اس کمال آدمی کا نام نامی ملک مقبول احمد ہے جو ایک کامیاب اشاعتی ادارے "مقبول اکیڈمی" کے روح رواں ہیں۔ چند روز پہلے ان کے قریبی دوستوں اور چاہنے والوں نے زبردستی حضرت کی 86 ویں سالگرہ کا کیک کاٹ کر انہیں بوڑھا ثابت کرنے کی کوشش کی، ورنہ تجربے، مشاہدے اور عمر میں بڑا ہونے کے باوجود ہم انہیں اپنا ہم عصر ہی سمجھتے ہیں، اس لئے کہ ان کی شخصیت کے بہت سے اثرات سے ہم متاثر ہیں۔ بلاشبہ وہ قلم اور کتاب کے مزدور ہیں۔ خدا انہیں نظر بد سے بچائے، کیوں کہ ہم سے بھی زیادہ چوکس ہیں۔ ان کی انکساری، دھیما پن اور انداز گفتگو بھی خوبصورت ہے۔ میں نے اخبار میں سالگرہ کی خبر پڑھی تو فوراً مبارک باد کے لیے ایس ایم ایس کر دیا لیکن جوابی رسید نہ ملنے پر جب ٹیلی فون کی گھنٹی کھڑکائی تو جواب ملا:

"حضرت بہت شکریہ محبت کا، جوابی کارروائی میں تاخیر پہ معذرت خواہ ہوں۔ خدا آپ کو عزت و آبرو کے ساتھ صحت و تندرستی کے ساتھ عمر طویل عطا فرمائے۔"

میں نے شکوہ کیا "حضور ہمیں بھی بتا دیتے، ہم بھی حاضر ہو جاتے؟" فرمانے لگے "یہ سب تماشا اقتدار جاوید نے دوستوں کے ساتھ سازش کر کے کیا ورنہ میں تو اس کا عادی نہیں۔" میں نے کہا "دوستوں کے خلوص و پیار میں یہ کوئی بری بات بھی نہیں تھی، ہم سب آپ کی محبت کے اسیر ہیں، آپ نے کتاب اور اردو زبان کی جو خدمت کی اس کے سب لوگ نہ صرف قائل ہیں بلکہ ان خدمات کا اعتراف ہمیشہ سنہرے حروف میں کیا جائے گا۔ ویسے بھی آپ تو ہم سب کے لئے دعاؤں کی گٹھڑی ہیں۔ خدا آپ کو سلامت رکھے تاکہ آپ کو دیکھ کر ہمیں بھی ہمیشہ حوصلہ ملے۔"

ملک مقبول احمد بظاہر ایک کہنہ مشق پبلشر ہیں، انہوں نے روز اول سے اب تک زندگی اور فن و ادب کے ہر موضوع پر انتہائی

خوبصورت، دیدہ زیب اور یادگار کتابوں کی اشاعت کی لیکن ان کی خوشگوار یادوں میں ادبی رسالہ "چودھویں صدی" نمایاں مقام رکھتا ہے کیونکہ یہ ان کا ایسے دنوں کا کارنامہ ہے جب انہیں ناتجربہ کاری میں بھی استاد احسان دانش اور رومانی افسانوں اور ناولوں کے تخلیق کار اے حمید جیسوں کا تعاون حاصل تھا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ:

> "صحافت کا تجربہ نہیں تھا لیکن دوستوں کی حوصلہ افزائی نے مجھے ڈگمگانے نہیں دیا اور میں 1956ء میں "چودھویں صدی" نکالنے میں نہ صرف کامیاب ہوا بلکہ استاد احسان دانش کے نام نے اپنے چاروں سے اسے منفرد معروف ادبی پرچہ بنا دیا۔ دوسری طرف بے ادب حکومتوں اور باادب منت خوروں نے اپنی ہٹ دھرمی سے "چودھویں صدی" کا چراغ گل کر دیا۔"

پھر بھی اس باکمال آدمی نے ہمت نہیں ہاری اور بطور پبلشر ہزاروں کتابیں شائع کر کے اشاعتی اداروں میں "مقبول اکیڈمی" کا پرچم بلند کر دیا اور پھر یوں ہوا کہ ایک دن "سفر جاری ہے" آپ بیتی کے لئے قلم اٹھایا تو ادبی دنیا میں تہلکہ مچ گیا حالانکہ یہ شاہکار تو اپنی تیسری نسل کی خواہش پر مرتب کیا تھا پھر اس کے بعد قلم میں روانی آئی اور خوبصورت اسلوب کے سبب سے شاہکار اردو ادب کی زینت بن گئے، یوں انہوں نے ایک پبلشر کو لکھنے لکھانے کی طرف مائل کر کے ایک نئی روایت کو بھی جنم دے دیا لیکن وہ اسے کمال انکسار سے "جمال ہم نشیں" کہتے ہیں جو انہیں کتابوں اور مصنفین کی مجلس سے نصیب ہوا۔

بات کہاں سے نکلی اور کہاں تک پہنچ گئی۔ حقیقت میں پیار، محبت اور خلوص کے پیکر ملک مقبول احمد ایک کامیاب اور قابل تقلید شخصیت کے مالک ہیں۔ "کتاب دوستی" کے اس بحرانی دور میں بھی ان کے ہمنواؤں کی تعداد خاصی بڑی ہے۔ ان کے بیٹے بھی آدمی کو انسان کی حقیقی منزل تک پہنچانے کا واحد راستہ "کتاب" کو ہی گردانتے ہیں۔ دو بیٹے ایک بیٹی اور داماد ڈاکٹری جیسے مقدس اور عظیم پیشے سے وابستہ ہونے کے باوجود "پبلشنگ" سے منسلک ہیں اور پوتا ابرار مقبول بھی بچوں کی بہترین انگریزی کی کتاب "سٹوریز آف دی پرافٹس" لکھنے پر شاہد اخوند گل بک ایوارڈ میں اول انعام حاصل کر کے "پاکستان" کا نام روشن کر چکا ہے۔ یعنی ملک مقبول احمد جیسے "چودھویں صدی" کے کمال آدمی کی تیسری نسل بھی "کتاب دوستی" کو آگے بڑھانے میں کامیاب و کامران ہے لیکن ایک دلچسپ پہلو اس کمال آدمی کا یہ ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر "لوئی کوہن" کی ایک کتاب کے اردو ترجمے کی تلخیص چھاپی۔ اس کتاب میں جسمانی بیماریوں کے خلاف قوت مدافعت پیدا کرنے کے لئے ایک موثر طریقہ علاج بتایا گیا۔ اسے (Hydro Theropy) یعنی "پانی سے علاج" کہا جاتا ہے۔ ملک صاحب نے یہ طریقہ اپنایا اور پھر ڈاکٹروں کے حیرت میں ہوتے ہوئے بھی اس مختلف طریقہ علاج سے ایسے باغی ہوئے کہ مدتوں سے کسی بیماری میں بھی کسی قسم کی ادویات استعمال نہیں کرتے اور اگر ان سے پوچھا جائے کہ آپ نے آخری مرتبہ "دوا" کب کھائی تھی تو وہ بتا نہیں سکتے اس لئے کہ یہ سوال پرانا قصہ ہے۔ دنیا کی ان سب باتوں پر ملک مقبول احمد کا دینی زاویہ حاوی ہے۔ وہ سچے مسلمان ہیں اور ہر دوسرے تیسرے سال حج یا عمرہ کرنے کے لیے ضرور جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ دل کا زنگ اتارنے کے لیے طواف کعبہ اور روضہ رسول کی زیارت سے بہتر کوئی نسخہ نہیں۔ ہمیں تو ان کے حج اور عمرے کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب وہ حرمین شریفین کے تحائف عنایت کرنے کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ ملک صاحب عبادت گزار ہیں۔ تہجد کی نماز باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ لیکن اس کا ذکر کبھی کسی سے نہیں کرتے۔ کہتے ہیں میری کامیابیاں اللہ اور رسول کی نظر کرم کا انعام ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سایہ دار درخت کو قائم و دائم رکھے تاکہ ہمارے جیسے اس کمال آدمی سے مستفید ہوتے رہیں۔ آمین!

◆◆◆

حسابِ دوستاں......!

اظہر جاوید

ایک درویش کا قصہ ہے، وہ تسبیح پڑھ رہے تھے کہ انہیں ساتھ کے کمرے سے آواز آئی۔ دو محنت کش خواتین باتیں کر رہی تھیں۔ ایک نے دوسری سے پوچھا: ''آج تم نے کیا کمایا؟'' پہلی نے ایک رقم بتائی اور کہا: ''وہ میں نے اپنے فلاں دوست کو دے دی ہے۔'' دوسری نے پوچھا: ''کیا تمہیں اس رقم کی واپسی کا یقین ہے؟'' پہلی نے کہا: ''میں نے سوچا ہی نہیں کیونکہ حسابِ دوستاں در دل است۔'' درویش نے سنا تو تسبیح توڑ دی۔ اور کہا: ''واقعی دوست کا حساب دل میں ہے، تسبیح میں نہیں۔''

سلطان رشک پر کچھ لکھتے ہوئے جب بھی مجھے یہ حکایت یاد آئی قلم توڑ دینے کو جی چاہا۔ مگر مشکلیں دو آ پڑی ہیں کہ حسبِ سابق میں یہ مضمون بھی بقلم خود نہیں لکھ رہا، یہ قلم عذرا اصغر کا ہے اور انہیں بھی سلطان رشک کی طرح احسان چڑھانے کا شوق ہے۔ اور دوسری مشکل یہ ہے کہ حساب کا ذکر آتے ہی اپنا حسابی کتابی یار سلطان رشک یاد آ جاتا ہے کہ اگر میں نے یہ مضمون بھی نہ لکھا تو یاری کے کھاتے ہیں صرف گھاٹا ہی گھاٹا رہ جائے گا۔

اگرچہ آج کے دور میں تصوف کا بہت بول بالا ہے اور ایک طرح سے صوفیا کا ہیڈ کوارٹر اسلام آباد ہی بنا ہوا ہے۔ یہیں سے سلسلہ شہابیہ چلا اور پھر چھوٹے موٹے کئی صوفیوں نے اپنا اپنا جوگ بیراگ لیا۔ مفتی جی نے اپنی کہی، اشفاق احمد نے اور دادا کالی اور یہاں تک کہ اپنے صوفی تابش نے بھی اور منزل کی تجردی۔ مگر ادھر تصوف کا عروج ہوا ادھر منافقوں کی برکت بڑھی۔ یوں لگتا ہے ان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ شیخ ابلاغ سے لے کر کشف المحجوب تک اٹھا کے دیکھ لیجیے، ان بزرگوں نے منافقوں کی دہائی دی ہوئی ہے۔ ہماری بدنصیبی بھی یہی ہے کہ ہمیں زندہ رہنے کے لئے، دوستوں سے، اپنوں سے، پیاروں سے، اپنی محبت کا یقین دلانے کے لئے اظہار کرنا پڑتا ہے اور بار بار کرنا پڑتا ہے۔ کبھی مضمون لکھ کر، کبھی کالم لکھ کر۔

اور اسی دورِ تماشائی کا المیہ یہ ہے کہ دوست پھر بھی خوش نہیں ہوتے، آپ کے پاس سے، آپ کے طرز سے کبھی مطمئن ہوتے ہی نہیں۔ ایک بزرگ مجھ سے اس لئے ناراض ہیں کہ میں جب ان کی تعریف و توصیف کرتا ہوں تو ساتھ میں ان کے فلاں ہم عصر کا ذکر کیوں لے آتا ہوں اور ان ہم عصر صاحب کو بھی اپنے طور پر شکایت رہی ہوگی کہ میں ان کا تذکرہ کم کرتا ہوں۔

بہت سوچتا ہوں کہ اس قلم کاغذ کا دھندہ چھوڑ کر کیا اور کروں مگر وہ تو سلطان رشک پہلے ہی میرے بارے میں فیصلہ دے چکا ہے کہ میں نہایت غیر کاروباری آدمی ہوں۔ ہم نے تو صرف عشق کا کاروبار کیا ہے، جس میں زیاں ہی زیاں ہے اور یہ زندگی تو متاعِ گم گشتی ہے۔ دنیاداری کے ناتے سے دیکھا جائے تو میں سراسر خسارے میں ہوں مگر محبت کے حوالے سے پرکھا جائے تو میں اتنا مالدار ہوں کہ خود سراپا رشک ہوں۔ کسی بزرگ نے کہا تھا، غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں، اور مجھے یہ مان ہے کہ ان ہنگاموں لاکھوں چہروں کے

بازار میں دو چار روگ ایسے بھی ہیں، جو میرے دوست ہیں اور سلطان رشک یقیناً انہی میں سے ایک ہے۔

ہمارے ہاں کہتے ہیں یار اور یاد، یا جاتا ہے یا دلا دیا ۔۔۔ مجھے سلطان رشک سے دونوں طرح کی مناسبت رہی ہے۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ ان سے پہلے پہل کب ملاقات ہوئی تھی، دوستوں میں یہ بتانا ایسا ضروری بھی نہیں ہوتا۔ یہ تو صرف محبوباؤں کے لئے یاد رکھنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی ان سے تعلقات میں جب یکسانیت آنے لگے تو پہلی ملاقات کی واردات کو دہرایا جاتا ہے مگر خیال ہے کہ پہلی بار رفعت سلطان کے ساتھ ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ کوئی پندرہ سولہ برس پہلے کی بات ہے۔ یہ نوجوانی کی ترنگ میں تھا اور مجھے لاہور رہنے اور کسی نہ کسی رسالے سے وابستہ ہونے کا زعم تھا۔ اور پھر جب کچھ عرصے بعد کسی پنڈی وال دوست نے یہ اڑائی کہ سلطان رشک رفعت سلطان سے لکھواتا ہے، تو مجھے بہت خوشی ہوئی ۔۔۔ کسی کے خلاف سن کر ہماری انا کو تسکین ملتی ہے نا۔ پھر یوں ہوا کہ یہ "نیرنگ خیال" سے وابستہ ہو گیا اور اس نے اپنے رسالے کا کوئی خاص نمبر نکالا اور جس ڈائجسٹ پرچے میں میں ملازم تھا، اس کے چیف ایڈیٹر کو اس نے تبصرے کے لئے ایک پرچہ بھیجا۔ مجبوری یہ تھی کہ وہاں تبصرے مجھے ہی لکھنا ہوتے تھے، سو میں نے تبصرہ نہ لکھا۔ کچھ عرصے کے بعد سلطان رشک لاہور آیا۔ ہمارے دفتر پر بھی دھاوا بولا۔ مجھ سے سرسری طور پر ملا اور سیدھا میرے چیف ایڈیٹر کے پاس چلا گیا اور تبصرہ نہ چھپنے کی شکایت کی۔ اس کے بعد کی تفصیل الگ ہے مگر آج بھی میں یہ بات محسوس کر سکتا ہوں کہ وہ اوپر والوں سے تعلقات بنانے اور بنائے رکھنے میں بہت ماہر ہے۔ اور ہاں ۔۔۔ اوپر والے سے بھی اس کے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ میری بدنصیبی یہ ہے کہ اوپر والے سے بھی اور اوپر والوں سے بھی تعلقات میں ہمیشہ میری انا آڑے آ جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اپنے دوست اصغر مہدی کا کہنا ہے کہ انا وا کچھ نہیں ہوتی یہ سراسر کمپلکس کا کھیل ہے۔ سچ ہے ان کمپلکسوں نے ہی اس مقام پر پہنچایا ہے کہ پہلے پنڈی آتے تھے تو دیکھنا پڑتا ہے کہ کس کس سے نہیں مل سکوں گا۔ اب سوچ رہا ہوں کس سے ملوں ۔۔۔؟

سلطان رشک زندگی کرنے اور زندگی گزارنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ اس نے ہم سے بہت بعد میں ادبی کیریئر شروع کیا مگر اپنی ذہانت سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ ہم شاید آصف اقبال کی طرح بٹوین دی وکٹس (Between the Wicket) ٹھک ٹھک کر گئے ہیں اور وہ جاوید میانداد کی طرح کامرانی کے چھکے لگا رہا ہے۔ بزنس میں بھی وہ اپنے بھائیوں اور اپنے ٹریڈ کے لوگوں سے بعد میں آیا اور اگر ان سے آگے نہیں نکل گیا تو یہ ضرور ہے کہ ان کے کندھے سے کندھا ملا کر چل رہا ہے۔ وہ نہایت ملنسار دوست اور معاملہ فہم بزنس مین ہے۔

میں نے رفعت سلطان کا ذکر کیا تھا۔ ایک لطیفہ بھی سنتے چلئے۔ رشک کی شادی ہوئی تو ہمارے ایک دوست مرزا ہمایوں بیگ کی بیوی دلہن کو دیکھ کر آئی اور بہت سراہنے لگی۔ سلطان بھائی کی بیوی ماشاءاللہ بہت خوبصورت ہے اور بہت اچھی شاعرہ بھی ہے۔ ہمایوں نے حیرت سے پوچھا۔ تمہیں کیسے پتہ چلا ہے۔ خاتون نے کہا۔ بھئی اس کا نام رفعت ہے اور میں نے خود رفعت سلطان کی غزلیں "افق" وغیرہ میں چھپی ہوئی دیکھی ہیں۔

دوستی کا معاملہ بھی عجیب ہوتا ہے۔ ان رویوں کے تعلقات میں ایسے ایسے پرت ہوتے ہیں کہ جنہیں آپ الٹنا بھی چاہیں تو الٹ نہیں سکتے۔ بے شمار باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں آپ سب کے سامنے دہرا نہیں سکتے۔ کچھ باتیں بڑی معصوم شرارتیں لئے ہوتی ہیں

مگر یوں بھری محفل میں کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ نہ جانے کون کیا معنی نکالے۔ پھر مسئلہ یہ ہے کہ یہاں اس کی عزیزہ خواتین بھی ہیں ان کے سامنے مجھے اس کا بھرم رکھنا چاہیے اور کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جن کے سامنے مجھے اپنا بھرم رکھنا ہے کہ میرے مستقبل کی تابناکی اسی میں مضمر ہے۔ اور اس سب احتیاط کے باوجود اگر قلم کہیں پھسل جائے تو میرا ادھ دوش پوش۔

میں نے کہا تھا یاد رہا ہو یا جائے یاد او پیا ... تو یوں ہوا ہم ایک بار اکٹھے لاہور سے کراچی جا رہے تھے۔ اتفاق کی بات ایک سندھی قلم ایکسپریس اور اس کی بس بھی ہماری ہم سفر ہو گئیں۔ آپ میں سے بیشتر لوگ یہ گواہی دیں گے کہ میں بھی شریف آدمی ہوں مگر بگلا کتنا ہی بھگت کیوں نہ ہو مچھلی خود چونچ کے سامنے آ جائے تو وہ بیچارا کیا کرے۔ تو یوں ہوا کہ وہ مچھلی بھی خود بخود سامنے آ گئی۔ میں پلیٹ فارم پر اترا۔ اس نے ایک پان کی فرمائش کی اور پیسے دینے کی کوشش کی۔ میں نے ایک کی بجائے آٹھ پان لا دیے اور ٹافیوں کی پیشکش ڈال گیا۔ سلطان رشک نے نظر بھر کے مجھے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ ان کے پاس برتھ نہیں تھی۔ میں نے برتھ پر قبضہ جما رکھا تھا۔ بہت دیر وہ بستر میں نے استعمال کیا کچھ گھنٹوں بعد اس خاتون نے بھی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔ اس دوران کھانے پینے کی چیزیں بھی آتی رہیں اور میں بخوشی میزبان بنتا رہا۔ آخری بار وہ بستر سلطان رشک نے استعمال کیا اور جب نیچے اترا تو اس کے تھوڑی دیر بعد اس نے اعلان کیا کہ راستے کے خرچ سے لے کر کراچی کے قیام تک حساب کتاب وہ دور کرے گا۔ سچ پوچھیے وقتی طور پر وہ مجھے ظالم سماج ہی لگا ـــــ مگر اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے وہ حساب کتاب کی تکمیل نہ ڈالتا تو معاملات نہ جانے کہاں سے کہاں پھسل جاتے۔

سلطان میں آگے بڑھنے، اپنی حیثیت منوانے اور اپنی اہمیت جتانے کی پوری پوری صلاحیت ہے۔ اگر آج اس کی ایک انکم ٹیکس افسر سے دوستی ہے تو اگلے ماہ وہ ایک دو اسسٹنٹ کمشنر ایک آدھ کمشنر سے بھی اس کے تعلقات استوار ہو چکے ہوں گے۔ اس معاملے میں وہ پورا دھاندو ہے۔

ایک اور جگہ ہم اکٹھے تھے۔ لوگ تو وزیٹنگ کارڈ لے کر چلتے ہیں میں کچھ عرضیاں جیب میں ڈال کر نکلتا ہوں۔ بقول عدم ـــــ ہر حسیں آنکھ کا تماشائی ـــــ ہر جواں زلف کا بھکاری ہوں۔ اس محفل میں ایک عفیفہ ہم پہ مہربان ہو گئی۔ قریب ہونے پر معاملہ شناسائی کا آیا تو اس نے پہل کی اور مجھ سے پوچھا۔ آپ کا نام ـــــ؟ اور اس سے پہلے کہ میں کوئی رومانٹک ڈائیلاگ سوچ کر اپنا نام بتاتا اس بھائی نے جھٹ سے کہا۔ "میرا نام سلطان ہے" ـــــ اور اب آپ سے کیا پردہ اس کے بعد اس بی بی نے ہم دونوں کو گھاس نہ ڈالی۔

وہ اکثر مجھے تلقین کرتا ہے کہ تخلیق میں کم از کم دس اشتہارات تو ہوں ـــــ اس طرح آپ لوگ کب تک پرچے کا بوجھ اٹھاتے رہیں گے ـــــ "ایک بار انجمن ادبی رسائل کا سالانہ اجلاس تھا ـــــ رات کے ڈنر سے ذرا پہلے پاکستان بھر کے مدیران رسائل خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اتنے میں ایک مدیر اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے بیشتر لوگوں کو اپنا تازہ پرچہ دیا ـــــ سب لوگوں سے الگ، سلطان رشک نے اسے پیچھے سے کھول کر دیکھنا شروع کر دیا۔ میں نے دور سے آواز لگائی ـــــ سلطان رشک تم رسالے میں اشتہار گن رہے ہو ... "محفل میں شریک سب لوگ کھلکھلا اٹھے۔

اس وقت تو میں نے یہ جملہ چٹکلہ مذاق میں کہا تھا مگر غور کروں تو یقین ہوتا ہے کہ وہ عقل سوجھ بوجھ اور ذہانت و فراست کا مالک ہے۔ یہی تو باتیں ہیں جنہیں ہم مذاق میں ٹال دیتے ہیں اور وہ تلقین جان کر اسی سے زندگی کو سنوارنے کے ڈھنگ نکالتا رہتا ہے۔ ہم

فیصل آباد سے لاہور واپس آ رہے تھے تو میں نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے بنے ہوئے کارخانوں کو دیکھتا چلا آ رہا تھا اور پھر رو تے سے کہا اور کہہ ہی دیا ۔۔۔ یار ان سب لوگوں کو ہمیں اشتہار دینے چاہئیں۔

میں نے اس کی شادی کا ذکر کیا تھا ۔۔۔ میں لاہور سے شرکت کرنے آیا تھا۔ اس کے اصرار کے باوجود حسبِ معمول میں ایک ہوٹل میں ٹھہرا۔ اس نے مجھے کہا، اس کے باوجود تم میرے مہمان ہو گے۔ میں نے طرح دینا چاہی مگر آخری دن جب میں لاہور جانے والا تھا تو وہ ہوٹل میں آ دھمکا۔ اور اس نے میرے احتجاج کے باوجود میرے ہوٹل کا تمام بل ادا کر دیا۔ مگر اسی وقت اس نے احتیاطاً ایک شاعر کو بھی ساتھ رکھا ہوا تھا جو رسالے میں اس کا نائب بھی تھا۔

ممکن ہے یہ بات اُسے بتانے اور جتانے کے لئے ہو کہ ہماری حقیقی دوستی ہے یا شاید اس میں وہی جذبہ کارفرما ہو کہ جب وہ لاہور آتا ہے تو دفتر ''تخلیق'' میں پہنچتے ہی جیب سے گولڈلیف کی دو ڈبیاں نکال کر میز پر پھینکے گا کہ جہاز سے سستی مل گئی تھیں۔ یا جہاز کا ٹکٹ کسی بہانے نکال کر رکھے گا کہ یا آج ٹیکسی والے نے ایئرپورٹ سے یہاں تک کا بڑا مناسب کرایہ لیا ہے اور اس طرح مجھ جیسے غریب عوام پوری طرح متاثر ہو جاتے ہیں۔

ان پندرہ سولہ برسوں کی بے شمار باتیں ہیں۔ ہماری دوستی کی باتیں، ہماری رنجش کی باتیں ۔۔۔ دنیا کے دستور کے عین مطابق کچھ ایسے دوست بھی درمیان میں آئے کہ انہوں نے ہمیں دور کرنے کی کوشش کی۔ کبھی مجھ سے، کبھی اس سے اپنی محبتوں کا دم بھرا۔ مگر وہ لوگ نہ جانے کہاں حالات کی مٹی میں رل گئے اور ہم آج بھی محبتوں اور رفاقتوں کے امین بنے ہوئے ہیں۔ آپ سے سچ کہوں، سلطان رشک دوستی کرنا اور دوستی نبھانا جانتا ہے۔ بات صرف مجھ تک ہوتی تو اور کئی پنڈی کے لوگوں کی طرح ہم آج ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہو چکے ہوتے۔ مگر میری ساری خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود اس نے ہمیشہ اپنا دل اور اپنے بازو کھلے رکھے ہیں۔ وہ یقیناً کاروباری آدمی ہے اس نے واقعتاً بزنس کو اہمیت دی ہے مگر یہ بھی تو ہے کہ اس سب کے باوجود اس نے ''نیرنگِ خیال'' کو نئی زندگی دی ہے۔ اس نے ایک قدیم روایت کو زندہ رکھا ہے۔ ورنہ ''ہمایوں'' کے کروڑپتی مالکان نے اپنے ہاتھوں سے اس رسالے کو دفن کر دیا۔ وہ چاہتے تو ان کے بااختیار لوگوں کے ایک کمیٹی یا شاید ہی بلڈنگ کے ایک دفتر کے کرایے سے یہ رسالہ تمام عمر زندہ رہ سکتا تھا۔ ''ادبی دنیا'' کی بھی ایسی ہی مثال ہے۔ لیکن سلطان رشک نے نہ صرف یہ کہ رسالہ چلایا ہے، حکیم یوسف حسن کا نام پائندہ رکھا ہے بلکہ خود بھی بہت محنت اور توجہ سے شاعری کی ہے اور اس میں اپنا ایک اہم مقام پیدا کیا ہے۔ اور ایک خاص اعتماد حاصل کیا ہے اور اس اعتماد کی بھی سن لیجئے ۔۔۔ یہ اعتماد اتنا قوی ہوا ہے کہ جس طرح وہ بزنس میں اپنے ساتھیوں کو مشورے دیتا ہے بالکل اسی طرح اس کا کوئی ہم عصر یا کم چھپنے چھپانے والا شخص اسے شعر سنائے تو وہ فوراً اپنے اوپر سنجیدگی طاری کر کے اس اعتماد کی چھڑی کو گھما کر یہ کہے گا ۔۔۔ ذرا اس مصرعے پر توجہ کریں ۔۔۔ پچھلے دنوں وہ لاہور آیا۔ شیخ داری نبھاتے ہوئے وہ ملک الاذان اصغر مہدی کے گھر بھی گیا اور تکلف میں اپنے شعر سنائے اور مروت میں ان کے بھی سنے اور آخر میں ان سے غزل کا کاغذ لیا۔ کچھ لمحے استغراق میں گزارے اور پھر کہا ۔۔۔ ذرا اس مصرعے پر نظرثانی کر لیں۔ میں نے دیکھا مصرعہ ٹھیک تھا کہ تھا مگر میں چپ رہا کہ ۔۔۔ میری دونوں سے آشنائی ہے۔

(اظہر جاوید کے پرانے کاغذات سے بازیافت)

◆◆◆

یادنگاری

عاشقی صبر طلب

(2013-2001)

......10......

ڈاکٹر رشید امجد

پاکستانی ادب کا اولین نعرہ حسن عسکری اور ممتاز شیریں نے بلند کیا تھا لیکن یہ تصور بنیادی طور پر ترقی پسندوں کو رد کرنے کے لئے تھا، دوسرے اس حوالے سے ایک بھی تخلیقی شے وجود میں نہیں آئی چنانچہ کچھ ہی عرصہ بعد یہ صرف ایک ہنگامی بحث کے طور پر اپنی موت آپ مر گیا۔ اس کے برعکس وزیر آغا کا ادبی قومیت کا تصور زمین اور اس کے مظاہر کے حوالے سے تھا اور پاکستانی ادب کی وہ تحریک ساری تھی جو آج اپنے مکمل وجود کے ساتھ ہمارے سامنے ہے۔

وزیر آغا نے ''اوراق'' کے ذریعے نہ صرف جدیدیت کی فکری و فنی حد بندی کر کے اسے ایک سمت عطا کی، بلکہ ساٹھ کی دہائی میں سامنے والی نئی نسل کی ذہنی، فکری و فنی تربیت بھی کی۔ ''اوراق'' کے اداریے اس ضمن میں خاصی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ''اوراق'' کا ایک مستقل سلسلہ ''سوال یہ ہے'' اور نظموں و افسانوں کے تجزیاتی مطالعے اس پرچے کی انفرادیت کی دلیل تھے۔ آغا صاحب کہتے تھے کہ کسی پرچے کو پوسٹ آفس نہیں ہونا چاہئے کہ جو کچھ ملا اسے آگے پہنچا دیا، بلکہ اس میں اس کے مدیر کے فکری رجحانات و رویوں کا مکمل احساس ہونا چاہئے، اس کی ایک سمت ہونا چاہئے۔ ''اوراق'' میں دونوں پہلو موجود تھے۔ ساٹھ کی نئی لسانی تشکیلات سے متاثر جس نسل نے نئے افسانے اور نئی شاعری کا آغاز کیا تھا اس میں ابتدا ابہامی افراط و تفریط تھی۔ نئے لوگوں کو کوئی پرچہ چھاپنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ''اوراق'' نے نہ صرف اس نئی نسل کو ایک پلیٹ فارم مہیا کیا بلکہ ان کی تربیت بھی کی۔ مجھے یاد ہے میں جب انہیں افسانہ بھیجتا تو وہ اس کے بارے میں مجھے تفصیلی خط لکھتے، ایک ایک جملے کے بارے میں بات کرتے، کبھی تبدیلی کا مشورہ دیتے، کبھی کہتے، میں مری آؤں گا تو افسانہ ساتھ لیتا آؤں گا، وہیں تفصیلی بات کریں گے۔ منشا یاد کے پاس سکوٹر ہوتا تھا۔ اتوار کو میں ان کے ساتھ مری جاتا۔ آغا صاحب افسانے کی سطر سطر پر بحث کرتے، پھر ہم دونوں سے پوچھتے کیا کیا پڑھا ہے، نئی کتابوں کے نام بتاتے اور اصرار کرتے کہ ہم انہیں ضرور پڑھیں۔ دوپہر کا کھانا ان کے ساتھ کھا کر ہم دونوں پنڈی آتے، اکثر بارش میں بھیگتے۔ منشا اسلام آباد میں رہتے تھے لیکن مجھے چھوڑنے پنڈی تک آتے اور کمیٹی چوک میں اتار کر گھر جاتے۔

وزیر آغا نقاد، شاعر اور جدید انشائیہ کے بانی تھے۔ تنقید میں ان کا ایک خاص مقام ہے۔ وہ ایک صاحب مطالعہ شخص تھے۔ ان کا مطالعہ صرف ادب تک محدود نہیں تھا۔ انہوں نے معاشیات میں ایم اے کیا تھا لیکن ان کے دلچسپی کے دائروں میں سائنس خصوصاً فزکس

شامل تھی۔ ان کی تحریروں میں اس وسیع مطالعے کی جھلکیاں جابجا موجود ہیں۔ انہوں نے اردو تنقید کو نئے لہجے اور نئے فکری رویوں سے آشنا کیا۔ وہ امتزاجی تنقید کے نئے دبستان کے بانی ہیں۔ مطالعے کا شوق آخر دم تک ان میں موجود رہا۔ میں آخری بار جب پچھلی جولائی کو ان سے ملا تو ان کا پورا کمرا کتابوں سے بھرا ہوا تھا صرف سونے کے لئے تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ وہ نہ صرف باہر سے کتابیں منگواتے بلکہ ملنے والے ہر پرچے اور کتاب کو پڑھتے۔ اس دن بھی انہوں نے تازہ موصول ہونے والے رسائل اور کتابوں پر گفتگو کی۔ ان کی خوبی تھی کہ اپنے مطالعے میں دوستوں کو بھی شریک کرتے۔ ان کے خلاف جب منظم ادبی محاذ بنایا گیا تو کوئی نہ کوئی انہیں خوش کرنے کے لئے مخالفوں کا ذکر کرتا، وہ عموماً خاموش رہتے اور دوسرے اس موضوع پر بات کرتے رہتے۔ لوگ ایک ایک کرکے جانا شروع ہوتے تو میں بیٹھا رہتا۔ جب سب چلے جاتے تو میں ان سے پوچھتا آپ نے اس دوران کیا کیا پڑھا ہے؟ وہ بڑے خوش ہوتے اور دیر تک کسی نئی کتاب یا موضوع پر بے تکان گفتگو کرتے۔

اس زمانے میں وہ اکثر پنڈی آتے۔ بلکہ کبھی کبھی مہینے میں دو دو تین تین بار۔ "لکھنے والوں کی انجمن" کے اکثر جلسوں میں وہ طویل لیکچر دیتے۔ اس زمانے میں وہ سلور گرل میں ٹھہرتے تھے۔ بعد میں اعجاز راہی کے مشورے پر راول ہوٹل میں ٹھہرنے لگے۔ لیکن آخر آخر وہ انجم نیازی کے گھر قیام کرتے۔ ان کا معمول تھا کہ سیدھے جمیل آذر کے گھر آتے۔ جمیل آذر چند منتخب دوستوں کو بلا لیتے۔ ہم دوپہر کا کھانا ان کے گھر کھاتے اور پھر آغا صاحب ہوٹل روانہ ہو جاتے۔ آغا صاحب ایک اعلیٰ ظرف دوست تھے۔ ہماری مقامی سیاست میں بالکل دخل اندازی نہ کرتے۔ ایک زمانے میں حلقہ ارباب ذوق پر کچھ ایسے لوگ قابض ہو گئے جنہیں میں پسند نہیں کرتا تھا۔ ان لوگوں نے حلقہ میں وزیر آغا کے ساتھ شام کا اہتمام کیا۔ میں نہیں گیا۔ رات کو ہوٹل میں پہنچا تو میں نے معذرت کی اور وجہ بتائی۔ انہوں نے قطعی برا نہیں منایا۔ کہنے لگے آپ میرے دوست ہیں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ان کے مخالف ہوتے تھے، وہ ذاتی اختلاف پر اتر آتے لیکن آغا صاحب نے اپنا علمی مرتبہ ہمیشہ برقرار رکھا۔ ان کی دوستی اونچ نیچ سے بالاتر تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم پہلی بار ان سے ملنے سرگودھا گئے تو وہ ریلوے سٹیشن پر ہمارے منتظر تھے۔

پچھلے چند برسوں سے میرا معمول تھا کہ جب بھی لاہور جانا ہوتا ان سے ملنا پہلی ترجیح ہوتی۔ میں جاتا تو کھل اٹھتے۔ گفتگو شروع ہوتی تو وقت کا خیال ہی نہ رہتا۔ میرے شیڈول میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری اور شیخ آجہد سے ملنا بھی شامل ہوتا، دیر ہو جاتی تو تبسم کا فون آتا کہ کدھر ہو، میرے جواب دینے سے پہلے ہی کہتے، آغا صاحب کے پاس ہو گے۔ میں کہتا بس اب اٹھنے والا ہوں۔ کبھی کبھی وہ کہتے "وہیں رہیں، میں بھی آ رہا ہوں، آغا صاحب سے مل لوں گا۔" گذشتہ ایک دو سالوں سے انہوں نے سرگودھا جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ سلیم آغا سے فون پر ہی ان کا رابطہ تھا۔ سلیم نے بتایا کہ ہر روز کم از کم نصف گھنٹہ ان سے بات ہوتی تھی، وہ زراعت کے سلسلے میں سلیم کو مشورے دیتے۔ تقریبات میں بھی انہوں نے جانا چھوڑ دیا تھا اور اپنے کمرے تک محدود ہو گئے تھے۔ کہتے تھے "میں نے اس کمرے کو اوڑھ لیا ہے، یہ اب میرا ابدی گھر ہے۔" اس پرگھر کے پیچھے بیٹھ کر انہوں نے غور و فکر کا سلسلہ آخری دم تک جاری رکھا۔ انہوں نے اب نثر لکھنا چھوڑ دی تھی۔ کہتے تھے، ہاتھ کانپتا ہے۔ البتہ نظموں کا سلسلہ آخر تک جاری رہا۔ اس دوران انہوں نے ایک اہم مضمون لکھا تھا جسے وہ اپنی کتاب "تخلیقی عمل" کا آخری باب کہتے تھے۔ کہنے لگے، "میری یہ کتاب تیس سال کے بعد مکمل ہوئی ہے۔" یہ مضمون جب کاغذی پیراہن میں چھپا تو مجھے فون کیا

کہ اسے پڑھ کر ان سے بات کروں۔ میرے پاس یہ پرچہ نہیں آیا۔ انہوں نے دو تین بار پوچھا میں نے کیا یہ پرچہ ملا کہ نہیں۔ اسی دوران تھیلی آدر سے پرچہ مل گیا۔ میں نے مضمون پڑھا۔ آغا صاحب نے برائن گرین کے بنیادی نظریے کہ پلانک لینتھ کے نیچے Cosmos کی چادر، مشتمل سطحوں سے بھرا ایک ایسا گورکھ دھندا ہے جس پر زمان و مکاں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ سٹرنگ تھیوری والوں نے اس پس منظر کا سراغ لگا کر Branes کو بھی دریافت کیا ہے۔ ان مختلف ابعاد Branes میں تین ابعاد کے حامل برین ہیں۔ ایک برین اس لئے قابل ذکر ہے کہ ہماری کائنات اس کے اندر بند ہے۔ قابل ذکر اور اہم بات یہ ہے کہ روشنی ایک برین سے دوسرے میں نہیں جا سکتی لیکن کشش (Gravity) ایک سے دوسرے میں جا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی اولین صفت نور نہیں بلکہ کشش ہے جس کے ذریعے اس نے اپنی ساری مخلوقات کو اپنے ساتھ جوڑا ہوا ہے۔ پرانے مشرقی نظریات کے تحت یہ فکر ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کے فلسفے سے جا ملتی ہے۔ آغا صاحب کا خیال ہے کہ کشش ثقل دراصل انسلاک، وحدت اور محبت کی علامت ہے۔ "تخلیقی عمل" کے آخری باب میں وہ مصنف اور اس کی تخلیق کو اسی تعلق کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ اس نقطہ نظر کے تحت مصنف اور تخلیق کا رشتہ اٹوٹ ہے۔ یہ ساختیات کے اس نظریے کے برعکس ہے جس میں مصنف کو تصنیف سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ آغا صاحب نے ساختیات کے تصور کو اجاگر کرتے ہوئے اس نکتہ چینی کا رویہ اختیار کیا تھا۔ ان کا یہ مضمون، جسے انہوں نے اپنی کتاب "تخلیقی عمل" کا آخری باب کہا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ اسے سوچنے اور لکھنے میں انہیں تیس برس لگے، فلسفیانہ تنقید کا ایک اہم حصہ ہے۔ میں اس بارے ان سے تفصیلی گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن آخری ملاقات میں موقع ہی نہیں ملا۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو آغا صاحب کی تنقید نے اردو میں فلسفیانہ تنقید کی بنیاد رکھی ہے۔ ان کا طریقہ کار استخراجی کی بجائے استقرائی ہے۔ آغا صاحب کو طبیعات سے خصوصی دلچسپی تھی۔ ریاضی دان نہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے طبیعات کا مطالعہ ایک ادیب کی حیثیت سے کیا اور گذشتہ برسوں میں اس شعبہ میں سامنے آنے والے معرکہ خیز تحقیقات کا گہرا مطالعہ کیا۔

"تخلیقی عمل" 1970ء میں منظر عام پر آئی تھی۔ 2003ء میں جب اس کا چھٹا ایڈیشن شائع ہوا تو انہوں نے تکوین کائنات کے حوالے سے اس میں ایک باب کا اضافہ کیا۔ "تخلیقی عمل" کی ساخت کو سمجھنے کے لئے انہوں نے حیاتیات، دیو مالا، تاریخ، تہذیب اور فنون لطیفہ میں سفر کرتے ہوئے طبیعات کی ان حدوں کو چھو لیا جو آج نئے سائنسی انکشافات کی بنیاد ہیں۔ اپنے پہلے اضافے کے بارے میں انہوں نے لکھا:

"آج سے کم و بیش تیس برس پہلے جب میں نے یہ کتاب لکھی تو تخلیقی عمل کے سلسلے میں فروغ پانے والے مختلف فکری مکاتب (مثلاً روحانی، جدلیاتی، جمالیاتی، نفسیاتی) کا ذکر تو ہوا مگر بوجوہ اس میں بیسویں صدی کی نئی تنقیدی تھیوری کے تحت ابھرنے والے فکری مباحث زیر بحث نہ آ سکے۔ اب میں ان کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔"

یہ تحریر 2003ء کی ہے۔ 2009ء میں انہوں نے تکوین کائنات کے حوالے سے "تخلیقی عمل" کا از سر نو جائزہ لیا اور طبیعات میں ہونے والی تازہ ترین پیش رفت کی بنیاد پر اس کتاب کا آخری باب لکھا۔ یہ ان کا آخری مضمون بھی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے نثر لکھنا چھوڑ دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے ہاتھوں کی کپکپاہٹ کی وجہ سے وہ نثر نہیں لکھ سکتے، البتہ نظمیں کہنے کا سلسلہ آخر دم تک جاری رہا۔ کہتے تھے، نظم ایک روشن ستارے کی طرح میری ذہنی افق پر نمودار ہوتی ہے اور میں اسے محفوظ کر لیتا ہوں۔

بطور مدیر وزیر آغا کے سفر کا آغاز ''ادبی دنیا'' سے ہوا۔ انہوں نے ''ادبی دنیا'' کو جدید فکری رویوں سے ہم آہنگ کرنے میں وہی کردار ادا کیا جو ایک زمانے میں میراجی نے کیا تھا۔ ادبی دنیا کے ادارتی دور میں مولانا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ ''اوراق'' کا اجرا ہوا تو اس کی پیشانی پر درج تھا ''مولانا صلاح الدین احمد کی یاد میں'' اور یہ جملہ آخری پرچے تک موجود رہا۔ ''اوراق'' نے جدیدیت کی تحریک کو معتدل بنانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ ''سوال یہ ہے'' میں اپنے دور کے اہم فنی و فکری موضوعات پر بحث کی جاتی تھی۔ میراجی نے ''اس نظم میں'' کے عنوان سے اپنے عہد کی نظموں کا تجزیہ کر کے جدید نظم کی تفہیم کی بنیاد رکھی تھی۔ ''اوراق'' میں نظموں کے تجزیاتی مطالعوں کے ساتھ نئے افسانوں کے تجزیاتی مطالعے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ اس سلسلے کا پہلا تجزیہ میرے افسانے ''پچھلے پہر کی موت'' پر تھا۔ ''اوراق'' کے اداریے ہر بار ہم عصر ادب کے کسی سوال پر بحث کا آغاز کرتے۔ ''اوراق'' نے اپنی اشاعتوں میں اپنے زمانے کی نئی نسل کو ہمیشہ اہمیت دی۔ ''اوراق'' جب بند ہوا تو میں نے پوچھا ''آپ نے ''اوراق'' کو بند کیوں کر دیا؟'' کہنے لگے دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ میں ''اوراق'' کے لئے موصول ہونے والی ہر تخلیق کو خود پڑھتا تھا۔ کتابت اور پروف ریڈنگ کے بعد پریس جانے سے پہلے پورا پرچہ دوبارہ پڑھتا تھا۔ اب مجھ میں اس کی سکت نہیں۔ دوسرے یہ کہ اس وقت میں خود زراعت کا کام کرتا تھا اور ''اوراق'' کا خرچ اٹھاتا تھا۔ اب میں یہ کام نہیں کرتا۔ سارا کام سلیم کر رہا ہے اور مجھے اچھا نہیں لگتا کہ اسے بھی یہ احساس ہو کہ میں اس کی محنت سے اپنا مشغلہ پورا کر رہا ہوں۔ ادبی پرچے ہمیشہ خسارے کا رونا روتے رہے ہیں۔ آغا صاحب نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا، نہ کبھی دوستوں سے اس سلسلے میں کچھ کہا۔

آغا صاحب کی علمی و ادبی خدمات پر پاکستان و بھارت کی جامعات میں بہت کام ہوا ہے۔ بھارت میں ان پر پی ایچ ڈی کے تین چار مقالے لکھے گئے۔ پاکستان میں ایم فل کی سطح پر بے شمار مقالے تحریر کئے گئے ہیں۔ مجھ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ آغا صاحب کی حیات ہی میں ان پر پی ایچ ڈی کے دو مقالے لکھے گئے۔ پہلا مقالہ تحسین عباس نے میری نگرانی میں لکھا، جس کا عنوان ہے: ''جدید اردو نظم کے تناظر میں وزیر آغا کی نظم نگاری''۔ اس مقالے پر ڈگری مل چکی ہے۔ دوسرا مقالہ سعدیہ طاہر نے ڈاکٹر روبینہ شہناز کی نگرانی میں ''وزیر آغا کی علمی خدمات ۔۔۔ تنقید کے حوالے سے'' مکمل کیا ہے۔ یہ مقالہ اب جانچ کے لئے بیرونی ممتحنین کو جا چکا ہے۔ پہلا مقالہ آغا صاحب نے دیکھ لیا تھا، بڑے خوش ہوئے، خصوصاً اس کے معیار پر۔ افسوس دوسرا مقالہ وہ نہیں دیکھ سکے۔ آغا صاحب کے مخالفوں میں سے اکثر نے انہیں پڑھے بغیر محض ذاتی عناد پر ان کی مخالفت کی۔ انشائیہ کو جس طرح منفی تنقید کا نشانہ بنایا گیا اس میں سراسر ذاتیات شامل ہے۔ آغا صاحب نظم میں اس طرز فکر کے بانی تھے جس کا آغاز میراجی سے ہوا تھا اور جو مجید امجد سے ہوتی ہوئی ان تک پہنچی تھی۔ نظم کا یہ انداز غزل سے اس کی نہ صرف استعاراتی بلکہ آہنگی علیحدگی تھی اور غزل سے اس کے مکمل الگ وجود کی دلیل تھی۔ بعض لوگ اس باریک فرق کو سمجھ نہ پائے لیکن جہاں تک ان کی تنقید کا تعلق ہے، ان کے مخالفین بھی ان کے نظریات سے اختلاف کے باوجود اس کی اہمیت و انفرادیت کے قائل ہیں۔ ''اردو شاعری کا مزاج'' نے جس اختلافی بحث کا آغاز کیا تھا وہ برسوں جاری رہی۔ اردو کی شاید ہی کسی اور کتاب کے حمایت و مخالفت میں اتنا کچھ لکھا گیا ہو۔ آغا صاحب کی تنقید کا بنیادی وصف یہ تھا کہ انہوں نے ایسے لوگوں پر لکھا جو اپنی کمزور پی آر کی وجہ سے نظر انداز کیے گئے تھے۔ ''نظم جدید کی کروٹیں'' ان کی ایسی کتاب ہے جس میں پہلی بار بعض معتبر مگر نظر انداز شاعروں پر قلم اٹھایا گیا۔ مجید امجد پر پہلا مضمون آغا صاحب نے لکھا تھا، بعد میں مظفر علی سید نے دوسرا مضمون لکھا۔ اس کتاب میں ہر شاعر کے عنوان کے ساتھ جو موضوعاتی و فکری استعارہ

استعمال کیا گیا وہی بعد میں ان کی پہچان اور مرکزی استعارہ قرار پایا۔ آغا صاحب جینوئین لوگوں کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ اور اچھی تخلیقات کو نہ صرف یاد رکھتے بلکہ احباب سے ان کا ذکر بھی کرتے۔ انہوں نے کئی بار علی محمد فرشی کی نظم ''علینہ'' کا ذکر کیا اور ہر بار اس کے کسی نئے پہلو کی طرف اشارہ کیا۔ کہتے تھے: ''یہ میری پسندیدہ نظموں میں سے ہے۔''

میری ان سے آخری ملاقات اکیس جولائی دو ہزار دس کو ہوئی۔ میں شام کو لاہور پہنچا تھا۔ یونیورسٹی گیسٹ ہاؤس میں سامان رکھ کر میں اور ڈاکٹر سہیل عباس ان کے گھر پہنچے۔ مجھے اچانک دیکھ کر ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ مجھے احساس ہوا کہ اس بار وہ کرسی سے اٹھ کر نہیں ملے۔ بہت کمزور لگ رہے تھے۔ لیکن سفید شلوار قمیض میں مجھے وہ بڑے ہی پروقار لگے۔ کہنے لگے: ''آپ کب آئے ہیں؟'' میں نے کہا: ''تھوڑی دیر پہلے۔ صبح واپس اسلام آباد جانا ہے اس لئے یہی تھوڑا سا وقت تھا۔'' گفتگو نئے آنے والے پرچوں پر ہونے لگی۔ اسی دوران انہوں نے بتایا کہ ان کے انٹرویو کی کتاب آ رہی ہے۔ کہنے لگے: ''آپ نے اور جمیل آذر نے میرا جو ایک طویل انٹرویو کیا تھا، وہ اس کتاب کا پہلا انٹرویو ہے۔ یہ انٹرویو 'ادبیات' میں چھپا تھا۔ شاہد شیدائی بھی موجود تھے۔ ہم آدھے گھنٹے کے لئے آئے تھے لیکن گھنٹے سے اوپر ہو گیا۔ تبسم کا فون آیا: ''مجھے معلوم ہے تم آغا صاحب کے پاس ہو گے، بھائی میں اور صبیح آج کھانے پر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

ہم نے آغا صاحب سے اجازت لی اور پہلی بار یہ ہوا کہ وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے نہیں آئے۔ عرصے سے یہ معمول تھا کہ ہر اتوار کو ان سے فون پر بات ہوتی تھی۔ وہ فون کر لیتے یا میں۔ ادبی باتیں ہوتیں، دوستوں کا ذکر بھی ہوتا۔ میں نے ایک بار ان سے کہا: ''اب بہت جواب دے گئی ہے۔'' بولے: ''کتنی عمر ہے آپ کی؟'' میں نے کہا: ''ستر پورے ہو گئے۔'' ہنسے اور کہنے لگے: ''You are just a kid۔ میں اب نوے کو چھونے والا ہوں۔''

ان کی موت سے تین چار دن پہلے سلیم آغا نے فون کیا کہ آغا جی ہسپتال میں ہیں۔ آخری دم تک ان کا تخلیقی شعور باقی تھا۔ سلیم آغا نے بتایا کہ مرنے سے غالباً ایک دن پہلے، جب وہ کچھ دیر کے لئے غنودگی سے نکلے تو بولے: ''میں جس تجربے سے گزر رہا ہوں اگر موقع ملا تو اسے لکھوں گا اور یہ ایسی تحریر ہو گی کہ چونکا دے گی۔''

ایک بات اور انہوں نے کہی: ''ساری رات میرے گرد ایک ڈرامہ ہوتا ہے جس کا مرکزی کردار میں ہوں، لیکن صبح سب کچھ بھول جاتا ہے۔''

موت کی اس غنودگی میں بھی ان کا تخلیقی سیلف زندہ تھا۔ ویسے موت کی آواز تو ان کی آخری چند نظموں میں سنائی دینے لگی تھی۔ ''تسطیر'' میں شائع ان کی چار نظموں، جو آخری ہیں، کی پہلی نظم ''غنودگی'' میں تو یہ گونج صاف سنائی دیتی ہے۔

غنودگی کو اوڑھ کر وہ سو گئے
مگر وہ خواب بھی عجیب تھے
زمیں سے اڑ کے آسماں کی سمت
وہ خواب تھے
غنودگی خمار تھی، تمام خواب لے گئے

تو خواب پھر پرائے جاگنے لگے
کہ سائباں کو تار تار کر گئے
دور دور تک گئے
وہ آسماں کا رزق تھے، چلے گئے!
غنودگی جو بچ گئی

غنودگی کا سائباں جھکا ہوا تھا چار سو
عجیب گول جنتوں میں ڈھل گئے
کہاں گئے، پتہ نہیں
غنودگی کہاں ہے اب
وہ ہولے ہولے بجھ گئی

زمین کا رزق بن گئی!!

موت کی خاموشی میں بھی وہ اس تخلیقی کا ناطہ ہی بن رہے تھے جو ان کے نزدیک لوگوں کو حیران کرتی تھی لیکن اپنی تحریروں میں وہ اس عظیم اسراری کی نشانیاں چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی نظموں کو جب ان کے تناظر میں پڑھا جائے گا تو احساس ہوگا کہ وہ برگد کے اس عظیم استعارہ کی مانند تھے جو خود گیان ہے اور اپنے سائے میں بیٹھنے والوں کو بھی گیان عطا کرتا ہے۔ ان کی نماز جنازہ کے بعد میں نے اوپر دیکھا تو برگد کا ایک عظیم درخت چھتنار کیے ہوئے تھا۔ ان کی آبائی حویلی میں یہ برگد جانے کتنے زمانوں کو اوڑھے ہوئے ہے۔ ان کی کئی تحریروں میں موجود ہے۔ گیان دھیان کے اس سفر کے روشن نکتے آنے والی نسلوں کو نئے زمانوں کی بشارت دیتے رہیں گے۔

⊛

ڈاکٹر ابرار احمد سے میری پہلی ملاقات احمد داؤد کے توسط سے ہوئی۔ وہ لاہور سے سول ہسپتال میں تعینات ہو کر پنڈی آئے تھے۔ سول ہسپتال کا ایک چھوٹا دروازہ کشمیری بازار میں اس گلی کے بالکل سامنے تھا جہاں میری رہائش تھی۔ ابرار سے بہت جلد بہت قربت ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ بھی میری طرح جدیدیت کی تحریک سے وابستہ تھے۔ دوسرا یہ کہ دونوں میاں بیوی ہسپتال ہی کے گھر میں رہتے تھے۔ چنانچہ بھابھی اور رخسانہ کی دوستی ہو گئی۔ وہ عموماً شام کو ٹہلتے ہوئے نکلتے اور سڑک پار کر کے ہمارے یہاں آ جاتے۔ ابرار کے پاس گاڑی تھی۔ ہم اکثر ان کی گاڑی میں صدر کے چکر لگاتے۔ کبھی آئس کریم کھاتے اور کبھی کہیں بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لیتے۔

فاسٹ فوڈ کا ابھی پنڈی میں رواج نہیں تھا۔ دیر ہو جاتی تو ہم لوگ کسی ایک گھر میں رات کا کھانا بھی کھا لیتے۔ پھر ابرار نے شام کو میرے گھر کے قریب ہی کلینک شروع کر دیا۔ میں اور داؤد شام کو جاتے یا اکثر ہی پر کچھ دیر اس کے کلینک میں رکتے۔ ادبی مسائل و سیاست پر گفتگو ہوتی۔ میرے تینوں بچوں سعدیہ، حسن اور حسین کو کوئی مسئلہ ہوتا تو رخسانہ انہیں خود ہی ان کے کلینک میں لے جاتی۔ ہمارے گھر سے ان کا کلینک پانچ منٹ کے فاصلے پر تھا۔ یہ بڑے مزے کے دن تھے۔ بھابھی ہم لوگوں سے بڑی گھل مل گئی تھیں۔ یہاں وہ تنہا تھیں۔ گھر یاد آتا تو ہمارے یہاں چلی آتیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں کہیں باہر ہوتا تو ابرار بھابھی کے ساتھ آ جاتے اور رخسانہ اور بچوں کو ساتھ لے کر صدر کا چکر لگوا لاتے۔ گاڑی اس زمانے میں بڑی نعمت تھی اور یہ نعمت ابرار کے توسط سے ہمیں بھی میسر تھی۔ ابرار احمد منفرد شاعر ہیں۔ ان کے بھائی افضال احمد بھی بڑے شاعر ہیں۔ وہ اس زمانے میں پنجاب یونیورسٹی میں پڑھ رہے تھے اور ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ہم جب بھی لاہور جاتے ان کے کمرے میں ٹھہرتے۔

مرزا حامد بیگ اور احمد جاوید بھی ابرار کے اچھے دوستوں میں شامل تھے۔ میں نے احمد جاوید اور ابرار احمد نے مل کر "دستاویز" کے دو شمارے بھی نکالے لیکن مالی مشکلات کی وجہ سے تیسرا شمارہ نہیں نکل سکا۔ اسی زمانے میں مذہبی بنیادوں پر کچھ ہنگامے شروع ہو گئے۔ ابرار کے والدین چنیوٹ میں تھے۔ وہ ان کے بارے میں اکثر فکرمند رہتے تھے۔ ابرار احمد ایک اچھے دوست اور کمال کے شاعر ہیں۔ لاہور ٹرانسفر ہوئی تو ملاقاتوں کے سلسلے منقطع ہو گئے۔ میں جب بھی لاہور آتا تو ان سے ضرور ملتا اور ہم پرانی یادیں تازہ کرتے۔ ان کی شاعری خصوصاً نظمیں آج بھی اسی طرح منفرد ہیں اور ان کا تخلیقی الاؤ اسی طرح بھڑک رہا ہے۔

(جاری ہے)

◆◆◆

سفرنامے

سورج کے رُخ پر

......11......

ڈاکٹر ابدال بیلا

کیچڑ، مٹی، دھول، ٹوٹی سڑکیں اور حواس باختہ پریشان دیہاتی۔ ادھر تو تھوڑے سے خوبصورت گھروں کی چمک شہر کے گھروں سے بھی آگے۔ راہداریاں شیشے جیسی اجلی اور ہر گاؤں میں کم از کم ایک مرسیڈیز کا شوروم۔

کاؤن پہنچ گئے۔

جمو گاڑی میں بٹھائے بٹھائے ہمیں سارا شہر گھما کے دکھانے لگا۔ شہر واقعی قابلِ دید تھا۔ چمکتا دمکتا، مسکراتا اور خوشی سے تمتماتا۔ ایک جگہ سے وہ تیزی سے گاڑی دوڑا کے لے گیا۔ میں نے پوچھا ادھر بہت لوگ ہیں، یہ کون ہیں؟ وہ چپ رہا۔ وہ جگہ گزر گئی تو مسکرا کے بولا۔ "یہ کرسٹوفر سٹریٹ تھی۔ ادھر "گے" اور "لیزبین" کمیونٹی اکٹھی ہوتی ہے"۔ کرنل رنگ چلایا۔ "یار ادھر روکا کیوں نہیں"۔ جمو نے کرنل رنگ کو غور سے ایسے دیکھا کہ رنگ کو پسینہ آ گیا اور دونوں ہاتھ گلی میں ہلاتے ہوئے بولا۔ "ایسے ہی جنرل نالج کے لیے کہہ رہا تھا" "اچھا کیا۔۔۔ ادھر نہیں رکے"۔ جمو بولا۔ "آگے دائیں طرف دیکھو۔ یہ سٹی میوزیم ہے۔ ادھر دنیا کا اعلیٰ آرٹ موجود ہے۔ پکاسو، وان گو، دالی، ڈی چیمپ کے شاہکار ادھر موجود ہیں۔ آگے چلو۔ تمہیں ایک عجیب میوزیم دکھاتا ہوں۔"

یونانی طرز کی خوبصورت عمارت میں اس نے گاڑی کھڑی کی۔ وہاں پر موجود ہر آدمی قدیم یونان کے لباس میں ملبوس تھا۔ لمبی لمبی چوڑے کی شیروانیوں جیسی قمیض کمر پہ کمر بند۔ کمر سے نیچے لٹکتے ہوئے چمڑے کی پٹیاں۔ سر پہ یونانی ہیٹ پنڈلیاں ننگی اور لمبی جرابوں پہ گھٹنوں سے اوپر جوتے۔ ہاتھ میں نیزہ۔ لگتا تھا ہم ایک موڑ مڑ کے کوئی بیس صدیاں پیچھے گھوم گئے ہوں۔ اندر عمارت کی راہداریاں بھی قدیم یونان کی۔ آتش دان میں لکڑی بھی لمبی صدیوں پہلے سے جلائی ہوئی دیواروں پہ رنگ روغن اور سجاوٹ بھی وہی قدیم عہد یونان کی۔ ادھر یونانی عہد کے مختلف سپاہیوں کی دکان۔ جنگ جدل کے اوزار۔ نیزے۔ تلواریں۔ ڈھالیں۔ وہیں قدیم یونان فوج کے سپاہی بھی اپنی یونانی یونیفارم پہنے۔ ایک کمرے میں عہد یونان کے چمکتے علم و عرفان کے ستارے۔ سقراط، پلاٹو، ارسطو۔ اور ان کے ساتھی۔ کوئی پڑھا رہا ہے۔ کوئی پڑھ رہا ہے۔ سوال ہو رہے ہیں۔ جواب سننے کے لیے کان کھڑے ہیں۔ کہنے کو وہ سب مجسموں کے روپ میں تھے۔ مگر لگتا تھا ابھی اٹھ کے چلنے پھرنے لگیں گے۔ ہر کوئی منظر میں ایسے ڈوبا ہوا جیسے وہ منظر بنایا نہیں گیا۔ اس منظر نے اپنے دائرے بنے ہیں۔ دیکھنے والے بھی خاموش۔ کہیں کسی کی ذرا سی سرگوشی سے سقراط کا دھیان نہ بھٹک جائے۔ پلاٹو اپنی "ریپبلک" لکھتے لکھتے کہیں چوک نہ جائے۔ میں پلاٹو کو پلاٹو ہی کہتا ہوں۔ دنیا کی کسی تہذیب تمدن یا معاشرت میں کسی کا نام بدلا نہیں جاتا۔ زبان و بیان کی ہر رمز، ہر فکر، اور نظریے کا نام اپنی اپنی زبان میں ترجمہ کر سکتے ہیں۔ کسی کے پاس وہ مخصوص آواز والا لفظ نہ ہو تو وہ

اس سے ملتا جلتا لفظ ادا کر کے فرض پورا کر لے گا۔ جیسے عرب ہمارے پاکستان کو الباکستان کہہ دیتے ہیں۔ مگر یہ کہیں نہیں ہوا کہ ترجمہ کرتے وقت ہم کسی کا نام ہی بدل دیں۔ پلاٹو کا نام پلاٹو ہی تھا۔ عربوں نے ترجمہ کیا تو ان کی مجبوری یہ تھی کہ ان کے پاس پ نہیں۔ وہ پ کی جگہ ب یا ف استعمال کرتے ہیں۔ یوں انہوں نے پلاٹو کے افکار ترجمہ کیے تو اسے فلاتو کہنے لگے۔ عربوں کو جہاں نون نہ لگانا ہو وہاں وہ نون لگا دیتے ہیں۔ یوں شاید "فلاتون" بن گیا ہمارے اردو دان لوگوں کو ہر جگہ الف گھیڑنے کی عادت پتہ نہیں کیوں پڑ گئی۔ انہوں نے عربی سے ترجمہ کرتے ہوئے "فلاتون" کو افلاتون بنا دیا۔ ایک شروع میں الف لگایا دوسرا نون غنہ کا نون بنا دیا۔ اب جب پلاٹو کا نام اور اس کا سارا کام اصل یونانی اور دیگر یورپی زبانوں میں ترجمہ کیا موجود ہے تو اب بھی ہم اس عظیم سکالر کا نام کیوں بگاڑیں۔

ویسے ہی ہم یورپ جا کے پلاٹو کے کارنامے اور اس کے افکار سناتے ہوئے "افلاطون" کہہ کے اسے پکاریں تو وہ ہمیں ڈانٹ دیں گے کہ یہ کام، یہ کتابیں تم کس ایڈیٹ سے منسوب کر رہے ہو۔ یہ کام تو پلاٹو کا ہے۔

میرا خیال ہے، اب ہمیں کچھ عقل کے ناخن لینے ہوں گے۔ جہاں جہاں ہم نے بڑے عظیم لوگوں کے ناموں کو بگاڑا ہے، انہیں اب واپس اصل آواز میں لکھنا ہوگا۔

ہماری زبان میں، ہر آواز کو لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اور کسی کا نام بگاڑنے سے بڑا کوئی جرم نہیں۔ میری اپنی بہت سی کتابیں دنیا کی کئی زبانوں میں ترجمہ ہو کے چھپ چکی ہیں۔ اب اگر کسی کتاب پہ میرا نام کسی نے بدل دیا ہو تو سوچیں مجھے کتنا غصہ آئے گا۔

پلاٹو بھی مدت سے ہم سے ناراض ہے۔ اسے منانے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ اس کا نام صحیح لکھنا شروع کر دیں۔ سقراط اور ارسطو کے ناموں میں زیادہ فرق نہیں۔ اصل سوق رط اور ارس ٹاٹل ہے۔ مگر شاید وہ ہمیں معاف کر دیں۔ لیکن ریاست اور (Republic) ریپبلک کا مصنف پلاٹو ہمیں معاف نہیں کرے گا۔ خمیازہ بھی ہماری ریاست یا (Republic) کو بھگتنا پڑے گا۔

کولون پھرتے ہوئے دن ڈھل گیا۔

ابھی کئی میوزیم دیکھنے رہ گئے۔ وال رف اینچو میوزیم انیسویں صدی سے قبل کے یورپ کا میوزیم تھا۔ وہی لباس، وہی اوزار، ویسے ہی گھر، گھڑیاں، گھروں کا سامان، میز کرسیاں، غالیچے، یورپ والے مانتے ہیں کہ انہوں نے اپنے گھروں، محلات اور قلعوں کی زیبائش اور آرائش اس وقت سیکھی جب صلیبی جنگوں کی صورت میں ان کا پالا اس عہد کی سب سے ترقی یافتہ قوم مسلمانوں سے ہوا۔ جرمنی والے کہتے ہیں۔ جب ہمارے سپاہی پادریوں کے کہنے سے صلیبی جنگیں لڑنے گئے تو انہوں نے مسلمانوں کے شاندار خیمے اور میدان جنگ میں ایستادہ آرام دہ پرتعیش خیمے دیکھے۔ اس سے پہلے جرمن گھروں اور قلعوں میں کھڑکیاں ان گھڑی ہوتی تھیں۔ ان میں پردے لگانا انہوں نے مسلمانوں سے سیکھا۔ دیواروں پہ نقش و نگار، آتش دان کی شان، دیواروں کی رنگینی اور چھتوں کے نیچے رنگ و آہنگ انہوں نے مسلمانوں سے سیکھے اور اپنا لیے۔ سپین میں آٹھ سو سال مسلمان رہتے ہوئے بھی یورپ کو حسن اور رعنائی سکھا گئے۔ فوارے بنائے۔ باغ سجائے۔ محلات اٹھائے۔ مسلمانوں کی بنی سپین میں ایک ایک عمارت اب سپین والوں کا سب سے بڑا اثاثہ

ہے۔ فورۃ ملا ہو یا قرطبہ، وہ اس پہ ناز کرتے ہیں۔

وہیں کولون میں ایک میوزیم انوکھا تھا۔ چاکلیٹ میوزیم۔ منہ کے چٹخارے والوں کا ادھر بڑا رش تھا۔ بچے بچیاں چاکلیٹ کے نت نئے عجوبے، ذرا ذرا سی اور اس سے وابستہ ہوش ربا عیاں دیکھ دیکھ منہ میں پانی بھر لاتے تھے۔ چاکلیٹ وہاں سے خریدتے بھی، کھاتے بھی، کھلاتے بھی۔ کولون میں پھرتے پھرتے شام پڑ گئی۔

روشنیوں کی جگمگ ہو گئی۔

جمو کی مرسیڈیز ہمیں دریا کنارے بنے کھلے وسیع رائن پارک میں لے گئی۔ جمو بولا یہ جرمنی کا خوبصورت ترین پارک ہے۔ تھا بھی وہ ہوش ربا۔ اوپر کیبن کار گھوم رہی تھی۔ وسیع و عریض۔ جو عمارتیں وہاں تھیں، وہ ایسی خوش قطع کہ آدمی سوچے کہ یہ بھی آدمیوں کی بنائی چیزیں ہیں۔ صفائی ستھرائی تو سارے جرمنی میں ایڈیشن تھیٹر جیسی ہوتی۔ وہاں اس سے بھی دو ہاتھ آگے۔ اس پارک کا طائرانہ جائزہ لیا کہ جمو کولون ایرانی انگل پہ ہمیں لے گیا۔ وہ کوئی تین سو فٹ اونچائی پہ بنایا ہوا کولون اور گرد و نواح کو تکنے کے لیے ایک کھلا چبوترا تھا۔ ادھر جا کے ہم تینوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔ جدھر ہم گردن گھماتے رہے ستاروں پہ لپٹا مسکراتا آسمان نظر آتا۔ وہ بھی نیچے اپنے قدموں میں۔ ہم چاروں طرف کا منظر دیکھ کے مبہوت ہو گئے۔

واپسی پہ آتے ہوئے، کھلے پارک میں دریا کے حسین پل کے نیک گرد و نواح میں آتی سنوری چمکتی عمارتوں کے پس منظر میں ایک بہت بڑی سکرین پہ فلم چلتی ہوئی نظر آئی۔ ہزار ہا لوگ کرسیوں پہ بیٹھے فلم دیکھ رہے تھے۔ کچھ ہماری طرح دور سے اپنی کار میں بیٹھے بیٹھے مفت میں فلم دیکھے جا رہے تھے۔

رات بھیگ گئی۔

صبح ہمیں جرمنی سے باہر ایک اور ملک جانا تھا، ہالینڈ۔ ہالینڈ کے شہر ایمسٹرڈیم کا چناؤ میں نے جمو کے ساتھ کرنل رنگ کی حق منشا سے کیا تھا۔ اصل میں ویک اینڈ آ رہا تھا۔ ہمارے پاس ایک چانس تھا کہ بون کے مغرب میں بلجیم کے شہر برسلز چلا جایا جائے یا ازراہ شمال مغرب میں ہیروں اور ہیریوں کے شہر ایمسٹرڈیم۔

ہم نے چالاکی یہ کی، کہ جنرل کی بیگم کو ہیروں کی چمک کا بتایا، جنرل کو سڑکوں کی جگہ نہروں کا شہر میں جال بتا کر بھی پھنسایا۔ کرنل رنگ سے جڑنہ ہوا اس نے ہیروں کی منڈی کا ذکر بھی جنرل صاحب سے کر دیا۔ میں تو خاموش رہا۔ جنرل صاحب شاید خود ہی سر اٹھائے کچھ دیر خلا میں تکتے ہوئے اس منڈی کو سوچتے رہے اور پھر ہماری تجویز پہ ہاں کر دی

جمو کے ساتھ ہم نے ایمسٹرڈیم جانے کے لیے ایک گھڑ ری بڑی اس کا بندوبست کر لیا تھا۔ اگلی صبح ناشتے کے فوراً بعد ہمیں بون سے ایمسٹرڈیم جانا تھا اس لیے میں کرنل رنگ کو ٹے کر کھانے کے فوراً بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔

کرنل رنگ تو سو گیا۔

میں گھڑ ری کا پروہ بناتے، ایمسٹرڈیم کے ہیروں کی چکا چوند کو سوچتا رہا۔

(جاری ہے)

◆◆◆

عراق اشک بار ہیں ہم

......5......

سلمیٰ اعوان

میرا بچپن تضادات کے ماحول میں گزرا تھا۔ سارا گھر عجیب چوں چوں کا مربہ سا تھا۔ ننھیال مسلک کے اعتبار سے پکا ٹھیٹھ وہابیت کا علمبردار، کمبخت مارا منشی عالم اور منشی فاضل کی سان پر چڑھا ہوا روشن فکر لڑکیوں کی نوعمری میں شادیوں کی بجائے اُن کی اعلیٰ تعلیم کا سرگرم حامی۔ اس خاندان کی لڑکیوں کیلئے موٹے ڈوپٹے اوڑھ کر ایم اے، ایم ایس سی کرنا تو جیسے کھیل تماشے والی بات تھی۔ "کوا نے وقت" گھر میں آتے تو اشتہاروں والا صفحہ غائب ہو جاتا کہ لڑکیاں فلموں کا نام نہ پڑھیں اور لڑکیاں ایسی چالاک شرارت اور گھنیاں سی کہ انہیں فلمی ستاروں کے ہر ہر سکینڈل کا علم۔ صبیحہ خانم اور سنتوش کمار کا عشق کس مرحلے میں ہے؟ پہلے بیٹے کی ولادت اور شادی کا حساب کتاب سب انگلیوں پر۔ وہ دیپ شمیم آرا کی بجائے نیر سلطانہ میں دلچسپی لے رہا ہے۔ نیلو کا مسئلہ کیا ہے؟

ددھیال کے ہاں یہ نماز روزے کی سختی اور رحمت کے مظاہرے عام۔ نماز کی ذرا سی کوتاہی پر صلواتیں۔ کسی مجبوری پر روزہ نہ رکھنے پر لعن طعن کا ہونا ضروری۔ مگر ان کے ساتھ ساتھ پسندیدہ موضوعات سیاست پر تبصرے، اُن پر حاشیہ آرائیاں، سعدی کی حکایات، اقبال، حافظ اور مولانا روم کے اشعار کے حوالے اور ان کے برلب زبان رہنے کو بھی انتہائی پسندیدہ سمجھا جاتا تھا۔ کارل مارکس کو میں اپنے بچپن سے جانتی تھی۔ صرف کارل مارکس ہی نہیں لینن اور اینگلز سبھوں سے متعارف تھی۔ وجہ آتی ہی تھی کہ اس لمبے چوڑے وسیع و عریض گھر میں میرا ایک خالو پکا سوشلسٹ تھا۔ میں مذہبی معاملات میں بڑا احترام اور قدر ہی باقی تھی۔ نماز کیلئے مصلے پیار کے مارے کھڑی ضرور ہوتی پر اگر موڈ نہ ہوتا تو کبھی نہ پڑھتی۔ روزے رکھتی اور سکول جا کر توڑ لیتی۔ سر پر دوپٹہ لے کر کالج جاتی اور وہاں گلے میں ڈالے گھومتی پھرتی۔ جب ذرا کہ یونیورسٹی گئی تو ساڑھیوں اور سلیولیس بلاؤز پہننے کے بھی شوق اور ارمان پورے کیے۔ ہاں یہ جب ماں بنی تو بچوں کیلئے دعاؤں نے اس شتر بے مہار کی ناک میں نکیل ڈال دی تھی۔ ان کیلئے تندرستی اور درازیٔ عمر کی طلب نے سجدوں کو طویل اور رقت بھرا بنا دیا تھا۔

یوں یہ بات ضرور تھی کہ اس گھر میں نظریاتی رواداری بھی تھی اور برداشت بھی کہ میرے اس سوشلسٹ خالو کی "داس کیپٹل" اور اسلام کے موازنوں میں گزرتیں۔ سبھوں کا آغاز ریڈیو سیلون کے گانوں سے ہوتا۔ سارے گھر میں "مجھے گلے سے لگا لو بہت اداس ہوں میں" جیسے نغمے گونجتے۔ ایک بار تھوڑی ہزاروں بار یہ سنا تھا۔ ہم حنفی مسلک سے ہیں۔ حنفیوں کی خصوصیات کیا ہیں؟ جانے میری بلا۔ پر اب بغداد آ گئی تھی کاظمین والے اماموں کی زیارتوں سے مستفید ہو گئی تھی۔ اب امام ابو حنیفہ کی بڑک اٹھی تھی اور خدا گواہ ہے کہ اس میں اس لعن طعن اور طعنوں کا خشخاش جتنے دانے برابر ہاتھ نہ تھا کہ جو میری بچی اور خالہ نے میرے عراق جانے کا سن کر کہا تھا۔ "ویسے تو تم پوری مرتد ہو۔ کہیں کہیں فضول ہے پر امام اعظم کے روضہ مبارک پر حاضری دے دینا۔"

میری یہ خالہ + چچی ذرا سی لبرل ہیں۔ بقیہ گھر خاندان تو سعودی عرب والوں کی طرح ان ہستیوں کی درگاہوں پر جانے کو بھی بدعت خیال کرتا ہے۔ اور عراق پر کچھ نہ کچھ پڑھنے کے چکروں میں امام بھی زد میں آ گئے تھے۔ پڑھا تو دنگ رہ گئی۔ کتنے گوشے ایسے تھے کہ جن پر بے اختیار زبان سے سبحان اللہ نکلا تھا۔ میں تو یہی بات ہے اپنی ہر صبح کا آغاز ایسی ہی مقدس جگہوں سے کرنا چاہتی تھی۔ یہ اتفاق کا کہنا تھا کہ جب تازہ دم ہوں تو چلنے کا کام بخشتا ہیں تھکیں تو پھر ایسے مقدس مقامات پر آ جائیں۔ موسم کی تنگی میں کسی پرسکون ماحول میں آرام، زیارت، نماز نفل وغیرہ وغیرہ سبھوں کی حسن و خوبی سے ادائیگی ہو جاتی ہے۔ یہ بات مکمل طور پر ثابت ہوئی تھی۔ تو آج دوپہر اس ہستی کیلئے تھی جسے دنیا ایک عظیم فقیہہ کے نام سے جانتی ہے۔ جس کی فقہ کوئی دنیا کی قابل مثال تھی۔ جسکے مسلکی پیروکار دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کہیں بھی چلے جاؤ ہو۔ دجلہ کا دیدار تو سانس لینے کی طرح ضروری ٹھہرتا ہے۔ دونوں کنارے بڑے معتبر کردہ چند عالم دائیں بائیں آرام فرماتے ہیں۔

اعظمیہ اور کاظمیہ مشرقی اور مغربی بغداد کو ملانے والا پل ایمہ Aimma برج کے نام سے بھی مشہور ہے۔ عمارتوں، درختوں، دجلے کے پانیوں پر پڑتے دوپہری تیز دھوپ کے سنہری رنگوں سے لطف اندوز ہوتے گاڑی ایک وسیع میدان میں رک گئی۔ ایک خوبصورت دیدہ زیب مسجد جسکے مین اوپر پارٹوں میں پنجتن اللہ اور نیچے محمد اس عظیم امام کے مسلک کا عکاس تھا۔ مسجد کی خوبصورتی اور رنگ آمیزی میں متانت اور سنجیدگی پنہاں تھی۔ عظیم الشان بلند و بالا چوبی کندہ کاری سے آراستہ دروازے پر وردیاں پہنے فوجی بیٹھے تھے۔ زنانہ حصے میں چیکنگ کے بعد اندر وسیع و عریض صحن میں داخلہ ہوا۔ اس وقت میرے ذہن میں شجرہ گزر رہی تھی۔ دادا زوطی ایران کے آتش پرستوں کی اولاد تھا۔ اسلام قبول کیا تو ایران میں رہنا مشکل ہو گیا۔ حضرت علی سے خصوصی محبت کی بنا پر کوفے آ گئے۔ یہاں شادی کی۔ بیٹا ہوا۔ ثابت نام رکھا۔ دعائے خیر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کی۔ ثابت کے ہاں اس گوہر آبدار کی آمد 80ھ میں ہوئی۔ نام نعمان اور کنیت ابوحنیفہ تھی۔ مسجد کی کشادگی آنکھوں کو اچھی لگی تھی۔ سامنے والے رخ سے نظر آنے والا چہار پہلو مینار اپنی نقاشی اور زیبائش کے اعتبار سے بڑا خوبصورت نظر آیا تھا۔ یہ مینار ہی سے مسجد کا دائیں سمت والا مینار متاثر ہوا تھا۔

"ان کا خانہ خراب ہو۔ کل آنے والا ان کے مقبرہ مزار والی آنکھیں آج ہی آ جائے۔"

جاہل عورتوں کی طرح کوسنے میری زبان پر تھے۔ بیرونی حصے میں اور اندر بھی مرمت و تزئین کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ آرائش اور زیبائش میں شوخی نہیں تھی۔ ایک گھمبیرتا کا احساس ملتا تھا۔ دیواریں صرف اللہ کے خوبصورت ناموں سے سجی ہوئی ہیں۔ پوری مسجد میں خوبصورت قالین بچھے ہوئے تھے۔ لطیف سی خنکی تھی۔ عمارت ایرکنڈیشنڈ ہے اور ہر مسجد کی طرح خواتین کا حصہ الگ۔

مزار مقدس بہت پر نور، اور ایک گوشے میں تھا۔ آئینہ کاری میں بھی بہت بھرمار نہیں ہے۔ نفاست اور قرینے کی جھلک ہے۔ چاندی اور لکڑی کی کندہ کاری سے سجی جالی سے اندر جھانکا۔ لگا جیسے آنکھیں تشہد کے ساتھ چپک سی گئی ہیں۔ ایک تیسری دیوار پر طاقچے کی سطح پر نمایاں ہو کر سامنے آ گئی تھیں۔ تیز چھناکے سے ایک منظر یادداشتوں میں ابھرا تھا۔ گلبرگ کا کوئی اندرونی حصہ کے رقبے پر پھیلا ہوا گھر تھا جہاں امریکہ سے آئی ہوئی ایک مشہور سکالر کیلئے مدعو تھی۔ چاندنی کی طرح جھلملاتی لو دیتی روشنی میں اندر دیکھتے ہوئے اس صاحب علم خاتون کے الفاظ سماعتوں سے ٹکرائے تھے جو اس نے عورتوں کی محفل میں باتیں کرتے کرتے واضح کیے تھے۔

""مسلمان عورت تو محسنِ انسانیت کے بعد امام ابوحنیفہ کا ممنون ہونا چاہیے۔""

کونے میں سے ایک شیریں آواز ابھری تھی۔ ""ذرا رکیے، آگے بڑھنے سے قبل کسی ایک واقعے کی تفصیل بتایئے۔"" ""مجھے یاد ہے میں نے رخ پھیر کر دیکھا تھا ایک خوبصورت لڑکی اپنی سرمگیں آنکھوں میں عقیدت و احترام کی لو جگائے واقعہ جاننے کیلئے مضطرب نظر آتی تھی۔ اور تفصیل کیلئے بغداد شہر بسانے والے عباسی خلیفہ کے محل جانا پڑا تھا۔ خاتون بڑی کامیاب داستان گو تھی۔ مدینۃ المنصور میں خلیفہ کے شاندار محل کی تفصیلات، بالکونیوں کا دجلہ کی طرف کھلنا، دجلے کی پراثر ہواؤں، اس کے پانیوں پر تیرتی کشتیوں اور سامنے مشرقی کنارے کی سمت عسکر المہدی کی عالی شان عمارتیں اور کھجور کے درختوں کا حسن جیسے تمام عورتوں کا مجمع سحر زدہ سا سنتا تھا۔ دلوں میں گھر کر گئی تھی۔ حرہ خاتون خلیفہ منصور کی بیوی کو شکایت تھی کہ منصور کسی ایسے فیصلے کا مجاز نہیں جو شرعی لحاظ سے قابل قبول نہ ہو۔ جھنجھلا کر خلیفہ نے کہا تھا ""تم ضدی عورت کبھی نہیں مانو گی چلو کسی مفتی یا کسی منصف کو بلاتے ہیں۔ تب شاید تمہیں یقین آ جائے۔"" حرہ خاتون نے حتمی لہجے میں کہا تھا۔

""منصف تمہارا نہیں میرا تجویز کردہ ہوگا۔ امام ابوحنیفہ کو بلاؤ۔""

منصور یکدم خاموش ہو گیا تھا۔ صادق القول، نہ بکنے، نہ جھکنے، نہ مرعوب ہونے، احقاق حق پر استقامت سے کھڑا ہونے والا بے حد بے باک انسان۔ بھلا منصور سے زیادہ کون جانتا تھا کہ عباسیوں کے ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھانے اور منصور کے مقابلے پر 541ھ میں محمد نفس ذکیہ نے ایک بڑی جمعیت تیار کی۔ امام ابوحنیفہ کی بھی انہیں مکمل حمایت و تائید حاصل تھی۔ امام مالکؒ نے بھی خلافت کیلئے محمد نفس کے حق میں فتویٰ دے دیا۔ محمد نفس ذکیہ دیندار اور دلیر تھے پر فن جنگ میں طاق نہ تھے۔ شہید ہو گئے۔ اب قیادت کا بار ان کے بھائی ابراہیم نے اٹھایا۔ ان کی تیاریوں کا اس درجہ چرچا تھا کہ منصور کی نیندیں حرام، دو ماہ تک کپڑے نہیں بدلے۔ بستر پر لیٹتا، پل بھر بعد تکیہ اٹھا کر پٹخ دیتا پھر سرہانے پھینکتا۔ ایک ہی رٹ تھی۔ ابراہیم کا سر میرے سامنے ہو یا میرا سر ابراہیم کے سامنے۔ بس اور کچھ نہیں۔ امام ابوحنیفہ نے ابراہیم کے جذبۂ جہاد کی نہ صرف زبانی حوصلہ افزائی کی بلکہ عملی مدد چار ہزار درہم بھیج کر کی۔ خط لکھا کہ تمہارے شانہ بشانہ اس جہاد میں حصہ لینے کیلئے بے تاب ہوں پر چند ناگزیر مجبوریاں پاؤں کی زنجیریاں بن گئی ہیں۔ لوگوں کی بہت قیمتی امانتیں میرے پاس ہیں۔

منصور کو ان سب باتوں کا علم تھا۔ میدان جنگ میں گو اس نے ابراہیم کو شکست دی پر بہت سارے ذرائع نے امام ابوحنیفہ کے دلی دکھ کے برملا اظہار کو مرچ مسالوں کے ساتھ یوں پیش کیا کہ کاش میں بھی اس جماعت میں شامل ہوتا جو ظلم کے خلاف حق و انصاف کے لیے جہاد کر رہی تھی۔ اور آج ان کی بیوی اسی انسان کو منصف چاہتی ہے۔ چند لمحوں تک تذبذب اور گومگو جیسی کیفیت میں رہنے کے بعد منصور نے سر اٹھایا، بہتر کہا اور اسی وقت انہیں طلب کیا۔ ملکہ حرہ خاتون نے اپنی نشست پردے کے قریب رکھی تاکہ خود اپنے کانوں سے امام ابوحنیفہ کا فیصلہ سن سکے۔ ""شرعی اعتبار سے ایک مرد کتنے نکاح کر سکتا ہے؟"" منصور نے سوال کیا تھا۔

""چار"" امام کا جواب مختصر تھا۔ منصور نے اپنا رخ بدلا۔ پردے کے عقب میں بیٹھی بیوی سے مخاطب ہوا۔ ""سنتی ہو"" حرہ خاتون نے دھیمی آواز میں سننے کا اقرار کیا۔ منصور خاموش ہو گیا۔ اس کے نزدیک تو مسئلہ ہی ختم ہو گیا تھا۔ ""لیکن"" امام کی باوقار آواز سے ماحول کا سکوت ٹوٹ گیا۔ بیشک اسلام میں چار نکاح جائز ہیں۔ مگر اجازت اس شخص کیلئے جو عدل و انصاف پر قدرت رکھتا ہو، ورنہ ایک سے زیادہ شادیاں مناسب نہیں۔ اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔"" یہ واضح اور مکمل جواب تھا۔ منصور نے اب سر جھکا دیا

تھا۔ آپ نے اجازت طلب کی اور گھر آ گئے۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ حرہ خاتون کا ایک خادم پچاس ہزار درہم لے کر حاضر ہوا۔

''خاتون نے عذر بھیجا ہے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ کنیز آپ کی حق گوئی کی انتہائی مشکور ہے۔'' آپ نے وہ رقم واپس کرتے ہوئے فرمایا۔ ''خاتون سے کہنا کہ میں نے جو کچھ خلیفہ کے سامنے بیان کیا وہ میرا فرض منصبی تھا۔ اس میں کوئی غرض پوشیدہ نہ تھی۔'' مجمع میں سے ''سبحان اللہ'' کی چند آوازیں گونجیں۔ کچھ مزید بتانے پہ اصرار ہوا تھا۔ امام اعظم کے نزدیک ایک بالغ عورت اپنے نکاح کی خود مختار ہے۔ جبکہ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ عورت کو ولی کی مختاری میں دیتے ہیں۔ انہوں نے عورتوں کے بارے قرآن مجید کے اصول مساوات کو مدنظر رکھا۔ فقہ حنفی نکاح، طلاق اور دیگر بہت سارے معاملات میں عورتوں کی شہادت کو مردوں کی طرح معتبر قرار دیتا ہے۔'' مائی گاڈ! اسلام کے یہ روشن رخ ہمارے سامنے کبھی نہیں آئے۔ عورت کمتر ہے اسکی آدھی گواہی۔ نوجوان لڑکیاں زیادہ پرجوش تھیں۔ امام کے نزدیک قصداً تارک الصلوٰۃ کافر نہیں۔ ان کے نزدیک ذمی (اسلامی ریاست کا غیر مسلم شہری) کا خون مسلمان کے خون کے برابر ہے۔ کوئی مسلمان ذمی کو قتل کرے تو مسلمان اس کے بدلے قتل کیا جائے گا۔ اس وقت جب میں نفل پڑھ رہی تھی تو یہی سوچے چلے جا رہی تھی کہ ہمارے جاہل ملاؤں نے اسلام کا خوبصورت چہرہ کتنا بھیانک بنا دیا ہے؟ اس میں تو حد درجہ لچک اور گنجائش ہے۔ ظہر کی اذان ہوئی۔ نمو جیسے سرشار ہوئی آواز کا اتار چڑھاؤ سر پا پا سے سوں میں حسن و رعنائی تھی۔ عورتیں کوئی اٹھارہ سو کے قریب آئیں۔ یہ سب قریبی محلوں کی تھیں۔

میری تو عسری نماز تھی۔ چار سجدوں میں کم مکا گئی۔ خواتین سے بات چیت کرتی چلی جاتی تو زبان کا مسئلہ بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ ہم عورتیں بھی کمال کی چیز ہیں۔ رستے ڈھونڈ لیتی ہیں۔ آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا خوب چھڑکاؤ ہوا۔ شفقت سے زیادہ صدام کی حامی تھیں۔ اکثریت نے حالات کی سنگینی جیسے تاثر کو واضح کرنے کیلئے آنکھوں اور ہاتھوں سے ایسی تمثیل کاری کی کہ جس کیلئے کہا جائے کہ ٹھیک ٹھیک ٹھکانوں پر نشانے لگے۔ مجھے ان کے جذبات کی حالت زار کی بھی سمجھ آ گئی۔ اقتصادی پابندیوں کا زمانہ کتنا بھاری تھا؟ امریکہ کیلئے تبرّا، ان کی بارش اور ہاتھ اٹھا کر جیسے انہوں نے کسی طوفان نوح میں اسکی غرقابی چاہی میں سب تھیں۔ میرے پاکستانی جاننے پر مجھے اپنے گھر لے جانے کی پیشکش کم و بیش سبھوں نے کی۔ وہ سنی مسلک سے تھیں کہ اس مسجد میں ان کا آنا ہی سنی ہونے کی علامت تھی۔ ہاں ایک ٹپ اور ٹھرے کی بات بھی ہوئی۔ قالینوں پر ہم بھی پھسکڑے مارے بیٹھی تھیں۔ عبایا کے نیچے میری شلوار کے پائینچے کہیں تھوڑا سا اوپر اٹھ گئے۔ ٹانگوں پر بالوں کا جنگل سا دیکھ کر ان سبھوں کے حلقوں سے ہنسی کے فوارے چھوٹ گئے۔ آنکھیں مٹکیں۔ چہرے بولے کہ ''یہ یہ کیا جنگلی پن ہے۔'' پھر بے تکلفی سے سیاہ عباؤں تلے سے اپنی لش لش کرتی گوری گوری گداز سڈول ٹانگوں کا نظارہ کروایا۔

''دیکھو دیکھو'' پھر چند ایک نے میری بھنوؤں کی طرف بھی اشارے بازی کی۔ میں نے بھنوؤں کے ساتھ زندگی بھر کبھی چھیڑ خانی نہیں کی۔ حتیٰ کہ اپنی شادی والے دن بھی نہیں۔ جاتے جاتے انہوں نے مجھے یہ دونوں نیک کام کرنے کی تاکید کی۔ کچھ سمجھا یا جو میں نے زبان نہ آنے کے باوجود سمجھا اور لطف اٹھایا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے نوافل ادا کیا۔ کولا پیا اور چاہا کہ تھوڑی دیر لیٹ جاؤں۔ تبھی ایک ادھیڑ عمر کے انتہائی خوش شکل اور سمارٹ سی شخصیت کو میں نے تین نوجوانوں کے ساتھ اندر آتے دیکھا۔ دیوار کی غربی سمت انہوں نے کچھ نشان دہی کرتے ہوئے اپنے ساتھ کھڑے نوجوانوں کو چند ہدایات دیں۔ یقیناً انتظامیہ کا کوئی اہم بندہ ہے۔'' میں نے خود سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

(جاری ہے)

انٹرویو

جدید افسانوی ادب پر مرزا حامد بیگ سے گفتگو

نثار احمد صدیقی (انڈیا)

اصلی نام: حامد حسین، ادبی نام: مرزا حامد بیگ، ڈاکٹر مرزا حامد بیگ، جائے پیدائش: کراچی (سندھ) پاکستان، سال پیدائش: 29 اگست 1949ء، تعلیم: ایم اے (اردو) پی ایچ ڈی (پنجاب یونیورسٹی)

صدیقی: "ذاتی و ادبی زندگی کے کوائف بتایئے؟"

مرزا: "میرا آبائی وطن علاقہ چھچھ، موضع کمال، تحصیل حضرو، ضلع اٹک ہے۔ والد محترم محمد اکرم بیگ پولیس آفیسر تھے، میرا بچپن اور لڑکپن سندھ میں گزرا۔ والد صاحب ڈی ایس پی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے تو ہم لوگ سندھ سے کیمبل پور چلے آئے۔ 1971ء میں انسپکٹر پولیس سندھ کی ملازمت سے بھاگ کر ایم اے اردو کرنے لاہور کا رخ کیا۔ 1972ء تا 1974ء لاہور میں بے روزگاری کاٹتے ہوئے لاہور کے فلم ساز و ہدایت کار رحیم گل کے اسسٹنٹ کے طور پر 1971ء میں پشتو فلم 'موسیٰ خان گل مکئی' مکمل کی۔ حلقہ ارباب ذوق، راولپنڈی کا سیکرٹری رہا۔ 28 فروری 1974ء تا اکتوبر 1974ء بطور ریسرچ اسکالر پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور میں ملازمت کی۔ 30 اکتوبر 1974ء کو بطور لیکچرر گورنمنٹ کالج بھکر چلا گیا۔ گورڈن کالج، راولپنڈی، اصغر مال کالج راولپنڈی اور گورنمنٹ کالج اٹک میں مختلف حیثیتوں میں تدریس سے منسلک رہا۔ 8 مئی 1977ء کو شاہدہ جہاں سے شادی ہوئی۔ اولاد: تین بیٹے۔ گورنمنٹ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ، لاہور سے صدر شعبۂ اردو کی حیثیت میں ریٹائر ہوا۔"

صدیقی: "آپ نے جب ادبی سفر شروع کیا اس وقت کن نظریوں کا بول بالا تھا۔ اس زمانے میں جدیدیت کی لہر تیز تھی لہٰذا آپ نے اس سے متاثر ہو کر کن کہانیوں کی تخلیق کیں۔ اب ان کہانیوں کی ادب میں کیا اہمیت ہے تفصیل سے بتائیں؟"

مرزا: "میں نے جب 1970ء میں افسانہ نگاری شروع کی تو ترقی پسند تحریک کے کئی گروپ بہت ہی فعال تھے از قسم کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، عصمت چغتائی، حلقہ ارباب ذوق کے افسانہ نگاروں میں سے غلام عباس، آغا بابر، رحمٰن مذنب، انتظار حسین اور غیر وابستہ افسانہ نگاروں میں ممتاز مفتی، ابوالفضل صدیقی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، جیلانی بانو، احسن فاروقی، غرض یہ کہ بہت سے اہم نام تھے، مگر ان کے بعد ساٹھ کی دہائی میں ابھر کر آنے والے نئے نام تو تھے ہی جن کا اوپر حوالہ دیا گیا۔ یہ فیصلہ تو ناقدین کریں گے کہ مرزا حامد بیگ کے تخلیق کردہ افسانوں کی زمین جاگتی ہے۔ 'انتظار' کراچی بابت اپریل 1974ء، 'برج عقرب' مطبوعہ 'سیپ' کراچی، بابت 1975ء، 'ایک یادگار محفوظ' مطبوعہ 'فنون' لاہور، بابت 1976ء، 'سرسوتی اور راج ہنس' مطبوعہ 'اوراق' لاہور، بابت جولائی اگست 1976ء، 'پانیوں سے ڈرا ہوا بچہ' مطبوعہ 'اوراق' لاہور، جنوری فروری 1977ء، 'بابا نور محمد سے کا آخری گیت' مطبوعہ 'اوراق' لاہور جنوری،

فروری 1978ء، 'تھکاوٹوں کی رات' مطبوعہ 'اوراق' لاہور جولائی اگست 1978، 'گمشدہ کلمات' مطبوعہ 'نئی نسلیں' کراچی، اکتوبر 1978ء، 'سونے کی مہر' مطبوعہ 'معاصر' لاہور 1979ء، 'نیند میں چلنے والا لڑکا' مطبوعہ 'اوراق' لاہور جنوری فروری 1979ء، اور 'مغل سرائے' مطبوعہ 'اوراق' لاہور، جنوری فروری 1980ء کی کیا اہمیت ہے۔ موضوع، تکنیک اور زبان و بیان کے حوالے سے یہ افسانے میرے پہلے افسانوی مجموعہ 'گمشدہ کلمات' کا حصہ ہیں۔ اس مجموعے پر فضیل جعفری (اطہر پرویز) اور مہدی جعفری کے تبصرے ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں، جو جوازِ نا لکھا دیں، 'الفاظ' علیگڑھ اور 'اسلوب' بمبئی میں شائع ہوئے۔ ان میں سے ایک افسانہ 'مغل سرائے' تو ایسا ہے جس کا سی ایم نعیم نے انگریزی میں ترجمہ کر کے ٹورنٹو، کینیڈا سے شائع کروایا تو برٹش "who is who" میں میرے نام کے اندراج کا باعث بنا اور وہ افسانہ لگ بھگ دس برس کیمبرج یونیورسٹی کے او لیول (اردو) نصاب کا حصہ رہا۔"

صدیقی : "کیا جدید افسانوں میں جو علامتی و تجریدی رجحان آیا تھا وہ ختم ہو گیا یا ابھی باقی ہے؟ اگر باقی ہے تو آپ کا ذاتی نظریہ اس کے متعلق کیا ہے؟"

مرزا : "اب یہ غلط فہمی دور ہو جانی چاہئے کہ علامت اور تجرید صرف و محض جدیدیت کی تحریک (جسے بھارت میں 'شب خون'، الہ آباد اور پاکستان میں 'اوراق' لاہور نے پروموٹ کیا) سے مخصوص ہے۔ راشد الخیری نے 1925ء سے قبل بہت سے علامتی افسانے لکھے۔ پریم چند کا افسانہ 'گلی ڈنڈا' اور 'عجیب ہولی' (1928ء) علامتی افسانے ہیں۔ 'انگارے' (مطبوعہ 1932ء) میں علامتی اور تجریدی افسانے دیکھنے کو مل جاتے ہیں۔ کرشن چندر نے 1948ء میں 'غالیچہ' جیسا تجریدی افسانہ لکھا۔ مرزا ادیب کا 'درون تیرگی' بہت پرانا علامتی افسانہ ہے، جو چالیس کے دہے میں لکھا گیا۔

آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں دہے میں علامتی اور تجریدی افسانہ زیادہ لکھا گیا۔ جن لوگوں نے دیکھا دیکھی یہ کام کیا ان کے افسانوں میں علامت اور تمثیل کا فرق مٹا ہوا تھا۔ کیونکہ تجرید کی سوجھ بوجھ ہی نہیں تھی نتیجتاً ابہام اور لایعنیت دیکھنے کو ملی لیکن جن افسانہ نگاروں نے تکنیک کی سطح پر گہرے شعور کا مظاہرہ کیا ان کے افسانے ان کے پیش رو افسانہ نگاروں کے افسانوں سے کہیں آگے کی چیز ہیں۔ جیسے سریندر پرکاش کا 'رونے کی آواز'، خالدہ حسین کا 'سواری'، انور سجاد کا 'گائے'، 'معراج' میں 'راکا' وہ علامتی ابعاد لیے ہوئے افسانے ہیں۔ یہ ایک بڑے جوکھم کا کام ہے۔ ان علامتی افسانوں کی دوہری معنویت کا مقابلہ یک سطحی افسانہ نہیں کر سکتا خواہ وہ غلام عباس کا افسانہ ہو یا عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی یا کرشن چندر کا۔ ان افسانوں سے موازنے کے لئے راجندر سنگھ بیدی کا 'گرہن'، 'لاجونتی' اور 'جوگیا' جیسے افسانے ڈھونڈ کر لانے پڑیں گے۔ لیکن لائیں گے کہاں سے؟

علامت اور تجرید کا برمحل استعمال اب بھی چیدہ چیدہ افسانہ نگار کر رہے ہیں اور ان کے افسانوں میں بھرپور افسانویت بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔ خالدہ حسین نے 'اے ڈیڈ لیٹر' اور 'ریڈیو' جیسے علامتی و تجریدی افسانے جدیدیت کی تحریک سے سست پڑ جانے کے بعد لکھے۔ خود میں نے بیسویں صدی کے آخری عشرے میں 'گانجے کا ادھار'، 'مٹی کا رنگ' اور 'تتلیاں لا گئیں' جیسے علامتی افسانے لکھے۔ 'مٹی کا رنگ' آکسفورڈ کی ایک انتھالوجی کا حصہ بنا۔ 2000ء میں افسانہ 'جاگتی پانی کا عوض' لکھا وہ بھی علامتی افسانہ ہے۔ جسے پینگوئن (انڈیا) نے اپنی ایک انتھالوجی میں جگہ دی۔ میں علامت اور تجرید کو افسانہ نگار اور ناول نگار کے طاقتور Tools تصور کرتا ہوں۔"

صدیقی : "آپ کے نزدیک پلاٹ لیس (Plot less) کہانیوں کی کیا حیثیت ہے؟"

مرزا: ''اگر اس سے مراد پلاٹ لیس افسانہ ہے تو بھی میرے لئے قابلِ قبول ہے۔ لیکن اس صورت میں جب اس میں افسانویت موجود ہو۔ پلاٹ کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا یہ ایک لمبی بحث ہے، اور افسانے کے لئے پلاٹ کیوں ضروری ہے اس سوال کا جواب بھی بہت وقت لے لے گا۔ محض دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں، بات قارئین تک پہنچ جائے گی۔ لیکن پہلے کرم شارٹ فکشن کے عناصر اور ہیئت سے متعلق روایتی طرز کے مجرب نسخہ 'پلاٹ' کو بھلا کر ان امثال پر غور کیجئے گا۔ اس لئے کہ جن ناقدین نے شارٹ فکشن کی ہیئت اور عناصر سے متعلق نظریہ سازی کی وہ تو افسانے لکھنے سے معذور تھے۔

خالدہ حسین کے اہم افسانوں 'ایک رپورتاژ'، 'سواری'، 'پرندہ' اور 'اے لیڈیلٹر' میں کہاں ہے پلاٹ؟ خود میں نے 'زمین جاگتی ہے' بغیر پلاٹ کے لکھا۔ ان افسانوں کو روایتی پلاٹ والے افسانوں کے ساتھ رکھ کر دیکھئے اور موازنہ کیجئے کہ افسانویت کا وفور کہاں کہاں ہے اور کہاں نہیں۔ یہ تو لکھنے والے کی استعداد ہے کہ وہ پلاٹ کے ساتھ یا بغیر پلاٹ کے کیا کرتا ہے۔ میرے بیشتر افسانوں میں پلاٹ ہے لیکن شاید روایتی پلاٹ کی روایتی تعریف پر پورا نہ اترے۔

صدیقی: ''آج کے جدید تر افسانہ نگاروں نے افسانے کا تکنیک بدل دیا ہے۔ آپ اس سے کہاں تک متفق ہیں اور کیوں؟

مرزا: ''میں آپ کی اس بات سے متفق نہیں۔ آج کے نئے ناموں نے ہی کچھ تو نہیں کیا۔ ایسا کرتے تو کامیابی اور ناکامی تو الگ چیز ہے ان کی کوئی بڑی پہچان تو بنتی۔ جیسے بے شک ناکامی ہوئی لیکن میرے ہمراہیوں میں سے ایک، اکرام باگ نے کیا، تکنیک ایجاد کی، افسانے لکھے اور یہ تکنیک تجریدی کی طرح سراسر مصوری سے مخصوص ہے۔ یہ الگ بات کہ تجریدی افسانے میں ہی کیا ناولٹ، طویل مختصر افسانے اور ناول میں کامیابی سے برتی گئی اور اکرام باگ کا کام ہے۔ لیکن کچھ نیا کیا تو انہوں نے۔ اور اسی حوالے سے ان کا کام تادیر یاد رکھا جائے گا۔''

صدیقی: ''جدید اور ترقی پسند کہانیوں میں ہم کس طرح امتیازات برت سکتے ہیں۔ امتیازی اوصاف کی روشنی میں آپ اپنی کہانیوں کے متعلق کیا کہنا چاہیں گے؟''

مرزا: ''جدید اور ترقی پسند افسانے میں کوئی حد فاصل نہیں۔ تکنیک کے تجربے تب بھی ہوئے اور ہم لوگوں نے بھی کئے۔ جب ترقی پسند افسانہ بام عروج پر تھا تو اس کا بہت عمدہ تجزیہ ممتاز شیریں نے اپنے مضمون 'اردو افسانے میں تکنیک کا تنوع' کے عنوان سے کر دیا۔ نیز 'نیا دور'، بنگلور/کراچی میں ممتاز شیریں کے سالانہ جائزے خاصے کی چیز ہیں۔ بلاشبہ ترقی پسند تحریک سے متعلق افسانہ بہت عمدہ لکھا گیا۔ لیکن تمام ترقی پسند افسانہ نگاروں کا افسانہ یکساں معیار کا نہیں تھا۔ بہت سی چیزیں بھرتی کی بھی ہوا کرتی تھیں۔ بے شک 'سویرا' لاہور، 'ادبِ لطیف' لاہور اور 'نقوش' لاہور یا 'شاہراہ' کی فائلیں دیکھ لیجئے، انہیں افسانہ نگاروں کے شاہکار دکھائی دیں گے جن کے نام میں نے ابھی لئے۔ ترقی پسند تحریک سے نکالے گئے سعادت حسن منٹو کے تمام افسانے شاہکار نہیں۔ درجن بھر افسانے انہوں نے بلاشبہ عمدہ لکھے لیکن ان سے کہیں بڑی تعداد میں اعلیٰ درجے کے افسانے راجندر سنگھ بیدی کے ہاں مل جائیں گے۔ اس کے مقابلے میں بیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں دہے کے محض تین برسوں میں لکھے گئے جدید افسانے سے بھی ایک انتخاب کر لیجئے، آپ حیران کن نتائج تک پہنچیں گے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ اگر وہ ترقی پسند تھے تو یہ لوگ بھی غیر ترقی پسند تھے۔ یوں موضوعاتی سطح پر بھی آپ کو کوئی حد فاصل دکھائی نہیں دے گی۔''

صدیقی: ''آپ اپنی چند اچھی کہانیوں کے بارے میں کچھ بتائیے؟''

مرزا : ''میں نے اچھے افسانے قطعاً نہیں لکھے۔ میرے تحریر کردہ افسانے راحت افزا نہیں۔ حد درجہ تاریک اور حوصلہ پست کر دینے والے ہیں۔ یہ بات عمر کے اس حصے میں کہہ رہا ہوں۔ جب تخلیق کار داد اور بے داد سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ البتہ یہ طے ہے کہ میں افسانوی پیر کے انگوٹھے سے قلم باندھ کر نہیں لکھتا جیسا کہ بہت سے افسانہ نگار کرتے ہیں۔ افسانہ لکھنا میرے لئے ایک جوکھم سے گزرنا ہونے سے کم نہیں ہوتا۔ 'زمین جاگتی ہے'، 'سرسوتی اور راج ہنس'، 'ایپے نورمحمد کا آخری کرتب'، 'اتالوں کی رات'، 'گمشدہ کلمات'، 'سونے کی مہر'، 'دھوپ کا چہرہ'، 'نیند میں چلنے والا لڑکا'، 'مغل سرائے'، 'دل کے موسم'، 'سعید زیدی'، 'آوازیں'، 'ایک خاکی کا معراج نامہ'، 'کار زوال'، 'انتظار گاہ'، 'ساحلی سوار'، 'گناہ کی مزدوری'، 'جہنم جوگ'، 'کالی زبان'، 'مٹی کا رزق'، 'کامنی کا ادھار'، 'چاچی بالی کی عرضی'، 'تتلیاں لا محدود'، 'لاولد حسرت کی حویلی' اور 'دل جلا' کے ساتھ میں نے یکجا الگ کرنے کی کوشش کی۔''

صدیقی : ''یہ چند ایسے افسانوں کے نام ہیں، ان کی تفہیم کے سلسلے میں ایک قاری کی حیثیت سے آپ کیا کہیں گے؟''

مرزا : ''محمد علی ردولوی کے افسانوی مجموعہ 'گناہ کا خوف' میں شامل افسانے زبان و بیان کے حوالے سے اہم، چند کا افسانہ 'گلی ڈنڈا'، غلام عباس کا 'سایہ' اور 'آنندی'، راجندر سنگھ بیدی کے 'لاجونتی'، 'سوتیا'، 'بھولا'، 'گرہن'، 'ایک روز الیم چورستے کے پاس کیا ہوا'، احمد ندیم قاسمی کا 'پرمیشر سنگھ'، ممتاز مفتی کا 'چپکے کا زمین'، 'دوکٹا ہوا' اور موم بتی، حیات اللہ انصاری کا 'سائے' اور 'ماسے'، انتظار حسین کا 'آخری قصہ'، انور سجاد کا 'گائے'، 'معراج میں رات کے وقت'، 'واردات'، 'کچھ بچی وہ انقروورث'، 'جس اسامی باپ' اور 'آخری آرام'، سریندر پرکاش کے 'رونے کی آواز' اور 'باز گوئی'، خالدہ حسین کے 'اسے ایک لیلے'، 'پرچھاں' اور 'سایہ معراج' کوش کا 'گنواں'، بیج مسعود کا 'کوزہ گر'، اسد محمد خان کا 'ترلوچن' میرے پسندیدہ افسانے ہیں۔ ان کی تفہیم کے سلسلے میں بات کروں گا تو مجھے اندیشہ ہے کچھ صریح لکھنا پڑ جائے گا۔ فراق گورکھپوری نے کہا تھا:

ایک تھا مجنوں، عاشق لیلیٰ، ویرانے میں موت آئی   اور اگر تفصیل سے پوچھو، یہ قصہ طولانی ہے''

صدیقی : ''کیا یہ سچ ہے کہ انور سجاد کے افسانوں میں فرائیڈ کے سیکس تھیوری (Theory of sex) کا یا وہ ملتے ہیں، جو اردو افسانے کے لئے مضر ہے؟ آپ مدلل جواب دیں؟''

مرزا : ''سگمنڈ فرائیڈ کی Theory of sex سے متعلق کسی بہتر پر تو ممتاز مفتی کے ہاں بھی نہیں ملتی۔ وہ بھی سگمنڈ فرائیڈ کے شاگرد ڈاکٹر سٹیکل سے متاثر تھے۔ ہمارے نام نہاد ناقدین انہیں سگمنڈ فرائیڈ سے متاثر بتاتے رہے ہیں۔ فرائیڈ سے اگر متاثر تھے تو شیر محمد اختر۔ جو اب گمنام ہو گئے۔ حلقہ ارباب ذوق، لاہور کے افسانہ نگار تھے۔ انور سجاد کے تو کسی ایک افسانے میں بھی فرائیڈ کی Theory of sex دکھائی نہیں دیتی۔ ان کے ہاں نہ ڈاکٹر سٹیکل کا کوئی اثر ہے نہ فرائیڈ کے دوسرے نامور شاگرد کارل یونگ کا کوئی اثر۔ البتہ انہوں نے کافکا، ہارڈی اور رانکے کو ضرور پڑھا ہے۔ اور پڑھنا چاہئے بھی۔ وہ کثیر المطالعہ شخص ہیں۔ 'سنڈریلا'، 'بی ایل فورٹی'، 'سرویٹر ورشن'، 'کونپل' اور 'کیکر' جیسے متنوع موضوعات کے حامل افسانے کوئی ان پڑھ افسانہ نگار کیا لکھے گا۔''

صدیقی : ''1980ء کے بعد افسانہ نگاروں میں آپ کن کن افسانہ نگاروں کے یہاں انفرادیت پاتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں کیا خوبیاں و خامیاں ہیں؟''

مرزا : ''بادصبا کا انتظار والے سید محمد اشرف، تیسری دنیا کے بچا 'مطبوعہ 1992ء' والے یوسف چوہدری تو ہیں ہی۔ غضنفر نے چند افسانے اچھے لکھے۔ خاص طور پر افسانہ 'کوٹھی کا نٹل'۔ امجد طفیل کے دو افسانے 'لیلک شاپ' اور 'مچھلیاں' شکار کرتی ہیں۔ محمد عاصم

بٹ، طاہر واقبال، طارق چھتاری اور صدیق عالم سے پرامید ہوں۔ ان آخر میں آنے والوں میں خالد جاوید متاثر کن ہیں۔ اس لئے بھی کہ جہاں کہانی پن کہانی پن کا واویلا ہو، اس فضا میں رہ کر خالد جاوید پیت کی طرف مڑتے ہوئے نکلے جیسا افسانہ لکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

افسانے کے بیشتر نئے نام ابھی نثر لکھنے پر قادر نہیں۔ وہ تجربات سے بھی ڈرتے ہیں اور سب سے بڑی خرابی یہ کہ انہوں نے اردو افسانے کے گریٹ ماسٹرز کو باقاعدہ نہیں پڑھا۔ حلقہ ارباب ذوق اور ترقی پسند تحریک کے چیدہ نام اور ان کا کام ان کی نظروں سے اوجھل ہے۔ بیسویں صدی کے چھٹے اور ساتویں دہے میں ابھر کر سامنے آنے والے اور فعال متحرک افسانہ نگاروں کے کام سے بھی وہ نابلد ہیں۔ ایسے میں انہوں نے کیا کرنا ہے؟ ہم نے اگر آج یہ طے کیا کہ جو ہوگا لکھنا ہے تو ہمارے لئے ضروری ہوگا کہ منٹو، راشد اور منٹو یا ان کے تیار کردہ جوتوں پر ایک نظر تو ڈال لیں۔ یہ دیکھنے کے لئے کہ ہم سے پہلے اس فیلڈ میں کیا کچھ ہو چکا ہے۔ میری ایک کتاب اردو افسانے کی روایت جسے اب ایم آر پبلی کیشنز، دریا گنج نئی دہلی والے شائع کر رہے ہیں، کے ذریعے پیچھے دور تک دیکھنے میں مدد ملتی ہے۔"

صدیقی : "ہند و پاک میں جدید اردو افسانے کے جدید نقاد کون کون ہیں، ان پر تفصیل سے روشنی ڈالئے؟"

مرزا : "مہدی جعفر نے بطور خاص جدید اردو افسانے سے جرأت کا اظہار کیا۔ وارث علوی نے مکمل افسانے پر نگاہ کی۔ گوپی چند نارنگ اور شمیم جعفری نے مختلف افسانہ نگاروں پر بہت عمدہ مضامین لکھے۔ پاکستان میں انتظار حسین، وزیر آغا، سجاد باقر رضوی، مظفر علی سید اور سلیم اختر نے کچھ وقت جدید اردو افسانے پر بھی صرف کیا۔ لیکن جدید اردو افسانہ بطور خاص کسی ایک ناقد کا موضوع خاص نہیں رہا، ما سوائے مہدی جعفر کے اور وہ بھی یہ جو اچھا کام نہیں کر سکے جس کے وہ اہل تھے۔

افسانہ وقت چاہتا ہے لکھتے وقت بھی اور پڑھنے کا تجربہ کرنے کے لئے بھی۔ یہ غزل نہیں کہ ایک نظر ڈالی اور نتیجہ پر پہنچ گئے۔ یوں تو غزل میں بھی عمدہ کام کو داد کب ملی ہے۔ عرفان صدیقی جیسا عمدہ غزل گو بھارت میں گمنام گذر گیا۔ اس کا نام میں نے پہلی بار محمد اظہار الحق کے شعری مجموعے 'دیوار آب' کا دیباچہ لکھتے ہوئے لیا تھا اور حیران تھا کہ بھارت کے ناقدین کے لئے محض روایتی غزل گو شعرا کس طرح قابل قبول بنے ہوئے ہیں اور عرفان صدیقی پر کوئی توجہ نہیں۔"

صدیقی : "ہند و پاک میں آج سے پچیس سالوں کے اندر کون سا ایسا ناول لکھا گیا ہے جس نے ذاتی طور پر آپ کو متاثر کیا ہے۔ کیا ترقی پسند ادب کے زمانے کا ناول 'خدا کی بستی'، 'آگ کا دریا'، 'اداس نسلیں' سے بہتر ناول ہے؟ اگر نہیں تو کیوں کر؟"

مرزا : "عبداللہ حسین کا 'اداس نسلیں' قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا' کے تسلسل میں لکھا گیا۔ عبداللہ حسین کو زبان پر عبور حاصل نہیں۔ محمد سلیم الرحمن نے 'اداس نسلیں' کی زبان درست کی۔ یوں ناول کا آدھا کریڈٹ محمد سلیم الرحمن کو جاتا ہے۔ 'نشیب' اور 'باگھ' اٹھا کر دیکھ لیجئے۔ ہر صفحے پر قلم لگانے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

بلاشبہ 'آگ کا دریا' قرۃ العین حیدر کے دو رخی شعور کا غماز ہے اور شعور کی رو کی تکنیک برتنے کے لئے قرۃ العین حیدر نے اس ناول کو لکھنے سے پہلے ہنری جیمز کے ناول کو 'ہمیں چراغ ہمیں پروانے' کے عنوان سے ترجمہ کیا۔ اس سے قبل لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے (انگلش) کرتے ہوئے ورجینا وولف پر مقالہ بھی لکھا جو شعور کی رو کی تکنیک برتنے والوں میں ایک اہم نام ہے۔ یوں 'آگ کا دریا' کی تخلیق کے پیچھے قرۃ العین حیدر کی بے پناہ محنت لگن اور برصغیر کی تاریخ کی پڑتال سب کچھ موجود ہے۔

شوکت صدیقی نے 'خدا کی بستی' کراچی پاکستان ہجرت کر کے آنے، لیاقت آباد کے کھلے میدان میں پانی کی نکاسی کے لئے

رکھے گئے جو سے جو بے پایوں میں زیست کرنے کے تجربے کے بعد کراچی کے ایک انتہائی گنجان آباد علاقے کھارادر میں انسانی زندگی پر لکھا ہے۔ 'خدا کی بستی' حقیقت نگاری کی مثال ہے۔ ان ناولوں کا آپس میں موازنہ مناسب نہیں۔ ہاں آپ پسندیدہ پوچھ سکتے ہیں۔ تو میرا جواب ہوگا میرا پسندیدہ ناول خدیجہ مستور کا 'آنگن' ہے۔ اس کے بعد جو دوسرا ناول مجھے اچھا لگا وہ قرۃ العین حیدر کا 'گردشِ رنگ چمن' ہے۔"

صدیقی : "عالمی سطح پر اردو کا مستقبل؟"

مرزا : "روشن نہیں تو تاریک بھی نہیں۔ لیکن عالمی سطح پر اردو کو زندہ رکھنے کے معاملے میں نثر کا حصہ کم ہوتا جا رہا ہے۔ اب جو کچھ بھی ہے وہ شاعری کے سر پر ہے۔ بیجنگ یونیورسٹی، چین، قاہرہ یونیورسٹی، مصر اور انقرہ یونیورسٹی، ترکی کے علاوہ اردو کہیں نہیں پڑھائی جاتی۔ برطانیہ میں رالف رسل تھے، وہ گزر گئے۔ رہ گئے کرسٹوفر شیکل، وہ ان کے متبادل نہیں۔ جرمنی میں کرسٹینا ہے جو اینا میری شمل کی متبادل نہیں۔ اللہ اللہ خیر صلیٰ۔ زبانیں ان کے بولنے والوں کی معاشی ترقی اور سیاسی اثر و نفوذ کے سر پر ترقی پاتی ہیں۔ ہم میں اگر یہ اوصاف نہیں تو کیا کریں صاحب؟"

◆◆◆

بین الاقوامی کارٹونسٹ جاوید اقبال

مردم شماری ٹالنے کی دعا کر رہے ہیں ----- ورنہ تو ان کی کارکردگی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا.....!!

طنز و مزاح

یہ شادی یہ تیرے پراسرار دھندے!

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

یہ ان دنوں کا قصہ ہے جب آتش جواں، تو راقم آتش فشاں تھا۔ ناظم آباد کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس کی ذہانت، وجاہت اور جسامت کا ڈنکا بجتا تھا۔ جہاں نہیں بجتا تھا وہاں وہ خود جا کر بجا دیتا تھا۔ بس ہم اتنا تھا کہ سیاست داں بنا مانگیں اور خود سر اتنا کہ بقول کبھی خط آبادی۔

موجِ عصمت ایک طرف، دل کی روانی اک طرف — کل تجربہ ایک طرف، میری جوانی اک طرف

ہماری آل ناظم آباد بین الاقوامی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم فٹ بال کے مایہ ناز کھلاڑی تھے۔ یوں سمجھیے کہ اپنے محلے کے میسی تھے۔ ایک بار ہماری ٹیم ایک لمانشی ٹورنامنٹ کے فائنل میں تھی۔ کھیل بڑے زور و شور سے جاری تھا اور تماشائی گراؤنڈ میں مالٹے کے چھلکے پھینک پھینک کر (بلکہ مار مار کر) کھلاڑیوں کے حوصلے بڑھا رہے تھے۔ (مالٹے پھینکنے کا خیال کسی کنجوس کے دل میں نہیں آیا۔) ہم سینٹر فارورڈ کی پوزیشن پر کھیلتے ہوئے دشمن کے گول پر تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ کھیلتے کھیلتے گیند اچانک ہمارے دائیں کان پر آ کر لگی اور سر چکرانے لگا۔ پہلی مرتبہ تجربہ ہوا کہ واقعی زمین گھومتی ہے۔ بلکہ اس وقت خود ہمارے گرد گھوم رہی تھی۔ ہم لڑکھڑا کر "گراؤنڈ بوس" ہوا چاہتے تھے کہ ایک ساتھی سہارا دے کر باہر لے آیا۔ گھر پہنچنے تک جسم میں بخار کی حرارت ہو چلی تھی لیکن بزرگوں کے منع کرنے کے باوجود ہم نے ٹھنڈے پانی سے غسل فرض کیا اور پنکھے کے نیچے آ کر لیٹ گئے۔ بس پھر کیا تھا، بخار کی حدت و شدت بڑھتی گئی اور تھرمامیٹر اس کی پیمائش سے عاجز نظر آنے لگا۔ ڈاکٹر صاحب بلوائے گئے۔ انہوں نے کئی گھنٹے کا شیڈول مرتب کر کے دوائیں تجویز کیں اور شیڈول کے لحاظ سے فیس (مع ٹی اے ڈی اے) لے کر رخصت ہوئے۔ تاہم ع "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"۔ والد صاحب کسی دوسرے ڈاکٹر کو فیض پہنچانا چاہتے تھے مگر والدہ کے بے حد اصرار پر ہمیں آدھی رات کے قریب ایک پرائیویٹ اسپتال کے پرائیویٹ کمرے میں داخل کرا دیا گیا جہاں ہنگامی علاج شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی موت اور زندگی کے درمیان فٹ بال میچ کا آغاز ہو گیا لیکن صبح ہونے تک زندگی پوائنٹس پر جیت گئی۔

ہوش آیا تو دیکھا کہ اہلِ خاندان نے بستر کے پاس دھرنا دے رکھا ہے۔ کسی کے ہاتھ میں تسبیح تھی، کسی کے ہاتھ میں دم کیے ہوئے پانی کی بوتل، کوئی تعویذ پکڑے کھڑا تھا تو کوئی بغیر کسی روحانی آلے کے یوں ہی اوپر والے سے لو لگائے ہوا تھا۔ سب کے چہروں پر تشویش اور تھکن کے آثار تھے لیکن دور کونے میں ایک چاند چہرہ و ستارہ آنکھیں والی کی انجان حسینہ تازگی اور فرحت کا پیغام لیے مسکرا مسکرا کر ہمیں دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ ہم نے تمام غم زدہ چہروں کو مسترد کر کے اس کی موجودگی کا از خود نوٹس لیا اور مسکراہٹ کا جواب کھکھیاہٹ سے دیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت ٹرے تھی جس میں ناشتا تھا۔ لیکن ہماری اصل دلچسپی ٹرے سے زیادہ ٹرے بردار میں تھی جو

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جوانیاں جوانیاں مسکراتی ہماری جانب کھنچی چلی آ رہی تھی۔ عیادت کے لیے آنے والے دوسرے لوگ ہٹتے گئے، فاصلے گھٹتے گئے اور عالم سوز کے بندھن کٹتے گئے۔ چند ہی لمحوں میں جب وہ مہ لقا، خوش ادا، زہرہ جبیں روبرو ہوئی تو یہ عقدہ کھلا کہ نرس تھی اور ہمارے لیے دوا نہیں بلکہ یہ دوا خانہ لائی تھی۔ ایسا حسین، دل نشین اور ''مسیحا'' بیمار دار دیکھ کر ایک لمحے کے لیے خود پر یہ الزام آیا کہ پہلے کبھی اتنے بیمار کیوں نہ پڑے جو اسپتال لائے جاتے اور کسی کا حسن بے مثال ہماری ''ہارٹ فیل'' کرتا۔ یہ کیا کہ ''بلڈ'' ایک دو دن گھر ہی میں لوٹ پوٹ کے کھڑا ہو جائے۔ ہمارے قریب پہنچ کر اس عفیفہ نے بڑے پیار سے اپنا نرم و نازک دست شفا ہماری کلائی پر رکھ دیا۔ اس نے نبض کی رفتار گنتی شروع کی اور ادھر کیفیت یہ ہوگئی کہ مومن کے الفاظ میں۔

''اس'' نے اس نبض پہ جو ہاتھ دھرا ۔۔۔ ہاتھ سے میرے مرا دل ہی چلا

پھر اس دشمن ہوش و خرد نے کمال شائستگی اور آہستگی سے ایک انجکشن ہمارے بازو میں گھونپ دیا اور ہمیں تکلیف کے بجائے ایک گونہ راحت کا احساس ہوا۔ بعد ازاں چند کیپسول اور کچھ کڑوی کسیلی گولیاں ہمارے دست طلب پر رکھ دی گئیں جنھیں ہم زیادہ کڑوے کسیلے کمپیر کے ساتھ ایسے مزے سے نگل گئے جیسے حلوے کو شہد میں گھول کر نوش جاں کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نیند کی وادیوں میں چلے گئے لیکن حالت یہ رہی کہ بقول شاعر۔

آنکھیں کھولیں کبھی بند بھی کیں ۔۔۔ وہ شکل نہ سامنے سے سرکی

دوپہر کے قریب کسی کی نرم و نازک ہتھیلی کا لمس پیشانی پر محسوس ہوا۔ آنکھ کھلی تو اسی قتالۂ عالم کی یہ گوہر افشانی تھی ''اٹھیے! آپ کی دوا کا وقت ہو گیا ہے۔'' آواز کی نغمگی اور شیرینی سے یوں لگا گویا ملکہ ترنم (جو اس وقت حیات تھیں) ایک کم سنی اس کے گلے میں بیٹھی ہوں۔ ''لیکن خالی پیٹ نہیں'' یہ کہہ کر اس نے سوپ کا پیالہ ہماری طرف بڑھایا جسے ہم نے سعادت مندی کے انداز سے حلق میں انڈیل لیا۔ شام تک طبیعت کچھ بحال سنبھل چکی تھی۔ گھر والوں کے چہروں کی بشاشت بھی لوٹ آئی۔ لیکن محض عارضی طور پر۔ رات گئے پھر ہمارا سانس اکھڑنے لگا اور حالت ملک کی معیشت سے زیادہ نازک ہوگئی۔ ایمرجنسی ڈیوٹی کے ڈاکٹر کی تلاش ہوئی اس لیے کہ ہم ''کوما'' میں جا رہے تھے۔ رشتے داروں کے بیان کے مطابق ڈاکٹر صاحب اتنی تاخیر سے پہنچے کہ اگر تھوڑی دیر اور نہ آتے تو زندگی کا ''فل اسٹاپ'' لگ جاتا۔ رات کے کس حصے میں وہ ''کوما'' بنا ہمیں خبر نہیں۔ صبح دوپہر زندہ تا آپ کے اس شعر کی مجسم تفسیر بن کر رہ گئے کہ

لو ہم مریض عشق کے بیمار دار ہیں ۔۔۔ اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

اس وقت تک کچھ بڑے بڑے قسم کے موٹی توندوں اور موٹی عینکوں والے معالج بھی آ چکے تھے جنھیں عرف عام میں اسپیشلسٹ کہا جاتا ہے اور جو اپنے ہر سانس کی فیس مریض کو ٹھونک بجا کر وصول کرتے ہیں۔ وہ ہمارے علاج کے سلسلے میں باہم صلاح مشورے کرنے لگے اور ہم عالم بے ہوشی کے عالم میں رضی اختر شوق کا یہ شعر زیر لب دہرا رہے تھے۔

ایک طرف میں جاں بہ لب، تار نفس شکستنی ۔۔۔ بحث چھڑی ہوئی ادھر چارہ گروں کے درمیاں

ڈاکٹروں نے نسخے میں ایک نیا شربت بڑھا دیا جبکہ ہم عالم اضطرار میں کسی کے شربت دیدار سے پیاس بجھاتے رہے۔ ہم دونوں شربتوں نے مل کر ہمارے لیے دوا اور دعا کا کام کیا اور دوپہر تک ہمیں اٹھا کر بٹھا دیا۔ ہماری محسنہ نے تیمارداری کا حق ادا کر دیا تھا۔ ہر آدھے

گھنٹے بعد نیم پخ بجتی' بلڈ پریشر وغیرہ چیک کرتی اور مشفقانہ انداز میں تسلی دیتی۔ جیسے ہی جسم میں بات چیت کی قوت آئی، ہم نے موقع کو غنیمت جانا اور پوری نیاز مندی سے اس کا نام پوچھا۔ ''گلنار'' اس نے دیوانہ وار جواب دیا اور چہکی ''اب آپ کیسے ہیں؟'' ہم نے ایسی سچویشن کے لیے مخصوص مرزا نوشہ کا مشہور و معروف شعر (ان کے دیکھے سے جو...) پڑھنا شروع ہی کیا تھا کہ اس نے ہمارے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ہم سمجھے کہ شاید اسے غالب سے کچھ زیادہ عقیدت نہیں ورنہ شعر تو برمحل تھا۔ لیکن جناب وہ تو کوئی چندہ رنگ سے زیادہ غالب شناس نکلی۔ بولی ''ایسا نہ کہیے، اب آپ کا حال واقعی اچھا ہے۔'' پھر اس نے ہمارے کچھ کوائف حاصل کر کے اپنے ناقص علم میں اضافہ کیا۔ یہ وہی کوائف تھے جو عموماً سرکاری دفتروں میں ''درج کرنے'' کیے جاتے ہیں یعنی روزگار، آمدنی، مشاغل وغیرہ جو ہم اپنی نحیف و نزار آواز میں اس تک پہنچاتے رہے۔ بات جب خاندان اور حسب نسب تک پہنچی تو ہم نے پنڈت گلزار دہلوی کے اس شعر کا سہارا لیا۔

ملتے ہیں عشق نام کے گزرے ہیں اک بزرگ ہم لوگ بھی فقیر اسی سلسلے کے ہیں

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی گویا گلنار سے گل گلزار ہو گئی۔ یوں اس کے ساتھ ہمارا پہلا باقاعدہ تعارف ہوا تھا۔ پھر تو ''بے فضول'' ملاقاتوں اور مذاکرات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب جوں جوں ہماری حالت نارمل ہو رہی تھی، گھر والوں کے چہروں پر تازگی اور ہمارے چہرے پر مردنی چھا رہی تھی۔ ہم اتنے سازگار اور یادگار ماحول میں شفایابی کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ حضرت داغ بھی شاید ایسے ہی عشق پرور حالات سے دوچار ہوئے تھے جو انھیں کہنا پڑا۔

ار کے ہم اطبا سے کے دیے تو اس مرگ منہ ذرا سا نکل آیا ترے بیماروں کا

ہمیں اسپتال آئے ہوئے دس دن ہو چکے تھے۔ گلنار کا بیشتر وقت ہماری ''فلاح و بہبود'' پر صرف ہو رہا تھا اگرچہ وہاں اور مریض بھی تھے۔ یوں تو نرسیں بھی کئی اور تھیں لیکن گلنار جیسی نر کہاں دستیاب تھی۔

وہ آتی تھی تو ہر اک مردہ تن میں جان آتی تھی وہ جاتی تھی تو اس کے ساتھ سب کی جان جاتی تھی

وہ چہرہ جس سے یہ سارا شفا خانہ چمکتا تھا رخ روشن کی تابانی تھی یا کندن دمکتا تھا

ایک روز معمول کے ''جامع مذاکرات'' کے دوران ہم نے اس سے کہا کہ وہ ہمارے جملہ کوائف تجربۂ اسپ اور ذات پات وغیرہ سے کماحقہٗ آگاہی حاصل کر چکی ہے، اب کچھ اپنے بارے میں بھی ہماری جانکاری میں اضافہ کرے۔ یہ سننا تھا کہ اس کی غزالی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اشکوں کا سیلاب پلکوں کا ڈیم توڑ کر باہر اُبل پڑا۔ ہم نے تسلی تشفی دے کر خاموش کرایا تو اس نے اپنی دل خراش روداد اتنے رقت آمیز لہجے میں سنانی شروع کی کہ اس دور کی فلم ''بابل'' کے آخری مناظر آنکھوں میں گھوم گئے۔ امداد باہمی کے اصول پر ہم دونوں نے ایک دوسرے کے آنسو پونچھے۔ اس نے ابتدا اور ہم نے تکمیل۔ خلاصہ کلام یہ تھا کہ اس کا گھر تقسیم ہند کے ہنگاموں میں تباہ ہو گیا تھا۔ باپ، بھائی اور کئی ایک عزیز بھی آزادی پر قربان ہو گئے تھے۔ وہ اپنی بوڑھی ماں اور چھوٹی بہن کے ساتھ مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے بے سروسامانی کے عالم میں لاہور پہنچی۔ گھر لاہور کی گوالمنڈی میں تھا لیکن وہ خود کراچی میں ایک اسپتال کے ہاسٹل میں رہتی تھی اور خاندان کی واحد کفیل تھی۔ یہ داستان الم سن کر ہمارا ننھا سا جیالا دل کلبلانے لگا، چنانچہ محض حقوق انسانی کے احترام میں ہم نے اسے پیشکش کی

آؤ مل جل کے علاجِ غمِ دوراں کر لیں
زندگی بھر کے لیے عیش کا ساماں کر لیں

اس نے نظریں جھکا لیں۔ گویا خاموشی نیم رضا۔ ہم نے اسے بتا دیا کہ وہ ہماری ہو گئی تو ہم اس کے خاندان کی کفالت ایک سعادت بلکہ عبادت سمجھ کر کریں گے چاہے اس کی خاطر ہمیں ورلڈ بینک سے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ ساتھ ہی اس سے عہد لیا کہ وہ ملازمت ترک کر کے بحیثیت شریکِ حیات اپنی توجہ اور محبت کے جملہ حقوق ہمارے نام محفوظ کرا دے گی۔ اب ہم کو اندیشہ تھا کہ ہمارا یہ انقلاب آفریں فیصلہ شاید دونوں کے اہلِ خاندان فوری طور پر قبول نہ کریں۔ انھیں ضرور ڈنک مارتا ہے۔ لہٰذا طے پایا کہ سب کچھ خفیہ طور پر کرنا ہوگا۔ بزرگوں کو بعد میں اسی طرح منا لیں گے جیسے ایک دوسرے کے خون کی پیاسی جماعتیں "مذاقِ جمہوریت" کے تحت پھر سے ایک ہو جاتی ہیں۔ ہمیں ڈر تھا کہ اگر ایسا نہ کیا تو دونوں اپنے اپنے گھروں میں "ماتس ون قادر موا" کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ تقریباً دو ہفتے بعد ہمیں ڈسچارج سلپ مل گئی۔ گلنار نے یقین دلایا کہ وہ اسی دن ملازمت کو خیرباد کہہ دے گی اور دوسرے دن علی الصباح نرسنگ ہاسٹل کے کمرے میں ہمارا انتظار کرے گی۔ پروگرام کے مطابق ہم کو پشاور روانہ ہونا تھا تاکہ ایک جگری دوست کے تعاون سے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں اور ظالم سماج کی پہنچ سے دور، بہت دور نکل جائیں۔ اپنے مستقبل کی منصوبہ بندی کرنے کے بعد ہم گھر آئے جہاں دن بھر مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ رات کے پچھلے پہر کچھ سکون نصیب ہوا۔ اب دھڑکتے دل کے ساتھ ہم نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے ضروری سامان اکٹھا کیا اور صبح ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

وہ رات ہم پر شبِ عاشور کی طرح بھاری تھی۔ بالآخر تقریباً پانچ بجے صبح جب تمام گھر والے خوابِ خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے، ہم بہت ہلکا سامان اور بہت بھاری انتڑی لے کر دبے پاؤں چوروں کی طرح گھر سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک "ہیٹ اینڈ کلین" آپریشن تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے ٹیکسی میں بلاوجہ ادھر ادھر گھومنے کے بعد سورج کی پہلی کرن کے نمودار ہوتے ہی ہم اسپتال کے ہاسٹل میں آ پہنچے۔ یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا لیکن یہ نوٹ کر کے انتہائی حیرت ہوئی کہ گلنار اطمینان کے ساتھ ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھی۔ اس کے حلیے اور سامان کی ترتیب سے بھی قطعاً اندازہ نہ ہوتا تھا کہ اسے ہمارے ساتھ زندگی کے ایک عظیم سفر پر روانہ ہونا ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے لاحول پڑھا۔ ایک لمحے کے لیے ہم ٹھٹکے کہ وہ ہمیں شادی سے پہلے ہی کس بات پر گرا لائی لیکن دراصل وہ اپنی یادداشت کو کوس رہی تھی کہ وہ وعدہ لینے والے سے وعدہ لے کر دروازہ بند کرنا کیوں بھول گئی تھی۔ ہم نے قدرے ترش روئی کے ساتھ اسے مخاطب کیا "گلنار! یہاں تو رات کا ایک ایک پل آنکھوں میں کٹا ہے اور تم نے ابھی تک کوئی تیاری نہیں کی؟"

"کیسی تیاری؟" اس نے بے رخی کے ساتھ سوال پہ سوال دے مارا۔ ہم نے اس کی بے نیازی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے مخلصانہ مشورہ دیا "خدا کے لیے ڈارلنگ، مذاق مت کرو۔ ابھی کل ہی تو تم نے وعدہ کیا تھا کہ۔۔"

"کیسا وعدہ؟" اس نے پہلے سے بھی زیادہ روکھے پن سے ہماری بات کاٹی۔

ہم نے تقریباً گڑگڑا کر اسے یاد دلایا "وہی محبتی وعدہ "نکاح" کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"۔ ہماری اس بے تکلفی پر وہ آگ بگولا ہو کے گرجی "مسٹر! میرے خیال میں آپ جسمانی طور پر تو صحت یاب ہو گئے ہیں لیکن ابھی ذہن میں فتور باقی ہے۔ میں نے آپ کی تیمارداری ایک فرض شناس نرس کی حیثیت سے کی تھی۔ آپ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھے اور انتہائی شدید نفسیاتی ہیجان کے باعث آپ پر

ہذیانی کیفیت طاری تھی۔ میرا فرض تھا کہ آپ کی دل جوئی کروں ورنہ آپ کا بچنا محال تھا۔ لیکن یہ پیشہ ہی ایسا ہے کہ جس پر ذرا زیادہ توجہ دو وہ بوریا بستر سمیت چلا آتا ہے۔"

"تو یہ تمھارا دوسرا روپ ہے؟" ہم نے دانت پیستے ہوئے طنز کا تیر چھوڑا۔

"میرا ایک اور صرف ایک روپ ہے محض پیشہ ور نرس اور بس۔" وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔ ساتھ ہی ہنس دی "اور بیٹے مسٹر اِن نمبر، احمقوں کی جنت سے باہر نکل کر حقائق کا سامنا کرنا سیکھیے۔"

"اچھا تو اب میں اِن نمبری بھی ہو گیا!" ہم نہایت لاچارگی میں منمنائے۔

"نہیں یہ بات نہیں" اس نے وضاحت کی "دراصل ہم لوگ مریضوں کو ان کے کمرے یا بیڈ کے نمبر سے پہچانتے ہیں۔ اور ہاں، یہ بھی جان لیجیے کہ میری شادی ہو چکی ہے اور اگلے ماہ رخصتی ہے جس کے بعد میں ہاسٹل اور اس ہی کے جنجال سے نجات پاؤں گی اور روز روز کی چخ چخ سے چھٹکارا پا لوں گی۔ حد ہو گئی اور کچھ حیا ہوتی ہے، کچھ شرم ہوتی ہے۔"

کل کی گلنار آج پوری طرح پھولن دیوی بن چکی تھی۔ ایک کے بعد ایک زوردار جھٹکا لگنے کے بعد اب اس کے پاس کہنے کے لیے صرف دو الفاظ رہ گئے تھے یعنی "گیٹ آؤٹ" جس کا ہم نے اسے موقع نہیں دیا۔ اور پھر جب ہم دل جلے قسمت کا ماتم کرتے، اپنا سوٹ کیس سنبھالے، بوجھل قدموں کے ساتھ اس جفا شعار کے کمرے سے خروج کر رہے تھے تو ہم نے دیکھا کہ ایک صاحب سولا ہیٹ گردن اکڑائے سر پر سجائے اور منہ میں سگار دبائے اسی کمرے میں داخل فرما رہے تھے ___ ان کے دونوں ہاتھوں میں بھاری بھاری صندوق تھے!

◆◆◆

ڈاکٹر انور سدید کی نئی تالیف "مفکر ادیب ڈاکٹر وزیر آغا"

منفرد اہلِ قلم ادیبوں کے مضامین کا مجموعہ ــــ پروفیسر غلام جیلانی اصغر، ڈاکٹر خورشید رضوی، شاہد شیدائی، منور عثمانی، مشتاق احمد، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، راغب شکیب، جمیل ملک اور انور سدید

ماہنامہ "سپوتنک" کی کتابی اشاعت ــــ قیمت: صرف 500 روپے

(ملنے کا پتہ: کلاسیک، ریگل چوک، دی مال، لاہور)

جدید اردو ناول کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ "اردو ناول کے رنگ" (مصنف: ڈاکٹر انور سدید)

اس کتاب میں محمد احسن فاروقی، دیوندر ستیارتھی، بانو قدسیہ، غلام الثقلین نقوی، قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، الطاف فاطمہ، جمیلہ ہاشمی، محمد سعید شیخ، ہاجرہ مسرور، یونس جاوید، انجم الحسن رضوی کے علاوہ کئی ناولوں کا تجزیہ کیا گیا ہے ــــ ناول نگاروں پر خیال انگیز مقدمہ شامل ہے۔

ملنے کا پتہ: مقبول اکیڈمی، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور

انشائیہ

اینزو (Enzo)

پروفیسر جمیل آذر

بعض لوگوں کو کتے بلیاں پالنے کا شوق جنون کی حد تک ہوتا ہے۔ مجھے اس قسم کے جانوروں کا پالنا تو دور کی بات ہے، دیکھنا تک گوارا نہیں۔ میری رہائش گاہ کے قریب ایک نوجوان نے چار پانچ کتے پال رکھے ہیں۔ یہ سب ولایتی ہیں اور خوبصورت بھی۔ صبح سویرے جب عبادت گذار مسجدوں کا رخ کرتے ہیں، یہ ان کے گلے میں چمڑے کے پٹے ڈال کر ان کو قابو کر کے سیر کو نکلتا ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ اس شخص کو کتوں سے اتنی محبت ہے کہ دسمبر کی شدید سرد ہوا میں بھی علی الصبح انہیں سیر کرانے کے لیے باہر نکلا ہوا ہے۔ محلے کے تمام لوگ ان جانوروں سے تنگ آ گئے ہیں۔ یہ کم بخت اپنے آقا کو خوش کرنے اور اپنی وفاداری کا دم بھرنے کے لیے صبح شام وقت بے وقت بھونکنے کا راگ الاپتے رہتے ہیں۔ ہمسائے کا سکون برباد ہو ان کی بلا سے۔ ان کا کام تو صرف بھونکنا بھونکنا اور مالک کے سامنے دم ہلانا اور پاؤں کو نمسکار کرنا ہے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مجھے تمام جانور ناپسند ہیں۔ گھوڑا، گائے، بیل وغیرہ مویشی مجھے پسند ہیں۔ لیکن پالتو جانوروں میں سے جسے میں پسند کرتا ہوں وہ طوطا ہے۔ دیسی نسل کے طوطوں سے لے کر ولایتی طوطے مجھے مرغوب ہیں۔ طوطے میں ایک خاص بات یہ ہے کہ خوبصورت ہونے کے علاوہ کچھ دانش کی قدر بھی رکھتا ہے۔ مثلاً سڑک کے کنارے ایک شخص اپنے بزرگ طوطے کے ساتھ کچھ کارڈ لیے بیٹھا ہوتا ہے جو اس کے سامنے پڑے ہوتے ہیں۔ ان کارڈوں پر قسمت کے حال لکھے ہوتے ہیں۔ یہ ترتیب وار الٹے رکھے ہوتے ہیں۔ بعض مظلوم الحال لوگ اپنے مستقبل کا حال معلوم کرنے کے لئے اس طوطے سے فال نکلواتے ہیں۔ اور طوطا نہایت مہارت سے ان کارڈوں میں سے ایک پتہ اپنی چونچ سے پکڑ کر باہر نکالتا ہے اور اپنے مالک کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ مظلوم الحال شخص اپنے اچھے مستقبل کی نوید سن کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ قسمت کا حال بتانے کی یہ صفت کسی اور جانور یا پرندے میں نہیں۔

طوطے میں ایک اور صفت بھی یہ ہے کہ اپنے مالک کی زبان سمجھتا ہے اور اس کی زبان میں بولتا بھی ہے۔ مجھے زبان کے حوالے سے ایک طوطے کی کہانی یاد آ گئی۔ ایک پنساری نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ طوطا بھی خوب چہچہاتا تھا۔ اس کے ساتھ گفتگو اور سلام دعا کرتا تھا۔ گاہکوں کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتا۔ اتفاق سے ایک روز اس سے بے خبری میں روغن بادام کی بوتل گر گئی۔ مالک نے اس نقصان پر طیش میں آ کر اس کے سر پر جوتے سے ٹھکائی کر دی۔ طوطے کو اس کا اتنا غم ہوا کہ اس نے بولنا چھوڑ دیا اور اسے چپ لگ گئی۔ مالک کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ اس نے طوطے کو بولنے کی طرف بڑا راغب کیا۔ مگر وہ بولنے کا نام تک نہ لیتا۔ ایک روز ایک گاہک آیا۔ اتفاق سے وہ گنجا تھا۔ اسے دیکھ کر طوطا بول اٹھا۔ ''کیا تم نے بھی اپنے مالک کی روغن بادام کی بوتل گرائی تھی؟''

طوطا خوددار ہے۔ اپنی عزت نفس کا بڑا خیال رکھتا ہے اس معاملے میں وہ اپنے مالک کی بھی پرواہ نہیں کرتا۔ طوطا چشم کا

محاورہ اسی لیے زبان زد خاص و عام ہے۔

اسے اتفاق کہیے یا تقدیر، لکھی کو کون ٹالے۔ میری چھوٹی پوتی کو اس کی بڑی بہن نے ایک ولایتی بلا تحفتاً دیا۔ حالانکہ وہ آرکیٹیکچر کی سینئر سٹوڈنٹ ہے مگر یہ بلے کو پا کر بہت خوش ہوئی۔ یہ ایک دو ماہ کا ننھا منا سا بلا ہے نہایت خوبصورت، بھورے رنگ کا۔ اس کے آنے سے گھر میں سب خوش ہیں۔ مگر اس کی موجودگی سے میں پریشان ہوں کیونکہ کتے بلیاں مجھے ہرگز گوارہ نہیں۔ مجھے ان سے کراہت آتی ہے۔

میری پوتی یونیورسٹی جانے سے پہلے اور واپس آنے پر اس کو پیار کرتی ہے، چومتی ہے اور اپنی والدہ سے خاص طور پر کہتی ہے کہ اس کا خیال رکھے۔ وہ بھی اس سے اتنا مانوس ہو گیا کہ اس کے واپس آنے کا منتظر رہتا ہے۔ اس کے لیے سپیشل فوڈ آتا ہے۔ جب اسے نیند آتی ہے تو اپنی مخصوص جگہ پر سوتا ہے۔ رفع حاجت کے لیے بھی اس کے لیے ایک علیحدہ گوشہ ہے جہاں یہ اپنی رفع حاجت پوری کرتا ہے کیا مجال جو کسی اور جگہ یہ کام کرے۔ چند ہی دنوں میں یہ اتنا شوخ اور چنچل ہو گیا کہ وہ سوائے میرے سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے اپنی اداؤں سے سب کے دل جیت لیے اور گھر کی ہر چیز کو فتح کر لیا۔

ایک روز شوخی میں گھر سے باہر نکل گیا۔ یہ ساعت اس کے لیے نیک ثابت نہ ہوئی، باہر ایک آوارہ بلے نے اسے دبوچ لیا اور اپنے دانت اس کی پشت میں پیوست کر دیے۔ زخمی حالت میں اندر لائے۔ زخم اتنا زیادہ تھا کہ چند ہی روز میں پک گیا۔ یہ اس کے لیے تکلیف دہ تھا۔ ویٹرنری ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ جہاں اس کے زخم کی سرجری ہوئی۔ وہاں دو تین ہفتے میں شفایاب ہو کر واپس گھر آیا۔ اس دوران میں میری پوتی بہت اداس رہی اور تقریباً ہر روز اسے دیکھنے کے لیے ہسپتال جاتی اور مطمئن ہو کر آتی۔ یہ ایک پرائیویٹ ہسپتال ہے جہاں پالتو جانور رکھنے والے لوگ اپنے کتوں اور بلیوں کو علاج کے لیے لاتے ہیں۔

ہسپتال سے شفایاب ہونے کے بعد اب یہ اور بھی شوخ و طرار ہو گیا۔ گھر کا کونہ کونہ اس کی دسترس میں ہے۔ کبھی وہ اس صوفے پر بیٹھتا ہے کبھی اس پر۔ سخت سردی کی وجہ سے اب یہ ہیٹر کے سامنے بھی کارپٹ پر استراحت فرماتا ہے۔ میرے کمرے میں ضرور آتا ہے۔ مجھے پیار بھری نظروں سے دیکھتا ہے۔ میں اسے دھتکارتا ہوں تو وہ ایک دو چھلانگیں مارتا ہوا میرے بستر پر چڑھ جاتا ہے اور مجھے تنگ کرنے کے تمام حربے استعمال کرتا ہے۔ ایک روز اس نے مجھے اتنی پیار بھری نظروں سے دیکھا کہ میرا دل خود بخود اس کی طرف کھنچنے لگا۔ میں نے اس کے سامنے اپنی ناپسندیدگی کو خیرباد کیا۔ اسے گود میں اٹھایا اور دست شفقت سے اس کے سر کو سہلانے لگا۔ اب اس بلے سے مجھے محبت ہو گئی ہے۔ وہ ہمارے کنبے کا فرد بلکہ اہم فرد بن گیا ہے۔

◆◆◆

بین الاقوامی ادیب، شاعر اور مصنف محمود شام کی زیر نگرانی
ماہنامہ "اطراف"
پوری آب و تاب سے کراچی سے شائع ہو رہا ہے ——— قیمت -/200 روپے
ملنے کا پتہ 262 اے، بلاک 3 گلشن اقبال، کراچی

جائزے

حسین احمد شیرازی۔ ایک باشعور طنز نگار

ڈاکٹر کیول دھیر (انڈیا)

حسین احمد شیرازی کی کتاب "بابو نگر" کے مطالعے کا موقعہ مجھے جب ملا جب میں اس سے قبل حسین شیرازی کو دو تین بار مل چکا تھا۔ بوقت ملاقات ان کے انداز گفتگو سے مجھے احساس تک نہیں ہوا کہ یہ شخص طنز و مزاح کا بندہ ہے۔ اس کے برعکس بس اتنا ہی پتہ چلا کہ حسین شیرازی ایک اعلیٰ سرکاری عہدے سے سبکدوش ہوا ہے اور اب ایک "اعلیٰ قسم" کا کامیاب ترین ایڈووکیٹ ہے۔ "بابو نگر" کے مطالعے نے اس بندے کی تصویر اور تعریف ہی بدل دی لیکن اچھا لگا کہ زندگی کے قریب یہ ایک زندہ انسان ہے اور زندہ لوگوں کی زندگی کے اندر تک جھانک کر بالکل اسی طرح اپنے قلم کے لئے مواد جمع کرتا ہے جیسے سمندر کی گہرائیوں میں غوطہ لگانے کے بعد سیپیاں حاصل ہوتی ہیں۔

طنز و مزاح محض ادب ہی نہیں زندگی جینے کا ایک سلیقہ بھی ہے کیونکہ اسے سب سے زیادہ تقویت اس وقت ملتی ہے جب وہ عام انسان کی زندگی کے ذوق کے مطابق میل کھاتا ہے۔ ایسا تب ممکن ہوتا ہے جب ایک طنز و مزاح نگار انسان کی زندگی کے دکھ سکھ اس کی روزمرہ کی زندگی میں رونما ہونے والی برائیوں، بے راہ رویوں اور بوالعجبیوں کو طنز و مزاح کے پیرائے میں اس طرح پیش کرے کہ زندگی جینے کا احساس بیدار ہو اور اصلاح بھی ممکن ہو سکے۔ ہمارے یہاں متعدد طنز و مزاح نگاروں نے جن میں شیرازی مقام مقدم پر ہے اسی جذبے کے تحت اس صنف مزاح کو بڑی مہارت اور چابک دستی سے استعمال کر کے لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دی ہیں اور ساتھ ہی غور و فکر کی دعوت بھی دی ہے۔

دراصل مزاح اور طنز کا اٹوٹ آپسی رشتہ ہوتا ہے اور اسی رشتے کی بنیاد پر بات کی جاتی ہے کہ طنز بغیر مزاح کے گالی بن جاتا ہے۔ مشہور مزاح نگار کنہیا لال کپور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "طنز و مزاح میں وہی فرق ہے جو ایک پھول اور پتھر میں ہوتا ہے یا جو نشتر اور تلوار میں ہے" ظاہر ہے کہ طنز و مزاح کی ادب اور روزمرہ کی زندگی کے اندر جو افادیت و اہمیت ہے اس سے انکار اس لئے ممکن نہیں کیونکہ دونوں کی اساس اصلاح پر رکھی ہوئی ہے۔ موجودہ دور میں مزاح کی اشد ضرورت اس لئے ہے کہ بیسویں صدی کے اختتام تک جہاں سائنس نے انسان کو بے شمار آسائیاں اور راحتیں میسر کی ہیں وہیں انسانی زندگی اس کے منفی اثرات کے باعث قابل رحم و مظلوم سی ہو گئی ہے۔ لگتا ہے جیسے ہر بشر اس تکلیف دہ زندگی سے پریشان حال ہے۔ ہونٹوں پر فریادیں اور دل میں معمولی خوشی یا مسرت پانے کی ڈھیر ساری آرزوئیں اور تمنائیں ہیں جو جدید دور کے انسان کی زندگی کا مقدر بن چکی ہیں۔ آج کے دور میں اگر کسی کو ایک حقیقی تبسم بھی مل جائے تو زندگی کی خوشی کی آس بندھ جاتی ہے۔ حسین احمد شیرازی کی تحریریں زندگی کی اسی آس کی ضامن ہیں۔

طنز و مزاح زندگی کا جائزہ لینے کی ایک کسوٹی بھی ہے جو تہذیب و معاشرت کی روش اس کی ناہمواریوں خامیوں

اور ناکامیوں کا ہمدردانہ جائزہ لے کر سچائی اور صداقت کے ساتھ اسے واضح کرتی ہے جو اس کا فرض اولین ہے۔ دراصل طنز و مزاح حکومت کے قوانین، مذہب کی اہم پابندیاں اور معاشرے کی روایات کے لئے جو اپنی شکست تسلیم کر لیتے ہیں، طنز نگاری پذیرائی بھی ایسے ہی ماحول اور معاشرے کی متقاضی ہوتی ہے۔ تہذیب جس قدر شائستہ ہوگی طنز و مزاح بھی اتنا ہی اعلیٰ ظرف ہوگا۔ چنانچہ طنز نگار کا بھی باشعور ہونا اولین شرط ہے۔ حسین شیرازی باشعور ہونے کی اس شرط کو بھرپور طور پر پورا کرتے ہیں۔ وہ زندگی اور اس کے ماحول میں ایسا ہی مواد حاصل کرتے ہیں جس پر عام انسان کی نظر نہیں پڑتی۔ ظرافت جہاں انسانی تعلقات کے لئے خوشگواری و استواری کے حالات پیدا کرتی ہے، ظرافت کی تعمیر شوخی، ذہانت اور مبالغے کے اشتراک سے ہوتی ہے۔ اس طرح شیرازی اپنی تخلیق سے قاری کو چونکانے میں کامیاب ہوتا ہے اور وہ اس طرح انسانی زندگی کی اثباتی قدروں کو دیکھتا ہے کہ اصلاح کے لئے بھی راستہ ہموار ہو جاتا ہے۔

حسین شیرازی نے اپنے تخلیقی فن سے جس طرح عمل جراحی کا کام انجام دیا ہے اس کی چند اعلیٰ مثالیں درج ذیل ہیں:

"ناجائز آمدنی بجنسہ اب کوئی برائی نہیں رہی۔ ایک شخص کو کسی نے ڈرایا کہ ناجائز مال کھانے والا اندھا ہو جاتا ہے کیونکہ حرام آنکھوں پر اثر کرتا ہے اور نظر کمزور ہو جاتی ہے تو وہ بولا کوئی بات نہیں، جب تک عینک لگانے کی نوبت نہیں آتی جاری رکھتے ہیں پھر چھوڑ دیں گے۔"

"ہمیں علاقائی اور قومیتوں کی بنیاد پر ہوتے جانے والے تعصب کی سمجھ نہیں آتی کیونکہ ہمارے ملک کے تمام باثر طبقات اس سرزمین کے اصلی "دھرتی کے سپوت" نہیں ہیں۔ اس سرزمین کے حقیقی بیٹے تو آج بھی پشاور سے کراچی تک گندگی اٹھانے اور کوڑا کرکٹ ٹھکانے لگانے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں!"

"انگریز مورخ "وار برٹن" نے اپنی کتاب میں "اگر گڑ" قصبہ کی زیارت کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ اس علاقے کے لوگوں نے وہاں سے گزرنے والے ایک نیک اور پارسا آدمی کو قتل کر کے اس کا مزار اس لیے بنایا تھا کہ ان کے پاس بھی کوئی تاریخی شخصیت ہونی چاہیے جس کی قسم اٹھا کر وہ دوسروں کو اپنی بات کا یقین دلا سکیں!"

"1994ء میں ہم نے اپنی کتابیں وفاقی وزیر قانون کو دکھائیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے اسی وقت سیکرٹری قانون کو بلا کر ان کتابوں کی کمپیوٹر کے لیے سافٹ کاپی بنانے کی ہدایت دی اور ہمارے ادارے کے سربراہ کو ہماری کتابوں کی تعریف و توصیف کا خط بھی لکھا۔ اس ملاقات کے دوران پاکستان میں تحقیق کے زوال کا تذکرہ آ گیا تو سیکرٹری نے تبصرہ کیا کہ کبھار جو ریسرچ بنتا ہے وہ اب شیروں میں متروک ہو گئے ہیں کیونکہ انھیں کوئی استعمال نہیں کرتا۔ یہی حال ہمارے ہاں ریسرچ کا ہے۔"

آخر میں یہی کہ شیرازی کا قلم رواں دواں رہے، زندگی کے گہرے سمندر میں وہ غوطے لگا کر زندگی کے حسن کی سچائیاں نکالتا رہے اور زندگی کے تلخ زدہ چہرے کو مسکراہٹوں سے ہمکنار کرتا رہے۔ میں ان کے لیے دعا گو ہوں۔

◆◆◆

کچھ وقت ماہنامہ ”تخلیق“ کے ساتھ

ڈاکٹر انور سدید

سلطان اظہر جاوید کے ماہنامہ ”تخلیق“ کا دسمبر 2015 کا شمارہ شائع ہو گیا ہے۔ اور یہ مضامین نظم و نثر کا خوبصورت مرقع ہے۔ فہرست مضامین دیکھتے ہی اس پرچے نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی اور میں سب کام چھوڑ کر اس کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ سب سے پہلے میں نے ترقی پسند نقاد مسلم شمیم کا مضمون ”علامہ اقبال اور مسلم نشاۃ ثانیہ“ پڑھا۔ انہوں نے اقبال کو اس نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا تسلسل قرار دیا ہے جس کا آغاز سر سید احمد خان نے انیسویں صدی میں کیا تھا۔ مسلم شمیم نے بالخصوص اس نکتے کو ابھارا کہ علامہ اقبال نے کائنات کی حرکی اور ارتقائی تصور پر زور دیا۔ اور اس کی مثال ان کی ”ساقی نامہ“ سے دی۔ ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے غفور شاہ قاسم کے تنقیدی مضامین کی کتاب ”تعبیر حرف“ کا تجزیہ کیا ہے اور یہ نکتہ بالخصوص ابھارا ہے کہ ڈاکٹر غفور شاہ قاسم نے پاکستانیت کو اقبالیاتی زاویے سے ابھارا ہے۔ پروفیسر جمیل آذر نے معروف ادیب شفیع ہمدم کے ادبی سفر کی جہات نکھاری ہیں۔ یہ کتاب ملک مقبول احمد نے مرتب کی ہے۔ جو اردو کتابوں کے ممتاز ناشر ہیں لیکن اب خود بھی تصنیف و تالیف کے میدان میں نمایاں ہو گئے ہیں۔ ایک تاثراتی مضمون قرۃ العین حیدر کی عظمت کے اعتراف میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

”تخلیق“ میں سلطان اظہر جاوید نے نامور افسانہ نگاروں کا بہت اچھا حلقہ قائم کر لیا ہے۔ اس مرتبہ افسانے کے حصے میں ڈاکٹر رشید امجد، آغا گل، محمد حامد سراج، پروفیسر زہیر کنجاہی، طارق بلوچ صحرائی، تسنیم کوثر اور اظہر جاوید کے افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ یہ افسانے ہماری معاشرتی زندگی کے مختلف زاویوں کو پیش کرتے ہیں لیکن اظہر جاوید کا افسانہ ان کی اپنی زندگی کی ایک قاش قرار دیا جا سکتا ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ زہیر کنجاہی اپنے افسانے کی اشاعت سے پہلے اس دنیا سے اٹھ گئے۔ وہ عرصے سے بیمار تھے۔ لیکن ادب کی تخلیق کاری سے کبھی غافل نہیں ہوئے۔ ان کی شاعری اور افسانے مختلف رسائل میں ان کی وفات کے بعد بھی چھپ رہے ہیں۔

خاکہ نگاری کے باب میں اس مرتبہ نذر امتیاز نے مطہر محبت اعزاز احمد آذر کا، اشفاق عاطف نے پرویز بزمی کا، ڈاکٹر محمد اقبال صمصام نے پروفیسر ظہور الحسن کے خاکے لکھے ہیں اور اپنے مشاہدات کی خوبصورت لفظی تصویریں بنائی ہیں۔ تاہم ملک مقبول احمد کا ستار طاہر پر خاکہ الگ نوعیت کا ہے۔ یہ خاکہ ایک ناشر اور ایک مصنف کے تعلقات کا آئینہ ہے۔ اظہر جاوید نے امرتا پریتم کا الفاظ میں مجسمہ اپنے خیال سے مرتب کیا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کے بارے میں بھارت کے انٹرویو نگار نثار صدیقی کا تحریری انٹرویو اور رشید امجد کی اپنی یاد نگاری کا نقش ... ”عاشق مہر طلب“ اس پرچے کے دو معلومات افزا مضامین ہیں۔ آپ ”تخلیق“ کے اس شمارے کو ”رشید امجد نمبر“ بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس مرتبہ سلطان اظہر جاوید نے ایک نیا سلسلہ ”تجزیاتی مطالعہ“ کے نام سے شروع کیا ہے۔ ادبی صحافت میں جدید نظم کے

تجزیوں کو حیدر امام نے ''ادبی دنیا'' میں اور ڈاکٹر وزیر آغا نے ''اوراق'' میں بہت فروغ دیا تھا۔ سونان اظہر جاوید نے افسانوں کے تجزیے کی طرف توجہ مبذول کی ہے۔ انہوں نے بھارت کے معروف افسانہ نگار روشن سعید کے ایک افسانے ''ملک کا آخری بادشاہ'' کا تجزیہ تسنیم انصاری صاحب سے کرایا ہے۔ انہوں نے اس افسانے کی معنوی تعبیر بڑی خوبی اور خوبصورتی سے کی۔ محترم مدیر تخلیق کو یہ سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔

میں ڈاکٹر امجد پرویز کو بالخصوص خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے موسیقی کی گم شدہ آواز کو بازیافت کیا۔ زبیدہ خانم کے گیتوں کا تذکرہ اتنا خوبصورت ہے کہ ان کے تذکرے کے ساتھ گیتوں کی موسیقی بھی کانوں میں رس گھولنے لگتی ہے۔ ڈاکٹر امجد پرویز نے ''جائزے'' کے باب میں ''تخلیق'' کے گزشتہ شمارے پر معنی خیز تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے۔ م۔ ص۔ ایمن کی کتاب ''محبت توحق'' پر تسنیم سحر صاحب کا تبصرہ ان کی خوش ذوقی کا آئینہ دار ہے۔ تسنیم سحر شاعر ہیں لیکن اپنے وسیع مطالعے کی اساس پر انہوں نے اپنا تنقیدی نقطۂ نظر بھی تعمیر و ترتیب کر رکھا ہے اور انہیں نقادوں کی صف اول میں جگہ دے کر مجھے خوشی ہو رہی ہے۔ ''نعت گنجینے'' پر انہوں نے تقدس کی جو لہر پیدا کی ہے اس کی داد فضا میں خوشبو کی طرح پھیل گئی ہے۔ بلکہ شیخ تخلیق و تنقید کے معاملات میں وہ ''ہرفن مولا'' ہیں۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ ان کی ''نعت گنجینے'' میری بیماری کے ایام میں لائبریری بہاولپور میں چلی گئی۔ اس پر تبصرہ نہ ہو سکا۔

سونان اظہر جاوید نے شاعری کے لیے نظم اور غزل کے الگ الگ گلشن آراستہ کیے ہیں۔ مجھے امین راحت چغتائی، ایصار عبدالعلی، کنول فیروز، ستیہ پال آنند، ایوب خاور، توقیر مشتاق، مرزا اطہر، احمد ظفر، کرشن کمار، سہیل سروری، طاہر منظور اور حمیرہ احمد نے اپنی شاعری سے متاثر کیا۔ ڈاکٹر معین قریشی اور ڈاکٹر محسن مگھیانہ کے مزاح پارے بے ساختہ مسکراہٹوں کو جنم دیتے ہیں۔ طارق اصغر نے ''تخلیق'' کے گزشتہ پرچے میں گلزار جاوید کے افسانوں کی کتاب پر خوبصورت تبصرہ کیا تھا۔ ''انجمن خیال'' میں ان پر خاکے کا ذکر درست نہیں۔ یہ سہو قلم ہے یا کتابت کی غلطی؟ مجموعی طور پر ''تخلیق'' نے مطالعے کا اعلیٰ، معیاری اور متنوع مواد پیش کیا ہے۔ سونان اظہر جاوید کو مبارکباد۔

(بشکریہ روزنامہ ''نوائے وقت'' 20 جنوری 2016ء)

●●●

معروف شاعرہ وصف وفا کی خوبصورت شاعری کا مجموعہ

وفا سے بے وفا تک

شائع ہوگیا ہے ——— قیمت:-/200 روپے

ملنے کا پتہ: شام کے بعد پبلی کیشنز، الحمد مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

اور ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور (رابطہ نمبر: 042-37310115)

ماہنامہ "تخلیق" (دسمبر ۲۰۱۵ء)

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

جس طرح تحقیق اور تخلیق کار کا گہرا تعلق ہوتا ہے اسی طرح اب پاکستانی ادب اور ماہنامہ "تخلیق" کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ۲۰۱۵ء اوراق پارینہ کا حصہ بن چکا ہے لیکن "تخلیق" کے دسمبر 2015ء کی یادیں کسی طرح بھی ذہن سے اوجھل نہ ہو پائیں گی۔ 160 صفحات پر مشتمل دسمبر 2015ء کا شمارہ بین الاقوامی ادب کا شہکار ہے۔ سونان اظہر کی "پہلی بات" قومی زبان کے حوالے سے ہے۔ 1973ء کے آئین کے مطابق 1988ء میں قومی زبان اردو کو عدالتی، دفتری اور تعلیمی زبان کا درجہ مل جانا چاہیے تھا لیکن غلامانہ ذہن نے اردو کا گلا دبائے رکھا۔ گزشتہ سال اردو زبان کو قومی سطح پر نافذ کرنے کا حکم عدالت عظمیٰ کی طرف سے صادر ہونے کے باوجود تا حال کوئی عملی پیش رفت نظر نہیں آتی۔ سونان اظہر کی "پہلی بات" قومی زبان اردو سے دلی وابستگی کا اظہار ہے۔ انھوں نے محکمہ ڈاک کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے۔ جس نے ٹکٹ پوسٹ اور رجسٹری کی شرح میں اضافہ کر کے کتب و رسائل کی ترسیل پر گراں قدر بوجھ ڈال دیا ہے۔ فرزند اقبال جسٹس (ر) ڈاکٹر جاوید اقبال، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی اور ابن محمد علی چراغ کے انتقال پر افسوس کا اظہار اردو کی اہل علم و دانش سے محبت کا ثبوت ہے۔ مظفر حسن منصور، غالب عرفان، ایم رفیق ارم، کی طرف سے حمد باری تعالیٰ جب کہ پروفیسر اعتبار ساجد، سید ریاض حسین زیدی اور حیات رضوی کے نذرانہ نعت تخلیق کی سعادت ہیں۔ مسلم شمیم کا مضمون "علامہ اقبال اور مسلم ثقافت" اقبال شناسی کا آئینہ دار ہے۔

قرۃ العین حیدر کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید، شفیع ہمدم کے ادبی سفر کے بارے میں پروفیسر جمیل آذر کی تحریر اور ڈاکٹر محمود شاہ قاسم کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تعبیر حرف شناسی" کے بارے میں ڈاکٹر سکندر حیات میکن کا مضمون ادبی چاشنی کے علاوہ ان کی ادبی صلاحیتوں کے اعتراف کی اہم پیش رفت ہیں۔ اظہر جاوید، تسنیم کوثر، طارق بلوچ صحرائی، پروفیسر زبیر کنجاہی، محمد حامد سراج، آغا گل اور ڈاکٹر رشید امجد کے افسانے زندگی کی عکاسی کرتے نظر آ رہے ہیں۔ تجزیاتی مطالعہ میں بھارتی افسانہ نگار روشن سعید کا افسانہ "ملک کا آخری بادشاہ" شامل کرنے کے ساتھ ساتھ تسلیم انصاری کا تجزیہ تخلیق کی زینت ہے۔ شاعر، ادیب، تجزیہ نگار، گلوکار، فن کار، ڈاکٹر امجد پرویز نے سریلی آوازوں کی زبیدہ خانم کو لفظوں کے تاروں سے ہدیہ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس تحقیقی مضمون میں زبیدہ خانم کے گائے ہوئے تقریباً تمام گیتوں کا خوبصورت تذکرہ کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر امجد پرویز نے کمال عرق ریزی سے موسیقاروں، شاعروں، فلم سازوں کے حوالوں سے نہ صرف زبیدہ خانم کے فن اور شخصیت کو اجاگر کیا گیا ہے بلکہ قیام پاکستان سے اب تک موسیقی کی مختصر تاریخ بھی بیان کر دی گئی ہے۔ طنز و مزاح کے حوالے سے ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کا مضمون "چھینکیں کی کی نہیں غالب" اور ممتاز مزاح نگار ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا مضمون "برف" پڑھنے کے لائق ہیں۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی نے وفاق میں ہونے والی چھینکوں کا تذکرہ کیا ہے جب کہ ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا مضمون "برف"، برفباری اور برف کی گولہ باری کے گرد گھومتا ہے۔ کشور ناہید، ستیہ پال آنند، طاہر سعید ہارون، ایوب خاور، توقیر مشتاق، پروین شیر، سلطان کھاروی، لطیف

قریشی، رشیدہ عیاں، رشید آفریں، مجید واحد، شہرین فاروق کی منظومات اور ظفر اقبال، امین راحت چغتائی، اکمل صابری، اسلم گورداسپوری، ایصار عبدالعلی، کنول فیروز، مرزا احمد نور طاہر، ڈاکٹر ایوب ندیم، اسلم سحاب ہاشمی، بسمل سروکی، کرشن کمار طور، حفیظ انجم کریم نگری، مشرق صدیقی، طاہر منظور، ضیاء اللہ طاہر، رشیدہ ماہین ملک، ڈاکٹر محمد شاہین کھوسہ، ڈاکٹر مقصود حسنی، وصف وفا، تمثیلہ لطیف، پروفیسر نور کمال شاہ کی غزلیات تخلیق کے حسن تخلیق کا کمال ہیں۔ پروفیسر اعتبار ساجد کی تحریر پر ہمیشہ کی طرح سب ہی اعتبار کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دیرینہ ساتھی اظہر جاوید کی یاد میں ایک خوبصورت مضمون تحریر کر کے حق دوستی نبھایا ہے۔

محترمہ عذرا اصغر کا اعزاز احمد آذر کے بارے میں، محترم اخلاق عاطف کا ملک فتح خان پرویز بیری کی خدمات کے حوالے سے، ملک مقبول احمد کا ستار طاہر کے بارے میں، ڈاکٹر محمد اقبال صمصام کا پروفیسر ظہور الحسن کے حوالے سے جب کہ اظہر جاوید کا امرتا پریتم کی ادیبانہ اور شاعرانہ صلاحیتوں کے حوالے سے خاکہ جات شامل ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کی یادیں نویں منزل میں تک پہنچ چکی ہیں۔ محمد اسلم کا مضمون نما افسانہ ''جنھیں اس کام ہی کچھ تو ملتی ہے'' یادنگاری میں شامل ہے۔ نسیم سحر ''ایک امین جو اللہ ابری نہیں'' ''یسمین کرن'' ''رسیدی ٹکٹ'' ''ڈاکٹر امجد پرویز'' ادب کی ترویج بلا تعطل'' خورشید بیگ میلسوی ''گور کھی سے'' کتابی جائزے میں غالب عرفان اور آفتاب خان کے کتابی تبصروں کا جہاں آباد ہے۔ سلطان اختر کی کاوشیں قابل ستائش ہیں جو اہل قلم سے رابطہ فرض میں سمجھ کر تخلیق کے حسن و جمال اور ادبی کمال کے لیے ہمہ وقت مصروف کار ہے۔

◆◆◆

معروف شاعر، مصنف اور ادیب پروفیسر حسن عسکری کاظمی کا نیا شعری مجموعہ

خواب دیکھا نہ کرو

شائع ہو گیا ہے ——— قیمت:-/300 روپے

ملنے کا پتہ : الحمد پرنٹرز، 9۔ ریٹی گن روڈ، لاہور (فون:042-37220761)

معروف افسانہ نگار سیما پیروز کا پنجابی شاعری کا مجموعہ

کچ دا رشتہ

شائع ہو گیا ہے ——— قیمت:-/200 روپے

ملنے کا پتہ : پاکستانی پنجابی ادبی بورڈ، 2۔ کلب روڈ نزد گورنر ہاؤس گارڈن، شاہراہ قائداعظم، لاہور

پروفیسر یوسف شیدائی

محمد اقبال فیروز

انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو اسے اکثر اپنے دوست اور شفیق اساتذہ شدت سے یاد آتے ہیں۔ خاص طور پر وہ عظیم شخصیات جنہیں انسان وقت کی بھول بھلیوں اور فکرِ معاش کے ہنگاموں میں الجھ کر ذہن کے کسی گوشے میں دفن کر دیتا ہے۔ میں ایک عرصے سے ایک شفیق، مہربان اور ادبی ذوق سے مالا مال شخصیت جناب پروفیسر یوسف شیدائی سے ملنے کی خواہش کو سینے میں دبائے بیٹھا تھا۔ جناب جوہر نظامی کے صاحبزادے پروفیسر مظفر حسن منصور سے ملاقات ہوئی تو باتوں باتوں میں یوسف شیدائی صاحب کا ذکر آ گیا کہنے لگے "اللہ کے فضل سے بالکل ٹھیک ہیں اور لاہور میں مقیم ہیں"۔ منصور صاحب کی کوششوں سے مجھے ان کا نمبر مل گیا اور اسی دن شام کو میں نے انہیں ایک پرانے شاگرد کے طور پر اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے بہت شفقت اور کھلے دل سے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ دل کی عجیب کیفیت تھی ایسے لگ رہا تھا جیسے میں نے ایک بہت بڑے خزانے کو تلاش کر لیا ہو۔ ان کی آواز بہت کمزور ہو چکی تھی مگر پہچاننے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہو رہی تھی۔

اس سال جولائی کی ۱۸ تاریخ کو ایک کاروباری سلسلے میں لاہور آیا تو ان سے ملنے کی شدید خواہش ہوئی۔ جب ہم ان کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچے تو انہیں اپنے آنے کی اطلاع دی اور وہ پانچ منٹ کے بعد خود ہی ہمیں لینے کے لیے تشریف لے آئے۔ میں نے انہیں دور سے آتے ہی پہچان لیا۔ پرانی یادیں بن بلائے مہمان کی طرح میرے دل و دماغ پر دستک دے رہی تھیں۔ میں نے یوسف شیدائی صاحب کو پہلی مرتبہ جوہر آباد میں منعقد ہونے والے ہندو پاک کے ایک عظیم الشان مشاعرے میں سٹیج سیکرٹری کے فرائض سر انجام دیتے ہوئے سنا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے اردو کے کورس میں حکیم مومن خان مومن، مرزا غالب، میر تقی میر، خواجہ میر درد اور آتش جیسے پرانے شعراء کا کلام شامل تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ ہمیں اس عمر میں ان شعراء کی شاعری کوئی اتنی اچھی نہیں لگتی تھی۔ ہماری دلچسپی صرف اس حد تک تھی کہ ہمیں ان کی شاعری کی خوبیاں اور خامیاں امتحان میں کامیابی اور اچھے نمبروں کے حصول کے لیے از بر کرنی ہیں۔ ان دنوں نوجوان یوسف شیدائی کا کلام جو عہدِ شباب کی اٹکھیلیوں اور ہجر و وصال سے جڑے ہوئے لطیف جذبوں کی بھرپور عکاسی کرتا تھا ہمیں ایک ایسی رنگین اور عجیب جذباتی دنیا میں لے جاتا تھا کہ اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے ہمارے پاس الفاظ نہیں تھے۔ بس شعر تھے جیسے یہ ہمارے احساسات کے پیامبر تھے۔

دیکھی رسوائیوں کا شیدائی — ہم کسی سے گلہ نہیں کرتے
ہم ہی بدنام ہو گئے ورنہ — لوگ دنیا میں کیا نہیں کرتے

ہمارے بہت سے کلاس فیلو ان کی شاعری سے بے حد متاثر تھے وہ جب بھی کسی مشاعرے میں کوئی تازہ کلام سناتے تو ترنم سے پڑھنے کا ان کا ایک مخصوص انداز ہوتا اور ہم کئی کئی روز تک اسی انداز سے ان کے شعروں کو گنگناتے رہتے۔ کچھ دوست تو انہیں کے ردیف اور قافیہ پر طبع آزمائی کرنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ یہ زمانہ شکیب جلالی، عبدالحمید عدم، احمد فراز، مصطفیٰ زیدی، ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض اور ناصر کاظمی جیسے شعراء کا تھا۔ میں اکثر شکیب کو یوسف شیدائی صاحب کے ساتھ کالج کے لان میں بیٹھ کر خوش گپیاں کرتے ہوئے

دیکھا کرتا تھا۔ یہ عظیم شاعر صرف چھتیس سال کی عمر میں اپنے ہاتھوں زندگی کا خاتمہ کر کے راہیِ ملکِ عدم ہوا تو شیدائی صاحب کو میں نے اتنا دکھی اس وقت بھی نہیں دیکھا تھا جب ان کا ایک بیٹا خسرہ کا شکار ہو کر فوت ہو گیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ کالج کے لان میں اکیلے بیٹھے انجانی پریشانی میں کچھ سوچ رہے تھے۔ ہمارے ایک کلاس فیلو سرور نے انہیں کلاس میں آنے کے لیے کہا تو کہنے لگے "آج مجھے کچھ دیر تنہا چھوڑ دو۔"

یوسف شیدائی صاحب نے ملاقات کے دوران مجھے اپنی دو کتابیں عنایت کی تھیں، "حرفِ تمنا" اور "دل دریچے"۔ ان کتابوں کے مطالعے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ان کی شاعری کا رنگ وقت کے ساتھ ساتھ کافی حد تک بدل چکا تھا۔ عشق و محبت کے لطیف جذبات موجود تھے لیکن بہت سی نظموں میں پہلی سی پختگی آ چکی تھی کتابوں میں بہت سی خوبصورت نظمیں تھیں، غزلیں تھیں اور مزاحیہ کلام بھی تھا۔

شیدائی صاحب کے کلام میں جن غزلوں کو میں نے پہلی مرتبہ سنا ان میں پچاس سال پہلے والی چاشنی موجود تھی، وہی رنگ تھا وہی لہجہ تھا مگر نئی بات یہ کہ اس میں پہلے کی نسبت زیادہ پختگی اور نغمگی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ تجربات و حوادث شاعری کی روح پر اثر انداز ہوتے ہی ہیں لیکن اس میں وہ رنگ جس پر ایک شاعر قدرتی طور پر اپنے کلام کی بنیاد کھڑی کرتا ہے آخر تک قائم رہتا ہے۔ شیدائی صاحب کی نظموں اور غزلوں کا رنگ بے حد متاثر کن ہے۔ ایک انگریز کا مقولہ ہے کہ شاعر الفاظ کو اس انداز سے دیکھتا ہے جس طرح ایک عام انسان عورت کو دیکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شاعری میں خوبصورت الفاظ کا چناؤ کرنے کے بعد ایک اچھے شاعر کو ایسی ہی تسکین ملتی ہے جیسے ایک عام آدمی کو کسی پری جمال کے چہرے پر نگاہ پڑنے سے۔ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے اس پر بحث تو ہو سکتی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک صاحبِ ذوق شاعری کی روح کو گہرائی سے سمجھنے والا قاری جب کسی اچھے شاعر کے کلام سے لطف اندوز ہو رہا ہوتا ہے تو اسے ایک ایک لفظ سے حسن و عشق کے جلوے نظر آتے ہیں۔ شیدائی صاحب کے کلام میں بھی یہ ایسی ہی خوبی ہے خوبصورت الفاظ جن کا چناؤ وہ اپنی مرضی سے نہیں کرتے ان کے اندر ایک خداداد صلاحیت ہے جو الفاظ کو ان کے سامنے کھڑا کرتی ہے۔ ورڈز ورتھ نے کہا تھا کہ خیالات خداوند تعالیٰ کا وہ عظیم تحفہ ہیں جو حقائق کو پرکھنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ شاعری جذبات سے جنم لیتی ہے۔ یکسوئی اور حافظے کی طاقت جذبات اور احساس کو ایک مخصوص شکل میں ڈھال دیتی ہے۔ اس کا نام شاعری ہے جب کہ Coleridge نے ایک بہت خوبصورت بات کی ہے اس نے تصورات کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے پہلے نمبر پر وہ تصورات ہیں جو ہر آدمی کے ذہن کے ساتھ جبلی اور فطری طور پر جڑے ہوتے ہیں اور وہ انہیں غیر ارادی طور پر استعمال کرتا ہے دوسرے نمبر پر موجود ہر ایک سے متعلق نہیں ہوتے یہ صرف شعراء کو تفویض کیے جاتے ہیں اور ایک شاعر انہیں ارادی طور پر استعمال کرتا ہے۔ میں نے ان کی کتاب "دل دریچے" میں جب ان کی پہلی غزل پڑھی تو یہ خیال شدت سے پیدا ہوا کہ تصورات پر ہر انسان کا زور نہیں چلتا انہیں یکسوئی اور خیال کی بھرپور طاقت سے قابو میں رکھنا صرف شعراء کا ہی کام ہے۔

آنکھوں میں حسن کے جشن وہ تیرا دیکھنا — دل دریچوں سے تجھے میرا وہ شب بھر دیکھنا

میں کہ تھا اک تپتے صحرا میں بگولے کی طرح — چاہتا تھا ریت کے ذروں میں گوہر دیکھنا

قربتوں میں بھی جدائی کا تصور دل میں ہے — اپنی عادت ہے جزیروں میں سمندر دیکھنا

میں نے جو کچھ محسوس کیا ہے وہ قلم کی نوک پہ لے آیا ہوں لیکن آرزو تو ان سے ملاقات تھی جو پوری ہوئی اور جس کے اثرات میں اب تک اپنے ذہن میں محسوس کر رہا ہوں۔

◆◆◆

بہترین ادبی جرائد میں سرِ فہرست

منشا قاضی

آج مجھے ایک ایسے ادبی جریدے پر تبصرہ کرنے کا اعزاز، شرف اور سعادت حاصل ہو رہی ہے جس کا تعلق عوام سے کم خواص سے زیادہ ہے اور اس میں دنیا کے ہر ملک کے ادیبوں، شاعروں، انشاپردازوں کی تحریریں جغرافیائی سرحدوں کو توڑتی ہوئی دلوں کو جوڑتی ہیں۔ اس ادبی جریدہ کا نام "تخلیق" ہے جس کے بانی مدیر اظہر جاوید سے میرا سلسلۂ محبت جاری رہا۔ ان کی اچانک موت کا غم آج بھی محسوس کرتا ہوں۔ وہ ایک بہت بڑے انسان تھے۔ ان کی ادبی وراثت کو ان کے بیٹے سونان نے سنبھالا اور رسالہ "تخلیق" کو بے پناہ ترقی دی۔ اس وقت میرے سامنے دسمبر 2015ء کا شمارہ ضوفشاں ہے۔ اس شمارے میں جن شاعروں، ادیبوں، انشاپردازوں، نقادوں اور مؤرخ حضرات کی تحریریں ہیں وہ اپنے دور کے عظیم ادیب ہیں۔ سونان اظہر جاوید کی "پہلی بات" اسی طرح چل رہی ہے جس طرح "تخلیق" کے بانی نے اس کی طرح ڈالی تھی۔ حمد، نعت، مضامین، منظومات، افسانے، غزلیں، رفتگان کی یادنگاری، سفرنامے، انٹرویو، تجزیاتی مطالعہ، موسیقی، طنز و مزاح، جائزے، پنجاب رنگ اور انجمن خیال۔ اتنا بیش قیمت مواد بہت کم ادبی جرائد میں آپ کو دیکھنے میں ملے گا۔ سونان کا وجدان جاگ رہا ہے اور اظہر کے جاوید تخلیق کو جس مقام پر لے آئے تھے اس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سونان ایک چھوٹی سی مل کا مالک ہے۔ اس نے مل کو مغلوب کر کے رسالہ "تخلیق" کو دل پر غالب کر دیا ہے۔ "تخلیق" پر سرمایہ بھی نچھاور کر رہا ہے اور اپنا خون جگر بھی۔ سونان نے محبت کے نئے رشتے تخلیق سے استوار کیے ہیں۔ اتنی محبتیں کسی دوسرے نوجوان کے حصے میں کم ہی نہیں آئیں۔ پوری دنیا کے ادیبوں، شاعروں اور انشاپردازوں کی زبان پر صرف سونان کا نام ہے کیوں کہ اس کا کام بول رہا ہے۔

دسمبر کے شمارے میں شامل کس کس شاعر، ادیب اور قلمکار کا ذکر کروں۔ افسانوں میں ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ "مڑ کر دیکھنا" ایسے ہی ہے جیسے "مڑ کر دیکھنا"۔ آغا گل کا "کالے پانی میں ڈوبتا سورج"، تسنیم کوثر کا افسانہ "Land Lady" کی مقبولیت کا آپ اندازہ پڑھ کر لگا سکتے ہیں۔ سونامی کی طرح جذبے کا استعمال بھی تسنیم کوثر کی فکری رعنائیوں کی تخلیق ہے۔ اظہر جاوید کی پنجابی تحریر کو حنیف باوا نے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اعزاز احمد آذر کے حوالے سے عذرا اصغر کا خاکہ دیکھ کر آذر کی یادیں تازہ کرتا رہے گا۔

اک شخص بے مثال تھا کل شب چلا گیا   وہ شاعر باکمال تھا، کل شب چلا گیا

ملک مقبول احمد کی ستار طاہر کے بارے میں معلوماتی تحریر بھی اس شمارے کی خاص الخاص تحریر ہے۔ عذرا اصغر "تخلیق" کی بانی ہیں ان کی خوبصورت تحریر ایک بے چین روح شاعر اور ادیب کے متعلق شاندار اور موثر پیرایہ اظہار کا نمونہ ہے۔ امریکہ میں تنویر جہاں، ہاشمی تنویر، توقیر مشتاق، وصف وفا اور انڈیا میں نارنگ ساقی نے "تخلیق" کو پاکستان کا فنون لطیفہ کا سفیر بنا دیا ہے۔ علامہ اقبال اور مسلم ثقافت پر مسلم شمیم کی خوبصورت تحقیقی تحریر ہے جو ان کے دل کی سرزمین سے لہلہاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ سید ضمیر جعفری کے گراں مایہ بیٹے

ملاحظہ فرمائیں:

''اظہر جی! ہم خود خواہ کسی ترتیب (بلکہ بے ترتیبی) میں مبتلا ہوں۔ ''تخلیق'' کی یاد سے کبھی غافل نہیں رہے کہ اس رشتے میں ایک عمر بیت گئی اور اگر دوسری مل جائے تو وہ بھی اس کی نذر کر دیں۔ ''تخلیق'' کے ہر شمارے کے ساتھ آپ کو آخر میں کہتا ہوں کہ معلوم نہیں آپ خود کس طرح زندہ ہیں مگر ''تخلیق'' کے سوتے جگائے رکھتے ہیں۔ آپ وہ فصل کاشت کر رہے ہیں جو عموماً سروں کی فصل کٹ جانے کے بعد اُگا کرتی ہے۔''

ڈاکٹر انور سدید کے خامہ عنبر شمامہ سے ڈاکٹر لطیف قرۃ العین حیدر حقیقت نگاری کا شاندار نمونہ ہے۔ پروفیسر جمیل آذر، شفیع ہمدم کا ادبی سفر پر رقم طراز ہیں۔ ڈاکٹر مسعود حیات مگسی ''تعبیر حرف'' کی حرف شناسی، مقیہ پال آہنگ ''جسم کے پیا تھو روزن'' اور طاہر سعید ہارون کے دوہے'' پالشہار'' منظومات کی جان ہیں۔ ایوب خاور'' بجھی روشن بہت تھیں اس کی آنکھیں'' پروین کی'' ماندگی'' سلطان کھاروی بھکارن کی سوچ یادیں، عاشق صبر طلب۔ ڈاکٹر رشید امجد کی مطالعاتی چیز ہے۔ اقتدار ساجد کا مضمون ''اظہر جاوید کی یاد میں'' تعزیت کے طور پر خوبصورت چیز ہے۔ سفرنامے'' سورج کے رخ پر'' ڈاکٹر اعوان جالی کی تحریر وار سے معاشرے کے دکھوں کی بولتی ہوئی تصویر ہے۔ بین الاقوامی شہرت یافتہ سفرنامہ نگار سلمیٰ اعوان کی اشک بار تحریر'' عراق اشک بار ہیں ہم'' دلوں میں زلزلے ڈال دیتی ہے۔

وہ عکس بن کے میری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعرہ اور زندہ و تابندہ شعری خالق گل صابری کے کلام کو پوری دنیا میں بے پناہ پسند کیا جا رہا ہے۔ بلبلِ پاکستان محترمہ بشریٰ رحمان نے گل صابری کو فن کی جادوگری کہا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جادوگر شاعرہ ہے اور اس کی جادو بیانی بھی مسلمہ حقیقت ہے۔ تخلیق کے سفر میں اپنی تخلیق کی دوستی کا حق محترم ڈاکٹر انور سدید نے جس خوبصورتی سے نبھایا ہے میں سمجھتا ہوں کہ وہ ضرب المثل ہے۔ (بشکریہ روزنامہ ''سعادت انٹرنیشنل'' 4 جنوری 2016ء)

◆◆◆

معروف افسانہ نگار محمد حامد سراج کے سب افسانے

''مجموعہ محمد حامد سراج''

شائع ہو گیا ہے

قیمت:-/1200 روپے

ملنے کا پتہ: سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ فون نمبر: 042-37220100, 042-37228143

قیصر نجفی ممکنات زیست کا شاعر

گوہر رحمان نوید

ہندوستان کی تقسیم کے بعد اردو شاعری میں کئی طرح کے نئے نئے مضامین در آئے اور اس کے موضوعات کا دائرہ وسیع ہوا اور ہماری شاعری کئی طرح کے نئے ذائقوں سے آشنا ہوئی۔ تقسیم کی ہڈیوں کو پگھلا دینے والی دردناکی، فسادات کے دکھڑے اور لہو رنگ واقعات کے ساتھ اپنوں کی بے وفائی اور میر کارواں میں خوئے دل نوازی کے فقدان کی وجہ سے کارواں سے بچھڑنے اور حرم سے بدگمان ہونے تک کے مضامین ہمارے شعرائے پوری دلچسپیوں اور جزئیات کے ساتھ زیب قرطاس کیے ہیں اور پھر ترقی پسندی، رومانیت اور حلقہ ارباب ذوق کے زیر اثر تخلیق ہونے والی میراجی اور راشد کی مبہم شاعری کے ساتھ حفیظ جالندھری، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی اور فیض کی ہر دل عزیز شاعری کے چرچے کوبہ کو پھیل گئے۔ قیصر نجفی کا تعلق بھی شعرا کے اس قبیل سے ہے جنھوں نے اپنے ہی دیس میں غریب الوطنی کا عذاب سہنے کے باوجود صرف اپنی ذات کا نوحہ کہہ کر لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس شہر خرابی کی تمام حکایت خونچکاں رقم کی ہے جس میں ان کے ہم جنسوں کو بڑی سفاکی کے ساتھ تہہ تیغ کیا گیا اور ان پر باعزت زندگی گزارنے کے تمام دروازے بند کر دیے گئے۔ قیصر نجفی جیسے اس پیدائشی شاعر نے جب ہجرت کر کے روشنیوں کے شہر کراچی کو اپنا مسکن بنایا تو وہاں بھی طرح طرح کے مسائل نے ان کا استقبال کیا اور ان کو کہیں پر اماں نہیں ملی۔ قیصر نجفی کی غزل کے ڈھیر سارے موضوعات میں سے ایک اہم موضوع شہر قائد کی آہوں اور آنسوؤں بھری زندگی ہے جس میں ٹارگٹ کلر، بھتہ خور، اسمگلر اور ڈاکو عام آدمی کی زندگی کا چراغ کسی بھی وقت بجھا سکتے ہیں لیکن افسوس کہ ان کو روکنے ٹوکنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔ اس شہر کے امن کو سبوتاژ کرنے والے عناصر کے بارے میں نجفی فرماتے ہیں:

کچھ امن پسند ایسے بھی ہیں شہر میں قیصر   پھرتے ہیں کھلے عام لیے تیغ و تبر تک

دہشت گردی اب صرف شہر قائد کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ یہ سرطان وطن عزیز کے پورے جسم میں پھیل چکا ہے۔ ہزاروں ہم وطنوں کی جان لینے کے باوجود بھی اس وبا میں کمی آنے کی بجائے مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ نجفی ایک حساس فنکار کی طرح اس آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں اور ان میں اپنے بھائی بندوں کو جلتا دیکھ کر خاموش کیسے رہ سکتے ہیں اس لیے پکار اٹھتے ہیں:

ہمیں اس شہر میں جینا ہے قیصر   کہ ہے جس شہر کی قاتل ہوا تک

اور سب سے زیادہ حیران کن بلکہ پریشان کن بات یہ ہے کہ ہمارے اپنے غیروں کے ساتھ ساز باز کر کے ملک و قوم کی تباہی و بربادی پر تلے ہوئے ہیں اور ہمارے دشمن ان ضمیر فروشوں اور وطن فروشوں کو خرید کر ان کو اپنی انگلیوں پر نچا رہے ہیں۔ مغربی اور مشرقی دشمنوں کے علاوہ جب ہمارے اپنے ہی مسلمان پاکستانی اس سوہنی دھرتی کے درپے آزار ہو جائیں تو پھر ان کا سد باب کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے۔

وہ بھی ہیں شجاعت کے سجائے ہوئے تمغے   دشمن کے اشاروں پہ جو اپنوں سے لڑے ہیں

قیصر نجفی نے اگرچہ اردو غزل کی کلاسیکی روایت سے سرمو انحراف نہیں کیا لیکن اس کے باوجود ان کے ہاں غزل کا جدید لہجہ اپنی

فوری تازہ کاری اور ابتکاری کے ساتھ کارفرما نظر آتا ہے۔ اس لیے پروفیسر حسن سجاد ان کو طرز نو کا شاعر قرار دیتے ہوئے رقم طراز ہیں۔

''قیصر تجلی کو میں اس لیے طرحِ نو کا شاعر کہہ رہا ہوں کہ ان کی شاعری میں انسان کی باطنی زندگی کے تہہ در تہہ اسرار اور ظاہری زندگی کے رموز بیک وقت جمع ہو گئے ہیں اور حیات انسانی کے ان دونوں پہلوؤں کے ربطِ معنوی سے ان کی شاعری میں ایک ایسا ادبی نکھار پیدا ہوا ہے جو بالکل نیا ہے اور ان کا اپنا ہے۔'' ایک شاعری عظمت کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ کلاسیکی روایات کا گلا گھونٹنے کی بجائے اگر کوئی نئی شاہراہ دریافت نہیں کر سکتا تو کم از کم اپنے لیے کوئی ایسی پگڈنڈی اختراع کرنے کی کوشش کرے جس پر اگلوں نے قدم نہ رکھا ہو ورنہ اگر وہ بعض شعرا کی طرح پٹے ہوئے نوالوں کی جگالی میں مگن ہو گیا اور لکیر کا فقیر بن کر بیرانی ڈول الاپنے لگا تو بہت جلد اس کی آواز عصر حاضر کی ڈھیر ساری آوازوں میں گم ہو جائے گی اور وہ گمنامی کے اندھیروں میں فنا ہو جائے گا۔ تجلی کی غزل بڑی حد تک تقلیدی شاعرانہ بدعت سے پاک ہے۔

کب رائیگاں سفر گیا تیری تلاش کا خود تک پہنچ گئے ہیں تجھے ڈھونڈتے ہوئے

میں جب بھی کہتا ہوں ان سے کہ کوئی بات کرو وہ مجھ سے ترکِ تعلق کی بات کرتے ہیں

تجلی اپنی منزل کو محبت کے نئے صاف اور شفاف رنگوں اور لہجوں سے آشنا کرانے کے بعد ایسی جوت جگاتے ہیں کہ عقل دنگ اور زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ ان کی غزل میں روایتی محبوب کا تصور تصویر سے آگے نہیں بڑھتا اس لیے ان کا محبوب آفتِ زماں ہے نہ فتنۂ جہاں بلکہ محبوب کے ایک مبہم سے خیال سے بھی وہ دل کھول کر محبت کرتے ہیں اس میں وہ تیر الزام کی پروا کرتے ہیں نہ سنگِ دشنام کی نہ انہیں صبح ناشاد کا خوف ہے اور نہ روزِ ناکام کا ڈر ہے بلکہ تمام مراحل سے گزرنے کے بعد محبوب کو ایک نظر دیکھنے کی آرزو میں ان کی ساری زندگی آنکھ بن جاتی ہے۔

حسرتِ دیدار میں قیصر زندگی آنکھ بن گئی میری

میں منتظر پڑا تھا خیالوں کی ریت پر وہ سوچ بن گیا تو سنوارتا چلا گیا

دورِ جدید کا ایک بڑا المیہ انسان کا نوع بہ نوع انسان کا شکاری بن بیٹھنا ہے۔ ہر شخص ہوس زر اور سطوت شمشیر پہ گھمنڈ کرتا پھرتا ہے۔ حیوان، سانپ، بچھو اور دیگر خونخوار درندوں سے اب کوئی خوف نہیں کھاتا کیونکہ انسان دوسرے انسان کو ڈسنے اور گزند پہنچانے کا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ ابن آدم خود اتنا مہلک اور زہریلا بن چکا ہے کہ اس کا طریاق ممکن نہیں۔ تجلی کے ایک ہم عصر غلام محمد قاصر نے اس کی طرف یوں اشارہ کیا تھا:

سارے سپیرے ویرانوں میں گھوم رہے ہیں بین لیے آبادی میں رہنے والے سانپ بڑے زہریلے تھے

جبکہ قیصر تجلی نے اس وحشت کے متعلق یوں فرمایا ہے

غزال بھاگے درندوں کے مسکنوں کی طرف دکھائی جب دیے انسان ان کو جنگل میں

تجلی کی غزل میں پرندوں، درختوں، اقدار کی شکست و ریخت، رویوں کی توڑ پھوڑ، رشتوں کی بے توقیری، اپنوں کی بے رخی، ناقدریِ عالم اور مشینی زندگی کی کارستانیوں کے متعلق مضامین موجود ہیں۔ یہی موضوعات آج کل تقریباً ہر شاعر کے ہاں کسی نہ کسی شکل میں ملتے ہیں لیکن تجلی ان کے خول اور اپنی ذات کے دائرے سے باہر آ کر مشکلاتِ زندگی کے کئی خوشگوار رستے اپنے پڑھنے والے کے لیے وا کر دیتے ہیں۔ وہ مایوسی کے زنگ آلود قفل پہ کلید اپنی حکمت اور بصیرت کے ذریعے کھول کر قاری کو اس جہانِ معنی میں پہنچا دیتے ہیں جہاں رجائیت کی ٹھنڈی میٹھی چھاؤں اس کی منتظر ہوتی ہے۔ وہاں پڑھنے والا گزشتہ کی حیاتِ بے مصرف کا ماتم کرنے کی بجائے آنے والے اچھے دنوں کی یاد میں کھو جاتا ہے اور تجلی کے عزم و حوصلے کی داد دینا شروع کر دیتا ہے۔

مصائب آج بھی ہم سے یہ کہہ گئے قیصر　　　بلا کے حوصلے ہم نے جناب میں دیکھے

تجلی شاعری کے جواز اور اس کی ضرورت و اہمیت کے بھی ایک بڑے مبلغ ہیں اور قوموں کی زندگی میں شاعر اور شاعری کے کردار سے بھی بخوبی آگاہ ہیں اس لیے جذبے کی صداقت و الفاظ کی حرمت میں گھول کر زندگی کے سربستہ رازوں سے نقاب سرکاتے ہیں اور وہاں پیش آمدہ واقعات اور آئندہ کی ممکنات کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراتے ہیں۔ انھیں عوامی ذوق کی کم مائیگی اور مادہ و ساماں کی رائیگانی کا دکھ اس لیے نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے فکرِ انسانی میں انقلاب برپا کرنے کی اپنی کوشش کی ہے۔ انھوں نے بے توقیر اور بے نور دل و دماغ میں اجالے پھیلائے ہیں اور ان کے لیے حوصلے و جرات کا سامان بھی بہم پہنچایا ہے۔

ایسا نہ بھی کیا تھا میرا مصرفِ حیات　　　شاعر تھا بند ذہنوں کے پٹ کھولتا رہا

تجلی کی غزل میں دنیا کے تراشیدہ لات و منات سے مرعوب اور دبے والے مضامین نہیں ملتے۔ امیر شہر کے مظالم اور غریب شہر کی دہائیوں سے بھی وہ کسی طور صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ محبت کی غارت گری، جنس وفا کی کمیابی اور طالع رقیب کے اوج پہ ہونے کے باوجود وہ اپنے کمزور و ناتواں اہلِ وطن کو فراموش نہیں کرتے اور ان کے حق میں یوں گویا ہوتے ہیں۔

کوئی نہ توڑ سکے ظلم کے اندھیروں کو　　　ہوائے شہر تو شب بھر دہائی دیتی ہے
امیر شہر کی دنیا بڑی سہی لیکن　　　فرازِ دار سے چھوٹی دکھائی دیتی ہے

مجموعی لحاظ سے قیصر تجلی دورِ حاضر کے ایک ایسے شاعر ہیں جو عالم کی تمام اچھی بری قدروں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے ان کے آگے ہتھیار نہیں ڈالتے بلکہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان کا مردانہ وار مقابلہ کر کے مستقبل کے امکانات کشید کرتے ہیں۔ رات کے رنگ کیسے ہیں؟ ان کو کیسے بدلا جا سکتا ہے؟ اور اس میں جگنوؤں کا چلن عام کرنے کی مزید کتنی گنجائش ہے؟ یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات وہ اپنے قاری کے لیے اس لیے چھوڑتے ہیں کہ وہ خود کائنات کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھا کر کن فکاں زندگی کے بارے میں جان سکے۔ اس گماں آباد ہستی میں تجلی کی شاعری انسان کو زندگی اور زندہ دلی اور انسانیت کی طرف لے جا کر یہی راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہی ہے اس لیے ان کی شاعری میں وقت کے ہونٹوں پہ تا قیامت برقرار رہنے کی اہلیت و صلاحیت باقی ہے۔

وہ چند سانس جو تھے ختم ہو گئے آخر　　　میں اب بھی وقت کے ہونٹوں پہ ہوں مرا تو نہیں

◆◆◆

پنجاب رنگ

سلیم شہزاد

نظم

[illegible]

یار سجن

یار سجن!
[illegible]
یار سجن!
[illegible]
یار سجن!
[illegible]

OOO

منزہ شاہد

زینب دا ہاڑا

[illegible]

OOO

حنیف باوا

آس دی لو

[illegible]

OOO

انور سدید کے تبصرے

تقاریرِ اقبال

"تقاریرِ اقبال" کے مصنف ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے لکھا ہے:

"یوں تو اقبال کے شعری و نثری سرمائے کے ہر پہلو پر کام کیا گیا ہے لیکن طالب علموں کے لیے فکرِ اقبال کے تناظر میں مختلف تقاریر کا خاطر خواہ انتظام نہیں کیا گیا۔"

اس خیال کے آتے ہی اس اہم کام کا بیڑا ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے خود اٹھایا۔ ان کا بنیادی مقصد تو فکرِ اقبال کو فروغ دینا تھا جس کے لیے وہ کئی برسوں سے کوشاں تھے اور اقبال پر کتابیں تالیف کر چکے تھے۔ سرگودھا میں عوامی اور کالج کی سطح پر تقریبات منعقد کر چکے تھے اور اہم بات یہ کہ چند "اقبال شناسوں" پر ضخیم کتابیں تالیف کرنے کا اعزاز بھی حاصل کر چکے تھے لیکن وہ فکرمند تھے کہ بچوں کو فکرِ اقبال سے آگہی عطا نہیں کی گئی۔ ایک معلمِ ادب کی حیثیت میں ہارون الرشید تبسم صاحب کا موقف یہ تھا کہ جو بات بچپن میں طالب علموں کے ذہن نشین کرا دی جائے وہ زندگی کے ہر دور میں یاد رہتی ہے۔ اور اس کے مثبت اثرات بھی بچے قبول کرتے ہیں۔ بھی بھی پروفیسر تبسم صاحب کہا کرتے ہیں کہ زندگی کے عمل میں مثبت طور پر استقلال سے حصہ لینے اور ناکامیوں پر مسکرانے اور کامیابیوں کے لیے محنت سے رستہ بنانے کا سبق میں نے کلامِ اقبال سے سیکھا ہے۔ چنانچہ انہوں نے آج کے طالب علموں کے ذہن کو فکرِ اقبال سے روشن کرنے کے لیے یہ اچھا کتاب لکھی جو کالجوں، سکولوں اور یونیورسٹیوں میں تقریری مقابلوں میں کام آ سکتی ہے اور اقبال کے افکار کے متعدد گوشوں کو روشن کرتی ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے پیش لفظ "تمنا" کے تحت لکھا ہے:

"علامہ اقبال اس لحاظ سے انفرادیت کے حامل ہیں کہ انہوں نے اپنی خدمات کا بنیادی ماخذ ملتِ مسلمہ کی بھلائی رکھا۔ اقبال کا زاویۂ نظر — عالمی اخوت و مروت رہا۔ وطنیت سے قومیت تک کے سفر میں انہوں نے بہت سے تجربات کشید کیے۔ قرآن و حدیث کے مطالعے نے ان کے فکری قرینے کو معنویت کی طرح ہر مسلمان کے لیے درس دیا۔ عشقِ مصطفیٰ ان کے ہر لفظ سے عیاں ہے۔"

یہ کتاب اس بنیادی خیال کے گرد افکارِ اقبال کا تذکرہ ہے اور جو موضوعات زیرِ بحث لائے گئے ہیں، ان میں سے چند اہم موضوعات حسبِ ذیل ہیں:

"اقبال اور فہمِ قرآن" — "اقبال اور عشقِ رسول" — "عصرِ حاضر اور اقبال" — "رزم و بزم گفتگو گرم و دم جستجو" "اقبال کا نظریۂ وطن" — "اقبال کا مردِ مومن" — اقبال کا "جہانِ تازہ" — "اقبال اور حسنِ عمل — "اقبال اور مردِ کامل" "اقبال کا تصورِ شاہین" — "اقبال کا تصورِ خودی" — "اقبال اور دامنِ فطرت" — "اقبال اور سحر خیزی"، اقبال اور جمہوریت وغیرہ۔

موضوعات کی تعداد 48 ہے اور ان میں اقبالؔ کا پورا فکر جو انہوں نے اپنی شاعری اور نثری تحریروں میں پیش کیا ہے سمو دیا گیا ہے۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ ہارون الرشید تبسم نے مشکل موضوعات کو بچوں کی زبان میں پیش کیا ہے اور اسلوب خطابیہ اختیار کیا ہے تاکہ بچے پورے مضمون کو زبانی یاد کر کے تقریر کر سکیں۔ بے شک فکرِ اقبال کی یہ ابتدائی کتاب قرار دی جائے گی۔ لیکن ہارون الرشید تبسم نے فکرِ اقبال کو بچوں کی زبان پر اتارنے اور پھر ان کے دل میں محفوظ کرنے کی کاوش کی ہے۔ جو ہر لحاظ سے مستحسن ہے۔ دبیز سفید کاغذ۔ اعلیٰ کتابت۔ خوبصورت سرورق۔ ضخامت 255 صفحے کی۔ مصنف کا پتہ۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم۔ 39۔ ولی بلاک۔ علامہ اقبال کالونی۔ سرگودھا ناشر۔ بک سٹی۔ جہلم پاکستان۔

شفیع ہمدم کا ادبی سفر

اس کتاب کے مؤلف ملک مقبول احمد نے ہیر گرتی جھنگ کے ادیب شفیع ہمدم کے بارے میں لکھا ہے:

"شفیع ہمدم کو میں ایسا ادیب سمجھتا ہوں جسے کسی بڑے شہر کی ہوا نہیں لگی۔ میں نے ان کی آواز کبھی ریڈیو پر سنی ہے اور نہ کبھی ان کی شکل ٹیلی وژن پر نظر آئی ہے۔ بلکہ میں نے تو انہیں لاہور میں کسی اخبار کے دفتر کا چکر کاٹتے ہوئے اور ادبی صفحے کے ایڈیٹر کو کیک اور پیسٹریوں کے ساتھ چائے پلاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ لیکن وہ اچھے ادبی رسائل میں ہر جگہ نظر آتے ہیں"۔

اس اقتباس سے آپ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ شفیع ہمدم ادیب اور صرف ادیب ہیں اور ان کا کام کتاب پڑھنا اور ادب تخلیق کرنا ہے۔ تاہم یہ بھی واضح رہے کہ وہ ملک مقبول احمد کے تعارفی کلمات کے مطابق گورنمنٹ کالج جھنگ میں لیکچرار تھے۔ طلبا کو اردو پڑھاتے تھے اور ان کے دل میں ادب کا ذوق پیدا کر دیتے تھے۔ میں نے ملک صاحب کی مرتبہ یہ کتاب دیکھی تو معلوم ہوا کہ شفیع ہمدم ادب کی کسی ایک صنف میں بند نہیں۔ اور وہ افسانے لکھتے ہیں۔ انشائیے تخلیق کرتے ہیں۔ خاکہ نگاری ان کے ذوق و شوق کی صنف ادب ہے۔ اور مطالعے کے بعد اثبات و اختلاف کے زاویے تنقید میں ظاہر کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ کثیر الجہت ادیب ہیں۔ زیر نظر کتاب میں ملک مقبول احمد نے شفیع ہمدم کے ادبی سفر کا جائزہ لینے کی کاوش کی ہے۔ اور اس مقصد کے لیے انہوں نے وہ تبصرے جمع کیے ہیں جو شفیع ہمدم کی تصنیفات پر مختلف اہل قلم نے لکھے تھے۔ اس کتاب کے پہلے حصے میں موضوع شفیع ہمدم کے خاکوں کی کتاب "دل دوستاں سلامت" اور "حال احوال" ہے۔ ان پر مضامین ڈاکٹر وزیر آغا، جمیل آذر، انجم حمیدی، سلیم آغا قزلباش، حنیف باوا، اور رانا نوشین خان نے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے میں "شفیع ہمدم کے خاکے کے پیچھے کے جہان ہوش ربا بھی نظر آ جاتے ہیں"۔ انشائیوں کی کتاب کا نام "وصف" ہے اور اظہار خیال کرنے والوں میں ڈاکٹر رشید امجد، انجم نیازی، عامر عبداللہ، جمیل آذر، عابد خورشید اور عبدالقیوم ہیں جو خود بھی انشائیہ نگار ہیں۔ معروف انشائیہ نگار و نقاد سلیم آغا قزلباش کی رائے میں "شفیع ہمدم کے انشائیے رفعتِ خیال، بوقلمونی اور وحدتِ تاثر کے حوالے سے اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔" صائمہ نورین بخاری نے لکھا ہے کہ نئے عزم کی

قوت کا احساس ابھار کر ''شفیع ہمدم کا نظریۂ فن ہے'' اور اس نظریے کے تحت ہی انہوں نے انشائیے، افسانے اور تنقید لکھی ہے۔

''انسان اور پرندے'' شفیع ہمدم کے افسانوں کی کتاب ہے جس پر تبصراتی مضامین منشا یاد، عبدالقیوم، حنیف باوا، دردانہ نوشین خان اور سلیم سکھروی نے لکھے۔ ''معاصر ادب اور ادیب'' کے نام سے تنقیدی کتاب پر اپنی رائے جمیل آذر، عبدالقیوم اور راقم الحروف نے پیش کی ہے۔ اپنے معاصرین سے شفیع ہمدم کا رویہ اعتراف فن کا ہے لیکن جب وہ اپنے دور کے بیشتر اور بزرگ ادیبوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ان کا نعرۂ تنقید سرنگوں یا عقیدت بن جاتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے چراغ کی لو بزرگ ادیبوں کے تذکرے سے روشن کر رہے ہیں اور اپنا ذوق ادب سنوار رہے ہیں۔ یہ خالصتاً دیہاتی رویہ ہے جو بڑے شہروں کی ادبی تنقید میں نظر نہیں آتا۔

ادبی دنیا کو ملک مقبول احمد کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس سادہ دل لیکن کشادہ نظر نقاد، انشائیہ نگار، افسانہ نویس اور خاکہ نگار جس کا نام شفیع ہمدم ہے کے بکھرے ہوئے مضامین جمع کیے اور انہیں کتاب کی صورت دی۔ ملک مقبول احمد کا شمار لاہور کے ممتاز ناشرین میں ہوتا ہے۔ ان کے ہم نشین بلند پایہ مصنفین اور ان کی کتابیں ہیں۔ اور وہ اپنے ادارے کے مصنفین کی عزت افزائی کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے۔ جس کی ایک مثال اس کتاب کی تالیف ہے۔ سفید کاغذ پر دلکش طباعت و کتابت میں یہ کتاب مقبول اکیڈمی، سرکلر روڈ، چوک اردو بازار، لاہور سے دستیاب ہے۔ سرورق دیدہ زیب ہے۔

پیڑ سے بچھڑی شاخ

''پیڑ سے بچھڑی شاخ'' کی مصنفہ نجمہ عثمان کے بارے میں ان کی ایک معاصر افسانہ نگار صفیہ صدیقی نے لکھا ہے:

''نجمہ کے افسانے برطانیہ میں رہائش پذیر ایشیائیوں کی سماجی اور مذہبی مشکلات اور مسلمانوں کی اپنی ایک علیحدہ دنیا بسانے کی کوششوں اور اس میں ناکامیوں کی داستانوں کے بارے میں نہایت جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔''

میں نے یہ کتاب پڑھی تو محسوس ہوا کہ نجمہ نے مشرق کے دیار میں جس فطری عورت کی پرورش کی تھی اور جن اقدار کو اپنے مزاج کا حصہ بنایا تھا — مغرب کے کھلے معاشرے میں ان سب کی حفاظت کی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کی کہانیوں میں نجمہ عثمان مغربی معاشرے میں آباد تارکین وطن کی افسانہ نگار ہی نہیں ہیں بلکہ وہ بالواسطہ طور پر ایک نقاد کا فریضہ بھی ادا کرتی ہیں اور اس معاشرے کے زمانی عمل کو چشم بیدار سے دیکھتی ہیں تو ان اثرات کو زیادہ اہمیت دیتی ہیں جنہیں مشرقی خاندانوں میں پیدا ہونے والے بچے قبول کر رہے ہیں۔ صفیہ صدیقی نے ان کہانیوں کو اپنے سامنے زندگی کے عمل سے گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس لیے انہوں نے انہیں افسانہ یا کہانی کہنے کی بجائے ''جیتی جاگتی تصویریں'' قرار دیا ہے۔ مجھے نجمہ عثمان ایک ایسی تخلیق کار محسوس ہوئیں جو ''فکشن'' کے کینوس پر حقیقت کے نقش ابھار کر یاد کراتی ہیں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اپنے گردوپیش کی زندگی کے ''سچ'' سے کشید کیا ہے۔ اور یہ سچ بعض اوقات انہیں اتنا کڑوا لگتا ہے کہ ان کی رگ و پے میں ملال کی لہر دوڑنے لگتی اور وہ اپنی کہانی پھاڑنے پر بھی آمادہ ہو جاتی ہیں۔ مجھے علم نہیں کہ انہوں نے ملال کے اس لمحے کو کس طرح سر کیا لیکن میں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ ''سیتا کا بن باس'' — ''پیڑ سے بچھڑی

شامل'' ـــ ''رشتوں کی دہلیز پر'' ـــ ''زخمی پھول'' ـــ ''مانگے کی عورت'' ـــ اور ''دعا کے بعد معلوم ہو'' ـــ جیسی بے مثال کہانیاں اس کتاب میں چھپ گئیں اور وہ اب ہمیں اس معاشرتی تجربے میں شامل کر رہی ہیں جو مختلف کرداروں کے وسیلے سے نجمہ عثمان کے بیان میں آیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے نجمہ عثمان کی کہانیوں پر چند اہلِ قلم نے تنقیدی نظر ڈالی تو ان کا تجزیہ بھی کیا اور اپنی رائے کا اظہار بھی کیا۔ چنانچہ اردو کے منفرد افسانہ نگار مصطفےٰ کریم کو نجمہ عثمان ''انسانی رشتوں کی آنچ کی آئینہ داری کرنے والی فنکار نظر آئیں۔ ارمان نجمی نے لکھا کہ وہ زندگی کی سچائیوں کی افسانہ طرازی کرتی ہیں۔ تنویر اختر کو ان کے افسانوں میں تہذیبوں کا ملاپ نظر آیا۔ رضا علی عابدی نے ان افسانوں میں خوابوں کے رنگ دیکھے۔ معروف افسانہ نگار ندرا اصغر نے نجمہ عثمان کو ایک ایسے مسافر کے روپ میں دیکھا جو دکھ کے جنگل میں بھٹک رہی ہیں۔ صفیہ صدیقی کے نزدیک یہ دل کی کہانیاں ہیں۔ ان سب کے برعکس فردوس حیدر نے پوری گواہی دی کہ نجمہ عثمان اپنی کہانیوں میں زندگی کرتا جاتی ہیں''۔ ان سب آراء میں تنوع ہے لیکن ان میں سے کوئی رائے بھی صداقت اور حقیقت سے بعید نہیں۔

نجمہ عثمان کو بچپن میں افسانوں سے زیادہ گڑیاں اچھی لگتی تھیں۔ ان گڑیوں کا دکھ درد اور خوشیاں خاموشی کی زبان میں ان سے گفتگو کرتیں لیکن جب ترکِ وطن ہو کر برطانیہ پہنچیں تو ان گڑیوں کو زندگی مل گئی اور یہ نجمہ عثمان کی کہانیوں کا موضوع بن گئیں۔ اور انہوں نے ہمیں مغرب میں آباد تارکینِ وطن کے حقیقی مسائل احساسات اور جذبات سے باخبر کرنے کے لیے بے حد موثر افسانے لکھے۔ انہوں نے پیش لفظ میں درست لکھا ہے کہ یہ کہانیاں لکھتے وقت وہ سرشاری سے ہی نہیں ـــ کرب کی کیفیت سے بھی گزری ہیں۔ اور اب اس کرب کو ان کے قاری بھی محسوس کرتے ہیں۔ بیرونِ ملک آباد بیشتر پاکستانی بھارتی افسانہ نگار ناسٹلجیا کا شکار ہو کر اپنے وطن کے کرداروں کے کہانیاں لکھتے رہتے ہیں لیکن نجمہ عثمان نے مشرقی خواتین کے مسائل کو برطانوی ماحول میں محسوس کیا اور اپنے گردوپیش کی نمائندگی کی۔ یہ دو قلبی تہذیب کی کہانیوں کی کتاب ہے۔ جس کے ہر نقش پر نجمہ عثمان کے دستخط ہیں۔ سفید کاغذ پر خوبصورت اعلیٰ کتابت میں یہ کتاب 256 صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت-/250 روپے۔

اُردو ناول...... کرداروں کا حیرت کدہ

''اردو ناول ـــ کرداروں کا حیرت کدہ'' کے مصنف ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے پیش لفظ میں لکھا ہے:

''زندگی دائمی حقیقت ہے اور قصہ اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون ہے۔''

اس کے ساتھ ہی انہوں نے سوال اٹھایا ہے ـــ ''لیکن یہ رگیں کیا ہیں؟'' ـــ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی نظر میں ناول یا فکشن میں یہ ''رگیں'' ـــ کردار ہیں۔ ان کی رائے میں: ناول یا فکشن کے یہ دونوں دو بڑے ستون ہیں جن پر اس کی عمارت ایستادہ ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے سے یہ عمارت دھڑام سے نیچے گر جائے گی اور اس کے ملبے سے قاری کو وہ مسرت حاصل نہیں ہوگی جس کے لیے وہ مطالعے کا جوکھم اٹھاتا ہے'' ـــ واضح رہے کہ ایک ذمہ دار نقاد کی حیثیت میں ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے اردو کے قاری کو

ناول پڑھنے کی ترغیب دینے کا باوقار اور منفرد مشن سنبھال رکھا ہے۔ ان کی ادبی شخصیت کا یہ پہلو قابل تحسین ہے کہ وہ صرف اردو ناولوں پر تنقید و تجزیہ کرتے ہیں۔ اور ''اردو ناول کے بدلتے تناظر'' ''آزادی کے بعد اردو ناول'' ''اردو ناول کے چند اہم زاویے'' لکھ کر اس صنف ادب کی تنقید میں امتیاز خاص حاصل کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب ناول کے ایک خاص جزو یعنی ''کردار'' کے لیے مختص ہے۔ جس کی اہمیت کا ذکر ممتاز احمد خان کے الفاظ میں اوپر کیا جا چکا ہے۔ لیکن یہ بات نظر انداز نہ کی جائے کہ ناول کی تنقید میں ''کردار'' زیر بحث تو آ رہا ہے لیکن ممتاز احمد خان نے پہلی مرتبہ اردو ناول کے مشہور کرداروں پر اتنی تفصیلی اور گہری نظر ڈالی ہے کہ ہر ناول میں اس خصوصی ''کردار'' کا تفاعل اپنے مخصوص تناظر میں روشن ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے اس کتاب میں مختلف ناولوں میں سے اظہار خیال کے لیے جو غیر معمولی کردار منتخب کیے ہیں ان میں عبدالحلیم شرر کے ناول ''فردوس بریں'' کا علی وجودی ہے۔ شمس الرحمان فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سر آسماں'' کا کردار ''وزیر خانم'' ہے۔ مرزا ہادی رسوا کے ناول کا سدا بہار کردار ''امراؤ جان ادا'' ہے۔ قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کے کردار ''گوتم'' ابوالمنصور، کمال، چمپا اور سرل ہاورڈ ایشلے'' ہیں۔ ان کے علاوہ قرۃ العین حیدر کے ناول ''گردش رنگ چمن'' خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' عصمت چغتائی کے ناول ''ٹیڑھی لکیر'' ڈاکٹر احسن فاروقی کے ناول ''شام اودھ'' اور ''سنگم'' محمد خالد اختر کے ناول ''چاکیواڑہ میں وصال'' ممتاز مفتی کے ناول ''علی پور کا ایلی'' اور ڈپٹی نذیر احمد اور نثار عزیز بٹ کے ناولوں کے کرداروں کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے اردو ناول میں کردار کے بارے میں اپنے مطالعے کی وسعت کو اس کتاب کے مقدمے میں سمیٹا ہے۔ انہوں نے اپنے موقف کی وضاحت کے لیے انگریزی ناولوں اور ان کے مشہور کرداروں کو بھی بحث میں شامل کیا ہے۔

قارئین کے لیے جو کردار دلچسپی کا باعث بنتے ہیں ان کے نام یہ لکھے گئے ہیں: ''دلی کی شام'' کے میر صاحب۔ پریم چند کا سورج۔ ''اداس نسلیں'' کا نعیم ''الامیرا'' کا مہدی ''ایک چادر میلی سی'' کی ''رانی'' ''خدا کی بستی'' کا ''نوشا'' ''راجہ گدھ'' کا ''قیوم''۔ ''غلام باغ'' کا کبیر مہدی۔ ''دائرہ'' کا آصف اور مغرب کے ادب سے ''پرائیڈ اینڈ پریجوڈس'' کے ڈارسی اور الزبتھ ''وودرنگ ہائیٹس'' کے ہیتھ کلف جارج ایلیٹ کے ایڈم بیڈ، ورجینیا وولف کا اور لینڈو کافکا کا جوزف ہرمن ہیسے کا سدھارتھ بالزاک کا اولڈ گوریو وغیرہ ممتاز احمد خان نے لکھا ہے کہ یہ سب کردار ہمارے حافظے کا حصہ ہیں۔ ناول میں کردار کے موضوع پر یہ مقدمہ پڑھتے ہوئے مجھے ممتاز شیریں کا مقالہ ''اردو افسانے میں تکنیک کا تنوع'' بار بار یاد آیا۔ اس مقالے میں انہوں نے افسانے میں تکنیک کی بحث اردو اور انگریزی کے افسانوں کے وسیع تناظر میں پھیلائی تھی۔ ایسی ہی وسعت ممتاز احمد خان کے مختصر کردہ مقدمے میں ناول میں ''کردار'' کے بارے میں ملتی ہے۔ اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ مضمون خاصا خاصان مضامین ہے جس کی روشنی میں ناول کی تنقید مستقبل میں سفر کرے گی۔ یہ کتاب کتابت اور طباعت کے لحاظ سے بھی خوبصورت ہے۔ مضبوط جلد۔ مصور سرورق دیدہ زیب۔ ضخامت 192 صفحات۔ ملنے کا پتہ: فضلی بک سپر مارکیٹ نزد ریڈیو پاکستان، اردو بازار، کراچی۔ مصنف کا پتہ: ڈاکٹر ممتاز احمد خان، مدیر قومی زبان، انجمن ترقی اردو، ڈی 159، بلاک نمبر 7، گلشن اقبال، کراچی۔

"عالمی رنگِ ادب"......فلسفۂ خوشی نمبر

ممتاز ادبی کتابی سلسلہ "عالمی رنگ ادب" نے "فلسفۂ خوشی نمبر" کے ابتدائیے میں یہ خبر دی ہے کہ جناب فضا اعظمی نے جو اس سے قبل "کربِ نامۂ پاکستان" — "مرثیہ مرگِ ضمیر" — "عذابِ ہمسائیگی" — "مثنوی زوالِ آدم" — "آوازِ عشق" — "مثنوی عذاب و ثواب" — اور "خاک میں صورتیں" جیسے موضوعات پر طویل فلسفیانہ نظمیں تخلیق کر چکے ہیں۔ اب انہیں "فلسفۂ خوشی" پر اپنے نئے فکری زاویوں سے شناسائی عطا کرنے والے ہیں اور اس موضوع پر طویل نظم تخلیق کر چکے ہیں جسے جناب شاعر علی شاعر شائع کر رہے ہیں۔ دکھوں کی ماری اس دنیا میں خوشی حاصل کرنا انسان کی بنیادی اور دائمی خواہش رہی ہے۔ انسان پیدا ہوتے ہی اس کا تعاقب کرنے لگتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے ہزار جتن کرتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی پہلی کتاب جو 1954 میں شائع ہوئی کا عنوان ہی "مسرت کی تلاش" ہے اور اس کا پہلا جملہ قاری کی سوچ کو مہمیز کرتا ہے — اور تجسس ابھارتا ہے — وزیر آغا نے لکھا ہے:

"یہ سوچنا غلط ہے کہ زیادہ آسائش زیادہ مسرت کا منبع ہے — مسرت آتی ہے تخیل کی اڑان سے — زندگی کو خطروں میں ڈالنے سے — دوسروں کے کام آنے سے"۔

فضا اعظمی نے مسرت کے موضوع کو باقاعدہ فلسفے کے ایک موضوع کی حیثیت دی اور اس کی مختلف ابعاد پر اسی طرح سوچا جس طرح علامہ اقبال نے فلسفۂ خودی پر سوچا ہوگا۔ خیام العصر محسن اعظم محسن ملیح آبادی نے اس نکتے کے انکشاف کے بعد فضا اعظمی کی شاعرانہ خیالی کی شہادت دی ہے اور یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ جمالیات اور احساسِ جمال کی تشکیل یعنی شعری صورت گری سے اعظمی صاحب کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور ایک بے نام خوشی جنم لیتی ہے — حصولِ مسرت کی مزید وضاحت یوں کی گئی ہے کہ فضا اعظمی خوشی کا حصول جدوجہد مسلسل اور سعیِ بلیغ سے اخذ کرتے ہیں — اور یہ زاویہ ڈاکٹر وزیر آغا کے بازیافتہ تین نکات پر ایک قیمتی اضافہ ہے جس کی عملی افادیت مسلّم ہے اور فضا اعظمی کو سابقہ فلسفیانہ کلام پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ انہوں نے اپنی محنت طرازی شعری صورت میں کی ہے جو نثر کے مقابلے میں گہرے اور دیرپا تاثر کی صورت ہے۔

"عالمی رنگ ادب" کے اس خاص نمبر میں فضا اعظمی صاحب کے "فلسفۂ خوشی" کی منظوم کاوش کو جناب شاعر علی شاعر، جلیل حیدر لاشاری، رضی مجتبیٰ، اسلام امجد، حمیرا اطہر، اقبال ساجد، یونس حسن، ڈاکٹر اختر ہاشمی، شبیر ناقد، حمیدہ سحر، جوہر اشرفی، سحر انصاری اور ڈاکٹر پیرزادہ قاسم رضا صدیقی نے اپنے فکر و خیال کے زاویوں سے پرکھا ہے اور ان سب کی تنقیدی آرا پڑھنے کے بعد یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ قارئین نے فضا اعظمی صاحب کے نادر خیالات پر مثبت انداز میں غور کیا ہے اور تسلیم کیا ہے کہ موجودہ دور کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کو تبدیل کرنے اور سچی خوشی حاصل کرنے کی جو راہ انہوں نے متعین کی ہے وہ آج کے دکھی انسان کو طمانیت کی غیر مادی دولت سے سرفراز کر سکتی ہے۔ میں یہاں محترمہ حمیرا اطہر کے مضمون کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہتا ہوں جو عقیل احمد فضا اعظمی کی پوری شخصیت اور زندگی کے کارناموں کا خاکہ ہے۔ اس خاکے میں وہ ہر قدم پر "خوشی کی تلاش میں سرگرداں مسافر" نظر آتے ہیں اور جوشِ پیہم میں ان کا استقلال متاثر کرتا ہے۔ حمیرا اطہر نے ان کی کردار نگاری میں فوٹوگرافی کی تکنیک استعمال کی ہے اور وہ بے حد کامیاب ہیں۔ شاعر علی شاعر مدیر "عالمی رنگ ادب" اس خاص نمبر کی اشاعت پر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سرورق پر مفکر فضا اعظمی کی تصویر ہے۔ ضخامت 272 صفحات۔ قیمت 50 روپے۔ ملنے کا پتہ۔ دفتر عالمی رنگ ادب، آفس نمبر 5، کتاب مارکیٹ، اردو بازار، کراچی۔

سہ ماہی مجلہ "اسباق" پونہ...... مدیر: نذیر فتح پوری

پونہ (بھارت) کے ادبی رسالہ "اسباق" کے مدیر نذیر فتح پوری "تخلیق" کے ایڈیٹر اظہر جاوید کے ذاتی دوستوں میں تھے۔ "اسباق" بھارت کے مردم خیز شہر پونہ سے گزشتہ 32 برسوں سے شائع ہو رہا ہے اور اردو کی معروف شخصیات پر خصوصی گوشوں کی اشاعت کی وجہ سے مثبت شہرت رکھتا ہے۔ (واضح رہے کہ اظہر جاوید پر بھی "اسباق" نے گوشہ پیش کر کے حق دوستی ادا کیا تھا۔) زیر نظر پرچے میں جناب محسن جلگانوی اور جناب پرکاش فکری پر گوشے پیش کیے گئے ہیں۔ اداریے میں اردو کو ہندوستان کی دوسری سرکاری زبان بنانے کی اس آواز کو تقویت دی گئی ہے جو مدھیہ پردیش سے سماج وادی پارٹی کے رکن چودھری منور سلیم نے راجیہ سبھا کے ایوان میں اٹھائی تھی۔ "اسباق" نے اپنے مقدور کے مطابق اردو زبان کے لیے زوردار آواز اٹھائی ہے۔ اب دیکھیے اس آواز کی صدائے بازگشت کہاں تک اثر کرتی ہے؟

مضامین کے حصے میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کا مقالہ غالب کو ایجاز رمز بھی ٹھہراتا ہے اور دوست بھی قرار دیتا ہے۔ تنقید کے اس علم پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے پُر اثر و فکر افروز مقالہ پیش کیا ہے۔ احمد سہیل نے "آتش فن" کے حوالے سے عمرانیاتی شعور کو دریافت کرنے کی کاوش کی ہے۔ گوشہ محسن جلگانوی میں ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ڈاکٹر شعیب راہی، عبدالاحد ساز اور رؤف خلش نے محسن جلگانوی کے فکر و فن پر معنی خیز روشنی ڈالی ہے اور ان کے فن کی انفرادیت کا تعین بھی کیا ہے۔ اس حصے میں نذیر فتح پوری نے جلگاؤں شہر کی علمی، ادبی اور تعلیمی شخصیات کے حوالے سے محسن جلگانوی کی خدمات کا تعارف کرایا ہے۔ پرکاش فکری کے گوشے میں خلیل تنویر اور ڈاکٹر شکیل الرحمان کے مضامین شامل ہیں اور یہ بات نمایاں نظر آتی ہے کہ پرکاش فکری کے ہر شعر میں جذبے کا خلوص ہے۔ دردمندی اور سوز و گداز ہے اور ان کے استعارے زندگی کی المناک فضاؤں کا گہرا تاثر بخشتے ہیں۔ یہ دونوں گوشے دو بڑے شاعروں کا فکری اور فنی تعارف خوبصورت انداز میں کراتے ہیں۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ جناب نذیر فتح پوری کو ایک ناروا بحث میں الجھایا گیا اور حد یہ ہے کہ ان کے مخالفین نے ان کے خلاف ایک اسلام دشمن شخص انور شیخ پر "اسباق" میں مضامین چھاپنے پر فتویٰ جاری کرا دیا۔ میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ پاکستان اور ہندوستان کے بعض تنگ نظر لوگ جب یورپ کی فضاؤں میں جاتے ہیں تو خوب کھل کھیلتے ہیں اور اپنے اسلام دشمن اور اقبال دشمن خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور ڈالر اور پونڈ ادا کر کے پاکستان و ہندوستان میں اپنے کافرانہ خیالات کی تبلیغ کرتے ہیں۔ انور شیخ اور مارکسیت پسند عمران شاہد بھنڈر دو ایسے ہی اشخاص ہیں جو فکری ریشہ دوانیوں میں مبتلا رہ چکے ہیں۔ بھارت میں انور شیخ کی وجہ سے نذیر فتح پوری نشانہ بنے اور پاکستان میں عمران بھنڈر نے ڈاکٹر وزیر آغا پر الزام تراشیاں کیں۔ ہمیں ان دونوں حضرات کے حقیقی خیالات کا علم ہے جبکہ انور شیخ اور عمران بھنڈر کے تصورات ادب و علم سے نا آشنا ہیں اور بے پر کی اڑا رہے ہیں۔ نذیر فتح پوری نے فتوے کے تناظر میں اپنی وضاحت "اسباق" میں درج کر دی ہے۔ اب یہ باب بند ہو جانا چاہیے۔ "اسباق" کا یہ شمارہ 102 صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت فی پرچہ -/60 روپے۔ ملنے کا پتہ: نذیر فتح پوری، پوسٹ بکس نمبر 13، پیاروڈ، پونے۔ (بھارت 411006) ---- دفتر "اسباق" سائرہ منزل 230/B/102، وشرانت واڑی، سنجے پارک، لوہ گاؤں روڈ، پونے (411033) (ایم ایس بھارت)

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

☆1☆ عزیزم سوہان اظہر جاوید!

دسمبر 2015ء کے شمارے کی وصولیابی کی رسید میں نے آپ کو بروقت بذریعہ ایس ایم ایس دے دی تھی۔ اب اس کے مطالعے سے فارغ ہو کر چند سطور میں اپنے تاثرات رقم کر رہا ہوں۔

''پہلی بات'' کے تحت ڈاک کی شرح میں گراں بار اضافے کے حوالے سے آپ کے عظیم والد (مرحوم) اظہر جاوید بھی وقتاً فوقتاً لکھا کرتے تھے۔ آپ بھی حکام بالا کی توجہ اس طرف مبذول کراتے رہتے ہیں۔ یہ کہنا سراسر ناانصافی ہوگا کہ اس وقت سے آج تک صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ تبدیلی آ چکی ہے اور وہ یوں کہ ڈاک کی شرح میں مزید اضافہ ہو گیا اور ہوتا ہی چلا جا رہا ہے۔ ع مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر۔

''ذکر لطیف قرۃ العین حیدر'' (ڈاکٹر انور سدید) کے مطالعے سے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں اور یہ ڈاکٹر صاحب کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ ''علامہ اقبال اور مسلم نشاۃ ثانیہ'' (مسلم شمیم) ایک قابل مطالعہ تحریر ہے۔ ''ضمیر حرف ۔۔۔'' میں ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے ڈاکٹر ظہور شاہ قاسم کے تنقیدی مضامین کے مجموعے ''تعبیر حرف'' کا عالمانہ انداز میں جائزہ لیا ہے۔ ''سلیم محبت ۔۔۔'' میں نذر الصغر صاحب نے نامور ادیب اور شاعر اعزاز احمد آذر (مرحوم) کی خدمات کو پرخلوص ہدیہ تبریک پیش کیا ہے۔ پروین ہومی کے تعزیتی جلسے میں پڑھا گیا اخلاق عاطف کا مضمون بہت دل گداز ہے۔ وفیات کے ضمن میں ''ستارہ طاہر'' (ملک مقبول احمد) اور ''پروفیسر ظہور الحسن'' (ڈاکٹر محمد اقبال صمصام) بھی عمدہ مضامین ہیں۔ ''یادیں'' کے تحت ''عاشق صبر طلب'' (ڈاکٹر رشید امجد) ایک اجمالی دلچسپ تحریر ہے۔ اس میں کئی دانشوروں کا تعارف بھی بہ انداز دگر آیا ہے۔ ''سورج کے رخ پر'' (ڈاکٹر اجمال وفا) پر لطف بھی ہے اور طنز آمیز بھی۔ مصنف نے پاکستان اور جرمنی کے فوجی اہلکاروں اور میس کا موازنہ بڑے فکر انگیز انداز سے کیا ہے۔ جرمن فوجی کا یہ جملہ میرے دل میں تیر کی طرح پیوست ہو گیا کہ ''سپاہی سے جنرل تک ایک جیسی پوشاک، ایک سا کھانا۔'' ''عراق اتفاق یار ۔۔۔'' (سلمیٰ اعوان) بھی خوب ہے۔ افسانوی ادب کے منظرنامے پر رشید امجد سے نثار احمد صدیقی کا مکالمہ میں نے بڑے انہماک کے ساتھ پڑھا۔ رشید امجد صاحب نے نثار احمد صدیقی صاحب کے چبھتے سوالات کے نہایت مسکت جواب دیے۔ ''ملک کا آخری بادشاہ'' (وحشی سعید) عام ڈگر سے ہٹ کر لکھا گیا ایک پراسرار نوعیت کا افسانہ ہے اور بہت اچھا ہے۔ نسیم انصاری نے اس کا تجزیہ بھی متن میں ڈوب کر کیا ہے۔ ''زبیدہ خانم ۔۔۔'' حسب سابق معلومات کا ایک خزانہ لیے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر امجد پرویز نے فلم ''یادش'' کی مکمل کاسٹ (مسرت نذیر، علاؤ الدین، اجمل اور یاسمین) تو لکھ دی لیکن ہیرو کو نظرانداز کیا۔ یہ فلم ہمارے جنگجو ہیرو سدھیر کی لازوال فلموں میں شامل تھی۔ مضمون میں ایک گانے کے بارے میں چھپا ہے کہ وہ شاہ جو نسلے پر فلمایا گیا۔ یہ کمپوزنگ کی غلطی ہے۔ ایکٹریس کا صحیح نام آشا پوسلے تھا۔ جھنگ کے ڈاکٹر محسن مگھیانہ میرے دوست اور ایک کامیاب مزاح نگار ہیں۔ تاہم، معذرت کے ساتھ، اس بار ان کی ''برف''

ضرورت سے زیادہ تشنگی رہی۔ اظہر جاوید کا لکھا ہوا "امرتا پریتم" کا خاکہ گھر کی گواہی لگتا ہے۔ کیا لاجواب تحریر ہے! افسانوں "اگر دیکھا" (ڈاکٹر رشید امجد)، "تحفہ" (پروفیسر زبیر کنجاہی) اور "سگریٹ اور تحریر" (اظہر جاوید) اسی پڑھنے کا اور محظوظ ہوا۔ تبصروں میں "متاعِ شاعری کی متاعِ بے بہا" (غالب عرفان) اور "ایک ایمن ——" (نسیم سحر) بہت پسند آئے۔ شعری تخلیقات بھی ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ میں خود کو تخصیص کا مکلف نہیں پاتا اس لیے انتخاب سے گریز کر رہا ہوں۔

موجودہ شمارے میں بعض مشہور اشعار میں غلطیاں سرزد ہوئی ہیں جن میں سے کچھ واضح طور پر کمپوزنگ، پروف ریڈنگ کی اغلاط لگتی ہیں۔ بہر حال آپ کے قارئین کی رہنمائی کی غرض سے میں پوری تحقیق کے بعد درست اشعار، مصرعے لکھ رہا ہوں۔

(1) صفحہ نمبر 13 پر دیا گیا اقبال کا شعر اصل میں اس طرح ہے۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں — ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

پہلے مصرعے میں "مال" کمپوز ہو گیا ہے۔

(2) اسی صفحے پر ایک شعر یوں لکھا گیا ہے۔

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ — جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی

عجیب اتفاق ہے کہ اس شعر کا دوسرا مصرع 90 فیصد لوگ اسی طرح لکھتے اور پڑھتے ہیں حالانکہ اس میں "رواں" کے بجائے دواں (سرگرداں) ہے یعنی ع جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی۔

(3) صفحہ نمبر 66 پر احمد ندیم قاسمی کا شعر یوں ہونا چاہیے تھا۔

انداز ہو بہو تری آوازِ پا کا تھا — دیکھا نکل کے گھر سے تو جھونکا ہوا کا تھا

(4) صفحہ نمبر 78 پر غالب کا درست مصرع ہے ع ——ساتھ رقیب کو لیے

(5) صفحہ نمبر 103 پر حالی کا شعر اپنی درست حالت میں اس طرح ہے۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا — مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

(6) صفحہ نمبر 137 پر فارسی شعر دراصل یوں ہے۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست — تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

(دوسرے مصرع کے شروع میں "تاکہ" کمپوز ہو گیا ہے۔)

(7) صفحہ نمبر 140 پر ایک مصرع میر سے منسوب کر کے یوں لکھا گیا ہے:

نازک ہے بہت کام یہاں شیشہ گری کا

یہ تو کوئی مصرع ہی نہیں۔ میر کا مکمل شعر یوں ہے۔

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام — آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

مصنف نے چار الفاظ پہلے مصرعے اور دوسرے مصرعے کے لے کر ان میں "یہاں" ملایا اور ایک نیا "مصرع" بنا لیا۔

صفحہ نمبر 130 کے ایک مضمون میں اس شعر کی تعریف کی گئی ہے۔

جس کمرے میں چھت پہ بارش ہے اپنے بچے کہاں سلاؤں میں

میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ کمرے کی چھت پہ بارش ہو رہی ہے تو شاعر کو کمرے کے اندر اپنے بچوں کو سلانے میں کیا قباحت پیش آ رہی ہے؟ چھت پر تو بارش ہوتی ہی ہے۔ آخر میں آپ کا دل سے شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرا مضمون ''دیکھتے ہیں ہم کہ غالب کون ہے'' منتخب کر کے ''گلبرگ'' (سری نگر) کے ''انٹرنیشنل ادب نمبر'' میں اشاعت کے لیے بھیجا اور مجھے مطبوعہ مضمون کی فوٹو کاپی بھی ارسال کی۔ بلاشبہ آپ اپنے والد بزرگوار کی دوستیاں اور تعلقات نبھا رہے ہیں اور ''تخلیق'' کی مزید ترقی کے لئے کوشاں ہیں۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (کراچی)

﴿2﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ عنایت فرمانے پر شکر گزار ہوں۔ ممنون ہوں کہ آپ نے میرے دوہوں کو ''تخلیق'' کی زینت بنایا۔

حالیہ شمارے میں بھی صفحہ 25 پر ''ابنار'' کے عنوان سے ساتواں دوہا کچھ اس طرح درج ہو گیا ہے۔

مولا سکل سنسار کا قادر وہ کہلائے ''بے وزن'' بیٹھا عرش پہ جگ کے کار چلائے

لفظ ''بے وزن'' سے یقیناً مصرع بے وزن ہو گیا ہے۔ صحیح مصرع یوں ہے۔

''اکلا'' بیٹھا عرش پہ جگ کے کار چلائے

یہ دوہا چونکہ اللہ تعالیٰ کی حمد کا حصہ ہے اس لئے تصحیح ضروری تھی۔

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون (لاہور)

﴿3﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

دسمبر 2015 کا تازہ ''تخلیق'' ملا۔ ماشاء اللہ اس دفعہ بھی سرورق بہت ہی خوب ہے۔ زندہ باد شاد باد رشید —— لیکن تازہ ''تخلیق'' میں میری کوئی چیز نہیں۔ غالباً میں نے آپ کو کچھ نہ کچھ ضرور بھیجا تھا۔ عزیزم! کہیں ایسا تو نہیں کہ میری طرف سے آپ کو کوئی شکایت ہے یا پھر آپ کو والد محترم کے کچھ تنگ نظر احباب نے میری طرف سے بدظن کر دیا ہے، حالانکہ میں نے پہلے بھی آپ کو لکھا تھا کہ مرنے سے ایک رات پہلے اظہر جاوید میرے ساتھ تھے اور ہم دونوں نے خوب کھل کر باتیں کی تھیں اور ہمیں ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں تھی —— مگر یہ جلنے والے لوگ، یہی ہاں تنگ نظر لوگ دوسروں کو ملتے ہوئے دیکھ کر خوش نہیں ہوتے۔

تو میرے عزیز! اگر آپ کے دل میں میری طرف کوئی غلط فہمی ہے اور آپ اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں، تو شوق سے آپ اپنے والد کے تنگ نظر افراد کو خوش کرنے کے لئے مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھیے —— میں بھی انتقاماً انہیں چاہتا ہوں کہ کوئی مجھ سے ملنا نہیں چاہتا اور میں چاہتا ہوں کہ وہ ملے۔

سید مشکور حسین یاد (لاہور)

4 ☆ سونان اظہر صاحب!

دسمبر کا تخلیق نظر نواز ہوا۔ دل خوش ہوا۔ یہ آپ کی دعاؤں کا اثر ہے کہ میں قوت ارادی کے ساتھ ایک انشائیہ سپردِ قلم کر کے ارسال کر رہا ہوں۔ تکلیف بدستور ہے۔ ملک مقبول احمد کا تحریر کردہ ستار طاہر کا خاکہ بہت دلنشین ہے۔ انھیں دلی مبارک باد۔ ستار طاہر نے جس محنت اور خلوص سے ادب کی خدمت کی وہ لائق ستائش ہے۔ اللہ انھیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ "مگر دیکھنا" اور ان کا یادگاری مضمون "عاشق صبر طلب" پڑھ کر لطف آیا۔ وہ اپنے فن کے بے تاج بادشاہ ہیں۔ ڈاکٹر امجد پرویز کا موسیقی کے حوالے سے زبیدہ خانم پر مضمون علم افروز ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے بغیر تو ادبی رسالہ نامکمل ہوتا ہے۔ ان کا قرۃ العین پر مضمون پڑھ کر مزہ آ گیا۔

پروفیسر جمیل آذر (راولپنڈی)

5 ☆ محترمی سونان اظہر جاوید

تخلیق کا نیا شمارہ ملا۔ خوشی ہوتی ہے کہ آپ نے مرحوم اظہر جاوید کی یاد کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ ظاہری اعتبار سے اس میں اضافہ بھی کیا ہے اور اس کو دلکش رنگ بھی دے دیا۔ تخلیق اور اظہر جاوید میرے لیے ایک ادبی خاندان جیسے ہیں۔ میں نے ادب میں اور عملی زندگی میں بھی بہت کم دوست بنائے ہیں۔ کیوں کہ یہ زمانہ دوستی اور دوستوں کا نہیں اور "دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے" کا میں قطعی قائل نہیں۔ آپ کا پیغام جنوری تا مارچ کے شمارے میں شامل کر رہا ہوں۔ "اسباق" کے ساتھ ایک کتاب "نذیر فتح پوری بنام سلطان اختر (خطوط)" رجسٹری سے ارسال کر رہا ہوں۔ کتاب پر ضرور تبصرہ کرائیں۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھے یاد کیا۔ آج مجھے لگا جیسے اظہر بھائی کی کمی پوری ہوئی۔

نذیر فتح پوری (انڈیا)

6 ☆ مکرمی سونان اظہر!

"تخلیق" کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ اسے پیاسوں کی طرح پیا، بھوکوں کی طرح کھایا اور اضطرابی کیفیت میں رہنے والوں کی طرح محسوس کیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مستقبل میں تاریخ صحافت کا زندہ باب بن جائیں گے۔ زیر نظر شمارہ کے حمد و نعت میں جو تقدس موجود ہے، وہ لائق تحسین ہے۔ علامہ اقبال پر مسلم نشاۃ ثانیہ کے آئینے میں بہت ہی خوبصورت مضمون تحریر کیا گیا ہے۔ یہ مضمون معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر جمیل آذر اور ڈاکٹر سکندر حیات کے مضامین بھی بہت ہی خوبصورت، معیاری اور اپنے موضوعات کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ منظومات کا حصہ بھی معیاری اور لائق تحسین ہے۔ ظفر اقبال، کنول فیروز، کرشن کمار طور، ڈاکٹر نجمہ شاہین، ڈاکٹر مقصود حسنی اور فوقیہ مشتاق کی غزلیں معیاری اور ایک نئے موڑ کی جانب اشارہ کرتی ہیں۔ کہانیوں میں رشید امجد کی کہانی بہت ہی اچھی، بالکل نئے اور اچھوتے انداز سے تحریر کی گئی ہے۔ عذرا اصغر نے جو خاکہ تحریر کیا ہے اسے پڑھنے کے بعد اعزاز احمد آذر کا چہرہ بالکل سامنے آ جاتا ہے۔ اظہر جاوید نے امرتا پریتم پر بہت ہی خوبصورت اور افسانوی رنگ میں خاکہ تحریر کیا ہے۔ جناب اظہر جاوید کی اردو خدمات اتنی گراں قدر ہیں کہ آنے والے ادبی مورخین انھیں کسی بھی طرح نظر

انداز نہیں کر سکتے۔ ''یادنگاری'' اور ''سفرنامے'' کا سلسلہ اچھا اور دلچسپ اور پسندیدہ ہے اسے جاری رکھئے ''انجمن خیال'' کے تحت جو خطوط ہیں ان میں رسالے کی تعریف وتوصیف کے ساتھ تخلیقات پر ناقدانہ نظر بھی پڑھنے کو ملی جو اکثر دوسرے رسائل میں نظر نہیں آتی۔ غالب عرفان اور آفتاب خان کے تبصرے مختصر ہی سہی لیکن جامع ہیں۔ مجموعی طور پر آپ کا رسالہ عالمی سطح کا ہے جسے کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ خدا آپ کو ہر طرح سے سلامت رکھے اور آپ کے بچوں کو بھی اپنی امان میں رکھے۔ آمین۔

نثار احمد صدیقی (انڈیا)

7 محترم سونان اظہر جاوید!

اپنی کتاب اردو ناول ''کرداروں کا حیرت کدہ'' ارسال کر رہا ہوں۔ اتفاق سے میری سب کتابوں پر مرحوم اظہر جاوید نے تبصرے بکمال مہربانی شائع کئے تھے۔ وہ اردو ناول کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ محترم انور سدید صاحب سے میں نے گزارش کی ہے کہ وہ طبیعت ٹھیک ہونے پر مختصر سا تبصرہ آپ کو دے دیں۔ انہوں نے خاص مضامین ناول پر لکھے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی ہوئی وقیع کتاب بھی اس صنف ادب پر آئی ہے۔ ''تخلیق'' بہار بخش رہا ہے ہمارے کتب خانے میں ایم فل، پی ایچ ڈی کے طالب علم بسلسلہ مطالعہ اور ریسرچ تشریف لاتے ہیں۔ اور ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ اگر میں تعریف نہ کروں تو زیادتی ہوگی کہ آپ کی سربراہی میں ''تخلیق'' اپنے معیار کو استقامت کے ساتھ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ اور نئے پرچے کا انتظار رہتا ہے۔

ممتاز احمد خان (کراچی)

8 محترمی سونان اظہر جاوید!

پچھلا شمارہ تخلیق ملا، سرورق بھی خوبصورت ہے۔ ہمارے ہاں صحرا کے باعث رنگ کم کم ہوتے ہیں۔ اور حتیٰ پانی وجہ حرارت میں تو فضا بھی Cozy ہو گئی تخلیق ملنے سے۔ ڈاکٹر انور سدید نے قرۃ العین حیدر کی یادیں تازہ کر دیں۔ وہ کوئٹہ میں رہ چکی ہیں۔ انہیں کوئٹہ بے حد پسند تھا۔ اپنی ملازمت کی پرواہ کیے بغیر میں قرۃ العین حیدر کو ٹیلی فون کیا کرتا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید نے متاع حیات ادب کے نام کر دی ہے۔ یہ ایک قابل تعریف عشق ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد نے عورت کی شخصیت کے نئے پہلو دکھائے ہیں۔ محمد حامد سراج منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ تسنیم کوثر کا افسانہ ''لینڈ لیڈی'' خوب ہے۔ میرے برادر گمشدہ ڈاکٹر یونس جاوید بہت دنوں سے دکھائی نہیں دے رہے۔ اظہر جاوید ہمارے مرشد ہیں۔ سب سے پہلے ان کا افسانہ لگنا چاہیے تھا۔ مجھے احساس ندامت ہوا۔ اپنے طور پر آپ انکساری کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ مگر اظہر جاوید کے لئے نہیں۔ سب سے پہلے ان کا افسانہ لگنا چاہیے۔ ڈاکٹر ابدال بیلا کا عاشق کا انداز خوب ہے۔ دونوں بھی شاہکار وصال ہیں۔ عشق والا جنون ظاہر ہوتا ان کی وردی ''بیٹھا'' مار رہی ہے۔ سلمیٰ اعوان ہمارے ابن بطوطہ کا ریکارڈ توڑ رہی ہیں۔ ان کے سفرنامے وسیع تر تناظر میں چلتے ہیں۔ وہ بیک وقت معاشرت، سیاسیات، الٰہیات، جمالیات، معاشیات پیش کیے جاتی ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ کی مانند انوکھی۔ اذیت بھری کہانیاں ان کے ہاں نہیں ملتیں نہ ہی وہ ان ملکوں کے ادیبوں کے تاثرات حتیٰ کہ فاتینگ اردو میں ترجمہ کر کے اپنی تخلیق قرار دیتی ہیں۔ ''غالب اگر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں۔'' والی قریا متعدد بار کر چکا ہوں مگر ان کے ہم رکاب انجن وغیرہ ہو جانے کا موقع نہ مل پایا۔ ظہیر انصاری کا تجزیہ خوب ہے۔ وہ میرے پسندیدہ قلمکار ہیں۔

جن دنوں ڈاک کے نرخ بڑھائے جانے کا شور اٹھا میں نے سخت مخالفت کی۔ ہمارے ڈائریکٹر جنرل آغا مسعود حسن نہایت ہی لائق عالم فاضل انسان تھے۔ انہیں قادر آف ایئر ڈیفنس کیا جاتا ہے۔ مگر توپ چلانے اور ڈاکخانہ چلانے میں فرق ہے۔ یوں تو مداری کا طوطا بھی توپ چلاتا ہے۔ مگر وہ ڈاکخانہ نہیں چلا سکتا۔ پھر "یونین" کے انجینئر ہمارے ڈائریکٹر جنرل لگا دیئے گئے۔ اس کے بعد ایک قبائلی سردار کو وزیر لگا دیا گیا۔ وزارتوں کی بندر بانٹ کے لیے نت نئے محکمے بنائے گئے۔ محکمہ ڈاک کا کل ریونیو پانچ سو ارب روپیہ سالانہ ہے اسے بھی وزارت بنا دیا۔ وزیر نے 24 گاڑیاں اور 2 موٹر سائیکلیں اپنے تصرف میں لے لیں۔ جنہیں آڈٹ نے "ریڈ ٹو کال" کے کھاتے میں ڈال دیا۔ پھر میرے ایک دوست کو جو کہ مولانا ہیں انہیں وزیر بنا دیا گیا۔ نرخ بڑھ جانے سے پہلے سال میں ریونیو 30% گر گیا۔ بھارت نے ہم سے کہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ان لینڈ نرخ رکھنے کے لئے تیار ہے۔ مگر حاکموں کے دو قومی نظریے پہ زد پڑتی۔ ان کی تو ایران، افغانستان، بھارت سے دشمنی ہے۔ پاکستانی کسی پڑوسی سے مل نہیں سکتے ان کے ہاں جا نہیں سکتے البتہ سامنے پڑے بحیرہ عرب کے کھارے پانی میں ڈوب سکتے ہیں۔ آپ کے اداریے نے میرے دل کے زخم تازہ کر دیے۔ آپ نے بقول شاعر زخم جگر کو چھو لیا۔ یاد رہے کہ محکمہ ٹیلیفون کی مانند ڈاک خانہ Public utility Deptt ہے۔ ریل میں دو بوگیاں اوسطاً آدھے کرایہ والی ہوتی ہیں۔ حکمرانوں کے لئے یہ دونوں محکمے مرغوب غذا ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں لینڈ لارڈ محکمے ہیں۔ ان کے پاس ایکڑوں کے حساب سے قیمتی زمینیں ہیں، جن کی مالیت کھربوں میں ہے۔ حکمران خاندان محکموں کو ناکارہ کر کے Privatization کی شقوں کے ذریعے اونے پونے فروخت کر کے زمینوں پر قبضہ کر لیں گے۔ ڈاک کے نرخ بڑھا کر محکمہ جاسوسی کو بڑھاوا دے رہا ہے۔ رسالوں کی ترسیل میں خلل پڑ رہا ہے۔ کتابیں بذریعہ ڈاک منگوائی نہیں جا سکتیں۔ پارسلوں کی ترسیل کا بڑا حصہ بسوں نے سنبھال لیا ہے۔ حکمران ان قیمتی زمینوں کی خاطر محکمہ تباہ کر رہے ہیں۔ اہل علم ان پہ فریاد کریں۔ بے نظیر انکم جو کہ سیاسی رشوت ہے اسمبلی ممبران جس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس میں سے وہ ادارے محکمہ ڈاک کو دیے جائیں تاکہ نرخ کم ہوں اور کمیشن کا کاروبار چلے— آپ نے اداریہ میں درست لکھا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ کسی طرح یہ بات وزیر اعظم تک پہنچائی جائے کیونکہ تو آپ بات اپنے زاویہ نگاہ سے پیش کرتے ہیں۔

آغا گل (کوئٹہ)

---

۷۸۶ عزیزم سلطان اظہر جاوید!

دسمبر 2015ء کا "تخلیق" موصول ہوا۔ یہ بات خوشی اور اطمینان کا باعث ہے کہ اس ماہنامہ کی تخلیقی زندگی میں 46 برس سے مسلسل ہمسفر ہوں۔ اظہر جاوید کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور اس نام کو زندہ و تابندہ رکھنے میں اور تخلیق کو جاری و ساری رکھنے میں جو خدمات آپ سر انجام دے رہے ہیں وہ یقیناً قابل ستائش ہیں۔ مجھ جیسی شاعرہ، جو مضافات میں رہتی ہے اسے بھی آپ زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے یہ چند سطور جذبات کے سمندر میں ڈوب کر خلوص سے لکھی ہیں امید کرتی ہوں کہ صفحۂ قرطاس پہ بکھرنے والے الفاظ گلوں کی خوشبو کی طرح ہمیں مہکاتے رہیں گے۔

سنبل صابری (ساہیوال)

﴿10﴾ کڑی!

افسانہ نگار معاشرے سے ہی کہانی اخذ کرتا ہے اور اس میں اپنی ذہنی اختراعات کا رنگ شامل کر کے ایسے پیش کرتا ہے کہ افسانے میں کوئی بہشت پیغام ہو۔ ڈاکٹر رشید امجد افسانہ نگاری میں ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ متعدد ادبی رسائل میں چھپتے ہیں۔ ماہنامہ "تخلیق" برائے ماہ دسمبر کے پرچے میں صفحہ نمبر 29 ان کا افسانہ "مگر دیکھنا" شائع ہوا۔ اس افسانے کا قاری قدم قدم پر خلا محسوس کرتے گزرتا جاتا ہے۔ ایک شادی شدہ شخص نامساعد حالات کی وجہ سے تعلیم ادھوری چھوڑ کر یونیورسٹی میں "اسسٹنٹ" بھرتی ہو جاتا ہے۔ یونیورسٹی تو ایک جہاں ہوتا ہے جہاں ہر وقت رنگ و نور کی بارش ہوتی ہے۔ رنگ برنگے لڑکے لڑکیاں۔ مگر ایک فیکٹریوں اور جاگیروں کے مالکان کی امیر زادی "زویا" کی نظر عمر رسیدہ اسسٹنٹ پر ٹک جاتی ہے اور یہ جاننے کی کوشش تک نہیں کرتی کہ وہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ۔ ان کے میل ملاپ کا چرچا چار سو پھیلتا ہے مگر یونیورسٹی کے پالیسی ساز بے خبر رہتے ہیں؟ زویا گھر میں اس اپنے محبوب سے Love affair کی باتیں کرتی ہے۔ زویا کا منگیتر تو یونیورسٹی پہنچ جاتا ہے اور اسسٹنٹ پر رعب جھاڑتا ہے مگر زویا کے ماں باپ یا کوئی بہن بھائی (اگر کوئی ہے) کا سارے افسانے میں ذکر تک نہیں؟ لڑکیاں تو اس عمر میں کیا کچھ نہیں کر گزرتیں؟ نہ گھر میں چیخ و پکار نہ بغاوت نہ دھمکیاں؟ اب وہ زویا سے دور دور رہنے لگا مٹی کا مادھو بنا بیٹھا۔ مگر اچانک زویا اسے موٹر سائیکل چھوڑ کر کار میں بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہے اور وہ بلا حیل و حجت بیٹھ جاتا ہے۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی ایک فائیو سٹار ہوٹل کے پاس جا رکی۔ کمرے کی چابی لی اور ساتویں منزل پر اپنے کمرے میں پہنچ گئے۔ دروازہ بند ہوتے ہی سینے کے بند قبا کھل گئے۔ Temptation کے سارے در کھل گئے۔ مصنف نے افسانے میں اس منظر کو اور اس کی تمام باریکیوں کو بہت ہی مہارت اور چابک دستی کے ساتھ پوری آب و تاب سے تحریر کیا ہے۔ واہ واہ گناہ کی طرف دھکیلنے کی کیا شاندار مثال اور Message دیا گیا ہے۔ یہاں زمین سیراب ہوتے اور کونپل ہوتے کا ذکر ہوا

حیرانی کی ایک اور بات یہ کہ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ہونے کے باوجود تیرہ سال بعد اچانک جب ملاقات ہوتی ہے تو ایک بارہ سالہ لڑکا اس کے ساتھ ہے اور وہ اسے بتاتی ہے یہ میرا بیٹا ہے ۔ ہمارا بیٹا۔ کمال ہے اتنا عرصہ وہ دوبارہ آپس میں نہ مل سکے حالانکہ لڑکی اپنی پہلی محبت کو زندگی بھر نہیں بھولتی۔ اور بارہ سال تک پھر اس کی کوئی اولاد نہ ہوئی۔ اس کے باوجود وہ سکون کی زندگی گذارتی رہی اور اس پر باہر آنے جانے اور گھومنے پر پابندی نہ تھی۔ میرا خیال ہے کہ زویا نے اپنے زعم میں ایسا انتقام لیا کہ اب اس کا منگیتر زندگی بھر زویا کے محبوب کی اترن استعمال کرے گا۔

ایک اور افسانہ "تحفہ" جو پروفیسر زہیر کنجاہی نے لکھا ہے اور صفحہ نمبر 44 پر چھپا ہے۔ اس کے تحریر نگار اب اس دار فانی سے گزر چکے ہیں۔ وہ شاعر اچھے تھے۔ مشکل یہ ہے کہ شاعری چل نکلے تو کالم نگاری پر اور پھر افسانہ نگاری پر منہ مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ لکھاری کی ذات بٹ کر رہ جاتی ہے۔ کسی ایک فیلڈ میں جم کر کام کرنا مقصود ہونا چاہیے۔ اس افسانے کی کہانی رشتہ دار پڑوسیوں کے گھروں کی داستان ہے۔ وہی لویا یا دلہن اور ان رسیدہ رشتہ دار رشتہ جب بیاہ کر آئی تو اپنے خاوند پر دلچسپی لینے کے بجائے سکندر میں مگن ہو گئی اور پھر ایک دن اتفاقاً رشتہ کے گھر کے سب لوگ گئے ہوئے تھے۔ اتفاقاً گھر کا دروازہ کھلا تھا۔ اتفاقاً رشتہ نہا رہی تھی۔ اتفاقاً غسل

خانے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اتفاق تھا سکندر ادھر آ نکلا اور پھر اتفاق تھا وہ دونوں جسم مدغم ہو گئے اور بیج بو دیا گیا۔ مگر جب رشنا نے بچی کو جنم دیا تو خود مرنے لگی۔ سکندر کو بلوایا اور رشنا نے اپنی اور (سکندر کی بیٹی) کے لئے ایک لاکھ روپیہ دیا کہ جب اس کی شادی ہو تو اسے ماں کی طرف سے دو چوڑیاں تحفہ دینا۔ لڑکی نے بہت تعلیم حاصل کی مگر آخر کار شادی تو ہونا تھی جب تقاضا شادی پر تیار ہو گئی تو رشتہ ڈھونڈنے لگے (بچہ گلی میں ڈھنڈورا شہر میں) سکندر کے چھوٹے بھائی کا لڑکا مستحق ٹھہرا اور شادی ہو گئی جبکہ سکندر نے دلہن کو چار چوڑیوں کا تحفہ دیا ''دو چوڑیاں اس کی ماں کی طرف سے اور دو چوڑیاں اپنی طرف سے'' دلہن کا دلچسپ جملہ'' دو چوڑیاں ماں کی طرف سے اور دو باپ کی طرف سے''۔ ساری کہانی یا افسانہ اگر افسانہ ہے تو اتفاقات پر چلتا ہے۔ اگر افسانے کا عنوان اتفاقات ہی رکھ دیا جاتا تو کیا تھا۔

صفحہ نمبر 175 اظہر جاوید کی تحقیق ..... ایک بے چین روح ..... امرتا پریتم۔ اظہر جاوید کو ایک بولڈ انسان اور بولڈ تحریروں کا شہنشاہ قرار دیا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں'' عورت صرف ایک دفعہ ہی پیار نہیں کرتی ہے''۔ کیا عورت کے جذبات نہیں ہوتے ..... یہ سراسر غلط مفروضہ ہے۔ امرتا پریتم بچے اور خاوند ہونے کے باوجود دھڑلے کے ساتھ ساحر لدھیانوی اور سجاد حیدر کی زندگی کا بھی حصہ ہے۔ ساحر سے تو اس کا پیار بھی تھا اور ساحر جب بہت بیمار ہوئے تو سکھ برادری کی مخالفت کے باوجود ساحر کو تیمارداری کے لئے اپنے گھر میں لے آئی۔ اس کے علاوہ بھی کئی کمزور لمحات میں کئی مرد آتے رہے۔ چنانچہ میں اظہر جاوید کی رائے سے مکمل اتفاق کرتا ہوں کہ عورت صرف ایک ہی دفعہ پیار نہیں کرتی ہے۔ جس طرح مرد جگہ جگہ منہ مارتا پھرتا ہے اسی طرح عورت کے جذبات پر بھی قید نہیں لگائی جا سکتی۔ امرتا پریتم سے نفرت کرنے والا آپ کو ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گا مگر ان کو چاہنے والوں کی نہ ختم ہونے والی قطار ملے گی۔ پوچھیں تو امرتا پریتم کو ایسا ہی کیوں کہا جاتا ہے۔

''تخلیق'' میں یادنگاری کے گوشے میں صفحہ نمبر 84 پر'' ہمیں اسی کام کی تنخواہ ملتی ہے''۔ That is what we have paid for محمد اسلم کی یادنگاری کا واقعہ امریکہ سے تعلق رکھتا ہے۔ خود میں نے انگلینڈ، جاپان، ہانگ کانگ، تھائی لینڈ، لبنان، شام اور متحدہ عرب امارات میں چھبیس سال گزارے ہیں۔ میں گواہ ہوں کہ محمد اسلم نے بالکل صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ جن ممالک کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں سے کچھ کو ترقی پذیر اور کچھ کو کم تر خیال کیا جاتا ہے۔ مگر جب بھی کسی مریض کو وہاں لے جایا جاتا ہے تو دروازے پر عملہ مریض کو اپنے حوالے کر کے لانے والوں کو فارغ کر دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں تو دھوں کھڑکیوں پر جھڑکیاں کھانا پڑتی ہیں۔ آپ ذرا سا ہنسیں تو فوراً مدد پہنچتی ہے۔ مصنف نے کمال کر دیا جب ایک ڈیوٹی پر موجود گارڈ کو چائے پینے کی دعوت دی تو اس نے مسکرا کر دعوت رد کر دی، یہ کہتے ہوئے کہ "I am on Duty. Thank you." ہمارے ہاں ڈیوٹی پر موجود پولیس والے سڑک پر ڈیوٹی کے بجائے ہوٹل میں بیٹھ کر چائے کے ساتھ لوازمات بھی کھاتے ہیں اور بل ادا نہیں کرتے۔

محترمہ سلمیٰ اعوان کا سفرنامہ خوب ہے۔

کرنل اجوال بیلا کا سفرنامہ'' سورج کے رخ پر'' قسط نمبر 10 اچھا لگا۔ اللہ تعالیٰ ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔ یہ بہت خوبصورت سفرنامہ اور خوشبودار تحریر ہے۔ محترمہ روحانہ روشین خان (مظفر گڑھ) اچھا افسانہ لکھتی ہیں اور اب تو ناول بھی لکھ چکی ہیں۔ تبصرہ خوبصورت منفرد انداز میں لکھتی ہیں مگر اس مرتبہ میں بے حد حیران ہوا کہ ''تخلیق'' ماہ دسمبر 2015 میں صفحہ نمبر 158 پر رقمطراز ہیں

''ڈاکٹر اقبال بیلا کا سفرنامہ ''سورج کے رتھ پر'' میں نے مکمل پڑھا۔ مجھے جرمنی سے دلچسپی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ''تخلیق'' کے خاص نمبر مارچ 2015 کے صفحہ نمبر 204 پر پڑھ چکی ہیں ''اقبال بیلا سورج کے رتھ پر'' کی قسط ششم لکھ چکے ہیں۔ اقبال بیلا کا یونیک طرز تحریر ہے۔'' مگر بدقسمتی سے میں اس سفرنامے کو شروع سے ہم ترتیب نہیں پڑھ پائی تو میرا اس سے ذہنی ربط نہیں بن رہا۔ ''یعنی وہ کئی اقساط پڑھ چکی ہیں اور انہیں ادراک ہے کہ ان کا طرز تحریر یونیک ہے مگر تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ لکھاری کی یادداشت قابلِ داد ہونا چاہیے۔

مرزا احمد نور طاہر (چکوال)

﴿11﴾ عزیزم سومان!

نمسکار۔ اچھے پیارے جریدے تخلیق کا ماہ نومبر اور دسمبر 2015 کا شمارہ دستیاب ہوا، خوشی ہوئی۔ میں نے بہت پہلے ای میل کے ذریعے آپ کو مطلع کیا تھا کہ نومبر 2014 کا شمارہ موصول نہیں ہوا۔ آپ نے اس طرف نہ تو توجہ دی اور نہ ہی جواب دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ یاددہانی کے لئے آپ کی طرف سے جشنی حصہ Subscription ایک خط موصول ہوا تھا۔ چند ذاتی وجوہات سے جناب نارنگ صاحب کو میں چیک ارسال نہ کر سکا۔ کچھ دماغ سے بھی اتر گیا۔ آپ نے میرے نام تخلیق بھیجنا بند کر دیا۔ دل افسردہ ہوا کہ وہ شخص جن سے پچھلے 25 سال میں جذباتی ذاتی تعلقات ہونے کے باوجود بھی چیک دینے کی کوتاہی نہیں کی۔ اگر اس شخص سے تھوڑی سی دیر ہو گئی تو آپ نے ''تخلیق'' کا سلسلہ منقطع کر دیا لیکن دل میں کبھی رنجش نے جنم نہیں لیا۔ کیونکہ ''تخلیق'' میرا اپنا ہے۔ مرتے دم تک اس سے رشتہ توڑنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ بڑی خوبصورتی اور محنت سے یہ سلسلہ قائم کئے ہوئے ہیں۔ خدا آپ کو تقویت بخشے آمین۔

2015 نومبر کے شمارے میں جناب محمد طارق علی کی کہانی ''ورق ورق بکھری زندگی'' بہت پسند آئی۔ اسی شمارے میں ''انجمن خیال'' میں بھارت کے جناب کرشن پرویز صاحب کی خط نما غزل پڑھ کر حیرانی ہوئی۔ جناب پرویز صاحب نے بھارت میں اردو کی موجودہ حالت میں اشک باری کی ہے جو مناسب نہیں ہے۔ بھارت میں اردو پنجابی محاورے کے مطابق ''چڑھیاں کلاں نچ'' ہے۔ ابھی حال میں ہی دہلی میں اردو ادب میلے کی دھوم دھام تھی کہ جشن ریختہ شروع ہو گیا۔ اکیڈمی (اردو) دور دراز علاقوں میں قائم ہو رہی ہے۔ بڑی تعداد میں لوگ جو دیوناگری میں اردو پڑھتے تھے (اور لکھتے تھے) اب اردو حروف کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں اور اردو کے ختم ہونے کا کوئی خوف نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے جناب کرشن پرویز صاحب نے کسی کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ کہا ہو۔ بھارت میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔

کلدیپ راج جوشی (انڈیا)

﴿12﴾ محترم سومان اظہر جاوید!

دسمبر 2015 کا تخلیق نظر نواز ہوا۔ ''پہلی بات'' سنجیدہ اور فکری سوچ کی عکاسی ہے۔ نہ جانے کچھ لوگوں نے اردو کے ساتھ خدا واسطے کا بیر کمایا ہوا ہے جس کی سزا قوم آج تک بھگت رہی ہے۔ پہلی بات تو یہی تھی کہ اردو کا ملک عزیز میں نفاذ ہو جاتا مگر ..... اسی طرح کتب کی اشاعت اور رسائل و جرائد کی ترسیل کے ضمن میں بھی آئے دن مشکلات اور ڈاک خرچ میں اضافہ غیر علمی و ادبی رویہ ن

پر مشتمل ہے۔ غالب عرفان نے کائنات کی روحِ رواں کے مالک کی حمد، عمدہ انداز میں درج کی ہے جو قابلِ تحسین ہے۔ خدا اور اس کے رسولؐ کے حضور اپنی عقیدتیں اور محبتیں نچھاور کرنے والے تمام قلم کار خوش نصیب ہیں۔ مسلم شمیم نے نشاۃ ثانیہ کی تحریک کا پس منظر بھرپور انداز میں پیش کیا ہے اور علامہ اقبال جو کہ مسلم نشاۃ ثانیہ کا نقطۂ عروج تھے، کے کردار کو واضح کیا ہے۔ کلامِ اقبال سے مسلم شمیم نے مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اقبال کا ایک مصرعہ یوں لکھا گیا ہے "سکوں مال ہے قدرت کے کارخانے میں" (ص 13) جبکہ "مال" کی جگہ "محال" ہونا چاہیے۔

"ذکرِ لطیف قرۃ العین حیدر" کے عنوان سے انور سدید نے لطیف انداز میں قرۃ العین حیدر پر مضمون رقم کیا ہے۔ یہ مضمون معلوماتی اور فکری و فنی زاویوں سے مزین ہے۔ مضمون کے آخر میں انور سدید نے جو پیش گوئی کی ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔ انور سدید کے بقول:

> "انھوں نے اتنی ادبی فتوحات کیں کہ اب اردو کی سب سے بڑی ناول نگار شمار ہوتی ہیں۔ یقیناً 2007 میں وفات پا جانے کے باوجود اپنے اعلیٰ ادبی مقام پر قائم ہیں اور ان کے فن پر دوسرے تمام ناول نگاروں سے زیادہ لکھا گیا ہے اور لکھا جا رہا ہے"۔ (ص 16)

پروفیسر جمیل آذر نے، ملک مقبول احمد کی مرتب کردہ کتاب "شفیق احمد کا ادبی سفر" کے تمام مندرجات اور مرتب کی فنی مہارت کا تعارف اچھے انداز میں کروایا ہے۔ ملک مقبول احمد کی یہ کاوش پروفیسر شفیق احمد کے ادبی کارنامے قارئین کے سامنے پیش کرتی ہے۔ ستیہ پال آنند، ایوب خاور اور حمیدہ احمد کی نظمیں دل کو لگتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ حمیدہ احمد کی نظموں کو چاہت کی ہلکی ڈور پر چلنا نہیں آیا۔ بلاشبہ وہ پختہ نظم گو ہیں۔ محمد حامد سراج کا افسانہ "موچی جوتے پالش کر رہا تھا" اگر مجید امجد کے اس شعر کے تناظر میں دیکھیں تو واضح ہو جاتا ہے۔

میں روز ادھر سے گزرتا ہوں کون دیکھتا ہے ۔۔۔ میں جب ادھر سے نہ گزروں گا کون دیکھے گا (مجید امجد)

عہدِ حاضر میں افسانہ لکھنے کا جو گر ڈاکٹر رشید امجد کے پاس ہے وہ بہت کم افسانہ نگاروں کو میسر ہے۔ "گمرو دیکھتا" انوکھے زاویوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ "سگریٹ اور بکری" اعجاز جاوید کی سچی کتھا کی انوکھی کہانی پر مبنی ہے۔ حصہ غزل ایک جھلملاتی کہکشاں کی مانند ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے

حسرت کتاب زیست کا عنوان بن گئی ۔۔۔ مکمل مری تمام ہوئی دیکھتے رہے
(نکہت صابری)

مر گئے ہیں وہ جنھیں عہد وفا کا پاس تھا ۔۔۔ آ گئے ہیں وہ جنھیں سوداگری کا شوق ہے
(اسلم گورداسپوری)

مجھ کو وہ حسرتوں کی یوں تصویر کر گیا ۔۔۔ چڑیا کو [illegible] کی جاگیر کر گیا
(ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ)

"سفیرِ محبت ــــ اعزاز احمد آذر" کا خاکہ عذرا اصغر نے بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ برجستہ اور شگفتہ جملوں سے لوگوں

کے دل چھیننے والے انیس شاعر اعزاز احمد آذر کو خراج پیش کیا ہے۔ اسی طرح سرگودھا کے معروف شاعر پروفیسر ریاض کے نقوش جناب اخلاق عاطف نے ابھارنے کی سعی کی ہے۔ ملک مقبول احمد نے "ستارہ طاہرہ" کے علمی و ادبی نقوش واضح کیے ہیں۔ ملک مقبول احمد نے بہت سے ادیبوں کی کتب چھاپ کر ان کو سامان مہیا کیا ہے۔ وہ شاید لاہور کے واحد پبلشر ہیں جن سے ادیبوں کو اعزازیہ مانگنے کی نوبت نہیں آتی۔ امرتا پریتم کی بے چین روح کی عکاسی اظہر جاوید نے اپنے خاکے میں کی ہے۔ قارئین کے سامنے یہ خاکہ پہلی بار پیش ہوا ہے۔ "عاشق صبر طلب" کے عنوان سے ڈاکٹر رشید امجد کی آپ بیتی کی نویں قسط میں انھوں نے زندہ شخصیات (ڈاکٹر وحید قریشی اور وزیر آغا) پر پی۔ ایچ۔ ڈی کروانے کی ایک نئی روایت قائم کی ہے۔ ڈاکٹر اقبال بیتا اور علی اعوان کی سفرنامہ نگاری بھی تخلیق کے قارئین کے لیے دلچسپی کا باعث بنی ہوئی ہے۔ نثار احمد صدیقی کے مقالے سے رشید امجد کے تخلیقی گوشے واضح ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر محسن مگھیانہ اور ایس ایم معین قریشی نے اپنے اسلوب کی شگفتگی کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ آفتاب خان اور غالب عرفان کے تبصرے نئی کتابوں سے شناسائی کرواتے ہیں۔ سلمان اظہر جاوید نے تخلیق کو نیا تخلیقی آہنگ دیا ہے۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن (سرگودھا)

﴿13﴾ محترمی سلمان اظہر جاوید

تازہ شمارہ تخلیق نظر نواز ہوا۔ میری شادی کے بعد بھی یہ دوسرا شمارہ ہے جس میں میری کوئی غزل شامل اشاعت نہیں جب کہ میری اصل پہچان تو غزل ہی ہے اور اس شمارے میں جن شاعروں کی غزلیں موجود ہیں انھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تخلیق کے انتخاب کے معیار کو اہل پنجاب کے علاوہ اگر کوئی شاعر پسند آتا ہے تو وہ بھارت کا ہوتا ہے کراچی کے شعراء سے آپ کے حسن کو خدا واسطے کا بیر ہے۔ ہاں! جس طرح آٹے میں نمک ضروری ہوتا ہے اسی طرح بھولے بھٹکے ایک شاعر کسی طرح کراچی کا در آیا ہے تاکہ "مشتے نمونہ از خروارے کی مثال قائم ہو سکے"۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے اس خط کو دیکھ کر آپ کے احباب مجلس میری غزل کو اب کبھی بھی نہ چھاپیں گے۔ بہر حال۔ (ادارہ معذرت سے عرض گزار ہے کہ آپ کا یہ خیال حقیقت سے سراسر بعید ہے۔)

رشید امجد کا افسانہ "گھر دیکھنا" اس بار بھی عجیب تاثر دے گیا جس میں جنسی لذت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔ کیا ہو گیا ہے اتنے اچھے افسانہ نگار کو؟ ان کے افسانوں کو پڑھ کر تو آج کی نسل نے افسانہ لکھنا سیکھا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے ممکن ہے آپ کے مجلس کو ان کے ایسے ہی افسانے پسند ہوں" "گاہے گاہے باز خواں" "میں اظہر جاوید مرحوم کی پنجابی تحریر کا اردو روپ اچھا افسانہ تھا جو ان کے اپنے اسلوب کا پتہ دیتا ہے۔ طارق اصغر نے اعزاز احمد آذر کا خاکہ خوبصورتی سے کھینچا ہے۔ بالخصوص مرحوم کی برجستہ حاضر جوابی تو ان کی خوش مزاجی بن کر نظر سے گزری۔

اس بار ڈاکٹر امجد پرویز، زاہدہ خانم کی کھنکناتی آواز کے گرویدہ ہوئے اور خوب دادرہ ہوئے۔ کیا زمانہ تھا وہ بھی جب ہر دوسری فلم اس سریلی آواز سے معمور ہوا کرتی تھی! ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ معین قریشی کا فکاہیہ "چھینکوں کی کئی قسمیں غالب" فکاہیہ ہی نہیں بلکہ چھینکوں کا گوشوارہ بن کر سامنے آیا۔ بہت افسوس ہوا یہ دیکھ کر کہ ہماری قوم اپنی زندگی کے قیمتی لمحات کس طرح چھینکوں میں ضائع کر کے فخر محسوس کرتی ہے۔ میرے دونوں تبصرے شائع فرمانے کا شکریہ لیکن کئی جگہ کمپوزنگ کی غلطیاں دیکھ کر افسوس ہوا۔ میں ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ معین

قریشی کے خط کا شکر گزار اور مجھی عجیب عمر کے خط کا ممنون ہوں۔ میں احتجاجاً اس خط کے ساتھ اپنی کوئی تخلیق نہیں بھیج رہا ہوں۔ ہو سکے تو یہ خط بھی "انجمن خیال" میں نہ شائع کرنے کا اہتمام کریں تاکہ مجھے شکریے کا موقع ملے۔ امید ہے آپ بخیر و عافیت ہوں گے۔

غالب عرفان (کراچی)

﴿14﴾ - سوہان صاحب!

تخلیق کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا "پتے کی بات" ذہن و دل کے دریچے وا کرتی ہے۔ عدالت عظمیٰ نے تو اپنا فرض ادا کیا اب سیاسی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ قوم کو اردو کے ثمرات سے نوازے۔ مسلم شمیم کا مضمون "علامہ اقبال اور مسلم ثقافت کا بیانیہ" عمدہ اور معلومات سے بھرپور مضمون ہے۔ نظموں میں ستیہ پال آنند صاحب کی نظم "جسم کے بیا تھ روزن" پہ بات کرنے کی جسارت کروں گا۔ میرے ناقص فہم کے مطابق جسم کے تو (9) روزن ہوتے ہیں۔ ستیہ پال آنند صاحب قلم کے بہت اچھے شاعر ہیں اب پتا نہیں انہوں نے کون سے روزن کو در خور اعتنا نہ سمجھا۔ رشید امجد صاحب کا افسانہ "مکر و محنت" بہت عمدہ افسانہ ہے۔ انتہائی مختصر الفاظ میں اتنی بڑی حقیقت کو سمیٹنا ڈاکٹر صاحب کا کمال ہے۔ آغا گل کا افسانہ "کالے پانی میں ڈوبتا سورج" موضوع کی کہانی سے مناسبت نہیں ہے۔ افسانہ نگار نے ہیرو اور ہیروئین کے طبقاتی فرق کو دور کرنے کے لیے ہیرو کے چچا کے کردار کو وضاحت سے بیان کیا۔ اختتام بھی مضحکہ خیز ہے۔ "موچی جوتے پالش کر رہا تھا" میں حامد سراج صاحب نے بہت خوبصورتی سے کردار کے نفسیاتی رخ کی عکاسی کی ہے۔ اظہر جاوید کے افسانے "سگریٹ اور کھڑکی" کا حنیف باوا نے عمدہ ترجمہ کیا ہے۔

"تخلیق" کے اداریوں میں کئی بار اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ مدیر "تخلیق" غیر مطبوعہ تخلیقات کو جگہ دیتے ہیں لیکن اس شمارے میں شامل ستیہ پال آنند صاحب کی نظم "جسم کے بیا تھ روزن" سہ ماہی "فن زاد 7" جہلم کے شمارہ اکتوبر تا دسمبر 2015ء کے صفحہ 16 پر شائع ہو چکی ہے جب کہ آغا گل صاحب کا افسانہ "کالے پانی میں ڈوبتا سورج" "ماہنامہ الحمرا لاہور" کے دسمبر 2015ء کے شمارہ میں "چاند گرہن" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک ہی افسانہ دو جرائد میں دو مختلف ناموں سے شائع ہوا ہے۔ کہانی ایک ہے۔ اہل قلم حضرات کو اس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ ایک ہی تحریر مختلف جرائد کو نہ بھجوا کریں۔ یہ ادبی اخلاقیات کے خلاف ہے۔ ادارہ تخلیق ہمیشہ ایسے اہل قلم کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ ادارے کے لئے معیار اور غیر مطبوعہ مواد شائع کرنا پہلی ترجیح ہے۔

جمیل حیات (اٹک)

﴿15﴾ - محترمی سوہان اظہر جاوید!

ماہنامہ "تخلیق" نومبر 2015ء کا شمارہ موصول ہوا۔ "تخلیق" کے انتہائی سادہ اور دلکش ٹائٹل نے دل موہ لیا۔ سوہان صاحب لکھتے ہیں کہ رسالے کا اداریہ ادبی معاشرے کا عکاس ہوتا ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اداریہ کسی بھی رسالے کی پالیسی کا مظہر ہوتا ہے اور "تخلیق" اپنے مثبت اداریہ اور اپنی متوازن پالیسیوں کی وجہ سے ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہے۔ ڈاکٹر محمد شاہین محسوس اور حیات رضوی امروہوی کے حمدیہ اشعار پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔

ہو نام تیرا ہی دل کے اندر، ہو ذکر تیرا مرے لبوں پہ ہو اتنی تجھ سے مری چاہت کہ عشق بھی بے مثال دے تو

(ڈاکٹر محمد شاہین کھوسہ)

اے مالک جہان جب تیرے ہاتھ کے قبضے میں ہے نظام جہاں، موت اور حیات

(حیات رضوی امروہوی)

امین راحت چغتائی اور مرزا احمد نور طاہر نے بہت ہی عمدہ اور اچھے اچھے انداز میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حضور اپنے گلہائے عقیدت پیش کیے ہیں۔ ملاحظہ کیجئے۔

میں غلامانِ محمدؐ میں لکھا جانے لگا بن گیا نقشہ نیا راحت مری تقدیر کا

(امین راحت چغتائی)

جب میں جاؤں چوم لوں روضے کی جالیاں جو مقصدِ حیات ہے وہ گھر ہے سامنے

(مرزا احمد نور طاہر)

"پیر ارشریف اور علامہ اقبال کے جدِ اعلیٰ" امین راحت چغتائی کا بہت ہی زبردست اور معلوماتی مضمون ہے جس میں انہوں نے شیخ نورالدین نورشی کی سوانح عمری، ان کا شجرۂ نسب، خلافت اور ان کے مریدین (خلیفہ) کی تفصیل اور سرزمین پیرار شریف کی اہمیت کو بہت ہی اچھے انداز میں رقم کیا ہے۔

"مظفر علی ظفر ..... ایک بھولا بسرا عمدہ شاعر" ڈاکٹر خواجہ زکریا کا مظفر علی ظفر کے فن و شخصیت پر ایک خوبصورت مضمون ہے۔ اور اپنے اس مضمون میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے مظفر علی ظفر کی قربت میں گزرے لمحات کو نہایت ہی اچھے انداز میں قلم بند کیا ہے۔

"سعادت حسن منٹو ..... ایک شخص آپ" انور سدید کا بہت اچھا آرٹیکل ہے۔

"منٹو اپنے فن کی دنیا میں زندہ رہے گا منٹو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہے"

جمیل یوسف کا سید ضمیر جعفری کی شخصیت اور فن پر ایک جامع اور مختصر تحریر ہے۔ جس میں سید ضمیر جعفری سے جمیل یوسف کی محبت اور عقیدت واضح جھلکتی نظر آتی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں کہ:

"طلعت محمود: فوزل محمد نیگی کے افسانوی بادشاہ" کی آخری قسط پڑھ کر طلعت محمود کے بارے میں مکمل جان کاری حاصل ہوئی اس کا سارا کریڈٹ ڈاکٹر امجد پرویز کو جاتا ہے جن کی تحریر کی وجہ سے ہماری معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔

"ڈاکٹر وزیر آغا ..... نئے مکالمات کی روشنی میں" غالب عرفان کا ڈاکٹر وزیر آغا کی پانچویں برسی پر لکھا گیا مضمون خاص واقعی خاص ہے۔ جس پر غالب عرفان خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ منظومات میں ایوب خاور، ناصر بشیر اور توقیر مشتاق نے میدان مار لیا۔ "قصہ کالے اور پانے کا" "دیپک کنول (انڈیا) اور" ورق ورق بکھری زندگی" محمد طارق علی، اور "حریت پسندی کی جنگلی بیل" ڈاکٹر زین السالکین سالک، اور "مسلمان" جمیل حیات کے افسانے لائق داد ہیں جبکہ طاہر آفریدی کے افسانہ "ایسا ظلم تو کوئی نہیں کرتا" کا اردو زبان میں گوہر رحمان نوید نے اچھے انداز میں ترجمہ کیا ہے، وہاں اظہر جاوید کی پنجابی زبان میں تحریر "رنگ والی چڑیا" کا حنیف باوا نے قومی زبان میں نہایت ہی اچھے انداز میں ترجمہ پیش کیا ہے۔ جس پر وہ خصوصی مبارکباد کے مستحق ہیں۔ حسن عسکری کاظمی کا سید

شہباز گردیزی، پروفیسر زبیر کنجاہی، کنول فیروز، خورشید بیگ میلسوی، شہزاد نیّر، بشیر جعفر، آصف ثاقب (کیلی فورنیا)، اور رشیدہ عیاں (امریکہ) کی غزلیں بہت ہی اچھی تھیں جبکہ پنجاب رنگ میں سلیم شہزاد اور منیر وشاہد، آ سنا تحفہ کنول، چھائے رہے۔ آئندہ ملاقات تک اجازت۔

سیّد مبارک علی شمسی (بہاول پور)

16# مکرمی سونان اظہر صاحب!

دسمبر کا شمارہ بروقت ملا۔ اس شمارے کا ٹائٹل (سرورق) انتہائی خوبصورت دکھائی دیا۔ اس تخلیقی مور کو دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ جنگل میں مور ناچا ہم سب نے دیکھا۔ پہلی بات میں ملوحتوں کی قومی زبان سے بے اعتنائی اور انجام واک کی زبوں حالی کا جو ا کھڑا آپ نے زبانِ خلق میں بیان کیا ہے اسے نقارہ خدا سمجھتا وقت کی آواز ہے۔ اگر یہ آواز اب کی بار دب گئی تو کہیں بقول شاعر ''لمحوں کی خطا کی صدیوں نے سزا پائی'' ہی ثابت نہ ہو۔ حمد و نعت شان کبریائی اور رسول کی مدح سرائی سے بھرپور دکھائی دیں۔ چاروں مضامین اور افسانے چونکہ منجھے ہوئے تخلیق کاروں نے لکھے لہٰذا ان تحریروں میں معلومات کی فراوانی اور روانی کہانی کی چاشنی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ''تحفہ'' گوکے تو اب لینڈ لیڈی کا سٹریٹ اور تجری ایسے افسانوں کی کہانیاں رواتی ہونے کے باوجود اچھوتی دکھائی دیں۔ پانچوں خاکوں میں متعلقہ شخصیات کی خوبیوں کو جسے حسین انداز میں بیان کیا گیا ہے تاہم امرتا اور جہری صاحب کے خاکہ نگاران دو شخصیات کے کئی مخفی پہلو بھی فنکارانہ چابکدستی سے سامنے لائے۔ عاشقی صبر طلب میں ڈاکٹر رشید امجد نے بڑے دلیرانہ انداز میں شمل کے لابریرین کی کلاس لی جبکہ ڈاکٹر اجمل نیازی نے سورج کے رخ پر پرواز کرتے ہوئے اپنی تحریوں کا رخ ہسپتالوں میں مریضوں کی طبقاتی تقسیم کی طرف موڑ کر ہمارے نظامِ صحت کو خوب جھنجھوڑا۔ ''عراق اشک بار ہیں ہم'' میں سلمٰی اعوان نے جو منظر کشی پیش کی ہے اسے پڑھ کر اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہو کہ ''اشک رواں کی نہر ہے اور ہم ہیں دوستو''۔ ڈار صدیقی کا رشید امجد سے مکالمہ اور وحشی سعید کا ''ملک کا آخری بادشاہ'' معلوماتی اور دلچسپ تحریریں دکھائی دیں۔ ڈاکٹر امجد پرویز کا زبیدہ خانم پر لکھا مضمون عاشقانِ موسیقی کے دلوں کو چھوتا محسوس ہوا۔ ڈاکٹر صاحب موسیقی کی دنیا کے ایک ایسے مستند لکھاری ہیں جن کی ہر تحریر پی ایچ ڈی کا مقالہ دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کی گدگداتی تحریر چٹکیوں کی کیں غالب پڑھ کر اندازہ ہوا کہ دراصل وہ کہنا کیا چاہتے تھے کہ انھوں ۔۔۔۔ ۔ ڈاکٹر محسن مگھیانہ کی برف کو پڑھ کر ہمارے ماضی کی یادیں بھی برف کی طرح پگھلنے لگیں اور یوں ہم نے اپنے آپ کو Pre Fridge دور میں پایا۔ نسیم سحر کا جائزہ قاری کو چونکانے میں کامیاب رہا۔ تبصرے اور تخلیق پر لکھے شذرے بھی پڑھنے کے لائق تھے۔ حسن خیال میں ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، غالب عرفان، نجیب عمر، ڈاکٹر سکندر مغل، دردانہ نوشین خان اور ریاض اللہ فہیم کی خیال آرائیاں سوچوں کے نئے دروا کرنے میں کامیاب دکھائی دیں۔ آخر میں ہم ریاض اللہ فہیم کے اس خیال کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں کہ تخلیق کا انداز قاری پر چھوڑ دینا چاہیے۔ پروفیسر زبیر کنجاہی اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ خدا ان کے درجات بلند کرے۔ سچ پوچھیں تو مجھے ان کی موت کا دلی دکھ ہوا۔ تخلیق ایک منجھے ہوئے لکھاری سے محروم ہو گیا۔

ایم ڈی ملک (راولپنڈی)

﴿17﴾ محترم جناب سونان اظہر جاوید صاحب

السلام علیکم۔ آپ کا پیارا ماہنامہ "تخلیق" تقریباً 3 ماہ کے بعد ملا ہے۔ مضامین سب اچھے ہیں۔ افسانے بھی معیاری ہیں۔ مگر غزلیں ؟؟؟ پہلی غزل ہی جو کہ ملک کے ایک نامور لکھاری یعنی ظفر اقبال صاحب کی ہے پھیکی اور کمزور ہے۔ ظفر اقبال صاحب ایک بڑے کہنہ گو شاعر معروف ہیں۔ مگر ضروری نہیں کہ ان کی ہر غزل ۔۔۔ غزل کے معیار پر ہو۔ ایسی غزلیں قارئین کے ساتھ سراسر بے انصافی ہے۔ جناب اسلم گورداسپوری۔ ابصار عبدالعلی، کنول فیروز، ڈاکٹر ایوب ندیم، طاہر منظور، رشیدہ ماہین ملک، کنول صابری اور تشکیلہ لطیف کی غزلیں معیاری ہیں۔

ایم رفیق ارم (فیصل آباد)

﴿18﴾ سونان اظہر جاوید صاحب!

بہت عرصے بعد لکھ رہی ہوں۔ اظہر جاوید بھی نہ بھولنے والی شخصیت تھے۔ جس نے ہمیشہ دلوں میں ذہنوں پر راج کیا۔ محبت پیار سے بھرپور۔ آپ کے ابا جان، اظہر کی تخلیق، نے کیا کیا رنگ دکھائے، بیان نہیں کر سکتے۔ "تخلیق" نے دوبارہ جنم لیا۔ بے حد اچھے مضامین۔ شاعری۔ افسانے۔ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اظہر جاوید کی تحریر امرتا پریتم ہم سب کی پیاری بہت پیاری ہے لیکن روح کیا خوبصورت تحریر ہے۔ وحشی سعید کے افسانے پر ظہیر انصاری نے اچھا تجزیہ کیا ہے۔ شاعر و رشیدہ عیاں، ایوب خاور، پروین شیر، فوقی، تسنیم کوثر جواب نہیں تمہارا۔ آذر، بہت یاد آئے کس کس کی تعریف کروں۔ اور تخلیق ہمیشہ تخلیق کرتا رہے کامیابی کے ساتھ۔

زرّیں سلیمان پتا (لاہور)

﴿19﴾ محترم سونان صاحب!

دسمبر کا "تخلیق" ملا۔ سرورق اس قدر دلکش ہے کہ بس جیسے کچھ دیر اسے ہی دیکھتے رہ جاتی ہیں۔ مور قص مور کے پورٹریٹ میں مور کے قدرتی رنگوں سے زیادہ ورنگ اشارہ کرتے ہیں کہ یہ سب اصناف ادب کی بوقلمونی کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ بے شک جمالیاتی برتری (aesthetic excellence) اور اعلیٰ ذوق کے حامل سرورق کی تخلیق میں "تخلیق" بہت سے ادبی رسالوں سے آگے ہے۔ ادبی رسالوں کے قاری کم ہیں لیکن اچھے سرورق نئے قارئین کے لیے کشش پیدا کر سکتے ہیں۔

دسمبر کے شمارے میں نظم و نثر، دونوں ہی شعبے اپنے روایتی معیار کی غمازی کر رہے ہیں۔ جناب غالب عرفان کی حمد اور پروفیسر افتخار ساجد کی نعت میں عقیدت کا قرینہ متاثر کن ہے۔ اچھی غزلوں میں سے یہ اشعار زیادہ اچھے لگے:

ممکن ہے کہ منزل کہیں مل ہی جاتی   اپنے رستے کے اگر آپ ہی رہبر ہوتے

(امین راحت چغتائی)

یہ نہیں معلوم کیسے زندہ رہنا چاہیے   دیکھنے میں ہر کسی کو زندگی کا شوق ہے

(اسلم گورداسپوری)

جس میں ہم اور تم برابر ہیں ہم فقیروں کا ایسا ڈیرا ہے
(کنول فیروز)

مدت سے ایک چاک پہ ہے رقص میں حیات وہ کوزہ گر کچھ اس طرح تسخیر کر گیا
(محمد شاہین کھوسہ)

ملی ہے اس کو ہمیشہ بہت پذیرائی لکھا ہے جب بھی کوئی حرف عذرا اصغر نے
(مرزا احمد نور طاہر)

جس زمانے میں نہ ہو گا کوئی محروم بہار اس زمانے کے تو آثار نظر آنے دو
(ڈاکٹر ایوب ندیم)

ان کو میں سمجھاؤں کا بچے پالے لوگ ہیں
(مظفر اقبال)

محترمہ عذرا اصغر نے اعزاز احمد آذر کے خاکے کو عنوان خوب دیا ہے۔ "سلطنتِ محبت" یہ خود وضاحتی عنوان ہے جو مرحوم کی ذات کے بارے میں ہم سب کی ترجمانی کرتا ہے۔ آذر مرحوم سے دوستی اور وابستگی ادب و شعور تحریرات کے محبوب ہیں۔ عذرا اصغر صاحبہ نے مرحوم کی ذات سے وابستہ صفات کو تحسین آمیز اسلوب سے سپردِ قلم کیا ہے۔ طنز و مزاح کے حصے میں محترم ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کا مضمون "چھٹیوں کی کمی نہیں غالب" ہمارے قومی باطن کی بہت سی کوتاہیوں اور کام چوریوں سے پیدا ہونے والے مسائل پر سنجیدگی سے فکر کرنے کا در کھولتا ہے۔ کون کہتا ہے ہم مفلس قوم ہیں۔ وقت بڑی دولت ہے اور یہ ہمارے پاس وافر ہے اور ہم (بقول معین قریشی) بطور رنگیلی قوم اسے بے حسی کے ساتھ لٹاتے ہیں۔ زیر تذکرہ مضمون کا عنوان غالب کے ایک مصرع کی پیروڈی پر قائم کیا گیا ہے۔ جیسے میں معین قریشی صاحب کے مصرع طرح پہ غالب کی جگہ طالب کا تصرف کرتے ہوئے مصرع لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔

چھٹیوں کی کمی نہیں طالب اک طلب پہ ہزار ملتی ہیں

چھٹیوں کے اعتبار سے ہمارا قومی کیلنڈر بڑا فراخ دل ہے۔ دروغ برگردنِ راوی ہر نئے سال کے کیلنڈر میں ایک آدھ سیاسی، دینی اور آفت زدہ اضافی چھٹی ضرور جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اور یہ ایسی بابرکت چھٹی ہوتی ہے اس کے آگے پیچھے دو چار مزید ہنگامی اور دیگر چھٹیاں بھی [illegible] کے طور پر شامل ہو کر تعطیلات کے دورانیے کو چھٹیوں کی بارات بنا دیتی ہیں۔

اس سال نومبر میں علامہ اقبال کی یوم پیدائش کی چھٹی نہیں دی گئی۔ ایسا لگا نہ معلوم قوم کا کون سا بنیادی حق مار دیا گیا کہ ہر طرف ہر مد اور میڈیا سے احتجاج اور حکومت پر لعن طعن برستی ہوئی سنائی دی۔ مجھ سے پوچھا گیا کہ کیا اسکولوں اور دفاتر میں سرکاری طور پر اس چھٹی کا ختم کیا جانا درست تھا؟ اور کیا اس طرح علامہ اقبال کی قومی اور بین الاقوامی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی؟ میں نے جواب دیا "بالکل نہیں" تو لوگوں کو یقین نہ آنے کی حد تک حیرانی ہوئی۔ میں نے اپنی رائے اسی بنیاد پر دی تھی جو معین قریشی صاحب کے مضمون کی روح ہے۔ انہوں نے شماریاتی انداز تحریر اختیار کرتے ہوئے خاصا تحقیقی "مقالہ" لکھ ڈالا ہے۔ اس میں اتنا اضافہ کرنا چاہوں گا کہ دنیا کی ترقی یافتہ قومیں ہفتہ میں دو دن چھٹی کرتی ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہاں بجلی کا کال ہے بلکہ اس لئے کہ انہوں نے

ذریعے منصوبہ بندی سے ماضی میں اتنا کام کر لیا ہے اور اب بھی کر رہے ہیں کہ وہ ہفتہ میں دو دن کی چھٹی افورڈ کر سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ کام چوری ان کا شعار نہیں ہے۔ ہم ابھی اور نہ جانے کب سے ترقی پذیر قوم ہیں مگر ہم ہفتہ میں ڈھائی (بلکہ اکثر پونے تین) دن کی چھٹی کرتے ہیں۔ ہفتہ اتوار پوری اور جمعہ کو آدھی یا تین چوتھائی چھٹی ہم مذہب کے نام پر کرتے ہیں۔ اس مذہب (اسلام) کے نام پر جس میں رزق حلال کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے اور رزق حلال مطلوبہ دیانت اور محنت کے بغیر ممکن نہیں۔ رہی علامہ اقبال کی یوم پیدائش کی چھٹی تو کچھ لوگ حکومت پر الزام تراشی کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اس طرح حکومت نے نہ صرف ہمارے قومی شاعر کی اہمیت کم کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ حکومت یہ بھی چاہتی ہے کہ نوجوانوں اور طلباء کو علامہ اقبال کی قومی خدمات کے بارے میں بے خبر رکھا جائے۔ بہت خوب۔ آپ اسکولوں اور دفاتر میں شوق سے چھٹی دیجئے تو کیا لوگ اس چھٹی کے دن لائبریری، ٹیلی ویژن اور سیمیناروں میں جا کر علامہ اقبالؒ کے بارے میں اپنے علم اور عقیدت میں اضافہ کریں گے؟ ہرگز نہیں بیشتر لوگ سو کر اور پکنک منا کر اور نوجوان (خصوصاً طلباء) سڑکوں پر ون ویلنگ، نہر پر تیراکی اور دوستوں سے گپ شپ میں وقت گزاریں گے۔

میں نے عرض کیا علامہ اقبالؒ کی یوم پیدائش کے دن نہ صرف یہ کہ چھٹی نہ دی جائے بلکہ اسکولوں میں طلباء و طالبات کی حاضری یقینی بنائی جائے اور ایک خاص پیریڈ میں علامہ اقبالؒ کے بارے میں ''لیکچر'' ''کوئز'' تقریری مقابلے یا علامہ کے اشعار کی صحیح ریڈنگ کے انعامی مقابلے کروائے جائیں۔ علامہ اقبالؒ کی بہو محترمہ جسٹس (ر) ناصرہ جاوید اقبال بھی میرے برابر والی نشست پر تشریف رکھتی تھیں۔ انہوں نے بھی میرے موقف کی تائید کی کہ اس چھٹی کو معمول کے مقابلے میں دوگنا کام کر کے اپنے قومی شاعر اور تصور پاکستان کے خالق کو نہ صرف عقیدت پیش کیا جائے بلکہ نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کرنے کے نتیجہ خیز عمل کا آج ہی سے آغاز کر دیا جائے۔ کیا خیال ہے ''تخلیق'' کے معزز قارئین کا؟

انصار عبدالعلی (لاہور)

◆◆◆

نیا سلسلہ

بین الاقوامی دوستوں کے رابطے کے لئے چند معروف لکھاریوں کے فون نمبر اور پتے

	نام لکھاری	فون نمبر	پتہ خط و کتابت
1-	عطاء الحق قاسمی	0333-4545637	کالم کالونی ای۔ ایم۔ ای ہاؤسنگ کالونی، ملتان روڈ، لاہور (پاکستان)
2-	ڈاکٹر اجمل نیازی	0300-8858470	6/D، وحدت کالونی، وحدت روڈ، لاہور (پاکستان)
3-	ڈاکٹر رشید امجد	03345164855	52C، گلی 7/A، گلستان کالونی، راولپنڈی (پاکستان)
4-	اوریا مقبول جان	03009385284	20۔ کلب روڈ، جی۔ او۔ آر، مال روڈ لاہور (پاکستان)
5-	ظفر اقبال	03334374597	68-B، جی۔ او۔ آر، شادمان، لاہور (پاکستان)

ماهنامه 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اسی لئے تمام رسائل اور کتب کے نام اس لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ نیرنگ خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ: سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ اطراف کراچی مدیر اعلیٰ: محمود شام 0321-8210736	ماہنامہ شاداب لاہور مدیر: ڈاکٹر کنول فیروز 0301-4123707
سہ ماہی دستک مری مدیر اعلیٰ: محمد آصف مرزا 03217426898	ماہنامہ سپوتنک لاہور مدیر اعلیٰ: آغا امیر حسین 0300-8440444	ماہنامہ حکایت لاہور مدیر: عارف محمود 0323-4329344
ماہنامہ ادب لطیف لاہور چیف ایڈیٹر: صدیقہ بیگم 0300-8479444	ماہنامہ چہار سو راولپنڈی مدیر مسئول: گلزار جاوید 0300-5176062	ماہنامہ اقرا لاہور مدیر: شاہد علی خان 0301-4001844
سہ ماہی سانجھاں لاہور مدیر: تنویر ظہور 0300-4426314	ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر: عمران منظور 0300-8430043	ماہنامہ کتاب اسلام آباد مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر انعام الحق 0300-9500936
ماہنامہ انشاء کلکتہ انڈیا مدیر: ف س اعجاز 0091-3322354616	ماہنامہ شاعر ممبئی انڈیا مدیر: افتخار امام صدیقی 0091-932451517	سہ ماہی انتساب انڈیا ایڈیٹر: سیفی سرونجی 0091-942564177
ماہنامہ ماہ نو لاہور نگران اعلیٰ: شفقت جلیل 042-35941405	ماہنامہ قومی زبان مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان 02134811406	ماہنامہ جیب کراچی مدیر: شمیم بدایونی 0333-2166968
ماہنامہ روشنائی کراچی مدیر: احمد زین الدین 0321-2011595	ماہنامہ ہمدرد نونہال مدیر: سعدیہ راشد 042-36620949	سہ ماہی لوح مدیر: بیگم ناز زیدی 0333-4722999

ماهنامه 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1-	تقاریر اقبال	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	0323-67577931	بک کارنر جہلم	400/-
2-	شیخ ابراہیم کا ادبی سفر	ملک مقبول احمد	042-37233165	مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ لاہور	450/-
3-	ہوٹل سے کشمیری شال	محمد عثمان	021-35848882	517۔ فیصل ٹاؤن لاہور	250/-
4-	اردو ناول کے ...	ڈاکٹر ممتاز احمد خان	021-34811406	فضلی بک سپر مارکیٹ کراچی	350/-
5-	لفظوں کی خوشبو	صدیق شاہد مرزا	042-35858498	... 40۔ ماڈل ٹاؤن لاہور	500/-
6-	خواب دیکھا کرو	حسن عسکری کاظمی	042-37220761	اظہار سنز، 19۔ اردو بازار لاہور	300/-
7-	ہوا کے کالمات	حسن عسکری کاظمی	042-37220761	رضا سنز پرنٹرز لاہور	300/-
8-	بکھرے موتی	عزیز جبران انصاری	0300/0312919	جبران اشاعت گھر ... کراچی	500/-
9-	... حمید نظامی	ڈاکٹر اجمل نیازی	042-99230518	"حمید نظامی فکر" ادارہ علوم ابلاغیات	200/-
10-	علامہ رشک ترابی	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	048-37111717	نظریہ پاکستان اکادمی سرگودھا	1000/-

◆◆◆

قوم کی ترقی...
ایک جذبہ، ایک ذِمہ داری
اور ہم یہ ذِمہ داری
بخوبی انجام دے رہے ہیں
PSO
Pakistan State Oil
Ta'aluq Care Line: 0800-03000 | Website: www.psopk.com | UAN: 111-111-PSO (776) | /PSOCL

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE
CPL NO. 96

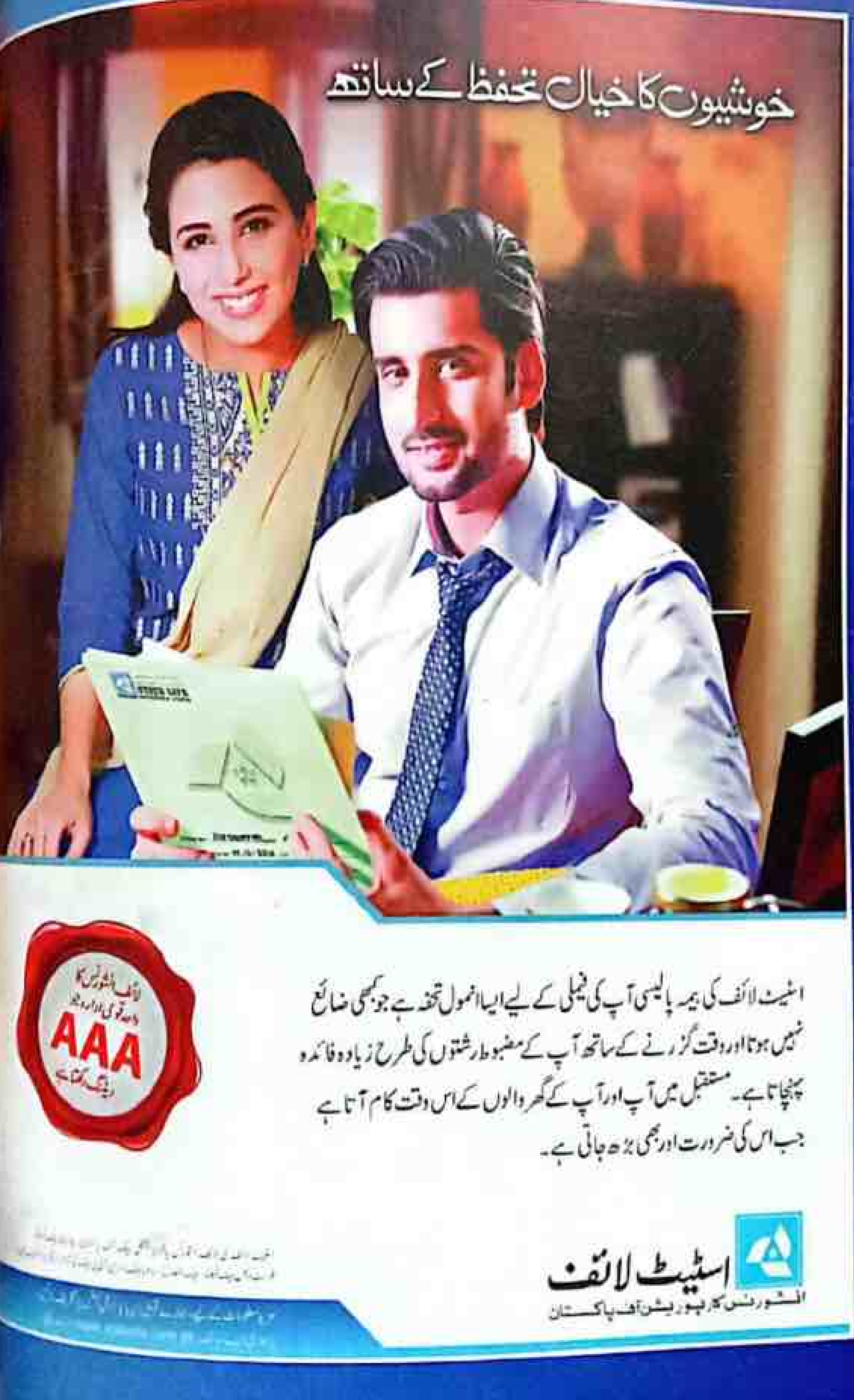

تخلیق
ڈاکٹر انور سدید نمبر

انور سدید نمبر

مسلسل اشاعت
47
واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصہ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 47 | جون 2016ء | شمارہ : 6 | CPL نمبر 96

قیمت : 200 روپے ——...... 750 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر —— ہندوستان کے لیے 1,200 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor) Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

فون نمبر: 04237187500، 04236671007 —— موبائل فون: 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

نشیر جہاں (امریکہ) —— ناشی ظہیر (امریکہ) —— نارنگ ساقی (انڈیا) —— جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جان آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود — میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا ہے اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ ہم ہے تو ''تخلیق'' ہمیشہ رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''صریر''، ''تحاریر'' اور ''طلوع افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا۔ (انشاءاللہ) جو مدیر اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقان تخلیق کے تعاون کی مرہون منت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔ ''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہل ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہل دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہل دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کے مضامین کے انتخاب کے لیے ''تخلیق پینل'' تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے اور چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں ''تخلیق'' کے اعزازی ذمہ داری محترمہ نیر جہاں، تاشی ظہیر، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسب سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زر تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زر سالانہ صرف 1,200 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

U.S.A.
Nayyar Jahan
2740 South Barrington
AVE Los Angles
C.A. USA
Ph: 0013102960363
Email: Zjahan@hotmail.com
urdu@urdu-markaz.com

U.S.A.
Tashie Zaheer
7828 Fairfield Court Cupertino
California
U.S.A.
Ph: 0014087802297
Email: tzaheer@gmail.com

INDIA
K.L. Narang Saqi
C-4-Connaught Circus, New
Delhi-110001, India
Ph: 0091-4237858
Email: narangsaqi@gmail.com

PAKISTAN
Javed Manzoor
78-Islam Block, Azam Garden,
Multan Road, Lahore
Ph: 0423754232
Cell: 0300-4445327
Email: [illegible]

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

ترتیب

پہلی بات	سلطان اظہر جاوید	5
حمد و نعت		
حمد باری تعالیٰ	نورین طلعت عروبہ	7
نعت رسول مقبولؐ	جمیل حیات	7
نعت رسول مقبولؐ	سید ریاض حسین زیدی	7
تعارف نامہ		
ڈاکٹر انور سدید	ادارہ تخلیق	8
فن، شخصیت اور تاثرات		
مولوی نذیر احمد	ڈاکٹر انور سدید	13
انور سدید کی ایک ـــ	ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا	18
انور اور ادب	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	22
ایک مثالی کتاب ـــ	نجم الحسن رضوی	28
انور سدید نامہ ـــ	حسن عسکری کاظمی	31
انور سدید ایک تجزیہ ـــ	سعادت سعید	34
ڈاکٹر انور سدید ـــ	پروفیسر قیصر نجفی	39
انور سدید اور سرگودھا کالج	سرفراز سید	41
انور سدید کی علمی ـــ	سلیم آغا قزلباش	46
انور سدید کی یاد ـــ	نذیر فتح پوری	49
تحسین اردو ادب ـــ	شاہد شیدائی	51
ادب کے ان تھک ـــ	اخلاق عاطف	56
انور سدید ـــ یادیں اور باتیں	مظفر حسن منصور	60
آہ! ڈاکٹر انور سدید	اشرف ذکی	62
چنار علم و ادب	ملک مقبول احمد	64
ہم سب کے انور سدید	مسعود مفتی	68
اردو ادب کے ان تھک ـــ	سکندر حیات میکن	74
عمر وسیلہ [illegible] ہے	شاہد بخاری	77
ڈاکٹر انور سدید اور تخلیق	قمر زمان	80
یادیں		
صاحب علم، صاحب قلم ـــ	سہیل اعوان	85
ڈاکٹر انور سدید ـــ	قمر ریاض	87
کون ڈاکٹر انور سدید؟	سلطان اظہر جاوید	89
میرے ابا جی (ایک مختصر تعارف)	مسعود انور	94
تعزیتی کالم		
انور سدید جیسے لوگوں ـــ	بشریٰ اعجاز	97
دبستان علم و فن کا ـــ	ڈاکٹر زاہد حسن چغتائی	99
ڈاکٹر انور سدید بھی جنت ـــ	خالد مجید ہاشمی	101
ڈاکٹر انور سدید کی یاد میں ـــ	اظہر سلیم مجوکہ	103
ایک اور چراغ بجھ گیا	تنویر قیصر شاہد	105
منظومات		
زندگی کی بیاض سے دوری	پروین شیر	107
کون کسے پہچانے گا؟	شیر طراز	
ڈاکٹر انور سدید ـــ	ریاض ندیم نیازی	
اک چراغ اور بجھا	شجاعت علی راہی	
شہر فکر کا وزن تھا ـــ	نعیم واحد	
محترم مرزا ڈاکٹر انور سدید ـــ	توقیر مشتاق	108

جائزے

انور سدید کی غزل	پروفیسر جمیل آذر	109
"قلم کے لوگ"	شفیع ہمدم	112
"وزیر آغا شناسی"	محمد علی چراغ	116

پنجاب رنگ

انور سدید ہوراں لئی	سلیم شہزاد	119
ادب دا پاندھی	حنیف باوا	119

معمولات

رپورٹ

ڈاکٹر کیول دھیر	ادارۂ تخلیق	120

مضامین

سید قیس: ایک طارق	مسلم شمیم	121
ابصار عبدالعلی	عذرا اصغر	127

افسانے

مزار	ڈاکٹر رشید امجد	130
سلطے کی لات	صوفی بیدار	133
میک اپ والی	اظہر جاوید	139

یادنگاری

یادیں گلاب	میجر غلام نبی اعوان	142

غزلیں

سید منظور حسین یاد، امجد اسلام امجد، حسین مجروح، منفعت عباس رضوی، محمد ممتاز راشد، ڈاکٹر نجمہ شاہین 145–146

انجمن خیال

مسلم شمیم، آصف ثاقب، نسیم سحر، احسان بن مجید، عذرا اصغر، ڈاکٹر سکندر حیات، صائمہ نورین بخاری، مظفر حسین منصور، رشید آفریں، ڈاکٹر محمد ایوب، آفتاب خان، ایم ڈی ملک، توقیر احمد، نجیب احمد، عزرا جاوید 147–159

تخلیق کو موصول رسائل اور کتب

ملکی اور غیر ملکی 160

سرورق
ایس خالد

ناشر: سونان اظہر جاوید
طابع: بیدار سرمدی
قانونی مشاورت: لطیف احمد قریشی
مطبع: نگسن پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور
مقام اشاعت:
H. No. E/12, Sheraz Villas, Islamnagar,
Walton Road, Lahore -Cantt

(ڈیزائننگ کے متعلق تحریر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی بات

''تخلیق'' کے تمام قارئین کو رمضان المبارک۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مبارک مہینے کی رحمتوں اور برکتوں کو سمیٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ تمام احباب سے درخواست ہے کہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور ساتھ ہی ڈاکٹر انور سدید کی مغفرت کے لیے دعا کرتے رہیں۔

20 مارچ 2016ء بروز اتوار سوشل میڈیا پر ڈاکٹر انور سدید کی وفات کی دل سوز خبر پڑھی تو دل پر قابو نہ رہا۔ بے اختیار آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا مہربان چہرہ آنکھوں کے سامنے چھا گیا ان کی وہ تمام مہربانیاں اور رہنمائیاں یاد آنے لگیں جو ماہنامہ ''تخلیق'' کو جاری رکھنے میں میری معاون رہیں۔ سوشل میڈیا پر لوگ ڈاکٹر انور سدید سے عقیدت اور محبت کے اظہار کے طور پر تصاویر اپ لوڈ کر رہے تھے، جن میں وہ لوگ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ موجود تھے، لیکن افسوس صد افسوس ان تمام احباب میں سے کوئی ایک عقیدت مند بھی ڈاکٹر صاحب کے آخری سفر پر ان کے جنازے کو کاندھا دینے کے لیے موجود نہ تھا۔

فروری 2012ء میں جب میں نے ''تخلیق'' کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تو جس انسان نے سب سے پہلے مجھے شاباش دی اور اپنی طرف سے ہر قسم کے قلمی تعاون اور رہنمائی کی یقین دہانی کرائی وہ ڈاکٹر انور سدید تھے۔ آپ آخری سانس تک اس عہد پر قائم رہے اور ''تخلیق'' کو روز بروز بہتر بنانے کے لیے اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ ادبی دنیا کے رنگ ڈھنگ اور احباب کی حوصلہ شکن باتوں سے پریشان ہو کر جب میں ڈاکٹر صاحب سے حالِ دل بیان کرتا تو ڈاکٹر صاحب نہ صرف میری حوصلہ افزائی کرتے بلکہ میرے اندر اس مشن کو دنیا کی طرف سے تمام اعتراضات کا مقابلہ کر کے جاری و ساری رکھنے کا جذبہ پیدا کر دیتے۔

مارچ 2013ء میں ''تخلیق ایوارڈ'' کے لیے ڈاکٹر صاحب کو نامزد کیا تو انھوں نے بھرپور خوشی کا اظہار کیا اور ایوارڈ اپنی نشست کے سامنے والی دیوار پر لگا دیا جو ہر وقت ان کی نظر کے سامنے رہتا۔ بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کو بے شمار ایوارڈز ملتے رہے لیکن وہ احباب سے خاص طور پر ''تخلیق ایوارڈ'' کا ذکر کرتے اور خوشی کا اظہار کرتے جو ''تخلیق'' کے لیے اعزاز کی بات ہے۔

اپنی ادارت کے پانچ سالوں میں جب بھی والد صاحب اظہر جاوید کی برسی کی تقریب منعقد کرائی تو ڈاکٹر صاحب علالت کے باوجود تشریف لائے اور ''تخلیق'' کی جانب سے منعقد کردہ تمام تقاریب میں شرکت کرتے رہے۔ اس سال 14 فروری 2016ء کو جب آرٹسٹ ریسٹورنٹ لاہور میں اظہر جاوید کی چوتھی برسی کی تقریب منعقد کی گئی تو میں نے ڈاکٹر صاحب کی ناسازیٔ طبع کے پیشِ نظر ان سے کہا کہ آپ اس بار تقریب میں تشریف نہ لائیں، آپ کی صحت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ یہ سنتے ہی غصے میں آ گئے اور کہنے لگے ''بے شک میں بیمار ہوں لیکن کیا کبھی ماضی میں ایسا ہوا ہے کہ اظہر جاوید کی برسی کی تقریب میں نہ آیا ہوں یا ''تخلیق'' کی جانب سے منعقدہ کسی تقریب میں شرکت نہ کی ہو؟ میں اب بھی ضرور آؤں گا'' اور علالت کے باوجود وہ تقریب میں تشریف لائے بلکہ سب سے پہلے آنے والے مہمان بھی وہی تھے۔ اس دن وہ ایک اظہر جاوید اور اپنی دوستی کے قصے سناتے رہے اور پرانی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔

تقریب کے آغاز سے پہلے جب میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ اسٹیج پر مہمانِ خصوصی کے طور پر تشریف رکھیں گے تو

گزشتہ پانچ سالوں میں یہ پہلی بار تھا کہ انھوں نے مجھ سے اپنی کسی خواہش کا اظہار کیا ہو۔ کہنے لگے کہ "میں اسٹیج پر ضرور بیٹھوں گا لیکن آپ مجھے محترمہ بانو قدسیہ کے ساتھ والی نشست پر بٹھایئے گا۔" باوجود اس کے کہ ادبی دنیا میں ان کا اپنا مقام بہت بلند ہے، محترمہ بانو قدسیہ کے ساتھ ان کی یہ عقیدت دیکھ کر میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ میں نے ان کا ہاتھ پکڑا اور اسٹیج پر لے گیا، بانو قدسیہ صاحبہ کے ساتھ والی نشست پر بٹھایا۔

تقریب کے اختتام پر مجھے اپنے پاس بلا کر کہنے لگے "سونان! مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ آج کی تقریب نے میری آدھی بیماری رفع کر دی ہے۔ آپ نے بہت بھرپور تقریب کا انعقاد کیا ہے۔ میں تمام احباب خصوصاً محترمہ بانو آپا سے مل کر بہت خوش ہوا ہوں۔ میں نے ایسی منظم اور معیاری ادبی تقریب آج سے پہلے نہیں دیکھی۔" ان کی جانب سے تعریف سن کر مجھے بہت خوشی ہوئی میں نے جواباً عرض کیا "انشاءاللہ اگلے سال جب آپ تقریب میں تشریف لائیں گے تو اور جوان ہو جائیں گے۔" وہ مسکرانے لگے۔ آہ! مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ تقریب ان کی زندگی کی آخری تقریب ہوگی اور اب "تخلیق" کی تمام تقاریب ان کے بغیر ہوں گی— !!

پاک و ہند کا شاید ہی کوئی ادبی جریدہ یا کتاب ہو جو ڈاکٹر صاحب کی نظر سے نہ گزرتی ہو۔ آپ بے شمار رسائل میں باقاعدگی سے لکھتے رہے اور متحرک اور فعال زندگی گزاری۔ صرف مجلہ "تخلیق" میں گزشتہ پانچ سالوں کے دوران (2012ء تا مارچ 2016ء) 19 مضامین، 32 کتابوں پر تبصرے، 7 جائزے، 3 خاکے، 3 نظمیں، 4 غزلیں اور 11 خطوط تحریر کیے جو کہ آپ کے بہت متحرک اور فعال لکھاری ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید جیسے قلم کار کئی صدیوں بعد جنم لیتے ہیں۔ میں بحیثیت مدیر "تخلیق" عہد کرتا ہوں کہ جس طرح والد صاحب کی یاد کو لوگوں کے دلوں میں آج تک روشن رکھے ہوئے ہوں، ڈاکٹر صاحب کی یاد کا دیا بھی کبھی بجھنے نہیں دوں گا۔ جس طرح موجودہ دور کا لکھاری آپ کی تحریروں سے فیض یاب ہو رہا ہے، آنے والے دور کے لکھاری بھی ڈاکٹر صاحب کے کام سے فیض حاصل کرتے رہیں گے۔ اس حوالے سے یہ اہم بات بھی بتانا ضروری ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کی نایاب اور کثیر غیر مطبوعہ تحاریر کی فائلز "تخلیق" کے پاس موجود ہیں جن میں سے ہر شمارے میں کوئی نہ کوئی تحریر شامل اشاعت ہوتی رہے گی۔ اس طرح "تخلیق" اور پڑھنے والوں کو بھی ڈاکٹر انور سدید صاحب کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔ اور ساتھ ہی درخواست کروں گا کہ انھیں کہیں بھی بحیثیت مرحوم نہ لکھا جائے۔ ڈاکٹر صاحب 80 سے زیادہ علمی و ادبی کتابوں کے مصنف تھے۔ انھیں اردو زبان پر بھرپور عبور حاصل تھا۔ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب کی قبر کو نور سے روشن رکھے جس قبر میں میں نے انھیں اپنے ہاتھوں سے سپرد خاک کیا۔

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

پچھلے دنوں ڈاکٹر کیول دھیر صاحب انڈیا سے پاکستان تشریف لائے تو ماہنامہ "تخلیق" نے اپنی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ان کے لئے ایک بہت پروقار تقریب اور پھر اپنے گھر شاندار عشائیہ کا اہتمام کیا۔ تقریب کی مکمل رپورٹ پرچے میں موجود ہے۔

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

•••

حمد

شاہ و گدا سبھی ہیں تجھی سے سدا سجدہ ریز
مخلوق سجدہ ریز ہیں ارباب سجدہ ریز

ہر پھول شاخ پر ہے ترا خواں بنا ہوا
باد صبا کے ساتھ چمن زار سجدہ ریز

کتنی تجلیاں نظر آ گئیں تجلی ہوئی
کتنے اجالے دیتے ہیں انوار سجدہ ریز

حمد عقیدتوں سے ادا تجھ سے ہر
اور دوسری طرف گل و گلزار سجدہ ریز

ذرے زمین پر تری تعریف میں مگن
ماہ و نجوم چرخ کے اس پار سجدہ ریز

جتنا جھکا ہے اتنا ہی اونچا ہوا ہے وہ
رکھتا ہے رفعتوں کے جو معیار سجدہ ریز

فکر و خیال ایک آئینہ ہے عشق
عابد ہے سجدہ ریز، گنہگار سجدہ ریز

نورین طلعت عروبہ

OOO

حمد

جگ میں آ کر جو کچھ ہے کو دیکھا
حسن لاریب جا بجا دیکھا

جب خدا نہیں رہی کوئی
پھر اسے اپنے رو برو دیکھا

اک زمانہ ہوا خوشحال
اس کی کن کے جو آرزو دیکھا

نور ارض و سما کا ہے جو عیاں
جب بھی دیکھا ہے با وضو دیکھا

جب اس میں تجلی جب سے ملے
خود کو خود کے ہی رو برو دیکھا

جمیل حیات

OOO

نعت

یادِ خدا پہ سب کو چلایا حضورؐ نے
قہرِ خدا کے ڈر سے بچایا حضورؐ نے

وہ جو کہ قرآن ہے جو تھا ازل سے یہاں
وہ نور راہ میں دکھایا حضورؐ نے

سوکھا شجر حیات کا شاداب کر دیا
اشجارِ دل کا بیج اگایا حضورؐ نے

وہ جو بت پرست تھا اُس پہ تھا آدمی
اس کا ہر غرور مٹایا حضورؐ نے

خلقِ خدا کو آئینہ حق کا دیا
خالق کا نقش دل پہ بٹھایا حضورؐ نے

قلب و نظر سے دل مومن منور ہے
ایسا چراغ دل کا جلایا حضورؐ نے

میرا ریاض نعت، باعث تسکین قلب ہے
یہ کام بھی مجھ کو سکھایا حضورؐ نے

سیّد ریاض حسین زیدی

OOO

تعارف نامہ

ڈاکٹر انور سدید

ادارہ "تخلیق"

ذاتی کوائف

1- ادبی نام : انور سدید
2- خاندانی نام : محمد انوار الدین (تعلیمی اسناد میں یہی نام درج ہے)
3- پیدائش : 4 دسمبر 1928ء (ضلع سرگودھا)
4- والد کا نام : مولوی امام الدین (مرحوم)

تعلیمی کوائف

1- ابتدائی تعلیم : (i) اسلامیہ پرائمری سکول سرگودھا (ii) گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان (ورنیکلر مڈل امتحان۔ 1942) اول بدرجہ اول (iii) گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا میٹرک 1944ء)

2- یونیورسٹی کے امتحانات : (i) پنجاب یونیورسٹی (ایم اے) اردو، اول بدرجہ اول، یونیورسٹی طلباء میں ریکارڈ نمبر حاصل کیے۔ یہ ریکارڈ 32 سال قائم رہا۔ (دو گولڈ میڈل حاصل کیے) (ii) اضافی امتحان (ادیب فاضل) اول بدرجہ اول (iii) پی ایچ ڈی (مقالہ "اردو ادب کی تحریکیں" نگران: ڈاکٹر وزیر آغا، ممتحن اول: ڈاکٹر سید عبداللہ، ممتحن ثانی: ڈاکٹر شمس الدین صدیقی

فنی اور انتظامی کوائف

1- سول انجینئرنگ ڈپلومہ گورنمنٹ سکول آف انجینئرنگ پنجاب، بمقام رسول (ضلع منڈی بہاؤالدین) اول (گولڈ میڈل)
2- سول انجینئرنگ ڈگری کورس۔ انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز ڈھاکہ
3- محکمہ آبپاشی پنجاب سے ریٹائرمنٹ بطور ایگزیکٹو انجینئر (4 دسمبر 1988ء)

صدارتی ایوارڈ

1- صدارتی ایوارڈ تمغہ امتیاز (2009ء)

اعزازات

1- انجینئرنگ سکول رسول میں اول بدرجہ اول آنے پر اعزاز — گولڈ میڈل
2- ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی میں اول آنے پر اعزاز — (i) یونیورسٹی طلائی تمغہ (گولڈ میڈل) (ii) بابائے اردو طلائی تمغہ
3- کتاب "اقبال کے کلاسیکی نقوش" پر — (i) رائٹرز گلڈ ایوارڈ — داؤد ادبی انعام

4- مقالہ "اردو میں تخلص نامہ نویسی کی روایت" پر — (ii) نقوش ایوارڈ
5- کتاب "اردو ادب کی تحریکیں" پر — (iii) ہجرہ ایوارڈ
6- بہترین کالم نگاری پر — (iv) (APNS Award) آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی ایوارڈ
7- "تخلیق" ایوارڈ — 2013ء

ادبی رسائل کی ادارت میں شرکت

1- ماہنامہ "اردو زبان" سرگودھا (1966ء تا 1984ء) 2- ماہنامہ "اوراق" لاہور (1988ء تا 1992ء)
3- ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" لاہور (1990ء تا 1995ء) 4- روزنامہ "تحریک" لاہور (1995ء تا 1998ء)
5- روزنامہ "نوائے وقت" لاہور (1999ء تا 2003ء) 6- ششماہی "مخزن" لاہور (رکن ادارت 2001ء تا 2016ء)

ادبی کالم نگار (اردو)

1- روزنامہ "مشرق" لاہور — ہفتہ وار ادبی کالم "سدیدیات" (1989ء تا 1999ء) 2- روزنامہ "جسارت" کراچی — ہفتہ وار ادبی کالم "دیدہ بازدید" (1993ء تا 2003ء) 3- ہفت روزہ "ندا" لاہور — ہفتہ وار ادبی کالم "طرفہ تماشا" (1995ء تا 1997ء) 4- روزنامہ "حریت" کراچی — ہفتہ وار ادبی کالم "لاہور نامہ" (1985ء تا 1989ء) 5- ماہنامہ "قومی زبان" کراچی — ماہانہ ادبی کالم "کچھ وقت غیر ملکی کتابوں کے ساتھ" (1985ء تا 1995ء) 6- روزنامہ "تحریک" — ادبی کالم "دبستان" (1995ء تا 1998ء) 7- روزنامہ "نوائے وقت" (i) ہفتہ وار ادبی کالم "ادب نامہ" (1999ء تا —) (ii) کتابوں پر تبصرہ "ہفتہ وار کالم" (1999ء تا —) (iii) تہذیبی کالم "گفتنی" (1999ء تا —) 8- ہفت روزہ "نوائے ملت" لاہور — ہفتہ وار ادبی کالم "ادب در ادب" (2004ء تا —) 0- ہفت روزہ "فیملی میگزین" — تہذیبی کالم "قومی سیاست" (1999ء تا —)

ادبی کالم نگاری (انگریزی)

1- پاکستان ٹائمز، لاہور — ہفتہ وار ادبی کالم (1993ء تا 1995ء) 2- دی "بزنس مین" ویکلی کراچی — ہفتہ وار ادبی کالم (1986ء تا 1990ء)

بیرونی ممالک میں پاکستان کی نمائندگی

1- غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی (انڈیا) — مقالہ "غالبیات شیخ محمد اکرام" پڑھا — 1988ء
2- انجمن ترقی اردو دہلی — مقالہ "مولوی عبدالحق کی صحافت" پڑھا — 1990ء

پاکستان کی ادبی کانفرنسوں میں شرکت

1- اکادمی ادبیات پاکستان کی (i) اہل قلم کانفرنسوں میں شرکت (ii) اردو انشائیہ پر مقالہ پیش کیا۔ 2- جشن نیاز فتح پوری کراچی (i) دو مرتبہ شرکت کی (ii) نیاز فتح پوری پر مقالات پڑھے۔ 3- اردو کانفرنس خانیوال — "اردو زبان کے ماخذات"

کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ 4۔ انشائیہ کانفرنس (گوجرانوالہ) ۔۔۔ اردو انشائیہ پر مقالہ پڑھا۔

اقبالیات

❖ اقبال کے کلاسیکی نقوش ۔۔۔ مکتبہ عالیہ، لاہور، 1977ء (دادا ادبی انعام یافتہ) دوسرا ایڈیشن، اقبال اکیڈمی، لاہور 1989 ❖ اقبال شناسی اور "ادبی دنیا" (تالیف) بزم اقبال، لاہور 1989ء ❖ اقبال شناسی اور "اوراق" (تالیف) بزم اقبال، لاہور 1989

تحقیق و تنقید

❖ اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش، الہ آباد (بھارت) 1983ء ۔۔۔ لاہور (پاکستان) 2006ء ❖ اردو ادب میں انشائیہ، مکتبہ فکر و خیال، لاہور، 1985ء ❖ اردو ادب میں "سفرنامہ" مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور 1989ء

تاریخ ادب کی کتابیں

❖ اردو ادب کی تحریکیں ۔۔۔ انجمن ترقی اردو کراچی (تین ایڈیشن اب تک شائع ہوئے) ہجرہ ایوارڈ یافتہ ❖ اردو ادب کی مختصر تاریخ ۔۔۔ مقتدرہ قومی زبان، لاہور 1990ء (20 سے زیادہ ایڈیشن چھپ چکے ہیں) ❖ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ۔۔۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد 1992ء

کلاسیکی شعرا پر کتابیں

❖ میر انیس کی قلم رو، اختر گلڈ الہ آباد (بھارت) 1985ء ❖ "غالب کا جہاں اور" مکتبہ کاروان، ملتان 1986ء ❖ میر انیس کی قلمرو، مکتبہ عالیہ لاہور 1989ء

تنقیدی کتب

❖ فکر و خیال، مکتبہ اردو زبان سرگودھا (1971ء) ❖ اختلافات، مکتبہ اردو زبان سرگودھا (1973ء) ❖ کھردرے مضامین، مکتبہ فکر و خیال، لاہور (1988ء) ❖ نئے ادبی جائزے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور (1989ء) ❖ شمع اردو کا سفر، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد (1989ء) ❖ بے سمتی تنقید، مقبول اکیڈمی، لاہور (1990ء) ❖ موضوعات، مکتبہ عالیہ، لاہور (1991ء) ❖ اردو افسانے کی کروٹیں، مکتبہ عالیہ، لاہور (1992ء) ❖ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد (1988ء) ❖ اردو نثر کے آفاق، مقبول اکیڈمی، لاہور (1998ء) ❖ اردو شاعری کا دیار، مقبول اکیڈمی، لاہور (1999ء) ❖ جدید اردو نظم کے ارباب اربعہ، مقبول اکیڈمی، لاہور (2007ء) ❖ مولانا صلاح الدین احمد ۔ ایک مطالعہ، انجمن ترقی اردو، کراچی (1990ء) ❖ مولانا صلاح الدین احمد ۔ فن اور شخصیت، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد (1991ء) ❖ وزیر آغا ایک مطالعہ، مکتبہ فکر و خیال، لاہور (1983ء) ❖ شام کا سورج (تالیف)، مکتبہ فکر و خیال، لاہور (1985ء) ❖ پاکستان کا ایک عظیم تخلیق کار، حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی، نسیم اکیڈمی، لاہور (2002ء) ❖ "ذکر اس پری وش کا" (انشائیے)، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا (1980ء) ❖ آسمان میں پتنگیں (انشائیے)، مقبول اکیڈمی، لاہور (1994ء) ❖ غالب کے نئے خطوط (طنز و مزاح) مکتبہ اردو

زبان، سرگودھا (1982ء) ❖ دلاور فگاریاں (سوانح) مقبول اکیڈمی، لاہور (1990ء) ❖ محترم چہرے (خاکے) نفیس اکیڈمی، کراچی (1989ء) ❖ قلم کے لوگ (خاکے) مکتبہ فکر و خیال، لاہور (1990ء) ❖ اوریان رفتہ (خاکے) کلاسیک، لاہور (2006ء) ❖ راہ سے شیام کے نام (تصوف) مکتبہ اردو زبان، سرگودھا (1976ء) ❖ آخری نظمیں راجہ مہدی علی خان (تالیف)، مکتبہ اردو زبان، سرگودھا (1976ء) ❖ بہترین ادب 1968 (تالیف) مکتبہ اردو زبان سرگودھا (1969ء) ❖ بہترین نظمیں 1976ء (تالیف) مکتبہ اردو زبان سرگودھا (1977ء) ❖ بہترین ادب 1970 (تالیف) مکتبہ اردو زبان سرگودھا (1970ء) ❖ بہترین نظمیں 1978ء (تالیف) مکتبہ اردو زبان سرگودھا ❖ وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام (تالیف) مکتبہ فکر و خیال، لاہور (1985ء) ❖ مباحثات، مکتبہ فکر و خیال، لاہور (1992ء) ❖ اردو افسانہ عہد بہ عہد، مقبول اکیڈمی، لاہور (1996ء) ❖ خطوط کے آئینے میں، مقبول اکیڈمی لاہور (2007ء) ❖ اردو ادب کے معمار، صلاح الدین احمد، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد (2007ء) ❖ نئے ادبی جائزے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور (1988ء) ❖ ادب کہانی 1996ء، مکتبہ فکر و خیال لاہور (1998ء) ❖ ادب کہانی 1997ء، مکتبہ فکر و خیال لاہور (1999ء) ❖ کچھ وقت کتابوں کے ساتھ، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، 1994ء ❖ دلی دور نہیں (سفرنامہ) مقبول اکیڈمی لاہور ❖ مزید ادبی جائزے، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور (1998ء) ❖ سخن ہائے گسترانہ، کراچی (2007ء)

تراجم

❖ زلفی بھٹو آف پاکستان (والپورٹ) قومی ڈائجسٹ لاہور میں قسط وار چھپا ❖ کشمیر، سرد جہنم (گورنر جگ موہن) قومی ڈائجسٹ لاہور میں قسط وار چھپا ❖ شہزادی ڈیانا کی محبت ـــ روزنامہ "خبریں" میں قسط وار چھپا ❖ فریب کار (فریڈرک فورسائیتھ) مقبول اکیڈمی، لاہور ❖ مائی فیوڈل لارڈ (تہمینہ درانی) ہفت روزہ "زندگی" لاہور میں چھپا ❖ ایک بے عنوان کتاب (غلام اکبر) ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ" میں قسط وار چھپا ❖ مون سٹون (ولکی کالنز) سومنات کا ہیرا ـــ قومی ڈائجسٹ میں قسط وار چھپا

طنز و مزاح

❖ غالب کے نئے خطوط (1982ء) ❖ دلاور فگاریاں (1990ء)

خاکہ نگاری

❖ محترم چہرے (1989ء) ❖ قلم کے لوگ (1990ء) ❖ اوریان رفتہ (2007ء) ❖ زندہ لوگ (2008ء)

انور سدید پر کیا گیا کام

❖ پروفیسر سجاد نقوی نے "کرم دم جستجو" کے عنوان سے کتاب لکھی ❖ ادبی رسائل "اوراق" لاہور، "تخلیق" لاہور، "کوہسار" بھاگل پور (انڈیا)، "چہار سو" راولپنڈی، "ارتکاز" کراچی، "روشنائی" کراچی اور "جدید ادب" خان پور نے خصوصی گوشے شائع کیے۔

انور سدید پر یونیورسٹیوں میں کام

❖ بھاگل پور (انڈیا) یونیورسٹی میں جناب سلطان احمد نے "انور سدید۔ فن اور شخصیت" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا اور

ڈگری لی ❖ گورنمنٹ کالج لاہور میں محمد تمیم بزمی نے "انور سدید کا فن" کے عنوان سے ایم اے کا مقالہ لکھا ❖ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے مس شائستہ پروین نے "انور سدید بطور نقاد" کے عنوان سے مقالہ لکھ کر ایم فل کی ڈگری لی۔

یونیورسٹی طلبا کی راہنمائی

❖ انور سدید پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اردو کے پرچے جانچتے رہے ہیں ❖ ایم اے اردو کے مقالات کے ممتحن رہے ❖ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تحقیقی کاموں کی نگرانی کرتے رہے ❖ دو طلبا طاہرہ سکندر (اردو میں ساقی نامے کی روایت) اور عبدالغنی (رسالہ "اوراق" میں اقبال شناسی) کے موضوعات پر انور سدید کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی۔

ادبی رسائل میں گوشے

❖ ماہنامہ "تخلیق" لاہور (مدیر اظہر جاوید / سونان اظہر جاوید) ❖ ماہنامہ "جدید ادب" خان پور (مدیر وحید قریشی) ❖ سہ ماہی "اوراق" لاہور (مدیر: ڈاکٹر وزیر آغا) ❖ ماہنامہ "کوہسار" بھاگل پور، بھارت (مدیر: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی) ❖ ماہنامہ "چہار سو" راولپنڈی (مدیر گلزار جاوید) ❖ سہ ماہی "ارتکاز" کراچی (مدیر: راغب شکیب) ❖ سہ ماہی "روشنائی" کراچی (مدیر: احمد زین الدین) ❖ ماہنامہ "اردو زبان" "انور سدید نمبر" (مدیر پرویز بزمی، ایم ڈی شاد)

انور سدید کی ادبی کارگزاری کا تحریری وتنقیدی جائزہ

حسب ذیل ادیبوں نے لیا اور مضامین لکھے: ❖ ڈاکٹر سید عبداللہ ❖ ڈاکٹر وحید قریشی ❖ ڈاکٹر وزیر آغا ❖ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ❖ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ❖ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ❖ پروفیسر صابر لودھی ❖ رحمان مذنب ❖ جوگندر پال (بھارت) ❖ مہاراج کول (بھارت) ❖ ڈاکٹر ناصر عباس نیر ❖ ہرچرن چاولہ ❖ ممتاز مفتی ❖ فرخندہ لودھی وغیرہ

ڈاکٹر انور سدید کے دو منفرد کام

اول: انھوں نے پورے اردو ادب کا ایک سال کا ضخیم ترین جائزہ "ادب کہانی 1997ء" پیش کیا۔

دوم: 2002ء میں "سندے نوائے وقت" میں 223 کتابوں پر تبصرے لکھنے کا ریکارڈ قائم کیا۔" بیک وقت کتابوں کے ساتھ ان کے سو تبصروں کی کتاب ہے۔

اولیاتِ انور سدید

مندرجہ ذیل کتابیں موضوعی لحاظ سے انور سدید کی اولیات ہیں ان موضوعات پر پاکستان میں کسی ادیب نے مزید کام نہیں کیا۔ ❖ اردو ادب کی تحریکیں ❖ اردو ادب میں سفرنامہ ❖ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ ❖ اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش۔

◆◆◆

فن، شخصیت اور تاثرات

مولوی نذیر احمد

ڈاکٹر انور سدید

مولوی نذیر احمد دہلوی (1830-1912ء) کا آفتاب علم و دانش اس وقت چمکا جب انہوں نے دلی کالج کے اساتذہ، مولوی مملوک علی، امام بخش صہبائی، مولوی کریم الدین احمد اور سب سے اہم ماسٹر رام چندر کی متنوع تعلیمات اور زندگی کی تربیت نے ان کے باطن سے ایک ایسے ادیب کو تصنیف و تالیف کی سطح پر رونما کر دیا جو اپنے ملک کے عوام بالخصوص 1857ء کے شکست خوردہ مسلمانوں کو قدامت کے اندھیروں سے نکال کر جدید دور کی روشنی میں لانے اور ترقی کی نئی راہوں سے متعارف کرانے کی اعلیٰ صلاحیت رکھتے تھے۔ بلا شبہ یہ صلاحیت انہیں فیاضِ فطرت کی طرف سے عطا ہوئی تھی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اگر "اتفاقات زمانہ" ان کا ساتھ نہ دیتے تو اورنگ آباد مسجد دہلی میں مولوی عبدالخالق کے زیر سایہ تعلیم کے حصول کے ساتھ محلے سے کھانا مانگ کر لانے کی عادت پختہ ہو جاتی۔ وہ تجدد کی بجائے تقلید کے راستے پر چل پڑتے اور ہم اس نذیر احمد سے متعارف نہ ہو سکتے جو علی گڑھ تحریک میں سرسید احمد خان کے معاون بنے۔ مرآۃ العروس، بنات النعش، توبۃ النصوح، فسانۂ مبتلا، ابن الوقت، ایامیٰ اور رویائے صادقہ جیسے مثالی ناول لکھ کر سرسید احمد خان، الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد کے ساتھ اردو ادب کے عناصر خمسہ میں شمار ہوئے۔ قانون کی انگریزی کتابوں "تعزیرات ہند"، "انکم ٹیکس ایکٹ 1861ء"، ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت کے ایسے تراجم کیے کہ ان کی وضع کردہ اصطلاحات کو آج بھی سکہ رائج الوقت کی حیثیت حاصل ہے۔ مذہبی تالیفات میں ان کے "ترجمۃ القرآن" کو روزمرہ کی زبان میں عام فہم اور با محاورہ ترجمہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید سے اخذ کردہ دعاؤں کا مجموعہ "ادعیۃ القرآن"، تین جلدوں میں قاموسی نوعیت کا کام "الحقوق والفرائض" اور مکالماتی انداز کی کتاب "اجتہاد" شامل ہیں جس میں اس مرکزی خیال کو تقویت دی گئی ہے۔ اسلام انسان کی زندگی کو فطرت کے اصولوں کے مطابق ڈھالتا ہے۔ "امہات الامہ" میں مولوی نذیر احمد مناظرے کے ایک ماہر کی حیثیت میں سامنے آتے ہیں۔ اور وہ پادری احمد شاہ شائق کی "امہات المومنین" کے جواب میں فریق مخالف کو مناظرے میں شکست دینے کے لیے ہر حربے کو استعمال میں لانے سے گریز نہیں کرتے۔ آنحضورؐ کی تعداد ازدواج پر یہ جوابی کتاب عامۃ الناس میں پذیرائی حاصل نہ کر سکی اور اسے جلا دیا گیا۔ دوسری مرتبہ مولانا راشد الخیری نے اپنے رسالہ "عصمت" میں ترامیم کے ساتھ اقساط میں شائع کی۔ شاہد احمد دہلوی نے دوسری مرتبہ کتابی صورت میں شائع کی اور جب علماء اور عوام کا دباؤ بڑھا تو سب جلدیں رسالہ "ساقی" کے قلمی معاون عظیم بیگ چغتائی کے پاس جودھ پور میں بھجوا دیں۔ لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی راوی ہیں کہ "امہات الامہ" دوسری مرتبہ بھی جلا دی گئی تھی۔ نذیر احمد دہلوی "مطالب القرآن" کے نام سے کلام مجید کی تفسیر لکھ رہے تھے کہ پیغام اجل آ گیا اور یہ کام ادھوری صورت میں ہی ان کی وفات کے بعد شائع کر دیا گیا۔ "منتخب الحکایات"، "نصاب خسرو"، "چند پند"، "سود مند"، "صرف صغیر" اور "مبادی الحکمت" ان کی درسی کتابیں ہیں جو بچوں کے مزاج کے مطابق سادہ اور آسان لیکن دلچسپ زبان میں لکھی گئی تھیں۔

ان سب کے ساتھ مولوی نذیر احمد کے خطبات کا مجموعہ "موعظہ حسنہ" اور شاعری کا مجموعہ "بے نظیر" بھی بے حد اہم ہیں جبکہ مشرقی شاعری کے بارے میں ان کی رائے چنداں اچھی نہیں تھی۔ انہوں نے لکھا ہے:

"میں نے شاعری کا شوق کیا ہوتا تو میں تو کیا کر سکتا، نہ کوئی کتاب تصنیف یا تالیف کر سکتا، نہ کلام مجید کا ترجمہ کر سکتا اور نہ لیکچر دے سکتا۔ نہ میرا کوئی تخلص ہے اور نہ مجھ کو اس لایعنی مشغلے کے لیے کبھی فرصت ملی۔ صاف بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں کی شاعری کا مذاق ایسا بگڑا ہے کہ جہاں قومی تنزل کے اور اسباب ہیں ان میں میرے نزدیک ایک بڑا سبب یہ کم بخت ایشیائی شاعری ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے وقتوں میں مولوی حالی نے نظمی مذاق کی بہت کچھ اصلاح کی ہے مگر اب بھی میں نوجوان لڑکوں کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں۔"

مولوی نذیر احمد دہلوی کی شاعری ان کے قومی جذبات اور ملی احساسات کی آئینہ دار ہے لیکن خود انہوں نے اپنی شاعری کو اپنی علمی اور ادبی زندگی میں اہمیت نہیں دی اور کہا کہ:

سخن بھتا سناؤ یہ نہ پہنچیں اصل مطلب کو — طبیعت کیا دکھائے خاک پھر اپنی جولانی
تم اپنی نثر لو اور نظم کو چھوڑو نذیر احمد — کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی

قوم کی اصلاح نذیر احمد دہلوی کی زندگی کا مقصد اولیٰ تھا اور تصنیف و تالیف کے ساتھ انہوں نے مسلم ایجوکیشن کانفرنس، انجمن حمایت اسلام لاہور اور طبیہ کالج دہلی کے پلیٹ فارم سے تقریروں کا سلسلہ شروع کیا جو 1888ء سے 1905ء تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ 42 لیکچر دو جلدوں میں چھپ چکے ہیں اور ان میں نذیر احمد دہلوی مصلح قوم کی حیثیت میں سامنے آتے ہیں اور وہ سب کچھ جرات مندی سے کہہ دیتے ہیں جس سے مسلمانوں پر ترقی کی راہیں کھل سکتی ہیں۔

نذیر احمد متحدہ ہندوستان کے صوبہ یوپی کے ایک مشہور شہر بجنور کے ایک نواحی گاؤں میں 1830ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا سلسلہ نسب آٹھ واسطوں سے شیخ عبدالغفور اعظم پوری تک پہنچتا ہے جو شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے جلیل القدر خلفاء میں سے تھے۔ ان کے والد مولوی سعادت علی بجنور میں معلم تھے۔ انہوں نے نذیر احمد کو فارسی کی متداول کتابیں گھر پر پڑھائیں۔ 1839ء میں مولانا نصراللہ خان بجنور میں ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے تو انہوں نے اپنے فارغ وقت میں مسلمانوں کی دینی، دنیوی اور اخلاقی تعلیم کا سلسلہ بھی شروع کر دیا۔ نذیر احمد نے بھی ان سے عربی زبان سیکھی، صرف و نحو اور فلسفہ و منطق کے اسباق پڑھے۔ تین سال کے بعد ان کا بجنور سے تبادلہ ہو گیا تو مولانا نصراللہ خان نے مولوی سعادت علی کو مشورہ دیا کہ نذیر احمد کو مزید تعلیم کے لیے دہلی بھیج دیں۔ اس دور میں دہلی میں اورنگ آبادی مسجد کا مدرسہ بہترین دینی ادارہ شمار ہوتا تھا۔ مولوی عبدالخالق اس مدرسے کے سربراہ تھے۔ لیکن مالی اعتبار سے یہ مدرسہ خود کفیل نہیں تھا اور طلبا کو محلے کے گھروں سے روٹی مانگ کر لانا پڑتی تھی۔ نذیر احمد اس "ٹکڑ گدائی" کے سخت مخالف تھے لیکن انہوں نے اپنے حالات حیات میں اس کا تذکرہ فخر سے یوں کیا ہے:

"کسی کو عار کا موجب ہو تو ہو مگر میں اسے فخر بیان کرتا ہوں کہ میری طالب علمی کا ابتدائی حصہ اس طرح بسر ہوا۔"

نذیر احمد نے اس مدرسے میں ساڑھے تین سال گزارے۔ جنوری 1846ء میں ایک تعطیل کے روز ان کا گزر اتفاقاً قدیم دہلی کالج کی طرف ہوا جہاں سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ جب انہوں نے پرنسپل کا راستہ بنانے کے لیے لوگوں کو دھکیلنا شروع کیا تو نذیر احمد کا پاؤں

پھسلا اور رونے لگے۔ پرنسپل نے سہارا دے کر اٹھایا تو نذیر احمد نے اپنی بپتا رو رو کر سنائی۔ پرنسپل کے ارشاد پر مفتی صدر الدین آزردہ نے نذیر احمد کا امتحان لیا تو وہ ان کی ذہانت سے بہت متاثر ہوئے اور نہ صرف انہیں قدیم دلی کالج میں داخلہ دے دیا بلکہ چار روپے ماہوار وظیفہ بھی مقرر کر دیا۔ نذیر احمد اتنے خوش ہوئے کہ اگلے روز اپنے بھائی کو بھی لے گئے اور کہا: "ان کو بھی نوکر رکھ لیجئے۔" اور اس طرح جنوری 1846ء میں دونوں کو داخلہ مل گیا۔

نذیر احمد کی مزاج سازی میں دلی کالج کی تعلیم نے انقلابی کردار ادا کیا۔ اس کالج میں انہیں نئے علوم و خیالات سے آگہی ملی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نذیر احمد کو ان کے والد مولوی سعادت علی نے انگریزی پڑھنے کی اجازت نہ دی۔ لیکن غیر نصابی تربیت نے ان کو عقلیت اور واقعیت پسند بنا دیا۔ آزاد خیالی اور کشادہ نظری کے علاوہ علم دوستی کا شوق بڑھتا گیا۔ اس ضمن میں ماسٹر رام چندر نے جو ہندو مت کو چھوڑ کر عیسائیت کے دائرے میں آ گئے تھے، اہم کردار ادا کیا۔ مولوی نذیر احمد اس دور میں تشکیک کا شکار بھی ہوئے لیکن وہ اپنا ایمان سلامت رکھنے میں بھی کامیاب ہوئے۔ انہوں نے ایک لیکچر میں بتایا:

> "اگر میں نے کالج میں نہ پڑھا ہوتا تو میں بتاؤں کیا ہوتا؟ ـــــ مولوی ہوتا ـــــ تنگ خیال، متعصب، اپنی عقل کو اپنے نفس کے احتساب سے فارغ، دوسروں کے عیوب کا متجسس، بدظن ـــــ مسلمانوں کا نادان دوست، زمانے کے وقت سے ناآشنا اور بے بہرا۔۔۔"

اور ماسٹر رام چندر کا ذکر آیا تو یہ بھی لکھ دیا:

> "ماسٹر نے مجھ کو گمراہ کر دیا تھا ـــــ اگر نہ ہوتا میرے رب کا فضل ـــــ یہاں تک کہ میں اپنا ایمان سلامت لے کر نکل گیا مگر کیسا ایمان، متزلزل، متقلقل، ضعیف، مضمحل۔۔۔"

اس سے مولوی نذیر احمد کی اپنے مذہب میں استقامت اور اسلام کو دین فطرت تسلیم کرنے کا پہلو نمایاں سامنے آتا ہے۔ لیکن اس دور میں اپنے جرأت مندانہ فیصلوں پر عمل درآمد کی دو مثال یہ سامنے آتی ہے کہ انہوں نے اپنی برادری کی رسوم و قیود کے خلاف اپنی مرضی سے مولوی عبدالقادر کی اس صاحبزادی سے شادی کر لی جس کا ذکر مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے مقبول و معروف مضمون "نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی، کچھ اپنی زبانی" میں کیا ہے اور بڑے پر لطف انداز میں۔

مولوی نذیر احمد نے اپنی عملی زندگی میں اپنے والد محترم کے معلمی کے پیشے کو فوقیت دی اور اس کا آغاز پنجاب کے قصبہ کنجاہ سے 1854ء میں کیا اور 1856ء میں انہیں ڈپٹی انسپکٹر (تعلیم) کی ملازمت مل گئی تو کانپور آ گئے لیکن مدارس کے انسپکٹر کیپٹن فلر کی کسی بات کو برداشت نہ کر سکے تو استعفیٰ دے دیا اور واپس دلی آ گئے۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں انہوں نے دلی کو درہم برہم ہوتے دیکھا۔ اس ہنگامے کے ابتدائی مرحلے میں نذیر احمد نے اپنے سسرال بزرگوں کی معاونت سے ایک انگریز خاتون مسز لیسن کی جان بچائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا خاندان تباہی سے بچ گیا اور جب حالات کچھ سدھر گئے تو انہیں الٰہ آباد میں ڈپٹی انسپکٹر کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔

مولوی نذیر احمد کی زندگی میں الٰہ آباد کا قیام اس لیے اہم ہے کہ صرف دو سال کے عرصے میں انہوں نے نہ صرف انگریزی زبان سیکھ لی بلکہ اس میں اتنی استعداد بھی پیدا کر لی کہ انکم ٹیکس ایکٹ اور تعزیرات ہند کا ترجمہ آسان اور عام فہم اردو میں کر دیا۔ ولیم ایڈورڈ اسس کی انگریزی کتاب کا ترجمہ جو "مصائب غدر" کے نام سے سامنے آیا اسی دور کی یادگار ہے۔ اول الذکر قانونی کتابوں کے تراجم کی اساس پر

انہیں 1962ء میں تحصیل دار اور 1963ء میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر فائز کیا گیا۔ اس دور میں ہی انہوں نے مزید کامیابیاں ادبی میدان میں بھی حاصل کیں۔ ان کی کتابوں "مراۃ العروس" اور "بنات النعش" پر سرکاری سطح پر انعامات دیے گئے اور اعظم گڑھ میں کلکٹر کے عہدے پر مسند نشین ہوئے۔ 1877ء سے 1884ء تک نذیر احمد نے حیدر آباد دکن میں سر سالار جنگ کی ملازمت میں زندگی گزاری جہاں وہ سر سید احمد خان کی سفارش پر گئے تھے۔ یہ ریاستی ماحول ان کے مزاج کے موافق نہیں تھا۔ چنانچہ فروری 1884ء میں سر سالار جنگ وفات پا گئے تو نذیر احمد مجلس مال کے رکن کے عہدے سے استعفیٰ دے کر دلی واپس آ گئے۔ ان کی پنشن چھ سو روپے ماہوار مقرر ہوئی۔

حیدر آباد کا یہ دور نذیر احمد کی ادبی زندگی میں چنداں اہم نہیں لیکن یہ حقیقت قابلِ ستائش ہے کہ یہاں انہوں نے صرف ساڑھے چھ ماہ میں قرآن مجید حفظ کر لیا اور دلی واپس آ گئے تو پھر ملازمت کے جھمیلوں سے نجات حاصل کر لی۔ اپنی اس آزاد زندگی میں انہوں نے "فسانۂ مبتلا"، "ابن الوقت"، "ایامیٰ" اور "رویائے صادقہ" کے نام سے ناول لکھے اور مذہبی تصانیف کا سلسلہ "ترجمۂ قرآن" سے شروع کیا اور یہ سلسلہ 1912ء تک جاری رہا جو ان کا سالِ وفات ہے۔ اس دور میں ہی انہیں "شمس العلماء" کا خطاب دیا گیا۔ ایڈنبرا یونیورسٹی نے ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری سے سرفراز کیا۔ ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام اور طبیہ کالج دہلی کے قومی اسٹیجوں پر ایک مصلحِ قوم مفکر کا درجہ حاصل کیا۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے لکھا ہے:

> "نذیر احمد کے خطبات ان کی غیر معمولی ذہانت، وسعتِ معلومات، حقیقت پسندی اور زمانہ شناسی کے مظہر اور ان کی باغ و بہار شخصیت کی جلوہ گری کا وسیلہ ہیں۔"

نذیر احمد کے مزاج کے آخر الذکر جوہر نے ان کے لیے مسائل بھی پیدا کیے۔ چند لیکچروں میں ان کی شوخی اظہار پر ناخوشگوار صورت پیدا ہوگئی اور ستم یہ ہوا کہ ان کی تصنیف "امہات الامہ" کے خلاف پھر ہنگامہ کھڑا کر دیا گیا اور اس کتاب کو دوبارہ نذرِ آتش کر دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد مولوی نذیر احمد پہلے جیسے خوش باش، خوش طبع اور خوش گفتار نذیر احمد نہ رہے۔ 27 اپریل 1912ء کو علالت کے دوران فالج کا حملہ ہوا اور 3 مئی 1912ء کو اس دنیا سے رختِ حیات سمیٹ لیا۔

مولوی نذیر احمد دہلوی کی زندگی کے احوال و آثار کے اس اجمال سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ان کی پوری زندگی تو آبادیاتی دور میں گزری۔ انہوں نے ابتدائے حیات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا دور دیکھا اور 1857ء کے بعد ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں رونما ہونے والے سیاسی، تمدنی، تہذیبی اور معاشرتی حالات اور واقعات کا مشاہدہ بھی کیا۔ مولوی افتخار عالم کی کتاب "حیات النذیر" ان کی زندگی پر پہلی ضخیم کتاب تھی جس کے بارے میں شبلی نعمانی، مولانا حالی، مفتی انوار الحق اور مولوی عبدالحق نے تحسین آمیز تبصرے لکھے اور اسے اردو کی بہترین سوانح عمریوں میں شمار کیا۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے ان پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا تو اعتراف کیا:

> "اردو کے ادیبوں میں ایسے کم ہیں جو ادبی، دینی اور قومی خدمات کے اعتبار سے نذیر احمد کی برابری کر سکیں۔ لیکن سر سید کے سوا شاید ایسا کوئی نہیں جس کی شخصیت اتنی جامع اور جامع الصفات ہو یا جس کی زندگی جہد و عمل اور اخلاص کی داستان ہو۔ عادت وضعی وجاہت اور شہرت کے بام بلند تک اتنی کڑی آزمائشوں سے گزری ہو۔ اسی لیے علامہ شبلی نے کہا تھا "مولانا نذیر احمد مرحوم اس پائے کے شخص تھے کہ اگر یورپ میں پیدا ہوتے تو ان کی درجنوں سوانح عمریاں لکھی جاتیں۔"

مولوی افتخار عالم کی سوانح نگاری میں عقیدت مندی کا کثیر عنصر شامل ہے۔ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی نے ان کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ ان کی وفات

کے 99 سال بعد کیا تو ایک ایسی کتاب وجود میں آئی جس میں نذیر احمد کے ذہنی ارتقا، سوانح اور سیرت کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور مولوی افتخار عالم کی عقیدت کی گرد صاف کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ مولوی نذیر احمد کو سکولوں اور کالجوں کے نصاب میں تو شامل کر لیا گیا اور ان کو سراہا بھی گیا، لیکن شاید آپ میرے ساتھ اتفاق کریں کہ مرزا فرحت اللہ بیگ کا مضمون "مولوی نذیر احمد کی کہانی، کچھ ان کی، کچھ میری زبانی" انہیں مقبول بنانے میں زیادہ معاون ثابت ہوا۔ ان کی ناول نگاری پر نقادوں نے زیادہ توجہ صرف کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے متعدد دوسرے کارنامے جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، پس منظر میں چلے گئے اور اب ان کی وفات کے سو سال کے بعد ان کا ذکر جمیل ہو رہا ہے تو انہیں استعمار کے نو آبادیاتی نظام کے مطلب بر مقاصد کی تکمیل میں معاون قرار دیا جا رہا ہے۔ لیکن ان کے دل میں پرورش پانے والے اس کرب اور درد کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جو انہوں نے 1857ء کے بعد کے مسلمان معاشرے کے لیے محسوس کیا اور مسلمانوں کے ادبار و زوال کو رفع کرنے کے لیے علوم نو کے حصول کی طرف متوجہ کرایا۔ علی گڑھ تحریک اور سرسید احمد خان سے ان کا تعلق واضح ہے لیکن ان سے اختلاف کے زاویے بھی موجود ہیں۔ انہوں نے نو آبادیاتی دور میں اپنے قومی مقاصد کی تکمیل کے لیے سرسید احمد خان کی طرح مشکل فیصلے کیے لیکن اپنی قومی اور خودداری کو قائم رکھا اور تہذیب اخلاق اور تعمیر سیرت پر توجہ مبذول رکھی۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول "نذیر احمد کی ترجمانی حیات پر مذہب غالب ہے اور مذہب پر افادیت۔ واقعیت پسندی، عقل اور عام فہمی کی چھاپ گہری ہے اور ان سے جو نذیر احمد تشکیل پاتا ہے، وہ بے مثال نظر آتا ہے۔" (نایاب تحریر ڈاکٹر انور سدید کے پرانے کاغذات سے بازیافت ہوئی)

◆◆◆

بین الاقوامی کارٹونسٹ جاوید اقبال

انور سدید کی ایک اہم تصنیف ــــ اردو ادب کی مختصر تاریخ

خواجہ محمد زکریا

ڈاکٹر انور سدید کا انتقال اردو تنقید و تحقیق کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔ 87 سال تین مہینے اگرچہ طویل عمر ہے لیکن اس عمر کو جس طرح مرحوم نے بسر کیا اور جتنا سرمایہ اردو ادب کے لیے چھوڑا وہ اس طویل عمر کے شایانِ شان ہے بلکہ تصنیفات و تالیفات کا پلہ تعداد و مقدار و معیار میں اتنا بھاری ہے کہ طویل العمری میں انتقال کرنے والے بہت کم لوگوں کو میسر آیا ہے۔ ان کی کتابوں کی کل تعداد 80 کے قریب ہے لیکن ان کی متفرق نویسی اتنی بڑی تعداد میں ہے کہ اگر ان تمام تحریروں کو جمع کر کے کتابوں کی صورت میں طبع کیا جائے تو شاید مزید سو کتابیں ان کے کریڈٹ پر آ جائیں۔ ان کی بہت سی تحریریں دوسروں کے ناموں سے بھی چھپی ہیں۔ انھوں نے اخبارات میں جو اداریے اور مضامین لکھے ہیں وہ بھی ان کے نام سے شائع نہیں ہوئے۔ ادبی رسائل و جرائد میں ہر مہینے ان کے طویل تبصرے خطوں کی شکل میں شائع ہوتے تھے۔ وزیر آغا ان کے عزیز دوست تھے اور انور سدید ان کا اعتراف کرتے تھے کہ تحریری دنیا کی طرف انھیں آغا صاحب لائے تھے۔ آغا صاحب خود کثیر التصانیف تھے لیکن وہ انور سدید کے 'تحریری وفور' کو نظرِ استعجاب سے دیکھتے تھے۔ بہت ضروری ہے کہ انور سدید کی ان متفرق اور منتشر تحریروں کو یکجا کیا جائے۔ ان کے کام پر کئی پی ایچ ڈی کے مقالات لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے جاتے جائیں گے تاکہ اردو ادب کے قارئین ان کی ہمہ جہت ادبی خدمات سے آگاہ ہو سکیں۔

انور سدید سے میرے خوشگوار تعلقات رہے ہیں۔ انھیں 2013ء کا تخلیق ایوارڈ دیا گیا تو اس موقع پر عزیزی سونان اظہر نے مجھ سے ایک مضمون لکھوایا جو مارچ 2014ء کے تخلیق میں شائع ہوا۔ وہ مضمون زیادہ تر ذاتی حوالے سے لکھا گیا تھا لیکن اس میں ان کی بعض کتابوں کی اہمیت کی بابت بھی اشارے کیے گئے تھے۔ اب ان کے انتقال کے بعد میرے اس عزیز اور میرے مرحوم دوست اظہر جاوید کے فرزند کی فرمائش پر ایک اور مضمون رقم کر رہا ہوں۔ انور سدید کے بے حد متنوع کام پر ایک سرسری مضمون لکھنے کے لیے بھی جو فرصت درکار ہے وہ مجھے میسر نہیں اور امکان یہی ہے کہ تادیر حاصل نہ ہو گی اس لیے ادائے فرض کی ایک معقول صورت یہ ہو گی کہ ان کی کسی اہم تصنیف پر کچھ لکھ ڈالوں۔ چونکہ میرا خصوصی شغف اردو ادب کی تاریخ سے ہے اس لیے میں نے خیال کیا کہ ان کی تصنیف 'اردو ادب کی مختصر تاریخ' کے چند پہلوؤں کی طرف توجہ دلاؤں۔

ڈاکٹر انور سدید کی یہ تصنیف پہلی بار فروری 1991ء میں مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد نے شائع کی۔ ان دنوں مقتدرہ کے صدر نشین ڈاکٹر جمیل جالبی تھے مگر اس کتاب کی ابتدا اور تکمیل ڈاکٹر وحید قریشی کے اصرار پر ہوئی جو ڈاکٹر جالبی سے فوراً پہلے مقتدرہ کے صدر نشین تھے۔ 1988ء میں کتاب کا مسودہ مکمل ہو کر وحید قریشی صاحب کے پاس پہنچ چکا تھا۔ میں نے مقتدرہ کے دفتر میں قریشی صاحب کے حکم پر اسے سرسری طور پر دیکھا بھی تھا اور جب قریشی صاحب نے اس کے بارے میں میری رائے پوچھی تو میں نے مثبت جواب دیا تھا۔ ابھی کتاب اشاعت کے مراحل سے گزر رہی تھی کہ وحید قریشی صاحب کے تعین کی مدت ختم ہو گئی۔ جالبی صاحب کی آمد کے بعد قدرے تاخیر

سے کتاب شائع ہوئی تو 1991ء کا آغاز ہو چکا تھا۔ انور سدید کی اس مختصر تاریخ سے پہلے اردو ادب کی لاتعداد ادبی تاریخیں شائع ہو چکی ہیں۔ آبِ حیات، شعر الہند (عبدالسلام ندوی)، گلِ رعنا (عبدالحی) جیسی نامکمل مگر مفید تذکرہ نما ادبی تاریخوں سے جب ادبی تاریخ نویسی رام بابو سکسینہ تک پہنچی (1927ء) تو اردو میں ادبی تاریخ نویسی کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ پھر مختصر اور طویل تاریخوں کی تصنیف و تالیف کا کام وقفے وقفے سے جاری رہا۔ اس کی تفصیل ڈاکٹر گیان چند جین کی ضخیم کتاب 'اردو کی ادبی تاریخیں' (2000ء) میں دیکھی جا سکتی ہے لیکن میرے نزدیک تاریخ ادب کو مقبول بنانے میں ڈاکٹر سلیم اختر کا بہت حصہ ہے انھوں نے 'اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ' لکھی جس کا پہلا ایڈیشن ستمبر 1971ء میں شائع ہوا۔ اس وقت یہ بہت مختصر تھی اور اس کی ضخامت دو سو صفحات سے بھی کم تھی اور 'مختصر ترین' اس کے لیے بہت مناسب نام تھا۔ بعد ازاں یہ پھیلتی چلی گئی۔ اس کا تیسواں ایڈیشن (2013ء) سات سو سے زائد صفحات پر مشتمل ہے۔ انور سدید کی مختصر تاریخ کا پہلا ایڈیشن بھی اتنی ہی ضخامت کا ہے۔ یہ دونوں تاریخیں مصنفین کے مزاجوں کی مناسبت سے ایک دوسرے سے کافی مختلف ہیں۔ دونوں کی ترتیب ابواب میں بھی خاصا اختلاف ہے۔ اگرچہ انور سدید کی مختصر تاریخ سلیم اختر کی مختصر ترین تاریخ کے بیس سال بعد شائع ہوئی لیکن انور سدید نے اپنے پیش رو مورخ کی پیروی نہیں کی۔ ابواب بندی میں جدت طرازی کا مظاہرہ کیا، مواد میں بھی مختلف ماخذ سے استفادہ کیا اور اسلوب میں 'مختصر ترین تاریخ' کے مزاحیہ و طنزیہ اسلوب کی بجائے سنجیدہ اندازِ بیان اختیار کیا۔

ڈاکٹر انور سدید نے مختصر تاریخ کی حدود کو بہت کچھ پھیلایا ہے۔ لسانیات اور اردو زبان کی ابتدا پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اردو کی مخصوص اصناف ادب کی تعریفیں تحریر کی ہیں، تذکرہ نویسی کی تفصیل مہیا کی ہے۔ یورپین شعرائے اردو کی شاعری کو متعارف کرایا ہے۔ دینی ادب کا تذکرہ کیا ہے، صحافت کو ایک سے زیادہ ابواب دیے ہیں۔ مکاتیب کے سلسلے میں بعد از غالب متعدد اہلِ قلم کے مکاتیب کی خصوصیات قلمبند کی ہیں، عمومی سفرناموں کے علاوہ حج کے سفرناموں پر بالتخصیص لکھا ہے۔ میرے خیال میں بعض ابواب قلم زد کیے جا سکتے تھے یا ان کا ذکر بہت سرسری کیا جا سکتا تھا لیکن ڈاکٹر انور سدید کے پاس مواد کی اس درجہ فراوانی تھی کہ وہ اسے نظر انداز نہیں کر پا رہے تھے۔ علاوہ ازیں ہماری تاریخ ادب کے چار پانچ سو سالہ دور کے تناسب میں معاصر ادب کو نسبتاً زیادہ صفحات دیے گئے ہیں اور اس کی ترتیب بھی قدرے دخیل احوالی ہے مگر اس سے بچنے کا کوئی طریقہ نہیں۔ صرف یہ کیا جا سکتا ہے کہ ادبا و شعرا کی عمر کی ایک حد مقرر کر دی جائے مثلاً اسی سال سے کم عمر والے کسی ادیب یا شاعر کا ذکر نہ کیا جائے۔ اس سے طرح طرح کے اعتراضات سے بچا جا سکتا ہے اور ترجیح و تعصب کا الزام لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

انور سدید نے بعض جگہ زمانی ترتیب بھی سختی سے قائم نہیں رکھی اور کئی جگہ رجحانات ہی تھیں، اہم افراد کے سلسلے میں بھی تقدیم اور تاخیر روا رکھی ہے۔ ظاہر ہے کہ آج تک کوئی ایسی ادبی تاریخ معرضِ وجود میں نہیں آئی جو ہر قسم کے اعتراضات سے بالا ہو اس لیے اگر تسامحات سے قطعِ نظر کر لی جائے تو اس میں بہت سی خوبیاں بھی نظر آئیں گی۔

اردو ادب کے آغاز سے لے کر معاصر ادب تک تقریباً آٹھ صدیوں کے ادب کا یہ جائزہ جامعیت میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ معاصر ادب کے جائزے سے قطع نظر بھی کر لیا جائے تو جنوبی ہند سے لے کر شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز تک اور پھر میر و سودا کے دور سے شروع کر کے لکھنوی شاعری سے ہوتے ہوئے غالب و مومن کے دور تک کلاسیکی شاعری کے حیرت انگیز ارتقا تک کے رجحانات اور اہم

انفرادی شعراء کی خصوصیات کے اندراج تک مشہور شعراء کے دوش بدوش نسبتاً کم اہم شعراء کا تذکرہ بھی اتنی معلومات مہیا کرتا ہے کہ کسی دوسری یک جلدی تاریخ ادب کے مولفین کے بس کی بات نہیں۔ پھر دور سرسید کے شعروادب میں ایک نئی دنیا کا جلوہ دکھایا گیا ہے۔ معاصرین سرسید کے ایک ایک نامور شخص کا تذکرہ کرنے کے ساتھ تحریک سرسید کا ردعمل بھی خاصی تفصیل سے پیش کیا گیا ہے۔ اقبال اور ان کے معاصرین کے موضوعات اور اردو شعری دنیا میں ان کے فنی اضافوں پر بھی اچھا مواد پیش کیا گیا ہے۔ غرض ڈاکٹر انور سدید کی اس مختصر تاریخ میں آپ کسی رجحان یا کسی رجحان ساز کو تلاش کریں تو وہ کہیں نہ کہیں نظر آ جائے گا تاہم بعض اوقات تلاش کرنے میں وقت لگے گا کیونکہ کتاب میں اشاریہ نہیں ہے۔ اگر اشاریہ بھی شامل ہوتا تو اس کی افادیت بڑھ جاتی۔

ڈاکٹر انور سدید کی اس تصنیف میں مختلف اور متنوع مآخذ کے ایک بہت بڑے ذخیرے سے استفادہ کیا گیا ہے۔ تقریباً دو سو مصنفین کی پانچ سو کے قریب تصانیف کا اندراج "کتابیات" میں کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں مختلف رسائل سے پچاس مضمون نگاروں کے اہم مضامین کے حوالے دیے گئے ہیں۔ ان میں بہت سے نادر اور نایاب رسائل بھی شامل ہیں۔ 1947ء سے پہلے کے رسائل کے حوالے ہیں اور تقسیم ملک کے بعد بھارت کے مختلف شہروں سے نکلنے والے رسائل کے نام بھی ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی میں کیسا نادر ذخیرہ کتب و رسائل اکٹھا کیا تھا اور جب ضرورت ان میں سے متعلقہ حوالے وہ کس طرح بہت کم وقت میں تلاش کر لیتے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ "مختصر تاریخ" ایک ڈیڑھ سال کے عرصے میں مکمل کر لی گئی تھی۔ یہ درست ہے تو اس کی اتنے کم وقت میں تکمیل مصنف کے لیے باعث فخر ہے اور قاری کے لیے باعث حیرت ہے۔ اس حیرت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے جب کتاب کے متن میں حواشی کی افراط پر نظر ڈالی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کتابیات کی جو فہرست آخر میں پیش کی گئی ہے وہ فرضی نہیں ہے بلکہ اندرونی صفحات سے اس کی تصدیق و توثیق ہوتی ہے۔

یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ "اردو ادب کی مختصر تاریخ" خامیوں سے مبرا یا تسامحات سے یکسر تہی ہے۔ مصنف نے بعض اوقات روانی میں لکھتے ہوئے حافظے پر غیر ضروری انحصار کیا ہے چنانچہ کئی جگہ انگشت نمائی کی گنجائش ہے۔ بعض جگہ کتابوں کے عنوانات، ادباء و شعراء کے اسماء اور سنین وغیرہ میں اغلاط دکھائی دیتی ہیں لیکن مجموعی طور پر اس کتاب میں جو معلومات مہیا کی گئی ہیں وہ قابل اعتبار ہیں۔ اکثر جگہ مصنف نے ادباء و شعراء کے سنین ولادت کی بجائے سنین وفات پر اکتفا کیا ہے۔ عموماً دور بندی کی تعیین سال ہائے وفات کے مطابق بہتر رہتی ہے مگر جلد وفات پا جانے والوں کے دور یہ تحقیق کو سمجھنے کے لیے سنین ولادت کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ بعض جگہ اشعار کے متون میں بھی اغلاط دکھائی دیتی ہیں خصوصاً قدیم ادب میں اغلاط زیادہ ہیں مگر بعد کے ادوار میں ان کی تعداد کم سے کم ہے۔ اردو میں صحیح پروف ریڈنگ ناممکن نہیں تو بے حد مشکل ضرور ہے۔

مجموعی طور پر ڈاکٹر انور سدید نے زندہ رہنے والے جو کام انجام دیے ہیں ان میں ان کی یہ تصنیف بہت اہم ہے۔ بہت مختصر ادبی تاریخوں میں ڈاکٹر اعجاز حسین، نسیم قریشی، عظیم الحق جنیدی اور نورالحسن نقوی کی تالیفات کا تو ڈاکٹر انور سدید کی تاریخ سے کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر کی 'تاریخ ادب اردو' ضخامت میں ڈاکٹر انور سدید کی تاریخ سے تقریباً ایک سو صفحات زیادہ ہے۔ بعض لحاظ سے یہ اچھی کتاب ہے لیکن قدرے زیادہ ضخامت کے باوجود اس میں انور سدید کی مختصر تاریخ کے مقابلے میں مواد کم ہے۔ مفصل تاریخوں میں تبسم کاشمیری کی اردو ادب کی تاریخ کا ابھی ایک حصہ چھپا ہے جو پونے نو سو صفحات پر مشتمل ہے لیکن ابھی اس میں انیسویں صدی کا نصف

اول ہی آ سکا ہے۔ شاید اس کی دو جلدیں اور بھی شائع ہوں گی۔ اس کتاب میں بعض قابل لحاظ خصوصیات ہیں لیکن اس کی صحیح وجہ بندی تکمیل کے بعد ہی ہو سکے گی۔ وہاب اشرفی کی "تاریخ ادب اردو" تین جلدوں میں بھارت سے شائع ہوئی ہے لیکن اس میں تاریخ سے زیادہ تذکرے کا رنگ غالب ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" کی چار ضخیم جلدیں آ چکی ہیں۔ یہ اردو ادب کی مفصل ترین اور بہترین تاریخ ہے لیکن ابھی یہ انیسویں صدی سے آگے نہیں بڑھی اور اگر اسی تفصیل سے لکھی گئی تو بیسویں صدی کے ادب پر کم از کم تین ضخیم جلدیں لکھنی ہوں گی۔ بدقسمتی سے ڈاکٹر جمیل جالبی کی صحت اچھی نہیں۔ اللہ انھیں صحت کاملہ عطا فرمائے تاکہ وہ اس کارنامے کی تکمیل کر سکیں! تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند کی چھ جلدیں نظر ثانی کے بعد پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر گیان چند نے اس کی اشاعت اول کے بارے میں لکھا تھا کہ اب تک مکمل ہونے والی ادبی تاریخوں میں یہ سب سے اچھی ہے۔ نظر ثانی کے بعد یہ پہلے سے بہتر ہو گئی ہے لیکن چھ جلدوں کی ضخامت طلبا اور عام قارئین کے لیے بہت زیادہ ہے البتہ کتاب حوالہ کے طور پر اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ان حالات میں ڈاکٹر انور سدید کی اردو ادب کی مختصر تاریخ طلبا اور عام قارئین کے لیے دیگر تمام ادبی تاریخوں کے مقابلے میں زیادہ مفید ہے۔ ڈاکٹر گیان چند نے اس کے بارے میں لکھا ہے:

> "میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ انور سدید نے گاگر میں ساگر یا کوزے میں دریا کو سمونے کا فن بڑی چابک دستی سے انجام دیا ہے۔ کون سا موضوع اور کون سا ادیب ہے جو اس زنبیل عمرو عیار میں موجود نہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک غیر معمولی تاریخ ہے جس کی جامعیت کا کوئی دوسری تاریخ مقابلہ نہیں کر سکتی۔ یہ نہایت معروضی ہے لیکن ذرا بھی سطحی نہیں۔"

یہ رائے بہت حد تک مبنی بر انصاف ہے۔ میں اتنا اضافہ کروں گا کہ بعض مقامات معروضی ہونے کے ساتھ ساتھ تحقیقی بھی ہیں۔

◆◆◆

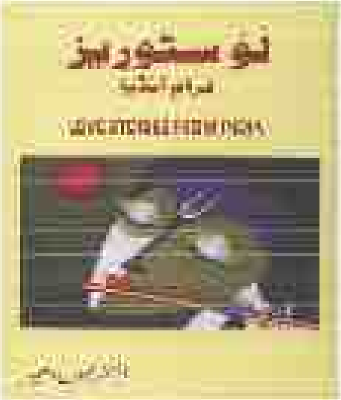

معروف ادیب ڈاکٹر کیول دھیر کے افسانوں کی کتاب

لو سٹوریز فرام انڈیا

شائع ہو گئی ہے

قیمت -/900 روپے

ملنے کا پتا: سنگ میل پبلی کیشنز

25۔ شاہراہ پاکستان، لوئر مال، لاہور۔ رابطہ نمبر 042-37220100

انوارِ ادب

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

12 فروری 2016ء، جمعۃ المبارک تقریباً چھ بجے شام ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ ذوالفقار احسن حسبِ معمول کمپوزنگ میں مصروف تھا۔ میرے بائیں ہاتھ میں ایک کتاب اور دائیں ہاتھ میں ٹیلی فون کا ریسیور، "السلام علیکم" میں نے پہل کی۔ جواباً "وعلیکم السلام" ہارون کمال ہو گیا!" "ڈاکٹر انور سدید کی ڈاکٹر وزیر آغا شناسی" مجھے مل گئی، بہت خوب، شاباش شاباش! کتاب دیکھ کر میری طبیعت بحال ہو گئی۔ یہ اتنا مواد کہاں سے حاصل کر لیا۔ کتاب پڑھ کر میں نے عزیز اکمل کو چٹھی لکھ دی ہے کہ اب جب چاہو آ جاؤ، میں زندہ رہوں گا۔ ہارون، کیا یہ کتاب ڈاکٹر سکندر حیات میکن، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر سلیم آغا اور ادبی پرچوں کو بھیج دی ہے؟" ڈاکٹر انور سدید کی گفتگو سن کر مجھے بہت تقویت ہوئی۔ میں نے جواباً بتایا کہ مذکورہ تمام احباب کو کتاب ارسال کر چکا ہوں۔ آپ کے بارے میں لکھنا میرے ذمے قرض تھا جس کی پہلی قسط ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید پھر بولے "سرگودھا میں بہت سا ادبی کام ہو رہا ہے۔ تمھاری رفتار بہت تیز ہے۔ کتابیں ضخیم ہوتی ہیں۔ ایک کتاب کا تبصرہ مکمل نہیں ہوتا تو دوسری کتاب میرے سامنے پہنچ جاتی ہے۔ اللہ کرے زورِ قلم اسی طرح تازہ رہے۔"

ڈاکٹر انور سدید سے یہ میری آخری گفتگو تھی۔ انھوں نے ایک عرصہ بعد خود اپنے پی ٹی سی ایل فون سے کافی دیر بات کی۔ دعاؤں کا انمول تحفہ آج بھی بازگشت کی صورت سماعتوں میں تازہ ہے۔ اس کے بعد ان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن میری محرومی کہ ان سے رابطہ نہ ہو سکا۔ 10 جنوری 2016ء کو میری کتاب "ڈاکٹر انور سدید کی ڈاکٹر وزیر آغا شناسی" منصہ شہود پر آئی تو بہت سے اخبارات و رسائل اور ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔ اتوار 20 مارچ 2016ء کو ریڈیو پروگرام "دانش کدہ" کے اختتام پر ممتاز عارف اور ذوالفقار احسن نے دل سوز خبر دی کہ ڈاکٹر انور سدید اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پاکستان کے مختلف چینلز پر ان کے انتقال کی خبر نشر ہوتے ہی پاکستان اور بیرونِ پاکستان ادبی حلقوں میں افسردگی پھیل گئی۔

20 مارچ کی شام کا سورج ڈھلنے سے پہلے ڈاکٹر انور سدید کی نمازِ جنازہ سرگودھا کے مرکزی قبرستان میں ادا کی گئی۔ ممتاز دانش ور، عالمِ دین پروفیسر فضل حق نے نمازِ جنازہ سے قبل راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) نے ڈاکٹر انور سدید کی شخصی عظمت اور ادبی خدمات کے بارے میں مختصر اظہارِ خیال کیا۔ اس گفتگو کے دوران ان کے انتقال سے ذہن پر غم کا بوجھ تھا اس لیے الفاظ میرے جذبوں کی ترجمانی سے عاری تھے۔ سارا دن شہر ان کے جنازے میں شریک تھا جو لاہور میں ایک طویل عرصہ بیماریوں کا مقابلہ خندہ پیشانی سے کرتے ہوئے اپنے ہی شہر میں ہم سے بچھڑ گئے۔ سرگودھا کے علاوہ قرب و جوار کے بے شمار شاعروں، ادیبوں نے نمازِ جنازہ میں شرکت کر کے ادب دوستی اور انور سدید سے اپنی محبت کا اظہار کیا۔ مسعود انور، ڈاکٹر امتیاز انور، جمیل ندیم اور محمد انیس (فرزندانِ انور سدید)، سرفراز سید (ممتاز صحافی)، کالم

ویں)، سوہان اظہر جاوید (مدیر ماہنامہ "تخلیق" لاہور)، ڈاکٹر سکندر حیات میکن (شاہ پور)، پروفیسر صابر اور عبدالرسول، پروفیسر مظفر حسین منصور (جوہر آباد)، عابد خورشید، پروفیسر سید مرتضیٰ حسن، ارشد ملک، پروفیسر فضل الحق، ڈاکٹر عامر سہیل، مقبول احمد (مقبول اکیڈمی لاہور)، شیخ رشید (محفل اخبار)، پروفیسر شفیق کھوکھر، ممتاز عارف، اخلاق عاطف، شاکر کنڈان، ذوالفقار احسن، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، طارق حلیم، میاں اصغر اقبال، طارق حبیب، شاکر کنڈان، یوسف خالد، ڈاکٹر شفیق آصف، انیس اکرم، جنید نعیم، ڈاکٹر محمود امیر، ملک محمد اصغر، ملک محمد منیر، عامر ملک، قیصر شکیل، نفاست حسین، ممتاز خان، ناصر شاہ، تحسین بابر، تحسین خان، عبدالمنان چوہدری، منصور قادر بھٹی، شیخ امجد، بیدار احمد بیگ، سجاد احمد، آصف حنیف، مسیح اللہ بٹ، تحسین احمد، نفیس احمد، حافظ محمد یوسف، عاشر وکیل راؤ، حافظ نعیم اللہ، محمد یٰسین، طاہر یٰسین، حافظ محمد یوسف، محمد ظفر، شاہد یٰسین، اطہر یٰسین، محمد نصیر، ڈاکٹر محمد یونس، حافظ عطاء اللہ، کیپٹن (ر) خاور اقبال (ڈائریکٹر ڈی ٹی ایس)، پروفیسر نصیر احمد (اسلام آباد)، اسعد اللہ ملک اور بہت سے احباب غم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید نے ادب کے بہت سے محاذوں پر یادگار خدمات انجام دی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید (محمد انوار الدین) سے میرا تعلق 1970ء سے تادم آخر قائم رہا۔ غالباً 8 دسمبر 1970ء کی بات ہے کہ میں ایجنسی اخبارات کی طرف جا رہا تھا کہ محترم انور سدید میرے پاس سے گزرے اور کہا "برخوردار! آج دفتر میں خوب ہوئے ہو"۔ "شکریہ سر!" میں نے جواب دیا۔ "صرف تقریریں ہی کرتے ہو یا کچھ لکھتے بھی ہو؟" انور سدید نے استفسار کیا۔ "سر! کیا مطلب ہے؟" "میری مراد ہے کوئی تخلیقی کام بھی کرتے ہو؟" "مضمون نویسی کا شوق ہے اور شعری ذوق بھی۔" "کبھی ڈاکٹر وزیر آغا کی بزم میں آئے ہو؟" انور سدید صاحب کا اگلا سوال۔ "ابھی تک موقع نہیں ملا۔" میرا جواب۔ ان سوال و جواب میں ایجنسی تک پہنچ گئے۔ اس پہلی ملاقات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محترم انور سدید کس درجہ ڈاکٹر وزیر آغا سے عقیدت رکھتے ہیں۔ میں ایک زبردست تقریری مقابلے کے بعد گورنمنٹ کالج سرگودھا میں ینگ سپیکرز یونین کا جنرل سیکرٹری چنا گیا۔ طارق محمود صدر چنے گئے۔ 1970-71ء میں ینگ سپیکرز یونین نے تقریبات منعقد کرنے کا ریکارڈ قائم کر دیا۔ مولا بخش آڈیٹوریم ہر ہفتے کسی نہ کسی تقریب کا مسکن دکھائی دیتا۔ طلباء و طالبات کے مابین تقریری مقابلے تو ہر ماہ ہونے لگے۔ 1971-72ء میں مجھے ینگ سپیکرز یونین کا صدر، مجلس ادب کا نائب صدر، پنجابی ادبی سنگت کا جوائنٹ سیکرٹری، ٹیوٹوریل گروپ کا سیکرٹری، فزکس سوسائٹی کا نمائندہ کلاس، کالج سٹوڈنٹس یونین کا جوائنٹ سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر انور سدید کی وجہ سے ڈاکٹر وزیر آغا سے شناسائی ہوئی۔ 1971ء میں مجلس ادب کے زیر اہتمام یوم اقبال کی تقریب میں چیئرمین بورڈ ڈاکٹر صفدر حسین اور ڈاکٹر وزیر آغا نے بحیثیت مہمانان خصوصی شرکت کی۔ اس تقریب میں مجھے بھی گفتگو کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور پھر ڈاکٹر وزیر آغا کی محفل میں جانے کا موقع ملتا رہا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کا لہجہ دھیما ہوتا لیکن ڈاکٹر انور سدید جارحانہ انداز میں پوچھتے "یہ صحافی کہاں تک پہنچی؟ اخبارات میں تصویریں ہی چھپواتے رہو گے یا کوئی ڈھنگ کا کام بھی کرو گے۔" میں ڈاکٹر انور سدید سے خوف زدہ رہنے لگا۔ گورنمنٹ کالج سرگودھا کو خیر باد کہنا پڑا۔ ایف ایس سی چھوڑ کر پرائیویٹ ایف اے کر لیا۔ میونسپل کمیٹی میں کلرک بھرتی ہو گیا تو سرکاری تقریبات میں شرکت کا موقع ملنے لگا۔ ڈاکٹر انور سدید شملہ کلاتھ ہاؤس کے قریب نظر آئے۔ میں نے فخر سے بتایا کہ میں نے ایف اے کر لیا ہے۔ انور سدید: "کیا پہاڑ توڑ دیا ہے؟" چہرے پر تبسم کی کوئی لکیر نمودار نہ ہوئی۔ بی اے کرنے کے بعد پھر ایسا ہی جملہ سننے کو ملا۔ "بی اے کر لیا ہے، تو کون سا کارنامہ انجام دے دیا ہے؟" اگلی ملاقات ڈبل ایم اے کرنے کے بعد ہوئی۔ یہ خبر سن

کر ڈاکٹر انور سدید، پہلی بار مسکرائے اور مزید مطالعہ اور تحقیقی کام کرنے کا مشورہ دیا۔ مولانا اظہر سرحدی (الحاج محمد شریف) نے مجھے انجمن ترقی اردو سرگودھا کا ناظم اعلیٰ بنا کر تحریک نفاذ اردو میں شامل کر لیا۔ ڈاکٹر انور سدید کے لہجے میں تبدیلی آ چکی تھی۔ ہر بڑی تقریب کے بعد حوصلہ افزائی اور آگے بڑھنے کی تلقین جاری رہی۔ سول ڈیفنس اور جانباز فورس کی وردی نے مجھے نظم و ضبط، وقت کی پابندی، اصولوں کی پاس داری اور بڑوں کا احترام کرنے کا جذبہ عطا کیا۔ سیلاب کے دنوں میں سرگودھا بائی پاس کے قریب ہم نے کالا تپی اپنی حدود قیود سے باہر نکل آیا۔ ڈاکٹر انور سدید ان دنوں محکمہ آبپاشی سرگودھا میں تعینات تھے۔ اپنے پورے سٹاف کے ہمراہ بعد از نماز عصر ہم نالا کے کنارے مٹی ڈلوانے کا فریضہ انجام دے رہے تھے۔ نماز مغرب کے بعد جب سورج ڈوب رہا تھا ڈاکٹر انور سدید کی نظر مجھ تک آ پہنچی۔ مجھے دیکھتے ہی بول اٹھے" ڈاکٹر وزیر آغا کی بزم دوستاں میں تمہاری بہت غیر حاضریاں ہیں۔" میں حیران تھا کہ سیلاب ڈیوٹی پر بھی ڈاکٹر انور سدید، مجھے ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں یوں قائل کر رہے ہیں۔ ایسے تخلیقی جماعت کے دوست دعوت فکر دیتے ہیں۔ قائد اردو ڈاکٹر سید عبداللہ کے زیر سرپرستی منعقد ہونے والی اردو کانفرنسوں میں ڈاکٹر انور سدید نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مولانا اظہر سرحدی (مرحوم) اور ڈاکٹر سید عبداللہ کے قریبی مراسم تھے اس لیے ڈاکٹر سید عبداللہ سرگودھا کی تقریبات میں محبت و عقیدت سے شرکت کیا کرتے تھے۔ پشاور کے اہل قلم بھی سرگودھا کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے۔ احمد ندیم قاسمی، قمر اجنالوی، قتیل شفائی، عطاالحق قاسمی، جعفر اقبال، پروفیسر مسعود مرزا بھی مولانا اظہر سرحدی کی دعوت کو نظر انداز نہ کرتے۔ ڈاکٹر انور سدید قومی زبان اردو کے ضمن میں منعقدہ ہر تقریب کی کامیابی تصور کیے جاتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انجمن ترقی اردو، حلقہ ارباب ذوق، رائٹرز کلب، پاکستان نیشنل سنٹر، آرٹس کونسل، سرگودھا اکادمی، گورنمنٹ کالج، گورنمنٹ انبالہ مسلم کالج، پی اے ایف کالج اور دیگر اداروں میں ڈاکٹر انور سدید کی گفتگو پسند کی جاتی۔ کتابوں پر تبصروں کے سلسلہ میں انھیں بطور خاص مدعو کیا جاتا۔ قندیل، اردو زبان، اوراق، کامران اور سرگودھا سے جاری ہونے والے تمام ادبی جرائد اور رسائل تک ڈاکٹر انور سدید کی بھرپور رسائی رہی۔ ملی و قومی تقریبات میں ڈاکٹر انور سدید کی شرکت لازمی تصور ہونے لگی۔ ڈاکٹر انور سدید، میرے ایم فل کرنے پر بہت خوش ہوئے۔ آغا تبسم صاحب، سید مجھے راستے پر آ ملے گئے ہوا یہ فقرہ سن کر میری خوشی ناقابل بیان تھی۔ ایم فل سے پی ایچ ڈی تک کے سفر میں ڈاکٹر انور سدید کی محبت اور راہنمائی میرے ساتھ رہی۔ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر وزیر آغا کا تعلق پھول اور خوشبو جیسا رہا۔ اخبارات و رسائل میں ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر و فن پر ڈاکٹر انور سدید کے تحقیقی مضامین نے محققین کے لیے کئی راستے ہموار کیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید کا تعلق قلبی رہا۔ ایک مخصوص گروپ میڈیا کا سہارا لے کر ڈاکٹر وزیر آغا پر تنقید کرنا فرض عین سمجھتا تھا تو ڈاکٹر انور سدید شمشیر بے نیام ہو کر ڈاکٹر وزیر آغا کے لیے ڈھال کا کام کرتے۔ ان کی تحریروں کے سامنے مخالفین کے غباروں سے ہوا نکل جاتی۔ سرگودھا سے لاہور جانے کے بعد بھی ڈاکٹر انور سدید نے ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر و فن پر تحقیقی مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ "اوراق" کا معیار بہتر سے بہتر بنانے میں ڈاکٹر انور سدید گہری دلچسپی کا مظاہرہ کرتے۔ پروفیسر سجاد نقوی اور ڈاکٹر وزیر آغا ان کے مشوروں کو بہت اہمیت دیتے۔ مجھے کئی ایسی محافل یاد ہیں جن میں ڈاکٹر وزیر آغا کو ڈاکٹر انور سدید کی صلاحیتوں کا برملا اظہار کرتے سنا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کہا کرتے تھے" مجھ سے زیادہ تو انور سدید نے لکھے ہیں اتنے کسی اور کو لکھنے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا۔" اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر انور سدید لفظوں کی حرمت کے امین ہیں۔ مجید امجد بھی ڈاکٹر انور سدید کی صلاحیتوں کے بہت معترف تھے۔ روزنامہ "نوائے وقت" میں ان کے مضامین، تبصرے اور کالم

پڑھنے والے بھی انھیں داد دیے بغیر نہ رہتے۔ سنڈے میگزین "نوائے وقت" اور "نوائے ملت" میں کتابوں پر تبصروں کا سلسلہ بڑی استقلال کے ساتھ جاری رہا۔ اگر ان تبصروں کو اکٹھا کر لیا جائے تو ایک نئی کتاب منظرِ عام پر آ سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر انور سدید حق گوئی اور بے باکی کی چلتی پھرتی تصویر ہیں۔ وہ کلمۂ حق بلند کرنے میں کبھی مرعوب نہ ہوئے۔ استادِ محترم ڈاکٹر خورشید رضوی نے ان کی حق گوئی اور بے باکی کے بارے میں لکھا ہے:

> "انور صاحب نے بے دھڑک بات کہنے کی جس جرأت کا اظہار کیا ہے وہ خاص مشکل چیز ہے۔ ذاتی گفتگو میں انھوں نے خود کو بنیادی طور پر سادہ اور دیہاتی قرار دیا تھا جو چھپا کر بات کہنے اور اپنے حقیقی جذبات کو مخفی رکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ یہ بات ان کے حوالے سے بالکل درست ہے۔ وہ اپنی بنیادی سرشت اور فطرت کے اعتبار سے صاف گو آدمی ہیں جو اپنے دلی جذبات کے اظہار سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا۔ انھوں نے اپنے نام کے ساتھ "سدید" کا جو اضافہ کیا ہے وہ بھی اس بنیادی رجحان کی نشاندہی کرتا ہے اور یہ لفظ انھوں نے قرآن حکیم سے اخذ کیا ہے اور جس آیت کریمہ سے لیا ہے وہ یہ ہے "قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا" (سیدھی اور کھری بات کرو) اپنے قلمی نام کے طور پر اس لفظ کا انتخاب ان کی ابتدائی مذہبی تربیت اور دیانت دارانہ صاف گوئی کی خواہش کا پتہ دیتی ہے۔"

اردو ادب کی تحریکوں کی طرح ڈاکٹر انور سدید بھی اپنی ذات میں ادب کی ایک ایسی تحریک ہیں جن کے بغیر اردو تنقید، تاریخ ادب، انشائیہ اور افکارِ وزیر آغا کی ترویج مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ ڈاکٹر انور سدید نے 4 دسمبر 1928ء کو قصبہ مہانی، تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا میں آنکھ کھولی۔ یہ علاقہ بہادروں، تحریک پاکستان کے کارکنوں، محنت کشوں اور رس دار پھلوں کے حوالے سے ملک بھر میں مقبول ہے۔ ان کے والد مولوی امام دین علاقہ کی ایک نیک اور شریف النفس شخصیت تھے۔ پرائمری تعلیم اسلامیہ پرائمری سکول سے حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان سے مڈل جب کہ 1944ء میں گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔ تحریکِ پاکستان میں آپ پیش پیش رہتے ہوئے ادب کی گلی کوچوں کی طرف راغب ہوئے۔ 1949ء میں انجینئرنگ کا ڈپلومہ سونے کے تمغے کے ساتھ حاصل کر لیا۔ 1961ء میں ایس ڈی او ہوئے۔ بعد ازاں ڈھاکہ سے اے ایم آئی ای کر کے 1970ء میں محکمہ انہار کے مستقل ہوئے۔ انھوں نے ایم اے اردو پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی سے قابلِ مثال کامیابی کے ساتھ پاس کیا کر ریگولر اور پرائیویٹ طالب علموں کو شکست دیتے ہوئے گولڈ میڈل حاصل کیے۔ 1979ء "اردو ادب کی تحریکیں" مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا ان کے نگران تھے جب کہ ڈاکٹر سید عبداللہ اور شمس الدین صدیقی ممتحن تھے۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر انور سدید کے اعزاز میں ایک تقریب "دل کشا ہوٹل" سرگودھا میں منعقد ہوئی جس کا احوال کتاب میں الگ موجود ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی تحقیقی صلاحیتوں سے اتنے لاتعداد صفحات پر بکھیرے کہ کئی قلم چلتے چلتے دم توڑ گئے لیکن صفحات کی صحرا نوردی مکمل نہ کر سکے۔ پیرانہ سالی کے باوجود قلم ان سے التجا کرتے ہیں کہ وہ اپنے قلم سے صفحات کی پیاس بجھاتے رہیں۔ انھوں نے ادب کی آبیاری کے علاوہ پنجاب کی سرزمین کے بہت سے علاقوں کو سیراب کرنے کا فریضہ ایمان داری اور دیانت داری سے کیا۔ سول انجینئرنگ ڈپلومہ گورنمنٹ سکول آف انجینئرنگ پنجاب، رسول ضلع منڈی بہاءالدین سے گولڈ میڈل حاصل کر کے اپنی فنی اور انتظامی صلاحیتوں پر مہر ثبت کی۔ انھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز ڈھاکہ سے سول انجینئرنگ ڈگری کورس مکمل کیا۔ 4 دسمبر 1988ء کو انھوں نے بحیثیت ایگزیکٹو انجینئر محکمہ

آپ یاقی پنجاب اپنی ملازمت کا دورانیہ مکمل کیا۔ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر وزیر آغا کا تعلق پھول اور خوشبو کا رہا یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے وصال 7 ستمبر 2010ء کو ڈاکٹر انور سدید نے کہا "یوں لگتا ہے کہ وزیر آغا نہیں بلکہ میں مر گیا ہوں" بعد ازاں ایک انٹرویو میں گویا ہوئے "کاش میری زندگی وزیر آغا کو لگ جاتی۔"

راقم الحروف کو ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کی بزمِ دوستاں میں بیٹھنے اور فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ جس طرح راقب شیب نے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ انہیں تعلیم کی پڑھائی پر گامزن کرنے میں انور سدید کا ہاتھ ہے اسی طرح مجھے بھی انور سدید کی سرزنش کبھی نہیں بھولتی کہ وہ ہر موقع پر مجھے تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد بھی ان کی رہنمائی میرے لیے مشعل راہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا شناسی میں انور سدید کے کردار پر کئی کتابیں مرتب کی جا سکتی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے ڈاکٹر وزیر آغا کے فکروفن کی تفہیم کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی تحریریا تمام کتب پر تبصرے اور تجزیاتی جائزے اخبارات و رسائل کی زینت بنتے رہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں اور ان کی کتب پر بلا جواز تنقیدی مضامین کا مدلل اور منہ توڑ جواب دینے میں انور سدید کبھی پیچھے نہ رہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ساٹھویں سالگرہ کے موقع پر ڈاکٹر انور سدید نے خوب صورت گیٹ اپ کے ساتھ پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب "وزیر آغا۔ ایک مطالعہ" بھی پیش کی۔ 18 مئی 1982ء کو منظر عام پر آنے والی یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ تخلیقی زاویے — تجزیاتی زاویے — تنقیدی زاویے — شخصی زاویے — صحافتی زاویے — انتخاب — حاصل مطالعہ۔

جنوری 1989ء میں ڈاکٹر انور سدید نے اظہارِ عقیدت کا ایک اور مظاہرہ "شام کا سورج" مرتب کی۔ 678 صفحات پر مشتمل یہ کتاب مکتبہ فکر و خیال لاہور سے شائع ہوئی جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کے فکروفن اور مختلف کتابوں کے حوالے سے اہلِ علم و دانش کے بہت سے مضامین شامل ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے فکروفن پر یہ کتاب شام کا پہلا ستارہ ہے جو صدیوں کئی ستاروں کو جنم دے گا۔ ادبی دنیا میں ایسے معرکے اور خلوص کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں کہ جب ایک ہم عصر شاعر ادیب دوسرے کی علمی و ادبی قدر و منزلت کا اعتراف کرے۔ اسے حقِ دوستی اور حقِ شاگردی کی اصول مثال کہا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی ادبی دنیا میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کی دوستی ضرب المثل ہے۔ آفتابِ ادب ڈاکٹر وزیر آغا نے پاکستان کو عالمی سطح تک متعارف کروانے میں جو کردار ادا کیا، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ جس طرح سرگودھا کے شاہین فضائے بسیط سے گزرتے ہوئے پوری دنیا میں اپنی ہوابازی اور شہبازی کا لوہا منوا چکے ہیں اسی طرح شہیرِ ادب سے ڈاکٹر وزیر آغا نے تنقید، انشائیہ، شاعری، اقبالیات، لسانیات، ادبیات اور سائنسیات کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے فکروفن کی تفہیم اور فروغ کے لیے ڈاکٹر انور سدید نے ایک شاہین کی طرح سفر طے کیا ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے دنیا کے ان تمام ممالک میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا رنگ جمایا ہے جہاں جہاں اردو زبان بولی جاتی ہے یا سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ان کا پیچھا کرتے ہوئے ان کی صلاحیتوں کے منظر اور پس منظر کی پھلنے پھولنے کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ ان کی سے مبرا ذاتی اغراض و مقاصد سے بالاتر ہو کر ڈاکٹر انور سدید نے اردو ادب کے گوہرِ گراں ڈاکٹر وزیر آغا کے فکروفن کو تجزیاتی اور فنی روشت

کے کینوس سے عالمی ادب تک متعارف کروایا۔ ڈاکٹر انور سدید کی ادبی خدمات کا احاطہ ایک مضمون میں کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ ان کی شخصیت ڈاکٹر محمد اقبال کے ان اشعار کے گرد گھومتی رہی۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

حلقۂ یاراں میں ان کے الفاظ پھول کی پتیوں کی صورت نظر آتے تھے لیکن ادبی مخالفین کے لیے ان کے لفظوں میں بارود کی انداز محسوس ہوتا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید ادبی محسنین کو کبھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا جب 7 ستمبر 2010ء کو ہمیں مفارقت دے گئے تو انور سدید بول اٹھے" کاش وزیر آغا کے جنازے میں چلا جاتا"۔ ادب دوستی اور احسان مندی کی ایسی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ 20 مارچ 2016ء کے بعد عالمی ادب میں ان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ ان کی ادبی خدمات ایک روشنی کی طرح ہیں اور یہ روشنی ہر سو پھیل رہی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ایک شخصیت نہیں ایک ادبی تحریک کا نام ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ پوری توقع ہے کہ ان کی ادبی کاوشوں سے محققین فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ میری یہ چند سطور ان سے نسبت کا اظہار ہے ورنہ یہ کوشش سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

◆◆◆

معروف ادیب ڈاکٹر سکندر حیات میکن کی کتاب

بحر ادب کے شناور

(ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید)

شائع ہو گئی ہے قیمت/-500 روپے

ملنے کا پتہ: مقبول اکیڈمی لاہور (فون نمبر: 04237324164-04237233651)

معروف شاعرہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی خوبصورت شاعری کا مجموعہ

پھول خوشبو اور تازہ

شائع ہو گیا ہے قیمت/-500 روپے

ملنے کا پتہ: الحمد پبلی کیشنز رانا چیمبرز سیکنڈ فلور پرانی انارکلی لاہور (فون نمبر: 04237231490)

ایک مثالی کتاب دوست شخصیت

نجم الحسن رضوی

ڈاکٹر انور سدید کتاب دوست بھی تھے اور کتاب گر بھی۔ وہ کتابیں لکھتے اور پڑھتے اس جہانِ فانی سے رخصت ہوئے اور کتابیں ہی انھیں زندہ رکھیں گی۔ انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز محکمۂ انہار کے ایک انجینئر کی حیثیت سے کیا اور عمر عزیز کا بڑا حصہ بپھرتے پانیوں پر مٹی کے بند باندھتے گزرا مگر پھر رفتہ رفتہ ان کے اندر علم و ادب سے والہانہ وابستگی کا ایسا عظیم دریا رواں ہونے لگا جسے قابو میں رکھنے کے لئے اسے صرف کتابوں کے بند باندھے جا سکتے تھے۔ اور پھر وہ ساری زندگی یہی کرتے رہے اور انوار الدین سے انور سدید ہو گئے۔

ان کا ادبی سفر بڑا طویل تھا، برسوں طویل — اپنے علمی و ادبی ذوق کی آسودگی کے لئے انھوں نے پہلے اپنے تعلیمی افق کو فروغ دیا۔ ایم اے (اردو) کے امتحان میں جامعہ میں اول آئے اور بعد میں پی ایچ ڈی کے لئے "اردو ادب کی تحریکیں" کے نام سے ایسا جامع مقالہ تحریر کیا جسے انجمن ترقی اردو نے کتابی شکل میں شائع کیا اور جس کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہر سال اس کا نیا ایڈیشن آ جاتا ہے۔

ادب ڈاکٹر انور سدید کے لئے جز وقتی مشغلہ نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کی کسی ایک صنف سے چپکے رہنے کے قائل تھے۔ ادب سے ان کی عملی وابستگی کی ترجمانی اقبال کے اس شعر میں جو اگرچہ 'خودی' کے بارے میں ہے یک لفظی ترمیم سے کی جا سکتی ہے۔

'ادب' کا نشیمن مرے دل میں ہے — فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

پہلے وہ افسانہ نگار رہے پھر نقاد، شاعر، انشائیہ نگار، مبصر، کالم نویس اور ادبی تجزیہ نگار۔ ہر کے ہر شعبے میں انھوں نے امتیازی قلم کار ہونے کا ثبوت دیا۔ ان کے مطالعے کے کمرے میں شاید حروف سازی کی ایسی خودکار مشین نصب تھی جس پر ہاتھ رکھتے ہی وہاں تازہ بہ تازہ ادبی مقالوں، کتابوں پر تبصروں، انشائیوں اور سالانہ ادبی جائزوں کا ڈھیر لگ جاتا جن سے اوراق، تخلیق، الحمرا، اور بے شمار دوسرے ادبی جرائد اور رسائل کی اشاعتی ضرورتیں پوری ہو جاتیں۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد انھوں نے اپنے سبک رفتار رخشِ قلم کو صحافت کی دشت پیمائی کا موقع بھی دیا اور اپنی سیاسی بصیرت اور حاضر دماغی کی داد پائی۔

میں ایک زمانے سے ان کی تخلیقی زرخیزی کا قائل تھا اور خاص طور پر افسانے اور ناول کی تنقید سے ان کی دلچسپی سے متاثر بھی مگر جب انھوں نے پہلی بار میرا ذکر اسّی کی دہائی کے اولین سالوں میں الہ آباد، بھارت میں چھپنے والی اپنی کتاب "اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش" میں کیا تو مجھے بڑا تعجب ہوا کیونکہ میں ان دنوں دوحہ میں تھا۔ اس وقت تک ڈاکٹر صاحب سے میرا کوئی ذاتی تعارف بھی نہ تھا اور نہ ہی میرے بہت زیادہ افسانے دیہاتی پس منظر سے شائع ہوئے تھے۔ وہ کہانی جس کا انھوں نے اس کتاب میں حوالہ دیا تھا 1974 میں

"ماروی کی واپسی" کے نام سے اوراق میں چھپی تھی۔ اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ افسانے کی تنقید میں کیسی حقانی نگاہ رکھتے تھے۔ اردو کے نقادوں میں یہ خصوصیت بڑی نایاب ہے۔ مجھے تو عام طور پر اپنے یہاں مشہور ترین نقادوں میں بھی یہی خامی نظر آتی کہ ان کی دور کی نگاہ کمزور ہوتی ہے۔

میں بیرون ملک ملازمت کی وجہ سے 1979 میں پاکستان سے دبئی چلا گیا تھا جس کی وجہ سے ڈاکٹر انور سدید سے کسی قسم کے رابطے کا کوئی امکان باقی نہ رہا۔ اگرچہ اوراق اور ڈاکٹر وزیر آغا سے ادبی تعلق گہرے سے گہرا ہوتا چلا گیا۔ لیکن جب تیس سال امارات میں قیام کے بعد 2008 میں وطن واپس آیا تو ڈاکٹر انور سدید سے فون پر رابطے کا سلسلہ شروع ہوا جو ان کی وفات سے دو ہفتے پہلے تک جاری رہا اور یہی وہ زمانہ ہے جب مجھے ان کی اصل شخصیت کو جاننے اور پہچاننے کا موقع ملا۔ عام طور پر ادب کے قارئین انھیں ایک بسیار نویس ادیب کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن ان سے بات چیت کر کے مجھ پر ان کی جو شخصیت عیاں ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ جتنا لکھتے تھے اس سے کہیں زیادہ پڑھتے تھے۔ آج ہمارے اہل ادب کا المیہ یہ ہے وہ عصری ادب کو اس طرح نہیں پڑھتے جیسا کہ پڑھنا چاہیے۔ خود میرا ذاتی تجربہ یہی ہے کہ جب آپ کسی سینئر یا جونیئر لکھنے والے دوست کو اپنی کتاب پیش کرتے ہیں تو اگلے ہی دن سے ان کی بے پناہ مصروفیات میں اس قدر اضافہ ہو جاتا ہے کہ انھیں کتاب کھول کے دیکھنے کی بھی فرصت نہیں ملتی اس پر رائے زنی تو دور کی بات ہے۔ مگر ڈاکٹر انور سدید سے جب بھی بات ہوتی وہ گفتگو کے دوران نہ صرف تازہ ترین کتابوں اور رسالوں کے ڈھیر لگا دیتے بلکہ ان کے مندرجات پر اپنے چشم کشا تبصروں سے بھی نوازتے۔ ان کے مطالعے کے کمرے میں ادب کے تازہ ادبیات کا دفتر کھلا ہوا تھا جہاں آپ کو فکشن اور شاعری کے قریوں میں آنے والے نئے موسموں کی خبر ملتی۔

ڈاکٹر انور سدید کو اپنی تخلیقی شخصیت کی تعمیر میں ڈاکٹر وزیر آغا کی پوری مدد حاصل رہی جس کا انھوں نے برملا اعتراف کیا اور ان سے اپنی بے پناہ محبت اور عقیدت کے اظہار کے لئے ان کے دفاع میں گھمسان کی جنگ لڑتے رہے۔ یہ غیر ضروری جنگ اپنے زمانے کے دو نابغہ روزگاروں ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے نادان دوستوں کی مہربانی سے سالوں جاری رہی جس کے نتیجے میں آغا صاحب کا کوئی نقصان ہوا نہ ندیم صاحب کا بس مخالف حلقوں میں انور سدید کے ادبی قد و قامت کو کم کرنے کی کوششیں جاری رہیں اس کا احساس خود انور سدید کو بھی تھا جس کا عکس ان کی تحریروں میں بھی نظر آیا۔

ادبی دنیا میں نظریاتی اختلاف اور قلمی محاذ آرائی کوئی نئی بات نہیں اور ہر زمانے میں مختلف شخصیتوں اور ادبی گروہوں میں چپقلش کے قصے تاریخ کا حصہ ہیں۔ ایک بار جب شاہد احمد دہلوی نے ذاتی طور پر احمد کی زبان پر جوش صاحب کے اعتراضات پر خفا ہو کے ان سے اپنی ناراضی کا اظہار ساقی کا جوش نمبر نکال کر کیا جس میں ان کے کردار و افعال کے بارے میں بے تکلف تبصرے کئے گئے تھے تو جوش صاحب نے جواباً افکار کے جوش نمبر میں ایک مضمون تحریر کیا جس کا عنوان تھا ضرب شاہد بہ فرق شاہد باز! اس کے بعد معاملہ ختم ہو گیا۔ لاہور اور سرگودھا کے ادبی مناظرے کے بھی سارے کردار اب باقی نہیں رہے۔ میں ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی دونوں کا معتقد اور ان کی تخلیقی عظمتوں کا گرویدہ ہوں اور مجھے یقین ہے کہ ان کے بارے میں اب کوئی دل دکھانے والی تحریر نہ چھپے گی۔ اسی طرح ڈاکٹر انور سدید کو بھی

ان کے علمی کارناموں کے لیے یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر انور سدید نے قرطاس و قلم کی دنیا میں قابلِ رشک کامیابیاں حاصل کیں اور اپنی تحریروں کو حیرت انگیز حد تک متنوع موضوعات سے آراستہ کیا۔ شاعری کے مختلف روپ، انشائیے کے رنگ، افسانے کے ڈھنگ اور ناول کے رنگ سب ان کے تنقیدی جائزوں کا حصہ بنے اسی طرح ڈاکٹر وزیر آغا سمیت اپنے زمانے کے نامور شاعروں کے فن کی تشریح و تعبیر بھی انھیں ہمیشہ عزیز رہی۔ وہ آخری دم تک تخلیقی کاموں میں مصروف رہے اور پیرانہ سالی اور بیماری کے باوجود کتابوں سے اپنی الفت کا ثبوت دیتے رہے۔ جب بھی ان سے فون پر بات ہوتی وہ اپنی بیماری سے زیادہ میری بیماری کے بارے میں متفکر لگتے اور مجھے حوصلے کے ساتھ تخلیقی کاموں میں مصروف رہنے کی تلقین کرتے۔ انھیں یقین تھا کہ بیماری کو تخلیقی قوت سے شکست دی جا سکتی ہے۔ انھوں نے 87 سال سے زیادہ عمر پائی اور تقریباً اسی ہی کتابیں لکھیں۔ آسمانی ستاروں کی روشنی ہم تک نوری سالوں کے ذریعے پہنچتی ہے جبکہ قلمی ستاروں کے تخلیقی نور کی ہم تک جلوہ فرمائی کتابی سالوں کی محتاج ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کی سب کتابیں ان کی شخصیت کو ایسے نکھاریں گی کہ وہ ادب کے آسمان پر ہمیشہ روشن ستارے کی طرح جگمگاتی رہے گی۔

◆◆◆

معروف مزاح نگار، ادیب، شاعر کے ایل نارنگ ساقی کی مرتبہ کتاب

انتخابِ کلامِ بیدی

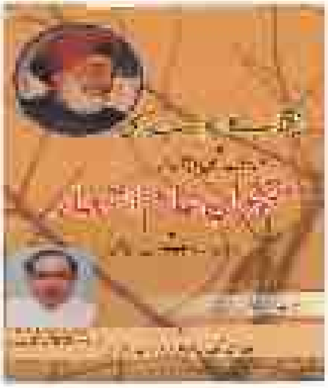

حروفِ تہجی اشعار

انگریزی، ہندی، اُردو ڈکشنری

شائع ہوگئی ہے

ملنے کا پتا: کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ

L-4، چوٹا گاتھ سرکس، نیو دہلی-110001 (رابطہ نمبر: 09811580888)

ڈاکٹر انور سدید نابغہ روزگار شخصیت
(ایک دیانت دار قلمکار)

حسن عسکری کاظمی

ڈاکٹر انور سدید کا شمار ان قلم کاروں میں ہوتا ہے جنہیں پڑھنے لکھنے کا جنون کسی پہلو سکون سے بیٹھنے نہیں دیتا۔ ان کا مقصودِ زندگی قلم سنبھالنے اور صفحۂ قرطاس پر تخلیقی جواہر بکھیرنے کے باوصف نئے آفاق کی جستجو میں اپنی جولانیاں دکھانے اور ہر لحظہ کچھ کر گزرنے پر آمادہ رکھتا تھا۔ ایسا ادیب جو شہرت اور ناموری سے بے نیاز اور حرمتِ قلم کو عزیز جانتا ہو اسے انور سدید اور شیدائے تخلیق کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی تحریر اور ان کا فن جس بنیاد پر قائم ہے وہ ان کا وسعتِ مطالعہ کا وصفِ خاص ہے۔ انہوں نے دورانِ ملازمت بھی ادب پڑھنے کی خاطر وقت نکالا، ہندو پاک کے بیشتر ادبی جریدوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے رہے۔ سرگودھا میں ڈاکٹر وزیر آغا کے ہاں شام کے وقت جتنے احباب آتے ان میں انور سدید کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ان کی تخلیقی جہتوں کا اندازہ اس ایک بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ادب کے ہر موضوع پر مکالمہ کرتے اپنی رائے کا اظہار کرتے اور تنقیدی اندازِ اظہار میں اپنی تخلیقیت کا معیار برقرار رکھتے رہے۔ ان کی تحریروں میں ہر صنفِ ادب کا حوالہ ملے گا۔ ڈاکٹر انور سدید کی نمایاں خوبی یہ رہی کہ وہ بے کم و کاست اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے شگفتہ یا رومانوی اندازِ نگارش اختیار کرتے، انہوں نے "اردو ادب کی تحریکیں" جیسا وسیع مقالہ سپردِ قلم کیا جو تحقیق کا نادر نمونہ ہے جسے ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر شمس الدین صدیقی نے پرکھا اور اعلیٰ معیار پر قرار رکھتے ہوئے اپنی نظیر آپ قرار دیا۔ اسی زمانے میں وہ سرگودھا میں قیام پذیر رہے جہاں ڈاکٹر وزیر آغا کے علاوہ ڈاکٹر جمیل بخاری، غلام جیلانی اصغر، صوفی فقیر محمد، ڈاکٹر خورشید رضوی، خلیل بدایونی، انور گوندی، ڈاکٹر منظور حسین اور جوہر نظامی سے ان کی ملاقاتیں رہیں، اوراق کی ادارت بالواسطہ کرتے رہے اور وہ وہیں پر رہ کر اپنے قلم کی معجز نمائی سے قاری کو مسحور کرتے رہے۔

ڈاکٹر انور سدید ایک نابغۂ روزگار شخصیت کے حامل انسان تھے۔ انہوں نے زندگی بھر کام، کام اور کام جیسے مقولے کو اپنا کر خود کو مصروفِ عمل رکھا۔ ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے بنا کر رکھی۔ وہ دیانت شعار، برجستہ اظہار اور سنجیدہ اطوار رکھنے میں اپنی نظیر آپ تھے۔ معروف ادیبہ اور افسانہ نگار محترمہ عذرا اصغر نے انور سدید کی سادہ مزاجی کے قائل نظر آتیں "درویش ادیب" نام دیا۔ یقیناً وہ معیارِ زندگی کی طلب سے بے نیاز رہے، پانچ مرلے کا مکان، وہ بھی کتابوں سے بھرا ہوا، تخت پوش پر کتابیں، بستر پر ادبی جریدے۔ مہمان کو اپنے چھوٹے سے ایک کمرے میں بٹھا کر مکالمہ کرتے۔ ان کی شناسائی ہندو پاک کے بیشتر قلمکاروں سے رہی۔ ان کی مثال ایسے شخص سے دی جا سکتی ہے جس نے اپنی ذات سے بڑھ کر دوسروں کو ترجیحاً پیش کیا اور مولانا حالی کے بقول یہی رویہ انہیں پسند آیا۔

ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا — خاکساری اپنی کام آئی بہت

ہمارے عہد کا مسئلہ ہے کہ تخلیقی صلاحیتوں سے کام لینے اور ادبی کاوشوں کو بروئے کار لانے کا عمل سست روی کا شکار ہوا دوسرے لفظوں میں نمود و نمائش کا رجحان جو حاجب کہ معیار بہتر سے بہتر کر تشخص ہنر کا نام تھا ادق پروان چڑھا لیکن ڈاکٹر انور سدید اپنے کام میں مگن رہے۔ انہوں نے ہر گوشۂ ادب کا مطالعہ جاری رکھا اور جاں فشانی کے ساتھ تحقیق اور تنقیدی طرز عمل اختیار کر کے ادب کی فروغ پذیری میں اپنا کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے کوئی ناول نہیں لکھا لیکن ناول نگاری کے فن پر جتنا لکھا شاید ہی کسی دوسرے نقاد نے اتنا لکھا ہو۔ اول تو پاکستان میں تنقید کا معیار غیر تسلی بخش خیال کیا گیا مگر ایسا بھی نہیں۔ سید وقار عظیم نے ناول اور افسانے پر نہایت تفصیل کے ساتھ بحث بھی کی اور جو کچھ لکھا قاری کی معلومات میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ البتہ ڈاکٹر انور سدید نے اس صنف ادب کی تفہیم اور مختلف ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں پر عملی تنقید سے نئے لکھنے والوں کو ترغیب دی۔

ڈاکٹر انور سدید کا انتقادی اسلوب ان کی پہچان بن گیا۔ انہوں نے اردو افسانے میں دیہات اور دیہی ثقافت کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اردو انشائیے کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ معرکہ آراؤں میں مختلف علموں کا منظر نامہ اور جدید قدروں سے متعلق کھوج لگائی۔ اردو ادب کی تاریخ کے حوالے سے اردو ادب کی تحریکیں، اردو ادب کی مختصر تاریخ اور اسی طرح پاکستان میں ادبی جریدوں کی تاریخ رقم کی۔ انہوں نے کلاسیکی شعراء پر خصوصیت کے ساتھ "میر انیس کی قلمرو" اور "غالب کا جہاں" لکھ کر خود کو منوایا۔ ڈاکٹر انور سدید نے شاعر مشرق علامہ اقبال کے حوالے سے اقبال کے کلاسیکی نقوش، اقبال شناسی اور ادبی دنیا، اقبال شناسی اور اوراق جیسی وقیع معلومات سے اردو ادب میں اضافہ کیا۔ ڈاکٹر انور سدید کا قلم اس طرح رواں دواں رہا کہ ان کے ادبی کارناموں کا احاطہ کرنے میں ایک دفتر بے کنار کی ضرورت پیش آئے گی۔ اس حوالے سے ان کو خراج تحسین پیش کرتا ہوا یہ شعر قاری کی نذر کیا جا سکتا ہے۔

موج در موج نظر آیا صحیفہ میرا — میرے دریا کی روانی نہیں دیکھی تم نے

ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں ڈاکٹر خورشید رضوی نے سچی بات کی کہ "انور صاحب نے بے دھڑک بات کہنے کی جس جرأت کا اظہار کیا ہے وہ خاصی مشکل چیز ہے۔ ذاتی گفتگو میں انہوں نے خود کو بنیادی طور پر سادہ اور دیہاتی قرار دیا تھا جو چھپا کر بات کہنے اور اپنے حقیقی جذبات کو مخفی رکھنے پر قادر نہیں ہوتا"۔ یہ بات غلط نہیں۔ ان سے اکثر ملاقات رہا کرتی وہ صاف گو اور کھلی ڈلی رکھے بغیر بات کرتے۔ معاصر قلم کاروں سے ان کے تعلقات اچھے رہے البتہ انہوں نے کسی کے بارے میں جو رائے پیش کی وہ اس پر قائم رہے۔ انہوں نے منشی پریم چند کو اردو افسانے کا باوا آدم قرار دیا۔ انور سدید دیہاتی ہونے کے ناتے پریم چند کو اپنے قریب اور اپنے مزاج کا نمائندہ افسانہ نگار تصور کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "پریم چند کی فطری سادگی نے ان کے اسلوب بیان کو بھی متاثر کیا ہے چنانچہ جب وہ دیہات کی عکاسی کرتے ہیں تو ان کے اسلوب کی سادگی بے جان نظر نہیں آتی بلکہ یہ دیہات کی سادہ فضا کے ساتھ ہم کلام اور ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید نے سنجیدگی کے ساتھ "انشائیہ اردو ادب میں" دس ابواب مکمل کئے ہیں۔ پہلا باب "انشائیہ کا فن" ہے۔ انہوں نے اردو کے گم شدہ انشائیہ نگاروں کو دریافت کیا ورنہ انہیں کوئی جاننے والا نہ ہوتا۔ اسی طرح نئے انشائیہ نگار بھی ان کی نظروں میں رہے۔ ان

کی یہ کتاب قاری کی معلومات میں اضافہ کرنے کے ساتھ انشائیہ کی تاریخ سے باخبر ہونے میں رہنما ثابت ہوئی۔ اردو ادب میں سفرناموں کو نظر انداز کیے جانے کی تلافی اس صورت میں ہوئی کہ ڈاکٹر انور سدید نے چودہ ابواب پر مشتمل یہ کتاب مرتب کی جس میں قبل از مسیح سے عہد موجود تک کے سیاحوں کا ذکر اور ان کے مشاہدوں پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید حقیقی معنوں میں ہر بات کی تہہ تک پہنچنے کی تڑپ رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ اور یادداشت دونوں اپنی مثال آپ تھی۔ حیرت کا مقام ہے کہ انہوں نے مختلف جہات میں لکھنے کے باوجود کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ ان کا لکھا حرف آخر ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے مختلف ادبی رسائل کے مدیران کرام سے دوستی نبھائی اور ان کی توقعات سے بڑھ کر قلمی معاونت کرتے رہے۔ وہ ہر ادبی جریدہ پڑھنے کے بعد مختلف مضامین پر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرنا فرض سمجھتے تھے۔ انہوں نے کسی کا دل نہیں دکھایا البتہ آئینہ دکھانا اور دعا کرنا ضروری خیال کیا۔ تخلیق اور الحمراء میں خصوصیت کے ساتھ ان کے خطوط شائع ہوتے اسی طرح بھارت کے ادبی جرائد میں بھی ان کی تحریریں دیکھنے کو ملتیں۔ اظہر جاوید سے اپنی محبت کا اظہار جہاں ان کی زندگی میں کیا وہاں ان کے انتقال پر ملال پر نثر و نظم کا بھرپور انداز میں ذکر کرتے رہے۔ ان کی وضع داری کا تذکرہ کرتے ہوئے یہ بتانا ضروری ہے کہ انہوں نے نقاہت اور پیرانہ سالی کے باوجود سونان اظہر جاوید کی فرمائش پوری کی۔ اظہر جاوید کی یاد کو زندہ رکھنے اور اظہر فہمی کے حوالے سے ہر تقریب میں شرکت کی، مضمون پڑھے۔ اظہر جاوید کے بارے میں انجمن خیال (خطوط) ہمارے پیش نظر ہے۔ وہ سونان سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھتے ہیں: "کیا یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ پورے پرچے سے اظہر جاوید کی خوشبو آتی ہے۔" انور سدید اپنی سادگی اور کم نظری کو عجز بنا کر بات کرنے کا منفرد انداز اپنانا چاہتے تھے "میری کم عقلی، کم نظری دیکھئے کہ میں ایک لمبے عرصے تک اظہر جاوید کو محض "ہری چگ" سمجھتا رہا اور رسالہ تخلیق کو ایسا گلشن قرار دیے جہاں نیلی، پیلی اور سنہری تتلیاں ہری چگ کی صدا سنے بغیر بھی اڑی چلی آتی تھیں۔ اس دور میں ہر بوالہوس نے حسن پرستی اختیار کر رکھی تھی۔ بعض بڑے رسائل کے معمر مدیران نوعمر لڑکیوں کے بچے کھچے افسانے چھاپتے تو رسالہ اور کیک لے کر ہوسٹل میں پہنچ جاتے اور افسانے کی تحسین میں اپنے جذبات کی تسکین فرماتے۔ لیکن اظہر جاوید کا اسلوب اشاعت ایسا تھا کہ گویا پنچھیاں اعتماد کرتیں اور جھولی میں آپ پہنچ جاتیں اور افسانے کی اشاعت پر شہرت کے آسمان پر پرواز کرنے لگتیں تو اظہر جاوید اپنا احسان شمار نہ کرتا۔"

ڈاکٹر انور سدید کی تحریر میں شعریت در آتی اور پوری فضا قوس قزح کی انگڑائی کا حسن پا کر قاری کو مبہوت کر دیتی۔ انہوں نے شاعری بھی کی لیکن ان کا اصل کارنامہ زندہ و تابندہ نثر تخلیق کرنا ہے۔ وہ کیا کچھ لکھ کر گئے اور کس معیاری تخلیقی تنقید اردو ادب کے دامن میں ڈال کر گئے۔ اسے پرکھنے اور سمجھنے میں زمانے لگ سکتے ہیں۔ انہوں نے بہت سی بیماریوں کے ساتھ سمجھوتہ کیے رکھا۔ وہ عرق النساء اور آشوب چشم میں مبتلا رہے لیکن قلم سے رشتہ برقرار رکھا۔ یہی وہ وصف خاص ہے کہ وہ ہمت مردانہ اور عشق جاودانہ رکھتے ہوئے ادب کے ساتھ غیر متزلزل وابستگی رکھنے کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے غالب کے بقول زیست کر گئے۔

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا　　حباب موجۂ رفتار ہے نقش قدم میرا

◆◆◆

ڈاکٹر انور سدید، ایک سنجیدہ دانشور

سعادت سعید

ڈاکٹر انور سدید ایک بسیار نویس دانشور تھے۔ انہوں نے اردو ادب سے متعلق ہر اہم گوشے کے بارے میں اپنی انتہائی سچی کھری آرا ظاہر کرنے میں کبھی پس وپیش نہیں کی۔ وہ اپنے نظریات میں واضح تھے۔ انہیں ادب کے پیچیدہ مسائل میں گم ہونے کا شوق نہیں تھا۔ ڈاکٹر انور سدید نے اصناف ادب کی بنیادی شناختوں کے ساتھ ساتھ تاریخی اور تہذیبی اقلیموں میں ہونے والی ادبی نشوونما کا بغور مطالعہ کیا تھا جس کے نتیجے میں انہیں ادبی دبستانوں پر تفصیلی تحقیق کا موقع ملا۔ ادبی تاریخ ایک ایسا میدان ہے کہ جس میں ادب سے متعلق ہر شے ایک میلے میں شامل دوکانوں کی صورت نظر آتی ہے۔ ادبی مورخ ان سے اپنی مرضی کا مال لیتا ہے اور اسے اپنے نقطۂ نظر کی کٹھالی میں پگھلا کر پیش کر دیتا ہے۔ ادبی مورخ اگر تعصباتی دائروں میں داخل ہو جاتا ہے تو پھر اسے ذاتی فکر و خیالات اور فن و تکنیک کی تفاصیل مہیا کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی۔

اردو ادب کی مختلف تواریخ کی موجودگی میں نئی ادبی تاریخ نویسی کا عمل کوئی زیادہ مشکل نہیں رہتا۔ تاہم جب ادبی مورخ معاصر دور کے ادب پر نظر ڈالتا ہے تو اسے اپنی فکری وجذباتی ترجیحات پر توجہ مرکوز کرنی پڑتی ہے۔ اور بسا اوقات مروجہ ادبی شعور کے برعکس اسے اپنے ہمعصروں کو فوقیت دینے کا جذبہ اسے غلط بحث کی وادیوں میں لے آتا ہے۔ مثلاً اردو ادب کے بیشتر بڑے معاصر ادیب اور شاعر اگر ترقی پسند فکر کا اظہار کرتے ہیں تو انہیں پراپیگنڈوں کا شکار قرار دے کر اس لیے رد نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی دوسرا ادیب ان کے مقابلے ادب و فن کے روایتی سانچوں سے وابستہ ہے اور اسی بنا پر تنظیم بھی تصور کیا جاتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ یکسر گوارا نہیں کیا جاتا کہ وہ غیر ترقی پسند خیالات کے پراپیگنڈے میں ملوث ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے ادب اور ادبی اصناف کی متعینہ تعریفوں سے باہر آنے کا کام نہیں کیا ہے۔ وہ ادب کو طے شدہ ادبی معیاروں کی روشنی میں پرکھنے کا کام کر چکے ہیں۔ اس کام کی افادیت یہ ہے کہ اس کے وسیلے سے درسگاہوں اور جامعات کی سطح پر نصابی ضرورتوں کو بدرجہ احسن پورا کیا جا رہا ہے۔ ان کی تنقیدی اور تحقیقی آرا سے روایتی حوالوں سے مزین تحقیقی اور تنقیدی مقالے بھرے پڑے ہیں۔ یہ وہ کام ہے جو حسن عسکری، کاظمی، سلیم احمد، ممتاز شیریں، ممتاز حسین، انیس ناگی، افتخار جالب اور ان کے نظریات کو درست سمجھنے والے نقادوں کے دائرہ خیال و فکر سے باہر تھا۔ اس نوع کے کام یونیورسٹی پروفیسروں نے بڑے پیمانے پر کیے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے ادب کے دبستان سرگودھا، اسلامی ادب کی تحریک اور اقبالیات کے حوالے سے بھی اہم مضامین رقم کیے ہیں۔ ان کے یہ مضامین ان کی ادبی وابستگیوں کو ظاہر کرتے ہیں۔ انہوں نے لاہور میں نئی ادبی تنظیم سے منسلک ادیبوں اور دانشوروں سے گہری ہمدردی اور دلچسپی کا اظہار کیا۔ ان کا بنیادی تشخص بے شک اوراق اور اردو زبان تھا۔ تاہم وہ اپنے نظریات کے فروغ کے لیے پاک و ہند کے ہر ادبی وتہذیبی رسالے اور صحافتی روزناموں کو استعمال کرنے کے قائل تھے۔ سرگودھا دبستان ادب کے پراپیگنڈے کے لیے مذکورہ

رسائل میں سہیل بخاری، عصمت ملیح، غلام جیلانی اصغر نے بھی حسب مقدور اپنا حصہ ڈالا۔ ڈاکٹر انور سدید نے "قومی ڈائجسٹ"، "زندگی"، "تکبیر"، "نوائے وقت" کے لیے بھی عام فہم مضامین لکھے۔ "بشارت"، "مشرق"، "حریت"، "امروز"، "سلیمین" اور "پاکستان ٹائمز" میں ادبی کالم لکھے۔ ادبی رسائل "ماہِ نو"، "تخلیق"، "مخزن" (دورِ نو) اور "الحمرا" میں بھی ان کے معاصر افسانہ نگاروں، شاعروں وغیرہ پر ادبی مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔

علامہ اقبال سے ان کی گہری دلچسپی تھی اس حوالے سے ان کی کتاب "اقبالیات کے کلاسیکی نقوش" اقبال کے فکر و فن کے پس منظر میں ایک عمدہ تحقیقی و تنقیدی کتاب ہے۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے "اختلافات"، "اردو ادب میں انشائیہ"، "اردو ادب میں سفر نامہ"، "اردو افسانے کی کروٹیں"، "اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش"، "اردو نظم کے ارباب اربعہ خطوط کے آئینے میں"، "اقبال شناسی اور ادبی دنیا"، "اقبال شناسی اور اوراق"، "اقبال کے کلاسیکی نقوش"، "بانو قدسیہ۔ شخصیت اور فن"، "برسبیل تنقید"، "پاکستان کا ایک ظلِ جلیل۔ حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدری"، "پروفیسر غلام جیلانی اصغر شخصیت اور فن"، "شام کا سورج"، "شمع اردو کا سفر"، "فرخندہ لودھی۔ شخصیت اور فن"، "فکر و خیال"، "کھردرے مضامین"، "مشفق خواجہ۔ ایک کتاب"، "موضوعات"، "مولانا صلاح الدین احمد فن اور شخصیت"، "مولانا صلاح الدین احمد ایک مطالعہ (باشتراک ڈاکٹر وزیر آغا)"، "نئے ادبی جائزے"، "وزیر آغا ایک مطالعہ" جیسی معلومات افروز کتب بھی تحریر کی ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے چند مضامین "راوی" میں بھی شائع ہوئے۔ ان میں غالب، پروفیسر جیلانی کامران اور فرخندہ لودھی پر ان کے مضامین ان کے ادبی ذوق کی نمایاں مثال ہیں۔ راشد عاصی کے بقول:

> "انور سدید وہ آدمی ہیں جن کی ادبی خدمات کو سراہنے والوں میں جناب مشفق خواجہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر سہیل بخاری، مرزا ادیب، غلام الثقلین نقوی، حنیف رامے، جوگندر پال، [illegible]، ڈاکٹر سلیم اختر (جو علیل ہیں اور ان کے لئے بھی دعائے صحت کی گزارش ہے)، ڈاکٹر وزیر آغا، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر ناصر عباس نیر اور اس طرح کی بہت سی دوسری اہم ہستیاں شامل ہیں۔"

ڈاکٹر وزیر آغا جناب انور سدید کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "شرفا دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کی شرافت ان کی داخلی کمزوری یا بزدلی کا نتیجہ ہے، دوسرے وہ جو اپنی داخلی قوت اور گزرنے کی صلاحیت کے باوصف شائستگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ انور سدید کی شائستگی موخر الذکر نوع سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ شائستگی ایک طرف تو ان کی سجی ہوئی شخصیت میں خود کو ادا کرتی ہے اور دوسری طرف ان کے شائستہ ادبی اسلوب میں۔ مگر ان کی داخلی توانائی اس شائستہ اسلوب کو ایک انوکھا تیکھا پن، اختصار، کاٹ اور چبھن عطا کرتی ہے جو ایک الگ سی بات ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید کے چند تنقیدی حوالوں کو جاننے کے لیے ان کے یہ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

(جدید شاعری کے سلسلے میں)

''جدید اردو شاعری کے دیوں کا کاروان اس وقت سے بار آور ہونا شروع ہو گیا تھا جب قدیم دلی کالج کا شیرازہ بکھر گیا اور اسے لاہور منتقل کرنے کے بعد گورنمنٹ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ چنانچہ علم و شعر و ادب کی وہ شمع جس نے قرون اولیٰ میں شمال سے جنوب کی طرف سفر کیا تھا اور ولی دکنی کے زمانے میں جنوب سے شمال کی طرف مراجعت شروع کی تھی، اب لاہور کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔''

(حفیظ جالندھری کے لیے)

''حفیظ کی شاعری میں فطرت کا جمال ایک نغمہ سرمدی بن کر ابھرا ہے۔ وہ فطرت کی آغوش میں سر رکھ کر ان حیات آفریں لوریوں کو سنتے ہیں اور فطرت کے نغمے سے قلب و روح کو تازگی عطا کرتے ہیں۔''

(ترقی پسندی)

''(ترقی پسند) شعرا نے محنت اور ریاضت سے ترقی پسند نقطہ نظر کو اجاگر کیا اور انقلاب کے اجزا اور آمد سحر کے انتظار کے لیے رجائی انداز میں گیت لکھے۔ تاہم مسلک کی پابندی اور نظریے کی جبریت اتنی سخت تھی کہ بہت جلد ان شعرا کے ہاں گھٹن کے آثار نمودار ہونے لگے اور بیشتر ان کی شاعری تخلیق ہونے لگی جس پر یکسانیت طاری تھی اور شعرا کا ایک جیسا ردعمل سامنے آتا تھا۔''

(عابد علی عابد کے حوالے سے)

''عابد کے ہاں حسن ایک ایسی صفت مطلق ہے جس کی عبادت تو کی جا سکتی ہے لیکن اس کے تقدس کو آلودہ نہیں کیا جا سکتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں جو معشوق بار بار اپنی جھلک دکھلاتی ہے وہ اتنی باعصمت اور پاک نظر آتی ہے کہ قاری اس سے پیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''

(جعفر طاہر کے بارے میں)

''وہ اردو کا پہلا شاعر تھا جس نے کینٹو کے مزاج کو سمجھا اور تخلیقی سطح پر قبول کیا بلکہ اردو ادب میں جعفر طاہر کو کینٹو کا پہلا موجد قرار دینا ان کا حق ہے۔''

ڈاکٹر انور سدید سے میرے تعلق کی کہانی کافی طویل ہے۔ اس کا آغاز 1970ء میں اوکاڑہ سے ہوتا ہے۔ وہ ڈاکٹر گلزار اکل پور کے سیکرٹری، میرے اسلامیہ کالج کے ساتھی پروفیسر سلیم بے تاب کی دعوت پر ایک میٹنگ میں شریک ہونے کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ وہاں تشریف لائے تھے۔ یہ ایک تنقیدی پروگرام تھا۔ اس میٹنگ میں انور سدید صاحب نے جس زور و شور سے وزیر آغا صاحب کا دفاع کیا وہ نقش آج بھی میرے ذہن کا حصہ ہے۔ آغا صاحب سے ان کی یہ محبت تادم آخر قائم رہی۔ میری اطلاع کا انداز یہ تھی کہ میں کسی کو رعایتی نمبر دینے کا قائل نہیں تھا۔ علامہ اقبال کی رومانویت پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

''اقبال کی رومانویت کا اظہار حسن ازل کی طلب و جستجو، ماضی کی عظمتوں کو اجاگر کرنے، مغربی شعرا کے تراجم سے اثر لینے اور رومانوی کرداروں یعنی مومن اور حق کی سطح پر ابلیس وغیرہ کو متعارف کرانا، فرد کی تخلیقی صلاحیت کو سنبھالا دینا اور زندہ

رہنے کی سکت پیدا کرنے جیسے رویوں میں ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید کی کتاب "اقبال کے کلاسیکی نقوش" اقبال اکادمی نے 1988ء میں شائع کی تھی اس کتاب میں "اقبال کا تصور حیات و مرگ" کے عنوان سے ڈاکٹر انور سدید کا ایک اہم مضمون شائع ہوا ہے اس میں اس حوالے سے ان کا موقف ہے کہ

"اقبال کی شاعری میں زندگی کا تصور ایک مثبت حقیقت کے طور پر ابھرتا ہے۔ اس نے حرکت اور حرارت کو اس ساحرانہ قوت سے تعبیر کیا ہے کہ زندگی جو در اصل انہی دو قوتوں کا مصدر ہے خود انسان کے حیطۂ اختیار میں اسیر ہو جاتی ہے اور حیات محض سانس کی آمد و شد کا نام نہیں رہتا بلکہ یہ فرد کو اعتماد ذات مہیا کر کے ایک طرف اس میں تسلیم و رضا کی خو پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف مطلوب حقیقی سے وصال کے لیے عشق صادق کا تند و تیز جذبہ عطا کرتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں اقبال انسان کو محض گوشت پوست کا ایک مجسمہ تصور نہیں کرتے بلکہ اسے ایک ایسے پیکر کے طور پر قرار دیتے ہیں جس کی فطرت ممکنات زندگی کی امین ہے۔ جو خلائے لم یزل کا دست قدرت ہے اور جس کی نگاہ خارا شگاف کے آگے مہر عظیم و جلیل بن تمام حقیقتیں واشگاف ہیں۔ ہر چند اقبال پر زندگی کی جملہ شادابیوں کی تمام حقیقتیں واضح ہیں۔ اور وہ فرد کو ان سے فرار کی تعلیم نہیں دیتے لیکن یہاں اس حقیقت کا اظہار ضروری ہے کہ وہ زندگی کے انبوہ میں فرد کو گم ہو جانے یا ایک معمول کے مطابق زندگی گزارنے کی تلقین بھی نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک افضل ترین زندگی وہ ہے جو جہان آب و گل کے ساتھ متعلق رہ کر بھی نہ صرف غیر معمولی ہو بلکہ اس جہان آب و گل کو تسخیر کرنے کی قوت بھی رکھتی ہو۔"

ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں کہ قوت تسخیر زندگی کے بارے میں اقبال کے فلسفے کا ماخذ ہے۔ خیال مرد مومن اور تصور خودی اس فلسفے سے پیدا ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے خاک کی ناپائیداری کے مقابلے میں اقبال کے دائمی زندگی کے تصور کو اجاگر کیا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے پاسکل (Pascal) کا قول نقل کیا ہے کہ "انسان واحد ذی روح مخلوق ہے جسے یہ بھی معلوم ہے کہ موت اس کی زندگی کا لازمی انجام ہے" اور کہا ہے کہ اقبال کے ہاں بھی موت کا یہ ادراک موجود ہے۔ یہ تصور ابتدا میں ان کی نظموں "شمع و پروانہ" اور "خفتگان خاک سے استفسار" میں نمایاں ہے۔ اقبال نے "اول و آخر فنا باطن و ظاہر فنا نقش کہن ہو کہ نو منزل آخر فنا" کی منطق کو تسلیم کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے ہیراکلائٹس کا یہ قول پیش کر کے کہ "زندگی آگ کی لطیف ترین متحرک قسم ہے اور ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ اس کے خیال کے مطابق جوہر حیات آگ کے ابدی ذروں سے بنتا ہے۔ ایٹم کے یہ ذرے تمام جسم میں بکھرے ہوئے ہیں اور انسان کو تمام حسی قوتیں عطا کرتے ہیں۔ جب جسم کا کارٹے جاتا ہے تو یہ ذرے بھی بکھر جاتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ آدمی مر گیا ہے۔ اور اس کا جسم خاک ہو گیا ہے۔" واضح الفاظ میں کہا ہے کہ "اقبال نے بھی زندگی کی اس ابدی توانائی کی حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔ اور اس کی دوامی حیثیت کو قبول کرتے ہوئے موت کو انسان کا انجام قرار نہیں دیا چنانچہ اقبال کے نزدیک زندگی وہ شمع سوزاں ہے جو ہمیشہ فروزاں رہتی ہے۔ اور جسے باد حوادث کا کوئی شعلہ بجھا نہیں سکتا۔"

ڈاکٹر انور سدید کے خیال میں جسمانی سطح پر انسان انجام لازمی ہے پھر وہ کہتے ہیں یہ انجام بقول ڈاکٹر وزیر آغا "ایک نئی تعمیر کی نوید بھی ہے۔" ان کے خیال میں اقبال نے موت کے اس مادی پہلو پر روح حیات کو فوقیت دی۔ ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں

"ہارٹ مین Heartman کا قول ہے کہ زندگی سے مادے کی نجی موت ہے۔ اقبال نے اس خیال کی تائید نہیں کی بلکہ وہ بیالی لوزا کے اس خیال کو شدت سے قبول کرتا ہے کہ انسانی روح خدا کا عکس ہے اور کائنات کا روحانی زاویہ پیش کرتی ہے۔ اقبال کے ہاں جزو اور کل کا رشتہ بندے اور خدا کا رشتہ ہے۔ جس طرح کل یعنی خالق کائنات کو زوال نہیں اسی طرح جزو اپنی لاشخصی حیثیت میں دوامی ہے اور موت اس مقام اتصال کا نام ہے اور وہ کل کی ایک نئی شکل میں ظاہر ہونے کے لیے کل میں ہی سما جاتا ہے۔ شاید اسی لیے اقبال نے انسان کو ایک حباب سے تعبیر کیا ہے جو موج دریا کا حصہ ہے۔ اسی سے ظہور لیتا ہے اور پھر دوبارہ جنم لینے کے لیے اسی میں ضم ہو جاتا ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے بجا طور پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "اقبال کی ایک بڑی عطا یہ بھی ہے کہ اس نے انسان کے دل سے موت کا خوف زائل کیا ہے اور اس کے دل میں حیات جاودانی کی تڑپ پیدا کی ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید اپنے مضامین میں اکثر بڑی علمی شخصیات کے اقوال کو قبول و رد کرتے ہوئے اپنے خیال کی منطق کو واضح کرتے ہیں۔ روایتی طرزِ احساس کے دائروں سے باہر آنے والے موضوعوں کے لیے نظریہ سازی کا بارِ گراں اٹھانا پریشان کن ہوتا ہے۔ اس حوالے سے موضوعی شعور کے حامل ڈاکٹر وزیر آغا کو اپنی کتب "اردو شاعری کا مزاج" اور "اردو ادب میں طنز و مزاح" اور پھر "تخلیقی عمل" میں کافی کشٹ اٹھانے پڑے۔ ڈاکٹر انور سدید نے ڈاکٹر وزیر آغا کے دفاع میں جس محبت اور عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے وہ اردو ادب کی تاریخ میں ایک مثال کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ عقیدت کا مظاہرہ اس سطح پر نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی دانشور کسی کے دفاع میں اتنا آگے نکل جائے کہ اس کا اپنا اور تخلیقی وژن کسی حالتِ اخفا میں چلا جائے۔ بہر حال کسی کے انتخاب پر اعتراض کی گنجائش نہیں ہے کہ انسان سوچ سمجھ کر ہی کسی عمل کا انتخاب کرتا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے جس جانفشانی اور محنت سے اپنی ادبی تنقید و تحقیق کے محل اسارے، اس کی مثالیں کافی کم ہیں۔ ان کے دائرہ تحقیق میں غزل، نظم، تنقید، تحقیق، ناول، افسانہ، انشائیہ، سفرنامہ، خاکہ اور پھر کئی ادبی اصناف شامل ہیں۔ انہوں نے کتابوں پر تبصرے کے فن سے بھی گہری رغبت رکھی اور اپنے نقطہ نظر کو بیان کرنے کے لیے مکتوب نگاری کی رسی کو بھی مضبوطی سے تھامے رکھا۔ ان کی موت سے اردو ادب کے قارئین یقیناً ایک عرق ریزی کرنے والے مورخ، محقق اور نقاد سے محروم ہو گئے ہیں۔

◆◆◆

اظہر تھا اس جہان میں "اک بے نوا فقیر" اپنی خودی کا عکس دکھا کر چلا گیا (ڈاکٹر انور سدید)

آپ کے محمود کلام کا لکھا ہوا آپ کا ابتدائیہ پڑھ کر بے پائی فرمائش (گزارش) پھر دہرا دوں اپنی آپ بیتی لکھو چھوڑیں حضرت!" (مشفق خواجہ)

"اظہر جاوید کی نظموں کا بنیادی نکتہ محبت ہے پاکیزگی کے ساتھ" (ڈاکٹر وزیر آغا)

ڈاکٹر انور سدید —— چند باتیں چند یادیں

پروفیسر قیصر نجفی

ڈاکٹر انور سدید —— اردو ادب کے ایک قلم کار، جن کی طبعی عمر تین چوتھائی صدی سے کہیں زیادہ عرصے پر محیط تھی اور ادبی حیات بھی دو چار برس کی بات نہیں، نصف صدی سے زیادہ کا قصہ ہے، جب راہیٔ ملک عدم ہوئے تو لگا کہ اردو دنیا سونی ہو گئی ہے۔ تخلیق، الحمراء، ہر دو جرائد کا تازہ شمارہ گریہ کناں ہے اور ان کی روح سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے ۔

انہی راستوں نے جن پر کبھی ہم چلے تھے باہم ۔۔۔ مجھے روک روک پوچھا ترا ہم سفر کہاں ہے

"تخلیق" اور "الحمراء" سے ڈاکٹر صاحب کا سالہا سال کا رشتہ جسد سے روح کے تعلق کے مماثل تھا۔ "تخلیق" کا دوسرا جنم تو واقعتاً ان کے دم قدم سے ممکن ہوا کہ وہ اس کے پہلو میں دل بن کر دھڑکتے رہے۔ عزیزم سونان جاوید نے جب ان کے ارتحال کی خبر دی تو دل دھک سے ہو گیا۔ وہ ایک بزرگ ادیب ہی نہیں تھے "تخلیق" کے ایک محسن بھی تھے —— ان کی مفارقت طول کر گئی۔

ڈاکٹر انور سدید کی ادبی خدمات، تاریخ ادب اردو کا مکمل ایک باب ہے —— وہ ایک کل وقتی قلم کار تھے گو پیشے کے اعتبار سے ایک انجینئر تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت فرائض منصبی ادا کرنے میں گزرتا تھا۔ ادبی کام ان کے فاضل وقت کا مشغلہ تھا —— اندازہ لگایئے، اگر ڈاکٹر صاحب کل وقتی قلم کار ہوتے تو ان کے سرمایۂ ادب کا طور کس اعتبار ہوتا۔ یہ بھی دھیان میں رہے کہ بسیار گوئی اور زود نویسی میں بھی وہ اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی کہ جب "تخلیق" یا "الحمراء" جیسے بڑے ادبی جرائد کا کوئی شمارہ ہو یا کسی اور قابل ذکر ادبی رسالے کا، اس کے مشمولات میں ڈاکٹر انور سدید کی نثری یا شعری کوئی تخلیق شامل اشاعت نہ ہو۔

ڈاکٹر انور سدید سے ہماری بالمشافہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ البتہ ان سے یاد اللہ ضرور تھی۔ اردو ادبی دنیا میں جب ہماری آمد کو ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا تسلیم کیا جانے لگا تو انہوں نے بھی فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور ہماری پذیرائی میں ایک مراسلہ تحریر کر کے بھیج دیا۔ ہم نے بھی تشکر نامہ رقم کرنے میں تاخیر نہ کی —— کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر صاحب کا ایک اور مراسلہ موصول ہوا جس میں انہوں نے احمد ندیم قاسمی پر دشنام طرازی کا الزام عائد کیا اور اس حوالے سے ایک تراشے پر اظہار خیال کرنے کو کہا۔ مذکورہ بالا خط کو یہاں نقل کرنا شاید نامناسب نہ ہو۔

"31 جنوری 2006ء

محترمی قیصر نجفی صاحب سلام و رحمت،

آپ کے گرامی نامے کے لیے شکر گزار ہوں۔ میں آپ کی چاپ دل کے قریب سنتا ہوں اور جب رسائل میں ملاقات ہوتی ہے اور اکثر یہ ہوتی ہے تو آپ سے اپنی خلوت میں بیٹھ کر طویل گفتگو کرتا ہوں۔ اب اس خط کے آئینے میں بھی آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ برادرم! میں تو ایک خاک نشین انسان ہوں جو سرگودھا جیسے دیہاتی شہر سے نکل کر مستقل طور

پیدا ہونے کے لئے آیا تو دینی اجنبیت کو شدت سے محسوس کر رہا ہوں اور یہاں اس شہر بے مثال نے جو رد عمل ظاہر کیا ہے وہ مسلسل قرائن سے ظاہر ہوگا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہمارا ادب کیا جہت اختیار کر رہا ہے اور ہمارے ادبائے کرام کس سمت میں جا رہے ہیں۔ اس کے مطبوعہ خطوط پر آپ کی رائے، آزادانہ رائے، جاننے کا مشتاق ہوں۔ میں آپ کی تحریریں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ مدیران کے نام خطوط میں آپ نے اپنی آزادانہ تحریر اور بے لاگ رائے زنی کو خوب تحفظ فراہم کیا ہے۔ تنقید کو تقریظ بنانے کے اس دور میں آپ جیسے لوگوں کا دم غنیمت ہے اور میں ان سے روشنی حاصل کر رہا ہوں۔ آج ہی اسلام آباد سے ایک دوست نے فون پر اطلاع دی کہ ریاض صدیقی کی خبر نہیں پہنچی آج اب میں شدید کرب میں مبتلا ہوں۔ خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔ والسلام مخلص ——— انور سدید

پس نوشت: معلوم ہوا ہے کہ کراچی میں ریاض صدیقی صاحب حادثے کا شکار ہو گئے۔ ہائے ہائے!''

ہم نے مندرجہ ذیل واقعہ کا حوالہ دے کر ڈاکٹر انور سدید کی خواہش کی تکمیل سے معذرت کر لی۔

''ڈیرہ اسمٰعیل خان ہماری جنم بھومی ہے۔ ایک مرتبہ (جب ہم کالج کے طالب علم تھے) مولانا مودودی وہاں تشریف لائے اور ایک جلسے سے خطاب کیا۔ لوگوں کا ایک جم غفیر جلسہ گاہ میں موجود تھا، جس میں ہر مسلک و مکتب فکر کے لوگ شامل تھے۔ دوران خطاب کسی شخص نے مولانا سے ایک سوال لکھ کر پوچھ لیا۔ سوال یہ تھا کہ حضرت علی اور امیر معاویہ میں کون حق پر تھا؟ مولانا نے سائل سے مخاطب ہو کر کہا: ''حضرت! آپ نے جن بزرگوں کے بارے میں سوال اٹھایا ہے۔ ان کا معاملہ اللہ تبارک و تعالیٰ کے سپرد ہو چکا ہے۔ اس ذات باری سے کون بھلا بہتر انصاف کرنے والا ہے ——— ہم اور آپ تو ویسے بھی کسی کے اچھا یا برا ہونے کا فیصلہ دینے کے مجاز نہیں کہ ہم خود گناہوں سے مبرا نہیں ہیں۔''

اس موقعہ پر ہمیں ایک اور واقعہ بھی یاد آ رہا ہے ——— ہمارا ایک بار بھی لاہور جانا ہوا۔ ہم نے قاسمی صاحب کو اپنی آمد کی اطلاع دی تو انہوں نے اسی روز ہمارے ساتھ ایک شام منانے کا پروگرام بنا لیا ——— یہ دن اظہر جاوید کی معیت میں طرح طرح کی مصروفیات میں گزر گیا اور ہمیں احمد ندیم قاسمی کے ہاں جانے میں قدرے تاخیر ہو گئی۔ اظہر جاوید نے ہمیں جلد از جلد ''فنون'' کے دفتر پہنچنے کی تاکید کرتے ہوئے کہا ''وقت ضائع مت کرو، ایک تاریخی لمحہ تمہارے انتظار میں ہے۔'' ایک مضمون میں ڈاکٹر انور سدید نے اظہر جاوید کو ''درویش حق مست'' کہا ہے اور صدق صد درست کہا ہے۔ یہ مضمون بھی ڈاکٹر صاحب کی شاندار قلم کاری کا مظہر ہے۔ شاید اظہر جاوید کی درویشی کا سب سے پہلے اس حقیر نے کھوج لگایا۔ ''اظہر جاوید نمبر'' ہمارے اس اعزاز کی شہادت دیتا ہے۔

◆◆◆

''سلیم شہزاد نے پنجابی شاعری کو جدید نظم کے مزاج سے ہم آہنگ کیا ہے۔ میں انہیں جدید پنجابی نظم کا میرا جی اور ن۔ م راشد شمار کر سکتا ہوں۔ بلاشبہ ان کی یہ منفرد حیثیت تاریخی ہے۔'' ——— (انور سدید)

''ڈاکٹر انور سدید کی رحلت سے ہماری علمی اور ادبی دنیا کی تاریخ کا ایک سنہرا باب بند ہو گیا ہے۔'' (عرفان صدیقی)

ڈاکٹر انور سدید اور برگد کا پیڑ

سرفراز سیّد

اور جب سرگودھا کے بڑے قبرستان میں میں نے سوہان اختر جاوید اور ڈاکٹر سلیم آغا نے تازہ کھدی ہوئی قبر پر ایک ایک مشت مٹی ڈالی اور گلاب کی پتیاں بکھیریں تو ڈاکٹر سلیم آغا نے عجیب سی بات بتائی۔ کہنے لگے کہ ڈاکٹر انور سدید کئی روز سے سرگودھا کے ہسپتال میں زیر علاج تھے۔ میں روزانہ عیادت کے لئے حاضر ہوا کرتا تھا۔ ایک روز کہنے لگے کہ سلیم صاحب! میں نے اپنے رب سے دو خواہشوں کا اظہار کر رکھا ہے۔ ایک تو یہ کہ میری عمر میرے محترم استاد ڈاکٹر وزیر آغا کی عمر سے زیادہ وقت ہونے پائے۔ ان کی عمر 88 برس تھی۔ میری عمر 87 برس 3 ماہ ہو چکی ہے۔ میں اسی عمر میں جانا چاہتا ہوں۔ دوسری خواہش یہ کہ میرا انتقال بھی اسی وقت پر ہو جس وقت پر ڈاکٹر آغا صاحب کا انتقال ہوا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید کی یہ خواہشیں اس طرح پوری ہوئیں کہ ان کی عمر اپنے استاد کی عمر سے آگے نہ جا سکی اور وہ اسی عمر میں ابدی سفر پر روانہ ہو گئے جہاں سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا اور یہ کہ ڈاکٹر آغا صاحب کا انتقال ساڑھے گیارہ بجے ہوا تھا اور ڈاکٹر انور سدید نے بھی عین ساڑھے گیارہ بجے آخری سانس لیا اور آنکھیں بند کر لیں!!! ایک محسن استاد کے لئے عقیدت احترام کا یہ عالم!

ڈاکٹر انور سدید نے جتنا لکھا ان کی تحریریں جتنی چھپیں، اس کی کوئی دوسری مثال دینے سے قاصر ہوں۔ پاکستان و بھارت کے ہر ادبی جریدہ میں ہر ماہ اہم سنجیدہ موضوعات پر مضامین اور مقالے، روزنامہ نوائے وقت میں علمی و ادبی موضوعات اور کتابوں پر تبصروں کے علاوہ بین الاقوامی امور پر بہت فکر انگیز تجزیے۔ "الحمرا" اور "تخلیق" میں بیک وقت چار چار مضامین اور تبصرے! ان باتوں پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ مختلف تعزیتی نشستوں میں بہت سی باتیں ہو چکی ہیں۔ میں کچھ دوسری باتیں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اقبال ٹاؤن لاہور میں ہم ایک دوسرے سے تقریباً 40،50 گز دور رہتے تھے۔ ان کی رہائش ستلج بلاک میں اور میری رہائش اس کے سامنے والے جہانزیب بلاک میں ہے۔ بیچ میں صرف ایک سڑک کا فاصلہ ہے۔ ہم ایک دوسرے سے اکثر ملتے تھے۔ میں اکثر ان کے پاس جایا کرتا تھا۔ وہ بھی چند ایک بار میرے گھر آئے۔ ایک بار میرے گھر میں چوری ہو گئی۔ ایک سال تک چوری نہ پکڑی گئی تو میں نے "چوری کی سالگرہ" منانے کا اعلان کر دیا اور شہر بھر میں دعوت نامے تقسیم کر دیے خاص طور پر پولیس کے اعلیٰ حکام تک دعوت نامے اہتمام کے ساتھ بھجوائے۔ اس سے پولیس کے حلقوں میں افراتفری سی مچ گئی۔ مجھے اعلیٰ افسران کے فون آنے لگے کہ ہم آپ کا سارا نقصان پورا کر دیتے ہیں! آپ یہ تقریب منعقد نہ کریں۔ مجھے ڈاکٹر انور سدید صاحب کا فون آیا کہ ان کے دوست کچھ پولیس افسروں نے ان سے کہا ہے کہ وہ یہ تقریب رکوا دیں مگر یہ کہ آپ نے اس تقریب کو روکنا نہیں۔ اس نے پولیس کے نظام کو جھنجھوڑ دیا ہے، یہ تقریب ضرور منعقد کرنی ہے، میں بھی آ رہا ہوں اور چوری کے موضوع پر انشائیہ پڑھوں گا۔ یہ تقریب اپنی جگہ دلچسپ تھی۔ میرے مکان کی چھت پر اس کا اہتمام تھا۔ اس کے پروگرام میں چوری کے موضوع پر بات چیت، مشاعرہ اور موسیقی کے علاوہ ڈاکٹر فقیر حسین ساگا کا خاص طور پر تیار کردہ چور رقص بھی شامل تھا۔ اس پروگرام میں قتیل شفائی، گلوکار شوکت علی، دوبئی سے عربی و اردو کے مشہور شاعر فاروق زبیر اور بہت سے دوسرے

لوگ بھی موجود تھے۔ اس تقریب کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اس میں ڈاکٹر انور سدید صاحب نے بہت ہلکے پھلکے انداز میں چوروں کی نفسیات اور چوری کی مختلف قسموں پر ایک چھوٹا سا انشائیہ پڑھا۔ جو بعد میں کسی جگہ شائع بھی ہوا۔ اس محفل میں ایک چھوٹا سا دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ میرے ایک صحافی دوست نے حاضرین میں ایک نامانوس اجنبی سا چہرہ دیکھا۔ وہ اسے اٹھا کر محفل سے باہر لے آیا۔ اس نے بتایا کہ وہ پولیس کا آدمی ہے۔ ایس ایس پی صاحب نے بھیجا ہے کہ سرفراز سید کے گھر کی اس تقریب کی رپورٹ پیش کرنی ہے۔ صحافی دوست نے کہا کہ یہاں تو صرف مشاعرہ وغیرہ ہو رہا ہے۔ چند شاعر آگئے ہیں کچھ اور آنے والے ہیں۔ وہ بولا کہ اچھا جو آگئے ہیں ان میں سے چند نام لکھوا دیں میں چلا جاؤں گا۔ صحافی دوست خود بھی علم و ادب سے خاصا نا آشنا تھا، بولا کہ لکھو اب تک مرزا اسد اللہ خان غالب، فراق گورکھ پوری، جوش ملیح آبادی اور جگر مراد آبادی آچکے ہیں باقی کا انتظار ہے۔ وہ بولا کہ جناب اتنے نام ہی کافی ہیں، میں رپورٹ بنا دوں گا۔ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے بعد میں اپنی کسی تحریر میں اس واقعہ کا بڑے دلچسپ انداز میں ذکر کیا۔

ایک اور دلچسپ واقعہ! فخر الدین بلے (مرحوم) بہت ہی باکمال شاعر اور شستہ اور شائستہ زبان بولنے والے شخص تھے۔ محکمہ اطلاعات میں ڈائریکٹر تھے۔ شادمان کالونی میں ان کی سرکاری رہائش گاہ پر مسلسل بہت بھرپور ادبی محفلیں ہوا کرتی تھیں ان میں علمی و ادبی مضامین کے بعد مشاعرہ ضرور ہوا کرتا تھا۔ 1980ء اور 1990ء کے عشرہ میں ان مجالس نے تاریخی حیثیت اختیار کر لی۔ ان کی کسی ادبی گروہ سے وابستگی نہیں تھی۔ ان کے ہاں ڈاکٹر وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، بشریٰ رحمان اور ڈاکٹر انور سدید باقاعدہ آیا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک محفل جنوری 1991ء کے پہلے ہفتہ میں منعقد ہوئی۔ سخت سردی پڑ رہی تھی۔ اس وقت بھی لوڈشیڈنگ ہوا کرتی تھی۔ میں اندر داخل ہوا تو کھلے کمرے میں بہت اندھیرا تھا۔ آسانی سے شکلیں بھی نہیں پہچانی جا رہی تھیں۔ کارنس پر ایک موم بتی جل رہی تھی۔ یہ تقریب ادب لطیف کی ایڈیٹر صدیقہ بیگم کی سالگرہ کے سلسلے میں تھی۔ میں نے ایک کرسی کے سامنے کھڑے ہو کر کہا کہ صدیقہ صاحب سالگرہ مبارک ہو۔ جواب آیا کہ سرفراز صاحب! میں انور سدید ہوں! اقتباس کے دوران آگے بڑھا۔ تین حضرات کا نام لئے بغیر ان سے مصافحہ کیا۔ چوتھے نے مصافحہ کرنے سے گریز کیا۔ آواز آئی کہ میں بشریٰ رحمان ہوں، مصافحے نہیں کیا کرتی۔ میں خاموشی کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید صاحب کے پاس خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس طرح کی اور بھی بہت سی ملاقاتیں ہیں، بہت سی یادیں ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی 80 کتابوں میں سے طلباء اور تعلیمی اداروں کی سطح پر اور عام مطالعاتی حلقوں میں ان کی کتاب ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' نے بہت مقبولیت اور شہرت حاصل کی۔ تاریخ کسی بھی زبان کے تعارف، فروغ اور پھیلاؤ کے لئے ابتدائی اور بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ مرتب کرنے کے سلسلے میں اب تک بہت کام ہو چکا ہے۔ پاکستان میں ہونے والا کام تو دکھائی دے رہا ہے مگر بھارت میں اس کام کی زیادہ تفصیل نہیں ملتی۔ اب تک اردو زبان و ادب کی تحقیق کے بارے میں جو کتابیں سامنے آچکی ہیں ان میں قیام پاکستان سے پہلے انگریزی میں لکھی جانے والی رام بابو سکسینہ کی کتاب ''تاریخ ادب اردو'' بہت مقبول ہوئی اب بھی بہت مقبول ہے۔ ابتداء میں انگریزی زبان کے باعث یہ زیادہ حلقوں تک نہ پہنچ سکی مگر معروف ادیب و علمی شخصیت مرزا محمد عسکری نے اسے اردو میں اس طرح منتقل کیا کہ ایک دم سے ہر طبقے، خاص طور پر اردو کے طالب علموں میں بہت مقبول ہوئی۔ یہ کتاب دوسرے مصنفین اور مؤلفین کے لئے رہنما ثابت ہوئی۔ رام بابو سکسینہ نے بہت جامع اور مربوط انداز میں کتاب مرتب کی تھی۔ اس کے بعد مختلف محققین نے اپنے اپنے

انداز میں اردو ادب کی تاریخیں لکھیں مگر مختصر دوں روں پر پھیلی ہوئی تحقیقات کو سمیٹنے والی کتابوں کی ضخامت اور حجم ایک سے زیادہ جلدوں پر پھیل گیا۔ اس دوران ڈاکٹر سید اعجاز حسین نے "مختصر تاریخ ادب اردو" لکھی جو بہت مقبول ہوئی۔ اس میں اختصار کے باوجود تنقیدی انداز بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر محمد صادق نے انگریزی زبان میں بہت معتبر تاریخ ادب اردو لکھی۔ ڈاکٹر ملک حسن اختر نے قدرے تفصیل کے ساتھ اردو کی تاریخ کو ایک ضخیم تصنیف کی شکل میں بیان کیا۔ اردو کے طلباء کے لئے یہ کتاب بھی خاص مقبول رہی۔ اس میں ڈاکٹر ملک حسن نے بھی واقعات بیان کرنے کے ساتھ اپنے تنقیدی ریمارکس بھی شامل کیے ہیں۔ تبسم قریشی، ڈاکٹر نذیر احمد نے بھی اردو کی تاریخ کو مختصر کرنے کی کوشش کی۔ ایک اہم مختصر تاریخ ڈاکٹر سلیم اختر نے مرتب کی یہ کتاب ضخامت تو ملک حسن اختر کی کتاب سے کم مگر پھر بھی کافی ضخیم تھی۔ حال ہی میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری نے نئے سرے سے اردو ادبیات کی تاریخ مرتب کی ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ دوسری کتابوں کے مقابلے میں اس کتاب میں عصر حاضر تک کے نام اور واقعات شامل ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اردو ادب کی بہت جامع اور مفصل تاریخ تیار کی ہے۔ اس ضمن میں مولوی عبدالحق کی زیر قیادت مجلس ترقی اردو کی کاوشیں بھی قابل قدر ہیں۔ اردو ادب کی تاریخوں کا ذکر کچھ طویل ہو گیا۔ اس کا ڈاکٹر انور سدید کی تاریخی کاوش "اردو ادب کی مختصر تاریخ" کے ساتھ موازنہ مقصود تھا۔ اس کتاب کے اب تک 10 سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اور یہ پاکستان اور بھارت کی یونیورسٹیوں میں اردو کے نصاب کا لازمی حصہ بن چکی ہے۔ اس کتاب کا پہلا ایڈیشن اپریل 1991ء میں اے ایچ پبلشرز نے شائع کیا۔ اس کا دیباچہ ڈاکٹر صاحب نے 16 فروری 1991ء کو لکھا تھا۔ میرے لئے اعزاز کی بات ہے کہ جس روز یہ کتاب چھپ کر آئی، ڈاکٹر صاحب نے خود میرے گھر آ کر اس کا ایک نسخہ مجھے دیا تھا۔ شاید اسی لئے یہ مجھے دوسری کتابوں پر فوقیت دیتی دکھائی دیتی ہے۔ تاہم ڈاکٹر صاحب کی تمام کتابیں الگ الگ موضوعات پر یکساں بہت جامع اور وقیع ہیں۔

اب مجھے ڈاکٹر انور سدید کی زندگی کے ایک بہت اہم پہلو کے بارے میں کچھ بیان کرنا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے محترم شاہد شیدائی کی زیر ادارت شائع ہونے والے معروف ادبی جریدہ ماہنامہ "کاغذی پیرہن" میں ڈاکٹر صاحب کا ایک 27 برس پرانا انشائیہ شائع ہوا جو ڈاکٹر صاحب نے اپنی 60ویں سالگرہ کے موقع پر لکھا تھا۔ اس انشائیہ کا عنوان تھا "برگد کا درخت"۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون میں لکھا کہ ان کا بچپن ان کے گاؤں سے باہر برگد کے ایک قدیم بلند درخت کے سائے میں گزرا جہاں اس کے سائے میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے تھے مگر کبھی کبھی اکیلے وہاں آ کر اس برگد سے خاموشی کی زبان میں ہم کلام ہوا کرتے۔ یہ اپنے انداز کا صوفیانہ عمل تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے مطابق انہیں یوں محسوس ہوتا تھا کہ برگد کا وہ درخت ان کا انتظار کیا کرتا تھا اور ان کے زیر سایہ آنے پر خوش ہو جاتا تھا۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس قدیم درخت پر بسیرا کرنے والے مختلف پرندے بھی ان کے ساتھ اور خود ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ہم کلام ہوتے محسوس ہوتے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ کالج وغیرہ کی تعلیم اور ملازمت کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو ملک بھر کے مختلف شہروں میں جانا پڑا (آخر میں آبپاشی کے ایکسین کے طور پر ریٹائر ہوئے) تعلیم اور ملازمت کے طویل وقفوں کے باعث ڈاکٹر صاحب کا اس قدیم پیڑ کے ساتھ رابطے کا تسلسل برقرار نہ رہا۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب کبھی طویل مدت کے بعد میں گاؤں آتا تو پہلے اس برگد کے نیچے سے گزر جاتا۔ میں اس درخت کے پاس پہنچتا تو محسوس ہوتا کہ درخت مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو رہا ہے۔ یوں لگتا جیسے اچانک ہوا چل پڑی ہے اور درخت کے پتے اور شاخیں حرکت میں آ کر میرا خیر مقدم کر رہے ہیں۔ تاہم یہ بھی محسوس ہوتا کہ درخت مجھ سے شکایت بھی کر رہا ہے کہ تم مجھے بھول گئے ہو۔ ڈاکٹر صاحب کی اس درخت کے

ساتھ اس انداز میں رفاقت جاری رہی اور پھر یوں ہوا کہ ایک طویل عرصے کے بعد وہ گاؤں گئے تو یہ دیکھ کر ایک جگہ قدم جم گئے کہ درخت موجود نہیں تھا اس کی جگہ پر ایک کالی سڑک گزر رہی تھی!

ڈاکٹر صاحب نے یہ داستان اس انداز میں بیان کی کہ یہ ڈرامائی شکل اختیار کر گئی۔ اس سے بہت پہلے اے حمید کا اسی نوعیت کا ایک افسانہ بہت مشہور ہوا تھا۔ اس میں افسانہ نگار سڑکیں بنانے والے ایک ایس ڈی او کے طور پر ایک دور کے پہاڑی علاقے میں سڑک تعمیر کرنے کے لئے جاتا ہے تو اسے بتایا جاتا ہے کہ سڑک کے راستے میں ایک قبر رکاوٹ بن رہی ہے۔ ایس ڈی او موقع پر پہنچتا ہے تو اچانک فلیش بیک کے طور پر ایک داستان ابھر آتی ہے جب وہ نوجوان تھا اور اس علاقے میں کچھ عرصہ رہا تھا تو وہ یہاں کسی کی خوبصورت آنکھوں پر مرمٹا تھا اور پھر کچھ عرصہ تک عہد و پیمان کے بعد اسے واپس آنا پڑا تھا۔ وہ پھر کبھی ادھر نہیں گیا۔ اب وہ اس قبر پر کھڑا تھا تو اسے بتایا گیا کہ وہ خوبصورت آنکھیں کسی کا انتظار کرتے کرتے اچانک بہت بیمار ہوئیں اور پھر ختم ہو گئیں۔ ان آنکھوں نے خواہش کا اظہار کیا تھا کہ ان کی قبر اس بستی کو آنے والی سڑک کے کنارے پر بنائی جائے۔ ایس ڈی او دیر تک اس قبر کے پاس کھڑا رہا۔ اسے ماتحت عملے نے بتایا کہ اس قبر کی موجودگی میں سڑک کی توسیع نہیں ہو سکتی۔ ایس ڈی او نے آہستہ سے کہا قبر مسمار کر دی جائے!!

میں نے ڈاکٹر صاحب والے برگد کے پیڑ کے حوالے سے سندھ میں ٹھٹھہ سے سات میل دور دریائے سندھ کے کنارے برگد کے دور تک پھیلے ہوئے ایک جنگل میں گزارے ہوئے اپنے کچھ لمحات اور اس کیفیت کا ذکر کیا تھا جو مجھ پر گزر رہی تھی۔ اس جنگل کو سسی کا باغ کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ سسی اسی باغ میں بچوں کے لئے انگلی پر دودھ لے کر جایا کرتی تھی۔ یہ دراصل ایک ہی برگد ہے جس کے نیچے آتی ہوئی شاخیں (داڑھیاں) زمین میں گڑتی چلی گئی ہیں اور وہ درخت صدیوں میں دور تک پھیل گیا ہے۔ میں نے اس جنگل سے گزرتے ہوئے ایک بوڑھے سندھی بابا سے پوچھا کہ وہ سسی کے بارے میں کیا جانتا ہے؟ اس نے کہا کہ "میں نے بزرگوں سے سسی کے بارے میں جو کچھ سنا ہے اتنا ہی جانتا ہوں البتہ میں نے سسی کی آواز سنی ہے؟" میں چونک گیا۔ "بابا تم نے سسی کی آواز سنی ہے؟ کیا کہہ رہے ہو؟" اس نے کہا کہ "ہاں سائیں! ایک بار نہیں، بہت دفعہ سنی ہے۔ دسمبر کے مہینے کے آخر میں کسی روز اچانک کسی دوسرے ملک سے آنے والی تند و تیز سرد برفانی ہوائیں آ جاتی ہیں۔ وہ اس جنگل سے گزرتی ہیں تو ان کے ساتھ ایک درد بھری سی آواز ابھرنے لگتی ہے ہوں ہاؤں ہاؤں! بزرگ کہتے ہیں کہ سسی بچوں کو پکار رہی ہے۔ ایسے میں ہدایت ہوتی ہے کہ گھروں کے دروازے بند کر کے سسی کی روح کے سکون کے لئے دعائیں مانگی جائیں۔ ہم دعائیں مانگنے لگتے ہیں۔ پھر ہواؤں کی تیزی کم ہونے لگتی ہے اور سسی کی آواز بھی آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے۔ میں نے یہ آواز سنی ہے سائیں!" یہ داستان "تخلیق" میں چھپی تو ڈاکٹر صاحب نے بہت پسندیدگی کا اظہار کیا اور خواہش کا اظہار کیا کہ میں مسلسل لکھا کروں مگر غم روزگار نے مہلت ہی نہ دی۔

ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ کم از کم (40) برسوں پر پھیلے ہوئے روابط اور واقعات کی داستان صرف ایک مضمون میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ بہت سے ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں کی علمی و ادبی تخلیقات پر بہت تبادلہ خیال ہوا۔ وہ حیرت انگیز صاحب مطالعہ شخص تھے۔ برصغیر پاک و ہند میں کسی بھی شہر میں کوئی تھوڑا سا بھی معروف ادیب وفات پا جاتا تو ڈاکٹر صاحب فوراً تفصیل کے ساتھ اس کا "وفاتیہ" قلم بند کر دیتے تھے۔ برصغیر میں شائع ہونے والی کوئی اہم علمی و ادبی تخلیق ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہتی تھی۔

ان کے پاس تبصروں اور تجزیوں کے لئے بے شمار کتابیں آتی ہیں۔ وہ ہر کتاب کا اول سے آخر تک تفصیلی مطالعہ کرتے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت بھرپور مصروف زندگی گزاری۔ چند گھنٹوں کی نیند کے سوا کوئی لمحہ ایسا نہ ہوتا جب وہ کچھ نہ کچھ پڑھ رہے یا لکھ رہے ہوتے۔ چار بیٹے، چاروں بہت اچھے مقام پر گئے۔ بہت آسودہ زندگی، اور ڈاکٹر صاحب نے ساری عمر اقبال ٹاؤن کے نیلم بلاک میں پانچ مرلے کے ایک مختصر مکان، بلکہ اس کے مزید مختصر چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں کتابوں کے ڈھیر میں گزار دی۔ ایک چھوٹی سی میز، ایک کرسی، مہمان آجاتا تو باہر گیراج میں بٹھا لیتے! ایک برس پہلے فالج قسم کی بیماری لاحق ہوگئی۔ چلنا پھرنا دشوار ہوگیا مگر اس حالت میں بھی کسی تقریب میں شرکت سے انکار نہ کرتے۔ بڑی مشکل کے ساتھ آہستہ آہستہ چل پڑتے۔ بعض مقامات پر سیڑھیاں بھی چڑھنا یا اترنا پڑتیں، کبھی تکلیف کا احساس نہ ہونے دیا۔ آخری تقریب اظہر جاوید کی یاد میں لاہور کے ایک ریسٹورنٹ میں تھی جہاں سیڑھیاں اتر کر نیچے گئے پھر وہی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئے۔ وہیل چیئر لینے سے انکار کر دیا۔ اس کے صرف چند روز بعد زیادہ علیل ہوگئے۔ سرگودھا میں مقیم بیٹے انہیں اپنے پاس لے گئے وہ کومے میں چلے گئے۔ ہسپتال، ڈاکٹر، نرسیں، آکسیجن، ٹیکے، دوائیں ـــــ مگر انہوں نے طے کر لیا تھا کہ اپنے استاد ڈاکٹر وزیر آغا کی عمر سے آگے نہیں بڑھنا، وہ اپنے اس عہد پر قائم رہے اور آنکھیں بند کر لیں۔

میں قبر پر مٹی ڈال کر واپس آنے لگا تو قبرستان کی روش سے گزرتے اچانک سفید ٹائلوں میں لپٹی ہوئی ایک قبر دیکھ کر چونک گیا، کتبے پر نام لکھا تھا "شکیب جلالی" جو 1934ء میں آیا اور 32 سال کی عمر کے ساتھ 1966ء میں چلا گیا۔ شکیب جلالی، باکمال شاعر، جس نے کہا کہ "آکے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے، جتنے پھل تھے اس پیڑ کے کہیں اور گرے"۔ ایک ملاقات میں ڈاکٹر انور سدید نے مجھے کہا تھا کہ کبھی سرگودھا جائیں تو شکیب جلالی کی قبر پر ضرور جائیں، میں تو جب بھی سرگودھا جاتا ہوں، شکیب کی قبر پر ضرور فاتحہ پڑھتا ہوں۔" میں نے اس روز دو جگہ فاتحہ پڑھی، شکیب جلالی اور اپنی والدہ کی قبر کے قدموں میں گلاب کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی ڈاکٹر انور سدید کی قبر پر!!

ڈاکٹر صاحب کے لئے میرے چند شعر:

کیسے کیسے فاصلے چشم زدن میں کٹ گئے!
کیسے کیسے لوگ اپنے درمیاں سے ہٹ گئے!

دائرہ در دائرہ چلتی رہی شب بھر ہوا
کیسے کیسے چاند چہرے آندھیوں سے اٹ گئے!

مختصر اتنی سی ہے بس راہیوں کی داستاں
گھر سے تو مل کر چلے تھے، راستے میں بٹ گئے!

◆◆◆

خوشخبری

گزشتہ دنوں نظریہ پاکستان کونسل ٹرسٹ کی جانب سے نسیم سحر صاحب کو زندگی بھر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں علامہ اقبال گولڈ میڈل سے نوازا گیا۔ یہ میڈل محسن پاکستان ڈاکٹر عبدالقدیر خان صاحب کے دست مبارک سے نسیم سحر صاحب نے وصول پایا۔ ادارہ "تخلیق" کے تمام قارئین کی طرف سے نسیم سحر کو بہت بہت مبارک ہو۔ (ادارہ "تخلیق")

ڈاکٹر انور سدید کی علمی اور ادبی خدمات

سلیم آغا قزلباش

ڈاکٹر انور سدید کی علمی اور عملی زندگی ایک مسلسل جدوجہد سے عبارت تھی۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے ان دونوں میدانوں میں کامیابیاں حاصل کیں۔ شاید اسی لیے اہلِ ادب نے انھیں مردِ آہن کا خطاب بھی عطا کیا۔ ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں ڈاکٹر خورشید رضوی کی یہ رائے صائب معلوم ہوتی ہے:

"وہ (ڈاکٹر انور سدید) اپنی بنیادی سرشت اور فطرت کے اعتبار سے صاف گو آدمی ہیں جو اپنے دلی جذبات کے اظہار سے خود کو باز نہیں رکھ سکتے۔"

ڈاکٹر انور سدید پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے۔ وہ 1988ء میں ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ لڑکپن ہی میں انھیں مطالعے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی وہ افسانہ نویسی کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ تاہم وہ اس صنفِ ادب پر بوجوہ پوری توجہ نہ کر سکے۔ جب عصمت علیگ نے سرگودھا سے ادبی مجلے "اردو زبان" کا اجرا کیا تو کچھ عرصے بعد ڈاکٹر انور سدید کو مذکورہ مجلے کی مجلسِ ادارت کے فرائض تفویض کیے۔ اسی دور میں انھوں نے انشائیہ نگاری کا آغاز کیا۔ دوسری طرف جب ان کے تنقیدی مضامین پر مشتمل پہلی کتاب "فکر و خیال" منظرِ عام پر آئی تو اس کی کافی پذیرائی ہوئی۔ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انھوں نے صحافت کا رخ کیا مگر صحافتی مصروفیات کو اپنے ادبی کام میں حائل نہ ہونے دیا۔ جامعہ پنجاب سے ایم۔ اے اردو کے امتحان میں اول آئے۔ اس کامیابی نے انھیں پی ایچ ڈی کی طرف راغب کیا اور "اردو ادب کی تحریکیں" پر مقالہ قلم بند کر کے جامعہ پنجاب سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ ان کی ادبی جہات کثیر ہیں اور ان کی کئی کتابوں کو ایوارڈ مل چکے ہیں۔ صدرِ پاکستان نے انھیں تمغۂ امتیاز سے بھی سرفراز کیا۔

"اردو ادب کی تحریکیں" ان کی چند اہم ترین تنقیدی و تحقیقی کتابوں میں شامل ہے۔

اس کتاب کے بارے میں ذوالفقار احمد تابش رقم طراز ہیں:

"اردو ادب کی تاریخ، اس کے فکری رجحانات، شخصی اپج، نظریاتی اختراعات، مقامی ایجادات، غیر ملکی اثرات، انفرادی انحرافات اور عہد بہ عہد ہونے والی عصری تبدیلیوں کا احوال سمیٹ لیا ہے۔ یوں اس کتاب کے مطالعے سے اردو ادب کا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔"

اسی طرح ان کی ایک دوسری اہم کتاب "اردو ادب کی مختصر تاریخ" کے بارے میں ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"کوئی بھی ادبی تاریخ اس کے مصنف کی شخصیت کے بغیر محض کتابوں اور ادبی شخصیتوں کی ایک کھتونی ہے ۔۔۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی اس کتاب کو محض احوال و آثار کا ایک ملغوبہ بنا کر پیش نہیں کیا، ان کے عقب میں موجود سیاسی، سماجی

لسانی اور تہذیبی گرہوں کو مس بھی کیا ہے۔"

دیکھنے میں آیا ہے کہ جن ناقدین کے پاس اپنی طرف سے کہنے کے لیے کچھ خاص نہیں ہوتا' ان کی تحریریں بوجھل انگریزی اصطلاحات اور غیر ملکی اہلِ نقد و نظر کے حوالوں سے اٹی ہوتی ہیں اور قاری ان بھاری پتھروں تلے پس کر رہ جاتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے اسلوبِ نگارش کی بابت سجاد نقوی کی یہ رائے بالکل درست ہے:

"انور سدید کی تنقید کی اثر آفرینی کا تمام انحصار اس کے تخلیقی اسلوب کا مرہونِ منت ہے۔ یہ اسلوب اکتسابی نہیں' وہبی ہے اور تنقید کے میدان میں آنے سے بہت پہلے انور سدید کی افسانہ نگاری کے سفر میں فنی پختگی کے بہت سے مراحل طے کر چکا ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید کی پسندیدہ ادبی شخصیات پر لکھی ہوئی کتابیں خصوصی توجہ کی طلب گار ہیں۔ ان کتابوں میں جن ادبی شخصیات کے فکر و فن کا احاطہ کیا گیا ہے' وہ اردو ادب کی تاریخ میں یاد رکھے جانے والی شخصیات ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے کچھ اس انداز سے ان شخصیات پر قلم اٹھایا کہ ان کی ذاتی اور ادبی زندگی میں تضاد یا تصادم کا کہیں احساس نہیں ابھرتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا کہ ذاتی زندگی میں ان شخصیتوں کا رویہ یا طرزِ عمل اور طرح کا تھا اور ادبی حوالے سے انھوں نے کوئی دوسری روش اختیار کر رکھی تھی' جو سادگی' شرافت' خلوص' سچائی' اصول پرستی اور راست گوئی انھوں نے ذاتی زندگی میں اپنا رکھی' وہی طرزِ عمل انھوں نے علمی و ادبی زندگی میں برقرار رکھا۔ لہٰذا ان معتبر اور جلیل القدر شخصیات کے علمی و ادبی کارناموں کا مطالعہ فقط ان کی ذات تک محدود نہیں رہتا' اس عہد کی تصویر کشی بھی کرتا ہے کہ جس میں وہ عظیم ہستیاں سانس لے رہی تھیں۔

ڈاکٹر انور سدید ایک محقق اور نقاد کے اونچے سنگھاسن پر متمکن ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ پائے کے انشائیہ نگار بھی تھے۔ انھوں نے سفرنامہ نگاری' کالم نگاری' خطوط نگاری' خاکہ نگاری میں بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے' نیز شاعری کے ذریعے اپنے باطن کو منکشف کرنے کی کوشش کی۔ تاہم بہ حیثیت انشائیہ نگار انھوں نے اپنی تخلیقیت کا بھرپور اظہار کیا۔ پروفیسر سجاد نقوی ان کی انشائیہ نگاری کے باب میں لکھتے ہیں:

"ادب میں پورے انسان کی بازیافت اسی صورت میں ممکن ہے جب ظاہر کا انسان اور باطن کا انسان ایک خاص تخلیقی لمحے میں یک جا ہو کر ایک "کل" میں ڈھل جائیں۔ انور سدید کے انشائیے اسی تخلیقی لمحے کی پیداوار ہیں اور ان میں جہاں ایک طرف ذات دیگر تازہ و شگفتہ موضوعات کی نمود کا اہتمام کرتی ہے' وہاں دوسری طرف ان کی تردمند ذات' ان کی تراش خراش اور نوک پلک سنوارنے کا فریضہ بھی انجام دیتی ہے۔ اس طرح ان کے انضمام سے انور سدید کے انشائیوں کی روحانی وحدت اور کاملی معرضِ وجود میں آتی ہے جو عظیم ادب کی حقیقی پہچان ہے۔"

انشائیہ نگاری کے ایوان میں ڈاکٹر انور سدید نے اپنی ایک انمٹ پہچان قائم کی۔ ان کے انشائیوں کے دو مجموعے "ذکر اس پری وش کا" اور "آسمان میں پتنگیں" اردو انشائیے کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ کلاسیکی شعرا پر قلم اٹھاتے وقت اکثر نقاد اور محققین ان پر پہلے سے موجود کام کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں کلاسیکی شعرا کے فنِ شاعری پر صادر شدہ فیصلوں ہی کو بنیاد بنا کر اکثر ان کی

شاعری کا تجزیہ کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی نقاد نے کلاسیکی شعرا کے بارے میں اپنے طور پر ان کے کلام کا منفرد انداز از سرِ نو جائزہ لینے کی کاوش کی ہو۔ ڈاکٹر انور سدید نے کلاسیکی شعرا پر قلم اٹھاتے وقت اپنے زاویہ نگاہ کو بروئے کار لانے کی حتی المقدور کاوش کی اور دوسرے نقادوں کی خوشہ چینی کرنے سے اجتناب کیا۔ ہر چند کہ کلاسیکی شعرا پر ایک بالکل نئے زاویے سے کچھ لکھنا کافی وقت طلب کام ہے تاہم ڈاکٹر انور سدید اس معاملے میں سرخرو دکھائی دیتے ہیں۔

پاکستان میں ''ادبی رسائل کی تاریخ'' ڈاکٹر انور سدید کی تیسری اہم کاوش ہے۔ اس کتاب میں ادبی رسائل کی تاریخ بیان ہوئی ہے۔ اس اہم تحقیقی و تنقیدی کتاب کے بارے میں پروفیسر سجاد نقوی نے بالکل صحیح تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''انور سدید نے جس محنت اور لگن سے ''اردو ادب کی تحریکیں'' ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' اور ''اردو ادب میں سفرنامہ'' جیسی کتابیں لکھی تھیں' اسی خلوص سے پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ لکھی جو اس موضوع پر پہلی کتاب کی حیثیت رکھتی اور اب ایک مستند حوالہ ہے۔''

میں یہ بات پہلے بھی لکھ چکا ہوں اور اس کا اعادہ کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کہ ڈاکٹر انور سدید نے اردو تنقید میں اپنے طرزِ تحریر کے ذریعے ایک خاص کاٹ پیدا کی۔ اس کاٹ میں جذباتیت یا فوری تاثر سے پیدا ہونے والی ہنگامی کیفیت موجود نہیں تھی۔ وہ جب کسی ادبی شخصیت یا مسئلے کو احاطۂ تحریر میں لاتے تو اس کے بطون میں کارفرما ان عوامل کو کھوجنے کی سعی بھی کرتے جو قاری کی نظروں سے اوجھل ہوتے تھے اور اس کے ساتھ ہی وہ اپنی بے لاگ رائے بھی قلم بند کر دیتے۔ پروفیسر سجاد نقوی نے اس سلسلے میں درست لکھا ہے:

> ''دیانت کو زندہ رکھنے کے لیے ڈاکٹر انور سدید ریاکاری اور منافقت سے نفرت کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کو ہرگز معاف نہیں کرتے جو ریاکاری کے مرتکب ہوتے ہیں۔''

مختصر یہ کہ ڈاکٹر انور سدید نے اردو تنقید کے پیش پا افتادہ طرزِ تحریر سے ہٹ کر ایک ایسا اسلوبِ بیان اختیار کیا جس میں دلائل و براہین کے برملا اظہار کے علاوہ اصل مدعا کو دو ٹوک انداز میں قاری کے سامنے پیش کرنے کا چلن بہت نمایاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے تنقید کا آغاز کیا تو تھوڑے عرصے میں اس صنف میں نام پیدا کر لیا۔ وہ ان معدودے چند خوش نصیب اہلِ قلم میں شامل تھے جنھوں نے اپنے تنقیدی مضامین کی تعداد اور مقدار کے ساتھ ساتھ ان کے معیار کو بھی ہمیشہ بلند رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔ ان کی کسی بھی تحریر کو اٹھا کر دیکھا جائے تو اس میں ہیچ مدانی یا سہل نگاری کا نام و نشان تک نہیں ملے گا۔ وہ اپنے عہد کے ان چند باخبر نقادوں میں شامل تھے جنھیں ایوانِ ادب کے مختلف گوشوں میں ہونے والی ہر لرزش سے بخوبی آگاہی رہتی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید کی کتابیں برصغیر پاک و ہند میں کثرت سے پڑھی گئیں اور انھیں ایسے نقادوں میں شمار کیا گیا جو بحرِ ادب میں جب غوطہ لگاتے تو ہمیشہ تہہ سے موتی نکال لاتے۔ بحرِ ادب کا وہ باکمال شناور آج ہم میں موجود نہیں ہے مگر اس کی لکھی ہوئی کتابیں ہمیں غواصی کی دعوت دے رہی ہیں۔

◆◆◆

خط و کتابت کے لیے ماہنامہ ''تخلیق'' کا پتہ

ماہنامہ ''تخلیق'' 12/E شیراز ولاز فیز-1، اسلام نگر و حسن روڈ لاہور کینٹ

انور سدید کی یاد میں

نذیر فتح پوری (انڈیا)

تخلیق لاہور کا خاص نمبر مارچ 2016ء کا شمارہ نمبر 3 موصول ہوا۔ دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ واہ کیا خوب تخلیق ہے۔

حسبِ روایت مضامین اور تبصروں کے باب میں ڈاکٹر انور سدید کا نام سرِ فہرست نظر آیا۔ اس سے پہلے بھی جب جب تخلیق کا شمارہ موصول ہوا۔ کبھی کسی مضمون کے حوالے سے، کبھی کسی کتاب یا رسالے پر تبصرے کے حوالے سے، کبھی انجمن خیال کے حوالے سے، کبھی اپنی کسی غزل کے حوالے سے ڈاکٹر انور سدید ہر جگہ نمایاں ہی نظر آئے۔ جب تک ڈاکٹر وزیر آغا کا رسالہ اوراق آتا رہا اس میں بھی ڈاکٹر انور سدید ہی کے قلم کا طلسماتی کردار غالب نظر آتا رہا۔ یہاں میں نے طلسماتی کردار اس لیے کہا کہ ڈاکٹر انور سدید جس موضوع پر اظہار خیال کرتے تھے پورے خلوص اور صداقتوں کے اعتراف کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے۔ وہ جس کتاب یا رسالے پر اظہار خیال کرتے اس کی ساری خوبیوں کا احاطہ کرتے۔ کسی سوال کو تشنہ نہیں چھوڑتے، کسی بات کو معلق نہیں رہنے دیتے۔ تخلیق کے جس شمارے کے حوالے سے میں نے گفتگو کا آغاز کیا ہے۔ اس شمارے میں پہلا مضمون محترمہ میر جہاں سے متعلق ہے جنہیں سال 2016ء کا تخلیق ایوارڈ تفویض ہوا ہے۔ یہ ایک تعارفی مضمون ہے۔ لیکن ایک صفحہ میں محترمہ میر جہاں کا مکمل تعارف سمٹ آیا ہے۔ یہ جان کر حیرت ہوئی کہ محترمہ میر جہاں کی پیدائش مہاراشٹر کے کسی شہر میں ہوئی تھی۔

اظہر جاوید پر ایک تین صفحہ کا مضمون بھی اس شمارے میں شامل ہے۔ اس سے پہلے بھی اظہر جاوید پر ان کے چند مضامین شائع ہو چکے ہیں۔ میں اسے قلم کا طلسم ہی کہوں گا کہ ایک ہی شخصیت پر بار بار لکھنا اور ہر بار نیا انداز، نئی گفتگو، نیا مواد، انوکھا متن۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انور سدید کتنے وسیع ذہن کے مالک تھے۔ ان کا مشاہدہ کتنا انوکھا تھا ان کے پاس لفظوں کا نایاب خزانہ تھا اور ان کا دل ایک حاتم طائی کی مثال تھا۔ بہت فراخ دلی کے ساتھ وہ اپنے موضوع میں خود کو اتار دیا کرتے تھے۔ تخلیق کے اسی شمارے میں سہ ماہی اسباق پونے کے ایک شمارے پر بھی تبصرہ ہے جس میں محسن جلگانوی اور پرکاش فکری کے فکر و فن پر اہم گوشے شائع ہوئے تھے۔ مضمون کی پہلی سطر میں انور سدید نے لکھا ہے۔

''ادبی رسالے ''اسباق'' کے مدیر نذیر فتح پوری ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید کے ذاتی دوستوں میں تھے۔ اور یہ بھی لکھتے ہیں (واضح رہے کہ اظہر جاوید پر بھی 'اسباق' نے گوشہ پیش کر کے حق دوستی ادا کیا تھا) اظہر جاوید کے فکر و فن پر جب 'اسباق' میں گوشہ شائع ہوا تو انور سدید صاحب نے اس شمارے پر بہت ہی گراں قدر تبصرہ سپرد قلم کیا تھا۔ جو پاکستان کے کسی رسالے میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں ''اسباق'' میں بھی اسے شائع کیا گیا تھا۔ انور سدید سے میرے سیدھے روابط کبھی نہیں رہے۔ ان کا کوئی خط میرے پاس نہیں۔ جگن ناتھ آزاد کے 39 خط ''آزاد نامہ بنام نذیر'' جب میں نے مرتب کر کے کتابی صورت میں شائع کیے تو کتاب کا انتساب انور سدید کے نام کیا۔ اور اس بات کی صراحت بھی کہ ان کا کوئی خط میرے نام نہیں۔ یہ کتاب میں نے ڈاک سے رجسٹرڈ پارسل کے ذریعے ان کو ارسال کی۔ لیکن مجھے رسید

تھیں لی۔ ممکن ہے کتاب کہیں راہ میں گم ہو گئی ہو۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مرحوم ڈاکٹر انور سدید نے بھی مجھے قابلِ اعتنا نہیں سمجھا۔ لیکن یہ حق ہے ہمارے درمیان راست رابطہ قائم نہیں ہو سکا۔ میری کسی کتاب پر مرحوم نے تخلیق میں ایک بہت ہی اہم تبصرہ کیا تھا۔ بلکہ میرے افسانچوں کے ایک مجموعہ پر بھی تخلیق میں اعترافی تبصرہ کیا تھا۔ تخلیق میں جن دنوں میری زندگی کے حالات ''بیتے کل کا اک پل'' عنوان سے قسطوں میں شائع ہو رہے تھے تب کئی قسطوں پر موصوف نے ''انجمن خیال'' کے تحت اپنی گراں قدر رائے کا اظہار کیا۔ اور میری حوصلہ افزائی اور پذیرائی میں تو خوبصورت جملے سپردِ تحریر فرمائے۔ جس سے مجھے کافی حوصلہ ملا۔ خوشی ملی۔ اور اگلی قسط لکھنے کی ہمت پیدا ہوئی۔

ایک بار محترمہ فرخ سارجی کے نام ایک خط لکھا تو اس میں میرا ذکر خیر بھی کیا۔ خط کی نقل محترمہ فرخ ساری نے مجھے ارسال کی تھی۔ بہت پہلے جب سال بھر کی ادبی تخلیقات پر ان کے جائزے شائع ہوا کرتے تھے۔ تب کسی نہ کسی حوالے سے میرے کسی شعر کا ذکر کر دیتے۔ یا میرے کسی ماہیے پر اظہارِ خیال فرما دیتے۔ یہاں ہندوستان میں ان کے اس نوعیت کے ادبی جائزے ہفت روزہ ہماری زبان دہلی میں شائع ہوتے تھے تب اپنے نام کا حوالہ پڑھ کر مجھے واقعی خوشی ہوتی تھی۔ سال بھر میں جتنی کتابیں اور رسالے انڈو پاک سے مرحوم کے پاس آتے ان سب کو جائزے میں شامل کرتے۔ گویا تخلیقی ادب کا ایک شاہی بازار لگا ہوتا اس بھیڑ میں مجھ جیسے شاعر کا حوالہ اپنے جائزے میں شامل کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی میرے لیے واقعی ادبی انعام تھا۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے ان کے بہت ہی گہرے ادبی مراسم تھے۔ وزیر آغا کے فکر و فن پر انور سدید نے دل کھول کر لکھا۔ الگ الگ زاویوں سے لکھا — جہاں تک میں جانتا ہوں اپنے ہم عصروں پر جس شدت اور مقدار میں انور سدید نے لکھا۔ کسی اور کا ایسا کام نظر نہیں آیا۔

مجھے ان کی ادبی اور تبصراتی زبان بہت اچھی لگتی ہے۔ میں نے ہمیشہ ان کے تنقیدی مضامین پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ تخلیق لاہور میں انجمن خیال کے تحت ان کے طویل تبصراتی خطوط شائع ہوتے تھے۔ رسالے کے پورے مواد و متن پر اتنی باریک بینی سے اظہار کرتے کہ خوشی ہوتی۔ میں نے ان کی تحریر میں کوئی کمتر جملہ کبھی نہیں دیکھا۔ نہ ہی استہزائی انداز دیکھا۔ نہ کسی کی بے جا دل شکنی والی کوئی تحریر میرے مطالعہ میں آئی۔ وہ ہر چھوٹے بڑے لکھاری کی قدر افزائی کرتے تھے۔ واقعی وہ بڑے دل اور بڑے ذہن کے مالک تھے۔ زندگی کی آخری گھڑیوں تک ان کا ذہن تازہ رہا۔ صحت نے ان کا ساتھ دیا۔ قلم نے ان سے دوستی کا حق ادا کیا۔ شعور کی روشنی، فکر کی بالیدگی اور فن کی چابکدستی نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ لکھتے رہے لکھتے رہے اور صرف لکھتے رہے۔ کچھ لوگ واقعی لکھنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں اور لکھتے لکھتے ہی دنیا کو آخری سلام کہہ کر رختِ سفر باندھ لیتے ہیں۔ انور سدید کی شخصیت ایسی ہی تھی۔ اب وہ دنیا سے چلے گئے۔ اب ان لوگوں کا امتحان ہے جو ان کے بعد موجود ہیں۔ دیکھیں کون قلم کے اس جادوگر اور دل کے اس حاتم طائی پر قلم اٹھاتا ہے۔ کون ان کا قرض ادا کرتا ہے۔ تخلیق اور الحمرا جیسے ادبی رسائل میں ان کے فکر و فن پر کب خصوصی اشاعت عمل میں آتی ہے۔ کیوں کہ یہ دونوں رسالے ان کے ذہن و دل سے بہت قریب تھے۔ اوراق لاہور کے بعد مذکورہ دونوں رسائل میں ڈاکٹر انور سدید کے مضامین کثرت سے شائع ہوتے تھے۔ ''حق مغفرت کرے''

◆◆◆

32 برس پہلے کے ''تخلیق'' میں مدیر و مفکر اصغر نے اداریے میں بڑے سچے کی بات لکھی ہے: ''ہم جو بہت با اختیار ہیں سچ پوچھیے تو بالکل بے اختیار ہیں۔ ہم جو چاہتے ہیں وہ کب ہوتا ہے؟ اور جو ہوتا ہے؟ وہ کب ہم چاہتے ہیں!!'' (ڈاکٹر انور سدید)

حسنِ اردو ادب......ڈاکٹر انور سدید

شاہد شیدائی

افسوس صد افسوس کہ ڈاکٹر انور سدید اس سال تین مارچ کو صبح گیارہ بجے ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کی وفات سے اردو ادب کا ایک باب ختم ہو گیا کہ وہ اس باغ کی آبیاری عمر بھر اپنے خونِ جگر سے کرتے رہے اور آخری دم تک اس میں نئے نئے پھول پودے اگاتے رہے۔ یہ صدمہ اہلِ علم کی برداشت سے باہر ہے!

انور سدید کے ادبی سفر کی ابتدا طالب علمی کے زمانے ہی میں ہو گئی تھی۔ ان کے بڑے بھائی نے گھر میں لائبریری بنا رکھی تھی جس سے وہ فیض یاب ہوتے تھے۔ انھوں نے سکول کے زمانے ہی میں محمد حسین آزاد کی "قصص الہند" پڑھ لی تھی اور وہ میر، غالب، اقبال کے علاوہ کئی دیگر اساتذہ کے کلام تک سے متعارف ہو چکے تھے۔ مڈل کے درجے میں وہ ڈیرہ غازی خان میں لائبریری کے انچارج رہے۔ سرگودھا کی میونسپل لائبریری میں وہ لائبریرین کی معاونت کرتے رہے جس کے صلے میں انھیں ایک کتاب گھر پر لے جا کر پڑھنے کی اجازت تھی۔ اسلامیہ کالج لاہور میں انھیں پروفیسر حضرات کا مشفق سایہ نصیب رہا۔ ممتاز شاعر ضیا جالندھری اور الطاف گوہر ان کے انگریزی کے استاد تھے جن سے نئے رسائل کا ذکر سنتے ہی انور سدید دیگر ہونہار طلبا کے ساتھ کالج لائبریری کا رخ کر لیتے اور اپنی ادبی پیاس بجھاتے۔ شروع شروع میں وہ افسانے لکھتے تھے۔ انھوں نے پہلی کہانی نانا ابا نویں جماعت میں لکھی تھی جو گوتھ سہارے کے رسالے "مجلہ سند" میں شائع ہوئی۔ پھر وہ قلمی رسالے "چترا" سے ہوتے ہوئے "نیرنگِ خیال"، "آج کل"، "چمنستان"، "ریاست" اور "ہمایوں" تک پہنچے۔ پھر روزگار، ادبی زندگی پر غالب آ گیا۔ مگر انور گوندی نے اپنے رسالے "کامران" میں ان کے چند ایک افسانے شائع کر کے انھیں زندہ رکھا۔ 1966ء میں "اوراق" کے اجرا پر انور سدید تنقید کی طرف آئے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کو وہ اپنا ادبی رہنما سمجھتے تھے جن سے ان کی پہلی باقاعدہ ملاقات 1964ء میں ہوئی تھی اور جنھوں نے انھیں ایم اے اردو کرنے کا مشورہ دیا جس میں انھوں نے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ گولڈ میڈل سے یاد آیا کہ انور سدید نے ایم اے کا امتحان پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے دیا تھا اور وہ پنجاب یونیورسٹی میں اول ٹھہرے تھے مگر اورینٹل کالج کے اساتذہ نہیں چاہتے تھے کہ باہر کے کسی طالب علم کو اول قرار دیا جائے۔ چنانچہ کئی دن تک نتیجہ رکا رہا اور ایک باقاعدہ طالب علم امجد اسلام امجد کو جو دوسرے نمبر پر تھے اول قرار دینے کا تہیہ کیا گیا۔ مگر یہاں ڈاکٹر وحید قریشی سب کے آگے دیوار بن کر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے یہ منطقی دلیل دی کہ طالب علم خواہ پرائیویٹ ہو خواہ کالج کا، اول اسے ہی قرار دیا جانا چاہیے جس کے نمبر سب سے زیادہ ہیں۔ چنانچہ انور سدید کو پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے اردو کے امتحان میں اول قرار دیا گیا اور وہ گولڈ میڈلسٹ ٹھہرے۔ انور سدید نے ہمیشہ ڈاکٹر وحید قریشی کے اس احسان کو یاد رکھا اور زندگی بھر ان کے عزت و احترام میں کوئی کمی نہ آنے دی۔

پھر انھوں نے وزیر آغا کے مشورے پر پی ایچ ڈی کرنے کی ٹھانی اور "اردو ادب کی تحریکیں" کے عنوان سے وزیر آغا ہی کی

کراچی میں پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کیا۔ ان کی یہ کتاب کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکی ہے اور اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ وزیر آغا سے جو تعلق پیدا ہوا وہ "اوراق" کے آخری شمارے کی اشاعت اور وزیر آغا کے آخری دم تک قائم رہا۔ انور سدید نے وزیر آغا کو ہمیشہ اپنا محسن سمجھا۔ سچ پوچھیے تو وہ وزیر آغا کے خاص دوستوں میں سر فہرست تھے۔ ان کا بیان ہے کہ وزیر آغا سے ملاقات نہ ہوتی تو وہ 1950ء ہی میں ادبی دنیا سے غائب ہو گئے ہوتے۔ اپنے محسن کے قرض کو اتارنے کے لیے انور سدید نے ایک معرکہ آرا کتاب "وزیر آغا ایک مطالعہ" لکھی اور ان پر مضامین کی ایک کتاب "شام کا سورج" مرتب کی۔ ان پر کئی مضامین لکھے جو اندرون ملک اور بیرون ملک رسالوں کی زینت بنتے رہے۔ چند ماہ پہلے "یاد نامہ ڈاکٹر وزیر آغا" کے عنوان سے ان کی جو کتاب منظر عام پر آئی وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ انھوں نے اپنے محسن کو تادم آخر اپنی یادوں میں بسائے رکھا۔

انور سدید کی تصانیف کی تعداد اسی (80) سے تجاوز کر چکی ہے۔ "اردو ادب کی تحریکیں" کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ ان کی ایک اور کتاب "اردو ادب کی مختصر تاریخ" بھی کلاسیک کا درجہ حاصل کر چکی ہے جس میں ان کی حقائق یکجا کرنے کا ہنر شامل ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر گیان چند جین لکھتے ہیں:

> "انور سدید نے غیر معمولی طور پر ایک وسیع موضوع کو جس سلیقے سے ایک متوسط حجم کی کتاب میں سمو دیا ہے اس کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔" (مضمون "دستک" جلد 2، ص 518)

محکمہ آب پاشی سے ریٹائرمنٹ کے بعد انور سدید نے جہاں تنقید و تحقیق کا کام جاری رکھا وہاں دو ماہنامہ "اردو زبان" کے لیے مدیر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیتے رہے۔ ادب کے سالانہ جائزے بھی ان کی پہچان ہیں جن میں انھوں نے زیادہ سے زیادہ نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا۔ پھر صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ "قومی ڈائجسٹ" کی ادارت کے بعد ہفت روزہ "زندگی" اور پھر روزنامہ "خبریں" سے منسلک رہے۔ اس کے بعد "نوائے وقت" کے ادارتی صفحے پر کام کرتے رہے۔ اس دوران میں کتابوں پر ان کے بے شمار تبصرے شائع ہوئے۔ کچھ حلقوں نے انھیں "نوائے وقت" سے نکلوانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے اور انور سدید آخری دم تک اس اخبار کے لیے کام کرتے رہے۔ وہ اس خیال کے حامی تھے کہ ہمیں اپنا نقطۂ نظر دوسرے پر آزادی سے ظاہر کر دینا چاہیے مگر یاد رہے کہ انھوں نے اپنے مخالفین کو جب بھی مخاطب کیا ان کے بلند مرتبے میں کوئی کمی نہ آنے دی اور ان کا احترام ملحوظ طور پر لازم قرار دیا — یہ ان کی بڑائی کا بہت بڑا پہلو ہے!

انور سدید میر، غالب اور اقبال کو نہایت اہم شعرا گردانتے تھے۔ وہ اٹھارھویں صدی کو میر کے نام سے، انیسویں صدی کو غالب کے نام سے اور بیسویں صدی کو اقبال کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ موجودہ دور کے نظم نگاروں کے بارے میں انھوں نے "جسارت" کے ادبی صفحے کے لیے ایک مضمون لکھا جس میں "اربعہ عناصر" کا ذکر کرتے ہوئے ن م راشد، مجید امجد، وزیر آغا اور عزیز حامد مدنی کو نہایت اہم نظم گو شعرا میں شمار کیا۔ طویل نظم کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ جب غزل کی ریزہ خیالی نے ادب کے پورے منظر کو متاثر کر دیا تو طویل نظم جو اس وقت مثنوی نگاری سے موسوم ہوتی تھی پس منظر میں چلی گئی۔ مثنوی کی ہیئت سے ہٹ کر طویل نظم کو پابند صورت میں نظیر اکبر آبادی نے فروغ دیا اور انھیں کامیابی اس لیے زیادہ ہوئی کہ ان کے مخاطب عوام تھے اور ان کے موضوعات روزمرہ کے معمولات حیات

سے منتخب کیے گئے تھے۔ ان نظموں کے تاثر میں اسی سرزمین کی خوشبو اور مزاج رچا بسا تھا۔ اس لیے نظیر اکبر آبادی کو بنجاروں نے تھام لیا ان کے مطابق طویل نظم کے لیے بھی کفایت لفظی اتنی ہی اہم ہے جتنی مختصر نظم کے لیے۔

انور سدید نے صنف انشائیہ کو ہموار سطح پر تخلیق ہونے والی صنف ادب قرار دیا ہے جس میں مصنف گرد و پیش کے مظاہر، مناظر اور اشیا حتیٰ کہ شخصیات اور کرداروں کو بھی اپنے ذاتی داخلی زاویے سے دیکھتا ہے۔ وہ انشائیہ کے ادبی اور فنی تقاضے پورے کرنے کے لیے تخلیقی زبان کو ناگزیر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ لطافت اور شگفتگی بھی اس کی داخلی ضرورت ہے جو موضوع کے انوکھے زاویوں کو قاری پر انداز دگر روشن کر دیتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے اندھیرے میں انشائیہ نے اچانک ایک جگنو چمکا دیا ہے۔ مزید یہ کہ اس نے اردو زبان کو ثروت مند کیا ہے جبکہ اس کے بعض عناصر فکشن اور تنقید کی زبان میں بھی در آئے ہیں۔ اسی طرح وہ غزل کی زبان میں تخلیقی شان پیدا کرنے کو مشکل کام قرار دینے کے باوجود امید رکھتے ہیں کہ یہ مشکل کام کرنے کے لیے نوجوان شعرا آمادہ ہیں اور انھیں غزل میں اعلیٰ شاعری کا مستقبل تابناک نظر آتا ہے کہ جدید اردو غزل کلیشے سے احتراز کرتے ہوئے نئے تلازموں اور استعاروں کی جانب مائل دکھائی دیتی ہے۔

زبان کے بارے میں انور سدید کے خیالات نہایت وقیع ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ زبان کسی قوم کے افراد کے درمیان محض کاروباری لین دین کا وسیلہ نہیں ہوتی، اس کی ساخت کی تعمیر میں اس قوم کی تہذیب کے گہرے اثرات بھی موجود ہوتے ہیں؛ اور زبان کا تجزیہ کیا جائے تو یہ لسانی مشق نہیں اس قوم کے ثقافتی اور تمدنی ارتقا کی تدریج کی داستان بھی سنا سکتی ہے جو وقت کی گردش میں غیر مستعمل ہونے کے باوجود بھی معدوم نہیں ہوتی۔ اس نکتے سے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ زبان کا عمل جامد نہیں اس میں تحرک کا عنصر موجود ہے اور اس خوبی کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ زبان کی وسعت کے امکانات کا دائرہ بھی وسیع ہے اور یہ دائرہ کسی ایک عہد کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتا یہ مختلف خطوں میں انسانوں کی ضرورتوں کے تحت آمد و رفت کی وجہ سے زیرِ تغیر ہوتا رہتا ہے اور یوں بعض رائج لسانی تشکیلات (الفاظ) ماضی کی گرد میں پناہ لے لیتے ہیں بلکہ نئے امکانات کے لیے جنھیں تخلیقی اذہان وجود میں لاتے ہیں جگہ خالی بھی کر دیتے ہیں۔ وہ اس لسانی عمل کو کسی خاص زمانے کے ساتھ مخصوص قرار نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ یہ فطری عمل ہے اور خودرو کی طرح خود بخود تشکیل پاتا رہتا ہے یعنی اگرچہ زبان اور امکانات کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ عمل میکانکی نہیں اور کسی ایک شخص یا گروہ کی منصوبہ بندی یا ارادی کاوش سے ظہور میں نہیں آتا۔

انور سدید افسانے کو زندگی کے تنوع کا مظہر قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس میں جتنے تجربے کیے جائیں گے افسانے کی صنف اتنی ہی ثروت مند ہوگی۔ ان کے خیال میں فکشن کی زبان دو جہتوں پر اپنا سفر طے کرتی ہے۔ ایک جہت راوی یا افسانہ نگار کی ہے جہاں وہ تخلیقی آرائی سے کام لیتا اور ردعمل پاتا ہے، استعارہ سازی کرتا یا منظر نگاری میں اپنا جوہر ظاہر کرتا ہے۔ دوسری جہت پر افسانے کے کردار اور داخلی تقسیم کے تقاضے اپنا ردعمل دکھاتے ہیں جہاں فکشن نگار کرداروں کے داخل اور صورت واقعہ کو توضیح و تشریح میں کرداروں کی اپنی مقامی زبان کو فوقیت دیتا ہے۔ ان کے خیال میں اس رویے سے انحراف بالعموم افسانے یعنی فکشن کو تصنع سے آلودہ کر دیتا ہے۔ مثال دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ غلام الثقلین نقوی کے دیہی کردار وہی بولی بولتے ہیں جو ان کی فطرت کا حصہ ہے اور دوسری طرف ایسے افسانہ نگار بھی ہیں جن کے

جب کردار برٹرینڈ رسل جیسی فلسفہ دانی پر اتر آتے ہیں تو وہ صرف مصنوعی نظر آتے ہیں بلکہ فکشن کی صداقت کو بھی معرضِ خطر میں ڈال دیتے ہیں۔

تنقید کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ اس میں مصنف تفہیم و آگہی اور توضیح و تشریح اور نظریاتی بحث کا فریضہ ادا کرتا ہے جس کے لیے علمی زبان کی معاونت ضروری ہے جبکہ بوجھل علمی زبان تنقید کو بھی گراں بار کر دیتی ہے اور قاری پر اپنا پورا انکشاف نہیں کرتی۔ یہاں وہ وزیر آغا کے والد گرامی آغا وسعت علی خان (وسیع) کو یاد کرتے ہیں جنھوں نے فرمایا کہ مشکل موضوع کو بچوں کی زبان میں لکھنا چاہیے۔ انور سدید کہتے ہیں کہ وزیر آغا نے اس نصیحت کو زندگی بھر پلے باندھے رکھا اور اس پر عمل کیا اور مشکل موضوعات میں آسان زبان کے استعمال سے معجزۂ فن پیدا کیا اور فکری تنقید اور فکری مباحث پر زیادہ کتابیں لکھیں اصنافِ ادب کی تہ داری کو زیادہ بصیرت سے پرکھا اور تحقیق و تنقید کے لیے اظہار کا زمانی اور مکانی اور موضوعی تناظر پھیلا دیا۔ اس سلسلے میں وہ ان کی کتابوں "اردو شاعری کا مزاج"، "تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر میں"، "تخلیقی عمل" اور "تنقید اور جدید اردو تنقید" کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کی کتابیں موضوع کے وسیع تناظر کی آئینہ دار ہیں اور اپنا معیار خود پیش کرتی ہیں جنھیں ان کا مغرب کی معیاری تنقیدی کتابوں سے موازنہ کیا جائے تو یہ اپنے میرٹ پر مقامِ امتیاز حاصل کر لیں گی کہ انھوں نے وزیر آغا کے خیالات کی بازگشت بعض انگریزی مضامین میں بھی دیکھی ہے کیونکہ انھوں نے متعدد نقادوں کے برعکس مطالعے کو جزوِ بدن بنایا اور پھر اپنے ذاتی نتائج اخذ کیے اس لیے ان کے بیشتر کام کو انٹرایکشن کا عمل قرار دیا جاتا ہے کہ وہ مغرب کے ساتھ اپنی شرائط پر مکالمہ کرتے ہیں جبکہ بیشتر ناقدین مغرب کی شرائط کے سامنے سرنگوں نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انور سدید وزیر آغا کی امتزاجی تنقید کے قائل نظر آتے ہیں جس کی ابتدا بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں ہوئی تھی جب بعض تنقیدی کتب کے بارے میں کہا گیا تھا کہ وہ امتزاجی تنقید کی مثالیں ہیں۔

انور سدید کے مطابق ادب بنیادی طور پر وسیع النظری کا تقاضا کرتا ہے اور اختلافِ رائے کی پوری اجازت دیتا ہے کیونکہ اختلاف ہی سے نیا سوال جنم لیتا اور پرانی بات کے نئے زاویے نکالتا ہے جس سے ادب کا مطلع وسیع اور روشن تر ہوتا چلا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے اردو کے ادبی معاشرے میں صحت مند فضا کبھی استوار نہیں ہوئی اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہر شخص صرف اپنے لکھے ہوئے کو مقدس اور متبرک قرار دے رہا ہے اور ان دنوں تنقیدی مضامین میں جو انتہائی غیر مہذب زبان در آئی ہے اس کی وجہ اوسط درجے کے ادیب شاعر یا نقاد ہیں انھوں نے اپنی ذات کو مرکزِ کائنات سمجھ رکھا ہے اور جو آرزومند ہیں کہ پوری دنیا ان کی موہوم اور خود ساختہ عظمت کی قصیدہ خوانی کرتی رہے۔ انور سدید بڑے کرب سے لکھتے ہیں کہ بعض ناکام ادیبوں اور شاعروں نے صرف ذاتی شہرت کشید کرنے کے لیے اپنے رسالے نکال لیے ہیں جن میں غزلیں چھپوانے والے متعدد بے وزن اور ردی خیال شعرا اور مضامین چھپوانے والے نقاد ایڈیٹر کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور وہ منافقت آمیز تحسین سمیٹنے اور اپنی فوقیت کا گنبد تعمیر کرنے میں مصروف ہیں۔ وہ اس رویے کو قابلِ اصلاح سمجھتے تھے مگر انھیں کوئی بات غلط نظر آتی تو ریاکاری کی درستی کے لیے اس کا جواب ضرور تحریر کر دیتے۔ انور سدید کے لیے یہ بہت بڑا المیہ تھا کہ ادب پر دنیاداروں کے قبضہ گروپ نے یورش کر رکھی ہے جو ادب کو بھی سیاسی حربوں کی طرح استعمال کر رہے ہیں۔ ایک ادبی پرچے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے نہایت افسوس سے لکھا کہ:

"اس کے مدیر نے جمیل الدین عالی، ستار، ان خوش حتی، احمد ندیم قاسمی، مشفق خواجہ، مشتاق احمد یوسفی، انتظار حسین، قدرت اللہ شہاب وغیرہ کو ضمیر فروش، بد دیانت، تخیلہ باز، خوشامد سرا اور نہ جانے کیا کیا لکھ دیا لیکن خطوط کے کالم میں ہر لکھاری مدیر کی قصیدہ گوئی میں مصروف ہے اور اب یہ کہنا مناسب ہوگا کہ اس قسم کے عمل کا مرتکب ادیب یا مدیر بالآخر خود اپنی شکست کی آواز بن جاتا ہے اور حشرات کی طرح اندھے منہ میں پڑا کرتا ہے۔"

انور سدید ادب کو بنیادی طور پر عبادت کا عمل قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ادب اپنا انعام آپ ہے۔ اور جو لوگ اس کے وسیلے سے دنیاوی درجات اور شہرت و دام و درم کے خواہاں ہیں، وہ زندگی حقیقت کا سامنا نہیں کر سکتے اور بہت جلد اپنی شکست کی آواز بن جاتے ہیں۔

بڑا ادب تخلیق ہونے کے سلسلے میں انور سدید کا خیال تھا کہ اس کے امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے لیکن زمانی اعتبار سے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ بڑا ادب کب پیدا ہوگا اور اس کی پیدائش کے لیے کوئی وقت معین بھی ہے کہ نہیں۔ انھوں نے یورپ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ وہاں بڑے ادب کا فیصلہ دینے کے لیے کئی ادارے موجود ہیں۔ نوبل ایوارڈ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جبکہ ہمارے ہاں ایسا کوئی ادارہ موجود نہیں جو غیر جانبداری سے یہ رائے دے سکے کہ کس تصنیف کو بڑے ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے ۔۔۔ پاکستان کے سرکاری ادارے یہ فرض دیانت داری سے ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ انور سدید اسے اردو ادب کی بہت بڑی کامیابی سمجھتے تھے کہ ڈاکٹر وزیر آغا نوبل پرائز کی شارٹ لسٹ میں تیسرے نمبر پر آ گئے تھے اور دوسری طرف انتظار حسین فکشن کے بکر پرائز کے امیدواروں کی شارٹ لسٹ میں شامل تھے۔ (اس مضمون کی تیاری میں ڈاکٹر انور سدید کے انٹرویو، مضامین اور خطوط سے استفادہ کیا گیا)

◆◆◆

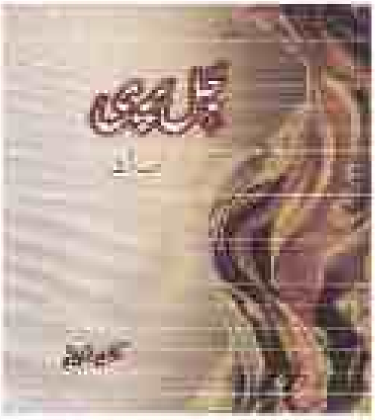

معروف شاعر مسعود عثمانی کا نیا شعری مجموعہ

جَل پری

(غزلیں، نظمیں)

شائع ہو گیا ہے — قیمت -/800 روپے

ملنے کا پتا: ادارہ اسلامیات، 14۔ دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور

(فون نمبر: 0423-7353255, 0423-73243991)

ادب کے اَن تھک خادمِ اعلیٰ، ڈاکٹر انور سدید کی یاد میں

اخلاق عاطف

20 مارچ 2016ء کو قبل از دوپہر الیکٹرانک میڈیا کلب سرگودھا سے ایک ٹی وی چینل کے بیورو چیف میرے دوست اکرم عامر نے ٹیلیفون کال کر کے مجھے ڈاکٹر انور سدید کے انتقال کی پرملال خبر سنائی اور مجھ سے ان کے سوانحی کوائف معلوم کیے۔ ویسے تو ڈاکٹر انور سدید گذشتہ برسوں سے علیل تھے مگر پچھلے کئی مہینوں سے ان کی علالت شدت اختیار کر چکی تھی۔ اردو ادب سے وابستہ ہر شخص کے لیے بلاشبہ یہ افسوسناک خبر تھی۔ یہ خبر سن کر ان سے ملاقاتوں کی کئی ایک یادیں میری سوچ کے البم پر نمایاں ہونے لگی تھیں۔

میں شاعری سے شغف کے ابتدائی دنوں میں سرگودھا کے معروف خطاط و شاعر ظہیر الدین ظہیر کی وساطت سے سرگودھا کی ادبی محافل کا حصہ بنا تھا۔ ظہیر الدین ظہیر ان دنوں محکمہ انہار میں ڈرافٹس مین تھے۔ ان کے گہرے دوست 'محو' نعت کے باکمال شاعر جناب رشک ترابی بھی اسی دفتر میں جاب کرتے تھے۔ جولائی 1976ء کی ایک دوپہر کو میں ان کے دفتر میں موجود تھا کہ عینک اور جناح کیپ سے آراستہ تھری پیس سوٹ میں ملبوس سجا بھاری چہرے اور بھرپور جسامت کا ایک دراز قد شخص افسرانہ لہجے میں دو تین ماتحتوں سے گفتگو کرتے ہوئے رشک ترابی کے قریب آیا اور ان کا حال احوال پوچھنے لگا۔ اس شخص کی افسرانہ نظر مجھ پر پڑی تو رشک ترابی نے میرا تعارف کرواتے ہوئے بتایا "یہ نوجوان شاعر اخلاق عاطف ہیں" افسر شخص نے بے تاثر سی مسکراہٹ کے ساتھ میری جانب دیکھتے ہوئے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی اور آگے چلا گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد رشک صاحب نے مجھے بتایا "یہ تھے ہمارے ایگزیکٹو انجینئر ڈاکٹر انور سدید اردو ادب کے معروف شاعر، محقق اور نقاد۔ اس دفتر میں ہم سبھی لوگ ان کے ماتحت کام کرتے ہیں"

1985ء کے آخر میں ضلع سرگودھا کی نعتیہ تاریخ، نعت گوئی پر مشتمل میری مرتبہ کتاب 'جانِ رحمت' شائع ہوئی تھی۔ جب تک ڈاکٹر انور سدید محکمہ انہار سے ریٹائر ہو کر سرگودھا سے لاہور شفٹ ہو چکے تھے۔ میں نے اس کتاب کے دو نسخے انہیں بھی ارسال کیے تو کوئی دو ڈھائی ماہ کے بعد ان کا ستائشی خط مجھے ملا جس میں ماہنامہ نعت لاہور میں چھپے 'جانِ رحمت' پر ان کے لکھے مختصر تبصرے کی فوٹو کاپی بھی موجود تھی۔

سرگودھا میں ایک عرصہ تک ڈاکٹر وزیر آغا کی رہائش گاہ پر 'شام دوستاں آباد' کے نام سے باہمی ادبی مکالمے کی محفل جمتی رہتی۔ ڈاکٹر انور سدید اس محفل کا جزوِ خاص یوں رہے کہ لاہور شفٹ ہو جانے کے باوجود 96-1995ء تک اس محفل میں شریک ہوتے رہے۔ 'شام دوستاں آباد' میں عام طور پر ڈاکٹر وزیر آغا کی کسی نئی تخلیق یا ادبی تحقیقی نگارش پر گفتگو ضرور ہوتی تھی اور انور سدید اس گفتگو میں سرگرم حصہ لیا کرتے تھے۔ وہ سرگودھا کی دیگر ادبی محافل میں بھی اکثر شرکت کرتے رہے۔ علاوہ ازیں ملکی یا ادبی دورے پر پاک و ہند کے جس شہر میں بھی جاتے وہاں کے اہم لکھاریوں سے ملنا اور خاص ادبی تقریبات میں شامل ہونا ان کے معمولات کا حصہ رہا۔ وہ اول و آخر دانشور تھے اس لیے (گمنام یا مشہور کی تفریق کیے بغیر) اہلِ دانش کے ساتھ بیٹھنا اور ہم کلام ہونا کسی ذہنی تحفظ کے بغیر اپنے لیے

باعث افتخار سمجھتے تھے۔

مارچ 2001ء کا ذکر ہے میں روزنامہ نوائے وقت کے لاہور آفس میں ادبی صفحے کے انچارج اپنے دوست عمران نقوی کے پاس بیٹھا تھا۔ وہ ادبی صفحے کی پروف ریڈنگ کر رہے تھے کہ ایک دفتری اہل کار کے ذریعے انہیں ادارتی شعبے میں طلب کیا گیا۔ پروف ریڈنگ کی ذمے داری مجھے سونپ کر عمران نقوی شعبہ ادارت میں چلے گئے۔ کچھ دیر کے بعد واپس لوٹے تو بولے "اخلاق صاحب تہانوں انور سدید صاحب یاد کردے پئے نیں" یہ سن کر میں نے کہا "ڈاکٹر انور سدید تے میرے بہت مہربان نیں پر ایہہ انور سدید صاحب کون نیں" جواب میں عمران نقوی نے کہا "بھائی جی ایہہ اوہی تہاڈے مہربان نیں پر لاہور وچ ایہناں نوں انور سدید کہیا جاندا اے" پھر میں ادارتی شعبے میں جناب انور سدید کے پاس حاضر ہوا۔ تب تک میری سات کتابیں شائع ہو چکی تھیں اس حوالے سے ڈاکٹر صاحب نے میرے لیے حوصلہ افزائی کی باتیں کرتے ہوئے مجھے تاکید بھی کی کہ میں جب بھی لاہور آؤں تو ان سے ضرور ملا کروں۔

پھر 2008ء کے آخر میں اسلام آباد میں منعقد ہونے والی قومی اہل قلم کانفرنس کے اولین عشائیے پر ان سے ملاقات ہوئی جب تک ان کا توانا لہجہ ان کی کمزور صحت کو چھپائے ہوئے تھا۔ میرے علاوہ محترمہ فرخندہ لودھی اور جناب صابر لودھی نے ان کے ساتھ کافی دیر تک بات چیت کی لیکن میں نے دیکھا کہ محض چند ایک سینئر اہل قلم نے ان سے رسمی علیک سلیک کی تھی جب کہ نوجوان اہل قلم کی اکثریت نے وہاں ان کی موجودگی کو نظر انداز ہی کیے رکھا۔ اردو ادب کے سینئر ترین نقاد سے جونیئر لکھاریوں کا عدم دلچسپی پر مبنی رویہ مجھے انتہائی غیر مناسب لگا تھا۔

مارچ 2012ء کی ایک سہ پہر کو مدیر ماہنامہ تخلیق جناب اظہر جاوید کی رسم چہلم کے اجتماع میں ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ ایک اور ملاقات ہوئی اور یہی ان سے میری آخری بالمشافہ ملاقات تھی جس میں نے محسوس کیا کہ کہن سالی ان پر غلبہ پا چکی تھی۔ جسمانی نقاہت کے باعث ان کی گفتگو کی روایتی روانی اور برجستگی مفقود ہو چکی تھی مختصر مختصر رک رک کر الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ کوئی ایک بات مکمل کر پاتے تھے۔ چہلم کی دعا کے بعد انہوں نے رخصت چاہی تو ان کا ڈرائیور سہارا دے کر انہیں گاڑی تک لے گیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر مجھے ان کی گرتی ہوئی صحت پر تشویش اور اظہر جاوید مرحوم کے ساتھ ان کے گہرے تعلق کا مزید اندازہ بھی ہوا تھا۔

2015ء کے وسط میں ادبی جریدے اسالیب کے مدیر ذوالفقار احسن کی مرتب کتاب "انور سدید کے نوادر افسانے" شائع ہوئی جس میں ادبی سفر کی شروعات کے برسوں میں ڈاکٹر انور سدید کے لکھے وہ افسانے یکجا کیے گئے تھے جو 1940ء سے 1960ء کے درمیان ہندوپاک کے مختلف ادبی پرچوں میں شائع ہو چکے تھے۔ ہر افسانے کے اختتام پر شائع کرنے والے پرچے کا نام مع سن اشاعت درج تھا۔ اس افسانوی انتخاب کی اشاعت سے مجھ پر پہلی بار یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ انور سدید صاحب نے اپنے ادبی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا تھا۔ میں نے بصد شوق یہ کتاب پڑھی تو اس میں شامل ہر افسانے کو درج تاریخوں کے معاصر زمانوں کے معروضی سماجی حقائق سے قریب ترین پا کر اور ڈاکٹر انور سدید کے نگارشی اسلوب کی ندرت سے متاثر ہو کر (جناب انور سدید یا عزیزم ذوالفقار احسن کے تقاضے کے بغیر ہی) از خود اس کتاب پر تبصرہ قلم برداشتہ کر کے ذوالفقار احسن کو بھیجا اور اس کی ایک کاپی جناب انور سدید کو بھی ارسال کی۔ ٹھیک تین دن کے بعد انور سدید صاحب نے مجھے شکریے کا فون کیا اور کہا "اخلاق صاحب! افسانوں کے پلاٹس اور اپنے اسلوب نگارش کے بارے میں آپ کی گرانقدر رائے کا دلی طور پر ممنون ہوں لیکن آپ کی تحریر پڑھ کر مجھے یہ جان کر بے حد سرشاری ہوئی کہ سرگودھا کے میرے

جونیئر لکھاری مجھے آج بھی ستانا چاہتے ہیں' کتنا یاد کرتے ہیں اور میری کاوشوں کو خاص قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں"

جنوری 2016ء کی ایک شام کو پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے "وزیر آغا شناسی اور ڈاکٹر انور سدید" کے نام سے ترتیب دی جا رہی اپنی کتاب کے لیے دو دن کے اندر ایک مضمون لکھنے اور ارسال کرنے کے لیے کہا (ڈاکٹر تبسم کا مزاج یہی ہے کہ جو بھی ادبی کام کرنے کی ٹھان لیں اُسے "تُرت پھُرت" کی طرح آئے بلاتوقف عمل کر کے رہتے ہیں) ڈاکٹر انور سدید کے حوالے سے ان کی زندگی (فروری 2016ء) میں شائع ہونے والی یہ آخری کتاب تھی جو ان تک پہنچی انہوں نے پڑھی اور اپنی وفات سے بارہ دن قبل انور سدید صاحب نے اس کتاب میں شامل میرے مضمون کے مندرجات کے بارے اپنی پسندیدگی سے مجھے موبائل کال کر کے آگاہ کیا تھا۔ اس مہربان توجہ پر میں ہمیشہ ان کا ممنون رہوں گا۔ مختصر کرو چند واقعات بیان کرنے میں نے اس لیے ضروری سمجھے ہیں کہ ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں پھیلائے جانے والے اس غلط تاثر کی نفی ہو سکے کہ وہ جونیئر لکھاریوں کے بارے میں نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے' ان کی عمدہ کاوشوں کی تحسین کے ضمن میں بخیل تھے یا ان سے میل جول رکھنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

کہا جاتا ہے' ڈاکٹر انور سدید نے ڈاکٹر وزیر آغا کے تحریک دلانے پر نہ صرف ایم اے اردو کیا بلکہ پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی اس اعزاز کے ساتھ حاصل کی کہ ان کو پی ایچ ڈی کے تحریری مقالے 'اردو ادب کی تحریکیں' پر پہلے اردو طلائی تمغے سے نوازا گیا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید کا مذکورہ تحقیقی مقالہ بلاشبہ ایک بڑا ادبی کارنامہ تھا جسے اردو ادب میں تہلکہ خیز شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی تھی۔ انور سدید کی پی ایچ ڈی کے ضمن میں نگران یا استاد کے طور پر ڈاکٹر وزیر آغا کا ذکر کرنے والے ناقدین تو جانے کیوں اس خوشگوار ربط کے بین السطور بھی اس حقیقت کا آج تک ادراک و اعتراف نہ کر سکے کہ وزیر آغا کی مردم شناس ادبی نگاہ نے انور سدید میں چھپے ایک ذہین ادبی نقاد کو قبل از وقت پہچان کر نقد و نظر کے اس راستے پر ڈال دیا تھا کہ جس کے ہر موڑ پر ہی کامیابیاں انور سدید کی منتظر تھیں۔ اس بارے میں دو آراء ہو ہی نہیں سکتیں کہ اپنے ادبی سفر کی ابتدا سے ہی انور سدید فکری و قلبی طور پر ڈاکٹر وزیر آغا کے بہت قریب تھے۔ مگر شاید اردو ادب کی تحریکیں' کو ملنے والی شہرت و پذیرائی سے انور سدید' ڈاکٹر وزیر آغا کی معنویت کے سحر میں تاحیات یوں مبتلا رہے کہ تادم آخر وزیر آغا شناسی کو بڑھاوا دیتے رہے' اس ادبی حق کے بنا پر انہیں وزیر آغا شناسی کا سب سے بڑا محرک قرار دینا بے جا یا غلط بھی نہ ہوگا۔

فکر و عمل کی مطابقت دو سگے بھائیوں میں بھی نہیں ہوا کرتی لیکن جناب احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کی صحبت کے درجنوں مواقع میسر آنے کے بنا پر میں کہہ سکتا ہوں ان محترم شخصیات کے عمومی رویے انسان دوستی اور ادب پروری کے مظہر تھے' ترقی پسندی اور کم مایہ لوگوں (بالخصوص اہل قلم) کی خیر خواہی کا عملی جذبہ دونوں کے ہاں نمایاں تھا۔ ادب کی کئی نثری و منظوم جہتوں کو انہوں نے اپنے فکر و فن سے سرفراز کیا' لیکن احمد ندیم قاسمی کی بنیادی پہچان شاعری اور افسانہ نگاری رہی جب کہ وزیر آغا کی اصل شناخت تنقید اور انشائیہ نگاری تھی۔

گذشتہ ساٹھ برسوں کے دوران پاکستان کا کون سا ایسا اردو اخبار ہوگا جس کے لیے ڈاکٹر انور سدید نے ادبی کالم اور کتابوں پر تبصرے نہیں لکھے' پاک و ہند کے ادبی جرائد میں خال ہی کوئی ایسا جریدہ ہوگا جس میں ان کے فنی فکری ادبی جائزے اور مضامین شائع نہ ہوئے ہوں۔ ان کی کئی کاوشوں نے 'ڈاکٹر زکلا ایوارڈ' 'نقوش ایوارڈ' 'اکادمی ادبیات ہجرہ ایوارڈ' حاصل کیے' آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی APNS کی جانب سے ملنے والا بہترین کالم نگار کا ایوارڈ اور حکومت پاکستان کا عطا کردہ صدارتی اعزاز 'تمغۂ امتیاز' لگن اور محنت سے کی ان کی شاندار ادبی کارکردگی کے قومی اعتراف کی ترجمانی کرتے ہیں۔

سیکڑوں اخباری کالموں اور ہزاروں تبصرہ جات کے علاوہ مختلف ادبی موضوعات پر شائع ہوچکیں۔ یہ سبھی کتابیں ڈاکٹر انور سدید کی ذاتی زرخیزی، فکری جولانی اور قلمی روانی کے منہ بولتے ثبوت ہیں۔ ڈاک وہ بعد سے شائع ہونے والا ہر ادبی پرچہ اور کتاب ان کے مطالعے سے گزرتی تھی اور ہر موصولہ کتاب پر وہ تبصرہ بھی لکھتے تھے۔ کاغذ قلم اور کتاب ان کی زندگی کے اٹوٹ انگ تھے۔ وہ زود نویس ہونے کے باوصف الفاظ کے مناسب دروبست سے آراستہ خوب صورت نثر لکھنے پر دسترس رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت لکھا، خوب لکھا اور بے تکان لکھا۔ برسوں پر محیط بیماری اور نقاہت اور آخری چند ماہ کی شدید علالت بھی ان کے ذہن کو سوچنے اور قلم کو لکھنے سے روک نہیں پائی۔ ایسی فکری سرفرازی شاید ہی کسی اور لکھاری کو نصیب ہوئی ہو کہ وفات سے ہفتہ بھر پہلے شائع ہونے والے ماہنامہ تخلیق میں ان کے نوشتہ تین مضامین ایک ادبی جائزہ اور سات کتابوں پر تبصرے شامل تھے۔ مزید یہ کہ ان کی وفات کے دن بھی روزنامہ نوائے وقت کے سنڈے میگزین میں ان کا کالم حسب معمول شائع ہوا تھا۔

ڈاکٹر انور سدید محکمہ انہار میں ایک کلرک کے طور پر بھرتی ہوئے، مزید حصول علم اور دیانت داری کے اوصاف کے بنا پر ترقی کرتے ہوئے ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے تک پہنچے اور اسی عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ یہ وصف تاحیات ان کا طرۂ امتیاز رہا کہ خدا امین فضل ربی کے بھرپور مواقع میسر ہونے کے باوجود رزق حلال پر قانع رہے، خود کو یا اپنی اولاد کو لقمۂ حرام نہیں کھلایا۔ لالچ اور بددیانتی کی قباحت سے دور رہ کر سچی درویشانہ زندگی گزاری۔ سرگودھا میں رہے یا لاہور میں، واجبی سے مسکن میں گزر بسر کی۔ اپنے فکری تحفظات کے تحت لکھتے لکھاتے کے باوجود انہوں نے قلم کی حرمت پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔ ضلع سرگودھا کے ایک چھوٹے سے قصبہ میانی میں جنم لینے والے انوار الدین کو تو تحقیق کے چند لوگ ہی جانتے ہوں گے لیکن اردو ادب کو رنگا رنگ قلمی پھولوں سے سجانے اور اپنی فکری خوشبو سے مہکانے والے ڈاکٹر انور سدید کو ایک زمانہ جانتا ہے اور کئی زمانے ان کا ذکر کرتے رہیں گے۔ ڈاکٹر انور سدید کی کاوشیں بلاشبہ اردو ادب کا گراں بہا سرمایہ ہیں جو حال و مستقبل کے تشنگان ادب کو سیرابی عطا کرتی رہیں گی۔ آفریں صد آفریں ان کی بھرپور اور مسلسل ادبی خدمات پر اور دعا کہ صد ہزار دعائیں ان کی روح کے سکون اور درجات کی بلندی کے لیے۔

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2015 تک

ماہنامہ "تخلیق" اب تک چار "تخلیق ایوارڈ" دے چکا ہے

1	2012ء	جناب شفیع عقیل صاحب	(کراچی)	021-34816655
2	2013ء	جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب	(لاہور)	0334-9719278
3	2014ء	محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ	(لاہور)	0333-4221870
4	2015ء	محترمہ قمر جہاں صاحبہ	(امریکہ)	001-3109870978

ڈاکٹر انور سدید — یادیں اور باتیں

مظفر حسن منصور

ڈاکٹر انور سدید والد گرامی جناب جوہر نظامی مرحوم کے خاص دوستوں اور کرم فرماؤں میں سے تھے۔ بزمِ ادب سرگودھا کے بانی اراکین میں شامل تھے۔ والد گرامی نے کمپنی باغ سرگودھا میں ماہانہ اردو مشاعروں کی بنیاد رکھی۔ ان دنوں مشاعرے ہی اردو زبان کی مقبولیت کا باعث تھے۔ اردو نظموں اور مشاعروں ہی کی بدولت اس خطے میں اردو زبان نے رابطے کا کردار استوار کیا۔ انور سدید سرگودھا کی ادبی سرگرمیوں سے جڑے ہوئے تھے۔ سرگودھا میں پاکستان بننے سے پہلے اس وقت کے نمایاں ادیبوں اور شاعروں میں الطاف مشہدی، جوہر نظامی، انور گوندلی، مرزا احمد منور اور انور سدید شمار کیے جا سکتے ہیں۔ تقسیم ہند کے بعد مشرقی پنجاب سے ہجرت کر کے آنے والے جن ادیبوں اور شاعروں نے سرگودھا شہر کو رونق بخشی ان میں محمد حسین شوق، اظہر سرحدی، تنجر بریلوی، مرزا معمول انور، اشک ترابی، میر عبدالرشید اشک خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے معاشیات کرنے کے بعد پچاس کی دہائی میں سرگودھا کی ادبی فضا میں ایک تازہ جھونکے کی طرح وارد ہوئے۔ سرگودھا کے اس ادبی پس منظر میں جس میں اردو غزل ہی شاعروں کا اوڑھنا بچھونا تھی ڈاکٹر انور سدید کی تخلیقی سرگرمیوں اور ادبی نشوونما کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ یہ میرے لڑکپن کی بات ہے جب سرگودھا کے ادیبوں نے والد گرامی جناب جوہر نظامی کی بطور شاعر سلور جوبلی کا اہتمام کیا۔ اس تقریب میں سید عبدالحمید عدم خصوصیت کے ساتھ شریک ہوئے اور صدارت بھی فرمائی۔ اس سلور جوبلی کے حوالے سے میر عبدالرشید اشک نے ہفت روزہ ''شعلہ'' جس کے وہ مدیر بھی تھے کا خصوصی ''جوہر نظامی نمبر'' شائع کیا جس کے صفحۂ اول پر دبستان سرگودھا کی ایک یادگار تصویر شائع ہوئی جس میں اظہر سرحدی، جوہر نظامی اور محمد حسین شوق کرسیوں پر براجمان تھے اور ایستادہ میں انور سدید، انور گوندلی، میر عبدالرشید اشک اور تنجر بریلوی جلوہ گر تھے۔ اس تصویر کے ذریعے میں نے پہلی مرتبہ انور سدید کو دیکھا اور پہچانا۔ انور سدید گھنگریالے بالوں کے ساتھ وجیہہ اور قد آور دکھائی دیے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ والد گرامی اپنے ذوق کی تسکین کے لیے ہر ماہ دو رسالے خصوصیت کے ساتھ خریدتے۔ ایک ''بیسویں صدی'' دہلی جس کے مدیر خوشتر گرامی تھے اور دوسرا رسالہ ''شمع'' دہلی تھا۔ اس زمانے میں انور سدید کے افسانے ان رسالوں میں چھپتے تھے۔ بطور شاعر ان کی پہچان ابھی آئی نہ تھی۔ پاکستان جس سال بنا میں اس سال پرائمری کے درجہ اول میں داخل ہوا تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انور سدید کے ادبی سفر کا آغاز میرے سفرِ عشق سے پہلے ہو چکا تھا ع کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

والد گرامی کی محکمہ ڈویلپمنٹ اتھارٹی میں ملازمت کے باعث ہم 1955ء میں بھاری دل کے ساتھ سرگودھا سے جوہر آباد منتقل ہوئے۔ ایک مدت تک ہمیں سرگودھا یاد آتا رہا۔ جوہر آباد عروس البلاد کی اپنی ایک کشش تھی۔ عباس احمد عباسی، ڈاکٹر احمد شکیب جلالی، الطاف پرواز، قیصر بارہوی نے ہمارے ذوق کی اس طرح آبیاری کی کہ سرگودھا کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔

انور سدید کا پہلا افسانہ ''چترا'' میں چھپا تھا۔ وہ پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھے۔ محکمہ انہار پنجاب میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔

دفتری امور میں مہارت رکھتے تھے۔ محکمہ میں ان کی reputation بہت اچھی تھی۔ لیکن وہاں محمد انوارالدین کو انور سدید کے قلمی نام سے شاید ہی کوئی پہچانتا ہو۔ انور سدید نے ڈاکٹر وزیر آغا کی سرپرستی میں تحقیق کے میدان میں قدم رکھا اور تنقید کی طرف مائل ہوئے۔ صنفِ انشائیہ پر ان کی کتاب "انشائیہ اردو ادب میں" شائع ہوئی تو پورے جمہور کو انداز دیتے ہوئے انہوں نے یہ انکشاف کیا کہ انشائیہ اپنی موجودہ صورت میں 1956ء کے لگ بھگ منظرِ عام پر آیا اور اسے بطور ایک تحریک ڈاکٹر وزیر آغا نے پروان چڑھایا۔ انور سدید خود ایک اچھے انشائیہ نگار تھے۔ مطالعے کا بہت شوق تھا۔ اخباروں اور رسالوں میں نئی کتابوں پر تبصرے لکھنے میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ ادبی رسالوں کا سالانہ جائزہ ان کی اختراع تھا۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے گھر واقع سول لائنز (ریلوے روڈ) سرگودھا اکثر شام کو احباب جمع ہوتے۔ ان میں انور سدید، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، سجاد نقوی، عصمت ملیک، جمیل یوسف، خورشید رضوی اور محمد افضل ملک بطور خاص شریک ہوتے لیکن وزیر آغا سے حقیقی کسبِ فیض اگر کسی نے کیا تو وہ انور سدید ہی تھے۔ وہ بنیادی طور پر ایک نقاد تھے ان کا مقالہ "اردو ادب کی تحریکیں" ان کی محنت اور دیانت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ان کی ایک کتاب جس نے اردو ادب کے طالب علموں کو اپنی طرف متوجہ کیا وہ "اردو ادب کی مختصر تاریخ" ہے۔ ان کی شاعری کا ذخیرہ ایک جداگانہ شان کا حامل ہے۔ اس کے مرتبے کا تعین ابھی باقی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے ان کی شاعری کی جڑیں روایت میں ہیں لیکن انہوں نے تخیل کے نئے پھول کھلانے میں خونِ جگر صرف کیا ہے۔ جدت اور روایت کے امتزاج میں ہی ان کے کلام کا سارا حسن پوشیدہ ہے۔ تخلیقی عمل سے گزرنے والا فنکار غیر شعوری طور پر تنقید کی تربیت بھی حاصل کرتا ہے وہ اپنے فن پارے کو آخری شکل دینے تک اسے ناقدانہ شعور کی چھلنی سے گزار کر خوبصورتی اور تابناکی کا لبادہ پہناتا ہے۔ انور سدید نے آغاز میں افسانے لکھے اور شعر بھی کہے چنانچہ تنقید کی طرف ان کی رغبت اور میلان پہلے سے موجود تھا جس کو نکھارنے میں ڈاکٹر وزیر آغا کو دقت محسوس نہیں ہوئی ہوگی۔

انور سدید نے اپنی تحریروں میں کما حقہ ادب کے ہر گوشے کا احاطہ کیا اور اپنی قابلیت کا لوہا منوایا۔ لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی رہنمائی اور فیضان کی بدولت آج اردو ادب میں انور سدید ایک بڑا نام ہے۔ آج اگر غالب اور ان کے شاگرد زندہ کیے جائیں تو غالب اپنے شاگردوں کے ادبی کام کے حوالے سے خواجہ الطاف حسین حالی کے کام سے زیادہ خوش بھی ہوں گے اور اس پر فخر بھی کریں گے۔ خواجہ الطاف حسین حالی نے غالب کے بعد ادب میں جو نئی راہیں تلاش کیں اور اردو ادب کے کینوس کو وسیع کیا اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے اگرچہ اچھے شاگرد تو پیدا نہیں کیے لیکن میرا خیال ہے اگر آج وہ انور سدید کے ادبی کام کے وسیع تناظر اور لوگوں کی خوش گمانی آرا کسی طرح سن سکیں تو یقیناً فخر سے کہیں گے کہ آخر شاگرد کس کا ہے!

◆◆◆

"ڈاکٹر انور سدید کے انتقال سے ملک اردو ادب کے بڑے ادیب اور نقاد سے محروم ہو گیا۔ مرحوم کی اردو ادب کے فروغ کے لئے خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔" (نواز شریف ...... وزیر اعظم پاکستان)

آہ! ڈاکٹر انور سدید

(ایک شجر سایہ دار جو نہ رہا)

اشرف ذکی

میں گورنمنٹ کالج سرگودھا میں زیرِ تعلیم تھا تو سرگودھا میں انتہائی خوبصورت ادبی ماحول استوار تھا۔ رب کریم نے ادبی ذوق عطا فرمایا تھا لہٰذا ادبی سرگرمیوں میں بھرپور شرکت رہتی تھی۔ انہی ایام میں، اظہر جاوید، سید اختر امام رضوی، جناب عصمت ملیح، شکیب جلالی اور چند دیگر دوستوں کے ساتھ جناب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب سے ملاقات کا سلسلہ بنتا تھا۔ انہی ملاقاتوں میں دو بار ڈاکٹر انور سدید صاحب سے بھی شرفِ ملاقات حاصل ہوا اور پوری زندگی میں صرف دو ملاقاتیں ہوئیں جو میں آج تک بھلا نہیں سکا۔ کالج اور پھر یونیورسٹی کی تعلیم سے فراغت کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔ مصروفیات کے گورکھ دھندوں میں الجھ کر آپ سے دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل نہ ہوا۔ لیکن معروف مواصلاتی رابطوں کا سلسلہ برقرار رہا۔

20 مارچ کو لاہور والے پی۔ ٹی۔ سی۔ ایل نمبر پر فون کیا تو کسی خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر صاحب تو وفات پا گئے ہیں۔ مزید کچھ کہنے سننے کی ہمت نہ رہی بے اختیار آنکھوں کی جھڑی لگ گئی۔ بیماری کے دوران میں ان کی طبیعت جاننے کیلئے فون پر رابطہ رکھتا تھا۔ یہ اطلاع ملنے پر دل اسے قبول نہیں کر پا رہا تھا۔ تصدیق کیلئے بے اختیار محترم سلطان اظہر جاوید (مدیر ماہنامہ "تخلیق") سے فون پر رابطہ کیا۔ انہوں نے بتایا کہ جنازہ سے واپس آ رہا ہوں۔ یہ سنتے ہی آنسوؤں اور سسکیوں میں اضافہ ہو گیا۔ رابطہ منقطع کیا اور ڈھیروں آنسو تھے۔ میں ان کی علالت کے دوران خصوصاً اپریل 2015ء سے مسلسل ہر روز دو رکعت نماز نفل ان کی سلامتی اور صحت کیلئے ادا کر رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے کوئی انتہائی قریبی عزیز اس عالمِ فانی سے کوچ کر گئے ہیں۔ تا دمِ تحریر یہ کیفیت برقرار ہے۔ گزشتہ شب میرے محترم بزرگ جناب مقبول احمد صاحب (مقبول اکیڈمی) نے فون کیا اور استفسار کیا کہ سلطان اظہر جاوید "تخلیق" کا آئندہ شمارہ جناب ڈاکٹر انور سدید کے نام کر رہے ہیں۔ تم نے کچھ بھیجا ہے؟ میں نے بتایا کہ میں نے تو ان دنوں کچھ بھی نہیں کہا، کچھ نہیں لکھا۔ ایک غم کی عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہوں۔ انہوں نے زور دیا کہ ضرور کچھ لکھنا چاہیے۔ سوچا کہ ان کا حکم بجا لانا چاہئے۔ حکم کی بجا آوری بھی ہو گی اور شاید غم بھی کچھ ہلکا ہو۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ میری ڈاکٹر صاحب سے بالمشافہ صرف دو ملاقاتیں ہوئیں۔ ان کے متعلق میری معلومات ان کی ذات پہ لکھے گئے مضامین، ان سے خط و کتابت، اور کچھ فون رابطوں پر مشتمل ہیں۔ میں ان کے متعلق گہرے رابطوں کا دعوے دار نہیں۔ لیکن میں شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ وہ شجر جو تناور بھی تھا اور انتہائی گھنے اور خوشگوار سایہ کا حامل بھی اب ہم اس کے سکون آور سایہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ نصف صدی سے مجھ جیسے معمولی لکھاری سے لے کر اس عرصہ کے کئی عظیم اور نامور لکھاریوں تک نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں ان سے راہنمائی حاصل کی۔ وہ ادب کا ایسا عظیم نام ہے جو اردو ادب کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہے گا۔

آپ قصبہ میانی تحصیل بھلوال ضلع سرگودھا میں 4 دسمبر 1928ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کا تعلق ایک معزز راجپوت گھرانے سے تھا جو تقسیم ہند سے قبل سری نگر میں رہائش پذیر تھا اور ہجرت کر کے ضلع سرگودھا میں رہائش اختیار کی۔ آپ نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ سکول سرگودھا بعد ازاں گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان سے ورنیکلر فائنل کا امتحان اعزازی حیثیت میں پاس کیا۔ میٹرک 1944ء میں گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے (اردو) فرسٹ کلاس فرسٹ میں پاس کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر سید عبداللہ کی نگرانی اور رہنمائی میں "اردو ادب کی تحریکیں" کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی۔ علاوہ ازیں گورنمنٹ انجینئرنگ سکول منڈی بہاؤالدین سے سول انجینئر کا ڈپلومہ حاصل کیا اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ بعد ازیں انسٹیٹیوٹ آف انجینئرنگ ڈھاکہ سے سول انجینئرنگ میں ڈگری حاصل کی۔ آپ نے محکمہ آبپاشی میں گورنمنٹ کی ملازمت کی اور ایگزیکٹو انجینئر کی حیثیت سے اسی محکمہ سے ریٹائرمنٹ لی۔ لیکن آپ نے دوران ملازمت اور بعد از ملازمت ادب کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ اردو ادب میں آپ کی خدمات قابل فراموش ہیں۔ مختلف اصناف میں آپ کی تحاریر سند کی حیثیت کی حامل ہیں۔ اور تا ابد امر رہیں گی۔ ان گنت دیگر مصنفین، مؤلفین، شعرا، سوانح عمریوں اور سیاحت وغیرہ پر تحریر کردہ تنقیدی آرا سند کی حیثیت رکھتی ہیں۔ آپ کی آرا ہمیشہ بے لوث رہیں لیکن حوصلہ بڑھانے اور رہنمائی کا انداز لئے ہوئے۔ انہوں نے بہت سے اعزازات حاصل کئے جن میں سے چند ایک کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ یونیورسٹی گولڈ میڈل، "اقبال کے کلاسیکی نقوش" رائٹرز گلڈ، داؤد ادبی ایوارڈ، بہترین کالم نگاری پر A.P.N.S ایوارڈ، "اردو ادب میں حج ناموں کی روایت" پر تحریر کردہ مقالے پر نقوش ایوارڈ، "اردو ادب کی تحریکیں" پر اکادمی ادبیات پاکستان کا تمغہ ایوارڈ، 2008ء میں صدارتی تمغہ امتیاز فن۔ ڈاکٹر انور سدید ڈاکٹر وزیر آغا سے انتہائی حد تک متاثر تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کو پرستش کی حد تک چاہتے تھے تو یہ مبالغہ نہیں ہو گا۔ انہوں نے جتنا کچھ ڈاکٹر وزیر آغا پر لکھا اگر اسے یکجا کیا جائے تو کئی ضخیم کتابیں وجود میں آ سکیں۔ آپ ہفت روزہ "ندا"، روزنامہ "مشرق"، روزنامہ "جسارت"، روزنامہ "خبریں"، روزنامہ "نوائے وقت" میں 1999ء سے رحلت تک کالم اور کتب پر تبصرہ تحریر کرتے رہے۔ مختلف اوقات میں غیر ممالک کی ادبی تقریبات میں شرکت کرتے رہے اور اپنے ملک و قوم اور اردو ادب کی انتہائی موثر کن انداز میں نمائندگی کی۔ مختلف یونیورسٹیوں میں ان کی نگارشات پر تحقیقی مقالہ جات لکھے جاتے رہے۔ ان کی نگارشات نے انہیں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل ضرور ہوئے ہیں لیکن دلوں میں مقیم ہیں۔ انشاءاللہ وہ رب کریم کی جوار رحمت میں ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

آپ کی رحلت سے پیدا ہونے والا خلا صدیوں پُر نہیں ہو سکے گا۔

◆◆◆

وقت ظالم ہے

رستے ناسور پہ رکھتا نہیں مرہم لیکن — وقت ظالم ہے، نئے زخم لگا دیتا ہے
حاکم وقت ہے تحسین پسندی کا شکار — مجھ سے خوددار کو محفل سے اٹھا دیتا ہے

(ڈاکٹر انور سدید)

مینارۂ علم و ادب......ڈاکٹر انور سدید

ملک مقبول احمد

قانونِ قدرت ہے کہ دنیا کی کوئی شے باقی نہیں رہے گی سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یعنی ہر جاندار و بے جان مخلوقات میں سب نے فنا ہونا ہے۔

علم کی روشنی پھیلا کر جہالت کے اندھیرے سے دور کرنے والے دنیائے علم و ادب کے سرخیل پاکستان کے صفِ اول کے بلند پایہ ادیب، نقاد، محقق، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، دانش ور ڈاکٹر انور سدید بھی 87¼ سال کی عمر میں 20 مارچ 2016ء کو اس دنیائے فانی کو چھوڑ کر عالمِ بقا کی طرف روانہ ہو گئے اور اپنے عزیز و اقارب سمیت ہزاروں احباب اور شاگردانِ رشید کو سوگوار چھوڑ گئے۔

وہ دنیائے علم و ادب اور صحافت کا بہت بڑا اثاثہ تھے۔ ان کی وفات ادبی دنیا کا عظیم سانحہ ہے۔ ان کی وفات سے جو علمی ادبی خلاء پیدا ہوا ہے، شاید برسوں تک پر نہ ہو سکے۔ 20 مارچ شام 5 بجے انہیں ان کے آبائی شہر سرگودھا میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔ اگرچہ انہوں نے اپنی عمرِ عزیز کا زیادہ تر حصہ لاہور میں ہی بسر کیا۔ لاہور سے ان کے جنازے میں اس ہیچ ملک مقبول احمد کے علاوہ محترم سعید بدر، پروفیسر شفیق کھوکھر، ڈاکٹر ارشد مقبول، محترم سرفراز سید اور محترم سلمان اظہر جاوید صاحب شریک ہوئے۔ بے شمار عقیدت مندوں میں محترم سلیم آغا قزلباش اور محترم ڈاکٹر سکندر حیات میکن بھی شریکِ غم تھے۔

ان کی وفات پر سعید آسی، ڈاکٹر تنویر حسین، خالد یزدانی، ناصر نقوی، ڈاکٹر زاہد منیر عامر، ابن عاصی، ساجد یزدانی، عبدالستار عاصم، مظفر علی رانجھا، ڈاکٹر ظہیر احمد بابر اور سرفراز سید ایسے متعدد اہلِ قلم نے انہیں اعلیٰ ترین الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر ظہیر احمد بابر نے انہیں ادبی تنقید کا سکندر کہا ہے۔ فاتحِ عالم سکندر تو 10 سال کی مدت میں نصف دنیا کی فتوحات کے بعد محض 33 سال کی عمر میں راہیِ ملکِ عدم ہو جاتا ہے لیکن ڈاکٹر انور سدید ادب کے وہ سکندر ہیں جنہوں نے گزشتہ نصف صدی میں ادب کی مختلف اصناف میں تحقیق و تنقید کے گل ہائے رنگ رنگ کھلائے اور ان کی تقریباً 88 تصنیفات و تالیفات اہلِ ادب سے خراجِ تحسین وصول کر رہی ہیں۔ (نوائے وقت)

محترم سرفراز سید نے لکھا ہے: "ڈاکٹر انور سدید جیسا باکمال شخص بھی چلا گیا۔ محمود شیرانی، ڈاکٹر محمد شفیع، ڈاکٹر سید عبداللہ، مولوی عبدالحق، مشفق خواجہ، ڈاکٹر وحید قریشی اور اس مرتبہ کے علم و ادب کے دوسرے بلند پایہ روشن میناروں کی روایات کو زندہ رکھنے بلکہ آگے بڑھانے والے بے حد و حساب وسیع مطالعہ والے باتمیز، باعلم اور حیرت انگیز یادداشتوں کے ساتھ منفرد اور نہایت عمدہ تحریر والے ڈاکٹر انور سدید کے انتقال سے حقیقی معنوں میں بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔" (اوصاف)

ڈاکٹر زاہد منیر عامر صاحب نے لکھا ہے کہ "ڈاکٹر انور سدید ایک شخص نہیں، ایک ادارے کا نام تھا۔ اردو زبان کا شاید ہی کوئی رسالہ ہو جس میں ان کی تحریر شائع نہ ہوئی ہو۔ وہ صرف اپنے لکھنے ہی میں منہمک نہیں تھے بلکہ ان کا ایک وصف نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی بھی تھا۔" سرگودھا جاتے ہوئے راقم نے محترم مظفر علی رانجھا صاحب کو فون پر ڈاکٹر انور سدید کے انتقال کی خبر سنائی تو "انہوں نے گلوگیر

لکھتے میں کہا کہ کاش ایک گھنٹہ پہلے مجھے یہ اطلاع مل جاتی تو میں اس ادبی محسن کا آخری دیدار کر پاتا۔ راجا صاحب نے گہرے دکھ کا اظہار کیا اور کہا کہ ڈاکٹر انور سدید صاحب نے علم و ادب اور فروغ کتب میں حیرت انگیز کردار ادا کیا ہے۔ ع ''آئے گا کون اور اب انور سدید ایسا''۔ علامہ عبدالستار عاصم نے کہا کہ 20 مارچ 2016ء کو علم و ادب کا آفتاب غروب ہو گیا لیکن ڈاکٹر انور سدید کے علمی و ادبی کارنامے جب تک اردو زبان زندہ ہے، اس وقت تک زندہ جاوید رہیں گے۔ حقیقت ہے کہ یہ علمی ادبی کارنامہ تاریخ میں ہمیشہ سفر کرتا ہے۔ یہی تو ادب کی پہچان ہے۔ محترم ناصر نقوی نے لکھا ہے "بابائے ادب ڈاکٹر انور سدید علمی و تحقیقی کتابوں کے حوالے سے انتہائی مستند نام ہے ان کا کام اور انداز عصر حاضر میں کسی کے پاس ہے نہ ہی ایسا جذبہ اور مستقل مزاجی کسی کے حصے میں آئی ہے۔ برسوں کی ریاضت میں دنیائے ادب میں نام پیدا کرنے والی اس شخصیت نے ایسے نقوش چھوڑے ہیں کہ اردو ادب اور دنیائے ادب بھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ درویشی اور عاجزی کے قد آور ادیب، شاعر اور نقاد ڈاکٹر انور سدید نے اپنی 87 سالہ زندگی کتابوں کے درمیان گزاری بلکہ ان کا اوڑھنا بچھونا ہی کتابیں تھیں۔ خدا مغفرت کرے اس باکمال میدان ادب کے شہسوار کی یقیناً اہل علم و ادب انہیں یاد رکھیں گے اور ان کی تحریریں، کتابیں اردو ادب میں طبع آزمائی کرنے والوں کی رہنمائی کریں گی۔" (الشرق)

ڈاکٹر انور سدید سے میں اس وقت سے غائبانہ طور پر واقف ہوں، جب ان کے افسانے رسالہ ''بیسویں صدی'' میں چھپتے تھے۔ میں نے اپنا رسالہ "چودھویں صدی" لاہور سے جاری کیا تو انہیں لکھنے کی دعوت دینے کے لئے تلاش کیا، لیکن معلوم ہوا کہ وہ محکمہ نہر پنجاب میں میانوالی کے صحراؤں میں انجینئر تک کی خدمات انجام دے رہے ہیں اور افسانے سے ان کی دلچسپی کم ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے 1966ء میں "اوراق" جاری کیا تو ڈاکٹر انور سدید نقاد کی حیثیت میں نمودار ہوئے۔ لیکن اس وقت بھی وہ لاہور سے دور کہیں محکمہ آب پاشی میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ میری ان سے پہلی ملاقات "تخلیق" کے مدیر جناب اظہر جاوید نے کرائی۔ اظہر صاحب ڈاکٹر انور سدید کا بھارت کا سفرنامہ "دلی دور نہیں" "تخلیق" میں قسط وار چھاپ رہے تھے۔ اچانک ایک دن انہیں خیال آیا کہ یہ سفرنامہ کتاب کی صورت میں پیش کیا جانا چاہئے، چنانچہ وہ انور سدید صاحب کو اپنے ساتھ مقبول اکیڈمی لے آئے اور آتے ہی "دلی دور نہیں" کا مسودہ میز پر رکھتے ہوئے کہا "ملک صاحب! یہ کتاب اپنے ادارے سے چھاپ دیجئے۔" اظہر جاوید ایسے دوست تھے جن کے ذوق پر میں ہمیشہ انحصار کرتا تھا اور ان کے حکم کی تعمیل میں کبھی تاخیر نہیں کی تھی۔ میں نے ان سے مسودہ لے کر کاتب کو آواز دی کہ سب کام چھوڑ کر پہلے اس مسودے کی کتابت کرے۔

ڈاکٹر انور سدید سے یہ ملاقات مختصر نہیں تھی، بلکہ اتنی طویل تھی کہ کئی برسوں پر پھیل گئی اور ان کے آخری دم تک جاری رہی۔ اس دوران میں نے ان کی متعدد کتابیں ''برسبیل تنقید''، ''میر انیس کی قلمرو''، ''زندہ لوگ''، ''دلاور فگاریاں''، ''اردو نثر کے آفاق''، ''شاعر کا دیار''، ''غلطوں کے آئینے میں''، ''ادب در ادب''، ''یہ دہ سفر میں''، ''ایک صدی کے افسانے''، ''اردو ناول کے رنگ''، ''غزل کے رنگ''، ''آپ بیتی کے رنگ''، ''جدید نظم کے ارباب اربعہ''، ''آسمان میں پتنگیں''، ''بیسویں صدی کی اردو شاعری''، ''فریب کار''، ''دلی دور نہیں''، ''مختصر اردو افسانہ عہد بہ عہد''، ''برسبیل گفتگو'' وغیرہ شائع کیں اور ان سے محبت کا تعلق ایسا بڑھا کہ درمیان سے من و تو کا رشتہ بے معنی ہو گیا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ ان کی ایک کتاب ہر سال مقبول اکیڈمی سے شائع ہو گی۔ میں اس وعدے کی تعمیل اب تک کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر

انور سدید "سرگودھا مکتب فکر" کے حقیقی نمائندہ اور ترجمان تھے، اس لئے عمر بھر ڈاکٹر وزیر آغا کا ساتھ دیا اور ان کے حق میں قلم کا بھرپور استعمال کیا۔ تاہم انہوں نے اردو ادب کی بہت خدمت کی۔ علمی، ادبی اور شعبۂ صحافت میں انہوں نے سینکڑوں افراد کی حوصلہ افزائی کی اور نئی پود کی آبیاری کی جس کی بدولت آج ان کے سینکڑوں شاگرد اور مداح موجود ہیں، جو علم و ملت کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید 4 دسمبر 1928ء کو ضلع سرگودھا کے ایک دور افتادہ مقام میانی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرگودھا اور ڈیرہ غازی خان میں حاصل کی۔ وہ بنیادی طور پر ادب کے طالب علم تھے اور تعلیم کے ابتدائی زمانہ میں ہی بچوں کے رسائل میں کہانیاں لکھنے لگے تھے، لیکن انٹرمیڈیٹ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے تو ان کے بڑے بھائی میاں معراج الدین نے انہیں انجینئر بنانے کا منصوبہ بنایا اور انہیں سائنس کے مضامین اختیار کرائے۔ اسلامیہ کالج کی تحریکی فضا میں وہ ایف۔ ایس۔ سی کا کورس مکمل نہ کر سکے۔ اس وقت تحریک پاکستان عروج پر تھی اور اسلامیہ کالج کے طلباء اس تحریک کا ہراول دستہ تھے۔ اس تحریک میں شمولیت کی وجہ سے انہوں نے امتحان میں شرکت نہ کی۔ کیونکہ "تھرڈ ڈویژن" لینا انہیں گوارا نہ تھا۔ اس دور میں انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھا اور محکمہ آب پاشی کی ملازمت اختیار کی۔ ماہانہ تنخواہ 25 روپے تھی۔ یہاں ناآسودگی محسوس کی تو وہ مقابلے کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ انجینئرنگ سکول رسول (ضلع گجرات) میں داخل ہو گئے۔ یہاں اسلامیہ کالج کی سائنس کی تعلیم کام آئی اور آخری امتحان اعزاز خاص کے ساتھ اول بدرجہ اول رہ کر پاس کیا اور طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔ انور سدید 1950ء میں محکمہ آب پاشی میں سب انجینئر کے عہدے پر فائز ہوئے تو یہاں بھی ترقی کا دروازہ بند پایا اور ناآسودگی محسوس کرنے لگے۔ اس بند دروازے کو کھولنے کے لئے انہوں نے دو مختلف امتحان پاس کرنے کے علاوہ ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) سے بی۔ ایس۔ سی کی سطح کے "اے ایم آئی ای" کے امتحانات میں کامیابیاں حاصل کیں۔ 1961ء میں ایس ڈی او کے عہدے پر ترقی پائی اور 1977ء میں ایگزیکٹو انجینئر بن گئے۔ ساٹھ برس کی معینہ عمر تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے تو وہ سپرنٹنڈنگ انجینئر کے گریڈ 19 میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک پیشہ ور انجینئر کی حیثیت میں انہوں نے اعلیٰ خدمات سرانجام دیں۔ اس دوران انور سدید نے ادب کے ساتھ اپنا رابطہ قائم رکھا۔ ادیب فاضل میں پنجاب یونیورسٹی میں اولیت بدرجہ اول حاصل کی۔ ایف۔ اے اور بی۔ اے کے امتحانات صرف انگریزی میں پاس کئے۔ ایم۔ اے میں بھی پرائیویٹ طالب علم کی حیثیت سے اول بدرجہ اول اور طلائی تمغوں سے کامیابی پائی۔ 1978ء میں "اردو ادب کی تحریکیں" لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ ان کے داخلی رہنما ڈاکٹر وزیر آغا اور ممتحن ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر شمس الدین صدیقی تھے۔ اس کتاب پر انہیں ہجرہ ایوارڈ دیا گیا۔ "اقبال کے کلاسیکی نقوش" پر نقوش ایوارڈ، مقالہ "اردو میں حج ناموں کی روایت" پر نقوش ایوارڈ اور بہترین کالم نگاری پر "اے، پی، این، ایس" ایوارڈ بھی انہیں مل چکا ہے۔ انور سدید قریباً اسی (80) کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں۔ ان کی کتابیں "اردو ادب میں سفرنامہ"، "اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش"، "اردو ادب کی تحریکیں"، "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" ادبیات کا درجہ رکھتی ہیں اور کالج اور یونیورسٹی کے طلباء کے علاوہ اعلیٰ ملازمتوں کے مقابلے میں شریک ہونے والوں کی معاونت بھی کرتی ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان نے ان کو پاکستانی ادب کے معماروں میں شامل کیا ہے۔ انور سدید کے فن اور شخصیت پر سجاد نقوی نے ایک کتاب "گرم دم جستجو" شائع کی۔ رسالہ تخلیق، اوراق، جدید ادب، ارتکاز، کوہسار، روشنائی، ماہنامہ قرطاس اور چہار سو میں ان کے گوشے چھپ چکے ہیں۔ 87 برس کی عمر میں بھی وہ جوانوں سے زیادہ کام کرتے رہے ہیں اور

ان کا قلم تیز گام ہے۔

انور سدید کے چار بیٹے ہیں۔ ان میں سے دو ڈاکٹر اور دو انجینئر ہیں۔ ماہنامہ "قومی ڈائجسٹ"، "زندگی" اور روزنامہ "خبریں" کے بعد وہ روزنامہ "نوائے وقت" کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ وہ مجید نظامی صاحب کے اس قول کی مثال ہیں کہ "مصنف اور صحافی زندگی کے آخری لمحے تک لکھتا رہتا ہے۔" ڈاکٹر انور سدید قلم کے شہسوار تھے۔ ان کے شب و روز پڑھنے لکھنے میں صرف ہوتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب بلاشبہ اردو ادب میں ایک اہم اور قد آور شخصیت تھے۔ ممتاز افسانہ نگار، نجم الحسن رضوی کراچی سے اظہر جاوید کے رسالہ "تخلیق" میں رقم طراز ہیں۔

"انور سدید صاحب کا تخلیقی وفور قیامت خیز ہے۔ کرکٹ میں اچھے بلے بازوں کو رنز بنانے کی مشین کہا جاتا ہے۔ انور سدید صاحب نے لفظوں کی ایسی مشین ایجاد کی ہے جس میں طرح طرح کے چربے، نتیجے، پہلے اور دلائل ڈھل گئے ہیں۔ وہ ضرورت کے مطابق ڈھل جاتے ہیں اور کھٹ سے دوسری طرف سے کوئی مقالہ، کتابوں پر تبصرہ، سالانہ ادبی جائزہ، کسی ادیب کا بری نامہ، غزل، انشائیہ یا دیگر تخلیق کے نام سے نکل آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بڑا زرخیز ذہن دیا ہے۔ اگر وہ نہ ہوتے تو "تخلیق" کا پیٹ بھرنے کے لئے مزید آدھے درجن قلمکاروں کے تعاون کی ضرورت پڑتی۔" بے شک کسی دبستان معاصر نے سب سے زیادہ تاریخ ساز، بے مثال اور یادگار ریکارڈ کی تخلیقی اور تنقیدی سطح پر اظہار کیا ہے تو وہ صرف اور صرف ڈاکٹر انور سدید کی ذات با صفات ہے۔

ڈاکٹر انور محمود خالد راوی ہیں کہ ملک کے نامور ادیب احمد ندیم قاسمی دفتر فنون میں موجود ادیبوں کے سامنے ان کی تعریف کرتے تھے لیکن اخبار میں رائے بدل جاتی۔ میں نے یہ بات حیرت سے سنی لیکن انور محمود خالد صاحب ثقہ ہیں۔ میں ان کی بات پر اعتبار کر سکتا ہوں۔ اپنی ساٹھ سالہ اشاعتی زندگی میں میرا صرف دو ہمہ جہت قلمکاروں سے واسطہ پڑا ہے۔ ایک سید رئیس احمد جعفری تھے اور دوسرے ڈاکٹر انور سدید۔ ان ادیبوں نے بہت زیادہ لکھنے کے باوجود اپنا معیار قائم رکھا ہے۔ ان کے نام اور کام کو ہمیشہ عزت اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید درویش صفت اور رطب اللسان تھے۔ انہیں کسی ستائش اور صلے کی تمنا نہ تھی۔ اردو ادب کی خدمت ان کا مشن تھا اور انہوں نے انتھک محنت کے ذریعے ملک کا نام روشن کیا۔ میرے ساتھ خصوصی محبت فرماتے تھے۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ تصنیف و تالیف میں میری رہنمائی فرمائی اور بڑے کھلے دل و دماغ سے میرے معمولی کام کو بھی سراہا اور میری حوصلہ افزائی فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔ (آمین)

◆◆◆

غلط طریقہ

الجھ رہا ہے تو کیوں ہر کسی سے رستے پر — بتاؤں تجھ کو — غلط یہ تیرا طریقہ ہے
گزار تو اسے ہنس بول کر زمانے میں — حیات چار دنوں کی تری رفیقہ ہے

(ڈاکٹر انور سدید)

ہم سب کے انور سدید

منور عثمانی

بڑا زمانہ وہ ہے جو لکھا جائے۔ اسی طرح بڑی تہذیب بھی وہ ہے جسے مصنف یا مصور میسر آ گئیں (ویسے تو سارے زمانے ہی اہم ہیں اور ساری تہذیبیں ہی گہرائی، بلندی، وسعت اور تنوع رکھتی ہیں)

زمانے کو لکھنے کے کئی پیرایے ہیں: مثلاً زمانی ترتیب سے رقم ہو تو تاریخ ہے، تخیل، کردار، واقعے اور ذاتی احساس کی تخلیقی آمیزش سے زمانہ ظاہر ہو جائے تو کہانی ہے، شخصیات کے احوال و آثار، اصناف و روایات اور فکری و فنی رجحانات و تحریکات کے تناظر میں زمانے کی کارفرمائی، کارگزاری یا کرتب بازی اظہار میں آ جاتا ہے تو مضمون، مقالہ، تجزیہ یا تبصرہ ہے، زمانہ اقدار کے موسموں سے محلول کر ایک آہنگ میں ڈھل جائے تو شاعری ہے، نکتہ آفرینی، تازہ بیانی اور داخل و خارج کی سیاحت فرمائی سے چھوٹے منظروں، واقعوں اور زاویوں کے کسی لمحاتی امتزاج پر (زمانہ) اپنے کسی انوکھے پن کو پالے تو انشائیہ، زمانہ سفر کو چلانے اور سفر راستے تخلیق کر کے یہاں سے وہاں تک پہنچے، جب چلے اور ایک پیمانے میں سمٹے تو ایک زمانے کی باتیں، یادداشتیں، عبرتیں، رفاقتیں، فرقتیں آپ ہی آپ میں ظاہر کر دے تو سفرنامہ، زمانہ اپنی سماجی، فکری، فنی ناہمواریوں کو ایک فنکارانہ لیکن ہموار اکائی وحدت سے ہم کنار کر کے خود کو ایک قطعے میں بدل دے تو ناول۔ اسی طرح کسی ایک شخص کو مخاطب کر کے زمانہ تحریر ہو تو مکتوب، ہزاروں لوگوں سے گفتگو مقصود ہو تو کالم، کسی فرد کے چلے جانے اور وصال سے زمانہ ہم کلام ہو تو خاکہ یا شخصیت نامہ، کسی مرحوم کے لیے اظہار غم اور اعتراف فضیلت کی منزل ہو تو تعزیت نامہ......

مختصر یہ کہ ذخیرے ہیں، پیرائے اور تخلیقی اسالیب ہیں جن کے ذریعے زمانے کی ادائیں، کرشمے تحریر ہو کر محفوظ ہوتی ہیں۔ سو ہر لکھنے والا زمانے کا محسن ہے اور ہر تحریر ایک جام جہاں نما ہے۔ اچھا! کیا یہ ممکن ہے کہ ایک ہی شخص، ایک ہی انہماک اور ایک ہی تسلسل سے ان سب اصناف میں لکھتا اور ان سب آفاق کو چھوتا چلا جائے؟ ابھی چند دن پہلے کی بات ہے کہ ایک شخص یہ سب بڑی نہایت آسانی، روانی اور خوش اسلوبی سے لکھتا ہوا اس زمانے سے کسی اور زمانے میں جا اترا۔ اس شخص کو اس کے زمانے نے انورالدین کا نام دیا تھا لیکن اس نے زمانے پر اپنے دستخط انور سدید کے نام سے چھوڑے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ مطلع ادب پر مستقل مزاج انور سدید کے دستخط زمانے کے مرکزی دھارے پر ثبت ہوئے ہیں یا کسی دور افتادہ حاشیے پر؟ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انور سدید کے حوالے سے آئندہ جو گفتگو ہوتی رہے گی اس کا بنیادی سروکار اسی سوال سے ہو گا۔

اس سوال کا جواب ڈھونڈنے سے پہلے یہ دیکھنا بھی ضروری ہو گا کہ ہمارے یہاں کتنے مصنفین ہیں جنھوں نے اپنے زمانے کے فکری و فنی آفاق کو ہر زاویے سے دیکھا اور زندگی کے فقط ابتدائی چند سالوں کو چھوڑ کر باقی تمام عمر تخلیقی مراحل اور تنقیدی منازل کو نہایت دل جمعی سے عبور اور فکر و احساس کے نتائج کو تحریر کرنے میں گزار دی۔ اس تلاش کے عمل میں ہم انور سدید کو اردو کے ان معدودے چند

مصنفین میں ضرور پائیں گے جنھوں نے کسی ماندگی کے، وقفے کے بغیر ایک طویل تصنیفی زندگی گزاری اور متعدد زاویوں سے تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی خدمات ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کے بغیر انجام دیں۔

انور سدید کی تخلیقی زندگی کے کئی زاویے ہیں۔ انھوں نے طالب علمی کے زمانے میں افسانے لکھنے شروع کر دیے تھے، ان کا آخری افسانہ 1970ء میں لکھا۔ شاعری بھی کی، آخری غزل مارچ 2016ء کے تخلیق میں شائع ہوئی (مارچ 2016ء ہی ان کا ماہِ وفات ہے)۔ انشائیے لکھے، اردو انشائیے کا سخت ترین ناقد بھی اردو کے پانچ بہترین انشائیہ نگاروں میں انور سدید کو ضرور شامل رکھے گا۔ وہ ذاتی، ادبی، رسالہ جاتی مکاتیب لکھنے میں بھی "ید طولیٰ" رکھتے تھے۔ اگر فقط ادبی رسائل میں شائع شدہ ان کے مکاتیب جمع ہو کر سامنے آ سکے تو دو باتیں پایۂ ثبوت کو پہنچ جائیں گی: ایک یہ کہ ادبی یا رسالہ جاتی مکاتیب لکھنے میں بھی انور سدید کا کوئی بدل نہیں، دوسری یہ کہ کئی عشروں میں پھیلی ہوئی اردو ادب کی فضا اور پیچ در پیچ فکری و فنی صورتحال میں اتنی بھرپور، اتنی طویل اور اتنی گہری شرکت کسی اور کے بس کی بات نہیں۔

گویا انور سدید پورے ادبی منظرنامے کے آدمی تھے (فقط کسی گوشے، زاویے، شعبے یا حلقے تک محدود نہیں تھے)۔ وہ منظرنامے میں شریک بھی تھے اور اس کے ناظر اور ناقد بھی تھے۔ وہ اس کے مداح بھی تھے اور ناشر اور رپورٹر بھی۔ ..... وہ یہ سوچ کر بھی اداس ہو جاتے تھے کہ اردو زبان و ادب کو خدانخواستہ زوال ہو جائے گا یا کوئی نقصان پہنچ جائے گا۔ وہ اس منظرنامے کا عرفان بھی رکھتے تھے، سو انھوں نے داد دی نہیں، بے داد بھی سہی، وہ طوفانوں کی زد پر رہے لیکن گھبرائے نہیں جیسے یہ تھی کہ وہ کسی بھی طوفان کو اپنے لیے تخلیقی تحریک کا باعث سمجھتے تھے۔ انور سدید کے تنقیدی کام کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو خالص، مکمل اور مفصل تحقیق و تنقید ہے جس کا ثمرہ اردو ادب کی تحریکیں، انشائیہ اردو ادب میں، میر انیس کی قلمرو، غالب کا جہان اور، اقبال کے کلاسیکی نقوش، اردو ادب میں سفرنامہ، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ، اردو افسانے میں دیہات کی پیشکش، وزیر آغا ایک مطالعہ، مولانا صلاح الدین احمد فن اور شخصیت، اردو ادب کی مختصر تاریخ وغیرہ ہیں۔ (کتابوں کی اس فہرست میں صرف چند یک موضوعی کتابیں درج کی گئی ہیں، تقریباً چودہ پندرہ یک موضوعی کتابیں ان کے علاوہ ہیں، متفرق مضامین کے متعدد مجموعے الگ ہیں) اسی زمرے میں ان کے تدوینی و تالیفی کام اور ادبی رسائل کی ادارت کو بھی رکھا جا سکتا ہے۔

انور سدید کے تنقیدی سرمایے کا دوسرا حصہ علمی و ادبی کتابوں پر مختصر تبصروں، تفصیلی مطالعوں، رسالہ ادبی جائزوں اور مرحوم ادیبوں کے شخصیت ناموں پر مشتمل ہے۔ تبصرۂ کتب میں انور سدید تصنیف و مصنف کا تعارف معاصر ادبی تناظر میں اس طرح کراتے کہ قارئین مطالعۂ کتب کی جانب راغب ہو جاتے۔ تبصرۂ کتب میں انور سدید کا مقصد اور رویہ کسی تصنیف کا استقبال کرنا اور ادبی دنیا سے اس کا تعارف کرانا رہا ہے۔ لہٰذا ان تبصروں میں کسی حد تک توصیفی پہلو غالب آ جاتا ہے اور یہ قطعاً کوئی نامناسب بات نہیں ہے۔ اسی طرح تعزیت ناموں یا مرحومین کے شخصیت ناموں میں انور سدید کلمۂ خیر کہتے ہوئے مرحومین کے حیات و فن اور خدمات و فضائل کا بھرپور تعارف کرا دیتے۔ ان مضامین کو پڑھتے ہوئے لگتا ہے کہ مصنف اپنا غم ظاہر بھی کر رہا ہے اور تذکرے کو پھیلا دے کر اپنے دکھ اور افسوس کو چھپانے کی کوشش بھی کر رہا ہے مبادا مضمون نوحے میں بدل جائے۔ ان تعزیتی مضامین میں بھی اگر توصیفی پہلو لوگوں کو نظر آئے تو

اسے ہماری مشرقی روایت کا تسلسل سمجھنا چاہیے۔ واضح رہے کہ مرحومین پر اتنی بڑی مقدار میں احساسات اور معلومات کے امتزاج سے اچھی، دلچسپ اور چند سطر میں شاید ہی کسی اردو ادیب نے مضامین لکھے ہوں۔ یہ انور سدید کا منفرد اعزاز ہے اور اس سے وہ زندگی کے آخری لمحات تک دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھے۔ سوائے زندگی کے آخری ہفتوں میں بدترین جسمانی تکالیف سے نمٹتے ہوئے بھی وہ انتظار حسین، جمیل الدین عالی اور دیگر مرحوم ادبا کے لیے اپنے احساسات رقم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ شاید 20 مارچ 2016ء (یعنی یوم وفات) تک اردو کے ایک دو قابل ذکر ادیبوں کو چھوڑ کر کوئی ایسا نہیں ہے جو دنیا سے سدھارا اور انور سدید نے اسے اپنے لفظوں اور آنسوؤں کا خراج پیش نہ کیا۔

انور سدید کے تنقیدی سرمایے کی تیسری جہت ردعمل کی ہے۔ وہ معاصر ادبی معاشرے کی صورتحال اور ادبا و شعرا کے رویوں پر ردعمل ضرور ظاہر کرتے تھے اور یہ اظہار عموماً تحریری ہوتا تھا۔ مختلف رویوں پر ردعمل ہم سب ظاہر کرتے ہیں۔ عموماً ہمارا ردعمل بند کمرے میں اور غیبت کے پیرائے میں فقط زبانی کلامی ہوتا ہے۔ اس سے ہمارا کتھارسس ہو جاتا ہے اور ہمارا تعلق دار اور متعلقہ کوئی بھی متاثر نہیں ہوتا۔ ہم بھی خوش، حلقہ احباب بھی خوش اور ارباب علم و ادب بھی خوش! انور سدید ایسا نہیں کرتے تھے۔ ان کا ردعمل اعلانیہ اور تحریری ہوتا جبکہ یہ ایک سنجیدہ، ادبی، احتسابی اور تنقیدی رویہ تھا۔ کلمہ حق ہو یا کلمہ خیر، وہ اسے برسر عام کہنے پر یقین رکھتے تھے۔ انور سدید ویسے تو صاحب توضیح تھے، صاحب ردعمل عموماً اس وقت ہوتے جب احوال واقعی سے مختلف بیانات سامنے آتے یا سرقوں، چربوں اور بغیر حوالے کے استفادوں کے معاملات کھلتے، یا جب لوگ دشنام آمیز یا دشنام آمیز طرز تخاطب اختیار کر لیتے۔ دوبارہ عرض کروں گا کہ ایسی صورتحال میں ہم سب ردعمل سے گزرتے ہیں لیکن ہمارا ردعمل ہمارے دل یا دوستوں کی کسی محفل تک محدود رہتا ہے اور چند لمحے فضا میں بکھرتے ہیں اور پھر ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ انور سدید نے زیادہ تر خطوط لکھے اس لیے بھی کہ وہ اپنے ردعمل کو دو ٹوک انداز میں تحریر کر دیتے تھے۔ گویا یہی اپنے زمانے کو لکھنے اور اس کی دستاویز تیار کرنے کا عمل ہے۔ اس عمل سے انور سدید منافقت اور غیبت سے بچ گئے، گو کہ دشمنوں کی آمدوں سے نہ بچ سکے۔

انور سدید زبانی کلامی ردعمل ہی نہیں زبانی کلامی تعریف و تحسین کے بھی قائل نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اہل ادب، اہل تحریر ہوتے ہیں سو اگر کسی کی تعریف مقصود ہے تو اسے لکھنا چاہیے۔ وہ نجی محفلوں اور ادبی تقریبوں میں کی جانے والی محض زبانی تعریف و تحسین کو رزق ہوا سمجھتے تھے۔

ایک ملاقات میں انور سدید اپنے ایک جاننے والے ادیب و شاعر کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ ''ہمارے یہ دوست جب بھی ملتے ہیں، مجھ ناچیز سمیت اپنے معاصر دوست ادیبوں کی خوب تعریف و توصیف فرماتے ہیں۔ میں ہمیشہ ایک اچھے سامع کی طرح وہ سب کچھ سنتا رہتا ہوں۔ ایک دن خلاف معمول میں نے ان سے عرض کی کہ آپ سے سالہا سال سے ملاقات ہے، آپ صاحب مطالعہ ہیں، اچھی کتابوں اور ادبی کاوشوں کی تعریف فرماتے ہیں، کبھی ان تعریفوں کو لکھ بھی ڈالیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ آپ ان تعریفوں کو خود بھی کسی قابل سمجھتے ہیں یا نہیں!!'' پھر سدید صاحب ہنستے ہوئے کہنے لگے ''بھائی! کیا کرتا! مجھ فراغی سے بچنے کا یہی طریقہ مجھے سوجھا۔''

اصل میں انور سدید کی سوچ یہ تھی کہ ہر اچھی کتاب ایک طویل تحقیقی ریاضت کے بعد وجود میں آتی ہے لہٰذا مناسب ہے کہ

مصنف سے بوقتِ ملاقات فقط ایک آدھ توصیفی جملے سے اس کی ساری ریاضت کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ سو انور سدید نے خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ہمیشہ تحریر کا سہارا لیا۔

انھوں نے کئی بار اپنی گفتگو اور مضامین میں ان اہم باتوں، بحثوں اور تقریروں کی جانب اشارہ کیا جو فقط چند لوگوں کی سماعتوں تک محدود رہیں اور تحریر کے جامے میں نہ آسکیں۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان پر لکھے اپنے ایک مضمون میں انور سدید ان کی قوتِ تقریر کا تذکرہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں ڈاکٹر وحید قریشی کے لیے منعقدہ تقریبِ پذیرائی میں سہیل احمد خان کی شاندار تقریر سننے کا اتفاق ہوا، بڑا لطف آیا: تقریب کے بعد (ایک ہی کار میں بیٹھ کر گھروں کو واپس جاتے ہوئے) مقررین کے ذکر پر وحید قریشی نے سب سے زیادہ داد سہیل احمد خان کو دی کہ سہیل احمد خان نے وحید قریشی کو حافظ محمود شیرانی کی تحقیق کی روایت سے منسلک کیا تھا۔ انور سدید کہتے ہیں:

''مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ یہ اعلیٰ پائے کی گفتار رزقِ ہوا بن گئی اور اب کسی کے ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔''

(نقوشِ رفتگاں، ص ۹۱)

یہ تھا انور سدید کا تحریر کی اہمیت کے حوالے سے خیال و احساس۔ وہ خود تمام عمر اپنے اس خیال و احساس کے مطابق عملی طور پر سرگرم رہے۔ داد زبانی ہی نہیں بلکہ تحریری دیا کرتے۔ لوگ اس امر پر بھی اعتراض کرتے تھے کہ انور سدید ایک تو بہت لکھتے ہیں اور دوسرے خواہ مخواہ لوگوں کی تعریف کر کے ان کا دماغ خراب کر دیتے ہیں..... یہ خاصا تحقیق طلب مسئلہ ہے کہ زیادہ تر دماغ کس کا خراب ہوا، جن کی تعریف کی گئی یا جن کی تعریف نہ ہو سکی..... "حقیقت تو یہ ہے کہ انور سدید کی داد محدود نہیں تھی، نہ ہی کسی غرض یا مفاد پر مبنی تھی۔ وہ تو درویش کی دعا کی طرح تھی، محبت سے بھری اور بے تمیز کی حامل۔ معروف افسانہ نگار روبینہ تحسین خان کی اس بات کو شاید کوئی بھی منصف مزاج رد نہ کر سکے کہ "ڈاکٹر انور سدید شفیق و مربی انسان ہیں۔ وہ ادب میں حوصلہ افزائی کا استعارہ ہیں۔" (اُمُّ اپریل 2016ء، ص 134)

انور سدید کی تحریر پڑھنے اور ان سے ملاقات کرنے والا ہر شخص یہ گواہی دے سکتا ہے کہ وہ پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے اردو کے نئے اور پرانے تمام ادیبوں، شاعروں کے ناموں اور کاموں سے خوب واقف تھے، نہ صرف واقف تھے بلکہ اکثر و بیشتر علمی و ادبی شخصیات سے رابطے میں بھی تھے اور یہ رابطہ اور مکالمہ آخر تک قائم و دائم رہا۔ عموماً ہمارے اکابرین صرف اپنے پسندیدہ حلقۂ ادب اور مرغوب صنفِ ادب کے وابستگان ہی سے واقف ہوتے ہیں، باقی اصناف اور دیگر علمی و ادبی شعبوں اور حلقوں سے وہ بے خبر رہتے ہیں۔ بڑے شہروں اور نمایاں ادبی مراکز سے دور مختلف علاقوں تک تو عموماً ہمارے کئی بڑوں کی نظر ہی نہیں جاتی، وہاں کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف و اعلان تو دور کی بات ہے۔ انور سدید مضافات کے اہم ادیبوں خصوصاً نو واردانِ بساطِ ادب کا تذکرہ ہی نہیں بھی کیا کرتے تھے۔ وہ کسی کتاب، لکھنے والے ادیب اور کسی بھی نوعیت اور درجے کے ادبی مجلے سے ناواقفیت کو اپنی محرومی سمجھتے تھے۔ (کئی لوگ اسے فخر کی بات سمجھتے ہیں)

ہندوستان کے نامور، کم معروف بلکہ بے نام معاصرین سے بھی انور سدید کا معاملہ اور رویہ اسی نوعیت کا تھا۔ وہاں کی کتابوں، مجلوں، تخلیق کاروں، محققوں اور نقادوں پر جتنا کچھ سدید صاحب نے لکھا اتنا ڈھیروں کام اب کون انجام دے سکے گا؟ اس کے لیے جتنی

ہمہ جہت مطالعہ، وسیع المشربی اور سب سے بڑھ کر جتنا وقت چاہیے وہ اب کس کے پاس ہے؟ انور سدید کے لیے یہ سب کچھ آسان اس لیے تھا کہ ادب و ادیب سے ربط ضبط ان کی طبیعت میں فطری طور پر موجود تھا یا یوں کہیے کہ ادبی ریاضت کے باعث فطرت و طبیعت کا حصہ بن چکا تھا۔ انھیں یہ قبول ہی نہیں تھا کہ اردو ادب کا کوئی رجحان و میلان اور کوئی تصنیف و تالیف ان کے مشاہدے یا مطالعے کا حصہ نہ بنے ہوں یا ادب کے کسی بھی شعبے، معاملے یا رویے کی کوئی بھی پیش رفت یا پیش پائی ان کے دائرہ علم سے باہر رہی ہو۔

ذاتی مشاہدے کی بنا پر عرض کروں گا کہ بعض اوقات تو انور سدید کسی بھی ادبی سرگرمی یا فکری و فنی کاوش سے واقف نہ ہونے پر خاصے دکھی ہو جاتے تھے۔ ایک مثال پیشِ خدمت ہے۔ سدید صاحب نے ماہنامہ کاغذی پیرہن میں پروفیسر امجد علی شاکر کا لکھا ہوا ایک خاکہ پڑھا جو انھیں بہت پسند آیا۔ مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ ہوا تو ساری گفتگو اس خاکے کی تعریف میں گزر گئی۔ کچھ دنوں کے بعد ان سے ملاقات ہوئی تو پھر اس خاکے کی تعریف ہونے لگی۔ ساتھ ہی اس بات پر افسوس کا اظہار بھی کیا کہ "میں امجد علی شاکر صاحب سے خوب واقف ہوں لیکن اس سے پہلے ان کا کوئی خاکہ نہیں پڑھ سکا۔" میں نے عرض کیا کہ "ان کے خاکوں کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔" یہ سن کر تو ایسا لگا کہ وہ حیران و پریشان ہو گئے ہیں۔ ایک گہرے تاسف سے کہنے لگے: "دیکھو بھائی! میری بے خبری! اتنا شاندار خاکہ نگار اور میں نے اس کی ایک کتاب بھی نہیں پڑھی۔" خاکوں کی وہ کتابیں انور سدید کو پہنچا دی گئیں جنھیں انھوں نے فوری طور پر پڑھ لیا اور پڑھ لیے جانے کی اطلاع اور داد و تحسین سمیت ان تمام لوگوں تک پہنچائی جو ان دنوں کسی بھی طرح رابطے میں آئے۔

جب ملاقات ہوئی تو مجھ سے پہلی بات یہ کی: "دیکھو! میں تو اپنی بے خبری کے باعث یہ خاکے نہ پڑھ سکا لیکن یہ ادبی حلقے کو کیا ہوا کہ اس نے اتنے اہم خاکہ نگار کو نظر انداز کیے رکھا۔" اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کتاب دوستی، ادب پروری، ادیب نوازی اور ادبی سرگرمیوں میں شرکت انور سدید کے لیے سانس لینے کی طرح ناگزیر تھیں۔

ان کی عنایات صرف ادیبوں ہی پر نہیں، ادب کے طلبہ اور ریسرچ سکالرز پر بھی برابر جاری رہتیں۔ ویسے بھی یہ ممکن نہیں کہ ادب سے سچی محبت رکھنے والا ادب کے طالب علموں سے بیگانہ رہ سکے۔ سو انور سدید طالب علموں اور تحقیق کاروں کی مواد کی فراہمی میں مدد کرتے، فکری رہنمائی سے نوازتے اور تعلیمی و تحقیقی کام بروقت مکمل کرنے اور تحریر و تصنیف میں داخل ہونے پر زور ڈالتے۔

سدید صاحب کے حوصلہ افزائی کے انداز اور شوقِ مطالعہ کی وارفتگی کے حوالے سے بالکل ایک ذاتی نوعیت کی مثال پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا۔ فروری 2016ء میں میں نے اپنی ڈاکٹریٹ مکمل ہونے کی اطلاع انھیں ٹیلی فون پر دی تو بہت خوش ہوئے۔ مبارک باد کے الفاظ ادا کرتے ہی دوسری بات یہ کی کہ "اپنا مقالہ ضرور دکھائیے گا"۔۔۔ پھر اگلے ہی لمحے کہا: "بھئی قابلِ داد ہیں...... قابلِ دید بھی۔ اس میں دیکھنا چاہتا ہوں...... ایک نظر۔" یہ تھا ان کے مطالعے کا معاملہ اور یہ تھی تخلیقی و تحقیقی و تنقیدی ہر کاوش سے آگاہ ہونے کی خواہش...... کہ دوسری طالب علمانہ کوشش کو بھی ایک نظر ضرور دیکھنا چاہتے تھے...... افسوس! اسی دوران میں ان کی طبیعت مزید بگڑتی چلی گئی اور مجھے ان کی خدمت میں اپنا مقالہ پہنچانے کا موقع نہ مل سکا...... اس بات کا تاسف تا حیات راقم کو ساری عمر رہے گا۔

میرے دوست محمد ہارون عثمانی نے انور سدید کی خواہش پر غالباً 2013ء میں اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے (عنوان کی ادبی

خدمات) کی ایک جلد تیار کرا کے ان کی خدمت میں پہنچائی تو بہت خوش ہوئے اور مقالے کے مطالعے کے بعد ہارون صاحب کی محنت اور تحقیقی دیانت کو خوب سراہا اور مقالے کی فوری اشاعت پر خاصا زور دیا" مبادا یہ اہم مقالہ دیگر مقالوں کی طرح یونیورسٹی لائبریری کے کسی کونے کھدرے میں پڑا رہ جائے۔ مقالہ کتابی صورت میں شائع ہوا تو انور سدید کی خوشی دیدنی تھی۔ ہر کسی سے ذکر کرتے رہے کہ "مخزن" کے حوالے سے ایک اہم کتاب سامنے آ گئی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہارون عثمانی کی اس کتاب کا انتساب محترم ڈاکٹر سلیم اختر کے نام ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انور سدید کے لیے یہ بات یا اسی نوعیت کی دیگر باتیں اہم نہیں تھیں۔ اصل میں ان کی دلچسپی ادب کی ہر دم جواں پیہم رواں زندگی میں تھی اور حقیقی خوشی شاید اس بات میں تھی کہ ان کا حلقہ احباب خصوصاً نوواردانِ بساطِ ادب مصروفِ تصنیف و تالیف رہیں۔

ان واقعات کے اندراج کا مقصد فقط یہ بتانا تھا کہ انور سدید اپنی ذات کے اسیر نہیں تھے اور گنے چنے موضوعات کے مطالعے تک محدود رہنا انھیں قطعاً گوارا نہیں تھا۔ ان کی دلچسپی سارے زمانے سے تھی اور ان کی مطالعاتی طلب اتنی زیادہ تھی کہ وہ غیر مطبوعہ مقالات اور طالب علمانہ نوعیت کے مسودات کو بھی ایک نظر ضرور دیکھنے کی خواہش رکھتے تھے۔ وہ دنیا کے کسی بھی گوشے سے چھپنے والے ادبی مجلوں کو (خواہ ان کا درجہ عالمانہ ہو یا طالب علمانہ) بڑی توجہ سے پڑھتے اور نہایت دلچسپی سے ان پر اپنے تاثرات رقم فرماتے:

میرزا ادیب نے انور سدید کے ذوقِ مطالعہ کے حوالے سے ایک بڑی پر لطف بات کہی تھی:

"(انور سدید) بے تحاشا پڑھتے ہیں اور بے تحاشا ہی لکھتے ہیں اور حافظے کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ان کی نظروں سے گزر جاتا ہے وہ اپنے نقوش حافظے پر مرتسم کر کے جاتا ہے۔ ایک بار میں نے تہیہ کر لیا کہ مطالعے کے معاملے میں انھیں زچ پہنچاؤں گا۔ بھارت کے ایک بہت ہی غیر معروف پرچے میں چھپے ہوئے ایک معروف قلم کار کے مضمون کا ان سے ذکر کر دیا۔ سوچا تھا مجھ سے مضمون کے بارے میں معلومات حاصل کر کے کچھ کہیں گے مگر صاحب! وہ نہ صرف مذکورہ مضمون پڑھ چکے تھے بلکہ اس کا ذکر بھی اپنے ایک مضمون میں کر چکے تھے جو ابھی غیر مطبوعہ حالت میں ان کے پاس پڑا تھا۔" (انور سدید۔ گرم موسم مجموعہ ص13)

ایسا لگتا ہے کہ انور سدید اردو ادب کے پورے زمان و مکان کو اپنا گھر آنگن سمجھتے تھے۔ کوئی بھی اس آنگن میں تشریف لاتا تو وہ اس کا استقبال کرتے اس کی شخصیت اور خدمات کو سراہتے۔ کوئی رخصت ہوتا تو لفظوں اور آنسوؤں سے خراج پیش کرتے۔ وہ اس گھر آنگن کی تقدیس کے لیے برسرِ پیکار بھی رہے۔ وہ معرکۂ ادب میں تو فولاد تھے لیکن حلقۂ ادب اور دیارِ رابطہ میں ابریشم کی طرح نرم تھے۔ تمام تر معرکہ آرائی کے باوجود ان کا مسئلہ زمانے کی تصنیف تھا نہ کہ زمانے کی تسخیر!

زمانے کو تصنیف کرنے والا اب ہماری یادوں میں تصنیف ہو رہا ہے" گویا وہ اب بھی آمادۂ تخلیق ہے اور حرف و صوت سے اپنا رشتہ توڑنے پر رضامند نہیں!!

◆◆◆

بحرِ ادب کا شناور......انور سدید

ڈاکٹر سکندر حیات میکن

انور سدید مجھے بہت دیر سے ادب کے گلستان میں ادبی رنگوں کے ساتھ ملے مگر بہت جلدی جدا ہو گئے۔ آنکھیں نم ہیں اور دل پژمردہ ہے کہ یہ کیا ہو گیا۔ ادب کے ساتھ زندگیاں گزارنے والے خزاں رسیدہ پتوں کی مانند گرتے جا رہے ہیں۔ سرگودھا کے ادیبوں کے سر کا تاج تھے، انور سدید۔ اردو ادب کا انوار تھے انور سدید۔ اردو ادب کا ایک عام قاری اور طالب علم کم سے کم انور سدید کی تصنیف کردہ ''اردو ادب کی تحریکیں'' اور ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' سے لازمی واقف ہوتا ہے۔ میں جب ڈاکٹر ناصر عباس نیّر کی رہنمائی میں ''اردو میں ادبی تحقیق: آزادی کے بعد'' کے عنوان سے اپنا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھ رہا تھا تو مجھے بہت خوشی ہوئی کہ انور سدید اردو ادب کا وہ سورج ہے جس نے اپنی تحقیقی و تنقیدی روشنی تقریباً ادب کی تمام اصناف تک پھیلائی ہے۔ اس انکشاف کے بعد مجھے ان سے ایک ادبی انس ہو گیا۔ میں نے اپنے مقالے کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر انور سدید پر ایک مضمون بہ عنوان ''اردو افسانے کی تحقیق و تنقید میں انور سدید کا حصہ'' رقم کیا جو ماہنامہ ''الحمرا'' فروری 2015ء میں شائع ہوا۔ یہ مضمون شائع ہوا تو مجھے مدیر ''الحمرا'' شاہد علی خان کا فون آیا کہ میکن صاحب آپ نے تو کمال کر دیا ہے۔ انور سدید بہت بیمار تھے لیکن آپ کا یہ مضمون پڑھنے کے بعد وہ کہتے ہیں کہ میں چارپائی سے اٹھ کھڑا ہو گیا ہوں۔ اس واقعہ کے دو روز بعد مجھے انور سدید صاحب کا فون آیا۔ ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ یہ میری پہلی باقاعدہ گفتگو ہوئی۔ وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ آج مجھے دلی تسکین ہوئی ہے۔ پھر ایک روز انارکلی بازار لاہور میں مجھے ایک پرانے کتب فروش سے انور سدید کی ایک کتاب ''غالب کا جہان اور'' ملی تو میں بہت خوش ہوا اور کتاب خرید کر مطالعہ شروع کر دیا۔ جب مطالعہ ختم ہوا تو اس کتاب نے خود بہ خود مجھ سے ایک مضمون ''انور سدید بطور غالب شناس'' لکھوایا۔ بعد ازاں یہ مضمون بھی ماہنامہ ''الحمرا'' میں شائع ہوا۔ یوں انور سدید سے ایک ایسا ٹیلیفونک رابطہ استوار ہوا جو ان کی موت سے چند دن قبل تک رہا۔ انشاء اللہ اب اس رابطے کی بازگشت ان کی تحریروں سے آتی رہے گی۔

جب بھی ان سے بات ہوتی وہ ڈاکٹر وزیر آغا کا تذکرہ ضرور کرتے اور ہر بار مجھے ایک ہی بات دہراتے کہ مجھے ادب کے گلستان میں وزیر آغا لائے تھے اور میری عطا ڈاکٹر وزیر آغا کی عطا ہے۔ وہ اس بات کا اظہار برملا کرتے کہ وزیر آغا میرے محسن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں بار بار ڈاکٹر وزیر آغا کا تذکرہ خوش ہو کر کرتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی وفات کے بعد ان کی ہر سالگرہ اور برسی پر وہ ''الحمرا'' میں مضمون لکھتے۔ انھوں نے مرتے دم تک وزیر آغا سے اپنی وفا نبھائی ہے۔ شاید ہی ایسی وفا ادب میں کہیں دیکھنے کو ملے۔ میں نے جب ایک بار اپنے اشاعتی مضامین کی فہرست ڈاکٹر انور سدید کو بھیجی تو کچھ روز بعد مجھے حیرانی ہوئی اور خوشی سے میری آنکھوں سے آنسو بھی آ گئے۔ ڈاکٹر انور سدید نے مجھ پر ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''اردو تحقیق و تنقید کا روشن ستارہ'' یہ مضمون بھی ''الحمرا'' میں چھپا تھا۔ ہمارے سماج میں جہاں لوگ کتاب دینے میں کل سے کام لیتے ہیں انور سدید کتابوں کے معاملے میں اتنے ہی فیاض تھے۔ ایک سال قبل انھوں نے مجھے اپنی کتابوں کا ایک سیٹ بڑی محبت سے بھجوایا۔ میں نے جب ان کا شعری مجموعہ ''دیدۂ و سفر میں'' پڑھا تو اس پر ایک مضمون لکھا۔ اسی طرح ان کی کتاب ''اردو ناول کے رنگ'' مجھے بھا گئی اور میں لکھنے پر مجبور ہو گیا۔ ''اردو ناول کے رنگ'' پر مضمون قومی زبان ستمبر

2015ء میں شائع ہوا تھا۔ ایک دن فون آیا کہ آپ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کی پوری تفصیل مجھے بھیجئے۔ جب میں نے اپنے مقالے کا ایک آخری باب بھیجا تو انہوں نے مجھے تاکید کی کہ اس مقالے کو فوری کتابی شکل میں لایئے۔ بلکہ اس سلسلہ میں میری رہنمائی کی اور اپنے مخلص دوست ملک مقبول احمد (مقبول اکیڈمی والے) سے بات بھی کر دی۔ انور سدید یاروں کے یار تھے۔ وہ اپنے یار ملک مقبول احمد کا تذکرہ بار بار مجھ سے کرتے تھے اور اکثر تعریف کرتے تھے کہ ملک مقبول احمد نے مجھ سے کبھی کاروبار نہیں کیا ہے۔ ہمیشہ محبت، دوستی اور ادب کا ایک خصوصی رشتہ ملک صاحب کے ساتھ انور سدید نے استوار رکھا تھا۔ دوسری طرف ملک مقبول احمد نے بھی آخری دم تک اس تعلق کو نبھایا ہے۔ 20 مارچ 2016ء کو ان کی وفات اور نماز جنازہ پر لاہور سے سرگودھا تشریف لائے تو بہت رنجیدہ تھے۔

ڈاکٹر انور سدید جب ادب سے جڑے تو ادب کے ساتھ ان کا رشتہ اٹوٹ انگ کی طرح رہا۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں بیماری، کمزوری اور بینائی کی کمی اور آنکھوں میں موتیے کے باوجود، ڈاکٹروں کی منع کے باوجود انہوں نے قلم کتاب سے خود کو الگ نہیں کیا۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اردو ادب کے اس شناور (ڈاکٹر انور سدید) کو لوگوں نے زود نویس اور بسیار نویس تک کہا اور ان کے محاسن کو معائب بنانے کی سعی ناکام لوگ کرتے رہے۔ میں نے ایک دن انور سدید پر ہونے والے ادبی کاموں کا جائزہ لیا تو مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ انور سدید نے ادب کے فروغ اور ترویج کے ضمن میں چھوٹوں، بڑوں سب پر لکھا ہے۔ انور سدید سچے دل سے ادب کو پروان چڑھانے میں خلوص دل اور نیت سے کام لیتے رہے ہیں۔ مگر انور سدید پر بہت کم تحقیقی و تنقیدی کاوشیں سامنے آئی ہیں۔ ادب کے اس شناور کو وہ تحسین ادبی تحریروں کی صورت میں پیش نہیں کی گئی، جس کا وہ حق دار تھا۔

جب میں نے اپنی کتاب "بحر ادب کے دو شناور (ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید)" کا مسودہ دکھایا تو بہت خوش ہوئے۔ مجھے اپنی غفلت پر بہت افسوس ہے کہ کاش یہ کتاب انور سدید کی زندگی میں شائع ہو جاتی۔ محمد شفیق کھوکھر کی کتاب "کثیر الجہات ادیب، انور سدید" جو مضامین کا انتخاب ہے، پر بہت شاداں ہوئے۔ سرگودھا کے شریف النفس ادیب ذوالفقار احسن نے انور سدید کے افسانوں کا انتخاب پیش کیا تو انور سدید کی ایک نئی صنف ہمارے سامنے آئی۔ میں نے ان افسانوں کا مطالعہ کیا تو بہت حیرت ہوئی۔ ان افسانوں میں ایک خاص تخلیقی رجحان اور انداز نمایاں ہے۔ جب میں نے ان کا ایک افسانہ "غم محرومی جاوید" پڑھا تو میرے ذہن کے کئی دریچے روشن ہو گئے۔ میں نے انور سدید صاحب کو فون کیا کہ ایک افسانہ نگار ہے اور اس نے ایک افسانہ "غم محرومی جاوید" لکھا ہے۔ میں وہ ہاتھ چومنا چاہتا ہوں، کہنے لگے نہیں نہیں۔ آپ زحمت نہ کیجئے، آپ بس کام کیجئے اور اپنے ادبی امور کو تیز کیجئے۔ میری بدقسمتی کہ میں وہ ہاتھ نہ چوم سکا۔

اکثر اوقات فون پر میں زیادہ تر خاموشی سے ان کی باتیں سنتا اور وہ گفتگو کرتے چلے جاتے۔ جب بولتے بولتے تھک جاتے تو کہتے، اب آپ بات کریں۔ ایک دن بہت بیمار تھے تو میں نے فون بند کرتے ہوئے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔ تو کہنے لگے بھائی! میں نے جو اپنی عمر جینا تھی، جی چکا ہوں۔ مجھے سلامتی کی دعا نہ دیجئے، بس یہ دعا کیجئے کہ باقی ماندہ زندگی کے ایام آرام سے گزر جائیں۔ انور سدید مروتوں کے آدمی تھے، بہت سی باتیں مروت میں دوستوں سے نہیں کرتے تھے۔ میں ان کے ساتھ آخری عمر میں وابستہ ہوا مگر وہ بہت غیر جانبدار ہو کر باتیں مجھ سے Share کرتے تھے۔ آخری دن جب ان سے بات ہوئی تو کہنے لگے کہ بڑھاپے نے اپنے تمام رنگ دکھا دیئے ہیں۔ میرا پیشاب بند ہو گیا ہے اور معدہ وہ افعال سے کی تعلیم سے ابھی مشورہ کیا ہے۔ میری ایک نئی کتاب کے لئے انہوں نے مقدمہ لکھا، وہ ان کی آخری تحریروں میں ہے۔ کہنے لگے وہ میرے پاس پڑا ہے۔ جلدی آپ کو بھجوا دوں گا۔ مگر 18 مارچ کو ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا مجھے فون آیا کہ ڈاکٹر انور سدید بہت بیمار ہیں اور سرگودھا کے ایک ہسپتال اشرف میڈیکل میں داخل ہیں۔ میں اسی وقت

ہسپتال گیا مگر وہ بے ہوش تھے۔ ان کی بہو نے کہا بس دعا کیجئے۔ دوسرے دن 19 مارچ کو پھر ہسپتال گیا مگر وہ اسی طرح بے ہوشی اور قے کی حالت میں تھے۔ 20 مارچ کی دوپہر کو فون آ گیا کہ وہ اب ہم میں نہیں رہے۔ آخر میں ایک بات اور یاد آ گئی، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی کتاب "ڈاکٹر انور سدید کی وزیر آغا شناسی" سے بہت خوش تھے۔ بلکہ انہی کی فرمائش پر مجھے ہارون الرشید تبسم نے وہ کتاب ارسال بھی کی تھی۔ میں پھر کہوں گا انور سدید پر علمی و ادبی ناقدین نے وہ توجہ نہیں دی جس کا حق تھا مگر انور سدید نے کسی کا حق رکھا نہیں ہے۔ اردو ادب کا وہ انور محض جسمانی طور پر تو چھپ گیا ہے مگر اس کی تحریروں کی اجلی اجلی کرنیں اردو ادب کو منور کرتی رہیں گی۔ ادب ساز، ادیب ساز اور ایک عہد ساز شخصیت کا نام ڈاکٹر انور سدید تھا۔

◆◆◆

"تخلیق" مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہے

کراچی	**دانش کدہ** (پروپرائٹر: شوکت علی) زہرا سکوائر، بلاک نمبر 6، گلشن اقبال (0300-2387965)
کراچی	**سٹی پریس بک شاپ** (پروپرائٹر: اجمل کمال) مدینہ سٹی مال آفس نمبر 316 صدر (طور) کراچی (0300-8259082)
لاہور	**ایسٹ بک ڈپو** (پروپرائٹر: محمد علیم) B-6، مال روڈ، لاہور (0320-4343588)
لاہور	**اظہار سنز** (پروپرائٹر: سید محمد علی انجم رضوی) 19، اردو بازار، لاہور (0300-4106357)
لاہور	**سنگ میل پبلی کیشنز** (پروپرائٹر: افضال احمد) 25، شاہراہ پاکستان، لوئر مال، لاہور (0300-8470143)
لاہور	**سلطان نیوز ایجنسی** (پروپرائٹر: محمد آفتاب) اکبر مارکیٹ، 1- میو ہسپتال روڈ، لاہور
فیصل آباد	**شمع بُک ڈپو** (پروپرائٹر: محمد اکمل) بیرون بھوانہ بازار، فیصل آباد (0300-6670134)
گوادر	**قندیل نیوز ایجنسی** (پروپرائٹر: شبیر شاکر) پشکان ضلع گوادر، بلوچستان (0322-3761579)

مردِ میدانِ فن تھے، انور سدید

شاہد بخاری

میں نے گورنمنٹ کالج سرگودھا سے 1966ء میں F.A کیا۔ جب B.A میں تھا تو پروفیسر قیوم شاکر صاحب نے بزم ادب گورنمنٹ کالج کی ہفت روزہ نشست کا مجھے سیکرٹری اور حافظ سعید کو سیکرٹری خصوصی نشست مقرر کیا۔ بزم ادب کی ان ہفتہ وار نشستوں میں LT/FT کے ایچ۔ اے۔ صوفی (بعد ازاں گروپ کیپٹن LT/FT) قیصرانی، رحمان قریشی (پرنسپل P.A.F کالج) ڈاکٹر سہیل بخاری، ڈاکٹر وزیر آغا، ظفر چوہدری (بعد ازاں ائر چیف P.A.F) انور سدید، سجاد نقوی (تب لائبریرین) اور پروفیسر خورشید رضوی باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے۔ ایک بار مجھ سے انور سدید صاحب نے پوچھا کہ حلقہ روزہ نشست میں مجھے کیوں نہیں مدعو کرتے؟ میں نے کہا وہ تو طالب علموں کے لیے مخصوص ہوتی ہے تو وہ کہنے لگے کہ میں بھی اردو ادب کا طالب علم ہوں، بجائے ہفتے کے بدھ کی شام کو پروگرام رکھا کریں۔ جب تو مجھے اب عجیب ہوتا ہے کہ وہ باقاعدگی سے، راجن ادیب اور سجاد نقوی کے ساتھ ہمارے پروگراموں میں شرکت کرتے، مفید مشورے دیتے اور ہماری حوصلہ افزائی فرماتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ کسی کے ادبی مزاج بزرگ نہیں تھے۔ وہ صرف ادب کے کاشت کار تھے اور تمام عمر ادب کی کاشت کرتے رہے۔ 20 مارچ (یوم وفات) پر بھی ان کی تحریر نوائے وقت میں شائع ہوئی۔ چونکہ سروس سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ کے بعد جب میں ماہنامہ ادب لطیف اور اخبار جہاں سے منسلک ہوا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ سینکڑوں لوگوں کو "ادب لطیف" اعزازی ارسال کیا جاتا ہے، بہت کم کو رسید بھیجنے کی توفیق ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان معدودے چند لوگوں میں سے تھے جو باقاعدگی سے رسالہ وصول ہونے کی اطلاع دیتے تھے اور اپنا تبصرہ بھی فرماتے تھے۔ پروفیسر سجاد نقوی کی خودنوشت "کچھ اپنے پہلے خیمہ سے" پر جب اخبار جہاں میں میرا کالم شائع ہوا تو بیدار کر مجھ سے فون پر پوچھنے لگے کہ کالم کیا ان کو دے آئے؟ میں نے کہا آج ہی ارسال کر دوں گا تو شفقت آمیز انداز سے کہا کہ ابھی خود دے کر آؤ اور میری طرف سے بھی مزاج پرسی کرنا، وہ چراغ سحری ہیں۔ ہر ایک کی دل جوئی کرنا ان کا شعار تھا۔

13 فروری کو Options ریستوران میں "تخلیق" کے بانی مدیر اظہر جاوید کی چوتھی برسی منعقد کی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے پہلے مدیرہ ادب لطیف کی خیر خیریت پوچھی اور پھر بتلانے لگے کہ ان کے والد چوہدری برکت علی بانی ادب لطیف پر میں نے کتاب مرتب کر کے خالد چوہدری کو دے دی تھی، وہ کب شائع ہوگی؟ پھر مشورہ دیا کہ ادب لطیف کے 80 سالہ نمبر سے پہلے اس کتاب کو شائع کرنا مناسب رہے گا۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے مدیر "سفید چھڑی" ڈاکٹر اقبال ایجا کی خیر خیریت دریافت کی اور مجھے تاکید کی کہ وہ باہمت انسان جب بھی لاہور آئیں تو مجھ سے ضرور ملوائیں۔ ان سے ملنے والوں کو Inspirations ملتی ہے۔

2004ء میں قرآنی ادعیہ والوں میں نے مرتب کی تو ان پر انور سدید صاحب نے نوائے وقت میں تبصرے کے آخر میں لکھ دیا کہ D-651 فیصل ٹاؤن سے یہ کتاب مفت میں حاصل کی جا سکتی ہے۔ زندہ دلان لاہور جوق در جوق آ کر وہ کتاب مفت میں لے

گئے۔ دوسری طرف ایک اور کرم فرمانے اخبار میں لکھ دیا کہ =/Rs.39 (35+4) کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر بھی یہ کتاب حاصل کی جاسکتی ہے۔ چونکہ پہلا ایڈیشن چند دنوں ہی میں مفت تقسیم ہو چکا تھا، جنھوں نے ٹکٹ بھیجے تھے، ان کے تقاضے شروع ہو گئے۔ اس زمانے میں لفافہ 4 روپے کا تھا۔ سب کو خط لکھے کہ خاطر جمع رکھیں جوں ہی دوسرا ایڈیشن شائع ہوگا فوراً ارسال کر دیں گے۔ اس اضافی خرچ اور فضول ٹیلی فون کالز سے پریشان ہو کر میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ کتاب پر صدیہ لاگت 35 روپے لکھا ہوا ہے تو آپ نے کیوں لکھ دیا کہ یہ کتاب مفت میں حاصل کی جاسکتی ہے۔ فرمانے لگے میرے خیال میں اتنی مفید کتاب 35 روپے میں مفت ہی کے برابر تو ہے۔

جب بھی میں ان سے دنیا کی آسان ترین زبان Esperanto کے بارے میں بات کرتا تو وہ سمجھاتے کہ اردو ہماری قومی زبان ہے، چاروں صوبوں میں رابطے کی زنجیر ہے، تمام برصغیر کے علاوہ دنیا کے اکثر حصوں میں اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود ہیں، اپنی تمام توانائیاں اس میں لگا دیں۔ انھیں اردو کی ترویج کے سلسلے میں تبلیغ کرتے ہوئے کبھی یہ وہم نہیں ہوا کہ ان کی ماں بولی، پنجابی خطرے میں ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے اردو ادب کو وہ کچھ دے دیا جو بڑی بڑی ادبی تنظیمیں اور سرکاری ادارے بھی مل کر نہیں دے سکتے۔ 2003ء میں تھوڑے وقت میں انھوں نے 225 کتابوں پر تبصرے لکھ کر ریکارڈ قائم کیا۔ ان کی بیشتر کتابیں مقابلے کے امتحانات میں شریک ہونے والوں کے لیے مددگار ثابت ہوئی ہیں۔ قلم ان کے لیے لائف سپورٹنگ ڈرگ کی طرح تھا۔ جسمانی طور پر تو وہ مضمحل ہو چکے تھے لیکن دماغی اضمحلال ان میں نہیں تھا۔ جو کتاب ان کو ملتی، وہ اس کی خوشبو اپنے مضامین اور کالموں کے ذریعے پورے ادبی چمن میں پھیلا دیتے تھے۔ نقاد تو اعلیٰ پائے کے تھے ہی، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، مکتوب نگار، تعارف نگار اور تبصرہ نگار بھی وہ منفرد تھے۔ ایک عرصے کے بعد پھر شاعری کی طرف لوٹے اور کیا خوب کہا ہے:

اے خوشا اپنا آشیانہ آسمانوں سے پرے — یہ زمیں تو ہو گی نا مہرباں، انور سدید
آفتاب تازہ کی آمد سے پہلے ہی یہاں — ٹوٹنے کو ہے ستم گر آسماں، انور سدید
روز و شب کی اس مسافت سے نمٹنے کے لیے — دھوپ کو اپنا بنا لے سائباں، انور سدید
وقت کا لبِ یہ تقاضہ ہے سجا لے آج تو — کاغذی پھولوں سے ایوانِ خزاں، انور سدید

آخری بار سرگودھا جانے سے قبل فون پر سمجھانے لگے، ایم اے او کالج چھوڑیں، TVETA میں عنقریب چینی زبان سکھلانے کا کورس شروع ہونے والا ہے۔ اس میں داخلہ لو اور چینی زبان سیکھ کر چینی ادب کو براہ راست پڑھو اور اس کا اردو میں ترجمہ کرو۔ ڈاکٹر صاحب! چینی زبان کورس میں داخلہ تو آسانی سے مل گیا لیکن اسے سیکھنا ہے بہت ہی مشکل کیوں کہ اس میں ہر لفظ کو پڑھا جاتا ہے اور ہر کو یاد رکھنا خاص مشکل کام ہے۔ دنیا سے جاتے جاتے آپ مجھے ایک آزمائش میں ڈال گئے ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ دعا کرتے رہیں کہ اللہ مجھے اس آزمائش میں سرخرو فرمائے!

ڈاکٹر صاحب نے افسانے بھی لکھے، جن پر بہت عمدہ کتاب ذوالفقار احسن نے مرتب کی ہے۔ آپ 1988ء میں ریٹائر ہوئے۔ 2016ء میں 87 سال کی عمر میں انتقال فرما گئے۔ 88 کتب تصنیف و تالیف کیں، چند ایک کا ذکر ابو ناصر مبارک مونگیری کی نظم سے ملاحظہ

فرمائیں، جو مرحوم کی زندگی میں لکھی گئی تھی۔

کبھی یہ ابتدائی دور میں لکھتے تھے افسانے
مگر کیوں دست کش ان سے ہوئے اب یہ خدا جانے

رخ انور کو ان کے ان کی مطبوعات میں دیکھیں
نہ کوئی حد حائل ہو تو ہر جہت میں دیکھیں

''ذرے فکر و خیال ان کا'' مرتب ہے کتاب ان سے
ہوا ہے ''انتقادات ادب'' کا سدباب ان سے

''کلاسیکی نقوش اقبال'' کے ''اردو کی تحریکیں''
وہ غالب کے خطوط نو ''وزیر آغا کی تحریکیں''

کہیں ''ذکر اس پری وش کا'' کہیں جذبات کے جلوے
کہیں ''اردو فسانے سے عیاں دیہات کے جلوے''

ہوا ''انشائیہ اردو ادب'' میں ضوفشاں کیوں کر
بدل کر رہ گیا آخر یہ غالب کا جہاں کیوں کر

جو لکھتا برمحل لکھتا جو لکھتے برملا لکھتا
بڑی تھے یہ وہ حالات ادب کا جائزہ لکھتا

یہ ہر عنواں بھی لکھتے ہیں یہ ہر کالم بھی لکھتے ہیں
یہ فرضی نام سے اخبار میں کالم بھی لکھتے ہیں

عقیدت ہے وزیر آغا سے ربط خاص رکھتے ہیں
بہت ان کے لئے یہ جذبہ اخلاص رکھتے ہیں

تو ہے فکر و نظر، ذہن رسا کی ان کی طراری
کبھی رکنے نہیں پائی قلم کی تیز رفتاری

◆◆◆

یادیں

چودھری برکت علی بانی ماہنامہ ''ادب لطیف''

(محمد خالد چودھری)

محترم والد چودھری برکت علی نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا، مقابلے کے امتحان کی تیاری مکمل تھی لیکن بانی پاکستان قائد اعظم کے فرمان پر تحریک پاکستان کے حصول کی جنگ میں شرکت کرنے کی وجہ سے اور ملک وقوم کے لئے اس امتحان کی قربانی دے دی۔ انہوں نے کوئی سرکاری عہدہ قبول کرنے سے معذرت کر لی اور اشاعتی شعبہ میں قسمت آزمائی کی۔ والد نے 1929ء میں پنجاب بک ڈپو اور 1935ء میں ماہنامہ ''ادب لطیف'' اور مکتبہ اردو قائم کئے۔ ماہنامہ ''ادب لطیف'' کی ادارت میری بہن صدیقہ بیگم انجام دے رہی ہیں۔ مجھے اپنے والد کے ساتھ زیادہ عرصہ رہنے کا موقع نہیں ملا مگر اس کے باوجود یادوں کے چراغ اب بھی دل و دماغ میں روشن ہیں۔ میں اکثر والد صاحب کے ساتھ اشاعتی ادارے میں ہوتا۔ ایک دن سعادت حسن منٹو ملنے آئے تو میری خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ پھر مرزا ادیب، عارف عبدالمتین، احمد ندیم قاسمی، ابن انشاء، اختر شیرانی، عبدالمجید سالک، عصمت چغتائی، قتیل شفائی، زبیدہ سلطان، ممتاز مفتی سب والد صاحب کو ملنے چودھری اکیڈمی تشریف لائے اور میری سب سے ملاقات ہوئی۔ میں خوش قسمت ہوں۔
18 اگست 1952ء کو وفات ہو گئے اور تمام ذمہ داری بھی ان
کے کندھوں پر ڈال گئے۔ اللہ تعالیٰ میرے والد، ماہر جاوید، ڈاکٹر انور سدید اور ان کے تمام رفقا کو جنت الفردوس میں آپس میں ملا دے اور اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

ڈاکٹر انور سدید اور "تخلیق"

قمر زمان

زبان و ادب کے فروغ میں علمی و ادبی رسائل نے ہمیشہ کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اپنے عہد کے بڑے اور اہم لکھنے والوں کی تحریریں پہلے ادبی رسائل میں شائع ہو کر عوام میں مقبول ہوئیں اور بعد میں انھیں کتابی صورت میں یکجا کیا گیا۔ ان رسائل کی اشاعت میں بعض شخصیات نے اپنی زندگیاں گزار دیں۔ تاہم ان کا نام اور کام آج بھی زندہ ہے۔ شیخ عبدالقادر "مخزن"، شاہد احمد دہلوی "ساقی"، نیاز فتح پوری "نگار"، صلاح الدین احمد "ادبی دنیا"، حکیم یوسف حسن خان "نیرنگ خیال"، محمد طفیل "نقوش"، احمد ندیم قاسمی "فنون"، ڈاکٹر وزیر آغا "اوراق"، صہبا لکھنوی "افکار" اور اظہر جاوید "تخلیق" اس کی چند ایک مثالیں ہیں۔

"تخلیق" اظہر جاوید نے 1969ء میں لاہور سے جاری کیا اور تھوڑے ہی عرصہ بعد اس نے نامور لکھنے والوں کی توجہ حاصل کر لی۔ کچھ لوگ آغاز ہی سے "تخلیق" سے وابستہ ہو گئے اور پھر عمر بھر ان کی یہ وابستگی قائم رہی۔ ان ہی میں سے ایک ڈاکٹر انور سدید بھی تھے۔ ڈاکٹر انور سدید ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے انھوں نے ادب کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی اور ہر ایک میں کامیابی حاصل کی۔ انھوں نے بطور شاعر، افسانہ نگار، انشائیہ نگار، شخصیت نگار، تبصرہ نگار، محقق اور نقاد اردو ادب کی بڑی خدمات انجام دیں۔ ادبی رسائل بھی ان کی خصوصی دلچسپی کا شعبہ تھے۔ اور وہ تواتر سے ان ادبی رسائل میں لکھتے رہے اور ادبی رسائل پر گہری نظر رکھتے تھے وہ جن رسائل میں تواتر سے شائع ہوتے رہے ان میں "تخلیق" کا نام سرفہرست ہے۔ کیونکہ وہ "تخلیق" کے آغاز سے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس سے وابستہ رہے۔ "تخلیق" سے اپنے تعلق کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں کہ:

> "ایک روز سجاد نقوی نے خبر دی کہ اظہر جاوید لاہور چلے گئے ہیں اور انھوں نے ایک رسالہ "تخلیق" نکال لیا ہے۔ جس کے ایک شمارے میں عبدالرشید الف صاحب کا مضمون شائع ہوا جس میں میری نظم "غالب پسند آم" کی عروضی غلطیوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ مجھے چونکہ عروض پر عبور حاصل نہیں تھا اس لیے اس مضمون کی اشاعت پر میں نے اظہر جاوید کا شکریہ ادا کیا اور اللہ کا کرم دیکھیے کہ یہ "عشق ابتدا" مستقل دوستی میں بدل گئی اور اب میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ "تخلیق" سے میرا رابطہ اس کے ڈیکلریشن کے بغیر چھپنے والے دور سے شروع ہوا اور نہ صرف اظہر جاوید کی زندگی میں چھپنے والے آخری شمارہ (فروری 2012ء) تک جاری رہا بلکہ ان کے بعد ان کے بیٹے سونان اظہر نے اپنے دورِ ادارت میں بھی قائم رکھا۔"
> ("تخلیق" مارچ 2016ء)

بلاشبہ یہ تعلق ہر گزرتے دن کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور ہم نے ڈاکٹر انور سدید کو "تخلیق" کے تقریباً ہر شمارے میں شامل دیکھا۔ ان کی شاعری، افسانے، انشائیے، جائزے، شخصی خاکے، مضامین اور خطوط "تخلیق" کا حصہ بنتے رہے۔ ان کا بھارت کا سفرنامہ "دلی

دور میں ''بھی پہلے پہل ''تخلیق'' میں قسط وار شائع ہوا۔ ڈاکٹر انور سدید کا اظہر جاوید کے ساتھ ایک خاص تعلق تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بہت قریب سے جانتے تھے۔ اسی قربت کی بنیاد پر ڈاکٹر انور سدید نے اپنی کتاب ''الماریوں میں بند لوگ'' میں اظہر جاوید کی شخصیت کی خوبصورت تصویر کشی کی وہ اظہر جاوید اور ''تخلیق'' کے حوالے سے رقم طراز ہیں کہ:

> ''اظہر جاوید اردو ادب کی اہم شخصیت تھا۔ اس نے کوہ بے ستون کو اپنے تیشۂ ضرب سے کاٹ کر ادب کی جوئے شیر رواں کی تھی۔ جوئے شیر اس کا رسالہ ''تخلیق'' تھا جس میں تین باتوں کو ہمیشہ فوقیت دی گئی۔ اول: اعلیٰ ادب کی ترویج و اشاعت۔ دوم: اعلیٰ تخلیق کاروں کی تلاش، جستجو اور نئے لکھنے والوں کا تعارف اور ان کے دل میں ادب کی شمع جلائے رکھنے کی کاوش۔ سوم: سینئر ادبا کا احترام اور ان کی ادبی خدمات کا وسیع پیمانے پر تعارف، توضیح، تفہیم اور تشریح۔''

یہ نہ صرف ان کی طرف سے اظہر جاوید کے لیے کلمات تحسین ہیں بلکہ ''تخلیق'' کے حوالے سے اظہر جاوید کے آدرش کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ جو لوگ اظہر جاوید سے واقف ہیں وہ ڈاکٹر انور سدید کے الفاظ کی صداقت کے مداح ہیں۔ اظہر جاوید نے بہت سارے نئے لکھنے والوں کو ''تخلیق'' کے ذریعے متعارف کرایا ان کی بنیادی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ ڈاکٹر انور سدید ''تخلیق'' میں شائع ہونے والی اصناف کا بہترین جائزہ پیش کرتے تھے اور اس حوالے سے ''تخلیق'' کے کردار کے مداح تھے۔ نظم کے فروغ کے حوالے سے وہ اس کی خدمات کا یوں اعتراف کرتے ہیں۔ عنوان ہے ''تخلیق 2000ء میں نظم''

> ''اس برس کم و بیش پچاس شعرا نے حرمت دانائی کی نظمیں پابند اور معریٰ اور آزاد تکنیک میں ''تخلیق'' میں پیش کیں اور قاری کے سامنے اپنا باطن عریاں کر دیا۔ بیسویں صدی کے اس آخری سال کی نظموں کا جائزہ لکھتے ہوئے مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اردو نظم کے ارتقا میں ''تخلیق'' نے بڑی مسلسل مزاجی، موضوعاتی تنوع اور شعرا و شاعرات کی کثرت فکر و خیال سے اپنا حصہ شامل کیا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ اظہر جاوید کی اس خدمت کو ہمیشہ یاد رکھے گی۔''
>
> (''تخلیق'' اکتوبر 2001ء)

ڈاکٹر انور سدید اپنے سالانہ جائزوں میں ''تخلیق'' میں شائع ہونے والی تمام اصناف پر بے لاگ تبصرہ کرتے تھے جس سے قاری کے لیے ان کی تفہیم آسان ہو جاتی تھی اور ان تخلیقات میں اس کی دلچسپی بڑھ جاتی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید کے لکھے ہوئے تبصروں پر ''تخلیق'' کے قارئین اپنے بھرپور ردعمل کا اظہار بھی کرتے تھے جس سے ایک مکالمے کی صورت بھی پیدا ہو جاتی تھی اور یہ ردعمل عموماً خطوط کی صورت میں ہوتا جو ''انجمن خیال'' کے نام سے ''تخلیق'' کا مستقل حصہ ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے ''تخلیق 2007ء کے جائزے'' پر جمیل آذر یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''ڈاکٹر انور سدید کا ''تخلیق 2007ء کا مختصر جائزہ'' احمد ستانی کتابوں پر تبصرے اور احمد فراز پر تحقیقی مضمون علم افروز ہیں۔ ان کا قلم توانا اور ذہن روشن ہے۔ اللہ انھیں سلامت رکھیں۔ وہ قلم کا حق ادا کرتے رہتے ہیں اور بھرپور انداز میں ادبی تخلیقات میں شرکت کرتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بڑا مشکل کام ہے اور یہ انھی کا حصہ ہے۔''
>
> (تخلیق دسمبر 2008ء)

اس طرح کے بہت سارے تبصرے خطوط کی صورت میں "تخلیق" میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مختلف ادبی رسائل میں اپنے خطوط کے ذریعے بھی تخلیقات پر اپنا ردِعمل پیش کیا ہے۔ وہ "تخلیق" کی "انجمن خیال" پر بھرپور تبصرہ کرتے تھے بلکہ "تخلیق" میں خطوط کی اشاعت کا مشورہ انھوں نے ہی دیا تھا۔ اس حوالے سے انھوں نے ایک دلچسپ واقعہ بھی لکھا ہے جس کا تجزیہ ادب کے قارئین کی دلچسپی کے لیے درج کرتے ہیں:

> "ایک ممتاز ضخیم ادبی پرچے میں پڑھنے والوں کے خطوط شامل نہیں کیے جاتے تھے میں نے مدیرِ محترم کی توجہ اس طرف دلائی تو یہ سن کر حیرت زدہ رہ گیا کہ وہ ادیب کو اس کی شہرت کے بارے میں باخبر رکھنے پر آمادہ نہیں تھے کہنے لگے "ادیب کو ہرگز یہ نہیں جتانا چاہیے کہ اسے پڑھنے والے کتنا پسند کرتے ہیں اس طرح وہ اپنی تخلیقات کی اشاعت کے لیے مدیر کے انگوٹھے تلے دبا رہتا ہے۔" ("تخلیق" اگست 2009ء)

پھر خود ہی انھوں نے لکھا ہے کہ "اظہر جاوید اس مزاج کے مدیر نہیں ہیں چنانچہ انھوں نے خطوط لکھنے والوں کی رائے کا ہمیشہ احترام کیا ہے اور "تخلیق" کے قارئین اس بات سے آگاہ ہیں کہ یہ پرچہ دنیا بھر میں اہلِ ادب تک پہنچتا ہے اور اس میں پوری دنیا سے ردِعمل بھی "انجمن خیال" کے ذریعے سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے "تخلیق" کو نئے لکھنے والوں کی نرسری قرار دیا جس نے بہت سارے نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا۔ انھوں نے "پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ" جیسی بے مثال کتاب لکھی جس میں ادبی رسائل کے ماضی و حال کا بہترین نقشہ پیش کیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی اب تک منفرد کاوش ہے جس نے اردو ادب کے قارئین سے بے پناہ داد وصول کی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے "تخلیق" کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ""تخلیق" کا بنیادی مقصد اس روشنی کو پھیلانا ہے جو ادیب کے بطون سے پھوٹتی ہے اور چاندنی کی طرح دل و جان کو راحت بخشتی ہے۔ اس مقصد کے لیے اظہر جاوید نے ممتاز ادبا کا تعاون حاصل کیا اور "تخلیق" کو ایک "نرسری" بنا دیا جس میں ادب کی نئی پود پروان چڑھتی ہے۔" (ص۔ 227)

ڈاکٹر انور سدید "تخلیق" کے ہر دور میں اس سے وابستہ رہے ہیں اور اپنی متنوع تحریروں کے ذریعے اس کے قارئین کو متاثر کرتے رہے ہیں۔ 1984ء میں "تخلیق" کا افسانہ نمبر شائع ہوا تو اس میں ڈاکٹر انور سدید کا مضمون "افسانے کی کروٹیں" خاص طور پر شامل تھا اور اسی عنوان کے تحت بعد میں انھوں نے ایک پوری کتاب لکھی۔ انھوں نے مرزا غالب کے اسلوب میں خطوط کی پیروڈی لکھنے کا سلسلہ شروع کیا جو کئی سال "تخلیق" میں شائع ہوتے رہے۔ وہ اپنے اسلاف کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے ساتھ ساتھ نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ وہ دنیا بھر سے شائع ہونے والے ادبی رسائل پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس حوالے سے ان کے تبصرے قارئینِ ادب سے بھرپور داد وصول کرتے تھے۔ وہ ادبی جائزوں میں اپنی تحریروں کو زیرِ بحث نہیں لاتے تھے جس پر اظہر جاوید خود تبصرہ کرتے تھے۔ حالانکہ ان کی تخلیقات اور تحریریں "تخلیق" میں سب سے زیادہ ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے "تخلیق 2000ء کا مختصر جائزہ" پیش کیا تو ہر موضوع پر بھرپور تبصرہ کیا لیکن اپنی کسی تخلیق کو جائزے میں شامل نہیں کیا۔ اس پر اظہر جاوید نے نوٹ لکھا کہ اس جائزے میں انور سدید نے اپنی تحریروں، تخلیقات کا ذکر نہیں کیا جو حسبِ ذیل ہیں: اس ذیل میں اظہر جاوید نے ان کی نظم، غزل، ورق ورق ماضی، جائزے، چند غیر ملکی کتابیں، ایک پاکستانی کی نظر میں، رفتگاں، تبصرے، انجمن خیال اور کئی کتابوں پر مضامین کی نشاندہی کی۔

ڈاکٹر انور سدید بہت زود نویس تھے اور ان کی تحریریں معاصر علمی و ادبی اخبارات و رسائل میں تواتر سے شائع ہوتی تھیں۔ وہ بیک وقت کئی رسائل کے جائزے لکھتے، کتابوں پر تبصرے کرتے، ادیبوں کی وفات پر تعزیت نامے لکھتے تاہم ''تخلیق'' میں ان کی تخلیقات سب سے زیادہ تھیں۔ ہر شمارے میں ان کی تحریریں دیگر لکھنے والوں سے زیادہ ہوتی تھیں۔ انھوں نے اگست 2009ء میں 3 یا 4 قسطوں میں ''تخلیق 32 برس پہلے'' کے زیرِ عنوان تمام اصناف پر بھرپور جائزہ پیش کیا۔ ''تخلیق'' کے معروف سلسلے ''انجمن خیال'' میں شائع ہونے والے بڑے بڑے ادیبوں کے خطوط کا جائزہ لیا۔ جن ادیبوں کے خطوط پر تبصرہ کیا گیا ان میں معروف ادیب ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر خالد محمود اعوان، مستنصر حسین تارڑ، ڈاکٹر طاہر تونسوی اور یوسف حسن کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنے سینئر اور معاصرین کے علاوہ نئے لکھنے والوں کی تحریروں کو بھی ہمیشہ توجہ سے پڑھا اور انھیں بھرپور انداز میں سراہا اور ان کی ہر ممکن حوصلہ افزائی کی۔ وہ اظہر جاوید کی نئے لکھنے والوں کو متعارف کرانے کے حوالے سے بڑی تعریف کرتے تھے بلکہ انھوں نے یہاں تک لکھا ہے کہ:

''گزشتہ ربع صدی میں جتنے نئے لکھنے والے ''تخلیق'' نے روشناس کرائے ہیں اتنے شاید ضخیم اور بڑے ادبی پرچوں نے نہیں کرائے۔'' (پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ)

اور یقیناً اس حوالے سے ''تخلیق'' کا کردار قابلِ تحسین ہے۔ پاکستان میں لکھنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے جنھیں ''تخلیق'' نے متعارف کرایا، ان کی حوصلہ افزائی کی اور اس میں ایک بڑی تعداد خواتین لکھاریوں کی بھی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اس حوالے سے جن خواتین کا ذکر کیا ہے ان میں پروین عاطف، عذرا اصغر، عالیہ بخاری، بانو، سرحب قاسمی، زہرہ حسین، رعنا اقبال، ارجمند شاہین، شگفتہ نازلی اور نوشابہ خاتون کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید نے ''تخلیق'' سے اپنے تعلق کو بڑی اہمیت دی اور اظہر جاوید کے انتقال کے بعد بھی اپنا بھرپور قلمی تعاون جاری رکھا۔ انھوں نے اظہر جاوید کے انتقال کے بعد شائع ہونے والے ''اظہر جاوید نمبر'' میں بھی بھرپور انداز میں اظہر جاوید کو خراجِ تحسین پیش کیا بلکہ انھوں نے ''اظہر جاوید کے کردار کے اس نادر گوشے'' کو بھی آشکار کیا جو انھوں نے احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کو قریب لانے کے حوالے سے ادا کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے اظہر جاوید کے وہ خطوط بھی شائع کیے جو انھوں نے احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر وزیر آغا کو صلح کے حوالے سے لکھے تھے۔ یوں انھوں نے اظہر جاوید سے اپنے دیرینہ تعلق کو آخر وقت تک نبھایا۔ ڈاکٹر انور سدید نے ایک بھرپور ادبی زندگی گزاری اور ان کی خدمات کا ہر سطح پر اعتراف بھی کیا گیا۔ حکومت اور ادبی تنظیموں کی طرف سے انھیں کئی اعزازات سے نوازا گیا۔ ''تخلیق'' کے موجودہ مدیر سونان اظہر نے جب ''تخلیق ایوارڈ'' کا اجرا کیا تو جیوری کے ایک پینل نے 2013ء کے ایوارڈ کے لیے ڈاکٹر انور سدید کا نام منتخب کیا۔ جو یقیناً ان کی بے پناہ ادبی خدمات کا برملا اعتراف تھا۔ ڈاکٹر انور سدید کا 20 مارچ 2016ء کو انتقال ہوا تو مارچ 2016ء کے ''تخلیق'' میں ان کی یہ تخلیقات شائع ہو چکی تھیں۔ 1- تخلیق ایوارڈ یافتہ نیر جہاں (تاثراتی مضمون) 2- درویشِ عشق مست (اظہر جاوید کے حوالے سے) 3- بیک وقت ماہنامہ ''تخلیق'' کے ساتھ (جائزہ) 4- تبصرے انور سدید کے (چھ کتابوں پر تبصرے)

راقم نے ڈاکٹر انور سدید اور ''تخلیق'' کے تعلق کے حوالے سے اپنی بساط کے مطابق یہ مختصر معلومات بہم پہنچائی ہیں اور مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہے کہ اس حوالے سے کئی اہم گوشے ابھی تحقیق طلب ہیں۔

◆◆◆

تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیسا!
تبت سنو کا روزانہ استعمال
تبت سنو - ایشیا کی مشہور رنگت نکھارنے والی کریم

صاحبِ علم، صاحبِ قلم اور صاحبِ ایمان شخصیت
ڈاکٹر انور سدید

سلمیٰ اعوان

ہفتے میں ایک بار یا کبھی کبھی دس بارہ دن بعد انہیں فون کرتی۔ ان کی طبیعت کا پوچھنا میرا معمول تھا۔ عمر کی جس منزل میں وہ تھے وہاں ان کا جوانوں کی سی توانائی کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھنا یقیناً خدا کی ان پر خصوصی نظرِ عنایت اور اس کا ایک تحفہ تھا۔

"آپ کیسے ہیں؟" میں پوچھتی۔ جواباً وہ مجھے اپنی بیماری کی تفصیل بتاتے۔ میں ہنس کر کہتی ڈاکٹر صاحب خدا آپ کو نظرِ بد سے بچائے۔ جس عمر کو آپ پہنچے ہیں اس میں آپ موجود ہوتے ہیں اور موجودگی بھی بڑی بھرپور اور طمطراق والی ہوتی ہے۔ جان لیجیے اور مان جائیے کہ آپ کو کوئی بیماری نہیں۔ آپ تندرست و توانا ہیں۔ وہ ہنس پڑتے۔

انہوں نے اتنا کام کیا کہ اس چھوٹے سے مضمون میں اس کا احاطہ ہی نہیں کیا جا سکتا۔ مجھے تو ان کی شخصیت کے ان پہلوؤں پر بات کرنی ہے جو وقتاً فوقتاً میرے سامنے آئے۔ ایک بار پاپولر فکشن لکھنے اور سنجیدہ ادب لکھنے والی خواتین کے حوالے سے بات ہوئی۔ وہ ڈائجسٹوں میں لکھنے والیوں کو کوئی مقام دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ میری ان سے اس پر اکثر گرما گرم بحث رہتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب میں کہتی۔ آخر آپ لوگ اس معاملے میں اتنا تعصب کیوں رکھتے ہیں؟ اعتراف کریں کہ یہ خواتین ادب کی قاریاں تیار کر رہی ہیں۔ ذہنی بلوغت کے بغیر سنجیدہ ادب تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ کیا سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی قرۃ العین حیدر کے "آگ کا دریا" کو سمجھ سکتی ہے یا ڈاکٹر انور سجاد کی "جنم روپ" کو ہضم کر سکتی ہے۔ نہیں حضور نہیں۔ اسے ایسی ہی ہلکی پھلکی تحریروں سے ذہنی وسعت حاصل کرنے دیں۔ مان جائیے۔

ہماری ٹیلی فونک گفتگو ہمیشہ پی ٹی سی ایل پر ہوتی تھی۔ آواز صاف اور گفتگو کا دورانیہ کبھی کبھی گھنٹے پر پھیل جاتا۔ مشرقی پاکستان پر لکھے جانے والے میرے ناول "تنہا" کے وہ بہت مداح تھے۔ اپنی ایک بار کی گفتگو میں انہوں نے کہا کہ اردو ادب میں تاریخ کو ناول کی صنف میں شامل کرنے کے تجربے بہت کم ہوئے ہیں اور جہاں تاریخ کو ناول نگاری کی آنکھ سے دیکھنے اور تاریخی شخصیات، واقعات اور ماحول کو ناول کا موضوع بنانے کی کوشش کی گئی ہے، وہاں تاریخ اور ناول کی کہانی میں کلی امتزاج پیدا نہیں ہو سکا۔ مگر میں تحسین سراہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تم نے "تنہا" میں جس خوبصورت مہارت اور چابکدستی سے بنگال اور پاکستان کی تاریخ کو سمویا ہے اس سے ایک شاہکار تخلیق ہوا۔

اگر وہ بسیار نویس تھے تو وہیں بہت پڑھنے والے بھی تھے۔ کوئی اچھی تحریر کہیں چھپتی تو وہ ان کی باریک بین نظر سے پوشیدہ نہ رہتی۔ اچھی تحریر لکھنے والے سے اگر واقف ہوتے یا ناواقف انہیں اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اپنے مضمون میں اس کا ذکر کرنا کبھی نہ بھولتے۔ حیرت کی بات کہ وہ ڈائجسٹوں کے بھی قاری تھے۔ کوئی اچھی کہانی یا افسانہ ان کی توجہ کھینچ لیتا۔ تحریر میں انہیں کوئی شعلہ نظر آ جاتا تو پھر وہ اس کا

ذکر کرنا اپنا فرض سمجھتے۔

ایسے میں میں انہیں فون پر ضرور کہتی۔ اب بتایئے ڈاکٹر صاحب آپ اپنی کہی ہوئی بات کی خود ہی نفی کر رہے ہیں۔

وہ ہنستے اور کہتے دیکھو بھئی یہ پرچے مجھے آتے ہیں۔ میں ان کی پہنچ کا ذکر بھی ضرور کرتا ہوں۔ مگر آپ کا ادارہ توجہ کھینچ لیتا ہے۔

اب ان کا ذکر نہ کروں تو بے ایمانی ہوگی۔

ان کی ساری زندگی درویشی میں گزری۔ رزق حلال کمانے اور کھانے والی ہستی کی محبت صرف کتابیں تھیں۔ خدا انہیں بلند درجات نصیب کرے۔

◆◆◆

ڈاکٹر کیول دھیر...... میری نظر میں

حسن عسکری کاظمی

کیول دھیر ہند و پاک میں جانا پہچانا اور دیکھا بھالا محبت کے خمیر میں گندھا ہوا ایک ایسا کہانی کار ہے جس کا اعتبار مثال کو ہر آ چکا ہے۔ یہ حضرت لاہور میں کہاں وارد ہوتے ہیں مجھے تو یوں لگتا ہے کہ وہ یہیں کہیں رہتے ہیں۔ انہیں لاہور سے اور لاہور میں رہنے والے قلم کاروں، گلی محلوں اور فنکاروں سے پیار ہے۔ لاہور ان کے دل میں جگمگاتا وہ قریہ لازوال ہے جہاں کی صبح صبح بہاریں اور شام شام ادھر سے زیادہ حسین ہے۔ یہاں کی ہر شے انہیں محبوب کے انداز خرام اور جلوہ صد رنگ کی طرح بار بار دعوت نظارہ دیتی ہے۔ کیول دھیر کا دھرم تو پیار بے پناہ پیار ہے۔ ان کی گفتگو میں مٹھاس اور کہانی میں آدمی ہی ان کا موضوع گفتگو قرار پایا ہے۔ ان کی گرد و پیش میں گوشت پوست کے سانس لیتے مرد و زن ان سے ہمکلام ہوتے ہیں۔ وہ نئے امکانات کی کھوج میں بازاروں، گلیوں، محفلوں اور ارباب دانش کی صحبتوں میں اپنی کہانی تلاش کرتے ہیں۔

یہاں لاہور میں اظہر جاوید سے دیرینہ رشتہ محبت رکھتے ہیں۔ "تخلیق" کے اوراق ان کے افسانوں، مکالموں اور حکایات سے اپنی ثروت مندی کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ "تخلیق" کا سرچشمہ اسی طرح جاری و ساری ہے۔ سونان اظہر نے "تخلیق" کو امانت سمجھ کر یہ عہد کیا کہ وہ اظہر جاوید کے ادبی ورثے کی حفاظت کریں گے۔ کیول دھیر نے دوست کی نشانی کو زندہ و پائندہ رکھنے پر سونان اظہر کو مبارک باد پیش کی۔ کیول دھیر نے جہاں اور بہت کچھ لکھا وہاں "لو سٹوری فرام انڈیا" جیسی بہترین کتاب لکھ ڈالی۔ یہی نہیں انہوں نے پاک و بھارت کی عوامی فکر کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے "ساحر لدھیانوی ایوارڈ" کا اجرا کیا۔ کیول دھیر سادہ لباس، سادہ انداز اور بے تکلف رویہ سے سب کو بھاتے ہیں۔ وہ مجھے کسی ایسی کہانی کا کردار نظر آتے ہیں جو کہانی ابھی صفحہ قرطاس پر نہیں اتری۔

ع وہ آدمی ہے مگر دیکھنے کی تاب نہیں

ڈاکٹر انور سدید سے جڑی چند یادیں

قمر ریاض (اومان)

ڈاکٹر انور سدید چلے گئے ان سے ایک ملاقات کی چند یادیں اور اس سے پہلے کی کچھ باتیں!!!

میں جن دنوں منڈیالی بیج طرز (شیخوپورہ روڈ) میں انجینئرنگ کے فائنل ایئر ایگزیم کے بعد عارضی طور پر تعینات تھا تو میں نے شہر کے چند دوستوں کو ڈھونڈ نکالا جو لاہور میں کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں مقیم تھے اور شاید گرا اچھروٹی کے ساتھ ہی کیپول ہمبرگی مارکیٹ کے اوپر کرائے پر ایک فلیٹ لے لیا یوں اچھرہ بازار بالکل سامنے پڑتا تھا اور ہر چیز کھانے پینے کی آسانی سے میسر تھی نیل پر شام کے وقت ہم دوستوں کا کھڑے ہو کر آتی جاتی گاڑیاں دیکھنا اور پاس سے گزرتے لوگوں کا مشاہدہ کرنا معمول کی بات تھی انہی دنوں جو سب سے اہم موضوع ہماری زندگی میں شامل تھا وہ آنے والے دنوں میں خود کو کسی بہتر پوزیشن پر دیکھنا اور ترقی کے وہ خواب تھے جو ہر شام آنکھوں میں اتر آتے اور ہم دودھ سے اجلے کپڑے پہنے ٹائی والی لگائے سوٹڈ بوٹڈ شخص کو نیل کے نیچے کسی خوبصورت گاڑی میں کسی اپسرا کے ساتھ اترتے اور ساتھ چلتے دیکھتے تو کتنے ہی ارمان آنکھوں میں اتر آتے اور تصور میں اپنے خوابوں کی ملکہ کو اسی گاڑی کا سوار پاتے۔ انہی دنوں ریڈیو ایف ایم پر فرحت تقوی صاحب کی ڈائریکٹر شپ میں کوئی ایک آدھ مہینہ میں نے بھی ایف ایم 101 جوائن کیا جن دنوں اس کا آغاز تھا اور جلد ہی اس کی بڑی دھوم دھام ہونے لگی مگر میری شفٹ ڈیوٹی ہونے کی وجہ سے دو ہی مہینے میں چھوڑنی پڑی۔

اردو ادب کی لت تو سرگودھا میں زیر تعلیم تھے۔ پروفیسر یوسف خالد صاحب کی زیر نگرانی ہاسٹل لائف میں لگ چکی تھی مگر اس کو جلا لاہور آ کر ملی مگر اس کی بنیاد سرگودھا ہوسٹل میں پڑی مجھے اچھی طرح یاد ہے پروفیسر یوسف خالد (جو خود بھی اعلیٰ شاعر ہیں) کبھی ہمیں پروفیسر غلام جیلانی اصغر کے گھر لے جاتے اور کبھی ہوسٹل میں چند ادیبوں کو ہر پندرہ دن بعد ہاسٹل کے بزم ادب پروگرام میں دعوت دیتے جن میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، غلام جیلانی اصغر، ممتاز عارف، یونس خیال، مسعود رضا خلیل، ذوالفقار احسن اور عابدہ خورشید اکثر بیشتر شریک ہوتے رہے۔

سرگودھا اسکول آف تھاٹ کی اصطلاح ان دنوں اکثر سننے میں آتی اور رائٹرز کلب سرگودھا میں ہونے والی محافل کا بڑا اہم کردار رہا سب سے بڑھ کر ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید نے اسے باقاعدہ ایک تحریک کی شکل میں نہ صرف چلایا بلکہ ڈاکٹر وزیر آغا کی ادارت میں چھپنے والے "اوراق" میں باقاعدہ ایک خاص حصہ سرگودھا کے ادیبوں اور شاعروں کو دیا گیا مگر یہ تاثر بھی پیدا کر دیا تھا انور سدید صاحب نے عمر بھر ڈاکٹر وزیر آغا کا ساتھ دیا اور اس ساتھ اور محبت میں ایک وقت یہ بھی آیا کہ احمد ندیم قاسمی کی ادارت میں چھپنے والا "فنون" اور "اوراق" میں لکھنے والے بٹ گئے اور کہیں پھر انشائیہ کی تحریکیں چلیں اور کہیں زور و شور سے افسانہ اور غزل کو فروغ ملا "اوراق" میں تنقید کو ادب کے بھرپور حصے کے طور پر پیش کیا جاتا اور دوسری طرف فنون میں نئے سے نئے افسانہ نگار اور شاعروں کی غزلیں بھرپور طریقے سے شائع کی جاتی مضمون لکھوائے جاتے اور مختلف آرا سامنے آتی جبکہ دونوں ادبی پرچوں میں تنقید کے میدان میں ایک طرف ڈاکٹر انور سدید

تھے اور دوسری طرف ڈاکٹر سلیم اختر اور پھر وہ وزیرستان کے ایک طرف ڈاکٹر وزیر آغا سمجھے جاتے دوسری احمد ندیم قاسمی مگر سچ تو یہ ہے کہ جتنی زیادہ مین سٹریم میں رہ کر احمد ندیم قاسمی نے ادیبوں اور شاعروں کی تربیت کی ہے وہ وزیر آغا کے حصے میں ایک —— نہیں آئی آج زیادہ تر بڑے ادیب "فنون" اور "اوراق" میں اس وقت مسلسل لکھتے رہے مگر اس دو دھڑے کے ادبی ماحول نے بھی اردو ادب کا فائدہ ہی کیا ہوگا نقصان نہیں ڈاکٹر انور سدید کی وفات پر ساری باتیں ذہن میں آتی جا رہی ہیں۔

ان دو دھڑوں سے پہلے طفیل احمد صاحب کی ادارت میں چھپنے والے "نقوش" نے بھی اردو ادب کو بڑے بڑے ادیب اور شاعر عطا کیے۔ میں لاہور میں مقیم ہونے کی وجہ سے ہر روز ڈاکٹر وزیر آغا کی لاہور میں رہائش پر چلا جاتا جہاں پر ہر وقت ادبی محفلیں جمی ہوتی تھی اور آغا صاحب کا خانساماں چائے اور گرما گرم کیک سے تواضع کرتا ایک وقت تو ایسا آیا کہ جب چائے اور کیک کھانے کو بہت دل کر رہا ہوتا تو میں آغا صاحب کے گھر چلا جاتا اور وہ بھی بڑی شفقت سے پیش آتے۔ انہی دنوں ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار ایک دن کہنے لگے قمر یار چلو مجھے وزیر آغا کے گھر لے چلو وہاں سے انور سدید کو بھی ملتے چلیں گے۔ میں نے کہا میں تو لاہور ہی ہوں آپ کسی بھی وقت تشریف لے آئیں ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار بہت آتی جاتی پھرتی ادبی شخصیت ہیں مگر ان کو ایسے ادبی دورے پر نکلنے کے لیے "محکوم مغربی" سے خصوصی اجازت لینا پڑتی ہے۔ تو ایک روز خوشی خوشی کہنے لگے قمر ہی اجازت مل گئی ہے میں لاہور آ رہا ہوں پہلے ہم لوگ اسی وقت ڈاکٹر انور سدید کے دفتر پہنچے ڈاکٹر صاحب ادبی صفحے کے انچارج تھے انھوں نے ہمیں بیٹھنے کا کہا اور چائے منگوائی پھر ڈاکٹر سلیمان کہنے لگے یہ قمر ریاض ہے سرگودھا سے تعلیم حاصل کر کے آج کل لاہور میں عارضی طور پر تعینات ہے اور وزیر آغا کے گھر ان کا کافی آنا جانا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا "سلیمان ایک وہ بھی وقت تھا میں شام میں وزیر آغا سے مل نہیں لیتا تھا تو مجھے لگتا تھا کہ وہ دن میری زندگی میں کبھی آیا ہی نہیں" اتنی محبت بھرا اظہار دیکھ کر ڈاکٹر سلیمان کی آنکھیں نم ہو گئیں ہم جتنی دیر ڈاکٹر انور سدید بیٹھے رہے اردو ادب اور وزیر آغا سے متعلق اور ان سے محبت کی باتیں کرتے رہے اس سارا طبیعت پر ملال کرتے رہے جس کی وجہ سے ان کی ملاقات اب پہلے کی طرح آغا صاحب سے نہیں ہو پاتی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید کا کام تنقید، تبصرہ نگاری اور ان کے لازوال مقالوں کے حوالے سے ہمیشہ گونجتا رہے گا ان سے ایک ہی ملاقات رہی مگر اس ایک ملاقات میں اس شخص کے لیے بے پناہ محبت تھی جو خود چلتا پھرتا اردو ادب تھا۔ جسے لوگ آج ڈاکٹر انور سدید کے نام سے جانتے ہیں۔ اللہ ڈاکٹر انور سدید کو غریق رحمت کرے۔ آمین!

◆◆◆

صلائے عام

بانی مدیر "تخلیق" جناب اظہر جاوید کی روایت کے مطابق ادارہ "تخلیق" نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔ ہم انہیں دعوت دیتے ہیں کہ ہمیں اپنے مضامین، افسانے اور شاعری کمپیوٹر کتابت میں ارسال کریں۔ ای میل کے ذریعے بھیجی کوئی تحریر ادارے کو قابل قبول نہیں۔ مختصر اور معیاری تحریریں اشاعت کے لئے قبول کی جائیں گی اور سال کے نئے بہترین قلم کار کے نام ایک سال تک "تخلیق" اعزازی طور پر جاری کیا جائے گا۔ (مضامین کی ایڈیٹنگ کے حقوق محفوظ ہیں۔) (ادارہ "تخلیق")

کون ڈاکٹر انور سدید؟

سونان اظہر جاوید

14 فروری 2012ء کو والد محترم اظہر جاوید کی وفات نے مجھے اندر سے توڑ دیا تھا۔ اب "تخلیق" جس کی آبیاری والد صاحب نے خونِ جگر سے کی تھی، کی اشاعت کو جاری رکھنے یا نہ رکھنے کا فیصلہ مجھے چند روز میں کرنا تھا جس کے لیے میں نے دوستوں سے مشاورت شروع کی۔ اس ضمن میں والد صاحب کے دفتر گیا اور دروازے پہ لگا 4-11 الحمرا تو غم دل اور بڑھ گیا۔ یہ دروازہ تو مجھے ہمیشہ کھلا ملتا تھا۔ اندر داخل ہوا تو ہر طرف ابو کی خوشبو آ رہی تھی۔ ہر آہٹ پر ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ابھی اندر داخل ہوں گے اور میں احتراماً ان کی سیٹ سے اٹھ کھڑا ہوں گا۔ ہر طرف ان کے قہقہوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ میں اپنی سوچوں میں گم "تخلیق" کے مستقبل کا سوچنے لگا۔ ادب میرا شعبہ نہیں تھا اور والد صاحب نے مجھے اس سے دور ہی رکھا۔ اس لیے صرف چند ادبی ناموں کے علاوہ میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔

اگلے روز والد صاحب کے دوستوں کو مشاورت کے لیے دعوت دی تو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر یونس جاوید، سرفراز سید، شاہد بخاری اور اعزاز احمد آذر تشریف لے آئے۔ بات چیت کا سلسلہ آگے بڑھا تو کسی دوست نے کہا ڈاکٹر انور سدید کو بھی اس مجلس مشاورت میں شریک ہونا چاہیے کیوں نہ سونان آپ ان سے بھی رابطہ کریں۔ میں نے حیرانی سے کہا؟

کون ڈاکٹر انور سدید؟

دوست نے مسکرا کر جواب دیا کہ آپ نہیں جانتے ڈاکٹر صاحب اظہر جاوید کے قریبی مخلص رفقا میں سے ہیں اور ادب میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں فوراً ابو کے ہاتھ سے بنی ہوئی احباب کے فون بک کی لسٹ اٹھائی اور ڈاکٹر انور سدید کو کال ملائی۔ سلام عرض کیا ڈاکٹر صاحب میں اظہر جاوید کا بیٹا ہوں اور آپ سے ملاقات چاہتا ہوں؟ بڑی گرم جوشی سے جواب دیا اور کہا میرے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں، جب مرضی آ جائیں۔ اگلے روز ڈاکٹر صاحب کے پاس حاضر ہوا اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اطمینان سے میری بات سنی۔ بہت خوش ہوئے اور کہا میں خود چاہتا ہوں کہ "تخلیق" میری زندگی میں بھی چھپتا رہے۔ آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں آپ سے عہد کرتا ہوں میرا قلمی تعاون و معاونت آپ کو میری آخری سانس تک ملتی رہے گی اور انھوں نے یہ عہد آخری سانس تک پورا کیا۔ ڈاکٹر صاحب سے یہ میری پہلی باضابطہ ملاقات تھی جو فروری 2012ء میں ہوئی۔ ان سے ملاقات کے بعد فوری طور پر "اظہر جاوید نمبر" کی اشاعت کا فیصلہ کیا اور 3 ماہ کی قلیل مدت میں "اظہر جاوید" نمبر شائع کر دیا۔ جون 2012ء میں اظہر جاوید نمبر کی اشاعت ادبی دنیا کے لیے اعلان تھا کہ "تخلیق" ان پرچوں کی فہرست سے باہر نکل آیا ہے جو مدیران کی وفات پاتے ہی مدفون ہو گئے۔ "اظہر جاوید نمبر" کی کامیابی پر سب سے زیادہ خوش ڈاکٹر انور سدید تھے۔ انھوں نے میری خوب حوصلہ افزائی کی۔ پیرانہ سالی کے باوجود آپ دفتر "تخلیق" تشریف لاتے رہے اور "اظہر جاوید نمبر" کے حوالے سے مواد کی ترتیب و تدوین میں میری مدد کرتے رہے۔ اظہر جاوید نمبر کی اشاعت کو ادبی حلقوں میں بہت سراہا گیا اور ادبی دنیا نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جب "اظہر جاوید نمبر" ڈاکٹر انور سدید کے پاس گیا تو فون آیا۔ کہنے لگے

آپ کو ادبی دنیا میں اپنا پہلا اور بھرپور قدم مبارک ہو۔ اس سے یہ تو ثابت ہو گیا ہے کہ آپ کے اندر ایسی صلاحیتیں موجود ہیں جو ایک بہترین مدیر کے لیے ضروری ہیں۔ 2012ء میں ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ قائم ہونے والا رشتہ ان کے آخری سانس تک قائم رہا اور میری آخری سانس تک قائم رہے گا۔

ڈاکٹر صاحب سچ کہتے تھے مخلص ادبی رشتے خون کے رشتوں سے زیادہ گہرے ہوتے ہیں۔ مجھے ان کی صورت میں اظہر جاوید نظر آتے تھے۔ انہوں نے مجھے والد صاحب کی کمی محسوس نہ ہونے دی اور بھائی جیسے نو وارد مدیر کو درپیش تمام مسائل کے حل کے لیے ہمیشہ ایک شفیق باپ اور ایک بہترین استاد کی طرح رہنمائی کرتے رہے۔ میری کم و بیش ہر روز ان سے فون پر بات ہوتی جس روز میں کسی وجہ سے کال نہ کر سکتا ان کی کال آ جاتی۔ میں ان سے اپنے نت نئے تجربات شیئر کرتا اور وہ مسکرا کر کہتے بھائی ہم تو پچھلے کئی سال سے ان تجربات سے گزر رہے ہیں آپ کو بھی حوصلے اور صبر سے کام لینا ہوگا۔

میں کہتا اگر ڈاکٹر صاحب یہ لوگ ..... ؟ میں غصے میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔ ڈاکٹر صاحب یہ کیسے لوگ ہیں پہلے مجھے قصے سناتے ہیں کہ میں امریکہ گیا اتنا خرچ کیا ایسا کیا ویسا کیا مگر جب "تخلیق" کا ہدیہ -/750 روپے دینا ہوتا ہے تو اعزازی پرچے لینے پر اصرار کرتے ہیں۔ اظہر جاوید سے طویل رفاقت رہی اور جفا کے قصے سناتے نہیں تھکتے مگر ان کے ہاتھ سے لگائے درخت کی آبیاری کرنے سے گھبراتے ہیں، کیوں؟ ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور مجھے سمجھایا آپ کو ہر روز ایک نیا تجربہ ملے گا مگر آپ اپنی توجہ ادب کی خدمت اور اچھے باپ کی میراث کو آگے بڑھانے پر رکھیں۔ اللہ نے آپ کو اس مقصد کے لیے چن لیا ہے۔ میں ان کی نصیحت پر عمل کرتا اور صرف ادب کی خدمت اور اظہر جاوید کے نام کو لوگوں کے دلوں میں زندہ رکھنے کے مشن پر لگ جاتا۔ مگر اب اس دل و دماغ کو کون سمجھائے گا؟ کون گفتگو میری ادبی پرورش کرے گا؟ کون مجھے پرچے کی تیاری پر ڈٹ جانے کا حوصلہ دے گا؟ ڈاکٹر صاحب کی کمی مجھ سمیت ادبی دنیا کو کئی سال تک محسوس ہوتی رہے گی۔

انہی تجربات کو شیئر کرتے ایک دن ڈاکٹر صاحب کو فون کیا تو بہت غصے میں تھے۔ میں نے پوچھا خیر ہے آج آپ کا مزاج برہم ہے۔ کہنے لگے فلاں آدمی نے امریکہ سے مجھے 100 ڈالر اور ساتھ اپنی کتابیں تبصرہ کے لیے بھیجی ہیں۔ اور لکھا ہے کہ میں جلد از جلد اس کی کتاب پر تبصرہ کر دوں۔ میں نے آج ہی اس کی وہ رقم اور کتابیں واپس پوسٹ کر دی ہیں اور رقعہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید پیسے لے کر کسی کتاب پر تبصرہ نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی اسے پیسے دے کر لکھوا سکتا ہے۔ میں اپنی مرضی سے لکھتا ہوں۔

میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں نے جب بھی کتب پر تبصرے کی فرمائش کی انہوں نے میری اس خواہش کا مان رکھا اور ہمیشہ میری فرمائش پوری کی۔ یہ ان کی محبت تھی۔ اس محبت پر میرا دل خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ میرا دل چاہا کہ اس وضع دار آدمی کے سامنے ہاتھ باندھ کر عقیدت سے کھڑا ہو جاؤں اور شکریہ ادا کروں، ہر اس معاونت اور محبت کا جو اتنے سالوں میں ان کی طرف سے مجھے حاصل رہی۔ پچھلے پانچ سالوں سے میری یہ عادت تھی کہ پرچہ پریس سے جیسے ہی تیار ہو کر آتا میں ڈاکٹر صاحب کو کال کرتا اور پرچے کی اطلاع دیتا، وہ خوشی اور بے چینی کا اظہار کرتے اور فرماتے "بھائی اب رات بے چینی میں گزرے گی۔ آپ صبح جلد از جلد پرچہ بھجوا دیں۔" میں اگلے روز پرچہ لے کر خود ان کے گھر جاتا۔ بڑی گرم جوشی سے ملتے اور پرچہ دیکھتے ہی کہتے بھائی آپ نے تو کمال کر دیا۔ ہر بار شکل خوب سے خوب تر ہوتا ہے اور پرنٹنگ، کاغذ ہر چیز معیاری ہے۔ یہ پرچہ تو ہر جگہ اپنی دھاک بٹھا دے گا۔ آپ نے "تخلیق" کو صف اول کا ذہین

لاثانی پرچہ بنا دیا۔ آپ نے یقیناً اپنے باپ کے ورثے کو دل و جان سے سنبھالا دیا ہے۔ اللہ آپ جیسی اولاد ہر ایک کو دے۔ میں ان کی اس قدر تعریف پر پھولے نہ سماتا اور دل میں عہد کرتا انشاء اللہ اگلا پرچہ اس پرچے سے بھی بہتر شائع کروں گا۔ یہ سوچ کر دوا بھی کی راہ لیتا اور اگلے شمارے کی تیاری شروع کر دیتا۔ تخلیق کار ادیب، شاعر، مصنف، مدیر اور ہر انسان شاید اس تھوڑی سی تعریف اور حوصلے کا متلاشی ہوتا ہے جو اسے اس کے بزرگوں اور محبت کرنے والوں سے درکار ہوتا ہے۔

ایک روز فون کیا تو پریشان تھے میں نے کہا ڈاکٹر صاحب خیریت ہے تو بولے "بھائی وہ ہی بڑھاپا"۔ "اب کیا ہوا ڈاکٹر صاحب؟" "بھائی بڑھاپا اپنا آپ دکھا رہا ہے بائیں آنکھ میں موتیا اتر آیا ہے۔ آنکھ کی 80 فی صد بینائی کا فرق پڑ گیا ہے۔ ڈاکٹر حضرات کہتے ہیں پڑھنا چھوڑ دو میں ایسا نہیں کر سکتا۔" میں نے جواباً عرض کیا ڈاکٹر صاحب مجھے علم ہے کہ قلم آپ کی زندگی اور تخلیق آپ کی جان ہے لیکن ڈاکٹر بھی ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کچھ روز ڈاکٹر حضرات کی بات پر عمل کر لیں مگر ایسا کرنا ڈاکٹر انور سدید کے لیے ناممکن تھا اور یہ میں بخوبی جانتا تھا۔ اگلے دن فون پر بات ہوئی تو اپنی میز کرسی پر براجمان تھے اور ادب کی بے لوث خدمت میں مصروف عمل تھے۔ پھر چند روز بعد اچھی خبر سننے کو ملی کہ آنکھ کی بینائی میں بہتری آئی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کافی عرصے سے صحت کے حوالے سے پریشان تھے اور اکثر کسی دوست کے انتقال کی خبر سنتے تو بہت مایوس ہو جاتے کہتے "سوہان دیکھو میر اقبال دوست بھی مجھے چھوڑ گیا مجھ سے کتنا چھوٹا تھا عمر میں۔ میرے جانے کی ہے اور یہ سب مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔" میں ان کی صحت اور درازی عمر کی دعا کرتا تو مجھے منع کرتے کہتے "میں نے اپنی زندگی بھرپور طریقے سے جی لی ہے اب بس یہی خواہش ہے اللہ آسان موت دے دے۔" اظہر جاوید کی چوتھی برسی کی تاریخ قریب آئی تو میں نے فون کیا اور انور سدید صاحب سے کہا آپ کی صحت ٹھیک نہیں اس بار آپ برسی کے فنکشن میں شرکت نہ فرمائیں تو فوراً غصہ میں بولے "کیا ماضی میں کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں "تخلیق" یا اظہر جاوید کی کسی تقریب میں شریک نہ ہوں۔" میں لاجواب ہو گیا میں جانتا تھا کہ ماہنامہ "تخلیق"، اظہر جاوید اور ڈاکٹر انور سدید لازم و ملزوم تھے اور ایسا ہی ہوا وہ تقریب میں سب سے پہلے آئے اور تقریب کے اختتام کے بعد کافی دیر تک بیٹھے احباب سے باتیں کرتے رہے۔ اس دن وہ بہت خوش تھے ان کے چہرے پر الوہی چمک تھی۔ یہ سطریں تحریر کرتے مجھے خیال آیا کہ احباب کے بقول اظہر جاوید بھی اپنی زندگی کی آخری تقریب میں خلاف معمول بہت زیادہ خوش اور پرجوش نظر آ رہے تھے۔ کیا جانے والے کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ دوبارہ کبھی دوستوں کو نہ مل سکے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی تقریب کے اختتام پر میری خوب پذیرائی کی اور کہا کہ یہ تقریب ان کی زندگی کی اب تک کی بہترین تقریب ہے آج سے قبل انھوں نے اتنی شاندار برسی کی تقریب نہیں دیکھی۔ مجھے کیا علم تھا کہ یہ تعریف کے الفاظ میرے لیے ان کے لبوں سے ادا ہوئے آخری الفاظ ہوں گے اور وہ بہت جلد ہم سے بچھڑ جائیں گے۔ ایسے وضع دار لوگ برسوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔

کل اس کی آنکھ نے کیا زندہ گفتگو کی تھی　　گمان تک نہ ہوا کہ وہ بچھڑنے والا ہے

تقریب کے بعد پرچے کی تیاری کے چکر میں چند روز ان سے بات نہ ہو سکی۔ 5 مارچ کو ان کا فون آ گیا بھائی پرچہ شائع ہو گیا۔ آواز سے کچھ علیل محسوس ہوئے۔ میرا دل بھر آیا کہ بیماری کے باوجود ایسے مشفق لوگ اپنے عہد کو نبھا رہے ہیں۔ "ڈاکٹر صاحب اس دفعہ کچھ میٹر زیادہ ہے تھوڑا ٹائم لگ جائے گا مگر پرچہ آپ کو پسند آئے گا۔" ہنس پڑے "بھائی آپ ہمیشہ ہی سرپرائز دیتے ہیں" مگر مجھے اس بار ان کے انداز سے بے قراری سی جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔ 12 مارچ کو فون کیا تو وہ بہت تکلیف میں تھے بولے "سوہان میرا پیشاب بند ہو گیا

ہے۔ اگلے روز 13 مارچ کو اطلاع ملی کہ ڈاکٹر صاحب کو سرگودھا لے گئے ہیں۔ میں نے رابطہ کیا تو میرا سن کر فون پر آ گئے۔ میں تو ان کو پرچہ شائع ہونے کی خبر دینے اور پرچے یہاں سے وصول کرنے کے لئے بے چین تھا مگر چپ رہا۔

''ڈاکٹر صاحب آپ سرگودھا آ گئے ہیں؟'' ''ہاں سونان میں زندگی اور موت کی کشمکش سے گزر رہا ہوں'' فوراً میرا دماغ ماضی میں چلا گیا۔ مجھے ابو کا وہ فون یاد آ گیا جب دنیا سے جانے سے چند لمحے پہلے میں نے انہیں فون کیا تو انھوں نے کہا ''بیٹا دل میں ہلکا سا درد ہے۔ ٹیکسی لے کر ڈاکٹر سبزواری کے کلینک جا رہا ہوں۔ آپ بھی وہاں پہنچو۔'' ٹیکسی بھی آ گئی مگر وہ اس میں سوار نہ ہو سکے۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ہی مجھے ان کے دنیا سے جانے کی خبر دی۔ میں نے سوچوں کو جھٹکا اور کہا ڈاکٹر صاحب اللہ آپ کو صحت دے! آپ بیمار ہوتے ہیں اور پھر فی الحال اس بار بھی ایسا ہی ہوگا اور ایسا ہی ہوا۔ 13 مارچ 2016ء اتوار کے روز علاج کے بعد تندرست ہو کر ہسپتال سے سرگودھا بیٹے کے گھر آ گئے۔ تین چار دن خیریت سے گزر گئے۔ 17 مارچ کو ڈاکٹر صاحب دوپہر 12 بجے لان میں بیٹھے تھے۔ بیٹے کو پکارا کہا میری طبیعت گھبرا رہی ہے مجھے اندر لے چلو۔ یہ وہ لمحہ تھا جب انھیں ہارٹ اٹیک ہوا۔ بیٹے فوراً ہسپتال لے گئے اور وہاں آپ کومہ میں چلے گئے۔

17 مارچ کو جب مجھے یہ خبر ملی تو دل ڈوبنے لگا مگر دل پر قابو رکھا۔ تین دن کومہ میں رہنے کے بعد 20 مارچ کو ڈاکٹروں نے ان کی موت کی تصدیق کر دی (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ 20 مارچ 2016ء اتوار کو دوپہر 12 بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب کے انتقال کی خبر سوشل میڈیا پر پڑھی تو دل کو یقین نہ آیا۔ ان کے نمبر پر کال کی تو ان کے بیٹے سے بات ہوئی جنہوں نے اس خبر کی تصدیق کی اور بتایا جنازہ شام ساڑھے چار بجے تک اٹھایا جائے گا۔ گھر سے جلد سرگودھا روانگی کی تیاری کی اتنے میں سرفراز سید صاحب کی کال آ گئی کہ انھیں بھی ساتھ لیتے چلوں۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا اور دماغ میں یادوں کی یلغار تھی۔ بار بار ڈاکٹر صاحب کا مسکراتا چہرہ آنکھوں کے سامنے آتا تو شدتِ غم سے آنکھیں بھر آتیں۔ یونہی سوچوں میں غلطاں سفر جاری تھا۔ سارجنٹ کے گاڑی روکنے پر سوچوں سے باہر آیا۔ تیز رفتاری کے باعث چالان ہو گیا لیکن دل میں یہی دعا کیے جا رہا تھا یا اللہ تو جانتا ہے ڈاکٹر صاحب سے میرا رشتہ ایک معلم، ایک رہنما اور طالب علم کا تھا۔ وہ میرے لیے میرے باپ کی طرح تھے۔ بس دعا ہے کہ ان کی آخری قیام گاہ تک خود اپنے ہاتھوں سے انھیں لے جاؤں۔ چار بجے کے قریب سرگودھا شہر میں داخل ہوئے تو والد صاحب شدت سے یاد آئے۔ یہ ان کا شہر تھا جہاں وہ پیدا ہوئے۔ ان گلیوں میں ان کا بچپن گزرا۔ سرگودھا کی مٹی بہت زرخیز ہے۔ بہت بڑے بڑے نام ادب کی دنیا کو یہاں سے ملے۔

لیکن آج یہ شہر اور اس کا گاؤں بھلوال سوگوار ہے آج اس شہر نے ایک گوہر نایاب کھو دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے گھر کے قریب پہنچا تو میت کو لے جانے والی گاڑی ڈاکٹر صاحب کے جسدِ خاکی کو جنازگاہ کی طرف لے جانے کو تیار تھی۔ میں فوراً میت والی گاڑی پر سوار ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ روشن ذہن، محققوں کا پیامبر، میرا محسن میرا استاد روشنی سا سفید لبادہ اوڑھے ابدی نیند سو رہا تھا۔ میری آنکھوں سے سیلِ رواں جاری ہو گیا۔ خود پر قابو نہ رہا۔ میرے آنسو ان کی چارپائی پر گر رہے تھے۔ مجھے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ مجھ سے ہم کلام ہوں اور مسکراتے ہوئے کہہ رہے ہوں ''سونان! میں نے اپنے حصے کا کام ایمانداری سے مکمل کر دیا ہے اب ادب کی اس شمع کو اظہر جاوید، تخلیق اور میرے نام کو زندہ رکھنا تمہاری ذمہ داری ہے۔

پھر وہ جاں سوز لمحہ بھی آ گیا جب ان کی آخری قیام گاہ قریب آ گئی ان کے جنازے کو کاندھا دیتے ہوئے قبر تک آئے اور جب لحد میں اتارنے کی باری آئی تو میں ان کی لحد میں سب سے پہلے اترا اور اپنے ہاتھوں سے انھیں ان کے دائمی گھر میں اتارا۔ آنکھ سے آنسو بدستور

جاری تھے۔ دل کو سکون نہیں مل رہا تھا جب ان کی قبر پر مٹی ڈالنے کی باری آئی تو ہاتھ مٹی میں سن کے ہو گئے ۔۔۔ میں مسلسل رو رہا تھا۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، سرفراز سید، عطاء مقبول احمد میرے پاس کھڑے تھے۔ فاتحہ خوانی کے بعد بوجھل قدموں کے ساتھ سب واپسی کے سفر پر چل پڑے۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے!

قبرستان سے واپس آتے ہی لاہور روانگی کی تیاری پکڑی۔ مغرب کی نماز پڑھی تو ہر طرف اندھیرا چھانے لگا واپسی میں سرفراز سید صاحب عجیب بات بتانے لگے کہ ڈاکٹر سلیم آغا کہہ رہے تھے کہ چند روز قبل جب ڈاکٹر انور سدید کی خیریت دریافت کرنے کے لئے فون کیا تو وہ کہنے لگے کہ آغا صاحب اب زندگی کی صرف دو خواہشیں پوری ہونی رہ گئی ہیں۔ ایک یہ کہ میری عمر میرے مرشد ڈاکٹر وزیر آغا سے زیادہ نہ ہو اور میری آخری سانس اسی وقت پر نکلے جس وقت ڈاکٹر وزیر آغا اس دنیا سے گئے اور سچی محبت و عقیدت کا یہ مظاہرہ خدا کو پسند آیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا 88 سال کی عمر میں اس دنیا سے رخصت ہوئے اور ڈاکٹر انور سدید 87 سال تین ماہ اور 19 دن کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ اپنے مرشد سے محبت کا یہ عالم تھا کہ مرشد جب دنیا سے رخصت ہوئے تو دوپہر 11:30 کا وقت تھا اور ڈاکٹر انور سدید صاحب بھی 11:30 پر دنیا سے کوچ کر گئے۔ یہ بات سنتے ہی میرا دل بھر آیا اور میں سوچنے لگا کیا ایسی سچی محبت کوئی کر سکتا ہے کہ اپنے استاد کے چلے جانے کے بعد بھی ان کی محبت و عقیدت میں کمی نہ آئے اور وہ احترام میں اس حد تک ہو کہ استاد کی عمر سے زیادہ عمر پانا بھی گوارا نہ ہو۔ ایسے وضع دار اور مخلص لوگ صدیوں بعد بھی پتہ نہیں جنم لیں گے یا نہیں۔ آخر میں نے عہد کر لیا ہے کہ اب کبھی غلطی سے بھی نہیں کہوں گا۔ کون انور سدید؟ کون انور سدید؟

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھتے جاتے ہیں
کہیں سے آبِ بقائے دوام لا ساقی

◆◆◆

رپورٹ

ممتاز مصنف و دانشور ڈاکٹر کیول دھیر کی ایڈیٹر ''تخلیق'' سونان اظہر کے گھر آمد

ڈاکٹر کیول دھیر 23 مارچ 2016ء کی شام کو ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور کے ایڈیٹر سونان اظہر جاوید کے گھر کھانے کی دعوت پر آئے تو مہمانوں کی کثیر تعداد ان کی منتظر تھی جس میں مجیب الرحمٰن شامی (ایڈیٹر روزنامہ پاکستان)، خاور نعیم ہاشمی (چینل 92)، امجد اسلام امجد، سرفراز سید (روزنامہ ''انصاف'')، پروین بخت قاضی، نگہت انجم، جاوید منظور، سلیم اختر، صفدر ماہی، انجم شیراز، بشریٰ رحمن، آمنہ مفتی، دیپا، رخشانہ نور، عمرانہ مشتاق (مانی)، صائمہ اشتیاق، لبنیٰ جاوید، انگیزہ سونان اور سعدیہ سونان نے ان کو خوش آمدید کہا۔ رسمی گفتگو کا آغاز ہوا پھر فوٹو سیشن اور تحائف کا تبادلہ ہوا۔ ساتھ ہی کھانے کا دور شروع ہوا اور آخر میں امجد اسلام امجد نے اپنا کلام اور صفدر ماہی نے موسیقی سنا کر محفل میں رنگ جما دیا۔ یہ محفل رات دیر تک جاری رہی۔ آخر میں ڈاکٹر کیول دھیر نے سب دوستوں سے اتفاقی ملاقات کی اور دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوئے۔

میرے اباجی (ایک ادھورا تعارف)

مسعود انور

میرے بچپن کے دن کا ذہن میں دھندلا سا ہے۔ غالباً 1960 یا 1961 کی بات ہے لوگ گھر میں آ رہے تھے اور میری اماں قلفی کا شربت بنا بنا کر بیٹھک میں بھیج رہی تھیں۔ واقعہ یہ تھا کہ اباجی کی ترقی ہوگئی تھی اور وہ اوورسیر سے ایس ڈی او ہو گئے تھے۔ لوگ مبارک باد دینے آ رہے تھے۔ ایک ہفتے بعد ہم نہر کے دائیں کنارے والی چھوٹی کالونی سے بائیں کنارے والی نہر کی بڑی کالونی میں شفٹ ہو گئے۔ اس بڑی کالونی میں پھل دار درختوں کی بہتات تھی۔ ہر صبح موسمی پھل ہمارے بنگلے کے باہر پہنچا دیے جاتے۔ ان کا وزن اور گنتی ہوتی۔ اباجی سولا ہیٹ پہن کر کھڑے ہو جاتے۔ ایس ڈی سی (کلرک) جیب سے رجسٹر نکالتا اور کالونی میں رہنے والے سب سے بڑے افسر جو اباجی تھے سے لے کر سب سے چھوٹے رتبے کے ملازمین جو کالونی کا خاکروب تھا سب کا نام بولتا۔ اباجی مقدار بولتے اور ایک بیلدار تلنے والے پھلوں کو تول کر اور گننے والے پھلوں کو گن کر ڈھیریاں بناتا جاتا۔ آخر میں تولنے والے پھلوں میں اگر تولنے والے کی کوتاہی سے کمی بیشی ہو جاتی تو اباجی کی ڈھیری سے کمی پوری کی جاتی اور اگر مقدار میں زیادتی ہوتی تو جس ملازم کے کنبے کے افراد زیادہ ہوتے اس کی ڈھیری بڑی کر دی جاتی۔ یہ لاہور کے مشرقی حصے میں واقع بی آر بی نہر کے کنارے "بیدیاں" نہر کالونی کا ہر روز صبح کا معمول تھا۔

دفتری امور کی بجا آوری کے لئے اباجی کو ہفتے میں ایک بار لاہور جانا ہوتا تھا۔ جب وہ واپس آتے تو کتابوں کا ڈھیر ان کی جیپ سے برآمد ہوتا۔ بیدیاں کالونی میں ان دنوں بجلی نہیں آئی تھی۔ اماں ہر شام ان کے لیمپ کا شیشہ صاف کرواتی اور مٹی کا تیل بھر کے ان کے مطالعے کے لئے تیار کروا کے رکھ دیتیں۔ مغرب کے بعد کھانا کھا کر ہم تو سو جاتے اور اباجی میز کرسی پر لیمپ کی روشنی میں مطالعہ شروع کر دیتے۔ جب ہم صبح اٹھتے تو اباجی کو پھر میز کرسی پر مطالعے میں مصروف پاتے۔ ایک عرصے تک ذہن میں یہی رہا کہ اباجی سوتے نہیں ہیں۔ یا تو وہ دفتر کا کام کرتے ہیں اور یا کتابیں پڑھتے ہیں۔ ان کا یہ معمول سوائے آخری چند برسوں کے ہمیشہ رہا۔

1963ء میں ان کا تبادلہ سرگودھا ہو گیا۔ سرگودھا میں انور چوہدری مدیر کامران ان کے بچپن کے دوست تھے۔ انور چوہدری مرحوم نے انہیں سجاد نقوی صاحب سے متعارف کروایا جو سرگودھا کالج میں لائبریری کے انچارج تھے۔ پڑھنے کے لئے اب کتابیں سجاد نقوی صاحب کے توسط سے آنے لگیں۔ سجاد نقوی ہی وسیلہ بنے اور اباجی کا ڈاکٹر وزیر آغا سے تعارف ہو گیا۔ اب اباجی دفتر سے گھر آتے کھانا کھاتے اور سائیکل پر سوار 38 سول لائنز ڈاکٹر وزیر آغا کے گھر پہنچ جاتے جہاں شام دوستاں آباد ہوتی تھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ماضی کے افسانہ نگار کو جو قلم پھینک چکا تھا میں چھپے ٹیلنٹ کو دریافت کر لیا اور دوبارہ قلم ان کے ہاتھ میں تھما دیا۔ یوں ڈاکٹر انور سدید کا دوبارہ ادبی جنم ہوا اور اردو ادب کو الفاظ کا ذخیرہ رکھنے والا جن مل گیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے انہیں یہ سبق دیا کہ ادیب بننے کے لئے صاحب مطالعہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ اپنے استاد کی خواہش کے احترام میں انھوں نے ایم اے اور پھر پی ایچ ڈی کر کے اپنے نام کے ساتھ لفظ ڈاکٹر کا اضافہ کر لیا۔

1973 میں میٹرک کے بعد میرا داخلہ گورنمنٹ کالج سرگودھا میں ہوا تو یہاں کے ادبی ماحول نے مجھے بھی متاثر کیا اور میں نے افسانہ لکھنا شروع کر دیا۔ جب ابا جی کو پتہ چلا تو حوصلہ افزائی کی بجائے انھوں نے سختی سے ڈانٹا اور اپنے استاد والا سبق مجھے بھی دیا مگر میں نظر انداز کرتا رہا۔ وہ کہتے تم سائنس کے طالب علم ہو پہلے اپنا کیریر بناؤ۔ پھر لکھنے کے لئے بہت وقت پڑا ہے لکھتے رہنا۔ بارہ چودہ افسانے چھپوائے اور دو سال امتحانات میں سپلیاں لینے کے بعد مجھے عافیت ابا جی کی بات ماننے میں ہی نظر آئی اور میں نے زرعی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا کیریر بنانے کا سبق انھوں نے ہر اس نوجوان کو دیا جو ان سے ملنے کے لئے آیا۔ میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو اگر ابا جی کو نہ ملتے تو شاید زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے۔

ڈسپلن کی پابندی ابا جی نے تمام عمر کی اور ہمیں بھی اس کا پابند بنایا۔ میں انہیں ایک سخت گیر باپ سمجھتا تھا۔ ساری عمر میں نے اپنے اخراجات کے لئے ان سے پیسے نہیں مانگے۔ ہوسٹل سے جب گھر واپس آتا تو اماں کو میرا خرچ دے دیتے اور اماں ہی سے میں لے کر واپس یونیورسٹی چلا جاتا۔ ان کے اندر چھپی شفقت کا اندازہ مجھے تب ہوا جب 1986 میں میری شادی کا وقت قریب آیا۔ میں کمالیہ میں نوکری کرتا تھا۔ گھر آیا تو برآمدے میں سوزوکی (FX) کھڑی تھی۔ اس سے پہلے 1968 میں جب ابا جی نے ایم اے میں پہلی پوزیشن لے کر ریکارڈ قائم کیا تھا تو میرے تایا جی نے انگلینڈ سے انھیں ایک کار تحفے میں بھیجی تھی جو 1983 میں انھوں نے جب لاہور میں پانچ مرلے کا گھر بنایا تو اس کے اخراجات پورے کرنے کے لئے کار بیچ دی تھی۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ 15 سالوں میں اس کار نے 16000 ہزار میل کی مسافت کی اور جب فروخت کی گئی تو اس کے ٹائر اور بیٹری تک اوریجنل تھے۔ کار تو گھر میں کھڑی رہتی اور وہ اپنا ذاتی کام سائیکل پر کرتے۔ سرکاری کام کے لئے سرکاری جیپ ہوتی تھی وہ بھی اس وقت استعمال ہوتی جب دورے پر جانا ہوتا تھا ورنہ ڈرائیور آتا جیپ صاف کرتا اور حکم کا انتظار کرتا کب بلاوا آئے اور وہ جیپ لے کر دفتر جائے۔ ابا جی تو پیدل یا سائیکل پر دفتر جا چکے ہوتے تھے۔ سرکاری اور ذاتی امور میں بے جا اخراجات کے وہ عادی نہیں تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ محکمہ تعمیر میں ایگزیکٹو انجینئر ہونے کے باوجود وہ نیک نامی کے ساتھ ریٹائر ہوئے۔

جب میں نے سوزوکی FX دیکھی تو پوچھا یہ کیوں لی تو کہنے لگے ہم نے تمہاری شادی کا ارادہ کیا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تمہاری بیوی کو تکلیف نہ ہو۔ ساری عمر ان کی اپنی بیوی یا تو ویگن بس اور یا پھر سائیکل کے کیریر پر آتی جاتی رہی مگر بہو کے سکون کا انہیں اتنا خیال دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے کبھی بھی انہیں اپنے لئے کپڑے بنواتے نہیں دیکھا۔ ماموں کی کپڑوں کی دوکان تھی۔ وہ موسم کے مطابق کپڑے سلوا کر بھیج دیتے اور ابا جی اپنے ادھار والے رجسٹر میں لکھ لیتے۔ جب ابا جی جاتے تو ادھار ادا کر آتے۔ جب ہم بڑے ہوئے تو یہ ذمہ داری ہم بھائیوں نے اٹھا لی۔ میری شادی پر پہلی دفعہ میں نے انہیں خریداری کرتے ہوئے دیکھا۔ شیروانی، کلہ، جوتا سب انھوں نے خود پسند کیا۔ شہر کے سب سے اچھے درزی ماسٹر غلام رسول سے شیروانی سلوائی اور ماسٹر شہزادہ سے کوٹ پتلون۔ میں نوکری کرتا تھا مگر انھوں نے کبھی بھی مجھ سے پیسے نہیں لئے۔ شادی کے اخراجات کے لئے میں نے ہاتھ بٹانے کی کوشش کی تو کہنے لگے یہ تمہارا کام نہیں۔ ہم چار بھائی ہیں اور سب پر اللہ کا فضل ہے مگر مرتے دم تک انھوں نے ہم میں سے کسی سے بھی کوئی رقم نہیں لی۔ ہم چوری چھپے اماں کی خدمت کرتے تو وہ پیسے واپس کر دیتیں یہ کہہ کر کہ تمہارے ابا جی ناراض ہوں گے۔

ساری زندگی انھوں نے اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کیا اور اپنی رائے کا بے لاگ اظہار کیا۔ محکمہ تعمیر سے 1988 میں ریٹائر ہوئے تو قومی ڈائجسٹ کی ادارت سنبھال لی۔ وہاں سے جناب شامی کی ''تکبیر'' میں چلے گئے۔ بیگم رشا شاہد نے ایک دفعہ کہا کہ ہم ساری زندگی کسی

سے نہیں ہارے جو ہمارا دل چاہتا ہے کہتے اور کرتے ہیں مگر انور سدید سے بات کرتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ انور سدید ایک منٹ میں قلم چھوڑ کر کہتے ہیں میں جا رہا ہوں۔ کسی ایسی ہی بات پر تحریر کو ٹھیر آیا اور کہہ دیا جب مجید نظامی صاحب کو پتہ چلا تو وہ "نوائے وقت" میں لے گئے اور نوائے وقت سے رفاقت آخری دم تک قائم رہی۔

قتیل شفائی سے اس وقت چپقلش شروع ہوئی جب یہ دونوں رائٹرز گلڈ کے الیکشن میں ایک دوسرے کے مخالف امیدوار تھے اور قتیل شفائی نے ان پر مسٹری ہونے کی پھبتی کسی تھی۔ آخری عمر میں جب قتیل شفائی بیمار ہوئے تو ایک شام سعادت شاہ کو ساتھ لے کر قتیل صاحب کے گھر جا پہنچے۔ سعادت شاہ بتاتے ہیں قتیل شفائی دیر تک ابا جی کا ہاتھ پکڑ کر روتے رہے اور کہتے رہے کہ ساری زندگی جن کے کہنے پر قتیل شفائی ابا جی سے لڑتے رہے ان میں سے کوئی بھی عیادت کے لئے نہیں آیا۔ قتیل صاحب کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ انور سدید ان کی عیادت کے لئے ان کے گھر آئیں گے۔ اسی طرح جس دن احمد ندیم قاسمی صاحب کا انتقال ہوا میں ابا جی کے تاثرات جاننے کے لئے اقبال ٹاؤن جا پہنچا۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر گلے لگ گئے اور بولے "اویار قاسمی صاحب مر گئے" آنکھوں میں آنسو تھے۔ اماں سب دیکھ رہی تھیں۔ وہ بولیں "ساری عمر تو لڑائی کرتے رہے اب آپ رو رہے ہیں۔" جواب میں کہنے لگے "میں احمد ندیم قاسمی کے بڑا ادیب ہونے کا تو قائل ہوں مگر جب وہ غلط بیانی کرتے ہیں تو ریکارڈ کی درستگی کے لئے لکھتا ہوں تب لوگ لڑائی سمجھتے ہیں۔" آخری ملاقات میں انھوں نے ڈاکٹر سلیم اختر صاحب کی عیادت کی خواہش کا اظہار بھی کیا مگر وقت نے مہلت نہیں دی۔ جب بھی کسی ادیب یا شاعر کی وفات ہوتی تو ایک مجلس عزاداری ان کے گھر بھی منعقد ہوتی۔ اقبر جاوید، رحمان مذنب، تحسین فراقی، مشفق خواجہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر وزیر آغا، مجید نظامی، عبداللہ حسین، انتظار حسین کی وفات پر تو میں نے انھیں باقاعدہ روتے دیکھا۔ جیسے ہی کسی ادیب کی وفات کی خبر آتی سب سے پہلا تعزیت نامہ ان کا پہنچتا۔ اور وہ کہتے اب اگلی باری میری ہے۔

آخری چند برسوں میں نظر کی تکلیف ہو گئی تھی۔ ایک آنکھ سے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا دوسری بھی آدھی ختم ہو چکی تھی۔ ردی بیچنے کے قریب ڈالا گیا تو اور بہت سی نئی کتابیں آ جاتیں۔ اب ان کی کوشش ہوتی کہ فوراً سب کو پڑھ لوں اور ان پر تبصرہ لکھوں کتاب نہ پڑھ سکنے کی تکلیف ان کے چہرے سے نمایاں نظر آتی۔ چوراسی برس کے ہوئے تو زندگی کی خواہش بالکل ختم ہو گئی۔ اور انھوں نے اس شعر میں اس کا اظہار کیا۔

چوراسی برس تک ہیں دنیا کے مزے چکھے ... ہر حال میں ہم خوش ہیں جس حال میں رب رکھے

(ڈاکٹر انور سدید کے بیٹے کی خصوصی تحریر ماہنامہ "تخلیق" کے لئے)

◆◆◆

خوشخبری

معروف افسانہ نگار اور مشہور دانشور پروفیسر عطیہ سید کو حال ہی میں قومی اور بین الاقوامی اعزازات سے نوازا گیا۔ 23 مارچ 2016ء کو حکومت پاکستان کے اعلیٰ ترین ادبی صدارتی ایوارڈ یعنی "تمغۂ امتیاز" سے نوازا گیا اور استنبول یونیورسٹی میں "لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ" سے نوازا گیا جس پر ہم انھیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ (ادارہ تخلیق)

تعزیتی کالم

ڈاکٹر انور سدید، بڑے لوگوں کی نسل کا نایاب انسان!

بشریٰ اعجاز

19 مارچ 2016ء کی شب ڈاکٹر انور سدید ستاسی برس کی فعال اور متحرک زندگی گزارنے کے بعد اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئے۔ جس کے ساتھ ہی دبستان سرگودھا کا باب بھی ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا، کہ اس دبستان کا یہ آخری چراغ تھا جس کے بجھتے ہی پرانی ادبی مخاصمتوں اور نظریوں کی چاند ماری بھی ختم ہوئی اور ان علمی ادبی مباحث کا بھی خاتمہ ہوا، جنہوں نے دبستان سرگودھا اور دبستان لاہور کو کئی دہائیوں میں پرجوش اور متحرک بنائے رکھا۔ اگر یہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ ڈاکٹر انور سدید ہی دراصل وہ سپاہی تھے، جنہوں نے دبستان سرگودھا کے محاذ کو گرم رکھا اور ڈاکٹر وزیر آغا کے ادبی نظریات اور ان کے خلاف اٹھنے والی تنقیدی آوازوں کا بھرپور دفاع کیا۔ مگر یہ صرف ایک پہلو ہے، اس ہمہ جہت شخصیت کا جس نے علمی اور ادبی سطح پر بطور تنقید نگار، شاعر، ادیب اور اخبار نویس اپنا اتنا مضبوط مقام قائم کیا کہ آج ان کے انتقال کے بعد ان جہات کو دیکھتے ہوئے یقین نہیں آتا کہ ایک زندگی میں کوئی اتنا کام بھی کر سکتا ہے! ایک وقت زندگی، ملازمت، کنبے، خاندان اور ادب میں اس درجہ فعالیت کہ ہر میدان! ڈاکٹر انور سدید کا میدان لگے اور ہر صنف میں وہ سب سے نمایاں دکھائی دیں، یہ کچھ ہر کسی کے حصے میں نہیں آتا۔ یہی وجہ آج انہیں یاد کرتے ہوئے بھی ان کی 84 عدد کتابوں پر نگاہ جاتی ہے اور کبھی ان مضامین، ادبی تبصروں اور ادبی جرائد و اخبارات میں شائع ہونے والے سالانہ تجزیوں پر جنہیں جمع کیا جائے تو شاید اتنی ہی کتابیں مزید مرتب ہو جائیں جتنی انہوں نے لکھیں۔

میں نے جب دنیائے ادب میں قدم رکھا تو لاہور جو علم و ادب کا مرکز اور گہوارہ سمجھا جاتا ہے، یہاں اوراق اور فنون کا طوطی بولتا تھا۔ دونوں پرچے دو انتہائی قد آور شخصیات کے زیر ادارت نکلتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی، جن کے حوالے سے دبستان لاہور اور دبستان سرگودھا قائم تھے۔ ایک تو میں نووارد تھی، دوسرے شاید اتنی بے ضرر کہ دونوں دبستانوں نے میری بھرپور حوصلہ افزائی کی اور مجھے بلا تامل اپنے ادبی وجود کا حصہ بنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ میری پہلی کہانی اوراق میں شائع ہوئی اور پہلی نظم فنون میں۔ بعد میں مسلسل ان دونوں پرچوں میں چھپتی رہی۔ مجلس ترقی ادب میں قاسمی صاحب کا وجود ایک شمع کی طرح تھا، پروانے جس پر نثار ہوتے رہتے تھے۔ مگر ڈاکٹر وزیر آغا کی مجالس کا احوال قدرے مختلف تھا چونکہ وہ وزیر کوٹ میں مقیم تھے لہٰذا کبھی کبھار لاہور آتے اور اپنے دوستوں کو اپنی چند روزہ آمد کی اطلاع دیتے۔ ایک فون مجھے بھی آتا، چنانچہ میں بھی کینٹ کے اس وسیع و عریض گھر میں ایک دو دفعہ حاضر ہوئی، جہاں آغا صاحب اپنی مہربان شخصیت کے ساتھ دوست احباب کی تواضع میں مصروف ہوتے۔ وہیں میری پہلی ملاقات اس بلند قامت شخصیت سے ہوئی، جن کا نام ڈاکٹر انور سدید تھا، اور جن کے رویے میں نوواردانِ ادب کے لئے ایک خاص مہربانی، اک خاص توجہ پائی جاتی تھی۔ انہی دنوں میں نے ایک کہانی لکھی، جس کا نام ”بچھڑا ہوا دوست“ تھا، اس کہانی کا عجب قصہ ہے جو ماں اور بیٹے کے تعلق پر بنی گئی تھی۔ اس کہانی کو فنون کے لئے ارسال کیا تو کچھ ہی دنوں بعد قاسمی صاحب کا خط ملا، جس کا لب لباب یہ تھا ”ابھی ہمارا سماج اس قابل نہیں ہے کہ ماں اپنی گزشتہ زندگی کے کسی بچھڑے ہوئے باب کا اپنے

بیٹے کے سامنے ذکر کرے اور چاہے ایک دوست کی طرح قبول کرے۔ چنانچہ آپ اس کہانی کو آنے والے وقت کے لئے سنبھال لیں۔" مگر میں اس کہانی کو ہر حال میں چھپوانا چاہتی تھی، اسے اوراق میں بھیج دیا۔ وہاں سے آغا صاحب کا جواب بھی تاکی صاحب کے جواب سے ملتا جلتا آیا مگر اس سے دلبرداشتہ ہوئے بغیر میں نے وہ کہانی اٹھائی اور تسطیر کو روانہ کر دی۔ مدیر تسطیر جناب نصیر احمد ناصر صاحب کا کہانی پر رد عمل، دونوں بزرگوں سے مختلف تھا۔ انہوں نے ایک تعریفی نوٹ بھی روانہ کیا اور کہانی اپنے پرچے میں شائع کر دی۔

انہی دنوں کی ایک شام کا ذکر ہے لاہور میں ڈاکٹر وزیر آغا کے گھر ایک ادبی نشست تھی، جس میں ان کے دوست احباب جمع تھے، آغا صاحب ڈاکٹر انور سدید کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، وہ قدرے تاخیر سے تو آئے، مگر مجھے دیکھتے ہی کہانی کی اتنی تعریفیں کیں کہ مجھے شرمندہ کر دیا۔ ان کا سوال تھا یہ کہانی آپ نے اوراق میں کیوں نہیں بھیجی۔ جس کے جواب میں، میں نے انہیں بتایا کہ اس کہانی کو فنون اور اوراق کے مسترد کرنے پر میں نے تسطیر میں دیا تھا وہ چونکا اور آغا صاحب کی طرف دیکھنے لگے۔ بعد میں انہوں نے اس پر ایک لمبا چوڑا خط تسطیر کو لکھا جو خطوط کے گوشے میں شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے موضوع کے اعتبار سے اس کہانی کو منفرد قرار دیا۔ مگر یہ صرف ایک مثال ہے۔ ان کا شمار بلاشبہ ان گنتی کے ادبا میں ہوتا تھا جو اپنی تحریروں کے بجائے دوسروں کی تحریر زیادہ دلچسپی سے پڑھتے تھے، اور اگر کوئی چیز ان کو اچھی لگتی تو دل ہی دل کے بجائے کھل کر دوسروں کے سامنے اس کا نہ صرف اظہار کرتے تھے بلکہ سالانہ تجزیوں یا خطوط کے ذریعے اس تعریف کی سند بھی پیش کرتے تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ اس ملک کے غالباً واحد ادیب تھے، جن کی نگاہ عصر حاضر کی نظم، نثر اور تنقید پر بھرپور تھی اور کوئی تحریر کہیں بھی چھپتی تھی ان تک کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتی تھی۔ ایک آدھ برس پہلے فون پر بات ہوئی تو آواز مضمحل تھی، کہنے لگے ہڈیوں میں اتنی تکلیف ہے کہ بیٹھنا مشکل ہو گیا ہے مختلف زاویے بدلتا رہتا ہوں تاکہ لکھنے پڑھنے میں آسانی ہو۔ خواہش ہے آخری سانس تک کام کرتا رہوں۔

عبداللہ حسین صاحب کی بھی یہی خواہش تھی اور ڈاکٹر وزیر آغا نے بھی لیٹش پا کاٹل میں کومے سے واپس آنے کے بعد اسی خواہش کا اظہار کیا۔ یہ تمام بڑے لوگ ادیب جن کی زندگی کا مشغلہ نہیں، زندگی کی سب سے بڑی کمٹ منٹ تھی، آخری سانس تک قلم اور کتاب سے جڑے رہے۔ ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر وزیر آغا سے ارادت مندی جن کی پہچان تھی، ان کی وفات کے بعد گرچہ تنہا رہ گئے مگر بطور ادیب، تنقید نگار اور اخبار نویس انہوں نے بہت کام کیا اور اپنی فعالیت میں بیماری اور بڑھاپے کے باوجود کمی نہ آنے دی۔ اپنی وفات سے قریباً دو ہفتے قبل محترم اظہر جاوید کی برسی پر ان سے ملاقات ہوئی۔ ملتے ہی گزشتہ "نوح" (اسلام آباد سے چھپنے والا موقر ادبی پرچہ) میں شائع ہونے والی میری طویل کہانی کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگے میں نے ہر ایک سے اس کہانی کا ذکر کیا ہے۔ دیہات نگاری پر وہ بلاشبہ ایک زبردست تحریر ہے۔ یہ ان سے آخری ملاقات تھی، جہاں وہ اظہر جاوید سے طویل رفاقت کا حق ادا کرنے آئے تھے۔ وہ ایسے ہی تھے۔ سارے پرانے لوگ تقریباً ایسے ہی ہوتے تھے۔ چھوٹے حسد، چھوٹی خود غرضیاں اور چھوٹے دکھ نہیں پالتے تھے۔ اسی لئے ان کی سوچ کا کینوس وسیع ہوتا تھا۔ فن ان کے نزدیک کسی مالی منفعت، شہرت یا دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کا ذریعہ نہ تھا۔ ان کی نظریاتی وابستگی اور باطنی زندگی اس کے بغیر مکمل ہی نہ ہوتی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید کے بعد ان بڑے اور وضع دار لوگوں کی نسل کا جیسے خاتمہ ہی ہو گیا ہے۔ اب ہم جیسے بچے ہیں، اچھے وقتوں اور اچھے لوگوں کے تذکرے۔

◆◆◆

دبستانِ علم و فن کا بنجارہ رخصت ہوا

ڈاکٹر زاہد حسن چغتائی

کاغذ کے پھول سر پہ سجا کر چلی حیات — نکلی بیرون شہر تو بارش نے آ لیا

ڈاکٹر انور سدید کی رحلت اردو ادب و صحافت کے لئے ایک بہت بڑا دھچکا ہے۔ آج دبستان سرگودھا کا پورا شکوہ کہیں کھنڈروں سے اوجھل ہو گیا۔ گویا ’’خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا‘‘ مرحوم سے میری نیاز مندی کئی دہائیوں سے تھی۔ یادش بخیر نوے کی دہائی میں میں سات سال حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی کا سیکرٹری رہا۔ یہ بڑا ہیجانی دور تھا ’’مطلق اور ادبی تفاخر‘‘ سے لبالب۔ یہی وہ دور تھا جب راولپنڈی اسلام آباد میں انشائیے اور جدید نظم کی تحریک چلائی گئی۔ حلقہ اربابِ ذوق راولپنڈی میں انشائیہ نگاروں اور نظم گو شعرا کی ایک پوری کہکشاں اتری ہوئی تھی اور یہ سب لکھاری ’’اوراق‘‘ اور ڈاکٹر وزیر آغا کے کاروانِ ادب میں شامل تھے۔ ان کا قیام ڈاکٹر جمیل آذر کی رہائش گاہ پر ہوتا اور جتنے دن بھی وہ راولپنڈی میں قیام کرتے گہما گہمی رہتی۔ ڈاکٹر رشید نثار، ڈاکٹر رشید امجد، شیخ خالد اور انجم نیازی کے گھروں پر دعوتیں ہوتیں ادبی نشستوں کو سجایا جاتا اور حلقہ تو گویا ڈاکٹر وزیر آغا کا مرکزِ نظر ہوتا جہاں جڑواں شہروں کے تمام اہلِ قلم اکٹھے ہو کر ڈاکٹر وزیر آغا سے کسبِ فیض کرتے۔ انشائیہ نگاروں میں انجم نیازی، جمیل آذر، خالد صدیقی، بشریٰ سیفی اور اس قبیل کے دیگر لکھاریوں کے چہرے ڈاکٹر وزیر آغا کی آمد سے کھل اٹھتے۔ اسی طرح جدید نظم گو شعرا علی محمد فرشی، انوار فطرت، حمید یازغ، امر آصف، احمد ناصر، ڈاکٹر ابرار عمر اور دیگر کو میں خود ڈاکٹر صاحب کی آمد پر حلقے میں مدعو کرتا اور مباحث کا ایسا دور چلتا کہ دلوں میں رونق بھر جاتی۔ ڈاکٹر انور سدید کا حکم تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی جڑواں شہروں میں آمد اور گہما گہمی کی مکمل رپورٹ ان کو ارسال کی جائے میں یہ حکم بجا لاتا تو ڈاکٹر انور سدید کا ایک خوبصورت خط میرے نام آتا جس میں سب دوستوں کو یہ مدیر پڑھوا کر خوش ہوتا۔ مرحوم سلطان صبروانی تو اس کی فوٹو کاپی بھی رکھ لیتے۔ اختر شیخ بطورِ خاص میرے دفتر آ کر یہ خط پڑھتے اور خوش ہوتے۔ اب سوچتا ہوں ہم چھوٹے چھوٹے لکھاریوں کی بھی کیا خوشیاں تھیں۔ ان دنوں خوشی اور شادمانی شاید اسی کا نام تھا۔

ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ہمارے رابطہ کار ڈاکٹر رشید نثار تھے۔ دونوں کا ان کے ساتھ قریبی تعلق استوار رہتا تھا۔ خط و کتابت اور ٹیلی فونک رابطہ بھی تھا۔ سو ہمیں دبستان سرگودھا کے دونوں سرخیلوں کے پل پل کی خبر رہتی۔ ایک مرتبہ خبر ملی کہ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید دونوں اکٹھے جڑواں شہروں کے دورے پر آ رہے ہیں۔ اس موقع پر ڈاکٹر رشید نثار نے اپنے گھر پر دونوں بزرگوں کی دعوت کی اور معیت چند دوستوں کو بھی مدعو کیا۔ انجم نیازی، جمیل آذر، قاضی عارف حسین اور شوکت واسطی بھی موجود تھے۔ گرمی کے موسم میں گھر کی چھت پر کھلی فضا میں کرسیاں بچھائی گئیں۔ گفتگو انشائیہ سے شروع ہوئی اور جدید نظم سے ہوتی ہوئی منشا یاد کے افسانوں تک دراز ہوئی۔ احمد ندیم قاسمی کا ذکر بھی آیا۔ وزیر آغا اور انور سدید دونوں کی رائے تھی کہ قاسمی صاحب بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے کئی افسانوں کا تذکرہ ہوا۔ ان پر ناقدانہ بحث کا لب لباب یہ تھا کہ افسانہ نگاری میں ان کے قد کاٹھ کو کم نہیں کیا جا سکتا۔ اس محفل میں میں ہی سب سے کم عمر

نکھاری تھا۔ مجھے اس دن پتہ چلا کہ بڑے لوگ کیا ہوتے ہیں۔ یہ احساس بھی ہوا کہ انسان بڑے ظرف کے ساتھ ہی بڑا کہلا سکتا ہے۔ اس لیے ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کے سامنے میری نظریں بصد احترام جھک گئیں اور ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ساتھ احمد ندیم قاسمی کا احترام بھی دو چند ہو گیا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ علمی اختلاف دلوں کو توڑنے کا عمل نہیں بلکہ دلوں کو جوڑنے کا حیلہ ہوتا ہے۔ اس دعوتی محفل میں کھانا ڈاکٹر وزیر آغا کی خواہش پر تاخیر سے کھایا گیا اور کھانے کے بعد بھی خاصی دیر تک رات گئے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ گاہے گاہے ڈاکٹر رشید نثار کی رگ ظرافت پھڑک اٹھتی تو وہ کوئی لطیفہ بھی سنا دیتے۔ ڈاکٹر وزیر آغا زیر لب مسکراتے جبکہ دیگر شرکا خوب قہقہے لگاتے۔ ایک موقع پر ڈاکٹر انور سدید نے جوابی لطیفہ سنایا تو ہر کوئی پیٹ پکڑ کر لوٹ پوٹ ہو گیا۔ اللہ اللہ کیا توفیق والے لوگ اور کیا یادگار عہد تھا۔ خوف و ہراس کے بادل ابھی افق پر منڈلائے نہیں تھے۔ انسان انسان سے خوف زدہ نہیں تھا۔ قہقہے دلوں سے چشموں کی طرح پھوٹتے تھے اور رنج و غم دلوں سے قلم کی نوک پر آ کر ادب تخلیق کرتا تھا۔ سوچتا ہوں وہ محفلیں اور دن رات کی گہما گہمی کیا ہوئی جس کی تفصیل جان کر دوست خوش ہوا کرتے تھے۔ اہلِ نام تھا محبتوں کا اور ڈاکٹر انور سدید اسی طرز کا ایک خوبصورت استعارہ تھا۔ وہ نہیں رہا تو دل اداس سا ہو گیا ہے۔ پنڈی والو کیسے ہو؟ یہاں کا مخاطبہ ہوا کرتا تھا۔ فون پر بات ہوتی تو اگرچہ وہ پوچھتے تھے تاہم ان کی آواز ہی دلوں میں طمانیت بھر دیتی تھی۔ وہ گئے وقتوں کا گراں قدر اثاثہ تھے۔ انہوں نے ساری زندگی انجمن کی طرح گزاری۔ قلم سے رشتہ کبھی منقطع نہ کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ ان کا ذہنی و فکری اشتراک ایسا ہی تھا جیسے جسم و روح کا ہوتا ہے۔ زمانے نے کئی کروٹیں بدلیں اتار چڑھاؤ آئے اہل قلم نے سرد و گرم کے مزے بھی چکھے مگر ڈاکٹر انور سدید کا قبلہ تبدیل ہوا نہ ادبی مسلک۔ بقول میر

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو　　آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

ضرورت اس امر کی ہے کہ لاہور کی کسی یونیورسٹی میں ان کے نام کی چیئر قائم کی جائے نیز کسی جامعہ کے ہال کو بھی ان سے منسوب ہونا چاہیے۔ اہل علم و فن کے اذہان میں یہ بات پہلے سے موجود ہے کہ آنے والے کئی ادوار میں انور سدید بہت دیر بعد پیدا ہو گا۔

◆◆◆

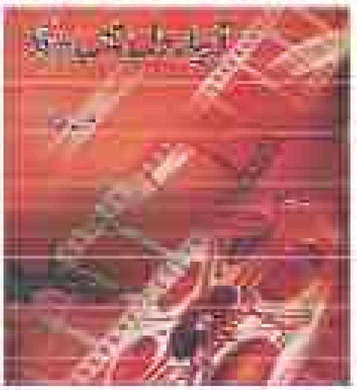

معروف ادیبہ، قلم نگار رخسانہ نور کی فلمی گیتوں کی کتاب

آ پیار دل میں جگا

شائع ہو گئی ہے

قیمت -/550 روپے

ملنے کا پتا: سانجھ پبلی کیشنز

بک سٹریٹ، 46/2 مزنگ روڈ، لاہور (رابطہ نمبر: 042-37355233)

ڈاکٹر انور سدید بھی جنت مکانی ہوئے

خالد شہزاد ہاشمی

ملک کے مایہ ناز ادیب، نقاد، شاعر اور دانشور ڈاکٹر انور سدید 20 مارچ کو اللہ کی رحمت میں چلے گئے۔ بطور مصنف ان کی خدمات کا احاطہ کرنا فوری طور پر دشوار ہے۔ ہاں ان کے ساتھ بیتے لمحات اور تعلق خاطر کو فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ ان سے پہلا تعارف تو تین دہائیاں قبل ان کی احمد ندیم قاسمی گروپ کے خلاف ناچ توڑ ''چاند ماری'' سے ہوا اور ادبی صفحات اور رسائل میں ان کی طنزیہ تحریریں پڑھنے کو ملتیں۔ میرا رجحان اس وقت قاسمی گروپ کی طرف تھا سو ڈاکٹر وزیر آغا گروپ کی ترجمانی کرتی ان کی طنزیہ تحریریں ذہن کو مکدر کرتیں اور پھر اچانک وہ نوائے وقت ایڈیٹوریل سے وابستہ ہو گئے اور ان سے نیاز مندی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ان کی صاف گوئی، ایمان داری، دیانت، چھوٹوں سے شفقت اور ان کی رہنمائی، اخلاقی اقدار کی پاسداری اور وضعداری اور دیگر خوبیاں آشکار ہوئیں اور ان سب سے بڑھ کر وہ شاعری، ناول، افسانہ، تنقید، نثر اور کسی بھی ادبی صنف کے معروف اور گمنام مصنف/آفاقی شاعر و ادیب کی جملہ خصوصیات کا فوری یوں احاطہ کرتے کہ مجھ جیسے بے ادب اور کم علم افراد بھی ان کے فن و شخصیت کے بارے میں با آسانی کھوج لگا لیتے۔ ان کے مختصر ریمارکس سب سے جامع اور موثر ہوتے۔ نوائے وقت کا ادبی صفحہ کرتے ہوئے ان کا ادب نامہ باقاعدگی سے شائع کرتا، جس پر وہ ہمیشہ مشکور ہوتے ان کا یہ ادب نامہ ہفتے میگزین کیلئے تبصرہ کتب اور دیگر تحریریں سرکولیشن کے ساتھ ظفر طاہر لاتے جو اقبال ٹاؤن میں سنگم بلاک میں ان کے پڑوسی تھے۔ ان کی رحلت کے بارے میں ظفر طاہر نے بتایا کہ انہوں نے ایک ہفتہ قبل کہا تھا کہ اب چند دنوں کا مہمان ہوں، میرا آخری وقت آ گیا ہے۔ وہ ظفر طاہر کے والد طاہر القادری کے قریبی دوست تھے ان سے کہتے کہ وہ اب ان کے والد کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ کوئی اہم دن آتا تو میں خصوصی طور پر فون کر کے انہیں موضوع بتاتا اور وہ ہمیشہ مقررہ وقت پر آرٹیکل بھجواتے چاہے وہ کتنے علیل ہی کیوں نہ ہوتے۔ جبکہ کسی بھی ادیب، شاعر یا دانشور کی رحلت پر انہیں فون پر مطلع کر کے ان سے کچھ لکھنے کی درخواست کرتا تو وہ ان کی موت کا سن کر از حد رنجیدہ ہوتے اور مجھے یوں لگتا کہ جیسے انہوں نے خود اپنی موت کے قدموں کی چاپ سن لی ہو۔ مجھ سے عمر میں خاصا بڑا ہونے کے باوجود برادر کہہ کر مخاطب کرتے اور کہتے کہ برادر میرے ساتھ کے تو سب چلے گئے اور اب میری باری ہے اور تم کسی روز ختم سن لو گے۔ جب رمضان میں فون کرتا تو فون پر ان کی کھنکھارنے کی صدا آتی جس کے بعد وہ بات کرتے، اونچا سننے کے باعث زیادہ آواز سے بولنا پڑتا، جب خیریت دریافت کرتا تو کہتے کہ برادر بس گزر رہی ہے۔ زیادہ تر پیشاب کی تکلیف کا ذکر کرتے، پھر نسیان میں بھی مبتلا تھے۔ اتنی عمر اور بیمار ہونے کے باوجود ان کا حوصلہ ہمیشہ بلند رہا۔ وہ زود نویس تھے اور بہت کم وقت میں مختلف موضوعات پر آسانی سے صفحات کے صفحات لکھ ڈالتے۔ جب بھی ان کا ادب نامہ مس ہو جاتا تو فون پر گلہ کرتے ہوئے کہتے کہ مجھے الطافی صاحب کی طرف سے گھر بیٹھے ٹکڑا وصول رہی ہے اس لئے میں اپنی تنخواہ کو حلال کر کے کھانا چاہتا ہوں۔ آپ مجھ سے لکھوائیں اور اسے شائع بھی کریں اور پھر ہمیشہ مشکور ہو کر یہ جملہ ضرور کہتے

کہ برادر یہ آپ ہی ہو جس نے مجھے زندہ رکھا ہوا ہے اور مجھے مسلسل لکھنے کا حوصلہ ملتا ہے۔

جب اپنی تحریر بھیجتے اس کے ساتھ عام طور پر مختصر سا خط بھی ضرور تحریر کرتے، جن میں سے بیشتر میرے پاس محفوظ ہیں۔ بطور میگزین ایڈیٹر صفحات کے موضوعات اور تھیموں، ڈیزائن سب کی الگ الگ تعریف کرتے، خاص طور پر میگزین کی خواتین کی تحریروں شازیہ سعید، فرزانہ چوہدری اور تحریم فاطمہ کا خصوصی ذکر کرتے کہ آپ خواتین کو بھی انواع و اقسام اور ان کے مزاج سے مختلف موضوعات دے کر کام لے رہے ہو۔ جب میں گلہ کرتا کہ آپ فون نہیں کرتے تو کہتے یار فون نہ بھی کروں مجھے تو ہر اتوار کو سنڈے میگزین اور عام ڈیلی کلر ایڈیشن میں آپ اور آپ کا کام اور انداز تحریر نظر آتا ہے اور آپ سے باقاعدہ ملاقات ہو جاتی ہے۔ وہ راقم کے ادبی، تاریخی اور اسلامی ذوق کو ہمیشہ سراہتے اور ان پر تحریری تبصرے بھی کرتے۔

ڈاکٹر انور سدید مرحوم کی نوائے وقت اور مجید نظامی مرحوم سے عقیدت اور محبت آپ اپنی مثال تھی اگرچہ انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد ادارہ جائن کیا لیکن شروع سے نوائے وقت پڑھتے تھے جس کا وہ ہمیشہ ذکر کرتے۔ نظامی صاحب کا ذکر کرتے ہوئے لہجے سے ان کی عقیدت عیاں ہوتی، وہ دفتر میں دائیں یا بائیں کی کسی بھی سیاست سے لاتعلق رہتے اور ہمیشہ اپنے کام کو ترجیح دیتے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے بغیر ڈاکٹر انور سدید کا تذکرہ ادھورا رہے گا، انہیں ڈاکٹر وزیر آغا کا سب سے بڑا مداح اور ترجمان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کی محبت کا قرض ان کی زندگی اور ان کی وفات کے بعد بھی بخوبی ادا کیا جبکہ ہمارے دیرینہ دوست اظہر جاوید سے بھی انہیں گہری انسیت تھی اور نوجوانوں میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر کی تنقید اور کام کی ہمیشہ تعریف کرتے۔ 20 مارچ کو سنڈے میگزین کے 23 مارچ اور نوائے وقت کی 76ویں سالگرہ کے خصوصی شمارے میں ان سے علم و ادب اور فروغ کتب میں نوائے وقت کے کردار پر خصوصی تحریر لکھوائی تھی جو ان کی وفات کے روز شائع ہوئی جبکہ ان سے آخری مرتبہ بات انتظار حسین کی وفات پر ہوئی تو ان سے ٹیلی فون پر تاثرات بھی لئے۔ اس موقع پر انتظار حسین مرحوم کی اہلیہ کا ذکر کرنے لگے کہ ان کی وفات کے بعد انتظار حسین بالکل ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔ میں نے کہا کہ ماشاءاللہ آپ کی اہلیہ محترمہ تو حیات ہیں تو کہنے لگے برادر اصل میں اسی نے مجھے سنبھال رکھا ہے یا یوں کہہ لیں کہ ہم نے ایک دوسرے کو سنبھال رکھا ہے ورنہ میرے جن ادیب شاعر دوستوں کی بیویاں انتقال کر گئی ہیں ان کا آخری وقت بہت خراب اور انجام بہت برا ہوا ہے۔ سچ پوچھئے تو ڈاکٹر انور سدید بہت باہمت انسان تھے جو زندگی کے آخری لمحے تک جدوجہد کرتے رہے۔ افسوس صد افسوس اب ان کا کوئی فون نہیں آئے گا اور نہ ہی ان کی طرح اتنے کھلے دل و دماغ سے کوئی حوصلہ افزائی کے چند الفاظ ادا کرے گا اور نہ ہی خصوصی اشاعت اور کسی ادیب، شاعر کی رحلت پر اس طرح رہنمائی اور فوری آرٹیکل ارسال کرے گا۔ اللہ تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین!

◆◆◆

محترمہ نیر جہاں صاحبہ کو ادبی خدمات پر 2015ء کا "تخلیق ایوارڈ" مبارک ہو! (ادارہ تخلیق)

میں ابر بن کے برستا ہوں کھیتوں پہ سدید
جو لے کے آتا ہے زرخیزیاں وہ دریا ہوں
(ڈاکٹر انور سدید)

ڈاکٹر انور سدید کی یاد میں

اظہر سلیم مجوکہ

20 مارچ 2016 کا دن اہل علم و دانش اور ادب کے طالب علموں کے لئے سوگوار دن تھا کہ عالمی سطح پر پذیرائی اور شہرت حاصل کرنے والے ادیب ڈاکٹر انور سدید اس روز جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ اپنے ادبی حوالے اور ان تھک کام کی وجہ سے ادبی دنیا میں انہیں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ عمر کے آخری حصے میں بیماری کے باوجود بھی انہوں نے قرطاس و قلم سے اپنا رشتہ استوار رکھا اور اپنے ادبی فرائض بااحسن خوبی نبھاتے رہے۔ انہوں نے لگ بھگ 70 سال ادب کے مختلف شعبوں میں آبیاری کی اور شعر و ادب کی خدمت اور پذیرائی میں مصروف رہے۔ نوائے وقت اور مجید نظامی سے انہیں خاص محبت اور عقیدت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آخری دم تک نوائے وقت کے صفحات پر ایک درخشاں ستارے کی مانند جگمگاتے رہے۔ انہوں نے ادب، سیاست، ثقافت اور بہت سے دیگر موضوعات میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر اور قلم کی جولانیاں دکھائیں۔ کتاب دوستی کے فروغ میں اپنا اہم کردار ادا کیا۔ مختلف موضوعات پر تحریر کی گئی کتب پر ان کے سیر حاصل تبصرے کسی بھی کتاب اور اس کے مصنف کے لئے سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ لکھنا اور پڑھنا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ جس رفتار اور مقدار سے انہوں نے لکھا ہے وہ آج کے طالب علموں کے لئے ایک دستوری کا درجہ رکھتا ہے۔ ان سے تحصیل علم و ادب حاصل کرنے والے شاگردوں کی فہرست بھی طویل ہے۔ وہ دبستان سرگودھا سے تعلق رکھتے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ مل کر دبستان سرگودھا کو مضبوط کیا اور لاہور میں دبستان لاہور کے ساتھ کئی ادبی معرکے کئے۔ وزیر آغا کی انشائی تحریک میں بھی انہوں نے اپنا اہم کردار ادا کیا۔ اردو ادب کی کئی تحریکوں کی پذیرائی اور بہت سوں کو متعارف کرانے میں بھی ڈاکٹر انور سدید کا خاصا حصہ ہے۔ تقریباً 1990 کی دہائی میں ان کے حوالے سے نثری نظم کی تحریک بھی خاصی مقبول ہوئی۔

ڈاکٹر انور سدید نقادوں کی پرواہ کئے بغیر اپنا مشن جاری رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں کئی نئی وارد ہونے والی اصناف متنازعہ ہونے کے باوجود مقبولیت کا درجہ اختیار کر گئیں۔ ملتان کے اہل ادب اور شعر و سخن کے دوستوں سے بھی ان کا قریبی اور قلبی تعلق رہا۔ اسلام آباد میں ہونے والی اہل قلم کانفرنسوں میں بھی ان سے خصوصی ملاقاتیں ہوئیں۔ فون پر بھی رابطہ رہتا۔ گزشتہ دنوں لاہور کے کتاب میلہ میں اپنے ادیب دوست بھائی مظہر مجوکہ کی وساطت سے ان کے بیٹے مسعود انور سے بھی ملاقات رہی اور ڈاکٹر صاحب کی صحت کے حوالے سے باتیں ہوتی رہیں۔ انہوں نے بتایا کہ اگرچہ ابا جی کی حالت بہتر نہیں اس کے باوجود دوستوں کے فون سنتے ہیں اور ان کی کالوں کا جواب دیتے ہیں۔

20 مارچ کو ان کی وفات کی خبر ادب دوستوں اور ادبی حلقوں کے لئے کسی صدمے سے کم نہیں تھی۔ اس روز ادب کے ایک عہد کا خاتمہ ہوا۔ وہ شخص جو اپنے علمی و ادبی کام کی وجہ سے ایک انجمن اور ایک ادارہ تھا راہی عدم ہوا۔ ادبی حلقوں میں ان کی وفات کی خبر جنگل میں

آگ کی طرح پھیلی۔ ملتان میں 20 مارچ کو بہاریہ مشاعرہ تھا لیکن علم و ادب کے لیے اہم چراغ کے بجھنے سے اس مشاعرے کی شمع کی لو بھی مدہم رہی۔ ملتان کے بیشتر علمی و ادبی حلقوں کی طرف سے اس بہاریہ مشاعرے کو ملتوی کرنے کی بازگشت بھی سنائی دی۔ تاہم منتظمین کی انتظامی اور شہری مجبوریوں کی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو سکا۔ بہر حال یہ قانون قدرت ہے خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ جانے والوں کو کب کوئی روک سکا ہے؟ زندگی کی مصروفیات کا پہیہ اسی طرح چلتا رہتا ہے لیکن ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت انسان اور ادب دوستی اور کتاب شناسی کے لیے کی جانے والی ان کی ان تھک محنت شعر و ادب کی دنیا میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ وہ دوستوں کے دلوں میں ہمیشہ آباد رہیں گے۔ اور ان کی یادوں کی شمع بھی ہمیشہ روشن رہے گی۔ انہوں نے پیرانہ سالی کے باوجود شعر و ادب سے اپنا تعلق آخر وقت تک برقرار رکھا۔ ان کی تدفین سرگودھا میں ہوئی جہاں شعر و ادب سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات نے بھی شرکت کی۔ یقیناً ان کے ادبی حوالوں سے اب تعزیتی ریفرنس بھی منعقد ہوں گے اور ان کی ادبی خدمات کو خراج تحسین بھی پیش کیا جائے گا لیکن حکومتی اور ادبی سطح پر ان کی ادبی خدمات کے لیے بہترین خراج تحسین یہ ہے کہ انہیں ادب کا بڑے سے بڑا ایوارڈ دیا جائے کہ کچھ شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ ان کو ملنے سے ایوارڈ کی توقیر بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو جوار رحمت میں جگہ ملے اور شعر و ادب کی دنیا میں ان کے نام اور کام کا ڈنکا اسی طرح بجتا رہے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

◆◆◆

"تخلیق" مندرجہ ذیل لائبریریوں میں بھی دستیاب ہے

لاہور	قائداعظم لائبریری	چیف لائبریرین: رانا اختر علی (042-99203371) باغ جناح شاہراہ قائداعظم، لاہور
لاہور	پنجاب یونیورسٹی لائبریری	چیف لائبریرین: حبیب پراچہ (042-99231126) پنجاب یونیورسٹی، قائداعظم کیمپس، لاہور
لاہور	پنجاب پبلک لائبریری	چیف لائبریرین (042-9921649) متصل لاہور میوزیم، شاہراہ قائداعظم، لاہور
لاہور	پریس کلب لائبریری	چیف لائبریرین: محمد اویس (042-36363316) پریس کلب، شملہ پہاڑی، لاہور
لاہور	کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی لائبریری	چیف لائبریرین: اظہر اقبال (042-99211145) کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی، میو ہسپتال روڈ، نیلا گنبد، لاہور

ایک اور چراغ بجھ گیا

تنویر قیصر شاہد

لیجئے ڈاکٹر انور سدید صاحب بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ بے شک ہر انسان کو اپنے اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ ہمارے ڈاکٹر انور سدید صاحب بھی ہمیشہ کے لیے واپسی کے راستے پر روانہ ہو گئے۔ وہ رخصت ہوئے ہیں تو ہماری ادبی دنیا اور تحقیق کا میدان بھی ویران ہو گیا ہے۔ لاریب ہم ادب و صحافت کی ایک بڑی شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جانے والے کی وجہ سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ بھی پُر ہوتے ہوتے ہو سکے گا۔ سائنسی اعتبار سے یہ فقرہ بنیادی طور پر غلط ہے کہ فطرت کائنات میں کسی بھی خالی جگہ کو برداشت ہی نہیں کرتی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہم تو اب سیاسی، علمی، مذہبی اور صحافتی میدانوں میں قابلِ فخر شخصیات سے تیزی کے ساتھ جس طرح محروم ہوتے جا رہے ہیں، یہ خلا جیسے "بلیک ہول" بن رہا ہے۔ یہ بلیک ہول ہے جو بڑے انسانوں کو نگل تو رہا ہے لیکن اس کے بطن سے ہمارے لیے کوئی کارآمد شے، کسی کارآمد وجود کی ولادت نہیں ہو رہی۔ ڈاکٹر صاحب کی رحلت نے ہمیں مزید مفلس، تہی دست اور بے سرمایہ بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر انور سدید صاحب، جنہوں نے دنیائے ادب و نقد میں محنت و ریاضت سے اپنی ذات کا لوہا منوایا، نے اپنے عملِ مسلسل سے ثابت کیا کہ تعمیری اور کارآمد زندگی کیا اور کیسی ہوتی ہے۔ زندگی کے آخری ایام تک ہاتھ سے قلم چھوڑا نہ ادبی ریاضت سے دست کش ہوئے۔ کیا یہ حیرت انگیز بات نہیں ہے کہ ایک شخص بائی پروفیشن انجینئر تھا لیکن اس نے ہماری ادبی دنیا میں ناقابلِ تردید یوں بڑا نام کمایا کہ ان کی انجینئرنگ کی مہارت اور تعارف کہیں گم ہو گیا اور ان کی ادبی، صحافتی اور تصنیفی زندگی عالمی سطح پر چھا گئی اور اسے تسلیم بھی کیا گیا۔ ادبیات کے متنوع موضوعات پر درجنوں کتابیں تصنیف و تالیف کر کے ڈاکٹر صاحب نے بلاشبہ بلند مقام حاصل کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی قیادت میں انہوں نے اپنے حریفوں سے جس مجاہدانہ انداز میں چومکھی لڑائیاں لڑیں، یہ ادبی معارکے ہماری علمی زندگی کے باب میں ہمیشہ تابندہ اور یادگار رہیں گے۔ یقیناً وہ ادب میں گروہ بندی کا حصہ تھے اور ممتاز ادیب و شاعر ڈاکٹر وزیر آغا کی سرکردگی میں رزم آرا بھی رہتے تھے۔ اس میدان کی طرف انہیں ان کے ادبی مخالفین نے دھکیلا جو یہ خیال کیے بیٹھے تھے اور مطالبہ کرتے تھے کہ ادب پر ان کی اجارہ داری تسلیم کی جائے۔ جب اس گروہ کی زیادتیاں اور دست درازیاں حد سے تجاوز کر گئیں تو ڈاکٹر انور سدید صاحب نے آخر کار اس گروہ کو للکار کر چیلنج کیا اور دلائل و براہین سے خم ٹھونک کر میدانِ کارزار میں اترے۔ کبھی پسپا ہوئے نہ شکست تسلیم کی۔ وسیع مطالعہ، گہری فکر اور غور و تدبر ہی ان کے ہتھیار تھے۔ یہی ان کے تیر و تفنگ تھے اور یہی ان کی ڈھال تھی۔ ان "ہتھیاروں" کو بروقت بروئے کار لانا بھی وہ خوب جانتے تھے۔ ان کی کمان سے نکلے تیر ہمیشہ ہدف کو لگے، چنانچہ اکثر میدانوں میں سرخرو ہوئے۔ ان کے غنیم کسمسائے بھی اور بلبلائے بھی۔ اتوار کو ٹی وی کی معرفت مجھے ڈاکٹر انور سدید صاحب کی فوتیدگی کی خبر ملی۔ اس وقت میں ڈاکٹر صاحب ہی کی لکھی گئی معرکہ آرا کتاب "غلام الثقلین نقوی شخصیت اور فن" پڑھ رہا تھا۔ ہماری دیہی زندگی کے پس منظر میں پروفیسر غلام الثقلین نقوی صاحب کے لکھے گئے افسانے اور ناول ہمیشہ یاد رہیں گے۔ نقوی صاحب ڈاکٹر صاحب کے قریبی دوست بھی تھے اور ادبی زندگی میں ہم فکر بھی۔ لاہور میں دونوں ایک ہی کالونی کے باسی بھی تھے۔ "اکادمی ادبیات" (اسلام آباد) کی نگرانی میں نقوی صاحب پر شائع ہونے والی ڈاکٹر انور سدید کی یہ کتاب 294 صفحات پر مشتمل ہے۔ نقوی صاحب چھ اپریل

2002ء کو انتقال کر گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے دوستی کا حق یوں ادا کیا کہ اکادمی ادبیات کی درخواست پر یہ شاندار کتاب لکھ دی۔ انہوں نے مجھے یہ کتاب بھجوائی اور اس کے پہلے صفحے پر محبت کے یہ الفاظ تحریر فرمائے تھے "برادر عزیز تنویر قیصر شاہد کی خدمت میں خلوص کے ساتھ"۔ نیچے ان کے وہی مشہور اردو کے دستخط جنہیں میں دور ہی سے پہچان لیتا ہوں۔ ساتھ ہی وہ جنوری 2012ء کی تاریخ درج ہے۔ یہ کتاب انہوں نے اسی خواہش کے ساتھ ارسال فرمائی ہوگی کہ میں پڑھ کر اس پر تبصرہ بھی لکھوں گا لیکن میری بدقسمتی کہ نہ لکھ سکا۔ چند روز قبل اس پر نظر پڑی تو کتابوں کے ڈھیر سے اسے فوراً نکالا۔ سوچا کہ غلام الثقلین نقوی صاحب کی اپریل کے پہلے ہفتے برسی آنے والی ہے، تبصرہ لکھوں گا تو موقع کی مناسبت سے ڈاکٹر صاحب خوش بھی ہو جائیں گے اور چار سال پرانا ادبی قرض بھی اتر جائے گا۔ ساری کتاب پڑھ لی تھی اور چند نوٹس بھی لے لیے تھے لیکن اس سے پہلے ہی ڈاکٹر صاحب داغِ مفارقت دے گئے۔ عمر بھر قلم کی مزدوری کرنے والے اور انور سدید صاحب ہم سے جدا ہوئے ہیں تو دل بجھ کر رہ گیا ہے۔ ان کی رخصتی پر سب دوست احباب گریہ ساماں ہیں۔

آہ! کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم، کیا گئے! زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے، مرجھا گئے

کالم کا دامن اتنا کشادہ نہیں ہے کہ ڈاکٹر انور سدید سے وابستہ لاتعداد یادوں کو یکجا کر کے سمیٹا جا سکے۔ انہیں چند الفاظ اور چند آنسوؤں کی شکل ہی میں یاد کر کے خراجِ عقیدت و تحسین پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہم دونوں جس ادارے سے وابستہ تھے، وہاں سے ایک ہفت روزہ اور ایک ماہنامہ شائع ہوتا تھا۔ جس محنت اور لگن سے ڈاکٹر صاحب کام کرتے تھے، دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی۔ دوپہر کو عین وقت پر وہ گھر سے لائے گئے توس کھاتے اور اکرم معاون سے دو کپ چائے لانے کا کہتے۔ دونوں کپ وہ خود نوشِ جاں کرتے تھے۔ میں نے ہمیشہ انہیں شلوار قمیص اور واسکٹ پہنے دیکھا۔ گرمی ہو یا سردی، ٹوپی ان کے سر سے نہ اترتی تھی۔ ہم مذاق کرتے تو بھی برا نہ مانتے۔ ایک خاص قسم کا تبسم ان کے ہونٹوں پر سایہ کیے رہتا۔ انہیں کبھی ناراض ہوتے بھی نہ دیکھا۔ بہت لکھتے تھے اور بے پناہ لکھتے تھے۔ متنوع موضوعات پر۔ برادرم رؤف طاہر صاحب ان کی بسیار و سرعت نویسی پر لطیفہ گوئی کرتے تو ردِعمل میں خاموش رہتے۔ میز کے نیچے ان کی ٹانگ ہمیشہ ہلتی رہتی۔ شاید یہ ان کے باطنی اضطراب کا اظہار ہوتا تھا۔ دفتر میں ہمیشہ بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ محکمہ انہار سے ریٹائر ہو کر انہوں نے خود کو ادبی و صحافتی زندگی میں بہت مصروف کر لیا تھا۔ نتیجے میں بہت سی کتابیں ہمارے سامنے آئیں۔ ہر کتاب ڈاکٹر انور سدید صاحب کی کمٹمنٹ اور خونِ جگر جلانے کا ثبوت ہے۔ بھارت میں بھی ان کی ادبی خدمات کا طوطی بولتا تھا۔ مجھے ایک بڑی افتاد اور آزمائش کا سامنا کرنا پڑا تو میری غیر حاضری میں میرے بارے میں ایک تفصیلی کالم لکھا۔ عیاں ہوا کہ وہ مجھ ایسے ہیچ مداں اور کم علم ساتھی سے کس قدر محبت و شفقت کرتے تھے۔ ایک بار راقم نے ان کے ادبی حریف گروپ، جس سے ان کی شدید چپقلش اور نوک جھونک رہتی تھی، کے بارے میں تین قسطوں میں کالم لکھا تو بے انتہا خوش ہوئے۔ میرا یہ کالم نہ صرف ایک بڑے ادبی جریدے میں دوبارہ شائع کروایا بلکہ نصف صفحے کو محیط راقم کی صحافتی اور "تحقیقی" خدمات کی تعریف بھی کی۔ یہ تعریف و تحسین یقیناً میری اوقات سے بڑھ کر تھی۔ انہوں نے کئی ادبی جرائد میں لاتعداد مضامین لکھے اور وطنِ عزیز کے تین بڑے اخبارات میں کالم نگاری بھی کرتے رہے۔ اگر ان مضامین اور کالموں کو اکٹھا کیا جائے تو کئی کتابیں مرتب ہو سکتی ہیں۔ اس بے پناہ شخص کو موت نے ہم سے چھین لیا ہے۔ ہم سب کا بھی یہی مقدر ہے۔ عالمِ آب و خاک و باد میں پیغامِ اجل ہر کسی تک پہنچنے والا ہے۔

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

◆◆◆

منظومات

کون کسے پہچانے گا اب

(ڈاکٹر انور سدید کے لئے)

شبیہ طراز

دھوپ گگن میں ناچ رہی ہے
چڑیاں چھت پر چہکی ہیں
ایک بچارا ڈالی ڈالی بھٹک رہا ہے
کون ہے جو اس کو دکھ دے
[illegible]
[illegible]
بچے ہیں چہتے بچے
پھولوں کی اک ڈالی جو کھلی ہے ڈالی پر
کھلی ادا کی تھی۔۔۔۔ اب مرجھا کر
وہ دیکھے سے تھک گئی ہے
پوجا میں بکھرا گلاب
چپ ہے اداسی کا ساحل دیکھ رہا ہے
سوچ رہا ہے۔۔۔۔
کرتی کیوں ایمان بیچ رہی ہے؟
اطہار کے کرن کو پہچانوں
سر کھو ڈالے دامن اور سارے سہارے
دکھ سے ہیں؟
کیوں اوراق پریشاں ہو کر
بچے ان کا ساتھ سمجھتے ہیں؟
جو سہ کے بیج کے اوپر
بچے کتنے حرف پڑے ہیں
لفظ بھی ان ان کھڑے ہیں۔۔۔۔
جس منظر میں ایک کمی ہے
وہ جگنو تک لفظوں کو دامن میں لا کر
قلم کی کمی ہے
سوچ تخیل کی دنیا تخلیق پہ کر رکھا تھا
آج تنہا ہے۔۔۔۔!

OOO

ڈاکٹر انور سدید

ریاض ندیم نیازی

عزم کی روحِ رواں تھے ڈاکٹر انور سدید
علم و فن کے ترجماں تھے ڈاکٹر انور سدید

خود وہ زندہ رہتے تھے وہ دشتِ معنی میں سدا
فی الحقیقت کہکشاں تھے ڈاکٹر انور سدید

کیوں نہ ہو دنیا سے شعر و فن میں ان کا تذکرہ
عظمتِ حرف و بیاں تھے ڈاکٹر انور سدید

جو بھی دولت ادب سے آپ سے کرتے ہیں پیار
ہر کسی کی جانِ جاں تھے ڈاکٹر انور سدید

زندگی بھر خدمتِ علم و ہنر کرتے رہے
صاحبِ عزمِ جواں تھے ڈاکٹر انور سدید

دوستوں کو ان کی مرگِ ناگہاں پہ ہے ملال
مہرباں و رازداں تھے ڈاکٹر انور سدید

ہو کے رخصت چھوڑ کر تنہا ہمیں جاتے رہے
وہ ندیمِ دوستاں تھے ڈاکٹر انور سدید

OOO

ریشم کی یہ نازک ڈوری

(انور سدید کی یاد میں)

پروین شیر (امریکہ)

دل کش رنگیں
نرم و نازک
ریشم کی ڈوری کھلی ہے
گردش کرتی ریل (Reel) سے جس کا
ایک سرا ہے وحشت کے اندر
پوشیدہ ہاتھوں میں
جو ہر لمحہ اس کو اپنی
جانب کھینچ رہا ہے!
چکر کھاتی پینگ سے ریشم کی ڈوری
لمحہ لمحہ کھلتی ہے کھنچتی جاتی ہے
وحشت میں کھنچتی جاتی ہے اور
اک دن قفس میں کھوکھلی پینگ
خالی ہو کر
یک دم ساکت ہو جائے گی!

OOO

شجاعت علی راہی

اک چراغ اور بجھا......

وہ صبح کے قافلے بلاتا وہ رہا شام و سحر
وادیِ فکر و نظر میں وہ رہا محوِ سفر

اس کی آنکھوں میں اترتے رہے سندر سے خواب
فکر و احساس کے وہ بنتا رہا تازہ گلاب

رنگ لفظوں سے بکھیرے تھے کبھی سر اس نے
ادب و شعر کے آباد کیے گھر اس نے

سوختہ کاغذوں پہ لفظوں کی تپش سہتا رہا
موم کی طرح وہ گھلتا رہا اور بہتا رہا

علم و عرفاں سے دمکتی تھیں وہ روشن آنکھیں
آخرش بجھ گئیں اک روز وہ زریں آنکھیں

اس کی آواز افق پار گئیں ادب کی
"اک چراغ اور بجھا اور بڑھی تاریکی"

OOO

عمیرہ احمد

شہرِ ہنر کا بوڑھا برگد

(۱)

شہرِ ہنر کے چباروں کو دور سے تکتا
[illegible]
[illegible]
سنتا
بوڑھا برگد [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
اور شہرِ ہنر کے چباروں پر [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
شہرِ ہنر کے چباروں [illegible]
[illegible]
اور بوڑھا برگد
[illegible]

(۲)

شہرِ ہنر کا بوڑھا برگد
شہرِ ہنر کے چباروں [illegible]
دیکھا
کیا کہرام مچا ہے
تم بھی رو دو
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
شہرِ ہنر کے چباروں [illegible]
اور تم بھی رو دو......

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

محترم ڈاکٹر انور سدید صاحب کے نام

آج جانے کیا ہوا ایک دیا وہ دیا
وہ دیا جو جلتا رہا
عمر بھر آگہی کے رستے
اور چلتے رہے اس دیے سے دیے
بجھ گیا وہ دیا روشنی دے گیا
روشنی دینے والے دیے بھی کہیں
بجھ گئے ہیں کہیں
ہر طرف جگمگاتے ہوئے ذہن ہیں
علم بیدار ہے
آگہی، روشنی، چاندنی
ہے ثمر ان کی
آپ کی

OOO

انور سدید کی غزل ''پرندہ سفر میں'' کی روشنی میں

(انور سدید کی یاد میں)

پروفیسر جمیل آذر

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا   سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا

مرحوم ڈاکٹر انور سدید ڈاکٹر وزیر آغا کے بے حد ممنون تھے۔ بقول مرحوم کے اگر انہیں وزیر آغا کی دوستی اور قرب میسر نہ ہوتا تو وہ اس مقام تک نہ پہنچتے جس پر وہ پہنچے۔ وہ انہیں اپنا پیر و مرشد مانتے تھے۔ اور یہ ہے بھی حق۔

ڈاکٹر انور سدید جیسا شاید ہی کوئی کثیر المطالعہ، بسیار نویس شخص ہندوستان اور پاکستان میں ہو۔ انہوں نے اقلیم ادب میں متعدد اصناف میں اپنے قلم کا لوہا منوایا۔ ابتدا میں انہوں نے افسانے پر قلم کے جو مختلف ادبی جرائد بالخصوص ماہناموں میں شائع ہوئے۔ پھر شعر و شاعری کی دنیا میں قدم رکھا ازاں بعد صحافت کی طرف آ گئے۔ جب ڈاکٹر وزیر آغا کی صحبت میسر آئی تو انشائیہ نگاری کی طرف توجہ مبذول کی اور گراں قدر انشائیے تخلیق کیے اور ان کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ "ذکر اس پری وش کا" کے نام سے شائع ہوا۔ ازاں بعد تنقید کی دیوی ان پر مہربان ہو گئی۔ "اردو ادب کی تحریکیں" کے مقالہ پر انہیں پنجاب یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔ تحقیق و تنقید کے مرد میدان کی حیثیت سے انہوں نے اپنی منفرد پہچان کروائی۔ عمر کے آخری دور میں جہاں صحافت کا جن ان کے قابو میں آیا وہاں شعر و شاعری کی دیوی نے بھی ایک بار پھر ان پر نظر التفات ڈالی۔ دیکھتے ہی دیکھتے غزلوں کا ایک خوبصورت مجموعہ "پرندہ سفر میں" کے نام سے مقبول اکیڈمی لاہور نے 2009ء میں شائع کیا۔ ملک مقبول احمد مرحوم شناس نظر نے انور سدید کے اندر چھپا ہوا سخنور دریافت کر لیا۔

انور سدید کی غزلوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ان کی پختہ عمر کی شاعری ہے۔ ان غزلوں میں عہد شباب کی وہ گرمی تو نہیں ہے جو عموماً نوجوان شعرا میں ہوتی ہے البتہ ان میں فکر کی گہرائی، تجربے کا نچوڑ اور مشاہدے کا حسن ضرور ہے۔ مجھے یہاں بے ساختہ ورڈزورتھ یاد آ گیا۔ اس نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف 'پریلیوڈ' میں بڑے پتے کی بات کی ہے کہ "اگرچہ اس کہن سالہ عمر میں میرے تمام حیوانی جذبات ختم ہو چکے ہیں لیکن خالق کائنات نے اس محرومی کی تلافی کرتے ہوئے مجھے فلسفیانہ ذہن عطا کر دیا ہے۔ اب میں پہلے کی نسبت فطرت کے حسن سے بہتر طور پر لطف اندوز ہوتا ہوں۔" انور سدید بھی اپنی بزرگی کی اس عمر میں زندگی کے حسن و مظاہر سے پہلے کی نسبت زیادہ محظوظ ہوئے۔ ان کی ایک غزل کے مندرجہ ذیل اشعار ان کی پختگی فکر اور طمانیت قلب کی غمازی کرتے ہیں۔

حسن پابند وفا برق کا ہوتا ہے   عشق مجبور جفا دست دعا ہوتا ہے

کانپتے ہونٹ ترے جس کو ادا کر نہ سکے   میرے ہونٹوں سے وہی سجدہ ادا ہوتا ہے

صبح کے وقت تو سورج نے مرا ساتھ دیا — شب کی دہلیز پہ کیوں مجھ سے جدا ہوتا ہے
جب گزرتا ہوں میں اس شہر کی گلیوں سے سدید — آنکھ بجھتی ہے تو دل آبلہ پا ہوتا ہے

یہ اشعار انور سدید نے اسی سال کی عمر کے قریب کہے۔ اس طویل مدت کے سفر میں انسان دنیا کے گرم و سرد و تلخی بھی چکھ چکا ہوتا ہے۔ اسی عرصہ میں اپنے پرائیوں کا ادراک بھی ہوتا ہے وفا اور بے وفائیوں کا تجربہ بھی۔ بچپن اور جوانی کی خوشیوں کو یاد کرتا ہے اور بڑھاپے کی تکلیف محسوس کرتا ہے۔ اپنے سامنے ہمعصروں کے جنازے اٹھتے دیکھتا ہے۔ انور سدید کے سامنے ان کے کئی احباب "اک اک کر کے ستاروں کی طرح ڈوب گئے" اور انہوں نے ہر ایک پر پرنم آنکھوں کے ساتھ دلگداز تعزیت نامے سپرد قلم کیے۔ وہ خود بھی اب بڑھاپے کے ساتھ مختلف بیماریوں میں مبتلا رہنے لگے تھے۔ انہیں اب بھی قلم کاری کی مشقت سے جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے رزق حلال کمانا پڑتا تھا۔ زندگی کے اس کڑے کوس کی مسافت میں اپنے زندہ رہنے کو وہ کسی معجزہ سے کم نہیں سمجھتے تھے۔

یہ زندگی تو کڑے کوس کی مسافت تھی — جو کٹ گئی ہے اسے ایک معجزہ جانوں
عہد حاضر اک مشین اور اس کا کارندہ ہوں میں — ریزہ ریزہ روح بکھری ہے مگر زندہ ہوں میں

آج کا زمانہ اقتصادیات، سائنس اور علم و فن کا ہے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی نے حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں نے دنیا کی اقتصادیات پر استحصالی نظام مسلط کر دیا ہے۔ لوگ دن رات مشین کی طرح کام کرتے ہیں۔ لوگوں کے دل سے خوف خدا اٹھتا رہا اور وہ دیوانہ وار سیم و زر کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ مابعد از مرگ کا عقیدہ اور جواب دہی کا تصور ختم ہونے کی وجہ سے ملک میں کرپشن عام ہو گئی۔ یہ کرپشن بالخصوص اہل اقتدار اور سیاستدانوں اور بیوروکریسی میں کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہے۔ اہل اقتدار کے غیر ملکی بنکوں میں اربوں روپے جمع ہیں۔ ان کی ہوس زر ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ ایسی غیر اصلاحی صورت حال کو دیکھ کر انور سدید اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

وابستہ اس طرح سے ہوئے سیم و زر کے ساتھ — لوگوں کے دل سے خوف خدا کا اتر گیا

وہ بنیادی طور پر دینی ذہن کے مالک تھے۔ ذات الٰہی پر بھروسہ، عقیدہ آخرت پر یقین، محنت و مشقت سے رزق حلال کمانا اور عطا کردہ نعمتوں پر اللہ رب العزت کا شکر بجا لانا ان کی فطرت میں شامل تھا۔ میں جب آج سے پچاس سال پہلے اور اب کے دور کو دیکھتا ہوں تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ پہلے سڑکوں پر تانگے اور سائیکلیں چلتی نظر آتی تھیں۔ کرنل اور بریگیڈیئر تک سائیکلوں پر دفتر جاتے تھے۔ اگر کسی کے پاس کار تھی تو لوگ اسے حیرت و حسرت سے دیکھتے تھے۔ لیکن اب سڑکوں پر کاروں کا سیل رواں ہے۔ پہلے کم کم گھروں میں ٹیلیفون، ریڈیو اور ریفریجریٹر تھے۔ اب تقریباً ہر گھر ان پر آسائش چیزوں سے مزین ہے۔ گھروں میں نت نئے ٹیلیویژن، موبائل فون اور لیپ ٹاپس موجود ہیں۔ آج کے بیشتر صحافی اور شاعر و ادیب خوش حال ہیں۔ ان کے ہاں وہ تمام جدید آسائشیں میسر ہیں جو آج کل لازمی تصور کی جاتی ہیں۔ انور سدید عرف عام میں متمول تو نہیں تھے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل سے انہیں وہ تمام بنیادی سہولتیں اور آسائشیں میسر تھیں۔ اہل دل ہونے کی وجہ سے ان نعمتوں کا شکر ادا کرتے کیونکہ وہ شکر گزار بندوں میں سے تھے۔

بے حد و حساب کرم اس نے کر دیا — گرچہ طلب خدا سے زیادہ نہیں کیا

انور سدید یہ بھی ہے فطرت کا معجزہ   پھل پھول لگ رہے ہیں جو سوکھے درخت کو

عمرِ عزیز کا طویل سفر طے کرنے کے بعد فطری طور پر آدمی اپنے تجربے، مشاہدے اور نتائج کا بھرپور تجزیہ کرتا ہے۔ ہم دوستوں، عزیزوں، قربت داروں اور رشتہ داروں کے ساتھ بڑی امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ بعض افراد کو ہم اتنا پسند کرتے ہیں کہ انھیں اپنے دل میں غیر معمولی جگہ دے کر انھیں پوجنے لگتے ہیں۔ لیکن جب مشکل وقت آتا ہے تو مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پھر آدمی سراب سے نکل کر بے رحم حقیقت کا ادراک کرتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں۔

اس سنگ دل کے پاس کہاں تھے وفا کے پھول   انور سدید جس کو سدا پوجتا رہا
تھا یقیں جس پہ اک حقیقت کا   وہ حقیقت نہیں ہے سایہ ہے
محبت کے گھر میں آج انور   لگا ہے سر پہ اک پتھر اچانک
ڈھونڈ اپنا آشیانہ آسمانوں سے پرے   یہ زمیں تو ہوگئی نامہرباں انور سدید
کانٹے جو دوستوں نے بکھیرے ہیں راہ میں   پلکوں سے اپنی آپ چنو اور خوش رہو

ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ وہ سرابِ دنیا میں گرفتار نہیں تھے۔ وہ حقیقت آشنا تھے۔

انور سدید 4 دسمبر 1928ء کو قصبہ میانی بھلوال ضلع سرگودھا میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم سرگودھا میں حاصل کی اور میٹرک کا امتحان بھی سرگودھا سے پاس کیا۔ وہ ہمیشہ اپنی کلاس میں فرسٹ آتے تھے۔ وہ اگرچہ بنیادی طور پر انجینیئر تھے لیکن وزیر آغا کی صحبت اور تربیت نے انھیں بے نظیر نقاد، محقق اور ادیب بنا دیا۔ انجینیئرنگ کی تعلیم تو انھوں نے انجینیئرنگ سکول، مغلپورہ سے لی لیکن ادب کی تعلیم وزیر آغا سے حاصل کی۔ وہ اس پر فخر کرتے تھے۔ یہ وزیر آغا ہی تھے جنھوں نے انھیں محمد انوار الدین سے انور سدید بنا دیا۔ پہلا نام حقیقی تھا تو دوسرا نام ادبی۔ ملک مقبول احمد قدر شناس ناشر نے ان کی متعدد کتابیں مقبول اکیڈمی لاہور سے شائع کیں۔ انور سدید 80 سے زیادہ کتابوں کے مصنف اور مؤلف تھے۔ 2008ء کو صدرِ پاکستان کی طرف سے انھیں علم و ادب کی خدمات کے صلے میں صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ علاوہ ازیں انھیں سرکاری اور غیر سرکاری ایوارڈ بھی عطا ہوئے۔

20 مارچ 2016ء کو ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور وہ سینکڑوں دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں کو سوگوار چھوڑ گئے۔ اٹھاسی سال کی عمر پائی جس میں انھوں نے لازوال تنقیدی و ادبی کام کیا۔ خدا انھیں غریقِ رحمت کرے! (آمین)

◆◆◆

آنکھ پہ پٹیوں کی چلمن، ہونٹ پہ لوہے کا قفل   اے دلِ بے خانماں کس گھر میں لے آیا مجھے
ہجرت پیہم مقدر کیوں ہوا انور سدید   اپنے کاندھے پر اٹھا کر اپنا گھر لایا ہے کون

(ڈاکٹر انور سدید)

"قلم کے لوگ" کا خاکہ

شفیع ہمدم

ڈاکٹر انور سدید کی ادبی لحاظ سے کئی جہتیں ہیں۔ ان کے ادبی کام سے ادب کے لوگ واقف ہیں۔ ابتدا میں انہوں نے افسانے تحریر کیے۔ بطور نقاد ان کا شمار ادب کے صف اول کے نقادوں میں ہوتا ہے۔ وہ کتابوں کے دیباچے اور فلیپ بھی لکھتے ہیں۔ کتابوں پر تبصرے بھی کرتے ہیں۔ وہ ایک زود نویس ادیب ہیں مگر بسیار نویسی کے باوجود اپنی تحریر کے معیار کو کم نہیں کرنے دیتے۔ وہ ایک اچھے انشائیہ نگار بھی ہیں۔ وہ اعلیٰ معیار کے شاعر بھی ہیں۔ ان کے خاکوں کی کتاب "قلم کے لوگ" 1999ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں چودہ ادیب شامل ہیں جو آج ہمارے درمیان موجود ہیں۔ جب تک ہم ان کی تحریروں میں معانقہ اور مصافحہ کرتے رہیں گے وہ ہمارے درمیان موجود رہیں گے۔ ڈاکٹر انور سدید نے جن شخصیات کو موضوع بنایا ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: ڈاکٹر سید عبداللہ، ابوالفضل صدیقی، فکر تونسوی، ڈاکٹر سہیل بخاری، خواجہ احمد عباس، کنہیا لال کپور، خلیل الرحمن اعظمی، سلطان بٹ، آنس معین، وحید انور گوندی، غلام جیلانی اصغر، مرزا ادیب، محمد عبداللہ قریشی اور ڈاکٹر وزیر آغا۔ یہ کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں ان لوگوں کے خاکے ہیں جو ہمیں داغ مفارقت دے چکے ہیں۔ دوسرے حصے میں ان لوگوں کے خاکے ہیں جو اس وقت بقید حیات ہیں مگر ان میں مرزا ادیب آج ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں۔

اردو ادب میں خاکہ نگاری ایک دیرینہ صنف ہے۔ اس کے ابتدائی نقوش ہمیں محمد حسین کی کتاب "آب حیات" میں نظر آتے ہیں۔ تاہم اردو خاکہ نگاری کی باقاعدہ ابتدا فرحت اللہ بیگ (خاکے) "نذیر احمد کی" کہانی کچھ میری کچھ ان کی زبانی" سے ہوئی۔ جسے اردو ادب کا بہترین خاکہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ رشید احمد صدیقی کے خاکوں کی دو کتابیں منظر عام پر آ گئیں "گنج ہائے گراں مایہ" اور "ہم نفسان رفتہ"۔ رشید احمد صدیقی صاحب اسلوب ادیب ہیں۔ ان کی کتاب "گنج ہائے گراں مایہ" میں تخلیق کے عمدہ نمونے ملتے ہیں۔

مولوی عبدالحق نے اپنی تمام مصروفیات کے باوجود خاکے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کے دو خاکوں "نور خان" اور "دیو مالی" کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ شاہد احمد دہلوی بہت عمدہ خاکے لکھتے تھے مگر بطور خاکہ نگار بشری کمزوریوں کو صرف نظر کر دینے کے عادی تھے۔ محمد طفیل کے خاکوں کے آٹھ مجموعے منصہ شہود پر آئے۔ ان کے بعض خاکے بہت عمدہ ہیں جو خاکہ نگاری کے اصولوں پر پورے اترتے ہیں۔ بعض خاکے اتنی تفصیل سے تحریر کیے گئے ہیں کہ وہ خاکہ نگاری کی قلمرو سے باہر نکل گئے ہیں۔

اردو میں خاکہ نگاری افسانے کی سی مقبولیت تو حاصل نہ کر سکی تاہم ادبی رسائل میں خاکے نظر سے گزرتے رہتے ہیں اور ہر سال خاکوں کی کتابیں بھی شائع ہوتی رہتی ہیں۔ بہت سے ادبا نے اس پر طبع آزمائی کی۔ ان میں چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، شوکت تھانوی، ممتاز مفتی، ضمیر جعفری، فارغ بخاری، نظیر صدیقی، ڈاکٹر وزیر آغا، حمید قریشی، اکبر حمیدی، شاہد حنائی اور دیگر خاکہ نگار شامل

ہیں۔ محمد طفیل کے علاوہ کسی نے بھی اس صنف کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ اکثر ادیبوں نے صرف قلم کا ذائقہ بدلنے کے لیے خاکے لکھے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانی صنف ہونے کے باوجود معیاری خاکے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید کے خاکوں میں جو محبت اور خلوص جھلکتا ہے وہ اس امر کا غماز ہے کہ انھیں موضوعِ خاکہ کے ساتھ گہری وابستگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خاکہ تحریر کرتے وقت عدم توازن کا شکار نہیں ہوتے۔ انھوں نے شخصیت کو سراسر مقدس فرشتہ ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی منٹو کی طرح جملوں کی تیغ و تفنگ لے کر حملہ آور ہوئے۔ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ انسانی شخصیت خیر و شر کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے شخصیت کے دونوں رخ دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اپنے ممدوح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کا رویہ ہمدردانہ ہوتا ہے۔ اس لیے شخصیت کی خامیاں بھی ناگوار معلوم نہیں ہوتیں۔ وہ ابوالفضل صدیقی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "مجھے یاد ہے ڈاکٹر جمیل جالبی پر انھوں نے معرکہ آرا سوانحی خاکہ لکھ کر ڈاکٹر وزیر آغا کو دیا۔ "اوراق" کے کاتب تحسین شیرازی ہزار کوشش کے باوجود نہ پڑھ سکے اور یہ کرامت بھی اسی خاص کاتب سے منسوب ہے جو ان کا مسودہ خط پڑھنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ ان کا خط بے حد پیچیدہ تھا لیکن بچے کاتنے کی طرح اس خط کے ساتھ لمبی ریاضت کے بعد ہی موافقت پیدا ہوتی تھی۔"

ڈاکٹر انور سدید نے جن لوگوں کے خاکے تحریر کیے ہیں ان میں سے اکثر کے ساتھ خاصا وقت گزارا تھا۔ محض سنے سنائے واقعات کی اینٹوں پر خاکے کی عمارت تعمیر کرنے کی بجائے شخصیت کے بطون میں اتر کر اس کے اندر کے جزیروں کی سیر کر کے ساخت کی ہے۔ جب ان کی شخصیات کے دریافت کردہ گوشے ہماری آنکھوں اور ذہن میں آتے ہیں تو ان کی ژرف نگاری کا ہمیں قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ آغا صاحب کے "گدلے پانی کا کنول" میں ان کی زندگی کا موازنہ گوتم سے کرتے ہیں کہ آغا صاحب پر گوتم کے اثرات ہونے کے باوجود گوتم اور ان کی زندگی میں بڑا فرق ہے۔ گوتم ایک تیاگی تھے، جبکہ وزیر آغا پر گوتم کے اثرات ہونے کے باوجود وہ ایک بھرپور زندگی گزار رہے ہیں۔

وزیر آغا کی زندگی میں تیاگ کا پہلو کبھی نہیں آیا۔ لیکن اس لمحے نے ان پر ایک جہانِ فانی آشکار کر دیا ہے اور وہ جنت گم شدہ کو پانے جنگل کی طرف لوٹنے اور اپنی ذات کے حجرے میں سمٹ جانے کا عزم ہے۔ وزیر آغا کی شاعری، انشائیہ نگاری اور تنقید ان بطنِ ماہی کا سفر ہے اور انھوں نے اس سفر سے ان ادبی جواہر پاروں کی تلاش کی ہے جن سے اردو ادب پہلے کبھی بالعموم آشنا نہیں ہے۔ اپنے خاکوں کی شخصیات پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالی ہے اس لیے وہ افراط و تفریط کی زد میں نہیں آئے اور ان خاکوں میں توازن کی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ ہر شخصیت کے گرد دھند کی دبیز ہونے کی وجہ سے عام لوگوں کی نظر اس کا احاطہ نہیں کر پاتی۔ خاکہ نگار شخصیت کے گرد پھیلی ہوئی دھند کو ہٹا کر اس کے ظاہری اور باطنی نقوش کو منظرِ عام پر لاتا ہے۔ اس لیے شخصیت اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سامنے آ کر چم چم کرنے لگتی ہے۔ خاکہ نگار کا کام صرف دھند کو ہٹانا ہے۔ اپنی پسند یا ناپسند کا لیبل چسپاں کرنا نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ کوئی خاکہ نگار بھی موضوعِ خاکہ کی شخصیت کو اس طرح پیش کرنے میں قادر نہیں ہے جس طرح وہ ہے یا جیسی وہ ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے اپنے خاکوں کے گرد پھیلی ہوئی دھند کو ہٹا کر ان کے اصل نقوش واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اپنی

آنکھوں پر پسند کی عینک لگا کر ان کے خدوخال دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ چنانچہ قاری شخصیت کے پوشیدہ منطقوں کی سیاحت اپنی آنکھ سے کرتا ہے اور اس طرح شخصیت کے بارے میں اپنی رائے قائم کر سکتا ہے۔ وہ اپنے ایک خاکے "ایک بھری ہوئی بیاض میں آنس معین" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شکیب جلالی اور آنس معین دونوں نے آتش فشاں اپنے اندر جلا رکھا تھا۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ یہ آتش فشاں انہیں لمحہ لمحہ بھسم کر رہا ہے اور ان کے گردوپیش میں جو دنیا پھیلی ہوئی تھی وہ ان کے حوصلے، ظرف اور معیار کے مطابق نہیں تھی چنانچہ ایک مبہم خوف دونوں کے جسم و جاں پر محیط تھا اور دونوں نے ایک جیسے حالات میں اندر کے آتش فشاں میں چھلانگ لگا دی۔ کم نظر لوگوں نے لکھا ہے کہ دونوں نے خودکشی کر لی تھی۔ شکیب جلالی نے سرگودھا میں آنس معین نے کئی سال بعد ملتان میں۔"

ایک قلم کار کے اندرونی گوشوں کے اثرات اس کی تحریروں میں منعکس ہو جاتے ہیں۔ تخلیق ایک ایسا آئینہ ہے جس میں تخلیق کار کی شخصیت کے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس کی تخلیقات کے ذریعے اس کے میلانِ طبع اور رویوں کا کھوج لگایا جا سکتا ہے چنانچہ اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید نے اپنی محبوب شخصیات کا خاکہ قلم بند کرتے وقت ان کے مخفی گوشوں کو سامنے لانے کے لیے ان کی تخلیقات کا انتخاب کیا ہے جو ان کی شخصیت کے نقوش مزید واضح کر سکتے ہیں۔ ظفر تونسوی پر لکھے گئے خاکے "آتش بازی کا انار" میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "ان کے ہاں جو مجسم مایوسی اور بے چارگی نظر آتی ہے وہ ان حالات ہی کی زائیدہ ہے اور اس شدید ردِعمل نے ہی انہیں معاشرے کا مذاق اڑانے پر آمادہ کیا اور وہ سنجیدہ شاعری سے طنز و مزاح کی طرف آ گئے۔ اب ان کی حیثیت ایک ایسے ناظر کی تھی جو سب کچھ دیکھتا ہے۔ بظاہر بے بس ہے لیکن خون کے آنسو پی رہا ہے اور جب بات اختیار میں نہیں رہتی تو نوکِ قلم سے نشتر کا کام لینے لگتا ہے اور ہنسی ہنسی میں وہ کام کر گزرتا ہے جو بڑے بڑے مصلح بھی سرانجام نہیں دے سکتے۔"

ڈاکٹر انور سدید کے خاکوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے تحریر کردہ خاکوں میں وہ اپنی شخصیت کی اس طرح نمائش نہیں کرتے کہ موضوعِ خاکہ کی شخصیت اس کے پیچھے دب کر رہ جائے۔ وہ خاکہ میں اپنی شخصیت کو اس وقت داخل کرتے ہیں جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ایسا کرنے سے موضوعِ خاکہ کی شخصیت کا کوئی پہلو مزید کھل کر سامنے آ سکتا ہے۔ وہ اپنی شخصیت کو اتنا دور بھی نہیں رکھتے کہ خاکہ عمومی یا ذاتی مضمون بن جائے۔ وہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ قاری کی توجہ کا مرکز و محور موضوعِ خاکہ کی شخصیت رہے۔ میرزا ادیب کے خاکے "حبابِ آسا" میں رقم طراز ہیں:

> "مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ میرزا ادیب ایک شاعر کی ساٹھویں سالگرہ کے جشن میں مضمون پڑھ کر واپس آ رہے تھے تو وہ اس قسم کی رومانوی مایوسی سے دوچار تھے۔ مجھے علم تھا کہ میرزا ادیب بھی کا ساٹھواں سال عبور کر چکے ہیں۔ ادب میں ان کی خدمات کسی دوسرے ادیب سے کم نہیں۔ لیکن کسی نے بھی ان کی سالگرہ کا جشن نہیں منایا۔ کسی رسالے نے ان پر خاص نمبر شائع نہیں کیا۔ درد کی ایک لہر میرزا ادیب کے دل سے میرے دل کی طرف مسلسل رواں تھی لیکن ہم دونوں خاموشی سے الفلاح سے وائی ایم سی کی طرف آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ میں نے ہمت کی الفاظ میرا ساتھ دے

کہ ان سے دریافت کروں مقبول ادیب اور بڑے ادیب میں کیا فرق ہے۔"

شگفتگی اور مزاح خاکے کی اساس ہرگز نہیں ہے۔ خاکہ نگار کا کام لفظوں سے ایک ایسی تصویر بنانا ہے جس میں موضوعِ خاکہ کی شخصیت جیتی جاگتی، ہنستی بولتی اور چلتی پھرتی نظر آئے۔ اگر خاکہ نگار شگفتہ طبیعت کا مالک ہے تو ظاہر ہے اس کے خاکے میں مزاح کا تڑکا ضرور لگا ہوگا۔ ڈاکٹر انور سدید کی طبیعت میں شگفتگی کا عنصر پایا جاتا ہے جس کا مظاہرہ وہ اپنی روزمرہ زندگی میں بھی کرتے رہتے ہیں۔ ان کی طبیعت کا رجحان ان کے خاکوں میں بھی موجود ہے۔

مگر وہ مزاح نگاری کی رو میں اس قدر نہیں بہتے کہ خاکہ پر شگفتگی اور مزاح غالب آ جائے۔ غلام جیلانی اصغر کا خاکہ "دیو جانس ثانی" غلام جیلانی اصغر "باغ و بہار" کی بھرپور نمائندگی کرتا ہے۔ ایسی ظریف الطبع شخصیت کا خاکہ اگر اس رنگ میں لکھا جاتا تو ان کے ساتھ انصاف نہ ہوتا۔ "غلام جیلانی اصغر جوانی کا ذکر آیا تو اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ انہوں نے اپنی عمر کو ایک خاص نقطے پر روک رکھا ہے۔ ہر چند ان کے قویٰ مضمحل ہو رہے ہیں لیکن وہ زمین پر اب بھی ایسی تیز قدمی کا مظاہرہ کرتے اور یوں سینہ پھلا کر چلتے ہیں کہ آج کے نوجوان بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پیدل چلنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ اس سے مرا ناتا ان کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ ایک دفعہ انہوں نے کار چلانے کی مشق بھی کی تھی لیکن اس کی تیز رفتاری انہیں پسند نہ آئی چنانچہ واپڈا کے بجلی کے کھمبوں سے دو چار بار پرخلوص معانقے کے بعد انہوں نے کار سے نجات حاصل کر لی اور اب اطمینان سے زمین پر پچے تلے قدموں سے چل رہے ہیں۔"

ڈاکٹر انور سدید بحیثیت نقاد غیر معمولی شہرت اور اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کی کئی تنقیدی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے مقالے "اردو ادب کی تحریکیں" نے بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ طلبا اور نقاد اس سے برابر استفادہ کر رہے ہیں۔ ان کے اندر کا نقاد بے حد توانا ہے چنانچہ تخلیقی عمل کے دوران وہ ایک جوہری کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تنقیدی کام کی طرح ان کا تخلیقی معیار بھی اعلیٰ پائے کا ہے۔ خاکہ لکھتے وقت بھی اجنبیت اور اوپرے پن کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ بات پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کے خاکوں کا مجموعہ "ہم عصر کے لوگ" اردو خاکہ نگاری کی تاریخ میں ایک خوش کن اضافہ ثابت ہوگا۔

◆◆◆

ڈاکٹر انور سدید

"اردو ناول کے جسد میں تازہ روح پھونکنے کا سلسلہ شروع ہوا تو نقادوں نے تخلیقی ناول کے مختلف پہلوؤں پر نئے انداز میں روشنی ڈالنے پر توجہ دی۔ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب "اردو ناول کے رنگ" بھی ایک ایسی ہی کاوش ہے جس میں انہوں نے بہت سے ناول نگاروں اور ان کی کتابوں کی ان خصوصیات کا جائزہ پیش کیا ہے جو انہیں منفرد بناتی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید ہمہ جہت ادیب ہیں اور تنقید کے علاوہ تخلیقی نثر یعنی افسانے اور انشائیے کے رموز سے بھی واقف ہیں اور ان کی وسعتِ نظر نے ان کے تنقیدی جائزوں کو مقامِ اعتبار عطا کیا ہے۔"

(نجم الحسن رضوی)

ڈاکٹر انور سدید کی ڈاکٹر وزیر آغا شناسی
(از پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم)

محمد علی چراغ

کتاب 'ڈاکٹر انور سدید کی ڈاکٹر وزیر آغا شناسی' دو معتبر بزرگوں کے علمی، ادبی، تحقیقی، تنقیدی اور تعلقات و مراسم کے باوصف اہم اور قابلِ ذکر تالیف ہے۔ کتاب کے مؤلف پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب خود بھی ان دونوں معزز اہلِ علم و ادب سے ایک طویل وابستگی رکھتے ہیں۔ اس کتاب میں مداح اور ممدوح، منبعِ علم و دانش، دو دبستان، توصیف و تحسین، عنوان تحقیق و تخلیق، عنوان ترسیل و تفہیم، اور کلا کار فن و پیشکار، شعر منتہا اور حرف گنائی کا طلب گار، تجسیم اور تشریح کا ماہر اور دریا موجود ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا علم و ادب، شعر و سخن اور نقد و نظر کے اپنے عہد کے ایک ممتاز فردِ فرید تھے۔ انھوں نے اپنی ابتدائی اٹھان میں ہی "اردو ادب میں طنز و مزاح"، "اردو شاعری کا مزاج" اور "تخلیقی عمل" جیسی کتابیں پیش کر کے گویا ٹھہرے پانی میں پتھر پھینک کر سب متعلقین کو اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا۔ بلاشبہ طلبہ اور اساتذہ دو دہائیوں تک ان کتابوں کے حلقۂ سحر میں رہے۔ میری پہلی ملاقات بھی وزیر آغا صاحب سے انھی کتابوں ہی کے حوالے سے ہوئی۔ برسوں تک ان کتابوں کا علمی و ادبی دنیا میں شہرہ رہا۔ ان کتابوں نے تخلیق و تحقیق کے میدان میں وافر معلومات کے ساتھ ساتھ فنی تحقیق کے سرمایہ کو بھی بڑھاوا دیا۔ یہی نہیں بلکہ ڈاکٹر وزیر آغا نے نئی شاعری کو اپنی شعری تصانیف سے جدیدیت سے ہمکنار کیا۔ جدید شاعری میں شام اور سائے، دن کا زرد پہاڑ، نردبان، آدھی صدی کے بعد وغیرہ شعر و سخن میں تازہ اور مسلسل ہوا کے جھونکوں کی طرح اثر انداز ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے شاعری کو متعدد استعاروں سے مرصع کیا۔ ہوا، بادل، بارش، ندی، شجر، دریا، سمندر، پرندہ، درخت، شہر، وقت، شام، صبح اور لمحہ وغیرہ کو نئے استعاروں سے فیض یاب کیا، یوں معنی کے کئی نئے در وا کیے۔

بحوالہ جریدہ نگاری ڈاکٹر وزیر آغا مولانا صلاح الدین احمد کے "ادبی دنیا" پرچے سے خوشگوار آغاز کر چکے تھے۔ پھر انھوں نے 1966ء میں "اوراق" اپنا پرچہ جاری کر لیا تھا۔ یہ 'اوراق' اس وقت منظرِ عام پر آیا جب جناب احمد ندیم قاسمی کا "فنون" لاہور کا واحد اور صحیح معنوں میں ادبی پرچہ موجود تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے 'اوراق' کو بھی لکھنے والوں کا ایک "وسیع" حلقہ میسر آ گیا تھا۔ اس وسیع قلمکاروں میں بھی کئی بڑے بڑے شاعر، ادیب، افسانہ نگار اور نقاد و دانشور بھی شامل تھے۔ اس کے چند ہی شماروں کے بعد 'اوراق' برعظیم پاک و ہند میں ایک طور پر دوسرے ادبی پرچوں کی طرح نمایاں ہوتا گیا۔ یہی وہ دور ہے کہ جب 'فنون' اور 'اوراق' برسرِ معرکہ آرائی بھی ہوتے چلے گئے۔ یہ محاذ آرائی پرچوں تک ہی نہ رہی بلکہ پس پردہ شخصیات تک بھی پھیلتی گئی۔

برِ عظیم پاک و ہند میں اردو ادب میں ادبی معرکہ آرائیاں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بعض حوالوں سے محسوس ہوتا ہے کہ ان معرکہ آرائیوں میں دونوں طرف سے زیادہ ہنگامہ اور ترقی افکار و خیالات آتے رہتے ہیں۔ جس وجہ سے اکثر معرکہ آرائیاں اور ادبی محاذ موجب تعمیر و ترقی ادب ہوتے ہیں۔ اور ان معرکہ آرائیوں کا باعث خیر ہوتا ہو اور ادب توانا ہوتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انور سدید "وزیر آغا اپنے عہد کے ممتاز ادیب شمار کیے جاتے ہیں۔" اس حقیقت کو کئی حلقوں میں تسلیم کیا جاتا رہا۔ اس طرح مخالف اور موافق گروہ بھی سامنے آتے رہے۔ ڈاکٹر انور سدید کہتے ہیں کہ اگرچہ "ان کے فن پر مثبت انداز میں دقیق پائے پر بحث ہوئی۔ ان کے بعض "کرم فرماؤں" نے انھیں دشنام طرازی کا ہدف بھی بنایا اور ان کی کردار کشی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔" اس تناظر میں کہ اگر معرکہ آرائی ذاتیات و رکیک کا ذریعہ بنے تو بھی ادبی زمرے میں آئے گی، بصورت دیگر صرف دشنام طرازی ہی رہے گی۔ وہ ادبی معرکہ آرائی کہ جس میں ذاتیات کو مجروح کیا جائے اور پگڑیاں اچھالی جائیں تو وہ صرف ارذل خیالی ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ فنون اور اوراق کی ادبی چشمک بڑی حد تک معمول سے زیادہ تلخ و ترش نہ تھی۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا مقام و مرتبہ بحوالہ نقد و نظر، تحقیق و تدقیق، جدید شاعری اور انشائیہ طرازی کے بعد انشائیہ نگاری میں یکتا اور منفرد ہے جبکہ جناب احمد ندیم قاسمی اپنی سخنوری اور افسانہ نگاری میں اپنے بلند مقام پر متمکن رہے۔ یہ دونوں محترم بزرگ میں سمجھتا ہوں کہ ایک دوسرے کی ضد تو نہیں تھے۔ آپ سب نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز شاعر ادیب یا سرکاری مناصب اعلیٰ پر متمکن مصنفین کی خوشنودی کی خاطر بہی خواہوں نے کیا کچھ نہ کیا۔ یہ بھی ایک مسلمہ امر ہے کہ تنقید نگاری میں ڈاکٹر وزیر آغا کا مقام و مرتبہ ممتاز اور معتبر ہے۔ ان کی تنقیدی تصانیف کی تعداد تقریباً دو درجن ہے۔ انھوں نے نظم اور انشائیے پر بھی لکھا لیکن آغا صاحب کی خاص شناخت تنقید ہی سے ہے۔ اگرچہ بحوالہ ڈاکٹر انور سدید "ڈاکٹر وزیر آغا" نامور مفکر، محقق، تخلیق کار، منفرد نظریہ ساز، نابغہ فکر شاعر، خلاق انشائیہ نگار اور رسالہ 'اوراق' کے ادیب ساز مدیر تھے۔" بحوالہ وزیر آغا شناسی جناب عابد خورشید نے لکھا ہے "وزیر آغا شناسی کا استعارہ ڈاکٹر انور سدید" میں سمجھتا ہوں یہ با معنی اور خوب صورت عنوان دونوں بزرگوں کے لیے ایک مناسب خراجِ تحسین ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا تخلیق کردہ ادب فکر و نظر میں تحریک پیدا کرتا رہا۔ وہ خود کو "کل" اور "جز" کی کائنات کے تناظر میں دیکھنے کی سعی کرتے رہیں۔ اسی پس منظر میں مولانا صلاح الدین احمد نے کہا کہ "وہ کبھی کائنات اصغر میں اور کبھی کائنات اکبر میں تبدیل ہو جاتے تھے۔" ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر وزیر آغا اپنے تنقیدی ورثے میں معیار نقد اور 'نقد النقد' کی روایت کی بنا ڈالنے والے تھے۔ انھوں نے ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے ترویج ادب اختیار کیے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیق و تصنیف اور تنقید قابل توجہ اور موجب فہم و فراست رہی۔ انھوں نے عوامی مقبولیت پر توجہ نہ دی بلکہ خواص اور خاص الخاص کو ملحوظ نظر رکھا۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا اس میں متانت اور شائستگی کے ساتھ ادب کے داخلی و خارجی فکری و فنی اوصاف کو بھی بطریق احسن نبھایا۔ وہ اپنی ہر تخلیق اور تنقید میں لاشعوری طور پر تحقیق مزید کی یا تحقیق پر تحقیق کی گنجائش رکھتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کی ہر کتاب نے فکر و نظر یا فکر زاد و نگراں کا سامان پیدا کیا۔ آغا صاحب کی ہر تصنیف اپنی سنجیدگی کے باعث دعوت غور و فکر اور قارئین میں جدید تر تخیل و تائید و تحسین بھی موجزن کرتی رہی اسی لیے انھیں بعض اوقات دوسروں کے تلخ و ترش اور تحت تاثرات بھی برداشت کرنا پڑے۔ بہر صورت ڈاکٹر وزیر آغا ادبی اور علمی اعتبار سے

ایک مضبوط اور توانا حیثیت کے مالک تھے۔

یہ بھی سچ ہے کہ مدوح پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ڈاکٹر انور سدید "عالمی شہرت یافتہ نقاد، انشائیہ نگار، کالم نویس، افسانہ نویس، اقبال شناس (اور) ماہر لسانیات" تھے۔ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے ہم خیال، ہم آہنگ، ہم رنگ سے بڑھ کر ہم راز بھی تھے۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم "ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر وزیر آغا کا تعلق پھول اور خوشبو جیسا رہا۔" "وزیر آغا کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید کا تعلق قلبی رہا۔" "انھوں نے" "ڈاکٹر وزیر آغا کے فکروفن کی تفہیم اور فروغ کے لیے ایک شاہین کی طرح سفر طے کیا۔" "ڈاکٹر انور سدید نے کمال فن سے ڈاکٹر وزیر آغا کے ادبی سرمایہ کو ان کی زندگی میں فروغ بخشا۔" "ادیب ڈاکٹر وزیر آغا بذات خود ایک جمول فکر نقاد، عمدہ خیال شاعر، قادر الکلام نثر نگار اور نفیس صاحب فن تھے۔

مجھے یاد ہے کہ آج سے قریباً پچیس سال قبل ایک بار ڈاکٹر وزیر آغا، ممتاز مفتی، ذوالفقار احمد تابش اور راقم (محمد علی چراغ) جناب اشفاق احمد کے گھر "داستان سرائے" میں بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں اشفاق صاحب کی موجودگی میں مفتی صاحب نے ڈاکٹر وزیر آغا سے دریافت کیا "یار وزیر آغا! سنیاں اے تُوں بڑے مربعیاں دا مالک وڈیرا ایں۔ تیرے کنے کو مربعے نیں۔" ڈاکٹر وزیر آغا نے قدرے سنجیدگی سی اور تھوڑی جھجک زدہ کیفیت میں کسی سے مخاطب ہوئے بغیر نظریں نیچی کیے دروں بینی کی حالت میں جواب دیا: "مطلق ہی کوئی زیادہ مربعے نیں۔ تھوڑی جنی وراثتی ہوگی زمین سمجھی اے۔" سچ ہے وزیر آغا نہ کوئی وڈیرا تھا اور نہ ہی کوئی منصب دار تھا۔ ایک خوشحال اور فارغ البال زمیندار تھا۔ دبستان سرگودھا کا ایک مضبوط ستون بلکہ مرکزی ستون کا درجہ رکھتا تھا۔ اور ڈاکٹر انور سدید صاحب کے بارے میں صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ وہ دبستان سرگودھا کے تمام ادیبوں میں سے ڈاکٹر وزیر آغا کے سب سے زیادہ قریب اور عزیز تھے۔ دونوں بزرگوں کی فکری ہم آہنگی سب سے بڑا رشتہ تھا۔ ڈاکٹر انور سدید بذات خود اپنے مثالی مقام و مرتبے کے باوجود ڈاکٹر وزیر آغا کی ہر تخلیق و تحریر کی تحسین و تجزیہ میں سب سے مستعد رہتے تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے زیر تبصرہ کتاب "ارمغان" کی ادبی تحقیقات سے بالاتر ہو کر پیش کی ہے۔ اگرچہ یہ کتاب بھی ڈاکٹر وزیر آغا ہی کے گرد گھومتی ہے لیکن اس میں دونوں بزرگان ادب کے بارے میں بہت کچھ موجود ہے۔ کتاب میں اکثر مقالات پر تالیف اور تحقیق بڑے خوشگوار انداز میں گھلے ملے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم صاحب کے اس کتاب میں پانچ چھ تحقیقی مضامین کی موجودگی نے بڑی حد تک تعریف و تعارف اور نقد و نظر کا مقصد ادب ادا کیا ہے۔ کتاب ہذا میں دس عدد مقالات یا مضامین ڈاکٹر انور سدید کے بھرپور موضوع مذکور کی صحیح معنوں میں توضیح و تفسیر و تشریح کرتے ہیں۔ اور یہ مرحوم ڈاکٹر انور سدید کے عزائم و ادراک اور تحقیق و توصیف سے معمور ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کی وزیر آغا شناسی میں دیگر اہل قلم ڈاکٹر زاہد منیر عامر، ممتاز عارف، اختر مرزا، ڈاکٹر محمود اسیر، پروفیسر یوسف خالد، پروفیسر ڈاکٹر آصف راز، سلیم آغا قزلباش، اخلاق عاطف، عابد خورشید، ارشد ملک، ذوالفقار احسن، سید مرتضیٰ حسن اور محترمہ نجمہ منصور کے مضامین کے علاوہ پروفیسر سجاد نقوی کی نگارش سب زیر تعارف کتاب کے انفرادی طور پر عمدہ معاون اور صحیح معنوں میں دونوں بزرگوں کے لیے خراج تحسین کا درجہ بھی رکھتے ہیں۔

◆◆◆

پنجاب رنگ

سلیم شہزاد

انور سدید

ہوراں لئی اک نظم

یار سدیدا!
ساڈیاں پچھے چھڈ کے
آپ اگیرے ہویوں!
اُتوں چپ چپیتی سوں
یار سدیدا!
تیرے لفظاں اندر
خلقت آ کے رولی
دھرتی ٹلے ہولی
یار سدیدا!
توں دکھڑے لکھ کے
اکھو لکھے پائے
سوراں اندر جائے
یار سدیدا!
تینوں جنتیں پھڑ کے
دھرتی ابھریا
انت سمے دا یارا!

OOO

حنیف باوا

ادب دا پاندھی

(ڈاکٹر انور سدید لئی نظم)

میں ویکھنا واں
کے دیاں
لفظیاں
اتے تکھیاں رتاں دے وچ
اک پرچھ
اک مہان کوی
اک سچا سالکھار
جے جنہوں دیاں اکھراں دے وچ
قلم نوں پھڑ کے
اپنے
بند کمرے دے وچ
دکھاں دی پھلکاری اوڑے
اک زوال پرست کلاوے واگ
بیٹھے فرش تے چپ وڑ کے
چپ دی نکل دے وچ لکیا
اج پچھانے
اوہ کی
ایہہ کوئی
اپنے اندر لکھدے
سچے موتیاں ورگے
والے حرفاں دے
بے قابو جذباں
اک تریہہ
اک سلیقے دے نال
پھڑ اتے تکھیاں ہوئے
پیڑاں دی تک دے اتے
ماں دی اکھاں

میں جیہے
اتھراں دے تکھیاں واگ
جدھ کھلارے
جوانے پیچ
تکھیاں دوڑ دے پئے
ادب دے سردا تاج
من چاہندے گئے
پر اج جد
اوہ مہان کوی
اتے سچا سالکھار
ستائش دے بھنڈارے
اک جہاں توں اوہلے ہویا
جاں
میں ویکھناں واں
اج اوہ گھر
اک اجاڑ
اتے کوئی ستیں دھرتی اتے
قلم کلی دے واگ
جہاں جہاں کر دے آگا چپ دے وچ
کلے روگ
اوہ بھٹکیاں واجھوں ادھر اودھر ویکھے
اتے اوہدے بے جوڑ نظم
اکھاں دی سولی تے ٹنگیا
اک علمی پیاری وچوں
اٹکی پیار جیہے
جیویں
اوہ سچا تے سچا سالکھار
اکھاں دے اک پہاڑ دے وچ
انھا کے
اوس قلم نے قلم نوں
مر گئے
بھاگاں بھریا کردیوے گا
کہ
اکھیاں دیاں ایہہ لیاں والاں
بھاواں کد لکھیاں گیاں

OOO

ماہنامہ "تخلیق" کی ممتاز بھارتی دانشور اور مصنف کیول دھیر کے اعزاز میں تقریبِ ملاقات

(ادارہ "تخلیق")

ممتاز بھارتی دانشور، ناول نگار، افسانہ نویس اور سفرنامہ نگار اور ایک سو کتب کے مصنف کیول دھیر کی پاکستان آمد پر ایک تقریب ملاقات سوموار 16 مئی 2016ء کو ماہنامہ "تخلیق" لاہور اور یونائیٹڈ مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی یونیورسٹی جوہر ٹاؤن لاہور کے پریس فورم کے زیر اہتمام یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں زیر صدارت قبل پاکستان بشریٰ رحمٰن سابق ایم این اے منعقد ہوئی جس کے مہمانانِ خصوصی میں امجد اسلام امجد، ڈاکٹر اجمل نیازی، حسن عسکری کاظمی اور مسعود عثمانی شامل تھے۔ ان کے علاوہ اظہار خیال کرنے والوں میں آمنہ مفتی، سرفراز سید، حسین مجروح، ڈاکٹر سعادت سعید، افتخار مجاز، ڈاکٹر جواز جعفری، بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر وحید سلیم، فرحت پروین، ڈاکٹر عطیہ سید، شاہد بخاری اور دیگر شامل تھے جنہوں نے کیول دھیر کی شخصیت اور ان کے فنی اور تخلیقی سفر پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے ان سے ملاقاتوں اور یادوں کو تازہ کیا اور ان کی گراں قدر ادبی خدمات کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اس دوران کیول دھیر کی منہ بولی بہن بشریٰ رحمٰن نے ان کی کتاب "The Last Waltz" اور "لوسٹوری فرام انڈیا" کی تقریب رونمائی کی رسم بھی ادا کی۔ خیال رہے کہ موخر الذکر کتاب کا انتساب بھی بشریٰ رحمٰن کے نام ہے۔ اس دوران کیول دھیر نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے پاکستان اس کے ادیبوں اور دانشوروں سے اس لئے بھی پیار ہے کیونکہ میری جنم بھومی پاکستان میں ہے۔ پروگرام کا آغاز شاہد بخاری کی تلاوت قرآن مجید اور آیات قرآنی کے منظوم ترجمے سے ہوا۔ خطبہ استقبالیہ ڈاکٹر عمرانہ مشتاق نے پیش کیا اور مولانا مرزا محمد الیاس نے کیول دھیر کو یونیورسٹی کی طرف سے یادگار شیلڈ بھی پیش کی جبکہ ممتاز گلوکار شوکت علی اور ان کے بیٹے امیر شوکت علی نے اپنی گائیکی سے حاضرین کو محظوظ کیا۔ تقریب کے میزبانوں میں سونان اظہر جاوید مدیر "تخلیق" ان کی بیگم سعدیہ سونان اور یو ایم ٹی کے پریس فورم کے مولانا مرزا محمد الیاس، عمرانہ مشتاق اور احمد سہیل نصر اللہ شامل تھے۔ تقریب میں ادیبوں، دانشوروں اور یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کی کثیر تعداد نے شرکت کی جن میں ڈاکٹر کنول فیروز، صدیقہ بیگم مدیر ماہنامہ "ادبِ لطیف" لاہور، تسنیم منٹو، ڈاکٹر ایوب ندیم، تسنیم کوثر، فراست بخاری، آفتاب خان، اعجاز عبدالعلی، ممتاز راشد، زریں سلمان، نیاز نعیم جاوید، احمد حماد، جاوید منظور، آغا راشد، اکرام تبسم، رشید مرزا، رخسانہ نور، راجا اسد علی خان، عمر سہیل، عشرت، صائمہ اشتیاق، آمنہ تحسین کنول، سلیم اختر، شکیل اختر مدیر ماہنامہ "مسکراہٹ"، تیرانی شفیق، سعید احمد زیدی، حسنین احمد شیرازی، محمد کمیل اور دیگر شامل تھے۔ اس شاندار ادبی تقریب کی نظامت کے فرائض معروف ٹی وی اینکر ڈاکٹر عمر عادل نے ادا کئے۔ آخر میں تمام حاضرین کی سموسوں، چکن سینڈوچ، بسکٹوں اور چائے کے ساتھ تواضع کی گئی۔

◆◆◆

مضامین

صادقین...... ایک خلاق مصور و مفکر

مسلم شمیم

صادقین کے حوالے سے میں نے جب بھی سوچا میرے ذہن کے افق پر تین عالمی نابغۂ اعظم شخصیات کی تصویریں ابھریں۔ عہد نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے لیونارڈو ڈاونچی (Leonardo da vinci)(1452ء۔1519ء)، مائیکل اینجلو (Michelangelo)(1475ء۔1564ء) اور بیسویں صدی کے پابلو پکاسو (Pablo Picasso)(1881ء۔1973ء) ان تینوں داستانی شخصیات (Legendry Personalities) کی خلاقانہ اور مفکرانہ مہارت اور جامعیت کے دائروں کے گرد حصار قائم کرنا کارے دارد ہے۔ لیونارڈو ڈاونچی کو "The Renaissance Man" کہا گیا اور ان کا شہرۂ آفاق مصوری کا شاہکار "مونالیزا" آج بھی اسی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ موصوف نے مجسمہ سازی کے علاوہ جنگ کے آلات کی نقش گری کی جو تین صدیوں کے بعد تشکیلی عہد میں حقیقی اشکال میں نمایاں ہوئے۔ مائیکل اینجلو کو ایک عظیم مصور ہونے کے ساتھ سب سے بڑے مجسمہ ساز ہونے کا منصب بھی حاصل ہے۔ اس باب میں حضرت موسیٰ اور حضرت داؤد کے مجسمے خصوصی حوالے ہیں۔ اگرچہ انھیں اپنے بزرگ ہم عصر لیونارڈو ڈاونچی کے مقابلے میں کم تر درجے کا آفاقی نابغۂ روزگار قرار دیا گیا ہے مگر ان کی خلاقیت کا ایک اور شعبہ ایسا ہے جو لیونارڈو ڈاونچی کے ہاں مفقود ہے، یعنی شاعری کا عظیم ورثہ۔ انھوں نے مختلف اصنافِ سخن میں تین سو سے زیادہ شاہکار نظمیں تخلیق کیں۔ فکر و فن کے ان دونوں مہر و ماہ کا تعلق اٹلی سے تھا جہاں سے نشاۃ ثانیہ کا آفتاب پہلے پہل طلوع ہوا اور پورے یورپ کو منور کر گیا۔ یورپ کی تیسری عظیم نابغۂ روزگار شخصیت پابلو پکاسو کی ہے جنھوں نے عہد جدید میں مصوری کی دنیا کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ اسپین کے شہر مالاگا (Malaga) میں 1881ء میں پیدا ہوئے، 1904ء میں پیرس میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں کے ہو رہے۔ مذکورہ تین مغربی دنیا کی شخصیات کے علاوہ ایک ایشیائی شخصیت عمر خیام کا بھی تصور صادقین کے تصور کے ساتھ ابھرتا ہے۔ عمر خیام جو اپنی شاعری یعنی رباعیات کے حوالے سے شہرت خاص رکھتے ہیں، اُن کے دوسرے شعبوں کے کارناموں کو تقریباً فراموش کر دیا گیا ہے۔ وہ ماہر علم ریاضی اور جلالی کیلنڈر کا موجد تھا۔ اس کے ساتھ وہ ایک باکمال سائنس داں عظیم ماہر فلکیات اور مستند فلسفی تھا۔ اصفہان میں اپنی قائم کردہ رصدگاہ (Observatory) میں عمر خیام نے گردش زمین اور ستاروں کے خلا میں ساکت اور معلق ہونے کے حوالے سے جو انکشافات کیے، وہ کئی صدیوں بعد یورپ کے سائنس دانوں کے ذریعے آج انسانی علم و شعور کے خزانے کا حصہ ہیں۔ صادقین اس کہکشاں کا ایک سیارہ ہیں، اور میں انھیں مذکورہ حلقۂ فکر و فن کا رکن رکین گردانتا ہوں۔ میرے نزدیک صادقین ایک ایسے نابغۂ عالم تخلیق کار تھے جو آج ہمارے تہذیبی وجود کا منہاج اور علامت قرار پائے۔ انھوں نے اپنی فن کارانہ دانش اور خلاقیت کے معنی خیز خطوط و نقوش اور رنگوں سے جو طلسمات تشکیل دی ہے، وہ اپنی لازوال اثر پذیری کی آپ اپنی دلیل ہے اور رہے گی۔

فیض صاحب نے اپنے ایک مضمون کا اختتام اس فقرے پر کیا ہے: "صادقین اپنے فن میں صرف صناع ہی نہیں، مفکر بھی ہیں۔"

اس فقرے کی وضاحت درج ذیل اقتباس سے بڑی حد تک ہوتی ہے، ملاحظہ کیجیے:

"صادقین نے اپنی ایک تصویر "نقش فریادی" سے موسوم کی ہے۔ ان کے کلیات فن کے پیش تر اوراق کے لیے تو شاید یہی عنوان سب سے زیادہ موزوں ہے۔ ان کا نقش ہائے رنگ رنگ کا ہر پیکر فریادی ہے۔ صرف کاغذی پیرہن کا رنگ اور فریاد مختلف ہے۔ یہ پیکر اگر ابن آدم ہے تو کبھی مجنوں، کبھی مسیحا جس کی رگوں کا کرب خار و خس میں پیوست ہے اور قلب مضطر کا طلوع کہکشاں میں گم۔ یہ نقش کسی شہر یا معمورے کی بہم تاریک دیواروں اور بہم روشن دریچوں کا عکاس ہے تو اس کی منزل وہ رنگ وحشت ہے، آزادی کے متمنی نظر آتے ہیں اور اس کے کنگرے فضا میں مائل پرواز۔ اگر یہ صحرا کا کوئی بہروپ ہے تو آب رواں کی طرح موج در موج طغیاں و پیچاں۔ اگر شجر و حجر ہے تو موجودات کی اعلیٰ تر صورتوں کے شوق وصال میں کوشاں و سرگرداں۔ صادقین لذت عکس اور عجز وضاحت سے بھی خوب آشنا ہیں۔ لیکن ان کے صوری تخیل میں پیدائش، نمو اور ارتقا کے کرب و اضطراب کا اظہار ان کے خطوط کو پیچ و تاب میں رکھتا ہے۔ ایسے خطوط جو گویائی اور وضاحت کے لیے شوخی رنگ سے قریب قریب بے نیاز ہیں۔ صادقین کے عمل میں قدیم مشرقی طغرا نگاروں کی خطوط کشی، جدید مغربی مصوروں کی تجریدی تخیل، قدیم اہل تصوف کے وحدت کائنات کے تصور، جدید اہل فکر کے فلسفۂ ارتقا کی رجائیت، سبھی کے عناصر موجود ہیں۔ لیکن ان عناصر کا مجموعہ ترتیب ان کے اپنے ذہن اور موقلم کی تخلیق ہے، کاوش حیات کی طرح ان تھک اور مسلسل۔"

صادقین کثیر الجہات شخصیت کے حامل فن کار، خلاق اور مفکر تھے۔ ان کی خلاقی نے اپنے اظہار کے لیے مصوری، خطاطی اور شاعری کے وسیع تر ذرائع ابلاغ کو اختیار کیا تھا۔ انھوں نے جس پیرایۂ اظہار کو بھی ہاتھ لگایا اسے تنوع، وسعت اور گہرائی سے ہم کنار کر دیا۔ تجربے، ایجاد، اختراع اور تازہ کاری نے ان کے فن کو وہ عظیم تابانی اور انفرادیت عطا کی ہے جو ان سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے۔ ان کے موقلم سے کھینچے ہوئے خطوط و نقوش ہوں یا ان کینوس پر بکھرے ہوئے رنگوں کی دھنک کہ ان کے قلم سے نکلے ہوئے شعری و نثری پیکر، ان سب پر صرف اور صرف صادقین کی چھاپ ہے، اور یہ تمام فنی ذرائع مل جل کر اس عظیم شخصیت کی تشکیل کرتے نظر آتے ہیں جسے ہم صادقین کہتے ہیں۔ وہ ایک حساس سماجی شعور اور گہری بصیرت کے حامل تخلیق کار تھے اور اسی لیے انھوں نے اپنے فن کو صرف مصوری اجتہاد تک محدود نہیں رکھا تھا بلکہ اسے معنویت کی وہ گہرائی بھی عطا کر رکھی تھی جو روح عصر اور سماجی شعور کی علامت بن کر ابھرتی ہے۔ ان کی مصوری کے مختلف ادوار اور Pattern ہیں جن میں انسانی خطوط اور اشکال نمایاں ہوتے نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ در اصل اس روحانی کرب اور اذیت کی نشان دہی کرتے ہیں جس سے ان کا عہد اور معاشرہ گزر رہا ہے اور دوچار ہے۔ انسانی جسموں پر تنی ہوئی نوک دار کانٹوں کی پوشاک اور سروں پر منڈلاتے ہوئے کوؤں اور گدھوں کی علامتیں اس صورت آشوب کی ترجمان ہیں جن کی بازگشت ان کے ہم عصر ادب اور فکر و فن میں بھی سنائی دے رہی ہے۔ صادقین نے بلاشبہ اپنے موقلم کو اس عصری جہاد میں شریک رکھا تھا جو شرف انسانیت کے احترام اور روشن خیالی کے فروغ و ترویج کے سلسلے میں جاری رہا ہے۔ ان کی شخصیت ایک ایسے عوام دوست اور زندگی آموز جمالیاتی مزاج اور رویے سے مل کر بنی تھی جو ہمارے عظیم صوفیوں اور درویشوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ گویا ان کے فن کی جڑیں دھرتی میں پیوستہ رہی ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد علی صدیقی:

> ''صادقین نے مصوری کی اہمیت کو جس طرح پھیلایا ہے، وہ ہماری مصوری کی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ وہ مصوری کو گھروں، گیلریوں، ترقیاتی سرگرمیوں کے مراکز، دفتروں، کیلنڈروں اور ڈائریوں میں جس واضح مقصدیت کے تحت لائے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مصوری خواص سے نکل کر عوام کے ایک بڑے حلقے تک آ گئی۔''

فیض احمد فیض کے شعری مجموعے 'زنداں نامہ' کے دیباچے بعنوان 'روداد قفس' میں ایک مقام پر مرحوم میجر اسحاق نے لکھا ہے:
''ایک نابینا کائنات کی رنگا رنگی میں فرق تو درکنار کبھی رنگوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ کئی لوگ ابھی بھلی نظر رکھتے ہوئے بھی رنگوں کو نہیں پہچان سکتے۔ ریڈیو پروگرام سننے کے لیے طاقت ور ریڈیو اسٹیشن ہی نہیں، ریسیونگ سیٹ بھی نقائص سے پاک ہونا چاہیے۔'' یہ مرحلہ مجھے بھی صادقین جیسی عظیم المرتبت اور نابغۂ روزگار خلاقیت کی گہرائیوں اور بلندیوں کا ادراک اور شعور کے حصول میں درپیش ہے جس کا اظہار ان کی خطاطی اور مصوری کی قلمرو میں ہوا ہے۔ فنونِ لطیفہ کے یہ دونوں شعبے دو متلازم و متحرک رکن کا درجہ رکھتے ہیں اور مجھے اس باب میں اپنی کم مائیگی کا بھرپور ادراک اور احساس ہے۔ سو اپنی نارسائی کا اعتراف کرتے ہوئے اس ضمن میں میرے ذہن و فکر کے افق پر جو پرچھائیاں ان تخلیقات کے حوالے سے ابھری ہیں، ان کی حیثیت تاثرات سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ میرے تاثرات اس باب میں اس حد تک ہیں کہ وہ ایک یکتائے روزگار مصور تھے اور اپنی امتیازی خصوصیت کے حوالے سے ان کی تصویریں بڑی انفرادیت کی حامل ہیں اور ان میں تنوع بھی ہے اور Innovation بھی اور بلند تر Inventive Creativity بھی۔ بقول جناب سبط حسن ''صادقین کی تصویروں کو سطحی نظر سے دیکھو تو بڑی بھیانک اور اذیت پسند دکھائی دیں گی۔ لیکن وہ لوگ جو ان تصویروں کے معنی و مفہوم پر غور کرتے ہیں تو مغموم اور مایوس نہیں ہوتے بلکہ بڑی فتح مندی اور شادمانی محسوس کرتے ہیں۔'' صادقین نے خطاطی کا جو آہنگ اور آرٹ اختیار کیا ہے اور حروف کو مربوط اور مسلسل لکھنے کا جو ایجاد کیا، وہ دراصل اس اختلاط اور اشتراک کی نشان دہی کرتا ہے جو وہ ہماری جمالیاتی اقدار و روایات میں ابھرتا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ تحریر کو تصویر کر دینے اور خطاطی کو مصوری سے ملا دینے کا فن صادقین سے منسوب ہے اور صادقین ہی سے منسوب رہے گا۔ انھوں نے شاعری میں رباعی جیسی مشکل صنفِ سخن کو غالباً اسی لیے منتخب کیا تھا کہ وہ چار مصرعوں کے محدود چوکھٹے میں الفاظ و معنی سے متحرک تصویریں بنا کر دکھا دیں۔ ان رباعیات میں موضوعات و مضامین کا جو تنوع اور پھیلاؤ موجود ہے، وہ ان کے وسیع تر تخلیقی افق کی نشان دہی کرتا ہے۔ مثلاً ان کی یہ رباعی:

اک بار میں ساحری بھی کر کے دیکھوں — کیا فرق ہے، شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے — شعروں میں مصوری بھی کر کے دیکھوں

شاعری کو تصویریں بنا دینے کا انھیں جو ملکہ حاصل تھا، وہ دراصل ان کے علاوہ مصوری اور خطاطی کمال کی دین تھا۔ غرض یہ کہ صادقین ایک ایسے خود آگاہ تخلیق اور فن کار ٹھہرتے ہیں جنھیں اس بات کا مکمل شعور حاصل تھا کہ ان کا فن عصری شعور سے ہم رشتہ رہ کر ہی اپنے لیے معنوی وسعت اور تنوع حاصل کر سکتا ہے جو مقامی حد بندیوں سے نکل کر عالمی تناظر کا حامل ہو سکے۔ وہ جانتے تھے کہ ماضی کی روایت تجربے کی پیوند کاری ہی سے برگ و بار پاتی ہے جس کے لیے فن کار اور تخلیق کار کو جہاں ایک طرف اپنی مٹی کی خوشبو اور اپنے عہد کی مہک کے احساس سے سرشار ہونا ہوتا ہے، وہیں اس کے لیے اقصائے عالم میں برپا اس کارخانے کا ادراک بھی ضروری ہے جس سے دنیا بھر کے پسماندہ، کمزور اور پس ماندہ معاشرے دوچار ہو رہے ہیں، چنانچہ ان کے فن اور تخلیق میں تیسری دنیا کے مفلوک الحال عوام کے لیے جو ہمدردانہ رویہ جاری

واضح نظر آتی ہے۔ وہ ان کے اسی احساس کی عکاسی کرتی ہے۔ انھوں نے غالب، اقبال اور فیض کی شاعری کو صورت گری کے لیے اسی لیے تو منتخب کیا تھا کہ وہ ان برگزیدہ فن کاروں میں جہاں ان کے عصری سچائیوں کو سانس لیتے ہوئے دیکھ سکتے تھے، وہیں ان کی آنکھوں میں آنے والے عہد کے خواب کی پرچھائیاں بھی دیکھ پانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اسی لیے صادقین نے اپنے پیش روؤں کی شاعری کو محض روایتی انداز میں مصور کرنے کے بجائے اپنے موقلم سے ان مختلف معنوں، جہتوں اور پہلوؤں کو اجاگر کر دیا ہے جو غالب، اقبال اور فیض کی شاعری میں انھیں محسوس ہوتے تھے۔

صادقین حقیقی معنوں میں Born Genius تھے اور ان کے Genius کا اظہار امروہہ کی گلیوں کے در و دیوار پر لڑکپن کے زمانے سے شروع ہو گیا تھا اور وقت کے ساتھ ان کے فن کے تمام شعبے پروان چڑھتے رہے اور بام ثریا کو چھونے لگے۔ صادقین کا کہنا ہے کہ میں خود اپنا شاگرد ہوں۔ ہاں اگر تربیت تلاش ازلی نے کی ہے۔ وہ اپنے فن کی انفرادیت پر نازاں بھی تھے اور اس کی عظمت و رفعت کا ادراک بھی رکھتے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ استاد کی تربیت پرانے اصولوں کے مطابق ہوتی ہے اور اس طرح فن محدود ہو جاتا ہے اور اس میں جدت کا فقدان ہوتا ہے۔ وہ یہ بات اپنی رباعی میں کہہ گئے ہیں:

فن ہے تخلیق و اختراع و ایجاد — نقل و تقلید سے میں ہوں یوں آزاد
خطاطی میں، شاعری میں نقاشی میں — آپ اپنا ہوں شاگرد، خود اپنا استاد

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے، وہ Born Genius تھے اور اس کا اظہار عہد طفولیت سے ہونا شروع ہو گیا تھا۔ ان کے کلیات 'رباعیات صادقین' جس کے مرتب و مدون سید سلطان احمد نقوی ہیں، میں اوائل حیات کی کچھ یادیں کے آخری حصے میں 'جز و بوسیدہ' کے زیر عنوان کچھ نظمیں بھی شامل کلیات ہیں۔ یہ کلام بقول خود ان کے ''فقیر صادقین کی انیس سال کی عمر تک کی وہ باقیات شاعری ہیں جو ضائع ہونے سے رہ گئیں۔'' اس دور کی شاعری میں جہاں صادقین کی خلاقیت کی جہات ظاہر ہوئی ہیں، وہاں ان کے جہان فکر و دانش کی جلوہ سامانیاں بھی سامنے آئی ہیں۔ ان کی خلاقیت اور افکار و نظریات کا سرچشمہ ایک ہی پہاڑ کی چوٹی سے پھوٹا ہے اور ان کے دھارے اور لہریں ایک دوسرے میں مدغم نظر آتے ہیں۔ فکر و تخلیقیت کا یکساں بہاؤ ان کی خطاطی، ان کی نقاشی، ان کی مصوری اور ان کی شاعری میں جلوہ گر ہے اور آنکھوں کو خیرہ کیے رکھتا ہے۔ مذکورہ ابتدائی دور کی شعری تخلیقات کے بارے میں ان کے چار مصرعے ملاحظہ ہوں:

آگے کوئی اشعار کی پھلواریاں ہیں — الاشیاں کرنے ہی کی تیاریاں ہیں
اس جلد میں، گوشۂ ادب میں میری — اے دوست! لڑکپن کی غلط کاریاں ہیں

مذکورہ غلط کاریوں کی فہرست میں دیگر منظومات کے علاوہ درج ذیل فکر انگیز نظمیں خصوصی توجہ کی طلب گار ہیں جن میں ان کے جہان دانش کی وسیع تر سرحدیں دکھائی دیتی ہیں۔ میرا سایہ، روح کائنات اور ابن آدم، غالب اور مارکس۔ ان کے علاوہ چند بہت مختصر نظمیں ہیں جن میں مندرجہ ذیل فلسفیوں، سائنس دانوں، مفکروں اور تخلیق کاروں کے حوالے سے ان کے نظریات کا منظوم بیان ہے: افلاطون، رومی، عمر خیام، گوئٹے، شیلے، رسکن، نیٹشے، اقبال اور آئن سٹائن۔ یہ نظمیں صادقین کی وسعت فکر و نظر اور دائرہ مطالعہ کا پتا دیتی ہیں جو عمر حیات کے ابتدائی دور سے ظہور پذیر ہونا شروع ہوئیں۔ اسی گوشۂ ادب میں ان کی ایک قدرے بڑی نظم 'دورِ حاضر کے انسان کا رجز' ہے۔ اس کے حوالے سے ایک ابتدائیہ نظم سے پہلے لکھا گیا ہے جو صادقین کی بصیرت، تعقل پسندی، تاریخی شعور اور عظمت بشر پر ایقان کا اظہار ہے۔ وہ فرماتے ہیں

"عصرِ جدید کا انسان ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے جہاں سے اسے اس کی تمام کارفرمائیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ کہیں شعلے بھڑکتے دکھائی دے رہے ہیں، کہیں سے گولوں کی آواز اور توپوں کی گرج کانوں میں آ رہی ہے، کہیں متضاد سیاسی نظریات کی بنا پر زبانی جنگوں کی صدائیں کانوں میں آ رہی ہیں، کہیں لہو کی ندیاں بہتی دکھائی دے رہی ہیں، کہیں کارخانے دکھائی دے رہے ہیں، ان میں بنتے ہوئے آلاتِ تباہی پر نظر پڑ رہی ہے، کہیں عمودی عمارات بادلوں میں سرگوشیاں کرتی ہوئی نظر آ رہی ہیں، کہیں مشعلِ علم اور شمعِ فن کی ضو دکھائی دے رہی ہے، کہیں خونی سیاست، نسل و خون کے درختوں کی پر اسرار گھنی چھاؤں میں رقص کرتی نظر آ رہی ہے، کہیں سرمایہ داروں کا جھوٹا بیوپار اخلاق میں نقب لگاتا ہوا دکھائی دے رہا ہے، کہیں مشعلِ تہذیب اور چراغِ تمدن کی روشنی نظر آ رہی ہے، فضا میں طیارے، سمندر میں جہاز اور خشکی پر ریلیں، موٹریں اور ٹینک دکھائی دے رہے ہیں، کہیں مشین منٹوں میں ہونے والا کام پلوں میں انجام دیتی ہوئی نظر آ رہی ہے۔"

اس تصویر خانے کی یہ رنگا رنگ تصاویر جو اس کے قابلِ ناز مرقع ہیں، اس کو فخر و نازش کا موقع دیتے ہیں جس کی بنا پر وہ کہنا شروع کر دیتا ہے:

مرے تیشے کی یورش سے دلِ کہسار میں لرزش　　حقیقت میں مرا دل جرأت و ہمت کا ہے مخزن

☆

مرا قبضہ آب و خاک و باد و برق و باراں پر　　علم اپنا گروں گا نصب میں ماہِ تاباں پر

☆

سمندر میرے قبضے میں، ہوائیں میرے قابو میں　　جو مجھ سے متصل ہیں، وہ فضائیں میرے قابو میں

☆

مجھے معلوم ہے تعبیر خوابِ زندگی کیا ہے　　بتا سکتا ہوں تفسیر کتابِ زندگی کیا ہے

☆

میں کیا ہوں، کون ہوں، انسان عہدِ حاضر ہوں　　ترقی کی حدِ آخر پہ خود کو دیکھتا ہوں میں

اس حصۂ کلیات میں ایک سادہ سی نظم 'رجعت پسندی' کے زیرِ عنوان ہے جو نظریاتی حوالے سے بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس نظم کا آخری شعر ہے:

یہی انسان کی بستی خاک میں اکثر ملاتی ہے　　ہمیشہ جنگ بن کر عرصۂ عالم پہ چھاتی ہے

آج کے معاشرے بالخصوص مسلم معاشرے میں رجعت پسندی کا عفریت مذہبی انتہا پسندی اور فسطائیت کے روپ میں عالمی امن اور ارتقا کے لیے ایک بڑا خطرہ بن کر کھڑا ہے۔ مذکورہ نظم اس تناظر میں جس قدر و قیمت کی حامل ہے وہ کسی وضاحت کی محتاج نہیں۔

صادق حسین جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے، وہ Born Genius تھے بلکہ انھیں Versatile Genius کہنا بھی نادرست نہیں ہوگا،

کیونکہ ان کی کثیرالجہت شخصیت کا ہر شعبہ یعنی مصوری ، نقاشی ، خطاطی اور شاعری یکساں فن کارانہ اور منفرد عظمت کا حامل ہے۔ شاعری کے شعبے میں انھوں نے مشکل ترین صنف رباعی کا انتخاب کیا اور شعوری طور پر کیا۔ اس ضمن میں ان کی رباعی ملاحظہ کیجیے:

خیام کو اک کتاب میں نے دی ہے ہر دکھ کی تپتے عذاب میں نے پی ہے
اصناف ادب میں سب سے کٹھن ہے جو صنف اپنے لیے انتخاب میں نے کی ہے

اس شعبے یعنی رباعیات صادقین کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مضمون کا درج ذیل اقتباس بڑی معنویت کا حامل ہے:

"صادقین کی فنی و تخلیقی شخصیت عمر خیام سے بہت مشابہ ہے۔ صادقین نے پہلے برش اور رنگ کی مدد سے مصوری کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کیا اور عالمی سطح پر اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کروایا، پھر رنگ اور برش سے آگے بڑھ کر حرف و صوت سے رجوع کیا اور رباعی نگار شاعر کی حیثیت میں ایسی بحرکی تہ سے آب دار موتی نکالے جس میں خود خیام نے غواصی کی تھی۔ خیام اور صادقین فکری و تخلیقی اعتبار سے ایک بحر کے اہم وسعت و ہم رنگ شناور ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انگریزی میں ترجمے کی بدولت خیام کی شہرت اپنے دائرے سے نکل کر عالمی سطح تک پہنچ گئی اور صادقین کی شہرت ابھی اردو کے حلقۂ اثر تک محدود ہے۔"

صادقین کا تعلق امروہہ سے تعلق ہے۔ وہ ایک عظیم خلاق ہونے کے ساتھ ایک عظیم آفاقیت پسند سیکولر مفکر تھے اور ان کا خلاقانہ اور مفکرانہ منصب میرے نزدیک یکساں عظمت کا حامل ہے۔ یہاں یہ نکتہ بیان کرنا بے محل نہیں کہ ان کی فکر اور تخلیقیت کا سرچشمہ مارکسزم (Marxism) تھا اور وہ اشتراکیت کے پرجوش حامی تھے۔ وہ یقیناً معروف معنوں میں عملی سیاست میں سرگرم عمل نہیں رہے مگر فکری محاذ پر ان کی کمٹمنٹ بہت ارفع تھی۔ نقاشی میں اس کا اظہار علامات اور استعارات کی زبان میں کیا گیا ہے جبکہ شاعری میں اور خصوصیت کے ساتھ ان کی رباعیات میں یہ اظہار کہیں بلند آہنگی کے ساتھ ہوا ہے اور کہیں فلسفیانہ الفاظ و اصطلاحات میں۔ مگر صادقین کے جہان فکر و تخلیق میں انسانی معاشرے کے دکھوں کی عکاسی بھرپور طور پر پائی جاتی ہے۔ ان دکھوں اور زخموں کی چارہ جوئی وہ ایک ایسے معاشرے کی تشکیل میں دیکھنے کے تمنائی ہیں جو ظلم ، استحصال اور عدم مساوات سے پاک ہو۔ یہ آرزو اور تمنا انھیں اشتراکیت کی طرف متوجہ کرتی ہے۔ وہ موجودہ طبقاتی معاشرے میں انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال کے خاتمے کی قطعی توقع نہیں رکھتے۔ وہ اس استحصالی نظام میں ظلم ، جبر اور جہل و افلاس کو معاشرے کا مقدر گردانتے ہیں اور اس باب میں اپنے کرب و احساس کو شعری پیکر اور اپنی نقاشی میں پوری شدت کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ ان کی اشتراکیت پسندی کو دہریت پسندی سے منسوب کرنا سراسر بہتان ہے۔ وہ مولانا حسرت موہانی کا یہ مصرع کہ "صوفی مومن ہوں ، اشتراکی مسلم" ، اسی نظریے کا ترجمان ہے۔ صادقین بھی صوفی منش عظیم تخلیق کار تھے اور ان کے خوابوں کی دنیا اور نظریات کی سرحدیں فیض احمد فیض کے خوابوں کی دنیا اور نظریات کی سرحدوں کے دائرے پھیل کر ایک دوسرے میں گھل مل گئے ہیں۔ اس تحریر کے ابتدائی حصے میں پیش کردہ فیض صاحب کا ایک اقتباس صادقین کے فکر و فن کے حوالے سے اسی زاویۂ نظر کا حامل ہے۔

◆◆◆

ابصار عبدالعلی۔ صنفِ ڈرامے کا ایک اہم نام

عذرا اصغر

ابصار عبدالعلی کو میں ایک مدت سے ٹی وی سکرین پر دیکھتی آ رہی ہوں۔ اس قدر رنجیدہ، بے حد خاموش طبع اور حسین بلکہ ایک حد تک غیر جذباتی، چہرے پر جیسے کسی تاثر کی پرچھائیں بھی کبھی نہ دکھی ہو۔ دھلا دھلایا سا صاف ستھرا سا، دیکھ کر ہی تاثر ابھرتا تھا۔ میں نے اکثر سوچا "یا اللہ کس غضب کا سنجیدہ شخص ہے۔ مسکرانا تک نہیں جانتا۔" پھر ایسا اتفاق ہوا کہ میں اور تنویر جعفری کشور ناہید کی طرف سے آ رہے تھے۔ یہ ان دنوں "ماہ نو" سے منسلک تھیں۔ اسلام آباد روڈ پر ——— ہمیں بہت سی گاڑیوں کے درمیان ایک گاڑی نظر آئی جس کو دیکھتے ہی تنویر نے نعرہ مارا۔ "ابصار" میرا ایسا ہے کہ میرے سامنے سے معروف سے معروف چہرہ گزر جائے تو مجھے پتہ نہیں چلتا۔ ابصار تو پھر بھی گاڑی میں بند تھے۔ میں نے چونک کر پوچھا۔ "کیا ہوا؟" اس نے کہا۔ "وہ دیکھو ابصار عبدالعلی جا رہا ہے اور میں اس سے ملنا چاہتی ہوں۔" "کیوں بھلا، کیا روز ٹی وی پر نہیں دیکھتیں اس شخص کو۔" میں نے تھوڑے بیزاری سے کہا۔ میں سوچ رہی تھی کہ ابصار سے مل کر اس کا رہا سہا امیج بھی غارت ہو جائے گا مگر وہ نہ مانی۔ چار و ناچار پیچھا کرتے ہوئے ہمیں رکشہ اس کی گاڑی سے آگے روکنا پڑا۔ میں رکشے سے اتر کر اس کی طرف بڑھی اس نے ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور پھر اپنے قریب آتا دیکھ کر گاڑی سے اتر پڑا۔ تپاک سے سلام کیا جیسے بہت جان پہچان ہو۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی جو ملنساری اور خوش طبعی کی غمازی کر رہی تھی۔ "اچھا تو یہ شخص مسکرا بھی لیتا ہے۔" مجھے تعجب ہوا۔ میں نے اپنا اور تنویر کا تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ محترمہ آپ سے ملنا چاہتی تھیں۔ اتنے میں چوراہے کی سبز بتی جل گئی اور ٹریفک رواں ہو گیا۔ ابصار نے انتہائی مہذب انداز میں ہمیں اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی دعوت دی اور منزل مقصود تک پہنچانے کی پیشکش بھی کی مگر مجھے بس اتنی ہی ملاقات کافی لگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ابصار کو میں نے مسکراتے دیکھا مگر دوسرے ہی لمحے وہ پھر ٹی وی پر ویسا ہی سنجیدہ تھا۔ خاموش اور غیر جذباتی۔ مجھے حضرت علیؓ کا قول یاد آیا۔ "تم کسی کو اپنی واقفیت سے زیادہ کر نہیں جان سکتے اور تمہاری واقفیت کی بساط ———" تب مجھے اپنی رائے پر پشیمانی ہوئی۔

پھر یوں ہوا کہ زیتون بانو لاہور آئی اور ابصار کے گھر ٹھہری۔ مجھ سے ملنے آئی تو میں گھر پر نہ تھی، وہ پیغام چھوڑ گئی۔ مجھے اسے ملنے جانا پڑا۔ ایک بڑے گیٹ کے سامنے دو خواتین کھڑی کچھ خرید رہی تھیں۔ میں نے رک کر پوچھا۔ "کیا آپ بتا سکیں گی زیتون کا جو ابصار عبدالعلی کہاں رہتے ہیں۔" ایک دبلی پتلی خوش اخلاق سی خاتون نے بڑے روایتی اخلاق سے کہا۔ "تشریف لایئے۔ ابصار تو گھر پر نہیں ہیں۔" "مجھے زیتون بانو سے ملنا ہے۔" میں نے بتایا۔ "وہ بھی نہیں ہیں۔" اور میں یہ سوچ کر ان کے ساتھ زینہ چڑھ گئی کہ اصل صورتحال صاحب خانہ سے پتہ کراؤں گی۔ مگر معلوم ہوا کہ وہی بیگم ابصار ہیں تو میں ایک بار پھر حیرت میں ڈوب گئی میرے خیال میں ٹی وی پر نظر آنے والے اس خشک مزاج بندے کی بیوی کو بد مزاج اور چڑچڑا ہونا چاہیے تھا۔ مگر مسز ابصار تو ایک عورت کو اس کا پتہ پوچھتے دیکھ کر بھی نہیں جھلائی بلکہ اپنے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بٹھا کر لذیذ قسم کی کافی پلائی۔ بے تکلفی سے باتیں کیں اور رخصت ہوتے

وقت پھر آنے کا وعدہ بھی لیا۔ بلکہ ابصار کی ننھی بچی رِدا ہمارے ساتھ یوں گھل مل گئی جیسے سدا سے ہم ساتھ رہ رہے ہوں۔ میرے خیال میں بچے والدین کی شخصیت کا عکس ہوتے ہیں۔ رِدا نے واقعی مجھے اپنے والدین کی خوش خلقی کا یقین دلا دیا تھا اور میں بہت خوشگوار تاثر لے کر لوٹی تھی یوں بھی میں خاصی حسن پرست واقع ہوئی ہوں۔ مسز ابصار خوش خلق ہی نہیں خوش شکل بھی تھیں۔ من موہنی سی۔

ابصار سے اگلی ملاقات نیشنل سینٹر میں ہوئی۔ اعزاز احمد آذر نے نیشنل سنٹر میں عوام کی عدالت سجائی ہوئی تھی۔ ہم بھی تماشہ دیکھنے جا پہنچے تھے۔ لوگ باری باری اسٹیج پر آ کر اپنے دل کا غبار نکال رہے تھے۔ عدالت کے کمرے کی فضا اتنی بوجھل تھی اور اعزاز احمد آذر مجرم بنے کرسی پر بیٹھے مسکرا رہے تھے۔ کبھی کبھی انسان اپنے سر آنے الزامات سن کر بھی ہنستا ہے۔ یہی حال کچھ اس وقت آذر کا تھا۔ ویسے بھی وہ ہنستا مسکراتا شخص ہے جیسے یہ اپنی کشور ناہید ہے کہ نہ ہنسے تو لوگ حیرت میں ڈوب ڈوب جائیں۔ کسی محفل میں سناٹا ہو تو لوگ پوچھتے ہیں: ''کیا کشور نہیں آئی؟'' اور کشور کے پہنچتے ہی وہ محفل زعفران زار بن جاتی ہے کہتے ہیں کہ محفلوں کی جان دو افراد ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے۔ ایک کا میں ذکر کر چکی ہوں، دوسرے ہیں اظہر جاوید۔ آپ کسی تقریب میں آ کر سب سے آگے بیٹھ جائیے اور پھر اچانک ایک کھلکھلاتا ہوا قہقہہ آپ کی سماعت سے ٹکرائے تو فوراً سمجھ لیجیے کہ اظہر جاوید آ گیا ہے۔ کشور ناہید اور اظہر جاوید میں قہقہوں کی ہی قدر مشترک نہیں ہے بلکہ جملہ بازی، فقرہ اچھالنا اور بات سے بات پیدا کرنے میں بھی یہ دونوں اشخاص اپنا ثانی نہیں رکھتے ـــ بات کہیں سے کہیں جا نکلی۔ میں ذکر کر رہی تھی نیشنل سینٹر کی تقریب کا جس کے اسٹیج سیکرٹری ابصار عبدالعلی تھے۔ میرے برابر بیٹھی ایک خاتون کچھ کہنے کو بہت بے قرار تھیں۔ وہ بے چینی سے بار بار اپنی کرسی پر پہلو بدل رہی تھیں۔ ایک مرتبہ اپنا ہاتھ بھی بلند کیا مگر ابصار نے بالکل غیر متوقع ان کی بجائے میرا نام پکار دیا۔ میں کہ صرف سننے کے لئے گئی تھی۔ کہنے کو کچھ سوچا بھی نہ تھا۔ اپنا نام سن کر لمحہ بھر کو چکرائی اور چار و ناچار سٹیج پر آ گئی۔ بہر طور مجھے کچھ تو کہنا ہی تھا۔ تب میں نے سوچا کہ ابصار شرارتیں بھی کرتا ہے۔ اور وہ ایک پورا سچ انسان ہے۔ کبھی مجھ پر یہ راز بھی منکشف ہوا کہ تحریریں پڑھنا ایک سنجیدہ موضوع ہے اور ''سنتے چلے جانے'' رکھنا اچھے میزبان کا سخن کے فرائض میں شامل تھے۔ تحریریں پڑھنے کے علاوہ ابصار کا دوسرا مشغلہ ڈرامہ نویسی ہے۔ یوں تو ڈرامے کی صنف خاصی پرانی ہے مگر ہمارے ایک بڑے جید ادیب کا ارشاد ہے کہ ڈرامہ نگاری سرے سے کوئی صنف ہے ہی نہیں اور اگر اس کے وجود کا اعتراف کر بھی لیا جائے تو ادب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس خطے میں افزائش مرغی بانی پر کتاب لکھ کر لوگ ادیب ہی نہیں بن جاتے بلکہ رائٹرز گلڈ کی ممبر شپ بھی حاصل کر لیتے ہیں اور اس کی معرفت ادیبوں کو ملی جملہ سہولیات بھی حاصل کر لیتے ہیں وہاں ہمارے یہ مفکر صنف ڈرامہ نگاری کو ادب کی صنف سے نکال دینے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر سید عبداللہ کا ارشاد ہے کہ ''ادب اس کے سوا اور کیا ہے کہ پڑھتے ہی دل میں اتر جائے اور سنتے ہی دل پر نقش ہو جائے۔'' آگے چل کر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ ''ابصار کی یہ تمثیلیں گلی پلے کو ادب کی ایک یادگار و باوقار صنف بنانے کے لئے کافی ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ابصار کا کوئی ڈرامہ دیکھ نہ سکی۔ اس کی ایک وجہ تو یہی ہے کہ ٹیلیوژن پر دکھائے جانے والے بے معنی ڈرامے کسی مجبوری کے تحت بھی دیکھنے پڑ جائیں تو پھر اکتاہٹ کوئی اچھا اور بامعنی ڈرامہ دیکھنے سے بھی روک دیتی ہے۔ پھر بھی کبھی یوں بھی ہوا ہے کہ کسی ''نامور'' ادیب کا کوئی ڈرامہ بڑے اہتمام سے دیکھنے بیٹھے اور معلوم ہوا کہ یہ کہانی تو ہم فلاں غیر ملکی مصنف کے نام سے پڑھ چکے ہیں بلکہ ہمارے ڈرامہ نگار نے ذرا بھی کوئی حوالہ نہیں دیا تھا۔ یعنی دوسروں کے

مال پر ہاتھ صاف کرنے کی مہارت بڑی صفائی اور دلیری سے ادا کی جاتی ہے۔

ابصار کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ اس نے ''کیسے کیسے لوگ'' کے اختتام پر ان کتابوں اور مصنفین کے ناموں کا حوالہ بھی درج کیا ہے جن سے اس نے استفادہ کیا۔ ہمارے یہاں اپنی دوکان چمکانے کے لئے پرایا مال ہتھیانے کی وبا عام ہے۔ ابصار نے اس رجحان سے انحراف کیا ہے۔

ڈرامے کی ابتدا، کب، کہاں اور کیسے ہوئی اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ہم تصوراتی طور پر سوچ سکتے ہیں کہ جیسے انسانی فطرت میں کہانی کہنا اور سننا پایا جاتا ہے۔ اسی طرح نقالی کرنا بھی فطری فعل ہے۔ کسی زمانے میں تو یہ فن عام تھا اور مخصوص لوگ سوانگ بھر کر اور نقلیں اتار کر مجمع لگاتے اور دیکھنے والوں کو مسرور کرتے تھے میری معلومات محدود ہیں اس لئے یقین کے ساتھ دعویٰ نہیں کرتی مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ میرے خیال میں ڈراما اسی فن کی مہذب اور سنوری ہوئی شکل ہے۔ شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ ڈرامہ نے سب سے پہلے یونان میں رواج پایا اس کے بعد روم میں آیا اور پھر سفر کرتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ ڈرامے کی دنیا میں شیکسپیئر کو نمایاں مقام حاصل ہے مگر حقیقت یوں ہے کہ شیکسپیئر سے پہلے کالی داس ''شکنتلا''، ''امانت'' اور ''اندر سبھا'' لکھ کر ادب کے سرمائے میں گرانقدر اضافہ کر چکے تھے۔ کالی داس اور امانت کے بعد آغا حشر نے نمایاں مقام حاصل کیا آغا حشر کے بعد ڈرامے کا سفر جاری ضرور رہا مگر بے حد سست رفتاری کے ساتھ۔ آج کل ہمارے یہاں ڈرامے پر خاصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اسٹیج ڈرامہ اور ٹیلی پلے میں بہت سے نئے نئے نام ابھر کر سامنے آ رہے ہیں اور یہ تو ہوتا ہی ہے کہ جہاں کسی چیز کی بھرمار ہو جائے وہاں مقصدی چیز خال خال ہی ملتی ہے۔ ناموں کی اسی بھیڑ میں دو نام سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک ہیں میرزا ادیب اور دوسرے ابصار عبدالعلی۔ دیکھا جائے تو ابصار عبدالعلی نے کم عمری کے باوجود زیادہ جاندار اور زندہ رہنے والے ڈرامے تخلیق کئے ہیں۔ ابصار کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے تاریخ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ گویا کھیل ہی کھیل میں وہ تاریخ کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ اور اس خوبی سے پڑھا رہے ہیں کہ کوئی چھوٹا بھائی بڑے بھائی کو متنبہ نہیں کرتا۔ ابصار نے ''کیسے کیسے لوگ'' میں ہمیں واقعتاً ایسے ایسے لوگوں سے ملوایا ہے جن کا نام اور کام تاریخ کے اوراق میں رہتی دنیا تک قائم و دائم رہے گا۔ ''کیسے کیسے لوگ'' میں جن لوگوں سے ابصار نے ہمیں ملوایا ہے ان میں وہ لوگ ہیں جنھوں نے کسی نہ کسی طور ایجادات کی ہیں یا اپنے فن میں ایسی مہارت پیدا کی جو دوسرا کوئی نہ کر سکا۔ اس طرح ہم موجد، طبیب، طبیعیات داں، علم نجوم و جفر کے جاننے والے، فلاسفر، ماہر ارضیات غرض ہر شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے ملتے ہیں۔ جو حیات انسانی کے محسن اور رہنما تھے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ لایعنی اور بے مقصد ڈرامہ نگاری کی اس بھیڑ میں ابصار نے ''کیسے کیسے لوگ'' تخلیق کر کے یقیناً ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ٹیلی ویژن ڈرامے نے خاص طور پر ڈرامہ نگاروں کی ایک کھیپ تو ضرور پیدا کی ہے مگر وہ ادب کو کوئی گراں مایہ چیز نہ دے سکے۔ ابصار عبدالعلی نے بامقصد اور سنجیدہ ڈرامہ لکھ کر ان کو گویا بتایا ہے کہ ڈرامے کی ابجد کیا ہوتی ہے اور ڈرامہ نگاری کا اسلوب کسے کہتے ہیں۔ ابصار خود بھی اگر اسی سنجیدگی اور لگن سے اپنے فن کی آبیاری میں لگے رہے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ ان کا نام بھی ڈرامہ نگاری کی تاریخ کے صفحات پر سدا منقش رہے گا۔

◆◆◆

افسانے

مزار

ڈاکٹر رشید امجد

مزار بنانے کا خیال اسے ابھی آیا تھا اور یادیں تو اب خواب ہو گئی تھیں اور صرف نانی اماؤں کی کہانیوں میں رہ گئی تھیں۔ شاید کبھی ۔۔۔ باغوں میں پھول کھلتے ہوں گے اور پرندے کی چہچہار نغمے بکھیرتی ہوگی۔ اب تو باغ ہی نہیں تھے۔ ہریالی کا تو بس ایک تصور ہی تھا کہ ایسی ہوگی۔ آسمان سے قہر برستا تھا اور زمین نے اپنے پانی اپنے بطن کی گہرائیوں میں چھپا لئے تھے۔ سوکھے کی وجہ سے زمین کا چہرہ جھریوں سے اٹ گیا تھا اور درختوں کی شاخیں پتوں کا پیرہن بھول گئی تھیں۔ خوراک اور پانی کی کمی کی وجہ سے پیدا ہونے والے بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی مرنے لگے تھے۔ اسے خیال آیا ۔۔۔ ایکا ایک ہی آیا کہ اس بستی میں کوئی مزار ہی نہیں جس کی جالیوں سے منتوں کے دھاگے باندھے جا سکیں، جہاں جمعرات کی جمعرات چراغ ہی روشن کئے جا سکیں شاید یہی اس ان جانے عذاب کی وجہ ہو۔

بس یہ خیال روز بروز پختہ ہوتا گیا کہ یہاں ایک مزار بننا چاہیے۔

بیوی سے بات کی تو پہلے اسے سمجھ ہی نہ آیا، پھر بولی ۔۔۔ "لیکن کس کا مزار؟"

"کسی کا بھی" اس نے سارے معاملے پر کافی غور کر رکھا تھا ۔۔۔ "کسی بزرگ کا"

"لیکن کس کا؟"

"کوئی بھی ۔۔۔ مثلاً حضرت کالا کالی سرکار"

"یہ مانے گا کون؟"

"سب مان جائیں گے، کیوں کہ بشارت ہوئی ہے۔ کالا کالی سرکار خواب میں آئے ہیں اور انہوں نے مزار بنانے کو کہا ہے۔"

بیوی کچھ متذبذب تھی۔

"لیکن ۔۔۔"

"لیکن کیا ۔۔۔؟" "لوگوں کی یادداشت ہے ہی نہیں۔ کہوں گا ہمارے بزرگوں نے کہا تھا کہ یہاں بھی ایک مزار ہوتا تھا۔"

بیوی اب بھی کچھ ڈانواڈول تھی، بولی ۔۔۔ "گدی نشین بھی تو چاہیے"

"میں بنوں گا وہی" پھر ہنستے ہوئے کہنے لگا ۔۔۔ "بس ذرا حلیہ بدلنا پڑے گا۔ سبز رنگ کا چولا، سبز پگڑی اور ۔۔۔"

چہرے پر ہاتھ پھیرا ۔۔۔ "لمبی داڑھی، گلے میں چار دانوں والی مالا" بیوی چپ رہی۔

بولا ۔۔۔ "مزار بن گیا تو آنے جانے والوں کی بھیڑ لگ جائے گی"

"کیا معلوم؟"

"جہاں لوگ عملی زندگی سے دست بردار ہو جائیں وہاں مزاروں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ سارا انحصار دعاؤں پر ہی ہو جاتا ہے۔"

بستی سے ذرا فاصلے پر ایک اونچا ٹیلہ تھا۔ اس نے دو چار مزدور لیے اور دوسرے دن مزار کی بنیادیں کھودنے لگا۔ رفتہ رفتہ ساری بستی میں یہ چرچا ہو گیا کہ کاکا جی سرکار نے اسے بشارت دی ہے کہ میرا گمشدہ مزار دوبارہ تعمیر کرو۔ دو چار اور مدد کے لیے آ گئے۔

بیوی نے پوچھا — "یہ مزار کی قبر میں کون ہو گا"۔

"کاکا جی سرکار" اس نے اطمینان سے کہا — "وہ تو وہیں ہیں نا" چند دنوں میں مزار کا گنبد بھی بن گیا۔

پہلے لوگ اکا دکا آئے، پھر آنے لگے۔ جمعرات کو تو تانتا بندھ جاتا۔ ایک دوست نے کہا — "کہو تو میں چھوٹی سی ریڑھی لگا لوں — اگربتیاں اور دیے، سرسوں کا تیل۔ جمعرات کو تو خاصی بکری ہو جائے گی"۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سوچا اپنی ایک ریڑھی بھی لگوا لے۔ کھانے پینے کی سوغات بیچے گی۔۔

مزار کی شہرت اب آس پاس بھی پھیلنے لگی۔ آس پاس کی بستیاں بھی سوکھے کی زد میں تھیں اور اپنے اپنے مزار سے محروم تھیں۔ اب جمعرات کے علاوہ بھی خاصے لوگ آنے لگے۔ مزار کی دونوں طرف کی جالیاں منتوں کے دھاگوں سے بھر گئیں چنانچہ آنے والوں نے دھاگوں کے ساتھ نئے دھاگے باندھنا شروع کر دیے۔

اب ایک مستقل مجاور کی ضرورت پڑ گئی۔

بیوی نے کہا — "نہیں کبھی نہیں میں تمہیں مجاور نہیں بننے دوں گی" اس کی کھانے پینے کی ریڑھی اب ایک چھوٹے سے ڈھابے میں تبدیل ہو گئی تھی۔ گھر میں کھانے پینے کی چیزوں کی افراط ہو گئی تھی۔ بولا — "دیکھو — "میں مجاور نہ بنا تو کسی دن کوئی آ جائے گا اور مزار پر قبضہ کر لے گا"۔

بیوی سوچ میں پڑ گئی۔

اس دوران ایک عجیب بات ہوئی۔ بستی سے روٹھے بادل جانے کہاں سے بھٹک کر ادھر آ نکلے، خوب برسے۔ جل تھل ہو گیا۔ ساری بستی میں کاکا جی سرکار کی جے جے ہو گئی۔ مزار پر رش بڑھ گیا۔ پانچ چھ نشئی قسم کے لوگوں نے مستقل ٹھکانہ بنا لیا۔ اب صورت حال چڑھاوا دینے والی ہوتی جا رہی تھی۔ اس دوران اس نے داڑھی تو بڑھانا شروع ہی کر دی تھی۔ ایک صبح بیوی جاگی تو اسے دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہنسے یا چیخے۔ اس کے سامنے ایک پکا مجاور کھڑا تھا۔

"یہ کپڑے کہاں سے لیے"

"کئی دن سے تیاری کر رہا تھا" "تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ شور کرو گی"

"لیکن —"

"لیکن ویکن کچھ نہیں" "اب صورت حال آخری حد تک پہنچ گئی ہے۔ یہ نہ کیا تو کسی دن وہاں میری جگہ کوئی اور بیٹھا ہو گا"

ڈھابہ کافی چل نکلا تھا۔ گھر میں ریل پیل ہو گئی تھی اس لیے بیوی کچھ نہ بولی۔

دستار بندی میں سارا گاؤں آیا۔ آس پاس کے لوگ بھی شریک ہوئے۔ خوب دیگیں پکیں۔ لوگوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ عورتیں اپنے دوپٹوں میں اور مرد کندھے کے رومالوں میں چاول باندھ کر لے گئے۔

کاکا جی سرکار کی جے جے ہو گئی۔

اب وہ رات حجرے ہی میں گزارتا۔ بیوی بھی پیرنی بن گئی۔ گاؤں کی عورتیں دعا کے لئے سفارش کرانے اس کے پاس آتیں اور ساتھ ہی کچھ نہ کچھ چڑھاوا بھی لاتیں۔ اناج، دودھ اور اناج کی تو کمی نہ رہی۔ بڑا بیٹا آٹھویں جماعت میں تھا۔ پڑھائی میں واجبی سے بھی کم۔ بیوی سے کہا ۔ "میرا خیال ہے اسے ساتھ رکھوں۔ میرے بعد اس گدی کو یہی سنبھالے گا۔"

بیوی اب اس کی ہر بات ماننے لگی تھی۔ معلوم نہیں اس کی کرامتوں اور بزرگی سے متاثر ہوئی تھی یا گھر کی حالت بدلنے سے، کچھ نہ بولی۔

"تو ٹھیک ہے کل سے یہ میرے ساتھ ہوگا"

مزار پر اس کی حفاظت کرنے والوں کی ایک جماعت تیار ہوگئی تھی۔ مزار پر جمع ہونے والے چندے میں سے انہیں بھی کچھ ملنے لگا تھا۔ چندے کی صندوقچی بھی اٹھانی پڑ گئی۔ حضرت کو مزار کی طرف سے دیگ پکائی جاتی۔ بیٹا اب روز مزار پر آتا اور سارا دن وہیں گزارتا۔ وہ بہت غور سے اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا اور اطمینان سے سر ہلاتا۔ بیوی دوسرے تیسرے آ جاتی یا وہ گھر کا ایک آدھ چکر لگا لیتا۔ اس بار آیا تو بیوی کچھ پریشان سی تھی۔ بولی ۔ "بیٹے کی حرکتیں ٹھیک نہیں"

"کیا ہوا..." وہ چونکا۔

"اس نے تو آس پاس کی کسی لڑکی کو بھی نہیں چھوڑا"۔

وہ بے ساختہ ہنس پڑا... "تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے"

"پریشانی کی بات نہیں" بیوی حیرت سے بولی

"نہیں" وہ ایک لمحے کے لئے رکا... "یہ اس کی تربیت ہو رہی ہے اسی نے آگے اس علاقے کا فائدہ ہونا ہے۔"

بیوی اسے دیکھتی رہ گئی۔ ایک خیال بار بار آتا لیکن پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی کہ مزار تو بن گیا، بادل بھی کبھی کبھار بھولے بھٹکے ادھر آ نکلتے ہیں لیکن بستی کی حالت تو وہی ہے۔ وہ کب ٹھیک ہوگی؟"

◆◆◆

بدلا ہوا منظر

یقین آتا نہیں خود اپنی آنکھوں پر ہمیں اب تک — یہاں پہ پھول کھلتے تھے، وہاں خنجر نکل آیا
جو منظر سامنے ہے وہ نہ دیکھا تھا کبھی ہم نے — کدھر یہ اپنی وحشت میں دل مضطر نکل آیا

آخری نصیحت

ڈوبتے سال نے یہ رو کے کہا — طور اپنے اگر نہ بدلو گے
جو ہے بویا اکتوبرے میں یہاں — پالوے میں اسی کو کاٹو گے

(ڈاکٹر انور سدید)

سُلفے کی لاٹ

صوفیہ بیدار

عشق تو بس ویاہیاں کریں کنواریاں تو بس رشتے ڈھونڈیں ــــ کڑ کڑ لے واگوں ورگے ہاں "انسو" پلک پلک کیجے کیجے مارتی ہاں ہوئی جا رہی تھی ــــ کلّی دیکھ نے سیدھے لیناں ــــ بھر بھر اتھر کرتے رہے ــــ ہائے ربّا جے چل میرے نال اے ہوو یکھ تے سہی تجھیاں دی وچی کھولی وچ سلفے کی لاٹ ڈکاں مار رہی ہے ــــ

کل سب سے اگے گئی زیتے کوں اسارہی تھی پیچھے پلٹ زمانیوں کا ــــ ذرا جو نظر پڑی تیں ہائیں ورتے کی ہو گئی چھم چھم نیر بہاتی یوں جھلی ڈال رہی تھی کہ "ڈھون" کو سوسو بل پڑتے ــــ کوئی دور کھوتے میں کوکتا

کے کتاو کیر سے لیتے شامت جس دی بھاری ــــ

بھاو الیئے ــــ سڑدیاں رہتاں ــــ ہلے لالو ــــ کوڈی تھی کہ ہو ہی کا ڈھول ــــ قتل کا موقع لیا ــــ ہائے ہائے میرا ویہ کھا جاوے ــــ تجھیاں کھلی جی کے پلو میں اتھر کا قی اپنی جو تع طلاق کو بھی روئے جا رہی تھی ــــ ابھی جیرا آئے گا اور ویسے سمیت مجھے بھی گت سے پکڑ کر دیہڑے دں باہر کرے گا ــــ روقو ازاوں میرے پچھلوں کا ویری ــــ روزا کے تیہ ہو جیں تو ــــ ویا تیرا بھائی بکر

اے ہاں تجھیاں باوا اسلم تے جیرا ــــ اے پر یہ ک لگائی اس نے ــــ تی سب کو تخلیق آ گے ہو رہی تھی ویکھاتے باوا اسلم کسے بھگا لیا ــــ کھیش وکھیاں بولے تو ــــ تجھیاں چیکی بھگا تیں لایا یہ خود اس کی اال جیری ورگی جوانی پیچھے ٹپ ہوئی کھڑی واگوں اڈی ہوئی آئی ہے ــــ

بھائی جو ہو گیا کرے ــــ ؟ خیر اں ــــ شیدس ماسی زینب کوں میں گھسر پھسر کرتے لگیں ــــ

کہتی ہے میں نے اپنا مرد پچھان لیا ہے باوا اسلم میرا مرد ہے اور میں اس کی عورت ــــ تجھیاں ویئ اال رہی تھی ــــ غضب خدا کا ــــ زیتے بولی اور پیچھے جو پچھوڑ آئی ہے وہ کیا ویر بھرا تھا ــــ آ سلفے کی لاٹ نے یکدم ڈھون کا قص روک دیا ؟ آتش گلابی جوڑے میں وہں حاضر ہو گیا ــــ "پھلوتی وریو ــــ جاؤ گھر وگھری اپنے خصموں کا لہو پیو ــــ ان کی کمائیاں پھیٹو ــــ ننداں اتے سساں بارے سازشیں کرو ست نی کہانیاں گھڑو ــــ اپنے بندوں کو تگڑے پیڑ کھلا کے اپنا مقصد پورا کرو ــــ تم کیا جانو عشق کا مطلب ــــ "

"میر اور باوا اسلم بھاتے میں نے قبولا ہے جسے پچھوڑ آئی تم لوگوں نے بنا تھا تمہارے بھیسوں نے ــــ "

"تی اس میں میری روح سما گئی" خیر اں بولی لو یک تجھیاں سہماں کو دھکے دیتی بوہے سے باہر نکالنے لگی "جاؤ جاؤ کوئی کم کا رہے کرو تمیں یا پھر اس کی طرح خصموں کو چھوڑ آئی ہو ــــ آئے ہائے وجیع، ہٹے کٹاتی زوانیاں پیچھے سرکے گئیں ــــ جاوہ مجھے پڑے تو جو گن کی آخری نظر پھر کے گلی میں پلٹ آئیں ــــ اتو ہوتو ہ ــــ کوئی بیڑ میں چوکی دیوتی کر یو ــــ مائیاں لڑکیوں باہوں سے بیچ سیاں الگ کر لگ گئیں باقی تحریوں پرا صبر ہو گئیں کیسا زمانہ آ گیا ہے ــــ ویوہ دیری تو دیکھو ــــ

گلی اب سرگوشیوں سے رسوائیوں والا کوٹھا بن گئی تھی — لڑکیوں کے کانوں کی لوئیں جلنے لگیں۔ ماسیوں کا رومانس، کیلیاں اور کوٹھے کتنے بہکانے والے تھے —

ان کے گمان کس قدر دل دھڑکانے والے تھے۔ نظریں تھیں کہ چوبارے سے نہ ہٹتیں — کیا تھا اس چوبارے میں زلیخائے مصر کی سوت کی آئی والی بڑھیا —

پنجاب کی منڈیروں پہ بال کھولے ہوئے پھرتی ہیر کی روح — بے انصافی کا ہرجہ — بندوں کے نشے اور — رب کا دیا حق چھیننے کے دن — اول سے آخری لاشیں ایک دہلیز سے دوسری دہلیز میں پھینکا جانے والا لمحہ —

وارث شاہ کی ہیر — سچی — نسرین گندرین کو شاپ کے پی پر چائے سویرے کو گھونٹ کاڑھنے والی گرہستنوں میں سے نہ تھی — وہ تو گھر بار تیلی لگا کے اپنا حق مانگنے چلی تھی — اس کے لیے کتنا سوکھا تھا۔ خصم بھی رکھتی اور یار بھی گھر کو ٹھاہر ابھر اور دل میں الگ بہار۔ مگر وہ سچی عورت تھی نہ خصم کو دھوکا دینا چاہتی تھی اور نہ یار کو۔ سارا معاشرہ پیچھے لگا لیا جو منافقت کا درس دیتا تھا —

اس کی گلی میں ہیر کی رات ہوتی تھی —

سانوں گل نوں کھول کے دسیے نیں کی انوکھیاں سانواں والے نی
وارث شاہ نہ دیئے موتیاں نوں چل اگ دے وچ نہ ساڑیے نی

''چل جا اب اپنے خصم کے گھر'' — جھیماں تک پہ ہاتھ دھرے اس کے سر پہ کھڑی تھی — وہ تو میں آ گئی ہوں — میں بھی گئی جھیماں نے پیار سے سمجھانا چاہا — تو تسو جھم جھم تیرا بھائی اتنا آئے سمجھانے گی آیا تو میرے ''ور'' کی بہن ہے اتنا جان لے میں وہ عورت نہیں جو یار الگ رکھے اور ور الگ —

پاؤ اسلم میرا خصم کچھ ہے اس ''ویلے'' سے تھوڑی چوک ہوگئی ... ''ویروں'' نے غیروں کے لڑنا شروع دیا ماریں کھاتی دھکے کھاتی میں جسم کچلواتی رہی کیا بیا رہتا — جھیماں بھی آبدیدہ ہوگئی — ''پر کڑیے — بس یہ پر'' ساری رعدوں کی ماں ہے — تو مرجا گھر لوں قسمت لے — میں تجھے آپ دیا ہواں گی'' جھیماں نے دل سے وعدہ کیا — ''تو جاتی ہے تا پاس میں وڈی جاواں گی میں مرگئی تو پھڑی ہو جاواں گی۔ اور اسلم اس کو تو سارے مل کر مار دیں گے — بس تو مجھے آج کی رات کی آخری لاری سے اسلم کے ساتھ بھگادے۔''

''نی آ ستے کیہ ستا کپ رہیا — گل رپٹ ماسی خیراں شیداں تجسس سے بے حال ہوئی۔ خصم پھر کر تیں ایک بار پھر جھیماں کے دروازے آن کھڑی ہوئیں — ایسے وہ بھی منہ کھول کے آئی تھیں ''ہم یہ سب نہ ہونے دیں گے — ہمارے بندوں کے آنے کا علم ہو گیا جھیماں ایہہ تجر خانہ ملاں — تمیں تو ہمیں پتہ ہم تمہاری دردگریں''

گاؤں گھروں موریوں، نالیوں سے معاشرہ گھسے چلا آ رہا تھا — جھیماں جوابا طعنے برسا رہی تھی ''سب کو پتا ہوں کس کا یار اپنے جوائی سے چل رہا ہے اور کوئی اپنے جیٹھ کے ساتھ خراب ہے —''

دن کی رنڈیاں راتوں کو لوٹنے والیاں — وہ جھیماں کا درس ہے اور کہ لگا یہ دنیا کا سب سے گندی معاشرہ ہے جس پہ پردے پڑے ہوئے تھے —

نسرین نے تو اس گھونگھٹ اٹھایا تھا مستقل عیاں کا دن تھا اس گھونگھٹ اٹھانے کا تھا۔

شورو جب چوبارے سے نکل کر ''ویہڑوں'' میں پہنچا تو پنچھی گھروں کو لوٹ رہے تھے دن بھر کے تھکے ہارے کام تھے پر ''پرے'' دھرے راتی جمار اس موڑ تے بولیاں بولتے تانگے ہانکتے، جانور، اچھو دھوڑ اڑاتے روٹی ٹکر کی خوشبو کو ڈ سے چلے آ رہے تھے ۔۔۔ کوئی کھڑکی کھڑکا رہی تھی ''سوہنے دے چیرے والیا میں کتی آں'' بس ایک ''کھانا'' تھا تندوروں سے رزق کی خوشبو والے دھوئیں جیسی اٹھ رہی تھے کئی بتی بکھری جیسی کی کوئی مہک نہ تھی ۔۔۔ وہ اک شور جو اس مردوں کی آمد پر ''سرگوشیوں میں تبدیل ہو گیا تھا ۔۔۔ تایا اکرام زور سے کھانسے آ ناکانا ساری بڑھیاں قہقہوں کی ''ہا'' سے یوں نکلیں کہ اس رنگ بدلتے دوپٹے ہی اٹھے بھاگتے نظر آئے تایا جی سلام ۔۔۔ یہ جا وہ جا ۔۔۔ رنگین غول غائب ہوتا چلا گیا۔

کھنگے کے دوڑ ہے تایا جی نے ''ہوں'' کیا عشاء کے بعد سارے میرے ویہڑے آ جانا ۔۔۔ مردوں نے ہنکارا بھر کے سر جھکا لیے ''جی! ۔۔۔ شورو جیرے کو لیتے آنا ۔۔۔''

زنانیوں نے پنچایت لگوا ہی دی ۔۔۔ بھیماں چلنے میں ''ڈکی'' ساگا کر ساگ تیار کرتے ہوئی منتالی ساتھ ہی تندور میں لکڑی کے ٹکڑے ''اک'' ڈال کے تیلی لگا دی۔

''وہ جیتو پٹ ہے بنا ۔۔۔ تیرا ابا آ گیا'' ۔۔۔ ''بی اماں'' مرجھائی ہوئی کڑیاں سر منہ لپیٹ کے تندوروں پر چڑھ گئیں۔

''کیہہ جتن چڑھ جایا اے ۔۔۔ جمیں بھر لے'' جی الٹھ نکلے لمبی ڈکار لے لگا ۔۔۔ قمصاں یکدم ویہڑوں میں جیتو کی اب سب تیرے ہاتھ تیرے ۔۔۔ کڑی شادی شدہ ہے ۔۔۔ اسلم کے پیچھے لگ کے آ گئی ہے۔ تجھے کتنا کہتی تھی اتنے میلے میں اتنے دن سائیکل پر نہ چڑھ جایا کر اس کی جوانی کی دھوم ''کوڈی زور'' آزمائی، اور گھوڑ دوڑ میں تھوڑی ہے جو سات دن میلے میں بھی سائیکل چلوائی سات گاؤں کی کڑیاں اس کے ڈولے دیکھ کے پاگل ہوئی پڑی ہیں یہ بڑا تو پیچھے ہی آ گئی ۔۔۔ چل پیچھے ہٹ!'' جیرے نے لات مار کر بھیماں کو پرے دھکیلا ''ڈولے دیکھ کے ۔۔۔ ہر ویلے اپنے ٹکیوں کے گن گاتی ۔۔۔ سائیکل پر جو سات دن کا انعام ملا وہ کدھر ہے؟ پتہ نہیں میں نے ابھی تک باؤ اسلم کو نہیں دیکھا ۔۔۔ کہتے ہیں میلے کے اندر اب جشن ہو رہے ہیں میلے داروں نے مال پانی کے اعلان کیے تھے تو کشتی بھی ہوتا تھی۔''

پیڑا آ گیا بھاگیا ۔۔۔ چل تایا اکرام نے منہ اٹھا ''سارے پہنچے'' ۔۔۔ جیرا کھا جانے والی نظروں سے بھیماں کو دیکھتا پنچایت کو چل پڑا ۔۔۔ ''او ئے شہر سے آنے والے رنگ باز ۔۔۔ تم سارا قصہ بیان کرو ۔۔۔'' تائے نے باؤ اسلم اور میلے داروں کے درمیان معاہدہ کروانے والے شہر کے لڑکوں کو کھڑا ہو کے سن و عن بیان کا حکم دیا۔ ''تایا جی جو بنا ۔۔۔ دیکھا ۔۔۔ پورا قصہ سناتا ہوں'' اسلم کا یار راشد جو نے موٹے رسالوں میں لکھتا لکھاتا تھا شہر سے واپس آیا تو ناول لکھنا چاہتا تھا اس سارے منظر کو دیکھا داستان گو جاگ اٹھا عشاء کے بعد شروع ہوا۔

وہ جی نسرین پورے سات دن اسلم کو دیکھنے میلے میں آتی رہی تھی اسلم ہاتھ کی انگلی پر وزنی سلائی مشین دھرے ایک ہاتھ سے سائیکل چلاتا اسی سے کھانا پینا ہوتا ۔۔۔ وہ دن تو یہ صبر سے دیکھتی رہی تیسرے دن یہ باولی ہوئی سائیکل کے چکر کے ساتھ چلنا شروع ہو گئی پھر اس کی حالت دن بدن بدتر ہوتی گئی ''کہ ''سائیکل کی آنکھیں رو رو کے سوج گئیں یہ بھی کھانے کا نشہ بھی وہ دھکا پیتا بھی تھی کا کر

منزل لیے سیکل کے ساتھ ساتھ بھاگتی۔۔۔

منت ترلے کرتی ہے سیکل والے باؤ یہ چھاحت سے لگالے یہ تو اللہ کا لے ۔۔۔ ارے کوئی اس کی سیکل کو روکو نہیں تو میرا دل رک جائے گا ۔۔۔ روز قسم کھاتی کر باؤں سے گھسیٹ مٹی میں رونا ہے سے لے جاتا، دور تک اس کی آہ و زاری سنائی دیتی باؤ اسلم گم صم اسمان تکتا رہتا۔۔۔

راشد قصہ سنانے کھو چکا تھا ۔۔۔ اور پوری پنچایت بھی قصہ گو کے ساتھ ۔۔۔ وہ وڈا بعد میں ہولے ہولے اس پر بھی 'سایہ' ہوتے لگا اسلم کی سیکل اپنے دائرے سے بھگ لے کھا کر اس مٹی کے کھاتوں پر چلنے لگتی جہاں نسرین کے مٹی میں رلے ہوئے جسے کی خوشبو رچی ہوئی تھی ۔۔۔ میلے کے منچلے اونچی تکتے ۔۔۔ اوباؤ ۔۔۔ او باؤ اسلم یہ تو دائرے سے باہر نکل رہا ہے ۔۔۔ تجھے خبر ہے تو نے اپنی حد کے باہر سفر شروع کر دیا ہے ۔۔۔ تو لکیر سے باہر ہو گیا ہے باؤ ۔۔۔ واپس آجا لوٹ آ ورنہ تو سارا جادو ٹوٹ جائے گا ۔۔۔ اپنی سیما کے اندر رہو ۔۔۔ اوہو ۔۔۔ اوہو ۔۔۔ وہ سیکل ایک جھٹکے سے دائرے میں داخل کرتا گردن کے سرخ ہوتے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑتا ۔۔۔ سیکل پر پیڈل مارتے پاؤں من من وزن کے ہو جاتے پنڈلیوں کی پوری طاقت سے پیڈل گھسیٹتا واپسی کا سفر اختیار کرتا تو گردن اور مولی مرغی کی طرح کا غصوں پر گری ہوتی۔۔۔

آج میلے کا ساتواں دن تھا ۔۔۔ پر تو ریت پڑ گئے تھے اب تو دنگل اتر کر رہا تھا میلہ ختم ہو رہا تھا اور تماشہ بھی ۔۔۔ جس نے کھو اپنا تھا وہ میلے میں کھو چکا تھا ۔۔۔ اسلم صبح سے سیکل پر سوار اس آس پر چکر مکمل کرتا کہ ہر چکر اسے آخری چکر کے نزدیک کر رہا تھا ۔۔۔ دیہاتوں میں طلب کی تڑپ جاگ اٹھی تھی پھر بجرائی بازوؤں کی مچھلیاں ہتھیلی پر دھری سلائی مشین اور جسے کا حتو ازن بوجھ تو اجسموں کے جنگل میں بھاگتا شروع ہو چکا تھا ۔۔۔ وہ اپنی تمنا کے گرد طواف کر رہا تھا۔۔۔

آج سے سات دن صرف سات دن پہلے جب وہ نہا دھو کر شیو بنا کر بازو پر امام ضامن بندھوا کر سائیکل پر سوار ہوا تھا تو ایک اور ہی اسلم تھا جو مہینوں سے اس مقابلے کی نہ صرف تیاری کر رہا تھا بلکہ کبڈی کشتی اور زور آزمائی کے مقابلوں کے لیے بھی صبح سے شام تک اکھاڑے میں اتر اور ورزش کرتا رہتا وہ پہلوان سہاگے پر بٹھا کر جب کھینچتا تو اہل محلہ عش عش کر اٹھتے ۔۔۔ مگر اتنے دن سائیکل چلانا جو جسم کا کام تھا صبر اور حوصلے کی منزلوں سے گزر رہا تھا مگر انعام کی رقم منتظمین سے معاہدے کی رقم اور دیگر مشتہر انعام کے ساتھ سند کا حصول اسے تھکنے نہ دیتا اس نے سوچا سائیکل تو کئی لوگوں نے چلائی کیوں نہ ساتھ میں کوئی وزن اٹھا کر منفرد انداز میں شہرت حاصل کی جائے بڑی چھماں کی مشین وہ دو روز پہلے ہی ہاتھ پر اٹھائے جب وہ میل کا سفر کر کے کارگھر سے لایا تو محلے میں کھڑی چھماں کے ساتھ کئی عورتوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا ماشاءاللہ ۔۔۔ اسلم باؤ تو بڑا گھبرو جوان نکلا ہے مشین کھلونے کی طرح ہتھیلی پر اٹھائے لے آیا اسلم نے طمانیت سے سر کو جھکا کر سوچا اب کے یہ کام پبلک میں کروں گا ۔۔۔ اور اب اس کا عملی مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بے پناہ شہرت مل رہی تھی دائرے کے اطراف کھڑے تماشائیوں میں اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا تھا ۔۔۔ اس کے کرتب کی شہرت بدن کی طاقت، جوانی کا نکھار ہاتھ پر دھری وزنی مشین تھے وہ کبھی ایک ہاتھ کی ہتھیلی تو کبھی دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر منتقل کر رہا۔۔۔

دیگر میلے اسلم کا چہرہ دیتے ہی کی او جھیا ہوا نے لگتا چہرے پر تھکاوٹ آمیز بیزاری مسکراہٹ مردانگی کو دو چند کر دیتی آنکھوں کے

اچیلے لینے میں تیر نے گرفت میں نہ آنے والے وقت جیسے ہو جاتے۔

رانجھے کی پہچان بھی تو ہیر کے سوا کسی کو نہ ہوئی تھی اور وہ ..... وہ تو خود ہیر تھی گز گز لمبے بال ساتھی سلکھنی شوخ اور من موہنی تھی کہ گندم جیسے اکھڑ سے کال ہو روئی کی مستی میں ڈھلا چلدار سراپا، اور لبوں پہ بیٹھے جنم کا "وچھوڑا" چپکا ہوا تھا۔

وہ جانتی تھی اس کے مقدروں کو "لیک" لگ چکی تھی۔ کھیڑے ڈولی اٹھا چکے تھے اب وہ جو جنگ لڑنے جا رہی تھی وہ مقدروں اور رسموں کی تھی ..... مگر نظر پر چلی تھی ..... آنکھ تھی کیسے ..... "کھیڑوں سے لڑ بچھڑا تھا ابلوں کے پاس جانا تھا روح کی گچ تھی صدے بے بس تھا۔

اسلم نے آخری چکر بھرنے کے لیے بہت جیج کی ..... انتظار اور سات جنم کا "ادھڑیاں" بوجھل "جب" پیڈل پر زور ڈالے تو تھے کہ دروازے کو چیرتی بھید بھری نسرین بھی ہوئی نکلی ..... اسلم کی سائیکل کے ہتھوں پر ہتھا لٹکی روتی جا رہی تھی ..... پیچھے ہی آہوی رنگت والی پنڈلیوں والا مرد ٹخنوں تک دھوتی چڑھائے ہاتھ میں سراؤں والی چلدار "کانپی" لیے برآمد ہوا اور تاڑ تاڑ چھیوں بھری پر ٹوٹ پڑا۔ بھاں تیری مرضی بچھ کاں دار تیرے پاس گئیں رہتا میں نے اپنا مرواڑ چھوڑ لیا ..... چل اٹھ جھوکیں کی گٹھری ورنہ تیرا سا ولی جاواں گا۔

اسلم سائیکل سے اتر رہا تھا، مہار کہیں، ڈھول شور چھیکر پر اعلان اور بڑھکوں کے "رولے" میں نسرین کے بدن پر جھکوں کی آوازیں کہیں دب گئیں ..... پکڑو ..... چھڑو ..... یہ بھی بے ہوش ہو گئی ..... ارے کوئی بچا مارو ..... اس کو پکڑو اس نے شاید عورت کو مار دیا" گھبرائی ہوئی چیخوں اور آہوی پنڈلیوں نے مارے مارے وہ سپاہیوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو ساری مردانگی لرز گئی آناً فاناً آہوی ٹانگیں لرز کر بھاگیں منٹوں کی منٹیں چیرتی ہوئیں۔

چھوٹا اسلم کے پاس آیا "استاد جی پیچھے تانگے پر ڈال کر تھیوؤں میں لے جاؤں آپ لوگوں سے تحقیق کرا جانا" ..... "اسلم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا چھوٹا جو کئی دنوں سے تماشا دیکھ رہا تھا پھر بولا "اسے مرہم پٹی کی ضرورت ہے لوگ بہت ہو گئے ہیں ہوش میں آنے کریا ..... مگر مگر ..... اسے ٹھیک کر ..... "چھوٹا لپک کر آیا اس کی ٹانگی کو رد لا کر کے سہارا دے کر اٹھایا چلو باجی اٹھو گھر چلتے ہیں نسرین نے دکھتے ہوئے لمحوں میں سورج کی آخری کرنوں میں اسلم سے نظر ملائی اور تشویت کے لمحے میں سر جھکا کر چلی گئی لگے کے ساتھ۔

"آگے آپ جانو یار رب جانے ....." راشد نے سر جھکایا تو آنکھیں آنسوؤں سے شرابور تھیں کئی دن والے اتھر چھپا رہے تھے ..... ماسے نے لمبی سی "ہوں" کی جانے کیسی ہوک تھی وقت نے جیسے "گھٹ" بھر لیا تھا ابھی سب گھر جاؤ فجر کے بعد بلاوا دیکھیں گا۔
تیر اگلی میں آکے "دھریک" بیٹھ ڈھیر ہو گیا۔

جھماں نے بڑے بڑے دور دیکھے تھے مگر یہ معاملہ ٹھنڈا نہ رکھتا جب اس کی اپنی منگنی ہوئی تھی کو مٹے پر چڑھ کر منگیتر کے ساتھ فرار کی ..... منگنی ٹوٹی تو دل بھی ٹوٹ گیا پھیکے دن راتوں جہاں جہاں بھاگا پھرا ..... تیرے کے ویلے ..... آج سب یاد آیا "اتھروں" میں بہہ گئی۔

پو پھٹ رہی تھی جب تیرے کی آنکھ کھلی اور اس نے یاد اسلم کو دوستوں یاروں سے چھڑا کر اپنے پیچھے پر لا بٹھایا سرکاری کھیتے کی ملاقات میں پہلے حساب کتاب، القام تخموں اور شرطوں پر آئے مال پانی کا پوچھا ..... جب اوقات سے زیادہ مال پانی نظر دیکھا تو ڈانٹ ڈپٹ کر ارادہ ترک کر دیا ..... "لاؤ ے میں تیری امانت سنبھال آؤں اماں حاجن کے پاس ..... پر نہیں وہ اب بہت ہو گئی ہے کوئی بھی وہ

وقت کے ناگ کو گھیر لے گا۔۔۔ میں شاہوں کی وڈھی ''ٹو'' کے پاس دھر آتا ہوں ادھر کون جائے گا۔؟ بابا اسلم الجیلی ادا سے ہنس دیا۔۔۔ ''بھائیا ۔۔۔ میں جس سے جان مار کر رقم وصول کر آیا ہوں۔

ان سے ذ حاذا کون ہوگا؟ میں بہت جان مار کر مال کما لایا ہوں مجھ سے زیادہ کون اس کی حفاظت کر سکتا ہے تو روٹی شوٹی کھا جش کر بھائیا ۔۔۔ تیرا آگی تیری بھی اگلی سے نکالنے کا سوچتے ہوئے بولا ۔۔۔ ''اچھا تو پھر بتا کون ہے جسے تو نکال لیا یا وہ بھی میرے گھر میں ڈال دی ہے ۔۔۔ تیرا رقیب ''موتی'' نے دیکھ کر تلملا اٹھا اسلم نے بھی گالی ڈالی ۔۔۔ تو تجھ سے شہر جا کر اپنے چھمیاں اور بال بچے کا کپڑا لے آنا تھوڑا تانگہ بھی ایک اور ڈال دوں کا فکر نہ کر ۔۔۔ تیرے کی باچھیں کھل گئیں ۔۔۔ ''آہ بابا کیوں سے راز دیا زمانے بھتوئیے میں ہو رہے ہیں؟ کیا بھتوئیے منہ پکار رہے ہو ۔۔۔؟'' ''اے کچھ نہیں کرساں والے میں ''سوہنی'' لگا سویرے شہر جانا ۔۔۔ اسلم نوں بہتا سوال جواب نہ کریں ۔۔۔'' اسلم کی مسکراہٹ پر بیا وہ مونچھیں جوانی کا پیو وسے رہی تھیں ۔۔۔

آنکھوں میں لال ''پیلے'' ''پیک کے جل اٹھیں ۔۔۔ رب خیر کرے میرے ویر دی ۔۔۔ ہائے کیسی لال آندھی چڑھی ہے میرے ویر کی آنکھوں میں ۔۔۔ آپا بھائیا کے ساتھ میری بھی کنگھی ڈال دے ۔۔۔''

نہ بابا اسلم تو آج رات ادھر شہر میں نسرین کو بیاہتا ہوں اک واری اپنے بندے کے پاس واپس جا کر ''لعنت'' لے آئے جب تک یہ چوبارے پر ہے تو تیرے دے پتہ چلا جا ۔۔۔ پر کیوں آیا ۔۔۔ ''میں کون سا اسے نکال کر لایا ہوں یہ پگلی خود سا توں پیچھے لگی میری سائیکل سے چپک گئی ۔۔۔ میں نے کیا کیا ۔۔۔؟''

مرد کب کچھ کرتا ہے؟ یہ اس کی مردانگی اس کا غصہ اس کا غرور عورت کو خاک کر دیتا ہے ''یہ جو تیرے متھے پر مردانگی کا تکبر ہے اسی نے اسے ''رول'' ڈالا ۔۔۔ سوچ رجھ کے بے تجھے چاہے تھی بہت ۔۔۔ ''چھمیاں بڑبڑا رہی تھی اسلم کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں ان سنی کرتا تھکے پر مدہوش پڑا آنے والے وقت اور اپنی آن کی جوانی میں بیج پڑتے دیکھ رہا تھا ۔۔۔ وہ کیسی جائے گی ۔۔۔ اس کے بعد اس کو ہوش نہ تھا۔۔۔

سات دن کی سائیکل چلائی ہوئی تھی محنت مزدوری کا میٹھا میٹھا سیک اور نیم نشاں اور رات کا آخری پہر ۔۔۔ چھمیاں اپنے بندے کو لے جا چکی تھی ۔۔۔ چھن چھن چھن ۔۔۔ بابا اسلم'' کا کان ''میں میٹھی سی سرگوشی ۔۔۔ اسلم نے ادھ کھلی آنکھوں سے ملتے ہیں ۔۔۔ تو دیکھا نسرین تو آپ ابھی تو یہاں پڑا ہے کوئی کیسی کوئی چیز ۔۔۔ لگتا نہیں ہے تو مجھ کو دوپہر اوڑھ لے ۔۔۔ وہ تن من دھن سے اسلم پر ''اصل'' کی پوری کی پوری

حسن کی رات اور جوانی کا غرور ۔۔۔ واعدا وقت پڑ گیا ۔۔۔ بیچ کا بھیسو کا پوری سیر دگی میں ۔۔۔ اسلم نے تاروں بھرے آسمان سے گواہی مانگی فلک نے دو بول پڑھا دیئے ۔۔۔ آج بڑی چاروں بھری بارات نے اسلم کو نسرین سے بیاہ دیا

◆◆◆

اردو ادب کے مشہور نقاد، صحافی اور ادیب ڈاکٹر انور سدید کی رحلت سے ملک ادبی صحافت، جائزہ نویسی اور شخصیت نویسی اور شخصیت نگاری سے محروم ہو گیا۔ (شہباز شریف، وزیر اعلیٰ پنجاب)

میک اَپ والی

پنجابی تحریر: اظہر جاوید
اُردو ترجمہ : حنیف باوا

اس کی موت کی خبر پڑھی تو میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ عجیب بات ہے ـــ نہ وہ میری رشتے دار تھی ـــ نہ دوست اور نہ ہی اس کے ساتھ جان پہچان والا اشتراک تھا ـــ جان پہچان تو دونوں جانب سے ہوتی ہے۔ میں تو اسے جانتا تھا لیکن اسے میرا نام بھی معلوم نہ ہو گا ـــ میں عمر کے اس حصے میں ہوں، جہاں "دن دے" والا عشق نہیں کیا جاتا ـــ لیکن پھر بھی اس کی موت کی خبر نے مجھے جیسے توڑ کر رکھ دیا۔

اسے مرے ہوئے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہو گیا ہے۔ اب بھی جب وہ یاد آتی ہے تو میں تڑپ جاتا ہوں ـــ بے قرار ہو جاتا ہوں ـــ اشکوں کے چراغ جلانے لگتا ہوں ـــ وہ کون تھی اور میرا یہ حال کیوں ہو جاتا ہے ـــ یہ کتھا بھی سن لیں۔

وہ ٹیلی ویژن میں میک اپ کرنے پر معمور تھی۔ اس کے ساتھ میری پہلی اور آخری ملاقات وہیں پر ہوئی تھی۔ وہ کئی برسوں سے وہاں پر ملازم تھی۔ لیکن میرا ٹیلی ویژن اسٹیشن پر جانا کبھی کبھار ہوتا تھا۔ حجاز میرے چھوٹے بھائیوں جیسا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ وہ مجھے سگے بھائیوں جیسی ہی عزت و احترام دیتا ہے۔ وہ جب بھی بات کرتا ہے، بھائی جان کہہ کر بلاتا ہے۔ وہ ٹیلی ویژن پر بطور افسر فائز ہے اور کبھی کبھار سال، دو سال بعد مجھے کسی پروگرام کے لئے بلا لیتا ہے۔ وہ فون اتنے بھروسے اور اعتماد سے کرتا ہے کہ مجھ میں انکار کرنے کی جرأت نہیں رہتی۔

تین چار سال پہلے کی بات ہے، نہ جانے کون سا پروگرام تھا۔ میں حجاز کے بلاوے پر ہی وہاں گیا تھا۔ کئی دیگر ادیب اور شاعر دوست بھی وہاں پر موجود تھے۔ جب خواتین اور مرد میک اپ روم میں داخل ہوئے تو وہ کہانی کار ریما کا میک اپ کر رہی تھی۔ حجاز نے مذاق کے انداز میں کہا "بھائی جان انتظار کریں گے یا کسی مرد سے میک اپ کروا لیں گے ـــ" میں نے بھی ہنس کر میک اپ مین کی جانب دیکھتے ہوئے کہا ـــ "اگر یہ شخص میک اپ کر کے مجھے ریما سے زیادہ خوبصورت بنا دے تو میں تیار ہوں ـــ" مردوں میں سے کسی ایک کے بولنے سے پہلے اس نے منہ میری جانب کیا اور بڑی آہستگی اور اپنے پن سے کہنے لگی۔

"سر جی! مرد تو سدا ہی خوبصورت ہے، میک اپ کی کیا ضرورت ہے؟ یہ تو عورتوں کے ہی چونچلے پیارے ہوتے ہیں ـــ" ایسا لگا جیسے میک اپ روم میں کوئی ان ہونی سی بات سرزد ہو گئی ہو۔ باقی لوگوں کا تو مجھے علم نہیں۔ میں ہکا بکا ہو گیا تھا۔ میں نے بڑی حیرانی سے کہا "آپ دنیا کی پہلی خاتون ہیں جس نے اتنی بڑی اور سچی بات کی ہے۔"

"صرف سچی ہی نہیں سر جی یہ پکی بھی ہے ـــ" اس نے پھر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

وہ پہلا موقع تھا، جب وہ میرے دل میں بس گئی۔ میں پھر واضح کر دوں، یہ کوئی عشق وشق نہیں تھا۔ وہ بے شک اتنی خوبصورت

نہیں تھی لیکن سن موہنی ضرور تھی۔ اس میں کوئی ایسی خوبی تھی جو بندے کو اپنی جانب کھینچ لیتی تھی۔ حجاز نے ہی مجھے بتایا تھا کہ کسی پروگرام میں کوئی مولوی صاحب آئے۔ انھیں جب میک اپ کروانے کے لئے کہا گیا تو وہ بھڑک اٹھے۔ ٹیلی ویژن والوں نے اپنی مجبوریوں کا اظہار کیا، بحث ہونے لگی، تو مولوی صاحب تو تکرار کرتے ہوئے مان گئے۔ ان کا میک اپ اسی لڑکی نے کیا۔ کچھ لمحوں کے بعد مولوی صاحب اندر سٹوڈیو میں گئے تو اس نے ہنستے ہوئے تمام ساتھیوں کو مولوی صاحب کا وزٹنگ کارڈ دکھایا جس پر انھوں نے اپنے ہاتھ سے اپنا پرائیویٹ نمبر بھی لکھ دیا تھا۔

میں اپنی مصروفیات میں گم ہو گیا اور اس کی یاد نہ جانے کہاں غائب ہو گئی۔ دو تین سال بعد حجاز کا جب پھر کسی پروگرام کے لئے فون آیا تو میری سوچوں میں کئی کول اور کئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ میں نے کہا "نوجوان! میں نے تیری بات سے کبھی انکار نہیں کیا۔ لیکن اس بار میری ایک شرط ہے۔" حجاز نے حسب سابق اسی تابع داری سے جواب دیا "بتائیں بھائی جان کیا حکم ہے؟" "میرا میک اپ اسی سن موہنی لڑکی سے کروائیں ... جس کا نام مجھے معلوم نہیں۔" "ہنستے ہوئے حجاز کی آواز میں مجھے پہلی بار اداسی جھلکتی ہوئی محسوس ہوئی ... "بھائی جان آپ کو بھی سن کر دکھ ہوگا اسے تو کینسر ہو گیا ہے ... وہ ہسپتال میں ہے اب تو اسے بچانا بھی مشکل ہو گیا ہے۔"

مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے دل پر چھری چلا دی ہو۔ میرے بڑے ہی چہیتے دوست کہانی کار حسرت علی کو بھی کینسر نے ہم سے چھین لیا تھا اور دیگر یار جاوید بٹ اور اشرف ندیم بھی جوانی میں ہی کینسر کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ ان کی خبر پر بھی تڑپ اٹھا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس میک اپ والی کی خبر نے مجھے کتنا اندر سے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں تو جیسے گم سم سا ہو گیا تھا۔

ہم دنیا دار کیسے بڑے سے بڑے صدمے کو برداشت کرتے ہوئے پھر سے دنیا داری کے کاموں میں کھب جاتے ہیں۔ جب میں دل کی بیماری میں مبتلا ہوا اور میں ہسپتال سے ہو کر آیا تو ایک اور حقیقت نے مجھے یہ بات سمجھائی کہ کسی کے ساتھ ہمدردی پیدا ہو جائے یا کوئی اپنی خوبصورتی کی وجہ سے آپ کے دل میں رچ بس جائے تو اس کے لئے کسی رشتے، کسی دوستی یاری کی سانجھ یا باہمی تعلقات کی ضرورت نہیں ہوتی ... درد اور غم کا اشتراک ہی سب رشتوں ناتوں سے افضل اور سچا ہوتا ہے۔

حکیم کے ساتھ میری دوستی بڑی گہری ہے۔ گئے گزرے دنوں میں بھی ہم اکٹھے رہے ہیں اور خوشحالی کے دور میں بھی ہم ایک دوسرے سے کبھی دور نہیں ہوئے۔ مجھے بھی اس بات پر بڑا فخر تھا اور حکیم کا بھی یہ دعویٰ تھا کہ ہمارا تعلق کسی لوبھ یا لالچ کی بنیاد پر قائم نہیں۔ ہم حقیقتاً ایک دوسرے کے دکھ اور سکھ کے ساتھی تھے۔ میں ہسپتال سے واپس آیا تو انہوں نے مجھے فون کیا۔ میں نے انھیں بتایا "میں نے پوری کوشش کی کہ میری بیماری کی خبر اخبار میں شائع نہ ہو اور زیادہ جان پہچان والیوں تک بھی یہ خبر نہ پہنچے۔ میں نے آپ کو بھی پریشان نہیں کیا۔" میں نے ذرا توقف کیا اور اسے اپنا ہمدرد دوست اور حکیم سمجھتے ہوئے بیماری کے حملے سے لے کر ڈاکٹروں کے علاج اور ان کی آئندہ کی ہدایات کی تمام تفصیل سے آگاہ کر دیا۔ حکیم نے شاید دکھ سے یا سرسری طور پر فون پر دو تین بار ... اوہو ... کیا اور کبھی کبھار لمبا سا اچھا بھی منہ سے نکلا ... اس تمام کتھا کو سنانے میں دس پندرہ منٹ تو لگے ہی ہوں گے ... میری بات ختم ہوئی اور میں نے سوچا کہ حکیم پریشان ہو کر فوراً میری طرف آئے گا۔ فون پر ہی کوئی مزید خدمت گزاری کے بارے میں پوچھے گا تو مجھے اس کی روتی ہوئی آواز سن کر کچھ تسلی اور قدرے سہارا ملے گا۔ لیکن ادھر سے تو جیسے کلاشنکوف کی گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ حکیم نے بات کاٹ کر تڑخ سے پوچھا "اور "فنون" کا دفتر کہاں

ہے؟" مجھے ایسا لگا جیسے میں پہلے ہی دیوار سے باتیں کر رہا تھا اور اب اسی دیوار سے سر پھوڑ لوں۔

ابھی کچھ روز قبل سو بہ بے جوان حسن رضوی کو موت لے آیا تھا۔ اسے تو دل کے حملے نے زیادہ دیر تک سانس کی ڈوری کو قائم رکھنے کی اجازت بھی نہ دی۔ مجھے بھی اسی قسم کی صورت سے واسطہ پڑ سکتا تھا۔ جب مجھ پر ہارٹ اٹیک ہوا میں دفتر میں ہی تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ شاعرہ سلطانہ میرے پاس موجود تھی۔ اس نے کرم کیا۔ میرے مہربان یار جاوید منظور کو فوراً فون کیا۔ وہ اور لطیف ہوا کے جھونکے کی مانند میرے پاس پہنچے اور مجھے لے کر فوراً ہسپتال کا رخ کیا۔ ابھی ٹیسٹ اور ابتدائی علاج ہو ہی رہا تھا کہ میری بیوی اور بیٹا بھی آ گئے۔ انہیں جاوید نے اطلاع کر دی تھی۔

حکیم کے انجمن سے سوال نے تو مجھے مار ہی دیا تھا۔ نہ جانے کس کی دعا نے مجھے بچا لیا تھا لیکن ایسے لگا، جیسے زندگی بھی ایک بوجھ ہے۔ اصل بات تو ہمدردی کی ہے۔ یہ رشتے ناطے، یہ یاری دوستی تمام دکھاوے کی باتیں ہیں۔ میک اپ والی کے ساتھ بھی میرا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن میں اس کی بیماری کی خبر سن کر تڑپ اٹھا تھا اور اس کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا تھا۔ اگر میں زندگی ہار جاتا اور ...... پھر بھی خبر ملنے والے کسی شعیب سال پرانے یار نے ایک دوبار "اوہو" کہہ کر خبر سنانے والے سے یہی پوچھنا تھا "فنون" کا دفتر کہاں ہے؟"

ابھی میں زندگی کی اس دلدل سے نہیں نکلا تھا کہ ایک روز حکیم آ گئی۔ وہ شاعر یا ادیب نہیں ہے۔ اسی لئے اس میں منافقت کم ملتی ہے لیکن کبھی کبھار انسان زیادہ ہمدردی جتاتے ہوئے طنز بھری بات کر جاتا ہے۔ حکیم نے پوچھا "اتنے دن کہاں رہے ...... میں نے بڑے قرن کے ...... "میں نے بات کو ٹال دینا تھا لیکن پاس بیٹھے کسی دوست نے اسے بتایا ...... "انہیں ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اور یہ ہسپتال داخل رہے ہیں ...... "حکیم نے بڑی ہمدردی اور حسرت سے بڑھ کر اپنے پن سے کہا ...... "تو آپ نے بتایا ہی نہیں۔ ہمارا بھی تو کچھ تعلق ہے۔ آخر مدد دیکھنا بھی تو ضروری ہوتا ہے ......" "تمہیں معلوم کر لے سے یہ جملہ بولتے ہوئے خود کو افسوس ہوا تھا یا نہیں، لیکن مجھے ملال نہیں ہوا۔ وہ مجھے حکیم سے بڑھ کر اچھی لگی، اس نے زندگی کے اس کے بارے میں تو سوچ لیا تھا لیکن "فنون" کے دفتر کے بارے میں قطعاً نہیں پوچھا تھا۔

میک اپ والے ...... تو ہوا کون ہے ...... نہ جانے روحوں کا وجود ہے یا نہیں، نہیں معلوم ان کے دیدار پسماندگان کے جذبات ان تک پہنچتے بھی ہیں یا نہیں ...... میں جو تمہارا کچھ بھی نہیں، تمہاری بیماری پر تڑپا بھی تھا اور تمہاری موت پر پھوٹ پھوٹ کر رویا بھی۔ میرے چہیتے یار اور میرے بہت ہی قریب رہنے والے لوگ میری بیماری پر پریشان ہوئے تھے اور نہ ہی انہیں میرے نہ مرنے کی خوشی تھی۔ انہوں نے تو "فنون" کا دفتر کھوجنا تھا یا پھر مرحوم کا منہ دیکھنا تھا...

میک اپ والے ...... نہ جانے تیرا کیا نام تھا۔ میں ابھی بھی تیرے لئے اشکوں کے دیے روشن کرتا ہوں اور اسی کوشش میں ہوں کہ میں کسی کے سامنے بھی اپنا دکھڑا نہ روؤں۔

◆◆◆

"اظہر جاوید کی ہر کہانی ان کی اپنی زندگی کی ایک بیت ہے۔ معاصر ان تجربوں کی یہ کہانیاں اظہر جاوید کی داستان حیات کے اوراق ہیں۔"
(ڈاکٹر انور سدید)

یاد نگاری

یادیں گلاب ہوتی ہیں

غلام نبی اعوان

زندگی کی تگ و تاز میں جب تک انسان سرگرداں رہتا ہے تو اسے ارد گرد کے مناظر اور آگے پیچھے کی ہوش نہیں ہوتی۔ زندگی کرنے کے لئے وہ ایک جہدِ مسلسل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ پھر اک وقت آتا ہے جب کوئی دوسرا کھلاڑی اس کے ہاتھ سے مشعل لے کر اگلی منزل کو دوڑ لگا دیتا ہے۔ تبدیلی کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ منظر بدلنے لگتے ہیں۔ اس کی دوڑ اختتام کو پہنچتی ہے۔ اس کے قویٰ مضمحل ہونے لگتے ہیں۔ آنکھوں کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے۔ جس میں درد رہنے لگتا ہے۔ "گوڈے گٹے" جواب دے جاتے ہیں اور مختلف عوارض اس پر چوطرفہ حملہ کر دیتے ہیں اس کی حیثیت گھر کے سٹور میں رکھی کسی فالتو شے کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ اکھاڑے سے باہر بیٹھا ایک ایسا پہلوان رہ جاتا ہے جس کی بات کوئی نہیں سنتا۔ یہی وہ مقام ہے جب وہ ایک لمبے سانس لینے کیلئے پیچھے مڑ کر اپنے ماضی پر نظر ڈالتا ہے تو اک دبستان اس کے سامنے کھل جاتا ہے۔ یادوں کی کہکشاں تا حدِ نظر پھیلی ہوئی جھلملا رہی ہوتی ہے۔ اس منظر پر کبھی وہ روتا ہے تو کبھی مسکرا دیتا ہے۔ اس کی مثال اس شناور جیسی ہوتی ہے جو چھلیں مارتے دریا کو عبور کر کے کنارے سے اک نظر تلاطم خیز موجوں پر ڈالتا ہے تو مبہوت رہ جاتا ہے کہ اتنے تلاطم طوفان سے بچ کر وہ صحیح و عافیت کنارے پر کیسے پہنچ گیا؟ کیسے کیسے مرحلے آئے جن سے وہ بخوبی گزرتا یا کارزارِ ہستی کے جھمیلوں سے نکل آنے کے بعد کچھ عرصہ تو وہ نئے تغیر و تبدل سے گھبرا سا اور حیران سا پھرا کرتا ہے۔ اک ایسی دنیا اس کے انتظار میں ہوتی ہے کہ جہاں اس کی حیثیت زیادہ سے زیادہ اس مقدس کتاب جیسی ہوگی جسے طاق پر رکھ دیا جاتا ہے۔ وہ فارغ البال اوقات کیا ہوتا ہے کہ عام طور پر فارغ التوقیر بھی ہو جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ پسپائی اختیار کرتے ہوئے وہ خاندان میں رابطے کی ڈوری بھی ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی فطرت اور مزاج کے خلاف عمل کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ وہ جو گھنٹوں بیٹھ کر اس کے چند نصائح اور واقعات مبہوت ہو کر سنتے تھے اب زندگی کی بھاگ دوڑ میں اتنے مصروف ہو جاتے ہیں کہ دو گھڑی بات چیت کا وقت ہی نہیں ملتا۔ غنیمت ہوا اگر کسی نے طبیعت کا حال پوچھ لیا۔ اس تبدیلی کو وہ دل ہی دل میں فطری عمل قرار دے کر مطمئن ہو جاتا ہے اور بتدریج داخلیت (Interoversion) میں پناہ لینے لگتا ہے۔ ستم بالائے ستم اگر اس دوپہری وقت میں زندگی بھر کا ہم سفر بھی آہستہ سے ہاتھ چھڑا کر ملکِ عدم چلا جائے تو تنہائی کا احساس دوچند ہو جاتا ہے۔ اس نازک مقام پر اس کا ماضی اس کا دستگیر بنتا ہے۔ اور اس کی انگلی پکڑ کر سیر پر لے چلتا ہے۔ اک نیا پردہ تخلیق ہوتا ہے جس پر ماضی کی تصویریں ہر وقت چلتی رہتی ہیں۔ یہ ساری فلمیں اسے اچھی لگتی ہیں۔ اس کی تنہائی کا تریاق ہونے لگتا ہے۔ کبھی تو قوسِ قزح کے اور کبھی بلیک اینڈ وائٹ تصویریں بڑی بھلی لگتی ہیں۔ اک جہان اس کے ارد گرد آباد ہو جاتا ہے۔ بیتے زمانے اسے رلاتے ہیں تو کبھی ہنساتے ہیں۔ وہ واقعات ماضی سے یوں کھیلتا ہے جیسے اکیلے کمرے میں کوئی تنہا بچہ بہت سے کھلونوں سے دل بہلاتا ہے۔ وہ بار بار آنکھ بند کر کے اپنے اندر چلا جاتا ہے اور کتابِ زیست کے اوراق کھول لیتا ہے۔

ارسٹھ سال پلک جھپکتے گزر گئے اور وقتِ زوال کی شفق نمودار ہوئی۔ فلم چلتی ہے تو وہ چھپر والا سکول منظر پر ابھرتا ہے جہاں دھول

بھرے ٹاٹ پر بیٹھ کر میں نے پڑھا تھا "قلم گوید کہ من شاہ جہانم"۔ کریما، پند نامہ، صرف بہائی، دیوان الصرف، گلستان، بوستان، پنج گنج اور مشکوۃ شریف کا علمی خزینہ انہی ٹاٹوں پر بیٹھ کر میرے حافظے کے نہاں خانوں میں اترا تھا۔ جمعرات کو چھٹی کے وقت ان ٹاٹوں کی مٹی جھاڑنے کے عمل سے گزرنے کے بعد ہم اس قدر خاک و دھول میں لتھڑ جاتے کہ کپڑے تو کپڑے دو دو دن تک ناک سے مٹی نکلتی رہتی۔ انقلاب آ رہا تھا۔ تقسیم کے اثرات ہجرت مہاجرت اور بے روزگاری کی صورت میں نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جہلم، بیکانیر اور مشرقی پنجاب سے لٹے پٹے قافلے مسلسل آ رہے تھے۔ میری چھوٹی سی بستی کے ارد گرد نئی دنیا آباد ہونا شروع ہوئی۔ پہلے سرکنڈوں کی اور چھپریوں کی باڑیں بنیں جن میں پھولداریوں کے کمرے کھڑے کئے گئے۔ جھونپڑے دیکھتے ہی دیکھتے در و دیوار میں تبدیل ہونے لگے۔ جس گھر میں بھی کم کم کی سواری اتری تھی اور پناہ گیروں میں دو وقت کا کھانا تقسیم ہوتا تھا وہاں بھوک نے ڈیرے ڈال دیئے اور قطاریں بنا کر کھانا لینے والوں نے اس نئی بستی گھر میں کھانا بھیجنا شروع کر دیا۔ ایک زمانہ تھا جب اوسط درجے زمیوں پر زمینوں سے اناج اندر آتا تھا۔ گھر کے ساتھ والے احاطے میں بھینسیں، گائیں اور بکریاں بندھی ہوتی تھیں۔ گڑ اور شکر کی بوریوں کی دھائیاں لگتی تھیں۔ وقت نے کروٹ لی۔ مہاجر بھائی ہاتھوں میں کلیم کے کاغذات اور ہمراہ پولیس لئے پہنچنے لگے اور زمینوں پر قبضے کرتے گئے۔ یہ زمینیں مقامی لوگوں کے بزرگوں کی ملکیت تھیں اور نسل در نسل ان کے قبضے اور استعمال میں تھیں۔ ریاستی نظام تھا اس لئے ان زمینوں کے کاغذات تو نہیں تھے۔ محکمہ مالیات کی مہربانی سے زمینوں اور دیگر جائیدادوں پر قبضے ہو گئے تو جھگڑوں، شریف خاندان زندگی گزارنے کیلئے سڑکوں پر آ گئے۔ انہی میں سے ایک میرا گھرانہ تھا۔ یوں ٹینٹ کی خیرات پر چلنے والا پچھر سکول میرا مقدر بنا۔ پچھر والا یہ سکول پورے علاقے کیلئے نعمت سے کم نہ تھا۔ دس دس میل دور سے بچے یہاں پڑھنے آتے تھے۔ جو صاحب حیثیت تھے وہ گھوڑیوں پر آتے۔ ذرا تصور کیجئے کہ سکول کے ساتھ بنجر زمین پر گھوڑیوں کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔ سوار سکول میں پڑھ رہے ہیں اور سبق سے زیادہ توجہ ان کی اپنی اپنی گھوڑیوں پر ہے کہ کہیں کوئی چور کھول کے نہ لے جائے۔ لیکن آج جب پچھر سکول کا گزرا وقت یاد آتا ہے تو میرا ضعیف سر تعظیم سے جھک جاتا ہے۔ علم و ادب کے جو قرینے مجھے دھول میں اٹے ہوئے ٹاٹوں نے عطا کئے، وہ زندگی بھر پھر کسی انگریزی کتب یا یونیورسٹی میں نصیب نہ ہوئے۔ خیراتی سکول کے بوسیدہ پوش، تنگ دست اور برائے نام مشاہرہ پانے والے اساتذہ نے محنت کی جو عادت ڈالی، وہ عمر بھر میرے ساتھ رہی اور میرے راستے ہموار کرتی چلی گئی۔ آج جب اپنی شخصیت (جیسی بھی ہے، اچھی یا بری) پر نظر ڈالتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس قامت کو چند ہاتھوں نے اونچا اٹھا رکھا ہے اور یہ ہاتھ اسی پچھر والے سکول کے عظیم اساتذہ کے ہیں۔ مجھے اپنے ہائی سکول، کالج اور یونیورسٹی کے اساتذہ و مشاہیر بھی بمشکل تذکرہ یاد آتے ہوں، مگر مدرسہ ترقی اعلیٰ اور [illegible] مڈل سکول کے پاکباز ایم تو ابھی معلم ہمیشہ میرے تصورات کے اونچے سنگھاسن پر بیٹھے مجھ سے ہمکلام رہتے ہیں۔ وہ سب بھلے لوگ رزق خاک ہوئے۔ اللہ ان کے اخروی درجات بلند فرمائے۔ ایک عرصہ ہوا کہ میں اپنے گاؤں نہیں گیا۔ کوئی رہا نہیں کہ جن کی کشش کھینچ کر لے جاتی اور عمر گریزپا بھی طویل سفر کی اجازت نہیں دیتی۔ وہ عمارت جو میرا سکول تھا آج بھی [illegible] کے ساتھ موجود ہے۔ مگر یہ کسی کے کلیم (Claim) میں آ گیا ہے اور آج کل وہاں ڈاکٹر کا کلینک ہے۔ ماضی میں جب بھی گاؤں گیا تو اس عظیم عمارت کو اور اس کے برآمدے کے "ستونوں" کو اپنے سجدوں اور آنسوؤں کے نذرانے پیش کر کے آیا۔ عمارت کی بوسیدہ اینٹوں کو بوسے دیئے۔ ان دیواروں سے مجھے ماں کی خوشبو آتی تھی۔ ہر شے فانی ہے۔ رب نام اللہ کا

کیسے کیسے اذیت ناک منظر آج بھی بہانے بلکہ تعجب یاد لگتے ہیں۔ میرا حساب شروع سے کمزور تھا۔ حساب کے پیریڈ سے

میری جان جاتی تھی۔ انتہائی محنت اور توجہ کے باوجود میرا ذہن حساب میں نہیں چلتا تھا۔ شاید یہ بات ناقابلِ یقین سمجھی جائے کہ عمر بھر کا سرکاری نوکر ہونے کے باوجود مجھے زبانی اپنی تنخواہ کا علم نہیں ہوتا تھا اور یہی حال خرچ کا تھا۔ ریٹائرمنٹ سے ایک ہفتہ پہلے بینک سے اپنی بچت کا استفسار کیا تو مبلغ گیارہ سو روپے میرا بینک بیلنس نکلا۔ اتنی رقم بچا لینے پر مجھے پورا دن فخر سا محسوس ہوتا رہا۔ بات ہو رہی تھی میرے کمزور حساب کی۔ اس پر مستزاد کہ "کھلی تڑین" (بے تحاشا مارنے والا) ماسٹر صاحب کو حساب کا استاد لگایا جاتا۔ حساب کے پریڈ سے بچنے کے لئے میں کئی دفعہ اپنی دادی کو مار کر بھی لے چکا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جنوری کے ٹھنڈے ٹھار دن تھے۔ میں گھر سے ہوم ورک کر کے نہیں گیا تھا۔ ماسٹر دین محمد صاحب کے تھیلے میں کھجور کی تازہ سوٹیاں دیکھ کر میری روح نکل گئی اور میں نے ایک دفعہ پھر دادی کو مارنے کا منصوبہ بنا لیا۔ رونی صورت بنا کر انچارج استاد کو فوتگی کا سانحہ جا سنایا۔ ایک منٹ نہیں لگا۔ میں بستہ اٹھا کر تیز تیز قدموں سے نکلا کہ جلد از جلد سکول کی حدود عبور کر جاؤں۔ اس طرح بدحواس دیکھ کر ایک اور استاد نے وجہ پوچھی تو انہیں بھی روہانسا ہو کر دادی کے وصال کی خبر سنائی اور دوڑتا ہوا سکول سے نکل گیا۔ سردیوں کی دوپہریں پنجاب میں بڑی خوشگوار ہوتی تھیں۔ روپہلی دھوپ جسموں کو ٹکوریں دیتی تھی۔ گلی ڈنڈا اٹھائے (کچے) ٹیلو ور پلیٹ فارم کے بڑے سیشن لگتے تھے میں کھیل کے خوشگوار منصوبے بناتا گھر پہنچا۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کی خالہ کی فوتگی کی وجہ سے سکول بند ہونے کی خبر دی۔ گلی ڈنڈا اٹھایا۔ گیجے جیب میں ڈالے اور فرحاں وشاداں "بالٹے" (گاؤں کے قریب کھلا میدان) میں چلا گیا۔ گلی کو ایک زوردار ٹُلا لگا کر میں ہوا میں اڑتی ہوئی گلی کی Flight (اڑان) سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک دو سخت گیر ہاتھوں نے مجھے اس طرح دبوچ لیا جیسے خفیہ والے مشکوک شخص کو دبوچ لیتے ہیں۔ مجھے دھر دبوچ کر لیا گیا اور گلے کی منزل سکول ٹھہری۔ جیسا کہ بعد از سزا مجھے سلسلہ واقعات کا پتہ چلا کہ جن استاد محترم نے میری گھبراہٹ کی وجہ پوچھی وہ دادا سے چچا کے دوست نکلے۔ سکول سے چھٹی ہوتے ماسٹر اللہ دتہ صاحب اپنی خستہ حال سائیکل پر گھر پہنچے ہوئے اتفاق سے چچا کے ساتھ ان کی براہ راست ملاقات ہوگئی۔ حقیقت حال معلوم ہونے پر دونوں بزرگ بصورت قیامت مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ ماسٹر صاحب کی ٹوٹی پھوٹی سائیکل پر مجھے یوں باندھا گیا جیسے قصاب منڈی سے خریدنے کے بعد بکرے کو اپنے سائیکل پر لادتا ہے۔ سکول کے چھپر کے نیچے مجھے کان پکڑا دیئے گئے۔ "انتقیش" میں مکمل آزادی دینے کے لئے چچا محترم یہ کہہ کر اپنے کسی کام پر نکل دیئے "ہڈیاں ہماری، چمڑی تمہاری"۔ میری پیٹھ پر دو سوٹیاں رکھ دی گئیں اور نیچے زمین پر الجبرے کی کتاب۔ فارمولے یاد کرنے کا حکم ہوا۔ اوپر پڑی سوٹیاں پیٹھ کو نیچے نہیں کرنے دیتی تھیں۔ میری ٹانگیں جواب دیئے جاتی تھیں۔ ذرا نیچے ہونے کی کوشش کرتا تو دور سے آواز آتی "پیٹھ اوپر"۔ یہ تعزیری عمل دوپہر ڈھلے شروع ہوا اور اب شام کا جھٹ پٹا ہوا چاہتا تھا۔ ظلمتی اندھیرا چھانے لگا تو مجھے الجبرا کے چودہ فارمولے یاد ہو چکے تھے۔ کتاب کے اوراق میرے پسینے اور آنسوؤں سے تر ہو چکے تھے۔ یوں میری جان اس وعدے پر چھوٹی کہ آئندہ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ بظاہر یہ ایک استادی "وحشت" اور "بربریت" کا واقعہ لگتا ہے۔ اگر آج کہیں یہ واقعہ پیش آ جائے تو استاد کو زندہ زمین میں گاڑ دیا جائے گا۔ مگر یہ واقعہ آج سے ساٹھ باسٹھ پہلے وقوع پذیر ہوا اور آج تک زندگی کے کسی ایسے نازک موڑ پر بھی میں نے جھوٹ نہیں بولا جس میں میرا کردار ملوث ہو۔ میں سچ کے ساتھ ڈٹ کر کھڑا رہا اور ذاتی طور پر بہت سے نقصان اٹھائے۔ ایک قابل صد احترام استاد نے اپنا قیمتی وقت دے کر میری کردار سازی کی اپنی سی کوشش کی۔ میری پیٹھ پر دھری دو سوٹیاں مجھے ہمیشہ حق سچ کا راستہ دکھاتی رہیں۔ ماسٹر اللہ دتہ صاحب! اللہ آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ یادیں گلاب سی ہوتی ہیں۔ مہکتی ہوئی، جاں فزا اور دلربا سی۔ یہ یادیں اگر تلخ بھی ہوں تو بوڑھے آدمی سے ہمکلام ہو کر اس کا Cathorsis کر جاتی ہیں۔

◆◆◆

پنجاب رنگ

سلیم شہزاد

انور سدید

ہوراں لئی اک نظم

یار سدیدا!
ساڈیوں پچھے چھڈ کے
آپ اگیرے ہوئیوں!
اُتھوں ویکھی سوداں
یار سدیدا!
تیرے لفظوں اندر
خلقت آ کے روئی
دھرتی ٹھنڈی ہوئی
یار سدیدا!
توں دکھڑے لکھ کے
الجھ کتھے پا کے
سوداں اندر جا کے
یار سدیدا!
تینوں بہتیں پھڑ کے
دھرتی اهر پایا
احمد سے دایاد!

OOO

حنیف باوا

ادب دا پاندھی

(ڈاکٹر انور سدید لئی نظم)

میں ویکھنا واں
کے دیاں
لفظ دیاں
اتے گھمّاں رتاں دے وچ
اک پرچھا
اک جہان کوئی
اک سچا ساکار
تے جتھوں دیاں انگلاں دے وچ
قلم نوں پھڑ کے
اوسے
بند کمرے دے وچ
دکھاں دی پھلکاری اوڑھے
اک زوال پرست کال دے واگوں
بکّے فرش تے چپ وار کے
چپ دی نکل دے وچ لکیا
انج بیٹھا اے
تے ایہہ
ایہو کوئی
اپنے اندر ٹھدے
سچے موتیاں ورگے
دانے حرفاں دے
بے قابو ہڑ وانگوں
اک ترنجے
اک سلیقے دے نال
بڑے تے گھکھوں ہوئے
پیڑاں دی تکھ دے آتے
ماں دی اکھوں
میں ویکھیا
اقراراں دے تکیاں وانگ
چمکدارے
بوٹاں دے بیج
گھڑوں دوڑے پئے
ادب دے سردا تاج
تن جاندے نے
چراغ جیہا
او جہان کوئی
اتے سچا ساکار
حشاں دے بہڑا کے
اس جہان توں او بے ہویا
جاں
میں ویکھناں واں
اج او گھر
اک اجاڑ
اتے کسی دستی دھرتی اُتے
قلم کلّی دے واگ
جہاں جہاں کردے اکلا بیٹھ دے وچ
کھلے مرگی
او ربھیاں دانگنوں ایدھر اودھر ویکھے
اتے ادب دے بتھوو قلم
اوکھاں دی سولی تے لٹکیا
اک علمی پیار دی وچوں
اگی پیار بچے
تے ایہہ
او اچا تے سچا ساکار
اکھڑے اک پلاں دے وچ
اٹھ کے
اوس قلمانے قلم نوں
مڑ کے
ہواواں بھریاں کردیوے گا
تے
اوکھیاں ویلیاں ایہہ لیاں والاں
بھلاں کدکیاں نیں

OOO

مظفر حسن منصور

ڈاکٹر انور سدید کی یاد میں

مژدہ ادب کا ہوا سعید
نام ہے جس کا انور سدید
روشن خیالی و جوہر شناس
دانا و یکتا فرد وحید
دقیق تجسس کمال زیرک
جوش طبیعت لائق دید
اس نے نکھارا نور قلم
اس نے سجائی جوہر امید
کشتِ سخن کو اس نے دیا
حسن روایت، رنگِ جدید
اس نے بھرا پیالۂ قلم
اس نے چلائی دل کی کلید
چاند اور ادیب جنوں
درد رسیدہ کشتہ دید
وقت کھلیں گے وقت کے ساتھ
شوق نے باندھی ہے تمہید
رخصت بزم جہاں سے ہوا
پیکر انور دل کا شہید
حق سے دعا ہے ہو یہ نوید
اس کو ملے جنت کی نوید

○○○

یونس محمد صابر

آہ! ڈاکٹر انور سدید جی!

لاہور زندہ دل ہے نظامی مجید بھی
ہم عصر اس صحافی کے تھے شہر شہر میں

شامل انہی میں ڈاکٹر انور سدید بھی
سرخی "نوائے وقت" کی بنتی رہی کئی

ہائے جو فن چراغ تھا اردو کا جل بجھا
لرزاں ہوا ہے شدت غم سے ادب تمام

انور تھا ایک شاعر و نقاد بے بدل
وہ تھا قلم قبیلے کا اسلوبِ پہلا

نظم و نثر میں اس کی محبت تھی بے ریا
وہ سب گیا کہ سارا دبستان رو دیا

ملتان نے تھا یہ مخفی وہ آخری مقام
جو لکھا اس میں جذب تھی حق حرف کی مٹھاس

○○○

جمیل حیات

التجا

نہ دن کو چین ملتی ہیں
نہ راتوں کو بے سوتی ہیں
پلٹ آؤ خدارا اب تم
کہ آنکھیں تو دن رات روتی ہیں
سنو! جن کو محبت ہو
حرم دل میں رہتے ہیں
نہ جانے کیوں بکھر کر آنسو
سدا آنکھوں سے بہتے ہیں
تمہیں اب یہ ہو لیکن
ستم دل تو ہوتے ہیں
وہ بچھڑے سے وفا کی خاطر
بہت ہنس کے روتے ہیں
اگر تم کو محبت ہے
تمہیں میں پھر قسم دے کر
یہ جاناں عرض کرتا ہوں
پلٹ آؤ کہ اب تک میں
تمہیں بس یاد کرتا ہوں
دل جاناں کو یاد کرتا ہوں

○○○

انجمنِ خیال (خطوط)

#1 ڈیئر سونان اظہر جاوید!

ماہنامہ تخلیق کا تازہ خاص نمبر کچھ عرصہ قبل موصول ہوا تھا، تب سے اس شمارے کے مطالعہ میں مصروف رہا۔ سرورق سے لے کر انجمن خیال کے مندرجات کا طائرانہ مشاہدہ و مطالعہ متاثر کن تھا۔ مجھے یہ کہنے میں باک محسوس نہیں ہو رہی ہے کہ ''تخلیق'' اپنے خوب سے خوب تر کے سفر پر گامزن ہے اور معیار و مقدار ہر دو اعتبار سے آپ کی زیر ادارت یہ جریدہ قابل تحسین و توصیف کا استحقاق رکھتا ہے۔ سرورق کے جمالیاتی پہلو کو نظر انداز کرنا اور اس کا ذکر خیر نہ کرنا کوتاہ چشمی اور بدذوقی کا میرے نزدیک مرتکب ہونا ٹھہرے گا۔ مرحوم دوست اظہر جاوید کی چوتھی برسی کی تصاویر اور پورا تاثر اس شمارے کی خصوصیت ٹھہرے گی اور گوشہ اظہر جاوید میں شامل تحریریں شمارے کی معنویت اور معیار کے باب میں انتہائی وقیع کہلانے کا حق رکھتی ہیں۔ گوشہ اظہر جاوید میں ڈاکٹر انور سدید کا مضمون اور تصاویر کے شعبہ میں ان کی متعدد تصویریں ان کی رحلت کی خبر کے پس منظر میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ٹھہرتی ہیں۔ میں نے ان کی تصاویر کو بار بار دیکھا اور یہ سوچ کر وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہے صدمات سے دوچار رہا۔ ان کی وفات سے اردو دنیائے ادب و فکر و دانش ایک عظیم شخصیت سے محروم ہو گئی۔ یہ خلا دیر تک محسوس ہوتا رہے گا۔ خصوصیت کے ساتھ تخلیق سے ان کی وابستگی اور ہر شمارے میں ان کی تحریروں کا تنوع اور جامعیت ناقابل فراموش اور گراں قدر صفات کی حامل ہوتی تھی۔ زیر نظر شمارے میں بھی ان کے چار مضامین اور تبصرے نہایت وقیع اور گراں قدر ہیں۔

ڈاکٹر انور سدید غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بڑی بصیرت و بصارت کی حامل شخصیت کا نام ہے۔ اپنی صحت کے حوالے سے ایک عرصہ دراز سے مسائل سے دوچار تھے مگر اس عرصے میں قرطاس قلم سے ان کا رشتہ قائم رہا بلکہ مجھے تو قوسِ قزح دکھائی دیا۔ ان کی زود نویسی اور کثیر نویسی قابل رشک تھی اور معیار اور معنویت سے مالا مال تھی۔ تخلیق کے لئے ان کی رحلت ایک ناقابل تلافی نقصان کا درجہ رکھتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تخلیق کے اگلے شمارے میں ڈاکٹر انور سدید کے حوالے سے تحریریں شامل ہوں گی بلکہ ایک پورا گوشہ شامل ہوگا۔ ڈاکٹر انور سدید کی جدائی کی خبر نے مجھے بہت متاثر کیا اور زیر نظر تخلیق کے خاص نمبر کی دوسری تحریروں کے حوالے سے کچھ اظہار خیال کرنے کا حوصلہ نہیں رہا۔ مگر یہ کہنے کی بات ضرور ہے کہ یہ شمارہ اور اس کا ہر گوشہ اور شعبہ نہایت وقیع اور گراں قدر نگارشات کا حامل ہے۔ انجمن خیال میں شامل مکتوبات اپنی جداگانہ حیثیت اور انفرادیت رکھتے ہیں۔ انجمن خیال کے چار شرکا نے میرے مضمون علامہ اقبال اور مسلم نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے اظہار خیال کیا ہے میں ان احباب کے لئے جذبہ شکر کا اظہار کرنا اخلاقی فریضہ سمجھتا ہوں۔ ایک مضمون اور شعری تخلیقات شامل مکتوب ہیں۔ تخلیق سے قلبی وابستگی پر مجھے فخر ہے۔

مسلم شمیم (کراچی)

خط 2 عزیز از جان سوہان اظہر جاوید صاحب "تخلیق شعار"

السلام علیکم۔ والا نامہ کمال محبت سے رقم ہوا ہے۔ میں آپ کی اس محبت کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں میں تخلیق کا بہت پرانا پڑھنے والا اور لکھنے والا ہوں۔ اظہر جاوید نے خلوص دل سے مجھے "تخلیق" میں اٹھایا بٹھایا۔ قریب قریب ہر شمارے میں میری موجودگی لازم ہوا کرتی۔ وہ اگر کسی بات پر ناراض بھی ہوتے تو خطوں کے حصے میں میری عزت پر کبھی حرف نہ آنے دیا۔ اعتراض کرنے والوں تک کے خیالات کو حذف نہیں کیا۔ ناراض جلد بھول گئے۔ افسوس یہ ہے کہ تخلیق کے کسی حالیہ شمارے میں ملک کے ایک نامور صاحب قلم نے شعری معترض ہوتے میری ذات کی بھی سخت لہجے میں تضحیک کردی۔ تخلیق کے حوالے سے میرے لیے یہ "انداز نظر" بہت تکلیف دہ ہے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ اسی ضمن میں میرے جواب کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ آپ نے تخلیق کے معیار کو استوار رکھا ہے اس سے اظہر جاوید کی روح یقیناً خوش ہوگی۔ حالات کی نامساعدت سے میں "تسلسل" قائم نہیں رکھ سکا۔ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ تخلیق بھیج دیتے ہیں۔ محض دل آزاری کے لیے ادبی تنقید کے نام پر حرف زنی سے میں بہت گھبراتا ہوں۔ میرے خیال میں مدیر کی ذمہ داری ہے کہ وہ دل کو چھیلنے والی تنقید (یا ریمارکس) نہ شائع کرے۔ اگر کرے بھی تو جواب بھی شامل کر کے شائع کرے۔ میں تخلیق اور آپ کے لیے دعا کرتا ہوں خدا آپ کو ثابت قدم رکھے۔ آپ اظہر جاوید کے بیٹے ہیں۔ ان کی قائم کردہ صحافیانہ روایات کی پاسداری آپ پر فرض ہے۔ گھر میں سب کے لیے دعا سلام۔

آصف ثاقب (بوئی)

خط 3 محترم بھائی سوہان اظہر جاوید

سلام مسنون۔ امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ مارچ کا شمارہ موصول ہوئے کافی دن ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر انور سدید کی وفات کی صورت میں ایک اپنا سانحہ درپیش آیا کہ بس ذہن و دل کا حال مت پوچھیے۔ ان کی مجھ پر بڑی شفقتیں تھیں۔ ایک مرتبہ انہوں نے مجھ پر کالم بھی لکھا تھا۔ میرے ہائیکوز کے پہلے مجموعے کا دیباچہ بھی انہوں نے لکھا۔ اب کیا کیا یاد کروں؟ مارچ کے شمارے میں ان کے مضمون "کچھ وقت ماہنامہ تخلیق کے ساتھ" میں انہوں نے جس محبت سے میرا ذکر کیا ہے وہ میرے لئے ایک حقیقی اعزاز سے کم نہیں۔ انشاءاللہ اپنی ان سے ملاقاتوں اور یادداشتوں کے حوالے سے بہت جلد ایک مضمون لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجوں گا کہ میرے خیال میں ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں جو بھی لکھا جائے اس پر سب سے پہلا حق آپ کا ہے۔ اور اظہر جاوید اور ڈاکٹر انور سدید کا تعلق تو یکجان تھا کہ اب جب ڈاکٹر انور سدید کی وفات کی خبر ملی تو ایک مرتبہ پھر اظہر جاوید کا غم بھی تازہ ہو گیا۔ اظہر جاوید، ڈاکٹر انور سدید اور "تخلیق" کی تثلیث اظہر جاوید کی وفات کے بعد بھی آپ نے بخوبی قائم رکھی اور یقیناً اب آپ پر دونوں کے حوالے سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ انہیں تخلیق کے اوراق پر ایسے ہی زندہ و رکھا جائے جیسے کہ وہ ہمارے دلوں میں ہیں۔ تخلیق ایوارڈ 2015ء کی خوبصورت تصاویر اور کوریج دیکھ کر اپنی وہاں سے غیر حاضری پر ملال ہوا۔ اظہر جاوید پر اس شمارے میں جتنے مضامین بھی ہیں محبت اور عقیدت سے لبریز ہیں اور ایک بڑے انسان، ادیب اور شاعر کے شایانِ شان ہیں۔ جناب غلام نبی اعوان کے یادنامے میں تخلیق کے زرِ سالانہ کے بارے میں ان کی بے نیازی کا ذکر پڑھ کر یاد آیا کہ میں ایک مدت تک سعودی عرب میں تھا اور وہ ہر شمارہ بالالتزام مجھے بھجواتے تھے، اور اگر میں دو سال تک بھی زر

سالانہ نہ بھیجتا تو انہوں نے رسالہ بھیجنے کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں کیا اور نہ ہی کوئی تقاضا کیا۔ ایسی درویش صفتی کم کم ہی مدیران میں دیکھنے میں آتی ہے۔ بلکہ ایک ادبی جریدے کے مدیر تو ایسے تھے کہ جن کا خط ہر چار پانچ ماہ کے بعد مجھے آتا تھا کہ آپ کا زرِ خریداری ختم ہو گیا ہے۔ جن احباب نے دسمبر 2015ء کے شمارے میں جناب م س ایمن کی کتاب پر میرا مضمون پسند کیا اور مارچ کے شمارے میں اس کا ذکر کیا ان کا بطورِ خاص شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ جناب منظور حسین یاد کا خط پڑھ کر محسوس ہوا کہ وہ آپ سے کچھ زیادہ ہی ناراض ہو کر اس پرچے میں اپنی برہمی کا اظہار کر رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی ان کی محبت کا ایک انداز ہے۔ ظاہر ہے اس انداز میں گلہ وہی کر سکتا ہے جسے اپنے مضبوط رابطوں پر مان ہو۔ جناب منظور حسین یاد سے میری بہت ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں اور وہ حقیقتاً بڑے معصوم اور پیارے آدمی ہیں۔ اگر ان کی برہمی کی واقعی کوئی حقیقت ہے تو آپ اس کا ازالہ کیجئے۔

نسیم سحر (راولپنڈی)

﴿4﴾ محترم سوہان اظہر جاوید

''تخلیق'' کا مارچ 16 کا شمارہ موصول ہوا۔ مندرجات میں ''پہلی بات'' اس لیے متوجہ کرتی ہے کہ اس میں دو باتوں کا بڑی دردمندی سے ذکر کیا گیا ہے۔ ایک، مرحوم ادیبوں کو یاد نہ کرنے، ان پر مضامین نہ لکھنے کا مشورہ دینے کی گھٹیا سوچ پر دکھ ہوا، مرحومین ہمارے وہ اساطیر ہیں جن کی تخلیقات سے عصرِ حاضر کے ادیب اور آنے والی نسلیں بھی استفادہ کریں گی۔ دوسری بات ادبی میلوں کے حوالے سے ہے۔ یقیناً آپ نے درست کہا، یہ میلے تفریحِ طبع کے لیے سجتے ہیں اور ان میں کرپشن بھی نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔

حمد و نعت میں شعرائے کرام کی محبت اور عقیدت قابلِ تحسین ہے۔ اظہر جاوید کی چوتھی برسی (چار سال بیت گئے) کے حوالے سے رپورتاژ میں مرحوم کی شخصیت پر گفتگو انتہائی دلچسپ ہے اور یہ سب مرحوم کے فرزند سوہان اظہر جاوید کی اپنے والد سے محبت اور ورثے میں ملنے والی اردو ادب سے عقیدت کا مظہر ہے۔ افسانوں میں ''بیج نے'' محسن احمد نے لکھا۔ جس وطن میں وہ قیام پذیر ہیں وہاں شرپسند عناصر کے باعث فسادات ہوتے رہتے ہیں اور حکومت امن کی خاطر کرفیو بھی نافذ کرتی رہتی ہے۔ چونکہ ہر انسان کی نفسیات الگ ہے اس لیے افسانہ نگار نے شرپسندوں سے ہی ایک ایسا کردار منتخب کیا جس کے دل میں ہمدردی کے جذبات ابھی باقی تھے۔ دراصل ایسے کردار فطرتاً مجرم نہیں ہوتے بلکہ کچھ ہاتھ ایسے ہوتے ہیں جو انھیں سبز باغ دکھا کر اپنے گروہ میں شامل کر لیتے ہیں۔ معاشرہ ایسے لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے فعال کردار ادا کر سکتا ہے۔ افسانہ توجہ سے مطالعہ مانگتا ہے۔ ''میری کہانی کا کردار'' دیپک بدکی لائے ہیں۔ آپ افسانے کی دنیا میں معروف ہیں لیکن زیرِ نظر افسانے میں وحدتِ تاثر کم ہے۔ کہانی افسانہ نگار کی ذات کو محیط کرتی ہے یوں انداز واحد متکلم اپنایا گیا۔ افسانے میں کوئی ایسا کردار ہے جو تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ایک تشنگی کا شکار ہے۔ یہ تشنگی دور کرنے کے لیے سرورق کا بہانہ تراشا گیا، اس طرح افسانہ اپنے انجام کو پہنچا۔ (از کہانیاں نہیں کیا جاتا ہے) علی اکبر ناطق نے ''مسلیں'' لکھ کر ایک پاگل کا قصہ بھیجا۔ اس پاگل کردار کی ایک قبر کی بے حرمتی کے عقب میں جذبۂ انتقام کارفرما ہے۔ اس قبر میں مدفون سے کچھ ایسا سرزد ہوا (ہم سب جانتے ہیں) جس سے آنے والی نسلوں میں بھی ایسے کردار جنم لیتے رہیں گے۔ ''فورکا تو کہاں ہے'' وحشی سعید نے لکھنے کی کوشش کی لیکن انصاف نہیں کر سکے، یہ تحریر

علامت اور بیان کا مرکب ہے۔ حضرت موسیٰ کے عصا کا اژدہا بن جانے کا واقعہ فرعون دور کے معروف جادوگر سامری کے ساتھ مقابلے میں پیش آیا تھا کہ فرعون کے ساتھ مکالمہ کے دوران۔ اس تحریر کو افسانہ کہنا محال ہے۔

''ایک لمحہ میں مقید زندگی'' شیخ خالد کے قلم کی جولانی کا مظہر ہے۔ رعنائیوں سے بھرپور زندگی میں اچانک کسی قسم کے دخول سے انسان بکھر کر رہ جاتا ہے۔ کروڑوں کی خرید و فروخت کا روبار بن چکا ہے لیکن یہ تعین نہیں ہو سکا کہ کون ضرورت مند ہے اور کسی حاجت رکھتا ہے؟ دولت حاصل کرنے کا یہ ذریعہ ایک انسان کو مکمل تو کرتا ہے لیکن ایک انسان ہی انسانیت کو ادھا کر دیتا ہے۔ افسانہ قابل مطالعہ ہے۔

انتہائی سادہ الفاظ میں لکھی گئی کہانی کا عنوان ''احساس'' ہے جس کے لکھاری نجیل حیات ہیں۔ کہانی میں دو مختلف کرداروں کو مصروف کار رکھا گیا۔ ایک وہ جس نے خود کو کسی بچے کی حفاظت پر مامور کر لیا دوسرا بچے کا والد ہے جس نے غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کیا اور اپنے رویے سے اپنے محسن کی دل آزاری کا باعث بھی بنا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے کرداروں کی کمی نہیں۔

نثار احمد صدیقی کا ڈاکٹر مرزا حامد بیگ سے انٹرویو میں نے پوری توجہ سے پڑھا اور من ہی من میں تالیاں بھی بجاتا رہا کہ اردو افسانے پر گفتگو مجھے اچھی لگتی ہے۔ بیگ صاحب نے انٹرویو میں کئی افسانہ نگاروں کا ذکر کیا لیکن دو اہم نام وقار بن الٰہی اور محمد منشا یاد کو نظر انداز کر گئے نہ جانے کیوں؟ ان دونوں افسانہ نگاروں نے یقیناً ڈاکٹر صاحب سے دو دہائیاں قبل افسانے کی دنیا میں قدم رکھا اور کئی معرکے کے افسانے لکھے۔ چوتھے سوال کے جواب سے میں مطمئن نہیں ہوا۔ یہ سوال Plotless افسانے سے متعلق ہے۔ میرا خیال ہے کہ جس میں کوئی پیغام نہ ہو، کسی خیال کا اظہار نہ ہو، وہ لفظوں کا انبار تو ہو سکتا ہے، افسانہ نہیں۔ اگر اردو افسانے میں یہ ایک تجربہ تھا تو ممنوع نہیں ہے۔ پلاٹ اور روایتی پلاٹ کیا ہے؟ یہ بات بیچ میں رہی اور جواب لپیٹ لیا گیا۔ یہ خط اختتام کے آخری مرحلے میں تھا کہ واہ کینٹ کے معروف افسانہ نگار جناب خالد قیوم تنولی نے ڈاکٹر انور سدید کے ارتحال کی سوگوار خبر سنائی مرحوم نے ادب کے حوالے سے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت کرے!

احسان بن مجید (اٹک)

٭5٭ سوہان اظہر جاوید!

یہ لکھتے ہوئے دل خون کے آنسو روتا ہے کہ نابغہ روزگار ڈاکٹر انور سدید اب اس دنیا میں نہیں رہے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ علم و ادب کا سمندر تھے۔ پیرانہ سالی میں بھی مسلسل ان کا قلم متحرک رہا۔ اظہر جاوید کی برسی میں شریک ہوئے اور کیمرے کی آنکھ نے ''مناظر'' اپنی آنکھوں میں بند کر لیے اور سوہان اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کے خاص نمبر میں وہ فوٹو چھاپ کر تخلیق میں محفوظ کر لیے۔ مجھے بتایا کرتے تھے کہ سوہان اظہر جاوید؟ کہ مجھے گود میں اٹھا کر گاڑی تک لاتے۔

گوشہ اظہر جاوید خاص نمبر کی خاص سوغات ہے۔ سعادت مند بیٹے کے دل میں اظہر جاوید دھڑکتے ہیں اور انہیں متحرک رکھتے ہیں۔ مضافات سے بڑے شہروں کی طرف سفر مشکل نظر آتا ہے اور بعض لوگ حوصلہ ہار دیتے مگر ڈاکٹر انور سدید، احمد ندیم قاسمی، اظہر جاوید، وزیر آغا، ملک مقبول احمد اور دوسروں نے جب اپنی قوت ارادی کو یکجا کر کے مصمم ارادہ کر لیتے ہیں تو مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے کامیابیاں سمیٹتے ہیں۔ اظہر جاوید مگر الگ شناخت رکھتے تھے۔ عام سا دفتر جہاں اشعار کی خوشبو بھی رہتی تھی اور جہاں خوشبو ہو وہاں مرد اور

عورتیں کھینچی چلی آتی ہیں۔ ڈاکٹر کیول دھیر، ڈاکٹر انور سدید، عذرا اصغر، پروفیسر قیصر نجفی، غلام نبی اعوان، حسن عسکری کاظمی اور ابصار عبدالعلی نے نثری اور منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مگر خود ادارہ تخلیق کا ’’رپورتاژ‘‘ خاصے کی چیز ہے۔

پروفیسر حسن عسکری کاظمی صاحب نے منظوم نذرانہ عقیدت اظہر جاوید کو پیش کیا ہے اور خوب پیش کیا ہے ایک شعر

قوس قزح کے رنگ تھے اس کے وجود میں — تتلی پہ سرخ پھول تھا جیسے سجا ہوا

عذرا اصغر نے تو ان کے ساتھ کام بھی کیا، قریب سے دیکھا اور پرکھا اسی لیے لکھتی ہیں ’’ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے‘‘

ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ ان کا پرخلوص تعلق تھا اسی لیے ’’درویش عشق مست‘‘ قرار دیا۔ اور فرمایا:

اظہر تھا اس جہاں میں ’’اک بے نوا فقیر‘‘ — اپنی خودی کا نقش دکھا کر چلا گیا

اور اب رب کریم نے دونوں کو یکجا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمتیں نازل کرے۔ ان کی شخصیت گوناگوں خوبیوں کا مرقع تھی پروفیسر قیصر نجفی نے خوب واقعہ دہرایا کہ اظہر جاوید نے شکوہ کے طور پر کہا۔

یہ تو تم تھے کہ جو لی تم سے محبت ورنہ — ہم وہ سرکش ہیں کہ خود اپنی بھی تمنا نہ کریں

ڈاکٹر انور سدید ان کے مزاج شناس تھے ان کے مطابق انہوں نے بے شمار چیونٹیوں کو رنگ دار بنا دیا اور اظہر جاوید کی نظر کرم سے بہت سی افسانہ نگار ہیں۔ اور خوب نام کمایا۔ بقول ڈاکٹر انور سدید اظہر جاوید کے دفتر میں نیلی پیلی، سرخ اور سنہری تتلیاں ہر وقت موجود رہتیں اور اظہر جاوید کا کمال کہ مسلسل شعر گوئی کرتے رہتے اور ان کی ہر طرح خاطر مدارات کرتے رہتے۔ علی اکبر ناطق نے افسانے لکھتے لکھتے ناول بھی لکھ ڈالا ’’نولکھی کوٹھی‘‘ اس میں پنجابی رنگ بھر کے اسے منفرد حیثیت کر دی۔ شیخ خالد نے معاشرے کے ناسور کی بھرپور نشاندہی کی ہے۔

اظہرین لکھاریوں نے کمال کی تحریریں بھیجی ہیں۔ بانو قدسیہ کو ’’تخلیق ایوارڈ 2014‘‘ سے نوازا۔ بہت قابل ستائش عمل ہے۔ اظہر جاوید کے بارے میں فیروز علی کی تحریر ’’اظہر جاوید ـــ میرے مرشد‘‘ بھی خاص تحریر ہے۔ وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ کاش امیر کے بھی مرشد ہوتے؟! ڈاکٹر رشید امجد کی یادنگاری کی 10 ویں قسط بھی خوب تر ہے۔ ڈاکٹر اعدال بیلا اپنے سفرنامے کی 11 ویں قسط سے آگے نکل رہے ہیں طرز تحریر منفرد اور دلچسپ ہے۔ اور محترمہ سلمیٰ اعوان جو ہمیشہ سفر میں رہتی ہیں انہوں نے ’’عراق اشک بار ہیں ہم‘‘ کی پانچویں قسط خوب تحریر کی ہے۔ ان کی تحریر کا انداز چونکا دینے والا ہے بہت خوبصورت محاورے اور دیگر منفرد الفاظ کا چناؤ کرتی ہیں۔ منظوم حصہ نثری نظم ہو یا کہ غزلیات بہت خوبصورت ہے۔ میں بعض لکھاریوں کے نام نہیں لکھ سکا مگر بلاشک و شبہ خاص نمبر تو خاص چیز ہے۔ اور لائبریری میں سنبھال کر رکھنے والی چیز۔ اور آخر میں ’’چودھویں صدی کا کمال آدمی‘‘ نے محبت، خلوص اور عقیدت کے آمیزے سے محترم ناصر نقوی نے لکھا ہے وہ ہے ’’کمال کا آدمی‘‘ محترم جناب ملک مقبول احمد اپنی ذاتی ہمت اور جانفشانی سے ایک گمنام گاؤں سے لاہور آ کر کامیابی کے جھنڈے گاڑے اور اولاد کو بھی بام عروج پر پہنچایا۔ دو بیٹے ڈاکٹر، بیٹی ڈاکٹر اور داماد بھی ڈاکٹر اور خود مقبول اکیڈمی کے بانی۔ چھیاسی سال عمر مگر بقول ان کے ’’ابھی سفر جاری ہے‘‘۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی عطا فرمائے۔

مرزا احمد نور طاہر (چکوال)

﴿6﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب

سلام مسنون۔ بہار کے موسم میں ''تخلیق'' (مارچ 2016ء) موصول ہوا۔ جب ورق گردانی کی تو بہار کے رنگ مزید نکھر کر سامنے آ گئے۔ جناب اظہر جاوید کی چوتھی برسی پر صدارت کی کرسی پر ڈاکٹر انور سدید کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ لیکن چند روز بعد ان کی وفات نے بہت رنجیدہ کر دیا۔ یوں محسوس ہوا کہ بہاریں روٹھ گئی ہیں اور ہر جانب خزاں رسیدہ پتے اُڑ رہے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید پاکستان میں شائع ہونے والے ادبی رسائل کا تاج تھے۔ بالخصوص ''تخلیق'' کے ساتھ ان کی وابستگی بہت زیادہ تھی۔ ''تخلیق ایوارڈ'' اور ہر سال کے اختتام پر ''تخلیق پر ایک نظر'' میں انور سدید سارا منظر نامہ اختصار کے ساتھ واضح کر رہے تھے۔ ''پہلی بات'' میں آپ نے اپنے لفظوں میں ایک بات کا اظہار کیا ہے۔ واشگاف الفاظ میں کہتا ہوں انور سدید ہمیشہ ادب اور ادیبوں کی خدمت کرتے ہیں۔ انہیں شہرت اور صلے کی پرواہ نہیں تھی شہرت انور سدید کو اللہ نے وافر دے رکھی تھی۔ آپ نے ادبی رشتے کی بات کی تو ایک بار مجھے فون پر ڈاکٹر انور سدید نے واضح کیا تھا کہ ''مسکین صاحب ادبی رشتے خون کے رشتوں سے بھی مضبوط ہوتے ہیں'' اور پھر انھوں نے اپنی اور وزیر آغا کی مثال دی تھی۔ ماہنامہ ''الحمرا'' (مارچ 2016ء) میں انور سدید کا خون کے قلم سے لکھا ہوا خط پڑھ کر آنکھوں سے آنسو آ گئے تھے کہ ایک ادیب نے ان پر شہرت سمیٹنے کا افسوس ناک بیان دے ڈالا۔

تخلیق کے اس تازہ شمارے میں ڈاکٹر خالد ندیم نے عہد حاضر میں کلام اقبال کی نئے تناظر میں اہمیت اور فکر کو اجاگر کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ''الحمرا'' اور ''تخلیق'' میں ڈاکٹر انور سدید کی تحریریں ایک تازگی کا احساس دلاتی ہیں۔ زیر نظر شمارے میں بھی انور سدید کی تخلیقی کاوشیں نمایاں ہیں۔ سید مبارک علی شمسی نے بڑے عمدہ انداز میں کربلا کی خاک کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ ''گوشہ اظہر جاوید'' بھی پورے جوبن پر ہے۔ خوش نصیب ہوتے ہیں وہ باپ جن کے نصیب میں سونان اظہر جیسے بیٹے ہوتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اظہر جاوید کی روح ہر بار ''تخلیق'' کی اشاعت پر زیادہ مطمئن ہوگی۔ آپ ''تخلیق'' کو ایک گلدستے کی مانند پیش کرنے لگے ہیں جس میں افسانوی پھولوں کی مہک، غزلوں کے رنگ، دعاؤں کے روپ، طنز و مزاح کی تازگی، اور سفرنامے کے عمدہ مناظر شامل ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد، ڈاکٹر ابدال بیلا اور ڈاکٹر ایس ایم معین نوازش نے اپنی تخلیقات کے ذریعے ''تخلیق'' کے گلدستے کو مزید نکھار اور وقار عطا کر رکھا ہے۔ ''انجمن خیال'' کے یاران نکتہ داں ''تخلیق'' کے تخلیقی رنگوں کی واضح جھلکیاں پیش کرنے میں مصروف ہیں۔ اللہ پاک سب کو سلامت رکھے آمین۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن (سرگودھا)

﴿7﴾ جناب محترم سونان اظہر جاوید!

آج صرف ڈاکٹر انور سدید کی رحلت پر دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہے۔ ''تخلیق'' کے ساتھ ساتھ دنیائے ادب سوگوار اور اداس ہے۔ جناب اظہر جاوید کی چوتھی برسی کی تقریب کی تصاویر دیکھتے ہوئے بزرگ ڈاکٹر صاحب کی بھرپور شرکت پر خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اچانک یہ خبر ہمیں احساس دلا گئی 'خوشبو میں کتنے رنگ ہیں معلوم ہوا ہے' پوچھ 'اردو ادب کی تفہیم و ترویج کے سلسلے میں غیر معمولی استعداد رکھنے والے جناب انور سدید نے اپنی گراں قدر تخلیقات کے ذریعے اردو ادب کو وسعت بخشی۔ مجھے 2006ء سے تخلیق میں چھپنے کا فخر و انبساط حاصل

ہے۔ اور یہ خوشی اس وقت اعزاز میں ڈھل جاتی تھی۔ جب ڈاکٹر انور سدید میری کسی بھی تحریر کو پسند فرماتے اور تبصرہ لکھتے تھے۔ میری دونوں کتب ''سفر آغاز کرتے ہیں'' اور ''اردو تنقید کے تخلیقی زاویے'' پر انہوں نے بہت خوب صورت طلیپ اور مضامین لکھے — مجھے فون پر مبارک باد دی اور دعاؤں سے نوازا۔ میرے ایسے اور بھی خوش نصیب ہیں جنھیں ڈاکٹر انور سدید نے حوصلہ افزائی کے قیمتی جملوں سے فیض یاب کیا اور تحقیق کے نئے زاویوں اور نئی جہتوں کو سنوارنے میں مدد دی۔ انشائیہ، ناول، غزل، نظم، افسانہ، تحقیق و تنقید، سوانح، سفرنامے غرض کہ ہر صنف کو مباحث اور روایت کو تحقیق کی کسوٹی پر پرکھنے والی عظیم ادبی شخصیت ڈاکٹر انور سدید کے بعد ایک خلا پیدا ہو گیا ہے جو یوں لگتا ہے اب کبھی بھی پر نہیں ہو سکے گا۔ ان کی یاد کے کتبے جگہ جگہ ہر صنف سخن پر سجے ہیں — مگر افسوس ہے ہمارے پاپولر الیکٹرانک میڈیا پر جو ایک کثیر الجہات مصنف کی رحلت پر خاموش رہا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ابدی جنت میں پرسکون نئی دنیاؤں اور نئی کہکشاؤں کی دریافت میں مشغول ہوں گے۔ خدا ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین بانی ''تخلیق'' جناب اظہر جاوید کے مشن کو جاری و ساری رکھنے میں آپ کے حوصلے، عزم و استقامت کو سلام۔

صائمہ نورین بخاری (ملتان)

★★★ عزیز محترم سونان اظہر جاوید!

سلام مسنون۔ مارچ کا ''تخلیق'' ملا۔ آپ کے والد گرامی اور میرے دوست اظہر جاوید کی چوتھی برسی کے حوالے سے رپورٹ پڑھی۔ کاش میں بھی اس تقریب میں شریک ہوتا۔ اظہر جاوید ادیب اور شاعر ہی نہ تھے اللہ تعالیٰ نے ایک مقناطیسی اثر اس کی شخصیت میں بھر دیا تھا کہ جو اس سے ایک بار ملتا تھا اس کی طرف ایک دائمی کشش محسوس کرتا تھا۔ ''تخلیق'' میں اس کی یادگیری کا سلسلہ قائم رکھنا آپ کے ایک سعادت مند بیٹے ہونے کی دلیل ہے۔ ان کے مرحوم دوستوں کے حوالے سے تعزیتی مضمون شائع کر کے آپ کسی پر احسان نہیں کر رہے بلکہ یہ ادب کی خدمت کا ایک حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے! ''تخلیق ایوارڈ یافتہ'' محترمہ نیر جہاں پر انور سدید کا تعارفی مضمون پسند آیا۔ محترمہ نیر جہاں کی ادبی خدمات لائق ستائش ہیں۔ وہ امریکہ میں مقیم ہزاروں اردو پڑھنے والوں کی آواز ہیں۔ عہد حاضر کا فکری بحران اقبال کے عنوان سے ڈاکٹر خالد ندیم کا مضمون وقت کی اہم ضرورت تھی جسے انھوں نے پورا کیا ہے۔ عالم اسلام کو علامہ اقبال کے فکر و فلسفہ کی روشنی میں نشاۃ ثانیہ کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ ''شبلی کی آپ بیتی — ایک تحقیقی کارنامہ'' ڈاکٹر سکندر حیات میکن کا مضمون ڈاکٹر خالد ندیم کی کتاب ''شبلی شناسی'' کے حوالے سے صاحب کتاب کو خراج تحسین ہے۔ اس مضمون کی خوبی یہ ہے کہ اصل کتاب کے پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ گوشہ اظہر جاوید کے حوالے سے سارے مضامین خوبصورت جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔ قیصر وڑائچ کا مضمون ''اظہر جاوید میرے مرشد'' ایک خوبصورت تحریر ہے جسے بار بار پڑھنے کو دل کرتا ہے۔ ''تخلیق'' کا یہ خاص نمبر ہر اعتبار سے قابل ستائش نظم و نثر کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔

مظفر حسن منصور (جوہر آباد)

﴿9﴾ مکرمی جناب سلطان اظہر جاوید صاحب!

ماہنامہ تخلیق کا ماہ مارچ 2016ء کا شمارہ اپنے جلو میں نظم ونثر کے اہم اور معلومات افزا مضامین لئے باصرہ نواز ہوا۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ میری نظم شامل اشاعت کرنے پر آپ کا شکر گزار ہوں۔

تخلیق میں شامل حمد، نعت، نظم، رپورتاژ، گوشہ فیض احمد فیض، افسانے، غزلیں، خاکے، یادنگاری، سفرنامے، انٹرویو، بیش قیمت متنوع مضامین ایک طرف مجھے تو ہمیشہ اس کا اداریہ متوجہ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ہمیشہ توانا اور موثر ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے آپ نہ صرف اردو ادب بلکہ اہم قومی معاملات و مسائل کی طرف اشارہ بھی فرماتے ہیں اور صحت مند تنقید اور اہم تجاویز بھی پیش فرماتے ہیں جو تخلیق کے ہر قاری کے دل کی آواز ہوتی ہے۔ مثلاً دسمبر 2015ء کے شمارے میں آپ نے عدالت عظمیٰ کے اردو زبان کو قومی سطح پر نافذ کرنے کے حکم/ دس سال کی مقررہ مدت کا گزرنا/ ادارہ مقتدرہ قومی زبان کا قیام/ فوجی اور سیاسی حکومتوں اور نوکر شاہی کی انگریزی کی بالادستی کا قائم رکھنا/ وزیراعظم اور دیگر اکابرین کا انگریزی میں تقریر کرنا/ اردو زبان کے دیگر مسائل جن پر آپ پہلے بھی احتجاج کرتے رہے ہیں مکرر احتجاج کرنا/ اردو کی قومی زبان کی حیثیت کا اعلان اور عمل نہ کرنے والوں یا رکاوٹ ڈالنے والے اسٹیبلشمنٹ کے ارکان کو سزا دینا/ سرکاری ملازمتوں کے تمام امتحانات اردو میں لینا/ انگریزی کو اختیاری مضمون کی حیثیت دینا اور اس کا اعلیٰ معیار کالجوں اور یونیورسٹی میں قائم کرنا ہے۔ آپ نے اس حقیقت سے بجا طور پر پردہ اٹھایا ہے کہ ماضی کی حکومتوں کی اردو سے لاتعلقی اردو ادب پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اور معیاری ادبی رسائل کی اشاعت کم ہوگئی ہے۔ سوچ کے سرچشمے خشک ہوگئے ہیں۔ فروغ اردو کے لئے اخبارات و رسائل، جرائد اور مطبوعہ مواد کی ڈاک سے ترسیل ارزاں ترین ہونی چاہیے لیکن صورت حال اس کے برعکس ہے۔ اور ایک کتاب بیرون ملک بھیجنے کیلئے اس کی قیمت سے چار گنا زیادہ ڈاک خرچ آتا ہے جو کم کیا جائے۔ اس ضمن میں ہمسایہ ملک کی شرح کی مثال سامنے ہے مختصر یہ کہ آپ نے اردو کے نفاذ کی وکالت نہایت مدلل انداز میں کی ہے جس کا نوٹس حکومت کو بھی فوراً لینا چاہیے۔

وفیات: ایک مستقل اور اہم پہلو ہے جو تخلیق نے کبھی نظرانداز نہیں کیا۔ اس کا بھی کریڈٹ آپ کو ہی جاتا ہے۔ مارچ 2016ء کے زیر نظر شمارے میں آپ نے اداریے میں "پچھلی بات" کے زیر عنوان ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جو کہتے ہیں کہ مرحومین کا ذکر نہ کیا جائے یہ عجیب منطق ہے جو ہر قاری کے ذہن سے بالاتر ہے۔ اور تخلیق نے اپنے مشاہیر کو یاد رکھنے کا جو عزم کیا ہے وہ بے شک قابل ستائش ہے۔ جہاں تک ادبی میلوں کا تعلق ہے تو سو فیصد نہ سہی کسی نہ کسی حد تک ان سے ادب کی راہ ہموار ضرور ہوتی ہے یہ تو تھی آپ کے اداریے کی بات اظہر جاوید کی شان شایان چوتھی برسی کی تقریب اور تخلیق ایوارڈ 2015ء کی تصویری جھلکیاں ایک نہایت یادگار اقدام ہے اس کے ذریعے اردو ادب کے نامور دانشوروں سے آپ کی ملاقات گھر بیٹھے کرادی اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر ضرور عطا فرمائے گا۔ یہاں گوشہ اظہر جاوید کی بھی اشد ضرورت تھی اور یہ فریضہ بھی آپ نے نہایت دانشمندی سے ادا کیا۔

ڈاکٹر کیول دھیر (انڈیا) کی "اظہر کی یادیں ۔۔۔ باتیں" ایک مسلسل اور طویل تحریر جو ابھی جاری ہے۔

ڈاکٹر انور سدید (اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے آمین) کا مضمون بعنوان "درویش عشق مست ۔۔۔ اظہر جاوید" میں انہوں نے اظہر جاوید کی زندگی کے نہایت اہم واقعات سے پردہ اٹھایا ہے۔ لکھتے ہیں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ گویا اظہر جاوید پر

پیش خبری وقت آ پہنچا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے انکسار اور ملنساریت کے دور کا ذکر اور یہ انکشاف بھی فرمایا کہ ان کی دوستی کا آغاز اظہر جاوید کی زندگی میں چھپنے والے ڈیکلریشن کے بغیر تخلیق کے پرچے سے ہوا۔ جیسے ان کے بعد آج تک ان کے فرزند ارجمند سونان اظہر جاوید نے بھی قائم رکھا۔

عذرا اصغر کا مضمون ''ایسا کہاں سے لائیں ـــــ'' اخلاقیات اور فنی بالیدگی وغیرہ کے بارے میں انہوں نے خوب تفصیلات بہم پہنچائی ہیں۔ پروفیسر قیصر نجفی صاحب نے ''یار عزیز ـــــ اظہر جی'' میں بقول ان کے اظہر جی کے ایوان شعر کے دو دروازے ہیں ایک غزل کی طرف اور دوسرا نظم کی طرف کھلتا ہے ان دونوں اصناف میں ان کی فنی رفعت بالیدگی بے مثل ہے جس کے ثبوت کے طور پر انہوں نے متعدد اشعار نمونے کے طور پر پیش کئے ہیں جو ایک انمٹ قیمت تحفے سے کم نہیں۔

جناب غلام نبی اعوان صاحب جو ''اظہر جاوید ـــــ چند یادیں'' میں رقم طراز ہیں کہ ایک وقت انہوں نے اظہر جاوید کے مشورے پر کمرشل صحافت کو خیر باد کہہ کر ٹیچر شپ شروع کی اور پھر تخلیق کی وساطت سے ہی علمی ادبی سرگرمیاں جنہیں خیر باد کہا تھا شروع ہو گئیں۔ تخلیق کے دیگر مندرجات کے مطالعہ اور خیال آرائی کے لئے وقت درکار ہے لہٰذا اسے آئندہ کے لئے اٹھا رکھنے کی استدعا ہے۔

رشید آفریں (سیالکوٹ)

﴿10﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کو بلند مقام تک پہنچانے میں اظہر جاوید صاحب کی کاوشیں چند سالوں پر محیط نہیں بلکہ یوں کہنا زیادہ بجا ہوگا کہ ''یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں'' آپ نے اظہر جاوید صاحب کے بعد جس طرح سے آگے بڑھ کر ''تخلیق'' کی اشاعت میں تسلسل اور ترویج و ترسیل میں غیر معمولی دلچسپی لی ہے اس سے یقیناً پرچے کا ادبی معیار بھی بلند ہوا ہے اور اس کے لیے ان تھک محنت کرنی پڑتی ہے۔

جوانی میں جب ہو گیا ہوں میں پیر ـــ تب ایسے ہوئے ہیں سخن دلپذیر

تخلیق کا تازہ شمارہ مارچ 2016ء میرے سامنے ہے۔ اس کی ترتیب پر نظر ڈالتے ہی خوشی ہوتی ہے کہ اس پرچے میں ایسے مختلف گوشے ہیں جن سے نہ صرف لکھنے والوں کا تنوع نظر آتا ہے بلکہ یہ تنوع قارئین کو ذوق کو بھی جلا بخشتا ہے۔ بہت سے شاعر اور ادیب ہمیں تخلیق میں نظر آتے ہیں جن میں نئے لکھنے والے بھی شامل ہیں اور پختہ بھی ہیں اور ملکی اور بین الاقوامی بھی ہیں۔ اظہر جاوید صاحب کی شخصیت واقعی ایسی تھی کہ ان پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے اور ان کے دوست اور چاہنے والے ان کو اپنے اپنے انداز میں خراج تحسین پیش کر رہے ہیں۔ میں خود ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب کے ساتھ ''تخلیق'' کے آفس میں اظہر جاوید صاحب سے ملا۔ ان سے مل کر ہمیشہ اپنائیت کا احساس ہوا۔ انارکلی کے ایک خاص گوشے میں کبھی کبھی رات کو وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہوتے تھے اور اپنی وجاہت اور گفتگو کے لحاظ سے بہت منفرد نظر آتے تھے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ خواجہ محمد زکریا صاحب سے ان کے متعلق ضرور کچھ لکھوائیں۔ یقیناً خواجہ صاحب اور اظہر جاوید صاحب میں جو دوستی تھی وہ قارئین کے لیے بہت مفید پہلو سامنے لائے گی۔ ''تخلیق'' کی اشاعت کے ہر شمارے پر

ایس ایم ایس بھیجا ایک منفرد روایت کا آغاز ہے جس سے پرچے کی طلب کی پیاس اور بڑھ جاتی ہے۔ شعرا و ادبا کے ٹیلی فون نمبر دینا قارئین اور تخلیق کاروں کو اور زیادہ قریب کر دیتے ہیں یہ سلسلہ بھی بہت اچھا ہے۔ "تخلیق" مارچ کے اس شمارے میں شروع کے چند صفحات پر 2015 کا اندراج غلط ہوا ہے جس پر تھوڑی سی توجہ کی ضرورت ہے اسی طرح پہلی بات میں جو مصرعہ لکھا ہوا ہے اس میں "بہ چراغ" کی بجائے "بہ مزار" ہونا چاہیے تھا جو سہو کتابت ہے۔ مجموعی طور پر شمارہ قابلِ ستائش ہے اور دعا ہے کہ اسی طرح "تخلیق" روز افزوں ترقی کرے۔

ڈاکٹر محمد ایوب (کراچی)

﴿11﴾ برادرم سونان اظہر!

دلکش رنگوں اور خوبصورت سرورق سے آراستہ مارچ 2016ء کا "تخلیق" ملا تو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ایس خالد کا بنا ہوا ٹائٹل دیکھ کر فوراً ہی ایک شعر سرزد ہو گیا۔ کمال کا ٹائٹل تھا جس پر ایس خالد مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ملاحظہ کریں:

ہوا کے شور سے بچے بکھر نہ جائیں کہیں　　　میں اپنے جسم سے شاخیں لپیٹ لیتا ہوں

حسبِ روایت اس بار بھی نادر و نایاب تحریروں سے سجایا گیا ہے۔ اظہر جاوید صاحب کی چوتھی برسی کی رنگین تصاویر اور دیگر رنگین صفحات نے رسالے کی خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ مضامین، افسانے، غزلیں، نظمیں اور قسط وار سلسلے تعریف و توصیف سے بالاتر ہیں۔ اظہر جاوید صاحب کے لیے خصوصی گوشہ شامل کر کے ایک بار پھر آپ نے ان سے محبت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ "انجمن خیال" میں دلکش اور منفرد انداز کے خطوط پڑھنے کو ملتے ہیں۔ آغا گل، طالب عرفان، مرزا احمد نور طاہر اور ایس ایم معین قریشی کے خطوط نہایت فکر انگیز اور متاثر کن ہیں۔ معین قریشی صاحب نے اشعار کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے بہت اچھی بات ہے۔ انھوں نے میرے ایک شعر کا حوالہ دے کر یہ تاثر دیا ہے کہ وہ اس شعر کے مفہوم تک نہیں پہنچ سکے اس کی وجہ یہ ہے کہ شعر کا پہلا لفظ حبس (ح ب س) ہے جو تبصرے میں جس (ج س) لکھا گیا ہے جس سے نہ صرف شعر بے وزن ہو گیا بلکہ اس کا مفہوم بھی بدل گیا اگر آپ شعر یوں پڑھیں تو سمجھ آ جائے گی۔

حبس کمرے میں، چھت پہ بارش ہے　　　اپنے بچے کہاں سلاؤں میں

موصوف نے اعتراض کیا ہے کہ شاعر کو بچے کمرے میں سلانے میں کیا قباحت ہے؟ تو بات یہ ہے کہ جون جولائی کے مہینوں میں ساون بھادوں کے موسم میں اور لوڈ شیڈنگ کے طویل دورانیے میں یہ ممکن نہیں ہوتا کہ بچے ایسے حبس زدہ کمرے میں سو سکیں۔ یہ شعر انہی لمحات کی عکاسی کر رہا ہے۔ اگر اہلِ نظر احباب غور کریں تو ۔۔۔ 20 مارچ کو یہ اندوہناک خبر ملی کہ محترم ڈاکٹر انور سدید بھی کوچ فرما گئے! آہ میدانِ ادب بڑے لوگوں سے کتنی تیزی سے خالی ہو رہا ہے۔ ابھی تو اظہر جاوید، ڈاکٹر شبیہ الحسن، ڈاکٹر وزیر آغا، خالد احمد، اعزاز احمد آذر، انتظار حسین، عبداللہ حسین وغیرہ وغیرہ کا غم ہی دل کو دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے کہ ادب کا ایک بہت بڑا نام ہم سے رخصت ہو گیا۔ ابھی گزشتہ ماہ ہی اظہر جاوید کی چوتھی برسی میں ڈاکٹر انور سدید سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ سب سے پہلے تقریب میں موجود تھے۔ میں جب آڈیٹوریم میں داخل ہوا تو سب سے پہلے انور سدید نظر آئے مجھے ان کے ساتھ والی کرسی پر جگہ مل گئی۔ سامنے والی کرسیوں پر کنول صابری، بھابی سعدیہ سونان اور سحر حفیظ موجود تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی محبت کہ وہ پہلے سے جاری گفتگو روک کر میری طرف متوجہ ہو گئے اور علمی و ادبی گفتگو شروع

کردی۔ وہ آج کل کے نوجوانوں کی تعریف کر رہے تھے اور ان کے کام کی تحسین فرما رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے ادبی رسائل کا ذکر بھی چھیڑ دیا اور فرمایا کہ آج کل بہت اچھے اچھے ادبی رسائل منظرِ عام پر آ رہے ہیں۔ انہوں نے کراچی کے پرچوں کی خاص طور پر توصیف کی اور کولاج، ریلاگ کے علاوہ چند اور ادبی پرچوں کا نام لیا پھر یہ بھی بتایا کہ اسلام آباد سے "لوح" کے نام سے ایک بہت اچھا ادبی جریدہ مطلع ہوا ہے وہ آپ تک پہنچا کہ نہیں؟ میں نے جواباً کہا کہ ابھی تک میں نے وہ پرچہ نہیں دیکھا تو فرمانے لگے وہ منگوا کر ضرور مطالعہ کریں اور اس میں لکھا بھی کریں۔ میں نے کہا ضرور۔ ــــ اسی طرح کی ہماری گفتگو جاری رہی۔ اس کے بعد تقریب کا آغاز ہو گیا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ کچھ دنوں بعد ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائیں گے۔ ان کی وفات کی خبر ملی تو ان سے ملاقاتوں اور یادوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میں بستر پر نیم دراز ہو کر ان کی یادیں تازہ کرنے لگا۔ مجھے یاد ہے کہ میری ان سے پہلی باقاعدہ ملاقات اکبر جاوید کے شعری مجموعے "ستم عشق کرتا ہوتا" کی تقریب پذیرائی کے دوران ایمبیسیڈر ہوٹل لاہور میں ہوئی تھی۔ غالباً 2004 یا 05 کی بات ہے۔ اس کے بعد اکثر تقریبات میں ان سے ملاقات ہوتی رہتی۔ تخلیق کے بھگوان سٹریٹ والے دفتر میں اکرم آرٹ سنٹر کے مختلف ہالوں اور ادبی بیٹھک میں۔ پبلک میں ہونے والی تقریبات میں شبِ طراز کے جوہر ٹاؤن والے گھر میں اور دیگر کئی مقامات پر ان سے ملاقات ہوتی رہی۔ وہ نہایت خوش دلی سے ملتے اور میں فرصت پا کر ان سے کوئی نہ کوئی ادبی موضوع چھیڑ دیتا اور وہ بڑے عمدہ انداز میں ہر موضوع پر گفتگو فرماتے۔

انہوں نے ادب کی ہر جہت پر کام کیا اور ہر طرح کی تحریر سے ادب کا دامن مالا مال کیا جس پر انہیں بابائے ادب کا خطاب ملا۔ پاک و ہند کے ہر ادبی پرچے میں ان کی تحریر موجود ہوتی۔ انہوں نے تن تنہا اتنا ادبی کام کیا جو کئی ادارے مل کر بھی سرانجام نہیں دے سکتے۔ ہزاروں کتابوں پر تبصرے، سینکڑوں شاعروں ادیبوں کی شخصیات پر مضامین اور کتابوں کے پیش لفظ لکھنے کا اعزاز بخشا ہے۔ انہیں اکبر جاوید اور تخلیق سے خصوصی محبت تھی۔ اس لیے اکبر جاوید کی ہر برسی میں شریک ہوتے اور تخلیق کے ہر شمارے کو اپنی انمول تحریر عنایت کی۔ زیرِ نظر شمارے میں بھی انہوں نے اکبر جاوید اور تخلیق کے بارے میں لکھا ہے۔ اور تبصرے بھی کیے ہیں۔ آپ ان کی غیر مطبوعہ تحریریں ان کے گھر سے حاصل کر کے تخلیق کی زینت بنائیں۔ یقیناً آئندہ شمارے میں ان کے لیے ایک گوشہ بھی مخصوص کیا جائے گا۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے اور ادب کو یہ ناقابلِ تلافی نقصان برداشت کرنے کی ہمت دے۔"

آفتاب خان (لاہور)

12 جولائی عزیزم سونان!

"تخلیق" کا خاص نمبر 2016ء، شمارہ نمبر 3 بروقت موصول ہوا۔ غالباً ابھی نصف تحریریں ہی پڑھی ہوں گی کہ بابائے ادب انور سدید کے انتقال کی خبر نے ہمارے دلوں کو دکھی کر دیا۔ سچ پوچھیں تو سدید صاحب ایسے رحجان ساز ادیب صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ان ایسے ادیبوں نے ہی ہمارے ادبی ذوق کی آبیاری کی۔ ان سے چند ملاقاتیں اور ٹیلی فون پر باتیں ہمارے لیے ایسی خوشگوار ادبی یادیں ہیں جن پر ہم آخری سانس تک بجا طور پر فخر محسوس کرتے رہیں گے۔ وزیر آغا کے ادبی لشکر کے اس سپہ سالار کی موت کے بعد اس نظریاتی ادب پروری کا سارا بوجھ جناب سلیم آغا قزلباش کے کندھوں پر آن پڑا ہے۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے عظیم باپ اور اس کے دوستوں کے ادبی ورثے کو مزید پروان چڑھانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ اکبر جاوید کی چوتھی برسی کی تقریب کی تصویریں جھلکیاں محترمہ نسرین جہاں پر

نفس، انور سدید کی تحریریں اور اس کے علاوہ کا رپورتاژ اور گوشۂ اظہر جاوید کی تمام تحریریں دیکھنے اور پڑھنے کے لائق تھیں۔ ان تحریروں کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قبلہ اظہر جاوید لوگوں کے دلوں میں کس خوبصورت انداز میں زندہ ہیں۔ اس شمارے میں شامل تمام غزلیات کو میں نے تنقیدی نظر سے پڑھا۔ تمام غزلوں کا ہر ہر لفظ متعلقہ بحری آہنگ میں دکھائی دیا۔ میں معذرت خواہ ہوں اس بار میں "تخلیق" کو اس دلجمعی کے ساتھ نہیں پڑھ سکا۔ انشاءاللہ اگلے شمارے میں بھرپور مطالعے کی کوشش کروں گا۔

ایم ڈی ملک (راولپنڈی)

﴿13﴾ محترم ایڈیٹر صاحب!

"تخلیق" کا "خاص نمبر" نظر سے گزرا۔ محترم اظہر جاوید صاحب کی چوتھی برسی کی رپورتاژ اور تصویری جھلکیاں اس نمبر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا، محترمہ بانو آپا اور انور سدید صاحب نے شرکت فرما کر اظہر جاوید صاحب سے اپنی دلی محبت کا ثبوت دیا۔ افسوس کہ سرگودھا کی ایک اور علمی اور ادبی شخصیت ڈاکٹر انور سدید "درویش عشق مست" کی باتیں کرتے کرتے انہی کے پاس چلے گئے۔ بلاشبہ ان کی وفات پاکستانی ادب اور "تخلیق" کے لئے ایک گہرا خلا پیدا کر گئی۔ ڈاکٹر خالد ندیم جو میرے ہم پیشہ اور جامعہ سرگودھا سے ہی منسلک ہیں، کی تحقیقی کاوش "شبلی کی آپ بیتی" پر ممکن صاحب نے خوبصورت مضمون لکھا۔ ممکن صاحب تخلیق سے اپنی محبت کا ہمیشہ ثبوت پیش کرتے رہتے ہیں۔ آپ اس سب کے لئے مبارکباد کے مستحق ہیں کہ اظہر صاحب کا سرمایہ سمیٹ کر بیٹھے ہیں اور اس پودے کو سینچ رہے ہیں۔

توقیر احمد (سرگودھا)

﴿14﴾ برادرم سونان اظہر جاوید!

ڈاکٹر انور سدید کی رحلت کی خبر ملنے پر میں سوچتی رہی کہ تعزیت کس سے کروں؟ مجھے اظہر جاوید صاحب کی برسی پر منعقدہ پروگرام کے چند روز بعد ان سے دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی ہر ادا رخصت کا اشارہ تھی۔ اس مختصری نشست میں جو فیض میں نے پایا، میں نے اسی دوران تحریر کیا تھا کہ یہ میرا اثاثہ ہے اور میں اس کا ذکر کبھی تحریر میں نہ کروں گی۔ وہ اپنی کتابوں کے محفوظ ہاتھوں میں منتقل ہو جانے پر بھی بہت مطمئن تھے۔ آپ کے ساتھ ان کا خصوصی تعاون، محبت اور شفقت رہی۔ یقیناً آپ کے لیے یہ سانحہ بہت بڑا ہے۔ خدا تعالیٰ آپ کو حوصلہ اور انہیں ابدی سکون عطا فرمائے۔ آمین!

عمیرہ احمد (لاہور)

﴿15﴾ جناب سونان جاوید صاحب!

آج آپ سے رابطے کے پیچھے ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔ جو خط لکھنے کا وسیلہ بنا۔ ہم سب جانتے ہیں کہ حقیقی کہانیوں کے پیچھے سے زندگیوں کی کہانیاں تخلیق ہوتی ہیں۔ لکھاری محض بھرے ہجوم میں سے بے چہرہ اصلی کرداروں کو نام اور فرضی کردار کے قالب میں ڈھال رہا ہے۔ یہ مختصر سا واقعہ سچا ہے۔ گذشتہ ماہ sanfrancisco سے ٹورنٹو کی فلائٹ کے انتظار میں گھنٹوں ائیرپورٹ کی انتظارگاہ میں گزری۔ ایک

خاتون اپنی فلائٹ کا اعلان ہوتے اٹھی۔ بیگ لیا چل دی۔ دوبارہ پیچھے مڑی۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ بچے امریکی انگریزی لہجے میں بولی Are you from pakistan? (تم وہاں سے ہو)۔ دیار غیر میں نئی شناسائیوں کی شروعات سے پہلے اپنی وطن کی شناخت کی ایسی خوشگوار ری انشورنس انکا حق ہے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ رکھ لو''۔ اس نے اردو کا ایک رسالہ مجھے تھمایا۔ تیز تیز قدموں سے اپنے گیٹ نمبر کی طرف روانہ ہوئی۔ پہلی اور شاید آخری ملاقات۔ میرا باقی وقت ایسے گزرا کہ فلائٹ کے اعلان تک ہم کے ساتھ رہی۔ اجنبی عورت نے مجھے تخلیق دو تین سال پرانے رشتے سے روشناس کرادیا۔ دل نے ممنونیت سے خاتون کو شکریے کی دعا دی۔ تخلیق کے بانی جناب اظہر جاوید کا نام پڑھا۔ یادگار یادوں کا پرانا باب کھلا۔ محترم اظہر صاحب سے ملنے کی سعادت نصیب نہ ہوئی لیکن ان کے ساتھیوں سے ذکر سنا تھا۔ جناب محترم ضمیر جعفری اور مفتی جی اظہر صاحب کا تذکرہ کیا کرتے تھے۔ آپ نے والد کے پرچے کو سنبھال کر اور اس کے معیار کو بین الاقوامی سطح پر لا کر ہم سب دوستوں کے دل جیت لئے۔ تخلیق ہمیشہ قائم رہے۔ یہی ہم سب دوستوں کی دعا ہے۔ اسی شمارے میں ڈاکٹر ابدال بیلا کی قسط وار کہانی شامل تھی۔ ان کی کتاب ''رنگ پچکاری'' یاد آئی۔ مدت ہوئی۔ کتاب دیکھی تو ایسے ہی ایک تبصرہ لکھ ڈالا۔ انہیں اتنا پسند آیا۔ انہوں نے کسی رسالے میں چھپوا دیا۔

غزالہ جاوید (انگلستان)

◆◆◆

نیا سلسلہ

بین الاقوامی دوستوں کے رابطے کے لئے چند معروف لکھاریوں کے فون نمبر اور پتے

نمبر شمار	نام قلمکار	فون نمبر	پتہ برائے خط و کتابت
-1	امجد اسلام امجد	0333-4231606	275-N، ڈیفنس لاہور
-2	پروفیسر عطیہ سید	0336-4237615	7-اتاترک بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
-3	بشریٰ رحمان	0300-9438596	''وطن دوست'' C-8، احمد بلاک نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور
-4	ڈاکٹر خورشید رضوی	0322-4691328	52/A، ڈی، ایم، ای سوسائٹی، ملتان روڈ، لاہور
-5	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	0302-4177388	28/D، منصورہ ملتان روڈ، لاہور

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اسی لئے تمام رسائل اور کتب کے نام اس لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ نیرنگ خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ: سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ الزاف کراچی مدیر اعلیٰ: محمود شام 0321-8216736	ماہنامہ شاداب لاہور مدیر: ڈاکٹر کنول فیروز 0301-4123707
ماہنامہ ارژنگ لاہور مدیر: حسین مجاہد 0300-4489310	ماہنامہ سپوتنک لاہور مدیر اعلیٰ: آغا امیر حسین 0300-8440444	ماہنامہ روشنائی کراچی مدیر: احمد زین الدین 0321-2011595
ماہنامہ ادب لطیف لاہور چیف ایڈیٹر: صدیقہ بیگم 0300-8479444	سہ ماہی فن زاد سرگودھا مدیر: یوسف چوہان 0301-6791402	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر: شاہد علی خان 0301-4001844
ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی 042-35290738	ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر: عمران منظور 0300-8438043	ماہنامہ قومی زبان کراچی مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان 02134973296
ماہنامہ انشا کلکتہ انڈیا مدیر: ف۔س۔اعجاز 0091-3322354616	ماہنامہ شاعر ممبئی انڈیا مدیر: افتخار امام صدیقی 0091-932451517	سہ ماہی انتساب انڈیا ایڈیٹر: سیفی سرونجی 0091-942564177
دو ماہی نگینہ سری نگر کشمیر ایڈیٹر: وحشی سعید 09419012800	ماہنامہ شاعری کراچی مدیر: سہیل غازی پوری 021-3628911	ماہنامہ سیپ کراچی مدیر: نسیم درانی 0333-2166968
سہ ماہی خیال و فن لاہور مدیر: محمد مختار راشد 0331-4387871	ماہنامہ [illegible] مدیر: سعدیہ راشد 042-36620949	سہ ماہی لوح لاہور مدیر: [illegible] 0333-4722999

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1	ویران آنکھوں کے خواب	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	0323-87577931	بک کارنر جہلم	800/-
2	ارمغانِ وطن	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	0323-87577931	بک کارنر جہلم	380/-
3	[illegible]	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	048-3711717	319۔ [illegible] اقبال کالونی، سرگودھا	500/-
4	[illegible]	ڈاکٹر یوسف شاہد	03300-8811665	AI-212، [illegible]	250/-
5	عالمی اردو ادب	نند کشور وکرم	011-22094419	عالمی اردو ادب، کرشن نگر، دہلی (انڈیا)	400/-
6	حسنِ عقیدت	[illegible] انصاری	0300/0312919	جبران اشاعت گھر، [illegible] کراچی	400/-
7	ہوا کا سفر	فرخ رابعہ	0332-5265968	[illegible] اسلام آباد	250/-
8	[illegible]	محمد حنیف مرزا	051-5551519	[illegible] راولپنڈی	350/-
9	پھول، خوشبو اور ستارہ	ڈاکٹر محمد [illegible]	042-37231490	[illegible] اردو بازار لاہور	500/-
10	[illegible]	ڈاکٹر [illegible]	021-32751428	اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی	500/-

ماہنامہ "تخلیق" کا ممتاز بھارتی دانشور اور مصنف ڈاکٹر کیول دھیر کے اعزاز میں تقریب

ڈاکٹر عمر عادل | جواز جعفری | ڈاکٹر ایوب ندیم | ظہیر جاوید | ظفر سہیل | تسنیم منٹو | زریں منا | عطیہ سید | عشرت شمیم | بشریٰ اعجاز

منور عثمانی، احمد عماد، سعادت سعید ... ڈاکٹر کیول دھیر، سونان اظہر، محسن ...

اکرام تبسم، مسعود عثمانی، سلیم اختر، شوکت علی (محمود) سونان اظہر، ڈاکٹر اجمل نیازی، ڈاکٹر عمرانہ مشتاق

تسنیم منٹو ... مسعود عثمانی، محسن عسکری ... ڈاکٹر کیول دھیر، سعادت سعید، ڈاکٹر اجمل نیازی، امجد اسلام امجد ...

سونان اظہر جاوید (ایڈیٹر تخلیق) کا ڈاکٹر کیول دھیر کے اعزاز میں اپنے گھر عشائیہ

ڈاکٹر اجمل نیازی، امجد، مقبول جان، سونان اظہر خوشگوار موڈ میں

امجد اسلام امجد، سونان اظہر، مجیب الرحمٰن شامی

مجیب الرحمٰن شامی، بشریٰ رحمٰن، سونان اظہر کھانے کی میز پر

سونان اظہر، خاور نعیم ہاشمی ... خوشگوار موڈ میں

نبیل نجم | جاوید منظور | سلیم اختر | پیرزادہ قاسمی | عمرانہ مشتاق | بشریٰ رحمٰن | آمنہ مفتی | لبنیٰ جاوید | سیما پیروز

امجد اسلام امجد، آمنہ مفتی، کیول دھیر، مجیب الرحمٰن شامی اور سونان اظہر

سونان اظہر، خاور نعیم ہاشمی، معہ بیگم سونان

خاور نعیم ہاشمی، امجد اسلام امجد

سونان اظہر، کیول دھیر

بشریٰ رحمٰن، رخسانہ نور

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE

CPL NO. 96

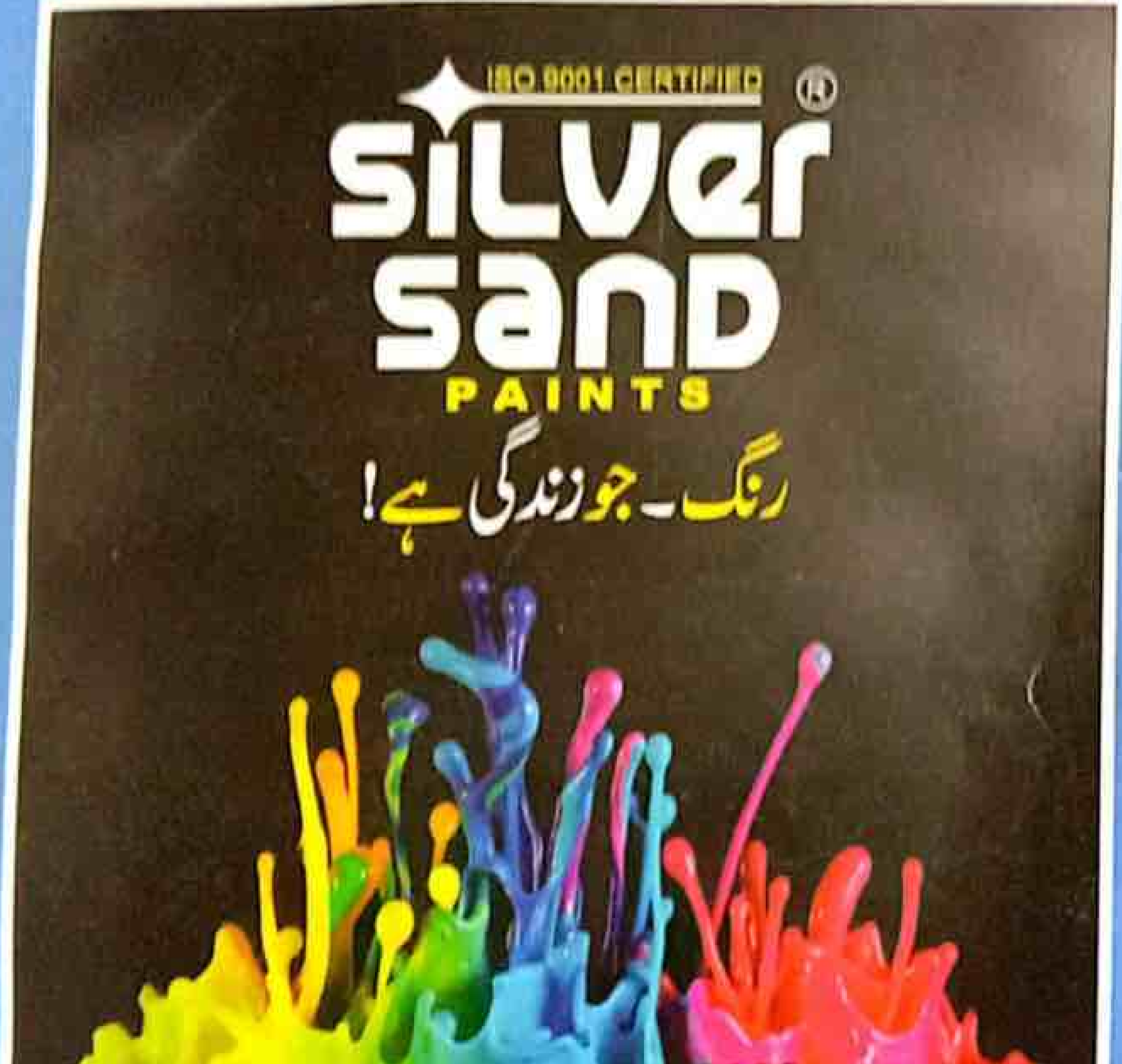

خلیق

ممتاز اور مقبول شاعرہ محترمہ نبیل صابری کا پہلا مجموعہ کلام

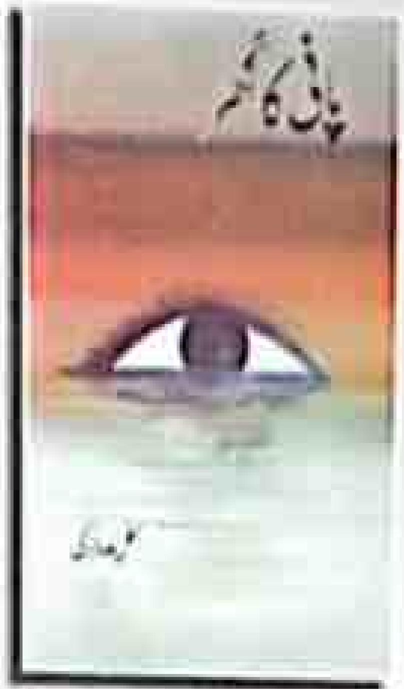

وہ عکس بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے
عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

"پانی کا گھر"

1998/2008

کے بعد دوسرا مجموعہ کلام

وہ بے وفا ہی سہی آؤ اس کو یاد کریں
تمام عمر پڑی ہے اُسے بھلانے کو

"روشنیوں کے رنگ" 2011

کے بعد تیسرا مجموعہ کلام

نبیل بھگو گئیں تجھے یادوں کی بارشیں
بھولی ہوئی تھی جس کو وہ یاد آ گیا مجھے

"یادوں کی بارشیں" 2013

کے بعد چوتھا مجموعہ کلام

رس کی پھوہار اس طرح مسرور کر گئی
آنکھوں میں تیری یاد کا موسم ہرا رہے

"رس کی پھوہار" 2015

چھپ گیا ہے

ملنے کا پتہ: جمہوری پبلیکیشنز 2 ایوان تجارت روڈ لاہور فون: 042-36314140 فیکس: 042-3630939

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسنِ کارکردگی)
عرصۂ ادارت 1969-2012ء

مسلسل اشاعت
47
واں سال

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 47 — ستمبر 2016ء — شمارہ : 9 — CPL نمبر 96

قیمت : 150 روپے ——— 750 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر ——— ہندوستان کے لیے 1,200 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor) Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

فون نمبر: 04237187500، 04236671007 — موبائل فون: 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگانِ خصوصی

نثیر جہاں (امریکہ) ——— تاشی ظہیر (امریکہ) ——— نارنگ ساقی (انڈیا) ——— جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ "تخلیق" کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جان آفریں کے سپرد کی تو اس ماہ کا "تخلیق" شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد "تخلیق" کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود — میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں "اظہر جاوید نمبر" پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ ہم سے تو "تخلیق" پیہم رواں رہے گا اور یہ "علامت"، "افکار"، "صریر"، "تقاضے" اور "طلوعِ افکار" جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (انشاءاللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک "تخلیق" کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔ "تخلیق" کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر "تخلیق" کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے "تخلیق" کے مضامین کے انتخاب کے لیے "تخلیق پینل" تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں "تخلیق" کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، تاشی ظہیر، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف 1,200 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

U.S.A.
Nayyar Jahan
2700 South Barrington
AVE Los Angles
C.A. USA
Ph: [illegible]
Email: [illegible]

U.S.A.
Tashee Zaheer
7028 Fairfeal Court Cupertino
California
U.S.A.
Ph: [illegible]
Email: [illegible]@gmail.com

INDIA
K.L. Narang Saqi
L-4-Connaught Circus, New
Delhi-110001, India
Ph: [illegible]
Email: [illegible]@gmail.com

PAKISTAN
Javed Manzoor
[illegible] Block, Azam Garden,
Multan Road, Lahore
Ph: [illegible]
Cell: [illegible]
Email: [illegible]@hotmail.com

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ — ریاض ندیم نیازی — 7
نعت رسول مقبولؐ — کنول صابری
نعت رسول مقبولؐ — نسیم سحر — 7

مضامین

اردو ادب کا جمال آفریں مستری — مرزا ادیب — 8
کتابیں جنھوں نے دنیا بدل ڈالی — ڈاکٹر مبارک علی — 13
تخلیق اور ایام تخلیق — مسلم شمیم — 16
فکر اقبال کی نوایہ ثروت مشترکہ — حسن عسکری کاظمی — 22
کلاسیکی موسیقی — دھرپد — ڈاکٹر جواز جعفری — 27

آپ بیتی

دن ڈھلنے لگا تھا — ڈاکٹر انور سدید — 35

منظومات

خواب — امجد اسلام امجد — 40
گیا (دوہے) — ڈاکٹر طاہر سعید ہارون
متضاد رستوں کے مسافر — ایصار عبدالعلی — 41
ایک عورت — ارمان نجمی (انڈیا)
یوم پاکستان — غالب عرفان
اگر تم بچنا چاہو — کرامت بخاری — 42
بہت مشکل ہے! — ڈاکٹر سلیمہ آغا قزلباش
میرے اندر موت کا کھیل — ڈاکٹر جواز جعفری

یادِ ڈاکٹر انور سدید — رشیدہ قریشی — 43
خواتین کے نام جو غیرت کے — فوزیہ مشتاق (امریکہ)
سچ زندگی ہے — مشرق صدیقی — 43

افسانے

تمہاری رضا ہی تو ہوں رہا — ڈاکٹر رشید امجد — 45
شکستہ جذبے — تحسین احمد (انڈیا) — 47
کہانیاں — نیلم احمد بشیر — 52
شمشان گھاٹ کی دلہن — محمد طارق علی — 55
بادِ اسرار — آمنہ مفتی — 61
فنا گزیدہ — طارق بلوچ صحرائی — 65
رشتوں کی ڈور — کلدیپ جوشی (انڈیا) — 69
ساون کا اندھا — محمد اعظم — 72
بڑی دیر ہو گئی — اظہر جاوید — 75

غزلیں

منظور حسین یاد، آصف ثاقب، سعود عثمانی، احسن عباسی، — 80
خالد اقبال یاسر، گستاخ بخاری، مرزا احمد نور طاہر،
نذیر فتح پوری، افتخار ساجد، قیصر نجفی، عراق مرزا،
پرتپال سنگھ بیتاب، طاہر منظور، رشیدہ عیاں، اسیر راتی شفق،
ضیاء اللہ طاہر، جاوید عباس جاوید — 85

یادنگاری

ہاشمی میر طلب — ڈاکٹر رشید امجد — 86

سفرنامے

سورج کے رخ پر — ڈاکٹر ایدال بیلا — 94

عراق اشک بار ہیں ہم	سلمیٰ اعوان	98

انٹرویو

افسانہ نگار اور صحافی احمد ندیم قاسمی	اظہر جاوید	104
جدید شاعری وعصری	نثار احمد صدیقی (انڈیا)	110

طنز و مزاح

بیچے روٹی اور الٹے	ڈاکٹر حسین قریشی	114
قینچی اور قلم	نجم الحسن رضوی	116

جائزے

''مٹی اور پاؤں'' پر ایک نظر	حنیف باوا	119
''مغربی تنقید کا مختصر تعارف''	خورشید بیگ میلسوی	122
''تخلیق'' کا انور سدید نمبر	منور عثمانی	124
O, Arab World	ڈاکٹر شگفتہ حیات نگین	130
ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور کا	سید مبارک شمسی	132
خوابوں کی آواز	حسن جعفر مبارک	134
خواب دیکھا کرو	محمد علی چراغ	139

پنجاب رنگ

سلیم شہزاد، حنیف باوا، منزہ شاہد		141

آفتاب خان کے تبصرے

الوداع اے بیاد ڈاکٹر انور سدید	ڈاکٹر ہارون رشید تبسم	142
جل پری	مسعود عثمانی	
پھول، خوشبو اور ستارہ	ڈاکٹر محمد شاہین مفتی	
ستارے ہے خاک پہ	محمد آصف مرزا	
روشنی جال	اعزاز احمد آذر	
منتخب عام اشعار	ارتضیٰ ساقی (انڈیا)	147

انجمن خیال

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، ارمان نجمی، محمد عارف علی، احسان بن مجید، غلام نبی اعوان، سلیم آغا قزلباش، ممتاز احمد خان، دردانہ نوشین خان، ڈاکٹر شگفتہ حیات، رشید وعیان، ڈاکٹر محمد اقبال صمصام، رشیدہ نفرین	148 - 159

تخلیق کو موصول رسائل اور کتب

ملکی اور غیر ملکی	160

سرورق

ایس خالد

ناشر: سوہان اظہر جاوید

طابع: بیدار سرمدی

قانونی مشاورت: لطیف احمد قریشی

مطبع: نیکسن پرنٹرز گلشن راوی، لاہور

مقام اشاعت:

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Islam Nagar, Walton Road, Lahore -Cantt

(اڈیٹنگ کے حقوق محفوظ)

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

پہلی بات

(قارئین "تخلیق" کو جشنِ آزادی اور پیشگی عیدالاضحیٰ مبارک!)

فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف سے ایک شائستہ آواز آئی۔ میں نیر جہاں بول رہی ہوں۔ سلام دعا کے بعد انھوں نے دلچسپ خواہش کا اظہار کر دیا کہ ان کی زندگی کی اہم خواہشات میں سے ایک یہ ہے کہ انھیں محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ اور محترمہ الطاف فاطمہ صاحبہ کی دستخط شدہ کتابیں مل جائیں۔ میں نے جواباً کہا کہ بانو قدسیہ صاحبہ کی ذمہ داری میں لیتا ہوں لیکن الطاف فاطمہ صاحبہ میرے رابطے میں نہیں ہیں کیونکہ بانو قدسیہ صاحبہ سے محبت اور عقیدت کا رشتہ ہے اور وہ بھی ہر موقع پر شفقت سے پیش آتی ہیں اور اکثر کہتی ہیں کہ اظہر کا بیٹا میرا بیٹا ہے۔ ان کی اس محبت کا ثبوت تو علالت کے باوجود اظہر جاوید کی چوتھی برسی کی تقریب میں تشریف لانے سے مل جاتا ہے۔ ان جیسی باوصف اور باکمال ادبی شخصیات اب ناپید ہو گئی ہیں (اللہ انھیں سلامت رکھے)۔

نیر جہاں صاحبہ کے اصرار پر میں نے الطاف فاطمہ صاحبہ کی تلاش شروع کی تو معلوم ہوا کہ وہ کافی عرصے سے ادبی منظر سے غائب ہیں۔ کافی تلاش کے بعد ان سے ٹیلی فون پر رابطہ ہوا۔ میں نے نیر جہاں صاحبہ کی خواہش کا اظہار کیا تو گرم جوشی سے کہا تم اظہر کے بیٹے ہو ضرور گھر آؤ میرے۔ لیکن جس دن سے میں ان کے گھر سے واپس آیا ہوں دل اداس ہے ہم کیسے لوگ ہیں ہم اپنے لیجنڈز کو بھول گئے ہیں؟ کس طرح یہ ادبی شخصیات تنہا اپنی زندگی بسر کر رہی ہیں؟ ان کے گھر کی خاموشی اور تنہائی پوچھ رہی تھی کہاں گئے مجھے سر آنکھوں پر بٹھانے والے؟ کہاں گئے وہ سب جو اپنی کتاب کا دیباچہ لکھوانے اور ایک تصویر کھنچوانے کے لیے قطار در قطار کھڑے رہتے تھے؟ کیا ہماری ذمہ داری نہیں کہ ان قد آور شخصیات کو اتنا پیار تو دیں جو ان کا حق ہے۔ بحیثیت قوم ہم سب پر قرض ہے؟ الطاف فاطمہ ہی نہیں میں اور بھی بہت سی ایسی ادبی اور فنی شخصیات کو جانتا ہوں جو گم نامی اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ میں اپنا احتجاج ریکارڈ کرا رہا ہوں۔ ثقافت کے علم بردار، خوشامدی چاپلوس اور فصلی بٹیروں کو نوازنے کے ساتھ ساتھ ریاست ان اصل اور سچے ادیبوں پر بھی توجہ دے جو ملک و قوم کا سرمایہ ہیں۔

ایک طرف تو عدالت عظمیٰ نے 1973ء کے آئین کے آرٹیکل 251(1) کے تحت اردو زبان کو قومی سطح پر نافذ کرنے کا حکم صادر کر کے اپنا فرض ادا کیا لیکن ستم کی بات ہے کہ نوکر شاہی اور سیاسی حکومتوں نے اب تک قوم کو نفاذ اردو کے فوائد اور برکات سے محروم رکھا ہے۔ انگریزی اب بھی پہلی جماعت سے پڑھائی جاتی ہے۔ ضروری ہو گیا ہے کہ اردو زبان کی قومی حیثیت کا اعلان کیا جائے اور اس کے نفاذ میں رکاوٹ ڈالنے والے ارکان اسٹیبلشمنٹ کی جواب دہی کی جائے۔ نیز سرکاری ملازمتوں کے تمام امتحانات اردو زبان میں لیے جائیں اور انگریزی کو اختیاری مضمون کی حیثیت دی جائے تا کہ اسے ہماری کمزوری نہ بنایا جائے۔

دوسری طرف آج کی سیاسی حکومتوں نے ادبی دنیا کو بھی زنگ آلود کر دیا ہے۔ مشاعروں اور ادبی تقریبات میں ایسی قومی اور بین الاقوامی شخصیات کو مدعو کیا جاتا ہے جن سے کسی قسم کے ذاتی و مالی مفادات کا حصول ممکن ہو۔ بیرون ملک مقیم غیر ادبی شخصیات کو اس لیے ادبی پروگراموں میں شرکت کے لیے خوشامدی اعزازات پر بلایا جاتا ہے کہ کل کو یہ ہمیں بیرون ملک فری ٹرپ سے فیض یاب کرائیں گے۔ اپنے ذاتی مقاصد کی تکمیل کے لیے ادبی کانفرنسوں کو ادبی میلوں میں تبدیل کر کے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت معاصر کو ادب کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ ان ادبی میلوں میں انھوں

کروڑوں خرچ کر کے اردو زبان کے فروغ کی کیا خدمت کی گئی ہے؟ بلکہ ہر میلے کے انعقاد کے بعد اخبارات میں احتجاج کی آوازیں ابھرتی ہیں اور شکایات کے انبار لگائے جا رہے ہیں جن کے ڈانڈے میگا کرپشن تک ہی پہنچتے ہیں۔ حکومت وقت اردو زبان و ادب کے فروغ کے لئے کوئی ٹھوس اقدام نہیں کر رہی بلکہ انگریزی کے فروغ کے لئے نت نئے انگریزی میڈیم تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں لا رہی ہے جبکہ وہ یہ بھول گئے ہیں کہ کسی قوم کی زبان ہی اس کی پہچان ہوتی ہے جو قومیں اپنی زبان سے محبت کرتی ہیں وہی کامیاب ہوتی ہیں۔

معیاری ادب اور اردو زبان کے فروغ میں دوسری بڑی رکاوٹ ادبی رسائل کی ترسیل کے لیے پوسٹ کی شرح ڈاک میں اضافہ ہے۔ بیرون ممالک رسالے کو پوسٹ کرنے سے پہلے کئی بار سوچنا پڑتا ہے۔ رجسٹری فیس میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے اس کے برعکس ہندوستان میں جب پہلا اخبار جاری ہوا تو اس دور کی انگریزی حکومت نے فروغ تعلیم کے لیے اخبارات، رسائل، جرائد اور مطبوعہ مواد کی ڈاک کی ترسیل کی شرح ارزاں کر دی تھی۔ شرح ڈاک میں غیر معمولی اضافے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب پاکستان اور ہندوستان میں اردو رسائل و کتب کی آمد و رفت اور تبادلہ رک گیا ہے۔ اس بار اضافہ کو واپس نہ لیا گیا تو آنے والے وقت میں ادبی رسالوں کو شائع کرنا اور ملک کے باہر بلکہ ملک کے اندر بھی بھیجنا ناممکن ہو جائے گا۔ ان تمام اقدامات سے دل برداشتہ ہونے کے باوجود میں اس عزم کا اعادہ کرتا ہوں کہ بحیثیت مدیر ماہنامہ "تخلیق" فروغ اردو ادب کے لئے کوشاں رہوں گا۔ ادبی دوستوں سے مشاورت اور خاصی سوچ بچار کے بعد یہ طے کیا ہے کہ ہم ادب کے فروغ اور ادبی بحالی کے لیے اپنا کردار ادا کریں اور اس کے لیے میں با خوشی یہ اعلان کرتا ہوں کہ "تخلیق" بہت جلد ادبی فورم تشکیل دے رہا ہے جس کا نام "تخلیق ادبی فورم" ہوگا۔ اس سلسلے میں کمیٹی ممبران سے مشاورت ہو رہی ہے۔ یہ کمیٹی "تخلیق ایوارڈ 2016ء" کے لئے ادبی شخصیت کے نام کا بھی جلد اعلان کرے گی۔ فورم کا بنیادی مقصد مالی طور پر کمزور ادیبوں کی کتب کی اشاعت اور ان کی عزت نفس کو مجروح کئے بغیر ان کی مالی امداد ہے۔ آپ تمام دوستوں سے درخواست ہے کہ انجمن خیال میں اپنی قیمتی آرا سے نوازیں اور 2016ء کے لئے آپ کسی ادبی شخصیت کو نامزد کرنا چاہتے ہیں تو اس کا اظہار کریں۔

مبارک باد حکومت پاکستان نے شعبہ ادب میں خدمات سرانجام دینے والے مندرجہ ذیل ادیبوں کو اعزازات سے نوازا ہے۔

ستارہ امتیاز: مستنصر حسین تارڑ، یوسف شاہین، داؤد پوتا، ڈاکٹر بائیل توکر (ترکی) **تمغہ امتیاز** محمد حمید شاہد، محمد جلیل عالی، ناصر علی سید، عبدالقیوم بیدار، سید حمید، پروین ملک۔ **تمغہ حسن کارکردگی** زاہد مسعود، انور شعور، رونق کمانی، نثار ترابی، شاکر شجاع آبادی، سرفراز شاہد، ڈاکٹر محمد قاسم بگھیو، محمد سلیم الرحمن، محمد حسین حسرت۔

ماہنامہ "تخلیق" کے تمام قارئین کی جانب سے تمام دوستوں کو ادب کے میدان میں خدمات پر ملنے والے اعزازات مبارک ہوں!

وفیات اور علیل: پچھلے دنوں بہت اچھے افسانہ نگار ذکاء الرحمن جہان فانی سے کوچ کر گئے۔ آج کل انجم الحسن رضوی صاحب امریکہ میں اپنا علاج کروا رہے ہیں اور میجر غلام نبی اعوان، فہیم الحسن جاوید، آپا نیر جہاں، رشیدہ عیاں صاحبہ علیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو صحت کاملہ عطا فرمائے!

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

حمد

جب ہو گیا پیغام رب سے ہستیاں آراستہ
اور وحدت سے ہوا پھر کل جہاں آراستہ

یہ مہ و خورشید و انجم سب اسی نے ہیں سجائے
کرتا ہے اپنے چمن کو باغباں آراستہ

جب بھی کرتا ہوں تصور خالقِ کونین کا
خود ہی ہو جاتے ہیں میرے قلب و جاں آراستہ

اس کے پرتو کی جھلک ہے اس کی ہر تخلیق میں
اس کے جلووں سے ہوا یہ خاکداں آراستہ

اپنے رب کی آرزو سے، اپنے رب کی یاد سے
میرے اس دل کے ہیں جسم و جاں آراستہ

اس کے ہر نقشِ حسیں سے روشنی ہے یوں بھی اس طرح
چاند تاروں سے ہے جیسے آسماں آراستہ

ہر دم و ہر سو رہا ہے اس کے جلووں کا ظہور
ہے تجلی سے تری میرا مکاں آراستہ

مدحتِ رب کے حسیں لفظوں سے ہوتا ہے ندیم
میرا سینہ، میرے شعروں کا بیاں آراستہ

اس کے جلووں سے ندیم، اس کے نظارے سے ندیم
چاند سورج جلوہ آرا، کہکشاں آراستہ

ریاض ندیم نیازی

ooo

نعت

ہے لازمی درود مسلسل پڑھا کریں
اس طرح اپنے دکھ کا مداوا کیا کریں

خونِ جگر سے ان کا لکھیں نام بار بار
طے اس طرح بھی درد کا ہر مرحلہ کریں

صلِ علیٰ وہی ہیں وہی "احمد" رسل
مقصد ہیں وہ انہی کے سہارے جیا کریں

یہ طے ہے ہر قرار ملے ان کے نام پر
ٹوٹے کبھی نہ رابطہ ان سے دعا کریں

کتنے کٹھن سفر ہوں کوئی معرکہ بھی ہو
عالم میں جذبِ شوق کے ہر دم رہا کریں

بھیجیں سلام ان پہ یہ میری بساط کیا
شام فراق آ تجھے آ تصور کریں

مالک ہے دوجہاں کا کرتا ہے بخششیں
شام طلب سے صبح تلک اب دعا کریں

آنکھوں میں اشک لے کے چلی اپنی زندگی
بسمل تمام حال ذرا عرض شاہ کریں

بسمل صابری

ooo

نعت

ماضی ہوں، حال ہوں کہ جہاں میں ہوں، کہاں آپؐ
رہتے ہیں گر میری طرف بھی نگراں آپؐ

منظر میں تو آنکھ میں نظر آئے تھے کبھی
لگتا ہے یہ کہ ہیں باعثِ تخلیقِ جہاں آپؐ

اشعار میں کیسے مجھے روشنی ہو کوئی؟
کر دیتے ہیں آساں مرے افکار بیاں آپؐ

کرتے ہیں عطائیں مجھے مدحت کے قرینے
رہتے ہیں سدا میرے قریبِ رگِ جاں آپؐ

بس ایک نظر آپ کی ہو جاتی ہے جب بھی
گلشن میں بدلتے ہیں مرے دل کی خزاں آپؐ

اس عہد کو تو حضرات کے آداب سکھا دو
دشمن پہ بھی کر دیتے تھے وا بابِ اماں آپؐ

نسیم سحر

ooo

مضامین

اُردو ادب کا جمال آفریں مستری

میرزا ادیب

(نوٹ: ادارہ "تخلیق" کو انور سدید کے پرانے کاغذات میں سے میرزا ادیب کے ہاتھ کی لکھی نایاب تحریر ملی جو "تخلیق" کے لئے اعزاز کی بات ہے۔ میرزا ادیب کے ہاتھ سے لکھی نادر تحریر کا نمونہ ادارہ "تخلیق" کے پاس محفوظ ہے۔)

چند روز ہوئے میں ادب کی ایک مخلوط محفل میں حاضر تھا۔ میں نے اس محفل کو مخلوط باعتبار جنس کے نہیں کہا۔ میری مراد محض طور پر یہ نہیں ہے کہ وہاں مرد بھی شامل تھے اور خواتین بھی بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ وہاں ادب کے کئی مکاتب فکر کے لوگ جمع تھے۔ نہ جانے کسی صاحب نے انور سدید کو موضوع گفتگو کیوں بنا لیا؟ ایک دم ایسا ہوا گویا سب کے سب کسی خفیہ تحریک کے زیر اثر متحرک ہو گئے ہیں اور ہر ایک یہ سمجھتا ہے کہ اگر اس نے اس اہم موضوع پر بحث نہ کیا تو اس کی ادبی حیثیت خطرے میں پڑ جائے گی۔ سلسلۂ گفتگو چل نکلا تو چلتا ہی گیا۔ میں ساری باتیں تو اپنے ذہن میں محفوظ نہیں کر سکا تھا، چند آرا ضرور محفوظ کر لی تھیں۔

ایک صاحب بولے "چھوڑیے میاں! کس آدمی کا نام لیا ہے۔ یہ انور سدید نہیں، انور شدید ہیں۔ شدتِ بیان کے علاوہ ان میں ہے کیا!"

دوسرے صاحب نے فرمایا "انھیں اپنے گرو وزیر آغا کے سوا اور کوئی نظر ہی نہیں آتا۔ انھی کی قصیدہ نگاری کرتے رہتے ہیں۔"

تیسرے صاحب نے زبان کھولی "یہ اپنی فضول حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔"

چوتھے صاحب بولے "بڑی سخت کی رائے دے رہے ہو۔ انور سدید تو سراپا ذہانت ہے۔ مجھے تو اس دور میں ان سے تیز تر لکھنے والا اور کوئی نظر نہیں آتا۔"

ان کے ساتھ جو صاحب بیٹھے تھے انھوں نے اس رائے کی تائید کی اور اپنی طرف سے کہنے لگے "انور سدید کی جو مخالفت کی جاتی ہے وہ مخالفت برائے مخالفت ہے۔ اگر یہ وزیر آغا گروپ کے آدمی نہ ہوتے تو تم انھیں گوہر نایاب تصور کرتے۔"

"گوہر نایاب!" ہونہہ۔ ایسے گوہر نایاب تو سڑکوں پر رلتے پھرتے ہیں۔" یہ الفاظ انھی صاحب کے تھے جو سب سے پہلے بول چکے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ معاملہ آپ سے تم پر آ گیا ہے اور باتوں کی تلخی کی وجہ سے گرم بازاری ہونے لگی ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں میں بھی زد میں نہ آ جاؤں میں نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ وہاں سے کھسک جاؤں اور میں نے یہی عقل مندی کی۔ اس گفتگو سے کم از کم ایک حقیقت واضح ہو گئی کہ انور سدید اردو ادب کی ایک متنازع شخصیت ہیں۔ ان کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کرنے والے بھی ہیں

اور ایسے لوگوں کی بھی معقول تعداد موجود ہے جو ان کی ذات پر سخت سے سخت تنقید کرنا اپنا فریضہ گردانتے ہیں۔ تو انور سدید اردو ادب کی ایک متنازع شخصیت ہیں۔ مگر اس وقت ایک سوال میرے ذہن میں ابھر آیا ہے وہ یہ ہے کہ کیا ایک ایسی شخصیت جس کے متعلق لوگوں کی آراء متضاد نوعیت کی ہوں، کیا ایک اہم شخصیت نہیں ہوتی؟ دیکھئے ہر شخص تو ادب کی ایسی شخصیت نہیں بن جاتا۔ لوگ عام شریف آدمی کے بارے میں تو سوچنا بھی مناسب نہیں سمجھتے۔ مگر ایک متنازع آدمی کے متعلق ضرور سوچا جاتا ہے اور ایسے آدمی کے بارے میں رائے بھی ظاہر کی جاتی ہے جو متضاد آراء کا محور بن گیا ہے۔ انور سدید کو آپ متنازع شخصیت کہہ کر آگے نہیں بڑھ سکتے آپ کو یہ بھی اعتراف کرنا ہوگا کہ اس آدمی کی اپنی ایک خاص اہمیت ہے۔ اہمیت نہ ہوتی تو ہمارے نقادوں کے لئے ایک مسئلہ کیوں بن جاتا؟ انور سدید کی یہ اپنی اہمیت ہی تو ہے کہ ایک صاحب نے جھنجھلاہٹ کے عالم میں انہیں مستری کہہ دیا تھا۔ انور سدید محکمہ انہار میں ایگزیکٹو انجینئر ہیں۔ اپنے عہدے کے لحاظ سے سماج میں بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ جن صاحب نے انہیں بزعم خویش مستری کہہ کر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا تھا انہوں نے اپنی طرف سے تو انہیں حقیر بنا دیا تھا مگر ہوا یہ کہ جب انور سدید کو معلوم ہوا کہ ان کے ایک مہربان نے انہیں مستری بنا دیا ہے تو مسکرانے لگے۔

خبر پہنچانے والوں کے لئے یہ معاملہ ایک معمہ بن گیا۔

"سدید صاحب! آپ مسکرا رہے ہیں!" کسی نے استفسار کیا۔

"جی ہاں! میں مسکرا رہا ہوں۔ آپ ازراہِ کرم میرا دلی شکریہ ان تک پہنچا دیں جنہوں نے مجھے مستری کا خطاب دیا ہے۔"

استفسار کرنے والے صاحب اور ان کے ساتھی مزید حیران ہو گئے۔ سدید صاحب نے انہیں زیادہ دیر تک پریشانی میں مبتلا دیکھنا پسند نہ کیا۔ کہنے لگے "میں تو ان کا ممنون ہوں، انہوں نے میری قدر افزائی فرمائی ہے۔"

"مستری کہہ کر؟"

"جی ہاں۔ مستری کہہ کر۔ آپ نہیں سمجھ سکے میں آپ کو سمجھاتا ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مستری ہونے کے ناتے میرا تعلق اپنے وطن عزیز کی مٹی اور پانی سے ہے۔ دونوں زندگی کی بڑی نعمتیں ہیں۔ سوچئے جس آدمی کا واسطہ وطن کی ان دو بڑی نعمتوں سے ہو اسے اور کیا چاہیے!" "میں اسی پانی اور مٹی کے ساتھ تعلق قائم ہونے سے حق حلال کی روٹی کھاتا ہوں۔"

میرا سوال یہ ہے کہ کیا اس صاحب نے انور سدید پر بات کرتے ہوئے یہ غلط کہا تھا کہ وہ سراپا ذہانت ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ایک تیز ذہانت ہی ایسا تحمل پیدا کرنے پر قادر ہو سکتی ہے۔ اب تو نہیں سدید صاحب ایک مدت تک خود کو مستری ہی کہتے رہے اور بڑا تو نہیں، بڑی سنجیدگی سے۔ میں نے محسوس کیا کہ انور سدید کے ادب کی قدر و منزلت تو ضرور کی جاتی ہے مگر مخالفت میں بھی کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ مخالفت کی اصل وجہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے یعنی وہ ڈاکٹر وزیر آغا کو اپنا گرو مانتے ہیں۔ مجھے خبر نہیں کہ گرو ماننے میں قباحت کیا ہے؟ انور سدید ایک بار نہیں بار بار برملا کہہ چکے ہیں کہ وہ آغا صاحب کو اپنا ادبی راہبر مانتے ہیں۔ کسی کو ادبی راہبر تسلیم کرنے میں برائی کیا ہے؟ ادب کے موجودہ دور میں جب گروہ بازی کے رجحان کا گراف بہت بڑھ گیا ہے۔ ہر گروہ کا کوئی نہ کوئی گرو بنا ہوا ہے تو انور سدید وزیر آغا کو گرو کہتے ہیں تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ جب انہیں وزیر آغا کو گرو ماننے کا طعنہ دیا جاتا ہے تو پتہ نہیں وہ یہ کیوں نہیں کہتے "ایں گناہ ہست کہ در شہر شما نیز کنند" ویسے یہ عرض کر دوں کہ اپنے گریبان میں جھانکنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس لئے بھی کہ گردن کو خم دینے سے اذیت

ہوتی ہے اور زیادہ وضاحت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اپنے گریبان میں جھانکنے سے جو کچھ وہ منظر نظر آتا ہے اس سے جھانکنے والا خود ہراساں ہو جاتا ہے۔

انور سدید کی ذات کو رگیدا جاتا ہے تو وہ بہت کم قابلِ ذکر ردِ عمل کا اظہار نہیں کرتے۔ البتہ جب ان کے گروہ کے کسی فرد پر تنقید کی جاتی ہے تو وہ خاموش نہیں رہتے۔ ہاں ایک مثال ایسی ہے جب میں نے انور سدید کو بھی خلافِ معمول مضطرب دیکھا تھا۔ ہم سب کے قابلِ احترام دوست جناب احمد ندیم قاسمی نے نہ جانے کیوں پچھلے دنوں انٹرویو دیتے ہوئے انور سدید کے متعلق کہہ دیا کہ وہ ان کا نام نہیں لینا چاہتے کہ اس سے ان کی زبان پلید ہو جاتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ فقرہ پڑھ کر مجھے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ الفاظ ندیم صاحب کے ہو سکتے ہیں۔ بہرحال یہ لفظ انہوں نے ہی کہے تھے۔ سدید صاحب نے ان کا نوٹس لیا اور شدت سے لیا۔ تلخی بڑھی اور بہت حد تک بڑھی۔ اس واقعے کے بعد پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے مجھے اتنا ہی دکھ ہوا جتنا ندیم صاحب کے مذکورہ فقرے سے ہوا تھا۔ ایک مشاعرے میں چند ایک نہایت غیر ذمے دار افراد نے ندیم صاحب کو غزل پڑھنے سے روک دیا۔ مجھے اب تک بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا ہوا ہے۔

یہ دونوں واقعے انتہائی تکلیف دہ تھے اور ان کی یاد سے کام و دہن میں کڑواہٹ سی گھل جاتی ہے۔ مگر میں ایک بات جانتا ہوں اور اس کا اظہار بے کم و کاست کرتا ہوں۔ میں ادب کا ایک پرانا طالب علم ہوں۔ اگر کہوں کہ میری ساری زندگی ادب ہی میں گزری ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ ادب کی دنیا میں ہر آن ہوائیں چلتی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی ان ہواؤں کے بعض جھونکوں میں خس و خاشاک بھی بھر جاتا ہے لیکن یہ ہوائیں جب تاریخ ادب کے رفیع الشان قصر کے قریب پہنچتی ہیں تو ہواؤں کے ساتھ چلتے ہوئے یہ جھونکے رک جاتے ہیں اور اپنا بوجھ گرا کر ہی آگے بڑھتے ہیں۔ میں نے جن ہواؤں کا ذکر کیا ہے وہ اپنے ساتھ ہر مصنف کے صرف خونِ جگر کی خوشبو اور اس کی شب و روز کی محنت کے پسینے کی بو لے کر قصرِ ادب میں داخل ہوتی ہیں۔

تاریخ ادب کسی مصنف سے یہ نہیں کہتی کہ تم نے فلاں وقت مشتعل ہو کر فلاں شخص پر بے جا تنقید کیوں کی تھی۔ کیونکہ اشتعال کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو وقتی اور ہنگامی ہوتا ہے۔ البتہ وہ یہ ضرور کہتی ہے کہ اگر معجزۂ فن لے کر آئے ہو تو بڑی خوشی سے میرے حوالے کر دو۔ میں اسے آنے والی نسلوں کو سونپ دوں گی۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ وقتی اشتعال میں جو کچھ کہا جائے اسے نظر انداز کر دینا چاہیے کیونکہ تاریخ ادب کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ انور سدید کی مخالفت کرنے والوں کو یہ اعتراض ہے کہ وہ مختلف ناموں سے کراچی کے اخباروں میں مخالف گروپ کے لوگوں کے خلاف لکھتے رہتے ہیں۔ سچی بات کہوں کہ سدید صاحب کے اس رویے پر مجھے بھی اعتراض ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ کوئی نقاب چہرے پر ڈال کر کچھ لکھنا میرے نقطۂ نظر سے مناسب نہیں ہے۔ کوئی شخص کچھ لکھتا ہے تو اسے سامنے آ کر اپنی تحریر کی پوری پوری ذمے داری قبول کرنی چاہیے۔ چھپنا نہیں چاہیے۔ دوسری وجہ یہ کہ میں خوب جانتا ہوں انور سدید میں تخلیقی صلاحیتیں بھرپور انداز میں ہیں۔ انہوں نے بہت تھوڑی مدت میں اتنی اعلیٰ معیار کی کتابیں ادب کو دے دی ہیں کہ واقعی حیرت ہوتی ہے۔ بسیار نویسی سے مصنف کا ذاتی معیار اگر بہت حد تک نہیں تو کسی حد تک ضرور اور لازماً متاثر اور مجروح ہوتا ہے۔ مگر انور سدید کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے بہت زیادہ لکھا ہے اور اپنا معیار قائم رکھا ہے۔ اس صورت حال میں وہ اس قسم کی کالم نگاری پر کیوں اپنا وقت اور اپنی صلاحیتیں ضائع کریں۔

چند ماہ سے سدید صاحب کے کالموں کی شکلیں مجھے دستیاب نہیں ہو رہیں۔ میری دلی تمنا ہے کہ انہوں نے یہ کالم لکھنے بند کر دیے ہوں۔ انور سدید بالعموم مسکراتے رہتے ہیں۔ ان کی مسکراہٹ دبی دبی ہوتی ہے۔ ہلکی ہلکی تارِ حریری کی طرح۔ آپ ان کے دفتر میں

تشریف لے جائیں تو اپنی فائلوں میں کتنے ہی مصروف کیوں نہ ہوں مسکرا کر آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ مجھے دار باتوں سے انھیں الرجی ہے۔ مختصر گفتگو کریں گے اور خاطر تواضع کا سلسلہ بھی جاری رہے گا۔ ان سے گھر پہ ملاقات کریں تو آپ کو کم و بیش دس بارہ منٹ ان کا انتظار کرنا پڑے گا۔ آتے ہی معذرت خواہی کے ساتھ کہ معاف کیجئے، ایک بڑا اہم کام کر رہا تھا۔ سمجھ لیجئے کہ وہ کوئی مضمون مکمل کر رہے ہوں گے۔ مضمون مکمل کئے بغیر اپنے کمرے سے باہر نکلنا ان کے لئے مشکل ہے۔ تیسری جگہ جہاں ان سے ملاقات ہوتی ہے کوئی تقریب ہوتی ہے۔ اگر دعوت نامے میں تقریب کا وقت پانچ بجے شام چھپا ہوتا ہے تو سدید صاحب تقریب کے ہال میں داخل ہونے والے پہلے شخص ہوں گے۔ تقریب ختم ہوگی تو ان کا اپنا مخصوص پروگرام شروع ہو جائے گا۔ تقریب میں جتنے لوگ بھی شامل ہوں گے ان سب سے فردا فردا ملیں گے نتیجہ یہ کہ تقریب کے ہال سے باہر نکلنے والے وہ آخری آدمی ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے دوستوں میں انور سدید سے زیادہ وقت کا پابند کسی کو نہیں پایا۔ سات بجے آندھی آئے یا موسلا دھار بارش ہو رہی ہو، وہ دفتر کو روانہ ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات میں نے یہ سوچ کر کہ موسم بڑا خراب ہے سدید صاحب ابھی گھر پہ ہوں گے انھیں ٹیلی فون کیا۔ معلوم ہوا وہ پانچ منٹ پہلے دفتر جا چکے ہیں۔ خیال رہے کہ میں نے سات بج کر پانچ منٹ پر فون کیا تھا۔

ہر کام وقت کی پابندی اور تنظیم کے ساتھ کرنے کے عادی ہیں۔ پڑھتے وقت ان کے ہاتھ میں کتاب ہوگی اور لکھتے وقت قلم۔ کتاب کی جگہ قلم نہیں لے سکتا اور نہ قلم کی جگہ کتاب لے سکتی ہے۔ بے تحاشا پڑھتے ہیں اور بے تحاشا ہی لکھتے ہیں اور حافظے کا یہ عالم ہے کہ جو کچھ ان کی نظروں سے گزر جاتا ہے وہ اپنے نقوش حافظے پر مرتسم کر کے جاتا ہے۔ ایک بار میں نے تہیہ کر لیا کہ مطالعے کے معاملے میں انھیں زچ پہنچاؤں گا۔ بھارت کے ایک بہت حد تک غیر معروف پرچے میں چھپے ہوئے ایک معروف قلم کار کے مضمون کا ان سے ذکر کر دیا۔ سوچا تھا مجھ سے مضمون کے بارے میں معلومات حاصل کر کے کچھ کہیں گے مگر صاحب! وہ نہ صرف مذکورہ مضمون پڑھ چکے تھے بلکہ اس کا ذکر بھی اپنے ایک مضمون میں کر چکے تھے جو ابھی غیر مطبوعہ حالت میں ان کے پاس پڑا تھا۔

سدید صاحب، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، محکمہ انہار میں ایگزیکٹو انجینئر ہیں۔ ایگزیکٹو انجینئر ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اچھی خاصی بڑی افسری ہوتی ہے۔ لیکن سدید صاحب کو اس افسری پر بالکل ناز نہیں ہے۔ کہتے ہیں یہ تو میرا اور میرے بچوں کے لئے رزق روٹی کا ایک ذریعہ ہے۔ بس البتہ میں نے جو بیس کتابیں لکھی ہیں یہ میرا اصل کام ہے۔ سدید صاحب واقعی اپنے ادبی کام کو اپنی متاع گراں بھی کہتے ہیں بلکہ اسے عبادت تک کا درجہ دیتے ہیں۔

باتوں باتوں میں ایک روز کہنے لگے۔ "روز قیامت میرے اعمال کی پرسش ہوگی تو میں اپنی ساری کتابیں اللہ میاں کے حضور پیش کر دوں گا اور کہوں گا۔ یہی میرا نامہ اعمال ہے۔" "اور اگر اللہ میاں نے یہ نامہ اعمال قبول نہ کیا تو —" میں نے سوال کیا۔ مسکرا کر بولے:
"نہیں میرزا صاحب! اللہ میاں بدذوق نہیں ہیں۔ وہ کوئی محتسب اور تنگ نظر نقاد بھی نہیں جنھیں صرف اپنوں کی تحریریں ہی پسند آتی ہیں اور دوسروں کی تحریروں میں سو سو کیڑے نکال دیتے ہیں۔ وہ میری عبادت قبول کر کے مجھے داخل بہشت ہونے کی اجازت دے دیں گے۔"

سدید صاحب بڑی خوبیوں کے آدمی ہیں۔ میں ان کی خوبیاں گنواؤں گا نہیں۔ ایک خوبی کا اظہار ضروری ہے۔ سدید صاحب ایک قناعت پسند آدمی ہیں اور یہی وہ خوبی ہے جس کی وجہ سے نہ تو انھوں نے کبھی قدرت کی کم عطیوں کا گلہ کیا ہے اور نہ اپنے روزگار کی شکایت ہی کی ہے۔ اپنی تنخواہ سے بچا بچا کر جو رقم جمع کی ہے اس سے ایک چھوٹا سا مکان اپنے اور بیوی بچوں کے لئے تعمیر کروا سکے ہیں اور

خوش ہیں کہ رہنے کے لئے ایک مکان موجود ہے۔ ہوٹل میں بیٹھنے اور لذیذ کھانے کھانے کا انھیں کوئی شوق نہیں۔ سیر و سیاحت سے بھی کوئی ایسی دلچسپی نہیں۔ نظم و نسق اور باقاعدگی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے قائل ہیں۔ روزمرہ کی مصروفیات ان کے لئے باعثِ طمانیت ہیں۔ میں جب بھی انھیں دیکھتا ہوں ان کے چہرے پر قلبی اطمینان کی روشنی ہی پاتا ہوں۔ انور سدید ایک انتہائی مطمئن انسان ہیں۔ علامہ اقبال کا یہ شعر ان کی ذات پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے:

تیری بندہ پروری سے میرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا، نہ شکایتِ زمانہ

زندگی تو بہرصورت انسان گزار ہی لیتا ہے۔ بیدل نے کیا خوب کہا ہے:

زندگی در گردنم افتادہ بیدل چارہ نیست
شاد باید زیستن، ناشاد باید زیستن

انور سدید اس شعر کے مصرعِ ثانی کے دوسرے حصے کو نہیں مانتے۔ کہتے ہیں ناشاد باید زیستن کیوں؟ انسان نے اگر خدا داد صلاحیتوں سے بہتر کام لیا ہے اور خلقِ خدا کو کسی نہ کسی ذریعے سے کچھ دیا ہے تو زندگی شاد ہے اس کے ناشاد ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اپنی اس تحریر میں پھر پیچھے جا کر اس حصے تک پہنچ جاتا ہوں جہاں انور سدید کو مستری کہا گیا ہے۔ سدید صاحب خود بھی اپنے آپ کو مستری کہنے اور کہلانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔

ادب کو اگر "تاج محل" سمجھ لیں اور قلم کار کو ایک مستری تو جو مستری بھی اس تاج محل کی تعمیر میں کسی نہ کسی طرح حصہ لیتا ہے اور اس کی آرائش و زیبائش میں اضافہ کرتا ہے وہ خود بھی تاج محل کے حُسن و جمال میں شریک ہو جاتا ہے اور انور سدید نے بھی اردو ادب کے تاج محل کے بنانے سنوارنے اور اس کے رنگ مرمر پر خوبصورت اور دلآویز نقش و نگار ابھارنے کی کامیاب اور قابلِ قدر کوشش کی ہے اس لئے میں انھیں مستری کہنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ وہ اردو ادب کے تاج محل کے ہنرمند آفریں مستری ہیں اور یہ حیثیت انھیں بہت بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے۔

◆◆◆

نیا سلسلہ

بین الاقوامی دوستوں کے رابطے کے لئے چند معروف لکھاریوں کے فون نمبر اور پتے

نمبر شمار	نام لکھاری	فون نمبر	پتہ برائے خط و کتابت
1-	جناب پروفیسر اعتبار ساجد	0333-5226995	158۔ علامہ اقبال ٹاؤن، گرومی شاہو، لاہور
2-	جناب اسلم گورداسپوری	0300-8081406	80۔ لارنس روڈ، لاہور
3-	جناب یونس جاوید	0333-4286647	903۔ فیز III-B ڈیفنس لاہور کینٹ
4-	جناب حامد سراج	03336833852	چشمہ بیراج، ضلع میانوالی
5-	جناب محمود شام	03218210736	A-262 گلشن اقبال، کراچی

کتابیں جنہوں نے دنیا بدل ڈالی

ڈاکٹر مبارک علی

کچھ کتابوں کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دنیا کو بدل ڈالا۔ ان کتابوں کا انتخاب اہلِ دانش اپنی مرضی اور حالات کے مطابق کرتے ہیں۔ لیکن جہاں کتابیں دنیا کو بدلتی ہیں، وہیں کچھ کتابیں ایسی بھی ہیں جو دنیا کو گمراہ کر کے اس کی پسماندگی کی ذمہ دار ہوتی ہیں۔ یورپ میں سائنسی انقلاب اور روشن خیالی کی تحریک کے بعد تین مفکروں کی کتابیں تھیں کہ جنہوں نے دنیا کے بارے میں نظریات اور خیالات کو الٹ پلٹ کر دیا۔ ان میں چارلس ڈارون (Charles Darwin) کی کتاب "اوریجن آف سپیشیز" (Origion of Species) جو 1859ء میں شائع ہوئی۔ اس نے انسانی ارتقاء کے بارے میں سائنس کی بنیاد پر ثبوت دے کر تخلیق کے عقیدے پر کاری ضرب لگائی جس کی وجہ سے اب تک اس کائنات کو مذہب کی نظر سے دیکھا اور سمجھا جاتا تھا اس کی اہمیت بدل گئی، اور اس کی جگہ سائنس نے لے لی۔ یہ اس بات کا سبب بنا کہ کائنات اور انسان کا مطالعہ سائنسی بنیادوں پر کیا جائے۔ اب تاریخ کا ایک نیا مکتبہ فکر جو بگ ہسٹری کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ کائنات اور انسان کے ارتقائی عمل پر تحقیق کر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے مفروضوں کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں۔

ڈارون کے ہی ایک ہم عصر کارل مارکس (Karl Marx) اور اس کے ساتھی اینگلز (Engles) نے 1848ء میں کمیونسٹ مینی فیسٹو (Manifesto) شائع کرایا۔ اس کے بعد 1867ء میں کارل مارکس کی کتاب (Das Capital) شائع ہوئی۔ ان دو کتابوں نے تاریخ، معیشت، فلسفے اور سیاسیات کے وہ دریچے کھولے جن کی وجہ سے سماج اور سوسائٹی کی پیچیدگیوں کو سمجھنے کی آگاہی پیدا ہوئی۔ یہ وہ نظریات تھے کہ جو دنیا بھر میں انقلابات کا باعث ہوئے۔

تیسرا اہم شخص سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) جس نے انسانی نفسیات کے پیچیدہ اسرار و رموز کھول کر اس کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کو بے نقاب کیا۔ لیکن جہاں ان کتابوں نے کائنات، دنیا اور انسان کے بارے میں خیالات اور افکار کو بدل دیا ہے، ایسی کتابوں کی بھی کمی نہیں کہ جنہوں نے نسلی تعصبات، انسان دشمنی اور یورپی سامراج کو تقویت دے کر ایشیا اور افریقہ کی حکومتوں کو جائز ثابت کیا۔ آرتھر گوبینو نے اپنی کتاب "An Essay on the Inequality of the Human" جو 1852ء میں شائع ہوئی۔ اس میں سفید اقوام کو برتر ثابت کرتے ہوئے یہ دلیل دی ہے کہ یہ ان کا حق ہے کہ وہ غیر یورپی اقوام پر حکومت کریں۔ اسی نظریے کو انگلستان کے فلسفی ہربرٹ سپنسر (Herbert Spencer) نے سوشل ڈارون ازم (Social Darwinism) کے تحت سروائیول آف دی فٹسٹ (Survival of the Fittest) کے ذریعے یہ دلیل دی کہ انسانی ارتقاء سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طاقتور قوموں کو زندہ رہنے کا حق ہے۔ کمزور قوموں کی قسمت میں موت کا ہونا لازمی ہے۔ ہربرٹ سپنسر اس کا بھی مخالف تھا کہ ریاست فلاحی (Welfare) ہو کیونکہ سوسائٹی میں جو کمزور لوگ ہیں انہیں زندہ رکھنے کے لئے ان پر خرچ کرنا بے سود ہے۔ لہٰذا جب ایڈولف ہٹلر نے 1925ء میں اپنی کتاب "MEIN

"KAMPF" شائع کی تو اس میں نسل پرستی کے افکار کی وہ بازگشت نظر آتی ہے جو ہٹلر سے پہلے یورپ کے نسل پرست دانشور اور سائنسدان کہہ چکے تھے۔ لہٰذا جب 1933 عیسوی میں ہٹلر برسراقتدار آیا تو اس نے اپنے نسل پرستانہ خیالات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے یہودیوں اور خانہ بدوشوں کا قتل عام کیا۔ اس نے EUGENIC پر عمل کرتے ہوئے اور پیدائشی طور پر کمزور بچوں کو اس تصور کے تحت مار ڈالا کہ جرمن قوم کو صحت مند اور مضبوط ہونا چاہیے۔ یورپ نے ان کتابوں کا سخت عذاب سہا اور اس کا حل بھی تلاش کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کتابوں کے نسلی تعصبات آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

اب ہم مختصراً یہ جائزہ لیں گے کہ مسلمانوں کے معاشروں میں وہ کونسی کتابیں تھیں کہ جنہوں نے فکری عمل کو روک دیا۔ یونانی فلسفے کے ترجمہ کے بعد مسلمانوں کی سوسائٹی میں جو ایک روشن خیالی کی لہر اٹھی تھی اس کو روکنے اور ختم کرنے کا کام امام غزالی (1111ء) نے کیا۔ اپنی کتاب "تہافۃ الفلاسفہ" میں انہوں نے فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے اس کو اس قدر رد کیا کہ مسلم معاشرے میں اس کی کوئی جگہ نہیں رہی۔ اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں انہوں نے مذہب میں کسی بھی نئی تشریح کے راستوں کو بند کر دیا۔ جس کی وجہ سے مسلم دنیا ایک جگہ ٹھہر کر روایتوں کی زنجیروں میں اسیر ہو گئی۔ جس سے اسے اب تک نجات نہیں ملی ہے۔ ہندوستان کا مسلم معاشرہ مغل زوال کے بعد اور برطانوی اقتدار قائم ہونے پر جن کتابوں سے متاثر ہوا ان کی مدد سے ہم اس کی ذہنی پختگی اور فکر کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ شروعات میں جن کتابوں نے اس کو اپنے سحر میں مبتلا کیا۔ ان میں طلسم ہوشربا، داستان امیر حمزہ، قصہ حاتم طائی اور قصہ چہار درویش وغیرہ تھیں۔ یہ کتابیں ایک مایوس اور بے بس معاشرے کے لئے نشہ آور تھیں جو انہیں حقیقی دنیا سے دور طلسماتی اور خوابوں کی سرزمین پر لے جاتی تھیں۔ جو انہیں وقتی طور پر سکون دینے میں مدد دیتی تھیں۔

ان کے بعد کتابوں کا نیا سلسلہ وجود میں آیا یہ اصلاحی تاریخی ناول تھے۔ بہت جلد انہیں مسلمان معاشرے میں مقبولیت ملی۔ کیونکہ وہ قوم جو عملی طور پر زوال شدہ تھی، شکست خوردہ تھی۔ ان ناولوں کے کرداروں میں وہ خود کو سوچتے ہوئے کافروں سے جنگ لڑ رہے تھے۔ انہیں شکست دے رہے تھے۔ فاتح ہو رہے تھے اور آخر میں کسی عیسائی دوشیزہ کو بھی انعام میں پاتے تھے۔ لہٰذا کتابوں میں تحریر شدہ ان فتوحات میں ہندوستان کے مسلم معاشرے میں ان حالات میں برتری کے ایسے احساسات پیدا ہوئے جبکہ حقیقت میں وہ گراوٹ اور پستی کے عالم میں تھے۔ یہ ایک ایسے فریب میں مبتلا تھے کہ جس سے چھٹکارا پانا ان کے لئے مشکل تھا۔ تاریخی ناولوں کے اس سلسلے کو آگے چل کر صادق حسین صدیقی سردھنوی نے آگے بڑھایا اور تقریباً ڈیڑھ سو ناول لکھ کر معاشرے کے ذہن کو نشہ آور بنایا۔ ان ناولوں کی جدید شکل نسیم حجازی کے یہاں ملتی ہے۔ جو اب تک اپنی مقبولیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

جب تاریخی ناولوں کا جادو ٹوٹا تو جاسوسی ناولوں کی لہر آئی، خاص طور سے ابن صفی کے جاسوسی ناول دلچسپی کا باعث بن گئے۔ جاسوسی ناولوں کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں سراغ رساں یا تحقیقی افسر اپنی ذہانت اور تجربے سے جرم کے سربستہ رازوں کو فاش کرتا ہے۔ اس بیانیے میں قاری حیرت زدہ ہو کر سراغ رساں کے کارناموں سے متاثر ہوتا ہے، اور پھر ایسے تاثر کو اپنی عملی زندگی میں قومی راہنماؤں سے جوڑتا ہے جو ایک سراغ رساں کی طرح معاشرے کے تمام مسائل حل کر دیں گے جبکہ سوسائٹی خاموشی کے ساتھ ان کے عمل کو دیکھے گی اور ان پر انحصار کرے گی۔ اس ذہنیت کے نتیجے میں سوسائٹی تماشائی بن جاتی ہے۔

آخر میں میں مولانا اشرف علی تھانوی کی کتاب ''بہشتی زیور'' کا ذکر کروں گا۔ یہ کتاب اس وقت لکھی گئی کہ جب ہندوستان کے مسلم معاشرے میں یہ بحث ہو رہی تھی کہ کیا عورتوں کو پڑھانا چاہیے یا نہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی اس کے حامی ہیں کہ عورتوں کو صرف اس قدر تعلیم دینی چاہیے کہ وہ گھر کا حساب کتاب کر سکیں۔ وہ عورت پر مرد کی بالادستی کے قائل ہیں اور عورت کے لئے گھر کے سوا کسی اور جگہ اس کی موجودگی کو پسند نہیں کرتے ہیں۔ کیونکہ اس کتاب میں عورت کو بطور غلام جاری ہونے کی ہدایات اور ترغیبیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کتاب لڑکیوں کو جہیز میں دی جاتی ہے کہ وہ تابع اور فرماں بردار بن کر رہیں۔

کسی بھی سوسائٹی میں کتابوں کی اشاعت سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیا شائع ہونے والی کتابیں دنیا کو بدلنے والی ہیں یا اسے فرسودہ روایات میں جکڑ کر رکھنا چاہتی ہیں۔ اس نقطہ نظر سے ہم پاکستان میں شائع ہونے والی کتابوں کا جائزہ لیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ یہ کتابیں مذہبی تعصبات، فرقہ وارانہ جذبات اور بے جا قومی فخر کے جذبات سے لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کر رہی ہیں۔ اس ذہنیت کا اظہار آج کے پاکستانی معاشرے میں نظر آتا ہے۔

(مذہبی معاملات میں ادارہ ''تخلیق'' کا لکھنے والے کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ یہ لکھنے والے کی رائے ہے)

◆◆◆

بین الاقوامی کارٹونسٹ جاوید اقبال

خلیق ابراہیم خلیق۔ شخصیت اور فکر و فن

مسلم شمیم

چند شخصیتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا تصور شرف بشر کے تفکر کو وجد کر دیتا ہے۔ ان چند شخصیتوں کی میری فہرست بھی بہت مختصر ہے۔ ان میں ایک شخصیت جناب خلیق ابراہیم خلیق کی ہے۔ ایسی شخصیتوں کا تصور مرحوم سرور بارہ بنکوی کے مشہور شعر کی طرف توجہ مبذول کراتا ہے۔ سو میرے ذہن میں جب بھی جناب خلیق ابراہیم خلیق کی شبیہ ابھرتی، سرور بارہ بنکوی کا یہ شعر لبوں پر بے ساختہ مچلنے لگتا ہے

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے، وہ لوگ　　　آپ نے دیکھے نہ ہوں شاید مگر ایسے بھی ہیں

خلیق ابراہیم خلیق کے حوالے سے یہ نقوش گوارہ شاید ان کے پورے حلقۂ ارادت کی قدر مشترک ہے۔ ان کی شخصیت کی جامعیت اور کثیر الجہتی پر تمام گوشوں سے روشنی ڈالنا اور گفتگو کرنا زیر نظر تحریر میں شامل نہیں ہے، بلکہ میرے پیش نظر وہ صاحب فکر دانشور شخصیت ہے جو کتاب "منزلیں گرد کے مانند" کے مطالعے کے نتیجے میں مجھ پر منکشف ہوئی ہے اور جس نے مجھے بے حد متاثر کیا اور سچ پوچھیے تو اس کتاب کے مطالعے سے قبل میری عقیدت اور احترام کی نوعیت بے اساس تھی۔ اس کتاب کے علاوہ میں نے ان کی تین طویل نظموں کا مجموعہ "اجالوں کے خواب" پڑھا تھا اور توجہ سے پڑھا تھا۔ اس مجموعے کے مطالعے کے دوران ان نظموں کے خالق کی وسعت فکر کے ساتھ گہری علمی کا اندازہ ہوا تھا مگر اس کی نوعیت بھی abstraction پر مبنی تھی یعنی قیاس اور تخیل کی کارفرمائی تھی مگر "منزلیں گرد کے مانند" کے مطالعے نے مجھے "آفتاب آمد دلیل آفتاب" کے مرحلے میں پہنچا دیا اور اب وہ میرے سامنے ایک intellectual giant کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا word view اور global vision قابل رشک ہے اور جس کا آئیڈیالوجیکل کمٹمنٹ قابل تقلید۔

خلیق ابراہیم خلیق کے آباؤ اجداد کا تعلق کشمیر سے ہے۔ وہ برہمن ذات کی معروف ترین شاخ کول سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی وہ شاخ ہے جس سے موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کا تعلق تھا جو دہلی کی ایک نہر پر آباد ہونے کے حوالے سے نہرو کہلائے۔ خلیق صاحب کا قبیلہ اسلام قبول کرنے کے بعد ترک وطن کر کے جھوائی ٹولہ لکھنؤ میں آباد ہو گیا، وہاں انھوں نے طبابت کا پیشہ اختیار کیا اور اطبائے جھوائی ٹولہ نے ہمہ گیر شہرت حاصل کی۔ جناب خلیق ابراہیم خلیق یکم فروری 1926 کو لکھنؤ کے مذکورہ خانوادے میں پیدا ہوئے۔ 1926ء میں خلیق صاحب کے والد حکیم محمد رفیق ابراہیم حیدرآباد دکن میں مقیم تھے۔ وہ جلد ہی لکھنؤ واپس آ گئے جہاں خلیق صاحب نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ وہ مرزا محمد عسکری جیسے جید عالم کے زیر تربیت رہے۔ کالی چرن ہائی اسکول سے انھوں نے میٹرک پاس کیا، کرسچین کالج سے انٹرمیڈیٹ کیا، پنجاب یونیورسٹی سے بی اے میں امتیازی کامیابی حاصل کی اور ادیب فاضل اردو میں یونیورسٹی میں ٹاپ کیا۔ اس دوران ان کا تخلیقی سفر شروع ہوا اور ان کی ادبی تحریریں، افسانے، مضامین و مقالات اور شعری تخلیقات ہندوستان کے موقر ترین جریدوں میں شائع ہونا شروع ہو گئیں۔ وہ آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور انجمن ترقی پسند مصنفین میں بھی فعال رہے اور کچھ عرصہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کے سیکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ شعر و ادب سے گہرے شغف کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنی معاشی زندگی کے لیے فلمی کیریئر کا

انتخاب کیا جس کا آغاز انفارمیشن فلمز آف انڈیا سے بحیثیت ڈاکومنٹری ڈائرکٹر کیا اور وہیں فلم سازی کی تربیت حاصل کی۔ 1953ء میں پاکستان آنے کے بعد کچھ عرصے انگریزی روزناموں "ٹائمز آف کراچی"، "پاکستان ٹائمز لاہور" اور "ڈان" کراچی میں فری لانس صحافی کی حیثیت سے مضامین اور کالم لکھتے رہے۔ پھر محکمہ فلمز و مطبوعات حکومت پاکستان سے منسلک ہو گئے جہاں سے انھوں نے ریٹائرمنٹ حاصل کی۔ انھوں نے انتہائی کم وسائل اور نامساعد حالات میں اعلیٰ معیار کی درجنوں دستاویزی فلمیں بنائیں جن میں کئی ایک نے بین الاقوامی اعزازات حاصل کیے۔ ان میں Cannes سے ملنے والا ایوارڈ بھی شامل ہے۔ 1960ء میں انھیں سینماٹوگرافی کے شعبے میں خدمات کے اعتراف میں تمغۂ امتیاز دیا گیا۔ ان کی کامیاب ترین دستاویزی فلموں میں "پاتھ وے ٹو پراسپیرٹی"، "ون ایکڑ آف لینڈ"، "کلچرل ہیریٹیج آف پاکستان"، "پاکستان اسٹوری"، "فن تعمیر" اور "مرزا غالب" شامل ہیں۔

مذکورہ بالا کوائف سے جناب خلیق کی شخصیت کی کثیر الجہتی اور جامعیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ انھوں نے تینوں شعبوں یعنی صحافت، فلم سازی اور ادب میں اپنے کارناموں کے ایسے تابندہ نقوش چھوڑے ہیں کہ جن کے توسط سے وہ تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ ایک اہم حوالے کے طور پر جانے جائیں گے۔ بہرحال "اجالوں کے خواب" کی تمام نظموں اور غزلوں میں شاعری کے جو محاسن اور غیر معمولی توانائی پائی جاتی ہے، میری رائے ہے کہ وہ بھرپور خلاقیت کے حامل تخلیق کار ہیں اور ان کی شاعری خاص خانوں میں رکھ کر دیکھی اور پرکھی جانے کے لائق ہے۔ ان کی اہم ترین تصنیف "منزلیں گرد کے مانند" جو ان کو زندۂ جاوید ہونے کی ضامن ہے اس کے حوالے سے میرا موضوعِ گفتگو ہے۔ جناب خلیق ابراہیم کی شاعرانہ خلاقیت جو ان کی غزلوں اور نظموں میں مجھے نظر آئی اس کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب میں اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں، یعنی "منزلیں گرد کے مانند" کے مطالعے نے مجھے کیا کچھ دیا اور کیا کچھ دکھایا، یعنی اپنا حاصل مطالعہ آپ تک پہنچانے کی جسارت رکھتا ہوں۔ یہ کتاب جسے خودنوشت کا نام دیا گیا ہے، میرے نزدیک اس کی کئی حیثیتیں ہیں۔ خودنوشت کے علاوہ یادداشتوں کے خانے میں یہ کتاب اس طرح سجائی جا سکتی ہے جس طرح بطور خودنوشت لیکن اس کے علاوہ بھی اس کتاب میں کئی کتابیں پائی جاتی ہیں، بالفاظ دیگر اس کے متن اور بطن سے کئی اور کتابوں کی ترتیب و تدوین کی جا سکتی ہے۔ ایک تاریخ بھی مرتب کی جا سکتی ہے جس میں برصغیر کے ساتھ ساتھ ہم عصر عہد کی سیاسی تحریکیں مرقوم ہیں اور سماجی اور ثقافتی زندگی کا اجمالی بیان اور تجزیاتی documentation کیا گیا ہے۔ گزشتہ دو صدیوں پر محیط روشن خیالی، خرد افروزی اور تعقل پسندی کی معتبر روداد اس کتاب سے ماخوذ ہو سکتی ہے۔ تاریخ شعر و ادب کی بھی یہ ایک جامع کتاب ہے اور معروف معنوں میں ایک جامع تذکرے کی کتاب بھی اس میں شامل ہے اور یہ ایک ایسا تذکرۂ شعرا و ادبا ہے جس میں صاحبِ تصنیف کی بصیرت و بصارت کی روشنی قاری کی آنکھوں کو چکاچوند کیے رکھتی ہے اور ان کے تنقیدی شعور کا ایک ایسا اظہار ملتا ہے کہ اس کا مطالعہ اردو تنقید کی ایک بہت اہم کتاب کے طور پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی تصنیف ہے جس کو کتاب الکتب کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کے مختلف شعبے اور گوشے اپنی جامعیت اور افادیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بڑھ کر اور وقیع تر ہیں۔ سوشل سائنسز کے طلبا کے لیے بھی اس کتاب میں اس قدر پرکشش مواد شامل ہے جس طرح شعر و ادب کے طالبات کے لیے۔ صاحب کتاب نے اس تصنیف کو خودنوشت سوانح عمری قرار دیا ہے۔ لہٰذا بطور خودنوشت کے اس کا مقام متعین کرتے ہوئے ہمارے پیش نظر شامل کتاب جناب مشفق خواجہ کی وقیع رائے ہے۔ اس سے ایک اقتباس درج کر رہا ہوں جس کی روشنی میں گفتگو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔

"عام طور پر خودنوشت اپنی ذات پر پردے ڈالتی ہیں تاکہ حقیقت اس صورت میں سامنے آئے جس طرح وہ چاہتے

> ہیں نہ کہ اس صورت میں جس طرح کہ وہ ہے۔ اپنی ذات کو کائنات کا مرکز سمجھ کر خود پرستی کی انتہاؤں تک پہنچ جاتے ہیں اور افسانوں واقعوں کو حقیقت بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس طرح آپ بیتی گزارے ہوئے واقعات کی نہیں خواہشوں، تمناؤں اور حسرتوں کی روداد بن جاتی ہے۔ اس صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ خود نوشت نگار اس خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ وہ جس موضوع پر لکھ رہے ہیں، اس کا ماخذ چونکہ ان کی اپنی ذات ہے، اس لیے انھیں یہ حق حاصل ہے کہ وہ جو چاہیں اور جس طرح چاہیں لکھیں لیکن ایک دیانت دار خود نوشت نگار اس ناجائز حق کو استعمال نہیں کرتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آپ بیتی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر نہیں لکھی جاتی کہ صرف اپنا ہی چہرہ نظر آئے، اپنے گرد و پیش پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ جس معاشرے سے وہ وابستہ ہے، اسے نظر انداز کر کے وہ اپنے آپ سے انصاف نہیں کر سکتا۔ ایک اچھی آپ بیتی صرف ذات کی ترجمان نہیں ہوتی، اس معاشرے کی بھی عکاسی ہوتی ہے جو فرد کی ذات کی تشکیل و تعمیر کرتا ہے اس اعتبار سے خلیق ابراہیم خلیق کی زیر نظر آپ بیتی ایک مثالی آپ بیتی ہے۔ یہ ایک فرد کی داستان حیات ہی نہیں، ایک پورے عہد کی معاشرتی، سیاسی، علمی اور ادبی تاریخ بھی ہے۔"

جناب مشفق خواجہ کی مذکورہ رائے کا آخری فقرہ میرے نزدیک خصوصی طور پر قابل توجہ اور قابل غور ہے۔ میں نے جب ''منزلیں گرد کے مانند ___'' کا مطالعہ کیا تو مجھے مذکورہ رائے کے حرف حرف سے متفق ہونے کا احساس ہوا اور میری یہ تحریر گویا اس احساس کی تفسیر ہے۔ اس خود نوشت کے مطالعے کے دوران متعدد خود نوشت سوانح عمریوں کے نقوش ذہن کے پردے پر ابھرے۔ خود نوشت سوانح عمریوں کا مطالعہ میرے خیال میں ادب اور غیر ادب کے قارئین کے لیے یکساں دلچسپی کا سامان بہم کرتا ہے۔ 'ذکر میر' اور 'یادوں کی بارات' دو وجہ سے خلاف اپنی ادب کی آپ بیتیاں ہیں۔ ''ذکر میر'' میں بھی اس عہد یعنی زوال آمادہ جاگیردارانہ ثقافت و اقدار کی تصویر کشی ملتی ہے اور خانقاہی زندگی میں عشق مجازی سے عشق حقیقی کے مدارج اور مراحل کی حکایات قارئین کو طرح طرح کے سوالات اور الجھنوں سے دوچار کرتی ہیں اور مجموعی طور پر اجالوں سے محروم سماج کی تصویر ابھرتی ہے۔ ''یادوں کی بارات'' میں الفاظ پردازی بلکہ الفاظ سے نگاری کے سحر میں قاری جہاں مبتلا رہتا ہے وہاں سچ اور جھوٹ کی سرحدیں کہاں شروع ہوتی ہیں اور کہاں ختم ہوتی ہیں؟ ان وسوسوں اور مرحلوں سے بھی دوچار رہتا ہے۔ بہر حال ''ذکر میر'' اور ''یادوں کی بارات'' کی ادبی حیثیت اور قدر و قیمت کا تعین کرنا میرا منصب نہیں۔ میر تقی میر اور جوش ملیح آبادی جیسی قد آور اور نابغہ عصر شخصیات کی خود نوشت کی جو شہرت اور مقبولیت تاریخ کا حصہ بن چکی ہے، وہ ''منزلیں گرد کے مانند ___'' کے حصے میں بھی نہیں آسکتی۔ شہرت اور مقبولیت کے باب میں نہ سہی افادیت اور اہمیت کے باب میں یہ خود نوشت ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے اور اس اعتبار اور زاویہ نظر سے تاریخ ادب میں غیر معمولی خود نوشت گردانی جائے گی۔ اس کا وصف خاص ''آپ بیتی'' برائے نام' اور جگ بیتی'' تمام'' ہونا ہے۔ خلیق صاحب نے سماج، عہد اور ہم عصر زندگی کو پہلے پیش نظر رکھا ہے اور اپنی ذات کو اس کا ایک ادنیٰ حصہ جانا ہے۔ سو یہ خود نوشت صاحب کتاب کے اس ادراک اور تفہیم کا بیان ہے جو اس نے اپنے سماج، اس کے ارتقائی مراحل، اپنے عہد اور ہم عصر زندگی کے حوالے سے حاصل کیا ہے اور غرض و غایت یہ نظر آتی ہے کہ وہ اس ادراک اور تفہیم کو بالفاظ اور اپنے قارئین سے share کرنا چاہتا ہے۔ یہ مشاہدہ ادراک و تفہیم جو ایک ایسی بھرپور زندگی گزارنے کے بعد حاصل ہوتا ہے جیسی زندگی خلیق ابراہیم خلیق نے گزاری ہے۔ جناب خلیق ابراہیم خلیق کا دیرینہ تعلق اور ان کا تحرک ترقی پسند تحریک رہی ہے۔ یہاں یہ بات بھی برمحل ہے کہ خلیق صاحب نے

صرف برصغیر کی تحریکوں اور تبدیلیوں کا مشاہدہ نہیں کیا تھا بلکہ ان کے مشاہدے کا تناظر بین الاقوامی بلکہ عالمی (Global) ہے۔ چنانچہ انھوں نے کرۂ ارض پر ہونے والے حادثات و واقعات اور تبدیلیوں کا مشاہدہ کیا تھا جسے زیر نظر کتاب میں تفصیل سے بیان بھی کیا ہے۔ انھوں نے 'انقلاب روس کے اثرات اور اشتراکیت کا نمو' کے زیر عنوان جن افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ ان کے global vision کا اظہار ہے۔ دوسری عالمی جنگ 1939ء۔ 1945ء کا پس منظر اور پیش منظر بھی ان کے مشاہدے اور مطالعے کا حصہ رہا تھا جس کا بیان انھوں نے کتاب مذکورہ کے گیارھویں باب میں کیا ہے۔ برصغیر کی آزادی کی تحریک بھی وسیع تر تناظر میں دیکھی اور بیان کی گئی ہے، خصوصیت کے ساتھ انقلاب اکتوبر کے آدرش کو پیش نظر رکھ کر آزادی کی تحریک کے حوالے سے یہ سوالات اٹھائے جاتے رہے کہ آزادی کا مطلب و مقصد کیا صرف یہی ہے کہ گورے آقاؤں کی جگہ کالے آقا آ جائیں، بلکہ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نظام رائج کیا جائے جس میں عوام کی بالادستی ہو اور معاشرہ ہر قسم کے استحصال سے پاک ہو۔ یہ فکر 1917ء کے اشتراکی انقلاب کی دین تھی۔ یہ انقلاب روس کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں طلوع سحر کی حیثیت رکھتا تھا اور ساری دنیا کے مظلوم و محکوم محنت کش عوام کے لیے بیداری کا پیغام تھا جس نے دنیا بھر کے انسانیت دوست دانش وروں کو شدت سے متاثر کیا جس کی پذیرائی علامہ اقبال نے اس شعری صورت میں کی تھی:

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا   آسماں! ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک!

برصغیر کی تحریک آزادی کا پس منظر زیر نظر کتاب کے مختلف ابواب میں بیان ہوا ہے اور پیش منظر بھی۔ ایک مختصر تاریخ تحریک آزادی اس کے اوراق اور بین السطور سے مرتب کی جا سکتی ہے جو 1857ء کی ناکام جنگ آزادی سے شروع ہو کر 14 اگست 1947ء کو قیام پاکستان تک پہنچ کر اپنی منزل اور سمت دونوں کھو بیٹھی۔[1] آزادی کی منزل Myth of Independence بن گئی اور 1971ء میں یہ خواب مزید منتشر ہو گیا جب ملک شکست و ریخت سے دوچار ہوا اور اس سانحے میں لاکھوں عوام کام آ گئے۔ آزادی کی تحریک کی داستان میں تمام حادثات و واقعات و سانحات کا بیان کہیں اختصار، کہیں تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں قارئین کے ذوق مطالعہ کو مہمیز کرتا ہے لیکن کہیں اس بیان میں element of fiction اور right of imagination کا عمل دخل نہیں پایا جاتا۔ جو بات بھی کی گئی ہے، وہ ٹھوس حقائق سے ماخوذ ہے۔ صاحب کتاب کا نقطۂ نظر اور زاویۂ نگاہ البتہ ہر مقام پر واضح ہے۔ اس باب میں خصوصیت کے ساتھ 1985ء میں انڈین نیشنل کانگریس کا قیام، 1905ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ، پہلی جنگ عظیم 1914ء، 1946ء کی Quit India Movement اور اعلان آزادی سے قبل 1946ء کے انتخابات اور بہت سی تحریکوں اور تنظیموں کا اس کتاب میں بھرپور ابلاغ کے ساتھ بیان ملتا ہے۔ صاحب کتاب کا سیاسی شعور اور سیاسی بصیرت ہر گام قارئین کی توجہ کا مرکز بنتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ یہ مجموعہ کتب ہے اور اس کے مختلف ابواب کو ترتیب دے کر متعدد کتابیں تیار کی جا سکتی ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے حوالے سے یہ کتاب میری رائے میں 'روشنائی' کے بعد سب سے اہم اور جامع کتاب ہے۔ ترقی پسند تحریک کے آغاز سے لے کر انجمن ترقی پسند مصنفین کی پانچویں کانفرنس تک جو بمبئی کے نواح میں بھیونڈی میں 27 مئی 1949ء کو منعقد ہوئی تھی اور جو تین روز جاری رہی تھی، اس کی ایک ایسی روداد شامل کتاب ہے جس میں نظریاتی مسائل سے لے کر تنظیمی امور پر تمام بحث و تمحیص کا تفصیلی بیان قارئین کے لیے فکر و شعور کے دریچے وا کرتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ارتقائی سفر کی تفصیلات کتاب کے متعدد ابواب میں بیان کی گئی ہیں۔

(1) یہ صاحب مضمون کا اپنا موقف ہے۔

اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت سجاد ظہیر کی شہرۂ آفاق کتاب 'روشنائی' کی یاد تازہ ہوتی رہی ہے۔ سجاد ظہیر کی طرح خلیق صاحب کے یہاں فکری توازن و ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور انھوں نے تفصیل کے ساتھ بعض ترقی پسندوں کے فکری انتشار اور بعض کی انتہا پسندی کی نشان دہی کی ہے۔ خلیق صاحب نے کچھ مقامات پر "روشنائی" میں دی گئی سجاد ظہیر کی آرا سے بھی اختلاف کیا ہے۔ خلیق ابراہیم سے اختلاف کیا ہے اور پروفیسر احمد علی کی ترقی پسند فکر اور نظریے سے کسی روگردانی کو انھوں نے قبول نہیں کیا۔ پروفیسر احمد علی نے بقول ان کے بہتر زمانہ لکھنؤ میں پہلے طالب علم اور پھر استاد کی حیثیت سے گزرا اور ترقی پسند ادب کی نشوونما اور فروغ کے لیے سجاد ظہیر، محمود الظفر اور رشید جہاں کی معیت میں ان کی مساعی اور ادارہ میں ان کی تخلیقی سرگرمیوں کا سنہرا دور تھا۔ 1939 میں پروفیسر احمد علی کی ادبی زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین سے الگ ہو گئے مگر تکنیکی طور پر دور ہونے سے ترقی پسند فکر اور نظریے سے ان کی قربت برقرار رہی۔ سجاد ظہیر سے پروفیسر احمد کے اختلاف رائے کو خلیق صاحب نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

> "سجاد ظہیر صرف پرولتاری ادب یعنی اس ادب کو جو مزدوروں اور کسانوں کی زندگی اور ان کے مسائل کے بارے میں ہو ترقی پسند ادب قرار دیتے تھے، جبکہ احمد علی کا موقف یہ تھا کہ ادب کو کمیونزم کی تنگنائے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے ہر پہلو میں ترقی پسندی موجود ہے اور متوسط طبقے کی زندگی کے بارے میں بھی جس سے تحریک کے بانی ارکان کا تعلق تھا، ترقی پسندانہ نقطۂ نظر سے لکھا جا سکتا ہے۔ اور غائر نظر سے دیکھیے تو احمد علی کا یہ بیان تسامحات پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ سجاد ظہیر اور محمود الظفر کی طرح کمیونسٹ پارٹی کے ممبر نہیں تھے لیکن اشتراکیت کی جانب ان کا رویہ ہمدردانہ تھا اور انسانیت کو درپیش بیشتر مسائل پر ان کی سوچ وہی تھی جو ان کے کمیونسٹ دوستوں کی تھی۔ ادب و فن کے بارے میں مارکس اینگلز اور لینن کے خیالات اور رویوں میں جو وسعت نظر کارفرما تھی، وہ اس سے بخوبی واقف تھے۔"

آگے چل کر خلیق صاحب نے لکھا ہے:

> "انجمن کے بعض نوجوان ارکین کے علی الرغم سجاد ظہیر نے احمد علی کے ادبی ہنر اور ذوق کا اعتراف تو کیا لیکن ان کے اردو کو چھوڑ کر انگریزی میں لکھنا شروع کر دینے پر جس رائے کا اظہار کیا ہے، اس کی ان جیسے انصاف پسند دانش ور سے توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ احمد علی اپنی انگریزی تحریروں میں بھی انسان دوستی، حقیقت نگاری اور ترقی پسندی کی روش پر قائم رہے اور ان کی کتابیں کیلیفورنیا یونیورسٹی اور کولمبیا یونیورسٹی کے نصاب میں شامل رہی ہیں۔ ان کے علاوہ کم لکھنے کے باوجود وہ اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں شامل ہیں۔"

سجاد ظہیر اور احمد علی کے درمیان پائے جانے والے اختلاف رائے کے بارے میں خلیق صاحب کا موقف یہ ہے:

> "بہرکیف اس افسوس ناک قضیے میں مغالطوں اور غلط فہمیوں کا بھی دخل تھا اور دونوں فریق غلط اندیشی کے بھی مرتکب تھے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ تمام بدگمانیوں اور رنجشوں کے باوجود احمد علی تمام عمر ترقی پسند رہے اور اپنی ترقی پسندی پر انھیں ہمیشہ فخر رہا۔"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے حوالے سے بھی خلیق صاحب کا رویہ اور رائے دوسرے ترقی پسند اکابر بشمول سجاد ظہیر کے مختلف

ہے جس کا اظہار زیرِ نظر کتاب میں بھی ہے اور ان کے اس مضمون میں بھی جو 26 اگست 1992ء کو آرٹس کونسل آف پاکستان کراچی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس بیادِ اختر حسین رائے پوری میں انھوں نے پڑھا تھا۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کے حوالے سے مذکورہ مضمون کے آخری جملے ناقابلِ فراموش ہیں:

> "ارتقائے انسانی کے سفر کے موجودہ مرحلے میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی دانش ورانہ بصیرت کا یہ اظہار اکیسویں صدی کی دہلیز پر ترقی پسند ادیبوں اور سماجی سائنس دانوں کے لیے نشانِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے کہ عصرِ حاضر کی شکست و ریخت میں انسان کی تعمیر کے دو ستون باقی ہیں، جمہوریت اور اشتراکیت۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور تشنہ ہے۔ جمہوریت وہ جو سرمایہ داری کے تسلط سے آزاد ہو اور اشتراکیت وہ جس پر کسی بھی قسم کی آمریت کا قبضہ نہ ہو۔"

"منزلیں گرد کے مانند — "کو اگر ایک تذکرۂ شعرا و ادبا کہا جائے تو بھی غلط نہ ہوگا مگر یہ ایسا تذکرہ ہے جس میں شعرا و ادبا کی ذات و صفات اور ان کے فن و شخصیت کا ایسا جائزہ اور تجزیہ پیش کیا گیا ہے جو تنقیدی مقالات میں پایا جاتا ہے۔ شعرا کی ایک طویل فہرست ہے جن کے فن اور شخصیت پر کہیں اختصار، کہیں تفصیل سے انھوں نے بحث کی ہے اور ان کے مقام و منصب کا تعین کیا ہے۔ شعرا کے فن اور کمالِ فن پر ناقدانہ اظہار کرنے میں دیانتِ فکر و نظر کے ساتھ وسعتِ قلب و نگاہ سے کام لیتے ہوئے انھوں نے کسی امتیاز و تفریق کو خاطر میں نہیں رکھا۔ تمام مکاتبِ فکر کے شعرا پر انھوں نے ایک دیانت دارانہ ناقدانہ نظر سے بھرپور انصاف سے کام لیا ہے۔ ان شعرا میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند شعرا سبھی شامل ہیں۔ اس کتاب میں مجاز لکھنوی پر باضابطہ ایک طویل مقالہ ہے جو میری رائے میں مجاز کے حوالے سے لکھا جانے والا بہترین مقالہ ہے بلکہ اسے ایک مکمل کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ میں نے خلیق صاحب سے یہ گزارش کی ہے کہ مجاز پر شامل کتاب تحریر کچھ اور اضافے یعنی انتخابِ کلام کے ساتھ جداگانہ کتاب کی صورت میں شائع ہو تو اس کی افادیت اور اہمیت دو چند ہو جائے گی۔ اس کتاب میں یگانہ چنگیزی کے حوالے سے بھی جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اپنی انفرادیت کا حامل ہے مجھے ایک غیر معروف شاعر شمس عظیم آبادی پر ان کی مفصل تحریر بڑی غیر معمولی لگی۔ شمس عظیم آبادی کو میں نے اپنے لڑکپن میں دیکھا اور سنا تھا جب وہ چند دنوں کے لیے بمبئی سے عظیم آباد (پٹنہ) آئے تھے۔ اس دوران کے قیام کا احوال بھی خلیق صاحب کی تحریر کا حصہ ہے۔

"منزلیں گرد کے مانند — " کے ابتدائی صفحات میں 'عرضِ حال' کے زیرِ عنوان خلیق نے اس کتاب کے بارے میں لکھا ہے: "یہ آپ بیتی سے زیادہ ایک تہذیب کی سرگزشت ہے"۔ یہ جملہ اس کتاب کے مندرجات اور موضوعات کا بھرپور عکاس ہے۔ تہذیب کی یہ سرگزشت لکھنؤ کی جاگیردارانہ ثقافت کی باقیات سمیت اس کے زوال کی حکایت خوں چکاں بھی ہے اور بمبئی میں ابھرتے ہوئے سرمایہ دارانہ نظام میں پیدا ہونے والے سماج اور اس نظام کے اپنے مخصوص تقاضوں اور ترجیحات کا بیان بھی جو صاحبِ تخلیق کی بصیرت و بصارت کا غماز ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع اور افادیت کے اعتبار سے ایک نایاب روزگار دستاویز ہے اور اس کی ادبی قدر و قیمت غیر معمولی بھی ہے اور لازوال بھی۔ "منزلیں گرد کے مانند — " زندۂ جاوید رہنے والی کتابوں میں شامل ہو چکی ہے اور خود اس کتاب کے حوالے سے خلیق ابراہیم خلیق زندۂ جاوید ہو گئے ہیں۔

◆◆◆

ظفر اقبال کی غزلیہ ثروت مندی

حسن عسکری کاظمی

یوں تو غزل کی مقبولیت کا گراف ہر عہد میں اونچا رہا لیکن عہد موجود میں یہ گراف معراجِ کمال کو چھو رہا ہے۔ پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو ہمیں آشوبِ وقت کے ہاتھوں بھارت میں کم اور تقسیم کے نتیجے میں اس نئے ملک کی مجموعی فضا میں اداسی، کرب، درد اور نقل مکانی سے پیدا ہونے والی بے چینی کے علاوہ قتل و غارت اور دربدری کا منظر نامہ دیکھنے کو ملا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، انجم رومانی اور شہرت بخاری بحیثیت غزل گو اپنے دلِ صد چاک کے ترجمان بن کر غزل کو وسیلۂ اظہار بنائے پائے گئے۔ دوسرے شعرا بھی غزل یا نظم میں سنجیدگی اور دردمندی کے ساتھ تخلیقی عمل بروئے کار لا رہے تھے ان گنت مسائل کا سامنا تھا غمِ ذات بڑھ کر غمِ زمانہ کے ہاتھوں ایک دوسرے سے بڑھ کر انکشاف کا دروازہ کھولے امید و بیم میں مبتلا ہوتے کچھ لکھتے رہے۔ وہ بیشتر صنفِ غزل کا معتبر حوالہ اور اس کی پذیرائی اور ثروت مندی کا نقطۂ آغاز کہلایا۔ فیض احمد فیض نے اسے وہ سحر ماننے سے انکار کیا جس کا خواب دیکھا تھا اسے "شب گزیدہ سحر" کہہ کر وہ حرفِ حق بلند کرنے کے سزاوار ٹھہرے۔ ناصر کاظمی کی غزل میں صبحِ ہجرت اور شامِ غریباں کا تذکرہ ملے گا۔ وہ جن گھروں کو چھوڑ کر نکلے اور جہاں آ کر بسا وہی غزل کا موضوعِ سخن رہا:

جہاں تنہائیاں سر پھوڑ کے سو جاتی ہیں
ان مکانوں میں عجب لوگ رہا کرتے تھے

یہ اضطراری کیفیت تمام ہوئی، وقت نے کروٹ بدلی، نئے غزل گو سامنے آئے۔ ان میں شہزاد احمد، فارغ بخاری، محسن احسان، احمد فراز، عارف افکار، اور ظفر اقبال (شاید یہ ترتیب درست ہو) قرطاسِ غزل پر نمودار ہوئے۔ ان کے علاوہ غزل گو شعرا کی بڑی کھیپ پاکستان کے مختلف علاقوں میں سرگرمِ عمل نظر آئی۔ ان تمام شعرا میں قدرِ مشترک وہ اعتماد اور دل بستگی کا وصفِ خاص ہے جو غزل کی مقبولیت میں برابر اضافے کا سبب بنا۔ غزل کی ہیئت میں اگر تبدیلی ممکن ہوتی اور الفاظ کو قدرے نئے تلفظ کے ساتھ برتنے کا خیال بھی آتا تو اس قسم کے تجربے کو خام خیالی کہا جاتا البتہ غزل میں نت نئے موضوعات اور وسعت پذیر مضامین اسی عہد میں در آئے یہاں مثالیں پیش کرنا مقصود نہیں لیکن یہ ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ ان شعرا نے قومی اور بین الاقوامی مسائل کا احاطہ کیا اور غزل کی نزاکتوں کا لحاظ رکھتے ہوئے پورے شعور کے ساتھ غزل کا دامن صد رنگ کر دیا۔ ان معروف غزل گو شعرا کے علاوہ دوسرے ہم عصر شعرا کے ہاں یہ زمانی وسعتِ نظر موجود ہے مثلاً سید حسن صہبا کا یہ شعر:

دیوار کیا گری مرے خستہ مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

غزل میں کیا کچھ نہیں، اور ابھی بہت کچھ اظہار پائے گا۔ یہ دونوں باتیں ایسی ہیں کہ ہر طرح کے امکانات غزل کے روشن مستقبل کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔ غزل کی مثال سبزۂ نورستہ کی سی ہے کہ جو سازگار موسموں میں ہرا بھرا اور ناسازگار ایام میں زمین پر بچھا رہتا ہے اور اس کی

جڑیں مضبوطی کے ساتھ اپنی جگہ پر قائم رہتی ہیں یا غزل چاک پر گندھی ہوئی مٹی کی طرح ہے جسے دستِ ہنر کمالِ فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختلف شکلوں اور شاہکار صورتوں میں ڈھالتا رہتا ہے۔ یہ انداز ظفر اقبال کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے اور بھی معتبر ہو جاتا ہے کہ ظفر اقبال نے غزل سے عشق کیا اور پے در پے غزل کا جمال ظفر اقبال پر ایک معشوق طراز کی نگاہِ غلط انداز کا عکس بن کر اسے نہال کر گیا۔ ابتدا میں ظفر اقبال نے غزل کے ساتھ وہ سلوک کیا جو خودنگر اور خلفشار عاشق اپنے محبوب کے ساتھ تنگ آ کر روا رکھتا ہے جیسے غالب کا خیال کہ

چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد

ظفر اقبال نے ''گلافتاب'' میں وہ گل کھلایا کہ ہر جگہ یہی کتاب اور اس میں لفظ کی ساخت، تلفظ میں تبدیلی اور بے باکانہ گفتگو، پردہ شب کا تذکرہ وہ غزل کا مزاج بدلنے کی ریڈیکل کوشش، ان غزل کو جریانہ کھینچنے کا عمل، یہ تجربہ کہاں تک کامیاب ہوا، یہ بحث ہی فضول ہے۔ البتہ اس طرز احساس کی بدولت ظفر اقبال کی فکر اور تخلیقی گلافتاب کھل کر سامنے آ گیا۔ وہ عہدِ شباب سے گزر کر جب بالغ نظر اور کہنہ مشق ہوئے تو غزل سے ان کا رشتہ بہت مضبوط و مستحکم ہوا کہ بابعد وشاید ان کے ہمعصر شعراء میں سے بیشتر اپنا حصہ ڈال کر غزل کی قدر و قیمت بڑھا کر رخصت ہوئے۔ اب ظفر اقبال یا عارف امام کے علاوہ غزل گو شعراء کا ازدہام ہے اور ہر شاعر اپنی بساطِ فکر کے مطابق غزل کہنے میں طاق ہے لیکن ظفر اقبال نے خود کو منوانے اور غزل میں دم پیدا کرنے کی خاطر بہت سے طور طریقے اختیار کیے۔ اس کے وسائل اپنی جگہ خود اس کے قرب و جوار میں اس سے تعلق رکھنے والے مضافات کے شعراء، ظفر اقبال کی رائے کو اہمیت دیتے اور پسند کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں شمس الرحمان فاروقی جیسا نقاد ایسی بات کہہ چکا ہے جس کی تائید یا تردید کرتے ہوئے خود ظفر اقبال سرمست و سرخوش دکھائی دیے مگر یہ بات اپنی جگہ اہم ہے کہ اس کی غزل میں تازہ کاری اور ہنرمندی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسے غالب کی طرح معاشی آسودگی یا زبوں حالی سے واسطہ نہیں پڑا لیکن وہ غالب کی طرح بے صدا ہونے کا ملال رکھتا ہے۔ مرزا غالب نے اکثر عمر بے در و بے گھر، بار کرایے کا مکان کہ جس کی چھت چھلنی، اس وہ گھنٹے برسے تو چھت چار گھنٹے برستی رہے۔ ظفر اقبال کا معیارِ زندگی ایسا کہ غالب کے زمانے کے نوابین بھی رشک کرنے لگیں۔ یہ الگ بات ہے کہ زندگی کی ناپائیداری اور فنا پذیری جیسا مضمون غالب اور ظفر اقبال کا من پسند مضمون ہے۔

نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے	بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
(غالب)

شور ہے اس گھر کے آنگن میں ظفر کچھ روز اور	گنبدِ دل کو کسی دن بے صدا کر جاؤں گا
(ظفر اقبال)

بہر حال ان دونوں کا موازنہ مقصود نظر نہیں۔ ظفر اقبال عہد موجود کا بلند قامت غزل نگار ہے۔ اسے چھوٹی سے چھوٹی بحر برتنے اور نیا موضوع چھیڑنے میں لطف ملتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ردیف بدل کر دیتی قوافی اور کبھی قوافی بدل کر دیتی ردیف استعمال کرنے کا خیال سوجھتا ہے۔ غزل کہتے ہوئے اسے کسی مضمون کی تکرار لاحق نہیں ہوتی۔ اسے غیب سے یہ مضامین اسی طرح آتے ہیں جیسے غالب نے دعویٰ کیا ہے کہ:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں	غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

ظفر اقبال غزل میں جتنے تجربے کرتا رہا ان سب میں اہم تجربہ خود اپنی ذات کو مرکز نظر بنانا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے قاری کو محترم جانتا ہے لیکن وہ خود منظر الموارج ہونے کے باوصف اپنا فرمان جاری کرنا چاہتا ہے۔ یہ رویہ انہیں لیکن اعتراف کر لینا بڑی بات ہے جس کا اظہار کرنا بھی ضروری ہے۔

ہر نیا ذائقہ چھوڑا ہے جو اوروں کے لئے　　پہلے اپنے لئے ایجاد بھی خود میں نے کیا
انکساری میں مرا حکم بھی جاری تھا ظفر　　عرض کرتے ہوئے ارشاد بھی خود میں نے کیا

ظفر اقبال نے پہلے مجموعے "آبِ رواں" میں جس لہجے کا استعمال کیا وہ صرف رجائی ہے بلکہ اس میں بلا کا اعتماد پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے وہ زندگی میں خاک اڑانے کی لذت سے آشنا ہے، وہ مشاہدے کی آنکھ کھلی رکھتا ہے۔ وہ سفر میں ہو یا حضر میں اپنی ذات کی اہمیت سے باخبر رہتا ہے۔

گاڑی کے گرد بھاگتے ہیں دور کے درخت　　یوں ہو نہ ہو مگر مجھے ایسا گماں تو ہے
مجھ پہ ظفر خدا کی زمیں تنگ ہی سہی　　خوش ہوں کہ میرے سر پہ کھلا آسماں تو ہے

مگر اسی عرصۂ زندگی میں ظفر اقبال نے ذریعۂ عبادت کی مسجد اپنے لئے الگ بنالی وہ لکھتا ہے کہ "بعض وقت اپنا سر پھوڑنے کے لئے دور دور تک پتھر تک نہیں ملتا"۔ "گلافتاب" میں انحراف رہا جب کا پیش لفظ قابل مطالعہ ہے۔ ظفر اقبال نے جو تجزیاتی اسلوب اپنایا اسے قبول عام کی سند تو مل گئی اس کے باوجود یہ چاہیے کہ ظفر اقبال کی بلند حوصلگی اور جنسی کیف کی شرح سے آگہی مل پاتی میں غزل پر کسی کہاوت کا گمان گزرتا۔ دراصل ظفر اقبال اس بہانے خود کو نمود رکھنا چاہتا ہے۔

کس کے لئے ہری ہوئی ہر شاخ جس کی　　ہے موسما کھلا ہے یہ گلزار کس لئے

بدن میں خون کا اک ذرہ بھی نہیں باقی　　نچڑ گیا ہوں سمندر کا سامنا کر کے

گورے گورے پاؤں کے　　کالی اینٹیں کالے روڑ

پوچھا تو اچار ظفر نے　　اپنی ذات ہتالی روٹی

"اب تک" ظفر اقبال کی اولین کلیات میں "رطب و یابس" نے چونکا دیا، وہ غزل کہہ کر جان چھڑانا چاہے بھی تو جان نہیں چھوٹتی۔

جان چھڑا اس غزل سے بھی　　لکھ مقطع ظفر اگلا حصہ

حرف پوشی ہے قافیہ بندی　　ہاں ذرا کس کے باندھیے شلوار

سطر خواب کا حلہ مانگیں　　سوچتے ہی کاپی وکلیں

خوب اپنی بھی گزرتی ہے ظفر   خلق سے دور خدا سے ناراض

ظفر اقبال نے روایتی غزل کا دامن تار تار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی اس کا یہ رد عمل اتنا شدید ہے کہ لسانی اسلوب میں دراڑیں ڈال کر وہ اپنی بحر اس اٹکانا چاہتا ہے۔ انیس ناگی کا یہ کہنا بجا ہے کہ رطب و یابس کی بیشتر غزلیات میں قافیوں کو اس طرح کسا ہے کہ معاصر غزل گو ہکا بکا ہو گئے ہیں چنانچہ وہ مروجہ قافیوں کے اصوات کے ذریعے معانی کی تشکیل کرتا ہے۔"

دھوپ سے کچھ بچاؤ رہتا ہے   سر پہ رکھتے ہیں شاعری کا ٹوپ
اب تو رکھی ہے دیکھنے کے لئے   کبھی چلتی بھی تھی ظفر یہ توپ

روکو گے تو ہم کریں گے دنگا   بن جائے گا بات کا بتنگا
پھر آپ بھی بدمعاش ہوں گے   میں ہوں ذرا مختلف لفنگا

ظفر اقبال کی انفرادیت اس میں ہے کہ وہ غزل میں اپنے لئے جدا راستہ بناتا اور اختیار کرتا ہے۔ نیا راستہ بنانا آسان کام نہیں۔ مرزا غالب نے اپنے لئے نیا راستہ بنانے کی کوشش کی، وہ نیا راستہ تو بنانے میں کامیاب رہا لیکن ناقدین بھول جاتے ہیں کہ روایت سے انحراف شاعر کو تنہا کرنے کا خطرہ بھی پیدا کرتا ہے اس لئے روایت سے بغاوت صرف شاعر کو منفرد بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے اسے جاودانی نہیں بناتی۔

ظفر اقبال کے ہاں قوافی اور ردائف بھی چونکانے والے اور قاری کو حیرت زدہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ 'گلافتاب' کو منفرد بنانے کی خاطر ظفر اقبال نے جنسی تجربوں کو بھی غزل سے منسلک کر کے دکھایا۔ اس پر فحش نگاری کی تہمت نہیں لگی البتہ جنس کا موضوع غزل میں شامل کرنے کی سعی جوانی کے زمانے کی بھول کہا جا سکتا ہے۔

تن جلا کے دیکھ لے سب کچھ یہیں پہ ہے   بیجان میرے پیچھے ہے تلوار اس طرف

کوئی اور مثال پیش کرنے کی ضرورت نہیں، بتانا مقصود ہے کہ ظفر اقبال کے جذبوں کا بہاؤ فطری اور شعری تقاضوں کے عین مطابق رہا۔

آب رواں، گلافتاب اور عیب و ہنر کے مراحل طے کرتے ہوئے تیغ و شیریں، اگلا اور دو گلتہ باتیں اس کی شہرت میں اضافہ کرنے کا باعث بنیں۔ ظفر اقبال نے تخلیقی طرز احساس کی سرشاری میں جوانی سے کہولت کا سفر طے کیا۔ اس کے لئے آرام یا توقف اڑتے ہوئے پرندے کا بھاگتا ہوا سایہ تھا جو اس کے ہاتھ کہاں آتا وہ خود کسی صورت اپنے کار ہنر کو التوا میں ڈالنے کے حق میں نہیں۔ اس کی خواہش یہی رہی کہ زبان و بیان پر مکمل گرفت اور اپنے اسلوب کی شادابی اور اظہار کی تازہ کاری کا سحر جگاتا رہے۔ ظفر اقبال کو وہی زمانہ ملا جو ناصر کاظمی اور منیر نیازی کے علاوہ شہزاد احمد کو ملا۔ وہ ان غزل گو شعراء کی موجودگی میں ان کی روش سے الگ تھلگ اپنا رنگ جمانے اور مروجہ اسلوب سے انحراف کرنے کی حکمت عملی اختیار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے مروجہ طرز اظہار کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا طور طریقہ رواج دینا چاہا۔ بعض اوقات وہ ظاہری سطح پر ایک بات کرتا ہے لیکن زیر سطح کوئی دوسری بات پیش نظر رہتی ہے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ اس نے کلاسیکی شعراء کو غزل میں اپنا رہنما بنانے کے باوصف خود رہنما بننے میں دلچسپی کا اظہار "خیال خام" کی صورت میں سامنے لانا چاہا لیکن ایسا بھی ہوا کہ وہ کلاسیکی پن پر اتر آیا ہے اور گزرتے ہوئے غزل گو شاعروں کے ساتھ ہمعصر شاعروں میں فنی نقائص ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے مگر ایسا

بھی نہیں اس نے میرؔ، غالبؔ، یگانہؔ، فراقؔ جیسے قدآور شاعروں سے بہت کچھ سیکھا۔ وہ ظفرؔ اکبرآبادی کو بڑا شاعر تسلیم کرتا ہے۔ نظم اور غزل میں جتنا سرمایہ اس کے ہاں ملتا ہے شاید دوسرے کسی شاعر کے ہاں اتنا ذخیرہ دستیاب نہیں۔ یہی صورت ظفر اقبال کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ اس کی یہ کلیات "اب تک" چار جلدوں پر مشتمل ہے جو ایک ریکارڈ ہے۔ دوسری کلیات میں اس کے چھ شعری مجموعے یکجا ملتے ہیں: وہم و گمان، اطراف، ہے ہنومان، تفاوت، ترتیب اور تماشا۔ ظاہر ہے یہ بھاری بھرکم کلیات اور اس کے علاوہ تیسری اور چوتھی کلیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ذاتی طور پر ایک قاری جہاں ظفر اقبال کی بسیار گوئی سے مرعوب ہوتا ہے وہاں اسے حیرت افزا اور نشاطیہ کیفیت سے لطف اٹھانے کا موقعہ فراہم ہوتا ہے۔ مظفر علی سید نے ایک جگہ ظفر اقبال کے "جدید ایجاز" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "ہم ظفر اقبال کی بیداری قدر کرتے ہوئے انہیں مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ وہ دوسروں کی شاعری کو بلا تکلف مسترد کریں لیکن اپنی شاعری کے ساتھ یہ ظلم نہ کریں کیوں کہ حقیقی اعلیٰ درجے کی شاعری انہوں نے اب تک کی وہی دوسرا تو کیا وہ خود بھی نہیں کر سکتے۔" یہ فیصلہ کرنا بھی محال ٹھہرا ہے کہ وہ شاعر بڑا ہے یا کالم نگار۔ کالم نگاری وسیلۂ روزگار ہے اور شاعری غم ذات اور غم کائنات کا اظہار ہے۔ یہاں سود و زیاں کا سوال نہیں۔ شاعری جذبوں کی تطہیر اور درد و کرب میں آگہی اور اختیارات کے حوالے سے خود کو مار دینے کا عمل ہے۔ ظفر اقبال کا خیال یہی ہے۔

کچھ تو لینا ہے بے حساب اس سے   کچھ اسے بے شمار دینا ہے

مرے اوقات بھی سارے کے سارے ہو چکے اس کے   کہ اپنی صبح رکھتا ہوں نہ اپنی شام رکھتا ہوں

پوری آواز سے اک روز پکاروں تجھ کو   اور پھر مری زباں پہ 12 تالا پڑ جائے

شعر کہنا بھی عجب ایک مصیبت ہے ظفرؔ   اور کہہ لوں تو سنایا نہیں جاتا مجھ سے

کسی موہوم کا جو بندہ بھی ہوں   اور اس کوشش پہ میں شرمندہ بھی ہوں
مرا ہر حکم چلتا ہے مجھی پر   میں افسر بھی ہوں اور کارندہ بھی ہوں

ظفر اقبال کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے اس کی ژرف بینی اور باریک بینی سے بڑھ کر یہ کوئی پہ نظر جاتی ہے۔ وہ غزل کو منقلب کرنے میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی غزل موج در موج ایک ایسا بحر بے کراں ہے کہ اس کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ کرنا عام قاری کے لئے محال ہے۔ اس مختصر مضمون کے آخر میں ظفر اقبال کے چند اشعار قارئین کو ہدیہ کرنا ضروری ہے۔

کبھی الٹا بھی سیدھا نظر آتا ہے مجھے   سب دکھا دیتا ہوں جیسا نظر آتا ہے مجھے

پار ہو جاتا نہیں دریا ہے وہ میرا ظفرؔ   درمیاں جس میں وہ میرے نام کی دیوار ہے

ہم ایسے عقل کے اندھے بھی دستیاب ہیں جو   جہاں میں رہ کے بھی اہل جہاں کے ساتھ نہیں

◆◆◆

کلاسیکی موسیقی: دُھرپد سے خیال تک

......1......

ڈاکٹر جواز جعفری

موسیقی ایک ایسا فن ہے جو کر کے دکھانے ہی سے سننے والوں تک پہنچایا جا سکتا ہے۔ یہ فن عمل کے بغیر بے کار ہے اور عمل، ریاضت (مشق) کے بغیر ناممکن ہے۔ یہ فن بہت سے دوسرے فنون کی طرح نامعلوم سے معلوم کی طرف سفر کرتا ہے اور یہی اس کا سب سے جو تخلیقی پہلو ہے۔ یوں تو دنیا میں لاتعداد آوازیں ہیں مگر موسیقی محض ان چند آوازوں سے واسطہ رکھتی ہے جنھیں موسیقی کی تکنیکی زبان میں سُر کہا جاتا ہے۔ دنیا بھر کی موسیقی کی عمارت انہی سات سُروں پر قائم ہے۔ کھرج (پہلا سُر) اور پنچم (پانچواں سُر) جو صوتی و نظام موسیقی میں اچل (غیر متحرک) سُر ہیں، کے علاوہ سب کے تیور اور کومل ملا کر ان سُروں کی تعداد بارہ تک جا پہنچتی ہے اور موسیقی کے ہزاروں راگ انہی بارہ سُروں سے جنم لیتے ہیں۔

موسیقی کے قدیم ناقدین کا خیال ہے کہ ابتدائی انسان چونکہ جنگل میں رہتا تھا اور اس کے آس پاس مختلف جانوروں اور پرندوں کی آوازیں اپنی طرف متوجہ کرتی تھیں اس لئے اس نے انہی کی آوازوں سے اپنا نظام موسیقی ترتیب دیا اور کھرج کی بنیاد مور، رکھب کی پپیہے، گندھار کی بکری، مدھم کی کونج، پنچم کی کوئل، دھیوت کی مینڈک اور نکھاد کی ہاتھی کی آواز پر رکھی۔ پرندوں اور جانوروں کے علاوہ قدیم ماہرین موسیقی کا ایک دبستان ایسا بھی ہے جو موسیقی کو دیوتاؤں کی آواز قرار دیتا ہے مگر نئے ناقدین موسیقی کو انسان کی ذاتی تخلیقی کاوشوں کے اظہار کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ انسان اپنی آواز اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور اسے مصنوعی طریقے سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ آواز انسان کی پہچان ہے مگر موسیقی کے ایسے دانشور بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ سُر انسان کی پیدائش سے اربوں سال پہلے ہی قائم ہو چکا تھا اور ہماری زمین کسی دل گداختہ کی طرح ایک معینہ تال پر کائنات کی پہنائیوں میں محو رقص تھی۔ آج انسان آواز کی مابعد الطبیعاتی تشریحات سے بلند ہو کر اسے سائنسی بنیادوں پر سمجھنے کے لئے کوشاں ہے اور جان چکا ہے کہ آواز فزیالوجی کا مسئلہ ہے جس کا تعلق آواز کی پیدائش اور سماعت سے ہے۔

ماہرین موسیقی کا کہنا ہے کہ موسیقی ایک فن ہے اور اگر یہ سچ ہے تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا بھر کی زبانوں کی طرح اس کے حروف تہجی (سارے گاما پادھانی سا) کیوں ہیں؟ دنیا میں موسیقی کے سوا کسی فن کے حروف تہجی نہیں ہیں۔ بنیادی طور پر موسیقی ایک زبان ہی ہے جو اپنے ابلاغ و اظہار کے لئے ایک فنی نظام کی محتاج ہے۔ یہ زبان ہماری مروجہ زبانوں سے مکمل طور پر مختلف ہے اور انسان کے صرف ان احساسات و جذبات اور کیفیات کے اظہار کا وسیلہ ہے جو کسی بھی مروجہ زبان کے ذریعے ادا نہیں ہو پاتیں۔ موسیقی کی زبان کو سیکھے بغیر اس کے پیغام کی ترسیل و تفہیم ممکن نہیں۔ اس زبان کے اپنے حروف تہجی، اپنے الفاظ (جو مہمل بھی ہیں اور غیر مہمل بھی) اپنا ابلاغ، لسانی ترکیبیں، اپنا روزمرہ و اپنی علامتیں، اپنا ماحول، صرف و نحو اور اپنے پیغامات ہیں۔ چونکہ موسیقی جذبات و احساسات کا ذریعہ اظہار ہے اس

لئے موسیقار کو بھی اس دولت سے مالا مال ہونا چاہیے ورنہ اس کا فن میکانکی عمل بن کر رہ جائے گا جس کی گرامر تو شاید درست ہو مگر اس کے پاس سامعین تک پہنچانے کے لئے کوئی پیغام نہ ہو۔ گویا موسیقی کی تخلیق میں احساسات بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان احساسات کو دوسروں تک پہنچانے میں حروفِ تہجی (سُر) کا کردار ہے جو اہمیت کا حامل ہے۔ اگرچہ یہ حروفِ تہجی دوسری زبانوں کی نسبت بہت ہی مختصر ہیں مگر ان حروفِ تہجی کو موسیقی کے قواعد کے ساتھ ملانے سے غنائی ترکیبیں وجود میں آتی ہیں جنھیں ہم موسیقی کے الفاظ کہہ سکتے ہیں۔ ایسی غنائی ترکیبوں کے مرکب سے، راگوں کی آروہی امروہی مرتب ہو کر ایک غنائی فارمولا بنتا ہے جسے ہم راگ کہہ سکتے ہیں۔ حروفِ تہجی کے قلیل ہونے کے باعث ان حروف کے استعمال پر ایک انتہائی سنگین ضابطہ عائد ہو جاتا ہے۔ کسی بھی راگ کی غنائی ترکیب میں ان حروفِ تہجی کے ادھر ادھر ہو جانے سے اس کے لگاؤ میں کمی بیشی ہو جانے سے یا سُر پر ٹھہراؤ میں کمی یا زیادتی کے سبب یہ غنائی فارمولا شدید بحران کا شکار ہو سکتا ہے۔ یعنی راگ کا وہ تاثر قائم نہیں ہو پائے گا جس کے حصول کے لئے موسیقار کوشش کرتا ہے۔

موسیقی کا لفظ اپنے اندر انتہائی کشادگی اور وسعت رکھتا ہے۔ گانے والوں نے بھی آواز کے ذریعے زندگی کے قریباً ہر رنگ، پہلو اور واقعے کو پیش کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ ہر معاشرے میں عوامی اور کلاسیکی موسیقی کے درمیان بھی موسیقی کی کئی قسمیں اور لہریں پائی جاتی ہیں۔ انسانی آوازوں کی یہی قسمیں موسیقی کو تنوع بخشتی ہیں۔ انسان کے کانوں میں رس گھولنے والی ماں کی لوری سے لے کر پیدائش اور شادی بیاہ کے گیت، فصلوں کی بوائی اور کٹائی کے گیت، فلمی گیت، پاپ میوزک، ریپ، راک، فوک، چیتی، کجری، اشتہاری جنگلز، ہوری، لاوٹیاں، بولیاں، قول، دوہا، ماہیا، مناجات، قوالی، غزل، ٹھمری، دادرا، خیال اور دھرپد تک سبھی آوازیں اور اوضاع موسیقی ہی کی ذیل میں آتی ہیں۔ خیال، ترانہ اور دھرپد جیسی کلاسیکی اصناف اور عوامی موسیقی کے درمیان، موسیقی کی ایک نیم کلاسیکل شاخ بھی ہے جس میں چیتی، کجری، ہوری، ٹھمری، غزل اور کافی جیسی اصناف شامل ہیں۔ گویا نیم کلاسیکل وہ مرحلہ ہے جسے پار کرتے ہی کلاسیکی موسیقی کی قلمرو شروع ہو جاتی ہے۔

کلاسیکی موسیقی کی قلمرو کا اصل باشندہ راگ ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آخر راگ ہے کیا؟ لغت کے لحاظ سے راگ ایک کثیر المفہوم لفظ ہے جس کے معانی لحن، ترانہ، لے، سُر، جوش، محبت اور جھگڑا کے ہیں۔ راگ کا تصور آتے ہی رنگ کا لفظ ذہن میں آتا ہے بلکہ موسیقی میں "راگ رنگ" کی اصطلاح عموماً استعمال ہوتی ہے۔ رنگ خود بھی کثیر المعانی لفظ ہے جس کے معانی ہیں فام، رنگت، روپ، انداز، طرز، نوع، رونق، نظیر، مزہ، لطف، خمار، کھیل تماشا، ناچ گانا، خوشی اور عیش و عشرت۔ راگ اور رنگ کے مرادی معانی راگ کا روپ، راگ کا انداز، راگ کی طرز اور راگ کا مزہ ہو سکتے ہیں۔ راگ رنگ کے ایک اور معانی راگ اور رقص ہو سکتے ہیں اور یہ معانی اس عہد کی یاد دلاتے ہیں جب راگ کے الاپ کے ساتھ رقاص، رقص بھی کیا کرتے تھے۔ رنگ کے ایک اور معانی عیش و عشرت ہیں جو یقیناً بادشاہوں اور مہاراجوں کی ان محفلوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن میں عیش و نشاط کے ساتھ موسیقی بھی محافل کا لازمہ سمجھا جاتا تھا اور شاید اسی لئے عام آدمی آج بھی موسیقی کو فن اور علم سمجھنے کی بجائے عیش و عشرت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ رنگ موسیقی کے ساتھ ساتھ تصوف کی بھی ایک بنیادی اصطلاح ہے جس میں عاشق محبوب کے رنگ میں رنگ جانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ قدیم موسیقی میں راگ کی بجائے "جاتی" کا لفظ استعمال ہوتا تھا اور موسیقی کے بیشتر ناقدین راگ کو جاتی ہی کی ترقی یافتہ شکل سمجھتے ہیں۔ بعد کے زمانوں میں راگ کے لئے راگ کا لفظ بھی استعمال ہوتا رہا۔ متنگ کی "برہد دیشی" پہلی کتاب ہے جس میں راگ پہلی بار اپنے اصطلاحی معنوں میں سامنے آیا۔ موسیقی کے بعض ماہرین

کے نزدیک ہماری موسیقی میں راگ کا تصور دسویں صدی عیسوی میں اور بعض کے بقول پانچویں اور ساتویں صدی میں داخل ہوا جبکہ موسیقی کے ایک ممتاز دانشور رشید ملک کی تحقیق کے مطابق راگ کا لفظ موجودہ معانی میں ہماری موسیقی میں پچھلے دو ہزار سالوں سے رائج ہے۔ اگرچہ راگ، جاتی ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے اور بھرت کی جاتیوں میں موجودہ راگ کی خصوصیات موجود تھیں بلکہ یہ جاتیاں راگ ہی کا تجریدی تصور لئے ہوئے تھیں مگر وہ راگ کو ان معانی میں استعمال نہیں کرتا جن معنوں میں یہ آج مروج نظر آتا ہے۔

جہاں تک راگ کے تشخص کا سوال ہے یہ سروں کا ایسا مجموعہ ہے جو آواز کے زیر و بم کے ساتھ روح میں خوشگوار حسنی پیدا کرے۔ راگ اپنی ظاہری اور باطنی ہر دو صورتوں میں پہچانا جاتا ہے۔ اس کی ظاہری شکل سروں کے ایک مخصوص مجموعے سے وجود میں آتی ہے جبکہ باطنی تشخص اس کا رس اور سروپ تشکیل دیتا ہے۔ موسیقی کے حوالے سے راگ محض ایک نغمہ نہیں، یہ ایک ایسا سانچہ بھی ہے جس میں کئی نغمے ڈھالے جا سکتے ہیں۔ ڈھلنے والے نغمات کی کثرت کے باوجود راگ کی پابندی کی وجہ سے ایک نغماتی وحدت بھی موجود رہتی ہے۔ اپنی وسعت کے اعتبار سے راگ تین طرح کے ہوتے ہیں۔

1- سمپورن 2- آڈو 3- کھاڈو۔ کسی بھی نغمے کا راگ بننے کے لئے کم از کم پانچ سُر کا حامل ہونا بنیادی شرط ہے۔ یہی شرط عوامی اور کلاسیکی موسیقی کے درمیان خط امتیاز کھینچتی ہے۔ موسیقی کے سات سروں سے ہزاروں راگ جنم لیتے ہیں مگر ہر راگ درج ذیل خصوصیات کی بنا پر دوسرے سے مختلف، منفرد اور جدا ہو جاتا ہے۔ 1- اپنے وادی اور سموادی سروں کی بنیاد پر 2- ہر راگ کی اپنی مخصوص آروہی امروہی اور پکڑ کے سروں کے مختلف ہونے سے ایک راگ دوسرے سے الگ ہو جاتا ہے۔ 3- ہر راگ سپتک کے پہلے یا دوسرے حصے پر زور دینے سے دوسرے راگوں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ 4- ایک راگ اپنی ہیئت یا چلن سے دوسروں سے جدا دکھائی دیتا ہے۔ 5- اگر کسی راگ کے تمام سُر تبدیل کر دیے جائیں تو وہ راگ بھی تبدیل ہو گا۔ دراصل ہر راگ کا اپنا الگ تشخص ہوتا ہے جس کی وضاحت لفظوں کی بجائے صرف سروں کے ذریعے ممکن ہے۔ اس نزاکت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ دھیوت کا سُر کومل شکل میں بھیرویں، بھیروں، ٹوڈی اور آساوری راگوں میں استعمال ہوتا ہے۔ بظاہر تو یہ ایک ہی سُر ہے لیکن کومل دھیوت لگاتے وقت اس کی بلندی اور مقدار ہر راگ میں مختلف ہے۔ یوں یہ ایک سُر (کومل دھیوت) چار مختلف مزاجوں یا کرداروں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ کسی بھی راگ میں سُر کی صحت، پابندیاں اور نزاکتیں ایک خاص قسم کی احتیاط کا تقاضا کرتی ہیں۔ راگ میں اگر کوئی سُر درست نہ لگے، ادھر سے ادھر ہو جائے، سُر سے حذف یا ضرورت سے زیادہ لگ جائے، تیور کی بجائے کومل لگ جائے تو موسیقار کی ساری محنت اکارت جاتی ہے اور تمام تر احتیاط کے باوجود معمولی سی خلاف قاعدہ حرکت سے راگ کا حلیہ بگڑ جاتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مطلوبہ راگ کی بجائے کوئی غیر مطلوبہ راگ سامنے آن کھڑا ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ موسیقار کو چاہیئے کہ وہ کسی بھی راگ کو گاتے وقت اس راگ کی وسعت، کریکٹر، چلن، ضابطے اور ترکیبوں کو ہر حال میں پیش نظر رکھے۔ ہماری موسیقی کے پس منظر میں نو رس یا جذبے کارفرما ہیں اور ہر راگ کی تشکیل میں ان میں سے کوئی ایک جذبہ یا رس موجزن نظر آتا ہے۔ یہ نو جذبے یا رس درج ذیل ہیں:

1۔ سنگھار رس (جذبۂ محبت) 2۔ ویر رس (جذبۂ شجاعت) 3۔ ادبھت رس (جذبۂ حیرت)
4۔ رودر رس (جذبۂ غیض و غضب) 5۔ بھیانک رس (جذبۂ خوف) 6۔ ہاسیہ رس (جذبۂ سرور)

7۔ کرون رس (جذبۂ رحم)   8۔ ادبھت رس (جذبۂ حیرت)   9۔ شانت رس (جذبۂ سکون)

راگ کی تصنیف کرنے والا کوئی بھی ماہر موسیقی راگ کو تشکیل دیتے وقت انھی احساسات و جذبات کو راگ کے مزاج میں شامل کر دیتا ہے۔ گانے والا تو محض اس جذبے یا رس کی بازیافت کرتا ہے اور سُر کے ذریعے سامعین کے سوئے یا اندرونی تحریک کو ابھارتا ہے اور یہ مکمل طور پر گانے والے پر منحصر ہے کہ وہ کس حد تک سامعین کو اپنے غنائی تجربے میں شامل کرتا ہے۔

سُر تال اور بندش موسیقی کے اجزائے ترکیبی ضرور ہیں مگر یہ موسیقی نہیں ہیں۔ جیسے ہم اینٹ، گارے اور پتھر کو عمارت نہیں کہہ سکتے۔ سُر تال، بندش، آواز، تعلیم، ریاضت اور محنت بھی ایک حد تک ہی راگ کی تعمیر و تشکیل میں مدد کرتے ہیں۔ راگ کے خد و خال صرف اسی وقت اجاگر ہوتے ہیں جب یہ تمام اجزا فنکار کے ذہن کی بھٹی میں تپ کر تخلیق کا درجہ اختیار کرتے ہیں۔

راگ کی تاثیر کا معاملہ بڑی حد تک جذبے یا رس کی مناسب ترسیل ہی سے جڑا ہوا ہے۔ یعنی راگ گانے والا نغمے کے اندر رکا ہوا جذبے یا رس کو کتنی کامیابی کے ساتھ ابھارتا ہے اور سننے والوں کو کس حد تک اپنے غنائی تجربے میں شریک کرتا ہے؟ اس سلسلے میں بنیادی اصول یہ ہے کہ گویا راگ کے سُروں کو اس سلیقے اور ضرورت سے لگائے کہ راگ کا روپ بگڑنے نہ پائے۔ مثلاً بھیرویں، پیلو، کھماج اور پہاڑی چاروں راگ کومل اور نرم جذبوں کی ترجمانی کرتے ہیں ان کا بنیادی مزاج بھی ان ہی کے درمیان تشکیل پاتا ہے۔ ان راگوں میں ان خواہشوں اور راتوں کا ادبی زبان میں اظہار ہوتا ہے جو کبھی پوری نہ ہو سکے۔ لیکن اگر موسیقار آواز کے نرم مجموعے ترتیب دینے کی بجائے گمبھیر تانوں پر اتر آئے اور تیز یا بلند سُر کا لوہا منوانے کے لئے آواز کے پتے کھینچنے لگے تو ان چاروں راگوں کی نزاکت اور شخصیت برقرار نہ رہ پائے گی۔

راگ کی صحیح ادائی کے علاوہ وقت کا معاملہ بھی راگ کی شخصیت اور پیش کش کے حوالے سے گہرا تعلق رکھتا ہے۔ موسیقی کے ضابطوں اور اصولوں کے ساتھ ساتھ بھی ماہرین موسیقی نے وقت کی پابندی پر بھی زور دیا ہے۔ ہر راگ کسی نہ کسی ٹھاٹھ کے تحت ہوتا ہے اور اس کے گانے کے لئے بھی ایک وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔ عموماً راگ صبح، دوپہر، شام اور رات کے وقت گائے جاتے ہیں۔ وقت کی تقسیم کا انحصار گائیک کی مرضی پر نہیں بلکہ تمام راگوں کو شدھ اور کومل سُروں کے اعتبار سے دن رات کے آٹھ پہروں پر مختلف درجے بنا کر تقسیم کیا گیا ہے اور یہ تقسیم محض غنائی روایت نہیں بلکہ سائنسی اور نفسیاتی اصولوں کو سامنے رکھ کر کی گئی ہے۔

موسیقی کے بعض علما، راگوں کو بھی ان کی راگنیوں اور اولادوں کے حوالے سے زیر بحث لاتے ہیں۔ ان کی یہ سوچ جاگیردارانہ ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے جہاں لوگوں کی ایک سے زیادہ بیویاں اور ہر بیوی سے کئی کئی اولادیں ہوتی ہیں۔ اس طرز فکر کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہندوستان ایک زرعی ملک ہے اور لوگوں کا وجودی تجربہ وحدت کو کثرت میں دیکھتا ہے۔ جیسے ایک دانے کو زمین سینکڑوں دانوں میں تبدیل کر دیتی ہے اسی طرح ایک راگ سے کئی راگ راگنیاں اور پھر ان کے بچے جنم لیتے ہیں۔

ہماری کلاسیکی موسیقی کا مزاج شخصی اور ہیئت میں جاگیردارانہ فکر کارفرما ہے۔ اسی لئے مغربی موسیقی کے برعکس ہماری گائیکی پر علم و فن کی بجائے شخصی رنگ غالب ہے۔ جہاں تک راگ کی ہیئت کا تعلق ہے آمرانہ عہد میں بادشاہ کے بعد درباری منتری کا منصب اہم ترین ہوتا ہے اور اسی کے تال میل سے کاروبار مملکت چلتا ہے۔ جبکہ بادشاہ کے دشمن کے ساتھ ہر طرح کے تعلقات منقطع رکھے جاتے

ہیں۔ ہماری موسیقی میں وادی اور سموادی سُر بھی راگ کی تشکیل و تعمیر میں ایسا ہی کردار ادا کرتے ہیں اور ورجت سُر (ممنوعہ سُر) بادشاہ کے دشمن کا کردار ادا کرتا ہے۔ آج بھی وہی ترتیب موجود ہے یعنی وزیراعظم، آرمی چیف، اور اپوزیشن لیڈر۔ موسیقی کی تشکیل کے پس منظر میں جاگیردارانہ حیثیت اپنی جگہ مگر آج ہم کلاسیکی موسیقی سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر موسیقی کے سات سُر بنیادی طور پر سات آوازیں ہیں جو ساری ایک دوسرے سے مختلف ہیں مگر ساری آوازوں کو ایک نظام کے تحت ہم آہنگ کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح جمہوریت میں بھی بہت سی آوازیں ہوتی ہیں۔ ہر آواز کی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور کسی بھی آواز کو دبانا جمہوریت کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔ گویا ہمارے لئے سُروں کی جمہوریت میں سیاسی دنیا کی جمہوریت کا سبق موجود ہے۔

رسکن نے کہا تھا کہ کسی ملک کی تاریخ اس کے نغمے (موسیقی) سے ترتیب دی جا سکتی ہے۔ مگر برصغیر ایک ایسا خطہ ہے جس کی موسیقی کی تحریری تاریخ کم و بیش تین ہزار سال تک پھیلی ہوئی ہے۔ سام وید (ہندوؤں کی چار کتابوں میں سے ایک) کے اشلوک گا کر ہی پڑھے جاتے تھے چونکہ اس عہد کی علمی زبان سنسکرت تھی اس لئے موسیقی کی تاریخ اور قواعد و ضوابط سے متعلق بیشتر اور مستند کتابیں سنسکرت ہی میں لکھی گئیں اور سنسکرت چونکہ عوام کی زبان نہیں تھی اس لئے موسیقی کے ان علمی ذخائر سے پوری طرح فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا۔ ان کتابوں میں بارھویں صدی عیسوی میں لکھی جانے والی سارنگ دیو پنڈت کی "رتناکر" اور [illegible] پنڈت کی "لکشن گیت" اہم ترین کتابیں ہیں۔

وقت ایک ایسی چیز ہے جو بڑی بڑی شاندار چیزوں کو تبدیل اور متروک کر کے رکھ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقت کا اثر دیگر ثقافتی مظاہر کی طرح موسیقی پر پڑنا فطری امر ہے۔ چنانچہ گزرتے وقت کے ساتھ پچھلی کئی صدیوں میں موسیقی نے بھی کئی چولے بدلے ہیں۔ گزشتہ ایک ہزار سالوں میں موسیقی کی بہت سی اصناف سرے سے غائب ہو چکی ہیں۔ سترھویں صدی میں سہلہ، گجری، مانگل، کافی، اتگار، بسیط، حالات، علالی، گمری، دوہڑہ، چہار اصول، معروفی، ہال نیان، ریختہ، نقش، دھنگ، سولنکا، لیجاری، جکری اور چیچ کے علاوہ اور بھی کئی اصناف تھیں جن میں سے کئی ایک متروک قرار پا چکی ہیں۔ علاوہ ازیں گائیکی کے کئی انداز اور موسیقی کی کئی اقسام تاریخ کا حصہ بن چکی ہیں۔ ویدک عہد میں سام گان بہت اعلیٰ اور مقبول تھا۔ یہ ایسی موسیقی تھی جسے رگ وید کی مناجات کو یکجا کر کے ترتیب دیا گیا تھا۔ یہ ایسا مقدس گانا تھا جسے صرف مخصوص خاندان ہی گا سکتے تھے۔ حتیٰ کہ عوام کو اس گانے سے دور رکھنے کے لئے باقاعدہ قوانین موجود تھے۔ اس عہد میں عوامی جذبات و احساسات کے اظہار کے لئے متر اگانا (جس کی مزید شاخیں پراشی اور اداکتا تھیں) مقبول تھا۔ مسلسل ضابطوں اور پابندیوں کے نتیجے میں جب سام موسیقی بے حیثیت ہو گئی تو اس کی جگہ متر اموسیقی نے لے لی۔ اب دھرو موسیقی کو عوامی موسیقی کے درجے پر فائز ہونے کا اعزاز مل گیا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب دھرو موسیقی بھی پابندیوں اور ضابطوں میں قید ہو کر خواص کی موسیقی بن گئی تو عوامی موسیقی کا منصب گندھرو موسیقی کے حصے میں آیا۔ اب اس کا تصور صرف موسیقی کی قدیم کتابوں میں رہ گیا ہے۔ چھٹی سے بارھویں صدی کے درمیانی عہد میں پربندھ موسیقی کو عروج حاصل ہوا مگر پندرھویں صدی تک آتے آتے تکنیکی پابندیوں نے اسے خواص کی موسیقی بنا کر عوامی رسائی سے باہر کر دیا۔ اب اس کی جگہ دھرپد نے لے لی جو اٹھارھویں صدی کے آس پاس مندروں، معبدوں اور درباروں کی گھٹی گھٹی فضاؤں میں قید کر دیا گیا تو خیال گائیکی اس کی جگہ لینے کے لئے پوری طرح تیار تھی اور آج کا عہد خیال گائیکی ہی کا عہد ہے۔ موسیقی میں تبدیلیوں کا ذکر چل نکلا ہے تو یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے کہ موسیقی کی کئی مقبول اصناف کے ساتھ ساتھ گائیکی کے کئی پسندیدہ انداز بھی فنا

کے کمالات اتر گئے۔ اور وہ تکنیکی تبدیلیاں جو مختلف راگوں کی ہیئت کے حوالے سے سامنے آئیں وہ الگ تھیں۔ مثلاً:

1۔ قدیم موسیقی میں تین گرام تسلیم کیے جاتے تھے یعنی شڑج گرام، گندھار گرام اور مدھم گرام۔ ان کا تذکرہ بھرت کی "ناٹ شاستر" کے علاوہ موسیقی کی دیگر اہم کتابوں میں بھی موجود ہے حتیٰ کہ ان کے تعین کے تفصیلی طریقے بھی موجود ہیں لیکن عملی موسیقی سے یہ صدیوں سے غائب ہیں۔ یہ تبدیلی کب، کیوں اور کیسے وجود میں آئی، کوئی نہیں جانتا۔

2۔ موسیقی کی قدیم کتب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ ایسا تھا جب مغرب کی طرح ہمارا اسکیل بھی اوپر سے نیچے کی طرف قائم تھا۔ یعنی پہلا سُر سب سے اوپر تھا اور آخری سُر یا نوٹ سب سے نیچے۔ ابھی ہم نے سام وید کی جس موسیقی کا ذکر کیا ہے، وہ گانا اسی اسکیل کے مطابق ہی گایا جاتا تھا۔

3۔ وہ بھی زمانہ تھا جب سکیل کا پہلا سُر (کھرج) چوتھی سرتی پر قائم تھا مگر موجودہ موسیقی میں یہ سُر پہلی سرتی پر قائم کیا گیا ہے۔

4۔ قدیم موسیقی میں موجودہ کھرج اور پنچم اچل سُر (غیر متحرک) نہیں تھے یعنی باقی سُروں کی طرح متحرک تھے جبکہ آج یہ خصوصی حیثیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔

5۔ کسی زمانے میں مدھم اچل سُر سمجھا جاتا تھا (جیسے آج پہلا اور پانچواں سُر سمجھے جاتے ہیں) پھر اس کی امتیازی حیثیت ختم ہو گئی اور یہ موجودہ موسیقی میں غیر متحرک نہیں رہا۔

6۔ قدیم موسیقی میں راگوں کو مورچھناؤں کے تصور پر تقسیم کیا گیا تھا جو قدیم سکیل کے مطابق اوپر سے نیچے کی طرف آتی تھیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ یہ نظام ہماری موسیقی سے غائب ہو گیا اور بارہویں اور تیرہویں صدیوں میں اس کی جگہ جنک میل کا تصور آ گیا۔ اس کے بعد یہ بھی متروک ہو گیا اور اس کی جگہ ٹھاٹھ سسٹم نے لے لی جو غیر تسلی بخش سمجھا جاتا ہے۔ شمالی ہند کی موسیقی میں دس ٹھاٹھوں کا تصور محض سہولت کے لیے رائج کیا گیا ورنہ ریاضی کی رو سے تو بہتر ٹھاٹھ ہونے چاہئیں۔

7۔ کسی زمانے میں موسیقی میں متوں اور بانیوں کے تصورات رائج تھے۔ یہ متروک ہوئے تو ان کی جگہ موسیقار گھرانوں کے تصور نے لے لی۔ لیکن ماہرین موسیقی کا خیال ہے کہ گھرانے کا تصور بھی زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ پائے گا۔

8۔ سکیل اور ٹھاٹھ کے علاوہ ہماری تالوں میں بھی مسلسل تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ کسی زمانے میں مرگ تھا کی تالیں رائج تھیں۔ آج ان کی جگہ ایک تال، تین تال، جھپ تال اور تلواڑہ تال نے لے لی ہے۔

9۔ ہماری موسیقی کے بہت سے راگ متروک اور معدوم ہو رہے ہیں (بعض تو ایسے ہیں کہ گانے والوں نے جن کے محض نام ہی سنے ہیں) اور ان کی جگہ نئے راگ مروج ہو رہے ہیں۔ ہندوستانی موسیقی اس وقت

> بھی تبدیلیوں سے دوچار ہوئی جب مسلمان اس خطے میں وارد ہوئے۔ سچ پوچھیں تو مسلمانوں نے برصغیر کو اردو زبان اور موسیقی (جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے) کی شکل میں دو خوبصورت تحفے دیے۔
>
> مسلمان صوفیا نے موسیقی کو نہ صرف مقامی آبادی سے رابطے کی زبان کے طور پر استعمال کیا، بلکہ مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی کے متوازی یہ صوفیا موسیقی کے بہت بڑے مداح کے طور پر بھی سامنے آئے۔

مسلمان حکمرانوں نے نہ صرف مقامی موسیقی کی سرپرستی کی بلکہ ایران اور وسط ایشیا سے بہت سے موسیقار لا کر یہاں آباد کیے گئے۔ ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کے اشتراک کے نتیجے میں موسیقی کی کئی نئی اصناف اور راگ وجود میں آئے۔ مثلاً راگ ایمن کلیان، ایرانی راگ یمن ہی کا بگڑا ہوا نام ہے۔ اسی طرح راگ نوروز یہاں آکر نورو چکا اور زنگولہ، جنگلہ بن گیا اور فارسی کا مشہور راگ حجاج آج کل حجیج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں امیر خسرو کے تجربات زیادہ اہم تصور کئے جاتے ہیں۔ ان کے عہد میں سنسکرت میں پربندھ اور چھند مروج تھے جن کے تلفظ کی ادائیگی میں مسلمان گویوں کو مشکل پیش آتی تھی۔ امیر خسرو نے مسلمان گویوں کے لئے آسانیاں پیدا کیں اور ایرانی طرز پر ہندی میں قول، ترانہ اور نقش گل وغیرہ کو فروغ دیا۔

مسلمان بادشاہوں نے ہندی اور فارسی کے اس اشتراک کا نہ صرف خندہ پیشانی سے خیر مقدم کیا بلکہ اس تہذیبی پیوندکاری کی سرپرستی بھی کی۔ ایرانی اور ہندی تہذیبوں کا یہ اشتراک صرف موسیقی تک محدود نہ تھا بلکہ فنون لطیفہ کے کئی شعبے بھی بڑی فراخدلی سے ایک دوسرے سے گھلے مل رہے تھے۔ تیرھویں صدی عیسوی میں جلال الدین خلجی پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے موسیقی کے علاوہ سنسکرت لٹریچر سے بھی دانشورانہ دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ فیروز تغلق نے سنسکرت لٹریچر کی سرپرستی کے ساتھ ساتھ سنسکرت کی علمی کتابوں کے فارسی میں تراجم بھی کرائے۔ محمد بن تغلق بھی ہندی حکمت اور جوتش کو وہاں کی صحبت سے لطف اندوز ہوتا تھا اور اکبر کے دربار کے بعض دانشور فارسی اور سنسکرت دونوں زبانوں میں لکھتے تھے جس کی بہترین مثال ٹوڈرمل ہے جس نے فارسی میں "بھگوت پران" کا ترجمہ کیا۔

اکبر اعظم کے عہد کو اپنی دیگر خصوصیات کے ساتھ ساتھ موسیقی کے حوالے سے بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اکبر نہ صرف خود موسیقی کا اعلیٰ ذوق رکھتا تھا بلکہ اس کے دربار میں بھی اس فن کے کاملین جمع تھے۔ اس کے زمانے میں مالوہ کا حاکم باز بہادر موسیقی کا نہایت نامور عالم اور عامل تھا۔ اس کے گانے کی خاص طرز کو "باز خانی" کہا جاتا ہے۔ اکبر ہی کے عہد میں اودے پوری رانی میرا بائی شاعری اور موسیقی میں کمال رکھتی تھی۔ آج بھی اس کے نام پر میرا بائی کی ملہار گائی جاتی ہے۔ اکبر کو موسیقی کا اس قدر ادراک تھا کہ اس نے بعض قدیم راگوں کے نام اپنی پسند کے مطابق تبدیل کر دیے۔ اس نے کرناٹکی کا نام درباری کرنائی کا سگھرئی اور بہار کا شاہانہ رکھ دیا۔ اکبر کی اختراع پسند طبیعت سے حوصلہ افزائی پا کر اس کے دربار کے گویوں نے کئی نئے راگ ایجاد کر ڈالے۔ اس کے درباری گائیک میاں تان سین نے میاں کی ٹوڈی، میاں کی سارنگ اور میاں کی ملہار ایجاد کئے۔ اس عہد میں سب سے زیادہ طبع آزمائی ملہار کے حوالے ہی سے سامنے آئی جیسے میاں کی ملہار، رام داس کی ملہار، سورداس کی ملہار، نائیک چرجو کی ملہار اور میرا بائی کی ملہار۔ عہد جہانگیر و شاہجہان میں بھی موسیقی کی سرپرستی کی روایت جاری رہی۔ عہد جہانگیر میں چھتر خان، جہانگیر داد، پرویز داد، خورم داد، ماکھو اور حمزان اور عہد شاہجہان میں جگن ناتھ، درنگ خان، لعل خان (گن سمندر) اور بلاس خان (تان سین کا بیٹا جس کی یادگار بلاس خانی ٹوڈی ہے) جیسے نامور گویے

موجود تھے۔ عہد عالمگیر کو موسیقی سے بے اعتنائی کے باعث تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے مگر اس کے عہد میں علم موسیقی پر سب سے زیادہ کتابیں منظر عام پر آئیں۔ مگر اکبر اعظم کے عہد کو موسیقی کے حوالے سے دو طرح کا اختصاص حاصل ہے۔ پہلا اختصاص یہ ہے کہ اس کے دربار سے اس عہد کا سب سے بڑا گویا تان سین (1589ء) وابستہ تھا اور بقول ابوالفضل اس کے پائے کا ماہر موسیقی پچھلے ایک ہزار سال میں پیدا نہیں ہوا اور دوسرا اختصاص یہ ہے کہ اس عہد کا سب سے اعلیٰ گانا دھرپد تھا اور اکبر کا عہد ہی اس کا سنہری زمانہ شمار کیا جاتا ہے۔

سولہویں صدی کی موسیقی میں دھرپد کو گائیکی کی سب سے اعلیٰ صنف سمجھا جاتا تھا۔ اس کا انداز سادہ اور لہجہ مردانہ تھا۔ دھرپد میں سُر کے جمالیاتی پہلوؤں پر زور دیا جاتا تھا۔ اس گائیکی میں تان، مُرکی، زمزمے، پلٹا، کھٹکا، الاپ، میںڈھ اور اندولن کی اجازت نہیں۔ ایک قسم کی سنجیدگی، متانت، وقار اور سوز اس کی امتیازی شان ہے اور یہی دھرپد کا وہ امتیازی پہلو ہے جس سے آج بھی ہماری موسیقی مرہون چلی آرہی ہے۔ دھرپد، خیال کے مقابلے میں سیدھا گانا ہے جس میں متن کی اہمیت پر خاص توجہ دی جاتی ہے اور لفظ اور سُر کی ادائیگی میں ایک خاص شائستگی نظر آتی ہے۔ خیال گائیکی میں عموماً ان باتوں کا خیال نہیں رکھا جاتا۔ ہندوستانی موسیقی میں پربندھ ایسا گانا ہے جو تیرھویں صدی تک اعلیٰ ترین گانا سمجھا جاتا تھا۔ دھرپد کی بنیاد پربندھ ہی پر رکھی گئی ہے۔ پربندھ کے دو حصے انترہ اور آبھوگ تھے۔ بعد ازاں انہی پر دھرپد نے اپنا وجود استوار کیا۔ ہیئت کے اعتبار سے دھرپد کے چار حصے ہیں۔ 1۔ استھائی 2۔ انترہ 3۔ سنچاری 4۔ ابھوگ۔

ہیئت کے اعتبار سے دھرپد موسیقی کی اقلیم کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ دیکھا جائے تو دھرپد میں تمام اصناف کی خوشبو شامل ہے۔ یہاں مارگ اور دیسی راگوں کے ذائقے بھی ہیں اور موسیقی کی مختلف اصناف اور گائیکی کے مختلف انداز کا رس بھی ملتا ہے۔ آپ اسے رنگا رنگ پھولوں کا گلدستہ کہہ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی خیال گائیکی کے بڑے بڑے استاد اپنے شاگردوں کو خیال سے پہلے دھرپد کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ وہ سُر پر ٹھہراؤ اور ضبط سے آگاہی حاصل کر سکیں۔

(جاری ہے)

◆◆◆

کلاسیکی موسیقی پر معلوماتی تجزیہ

سات سُروں کے نام "سا، رے، گا، ما، پا، دھا، نی" ہیں۔ آئینِ اکبری میں انہیں کھرج، رکھب، گندھار، مدھم، پنچم، دھیوت اور نکھاد لکھا گیا ہے۔ انسان کے جسم کی ناف سے ہوا سانس کے ذریعے گلے اور تالو تک 22 رگوں کے ذریعے باہر آتی ہے۔ ان میں سے

نوٹ: اسی طرح دھرپد کو دھروپد اور دھرپت بھی کہا جاتا ہے۔ مختلف علاقوں اور خطوں میں اس کے مختلف نام یوں لیے جاتے ہیں: دکن میں چھند، تلنگانہ اور کرناٹک میں دھرو، بنگال میں پلا، جونپور میں چٹکلا، متھرا میں بشن پد، راجپوتانہ میں کچاری، دہلی میں قول یا ترانہ، لاہور کے بعض علاقوں میں چھند، گجرات میں چکری اور بہاروں کی شان میں گائے جانے والی طرز کو گرگ یا ساورو کہا جاتا ہے۔

(ادارہ تخلیق)

آپ بیتی

دن ڈھل چکا تھا

ڈاکٹر انور سدید

میری زندگی کا سفر کب شروع ہوا؟ اس کی صحیح تاریخ بتانا اب مشکل ہے۔ سکول کی پہلی جماعت میں داخلے کے وقت میری تاریخ پیدائش 4 دسمبر 1928ء درج کرائی گئی۔ یہی تاریخ میٹرک کے سرٹیفکیٹ میں منتقل ہوئی اور بعد میں زندگی کے سرکاری امور میں استعمال ہوتی رہی ہے۔ میری والدہ بتاتی تھیں کہ میں دریائے جہلم کی بڑی طغیانی کے دنوں میں پیدا ہوا تھا۔ اس لحاظ سے میری تاریخ پیدائش جولائی 1927ء کے کسی دن پر پڑتی ہے۔ اس وقت ہمارا خاندان قصبہ میانی میں آباد تھا جو دریائے جہلم کے بائیں کنارے پر واقع تھا۔ دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر پنڈ دادن خان کا قصبہ ہے جہاں میرے محترم نانا تاج دین رہتے تھے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا نسبی تعلق ایک نو مسلم راجپوت خاندان سے تھا۔ میرے ایک بزرگ میاں بشیر احمد نے بتایا کہ آزادی سے پہلے سری نگر (کشمیر) سے ایک ہندو نجومی وقتاً فوقتاً سرگودھا آیا کرتا تھا۔ اس کے پاس ہمارے خاندان کی بھی جنم پتریاں تھیں۔ اس کی روایت کے مطابق اٹھارویں صدی کے آخر میں ہمارے خاندان کے ایک ہندو بزرگ نے کشمیر کے ایک ولی اللہ کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسلام قبول کر لیا۔ ڈوگرہ راج میں یہ خاندان نقل مکانی کر کے گجرات کے راستے پہلے بھیرہ پہنچا اور پھر میانی میں مستقل طور پر آباد ہو گیا۔

ایک روایت کے مطابق میانی کی ایک خاتون جو خاصی امیر تھی نوجوانی کے عالم میں بیوہ ہو گئی۔ انہوں نے جب دوسری شادی کا ارادہ کیا تو شرط رکھی کہ اس مرد سے شادی کریں گی جس کی شرافت کی شہادت پورا شہر دے گا۔ اس معیار پر میرے دادا مولوی الٰہ دین پورے اترے جو ان دنوں بھیرہ میں قیام پذیر تھے۔ شادی کے بعد وہ میانی منتقل ہو گئے۔ اس سلسلے میں اپنے بزرگوں سے میں نے سنا میرے دادا نے اپنی بیوی کا مال و متاع اور زرعی اراضی قبول کرنے کی بجائے غربا اور مساکین میں تقسیم کر دی۔ اور اپنی قسمت سازی خود اپنی محنت کی اساس پر کی۔ اور ایک ایسے انسان کی زندگی بسر کی جسے دوسروں سے ادھار لینے کی ضرورت کبھی نہیں پڑی لیکن وہ دوسروں کے آڑے وقت میں ہمیشہ کام آتے رہے۔ انہوں نے اپنے خاندان کی سرگودھا میں منتقلی کے بعد وفات پائی جو سرکار برطانیہ نے نہر موڑ جہلم کے بائیں کنارے پر آباد کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی وفات پر سوجی، گھی اور گڑ کا حلوہ بڑے بڑے کڑاہوں میں تیار ہوا۔ اور پورے شہر میں تقسیم ہوا تھا جو صرف تین بازاروں اور چند ہزار کی آبادی پر مشتمل تھا۔ لمبی عمر اور کامیاب زندگی گزار کر وفات پا جانے والوں کی آخری رسوم میں یہ خیرات غیر معمولی اہمیت رکھتی تھی۔ اب یہ رسم معدوم ہو چکی ہے۔ دادا جان کی زندگی کا یہ واقعہ بھی اہم ہے کہ بیسویں صدی کے اوائل میں جب سرگودھا کی نئی آبادی کی داغ بیل ڈالی جا رہی تھی تو انہوں نے اپنی گلی میں مسجد تعمیر کرائی۔ یہ شہر کی دوسری مسجد تھی جس کی تعمیر ذاتی وسائل سے عمل میں آئی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سرگودھا نو آباد جدید شہر تھا۔ لیکن سر عمر حیات ٹوانہ نے جو فرزند برطانیہ شمار ہوتے تھے شاہ پور کو ضلع کا صدر مقام بنوایا جبکہ تمام سرکاری ادارے سرگودھا میں قائم تھے۔ تین بڑے افسر، ڈپٹی کمشنر، سپرنٹنڈنٹ پولیس اور محکمہ آبپاشی کے سپرنٹنڈنگ

انجینئرز کے دفاتر اور کالونیاں اس شہر میں ہی تھیں اور امور حکومت بھی یہیں طے پاتے تھے۔ صرف ڈیمونٹ مورنسی ڈگری کالج شاہ پور میں قائم کیا گیا۔ میرے دادا پہلے میانی سے شاہ پور منتقل ہوئے اور پھر سرگودھا آ گئے جہاں انہوں نے بلاک نمبر 16 (سولہ) میں پانچ پانچ مرلے کے دو پلاٹ سرکاری قیمت پر خریدے اور معمولی درجے کے مکانات تعمیر کر لیے تھے۔ میرے شعور نے یہیں ہوش کی آنکھ کھولی۔

اپنی زندگی کے ابتدائی چھ سات سال کا کوئی واقعہ میرے ذہن میں موجود نہیں۔ ایک دن کھیلتا ہوا گھر آیا تو آنگن میں والدہ چارپائی پر بیٹھی ہوئی تھیں اور ان کے پہلو میں کپڑے میں لپٹی ہوئی گول مٹول سی سرخ و سفید ایک گڑیا پڑی تھی جو ہلتی بھی تھی، سانس بھی لیتی تھی اور روتی بھی تھی۔ یہ میری سب سے چھوٹی بہن فضیلت تھی جو مجھ سے چھ سال چھوٹی بتائی جاتی ہے۔ والدہ کی چارپائی کے گرد جو عورتیں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں انہوں نے مجھے بتایا کہ یہ گڑیا اللہ میاں نے بھیجی ہے۔ والدہ کے سرہانے تانبے کے گول پیسے پڑے تھے اور وہ ایک ایک پیسہ محلے کے بچوں میں تقسیم کر رہی تھیں اور انہیں جلیبیاں بھی دے رہی تھیں۔ میرے بچپن کی یہ سب سے پرانی یاد ہے۔ اور اتفاق دیکھیے کہ آٹھ بہن بھائیوں کے کنبے کے چھ افراد (چار بھائی اور دو بہنیں) اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ صرف فضیلت اور یہ ناچیز (انور سدید جس کا پیدائشی نام محمد انوار الدین ہے) زندہ ہیں۔

بچپن کی دوسری تصویر اسلامیہ پرائمری سکول بلاک نمبر 7 سرگودھا کی ہے جہاں میں نے ابتدائی تین جماعتوں کی تکمیل کی۔ اس مدرسے میں ہر صبح قرآن پاک کی تلاوت سے شروع ہوتی تھی۔ پھر اقبال کی مشہور نظم "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" پڑھی جاتی۔ اور بعد میں قرآن مجید کی آخری سورتیں حفظ کرائی جاتیں۔ میں نے آخری دس سورتیں اسی زمانے میں حفظ کی تھیں۔ اس زمانے کے ایک استاد نور محمد صاحب کا سراپا بھی میرے ذہن میں موجود ہے لیکن یہ خوش آئند یاد نہیں۔ نور محمد صاحب بڑے جابر استاد تھے۔ اپنی داڑھی کو مہندی سے رنگا کرتے اور اوپر نیچے باندھ کر تیسری جماعت کو پڑھانے آ جاتے۔ ذرا سی غفلت یا غلطی پر کڑی سزا دیتے۔ میرا ایک ہم جماعت عبدالمجید ایک روز کسی وجہ سے سکول نہ آ سکا۔ اگلے روز آیا تو ماسٹر نور محمد صاحب نے بید سے اتنا مارا کہ وہ سکول سے ہی بھاگ گیا۔ عدم تعلیم کی وجہ سے اس نے شملہ کلاتھ ہاؤس پر ایک سیلز مین کے طور پر اپنی زندگی کے ایام پورے کیے۔ ایک اور طالب علم تورا خان کو بھی انہیں ماسٹر نور محمد کے تشدد نے تعلیم سے متنفر کر دیا تھا اور یہ بعد میں جرائم پیشہ گروہ کے ہتھے چڑھ گیا۔ جیب تراشی کا پیشہ چھوڑا تو جوئے کا اڈا چلانے لگا۔ کبھی ملتا تو ماسٹر نور محمد کی بید زنی کو ضرور یاد کرتا لیکن اپنی جھنجھلی آنکھ ملا کر کہتا "میں دو انگلیوں کی کمائی کھاتا ہوں۔ اللہ نے مجھے اس کام میں بڑی مہارت دی ہے۔ ہر طرف دولت ہی دولت" مجھے یہ تو علم نہیں کہ تیسری جماعت میں میں کیسا طالب علم تھا لیکن یہ یاد ہے کہ میں نے ماسٹر نور محمد صاحب سے کبھی سزا نہیں پائی۔ ان کا خوف اتنا ہوتا تھا کہ میں اگلا سبق گھر سے یاد کر کے سکول جاتا تھا اور روز کا "ہوم ورک" بھی کبھی ادھورا نہیں چھوڑا تھا۔ چنانچہ ماسٹر صاحب کی مار سے محفوظ رہا۔

اس زمانے میں پریم ٹاکیز میں خاموش فلم دیکھنے کا واقعہ بھی مجھے یاد ہے۔ سالانہ میلہ مویشیاں کے موقع پر شہر میں تھیٹر آتے اور تماشے دکھاتے تھے۔ لیکن بچوں کو بڑے بھائی ساتھ نہیں لے جاتے۔ خاموش فلم دکھانے کے لیے کمپنی باغ کے جنوبی سرے پر پریم ٹاکیز قائم ہوئی تو انتظامیہ نے سکول کے بچوں کو ایک شو دکھانے کا انتظام کیا۔ ہماری جماعت جب سینما ہال میں پہنچی تو ہال روشنیوں سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔ پھر اچانک روشنیاں بجھ گئیں اور سامنے سفید پردے پر تصویریں متحرک ہو گئیں۔ میرے بچپن کے لیے یہ سب حیرت انگیز

تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد ہی مجھے پیشاب کی حاجت ہوگئی۔ اور سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ فراغت کس طرح ہو۔ آخر دباؤ زیادہ ہوگیا تو پیشاب شلوار میں ہی خطا ہوگیا۔ اس کے بعد خاموش قلم نے جو تحیر پیدا کیا تھا رفع ہوگیا اور میں شرمندگی کے احساس سے گھر لوٹا۔

بچپن کے اساتذہ میں سے مرزا ہاشم الدین بھی مجھے اچھی طرح یاد ہیں۔ مرزا صاحب بھی سخت گیر استاد تھے لیکن وہ مشفق اور مہربان بھی تھے۔ وہ طلبا کی پوری شخصیت پر نظر رکھتے تھے۔ ایک دن میں نے گھر میں کچھ شرارتیں کیں۔ ان کی خبر مرزا صاحب کو ہوگئی۔ بس پھر کیا تھا۔ سب زبانی املا لکھوائی اور اس میں میری کوئی غلطی نہ نکلی تو بھی اپنی چھڑی سے مجھے پیٹ ڈالا کہ میں نے لفظ "ن" کا دائرہ صحیح نہیں بنایا تھا۔ سکول کی اس پہلی پٹائی نے مجھے اپنا خط درست کرنے میں بڑی مدد دی۔ مرزا ہاشم الدین صاحب نے ہمیں نصاب سے باہر کی کتابیں محض اس لیے پڑھائیں کہ بچوں کی زبان درست ہو جائے اور کتاب پڑھنے میں دلچسپی پیدا ہو۔ مولانا محمد حسین آزاد کی "قصص الہند" میں نے لفظاً لفظاً چوتھی جماعت میں پڑھی تھی اور نہ صرف مجھے لمبے عرصے تک یاد رہی بلکہ "آب حیات"، "نیرنگ خیال" اور "دربار اکبری" جیسی کتابیں پڑھنے کی ترغیب بھی دی جو محمد حسین آزاد کی کلاسیکی کتابیں ہیں۔ چھٹی جماعت میں عربی کے استاد مولوی محمد بخش صاحب ہمیں اردو پڑھاتے تھے۔ انہوں نے غالب، حالی، داغ اور اقبال کے اشعار ہمیں ازبر کرا دیے تھے۔ مولوی صاحب ہمارے محلے میں رہتے تھے اور مغرب کی نماز کے علاوہ رمضان شریف کے مقدس مہینے میں تراویح کی قیادت بھی کرتے تھے۔ وہ جب بنگلی کے آخری مکان سے نکلتے تو سب لڑکے مودب ہو جاتے اور مولوی صاحب کو سلام کرتے۔ وہ محبت سے جواب دیتے لیکن کوئی ننگے سر نظر آ جاتا تو اپنی چھڑی اس کے سر پر ضرور مارتے۔ وہ بالوں کی انگریزی وضع کی حجامت بھی پسند نہیں کرتے تھے اور اگر بالکل گھٹا ہوا ہوتا تو خوش ہوتے۔ ان کے گھر پر شام کو تعلیم یافتہ لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا اور کسی نہ کسی مسئلے پر بحث و مباحثہ شروع ہو جاتا۔ میں کسی پچھلی چارپائی پر بیٹھا سنتا رہتا لیکن بیشتر باتیں میری سمجھ میں نہ آتیں۔ نماز مغرب کا وقت ہو جاتا تو سب لوگ مسجد کی طرف چل پڑتے۔ جہاں مولوی محمد بخش صاحب امامت فرماتے تھے۔ مرزا ہاشم الدین ممتاز ماہر اقبالیات مرزا احمد منور کے والد تھے اور مولوی محمد بخش صاحب غزل کے منفرد شاعر خالد اقبال یاسر کے دادا تھے۔ دونوں اقبال کے شیدائی تھے۔ میرے دل میں ادب کی شمع ان دو اساتذہ نے ہی روشن کی۔ مرزا ہاشم الدین کی پٹائی میں میں بے قصور تھا لیکن چونکہ یہ میری پہلی پٹائی تھی اس لیے مجھے یاد ہے۔

میں نے چھٹی جماعت گورنمنٹ ہائی سکول سرگودھا سے اولیت کے اعزاز سے پاس کی۔ اور پھر اپنے بڑے بھائی فیروز الدین نور کے پاس ڈیرہ غازی خان چلا گیا جو اس محکمہ زراعت میں ہیڈ کلرک تھے اور معززین شہر میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے مجھے ہندو ہائی سکول میں بھیج دیا۔ اس سکول میں ایک پیریڈ "اپدیش" یعنی پند و نصائح کا ہوتا تھا۔ پہلے دن اپدیش کے ہندو استاد نے بچوں کو کہا کہ کوئی بیت کسی شاعر کا یاد ہو تو سناؤ"۔ کسی بچے نے کوئی شعر نہ سنایا۔ میری باری سب سے آخر میں آئی۔ اور میں نے یہ شعر پڑھا:

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

لالہ جی نے "معنی بتاؤ" میں نے کہا "معنی تو نہیں آتے۔ عربی ماسٹر صاحب نے یہ شعر لکھوایا۔ میں نے یاد کر لیا" ۔۔۔ بولے "جس شعر کے معنی ہی معلوم نہیں اسے یاد کرنے کا کیا فائدہ" اور پھر خود اس شعر کی تشریح کی اور پوچھا "کوئی اور شعر بھی آتا ہے" ۔۔۔ میں نے یہ شعر پڑھا:

یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے　　　لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

لالہ جی بہت خوش ہوئے۔ مجھے شاباش دی۔ سب لڑکوں کو شرمندہ کیا۔ لیکن نقصان یہ ہوا کہ چھٹی کے بعد سب ہندو لڑکے میرے گرد جمع ہو گئے اور مجھے اچھی بھلی زد وکوب کرنے لگے شور برپا ہو گیا۔ اتنے میں ایک ہندو ماسٹر صاحب کا ادھر سے گزر ہوا۔ دوسرے لڑکے تو بھاگ گئے، مجھے بھاگنے کا راستہ معلوم نہ تھا۔ لالہ جی نے سمجھا کہ میں ہی شرارتیں کر رہا تھا، آؤ دیکھا نہ تاؤ، دو جڑ دیں۔ میں روتا ہوا گھر پہنچا تو بڑے بھائی صاحب نے اگلے روز مجھے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخل کرا دیا جو ڈیرہ غازی خان میں مسلمانوں کا مدرسہ شمار ہوتا تھا۔

اس سکول میں مجھے داخل کرانے کے لیے زراعت انسپکٹر عبدالجلیل صاحب کا چھوٹا بھائی اقبال لے کر گیا جو سکول میں نالائق طالب علم شمار ہوتا تھا۔ ماسٹر صاحب نے پہلے اقبال کو گھور کر دیکھا اور پھر مجھے کہا ''جاؤ آخری بنچ پر بیٹھ جاؤ''۔ یہ مولوی محمد عثمان صاحب تھے جو الجبرا پڑھا رہے تھے۔ یہ مضمون ساتویں جماعت سے شروع ہوتا تھا اور مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ انہوں نے پہلا سوال لکھوایا تو کوئی لڑکا بھی درست حل نہ کر سکا۔ مولوی صاحب طلبا کی سلیٹ دیکھتے۔ کسی کو دھپ مارتے، کسی کو دھول جماتے، کسی کے کان کھینچتے۔ میری باری آئی تو میری سلیٹ لے کر باہر پھینک دی اور کہا ''ایک اور کودن (نالائق) آ گیا ہے''۔ پھر انہوں نے یہی سوال تختہ سیاہ پر حل کیا اور اسی قسم کا ایک اور سوال دے دیا۔ طلبا یہ سوال بھی حل نہ کر سکے صرف میرا جواب درست نکلا۔ مولوی محمد عثمان خوش ہو گئے۔ سب کو میری سلیٹ دکھائی۔ اور کلاس کے لائق ترین لڑکے دیو پرکاش کے ساتھ سب سے اگلے بنچ پر جگہ دے دی۔ اس کے بعد مولوی محمد عثمان نے میرے ساتھ ہمیشہ میرے باپ جیسا سلوک کیا اور میری ہر مشکل میں مدد کی۔ بڑے بھائی کی تنخواہ ملتان سے آتی تھی۔ کبھی دیر ہو جاتی تو مولوی صاحب مجھے جرمانے سے بچاتے اور میری فیس خود ادا کر دیتے۔

ڈیرہ غازی خان کے اساتذہ میں سے مجھے مولوی پیر بخش بھی بہت یاد آتے ہیں۔ انہوں نے مجھے کلاس لائبریری کا انچارج بنا دیا تھا۔ کتابیں اور رسالے پڑھنے کے لیے ملنے لگے تو ذوق بھی پروان چڑھنے لگا۔ منشی پریم چند، راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، خواجہ حسن نظامی اور پنڈت سدرشن کو میں نے اس لائبریری کی کتابوں میں پڑھا۔ میں اس زمانے میں بزمِ ادب کا سیکرٹری بھی تھا۔ اور ہر ہفتے ایک مضمون پڑھتا تھا۔ مولوی پیر بخش صاحب نے ہی میری زبانی تقریر کرنے کی ترتیب استوار کی۔ طلبا میں سیاسی بصیرت پیدا کرنے کے لیے محمد افضل نیازی کی تحریک پر طلبہ کی ایک اسمبلی بنانے کی تجویز منظور کی گئی تو ہیڈ ماسٹر رسول بخش صاحب نے اس کے لیے باقاعدہ انتخابات کروائے، اور ووٹوں کی پرچیاں ڈالی گئیں۔ مجھے اپنی کلاس میں سب سے زیادہ ووٹ ملے۔ اسد علی شاہ جو وفاقی سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے ہیں اس اسمبلی میں وزیرِ تعلیم مقرر ہوئے۔ میں ان سے ایک سال جونیئر تھا۔ مجھے ان کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ مجھے یاد ہے محمد افضل نیازی کا بھائی شفیع اللہ نیازی بھی اس انتخاب میں امیدوار تھا لیکن وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ وزیرِ تعلیم کی حیثیت میں اسد علی شاہ نے سکول میں ''یومِ اقبال'' کی تقریب منعقد کی۔ میں نے اخبارات کی مدد سے کر اقبال پر ایک مضمون لکھا اور اس تقریب میں پڑھا۔ سکولوں کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر محمد صادق شاہ صاحب جو جنرل (ر) اسلم شاہ کے والد تھے صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے میرا مضمون سن کر مجھے شاباش دی اور ایک روپیہ انعام بھی دیا۔ دو روپے کا پہلا انعام اسلم شاہ کو ملا تھا جو ان کے فرزند تھے اور زبانی تقریر میں ملکہ رکھتے تھے۔

آٹھویں جماعت میں پہنچ کر میں نے اینگلو ورنیکلر فائنل کا امتحان بھی دیا جس کے لیے چند مخصوص طلبا منتخب کیے جاتے تھے۔

اس امتحان کی مجھے یہ بات یاد ہے کہ ہمارے حساب کے ماسٹر مولوی خان نے ہمیں تختیوں کی نقل بالکل نہ کرنا۔ ہمارا مقابلہ ہندو سکول کے ساتھ ہے۔ ہمیں ثابت کرنا ہے کہ مسلمان اپنے علم پر بھروسہ کرتا ہے۔ ماسٹر صاحب کی اس نصیحت پر ہم سب طلبا نے سختی سے عمل کیا جبکہ ہندو سکول کے دو طالب علم "بوٹی" استعمال کرتے ہوئے پکڑے گئے تھے۔ میں نے یہ امتحان اول درجہ اول پاس کیا لیکن پورے ضلع میں وظیفہ حاصل کرنے کی پوزیشن حاصل نہ کر سکا۔ آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں ڈیرہ غازی خان سے واپس سرگودھا آ گیا اور یہاں گورنمنٹ ہائی سکول میں سائنس اور ڈرائنگ کے مضامین کے ساتھ نویں جماعت میں داخلہ لیا۔ اب اردو سے تعلیمی رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ لیکن ماسٹر ہاشم الدین، مولوی محمد بخش اور مولوی پیر بخش نے ادبی ذوق کا جو بیج میرے دل میں بویا تھا وہ برگ و بار لا رہا تھا۔ بزم ادب کی سیکرٹری شپ نے سونے پر سہاگے کا کام کیا تھا۔ ڈیرہ غازی خان میں اس ذوق کو ایک کریانہ فروش شیر محمد پاکستانی نے بھی پروان چڑھایا تھا جن کے پاس اخبار زمیندار، انقلاب اور ویر بھارت وغیرہ آتے تھے۔ ان کی لائبریری سے بھی مجھے استفادہ کا موقع ملتا تھا۔ یہ صاحب 1941ء میں اپنے نام کے ساتھ "پاکستانی" لکھتے تھے۔ میں اخبار کا بچوں کا صفحہ پڑھ کر کہانی لکھتا تو حوصلہ افزائی کرتے۔ ایک اور اہم کردار شیخ منظور الٰہی کا ہے جو اردو کے ممتاز افسانہ نگار مقصود الٰہی شیخ کے بڑے بھائی تھے۔ ان کی لائبریری میں اردو کے اہم رسائل ہمایوں، ساقی، ادبی دنیا وغیرہ کی جلدیں محفوظ تھیں۔ شیخ صاحب کلرک آف کورٹ تھے۔ دفتر چلے جاتے تو میں یہ رسائل آزادی سے پڑھتا۔ شفقت کاظمی جو اپنے نام کے ساتھ "خاکپائے حسرت موہانی" لکھا کرتے تھے، میرے دوست آفتاب احمد خان کے اتالیق تھے۔ انہیں تعلیم دینے کے لیے آتے تو میں بھی پہنچ جاتا۔ اشعار کا مطلب سمجھاتے سمجھاتے ہماری ادبی تربیت کرنے لگتے۔ اور مجھے بھی استفادہ کا موقع مل جاتا۔ میں ان کے اس احسان کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ میرا خیال ہے کہ مشاعرے سننے کی لت بھی مجھے ڈیرہ غازی خان میں ہی پڑی تھی۔ یہ ایک دور افتادہ ضلع تھا لیکن ادب کی روایت میں پختہ تھا۔ مقامی مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی باہر کے شاعر بھی بلائے جاتے تھے۔ میں نے اختر رضوانی کو پہلی مرتبہ ڈیرہ غازی خان کے ایک مشاعرے میں ہی سنا تھا۔ دو اشعار یاد رہ گئے ہیں۔

سلسلہ در سلسلہ ہے اس کا حسنِ دل فریب — عشق میرا داستاں در داستاں ہے آج تک
اب کہاں اہلِ جہاں کے دل میں سوزِ عاشقی — ایک اختر ہے جو مصروفِ فغاں ہے آج تک

(ڈاکٹر انور سدید کے پرانے کاغذات سے بازیافت)

◆◆◆

''اظہر جاوید کی ہر کہانی ان کی اپنی زندگی کی ایک پرت ہے۔۔۔ یوں ان تجربوں کی یہ کہانیاں اظہر جاوید کی داستان حیات کے اوراق ہیں۔'' (ڈاکٹر انور سدید)

''سلیم شہزاد نے پنجابی شاعری کو جدید نظم کے مزاج سے ہم آہنگ کیا ہے۔ میں انہیں جدید پنجابی نظم کا میرا جی اور ن۔م راشد شمار کر سکتا ہوں۔ بلاشبہ ان کی یہ منفرد حیثیت تاریخی ہے۔'' ——— (ڈاکٹر انور سدید)

منظومات

امجد اسلام امجد

خواب

صاحبو! خواب پرندوں کی طرح ہوتے ہیں
جھوٹ: چاہو تو یہ اڑ جاتے ہیں
اور پھر ہاتھ نہیں آتے ہیں
کبھی اک شاخِ تمنا پہ چہکتے ہوئے گاتے رہنا
داستاں دور کے دیسوں کی سناتے رہنا
ہر نئی رت میں نیا گیت بنا کر لانا
کبھی ہنسنا، کبھی رو دینا رلاتے رہنا
اڑتی خوشبو کی طرح قید نہیں ہو سکتے
کسی بھی تیر سے یہ صید نہیں ہو سکتے
کبھی منزل، کبھی رستوں کی طرح ہوتے ہیں
صاحبو! خواب پرندوں کی طرح ہوتے ہیں

(2)

صاحبو! خواب کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں
آبگینوں کی طرح چھوٹنے لگتے
اک ذرا ٹھیس لگی، ٹوٹ گئے
یہ کسی عمر، کسی وقت کے پابند نہیں
کبھی گڑیا کی طرح سوتے ہیں تھکے سے لگ کر
کبھی کونوں میں پڑے رہتے ہیں بیگانے سے
کسی مانوس سی آہٹ کا اشارہ پا کر
دھیان کے طاق میں سجتے ہیں پری خانے سے
خواہشیں دل میں کھلاتے ہیں ستارے کیا کیا
آنکھ میں خواب کا اک چاند اتر آنے سے
کبھی اپنے، کبھی غیروں کی طرح ہوتے ہیں
صاحبو! خواب کھلونوں کی طرح ہوتے ہیں

(3)

صاحبو! خواب مکانوں کی طرح ہوتے ہیں
جو سدا دل میں گھر بنتے ہیں
اور اک پل میں کھنڈر بنتے ہیں
امن اور وہم میں جو لوگ تھے زندہ ہو گئے
پر یہ آواز کے سائے نہیں مرنے والے
شب کی پہنائی میں بکھرے ہوئے قدموں کی
آنچ میں اکھڑ کے رہتے نہیں مرنے والے
کس قدر رنگ بہم ہوں تو بنے گل دستہ
ایک لمحے میں بکھر جاتا ہے کسی بات سے وہ
عمر بھر جاگ کے کاٹیں جو [illegible] ریشم
آنکھ جھپکیں تو پھسل جائے وہیں ہاتھ سے وہ
گمشدہ آگ کے شعلوں کی طرح ہوتے ہیں
صاحبو! خواب مکانوں کی طرح ہوتے ہیں

OOO

ڈاکٹر طاہر سعید ہارون

بگیا (دوہے)

رت آئی برسات کی پیدا لی انگڑائی
من بگیا میں جھولا آس جھلاتے آئی

سندر والے پیڑ کے پتے سنگ ہوا میں
جھوم جھوم راگنی پون چھیڑے گا میں

جھم جھم کی اک بوند میں دھرتی کی جھنکار
پھول جدھر بھی دیکھتا اپنی روپ بہار

بھاری بوندیں ہوں کی بوجھ سہا نہ پائے
نازک گل کی پنکھڑی لیے لیے جھکتی جائے

لال گل اور کی جیب اپنی دکھلائے
بھنورا آئی چوسنے اڑتا ہنسا جائے

من بگیا میں خوشبو تتلی پر پھیلائے
رت بکھرے کوئی تو پون جھونکا آئے

بگیا اجڑی چاندنی جگنو سب حیران
دیکھ کے کس دیس کا من ہی من مہمان

دھنک گلی جھولیں بداولی کے سنگ
رت آئی برسات کی نئے دھنک کے رنگ

OOO

ابصار عبد العلی

متضاد رستوں کے مسافر

کبھی کہتے ہیں وہ
خیر و شر کے درمیان دیوار بنائے جاتے ہیں
خیر کے خدام ہیں وہ
وہ شر کو دور سدا دور کرتے جاتے ہیں
وہ کہتے ہیں کہ وہ صورت نما ہیں
باقی سب تاریکیاں ہیں
وہ تو ہیں صداقت پیکر
دوسرے باطل کا مظہر
شر کے رہبر ہیں
مگر وہ شر کو دور راستے پہ روکنے کو نکلے ہیں
وہ فرماتے ہیں "منزل تو ہے ایک، دونوں کی منزل وہ
چلیں اک ساتھ دونوں
وہاں اک ساتھ ہی پہنچیں"
مگر وہ مختلف متضاد رستوں کے مسافر ہیں
وہ فرماتے ہیں
دنیا اک سمندر ہے مسافر کا
یہاں پر شر کا طوفاں
خیر کو مغلوب کرتا جاتا ہے
اس میں آپ، وہ، ہم لوگ
دورانِ سفر میں ہیں
تو جب سب اک سمندر کے مسافر ہیں
تو پھر وہ ایک کشتی میں سفر سے کیوں گریزاں
ہیں؟

OOO

ارمان نجمی (انڈیا)

ایک عورت

ایک عورت
اکیلی بھی رہ کر اکیلی نہیں
اس کے افکار کی وسعتوں میں
زمیں آسماں بھی ہیں
ماہ و مریخ بھی جگمگاتے ستارے بھی ہیں
اس کی آنکھوں میں پیہم شرارے بھی ہیں
وہ جو چاہے تو گھر کی فضاؤں کو گلزار کر دے
وہ لڑکی بھلائی کی خوشبو سے سرشار کر دے
حاسدوں پر بھی وہ تو وار کر دے
اس کی طاقت کا اندازہ کرنا ہے مشکل بہت
اس کو کمزور ہرگز سمجھنا نہیں
ایک عورت جو چاہے
تو گھر بار کو اپنی جنت بنا دے
ایک بیاباں کو بھی ایک گلزار کی صورت
دلوں پر حکومت کرے
اپنی اوقات بھولے نہیں
اپنے دامن کی عصمت پہ قائم رہے

OOO

غالب عرفان

یومِ پاکستان

یہ دن
یہ جشن رقصِ دوام
یہ دن ہماری آرزوؤں کی سحر کا آئینہ
عروجِ وقت کی جبیں پہ
مثلِ ماہتاب ہے
صداقتوں کا باب ہے
عزم کے چمن کی سرزمیں پہ
لہلہاتی کھیتیوں کے درمیاں
جفاکشوں کی آن ہے
رواں رواں جہانِ نو
دلوں پہ حکمراں ہے
یہ دن بہت عظیم ہے
یہ دن ہمیں عزیز تر دلوں سے
بھی عزیز ہے

یہ دن
تصورِ حسیں ہے
مثالِ عشق کی طرح
وفا سے لم یزل بھی ہے
حیات بے بدل بھی ہے

OOO

کرامت بخاری

اگر تم بیچنا چاہو

اگر تم بیچنا چاہو
ادائیں بھی وفائیں بھی
حسیں خوابوں کے رنگوں کی ادائیں بھی
یہ بازار ہے
یہاں آواز بکتی ہے
یہاں تصویر بکتی ہے
یہاں ہر جرم کی اجرت
یہاں تحریر بکتی ہے
یہ بازار جیسے اک بیکراں گہرا سمندر ہے
یہاں پر کشتیاں ساحل پہ آ کر ڈوب جاتی ہیں
مسافر مر بھی جاتے ہیں
مگر روحیں نہیں جاتی
یہ انسانوں کا جنگل ہے
اور اس جنگل میں مشکل کا سماں ہر وقت رہتا ہے
اگر تم بیچنا چاہو
ادائیں بھی وفائیں بھی
حسیں خوابوں کے رنگوں کی ادائیں بھی
مرے دل میں بھی اک بازار چلتا ہے
جہاں ہر شام ہوتے ہی، ہجوم یاس ہوتا ہے
غموں کی بھیڑ لگتی ہے
کئی یوسف سر بازار بکتے ہیں
اگر تم بیچنا چاہو

OOO

سلیم آغا قزلباش

بہت مشکل ہے!

کیا تم
ماسک پہنے ہوئے چہروں کے اژدہام میں
اصلی چہروں کو ڈھونڈ سکتے ہو
آوازوں کے بے ہنگم شور میں
کھری سچی آوازوں کو سن سکتے ہو؟
رنگوں کے گڈمڈ دھاروں میں سے
خالص اصلی رنگوں کو
الگ کر سکتے ہو؟
روشنیوں کے شہر میں
گھر گھر پھیلے اندھیروں میں
چمک دار آنکھوں کا کھوج لگا سکتے ہو؟
پھولوں سے بچھڑی پتیوں کو
ہتھیلی پر رکھ کر
کیا دوبارہ پھول کی طرح
جوڑ سکتے ہو؟
ویرانے کی گلی کی
گلی دیواروں کے اندر
جنم لینے والی خواہشوں اور
ٹوٹتی سانسوں کو روک سکتے ہو؟
بیمار دل کی دھڑکنوں کو
سمجھ سکتے ہو؟
اور کیا تم
لفظوں سے عکس
لایعنی فرہنگ میں
صدیوں سے گمشدہ معنوں کو
تلاش کر سکتے ہو؟
دل کی بات جو میں
تم سے کہہ رہا ہوں
کیا تم سن سکتے ہو؟
بہت مشکل ہے!!

OOO

ڈاکٹر جواز جعفری

میرے اندر موت کا کھیل جاری ہے

زندگی اور موت
ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں
میرے اندر موت کا کھیل جاری ہے
لگتا ہے
میرے جسم کے حصے مرتے رہتے ہیں
میں پھر بھی زندہ رہتا ہوں
موت
جسم کی تکمیل زندگی کا نام ہے
میرے جسم کے ریزہ ریزہ ہونے پر
تم خوش ہوتے ہو
اگر موت کے بس میں ہوتا
تو کب کی مجھے نگل چکی ہوتی
میں اپنے فانی جسم سے باہر
ہمیشہ زندہ رہوں گا
اپنے لفظوں میں
اور
تمہاری یادوں میں

OOO

رشیدہ آفریں

بیادِ ڈاکٹر انور سدید

چل بسا ہے دوستوں کو چھوڑ کر اک مہرباں
آئینہ گر تھے یہی جو تھے جواں

فیض ہی پاتے رہیں گے تا ابد پیر و جواں
تھا وہی اہلِ ادب میں اک امیرِ کارواں

تبصرہ ہو یا کہ ہو کالم نگاری کا ہنر
ہر کس و ناکس کو تھا وہ صاف گو شیریں بیاں

ہوں تراجم یا کہ ہو خاکہ کوئی دلکش اثر
لفظ و معانی کا تھا گویا ایک سحر بے کراں

آ گیا جو راہِ ترقی کا کہیں پر مرحلہ
منزلیں ہوں وادیاں ہوں ہم سفر اور ہم زباں

جامعاتِ پاک ہوں یا غیر ملکی کا فرض
حشر تک اور منتقد اس کا رہا حق اک بیاں

باب ہو تخلیق کا یا حاشیہ تاریخ کا
ہر فن میں ان سلیقے کے بنے ہیں دائرہ

جس کو سب کہتے رہے ہیں ڈاکٹر انور سدید
وہ گئی اس کی رہے گی اب جہاں میں داستاں

ہم رکاب اس کے کبھی تھے اظہر جاوید بھی
آفریں کی ہے دعا دونوں کو ہوں آسانیاں

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

خواتین کے نام جو غیرت کے نام پر قتل ہوئیں

پارسا مردوں کی تنگی شاطریں
اور فضا میں خوف کی لہر
اور حویلی کی اونچی دیواروں سے
نکلی چیخیں
ہر طرف تھا اک سناٹا
ایک معشوقِ زندہ کا جس کا قتل ہوا تھا
غیرت ہے
گاؤں گاؤں دھوم مچی ہے
شان سلامت اونچے شملے والوں کی

OOO

مشرق صدیقی

صبحِ زندگی ہے تُو

اے وطن صبحِ زندگی ہے تُو
اے وطن شامِ شگفتگی ہو تم
اے وطن شانِ دلبری ہو تم
اے وطن وجہِ سرخوشی ہے تم
دل نشیں لطف دلبری ہے تم
اے وطن صبحِ زندگی ہے تُو

تُو ہمارے دلوں کی دھڑکن ہے
تُو ہمارے وفا کا مسکن ہے
ہم ہیں بلبل تو ایک گلشن ہے
دل کی دنیا تجھی سے روشن ہے
صبحِ الفت کی روشنی ہے تُو
اے وطن صبحِ زندگی ہے تُو

OOO

تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیسا!
تبت سنو کا روزانہ استعمال
جلد کو تر و تازہ اور خوبصورت بنائے۔
جلد کو ریشم کی طرح نرم و ملائم بنائے۔
چھائیاں، داغ دھبے دور کرے۔
جلد کو گرد و غبار سے بچائے۔
جلد کو عمر کے اثرات اور جھریوں سے عرصہ دراز تک محفوظ رکھے۔
Tibet
Tibet
تبت سنو۔ ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

افسانے

نہ پری رہی نہ جنوں رہا

ڈاکٹر رشید امجد

شروع شروع میں شک تھا لیکن اب یقین ہو چلا تھا کہ اس گھر میں ان کے علاوہ کوئی اور بھی رہتا ہے۔ گھر میں اس وقت چار لوگ تھا: دونوں میاں بیوی، ڈرائیور اور ایک ملازم جو کچن اور گھر کے کام کرتا تھا۔ دونوں میاں بیوی عمر کی آخری سیڑھیوں پر تھے۔ میاں کو ریٹائر ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ ایک زمانے میں وہ بہت خواب دیکھتا تھا۔ بے تعبیر خواب۔ اب اس نے خواب دیکھنا تقریباً چھوڑ دیا تھا۔ خواب اب اپنی مرضی سے تو دیکھے نہیں جا سکتے، جی تو چاہتا تھا کہ اب بھی خواب دیکھے، بھلے سے بے تعبیر ہی ہوں لیکن اب تو نیند کی گولی کھا کر بھی نیند نہیں آتی تھی، رات کو واش روم جانے کے لئے اٹھتا تو پھر نیند ہی نہ آتی۔ ایک دو بار ٹی وی لگایا تو بیوی اٹھ گئی، سو اب اس نے ایک نیا طریقہ نکالا، ٹی وی آن کر کے آواز بند کر دیتا۔ عجیب سا لگتا۔

"میں شاید بغیر آواز والی تصویروں کے دور میں پہنچ گیا ہوں۔"

پھر اس میں بھی ایک مزہ آنے لگا۔ آواز کے بغیر حرکات ___ وہ چلتے ہونٹوں کو اپنے معنی پہنا دیتا۔ بیوی بھی ڈسٹرب نہ ہوتی، وہ بھی اپنی عمر کی آخری سیڑھیاں اتر رہی تھی ___ ہر وقت اداس رہتی۔ بیٹے بیویوں کو لے کر باہر چلے گئے تھے۔ بیٹیاں اپنے اپنے گھر۔ کبھی اس گھر میں بچوں کی قلقاریں تھیں۔ بچے چلے جاتے، بھرے پُرے گھر میں ایک اداسی اور تنہائی چوکڑی مار کر بیٹھی ہوئی تھی اور جانے نہ جاتی تھی۔ دونوں ملازم سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے۔ رات کو دس بجے وہ اپنے کمرے میں چلے جاتے اور صبح ان کے دروازہ کھولنے پر اندر آتے۔ میاں ان کے جانے کے بعد ایک ایک دروازہ چیک کرتا اور پھر دیر تک ٹی وی دیکھتا رہتا۔ بیوی سو جاتی۔ اس اداس گھر میں وہ دونوں تھے اکثر خاموش رہتے، کبھی کبھار کوئی بات ہو جاتی، بس ایک دوسرے کے پاس ہونے کا احساس تھا۔ اس گھر کے اندر وہ دو تھے، رات کے وقت، دن کو چار ہو جاتے، اور کون تھا؟ بس ایک دن احساس ہوا کہ کوئی اور بھی ہے جو ہے تو سہی مگر دکھائی نہیں دیتا۔ یہ خوف کی بات تھی لیکن خوف محسوس نہیں ہوا۔ اس تیسرے کا احساس تو دن کو بھی ہوتا تھا لیکن رات کو تو یہ احساس بڑھ جاتا۔ لگتا کوئی کبھی لاؤنج میں، کبھی اوپر والے حصے میں، کبھی سیڑھیوں میں موجود ہے۔ کئی بار جی چاہا کہ اپنے کمرے سے نکل کر دیکھے لیکن ہمت نہ ہوتی۔ بیوی سے بات کرتے ڈرتا تھا کہ خوف زدہ ہو جائے گی ___ وہ تو پہلے ہی ایک ڈری ہوئی سہمی ہوئی عورت تھی۔

شروع شروع میں اس تیسرے کا احساس رات کو باہر کے کمرے میں ہوتا تھا لیکن اب لگتا کہ وہ ان کے بیڈروم ہی میں موجود ہے۔

بس ایک احساس ہی تھا، ورنہ دکھائی تو کچھ نہ دیتا، پھر لگا کوئی ان کے درمیان میں ہے۔ اپنی اپنی دیواروں کی طرف منہ کئے دونوں میاں بیوی عمر کی ڈھلوان پر تیزی سے پھسلتے ہوئے، انتظار کر رہے تھے لیکن اب شاید انتظار بھی نہیں تھا۔ درمیان میں لیٹا ہوا کوئی خود کو محسوس کرا رہا تھا۔ کئی بار غیر ارادی طور پر میاں بغیر مڑے ہاتھ سے کچھ ٹٹولنے کی کوشش کرتا۔ درمیانی خالی جگہ پر ہاتھ ادھر ادھر ہوتا تو اطمینان سا آ جاتا لیکن دوسرے ہی لمحے اطمینان کی چڑیاں پھر سے اڑ جاتیں۔

''کوئی تو ہے'' وہ سوچتا — ''پر دکھائی کیوں نہیں دیتا''

دکھائی تو وہ نہیں دیا بس اپنے ہونے کا احساس ہی کراتا رہا۔

اب وہ اپنے وجود پر بھی اس کی دستک محسوس کر سکتا تھا۔ شاید وہ دستکیں دے کر وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ اپنے وجود میں موجود بھی ہے یا نہیں۔

''یہ تو میری کیفیت ہے'' میاں سوچتا — ''میری بیوی کو تو کوئی احساس ہی نہیں''۔

وہ یہ ذکر کر کے اسے خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو پہلے ہی ڈری ہوئی سی عورت تھی۔

''تنہائی بھی اپنا ایک وجود رکھتی ہے'' اسے ایک دن اچانک خیال آیا ''پرندے ہجرت کر جائیں تو باغ اجڑ جاتا ہے، گھر میں بچوں کی قلقاریاں نہ ہوں تو گھر تنہائی بسا جاتا ہوا اداس ہوتا ہے، اور یہ اداسی بھی تو اپنا وجود رکھتی ہے۔''

تو یہ تنہائی تھی یا اداسی جو اس گھر میں دبے پاؤں چلتی تھی اور اپنے ہونے کا غیر محسوس احساس کراتی تھی۔

''ہم دونوں میں سے جو پہلے چلا جائیگا وہ شاید خوش قسمت ہوگا'' اس نے سوچا — ''جو رہ گیا، یہ جو کوئی نظر نہیں آتا بھوکے کتے کی طرح اس پر ٹوٹ پڑے گا''۔

تصور میں اپنے وجود کو ادھڑتا ہوا دیکھتا، محسوس کرتا۔

اذیت — نہ ختم ہونے والی اذیت

''ہم دونوں میں سے ایک کو تو اس سے گزرنا ہے''

ہمدردی سے اپنی دیوار کی طرف منہ کئے ڈری سہمی عورت کو دیکھتا۔

''یہ تو پہلے ہی بوڑھی ہو گئی ہے اور اذیت برداشت نہیں کر سکے گی''

پھر وہ سوچتا — موجود تو کوئی تھا بے شک دکھائی نہ دے — اور اس نے ان میں سے کسی ایک کو تو ادھیڑنا تھا۔

درد کی ٹیسیں سارے وجود میں دوڑ جاتیں۔

''ہم میں سے ایک کو ....''

تفتیشی افسر نے اپنی رپورٹ میں لکھا — ''وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ تمام کوشش کے باوجود وہ کچھ بتاتا ہی نہیں''

نیم تاریک کوٹھری کے کھردرے فرش پر لیٹے لیٹے سوچتا ہے — ''بتائے بھی کیا، بتانے کو کچھ ہے ہی نہیں''۔

◆◆◆

اطلاع عام

قارئین کی پرزور فرمائش پر رسالہ ''تخلیق'' کو فیس بک پر پیش کرنے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ اب آپ فیس بک پر ماہنامہ ''تخلیق'' پیج (Monthly "Takhleeq" Page) کو Link کر کے ''تخلیق'' کے ہر شمارے کے حوالے سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی پسند کی تحریریں download کر سکتے ہیں۔

شکستہ جذبے

یٰسین احمد (انڈیا)

سنگاپور کے اس خوبصورت وسیع شاپنگ مال IMM کے صرف ایک ہی فلور کے چکر لگانے کے بعد سرفراز کو احساس ہو گیا کہ وہ 'ین لی' کی تیز چال کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس کے پاؤں دکھنے لگے اور قدم سست پڑنے لگے۔ ین لی نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا: "تھک گئے ہو؟" "نہیں۔" سرفراز خفت مٹانے کے لئے مسکرا دیا۔ "عادت ہونا چاہئے پیدل چلنے کی۔" ین لی نے کہا۔ "آپ لوگ پیدل نہیں چلا کرتے۔" "پیدل چلتے ہیں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن اسی وقت جب موٹاپا چھٹنے لگتا ہے اور پھر ذیابیطس کا شکار ہونے لگتے ہیں۔" وہ مسکرا کر چپ رہی اور پھر بولی۔ "آپ یہاں بنچیں میں بیٹھے فلور پر ہو آتی ہوں۔ کھانے پینے کی کچھ ضروری چیزیں خریدنا ہیں۔" وہ وہیں ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور ین لی کو اسکلیٹر سے نیچے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ین لی عمر میں اس سے گیارہ بارہ سال بڑی رہی ہوگی۔ لیکن اس کی صحت اور پھرتیلا پن قابل رشک تھا۔

اس کی ین لی سے کوئی دیرینہ شناسائی نہیں تھی۔ وہ نہ اس کی گرل فرینڈ تھی اور نہ محبوبہ۔ ین لی اس فلیٹ کی مالک تھی جس فلیٹ کا ایک کمرہ سرفراز نے کرایہ پر لیا تھا۔ سرفراز اس کمرہ کا ماہانہ آٹھ سو ڈالر کرایہ ادا کرتا تھا۔ 12x12 کے اس کمرے میں ہر سہولت مہیا تھی۔ اٹیچڈ باتھ روم، آرام دہ بیڈ، وسیع اور خوبصورت سا وارڈ روب، ایک چھوٹی سی لکھنے پڑھنے کے لئے میز اور کرسی۔ کمرہ میں 4x6 کی ایک کھڑکی بھی تھی جس سے صبح کے وقت سورج کی نرم کرنیں اور دن بھر خوشگوار ہوائیں سرسراتی رہتی تھیں۔ اس کھڑکی سے دنیا بھر کا نظارہ آسانی سے کر سکتا تھا۔ پل پل رنگ بدلتا آسمان، سرسبز و شاداب درخت اور شہری فلک بوس عمارتیں۔ فلیٹ نویں فلور پر تھا جس کی وجہ سے باہر کی آوازیں مخل نہیں ہوا کرتیں۔ اس کے علاوہ سرفراز کو کچن اور فریج کے استعمال کی بھی اجازت تھی۔

اس گیارہ ماہ پہلے سرفراز کوچی سے سنگاپور آیا تھا۔ یہ ہجرت کسی معاشی تنگ دستی کا نتیجہ نہیں تھی کیونکہ وہ کروڑ پتی باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ چودھری افضل حسین کوچی کے بہت بڑے چرم سوداگر تھے۔ ان کے کارندے کئی بڑے شہروں میں پھیلے ہوئے تھے جہاں سے وہ کچا اور خام مال خریدتے اور کوچی بھیج دیا کرتے تھے۔ کوچی میں اس خام چرم کو فنشنگ کے بعد دنیا کے ملکوں میں برآمد کیا جاتا تھا۔ انہوں نے بیٹے کو سائنس اور کمپیوٹر کی اعلیٰ تعلیم دلائی تھی۔ سوچا تھا کہ سرفراز تعلیم حاصل کرنے کے بعد کاروبار کو جدید طریقے پر وسعت دے گا۔ لیکن سرفراز کو چرم کا یہ کاروبار پسند نہیں تھا حالانکہ خاندان کی یہی روایت تھی کہ بیٹا باپ کا کاروبار سنبھالے اور خاندان کی ہی کسی لڑکی کو بہو بنا کر لائے۔ سرفراز کو علم تھا کہ چودھری جی خاندان کی کسی لڑکی کو بہو بنانا چاہتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں سرفراز کی مرضی و منشا کے خلاف تھیں۔

علم بغاوت بلند کئے بغیر اس نے خاموشی سے ایک ایجنٹ کی مدد سے سنگاپور میں ملازمت حاصل کی اور سنگاپور آ گیا تھا۔ ماں باپ نے وقتی طور پر خاموشی اس لئے اختیار کر لی کہ بیٹے کو ایک بہت بڑی فرم میں ملازمت ملی تھی اور معقول تنخواہ تھی۔

پردیس میں اپنے ہم زبان سے ہمدردی جتانا ایک فطری امر ہے۔ تمل زبان بولنے والوں میں یہ جذبہ شدت سے پایا جاتا

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سنگاپور میں تمل بولنے والوں کی اکثریت ہے اور زبان کو سرکاری درجہ حاصل ہے۔ سرکاری اعلانات اور اشتہارات تمل زبان میں بھی شائع ہوتے ہیں۔ اس زبان کے اخبارات اور رسائل بھی خوب بکتے ہیں۔ ٹی وی چینل ہیں اور فلمیں بھی چلتی ہیں۔ زبان اسی وقت ترقی کرتی ہے جب عوام میں شعور ہو، اپنی زبان سے انسیت ہو ورنہ صرف سرکار سے امید رکھنا عبث ہے۔ اسی زبان کی وجہ سے سرفراز کو دقت کا سامنا کرنا نہیں پڑا تھا جس نے سنگاپور میں ملازمت دلائی تھی وہ تاملین تھا جس کمپنی میں ملازمت ملی تھی اس کا مالک تاملین تھا ایک تمل ایجنٹ نے ین لی کے فلیٹ کی نشاندہی کی تھی۔

وہ نیا نیا فلیٹ میں کرایہ سے آیا تھا اس وقت ین لی کا شوہر کنگ چو بھی ساتھ تھا لیکن میاں بیوی کے درمیان اختلافات کی دراڑ آچکی تھی ازدواجی زندگی کے انتیس برس ان دونوں نے بڑی محنت اور رفاقت سے گزارا تھا۔ مل کر ایک بیکری چلائی جو ایسے مقام پر تھی جہاں سے بون ایم آر ٹی (میٹرو ٹرین) کا جال سارے شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ صبح چھ بجے سے رات گیارہ بجے تک سینکڑوں لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی بیکری سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ متوسط زندگی گزارنے کے لئے کافی تھی۔

ایک بیٹی تھی، جس کی شادی انہوں نے پچھلے سال کر دی تھی۔ اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ بالی میں رہا کرتی تھی۔ بیٹی کی شادی کے بعد کنگ چو کی عادتیں بگڑنے لگیں۔ مے کشی میں شدت آگئی، جوئے اور ریس کی لت بھی پڑ گئی۔ بیکری کی محدود آمدنی ان عادتوں کے متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ جس کی وجہ سے دونوں میں روزانہ جھگڑے ہونے لگے۔

آج دنیا کی پڑھی لکھی اور نصف آبادی پلاسٹک کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے پر تکیہ کئے ہوئے ہے اور پلاسٹک کا وہ ٹکڑا ہے کریڈٹ کارڈ۔ جو ابتدا میں ریشم کی ڈوری کی طرح ملائم اور جاذب نظر لگتا ہے لیکن رفتہ رفتہ پھانسی کے پھندے کی مانند سخت ہو جاتا ہے وہ دونوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ کنگ چو ذہنی طور پر اتنا مفلس ہو گیا تھا کہ بیوی سے لڑنا جھگڑنا روز کا معمول تھا۔

اس دن اتوار تھا جب سرفراز اپنے کمرہ میں لیٹا فون پر ماں باپ سے بات چیت کر رہا تھا کہ باہر سے ان دونوں کی زور زور سے گفتگو کرنے کی آوازیں سنائی دیں وہ دونوں چینی زبان میں بات کر رہے تھے ان کی زبان تو سمجھ میں نہیں آئی لیکن وہ یہ جان گیا تھا ان کے لہجوں میں تلخی ہے غصہ اور نفرت ہے۔

میاں بیوی کے معاملے میں اس کا دخل دینا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا، یہ سوچ کر فون بند کر کے بستر پر لیٹا رہا۔ لیکن جب سامان پھینکنے اور ین لی کے چیخنے چلانے کی آوازیں آئیں تو کمرہ سے باہر آیا۔ کنگ چو ایک سوٹ کیس کھینچتے ہوئے باہر نکل رہا تھا اور ین لی صوفے پر بیٹھی دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپائے سسک رہی تھی۔ سرفراز معاملہ کی نوعیت کو تاڑ گیا" کنگ چو گھر چھوڑ کر جا رہا تھا وہ اسے روکنے کے لئے باہر کی طرف لپکا۔ مگر اس وقت تک کنگ چو لفٹ سے نیچے اتر چکا تھا۔ وہ واپس چلا آیا۔ ین لی اب بھی وہیں سسک رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر اپنا ہاتھ چہرے سے ہٹایا اور کہا۔

"آپ کیوں گئے تھے اس کو بلانے کے لئے؟ میرے بغیر کنگ چو نہیں رہ سکتا۔ میں جانتی ہوں وہ جلد لوٹ آئے گا۔"

سرفراز حیران رہ گیا۔ اس لئے نہیں کہ اس کے لہجے میں غیر معمولی اعتماد کا عنصر شامل تھا بلکہ اس لئے کہ ین لی نے یہ فقرے تمل میں ادا کئے تھے۔ پیشے نے اس کو بھی تمل زبان سکھا دیا تھا۔ پھر وہ کہنے لگی۔ "وہ اپنی بری عادتوں کا ذمہ دار مجھ کو ٹھہراتا ہے۔ کہتا ہے کہ میں ٹھیک سے محنت نہیں کر رہی ہوں اس لئے بیکری کا کاروبار ٹھپ ہو رہا ہے۔ آج ہم گلے تک قرضے میں ڈوب چکے ہیں۔ میرے لئے اس کے

سوائے اور کوئی چارہ نہیں کہ بیکری فروخت کردوں اور کہیں نوکری کرلوں یا پھر اس فلیٹ کو بیچ دوں اور بے گھر ہو جاؤں۔''

یی لی نے سسکنا بند کر دیا تھا لیکن اس کی آواز میں اس کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں بدستور لرزاں تھیں۔ ایسے موقعوں پر سرفراز اس کو صبر اور سوچ سمجھ کر اقدام کرنے کا مشورہ دینے کے سوائے اور کیا کر سکتا تھا۔

یی لی خود دار بہادر عورت تھی زندگی کی رگوں سے اپنے حصے کی مسرتوں کا ایک ایک قطرہ نچوڑ لینے کا ہنر جانتی تھی۔ اپنے اکیلے پن کا احساس تھا شوہر کی جدائی کا بھی غم تھا لیکن حوصلہ کھونا اس نے نہیں سیکھا تھا۔ اس نے بیکری ملیشیا کے ایک خاندان کو فروخت کر دی بینکوں کے سارے قرضے ادا کر دیے اور خود اس بیکری میں ملازمت ہو گئی جس بیکری میں مالک بن کر راج کیا کرتی تھی۔ آج اسی بیکری میں ایک ملازمہ کی حیثیت سے مشاہرہ لینے لگی تھی اس کے باوجود اس کی پیشانی پر ایک بل نہیں آیا تھا۔

تین مہینے گزر گئے کنگ چونہ لوٹ کر آیا اور نہ اس کی کوئی خبر ملی۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ وہ سنگاپور میں موجود ہے یا اپنی بیوی کے پاس بالی چلا گیا۔

سنگاپور کی بارش کا کوئی اعتبار نہیں۔ اچانک شروع ہوتی ہے اور برستی ہے اس طوفانی انداز میں کہ سامنے کی چیز بھی نظر نہیں آتی اور رکتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بارش ہوئی ہی نہیں تھی۔ اس دن آفس سے نکل کر سرفراز نے بھوک محسوس کی تھی اس وقت ایک ہندوستانی ہوٹل میں ڈنر کیا اور اس میں بیٹھ گیا۔ بارش شروع ہو گئی تھی اس کے شفاف شیشوں سے بارش اچھی لگ رہی تھی لیکن فلیٹ کے قریب بس سے اترا تو بھیگ گیا حالانکہ بس اسٹاپ سے بلڈنگ کا فاصلہ چند قدموں کا تھا۔ بلڈنگ میں آنے کے بعد فلیٹ تک بارش سے محفوظ رہا مگر کچھ ہی لمحوں میں جسم کا کچھ حصہ بھیگ گیا تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر لباس تبدیل کیا، بال خشک کیا اور باہر نکلا۔

ہال میں یی لی بیٹھی ٹی وی پر چینی زبان کی کوئی تاریخی فلم دیکھ رہی تھی۔ وہ یی لی کی پشت پر کھڑا رہا۔ بظاہر اس کی نظریں ٹی وی پر مرکوز تھیں مگر زیر دیدہ نگاہیں کہیں اور تھیں۔ ذرا سا آگے کی طرف جھکی ہوئی یی لی کے پیچ و خم بہت ہی نمایاں تھے۔ انتہائی جاذب نظر اور پرکشش۔ اس عمر میں بھی یی لی حسن کی دولت سے مالا مال تھی۔

اچانک یی لی نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا ''کافی پئیں گے؟''

سرفراز مسکرایا ''ہاں اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو۔''

''میں بھی کافی پینا چاہتی تھی۔'' کہتے ہوئے یی لی اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ باہر بارش تھم چکی تھی رات کی تنہائی اور پھر خوشگوار موسم نے سرفراز کے جسم میں ہوس ناک خواہشات پیدا کرنے لگیں۔ وہ ایک صوفہ پر بیٹھ گیا کچھ دیر بعد یی لی کافی کے دو کپ لے آئی۔ اپنی کپ سنٹر ٹیبل پر رکھ کر اس نے دوسرا کپ سرفراز کی طرف بڑھایا لیکن اس نے کافی کا کپ نہیں لیا بلکہ اس کی کلائی پر ایک ہاتھ رکھ دیا۔ یی لی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کو دیکھا اور پھر اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی لیکن چھڑا نہ سکی۔ تھوڑی سی مزاحمت کے بعد کافی کا کپ اس نے ہاتھ سے چھوڑ دیا اور دوسرے ہاتھ سے زوردار طمانچہ اس کے گال پر رسید کر دیا۔ گرم کافی کے کچھ قطرے سرفراز کے کپڑوں پر گر گئے۔ یی لی کے بگڑے ہوئے تیور نے یکلخت اس پر گھبراہٹ طاری کر دی۔ وہ تیزی سے صوفہ پر سے اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تنہائی میں کچھ دیر سوچتا رہا تو ضمیر ملامت کرنے لگا۔ آج اس نے انتہائی ذلیل حرکت کی تھی وہ اپنی ہی نظر میں گر گیا تھا۔ وہ رات بھر سو نہ سکا ضمیر مسلسل کچوکے لگاتا رہا۔ ذہن میں یہ خیال منڈلاتا رہا کہ اگلا قدم یی لی کا کیا ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اسے کمرہ خالی کرنا پڑے۔ اگر ایسا ہوا

تو وہ کمرے سے ہی نہیں سنگاپور سے چلا جائے گا۔

وہ صبح صبح بستر سے اٹھ گیا باہر ابھی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ جلدی جلدی فریش ہو کر کمرے سے نکل گیا وہ ین لی کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ قیام گاہ سے نکل کر وہ اس مقام پر آ گیا جہاں سے وہ ہر روز بس یا میٹرو پکڑ کر آفس جایا کرتا تھا لیکن ٹرین یا بس پکڑنے کی بجائے ایک بنچ پر بیٹھا رہا۔ کتنی ہی ٹرینیں آئیں اور چلی گئیں۔ کتنی ہی بسیں اسٹاپ پر رکیں اور نکل گئیں وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ خالی معدہ وہ وہاں دو تین گھنٹے بیٹھا رہا۔ ناشتہ کیا نہ آفس گیا۔ نو بجے کے قریب ین لی اچانک نمودار ہو گئی۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لئے اس نے پوچھا ''آج آفس نہیں گئے۔؟''

اس نے سر جھکائے ندامت بھرے لہجے میں کہا: ''مسز ین لی آئی ایم سوری...''

''کوئی بات نہیں۔'' ین لی فوراً سنجیدہ ہو گئی تھی۔ ''مجھ کو تم سے بے پناہ محبت ہے میرا جسم اس کی امانت ہے۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ین لی نے اپنا ایک ہاتھ شفقت سے اس کے کندھے پر رکھ دیا اور کہا: ''آپ کی صورت بتا رہی ہے کہ رات بھر سوئے نہیں۔ آج آفس سے چھٹی لے لو ناشتہ کرو اور روم میں جا کر دن بھر آرام کرلو۔''

وہ ایک سعادت مند بچے کی طرح اٹھا اور گھر جانے والی بس کی قطار کی سمت جانے لگا۔ کچھ قدم چل کر اس نے پلٹ کر دیکھا ین لی اپنا ایک ہاتھ وش کرنے کے انداز میں ہلا رہی تھی۔

اس واقعے کو دو ڈھائی ماہ ہو گئے۔ سرفراز ہمیشہ اس کا سامنا کرنے سے کتراتا رہا۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے کبھی کبھی آمنا سامنا ہو ہی جاتا تھا تو وہ فوراً اپنا سر جھکا لیتا۔ اتنے دن گزر جانے کے بعد بھی اس کو حیرت تھی کہ ایسی حرکت اس سے کیسے سرزد ہو گئی پتہ نہیں وہ کونسا آسیبی لمحہ تھا۔ جب غیر ارادی طور پر اس نے ین لی کی کلائی پکڑی تھی۔ ین لی کو سمجھنے میں اس سے غلطی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے ایسی حرکت کبھی کسی کے ساتھ نہیں کی تھی حالانکہ تعلیمی دور میں کئی لڑکیوں کے ساتھ رہا۔ خاندان میں بھی جوان لڑکیوں کی کمی نہیں تھی بارہا موقع بھی ملے تھے لیکن کسی کا ہاتھ پکڑنا تو دور کبھی نظر اٹھا کر بھی اس نے نہیں دیکھا۔ آج احساس ہو رہا تھا کہ دنیا کی کوئی عورت چاہے وہ کسی ملک کی ہو کسی قوم و مذہب کی ہو کتنی ہی آزاد خیال ہو کیسا ہی لباس پہنتی ہو اپنے گوہر عفت کو دبیز پردوں میں چھپائے رکھتی ہے۔

ایسا لگتا تھا کہ ین لی اس واقعے کو بھول چکی ہے یا بھلا دینا چاہتی ہے۔ کیونکہ اس کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ پہلے ہی کی طرح خلوص سے ملتی اور مسکرا کر بات کرتی۔ کبھی کبھی کافی چائے یا ناشتہ کا آفر بھی کر دیتی۔ آج بھی اس نے شاپنگ پر ساتھ چلنے کے لئے کہا تھا پہلے انہوں نے مصطفیٰ کے 'کیری اینڈ کباب' سیکشن میں بیٹھ کر ہندوستانی کھانے کھائے پھر اس کے بعد IMM آ گئے تھے۔

IMM میں بیٹھے بیٹھے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت گزر گیا تھا اس کے باوجود سرفراز کو بوریت محسوس نہیں ہو رہی تھی بلکہ بڑے انہماک سے ان لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو ادھر سے گزر رہے تھے مصروف لوگ۔ بے فکرے لوگ۔ کہیں ایک پل بیکار ضائع نہ کرنے کے قائل لوگ جیسے وہ سب کسی بہت بڑی مشین کے پرزے ہوں اگر ایک پل بھی رک جائیں تو ساری مشین رک جائے گی۔

کچھ لمحوں کے بعد ین لی آتی ہوئی دکھائی دی۔ ایک ہاتھ میں سامان سے بھرے چار پانچ پالتھین کے بیگ سنبھال رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ سے آئسکریم کھا رہی تھی۔ کھا کیا رہی تھی بچوں کی طرح اپنی لال لال زبان سے چاٹ رہی تھی مسکراتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ''آئسکریم کھائیں گے؟''

"نہیں۔" سرفراز نے جلدی سے جواب دیا۔

"میں تمہیں اپنی چھوٹی آئسکریم نہیں دوں گی۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ "تمہارے لئے دوسری کون....." کہتے کہتے اس نے پالیتھین بیگ سے آئسکریم نکالنا چاہا۔ لیکن یکلخت ایسے رک گئی جیسے اس کا ہاتھ برقی تار کو چھو گیا ہو۔ اس کی نگاہ سامنے سے گزرنے والے لوگوں پر جمی ہوئی تھی۔ چہرہ یکدم بجھ سا گیا۔ سرفراز نے نگاہ پھیر کر اس سمت دیکھا جہاں ین لی کی نگاہ مرکوز تھی۔ ادھر سے کنگ چو گزر رہا تھا کسی عورت کی کمر میں اپنا ایک ہاتھ پھیلا رکھا تھا۔

ین لی نے اپنے سارے بیگ بینچ پر رکھ دیے۔ سرفراز نے بیگ اٹھا لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ ین لی مزید کچھ دیر وہاں کھڑی رہے۔ ین لی نے جو کچھ دیکھا تھا اس کے لئے غیر متوقع تھا اور اذیت رساں بھی۔ سرفراز نے جلدی سے کہا "چلو گھر چلتے ہیں۔"

ین لی چپ چاپ اس کے ساتھ چلنے لگی۔ قریب کے ہی ایک Exit سے وہ دونوں باہر نکلے ٹیکسی لی اور گھر چلے آئے۔ راستہ بھر خاموشی رہی۔ ٹیکسی سے اتر کر وہ بے خودی کے عالم میں آگے بڑھ گئی۔ سامان کو اس نے ہاتھ نہیں لگایا۔ سرفراز نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور سامان اٹھا کر لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے وہاں پہنچنے تک ین لی لفٹ سے اوپر چلی گئی تھی۔ وہ اکیلا ہی فلیٹ تک آیا۔ فلیٹ کا دروازہ کھلا پڑا ہوا تھا۔ ین لی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور دروازہ بند کر لیا تھا۔ سرفراز نے کچھ سامان کچن میں رکھا اور کچھ فریج میں رکھ دیا۔ وہ ین لی کی حالت کو سمجھ رہا تھا اس کے اعتماد کو اس کی انا کو کنگ چو نے تار تار کر دیا تھا۔ ین لی کے ساتھ زندگی کے طویل عرصے تک گزارنے کے بعد اس نے کسی اور عورت کی باہوں میں پناہ ڈھونڈ لی تھی۔

دن گزر گیا اندھیرے نے اپنی باہیں پھیلا دیں۔ ین لی اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی ہال میں اندھیرا پھیل گیا تو سرفراز نے روشنی کی۔ اپنے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ ین لی نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر آ گئی۔ قدرے پرسکون نظر آ رہی تھی لیکن آنکھوں کا اداس آنگن بتا رہا تھا کہ خوب بارش ہوئی ہے۔

ین لی نے آہستگی سے کہا۔ "سرفراز تم نے دیکھا وہ کنگ چو تھا۔ میرا انتظار، میرا اعتماد، میری برسوں کی چاہت سب کچھ خاک میں ملا دی اس نے۔"

"مسز ین لی آپ صبر کریں۔ ممکن ہے کہ کنگ چو کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے۔"

وہ کچھ دیر چپ رہی اور یہ کہتے ہوئے اٹھی۔ "تم یہاں رکو۔" کہتے ہوئے اٹھ کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں شراب سے بھرے دو گلاس تھے۔ ایک گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "سرفراز ایک دن تم میرے ہاتھوں کی کافی پی نہ سکے آج میں ایسی چیز پلاؤں گی جو کافی سے زیادہ سرور انگیز ہے۔"

سرفراز سرتاپا لرز گیا۔ فوراً جانے کے لئے پلٹا تو ین لی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ ہاتھ چھڑا نہ سکا ین لی کے ہاتھوں کی تپش سے سرفراز کا وجود برف کی طرح پگھلا جا رہا تھا۔

◆◆◆

کہانیاں

نیلم احمد بشیر

لوگ پوچھتے ہیں آپ کو کہانیاں کہاں سے ملتی ہیں؟ انہیں کیا بتاؤں کہ مجھے تو کہانیاں ہر جگہ، ہر وقت، ہر صورت میں مل جاتی ہیں۔ بلا کوشش اور بلا محنت کے۔ کبھی گری پڑی، کبھی گلیوں میں بکھری ہوئی اور کبھی فضا میں تیرتی ہوئی۔ مجھے تو انہیں ڈھونڈنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کہ وہ لاتعداد کبوتریوں کی طرح میرے آس پاس اترتی، پھڑ پھڑاتی، اور معصوم چڑیاں کھاتی رہتی ہیں۔ میں دانہ ڈالتی ہوں تو وہ چگنے کے لئے ہتھیلی پہ آ بیٹھتی ہیں اور یہیں سے میرا اور ان کا دوستانہ شروع ہو جاتا ہے۔

ابھی کل ہی کی بات ہے۔ ایک بڑھتی ہوئی عمر کے حساب سے اپنی صحت کا خیال کرنے والی کہانی شام کو سڑک پہ واک کرتی چلی جا رہی تھی کہ یکدم پورے علاقے کی بجلی چلی گئی۔ "اوہو اتنا اندھیرا ہو گیا ہے۔ سڑک پہ چلنے والے اوباش مرد تو لازماً میرے گرد ہو جائیں گے۔ یہ سوچے بنا کہ میں بزرگی کی حدوں کو چھو رہی ہوں۔ اکثر تیاں ووٹیاں اب میرے برابر کی ہوں گی۔" کہانی نے ڈکواری سے سوچا اور تیز تیز قدموں سے گھر کی جانب چلنے لگی۔ تھکے سے اندھیرے میں بھی اسے سامنے پڑے بنچ پہ بیٹھی ایک تنہا کہانی نظر آ گئی ہے۔ بکھرے ہوئے بالوں اور تنہا ماڈرن کپڑے پہنے وہ زار و قطار روئے چلی جا رہی تھی۔ بوڑھی کہانی نے اگلا قدم اٹھایا نہ گیا اور وہ وہیں بنچ پہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد اس نے پیار سے سوال کیا۔ "کیا بات ہے بیٹا؟ کیوں رو رہی ہو؟ کیا میں تمہاری کوئی مدد کر سکتی ہوں؟" ہمدردی کے دو بول سن کر نوجوان کہانی نے زور زور سے رونا شروع کر دیا اور دوپٹے سے اپنے آنسوؤں کی آبشار روکنے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑی خاموش ہو کر تھکی ہی دیر اس کی کمر سہلاتی رہی اس کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ آخر کار وہ بولنے لگی۔ "مجھے میرے میاں نے مار کر گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ پہلے بھی ایسا کئی بار کر چکا ہے۔" "مگر یہاں کیوں بیٹھی ہو اور جا کہاں رہی ہو؟" بڑی نے اس کے ماتھے پہ آتے ہوئے بال ہٹاتے ہوئے پوچھا۔ "ڈیفنس سے آئی ہوں۔ وہیں میرا گھر ہے۔ اور اب امی ابو کے گھر شادمان جانا ہے رکشے میں۔ اس تھک کر یہاں بیٹھ گئی تھی۔" "کیا مطلب؟ تم ڈیفنس سے یہاں تک؟" "جی پیدل آئی ہوں"۔ اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا اور سر جھکا لیا۔ بڑی سوچنے لگی۔ "کتنی پاگل ہے یہ۔ اتنا فاصلہ پیدل چل کے طے کیا ہے اس نے۔ شاید کبھی کبھی انسان پہ ایسا وقت بھی آ جاتا ہے کہ دوری اور فاصلوں کی صعوبتیں بے معنی ہو جاتی ہیں اور اس پہ کسی بے خودی طاری ہو جاتی ہے کہ راستے مشکل چیز بھی آسان لگنے لگتی ہے۔" "آخر میں نے کیا گناہ کیا ہے جو اللہ میاں مجھے یہ سزا دے رہے ہیں؟" کہانی بولتی چلی گئی۔ "تین سال ہونے کو آئے، ایک دن بھی سکھ کا نصیب نہیں ہوا۔ اس نے مجھ سے دھوکے سے شادی کی۔ اس کے پہلے سے ہی بیوی بچے موجود تھے مگر اس نے میرے گھر والوں سے یہ بات چھپائی اور اب پہلی بیوی کے کہنے پہ مجھے رکھنا نہیں چاہتا اور گھر سے نکال دیا ہے۔" "تمہارے والدین؟" بڑی نے پوچھا۔ "وہ تو خود بھائی بھابھی کے در پہ پڑے ہیں۔ میں ان کے گھر جاتی ہوں تو وہ تین دن بعد رکشے میں سوار کرا کر روانہ کر دیتے ہیں۔" وہ پھر ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔ "اچھا سنو، میری

طرف دیکھو۔ تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میرے میاں نے بھی پندرہ سال پہلے مجھے گھر سے نکال دیا تھا، ایک نئی عورت کے چکر میں۔" بڑی نے چھوٹی کو اپنی کہانی سنائی تو وہ حیرت زدہ ہو کر ٹکر ٹکر اسے دیکھنے لگی۔ بڑی عمر کی اچھی کہانی بھی کیا اس جیسے امتحانوں سے گزر چکی ہے؟" "پھر آپ نے کیا کیا؟" "گزارا کیا تھا۔ میں نے اپنے پیروں پہ کھڑا ہونا سیکھا۔ ملازمت کی۔ بچے پالے۔ میں جانتی ہوں یہ سب کہنا آسان اور کرنا مشکل ہے مگر ایک بات تمہیں بتاؤں، دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ بس انسان کو مضبوط ہونا چاہیے۔" چھوٹی نے بوڑھی ہوتی، اسی راہ سے گزری ہوئی کہانی کی طرف دیکھا اور پھر سسکنے لگی۔ "why me? آخر میرے ہی ساتھ یہ سب کیوں؟"

"پگلی یہ نہیں ہوتا۔ زندگی میں جو ہونا ہوتا ہے بس ہو جاتا ہے۔ اچھا چلو آؤ میں تمہیں اپنی ایک دوست کے گھر سے پانی پلواؤں تم پیاسی ہوگی اتنا چل کر آئی ہو۔ یہ بالکل ساتھ ہی ہے اس کا گھر۔" بڑی کو اپنی ایک فرنیچر ڈیزائنر دوست کہانی کا خیال آ گیا جس کا گھر وہاں سے قریب ہی تھا۔ نوجوان کہانی روبوٹ کی مانند بڑی کی انگلی تھامے اٹھی اور اس کے ساتھ چلنے لگی۔ چند ہی لمحوں میں وہ ایک گھر کے آگے کھڑی تھیں۔ دوست کہانی نے "آؤ آؤ ویلکم" کہہ کر دونوں کو اندر بلا لیا اور روتی ہوئی آنکھوں والی کو استفہامیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ بڑی نے مختصراً اس کی رام کہانی سنائی اور دوست سے پوچھنے لگی۔ "ہم لوگ اس کیلئے کیا کر سکتے ہیں؟ کچھ تو کرنا ہوگا۔" پینتیس چالیس سالہ فرنیچر ڈیزائنر کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ اس کے چہرے پہ حیرت اور دکھ کا کوئی بھی تاثر نہ تھا۔ "رشیدہ شربت لا کر دو باجیوں کو۔" اس کے آواز دینے پہ ایک ملازمہ اندر آئی جس نے ٹھنڈے ٹھنڈے صندل کے شربت بھرے دو گلاس سامنے رکھ دیے اور حیرت و استعجاب سے انہیں دیکھنے لگی۔ مہمان پیاسی تھیں غٹا غٹ پی گئیں اور گلاس خالی ہو گئے۔

فرنیچر ڈیزائنر کہانی نے بڑی کو اپنے نئے ڈیزائن کئے ہوئے فرنیچر دکھانے شروع کر دیے اور خوش گپیوں میں مصروف ہو گئی۔ بڑی نے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھا کہ اس خاموش اداس بت کا کیا کرنا ہے۔ اب اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ ان دونوں ہی کی ذمہ داری بن گئی ہے۔ "دیکھو گھبراؤ نہیں اور اپنے آپ کو سنبھالو۔ تم سیدھی اپنے والدین کے پاس جاؤ اور انہیں کہو کہ تمہیں سہارا دیں کیونکہ بالآخر تم ان ہی کی ذمہ داری ہو۔ اس کے علاوہ تمہارا کچھ نہیں ہو سکتا۔" دوست نے بڑے میٹر آف فیکٹ انداز میں بات کی اور بڑی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ خاموش بت شربت پیتا رہا، سنتا رہا۔ "لیکن وہ مجھے نہیں رکھیں گے۔ پھر اسی کے پاس بھیج دیں گے۔" "چلو بہت ہی اچھا۔" "دیکھو یہ کوئی انوکھی بات نہیں، گھر گھر کی کہانی ہے۔" دوست نے خشک لہجے میں کہا۔ "کیوں رشیدہ؟" اس نے اپنی ملازمہ کہانی کو مخاطب کیا۔ "ہاں جی بی بی جی۔" "تو یہاں کیوں کام کرتی ہے۔ گھر کیوں نہیں ٹکتی آرام سے؟" دوست نے اپنی نوکرانی سے سوال کیا۔ "باجی۔ آپ کو پتہ ہے نا وہ کھسماں نوں کھانا نشہ کر کے مجھے پیٹتا ہے اور خرچہ بھی نہیں دیتا۔ بس جی ہمارے تو نصیب ہی خراب ہیں۔" رشیدہ نے اپنی جیون کتھا سنانا شروع کر دی۔ میں تو چاہتی ہوں جل کے مر جاؤں لیکن پھر بچوں کا خیال آ جاتا ہے۔ بس محنت کر کے ان کا پیٹ پالتی ہوں کیا کروں؟" فرنیچر والی کی ننھی چھ سالہ بیٹی بھاگتی ہوئی آئی اور ماں کا پلو کھینچنے لگی۔ "ممّا رشیدہ سے کہیں مجھے آئس کریم دے۔" اس نے ضد کرنا شروع کر دی۔ "جا رشیدہ فریزر میں سے اسے آئس کریم نکال دے۔ جاؤ بیٹا۔" ننھی اچھلتی کودتی رشیدہ کے ساتھ کچن کو چل دی۔ "اسے دارالامان میں نہ بھجوا دیں۔" بڑی کہانی ابھی تک نوجوان کہانی کی مدد کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ "نہیں میں نے سنا ہے وہاں سے لڑکیاں سپلائی کر دی جاتی ہیں۔" مصیبت زدہ کہانی خوفزدہ ہو کر بولی۔ "بھئی نہیں یہ سب بکواس ہے۔ آخر عورتوں کی مدد کا ادارہ ہے ایسا

کیسے ہو سکتا ہے؟" بڑی کو بڑی مشکل سے ہی کبھی کسی پہ شک ہوتا تھا۔ وہ ہر ایک اور ہر بات پر بڑی جلدی اعتبار کر لیتی تھی۔ "یہ میڈ بلتے میں تو ایسی باتیں ہوتی ہی ہیں مگر ــــ" مصیبت کی ماری نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اب اس نے رونا بند کر دیا۔ "منی! ادھر آؤ"۔ فرنیچر والی کہانی نے اپنی ننھی بیٹا کو آواز دی۔ وہ آئس کریم کو زبان سے چاٹ چاٹ کر گرنے سے بچاتی ہوئی ماں کے پاس آ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔ "جی ما" "بیٹا ان آنٹی کو بتاؤ تمہارے پاپا مجھے کیسے مارتے ہیں۔" فرنیچر والی اختر نے بیٹا سے سوال کیا۔ بڑی اور چھوٹی کہانی چونکیں اور خوبصورت انٹیریئر والے گھر کی مالدار مالکن کی طرف حیرت سے دیکھنے لگیں۔ "پاپا آپ کو ڈنڈے سے مارتے ہیں۔" ننھی کہانی نے آئس کریم چاٹتے ہوئے جواب دیا۔ "اور اس روز کچن میں کیسے مارا تھا؟" ماں نے پھر سوال کیا اور بیٹی کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"اس روز انہوں نے بال نوچے تھے آپ کے دھکا دیا تھا اور پھر گرا بھی تھا۔" ننھی کہانی آرام سے بولتی چلی گئی اور آئس کریم چاٹتی گئی۔ "مگر کیوں؟ اختر تو تمیز سے اچھی طرح گھر میں آیا ہوا" بڑی نے حیرت سے سوال کیا "کماتی بھی ہو؟" "تنخواہ دے میرا میاں۔ پالتی ہوں نہ اس کو۔ دراصل اسے کھانے کھانے پینے کا بہت شوق ہے۔ بس اسی لئے ہماری لڑائی ہو جاتی ہے۔" تعلیا رک سکول آف فیشن کی پڑھی ہوئی انٹیریئر ڈیزائنر نے بڑے تحمل سے بتایا اور پھر خود قہقہہ لگا کر ہنسنے لگی۔ "اب آپ جائیں۔ ڈرکش لیں، اندھیرا ہوتا جا رہا ہے۔" اس نے دکھیاری کو مسکرا کر کہا جس کے آنسو اب خشک ہو کر گالوں پہ جم چکے تھے۔ "میں بھی چلوں۔ کافی دیر سے گھر سے نکلی ہوئی ہوں۔ بچی سوچ رہی ہوگی ماں کہاں رہ گئی۔ اور اب تو بجلی بھی آ گئی ہے۔" سب سے بیشتر کہانی نے اٹھنے کا قصد کیا۔ "آپ بھی بس ـــ ایسے ہی نہ کسی کے آنسوؤں سے گھبرا جایا کرتی ہیں ـــ" "آپ، ہم، سب، یہ وہ ـــ کہانیاں ہیں اور کہانیاں تو چلتی ہی رہتی ہیں" فرنیچر والی اختر کہانی نے اپنے سے کئی برس بڑی کہانی کو پیار سے لپٹا کر سرگوشی کی اور مسکرانے لگی۔ "مگر ماما میں آپ کو ابھی سے بتا رہی ہوں جب میرا میاں مجھے مارے گا نا تو میں اس کا ہاتھ پکڑ لوں گی۔ اسے اپنے آپ کو مارنے نہیں دوں گی۔ مارنے سے تو بہت درد ہوتا ہے نا ـــ" ننھی منی کہانی نے ایک نیا موڑ لینے کے ارادے کا اظہار کر کے سب کو چونکا دیا۔ کمرے میں موجود ہر کہانی کی آنکھ میں یکدم جگنوؤں دیے جھلملانے لگے۔

◆◆◆

مقامی ماحول اور ایک دیس کے دل بر موسموں سے چنیدہ

محمد طارق علی کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ

مجھے ستمبر پسند ہے

جلد منصہ شہود پر آنے کے لیے تیار ہے

مکتبہ دستاویز چناب بلاک نمبر 10، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور۔ فون: 0333-4344716

شمشان گھاٹ کی دلہن

محمد طارق علی

مہاراج گنج نیپال راج دھانی کاٹھمنڈو کی ایک مشہور اور خوب صورت بستی ہے۔ میرا گھر وہیں تھا۔ اس سے دو تین گلیاں آگے ایک اوسط درجے کا دو منزلہ مکان بھی تھا۔ اس میں خاص بات تھی اس کے گراؤنڈ فلور پر کریانے کی ایک دکان۔ خوب سجی سجائی، ہر چیز قرینے اور ترتیب سے رکھی ہوئی۔ اس کے چبوترے پر دو تین موڑھے رکھے تھے کہ کسٹمرز مطلوبہ اشیا کی لسٹ اندر ساوتی (مالکن) کو تھما کر آرام سے بیٹھ کر انتظار کریں۔ یہ سب کچھ ہر گاہک کے لئے توجہ انگیز تھا۔

لیکن سب سے زیادہ متوجہ کرنے والی چیز ساوتی کی دل کش مسکراہٹ تھی جو وہ بہت خوش دلی سے آنے والے ہر گاہک کو پیش کر کے اسے اس کی اہمیت کا احساس دلاتی تھی۔ وہ ایک وزٹ کے بعد میں بھی اس کی مسکراہٹ کا اسیر ہوا اور پھر مستقل کسٹمر بن گیا۔ سامرو، دکان کی ساوتی، مجھے بطور خاص اہمیت دیتی کہ ایک تو میں غیر ملکی تھا اور دوسری بڑی خوبی یہ کہ سودا نقد لیتا تھا۔ میں اوروں کی طرح ادھار کھانے والا نہیں تھا۔

''آپ پاکستان سے آئے ہیں ناں؟'' ایک دن سامرو نے سوال کیا۔ ''جی ہاں۔ یہی کوئی ایک ڈیڑھ ماہ پہلے آیا ہوں۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''آپ ہمارے پڑوسی ہیں۔ مجھے تو آپ کے گھر کا فون نمبر بھی معلوم ہے'' وہ مسکرائی ''مگر کیسے؟'' میں بدستور حیران تھا۔

''آپ سے پہلے اس گھر میں ایک اور پاکستانی شاکیل (شکیل) صاحب تھے۔ میری پسل (دکان) کے ایک پکے کسٹمر۔ دراصل میں ان کا پتہ کرنے کیلئے آپ کے گھر آنا چاہتی تھی۔ لیکن پھر سوچا آپ صاحب لوگ ہیں، برا نہ مان جائیں۔''

''نہیں، آپ جب چاہیں تشریف لائیں۔ میری مسز آپ سے مل کر خوش ہوں گی۔'' میں نے اپنا سودا وصول کیا اور گھر چلا آیا۔

سامرو سے میرا تعارف تو ہوا لیکن اگلے دنوں میں میں اس کی پسل یا دکان تک کم کم جانے لگا۔ وائف نے گھر کے مختلف کام کاج کے لئے ایک نوکر (بہادر) رکھ لیا تھا۔ اب وہی مہینے بھر کا سودا یا روزمرہ کی چھوٹی موٹی چیزیں لانے لگا۔

آتی جاتی صبح و شام کے ساتھ اپنی گردشیں پوری کرتے رہے۔ میں دفتری اور سوشل مصروفیات میں کھویا رہا۔ ساوتی اپنی کمرشل مسکراہٹ سمیت مجھے کبھی یاد نہ آئی۔ یاد آتی بھی کیوں میرا اور اس کا کوئی ذاتی سمبندھ تو تھا نہیں۔ وہ ایک چالیس، پینتالیس سال سادہ سی عورت، ہمہ تن اپنی پسل میں مگن، گاہکوں کو بروقت نمٹاتے اور نوٹ گننے میں مصروف رہنے والی۔ ایک اتوار کے دن بہادر چھٹی پر تھا۔ شام کو گھر پر ایک چھوٹی سی ڈنر پارٹی تھی۔ میں بیگم کی دی ہوئی لسٹ لئے ساوتی کی پسل پر چلا گیا۔ وہ موجود نہ تھی۔ ایک سانولی صورت چمکدار آنکھوں اور بوٹے سے قد والی یتیم لڑکی نے ہاتھ جوڑ کر مجھے نمسکار کہا۔

''وہ کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''کون، ماما؟ وہ بیمار ہیں۔ انہیں ٹیچنگ ہسپتال میں بھرتی کر لیا گیا ہے'' لڑکی کے لہجے سے تشویش عیاں تھی۔ ہونٹوں پر سجی کمرشل مسکراہٹ بھی اس نے ماں ہی سے لی تھی۔ ''کیوں، انہیں کیا ہوا؟'' ''ہائی بی پی، ان کا سسٹم کمزور، اور سانس

میں آ گئی ہو۔" اس نے مجھ سے لسٹ لے کر چیزیں پیک کر دیں۔ میں نے اسے پیسے تھمائے اور سودا گھر لے آیا۔

اگلے ایام میں میں پھر اپنی دفتری مصروفیات میں کھو گیا اور دفتر ہی کے ایک ضروری کام سے چند دنوں کے لئے کاٹھمنڈو سے باہر بھی گیا۔ واپسی پر پتہ چلا کہ وائف چند اشیا کی خریداری کے لئے اس دکان پر گئی تھیں، سانولی سے پرچے ہوا، پھر خوب باتیں اور باہمی دوستی کا آغاز بھی۔ ایک روز مسز نے ذرا تفصیلاً اس سانولی کا ذکر چھیڑ دیا۔

"سامرہ بہت اچھی عورت ہے، ہم پاکستانیوں کو بہت چاہتی ہے۔ میں نے اسے گھر بلایا ہے، کہہ رہی تھی بیٹی کو ساتھ لے کر آؤں گی، طاہر صاحب کو بھی ملنا ہے، ایک چھوٹا سا کام ہے ان سے۔"

"بھئی، اپنا تو اب تک کا تجربہ یہ ہے کہ اکثر مقامی لوگ غیر ملکیوں سے کام کے بغیر نہیں ملتے تم اس سانولی سے دوستی یا بہناپا اس رہنے ہی دو۔" "وہ ایک پریشان سی عورت ہے۔" "ہر وقت تو مسکراتی رہتی ہے۔" "مسکرانا اس کی ضرورت ہے، تیوریاں چڑھا کر اپنی بنسل میں بیٹھے گی تو کون اس سے سودا لینے آئے گا؟" "اسے مجھ سے کام کیا ہے؟" "وہ جب آئے گی تو معلوم ہو جائے گا۔" "سامرہ کے آتے ہی میں گھر سے کھسک جاؤں گا۔" میں نے مذاقاً کہا۔ "لو" یہ کیا بات ہوئی؟ انسان ہی انسان کے کام آتا ہے۔ اور آپ تو ایک انٹرنیشنل ویلفیئر این جی او میں کام کرنے والے سینئر آفیسر ہیں، ہو سکتا ہے آپ اس کا کام نہ کر سکیں لیکن اس کی طرح خوش دلی تو دکھا سکتے ہیں" ایک جھٹکے سے مذاق والی بات کا سیریس جواب مجھے لاجواب کر گیا۔ جاتی سردیوں کی ایک اداس سی شام تھی۔ دکان والی سانولی ہمارے گھر آ گئی، ساتھ میں وہی لڑکی بھی تھی۔ مسز انہیں دیکھ کر خوش ہوئی۔ چائے کی پیالی پر تینوں گپ شپ کرتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد مسز نے بہادر کے ذریعے مجھے بلا بھیجا، بیٹھک میں سامرہ کے کہنے پر۔ میں نے ہاتھ جوڑ کر اسے نمستے کہا۔ اس کی صورت بھی بجھی بجھی سی لگ رہی تھی۔ میں نے طبیعت کا پوچھا تو جواب ملا کہ پہلے سے بہت بہتر ہے۔

"آپ کے حسبنڈ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔ "آپ یہ نہ ہی پوچھتے تو اچھا ہوتا۔" اس کی آنکھیں چھلک اٹھیں۔

یقیناً کوئی گمبھیر سی بات ہوگی میں نے اس موضوع کو جانے دیا۔ اس نے ہاتھ سے آنکھیں صاف کیں۔ پھر چند لمحوں کی خاموشی، چہرے پر کھنچی لکیریں جنہیں الفاظ کی ضرورت نہ تھی۔ "یہ آپ کی چھوٹی بیٹی ہیں؟" میں نے موضوع بدلا۔ "نہیں، یہ میری سب سے بڑی بیٹی ہے، اس کے بعد ایک اور بیٹی اور ان دونوں سے چھوٹا ایک بیٹا بھی ــــ اس بیٹی کا نام "ماریہ" ہے اور دوسری کا نام "جاسمین"۔ کافی سال پہلے میرے گھر کی اپر سٹوری میں ایک پاکستانی فیملی کرائے پر آ کر ٹھہری تھی۔ وہ صاحب آپ ہی کے دفتر میں اکاؤنٹس کلرک تھے، ان کی دو لڑکیوں کے نام مجھے پسند آئے تو میں نے بھی اپنی دونوں بیٹیوں کے یہی نام رکھ لئے۔" "ماریہ، ماریہ" میں سوچنے لگا کہ اصل میں یہ کیا لفظ ہوگا۔ اور پھر ذہن نے مجھے گائیڈ کیا۔ "شاید اس پاکستانی کی بیٹی کا نام "مریم" ہوگا؟" میں نے پوچھا

"ہاں، بالکل یہی۔" سامرہ مسکرائی۔ "میں اپنی ماریہ کو اس لئے ساتھ لائی ہوں کہ آپ سے ایک کام ہے۔ اس نے ایف اے کیا ہے، جاب کوئی بھی نہیں، آج کل بنسل میں میرا ہاتھ بٹاتی ہے۔ آپ کے آفس میں اسے کوئی کام مل جائے۔ چاہے چھوٹا سا ہو، جیسے پیا (چائے بنا کر صاحب لوگوں کو پیش کرنا) یا پھر آپ جیسی کسی اچھی پاکستانی فیملی کو گھر کے کام کے لئے کھائی (نوکرانی) کی ضرورت ہو۔ اصل اس کا باپ اگر یہاں ہوتا تو وہ اسے ضرور آگے پڑھاتا، اسے آگے پڑھنے اور آگے جانے کا بہت شوق ہے۔" "اس کا فادر کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سالوں سے وہ ہانگ کانگ میں اپنا دوسرا گھر بسائے بیٹھا ہے، جس میں کوئی خط نہ پتر، کوئی پیسہ ٹکا"۔ اس کی پلکیں بھری

آنکھیں پھر گیلی ہو گئیں۔ میرا دل چاہا لیکن کوئی وعدہ نہیں کیا۔ اسے صرف اتنا کہا "اچھا، دیکھوں گا"۔ وہ دونوں تھکے تھکے سے قدم اٹھاتی، یوں لوٹ گئیں جیسے مرضی ہارا یوں ہی کہیں کو چلی جا رہی ہوں۔ دن بیتتے رہے۔ اس ملاقات کے بعد سامرہ مجھے ملی اور نہ میں اس سے۔ البتہ ایک آدھ بار میں اس کی دکان تک گیا تو وہ گاہکوں میں گھری نظر آئی۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھیں سوالی ہوئیں لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔ مجھے مطلوبہ اشیا تھما کر پیسے لے لئے۔ میں چپ چاپ چلا آیا۔ اس کی بیٹی کے لئے کسی ڈھنگ کے کام کا پتہ لگتا تو اسے ضرور بتاتا۔ دنیا داروں سے کچھ لینا کوئی آسان کام نہیں۔ ہر جگہ یہی دستور دیکھا ہے۔

مختلف مقتدر بیرونی اداروں کے مالی تعاون سے چلنے والے انٹرنیشنل این جی او (NGO) "نیو لائف" میں میں کافی عرصے سے کام کر رہا تھا۔ اس کی مقامی شاخ میں میری پوسٹنگ ایک معمول کی بات تھی۔ "نیا جیون" کے اکثر ورکروں کو میں بخوبی جانتا اور سمجھتا تھا۔ وہ قریباً سبھی ایک جاگیر "حویلی" سے متصف تھے۔ اپنے گھر میں "زن مرید" اور گھر سے باہر نکلتے ہی کسی اور "اگلی ہی" زن کے متلاشی۔ ہماری مقامی مین برانچ میں ایک نوجوان مالن دیہاڑی پر ہفتے میں پانچ دن دفتر آتی تھی۔ کیاریاں ٹھیک کرتی، پودے لگاتی اور صاحب لوگوں کی میزوں پر چھوٹے چھوٹے گملے دستے رکھ دیتی۔ دفتر کے اکثر لوگ ان "فضول" سے کاموں میں "جنسی" اس کی نو تیز جوانی پر "ترس" کھاتے، آہیں بھرتے اور اس سے "ایت" مانگتے۔ مالن بے چاری کو اپنا کام کرنا مشکل ہو جاتا۔ ایسے ماحول میں سامرہ کی ماریہ آ کر کیا کرتی۔ مجھے اپنے دل میں برا بھلا ہی کہتی۔ میں اس کارن خاموش تھا۔ پھر خاموشی خاموشی میں ایک برس بیت گیا، پتہ ہی نہ چلا۔

اتوار کا چھٹی والا دن، گیلی گیلی سی صبح، ہلکی ٹھنڈی ہوا، بہت دلنشیں موسم۔ ایسے میں میں فیملی کو لے کر پوکھرا چلا گیا۔ جھیل کے قریب پارکنگ میں گاڑی کھڑی کی تو دیکھا چند پولیس مین پیدل چلنے والوں کو آگے جانے سے روک رہے تھے کہ جھیل کے قریب ہی کوئی فلمی یونٹ شوٹنگ میں مصروف تھا۔ میں نے پولیس اہل کاروں کو اپنا "نیو لائف انٹرنیشنل" والا کارڈ دکھا کر بتایا کہ جھیل کے ساتھ سن رائز ہوٹل میں کمرہ بک ہے اور ہمیں ابھی وہاں جا کر چیک ان کرنا ہے۔ اجازت ملتے ہی ہم مذکورہ ہوٹل میں تھے۔ لنچ کھا کر باہر نکلے تو معلوم ہوا کہ شوٹنگ پیک ہو چکی اور اب سڑک پر خاصی تعداد میں لوگ ہیرو اور ہیروئن سے آٹو گراف لے رہے ہیں۔ میں اپنی فیملی سمیت یہ نظارہ دیکھنے لگا۔ ہیروئن بھرپور میک اپ اور اچھے خاصے کمسن لباس میں تھی، جب کہ ہیرو دیہاتی گیٹ اپ میں تھا۔ پولیس والوں نے اس فلمی جوڑے کو شائقین کے گھیراؤ سے نکالا اور وہ فوراً سن رائز ہوٹل کی طرف لپکے۔ چھلکتا بدن اور دوادو تیکھے ابھار لئے ہیروئن ہمیں دیکھ کر ٹھٹکی "ارے آپ لوگ؟ یہاں کیسے؟"

"ہم بچوں کے ساتھ یہاں سیر کے لئے آئے ہیں۔ اور تم فلموں میں کب سے؟" میری مسز نے اسے فوراً پہچان لیا۔ وہ ماریہ تھی۔ "اگلے پورے ہفتے میرا کوئی شوٹنگ شیڈول نہیں، آپ سے کاٹھمنڈو میں کسی بھی دن گھر پہ ملاقات ہوگی" وہ ہیرو کے ساتھ آگے بڑھ گئی۔ میں حیران حیران ماریہ کو تکتا رہ گیا۔ خوب چھنک چھلونی ہوئی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی سادہ صورت گھریلو لڑکی ہے۔

تین چار دن بعد میں اور مسز کاٹھمنڈو میں ماریہ کو اس کے گھر پہ ملے۔ وہ پہلے کی طرح میک اپ سے مبرا چہرہ لئے ہوئے تھی اور سادہ کپڑوں میں ملبوس، تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔

"میں آج کل اپنی دوسری فلم کر رہی ہوں۔ پہلی فلم "پیار یا پیسہ" میں بہت مشکل سے انٹری ملی تھی جو چھ ماہ دن رات محنت کے بعد مکمل ہوئی۔ نیپال کے دو تین سرکٹس میں چلی اور اچھا بزنس کیا۔ اب اس دوسری فلم میں اس سے بھی زیادہ محنت کرنی پڑ رہی ہے۔ اس میں

میرا اچھا رول ہے، اچھی اور بڑی لڑکی والا۔" وہ میرے برابر والی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر سے تازہ ترشے سرخ سرخ پکے سیبوں کی سی مہک آ رہی تھی۔ یوں لگا جیسے محنت کی آنچ سے اس کا کنوارپن دہک اٹھا ہو۔

"دراصل ماریہ میری بیٹی، کوئی بھی جاب نہ ملنے پر مایوس ہو چکی تھی لیکن اچانک کسی کی سفارش پر اسے فلم نگری میں چانس ملا، بہت سوچ کر اس نے قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔" پاس بیٹھی اس کی ماں بولی۔

"پہلی فلم میں مجھے صرف دس ہزار ملے اور اس دوسری فلم میں بھی اس سے زیادہ رقم ملنے کی امید نہیں، لیکن نام چل پڑے تو پھر دولت اور شہرت بھی کچھ ہے ـــــ مجھے آپ لوگوں کی آشیرباد چاہیے۔" اس کے لبوں کو ہلکی سی مسکراہٹ نے چھوا۔ ماں اٹھ کر کمرے سے نکل گئی۔ "اس ہفتے میں میری کوئی شوٹنگ نہیں تھی لیکن مجھے برابر تین دن اسٹوڈیو جانا پڑا۔ پروڈیوسر اور اس کے چار پانچ دوستوں نے میرا ڈانس دیکھنا تھا، وہ بھی کم کپڑوں میں" ـــــ اس کی آواز کپکپا گئی۔ اپنی ہتک کا اظہار زیادہ وہ نہ کر سکی۔

اسی وقت ماں چائے لے آئی، ہم گھونٹ گھونٹ حلق میں اتارتے گئے۔

"میں نے سنا ہے کہ پاکستان کی فلم انڈسٹری بھی کافی بڑی ہے، آپ ماریہ کے لئے کوئی اچھا سا چانس کھوج دیں گے۔" ماں نے کہا۔ اس مرتبہ میں نے حامی بھر لی کہ ایک مصدقہ اطلاع کے مطابق میرا ایک کلاس فیلو اور دوست شاہد سیالوی فلم شوٹنگ کے لئے اپنے یونٹ سمیت نیپال آنے والا تھا۔ چائے کے بعد ہم نے اجازت لی اور گھر چلے آئے۔ کوئی دو ہفتے بعد شاہد سیالوی اپنی رنگ برنگی ٹیم کے ساتھ کاٹھمنڈو میں تھا۔ مجھے گرمجوشی سے ملا۔ میں نے اس کے اعزاز میں ڈنر دیا۔ دو روز بعد میری سفارش پر ماریہ شاہد سے اس کے ہوٹل میں جا کر ملی۔ وہ ہاتھوں کی انگلیوں سے چوکھٹے بنا بنا کر مختلف زاویوں سے اسے خوب دیکھا کیا۔ ایک جھلک سے انٹرویو میں اس نے ماریہ کے ذاتی کوائف اور جسمانی پیمائش کے اعداد و شمار پوچھے اور دو دن بعد بوقت شام اسکرین ٹیسٹ کے لئے بلا لیا۔ مختلف لباس پہن پہن کر وہ کیمرے کے آگے پوز بناتی رہی۔ حسب فرمائش ایک بلا جھجک سیکسی ڈانس بھی پیش کیا۔ اگلے دن رزلٹ تھا اور شاہد نے اسے ناکام قرار دیا۔ وہ مایوس چہرہ لئے میرے پاس چلی آئی۔

"انکل، مجھے تو کہا گیا تھا کہ تم بہت ہی ٹھیک ہو اور اب ـــــ؟"

میرے استفسار پر شاہد نے فون پر بتایا "مجھے اپنی فلم کی ہیروئن "نازیہ" کے لئے بطور سہیلی ایک مقامی لڑکی کی ضرورت تھی، وہ بھرے بدن والی ایک گھریلو عورت ہے جبکہ دھان پان سی ماریہ اس کے سامنے بالکل غیر اہم لگتی ہے۔ تم فکر نہ کرو، میں ماریہ کو سمجھا دوں گا۔"

اسی شام ماریہ کا فون آیا۔ "شاہد جی نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے مجھے کہا کہ تم ہمیں چند اچھی اچھی نیپالی ڈشیں کھلا دو۔ اس وقت تو میں نے یہ کہہ کر انہیں ٹال دیا کہ ماں گاؤں سے آنے والی ہیں، وہ پکا کر کھلائیں گی لیکن انکل، وہ تین چار (آدمی) ہوں تو کوئی بات نہیں، ہیں پچیس کو بھلا ہم کیسے اور کہاں بلائیں؟"

"تم فکر نہ کرو، انتظام میرے ذمے۔ ہوٹل کے بیرے کھانے سمیت تمہارے گھر پہنچ جائیں گے تم شاہد سے صرف تاریخ اور دن یا ٹائم کا پوچھ لو۔" ڈنر پر میں بھی شامل تھا۔ میرے پرزور اصرار پر اس نے ماریہ کو کلب ڈانسر کا رول دے دیا۔ محض تین چار منٹ کے اس رول پر وہ کچھ زیادہ خوش نہیں تھی۔ اس نے ایک روز مجھے کہا "انکل میں تو چاہتی تھی کہ شاہد جی کی اس فلم کے ذریعے مجھے پاکستان میں کوئی اچھا بریک تھرو ملے، پر میرا نصیب۔"

"وہ بھی ہو جائے گا، تم بس صبر سے کام لو۔" اس کا چہرہ قدرے پرسکون ہو گیا۔

وقت مقررہ پر شاہد کی فلم کا ڈانس ڈائریکٹر اور اس کا اسسٹنٹ ایک لوکل ڈانس ماسٹر کی مدد سے ماریہ کو تیز اصولوں پر نچاتے رہے۔ وہ کم کپڑے پہنے، بل کھاتے کے مختلف پوزوں پر بدن چھلکاتی اور "کٹ، اسٹارٹ، ٹیک، ری ٹیک" والے گرفتہ احکامات پر عمل کرتی رہی۔ آخر تین دن بعد کہیں جا کر اس کے ڈانس کی عکس بندی مکمل ہوئی۔ وہ جان چھوٹ جانے پر خوش تھی اور اس بات پر حیران تھی کہ "ہر کوئی مجھے "تو تو چینک" بھی کہتا ہے لیکن کیمرے کو میرا شریر دکھانا چاہتا ہے۔" چند دن بعد اس نے اپنی فیس کی بات کی تو شاہد نے کہا: "تم آج شام آٹھ بجے ہوٹل میں آ کر پیسے لے جانا۔" وہ اس کا مطلب سمجھ گئی۔ مقررہ موسے گھر پر میرے سامنے آ کر بیٹھ گئی، بولی:

"انکل، یہ فلم نگری والے ہم فن کاروں کی مجبوری کا فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن مجھے شاہد جی سے ایسی امید نہ تھی۔" اس کی آنکھوں میں ملال کا رنگ تھا، شاید وہ اندر سے احمق لڑکی کسی لہر کو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کی بات سے میں سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ شاہد جیلانی جو کبھی پہلے بہت شائستہ انسان سمجھا جاتا تھا اب پوری طرح فلمی رنگ میں رنگا گیا ہے اور برے اچھے اصول سے بیگانہ لگتا ہے۔" میں نے ماریہ سے کہا: "اچھا تم میرے ساتھ شاہد کے پاس چلنا لیکن جس طرح میں کہوں اسی طرح کرنا۔" میں اسے اپنی کار میں پی سی ہوٹل لے گیا۔ شاہد بہکے بہکے قدموں سے لاؤنج میں آ کر مجھے ملا: "تمہارے ساتھ یہ چادر پوش لڑکی کون ہے؟" آنکھوں میں نشے کے سرخ ڈورے تھے، وہ سر شام ہی پی کر بیٹھا تھا۔ "وہی میری پڑوسن ماریہ ہے، اسے تیز بخار چڑھا ہے اس کے پاس کوئی پیسہ نہ تھا، پیسے اس نے مجھے بتایا کہ آج شاہد بھائی نے پیسے دینے ہیں، آپ مجھے ان کے پاس لے چلیے۔ ماریہ اور اس کی فیملی پاکستان اور پاکستانیوں سے پیار کرنے والے لوگ ہیں۔ تم اس کے پیسے اسے دے دو تاکہ یہ علاج کروائے۔"

"سوری مسٹر طاہر، میں کسی کا بھائی نہیں، یہ جذباتی رشتہ داریاں میری ڈکشنری میں نہیں۔" اسی وقت شاہد جیلانی نے بڑا سا منہ بنا کر پرس کھولا اور پیسے اسے دے دیے۔ بعد میں ماریہ میری بڑی ممنون ہوئی۔ "انکل آپ نے مجھے بچا لیا، ورنہ رات بھر جانے وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتے۔" اس کے چہرے سے خوشی جھلک رہی تھی۔

میرا آجر محکمہ "نیو لائف" یا "نیا جیون" ایک بین الاقوامی این جی او کا ادارہ تھا۔ کافی عرصے اور ملکوں کے علاوہ نیپال میں بھی معذوری سے مجبور، بیمار اور غریب عورتوں کے لیے کام کر رہا تھا۔ میں اسی سلسلے میں وقتاً فوقتاً مختلف شہروں کے وزٹ کرتا رہتا تھا۔ انہی دنوں میں چار ہفتے کے دورے کا شیڈول بنا کر کھٹمنڈو سے نکل گیا۔ گھر والے میری ان عارضی غیر حاضریوں کے عادی تھے۔ مناسب ٹی اے ڈی اے کی صورت میں ملنے والی اضافی آمدنی میرے لیے ایک نعمت تھی، گزارا ٹھیک ہو رہا تھا پر دورے میری ضرورت تھے۔

ایک ماہ بعد کھٹمنڈو لوٹا تو بیگم نے مجھے خبر سنائی کہ ماریہ کو چند فلمی لوگوں نے مشورہ دیا کہ تم ٹھیک ٹھاک خوبصورت ہو، شریر بھی اچھا ہے، اب نیپال کی چھوٹی سی فلم نگری چھوڑو، سیدھی کولکتہ یا ممبئی کی راہ پکڑ کر اپنا جیون سنوارو۔ تم نے یہ کہاوت سنی نہیں: "نئی راہ نئی قسمت"۔ وہ ایک ہم وطن ایجنٹ کے ہمراہ چلی گئی سنا ہے آج کل ممبئی میں ہے۔ دیکھتے ہیں شاید وہاں اس کی قسمت سنور جائے، اچھے دن اور اچھی راہ ورات بھی مل جائے۔" خبر سن کر میں نے اپنا سر تھام لیا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ایک اور سال بیت گیا۔ ماریہ کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔ ماں بے حد پریشان، البتہ کبھی کبھی کوئی اجنبی مانش (آدمی) بند لفافے میں دو تین ہزار روپے ساحرہ کے ہاتھ میں دے جاتا۔ وہ ماریہ کو پوچھتی تو کہتا: "مجھے کچھ معلوم نہیں، ممبئی سے کوئی آدمی آیا اور لفافہ دے گیا تھا۔" ماں سوچتی: "چلو میری بچی زندہ تو ہے لیکن کہاں اور کس حال میں ہے، پیسے بھیج سکتی ہے تو خط کیوں نہیں لکھتی، خاموش کیوں ہے؟ اور اس خاموشی کے پیچھے کیا بھید ہے؟" ماں کو سو طرح کے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔ دکان کا کام بھی جیسے تیسے چلا رہی تھی۔ وہ زندہ تھی

لیکن مردوں سے بدتر۔ روح میں اَٹکی کوئی آس اسے مرنے سے روک رہی تھی اور وہ دونوں کو بس دھکا دیے جا رہی تھی۔

ایک دن گھر میں تو کرتیں تھا، میں کچھ سودا لینے باسل پر چلا گیا۔ زرد رو سامرہ مجھے دیکھ کر بولی ”طاہر بھیا! آپ ہی کچھ کوشش کیجئے، میری ماریہ کا پتہ لگائیے۔“

”سنا ہے وہ کبھی کبھی آپ کو پیسے بھیجتی ہے تو ساتھ میں کوئی خط یا رقعہ؟“

”کچھ بھی تو نہیں، پیسے بھی ڈاک سے نہیں آتے کوئی آ کے دے جاتا ہے اور اب تو کئی مہینوں سے پیسے بھی نہیں آئے، جانے وہ کس حال میں ہے یا کس کے جال میں ہے؟ پر میرا من کہتا ہے کہ وہ زندہ ہے، ضرور زندہ ہے، اور تو رابطہ ممتا بلک اٹھی۔ میری آنکھیں بھی گیلی ہو گئیں۔ اگلے دن دفتر میں میں نے مکمل کام کرنے سے پہلے ”نیو لائف“ کے انفارمیشن والوں سے بات کی۔ انھوں نے تعاون کا وعدہ کیا اور کوئی آٹھ دس دن بعد جواب ملا کہ ہاں اس نام کی نیپالی لڑکی ممبئی میں موجود ہے اور کام بھی کر رہی ہے“۔ میں خوش ہوا تاہم اگلی بات میرے لئے بم دھماکے سے کم نہ تھی۔ ”لیکن کوئی اچھا کام نہیں، وہ نیلی فلمیں کرتی ہے، کسی مافیا کے قبضے میں ہے، اکثر نشے میں چور رہتی اور خوب گالیاں بکتی ہے۔“ یہ بات میں اس کی ماں کو نہ بتا سکا تاہم میں نے ترپتی ممتا کو تسلیاں ضرور دیں۔ ”نیو لائف“ والوں نے مجھ سے ممبئی میں ماریہ کے ضروری علاج اور جلد بازیابی یعنی نیپال واپسی کی بھی بات کی تھی۔ میں انتظار کرنے لگا۔

لیکن اگلے سارے دن خالی خالی اور افسوس بھرے تھے۔ میرے دن کوڑی کرتے گزر رہے تھے۔ مجھے ”نیو لائف“ والوں کے ایفائے وعدہ کا انتظار بدستور تھا۔ ایک بھی آس اور بھی بھی تھی میں اداس کی ماں ججتی نظر آتی تھی لیکن مجھے ”نیا جیون“ کی کارکردگی پر بھروسہ تھا۔ پھر بھی چھ ماہ کا وقت گزر گیا۔ سامرہ کو میں باسل جا کر کم ملتا اور جب بھی اس سے ملا کرتا روتی ہے، میں جھوٹی تسلیاں اسے دیتا۔ وہ بیچاری بے بس عورت پھر کچھ یقین کے کچے دھاگے میں خود کو لپیٹ لیتی۔ لیکن یہ سلسلہ بھی کب تک؟ میں اکثر سوچتا۔

مارگ (وسط نومبر) کے دن تھے اور ڈھلتے سورج کی ایک سرد سی شام، مجھے آفس میں ایک فون کال ملی ”طاہر جی، میں باسنی بری میں ”نیا جیون“ کے روگی مہیلاؤں کے آشرم کی انچارج بول رہی ہوں، پاروزیا سے آئی ہماری ایک نئی مہمان نے آپ کو ملنے کیلئے بلایا ہے۔“ یہ خبر سن کر میں اچھل پڑا۔ باسنی بری کا سرسبز علاقہ حید آفس سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس مہاراج گنج سے چند کلومیٹر آگے میری گاڑی نے تیزی دکھا کر مجھے آشرم پہنچا دیا۔ وہاں ہال نمبر دو کے بیڈ چار پر خوب صورت جسم والی ماریہ نہ تھی بلکہ ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ پڑا تھا۔ وہ نحیف آواز میں کچھ بولی، میں اس کے خشک ہونٹوں تک جھک گیا۔

”طاہر جی، میری ماں کیسی ہے، میں اس کے چرنوں تک نہیں جا سکتی، اسے بتا دیجئے گا کہ میں ممبئی سے آ گئی، مگر، مگر یہ نہ بتائیے گا کہ اس دکھوں کی گھری سے میرے اس جہان تک جانے میں اب زیادہ دن باقی نہیں ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ طاہر جی، آپ کو معلوم تو ہو گا میری پیاری ماں نے اپنے بچوں، اپنے گھر کے لئے بہت دکھ جھیلے ہیں، میں میں ابھاگن چاہتی تھی جو مجھے نئے جیون کی طرف لے جائے۔ لیکن دنیا والوں نے مجھے نرک والے راستے کی اور دھکیل دیا جو کبھی میرے خیال میرے سپنے میں بھی نہ تھا۔ طاہر جی، میں کس کو دوشی سمجھوں، خود کو، یا ان کو جو مجھے میرے گھر سے، میرے شہر سے نکال کر اس راہ پر لے گئے، جس کی کوئی منزل نہیں۔ ہاں طاہر جی، ایک آخری بات، ماں کو بتا دیجئے گا کہ میں نے اپنا گھر بسا لیا ہے، یہ نہ بتائیے گا کہ کون سے شمشان گھاٹ مجھے دلہن بنا کر لے جایا گیا۔“ اکھڑتی سانس میں دھنسی ویران آنکھوں سے آنسو بہتے تو میری بھی ہچکیاں نکل گئیں۔

◆◆◆

باؤ اسرار

آمنہ مفتی

اس رات جب بیٹا سونے کے لئے بستر پہ لیٹا تو اس کے ذہن میں سوال تھے، جیسے ننھے ننھے سنپولیے۔ اور یہ سنپولیے کلبلاتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔

شاماں نے آج بڑے پیر کی نیاز دلوائی تھی۔ صبح سے نیاز کا سامان منگانے، نیاز پکانے اور بانٹنے میں اتنی مصروف تھی کہ بیٹا کب گیا اور کب آیا اسے علم ہی نہ ہو سکا۔ ڈھلتی راتوں کا چاند جو دن بھر آسمان پہ کہیں ملگجا نظر سے پوشیدہ رہا تھا، اب پکانوں کے اوپر چمک رہا تھا۔ ہوا میں گرد اور گوبر کی بو ٹھہری ہوئی تھی اور سوائے جھینگروں کی سنسناہٹ کے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بیٹے نے کروٹ بدلی تو اس کا پاؤں لگ کے چادر پائنتی سے تھوڑی ہٹ گئی۔ ادوائن شاید چھوٹی پڑ رہی تھی اس لئے کچھ حصے میں پٹ سن بان باندھ کر پورا کیا گیا تھا۔

بان کی ننھی سی پھانس بیٹے کے انگوٹھے میں چبھی اور ایک میٹھا سا درد پورے جسم میں پھیل گیا جیسے نوعمری کا عشق۔ وہ پھانس اکھیڑ ہی رہا تھا کہ شاماں اندر داخل ہوئی۔ اس کے جلو میں لونگ اور الائچی کی خوشبو کا تیز جھونکا تھا۔ بیٹے کا پھانس نکالتا ہاتھ کانپ گیا۔

"کیا ہوا؟" شاماں نے اپنی دوپٹوں اور پھندنوں والی چادر اتار کے کھونٹی پہ ٹانگتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ چبھ گیا ہے شاماں، بیا بان تھا" بیٹا شاماں کے چھلکتے وجود کو دیکھ کر مسکرایا۔ نیاز کی دیگ تیار کرتے میں سے دیسی گھی اور بھنی ہوئی سوجی کی مہک اٹھ رہی تھی۔ شاماں کے بال چھپانے کو کے اس کی گوری گردن سے چپکے ہوئے تھے اور موٹی موٹی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔

"دکھا کہاں چبھا ہے؟" وہ بیٹے کے انگوٹھے پہ جھکی تو بیٹے کو لوٹے میں تیرتی، سیاہ دھبوں والی پیازی مچھلی یاد آگئی، جس کی دم فرانسیسی جالی کی بنی ہوئی معلوم ہو رہی تھی اور گول سنہری آنکھیں ایک ابدی حیرت میں جڑی ہوئی تھیں۔

"میں اور ابا آج چھوریوں کی طرف گئے تھے۔"

شاماں نے پھانس کھینچی تو نا جانے کیوں پھل پھل خون بہنے لگا۔ شاماں نے گھبرا کے ہاتھ سے دبایا۔

"چھوریوں کی طرف، مگر کیوں؟" شاماں نے اپنے چہرے کے تاثرات سے بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے اتنی چھوٹی سی پھانس سے اتنا خون بہنے پہ شدید حیرت ہے۔

"جانتی ہے نا ابے کو شوق چڑھا ہوا ہے، چھوریوں کو آباد کرنے کا۔"

"ہاں سن رہی ہوں میں بھی، اچھا ہے۔ زمین دو حصے ہوئی ہے، مل جائے گی تو آسانی ہوگی۔"

شاماں نے ہاتھ اٹھایا تو خون رک چکا تھا لیکن شاماں کی ہتھیلی پہ سرخ خون کے دھبے روشندان سے آتی چاندنی میں چمک رہے

نمایاں ہو رہے تھے۔

"میں ہاتھ دھو آؤں۔" شاماں اٹھی تو جیدے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہ جا شاماں نہ جا، رات بہت ہو گئی ہے، نہ جا۔۔۔"

شاماں جو ماہوں کی راتوں کو بھی خاطر میں نہ لاتی تھی، رک گئی، جیدے کے لہجے میں اتنا خوف تھا۔

خون آلود ہتھیلی سمیت وہ جیدے کے برابر بیٹھ گئی۔ رنگلے پایوں والا پلنگ اجڑا ہوا تھا لیکن شاماں بھی جب بھر جوبن تھی۔ جیدا بیک سلائی تھا لیکن شاماں کے وجود سے سارا پلنگ بھر گیا۔

"میں نے آج جھوریوں میں عجیب چیزیں دیکھیں۔" جیدا جھجھکتے ہوئے بولا۔

"تجھے وہاں نہیں جانا چاہیے تھا جیدے، اتنا سیانا ہو کے بھی اب کی باتوں میں آ گیا؟" شاماں کے لہجے میں دہشت تھا۔

"وہاں مجھے ایک جوگی ملا، وہیں رہتا ہے جھنڈ کے اندر کہیں۔" جیدا جو بکو کے آیا تھا وہ بتانے سے پہلے اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

شاماں نے اٹھ کر کونے میں رکھی صراحی سے تانبے کا منقش گلاس بھرا اور جیدے کی طرف بڑھایا۔ جیدا مشکور نظروں سے اسے دیکھ کر پانی پینے لگا۔

"جوگی نے تو رہنا ہے وہاں، اس کی روزی جو ہے۔" شاماں نے آدھا سا جملہ بولا۔ جیدے کے ہاتھ میں گلاس کانپا۔

"جوگی کی روزی کا جھوریوں سے کیا تعلق؟"

شاماں نے کوئی جواب نہیں دیا اور گلاس میں بچے ذرا سے پانی سے ہاتھ دھوتی رہی۔

آلودہ پانی کے ہلکے گلابی قطرے پیال کے فرش سے ہوتے ہوئے نیچے ریت اور پھر مٹی میں جذب ہو گئے۔

"جوگی کہہ رہا تھا ابا ایسا نہیں ہے۔" جیدے کی بے تکی بات پر شاماں ہنسی اور اپنی چوٹی کے بل کھولنے لگی۔ کمرے میں آٹے اور بال چھڑ سے لدی ہوائیں گھس آئیں۔

"جوگی کہہ رہا تھا کہ وہ میاں اللہ یار کو جانتا ہے اور وہ جھوٹ نہیں بولتا اور اگر ابا اللہ یار ہے تو پھر جس اللہ یار کو وہ جانتا ہے وہ کوئی اور ہے۔"

شاماں اچک کر پلنگ پہ بیٹھی۔

"ابا ایسا نہیں ہے، یہ تو مجھے بھی پتا ہے، اس کے لئے جوگی ہونا ضروری تو نہیں۔" شاماں زور سے ہنسی۔

"اب کو وہاں ایک گورے نے زخمی بھی کر دیا لیکن جوگی نے ایسی دوائی لگائی کہ ابا اپنے پیروں پہ چل کے آیا۔"

"وہ یہ بھی کہتا ہو گا کہ اس گھر کے نیچے سانپوں کی باؤلی ہے، صدیوں پرانی۔" شاماں گول تکیے کے سرخ اور زرد غلاف والے تکیے پہ سر رکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔

"ہاں ہاں کہتا تھا۔"

"اور یہ بھی کہ اس باؤلی میں ایک ناگن رہتی ہے، جو سو سال بعد عورت بن کے باہر نکلتی ہے اور اس گھر کے ایک فرد کو اس کے اور اس کی سب دولت سمیت لے کے باؤلی میں چلی جاتی ہے۔"

جیتے کے سر سے پسینہ پھوٹ نکلا اور کمر میں خوف کی ننھی ننھی کرچیاں کھب گئیں۔

"تجھے کیسے پتا؟" وہ بولا تو اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ شاماں نے دیوار کی طرف کروٹ لی اور بالوں کا ریشمی سرسراتا ڈھیر جیتے کے منہ پر گرا۔

"یہ کوئی نئی کہانی ہے؟ شاملات میں ہر لڑکی یہی بتاتی تھی کہ میاں اللہ یار کے ڈیرے کے پیچھے بہت بڑی باڑی ہے اور وہ اتنے بڑے خزانے پہ ہے کہ اگر میاں اللہ یار کو معلوم ہو جائے تو پاگل ہی ہو جائے"۔

"تو جب سب کو پتا ہے تو ہمیں کیوں نہیں معلوم۔۔۔؟" جیتا جھنجھلاہٹ کے جنگل سے نکلا۔

شاماں نے اب کی بار جیتے کی طرف کروٹ لی۔ اس کی چوڑی چوڑی آنکھوں میں نیند کے سرخ ڈورے تھے اور کالے بالوں کے ہالے میں اس کا سرخ و سفید چہرہ اتنا خوبصورت لگ رہا تھا کہ جیتے کو سب سوال بھول گئے۔ باہر ہوا سرد ہو چکی تھی اور رات کے دوسرے پہر کی اوس درختوں اور فصلوں پہ ہلکی ہلکی دھند کی شکل میں اترتی آ رہی تھی۔

اگلی صبح میاں اللہ یار اسی طرح اکڑ کے بیٹھا تھا جیسے اسے کوئی زخم لگا ہی نہ ہو۔ فضل بی بی دوری میں اس کے لئے سردائی گھوٹ رہی تھی اور بخت بی بی اپنے نیلے سوت کے پلنگ پہ بیٹھی گوڈیاں اور لونگ سے سجا پنکھا جھل رہی تھی۔ جھل تو وہ خود کو ہی رہی تھی لیکن اس کی شدید خواہش تھی کہ یہ جھونکے میاں اللہ یار کی طرف مڑ جائیں۔

جیتا نہا کر آیا تھا اور اس کے گیلے بالوں سے گرتے پانی کے قطرے اس کے سفید کرتے میں جذب ہو رہے تھے۔ میاں اللہ یار جیتے کو دیکھتے ہی گندا سا منہ بنا کے تھک تھک کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ جیتا کمزور اور زن مرید ہے اور اسی زن مریدی کی وجہ سے وہ اسے ڈرا رہا ہے کہ جھوریوں کو کاشت نہ کیا جائے۔

میاں اللہ یار کو غصے میں دیکھ کے فضل بی بی سردائی کا گلاس لے کے دوڑی۔ میاں اللہ یار نے دو بڑے بڑے گھونٹوں میں گلاس خالی کیا اور بادام مصری خشخاش کے بارے میں اتنے نادر خیالات کا اظہار کیا کہ گزرے کی ادا ٹولی میں بھی اتنی باریک تفاصیل بیان نہیں کی گئی ہوں گی۔

جیتے کے کان لال ہو گئے اور بخت بی بی نے پنکھے میں منہ چھپا لیا۔ اس کے بعد میاں اللہ یار نے ٹریکٹر ڈرائیور کو جیپ نکالنے کا حکم دیا اور جیتے کو شاماں کے کمرے میں چپ کے سوتے رہنے کا مشورہ دیتے ہوئے جھوریوں کی طرف نکل گیا۔

جیتا دیر تک اپنی سگی اور سوتیلی ماں کے سامنے شرمندہ سا بیٹھا رہا پھر کھنکھار کے بولا کہ میاں اللہ یار یہ ٹھیک نہیں کر رہا۔

"کیا ٹھیک نہیں کر رہا؟ یہاں تو ساری زمین ہی ایسی تھی۔ اگر سب لوگ اسی طرح ڈر کے بیٹھے رہتے تو آج سارے میں تو بس اوت جھاڑیاں ہوتیں۔"

فضل بی بی شوہر سے جتنا مرضی دبے لیکن سوتیلے رشتوں کو ذرا خاطر میں نہ لاتی تھی۔ جوانی اور بیاہے جانے کا غرور اس کی ریڑھ کی ہڈی کو اکڑائے رکھتا تھا۔ اتھری گھوڑی کی طرح ابھی وہ پنجوں کے بل چلتی تھی۔

"بات یہ نہیں چھوٹی بی بی!" جیتا نظر جھکا کے تحمل سے بولا۔

"تو اور بات کیا ہے؟" فضل بی بی ایک ہاتھ کمر پہ رکھ کے دوسرا ہاتھ چلا کے بولی۔ "بات تو ساری یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہو رہا ہے میرے باؤ اسرار کے لئے، اور تجھے پتہ ہے وہ بابے شریکے کا ساز اور کچھ نہیں۔" فضل بی بی چنگھاڑی۔

جنت بی بی کے دماغ سے لگے ہونٹ سختی سے بھینچے رہے۔ اس نے زندگی سے یہی سیکھا تھا کہ ہونٹوں پہ چپ کا تالا لگائے رکھو۔ لوگ ڈرتے رہتے ہیں کہ نا معلوم کیا طوفان اندر دبا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے ڈھلتے ہوئے وجود کی عمارت میں اتنا دم نہیں تھا کہ فضل بی بی کی چڑھتے دریا جیسی جوانی کے سامنے ٹھہر جاتا۔ سوکن کے سامنے چپ رہنا کمزوری نہیں ایک دفاعی حربہ تھا۔

"اور کیا؟ اتم تو سارے جوان اشکرے، میرا اسرار تو ابھی اتنا چھوٹا ہے کہ کندھے سے لگا کر دکھا سکتی ہوں تو وہ معلوم نہیں ہوتا، اس بے چارے کو کہاں پتہ۔ کچھ سٹے دیا تم ساروں نے۔" فضل بی بی کی آواز میں غضب تھا۔

جوان اشکر اپنی نظریں جھکائے جھکائے اٹھا اور جوتی میں آدھا پیر اڑائے وہاں سے نکل گیا۔ پچھلے صحن سے ایک تیز جھونکا گزرا اور ٹاہلیوں کی ٹہنیاں چیخ کر رہ گئیں۔

◆◆◆

معروف ادیب، شاعر اور مصنف اسلم گورداسپوری کی فلسفہ مارکسزم پر کتاب

"مارکسزم اور آج کی دنیا"

شائع ہو گئی ہے — قیمت:-/400 روپے

ملنے کا پتہ: بلاک نمبر 7، آفس نمبر 6، سیکنڈ فلور، میاں چیمبرز، 3 ٹمپل روڈ، لاہور

معروف ادیب، شاعرہ اور مصنفہ شاہین زیدی کی اداریوں کی نئی کتاب

بند کواڑوں کا ادب

شائع ہو گئی ہے — قیمت:-/200 روپے

ملنے کا پتہ: طلوعِ اشک پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور

خودگزیدہ

طارق بلوچ صحرائی

چپ راستے کی چاپ سہم جائے یا کوئی مظلوم آسمان کی طرف دیکھے اور خاموش ہو جائے تو اندر ایک عجیب سا شور برپا ہو جاتا ہے۔ مجھے ہنستے ہنستے روتے اور روتے روتے ہنستے لوگ بہت اچھے لگتے ہیں اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر اس کی آنکھوں میں ساون بھر آیا میں نے تڑپ کر اس کا سر اپنی گود میں لے لیا۔ رات کی سیاہ زلفیں شام کے مرمریں کاندھوں پر گر چکی تھیں۔ آسمان پر بادلوں کے چند شریر ٹکڑے راستہ بھٹکی ہوئی دعاؤں کی طرح دوڑ رہے تھے اور ٹمٹماتے تارے ان راستہ بھولی دعاؤں کو دیکھ کر چشم نم لئے اداس کھڑے تھے۔ دعاؤں کو اگر اخلاص کی سرگوشی اور آنکھ کا پانی میسر آئے تو وہ منزل تک نہیں پہنچ پاتیں اور راستوں ہی میں بھٹک جاتی ہیں۔ سفر کو معافی سے شروع ہونا چاہیے اور ہر نئے دور کا آغاز معافی سے ہی ہوتا ہے۔ فطرت کے بھی اپنے ہی راز ہیں جو ان رازوں کو پا لیتا ہے اسے انعام میں قید بنا دیا جاتا ہے۔ رات بھی ایک راز کا نام ہے یہ ہر شام سے ایک چراغ مانگتی ہے اور جو مسافر شب بھر اپنا دیا بجھنے نہیں دیتا صبح اس کو آفتاب عطا کر دیتی ہے مجھے سورج اچھا لگتا ہے اسے اپنی روشنی کو ثابت نہیں کرنا پڑتا۔ سچ بھی وہی ہوتا ہے جسے ثابت نہ کرنا پڑے جو آنکھوں کو چندھیا دے۔ عام مٹی میں آنکھیں بونے سے صرف خواب ہی اگتے ہیں مگر جو آنکھیں مدینہ میں بوئی جائیں وہاں سے آفتاب اگتے ہیں جن کی روشنی پوری کائنات کو خیرہ کر دیتی ہے۔ "ہم کیسے لوگ ہیں جو در بند کر کے دیپ بجھا کر درختوں اور رشتوں کو کاٹ کر پرندوں اور جگنوؤں کو مار کر تتلیوں کو اداس کر کے خوش ہو جاتے ہیں؟" اس کے پاس ہمیشہ سوال جیسا جواب اور جواب جیسا سوال ہوتا تھا۔ ہم صدیوں غلام رہنے والے اپنی فطرت میں اذیت پسند لوگ ہیں ہم معافی جیسے بڑے اور معتبر لفظ سے نا آشنا ہیں۔ ہماری عمر کا کیا بالن ساری زندگی سلگ سلگ کر دھواں دیتا رہتا ہے۔ اور پھر چاروں طرف خاموشی چھا گئی۔ لوگ خود غرض ہو جائیں یا لفظ مسخ شدہ لاشیں بن جائیں دنیا گونگی ہو جائے یا آدمی بہرہ ہو جائے درد آواز چھین لے یا قصر جہانگیر زنجیر سے خالی ہو جائے پھر ایسی تنہا دنیا رہنے کے قابل نہیں رہتی۔ ہم دونوں باپ بیٹا گاؤں میں اپنے گھر کے کھلے آنگن میں سونے کے لیئے لیٹے تھے۔ وہ امریکہ سے ڈاکٹر بن کر تین ماہ پہلے ہی لوٹا تھا اس کی ماں نے اپنی آنکھوں کی سلائیوں سے اس کے لئے بہت سے خواب بنے تھے میری بھی یہی خواہش تھی وہ پردیس جا کر بہت سا پیسہ کمائے مگر وہ کہنے لگا ابا میں اب ملک سے باہر نہیں جاؤں گا اسی ملک میں رہ کر اس کی خدمت کروں گا۔ ابا وطن کو ہماری ضرورت ہے خالی وطن کی محبت کے دعوے کرنے کا کیا فائدہ ابا گاؤں سے پوچھا ہے نہیں ملک کی بہتری دیکھ بھال اور تازہ وعدہ و چارے سے خوش ہوتی ہے۔ کہنے لگا ہونٹوں پر اگر کربلا لکھ دیا جائے تو پھر دریا کی کوئی شرط باقی نہیں بچتی۔ ابا جانے سے ہوتا جانے کے خوف میں مبتلا انسان عمر بھر سکون نہیں پا سکتا۔ اور جس دریا سے لوگ پانی بھرنا چھوڑ دیں مچھیروں کے گیت خاموش ہو جائیں، کشتیاں لوٹ جائیں اور چپو بکھر جائیں اور ملاح صحرا نشین ہو جائیں وہ دریا نہیں رہتے مٹی ہو کے بن جاتے ہیں اور پھر موسموں کے کیلنڈر سے ساون بھادوں اتر جاتے ہیں۔ مجھے یاد آیا میں نے ایک دن اپنے دادا سے پوچھا جس کی مٹھی سے عمر کی کافی ریت گزر چکی تھی اور جس کے چہرے پر جھریوں نے نوے سال کی تاریخ رقم کر رکھی تھی دادا یہ زندگی کیا

ہے؟ دادا جنہا پھر وہ آسمان جس پر بادلوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تیر رہے تھے کی طرف دیکھ کر بولا بیٹا یہ زندگی آوارہ بادلوں کی چھاؤں جیسی ہے اتنی ہی مختصر اتنی ہی ناپائیدار اور اتنی ہی غیر یقینی پھر میری طرف دیکھ کر بولا انسان کی قدر کیا کرو یہ سب سے قیمتی اثاثہ ہے اور پھر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا ہم بھی عجیب لوگ ہیں چراغ بجھا کر شب کو جلا لیتے ہیں۔ میں نے اچانک سوال کیا دادا رب کیسے ملتا ہے؟ دادا نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر لیں کافی دیر خاموش رہنے کے بعد بولا رب تک پہنچنے کا سب سے محفوظ راستہ خدمت خلق ہے پھر بولا خاموشی رفاقت اور رات کے پچھلے پہر بھی رب تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور لیں بیٹا میں تمہیں ایک عجیب بات بتاؤں مجھے نہ جانے یہ کیوں لگتا ہے رب جمعہ کی پہلی اذان کے وقت مسجد میں آتا ہے جو شخص اس وقت سب کو معاف کر کے اللہ کو اللہ سے مانگ لیتا ہے اسے رب مل جاتا ہے۔

''بابا مجھے آج کہانی تو سنا جیسے مجھے بچپن میں سنایا کرتا تھا'' میں نے حیرانی سے یوسف کی طرف دیکھا ہاں بابا مجھے بچپن اچھا لگتا ہے۔ آج کے اس تیز رفتار اور مادہ پرستی کے دور نے ہم سے ہمارا بچپن چھین لیا ہے۔ شہروں میں بچے تو ہیں مگر بچپن کہیں کھو گیا ہے۔ جہاں رشتوں کو زوال آ جائے جہاں نانی دادی اولڈ ہوم چلی جائے جہاں بوڑھوں کو بوجھ سمجھ لیا جائے وہاں بچوں کو کہانی کون سنائے گا۔ کہانی اور لوری نہ سننے والے بچے مدر ٹریسا یا ایدھی نہیں جلاد بنتے ہیں اور تاریخ کو ہیروشیما اور ناگاساکی کی قیامتوں سے آلودہ کر دیتے ہیں۔''

یہ کیسا عجیب دور ہے جہاں پہلے صرف کہانی ہوتی تھی خوابوں میں لیکن اب کہانی میں کہانی بن جاتی ہے۔

میں نے یوسف کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہانی سنانا شروع کی ''ساحل سمندر پر ایک بڑا برگد کا درخت تھا اس کے ارد گرد آم اور جامن کے درخت تھے دن کو تھکے ماندے مسافر اس کی گھنی چھاؤں تلے آرام کرتے تھے رات کو پرندے اور جگنو اس کی آغوش میں پناہ لیتے تھے۔ تتلیاں دن رات اس برگد کے پتوں سے کھیلتی رہتیں اور اس سے سرگوشیاں کرتی رہتیں۔ کوئل اور بلبل یہاں گیت سنانے آتی تھیں وہ برگد ان سب کے درمیان بہت خوش رہتا تھا۔ قافلے یہاں قیام کرتے تھے اور مسافر ایک دوسرے کو کہانیاں سنایا کرتے تھے اور ایک دوسرے سے ڈھیروں باتیں کرتے تھے پرانے لوگوں کی باتیں بھی یادیں ہوا کرتی تھیں۔ ہر کوئی کسی نہ کسی کو یاد کر رہا ہوتا تھا۔ یادیں بھی عجیب ہوتی ہیں وقت کو تھام لیتی ہیں اور دل کی دیوار پر محبت کی سنہری بیلیں چپ چاپ چڑھا دیتی ہیں۔ بھول جانے سے زندہ بھی مر جاتے ہیں اور یاد کرنے سے مرنے والا بھی جی اٹھتا ہے۔ لوگ بدلے تو وقت بھی بدل گیا مادی ترقی نے اخلاقی ترقی کو مات دے دی۔ پھر اس برگد کے سامنے ایک بہت بڑا ہوٹل بن گیا۔ اب برگد گاڑیوں کی پارکنگ کے لئے استعمال ہونا شروع ہو گیا۔ ہر وقت گاڑیوں کا شور، دھواں تیل کی بو، مصنوعی قہقہے، دولت اور جسموں کی نمائش اور سٹیلس کے پنجرے میں قید لوگ برگد اداس رہنے لگا۔ اس کو وہ دن بھلے لگتے تھے جو دن کے مسافروں کی کہانیاں سنتا تھا، پرندوں، جگنوؤں، تتلیوں کے ساتھ وہ مسکراتا تھا۔ پھر برگد کا درخت بیمار ہو گیا اس کے تمام پتے جھڑ گئے اس کی وادی کی طرف ہجرت کر گئے برگد سوکھ کر ٹنڈ منڈ ہو گیا تھا اب یہاں نہ کوئی پرندہ آتا تھا نہ جگنو نہ تتلیاں اور نہ گلہریاں بھولا بھٹکی تھیں۔ اب برگد موت کی دعا مانگنے لگا تھا۔ لمبے عرصے کے بعد ایک دن ایک طوطا آ کر برگد پر بیٹھ گیا برگد بہت خوش ہوا برگد نے طوطے سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھی تو طوطا بولا میرا جو مالک ہے جو سامنے والے ہوٹل کا بھی مالک ہے بڑا پریشان رہتا ہے کہتا ہے میں سارا سمندر خریدنا چاہتا ہوں مگر میرے پاس اتنا سرمایہ نہیں ہے برگد بولا اپنے مالک سے کہو تم کنارے خرید لو سمندر خود بخود تمہارا ہو جائے گا۔ طوطا بہت خوش ہوا جب وہ اڑنے لگا تو برگد بولا اپنے مالک سے کہنا تم دنیا کی ہر شے خرید سکتے ہو مگر سکھ اور سکون نہیں خرید سکتے۔ سکون رہنے کے لئے اور سکھ پانے کے لئے برگد بننا پڑتا ہے انسان کو اس دنیا میں پھل بننے کے لئے بھیجا گیا ہے۔ درخت اپنا پھل خود نہیں کھاتا نہ ہی اپنے سائے میں بیٹھتا ہے جو ملا

جاتے ہیں اسے بانٹ کر کھاؤ یعنی کھانے سے نعمتوں میں سے خوشبو اڑ جاتی ہے۔" شہر ساحل، سمندر، جنگل، پہاڑ تھا، شہر جب بھی پھیلتے ہیں گھنے سہانے چھاؤں بھرے پتے پھیلتا نہیں رہتے یہ سب قاتل تیشوں کی نذر ہو جاتے ہیں اور پھر مسافر دھوپ کے زرد گلشن میں پلتا ہوا موت بنا پھرتا ہے۔ پھر ایک دن قاتل تیشے نے اس برگد کا بھی خون کر دیا!!! اب یہاں ایک پارکنگ پلازہ ہے۔ برگد تھا تو اجتماعی سوچ ختم ہو جاتی ہے یہ سب، جگنو، تتلیاں اور فطرت ہجرت کر جاتے ہیں اور صرف جسموں کی آلودگی رہ جاتی ہے۔ برگد نہ رہے تو قافلے یہاں قیام نہیں کرتے اور نہ ہی مسافر ایک دوسرے کو کہانیاں سناتے ہیں۔ کہانی ختم ہو جائے تو بچپن مر جاتا ہے جس کا بچپن مر جائے اس کے حرف بھی مر جاتے ہیں اس لئے اسے عمر بھر زندگی کی شاعری کی سمجھ نہیں آتی۔ جس کا بچپن مر جائے اسے عمر بھر زندگی کی لذت میں [illegible] کے سانپ کے کاٹ کھائے جانے کا خوف رہتا ہے۔ کہانی سن کر یوسف بچوں کی طرح خوش ہو گیا جیسے اس کا بچپن لوٹ آیا ہو کہنے لگا بات تو ٹھیک کہتا ہے انسان کو دنیا میں عمر بھر جینے کے لئے بھیجا گیا ہے مگر وہ آکاس بیل بن جاتا ہے۔ میں نے کہا یوسف ظفر ایک بات تو بتا جب سے تو پردیس سے آیا ہے تو کتنا بدل گیا ہے تو مجھے ایک بزرگ اور مرشد کی طرح لگنے لگ گیا ہے یہ تمہیں کہاں سے روشنی مل گئی ہے!! بولا جب میں امریکہ پڑھنے گیا تو میرے ذہن کے گنبد میں ہزاروں عجیب و غریب سوالوں کے کبوتر ہر وقت غٹر غوں غٹر غوں کرتے رہتے تھے۔ میں خود سے ایسے سوال کرتا تھا کہ جیسے کوئی دوسرا کسی سے کرے تو وہ چیخ اٹھے۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا یہ زندگی جو ہم گزار رہے ہیں یہ اصل زندگی تو نہیں ہے۔ سانس لینا اور صرف جیے جانا یہ تو ایک عادت اور روایت کا نام ہے زندگی تو اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ آدمی سے انسان بنتا ہے۔ اتنے ترقی یافتہ ملک میں لوگ بے شمار نفسیاتی الجھنوں اور بیماریوں کا شکار ہیں ایسا کیوں ہے!! غور کرنے پر مجھے معلوم ہوا ان لوگوں نے نکاح چھوڑ دیا ہے جس کی سزا صرف یہ قوم ہی نہیں پوری انسانیت بھگت رہی ہے اور بھگتے گی۔ ساری کی ساری نفسیاتی بیماریاں صرف نکاح کو چھوڑنے کی وجہ سے ہیں۔ نکاح تمام رشتوں کو جنم دیتا ہے۔ زندگی کا سارا حسن اور سارا دین رشتوں میں ہے جہاں رشتے کچے، مضبوط اور بے خلوص ہوں گے نفسیاتی مسائل پیدا ہوں گے۔ قربانی اور وقت رشتوں کے لئے کھڑے ہیں رشتوں کے خوبصورت بندھن میں بندھا انسان یا وہ نہیں رہتا اور گوشت کا ٹکڑا سونے کی بیلوں کو آباد نہیں کیا کرتا۔ مجھے اپنی ماں یاد آ گئی رشتوں کے تقدس کو سمجھاتی ہوئی میں نے ایک دن اپنی ماں سے پوچھا ماں تو سارا دن وردِ پاک پڑھتی رہتی ہے مگر تو مدینے کیوں نہیں جاتی!؟ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں بولی پتر گنبدِ خضریٰ کو دیکھنے کے لئے میں اس معیار کی آنکھیں کہاں سے لاؤں اور پھر وہ اشکبار ہو کر کہنے لگی۔ وہ سچ کہتی تھی انسان کو باہر سے کچھ نہیں ملتا جو کچھ بھی ملتا ہے یا تو اپنے اندر سے ملتا ہے یا پھر مدینے سے۔ پھر ایک دن میں نے اپنے رب سے دعا مانگی اے رب العزت مجھے زندگی بسر کرنے کا طریقہ، سلیقہ اور قرینہ عطا فرما۔ اور پھر مجھے روشنی مل گئی پھر مجھے زندگی بسر کرنے کا طریقہ، سلیقہ اور قرینہ آ گیا۔ مگر بابا ساتھ میں سب کچھ بدل جاتا ہے۔

پہلے میں کہتا تھا سائل لینے آتا ہے مگر روشنی ملنے کے بعد پتا چلا سائل تو آپ کو دینے آتا ہے۔ پہلے میں کہتا تھا میزبان مہمان کو کھلاتا ہے آگہی کے بعد پتا چلا مہمان میزبان کا رزق لے کر آتا ہے۔ پہلے میں کہتا تھا روشنی کے لئے مغربی اور جدید تعلیم ضروری ہے مگر اب پتا چلا ختم ہونے والی روشنی اور جہالت کے لئے خاکِ مدینہ چاہیے ہوتی ہے۔ پہلے میں اپنی ناکامی کے لئے دوسروں کو موردِ الزام ٹھہراتا تھا مگر بعد میں معلوم ہوا قرآن کہتا ہے "(اے آدم زاد) تجھ کو جو فائدہ پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو نقصان پہنچے وہ تیری ہی (شامتِ اعمال کی) وجہ سے ہے جب مجھے زندگی بسر کرنے کا طریقہ، سلیقہ اور قرینہ آیا تو مجھے پتہ چل گیا۔ ہر انسان صفر کی طرح ہوتا ہے وہ جتنا بھی ترقی کرتے جا رہے وہ آئن سٹائن ہو، نیوٹن ہو یا سکندر ہو اپنے صفروں میں اضافہ کرتا جاتا ہے مگر رہتا زیرو ہی ہے اگر اس نے خود کو حقیقی اور

valuable بنا ہے تو اُسے ذاتِ واحد کے دائیں جانب آ کر سجدہ ریز ہونا پڑے گا ورنہ وہ صفر ہی رہے گا۔ اور پیشانی کے قلم سے لکھا جانے والا سب سے معتبر لفظ اپنے خالق کے آگے سجدہ عشق ہے اور عشق جب تک ہجرت نہ ہو تب مکمل نہیں ہوتا۔

اور دوسری بات اپنے ہر تعلق کو برتنے کو خواہ وہ خالق کے ساتھ ہے یا اس کی مخلوق کے ساتھ ہے اسے غیر مشروط محبتوں کے ساتھ مشروط کر دو، زندگی جنت بن جائے گی یہی زندگی بسر کرنے کا طریقہ، سلیقہ اور قرینہ ہے۔ بابا ہمارا ایک المیہ ہے ہم عرصہ دراز تک تلافی کی زنجیروں میں جکڑے رہتے ہیں ایک عرصہ آزادی کا گزارنے کے بعد تمام دوسروں کو تو معاف کر دیتے ہیں مگر خود کو معاف نہیں کرتے اس لئے خود کو ہر لمحہ اذیت دیتے رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اذیت میں رکھتے ہیں بابا ہمیں دوسروں کے ساتھ ساتھ خود کو بھی معاف کرنا ہوگا اور خود کو معاف کرنے کے لئے پہلے رحمت العالمین کے رب کے رحمان اور رحیم ہونے کا مکمل یقین ہونا لازمی ہے بابا ہم مردم گزیدہ نہیں خود گزیدہ ہیں بابا خود گزیدہ۔

میں نے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا یوسف نے تڑپ کر میری طرف دیکھا اور اپنا رومال نکال کر میرے کٹے ہونٹوں کا خون صاف کرنے لگا۔ میں ساری رات روتا رہا۔ استغفار، یا رب کریم سے معافی طلب کرتا رہا، دوسروں کو معاف کرتا رہا۔ صبح کا آغاز ہو چکا تھا فجر کی اذان شروع ہو چکی تھی آسمان پر نور پھیل رہا تھا میں نے گہری نیند میں سوئے ہوئے بیٹے کا ماتھا چوما اور پھر خود کو معاف کر دیا۔

◆◆◆

علمی، ادبی اور تحقیقی مجلہ مدیر **عبدالوحید** کی نگرانی میں

ہفت روزہ **"اُنس"**

پوری آب و تاب سے اسلام آباد سے شائع ہو رہا ہے

ملنے کا پتہ: ہفت روزہ "اُنس" اسلام آباد، 56 کا کمپلیکس روڈ حق لین، نیو لالہ زار، راولپنڈی کینٹ (فون: 03335144348)

منفرد ادبی جریدہ مدیر **وحشی سعید** کی نگرانی میں

دو ماہی **"نگینہ"**

پوری آب و تاب سے کشمیر (انڈیا) سے شائع ہو رہا ہے

ملنے کا پتہ: پوش کرن، سری نگر، کشمیر-190010، انڈیا

رشتوں کی ڈور

کلدیپ جوشی (انڈیا)

جج صاحب کے کرسی نشین ہوتے ہی عدالت کی کاروائی شروع ہو گئی۔ مقدمہ ششیکھر اور کامنی کی طلاق کا تھا۔ بحث ختم ہو چکی تھی۔ آج کا دن فیصلہ سنانے کے لئے مقرر تھا۔

جج صاحب نے فرمایا کہ فریقین کے وکلا کی دلیلوں اور مقدمے کے دوسرے پہلوؤں پر غور کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ دونوں فریقین ششیکھر اور کامنی کے تعلقات میں کافی تلخی آ چکی ہے اور کافی عرصے سے ان کے درمیان کوئی ازدواجی تعلقات بھی نہیں ہیں۔ اس لئے میرے لئے سوائے طلاق کی منظوری کے اور کوئی راستہ نہیں۔ لیکن پھر بھی فیصلے پر دستخط کرنے سے پہلے میں ایک بار پھر ششیکھر اور کامنی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا دونوں اپنے طلاق کے فیصلے پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ ششیکھر اور کامنی کی مکمل خاموشی کو محسوس کرتے ہوئے جج صاحب نے طلاق کے کاغذات پر دستخط کر کے دونوں کی علیحدگی پر مہر ثبت کر دی۔

فیصلے کے مطابق ایک سال کی معصوم لڑکی کی پرورش ماں کو سونپی گئی۔ لڑکی کی پرورش اور کامنی کے نجی اخراجات کے لئے ششیکھر پر پندرہ لاکھ کی رقم یکمشت واجب الادا ہوئی۔

ششیکھر اور کامنی جو اب تک پتی پتنی تھے میاں بیوی تھے ایک دوسرے کے ہمسفر تھے اب دو الگ الگ انسان ہو گئے۔ ان کے درمیان اب اجنبیت جنم لے چکی تھی۔ کاغذات پر دستخط کر کے دونوں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے عدالت سے ایک ساتھ باہر نکلے اور الگ الگ راہ ہو لی۔ لیکن چند قدم ہی چل کر دونوں کے قدم رک گئے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ آنکھیں جن میں ہزاروں سوالات تیر رہے تھے۔ دونوں طرف سے مکمل خاموشی اس سکوت کو کبھی کبھی توڑتی ہوئی آواز اس ننھی سی بچی کی تھی جو سب باتوں سے بے خبر اپنے مستقبل سے انجان کامنی کا ہاتھ پکڑے کبھی ممی کو دیکھتی اور کبھی پاپا کو۔ غیر ارادتاً ششیکھر کے قدم ننھی کی طرف بڑھے لیکن وہیں پر شل ہو گئے۔ کامنی اور ششیکھر بدستور ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ زبانیں خاموش تھیں لیکن آنکھیں متکلم۔ "پہلی ملاقات کالج میں داخلے کے بعد ہوئی تھی" کامنی کی آنکھیں بول اٹھیں۔ "نہیں پہلی ملاقات تو اس دن ہوئی تھی جب داخلے کا فارم لینے والی قطار میں کھڑا ہونے لگا تو دیکھا قطار سے ذرا ہٹ کر تم فون پر بات کر رہی تھی۔ میں نے پوچھنا مناسب سمجھا۔ کیا آپ بھی لائن میں کھڑی ہیں؟" "ٹھیک، بے تکلف تم نے "آپ" نہیں "تم" کہا تھا اور تمہارے اس بے تکلف انداز میں بولے "تم" میں چھپی ہوئی اپنائیت میں نے محسوس کی۔ مجھے ایسا احساس ہوا کہ جیسے محبت کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں ہم دونوں ایک ساتھ تیر رہے ہوں۔"

"یاد آیا۔ ہم دونوں کو ایک ہی کورس میں داخلہ مل گیا اور سیکشن بھی ایک" "کالج کی پہلی کلاس تھی۔ ہر سٹوڈنٹ ادھر ادھر نظر دوڑا کے بیٹھنے کی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی کسی کی متلاشی تھی اور کوئی کسی کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جونہی میں کلاس میں داخل ہوئی تم نے اشارہ کر کے مجھے اپنے ایک کی دوسری سیٹ پر بیٹھنے کی دعوت دی۔" "اور تم نے اس دعوت کو بلا تامل بخوشی منظور کر لیا"

''وقت کے دھارے نے ہمیں اس وقت ساتھ ساتھ لا کھڑا کیا جب ہم دونوں کالج کی طرف سے تیار کیے جانے والے ڈرامے میں منتخب ہو گئے۔'' ''جی ہاں اچھی طرح یاد ہے۔ یہ بھی یاد ہے کہ ڈرامے کی سکرپٹ کے مطابق تمہارے جنگ آمیز ڈائیلاگ کو مجھے برداشت کرنا تھا۔ یہی لمحات کسی اور رنگ کے ہوتے تو میں وہ تبدیلی کر دیتی جو تم یاد کرتے''۔

''بھئی خیر تو تم نے لے ہی لی۔ اسی حقارت آمیز ڈائیلاگ نے ہی تو ہم دونوں کی انا کو ایک لا کھڑا کر دیا۔ جیسے ندی کے دو پاٹ آپس میں مل گئے ہوں''۔

''لیکن مجھے اس وقت یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ندی کے دو پاٹ میلوں تک ساتھ بہتے پانی کے محافظ ہوتے ہیں لیکن کبھی مل نہیں پاتے'' ''کالج چھوڑنے کے بعد کافی دنوں تک کوئی رابطہ نہ رہا۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن اچانک مال میں ریمنڈ کے سٹال پر تمہیں دیکھا'' ''شیکھر شیکھر'' چلاتی ہوئی بھاگتی ہوئی تمہارے پاس چلی آئی اور غیر ارادتاً ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ تم نے بھی مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے تمہارے ہاتھوں کی مضبوط گرفت میں اُس کا گمان ہوا۔ ہاتھوں کے ملتے ہی کالج کے پرانے حسین دنوں کی یاد تازہ ہو گئی''۔

''آج کل کیا کر رہے ہو'' ''ایک پرائیویٹ کمپنی میں ایگزیکٹو ہوں۔'' ''شادی ہو گئی کیا''۔

''ارے مجھ جیسے ''غیر جاذب'' انسان کے ساتھ کون شادی کرے گا'' ''غیر جاذب'' کہتے کہتے تم نے چور نگاہوں سے مجھے دیکھا تمہاری آنکھیں بول رہی تھیں کہ میں اس لفظ کی تردید کروں''۔

''اور تمہاری؟'' ''ہم بھی اسی انتظار میں ہیں کہ کوئی شہزادہ آئے اور ہاتھ پکڑ کر اپنی دنیا میں لے جائے تم نے پھر میری طرف دیکھا۔ تمہارے اس دیکھنے میں دعوت محبت عیاں تھی۔'' ''ہم دونوں نے ایک دوسرے کے فون نمبر لئے اور جدا ہو گئے میں گھر پہنچا ہی تھا کہ فون کی رنگ ہوئی۔ یہ فون تمہارا تھا۔'' ''اور اس کے بعد تم نے فون کیا''۔ ''بالکل ٹھیک لیکن تم نے فون کال کرنے میں جلدی ہی دکھا دی'' ''یہ مت بھولو کہ یہ پروگرام تم نے ہی پہلے کیا تھا'' ''اور ہم کافی ہاؤس میں ملے، خوب باتیں ہوئیں، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کی گئی اور دونوں شادی کے لئے رضامند ہو گئے''۔ ''دونوں نے مندر میں سات پھیرے لئے اور جنم جنم تک ایک ساتھ رہنے کی قسمیں کھائیں''۔

''میں نے محسوس کیا کہ مجھے جنت نصیب ہو گئی ہو'' ''مجھے بھی احساس ہوا کہ ساری خوشیاں سمٹ کر میرے دامن میں آ گئی ہوں'' ''لو دست مرتروں سیر سپاٹا'' ''سردی کی ٹھنڈی راتوں میں محبت کی گرمی'' ''ان خوشیوں میں اضافہ اس وقت ہوا جب منّی نے جنم لیا'' ''سارا گھر خوشیوں میں جھوم اٹھا'' ''ایک ماہ پورا ہونے پر ہم نے ایک ہوٹل میں بڑی پارٹی دی'' ''تمہارے آفس کے بڑے بڑے ایگزیکٹو اپنی فیملیز کے ساتھ شامل ہوئے'' ''تمہاری کئی سہیلیوں نے بھی دھاوا بول دیا'' ''منّی کے تحائف سے سارا گھر بھر گیا'' ''خوشیاں ہی خوشیاں تھیں'' ''مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں تھیں'' ''قہقہے ہی قہقہے تھے''۔

''شیکھر اور کامنی کی نظریں ایک بار پھر ملیں۔ دونوں کی آنکھیں اٹھا بول اٹھیں۔'' ''پھر کیا ہوا''۔ ''پھر کیا ہوا''۔

دونوں اسی سوچ میں تھے کہ پھر کیا ہوا لیکن کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھے۔ دراصل جب جنگ اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو یہ فیصلہ کرنا ممکن ہو جاتا ہے کہ پہلا پتھر کس طرف سے مارا گیا تھا۔

لیکن اب حقیقت تو یہ تھی کہ دونوں الگ الگ راستوں کے راہی تھے۔ دونوں نے ایک بار پھر ایک دوسرے کو دیکھا اور الگ

الگ راہیں اختیار کر لیں۔ الگ الگ منزلیں۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر کھڑکی کی طرف دیکھتی اور اس کی آنکھوں کو آبدیدہ کر جاتی۔

اپنے اپنے گھر پہنچ کر دونوں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ ماضی کی ہر یاد کو اپنی محبتوں، اپنی تصویروں، کتابوں میں چھپے ہوئے گلابوں کو جو کبھی ویلنٹائن ڈے پر دیے گئے ہوں گے، خوبصورت پیڈ پر لکھے محبت بھرے خطوں کو، شادی کے البم کو اور یہاں تک منگنی کی پارٹی کے البم، سی۔ ڈی۔ غرضیکہ پرانی ہر یاد کو نذر آتش کر دیا۔

وقت نے تو گزرنا ہی تھا، گزر گیا۔ لمحے دنوں میں، دن مہینوں میں اور مہینے برسوں میں منتقل ہوتے گئے۔

ایک ضعیف العمر شخص اپنے بیٹے کے خریدے عالیشان مکان کی پہلی منزل پر اپنے کمرے سے ملحق بالکونی میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ ماہ نومبر کی شروعات تھیں۔ صبح کی ہوا میں ہلکی ہلکی خنکی نمودار ہو چکی تھی۔ درختوں میں سے چھن چھن کر آتی سورج کی کرنیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اخبار کے ایڈیٹوریل صفحہ پر کوئی من پسند تحریر کو انہماک سے پڑھ رہا تھا کہ اس کا بیٹا اور بہو پاس رکھی کرسیوں پر آ کر بیٹھ گئے۔ نوکر چائے رکھ کر چلا گیا۔ بہو نے خوبصورت کیتلی سے کپ میں چائے ڈالتے ہوئے بات چھیڑ دی" بابو جی اپنے امرت کے لئے ایک رشتہ آیا ہے۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ بنگلور سے ایم۔ بی۔ اے کرنے کے بعد اسے ایک ایم۔ این۔ سی میں اچھی پوسٹ مل گئی ہے۔ لڑکی اور امرت ایم۔ بی۔ اے میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے اور وہیں دونوں ایک دوسرے کے نزدیک آ گئے" ساتھ ساتھ پڑھتے تھے اور نزدیک آ گئے

"بابو جی سن رہے ہیں نا آپ"۔

"ہاں بھئی سن رہا ہوں" "لڑکی ہم کو پسند ہے اور۔"

"اور امرت کو؟" بابو جی نے بات کاٹتے ہوئے کہا "اور امرت کو بھی۔ لڑکی کے والد سنٹرل گورنمنٹ میں ایک اونچے عہدے پر فائز ہیں۔ لڑکی کی ماں پبلک سکول کی پرنسپل ہے" "اور خاندان" "خاندان چھوٹا سا ہی۔ لڑکی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ لڑکی کی ماں بھی اکلوتی اولاد تھی جس کے باپ (یعنی لڑکی کے نانا) کی سڑک حادثے میں موت ہو گئی۔ لڑکی کی نانی نے اپنی بچی کو اکیلے دم پر پالا پوسا، اعلےٰ تعلیم دلوائی۔" یہ دیکھئے فوٹو۔ لڑکی اپنے ماں باپ کے ساتھ کھڑی ہے" بابو جی نے فوٹو ہاتھ میں لیا۔ لڑکی کو سرسری نگاہ سے دیکھا لیکن لڑکی کی ماں پر نظریں لگی کی لگی رہ گئیں۔ اپنا چشمہ اتار کر رومال سے صاف کیا اور پھر چشمہ پہن کر نظر لڑکی کی ماں پر ٹک گئی۔ بابو جی ساکت و خاموش۔ بابو جی کو ایسا محسوس ہوا جیسے گزری ہوئی نصف صدی پارہ پارہ ہو کر لمحوں میں تبدیل ہو گئی ہو۔ اور جیسے فوٹو میں ادھیڑ عمر کی پچاس سالہ عورت نہیں بلکہ ایک حسین سی لڑکی ہو۔ بابو جی کی نظریں فوٹو پر بدستور لگی تھیں اور آنکھوں سے چھم چھم کرتے آنسو فوٹو کو بھگو رہے تھے۔" بابو جی، بابو جی" بہو نے کندھے پر ہاتھ رکھ دیئے "بابو جی" بیٹا بھی زور سے بولا۔

بابو جی نے بہتے ہوئے آنسوؤں کے ساتھ آہستہ آہستہ چہرہ اٹھایا۔ بیٹے اور بہو کو دیکھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بمشکل الفاظ نکلے۔

"لڑکی کا نانا زندہ ہے"

◆◆◆

"ڈاکٹر انور سدید کے انتقال سے ملک اردو ادب کے بڑے ادیب اور نقاد سے محروم ہو گیا۔ مرحوم کی اردو ادب کے فروغ کے لئے خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔" (نواز شریف ۔۔۔۔۔ وزیر اعظم پاکستان)

ساون کا اندھا

محمد اسلم

میری ترقی پر میرا تبادلہ ایک ایسے شہر ہوا جو میرے لئے اجنبی تھا۔ سواری سے اتر کر میں نے اپنا سامان لاک روم میں جمع کرایا اور رکشے میں سے دفتر پہنچا۔ آمدی رپورٹ (Arrival report) کے ساتھ ڈائریکٹر صاحب کے کمرے میں حاضری کے لئے پہنچا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر سر کے بالوں سے تقریباً فارغ "سوٹڈ بوٹڈ" سمارٹ افسر تھے۔ مجھے اشارے سے بیٹھنے کا کہہ کر وہ بغیر کسی رسمی تمہید کے، ایک چبھتی، نیم طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بولے

"اسلم صاحب آپ نے اپنی ٹرانسفر کروائی نہیں ۔۔۔؟"

میں اس سوال کے لئے تیار نہیں تھا۔ مجھے تذبذب میں دیکھ کر پھر گویا ہوئے "بالائی علاقوں (Upcountry) کے لوگ یہاں نہیں ٹکتے ۔۔۔ آپ وہیں کہیں پوسٹنگ کرا لیتے۔ کوئی سفارش نہیں تھی آپ کے پاس؟ ۔۔۔" ڈائریکٹر صاحب نے اب میری آمدی رپورٹ سے کھیلنا شروع کر دیا تھا وہ اسے اپنے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں سے گھمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ نئے دفتر میں اس استقبال نے مجھ سے گویائی چھین لی تھی اور میں گم سم ڈائریکٹر صاحب کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

پھر جیسے انہیں میری حالت پر ترس آ گیا اور چپراسی کو بلا کر کہا:

"اسلم صاحب کو شمسی صاحب کے کمرے میں لے جاؤ۔" اور بغیر کچھ کہے چپراسی کے ساتھ ہو لیا۔ ایک مناسب سائز کے کمرے میں میری میز لگائی گئی تھی اور یہاں میرے ساتھی پانی کی خصوصیات جانچنے کے سیکشن کے انچارج نجیب الحسن شمسی تھے۔ گندمی رنگ والے پچپن ساٹھ سالہ شمسی صاحب چھوٹا قد لئے چھریرے بدن کے مالک تھے۔ کلین شیو اور رنگے ہوئے کھچڑی بالوں نے انہیں مزید سمارٹ بنا دیا تھا۔ ان کی میز پر کوئی فائل نہیں تھی اور وہ پوسٹ کارڈ لکھنے میں مصروف تھے۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے بیٹھے بیٹھے اپنا ہاتھ مصافحے کے لئے بڑھا دیا۔ "بڑے دنوں سے آپ کا انتظار ہو رہا تھا ۔۔۔" ان کے لہجے میں ملامت تھی۔

میں نے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا اور اپنی میز پر بیٹھ گیا۔ شمسی صاحب دوبارہ کارڈ لکھنے میں مصروف ہو گئے۔ تحریر ختم ہوئی تو مجھ سے مخاطب ہوئے:

"یہ خط میں نے اپنے بیٹے کو لکھا ہے۔" "اس میں ایک لطیفہ بھی ہے۔ آپ بھی سنئے" اور انہوں نے خط کا مضمون سنانا شروع کر دیا۔ تحریر ختم ہوئی تو کارڈ کو میز کی اوپر والی دراز میں رکھا اور میز کے نچلے کشادہ دراز میں سے آدھا پون کلو کا پپیتا نکالا، چھیلا اور کاٹ کر چینی کی پلیٹ میں قاشیں سجا دیں۔ "آپ کھائیں گے؟" انہوں نے کانٹے سے قاش منہ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

میں نے معذرت کی تو بولے۔ "بالائی علاقے کے لوگوں کو پپیتے کی خوبیوں کا علم ہی نہیں۔" میں خاموش رہا۔ "بہت اچھا پھل ہے معدے کے لئے اکسیر ہے" وہ منہ چلاتے ہوئے بول رہے تھے "آپ نے میری چستی (Smartness) سے اندازہ لگا لیا ہوگا" میں بدستور خاموش رہا۔

"آپ بھی میرے ساتھ چل کر دیکھیں ــــ بہت تیز چلتا ہوں ــــ آپ کو تھکا دوں گا ــــ" مجھے ان کی باتوں میں دلچسپی ہو رہی تھی۔

"آپ بتائیں میری عمر کیا ہوگی؟" انہوں نے اچانک سوال کیا۔ اب تک میں ان کے ذہن میں جھانکنے کے قابل ہو چکا تھا۔
"یہی کوئی چالیس سال" میں نے شرارتاً جھوٹ بولا۔ "دیکھا آپ بھی دھوکہ کھا گئے" انہوں نے ایک اور قاش منہ میں ڈالتے ہوئے قدرے شرماتے ہوئے کہا "اکثر لوگ مجھے جوان سمجھتے ہیں ــــ"

"آپ کو کون کافر جوان کہتا ہے؟" میں نے مزا لینے کی غرض سے کہا۔ شمسی صاحب غیر متوقع جواب پا کر حد درجہ اچھل گئے اور بولے:

"کیوں؟ کیا ہوا؟ میں جوان نہیں لگتا؟" "نہیں ــــ شمسی صاحب آپ جوان نہیں نوجوان ہیں۔" اور شمسی صاحب اس اعزاز پر شرماتے مسکراتے پلیٹ صاف کر گئے۔

اس اثنا میں میرے جونیئر آفیسرز میرے آنے کی خبر سن کر مجھے ملنے آتے رہے اور میں جان گیا کہ شمسی صاحب دفتر کی ہر دلعزیز شخصیت تھے۔ شمسی صاحب کا معمول تھا کہ دس بجے دفتر آتے وقت (سرکاری وقت آٹھ بجے کا تھا) درمیانے سائز کا پپیتا خرید لاتے۔ علیک سلیک کے بغیر پپیتا میز پر رکھتے۔ اٹیچڈ باتھ روم میں ہاتھ منہ دھوتے اور میز پر بیٹھ کر سب سے پہلا دفتری کام پپیتا کھانے کا کرتے۔ ادھر سے فارغ ہو کر، وہ تین دنوں کے وقفے سے اپنے بیٹے کو پوسٹ کارڈ لکھتے۔ مجھے سناتے۔ اپنی مقفع و مسجع اردو کی داد لیتے اور ان کی چھٹی کا وقت ہو جاتا۔ اس دفتر میں مجھے آتے ہوئے کافی دن ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں میں نے شمسی صاحب کو کوئی سرکاری کام کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس بارے میں ان کا خیال تھا کہ چونکہ ان کے شاگرد (ان کے جونیئرز) یہ کام بہ احسن کر رہے تھے اس لئے انہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک بات جو کئی دنوں سے مجھے پریشان کر رہی تھی وہ یہ کہ بیٹے کو لکھے گئے درجنوں خطوط میں ان کی بیوی کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ ایک دن جب وہ اپنا تازہ خط مجھے سنا چکے تو میں نے ہمت کر کے ان سے پوچھ لیا۔ "شمسی صاحب بیگم کو کیا علیحدہ خط لکھتے ہیں؟"

"نہیں ــــ وہ بے وقوف عورت ہے" انہوں نے جواب دیا۔ ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد بولے "وہ جھوٹی ہے ــــ" میں خاموشی سے ان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"شادی کے وقت اس کے ماں باپ نے عمر کم بتائی تھی ــــ" وہ بولے

"کتنی کم؟" میں نے سوال کیا۔ "مجھے نہیں معلوم لیکن وہ مجھ سے کافی بڑی ہے"۔ "آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟" میں نے ہمت کر کے اور سوال داغ دیا۔ "ایک دفعہ کھانا کھاتے ہوئے اس کے مصنوعی دانت گر پڑے تھے ــــ" "پھر؟"

"پھر اس نے وہ دانت کوڑے کی ٹوکری میں چھپا دیئے ــــ"

"آپ نے ڈھونڈے؟" "مجھے نہیں ملے ــــ میرا تعلق صرف بیٹے سے ہے ــــ" ان کے لہجے میں تلخی آ رہی تھی۔ میں شمسی صاحب کی ذہنی کیفیت کو بھانپ چکا تھا۔ سو بات یہیں ختم ہو گئی۔ ایک دن دفتر آئے تو شمسی صاحب غیر معمولی خوش دکھائی دے رہے تھے۔ گنگنا رہے تھے۔ بار بار واش روم میں جا کر بالوں اور مونچھوں میں کنگھا کر رہے تھے اور آئینے کے سامنے پہلو بدل بدل کر اپنا سراپا دیکھ رہے تھے۔ میں اس خوشی کا سبب پوچھنے ہی والا تھا کہ خود گویا ہوئے۔

"آج ہمیں ایک دور کے رشتے دار ملنے آرہے ہیں۔" "کہاں سے؟" میں نے پوچھا۔ "مدین سے" "خیریت سے؟" "ہاں — خیریت سے ہی آرہے ہیں" انہوں نے کچھ زور دے کر کہا۔ تھوڑی دیر بعد ان کے مہمان تشریف لے آئے۔ سفید شلوار قمیض میں ملبوس دبلے پتلے، سانولے رنگ کے یہ شمسی صاحب کے ہم عمر شخص تھے اور ان کا نام علی بخش تھا۔ ان کے آتے ہی شمسی صاحب کچھ شرمائے شرمائے سے لگے۔ مہمان کی تواضع ٹھنڈے کوک سے کی اور تھوڑی دیر کے بعد ان کے ساتھ دفتر سے چلے گئے۔

اگلے دن آئے تو مجھے بتانے لگے۔

"یہ جو صاحب کل آئے تھے وہ ہمارے دور کے رشتہ دار ہیں۔"

"آپ نے بتایا تھا" میں نے جواباً کہا۔ میرا جواب سن کر قدرے شرمائے اور کہا "شاید — میرا سٹیٹس (Status) دیکھنے آئے ہیں" میں خاموش رہا۔ پھر خود ہی بولے۔ "ان کی ایک جوان بیٹی ہے!" — ان کے کان سرخ ہو رہے تھے۔

علی بخش جتنے دن مہمان رہے شمسی صاحب روزانہ کی بنیاد پر ان کی خاطر مدارت کی ڈیوٹی دیتے رہے۔ مہمان کے لئے ناشتے میں حلوہ پوری دوپہر میں بریانی اور قورمہ اور رات کے کھانے میں بندو کے کباب، رس ملائی آئس کریم وغیرہ کا اہتمام ہوتا رہا۔ پھل جوس اور مشروبات اس کے علاوہ تھے۔ تقریباً ایک ہفتہ قیام کے بعد علی بخش واپس مدین چلے گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ زمین کے مقدمے کے سلسلے میں ادھر آئے تھے۔ اور پھر ہیڈ آفس سے چٹھی آگئی۔ ڈائریکٹر کی سفارش پر شمسی صاحب کو "فی الفور" اور "قبل از وقت" ریٹائر کر دیا گیا تھا۔ انہیں "وافر" قرار دے دیا گیا تھا۔

اب تک میرے علم میں یہ بات بھی آچکی تھی کہ شمسی صاحب میرے "گرائیں" تھے۔ اور میرے آبائی شہر کے محلے "کوکھڑا" کے رہائشی۔ لیکن میں جب بھی ان سے اپنے گرائیں ہونے کا ذکر کرتا وہ میرے شہر کی مٹی دھول اور غلاظت کی نشاندہی کر کے میری بات ہوا میں اڑا دیتے۔ دوسرے دن شمسی صاحب چارج چھوڑنے کے لئے دفتر آئے تو میں نے پوچھا "ریٹائرمنٹ کے بعد کہاں جائیں گے؟"

"کراچی جاؤں گا — وہاں میرے بہت دوست ہیں —" "اور ملتان؟" "ادھر جاؤں گا بعد میں چلا جاؤں گا وہاں" "اپنے گھر کا ایڈریس دے جائیں — کبھی آپ سے ملنے آؤں گا"۔

"آپ کہاں آئیں گے — میرا گھر ڈھونڈنا مشکل ہے —" انہوں نے پلکیں جھکاتے چارج رپورٹ پر خانہ پری کرتے ہوئے کہا۔ اور میں خاموش ہو گیا۔ دوسرے دن دفتر نے ان کے لئے الوداعی پارٹی کا اہتمام کیا۔ انہیں پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ ان کی محبت اور کارکردگی کے قصیدے پڑھے گئے اور ان کے ساتھ گروپ فوٹو بنوایا گیا۔ میں شمسی صاحب کی اچانک ریٹائرمنٹ پر دکھی ہو رہا تھا۔ نہ جانے پھر ان سے کب ملاقات ہو! ملتان گیا تو ان کا گھر ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا میں نے سوچا۔

پارٹی ختم ہوئی تو ندیم نے مجھے گھر چھوڑنے کی آفر کی۔ رات کافی بیت چکی تھی سو میں نے اس کی آفر قبول کرنے میں عافیت سمجھی۔ گاڑی روانہ ہوئی تو میں نے ایک بار پھر شمسی صاحب کی جدائی پر دکھ کا اظہار کیا۔ "سر آپ بہت سادہ ہیں —" ندیم نے گاڑی چلاتے ہوئے کہا۔ میں خاموش رہا۔ ندیم نے بات جاری رکھی۔ "آپ نے شمسی صاحب سے ان کے گھر کا ایڈریس پوچھا تھا؟" ندیم نے سوال کیا۔ "ہاں — پھر؟" "سر وہ ساون کے اندھے ہیں —" میں ندیم کی اطلاع پر مسکرا دیا۔ یہ کوئی اطلاع نہ تھی!

◆◆◆

بڑی دیر ہو گئی

اظہر جاوید
ترجمہ: حنیف باوا

میں پیچھے مڑتے وقت عقب سے ایک زنانہ آواز آئی۔ میں نے حیران ہوتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہاں بھی کوئی میرا شناسا ہو سکتا ہے۔۔۔؟

میں برسوں بعد ٹیلی ویژن آیا تھا۔ یا نہیں، آج سے پیشتر میں یہاں کیسے آتا، کس نے بلا بھیجا تھا۔ یہ دنیا تو ایکسرا ایسی ہے۔ یہاں آ کر تو بار بار بتانا پڑتا ہے۔ میں بھی ایک شاعر، ادیب اور دانشور ہوں۔ پھر بھی وہ مجھے تسلیم کریں یا نہ کریں۔ اس دنیا کے دانشور جب یہاں کی سرکار کے پروانی نوکری پر تعینات نہیں ہوتے اس وقت وہ ہم جیسے لوگوں کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں کہ ان کی کوئی نظم یا غزل اپنے کسی اخبار یا رسالے میں چھاپ دیں۔

نہ جانے کون سی ہوا چلی تھی کہ ٹیلی ویژن والوں نے مجھے بھی بلا بھیجا۔ پہلے ٹیلی فون کی ایک کال پھر دوسری۔ میں برسوں کی مسافت کو ضائع کر کے ٹیلی ویژن سٹیشن جا پہنچا۔ پتا چلا کہ پروڈیوسر صاحب اندر سیٹ پر میرا انتظار کر رہے ہیں۔

میں راہداری میں سے گزر کر اسٹوڈیو کی طرف جا رہا تھا۔ کہ پیچھے سے "السلام علیکم" کی آواز آئی۔ میں نے انھیں قدموں پر رک کر پیچھے کی طرف مڑتے ہوئے گردن کو گھما کر عقب میں دیکھا۔ "مجھے بھلا کس نے سلام کرنا ہے؟" ۔۔۔ آنکھوں اور دل میں بے چینی کی ایک عجیب صورت تھی ۔۔۔ سامنے فربہ جسم والی ایک عورت کھڑی تھی جس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اور سامنے کی اور سنواری ہوئی مانگ کے دونوں جانب سے سفید بال جھانک رہے تھے۔ اور میں اس کے فربہ جسم کی طرف دیکھتا رہا۔ جسم ۔۔۔ تسبیح ۔۔۔ سفید بال ۔۔۔ یہ تمام ایک دوسرے میں ایسے گڈمڈ ہو گئے ہوئے تھے کہ میرے لئے انھیں الگ الگ پہچاننا مشکل ہو گیا تھا میں نے جلدی سے جواب میں وعلیکم السلام کہا اور اس کا حال پوچھا۔ لیکن ان دونوں جملوں کے درمیانی فاصلے طے کرتے ہوئے مجھے پہچان کے لئے کوسوں دور جانا پڑا ۔۔۔ اب میں نے اپنا پن ظاہر کرنے کے لئے کہا۔

کہاں ہوتی ہیں آپ۔۔۔؟

ہم تو یہیں ہوتے ہیں۔ لیکن آپ کہیں بھی نہیں پائے جاتے ۔۔۔ اس کی آواز میں اب بھی کھنک تھی۔ میری نظریں بار بار اس کی تسبیح اور سفید بالوں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں۔۔۔" میں نے بات کو آگے بڑھایا۔ میں نے ہی کبھی یہاں کا چکر نہیں لگایا۔ آج نہ جانے کتنے عرصے کے بعد آیا ہوں۔ ٹھیک ہے ۔۔۔ میں ذرا ریکارڈنگ سے فارغ ہو لوں۔ پھر ملاقات چلے گی۔"

میں تو چلی جاؤں گی۔۔۔ آپ کسی روز میرے گھر تشریف لائیں نا۔۔۔" اس نے مزید گمبھیر انداز سے کہا۔

"گھر کہاں ہے آپ کا؟" میں نے پوچھا

"بھول گئے ہو۔۔۔ وہی، پرانا گھر ہے۔ گڑھی شاہو تھانے کے نزدیک"

میں ہنس پڑا۔۔۔ "اس بڑھاپے میں تھانے کے چکروں میں کیوں ڈال رہی ہو۔۔۔"

"اللہ معاف۔۔۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔۔۔" اس کے لہجے میں شکایت تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور اداکارہ بھی کھڑی تھی، اسی لئے شاید اسے میری بات اچھی نہیں لگی تھی۔۔۔ میں نے بھی بات کو سمیٹا اور اسے سلام کر کے سٹوڈیو کی طرف چل پڑا۔

کبھی کبھار ہمارا ذہن یا تو کسی بھنور میں پھنسا ہوتا ہے یا پھر دل کسی اور طرف اٹکا ہوا ہوتا ہے اسی لئے تو کوئی اور بھی بات زیادہ دیر تک یادوں میں اٹکی نہیں رہتی۔ بندہ اور کہیں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔

ہفتہ دو ہفتے اسی طرح گزر گئے۔ مجھے اس کی یاد نہ آئی۔ وقت نے ایک اور کروٹ لی۔۔۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرے ستارے عروج پر ہیں۔ ایک اور پروڈیوسر کا فون آیا کہ فلاں پروگرام کی ریکارڈنگ کے لئے پرسوں آسکو گے؟ میں نے بھی زیادہ نخرہ نہ دکھایا جھٹ وعدہ کر لیا۔

اس پروگرام میں چار پانچ لکھنے والوں نے شرکت کرنا تھی۔

ایک دو بیبیاں، دو تین مرد۔۔۔ ریکارڈنگ سے پہلے تمام کو میک اپ کے کمرہ میں جانا پڑا۔ پہلے کمرے سے گزر کر ہم دوسرے کمرے کی طرف بڑھے تو سامنے ایک بڑے شیشے میں اس کا عکس نظر آیا۔۔۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا۔ میں پھر پہچانتے اور نہ پہچانتے کی حالت میں تھا۔ آج نہ تو اس کے سفید بال تھے نہ ہی اس کے ہاتھ میں تسبیح نظر آئی۔ اس روز شاید اس نے کسی ڈرامے کے لئے یہ روپ دھار رکھا تھا۔۔۔

میں پہلے میک اپ روم کے وسط میں تھا۔ میرے ساتھی دوسرے کمرے کی طرف چلے گئے اس نے اسی شگفتگی اور چہکتی آواز میں کہا۔

"سلام علیکم"

"پھر۔۔۔ سلام علیکم" میں نے ایسے ہی پھیکا سا جملہ کہا۔

پھر کیا۔۔۔؟ ایک تو آپ کو سلام دعا کہیں لیکن دیر سے آپ کہتے ہیں۔ پھر سلام علیکم اس نے فنکاروں والے تیکھے اور تھکویں انداز میں کہا۔ میں ویسی ہی ہنسی ہنستا ہوا دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ ایک شیشے کے آگے لکھنے والی سلمیٰ بیٹھی تھی اور میک اپ کرنے والی ایک خوبصورت سی آرٹسٹ اس کا بناؤ سنگھار کر رہی تھی۔۔۔ میرے منہ پر سرخی پاؤڈر تھوپنے والا مجھ جیسا ہی کوئی شخص تھا۔۔۔ میں شاید پچھلے کمرے سے ہی شوخی لے کر آیا تھا۔۔۔ میں نے میک اپ کرنے والے سے کہا۔ "یار جی۔۔۔ میں آپ کو تب تسلیم کروں گا، اگر آپ مجھے اس بی بی سے زیادہ خوبصورت بنا دیں گے۔۔۔" میں نے سلمیٰ کی طرف اشارہ کیا۔

اس سے پہلے کہ میک اپ والا بولتا، سلمیٰ کا میک اپ کرنے والی خوبصورت عورت نے کہا "سر جی۔۔۔ مرد ہمیشہ عورت سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ عورت کا کیا مقابلہ مرد کے ساتھ۔۔۔" اتنی عجیب اور سچی بات سن کر میں ایسے چونکا جیسے میں نے کوئی اچھا سا شعر سن لیا

ہو۔ میں نے بے اختیار ہو کر اس میک اپ کرنے والی سے کہا "زندگی میں میں نے وہ پہلی عورت دیکھی ہے جو ذہین بھی ہے اور جس نے ایسی کمال کی بات کی ہے کہ جس کا کوئی جواب نہیں"۔

میک اپ کرنے والی سلمیٰ سے فارغ ہو کر ہنستی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی اور شاید اس نے وہاں جا کر تمام بات فنکاروں کے گوش گزار کی ہو۔ میں ملحقہ کمرے سے باہر آیا اور جانے لگا تو تمام کو ہنستے ہوئے دیکھ کر وہیں رک گیا۔ میک اپ والی نے کہا "میں کمرے کے اندر والی بات سنا رہی تھی"

میں نے اپنی واقف کار فنکارہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تو اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ نرم و نازک سی تھی"

"اور آپ بھی تو نرم نازک بادام کی گری جیسے خوبصورت ہوتے تھے۔" اس نے فوراً جواب دیا اور پھر میک اپ والی کی جانب دیکھ کر کہنے لگی۔

تم نے سچ کہا ہے۔ آج بھی یہ انتہائی خوبصورت ہے۔ لیکن میری ڈھیر ساری خوبصورت سوکنوں میں ایسے پھنسا ہوا ہے پیچھے مڑ کر دیکھنا تک گوارا نہیں کرتا۔

مجھے جیسے کرنٹ سا لگ گیا۔ میں نے آئینہ نہیں دیکھا۔ لیکن لگتا تھا کہ اس بڑھاپے میں بھی گال سرخ ہو گئے ہوں گے۔ میں نے گھبرا کر سلمیٰ کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ برا نہ مان گئی ہو۔ لیکن فنکار فراخ دل ہوتے ہیں۔ لکھنے والوں نے تو خواہ مخواہ کے خول اپنے اوپر چڑھا رکھے ہیں۔ دوسری ملاقات اور اس کے بے باک اظہار نے مجھے کوئی چالیس سال پہلے کے عرصے میں دھکیل دیا۔ جوانی کی بھی پہلی یا دوسری سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ شعر و شاعری کے چسکے نے آ لیا اور پرچے ایک ہفت روزہ کی ایڈیٹری مل گئی۔ ایڈیٹری کیا مالک نے اخبار ہی میرے حوالے کر دیا کہ جیسے چاہوں اسے شائع کروں۔

نوجوانی، شاعری اور ایڈیٹری ۔۔۔ تینے ڈھیر سارے سرور ملے تو سرگودھا اب بہت چھوٹا لگنے لگا تھا۔ لاہور آنا اور قلم والوں کے ساتھ اشتراک پیدا کرنا اس وقت کے شاید تمام نوجوانوں کا یہ شوق ہوتا تھا۔ سرگودھے کے ساتھیوں میں پرویز اور کنول نے لاہور کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنا لیا تھا۔ میں بھی پرچہ چھاپنے کے لیے ہر ہفتے لاہور پہنچتا تھا۔ اب سوچتا ہوں تو ہنسی آ جاتی ہے۔ یہ پرچے کا نام ضرب مجاہد تھا جس میں اب فلمی خبروں اور کالموں کا تڑکا لگانا بھی شروع کر دیا گیا تھا۔ لاہور کے آنے جانے اور فلمی دفتروں کا چکر لگانے پر ایک ہدایت کار سے دوستی ہو گئی۔ وہ جو نئی فلم بنا رہا تھا اس میں ٹیلی ویژن سے منتخب ہونے والی ہیروئن تھی۔ اس کا فلمی نام راج رانی تھا۔

گزرے سالوں پر جب میں نظر ڈالتا ہوں تو کرنٹ سا لگتا ہے۔ چاہے میں عمر کے اس حصے میں تھا جس میں دیوار پر ہاتھ رکھ دیا جائے تو وہ بھی باتیں کرنا شروع ہو جاتی ہے۔ راج رانی تیر کی طرح دل میں اتر جاتی تھی۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی۔ آج میں بھی سوچتا ہوں لیکن کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ پاتا۔ نہ جانے اس وقت میں نے آگے قدم کیوں نہیں بڑھایا۔ شاید چھوٹے شہر سے آنے کا کمپلیکس تھا۔ اس کے ایکٹرس اور ہیروئن ہونے کا دبدبہ تھا یا پھر مجھے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ زندگی کا پہلا عشق ان دنوں میں نے سرگودھے میں کیا تھا۔ جب بھی میرا لاہور آنا ہوتا تو کبھی پرویز اور کبھی کنول میرے ہمراہ ہوتے۔ فلم کے دفتر گیا تو کنول بھی کسی کو دل دے بیٹھا۔ اس

نے اردو میں ایک قطعہ تحریر کیا تھی جس کا مطلب کچھ یوں تھا کہ میرے دل کے محل میں میری سوچوں کی راج رانی آئے گی۔

وہ قلم پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ پائی۔ دفتر بھی اجڑ گیا۔ لیکن راج رانی کی یاد اسی طرح تر و تازہ تھی۔ میں لاہور آیا پرویز کو ساتھ لیا اور راج رانی کے گھر پہنچ گئے۔ اسے آواز دی اور اس نے ہمیں اندر بلا لیا ۔۔۔ وہ صحن میں تخت پوش پر لیٹی ہوئی تھی۔ نہ جانے اس کے جسم میں تناؤ تھا یا اس کا لباس ہی اتنا تنگ تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ابھی اس کے بخیوں کی تڑ تڑ ۔۔۔ تڑوچ کر کے ٹوٹنے کی آواز آئے گی۔ اس نے پرویز کو تخت پوش کے قریب پڑی ہوئی کرسی پر بٹھایا اور مجھے اپنے بالکل نزدیک جگہ دی۔

ہم کیا باتیں کر رہے تھے یاد نہیں۔ فلم کے ایک منظر کی طرح یہ یاد آ رہا ہے کہ وہ کبھی نیند سے بیدار ہونے کی وجہ سے کبھی کبھی انگڑائی لیتی تو تخت پوش چر چر کرنے لگتا۔ پھر پرویز فوراً اٹھا اور بیرونی دروازے سے باہر نکل گیا ۔۔۔ چند لمحوں بعد جب ہم راج رانی سے اجازت لے کر چلنے لگے تو پرویز کہنے لگا۔۔۔ میں تو وہاں سے بھاگ آیا تھا۔ سچ بتاؤں ۔۔۔ میرا تو کام ہو گیا تھا راج رانی جس کا حقیقی نام جمیلہ ہے، نے جب بیتے دنوں کا ذکر کیا تو میں چالیس سال پیچھے لوٹ گیا تھا۔ اس کے ساتھ تعلق کبھی منقطع نہیں ہوا تھا۔ کہیں نہ کہیں آمنا سامنا ہوتی جاتا تھا۔ دو چار دس برس کے بعد ہی سہی ۔۔۔ وہ جب بھی ملتی بڑی بے تکلف ہو کر بات کرتی ۔۔۔ ایک روز اس کا وہ حکیم ناصر کے دواخانے میں ٹکراؤ ہوا میرے چلے جانے کے بعد وہ میری تعریفیں کرتی رہی۔ حکیم سے کہنے لگی۔

''حکیم جی ۔۔۔ آج کل تو وہ باتیں ہی نہیں ہیں۔ نہ تو اخبار کسی کام کے رہے اور نہ ہی اخبار والے میں آپ کو کیا بتاؤں حکیم صاحب کہ وہ کتنا سندر ہوتا تھا''۔

حکیم کے بتانے پر بھی میں نے کوئی دھیان نہ دیا۔ سوچا وہ اگلی عورت ہے پرانے لوگوں میں کچھ دیر لگا تار ہوتا تھا۔ میری ویسے ہی تعریف کر دی۔ پھر کئی برس گزر گئے۔ وہ کبھی بھول کر بھی یاد نہیں آئی۔ پر اب جب مسلسل دو ہفتوں میں ٹیلی ویژن پر اس کے ساتھ دو بار ملاقات ہوئی۔ اس نے بے شک مذاق میں ہی سوتنوں کا ذکر کیا تھا ۔۔۔ گھر آنے کی دعوت دی تو جیسے میرے دل میں کھد بد ہونے لگی۔ فریب کھاتے ہوئے دیر نہیں لگی ۔۔۔ میں نے دل سے مشورہ کیا اور ذہن کو کو دلایا۔ کیا پتا کہ کب کسی پر کوئی کمزور پل آ جائے۔

شاید وہ حقیقتاً مجھے چاہتی ہو ۔۔۔ ملاقات کرنے میں حرج ہی کیا ہے۔

میں کوئی پندرہ سولہ برس بعد آخری بار اس کے گھر گیا تھا۔ اتنے عرصے میں تو شہری گلیوں اور محلوں کے نقشے ہی بدل جاتے ہیں۔ تھانے کے نزدیک جا کر میں نے اس کے بارے میں پوچھا۔ مجھے فوراً اس کا گھر مل گیا۔

''بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ شکر ہے کہ آپ آ ہی گئے ۔۔۔'' جمیلہ نے دروازہ کھولتے ہوئے بڑے پیار اور محبت سے میرا استقبال کیا۔ وہ مجھے لے کر اپنے بیڈ روم تک لے گئی۔ چھوٹا سا گھر تھا۔ لیکن تھا صاف ستھرا۔ صحن سے گزرنے کے بعد بیڈ روم آ گیا۔ ڈبل بیڈ، سنگھار میز۔ سامنے رنگین والے صوفے کی ایک کرسی۔ ایک طرف پیڈسٹل فین ۔۔۔ وہ ساتھ ساتھ خوشگوار باتیں کرتی جا رہی تھی اور ساتھ کہہ رہی تھی۔ یہ ایک غریب سے فنکار کا گھر ہے۔ شاید آپ کو پسند بھی آئے گا یا نہیں۔ میں نے بھی رسمی باتوں پر تعریف کی۔ وہی پرانی بات ۔۔۔ دل بڑا اور اچھا ہونا چاہیے۔ جمیلہ نے پوچھا ۔۔۔ کیا لیں گے؟ چائے، بوتل یا کھانا کھائیں گے ۔۔۔ میرے جواب سے پہلے ہی کہنے لگی۔ پہلے بوتل پی لیں۔ کھانا ابھی تیار ہو جاتا ہے۔ باقی پھر دیکھیں گے۔ شکر ہے آج چوہدری کے گھر والوں تو آئے۔ وہ بولے جا رہی تھی اور فٹ

جا رہی تھی۔ پھر کسی کو آواز دیتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔

جب وہ واپس آئی تو میں نے اس کے جسم میں گم ہوئے چالیس سالوں کو ڈھونڈنے کے لئے نظر دوڑائی۔ کچھ لمحوں کے لئے مجھے پوری دنیا اور اس کی بے قراری بھی ۔۔۔ کنول کا قصہ ذہن میں آیا ۔۔۔ جمیلہ کی میرے متعلق کی ہوئی تعریفیں بھی ذہن میں ابھریں تو میں چپکے چپکے تک بات کو آگے بڑھانے کے لئے کچھ سوچ رہا تھا کہ اچانک باہر صحن میں سے کسی بچے کی آواز آئی۔

"نانی جی ۔۔۔ بڑی دیر ہوگئی ہے ۔۔۔"

مجھے جیسے پھر کرنٹ سا لگا ۔۔۔ نانی جی ۔۔۔ اس فقرے نے مجھے کھینچ کر پھر آج کے زمانے میں لا کھڑا کیا ۔۔۔ سامنے شگفتہ بیٹھی نظر پڑی تو مجھے اپنے سفید بال اور چہرے پر وقت کی ڈالی ہوئی گہری لکیریں بہت واضح ہو کر دکھائی دیں۔ میں فوراً اٹھا تو جمیلہ نے پوچھا کیا ہوا۔

میں نے کہا ۔۔۔ بہت دیر ہوگئی ہے۔ جمیلہ حیران و پریشان ہو کر کہنے لگی ۔۔۔ ابھی تو آپ آئے ہیں۔ دیر کہاں ہوئی ہے۔ بات سمجھ میں نہیں آئی" "سمجھ تو مجھے بھی نہیں آتی" میں نے کمرے سے باہر نکلتے ہوئے کہا ۔۔۔ لیکن یہ تو واضح ہو گیا ہے، کہ بڑی دیر ہوگئی ہے۔

◆◆◆

"تخلیق" مندرجہ ذیل لائبریریوں میں بھی دستیاب ہے

لاہور	قائداعظم لائبریری	چیف لائبریرین: راجہ اختر علی (042-99203371) باغ جناح شاہراہ قائداعظم، لاہور
لاہور	پنجاب یونیورسٹی لائبریری	چیف لائبریرین: حبیب پراچہ (042-99231126) پنجاب یونیورسٹی، قائداعظم کیمپس، لاہور
لاہور	پنجاب پبلک لائبریری	چیف لائبریرین (042-9921649) متصل لاہور میوزیم، شاہراہ قائداعظم، لاہور
لاہور	پریس کلب لائبریری	چیف لائبریرین: محمد اویس (042-36363316) پریس کلب، شملہ پہاڑی، لاہور
لاہور	کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی لائبریری	چیف لائبریرین: اظہر اقبال (042-99211145) کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی، میو ہسپتال روڈ، نیلا گنبد، لاہور

غزلیں

آصف ثاقب

O

میرا ہر زخم ہے گلاب سا
تیرے ایوان میں دریچے سا

آخری عمر کا یہ تحفہ ہے
میرا جی بارہ ہے بچے سا

پھول مجھ کو بھی گئے ہوں گے
میرا چہرا یہاں ہے بجھے سا

یہ میرا کیا تھا بہت ہجر میں
میں شجر پہ رہا ہوں پتے سا

ایک لرزہ ہے شاخساروں میں
اڑتا جاتا ہوا ہے جھونکے سا

اس کے لبوں میں غم چھلکتا ہے
کوئی آنسو رکا ہے تارے سا

عشق میں فرق یہ آیا ثاقب
ماجرا اب نہیں ہے پہلے سا

OOO

سید مشکور حسین یاد

O

ایسی بات میں وزن نہیں ہے
یہ حالات میں وزن نہیں ہے

جتنی ذات ہے بھاری بھرکم
اتنا صفات میں وزن نہیں ہے

کیوں ہم سوتے جاگتے کم ہیں
کیا ان رات میں وزن نہیں ہے!!

کیوں نہ ہو بیت ہوا کا جھونکا
ایسی بات میں وزن نہیں ہے

وہ کندن سا شعر ہے لیکن
اس کے گات میں وزن نہیں ہے

کیوں ہم رہ گئے عقل کے پیچھے
کیا جذبات میں وزن نہیں ہے

OOO

مسعود عثمانی

O

جب بھی اس کی یاد سے پوچھوں کب جدائی ہو
تم بھی اک دن مر جاؤ گی؟ تم بھی فانی ہو

اک دوسرے کے پاس کھڑے ہم اب یہ سوچتے ہیں
آنکھیں کس دن سے اب کھلی جاتی ہو

ایسے تو میں خاموشی بھی سنتا رہتا ہوں
لیکن مجھ سے باتیں کر جب آسانی ہو

دیکھو اس جنگل میں مجھ کو زندہ رہنا ہے
بے شک آگ لگی ہو لیکن راکھ پرانی ہو

بات کئے جب جانے میں وہ الاپ کرے
لفظوں نرم سا ہو اور لہجہ قبولی ہو

یہ دنیا تم سے زندہ اور تابندہ ہے
تم تو جیسی ملی ہو ویسے پانی ہو

OOO

حسن عباسی

O

قدیم آگ سے رشتہ بنا لیتے ہیں
ہم اپنی آنکھ سے شعلہ بنا لیتے ہیں

فسردہ ہونے نہیں دیتے ہم محبت کو
ذرا سی بات سے جھگڑا بنا لیتے ہیں

خوشی آنکھوں سے ملتی ہے تھوڑا سا جہیں
ہم اس خوشی سے قصہ بنا لیتے ہیں

تمام رات عجب دور چلتا رہتا ہے
کسی کتاب سے نقشہ بنا لیتے ہیں

ہم اپنی جان کے دشمن کو قتل کرتے نہیں
جہاں بھی جاتا ہے خطرہ بنا لیتے ہیں

تمہارے لب کی طرح ایک بھی نہیں بنتا
ہزار طرح سے مصرعہ بنا لیتے ہیں

پرانے دوست سے چلتا ہے اور حساب کتاب
نئے کے ساتھ تو کھاتہ بنا لیتے ہیں

خود اپنے آپ پہ کرتے ہیں اس قدر تنقید حسن
جو ٹوٹتے رہنے سے شیشہ بنا لیتے ہیں

OOO

خالد اقبال یاسر

O

داستاں کے رنگ کا اسباب چوری ہو گئے
لب کے موقوف سب، اعراب چوری ہو گئے

جانے کیا کر آئے تھے یا ہو گئے گم راستے میں
ہم بتا دے رو کے اسباب چوری ہو گئے

گرد میں تھے بکھرے تیرے، کچھ ادھورے تجربے
جیسے غارت ہو گئی، اسباب چوری ہو گئے

بے غرض جاں نذر کرنے کی روایت بھی تھی
عشق کے دربار کے آداب چوری ہو گئے

آسرا ہر کوئی تھا جھوٹی تسلی کے لیے
سب کی قائل ہوئے، احباب چوری ہو گئے

کوئی بھرتی اک طرف کیا حسب و انتساب
سارے انکار از سب ایجاب چوری ہو گئے

ہم جنوں کے دن کے استعمال کا کیا پوچھتا
میرے اپنے آسی اصحاب چوری ہو گئے

مرحلہ تو آشنائی کا ابھی آیا نہ تھا
ہم یاترمت گئے القاب چوری ہو گئے

OOO

گستاخ بخاری

O

رنگ اتنے کہ رگِ جاں میں آتے ہی نہیں
ایسے جس طرح بیاباں میں آتے ہی نہیں

حمد کی منزل حمد پہ ہو جلوہ افروز
وصف کم یاب ہیں امکاں میں آتے ہی نہیں

میں نہیں بات کا افسانہ بنانے والا
وہ اشارے ہیں کہ عنوان میں آتے ہی نہیں

شہرۂ عشق ہو، رسوائی ہو، جدائی ہو
اب جواں مرد تو میدان میں آتے ہی نہیں

ہم نہ ہو جائیں کہیں ترکِ تعلق پہ اداس
وسوسے کیوں ترے امکان میں آتے ہی نہیں

لوگ ڈرتے ہیں کہ آسیب نہ ہوں خالی جگہ
اس لیے خانۂ ویراں میں آتے ہی نہیں

کمپیوٹر نے بہت کر دیا مصروف انہیں
اب تو بچے بھی دالان میں آتے ہی نہیں

اس کو کس بات پہ اصرار رسوائی ہے
نام اس کے مرے گردان میں آتے ہی نہیں

کیسے "گستاخ" تمنا کا تعاقب چھوڑوں
لفظ تشکیل کے زنداں میں آتے ہی نہیں

OOO

مرزا احمد نور طائر

O

تری چاہت میں جھگڑا کر لیا ہے
زمانے بھر کو دشمن کر لیا ہے

رہو گے میری نظروں میں مسلسل
تمہاری ہی گلی میں گھر لیا ہے

ہوا اٹکھیلیاں کرنے لگی ہے
دیا دیوار پر جو دھر لیا ہے

تمہارا وہم گزرا وفا میں
نہ جانے چاہتا تھا پر لیا ہے

ہمارا دم ادب سے وفا نے
تری محفل میں بھی اکثر لیا ہے

جبیں شوق نے سجدے کی خاطر
فقط تیرا ہی سنگِ در لیا ہے

کسی کے ہجر میں رو رو کے آخر
ہوا بارش کا موسم تر لیا ہے

سنبھل کر راہِ الفت میں اے طائر
پر اغیار نے اکثر لیا ہے

OOO

اعتبار ساجد

O

مجھے دن رات کے چکر سے فرصت ہی نہیں ملتی
اب اپنے آپ سے ملنے کی مہلت ہی نہیں ملتی

اگرچہ اس دل نے بھی دل کے تعلق کے حوالے سے
کریں کیا اب یہ آپس میں طبیعت ہی نہیں ملتی

مہکتا ہے اگرچہ روشنی خوش سے یہ چراغِ دل
مگر یہ لکھتی اس کی مدت ہی نہیں ملتی

بدن دیوار پہ اترا ہے مرے عزائم پر
مجھے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہیں ملتی

قریب آ کر تری پہچان مشکل ہو گئی مجھ کو
جو نقشِ دل پہ ہے اس سے تری صورت ہی نہیں ملتی

غزل جیسے لیے کچھ کی حسرت دل میں ہے لیکن
زمیں کوئی ہمیں حسبِ ضرورت ہی نہیں ملتی

جو کرنا ہے ابھی اک لمحۂ موجود میں کر لیں
کہ اگلا سانس لینے کی رعایت ہی نہیں ملتی

OOO

قیصر نجفی

O

بے وجہ غمِ جاناں بے وجہ سفر کرنا
جو کام نہ کرنا ہو وہ کام مگر کرنا

بچھڑ کے ہوتے ہوئے دل نے آس اس سے لگائی ہے
سیکھا نہیں کچھ جس نے بجز زیر و زبر کرنا

اپنے لئے جینا تو شاید ہے بہت آساں
ہے مگر بہت مشکل اوروں کی بسر کرنا

اس شہر میں دیکھا ہے ہم نے تو اسے بے گھر
آتا ہو ہر اک دل میں جس شخص کو گھر کرنا

دیکھے تو کوئی ان کی اس دیدہ دلیری کو
خود لوٹنا پھر خود ہی دنیا کو خبر کرنا

ہم کارِ محبت میں مصروف رہے اتنے
قیصر کہاں یاد آیا کوئی کارِ ہنر کرنا

OOO

نذیر فتح پوری (انڈیا)

O

دور سے آ رہا ہے سنی آواز
درد کا قافلہ ہے سنی آواز

یہ پرندے جو چہچہاتے ہیں
لب پہ ذکرِ خدا ہے سنی آواز

ہے سماعت اگر تری اپنی
وقت کیا کہہ رہا ہے سنی آواز

عکس کیا دیکھتا ہے چہرے کے
آئینہ بولتا ہے سنی آواز

دھیرے قدم نہ رکھو اس پہ
راستہ چیختا ہے سنی آواز

OOO

مراق مرزا (انڈیا)

O

وہ ایک زمیں جسے چھوڑ کر گزر گیا سورج
فلک کو اس کے ستاروں سے بھر گیا سورج

حیات کے کئی منظر عیاں ہیں لمحوں میں
ازل سے وقت کو آئینہ کر گیا سورج

اک آسمان مری فکر میں ہوا روشن
مرے وجود میں شاید اتر گیا سورج

بناؤ خاک کی تصویر جانے کیا ہو گی
کبھی یہ تھک کے اچانک ٹھہر گیا سورج

یہ کیسا دور ہے ہر سمت تیرگی کیوں ہے
ہے بے ضمانت ہر شے کدھر گیا سورج

تھمز اجالوں کا گاؤں کو آج چھوڑ گیا
مکاں تھا مٹی کا، تو وہ بکھر گیا سورج

کل اپنے خواب کی وادی میں تھا مراق جہاں
تو اپنے برف پہن کر ٹھہر گیا سورج

OOO

پرتپال سنگھ بیتاب (انڈیا)

O

چاند کو چاند ستارے کو ستارہ کہنا
اچھا لگتا ہے کسی اچھے کو اچھا کہنا

میری تنہائی کا ہے میرا شجیں ہے یہ کمال
ہر تحر آئے آئے جانے والا کہنا

اپنی صورت کا تحر آتا ہر اک صورت میں
جو مقابل ہے وہ اس کو بھی مقابل کہنا

جانے کیا ہو گیا بچھڑوں سے تمہیں اے یارو
ہو گیا شیوہ ہر اک شے کو تماشا کہنا

یوں بھی سب چھوڑ کے ہو جاؤ کوئی دن روپوش
اپنی آوارگی کو دیس نکالا کہنا

جانتا ہوں تجھے مر جانے کا اک دن یہ برا
سمندر کو کبھی تو کبھی قطرہ کہنا

روح کا رنگ ہے کوئی کہہ ہے دیوانے ہیں
اپنوں کو غیر کبھی غیروں کو اپنا کہنا

اپنے رستے میں بھلا کس لئے بوتے کانٹے
کیا ضروری ہے ہر اک پودے کو پودا کہنا

اتنا بے ہوشی کبھی ہوتی نہیں اچھا بیتاب
کوئی ذرہ جو چمک جائے ستارہ کہنا

OOO

آفتاب خان

O

محبت سے مگر چارہ وفاداری نہیں ہوتی
چلو کر لو ادھوری سی اگر ساری نہیں ہوتی

محبت کے لیے جذبہ ضروری ہے محبت کا
اگر یہ جیب خالی ہو خریداری نہیں ہوتی

کسی سے سیکھ بیٹھا وہ طریقہ دل چرانے کا
مگر مجھ سے محبت کی اداکاری نہیں ہوتی

محبت پرورش پاتے دلوں کے نرم گوشے میں
کبھی پتھر زمینوں میں شجرکاری نہیں ہوتی

یہاں کچھ احتجاجوں سے کبھی عاشق ڈرتے ہیں
مگر ان کے لیے کوئی سند جاری نہیں ہوتی

OOO

طاہر منظور

O

بے مروت ہے، بے وفا، وہ ہے
منتظر دل اسی کی ادا وہ ہے
جو مری حسرتوں کا ساتھی تھا
وہ قدم ساتھ، بس چلا وہ ہے
جان دے دے، جو رہِ الفت میں
درحقیقت تو دیوتا، وہ ہے
میرے دل کے قریب تھا جو کبھی
دور مجھ سے چلا گیا، وہ ہے
سر تسلیم خم ہے کہتا ہوں
میری چاہت کی انتہا وہ ہے
مجھ کو خوش کن گمان دیتا ہے
میرے بارے میں سوچتا وہ ہے
یہ عداوت ہے، یا محبت ہے
میرے آنگن کا آئینہ، وہ ہے
جسم پرچم کو کھینچتا ہوں
آنسوؤں میں بسا ہوا وہ ہے
عمر بھر کی میری ریاضت کا
منکشف ہوا صلہ وہ ہے
وہ مرا ذکر بھی ہے فکر بھی ہے
میرے ہر راز میں چھپا وہ ہے
شعر طاہر کے چاند کے گاتا ہے
کاوشیں سیکھی کر رہا وہ ہے

OOO

ضیاء اللہ طاہر

O

عکس میں کوئی تکرار میں فرق
ہیں لفظ گویا در میں فرق

شیوۂ شراب و شباب ہیں الگ
ہے تیری چشم خمار میں فرق

ہم ہوئے آتش فراق میں راکھ
تم ٹھہرے محفلِ اغیار میں فرق

دیکھے کس طرح والہانہ دل کو
جو ہے تیرے انکار میں فرق

ٹھہرے جو ہم، خزاں کے پروردہ
کیا فرق ہے کون بہار میں فرق

دیکھ لو مستقل ایسا لگتا ہیں
رہے نہ مرگ گل بہار میں فرق

فکر جتنی بھی ہو تو چاہیے کامل
کب تک حیات مستعار میں فرق

واسطہ جب سے اس سے پڑا طاہر
ہوئے جاتے ہیں خس و خار میں فرق

OOO

رشیدہ عیاں (امریکہ)

O

لامکاں، خود لامکانی ہی میں بکھر، کھو گیا
چار دیواریں روانی تھیں، کہ وہ گھر ہو گیا

طاق میں جب تک رکھا تھا، تماشا تھا، جگنوؤں تو
ہاتھ سے جوں ہی چھوا میں نے وہ پتھر ہو گیا

جب سوا قمر سے نگاہیں منظر کر میں کھو گئی
بند آنکھوں میں ہویدا ایک منظر ہو گیا

جستجو کوئی نہ تھی، اس جستجو کے باوجود
دیکھتا ہی وا در جہاں مجھ پہ ہو گیا

ایک ناقص سنگ ریزہ ہی تو تھا میرا وجود
آپ نے کیا چھو لیا پل بھر میں گوہر ہو گیا

ایک دانہ کیا چکھا تھا، کھل گئی کل کائنات
سلسلہ در سلسلہ چکھا مقدر ہو گیا

رہرو راہ طلب تھی ناشناسائے مقام
دیکھتا مجھ پہ عیاں عرفان کا در ہو گیا

OOO

نیّر رانی شفق

O

دل و نظر میں ہیں کیسی محبتیں دیکھو
تماشا بن گئیں ہر سو یہ قربتیں دیکھو

لرز اٹھی ہوں میں نکلے ہی چاند کو چھت پر
کہ چاندنی میں ابھی چھپائی تھیں وحشتیں دیکھو

وہ دور رہ کے بھی مجھ کو دکھائی دیتا ہے
یہ ہجر شب کو بخشیں ہیں حیرتیں دیکھو

حنائی ہاتھوں کو تھامے وہ مرے ساتھ چلے
تڑپ رہی ہیں عجب دل میں حسرتیں دیکھو

جو میٹھے لہجے لبوں پہ سجائے پھرتے ہیں
انہی کے دل میں بسی ہیں کدورتیں دیکھو

مکان اپنا ہے، گلیاں نہ راستے اپنے
یہ کس طرح کی ملیں مجھ کو ہجرتیں دیکھو

میں سایہ بن کے رہی جس کے ساتھ ساتھ شفق
اسی نے بخشی ہیں دن رات فرقتیں دیکھو

OOO

جاوید عباس جاوید

O

پارساؤں میں پھنس گیا ہوں میں
کن بلاؤں میں پھنس گیا ہوں میں

میرے بچے خطا کہاں ہے تو
بددعاؤں میں پھنس گیا ہوں میں

تھی ہواؤں کی جستجو مجھ کو
ناخداؤں میں پھنس گیا ہوں میں

شہر در شہر گھومتا تھا میں
تیرے گاؤں میں پھنس گیا ہوں میں

اے صنم، جن سے تو بھی خائف ہے
ان اداؤں میں پھنس گیا ہوں میں

گونجتی ہیں جو آسمانوں میں
ان صداؤں میں پھنس گیا ہوں میں

اب رہائی محال ہے جاوید
پارساؤں میں پھنس گیا ہوں میں

OOO

یاد نگاری

عاشقی صبر طلب

(2013-2001)

……11……

ڈاکٹر رشید امجد

"انجمن ترقی پسند مصنفین" پر پابندی لگی تو ایک حوالے سے ترقی پسند تحریک کے لیے اچھا ہوا کیونکہ ترقی پسند تحریک کے منشور سے کسی کو اختلاف نہیں تھا۔ سارے جھگڑے شخصی تضاد سے شروع ہوئے۔ جہاں کوئی ادارہ ہوگا وہاں اشخاص بھی ہوں گے۔ اشخاص ہوں گے تو پسند ناپسند بھی ہوگی۔ ترقی پسند تحریک اردو کی واحد تحریک ہے جس کا ایک لکھا ہوا منشور تھا۔ اس منشور کی پابندی کرانے کے لیے "انجمن" وجود میں آئی لیکن پہلے دن سے ہی یہ اختلافی ہوگئی۔ کئی بڑے ادیب، جن میں منٹو، غلام عباس اور ممتاز مفتی جیسے بڑے لوگ شامل تھے، بظاہر اس تحریک سے الگ رہے لیکن ترقی پسند تحریک کے اثرات ان پر بھی ہیں، بلکہ ہر ادیب پر۔ کون ادیب ہے جو آزادیٔ رائے کے اظہار کا مخالف ہو، جو مظلوموں کا حمایتی نہ ہو، جو مساوات نہ چاہتا ہو۔ اختلاف صرف شخصی تھا، چنانچہ میرے خیال میں جب "انجمن" پر پابندی لگی تو ایک حوالے سے یہ اچھا ہی ہوا کہ اب تحریک کسی ادارے یا انجمن کی ملکیت نہیں رہی۔ ساٹھ کی دہائی والوں نے پرانے ترقی پسندوں کے شخصی رویوں کے خلاف بغاوت کی لیکن آخر آخر وہ ترقی پسند ہو گئے اور خود کو ترقی پسند کہلانے لگے۔ بھٹو دور میں کمیونسٹ پارٹی پر سے پابندی ختم ہوگئی۔ انجمن بھی بحال ہوگئی، اگرچہ اس کا سرکاری اعلان نہیں ہوا۔ کئی شہروں، خصوصاً کراچی اور لاہور میں انجمن کے جلسے بھی شروع ہو گئے۔ لیکن حلقہ ارباب ذوق کی وجہ سے کامیاب نہ ہوئے۔ وجہ یہ کہ حلقہ خود ایسا پلیٹ فارم تھا جہاں ہر طرح کی بحثیں ہو رہی تھیں اس لیے اب کسی انجمن کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ لیکن پرانے ترقی پسند، جو خود کو اس تحریک کا پروہت سمجھتے تھے، وقتاً فوقتاً اس طرح کی کوششیں کرتے رہے۔ ایک ایسی ہی کوشش زکریا یونیورسٹی کے سیمینار میں بھی کی گئی۔ یہ تین روزہ سیمینار تین بڑی ادبی تحریکوں (سرسید تحریک، ترقی پسند تحریک اور جدیدیت) کے حوالے سے تھا۔

ہم لوگ یونیورسٹی کے گیسٹ ہاؤس میں تھے۔ میرا اور کشور ناہید کا کمرہ ساتھ ساتھ تھا۔ کھانے کے بعد کشور نے مجھے بلایا اور کہا: "میں نے سنا ہے تیسرے اجلاس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے بارے میں گفتگو ہوگی اور انجمن کے عہدیداروں کا انتخاب ہوگا۔ ڈاکٹر انوار احمد کو منع کرو۔ یہ سرکاری یونیورسٹی ہے۔ وہ مشکل میں پڑ جائے گا۔" میں نے کہا "میں نے بھی یہی سنا ہے۔ آپ کی بات بالکل درست ہے، میں کوشش کرتا ہوں۔" ہم دونوں نے انوار احمد کو ساری اونچ نیچ سمجھائی۔ وہ رضامند ہوگئے اور طے ہوا کہ تیسرے دن کا اجلاس یونیورسٹی کی بجائے کسی اور جگہ ہوگا۔ سیمینار دو دن میں ختم کر دیا گیا۔ تیسرے دن کا اجلاس ایک ہوٹل میں رکھا گیا۔ صبح وہاں پہنچے تو عجیب صورت حال

تھی۔ لاہور سے آئے رشید مصباح نے کہا کہ ہم عرصے سے لاہور میں انجمن کے اجلاس منعقد کر رہے ہیں۔ اب اگر اور لوگوں کو عہدیدار چنا گیا تو ہم احتجاج کریں گے۔ میں نے پوچھا "یہ تو بتائیں کہ لاہور میں انجمن کے جلسوں میں کیا ہوتا ہے؟" کہنے لگے "وہی حلقے والی بات: ایک نظم، ایک افسانہ پڑھا جاتا ہے اور بحث ہوتی ہے۔" میں نے کہا "تو پھر حلقے میں اور انجمن کے اجلاسوں میں کیا فرق ہے؟ حلقے ہی کو مضبوط کریں۔" انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ پہلی نشست میں زوردار تقریریں ہوئیں۔ راحت سعید بھی کراچی سے آ چکے تھے۔ محمد علی صدیقی پہلے ہی موجود تھے۔ معلوم ہوا کہ دوسری نشست میں، جو کھانے کے بعد تھی، انجمن کے قیام کا اعلان اور عہدیداروں کا انتخاب ہوگا اور صدارتی پینل میں میں بھی شامل ہوں۔ میں ذاتی طور پر انجمن کو ایسا مردہ گھوڑا سمجھتا ہوں جس میں دوبارہ جان پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اب اس کی ضرورت ہے۔ اس سے ترقی پسند تحریک کو نقصان ہوگا کیونکہ پھر شخصی سیاست شروع ہو جائے گی۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری میرے ساتھ بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے ساری بات کی۔ وہ مجھ سے اتفاق کرتے تھے۔ کہنے لگے "تمہاری گاڑی کہاں ہے؟" میں نے کہا "پیچھے۔" بولے "وہ سامنے واش روم ہے۔ اس کا دوسرا دروازہ سیڑھیوں کی طرف ہے۔ جاؤ اور دوسری طرف سے اتر جاؤ۔" میں خاموشی سے اٹھا تو احمد جاوید بھی میرے ساتھ چل پڑا۔ اس کا بھی یہی خیال تھا کہ اس وقت انجمن کی تجدید سیاسی فوائد سے جڑی ہوئی ہے۔ ہم دونوں نیچے اترے۔ میں نے ڈرائیور سے کہا "سیدھے پنڈی کی طرف نکل چلو۔ کھانا راستے میں کہیں کھا لیں گے۔"

کوئی گھنٹہ بھر بعد انوار احمد کا فون آیا "تم کدھر ہو؟ سٹیج سے بار بار تمہارا نام پکارا جا رہا ہے۔" میں نے کہا "میں تو اس وقت خانیوال سے بھی آگے نکل چکا ہوں۔"

بعد میں معلوم ہوا کہ انجمن کی تجدید ہوئی، لیکن تین چار سال گزر چکے، اس کی ایک بھی کارروائی سامنے نہیں آئی۔ غالباً ساری بات لیٹر پیڈ چھپنے تک ہی محدود ہے، جس سے جانے کیا فوائد حاصل کیے جا رہے ہیں؟

◉

جامعہ حفصہ کے بحران کے دنوں میں جب ابھی آپریشن شروع ہونے والا تھا، کئی لوگ جن کے بچے، خصوصاً بیٹیاں وہاں پڑھتی تھیں، بڑے پریشان تھے۔ میں نے ایک ایسے ہی شخص سے پوچھا "آپ نے اپنی بیٹی کو وہاں کیوں بھیجا؟" بولے "مالی مشکلات کی وجہ سے میرے پاس بیٹی کی پڑھائی کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ایسے مدرسوں میں بچوں کو رہائش، کھانا حتیٰ کہ کپڑے بھی مل جاتے ہیں اور تدریس بھی ہو جاتی ہے۔"

یہ بات سچ ہے کہ مدرسوں میں پڑھنے والے زیادہ بچے غریب گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ماں باپ انہیں مدرسوں میں بھیج کر ان کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ ایک دور میں یہ مدرسے واقعی اپنا کام عمدگی سے کر رہے تھے۔ یہ ضرور تھا کہ وہاں جدید تعلیم کی سہولت نہیں تھی، لیکن وہاں کے طلبہ پڑھنا لکھنا سیکھ جاتے تھے اور ان کے اندر ایک انکساری بھی ہوتی جو ان کی نفسیاتی کمزوری کی دلیل تھی۔ معاشرے سے کٹے ہوئے یہ لوگ خدمت گاری اور خلوص کے جذبات رکھتے تھے۔ لیکن جب کچھ مخصوص قوتوں نے ان مدرسوں کو دہشت گردی کی نرسریوں میں تبدیل کیا تو ان طلبہ میں رعونت کے ساتھ ساتھ بے رحمی بھی پیدا ہو گئی۔ ان کے نظریات محدود اور ان کے اسلام کا تصور قبائلی نظام کے تصورات تک محدود کر دیا گیا۔ کچھ مدرسے اگرچہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے طلبہ جدید علوم سے بھی آشنا ہوں

لیکن ایسی کوششیں ابھی بڑی محدود ہیں۔ موجودہ صورت حال سے نکلنے میں بہت وقت لگے گا اور ان مدرسوں کو جدید ماحول اور علم سے آشنا کرنے کے لیے تو اب شاید ایک یا دو نسلوں کو کام کرنا پڑے گا۔

◉

ممتاز مفتی کہتے تھے میاں بیوی کا رشتہ کوئی رشتہ نہیں، یہ ایک کنٹریکٹ ہے۔ چل جائے تو ایک ایسا مضبوط رشتہ ہے جس کی مثال نہیں۔ میاں بیوی ایک دوسرے سے وہ باتیں بھی کر لیتے ہیں جو ماں باپ اور بہن بھائیوں حتیٰ کہ اولاد سے بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن اگر یہ کنٹریکٹ ٹوٹ جائے تو علیحدگی کی صورت میں دونوں ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہو جاتے ہیں۔ بہن، بھائی، بیٹا، بیٹی ساری زندگی بھی ناراض رہیں تو بھی ایک دوسرے کے بہن، بھائی، بیٹا، بیٹی ہی کہلائیں گے۔ یہی صورت ماموں، خالہ، چچا اور پھوپھی کی بھی ہے۔ لیکن خاوند بیوی اسی وقت تک ایک دوسرے کے خاوند بیوی ہیں جب تک نکاح نامہ موجود ہے۔ اس کی تنسیخ ہوتے ہی وہ ایک دوسرے کے لیے غیر ہو جاتے ہیں اور ان کے درمیان کوئی رشتہ موجود نہیں رہتا۔ یہ تو دنیاوی صورت ہے۔ مرنے کے بعد تو کوئی بھی رشتہ موجود نہیں رہتا۔ جانے والا اپنے تمام رشتے اور تعلقات دنیا ہی میں چھوڑ جاتا ہے۔ روز حشر نفسا نفسی ہوگی۔ کوئی کسی کو پہچانے گا بھی نہیں۔ سزا/جزا کے بعد جنت دوزخ میں بھی کوئی رشتہ نہیں ہوگا۔ ہر فرد فرد ہوگا تو پھر یہ دنیاوی گورکھ دھندہ کیا ہے؟ چند برسوں کے یہ سارے رشتے کیا معنی رکھتے ہیں؟ یہ تو ڈرامے کے کرداروں کی طرح ہوتے ہیں جو سٹیج پر کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے سے متعلق ہوتے ہیں اور پردہ گرتے ہی فرد فرد ہو جاتے ہیں۔ بے معنویت کا فلسفہ یہیں سے جنم لیتا ہے۔

◉

مشرف کی پہلی تقریر سے امید سی بندھ چلی تھی کہ شاید اب ملک کی اقتصادی پالیسیوں میں کوئی ایسی تبدیلی آئے گی جس کا فائدہ عام آدمی کو ہوگا۔ مشرف کی روشن خیالی کے بھی بڑے چرچے تھے اور انہوں نے مصطفیٰ کمال کو اپنا آئیڈیل کہہ کر کچھ واضح اشارے بھی دیے تھے لیکن اقتدار کی طوالت کے لالچ میں وہ مذہبی جماعتوں سے اتحاد کرنے پر مجبور ہو گئے۔ مسلم لیگ کے خلاف تو بغاوت ہوئی تھی اس لئے نواز شریف سے تو اتحاد کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ بے نظیر نے ابتدا میں مشرف کی حمایت میں بیان دیے لیکن مقتدر حلقوں نے مشرف کو پیپلز پارٹی کے قریب نہ ہونے دیا۔ ایجنسیوں نے حسب معمول مذہبی عناصر کو استعمال کیا اور روشن خیالی کے اوپری پردے کے پیچھے ضیاء والی مذہبی جنونیت قائم رہی۔ نائن الیون کے فیصلے نے رہی سہی کسر نکال دی اور پاکستان ایک ایسی دلدل میں پھنس گیا جہاں سے باہر نکلنا آسان نہیں۔

مشرف دور کی اقتصادی پالیسیاں بھی بری طرح ناکام رہیں۔ ان کے پہلے وزیر اعظم جمالی کے بارے میں مشہور تھا کہ ساری رات نمازیں پڑھتے ہیں اور دن بارہ بجے تک سوتے ہیں۔ اس کے بعد دفتر میں محفل لگاتے ہیں۔ دوسرے وزیر اعظم شوکت عزیز تھے جن کے بارے میں کہا گیا کہ اقتصادیات کے ماہر ہیں۔ اس ماہر کا معیار یہ تھا کہ وہ موبائل فونوں کی فروخت کے گراف سے اقتصادی ترقی کا اندازہ کرتا تھا۔ اس وقت تک عام لوگوں میں بچت کا خاصا رواج تھا اور یہ رقم بنکوں کے علاوہ زیادہ تر نیشنل سیونگ میں رکھی جاتی تھی جہاں ایک لاکھ پر تقریباً ساڑھے تیرہ سو روپے ماہانہ منافع ملتا تھا۔ شوکت عزیز نے اسے کم کر کے ساڑھے پانچ سو روپے کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

لوگوں نے بنکوں اور نیشنل سیونگ سے پیسے نکلوا کر پلاٹ خریدنے شروع کر دیے۔ کہا جاتا ہے کہ شوکت عزیز کی اس پالیسی کے پیچھے دو تین بڑے رئیل سٹیٹ کے اداروں کا ہاتھ تھا۔ انہوں نے سستے داموں زمینیں خرید کر مہنگے داموں بیچیں اور خوب رقم کمائی۔ وہ پیسہ جو ملکی اقتصادیات میں گردش کر رہا تھا اور اس سے کئی طرح کے کاروبار چل رہے تھے، مٹی بن گیا۔ ان میں سے ایک ادارہ تو ایسا ہے کہ اس نے ہر دور کے اہم لوگوں کو مفت فارم ہاؤس اور پلازے تحفے کے طور پر پیش کیے۔ خود مشرف کا نام بھی ایسے لوگوں میں شامل ہے۔ اس ادارے کا اثر و رسوخ اتنا ہے کہ کوئی عام شخص دم نہیں مار سکتا۔ ہمارے گھر عاشق نامی ایک مالی کام کرتا تھا، جو روات کے قریب کسی گاؤں میں رہتا تھا۔ ایک ٹوٹی سائیکل پر شام کو آتا۔ دن کو کسی اور جگہ کام کرتا۔ اچانک وہ غائب ہو گیا۔ پہلی تنخواہ لینے بھی نہ آیا۔ رشادہ کہنے لگی: پتہ تو کریں کہیں بیمار تو نہیں ہو گیا۔ میں کہاں سے پتہ کرتا۔ کئی ماہ گزر گئے، ایک دن شام کو عاشق آ گیا۔ میں نے پوچھا "بھئی تم کدھر تھے، خیریت تو تھی نا؟"

کہنے لگا: "ایک رات پٹواری نے ہماری برادری کو بلوایا اور کہا کہ آپ کی یہ زمین ایک ادارہ لینا چاہتا ہے۔ یہ قیمت مقرر کی گئی ہے، اگر مرضی سے دے دیں تو ٹھیک ورنہ کل زمین پر زبردستی قبضہ کر کے تمہارے گھر گرا دیے جائیں گے۔ پھر تم لوگ عدالتوں میں جاتے رہنا۔"

برادری والوں نے مشورہ کیا کہ ہم کمزور لوگ ہیں، اس سے پہلے آس پاس کے علاقوں پر اسی طرح کے قبضے ہو چکے ہیں۔ ہمارے پاس عدالتوں کے لیے رقم کہاں سے آئے گی، چنانچہ ہم نے پیسے لے لیے، اگرچہ یہ مارکیٹ ریٹ سے بہت ہی کم تھے۔"

"پھر..." میں نے پوچھا۔

"ہم لوگوں نے اڈیالہ جیل سے آگے، بلکہ گورکھ پور (گاؤں کا نام) سے بھی آگے زمین لی اور ہم چلے گئے۔ اس نئی آبادکاری میں اتنا مصروف رہا کہ آپ کو بھی نہ بتا سکا۔"

ڈاکٹر انور زاہدی کا معاملہ تو میرے سامنے کا ہے۔ ریٹائرمنٹ پر انہیں آئی ایٹ میں دس مرلے کا پلاٹ ملا۔ انور زاہدی چاہتے تھے کہ پنڈی میں رہیں اور یہاں گھر بنا کر بیٹے کا کلینک کھول لیں چنانچہ انہوں نے آئی ایٹ کا پلاٹ اونے پونے بیچ دیا (اگرچہ اب اس کی قیمت کروڑ سے بھی زیادہ ہے) اور ساری جمع پونجی ملا کر تیس لاکھ میں ایک کنال کا پلاٹ لے لیا۔ میں نے انہیں کہا، کبھی کبھار جا کر پلاٹ کو دیکھ آیا کرو۔ ایک دن شام کو میرے گھر آئے تو بڑے پریشان تھے۔ پوچھا "خیریت؟" کہنے لگے "پلاٹ پر کسی نے قبضہ کر لیا ہے۔ سات آٹھ پلاٹوں کے گرد کسی نے دیوار بنا دی ہے، میرا پلاٹ بھی انہی میں ہے"۔

معلوم ہوا ہے کہ ایک ادارے نے یہ کہہ کر کہ زمین ان کے دائرے میں آتی ہے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ پاکستان میں پٹواری اتنا طاقتور ہے کہ وہ نقشے میں جہاں چاہے تبدیلی کر لے، کوئی اسے چیلنج نہیں کر سکتا۔ زاہدی نے عدالت جانا چاہا لیکن کسی نے مشورہ دیا کہ کیوں اور پیسے بھی برباد کرتے ہو۔ زاہدی چپ ہو بیٹھا، اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

⊙

اپنے ثقافتی مزاج، داستانوں، محلوں اور گلیوں کے حوالے سے لاہور مجھے بہت پسند ہے اور میں نے کئی بار لاہور میں مستقل قیام کا ارادہ بھی کیا لیکن لاہور نے مجھے قبول نہیں کیا۔ داتا صاحب سے بھی کئی بار التجا کی، دربار میں حاضر ہو کر دعا مانگی لیکن انہوں نے بھی پذیرائی

تھیں گی۔ جب والد صاحب لاہور میں تھے تو میں نے کئی بار وہاں جانے کی کوشش کی۔ سکول کے زمانے میں میرے ایک ماموں غلام حسین اور دو خالائیں لاہور میں رہتے تھے۔ ہم ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں لاہور جاتے۔ ماموں کا گھر حضوری باغ کے بالکل سامنے تھا۔ ایک بڑی کئی منزلہ عمارت تھی جو فسادات میں جل گئی تھی۔ ماموں سب سے اوپر والی منزل میں رہائش پذیر تھے۔ اس سے نچلی دو منزلیں جلی ہوئی تھیں، پھر ایک منزل پر کوئی اور خاندان آباد تھا۔ اس عمارت کی سیڑھیاں دونوں طرف سے تھیں لیکن بائیں طرف والی سیڑھی جل کر کئی جگہ سے ٹوٹ گئی تھی۔ دائیں طرف والی سیڑھی ٹھیک تھی۔ اوپر والی منزل سے حضوری باغ، قلعہ اور شاہی مسجد صاف نظر آتے تھے۔ ماموں کے بچے پڑھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے اس لئے چھوٹے موٹے کام کر رہے تھے۔ ہم جاتے تو وہ ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ سب اپنا اپنا کام کرتے تھے اس لئے سب کے پاس اپنے پیسے ہوتے تھے۔ وہ مجھے خوب گھماتے اور کھلاتے پلاتے۔ دو ماہ کی ان چھٹیوں میں ہم ایک ایک ہفتہ خالاؤں کے گھر بھی رہتے جو وچھووالی کی ایک ہی گلی میں تھے۔ واپسی پر میں ہمیشہ اداس ہو جاتا اور میرا جی چاہتا کہ امی مجھے یہیں چھوڑ جائیں۔

والد صاحب شاہدرہ قالین فیکٹری میں ملازم ہو کر شاہدرہ آ گئے تو انھوں نے ایک کمرے کا کوارٹر لے لیا۔ میں اس دوران دو بار بھاگ کر ان کے پاس پہنچا۔ میری خواہش ہوتی کہ وہ مجھے اپنے پاس رکھ لیں لیکن وہ کوئی جواب نہ دیتے اور دوسرے تیسرے دن علیا چاچا آ کر مجھے واپس لے آتے۔ ملازمت شروع ہوئی تو یہ بھی مقامی انتظامیہ کے تحت تھی جس میں تبدیلی کا امکان ہی نہیں تھا۔ شادی کا سلسلہ شروع ہوا تو بھی میں نے کوشش کی کہ لاہور میں ہو جائے تاکہ پاؤں پھنس جائے۔ ایک دو کوششیں بھی ہوئیں لیکن امی کی مرضی آڑے آ گئی۔ کالج میں ملازمت کے دوران دو بار موقع ملا کہ لاہور چلا جاؤں۔ لیکن عین وقت پر کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی۔ سعدیہ کو لاہور میں داخلہ ملا تو میں نے ایک بار سنجیدگی سے کوشش کی۔ گوجرانوالہ کالج میں پرنسپل کی جگہ خالی تھی۔ ڈائریکٹر کا اصرار بھی تھا کہ میں جاؤں کیونکہ حیدر علی کے حوالے سے مجھے ہی جانا چاہئے تھا لیکن پھر کچھ ہو گیا۔ ریٹائر ہوا تو ایک کوشش اور کی کہ یہ گھر بیچ کر لاہور چلے جائیں لیکن سعدیہ کی شادی پنڈی میں ہو چکی تھی اور حسن حسین بھی تعلیم کے ان مراحل میں تھے کہ یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔ سو لاہور جانے کے خواب ادھورے رہ گئے۔ یوں لگتا ہے کہ لاہور اور داتا صاحب کو میرا لاہور میں رہنا پسند نہ تھا۔

لاہور کے بعد جو شہر مجھے اچھا لگتا ہے وہ پشاور ہے۔ پشاور اپنے ثقافتی ورثے، ذائقوں اور کھانوں کے حوالے سے وسط ایشیائی ریاستوں کا تسلسل ہے جو کشمیر تک پہنچتا ہے۔ پشاور میں جا کر احساس ہوتا ہے کہ آپ سرینگر میں پھر رہے ہیں۔ اس کے برعکس پنڈی روکھے لوگوں کا شہر ہے۔ یہاں محفلوں کا رواج ہی نہیں۔ یہاں کا مزاج بیوروکریسی اور فوج کا مزاج ہے جہاں پروٹوکول اور حفظ مراتب کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ رہا اسلام آباد تو یہ شہر ہے ہی نہیں، اس شہر جیسا ہے۔ ملتان بھی اپنے صوفیانہ ورثے اور میٹھی سرائیکی کی وجہ سے توجہ کھینچتا ہے۔ وہاں جا کر بھی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن لاہور لاہور ہی ہے۔

◉

اس دوران دو اور کام بھی مکمل ہوئے۔ ایک والد کا کلام شائع کرایا اور دوسرے استاد غلام رسول طارق کے کلام کی اشاعت۔ والد کی زندگی میں ان کا مرثیوں کا ایک مجموعہ ''خونِ حسین'' شائع ہوا تھا۔ ان کی وفات کے بعد مجھے ان کے ہاتھ کی لکھی کچھ بیاضیں مل گئیں۔

ان میں سے کچھ کلام پڑھا جا سکتا تھا، کچھ بہت شکستہ تھا اور کچھ پانی پڑنے سے پڑھنے کے قابل نہیں تھا۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے میری درخواست پر اس سارے کلام کو مرتب کر کے اس پر ایک طویل دیباچہ تحریر کیا۔ یہ کلام ''نقشِ خیال'' کے نام سے شائع ہوا۔ اس دوران معلوم ہوا کہ ''کلامِ مونس'' کے نام سے ان کا ایک مجموعہ لاہور سے چھپ چکا ہے، اسے بھی ''نقشِ خیال'' میں شامل کر لیا گیا۔ ''نقشِ خیال'' کے دو ایڈیشن شائع ہوئے۔ دوسرے ایڈیشن میں کچھ نیا کلام بھی جو ان کے ایک شاگرد سے ملا، شامل کر لیا گیا۔ استاد غلام رسول طارق کے کلام کی اشاعت میں ان کی بیٹی زاہدہ نے بڑی مدد کی۔ یہ مجموعہ بھی ''کلامِ طارق'' کے نام سے شائع ہو گیا۔ اس دوران ایک اور اچھا کام یہ ہوا کہ بشیر احمد صرفی کا، جو کچھ عرصہ بشیر احمد دانی کے نام سے بھی لکھتے رہے تھے، کلام بھی میری درخواست اور ان کے بیٹے سجاد دانی کی خواہش پر ایک مبسوط مقدمے کے ساتھ ڈاکٹر شفیق انجم نے مرتب کر دیا۔ بشیر احمد دانی میری جوانی کے زمانے کے دوست تھے۔ ان کا گھر صدر میں تھا۔ ان کے والد احمد دانی بھی شاعر تھے اور ریڈیو آزاد کشمیر میں سکرپٹ رائٹر تھے۔ یہ ہماری بے کاری کا زمانہ تھا۔ بشیر دانی ردی اکٹھی کرتا، اسے بیچ کر ہم چائے پیتے۔ چائے کا کپ دو آنے میں آتا تھا۔ ہم ایک کپ لیتے اور ایک پرچ میں اور دوسرا پیالی میں چائے پیتا۔ اکثر اس بات پر جھگڑا ہو جاتا کہ پرچ میں زیادہ چائے ہے یا پیالی میں۔ لکھنے والوں کی انجمن بنی تو بشیر صرفی اس کا پہلا سیکرٹری چنا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اسے ریڈیو پروڈیوسر کی ملازمت مل گئی اور وہ کراچی چلا گیا۔

سرسید کالج سے پاکستانی ادب کا سلسلہ اسی کی دہائی میں شروع ہوا۔ میرے ساتھ اس کے نائب مدیر فاروق علی تھے۔ ہم انہیں شادی کہتے تھے۔ شادی چھپاں چھیاں میں رہتے تھے جو ڈھوک پیرو سے زیادہ دور نہیں تھا۔ میں صبح ان کے یہاں پہنچتا اور ان کی پچاس سی سی کی موٹر سائیکل پر دونوں کالج جاتے۔ اکثر صبح ہم شادے کی نہاری کھاتے اور پھر مزے مزے کالج کی راہ لیتے۔ ان کے موٹر سائیکل کی رفتار ایسی تھی کہ میں کئی بار پیچھے سے اتر کر کسی دکان سے کوئی چیز لے لیتا اور پھر دوڑ کر دوبارہ سوار ہو جاتا۔ اس موٹر سائیکل کو ہم سب شادی کا گھوڑا کہتے تھے۔ ان کی بیگم غزل سے رخسانہ کی بڑی دوستی تھی اور اکثر شامیں ہم ایک دوسرے کے گھر گزارتے۔

⊛

ڈاکٹر انور نسیم سے پرانا تعلق تھا لیکن عمل میں آنے کے بعد ڈاکٹر روبینہ شہناز کی وجہ سے گویا تجدیدِ ملاقات ہوئی۔ افسانے لکھنا انہوں نے چھوڑ دیے تھے۔ میرے اصرار پر انہوں نے پرانی چیزیں تلاش کیں اور ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''یہ قربتیں اور یہ فاصلے'' شائع ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے دو تین نئے افسانے لکھے۔ وہ اپنی دیگر مصروفیات کے ساتھ ہائر ایجوکیشن کمیشن کے ممبر بھی تھے جس کی وجہ سے اردو والے انہیں اپنا نمائندہ سمجھتے تھے۔

⊛

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں میرا باقاعدہ آنا جانا ڈاکٹر بشیر سیفی کے دور میں ہوا۔ اس وقت ڈاکٹر نثار قریشی صدر شعبہ تھے۔ نثار قریشی تین سال کے لیے مصر گئے تو ڈاکٹر انعام الحق جاوید صدر شعبہ ہو گئے۔ ان کے زمانے میں بھی اوپن یونیورسٹی میں بہت آنا جانا رہا۔ نثار قریشی واپس آئے تو کچھ نامعلوم وجوہات کی وجہ سے میرا تعلق نہ ہونے کے برابر رہا۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید کے بعد ڈاکٹر میاں مشتاق احمد کچھ عرصہ صدر شعبہ رہے۔ ان کا تعلق بہاولپور سے ہے اور وہ اسلامیہ

یونیورسٹی بہاولپور سے یہاں آئے تھے۔ میرے ان کے ساتھ مراسم بہاولپور ہی سے تھے۔ ان کی بیگم صغریٰ بیگم بھی بہت نفیس اور پڑھی لکھی خاتون ہیں۔ ان کے دو بیٹوں کے نام بھی حسن اور حسین ہیں۔ میاں مشتاق احمد میری وجہ سے معتوب ہو گئے۔ ہوا یوں کہ نثار قریشی واپس آئے تو پروین کلو کے مقالے کی وجہ سے ان سے بھی ناراض ہو گئے۔ پروین کلو کے معاملے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہماری جامعات میں نظریاتی اختلاف کی وجہ سے بعض استاد کس طرح طلبہ کے کیریئر کو تباہ کر دیتے ہیں۔ نثار قریشی کے مصر قیام کے دوران شعبہ نے پروین کلو کے لئے پی ایچ ڈی کا موضوع منظور کیا۔ یہ موضوع تھا: "روسی تراجم کے اردو فکشن پر اثرات"۔ ابتدا میں اس کے نگران ڈاکٹر صدیق شبلی تھے۔ صدیق شبلی واضح نظریاتی وابستگی کے باوجود کسی مخالف نظریے کے طالب علم کو نقصان نہیں پہنچاتے تھے بلکہ ہر ممکن مدد کرتے تھے۔ شبلی صاحب نے ایک دن مجھے کہا کہ اس موضوع پر آپ بہتر کام کروا سکتے ہیں۔ پروین کلو نے ایم فل کا مقالہ بھی میری نگرانی میں لکھا تھا۔ دوسرے وہ غلام نبی کلو کی بیٹی ہیں۔ غلام نبی کلو میجر اسحاق کے بہت قریبی ساتھی اور مزدور کسان پارٹی کے اہم راہنما تھے۔ میری ان سے دو تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ان کی دیانتداری کا یہ مقام تھا کہ مخالفین بھی جھک کر ملتے تھے۔ میں نے حامی بھری اور پروین نے میرے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا۔ سچی بات ہے میں نے بہت کم لوگوں کو اتنی لگن سے کام کرتے دیکھا ہے۔ مقالہ لکھا جا رہا تھا کہ اس دوران نثار قریشی واپس آ گئے۔ پروین ایک دن ان سے ملنے گئی اور اپنے مقالے کا ذکر کیا تو وہ بولے: "یہ موضوع منظور کیسے ہو گیا؟" پروین کلو نے کہا: "شعبہ کے بورڈ نے اس کی اجازت دی ہے۔" کہنے لگے: "تمہیں روسی آتی ہے؟" اس نے کہا: "نہیں۔"

بولے: "تو پھر تم یہ مقالہ کیسے لکھ سکتی ہو؟"

پروین نے کہا: "میں نے تراجم کی صحت اور معیار نہیں دیکھنا۔ میرا کام تو اردو فکشن پر ان کے اثرات تلاش کرنا ہے۔"

نثار قریشی قائل نہ ہوئے اور بولے: "میں تمہیں ڈگری نہیں لینے دوں گا۔"

پروین کلو میرے پاس آئی اور ساری روداد سنائی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ تم بے فکر ہو کر مقالہ مکمل کرو۔

مقالہ مکمل ہو کر جمع کرا دیا گیا۔ دو برس گزر گئے۔ کئی بار پوچھا، یہی جواب ملا کہ رپورٹیں نہیں آئیں۔ ایک دن میں شعبے میں اپنے دفتر میں تھا کہ شعبہ روسی زبان و ادب کی سربراہ ڈاکٹر عاصمہ کا فون آیا کہ ڈاکٹر صاحب اگر فراغت ہو تو آ جائیں، ایک دوست آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ روسی زبان و ادب کے شعبہ کا دفتر بھی برآمدے میں تھا۔ میں پہنچا تو ایک غیر ملکی وہاں موجود تھے اور میز پر پروین کلو کا مقالہ پڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر عاصمہ نے تعارف کروایا کہ یہ روسی سفارت خانے کے سیکنڈ سیکرٹری ڈاکٹر نکولا ہیں۔ نکولا روانی سے اردو بولتے ہیں۔ سلام دعا کے بعد کہنے لگے: "یہ مقالہ آپ نے لکھوایا ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ بولے: "دیکھیں اس میں مقالہ نگار نے لینن اور سٹالن کی تصویر لگا دی ہیں۔ ماسکو کے ریڈ سکوائر کی تصویر بھی ہے۔" میں نے کہا: "اسے منع بھی کیا تھا لیکن بڑی جذباتی لڑکی ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے نفی میں سر ہلایا: "یہ باتیں اب پرانی ہو چکی ہیں۔ یہ مقالہ تو ڈگری کے قابل نہیں۔"

مجھے بڑا غصہ آیا۔ میں نے کہا: "صرف اس بنیاد پر کہ اس میں لینن اور سٹالن کی تصویریں ہیں؟"

وہ کچھ نہیں بولے۔ میں نے کہا: "یہ غلام نبی کلو کی بیٹی ہے۔ آپ تو انہیں جانتے بھی نہیں ہوں گے۔ یہ شخص وہ تھا جس نے روس کے لئے سامراج سے ساری زندگی لڑائی لڑی لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ ایک دن روس خود سامراج بن جائے گا۔"

صورت حال خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر عاصمہ گھبرا گئیں۔ انیقا کا موڈ بھی خراب ہو گیا۔

چند دن بعد معلوم ہوا کہ انہوں نے رپورٹ بھجوا دی ہے۔ صرف یہ لکھا ہے کہ سکالر کو روسی زبان نہیں آتی اس لئے اسے ڈگری نہ دی جائے۔ میں نے وائس چانسلر سے کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ سکالر کو روسی زبان نہیں آتی۔ اس نے مقالے میں کہیں اس کا ذکر نہیں کیا۔ اور دوسرے یہ کہ کیا محض اس وجہ سے پورا مقالہ رد ہو سکتا ہے؟

یہی بات نثار قریشی نے پروین کلو کی تھی۔ ایک لمبا عرصہ گزر گیا۔ سکالر پریشان ہو گئی ہیں لیکن نثار قریشی واپس نہیں ہونے دے رہے۔ اسی دوران وہ بیمار ہو گئے اور میاں مشتاق قائم مقام صدر شعبہ ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی بیگی کا ایک کام کر دو اور مقالے کا ڈیفنس کروا دو۔ انہوں نے ڈیفنس کروا دیا۔ بڑا کامیاب ڈیفنس تھا۔ صدیق شبلی اپنی بیماری کے باوجود آئے۔ نثار قریشی کو معلوم ہوا تو میاں مشتاق سے ناراض ہو گئے۔ میاں مشتاق ڈیپوٹیشن پر یہاں آئے تھے۔ نثار قریشی نے ان کے خلاف فرضی کیس بنوائے اور انہیں یہاں سے رخصت کروا دیا۔ ہماری اکثر جامعات میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ سمسٹر سسٹم بھی اسی وجہ سے یہاں کامیاب نہیں، اسی لئے اب کئی یونیورسٹیاں اسے ختم کر رہی ہیں۔ سمسٹر سسٹم میں طلبا کا مستقبل مکمل طور پر استاد کے ہاتھ میں آ جاتا ہے اور ہمارے استاد اس قابل نہیں کہ دیانتداری سے کسی کام کا جائزہ لیں۔ جو طالب علم ان کی خوشامد کرتا ہے وہ اچھا گریڈ حاصل کر لیتا ہے اور جو طالب علم ذرا دور رہتا ہے وہ معتوب ہو جاتا ہے۔

◉

میں جب سکول میں پڑھتا تھا تو آٹھویں تک فارسی اور نویں دسویں میں تاریخ اور جغرافیہ لازمی مضامین تھے۔ فارسی پڑھنے کا فائدہ یہ تھا کہ اردو کے بنیادی ڈھانچے، گرامر، افعال، کہاوتوں اور محاورے سے واقفیت ہو جاتی تھی۔ دوسرے گلستان بوستان کے منتخب حصے پڑھ کر اخلاقی اقدار سے آگاہی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ہر پڑھے لکھے گھر میں سعدی کی گلستان، بوستان اور حالی کی مسدس لازماً ہوتی تھیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کی اخلاقیات نے سعدی کی کتاب سے جنم لیا ہے۔ ضیاء الحق کے زمانے میں جب یہاں سعودی اثر بڑھا تو ایک منصوبے کے تحت فارسی کو نکال کر عربی زبان کو لازمی قرار دے دیا گیا۔ عربی ہماری مقدس زبان ہے لیکن ہماری ثقافت کا حصہ نہیں۔ فارسی اور ایرانی ثقافت ہند اسلامی کلچر کی بنیاد ہے۔ فارسی دور کرنے کا جو نقصان اردو زبان کو ہوا، وہ تو ہوا، لیکن ہماری اخلاقیات بے جڑ ہو کر آہستہ آہستہ روبہ زوال ہو گئیں۔

تاریخ اور جغرافیہ پڑھنے کے فوائد یہ تھے کہ ہم نہ صرف اپنے، بلکہ دوسری قوموں کے ماضی سے واقفیت حاصل کرتے تھے۔ جغرافیہ سے دنیا بھر کا پتہ چلتا تھا جس میں سرحدوں اور موسموں تک کا علم موجود تھا۔ تاریخ میں تین میں سے دو آپشن چننے پڑتے تھے۔ یہ تھے: اسلامی تاریخ، یورپ کی تاریخ اور ہندوستان کی تاریخ۔ میں نے یورپی اور ہندوستانی تاریخ پڑھی اور اسی سے معلوم ہوا کہ یورپ آج جس انتہا پر ہے اس کا ماضی ہماری موجودہ صورت حال سے بھی بدتر تھا۔ یہ بھی جانا کہ کس طرح یورپ میں تحریکیں شروع ہوئیں اور مغرب نے کس طرح پاپائیت اور بادشاہت سے جان چھڑائی۔ شاید اسی لیے کہ ہماری نوجوان نسل اس ساری جدوجہد اور طریقہ کار سے آشنا نہ ہو جائے، تاریخ کو لازمی نصاب سے خارج کر دیا گیا ہے۔ رہا جغرافیہ تو اس کی بھی ضرورت نہیں کہ ہم اپنے خول میں بند ہیں، ہمیں ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ پھر یہ کہ تاریخ خلا میں وجود میں نہیں آتی، اس کے لیے جغرافیہ ضروری ہے۔ سو نہ رہے جغرافیہ نہ تاریخ۔

◆◆◆

(جاری ہے)

سفر نامے

سورج کے رُخ پر

......12......

ڈاکٹر ابدال بیلا

ایمسٹرڈیم جانے کے لیے بڑی لگژری بس آ گئی۔ منٹوں میں سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ بس چلانے والا ایک موٹا سا جرمن تھا۔ اس کے برابر میں ایک چست سی نیلی جین کے اوپر آسمانی رنگ کی شرٹ اور گہری نیلی جیکٹ میں ملبوس ایک پتلی سی گوری ڈچ خاتون بیٹھی تھی۔ اس کے بیٹھنے کی نشست بھی چھوٹی سی تھی۔ پتلی پتلی سی وہ لڑکی اس بس کی کنڈیکٹر تھی۔ ڈرائیور سے جین کہہ کے بلاتا اور وہ ڈرائیور کو ولی کے نام سے پکارتی۔ شاید ڈرائیور کا نام ولیم ہو۔ ولیم نے لاری چلنے سے سڑک کے ایک طرف کھڑی کر دی اور جین ہم سب کے بیٹھ جانے کے بعد ڈرائیور کو جرمن زبان میں کچھ کہنے لگی۔ مجھے اس کی باتیں تو سمجھ میں نہ آئیں مگر لگتا تھا وہ ہم سب کے اطمینان سے بیٹھ جانے کے بعد اس کو چلانے کا اشارہ دینے کی منتظر تھی۔ آخر اس نے کھڑے ہو کے اطمینان سے ہم سب کو دیکھا۔ پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں ہم سب کو دیکھ کے پوچھا۔ سب بیٹھ گئے؟ چلیں؟ ہوں کے اُس نے ولیم کو اشارہ دے دیا۔ بس ایک خوشگوار حرکت کے ساتھ یوں سے ایمسٹرڈیم کی طرف چل پڑی۔ شہر کی کچھ سڑکوں سے اونچی عمارتوں کے بیچ تنگ راہداریوں سے ہوتی ہوئی لاری ایمسٹرڈیم جانے والی موٹروے پہ آ گئی۔ چار لین والی، دو رویہ موٹروے جرمنی سے گزرتے ہوئے آٹو بان کہلاتی ہے۔

ایمسٹرڈیم تک ہمارا سفر کوئی پانچ گھنٹے کا تھا جس میں راہ میں کوئی پون گھنٹے کے لیے لنچ بریک کا وقفہ بھی تھا۔ وہ ایک خوشگوار روشن دن تھا۔ اپریل کا پہلا ویک اینڈ تھا۔ موسم بہار نے سڑک کے گرد اگرد سبز میدانوں پہ رنگ برنگ کے پھولوں کے گجرے سجائے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں راہ میں خوبصورت گھروں کی بستیاں مسکرا کے ہمیں دیکھ دیکھ کے اطمینان بھرے سفر کی دعائیں دے رہی تھیں۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے سفر کے بعد اچانک موٹروے کے تمام سائن بورڈ جرمن زبان کی بجائے ڈچ زبان میں لکھے نظر آنے لگے۔ حیرت ہوئی۔ نہ کوئی واہگہ بارڈر کی طرح کہیں دروازہ آیا نہ کوئی امیگریشن کے دفاتر۔ نہ کوئی کہیں کسٹم اہلکار، کوئی سپیڈ بریکر تک نہ آیا اور ہم جرمنی سے نیدرلینڈ پہنچ گئے۔ کہنے کو نیدرلینڈ کو ہی نیدرلینڈ کہا جاتا ہے اور اب بھی کچھ لوگ اسے ہالینڈ کہتے ہیں حالانکہ ہالینڈ اس ملک کا ایک صوبہ ہے۔

جین ولیم سے جڑی لاری کی بڑی ونڈ سکرین کے پاس بیٹھی تھی۔ جین کے پاس ہی ڈیش بورڈ کے ایک ہک میں بل کھاتی لمبی تار کے کونے سے جڑا ایک مائیکروفون رکھا تھا۔ خیال تھا کہ جین ٹور گائیڈ کی طرح مائیکروفون لے کر کھڑی ہوگی اور ہمیں ہالینڈ کے لینڈ سکیپ بارے کچھ بتائے گی۔ کئی بار اس نے مائیکروفون کو ہاتھ لگایا مگر اسے ہک سے باہر نہ نکالا۔ شاید اس کی سفر میں بریفنگ کی کوئی الگ سے فیس متعین ہو۔ بس کی اگلی سیٹوں پہ بیٹھی بیگم جنرل احسان نے کرنل فردوس سے کہا۔ کرنل بیلا کو کہیں کہ وہ مائیکروفون پہ ہمیں ہالینڈ کے

بارے میں کچھ بتاتے جائیں۔ مائیکروفون کا انتظام کے جیمن نے ڈیش بورڈ کے ہک سے جڑا مائیکروفون اتار کے میرے اشارے سے مجھے پکڑا دیا۔ اور میں ہیلو لیڈیز اینڈ جنٹلمین ۔۔۔ کہتے ہوئے اپنی نشست کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ بس کی کھلی کھڑکیوں کے آر پار نیدرلینڈ کے پھیلے وسیع سبز میدانوں پہ نگہ کی جہاں اب دونوں اطراف میں قریب اور دور جہازی سائز کی اونچی بڑی ہوائی چکیاں اپنے سفید پروں کو خوش شانتگی سے گھمائے جا رہی تھیں اور سڑک کے دونوں اطراف میلوں تک لال پیلے اودھے نیلے پھولوں کے کھیت تھے۔ ہوا میں رنگوں کی بوچھاڑ نے خوشبوؤں کی یلغار کی ہوئی تھی۔ بس کی کھڑکیوں سے چہرے چپکائے کچھ ساتھی محویت سے وہ نظارہ دیکھ رہے تھے باقی بیٹھے بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ میری آواز، لیڈیز اینڈ جنٹلمین کے ساتھ ہی اونگھتے چہروں کی آنکھیں کھلیں اور بے یقینی نظروں نے ایک ساتھ مجھے دیکھا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ بات نیدرلینڈز کی تاریخ سے شروع کروں یا اس کے جغرافیے سے۔ اسی اثناء میں جیمن نے اپنی سبز آنکھوں میں دلچسپی اور تجسس سے مجھے دیکھ کے اپنے باریک سنورے ہوئے ابرو اٹھائے اور میری باتوں کو کچھ کہہ دینے کی راہ دے دی۔ مجھے سواری کے اطراف میں میلوں پھیلے ٹیولپ اور ڈیفوڈلز کے پھولوں میں سے حسین ترین پھول جیمن کے چہرے پہ مہکتا نظر آیا۔ میں نے بات تو ٹیولپ کی کی مگر نگہ جیمن سے نہ ہٹائی۔ جیمن بھی سمجھ گئی کہ پھولوں کی رنگارنگی کے بہانے میں اسے بیان کرنے لگا ہوں۔ وہ ولیم سے ذرا ہٹ کے جم کے بیٹھ گئی اور میرے کہے جملوں سے لطف اندوز ہونے لگی۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ وہ ایسے لمبے سفر پہ خود مسافروں کو جو معلومات دیتی آئی ہو آج وہ خود وہی سب ایک مسافر سے سننے والی ہو۔ میں نے جیمن کی خاطر اپنی ساری گفتگو انگریزی میں ہی کی۔ ایک نکتہ یہ بھی ذہن میں تھا کہ یورپ کی اس شاہراہ پر میں اپنی زبان میں کوئی بات کہہ کے ولیم اور جیمن کے لیے کیوں تجسس کا باعث ہوں کہ وہ دونوں سوچیں نہ جانے ان کی شاہراہ پر میں اپنی کون سی خفیہ باتیں کر رہا ہوں۔

لیڈیز اینڈ جنٹلمین۔ نیدرلینڈ دنیا کے ممالک میں سے وہ واحد ملک ہے جس نے اپنا آدھے سے زیادہ علاقہ سمندر سے واگزار کرایا ہے۔ دنیا کے دیگر ممالک کی ہزاروں کلومیٹر زمین سمندر کھا گیا۔ نیدرلینڈ نے ہزار کلومیٹر لمبا علاقہ سمندر کی زمین سے لے کر اس پہ ٹیولپ اور ڈیفوڈلز کے پھول اگا لیے۔ ملک کا زیادہ تر علاقہ ابھی بھی سطح سمندر سے نیچے ہے۔ سمندر کی موج در موج کو انہوں نے یکے بعد دیگرے مضبوط بند بنا بنا کے روکا ہے۔ آج ہم شہر ایمسٹرڈیم جا رہے ہیں۔ یہ شہر انوکھا ہے۔ یہاں سڑکوں کی جگہ گول گول دائروں میں بنی نہریں ہیں۔ نہروں کے کنارے گھر ہیں۔ جگہ جگہ ان نہروں پہ گولائی والے خوشنما پل ہیں جن کے نیچے سے خوش رنگ تیز رفتار کشتیاں بھاگتی پھرتی ہیں۔

ایمسٹرڈیم، نیدرلینڈ کا دارالخلافہ ہے۔ بارہ لاکھ کی آبادی کا یہ شہر دنیا بھر میں آزادی خیال اور جدت بھری تمناؤں بھرے خوابوں کا ایک انمول استعارہ ہے۔ یہاں کی اہم ترین بات اس شہر کا دھیما، شوخ، چنچل اور ہر کسی کو خوش دلی سے قبول کرنے کا مزاج ہے۔ دنیا کی ہر نئی تحریک اس شہر سے پیدا ہوئی۔ وہ "گے" "موومنٹ ہو" "گرین" "لائف سٹائل ہو، بیدہ تھیمیں ہوں، کچھ بھی ہو، خواتین و حضرات! اس شہر میں ہم جنس سے شادی کرنے والوں کو بھی چھوٹ ہے۔ میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر جنرل احسان کی تیز بھی نگاہ سے ڈر گیا اور وہ بات گول کر گیا کہ دنیا بھر میں سب سے پہلا باقاعدہ سرکاری طور پر قائم کیا گیا ریڈ لائٹ ایریا اس شہر میں ہے۔ جہاں حسینائیں شوکیس میں

سلوری بنی کھڑکی ہوتی ہیں اور شوکیسوں میں بڑی قابل قدر نوادرات اشیا کی طرح ان پر پرائس ٹیگ چسپاں ہوتے ہیں۔ اس شہر میں رات بھی نہیں ہوتی۔ رات کو بھی کوئی من چلا نہیں سوتا نہ کسی من چلی کو سونے دیتا ہے۔ رنگا رنگ بھری یہ رات ابھی اس دن کے سورج کے غروب ہونے کی منتظر ہے۔ مگر اس سے پہلے کہ رات ڈھلے میں آپ کو اس شہر اور اس ملک کی تاریخ سے آگاہ کرتا چلوں۔ میں نے یہ کہہ کے پھر جنرل احسان کی طرف دیکھا، جو تاریخ کے نام سے میری طرف سے رخ موڑ کے کھڑکی کے باہر تکنے لگے تھے۔

خواتین و حضرات! اب میں نے نیدرلینڈ کی تاریخ کے کچھ پہلو بتانے کا سوچ لیا۔ مجھے سامنے بیٹھی جین، وہ ساری باتیں کہہ دینے کو کہہ رہی تھی۔ اس کی سبز آنکھوں کی پتلیوں جیسی شفاف حیرت مجھے بات کیے جانے پر اکسا رہی تھی۔ سو جین! میں نے کہا تو نہیں مگر کہہ میں اسی سے رہا تھا۔ اب میں صرف جین سے مخاطب تھا۔ سن سبھی رہے تھے۔ جین تمھارا شہر ایمسٹرڈیم دریائے ایمسٹل اور دریائے آئی جے کے دہانوں پر بنی حسین بندرگاہ ہے۔ بندرگاہ والے ان دریاؤں کے سنگم سے کبھی وہاں نمکین سمندری پانی کی جھیل تھی۔ مگر جب سے تمھارے شہر واسیوں نے سمندر سے نمک نکال کے اسے اپنے شہر کی زمین کا روپ دے دیا ہے، وہ جھیل اب نمکین نہیں رہی۔ اس جھیل کا پانی تمھارے گلابی ہونٹوں پر لگی بام یا مدھم میٹھی لپ اسٹک جیسا میٹھا ہو گیا ہے۔ یہ اسی مٹھاس نے تیرے ہر بول کو میٹھا کر دیا ہے۔

ہاں جین۔ میں سچ کہہ رہا ہوں مائی ڈیئر۔ یہ سرگوشیاں، بولتے بولتے خاموشی کے ان لمحوں میں جین سے بات کر رہا تھا۔ جب جین میری آنکھوں میں دیکھ کے مجھے میرے کہے جانے والے سارے جملے بھلا دیتی تھی۔ وہ کوئی تیس اکیس سال کی میم تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں نیدرلینڈ کی ساری تاریخ تھی۔ وہ مسکراتے مسکراتے نگاہ موڑ کے گرد گرد پھیلے ٹیولپ کے کھیتوں سے ہٹا کے مجھے یک لخت یوں تکتی تو مجھے لگتا فرانس کے نپولین بونا پارٹ نے سرحدوں کو روندتے ہوئے نیدرلینڈ کو فتح کر لیا ہے۔ 1795ء کو نپولین نے ہالینڈ کو زیر کر کے یہاں اپنے چھوٹے بھائی لاؤس کو بادشاہ مقرر کیا تھا۔ جین کی آنکھوں میں فرانسیسی بادشاہ لاؤس کی آنکھوں کی سبز رنگت تھی۔ میرا دل چاہتا تھا میں جین سے پوچھوں، لاؤس نے تمھارے شہر پہ کتنی دیر راج کیا۔ راج بھی کے تاراج کرنے کی خاطر ہوتے ہیں۔ سب گزر جاتے ہیں۔ لاؤس بادشاہ نے نیدرلینڈ، بیلجیم اور لکسمبرگ تینوں کو جوڑ کے ایک بڑا ملک بنا دیا۔ آگے فرانس میں لاؤس کے بھائی نپولین کا راج تھا۔ جرمنی بھی نپولین کی دسترس میں تھا مگر ہر راج کی راہ میں ایک نہ ایک دن باقی ہو جاتی ہے۔ ہالینڈ میں بھی ایک خاموش شہزادہ آ گیا۔ وہ جین کے برابر بیٹھے لاری چلاتے ولیم کا ہم نام تھا۔ کنگ ولیم آف اورنج۔ مالا گمر کا بادشاہ زیادہ باتیں کرنا اسے پسند نہ تھیں۔ خاموشی میں راج کرتا تھا۔ اس لیے پرنس آف سائلنس کے خطاب سے مشہور ہوا اور نج خاندان کا راج آج تک ہالینڈ میں قائم ہے۔ ہالینڈ دنیا کے دیگر ممالک سے یوں بھی مختلف ہے کہ یورپ کے باقی ممالک میں شہنشاہیت کی کوکھ سے جمہوریت نکلی ہے مگر یہاں ری پبلک کے لیے انھوں نے خود آگے شہنشاہیت کا روپ چنا ہے۔ وقت گزرتا گیا۔ 1830ء میں بیلجیم الگ ہوا۔ چند سالوں بعد لکسمبرگ نے بھی علیحدگی چن لی۔ ہالینڈ میں آبادی رقبے سے کہیں زیادہ تھی۔ انھیں زمین کم پڑی تو انھوں نے سمندر سے زمین چرا لی۔ بند باندھ باندھ کے اپنا ملک دوگنا کر لیا۔

تیرھویں صدی میں پہلے پہل پرتگالیوں نے اپنے بحری بیڑے کھلے سمندروں میں ڈالے۔ نکلے تو وہ سب ہندوستان کی طرف تھے مگر کچھ ان میں سے مغرب کی طرف اٹلانٹک کے پار جنوبی امریکہ پہنچ گئے۔ امریکہ میں انھیں نئی سرزمین مل گئی۔ پرتگالیوں کے بعد ان کے پڑوسی سپین والوں نے سمندر پر راج کرنا شروع کر دیا۔ پورے جنوبی امریکہ میں سوائے برازیل کے آج بھی ادھر سارے ممالک سپینش بولنے والے ہیں۔ صرف برازیل میں زبان پرتگالی ہے۔ جسے انھوں نے اپنے ملک برازیل سے جوڑ کے برازیلی بنا لیا ہے۔ مگر

امریکہ میں بھی سپین والوں کی اجارہ داری ہی زیادہ۔ جلد ہی یورپ کے دوسرے ممالک امریکہ فتح کرنے کی اس دوڑ میں شامل ہو گئے۔ فرانس اور ہالینڈ بھی اس دوڑ میں آ ملے۔ آخر میں برطانیہ آیا اور خصوصاً شمالی امریکہ جہاں اب یونائیٹڈ سٹیٹس آف امریکہ اور کینیڈا ہے۔ وہاں برطانوی تسلط قائم ہو گیا۔ شروع میں تو یہ حال تھا کہ شمالی امریکہ کی مشرقی پٹی پہ اسی ہالینڈ کا قبضہ تھا۔ سالہا سال تک موجودہ نیو یارک کا نام نیو ایمسٹرڈیم رہا۔ یورپی جہاں جاتے، جو بھی زمین قبضہ کرتے اسے اپنے کسی شہر کا نام دے دیتے۔ وہ تو بعد میں برطانیہ کے ڈیوک آف یارک نے اپنا بحری بیڑا جب نیو ایمسٹرڈیم کے دہانے پہنچایا تو وہاں کے ڈچ لوگوں نے بغیر لڑے ہتھیار ڈال دیے۔ یوں نیو ایمسٹرڈیم کا نام بدل کے نیو یارک ہو گیا۔ شمالی امریکہ کا باقی علاقہ بھی برطانوی استعمار نے فرانسیسیوں سے خالی کرا لیا۔

امریکہ کی زمینوں میں یورپی لوگوں نے بڑا ظلم کیا۔ کئی صدیوں سے آباد اصل آبادی کو ریڈ انڈین کہہ کے ان سے شیطانی صفات وابستہ کر کے ان سب کو تقریباً ملیا میٹ کر دیا۔ ہزاروں، لاکھوں کی تعداد میں اس دھرتی کے لوگوں کو ایسے تلف کیا جیسے کیڑوں مکوڑوں کو مارا جاتا ہے۔ یورپی لوگوں کے پاس بس ایک فوقیت تھی۔ ان کے پاس بندوق تھی۔ ریڈ انڈین بے چارے تیر کمان، نیزوں، تیروں یا سوٹیوں سے لڑتے تھے، مارے گئے۔ ان امریکی زمینوں سے یورپی لوگوں کو سونے کے ذخائر ملے۔ چاندی ملی، ہیرے جواہرات ملے۔ وہاں سے یورپ کے لیے یہ آلو لائے۔ ٹماٹر بھی وہیں سے ان کو ملا۔ ادھر ہی سے انہیں تمباکو ملا اور پوری دنیا کو یورپ نے سگریٹ پلانا شروع کر دیا۔

دوسرے یورپی ممالک کی طرح ہالینڈ والوں نے بھی مشرق میں بحری بیڑے بھیجے تھے۔ ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر تو فرانسیسی اور بعد میں انگریزوں نے ان کے پیر نہ ٹکنے دیے مگر انہوں نے انڈونیشیا کے تمام جزیروں پہ قبضہ کر لیا اور صدیوں تک انڈونیشیا کو اپنی کالونی بنائے رکھا۔ مشرقی اور مغربی کالونیوں میں ایک بنیادی فرق تھا۔ امریکی سرزمینوں پہ قبضہ کرنے والے تمام یورپی ممالک نے وہاں کے مقامی لوگوں کو صفحۂ ہستی سے تلف کر دیا، مار دیا۔ اب وہاں اپنے کھیتوں، کارخانوں، سونے چاندی کی کانوں اور گھروں میں کام کاج کے لیے انہیں نوکروں کی ضرورت تھی۔ یہ کام انہوں نے افریقہ کے کالے حبشیوں کو غلام بنا کے پورا کیا۔ لاکھوں، کروڑوں کی تعداد میں کالے لوگ افریقہ سے خریدے جاتے۔ مہینوں کا جان لیوا سخت بحری سفر راہ میں ہوتا۔ بہت سے کالے غلام سفر میں مارے جاتے، جو مر جاتے انہیں اٹھا کے سمندر میں پھینک دیا جاتا۔ جو بچ جاتے وہ کوڑے کھاتے، مار کھاتے، گوروں کے کھیتوں، ان کے کارخانوں، گھروں اور سونے چاندی کی کانوں میں کام کرتے۔ تھوڑے سے آلکلاتے گورے ان سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھتے۔ ذرا ذرا سی بات پر انہیں قتل کر دیتے۔ 1971 تک امریکہ میں کالوں کے لیے ہر شہر کے ہر چوک میں پھانسی گھاٹ لگے تھے۔ جہاں کوئی بھی گورا امیر زادہ بغیر روک ٹوک کے اپنے سیاہ فام غلام کو پھانسی پہ لٹکا سکتا تھا۔ مشرق میں یورپی گوروں کو افریقہ سے غلام خرید کے لانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ یہاں ہندوستان کے قرب و جوار میں ہم ہندوستانیوں نے پیٹھ پہ ہاتھ رکھ کے سر جھکا کے گوروں کی غلامی اتنی خوش اسلوبی اور دلی شوق سے کی کہ انہیں کہیں اور سے غلام خرید کے لانے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ یہ غلامی، یہ جی حضوری آج تک جاری ہے۔ نیدر لینڈ کے قرب و جوار، جغرافیے اور تاریخ کی باتیں کرتے کرتے ہم ایمسٹرڈیم کی راہ میں موجود ایک نہر کے کنارے بنے ایک بے حد خوبصورت ریسٹورنٹ میں لنچ کے لیے رک گئے جس کے پاس ہی ایک کھیت میں ایک گوری گھڑ سواری کر رہی تھی۔ (جاری ہے)

◆◆◆

عراق اشک بار ہیں ہم

............6............

سلمیٰ اعوان

چند لمحوں کے انتظار کے بعد جونہی مجھے ان کی واپسی کا احساس ہوا میں نے فوراً آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا۔ تصویریں بنانے کی اجازت مانگی اور ان سے چند لمحے دینے کی بھی درخواست کی۔ یہ باوقار شخصیت ڈاکٹر قاسمی کی تھی۔ وہ روضہ مبارک کے منتظم اعلیٰ تھے۔ مرنجان مرنج سی شخصیت۔ سفید براق داڑھی پر نور چہرے سے جھلکتی محبت اور متانت متاثر کرتی تھی۔ خوبصورت انگریزی بولتے تھے۔ مزار مبارک کے پاس ہی کرسی پر بیٹھ گئے۔

"آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

انہوں نے چہرہ اٹھا کر مجھے غور سے دیکھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اثبات میں سر ہلایا۔ اسکے قریب ہی بیٹھنے کی اجازت ملنے پر میں سامنے قالین پر بیٹھ گئی تھی۔ "کچھ روشنی ڈالیے۔ کچھ بتائیے آپ کی حکمران حالات کو کس تناظر میں دیکھتی ہے؟"

کاش میں ان سے کچھ نہ پوچھتی۔ وہ پھٹ پڑے تھے۔

امریکیوں سے کہیں زیادہ وہ سعودی عرب، اردن، مصر اور دیگر اسلامی ملکوں کی مفاد پرستیوں پر برہم تھے۔ سعودی شاہوں کے وہ لتے لیے تھے انہوں نے کہ میں ان کے لفظوں کو زبان ہی نہیں دے سکتی۔ کاش ڈوب مرنے کیلئے کوئی جگہ ہوتی۔ جنرل ضیاالحق نے فلسطینیوں پر جو ٹینک توپیں چلائی تھیں وہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل سے آگاہ تھے۔ پاکستان کے حکمران کو شرم آنی چاہیے تھی۔ [illegible] اول۔ ابھی تو یہ مقام شکر تھا کہ زرداروں کے زمانے میں عراق فوجیں نہیں بھیجیں۔ شاید نہیں یقیناً یہ اس وقت ابومصعب الزرقاوی کی خوفناک دھمکی تھی جو اسامہ بن لادن کا چہیتا ہونے کے ساتھ ساتھ آئی ایس آئی کا بھی محبوب تھا۔ عراقی مزاحمتی گروہوں کے پس منظر میں زیادہ تر اسی گروپ کی توانائیاں تھیں۔ جس نے قسم کھا کر پاکستان کو پیغام بھیجا تھا کہ اگر تمہاری فوجیں عراق آئیں تو میں ان کا وہی حشر کروں گا جو صومالیہ میں امریکی فوج کا کیا گیا تھا۔

افسوس صد افسوس یہی سب کچھ ہوتا ہے مسلمانوں کے ساتھ جو ہو رہا ہے۔ یاد آیا کہ یہ صدام بوسنیا اور کوسوو میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم پر سربیا کے ملاسووچ کی حمایت کرتا تھا۔ کبھی جو اس کے چھوٹے منہ سے مقبوضہ کشمیر میں ہونے والے بھارتی مظالم پر بھارت کی لعن طعن کے لیے چند لفظ نکلے ہوں۔ افغانستان پر سوویت یونین کے قبضے پر حمایت ہوتی ہے۔ ایران عراق اور خلیجی جنگ میں مرنے والے کون تھے؟ مسلمان۔ ابھی ہوا تھا ان کے ساتھ جو ہوا۔ عراق میں تباہی کے مناظر دیکھیں۔ غریبوں کی لاشوں کی بے حرمتی۔ خدا راضی ہو ہمارے نوجوان رضاکاروں سے جنہوں نے ان کی لاشیں کتے بلیوں سے محفوظ رکھیں۔

درمیانی عمر کا ایک آدمی ان کے پاس آیا۔ ہم ایستادہ ہو کر اس نے دھیمی آواز میں کچھ کہا تھا۔

انہوں نے میری طرف دیکھا اور کہا۔ "معذرت چاہتا ہوں، انجینئر آیا ہے کچھ پوچھنا چاہتا ہے؟"

میں نے کھڑے ہو کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور سب میں خاموش بیٹھی بظاہر محراب و منبر دیکھتی تھی۔ دیواروں پر نظریں گھماتی تھی۔ فانوسوں کی چمک دمک آنکھیں خیرہ کرتی تھی۔ امام اعظم کی زندگی کے چند مزید گوشے سامنے آئے اور آنکھوں کو بھگونے لگے تھے۔

کوفے اور بصرہ کی ممتاز درسگاہوں سے حصول علم کے بعد مدینہ منورہ کا رخ کیا کہ وہ شہر مقدس حدیث کا مخزن بھی تھا اور اس دلبر کی آخری آرام گاہ بھی۔ یہاں علم کے دریا نہیں سمندر بہہ رہے تھے۔ حضرت عطا ابن ابی رباح کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے عقیدہ دریافت کیا۔ جواب دیا۔ میں اسلاف کو برا نہیں کہتا۔ گناہ گار کو کافر نہیں کہتا اور قضا و قدر کا قائل ہوں۔

جب یہ پڑھا تھا، یہی بات قربان ہونے کو جی چاہتا تھا۔ واہ کیسی روشن خیالی تھی۔ یہاں ہمارے مولوی اور علما حضرات کہ جو دین کو گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں۔ جسے چاہیں پل بھر میں کافر قرار دے دیں اور جسے چاہیں مسلمانیت کی سند عطا کر دیں۔ دین پر ان کی اور ان کے نظریات کی اجارہ داری۔

خلیفہ منصور نے بغداد کی بنیاد رکھی تو اپنی پوری مملکت سے نامور گرامی کاریگر، ماہر تعمیرات اور جید ریاضی دان بلوائے کہ عمارتیں اصول ہندسہ کے مطابق تعمیر ہوں۔ ان ماہرین کا افسر اعلیٰ امام ابوحنیفہ تھے۔ امام اعظم نے ایک ایک اینٹ شمار کرنے کی بجائے لکڑی کے لمبے پیمانوں سے اینٹیں ماپنے کا طریقہ رائج کیا۔ بعد میں اکائی کا طریقہ رائج ہوا۔

مدینہ منورہ میں اس وقت حدیث و فقہ میں کمال حاصل کرنے والے صرف دو افراد زندہ تھے۔ ایک سلیمان اور دوسرے سالم بن عبداللہ۔ ان دونوں کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنے علم میں نئے باب کے اضافے کیے۔

امام اعظم کے بارے میں ایک بات مشہور تھی کہ دین میں نئی نئی باتیں نکالتا ہے۔

مدینہ منورہ میں امام باقر بھی آپ کے بارے میں ایسی باتیں سن چکے تھے۔ ایک بار ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تعارف کے مرحلے سے گزرے۔ انہوں نے بغور انہیں دیکھا پھر فرمایا "تو اچھا تم ہو ابوحنیفہ۔ وہی ابوحنیفہ جو قیاس کی بنیاد پر ہمارے جد کی حدیثوں سے اختلاف کرتا ہے۔" آپ نے انتہائی ادب سے جواب دیا۔

"معاذ اللہ! حدیث کی مخالفت میں کیسے کر سکتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو کچھ پوچھنا چاہتا ہوں؟"

حضرت امام باقر نے رضامندی کا اظہار کیا تو آپ نے سوال کیا۔ "مرد ضعیف ہے یا عورت۔"

"عورت" حضرت امام باقر کا جواب تھا۔ "وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا۔"

آپ کا دوسرا سوال تھا۔ "مرد کا۔" امام باقر کا جواب تھا۔ "اگر میں اپنے قیاس کا سہارا لیتا تو یہ کہتا کہ عورت کا زیادہ حصہ ہونا چاہیے کیونکہ ظاہری قیاس کی بنیاد پر ضعیف اس رعایت کا زیادہ حق دار ہے۔" امام باقر نے فرط مسرت سے آپ کی پیشانی پر بوسہ دیا۔ اور طویل عرصہ اپنے ساتھ رکھا اور حدیث و فقہ کے سلسلے میں بہت سی نادر معلومات دیں۔

پھر اٹھی اور جالیوں سے لگی۔ انہیں دیکھنے کی کوشش کی۔ میں نے خود کو سناتے ہوئے کہا تھا۔ تو یہاں وہ شخص آرام فرما ہے جس

نے جابر سلطان کے سامنے ہمیشہ کلمہ حق کہا۔ منصور نے آپ کو قاضی کے عہدے کی پیش کش کی۔ معذرت کرتے ہوئے کہا "میں اس ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کا اہل نہیں۔" منصور نے طیش میں کہا۔ "تم جھوٹ بولتے ہو۔" امام جواب دیتے ہیں۔ "جھوٹا شخص قاضی جیسے منصب کا اہل نہیں ہوتا۔" پیشے کے اعتبار سے آپ کپڑے کے بہت بڑے تاجر تھے۔ ریشمی کپڑا خود بناتے بھی تھے۔ مختلف شہروں اور ملکوں میں ان کا کاروبار تھا۔ عام لوگوں سے میل ملاقات کے مواقع کثرت سے ملتے تھے۔ اسی لیے لوگوں کی روش، ان کے عمومی رویے، ان کی ضروریات، ان کے معاشی اور معاشرتی مسائل اور تقاضوں سے ذاتی طور پر آگاہ رہتے تھے۔ اسی لیے مجتہد مسائل میں عوامی رجحانات اور فطری مزاج کے مطابق فیصلے دیتے تھے۔ اس غرض کیلئے ان کے ہاں مجلس مشاورت تھی۔ مجلس کے سامنے مسئلہ پیش ہوتا۔ بعض اوقات اس پر ہفتوں بحث و مباحثہ چلتا۔ طویل بحث کے بعد جس بات پر سب کی رائے متفق ہوتی اسے امام ابو یوسف کتاب اصول میں درج کرتے۔

امام اعظم اپنے اراکین بورڈ کی باقاعدہ فکری تربیت اور رہنمائی بھی کرتے۔ یہ اس تربیت کا نتیجہ تھا کہ فقہا کی ایک جماعت تیار ہوگئی۔ فقہ حنفی کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان ائمہ کے مختلف اذہان سے جب ایک مسئلہ منقح ہو کر نکلتا تو اس کی حیثیت فرد واحد کی سوچ اور فکر سے مختلف ہوتی۔ قرآن حکیم میں ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کی وسعت سے زیادہ احکام کا بار اس پر نہیں ڈالا بلکہ وہ انسانوں کیلئے تنگی اور عسرت کو نہیں آسانی کو پسند کرتا ہے۔ کاروباری اصول اور دیانت آج کے چور اچکے راتوں رات امیر بننے کے خواہاں تاجروں کیلئے لمحۂ فکریہ ہے۔ ایک دن ایک عورت ایک قیمتی تھان لائی۔ اس نے اسے فروخت کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ آپ نے قیمت دریافت کی۔ خاتون نے سو درہم بتائے۔ آپ نے فرمایا۔ "کپڑا تو بہت قیمتی ہے۔ دام کم کس لئے بتا رہی ہو؟" خاتون بولی۔ "چلئے دو سو درہم سمجھ لیجیے۔" آپ نے کہا۔

"خاتون محترم اس کی قیمت کسی طرح بھی پانچ سو درہم سے کم نہیں۔"

عورت پریشان ہو گئی۔ "آپ مذاق کر رہے ہیں؟" اس نے کہا۔

"ہرگز نہیں۔ میں خرید لیتا ہوں اسے۔" پانچ سو درہم اس کے حوالے کئے۔ اصول تو ایسے ہی تھے۔ ان کے ہاں گھاٹے کا کوئی سوال نہ تھا۔ کاروبار روز افزوں عروج پر رہا۔ نیت ٹھیک تھی نا۔

جب اخلاق کے ساتھ باہر آئی بیرونی دیوار کے حسن کو گو کہ چند لمحے دیکھتی رہی۔ بڑے اور چھوٹے دروازوں کی خوبصورتی کو بھی سراہا۔ کافی دیر ارد گرد کے جائزے میں گزار دی۔ یہ محلہ ان کے نام ہی پر محلہ حنفیہ کہلاتا ہے۔ ملحقہ ایک بہت بڑا اسکول بھی ہے۔ سلجوقی بادشاہ ملک ابو سعد الخوارزمی نے 1066 میں تعمیر کروایا۔ مزار کا گنبد بھی انہی کی یادگار ہے۔

رخصت ہونے سے قبل میں نے بہت دکھ سے جیسے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔ "میرے بہت پیارے امام اعظم یہ بندی آپ کی بہت شکر گزار ہے۔"

میں نے اس عظیم ہستی کو خراج پیش کرتے ہوئے عمارت کے حسن کو پھر دیکھا تھا۔ تاریخ بغداد میں یہ واحد عمارت ہے جو بغداد شہر کے عروج و زوال کے المیوں کے باوجود ابھی تک اپنی پوری استقامت سے کھڑی ہے۔ ہلاکو خان کے ہاتھوں سے بچی۔ نادر شاہ نے بغداد پر حملے کے دوران خود اس کا خیال رکھا۔ اسے سلاطین عثمانیہ نے سنوارا۔ اسے جابر صدام نے بھی نوازا۔ وسیع و عریض مسجد کے

خوبصورت قالین اسی کی طرف سے بچھائے گئے تھے جو ابھی بھی اس کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ اس مرد حق کو منصور نے جیلوں میں رکھا، بیڑیاں پہنائیں، وہ واردات بھی تاریخ کے سینے پر نقش ہے جب منصور نے آپ کو زہر دیا تھا۔

اس سیاہ واردات کے پچھلے پہر اگر علم کا ایک دروازہ بغداد کے بندی خانے میں بند ہو رہا تھا تو دوسرا دروازہ رات کے آخری پہر بیت المقدس کے قریب ایک خوبصورت بچے امام شافعی کی صورت میں کھل رہا تھا۔ ہوائیں ابھی بھی گرمی سے لدی پھندی تھیں۔ البتہ دھوپ کے رنگ سونے میں گھل گئے تھے۔ عمارتوں، گھروں اور کھجور کی چوٹیوں پر بکھرا یہ سونا ماحول کو عجیب سی فسوں خیزی دے رہا تھا۔ یہ شہر کی ہی فسوں خیزی سچائی کے راستے پر ان کی استقامت کا بتاتی تھی۔

تین دن تک نماز جنازہ وہیں پڑھی جاتی رہی۔ خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را۔ اور جب میں گاڑی میں بیٹھی میں نے کہا تھا۔ "اتفاق قرب وجوار میں جتنے بھی اللہ کے برگزیدہ لوگوں کے مزار مبارک ہیں ان کا دیدار کروا دو۔ فاتحہ خوانی ہو جائے۔"

گردوغبار سے اٹے پڑے راستوں کو دیکھتے ہوئے میں بڑی دکھی سی تھی کہ بغداد اللہ کے نیک اور پسندیدہ لوگوں کا مسکن۔ اس پر تو وہ مثال صادق کرے بنت الغداد تو بچے سے ولی درویش بر آمد۔ تاہم یہ بھی مقام شکر کہ سڑکیں گلیاں کشادہ تھیں۔ گاڑی چالو بھی تھی اور موڑ بھی سہولت سے کٹ رہے تھے۔ وہ در پہ گھر گندگی اور کھچی کا نمونہ تھے۔ اللہ کے پسندیدہ لوگوں کے آستانے تو صدیوں پرانے تھے اور انہی جگہوں پر تھے۔ زمانے کے ستم رسیدہ ہاتھوں نے جانے کتنی بار انہیں تکلیف پہنچائی۔ آبادیاں بنیں اور مسمار ہوتی رہیں۔ سلطنت عثمانیہ نے بھی تعمیر کی۔ سے ملک کے طور عراق تو اپنی استقامت کی گھمن گھیریوں میں الجھا رہا۔ ان پر کیا توجہ دیتا۔ گھروں کے اوپر بجلی کی موٹی موٹی تاروں کا بے ہنگم سا پھیلاؤ دیواروں میں کھلے [illegible] کی ہیئتیں عجیب سے کوفت بھرے تاثر کو پیدا کرتی تھیں۔ جمیلہ ہاشمی کی دشت سوس کے صفحات دماغ میں پھڑپھڑاتے تھے۔ کہیں انا الحق کی آوازیں کانوں میں گونجتی تھیں۔ کہیں وقت کے علماء سے تصادم کے منظر ابھرتے تھے۔

تاریخ کی ایک اہم ہستی کہاں بسیرا کیے ہوئے ہے؟ اگر زرد اینٹوں والی دیوار کی پیشانی نیلی اور فیروزی ٹائلوں سے تحریر زمانوں پرانی تحقیق حضور الحلاج کے نام کو نمایاں کرتے ہوئے ہوتی تو مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ملحقہ گھر اور گلی کی گندگی دونوں بہت سے سوال کر رہی تھیں۔ مگر ہم تیسری دنیا کے ملکوں کا اپنے قابل فخر ورثوں کے ساتھ بے اعتنائی کا یہی المیہ ہے۔

دروازہ ذرا سا دھکا دینے سے کھل گیا۔ سامنے بڑے سے برآمدے نما چھوٹی دروازے والی ایک اور عمارت تھی۔ اندر دو غیر ملکی خواتین تھیں۔ بھاری بھرکم وجود والا متولی انگلش ملی انگریزی میں باتیں کر رہا تھا۔ کمرے میں سیلن تو نہیں تھی مگر گھٹن کی مہک کا راج تھا۔ اپنے بارے میں بتایا۔ فاتحہ پڑھی اور باہر آ گئی۔ متولی نے بخشش [illegible] کیلئے میری طرف دیکھا ضرور مگر چونکہ میری بجائے زیادہ موٹی اسامیاں پیش نظر تھیں اس لئے کچھ پرواہ نہ کی۔ کچھ ایسا ہی حال حضرت جنید بغدادی کے مزار مبارک کا تھا۔ کچا پکا راستہ ویسے ہی مٹی کوڑے کرکٹ سے اٹا پڑا۔ مرکزی دروازے کی سفید رنگت بھی ماند ہوئی پڑی۔ گیٹ سے ملحقہ دیوار پر نیلے حروف میں مرقد جنید بغدادی لکھا ہوا اور ساتھ ہی کچرے کے ڈھیر پڑے ہوئے۔ دائیں ہاتھ دیوار کے ساتھ قبر بنی تھی۔ "یا اللہ" لمبی سانس کھینچی تھی۔

اندر داخل ہوئی۔ چلو شکر کہ یہاں صفائی ستھرائی بہتر تھی۔ اور گرد و درختوں کی چھاؤں تھی۔ بیلوں کی فراوانی تھی۔ سبزے کی بہتات

طبیعت کو شاداب کرتی تھی۔ لوہے کی راڈوں میں پھنسا پڑا سا بورڈ رہنمائی کرتا اور بتاتا تھا کہ یہاں مدرسہ بھی ہے۔ جامع مرقد الشیخ الجنید بغدادی و مرقد شیخ سری السقطی ہے۔

مزار کھلا تھا۔ میں اندر گئی۔ استاد اور شاگرد دونوں کیلئے باری باری فاتحہ پڑھی۔

تھوڑی دیر کیلئے بیٹھی تو اس عظیم ہستی کی زندگی کے بہت سے پڑھے ہوئے گوشے جھلملانے لگے تھے۔ ابن ساباط والا واقعہ تو مثالی تھا۔ ابن ساباط عراق کے بدنام ڈاکوؤں، قاتلوں اور بدمعاشوں کا سرغنہ جس کی زندگی جیلوں میں گزری تھی۔ قتل کی سزا سے اس نے اپنے کو اپنے سو ساتھیوں کے نام بتانے پر بچایا تھا پر اس بدعہدی، بے وفائی اور ساتھیوں سے غداری نے اس کے نامۂ اعمال کو اور داغدار کر دیا۔ قید کے دوران ایک رات وہ بھاگ نکلا۔ بغداد کے گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے وہ چوری کیلئے ایک شاندار سے گھر میں داخل ہوا جہاں کپڑوں کے تھان پڑے تھے۔ وہ انہیں اٹھانے کے منصوبوں میں تھا جب کوئی دبے پاؤں مشعل کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ آنے والے نے شفقت بھرے لہجے میں اسے اپنے تعاون کی پیشکش کی۔ ابن ساباط نے بھی اپنی طرح کا چور سمجھا اور گٹھڑ اس کے سر پر لدوا کر کسی محفوظ ٹھکانے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں کئی بار سستی سے چلنے پر ڈانٹ ڈپٹ بھی کی۔ ابن ساباط کو کسی محفوظ جگہ پہنچا کر رخصت چاہی تو پتہ چلا کہ وہ تو مالک مکان تھا۔ اور یہ حضرت جنید بغدادی تھے۔ ابن ساباط کو جہاں چالیس (40) برس تک دنیا کی خوفناک اور بدترین سزائیں نہ بدل سکیں وہاں اس عظیم ہستی کی محبت، قربانی اور ایثار نے کایا کلپ کر دی۔ شیخ احمد بن ساباط کا شمار حضرت شیخ جنید بغدادی کے قابلِ فخر فقراء میں ہوتا تھا۔ آپ کا کہنا تھا کہ ابن ساباط نے وہ راہ لمحوں میں طے کر لی جو دوسرے برسوں میں طے نہیں کر سکے۔ میں نے اپنے بڑے بیٹے کا نام جنید رکھا تھا۔ میں ان سے بہت متاثر تھی۔ یہ بہت خوبصورت اور شہ زور تھے۔ حلیم بھی بڑے تھے مگر جب خدا کا کرم ہوا تو صدر یہ حلیم الشیخ بن گئے۔ مجھے اس کا نام مختصر نہیں رکھنا چاہیے تھا وہ شاید اسی لیے بہت غصیلا ہے۔

شکر ہے مزار پُروقار تھا۔ دونوں کے مزار مبارک کے تعویذ خوبصورت منظر دے رہے ہیں۔

بغداد کی مقدس سرزمین نبیوں، ولیوں، خدا کے پیارے لوگوں کی آماجگاہ۔ مجھ جیسی گنہگار بھی حاضری سے خانہ پُری کر رہی تھی۔

حضرت معروف کرخی کے دربار میں حاضری ہوئی۔ نفل پڑھے۔ یہ بھی وہیں قریب ہی ملتے ہیں۔ ایک دوسرے سے متاثر، ایک دوسرے کے شاگرد، استاد۔ امام احمد بن حنبل امام شافعی کے حلقۂ درس میں شامل ان کے شاگرد حنبلی مسلک کے امام معتزلہ (قرآن مخلوق ہے) جیسے عقیدے کو تسلیم نہ کرنے پر مامون اور اس کے بھائی معتصم باللہ کی قیدوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرنے والی ہستی۔ بغداد اور اس کے نبی کی سچی عاشق۔ بغداد کے بہت سے لوگ حنبلی عقیدے کے پیروکار ہیں۔ میں نے یہاں فاتحہ کے ساتھ عصر کی نماز بھی ادا کی۔

اس علاقے کے کچھ حصے نسبتاً بہت خوشحال نظر آتے تھے۔ سڑکیں کشادہ، درختوں کی بہتات اور بازار شاندار تھے۔ کچھ درمیانی بود و باش والے اور کچھ ماٹھے سے تھے۔ یہاں بھی ہر گھر میں اور شاہراہوں کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں اسے ہی نصب تھے۔

خوبصورت دل کش لڑکیاں کہیں عبایا پہنے، کہیں اسکرٹ پر لانگ شرٹ پہنے بالوں کے جوڑوں پر چمکتے رنگوں والے سکارف پہنے دکانوں کے اندر آ جا رہی تھیں۔ سائیکل چلاتے مرد، موٹر سائیکل اڑاتے نوجوان، کہیں مجمع گریوں کے ریڑے، کہیں چوبی سیڑھیوں میں بیٹھے اٹھتے خوش پوش سے آدمی جنہیں دیکھ کر نہ صرف ہنسی آ گئی بلکہ بغداد میں اپنا پہلا دن بھی یاد آیا۔ ایک جگہ میں نے عورتوں کو بڑی بڑی سینیوں میں عراقی پیسٹریاں سروں پر اٹھائے لے جاتے دیکھیں۔ وہی ہمارے ہاں والا منظر کہ جیسے سوہن کے تھال حلوائی کی دکانوں پر جاتے

ہیں۔ ایک دو جگہ میں نے عورتوں کو پانی کی بالٹیاں اٹھائے پانی لے جاتے دیکھا۔

منظروں میں کتنی یکسانیت تھی۔

(۲)

کمرے میں بچھے گہرے سرخ خوش رنگ پھولوں سے بنے قالین پر وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے۔ دونوں کی عمروں میں بس تھوڑا ہی فرق ہوگا۔ دونوں اپنی عمروں کے حسابوں بڑے خوبصورت تھے۔ سرخ و سفید چہروں پر گھنی چھوٹی داڑھی جن میں سفید بالوں کی کثرت تھی۔ چہرے مہرے سے بھی اچھی قامتوں والے۔

گزشتہ رات جب ہم سعدون سٹریٹ سے گزرتے تھے۔ یہاں رات جوان تھی۔ افلاق ونڈسکرین سے سڑک پر ٹریفک کے اژدہام کو دیکھتا تھا اور میں سعدون سٹریٹ کی جولانیوں کو۔ دفعتاً وہ سوال لبوں پر آیا جو میرے اندر سالوں سے تھا۔ بارہا جواب بھی کچھ ادھر ادھر سے مل گیا تھا پر تشنگی برقرار تھی۔ حالات اور مواقع میسر آئے تو اندر سے نکل آیا کہ "عراقی فوج پیشہ ورانہ تربیت کے لحاظ سے اتنی ماٹھی نہ تھی اور جدید ہتھیاروں سے بھی لیس تھی تو پھر اتنی جلدی بغداد ڈھے کیسے گیا؟"

ہم اب کاظمین کی طرف بھاگے جاتے تھے۔ گاڑی چوتھے گیئر میں ڈالتے ہوئے افلاق میری طرف دیکھے بغیر بولا۔

پہلی بات امریکی ڈالروں میں بہت کشش ہے اگر ایمان کمزور ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ماشاء اللہ سے مسلمانوں میں غداروں کی کبھی کمی نہیں رہی۔ دوسرے حکمران بھی کچھ اتنا پسندیدہ نہ تھا۔ میرے خیال میں سب سے بڑی اور اہم بات ہمارے صحرائی کئی بڑی کشش کے حامل تھے۔ انہیں لالچوں اور دھونسوں سے سمجھداری اور دانائی سے بچایا جا سکتا تھا جس کی بہرحال ہمارے پاس اشد کمی تھی۔ یہ تو موٹی موٹی باتیں ہیں۔ تفصیلی اندرونی کہانیاں آپ سننی ہیں تو ذرا دلیری اور دیدہ دلیری کی ضرورت ہے جو میرے خیال میں آپ میں ہے۔ فوج کے ایک ریٹائرڈ کرنل جو صدام کی خصوصی انٹیلی جنس سیل میں بڑا معتمد تھا سے مل لیجیے جو واقعات کے عینی شاہد ہیں۔ سوالوں کے جواب تفصیلات کے ساتھ مل جائیں گے۔

"خطرے والا معاملہ ہے کیا؟" میں نے اندر کی گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے لہجے کو نارمل کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں پر القاعدہ اور دیگر عسکری گروہوں کے ساتھ ہمدردیاں تو ہیں نا ان کی۔"

لمبے ڈرائیو مکمل ہو گئے۔ پانچواں دن تھا اور ہر صبح ہوٹل میں میرے باہر نکلنے سے پہلے مروان کوئی دس بار تاکید کرتا تھا۔ احتیاط کا دامن نہیں چھوڑنا۔ میں نے افلاق کو دیکھا۔ اندر کی تیز دھڑکنوں پر قابو پایا۔

"اوپر خدا اور نیچے تم تو ڈر کس بات کا؟ جہاں جہاں سے جو جو مل سکتا ہے وہاں وہاں لے چلو۔ سفر تو کھوٹا ہوا۔"

"چلیے میں رابطہ کرتا ہوں۔ کل پر رکھیے۔"

ٹیکسی سینٹر پر اپنے عبایا کو سنبھالتی اور سر کے ڈوپٹے کو ٹھیک کرتے میں نے زمین پر قدم رکھا۔ افلاق نے دروازہ بند کیا اور میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی چھاتی پر روز کی طرح بوسہ دیتے ہوئے میں نے حسب معمول سو ڈالر کا نوٹ اس کی جیب میں ڈالتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا۔

(جاری ہے)

◆◆◆

انٹرویو

افسانہ نگار اور صحافی ''احمد ندیم قاسمی''

اظہر جاوید

ایک معتبر نام ـــ باوقار شخصیت، شعر و ادب کا مان ـــ رواں صدی کے لیے جیتے ''احمد ندیم قاسمی''۔
شاعر، افسانہ نگار، نقاد، صحافی، ایک اہم سرکاری ادبی اشاعتی ادارے کے سربراہ ـــ غزل کہی تو پورے بانکپن کے ساتھ ـــ نظم کو بھی کمال کا درجہ دیا ـــ افسانہ نگاری کو ان کے نام سے اعتبار ملا ـــ تنقید میں شائستگی اور تہذیب کو رواج دیا ـــ صحافت میں متانت کی بنیاد رکھی اور طنز و مزاح لکھا تو اعتدال کے ساتھ ـــ اعتدال کی حدوں سے دور بچوں کا ادب تخلیق کیا تو بچپن کی شگفتگی اور تازگی کو سمو کر۔

یہ بات پورے دعوے کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اردو ادب میں اتنی ہمہ صفت اور ہمہ گیر کوئی اور شخصیت نہیں ہوئی۔ دوسری زبانوں کے معلوم ادب میں بھی ایسی کوئی ہستی نظر نہیں آتی۔ اس ادبی عہد کو عہدِ ندیم کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ احمد ندیم قاسمی نے جس طرح کم و بیش ساٹھ برس سے قلم کی حرمت کو عظمت دی، اپنے فن سے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے اور اپنی مشفقانہ تربیت سے سینکڑوں نئے لکھنے والوں کو اعتبار بخشا ہے۔ یہ کام، یہ خدمت کسی ادارے نے کم کم کی ہوگی۔

21 نومبر 1917ء کو پنجاب کے ایک دور افتادہ گاؤں انگہ (ضلع سرگودھا) میں پیدا ہونے والے احمد شاہ، اب احمد ندیم قاسمی کی حیثیت میں ساری دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔ وہ علاقہ اب بھی پس ماندہ ہے، تصور کریں، پون صدی پہلے، یعنی اسی نوے سال پہلے وہاں کیا عالم ہوگا اور پھر یتیم گھرانے کے احمد شاہ کو بی۔ اے کرنے اور احمد ندیم قاسمی بننے کے لیے کن کن کٹھنائیوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ اپنے شفیق چچا کی سرپرستی میں انھوں نے بہاول پور سے گریجویشن کی اور پھر خود کو وقت کے سمندر میں دھکیل دیا۔ ایک تشویش ناک بیماری اور طویل بیکاری کے بعد جب انھیں محکمۂ آبکاری میں انسپکٹری کی ملازمت ملی تو جوش ملیح آبادی نے پیغام بھیجا ''بے کاری سے آبکاری بھلی''۔

امتیاز علی تاج کے والد سید ممتاز علی کے بچوں کے رسالے ''پھول'' اور اسی ادارے کے جریدے ''تہذیبِ نسواں'' کے مدیر رہے۔ براڈ کاسٹنگ کارپوریشن (ریڈیو) پر پروڈیوسر ہوئے۔ سالہا سال تک روزنامہ ''امروز'' کے ایڈیٹر رہے۔ سعادت حسن منٹو کے ایما پر ایک فلم کے گیت لکھنے (1944-1945ء) دہلی گئے۔ ان گیتوں کا معاوضہ پانچ سو ملا، جس سے بقول قاسمی صاحب ـــ انھوں نے پہلی بار کوٹ پتلون سلوائی اور سوٹ پہنا۔ جنگِ عظیم دوم کے شدید اثرات جب متحدہ ہندوستان تک پہنچے تو مذکورہ فلم کے پروڈیوسر نے ارادہ ترک کر دیا۔ کوئی تیس برس پہلے بننے والی ممتاز علی شاعری فلم ''اوری'' میں مکالمے لکھے اور معروف فلم ساز اور موسیقار ایس گل نے اپنی ایک فلم میں احمد ندیم قاسمی کے دو گیت شامل کیے۔ مشہور فلم ''کرتار سنگھ'' ان کے افسانے ''پرمیشر سنگھ'' کا روپ ہے اور ''وحشی جٹ'' نامی فلم ان کے افسانے ''گنڈاسا'' سے ماخوذ تھی۔ جس کا بعد میں اعتراف ہوا۔

احمد ندیم قاسمی کے اب تک نو (9) شعری مجموعے اور پندرہ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی ہوئی ان کی

کہانیوں اور ریڈیائی ڈراموں کی گیارہ کتابیں لکھی ہیں۔ تہذیب و فن کے نام سے مضامین کا مجموعہ چھپا ہے۔ جس میں نظریہ پاکستان کے پس منظر محرکات اور موجودہ حالات میں اس کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔ ان کے طنزیہ مزاحیہ کالموں "حرف و حکایت" کا کڑا انتخاب "کیسر کیاری" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ پنجابی زبان کی شاعری ابھی پس منظر میں ہے۔ احمد ندیم قاسمی کے فن پر اب تک چار کتابیں مرتب ہوئی ہیں، "افکار" کراچی کے ضخیم ندیم نمبر کے علاوہ ایک ڈاکومنٹری فلم ــــ اے لونگ لیجنڈ (A Living Legend) بھی تیار ہو کر اہل فن اور نیازمندان ندیم سے داد پا چکی ہے۔ احمد ندیم قاسمی اب کئی برس سے مجلس ترقی ادب کے ڈائریکٹر ہیں اس ادارے کے تحت شعر و ادب کی کلاسیکی اور تحقیقی کتب شائع ہوتی ہیں۔ یہ بھی "الٹی وہ کم جاب" ہے۔ مگر ان کی قابل رشک جواں ہمتی کا یہ کمال ہے کہ اس کے ساتھ کم و بیش تین دہائیوں سے اپنا عہد ساز اور اسلوب گر رسالہ "فنون" بھی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مشاعروں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں۔ ادبی محفلوں کی صدارت کے لئے وقت نکال لیتے ہیں اور بے شمار کتابوں پر فلیپ اور تقریظ بھی تحریر کرتے رہتے ہیں۔

چشم بد دور ــــ اتنی بھرپور زندگی گزارنے والے اس بیاسی سالہ جواں عزم قلم کار کے نہ لہجے میں تھکن ہے، نہ سوچ میں بڑھاپا آیا ہے اور نہ مزاج میں بزرگانہ چڑچڑاپن ــــ "اخبار جہاں" کے لئے ان سے جب یہ گفتگو ہو رہی تھی تو انہیں کپکپی سے بخار چڑھ رہا تھا۔ فلو کی وجہ سے گلا خراب تھا مگر چونکہ وہ وعدہ کر چکے تھے، وقت دے چکے تھے، اس لئے پوری وضع داری اور نہایت مروت سے ڈیڑھ دو گھنٹے تک گفتگو کرتے رہے۔ حسب معمول بیچ میں چٹکلے بھی چھوڑتے رہے، آنے والے مہمانوں کو خوش آمدید کہتے رہے ــــ چائے سے تواضع کرتے رہے اور دفتر کے کارکنوں میں عیدی بھی بانٹتے رہے۔ ماشاء اللہ حافظہ اتنا اچھا ہے کہ برسوں پہلے کا واقعہ انہیں اپنے پورے سینریو (منظر نامہ) کے ساتھ لفظ بہ لفظ یاد ہوتا ہے۔ اپنی زندگی سے وابستہ کوئی بھولا ہوا لطیفہ بھی دوبارہ سنائیں گے تو کئی چاشنی کے ساتھ ــــ حاضرین محفل قہقہے لگائیں گے لیکن ان کی ذاتی زیر لب معصوم سی مسکراہٹ بکھر رہی ہوگی۔ ہاں کبھی کبھی لہجہ جوانوں جیسا شوخ ہو جاتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی پچھلے پانچ سات برسوں میں زندگی کے بہت المناک حادثوں سے گزرے۔ ان حادثوں نے انہیں اندر سے توڑ پھوڑ دیا مگر انہوں نے ان سارے غموں کو، ان سانحوں کے کرب کو اندر ہی سمو لیا۔ اپنے متعلقین پر اس کی پرچھائیں تک نہیں پڑنے دی۔ ان کے فن میں سوز اور بھی گمبھیر ہو گیا اور شعروں میں غم سے سچ ان کے ساتھ آنے لگا۔ ان کی منہ بولی بہن خدیجہ مستور کا انتقال ہو گیا۔ رفیقہ حیات وفات پا گئیں۔ خدیجہ اور ظہیر بابر کی جواں سال بچی کرن اور کچھ ہی عرصے بعد ان کی اپنی جوان بیٹی ڈاکٹر ناہید ڈاکٹروں کی لاپرواہی سے مر گئیں اور پھر ــــ سب سے بڑا صدمہ ان کا دوست اور رفیق بھائی جیسا ظہیر بابر انتقال کر گئے۔ احمد ندیم قاسمی نے یہ سب یوں سہہ لیا کہ ان کے ردعمل میں ان کے ہاں نہ کوئی تلخی آئی ہے نہ جھنجھلاہٹ ــــ یہ ایک عظیم انسان کے بڑے ظرف اور حوصلے کی بات ہے۔ ہمہ جہت پہلو شخصیت احمد ندیم قاسمی سے سوال کیا جائے کہ انہیں اپنا کون سا رخ پسند ہے، تو وہ فوراً کہتے ہیں شاعر ــــ!! غزل گو شاعر یا نظم کا شاعر ــــ؟ ایک اور سوال تھا۔ احمد ندیم قاسمی نے اسی متانت سے جواب دیا ــــ شاعر ــــ اپنی کیفیت کی بات ہوتی ہے کہ وہ کبھی غزل تخلیق کرتی ہیں یا نظم ــــ یہ کوئی شعوری کوشش نہیں ہوتی۔ شاعری کے امکانات بہت وسیع ہیں۔ میں آج کی شاعری سے بھی مطمئن ہوں اور اردو شاعری کے مستقبل سے بھی پُرامید ہوں۔ البتہ یہ ضرور خیال ہوتا ہے کہ شاعروں کو اپنی کتاب یا مجموعہ چھپانے میں جلدی نہیں کرنی چاہئے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے، چار پانچ سال بعد پلٹ کر دیکھیں تو عجلت میں کمی ہوتی اور چھپائی شاعری کمزور محسوس ہوتی ہے۔ میرا قطعات کا

مجموعہ "دھڑکنیں" کے نام سے چھپا تھا۔ کچھ برس بعد میں نے اپنے کئی قطعات اور ان کے کئی مصرعے تبدیل کر دیے تھے۔ مگر ایک تقریب، جو میرے لئے مری میں منعقد ہوئی، اس میں جمیل ملک نے مضمون پڑھتے ہوئے کتاب کے پہلے ایڈیشن والے قطعات کا حوالہ دینا شروع کیا تو میں بہت شرمسار ہوا۔ بعد میں جمیل ملک نے بتایا کہ ان کے پاس پہلا ایڈیشن ہی تھا۔

احمد ندیم قاسمی نے تسلیم کیا کہ کتابوں کی رونمائی کی تقریبات نے بھی ادب میں سہل نگاری پیدا کر دی ہے۔ زیادہ تر، یہاں تعریف ہی میں مضمون پڑھے جاتے ہیں۔ اسی طرح طلب نگاری کا معاملہ۔ "ندیم صاحب ــــ ایک لمحے کو رکے اور خود ہی نہایت سچائی سے کہا ــــ میں کوشش کرتا ہوں کہ کم سے کم جھوٹ بولوں۔ توجہ، لگن اور محنت کے بغیر چھپی ہوئی کتابوں، بیشتر اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں اور دھڑا دھڑ چھپنے والے ادبی اخبارات نے ادب کو کرپٹ کر دیا ہے۔ اگر یہ اخبارات ادبی تجربوں اور ادب کی ترویج کے لئے ہوں تو صحت مند روایت ہو مگر ان میں ایسے ایسے خود ساختہ سکینڈل گھڑ کر چھاپ جاتے ہیں اور کوئی بھی جونیئر کسی بھی سینئر کے خلاف جو جی میں آئے، کہہ دیتا ہے ــــ اس سے ادب، جو تہذیب اور شائستگی کا دوسرا نام ہے، تخریب ہونے لگتا ہے۔ میں اپنی بات نہیں کرتا کہ میرے بارے میں ایسے اخبارات نے کیا کچھ چھاپا۔" ندیم قاسمی نے قدرے ملال سے کہا۔ "افسوس تو یہ ہے، شاعرات اور ادیب خواتین کو بھی نہیں بخشا جاتا۔"

سوال کیا ــــ "مشاہدے میں آیا ہے کہ کسی شخص نے آپ کے خلاف بہت طومار باندھے۔ اپنے تئیں آپ پر کیچڑ بھی اچھالنے کی کوشش کی۔ مگر کچھ عرصے بعد آپ نے اسے معاف کر دیا۔ اس وقت آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟"

ندیم صاحب نے بڑے اطمینان سے کہا ــــ "جب کوئی عزت نفس سے کھیلتا ہے تو تکلیف ضرور ہوتی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں، معاف کر دینا سب سے بڑی نیکی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ــــ" انہوں نے ذرا سے توقف سے کہا۔ "بشریت کا تقاضا ہے کہ دو تین لوگ ادب میں ایسے بھی ہیں، جنہیں میں زندگی بھر معاف نہیں کر سکتا!" ان کا اشارہ جس طرف تھا، ادبی معاشرے سے باخبر لوگ اس کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ لہٰذا کریدنے اور ان کے نام بلوانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بدلتے ہوئے حالات ساری دنیا میں اور اس خطے میں بھی نہ صرف ادب پر بلکہ شاعری پر بھی اپنے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ ایک اور سوال کے جواب میں انہوں نے بتایا کہ غزل کا کینوس تنگ ہے۔ یا اس کی روایتی پابندیاں بھی حائل ہوں۔ پھر بھی وقت کی جدید قدریں پوری طرح غزل میں بھی شامل ہو رہی ہیں۔ نظم میں تو جدید علوم اپنی پوری آگاہی کے ساتھ داخل ہو گئے ہیں۔ سائنس کی ترقی، کمپیوٹر، سٹلائیٹ چینل اور ٹیکنالوجی نے جتنا آج کی نسل کو سکھایا ہے، میرے عہد کے لوگوں کو کہاں نصیب تھا۔ میں تو دس سال کا تھا، جب میں نے پہلی بار بائیسکل دیکھا اور اس کے بھی کئی برس بعد ریل گاڑی دیکھی۔ دو تین دہائیوں سے جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، اور اس صدی کے آخری عشرے میں علوم نے جتنی ترقی کی ہے۔ میں نے اس کو پیش نظر رکھ کر کئی سال پہلے یہ شعر کہا تھا:

یہ زمیں، یہ خلا کی رقاصہ — آدم نو کے انتظار میں ہے

حالات کے بدلنے کی بات چلی تو بھارت سے موجودہ تعلقات کا ذکر آیا اور یہ کہ اس کے حوالے سے ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات ادب پر کیسے مرتب ہوں گے؟ یہ بھی استفسار کیا گیا تو احمد ندیم قاسمی نے دوٹوک انداز میں جواب دیا۔

"اس سلسلے میں میرا موقف بڑا واضح ہے اور ایک بار نہیں، میں کئی بار لکھ کر واضح کر چکا ہوں کہ ہم جنگ کے تو خلاف ہیں مگر امن مشروط طور پر

اور شکست خوردگی کی حالت میں قبول نہیں کریں گے۔ ادھر ہوں یا ادھر، میں نے امن دعاؤں کی مکمل کر مخالفت کی تھی۔ لیکن اگر ہمارے حکمران یہ یقین کر آ نہیں تعلقات قائم کرنے کے لئے بڑے مسئلے کو (کشمیر کے مسئلے کو) بعد میں حل کیا جائے گا۔ پہلے چھوٹے چھوٹے مسئلوں کو ختم کرکے ہونی چاہئے، میں اس سوچ کے خلاف ہوں۔"

"سب سے پہلا بڑا مسئلہ کشمیر کا مسئلہ حل ہونا چاہیے۔ اور یہ سب کچھ دوستانہ ماحول میں اور امن و آشتی سے بھی ہو سکتا ہے۔"

"سوال یہ پیدا ہوتا ہے" اسی بات کو دوسرا رخ دیتے ہوئے پوچھا گیا —— "آج جو کچھ ہو رہا ہے، کیا اس کا ادب پر کوئی واضح اثر مرتب ہوگا؟" "بعض اوقات حالات کا فوری ردعمل ہوتا ہے۔" ندیم صاحب نے جواب دیا اور کبھی کبھی کئی سال گزر جاتے ہیں اور پھر ان اثرات سے بڑا ادب تخلیق ہوتا ہے۔ روس پر نپولین کے حملے کے پچاس برس بعد ٹالسٹائی نے (جنگ اور امن) War and Peace جیسا عظیم ناول لکھا۔ دوستی ہو جانے اور بھائی چارے کے تعلقات کے بعد 65، اور 71، کی جنگوں میں تخلیق کیے ہوئے ادب کا کیا حشر ہوگا؟ —— کیا ہم اسے مانیں گے —— (Own)؟ کریں گے؟)۔ احمد ندیم قاسمی نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا۔ "میں تو Own کروں گا۔" میرا ایک شعر ہے۔

میں محبت کا محبت سے تو دیتا ہوں جواب
اور اعدا کے لئے قہر و قیامت ہوں میں

اسی گفتگو کے پس منظر میں احمد ندیم قاسمی کے مضامین (جو کتابی صورت میں چھپ گئے ہیں) "تہذیب و فن" کا ذکر آیا۔ انہوں نے کہا، میں نے کسی مصلحت کا شکار ہوئے اور کسی کمپلیکس میں مبتلا ہوئے بغیر کھل کر نظریۂ پاکستان کو اجاگر کیا ہے۔ اب بھی، اسی سلسلے کی دوسری دو کتابیں جو آ رہی ہیں، ان میں بھی پاکستانیت کا پرچار ہے اور اس بات پر فخر و افتخار محسوس کیا ہے۔" پاکستانیت کا ذکر ہوا تو سوال کیا —— کیا ہمارے ادب کی کوئی واضح پہچان ہے؟"

ندیم صاحب کا جواب تھا۔ بالکل ہو چکی ہے۔ نظم و نثر کیا، ہماری غزل بھی اپنے پاکستانی لہجوں کی وجہ سے صاف پہچانی جاتی ہے۔ یہاں شاعری ریاضت کی طرح ہوتی ہے۔ ہندوستان کے بیشتر شاعر صرف مشاعروں کی شاعری کرتے ہیں۔ شعر والوں نے تو باقاعدہ سامعین سے داد کے لئے عرض گزارش کی جاتی ہے۔ اور قسم قسم کے نعرے کیے جاتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کی بات چلی تو ندیم صاحب کا جواب اثبات میں تھا کہ یہ سوچ آج بھی اپنے پورے بانکپن کے ساتھ زندہ ہے۔

"کیا اسی تیس کی دہائی والے جذبے کے ساتھ ...؟"

"جی ہاں۔" احمد ندیم قاسمی نے جواب دیا۔ بلکہ میں تو محسوس کرتا ہوں کہ آج کے لکھنے والوں نے بھی اس سوچ کو ہی اجاگر رکھا ہے۔ یہ دعویٰ ترقی پسندوں ہی کا نہیں، مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے نظم کہنا ترقی پسند شاعروں سے سیکھا ہے۔

افسانہ نگاری کی تاریخ آپ کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ دیہات نگاری زیادہ اجاگر ہو کر آپ ہی کے افسانوں میں آئی اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ آپ کے افسانے الحمدللہ، انگریزی، روسی، جاپان اور کئی دوسرے غیر ملکی زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکے ہیں۔ کیا آپ افسانہ نگاری سے مطمئن نہیں۔ پچھلے کئی سال سے آپ نے کوئی نیا افسانہ نہیں لکھا ——؟

طویل سوال کو احمد ندیم قاسمی نے تحمل سے سنا اور کہا ——

یہ کہا جاتا ہے کہ اردو افسانہ پچھلے کچھ سال میں زوال کا شکار رہا ——— دراصل علامت خصوصاً تجریدیت نے افسانے کے اندر سے کہانی کو خارج کر دیا۔ اس میں ہمارے اسلام آباد والے افسانہ نگار پیش پیش رہے۔ وہ خود بھی اب واپس حقیقت نگاری کی طرف آ گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں، ہر افسانے میں علامت تو ہوتی ہے۔ مگر ان میں کردار علامت بنتے ہیں۔ چیخوف، موپساں، منٹو، کرشن چندر، ان کی کہانیاں دیکھیں، یا میری جن کہانیوں کا آپ نے حوالہ دیا ہے، ان میں کردار ہی علامت بن کر ابھرے ہیں۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ حیدرآباد (پاکستان) میں مقیم ایک نقاد نے میری کہانی ''الموات'' کو نہایت ''معمولی کہانی'' قرار دیا ہے اور اس میں سے کئی عیب نکالے ہیں۔ حالانکہ آپ بھی اسے افسانوی کہانیوں میں شمار کر رہے ہیں، اور یہ بھی حوالہ دے رہے ہیں کہ دنیا کی کتنی زبانوں میں اس کا بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔''

''اس وقت بارہ کہانیاں میرے ذہن میں کلبلا رہی ہیں۔ بس ذرا سی فرصت کی بات ہے۔ ان میں سے تو چار پانچ کہانیاں شروع بھی کر رکھی ہیں۔'' انہوں نے افسانے کے ساتھ اپنی رفاقت پکی کرتے ہوئے کہا۔ ''اور کالم نگاری ———؟''

''طنز و مزاح کے کالم لکھنے تو میں نے چھوڑ دیئے ہیں۔ اب جو اخباری کالم لکھ رہا ہوں یہ سیاسی، سیاسی اور معاشرتی اقتصادی مسائل پر ہوتے ہیں۔ ممکن ہے ان کا بھی کسی وقت ''حرف و حکایت'' کے کالموں کے انتخاب ''کیسر کیاری'' جیسا کوئی انتخاب ہو سکے!

''اپنا کون سا افسانہ سب سے اچھا لگتا ہے ———؟'' ''کسی ایک کا ذکر کروں گا تو باقیوں کے ساتھ نا انصافی ہوگی ——— ''انہوں نے صاف اور کھرے لہجے میں جواب دیا۔

برسوں سے آپ ادبی رسالہ ''فنون'' چھاپ رہے ہیں۔ کیا آپ محسوس نہیں کرتے کہ یہ کار بے سود ہے؟''

''نہیں، انہوں نے ایک لمبی سانس لے کر کہا '' آپ خود بھی کم و بیش اتنے ہی عرصے سے ایک ادبی رسالہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ رسالے کو زندہ رکھنے میں بہت مشکلات آتی ہیں، آتی رہتی ہیں، بددل بھی کرتی ہیں۔ حوصلے بھی توڑنے لگتی ہیں۔ مگر میں یوں محسوس کرتا ہوں کہ جیسے میں ایک دریا کے کنارے بیٹھا ہوں اور ہاتھ میں چھلنی لئے ریت چھان رہا ہوں۔ کہیں نہ کہیں سے کوئی ایک سونے کا ریزہ چمک پڑتا ہے بس یہی حاصل ہوتا ہے۔ ہر بار جب بھی ''فنون'' کا نیا شمارہ شائع کرتا ہوں، تو ایک دو ایسے نوجوان شاعر اور ادیب لڑکے یا لڑکیاں سامنے آتی ہیں، جن میں بہت زیادہ امکانات ہوتے ہیں اور دس بارہ برس میں وہ اپنا ایک قبت مقام بنا لیتے ہیں۔ یہ میرے لئے بہت اطمینان بخش ہوتا ہے اور اسی وارفتگی سے میں رسالہ شائع کئے جا رہا ہوں۔

''ندیم صاحب، آپ نے دو ایک بار علامہ اقبال پر بھی تنقید کی ہے ———؟''

''جی'' ندیم صاحب نے اپنے دھیمے لہجے میں کہا۔ میں سمجھتا ہوں اچھے آدمیوں میں بھی کوئی نہ کوئی کمی رہ ہی جاتی ہے ——— ہم اقبال ہی کے نظریات کے مقلد ہیں۔ ملائیت سے دشمنی ——— سامراجیت سے دشمنی اور جاگیرداری سے نفرت ——— مگر حیرت کی بات ہے کہ اقبال، جارج پنجم کا قصیدہ لکھتے ہیں۔ ''ضربِ کلیم'' کو نواب بھوپال کے نام معنون کرتے ہیں اور اشعار کے نیچے رقم کرتے ہیں کہ نواب بھوپال کے شیش محل میں لکھے گئے۔ یہ کہا کہ ——— غالب نے بھی قصیدے لکھے تھے، مگر اس دور میں قصیدہ شاعری کا اور شاعری زندگی کا حصہ تھے۔ اقبال جیسے بالغ نظر اور جدید سوچ کے شاعر سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی ——— مجھے اقبال کی اس سوچ سے اختلاف ہے۔

ادب اور حکومت کے تعلق کا ذکر آیا تو ندیم صاحب نے کہا ——— ادب کسی بھی حکومت کی ترجیحات میں شامل نہیں۔ عام ادیبوں

یا ادب کی خدمت کی بات تو رہنے دیں، مجلس ترقی ادب کا معاملہ لے لیں۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز میں جب بھی اسے ملنے والی حکومتی گرانٹ کو بڑھانے کا دعویٰ کیا گیا اسے کسی نہ کسی بہانے کم کر دیا گیا ——— مجلس ترقی ادب کلاسیکی کتابیں بھی کم قیمت پر چھاپنے کا کام کر رہی ہے۔ گرانٹ کم ہونے پر کتابوں کی اشاعت کیا ملازمین کی تنخواہیں بھی پوری نہیں ہوتیں ——— اگر مشتاق قادر فاؤنڈیشن والے دو لاکھ کا عطیہ نہ دیتے تو مجلس ترقی ادب کا حال اور بھی مندا ہوتا ——— احمد ندیم قاسمی کہتے ہیں حکومت کلچر کا ذکر تو بہت کرتی ہے مگر یہ نہیں جانتی کہ کسی ملک کا کلچر وہاں کے اہل قلم اور کتابوں کے توسل ہی سے زندہ رہتا ہے ——— ادب اور ادیب ہی زبوں حالی میں ہوں گے تو کلچر (ثقافت) کیسے پنپ سکے گا؟

(انجم جاوید کے پرانے کاغذات سے بازیافت۔ غالباً یہ تحریر 1990ء کے عشرے کے آخر میں یا 2000ء کے عشرے کے اوائل میں لیا گیا ہے)

◆◆◆

"تخلیق" مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہے

کراچی	**سٹی پریس بک شاپ** (پروپرائٹر: اجمل کمال) مدینہ سٹی مال آفس نمبر 316 تھرڈ فلور کراچی (0300-8259082)
لاہور	**ایسٹ بک ڈپو** (پروپرائٹر: محمد عظیم) B-6 مال روڈ لاہور (0320-4343588)
لاہور	**اظہار سنز** (پروپرائٹر: سید محمد علی انجم رضوی) 19 اردو بازار لاہور (0300-4106357)
لاہور	**سنگ میل پبلی کیشنز** (پروپرائٹر: افضال احمد) 25 شاہراہ پاکستان لوئر مال لاہور (0300-8470143)
لاہور	**سلطان نیوز ایجنسی** (پروپرائٹر: محمد آفتاب) اکبر مارکیٹ 1- میو ہسپتال روڈ لاہور
فیصل آباد	**شمع بُک ڈپو** (پروپرائٹر: محمد اکمل) بیرون جھنگ بازار فیصل آباد (0300-6670134)
گوادر	**قندیل نیوز ایجنسی** (پروپرائٹر: شبیر شاکر) پشکان ضلع گوادر بلوچستان (0322-3761579)

جدید شاعری و مصوری پر پروین شیر سے مکالمہ

نثار احمد صدیقی (انڈیا)

اصلی نام — پروین شیر — ادبی نام — پروین شیر — تاریخ و جائے پیدائش — 25 ستمبر پٹنہ (بہار)
پہلی تخلیق — 12 سال کی عمر میں پہلی نظم ہوئی اور پہلی مصوری بھی۔

کتابیں :۔ o "کرچیاں" (شاعری، مصوری) پہلا ایڈیشن 2005ء میں۔ o "نہال دل پر سحاب جیسے" شاعری، مصوری کا دوسرا مجموعہ 2010ء میں۔

صدیقی : اپنی زندگی کے ذاتی و ادبی کوائف بتائیے۔

پروین : عظیم آباد کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔ والد سید فضل اللہ قادری معروف مفکر، فلسفی و دانشور، مسلم لیگ کے لیڈر اور زمیندار تھے۔ میں 6 سال کی تھی کہ وہ اس دنیا کو چھوڑ گئے۔ والدہ ہی میرے لئے ماں بھی تھیں اور باپ بھی۔ خالو پروفیسر اختر اورینوی مشہور تنقید نگار اور مصنف تھے۔ انہوں نے میرے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔ 12 سال کی عمر سے شاعری، مصوری، موسیقی اور افسانے لکھنے کا شوق ہوا۔ جہاں شادی ہوئی وہاں بھی علم و ادب کا ماحول تھا۔ خسر سید احسن شیر خدا بخش لائبریری کے سکریٹری تھے اور پٹنہ میوزیم کے کیوریٹر۔ 1933ء میں انگلینڈ میں علامہ اقبال سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ 15 سال کی عمر میں مصوری کے مقابلے میں مجھے پہلا انعام ملا تھا۔ اس کے فوراً بعد کینیڈا آگئی شادی ہو کر۔ یہاں آکر یونیورسٹی آف منی ٹوبا سے فائن آرٹس کی تعلیم حاصل کی۔ پھر مصوری کی نمائش رفتہ رفتہ شروع کر دی۔ ساتھ ہی اپنی تین اب سے اہم تخلیقات تین بچے: صبا، شیراز اور فراز کو سنوارنے لگی۔ میری پہلی نظم 1980ء رسالہ "شمع" میں شائع ہوئی تھی۔ بہت کم سنی سے اپنی زبان و تہذیب سے دوری نے مجھے ان سے اور قریب کر دیا۔ یہاں بین الاقوامی مشاعروں میں علی سردار جعفری، قمر رئیس، احمد فراز، رئیس امروہوی، ستیہ پال آنند وغیرہ کی حوصلہ افزائی سے تخلیقیت کو جاری رکھا۔ تیسرا شعری مجموعہ مصوری کے ساتھ اور سفرنامہ مصوری کے ساتھ شائع ہونے والا ہے۔

صدیقی : آپ ایک شاعرہ اور مصورہ دونوں ہیں۔ بحیثیت شاعرہ آپ الفاظ سے اور بحیثیت مصورہ رنگوں سے اپنے خیالات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرتی ہیں۔ لیکن آپ کی شاعری میں بھی کہیں مصورانہ خیالات نظر آتے ہیں جو خالص ادبی نقطۂ نظر سے غلط ہے۔ آپ اس کے متعلق کیا کہیں گی؟

پروین : مصورانہ خیالات شاعری میں اور شاعرانہ خیالات مصوری میں، میرے خیال میں یہ فن کا حسن ہے۔ معتبر ادبی نقادوں کا کہنا ہے۔ قلم رنگ بکھیرے، تصویریں بنائے اور موقلم الفاظ کا جادو دکھائے۔ تخلیق کی خوبصورتی یہی ہے۔ پیکر آفرینی کے بغیر شاعری کیسے ہو سکتی ہے! مصورانہ خیالات اور امیجری تو شاعری کی جان ہے۔

صدیقی : آپ شاعرہ اور مصورہ دونوں ہیں، لیکن ان دونوں میں آپ کو کس سے زیادہ دلچسپی ہے اور کیوں؟

پروین : جذبات کے دھارے کو باہر نکلنے کا کوئی بھی راستہ ملنا چاہیے۔ خواہ وہ قلم ہو یا موقلم۔ کبھی یہ دھارے قلم کے ذریعہ بہہ نکلتے ہیں تو کبھی موقلم کے ذریعہ۔ کبھی یہ راستہ قرطاس کی طرف جاتا ہے تو کبھی کینوس کی طرف۔ دونوں میرے لئے اہم ہیں۔ دونوں میرے جذبات کی ترجمانی میں یکساں ہیں۔ دونوں میرے سہارے ہیں اور اپنی بانہوں میں سمیٹے رہتے ہیں۔

صدیقی : گنیش پائن، ایم آر اچریکر، عبدالرحمن چغتائی اور طیب رائے، یہ سب بین الاقوامی آرٹسٹوں میں شامل ہیں۔ آپ کو ان آرٹسٹوں کی پینٹنگ میں کیا خاص بات نظر آتی ہے، تفصیل سے جواب دیں؟

پروین : میں ایک تخلیق کار ہوں۔ اس کا جواب ایک نقاد زیادہ بہتر دے گا۔

صدیقی : ہندوستانی والدین جنسی تعلیم کے خلاف ہیں، کیا آپ بھی اس کے خلاف ہیں؟ اگر خلاف نہیں ہیں تو پھر آپ کی کوئی نظم یا پینٹنگ اس موضوع پر کیوں نہیں ہے؟

پروین : میں اس کے خلاف نہیں ہوں بشرطیکہ یہ تعلیم سائنس کے قواعد اور اصولوں کے مطابق دی جائے جیسے یہاں اسکولوں میں دی جاتی ہے۔ یہی کینیڈا ہے۔ میرے گھر کا ماحول اور پرورش یہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اس موضوع پر شاعری اور پینٹنگ نہیں کی۔ جنسی تعلیم الگ چیز ہے اور اس موضوع کو پینٹ کرنا یا اس پر شاعری کرنا الگ۔ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی۔

صدیقی : کیا مغربی شاعری کے زیرِ اثر اردو میں غزل کی اہمیت کم ہوتی جا رہی ہے؟ آخر کیوں؟

پروین : میں نہیں سمجھتی کہ اردو میں غزل کی اہمیت کبھی کم ہو سکتی ہے۔ دنیا میں یہ ایک منفرد صنفِ سخن ہے۔ اس کی اپنی ایک پہچان ہے۔ وقت کے ساتھ پرانے استعاراتی نظام اور لفظیات میں تبدیلی ضرور آئی ہے لیکن اس کی وجہ مغربی ادب نہیں بلکہ وقت ہے۔ مغرب کا کوئی اثر غزل نے قبول نہیں کیا۔

صدیقی : آج یورپی ممالک سے ادب میں کون سے نئے رجحانات سامنے آئے ہیں اور اس عہد میں اردو ادب پر اس کے کیا اثرات پڑے ہیں؟

پروین : مغربی ممالک کے ادب روایتوں کو توڑ چکے ہیں۔ عریانی کی حد اور اخلاق کی حد نہ ہونے سے اظہار کی آزادی ہے۔ میرے خیال میں اردو ادب پر بھی اس کا اثر ہوا ہے اور بے سمتی پیدا کی ہے مغربی ادب نے۔

صدیقی : جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نام پر جو شاعری اور کہانیاں لکھی جا رہی ہیں اس سے آپ کہاں تک متفق ہیں؟

پروین : میرے نقطۂ نظر سے سچا فنکار یہ نہیں سوچتا کہ وہ کس خانے میں فٹ ہوتا ہے۔ وہ کیا ہے، کیوں ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ صرف تخلیقیت کی آگ ہوتی ہے اور بس۔ نقاد کسی خانے میں رکھ دیں، سچا فنکار ان خانوں پر دھیان نہیں دیتا۔

صدیقی : ڈاکٹر مظفر حنفی نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ زبیر رضوی ایک اچھے مدیر، ندا فاضلی اچھے شاعر اور گلزار ایک اچھے فلمی نغمہ نگار ہیں۔ آپ اس جملے سے کس حد تک متفق ہیں؟

پروین : ندا فاضلی کی طرح زبیر رضوی اور گلزار دونوں کو میں سب سے پہلے بہترین شاعر گردانتی ہوں۔ اس کے بعد یہ جو بھی ہیں ضرور بہت اعلیٰ ہیں۔

صدیقی : آزاد غزل، نثری غزل سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کریں۔

پروین : غزل کی جو اپنی ایک صنف ہے اسے کیوں بگاڑا جائے؟ اس کو اسی میں رہنا بہتر سمجھتی ہوں۔ اس پر جو تجربے ہوئے ہیں وہ ادھورے اور ناکامیاب رہے۔

صدیقی : کیا یہ سچ ہے کہ اردو دنیا میں شاعری کے مقابلے فکشن زیادہ مقبول ہے؟

پروین : میرا تو خیال ہے فکشن سے کہیں زیادہ شاعری مقبول ہے۔ برسوں پرانی شاعری کی گونج آج بھی ہر جگہ زندہ ہے لیکن فکشن نہیں، ہے بھی تو کم کم۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ شاعری کو گلوکار بھی زندہ رکھتے ہیں۔

صدیقی : نثری نظم کی موجودگی میں نثر و نظم کے متعلق حد فاصل کھینچنا ممکن ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو نثری نظم کو کس خانے میں رکھیں گے؟

پروین : نظم تو نظم ہے اور نثر نثر ہے۔ نظم استعاروں سے پر ہوتی ہے نثر میں یہ بات نہیں ہو سکتی۔ شاعری اپنے قواعد کا استعمال کرتی ہے کہیں سے بھی شروع ہو سکتی ہے لیکن نثر نہیں۔ اس لئے نثری نظم کو بھی نظم ہی کے خانے میں رکھا جائے گا۔

صدیقی : اگر نثری نظم سنجیدہ شعری اظہار ہے تو اس کی شناخت کے تنقیدی وسائل کیا ہوں گے؟

پروین : وہی ہوں گے جو نظم کے ہوا کرتے ہیں۔

صدیقی : فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید اور ساجدہ زیدی کی شاعری کے متعلق اپنے تاثرات تفصیل سے دیں۔ ان شاعرات کی شاعری میں کیا خوبی یا خامی ہے؟ نشاندہی کریں۔

پروین : میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں نے فہمیدہ ریاض اور ساجدہ زیدی کو زیادہ نہیں پڑھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں کینیڈا کے بہت دور دراز شہر ونی پیگ میں رہتی ہوں، جہاں اردو کی کتابیں حاصل کرنا آسان نہیں۔ کشور ناہید کی شاعری کے موضوعات جنسی تعصب کی ناانصافیاں ہیں جو اکثر شاعرات کے یہاں ہیں، لیکن ان کے یہاں اظہار کا طریقہ کار منفرد ہے۔ مرد اساس معاشرے کے جبر سے ان کی دل تراش فریاد ایک طاقت بن کر سامنے آتی ہے۔ تخلیقی پہلو میں بلند آواز ہی کا حصہ ہے۔ تیز ان کی، بے جھجک نسوانی اظہار، جرأت، فکری سچائی و حقیقت ان کے یہاں بھرپور ہے۔ انہوں نے عورتوں کے مسائل اور ان پر کی گئی ناانصافیوں اور تشدد کو اپنی اس نظم میں حسن و خوبی اظہار کیا ہے۔

گھاس تو مجھ جیسی ہے / گھاس بھی مجھ جیسی ہے / پاؤں تلے بچھ کر ہی زندگی کی مراد پاتی ہے
ذرا سر اٹھانے کے قابل ہو / تو کاٹنے والی مشین / اسے مخمل بنانے کا سودا لئے / ہموار کرتی رہتی ہے
عورت کو بھی ہموار کرنے کے لئے / تم کیسے کیسے جتن کرتے ہو / نہ زمین کی نمو کی خواہش مرتی ہے نہ عورت کی

ان کی نظموں میں ایسی ہی بلند آوازیں ہیں جیسے نظم "جاروب کش" اور "میری ماں" وغیرہ۔ پروین شاکر کے یہاں محبت کے نازک نسوانی احساسات کی جھنکار ہے۔ ساتھ ہی مرد اساس معاشرے کے جبر سے دھیمے دھیمے لہجے میں آہ و فریاد بھی ہے۔ پروین شاکر کی نظم "میں نے چاند دیکھا" میں محبت کے تجربات لکھے ہیں:

نہ میں نے چاند دیکھا / اور نہ کوئی تہنیت کا پھول کھڑکی سے اٹھایا / مرا ملبوس اب بھی فلیجا ہے / حنا سے ہاتھ خالی
اور چوڑی سے کلائی / نہ میرے پاس تم تھے / اور نہ میرے شہر سے گزرے / میں کیا الماس لگاتی رنگ اور خوشبو پہنتی
چاند کی جانب نظر کرتی / کہ میری لذت دیدار تو تم ہو / مرا تیوہار تو تم ہو

جو تخلیقات ذاتی تجربات پر مبنی ہوں ان کے اظہار اور بیان میں تجربات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ کشور ناہید اور پروین شاکر کے یہاں یہی صورت حال ہے۔ کاش میں نقاد بھی ہوتی تو ان شاعرات کی خامیوں پر آپ کے سوال کا جواب دے سکتی۔

صدیقی : اردو دنیا میں شاعرات کی کمی کیوں کر ہے؟ اس کی کوئی خاص وجہ؟

پروین : صرف اردو دنیا میں ہی نہیں پوری دنیا میں یہی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ انہیں جنسی تعصب کی ناانصافیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر معاشرے میں عورتوں کا درجہ کمتر رہا۔ ہر شعبے میں وہ پیچھے رہیں۔ گرچہ انسانیت کو دو حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ ادب، مصوری اور موسیقی میں یہ تعصب صدیوں سے رہا اور 1550ء کے پہلے مصور عورتوں کو کوئی نمائندگی نہیں ملی۔ مشرق میں برسوں پہلے عورتوں کا شعر کہنا معیوب تھا۔ اردو دنیا میں اس کی اور وجہ طبقۂ نسواں کی گھریلو ذمہ داریاں بھی ہیں۔

صدیقی : عالمی سطح پر اردو کی کیا حیثیت ہے؟

پروین : دکھ تو یہی ہے کہ عالمی سطح پر اردو کی جو حیثیت ہونی چاہیے وہ نہیں ہے۔ جب ہندوستان و پاکستان ہی میں ٹھیک نہیں تو عالمی سطح پر کیا کہا جائے؟ جو زبان ذریعہ معاش ہو اسی کی حیثیت بڑھ جاتی ہے۔ اگرچہ ہر جگہ اردو کی بہبودی کے لئے کامیاب کوششیں جاری ہیں اور رہیں گی۔

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2015 تک

ماہنامہ "تخلیق" اب تک چار "تخلیق ایوارڈ" دے چکا ہے

1	2012ء	جناب شفیع عقیل صاحب	(کراچی)	021-34816655
2	2013ء	جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب	(لاہور)	0334-9719278
3	2014ء	محترمہ بانو قدسیہ صاحب	(لاہور)	0333-4221870
4	2015ء	محترمہ قمر جہاں صاحب	(امریکہ)	001-3109870978

طنز و مزاح

بچے دو، دو ہی اچھے

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

حکومت نے نعرہ دیا "بچے دو ہی اچھے۔" خوشاب کے فیض ملک (حقیقی نام نہیں) نے اپنا جمہوری حق استعمال کرتے ہوئے اس میں انتہائی سود مند ترمیم کر کے اسے یوں مکمل کیا "بچے دو، دو ہی اچھے۔" یعنی ایک دفعہ میں دو بچے دنیا میں رونق افروز ہوں، نہ کم نہ زیادہ۔ اس طرح دو کا پہاڑا پڑھتے رہو ___ جب تک سانس تب تک آس۔ یہی پہاڑا پڑھتے ہوئے ملک صاحب دو گیارہ 22 تک پہنچ چکے ہیں۔ بیوی بچاری کو "بچے" کام پر لگا کر گھر کے چھوٹے موٹے کام (جن میں بچوں کی پرورش بھی شامل ہے) فیض ملک نے اپنی ساس کے حوالے کر دیے ہیں اور اس طرح اس نے ایک مقبول محاورے کے ساتھ بھی چھیڑ چھاڑ کر کے اسے یہ عملی شکل دی کہ "جب تک ساس تب تک آس"۔ بہت عرصے قبل مقبول مزاح گو (سعید آغا) نے آبادی کے حوالے سے اپنے ایک قطعے میں ایک فنی مسئلے کی نشاندہی کی تھی جسے ہمارے ملک صاحب نے بحسن و خوبی حل کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

اک ایسا ایڈ دیکھا ہے مرے بچوں نے ٹی وی پہ — بہت تکلیف میں ہوں میں کہ میرے چار بچے ہیں
وہ مجھ سے پوچھتے ہیں "کون سے والے ہیں دو اچھے؟" — حکومت کا ہے یہ نعرہ کہ دو بچے ہی اچھے ہیں

فیض ملک پنجاب کے ضلع خوشاب کا باسی ہے اور سبزی اور آئس کریم کی ریڑھی لگاتا ہے۔ یہ اس کا پیشہ ہے اور "وہ" اس کا فرض (آپ چاہیں تو اسے الٹ کر پڑھ لیں تیجہ وہی "قسمت" برآمد ہوگا) جو پچھلے گیارہ سال سے ہو رہا ہے۔ دونوں میاں بیوی کے حوصلے شاہ پر ہیں۔ خاص طور پر فیض ملک کا حوصلہ پاک چین دوستی کی طرح پہاڑ سے زیادہ بلند، سمندر سے زیادہ گہرا اور فولاد سے زیادہ مضبوط ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ابھی تو پارٹی شروع ہوئی ہے۔ دو ٹیمیں مکمل ہو گئی ہیں "نیوٹرل" امپائر کے ساتھ جس میں کھیل سکتی ہیں۔ کسی باہر والے امپائر کی انگلی اٹھنے کا انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میچ فکسنگ بھی ہوئی تو فکر کی بات نہیں۔ گھر کا مال گھر میں رہے گا اور گھر کا راز آئی سی سی کی پہنچ سے کوسوں دور۔ کوئی فیض ملک کی مالی حالت کے تناظر میں اس کی "تخلیقی" صلاحیتوں پر طنز کرتا ہے تو وہ برملا علامہ اقبال کا یہ شعر (بہ تحریف) پڑھ کر اس کا منہ بند کر دیتا ہے:

یہ شہادت گہِ "خلافت" میں قدم رکھنا ہے — لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

سچی بات یہ کہ ہم اپنے لوگوں کی قدر نہیں کرتے۔ فیض ملک اگر یورپ کے کسی ملک میں ہوتا تو عوام اسے سر آنکھوں پر اور حکام عجائب گھر میں بٹھاتے جہاں اس کی نمائش پر باقاعدہ ٹکٹ لگتا۔ بے ثمر جوڑے اس سے ہاتھ ملا کر ہی "ثمر قند" ہو جاتے لہٰذا مصافحہ یا معاوضہ حکومت کی آمدنی میں اضافہ کا ذریعہ بنتا۔ اس کے بچوں کے جوڑے ہر سال پیدا ہوتے ہی قومیا لیے جاتے۔ اس طرح اس پر ان کی کفالت کا بار بھی نہیں پڑتا۔ ویسے یہ بات لائق تحسین ہے کہ کفالت کا بار اس غیور شخص نے اب بھی کسی پر نہیں ڈالا ہے۔ نہ ہی وہ دوسری شادی کا قائل

ہے۔ وہ تو ایک بیوی اور ایک ریڈ پر قانع ہے۔ ایک نے اس کی "زراعت" اور دوسری نے "معیشت" کا بھرم رکھا ہوا ہے۔ ایک پرانا لطیفہ یاد آیا۔ ایک پاکستانی بھائی اپنے [illegible] بچوں کے ساتھ لندن کے چڑیا گھر کی سیر کر رہے تھے۔ جب وہ شیر کے پنجرے کے سامنے پہنچے تو بچوں کو یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ شیر وہاں نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ پنجرے کے اندر واقع اپنے "ڈبل بیڈ روم" میں مسز شیر کے ساتھ قیلولہ کر رہا تھا (آخر جانوروں کے بھی جذبات اور پرائیویٹ اوقات ہوتے ہیں)۔ پاکستانی نے ایک گارڈ سے التجا کی کہ بچوں کی دل پشوری کی خاطر، تھوڑی دیر کے لیے "انگریز شیر" کو باہر لا کر انہیں اس کا جلوہ دکھا دے۔ گارڈ نے حیرت سے پوچھا "کیا یہ سب آپ کے بچے ہیں؟" اس نے ہاں میں سر ہلایا تو گارڈ نے کہا "او کے، میں شیر کو لاتا ہوں تاکہ وہ آپ کی زیارت کر لے۔" جب وہ دونوں "میاں بیوی" پنجرے سے جھنجلائے ہوئے باہر نکلے تو پاکستانیوں کی پلٹن دیکھ کر شیر نے انگریزی میں زوردار دھاڑ ماری۔ دھاڑ سن کر پاکستانی نے اپنے بچوں کو ڈانٹا "دیکھو تمہاری ضد نے اس بے زبان کے آرام میں خلل ڈالا تو یہ غصے میں چیخنے لگا۔" "یہ بات نہیں ہے" گارڈ نے دھاڑ کا ترجمہ کیا "دراصل وہ اپنی "مسز" کو غیرت دلا رہا ہے۔" فیصل ملک خوشاب کی مجموعی آبادی میں اپنے [illegible] کردار پر فخر نہیں کرتا۔ قصبے والے اس کی مدد تو کوئی نہیں کرتے الٹا اس سے "ڈومور" کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ علاقے کے بیشتر نوجوان روزگار کے لیے بڑے شہروں یا دوسرے ملکوں میں ہیں اور خالی زمینوں کے لیے افرادی قوت درکار ہے۔ فیصل ملک اس ضمن میں اپنی قومی ذمہ داری سے بخوبی آگاہ ہے چنانچہ وہ اپنے سنگی ساتھیوں کے لیے ہر سال دہری خوشی کا اہتمام کر دیتا ہے۔ یاد آیا، پچھلے دنوں میں ہمارے ایک باس ہوتے تھے۔ ایک روز موڈ میں تھے۔ ہم سے کہنے لگے "آپ کی شادی کو کتنا عرصہ ہوا ہے؟" ہم نے عرض کیا، چار سال۔ پوچھا "بچے کتنے ہیں؟" ہم نے بتایا "دو عدد" پھر باس نے از خود انکشاف کیا کہ ان کی شادی کو صرف دو سال ہوئے ہیں۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ شاید ابھی تک لاولد ہیں، ڈرتے ڈرتے سوال کیا "سر کوئی بچہ ہوا؟" بولے "چار عدد" معلوم ہوا کہ وہ بھی "ڈبل شاہ" تھے۔ گذشتہ دنوں اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت نے ٹی وی پر مانع حمل ادویات کی اشتہار بازی پر پابندی عائد کر دی ہے۔ دیر سے سہی، آخر حکومت کو بھی افرادی قوت کی اہمیت کا اندازہ ہو گیا۔ اللہ جانے اب "بہبود آبادی" کی وزارت بھی رہے یا نہیں۔ کلینک تو عرصہ دراز سے بند پڑے ہیں۔ یوں بالواسطہ طریقے سے حکومت پہلے ہی افزائش پیدائش کے لیے گرم جوش ماحول پیدا کرتی رہتی ہے۔ اسی "گرم جوشی" کا نتیجہ ہے کہ پاکستان اقتصادی سروے کے مطابق ہر سال شہری آبادی میں 26 لاکھ 90 ہزار نفوس کا اضافہ ہو رہا ہے۔ 2014ء میں پاکستان کی آبادی 18 کروڑ 80 لاکھ تھی جبکہ 2015ء میں یہ بڑھ کر 19 کروڑ 17 لاکھ ہو گئی اور فیصل ملک جیسے محبان وطن کے "عملی تعاون" سے موجودہ سال 19 کروڑ 54 لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ حکومت کو خاندانوں کی یک جہتی اور زن و شوہر کے تعلقات میں "خوش ذوقی" دل سے عزیز ہے۔ لوڈ شیڈنگ، بے روزگاری، سینما گھروں کا انہدام، کھیل کے میدانوں میں تجارتی اور رہائشی پلازوں کی تعمیر جیسے اقدامات سے حکومت غریب اور متوسط طبقے کے شہریوں کو غیر محسوس طریقے پر ترغیب دے رہی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ وقت گھروں میں گزاریں لیکن خالی نہ بیٹھیں۔ علامہ اقبال کے ایک مشہور پیغام کے ایک تہائی (1/3) حصے یعنی "عمل پیہم" پر کاربند رہتے ہوئے علامہ ہی کے ایک اور پیغام پر مکمل یقین رکھیں یعنی کہ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ۔ حضرت ضمیر جعفری (مرحوم) نے بھی وطن عزیز کے "مردم خیز دل" کو ایک چھوٹی سی شرط کے ساتھ اس بات کی اجازت دے دی تھی کہ وہ ملک کی افرادی قوت میں سرمایہ کاری بلا روک ٹوک جاری رکھیں۔ فرمایا:

شوق سے لخت جگر نور نظر پیدا کرو ظالمو تھوڑی سی گندم بھی مگر پیدا کرو

◆◆◆

قینچی اور قلم

نجم الحسن رضوی

قینچی تخلیقی اوزار ہے مگر اب تک اس سے درزی اور حجام زیادہ فائدہ اٹھاتے رہے ہیں لیکن پتہ چلا کہ قینچی پیرہن سازی اور گیسو تراشی سے زیادہ ادبی کاموں میں استعمال ہو سکتی ہے۔ اس بات کا احساس مجھے کل دانشور نے دلایا، وہ تشریف لائے تو کتابوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا ان کے ساتھ تھا۔ میں نے پوچھا: "یہ کیا ہے جناب؟" بولے: "ان دنوں میں علم وادب کے پیچھے خزانے ڈھونڈ رہا ہوں یہ کتابیں جو میں نے چھاپی ہیں اس کا ثبوت ہیں!" "ارے!" میں بولا: "اب آپ کتابیں بھی لکھنے لگے، ویسے مجھے یقین تھا کہ ایک دن آپ قلمکار بن کے رہیں گے!" "قلمکار!" دانشور ہنسے: "آج کل قلم سے کون لکھتا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا: "آپ تو پہلے ایک سے ایک قیمتی قلم اپنے لئے خریدتے تھے اور کہتے تھے ہمیشہ اچھا قلم پاس رکھنا چاہئے تاکہ اچھا لکھنے کا امکان رہے۔" دانشور نے کہا: "قلم کا زمانہ گیا اب کوئی قلم نہیں خریدتا، ازار بند ڈالنے کے لئے بھی نہیں!" میں نے کہا: "مگر ہمارے شاعر، افسانہ نگار اور نقاد وہ اب کیسے لکھتے ہیں؟" کہنے لگے: "وہ تو اب لکھتے ہی نہیں، ادبی کانفرنسوں اور مذاکروں نے انھیں اتنا مصروف اور مشہور کر دیا ہے کہ لکھ لکھا کر انھیں مشہور ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے سوال کیا: "پھر بازار میں نئی کتابوں کا سیلاب کیسے آیا ہوا ہے؟"

فرمایا: "اس کی وجہ مجھے وہ کتابوں کے بازار میں اب میرے نام کا سکہ چلتا ہے!"

میں نے پوچھا: "مگر آپ تو خود قلم سے پرہیز کرنے لگے ہیں، کتابیں کیسے لکھتے ہیں؟"

دانشور نے کہا: "اصل میں تجربے سے پتہ چلا کہ کتابیں چھاپنے کے لئے اب قلم کی نہیں قینچی کی ضرورت ہوتی ہے۔"

میں نے حیرت سے پوچھا: "قینچی کی؟ آپ کیا کہہ رہے ہیں، بھلا قینچی کیسے لکھنے کے کام آ سکتی ہے۔"

انھوں نے جواب دیا: "لکھنے کے لئے نہیں، ادب کی ری سائیکلنگ کے لئے، اب قینچی سے بڑا کوئی تخلیق کار نہیں، چار پانچ کتابیں سامنے ہوں اور قینچی پاس ہو تو اس کی برکت سے دیکھتے ہی دیکھتے ایک نئی کتاب جنم لے سکتی ہے۔ اس میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگتا۔ قینچی قلم سے زیادہ تیز رفتار ہوتی ہے، قلم سے مہینوں میں ایک کتاب تیار ہوتی ہے جبکہ قینچی سے ہفتے بھر میں کئی کتابیں چھپنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔"

میں نے کہا: "مگر قینچی کو بھی تو اپنی خوراک چاہئے وہ اسے کیسے ملتی ہے؟"

کہنے لگے: "بھئی ردی فروش سلامت رہیں، تم نے دیکھا آج کل پرانی کتابوں کا کاروبار کتنے زوروں پر ہے!" میں نے کہا: "پھر آپ تو خوش ہوں گے۔" بولے: "کیوں نہیں، کون نہیں چاہتا کہ پرانی کتابیں نئے جنم میں آ کے اہل ادب کا دل خوش کریں، ہم لوگ جو ردی کاغذوں سے تخلیقی شہ پارے چھانٹ کے مردہ کتابوں کو پھر سے زندہ کر رہے ہیں کتابوں کے مسیحا کہلانے کے مستحق ہیں!"

میں نے پوچھا: "اور قینچی کو کیا کریں گے؟"

"مقراضِ ادب اور کیا!" دانشور نے کہا۔ "یہ اسی کی کاٹ چھانٹ کا کمال ہے کہ پرانی کتابوں میں وہی بہترین تحریریں اب لوگوں تک پہنچ رہی ہیں۔ خود میں نے بھی کئی کتابیں ترتیب دی ہیں۔ قینچی اپنی اور کتابیں دوسروں کی!" انھوں نے تھیلا کھول کے کتابیں میز پر ڈھیر کر دیں۔ ان کتابوں کے نام تھے: 'شکار پور کا شیر'، 'خطرناک لوگ'، 'غالب کے پرزے' اور 'میر صاحب روتے کیوں تھے'۔ میں نے کہا، "اب ان کا تعارف بھی کرا دیجیے، ویسے مجھے پتہ نہیں تھا کہ آپ کو شکاریات سے بھی دلچسپی ہے۔"

"اچھا یہ کتاب" دانشور نے 'شکار پور کا شیر' نامی کتاب اٹھائی اور بولے، "میں نے شیر کا شکار نہیں کیا مگر مختلف کتابوں سے ان شیروں کے قصے ضرور جمع کیے ہیں جو شکار نہیں ہوئے بلکہ خود شکاری کو ہڑپ کر گئے اور وہ شیر بھی جو کسی کام کے نہیں۔ آدم خور بنے تو شکاریوں سے دو دو ہاتھ کیے، اس پر یا گھر میں پڑے اونگھتے رہتے ہیں کہ بارے آرام سے گزرتی ہے۔"

میں ابھی اس کتاب کے حدود اربعہ پر غور ہی کر رہا تھا کہ انھوں نے دوسری کتاب آگے بڑھا دی۔ "اور یہ کتاب دیکھو 'خطرناک لوگ'۔ اس کتاب میں دس کتابوں کے اقتباسات ریزہ ریزہ استعمال کیا گیا ہے اور اس میں ان 'ناک والے' لوگوں کا تذکرہ ہے جو اپنی ناک کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ تو اب قصہ حسین ذیال ایک بزرگ تھے جنھوں نے لکھنوی بیگمات کے حوالے سے ایک بار لکھا تھا، چھوٹی ناک سہاگ کا پتا اور بڑی ناک کو لاوا تصور! میری کتاب میں ساری چھوٹی بڑی ناکوں والے ملیں گے، بڑی ناک والے، ہاتھی کی سونڈ جیسی ناک والے، جو کروں کی لمبا جیسی ناک والے، وہ نالی بندوق جیسی ناک والے، وہ جو اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے اور وہ جو اپنی ناک کے نیچے ہر قسم کے ہنگامے کے انتظار میں رہتے ہیں کہ اس سے انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کتاب میں ان بڑی ناک والوں کا بھی ذکر ہے جن سے دوسروں کی چھوٹی ناک بھی برداشت نہیں ہوتی۔ تم نے غلام عباس کی کہانی 'ناک کاٹنے والے' تو پڑھی ہی ہوگی!"

میں نے پوچھا: "اچھا اور باقی دو کتابیں؟" بولے: "یہ خالص ادبی کتابیں ہیں بھائی۔ ایک تو ہے چچا غالب کے بارے میں اس کا نام ہے 'غالب کے پرزے'، اور دوسری کتاب ہے 'میر صاحب روتے کیوں تھے'۔" میں ہنسا، "واہ صاحب، مرزا غالب کے اپنے زمانے میں بھی یہ خبر گرم تھی کہ ان کے پرزے اڑیں گے مگر کسی کو پتہ نہیں تھا کہ ان کے پرزے اڑانے کا اعزاز صرف آپ کے حصے میں آئے گا!"

دانشور نے کہا، "اس کتاب میں غالب کے بارے میں بڑی مفید معلومات اکٹھا کی گئی ہیں، مثال کے طور پر انھیں آم کے علاوہ پپیتا بھی بہت پسند تھا۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ انھوں نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ 'پاپایا' کی شکل میں دیکھا۔ آم اور پپیتا کھانے سے ان کی شاعری اتنی آسان ہو گئی کہ دلی کے ان شاعروں کو بھی سمجھ میں آنے لگی جو پہلے ان کے نام سے چڑتے تھے۔ کتاب میں ان کے بارے میں بہت سی دیگر معلومات بھی ملیں گی، مثال کے طور پر ان کے مشکل قافیوں اور آسان مصرعوں کی تعداد اور ان کے غیر معروف لطیفے۔ کتاب پڑھنے سے یہ بھی پتہ چلے گا کہ یہ کہنے پر کہ 'ہم ناز غیرت سے چاہتے' بھی چچا غالب کتنی بار حضرت آدم کی طرح جنت بدر ہوئے۔ اس کے علاوہ پڑھنے والے یہ بھی جان سکیں گے کہ ان کے بعد کیا ہوا یعنی غالب جنت کے کن نظیروں سے کام بدر ہیں!"

میں نے کہا، "واہ بھئی آپ نے تو پوری غالب انسائیکلوپیڈیا مرتب کر دی ہے۔ اچھا وہ کتاب 'میر صاحب روتے کیوں تھے' کچھ اس کے بارے میں بھی بتائیے۔ ان کے تو سارے شعری آنسوؤں میں بھیگے ہوئے نظر آتے ہیں!"

دانشور نے کہا، "ہاں مگر یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ وہ آخر اتنا روتے کیوں تھے۔ میں نے اپنی تحقیق سے اس سوال کا جواب دینے کی

کوشش کی ہے۔" میں نے کہا: "جبھی اس زمانے میں دلی لٹ رہی تھی!" دانشور بولے: "دلی تو لٹ رہی تھی مگر میر صاحب کو دلی سے زیادہ اپنی دستار کی فکر تھی ورنہ وہ یہ کیوں کہتے کہ دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار، اصل میں وہ بھاری تھی اور ڈھیلی بھی جس کی وجہ سے اسے دونوں ہاتھوں سے بھی سنبھالنا مشکل ہوتا تھا۔ آخر ان کا سر درد سے کیوں نہیں پھٹتا!" میں نے کہا: "مگر رونے کی کچھ اور وجہ بھی ضرور رہی ہوگی ورنہ گھر میں دستار اتار کے سوتے وقت بھی وہ کیوں روتے اور لوگوں کو یہ کیوں کہنا پڑتا کہ سرہانے میر کے آہستہ بولو، ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے!"

دانشور نے کہا: "جبھی وہ کوئی بات جانتے کب تھے، روتے تھے یا چپ رہتے تھے۔ کسی سے بات کرنا انھیں پسند نہیں تھا، نہ کسی کی سنتے تھے نہ کسی سے بولتے تھے، کہتے تھے اس سے زبان بگڑ سکتی ہے حالانکہ ان کے زمانے میں ٹی وی چینل کہاں وجود میں آئے تھے۔"

میں نے کہا: "ماحول تو واقعی بہت خراب ہو گیا تھا میر صاحب کے زمانے میں!" دانشور نے تائید کی: "یہ تو ٹھیک ہے، میر صاحب فطرت اور ماحول کی خوبصورتی کے دلدادہ تھے، پھول کھلے ہیں پات ہرے ہیں والی شاعری سے یہی پتہ چلتا ہے، شاید انھیں ماحولیات کی جانچ کا بڑا ذوق تھا۔ میں نے اس کتاب میں ان کے وہ سارے دکھ درد بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں جنھیں جمع کر کے انھوں نے اپنا دیوان چھپایا تھا۔" یہ کہہ کر وہ اپنی کتابیں تھیلے میں ٹھونسنے لگے تو میں نے دیکھا نیلے جلد والی ایک کتاب تھیلے میں سے نکل کے میز پر گر پڑی۔ میں نے دیکھا۔ اس کا نام تھا 'باورچی خانے میں شام'۔ میں نے حیرت سے پوچھا: "یہ بھی؟" بولے: "ہاں یہ بھی مگر یہ تمھارے مطلب کی نہیں، لیکن اس کی مانگ بہت ہے ان خواتین میں جو ٹی وی پر کھانا پکانے کے پروگرام تو بہت دیکھتی ہیں مگر خود کبھی کھانا نہیں پکاتیں، کہتی ہیں اتنے سارے جھوٹ کس لئے ہیں!"

میں نے قہقہہ لگایا: "اچھا تو آپ نے یہ کتاب ان عورتوں کے لئے چھاپی ہے جو خود کبھی کھانا پکانے کی زحمت گوارا نہیں کرتیں۔"

بولے: "میں نے جو کھانے اپنی کتاب کے لئے چنے ہیں وہ ان سے کبھی نہیں پک سکیں گے۔"

میں نے پوچھا: "کیا مطلب؟"

کہنے لگے: "یہ کوئی عام کھانے نہیں، ذرا ان کے نام سنو، چاول کے کباب، کوفتوں کی نہاری، مرغ کی کھیر، آلو کا زردہ اور قیمے کی پڈنگ، یہ سب شاہی کھانے ہیں جنھیں صرف شاہی باورچی پکا سکتے ہیں!" پھر انھوں نے کتاب تھیلے میں ٹھونسی اور رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے دیکھا وہ اپنی قینچی میز پر بھول گئے تھے۔ میں نے قینچی اپنے ہاتھ میں لی تو عجیب عجیب منصوبے ذہن میں کلبلانے لگے۔ میں نے سوچا دادا جان کی الماری میں بے شمار پرانی کتابیں بے کفن مردوں کی طرح پڑی ہیں کیوں نہ انھیں ری سائیکل کر دیا جائے۔ پھر میں نے وہ کتابیں چھانٹ کے نکالیں جو انسانوں اور جانوروں کے بارے میں تھیں اور ان میں انسانوں کی مختلف نسلوں اور جانوروں کی قسموں کو تفصیل سے بیان کیا گیا تھا۔ کتابوں کی یہ سیریز پچاس سال پہلے 'آدمی اور جانور' کے نام سے شائع کی گئی تھی۔ میں نے ان کتابوں کا تیا پانچہ کر کے ان کے کاغذی تھیلے سے صرف چند گھنٹوں میں ایک نئی کتاب تیار کر دی جس کا نام میں نے 'جانور اور آدمی' رکھا ہے۔ یہ کتاب چھپ چکی ہے اور میں اس کے بعد دوسری کتاب کے لئے مواد کی تلاش میں اب تک دس بارہ کتابیں کاٹ پیٹ چکا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جلد ہی میرا شمار بھی اس عہد کے بہترین مصنفین اور مرتبین میں ہونے لگے گا۔ بے شک قینچی بڑے کام کی چیز ہے۔

◆◆◆

جائزے

''مٹی اور پاؤں'' پر ایک نظر

حنیف باوا

فرخندہ نسیم کی ''مٹی اور پاؤں'' اگرچہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے لیکن اس میں جو کہانیاں شامل کی گئی ہیں وہ اپنے اندر بڑی وسعت رکھتی ہیں انھوں نے کہانی لکھتے وقت بڑے بڑے الفاظ کا سہارا لینے کی بجائے ہلکے پھلکے الفاظ کو اس سلیقے اور پورے فنی لوازمات کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ کہانی ابتدا سے لے کر اختتام تک خوبصورت سے خوبصورت تر ہوتی چلی گئی ہے مثال کے طور پر کہانی ''عمارت'' کی ایک چھوٹی سی عبارت کو دیکھیں کہ کتنے آسان اور خوبصورت پیرائے میں آراستہ کیا گیا ہے۔

''راحت ایک سمجھدار آدمی تھا اس نے ترسی ہوئی محبت سے گھر بسانے کی بجائے چاند کی طرح اکیلے رہنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس ویسے بھی اس پر ایسے برس رہا تھا جیسے سورج گرہن کے بعد زمین پر شہاب ثاقب گرتے ہیں۔ اس کے محل نما گھر کا صرف ایک ہی رفیق تھا، اس کا شوق۔ خوبصورت اور پرشکوہ عمارتیں بنانے کا شوق''

ایک اور پیرا دیکھیے جسے افسانہ ''عجیب'' سے لیا گیا ہے۔

''چونکہ اس کا دماغ بے شمار روحانی فلسفوں کا دستور تھا، وہ انھیں چوس چوس کر ایک نئے اور منفرد فلسفے کا عرق نکالنے میں کامیاب ہو گیا ہے اب وہی عرق کاریزوں کے ذریعے چھوٹی جڑوں تک پہنچانے میں دن رات مصروف تھا۔ یہ چھوٹی جڑیں دنیا کے مختلف ممالک کے پودوں سے نکال کر بڑی تکنیک سے یہاں جمع کی گئی تھیں۔''

اس مجموعے میں ایک بہت خوبصورت کہانی ''دربار'' ہے اس کی ایک چھوٹی سی عبارت کو پڑھئے اور لطف اٹھائیے۔

''سائیں جی کے چہروں میں گھبراہٹ دوڑ گئی۔ ان کی پیشانی پر ہلکا سا عرق ناچ گیا ان کی زبان لڑکھڑا کچھ پڑھنے لگی۔ یہ تو انھوں نے سوچا تک نہیں تھا انھوں نے دوبارہ تسبیح پر استخارہ کیا۔ بھئی میرے استخارے میں تو ایسی کوئی طلاق واقع نہیں ہوئی۔''

ایسی اور بہت سی مثالیں دی جاسکتی ہیں لیکن طوالت کے ڈر سے ایسا نہیں کیا گیا۔

اس کتاب کی بعض کہانیوں کے اندر اتر کر ہم دیکھیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوگا جیسے فرخندہ نسیم کا تعلق ان بستیوں میں سے ہے جو بستیاں ان کے افسانوں کا ایک حصہ ہیں۔ ان بستیوں، محلوں اور گلیوں میں سے جو کردار فرخندہ نسیم چن کر لاتی ہیں اور جو واقعات شب و روز وہاں رونما ہوتے ہیں انھیں لا کر اپنے افسانوں میں آباد کیا ہے اور ان بستیوں کے گلی کوچوں کے دکھوں اور سکھوں اور ناانصافیوں کو اس پراثر انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پڑھنے والوں کو ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے وہ دکھ وہ سکھ، وہ مظالم اور محرومیاں، وہ راحتیں اور وہ خوشیاں ان کے اپنے ہوں۔ ان کی افسانہ نگاری پر گرفت بڑی مضبوط ہے۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ ان کی کہانیوں میں کچھ بھی زائد نہیں ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کو غیر ضروری طوالت سے بچائے رکھا ہے جس کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ان کی یہ تحریریں تاثر اور فنی پختگی کے لحاظ سے ایک

منظر و مقام پر کھڑی دکھائی دیتی ہیں۔ مثال کے لئے ان کا افسانہ "جانور" پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس میں اس کا مرکزی کردار منا ہے (جو ایک چھوٹا بچہ ہے) جو چھپکلی سے بہت زیادہ ڈرتا ہے۔ کسی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے منے کا تایا ایک روز ایک دیوار سے ایک لکڑی کی بنی ہوئی چھپکلی کو لٹکا دیتا ہے۔ اس کمرے میں جب منا داخل ہوتا ہے تو ہوا تی بڑی ہیبت ناک چھپکلی کو دیکھ کر اس قدر خوف زدہ ہوتا ہے کہ موت اسے آ لیتی ہے۔ اس طرح اس کا ورثہ صفت تایا ابو منے کے نام کی جو زمین ہوتی ہے وہ ہتھیا لیتا ہے۔ بعد از اں وہ اسی زمین پر اسی کے نام پر منا فارم قائم کر دیتا ہے، جو تایا ابو کی ریاکاری کی کھلی دلیل ہے۔ اس افسانے کی جو خاصیت ہے وہ بڑی عمدگی سے افسانے کو انجام تک پہنچاتی ہے۔ ماحول کو اس کی ضرورت کے مطابق ڈھالنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ نیز اس کے اندر "عکس در عکس" فرخندہ کا ایک ایسا افسانہ ہے جس کی تحریر میں اشاروں اور کنایوں سے کام لیا گیا ہے۔ اس کا مرکزی کردار اور اپنے دوست کی موت کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ زندگی تو سراسر بے وفائی کا پیکر ہے۔ صرف موت ہے جو انسان سے وفا کرتی ہے۔ چنانچہ وہ موت کی تلاش میں جنگل کی اور چل پڑتا ہے یہاں پہنچ کر فرخندہ کے قلم نے جو جوہر دکھائے ہیں کہ جنگل میں موت کی مماثل دہشت ناکی کی منظر نگاری اپنے عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ اس منظر نگاری کی چھوٹی سی جھلک آپ بھی دیکھیے گا "وہ موت کے گھرے سے زندی طرح نکل بھاگا یا پر کالے سیاہ راستے وحشیوں کی طرح تعاقب پا۔۔۔۔۔ دور پہاڑوں کی سمت سے الو بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں رات کے اس وحشت ناک سناٹے میں پکارا ریں بھی مختصر یا تھیں ۔۔۔۔۔ تاروں نے گھبرا کر آسمان کے دوپٹے میں منہ چھپا کر وحشت کو اور بڑھا دیا۔ کوئی زندگی کہیں نہیں تھی۔ تمام موجودات کو وحشت نے پکڑ رکھا تھا"

سرمد موت کی تلاش میں سرگرداں جب ایک کٹیا میں پہنچتا ہے تو وہاں اس کا ایک بزرگ سے سامنا ہوتا ہے۔ جو اس قدر عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اب تک زندگی کو گلے لگائے بیٹھا تھا۔ وہ بھلا اسے موت کیسے عطا کر سکتا تھا۔ وہاں سے مایوس ہو کر وہ ایک چٹان کی طرف چل پڑتا ہے۔ وہاں پہنچ کر وہ سوچتا ہے۔ "ہاں یہ مجھے موت دے سکتی ہے" اس نے اتنا سوچتے ہوئے اپنے سر کو پوری قوت سے چٹان پر دے مارا۔ لیکن اتنا سخت قدم اٹھانے کے باوجود بھی زندگی نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ رات کے جانے کے بعد جب سپیدہ سحر نے آنکھ کھولی تو بے ہوش سرمد نے جسم میں حرکت آ گئی۔ اس سے آگے فرخندہ کا قلم کیا کہتا ہے، دیکھیے۔

"جب اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں تو وہاں رات کا کوئی منظر نہیں تھا۔ اس کے سامنے تازہ صبح پھولوں کی ڈالی لئے کھڑی تھی۔ اس نے اٹھ کر دیکھا اسی موت کی چٹان کی کوکھ سے زندگی کا ننھا پودا پھوٹ رہا تھا۔ چٹان کے عقب سے زندگی طلوع ہو رہی تھی۔ سرمد نے دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ زندگی کو گلے لگا لیا" بہت خوب اگرچہ یہ مختصر افسانہ ہے لیکن اس کے اندر کا پھیلاؤ ہمیں یہ بتا رہا ہے کہ جب تک زندگی موجود ہے اسے گلے سے لگانا ہی بہتر ہے۔ اس سے پیار کرنا ہی پرسکون زندگی کی علامت ہے۔

ان کا افسانہ "مٹی اور پاؤں" (جس پر پوری کتاب کا نام رکھا گیا ہے) اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ جب تک انسان اپنی مٹی، اپنی دھرتی ماں سے دور بھاگتا رہے گا تو وہ دھرتی اسے گندگی کا ڈھیر نظر آتی رہے گی۔ اس افسانے کا جو مرکزی کردار ہے وہ ہمیشہ اس دھرتی پر بکھری دھول سے دور بھاگتا ہے۔ جب بھی اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ دھول اس کے ہاتھوں سے چمٹ گئی ہے تو وہ اپنے ہاتھوں کو انتہائی گندا سمجھ کر انھیں بار بار صابن سے صاف کرتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اسے ہاتھوں کے گندا رہنے کا احساس برقرار رہتا ہے۔ لیکن ایک روز جب بارش کھل کے برس رہی تھی تو گلی کے بچے اس بارش میں نہانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے لیکن اس بوڑھے کردار کے پوتے کو گلی میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ بارشوں کے موسموں کو بدکردار بنا کر یہ سمجھتا تھا لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ اس کے پوتے بارش میں کھیلتے

ہوئے اپنے ہم عمروں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ تو معاً باہر سے دور سے پکار اٹھتا ہے آؤ جا تم بھی اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ کھیلو۔ دادا کی آواز جیسے کانپ رہی تھی۔ اس کی بہوؤں نے سمجھا کہ کہیں ان کے چلنے پھرنے سے عاری سسر گر نہ پڑے ہوں۔ اس سے آگے فرخندہ شمیم سے سنیے کہ وہ کیا کہہ رہی ہیں۔

''لیکن وہ سب کے سب ششدر رہ گئے۔ دادا گیلی مٹی پر بیٹھے ہوئے کھڑے تھے۔ اور اس کے پوتے اس کے شدید یا لجاجت کے پائے کو مٹی سے گل گوں کر رہے تھے اور اس کے قدم وہ دبا کر مٹی سے ہم رشتہ کر رہے تھے۔ مٹی دادا کے لیے جادوئی تھی جسے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک لافانی تبسم کھلنے لگا تھا۔'' دیکھیے مٹی کے دریا لمس نے اس کے اندر کے ہمیشہ لاچار رہنے کے احساس کو کیسے ختم کر دیا اور کیسے اس مٹی نے اپنے گلے سے واضح طور پر دور رہنے والے بزرگ کو دوبارہ اس کے قریب کر دیا۔

ان کا ایک اور افسانہ ''عمارت'' ہے۔ جو میرے ذہن پر اب تک نقش ہے۔ فرخندہ جی نے بڑے ہی بچے تلے الفاظ میں اپنی پوری ہنرمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس حقیقت کو بڑے ہی پیارے انداز میں آشکار کیا ہے۔ کہ کوئی بھی عمارت چاہے اس کی تعمیر میں جتنے بھی ملٹی جوہر دکھائے گئے ہوں جتنی چاہے رقم خرچ کی گئی ہو وہ عمارت کو خدا کے گھر سے کبھی بھی کسی طور بھی افضل و اعلیٰ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ میرے خیال میں یہ افسانہ فرخندہ شمیم کی ایک الگ سوچ کا حامل افسانہ ہے۔ میں ان کے ایک اور افسانے کا ذکر کیے بغیر نہیں رہوں گا جو ہمارے معاشرے کے ایک ایسے جعلی پیر کے گرد گھومتا ہے۔ جو اپنے گھناؤنے عزائم کی تکمیل کے لیے خواتین کو اپنے چنگل میں ایسے جکڑ لیتا ہے کہ ان میں اس چنگل سے باہر آنے کی ذرا سی بھی سکت باقی نہیں رہتی۔ فرخندہ نے اس افسانے کے کردار (جعلی پیر) کی اس خوبصورتی سے تعمیر کی ہے کہ وہ کردار اپنی جملہ بد صورتیوں، کراہتوں اور نفرتوں کے ساتھ قاری کے ذہن میں اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یہ بھی ان کا ایک اعلیٰ افسانہ ہے۔ غرضیکہ فرخندہ شمیم کی اس متذکرہ کتاب کے جتنے بھی افسانے ہیں وہ اپنے اندر کوئی نہ کوئی خوبی لیے ہوئے ہیں۔ انھیں پڑھ کر یہ احساس ضرور ہوتا ہے کہ فرخندہ جی نے انھیں حوالہ تحریر میں لانے سے پہلے خود اپنے اردگرد کے ماحول میں اتر کر ایسے واقعات اور کردار کو چنا جو ان کہانیوں کو قاری کے دل کے قریب کرنے میں اہم رول پلے کرتے ہیں۔ نیز یہ بھی محسوس ہوتا ہے جیسے یہ واقعات اور کردار ہی ان کے لیے ضروری اور موزوں ہوں۔ یہ خوبی فرخندہ جی کو اردو افسانہ نگاروں کی اس بھیڑ میں ایک الگ شناخت دینے کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے۔

فرخندہ جی کے جن افسانوں کا میں نے ذرا تفصیل سے ذکر کیا وہ اپنی جگہ لیکن ان کے علاوہ بھی چند افسانے ایسے ہیں۔ جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ان کے دوسرے افسانوں سے ذرا ہٹ کر کھڑے دکھائی دیتے ہیں مثلاً افسانہ خالو، ریپ، بچھڑا ہوا چاند، بے وقت، ''وہ تو جاگتے سوتے میں ڈسے گا'' وغیرہ وغیرہ۔

◆◆◆

معروف کالم نگار، شاعر اور ادیب سید مبارک علی شمسی کا نیا مجموعہ

خواب ادھورے ہیں

شائع ہو گیا ہے　　قیمت -/200 روپے

ملنے کا پتہ: قائم سٹار و پرنٹ ایڈ، ملتان (0300-7192804)

''مغربی تنقید کا مختصر تعارف'' ظفر سپل کی مختصر اور جامع کوشش

خورشید بیگ میلسوی

تنقید ادب اردو یا کسی بھی زبان کے فن اور مقصدیت کے پہلوؤں سے بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ ہم علامہ اقبال کے کلام کو جب تنقیدی مطالعے میں لاتے ہیں تو ان کے ہاں بھی مغرب کے تخلیق کاروں، نقادوں، فن اور ادب برائے زندگی کے فکری علمبرداروں کے ساتھ مکالمے کی صورت میں مشرق و مغرب کی تہذیبی تنقیدی مطالعے کا پہلو ملتا ہے۔ ویسے بھی مغربی تنقید ہماری اس سمت رہنمائی کرتی ہے کہ یہ ادب اس وقت تخلیق ہوتا ہے۔ جب نقاد موجود ہوں۔ اور تنقید تخلیق کو بھی ہے اور اس کا باعث بھی۔ یہ ایک خشک اور ادق قواعد والا موضوع ہے۔ جس کے لئے کتابوں کے انبار لگا کر طویل ترین مطالعے کی ضرورت ہے۔ عصر حاضر میں اردو زبان کی دانش گاہوں کے طلبہ و طالبات اس کے لئے عرق ریزی میں مصروف ہیں۔ انہیں حوالوں اور تشریحات کے لئے طویل ترین مقالہ جات لکھنے اور ضخیم کتابوں کے مطالعے سے گزرنا پڑتا ہے۔ جو ان کا منصب اور شیوہ ہے۔ ظفر سپل نے تنقید کا وہ حصہ جس نے مغرب (انگلینڈ، امریکہ، فرانس، جرمنی یا روس) کے ممالک میں عروج پایا، کو سہل اور دلچسپ، پرکشش زبان اور پیرائے میں اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔ جس سے نہ صرف ادب کے طلبہ و طالبات، ماہر لسانیات، ادبی تنقید کے مبتدی اور ادب پسند قاری کے علاوہ شاعر و ادیب تک یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔

ظفر سپل نے یونان کے مثالی عہد کا تھوڑا سا تذکرہ اس لئے بھی کیا کہ تنقید کے ماخذات وہیں سے افلاطون، سقراط، ارسطو کی صورت میں ابھرے۔ کسی نے شاعر کو Product کی Abstract تصویر کی وجہ سے کسی بھی معاشرے کا غیر پیداواری رکن قرار دیا کہ اس کا استقبال کر کے دوسرے شہر بھیجا جائے۔ نیز شاعری یا ادب کسی معاشرے کے لئے غیر ضروری ہے۔ تو کسی نے یہ کہا کہ میکانیات اور ٹیکنالوجی میں انسانیت کے حدود زیاں کے رطب و یابس میں ادب ہی تہذیب کی بقا کا ضامن بنتا ہے۔ مصنف نے یہ بھی ضروری سمجھا کہ اردو زبان کے نقادان حسن کی دریافت کی تاخیر سے بھی قاری کو آگاہی دے جو محمد حسین آزاد کی "آب حیات" میں تاثراتی اور مولانا الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعر و شاعری میں باقاعدہ مقصدیت کے کھولی ثقافت کے لئے دربار سے وابستگان ادیب، اگر غالب و ذوق مشرق میں تھے تو یورپ میں بھی دربار سے وابستگی کسی ادیب کی Recogintion بھی جاتی رہی۔ فرانس اور روس کی تحاریک انقلابی میں ادیب کی شمولیت کافی حد تک نظر آئی۔ زمانی انقلابات کے پہلو میں شاعر کے تحرک و متحرک کردار کے بارے میں ظفر سپل نے جہاں بھیس؟ کو کرنے کی دانشورانہ کوشش کی ہے وہاں اس کی فکر کو بھی سلیس زبان میں قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ فرانس کے انقلاب کے مقاصد سے انحراف نہ کرنے والے "گوسے" کے بارے میں بتایا کہ وہ اعتدال پسندی اور خود پر انحصار تحریک سے تنقید نگار تھے۔ تاہم دولت کے ارتکاز میں ان کا نظریہ "داس کیپٹال" کے مصنف کارل مارکس سے مختلف بر گزشتہ تھا۔

دولت کے ارتکاز اور تقسیم کے پر امن طریق کار کی جانب اس نے رہنمائی کی۔ یہ ایک الجھن سے خالی بات نہیں ہے۔ کہ ظفر

سہیل نے تاریخی تدریجی تعارف سے تنقیدی قسم کا اہتمام کیا ہے۔ جس میں کرۂ ارض کے مغربی حصے پر کبھی میتھیو آرنلڈ جنم لیتا ہے کبھی روم کا ذکر کرنے کے بعد 10 ویں صدی کے دانتے کا ذکر کرتا ہے۔ اور یہ بھی اس کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے اشارۃً ہمیں بتایا ہے کہ مولانا روم کی 1273 کی وفات سے ذرا دیر بعد 1483 میں پیدا ہوا۔ "ڈیوائن کامیڈی" "کامیڈیا" اطالوی زبان کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ پھر کلاسیکیت اور گوئٹے کا ذکر آتا ہے۔ اور ویسٹ ایسٹ دیوان (دیوان مغرب) شائع کیا۔ جس کے جواب میں شاعر مشرق علامہ اقبال نے پیام مشرق تخلیق کی۔ "فاؤسٹ" ناول کا ذکر آتا ہے اور ہمیں یہ گوئٹے کے معاشقوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ انقلاب فرانس کی رومانوی تنقید میں ورڈز ورتھ کی شاعری سامنے آئی ہے۔ جسے پوئٹ آف نیچر کہا گیا۔ حالانکہ کلاسیکل ادب مذہب کی کلیسائیت سے ہم کلام رہا۔ روسو نے تہذیب کو رد کر کے نیچر کا بیان کیا۔ جذبات کو عقل پر غالب قرار دیا۔ ورڈز ورتھ کی کالرج سے ملاقات اور دونوں کی مشترک تصنیف لیریکل بیلڈز" سامنے آئی جو شاہکار تھی۔

ٹالسٹائی اور سائنسی تنقید کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے ظفر سہیل ہمیں بتاتے ہیں کہ میتھیو آرنلڈ اسی دوران ہی سامنے آیا۔ یہ ٹالسٹائی یونیورسٹی سے اردو ادب کی دانش گاہ کا معتبر بن گیا۔ "جنگ اور امن" نے پورے گلوب میں ہلچل پیدا کر دی۔ پھر بیسویں صدی میں ایلیٹ آیا جس نے "ویسٹ لینڈ" لکھی اور تنقید کو تخلیق کی ہی تہہ قرار دے کر یورپ ہو یا فرانس یا ایلیٹ تنقید کے حوالے سے متن، مصنف، اور تنقید کی مشترکہ یورپ میں جن رائج زاویوں کے ساتھ موجود ہے۔

شعرا اور نقادانِ فن کے حالات حیات کے ساتھ ظفر سہیل نے تنقید کی ارتقا پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ ان کا ایجاز و اختصار ورطۂ حیرت میں ڈالنے کے لئے کافی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر قمطراز ہیں۔

"ظفر سہیل صاحب نے قدیم مغربی تنقید سے لے کر ٹی ایس ایلیٹ تک مغرب میں تنقید کے ارتقا کے مختلف مراحل کی نشاندہی کی ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے دانتے، گوئٹے، ورڈز ورتھ اور ٹالسٹائی کو تنقید کے ارتقا میں سنگ میل قرار دیتے ہوئے ان کے نظریات اور تصورات کی بطور خاص صراحت کی ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر "مغربی تنقید کا مختصر تعارف" کے بارے میں مزید کہتے ہیں۔

"ظفر سہیل سادہ اور رواں نثر لکھتے ہیں۔ بوجھل اصطلاحات سے مقالے کو گراں بار نہیں بناتے۔ اسی لئے ان کی تحریریں بآسانی پڑھی جا سکتی ہیں۔

مجھے توقع ہے کہ ظفر صاحب کی یہ کتاب تنقید سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے قارئین بالخصوص طلبا میں مقبولیت حاصل کرے گی۔
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے"

میں ڈاکٹر سلیم اختر جیسے عظیم نقاد کی رائے پر اکتفا کرتے ہوئے اپنے مضمون کا اختتام اس دعا کے ساتھ کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مصنف کی عمر دراز کرے اور ان کی تخلیقات میں مزید اضافہ کرے۔ تاکہ علم و ادب کے تشنگان سیراب ہوتے رہیں۔ آمین۔

◆◆◆

32 برس پہلے کے "تخلیق" میں مدیر **عذرا اصغر** نے اداریے میں سوچنے کی بات لکھی ہے: "ہم جو بہت با اختیار ہیں سچ پوچھیے تو بالکل بے اختیار ہیں۔ ہم جو چاہتے ہیں وہ کب ہوتا ہے؟ اور جو ہوتا ہے آہ وہ کب ہم چاہتے ہیں؟!" **(ڈاکٹر انور سدید)**

تخلیق کا انور سدید نمبر ـــــ ایک جائزہ

منور عثمانی

ماہنامہ "تخلیق" لاہور نے "انور سدید نمبر" شائع کر کے اولیت حاصل کر لی ہے!

اردو ادب کے بے لوث خدمت گار ڈاکٹر انور سدید کی رحلت بلاشبہ دنیائے اردو کے تمام تخلیقی، تحقیقی، تنقیدی اور صحافتی حلقوں کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے۔ انور سدید کی شخصیت کے کئی حوالے ہیں، ایک حوالہ ادبی رسائل سے ان کا خاص تعلق خاطر ہے۔ ہمارے یہاں گزشتہ کئی دہائیوں سے ادبی رسالوں اور اخبارات کے ادبی صفحوں پر جو رونق، گہما گہمی، چمک دمک، انور سدید کے مضامین، مکاتیب، ادبی جائزوں، تبصروں، کالموں، انشائیوں، سفرناموں، روزنامچوں، مکالموں، مصاحبوں (انٹرویوز) حتیٰ کہ ان کی غزلوں، نظموں سے قائم تھی، وہ جاتی رہی، گویا اردو کی ادبی صحافت کا ایک عظیم الشان باب بند ہوا لیکن متعدد دروازے اور دریچے کھول گیا، جن سے روشنی اور تازہ ہوا کا حصول جاری رہے گا۔

ماہنامہ تخلیق اور مدیر تخلیق کے لیے تو یہ ایک ذاتی نوعیت کا حادثہ ہے۔ ادارے نے سب سے پہلے "انور سدید نمبر" چھاپنے اور اس کے بعد بھی تخلیق کے ہر شمارے میں انھیں خراج تحسین و عقیدت پیش کرنے کا اعلان کیا۔ ایک وعدہ پورا ہوا اور تخلیق کا انور سدید نمبر قارئین تخلیق اور مداحین سدید سے داد وصول کر رہا ہے۔ یہ شمارہ انور سدید کی دیانت، محنت، محبت، شفقت اور علمی و ادبی عظمت کے حوالے سے معاصرین کی متعدد گواہیوں اور مختلف شہادتوں کو اپنے جلو میں لیے ایک اہم اور حوالہ جاتی دستاویز کے طور پر طلوع ہوا ہے۔ انور سدید کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے یہ شمارہ بڑی مدد کر سکتا ہے۔ تعصبات اور تنازعات کے گرد و غبار سے نکلنا اور اس شمارے کا مکمل مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ اس نمبر میں سب سے پہلے "تعارف نامہ" کے عنوان سے انور سدید کے شخصی، علمی، ادبی، ادارتی، اشاعتی کوائف مرتب و شائع کر دیے گئے ہیں۔ یہ عام قارئین اور ادب کے طلبہ کے لیے انتہائی مفید اقدام ہے۔ انور سدید نمبر میں پہلا مضمون ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کا ہے۔

خواجہ محمد زکریا..... جو تدریس ادب اور تحقیق ادب کا ایک معتبر حوالہ ہیں ان کا یہ کہنا بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ:

> "بہت ضروری ہے کہ انور سدید کی ان متفرق اور منتشر تحریروں کو یکجا کیا جائے۔ ان کے کام پر کئی پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالات لکھے جا سکتے ہیں اور لکھے جانے چاہئیں تاکہ اردو ادب کے قارئین ان کی بے انتہا ادبی خدمات سے آگاہ ہو سکیں۔" (ص 18)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے اپنے مضمون میں بطور خاص انور سدید کی کتاب "اردو ادب کی مختصر تاریخ" کو موضوع بنایا اور اس کے متعلق نہایت متوازن اور غیر مبہم انداز میں اپنے تنقیدی نتائج کو پیش کیا ہے۔

خواجہ محمد زکریا کا مضمون کئی حوالوں سے اہم ہے خصوصاً اس تناظر میں کہ خواجہ صاحب تاریخ اردو ادب سے گہرا شغف رکھتے ہیں

اور تحسین و ستائش کے معاملے میں قطعاً مبالغے اور جوشِ بیان سے کام نہیں لیتے۔

پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے اپنے مضمون "انوارِ ادب" میں سب سے پہلے ان ثمرات کا ذکر کیا جو انھیں انور سدید کی سرزنش سے حاصل ہوتے رہے ہیں۔ ہارون الرشید تبسم کو اپنی تعلیم مکمل کرنے، علم و ادب کے راستے پر سنجیدگی سے آنے، تخلیقی و تصنیفی میدان میں مشغولی سے جڑے رہنے کے حوالے سے انور سدید تلقین ہی نہیں سرزنش سے کام لیا کرتے تھے۔ اپنی ذات کے حوالے سے کسی معروف ادیب کی یہ گواہی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ:

> "جس طرح راغب شکیب نے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ انھیں تعلیم کی پٹڑی پر گامزن کرنے میں انور سدید کا ہاتھ ہے، اسی طرح مجھے بھی انور سدید کی سرزنش کبھی نہیں بھولتی کہ وہ ہر موقع پر مجھے تعلیم حاصل کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔" (ص 26)

نجم الحسن رضوی نے انور سدید کی کتاب دوستی اور ادب نوازی کو موضوع بنایا ہے۔ کتاب دوستی کے حوالے سے بتایا کہ "وہ بسیار نویس تھے لیکن جتنا لکھتے تھے اس سے کئی گنا زیادہ وہ پڑھتے تھے۔" (ص 29) ادب نوازی کے حوالے سے لکھا کہ جس بھی تخلیق کار کی کوئی تحریر اچھی لگتی خواہ وہ کسی علاقے، عمر یا مرتبے کا ہوتا اس کا ذکر نہایت شگفتگی اور محبت سے کرتے۔

حسن عسکری کاظمی نے "انور سدید ۔۔۔ ایک دیانت دار قلمکار" میں انور سدید کی شخصیت اور قلمکاری کے تقریباً تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ساتھ ہی ان کی خوبصورت نثر نگاری کو بھی اپنے مضمون میں دو بار خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ حسن عسکری کاظمی کے نزدیک "ان کا اصل کارنامہ عمدہ و جاندار نثر تخلیق کرنا ہے۔" (ص 33)

ڈاکٹر سعادت سعید نے اپنے مخصوص انداز میں انور سدید کی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں انور سدید کی کتاب "اقبالیات کے کلاسیکی نقوش" کو خصوصی طور پر سراہا ہے اور اسے ایک عمدہ تحقیقی و تنقیدی کتاب قرار دیا ہے۔ پروفیسر قیصر نجفی نے انور سدید کی دیگر خدمات کے ساتھ ساتھ ادبی رسائل سے ان کے تعلقِ خاطر اور قلمی معاونت کو بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

سرفراز سید کا مضمون "انور سدید اور برگد کا پیڑ" اپنے عنوان کی طرح ہرا بھرا ہے۔ اس میں مختلف ملاقاتوں اور یادداشتوں کے حوالے سے کئی اہم اور دلچسپ منظر محفوظ ہو گئے ہیں۔ مضمون نگار نے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنیاد پر قائم ہونے والے اس تاثر میں ہم سب کو شامل کیا ہے کہ انور سدید:

> "حیرت انگیز صاحبِ مطالعہ شخص تھے ۔۔۔۔ برصغیر میں شائع ہونے والی کوئی اہم علمی و ادبی تحقیق ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہتی تھی ۔۔۔۔ چند لمحوں کے سوا کوئی لمحہ ایسا نہ تھا جب وہ کچھ نہ کچھ پڑھ رہے یا لکھ رہے ہوتے۔" (ص 45،44)

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا مضمون "ڈاکٹر انور سدید کی علمی و ادبی خدمات" گو مختصر ہے لیکن انور سدید کی تمام تخلیقی، تحقیقی اور تنقیدی جہتوں کا احاطہ بڑی خوبی سے کر رہا ہے۔ سلیم آغا لکھتے ہیں:

الف) "وہ اپنے عہد کے ان چند باخبر نقادوں میں شامل تھے جنھیں ایوانِ ادب کے مختلف گوشوں میں ہونے والی ہر لرزش سے بخوبی آگاہی رہتی تھی۔" (ص 48)

نذیر فتح پوری، پونہ (ہند) سے ادبی رسالہ "اسباق" نکالتے ہیں۔ ان کا مختصر مضمون کئی اہم نکات لیے ہوئے ہے۔

نذیر فتح پوری نے نہایت دو ٹوک انداز میں لکھا: "جہاں تک میں جانتا ہوں اپنے ہم عصروں پر جس شدت اور مقدار میں انور سدید نے لکھا، کسی اور کا ایسا کام نظر نہیں آتا۔" (ص 50)

شاہد شیدائی کا مضمون اس حوالے سے اہم ہے کہ انھوں نے انور سدید کی شخصیت اور فن کے تقریباً تمام پہلوؤں کو انور سدید کے انٹرویوز، خطوط اور مضامین سے استفادہ کرتے ہوئے نہایت اختصار سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ سو یہ مضمون فقط تاثراتی یا تعزیت نامہ نہیں رہا، انور سدید کا بھرپور تعارف نامہ بن گیا ہے۔ شاہد شیدائی نے ادب اور ادیب کے حوالے سے انور سدید کی فکر، احساس اور ترجیحات کی تلخیص کچھ اس طرح پیش کی ہے:

> "انور سدید کے مطابق ادب بنیادی طور پر وسیع المشربی کا تقاضا کرتا ہے اور اختلاف رائے کی پوری اجازت دیتا ہے کیونکہ اختلاف ہی سے نیا سوال جنم لیتا اور پرانی بات کے نئے زاویے نکھارتا ہے جس سے ادب کا مطلع وسیع اور روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔۔۔ انور سدید کے لیے یہ بہت بڑا المیہ ہے کہ ادب پر بیوپاریوں کے قبضہ گروپ نے یورش کر رکھی ہے جو ادب کو بھی سیاسی حربوں کی طرح استعمال کر رہے ہیں۔۔۔ انور سدید ادب کو بنیادی طور پر عبادت کا عمل قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ادب اپنا انعام آپ ہے۔" (ص 54، 55)

اخلاق عاطف نے انور سدید کو ادب کا "ان تھک خادم" قرار دیا۔ انور سدید اگر حیات ہوتے تو خود بھی اپنے لیے اسی لقب کو پسند کرتے کہ ان کی طبیعت کا عجز و انکسار اور ان کی تحریروں اور کتابوں کا متنوع انبار جسے "کتب مینار" کہنا مناسب ہے، سب اسی لقب کی مختلف جہتوں اور پرتوں کو نمایاں کر رہے ہیں۔ ("کتب مینار" انور سدید کی وضع کردہ "ترکیب" ہے جسے انھوں نے تبصروں پر مشتمل اپنی ایک کتاب کا عنوان بنایا ہے) اخلاق عاطف نے بھی اس امر پر زور دیا کہ انور سدید تمام علاقوں اور دبستانوں کے انور سدید تھے۔

اخلاق عاطف نے انور سدید کے نثری اسلوب کی "سندرتا" کو بھی خراج تحسین پیش کیا ہے۔

مظفر حسن منصور نے اپنے مضمون "انور سدید۔۔۔ یادیں اور باتیں" میں انور سدید کی ابتدائی ادبی زندگی کے حوالے سے اپنی یادیں تازہ کی ہیں۔ مضمون میں ایک یادگار گروپ فوٹو کا بھی ذکر ہے جو ہفت روزہ "شعلہ" کے "جوہر نظامی نمبر" کے صفحہ اول پر شائع ہوا تھا اور اس میں انور سدید بھی نظر آ رہے ہیں۔ مظفر حسن منصور سے گزارش ہے کہ اس یادگار تصویر سے "تخلیق" کو ضرور نوازیے تاکہ یہ یادگار شائع ہو سکے۔

اشرف ذکی نے انور سدید کی رحلت پر اپنے دلی جذبات کچھ اس طرح بیان کیے کہ سب نے یہ جانا کہ یہ ہمارے ہی دل کی بات ہے۔ اشرف ذکی کے دو فقرے ملاحظہ ہوں جن سے مضمون نگار کی محبت و عقیدت بھی ظاہر ہو رہی ہے اور حقیقت حال بھی:

> "میں شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ وہ شجر جو تناور بھی تھا اور انتہائی گھنا اور خوشگوار سائے کا حامل بھی: اب ہم اس کے سکون آور سائے سے محروم ہو گئے ہیں۔ نصف صدی سے مجھ جیسے معمولی لکھاریوں سے لے کر اس عرصے کے کئی عظیم اور نامور لکھاریوں تک نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں ان سے رہنمائی حاصل کی۔" (ص 62)

ملک مقبول احمد نے "ہمارے علم و ادب۔۔۔انور سدید" کے عنوان سے اپنے تاثرات و خیالات کو پیش کیا ہے۔ ملک مقبول احمد ایک معروف ناشر اور ادیب ہیں۔ ہمارے یہاں عموماً ناشر اور مصنف کے تعلقات مثالی نہیں رہے۔ انور سدید سے ملک مقبول احمد اور ان کے ادارے کا تعلق گو بہت پرانا نہیں لیکن بہت ہی کم عرصے میں یہ تعلق ایک گہری دوستی اور باہمی محبت میں بدل گیا۔ ملک مقبول احمد کے زیرِ نظر مضمون اور دیگر تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انور سدید سے ان کی محبت، عقیدت کے دائرے میں داخل ہو گئی ہے۔ معاصر ادبی و اشاعتی ماحول میں اس محبت و عقیدت کی شاید ہی کوئی اور مثال ہمیں دستیاب ہو سکے۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن کے مضمون کا عنوان "بحرِ ادب کے شناور: انور سدید" ہے۔ سکندر حیات میکن نے تخلیق کے زیرِ نظر مضمون میں دیگر باتوں کے علاوہ اس امر پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ انور سدید نے تو بے شمار جونیئر سینئر ادیب و شاعر پر خلوص و محبت اور فقط ادب پروری کی خاطر لکھا لیکن ادبی حلقے نے اس محسن کا حق ادا کرنے میں بخل سے کام لیا بلکہ بقول میکن صاحب انور سدید کے محاسن کو معائب بنا کر پیش کیا جاتا رہا اور تصنیف و تالیف سے ان کے تعلق خاطر کو فقط زود نویسی اور بسیار نویسی کہہ کر ان کا رتبہ کم کرنے کی کوشش کی جاتی رہی، گو یہ ایک سعی ناکام ہی ثابت ہوئی۔

شاہد بخاری کا مضمون "مردِ میدانِ فن تھے انور سدید" اپنے عنوان کی طرح بہت خوب ہے۔ شاہد بخاری نے سرگودھا میں اپنے طالب علمی کے زمانے کی ادبی سرگرمیوں کا پس منظر ابھارتے ہوئے انور سدید کی علم و ادب میں دلچسپی، ادب کے طالب علموں کی حوصلہ افزائی اور نو واردانِ ادب کی رہنمائی کے حوالے سے اپنی قیمتی یادوں میں ہمیں شریک کیا ہے۔ اس مضمون کا ہر اقتباس عمدہ ہے اور آخر میں انور سدید کے حوالے سے ایوب صابر مبارک مونگیری کی ایک اہم لیکن کمیاب نظم کی شمولیت قارئینِ تخلیق اور مداحینِ سدید پر احسان ہے۔

قمر زمان نے "انور سدید اور تخلیق" کے عنوان سے اپنے مضمون میں انور سدید کے ماہنامہ تخلیق اور مدیرِ تخلیق سے گہرے تعلق کو واضح کیا ہے۔ قمر زمان کا کہنا ہے کہ مدیرِ تخلیق اظہر جاوید اور انور سدید میں ایک قدر مشترک یہ بھی تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی فرماتے تھے۔ قمر زمان کے مضمون سے معلوم ہوا کہ تخلیق میں قارئین کے خطوط کی اشاعت کا سلسلہ بھی انور سدید کے مشورے ہی سے شروع کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلا کہ انور سدید نے تخلیق کے (خطوط کے حصے) "انجمن خیال" میں شائع ہونے والے مراسلوں کے تنقیدی جائزے پر مبنی ایک مضمون بھی لکھا تھا جو ظاہر ہے ایک منفرد سی بات تھی۔

سلمیٰ اعوان نے اپنے مختصر اظہاریے کو "صاحبِ علم، صاحبِ قلم اور صاحبِ ایمان شخصیت: انور سدید" کا عنوان دے کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ سلمیٰ اعوان نے دیگر باتوں کے علاوہ ایک نئی اور دلچسپ بات لکھی کہ انور سدید ویسے تو ڈائجسٹوں میں چھپنے والے پاپولر فکشن کے کچھ زیادہ قائل نہیں تھے لیکن ڈائجسٹوں کی کسی تحریر میں کوئی تخلیقی شعلہ انھیں نظر آ جاتا تو وہ اس کی جانب اپنے کسی مضمون، مراسلے یا جائزے میں ضرور اشارہ کرتے۔

عمان سے قمر ریاض نے انور سدید کے حوالے سے اپنی یادیں اور تاثرات قلم بند کر بھیجے ہیں۔ انھوں نے انور سدید کو "چلتا پھرتا اردو ادب" اور وزیر آغا کے لیے انور سدید کے دل میں موجود محبت و عقیدت کو بے مثل قرار دیا ہے۔

سونان اظہر جاوید نے بڑی محبت بھری زبان میں اپنے دل کی دنیا پڑھنے والوں پر عیاں کر دی ہے۔ ان کا مضمون گہری تاثیر کا

حامل ہے۔ انھیں انور سدید میں اپنے والد ماجد اظہر جاوید کا عکس نظر آیا اور تخلیق کو جاری رکھنے کے حوالے سے انور سدید کے خلوص، ادبی اور ادارتی سرپرستی اور رہنمائی نے انھیں اپنے والد کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔ سو اسی لیے سونان اپنے والد کے ورثے ''تخلیق'' کو مسلسل اور مستحکم رکھنے میں کامیاب رہے۔ تخلیق کے اداریے میں بھی (مدیر) سونان اظہر جاوید نے اپنے احساسات اور انور سدید کے قلمی و شخصی احسانات کا تذکرہ بڑی محبت اور دل سوزی سے کیا ہے۔ انور سدید کے فرزند ارجمند جناب مسعود انور نے ''میرے ابا جی'' کے عنوان سے ایک بہت ہی خوبصورت مضمون رقم کیا ہے۔ ان کے مضمون کا بنیادی تاثر وہی ہے جو پورے ادبی حلقے میں انور سدید کے حوالے سے موجود ہے یعنی انور سدید ایک دیانت دار، محقق، خود دار، صاحب مطالعہ اور قول سدید کہنے والے شخص تھے۔

بشریٰ اعجاز کا تعزیتی کالم بھی اہم ہے۔ انھوں نے بھی اپنے ذاتی مشاہدے کی بنا پر یہ گواہی دی کہ ''(انور سدید) کے رویے میں نووارد ان ادب کے لیے ایک خاص مہربانی اور ایک خاص توجہ پائی جاتی تھی۔''

ڈاکٹر زاہد حسن چغتائی نے انور سدید کو ''دبستانِ علم و فن کا منارہ'' کہا تو بالکل درست کیا۔ چغتائی صاحب کے نزدیک انور سدید محبتوں اور رفاقتوں کا ایک ''خوبصورت استعارہ'' اور ''گئے وقتوں کا گراں قدر اثاثہ'' تھے۔

خالد ہمزہ ہاشمی کا کالم اس حوالے سے اہم ہے کہ انھوں نے روزنامہ ''نوائے وقت'' سے انور سدید کی وابستگی، قلمی خدمات اور رفاقت کاروں سے گہری اپنائیت کا تذکرہ کیا ہے۔ خالد ہمزہ ہاشمی نے احباب سے مقدم جانا انور سدید کی ''صاف گوئی، ایمان داری، چھوٹوں سے شفقت اور ان کی رہنمائی، اخلاقی اقدار کی پاسداری اور وضعداری'' کے حوالے سے پیش کیا ہے۔

اظہر سلیم مجوکہ نے اپنے کالم میں انور سدید سے محبت و عقیدت کا اظہار کچھ اس طرح کیا کہ ملتان کے پورے ادبی حلقے کی نمائندگی کا حق ادا ہو گیا۔ اظہر سلیم مجوکہ بھی اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انور سدید صرف ایک شہر یا حلقے تک محدود نہیں تھے۔

تنویر قیصر شاہد کا کالم پڑھ کر انور سدید سے محترم کالم نگار کے تعلق کی تین جہتیں سامنے آتی ہیں۔ وہ انور سدید کے قاری اور مداح ہیں، صحافتی دنیا کے رفیق کار بھی ہیں اور انور سدید کے احسان مند بھی۔ صحافتی رفاقت کاری میں انھوں نے انور سدید کو خوش مزاج، منکسر، ہمدرد، بااصول، محقق اور متنوع موضوعات پر بسیار و سرعت نویس پایا۔

جمیل آذر نے اپنے مضمون میں انور سدید کو بڑی محبت سے یاد کیا۔ ان کے کوائف پر بھی ایک نظر ڈالی لیکن بطور خاص ان کی غزلوں کو موضوع بنا کر انور سدید کے تجربات، احساسات اور شخصیت کی مختلف پرتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی۔

معروف خاکہ نگار شفیع ہمدم نے انور سدید کی خاکہ نگاری کو ان کی کتاب ''قلم کے لوگ'' کے حوالے سے موضوع بنایا ہے۔ شفیع ہمدم کے نزدیک انور سدید کی خاکہ نگاری دو اہم خصوصیات رکھتی ہے:۔

(الف) انور سدید کی خاکہ نگاری کی بنیاد خلوص ہے اور تحریری فضا توازن کی حامل ہے۔

(ب) انور سدید اپنے خاکوں میں اپنی شخصیت کو اپنے ممدوح کی شخصیت اور اپنے حالات و واقعات کو ممدوح کے حالات و واقعات پر حاوی نہیں ہونے دیتے۔ شفیع ہمدم کے الفاظ میں: ''(انور سدید) خاکے میں اپنی شخصیت کو اس وقت داخل کرتے ہیں جب وہ محسوس کرتے ہیں کہ ایسا کرنے سے موضوعِ خاکہ کی شخصیت کا کوئی پہلو مزید کھل کر سامنے آ سکتا ہے۔'' (ص 114)

محمد علی چراغ نے ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی کتاب ''انور سدید کی وزیر آغا شناسی'' کا تجزیہ کرتے ہوئے وزیر آغا اور انور سدید دونوں کی شخصی خصوصیات، علمی وجاہت، باہمی مودت کو اپنے مخصوص نثری انداز میں پیش کیا ہے۔ محمد علی چراغ نے اس اہم کتاب کی تالیف و اشاعت پر ہارون الرشید تبسم کو بجا طور پر داد دی ہے۔

حصہ منظومات میں شاعروں نے اردو اور پنجابی میں انور سدید کو خراجِ محبت و عقیدت پیش کیا ہے۔ سلیم شہزاد نے اپنی پنجابی نظم میں انور سدید کے بچھڑنے پر اپنے اور خلقت کے احساسات کو بڑی خوبی سے منکشف اور محفوظ کیا ہے۔ حنیف باوا نے اپنی پنجابی نظم میں کہا ہے کہ انور سدید کے جانے پر ان کے پڑھنے کا کمرہ بھی رنج و ملال کی زد پر ہے اور ان کا قلم ایک طویل رفاقت کے خاتمے کو تسلیم کرنے ہی سے قاصر ہے اور اپنے رفیق کے انتظار میں ہے ایسا انتظار..... جو ناختم ہے۔ دونوں پنجابی نظمیں پر تاثیر ہیں؛ بجا کہا گیا ہے کہ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔

شہ طراز کی اردو نظم بھی انور سدید کی رحلت پر ان کے مکان، صحن، چڑیوں، ستاروں، کتابوں، قلموں، لفظوں اور پھولوں کی اداسی کو کچھ اس طرح ایک خاص آہنگ سے ابھارتی ہے کہ مرحوم کے سارے حلقۂ احباب کی قلبی کیفیات اس کی مختلف پرتوں کا حصہ بنتی نظر آتی ہیں۔ پروین شیر، ریاض ندیم نیازی، شجاعت راہی، مجید احمد اور توقیر مشتاق نے بھی بڑی محبت اور مہارت سے اپنے احساسات کو زبان دی ہے۔

تخلیق کے اس خاص نمبر میں ڈاکٹر انور سدید کا ایک غیر مطبوعہ مضمون ''مولوی نذیر احمد'' کو نوادر کے طور پر شائع کیا گیا ہے۔ اس نمبر میں دیگر مضامین، افسانے، غزلیں بھی خوب ہیں؛ خصوصاً رشید امجد اور اظہر جاوید کے افسانے (اظہر جاوید کے پنجابی افسانے کا اردو ترجمہ حنیف باوا نے کیا ہے) اور صادقین پر مسلم شمیم اور ابصار عبدالعلی پر طارق اصغر کے مضامین بہت عمدہ ہیں۔

خطوط کے حصے میں ''انجمن خیال'' میں بھی انور سدید مرحوم کو خراجِ تحسین و عقیدت پیش کرنے کا سلسلہ جاری رہا ہے۔ مسلم شمیم نے اپنے مراسلے میں لکھا ''ڈاکٹر انور سدید غیر معمولی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بڑی بصیرت و بصارت کی حامل شخصیت کا نام ہے..... ان کی زود نویسی اور کثیر نویسی کا کمال رفتہ تھی اور معیار اور معنویت سے مالا مال تھی۔'' (ص 147)

تبسم سحر نے اپنے مکتوب میں انور سدید کی محبتوں اور شفقتوں کا ذکر کیا۔ مرزا احمد نور طاہر نے انھیں علم و ادب کا سمندر قرار دیا۔ سکندر حیات میکن نے کہا کہ انور سدید ہمیشہ ادب اور ادیبوں کی خدمت کرتے رہے، ستائش و صلے کی پروا کیے بغیر۔ صائمہ نورین بخاری نے انور سدید کی قلمی شفقتوں کا ذکر کیا، ساتھ ہی الیکٹرانک میڈیا کی بے حسی پر افسوس کا اظہار بھی کیا جس نے اتنے بڑے ادیب کے دنیا سے جانے پر خاموشی اختیار کیے رکھی۔ آفتاب خان نے لکھا کہ انور سدید نے تن تنہا جو ادبی کام کیے وہ ہمارے کئی اداروں کے بھی بس کی بات نہیں۔ ایم۔ ڈی ملک نے انھیں ایسے ادبا میں شمار کیا جو اپنے جونیئرز کے ادبی ذوق کی آبیاری کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ مجید احمد نے انور سدید سے آخری ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''ان کی ہر ادا رخصت کا اشارہ تھی۔''

تخلیق کا انور سدید نمبر ایک یادگار اور متنوع رنگوں کا حامل شمارہ ہے۔ اسے یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ انور سدید کے جانے کے بعد یہ دنیائے اردو کا پہلا ''انور سدید نمبر'' ہے۔ ادارہ تخلیق اور مدیر تخلیق مبارک باد کے مستحق ہیں۔

◆◆◆

O' Arab World......ایک مطالعہ

ڈاکٹر سکندر حیات میکن

پاکستان میں اور عالمی سطح پر اقبال شناسی کے ضمن میں ایک قابلِ قدر نام پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر کا بھی ہے۔ انھوں نے علامہ محمد اقبال کے افکار و نظریات کو بڑے پیارے پیارے اور بڑے واضح انداز میں متعارف کروایا ہے۔ پاکستان میں ہی نہیں ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے بین الاقوامی سطح پر بھی نمایاں کاوشیں کی ہیں اقبال اور فکرِ اقبال سے متعلق ان کی تحقیقات پاکستان، جاپان، یونان، ہندوستان اور مصر میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ انھوں نے علامہ محمد اقبال کے افکار و کلام کے مختلف زاویوں اور فلسفیانہ نظریات کو وسیع پیمانے پر علمی اور عام فہم انداز میں پیش کیا ہے۔

"O' Arab World" ان کی عالمِ عرب کو اقبال سے متعارف کروانے کی کاوشوں کا ایک حصہ ہے جس میں انھوں نے بڑے موثر انداز میں عالمِ عرب سے اقبال کی توقعات اور عربوں سے اقبال کے خطاب کو موضوع بنایا ہے۔ یہ کتاب اقبال اکادمی پاکستان کی جانب سے 2010ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کا دیباچہ نامور اقبال شناس اور اقبال اکادمی کے ڈائریکٹر محمد سہیل عمر نے لکھا ہے۔ انھوں نے اس کے دیباچے میں علامہ محمد اقبال کے عربوں سے متعلق نظریات کے ساتھ ساتھ عجمی لوگوں سے متعلق مشاہدات کو بھی بیان کیا ہے۔

محمد سہیل عمر نے ذکرِ عرب اور فکرِ عجم کو اقبال ہی کے شعر کے ذریعے واضح کیا ہے۔

ذکرِ عرب کے سوز میں ، فکرِ عجم کے ساز میں نے عربی مشاہدات نے عجمی تخیلات

سہیل عمر نے اقبال کے کلام میں سوزِ عرب اور سازِ عجم کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ اس دیباچے کے بعد ڈاکٹر زاہد منیر عامر کا مقالہ "Muhammad Iqbal's passion for the Arabs" شروع ہوتا ہے۔ اس مفصل تحقیقی مقالے میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے علامہ محمد اقبال کے عربوں کے بارے میں افکار و نظریات کو متعارف کروایا ہے۔ اس مقالے کی ابتدا میں وحدتِ اسلام کے ذریعے انھوں نے شہد کے قطرے کی مثال دی ہے جو مختلف قسم کے پھولوں کے رس کشید کرنے کے بعد وجود میں آتا ہے اسی طرح ملتِ اسلامیہ شہد کے چھتے کی مانند ہے اور اسلام ایک عالم گیر معاشرے کی تشکیل کرتا ہے جب کہ اسلام کے ماننے والوں کا تعلق کسی بھی علاقے یا قبیلے سے ہو اسلام ان کو ایک وحدت میں جوڑ کر رکھتا ہے۔

ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے اس تاریخی مقالے میں علامہ محمد اقبال کے مختلف فارسی اور اردو کلام کے ذریعے اسلام کی عالم گیر بصیرت کو مدِنظر رکھتے ہوئے عرب تہذیب کے حوالے بھی دیے ہیں۔ اسی طرح اقبال کی نظر میں عرب اور عرب تہذیب کی عظمت کو بھی بیان کیا ہے۔ اقبال خود عجمی تھے لیکن انھوں نے اپنے تخاطب میں عرب اور اقوامِ عرب کو زیادہ اہمیت دی۔ ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے گہرے مطالعے سے عربوں کے نسلی تفاخر کو نہیں بلکہ ان کے غیر معمولی کردار کو اقبال کی پسندیدگی کا مظہر ٹھہرایا ہے۔

علامہ اقبال کے کلام میں عربی زبان، عربی تہذیب اور اسلام میں عربوں کی اہمیت کو مختلف زاویوں سے پیش کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے کلامِ اقبال سے قطرہ قطرہ اکٹھا کر کے ان کو مکمل انداز میں یکجا پیش کر دیا ہے۔ زیرِ بحث کتاب ('O' Arab

"World") میں انھوں نے عربوں کے ساتھ اقبال کی وابستگی کو بھی رقم کیا ہے۔ اقبال فطری طور پر صحراؤں میں رہنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ نمایاں کیا ہے کہ اقبال نے عرب کے صحراؤں میں رہنے والوں کی سادہ طبیعت کو پسند کیا ہے۔ صرف یہی نہیں اقبال کی عربوں سے اثر پذیری ان کے نسلی خصائص اور تاریخ کے آئینے میں ان کے کردار کو بھی روشناس کروایا ہے۔ اقبال نے عرب کے باسیوں کو خصوصی طور پر پسند کیا کیوں کہ اسلام کے چراغ کو عربوں نے روشن کیا اور یہی اولین حاملین قرآن ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے کلام اقبال میں اثر کر ایک شہد کی مکھی کی طرح ایا ایہا عرب سے متعلق اقبال کے افکار کو متعارف کروایا ہے۔ کلام اقبال میں عربوں کی تہذیب، ان کی تاریخ، ان کے علوم اور ان کے کمالات کو جس طرح بیان کیا ہے، ڈاکٹر زاہد منیر نے عربوں کے ان کمالات سے قارئین کو بالخصوص مصری باشندوں کو روشناس کروایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے نہ صرف اردو شعری مجموعوں بلکہ تمام فارسی کلام سے بھی استفادہ کر کے عربوں کی عظمت سے متعلق اقبال کے خیالات اور تفکرات کو واضح طور پر بیان کر دیا ہے۔ اقبال کی عربوں سے وابستگی کے ضمن میں مصنف نے اس کتاب میں اقبال کی ان نظموں کی نشان دہی بھی کی ہے جو بالخصوص عربوں سے مخاطب ہو کر لکھی گئی ہیں۔ جن میں زیادہ تر طویل نظمیں اس تاثر کو زیادہ اجاگر کرتی ہیں کہ اقبال خود کو عربوں کا شاعر کہتے ہیں۔ اس اہم تحقیقی مقالے میں انھوں نے فرداً فرداً ان نظموں کے موضوعات اور عرب کی تہذیب اور عرب کے کمالات کے مختلف رنگوں کو نمایاں کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ عرب کی سرزمین اقبال کی تمناؤں کا مرکز ہے اور اقبال کا دست دعا جب بھی بلند ہوتا ہے تو بھی ان کی نظر میں اپنے تمناؤں کے مرکز سے خالی نہیں ہیں۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے اقبال کی عربوں کے ساتھ عقیدت و وابستگی کو ان کی نظموں میں بھی تلاش کیا ہے۔ علامہ محمد اقبال کے کلام میں عالم عرب کے حوالے سے خیالات و افکار کو ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے اس کتاب میں تین نظموں کے ذریعے پیش کیا ہے۔ جس میں پہلی نظم تاریخ و دیار اعتراف، دوسری تبصرہ و تجزیہ اور تیسری عالم عرب کے نام پیغام پر مشتمل ہے۔ اقبال نے عرب سخنوروں کو بھی ہندی مسلمانوں کی طرح سمجھایا ہے اور انھیں غفلت اور غیروں پر تکیہ کرنے کی بجائے اپنی قوت و بازو پر بھروسہ کرنے کی تلقین کی ہے۔ اقبال کے عرب دنیا کے بارے میں تفکرات کے ضمن میں ڈاکٹر زاہد منیر عامر کا انگریزی میں ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

> "In a romantic Ghazal, Iqbal has addressed the Arab and the non Arab world with great passion - where is the Arab who will bring back the golden period? He has lost his selfhood and has become colorless - deprived of beauty. Iqbal remind the Arab world of their old lesson that the Muslim empire has no boundries - his world has no limits. However, the concept of rationalism has led the Arab astray. Same is the case with non Arab world

یہ کتاب (O' Arab World) ہمیں ایا ایہا عرب سے متعلق اقبال کے خیالات و افکار سے آگاہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر زاہد منیر عامر نے بڑے منفرد اسلوب اور تخلیقی عبارت سے اس کتاب میں عالم عرب کے لیے اقبال کے جذبات اور مختلف نظریات کی عکاسی کی ہے۔ یہ کتاب اقبال کی عربوں کے ساتھ جذباتی اور دلی وابستگی سے شناسائی کرواتی ہے۔

◆◆◆

ماہنامہ "تخلیق" لاہور کا ڈاکٹر انور سدید نمبر

سید مبارک علی شمسی

ماہنامہ "تخلیق" لاہور برصغیر کا قدیمی اور معیاری ادبی جریدہ ہے۔ اظہر جاوید کی وفات کے بعد ان کے فرزند سونان اظہر جاوید باقاعدگی سے شائع کر رہے ہیں۔ میں عید سے چند روز قبل سونان اظہر جاوید سے ملنے کیلئے گیا تو تخلیق جون 2016ء کا تازہ شمارہ چھپ چکا تھا۔ سونان بھائی سے کافی دیر گپ شپ کے بعد میں نے اجازت طلب کی۔ انہوں نے مجھے "تخلیق" کا ڈاکٹر انور سدید نمبر پیش کیا۔ سرورق پر ڈاکٹر انور سدید کی مسکراتی تصویر ساری توجہ اپنی جانب مبذول کر رہی تھی۔ ڈاکٹر انور سدید کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر یوں گمان ہوتا تھا جیسے ڈاکٹر انور سدید سامنے بیٹھے سرگوشیاں کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے 4 دسمبر 1928ء کو میانی ضلع سرگودھا میں مولوی امام الدین (مرحوم) کے گھر میں آنکھ کھولی۔ آپ کا خاندانی نام محمد انوار الدین تھا جبکہ ادبی نام ڈاکٹر انور سدید ہے۔ ابتدائی تعلیم اسلامیہ پرائمری سکول سرگودھا سے اور مڈل گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خاں سے حاصل کی اور میٹرک کی ڈگری بھی اسی ادارہ سے ہی حاصل کی۔ جبکہ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو اور پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ سول انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کر کے محکمہ آبپاشی میں بھرتی ہوئے اور اسی محکمہ سے ہی بطور ایگزیکٹو انجینئر ریٹائرمنٹ لے لی۔ انہوں نے صدارتی ایوارڈ تمغہ امتیاز (2009ء) میں حاصل کیا علاوہ ازیں بہت سے ایوارڈ حاصل کئے جن میں تخلیق کا ایوارڈ نمایاں ہے۔ آپ کی تصنیفات کی تعداد 88 سے زائد ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا سے عقیدت رکھتے تھے اور انہیں اپنا مرشد تسلیم کرتے تھے۔ 20 مارچ 2016ء کو 88 برس کی عمر میں طویل علالت کے بعد زندگی کی جنگ ہار کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

زیر مطالعہ رسالہ "تخلیق" کی ورق گردانی کرتے کرتے صفحہ نمبر 9 پر جا پہنچا جہاں مدیر سونان اظہر جاوید نے تخلیق بات میں ڈاکٹر انور سدید کی علمی و ادبی اور صحافتی خدمات کے ساتھ ساتھ "تخلیق" کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے قلمی تعاون اور رہنمائی کو سراہتے ہوئے انہیں خراج عقیدت پیش کیا ہے اور اپنی تحریر کے ذریعے ان کے ساتھ گہری محبت و عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ رقم کرتے ہیں کہ "کسی بھی جگہ ڈاکٹر انور سدید کو مرحوم نہ لکھا جائے" بہت خوب ۔۔۔ واقعی ڈاکٹر انور سدید اپنے نام کام اور اپنی تحریروں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہیں گے، اردو ادب کی تاریخ میں ان کا نام سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں تفصیلی تعارف نامہ پڑھ کر اس ہمہ جہت ادبی شخصیت کے بارے میں مزید جانکاری حاصل ہوئی اور معلومات میں اضافہ ہوا۔ "تخلیق" میں خدیجہ فتح پوری (انڈیا)، شاہد رشید اللہ، اخلاق عاطف، مظفر حسن منصور، اشرف ڈی کے، ملک مقبول احمد، قمر زمان اور شاہد بخاری کے مضامین بھی قابل قدر ہیں۔ یادوں کے دریچے میں محترمہ سلمیٰ اعوان، محترم قمر ریاض، محترم سونان اظہر جاوید اور محترم مسعود انور نے ڈاکٹر انور سدید کی قربت اور شفقت میں گزرے قیمتی اور یادگار لمحات کی یادوں کو بہت ہی اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ خصوصاً جناب سونان اظہر جاوید نے اپنی تحریر "کون ڈاکٹر انور سدید؟" اور ڈاکٹر انور سدید کے فرزند محترم مسعود انور نے اپنی تحریر "میرے ابا جی (ایک ادھورا تعارف)" کس قدر کرب میں مبتلا ہو کر غمگین موسم میں اداس سوچوں کے

ساتھ تحریر کی ہو گی یہ تو آپ کو ان حضرات کی تحریریں پڑھ کر ہی اندازہ ہو گا۔ تاہم محترمہ بشریٰ اعجاز، محترم ڈاکٹر زاہد حسن چغتائی، محترم خالد بزدار ہاشمی، محترم اظہر سلیم مجوکہ، اور محترم تنویر قیصر شاہد کے تحریری کالم بھی لائق داد ہیں۔ جبکہ محترمہ پروین شیر، محترمہ شب طراز، محترمہ فوقیہ مشتاق، محترمہ عبیرہ احمد، محترم شجاعت علی راہی اور محترم ریاض ندیم نیازی نے بھر پور انداز میں ڈاکٹر انور سدید کو منظوم خراج تحسین پیش کیا ہے۔ بقول ریاض ندیم نیازی۔

علم و فن کے ترجماں تھے ڈاکٹر انور سدید بزم کی روح رواں تھے ڈاکٹر انور سدید

محترم پروفیسر جمیل آذر نے اپنے مضمون "انور سدید کی غزل (پر چند سطریں) کی روشنی میں" قادر الکلام شاعر، ادیب، صحافی، محقق، نقاد، افسانہ و ناول نگار، کالم نگار و انشائیہ نگار ڈاکٹر انور سدید کی شاعری کا جائزہ بہت منفرد انداز میں پیش کیا ہے۔ اس مضمون میں ان کا انداز بیان سادہ اور اسلوب اچھا اور منفرد ہے۔ لکھتے ہیں کہ "جب مشکل وقت آتا ہے تو مایوسی سے دوچار ہونا پڑتا ہے پھر آدمی سراب سے نکل کر بے رحم حقیقت کا ادراک کرتا ہے" مندرجہ ذیل اشعار اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید سراب دنیا میں گرفتار نہیں تھے وہ حقیقت آشنا تھے۔ اشعار ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ اس سنگ دل کے پاس کہاں تھے وفا کے پھول انور سدید جس کو سدا پوجتا رہا
۲۔ دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا
۳۔ تھا یقیں جس پہ اک حقیقت کا وہ حقیقت نہیں ہے سایہ ہے

محترم شفیع ہمدم کا "قلم کے لوگ" کا خاکہ اور محترم محمد علی چراغ کا "ڈاکٹر انور سدید کی ڈاکٹر وزیر آغا شناسی" بھی اپنی مثال آپ تھے۔ اور پنجاب رنگ میں محترم سلیم شہزاد اور حنیف باوا نے اپنے اپنے روایتی انداز میں ڈاکٹر انور سدید کو خراج تحسین پیش کیا ہے جبکہ غزلیات میں سید منظور حسین یاد، حسین مجروح اور ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ چھا گئیں اور انجمن خیال میں مسلم شمیم اور سکندر حیات مکین نے میدان مار لیا۔ ماہنامہ تخلیق لاہور کا ڈاکٹر انور سدید نمبر لازوال، منفرد اور دلکش رسالہ ہے اور اردو ادب کیلئے ایک نادر اور لازوال دستاویز ہے۔ میری دعا ہے کہ تخلیق دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے اور خالق اکبر ڈاکٹر انور سدید کو کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں جگہ دے۔ (آمین)

بقول شاعر: اٹھ کے محفل سے وہ کیا گئے ساتھ ہی دل ہمارا گیا

(بشکریہ روزنامہ "خبریں" ملتان، 28 جولائی 2016ء)

◆◆◆

حضرت علیؓ کا قول ہے "دوستوں کو آزماؤ نہیں ... ورنہ اکیلے رہ جاؤ گے"
میں بھی بہت اکیلا رہ گیا ہوں۔ اس لیے کہ اصولوں کی کسوٹی پر دوستوں کی آزمائش کرتا آیا ہوں — خدا کا شکر ہے — تنہا ہونے کے باوجود کسی کا محتاج نہیں — کسی ادیب، شاعر کے زیر احسان نہیں۔ "تخلیق" پر کچھ لوگوں کی عنایات ہیں مگر یہ وہ لوگ ہیں جنہیں نہ پیچھے کی للک ہے نہ ناموری نہ تحسین کا چسکا ہے نہ شہرت کا ٹھرکا۔"
(اظہر جاوید ("اپنی بات" اگست 2002ء)

خوابوں کی آواز

حسن جعفر زیدی

حسین مجروح کی "آواز" اپنے اندر ایک بہت بڑا جہانِ معنی سموئے ہوئے ہے۔ اس میں خواب ہیں، خواہشیں ہیں، امیدیں ہیں، مایوسیاں ہیں، فطرت کے اچھوتے رنگ ہیں، معاشرے کی تلخ و شیریں حقیقتیں ہیں، تلخ حقیقتوں کا درد اور احساس کی شدت۔ بہت گہری ہے، حسن و عشق ہے، ہجر و وصال ہے، انسان کے باطن و ظاہر میں موجود کیفیات ہیں، سیاست کے سراب میں چھپے فریب ہیں، سرمایہ دارانہ معیشت اور صنعت کاری کی جبر کے تلے پستے ہوئے انسانوں کا المیہ ہے، Urbanisation کے نتیجے میں انسان سے فطری زندگی کا حسن چھن جانے کا کرب ہے۔ مگر "آواز" میں اول سے آخر تک جو عنصر سب سے غالب ہے وہ خواب ہے۔ مجروح اپنے خوابوں سے جڑا ہوا ہے، وہ ان سے پیار کرتا ہے، وہ نہیں چاہتا کہ خواب چھن جائیں، خواب مر جائیں، خواب ہی اسے زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

پہلی نظم "نیند کی جھیل پر" اچھے خوابوں کے آہستہ آہستہ دم توڑنے کا المیہ بیان کرتی ہے اور اگر کچھ خواب بچے رہتے ہیں تو انہیں بھی صبح سار دنیا ملیامیٹ کر دیتی ہے کیونکہ یہ دنیا خوابوں سے گھبراتی ہے اور جو امیدیں یہ بچے کھچے خواب زندہ رکھنے کی کوشش کرتی ہیں، انہیں بھی دنیا نگل جاتی ہے۔ امیدوں کے لئے "تازہ کلیوں" کا استعارہ استعمال کیا گیا ہے جو بہت خوبصورت ہے۔

دوسری نظم "خواب میں دیکھا ہوا دن" اس نئے دن کا خواب دکھاتی ہے جس کی تمنا شاعر کے دل میں موجزن ہے، ایک مثالی دنیا کا خواب، ڈر، خوف سے بے نیاز، فطری آزادی اور محبت سے بھرپور دنیا کی امید دلانے والا خواب جو کسی وقت بھی طلوع ہو سکتا ہے۔ آخری دو سطریں ملاحظہ ہوں:

خواب، امید کی توفیق سے بڑھ سکتا ہے　　　اور نیا دن تو کسی وقت بھی چڑھ سکتا ہے

ایک اور نظم "ایک پرانا خواب" پھر سے ایک مثالی محبت بھری دنیا کی چاہت لئے ہوئے ہے۔ خوبصورت استعاروں سے بھرپور یہ نظم اختتامی سطروں میں اس خواب سے دل کی چاہت جس شدت سے بیان کرتی ہے وہ یوں ہے:

اگر وہ خواب ساون / یونہی بے قرار رہا / اور دہ مجھ کی دہشت سے تمتمایا ہوا / نظر بچا کے زمیں پہ کبھی اتر آئے / تو آدمی
اسی کے خوشی سے مر جائے

نظم بعنوان "تدفین" میں شاعر اپنے خواب کے آخری ہچکی لے جانے کے بعد اس کی تدفین کرنا چاہتا ہے لیکن شہر جو دراصل ہمارے معاشرے کی علامت ہے، اس قدر بے حس اور بیمار ہو چکا ہے کہ تیرگی تازہ کی خبر سے بھی خوف کھاتا ہے۔ وہ معاشرہ شاعر کے حسین خواب کے کفن دفن میں بھی اس کے ساتھ کھڑا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ان حالات میں وہ اپنے خواب کو دفن کرنے کے بجائے لوبان کی مانند اس کا دھواں بنا کر شہر پر وار دیتا ہے کہ شاید اس بے حس اور بیمار معاشرہ میں زندگی کی کوئی رمق دوڑنے لگے۔

سو اس خواب کا بے وقت دھواں / ہم نے لوبان کیا / شہر پہ قربان کیا

بے روح معاشرہ کی مردنی اور بے حسی پر ایک اور نظم ہے "نصاب سے خارج سوال"۔ ایک آواز جو آسمان کے پار تک سنی جا سکتی ہے مگر دیوار کے اس پار اس معاشرے کے لوگوں کو سنائی نہیں دیتی۔ ایک آگ ہے جس سے خیمہ کی طنابیں تو جل رہی ہیں لیکن خیموں یعنی معاشرہ کے لوگوں میں تپش پیدا نہیں کرتی۔ ایک آندھی ہے جو درختوں سے پتے گرا رہی ہے لیکن بوڑھے درختوں میں کوئی لرزش نہیں ہوتی اور پھر وہ ایک ایسی کربلا کا ذکر کرتا ہے جس میں لاشے روز گرتے ہیں۔ ایک صورت حال جس سے آج کل دہشت گردی سے دوچار ہمارا معاشرہ گزر رہا ہے۔ مگر اس معاشرہ کے لوگ اپنے مقتولین کا ماتم نہیں کرتے اور المیہ یہ ہے کہ یہ معاشرہ اپنے منتشر خوابوں کی تعبیر کرنے سے بھی قاصر ہو چکا ہے۔

یہ کیسا خواب ہے / جس کی بشارت روز ملتی ہے / مگر تعبیر کا سورج / ہمارے صحن کو روشن نہیں کرتا

پھر آگے چل کر شاعر کی خواب سرائے نظمیں "چیون ہانہ" میں ملتی ہے۔ اس نظم میں شاعر نے اس گہرے انسانی المیہ کا شدت سے احساس دلایا ہے کہ تیزی سے ہونے والی Urbanisation اور اصرافیت نے انسان کو اپنی قدرتی اور فطرتی زندگی سے جدا کر دیا ہے۔ وہ چیون ہانہ جہاں جنگل اور شیشم کے پیڑ تھے، ہرے بھرے کھیت تھے، صاف ہوا تھی، صاف شفاف پانی کے راجباہے تھے، سونا چاندی اگلتی مٹی تھی، پھول اور ان کی خوشبو تھی۔ مگر اس کے ہمسایہ میں پھیلتے سانپ کے پھنوں جیسا ایک شہر واقع تھا جس سے متاثر ہو کر وہ محصور پلازوں میں گھر گیا ہے۔ کارخانوں، گاڑیوں اور صنعتوں کے شور میں گم ہو گیا ہے۔ شاعر کے خواب جس چیون ہانہ میں بسیرا کرتے تھے اب اس کا المیہ یہ ہے کہ وہ

نئی بھی میلوں سی گلیوں کے پتھر پیڑ رستوں پر اگا بیٹھا ۔ چیون ہانہ خود سے پوچھتا ہے:

بابا کی اندھی چاہت سے جان چھڑائے کیسے　　　ہمسائے کی منہ زوری کو اب جھٹلائے کیسے

شہر کی میکانکی اور مادی مفادات سے لبریز زندگی اور شہریوں کے طمع و لالچ کے خواب، فطرت اور قدرتی زندگی میں پرواز کرنے والے پرندوں کے خواب نہیں ہوتے۔ "پرندوں کی آپ بیتی" اس حوالے سے ایک بہت خوبصورت نظم ہے۔ اس کی ابتدائی سطریں:

پرندے　خواب　کیا　دیکھیں　　　کہ سب موسم یہاں بس اک جیسے ہیں

اور پھر آگے چل کر وہ لکھتا ہے:

پرندے　خواب　جو　دیکھیں　　　تو　آخر　کس　لئے　دیکھیں

اور اس کی وجہ شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ پرندوں کے ہاں نہ تو نئے لباس حاصل کرنے کی طمع ہے، نہ طبقات ہیں کہ انہیں سپہ سالاری کے عہدے کا لالچ ہو، نہ ماضی کا اندیشہ ہے، نہ مادی خواہشات ہیں، نہ انہیں اپنے آشیانے کرائے پر چڑھ جانے کا سلیقہ آتا ہے مگر پرندوں کا مسئلہ یہ ہے کہ انہیں شہر سے بھی تعلق رکھنا پڑتا ہے جو ان کے لئے بہت بڑی الجھن بن جاتا ہے۔

پرندے شہر کے آنگن میں جب پرواز کرتے ہیں / تو الجھن سے الجھتے ہیں / کہ اس بستی کی چھاگل / خواہشوں کے گرم پانی سے لبالب ہے / مگر پیڑوں سے خالی ہے

آخری سطر کے مطابق شہریوں کی میکانکی زندگی، خواہشوں کے الاؤ میں جل رہی ہوتی ہے اور شخصیت کا شکار ہوتی ہے۔ اس میں گہرائی اور ٹھہراؤ نہیں ہوتا، یہ خالی ہوتا ہے۔

Urbanisation نے انسانی فطری زندگی کو اپنے قدرتی حسن سے کس قدر دور کر دیا ہے اس کا شدید احساس لئے ہوئے ایک نظم ہے ''موبائل کی جنتری''۔ یہ گر اور موبائل کا انسان اپنی ماں کے ہاتھ کی روٹی کی مہکار سے محروم ہو چکا ہے۔ گیس کے چولہے استعمال کرنے والے معاشرہ میں سرد مہری پائی جاتی ہے جبکہ پچھلے دور میں مائی جیراں کی بھٹی میں شہر میلے تنوں کی محبت سرسراتی تھی۔ آج جوس کا پانی استعمال کرنے والے لوگ ماضی میں چاتی کے پانی کے چشمۂ فیض سے محروم ہو چکے ہیں۔ شاعر اپنے شہر جھنگ کے کھیتیاں والا بازار کے Nostalgia کا اظہار بھی کرتا ہے جہاں سرخ چاتی کا چشمۂ فیض سبھوں کو یکساں سیراب کرتا تھا۔ فلک بوس عمارت کی چالیسویں منزل سے نیچے رینگتی زندگی کو دیکھتے ہوئے وہ اپنے ہم عصر خواب زادوں کا نوحہ لکھتا ہے اور وقت کی رفتاروں کی رفتار سے گھومتی اس گردش سے رخصت ہو کر کھڑا ہو جاتا ہے اور سوال کرتا ہے:

> ہم جو اشیا کی چاہت میں سرشار ہیں / اور ماضی کی چوکھٹ سے بچھڑے ہیں / اپنے معدوم کا صحیح موجود سے / کوئی خود کار رشتہ
> بنا پائیں گے / / سرخ چاتی کے چولہے میں قرآن کا اسم / اور بھٹی کی حیرت میں وعدوں کی تیغ / کب تلک اور کیسے / لگا
> پائیں گے!!

اصرافیت کا شکار انسان کا یہ واویلا ہے جو اجنبیت (Alienation) کا المیہ ہے کہ وہ اپنے معدوم کا صحیح موجود سے کوئی خود کار رشتہ بنانے میں ناکام ہے۔

ہمارے معاشرے میں جہالت اور تاریکی اس قدر غالب آ چکی ہے کہ اب اس کے پاس خواب ہی نہیں ہیں۔ اس صورت حال پر ایک بہت خوبصورت نظم ہے ''ٹوٹ کے جڑتی ہوئی امید'' اس کی پہلی سطر یہ ہے کہ ''رات کے پاس کوئی خواب نہیں''

یہاں رات سے مراد پورا معاشرہ ہے جو اپنی تقدیر بدلنے کے لئے کوئی خواب نہیں رکھتا بلکہ سہارے ڈھونڈتا ہے، تجربے مانگتا ہے، ادھار پہ جیتا ہے، آگے بڑھنے کے عزم میں بھی جلتا ہے۔ اگرچہ

> رات کے پاس ابھی کچھ ہے مگر خواب نہیں / خواب تو ایک طرف / لمحۂ موجود کی ارزانی کا شکوہ بھی نہیں

اس صورت حال میں شاعر اپنے خواب زلیخاؤں کی تیاری میں دیکھتا ہے جو کسی یوسف، کسی کنعان کی موہوم جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب ہیں اور رات کے برعکس صبح کا استعارہ استعمال کرتے ہوئے اس احساس کا اظہار کرتا ہے۔

> صبح کے شور میں / ابھی ہوئی / سہ پہر کا غم کھینچتے ہیں

مجروح نے نئے استعاروں، علامتوں، نئی لفظی تشکیل کے تجربوں کے ساتھ بڑی عمدہ غزلیں کہی ہیں جو اس مجموعہ میں نگینے کی طرح جڑی نظر آتی ہیں۔ غزل کے اشعار میں بھی مجروح جا بجا اپنے خوابوں کا اظہار مختلف زاویوں، جہتوں، مطالب اور معانی کے ساتھ کرتا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں:

بیچے تمام عمر جو خواہش کے نرخ پر — لینے گئے وہ خواب تو قیمت بدل گئی

موسم کی تنگی سے گئے خواب دیکھ کر — لو بن گئی ہے ابر کو بھاتی ہوئی ہوا
پکڑی گئی ہے خواب چرانے کے جرم میں — چہرہ بدل کے باغ کو جاتی ہوئی ہوا

خواہش و خواب تھے مجروح گروانے میرے — جن کو لوٹا گیا سرکاری وسائل کی طرح

چراغ کیسے جلائیں کہ روشنی کے عوض — وہ خواب مانگتا ہے اور ادھار مانگتا ہے

ادھورے خواب کا ہر مرتبہ قتل عمد ہوا — ہمارے بخت میں لکھا گیا ہے مسترد ہونا

مجروح کو اپنے خواب بہت عزیز ہیں۔ سماج، انسان، کائنات اور خود اپنے ساتھ اس کی جو بھی کمٹمنٹ ہے وہ اسے خواب کی شکل میں دیکھتا ہے۔ آخر اس کی کمٹمنٹ ہے کیا؟ اس کا پتہ اس کی بہت سی نظموں سے ملتا ہے جن میں وہ ایک مردہ سماج میں زندگی لوٹانے کی بات کرتا ہے۔ سماجی ترقی، فکری دوام، سوچ کی آزادی، انسان کے سچے جذبے، انسان اور انسان کا مکر و فریب سے آزاد رشتوں پر یقین، کائنات اور انسان کے مابین فطرت کا لازوال رشتہ جس کو جاگیردارانہ طبقاتی معاشرہ اور شہروں کے سرمایہ دارانہ صنعتی جبر نے تباہ و برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ وہ انسان اور خدا کے مابین تعلق بھی روایتی اوہام سے آزاد فطرت کے ذریعہ قائم کرتا ہے۔ اس کی نظم "حاصل کی تلاش" سے یہ بات بہت اچھی طرح متشرح ہوتی ہے۔

مرے بچو! مرے سکول سے بھاگے ہوئے بچو!! / پلٹ جاؤ / انہی قدموں سے / ان جس کی منکر ہوا گاہوں کی جانب / جن کی چشم تحیر / کائناتی بھید کھلتے ہیں / خدا تی سامنے / تو تخلیق ہوتے ہیں / پلٹ جاؤ مرے بچو! / خدا آپ سے تمہارا
منتظر ہے / ہیں اوہام کے باہر

حکمران اشرافیہ کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی استحصال کی تصویر کشی کرتے ہوئے مجروح ان کی زوال پذیری کی نشاندہی بھی کرتا ہے اور اس کے خوابوں میں سے ایک اہم خواب یہ بھی ہے کہ ان طبقوں سے انسانوں کو نجات حاصل ہوگی۔ نظم "انسان ورون کے بیچ" انہی حکمران طبقوں پر کہی گئی ایک مضبوط نظم ہے۔ ان کی کھوکھلی آن بان ان کی منافقت اور خود غرضی پیش کی ہے۔ اس کی ابتدائی سطریں ہیں:

یہ کون مخلوق ہیں خدایا! / کہ جن کی آنکھیں / رخ شعر پر آ گئی ہوئی ہیں / دلوں پہ جستیں لگی ہوئی ہیں / زبانیں جن کی لعاب
غیرت سے تر بتر ہیں / اگر مصر ہیں / کہ خواب ان کی اصنافِ روشنی سے معتبر ہیں

مگر شاعر اپنے خوابوں کو زیادہ معتبر سمجھتا ہے۔ اس کے باوجود کہ یہ حکمران سمجھتے ہیں کہ نسلوں سے کھیلنے والے دانش وران کے غلام ہیں اور انہیں اعتماد اور اطمینان ہے کہ وہ محترم ہیں کہ ان کو حسب خواہش سپاس نامے پیش کیے جاتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ زمانے کی بدلتی ہوئی انقلاب آفریں ہوا کا رنگ دیکھ کر مضطرب اور پریشان بھی ہیں۔

وہ مضطرب ہیں / کہ بند کمروں میں روشنی گھر بنا رہی ہے / وہ دل گرفتہ بھی ہیں کہ موسم / ہوا کا پانسہ پلٹ رہے ہیں

اور اسی مفہوم کی ایک اور بڑی پائیدار اور بھرپور نظم "آئینوں کی سیاست" ہے۔ اس کا سیاسی Vocal یا Content اور واضح ہے۔ اس میں شاعر TV میڈیا کی منافقت کا پردہ چاک کرتا ہے۔ ٹی وی سکرین ایک آئینہ ہے، جس میں سیاست دان کے چہرے کے تیور دیکھ کر کیمرہ یا اینکر پرسن اس کی مرضی کے تصویر پیش کر دیتا ہے۔ چنانچہ لوگوں تک بھی ان سیاست دانوں کے اصلی چہرے بے نقاب نہیں ہو سکتے۔ شاعر اس صورت حال سے سیاست دانوں کو ڈرانے کی کوشش کرتا ہے۔

ڈرو اس وقت سے / اس وقت کی دیدہ دلیری سے / ڈرو / جب دھوپ کی تقسیم / راشن کارڈوں پر ہو / ڈرو اس وقت سے /

اس وقت کی عبرت نگاہی سے ڈرو/ جب خواب اور تجلی تمہاری بستیوں سے کوچ کر جائیں

نظم "آواز کی موت" جو کتاب کے عنوان "آواز" کی طرف اشارہ کرتی ہے، فکری آزادی کی آواز ہے جو معاشرتی تبدیلی اور انقلاب کی جانب گامزن کرتی ہے اور یہاں بھی برف پگھلانے کا استعارہ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس پر خشکی طاری تھی/ اس میں یہ سوال کہ کون ہے جو :

جو خوف میں آواز کو آباد کرے/ برف کو آگ دکھائے کسی تیاری کی/ اور شاخوں کو سوالات سے آزاد کرے

اور آخر میں شاعر اس انجام کا پتہ دیتا ہے کہ

اب تو لازم ہے کہ موسم کی عداوت کا سراغ — اس کے مظلوم لہو سے ہی لگایا جائے

ہمارا معاشرہ اس درجہ فکری، سیاسی و معاشرتی جمود کا شکار ہو چکا ہے کہ اس پر مردہ ہونے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اس حوالے سے مجروح کی نظم "موت جو زیرہ" بہت بھرپور استعاراتی حامل خوبصورت نظم ہے۔ اس جمود اور مردنی کے لئے اس سے بہتر کوئی اور استعارہ نہیں ہو سکتا تھا کہ

یہ مردوں کا قبیلہ/ موت کا دارالخلافہ/ جہاں بس ماتم کناں ہیں/ تو مرگ بھی قائم ہیں/ اگر بیان وداع — یوں کھینچے آتے ہیں/ جیسے موت کا دارالخلافہ بھی/ کوئی زندہ تماشا ہو

مگر شاعر موت کے اس قبیلے سے بالکل مایوس نہیں ہے۔ امید رکھتا ہے کہ جو سوئے تھے وہ پتہ غار میں سے سالوں کے جاگ اٹھنے کا وقت آنے والا ہے جنہیں وہ "حنوط شدہ سائے" قرار دیتا ہے۔ خلیوں کی صنعت سازی ایک بڑا بھرپور استعارہ ہے جو فطرت کے حیاتیاتی عمل کی نمائندگی کرتا ہے اور پھر سے زندگی اور انقلاب کے آثار نمودار کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

یہ حنوط شدہ سائے/ بے تاب ہیں پھر سے جواں ہونے کو/ اپنی آل کے ہاتھوں/ جسے اصرار کرنے اور دھڑکنوں کو زباں دینے
کا ہوگا/ جسے خلیوں کی صنعت میں/ انحراف کا تفاخر ہونے والا ہے/ اگر ایسا ہوا/ تو ابن آدم اسی چہرے ہوگا/ زمیں پر اس
تماشے کے/ فقط کردار بدلیں گے/ کہ سارا کھیل بدلے گا

یقیناً شاعری جس خواہش کا اظہار ہے اس کے مطابق تو سارا کھیل بدلے گا تب ہی یہ معاشرہ پھر سے زندہ ہو سکتا ہے۔

بحیثیت مجموعی "آواز" ہمیں جھنجھوڑتی ہے۔ خود اپنے ہونے اور زندہ رہنے کے احساس کو مہمیز دیتی ہے۔ پچھلی کچھ صدیوں سے بالعموم اور کچھ عشروں سے بالخصوص انسان، معاشرہ اور فطرت جس بے رحمانہ جبر کے ہاتھوں کچلے گئے ہیں اس پر "آواز" ایک احتجاج بھی ہے اور مزاحمت بھی ہے۔ شاعر قاری کو بہت جلد اپنے ساتھ ہم آہنگ کر لیتا ہے کہ شاعر اور قاری دونوں کا ایک سا دکھ ہے۔ دونوں کے دکھ، احساسات اور جذبات مشترک ہو جاتے ہیں کہ شاعر ایک ایسے فرد کی بات کر رہا ہے جو اس معاشرہ کا ہر فرد ہے۔ اس کے خواب، اس کا رومانس، اس کی امنگیں اور خواہشات وہی ہیں جو اس معاشرہ کے ہر فرد کی ہیں۔ کون ہے جو آج کی زد آشوب صورت حال پر احتجاج نہیں کرنا چاہتا/ اسے بدلنا نہیں چاہتا اور اس کے کرب سے نجات نہیں چاہتا۔ اس اعتبار سے "آواز" ہر شخص کی آواز ہے۔ ہر ایسے شخص کی آواز جس میں احساس اور انسانیت کی کوئی رمق ابھی باقی ہے۔ وہ ہر شخص کے خوابوں کی آواز ہے۔

◆◆◆

خواب دیکھا نہ کرو

محمد علی چراغ

پروفیسر حسن عسکری کاظمی برسوں سے دنیائے علم و ادب میں مختلف حوالوں اور متعدد اصناف ادب میں معتبر اور معزز نام اور مقام حاصل کر چکے ہیں۔ نظم، غزل، نعت، مناقب اور سلام کے ساتھ ساتھ شاعر نہیں بلکہ خواص اہل نقد و نظر بھی ہیں۔ "دیارِ ادب" اور "شہید جاں میں اجالا" سفرنامے پیش کیے، کالم نویسی میں بھی باوقار مرتبے پر ہیں۔ وہ زود نویس مصنف اور آسودہ اوصاف شخصیت کے حامل بزرگ ہیں۔ ہر صنف اور ہر موضوع پر بے تکان خامہ فرسائی پر قادر ہیں۔

> "اس شعری مجموعے میں غزلوں کے ساتھ ساتھ آزاد نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں۔ غزل سے میری وابستگی پہلی محبت ہے۔ غزل کے بارے میں میری یہی رائے ہے کہ اس کا ہر شعر تہ در تہ معانی کا خزینہ اور شاعر کے باطن میں چھپی دنیا کا عکس جمیل ہے۔ غزل کا رسیلا پن اور معنوی اعتبار سے انسان کے ذوق جمال کا لطیف ترین اظہار کسی دوسری صنف شاعری میں ممکن نہیں اور غزل زندگی کے تمام پہلوؤں، تمام رنگوں اور امنگوں کی ترجمانی کرنے کا عمل ادراک رکھتی ہے اور اسے ہر نوع کے معاملات، مشاہدات اور تجربات کے اظہار نے فکری بلوغت سے ہمکنار کیا ہے۔"

"خواب دیکھا نہ کرو" حسن عسکری کاظمی کا مجموعہ غزل و نظم ہے۔ بلاشبہ جناب حسن عسکری کاظمی کی گونا گوں غزلیں اعلیٰ ادبی اوصاف عالیہ سے مرصع ہیں۔ کاظمی صاحب کی اس مجموعے میں شامل غزلیں تجربات، مشاہدات حیات اور انسانی امنگوں اور آرزوؤں کی لازمی رنگینیوں اور خوابوں کی تخیل موہوم کی خوابیدہ تعبیروں کی وادیوں کی صدائیں ہیں۔ حسن عسکری کاظمی صاحب کی یہ شاعری خلا میں نہیں بلکہ زمین کی سطح اور زمین کے باسیوں سے متعلق ہے۔ 'خواب دیکھا نہ کرو' زندگی آمیز تجربوں سے کشید کی گئی فکر کو منفرد پیرایہ اظہار سے معتبر بنانے کا ایک کامیاب تجربہ ہے۔

کاظمی صاحب چونکہ زندگی اور ادب کے باہمی رشتے کو تلاش ظلمت اور شائستگی اور احترام آدمیت کا جز بھی قرار دیتے ہیں اس لیے وہ فرماتے ہیں کہ:

ہر لفظ خزینہ ہے دنیا کو دیے جاؤ
یہ کار ہنر تم بھی چپ چاپ کیے جاؤ

اور یہ بھی کہ:

گزری ہے ایک عمر یوں تولتے ہوئے
شائستگی فکر میں رس بولتے ہوئے

پروفیسر حسن عسکری کاظمی صاحب بلاشبہ مودب اور مہذب شاعری کے خالق ہیں۔ اسی لیے 'خواب دیکھا نہ کرو' کی شاعری انسانیت نوازی، احترام آدمیت اور شرف بشری کو بھی فروغ دیتی اور تکریم انسانی کی پاسداری کرتی ہے۔ اسی تناظر میں وہ لکھتے ہیں کہ:

زمیں پہ بھیجا گیا، عرش پہ اٹھایا گیا — یہی حیات ہے میری، یہی ممات مری
شبیہ آدم خاکی ہوں خاک ہو کے رہا — یہی ہے میرا تعارف یہی ہے ذات مری

اور اس کے بعد انسانی ذات کے حوالے روحانی ارتقا کے درجات اور مراحب کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے اور ترقی اور بلندی جو تغیرات و حسنات کی پرسکون منزلوں میں سے ہے، اس کا بڑی سادگی لیکن ایقان قلبی سے ذکر کیا گیا ہے۔

یہ ارتقا کی منازل کا اک کرشمہ — نکل کے جسم سے آئے تو ماندگی نہ رہی

اس رفعت و عظمت سے پہلے وہ یاس و ناامیدی کے برعکس امید دلواتے ہیں کہ

طلوع ہو گی وہ صبح روشن مجھے یقیں ہے — میں عہد فردا کے خوش نصیبوں کی آرزو ہوں

پروفیسر حسن عسکری کاظمی صحیح معنوں میں نباض قوم ہیں اور عکاس احوال امت بھی۔ ان کا تخلیقی عمل مختلف جہتوں میں اظہار پاتا ہے۔ آج کا انسان جن مسائل و احوال سے دوچار ہے وہ سادہ اور عام نہیں ہیں۔ ان میں قومی، ملکی اور عالمی تخریب کاری، دہشت گردی، سماجی، سیاسی، معاشرتی، ثقافتی اور تہذیبی تہدیم و تخریب کے ساتھ ناگفتہ بہ حال اور مخدوش مستقبل سب شاعر کے سامنے ہے۔

مسائل پہ رہا ان کا تصرف — مگر نیت کہاں ان کی بھری ہے

اب بقول "شاعر محترم" غزل کے موضوعات میں رنگارنگی اور وسعت آفاق نیز مضامین میں تنوع سے متعلق امکانات پر سب کا اتفاق ہے۔ غزل اپنی ابتدائی تعریف سے بہت آگے نکل آئی ہے۔ اب انسانی حیات و ممات کے لامحدود آفاق اور انسانی معاشرے کی جملہ اقدار جیسے مسائل اور ان مسائل کے ہر پہلو کو غزل میں ان کا موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ شاعر کسی بھی معاشرے میں اگر صحیح معنوں میں چشم بینا کا درجہ رکھتا ہے اگر وہ صرف عوام کے لیے لکھتا ہے تو وہ فقط عمومی اور عوامی سطح کی تخلیق کرتا ہے اس میں سطحیت پیدا ہوتی ہے۔ شاعری کہ جو قابل ذکر قابل قدر و منزلت ہوتی ہے وہ اضداد لطافت و کثافت، جور و جفا، ظلم، بیم، امتیاز خیر و شر، اور فروغ حسن وغیرہ کا مجموعہ ہوتی ہے۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے اپنی موجودہ غزلیہ شاعری میں ہر سطح کے اہل ذوق کے لیے دفتر شعر و سخن کے قرینوں ادبی و علمی خیالات و افکار کو سمو کر اہل خرد و ادراک کو معیاری و اہم کلام سے ادب یاب ہونے کے مواقع فراہم کیے ہیں۔ کئی مقامات پر عسکری صاحب نے زیرک نظر قارئین اور دور رس رکھنے والے اہل ذوق کو مزید غور و فکر کے کئی نئے پہلوؤں سے بھی روشناس کرایا ہے۔

ظلمت شب میں گھرے میرے زمانے والے — خاک کا رزق ہوئے شمعیں جلانے والے
درس گاہوں کو بھی مقتل میں بدلتے دیکھا — آ گئے شہر میں اب خون بہانے والے
مصلحت حاکم دوراں کا چلن ٹھہرا ہے — اس خرابے کو ہیں اب کون بسانے والے

پروفیسر صاحب کی اس کتاب کی شاعری میں تخلیقی اظہار عمومی اور تصوراتی ہے۔ اسی لیے ان کے ہاں اذیت، آلام اور مسائل و مصائب کا شعور موہوم نہیں بلکہ بلند آہنگ احساسات کے جلو میں اظہار پاتا ہے۔ حسن عسکری کاظمی صاحب کے زیر تعارف مجموعے میں ادب عالیہ کی توانائیاں، مقصدی اور دلی شعوری کی رعنائیاں، ادب عالیہ کی انسانیت نوازیاں اور امن و سکون کی آسانیاں وغیرہ باتیاں بھی موجود ہیں۔ اظہار سنز لاہور کی شائع کردہ اس کتاب کے صفحات 156 اور قیمت 300 روپے ہے۔

◆◆◆

پنجاب رنگ

سلیم شہزاد

نظم

مینوں سیہ
کئی دے تو تے
اِک دا اُدرے
سپ دی اُڈری
دھرتی اندر بہہ گئے نیں
سانوں قبری کر گئے نیں
پتی دی ٹھل
جھولو سارے
گے دا گھوں بہہ گیا اے
سانوں زہری کر گیا اے
آپیڈ وری آپ تے
عشق دی اُڈری
سچھاں مٹے
وری چیتا
اکھو تے

OOO

حنیف باوا

اِک راہک دی دھی

دگی ۔۔۔ چپ جیہا ساون ماگیں گیں
میں کیکی اُوش آں
ماگیں گیں
ساون ورسیں
بدلیاں دے وچ نہ ماگھ گوری
اودیاں گیں
جھوکے دے جاندا
اس ورہے تاں ماگیں دی
بیوں وانگ علس
تکاسر پیرا اگلیا جاتی
سینے میاں پہریاں آنکھ دیاں جاتاں
اِدھر پہرے سے
دھپ دی مزدے
بیا لے دا دھی
لفظاں دل لھڑے
چکے آون جن لیے علس
دِواں دے دے وچ تکی ہوئی
چپ جیہا ساون ماگیں گیں میں کی خوش آں
ماں ۔۔۔ پچھلے ورہے دی دھپے
ساون آیا
بدلیاں دے وچ نہ ماگھڑیا
جھوکے گھر جایا
پچھلے ورہے دی دھپے تیجیاں
جاواں چپ ہیاں
پچھلے ورہے دی دھپے تیریاں
سدھراں روئیاں
در تیرے دا اچیہ سرہا

پچھلے ورہے دی دھپے سر تکا کری
وگی ۔۔۔ ماگیں گیں بن جاتی آں
ایس ورہے دی پچھلے ورہیاں وانگوں
ساون ماہ مہاراں داوی
پر میں پہرے ماگیں
اِس دی تھکدی ایس لوؤں
گی لوؤں
ایس ورہے دی عمر ندیاں

OOO

منزہ شاہد

ھُو

[illegible]

OOO

تبصرے

آفتاب خان کے تبصرے

انوارِ ادب، بیادِ ڈاکٹر انور سدید......ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

ناشر: مقبول اکیڈمی، اردو بازار، لاہور　　　صفحات: 512　　　قیمت: 1200 روپے

20 مارچ 2016ء کو جب ڈاکٹر انور سدید نے دنیا اور دنیائے ادب سے منہ موڑ لیا تو ان کے چاہنے والوں میں درد و اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ ان کی یاد میں تعزیتی ریفرنس بھی منعقد ہوئے اور ان کو خراج پیش کرنے کے لیے بہت سے شاعروں، ادیبوں نے ان پر مضامین تحریر کر کے ان سے عقیدت و محبت کا حقیقی اظہار پیش کیا۔ بہت سے مقالے اور مضامین "تخلیق" کے انور سدید نمبر میں بھی شائع ہوئے جبکہ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے انہیں خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے یہ کتاب مرتب کر ڈالی جو ڈاکٹر انور سدید کی وفات کے فوراً بعد منظرِ عام پر آ گئی (تقریباً 2 ماہ بعد)۔

مذکورہ کتاب میں ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے چند ابواب کے ذریعے انور سدید کی شخصیت اور فن کو نہایت خوبی اور عرق ریزی سے پیش کیا ہے۔ کتاب کا سب سے اہم باب وہ ہے جس میں ڈاکٹر ہارون نے ڈاکٹر انور سدید کی 40 کتابوں پر تفصیلی اور بھرپور انداز کا تبصرہ کیا ہے اور تقریباً ہر کتاب میں موجود ابواب ان کے عنوان کے ساتھ درج کیے ہیں۔ پھر ان پر تفصیلی گفتگو بھی کی ہے۔

کتاب میں ایک اور باب "یادانِ گمشدان کے لیے" کے عنوان سے ہے جس میں انور سدید پر نامور شاعروں، ادیبوں کے لکھے گئے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کی تعداد تقریباً 56 تک ہے جن میں عہدِ حاضر کے کئی معتبر اور ممتاز مشاہیر نے خامہ فرسائی کی ہے اور ڈاکٹر انور سدید کی ادبی اور ذاتی زندگی اور فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ جن اہلِ قلم نے ان پر لکھ کر تحریر کیا وہ یقیناً قابلِ ستائش ہیں جبکہ ڈاکٹر ہارون الرشید نے اس کتاب میں اس دکھ کا اظہار بھی کیا ہے کہ مضامین کے حصول کے لیے بہت سے اہلِ قلم کو بار بار یاد دہانی کرانی پڑی اس کے باوجود اکثر شاعروں، ادیبوں نے تعاون نہیں کیا اور اپنے مضامین سے نوازنے میں بخل سے کام لیا۔ ان میں بعض بڑے بڑے نام بھی شامل ہیں جو سرکاری اداروں کی ڈائریکٹر یا رکنیتوں پر براجمان ہیں۔ اس کے باوجود ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کو مایوس یا دل گرفتہ نہیں ہونا چاہیے۔ انہوں نے جس طرح یہ مذکورہ کتاب مرتب کر دی ہے اس سے ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت اور فن سو فی صد نہیں تو 80 فی صد لوگوں کے سامنے آ گیا ہے۔ آپ جیسے لوگوں کا دم سلامت رہے تو ابھی ڈاکٹر انور سدید پر مزید کئی کتابیں مرتب کی جائیں گی لیکن ان میں "انوارِ ادب" سنگِ میل کی حیثیت سے شمار کی جائے گی۔

جل پری ...... مسعود عثمانی

ناشر: کتب نما پبلشرز، دینا ناتھ مینشن، مال روڈ لاہور   صفحات: 176   قیمت (اول ایڈیشن): 800 روپے

مسعود عثمانی اردو شاعری کا ایک معتبر حوالہ ہیں۔ انہوں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ "قوس" ہی سے ادبی اور عوامی حلقوں میں مقبولیت حاصل کر لی تھی جس کی وجہ ان کی شاعری کی انفرادیت اور نیا پن تھی جس نے بہت جلد ہر کسی کو اپنی طرف متوجہ کر لیا اور پھر بتدریج ان کی شاعری میں مزید نکھار پیدا ہوتا چلا گیا اور اب جب یہ ان کا نیا شعری مجموعہ "جل پری" سامنے آیا ہے تو اس کی شاعری نے مبہوت اور سحر زدہ کر ڈالا ہے۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ کتاب آرٹ پیپر پر مکمل رنگین شائع کی گئی ہے جس نے شاعری کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے مگر اصل بات اس کتاب کی متاثر کن شاعری ہے۔ یہ مجموعہ غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے مگر ان کی قرأت کرتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان کی نظم بہت اعلیٰ ہے یا غزل۔

مسعود عثمانی کی "جل پری" میں کی گئی شاعری کسی دوسری دنیا کی خبر لاتی ہے۔ وہ اس زمین پر رہ کر کسی دوسری دنیا کی ان جانے خواب دیکھتا ہے۔ وہ دنیا خلا کے پار بھی ہو سکتی ہے اور سمندر کی تہہ میں بھی جہاں مسعود کے خوابوں کی جل پری کی سکونت کا گمان ہے لیکن جب وہ اس دنیا میں شعوری طور پر واپس آتا ہے تو اسے یقین ہوتا ہے کہ یہ جل پری صرف خواب ہے حقیقت نہیں۔ وہ خواب جو ایک بچہ سات برس کی عمر سے اب تک دیکھتا آ رہا تھا۔ اسی لیے اس نے یہ کہا

وہی ہے گیت جزیرے میں جل پری وہی ہے   یہ خواب اب بھی وہی ہے بھید وہی ہے

"جل پری" میں موجود شاعری ایک طلسم حیرت کدہ ہے جہاں الفاظ کے نشیب و فراز اور تشبیہات و استعارات کے نت نئے جمالیات دکھائی دیتے ہیں اور پڑھنے والا ہر شعر پر کسی حیرت افزا مسرت میں گم ہو جاتا ہے۔ یہ حیرت ہی ان غزلوں نظموں کی انفرادیت قرار پائی ہے۔ نمونے کے طور پر غزلیات کے چند اشعار پیش کرتا ہوں

رکو! ملیں کوہ فروزاں سے آگ لے آئیں   یہ شمع شب نہ بجھی ہے نشاں چلا جائے

وہ ناچتا ہوا جنگل، وہ جاگتا ہوا خواب   وہ مور پھر مرے باغات میں نہیں آئے

اس وقت بھی کچھ آگ کے جلتے تھے بدن میں   لیکن مری آنکھوں میں دھواں ایسا نہیں تھا

زباں میں ذائقے انجیر اور زیتون جیسے   ہوا میں رس کسی مشروب میوہ دار جیسا

یہ رہا تیرا تخت و تاج میاں   فقر کا اور ہے مزاج میاں

ان چند اشعار سے کتاب میں موجود مسعود عثمانی کی تمام شاعری کا جائزہ نہیں لیا جا سکتا۔ مجموعے میں درجنوں ایسے دل نشین اشعار

موجود ہیں جو دل و دماغ کو چھو لیتے ہیں اور جو شعر من کو چھو جائے وہی شعر، اشعر کہلانے کا حق دار ٹھہرتا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ اس کتاب میں دل کو چھونے والے بے شمار اشعار موجود ہیں جس سے تخلیقی شاعری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسعود عثمانی کی شاعری میں سمندر، ستارے، چراغ، پرندے، کہکشاں، باغات، شجر، حجر، جل پری کے ساتھ ساتھ ہجر و فراق، ظلم و انصاف، وفا و جفا اور دوسرے انسانی جذبات و احساسات کے مضامین موجود ہیں جن میں عہد گزشتہ بھی ہے۔ عہد رواں بھی اور فردا کے طلسمات بھی اپنے ہونے کا پتا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ شاعری آنکھوں سے نہیں دل سے پڑھنے کے لائق ہے۔ بقول مسعود:

سخن کہن ہے مگر تازگی تو دیکھ اس کی　　　نیا نگر ہے لہجہ ہزار سال ہرا

پھول، خوشبو اور تارہ ...... ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

ناشر: الحمد پبلی کیشنز، انارکلی، لاہور　　صفحات: 164　　قیمت: 500 روپے

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کا یہ تیسرا شعری مجموعہ ہے جو غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کی بیشتر شاعری حسرت و یاس اور اداسی کے جذبات پر مشتمل ہے جس میں خاص طور پر ہجر کی نارسائی اور بے وفائی کا ذکر بیان کیا گیا ہے جبکہ بعض ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جن میں عہد حاضر کے سلگتے مسائل کو موضوع بنایا گیا ہے۔ خواتین کی شاعری کا ایک یہ منفی پہلو ہوتا ہے کہ اس میں عشق و محبت کے روایتی مضامین کی بھرمار ہوتی ہے اور ان اشعار میں چاشنی، شعریت اور دلکشی کا فقدان ہوتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ اس میں روایتی مضامین کو بڑے روایتی اور عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے کسی قسم کی تشبیہات یا تلازمات سے شاعری کو خوب صورت بنانے کی شعوری کوشش نہیں کی گئی اور حقیقت یہ ہے کہ خواتین کی شاعری میں وہ مہارت ایک طویل عمر کی ریاضت کے بعد آتی ہے اور جب آ جاتی ہے تو اسے فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شاکر بننے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

بہر حال اس کتاب کی شاعری ایسی بھی نہیں کہ اسے یکسر نظر انداز کر دیا جائے۔ یہ شاعری عوام الناس کو اور خاص طور پر خواتین کو بے حد پسند آئے گی۔ چند اشعار دیکھیں:

جو لبوں پہ ہیں ابھی سن تو سہی کہتی ہیں　　　دلوں میں ہیں جو بھی سوالات، نہ پوچھ میاں

آئنہ تھا میں تھی اور اس کی نگاہوں کا حصار　　　اس رعایا کو ملا یوں بادشاہوں کا حصار

اس کی کسی کتاب میں میرا شمار تھا　　　پھر ایک روز بس وہ ستارہ بدل گیا

ذہنوں سے کہاں لفظوں سے ماری گئی ہوں میں　　　جیون کے چاک سے یوں اتاری گئی ہوں میں

زیر نظر کتاب میں غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی موجود ہیں مگر وہ بھی روایتی انداز کی حامل ہیں۔ ان میں کسی قسم کی شعریت

محسوس نہیں ہوتی بلکہ یوں لگتا ہے جیسے ترجمہ پڑھ رہے ہیں جبکہ موجودہ عہد میں جدید نظم بہت آگے نکل گئی ہے۔ چاہے وہ آزاد نظم ہو یا نثری نظم۔ اس میں الفاظ کا شکوہ اور روحِ معنی نہایت بلند مقام پر فائز ہوتی ہے۔ اس لیے محمد شاہین کی نظمیں جدید نظم کو لی سے دور ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ یہ شاعری بالخصوص خواتین کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہی اس شاعری کی تعریف ہے۔ شاعر حضرات کو اس میں وہ کشش محسوس نہیں ہوگی جو جدید عاصر کی شاعری کا خاصہ ہے اور جو کسی بھی شعر کو مقبولِ عام بنانے کا مجرب نسخہ ہے۔ محترمہ کو جدید شاعری کا زیادہ سے زیادہ مطالعہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ اردو ادب میں کوئی مقام حاصل کرنا چاہتی ہیں تو۔ اور اگر وہ صرف اپنے کتھارسس کے لیے شاعری کر رہی ہیں تو پھر انہیں مطمئن رہنا چاہیے اور بڑے شاعروں سے کتاب پر رائے لکھوانے سے بھی گریز کریں کہ ان کی کتاب پر شیخ پالی آمند سمیت جتنے بھی جید شعراء نے رائے دی ہے وہ بالکل رواتی سی ہے اور اس سے ملتی جلتی رائے ہر دوسری کتاب پر دی گئی ہوتی ہے۔

ستارہ ہے خاک پر ...... محمد آصف مرزا

ناشر: رمیل ہاؤس آف پبلی کیشنز، راولپنڈی صفحات: 166 قیمت: 350 روپے

محمد آصف مرزا اگرچہ باقاعدہ شاعر نہیں ہیں اور اس وقت وہ عمر کے اس حصے میں ہیں جب شاعری کی دیوی بہت زیادہ مہربان ہوتی ہے لیکن آصف مرزا نے یہ شاعری تقریباً تیس برس قبل کی تھی اور بڑے ذوق و شوق اور بھرپور لگن کے ساتھ مصرع سازی کے ہنر کو آزمایا جس کی وجہ سے ان کی شاعری پختہ گو شاعروں کے ہم پلہ قرار پاتی ہے۔ آصف مرزا کی شاعری میں زندگی کے کئی رنگ ملتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف شعری لوازمات پر توجہ دی ہے بلکہ خیالات کا سمندر بھی ان کے آس پاس موجود رہا جس میں سے انہوں نے اپنی غزلوں کے لیے گوہر نایاب نکالے اور انہیں شعروں کی شکل دی لہٰذا ان کی شاعری کسی بھی ماہر اور اچھے شاعر کے مقابلے پر پیش کی جا سکتی ہے۔ چند اشعار دیکھیں:

زندگی جیسے تیروں میں نہیں اب چل سکتی — اترا ہے اسے یوں لگا نہ اتصال میں

زمیں کروٹ بدلنے کو ہے تیار — ہے پانی دشت میں دریا میں گرد

عدم سے مجھ کو اٹھا لایا تھا یک مشت — سو یوں ہوا کہ میں اقساط میں چلا آیا

دیکھو تو آسماں کے ستارے بھی ہیں غبار — سوچو تو کیسا کیسا ستارہ ہے خاک پر

میں بھی ہوں ان کے تعاقب میں لپکتا جاتا — اور دنیا بھی مری گھات میں لگی ہے

آصف مرزا کی شاعری میں زمان و مکاں کے تذکرے بکثرت پائے جاتے ہیں۔ وہ دنیا میں آنے اور جانے کے حوالے سے

بہت سے اشعار کہہ چکے ہیں مگر ان کی شاعری میں معاشی، سماجی، سیاسی اور اصلاحی موضوعات بھی کثرت کے ساتھ موجود ہیں البتہ رومانی اشعار بمشکل نظر آتے ہیں۔ کہیں کہیں وہ حضرت اقبال سے بھی متاثر نظر آتے ہیں لیکن مجموعی طور پر اس شاعری میں آصف مرزا کا اپنا انداز اور رنگ و آہنگ شامل ہے جو پختہ بھی ہے اور پُر اثر بھی ہے۔ اگر وہ باقاعدگی سے شاعری اختیار کرتے اور مسلسل لکھتے رہتے تو یقیناً ان کا شمار دورِ حاضر کے اہم شاعروں میں ہوتا۔ پھر بھی وہ صاحبِ کتاب ہو گئے ہیں اور یہ حوالہ بھی معتبر ہے۔ ان کا نام ادبی تاریخ میں کسی نہ کسی طرح شامل رہے گا۔

روشنی مثال (حمد و نعت) ......اعزاز احمد آذر

ناشر: حسن اعزاز پبلی کیشنز، لاہور　　صفحات: 104　　قیمت: 300 روپے

اعزاز احمد آذر بلند پایہ شاعر و ادیب تھے۔ ان کی متعدد کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ تاہم یہ زیرِ تبصرہ کتاب ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی افتخار مجاز اور اعزاز احمد کے صاحبزادے حسن اعزاز نے ترتیب دے کر شائع کی ہے جو حمد، نعت، سلام، منقبت اور کافیوں پر مشتمل ہے۔ شاعری میں یہ وہ صنفِ سخن ہیں جنہیں کاغذ پر اتارنے کے لیے خلوص، جذبہ، عقیدت، محبت اور مودت کے ساتھ ساتھ نہایت احتیاط کی بھی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ ذرا سا قلم لرزا اور شاعر شرک کے گناہِ کبیرہ سے ہمکنار ہو گیا۔ (جیسا کہ آج کل اکثر نعت گو اور نعت خواں ہو رہے ہیں)

اعزاز احمد آذر ایک صاحبِ علم اور صاحبِ مطالعہ ادیب و شاعر تھے اس لیے وہ بخوبی اس بات سے آگاہ تھے کہ کس کا کیا مقام ہے۔ وہ اللہ، رسولِ کریمؐ، امام حسینؑ اور دیگر قابلِ احترام ہستیوں کے مقام و مرتبہ کا بخوبی ادراک رکھتے تھے۔ اس لیے انہوں نے ایک حدِ فاصل روا رکھ کر سب کو ان کے مقام و مرتبے کے لحاظ سے شعروں میں جگہ دی ہے اور کفر و شرک سے بچ گئے ہیں۔ ان کی حمد و نعت اور سلام کے چند اشعار دیکھیں:

گرتے جھرنے، بہتے دریا، تیرے ہی گُن گاتے ہیں　　سب تیری قدرت کے مظہر، بارش، اوس، ہوا ہیں

مجھے نعلین سے اپنے لپٹ جانے دے اے آقاؐ　　زمیں کے ایک ذرّے کو بلندی آسمانی دے

رک گئیں گردشیں، تھم گئیں دھڑکنیں　　میرا سر ہے محمدؐ کا دربار ہے

جس خاک کو شبیرؑ نے گوندھا ہے لہو سے　　یہ میرا عقیدہ ہے کہ وہ خاکِ شفا ہے

اعزاز احمد آذر کی یہ کتاب عقیدت و محبت کی سرشاری میں ڈوبے ہوئے کلام سے آراستہ ہے جو اہلِ ایمان کے دلوں کو گرماتا اور ان کی اُخروی زندگی کو سنوارنے کے کام آئے گا۔ آذر صاحب کے بھائی اور صاحبزادے قابلِ تحسین ہیں کہ انہوں نے ان کا یہ عقیدت

بحرا کلام یکجا کر کے اہلِ علم و دانش کے مطالعے کے لیے کتابی شکل میں فراہم کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس نیک کام کے لیے اجرِ کثیر عطا فرمائے۔ آمین!

مقبول عام اشعار۔ انتخاب کلام بیدی...... نارنگ ساقی

ناشر: کنور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ نئی دہلی صفحات: 438 قیمت: محبانِ اردو کو ہدیہ محبت

نارنگ ساقی ایک ادیب و وسیع شخصیت ہیں۔ وہ خود شاعر و ادیب تو نہیں لیکن انہوں نے متعدد کتابیں مرتب کر رکھی ہیں جن میں یہ زیرِ تبصرہ کتاب بھی شامل ہے جو کہ تین زبانوں، اردو ہندی اور انگریزی میں ہے۔ کتاب کی ابتداء میں حروفِ تہجی اور مختلف الفاظ کے تحت کے گئے مقبول عام اشعار کا ایک وسیع ذخیرہ شامل کیا گیا ہے۔ یہ وہ اشعار ہیں جو ہند و پاک میں ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ اشعار کے ساتھ شاعروں کے نام بھی دیے گئے ہیں جس سے اصل شاعر کا علم ہوتا ہے ورنہ بہت سے مقبول اشعار کسی کے نام کر دیے جاتے ہیں۔ اس انتخاب سے ان اغلاط کا ازالہ ہوگا۔ کتاب کے دوسرے باب میں کنور مہندر سنگھ بیدی کے کلام سے منتخب غزلیں اور نظمیں پیش کی گئی ہیں۔ بیدی صاحب کی شاعری میں زبان و بیان کی شیرینی پائی جاتی ہے اور یہ شاعری خوب لطف دیتی ہے۔ چند اشعار دیکھیں:

مجھ کو سو بار جہنم میں جلایا ہوتا
میرے سینے میں مگر دل نہ بنایا ہوتا

اداسی، سرد آہیں، کرب، حسرت، درد، مجبوری
انہیں دو چار چیزوں کا محبت نام ہے ساقی

قفس سے رہائی تو مل جائے پہلے
نکل آئیں گے بال و پر رفتہ رفتہ

آؤ اس دنیا ہی کو جنت بنا ڈالیں سحر
پھر خدا جانے کہاں جانا ہو مر جانے کے بعد

کنور مہندر سنگھ بیدی کی شاعری اسلامی ثقافت اور طرزِ معاشرت کے بے حد قریب ہے اور ان کی نظموں میں بھی انقلابی سوچ پائی جاتی ہے۔ اس کتاب میں اگرچہ ان کا زیادہ کلام شامل نہیں مگر جس قدر بھی ہے، بہت خوب ہے۔ کتاب کے آخر میں فرہنگ دی گئی ہے جس میں اردو الفاظ کے انگریزی اور ہندی میں تلفظ اور معانی دیے گئے ہیں۔ یہ ایک خاصے کی چیز ہے اور اردو سے نابلد افراد کو اس کا مطالعہ کر کے اردو زبان سیکھنے میں کافی حد تک مدد مل سکتی ہے۔

نارنگ ساقی کی مرتبہ یہ کتاب ایک اہم حوالہ جاتی کتاب ہے جو طالب علموں کے کام بھی آ سکتی ہے اور اہلِ ذوق حضرات بھی اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ کتاب کی کوئی قیمت نہیں رکھی گئی اور یہ صرف کنور مہندر سنگھ بیدی کے کلام کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے لیے مفت فراہم کی جا رہی ہے۔

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ عزیزم سلطان اظہر جاوید!

ماہنامہ "تخلیق" جون 2016ء موصول ہوا۔ ڈاکٹر انور سدید کی یاد میں شائع شدہ یہ خصوصی شمارہ آپ کی انور سدید سے گہری محبت کا اظہار ہے۔ میری کتاب "انوارِ ادب یادِ ڈاکٹر انور سدید" ابھی منظرِ عام پر نہ آ سکی۔ آپ نے خصوصی شمارہ تخلیق دے کر میدان مار لیا۔ کچھ اللہ کے ولی قلم کار ایسے ہیں جنھوں نے ایک ہی مضمون بہت سے جرائد کو ارسال کر دیا ہے۔ بات در حقیقت عقیدت کی ہے۔ اس شمارہ کے ٹائٹل پر ڈاکٹر انور سدید اور اظہر جاوید کی متبسم تصاویر بہت خوب صورت ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں: "ہم زندہ ہیں، ہماری مسکراہٹ سے اندازہ کر لو۔" فن کار کبھی نہیں مرتا اس کا فن اسے زندہ رکھتا ہے۔ اس شمارہ میں آپ کے علاوہ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم)، نجم الحسن رضوی، حسن عسکری کاظمی، سعادت سعید، پروفیسر قیصر نجفی، سرفراز سید، سلیم آغا، نظیر فتح پوری، شاہد شیدائی، اخلاق عاطف، مظفر حسن منصور، اشرف ذکی، ملک مقبول احمد، منور عثمانی، سکندر حیات میکن، شاہد بخاری، قمر زمان، قمر ریاض، عظمیٰ اعوان، مسعود انور، پروین شیر، رشید طراز، ریاض ندیم، شجاعت علی راہی، منیر واحد، توقیر مشتاق، پروفیسر جمیل آذر، شفیع ہمدم، محمد علی چراغ، سلیم شہزاد، حنیف باوا کی ڈاکٹر انور سدید کے ساتھ محبت و عقیدت کا اظہار قابلِ ستائش اور قابلِ تقلید ہے۔

ڈاکٹر انور سدید 20 مارچ 2016ء کو ہمیں داغِ مفارقت دے گئے لیکن ان کی تخلیقات اور ادبی خدمات کی وجہ سے وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اس خصوصی شمارے کی اشاعت پر آپ نے اہلِ علم و دانش کے سپہ سالار ڈاکٹر انور سدید کو جن خوب صورت لفظوں کا نذرانہ پیش کیا ہے اس پر تمام اہلِ قلم آپ کے سپاس گزار ہیں۔ بزرگوں کو زندہ رکھنے کا یہی طریقہ ہے کہ ان کے کارناموں کو عوام الناس تک پہنچایا جائے۔ جس خطے میں بارش نہ ہو تو وہاں کی فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں اور جس خطے میں سلطان اظہر جیسے قدردان نہ ہوں تو وہاں کی نسلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ آپ نے دبستانِ ادب کو خراجِ عقیدت پیش کر کے اپنا فرض قرض کی طرح ادا کیا ہے۔ میں آپ کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم (سرگودھا)

﴿2﴾ عزیزم سلطان اظہر جاوید!

"تخلیق" کا ڈاکٹر انور سدید نمبر موصول ہوا۔ آپ کی اس علمی، ادبی، قلمی، فکری، جذباتی اور تاریخی کاوش نے ڈاکٹر صاحب کی رحلت کے صدمے کو بڑی حد تک ختم کر دیا۔ اس نمبر کا شمار "تخلیق" کے ان معدودے چند خاص شماروں میں ہو گا جن کی تخلیقات پر میر انیس کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ "لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار" یا پھر جیسا کہ شاعر نے کہا تھا:

کیا خوب برق تو نے دکھلایا ہے زورِ طبع — کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجا نکال کر

پرچے کا آغاز آپ کے "تعارف نمبر" سے ہوتا ہے جسے پڑھ کر ایک لمحے کے لیے تو یقین نہیں آتا کہ ایک شخص بیک وقت اتنی بہت سی جہتوں میں کس طرح اتنی کاملیت (Perfection) کے ساتھ کام کر سکتا ہے اگر اتنی کے اس کے پر ایمان لانے کو جی چاہتا ہے کہ

اک ذرہ ناچیز سے حیرت میں نگاہیں　　　اک قطرہ بے مایہ کی تھاہ ہی نہیں تھاہ

ڈاکٹر صاحب جتنے عظیم تخلیق کار تھے غالباً اس سے بڑھ کر عظیم قاری تھے۔ میں نے اپنی پوری زندگی میں ان جیسا کثیر المطالعہ شخص نہیں دیکھا۔ تحریر کے باب میں میرے نزدیک ان کا سب سے بڑا کارنامہ ادبی جرائد کے مشمولات پر ان کے وہ لاتعداد سالانہ تحقیقی اور تنقیدی جائزے ہیں جو ان کے قلم سے جھرنوں کی طرح نکلتے تھے۔ میرے خیال میں ان کے اس کام ہی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ مذکورہ شمارے کے مضمون نگاروں نے ڈاکٹر صاحب کے تعلق سے اپنی یادوں کو تازہ کر کے قارئین "تخلیق" کے علم میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے دلچسپی کا سامان بھی مہیا کیا ہے۔ مجھے پروفیسر قیصر نجفی کے مضمون میں مصافحے والا واقعہ بہت پرلطف لگا۔ ڈاکٹر صاحب کے بیٹے مسعود انور کا مضمون "میرے ابا جی (ایک انوکھا تعارف)" چشم کشا ہے۔ اس کا عنوان مصنف کی جدت طبع کا غماز ہے۔ بلاشبہ مرحوم کا "انوکھا تعارف" ممکن ہی نہیں۔ دیگر ادبی کاوشوں میں صادقین پر مسلم شمیم اور ابصار عبدالعلی پر محترمہ عذرا اصغر کے مضامین خاص طور پر پسند آئے۔ مؤخر الذکر میں صادقین کے دل موہ لینے والے اشعار پڑھنے کو ملے۔ "میک اپ والی" اظہر جاوید کی ایک کرشماتی بلکہ طلسماتی تحریر ہے جو افسانے کا رنگ لیے ہوئے ہے۔ پنجابی کے اس مضمون کا ترجمہ حنیف باوا نے بہت عمدہ کیا ہے۔ مجھے اس مضمون کے دو جملوں نے محظوظ کر دیا یعنی: (1) صرف پی جی نہیں مرتی، یہ (بات) سچی بھی ہے۔" اور (2) وہ شاعر اور ادیب نہیں ہے اسی لیے اس میں منافقت کم ملتی ہے۔" اس پر مجھے اپنے ایک مرحوم دوست (محسن وارثی) کا یہ معرکۃ الآرا شعر یاد آ گیا۔

اے کاش زندگی میں ایسا بھی وقت آئے　　　دانشوروں کو کوئی سچ بولنا سکھائے

آفتاب خان صاحب نے اپنے خط میں وضاحت کر کے اپنے ایک شعر کے بارے میں میرے اس اشتباہ کو دور کر دیا جو کمپوزنگ کی "حسنِ سامانی" کے باعث پیدا ہوا تھا۔ میرے (جائز) اعتراض کے باوجود انھوں نے میرے خط کو پسند کیا۔ ایسی کشادہ دلی ہر کس و ناکس کے نصیب میں کہاں! میں ان کا ممنون (بلکہ ممنونِ حسین) ہوں۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (کراچی)

﴿3﴾ سونان اظہر جاوید صاحب! سلام و رحمت!

تخلیق کا خاص نمبر شمارہ 3 مارچ 2016ء موصول ہوئے مہینہ سے زیادہ ہو گیا۔ میں ان دنوں سفر پر تھا اس لئے اس کا مطالعہ نہ کر سکا۔ یہ شمارہ اچھا ہی نہیں یادگار بھی ہے کہ اس میں اظہر جاوید کی یادوں کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے انتظار حسین کو جس طرح یاد کیا ہے اور ان کے ابتدائی یا تشکیلی دور کی نشان دہی کی ہے وہ ہماری اجتماعی تہذیب کا ایک روشن باب ہے۔ ان سطور میں جن لوگوں کا ذکر آیا ہے وہ سب لائق و فائق اساتذہ ہی نہیں تھے بلکہ ان کے علمی و ادبی کارنامے ہمارے لئے مشعل راہ ہیں اور رہیں گے۔ مرزا حامد بیگ کا انٹرویو کافی معلوماتی ہے۔ لیکن کچھ معاملات پر ان کی آراء سے مجھے اختلاف ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ "عرفان صدیقی جیسا عمدہ غزل گو ـــ گمنام گزر گیا۔ اس کا نام میں نے پہلی بار محمد اظہار الحق کے شعری مجموعہ "دیوار آب" کا دیباچہ لکھتے ہوئے لیا تھا اور حیران تھا کہ ـــ ناقدین کے

لے مخمس عروضی غزل کو شعرا کس طرح قابلِ قبول بنے ہوئے اور عرفان صدیقی پر کوئی توجہ نہیں۔" ص 129۔ مجھے دکھ ہے کہ ان تک عرفان صدیقی کی چیزیں بروقت نہ پہنچ سکیں، ورنہ ان کا کلام "شب خون" اور "سوغات بنگلور" (مدیر محمود ایاز) جیسے معیاری پرچوں کے علاوہ "آج کل" میں بہت تسلسل سے شائع ہوتا تھا اور ان کی پذیرائی ان کی زندگی میں کم نہیں تھی۔ "آجکل" نے ان پر ایک خاص نمبر نکالا تھا جس کی دوبارہ اشاعت کی نوبت آئی تھی۔ خاص نمبر، ان کے انتقال کے بعد بھی شائع ہوئے تھے جیسے جاویں سے لکھے گئے نیا ورق انکار، لکھنؤ۔ ایک گذارش یہ کہ لکھنے والے کم از کم کاغذ پر تو ہندوستان رہنے دیں، ورنہ دیا پہلے انسلاکات کے ساتھ ہماری اجتماعی یادداشت سے بھی غائب ہو جائے گا۔ ابدال بیلا میرے ہم پیشہ ہیں اور میں ان کا قدردان رہا ہوں، ان کا یہ سفرنامہ دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں۔ افلاطون اور پلاٹو کے ناموں کے متعلق ان کی رائے سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ ان تمام یونانی عالموں کے خیالات مع اسمائے گرامی ہمیں عربی کے ذریعے ہی ملے ہیں۔ یونانی تلفظ انگریزی میں کس حد تک ادا ہوا ہے یہ جاننا بھی ضروری ہے۔ سقراط کو سقراط اور جیوگرفس کو بقراط کیا کہ ہم ان کے ناموں کو جانتے رہے ہیں۔

ابدال بیلا صاحب کے سورج کے رخ پر افلاطون اور پلاٹونس کے بارے میں مجھے یہ کہنا ہے کہ یہ ایک ہی شخصیت کے دو نام نہیں ہیں بلکہ یہ دو الگ الگ فلسفی ہیں۔ پلوٹو کو پلاٹون لکھنا کسی طرح درست نہیں ہے کہ رومن حروف میں اسے plato لکھا جاتا ہے ایک جگہ اسے plotonus بھی لکھا ہوا دیکھا ہے۔ یہ بعد 204 یا 205 ق م تا 270 تک زندہ رہا۔ جبکہ افلاطون جنہیں سب لوگ plato کے نام سے جانتے ہیں وہ اس سے تقریباً 200 برس پہلے پیدا ہوا تھا۔ اس کا زمانۂ حیات 428 یا 427 (424 / 423) 348 یا 437 درج ہے۔ ان دونوں کے بارے میں تفصیل ایک الگ موضوع ہے۔ ویسے یہ تمام معلومات گوگل کے ذریعہ با آسانی حاصل ہو سکتی ہیں۔ ابدال بیلا صاحب نے ری پبلک republic کے مصنف کا نام پلاٹو درست ہی لکھا ہے لیکن اس کے نیچے سے بھی ظاہر ہونا چاہئے کہ یہ افلاطون کی ہی تصنیف ہے۔ (غلطی سے یہاں ارسطو لکھا گیا تھا درست کر لیں)

دوسری بات سلمیٰ اعوان کے 'عراق اشک بار ہیں ہم' کے متعلق ہے۔ ص 124 پر یہ عبارت درج ہے "انہوں نے عورتوں کے بارے قرآن مجید کے اصولِ مساوات کو مدِ نظر رکھا، وہ حقِ خلع، نکاح، طلاق و دیگر بہت سارے معاملات میں عورتوں کی شہادت کو مردوں کی طرح معتبر قرار دیتا ہے" اس عبارت کی سند پیش کرنی لازمی تھی ورنہ اسے ایک ذہنی اختراع یا خوش فہمی سمجھا جائے گا۔ ایسے معاملات میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حوالے سے کر سلمیٰ اعوان میرے علم میں اضافہ کریں گی۔

رشید امجد کی "عاشقی صبر طلب" 10 ویں قسط پڑھ کر بہت اطمینان ہوا کہ انہوں نے بھی وزیر آغا کے بارے میں وہی نتائج اخذ کئے، جن کا بیان اپنے دو مضامین میں کر چکا ہوں۔ مصنف اور تخلیق کے رشتہ کو میں بھی اتو بت ہی گھتا ہوں کہ دکھ جھیلنے والا ہی اپنے دکھوں کو واردات بنا کر بیان کرتا ہے۔ مجھے صاحب! انتظار حسین کے بعد انور سدید صاحب نے بھی بساط لپیٹ لی۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ ان کے کاموں کی فہرست بنا کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ تن تنہا کتنا بڑا کام کر گئے۔

ارمان نجمی (انڈیا)

﴿4﴾ محترمی سلام مسنون!

"تخلیق" کا شمارہ جون (نمبر 6) "ڈاکٹر انور سدید نمبر" تھا۔ مرحوم کی شخصیت و فن پر ایک عمدہ دستاویز جو یقیناً ایک وسیع حوالہ جاتی مرتبہ رکھتی ہے۔ مرحوم اتنا بڑا تخلیقی، تنقیدی و تحقیقی کام چھوڑ گئے ہیں کہ جسے دیکھ کر یہ یقین کرنا مشکل لگتا ہے کہ ایک اکیلی شخصیت اتنا کچھ کیسے کر گئی۔ ایک شاداب ادبی سرمایہ جس پر اردو ادب جتنا ناز کرے، کم ہوگا۔ یہ محض کہنے کی بات نہیں، مرحوم کو اظہر جاوید اور "تخلیق" سے قلبی محبت تھی۔ اس محبت کی جڑیں گہری تھیں، اتنی کہ زمانے کی مسموم ہوائیں بھی ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں۔ انور سدید سے گہرے رشتے کا چراغ اب سونان اظہر جاوید کے مضبوط ہاتھوں نے سنبھال لیا ہے۔ زیرِ نظر "نمبر" چاہت و عقیدت کی خوشبو رکھتا ہے۔

افسانوں میں "سیلے کی لات" "مرے کا لنگا" صوفیہ بیدار نے بے ساختہ انداز میں پنجابی کا تڑکا لگا کر اسے خستہ کرارا بنا دیا۔ یوں لگا کہ اردو و پنجابی ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چھیاں چھیاں چلی جا رہی ہیں۔ پنجابی تحریر اظہر جاوید کی ہو اور اس کا پُرلطف ترجمہ لطیف باوا کا، پھر وہ دو آتشہ چیز بن جاتی ہے۔ "میک اپ والی" میں یہی بات ہے۔

محترم غلام نبی اعوان نے اپنے مخصوص مجبولی انداز میں "یادیں گلاب ہوتی ہیں" لکھا اور پھر قاری کو اپنے ساتھ ساٹھ باسٹھ سال پہلے کے زمانے میں لے گئے۔ مضمون کا نچوڑ یہ تھا کہ مصنف نے حق گوئی کا پہلا سبق ٹاٹ والے اسکول سے سیکھا اور پھر زندگی بھر یہ سبق ان کے کام آیا۔ اس تحریر نے راقم کو بھی اسی پرانے زمانے والے اسکول کی یاد دلا دی۔ ایسی یادیں جب گھر کر تی ہیں تو پھر چھپتے آنسوؤں کی گرمی اور بڑھا دیتے ہیں۔ اسی لئے تو "حصہ غزل" میں اعجاز اسلام امجد نے کہا۔

دل میں خوشبو کی طرح پھرتی ہیں یادیں امجد   ہم نے اس دشت کو گلزار بنا رکھا ہے

مسلم شمیم نے صادقین کو یاد کیا اور اپنی خوب صورت تحریر میں بتایا کہ مرحوم ایک بڑے اور فطری انداز والے "فن کار، خلاق اور مفکر تھے" بے شک ایسی ہوئے سے قد والی سادہ شخصیت پاکستان کی اعلیٰ پہچان ہے۔ عذرا اصغر نے اپنے مضمون میں ابصار عبدالعلی کی گھریلو اور مجلسی زندگی کے چند خوب صورت گوشے دکھائے اور یہ بھی بتایا کہ ابصار نے "اپنی کم عمری کے باوجود زیادہ جاندار اور زندہ رہنے والے ڈرامے تخلیق کئے ہیں۔" شخصی پیکر تراشنے میں عذرا اصغر کو کمال حاصل ہے۔ خواہ وہ پیکر ان کے ڈرامہ نگار کا ہو یا ان کے مرحوم سرتاج اصغر مہدی کا، سماں باندھ دیتی ہیں۔

سونان اظہر جاوید نے بھارت سے آئے اردو کے عاشق اور ممتاز قلم کار کیول دھیر کے اعزاز میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا اور 18 مئی 2016ء کی یہ تاریخ اس لئے بھی یاد رہے گی کہ بالاتفاق اسی دن راقم نے سونان صاحب کو فون کیا تو کہنے لگے کہ اس وقت معزز مہمان کیول دھیر میرے پاس آئے بیٹھے ہیں، لیجئے آپ بھی ان سے بات کیجئے۔" پھر اگلے لمحات میں مجھے فون پر ایک میٹھی شخصیت سے شرفِ کلام حاصل ہوا، اس کا سرور ابھی بھولے نہیں بھولا۔

محمد طارق علی (راول پنڈی)

﴿5﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

اپریل تا جون کا "تخلیق" موصول ہوا، ممنون ہوں۔ تخلیق کا یہ شمارہ "ڈاکٹر انور سدید نمبر" ہے۔ مدیر تخلیق نے "پہلی بات" میں

ڈاکٹر صاحب کی معیت میں بیتے شب و روز تخلیق کے ساتھ وابستگی اور احساسات پر بھرپور گفتگو کی۔ مندرجات میں حمد و نعت شعرا کی بہترین کاوشیں ہیں۔ "فن، شخصیت اور تاثرات" ایک عنوان ہے۔ جس کے تحت (18) مضمون نگاروں نے ڈاکٹر انور سدید کے ادبی معرکات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ "یادیں" کے عنوان سے چار مضامین لکھے گئے۔ "آفریق کالم" میں (5) لکھاریوں نے اپنے تاثرات لکھے۔ "منظومات" میں (6) شعرائے ڈاکٹر صاحب کو خراج تحسین پیش کیا۔ "جائزے" اور "پنجاب رنگ" میں بالترتیب (3) اور (2) قلم کاروں نے ڈاکٹر صاحب کے فن کی مختلف جہات پر روشنی ڈالی۔

اس شمارے کی اشاعت پر جہاں ادیبوں اور دانشوروں کی کاوشیں کام آئیں وہاں سونان اظہر جاوید (مدیر تخلیق) خصوصی تحسین کے مستحق ہیں جنھوں نے اس نمبر کی تیاری میں ذاتی دلچسپی لی اور قارئین تخلیق کو ڈاکٹر انور سدید سے بھرپور متعارف کرایا۔ تخلیق کے اس خاص شمارے کا سرورق محترم اظہر جاوید اور ڈاکٹر انور سدید کی تصاویر سے مزین ہے اور پس ورق پر بھارتی دانشور اور مصنف ڈاکٹر کیول دھیر کے اعزاز میں دیے گئے عشائیہ کی تصویری جھلکیاں دی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ معمول کی اشاعت میں رپورٹ، مضامین، افسانے، یاد نگاری، غزلیں اور قارئین کے خطوط بھی شامل ہیں۔ تخلیق کا یہ شمارہ ایک ادبی دستاویز ہے۔

احسان بن مجید (اٹک)

محترمی ایڈیٹر صاحب!

پرانی قدریں اور روایات سرعت رفتار سے ایک کے بعد ایک معدوم ہوتی جا رہی ہیں۔ بے محابا مغربی تقلید اور ترقی کے نام نہاد سیلاب نے تہذیبوں کو خس و خاشاک بنا ڈالا ہے۔ انحطاط کے اس مادر پدر آزاد ماحول میں جب کہیں پرانی اقدار، وضعداری اور مشرقی تہذیب و تمدن کے پاس کی کوئی جھلکی نظر پڑتی ہے تو آدمی کو چونکا جاتا ہے۔ حیرانی گھیر لیتی ہے۔ پھر مجھ جیسا شخص جس نے اپنی گزشتہ عمر انہی قدروں اور روایتوں میں گزاری ہو وہ حیرتوں میں ڈوب جاتا ہے۔ بالکل ایسا ہی تاثر میرے دل و دماغ پر ابھرا جب میں "تخلیق" کا انور سدید نمبر پڑھنے بیٹھا۔ اظہر جاوید کی روح بھی عالم بالا میں شاداں و فرحاں ہوگی۔ میں ابھی اداریہ سے آگے نہیں جا پایا۔ ایڈیٹر کے جذباتی الفاظ نے میرے قدم جکڑ لیے اور میں آگے نہ بڑھ سکا۔ آج میرا جی کرتا ہے کہ ان خدشات و تفکرات کا ایک ہلکا سا جائزہ لوں جو اظہر جاوید کے وصال پر مجھ جیسے دیگر پرانے دوست احباب، لکھاریوں اور قارئین کے دل و دماغ پر جالے تان رہے تھے میرے اس جائزے کو کسی طور پر مدیر تخلیق کے مخلص عملے کی خوشامد نہ سمجھا جائے۔ اظہر جاوید کی وفات سے اردو ادب کا ناقابل تلافی نقصان ہوا ہے۔ اس ناگہانی حادثے نے سب ہی خواہوں کے دل و دماغ کو ماؤف کر دیا تھا۔ سب لوگ "تخلیق" کے مستقبل کے بارے میں فکر مند تھے۔ کیونکہ تخلیق صرف ایک ادبی رسالہ نہ تھا۔ یہ ایک تہذیب، مزاج اور شخصیت روپے کا نام تھا جسے مرحوم ایڈیٹر نے نامساعد حالات میں اس مقام تک لانے میں خون جگر سے کام لیا تھا۔ جب اس سانحہ کے بعد پہلا شمارہ آیا تو کمنام ایڈیٹر کا اداریہ وعدوں، دعووں اور عزائم سے بھرا ہوا تھا۔ اظہر جاوید نے اپنے کاروباری بیٹے کو ادبی جھمیلوں سے دور رکھا تھا۔ ان عزائم کا صرف اتنا نوٹس لیا گیا جتنا سکول کے کسی مقرر طالب علم کی تقریر پر جذباتی سی جوشیلی تقریر کا لیا جاتا ہے۔ پھر "اظہر جاوید نمبر" آیا تو ایڈیٹر کے دعوے کچھ کچھ سچ ہوتے نظر آئے۔ اس کے بعد تخلیق کا ہر قدم بہتری اور صوری و معنوی خوبصورتی کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ نوجوان ایڈیٹر اپنے ابا کے پرانے دوستوں اور لکھاریوں سے مسلسل رابطے میں رہا۔ سب لوگوں

سے ذاتی تعلق قائم کر کے ان سے تعاون اور رہنمائی کی درخواست کرتا رہا۔ آج بلاشبہ وہ جتنی خدمات اپنی موت آپ مر گئے ہیں اظہر جاوید کا ''تخلیق'' اسی طرح بھرپور توانائی اور آب و تاب سے ادب کی خدمت کر رہا ہے۔ نوجوان ایڈیٹر اپنے بابا کے سب پرانے دوستوں کو وہ احترام دیتا ہے جو ہماری روایات کا اہم جزو ہے۔ انور سدید کے اظہر جاوید سے تعلقات ہشت پہلو تھے۔ نوآموز ایڈیٹر نے ان تعلقات کو دوام دے ڈالا۔ ڈاکٹر انور سدید کا وصال اس صدی کا سب سے بڑا ادبی نقصان تھا۔ اس نقصان کو ایڈیٹر ''تخلیق'' نے اپنی روح تک محسوس کیا اور ایڈیٹر کی اس کیفیت کا میں ذاتی طور پر شاہد ہوں۔ ٹیلیفون پر اس کی سوگوار آواز کی بار بار کی گفتگو اور دکھ کی مکمل کیفیت کو بیان کر رہی تھی۔ یہ اگرچہ ایک حقیقت ہے کہ آنے والے زمانوں تک عالم اردو ادب انور سدید کے وصال پر سوگوار اور بے عمل رہے گا لیکن ایڈیٹر تخلیق نے انور سدید کی روح سے بے تحاشہ جذباتی سے عہد و پیمان کئے ہیں۔ اگلے زمانے کے رواتی طور طریقے یاد آ گئے جب والد کی وفات کے بعد گھر کا بڑا بیٹا جانشینی کی پگ پہن لینے کے بعد حاضرین کے سامنے گھر کو والد کے طور طریقوں کے مطابق چلانے کے وعدے وعید کرتا تھا۔ ایڈیٹر تخلیق نے اداریے میں بڑی کمال کی باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر انور سدید کو مرحوم نہ لکھنے کی اپنے تمام مخاطبین سے گزارش کی ہے۔ بحیثیت ایڈیٹر وعدہ کیا ہے کہ تخلیق میں انور سدید اپنی تحریروں کے ذریعے ہمیشہ موجود رہیں گے اور ہر ماہ ان کی کوئی نہ کوئی غیر مطبوعہ تحریر رسالے کی زینت بنے گی۔ اب تک میری جتنے لکھاری دوستوں سے بات ہوئی ہے ہر ایک سونان کے جذبے، اخلاص اور ڈاکٹر انور سدید سے انتہائی محبت کی کیفیت کو سراہ رہا ہے۔ ویسے دیکھا جائے تو ایڈیٹر تخلیق نے روایات کے ایک نئے سلسلے کا آغاز کیا ہے۔ میری یہ دلی دعا ہے کہ اللہ پاک سونان کے اس جذبے کو قائم و دائم رکھے۔ ایڈیٹر تخلیق کا عزم بالجزم دوسرے اہالیان قرطاس و قلم کیلئے ایک قابل تقلید مثال ہے۔ پورا شمارہ ڈاکٹر انور سدید کے علمی و ادبی کارناموں کے علاوہ ان کے ذاتی کردار و عمل پر کماحقہ روشنی ڈال رہا ہے۔ مضامین کی ایسی رنگارنگی ہے کہ رسالہ ایک حوالہ جاتی کتاب بن گیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کو جاننے اور سمجھنے کیلئے تخلیق کا یہ خاص شمارہ اپنے قاری کو دوسری کتابیں کھنگالنے سے چھٹکارا دے سکتا ہے۔

تخلیق کے ایڈیٹر اور اس کے تخلیقی عملے کی جتنی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ انور سدید کو اس طرح یاد کرنے کا اعزاز بس تخلیق کے سر بندھتا ہے۔

غلام نبی اعوان (راولپنڈی)

﴿7﴾ برادر عزیز سونان اظہر جاوید صاحب!

ڈاکٹر انور سدید کی علمی و ادبی خدمات پر ''تخلیق'' کا شاندار نمبر شائع کر کے آپ نے ایک اہم ادبی فریضہ انجام دیا ہے۔ مذکورہ نمبر میں شامل اکثر مضامین، ڈاکٹر انور سدید سے اہل قلم کی عقیدت و مودت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کی رحلت کے سانحے کو تمام مضامین نگاروں نے نہ صرف گہرے طور پر محسوس کیا ہے بلکہ اسے ادب کا بہت بڑا نقصان بھی قرار دیا ہے۔ ''فن، شخصیت اور تاثرات'' کے ذیل میں بیشتر تحریریں ڈاکٹر انور سدید کی علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات کا احاطہ کرتے ہوئے اردو کے ایوان ادب میں ان کے مقام و مرتبے کی اہمیت اور انفرادیت کو اجاگر کرتی ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، شاہد شیدائی، ڈاکٹر سعادت سعید اور منور عثمانی کے مضامین خصوصی توجہ کے طلب گار ہیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ دیگر اہل قلم کی تحاریر کم اہمیت

کی حامل ہیں۔ حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، اخلاق عاطف، سکندر حیات میکن اور دیگر قلم کاروں نے بھی ڈاکٹر انور سدید سے اپنے تعلق خاطر کو متاثر کن انداز میں بیان کیا ہے۔ دوسری طرف سوہان اظہر جاوید کی تحریر "کون ڈاکٹر انور سدید" نثر میں لکھا گیا نوحہ ہے جو سوہان کی ڈاکٹر انور سدید سے بے پناہ عقیدت اور محبت کا برملا اظہار بھی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی پدرانہ شفقت کا ہر زاویہ سوہان کی تحریر سے مترشح ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی ذات سے جڑی یادوں کو سوہان نے لفظوں کے بجائے خون کے آنسوؤں کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ اپنے والد اظہر جاوید کی جدائی کے گہرے صدمے کو سہنے کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ ہے جو اس پر گزرا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کو اپنے ہاتھوں لحد میں اتارنے کے بعد اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے اپنے والد جیسی ہستی کو دوبارہ کھو دیا ہے۔ "یادیں" کے عنوان کے تحت مسعود انور کی تحریر "میرے ابا جی" ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت کے بعض گوشوں کو منور کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ مسعود انور نے ایک بیٹے کی آنکھ سے اپنے والد کی جس انداز سے تصویر کشی کی ہے، وہ قاری کو متاثر کرتی ہے۔

"تعزیتی کالم" میں شامل تحریریں، ڈاکٹر انور سدید سے کالم نویسوں کے تعلق خاطر کو عیاں کرتی ہیں۔ ان کالمی تحریروں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کی مفارقت کو ان سب نے واقعتاً محسوس کیا ہے اور اپنے سچے جذبات کو اپنے کالموں کے دامن میں سمو دیا ہے۔ حصہ "منظومات" میں شامل ہر شعری اظہاریہ ڈاکٹر انور سدید سے ذاتی وجذباتی وابستگی کو آشکار کرتا ہے۔ خاص طور پر شبہ طراز کی نظم بعنوان "کون کسے پہچانے گا اب" کمال کی ہے۔ "جائزے" کے ذیل میں شامل پروفیسر جمیل آذر، شفیع ہمدم اور محمد علی چراغ کی تحریریں بھی قاری کو متوجہ کرتی ہیں۔ "انجمن خیال" میں شامل مختلف اہل قلم کے خطوط میں ڈاکٹر انور سدید کے سانحۂ ارتحال پر نہ صرف غم واندوہ کا اظہار کیا گیا ہے بلکہ ان کی علمی و ادبی خدمات کو بھی مختصر الفاظ میں سراہا گیا ہے۔ مجلّہ "تخلیق" کے کم وبیش 119 صفحات ڈاکٹر انور سدید کے لیے مختص کر کے آپ نے انھیں ہدیۂ تبریک پیش کرنے کی احسن کوشش کی ہے۔ یہ آپ کا فرض بھی تھا اور ڈاکٹر انور سدید اس کے حق دار بھی تھے۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

سلیم آغا قزلباش (سرگودھا)

﴿8﴾ محترم سوہان اظہر جاوید! اسلام مسنون

تخلیق (انور سدید نمبر) موصول ہوا۔ آپ کی انور سدید سے عقیدت ومحبت کو سلام پیش کرتا ہوں کہ آپ نے ان کی رحلت کے فوراً بعد اردو دنیا کے معروف اور نامور لکھنے والوں مثلاً خواجہ محمد زکریا، ہارون الرشید تبسم، نجم الحسن رضوی، سعادت سعید، حسن عسکری کاظمی، سرفراز سید، سلیم آغا قزلباش، نذیر فتح پوری، شاہد شیدائی، قیصر نجفی، اخلاق عاطف، مظفر حسن منصور، اشرف ذکی، سکندر حیات میکن ملک مقبول احمد، مسعود عثمانی، شاہد بخاری، قمر زمان، سلمیٰ اعوان، اظہر سلیم مجوکہ، تنویر شاہد کے علاوہ بشریٰ اعجاز اور منظومات کی ذیل میں پروین شیر، شبہ طراز، فوقیہ مشتاق وغیرہ کی نگارشات شائع کیں۔ جن سے انور سدید کی شخصیت اور خدمات کے حوالے سے زیادہ معلومات حاصل ہوئیں۔ دوسرے یہ کہ ٹائٹل پر ایک دوسرے کے چاہنے والے دو ادیبوں اظہر جاوید اور انور سدید کے ساتھ ساتھ تصویریں چھاپ کر لطف کا سامان پیدا کر دیا۔ یوں لگتا ہے دونوں بہت کچھ "تخلیق" کے قارئین سے کہہ رہے ہیں۔ یہ محض دو تصویریں نہیں بلکہ ادب کی تاریخ کے دو نامور فن کار ہیں جن کی ادبی خدمات تاریخ ادب اردو میں روشن الفاظ میں تحریر کی جائیں گی۔ ہندوستانی ادیب ڈاکٹر کیول دھیر کے اعزاز

میں آپ کی ضیافت کی روداد دونوں ملکوں کے ادیبوں، شاعروں، نقادوں اور دانشوروں کو قریب لانے کی مرحوم اظہر جاوید کی طویل کوششوں کی یاد دلاتی ہے۔ آپ کے اداریے "پہلی بات" میں آپ کا یہ اعلان کہ آپ انور سدید مرحوم کی غیر مطبوعہ تحریریں چھاپتے رہیں گے "تخلیق" کے پڑھنے والوں کے لیے خوش کن ہے۔

ممتاز احمد خاں (کراچی)

(9) محترمی سونان اظہر جاوید!

السلام علیکم۔ تخلیق سے کچھ عرصہ کے تعطل کے بعد رابطہ بحال ہوا۔ ڈاکٹر انور سدید نمبر موصول ہوا۔ بلاشبہ انور سدید ادب کی مقبول عام شخصیت اور ادب کے فلک پر چمکتا ہوا آفتاب تھے (ہیں)۔ ہر ادیب انہیں اپنے سے قریب تر جانتا ہے۔ یہ ان کے اخلاق حسنہ کی دلیل ہے۔ میری ان سے ان کی رہائش گاہ پر ایک بار ملاقات ہوئی۔ ٹیلی فون پر بات چیت ہوتی رہتی تھی۔ ان کے شفقت بھرے خطوط میرے نام آئے جو میرے لیے قیمتی اثاثہ ہیں۔ انہوں نے غالباً 2010ء کے سیلاب پر فکرمندی کا خصوصی خط لکھا، یہ ان کا بڑا پن تھا۔ انور سدید کا حافظہ قابل رشک تھا۔ اس کی میں تعریف کرتی ہوں۔ جس علاقے کی بات ہوتی وہ اس علاقے سے نکلنے والے چھوٹے بڑے ادبی رسالے حتیٰ کہ یک ورقی اخبار اور ادبا، شعراء کے نام بتاتے جاتے۔ میرے افسانے "کواڑ" کو انہوں نے خصوصی پسندیدگی سے نوازا۔ یوں کسی کی تحریر کو یاد رکھنا اور دوران گفتگو حوالہ دینا حافظہ اور یادداشت کے علاوہ خلوص و محبت کا اظہار ہے۔ ان کا یہ عالم سب کے ساتھ تھا۔

"تخلیق" کے انور سدید نمبر میں ان کی علمی ادبی خدمات سے متعلق مضامین ہیں۔ وہ تو ادب کا سمندر تھے۔ اس ضمن میں ان کی خدمات کا شمار ہی بذات خود ایک الگ کتاب بن سکتی ہے۔ ادب ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ سونان اظہر جاوید کی ڈاکٹر صاحب سے بے لوث محبت و عقیدت عیاں ہے۔ وہ ان کے سفر آخرت میں ہر مرحلہ پر موجود ہے۔ سونان صاحب نے درست لکھا کہ لوگوں نے انتقال کی خبر سنتے ہی فوٹو، ان کے ساتھ لی گئی تصاویر کی پوسٹ لگانا شروع کر دی۔ یہ عمل یادگاری کم اور خود نمائی زیادہ تھا۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا "انور سدید کی اہم تصنیف۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ" معلوماتی تحریر ہے۔ معلوماتی تو تمام ہی تحریریں ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا انور ادب بھی خالی از دلچسپی نہیں۔ انور سدید کتاب میں سانس لیتے تھے۔ کتاب دوستی بھی ان کے لیے ناکافی اصطلاح ہے۔ سوچتی ہوں انہوں نے اپنی حیات میں کتنے الفاظ لکھے ہوں گے شمار ہی نہیں کر سکتی ۔۔۔ ان کی خدمت ادب تو ان کے لیے باعث مغفرت بن جائے۔ سرفراز سید کا مضمون "ڈاکٹر انور سدید اور برگد کا پیڑ" میں ان کے آخری دو خواہشات کا ذکر اور ان کا پورا ہو جانا محمود ایاز کی مثل یاد آ گئی۔ ڈاکٹر صاحب ادبی کنجوس نہیں تھے۔ حوصلہ افزائی ان کا طریق تھا۔ وہ بہت سے دیگر ادبا، شعراء یا لکھاریوں کی طرح اپنی قصیدہ گوئی پر خوش اور دوسروں کو نیچا ثابت کرنے پر لگے ہوئے بدنما کردار سے کوسوں دور تھے۔ وہ جس کی تحریر کو اچھا گردانتے نام لے کر ذکر کر دیتے۔ جونیئر، نئے لکھنے والے کم مشہور کا نام لینا کسر شان نہیں سمجھتے تھے۔ تخلیق کے باقی مندرجات میں "میک اپ والی" سادہ اسلوب میں سچا مشاہدہ ہے۔ غلام نبی اعوان "یادیں گلاب ہوتی ہیں" عنوان کرتے ہیں۔ یہ عنوان کتنا اچھا ہے کہ ہاں یادیں گلاب ہوتی ہیں۔ گرم گرم امرتیوں جیسی میٹھی، ناک کے نیچے رکھے تازہ گلاب سی مہکتی، بارش کی دھلی ہوئی جیسی تازہ اور چاندنی میں پرانے گیت جیسی اداس ہوتی ہیں۔ الحمرا میں خطوط کی محفل ہوتی تھی یا تخلیق کا انجمن خیال، پہلے پہلے دو تین بھرپور خطوط انور سدید کے ہوتے تھے۔ ۔۔۔ بس دنیا چلتی رہتی ہے ۔۔۔ کیا کسی نے اگر تم یہ سمجھتے ہو

کر دنیا تمہارے بعد کیسی ہو گی (یعنی ایسی نہ رہے گی) تو یہ دیکھ لے کہ جو تمہارے سامنے چلے گئے ان کے بعد دنیا میں کیا تبدیلی آئی؟ (یعنی کوئی فرق نہ پڑا) رہے نام اللہ کا۔

وردانہ نوشین خان (مظفر گڑھ)

﴿10﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

سلام مسنون! ماہنامہ "تخلیق" کا "اظہر جاوید نمبر" کے بعد "انور سدید نمبر" اردو ادب میں ایک معتبر حوالے کے طور پر محفوظ رہیں گے۔ ماہنامہ "تخلیق" کا "انور سدید نمبر" جب نظر نواز ہوا تو طبیعت خوش ہو گئی۔ محترم اظہر جاوید کے فرزند ارجمند نے اردو ادب کے شناور (انور سدید) کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے، وہ دیگر ادبی رسالوں میں سے کسی نے اس معیار اور وقار کو نہیں چھوا ہے۔ "انور سدید اور ماہنامہ تخلیق" اس موضوع پر ایک مقالہ قلم بند کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی محقق کو فرصت ہوئی تو یہ ایک وقیع مقالہ ثابت ہو گا۔ مولوی نذیر احمد پر خود انور سدید کا خاکہ نما مضمون انور سدید کی گہری بصیرت پر دال ہے اور واقعی ایک نایاب تحریر ہے جو مولوی نذیر احمد کو شخصی اور علمی زندگی کو روشن کرتا ہے۔ "انور سدید نمبر" میں ملک کے نامور ادبا نے بڑی عقیدت اور محبت سے انور سدید کے غم کو محسوس کیا ہے اور اپنے تاثرات رقم کیے ہیں۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر ہارون الرشید، حسن عسکری کاظمی، سعادت سعید، سلیم آغا قزلباش، سرفراز سید، شاہد شیدائی، ملک مقبول احمد، منور عثمانی، مظفر حسن منصور، شاہد بخاری اور راقم نے بھی انور سدید کے ساتھ اپنی یادوں کو ضبط تحریر میں لایا ہے۔ "یادیں" کے عنوان سے سلمی اعوان، قمر ریاض، مسعود انور اور سونان اظہر جاوید نے آنکھیں نم کر دی ہیں۔ انور سدید خوش نصیب ہیں کہ ان کو لوگ دل سے چاہتے ہیں۔ تعزیتی کالموں میں بھی انور سدید کی وفات اور ان کے ادبی کارناموں پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اس خاص نمبر میں چند اہم کالم شامل کیے گئے ہیں جو انور سدید کی بڑی شخصیت کے گوشوں کو منور کرتے ہیں۔ بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر زاہد حسن چغتائی، نوید قیصر شاہد، اظہر سلیم مجوکہ وغیرہ نے اپنے غم کا اظہار کیا ہے۔ زیر نظر شمارے میں انور سدید کو منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا گیا ہے۔ محترمہ شبہ طراز اور مجید احمد نے خوب صورت انداز میں علم و ادب کے اس برج کو تحسین پیش کی ہے۔ پروفیسر جمیل آذر نے انور سدید کے شعری مجموعے "برہنہ سرگوشی" پر منفرد انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ سلیم شہزاد اور حنیف باوا نے پنجابی میں منظوم خراج پیش کر کے انور سدید کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔

مسلم شمیم نے صادق حسین کی کثیر الجہت شخصیت پر جامع مضمون قلم بند کیا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ "مزار" اپنے منفرد پہلو کی جانب توجہ مبذول کرواتا ہے۔ آخر میں انجمن خیال بھی "تخلیق" کے حسن تخلیق کو نیا رنگ بخشے ہوا ہے۔ ایک اہم مضمون "یادیں کتاب ہوتی ہیں" میں غلام یحییٰ اعوان نے اپنی یادوں کے عکس اس پیرہن کے پیوست کر دیا ہے کہ بچپن ایک انمول لمحے کا نام ہے جو بہت جلدی بیت جاتا ہے مگر یادیں امر کر جاتا ہے۔ ماہنامہ "تخلیق" کا انور سدید نمبر دراصل ایک بڑی علمی و ادبی شخصیت سے وسیع القلبی کے ساتھ اپنی عقیدت اور محبت کا اظہار ہے۔ مختلف کالموں، یادوں اور تاثرات کو ایک گلدستے میں سمو کر "انور سدید نمبر" شائع کرتے پر سونان اظہر جاوید نے کمال کیا ہے اور اس پر خصوصی مبارک باد کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ اس خاص شمارے کی اشاعت پر آج اظہر جاوید اور سونان اظہر جاوید انور سدید کے رو برو سرخرو ہو گئے ہیں۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن (سرگودھا)

﴿11﴾ پیارے بیٹے سونان اظہر جاوید، دعائیں ہزاروں!

اللہ تبارک و تعالیٰ آپ کو مع متعلقین خوش و خرم رکھے۔ آمین! بہت عرصہ سے ارادہ کر رہی ہوں لیکن قلم پر ہی قابو نہیں پا رہی ہوں۔ آج ذرا طبیعت بہتر ہوئی تو سوچا خط لکھ ڈالوں۔ پھر بھی مجبوراً تازہ کلام اپنے رجسٹر کے پرچوں پر سے کاپی کروا رہی ہوں کہ اب لکھا نہیں جاتا۔ قبول کر لیجئے اور ممکن ہو تو آئندہ "تخلیق" کی اشاعت کی نذر کر دیجئے۔ عمر کا ایک ایک پتہ جھڑتا جا رہا ہے۔ کٹتی جا رہی ہوں۔ آپ سے دوریاں راہ میں ورنہ آپ کے حوالے کرتی جاتی۔ شاید آپ ہی قدر کر لیں ورنہ اس ناقدروں کی دنیا میں "ناقدری کی بھینٹ ہی چڑھ رہی ہوں۔ اب تو ..... نہ قدم چلتے ہیں نہ قلم چلتا ہے۔ مگر ہاں، پھر بھی شکر ہے قلم کچھ کچھ چل رہا ہے۔ اسی وجہ سے تازہ کلام وجود میں آ جاتا ہے۔ گذشتہ دنوں بیماریوں اور بیزاریوں کے باوجود بھی قدم نہیں چلتے نہ چلیں، قلم تو چلتا ہی رہا۔ کچھ تازہ کلام ہو گیا ہے۔ یہ میرے بڑھاپے کی اولاد کی طرح بہت پیارا ہے سو پیارے "تخلیق" کے لئے ارسال کر رہی ہوں۔

رشیدہ عیاں (امریکا)

﴿12﴾ محترمی سونان اظہر جاوید صاحب!

"تخلیق" کا ڈاکٹر انور سدید نمبر ملا۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات سے علمی و ادبی حلقوں میں صفِ ماتم بچھ گئی ہے۔ دنیائے علم و ادب پر سکتہ طاری ہے۔ مجلس "تخلیق" بلبل کی طرح اداس ہے۔ گلستان ادب سوگوار ہے۔ انہیں جاننے والا ہر بندہ صدمے سے دوچار ہے لیکن معاً خیال آتا ہے کہ موت تو ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی بندہ بشر کو انکار نہیں۔ یہ دنیا فانی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ وہ دعاؤں کے محتاج ہیں۔ ان کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا اور اظہر جاوید صاحب بھی۔ یہ ایک خوبصورت تکون تھی جو اپنے آثار اور یادوں کے سہارے زندہ رہے گی۔ "تخلیق" کے لکھاریوں اور قارئین کا ان کو خراج تحسین پیش کرنے، ان کی خدمات کو یاد رکھنے کا بہترین طریقہ ان کے حق میں دعائے مغفرت ہے۔ ان کے بارے میں مضامین چھپتے رہیں گے خصوصی نمبر نکلتے رہیں گے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک کہ گلستان علم و ادب میں بہار ہے۔ مرغانِ چمن کی چہکار ہے۔ پھولوں کی مہکار ہے۔ سونان اظہر جاوید صاحب نے ڈاکٹر انور سدید نمبر شائع کر کے اپنی سعادت مندی کا ثبوت پیش کر دیا ہے اور تمام ادبی پرچوں پر فوقیت لے گئے انھوں نے اپنے والد مرحوم کی دوستی کا بھرم رکھتے ہوئے ان کی روح کو شاد اور فرحاں کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب دنیائے علم و ادب کی ایک جاندار، زوردار اور باوقار آواز تھے۔ وہ اپنی تخلیقات سے "تخلیق" کے صفحات کو زینت بخشتے رہے۔ اپنی موجودگی سے محفل یاراں میں رنگ بھرتے رہے۔ انہوں نے مرتے دم تک "تخلیق" کے ساتھ دوستی نبھائی۔ قدم قدم پر سونان اظہر صاحب کی ڈھارس بندھائی۔ ڈاکٹر انور سدید نمبر میں ان کے دوست احباب نے ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کر کے دوستی کا حق ادا کر دیا ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اپنے محسنوں، بزرگوں کو اسی طرح یاد رکھا جاتا ہے۔ "تخلیق" کے اس شمارے میں ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے مختلف گوشوں سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔ ان کے ذریعے ان کی زندگی کے رنگ ڈھنگ آشکار کیے گئے ہیں۔ ہر معتبر لکھاری نے خلوص و محبت کے جذبوں میں ڈوب کر اپنے تجربات و مشاہدے ڈاکٹر صاحب سے اپنے روابط اور مراسم کا بھی گرمجوشی سے اظہار فرمایا ہے۔ انہوں نے اپنی والہانہ تحریروں سے ڈاکٹر انور سدید کی ان خوبیوں کا ذکر کیا ہے جن کے باعث وہ ممتاز و نمایاں تھے۔

ڈاکٹر انور سدید نمبر میں ہر مضمون اپنی انفرادیت، افادیت اور خصوصیت کے لحاظ سے معلومات سے معمور اور مفید ہے۔ ادارہ

تخلیق نے اپنے تعارف نامے میں ڈاکٹر انور سدید کی گوناگوں علمی و ادبی خدمات کا تذکرہ کر کے ان کی طلسماتی شخصیت کا ایسا بھرپور نقشہ کھینچا ہے کہ جو تخلیقی افق پر ستارہ نور بن کر روشنیاں بکھیرتا انسانی ذہن کو روشن کرتا ہوا دل میں اتر جاتا ہے اور ان کے فن کی مختلف جہتیں انسان کو حیرت زدہ کر دیتی ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے فن، شخصیت اور تاثرات کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید نے ایک انوکھے اور اچھوتے انداز میں ذکر کر کے "تخلیق" کے صفحات پر اپنی موجودگی کا احساس دلا دیا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ وہ اب بھی موجود ہیں اور مولوی نذیر احمد کے حوالے سے ہم سے ہم کلام ہیں۔ خواجہ محمد زکریا نے انور سدید کی کتاب "اردو ادب کی مختصر تاریخ" کا نہایت دیانت داری سے غیر جانب دارانہ تجزیہ کر کے سچی اور کھری باتیں کرنے کی روایت کو زندہ رکھا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب نے اپنے مضمون "انوار ادب" میں ڈاکٹر انور سدید سے اپنی عقیدت کا ذکر کر کے یادوں کی پوٹلی کھول کر رکھ دی ہے جس سے محفل "تخلیق" معطر ہو کر خوشگوار اور پُربہار ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید اچھا لکھتے ہیں، ایمان داری سے لکھتے ہیں، سچ کے ساتھی ہیں، اچھی باتیں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں انہوں نے اچھی اور مفید باتیں کر کے اپنی عقیدت کا اظہار کر دیا ہے۔ ملک مقبول احمد کا مضمون "مینارہ علم و ادب۔ ڈاکٹر انور سدید" کی بھرپور علمی و ادبی زندگی کا بیان ہے جس میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں گراں قدر معلومات ہیں۔ سلطان اظہر جاوید صاحب نے اپنے مضمون "کون ڈاکٹر انور سدید؟" میں عقیدت و احترام سے ڈاکٹر انور سدید کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ مسعود انور نے "میرے ابا جی (ایک ادھورا تعارف)" میں ڈاکٹر صاحب کے حوالے سے اصول باتیں کر کے محبت نامہ تحریر کر دیا ہے۔

"تخلیق" کے ڈاکٹر انور سدید نمبر میں چھپے ہوئے مضامین سے استفادہ کر کے پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس سے اس نمبر کی افادیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نمبر کے ہر مضمون پر رائے دینا طوالت کے باعث ممکن نہیں۔ بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ آخر میں ڈاکٹر وزیر آغا صاحب، اظہر جاوید صاحب اور ڈاکٹر انور سدید صاحب کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔

ڈاکٹر محمد اقبال صمصام (مردان)

﴿13﴾ جناب سلطان اظہر جاوید!

آپ نے تخلیق کے خاص نمبر میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں جس قدر نظم و نثر میں تحقیقی اور معلومات افزا مضامین میں ان کی شخصیت کے ہمہ جہت پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے اگرچہ ان کے تخلیقی اور تحقیقی کام لامحدود ہیں تاہم آپ نے بجا طور پر حق ادا کر دیا ہے جو ہر لحاظ سے لائق تحسین ہے اور آپ اس کے لئے بجا طور پر مبارکباد کے مستحق ہیں تخلیق کے ساتھ ان کا ادبی رابطہ یاد و بھی آپ کے لئے ایک اعزاز ہے۔ جون 2016ء کے شمارے میں ٹائٹل کے اندرونی صفحے پر آپ کے گھر پر ممتاز بھارتی دانشور اور مصنف ڈاکٹر کیول دھیر کے اعزاز میں استقبالیہ کے دوران میں ان کے ہمراہ پاکستانی دانشوروں کی تصویریں نادر اور یادگاری ہیں جو نہ صرف اردو ادب کی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کر جائیں گی بلکہ اردو ادب کے شائقین اور طالب علموں کے لئے نہایت معلومات افزا بھی ثابت ہوں گی جون 2016ء کے اسی شمارے کے ٹائٹل پیج پر ڈاکٹر انور سدید اور اظہر جاوید کی باہم تصویر لاجواب ہے جس نے اس عالمی معیار کے تحقیقی اور تخلیقی جریدے کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ماہ جون 2016ء کے شمارے میں حمد کے زیر عنوان نور بین طلعت عروبہ نے جس

حیات نہایت خلوص دل اور عجز و انکسار سے رب ذوالجلال کے ہاں نعت طراز ہیں اور جناب تحتی مرتبت حضور سرورِ کائنات کیلئے جناب سید ریاض حسین زیدی نعت کے گجہائے عقیدت پیش کر رہے ہیں وہ بھی یقیناً اجر و ثواب سے سرشار ہیں ان کا اردو ادب میں اعلیٰ مقام ہے۔ ادارہ تخلیق کا ڈاکٹر انور سدید کے لئے تعارف نامہ جس میں ذاتی کوائف، تعلیمی کوائف، فنی اور انتظامی کوائف صدارتی ایوارڈ اور دیگر اعزازات، ادبی رسائل کی ادارت میں شرکت، ادبی کالم نگاری (اردو) اور انگریزی زبان میں، بیرونی ممالک میں پاکستان کی نمائندگی، پاکستان کی ادبی کانفرنسوں میں شرکت، انتہائیات، تحقیق و تنقید اور تاریخ ادب پر کتابیں، تراجم علاوہ ازیں خاکہ نگاری، انور سدید پر انفرادی طور پر یونیورسٹیوں میں کیا گیا کام، ادبی رسائل میں گوشے انفرادی طور پر برصغیر میں تحریری و تنقیدی جائزے۔ ڈاکٹر انور سدید کے وہ منشور کام اور ان کی ادبیات وغیرہ کے علاوہ ان گنت کارہائے نمایاں موجود ہیں جنہیں احاطہ تحریر میں لانا فردِ واحد کے بس کی بات نہیں۔ مختصر یہ کہ تعارف نامہ اپنی جگہ ایک نادر اور بیش قیمت معلومات افزا تحریر ہے جو میری نظر میں بے مثال ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کے فن اور شخصیت پر انفرادی طور پر متعدد دانشوروں کے مضامین جن میں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، نجم الحسن رضوی، حسن عسکری کاظمی، سعادت سعید، پروفیسر قیصر نجفی، سرفراز سید، سلیم آغا قزلباش، نذیر فتح پوری، شاہد شیدائی، اخلاق عاطف، مظفر حسن منصور، اشرف زکی، ملک مقبول احمد، منور عثمانی، سکندر حیات میکن، اور قمر زمان شامل ہیں جو اردو ادب میں ڈاکٹر انور سدید کا مقام و مرتبہ متعین کرنے کیلئے کافی ہیں۔

یادیں کے عنوان سے سلمیٰ اعوان، قمر ریاض، اعزاز احمد جاوید اور مسعود انور کی نہایت دلپذیر تحریریں ہیں جبکہ تعزیتی کالم بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر زاہد حسن چغتائی، خالد یزدانی، اظہر سلیم مجوکہ، تنویر قیصر شاہد کے مضامین اور تمام نظمیں جو پروین شیر، رشید طراز، ریاض ندیم نیازی، شجاعت علی راہی، امجد احمد اور فوزیہ مشتاق نے لکھیں، جائزے کے زیر عنوان پروفیسر جمیل آذر کا مضمون "قلم کے لوگ"، شفیع ہمدم، وزیر آغا شناسی از محمد علی جی اخ، پنجاب رنگ میں سلیم شہزاد اور حنیف باوا کی نظمیں یہ سب مضامین اور منظومات ڈاکٹر انور سدید کی شخصیت اور اردو ادب میں ان کی خدمات کو بہترین خراج تحسین ہے۔

تخلیق کے معمولات کا حصہ جس کا آغاز ماہنامہ تخلیق کی ممتاز بھارتی دانشور اور مصنف کیول دھیر کے اعزاز میں تقریب ملاقات پر تفصیلی رپورٹ سے ہوا۔ کیول دھیر کے عشائیہ میں شریک خواتین و حضرات کے ناموں کی تفصیل بھی مہیا فرمائی جبکہ رنگین تصاویر چاروں پیج کے اندرونی صفحے پر موجود ہیں۔ مضامین کے باب میں صادقین کے بارے میں مسلم شمیم کی تحریر نہایت ادبی اور معلوماتی ہے۔ افسانوں میں ڈاکٹر رشید امجد کا "مزار" خوب رہا، جس کا اختتام انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ایک ہی جملے میں کیا "یہ اس کی تربیت ہو رہی ہے۔ اس نے آنکھ وا اس طلاقے کا لمبا سجدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ "میک اپ والی" اظہر جاوید کی پنجابی تحریر (جس کا ترجمہ حنیف باوا نے اردو میں کیا) بھی نہایت متاثر کن ہے۔ غزلوں میں سید منظور حسین یاد، امجد اسلام امجد، حسین مجروح، منصف عباس رضوی، محمد ممتاز راشد اور ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، تخلیق کی مجلس ادارت کے عمدہ انتخاب کے نمونے ہیں۔ انجمن خیال (خطوط) میں تقریباً تمام مراسلہ نگاروں نے تخلیق کے مندرجات کے علاوہ صرف اظہر جاوید کو یاد کیا بلکہ ڈاکٹر انور سدید کے لئے بھی نیک خواہشات کا اظہار کیا اور دعائے مغفرت فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان دو شخصیتوں پر اپنی رحمتوں کا نزول فرمائے اور انہیں اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

◆◆◆

رشید آفرین (سیالکوٹ)

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اس لیے تمام رسائل اور کتب کے نام اس لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ نیرنگِ خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ : سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ اطراف کراچی مدیر اعلیٰ : محمود شام 0321-8210736	ماہنامہ شاداب لاہور مدیر : ڈاکٹر کنول فیروز 0301-4123707
ماہنامہ ارژنگ لاہور مدیر : حسن عباسی 0300-4489310	ماہنامہ سپوتنک لاہور مدیر اعلیٰ : آغا امیر حسین 0300-8440444	ماہنامہ روشنائی کراچی مدیر : احمد زین الدین 0321-2011595
ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور چیف ایڈیٹر : صدیقہ بیگم 0300-8479444	ماہنامہ [illegible] کہانیاں لاہور مدیر : ایم اے ساجد 0301-4885283	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر : شاہد علی خان 0301-4001844
ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور مدیر اعلیٰ : الطاف حسن قریشی 042-35290738	ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر : عمران منظور 0300-8438043	ماہنامہ قومی زبان کراچی مدیر : ڈاکٹر ممتاز احمد خان 02134973296
ماہنامہ انشاء کلکتہ انڈیا مدیر : ف س اعجاز 0091-3322354616	ماہنامہ شاعر ممبئی انڈیا مدیر : افتخار امام صدیقی 0091-932453517	سہ ماہی انتساب انڈیا ایڈیٹر : سیفی سرونجی 0091-942564177
سہ ماہی نگینہ سری نگر کشمیر ایڈیٹر : وحشی سعید 09419012800	ماہنامہ کتاب اسلام آباد مدیر : ڈاکٹر انعام الحق 051-2264283	سہ ماہی سیپ کراچی مدیر : نسیم درانی 0333-2166968
سہ ماہی دستِ خیال لاہور مدیر : ڈاکٹر اظہر وحید 0321-9440981	ماہنامہ [illegible] مدیر : سعید احمد 042-36620949	سہ ماہی لاہور مدیر : [illegible] 0331-4722999

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1-	[illegible]	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	042-37310530	[illegible] اردو بازار لاہور	600/-
2-	حرفِ آغاز	ڈاکٹر اظہر وحید	0321-9440981	دارِ احساس، جوہر ٹاؤن لاہور	400/-
3-	[illegible] کا ادب	شاہین زیدی	0333-4524137	[illegible] پبلشرز لاہور	200/-
4-	[illegible]	[illegible]	0333-4344716	دستاویز مطبوعات [illegible] روڈ لاہور	400/-
5-	ترے مقام کو انجم شناس کیا جانے	ڈاکٹر محمد اقبال [illegible]	091-2580309	[illegible] پبلشرز [illegible] پشاور	400/-
6-	گل ہائے رنگ رنگ	[illegible]	—	بہادر یار جنگ اکادمی کراچی	650/-
7-	[illegible] قرآنی کہانیاں	[illegible]	042-37164074	[illegible] پبلشرز [illegible] لاہور	300/-
8-	خواب ادھورے ہیں	سید مبارک علی [illegible]	0312-4524149	[illegible] پبلشرز ملتان	200/-
9-	اقبال [illegible]	[illegible]	0302-7796970	[illegible] پبلشرز بہاولپور	500/-
10-	مدحت	طارق حبیب	041-2615359	مثال پبلشرز فیصل آباد	300/-

The Social Lounge...
Dining should be fun...
options COFFEE & MORE
options AN EXOTIC RESTAURANT
Best Fun Dining Restaurant in Pak
Declared by Consumer Choice
8 Aibbok Block Garden Town,
Lahore. Ph: 042-35941909
Do-Burj Plaza, Koh-e-Noor,
Faisalabad. Ph: 041-8714909

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE
CPL NO. 96

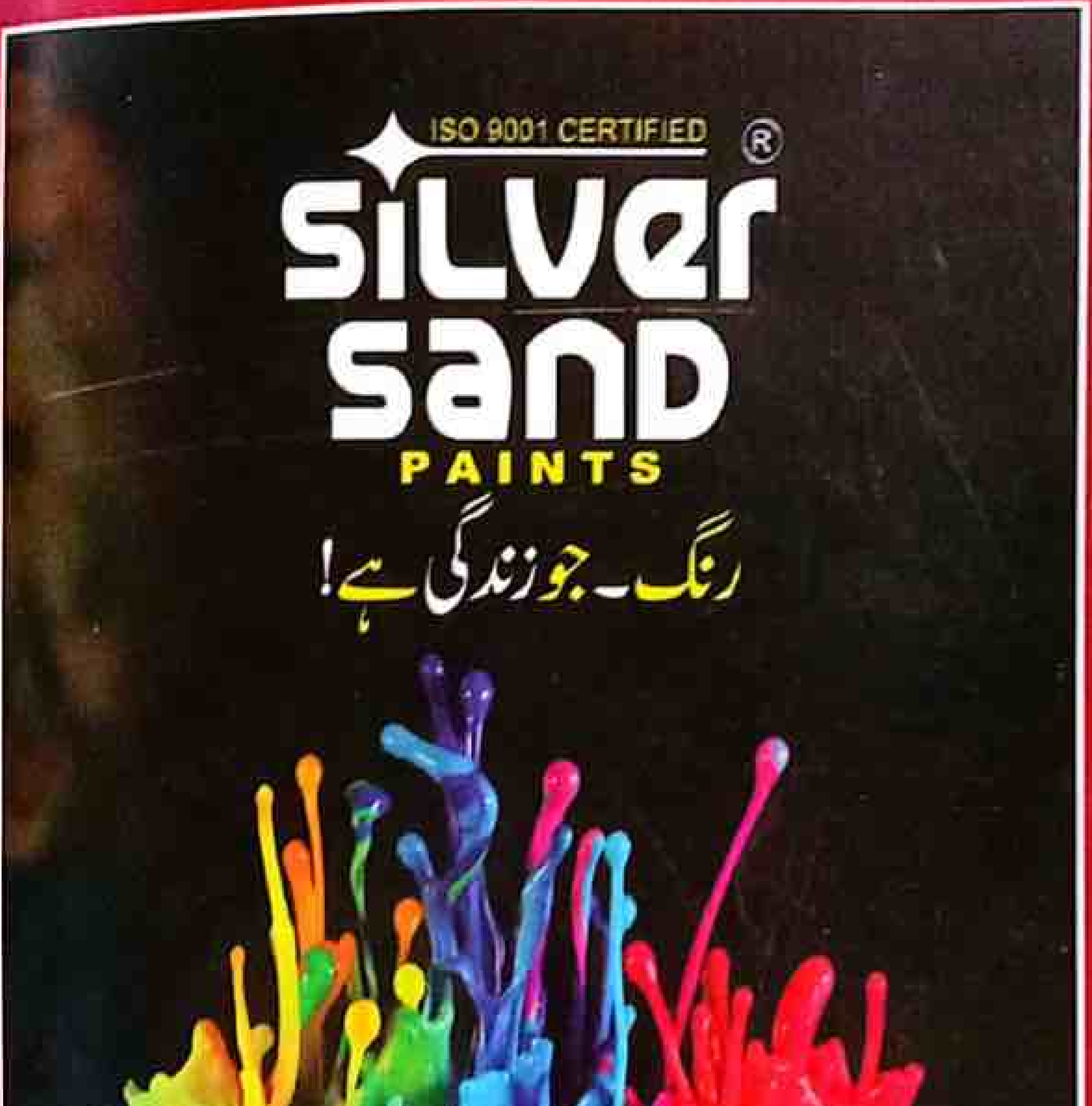

تخلیق

Brighto
Inspired by Nature
Brighto
STAIN FREE
EASY WIPE
اب دیواریں رہیں
صاف شفاف
بِنا رنگ اُڑائے!
Brighto PAINTS
brighto.paints | Toll Free 08000-1973 | www.brightopaints.com

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصہ ادارت 1969-2012ء

مسلسل اشاعت
47
واں سال

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 47 | دسمبر 2016ء | شمارہ : 12 | CPL نمبر 96

قیمت : 150 روپے .... 750 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر ــــ ہندوستان کے لیے 1,200 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor) Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

فون نمبر: 04237187500، 04236671007 ــــ موبائل فون: 03218899007 ای میل: ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

نثیر جہاں (امریکہ) ــــ ناشی ظہیر (امریکہ) ــــ نارنگ ساقی (انڈیا) ــــ جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ "تخلیق" کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جانِ آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا "تخلیق" شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد "تخلیق" کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود — میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں "اظہر جاوید نمبر" پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو "تخلیق" پیہم رواں رہے گا اور یہ "علامت"، "افکار"، "صریر"، "تقاضے" اور "طلوعِ افکار" جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا (انشاء اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک "تخلیق" کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔ "تخلیق" کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر "تخلیق" کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے "تخلیق" کے مضامین کے انتخاب کے لیے "تخلیق پینل" تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں "تخلیق" کی اعزازی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، ہاشمی ظہیر، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف 1,200 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

U.S.A.	U.S.A.	INDIA	PAKISTAN
Nayyar Jahan	Tadhee Zaheer	K.L. Narang Saqi	Javed Manzoor
2700 South Barrington AVE Los Angles C.A. USA	7028 Fairfeal Court Cupertino California U.S.A.	C-4-Connaught Circus, New Delhi-110001, India	78-Islam Block, Azam Garden, Multan Road, Lahore
Ph: [illegible]	Ph: [illegible]	Ph: 0091-[illegible]	Ph: [illegible] Cell: [illegible]
Email: Zjhanay@hotmail.com urdu@urdu-markaz.com	Email: tadheer@gmail.com	Email: narangsaqi@gmail.com	Email: [illegible]@hotmail.com

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ — خالد اقبال یاسر — 7
نعت رسول مقبولؐ — امین راحت چغتائی — 7
نعت رسول مقبولؐ — سیفی سرونجی (انڈیا) — 7

"تخلیق" ایوارڈ 2016ء

تعارف نامہ — ادارہ تخلیق — 8

فن و ادب

ایک دلآویز شخصیت۔ عذرا اصغر — عظمیٰ اعوان — 10
عذرا اصغر، آخر وہ چاہتی کیا ہیں؟ — شیخ فرزانہ — 14

مضامین

شہزاد احمد، ایک شاعر — ڈاکٹر انور سدید — 17
اختر کی نعت، ایک مطالعہ — امین راحت چغتائی — 22
جمیل صابری ۔۔۔ اردو شاعری — ڈاکٹر ہارون الرشید — 26
فیض احمد فیض ۔۔۔ رونقِ بزمِ یاراں — تعبیر جاوید — 29
کلاسیکی موسیقی وغیرہ ۔۔۔ — ڈاکٹر جواز جعفری — 41
معروف بین الاقوامی ناول نگار، کشمیری لال ذاکر — سید منصور وکرم (انڈیا) — 48
اردو زبان کا معمار چلا گیا — ڈاکٹر رنگ ساقی (انڈیا) — 52

منظومات

آئینہ شکن — ابصار عبدالعلی — 55
پھول پھلیاں — پروین شیر (امریکہ) — 55
سر چھپانے کی قیمت — نیر جہاں (امریکہ) — 55
اے شہرِ درد آشنا — شہزاد نیر — 56
قطعات — کرشن پرویز (انڈیا) — 56
ساون آیا — بی بی جنت قاسمی — 56
پانی شور کرتا ہے — سید مبارک علی شمسی — 57
شہیدوں کے مزار — غلام نبی طیال — 57
مقدر — جمیل حیات — 58
شام ہوئی — نوفل مشتاق (امریکہ) — 58
سارے الفاظ — شازیہ مفتی — 58

افسانے

ستم کدۂ جہاں — تحسین احمد — 59
اور وہ پورا ہو گیا — عطیہ سید — 63
بدلتا ہے رنگ ۔۔۔! — عذرا اصغر — 68
محبوب کی آزادی — دیپک کنول (انڈیا) — 71
کچھوے کا دوسرا جنم — ڈاکٹر زین سالک — 77
ردی — شیخ خالد — 80
بھولا — طارق بلوچ صحرائی — 82
بے بہادری سے ۔۔۔ — دردانہ نوشین خان — 85
اترا ہوا پہناوا — نوید مرزا (فرانس) — 88
میرے پیارے کی یاد — اظہر جاوید — 93

غزلیں

منظور حسین یاد، جلیل عالی، آصف ثاقب، سید ریاض حسین زیدی، سعود عثمانی، حسین مجروح، حسن عباسی، مرتضیٰ برلاس، رشیدہ عیاں، مرزا احمد نور طاہر، ڈاکٹر ایوب ندیم، آفتاب خان، اسلم سحاب ہاشمی، عمران شفق۔ — 99
آسناتھ کنول، امر حقی، ارشد محمود ارشد، یوسف وفا — 104

یادنگاری

عاشق صبر طلب	ڈاکٹر رشید امجد	105
یادِ حیات تجھے ہم کس ...	مستنصر حسین تارڑ	112
ضمیر نیازی اور میں	اظہر جاوید	114

سفرنامہ

عراق اشک بار ہیں ہم	سلمیٰ اعوان	116

تجزیہ نگاری

"کیا راون مرے گا؟"	بشریٰ سعید	121
کیا راون مرے گا (تجزیہ)	ڈاکٹر اشرف	123

طنز و مزاح

ثانی الاجیہ	ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی	125

جائزے

بحر تجلیات کا شناور	حسن عسکری کاظمی	128
"آواز" ... نئی آواز	مسلم شمیم	130
"جرس بے صدا"	پروفیسر جلیل الرحمٰن	134
طارق حبیب کا ذوالفین	اخلاق عاطف	137
میرا ادیب مشاہیر	طلعت اشرف زیدی	140

تبصرے

تحقیق و تنقید کے سو سال	ڈاکٹر انور سدید	144
مارکسزم اور تاریخ کی دنیا	تحسین جاوید	
خواب گر (ناول)	آفتاب خان	
میرے ان کہاں	آفتاب خان	
تصانیف ایس ایم حلیس کا جائزہ	آفتاب خان	148

انجمن خیال

آصف ثاقب، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی، انور جاوید ہاشمی، مرزا احمد نور طاہر، نثار احمد صدیقی، غالب عرفان، ابن عظیم فاطمی، رشیدہ عیاں، عراق مرزا، ڈاکٹر محمد حیات مکلن، اخلاق عاطف، رشید آفرین — 149–159

تخلیق کو موصول رسائل اور کتب

ملکی اور غیر ملکی — 160

سرورق

ایس خالد

ناشر: سونان اظہر جاوید

طابع: بیدار سرمدی

قانونی مشاورت: لطیف احمد قریشی

مطبع: یکسن پرنٹرز گلشن راوی لاہور

مقام اشاعت

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I,
Islam Nagar, Walton Road, Lahore -Cantt

(اڈیٹنگ کے حقوق محفوظ)

○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

پہلی بات

انسانی فطرت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کو کسی کل چین نہیں۔ وہ ہر وقت تبدیلی کا منتظر رہتا ہے۔ اسے ہر اس چیز پر اعتراض ہوتا ہے جو اس کے حق میں نہ ہو یا جو اس کی مرضی کے مطابق نہ ہو۔ انسان اللہ سے زیادہ خود کی سننے میں مگن ہے۔ اعتراضات کا تو کیا ٹھکانہ؟ حضرت انسان اللہ کی ذات کو بھی اعتراضات کی زد میں لانے سے گریز نہیں کرتا تو خود انسان کی نظر میں دوسرے انسان کی کیا وقعت ہے۔ وہ اس کی کاوشوں کو سراہنے سے نہ صرف گریزاں ہے بلکہ مفادات کی جنگ میں دوسرے انسان کے جذبات اور احساسات کو بھی روندنے سے گریز نہیں کرتا۔

ایسے ہی دور سے میں پچھلے چار سال سے گزر رہا ہوں۔ بہت سے قارئین "تخلیق" کو میرے انداز ادارت پر اعتراض ہے۔ عام طور پر میں ان اعتراضات کا جواب دینے سے احتراز کرتا ہوں لیکن جب "تخلیق" کو ایسا پرچہ کہا جانے لگے کہ جو صرف ایک خاص گروپ یا چند گنے چنے لوگوں کی تحریروں کو چھاپتا ہے تو پھر میرا فرض ہے کہ میں ان اعتراضات کا جواب ادبی فورم پر دوں۔

"تخلیق" کے ہر شمارے کی طباعت کوشش کے باوجود گرفت میں نہیں آتی جتنا مواد شائع کیا جاتا ہے اس سے کہیں زیادہ مخطوطہ بھی رہ جاتا ہے۔ اکثر اہلِ قلم اعتراض کرتے ہیں کہ ان کی تحریروں کو "تخلیق" ادبی چینل شامل کیوں نہیں کرتا؟ کیا چینل صرف اپنے پسندیدہ لوگوں کی تحریریں شامل کرتا ہے؟ کیا اکثر لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ چینل غیر جانبدار نہیں بلکہ ادبی گروپ سسٹم کو فروغ دے رہا ہے اور ان کی معیاری تحریروں کو غیر معیاری ثابت کر رہا ہے۔

اگر اظہر جاوید والد محترم کے دورِ ادارت اور میرے دورِ ادارت کا تجزیہ کیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ میں نے بارہا اپنے اداریوں اور اپنے عمل سے بھی ادبی گروپ سسٹم کی حوصلہ شکنی کی ہے اور "تخلیق" کو اس سے دور کیا ہے اور تحریروں کا چناؤ غیر جانبداری سے کرنے کی روایت ڈالی ہے۔

بے شمار دوستوں نے مجھے شروع میں فون کر کے کہا کہ آپ نے فلاں صاحب کی تحریر کو "تخلیق" میں جگہ دے دی ہے جبکہ اظہر جاوید کے دور میں ان کی کبھی کوئی تحریر شامل نہیں ہوتی تھی۔ میرا ان تمام اہلِ قلم سے یہی سوال ہوتا تھا کہ ہم کب تک ان ادبی گروپ بندیوں میں بندھے رہیں گے؟ اور اس کا حاصل کیا ہے؟

"تخلیق" کو الحمدللہ شائع ہوتے 47 سال ہو گئے ہیں۔ ان سالوں میں ہندوستان کے بڑے بڑے اداروں کے نہایت وقیع رسائل کھلونا، بانو اور شمع جبکہ پاکستان میں علامت، افکار، صریر، تقاضے، اوراق اور طلوعِ افکار جیسے رسائل بھی بند ہو گئے ہیں۔ "تخلیق" کی مسلسل باقاعدہ اشاعت کا سہرا ان تمام احباب کے سر جاتا ہے جو اندرون اور بیرون ملک اپنی محفلوں کے دامن میں ہوتے "تخلیق" کو ہر جگہ لیے پھرتے ہیں اور ادب کے نئے قاری سے اسے متعارف کرواتے ہیں۔ یہ انہی احباب کی محنتوں کا ثمر ہے کہ "تخلیق" ترقی کے مراحل سے گزر رہا ہے جبکہ ادبی رسائل کے خریدار اور ان کے لیے اشتہارات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اپنے وقت کے اچھے اور معیاری رسائل اپنے

مدیروں کی عظمت سمیت اشتہارات اور شہ پاروں سے محروم رہے اور آخر کار بند ہو گئے۔ ایسے بہت سے اچھے بھلے خوش حال ادیب اور شاعر بھی مفت کا پرچہ لینا فخر سمجھتے ہیں۔ اگر پرچہ ڈاک میں گم ہو جائے (اطلاعاً عرض ہے فی پرچہ -/35 روپے رجسٹرڈ ڈاک کے ذریعے جاتا ہے) یا انہیں احساس دلانے کے لیے ترسیل روک دی جائے تو فون اور خطوط کی یلغار کر دیتے ہیں اور اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پہلے پہل میں اس سب سے گھبراتا تھا، جھنجھلا جاتا تھا اور پہروں کڑھتا رہتا تھا لیکن اب میں مزاج آشنا ہو گیا ہوں۔ اب اعتراضات کو ہنس کر ٹالنے کی عادت اپنا لی ہے۔

اپنے سابقہ اداریوں میں بار بار ادب کے نئے داروں کو جھنجھوڑنے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ ان تک اپنی بے اختیار آواز پہنچانے کی جرأت کرتا رہا ہوں اور ان کو مسائل سے آگاہ رکھنے کی سعی کرتا رہا ہوں مگر آج تک چند اطراف کے سوا کہیں سے یادِ صبا کا جھونکا نہیں آیا!

جب ادب میں سیاست در آئے اور سیاست سے ادب (تہذیب و شائستگی) دور ہو جائے تو معاشرے اور قوم کی پہچان اور شان ختم ہو جاتی ہے۔ ہم اسی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ ادب میں جو ہوتا ہے اس کے لئے تو میں اور آپ جواب دہ ہیں مگر سیاست والوں کا کیا دھرا بھی ہمیں بھگتنا پڑتا ہے۔ ادیبوں نے ادب کو بے توقیر کیا ہے۔ سیاست والوں نے ملک کو بے توقیر کیا۔ اداروں کی حرمت لیر لیر کر دی گئی ہے صرف ایک ادارہ فوج کا بچا ہے۔ اللہ تعالیٰ پاکستان اور اس ادارے کو قائم رکھے جس پر اس ملک کی ساکھ قائم ہے۔ آمین!

''تخلیق'' نے اپنی سابقہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس سال کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ''تخلیق ایوارڈ 2016ء'' محترم مسعود اشعر صاحب کو دینے کا فیصلہ کیا ہے جو انہیں اظہر جاوید کی چھٹی برسی فروری 2016ء میں پیش کیا جائے گا۔ محترم مسعود اشعر کو ادارہ ''تخلیق'' اور تمام ادبی برادری کی جانب سے ''تخلیق ایوارڈ 2016ء'' مبارک!

وفیات اور علیل : محترم اقبال بیمار علیل ہیں۔ علالت کے باعث اپنے سفرنامہ ''سورج کے رخ پر'' کی اقساط ارسال نہیں کر سکے اس شمارے میں ان کا سفرنامہ شامل نہیں ہے۔ تمام احباب اقبال بیمار، محمد غلام نبی اعوان اور ظفر اقبال پچھلے دنوں آپریشن کروا کر فارغ ہوئے ہیں اور اب صحت یاب ہیں ان تمام و دیگر احباب کے لیے دعا کریں جو بیمار ہیں اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔

پچھلے دنوں یادِ رفتگاں (پروفیسر) اطہر ناسک، کشمیری لال ذاکر بھارت کے مشہور ادیب جنہوں نے اردو کے فروغ کے لیے اہم کردار ادا کیا اور اسلم کولسری جیسے عظیم شاعر جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

اطلاع عام

قارئین کی پر زور فرمائش پر رسالہ ''تخلیق'' کو فیس بک پر پیش کرنے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ اب آپ فیس بک پر ماہنامہ ''تخلیق'' پیج (Monthly "Takhleeq" Page) کو Link کر کے ''تخلیق'' کے ہر شمارے کے حوالے سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی پسند کی تحریریں download کر سکتے ہیں۔

حمد

خود بخود دنیا و مافیہا سے بے گانی ہوئی
ملنے کو مجھ کو تری توفیق ارزانی ہوئی

دیکھنے میں ایک دنیا دار ہوں سیدھا بھلا
چلتے پھرتے کیفیت ہے جو روحانی ہوئی

رہ گیا تھا مجھ کے تیری خامشی کے وہم سے
فرصت شرمندگی سے عقل نورانی ہوئی

بے طلب کیا کچھ دیا گستاخیوں کے باوجود
مہربانی پر تری کتنی پشیمانی ہوئی

مضطرب تھا بہت میں تیرے فضل کا امیدوار
تیری بے پایاں کرم کی جو جھلانی ہوئی

تو مگر ہر مرحلہ صرف نظر کرتا رہا...
زندگی بھر مجھ سے جو نادانی ہوئی

تیرے ذکر و افکار سے آگے نہیں لکھا قلم
کچھ نہ سوجھا جز ترے تحریر طولانی ہوئی

سرخوشی تھا میں سر ہوا اطمینان سے
میرے اطمینان پر اوروں کو حیرانی ہوئی

اترتے اترتے جو خوشی مجھ سے عاشق نے کچھ کیا
منکشف بے ساختہ علم سلیمانی ہوئی

تیری آغوش کشادہ کی پنہ میں آ گیا
جب بھی ہلا کا وقت میری مسلمانی ہوئی

بے تولی جو آس میری ٹوٹنے والی تھی
تیری رحمت کی حقیقت دل نے تب پہچانی ہوئی

خالد اقبال یاسر

○○○

نعت

انھیںؐ نے کر دیں بدل ہیں بہار رخ دو عالم کی

ہم ان کی خاک پا کو بھی عروج آسماں سمجھے
کہ عظمت سے کیا ان کی رفعت سے امکاں سمجھے

بلا لیتے ہیں جب صل علیٰ پڑھتے ہیں آقاؐ پر
یہاں ان کا ہے انس کا دل وہی ان کی زباں سمجھے

دلا ہے بھی ہوا ہے خفا کوئی ان کے سوالوں سے
کوئی حرف کہے ان کو کوئی حرف نہاں سمجھے

دعائیں ہو رہی ہیں مستجاب اللہ کے در پر
گھڑیاں تھیں کوئی آقا کو اپنا ترجماں سمجھے

یہ تسخیر فلک، رفتار عالم، وقت کا ٹھہراؤ
ہم اپنی کم نگاہی سے انھیںؐ کیونکر کہاں سمجھے

انھیںؐ نے کر دیں بدل ہیں بہار رخ دو عالم کی
انھیںؐ کو کارواں سمجھے امیر کارواں سمجھے

انھیںؐ کے فیض سے روشن ہوا امکان ہستی کا
انھیںؐ کا نام راحت حاصل عمر رواں سمجھے

امین راحت چغتائی

○○○

نعت

کیسی حسین آج مدینے کی رات ہے
گویا کہ آج جشن منانے کی رات ہے

آئے ہیں وہ جو آپ کے کرنے کو ہم سلام
جو کچھ ہے اپنے دل میں سنانے کی رات ہے

اپنے غموں کو ہم نے چھپایا ہے ہر گھڑی
سب کچھ نہیں پہ آج بتانے کی رات ہے

ہوتی ہیں سب دعائیں مدینے میں اب قبول
روضے پہ ان کے اشک بہانے کی رات ہے

قسمت مدینے لائی ہے ہے فکر کا مقام
سیفی چراغ گھر میں جلانے کی رات ہے

سیفی سرونجی (انڈیا)

○○○

تعارف نامہ

عذرا اصغر

ادارہ "تخلیق"

ذاتی کوائف

1- پیدائشی نام : مبارک شاہی بیگم (دادی نے رکھا تھا چونکہ والد کو اس موقع پر سرکاری ترقی ملی تھی) 2- اصل نام : عذرا مبارک
3- شادی کے بعد : عذرا اصغر اسی ادبی نام سے معروف ہیں 4- پیدائش و مقام پیدائش : 22 دسمبر، محلہ جوش قاضی، دہلی (بھارت)
5- تعلیم : بی اے آنرز

پہلی کہانی جو شائع ہوئی

فروری 1962ء، پندرہ روزہ "نیا پیام" لاہور۔

ناول : (1) "دل کے رشتے" بار اول 1970ء، نسیم بک ڈپو، انار کلی، لاہور۔ "دل کے رشتے" بار دوم 1990ء، مقبول اکیڈمی، اردو بازار، لاہور۔ (2) "مسافتوں کی تھکن" 2007ء، عزیز پبلشرز، اردو بازار، لاہور۔

افسانوی مجموعے :

1- "پت جھڑ کا آخری پتہ" بار اول 1980ء، عزیز پبلشرز، اردو بازار، لاہور۔ "پت جھڑ کا آخری پتہ" بار دوم 1989ء، مقبول اکیڈمی، اردو بازار، لاہور۔ 2- "بیسویں صدی کی لڑکی" 1989ء، مقبول اکیڈمی، اردو بازار، لاہور۔ 3- تنہا برگد کا دکھ 1990ء، مقبول اکیڈمی، اردو بازار، لاہور۔ 4- "کھلا سمندر" 1990ء، تجدید اشاعت گھر، لاہور۔ 5- "یادوں کے طاق پر رکھی کہانیاں" 2012ء، دستاویز، لاہور۔ 6- "کوزہ گری میں بیتا وقت" 2014ء، دستاویز، لاہور۔

تصانیف

یادنگاری : "تیری آنکھوں کے ساتھ میں" مئی 2011ء، تجدید اشاعت گھر، لاہور۔ **تالیف** : "مشرق و مغرب کے سیاسی افکار" 1986ء، عزیز پبلشرز، اردو بازار، لاہور۔ ڈرامے : ریڈیو پاکستان لاہور سے جشن تمثیل میں نشر ہوا، اول انعام یافتہ۔ 1983ء۔ ریڈیو پاکستان راولپنڈی سے جشن تمثیل میں دو معروف ڈرامے نشر ہوئے، اول انعام یافتہ۔ 1996ء۔ پی ٹی وی کے لئے افسانہ "ہیڈ کوارٹر" کو ڈرامائی تشکیل دی گئی۔ ان پانچوں ڈرامائی تشکیل مستنصر حسین تارڑ نے دی۔

متفرقات

اردو افسانے، پنجابی افسانے، بچوں کے لئے کہانیاں، فرخندہ لودھی کے پنجابی افسانوں کے اردو تراجم کئے، انشائیے، رفقا کے مضامین، شخصی و تنقیدی تبصرے، مذہبی مضامین، تلخیصیں، ہائیکو اور ماہیے لکھے جو مختلف ادبی جرائد میں شائع ہوتے اور ہو رہے ہیں۔

کالم نگاری

روزنامہ امروز، روزنامہ مشرق، روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ تیز، لاہور، روزنامہ اوصاف، اسلام آباد، ہفت روزہ تکبیر، راولپنڈی، ہفت روزہ آئینہ حضرو، ہفت روزہ وائس آف اٹک (اسلام آباد)، ہفت روزہ تعمیر اٹک، حضرو، ریڈیو پاکستان اسلام آباد اور روزنامہ مغربی پاکستان میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بچوں کے لئے کہانیاں لکھیں خصوصاً پھولوں کے لئے جو کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہیں۔

عذرا اصغر فن و شخصیت کے حوالے سے ہونے والا کام

1- افسانوں کے کئی کہانی پنجابی اور سندھی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ جامعہ یونیورسٹی کے نصاب میں بھی شامل ہیں۔ 2- فن و شخصیت پر ایم۔ اے اردو کا مقالہ نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد، مقالہ نگار طالب انجم تمیمی۔ 3- تجدید نو کا توضیحی اشاریہ جولائی 1980 تا نومبر 1997 نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد، مقالہ ایم۔ اے اردو، طالبہ ثمینہ مریم۔ 4- عذرا اصغر، شخصیت و فن، مقالہ برائے ایم اے (اردو)، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور، مقالہ نگار، ماہ وش محبوب۔ 5- بہت سے معروف ناقدین کے تحریر کئی شخصی اور تنقیدی مضامین، انٹرویو۔ 6- گوشہ عذرا اصغر نیشنل آرکائیوز پاکستان اسلام آباد، گوشہ عذرا اصغر، سہ ماہی "نوادر" لاہور۔ 7- بحیثیت مدیر: ماہنامہ "نور وعلم" لاہور 1970 تا 1971ء۔ ماہنامہ "تخلیق" لاہور 1972 تا 1985ء۔ اعزازی مدیر ماہنامہ تجدید نو 1980 تا 2002ء۔ سہ ماہی تجدید نو 2006ء تا حال۔ 8- صدر بزم تجدید، اسلام آباد، لاہور، کراچی۔

زیر طبع تصانیف

فن و شخصیت (ڈاکٹر آغا سہیل)۔ اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔

◆◆◆

صلائے عام

ادارہ "تخلیق" کے مصنفین کے بورڈ نے 2016ء کا "تخلیق ایوارڈ" ادبی دنیا کی معروف شخصیت محترمہ عذرا اصغر کو دینے کا اعلان کیا ہے۔ ایوارڈ کی تقریب اظہر جاوید بانی رسالہ "تخلیق" کی پانچویں برسی فروری 2016ء کو منعقد ہوگی (انشاءاللہ) اس تقریب میں شرکت کی صلائے عام ہے۔ (مقام، تاریخ اور وقت کا اعلان بعد میں کیا جائے گا) درخواست ہے کہ اظہر جاوید اور انور سدید کے ایصالِ ثواب کے لئے کلام مجید کا ایک رکوع ضرور تلاوت کر دیجئے۔ دعائے مغفرت تقریب میں ہوگی۔ (ادارہ "تخلیق")

فن اور ادب

ایک دلآویز شخصیت۔ ایک خوبصورت اور منفرد افسانہ نگار و ناول نگار

عذرا اصغر

سلمیٰ اعوان

کچھ لوگ لکھنے لکھانے کا فن پالنے سے ہی لے کر دنیا میں آتے ہیں۔ عذرا اصغر بھی شاید انہی لوگوں میں سے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کا یہ شوق، کاغذ قلم سے ان کی لگن ان کے بچپنے شوقوں کی طرح اماں کی نظروں میں آ گیا ہوگا۔ انہوں نے روایتی ماں کی طرح شادی کا جھنڈا دیتے ہوئے یقیناً کہیں کہہ دیا ہوگا کہ بس گھر داری سیکھو، لکھنا وغیرہ یہ کام اپنے گھر جا کر کرنا۔ عذرا کو سیر سپاٹوں کا بھی بہت شوق تھا۔ اس کے بچپن کا یہ شوق دوسرے شہروں یا اپنے ہی شہر کے ذرا دور کے کونوں میں رہنے والے بس چچا ماموں اور خالاؤں کے گھروں تک ہی محدود تھا کہ جہاں جانے کے لئے بس گاڑی، تانگہ یا بگھی تک کے سفر کی ہی چھٹی ملتی تھی۔ یہ اماں نے اس پر بھی پابندی لگا دی تھی۔

یہاں عذرا کی ایک تحریر پیش خدمت ہے۔

شادی سے پہلے مجھے واقعی سیر کا بہت شوق تھا مگر موقع نہیں ملتا تھا۔ اماں نے سارے میرے شوق میری شادی تک کے لئے اٹھا رکھے تھے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ مجھے شادی کا چکمہ دیا ہوا تھا۔ مجھے نہ زیور پہننے کا شوق تھا اور نہ لش لش کرتے کپڑوں کا کہ میں شادی کے تصور سے خوش ہوتی۔ لیکن آدھی عمر کے اپنے سیر کے شوق کو ملتوی کر دیا تھا۔ سیر کو ہی نہیں میں اپنی افسانہ نگاری کو بھی وقت کے انتظار میں اٹھا رکھی تھی۔

اور اماں نے شاید اسی لئے ڈولی میں بٹھانے کی بھی جلدی کی۔ اور وہ بھی شاید اسی انتظار میں تھی کہ وہ کب پیا گھر آئے اور کب کاغذ قلم سے رشتہ جوڑے۔ شوہر بھی تخلیقی ذہن کا مالک تھا اور ساتھ ہی ظرف والا بھی تھا۔ کہیں جان گیا کہ خوبصورت بیوی لکھنے لکھانے کی شوقین ہے تو اصرار کیا کہ لکھو۔ اور یہ اصرار اور حوصلہ افزائی عمر بھر ساتھ چلی۔ یوں تو بیس سال کی عمر سے جو رشتہ کاغذ قلم سے جڑا وہ آج تک قائم ہے اس میں کہیں مختصر سے وقت کے لئے تھوڑا بہت تعطل آیا ہو تو اور بات ہے۔ ورنہ کھانے پینے کی طرح یہ سلسلہ اس کی زیست کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔

عذرا کا تعلق ادبی و علمی گھرانے سے رہا۔ ان کی فکری تربیت میں اس ماحول نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی لئے ان کی ابتدائی افسانہ نگاری نے فوراً اپنے وقت کے قابل ذکر ادبی پرچوں میں جگہ پانی شروع کر دی تھی۔

پہلا افسانہ فروری 1962ء کے لگ بھگ لکھا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جسے آج کے تناظر میں پاکستان کا بہترین زمانہ کہا جا سکتا تھا۔

امن و سکون والا، محبت و پیار والا۔ اس کے دونوں بازو سلامت تھے اور دونوں میں ابھی نفرتوں کی آگ اس حد تک نہ بھڑکی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو جلانا شروع کر دیتے۔ کم عمری کے باوجود عذرا کے ہاں تصوراتی کہانیاں گھڑنے کا ڈھب تخلیقی نہ تھا جیسا کہ اس عمر کی اکثر نوخیز لکھاری لڑکیوں کا چلن ہوتا ہے کہ وہ خیالی دنیا کے ایسے ایسے معرکۃ الآرا افسانے اور ناول گھڑ لیتی ہیں کہ بندہ حیرت سے سوال کرتا ہے یہ کن کرداروں اور کس ماحول کا ذکر کرتی ہیں؟ ایسا کہاں ہوتا ہے؟ ایسے لوگ کہاں ہیں اور یہ کون سی دنیا ہے؟ عذرا کے اس دور کے افسانے سماجی اور معاشرتی مسائل کے عکاس تھے۔ عذرا کو اپنے گردوپیش کی دنیا میں جو نظر آتا تھا، معاشرے کی کجیاں، اس کے داغ دھبے، اس کے ظلم و ستم، انسانی رویے، ان میں تخلیقی لہر تھی، کدورتیں، منافقتیں اور دوغلے پن، کہیں کہیں ظرف کے اعلیٰ معیار اور اظہار یہ سب سادہ اور موثر بہنے والی زبان میں واحد متکلم اور کہیں صیغہ غائب میں کہانیوں کی صورت منظر عام پر آئے۔ یہ افسانے یہ کہانیاں اپنی ہیئت کے اعتبار سے بھی بڑی مضبوط لکھی گئیں۔

عذرا کے افسانے اپنے ارد گرد کے ماحول کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنی تہذیبی روایات کی بھی عکاسی کرتے ہیں کہ کہانی کی بنت میں جو رنگ اور سوز وہ استعمال کرتی تھی اس کا تانا بانا وہ اپنے ورثے سے اٹھاتی تھیں۔ اس دور کے پاکستان کے تقریباً کثیر الجہات معاشرے کے کردار جو پاکستان کے مختلف علاقوں سے اٹھ کر بڑے شہروں میں روزگار کے لئے آ گئے تھے۔ ان مختلف طبقات کے گونا گوں مسائل کا ادراک جیسے عذرا اصغر کی آنکھ نے دیکھا اور محسوس کیا وہ یقیناً قابل تعریف تھا۔ اس کے تیز مشاہدے اور باریک بین آنکھ کہیں مختصر اور کہیں طویل افسانوں کی صورت اپنے قارئین سے بے پناہ داد سمیٹتی رہی۔ عذرا کے افسانوں کا دوسرا دور 1965 اور 1971 کی پاک بھارت جنگوں جہاں وطنیت کی خوشبو، حب الوطنی کی مہک، فوج کی جانبازی، اپنے لوگوں کے بے مثل جذبوں، پاکستان کے دولخت ہونے، اردو بولنے والے لوگوں کی دوسری بار دربدری جیسے موضوعات پر تخلیقی سرگرمی کا محرک بنے۔ پیپلز پارٹی کے برسراقتدار آنے، مارشل لاء لگنے اور آمریت کا زمانہ جس کا مزاحمتی ادب متقاضی تھا کہ پاکستانی تاریخ یا اس ملک کی تاریخ کا وہ بدترین ضیائی دور جب افغان روس جنگ کا غلغلہ مچا۔ جب ایک نئے کلچر نے اس دھرتی پر قدم رکھا۔ جو بندوق، کلاشنکوف، تشدد اور خون کے آمیزے سے گندھا ہوا تھا۔ ادب کی اس مزاحمتی جنگ میں عذرا اصغر نے اپنا حصہ ڈالا اور سرخرو ہوئیں۔

عذرا جب لاہور تھیں تو نہ صرف تخلیق جیسے پرچے کی ایڈیٹری کرتی تھیں بلکہ لاہور کی ادبی محفلوں کی روح رواں بھی تھیں۔ اردو ادب کی معروف مصنفہ سائرہ ہاشمی کی بزم ہم نفساں کی بھی بہت فعال رکن تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ مشرقی پاکستان پر لکھی جانے والی اپنی کتاب "تنہا" کی تقریب رونمائی میں شرکت کے لئے میں اظہر جاوید اور عذرا اصغر کو مدعو کرنے ان کے دفتر گئی تو تخلیق کا دفتر جو ان دنوں داتا دربار کے آس پاس کسی دو منزلہ عمارت کے کسی کمرے میں ہوتا تھا وہ اور شہناز الگ الگ میزوں پر بیٹھی کام میں مصروف تھیں۔ اشاعت کے لئے آنے والے ڈھیروں ڈھیر مواد میں سے بہترین کو منتخب کرنا خاصا مشکل اور محنت طلب کام ہوتا ہے کہ ادیب اور شاعر لوگ بڑے حساس ہوتے ہیں۔ لکھی ہوئی ہر اچھی بری چیز کو چاہتے ہیں کہ فوراً چھپ جانا چاہیے۔ ایسے میں ان کی ناراضگی مول لینا اور انہیں مطمئن کرنا عذرا اصغر جیسی ہنس مکھ اور بردبار شخصیت کے لئے بھی خاصا کٹھن ہوتا۔ تاہم نرم سے لہجے میں دوٹوک بات کرنے والی عذرا نے ہمیشہ اپنا احترام ملحوظ رکھوایا اور ادبی حلقوں میں بڑی محترم ٹھہریں۔ جب اسلام آباد اصغر مہدی کا تبادلہ ہوا تو تخلیق والا تجربہ بڑا کام آیا۔ انہوں نے ذاتی پرچہ تجدید نو کے نام سے نکالا۔

تجریدؔ کو مرتب کرنے میں وہ بالکل آزاد اور اپنی مرضی کی مالک تھیں۔ شب طراز جیسی ذہین شاعرہ اور آرٹسٹ بیٹی کی معاونت کے ساتھ ساتھ انہیں اپنے داماد شاہد سلیم عباس کا بھرپور تعاون اور معاونت بھی حاصل تھی۔ شاید اسی لیے تجریدؔ کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کا رنگ ڈھنگ بڑا الگ اور منفرد تھا۔ مقامی زبانوں کی اہمیت سے عذرا صاحبہ زبان ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی اقدار سے بھی آگاہ تھیں۔ پردیس میں انہیں مامتا سے محروم کرنے کی کاوش نے ان کے بارے ایک لبرل اور متوازن شخصیت والی ہستی کا تصور اجاگر کیا۔ اسلام آباد کی ادبی زندگی میں بھی عذرا بہت فعال رہیں۔

"دل کے رشتے"، "مسافتوں کی تھکن" اور "شجر بے سایہ" تین ناولوں کے علاوہ عذرا کے چار افسانوی مجموعے ہیں۔ یہ "پت جھڑ کا آخری پتہ"، "بیسویں صدی کی لڑکی"، "تنہا برگد کا دکھ"، "کھلا آسمان"، "کھڑکی میں بیٹھا وقت" اور "یادوں کے طاق میں رکھی کہانیاں"۔

عذرا کی کہانیوں کی طرح ان کے مجموعوں کے نام بھی بڑے انوکھے اور بڑے منفرد سے ہیں۔ چند لمحوں کے لئے قاری کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسے یک گونہ ادبیت کا احساس دلاتے ہیں۔

تیری آنکھوں کے ساتھ.........میں۔

عذرا اصغر کا یہ وہ شاہکار نثر پارہ ہے جس میں ادب کی کئی صنفوں کی نمائندگی ہوئی ہے۔ کہہ لیجئے یہ ان محسوسات کا گلدستہ ہے جو انہوں نے اپنے رفیق زندگی کی عارضی جدائی کے سلسلے میں محسوس کئے۔ عذرا اصغر کا یہ انداز ایسا موہ لینے والا ہے کہ وہ شوہر کا خط کھولتی ہے تو یادوں کے دریچے بھی ساتھ ہی کھل جاتے ہیں۔ ان یادوں کو لکھتے ہوئے وہ محسوسات کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کو جیسے بیان کرتی ہے وہ قاری کو نہ صرف اپنی گرفت میں جکڑتی ہے بلکہ ایک انوکھے سرور سے بھی آشنا کرواتی ہے۔

یہاں میں عذرا کے محسوسات اور اصغر مہدی کے خط کا چھوٹا سا حصہ پیش کرتی ہوں۔ ذرا تحریر کی دلکشی تو دیکھیے۔

گھر سے جانے والوں کو گھر اور گھر والے تو یاد آتے ہیں لیکن اتنا نہیں کہ جتنا گھر میں رہ جانے والے ان کی کمی محسوس کرتے ہیں۔ اصغر سفر میں تھے۔ ان کے لئے ہر صبح نئی تھی۔ ہر شہر نیا تھا۔ وہ تجربات سمیٹ رہے تھے۔ مشاہدات کر رہے تھے۔ اور پھر وہ جمالیاتی حسن پرست بھی ہیں۔ ہر ذی شعور انسان حسن پسند ہوتا ہے اور اصغر تو شاعر ہونے کے ناطے دو آتشہ ہوئے۔ انڈونیشیا اور اس کے ارد گرد کے قدرتی مناظر کا حسن انہیں متاثر کر رہا تھا۔ وہ ان نظاروں کو شیئر کرنا چاہتے تھے۔ لہٰذا خلاف عادت خط لکھتے تھے اور علاقوں کی منظر کشی کرتے تھے۔ یعنی "[illegible]"۔

خوبصورت تحریر کا سرور اس وقت دو آتشہ ہو جاتا ہے جب اچانک وہ بیٹری بدل کر اصغر مہدی کا خط سامنے لے آتی ہے۔ ایک نیا ماحول، نیا انداز، مزے کی بات کہ سفر اصغر مہدی کرتے ہیں، وہ بھی اپنے مختصر سے الفاظ میں ماحول کا پورا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔

اصغر مہدی کا خط:

"میرے بچوں کی ممی، دادی اور نانی صاحبہ! السلام علیکم! بنکاک میں ایک گھنٹہ قیام کے بعد ہی جہاز عازم سنگاپور ہوا لیکن سنگاپور سے دوسرا جہاز تبدیل کر کے سنگاپور ائیر لائنز کے ذریعے جکارتہ پہنچنا تھا لہٰذا سنگاپور دو ڈھائی گھنٹے قیام کرنا پڑا۔ سنگاپور پہنچتے ہی تم مجھے اور بھی یاد آئیں۔ کیوں کہ پچھلے گروپ میں تم تھیں جب تمہیں بخار آگیا تھا۔ بخار زیادہ تیز تو نہیں تھا مگر تم پر

جذباتی کیفیت طاری ہو گئی اور تم اونچے اونچے گاتی رہیں۔ وہ گانا ''جیون میں ایک بار، آنا سنگاپور'' اور اب تم نہیں آ سکے لیکن میں سنگاپور آ گیا ہوں۔ شاعر نے شاید اپنی دلی کیفیت بیان کی تھی کہ سنگاپور ایک بار تو ضرور آنا چاہیے۔ واقعی سنگاپور اسی ہی جگہ ہے۔ تیری بیوی! انشاء اللہ تمہیں بھی دکھاؤں گے سنگاپور۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے لاہور والے کہتے ہیں نا، ''جنہیں لاہور نہیں دیکھا وہ جمیا ہی نہیں'' تو جناب سنگاپور ائیرپورٹ کو مشرق بعید میں بنیادی مرکزی حیثیت حاصل ہے جو یورپ میں فرینکفرٹ کو ہے۔ اس لئے کہ یہاں سے بھی دنیا کی تمام بڑے بڑے ممالک کیلئے ہر وقت سینکڑوں پروازیں آتی جاتی رہتی ہیں اور میرے خیال کے مطابق سنگاپور ائیرپورٹ اپنی خوبصورتی اور گہما گہمی میں فرینکفرٹ سے بھی زیادہ نہیں تو کسی طور کم بھی نہیں ہے۔ اس لئے کہ دو برس پہلے امریکہ جاتے ہوئے جب مجھے فرینکفرٹ ائیرپورٹ پر چھ گھنٹے قیام کرنا پڑا تھا تو ان چھ گھنٹوں میں اس ائیرپورٹ کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا تھا۔ ایک اور بڑی اور اہم انفرادیت جو مشرق بعید کے ائیرپورٹس پر جو امریکہ یورپ کے ائیرپورٹوں سے نمایاں ہے، وہ یہ کہ یہاں جدید اسلحے سے لیس کمانڈوز کہیں دکھائی نہیں دیتے جب کہ یورپ اور امریکہ کی ائیرپورٹس پر مسلح کمانڈوز یوں مستعد نظر آتے ہیں گویا آن کی آن میں لوگوں کو بھون کے رکھ دیں گے۔

پورے سو صفحات سے بھی کم کی یہ کتاب کس قدر دلآویز ہے کہ اس کا صرف پڑھنے سے تعلق ہے۔ دراصل بہت سے دیگر مصنفین کے برخلاف جو اپنی زندگیوں پر تین چار پانچ سو سے کے صفحات کی کتاب لکھ کر بور تیس مارخاں خیال کرتے ہیں عذرا نے گویا انتہائی چابکدستی سے کام لیتے ہوئے اتنے رنگارنگ تجربات کو ان صفحات میں سمیٹ دیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ اپنی ذات، اپنے خواب اور خواہشیں، اصغر مہدی جیسے شوہر کا احوال، بچوں اور ان کے بچوں سے تعلقات کوئی بھی رشتہ ایسا نہیں جس پر روشنی پڑنے سے رہ گئی ہو۔ سچی بات ہے یہ عذرا کی فنی چابکدستی کا بہترین کمال ہے۔

دیگر فطرت اور ماحول کی عکاسی ہے تو وہیں لوگوں، ان کی عادات و اطوار کا بھی ذکر مختصراً ہے مگر یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہو۔ اسے سفرنامہ کہا جا سکتا ہے، یہ رپورتاژ کے زمرے میں آ سکتا ہے۔ اسے خطوط نویسی کا ایک خوبصورت اور منفرد انداز کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اصغر مہدی بھی کمال کے فنکار آدمی ہیں۔ اپنی شریک زندگی کو وہ کبھی اپنے بچوں کے حوالے سے مخاطب کرتے ہیں اور کہیں بچوں کے بچوں کے ناطے سے۔

عذرا کی شخصیت میں متانت اور دلآویزی ہے۔ محبت اور پیار ہے۔ خدا اسے تندرستی سے نوازے۔ وہ لاہور اور کراچی آتی جاتی رہے۔ ملتی ملاتی رہے۔ محبتیں بانٹتی رہے۔ خوبصورت تحریروں سے اپنے قارئین کو گرماتی رہے۔ (آمین)

●●●

معروف افسانہ نگار ابن عاصی کے افسانوں کا مجموعہ

''نامعلوم افراد کی معلوم کہانی'' شائع ہو گیا ہے ——— قیمت/-100 روپے

ملنے کا پتہ: مثال پبلشرز، رحیم سنٹر فیصل آباد (041-2615359)

عذرا اصغر ——— آخر وہ چاہتی کیا ہیں؟

شبہ طراز

بہت عرصے پہلے ایک ہندوستانی فلم ''زبیدہ'' دیکھی تھی جس کی کہانی کے مرکزی خیال نے مہینوں، سالوں ذہن کو جکڑے رکھا۔ جنہوں نے فلم دیکھی ہے ان کو تو معلوم ہوگا لیکن جنہوں نے نہیں دیکھی ان کے لیے پس منظر بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ فلم کا لب لباب یہ ہے کہ ایک لڑکے کو اس کی نانی نے پالا پوسا ہوتا ہے جس کی ماں اس کے بچپن میں ایک حادثے کا شکار ہو کر مر جاتی ہے۔ یہ لڑکا اپنی ماں کے ماضی کے بارے میں متجسس ہے اور ساری فلم میں وہ ایک ادھوری فلم کا رول تلاش کر رہا ہے جو تب بن رہی تھی۔ فلم فلیش بیک میں ہی چلتی ہے۔ فلم کا آخری سین ہے کہ لڑکا وہ ادھوری فلم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے اور اپنی نانی کے ساتھ بیٹھ کر وہ فلم دیکھ رہا ہے جس میں اس کی ماں پر ایک گانا فلم بند ہوا ہے۔ آخر میں وہ نانی سے پوچھتا ہے کہ ''نانی، ماں آخر چاہتی کیا تھیں۔۔۔؟'' یہ فلم کا کلائمکس ہے۔

یہاں منظر بتانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ بعض روحوں کو اللہ تعالیٰ ڈھیر ساری توانائی کے ساتھ خلق فرماتا ہے بلکہ شاید تمام روحوں کو، اور بعض انھیں اس توانائی کو مثبت انداز میں خرچ کرتے ہیں تو ان کے وجود سے سورج کی طرح کرنیں پھوٹتی ہیں جو تمام تجسس اور تمام خوبصورت زندگی کا عندیہ دیتی ہیں۔ کسی کی بھی زندگی میں وہ لمحہ اہم ہوتا ہے جس لمحے اس زندہ وجود نے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اس نے کیسی زندگی گزارنی ہے۔

سماجیات کے حوالے سے دیکھا جائے تو خصوصاً مشرقی معاشروں میں آج بھی (یہ آج بھی کم از کم ایک صدی پر محیط ہے) عورت کو بنیادی حقوق میسر نہیں جن کے حصول کی مغرب میں تو جدوجہد شروع بھی ہو چکی ہے اور بہت سارے حقوق خواتین نے حاصل بھی کر لیے ہیں، پھر ایسے میں کسی عورت کا اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کر لینا اور اس فیصلے پر قائم رہنا یقیناً ایک بڑی بات ہے۔

''عذرا اصغر'' ایک ایسی ہی باہمت، پرعزم اور توانا خاتون کا نام ہے جس نے بہت بچپن میں اپنے مستقبل کا خاکہ تیار کر لیا تھا۔ انھیں کہانیاں پڑھنے اور کہانیاں لکھنے کا بچپن سے شوق تھا۔ اپنے خاندانی مسائل کی وجہ سے وہ تعلیم حاصل نہ کر سکیں جس کا انھوں نے خواب دیکھا تھا لیکن سکول کے زمانے میں ہی پڑھنے اور چھپ چھپ کر لکھنے میں وہ کامیاب ہو چکی تھیں اور بڑے ہونے تک وہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ انھوں نے ایک لکھاری ہی بننا ہے۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ اور رقابت، بے دلی، خوشیاں اور غم، قسمت کی سختیاں اور مہربانیاں جھیلتے جھیلتے یہ نام قد آور ہوتا گیا۔ اس جرأت مند خاتون نے حالات کے سامنے کبھی ہتھیار نہیں ڈالے، نامساعد حالات سے بھی گھبرائی نہیں، قلم کا ساتھ نہیں چھوڑا، افسانے لکھے، ناول لکھے، کالم لکھے، ریڈیو پر کالم پڑھے، کئی جریدوں کی مدیرہ رہیں، زیادہ تر نیک نامیاں کمائیں، دشمنوں کے وار بھی سہتی رہیں اور اپنے گھر کی بنیادوں کو بھی مستحکم رکھا۔ یہی ساری باتیں ان کی کامیابی کی دلیل بھی ہیں اور ان کی خوشگوار زندگی کی دلیل بھی۔

میں کوئی نقاد نہیں کہ ان کے فن کی گہرائیوں اور گیرائیوں میں جا کر ان رموز کا جائزہ لوں جن پر خود میں بھی عبور نہیں رکھتی۔ لیکن ایک قاری کے طور پر جائزہ لوں تو مجھے زبان و بیان کی قدرت، کہانی پر گرفت، اعلیٰ اسلوب، ندرت و تازگی اور حالات حاضرہ پر نظر جیسی تمام خوبیاں ان کے افسانوں میں نظر آتی ہیں۔ چھ افسانوی مجموعوں کی مصنفہ ہونے کے ناطے ان کا قلم اب اوج مہارت کے اس مقام پر ہے جہاں ''ایک خیال، ایک جملہ، ایک منظر، ایک خواب یا ایک امید کو افسانے میں ڈھال دیتا ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے افسانوں سے زیادہ کہانیاں لکھیں۔ معاشرتی سنگدلی کی کہانیاں، معاشی مجبوریوں پر مبنی، گھریلو جھگڑوں پر منحصر، خانگی مسائل پر موقوف اور ان تمام عنوانات کے تحت لکھی جانے والی کہانیوں میں کردار سازی پر بھرپور توجہ مرکوز رکھی۔ یہ کردار زندگی برتتے ہوئے وہ عام کردار ہیں جو ایک معاشرہ تشکیل کرتے ہیں۔ یہ کردار آپ کو گھروں میں، دفتروں میں، پارکوں میں، کیفے ٹیریا میں، تعلیمی اداروں میں، فٹ پاتھوں پر جا بجا بکھرے نظر آتے ہیں۔ عورتوں کے پاس وہ Exposure نہیں ہوتا جو مرد کو حاصل ہے لیکن مشاہدے کی قوت یقیناً مرد سے زیادہ ہے اسی لئے زندگی کے کرداروں میں رنگ بھرنے کا فن اس کو مردوں پر فوقیت دلاتا ہے۔ جتنا حساس دل عورت کے پاس ہے اور تخیل کی جو اڑان وہ بھر سکتی ہے، مرد اس سے قاصر ہے مرد روزمرہ زندگی سے براہ راست نبرد آزما ہوتا ہے اور براہ راست بیان کر دیتا ہے لیکن احساس کے جس راستے سے گزر کر کسی عورت کا قلم منظر کشی کرتا ہے تو تحریر دلوں پر نقش کر دیتا ہے۔

عذرا اصغر کے بہت سے افسانوں نے ملکی اور غیر ملکی سطح پر مقبولیت پائی۔ مجھے ان کے جن افسانوں میں طاقت، جمود اور عالم گیریت محسوس ہوتی ہے ان میں ''عکس چھپے'' ''کفن کے ٹکڑے''، بارود کی بو، گدلا سمندر، تنہا، گدھ کا دکھ، پہلا پتھر، نیند، عرفان ذات کا مسافر، عافیت کی سرزمین اور نیا پاکستان شامل ہیں۔ ان کا پہلا ناول خالصتاً معاشرتی اور تجسّس نسوانی ذوق کا حامل ہے لیکن دوسرا ناول ''مسافتوں کی تھکن'' سماجی ہونے کے باوجود نہایت اہم بحثوں کو جنم دیتا ہے۔ کرداروں کی علمی گفتگو محض باہمی گفتگو نہیں بلکہ اعلیٰ نظریاتی فلسفوں کی گرہوں کو سلجھاتی ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ناقدوں کو ابھی تک یہ ناول کیوں نظر نہیں آیا تو اس کا آسان ترین جواب یہی ہو سکتا ہے کہ ایک تو ہمارے کرپٹ ترین ملک کے کرپٹ ترین اداروں سے انصاف اور میرٹ کی توقع ہی عبث ہے۔ جس ملک میں کمزور سے کمزور ایوارڈ بھی سفارش سے دیے جاتے ہوں، پی ڈی جیکل، ادبی و غیر ادبی تنظیمیں سب ذاتی تعلقات کی مرہون منت ہوں اور مفاد محض دولت سے مشروط ہو جائے تو وہ قوم اور ملک زوال و انحطاط کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے اور ہم آج اسی زوال سے، اور روی اور کرپشن کے دور سے دو چار ہیں دوسری اہم وجہ عذرا اصغر میں ''چاپلوسی'' اور ''جی حضوری'' کا فقدان ہے۔ چونکہ انہیں ادب سے حقیقی معنوں میں پیار تھا اور پیار ہے اور یہی پیار انہوں نے نوروز اور تخلیق جیسے رسالوں کی مدیرہ کر اور 23 قیمتی سال اپنے ذاتی جریدے ''تجدید نو'' کی آبیاری کر کے ثابت بھی کیا ہے۔ لیکن کسی کی چاپلوسی نہیں کی، کسی سے مالی فائدے کی امید نہیں رکھی، کسی کے سامنے دست سوال دراز نہیں کیا۔ شاید اسی لئے نقادوں کو بھی ان کی پذیرائی کرنا چاہیے تھی وہ نہیں کی گئی۔ ان کی کمٹمنٹ ادب سے رہی ادیب سے نہیں اس لئے آج بھی ان سے پیار کرنے والوں کی تعداد زیادہ بھی ہے اور مستحکم بھی ہے۔

میرے خیال میں انسانوں سے وعدہ لینے والا رب داہنے ہاتھ میں تحریروں کا پلڑا دیکھے گا تو سب سے زیادہ خوش ادیب طبقوں سے ہو گا۔ اور پھر اگر ادیب کا اعمال نامہ اور زندگی گزارنے کا ڈھب درست نہیں ہو گا تو شاید جنت کے وہ دروازے کھول دیے جائیں گے جہاں

سے بہترین انسانوں نے داخل ہونا ہوگا۔ اور یقیناً ایک محبوتن اور ایماندار لکھنے والے کے لئے یہی سب سے بڑا انعام ہوگا۔

زندگی کے ماشاء اللہ ستر کے لگ بھگ سالوں کو دیکھتے ہوئے آخر میں یہی ہوئے کہ وہ جیسے عذرا اصغر کے ماضی میں جھانکوں تو یہی سوال کرتی ہوں کہ "ماں آخر جاتی کیا تھیں ..." اور اس کا جواب بھی میرے پاس ہی ہے کہ ایک بے چین روح کے پاس توانائی کا ڈھیر ہو اور وہ اسے صرف کرنا چاہے تو اس توانائی سے معاشرتی برائیوں کا ایٹم بم بھی بن سکتا ہے لیکن اگر اسی توانائی کو مثبت انداز میں استعمال کیا جائے جیسا کہ عذرا اصغر نے کیا تو سورج کی طرح روشنی کی کرنیں بکھیری جا سکتی ہیں جو زندگی کی نمو کا موجب ہوتی ہیں۔ تخیل کے رنگوں کی پھلجھڑیاں چھوڑی جا سکتی ہیں جو انسانی فکر کو مہمیز کر دیں۔ حرفوں کے چراغ جلائے جا سکتے ہیں جو زندگی کے کرداروں کی رہ گزاروں کو حیات بخش دیں اور ایسے نقش ثابت کریں جن پر چلنے والے حرف کی حرمت کے قائل ہوں محض دولت پرستی اور اقربا پروری پر یقین نہ رکھتے ہوں۔ اسی لئے "زبیدہ" بن کر انہوں نے متعین راستہ چلنے کے بجائے "عذرا اصغر" بن کر ہمارے راستوں میں فکر کے آئینے نصب کر دیے ہیں۔ یہی ان کی کامیابی اور ان کے نقش قدم پر چلنے والوں کی خوش قسمتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کو صحت مند اور طویل زندگی عطا فرمائے اور ان کے قلم کی تحریروں کو ابدیت سے نوازے اور ان کے فکری موتیوں کو ہماری نسلوں میں قائم و دائم رکھے۔ آمین۔

◆◆◆

"تخلیق" مندرجہ ذیل لائبریریوں میں بھی دستیاب ہے

لاہور	قائداعظم لائبریری	چیف لائبریرین: رانا اختر علی (042-99203371) باغ جناح شاہراہ قائداعظم، لاہور
لاہور	پنجاب یونیورسٹی لائبریری	چیف لائبریرین: حبیب پراچہ (042-99231126) پنجاب یونیورسٹی، قائداعظم کیمپس، لاہور
لاہور	پنجاب پبلک لائبریری	چیف لائبریرین (042-9921649) متصل لاہور میوزیم، شاہراہ قائداعظم، لاہور
لاہور	پریس کلب لائبریری	چیف لائبریرین: محمد اویس (042-36363316) پریس کلب، شملہ پہاڑی، لاہور
لاہور	کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی لائبریری	چیف لائبریرین: اظہر اقبال (042-99211145) کنگ ایڈورڈ میڈیکل یونیورسٹی، میو ہسپتال روڈ، نیلا گنبد، لاہور

مضامین

شہزاد احمد — ایک شاعر ایک دانشور

ڈاکٹر انور سدید

جولائی کے مہینے میں قائد اعظم لائبریری لاہور کے مجلہ "مخزن" کی ایک مجلس مشاورت میں شہزاد احمد کو دیکھا تو ان کے چہرے پر وہ تازگی نظر نہ آئی جو ستر کی دہائی ختم کر لینے کے باوجود ان کے چہرے پر گل نو دمیدہ کی طرح ہمیشہ کھلی رہتی تھی۔ مجھے علم تھا کہ عارضہ قلب کے ایک حملے میں وہ کئی دن ہسپتال میں داخل رہ چکے تھے اور اب بھی وہ امراض قلب کے متعدد ڈاکٹروں کی نگہداشت میں تھے لیکن انہیں دیکھ کر اطمینان ہوا کہ "مخزن" کے مدیر کی حیثیت میں وہ ہر مضمون پر اپنی تیکھی بے لاگ رائے دے رہے تھے۔ مزید یہ بھی بتایا گیا کہ وہ مجلس ترقی ادب لاہور میں حاضر ہو کر اپنے فرائض منصبی خوش اسلوبی سے ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے ڈاکٹر جمیل جالبی کی "تاریخ ادب اردو" کی چوتھی جلد جو 1626 صفحات پر مشتمل ہے اور میرزا اسداللہ خان غالب سے داغ دہلوی اور اسمٰعیل میرٹھی تک اہم شعرا کا تاریخی احاطہ کرتی ہے، چھاپ کر مجلس ترقی ادب میں اپنے دورِ نظامت کو منور کر دیا تھا۔ جناب احمد ندیم قاسمی کی 10 جولائی 2006 کو وفات کے بعد وہ اس ادارے کے ناظم مقرر ہوئے تھے۔ پھر 17 اکتوبر 2009 کو ڈاکٹر وحید قریشی بھی اس دنیا سے رحلت فرما گئے تو رسالہ "مخزن" کی ادارت بھی شہزاد احمد کو تفویض کی گئی تھی اور وہ اس فریضے کو بھی بڑی ذمہ داری سے انجام دے رہے تھے۔ "مخزن" کا 23 واں شمارہ مجھے کم اگست 2010 کی صبح کو ڈاک سے ملا تھا۔ اس کے اداریے میں انہوں نے "ادب کی ضرورت" کا سوال اٹھایا تو یہ حقیقت بھی بیان کر دی کہ "سائنس، فلسفہ اور مذہب روایتی علوم ابھی تک انہیں سوالوں تک محدود ہیں جو ہمارے بزرگوں نے اٹھائے تھے۔" نئی سائنسی ایجادات اور دنیا کی تیز اور شدید تبدیلی کا آشنا ہونے اور اپنی کتابوں میں مغرب کے جدید مفکرین سے مباحثہ کرنے کے باوجود شہزاد نے ادب کی بے کراں وسعتوں کا احساس دلایا اور لکھا:

> "سائنس کے جتنے بھی علوم ہیں، سب کی حدود متعین ہیں، جن سے وہ باہر نہیں نکلتے۔ لہٰذا جب آپ ایک سائنس کے اندر داخل ہو جائیں تو زندگی کے کسی ایک رخ کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہی حال فلسفے اور کسی حد تک روایتی مذہب کا ہے۔ ان کے سوال متعین ہیں اور بہت حد تک ان کے جواب بھی معلوم ہیں۔"

لیکن ادب کا سوال آیا تو انہوں نے کہا:

> "ادب اپنے اردگرد حدود کو قبول نہیں کرتا۔ خاص طور پر شاعری کوئی بھی ایسا سوال اٹھا سکتی ہے اور اس کا جواب دینے کی کوشش بھی کر سکتی ہے جس کا تعلق مابعد الطبیعات سے بھی آگے کا ہو۔ لہٰذا جتنے علوم ہیں وہ سب شاعری ہی کے سوتے سے پھوٹتے ہیں۔"

انہوں نے وسعت پذیری اور گہرائی کو ادب کے بنیادی خواص میں شمار کیا اور "مخزن" کے قارئین سے وعدہ کیا کہ

''ہم ادب کی روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش جاری رکھیں گے اور جو کچھ جدید علوم نے ہمیں سکھایا ہے اس سے بھی استفادہ کریں گے۔ عین ممکن ہے کہ کوئی نیا انسانی رویہ بھی اس چشمے سے پھوٹ نکلے۔''

شہزاد احمد کے سوالات اتنے اہم تھے کہ ''مخزن'' کا یہ اداریہ پڑھنے کے بعد میں جواب تلاش کرنے کے لیے ان کتابوں میں ٹاک ٹوئیے مارنے لگا جن میں متذکرہ سوالات پر مصنفین عالم نے بحث کی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ ''مخزن'' کا یہ اداریہ سوچ کی لہر کو مہمیز کرتا ہے اور میں شہزاد احمد کی اس خوبی کو تسلیم کرتا تھا کہ وہ ادب اور دیگر علوم کے مطالعے کو ''اپ ٹو ڈیٹ'' (up to date) رکھتے تھے۔ شہزاد احمد سے یہ ملاقات غائبانہ ہی خوشگوار محسوس ہو رہی تھی کہ ٹیلی ویژن کے زیریں حصے میں چلتی ہوئی ایک پٹی میرے بیٹے نے پڑھی اور وہ وہیں سے چیخا:

''ابا جی! شہزاد احمد فوت ہو گئے۔ ٹی وی پر پٹی چل رہی ہے۔'' میرا دل دھک سے رہ گیا۔ اردو ادب ایک علمی مزاج ادیب جس کے تمام اعداد کر پاتے تھے سے محروم ہو گیا۔ ''مخزن'' کے نئے شمارے میں انہوں نے جو وعدے کیے تھے وہ سب بکھر گئے۔

شہزاد احمد بنیادی طور پر شاعر تھے۔ 14 اپریل 1932 کو امرتسر میں پیدا ہوئے جو اس دور میں لاہور کے ساتھ ایک محلے کی طرح منسلک تھا۔ دونوں شہروں کی ادبی فضا ایک جیسی تھی اور بچے پیدا ہوتے تو کتاب دوستی ان کی گھٹی میں ڈال دی جاتی۔ شہزاد احمد کو ادب کی پہلی گھٹی اپنی والدہ سے ملی جنہیں سعدی کی ''گلستاں'' زبانی یاد تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں جس کتاب نے متاثر کیا وہ محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' تھی۔ ''مہتاب داغ'' کے مطالعے نے انہیں شاعری کی طرف راغب کیا۔ ان کے بچپن کے دوست صلاح الدین ندیم نے مجھے بتایا تھا کہ وہ شہزاد کے ساتھ ''بیت بازی'' کا مقابلہ کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کو شکست دینے کے لیے جگر مراد آبادی، اصغر گونڈوی، امیر مینائی اور فانی بدایونی کے بے شمار اشعار حفظ کر رکھے تھے۔

آزادی ہند کے ساتھ پنجاب تقسیم ہو گیا تو شہزاد احمد لاہور آ گئے اور اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ فلسفہ اور نفسیات میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ پہلا ایم اے 1952 میں ''نفسیات'' میں کیا۔ انہوں نے دوسرا ایم اے 1955 میں فلسفے میں کیا اور گورنمنٹ کالج لاہور کے مشہور رسالہ ''راوی'' کی ادارت بھی کی۔ اسی دور میں ہی تھل کا ترقیاتی ادارہ ٹی ڈی اے قائم ہوا تو شہزاد احمد کو پہلی سرکاری ملازمت ملی اور وہ اس ادارے میں پبلک ریلیشنز افسر مقرر ہو گئے۔ اب انہیں لاہور چھوڑ کر خوشاب کے نزدیک نو آباد شہر جوہر آباد میں قیام کرنا پڑا۔ جہاں ادبی ذوق کی تسکین کے لیے انہیں کلاسیکی غزل کے معروف شاعر جوہر نظامی کے ساتھ مجلس آرائی کا موقع ملتا رہا۔ ہفتے کے اختتام پر چھٹی کا دن آتا تو سرگودھا آ جاتے جہاں ان کی مجلس ڈاکٹر وزیر آغا سے رہتی جو جدید نظم میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے۔ اس دوران شہزاد احمد نے اردو غزل میں اپنے فن کو عصریت کے عناصر سے مستحکم بنایا اور وہ اس دور کے چند ایسے شعرا میں شمار کیے جانے لگے جو غزل کو نہ صرف ایرانی مرغزاروں میں سے نکال کر اپنے رنگین گرد و پیش کے مظاہر کی طرف مائل کر رہے تھے بلکہ تخلیقی سطح پر انکشاف ذات بھی کر رہے تھے۔

شہزاد احمد کی شاعری کا سفر تو ان کے بچپن سے ہی شروع ہو گیا تھا لیکن ان کی شاعری کا پہلا مجموعہ ''صدف'' 1958 میں شائع ہوا۔ پھر ان کی شاعری کی مزید سات کتابیں ——— ''جلتی بجھتی آنکھیں'' ——— ''ادھ کھلا دریچہ'' ——— ''خالی آسمان'' ——— ''بکھر جانے کی رُت'' ——— ''ٹوٹا ہوا پل'' ——— ''کون اسے جاتا دیکھے'' ——— اور ''پیشانی میں سورج'' چھپ گئیں۔ اولیں پانچ کتابوں کو ''دیوار میں دستک'' کے عنوان سے کلیات کی

صورت بھی دی گئی۔ بعد میں "پیشانی میں سورج" — "اترے مری خاک میں ستارہ" — "اندھیرا دیکھ سکتا ہے" اور "مٹی جیسے لوگ" شائع ہو کر مقبول ہوئیں — وفات کے وقت وہ پاکستان کے ممتاز ترین شاعروں میں شمار ہوتے تھے اور ان کے فن کی ترقی کا سفر جاری تھا۔ اب میں مناسب سمجھتا ہوں کہ یہاں شہزاد احمد کی غزل کے چند اشعار پیش کروں جو ان کے جوہرآباد کے قیام کی یادگار ہیں۔

کیا اسے تیز ہوا کا کوئی اندازہ نہیں — جس نے دیوار سمجھ رکھی ہے اپنی چلمن
یہ انتظار کی گھڑی، یہ چاندنی کی چبھن — تمام رات سلگتے رہے تو کیا ہو گا

اور اب "فنون" کے جدید غزل نمبر سے جو جنوری 1969 میں شائع ہوا تھا، چند اشعار جو شہزاد احمد کی شاعری کے ارتقا کا اگلا قدم ہیں۔ یہ غزلیں شہزاد احمد نے خود منتخب کی تھیں۔

ذہن کے تاریک گوشوں سے اٹھی تھی اک صدا — میں نے پوچھا "کون ہے؟" اس نے کہا کوئی نہیں
ہم جو دستک بھی دیتے تھے صبا کی مانند — آپ دروازۂ دل کھول دیا کرتے تھے

شہزاد احمد کو ابتدائی پذیرائی رسالہ "نقوش" میں 1947 میں ان کی ایک نظم کی اشاعت پر ملی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ شہزاد احمد نے اپنی نظموں کا الگ مجموعہ ترتیب نہیں دیا بلکہ ان کی غزلوں کی تیسری کتاب "ادھ کھلا دریچہ" چھپی تو اس میں ان کی نظمیں بھی شامل تھیں اور اس کتاب میں شامل ان کی اس مختصر نظم کو اس دور میں بھی بہت شہرت حاصل ہوئی تھی۔

نئی پود

اداس گلی تو ہماری پاس / آ گئی ہے اداس وادیوں میں / کھلے ہوئے سرکشیدہ پودے / ہاتھوں کو ہلا کے، کہہ رہے ہیں /
اے دور نئے وقت کے پیمبر / تھکے ہوئے پیڑ کو بتا دے / ٹوٹی ہوئی شاخ کو سنا دے / ان کہر کی وادیوں کے پیچھے /
سورج کی تمازتیں جواں ہیں / اور وقت کے قافلے رواں ہیں

غزل میں شہزاد احمد کا تجربہ یہ تھا کہ انہوں نے غزل کے کلاسیکی نظام کو مروجہ معانی میں قبول نہیں کیا اور اپنی سائنسی سوچ کو جدید مابعد الطبیعات کی دریافت پر لگا دیا اور بالعموم غزل کہتے وقت اپنے موڈ (Mood) کو بکھرنے نہیں دیا۔ دوسری طرف انہوں نے نظم ایسے لمحات میں کہی جب ان کا لاشعور پوری طرح ان کی گرفت میں ہوتا تھا اور شعور بھی ان کے تخلیقی کردار کا حصہ بن جاتا تھا۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ شہزاد احمد کی نظم "ہونے اور نہ ہونے کے" نقطۂ اتصال پر وجود میں آتی ہے۔ اس کی ایک مثال ان کی نظم "اسے ہم نے دیکھا" ہے جو لاشعور کے بہاؤ میں آزاد تلازمۂ خیال کے تحت عمل میں آنے والی تخلیق نظر آتی ہے۔ اب نظم ملاحظہ کیجئے:

"اسے ہم نے دیکھا / ہمیں آسمانوں کے اندر سرکتی ہوئی سیڑھیاں یاد آ گئیں / برستے ہوئے موسموں نے کہا / گھر
سے نکلو / چلو تم کو افلاک پر وہ ستارے دکھائیں / جنہیں دیکھتے ہی ہم اپنی زمیں بھول جائیں
مگر ہم نے سوچا / کہ مٹی کے اندر بھی کتنے خلا ہیں / آگ میں جھلکتی ہوئی کہکشائیں ہیں / ایسی ہوائیں ہیں / جو روشنی کی طرح
تیز ہیں / سو ہم خاک کے ساتھ چمٹے رہے / پھر بھی اس کو نظر بھر کے دیکھا نہیں / ہم نے سوچا نہیں / آسمان کی سرکتی ہوئی
سیڑھیاں / کس طرف جا رہی ہیں / ہمیں خاک ہی سے عقیدت رہی / اس کے دل میں اترنے کی خواہش رہی"

شہزاد احمد اپنی نظموں میں اپنے تخلیقی وجود کا اثبات فنکارانہ انداز میں کراتے ہیں لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ ان کی نظمیہ شاعری کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنی اہمیت غزل کو دی گئی ہے۔ اور میرا اندازہ ہے کہ مشاعرے کی داد نے انہیں جو بے پناہ شہرت دی تھی شہزاد احمد کے نفسِ مضمون نے اسے کافی سمجھا اور ان کی نظم کے سلسلے میں نقادوں نے جو تغافل برتا تھا اس سے بے نیاز ہو گئے۔ وجہ شاید یہ بھی ہے کہ شہزاد احمد ایک آزاد فکر اور آزاد عمل انسان تھے۔ اور اپنی زندگی میں انہوں نے کبھی کسی نقاد سے اپنے فن پر لکھنے کی فرمائش نہیں کی۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنے فن کی انفرادیت سے اپنے دور کے بالغ نظر ادیبوں کو متاثر ضرور کیا اور مختار صدیقی، ڈاکٹر وزیر آغا، اشفاق احمد، انتظار حسین، ڈاکٹر خورشید رضوی، عرفان صدیقی، ڈاکٹر تحسین فراقی اور ڈاکٹر توصیف تبسم نے ان کی غزل کی شاعری پر بڑے خیال انگیز مضامین لکھے جن کا تذکرہ اب شہزاد احمد کی وفات کے بعد زیادہ ہونے لگا ہے۔

شہزاد احمد کی آزاد روی کا ایک منفی نتیجہ یہ نکلا کہ انہیں بے روزگاری اور بے کاری کے لیے وقفے گزارنے پڑے اور ان کے مالی حالات کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے گئے۔ اس قسم کے ایام میں وہ روز کنواں کھودتے اور روز تازہ پانی نکالتے۔ جاں کاہ محنت کے ان ادوار میں بھی شہزاد احمد نے اپنی خودی اور خودداری کو ہمیشہ قائم رکھا اور اپنے رکھ رکھاؤ، طرزِ حیات اور آن بان شان میں کمی نہیں آنے دی۔ ان دنوں شہزاد فلسفہ اور نفسیات کی انگریزی کتابوں کے تراجم کرتے اور مشاعرے پڑھنے کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے معمولی پروگرام بھی قبول کر لیتے تھے۔ اپنی شکستہ حالی کا ذکر کبھی نہ کرتے بلکہ ہمیشہ کہتے کہ وہ اپنے بہت سے معاصرین سے اچھے ہیں اور دینے والے کی رحمتیں ان پر ہمہ وقت نازل ہوتی رہتی ہیں"۔ المیہ یہ ہوا کہ 1984 میں ایک مشاعرہ پڑھنے کے لیے کراچی گئے تو ان کے دل نے بغاوت کر دی۔ اختلاجِ قلب کا حملہ اتنا سخت تھا کہ انہیں فوراً ہسپتال میں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل کرنا پڑا۔ اس دوران شہزاد احمد کے ڈاکٹروں کے رنگ اچانک فق ہو گئے۔ ہر طرف افراتفری پڑ گئی۔ مریض کو آکسیجن دینے کے عمل میں غیر معمولی تیزی آ گئی۔ چند سے بعد جب حالات سنبھلے تو ڈاکٹروں نے بتایا کہ شہزاد احمد کی چند لمحوں کے لیے "کلینیکل ڈیتھ" (Clinical death) واقع ہو گئی تھی لیکن ڈاکٹروں کے بروقت برقی جھٹکوں نے انہیں بحال کر دیا اور شہزاد احمد کو حیاتِ نو مل گئی جس کا سلسلہ اگست 2012 تک جاری رہا۔

موت اور پھر زندگی کے درمیانی لمحے کی واردات کو شہزاد احمد نے یاد رکھا۔ ایک دن اس لمحے کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ایک آواز انہیں کہہ رہی تھی "شہزاد اڑو!" "میں نے کہا" میں اڑ نہیں سکتا، میرے پر نہیں ہیں۔" پھر آواز آئی "پروں کے بغیر اڑنے کی کوشش کرو" اور میں نے کوشش کی تو واقعی فضا میں اڑنے لگا لیکن اسی لمحے مجھے جھٹکا لگا اور میں اپنے پلنگ پر پڑا تھا"— موت سے واپس آ کر شہزاد احمد کو نہ صرف نئی زندگی مل گئی بلکہ ان کے اندر کام کرنے کا نیا ولولہ بھی پیدا ہو گیا اور اب وہ شاعری کے ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی آ گئے۔ قومی نظمیں تو وہ پہلے بھی کہتے تھے لیکن اب مذہبی احساس نے ان کو نعت نگاری کی روحانی لطافت سے بھی سرشار کر دیا۔ مسجد نبوی کی تصویر دیکھتے تو ان پر نعت کے اشعار اترنے لگتے اور ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ انہیں یوں لگتا جیسے وہ مدینے کی گلیوں میں گھوم رہے ہیں۔ خیال کا یہ عالم ان کے تجربے کی متاعِ گراں مایہ تھا۔

شہزاد احمد کو احساس تھا کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب ہے۔ اور مشرق کا روحانی تجربہ مغرب کے سائنسی تجربے سے مختلف ہے۔ شہزاد احمد نے فلسفہ اور نفسیات کے گن گیان کو تراجم کے ذریعے منکشف کرنا شروع کیا تو انہوں نے فرائیڈ اور ژنگ سے آگے جانا بھی

ضروری سمجھا اور "مذہب، تہذیب اور موت" کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کی سریت کی نوعیت الگ ہے۔ 1986 کے حملہ قلب سے بحالی کے بعد انہیں احساس ہو گیا تھا کہ خدا نے انہیں دوسری زندگی کسی بڑے کام کے لیے عطا کی ہے اور وہ شاعری سے حقیقت کی طرف سفر کرنے لگے تو ان کی معاونت انگریزی زبان کو اردو میں ترجمہ کرنے کی صلاحیت نے کی۔ ان کی کتابیں تخلیقی رویے (1986)، ذہن انسانی کا حیاتیاتی پس منظر (1988)، نفسی طریق علاج میں مسلمانوں کا حصہ (1988)، سائنسی انقلاب (1988)، دو مراکز (1990)، ڈاکٹر عبدالسلام کی تصنیف کا ترجمہ "ارمان اور حقیقت" (1993)، گروجیف معجزے کی تلاش میں (2007)، ابراہام ماسلو (2006)، وجودی نفسیات پر ایک نظر (2005) اور قرۃ نور بیگ (2006) جیسی کتابیں پیش کیں۔ اس برس ان کی دو کتابیں "تحلیل نفسی" اور "اسلامی فلسفے کی تاریخ" شائع ہوئی ہیں۔ اول الذکر میں لاک اٹس، ایرک فرام اور سگمنڈ فرائیڈ کی بیٹی اینا فرائیڈ کی تحلیل نفسی کے عوامل کا تجزیہ ہے۔ دوسری کتاب ماجد فخری کی انگریزی کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ اور اب کہا جا سکتا ہے کہ شہزاد احمد نے زندگی کے آخری ایام تک اپنے قلم کو رکنے نہیں دیا اور وہ اردو ادب کو نئے خیالات کی آکسیجن فراہم کرتے رہے۔ اور اتنا ثمر مند کام کیا جو ان کی عمر کا کوئی دوسرا ادیب نہیں کر سکتا تھا۔ کہ آخری دور میں رسالہ "مخزن" کی ادارت بھی قبول کر لی اور ڈاکٹر وحید قریشی نمبر شائع کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ شہزاد احمد کی ادبی خدمت کا ایک اور زاویہ جناب احمد ندیم قاسمی کی وفات کے بعد 2006 میں اس وقت سامنے آیا جب انہیں مجلس ترقی ادب لاہور کا ناظم مقرر کیا گیا۔

شہزاد احمد نے مجلس ترقی ادب کو اس کے منشور کے مطابق صحت مند خطوط پر استوار کرنے اور تجارتی ادارہ بنانے کی کوشش کی۔ انہوں نے سب سے پہلے ڈاکٹر رفاقت علی شاہد جیسے محقق کا تعاون حاصل کیا اور ایک سال کے عرصے میں سترہ کلاسیکی کتب کو شستہ کتابت میں شائع کیا۔ بعد میں رفاقت علی شاہد تو چلے گئے لیکن شہزاد احمد نے کارکنوں کی نئی ٹیم بنائی جس نے کلیات آتش، کلیات مومن، کلیات ذوق، ڈاک جہاں گیری، تاریخ اقوام عالم، اردو افسانے میں رومانی رجحانات، مولانا صلاح الدین احمد اور ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری پر پی ایچ ڈی کے مقالات، بحر الفصاحت کی سات جلدیں، کلیات میر کی تین جلدیں، تمدن ہند پر اسلامی اثرات اور متعدد نایاب کتابیں دوبارہ شائع کیں اور ان کی کامیاب مارکیٹنگ بھی کی۔ مجلس کے سہ ماہی جریدہ "صحیفہ" کا اشاریہ اور 1857 جنگ آزادی نمبر شائع کیا۔ اہم بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ذاتی لائبریری سے سات ہزار کتابیں مجلس کی لائبریری کی نذر کر دیں جن سے اہل علم اب استفادہ عام کر رہے ہیں۔

اشرف جاوید کی رائے میں "شہزاد احمد نے ان چھ برسوں میں اتنا کام کیا ہے کہ مجلس کے پچھلے پچاس برسوں کا کفارہ ادا ہو گیا ہے۔"

ذاتی زاویے سے شہزاد احمد ایک مجلسی انسان تھے۔ ان کے چہرے سے خوش طبعی ہر وقت عیاں ہوتی رہتی تھی۔ اٹھتے بیٹھتے پر شائستہ مزاح کا مظاہرہ کرتے اور جواب میں خوبصورت تخلیقی فقرہ کہنے سے بھی گریز نہ کرتے۔ شاعری ان کی پہلی محبت تھی لیکن نثر کی طرف آئے تو اسے بھی پہلی بیوی جیسے حقوق تفویض کیے اور اردو زبان و ادب کو ثروت مند کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ وفات کے وقت 80 برس کو پہنچ چکے تھے لیکن مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ شہزاد احمد کم عمری میں فوت ہو گئے۔ رسالہ "مخزن" کے نئے شمارے میں انہوں نے ادب کو سائنس پر فوقیت دی تھی، چند اہم سوالات بھی اٹھائے تھے اور مدیر "مخزن" کی حیثیت میں ان کا جواب فراہم کرنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ افسوس، صد افسوس کہ اب یہ وعدہ پورا نہ ہو سکے گا لیکن مجھے یقین ہے کہ سینکڑوں من مٹی کے نیچے شہزاد احمد سوئے نہیں ہوں گے بلکہ اپنے سوالات کا جواب تلاش کر رہے ہوں گے۔

◆◆◆

اختر کی نعت، ایک مطالعہ

(20/اپریل 1918ء۔ 18/مارچ 2007ء)

امین راحت چغتائی

میں اختر ہوشیار پوری مرحوم کی شاعری کے ساتھ نصف صدی سے زیادہ عرصہ بسر کر چکا ہوں اور انھیں زندگی کے آخری لمحوں تک ویسا ہی تازہ فکر پایا جیسا انھیں 1948ء میں اپنی پہلی ملاقات کے وقت دیکھا تھا۔ ان کی شاعری میں کہیں تھکن کا احساس ہے نہ انھوں نے اپنے آپ کو دہرایا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے سات مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ اور "قمر الاخضر" ان کا چودھواں (1999) مجموعہ کلام ہے اور نعت نگاری کے لحاظ سے چوتھا۔ ان کی نعت کے دو مجموعے "برگِ سبز" اور "تجلی" بالترتیب 1987ء اور 1997ء میں نظر نواز ہوئے۔ 1998ء میں منعقد ہونے والی قومی سیرت کانفرنس میں وزیر اعظم جناب محمد نواز شریف نے بذاتِ خود انھیں موخرالذکر مجموعے پر انعام دیا تھا جو جناب اختر ہوشیار پوری نے کانفرنس ہال میں ہی وزیر اعظم کے خود انحصاری فنڈ میں دے دیا تھا۔ اپنے آقا کی مدحت نگاری پر ملنے والے انعام کا اس سے زیادہ مبارک مصرف اور کیا ہو سکتا تھا۔

جناب اختر ہوشیار پوری جس طرح جدید اردو غزل کو نیا اسلوب اور لہجہ دینے والے اکابر شعرا میں شمار ہوتے ہیں اسی طرح جدید نعت میں بھی ان کا لہجہ نئے پن کا احساس دلاتا ہے۔ ان کی نعت کے پانچوں مجموعوں میں تین خصوصیات بہت نمایاں ہیں۔ اول، عجز و انکسار، دوم حدِ ادب اور سوم غیر روایتی موضوعات اور تینوں اوصاف کا اسلوبِ بیان نیا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے برگِ سبز (1988) کی مختلف نعتوں کے یہ تین اشعار پڑھیے:

قرطاس کا سجدہ ہے مری نوکِ قلم ہے — یہ معجزۂ نعتِ شہنشاہِ حرم ہے

قلم کا رو! حرا سے حرف کی آواز آتی ہے — کہ اب آواز کے سورج کو وادی میں اُگنا ہے

ان کی گلیوں کی اگر خاک میسر آ جائے — آئینہ ہو کہ نہ ہو آئینہ گر بن جاؤں

اب تجلی کے یہ اشعار دیکھیے۔ مواجہ شریف سامنے ہے جہاں بڑے بڑوں کا دامنِ صبر ہاتھوں سے چھوٹ چھوٹ جاتا ہے مگر تجلی کے شاعر کے عجز اور حسنِ طلب کا اسلوب نرالا ہے:

میں نے ہاتھوں پہ سجایا ہے لبوں کو اختر — اور پھیلا دیا ہاتھوں کو کہ چھلکے چھاگل

اس شعر کو بار بار پڑھ کر یہ احساس شدت سے غالب رہتا ہے کہ معاصر شعرا کے ہاں ایسا اور دل آویز اسلوب کم کم نظر آتا ہے جس میں دیارِ رسولؐ کے تقاضائے ادب بھی ملحوظِ خاطر ہوں اور عاجزانہ طلب بھی ہو۔ پاسِ ادب کے ساتھ مدحت سرائی کا ایک اور انداز دیکھیے:

وہ ورلڈ بکرم، وہ ورلڈ گاؤ عالی — مٹی کا ہر ہیولیٰ انسان ہو گیا ہے

تخلیق کے غیر روایتی موضوع اور اسلوب کا بھی ایک شعر ملاحظہ کیجیے:

ہنگام اولیں، حرف کا تم چوم کے خوش ہوں — جب نام ترا آئے، قلم چوم کے خوش ہوں

اب آیئے تیسرے مجموعہ "نعت رسالت مآبؐ" (1999ء) کی طرف۔ نعتیہ ادب کے قارئین و ناقدین یہ کلام پڑھنے کے بعد محسوس کریں گے کہ جناب اختر بڑی خاموشی سے نعت کے جدید شعرا کی ذہنی تربیت کر رہے ہیں۔ اس کتاب کی نعتیہ فضا یکسر مختلف ہے۔ اس میں نہ صرف مذکورۃ الصدر کتابوں کے اوصاف برقرار ہیں بلکہ کئی مقامات پر خیال کی ندرت، الفاظ کی جدت اور معانی کی لطافت نے کچھ ایسا سماں باندھ رکھا ہے کہ آنکھیں فرطِ عقیدت سے چھلکتی ہیں تو روح انوکھے کیف و سرور سے سرشار ہوتی ہے۔ یہیں نہیں، نعت کی صورت میں عصر حاضر پر مرتب ہونے والے سیرتِ رسولؐ کے اثرات کا ظہور بھی دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً

آپؐ کا طرزِ کلام و گفتگو حق رہیں — جب کبھی چٹکی ہیں کلیاں بادِ صبح و شام سے

یوں فرشتے ہیں عرش پر جیسے — کوئے خیرالانامؐ ہوتا ہے

میں لوٹ لوٹ کے آتا ہوں دیکھنے تجھ کو — کہ جیسے میرا چلنا ہی رقصِ آہو ہے

کوئی فرشتہ سپردِ قلم کرے آ کر — بیان کرنے لگا ہوں میں داستانِ رسولؐ

درودوں کی صداؤں کے تصدق — میں اپنے قد سے اونچا ہو گیا ہوں

تو نے انساں کو بلند اتنا کیا سوچتا ہوں — اب گداؤں کو میں شاہوں کے مقابل سمجھوں

اخترؔ یہ عرصۂ عظمت الرسولؐ ہے — روزِ ازل کی صبح بھی، یوم نشور بھی

میں نے یہ چند اشعار یونہی منتخب نہیں کر لیے بلکہ انتخاب سوچ سمجھ کر کیا ہے اور بتانا یہ مقصود ہے کہ جناب اختر کی نعت میں ایک کیا پن تو ہے ہی مگر یہ لے عصر حاضر کے دوسرے نعت گو شعرا سے ممیز بھی کرتا ہے۔ ان کے انداز فکر اور اسلوب بیان میں جدید عہد کے تقاضوں کی جھلک بھی ہے اور ذات و صفات دونوں حوالوں سے لکھی جانے والی نعت کا دل آویز امتزاج بھی۔ ان کی نعت کیف افزا شاعری کے ذیل میں بھی آتی ہے اور عشق و فکر دو خیال ہونے سے بھی بچاتی ہے۔ ہمارے عہد میں تو میدِ رسالت کی حد فاصل کو جن نعت گو شعرا نے بڑی احتیاط سے سمجھا ہے ان میں سرفہرست تو حفیظ تائب ہیں مگر ان کے ہم رکاب اختر ہوشیار پوری بھی ہیں۔

جناب اختر کا چوتھا مجموعہ نعت "قبلِ الفجر" (2000ء) ہے جسے وزارت مذہبی امور انعام سے بھی نواز چکی ہے۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ایک بار کہا تھا کہ شاعری کا پہلا منصب مسرت بہم پہنچانا ہے۔ وہ خود مذہبی آدمی تھا۔ مذہب اور ادب میں کسی خط امتیاز کا قائل

نہیں تھا۔ اس نے مسرت کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ یہ روحانی بھی ہو سکتی ہے اور مادی بھی۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ مسرت روح کے ذریعے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اگر کوئی شاعر رسولِ اکرمؐ کے سراپا اور فکر و عمل سے سرشار ہو کر نعت تخلیق کرتا ہے تو یہ اس کی محض ذاتی روحانی مسرت نہیں ہے بلکہ حضورؐ سے نسبتی مرتبت کا ہر واقف اس سے سرشار ہوتا ہے اور "قمر الاختر" میں بھی کچھ ایسی ہی سرشاری ہے۔ کتاب میں کہیں مایوسی، اندھیروں یا ناکامیوں کا ذکر نہیں ہے۔ حضورؐ سے وابستگی کے باعث بہاروں کی آمد، خوشبوؤں کی اڑان، گل و ریحاں کی مہکار کا ذکر ہے۔ یہ سب رجائیت کی علامتیں ہیں اور اختر خود:

خدا کرے کہ زمانہ بھی نیند سے جاگے — سحر کے وقت میں جب اُن کا نام لے کے "اٹھوں"

کہتا ہوا لوگوں کو پیامِ حیات دے رہے ہیں۔

اس مجموعے میں فضائل و شمائل کا بیان زیادہ ہے اور رنگِ تغزل بھی اپنی جلوہ سامانیوں کے ساتھ بھرپور ہے اور اختر کی بعض غزلوں پر بھی نعت کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ جب دونوں رنگوں کی حلاوت سے یہ شعر تخلیق ہوا

مری داستانِ حیات میں ترے نام ہی کی بہار ہے — تیری صبح ہی کے گلاب ہیں، تیری شام ہی کی بہار ہے

اور فضائل کی عظمت نے اس شعر کو جنم دیا:

زمانہ تو یہاں سے ہے وہاں تک — محمدؐ ہیں مکان و لامکاں تک

اب اسی مزاج کے چند اور اشعار دیکھیے اور فیصلہ کیجیے کہ جناب اختر کے ہاں نئی نعت نے فروغ پایا ہے یا نہیں؟

شعورِ آدمی نے کروٹیں لیں — گلستانِ مدینہ کی ہوا سے

کب بامِ افق پہ کچھ دھرا ہے — سورج تو حرا سے پھوٹتا ہے

آپؐ سے حال و ماضی ہوئے سر بہ خم — اور فردا ہے عقدہ کشا آپؐ سے

پہلے اُن کا نام لکھا اور پھر لب رکھ دیے — آفرینش کی صحیفہ داریاں کہتے ہوئے

اور 2003ء میں "خاتم المرسلینؐ" (پانچواں مجموعۂ نعت) مرتب کرنے تک جناب اختر ہوشیار پوری "ستارۂ امتیاز" (7 جولائی 1998ء) اور "تمغۂ امتیاز" (23 مارچ 1990ء) سے سرفراز ہو چکے تھے۔ "خاتم المرسلینؐ" کی اشاعت کے وقت وہ عمر کی پچاسی منزلیں طے کر چکے تھے اور آج میں خود ان کے نعتیہ مجموعوں کا جائزہ لیتے وقت بفضلِ تعالیٰ اسی سال کے مراحل میں ہوں۔ الحمد للہ!

نعت کے ضمن میں وہ خود بہت محتاط شاعر تھے۔ "خاتم المرسلینؐ" کے پیش لفظ "ایک حرفِ احساس" میں وہ بہ صد عجز کہہ چکے ہیں کہ نعت کہتے وقت توحید و رسالت کا امتیاز ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہا۔ نیز کوئی لفظ یا ترکیب ایسی نہیں جو شائستہ و معیاری نہ ہو اور یہ درست ہے۔ ان کی ہر نعت میں مقامِ آشنائی اجالا ہے۔ مدینے سے وابستگی کے ہزاروں اظہار ہیں اور ہر اظہار میں ایک قرینہ ہے۔ بلکہ زیرِ نظر مجموعے کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں کوئی نعت ایسی نہیں جو مدینے کی برکات کے ذکر سے خالی ہو اور چونکہ یہاں مدینہ موضوعِ سخن ہے اس لیے اسلوبِ سخن میں غزل کا رنگ در آیا ہے۔ مثلاً

وجہِ بہارِ زیست مدینے کا پھول ہے — میری رگوں میں خون نہیں، حبِ رسولؐ ہے
کیا کہوں لطفِ نبیؐ کا اعجاز — بک گیا ہے مدینہ جاکر

شہرِ نبیؐ میں چھاؤں بھی، لطفِ شگفتگی بھی ہے — روشنی سحر بھی ہے، چاند کی چاندنی بھی ہے

سوادِ وادیٔ طیبہ ہے مسکنِ امن و سکوں — کہ اس کے حلقے میں تفریقِ نام و ذات نہیں

پا ہی لیں گے کسی روز منزل — قافلے چل دیے ہیں مدینے

دوسرا پہلو جو اس کتاب میں بہت نمایاں ہے، وہ حضورؐ کا وجہ کائنات ہونا ہے اور انھیں کو شمعِ حرم بھی کہا گیا ہے اور چاند کا اجالا بھی۔ حضورؐ کی ذات کو نعمتِ جاں اور دوا ہے اسقی سے تعبیر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضورِ رسالت مآبؐ ہی کی وہ چوکھٹ ہے جس سے زمانے کا بھلا ہوتا ہے۔ یہیں سراپا غزل کے انداز کا بھی ایک بولتا ہوا شعر نظر سے گزرے گا۔ ملاحظہ فرمائیں:

جنبشِ لب میں شگوفوں کی چٹک ہے پنہاں — بات کے لہجے میں انداز صبا ہوتا ہے

جناب اختر نے "تجلی" کے پیش لفظ میں خود بڑے وثوق سے یہ اقرار کیا ہے کہ "میں نے نعت ہوش سے نہیں جوش سے کہی ہے اور اپنی اوقات کو ایک لمحے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا کہ عشقِ رسولؐ، اطاعتِ رسولؐ کے سوا کچھ نہیں۔ خود خالقِ دو جہاں اپنی محبت کو اتباعِ رسولؐ سے مشروط کر رہے ہیں۔ اب آخر میں جناب اختر ہوشیار پوری کا ایک غیر فانی شعر ملاحظہ فرمائیں:

ارضِ طیبہ میں میرے نبیؐ کا وجود — جیسے قرآن اخترؔ ہو جزدان میں

◆◆◆

ماہنامہ "تخلیق" ستمبر 2016ء۔ ایک جائزہ .... تجزیہ نگار: حامد سراج

میرے دل میں سونان اظہر کا مقام اور عزت بے انتہا ہے۔ اس نے اپنے والد محترم کے بعد جس طرح "تخلیق" سنبھالا، سنوارا اور نکھارا ہے، قابلِ تحسین ہے۔ یہ زندگی ہے یارانِ ادب — فکرِ معاش میں کوئی کیا کیا کرے

"تخلیق" کئی دن سے میرے سرہانے موجود ہے۔ آج تسلی سے مطالعہ شروع کیا ہے۔ فیس بک کے ساتھ ایک سلسلہ چلا ہے۔ کوشش تو ہے وہ بھی چلتا رہے۔ کتاب کا تعارف اور کتب تک رسائی تو رہے۔ ابھی قاری زندہ ہے۔ قاری کی موت کا اعلان کرنے والوں سے مجھے اتفاق نہیں۔ دیکھیے "تخلیق" کے مندرجات آپ کے سامنے ہیں۔ "ادارے آپ کے" صحرا نورد کے خطوط کے خالق مرزا ادیب مرحوم کی ایک نایاب تحریر سونان اظہر کھوج لائے ہیں۔ کمال کر دیا۔ افسانوں کا چناؤ اب کی بار بہت عمدہ ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد، مبین احمد کے افسانے افسانوی ادب کی آبرو ہیں۔

بسمل صابری...... اُردو شاعری کی راج دھانی

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

اردو غزل کے افق پر شفق کی مانند لفظوں کی دھنک لیے پیشتر کرب سے بکھرے لفظوں کو تجسیم کے سانچے میں ڈھالنے کا فن بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ ادب خواہ کسی بھی زبان کا ہو، شاعری دنیا کی مادری زبان ہے۔ جب حالات کے تھپیڑے ذہن کے دروازے پر دستک دیتے ہیں تو تخلیق براہ راست دل پر دستک دیتی ہے۔ لفظ سلیقے اور قرینے سے لبوں کی دہلیز پر رقص کناں ہو کر صفحۂ قرطاس پر بکھرنے لگتے ہیں۔ بہترین انداز تکلم، مٹھاس، دلربائی، نسوانی حسن اور حسن غزل یکجا ہو جائیں تو بسمل صابری کے روپ میں گلستان ادب میں مشرقی لبادہ اوڑھے نظر آتے ہیں۔ بسمل صابری کا تعلق مردم خیز ضلع منٹگمری یعنی ساہیوال سے ہے۔ 22 ستمبر 1937ء کی خوش بختی ہے کہ ان کے دامن میں ایک محترم آواز، لاکھوں لفظوں کا خزینہ لیے عالم بالا سے عالم وجود میں آئی۔ بسمل صابری نے ایم اے اردو اور ایم اے فزیکل ایجوکیشن کی ڈگریاں حاصل کیں۔ حسن اتفاق ہے کہ ادب اور صحت جسمانی کے علوم بسمل صابری کی ذات میں یکجا ہیں۔ 1986ء میں اپنے آبائی شہر ساہیوال میں گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج برائے خواتین میں بحیثیت پروفیسر خدمات انجام دیتے ہوئے 1997ء میں اپنی ملازمت کا دورانیہ مکمل کیا۔ انفرادیت کا طرۂ امتیاز طالبات کی ذہنی فکری تربیت ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو جمنا ستک کی صورت طالبات کے اذہان میں منتقل کیا۔ ان کے شعری اثاثہ میں "پانی کا گھر" 1998ء، (دو ایڈیشن) روشنیوں کے رنگ 2011ء، "یادوں کی بارشیں" 2013ء، "پیاس نگر" (نعتیہ مجموعہ کلام) 2015ء میں ریڈیو، پی ٹی وی اور اخبارات وغیرہ میں شائع ہونے والا کلام شامل ہے۔

بسمل صابری کا شمار اردو کی ممتاز اور صف اول کی شاعرات میں ہوتا ہے۔ وہ اسٹیج پر آ کر جب غزل سرا ہوتی ہے تو ان کی آواز جہان دیکی کی طرح سوز و گداز سے آشنا کرتی چلی جاتی ہے۔ اور ان کی بلند آہنگ کی سی آواز کے ساتھ قلب و جاں کے آس پاس شعلے سے لپکتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے سے موقع اطرویا کے مشاعرہ وابالے (انڈیا) 23 اپریل 1998ء علی سردار جعفری کہتے ہیں:

> "بسمل صابری کی شاعری کو میں نے ہمیشہ گن داد دی کیا۔ میں نے آپ کا کلام سنا تو یہ خیال یقین میں بدل گیا۔ اب جب آسمانی الہام کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں تو آپ کی آواز شاعری تخت و بیت از تعمیری بن کر ابھری ہے۔ یہ آواز نورانی کرن ہے۔ جو تحت سے تخت اندھیرے کو چیر کر نکل جاتی ہے اور روشنی کی بشارت بن کر انسان کو زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے اور بہت بڑا فرض ہے جو آپ ادا کر رہی ہیں۔"

بسمل صابری کی کتاب "یادوں کی بارشیں" میں حسن تخیل بام عروج پر ہے جس میں روایت اور جدت کا سنگم حسین انداز میں ملتا ہے۔ غم دوراں کے ساتھ ساتھ غم جاناں کا بھی خوب تذکرہ موجود ہے۔ انھوں نے صرف اور صرف محبت کے شعر نہیں کہے بلکہ ہر موضوع پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کی شاعری کا دائرہ "عکس"، "پانی"، "گھٹا"، "پیار"، "محبت"، "بارش"، "منظر"، "رعنائی"، "آنچل"، "آنگن"، "آئینہ"

''حسن''، ''چراغ''، ''خورشید''، ''قمیص''، ''احساس''، ''عرفان''، ''فضا''، ''موسم''، ''رت''، ''خوشبو''، ''اشک''، ''اشارہ''، ''غزل''، ''عطا''، ''کنول''، ''تقدیر''، ''عشق''، ''آرزو''، ''رستہ''، ایسے لفظوں سے ہوتا ہوا متصوریت کے تاج محل کا حصار کر لیتا ہے۔ ان تمام استعاروں پر ان کی غزل کی عمارت کھڑی نظر آتی ہے۔

''یادوں کی بارشیں'' کبھی عکس بن کر، کبھی جگنو بن کر، کبھی اداس بن کر، کبھی بارش بن کر اور کبھی ایک دعا بن کر ہمارے سامنے آتی جاتی ہیں۔

آنگن میں تیرے پیار کی رعنائیوں میں تھی　　بکھری جو دھڑکنوں میں تو پنہائیوں میں تھی

منظر بدل رہے ہیں گھٹاؤں کے ساتھ ساتھ　　پھر بھی تو ہر قدم مری تنہائیوں میں تھی

کنول صابری کی غزل میں سماجی، معاشرتی مسائل کے ساتھ ساتھ رومانوی فضا بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ ان کی غزلوں میں ایک نغمگی اور سلاست ہے جو گنگنانے میں بھی بھلی لگتی ہیں اگر یوں کہا جائے کہ ان کی غزل میں رنگِ تغزل اپنے درجہ عروج پر ہے تو غلط نہ ہوگا۔ مشتے نمونہ از خروارے

کہانی ہجر کی اغیار سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے　　مری ہر خواہشِ بے کار سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے

گر ہو سکے تو دور گگن سے نظر میں آ　　تو شہرِ یار ہے کبھی میرے گھر میں آ

پاکستان کے نسائی ادب پر نگاہ ڈالی جائے تو کئی قد آور شاعرات کے نام ابھر کر سامنے آتے ہیں جو اپنی علمی و ادبی، تخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ادبی افق پر ایک دھنک کی طرح جلوہ فگن ہیں۔ ان میں منور سلطانہ، حمیدہ ریاض، انوشی گیلانی، پروین شاکر، عشی ناز، فاطمہ حسن، یاسمین حمید، حمیدہ شاہین، شاہدہ لطیف، فاخرہ بتول، نورین طلعت عروبہ، شبنم شکیل شامل ہیں لیکن ان میں ایک نمایاں نام کنول صابری کا نام غزل کی وجہ سے بہت مقبول ہے۔ ان کی شاعری کے بارے میں بشریٰ رحمن صاحبہ کہتی ہیں۔

> ''ایسی خواتین جو اپنی زندگی لمحے کی تزئین میں ایک مشن کی طرح گزارتی ہیں اور اپنے فرائض منصبی بھی پوری طرح ادا کرتی ہیں وہ ایک رول ماڈل کی طرح ہوتی ہیں۔ پی آر او اور سستی شہرت سے دور رہتی ہیں اسی لیے ایک زمانہ ان کا معترف نظر آتا ہے۔ کنول صابری بھی مبارکباد کے لائق ہیں، وہ ہم سب عورتوں کا فخر بھی ہیں''

اردو غزل کے حوالے سے ایک بہت ہی معتبر نام ڈاکٹر خورشید رضوی کا ہے جنھوں نے غزل کے میدان میں اپنا لوہا منوایا ہے اور منفرد مقام و مرتبے کے حامل ہیں وہ کنول صابری کی شاعری کے حوالے خاص طور پر ''یادوں کی بارشیں'' پر رائے دیتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''اردو غزل میں کنول صابری کا اسم گرامی کم و بیش نصف صدی کا قصہ ہے۔ ان کا نام، کلام اور دل آویز ترنم مدتوں مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت بنا رہا لیکن اس مقبولیت نے انھیں فنی ریاضت سے غافل نہیں کیا اور وہ مسلسل آرائش زلف شعر و سخن میں پیش از پیش مصروف رہیں۔ کنول صابری نے نظمیں بھی کہیں لیکن بنیادی طور پر وہ غزل کی شاعرہ ہیں۔ ان کا

اسلوب سادہ اور سہل ہے جس کی خاص وجہ ان کے سچے اور گہرے احساسات ہیں۔ ان کا ایک برجستہ شعر مدتوں سے میری لوحِ ذہن پر نقش ہے۔

وہ بے وفا ہی سہی آؤ اس کو یاد کریں تمام عمر پڑی ہے اسے بھلانے کو

اردو ادب کے ممتاز دانشور، نقاد، محقق، انشائیہ نگار، شاعر ڈاکٹر انور سدید کتابوں پر تبصروں کے حوالے سے اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے کنول صابری کے فکر و فن کے حوالے سے لکھا ہے:

''کنول صابری کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے شاعروں کی عارضی شہرت کو اپنی بقا کی چھتری نہیں بنایا بلکہ اپنی خلوتوں کو ریاضِ فن کے لیے وقف کر دیا اور شاعری کے تین مجموعے پیش کیے تو یہ ان کے اعتمادِ ذات کے مظہر اور ان کے فن کی عظمت کے نقیب ہیں۔ ''یادوں کی بارشیں'' کی غزلیں دل کے تاروں کو ہلاتی ہیں اور اس معنویت کو متحرک کر دیتی ہیں جو درد کے تخلیقی تجربے سے پیدا ہوتی اور زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں۔''

''یادوں کی بارشیں'' ایک نہایت ہی عمدہ شعری مجموعہ ہے جس میں کنول صابری کی غزلیات شامل ہیں۔ کنول صابری نے کمالِ ہنرمندی سے شعر کہے ہیں ان کی غزل عصری تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ وہ غزل کہتے ہوئے غزل کے تمام فنی محاسن کا پورا پورا خیال رکھتی ہیں اور غزل کے تمام تر لوازمات کو بھی پورا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کا ذائقہ ہی جدا ہے۔ کنول صابری نے تقریباً ہر بحر میں طبع آزمائی کی ان کی طویل بحری غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

سرسراتا ہوا لمحہ تری پہچان بنا گلشنِ شوق میں اک پھول کھلا ہے کوئی
ایک آہٹ سی ہے ہر سو تری خوشبو مہکے اب تصور نے مرے رنگ بھرا ہے کوئی

فطرت شناس کنول صابری نے مناظر، وطن، اہلِ وطن حتیٰ کہ اداس چہروں کے دکھ بھی اشعار کی سچائی میں ڈھال رکھے ہیں۔ ''یادوں کی بارشیں'' نہ صرف کنول صابری کو بھگو رہی ہیں بلکہ ہر اس شخص کی نمائندگی کر رہی ہیں جو یادوں کے سہارے زندگی گزارتا ہے۔ محبتیں، الفتیں، قربتوں اور چاہتوں کے گلاب تر و تازہ رہتے ہیں۔ رتوں پر زور نہیں ہوتا لیکن حسین رتیں یادوں کا لبادہ اوڑھ کر تخلیق کار کا حصہ بن جاتی ہیں۔ کنول صابری با شبہ روشن یادوں سے مستقبل روشن کرتے ہوئے روشن فکر تک پہنچنا چاہتی ہیں۔ ماشاءاللہ ابھی وہ محوِ سفر ہیں انھیں یادوں کی بارش میں محبت کا سائباں لے کر ابھی طویل سفر طے کرنا ہے۔ وہ اس سفر میں تنہا نہیں ہیں کیونکہ تخلیق کار تنہائی میں بھی محشرِ خیال ہوتا ہے۔

حاصلِ زیست ہیں کنول صابری تری جلتی یادیں دیپ جب بجھنے لگے دل کو جلانے آئے

کنول صابری کا ایک نمائندہ شعر ملاحظہ ہو مجموعہ کلام ''یادوں کی بارشیں''

کنول بکھر گئیں تجھے یادوں کی بارشیں بھولی ہوئی تھی جس کو وہ یاد آ گیا مجھے

◆◆◆

فیض احمد فیض ——— رونقِ بزمِ یاراں

ظہیر جاوید

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ شعر و ادب کی دنیا میں جناب فیض احمد فیض نے امامِ وقت کا مقام حاصل کیا ہے اور شاعروں کی جس لڑی نے ولی دکنی، میر و سودا، انشاء، مصحفی، غالب، ذوق اور مومن و داغ سے لے کر شاد عظیم آبادی، علامہ اقبال اور جوش تک کو پرو رکھا ہے، فیض صاحب نے بھی اسی لڑی میں جگہ پائی ہے اور اب ان کے جانے کے بعد نگاہیں ہر جا کامل کو ڈھونڈ رہی ہیں۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فیض صاحب کو اردو کے ایک متحرک عہد نے فیض احمد فیض بنایا تھا۔ آج اردو کا وہ متحرک دور نہیں ہے۔ اردو زبان اپنا مقام کھو رہی ہے۔ اس کی باریکیاں اور اس کی گہرائی نگاہوں سے اوجھل ہونے لگی ہے۔ اردو کے چلتے پھرتے سکول تہہ خاک سو گئے ہیں۔ معلم وقت کوئی نہیں اور وہ چراغ محفل کا کہیں دور دور تک نشان نہیں ہے۔

آیئے! فیض احمد فیض کے قدموں کے نشان تلاش کریں۔

فیض احمد فیض 13 فروری 1911ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے مولوی ابراہیم سیالکوٹی کے مدرسے میں حاصل کی۔ پھر مشن ہائی سکول میں پڑھے۔ اس کے بعد فیض صاحب نے مرے کالج سیالکوٹ میں تعلیم پائی۔ اسی دوران میں انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم حضرت علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے حاصل کی۔ اس کے بعد جناب فیض نے لاہور کے گورنمنٹ کالج سے پہلے عربی میں بی اے آنرز کیا پھر انگلش میں ایم اے، یہ 1932ء کی بات ہے۔ ان کا اگلا قدم اورینٹل کالج لاہور سے ایم اے عربی تک تھا اور اتنی تعلیم پانے کے بعد انہوں نے 1935ء میں ایم اے او کالج امرتسر میں پہلی نوکری کی۔ اس وقت اس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر تھے اور انہوں نے فیض صاحب کو انگریزی کا لیکچرر رکھا۔

لاہور میں پہلی بار فیض صاحب کا قیام 1928ء سے 1935ء تک رہا۔ ان برسوں میں لاہور اردو زبان کا ترجمان بنا ہوا تھا۔ مولانا محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی کے بعد انجمن حمایت اسلام اور حکیم شجاع الدین کی محفلوں میں بہت سے نوجوان فیض پا چکے تھے اور "شورِ محشر" کی ادبی تحریروں نے بہت سے جوانوں کی تربیت کی تھی۔ ان بزرگوں سے ادبی محفل سجانے کے اس رواج کو لے کر حضرت علامہ اقبال اٹھے تھے۔ انہوں نے بازار حکیماں میں ادبی تربیت گاہ قائم کی تھی۔ دوسری طرف نواب ذوالفقار خان نے پٹیالے سے لاہور آ کر 1912ء میں اپنی رہائش گاہ "زرافشاں" میں ادبی محفل کا اہتمام کیا تھا اور علامہ کے ساتھ وہ بھی اردو کی درسگاہ بن گئے تھے۔ 1918ء میں مولانا تاجور نجیب آبادی نے انجمن ارباب علم پنجاب قائم کی جس کے تاحیات صدر سر عبدالقادر ہوئے۔ اس انجمن نے کئی رسالے شائع کیے، نظموں کے کئی مجموعے مرتب کرائے اور شعر و ادب کی پرورش کے ہر رنگ اور آہنگ کو اختیار کیا۔

سر عبدالقادر بڑی محترم شخصیت کے مالک تھے اور اس میں کچھ کلام نہیں کہ حضرت علامہ اقبال کا حوصلہ سر عبدالقادر ہی تھے۔ علامہ نے جب جب شاعری ترک کرنا چاہی انہیں محترم عبدالقادر نے روکا اور یہی سمجھایا کہ ان کی شاعری مسلمانوں میں زندگی کی نئی روح پھونک

سکتی ہے۔ ان کی اس دوستی اور قربت کا ایک خوبصورت ثبوت حضرت علامہ کا پہلا شعری مجموعہ بانگِ درا ہے، اس کا دیباچہ سر عبدالقادر کا لکھا ہوا ہے، اس میں سر عبدالقادر پر حضرت علامہ کی نظم موجود ہے، یہ شعری مجموعہ 1924ء میں شائع ہوا تھا۔

یہ باتیں لاہور میں فیض صاحب کی آمد سے پہلے کی ہیں، جب فیض صاحب لاہور آئے تو اس وقت حضرت علامہ اقبال کی شخصیت پر سر عبدالقادر کی انگریزی میں ایک کتاب آ چکی تھی اور انہوں نے 1930ء میں پنجاب لٹریری لیگ کے پہلے اجلاس میں حضرت علامہ اقبال کی فارسی شاعری پر مضمون بھی پڑھا تھا۔ یہ مضمون ایک یادگار دستاویز ہے۔ یہ تو حضرت علامہ سے سر عبدالقادر کی نسبت کا معاملہ تھا اس سے ہٹ کر انجمن ارباب پنجاب نے مشاعروں کا جس طرح اہتمام کیا اور سر عبدالقادر کے "مخزن" نے جس طرح اردو کو آگے بڑھایا اس نے سخن وروں کی نئی فصل اگادی، یہ کیفیت بلکہ اس طرح سے سامنے آئی کہ انجمن ارباب پنجاب کے بعد 1919ء میں حکیم احمد شجاع نے "ہزار داستان" شائع کیا تو پطرس بخاری، امتیاز علی تاج، عبدالمجید سالک، عابد علی عابد اور اختر شیرانی جیسے نوجوان ابھر کے سامنے آئے، ان میں سے جناب حفیظ جالندھری نے دورِ جدید کے مخزن کی ادارت سنبھالی، حکیم یوسف حسن نے نیرنگ خیال نکالا، پطرس بخاری کا طنز و مزاح اور ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کے تنقیدی مضامین ان دونوں ادبی رسالوں مخزن اور ہزار داستان کی جان تھے۔

جس وقت فیض صاحب نے لاہور میں قدم رکھا تو یہ سب اصحاب لاہور کے دل کی دھڑکن بنے ہوئے تھے اور نوجوان ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر کا ادبی چلبلا پن انہیں رونق بزم کا مقام عطا کر چکا تھا، ایسے میں جناب تاثیر نے ایک ادبی شاہکار تخلیق کر ڈالا، اس شاہکار کا نام "کارواں" تھا۔ ڈاکٹر تاثیر کوئی عام شخصیت نہیں تھے ان کی پرورش میاں نظام الدین نے کی تھی، میاں نظام الدین، میاں امیر الدین کے بھائی تھے اور میاں امیر الدین کے صاحبزادے صلاح الدین کی شادی حضرت علامہ اقبال کی بھتیجی [illegible] سے ہوئی تھی، ان تعلقات نے جناب تاثیر کو جہاں شخصی اعتبار سے بہت مضبوط بنا دیا تھا، وہاں علم کی روشنی، علم کی لگن اور علمی جوہر ہونے نے انہیں آگے بڑھایا اور وہ ایک مستند استاد، شاعر اور ادیب تسلیم کر لیے گئے۔ ایسے میں وہ ادب اور مصوری کے ملاپ کے ایک خوبصورت تجربہ "کارواں" کو سامنے لائے، اسے جناب عبدالرحمن چغتائی کی مصوری سے سجایا گیا تھا، جناب عبدالرحمن چغتائی فن کی دنیا میں اسی مجلے کی بدولت متعارف ہوئے تھے۔

یہ 1930ء کا زمانہ ہے، چراغ حسن حسرت کلکتہ سے لاہور آ چکے تھے اور عرب ہوٹل ان کی ادبی محفل کا مرکز بن چکا تھا۔ عرب ہوٹل ریلوے روڈ پر اسلامیہ کالج کے بالکل سامنے تھا، جناب تاثیر اسلامیہ کالج میں پڑھاتے تھے اس لئے عرب ہوٹل کی محفلوں میں ان کی شرکت دوسروں سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس زمانے میں لاہور کی ریلوے روڈ، برف خانہ چوک، پیچھے دل محمد روڈ کی طرف نکلتی اور اوپر سرکلر روڈ کی جانب بڑھتی سڑک اخباری دنیا کا مرکز ہوا کرتی تھی، کتب خانے بھی یہیں پر تھے اس لئے یہ بارونق علاقہ تھا، یہی وجہ تھی لاہور کی دوسری ادبی محفلوں سے زیادہ ہجوم عرب ہوٹل میں ہوتا تھا اور مولانا عبدالمجید سالک، جناب تاثیر، پطرس بخاری، مجید ملک، اختر شیرانی، حفیظ ہوشیارپوری، مظفر حسین شمیم، کرشن چندر، باری علیگ، مولانا صلاح الدین احمد، حکیم محمد حسن قرشی، راجہ حسن اختر، پروفیسر علم الدین سالک، سید عبداللہ اور مولانا احمد شاہ بخاری یہاں زیادہ نظر آتے تھے، مولانا ظفر علی خان بھی گاہے گاہے قدم رنجہ فرماتے تھے۔

والد بزرگوار چراغ حسن حسرت کلکتہ میں قیام کے دوران 1925ء میں ایک ماہوار مصور اردو رسالہ آفتاب شائع کر چکے تھے، یہ رسالہ دو سال تک جاری رہا تھا، مگر صحافتی سفر میں والد صاحب کا یہ پڑاؤ بہت بعد میں آیا، انہوں نے اپنے سفر کا آغاز 1921ء میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ہفتہ وار اخبار پیغام سے کیا تھا، اس وقت ان کی عمر سترہ برس تھی پھر وہ عصرِ جدید اور نئی دنیا کے مدیر رہے، انہوں نے مولانا

شائق احمد عثمانی سے صحافت سیکھی تھی، جناب شاد عظیم آبادی کی محفل میں غزل کی تربیت پائی تھی، آغائے مؤید الاسلام جلال الدین طہرانی سے سیاست پر گفتگو کا سلیقہ حاصل کیا تھا، وہ سبھاش چندر بوس سے بھی ملے تھے جناب بوس کی خواہش پر ہی ''جمہور'' جاری ہوا تھا اور والد صاحب اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔

لاہور میں ان کی آمد 1929ء میں ہوئی، انہیں مولانا ظفر علی خان کلکتہ سے لاہور لائے تھے اور زمیندار کا مدیر معاون مقرر کیا تھا اس وقت والد صاحب کے کالموں نے ہندوستان بھر میں دھوم مچا رکھی تھی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خان، مولانا حسرت موہانی اور حضرت علامہ اقبال ان کے کالموں کی کھل کر تعریف کر چکے تھے، اس لئے وہ غیر معروف نہیں تھے، بلکہ لاہور کی ادبی شان میں ایک قابل قدر اضافہ تھے۔ لاہور کے ادیبوں سے والد صاحب کی دوستیاں آفتاب کے زمانے سے ہی قائم تھیں۔ اور اہل لاہور کی نظمیں غزلیں بھی شاد عظیم آبادی اور وحشت کلکتوی جیسے بزرگوں کے ساتھ شائع ہوتی تھیں، چنانچہ لاہور میں انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا، لاہور کے سب دوستوں میں مولانا عبدالمجید سالک صاحب کے ساتھ والد صاحب کے گہرے مراسم تھے جو تادم آخر قائم رہے۔

1930ء کے اس منظر نامے میں فیض احمد فیض بازار حکیماں سے لے کر عرب ہوٹل تک کی تمام محفلوں میں ایک سامع کی حیثیت سے شرکت کرتے اور بزرگوں کی گفتگو سے سیکھتے رہے ہیں۔ فیض صاحب کی تربیت کرنے والوں میں ایک نام جناب پطرس بخاری کا ہے، بخاری صاحب اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں انگریزی پڑھاتے تھے اور سول اینڈ ملٹری گزٹ میں ان کے مضامین نہ صرف انہیں ایک دنیا سے متعارف کرا گئے تھے بلکہ ان کی انگریزی کے منفرد انداز تحریر کا لوہا بھی منوا گئے تھے۔ نیرنگ خیال اور کارواں میں ان کا طنز و مزاح اردو میں بھی ان کا سکہ رائج کئے ہوئے تھا۔ حضرت علامہ اقبال کے ہاں ان کی اکثر حاضری رہتی تھی وہاں فلسفے پر نکتے اٹھاتے رہتے تھے، حضرت علامہ کی نظم ''ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام'' دراصل ان کے ہی نام ہے۔ فیض صاحب اور ن م راشد نے گورنمنٹ کالج میں پطرس بخاری صاحب سے ہی انگریزی کی تعلیم پائی تھی۔

فیض صاحب کی تربیت میں مجید ملک صاحب کا بھی ہاتھ ہے۔ مجید ملک لاہور کے رہنے والے اور ان کا تعلق انگریزی کی صحافت سے تھا۔ وہ لاہور کے روزنامہ مسلم آؤٹ لک سے وابستہ تھے مگر اردو پر بھی ان کی بڑی گرفت تھی۔ ایک زمانے میں ان کی نظم ''مگر اے حسینہ ناز نیں، مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں'' بہت مشہور ہوئی تھی اور آج بھی عام طور پر ان کی شناخت اسی نظم سے ہوتی ہے یہ نظم پہلی بار کارواں میں ہی 1934ء میں شائع ہوئی تھی، مجید ملک صاحب کی پہچان صرف یہ نظم نہیں ہے ان کا مقام بہت بلند ہے۔ مسلمانان ہند اور اسلامیان پاکستان کے لئے ان کی خدمات کا کچھ شمار نہیں کیا جا سکتا، پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ جناب مجید ملک، فیض صاحب کی اصلاح کرتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد لکھتے ہیں کہ مجید ملک ایک دن میری موجودگی میں فیض سے کہنے لگے'' بھئی تم تو عربی دان ہو مگر کل جب تم اپنا ایک شعر سنا رہے تھے تو تم نے بے نیل مرام کو بے نیل و مرام پڑھا'' فیض نے جھینپ کے کہا'' مجید بھائی غلطی ہو گئی ہوگی'' مجید ملک صاحب نے جرح جاری رکھتے ہوئے کہا'' نہیں، میں آج تمہاری کتاب دیوان دست صبا دیکھ رہا تھا اس میں بھی بے نیل و مرام لکھا ہے'' فیض صاحب نے بعد میں اس غلطی کو درست کر لیا اور نسخہ ہائے وفا میں اصلاح کے بعد ان کا شعر یوں آیا ہے کہ

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد | کوچہ یار سے بے نیل مرام آتا ہے

یاد رہے کہ دست صبا 1952ء میں شائع ہوئی تھی اور مجید ملک صاحب کی اس اصلاح کا تعلق شاعری سے نہیں زبان سے ہے،

شاعری میں فیض صاحب، مجید ملک سے بہت آگے تھے۔ مجید ملک اور ان کی بیگم آمنہ نے فیض صاحب کو انگریزی صحافت میں طاق کیا تھا۔ بیگم آمنہ پہلی ہندوستانی خاتون تھیں جو رائٹر کی نمائندہ ہوئیں۔ فیض صاحب خالہ آمنہ کے لاڈلے اور ان سے چھوٹے بھائی کی طرح جھاڑیں کھا لیتے تھے۔ بنیادی طور پر یہ صاحبان انگریزی سے بندھے ہوئے تھے ان میں صرف والد صاحب ہی خالص مشرقیت کے ترجمان تھے۔ ہمارے ہاں مخلوط محفلوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ خانساماں تھا، بیرا تھا، چوکیدار تھا۔ ڈائننگ ہال بھی تھی۔ مہمانوں کو کشمیری چائے اور کھانے میں طرح طرح کی ڈشیں ملتی تھیں۔ والدہ گھر کے تقدس اور میری پرورش کے معاملے میں کوئی رعایت نہیں کرتی تھیں۔ مردوں کی اور خواتین کی بیٹھک الگ رکھتی تھیں۔ وہ عبدالمجید سالک صاحب کو چھوڑ کر والد صاحب کے سب دوستوں سے پردہ کرتی تھیں۔ ہمارے گھر میں اونچی آواز میں بولنا یا ہنسنا برا سمجھا جاتا تھا۔ مہمانداری بہت تھی اور میرے والدین اسی میں خوش رہتے تھے کہ ان کے گھر میں ریل پیل لگی رہے۔ چنانچہ عزیز و اقارب کا آنا جانا لگا رہتا تھا۔ جو نہیں آتا اسے خط لکھ کے بلایا جاتا اور پوچھا جاتا کہ میاں کیوں نہیں آئے۔ تاخیر کا سبب کیا ہے؟

میں نے جب ان ادبی شخصیات کو پہلی بار دیکھا تو یہ بزرگ انڈیا گیٹ دہلی کی اس کوٹھی کے لان میں بیٹھے کشمیری چائے پی رہے تھے جو برطانوی فوج کے ادبی شعبے سے وابستگی پر والد صاحب کی رہائش گاہ تھی۔ جب مجھے ان کے حضور پیش کیا گیا تو ان کے درمیان ادبی گفتگو جاری تھی۔ والد صاحب اساتذہ میں سے کسی شاعر کا تذکرہ کر رہے تھے۔ ان کے شعر سنا رہے تھے اور بخاری صاحب، تاثیر صاحب چٹکیاں بھر رہے تھے۔ جناب مجید ملک خاموش، ہمہ تن گوش تھے اور جناب فیض گفتگو سنتے ہوئے ٹہل رہے تھے۔ خالہ آمنہ والدہ کے پاس تھیں۔ والدہ نمازی پرہیزگار اور سادہ خاتون تھیں۔ مردوں کی محفل میں نہیں بیٹھتی تھیں۔ ادیبوں کی بیگمات اور ان کے بچے زنان خانے میں ان کے پاس آ کر محفل جماتے تھے۔ دہلی میں جناب غلام عباس کی والدہ، ان کی پہلی بیگم اور بچے بڑے شوق سے آتے تھے۔ انکل تاثیر کی بیگم اور میری آنٹی کرس اگرچہ اردو نہیں بول سکتی تھیں مگر ہمارے ہاں گاہے بگاہے آتیں اور والدہ سے اشاروں میں باتیں کرتی رہتی تھیں۔ والدہ ان کے لئے خاص طور پر چائے کے ساتھ اپنے ہاتھوں سے کوئی کشمیری ڈش پکا کے ضرور رکھتی تھیں۔ آنٹی ایلس بھی کبھی کبھی والدہ سے ملنے آتی تھیں۔ وہ اردو بول لیتی تھیں، اس لئے ان کے اور والدہ کے درمیان بات چیت آسان رہتی تھی، اور یہ بات چیت عموماً کھانے اور اس کی ترکیبوں کے گرد گھومتی رہتی تھی۔

یوں تو یہ تمام اصحاب یعنی جناب پطرس، جناب مجید ملک، جناب تاثیر، جناب فیض اور والد صاحب ایک دوسرے کے بہت قریب تھے لیکن انکل تاثیر کے ساتھ والد صاحب کی گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ تھے ہی دل کو چھو لینے والے۔ بچوں، بڑوں سب کے لاڈلے۔ مجھے انکل تاثیر ہمیشہ ٹیمو (شالقم) کہہ کر بلاتے تھے اور میں اتوار کو ان کی بیٹیوں سلمیٰ اور مریم کے ساتھ ہمایوں کے مقبرے جایا کرتا تھا۔ ہمیں اردو صحافت کی ایک خاموش شخصیت بدر الدین کی نگرانی میں بھیجا جاتا تھا اور ہم وہاں آنکھ مچولی کھیلتے تھے۔ اگر ادھر نہیں جاتے تو قطب مینار کی طرف نکل جاتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم لاہور میں تھے تو انکل باری علیگ، انکل رشید اختر ندوی، انکل کیپٹن ممتاز ملک، انکل غلام محمد اور ان کی بیگم خالہ ثریا اور کراچی میں انکل حفیظ ہوشیار پوری کے خاندان کے بچوں اور بیگمات کا ہمارے ہاں زیادہ آنا جانا تھا۔ ان دوستوں میں پطرس بخاری صاحب شاعری نہیں فرماتے تھے مگر جیسے ملک محفل کی بات ہوتی ہے اس حساب سے ان کے کوئی دس بیس شعر ہیں۔ رہے مجید ملک تو وہ 1940ء سے پہلے ہی ادبی سرگرمیاں ترک کر چکے تھے۔ ان چاروں میں تاثیر صاحب کی اردو ادب کے ساتھ بندش بڑی توانا

تھی۔ انہوں نے آخر دم تک اپنا یہ تعلق قائم رکھا۔ مجھے ان سے ان کا ایک شعر آج بھی یاد ہے، جو یوں تھا کہ

دل میں جو کچھ ہے انہی کا ہے ہمارا کیا ہے   آرزو ان کی، طلب ان کی، تمنا ان کی

کاروان کا پہلا رسالہ 1933ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کے بعد جناب تاثیر تو انگریزی کی اعلیٰ تعلیم کے لئے کیمبرج چلے گئے اور کاروان کا دوسرا مجلہ مجید ملک صاحب نے چغتائی صاحب کے ساتھ مل کر شائع کیا۔ اس شمارے میں ہی نیاز مندان لاہور کا وہ مشہور مضمون "یوپی کے تنقید نگاروں کی خدمت میں" شامل اشاعت تھا، جس میں لاہور کے اصحاب اردو نے اہل پنجاب کی تحریروں پر اہل یوپی کی پھبتیوں کا جواب دیا تھا۔ یہ پہلا جواب تھا۔ اس کے بعد دونوں طرف سے جو علمی نوک جھونک شروع ہوئی وہ دس برس تک جاری رہی اور اس دوران میں زبان و بیان کی بڑی باریکیاں سامنے آئیں۔ اساتذہ کے کلام اور نگارشات کو دلائل کے طور پر پیش کیا گیا۔ انجمنوں، کالجوں اور ادبی رسالوں میں ایک ایک لفظ کو کھول کھول کر یوں بیان کیا گیا کہ ایک نوجوان نسل کی تربیت ہو گئی۔ نیاز مندان لاہور میں مولانا عبدالمجید سالک، چراغ حسن حسرت، پطرس بخاری، مجید ملک، ایم ڈی تاثیر، امتیاز علی تاج، صوفی تبسم، حفیظ جالندھری اور ہری چند اختر کے نام آتے ہیں اور ان بزرگوں کی ان ادبی کاوشوں کے نتیجے میں ہی لاہور کو اردو کی ادبی روایت میں دلی اور لکھنو کی طرح ایک منفرد دبستان کا مقام حاصل ہوا۔

فیض احمد فیض، حمید نظامی، شورش کاشمیری، ن م راشد اور کرشن چندر جیسے اصحاب کی بنیادی تربیت اسی ماحول میں اور ان بزرگوں نے ہی کی۔ پھر ان دنوں لاہوری دروازے کے قریب اردو بازار کے سامنے ایک ہال ہوا کرتا تھا، یہاں باقاعدہ مشاعرے ہوتے تھے جن میں نیاز مندان لاہور کے مشاعرے میں مولانا عبدالمجید سالک، جناب حفیظ جالندھری، جناب تاثیر، جناب صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور مولانا تاجور کے مشاعروں میں جناب وقار انبالوی، جناب فاخر ہریانوی، جناب روش صدیقی، جناب اختر شیرانی، جناب احسان دانش جیسے بزرگ نغمہ سرا ہوتے اور اردو کا رنگ جماتے تھے۔ ان مشاعروں میں بھی ایک دوسرے پر شعر اچھالے جاتے تھے اور ان سے نوجوانوں کو شعری آداب کا علم ہوتا تھا۔

لاہور میں اردو کے ان بہتے دریاؤں سے بے شمار نوجوانوں نے علم و ادب کے موتی چنے اور ان میں سے ہر شخص اپنی لگن کے مطابق مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔ جناب شورش کاشمیری اور جناب حمید نظامی نے صحافت میں نام پیدا کیا۔ محترم کرشن چندر افسانوں کی دنیا میں چمکے۔ جناب محمود نظامی اور جناب یوسف ظفر نے ریڈیو کو آباد کیا۔ ن م راشد، میرا جی نے شاعری میں قدر پائی مگر ان سب میں قد آور شخصیت جناب فیض احمد فیض کی رہی۔

جناب پطرس بخاری، جناب تاثیر اور جناب مجید ملک انگریزی ماحول اور آداب کو پسند کرنے والے اصحاب تھے، اس لئے ان تین اصحاب میں زیادہ قربت تھی۔ ہم انہیں اس دور کے بادشاہ گر کہہ سکتے ہیں۔ یہ اصحاب انگریزی کو اردو میں لانے کی شہرت رکھتے ہیں۔ جناب شورش کاشمیری اسے یوں بیان کرتے ہیں کہ تاثیر، پطرس اور مجید ملک کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انگریزی خیالات کو اردو میں سمویا اور یورپی شعر و ادب کو اردو کا جامہ پہنایا۔ فیض صاحب نے انگریزی بود و باش کا انداز ان سے ہی حاصل کیا۔

یوں اس محفل میں فیض صاحب نے شاعری کا یورپی انداز جناب تاثیر سے اور انگریزی صحافت کی تربیت مجید ملک سے حاصل کی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جناب فیض نہ تو انگریزی صحافت کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں اور نہ ان کی وجہ شہرت شاعری کے یورپی انداز کو اردو

میں سموئے گئی ہے۔ پھر ان کی شاعری کا انداز جناب تاثیر سے بھی مختلف ہے وہ تو خالص اردو کے شاعر ہیں اور "تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے" اور "چند روز اور مری جان فقط چند ہی روز" اور "جیسے مصرعوں کو دلوں کی دھڑکن بنا دیتے ہیں، یوں جناب پطرس بخاری، جناب تاثیر، جناب مجید ملک، اور خالد احمد کے ساتھ اس محفل میں چراغ حسن حسرت کی شمولیت نمایاں ہو جاتی ہے اور میں شاہد ہوں کہ فیض صاحب نے والد صاحب کے ساتھ جو آخری نشست فرمائی تھی اس میں بھی وہ ان سے کرید کرید کر علم و ادب کی باتیں پوچھ رہے تھے۔ گفتگو استاد ذوق کی غزل ... کیکر تیرے آگے نہ نکلے جو دعا کروں ... کے گرد گھومتی رہی تھی مگر یہ بعد کی بات ہے۔

میں دہلی کی جس ملاقات کا ذکر کر رہا ہوں وہ غالباً 1942-43ء کی ہے، اس وقت میں کوئی پانچ سال کا تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب جناب مجید ملک برطانوی فوج کے تعلقات عامہ میں افسر ہو چکے تھے۔ انہوں نے والد صاحب اور اپنے کئی دوستوں کو اس شعبے میں بھرتی کر لیا تھا، ان میں فیض صاحب بھی تھے۔ فیض صاحب 1942ء سے 1947ء تک فوجی خدمات انجام دیتے، انگریزوں کے حق میں پراپیگنڈہ کرتے اور ہندوستانیوں کو فوج میں بھرتی ہو کر جنگ میں جانے کی ترغیب بھی دیتے رہے تھے۔ فیض صاحب کی زندگی کے ان پانچ برسوں پر بہت کم کام ہوا ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی فوجی زندگی کے ان پہلوؤں پر بات کی جائے۔ انگریز سرکار کی اس ملازمت سے پہلے ان کا صرف ایک مجموعہ کلام نقش فریادی (1943ء) منظر عام پر آیا تھا، اس فوجی دور میں بھی ان کے کچھ اشعار ضرور ملتے رہے مگر ان کی حیثیت ابتدائی ہی رہی البتہ اس دور کے گزرنے اور آزادی ملنے پر فیض صاحب نے جو فرمایا وہ عمر بند ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر — وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
کہاں سے آئی نگار صبا کدھر کو گئی — ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

جناب فیض نے یہ نظم تقسیم سے چند دن پہلے سرینگر میں سنائی تھی۔ اس کے بعد فیض صاحب کا صحافتی دور شروع ہوتا ہے، وہ میاں افتخار الدین کے ادارے پروگریسو پیپرز لمیٹڈ کے چیف ایڈیٹر ہو جاتے ہیں۔ پاکستان ٹائمز اور امروز نکلتے ہیں تو فیض صاحب کے کہنے پر والد صاحب کو امروز کا ایڈیٹر لیا جاتا ہے، ابتدائی دنوں میں امروز کا اداریہ فیض صاحب ہی لکھتے تھے، اس پر جناب شورش کاشمیری نے روزنامہ "آزاد" میں فیض صاحب کے اداریے کے سلسلے میں یہ اداریہ لکھا کہ "اظہار کی زبان اور خیال کی زبان میں تضاد پایا جاتا ہے" یعنی شورش صاحب کا کہنا تھا کہ فیض صاحب اداریہ انگریزی میں سوچتے اور اردو میں لکھتے ہیں، شورش صاحب کے اداریے کا نتیجہ یہ نکلا کہ فیض صاحب امروز سے الگ ہو گئے، امروز چراغ حسن حسرت کا شاہکار بنا اور فیض صاحب نے پاکستان ٹائمز کو مشق سخن بنایا۔

اسی دور سے متعلق فیض صاحب کی اپنی ایک تحریر بھی ملتی ہے جس سے ان احباب کے تعلق پر روشنی پڑتی ہے جناب پطرس پر اپنے مضمون "..... کہ گوہر مقصود گفتگو ست" میں وہ اس وقت کی بات لکھ رہے ہیں جب وہ چیف ایڈیٹر تھے، لکھتے ہیں "ایک رات میرے ہاں محفل عروج پر تھی، تاثیر مرحوم، حسرت مرحوم، صوفی تبسم، عابد علی عابد، آغا بشیر احمد اور بخاری صاحب موجود تھے، حسرت صاحب نے انہی دنوں ایک عجیب و غریب عربی کا ناچ دیکھا تھا اور مختلف ثقافت آواز میں گھیری کی کسی غزل پر اس عربی دھن کی چھری چلا رہے تھے، اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی، ہمارے رپورٹر میاں شفیع ٹیلیفون پر تھے، کہنے لگے، ابھی ابھی ایک ٹیلیفون آپریٹر نے گورنمنٹ ہاؤس سے ٹیلیفون ملاتے ہوئے سنا ہے کہ قائد اعظم فوت ہو گئے ہیں، یہ سننا تھا کہ نشست برخاست ہوئی۔ سب نے پی پی ایل کا رخ کیا، دفتر پہنچ کر ہزار جگہ سے خبر کی تصدیق چاہی لیکن کسی نے کچھ بتا کر نہ دیا، میں نے طے کیا کہ پاکستان ٹائمز اور امروز کے ضمیمے بہرحال تیار کر لئے جائیں، ممکن

بے رات میں کسی وقت کوئی اطلاع پہنچ جائے۔ میں اداریہ لکھنے بیٹھا، بخاری صاحب مرحوم کی سوانح حیات مرتب کرنے لگے صوفی صاحب قطعہ تاریخ کی فکر کرنے لگے۔ تاثیر مرحوم اور حسرت مرحوم امروز کی ترتیب میں مصروف ہو گئے۔ تین بجے کے قریب خبر کی تصدیق ہوئی"۔

اس تحریر کی خاص بات یہ ہے کہ بخاری صاحب، تاثیر صاحب اور صوفی صاحب تو پی پی ایل کے عملے میں شامل نہیں تھے، پھر یہ اصحاب کیا کر رہے تھے؟؟؟؟ آج کا زمانہ ہوتا تو یہ کہتے اچھا بھائی تم کام کرو ہم چلتے ہیں مگر یوں نہیں ہوا سب یکسو ہو کر کر رہے تھے، کیوں؟...... وہ اپنے دوستوں کو خوب سے خوب تر بنا رہے تھے ان کی عزت بڑھا رہے تھے۔ یہ تھا اس زمانے کا دستور...... اتنی محبت، اتنا پیار کرنے والے دوستوں میں نفاق بہت دکھ دیتا ہے میں نے اپنے والد صاحب کو دیکھا ہے وہ تاثیر صاحب کو یاد کر کے بہت روتے تھے۔ تاثیر صاحب شاید اپنی بیماری کی بدولت پھیلنے لگے تھے، وہ پہلے حسن عسکری صاحب پر چڑھ دوڑے، پھر ترقی پسند ادیبوں کو لتاڑتے بیٹھے جانے سے پہلے والد صاحب سے الجھے آخر میں فیض صاحب کو بھی دکھی کر گئے۔

جس زمانے میں روزنامہ امروز کا دفتر ایبٹ روڈ پر نشاط سینما کے ساتھ تھا، اور والد صاحب اس سے وابستہ ہوئے تو میری عمر گیارہ برس کی ہو چکی تھی۔ میں وہاں باقاعدگی سے جانے لگا۔ کلاسیکی ادب کے ساتھ ساتھ وہ معاصر کو بھی پڑھنے لگا تھا فسانہ آزاد، آب حیات، طلسم ہوشربا کے ساتھ ساتھ جناب شوکت تھانوی کی حکایات اور جناب نسیم حجازی کی داستان مجاہد کو بھی سبق بنا چکا تھا۔ اس زمانے میں میں جب انکل فیض کو دیکھتا تو وہ مجھے عجیب انسان معلوم ہوتے تھے اتنے بھی نہ جائے، نہ کوئی گیت گنگناتے تھے جبکہ میرے نزدیک شاعر وہی تھا جو ہر حال میں رہے، مرید، شیخ ملک، سنگل کیلئیں اور طلعت محمود کی آواز میں لہراتی ہوئی گفتگو کرے۔ میں چونکہ فیض صاحب کی "نقش فریادی" پڑھ چکا تھا اور یہ جانتا تھا کہ وہ شاعر ہیں اس لئے مجھے ان پر افسوس ہوتا تھا۔ میں ان کے لئے دکھی تھا اور یہ دکھ اس وقت اور بڑھ جاتا جب میں دیکھتا کہ وہ والد صاحب کے پاس آ کر بیٹھتے ہیں، جھجک جھجک کر کچھ سیاسی باتیں کرتے ہیں، عجیب عجیب سوال پوچھتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، نہ ہنستے ہیں نہ گاتے ہیں۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا میں نے ایک دن کوریڈور میں فیض صاحب کو روک لیا اور بڑے مدبرانہ انداز میں انہیں مشورہ دیا "انکل آپ ماڈرن بنا کریں.... یوں نہ رہا کریں کہ ہمیں ترس آتا ہے.... سنا کیجئے" فیض صاحب کچھ حیرت زدہ ہوئے، مسکرائے اور والد صاحب کے کمرے کی جانب بڑھ گئے، پیچھے وہاں سے قہقہے اٹھے پھر میری طلبی ہوئی اور قہقہوں میں مجھ سے یوں نہ رہو کو سنانے کی فرمائش ہوئی۔ یہ فرمائش بھی میری شنوائی کا حصہ تھی۔

یہاں سے میری اور فیض صاحب کی جان پہچان ہوئی، وہ ملتے تو ایک آدھ فقرہ ضرور کہتے، مثلاً پوچھتے "کیا پڑھ رہے ہو" میں عرض کرتا فسانہ آزاد، گلشن بے خار، یا جو کتاب زیر مطالعہ ہوتی اس کا نام لے دیتا، مجھے یاد ہے کہ یہ میرا "طلسم ہوشربا" پڑھنے کا وہ دور تھا جب میں زبان کا مطالعہ نہیں کر رہا تھا بلکہ ابھی صرف کہانی سے لطف لے رہا تھا، میری نظر عمر عیار کی عیاریوں اور برق کی چالاکیوں سے آگے نہیں گئی تھی مگر نہ چاہتے ہوئے بھی طلسم ہوشربا کے اشعار، الفاظ کی بندش اور نقشہ کشی ذہن پر اپنے اثرات مرتب کرنے لگی تھی اور میں مزنگ سکول کی بزم ادب میں تاریخی کہانیاں سنانے لگا تھا۔

جب کوئی اس راہ پر قدم اٹھا لے تو ادب کی تمیز آ جاتی ہے وہ کچھ کچھ پہچاننے لگتا ہے۔ اس لئے مجھے جناب فیض سے لے کر قتیل شفائی تک سب کی تھوڑی تھوڑی پہچان ہو گئی اور میں مودب ہوتا چلا گیا۔ فیض صاحب آتے دکھائی دیتے تو میں راستہ چھوڑ دیتا، بہت

کے کھڑا ہو جاتا اور انہیں سلام کرتا۔ وہ اپنی دُھن میں ہوتے تو جواب بھی نہ دیتے اور اگر دیکھ لیتے تو مسکرا کے کچھ نہ کچھ کہہ دیتے۔ اس زمانے میں ہم وارث روڈ پر، تاثیر صاحب مسن روڈ پر اور فیض صاحب قلعہ پہاڑی کے قریب رہتے تھے، اور تانگہ شاہی سواری ہوتی تھی۔ بخاری صاحب 50-49ء میں اقوام متحدہ چلے گئے تو دوستوں کی یہ محفل بکھر گئی، پہلے تاثیر صاحب الگ ہوئے پھر 30 نومبر 1950ء کو ان کا انتقال ہو گیا۔ مجید ملک صاحب اطلاعات کے محکمے سے وابستہ ہو کر کراچی چلے گئے ایسے میں لاہور میں فیض اور حسرت ہی رہ گئے اور ان کی محفلیں بھی پہلے سی نہ رہیں۔ یہی وہ وقت تھا جب مارچ 1951ء میں فیض صاحب فوج کے کئی جرنیلوں کے ساتھ گرفتار کر لئے گئے، اور پنڈی سازش کیس کی خبر سب کو مبہوت کر گئی۔ شروع شروع میں تو پتہ ہی نہیں چلا کہ فیض صاحب کس جیل میں ہیں، پھر جب والد صاحب کو ان کا ٹھکانہ مل گیا تو ان کی فکر کچھ کم ہوئی۔ انہوں نے اپنے ذرائع سے فیض صاحب کو سگریٹ اور کچھ لوازمات بھجوانے کا بندوبست کیا۔ مجھے لے کر آنٹی ایلس کے پاس پہنچے تو سلیمہ اور منیزہ لان میں کھیل رہی تھیں، ہم ڈرائنگ روم میں آنٹی ایلس سے ملے، مجھے یاد ہے کہ والد صاحب انہیں تسلیاں دیتے رہے تھے، آنٹی بوجھل دل لئے خاموش تھیں گو میں اس وقت تیرہ برس کا تھا مگر مجھے کچھ سمجھ نہیں تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ بس میں اپنی کرسی سے اٹھ کر ان کے پاس جا بیٹھا۔ میں نے اپنا ہاتھ آنٹی کے ہاتھ پر رکھ دیا اور بہت صبر والی آنٹی ایلس کے آنسو نکل آئے۔

میں نے اب تک جو لکھا وہ تمہید ہے، محض تمہید، اور اس کا مقصد صرف ایک ادبی ماحول کو آپ پر اجاگر کرنا اور اس ادبی ماحول میں ان دونوں کے قرب کا ایک ہلکا سا خاکہ مرتب کرنا ہے۔ اس تعلق کی اصل تصویر تو ان دونوں بزرگوں نے خود آپ کے لئے مرتب کر دی ہے اور وہ تصویر ان دو خطوط سے واضح ہوتی ہے جو انہوں نے ایک دوسرے کو لکھے ہیں۔ یہ اس وقت لکھے گئے ہیں جب فیض صاحب پنڈی سازش کیس کی سزا کاٹ رہے تھے۔ یہ کل چھ خطوط تھے جو فیض صاحب نے مجھے بھیج دیئے تھے، یہ خطوط مجھ سے نقوش والے طفیل صاحب نے والد صاحب کی وفات کے دو سال بعد لئے تھے اور واپس نہیں کئے۔ آیئے پہلے والد صاحب کا خط پڑھتے ہیں۔ اس خط میں زیادہ تر فارسی کے اشعار ہیں، جو اصحاب فارسی نہیں جانتے ان کی سہولت کے لئے ان کا ترجمہ درج کر دیا ہے تاکہ سب لطف لے سکیں۔ یہ ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر طیب منیر صاحب نے کیا ہے اور خطوط بھی انہوں نے ہی فراہم کئے ہیں۔ والد صاحب لکھتے ہیں:

''مکرمی! میں نے آپ کو خط لکھا تو یہ امید نہیں تھی کہ اس قدر جلد جواب مل جائے گا، کیوں کہ مجھ سے بعض لوگوں نے کہہ رکھا تھا کہ قریب ترین عزیزوں کے سوا اور کسی سے خط و کتابت کی اجازت نہیں اور کرمانی (یہاں ایوب کرمانی کا حوالہ ہے جو امروز کے ادارتی عملے میں شامل تھے) نے تو مجھ سے کئی بار مراجعت کیا کہ اس نے کئی خط لکھے کوئی جواب نہ ملا۔ اب معلوم ہوا کہ معاملہ کی نوعیت مختلف ہے۔ میں نے ملاقات کے لئے درخواست دے دی ہے۔ معلوم نہیں یہ درخواست کتنے مرحلے طے کرے۔ بہر حال آپ کو کسی کتاب کی ضرورت ہو تو لکھ دیجئے، ساتھ لیتا آؤں گا۔ میری دو بے حیثیت کتابیں (زرنج کے خطوط اور بریت کی بیٹی کی طرف اشارہ) پچھلے دنوں چھپی ہیں، ان میں آپ کو لطف تو کیا آئے گا؟ پھر بھی ساتھ لے آؤں گا۔

اس گوشہ نشینی کے زمانے میں فارسی کے بعض شعرا کے کلام کے مطالعہ کا موقع ملا۔ سعدی کے کلیات کا ایک نسخہ ایران کا چھپا ہوا ہاتھ آیا ہے، لیکن اس میں مطائبات نہیں، مطائبات فحش سمجھ کر نظر انداز کر دیا گیا۔ نول کشور کا چھپا ہوا کلیات نہیں ملتا جس میں سعدی کا پورا کلام موجود ہے اور بھی کچھ کتابیں ملی ہیں، لیکن غلط سلط چھپی ہوئی۔ عرفی کے دیوان میں بہت سے شعر الحاقی ہیں۔ ظہیر فاریابی کا کلام بے مزہ

ہے۔ نظیری کا کوئی اچھا اسٹوڈنٹس ایڈیشن نہیں۔ مبارک علی نے دیوان نظیری چھاپا تو ہے، لیکن وہ سر بسر مجموعہ اغلاط ہے۔

ان دنوں بعض ایسے شعرا کا کلام بھی نظر سے گزرا جنھوں نے زیادہ شہرت نہیں پائی۔ ان میں میر رضی دانش بھی ہے، جس کا دیوان نایاب ہے، اہل تذکرہ نے دو دو چار چار شعر نقل کر دیے ہیں، غلام علی آزاد بلگرامی کا انتخاب مجھے پسند نہیں، انھوں نے اساتذہ کے وہی شعر نقل کیے ہیں جو ان کے زمانے میں عام مذاق شعر سے مطابقت رکھتے تھے، یعنی زیادہ تر مثالیہ اشعار ہیں جو غنی، صائب، قدسی، اور علی قلی سلیم کے کلام کا اہم ترین حصہ سمجھے جاتے رہے ہیں۔ البتہ مرزا مظہر جان جاناں نے "خریطۂ الجواہر" کے نام سے جو بیاض مرتب کی ہے، اس سے مرزا کے حسن ذوق کا ثبوت ملتا ہے۔ رضی دانش کے چند شعر لکھتا ہوں، یہ وہی شاعر ہے جسے دارا شکوہ نے ایک شعر پر ایک لاکھ کا انعام دیا تھا، یہ شعر آپ کو یاد ہوگا:

تاک را سرسبز دار اے ابر نیسان بہار   قطرہ تا مے می‌تواند شد چرا گوہر شود

(اے بہار کے ابر نیسان، تاک کو سرسبز و شاداب رکھ، وہ قطرہ جو شراب بن سکتا ہے، اسے کیا پڑی ہے کہ وہ گوہر بنے؟...... نیسان رومی سال کا ساتواں مہینہ، مطابق ماہ اپریل۔ اس مہینے کی بارش کو بھی نیسان کہتے ہیں۔ یہودیوں کے سال مقدس کا پہلا مہینہ ہے)

سینۂ ما چاکلد ازاں کربلائے حسرت است   آرزوئے کشتہ ہر سو شہید افتادہ است

(ہم چاک گدازوں کا سینہ حسرتوں کی کربلا ہے، ہماری آرزوئیں ہر طرف شہید پڑی ہوئی ہیں)

رضی دانش مشہد کا رہنے والا تھا، شاہ جہاں کے عہد میں ہندوستان آیا، کچھ عرصہ دلی اور لاہور میں رہنے کے بعد دکن چلا گیا، زندگی کے آخری زمانے میں وطن کا قصد کیا اور مشہد میں ہی وفات پائی۔ نجفی تھانیسری خاص ہندوستانی شاعر اور رضی دانش سے بہت زیادہ غیر معروف ہے، اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:

زبس کہ حسن فزود و خلش گداخت مرا   نہ من شناختم او را نہ او شناخت مرا

(اس کا حسن اتنا بڑھ گیا اور میرے غم میں اتنا اضافہ ہوا، نہ میں نے اسے پہچانا اور نہ اس نے مجھے پہچانا)

مجد مرگم ایں قدر دارم کہ خواہی گفت حیف   تا کنم با او وفا عمرش وفاداری نہ کرد

(میری موت کی شان یہ ہے کہ تو صرف اتنا کہے گا کہ افسوس اس کی عمر اتنی نہ ہوئی کہ میں اس کے ساتھ وفا کرتا)

شیخ جمالی کنبوہ بھی انھیں لوگوں میں سے ہیں جنھیں اب کوئی نہیں جانتا۔ یہ شعر انھی کا ہے

مارا کہ خاک کوچہ پیراہن است بر تن   آں ہم ز آب دیدہ صد چاک تا بہ دامن

(ہمارے جسم پر تیری گلی کی خاک سے لباس بن گیا ہے اور اس کا حال بھی یہ ہے کہ وہ آنسوؤں سے دامن تک چاک چاک ہو چکا ہے)

دارا شکوہ اور اورنگ زیب دونوں شعر کہتے تھے، اورنگ زیب کے تو صرف دو تین شعر مشہور ہیں، مثلاً یہ شعر اسی کا ہے

غم عالم فراواں است و من یک غنچہ دل دارم   چساں در شیشۂ ساعت کنم ریگ بیاباں را

(دنیا کا غم بے کراں ہے اور میرا دل ایک شیشے کی طرح ہے، اب میں صحرا کی ساری ریت کو شیشہ ساعت میں کیسے ڈالوں)

لیکن داراشکوہ کا پورا دیوان موجود ہے، ایک غزل کا مطلع ہے۔

بر قلم و پیچ کہ شد از تاب زلف یار شد   دام شد زنجیر شد تسبیح شد زنار شد

(دام ہوا زنجیر ہوا تسبیح ہوا زنار ہوا جو خم اور پیچ بھی پیدا ہوا زلف یار کی پیچیدگی سے پیدا ہوا)

جہانگیر نے بہت کچھ کہا ہوگا لیکن تذکروں میں چند شعر ملتے ہیں، یہ مطلع تو قیامت کا ہے۔

ساقیا مے بہ رخ گلزار می باید کشید   ابر بسیار است مے بسیار می باید کشید

(شراب کا ساغر باغ کے روبرو بیٹھ کے پینا چاہیے، ابر بھی بہت ہے اور شراب بھی بہت پینی چاہیے)

بابر بڑا صاحب ذوق شخص تھا ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا اور شعر سمجھتا بھی خوب تھا، اس کے مصاحبوں میں آتش قندھاری ایک شاعر تھا اس کا یہ مطلع خود بابر نے نقل کیا ہے، بچپن میں کہیں پڑھا تھا اب تک یاد ہے۔

سر شکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد تماشا کن   بیا در کشتی چشمم نشین و سیر دریا کن

(میرے آنسو تیرے بغیر رفتہ رفتہ سمندر بن چکے ہیں، آ میری آنکھوں کی کشتی میں بیٹھ اور اس دریا کی سیر کر)

سلیمہ سلطان بیگم، اکبر کی بیگم اور نہایت خوش ذوق خاتون تھی، اس کے کلام کا بڑا حصہ زیب النساء کے نام منسوب ہو گیا ہے، اس کی غزل کا ایک مطلع ہے۔

کاکلت را گر ز مستی رشتۂ جاں گفتہ ام   مست بودم زیں سبب حرف پریشاں گفتہ ام

(مستی کے عالم میں اگر میں نے تیری زلف کو رشتہ جاں کہہ دیا ہے تو میں مست تھا اس لئے پریشان خیالی کا شکار ہو گیا)

اس سلسلے میں یاد آیا کہ آغا بیگم دختر قزلباش خاں امید بہت اچھے شعر کہتی تھی، شجاع الدولہ کی ایک لڑکی بیٹا بیگم سے بھی بہت سے شعر منسوب ہیں، مثلاً یہ مشہور شعر انہی کا ہے۔

ڈبڈبائی آنکھ، آنسو تھم رہے   کاسۂ نرگس میں جوں شبنم رہے

دراصل میں تو یہ بتانا چاہتا تھا کہ فارسی کے بعض غیر معروف شعراء کی پوری پوری غزلیں نقل کروں لیکن بھٹک کے کہیں سے کہیں جا پہنچا اور اب یہ خط اتنا لمبا ہو گیا ہے کہ کچھ اور کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہی، پھر موقع ملا تو کچھ عرض کروں گا۔"

نیاز مند ـــــ حسرت

اس مضمون کے شروع میں میں نے لاہور کی ادبی تحریکوں، ادبی محفلوں اور ادبی شخصیات کا ذکر کیا ہے، والد بزرگوار چراغ حسن حسرت کا یہ خط اس ماحول کی بھرپور عکاسی کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ محفل کیا ہوتی تھی اور ادبی شخصیات جب مل بیٹھتی تھیں تو ان کی گفتگو کا دائرہ کیا ہوتا تھا اور جب کسی صورت وہ تنہائی میں ادب جاتی تھیں تو انہیں سکوت کے توڑنے سے اٹھنے والی کون سی آواز پسند تھی اور وہ کیا سننے کو بیتاب رہتے تھے اس خط کو دیکھئے اور سوچئے کہ غیر ادبی ماحول میں قید شخص کے لئے بہترین تحفہ اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا، پھر والد صاحب کی خوبی یہ بھی تھی کہ انہیں دیوان کے دیوان ازبر تھے اس لئے وہ ہر محفل کی ضرورت تھے۔

جناب شورش کاشمیری، والد بزرگوار کے متعلق فرماتے ہیں کہ "وہ الفاظ کی نسلوں تک سے واقف تھے، انہیں معلوم تھا کہ فلاں محاورہ کہاں سے آیا، فلاں روزمرہ کی اصلیت کیا ہے؟ اس ضرب المثل کی بنیاد کس نے رکھی، یہ کہاوت کیونکر بنی، فلاں ادیب کا سرمایہ الفاظ کتنا ہے، فلاں شاعر کے پاس کل کتنے الفاظ ہیں! عروض میں یگانہ استادوں میں منفرد۔" (نورتن)

جناب کرشن چندر لکھتے ہیں "اگر یہ کہا جائے کہ عرب ہوٹل لاہور کی بین الاقوامی شہرت محض حسرت کے طفیل تھی تو یہ بے جا نہ ہوگا! لاہور کا یہ چھوٹا سا ہوٹل حسرت جیسے جہاں دیدہ کی کرم فرمائی سے آج اچھا خاصا ادارہ ادب بنا ہوا ہے اور لاہور آ کر تو ہر ادیب جہانگیر کا مقبرہ دیکھ چکنے کے بعد سیدھا عرب ہوٹل کا رخ کرتا ہے"

جناب سعادت حسن منٹو فرماتے ہیں "ان کا انداز گفتگو سارے لاہور میں مشہور ہے، انگوٹھے کے ساتھ والی دو انگلیوں میں سگریٹ دبا کر زور کا کش لگائیں گے اور پوچھیں گے مولانا! آپ نے قاآنی کا مطالعہ کیا ہے؟ اگر آپ میری طرح کم تعلیم یافتہ ہیں اور آپ کو فارسی سے کوئی شد بد نہیں تو آپ مولانا چراغ حسن حسرت کے سامنے بالکل ایک چغد کی حیثیت سے بیٹھے ہوں گے پھر وہ آپ کو زیادہ چغد بنانے کے لئے، سعدی، حافظ، غالب کا فارسی کلام سنائیں گے اور آپ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوگی کہ خودکشی کر لیں"

محترم ڈاکٹر طیب منیر کا ارشاد ہے کہ "چراغ حسن حسرت ایسا محور تھے جن کے گرد ہوٹل میں آنے والے اصحاب گردش کرتے تھے، کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا کہ صبح کا ناشتہ اسی ہوٹل میں کیا، دوپہر کا کھانا وہیں تناول فرمایا، سہ پہر کی چائے وہیں نوش کی، پھر رات کا کھانا کھا کر وہاں سے اٹھے، حسرت اس زمانے میں عرب ہوٹل کی بالائی منزل پر رہتے تھے اس لئے ہوٹل میں آنا فقط چند قدم کا فاصلہ تھا، جوں ہی حسرت ہوٹل میں آتے، احباب کی آمد شروع ہو جاتی، ہوٹل کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ اخباروں کے دفاتر میں تحریریں وہیں سے آتیں عرب ہوٹل کی محفلوں میں پہلے آ داخل ہوتی تھیں، اسلامیہ کالج کے طلبہ تو ہر وقت حسرت صاحب کے گرد جمع رہتے، مولانا علم و حکمت کے آبدار موتی بکھیرتے رہتے اور اہل ذوق ان کو چنتے رہتے"

فیض صاحب کے ساتھ مراسم اسی عرب ہوٹل سے شروع ہوئے تھے، اور جیسا کہ زمانے کا دستور ہے کہ ذہین لوگ اپنی ذہانت کے اظہار سے دوسروں کو موہ لیتے ہیں، فیض صاحب نے بھی پطرس، تاثیر، مجید ملک اور حسرت کی محفل میں اپنا مقام بنا لیا۔ یہاں سے پر کھولے تو پرواز کرتے اوپر ہی اوپر اٹھتے چلے گئے۔ یہ ہوں پہلے کی بات ہے میں نے ڈرگ روڈ کراچی میں ان کے در دولت پر حاضری دی تھی، ان کا اپارٹمنٹ بلا والا تھا اور میں لاہور سے انھی ان کے در پر پہنچ گیا تھا، فیض صاحب تنہا تھے۔ مجھے پاس آتے، خود دروازہ کھولا، اپنے بستر پر جا کر تکیہ پر ٹانگ رکھی اور لیٹ گئے۔ سکوت کا عالم تھا، کبھی کبھی ہاتھ بلند کر کے ہوا میں لہرا دیتے تھے، آدھ پون گھنٹے کی اس خاموش ملاقات کے بعد جب میں نے اجازت چاہی تو انہوں نے دو باتیں کہیں، ایک بات تو میں پہلے بھی کسی مضمون میں لکھ چکا ہوں کہ سیدھا حسن سے مل لینا، دوسری بات اب بیان کرنے لگا ہوں...... انہوں نے جو فرمایا اس کا لب لباب کچھ یوں تھا کہ "حسرت صاحب کے عرب ہوٹل سے ہم نے بہت علم حاصل کیا تھا اگر ہو سکے تو عرب ہوٹل پر ضرور لکھنا"

والد صاحب کا خط آپ نے پڑھ لیا ہاں اب یہ بھی تو دیکھئے کہ والد صاحب کے خط کے جواب میں فیض صاحب کیا لکھتے ہیں:

فیض صاحب کا خط یوں شروع ہوتا ہے:

"آپ کا گرامی نامہ کافی دنوں سے آیا رکھا ہے، ایک زمانے کے بعد کشاکشِ دیدہ و دل کا کچھ سامان ہاتھ آیا، اس لئے جواب کی کاوش کے بجائے خط اندوزی میں محو، بالخصوص طور پر وحشی و آتش کے یہ دو شعر بہت پسند آئے:

تو بلبل کہ حسن فزود و شمع گداخت مرا   نہ من شناختم او را نہ او شناخت مرا

اور

ع آرزو با خوب لیکن اہل قدر با خوب نیست

پہلے شعر کا مضمون داغ نے بھی باندھا ہے لیکن اس شعر کے مقابلے میں بہت پھیکا ہے، غالباً آپ کو بھی یاد ہوگا:

وہ روز روز ترقی پہ حسن ہے ان کا   کہ صورت ان کی مجھے بھول بھول جاتی ہے

گنا بیگم کے متعلق ایک عرصے سے تجسس تھا اس کے بارے میں کہیں ذخیرہ ہو تو لکھئے گا۔ اس کا ایک شعر مجھے بھی یاد ہے:

کہاں تک لکھے جاؤں خط ان کو ہمدم   وہ جب بھولتے ہیں یوں ہی بھولتے ہیں

آپ نے جو غزلیات خط الگ کے ذریعے نہیں لکھیں وہ اب لکھ بھیجئے اور اپنی نئی کتابیں بھی بھیج دیجئے (ایک سطر مبصر نے کاٹ دی)

ایک زمانے سے آرزو تھی کہ اردو شعرا کا کوئی ڈھنگ کا انتخاب مرتب ہو جائے آج کل اسی کام میں مصروف ہوں۔ تھوڑا سا کیا ہے بہت سا باقی ہے۔ حال ہی میں میر اور سودا کو دوبارہ احتیاط سے پڑھا، جس سے شبہ ہونے لگا ہے کہ سودا میر سے بڑا شاعر تھا، یہ ٹھیک ہے کہ میر کے اچھے اشعار کی تعداد سودا کے ہاں نہیں ملتی لیکن سودا کے کلام کی عام سطح میر سے بلند ہے اور فنی دسترس میں میر ان سے یقیناً پیچھے ہے۔

میں نے منظومات کا ایک نیا مجموعہ "دست صبا" (1952ء میں شائع ہوئی) کے نام سے چھپنے کے لئے بھیج دیا ہے، افسوس کہ آپ لاہور میں نہیں ہیں ورنہ میں چاہتا تھا کہ آپ ایک نظر دیکھ لیتے۔ چار پانچ سال انگریزی اخبار میں سر مارنے سے جو تھوڑی بہت اردو آتی تھی، وہ بھی بھول گئی ہے، اس لئے ان منظومات میں بہت سی فروگزاشتیں رہ گئی ہیں، آپ دیکھ لیتے تو کچھ صاف ہو جاتا۔

عید کے دن آپ نے لاہور کی طرف رخ کر کے آنسو بہانے کو کہا ہے، یہاں تو عید شب برات کی قید نہیں، مستقل یہی کیفیت رہتی ہے، اس کے اظہار میں ایک شعر میں نے بھی کہا تھا:

یہ خصوصیت ہے یادِ حریفاں بادہ پیما کی   کہ شب کو چاند نہ نکلا، نہ دن کو ابر آئے

اس وقت بے ساختہ مولانا عبدالباری آسی کی شرح غالب یاد آ گئی جس میں غالب کے ہر شعر کی تشریح کے بعد لکھتے ہیں "میں نے بھی کہا ہے" امید ہے آپ کا مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

فیض

یہ مضمون یہاں ختم نہیں ہوتا مگر اسکے بعد والد صاحب کی میری موجودگی میں فیض صاحب کے ساتھ ایک ملاقات ہے جو والد صاحب کی وفات سے کچھ پہلے لاہور میں ہوئی، اس پر پھر بات ہوگی۔ قلم ہاتھ سے رکھنے سے پہلے میں ڈاکٹر طیب منیر (اسلامی یونیورسٹی) عبدالرحیم خان صاحب (مقتدرہ قومی زبان) اظہر جاوید (مدیر ماہنامہ تخلیق) اور عظیم قریشی (صحافی) کے تعاون کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، باقی سب اللہ ہی اللہ اور آپ سب کے لئے دعائے خیر۔

◆◆◆

کلاسیکی موسیقی: دُھرپد سے خیال تک

......2......

ڈاکٹر جواز جعفری

دھرپد کی ہیئت اور ساخت کے حوالے سے موسیقی کی ایک قدیم کتاب "تحفۃ الہند" کے مصنف مرزا محمد کا کہنا ہے کہ یہ چار تُک ٹکڑوں یا فقروں پر مشتمل ہوتا ہے لیکن یہ چاروں فقرے غیر منظوم مگر مقفیٰ ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے موسیقی کی بعض قدیم کتابوں میں دھرپد کے چار ٹکڑوں کے لئے مصرعوں کی بجائے تُک کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے لغوی معانی بنانا، جوڑنا اور ٹکڑا کے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ یہ مصرعے باقاعدہ شاعری نہیں ہوتی البتہ ان میں قافیے موجود ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے ایسی شاعری کو آج بھی تُک بندی کہا جاتا ہے۔ اس کے برعکس "برصغیر میں موسیقی کے فارسی ماخذ" کے مرتب رشید ملک کے نزدیک دھرپد چار تُک فقروں سے ترتیب دیا جاتا ہے جن میں قافیہ کی موجودگی لازمی نہیں سمجھی جاتی۔ ان کے نزدیک دھرپد کے چاروں فقرے غیر مقفیٰ ہوتے ہیں۔ حیرت ہے کہ وہ تُک کا لفظ استعمال کرتے ہیں مگر اس لفظ کے معانی سے آگاہ نہیں ہیں۔ اگر وہ لغت دیکھنے کی زحمت گوارہ کر لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ تُک کے معانی ہی (1) موزوں فقرہ یا مصرعہ (2) فقروں کے آخری الفاظ کا ہم قافیہ ہونا کے ہیں۔ میرے خیال میں دھرپد کی چار سطریں خالص شاعری تو نہیں ہوتی ہوں گی البتہ ان فقروں میں قوافی ضرور ہوتے ہوں گے۔

جہاں تک دھرپد کے موضوعات کا تعلق ہے یہ اپنی گائیکی کے انداز کی طرح سنجیدہ ہی ہوا کرتے تھے۔ مثلاً حمد و ثنا، تاریخی واقعات، شجاعت و بہادری، اعلیٰ ظرفی اور اخلاقی بلندی وغیرہ دھرپد کے خصوصی موضوعات ہیں۔ ہندوستان میں فنی اعتبار سے کلاسیکی موسیقی کی کئی صنفیں ہیں۔ ان سب کے درمیان تفریق و امتیاز کا معیار یہ ہے کہ کوئی صنف کلاسیکی موسیقی کے اجزائے ترکیبی کو کتنی اہمیت دیتی ہے؟ مثلاً خیال گائیکی میں لفظ کو سُر اور تال کے ذریعے ادا کیا جاتا ہے۔ ٹھمری میں سُر اور تال کی مدد سے متن (بول) میں معانی آفرینی کی جاتی ہے جبکہ دھرپد گائیکی ان دونوں کے درمیان ہے۔ یہاں سُر اور لفظ کو برابر اہمیت دی جاتی ہے۔ دھرپد سراپا ضابطے کی گائیکی ہے جو آزادی دینے کی حد تک دستوری ہے۔ اس پر مذہبی رنگ نے اسے ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور متین بنا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان گویوں نے اس کے مذہبی رنگ کی جگہ عشق و عاشقی کے مضامین شامل کئے اور اسے تانوں اور پلٹوں سے آراستہ کر دیا۔ اس حوالے سے سب سے اہم نام میاں تان سین کا ہے جس نے مندروں اور درباروں کی سنجیدہ فضا سے دھرپد کو باہر نکالا اور اس کے مذہبی رنگ کی جگہ اس میں عوامی احساسات شامل کئے حالانکہ اس سے قبل روایتی دھرپد اتنا غیر عامیانہ اور خواص تھا کہ اسے کوئی بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ تان سین نے دھرپد میں ایک نئے انداز کی گائیکی کو متعارف کرایا جسے آج ہم "گوڑی بانی" کے نام سے جانتے ہیں۔ اس نے دھرپد کو موضوعاتی تنوع بخشا یعنی بعض عوامی دھنوں کو دھرپد کا حصہ بنا دیا اور دھرپد کے فقروں کو شاعرانہ اوصاف سے مالا مال کیا۔ یہی وجہ ہے کہ تان سین کو اپنے عہد کے

کٹر ہندو طبقے میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا کیونکہ یہ طبقہ اسے ہندوؤں کی قدیم موسیقی کو بگاڑنے کا ذمہ دار قرار دیتے تھے۔

جہاں تک دھرپد کی ایجاد کا تعلق ہے اس سلسلے میں موسیقی کے بیشتر ناقدین گوالیار کے راجا مان سنگھ (1485ء ۔۔ 1516ء) ہی کا نام لیتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ ایک روایتی موقف ہے جس کا تحقیق و جستجو سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ موسیقی کے حوالے سے لکھی گئی دو اہم کتابوں "معارف النغمات" کے مصنف محمد نواب علی خاں اور "شاہجہان نامہ" کے محمد صالح کنبوہ، گوالیار کے راجا مان سنگھ ہی کو دھرپد کا موجد قرار دیتے ہیں۔ ادھر "بادشاہ نامہ" کا مصنف لاہوری "تحفۃ الہند" کا مصنف مرزا محمد اور "راگ درپن" کا فقیر اللہ، راجا مان سنگھ کو دھرپد کا موجد تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک مان سنگھ کا اہم کارنامہ (بلکہ اسے موسیقی کے حوالے سے ایک بہت بڑا اجتہاد کہنا چاہیے) یہ ہے کہ اس نے دھرپد کو جو اس زمانے میں سنسکرت زبان میں تصنیف ہوتا تھا اسے گوالیاری زبان میں ترتیب دیا جو دارالحکومت آگرہ اور گوالیار میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ دھرپد اس عہد کا سب سے اعلیٰ گانا تصور ہوتا تھا مگر گوالیار اور آگرہ کے لوگ اس کی بندش کے بولوں کی تفہیم نہ کر سکنے کے باعث اس گانے سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہو پاتے تھے۔ چنانچہ راجا مان سنگھ نے گوالیار اور آگرہ کے لوگوں کی اسی مشکل کو پیش نظر رکھتے ہوئے سنسکرت کی بجائے گوالیاری زبان میں دھرپد تصنیف کرائے۔ اس "طرز جدید" کے نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے یہ طرز آگرہ، گوالیار اور گرد و نواح میں نہایت تیزی سے مقبول ہوا۔ مان سنگھ جو خود بھی ماہر موسیقی تھا کے اسی کارنامے کے باعث بعض مورخین نے اسے دھرپد کا موجد قرار دے دیا۔ ویسے بھی قدیم زمانوں میں انسانوں کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ بعض نئی چیزوں کو عوام میں مقبول بنانے کے لئے ان کی ایجاد کا سہرا دیوتاؤں، اوتاروں، بادشاہوں اور راجوں مہاراجوں کے سر باندھ دیا کرتے تھے۔

دھرپد کی تاریخی قدامت کے حوالے سے موسیقی کی کتاب "منتخب النغم" کے مصنف کا موقف قدرے اہم ہے۔ وہ نہ صرف دھرپد کو پربندھ کا دوسرا حصہ تسلیم کرتا ہے بلکہ اس کا کہنا ہے کہ دھرپد دربار تک رسائی حاصل کرنے سے بہت عرصہ پہلے موسیقی کی ایک ذیلی صنف کے طور پر بنگلہ میں موجود تھا۔ جبکہ "راگ درپن" کے مرتب رشید ملک نے اسی بات کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان کے نزدیک یہ کہنا غلط ہوگا کہ مان سنگھ دھرپد کا بانی ہے بلکہ یہ صنف بنگال اور دوسرے علاقوں میں بہت پہلے ہی سے موجود تھی اور اسے مختلف علاقوں میں وشنو، دستو اور دھرپد کے ناموں سے یاد کیا جاتا تھا اور بھکاری گویے اسے گلیوں بازاروں میں لوک دھن کے طور پر گاتے تھے۔ دھرپد کی ایجاد کے حوالے سے "آئین اکبری" کے مصنف ابوالفضل کا موقف قدرے مختلف اور قابل قبول ہے۔ اس کے بقول شروع میں دھرپد آگرہ اور گوالیار کے نواح میں گایا جاتا تھا۔ مان سنگھ گوالیار کا راجا ہوا تو نائیک بخشو، بیجو اور بھنو نے اسے ایجاد کیا۔ مان لیا کہ راجا مان سنگھ بہت سر شناس تھا مگر اس قسم کی ایجاد موسیقی کا کوئی نائیک اور گندھرو (کامل) ہی کر سکتا ہے۔ جہاں تک مذکورہ بالا نائیکوں کا تعلق ہے تو یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ دھرپد کی ایجاد کا کارنامہ عہد اکبری میں انجام نہیں دیا گیا بلکہ یہ نغمہ پہلے سے موجود تھا۔ البتہ اکبر اعظم نے اس کی سرپرستی کر کے اسے بام عروج تک پہنچا دیا اور راجا مان سنگھ نے اپنے درباری موسیقاروں کے ذریعے سنسکرت اور جنوبی ہند کی دوسری زبانوں کی بجائے اسے گوالیاری زبان میں تصنیف کرایا۔ راجا مان سنگھ کے نائیکوں کا کارنامہ تو میرے خیال میں ان نائیکوں نے نہ صرف ایک نئی زبان (گوالیاری) میں اسے پیش کیا بلکہ اسے اندر سے بھی خوب آراستہ کیا اور یوں اسے پورے ہندوستان میں مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں دھرپد کے حوالے سے سب سے زیادہ کریڈٹ نائیک بخشو کو دیا ہے جس نے دھرپد کی تجدید

گائیکی اور مذہبی مضامین کی جگہ عوامی احساسات اور عام پسند طرزوں کو دھرپد کا حصہ بنایا۔ گوالیار ہمیشہ سے موسیقی کا گھر رہا ہے۔ یہاں کے باشندے سخن فہم، خوش گفتار اور موسیقی کے اعلیٰ ذوق سے مالا مال تھے۔ لہٰذا نائیک بخشو نے نئے مضامین، تخلیقی بندشوں، نغمات کے حسن اور پسندیدہ تصرفات کے لطف سے اسے درجہ کمال تک پہنچا دیا۔ وہ ایسا بے مثل گویا تھا کہ راجا مان سنگھ بھی دوسرے راجاؤں کے سامنے اس پر فخر کیا کرتا تھا۔ نائیک بخشو جوڑی کی بجائے اکیلا گاتا تھا وہ خود ہی الاپ کرتا اور خود ہی پکھاوج بجاتا۔ اس کی مسحور کر دینے والی آواز نے ہندوستان کو سحر زدہ کر دیا۔ نائیک بخشو اور شاہجہان کے درمیان ڈیڑھ صدی کا فاصلہ حائل ہے مگر شاہجہانی عہد تک بھی اس کے دھرپد عوام میں اسی طرح مقبول تھے۔ اس کی بندشوں کی ادبی حیثیت اور عوامی مقبولیت کے پیش نظر شاہجہان نے انہیں جمع کرنے کا حکم دیا اور بعد ازاں یہ دھرپد "سہس رس" (ہزار دھرپد) کے نام سے کتابی شکل میں سامنے آئے۔ اس کتاب کے دو مخطوطے آج بھی انڈیا آفس لائبریری، لندن میں محفوظ ہیں۔ نائیک بخشو کا ایک کارنامہ یہ بھی کہ ہندوستانی اور ایرانی موسیقی کے ملاپ سے جو کچھ جھول پیدا ہو گیا تھا اور اسے ختم کرنے کے لئے راجا مان سنگھ نے ایک کمیشن قائم کیا تھا اس نے اپنے ہمعصر گویوں نائیک محمود، نائیک مچھو، نائیک بھنو، نائیک لوہنگ اور نائیک کرن کے ساتھ مل کر دونوں خطوں کی موسیقی کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی۔ دھرپد نے نہ صرف کئی صدیوں تک کلاسیکی موسیقی پر راج کیا بلکہ اس دوران نائیک گوپال، نائیک بیجو، نائیک تان سین، نائیک سوامی ہری داس، ابراہیم عادل شاہ، نائیک محمود، نائیک لوہنگ، نائیک کرن، نائیک بھنو، میاں چاند خاں، میاں سورج خاں، نائیک سورداس، بلاس خاں، عاقل خاں، خضر خاں، سورگیان خاں اور محمد خاں ڈھاڈی جیسے بے مثال دھرپدی گویے بھی پیدا کئے۔ آج بظاہر دھرپد کا ستارہ غروب ہو چکا ہے مگر اب بھی وہ ہماری کلاسیکی موسیقی کی رگوں میں خون کی طرح بھاگ رہا ہے۔ اگرچہ دھرپد گائیکی متروک ہو چکی ہے مگر اس کے باوجود ہندوستان میں بعض گھرانے اس عظیم ثقافتی سرمائے کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ ان گھرانوں میں ڈاگر اور گوبھاری گھرانے دھرپد گانے کے حوالے سے خصوصی شہرت رکھتے ہیں۔ بالخصوص معین نصیرالدین اور امین نصیرالدین جو ڈاگر بندھو کے نام سے مشہور ہیں، سوامی ہری داس، نائیک بیجو اور میاں تان سین کے ایک ہی راگ (بندرابنی سارنگ) میں ترتیب دیئے ہوئے دھرپدوں کو ان کی اصلی ترتیب اور بولوں کے ساتھ گانے کے حوالے سے خاص شہرت رکھتے ہیں۔ یہاں استاد فیاض خان اور استاد عبدالکریم خان کی خدمات کا تذکرہ بھی نہایت مناسب معلوم ہوتا ہے جنہوں نے خیال گائیکی میں بول تان شامل کر کے اس کا ٹوٹا ہوا رشتہ دھرپد کے ساتھ دوبارہ بحال کر دیا۔ گویا آگرہ اور کیرانہ گھرانے دھرپد کی عظیم اور پاکیزہ روایت سے خود کو علیحدہ نہیں کر پائے۔ بالخصوص استاد فیاض خان کے بیشتر خیال دھرپد رنگ ہی میں پائے جاتے ہیں۔ دھرپد اکبر اعظم کے سنہری دور سے لے کر آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے عہد تک مغل دربار سے وابستہ رہا مگر اب خیال اس کی جگہ کا بے تاج بادشاہ بننے کے لئے پوری طرح تیار تھا۔ خیال جو عوام کے خیال و خواب پر چھایا ہوا تھا۔

خیال گائیکی کو کلاسیکی موسیقی میں وہی درجہ حاصل ہے جو شاعری میں غزل کو مگر اپنی تمام تر عوامی مقبولیت کے باوجود اس عہد کے دھرپد گانے والے گویے اسے کلاسیکی موسیقی کا درجہ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اپنے عہد کا پایا اور مقبول گانا ہونے کے باعث دھرپد نے خیال کے جڑ پکڑنے کی شدید مزاحمت کی اور کافی عرصے تک خیال کی دربار تک رسائی کا راستہ بھی روکے رکھا۔ محمد شاہ بادشاہ جس کا عہد حکومت خیال گائیکی کا عہد زریں شمار کیا جاتا ہے اس کے دربار کا مقبول ترین گانا بھی دھرپد ہی تھا۔ اس لئے ایک عرصے تک دھرپد کے سامنے خیال کا چراغ نہ جل سکا۔ بالآخر خیال نے اپنے طریقہ واردات تبدیل کیا اور دھرپد ہی کی بنیاد پر خود کو استوار کیا تب کہیں جا کر

خیال کو قبولیت کی سند نصیب ہو گئی۔

خیال عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معانی تصور، فکر، اندیشہ، غور و خوض، رائے، نقشا، ارادہ، توجہ، وہم، مضمون، پاس اور لحاظ کے ہیں مگر موسیقی میں یہ لفظ اپنے اصطلاحی معنوں میں استعمال ہوتا ہے جس سے مراد گائیکی کا ایک مخصوص انداز ہے جو دھرپد گائیکی سے قدرے مختلف ہے۔ ناقدین موسیقی اسے عام لوگوں کی بجائے کوئیوں کا گانا بھی قرار دیتے ہیں۔ دھرپد جو اپنی ضابطہ پسندی اور مذہبی تقدس کے باعث خواص کا گانا بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے مقابلے میں خیال عوامی گانا کہلایا۔ یہ دھرپد کی ضابطہ بندی کے خلاف ایک طرح کی بغاوت تھی اور خیال گائیکی اپنے نئے ثقافتی تجربے کے اعتبار سے سیکولر گائیکی تھی کیونکہ دھرپد کو مخصوص خاندان ہی گا سکتے تھے اور عوام کو اس سے دور رکھنے کے لئے باقاعدہ قانون سازی بھی کی گئی تھی۔ دھرپد میں سننے والوں کو صرف ضابطوں، اصولوں اور قواعد موسیقی سے واسطہ پڑتا تھا مگر خیال گائیکی کے پاس سننے والوں کے لئے پیغام بھی تھا۔ دھرپد سیدھا اور طبعی گانا تھا۔ اس کے مقابلے میں خیال میں مرکی، پھندا، کھٹکا، سوت، میڈ، گمک، گٹکری، زمزمہ، تان اور پلٹوں کی کھلی چھٹی تھی اور گائیکی کے ان حربوں نے خیال کی دلآویزی کو دو چند کر دیا تھا۔ دھرپد میں صرف سنجیدہ مضامین جگہ پا سکتے تھے جبکہ خیال میں حمد و ثنا سے لے کر ہجر و وصال، انتظار، گلے شکوے، تہوار، موسم کے رنگ، بارشوں میں انگڑائیاں لیتی ناآسودہ خواہشیں، خوشی و غم کے لاتعداد رنگ، انکسار اور بہت سے دیگر عاشقانہ و جذباتی مضامین باندھے جا سکتے تھے۔ یہی وہ عوامی رنگ تھا جس نے خیال کو عوام میں مقبولیت کے لئے بنیادیں فراہم کیں۔

جس طرح دھرپد کا پھول پربندھ کی شاخ پر کھلا تھا اسی طرح خیال نے بھی دھرپد ہی کے وجود سے جنم لیا۔ دھرپد نے پربندھ کے انترے اور ابھوگ پر اپنا وجود استوار کیا تھا مگر اب دھرپد کے استھائی، انترے، سنچاری اور ابھوگ میں سے استھائی اور انترے کو الگ کر کے خیال نے اپنا الگ تشخص قائم کر لیا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ خیال کی بنیاد قوالی پر رکھی گئی ہے اور بعض اسے دھرپد کی ارتقائی شکل قرار دیتے ہیں کیونکہ ابتدائی خیال کی چیزوں میں دھرپد کی بھول بھلیاں دکھائی دیتی ہیں۔ آج کی خیال گائیکی سترھویں صدی کی گائیکی سے بہت مختلف ہے کہ اس عہد کا خیال بھی دھرپد سے اچھی خاصی مشابہت رکھتا تھا۔ وقت کے ساتھ اس میں تبدیلیاں آتی چلی گئیں۔ شروع میں بندشیں شعری محاسن سے مالا مال ہوا کرتی تھیں اور موضوعات بھی راگ کے بنیادی رس یا جذبے کے ترجمان ہوتے تھے۔ موجودہ عہد تک آتے آتے خیال کے بول کم ہوتے ہوتے بعض اوقات دو تین الفاظ تک محدود ہو گئے ہیں۔ جیسے راگ درباری کے المیہ میں دو لفظ "مبارک بادیاں" کی گردان سنتے سنتے بعض اوقات سننے والا اکتا سا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ موسیقی میں الفاظ اضافی چیز ہیں۔ اس کی بہترین مثال ترانہ ہے جس میں الفاظ کی جگہ امیر خسرو سے منسوب چند مہمل الفاظ (تانا نا توم توم درے دیرے) لے لیتے ہیں۔ موسیقی کی مشہور کتاب "راگ درپن" کے مطابق ہیئت کے اعتبار سے خیال چار مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے (یاد رہے کہ دھرپد کے بھی چار ہی فقرے ہوتے تھے) پہلے دو مصرعوں کے قوافی الگ ہوتے ہیں اور آخری دو آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ جبکہ "تحفۃ الہند" کے مصنف کے بقول یہ دو ٹکڑوں پر مبنی ہوتا ہے اور اس کی زبان خیر آبادی ہوتی ہے۔ البتہ "راگ درپن" کے مصنف فقیر اللہ کا خیال ہے کہ یہ دہلی کی دیسی زبان میں تخلیق پاتا ہے۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ شاید اپنے چار مصرعوں ہی کی بدولت چٹکلا کہلاتا ہے جو بعد ازاں [illegible] بن گیا جس کا بانی سلطان حسین شرقی ہے۔ اپنی ہیئت کے اعتبار سے خیال تین حصوں پر مشتمل ہے۔

1۔ الاپ 2۔ استھائی 3۔ انترہ

1۔ الاپ: یہ حصہ راگ کی خاص سُروں کی باہمی ترکیب و ترتیب کو واضح کرتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ الاپ راگ کے باطن سے پردہ ہٹاتا ہے۔ یہاں موسیقار کسی مصور کی طرح ایک باریک خاکہ کی مدد سے ذہن کے پردے پر چند نقوش بناتا ہے۔ آپ اسے راگ کا خاکہ کہہ سکتے ہیں۔ وہ راگ کا تاثر ابھارنے کی کوشش کرتا ہے تاکہ راگ کا مطلوبہ ماحول تخلیق کیا جا سکے۔ اس ماحول سازی کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں۔ (1) سننے والوں کو راگ کے خصوصی پہلوؤں سے آگاہ کرنا۔ (2) موسیقار کے ساتھ سنگت کرنے والوں کو راگ کی ترتیب سے روشناس کرانا۔

2۔ استھائی: اس سے قبل الاپ راگ کا مخصوص ماحول اور پس منظر تعمیر کر چکا ہے۔ اب یہاں سے خاص بندش کا آغاز ہوتا ہے گویا یہی وہ مقام اتصال ہے جہاں سے موسیقی و شاعری کا باہمی رشتہ شروع ہوتا ہے۔ موسیقار موضوع کو واضح کرنے کے لئے بولوں کا سہارا لیتا ہے۔ یہ بول راگ کے بنیادی رس یا جذبے کو سامنے رکھ کر تخلیق کئے جاتے ہیں۔

3۔ انترہ: انترے کے خاتمے تک راگ کا بنیادی تاثر ایک تخلیقی پیکر میں تبدیل ہو چکا ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر موسیقار سُروں کے ایسے مجموعے ترتیب دیتا ہے جو راگ کے بنیادی جذبے کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔
عنایت الٰہی ملک کے بقول خیال کا آخری حصہ ابھوگ ہے جس کا رواج اب بہت کم رہ گیا ہے۔ اس مرحلے پر موسیقار چند آخری ارادے کہہ کر راگ کے نمایاں پہلوؤں اور خدوخال کی طرف اشارے کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی راگ کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

جہاں تک خیال کی ایجاد جیسے اہم سوال کا تعلق ہے تو قدما موسیقی کی اکثریت اس بات سے متفق ہے کہ خیال مسلمانوں کی ایجاد ہے مگر بعض حضرات اس رائے سے اختلاف بھی کرتے ہیں۔ ان کے مطابق خیال نے موسیقی کی روایت سے جنم لیا ہے۔ گویا اس حوالے سے محققین کی آراء تقسیم ہیں۔ اس سلسلے میں موسیقی کے ایک مشہور نقاد دیو گھوش کا کہنا ہے کہ خیال کے بقول نے روپک الاپتی کی شاخ پر جنم لیا۔ جو مورخین مسلمانوں کو خیال کی ایجاد کا کریڈٹ دیتے ہیں ان کے دلائل خاصے جاندار ہیں۔ مثلاً (1) بیشتر خیالوں کی بندشیں مسلمان موسیقاروں کی تخلیق کردہ ہیں۔ (2) بے شمار راگوں کے نام فارسی زبان میں ہیں۔
(3) بعض راگوں کے نام بھی مسلمان موسیقاروں اور گویوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ (4) خیال بذات خود مسلمانوں کی زبان (عربی) کا لفظ ہے۔ (5) خیال گانے والے بیشتر گویے مسلمان ہیں۔ (6) کسی ہندو نے خیال گائیکی کے کسی گھرانے کی بنیاد نہیں رکھی۔ (7) ہندو خیال گائیکی کی طرف تاخیر سے آئے اور مسلمانوں ہی کے شاگرد کہلائے۔ بیشتر مورخین نے خیال کی ایجاد کا سہرا امیر خسرو، نائیک گوپال، سلطان حسین شرقی اور نعمت خان سدا رنگ کے سر باندھنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں سری واستو کا موقف ہے کہ خلجی دربار سے وابستہ موسیقار نائیک گوپال اور امیر خسرو نے خیال کو قوالی کی طرز پر ایجاد کیا جس کا منبع ایرانی موسیقی تھی۔ جبکہ "مرزا نامہ" کے مصنف کا کہنا ہے کہ "ہندی راگوں میں تان سین کے دھرپد اور امیر خسرو کے خیال کو پسند کرنا چاہیے۔" سری واستو کا موقف اس لئے بھی قابل غور ہے کہ اس میں خیال کی ایجاد کا کریڈٹ امیر خسرو کے ساتھ ساتھ اس عہد کے ایک ہندو موسیقار نائیک گوپال کو بھی دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ حالانکہ یہ موقف سرے ہی سے مشکوک ہے کہ ہندو گویے تو بعد میں بھی خیال گائیکی کی طرف کم کم ہی مائل ہوئے۔ چہ جائیکہ وہ شروع شروع میں اس کی طرف راغب ہوتے یا پھر اس صنف کی ایجاد میں کوئی کردار ادا کرتے۔ سری واستو کے بیان کا

دوسرا حصہ تو اور بھی غلط قرار دیا جاسکتا ہے کہ ایرانی دور کی موسیقی میں خیال نام کی سرے سے کوئی صنف ہی موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں "آئین اکبری" کے مصنف ابوالفضل کا رویہ بھی خاصا قابلِ غور ہے کہ وہ دھرپد گائیکی کے سلسلے میں نائیک بخشو اور تان سین کا تذکرہ تو کرتا ہے مگر خیال گائیکی کے سلسلے میں اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا جس کا ایک ہی مطلب ہے کہ سولہویں صدی تک خیال کا کوئی وجود ہی نہیں تھا اور اگر تھا بھی تو اس نے اس "غیر اہم" صنفِ موسیقی کو لائقِ توجہ ہی نہیں گردانا۔

خیال کی ایجاد کے سلسلے میں ریاست جونپور کے سلطان حسین شرقی (پندرھویں صدی) کا نام بھی اکثر سننے میں آتا ہے۔ وہ سلاطین شرقی کا آخری حکمران اور موسیقی کا استادِ کامل بھی تھا۔ ناقدین کے مطابق نہ صرف اس نے درجنوں راگوں کے اختلاط سے نئے راگ تخلیق کیے اور ان کے نئے نام بھی رکھے۔ اس کے ایجاد کردہ جونپوری، حسینی کانحرہ اور حسینی ٹوڑی جیسے راگ آج بھی مروج ہیں۔ "راگ درپن" کا مصنف فقیر اللہ "معارف النغمات" کا مصنف محمد نواب علی خان، "تحفۃ الہند" کا مصنف مرزا محمد اور شیخ اکرام متفقہ طور پر سلطان حسین شرقی کو خیال کا موجد قرار دیتے ہیں۔ مگر میرے خیال میں ان تمام مصنفین میں سے "راگ درپن" کے فقیر اللہ کا بیان قدرے اہم ہے کہ جس کے مطابق سلطان حسین شرقی نے خیال کی بنیاد چٹکلہ پر رکھی (اودھی بولی میں ہندوستانی عورتوں کا مقبول گیت) جو عوامی موسیقی کی ایک اہم کڑی بھی جاتی ہے۔ آگے چل کر اس نے اودھی کی خاص صورت اختیار کی اور انھیں سے خیال کی بندشیں نکلیں۔ فقیر اللہ کا یہ موقف اس لئے بھی قابلِ غور ہے کہ اس میں خیال کی بنیاد عوامی موسیقی پر رکھی گئی ہے اور اسے عوامی موسیقی کی کڑی بھی قرار دیا گیا ہے۔

خیال کی قدامت کے لئے اتنا کافی ہے کہ صرف سولہویں صدی میں خیال کی کئی صورتیں موسیقی میں رائج تھیں جن میں بھلائی خیال، گوری خیال، باجری خیال، ڈاگری خیال، راس دھاری خیال، ترکانگی خیال، رام مات خیال، علی بخشی خیال، چرواخیال اور شطاری خیال خاصے معروف ہیں۔ اس کے علاوہ خیال راجستھانی موسیقی کی ایک صنف بھی ہے جسے سوانگ بھرنے والے گاتے ہیں اور یہ خاص و عام میں بے حد مقبول بھی ہے۔ مدھیہ پردیش میں چندیری کے ہندو سنت، ایک مسلمان صوفی علی شاہ کے "خیال" سے بہت متاثر رہے ہیں۔ راجستھان میں راس دھاریوں نے خیال کو بہت ترقی دی۔ راس دھاری خیال راجستھانی ڈرامے کی قدیم ترین مثال ہے۔ اسی طرح خیال نامی رقص اتر پردیش میں گزشتہ سولہ سو سالوں سے رائج چلا آ رہا ہے۔ اس ساری گفتگو سے ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ دستوری موسیقی کے درجے پر فائز ہونے سے قبل خیال عوامی موسیقی کی صنف کے طور پر صدیوں سے موجود رہا ہے۔

خیال کی ایجاد کے حوالے سے استاد بدرالزمان واحد سکالر ہیں جنھوں نے خیال کی ایجاد کا سہرا محمد شاہ رنگیلا کے درباری گویے نعمت خاں سدا رنگ کے سر باندھنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ موسیقی کے مورخین اپنی بے خبری کے باعث خیال کی ایجاد کا سہرا امیر خسرو اور سلطان حسین شرقی کے سر باندھنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ خیال کی ایجاد، رواج اور پرداخت نعمت خاں سدا رنگ کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اگر غور کیا جائے تو استاد بدرالزمان کے بیان کے صرف آخری نصف حصے پر یقین کیا جاسکتا ہے جبکہ سدا رنگ کو خیال کا موجد قرار دینے والی بات کسی بھی طرح قابلِ قبول نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک سدا رنگ کی خیال گائیکی کو فروغ دینے والی بات ہے وہ نہ صرف درست ہے بلکہ اس کی تائید بعض دوسرے ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ مری واستو کے بقول امیر خسرو نے خیال کو ترقی دینے کی کوشش کی مگر یہ چنداں مقبولیت نہ حاصل کرسکا اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ چنانچہ نعمت خاں سدا رنگ نے اسے ترقی دینے کی از سر نو کوششیں کیں۔ اسی طرح موسیقی کے ایک اور نقاد عنایت الٰہی ملک بھی اس بات سے متفق ہیں کہ خیال گائیکی کو سدا رنگ ہی نے دوام بخشا۔ مگر یہاں سوال یہ پیدا ہوتا

یہ کہ خیال کو امر اور زندگی بخشنے اور عوام میں اسے مقبول بنانے والا سدا رنگ ہے کون؟ یہ کہاں پیدا ہوا اور اس کا زمانہ حیات کیا ہے؟

زمانہ حال میں خیال گانے اور سننے والے لوگوں کے کان سدا رنگ کے نام سے کافی حد تک آشنا ہیں۔ آج کل گائی جانے والی تقریباً ہر دوسری بندش سدا رنگ ہی کے نام سے منسوب ہے۔ "مرقع دہلی" پہلی کتاب ہے جس میں علمی سطح پر پہلی بار ہمیں نعمت خاں سدا رنگ کا نام ملتا ہے۔ اس کتاب کے مصنف درگاہ قلی خان نے سدا رنگ اور ان کے داماد فیروز خاں ادا رنگ پر ایک پیرا گراف تحریر کیا ہے۔ یوں پہلی بار ہم اس کتاب کے ذریعے اس عظیم فنکار سے روشناس ہوتے ہیں۔ نعمت خاں سدا رنگ کی پیدائش اورنگ زیب عالمگیر (1707ء۔۔۔1650ء) کے عہد میں ہوئی۔ موسیقی کے حوالے سے اس کی ابتدائی تعلیم بہادر شاہ اول (1712ء۔۔۔1707ء) کے دربار میں ہوئی جبکہ وہ معز الدین جہاندار اور محمد شاہ رنگیلا کا پسندیدہ فنکار تھا۔ وہ خوش آواز ہونے کے ساتھ ساتھ بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کا بھی مالک تھا جس کے ثبوت کے طور پر وہ ہزاروں بندشیں پیش کی جا سکتی ہیں جو تین صدیاں گزرنے کے بعد بھی آج گانے والوں اور موسیقی سے وابستہ حلقوں میں اسی طرح مقبول ہیں۔ سدا رنگ کے عہد کا معتبر ترین گانا دھرپد تھا۔ مگر اس نے اپنے لئے خیال گائیکی کو وسیلۂ اظہار کے طور پر پایا۔ اگرچہ یہ ایک مشکل راستہ تھا مگر اس نے جب ایک بار خیال کو عوام میں مقبول بنانے کا تہیہ کر لیا تو پھر وہ اپنے ارادے سے پیچھے نہیں ہٹا۔ اس نے بیک وقت کئی زبانوں میں خیال تصنیف کئے جو بے حد مقبول ہوئے۔ بالآخر اس کی کوششیں ثمر آور ثابت ہوئیں اور اس کی زندگی ہی میں خیال ہر خاص و عام کے دل میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس تحریک میں اس کا خوش آواز داماد فیروز خاں ادا رنگ بھی اس کا دست و بازو تھا۔ محمد شاہ نے ہمیشہ سدا رنگ کی سرپرستی کی کیونکہ بادشاہ خود بھی شاعر تھا اور رنگیلا تخلص کرتا تھا جبکہ کئی خیالوں کے بول بھی اس سے یادگار ہیں۔ محمد شاہ کے عہد کا سیاسی و سماجی انحطاط اپنی جگہ مگر اس کا عہد حکومت موسیقی اور شاعری کا عہد زریں کہلاتا ہے۔ سدا رنگ کے حوالے سے عنایت الٰہی ملک نے ایک عجیب و غریب موقف اختیار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سدا رنگ نے خود کبھی خیال نہیں گایا بلکہ اس نے محمد شاہ کے حرم کی ناچنے والیوں کو خیال گائیکی کی تعلیم دی۔ یہ وہ بات ہے جس پر کوئی بھی اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ایک ایسے عہد میں جبکہ دھرپد کو عوام اور دربار میں اعلیٰ ترین گانے کا درجہ حاصل تھا۔ کیا صرف خوبصورت بندشیں تخلیق کر کے خیال گائیکی کو عوام سے لے کر دربار تک قبول عام کی سند سے سرفراز کیا جا سکتا تھا؟ اگر سدا رنگ صرف بندشیں تخلیق کرتا تھا اور حرم کی ناچنے والیوں کی تعلیم دیتا تھا اور اس نے خود کبھی خیال نہیں گایا تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے موسیقار اور گویے تھے جنہوں نے خیال کو اٹھارویں صدی کا مقبول ترین گانا بنانے میں اہم ترین کردار ادا کیا؟ یقیناً یہ وہ معجزہ ہے جسے سدا رنگ کے علاوہ کوئی گویا انجام نہیں دے سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ خیال کی ایجاد کا سہرا آپ نائیک گوپال، امیر خسرو اور سلطان حسین شرقی میں سے کسی کے بھی سر باندھ سکتے ہیں لیکن خیال کی پرداخت، حیات نو، دھرپد کی آمریت کے زمانے میں اسے خاص و عام میں رواج دینے اور مقبول بنانے کا کریڈٹ صرف اور صرف سدا رنگ ہی کو جاتا ہے۔ خیال کو بنانے سنوارنے اور آراستہ کرنے میں اگرچہ درجنوں مسلمان گھرانوں کا خون جگر شامل ہے مگر خیال کی رگوں میں تازہ خون شامل کرنے کا معجزہ سدا رنگ ہی نے انجام دیا۔ یہ اس کا ایک ایسا علمی و فنی کارنامہ ہے جسے کلاسیکی موسیقی کی تاریخ میں ہمیشہ سنہری حروف سے لکھا جائے گا۔

(ختم شدہ)

◆◆◆

معمر ترین فکشن نگار: کشمیری لال ذاکر

نند کشور وکرم (انڈیا)

اردو کے ممتاز اور زود نویس فکشن نگار اور شاعر کشمیری لال ذاکر کا 14 اگست 2016ء کو چنڈی گڑھ کے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں انتقال ہو گیا۔

ذاکر صاحب نے جتنی طویل عمر پائی اتنی شاید ہی کسی اور فکشن نگار نے پائی ہو۔ وہ لگ بھگ 98 سال کی عمر میں اس دنیائے فانی سے رخت سفر باندھ کر عدم کی نامعلوم وادی کی جانب روانہ ہو گئے اور ان کی وفات سے اردو ادب ایک ایسے ممتاز فکشن نگار سے محروم ہو گیا جس نے زائد از پون صدی اردو ادب میں اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ ان کی رحلت سے اردو ادب نے ایک ایسا نامور اور معروف فکشن نگار کھو دیا جس نے میدان ادب میں شہرت کی بلندیوں پر اپنا پرچم لہرایا اور جس کا نام ادبی دنیا کا جانا پہچانا نام بن گیا تھا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ شاید ہی کوئی اردو داں ایسا ہوگا جس نے ان کی کوئی تخلیق خصوصاً ناول یا افسانہ نہ پڑھا ہو تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔

میرے ذاکر صاحب سے کوئی نصف صدی کے تعلقات رہے ہیں اور ہم اکثر دہلی اور چنڈی گڑھ میں منعقدہ ادبی تقریبات اور محفلوں میں ایک دوسرے سے ملتے رہے ہیں اور مجھے ان کے بہت قریب رہنے کا شرف حاصل رہا ہے۔ ذاکر صاحب کی پیدائش 7 اپریل 1919ء کو پنجاب کے مشہور شہر گجرات کے بیکا بانیاں میں گورداس مل موہن کے ہاں ہوئی۔ انہوں نے انگریزی میں ایم اے اور بی ٹی کی ڈگری حاصل کرنے کے علاوہ تعلیم بالغاں اور سوشل ایجوکیشن میں خصوصی تربیت حاصل کی اور درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ وہ کوئی تیس سال تک پنجاب اور ہریانہ کے محکمہ تعلیم میں خدمات انجام دینے کے بعد 1977ء میں حکومت ہریانہ کے محکمہ غیر رسمی تعلیم بالغاں کے سربراہ کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔

ذاکر صاحب نے متعدد ناولوں سے اردو فکشن کو مالا مال کیا جن میں ان کے ناول "کرماں والی" کو غالباً سب سے زیادہ شہرت ملی اور اسے قارئین نے بے حد پسند بھی کیا۔ یہ فرقہ وارانہ اتحاد و یگانگی کی کہانی ہے۔

اس ناول کی کہانی کو اتنا پسند کیا گیا کہ بعد ازاں 1990ء کے قریب نیشنل اسکول آف ڈرامہ نے اسے اڈاپٹ کر کے ڈرامے کی شکل میں اسٹیج پر پیش کیا اور یہ عوام میں اتنا مقبول ہوا کہ اسے ایک سو سے زیادہ بار اسٹیج پر پیش کیا جا چکا ہے اور بعد ازاں اسی ڈرامے کو پنجابی زبان کا جامہ پہنا کر "میرا دا تھا میرا جوگی کے نام" سے جالندھر اور سرینگر ریڈیو سے بھی پیش کیا گیا تھا۔

ان ناولوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاکر صاحب نے ہر اہم قومی، سماجی اور سیاسی تحریک یا واقعہ کو بڑی خوبصورتی سے ایک ناول کی شکل دی ہے۔ ان کے ناول "انگوٹھے کا نشان" میں بندھوا مزدوروں کے مسائل و مصائب پر بڑی حقیقت پسندانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ "بلیک باکس" نامی ناول میں کنشک جہاز کے اغوا کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے جس میں کینیڈا سے ہندوستان آتے ہوئے سینکڑوں معصوم اور بے گناہ افراد دہشت گردی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح "کشمیر جل رہا تھا" اور "لمحوں میں بکھری زندگی" میں

انہوں نے کشمیر جنت نشاں کے ناگفتہ بہ حالات پر بہت ہی دلپذیر انداز میں ناول رقم کئے جن میں کشمیر کی تاریخی، تہذیبی اور معاشرتی حالات کی بڑی عمدہ منظر کشی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ کس طرح شرپسند طاقتوں نے اس پُرامن خطے کے امن و سکون کو برباد کر دیا ہے۔ "سیندور کی راکھ" ان کا سوانحی ناول ہے جس کے مطالعہ سے قاری ان کی زندگی کے بہت سے حالات سے روشناس ہوتا ہے۔ نشہ بندی کے موضوع پر (سلاخ ٹوٹی ہے) اوڈیا بھاوے کی تحریک "بھودان اندولن" پر (دھرتی سدا سہاگن) اور ہندوستان کے ساحلی علاقوں پر قہر برپا کرنے والے طوفان 'سنامی' پر (سمندر اب خاموش ہے) پنڈی کی گرہ شہر کے ماحول اور پس منظر میں (ایک شہر ایک محبوبہ میرا شہر ادھورا) تاریخی ناول (خون پھر خون ہے) مجبور اہوئی ایک رات، سمندر صلیب اور دوار) مشترکہ خاندان کی شکست و ریخت اور بوڑھوں کے مسائل پر "ڈوبتے سورج کی کتھا" قلم بندی۔ سماج میں عورت کی ناگفتہ بہ حالت اور اس کے مسائل پر ناول "لمحوں میں بکھری زندگی" ایسے متعدد ناول لکھے ہیں، جن کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاید ہمارے عہد کا کوئی بھی اہم مسئلہ ان کے قلم کی زد سے نہیں بچ پایا جس پر انہوں نے اپنے انداز و اسلوب میں اپنے خیالات و نظریات کو صفحۂ قرطاس پر ابھارا ہو۔

بلاشبہ ڈاکٹر صاحب فکشن کے میدان میں ایک ممتاز و مستند فکشن نگار کی حیثیت سے ایک بلند مقام حاصل کر چکے تھے اور غالباً وہ ملک کے واحد افسانہ نگار اور ناول نگار تھے جنہوں نے ملک کے لگ بھگ ہر اہم مسئلے اور واقعہ کو اپنے دلپذیر ناول یا افسانے کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اور انہیں اس خوبی سے صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے کہ بعض کے نقوش قاری کے دل و دماغ پر ثبت ہو کر رہ جاتے ہیں۔

ناولوں کے علاوہ انہوں نے لاتعداد افسانے بھی لکھے اور ان کے کئی افسانوی مجموعے اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ان میں جب کشمیر جل رہا تھا، اداس شام کے آخری لمحے، دیر یوں والا قصبہ، ایک کرن روشنی کی، اچھے ہم وہی لگتے، چنار چنار چہرے، برف دھوپ چنار اور سمندری ہواؤں کا موسم وغیرہ شامل ہیں۔ ان مجموعوں کی کئی کہانیوں کی ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی ہوئی ہے اور وہ متعدد بار اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان میں ... آخری صدی کا سورج، افق، دوسرا مرد، شام بھی تھی دھواں دھواں، کورے قیدکا ورق، ڈریم لینڈ، پھولاں، جھیل، ادھورے شہر کی ادھوری کہانی، رشتہ وغیرہ ایسی کہانیاں ہیں جنہیں قارئین نے بہت پسند کیا اور محققین نے بھی ان پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور انہیں بے حد سراہا ہے۔

اسی طرح ان کے افسانوی مجموعے "جب کشمیر جل رہا تھا" میں شامل فسادات سے متعلق لکھی کہانی "افق" پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور افسانہ نویس بلونت سنگھ نے لکھا تھا کہ فسادات کی بابت جتنے افسانے لکھے گئے ہیں ان میں سے بہت کم اس کے مقابلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔

بلاشبہ ڈاکٹر صاحب کی کہانیاں زندگی کی منہ بولتی تصویریں ہیں جنہیں انہوں نے اپنے پُراثر الفاظ اور فنکارانہ بنت سے اس طرح سے پیش کیا ہے جیسے کسی مصور نے اپنا انوکھا شاہکار پیش کیا ہو۔

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب کی اردو ادب میں صحیح شناخت ایک نامور فکشن نگار کی حیثیت سے ہی رہی ہے مگر انہوں نے ناولوں اور افسانوں کے علاوہ ادب کی دیگر اصناف میں بھی اپنی علمی اور ادبی صلاحیت و بصیرت کے جوہر دکھائے ہیں۔ انہوں نے ایک شاعر کے طور پر اپنی شعری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ صحافت، خاکہ نگاری، ادارت نگاری، رپورتاژ اور سفرنامے پیش کر کے بھی اہلِ اردو سے داد و تحسین حاصل کی ہے۔ علاوہ ازیں ان کی اردو تصانیف ہندی، انگریزی اور پنجابی کے علاوہ بعض دیگر زبانوں میں بھی اشاعت پذیر ہو کر

دیگر زبانوں کے اعلیٰ ادب سے بھی خراجِ تحسین پا چکی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی خاکہ نگاری سے متعلق کتابوں اپنی ہوا، ان کی خوشبو، شخصیتوں کے سفیر، درد آشنا چہرے اور گمشدہ بکری کا قلندر اور یارانِ تیز گام کے مطالعے سے ہم پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ خاکہ نگاری کے فن پر ان کی پوری گرفت ہے اور انہوں نے اپنے احباب اور ادیبوں کے خاکے اس طرح تخلیق کئے ہیں جیسے وہ کسی مصور کے شاہکار ہوں۔ انہوں نے اپنے خاکوں کو اپنے ذخیرۂ الفاظ، منفرد اسلوب اور فنکارانہ مہارت سے زندۂ جاوید تصویریں بنا دیا ہے۔ انہوں نے راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس، اجمل دت، قمسنار ڈرس وت، قتیل شفائی، ساحر لدھیانوی، ریاض شاہد، اختر یوسف، جوائے وغیرہ کے خاکے اس منفرد اسلوب و انداز میں پیش کئے ہیں کہ کہیں کہیں ان میں مختصر افسانے کا رنگ بھی جھلکنے لگتا ہے۔

فکشن کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے شاعری کے میدان میں بھی اپنا سکہ جمایا ہے اور اپنی سحر انگیز شاعری سے قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ان کے بعض اشعار تو قاری پر اپنے اَن مٹ نشان چھوڑتے ہیں اور انہیں بار بار گنگنانے کو جی چاہتا ہے۔ ان کے شعری مجموعہ "شیشہ بدن خواب" کے دیباچے میں ممتاز و نامور محقق اور نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ان کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہیں ایک اچھا شاعر قرار دیتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ:

> "کشمیری لال ذاکر فکشن نگار تو بہت پہلے ہوئے اور وہ مستند ہیں (جتنی ان کی عمر ہے اس سے بھی زیادہ کتابیں ان کی اردو ہندی پنجابی میں نکل چکی ہیں) لیکن وہ شاعری بھی اس دھج سے کرتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا جب وہ ایک فائل میرے یہاں چھوڑ گئے جو ان کے کلام پر مشتمل تھا۔ کیا لطافت اور رچاؤ اور سلاست اور روانی ان کے کلام میں ہے۔ اس کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہوا۔ روایت کا فیضان جاری و ساری ہے۔ جس شخص نے ساری عمر وحشت ادب کی سیاحی میں گزار دی وہ شعر کہنے لگے تو تعجب ہونا چاہیے۔ مشاعروں نے کتنوں کو شاعر بنا دیا اور ہمارے کشمیری لال ذاکر اکو فکشن نگار ہی، اسلوب تخلیق کی کسوٹی پر کسے گئے تو شاعر نکلے۔"

ڈاکٹر صاحب کی شاعری کے اسلوب و معیار سے متعارف کرانے کے لئے ان کے کچھ منتخب اشعار پیش کئے جاتے ہیں جنہیں قارئین نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور سراہا ہے:

جس نے خوابوں کے بھرے کھیت جھلس ڈالے ہیں — میرے ماحول کی وہ گرم ہوا لے جاؤ

☆

تم عدالت میں کھڑے ہو، یہ نہ بھولو ذاکر — وقت منصف ہے، بڑی سخت سزائیں دے گا

☆

میں وہ آنسو کہ چھلکتا ہی رہا پلکوں پر — کسی دریا پہ کسی گال پہ ٹپکا ہی نہیں

☆

عمر بھر ایک ہی لمحے کی پرستش کی ہے — جو کبھی خواب، کبھی زخم، کبھی مرہم تھا

☆

وہ چلا جائے گا دلوں کی تجارت کرکے   مدتوں شہر میں اس شخص کا چرچا ہوگا

☆

یہ اور بات کہ آگے ہوا کے رکھے ہیں   چراغ جتنے ہیں سارے جلا کے رکھے ہیں

☆

انہیں فسانے کہو دل کی داستانیں کہو   یہ آئینے ہیں جو کب سے سجا کے رکھے ہیں

ڈاکٹر صاحب کو میدانِ ادب میں اپنی تخلیقات پیش کرتے ہوئے زائد از پون صدی ہونے والی تھی اور وہ ایک سو کے قریب اپنی نگارشات پیش کر چکے تھے اور اب بھی دو تین سال قبل تک ان کا اشہبِ قلم تیز رفتار سے تخلیقی سفر پر رواں دواں تھا اور وہ نوے سال کی عمر میں بھی نوجوانوں کی طرح مسلسل کئی کئی گھنٹے لکھتے پڑھتے اور انتظامیہ امور کو نبھانے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ ہریانہ اردو اکادمی کے سیکرٹری کی حیثیت سے برسوں سے اپنی ادبی اور انتظامیہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے رہے اور انہوں نے اپنی کاوش و استعداد سے اس اکادمی کو ملک کی چند برگزیدہ اکادمیوں کی صف میں کھڑا کر دیا تھا۔ ان کی جسمانی اور ذہنی قوت و صلاحیت کو دیکھ کر لوگ ان پر رشک کرتے تھے اور ان کی اس چستی اور پھرتی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتے تھے۔ ان کی موجودہ استعداد و صلاحیت کو دیکھتے ہوئے احباب توقع کرتے تھے کہ وہ اسی طرح مسلسل اپنی ادبی اور انتظامیہ امور کو بخوبی انجام دیتے ہوئے ایک صدی کا فاصلہ بڑی خوش اسلوبی سے طے کر لیں گے مگر افسوس ایسا نہ ہو سکا اور وہ 98 برس کی عمر میں ہی ہم سے جدا ہو گئے اور ہمارا ان کی زندگی میں ہی بڑی شان و شوکت سے ان کا صدی تقریبات منانے کا پروگرام شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

ڈاکٹر صاحب پر کئی یونیورسٹیوں میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے مقالے لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں لیکن ابھی بھی ناقدین و محققین نے ان پر وہ توجہ نہیں دی جس کی ضرورت ہے۔ انہوں نے ادب کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں انہیں تحقیقی اور تنقیدی کسوٹی پر مزید پرکھ کر ان کی ادبی کارگزاریوں کا مفصل تجزیہ و تحقیق کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں متعدد اداروں اور اکادمیوں نے انعامات و اعزازات سے نوازا، جن میں ہریانہ ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ (1969ء)، غالب ایوارڈ (1986ء) مجموعی ادبی خدمات پر پاکستان کا مجلس نقوش ایوارڈ (1994ء)، مجموعی خدمات پر عالمی پنجابی کانفرنس لاہور کا ایوارڈ (2005ء)، پنجاب سرکار کی جانب سے شرومنی اردو ساہتیہ ایوارڈ، اور حکومت ہند کا یونیسکو ایوارڈ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں صدر جمہوریہ ہند نے تعلیم اور ادب کے میدان میں ان کی قابل قدر خدمات پر انہیں 29 مارچ 2006ء کو 'پدم شری' اعزاز عطا کیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی طویل زندگی قابل تقلید اور شاہانہ انداز میں بسر کی جس پر لوگ حیرت و رشک کا اظہار کرتے تھے۔ اس کا احساس دوسروں کو ہی نہیں خود انہیں بھی تھا۔ جیسا کہ اپنے ایک شعر میں انہوں نے اپنے دور کے افراد کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی شان و تمکنت سے کہا تھا:

کسی کو ہے بھی سلیقہ چمن میں جینے کا!   میں جس سکون سے بکھرا ہوں، کون بکھرے گا؟

◆◆◆

اُردو زبان کا معمار چلا گیا

کے ایل نارنگ ساقی (انڈیا)

اب یادِ رفتگاں کی بھی ہمت نہ رہی　　　یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں

کشمیری لال ذاکر صاحب 98 برس کی عمر میں 31 اگست 2016 کو چنڈی گڑھ میں اس دنیا سے رختِ سفر باندھ کر سوئے عدم روانہ ہو گئے۔ جب ان کی بیٹی کلپنا نے فون پر بتایا تو خبر بجلی بن کر مجھ پر گری۔ صرف پانچ دن پہلے انہوں نے فون کر کے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ میں چاہتا ہوں جو کچھ مضامین مجھ پر لکھے گئے ہیں انہیں یکجا کر کے میں اسے مرتب کر کے کور مہندر سنگھ بیدی لٹریری ٹرسٹ کی طرف سے شائع کروں۔ میری بدقسمتی کہ بروقت چنڈی گڑھ نہ پہنچ سکا۔ جس کا مجھے ہمیشہ قلق رہے گا۔ انشاء اللہ میں ان سے کتاب شائع کرنے کا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔ ذاکر صاحب کا خیال آتے ہی ایک دل کش تصویر نظروں کے سامنے آ جاتی ہے۔ خوبصورت، صاف دل، صاف گو اور بے لاگ شخصیت۔ میں نے انہیں کبھی کسی کی غیبت کرتے نہیں دیکھا۔

ان کی پیدائش 17 اپریل 1919 میں موہیال خاندان میں پنجاب کے مشہور شہر گجرات (پاکستان) کے گاؤں پکا ڈیالاں میں ہوئی۔ موہیال برادری کو حسینی براہمن بھی کہا جاتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق ان کے بزرگوں نے جنگ کربلا میں حسین صاحب کا ساتھ دیا تھا اور حضرت حسین کا سر یزید کے قبضے سے چھڑا کر لائے تھے۔ 1970ء میں میرا تعارف آنجہانی راجندر ملہوترہ صاحب سے ہوا تھا وہ ان دنوں انبالہ میں ہر سال انڈو پاک مشاعرہ منعقد کیا کرتے تھے۔ عام طور پر ان کا مشاعرہ ماہ مارچ کے آخری ہفتے میں ہوتا تھا۔ چونکہ دہلی کا شنکر شاد کا انڈو پاک مشاعرہ دہلی میں مارچ کے آخری ہفتے میں ہوتا تھا۔ ملہوترہ صاحب میرے ذمہ لگا دیتے تھے کہ دہلی کا شنکر شاد کے مشاعرے میں شامل چند پاکستانی شاعروں اور کچھ ہندوستانی شاعروں کو دہلی سے ساتھ لے کر انبالہ پہنچاؤں۔ 1978ء میں قتیل شفائی صاحب اور چند اور شعرا کو لے کر انبالہ گیا تو قتیل صاحب نے کشمیری لال ذاکر صاحب سے ملاقات کے لیے چنڈی گڑھ جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میں انہیں لے کر ذاکر صاحب کے دردولت پر پہنچ گیا۔ ذاکر صاحب قتیل شفائی سے بغل گیر ہونے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اس خلوص اور تپاک سے ملے کہ جیسے میری ان سے مدتوں شناسائی ہو۔ میں تو پہلی ملاقات سے ہی ان کا گرویدہ ہو گیا۔ اس کے بعد میرا ان سے تعلق ہمیشہ نیازمندی کا رہا اور وہ بھی مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھنے لگے۔

ذاکر صاحب نے ایم۔اے انگریزی اور بی ٹی کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد تعلیم بالغاں میں خصوصی سند حاصل کی اور ہریانہ سرکاری سروس میں آ گئے (اس وقت ہریانہ متحدہ پنجاب میں شامل تھا) ان دنوں کا ایک دلچسپ قصہ سن لیجیے۔

''جن دنوں ذاکر صاحب گوڑگاؤں میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تھے۔ فرید آباد کے گرلز اسکول میں ایک ڈرائنگ ماسٹر تھے اور اسی اسکول میں ان کی بیوی پنجابی پڑھاتی تھیں۔ ان دونوں نے اسکول کے پرنسپل کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ ذاکر صاحب نے ایک دو بار ڈرائنگ ماسٹر کو بلا کر سمجھایا لیکن اس نے اپنا رویہ نہیں بدلا چنانچہ انھوں نے خاوند کو دور

ایک اسکول میں اور بیوی کو اتنے ہی فاصلے پر کسی دوسرے اسکول میں ٹرانسفر کر دیا۔ لیکن انھوں نے اسکول سے چارج دینے کے بعد نئے اسکول میں رپورٹ نہیں کیا تھا۔ اس بات کو تقریباً ایک ماہ ہو گیا تھا دفتر والوں نے ان کے خلاف تادیبی کارروائی کے لیے فائل نہیں بھیجی تھی جس پر وہ مصروفیت کی وجہ سے کوئی ایکشن نہ لے سکے تھے۔ ایک صبح ڈرائنگ ماسٹر اجازت لے کر ان کے کمرے میں داخل ہوا اور ان کے سامنے بند لفافہ رکھ دیا۔ لفافے پر لکھے ہوئے ایڈریس کے چند ڈرائنگ سے انھوں نے پہچان لیا تھا کہ یہ کوئی مہندر سنگھ بیدی صاحب کا ہے۔ انھوں نے لفافہ کھولا۔ اس میں نہایت مختصر خط تھا جس میں لکھا تھا "یہ میاں بیوی اس وقت بڑی پریشانی میں ہیں۔ آپ نے دائرے جانے کے پیش نظر انھیں اکٹھا کر دیجیے اور ان کی دعائیں لیجیے" خط پڑھ کر ڈاکٹر صاحب مسکرائے۔ ڈرائنگ ماسٹر نے بڑی جرأت کر کے پوچھا "کیا لکھا ہے سر؟" "آپ کے فائدے کی بات ہے آپ جائیے"۔ انھوں نے ماتحتوں کے ذریعے فائل نکالی اور میاں بیوی کو فریدآباد کے قریب ایک اسکول میں ٹرانسفر کے آرڈر جاری کر دیے۔"

ڈاکٹر صاحب اردو، ہندی اور پنجابی میں ناول افسانے، ڈرامے کے علاوہ اور مختلف موضوعات پر 140 سے زیادہ کتابیں تحریر کر چکے تھے۔ وہ ایک معروف افسانہ نگار ہی نہیں بلکہ جانے پہچانے شاعر بھی تھے۔ یوں تو ان کی تمام تصانیف کی خوب پذیرائی ہوئی۔ خصوصاً "کرماں والی" "سمندر کی راکھ" اور "جب کشمیر جل رہا تھا" کو خاص طور پر شہرت ملی۔ وہ اپنی کہانیوں میں زندگی کی تلخ و شیریں لمحات کی حقیقت نگاری، انسانی جذبات کی گہرائی، جیتے جاگتے کرداروں کی تخلیق اور مناظر فطرت کی عکاسی اس سلیقے سے کرتے کہ پڑھنے والا عش عش کر اٹھتا۔ 1990ء میں نیشنل اسکول آف ڈرامہ نے ان کے مشہور ناول "کرماں والی" کو ڈرامے کی شکل میں کمانی آڈیٹوریم دہلی میں اسٹیج پر پیش کیا۔ جو اس قدر پسند کیا گیا کہ عوام کے اصرار پر اس کے ایک سو سے زیادہ شو اسٹیج کیے گئے۔

محقق ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں۔

"جناب کشمیری لال ذاکر اردو فکشن میں ایک عظیم فنکار پریم چند کی روایت کے علمبردار ہیں انھوں نے شہر کی طرف سے دیہات کی طرف واپسی کا راستہ اختیار کیا۔"

نزہت جاوید نے ان کے ناول کرماں والی کے بارے میں لکھا۔

"دراصل کشمیری لال ذاکر اپنی تخلیقی کاوشوں سے اپنے مضبوط پلوں کی تعمیر میں منہمک ہیں۔ وہ انسانی رشتوں کے ایسے ایسے پل تعمیر کرتے رہے ہیں جن کے نیچے سے انسانی جذبات اور احساسات کا صاف و شفاف اور گہرا پانی بہتا تھا جو انسانی برادری کے کھیتوں کو سینچتا اور دھرتی کے باسیوں کی زندگی کو سیراب کرتا۔"

1984ء میں محکمہ تعلیم سے ریٹائر ہونے کے بعد ہریانہ سرکار نے ان کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے لیے انھیں اردو اکیڈمی کا سیکرٹری مقرر کیا۔ ڈاکٹر صاحب ان دنوں کوئی بھی مشاعرہ منعقد کرنے سے پہلے مجھ ناچیز سے شاعروں کے انتخاب کے لیے ضرور مشورہ کرتے اور اس کے بعد ہندستانی اور پاکستانی شاعروں کو دہلی سے ہریانہ، چنڈی گڑھ یا دوسرے شہروں میں لانے اور لے جانے کی ذمہ داری مجھے سونپ دیتے۔ متعدد بار میں قتیل شفائی، اختر جاوید، احمد فراز، حسن رضوی، جمیل صاحب، بشری اعجاز، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی،

جگن ناتھ آزاد کے علاوہ اور بہت سے شعرا کو لے کر ہریانہ کے مختلف مقامات پر پہنچاتا اور واپس لاتا رہا۔

ذاکر صاحب خود شاعر ہونے کے باوجود بہت کم مشاعروں میں حصہ لیتے تھے اور نہ ہی کبھی انہوں نے اپنا کوئی مجموعہ چھپوانے کی طرف توجہ دی۔ 1994 میں ہم نے ان کا جشن منانے کا فیصلہ کیا تو اس وقت ہم نے بہت سے ادیبوں سے مضامین لکھوائے۔ فن اور شخصیت کا کشمیری لال ذاکر نمبر شائع کیا اور ایک عدد ضخیم سوونیئر شائع کیا جس کا اجرا چنڈی گڑھ میں ہریانہ اور پنجاب کے گورنر مرحوم سریندر ناتھ نے ہریانہ کے گورنر ہاؤس میں کیا۔ جس میں دہلی، پنجاب اور ہریانہ کے بہت سے ادبا اور شعرا نے حصہ لیا۔

1999 میں ذاکر صاحب سے اصرار کرنے میں ان کا شعری مجموعہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ ذاکر صاحب کے پاس اپنی غزلوں کا کوئی ریکارڈ میسر نہیں تھا۔ ہم نے کوشش کر کے ان کی بکھری ہوئی غزلوں کو مختلف رسالوں اور اخباروں میں سے جمع کر کے ان کا شعری مجموعہ "شیشہ بدن خواب" شائع کیا۔ جس کا انتساب انھوں نے قتیل شفائی، جگجیت سنگھ، صابر دت اور میرے نام کیا اور اپنی کتاب اپنے دستخط کے ساتھ یہ لکھ کر پیش کی۔ "لیجیے حضور پہلی کتاب آپ کو پیش کر رہا ہوں" دعاؤں کے ساتھ کشمیری لال ذاکر۔ اس کتاب کے دیباچے میں اردو ادب کے ممتاز نقاد اور محقق پروفیسر گوپی چند نارنگ لکھتے ہیں:

> "جتنی ان کی عمر ہے اس سے بھی زیادہ کتابیں ان کی اردو، پنجابی میں نکل چکی ہیں۔ لیکن وہ شاعری بھی اس وضع سے کرتے ہوں گے اس کا اندازہ مجھے اس روز ہوا جب ایک فائل میرے ہاں پہنچا گئے جو ان کے کلام پر مشتمل تھا۔ کیا نفاست اور چاؤ، سلاست اور روانی ان کے کلام میں ہے۔ اس کا اندازہ پڑھنے کے بعد ہوا۔"

مزید لکھتے ہیں:

> "یہ حقیقت ہے اس میں مبالغہ نہیں کہ اگر کشمیری لال ذاکر نہ ہوتے تو آج ہریانہ میں اردو کا نام لیوا اعلیٰ سطح پر کوئی نہ ہوتا۔ ہریانہ اردو اکیڈمی ان کے اور وہ ہریانہ اردو اکیڈمی کے دم سے اردو کا پرچم اٹھائے ہوئے ہیں۔ بڑے بڑے ادبا و شعرا اس اکادمی کی دعوت پر چنڈی گڑھ اور دوسرے مقامات پر جمع ہوتے ہیں اور گورنر ہریانہ اور وزیر اعلیٰ کی مہمان نوازی سے فیضیاب ہوتے ہیں۔"

ذاکر صاحب کے کچھ شعر پیش کرتا ہوں۔

- میرا نام لکھے گا ہوا کے جھونکوں پر
  پھر اس میں درد کی تختیاں لگا دے گا
- پھر اس کے بعد پرندے ادھر نہیں آئے
  بس ایک بار انہیں گھر بنانا ہوتا ہے
- صحرا صحرا سورج اگلتا رہتا ہے
  دریا دریا چاند ابھرتے رہتے ہیں
- جب نہ وہ وقت کی روٹی کو کوئی ترسے گا
  کیسی ہوں گی وہ رتیں کیسے زمانے ہوں گے
- انقلاب آئے تو چپ چاپ ہی آ جاتا ہے
  تم نے تاریخ کے اوراق کو دیکھا ہی نہیں

میں اس مضمون کو انہی کے شعر پر ختم کرتا ہوں۔

سانسوں کی دولت کو اپنے ہاتھوں میں
ڈھلتی عمر میں کھونا اچھا لگتا ہے

◆◆◆

منظومات

ابصار عبدالعلی

آئینہ شکن

انہوں نے اپنے گھر میں
آئینہ رکھا نہیں کوئی
مگر وہ دوسروں کو آئینے کے سامنے لانے کے
عادی ہیں
وہ گھر میں آئینہ رکھتے نہیں ہیں
اگر مل جائے آئینہ تو اس کو توڑ دیتے ہیں
وہ آئینہ شکن مخلوق
وہ فرعون زادے
مجسم خود پرستی ہیں
بزعم خود سمجھتے ہیں
وہ یکتا ہیں زمانے میں
کہ وہ بے مثل ہیں، بے عکس و شباہت ہیں
انہیں آئینہ بھی ایک سے دو کر نہیں سکتا
مگر ہم دوسروں سے کہتے ہیں
مقابل آئینہ رکھو، دو ہیں چہرے
کہ تم فرعون زادوں، شاہزادوں کی طرح
بے مثل نہیں ہو
یکتا نہیں ہو
تمہارے جیسے کتنے اور بھی ہیں

OOO

پروین شیر (امریکہ)

بھول بھلیاں

بھول بھلیوں کے اندر اک
دوڑ لگی ہے
پیچیدہ رستوں کے آگے
جال بچھے ہیں
تنگ سی گلیاں، اونچی اونچی دیواریں
دوڑنے والے سب انجان ہیں لیکن
جانے پہچانے لگتے ہیں
ادل بدل کر رستے پھر
خار و خس سے رستے پُر ہیں
ان گلیوں میں
دیواروں کے آگے پیچھے
بچے بڑے بھی بھول بھلیاں
کے اک کھیل میں کھوئے ہوئے ہیں
بھاگنے والے ایسے بھی ہیں جو
دوڑ اڑان کی
کھوج میں اس کی سرگرداں رہتے ہیں
جن کے ملنے کا کوئی امکان نہیں ہے!

OOO

نیر جہاں (امریکہ)

سر چھپانے کی قیمت

عجب سانحہ ہوا
کہ دریا پانی آگیا گھر میں
تمام لوگ اب خودکشی کی سوچنے لگے

یہ ان دنوں کی بات ہے
کہ گھر کے زرد موسموں کے درمیان
بکھرنے دل کو چھوڑ کے
ملامت کی بات کی
اور ابھی زمین نے
تعفن سے چور جسم کو
حرارتوں کی بھیک دے کے یہ کہا
"زمین مقتول ہے
یہ دلوں میں صرف برف ہے
مشقتوں کی کھردری ردا لے
جو دو سکے تو تعمیر ہوا"
سو یوں ہوا
ہمارے سر پہ سائبان تو آ گیا
مگر ہمارے پاؤں سے زمیں کھسک گئی!

OOO

شہزاد نیر

اے چشمِ درد آشنا

اک بوند برسی
اک اشک چھلکا
خاموش نظروں کوئی بات سی کر
دل دُکھتا ہے
تو میرے دل پر ہاتھ تو رکھ
میں تیرے ہاتھ پہ دل رکھ دوں
دل درد بھرا
جو اس کو چھوئے
یا اس سے ملے
اک لفظ محبت بول ذرا
میں سارے لفظ تجھے دے دوں
دل درد سراب کو تب سے بھر
تو میرے خواب پہ آنکھ تو دھر
میں تیری آنکھ میں خواب بھر دوں
خاموش محبت اب بات تو کر
دل دکھتا ہے

OOO

کرشن پرویز (انڈیا)

قطعات

(اظہر جاوید اور جناب انور سدید کے لیے)

ایک عالم ہے اب بھی لوٹ کہاں
سب کے دل میں ہی زخم تازہ ہے
صرف گھروں پہ ہی نہیں موقوف
آج ہر دل میں اک جنازہ ہے

بانٹ لیتی اپنی وحشت دل
اور بڑھتی ہے کم نہیں ہوتی
شدت غم کی انتہا مت پوچھ
آنکھ رو کر بھی نم نہیں ہوتی

جو بھی گذری ہے ہاتھوں دل پہ
ہم زباں سے بتا نہیں سکتے
اور بڑھتا ہے درد دل پوچھو
حال دل بھی سنا نہیں سکتے

جو ماتم ہیں آج سب احباب
دل سے ہم کو بھلا نہ پائیں گے
ایسے صدمے گذر گئے دل پہ
کیسے محفل کوئی سجائیں گے

ظلم ایسا دیا مقدر نے
لاکھ کوشش بھی کی بھلانے کی
لب لرزتے ہیں آنکھ بہتی ہے
بات ہوتی نہیں سنانے کی

OOO

پیروز بخت قاضی

ساون آیا

دن کو سورج دھوپ بکھیرے
تپش پسینہ حبس اور گرمی
جیسی بھی ہاں سب ہی
سایہ ڈھونڈیں چین نہ آئے

شام ڈھلے تو من گھبرائے
ہوا چلے نہ کچھ بھی بھائے
پتے ساکن رکھ خاموش
جیسے چپ اور گل مرجھائے

رات ہوئی تو گم سم امبر
کروٹ لے کر نیند بھگائے
آندھی جھکڑ کھڑکیں ماریں
بات کڑکی کا کھٹکا جائے

بوندیں برسیں تیز ہوا میں
کالی گھٹا جب گھر کر آئے
بجلی چمکے نیل گگن میں
چھم چھم برکھا جی بہلائے

اجلی سڑکیں گیلی مٹی
پتے سبزہ سب دھل جائے
کیسا ہے کا روپ ہے بدلا
ساون رت جو چھا جائے

OOO

سید مبارک علی شمسی

پانی شور کرتا ہے

سنہری دن ہوا کرتے تھے
جب تیری مدھ بھری آنکھوں میں
دیپک جلا کرتے تھے
تیرے لباس کی سلوٹوں پر
ہر رات میں ستارا کرتے تھے
تیرے چہرے کو دیکھ کر
ہم حسن کے آئینے لو کرتے تھے
اور تیری چھلکتی ہوئی آنکھوں میں
ساحری کے دیپک جلا کرتے تھے
جب ان گزرے دنوں کی یاد
خزاں خزاں میری آنکھوں میں
آ کے سما جاتی ہے
تو میری بھیگی آنکھوں کی
تشنگی اکتاتی ہے
پھر اپنے ہی آنگن سے
جو قطرہ قطرہ ٹپکتا ہے
وہ پانی شور کرتا ہے

OOO

غلام نبی خیالؔ (جموں کشمیر)

شہیدوں کے مزار

زندگی کا کارواں پھر سوئے منزل چل پڑا
درد رکھتا تھا وطن کا جو بھی وہ دل چل پڑا
عزم کو زندہ بنا کر مرتے رہتے ہیں جاں نثار
جا بجا کشمیر میں دیکھو شہیدوں کے مزار

جان قرباں کر چلے دار و رسن کو چوم کر
گولیاں کھاتے رہے جو رقص میں جھوم جھوم کر
اُن کی ہیں ہر جا ہی قبریں قطار اندر قطار
جا بجا کشمیر میں دیکھو شہیدوں کے مزار

گلشنوں میں آنکھ کھولی اور پھولوں میں پلے
جان و تن ارض وطن پر خود ہی قرباں کر چلے
ان کے خون تازہ سے کھلتے رہیں گے لالہ زار
جا بجا کشمیر میں دیکھو شہیدوں کے مزار

کارزاروں کی طرف پھر آبلہ پا چل پڑے
جس طرح شعلوں کی جانب موج دریا چل پڑے
پھر مہک اٹھی ہے سینوں کی پژمردہ بہار
جا بجا کشمیر میں دیکھو شہیدوں کے مزار

پانچ صدیوں سے ہیں پھر مظلوم کشمیری عوام
روز و شب کے آرزو آنسو مرو آہیں صبح و شام
مقتلوں میں قتل ہم ہوتے رہے ہیں بار بار
جا بجا کشمیر میں دیکھو شہیدوں کے مزار

ایک چھوٹا سا گھرانہ تھا کبھی خوش حال تھے
ایک ہی نور نظر تھا جس کے ماہ و سال تھے
آج اس کی قبر ہے اور آ رہا ہے اشک بار
جا بجا کشمیر میں دیکھو شہیدوں کے مزار

ایک بھائی ہو گیا اپنی بہن سے یوں جدا
ایک بوڑھے باپ کی آنکھوں کا تارا بجھ گیا
ایک ماں کا دل ہے گھائل اور سینہ ہے فگار
جا بجا کشمیر میں دیکھو شہیدوں کے مزار

رات کی تاریکیوں میں قتل تارے ہو گئے
گلشن کے پاسباں مٹی کو پیارے ہو گئے
اصل گیا ان کے لہو سے درد کا گرد و غبار
جا بجا کشمیر میں دیکھو شہیدوں کے مزار

مدفنوں میں آج ان کے جسم و جاں خوابیدہ ہیں
خواب جو دیکھے تھے انہیں نے وہ سب دیدہ ہیں
ان کے ہونٹوں کا تبسم تھا نکھار و شاہکار
جا بجا کشمیر میں دیکھو شہیدوں کے مزار

روز ہوتے ہیں گھر گھر ان جنازوں کی قسم
جو کفن بردوش ہیں ان جانثاروں کی قسم
ہم وطن بدلے وطن کو پھر سے بخشیں گے وقار
جا بجا کشمیر میں دیکھو شہیدوں کے مزار

خون کے شعلوں سے جو ہیں کے دیے جلتے رہیں
سوئے منزل حریت کے کارواں چلتے رہیں
مادر کشمیر کی خاطر کریں سب کچھ نثار
اب بھی یہ اعلام دیتے ہیں شہیدوں کے مزار

OOO

جمیل حیات

مقدر

منتظر تھا جانے کب سے میں
ایک لاریب حسن کا دیدار
بعد مدت کے جس کو اب دیکھا
وہ مرے سامنے سے گزری تھی
دل نشیں چال، مرمریں باہیں
خوبرو زلف، شربتی آنکھیں
خوشبوؤں میں بسا بدن اس کا
ہجر میں بھی خیال جس کا تھا
کتنے عرصے سے منتظر تھا میں
جب مرے سامنے سے گزری ہے
رہ گیا دیکھتے نظر میں
اس کو دیکھے بنا پلٹ آیا

OOO

فوقیہ مشتاق

شام ہوئی

ہر سو پھیلے خاموشی کی چھینٹیں ہیں
اور آنکھیں حیرت میں لپٹی رہتی ہیں
دیے کی لو پر اک سناٹا طاری ہے
دل سکتے سے پہ کچھ کچھ کہتے رہتے ہیں
اور سانسیں محبوس ہوئی ہیں سینے میں
لوگ خاموش بھی گم سم سے لگتے ہیں
لفظ حیات کے معنی کی شام ہوئی
تیرے آنے کی امید کی شام ہوئی

OOO

شازیہ مفتی

سارے لفظ

میرے سارے لفظ ہیں ان کے
میرے سارے لفظ ہیں بے زباں
کبھی ایک ڈوری میں باندھ کر
کسی طاقچے میں سنبھالا تھا
یہ بکھرے پتوں کی طرح ہیں
جو یونہی راہ بدل گئے
تھکیں جہاں گزرگاہیں دور بہت ہے
کوئی راہ بھی ہے تو کوئی یہاں
انہیں سوچا تو یہ گماں ہوا
یہ تو میرے ہیں یہ تیرے ہیں
کئی تجربوں کی سی دھار ہیں
جو خموش ہیں تو سکوت ہے
جو یہ جاگ اٹھے تو شور ہے
انہیں کون دے گا قوت ہے
انہیں کون اپنا بنائے گا
انہیں کوئی نیند سلا ہی دوں
یا سر سے ان کو بھلا ہی دوں
میرے سارے لفظ ہیں ان کے
میرے سارے لفظ ہیں بے زباں

OOO

افسانے

صنم کدہ ہے جہاں

یٰسین احمد

حسبِ معمول آج بھی کلینک مریضوں سے بھرا ہوا تھا۔ متواتر دو گھنٹوں تک وہ ان مریضوں کے معائنے میں مصروف رہی۔ کچھ مریضوں کو ابھی دیکھنا باقی تھا کہ اچانک اس کا موبائل بج اٹھا۔ پہلی دفعہ اس نے موبائل کی طرف توجہ نہیں دی۔ دوبارہ فون بجا تو اس نے موبائل اٹھا لیا۔ کال ماں کی تھی۔ ماں کی بات سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ سر چکرانے لگا۔ اس کو یوں لگا جیسے کسی نے سمندری بھنور میں اس کو دھکیل دیا ہے۔

ماں نے فون پر بتایا تھا کہ پولیس کی بھاری جمعیت نے ان کے گھر پر دھاوا کیا ہے۔ اس کے باپ کو گرفتار کرنا چاہتے ہیں ان کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔

اس نے فوراً گھر جانے کا ارادہ کیا لیکن اسسٹنٹ نے کہا کہ باقی مریضوں کو بھی دیکھ لے، وہ لوگ بہت دیر سے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس نے جانے کا ارادہ بدلا اور مریضوں کے معائنے میں مصروف ہو گئی۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ اندھیرے دبے پاؤں یوں اتر رہے تھے جیسے کوئی چور اچکا سرقے کی نیت سے کسی کے گھر میں پاؤں دھرتا ہے۔ مگر اندھیرا اتنا گہرا ابھی نہیں ہوا تھا کہ کچھ نظر نہ آسکے۔

آدھے گھنٹے کے بعد وہ گھر جانے کے لئے نکل گئی تھی۔

کار میں بیٹھے بیٹھے دور سے اس نے دیکھ لیا کہ گھر کا بلند اور آہنی پھاٹک بند ہے۔ پھاٹک کے باہر پولیس کے کئی اعلیٰ عہدیدار بھاری جمعیت کے ساتھ وہاں موجود ہیں جو کاروں اور جیپوں میں بیٹھ کر آئے تھے۔ اپنے ساتھ تین چار مقامی چینل والوں کو بھی لے آئے تھے۔ ٹی وی چینل کے کیمرے ہر منظر کو اپنے سینے میں قید کر رہے تھے۔ آس پاس کے مکانوں کے مکین یہ تماشہ دیکھنے کے لئے اپنے اپنے گھر کے دروازوں سے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ عورتیں کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔

لگتا تھا کہ پولیس کوئی شدید اقدام فوری طور پر کرنے سے گریز کر رہی ہے۔ وہ اس کے باپ کو سمجھا رہے تھے کہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دے اور اسے جو کچھ بھی کہنا ہو عدالت میں کہے۔ لیکن اس کا باپ کچھ سننے پر تیار نہیں تھا۔ وہ پھاٹک کے اندر کھڑا تھا۔ پھاٹک کے دائیں بائیں جانب جو خلا پیدا ہو گیا تھا اس میں سے جھانکتے ہوئے اول فول بک رہا تھا۔

اس نے اپنی کار سڑک کی ایک جانب پھاٹک سے کچھ دور کھڑی کی اور کار سے اتر کر چپ چاپ سر جھکائے پھاٹک کی طرف بڑھتی گئی۔ اس کو دیکھ کر پولیس نے اس کے لئے راستہ بنایا۔ اس وقت اس کی حالت ایسی تھی جیسے بدن کا سارا لہو خشک ہو گیا ہو۔ وہ یوں

محسوس کر رہی تھی جیسے ان کے درمیان بے لباس چل رہی ہو۔

وہ پھاٹک کے قریب پہنچی تو باپ نے اس کو دیکھ لیا۔ باپ کے چہرے پر ناگواری کے جذبات ابھر آئے۔ وہ چپ ہو گیا۔ کچھ لمحوں تک پھاٹک کے اس طرف خاموشی رہی اور پھر پھاٹک کھول دیا گیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ پولیس والے، ٹی وی چینل والے سب کے سب اندر گھس آئے۔ پولیس والوں نے اس کے باپ کو اپنے نرغے میں لے لیا تھا۔

وہ یہ سارا منظر دیکھنے کے لئے رکی نہیں بلکہ تیز تیز قدموں سے طویل کمپاؤنڈ طے کرتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئی تھی۔ اندر ماں حواس باختہ کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ یوں سفید ہو گیا تھا جیسے اگلے کچھ پل میں اس کا دم نکل جائے گا۔ اس کے باوجود تلخ لہجے میں ماں بولی۔ "تم کیوں آ گئیں؟ تمہاری وجہ سے گیٹ کھولنا پڑا۔"

ماں کی بات کا اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ ایک حساس ڈاکٹر تھی۔ 26 سال کی عمر ہو چکی تھی۔ لیکن آج تک کبھی اپنی ماں کی بات کی تردید نہیں کی تھی چاہے ماں کی بات کتنی ہی غلط کیوں نہ ہو۔ ماں مزاجاً سادہ لوح تھی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ پولیس مسلسل دھمکی دے رہی ہے۔ پولیس والے پھاٹک توڑ سکتے تھے یا پھر پھاٹک پر چڑھ کر دوسری طرف اتر سکتے تھے۔

اس کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پولیس گھر پر چھاپہ مارے۔ گھر کی تلاشی لے۔ اس کے باپ کو گرفتار کر کے لے جائے۔ پھر رات کی خبروں میں ٹی وی پر یہ سب کچھ دکھایا جائے۔ دوسرے دن کے اخبارات میں اس واقعے کی تفصیلات شائع ہوں۔ بدنامی اور ہتک کے شدید ترین احساس نے اس کو بے چین کر دیا۔ وہ اپنے کمرے میں آ کر کرسی پر بے جان سی بیٹھ گئی۔

اس کے بیڈ روم میں جو کھڑکی تھی وہ کمپاؤنڈ میں کھلتی تھی۔ جہاں سے وہ سب کچھ دیکھ سکتی تھی مگر اس نے دیکھنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن اس کے باپ کی اونچی اونچی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ اب بھی پولیس سے الجھا ہوا تھا۔ "تم لوگ خواہ مخواہ مجھ پر جھوٹے الزامات لگا رہے ہو۔ معمول رشوت بند کر دیا تو ایسی اوچھی حرکتوں پر اتر آئے۔ میں ایک معزز شریف شہری ہوں۔ چار دفعہ عمرہ کر چکا ہوں اور دو بار حج۔ میری ایک بیٹی ڈاکٹر ہے دوسرا بیٹا ڈاکٹری کر رہا ہے۔ میں تین بار اس علاقے کا کونسلر رہ چکا ہوں۔ ایک بار ایم ایل اے بھی۔"

باپ کے منہ سے یہ باتیں سن کر اس کو حیرت ہوئی۔ اس کے باپ کی زبان میں لکنت تھی چھوٹے چھوٹے جملے بھی ادا کرتے وقت ہکلاتا تھا۔ لیکن اتنے طویل فقرے ادا کرتے وقت کہیں بھی نہیں ہکلایا تھا۔ غصہ میں شاید آدمی سچ بولتا ہے اور روانی سے بولتا ہے؟

اسی وقت دو لیڈی کانسٹیبل اس کی ماں کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئیں۔ ماں نے آہستگی سے کہا۔ "یہ میری بیٹی کا کمرہ ہے!"

وہ دونوں کمرے میں اندر آ گئیں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ اس کے اٹیچڈ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور پھر اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے ہوئے باہر نکل گئیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اب شاید ان کا رخ ماں کے کمرے کی طرف تھا۔ برآمدے سے آنے والی آوازیں اب کم ہو گئی تھیں۔ پولیس کے عہدے دار اس کے باپ کو گھر کے اندر لانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ تلاشی شروع ہو گئی تھی۔

وہ بچپن سے ہی کم گو اور حساس واقع ہوئی تھی۔ میڈیکل کی تعلیم نے اس کو مزید ذکی الحس بنا دیا تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ ایسے

حالات سے دوچار ہوئی تو اس کے اندروں ایک عجیب سی بے چینی پھیل گئی تھی۔ کم سنی میں اس کو کوئی علم نہیں تھا لیکن جب سے شعور آیا تھا اس نے کئی دفعہ ماں سے اپنے باپ کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ ہر دفعہ ماں اس کو ٹال جاتی تھی اور منع کرتی۔ "تم کو کوئی تکلیف ہو تو بتاؤ...!"

تکلیف کیا ہے؟ تکلیف کسے کہتے ہیں؟ یہ کب اور کیوں ہوتی ہے؟ تکلیف کا تجزیہ کرنا وہ نہیں جانتی تھی۔ ماں سے اس کو بھرپور پیار ملا تھا۔ رہا باپ کا معاملہ... اسے یاد نہیں کہ کبھی اس نے اپنے باپ سے محض آدھا گھنٹہ سکون سے بیٹھ کر بات کی ہے۔ وہ گھر میں رہتا ہی کب تھا؟ ہفتے میں صرف دو دن اور دو راتیں۔ پہلے یہ سارا معاملہ اس کے دائرہ سمجھ سے باہر رہا لیکن رفتہ رفتہ ہر بات اس پر عیاں ہوتی گئی کہ اس کی ماں پہلی منکوحہ بیوی ہے۔ تیس سال پہلے ان دونوں کی شادی ہوئی تھی۔ شادی کے چار سال بعد وہ پیدا ہوئی تھی۔ اس کے بعد کوئی اولاد نہ ہوئی۔ باپ کو اولاد نرینہ کی خواہش تھی۔

اس خواہش کی تکمیل کے لئے اس نے دوسری شادی کی۔ دوسری بیوی کو کوئی اولاد نہ ہوئی تو تیسری شادی کی تھی۔ تیسری بیوی کو بھی دو لڑکیاں ہو گئیں تو 55 برس کی عمر میں اس کے باپ نے چوتھی شادی کی تھی جس سے ایک لڑکا ہوا تھا۔ اولاد نرینہ کی خواہش میں شادیاں کرنا اس کی نظر میں کوئی معقول جواز ہرگز نہیں تھا۔ مرد کی ہوس کا ریشمی لبادہ سمجھتی تھی وہ......

اس نے جس اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی وہاں دولت مند گھرانے کے بچے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس کو تعلیم حاصل کرنے کا شوق تھا۔ پڑھ لکھ کر کچھ کرنا چاہتی تھی۔ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی جس کے لئے دن رات اس نے محنت کی تھی وہ ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ اس کی اس خواہش کا علم ماں کو تھا۔ جب میڈیکل کالج میں داخلے کا وقت آیا تو اس کو ایک ایسے کالج میں داخلہ مل گیا تھا جہاں ڈونیشن کے نام پر لاکھوں روپیہ وصول کیا جاتا تھا۔ وہ حیران رہ گئی تھی کہ آسانی سے اس کو داخلہ کیسے مل گیا؟

ماں نے اس کو بتایا تھا کہ وہ میڈیکل کالج ان ہی لوگوں کا ہے جن کی سیاسی جماعت سے اس کا باپ وابستہ ہے۔ اس سیاسی وابستگی کا نتیجہ تھا کہ اس کا باپ دو دفعہ کونسلر رہا اور ایک دفعہ ایم ایل اے۔ لیکن میعاد پوری ہونے سے پہلے اسمبلی تحلیل ہوگئی تھی اس کے باپ کو بھی جانا پڑا تھا۔ سیاست سے کنارہ کش ہونے کے بعد بھی اس کے باپ کے کروفر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ اب بھی ہر سال نئے ماڈل کی قیمتی کار میں گھومتا پھرتا تھا۔ جوانی میں پتنگ اڑانے اور کشتیاں لڑنے کا شوق تھا۔ سیاست میں آنے کے بعد یہ شوق ختم ہوگیا۔ لیکن آج بھی پابندی سے گھنٹے دو گھنٹے ورزش کرنے کا عادی تھا۔ روغن بادام کی جسم پر مالش کراتا۔ سیروں دودھ ہضم کر جاتا۔ جس کی وجہ سے صحت بالکل ٹھیک رہتی تھی۔ ستر کے پیٹے میں پہنچ چکا تھا لیکن پچاس پچپن کا لگتا تھا۔

وہ حیران رہتی تھی کہ اس سارے ٹھاٹ باٹ کے لئے پیسہ کہاں سے آتا ہے؟ مگر آج جب پولیس نے جب گھر پر چھاپہ مارا تھا سب کھل کر سامنے آگیا تھا۔ پولیس نے گھر کا چپہ چپہ کھنگال ڈالا تھا۔ توشک اور تکیوں کی روئی تک ادھیڑ دی تھی۔ چھتوں کی سیلنگ میں جگہ جگہ سوراخ کر دیا تھا۔ جب ان کے ہاتھوں اتنا قابل گرفت مواد ہاتھ لگا تھا کہ پولیس والے حیران رہ گئے تھے۔ کئی نوجوانوں کے پاسپورٹ، مفرور افراد کے محفوظ شدہ سادے اسٹامپ پیپر، گروی رکھے ہوئے مکانات کے دستاویزات اس کے علاوہ سونے کی اینٹیں اور بسکٹس اور ڈالر، ریال اور روپیوں کے بنڈل جن کی لاگت کروڑوں میں تھی۔ اس کے باپ نے غلط اور ناجائز طریقوں سے جتنا روپیہ کمایا تھا

سکتا تھا کیا گیا تھا۔ پولیس نے یہ سب کچھ اپنے تحویل میں لے لیا۔

پنچ نامے اور تلاشی کی کارروائی تقریباً چار گھنٹوں تک چلتی رہی۔ پنچ نامے کے کاغذات پر پولیس نے اس کے اور ماں کے دستخط بھی لئے تھے۔ چار پانچ پولیس کے جوانوں نے اس کے باپ کو طاقت کے بل بوتے پر وین میں بٹھایا تھا۔

دو دن بعد اس کی سالگرہ تھی۔ آج صبح ناشتے پر اس نے ماں سے کہا تھا کہ اس بار سالگرہ بڑے دھوم دھام سے کسی اسٹار والے ہوٹل میں منائی جا رہی ہے۔ ماں بخوشی راضی ہو گئی تھی۔ کلینک جانے سے پہلے اس نے ایک لسٹ بنائی تھی جس میں وہ سارے دوست شامل تھے جن کا ساتھ تعلیمی دور میں ملا تھا۔ وہ ساتھی بھی شامل تھے جن سے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا لیکن اب اس نے ارادہ بدل دیا۔ وہ اپنی سالگرہ منانا نہیں چاہتی تھی۔ آج جو ذلت اور بدنامی اس نے محسوس کی تھی وہ ناقابل برداشت تھی۔ کل اس واقعہ کی تشہیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ٹی وی چینل اور اخباروں میں اس کے باپ کے کارناموں کو دکھایا جا سکتا تھا!! اپنے ہم پیشہ ساتھیوں میں وہ مزید ذلیل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ سالگرہ کے موقع پر آج کا واقعہ موضوع بحث بن سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ کچھ نہ پوچھیں لیکن خاموش آنکھوں میں اٹھنے والے سوالات پڑھنے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ پولیس کے جانے کے بعد گھر میں سناٹا چھا گیا تھا۔ گھر کے ملازمین جو اب تک پولیس کی موجودگی میں ادھر ادھر دبکے بیٹھے تھے نکل کر باہر آ گئے۔ ایک ملازم نے آ کر اس سے رات کے کھانے کے لئے پوچھا۔ اس نے انکار کر دیا۔

رفتہ رفتہ اس کے خون کی روانی تیز ہو گئی تھی۔ لحظہ بہ لحظہ بلڈ پریشر بڑھتا جا رہا تھا۔ ذہنی تناؤ عروج پر تھا۔ اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ اگلے کسی لمحے میں اس کی ذہنی رگیں پھٹ جائیں گی۔ اس کو وحشت سی ہونے لگی تھی۔ اگر اس کا باپ محنت مزدوری کر کے خون پسینے کی گاڑھی کمائی سے اس کو اس مقام تک لاتا تو اس کو خوشی ہوتی اور وہ دنیا میں سر اٹھا کر جیتی لیکن اس نے ....

دفعتاً وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ وارڈ روب کھول کر ایک تولیہ پر اپنے سارے تعلیمی صداقت نامے، ڈگریاں اور دوسرے تعلیم سے وابستہ کاغذات ڈال دیئے اور تھیلے کی شکل میں لے کر تیزی سے کمرے سے نکلی اور باہر کیاری میں چلی آئی۔ زمین پر تولیہ پھینک کر اس نے تیلی جلا دی۔ ماں اس کی اس حرکت کو خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ پہلے پہل کچھ سمجھ نہ سکی تھی لیکن جب کاغذات نے آگ پکڑی تو وہ چلائی۔ ''بیٹی یہ تم کیا کر رہی ہو......؟''

حسب عادت اس نے ماں کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اس صنم کدے کے بت کو توڑ سکے لیکن اس کی دی ہوئی سوغات کا بوجھ سر پر اٹھا کر جینا بھی نہیں چاہتی تھی۔

◆◆◆

مدیر نند کشور وکرم کا اردو کا واحد حوالہ جاتی مجلہ

عالمی اردو ادب

شائع ہو گیا ہے ——— قیمت -/400 روپے

ملنے کا پتہ: عالمی اردو ادب، آدرش نگر، دہلی۔ 110051 (انڈیا)

اور وہ پورا ہو گیا

عطیہ سید

اس دن نجانے کیا بات تھی کہ سٹاف کا مقرر کردہ ڈاکٹر بھی دم سادھے دکھائی دیتا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ مریض کے ہاتھ میں پروانہ مرگ تھمانے والا تھا۔ لیکن خود اس مریض کے لیے یہ روح فرسا خبر کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ عرصے سے بخوبی واقف تھا کہ اس کی ہستی کی عمارت کتنی بودی تھی۔ اس کی ابتدا بھی صفر تھی اور انجام بھی صفر۔ وہ تھا بھی کیا اس مادہ پرست معاشرے کی نظر میں ــــ ایک نت پونجیا، نکما۔ یہ سچ تھا کہ اس نے بطور ادیب بڑا نام کمایا ــــ مگر اسے اس سے کیا حاصل ہوا؟ دو وقت کی روٹی بھی نہیں۔

اسے اس دن بارہ بجے دوپہر کے قریب ہسپتال سے فارغ کر دیا گیا۔ اس کی جیب میں آٹھ آنے تھے اور ہاتھ میں آخرت کا ٹکٹ۔ لیکن ایک سفید پوش گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث ان آخری دنوں میں بھی اسے شدید کوفت ہو رہی تھی کہ اس کی قمیص میلی ہوئی اور پاجامہ میلا تھا۔ اس کوفت کے باوجود اسے ایسا لگا جیسے بارونق بازار جا رہا تھا تاکہ اپنے دوست حافظ سے چند روپے شراب کے لیے ادھار لے سکے۔ حافظ کی دکان تک جانے کے لیے اسے نرسوں کے ہوسٹل کے پاس سے گزرنا تھا۔ ڈھلوان سڑک سے نیچے اترا تو اس کا دم بری طرح سے پھولنے لگا۔ سامنے برگد کا پیڑ تھا۔ اس نے اس کی چھاؤں میں چھوٹی اور راہ گیروں کی جھجکتی ہوئی نظروں کی پروا کیے بغیر تنے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ جسم کی طنابیں آج سے ٹوٹنے لگی تھیں۔ شراب کی بے پناہ طلب محسوس ہو رہی تھی۔ شراب ــــ ہاں یہی تو وہ چار حروف تھے جن میں ادب کم ازکم چند پل اس نے اپنے آپ کو پایا تھا۔ "اپنے آپ" اسے ہنسی آ گئی۔ سچ تو یہ تھا کہ اسے اپنا وجود ایک پھٹے پرانے کوٹ کی طرح محسوس ہوتا تھا جیسے کسی نے آتشِ شوق کے لیے لنڈے سے خریدا ہو اور بیکار سمجھ کر گودام میں لٹکا کر بھول گیا ہو۔ اپنی کم مائیگی اور ٹھکرائے جانے کا احساس اس کے اندر شیش ناگ کی طرح کنڈلی مار کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس شیش ناگ نے ڈس ڈس کر اس کا وجود نیلا کر دیا تھا۔ اس زہر کا تریاق صرف شراب ہی تھی۔

اس نے جب آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو شیطان اور گہرے سمندر کے بیچ پایا۔ باپ کے لئے وہ ایک فالتو چیز تھی کہ اسے اپنی دوسری بیوی کے بچے زیادہ عزیز تھے، اور ماں اپنی محرومیوں میں گم اسے بھلا بیٹھی تھی۔ دنیا کے میلے میں وہ اکیلا تھا۔ بالکل اکیلا۔ وہ اکثر سوچتا وہ اگر ہے تو کیوں ہے؟" ایک ایسا سوال جس کا جواب وہ ابھی تک حاصل نہیں کر سکا تھا۔ یہ الگ بات کہ بڑا ادیب بننے کے بعد اس کے وجود کے بیکار اور فالتو ہونے کے احساس پر انا اور خود بینی کا خول چڑھ چکا تھا مگر اسی خول کی تہہ میں کوئی ناسور تھا جو اب بھی رستا تھا۔

دوپہر سے شام ہونے کو آئی اور وہ ابھی برگد کے نیچے بیٹھا اپنے وجود کی گرتی دیوار سنبھالنے میں مصروف تھا۔ کائیں کائیں اور چیں چیں کی آوازوں نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی ــــ تھوڑی دیر کے لیے جس کے بعد اس کا ذہن پھر خارج سے داخل کی طرف لوٹ آیا ــــ ان یادوں کی طرف جنہیں وہ تقریباً فراموش کر چکا ــــ ان گتھیوں کی طرف جن کے سرے اس کے لاشعور میں دفن ہو گئے تھے۔ لیکن آج جب اس کی نظر دھندلا رہی تھی، وہ سب مدفون زندہ ہو رہے تھے۔ اسے جب ٹھکرایا گیا تو اسے اپنے آپ سے وحشت ہونے

گئی ـــــ شدید نفرت۔ اس نے سخت گیر باپ کے سامنے کبھی زبان نہیں کھولی تھی، مگر اپنے ہر عمل سے باپ کے ہر عقیدے کی دھجیاں بکھیر دیں۔ باپ کے برعکس وہ کسی قسم کے مذہبی فرائض اور رسوم کی ادائیگی کو ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ اس کا باپ روایتی اخلاقیات کا پابند تھا اور اس نے عنفوانِ شباب ہی سے آوارگی اختیار کر لی۔ وہ بہت جلد ایسے مشاغل کا عادی ہو گیا جن میں روپے پیسے کی ضرورت پڑتی تھی یعنی جوئے اور شراب کی لت۔ ان مشاغل نے جیسے اس کے لیے وقت گزارنے کا ذریعہ مہیا کر دیا۔ سب کچھ داؤ پر لگانے میں جو لطف تھا اس نے اسے جوئے کا رسیا بنا دیا۔ جہاں تک شراب کا تعلق تھا اس سے اس کی بصیرت میں اضافہ ہو جاتا لیکن ساتھ ساتھ کڑواہٹ بھی بڑھ جاتی تھی۔

اس دوران اس نے کہانیاں لکھنی شروع کر دیں۔ بہت جلد اسے خود اور دوسروں کو بھی احساس ہو گیا کہ اس بھٹکے ہوئے نوجوان میں ایک بڑا ادیب سانس لے رہا تھا۔ اس کا ذہن کمپیوٹر کی سی تیزی اور فنی مہارت سے کہانیاں گھڑتا، وقت گزرتا گیا۔ اس آوارگی سے نوشی، تلخی اور فن کی عظمت میں اضافہ ہوتا چلا گیا لیکن اس کی غربت قائم رہی۔ اس کی عظیم کہانیوں کی قیمت دنیا نے کیا لگائی! چند ٹکے صرف چند ٹکے ـــــ اور یوں وہ اپنے بصیرت افروز اور خوبصورت افسانے چند روپوں کے عوض فروخت کرتا رہا تاکہ اس کی مے نوشی جاری رہ سکے۔ ان ٹکوں کی اسے پرواہ نہ تھی۔ وہ اس کے لنگوٹیے یار حافظ کے ذمے تھی۔

جب وہ ہسپتال سے فارغ ہوا تو اس کا ارادہ سب سے پہلے حافظ کی دکان تک پہنچنا تھا مگر یہ جوئے شیر لانے کے برابر تھا۔ حافظ کی دکان انارکلی کے آخری سرے پر ایک تنگ گلی میں تھی اور وہ اپنے نحیف و نزار جسم کا مردہ بوجھ اٹھا کر دو قدم چلنے کا متحمل بھی نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے اپنی بچی کھچی توانائی اکٹھی کی اور منٹوں کی مسافت صدیوں میں طے کر کے آخرکار حافظ کی دکان تک جا پہنچا۔ دکان بند تھی۔ ساتھ والے دکاندار نے بتایا کہ ہفتہ پہلے حافظ کسی دور کے عزیز کی مرگ کی خبر سنتے ہی دکان بند کر کے چلا گیا۔ واپسی کی کوئی خبر نہیں۔

اس کے سر کی نسیں پھٹنے کو تھیں اور شریانوں سے خون ابلنے کو تھا۔ سانس پھولا جا رہا تھا۔ پہلو میں دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ وہ اس حالت میں میکلوڈ روڈ پر واقع اپنے ایک کمرے کے فلیٹ تک جانے کی حالت میں نہ تھا۔ اس نے جیب میں صرف پچاس روپے ہونے کے باوجود رکشا لیا اور سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ رکشا شہر کی تنگ اور چھوٹی سڑکوں سے ہچکولوں اور جھٹکوں کے ایک طویل دورانیے کے بعد آخرکار منزل پر پہنچا۔ وہ رکشا سے نیچے اترنے لگا تو ضعف سے لڑکھڑا سا گیا۔ اس کے پاجامہ کا پائنچہ پائدان میں اٹک گیا۔ وہ گرنے لگا تھا، لیکن سنبھل گیا۔ اس کو اطمینان ہوا کہ وہ سنبھل گیا، ورنہ بھرے بازار میں چاروں شانے چت گرنا اس کے وقار کے کس قدر خلاف تھا۔

''وقار!'' اس کے لبوں پر کسیلی مسکراہٹ ابھر آئی۔ ''کیا اس کا بھی کوئی وقار ہے؟'' وہ کتنا حساس تھا اب تک ان 'معمولی معمولی' باتوں کے بارے میں، حالانکہ وہ دنیا بھر کی لاتوں اور رسوائیوں کو خود لبیک کہنے والا تھا۔ رکشا والا تشویش سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''میں آپ کو آپ کے فلیٹ تک چھوڑ آؤں ـــــ سہارا دے کر، سیڑھیاں ہیں۔''

''نہیں بھئی نہیں۔ میں پہنچ جاؤں گا ـــــ اوپر ـــــ کسی نہ کسی طرح۔''

وہ اندھیری سیڑھیوں سے دیوار کے سہارے اوپر دوسری منزل پر پہنچ گیا اور اپنے فلیٹ کا مقفل دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ بجلی جلا کے کمرہ روشن کیا۔ چالیس واٹ کے بلب کی روشنی مٹیالی تھی۔ چھوٹے سے کمرے میں بان کی ایک چارپائی پڑی تھی جس پر مسلا ہوا گندا بستر تھا۔ کونے میں لکڑی کی بوسیدہ الماری اور کھڑکی کے قریب لکڑی کی بے ڈھنگی میز جس کی کھردری سطح کو چھپانے کی خاطر اس پر پرانے

اشتہارات کے صفحات پھیلا دیے گئے تھے۔ اس میز پر ایک دو کتابیں اور کچھ لکھے ہوئے اوراق پریشان تھے۔ اس نے کمرے پر طائرانہ نگاہ دوڑائی۔ ''تہی دامن'' کسمپرسی کی تصویر بالکل اس کی زندگی کی طرح۔''

اسے ابکائی سی آنے لگی۔ وہ جلدی سے غسل خانے کی طرف بڑھا۔ قے کے بعد اسے قدرے سکون محسوس ہونے لگا۔ وہ واپس جا کر بستر پر لیٹ گیا۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ زندگی کے پچھلے پہر موت کے قدموں کی بڑھتی ہوئی چاپ اور تنہائی کے شور میں وہ تن تنہا تھا ۔۔۔ نہ کوئی نہ ساتھی ۔۔۔ نہ حاصل نہ حصول ۔۔۔ نہ رشتہ نہ بندھن۔ سچ کہنے کے جنون، دیانت داری کے خبط اور خود داری نے اس کی کسی دوستی کو بھی پنپنے نہیں دیا۔ بس ایک ڈور تھی جو برسوں سے اس نے تخلیق سے باندھ رکھی تھی۔ مگر شراب نے قطرہ قطرہ اس کا ذہن چٹخا دیا تھا۔ تخلیق کے سوتے جو اس کے ذہن کی کوکھ سے پھوٹتے تھے سوکھ چکے تھے۔ الفاظ اس کی گرفت میں نہیں تھے۔ اب وہ کہانیوں کے پیکر تراشنے میں اتارنے سے قاصر تھا۔ کچھ عرصے سے اس کے لکھنے کی صلاحیت، کہانی کہنے کا قرینہ ۔۔۔ سب زنگ آلود تھے۔ اس کے ہاتھوں کی طرح اس کے ذہن میں لرزش سی تھی۔ اس پر قیامت یہ کہ وہ اس امر سے بخوبی واقف تھا کہ اب وہ جو کچھ لکھ رہا ہے وہ بے کس ہے، بے جان ہے۔ فن ۔۔۔ اس کا آخری رفیق سفر بھی اس کا ساتھ تقریباً چھوڑ چکا تھا۔ وقت نے یہ ستم ڈھایا کہ جس فن نے اس کی عزت نفس کا بھرم رکھا ہوا تھا اس کی آخری رمق بھی مسلسل بے تحاشا شراب نوشی نے نچوڑ لی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ اب بھی ایک بوڑھی ہوتی ہوئی طوائف کی طرح اپنے بے حس جسم اور سرد جذبات کے کاروبار میں مصروف تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اب یہ جنس قابل فروخت نہیں۔ وہ اپنے اندر گم تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ''کون؟'' ''طاہر'' ''دروازہ کھلا ہے۔''

طاہر کھاتے پیتے گھرانے کا نوجوان تھا۔ اس کے باپ کا جوتوں کا کارخانہ تھا۔ لیکن اسے نہ جانے کیسے پڑھنے کی لت پڑ گئی تھی اور اس نے ادیبوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس میں ایک دن طاہر کی اس سے ملاقات ہوئی تو اس کے ساتھ ایسا نتھی ہوا کہ چوبیس گھنٹے چپکا رہتا۔ شام اپنی بڑی سی گاڑی میں مال روڈ کی سیر کرواتا۔ رات کو وسکی کی ایک بوتل لاتا اور دونوں اس کے فلیٹ پر بیٹھ کر شغل کرتے۔ طاہر کے ذہن میں افسانہ نگار بننے کا سودا سما گیا تھا۔ اس نے کئی ایک افسانے لکھے اور اصلاح کے لیے دیے۔ مگر وہ انہیں دوبارہ لکھنے کے لیے کہتا۔ یہ استادی شاگردی کا رشتہ کچھ عرصہ چلتا رہا۔ ایک دن اچانک طاہر غائب ہو گیا۔ جس طرح وہ یک دم اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا اسی طرح وہ اس سے نکل گیا۔ ایسے کیوں ہوا؟ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ آج تین برس بعد وہ پھر ڈرامائی انداز میں نمودار ہوا۔ طاہر کی آمد سے اسے حیرت بھی ہوئی اور مسرت بھی۔ مسرت کا سبب یہ کہ اس کے ذہن میں طاہر اور وسکی لازم و ملزوم تھے اور اس وقت جب کہ اس کے وجود کی کشتی ڈانواں ڈول تھی تو وسکی کا ایک گھونٹ آب حیات کے چند قطروں سے کم نہ تھا۔

طاہر اندر داخل ہوا تو اسے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ اس کے ہاتھ میں لفافے میں لپٹی کوئی بوتل نہیں تھی۔ وہ اتنے برسوں بعد آیا بھی تو خالی ہاتھ۔ طاہر نے نہ علیک سلیک کی اور نہ اس کا حال پوچھا بلکہ چھوٹتے ہی مطلب کی بات کی۔ شاید اسے خبر تھی کہ وہ زندگی کے آخری سرے پر اٹکا ہوا ہے جہاں دنیا داری اور رسمیات بے معنی ہو جاتی ہیں۔

''میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔'' اس کے لبوں پر ایک کڑوی کسیلی مسکراہٹ ابھری اور اس نے عینک کے شیشوں میں سے اپنی ایکس رے نگاہیں طاہر پر مرتکز کر دیں۔

"طاہر! میں مر رہا ہوں۔" اس نے چھری کی کاٹ جیسی حقیقت پسندی سے بے جذبات آواز میں کہا۔

"جی میں جانتا ہوں۔" طاہر بھی اس ہی کی طرح بے حد جذباتیت اور حقیقت پسندی سے بولا۔ لیکن اس کا لہجہ انتہائی سوگوار تھا۔

"تو پھر؟ —— اس وقت تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"بہت کچھ۔" "مثلاً کیا؟" "آپ جانتے ہیں کہ مجھے جنون کی حد تک شوق ہے کہ میں افسانہ نگار بن جاؤں اور میرے افسانے معتبر ادبی جرائد میں چھپ سکیں۔"

"مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم لکھ نہیں سکتے۔"

"جی ہاں!" طاہر نے بڑی بے باک دیانت داری سے اعتراف کیا۔ "مگر ——"

اس نے سوچا اب طاہر اس سے کہے گا کہ وہ اسے اپنا کوئی تازہ افسانہ دے تاکہ وہ اسے اپنے نام سے کسی رسالے میں چھپوا سکے۔ سو اس نے طنزیہ مسکراہٹ سے کہا۔ "میں نے کافی عرصے سے کچھ نہیں لکھا، اور اب دم رخصت تمہیں مجھ سے ایسی کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔" "میں جانتا ہوں کہ آپ ایک عرصے سے کچھ نہیں لکھ سکے۔"

اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے بھرے بازار میں اس کے منہ پر زناٹے سے تھپڑ مار دیا۔ لیکن اس نے اپنی اندرونی کیفیت کو چھپاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا: "تو پھر ...؟"

"میری آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ اپنا نام میرے حوالے کر دیں، تاکہ میں اپنی تحریریں آپ کے نام سے مشہور رسائل میں شائع کروا سکوں۔ آپ یوں بھی رخصت ہو جائیں گے۔ آپ کو اس سے کیا فرق پڑے گا کہ آپ کے نام کو کون استعمال کر رہا ہے۔"

صدمے سے اس کی زبان جیسے گنگ ہو گئی۔ طاہر جو عرصے سے اس کی دوستی کا دم بھرتا تھا —— کس قدر رذیل نکلا۔ وہ خود بھی تو حق تھا —— ذاتوں کا دل دادہ، روایتی اخلاق کی نفی کرنے والا —— لیکن وہ اتنا کمینہ نہیں تھا کہ دم واپسیں کسی سے اس کی متاع زیست چھین لے —— کسی کی لاش کا سودا کرے۔ اس کے پاس تھا بھی کیا سوائے نام کے، اور یہ شخص مرتے وقت اس سے وہ بھی چھین لینا چاہتا تھا۔ اس کے دل سے لہو ٹپکا، مگر آنکھ میں کوئی آنسو نہ تھا۔ "اس معاشرے میں جہاں لین دین، نفع و نقصان کے اصول پر ساری حیات ایک کاروبار ہے، وہاں کسی سے کیا توقع کی جا سکتی ہے۔" اس نے سوچا۔

"لیکن تمہیں اس سے کیا حاصل ہوگا؟"

طاہر کی آنکھیں مسکرانے لگیں اس کی سادگی پر مگر نہایت شستہ انداز میں بولا۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ اتنے بڑے افسانہ نگار، اور اتنی سی بات سمجھ نہیں پائے۔ مجھے مادی اور روحانی دونوں فائدے ہوں گے۔ میں لوگوں سے کہوں گا کہ آپ مرتے وقت اپنے غیر مطبوعہ افسانے میرے حوالے کر گئے ہیں۔ اس طرح میں ان کے مجموعے چھپوا کر بیچ سکوں گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی تسکین ہوگی کہ میری تحریریں شائع ہو گئیں، چاہے میرے نام سے نہیں آپ کے نام سے ہوں۔ آپ کا نام اتنا بڑا ہے کہ لوگ میری تحریروں کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔"

طاہر اس تصور سے چٹخارے لے رہا تھا۔

"تاجر، بنیا، ساہوکار کا بیٹا کاروباری نہیں ہوگا تو کیا ہوگا۔"

پھر اسے خیال آیا کہ وہ چند گھڑی کا مہمان ہے۔ روح کی ابدیت پر اس کا کوئی ایمان نہیں تھا۔ اس کا شعور بھی جسم کی طرح فانی ہے۔ مرنے کے بعد اسے کسی قسم کا احساس نہ ہوگا کہ اس کے نام کا کیا حشر ہوا۔ "مگر اس پل ۔۔۔ اس پل تو وہ زندہ ہے ۔۔۔ دکھ سکھ، اذیت اور لذت کو محسوس کر سکتا ہے۔ تو کیوں نہ وہ شام کے اس کنارے چند گھڑیاں کیف و سرور کی گذارے۔ اس تجارتی معاشرے میں اپنی زندگی کے ڈراپ سین سے پہلے کیوں نہ آخری سودا کرے چاہے وہ گھاٹے کا سودا کیوں نہ ہو۔ اس کی موت کے بعد یہ سوداگر اس کی کھال کھینچ کر اپنے لئے جوتے بنوائے گا مگر کیا ہوا۔ ان چند بچی کھچی گھڑیوں کی قیمت تو لی جا سکے گی ۔۔۔ اور اس نے اپنا سب کچھ اس آخری داؤ پر لگانے کا سوچ لیا۔ آخر وہ ایک جواری جو ٹھہرا۔

"طاہر! ٹھیک ہے جو جی میں آئے کرو۔ لیکن مجھے اس وقت وسکی کی اشد ضرورت ہے۔ ہو سکے تو لے آؤ۔ وسکی کی ایک بوتل کے عوض میرا مسودہ تمام ۔۔۔ یہ کوئی اتنا برا سودا نہیں ہے۔" طاہر پلک جھپکنے میں وسکی لے آیا۔ ساتھ میں اخبار کے کاغذ میں لپٹے ہوئے تکّے کباب بھی تھے۔ غالباً طاہر کو اندازہ تھا کہ وہ صبح سے بھوکا ہوگا۔

"معلوم ہوتا ہے طاہر پہلے ہی سے وسکی اور کباب لے کر آیا تھا۔ مگر بد ذات نے جان بوجھ کر سودا بازی کی نیت سے اسے سیڑھیوں کے روشن دان میں چھپا دیا تھا۔ انسان کی پستی کی شاید کوئی حد نہیں ہوتی۔"

رات گہری ہو چکی تھی۔ ٹریفک کا شور مدھم ہو چکا تھا۔ اس نے دو تکّے کباب کھائے۔ وسکی کی بوتل کھولی اور مٹی کی صراحی پر اوندھے گلاس میں انڈیل دی۔ ایک چوتھائی بوتل پینے کے بعد جیسے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے آہستہ آہستہ چسکیاں لیتے ہوئے ایک چوتھائی اور پی لی۔ سرور کی لہریں اس کی رگ و جاں میں دوڑنے لگیں۔ اس کی بوٹی بوٹی میں چھپی ہوئی دکھن، اس کے رگ و ریشے میں سرایت کیا ہوا درد، اس کے پور پور میں رچی اذیت ۔۔۔ سب دھندلانے لگیں۔ وہ جیسے اپنے جسم سے باہر نکل کر علیحدہ کھڑا تھا۔

یہ کیفیت کچھ دیر قائم رہی۔ جیسے چراغ گل ہونے سے پہلے بھڑک اٹھتا ہے، ایسے ہی اس کے ذہن کی راکھ کریدنے سے بچی کھچی چنگاریاں دہک اٹھیں۔ اس نے لکڑی کی بے ڈھنگی میز چارپائی کے سرہانے جوڑ کر رکھ دی۔ پھر اس پر وسکی کی بوتل اور گلاس سجا کر رکھا۔ چارپائی کے سرہانے سے تکیہ اٹھا کر اس دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا جس کے ساتھ چارپائی جڑی ہوئی تھی۔ میز سے دس بارہ کھلے سادہ کاغذ اٹھائے اور لکھنا شروع کر دیا۔ اس کے ذہن میں خیالات کی فراوانی، الفاظ کی روانی، اور کہانی کے واقعات کی مسلسل آمد نے خود اسے حیران کر دیا تھا۔ ایسا بڑی مدت بعد ہوا تھا ورنہ اب تو وہ کوشش کے باوجود لکھ نہیں پاتا تھا۔

سو وہ لکھتا رہا سحر ہونے تک۔ صبح دم جب سورج کی پہلی کرنیں کھڑکی سے داخل ہو کر اس کے چہرے پر رقصاں ہوئیں تو انہوں نے اس کے چہرے پر ایک گہری آسودگی اور عجیب قسم کی طمانیت پائی۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی، آنکھیں آزردہ تھیں۔ وہ اپنا شاہکار مکمل کر چکا تھا ۔۔۔ اور یہ اس کی اپنی کہانی تھی جس کے ساتھ ہی وہ پورا ہو گیا۔

◆◆◆

بدلتا ہے رنگ......!

عذرا اصغر

سیٹھ دلاور حسین صدیقی کا یہ ساتواں حج تھا۔

وہ سات حجوں کے علاوہ دو عمرے بھی ادا کرنے کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔ ہر دو سال بعد مولائے کائنات کے یہاں سے انہیں بلاوا آ جاتا تھا وہ اللہ کے مقرب بندوں میں سے تھے۔ وہ پاکستان بننے کے اعلان کے ساتھ ہی پاکستان آ گئے تھے۔ یہاں سے بھی ہندو سکھ اپنے بھرے پرے گھر چھوڑ کر اور جانیں بچا کر بھاگ رہے تھے۔ ایسے ہی ایک گھر میں دلاور حسین کا کنبہ آ اترا۔ وہ گھر کیا تھا ایک محل تھا۔ خوشنما فرنیچر اعلیٰ درجے کے ساز و سامان سے آراستہ۔ پاکستانی حکومت ابھی بے سر و سامانی کے عالم میں تھی۔ نہ ریونیو بورڈ تھا اور نہ کوئی محکمہ ابھی باضابطہ طور پر وجود میں آیا تھا اور نہ آبادکاری کا کام ابھی شروع ہوا تھا۔ جس کے جہاں سینگ سمائے جا گھسا۔ لاتعداد لوگ کیمپوں میں پڑے تھے۔ جو کھاتے پیتے لوگ آئے وہ خوف زدہ تھے۔ ناجائز قبضہ کرنے سے ڈر رہے تھے۔ مگر نو آباد ملک میں دلاور حسین جیسے لوگوں کی کایا پلٹ گئی۔ کنبے کے بدلے محل ہاتھ آ گیا تھا۔ ہندوستان کے ایک نہایت چھوٹے سے شہر میں وہ بساط خانے کا ٹھیلہ لگاتے ہر مال چار آنے کی صدا لگاتے گلی گلی مال بیچتے پھرتے تھے پاکستان میں اگلی لاٹری نکل آئی تھی۔ دلو میاں سے وہ دلاور حسین بن گئے تھے سیٹھ اور صدیقی کا لاحقہ و سابقہ انہوں نے خود اپنے نام کے ساتھ لگا لیا تھا۔ قسمت کے دھنی تھے یا اگلی دانشمندی کام آ گئی تھی۔ لوگ کہتے تھے تجوریوں میں بھرا بہت سا پیسہ بھی ان کے ہاتھ آیا تھا۔ جس سے انہوں نے کاروبار شروع کیا اور سیٹھ دلاور حسین صدیقی کہلانے لگے۔ بچوں کو اسکول میں داخل کیا اور حکومت کے قدم جماتے جماتے اپنے بھی قدم جما لیے۔ پہلا حج کر کے حاجی کا لاحقہ بھی ان کے نام کے ساتھ جڑ گیا اور وہ ایک معزز ترین با اعتبار شخصیت بن گئے۔

دن گزرنے کے ساتھ ہی دونوں ملکوں میں فسادات کی آگ شدت اختیار کر گئی۔ معزز پڑھے لکھے لوگ کیمپوں میں پناہ گزین ہوئے اور کتنے مر گئے۔ لٹے پٹے پاکستان پہنچے اور ایسے ہی پاکستان سے لوگ ہندوستان گئے۔ بے سر و سامانی اور افراتفری کا سماں تھا۔ جنہوں نے اچھے دن دیکھے تھے وہ اب بدحال تھے۔ سر چھپانے کو ٹھکانہ ڈھونڈتے تھے۔ زمانے نے یکلخت کروٹ بدلی تھی۔ جمیل احمد خان بھی انہیں لوگوں میں سے ایک تھے۔ وہ تو اللہ کا کرم ہوا ایک محکمے میں گزارے لائق نوکری مل گئی اور زندگی کی گاڑی کھسکنا شروع ہو گئی۔ لیکن جس نے روپے پیسے کی ریل پیل دیکھی ہو۔ بچپن سے جوانی تک عیش و عشرت میں زندگی بسر کی ہو وہ ملازمت کی محدود آمدنی میں کیسے مطمئن ہو سکتا ہے۔ بی بی بھی صابر و شاکر تھیں۔ وہ تمام عمر کی صابرہ و شاکرہ تھیں۔ صبر شکر ان کی سرشت میں تھا۔ سینکڑوں مکان خالی پڑے تھے مگر انہوں نے کسی ایسے مکان پر قبضہ کرنا پسند نہیں کیا۔ پھر جب الاٹمنٹ کا کام شروع ہوا تو انہوں نے بھی اپنا کلیم جمع کرا دیا۔ ان دنوں کام تیزی سے جاری تھا لہٰذا جلد ہی جمیل احمد خان کو ایک معقول سا مکان اور ایک بلڈنگ الاٹ ہو گئی اور زندگی سکون سے گزرنے لگی۔ ایک دن سر راہ ان کی ملاقات دلاور حسین سے ہو گئی۔ وہ خوش ہو کر ملے اور بولے

"ارے وڈو میاں سناؤ کیسے ہو۔ کیا کر رہے ہو۔" انہوں نے کہا۔

"بھائی جمیل تم تو جانتے ہو ہم کاروباری آدمی ہیں۔ یہاں بھی اللہ کا کرم ہے وسیع کاروبار ہے اپنا۔" یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے اپنا کارڈ نکال کر جمیل خان کو دیا اور بولے۔

"جمیل بھائی گھر آؤ کبھی تاکہ بیٹھ کر باتیں ہوں۔"

جمیل احمد خان نے سرسری کارڈ پر نظر ڈالی اور خاموشی سے کارڈ پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ اور گھر چلے آئے۔

وقت کا کام تو گزرنا ہے۔ سو وہ گزرتا رہا اور اس گزرتے وقت کے ساتھ اولاد بڑی ہو گئی۔ اور باپ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہو گئے۔ رفتہ رفتہ چاروں لڑکوں نے کاروبار میں وسعت پیدا کی۔ مالی طور پر آسودگی ہوئی تو صابرہ بیگم کو بیٹوں کا گھر بسانے کی فکر لاحق ہوئی۔ ظاہر ہے سب سے پہلے بڑے بیٹے عقیل کا نمبر آیا۔ لڑکیاں اور خاندان دیکھے جانے لگے۔ نئے ملک اور ماحول میں نجیب الطرفین خاندان تلاش کرنا مشکل تھا۔ بات عقیل تک پہنچی تو اس نے ماں سے کہا۔ "آپ کو بھاگ دوڑ کرنے کی ضرورت نہیں۔ لڑکی میں نے ڈھونڈ لی ہے اس کا نام فائزہ ہے۔ میری کلاس فیلو ہے اور اس کے والد صاحب با عزت آدمی ہیں۔ سیٹھ وڈا ورسین۔"

سیٹھ وڈا ورسین کا نام سن کر جمیل صاحب ٹھٹکے۔ بولے۔

"بیگم سیٹھ وڈا ورسین نیچی ذات کے آدمی ہیں۔ یہاں آ کر صدیقی بن گئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ہماری جوتیوں میں بیٹھا کرتے تھے۔"

لیکن عقیل مصر تھا۔ "اس کا موقف تھا کہ ذات پات سب فرسودہ چیزیں ہیں۔ وہ صاحب عزت آدمی ہیں۔ ان کا گھرانہ پابند صوم وصلوٰۃ ہے۔ انہوں نے متعدد حج ادا کئے ہیں۔ اور یہ میرا فیصلہ ہے شادی تو میں فائزہ سے ہی کروں گا۔"

"ورنہ۔۔۔"

"ورنہ کیا۔۔۔؟ آپ نہیں کریں گے تو میں خود کر لوں گا۔" بیٹے نے دھمکی دی اور جوان بیٹے کے آگے جمیل صاحب کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑے۔ بادل نخواستہ وہ سیٹھ صاحب کے ہاں رشتہ لے کر گئے اور فائزہ دلہن بن کر ان کے گھر آ گئیں۔ وڈا ورسین کے لئے تو جمیل خان صاحب کے خاندان سے رشتہ جوڑنا باعث فخر بھی تھا اور باعث افتخار بھی مگر جمیل صاحب اس شادی پر ملول بہت تھے۔ مگر ان کے ملال سے کیا ہوتا تھا۔ فائزہ اب ان کے گھر کی عزت تھیں۔ رفتہ رفتہ ان کے گھر اسلام اترنے لگا۔ عقیل نے داڑھی رکھ لی اور شلوار کے پائنچے اونچے کر لئے۔ فائزہ کے خاندان میں اسلام حجاب پہننے اور داڑھی رکھنے تک محدود تھا۔ کاروبار میں جھوٹ بولنا، کم تولنا اور بے ایمانی کرنا جائز سمجھا جاتا تھا۔ کاروبار میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی اسی صورت ممکن ہوتی ہے۔ نماز روزے کے پابند تو جمیل صاحب کے گھر والے بھی تھے مگر جھوٹ اور منافقت ان کے نزدیک گناہ عظیم سمجھی جاتی تھی۔ جمیل صاحب اس تضاد پر بس لاحول پڑھ کر رہ گئے۔ بدلتے ہوئے ماحول نے ان کے لبوں پر چپ کے تالے ڈال دیے تھے۔ بچوں کے ساتھ شفقت ومحبت اور بزرگوں کا احترام ان کے اصول اولین تھے۔ وہ خاندانی اصولوں کو سینے سے لگائے تھے۔ گھر کا ماحول خوشگوار اور پرسکون تھا۔ انہوں نے بچوں کی تربیت اعلیٰ پیمانے اور اپنے خاندانی اصولوں کے مطابق کی تھی مگر جانے کیسے عقیل میاں میں بغاوت کے جراثیم در آئے تھے۔ کہتے ہیں محبت انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ اسی محبت نے عقیل کو

ماں باپ سے بغاوت پر اکسایا تھا۔ وہ سیٹھ والا اور حسین کی ظاہر داری سے بہت متاثر تھا۔ جس کا اصول تھا بے شک جھوٹ بولو۔ باپ قول میں بھی ہیرا پھیری کرو کہ بزنس کے اصول یہی ہیں مگر زکوٰۃ اور صدقہ میں کوتاہی نہ کرو۔ اللہ بخشنے والا ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ سے بھی وہ سودے بازی کرتے تھے۔ عقیل پوری طرح سسرال کے رنگ میں رنگا جا چکا تھا۔ باپ کی ایمان داری اس کے نزدیک فضول اور بے بنیاد چیز تھی۔ مگر باپ اور تینوں بھائیوں کی وجہ سے وہ بزنس کے معاملات میں دو نا پاتا تھا۔ البتہ اعلیٰ تعلیم نے فائزہ کو بھی پیسا دی تھی۔ جمیل کو یہ ظاہر داری والا مسلک سخت ناپسند تھا وہ کھلی آنکھوں سے گھر کا نقشہ بدلتے دیکھ کر کڑھتے ضرور تھے مگر مصلحتاً خاموش تھے۔ بیٹے نے ایک دفعہ بغاوت دکھائی تھی کیا پتہ پھر کیا کر دے اور وہ اپنی عزت کو خاموشی میں لپیٹے ہوئے تھے۔

اور اب اس ستائیسویں حج پر فائزہ بھی باپ کے ساتھ روانہ ہو رہی تھی۔ نگین نہ جانے کیوں یہ بات اس نے اپنے ساس سسر سے پوشیدہ رکھی۔ دوسرے بچوں سے جب جمیل کو پتہ چلا تو انہوں نے بیٹے سے پوچھا۔

"سنا ہے تمہاری بیوی اپنے باپ کے ساتھ حج پر جا رہی ہے۔؟"

"جی ہاں! آپ نے صحیح سنا ہے۔ یہ سعادت اسے نصیب ہو رہی ہے۔"

"مگر تم نے یا اس نے مجھ سے اجازت نہیں لی۔؟"

"ابو! اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟ میں اس کا شوہر ہوں اور میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔" بیٹے کا جواب سن کر جمیل صاحب دق رہ گئے۔ ان کا بیٹا پوری طرح باغی ہو چکا تھا۔ وہ کڑھ کر رہ گئے۔ شاید زمانہ بہت بدل گیا تھا اور وہ ماضی میں جی رہے تھے۔

◆◆◆

محبوب کی آزادی

دیپک کنول (انڈیا)

تیس سال گزر گئے محبوب علی کی زندگی میں رتی بھر بدلاؤ نہیں آیا۔ اس کے نصیب میں چاکری کرنا لکھا تھا۔ پہلے وہ اللہ بخش کے گھر پلتا تھا۔ مویشی خانے سے گوبر اور گھاس پھوس نکالتا تھا۔ بھینسوں کو نہلاتا دھلاتا تھا۔ پھر انہیں جنگل چرانے کے لئے لے جاتا تھا۔ وہ پہر کو جب وہ جنگل سے لوٹتا تھا تو اللہ بخش کی بیوی منہ پھاڑے ون کے باہر ٹکٹکی کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ محبوب ابھی اندر آ کر دم بھی نہ لینے پاتا تھا کہ اللہ بخش کی بیوی گلنار سارے جھوٹے برتن اس کے سامنے لا کر پٹخ دیتی تھی۔ وہ اپنی بھوک کو مار کر یہ جھوٹے برتن لے کر گھر کے سامنے بہتے نالے کے پاس انہیں دھو کر لے آتا تھا۔ اس کے نصیب میں دو گھڑی کا آرام نہیں لکھا تھا۔ آ بے لوٹھ سے جا بے لوٹھ سے کے مصداق وہ دوڑائے دوڑاتے رہتے تھے۔ کبھی جنگل، کبھی بکن تو کبھی مویشی خانہ۔ رات کو بھی اللہ بخش اس سے کام کرواتا تھا۔ اسے پاؤں دابے بنا نیند نہیں آتی تھی۔ محبوب علی آدھی رات تک اس کے پاؤں دباتا تھا۔ کبھی اسے جھپکی آ جاتی تھی تو اللہ بخش اسے لات مار کر جگا دیتا تھا۔ کھانا بھی اسے پیٹ بھر کے نہیں ملتا تھا۔ دو مکئی کی روٹی اور ایک پیاز۔ وہ اسی پیاز کے ٹکڑے کر کے ان ٹکڑوں کو روٹی میں لپیٹ کر کھاتا تھا۔ یہ اس کا روز کا کھانا ہوتا تھا۔ سونے کے لئے مویشیوں کا بندی خانہ تھا جہاں اس نے اپنی جائیداد استعمال کے رکھی تھی۔ ایک پچھرے کا زنگ آلودہ ٹرنک اور ایک میلی کچیلی رضائی۔ کبھی وہ فرش پر گھاس بچھاتا تھا، ٹرنک کو سرہانہ بنا لیتا تھا اور اوپر اپنی میلی کچیلی رضائی اوڑھ لیتا تھا جس میں ہمواری ذرہ بھر بھی نہیں تھی۔ اس ناہمواری کی وجہ روئی کا گچھلانا تھا جو کہیں رسولی کی طرح ایک جگہ جمع ہو گئی تھی اور کہیں پر رضائی کے چیتھڑے نکل آئے تھے۔ وہ اس رضائی کو متاع عزیز کی طرح اپنے سینے سے لگائے رکھتا تھا کیونکہ اس کے ساتھ اس کے ماں باپ کی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ اس رضائی میں ان کے بدن کی مہک آج بھی رچی بسی تھی۔ وہ کبھی اس رضائی کو توشک کی طرح استعمال کرتا تھا تو کبھی ردا کی طرح اوڑھ لیتا تھا۔ وہ جب کبھی بے حد اداس ہو جاتا تھا تو وہ اس رضائی سے باتیں کرنے لگتا تھا۔ کبھی روتا تو کبھی اسی رضائی میں منہ چھپا کر سسکنے لگتا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے یہ لحاف نہیں اس کی ماں ہے جو اسے اپنے پہلو میں چھپا لیتی ہے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اس کا دکھ درد سمجھنے والا کوئی انسان نہیں تھا بلکہ وہ بھینسیں تھیں جنہیں وہ دن میں گھاس چرانے کے لئے جنگل میں لے کے جاتا تھا۔ وہ حیوان مطلق سہی مگر حیوان ناطق کی طرح وہ احسان فراموش نہیں تھیں۔ وہ جس طرح ان کی دیکھ بھال کرتا تھا اس بات کا احساس تھا انہیں جبھی تو وہ رات کو اس کے سر کو چاٹ چاٹ کر اسے سلا دیتی تھیں۔ آزادی کے ہنگام آیا تو یہاں بھی اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ پہلے وہ گوبر اٹھاتا تھا۔ مویشی خانہ دھوتا تھا۔ اب وہ بچوں کے لنگوٹ دھوتا تھا۔ ان کا بول و براز صاف کرتا تھا۔ صبح و شام سارے جھوٹے برتن صاف کرتا تھا۔ رات کو سیف اللہ چودھری کے پاؤں دباتا تھا۔ جب اسے نیند آ جاتی تھی جب جا کے اسے وہ اسے کھانے کے لئے مل جاتے تھے۔ کھانے میں تھوڑا سا چاول اور سبزی ہوتی تھی۔ برسوں ہوئے جب اس نے گوشت کا مزہ چکھا تھا۔ یہ لوگ روز گوشت پکاتے تھے مگر اسے کھانے کو نہیں دیتے تھے۔ اس کے نصیب میں یا تو آیا لا اسیایا یا باسی جاسی کھانا ہوتا تھا۔ وہ زہر مار کے کھا لیتا تھا۔ کیا کرتا وہ؟ نہ کھاتا تو بھوک کے مارے مر جاتا۔

اس لئے طوعاً و کرہاً وہ یہ باسی بے مزہ کھانا کھا لیتا تھا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب بھی وہ تکلیف میں ہوتا ہے تو اُسے سب سے پہلے اپنی ماں یاد آتی ہے بعد میں خدا۔ اُسے بھی ہر رات اپنی ماں یاد آتی تھی اور ماں کی یاد اُسے لہولہان کر دیتی تھی۔ اُسے اس کا وہ نورانی چہرہ یاد آتا تھا جس پر خدا نے جیسے اپنا ہاتھ پھیر دیا تھا۔ اُسے یاد آتا تھا کہ جب وہ اُسے کھانا کھلاتی تھی تو جب تک اس کے سامنے چوکڑی مار کر بیٹھ جاتی تھی جب تک وہ شکم سیر نہیں ہو جاتا تھا۔ اس بیچ وہ ممتا بھری آنکھوں سے اُسے جب تک نہارتی رہتی تھی۔ اس پر صدقے واری ہوتی تھی جب تک وہ ٹانگیں پھیلا کر سو نہیں جاتا تھا۔

وہ اپنے ساتھ جو میلی کچیلی رضائی لے کے آیا تھا وہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ کبھی پچھواڑے میں ایک ٹاٹ کی بوری بچھا کر اور لنگ کو اپنا سرہانہ بنا کر وہ اس رضائی کو اپنے اوپر لے کے سوتا تھا۔ کبھی اگر اُسے بھوک لگتی تھی تو وہ گھر کی مالکن سے کھانا نہیں مانگ سکتا تھا کیونکہ وہ تو اپنے شوہر سے بھی دو ہاتھ آگے تھی۔ وہ کہتے ہیں نا اللہ ملائی کیسی جوڑی ایک اندھا ایک کوڑھی۔ سیف اللہ جتنا موذی اور خسیس آدمی تھا اس کی بیوی اس سے بھی زیادہ بخیل اور بے درد تھی۔ وہ جتنے کا کھانا اُسے کھلاتی تھی بدلے میں اس سے اس کا حساب وصول کرتی تھی۔ وہ دوپہر میں جب کھانا کھا کے سونے چلی جاتی تھی تو باورچی خانے میں تالا لگا کر جاتی تھی۔ وہ کئی جتن سے اپنی پیٹ کی آگ بجھانے کی کوشش کرتا تھا۔ کبھی اگر وہ مالکن کی نظروں سے چھپ چھپا کر رسوئی میں کوئی چیز اٹھا لیتا اور وہ پکڑا جاتا تو پھر اس کی خیر نہیں ہوتی تھی۔ سیف اللہ کی بیوی زلیخا مار مار کے اس کے گال لال کر دیتی تھی۔ کمبخت کے گال بھی اتنے گورے تھے کہ وہ طمانچے پڑتے ہی اس کے گال شفق زار بن جاتے تھے۔ زلیخا کا یہ ماننا تھا کہ نوکر کو ہمیشہ بھوکا رکھ کر کھانے کو دو۔ جب بھی دو اُبلا سیلا دو۔ کھانے میں اتنا ہی دو جس سے وہ زندہ رہ سکے۔ پیٹ بھر کے دو گے تو وہ کھا کے موٹا فربہ ہو جائے گا اور پھر آلسی اور کام چور بن جائے گا۔ اپنی ہی ذات برادری کے لوگوں کے رویے سے اس کے احساس کو دراصل ٹھیس لگی تھی کہ اسے کسی سے کوئی لگاؤ نہ رہا تھا۔ نہ ہی لگاؤ اسے سیف اللہ سے تھا اور نہ ہی چودھری اللہ بخش سے۔ وہ تو بس زندگی کے دن جیسے تیسے کاٹ رہا تھا۔ چھوٹے پنے میں ہی اس کا بچپن چھن گیا تھا۔ بے رحم حالات نے اس سے اس کی خوشیاں چھین لی تھیں۔ ماں باپ کا پیار چھین لیا تھا۔ کبھی کبھی اُسے اس بات پر بھی غصہ آ جاتا تھا کہ جب وہ ہر روز اپنے ماں باپ کے ساتھ جنگل جاتا تھا۔ اس دن وہ کیوں نہیں گیا۔ کیا یہ مشیت ایزدی تھی؟ یہ سوال اُسے روز روز کے پریشان کرتا تھا۔ محبوب علی کا نام بے شک محبوب تھا پر وہ کسی کا مونس اور محبوب نہیں تھا۔ آزو کی حسین وادیوں میں اس نے بے شک جنم لیا تھا۔ وہ بے حد خوبصورت تھا مگر ایسی خوبصورتی کا کیا فیض؟ کہتے ہیں کہ بے فیض اگر یوسف ثانی ہے تو کیا ہے؟ وہ بھی تہی دست تھا، غریب تھا، نادار تھا اس لئے ہر کوئی اُسے جوتے کی نوک پر مارتا تھا۔ اس کی زندگی میں ویرانی اور آشفتہ حالی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ برسوں پہلے یتیم ہو چکا تھا۔ اُسے یتیم و یسیر بنانے میں کسی انسان کا نہیں بلکہ قدرت کا ہاتھ تھا۔ اس کے ماں باپ جو کہ پیشے سے بکروال تھے آزو کی ایک پہاڑی پر رہتے تھے۔ یہ لوگ چونکہ ایک جگہ ٹک کے نہیں رہتے ہیں، جنگل جنگل گھومتے رہتے ہیں۔ چونکہ ان کے پاس اب پہلے جیسا گلہ بھی نہیں رہا تھا اس لئے کر وہ شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال کی طرف کوچ کرتے۔ اوپر سے محبوب چھوٹا بھی تھا اس لئے ایک ٹھور سے دوسرے ٹھور بھٹکنے کی بجائے انہوں نے آزو میں ہی ایک ڈھوکا بنا لیا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ رہ کر بے فکری کی زندگی گزار رہا تھا۔ جنگل اس کا ساتھی اور نگہبان تھا۔ وہ جس ڈال پر چاہتا، چڑھ کے بیٹھ جاتا تھا۔ جو پھل بھاتے، وہ کھا لیتا تھا۔ کبھی اپنی غلیل سے بے دریغ جنگلی مرغے کا شکار کرتا تھا۔ ماں اپنے بیٹے کو قلقاریاں مارتے دیکھتی تو اس پر واری صدقے ہوتی تھی۔ کتنی پرسکون اور خوشحال تھی ان کی زندگی۔ وہ غریب ہوتے ہوئے بھی تنگ دل نہ تھے۔ ان کی زندگی میں تنگی

یکسوئی، شادمانی اور فارغ البالی تھی۔ ان کا کل اثاثہ دس بیس بھیڑ بکریوں کا جھنڈ تھا جس کو پال کر وہ اپنا گزارہ چلاتے تھے۔ ان بھیڑ بکریوں کی بدولت ان کی زندگی کی گاڑی جیسے تیسے چل رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا باپ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر پہلگام میں بیچ کے آتا تھا۔ جن سے چار پیسوں کی فاضل کمائی ہو جایا کرتی تھی۔ یہ چار پیسے وہ اپنے بچے کی خوشیوں پر قربان کر دیتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ موسم اچانک بدل گیا۔ پہلے تیز جھکڑ چلنے لگے۔ اس کے بعد آسمان میں بادل گرجنے لگے، بجلیاں کڑکنے لگیں۔ اس کے ماں باپ جنگل میں اپنے گلے کے ساتھ تھے جب کہ وہ گھر میں اکیلا تھا اور اپنے ماں باپ کے لوٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ لوٹ کر نہیں آئے۔ ہونی اپنا کام کر گئی۔ آسمان سے ایک کڑکڑاتی ہوئی بجلی گری جس نے ان دونوں کو اپنی لپیٹ میں لیا اور دونوں وہیں پر جل کر راکھ ہو گئے۔ اس وقت محبوب کی عمر فقط سولہ سال تھی۔

محبوب کا سب کچھ چلا گیا تھا۔ ماں باپ، بھیڑ بکریاں۔ وہ کنگال ہو کے رہ گیا تھا۔ اس کے پاس کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو روز پانی پینے کے لئے کنواں کھودتے تھے۔ جب سرمایہ حیات ہی چلا گیا تھا تو وہ کیسے جی پاتا۔ اللہ بخش نے کوٹھے پر ترس کھا کر اسے اپنے گھر میں پناہ دی۔ وہ اپنے آپ کو اللہ بخش کا زیر بار محسوس کرتا تھا جس نے اس مصیبت کی گھڑی میں اسے آسرا دیا تھا۔ اللہ بخش آزردہ کا ایک صاحب حیثیت آدمی تھا۔ اس کے پاس ہر قسم کے ڈھور ڈنگر تھے۔ وہ ہر سال بقر عید سے قبل اپنے بیٹے گئے دنبے پہلگام بھیج دیتا تھا جنہیں بیچ کر وہ اپنی جھولیاں بھر لیتا تھا۔ اللہ بخش کے پاس کسی چیز کی کمی نہ تھی۔ روپیہ پیسہ، زمین جائیداد سب کچھ تھا اس کے پاس پھر بھی اس کی بھوک نہیں مٹ رہی تھی۔ اس کے گھر میں ایک بھینس چار بچھڑے تھے۔ وہ نوکروں پر کڑی نظر رکھتا تھا۔ ایک ایک بوٹی اور روٹی کا حساب رکھتا تھا۔ چار دن کے بعد جب اس نے محبوب کو اپنا اصلی رنگ دکھایا تو محبوب کا دل صد چاک ہوا۔ اس نے اس پر کوئی مہربانی نہیں کی تھی بلکہ وہ اسے مجبور اور لاچار سمجھ کر اس کا استحصال کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسے کام پر لگا دیا۔ کام تھا کہ شیطان کی آنت جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ محبوب نے دل میں کیا کیا خواب پال رکھے تھے۔ اللہ بخش نے ایک جھٹکے میں اس کے سارے خواب چکنا چور کر کے رکھ دیئے تھے اور ان کی کرچیں اس کے دل و جگر میں پیوست ہو کر رہ گئی تھیں۔

ایک دن سیف اللہ بھیڑیں خریدنے آزردہ چلا آیا تو اس نے اس لڑکے کو دیکھا۔ خاموش، آزردہ اور لاچار۔ وہ اپنے کام میں گم تھا۔ اس نے اسے ایک بہتر زندگی کا خواب دکھا کر لبھایا۔ وہ اس کی باتوں کے جھانسے میں آ گیا اور اس نے اللہ بخش کو خیر باد کہہ کے سیف اللہ کی چاکری قبول کی۔ سیف اللہ کا پہلگام میں ایک ہوٹل تھا جس کا نام "چوہدری مسلم ہوٹل" تھا جس میں کمرے بھی تھے اور کھانے پینے کا ایک ریستوران بھی تھا۔ یہ ہوٹل ٹورسٹ سیزن میں خوب چلتا تھا۔ اس کے ہوٹل میں آٹھ دس لوگ کام کرتے تھے۔ سب مقامی لوگ تھے۔ محبوب کو لگا کہ بہت جلد اس کی مصیبتوں کا انت ہونے والا ہے۔ سیف اللہ اسے اپنے ہوٹل میں کام پر لگا دے گا۔ ہوٹل میں کام کر کے نہ صرف پیٹ بھر کے کھانا ملے گا بلکہ تھوڑی بہت بخشش بھی مل جایا کرے گی جس سے اس کا دل درد دور ہو جائے گا اور وہ پائی پائی جوڑ کر بھیڑیں خرید لے گا اور پھر اپنے ڈھوکے میں جا کے رہے گا مگر یہ سب اس کی خام خیالی ثابت ہوئی۔ سیف اللہ کے گھر میں دو پوتوں نے ایک ساتھ جنم لیا تھا۔ ان کے لئے اسے ایک نوکرانی کی ضرورت تھی جو تلاش بسیار کے باوجود مل نہیں پائی۔ تبھی سیف اللہ کی نظر محبوب پر پڑی۔ اس نے سوچا کہ یہ لڑکا دل سے بہتر کام کرے گا۔ یہی سوچ کر اس نے محبوب کو کام پر لگا دیا۔ محبوب کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اسے لگا کہ وہ چولہے سے نکلا تو کڑاہی میں جا گرا۔ سیف اللہ کا بہت بڑا کنبہ تھا۔ اتنے بڑے پریوار کو ایک ہی چھت کے نیچے یک جٹ رکھنا کار دارد سے کچھ کم نہ تھا۔ اس کی دو بیویاں، بارہ بچے، چار بہوئیں اور تین پوتے پوتیاں تھیں۔ پہلے وہ اتنا سخت نہ تھا لیکن جس دن سے اس کی چھوٹی

نیلم اس کے ہوٹل میں کام کرنے والے سونیا کے ساتھ بھاگ گئی تھی تب سے وہ بہت سخت اور سفاک ہو گیا تھا۔ اس نے چھوٹی نیلم کو روکنے کی بڑی توڑ کوشش کی تھی مگر بھاگن کو ہونے لگی۔ پھوڑے کوت بیاہ سے کھائی۔ اب جب کہ اس کی عمر حد سے تجاوز کر چکی تھی، وہ پھر بھی اپنے آپ کو بوڑھا ماننے کے لئے تیار نہ تھا۔ اپنی جوانی کے بھرم کو قائم رکھنے کے لئے وہ اپنی داڑھی میں مہندی لگاتا تھا۔ پہلے ہفتے اس کا چہرہ اودے رنگ کے بینگن کی طرح ہو جاتا تھا۔ ایک ہفتے کے بعد ایسا لگتا تھا جیسے کسی نے اس کے چہرے پر روغن جوش کی پلیٹ ماردی ہو۔ وہ دن بھر یا تو اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا رہتا تھا یا اپنی داڑھی کھجلاتا رہتا تھا جو کھنچتی کھنچتی کے اس کے سینے تک لٹک گئی تھی۔ وہ دن میں بھی سوتا نہیں تھا۔ بس ہر دم اپنی متلاشی نگاہیں ادھر ادھر گھماتا رہتا تھا کہ کہیں کوئی کچھ کھا تو نہیں رہا ہے۔ ایک نیلم کے بھاگ جانے سے وہ کافی چڑچڑا اور وہمی ہو گیا تھا۔ سیف اللہ کی دوہری شخصیت تھی۔ باہر شیر اور گھر میں بلی۔ جب کبھی بچوں کے ساتھ اس کی کسی بات پہ لے دے ہوتی تھی اور زلیخا آنکھیں چڑھا کر دیتی تھیں تو وہ فوراً انہیں بول دیتا تھا۔ گھر میں اس کی دھاک اور دہشت ختم ہو چکی تھی۔ وہ دن تو کب کے لد چکے تھے جب وہ گھر والوں پر دھونس جماتا تھا کیونکہ تب وہ جوان اور تنومند تھا۔ آج وہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ جب زلیخا اسے سب کے سامنے لتاڑتی تھی تو اس کے سامنے تو وہ بھیگی بلی بن جاتا تھا اور پیچھے جا کر وہ اپنی جھنجھلاہٹ اتار دیتا تھا۔ کوئی ایسا دن نہیں ہوتا تھا جب وہ کسی نہ کسی نوکر کی پٹائی کر دیتا تھا یعنی کمہار پر بس نہ چلا گدھے کے کان اینٹھ لئے۔ اس کے نوکر جب بھی اکیلے میں بیٹھتے تھے تو پانی پی پی کر اسے کوستے رہتے تھے۔ وہ بھی نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوتا تھا، ان پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ محبوب کو لے کر بھی زلیخا اور سیف اللہ کے بیچ خوب جھک جھک ہوئی۔ بچے بھی ماں کی حمایت میں کھڑے ہو گئے۔ زلیخا بولی۔

"ایک بار تم اپنے ہاتھ جلا کے دیکھ چکے ہو، پھر آگ لے کر اس گھر میں آ گئے۔ یہ مت بھولو کہ تمہارے گھر میں چار چار جوان جہان بیٹیاں ابھی بھی ہاتھ پیلے کرنے کو کھڑی ہیں۔"

"اس چھٹنے لونڈے کو دیکھ کر اگر کسی کا دل پھسل گیا تو کیا کرو گے تم؟"

"تم کس مرض کی دوا ہو۔ تم اس پر نظر رکھا کرو۔"

"میں کیا چوکیدار بن کر اس کے پیچھے سارے دن کھڑی رہوں۔ سٹھیا گئے ہو تم"

"میں نے تم سے زیادہ دنیا دیکھی ہے۔ کس کے دل میں کیا ہے میں چہرہ دیکھ کے ہی بھانپ لیتا ہوں۔"

"بس بس رہنے دو اپنی لن ترانی۔ اتنے ہی زیرک تھے تو پھر میری سوت کو بھاگنے کیوں دیا؟ میں کہتی ہوں کہ اس لڑکے کو پیچھے کام پر رکھ دو۔ میں اس آگ کو بچوں سے دور ہی رکھنا چاہتی ہوں۔"

زلیخا کی مرضی کے آگے سیف اللہ گھٹنے ٹیک ہی دیتا کہ زہرہ نے بیچ میں مداخلت کی۔ وہ اپنے نوزائیدہ بچوں سے پریشان تھی اور اسے دن بھر ان کی نگہداشت کرنا پڑتا تھا اس لئے اسے نوکر کی ضرورت تھی۔ وہ محبوب کی حمایت میں کھڑی ہو گئی۔ محبوب کو کام پر رکھ دیا گیا۔ جس کے لئے گھر میں اتنا وبال کھڑا ہو گیا تھا وہ اس گھر میں اپنے آپ کو قفس میں قید پنچھی کی طرح محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس پنجرے کو توڑ کر نکل جانا چاہتا تھا، پر وہ جائے کہاں۔ نہ جائے ماندن، نہ پائے رفتن۔ اس کی دنیا کا جغرافیہ بڑا محدود تھا۔ وہ اللہ بخش کے گھر سے شروع ہو کر سیف اللہ کے گھر پر آ کے ختم ہو جاتا تھا۔ اس کے آگے نہ اس کی کوئی دنیا تھی، نہ کوئی منزل۔ وہ یہاں سے جائے تو کہاں جائے۔ یہ سوال اسے رہ رہ

کے بے حس اور بے عقل کر دیا تھا۔ ایک دن جب وہ پتیلی کی کھرچن سے اپنی بھوک مٹانے کی کوشش کر رہا تھا تو اُسے لگا جیسے کہیں سے دو آنکھیں اُس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اُس کے بدن میں خوف کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اُسے لگا کہ ابھی زلیخا آئے گی اور اُسے پیٹے گی۔ اُس کے دل میں ہول اُٹھنے لگے۔ وہ من ہی من میں اپنے مولا کو یاد کرنے لگا۔ وہ ابھی اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ کھڑکی میں سے دو ہاتھ نکلے اور ان ہاتھوں کی نرم و نازک انگلیوں میں ایک چینی پلیٹ تھی جس میں تھوڑے سے چاول اور گوشت کی ایک دو بوٹیاں تھیں۔ وہ اپنے اس محسن کو دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جو اس کا ان داتا بن کر آیا تھا۔ تبھی کھڑکی کا پردہ ہٹا اور اس میں سے سیف اللہ کی چھوٹی بیٹی غزالہ نے اُسے اپنی جھلک دکھائی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے وہ پلیٹ لی اور پھر ایک کونے میں چپ چاپ وہ کھانا کھانے بیٹھ گیا۔ اُسے لگا کہ پروردگار کہیں نہ کہیں موجود ہے اور وہ ہر ذی روح تک رزق پہنچاتا ہے۔

اس واقعے کے بعد محبوب علی کا ارادہ بدل گیا۔ اُسے اپنی زندگی سے پیار ہونے لگا۔ ایک ایسا نیک سیرت انسان اُس کی بھوک کو سمجھ گیا۔ اب اُسے کیا پروا تھی۔ جب بھی اُسے بھوک ستائے گی وہ لڑکی اُسے کھانا دے جائے گی۔ کھانا اُس کا محبوب، اُس کا خدا تھا۔ اس میں ابھی وہ جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا جسے لوگ عشق کہتے ہیں۔ اُسے تو اس لڑکی میں ایک فرشتہ نظر آیا تھا۔ وہ اتنا بھولا تھا کہ وہ یہ سمجھ ہی نہیں پایا کہ جب ایک لڑکی کسی لڑکے پر مہربان ہوتی ہے تو اس جذبے کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ وہ تو اتنا معصوم اور بھولا تھا کہ اُسے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ یہ بورژوائی سماج کیا ہوتا ہے۔ اشتراکیت کسے کہتے ہیں۔ حب الوطنی کیا ہوتی ہے۔ آزادی کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ لوگ کہتے تھے کہ ملک برسوں پہلے آزاد ہو گیا۔ مگر اسے وہ آزادی دکھائی کیوں نہیں دے رہی تھی۔ اگر وہ آزاد تھا تو سیف اللہ نے اس کی آزادی کیوں چھین لی تھی اور اسے قیدی کیوں بنا دیا تھا۔ وہ اسے پیٹ بھر کے روٹی نہیں دیتا تھا۔ اس سے رات دن کام کرواتا تھا۔ ہر پل اس پر کڑی نگرانی رکھتا تھا جیسے وہ ایک باغی تھا۔

ہر دوسرے تیسرے دن جب اسے بھوک ستانے لگتی تھی اور زلیخا سو جاتی تھی تو وہ کھڑکی کے پاس بیٹھ کر برتن مانجھنے لگتا تھا۔ اس کی متلاشی نگاہیں غزالہ کو ڈھونڈنے لگتی تھیں۔ غزالہ بھی جیسے اس کے انتظار میں بیٹھی رہتی تھی۔ اصل میں غزالہ کو اس من موہنے نوجوان سے یکطرفہ پیار ہو گیا تھا جس کا محبوب کو کوئی علم نہیں تھا۔ وہ کھانا اپنی ماں کی نظروں سے چھپا کر محبوب تک لے آتی تھی۔ محبوب شدتِ جذبات سے اپنے آنسو روک نہیں پاتا تھا۔ وہ بس روتا رہتا تھا۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی روتا رہتا ہے۔ زلیخا اسے آنسو بہاتے دیکھ کر تڑپ تو اٹھتی تھی پر زبان سے کچھ بولتی نہیں تھی۔ اس واہیات دنیا میں اور درندگی سے اس نوجوان کو نکل جانا چاہیے سوچتی رہتی۔

ایک دن کیا ہوا کہ زلیخا نے غزالہ کو اسے چوری چھپے روٹی کھلاتے ہوئے دیکھا۔ بس پھر کیا تھا گھر میں قیامت آ گئی۔ اسے لگا کہ بچی کے قدم بہکنے لگے ہیں اور وہ اس نیچ سے پیار کرنے لگی ہے۔ اس نے غزالہ کو بالوں سے پکڑ کر اندر کمرے میں گھسیٹا اور پھر اس کے جھونٹے کھینچ کر وہ اسے زمین پر گرا گرا کے لاتوں اور ہاتھوں سے پیٹنے لگی۔ وہ روتی رہی گڑگڑاتی رہی مگر زلیخا کا غصہ ذرا بھی نہ تھما۔ وہ اسے تب تک مارتی رہی جب تک اس کے بھائی بہن اسے چھڑانے نہیں آئے۔ بات سیف اللہ تک پہنچ گئی۔ اسے لگا کہ یہ لونڈا بڑا حرام خور نکلا۔ جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کرنے کی سوچنے لگا۔ اس نے محبوب کی پہلے جم کر پٹائی کی پھر اس کی ڈیوٹی ریستوران میں لگا دی اور بیوی سے تنبیہ کی کہ وہ اس بات کی ڈھنڈورا نہ پیٹے کیونکہ اس لونڈے کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بیٹی کی تو بدنامی ہو جائے گی۔ محبوب کے

لئے یہ سراغ ہی کے بھاگوں چھینکا تو وہ ثابت ہوئی۔ اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ سیف اللہ اسے انعام نہیں بلکہ سزا دینا چاہتا ہے۔ وہ اسے اس گستاخی کے لئے تڑپا تڑپا کے مار ڈالنا چاہتا ہے۔ اس نے وہ وظیفوں کی چھٹی کر دی اور یہ سب کام اس نے محبوب کو سونپ دیا۔ وہ صبح چار، بجے نیند سے اٹھتا تھا۔ پورے ریسٹوران میں جھاڑو لگاتا تھا۔ اس کے بعد ڈرموں میں پانی بھر دیتا تھا۔ پانی بھرنے کے بعد وہ بڑی بڑی دیگیں دھو ڈالتا تھا۔ آخر بجے تک وہ تھکن سے نڈھال ہو جاتا تھا۔ پیٹ کھانا مانگتا تھا مگر وہ کہاں سے ملتا۔ تب جب دیگیں چولہے پر چڑھ جاتی تھیں تو وہ رسویاں کے پاس جا کر اس سے ایک روٹی مانگتا تھا تو وہ اسے گالی دے کر بھگا دیتا تھا۔ یہاں اس کا کوئی ان داتا نہیں تھا۔ یہ سب سیف اللہ کے پالتو تھے جو اس کے اشارے پر بھونکتے تھے۔ وادی کے حالات بگڑنے سے دگرگوں چل رہے تھے۔ ایک دن پورے گام میں بھی ہڑتال ہو گئی۔ سارے نوکر ہوٹل بند کر کے اندر ہی پڑے رہے۔ راستے میں سڑک پر پولیس اور بھیڑ کے بیچ جھڑپ شروع ہو گئی۔ محبوب نے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی تو سیف اللہ نے اسے ماں کی گالی دی۔ اس گالی سے اس کی روح تڑپ اٹھی۔ اسے لگا جیسے سیف اللہ نے اس کے کانوں میں تیزاب انڈیل دیا ہو۔ کئی بار اس کا خون کھول اٹھا۔ اس کا جی چاہا کہ سیف اللہ کے منہ پر ایک زور کا طمانچہ لگا دے۔ اسی لمحہ فضا میں نعرے گونجنے لگے۔ ہم کیا چاہتے آزادی۔ ہم کیا چاہتے آزادی''

اس نعرے کے ساتھ ہی جیسے کسی بلوائی کی روح اس کے اندر حلول کر گئی۔ وہ سرعت سے اٹھا۔ پوری طاقت سے چلایا۔

''ہم کیا چاہتے ہیں آزادی'' اس کے ساتھ ہی وہ پچھواڑے کے راستے بھاگ گیا۔ وہ جب گلوارے میں آ گیا تو وہاں بھاری بھیڑ تھی۔ اس نے ایک پتھر اٹھا کر ہوٹل کے شیشے پر مارا بھیڑ میں کھلبلی مچ گئی اور اس کے بعد ہوٹل پر تابڑ توڑ پتھر برسنے لگے۔

محبوب بھی اللہ کو پکارتا جا رہا تھا۔ ڈالے کے بیچ چلانے کے باوجود اسے سیف اللہ کے ہوٹل پر پڑے پتھروں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2016ء تک

ماہنامہ ''تخلیق'' اب تک پانچ ''تخلیق ایوارڈ'' دے چکا ہے

1	2012ء	جناب شفیع عقیل صاحب	(کراچی)	021-34816655
2	2013ء	جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب	(لاہور)	0334-9719278
3	2014ء	محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ	(لاہور)	0333-4221870
4	2015ء	محترمہ قمر جہاں صاحبہ	(امریکہ)	001-3109870978
5	2016ء	محترمہ عذرا اصغر صاحبہ	(پاکستان)	0300-8839895

کِٹسونے کا دوسرا جنم

ڈاکٹر زین سالک

کالی لومڑی اس کی کٹھکر تھیلی میں بیٹھنے کے لئے بے صبری ہو چکی تھی۔ وہ کھٹنے میں آ کر قریبی لیمپ پوسٹ کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اس صدمے کو سہنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔ ابھی وہ گیٹ سے زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ اس نے بلی کے کانوں والا سر اور گلے کو ڈھکنے کا چمکیلا گہرا نیلا اسکارف لبادے کے جزو کی طرح بطور کیپ ہوڈی پہنا ہوا تھا۔ پیڈ کے نیچے میں سے ٹی ہوئی اونی تیلی رسی کے سرے پر لٹکتے سفید گولا پھندنے کسی تھیلا جانور کی طرح تھی اس تھیلی میں دیکھے چھوٹے جانور کا گویا دل بہلانے اس کے سامنے آگے پیچھے جھولنے لگتے تھے۔ اندر داخل ہوتے وقت اس کی کٹھکر تھیلی میں موجود گول لومڑی کو سر پر ڈھکی ٹوپی پہنا کر انسانی بچہ سمجھ کر کوئی وقت نہ ہوئی تھی۔ اس نے ویسے بھی گیٹ کیپر کی طرف غیر محسوس طریقے سے اس کو کسی قسم کا شک ہوئے بغیر پیٹھ کر لی تھی۔ اور یوں تھیلی میں کاوے بیٹھے ہوئے شیر خوار بچے کے ہمراہ وہ گیٹ پر زائر باپ کا چکمہ دینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"میاگی فوکس ولیج" جاپان کے جانوروں کے مخصوص کردہ محفوظ علاقوں، سینکچوری میں سے کی طرح سے مار تھی۔ جسے جادوئی کہا جاتا تھا۔ اس بار وہ یہاں تیرہویں بار اس کے موسم میں آیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا تھا کہ کالی لومڑی کو وہ جو آج تک جس سے جا رہا بلکہ اور زیادہ اچھی طرح سے دیکھ بھال اور عقیدت و احترام سے اس کا ہر وقت خیال رکھنے اور اشٹو کے اس یرو سے جتایا لومڑی برکات سمیٹنے کے بعد اسے واپس سینکچوری میں پہنچانے کے نیک ارادے سے لے جا رہا ہے۔

اس کا ... دور کا ایک عام سا نوعمر لڑکا تھا۔ اس کے ماں باپ پرانی نسل کے لوگوں کی طرح اسے کثیر تعداد ماضی کی روایات سے مالا مال جاپانی ثقافت سے جڑے رہنے کی اہمیت پر مستقل و حتی الامکان زور دیتے رہتے۔ وہ شنٹو اور بدھ مت کے مذاہب اور جانوروں خصوصاً بلی اور لومڑی کے بارے میں اتنے بہت سے بنیادی عقائد جانتے سمجھتے رہا سکتے بڑا ہوا تھا۔ اسے یہ تو احساس نہیں ہوتا تھا کہ یہ فوک لور ہے یا وہ اس بارے میں کنفیوز تھا یا پھر کسی اور الجھاؤ کے چکر سے سرشار ہونے کی نتیجے پر پہنچ نہیں دیتا تھا۔ اس نے ست سوز اور رنگین کہانی کی باتیں پڑھی اور سنی تھیں۔ اگرچہ اس کے پاس کوئی ذاتی تجربہ یا طریقہ ان کی حیثیت و حقیقت معلوم کرنے کا نہیں تھا۔ وہ سوچتا کیا دوسرے مجمع میں یہ زیادہ روشن اور واضح ہوتا ہے یا پھر اسی طرح ـــ لوگ سنتے اور الوٹ یقین کر لیتے ہیں۔

جاپانی ثقافت میں کٹسونے الوہی یا شیطانی لومڑی یوکائی کا سامنا کرنے، غیر مرئی رابطہ کرنے یا محض حیران ہونے کے علاوہ کیا ان تمام لومڑیوں کا ہم سے کسی اور قسم کا بھی کوئی تعلق ہے؟ کیا یہ واقعی اچھی ہوتی ہیں یا بری؟ الوہی یا یوکائی؟ اپنے مرئی فزیکل وجود کے علاوہ؟ آخر یہ اتنی اہم کیوں ہیں کہ ان کے مجسمے ہر جاپانی مندر میں، باغات میں، پبلک مقامات میں ہم لوگوں نے نصب کیے ہوئے ہیں؟ ہم انہیں خانقاہوں سے کیوں منسلک کرتے ہیں۔ بطور وقف یا چڑھاوا کے طور پر۔ شکر ہے ہم لوگ ان کی پوجا نہیں کرتے۔ فرعونی تہذیب والوں کی طرح۔ بہرحال کٹسونے کا کردار غیر معمولی طور پر گہرا اور پیچیدہ ہے۔ شاید تمام لومڑیاں ہی غیر مرئی قوتوں کی حامل ہوتی ہیں یا پھر

محض ایک اتفاقیہ جانور!

وہ خود بلا شک و شبہ غیر معمولی طور پر ذہین تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی محنت کا بھی اس ریسرچ پروجیکٹ کے چناؤ میں ہاتھ ضرور تھا۔ وہ جلد از جلد بہت کچھ بن کر کے دنیا کو بہت کچھ دکھانا چاہتا تھا۔ اس کے ہم عصر، ہم عمر ساتھیوں کی کامیابیوں کا اس پر غیر معمولی دباؤ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ وہ ان سب سے زیادہ ارفع ہے۔ اسے اپنی "سست رو قسمت" سے سخت چڑ تھی۔ لیکن اسے یہ یقین تھا کہ ایک دن وہ اچانک اونچی چھلانگ لگا کر ان سب سے بہت بلندی پر چلا جائے گا کیونکہ یہ اس کی قسمت میں لکھا ہے۔ اس سوچ نے اسے حد درجہ توہم پرست بنا دیا تھا۔ وہ مندروں میں ضرورت سے زیادہ جانے لگا۔ اس نے گلے، ہاتھوں، انگلیوں میں منت کے دھاگے، کاغذوں کے تعویذ، اونی کوڑی پہننے اور درختوں کی ٹہنیوں پر لگانے شروع کر دیے۔

خود سے جلنے والے فرضی دشمنوں سے بچاؤ، ہر مرحلے پر کامیابی، ہر چیز میں چار کے حرف سے اجتناب برتنے، کالی بلی کے راستہ کاٹنے سے بچنے کے لئے غیر معمولی احتیاط کرنے لگا۔ جب کلاس کے ساتھیوں نے اس کے نئے حلیے پر اسے دلچسپی سے دیکھنا شروع کیا تو اسے سخت غیر طبعی طیش آنے لگا۔ وہ ہر ایک سے معمولی باتوں پر اور کبھی بلا ارادہ اور کبھی بلا جواز ہی لڑنے جھگڑنے لگا۔ ایک دن وہ اپنے بیک پیک میں ہتھوڑی ڈال کر یونیورسٹی لے گیا اور گھر آ کر جب اس کے بھائی نے یہ بات گھر والوں کو بتائی تو اس نے سن لیا اور معمولی ان بن پر اپنی ہتھوڑی سے اس کا سر پھاڑ دیا۔ ہڈی کا تو کچھ بچاؤ ہو گیا تھا اور صرف ٹانکے آئے تھے۔

گھر والے اچانک خبردار ہوئے اور پہلی مرتبہ انہیں اس کی طرف سے سخت الجھن کا سامنا کرنا پڑا۔ انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس نئے مسئلے سے کیسے نمٹا جائے اور انہوں نے کچھ ٹھوس عملی اقدامات کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اسے ریسرچ ورک کی ذہنی الجھن سے زیادہ وجہ جان کر اسے ماؤنٹ فیوجی اور اطراف کے کچھ سیر و تفریح کے مقامات کی سیر پر جانے کے لیے زور ڈال کر آمادہ کر لیا بلکہ محبت کرنے والے بھائی نے تو اسے اپنے پیسوں سے آتو بس کا ٹکٹ بھی لا کر دے دیا اور والدہ نے خرچ کے پیسے بھی اس کے حوالے کر دیے اور یوں وہ پہلی بار اپنی مرضی سے زیادہ ان کی خواہش پر ٹوکیو کے بس سٹیشن پر آ گیا تھا۔ اس دن علی الصبح Shiroishi شیروئشی پہنچ گیا تھا۔ بس تیار تھی وہ فوراً اس میں سوار ہو گیا۔ اس نے اچٹتی سی نظر ٹیکسیوں کی طرف بھی ڈالی تھی لیکن وہ تین چار ہزار ین محض اس سفر پر خرچ کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

انٹرنس فیس دینے کے بعد اس نے سور کا لومڑی کے کھانے کا تھیلا خریدا۔ اور اندر داخل ہو گیا۔ ملحقہ وسیع کار پارکنگ میں اتنا رش نہیں تھا۔ گیٹ کے ساتھ ہی جاپانی میں قواعد و ضوابط اور ہدایات ایک بورڈ پر لکھی تھیں۔ "کھانا اپنے ہاتھ" سے لومڑیوں کو نہیں کھلانا بلکہ سامنے پھینکنا ہے۔ چھوٹے بچوں کو نہ لائیں، وغیرہ وغیرہ۔ علامتی تصویروں اور سرخ کالے کے نشانات (کراس) کے ذریعے ممنوعات۔۔۔ ہوں۔۔۔ اجنبیوں کے لیے، غیر ملکیوں کے لئے اس نے سوچا۔ کسی پالتو جانوروں کے چڑیا گھر کی طرح چند لومڑیاں یا تو پنجروں میں یا گلے میں پٹے اور کھانے کے تسمے زنجیروں کے ساتھ بندھی تھیں۔ یہ اسے ناخوش سی لگیں۔ چند آزاد خرگوش بھی تھے جنہیں گود میں لے کر ویسے ہی سہلایا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بونے گھوڑے بھی تھے جن کے ساتھ اس نے سیلفی بھی لی۔ وہ کیمرہ تو گھر بھول آیا تھا تو کوشش یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ یہاں سے کور کر سکے لیکن اصل مقصد ان کی عکاسی کی بجائے اس کی ریسرچ کا بھی حصہ تھی۔ اس کے بعد اس کا پروگرام دیگر فلم دیکھنے کا بھی تھا۔

ایک جگہ اس نے دیکھا کہ سیاح تھوڑی سی فیس دے کر ایک لومڑی کو لپٹا رہے ہیں۔ تھپتھپا رہے ہیں اور کسی بلی کی طرح پیار کر رہے ہیں۔ اس کا بھی دل چاہا تھا کہ ایک لمبے کوٹ سے پچھواڑے اور تھپتھپانا خاصا مزیدار عمل ہوگا۔ وہ یہ تجربہ کرنا چاہے گا۔ لیکن پھر اچانک اس کا دل یہاں سے بھر گیا۔ اس نے سردیوں میں یہاں آنے کا اور برف پر بھاگتی دوڑتی لومڑیوں کو دیکھنے کا پروگرام بنایا جب ان کے بال بھی اور زیادہ گھنے دار ہو جائیں گے۔ سٹاف نے اسے یہ بھی بتایا کہ اس جگہ کی دیکھ بھال پرائیویٹ ہاتھوں میں ہے اور اس کی ملاقات منیجر سے کروائی اور اس نے بھی اسے اپنی ریسرچ کے بارے میں بتایا۔ اس نے اس کے گھر کا ڈنر کے پروگرام میں دلچسپی ظاہر کی۔

اور پھر جب وہ سردیوں میں یہاں آیا تو ہر طرف برف ہی برف تھی۔ ذرا سی دیر کو سورج آیا تو اس نے دھوپ سینکنے کی اونچی جگہ سے نیچے کھائی میں دیکھا جہاں بہت سی سرخ، سپید اور بھوری بالوں والی لومڑیاں اوپر اسے دیکھنے لگیں۔ اس غول میں اسے ایک بالکل مختلف رنگ کی وہ کالی لومڑی نظر آئی۔ جو کسی چھوٹی سی کالی بلی کی طرح ٹکی اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں اس سے ملیں تو یہ اسے اپنی آنکھوں میں گھستی سی محسوس ہوئیں۔ وہ کوشش کے باوجود ان سے نظریں ہٹا نہ سکا۔ یہ اس کے دل و دماغ میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں۔ آج تک کسی جانور کی آنکھیں اسے ایسی نہیں لگی تھیں۔ اسے لگا یہ اس سے کچھ کہنا چاہ رہی ہیں۔ اس سے روحانی رابطہ کرنا چاہتی ہیں اور پھر اسے اپنے کانوں میں ان کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ اس غیر مرئی سی لومڑی کے بس میں جیسے آ چکا تھا۔ یہ آنکھیں اس کے دل میں گڑ گئی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ وہ اس کے تمام حالات سے واقف ہیں اور پھر اسے سمجھایا لگا جیسے وہ اسے کچھ مشورہ دے رہی ہیں اس کی رہنمائی کر رہی ہیں۔

اسے یکایک اپنی کھوئی ہوئی توانائی واپس آتی محسوس ہوئی۔ اور اس نے اس مشورے کو اپنی دانست میں اچھی طرح سمجھ کر اس پر عمل کرنے کے لئے گرہ میں باندھ لیا۔ اور پھر وہ کچھ زیادہ ہی میانی گوس و ہنچ کے چکر لگانے لگا۔ گھر والوں کی تشویش حد سے بڑھنے لگی انہوں نے اب کی بار کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے لگا کہ اسے ہر لمحہ اس کی ضرورت ہے۔ وہ آنکھیں اسے ہر جگہ ہر وقت نظر آتیں اپنے اندر گھستی ہوئی لگتیں اور وہ ان کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا۔

لیمپ پوسٹ کے پاس رکی گاڑی کو اس نے غور سے دیکھا تو اس کا بھائی اور باپ نیچے اتر رہے تھے۔ وہ اسے سہارا دے کر گاڑی تک لائے جس میں بیٹھے اجنبی نے اس سے ہاتھ ملایا، اپنا تعارف کرایا اور اس کی کمر و تھیلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں ڈاکٹر [illegible] ہوں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ سکون بخش ٹیکا آپ کو لگا دوں؟"

◆◆◆

منفرد ادبی جریدہ

دوماہی **نگینہ** (انٹرنیشنل)

کا عالمی ادب نمبر اکتوبر۔نومبر 2016ء شائع ہو گیا ہے۔

مدیر: وحشی سعید —— قیمت: 500/- روپے

ملنے کا پتہ: پوش کرن نگر، سری نگر، کشمیر-190010

ردّی

شمع خالد

جس دن میں ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آئی تو اپنے بیڈ روم میں آ کے مجھے یوں لگا کہ میں کسی اجنبی جگہ پر آ گئی ہوں۔ نیا قالین، نیا بیڈ، نیا اے سی لگا ہوا تھا، نیا ایل ای ڈی دیوار میں لگا ہوا اور ڈریسنگ ٹیبل پر وہ تین پرفیوم کی بوتلیں جن کی مالیت پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھی، نیا آرتھوپیڈک گدا تا کہ میری کمر میں تکلیف نہ ہو۔ کمرے کا سامان یوں دیکھ کر میں حیران رہ گئی، پردے بھی نئے تھے۔ میں بڑی حیران ہوئی اور میں نے بچوں سے پوچھا کہ میری رائٹنگ ٹیبل اور میری کتابوں کی الماری کہاں گئی؟ بچوں نے کہا آپ کے کمرے میں ہر وقت کاغذوں کے ڈھیر، رسالے کتابیں بکھرے رہتے ہیں۔ اب ہم آپ کا کمرہ صاف ستھرا دیکھنا چاہتے ہیں۔ پہلی رات مجھے نیند نہ آئی۔ برسوں کی یادیں اس کمرے میں دفن تھیں جن کو بڑے کمال اور صفائی سے غائب کر دیا گیا تھا۔ لیکن یادیں کبھی غائب ہو سکتی ہیں۔ یہ تو شہد کی مکھیوں کی طرح دل کے اندر ہی اندر اپنا گھر بنائے رکھتی ہیں اور دل شہد کے چھتے کی طرح آہستہ آہستہ لبالب بھرتا رہتا ہے پر کبھی جب شہد نکالی جاتی ہے تو چھتے کو ایک اور نیا زخم مل جاتا ہے۔ میرے دل کے چھتے سے جب پہلی شہد کی مکھی اڑی تو مجھے یوں لگا کہ خالد صاحب مجھے گھور رہے ہیں۔ برسوں ہم نے اسی بستر پر کئی راتیں انتہائی مسرت سے اور کبھی لڑتے جھگڑتے منہ پھیر کر گزاری تھیں لیکن نہ کبھی خالد نے اس بستر کو چھوڑا اور نہ میں نے۔ ہم لڑائی کے باوجود ہفتوں آپس میں بات نہیں کرتے تھے لیکن سونے کے لیے اپنے اپنے مقام پر ہوتے تھے۔ میں سوچنے لگی خالد شاید مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ تم نے کمرہ کیسے بدل دیا میرے سوٹ یہاں لٹکے تھے وہ کہاں گئے۔ میری کتابیں جن کے میں کور بھی میں خراب نہیں ہونے دیتا تھا وہ کہاں گئیں۔ میرے دماغ میں ایک دھماکا سا ہوا مجھے یاد آیا کہ خالد نے شادی سے پہلے جو مسودہ مجھے افسانوں کی صورت میں تخلیق کر کے دیا تھا وہ افسانے تو انھوں نے اپنی جان سے بھی زیادہ سنبھال کے رکھے ہوئے تھے اور ہم جب بہت اچھے موڈ میں ہوتے تو وہ کہتے کہ ایک کتاب ایسی چھاپیں گے جس میں تمھارے اور میرے افسانے ہوں گے۔ مجھے یاد آیا ہمارے اکثر دوست ہمیں خط میں شمع پرستے خالد لکھتے تھے تو میں نے کہا ہم اس کتاب کا نام بھی "شمع پرستے" خالد رکھیں گے۔ وہ افسانے میں نے اپنے دفتر کے ایک چپڑاسی کو دیے اور ساتھ ہی اس کو پیسے دیتے ہوئے کہا کہ جاؤ ان کی فوٹو کاپی کروا لاؤ۔ میں چاہتی تھی کہ خالد کی زندگی میں نہ سہی ان کے بعد یہ کتاب چھپ جائے چند دنوں تک وہ لڑکا غائب رہا جب واپس آیا تو میں نے کہا وہ افسانوں کی فوٹو کاپیاں کہاں ہیں؟ اس نے حیرت سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا کون سی کاپیاں آپ نے تو مجھے کچھ نہیں دیا۔ وہ شاید ماں کی موت کے صدمے میں تھا یا انجانے میں کسی ویگن میں بھول گیا تھا۔ برسوں کی خالد کی محنت وہ میرے محبت نامے جو انھوں نے مجھے اپنے آپ پہ اعتماد دکھایا تھا وہ گم ہو چکے تھے۔ میں نے اس کی بہت منت سماجت کی لیکن وہ مسلسل انکاری رہا۔ خالد بھی کیا چیز تھے۔ چالیس سال کی ازدواجی زندگی اور پانچ سال کے رومانس میں بھی میں اس شخص کو سمجھ نہ پائی۔ نویں جماعت میں جو ہماری دوستی ہوئی تو پھر رومانس اور شادی پہ ختم ہوئی۔ ہمارا رومانس بھی عجیب تھا۔ خالد روزنامہ "تعمیر" میں میرے بارے میں افسانہ لکھتے تو مجھے اپنے ہونے کا احساس ہوتا اور میں اپنے آپ کو دنیا کی منفرد ترین اور انوکھی ہستی سمجھتے

تھی اس کے جواب میں میرا کوئی افسانہ چھپتا۔ خالد نے صرف مجھ پر ہی افسانے نہیں لکھے مجھ سے پہلے کالج کی جن لڑکیوں کو پسند کرتے تھے، چاہتے تھے ان کی بھی کہانیاں بھی اس میں لکھیں لیکن عجیب بات ہے کہ مجھے کبھی بھی ان کہانیوں سے اور ان لڑکیوں سے جلن نہ ہوئی بلکہ میں وہ افسانے پڑھتی اور اپنی اہمیت کا اور احساس ہوتا۔ شادی کے بعد خالد نے وہ افسانے یوں غائب کر دیے جیسے کوئی بہت بڑا خزانہ ہو میں اکثر انہیں کہتی کہ افسانے نکال لیے جائیں کر کتاب چھپ جائے۔ اس چکر میں دن رات محبت اور ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی میں گزر رہے تھے۔ ایک دن خالد نے مجھے لڑتے ہوئے کہا کہ تم مجھے جانتی ہی کتنا ہو میں نے اپنا اس قصہ سچ تمہیں بتایا ہی نہیں۔ تو میں نے ہنستے ہوئے اور آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا کہ آپ کو جاننے اور سمجھنے کے لیے مجھے دوسرا جنم لینا پڑے گا۔ اس وقت ہم دونوں بڑھاپے کی دہلیز پر بیٹھے ہیں۔ ہماری محبت جہاں پورے خاندان میں مثالی تھی وہیں میرے دل کے اندر کہیں دور یہ جملہ گونجتا رہتا اور میں سوچتی رہتی کہ کیا اس شخص نے کبھی اپنا دکھ اپنی خواہشیں اپنی محبت بھی میرے سامنے کھول کر نہیں رکھیں پھر اس زندگی کا کیا فائدہ؟ وقت گزرتا گیا اور وہ خاموشی سے اچانک کچھ کہے بغیر مجھ سے موت کی وادیوں میں اتر گئے۔ ہاں مرتے وقت میرا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا جب ان کی روح پرواز کر رہی تھی تو میں ان کے کان میں سورہ رحمٰن پڑھ رہی تھی دو برسوں کا بندھن ختم ہوا لیکن یادیں کم نہ ہوئیں۔ مجھے میری بیٹی نے دلی بلوا لیا اور کہا امی مبارک ہو میں ابو کی الماری صاف کر رہی تھی تو ابو کے افسانے مل گئے ہیں میں خوشی خوشی واپس آئی بیٹی امی کو افسانے دیے اور وہ بھی خالد کی طرح مجھے چھوڑ کر اپنے دیس میں چلے گئے۔ اب یہ تنہا گھر وہی آرائش میرے لیے بے حد تکلیف دہ تھی۔ اگر میں ان کا مکمل پڑھ بیٹھ نہیں سکتی تھی لیکن وہ میرا ایک سہارا تھی جو بیٹوں نے اپنی محبت میں مجھ سے چھین لیا۔ اسی طرح یادوں سے بھری کتابوں کی الماری جس میں میرے پیارے دوستوں کی دی ہوئی کتابیں، میری اپنی کتابیں بھی ہوئی تھیں ان کو اٹھا کر بھی سیڑھیوں میں پھینک دیا۔ ایک دن بیٹا میرے پاس کتابوں کا ایک ڈبہ لے کر آئی جس میں میری کچھ کتابیں تھیں، جو میں نے سنبھال کر رکھی تھیں وہ گیلی ہونے کے بعد بالکل بوسیدہ ہو چکی تھیں۔ میں نے بیٹا سے پوچھا یہ کیا ہوا؟ اس نے کہا کہ امی کسی نے آپ کا یہ ڈبہ اٹھا کر باہر پھینک دیا تھا اور یہ کتابیں گیلی ہو گئی ہیں۔ میں ان کتابوں کو دیکھ کر سوچنے لگی کہ یہ ردی کا ڈھیر بن گئی ہیں۔ میرے بعد یہ کتابیں بھی گل سڑ کر زمین میں لپٹ چکی ہوں گی تو پھر ہم آخر لکھتے کیوں ہیں؟ اپنی زندگی جو ہمیں بھی آہستہ آہستہ اتنا کھوکھلی کا شکار کر کے ردی کر دیتی ہے، ہم بھی بغیر محسوس کیے ڈھیر سے ردی کے ٹکڑے میں تحلیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔

◆◆◆

معروف افسانہ نگار، ادیب، تجزیہ نگار روحشی سعید کا شاہکار

آسمان میری مٹھی میں

شائع ہو گیا ہے

ملنے کا پتہ: گلمرگ پبلی کیشن، ہوٹل شہنشاہ پیلس بلیوارڈ، سری نگر، کشمیر-190001

بھولا

طارق بلوچ صحرائی

نسل در نسل غلامی نے میرے اندر زہر بھر دیا ہے۔ میرا مقصدِ حیات صرف انتقام ہے۔ میرے اندر کا ہلاکو خان ہر لمحہ کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کرنے کا سوچتا رہتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے میں وہ پہلا پتھر ہوں جو کسی سنگسار ہونے والے کو لگا ہو یا وہ آخری پتھر ہوں جو اسے مرنے کے بعد لگا ہو۔ شاید اسی لئے میرے اندر کا سورج کبھی آفتاب کی طرف دیکھنے سے گریزاں ہے۔ میری سوچوں کا قلندر ہر دم رقص میں رہتا ہے۔ میرے اندر ہر گھڑی کوئی دھمال ڈالتا رہتا ہے۔ وقت کی ان پتھریلی ناہموار بل کھاتی سڑکوں پر ابھی تک میرا ایمان لڑکھڑاتا ہوا چل رہا ہے۔ میری ماضی کی کتاب دیمک زدہ ہے۔ جب بھی میں اس کو کھولنے کی خواہش کرتا ہوں کوئی نہ کوئی ورق پھٹ جاتا ہے۔ کل جب میں نے اس خستہ حال ماضی کی کتاب کو کھولا تو "بھولے" کا ورق میرے ہاتھوں میں آن گرا۔ ہمارے گاؤں (جہاں ہم کے مسیحوں درشت تھے گھروں اور گلیوں میں گرد واشت نہ تھی) کا باسی بھولا بھی عجیب تھا۔ اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت تھی۔ وہ سب کا دوست تھا مگر کوئی بھی اس کا دوست نہ تھا۔ وہ سب کے کام کرتا تھا اور سب کے مذاق کا نشانہ بھی بنتا تھا۔ اس کو دیکھ کر سب کی حسِ ظرافت بیدار ہو جاتی تھی۔ اگر کسی نے اس کے ساتھ برا سلوک بھی کیا ہوتا تو نہ تو کسی سے بدلہ لیتا تھا اور نہ ہی اس کی زبان پر کبھی شکوہ آیا تھا۔ جب کبھی میں اس کا مذاق اڑاتا تو میری ماں کہتی بیٹا بھولے کا مذاق نہ اڑایا کر ایسے لوگ اللہ کی نعمت ہوا کرتے ہیں جس گاؤں جس محلے میں کوئی "بھولا" نہ ہو وہاں اللہ کی رحمت نہیں آتی۔ پھر ایسے محلے اور گاؤں شہر بن جایا کرتے ہیں۔ شہر پلازوں کے قبرستان کو کہتے ہیں۔ جب باغات اور ہری بھری فصلوں کی جگہ دکانیں اور پلازے بن جائیں تو یہاں سے خواب اور پرندے ہجرت کر جایا کرتے ہیں۔ شہروں کی راتیں بھی بانجھ ہوتی ہیں ان کی کوکھ میں خواب نہیں ہوتے۔ شہروں میں تکبر کی حکمرانی ہوتی ہے۔ تکبر وہ پیاسا صحرا ہے جو انسان کا تمام علم اور نیکیوں کا دریا پی جاتا ہے۔ جہاں سے فطرت ہجرت کر جائے جہاں پھول، جگنو، پرندے، تتلیاں، محبت اور احساس باقی نہ رہے تو وہاں لوگ بد مزاج بن جاتے ہیں اور پھر یہاں ہر کوئی اپنا خنجر چھپائے پھرتا ہے۔

مجھے اس وقت ماں کی باتوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ کہتی تھی مجھے شہر اچھے نہیں لگتے کیونکہ یہاں "ساغر" اور مزدوروں کے خواب بکھرے پڑے ہیں کہتی تھی انسان بھی عجیب ہے۔ سورج پر گھر بناتا ہے اور عمر بھر چھاؤں تلاش کرتا رہتا ہے۔ قبرستان میں دکان بناتا ہے اور گاہک تلاش کرتا رہتا ہے۔ کہتی بیٹا مجھے ان قبیلے سے محبت ہے مگر بیٹا دیواریں بنانے کا کام کبھی نہ سیکھنا ہجر سے پل بنانا سیکھو۔ کہتی تھی میں نے رب کا رزق ہر جگہ دیکھا ہے سوائے گوداموں کے۔ کہتی تھی فطرت کے ساتھ رہا کرو فطرت کا کام ہی نوازنا ہے۔ رب کی رحمتوں کو ماپنے کی کوشش نہ کیا کرو وہ ہمارے اندازے، ہماری سوچ سے بہت آگے اور لامحدود ہے۔ اس کے دربار میں سوال کرنے والا یا اس کے الفاظ اہم نہیں ہوتے بس سوال اہم ہوتا ہے۔

ماں کے دوپٹے میں بہت ساری گرہیں لگی ہوتی تھیں۔ مجھے شک ہے وہ اپنے غم اسی میں چھپا کر رکھتی تھیں۔ میں نے ایک دن

بابا سے پوچھا بابا مجھے ماں کی باتوں کی سمجھ نہیں آتی ایسا کیوں ہے؟" بابا مسکرائے اور بولے تم دنیادار ہو اس لئے تمھیں ان باتوں کی سمجھ نہیں آتی۔ میں نے پوچھا بابا یہ دنیا کیا ہوتی ہے؟" بابا مسکرائے اور بولے پتر جہاں اہلِ معاملہ تمھارا مذاق اُڑائے وہ دنیا ہے۔ کہنے لگے ایک کام کرو تمھیں دنیا کی سمجھ آ جائے گی جہاں جیت اٹل ہو وہاں جان بوجھ کر ہار جانا۔ میں نے حیرانی سے پوچھا اس سے کیا ہوگا۔ بابا بولے اس سے تمھارے اندر عشق کا دیوا اُگ آئے گا پھر اس کے سامنے میں بیٹھ کر تختی یاد کرنا جب تم ساری تختی یاد کرلو گے تو ماں کی باتوں کی ہی نہیں ساری کائنات کی سمجھ آ جائے گی۔ میں نے پوچھا بابا یہ عشق کی تختی کیا ہوتی ہے؟" بابا مسکرائے اور کہا بہت آسان ہے یہ دو سے شروع ہوتی ہے اور ایک پر ختم ہو جاتی ہے۔ نہ سمجھ آئے تو بھولے سے سیکھ لینا اسے ساری تختی آتی ہے۔

مجھے یاد آیا ہمارے استاد نے ایک دن کلاس میں سوال دیا، جاندار اور بے جان میں کیا فرق ہے؟ سب نے لکھا سانس لینے والا جاندار ہیں اور باقی سب بے جان۔ مگر بھولے کا جواب تھا جو اللہ کی تسبیح وحمد وثنا بیان کرے وہ جاندار ہے باقی سب بے جان کیونکہ ارض و سماوات کی تمام مخلوق اللہ کی تسبیح بیان کر رہی ہے۔

بھولا باہر پڑھنے چلا گیا اور میں گاؤں چھوڑ کر شہر آ گیا۔ میری ماں اس دن بہت روئی تھی کہنے لگی ہمارے پاس رب کا دیا ہوا بہت ہے۔ دولت دنیا کی زنجیر ہے اور زنجیروں سے محبت کرنے والے کبھی آزاد نہیں ہوتے سدا غلام رہتے ہیں۔ کہنے لگی اگر مال و دولت اور اس دنیا کی حیثیت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو رب اپنے نہ ماننے والوں اور کافروں کو کبھی نہ دیتا۔ میرے باپ نے مجھے روکا نہیں مگر میں نے ان کی آنکھوں میں شبنم دیکھی تھی۔ مگر میرے اندر دولت کی ہوس آ گئی تھی کہ سب کی محبتوں کو چھوڑ کر میں شہر چلا آیا۔ میں نے شہر میں آ کر بہت پیسہ کمایا، بہت سا بینک بیلنس اکٹھا کیا اور بہت سی جائیداد خریدی اور پھر انہیں کا ہو کے رہ گیا۔ پتھروں کے شہر انسانوں کو بھی پتھر بنا دیتے ہیں۔ یہ انسان سے معصومیت چھین کر اسے بے حس بنا دیتے ہیں۔ اس لئے شہروں میں "بھولے" نہیں ہوتے سب زیرک اور ہوشیار ہوتے ہیں۔

ماں کے آنسوؤں اور دعاؤں نے اثر دکھایا مجھے لگا میں کسی سراب کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔ نہ جانے مجھے یہ کیوں گمان ہوا کہ میرا اور دنیا کا تعلق "سر" اور "کتبے" کی طرح ہے جو ساتھ تو رہیں گے مگر کبھی مل نہیں پائیں گے۔ مجھے اچھے باپ کی بات یاد آ گئی۔ ایک دن کہنے لگے "زندگی تو ہلکی پھلکی ہے سارا بوجھ تو خواہشوں کا ہے۔" بابا کہتے تھے حسن خاموش بھی ہو تو بولتا ہے اور آرائش جمال کے بعد آئینہ گر جائے تو اسے حسن کہتے ہیں اور زندگی کا حسن یہ ہے کہ آدمی Guilt Free زندگی گزارے۔ اس کے اندر کوئی خلش نہ ہو۔ اگر دنیا ہی میں ساری راحتیں اور خوشیاں میسر ہوتیں تو جنت کا تصور ہی بے کار تھا اور جو کہانی آپ دوسروں کے لئے لکھتے ہیں قدرت اسی کہانی پہ آپ کی فلم بنا دیتی ہے اور یہی فلم روز محشر پیش کی جائے گی۔

میں عمر بھر دولت و دنیا ہی کی کہانی لکھتا رہا اور مقصد حیات کو پس پشت ڈالے رکھا اور سکون سے محروم رہا۔ ماں سچ کہتی تھی جس دن تم کو معلوم ہو جائے گا کہ اصل چیز کثرت نہیں برکت ہے تمھاری واپسی شروع ہو جائے گی۔ میں زندگی میں کبھی رویا نہ تھا اب مجھ میں ایک نئی تبدیلی آ گئی تھی میں بات بات پر رونے لگا تھا۔ ماں کہتی تھی تم پتھر دل ہو اللہ کی رحمت صرف نرم دلوں پہ آتی ہے۔

بھولا تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آ چکا تھا اور وہ گاؤں میں اپنے کھیتوں میں کاشت کاری کر رہا تھا۔ پھر اچانک میں نے ایک

فیصلہ کیا۔ اپنا سب کاروبار بچوں کے حوالے کیا اور گاؤں چلا آیا۔ میرے گھر جانے والی پگڈنڈی پر گھاس اُگ چکی تھی۔ ماں کہتی تھی گھروں کو جانے والی پگڈنڈیوں پر اگر گھاس اُگ آئے اور دم پھیروں کے ساتھ کھلے جانے لگیں تو سمجھ لینا انسانیت کو زوال آ گیا ہے۔

گھر میں ماں آج بھی پہلے دن کی طرح میری منتظر تھی۔ ماں اُس دن مجھ سے لپٹ کر بہت روئی۔ میرے آنسو دیکھ کر اُس دن میرا باپ بھی بہت رویا تھا۔ ماں دوپٹے سے میرے آنسو پونچھتے ہوئی بولی پُتر تو پریشان نہ ہو میرے آنسو تو خوشی کے آنسو ہیں۔ پلکوں کی منڈیروں پر بیٹھے یہ آنسوؤں کے پرندے اب کئی دن تک دل کے صحن میں اترتے رہیں گے پُتر تجھے کیا معلوم ماں کیا ہوتی ہے؟ جس دن سے وہ ماں بنتی ہے اُس دن سے اُس کی آنکھوں کی نمی کبھی ختم نہیں ہوتی۔ مسجد میں سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی۔ ماں نے اپنا دوپٹہ سر پر لے لیا اور خاموش ہو گئی۔ جب اذان ختم ہوئی تو بولی تم میری خوشی دیکھ رہے ہو ماں جب بندہ اُس کی طرف رجوع کرتا ہے تو رب اُس سے بھی 70 گنا زیادہ خوش ہوتا ہے۔ مجھے یقین تھا تو ایک دن ضرور لوٹے گا میں نے پوچھا ماں تجھے کیسے یقین تھا کہ میں ایک دن ضرور لوٹوں گا؟ ماں بولی پُتر دعاؤں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ ماں کی سوچوں کے مکان پر اُس کی اولاد کی تختی لگی ہوتی ہے اور ماں کے غاروں پر کچھ چیزیں وحی کی طرح اُترتی ہیں۔ ماں بولی پُتر بھولے سے مل وہ اکثر میرے پاس آتا رہتا ہے۔ تیری ہی باتیں کرتا رہتا ہے۔ بھولا بھی کہتا تھا تو ضرور واپس لوٹے گا۔ پُتر اتنا پڑھنے کے باوجود بھی وہ ذرا سا نہیں بدلا۔ ابھی بھی بچوں کی طرح معصوم اور بھولا بھالا ہے۔ لوگ اب بھی اسے دھوکہ دیتے اور مذاق کا نشانہ بنانے سے باز نہیں آتے وہ اب بھی دھوکہ کھا کر مذاق کا نشانہ بن کر بھی غصہ نہیں کرتا بلکہ بچوں کی طرح مسکراتا رہتا ہے۔ اللہ اسے ہمیشہ سلامت رکھے۔ بھولا مجھ سے مل کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ کہنے لگا تم نے اچھا کیا واپس لوٹ آئے۔ شہروں میں اگر سزا بھی مارے تو اجنبیت مار دیتی ہے۔ انسان دوستوں اور پودوں کے بغیر نامکمل ہوتا ہے۔

سنو جو میں سمجھتا ہوں کہ رب کی انسان سے ایک ہی طلب ہے کہ وہ ویسا ہی لوٹ کر آئے جیسا کہ اُس نے اُسے دنیا میں بھیجا تھا۔ معصوم بچے کی طرح جس کے دل میں نہ لالچ ہوتا ہے نہ بغض کینہ۔ نہ اُس میں حسد ہے اور نہ کسی سے دشمنی۔ نہ وہ جھوٹا ہوتا ہے اور نرم دل ہوتا ہے ذرا سی بات پر رونے لگتا ہے اور معمولی سی چیز ملنے پر خوش ہو جاتا ہے۔ ماں جتنا بھی مارے دوڑ کر ماں کی طرف ہی آتا ہے۔ اُسی سے لپٹ جاتا ہے۔ جتنا بھی کھیل کود لے واپس ماں کی گود ہی میں آتا ہے۔ رب کو مکار، چالاک، عیار، دنیادار اور مکار دل اچھے نہیں لگتے اسے "اسماعیل" اچھے لگتے ہیں جو خدا اور باپ کی رضا کے سامنے سرنگوں رہتے ہیں۔ رب کو بھولے بھالے لوگ اچھے لگتے ہیں۔ میں جب گھر کی طرف لوٹنے لگا تو وہ بولا "میری ایک بات مانو گے" "ہاں! میرے سارے دانت گر چکے ہیں۔ میں رب کے پاس ایسے جانا چاہتا ہوں جیسے اُس نے مجھے بھیجا تھا۔ معصوم بھولا بھالا بچہ جب تم مجھے قبر میں اتارو تو میرا کفن اقبال لینا میں دنیا سے کوئی چیز ایسی نہیں لے کر جانا چاہتا جو میں وہاں سے لے کر نہیں آیا۔" میں گھر واپسی میں چلتا ہوا سوچ رہا تھا کفن تو ایک تحفہ ہوتا ہے جو اُس کے پیارے اسے دیتے ہیں۔ بھولا تو بھولا ہی رہا اگر میں نے تیری بات مانی تو لوگ مجھے زندہ دفن کر دیں گے۔ اُجالا تاریکی میں گم ہو جائے تو مل سکتا ہے مگر تاریکی تاریکی میں ضم ہو جائے تو شناخت نہیں کر سکتے۔ میں اُسے کیا بتاتا بھولے ہم اس دور میں زندہ رہ رہے ہیں جہاں ہر شخص نے اپنا مکان وہی رکھا ہے مگر پتہ تبدیل کر لیا ہے۔ اس لئے کسی "بھولے" کو کوئی "دانا" نہیں مل سکتا۔ کتنا "المیہ" ہے اب پورے ملک میں سب "دانشور" رہتے ہیں اب کسی محلے، کسی شہر اور کسی گاؤں میں کوئی "بھولا" نہیں رہتا۔

◆◆◆

بے مہاری سے بے چاری تک

دُردانہ نوشین خان

توبہ ۔۔۔ پھر یہ بے مہاری بلی آ گئی۔ اس کم بخت کو میرا ہی گھر ملا ہے کھانے سونے کو ۔۔۔ اب اس کے پیچھے اٹھ ہی گئی ہوں تو الگنی سے شال کو لے لوں مغربی دھوپ ڈھلنے لگی ہے۔ کپڑے سوکھ گئے ہوں گے۔

ارے لو! ۔۔۔ یہ شہد کی بوتل ظہر کے وقت اٹھائی تھی، منڈیر میں دھر دی۔ شکر ہے اب نظر پڑ گئی ورنہ رات کو تا کتے ٹوئیاں مارتی پھرتی۔ آج سردی لگتی ہے اس بار دسمبر ٹھٹھر گیا ہے۔ کبھی شور رہتا تھا کہ سردیاں روٹھ گئیں۔ جوانی کا دور تھا صحت مندی کی چربی ۔۔۔ اب تو سردی بھی بہت لگتی ہے اور گرمی بھی ۔۔۔ میری چڑ دن سوچتی ہوگی بڑھیا اپنے آپ بڑبڑ کرتی رہتی ہے۔ اب زبان کوئی کرنا لے میں رکھنے سے تو رہی۔ کوئی اور نہ ہوگا تو خود سے ہی بولوں گی۔

ارے ہاں مجھے یاد آ گیا دسمبر کا آخر ہے۔ چھٹیاں ہوں گی۔ نوشی راشی گھر آئے ہوں گے (سوتیلے بچے) اتنے ہو اسلام کرنے آ جاتے ۔۔۔ نوشی تو اپنی ماں زبیدہ کی تصویر ہے وہی چتون پر سوطی ۔۔۔ راشی سلام کر لیتا ہے ۔۔۔ سنا تھا زبیدہ راشی کا رشتہ اپنے بھائی کے گھر جوڑ رہی ہے۔ حالانکہ زبیدہ کی بھتیجی میں کوئی گن نہیں میں نے معز تحمل کی بیٹی کا بتایا تھا۔ خوبصورت لڑکی تھی ڈاکٹر بن رہی تھی۔ میری رائے تو تیری طرح لگی زبیدہ کو ۔۔۔ سوکن جو ہوئی

کیا وقت ہو رہا ہوگا۔ اس موئے کلاک کو کون دیکھے ۔۔۔ پانچ بجے دوا کھانی ہے کہیں بھول نہ جائے ۔۔۔ یہ تخت ۔۔۔ میرے گلاس ۔۔۔ ہاں سب رکھے ہیں میرے ۔۔۔ اوہو جگ خالی ہے۔ پانی بھر کر رکھ دوں۔ سستی نہ کروں۔ رات کو اٹھنا پڑتا ہے۔ صنوبر ایسا ہی کام کرتی ہے دو منٹ میں تو برتن اجل جاتے ہیں اس کے پانچ منٹ میں صفائی ۔۔۔ یہاں سے تو اسے نکلنے کی جلدی ہوتی ہے۔ اب یہ جگ بنا دھوئے نکل سے پڑا ہے۔ صبح آئے گی تو منت خوری سے پوچھوں گی ساتھ کے نل سے جگ بھر لانے میں سانس پھول گیا ۔۔۔ یونہی کہتے ہیں موٹاپے میں سانس پھولتا ہے میں تو سوکھی سڑی جھاڑو تیلی ہوں۔

چلو دوا تو پی لی ہے۔ آنگن کا ایک چکر لگا لوں۔ رات کو یاد آ جاتے ہیں بارش کا کوئی بھروسہ نہیں ۔۔۔ کوئی چیز کھلے میں نہ رہ گئی ہو ۔۔۔ گیٹ کا لاک چیک کر لوں ۔۔۔ صنوبر جب گئی ہے جب سے بند ہے ۔۔۔ اور آتا کون ہے ۔۔۔ ارے ارے یہ بے مہاری نگوڑی بلی پھر گھسی جا رہی ہے میرے کمرے میں ۔۔۔ خدائی خوار ۔۔۔ لے آئے میرے سر پر جو آیا ۔۔۔ میرے گدے میں دبکے جا رہی ہے ۔۔۔ تو بھی ایسی کی تیسی ۔۔۔ آئے ہائے چپل کہاں گئی میری ۔۔۔ یہ میرے موزے گیلے ہو رہے ہیں ۔۔۔ دو نگوڑی مجھ پر بیٹھ گئی ۔۔۔ دو گھڑی دم لے لوں ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ یہ اخبار لیتی جاؤں گی اندر ۔۔۔ مجھے نیند کہاں آتی ہے جلدی ۔۔۔ کوئی کالم والم رہ گیا ہوگا، پڑھ لوں گی ۔۔۔ مغرب کی اذانیں بلند ہو گئیں ۔۔۔ اللہ کی آواز میں کیسی رحمت اور تسلی ہوتی ہے میں بھی نماز تسبیح کر لوں ۔۔۔ یا اللہ ہر حال میں تیرا شکر ہے۔ میری عمر کے کتنے لوگ ہیں جو چارپائیوں پر نماز پڑھتے ہیں ۔۔۔ معذوری سے مرتے دم تک بچائیو ۔۔۔ تو جانتا ہے میں تھکی اکیلی ہوں۔

جو شوق سے بیاہ کر لایا وہ دو برس پہلے ساتھ چھوڑ گیا۔ اس کی موت سے پہلی والی کو تو کوئی فرق نہ پڑا اس کے برسرِ روزگار بیٹے کھڑے تھے بھرا پرا گھر تھا۔ مگر میرا تو لکڑی کی طرح گھر بکھر ہو گیا۔ جب تک میری سروس تھی کسی نہ کسی کا آنا جانا لگا رہتا ۔۔۔ تسبیح ادھر سنبھال کر رکھ دوں تہجد کو ڈھونڈنا نہ پڑے ۔۔۔ عینک کہاں رکھ دی؟

ابھی تو صرف سات بجے ہیں۔ سرمائی راتیں شیطان کی آنت ہوتی ہیں ۔۔۔ کبھی کسی زمانے میں جب شادی نہیں ہوئی تھی رات کے نو۔ دس یوں ہی بجے جایا کرتے تھے نعیم بھائی ہم دو بہنیں اماں ابا ۔۔۔ ہم دونوں بہنیں اگلے دن پہننے کے کپڑوں کو استری کرتیں۔۔۔ میچنگ جیولری ساتھ رکھتیں ۔۔۔ سلمیٰ فیصل پلاننگ کے دفتر جاتی تھی۔ میں ایجوکیشن آفس میں اسٹینو تھی پھر بھلا ہوا کہ میں گرلز کالج میں کلرک بھرتی ہو گئی لیکچراروں سے دوستی رہتی۔ کتنی لڑکیاں میری دوست تھیں۔ ہر لڑکی کو کلرک سے واسطہ پڑتا ہے۔ کالج والے آج بھی کہتے ہیں تم بیگ جیسی نہ آئی پھر ۔۔۔ آخر ایسی کوئی بات تھی تو بیگ صاحب مر مٹے۔ چکر پہ چکر لگاتے تھے۔ پہلی بار جب دیکھا جب اپنی بیٹی کو فرسٹ ائیر میں داخل کرانے آئے تھے ۔۔۔ ویسے سچی بات تو یہ ہے کہ بیگ صاحب بھی چار جوان بچوں کے باپ نہ لگتے تھے۔ میری عمر کوئی پچیس سال تھی۔ بیگ صاحب سینتالیس سال کے تھے۔ ان کی پہلی بیوی زبیدہ میرے سامنے اماں لگتی تھی۔ ابھی شکل موٹی بھاری ۔۔۔ بیگ صاحب کی ہم عمر تھی ۔۔۔ کہاں نوخیز کلی جیسی کہاں زبیدہ بتول ۔۔۔؟

بیگ صاحب کا عشق رنگ لایا۔ ہم نے نکاح کر لیا۔ میری بہن سلمیٰ نے ڈاکٹر کو پسند کر لیا وہ نوکری چھوڑ کر میاں کے ساتھ جدہ چلی گئی ۔۔۔ نعیم بھائی بھی والدین کے بعد کینیڈا چلا گیا۔ میرے نصیب کی خوشیاں تو بس وہیں تک تھیں۔ جب تک بیگ صاحب حیات رہے۔ انہوں نے میری منت سے پہلے ہر خواہش پوری کی الگ سے گھر بنوا دیا۔ زبیدہ کے لائق فائق بیٹے تھے دو بیٹیاں تھیں۔ اللہ چاہتا تو مجھے ایک بچہ ہی دے دیتا بیگ صاحب کو اولاد کی تمنا کیا کم ہوتی۔ وہ مجھے دیکھ دیکھ جیتے تھے۔ اولاد تو ان کے پاس پہلے سے موجود تھی۔

اف ۔۔۔ رات کا ایک بج گیا میری آنکھ نہیں جھپکی۔ گھڑی دو گھڑی تو سو لوں ۔۔۔ فجر کی نماز قضا نہ ہو یا اللہ ۔۔۔ میری آنکھوں ۔۔۔ دماغ اور جسم کو سکون عطا فرما دو ۔۔۔ ہا ۔۔۔ یہ کیا؟ چڑیاں چہچہانے لگیں ۔۔۔ باہر دن کی روشنی پھیلی ہوئی لگ رہی ہے شکر ہے نماز بچ گئی ۔۔۔ الحمد اللہ نماز قرآن تسبیح پوری ہو گئی ۔۔۔ اب سو جاتی ہوں ۔۔۔ سردی بہت ہے۔

ہائے ہائے ۔۔۔ یہ کون دروازہ توڑے دے رہا ہے ۔۔۔ کیا ظلم ہو گیا ۔۔۔ دن کے گیارہ بج گئے۔ یہ تو صنوبر ہو گی ۔۔۔ ٹھہرو ٹھہرو ۔۔۔ دم تو لو ۔۔۔ آ رہی ہوں ۔۔۔ صنوبر! ۔۔۔ ذرا رک کر میری ایک بات سن لو ۔۔۔ بیٹی میں ڈھلتی شام ہوں جانے کب چراغ بجھ جائے ۔۔۔ کبھی تم آؤ اور دروازہ نہ کھلے تو پلٹ نہ جانا ۔۔۔ کسی بچے کو بلا کر گیٹ کھلوا لینا ۔۔۔ مجھے دیکھ کر جانا ۔۔۔ اگر میں مر گئی تو ہاتھ پاؤں سیدھے کر کے آنکھیں بند کر کے منہ ڈھانپ دینا ۔۔۔ تمہیں اللہ بہت اجر دے گا ۔۔۔ ڈرنا نہیں ۔۔۔ تم ڈر کر چلی گئی تو میں یہاں پڑی پڑی سڑ جاؤں گی ۔۔۔ اور ہاں ۔۔۔ میرے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل میں چھوٹی سی نیلی ڈائری ہے اس میں ضروری فون نمبر لکھے ہیں ۔۔۔ فون کے خرچے کے سو روپے بھی اس میں رکھے ہیں ۔۔۔ ان نمبروں پر فون کر کے اطلاع دے دینا ۔۔۔ اس کے بعد پڑوسیوں کو بتا کر چلی جانا ۔۔۔ کوئی تو بندوبست کرے گا ۔۔۔ اب اگر مرنے والا خود اپنا کفن دفن کر سکتا تو کیوں کسی کی راہ دیکھتا؟؟

اب جاؤ ۔۔۔ کام شروع کرو۔

اے لو ۔۔۔ ادھر چائے پر پیالے کر بیٹھی ہوں ادھر یہ حضور نازل ہوگئی ۔۔۔ میں کوئی حلوے مانڈے تمہیں لیے بیٹھی ۔۔۔ پھٹکار ماری ۔۔۔ جا کر آباد گھروں کو تاک ۔۔۔ اصنوبر ۔۔۔ میرے لئے دو انڈے بھگری سے لا کر رکھ دیجیو ۔۔۔ جب بھوک ستائے گی ہمت ہوگی تو فرائی کروں گی ۔۔۔ اور ہاں پڑوسیوں سے اخبار مانگ لائیو ۔۔۔ ذرا دیکھ لوں گی ۔۔۔ کوئی بجلی بھری ہے اس لڑکی میں ۔۔۔ کام نمٹایا اور یہ جا وہ جا ۔۔۔ چلی بھی گئی۔ جاؤں جا کر گیٹ بند کر آؤں۔ گھر میں پڑے پڑے میں بیزار ہو گئی ہوں۔ کل مارکیٹ کا چکر لگاؤں گی دوائیاں بھی ختم ہو رہی ہیں ۔۔۔ اللہ کرے موسم ٹھیک ہو ۔۔۔ چھٹیاں تو ختم ہوگئی ہوں گی بیگ صاحب کے بچے میرے پاس نہ آئے ۔۔۔ بڑی پکی عورت ہے ۔۔۔ سارا مال تو سمیٹ کر بیٹھی ہے میرے میاں کا ۔۔۔ کھٹاک! ۔۔۔ یہ کیا گرا؟

جب بھی آرام کرنے بیٹھوں میری جان کی دشمن آن ٹپکے گی ۔۔۔ جانے کیا گرایا ہے باہر ۔۔۔ لگتا ہے خالی ڈبہ تھا آٹے کا ۔۔۔ صنوبر سے کہوں گی کل کر لاؤ تو جیب میں ڈال دے آہ کوئی بھی تنگی تسلی بھی نہیں جس سے دکھ سکھ بانٹ لوں ۔۔۔ یہ بے مہاری میاؤں میاؤں کر کے سر کھاتی رہتی ہے۔ کہیں کل رات کی طرح آج بھی سوتے نہ بیت جائے ۔۔۔ ٹھنڈی ہوا جانے کہاں سے گھسی آ رہی ہے۔ میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں ۔۔۔ اللہ تو ہوا ہے کمبل اور کیا کروں ۔۔۔ اللہ مالک ہے جمائیاں آ رہی ہیں ۔۔۔ کھٹاک ۔۔۔ اف مجھے جگا دیا ۔۔۔ رات کا کیا وقت ہے؟ انہیں پتہ تو دن کی روشنی پھیل رہی ہے ۔۔۔ ارے دن کے دس بج گئے ۔۔۔ مجھے کیا ہوگیا پھر لمبا رقھا ۔۔۔ اتنا وقت نکل گیا ۔۔۔ سخت سردی ہے توبہ ۔۔۔ اٹھوں ۔۔۔ میری ٹانگیں حرکت کیوں نہیں کرتیں ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ میری ٹانگیں ۔۔۔ کیا ہوگیا ہے انہیں ۔۔۔ ہاتھ سے دبا رہی ہوں محسوس رہی ہوں ۔۔۔ بائیں ٹانگ ٹھیک ہے ۔۔۔ تو کیا ۔۔۔ مجھے دائیں طرف فالج ہوگیا؟! ۔۔۔ نہیں اللہ میاں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ اف یہ گیٹ کس نے بجانا شروع کر دیا ۔۔۔ صنوبر آ گئی "صنوبر" کو کیسے بتاؤں ۔۔۔ یہاں سے کیا آواز پہنچے گی ۔۔۔ ہش ہش ۔۔۔ وہ بلی میری ڈبل روٹی لے کر بھاگی ۔۔۔ یہ میرے کمرے میں کیسے آ گئی تھی ۔۔۔ اچھا تو کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا بھی اسی کے پٹ سے آ رہی تھی۔ آگے پردہ تھا مجھے پتہ نہ چلا۔

"باجی جی ۔۔۔ باجی جی ۔۔۔ آپ ٹھیک تو ہو؟" صنوبر کھڑکی کے پاس سے پوچھ رہی ہے۔ "صنوبر ۔۔۔ تم صنوبر ہو نا بیٹی ۔۔۔ میں اٹھ نہیں سکتی ۔۔۔ گیٹ کھلوا کر آ جاؤ" صنوبر اندر آ کر کہہ رہی ہے "میں نے بلی کو منہ میں ڈبل روٹی دبائے نکلتے دیکھا تو پتہ چلا کہ گلی والی کھڑکی کھلی رہ گئی ہے۔ باجی جی یقیناً سو رہی ہوں گی ۔۔۔ آج تو بلی نے کام کر دکھایا ورنہ میں تو سوچ رہی تھی پہلے دوسرے گھروں میں کام کر آؤں پھر پتہ کروں گی"۔

"صنوبر ۔۔۔ تو ڈاکٹر کو فون کر دے ۔۔۔ میری دائیں ٹانگ حرکت نہیں کر رہی"

لو جی ڈاکٹر صاحب نے بھی یہی کہا آج آپ بلی کی وجہ سے بچ گئیں۔ سرد ہوا نے کسر نہ چھوڑی تھی مگر بلی آپ کی ٹانگوں کے پاس دبک کر پڑی رہی اس کی حرارت سے بچاؤ ہو گیا۔ یہ اگر او عارضی ہے ۔۔۔ احتیاط کیجئے"

"صنوبر ۔۔۔! بے چاری بلی کو دودھ ڈال دیا کر ۔۔۔" صنوبر مسکرا رہی تھی سوچتی ہوگی۔ بے مہاری سے بیچاری تک کا یہ سفر باجی جی کا ہے یا بلی کا۔

◆◆◆

الٹراوائیلٹ

نوید مرزا (فرانس)

مہمان اٹھ کر جا چکے تھے۔ انہیں ان کی کار کے پاس الوداع کہہ کر، واپس ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو ان کے آنے، بیٹھنے، گپ شپ لگانے اور پھر اٹھ کر چلے جانے کا احساس ابھی تک موجود تھا۔ ان کا لایا ہوا گلدستہ صوفے کے پاس رکھے فرشی گلدان میں مہک رہا تھا۔ رنگین سینڈوچ، چکن پاؤ، شاشلک سوپ اور فروٹ ٹریفل کے لئے کیے گئے تعریفی جملے اور اس ضمن میں کی گئی جوابی کارروائی ابھی تک دستر خوان پر مروت و تکلف کی آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ اسی میز پر کبھی سویٹ ڈش۔ ارے اتنا کم!! اور لیجئے!! آپ لیجئے! شروع کیجئے، کی آوازوں میں گھری معلوم ہوتی تھی۔

ادھر چند لطیفے چائے کی خالی پیالیوں کے گرد ابھی تک منڈلا رہے تھے۔ راکھ دان سے اٹھتے دھوئیں میں فضول کی بحث اور بے بنیاد دلائل کی حدت ابھی تک باقی تھی۔ عثمان کو فلسفیانہ گتھیاں الجھانے کا بہت شوق تھا۔ اس پر یہ نئی نئی شادی۔ پھر تو بس چل سو چل۔ یہ میں اور مجھ سے پوچھ۔ عثمان کی شوخ بیانی کو کنارہ دیتا تو اپنی نئی نویلی دلہن کی مسکراہٹ کا۔ میں نے بھی دوستی کا حق پورا پورا ادا کیا اور اس کی یا مخالف بن کر بحث میں ڈٹا رہا جو چلتی تھی تو صرف اسے اونچا اڑانے کے لئے۔

ہم دوست جب کہیں اکٹھے ہوتے ایک انتہائی سادے اور صلح پسند اصول کو نکال کر میز پہ رکھتے: بحثیں کرو، جھوٹ اور پھر شروع۔۔۔۔ آج تو ویسے بھی اسے کھلی چھٹی تھی جس کا موصوف نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور یونان سے ایران تک ہی کیا اس سے بھی اسے پرے، سقراط، بقراط، افلاطون، ڈیکارٹ، سارتر اور اس کے ساتھ پتہ نہیں کس کس ایرے غیرے نتھو خیرے کو آج رات گئے اٹھا کر میرے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ اور میں پہلے تو شوق میں اور پھر مارے مجبوری کے، کہ دوست بھی ہے اور مہمان بھی، جیسے تیسے ساتھ دیئے جا رہا تھا۔

مجھے ڈر تھا تو بس ایک ہی بات کا۔ ہو نہ ہو گفتگو کی ناؤ موضوعات کی طغیانی میں بار بار رخ بدلتی، جھولتی ہچکولے کھاتی پاش پاش ہو گی تو جا کر اسی چٹان پر۔ اور وہی ہوا۔ ساری بات کا لب لباب ایک ایسے نقطہ پر آن کر ٹھہرا جس نے مجھے گونگا کر دیا۔ فضا میں شادی کا سا ماحول تھا جو یہ جوڑا آتے آتے اپنے ساتھ ہی لایا تھا۔ اس دعوت کا اہتمام دراصل عثمان کی بیگم کے یہاں آنے کی خوشی میں کیا گیا تھا۔ ڈیڑھ سال کے طویل انتظار اور امیگریشن کے جاں گسل مراحل سے گزر کر وہ حال ہی میں لاہور سے آئی تھی۔ بس پھر کیا تھا آتے ہی نوبیاہتا جوڑا عجیب سی کشمکش کا شکار ہو گیا۔ ادھر دوستوں میں جنگ و جدل تک کی نوبت صرف اس بات پر آ پہنچی تھی کہ پہلے ان کی دعوت کون کرے گا۔ ادھر ان کے ذاتی ڈالی جس تیس اڑانے کا شوق اس حد کو پہنچا تھا کہ دوستوں سے پیچھا چھڑا کر تنہا پیرس کو گھومنے کے چکر میں ایسی معیاری بہانے بازی پہلی بار دیکھنے میں آ رہی تھی۔

اس ساری کھینچا تانی میں میری بیگم نے آج شام کی دعوت پر انہیں کیسے آمادہ کر لیا اس راز سے تو آنے والوں کے علاوہ اگر کوئی واقف تھا تو بس وہی جو بھیدوں کے سب راز جانتا ہے۔ مجھے تو اس فون پر اتنا بتا دیا گیا تھا کہ عثمان اور عائشہ آج شام کے کھانے پر آ رہے ہیں اس لئے ذرا جلدی آ جایئے گا۔

جب میں گھر پہنچا تو ڈرائنگ روم کا سارا ماحول ہی بدلا ہوا تھا۔ کھانے کی میز سجی ہوئی تھی۔ ایک لمبا ریشمی رومال بیچ میز کے شرقاً غرباً بچھا تھا۔ جس سے دستر خوان تین حصوں میں بٹا معلوم ہوتا تھا۔ سفید پھر لال پھر سفید۔ اس لال پٹی کے دونوں طرف ڈنر سیٹ کی پلیٹیں، چمچ، چھریاں اور کانٹے بڑے سلیقے سے رکھے تھے۔ ان سب کے درمیان تازہ گلاب کی پتیوں میں گھرا روایتی طرز کا سنہری پانچ شاخوں والا شمعدان رکھا تھا جس میں سونے کا ورق اوڑھے آدھی شمعیں ایسے تیار کھڑی تھیں کہ بس دیا سلائی دکھانے کی دیر تھی۔ ہوا میں تیرتی تازہ پکے کھانوں کی ملی جلی خوشبو بتاتی تھی کہ ادھر کچن میں بھی سب کچھ تیار ہے۔ ہر شے کی ایک جگہ تھی اور ہر شے اپنی جگہ پر تھی۔ کہیں کوئی کسر تھی نہ تبدیلی کی گنجائش۔ ہر چیز میری مرضی ہی سے نہیں بلکہ میرے اپنے ہاتھ سے رکھی معلوم ہوتی تھی۔

"ارے! آپ آ بھی گئے؟" وہ کچن سے نکل کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تو اس کی مسکراتی نظروں نے میری ایک جھلک دیکھی۔ "آپ کے کپڑے نکال دیئے ہیں اپنی سہولت سے تیار ہو جایئے۔" ڈرائنگ روم کے کسی پردے کی اوٹ سے اس کی آواز آئی۔ میں نے یہ سنا تو لمحہ بھر کے لئے وہیں کھڑا سوچنے لگا کہ میں تو اس کی توقع سے کہیں پہلے آ کر بھی اسے حیرت کے چند الفاظ ہی دے سکا، کیونکہ اس سے آگے کا بندوبست تو وہ پہلے ہی سے کر چکی تھی۔ پلنگ کے کنارے پڑا جوڑا دیکھ کر میں خوش ہو گیا۔ پتہ نہیں کیوں میں دوپہر ہی سے اسی سوٹ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد میں بیٹھک کے اسی صوفے پر بیٹھا عثمان اور عائشہ کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔ باہر کی گھنٹی کی اطلاع پر میں ان کے استقبال کو گیٹ کی طرف بڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ بھی میرے ساتھ ہی آ رہی تھی۔ بیوی ہمیشہ ایک قدم پیچھے۔ مہمانوں کو باہر کھڑا دیکھ کر ہم نے دور ہی سے ایک ساتھ ہاتھ ہلایا۔ جب میں عثمان سے مصافحہ کر رہا تھا تو وہ میرے بائیں جانب ذرا ہٹ کر کھڑی عائشہ سے مل رہی تھی۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ ہمیشہ کی طرح سبھی کچھ جیسے کسی سوچے سمجھے پروٹوکول کے تحت ہو رہا تھا۔ لیکن معلوم نہیں میری طبیعت پر کچھ عجیب سا بوجھ تھا۔ آج ہم رنگی، اتنی مناسبت اور اس قدر سلیقہ مندی سے مجھے کوفت سی ہونے لگی۔ شاید اس لئے کہ میں غیر شعوری طور پر اس جوڑے سے اپنا موازنہ کرنے لگا تھا۔ ان کے ہاں تو کوئی طریقہ یا ریت، کوئی بندش، کوئی خاص لحاظ قاعدہ نہ تھا۔ ہاں البتہ جھجک تھی، شرارت تھی، مسکراہٹیں تھیں، اٹکھیلیاں تھیں۔ جلدی میں عائشہ کا پرس عثمان نے پکڑ لیا ہے تو کار کی چابیاں اور موبائل پتہ نہیں اس کی بیگم کے ہاتھ میں کیسے آ گئے ہیں۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف ایک نظر دیکھتے ہیں، ہونٹ بھینچ کر ہنسی روکتے ہیں اور چلتے وقت "پہلے تم، پہلے تم" کے چکر میں وہ اس کا پاؤں مسل دیتی ہے۔ سوچ کو ذرا سا اشارہ ہو تو ماضی تک پہنچنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ جب اجنبیت بھی ابھی حیا کے ریشمی پردوں میں پلکیں جھپکتی تھی، جذبات کی شوخی احساس کے آئینوں میں اپنا عکس ڈھونڈتی تھی اور زبان پر آئے الفاظ بھی یوں اٹک اٹک جاتے تھے جیسے بچے کسی نئے چہرے کو دیکھ کر سامنے آنے سے ہچکچاتے ہیں، وہ لمحہ کہ جب رشتے کی بندش سے آگے کے تعلق کا کوئی نام نہ تھا جب بھی اس

کے ہونٹوں پر پھیلی مسکراہٹ میں ضم ہو گیا تھا۔ آنکھوں میں جھلکتے میرے عکس کے ساتھ ساتھ کچھ جھجک، کچھ خواہش اور کچھ انتظار بھی تھا۔ جیسے وہ گفتگو کی بھول بھلیوں میں اترنے سے پہلے میرا مائنڈ میپ (Mind Map) دیکھ رہی ہو۔

وہاں بھی جو کچھ ہو رہا تھا اسے چھوڑ کر "یہاں اور ابھی" جو کچھ ہو رہا ہے اسے دیکھنے کو میں اپنی آنکھوں میں آ بیٹھا۔ داخلی کمرے میں لگے ہوئے فانوس کی برقی شمعیں اب بھی ہوئی تھیں۔ لیکن ایک منٹ پہلے تک جلتے ہوئے اس فانوس کی تصویر ابھی تک میری آنکھ کے پردے پر محفوظ تھی بالکل اسی لمحے کی طرح جس نے عثمان اور عائشہ کو اسی فانوس کے نیچے سے گزر کر ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ آنکھوں کو پھر سے خالی چھوڑ کر میں اسی گہما گہمی میں ان کے پیچھے ہو لیا۔ جب عثمان نے اندر قدم رکھتے ہی کہا "بھابھی میز سجانا تو کوئی آپ سے سیکھے!" عائشہ نے ہاتھ میں پکڑا گلدستہ میری بیگم کو تھما دیا تو اس نے بے تکلفانہ کلمات کی ادائیگی میں لپٹے ہوئے سیدھا صوفے کے ساتھ رکھے کشمیری گلدان میں سجا دیا۔ اور وہ اس طرح پورا ماحول میں سما گیا کہ یہ جاننا جزئی نہ گستاخانہ شوخی۔ دیکھنے والوں کی نظر تحسین نے بھی گواہی دی کہ اس سے بہتر ان پھولوں کی کوئی جگہ ہو ہی نہیں سکتی۔ عثمان نے عائشہ کو ہلکی سی کہنی مار کر کہا "سیکھو! سیکھو! اس کو کہتے ہیں سلیقہ شعاری۔۔۔ ارے بھئی جمشید بھابھی نے اتنا کچھ کہاں سے سیکھا ہے یار! میں تو ہر بار تمہارے گھر میں آ کر حیران رہ جاتا ہوں۔" وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔ میں نے ایک نظر اس کو دیکھا اور پھر پتہ نہیں کیوں ایک خفیف سی مسکراہٹ میری آنکھوں سے اتر کر ہونٹوں پر پھیل گئی۔ جسے اس نے بے معنی نہیں تو بے محل سمجھا، عثمان نے ستائش اور اس کی بیوی نے رومانی سمجھا۔ یہ جو گلہ میرے ہونٹوں کے تناؤ میں عبارت تھا اسے کوئی نہ سمجھ پایا۔

"ارے بھئی جھوٹ، پتہ ہے مجھے اسے صرف پیٹ پوجے کھانوں کے چکر میں یہ تعریفوں کی رال ٹپک رہی ہے اور کوئی بات نہیں۔" میں نے بولتے بولتے نظر سے جملہ پوری محفل پر پھیلا دیا اور سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ مجھے کیا معلوم کہاں سے آئی یہ ہنر مندی اور کہاں سے اترا یہ ذوقِ زیبائش۔ کبھی کبھی تو لگتا ہے میں نے زندگی جی نہیں صرف دیکھی ہے، کسی صاف شفاف اور بے سجائے شوکیس میں رکھی ہوئی، جس پر لکھا ہے "صرف دیکھئے، ہاتھ لگانا منع ہے!"

میں عثمان کے ساتھ بیٹھ گیا اور وہ گلدان کا فاصلہ چھوڑ کر پرے صوفے پر عائشہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ادھر تصویروں، کپڑوں، جوڑوں اور زیورات کی باتیں تھیں تو ادھر فلم کا بجٹ، دوستوں کا آنا، ہوٹل میں کھانا اور اس سارے کے متعلق حسن انتظام کا تذکرہ چل رہا تھا۔ بیچ بیچ میں کبھی ادھر سے ان کی کسی بات میں کوئی مداخلت کر دیتا تو کبھی ہماری بات چیت میں رہ گئی کمی کو ان میں سے کوئی پورا کر دیتی۔ پھر ہوتے ہوتے ہم سب ایک ہی گفتگو میں شامل ہو گئے۔ اور اب ہر جوڑے میں سے ہر کوئی اپنے ساتھی کے پسندیدہ کھانے اور ٹی وی پروگرام گن گن کر اپنی قربت اور محبت جتانے میں مصروف تھا۔ اس کھیل میں سب سے زیادہ نمبر آنے طے اور اس کسوٹی پر بلاشبہ ہم سب سے زیادہ محبت کرنے والا جوڑا قرار پاتے۔ اور یہ بات بھی سچی تھی کہ کھانے پلانے اور اوڑھنے پہننے سے لے کر تفریحی مشاغل تک روزمرہ کے معمولات میں سے میری ایسی کوئی عادت نہ ہو گی جس کے صحیح وقت پر پورا ہونے کا اس نے بطریقِ احسن انتظام نہ کیا ہو۔ بلکہ اکثر اوقات تو مجھے پتہ چلنے سے پہلے ہی کام ہو چکا ہوتا۔ میری آنکھوں سے اوجھل میری دسترس سے باہر۔ کاش مجھے پتہ چلتا، کاش میں اس میں شامل ہوتا۔ میری زندگی کی بیک سٹیج پر اکیلی گم رہنے کی بجائے مجھے بنانے سنوارنے کے اس عمل میں وہ خود مجھے بھی شامل کر لیتی تو میں

یوں ہال میں بیٹھا اجنبیوں کی طرح اپنے ہی کردار کی تنہائی کا تماشہ دیکھ رہا ہوتا۔ پھر مجھے یہ بھی خیال آتا ہے کہ میں دل ہی دل میں اسے بے جا کوستا رہتا ہوں۔ معمولاتی اعتبار سے تو وہ ایک مکمل اور آئیڈیل بیوی تھی۔ ایسی بیوی کہ جس کی خواہش ہر شخص شوہر بننے سے پہلے تک کر سکتا ہے۔ پسندیدگی کے گرد گھومتی بات آخر کار اس محور میں جا پہنچی جس کا خوف مجھے کب سے لگے جا رہا تھا۔ ہزار بار کی سنی بات جب مشاہدے میں آئے تو بہت سے ایسے نئے پہلو بھی سمجھ میں آ جاتے ہیں جن کی طرف پہلے کبھی دھیان گیا ہی نہیں تھا۔ اور اگر اسی بات کے مشاہدے سے بڑھ کر آدمی تجربے سے گزر جائے تو پھر سب کہا سنا فسانہ اور سب دیکھا بھالا تماشہ معلوم ہوتا ہے۔ حقیقت صرف آپ بیتی تک سکڑ کر رہ جاتی ہے۔ کھانا میز پر لگایا جا چکا تھا۔ عثمان نے رشین سیلڈ اپنی پلیٹ میں ڈالتے ہوئے، لاکھ گھسا پٹا سہی لیکن اس وقت اپنے حالات کے مطابق سب سے اور مکمل اور انچھوتا سوال ورلڈ میپ کی طرح کھول کر پوری میز پر بچھا دیا: "محبت کر کے شادی کرنی چاہیے یا شادی کر کے محبت؟" اس نے اپنی بیوی کی طرف بہت ہی جذباتی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو میں پہلے ہو۔۔۔ تو تھوڑی بھی بعد میں کرو۔۔۔ تو مفت کی سر دردی! چلو بسم اللہ کرو؟" میں نے اس کا سارا فلسفہ سمیٹ کر اس کے ہاتھ میں دے دیا اور سب پھر سے کھانا کھانے لگے۔

"جمشید یار تم ابھی بال ایگل ڈھٹ کھیلنے کا تمہارا شوق ابھی تک گیا نہیں۔ بات کو ٹال دینا تو کوئی تم سے سیکھے۔ حضرت میں پوچھ رہا تھا کہ بیوی سے محبت شادی سے پہلے ہوتی ہے یا بعد میں؟"

میں ٹھیک ٹھاک قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔ "اب کیا ہے؟ اب کیا ہوا تمہیں؟" "دیکھو یار تم ابھی تو وارد ہونے والے ہو۔ لیکن پھر بھی ایک بات ابھی سے سمجھ لو تو بہت سی الجھنوں سے بچ جاؤ گے" "اب وہ حیرت اور بیزاری کے ملے جلے جذبات میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اس کی بیوی میری اصول بات سننے کے لیے چھری کانٹا چھوڑ کر بیٹھی تھی۔

"دیکھو بیٹا! میں نے اسے چڑاتے ہوئے کہا۔ موصوفہ چند تکنیکی وجوہات کی بناء پر شادی سے پہلے بیوی نہیں ہو سکتیں اور اس سانحہ کے بعد یہ بات تو پکی ہے کہ محبوبہ نہیں رہتی۔ اب سوال ذرا دوبارہ کرنا!" وہ کالا میرا منہ دیکھ رہا تھا اور ہماری نگاہیں تھیں کہ ہنستے چلی جا رہی تھیں۔

"تم کیوں لال پیلے ہوتے ہو شہزادے؟ محبت کا رنگ دیکھا ہی کس نے ہے؟ ایک نام ہے، نام رکھنے والوں نے رکھا کہ یوں چلتا ہے تو یونہی سہی! کسی طرح تو گلشن کا کاروبار چلے۔" مجھے احساس ہوا کہ اسے اوچھا اڑانے کی بجائے میں تو اسے ہر لحاظ سے دبائے جا رہا تھا۔ شاید غیر شعوری پر میں اپنا نفسیاتی دفاع کر رہا تھا۔ مجھے خطرہ عثمان سے نہیں اس کے چھیڑے ہوئے موضوع سے تھا۔ اور اب معاملہ ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر میں نے بھاگنے کی بجائے گتھی میں پناہ لے لی تھی۔

"یہ تو آپ نے بہت ہی عجیب بات کی جمشید بھائی۔" عائشہ کی آواز نے میز کے گرد بکھرے بے تکلف شور کو چپ کرا دیا۔ "یعنی آپ کے کہنے کے مطابق محبت کا کوئی رنگ نہیں؟" اس کے سوال کے بعد سناٹا اور گہرا ہو گیا۔ چھری کانٹوں کی جھنکار ماند پڑ گئی اور قریب تھا کہ دھڑکتے دھڑکتے تمام حرکتیں منجمد ہو جائیں۔ مجھے لگا کہ فضا میں بکھری ساری سماعتیں میرے چہرے کی طرف امڈ آئی ہیں۔ محفل نے دم توڑا ابھی تو اس ایک حرف پر جو میرے ہونٹوں پر منجمد ہو کر رہ گیا۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ میرے خیال میں محبت وہ جذبہ ہے جو زندگی کے موسموں کے ساتھ ساتھ رنگ بدلتا ہے۔ ہم اس کے گرگٹی مزاج کے پیچھے بھاگتے بھاگتے عمریں گزار دیتے ہیں لیکن پھر شاید ہی اس کا کوئی رنگ دکھائی دیتا ہو بلکہ وہ بھی نہیں۔" میں نے جزدان میں لپٹا اپنا خود ساختہ فلسفہ ایک گراں بہا تحفے کی طرح اس کا ہاتھ نہ کھینچ پائے۔

"گستاخی معاف کامران بھائی لیکن میرے خیال میں زندگی کا ہر رنگ محبت کا رنگ ہے کیونکہ محبت تو روشنی کی طرح ہے۔۔۔ لال پیلا گلابی عنابی۔۔۔ میرا مطلب ہے قوس قزاح کے سبھی رنگوں میں رچی بسی ہر شے کو لپیٹے ہوئے ہے۔۔۔ یہ ہیں عثمان؟" "ارے بھئی واہ! کیا تشبیہ دی ہے تم نے۔ محبت روشنی کی طرح ہمہ وقت سادہ بھی، رنگین بھی بلکہ میں تو کہوں گا بے کنار بھی۔۔۔" رات کافی ڈھل چکی تھی۔ ساڑھے بارہ بجے تو وہ لوگ ہمارے گھر سے گئے تھے۔ چلو یہ ہنگامہ بھی ہو گیا۔ ایک بلبلہ، وقت کی ساری خوشیاں اس کے رنگین وجود پر منعکس ہوئیں اور پھر وہ ٹوٹ گیا۔ پانی کی سطح پر ایک دائرہ اس کے بننے، ہونے اور پھر ٹوٹ جانے کا احساس دلا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ بھی تحلیل ہو گیا۔ کھانے کی میز پر رکھے برتن اٹھائے جا چکے تھے۔ ڈرائنگ روم اب صاف تھا۔ چائے کے خالی کپ اور دوسری چیزیں بھی سمیٹ کر اس میز کو چمکا دیا گیا تھا۔ ڈرائنگ روم میں ہر شے پہلے کی طرح معمول پر آ چکی تھی۔ بس کچن میں کچھ کام جاری تھا۔ اس شام کے نشان بھی اب آہستہ آہستہ وقت کی سطح پر تحلیل ہوتے جا رہے تھے۔ میں نے آخری بتی بھی بجھا دی اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کاش عثمان سوال کا رخ اس کی طرف نہ موڑتا۔ "کیوں بھابھی آپ کیا کہتی ہیں محبت کے روشنی صفت ہونے پر؟"

"جی عثمان بھائی کہتی تو عائشہ ٹھیک ہی ہے۔ محبت کے رنگ بھی روشنی کی طرح ترتیب دیے ہوتے ہیں۔ بہت سرخ سے جامنی کی طرف۔ ایک کے بعد دوسرا ہر کوئی اپنی جگہ سجا ہوا۔" اس کی آواز، اس کے الفاظ اور لہجے میں ایسا ٹھہراؤ تھا جیسا کبھی کبھی اچھی ادبی محافل کے اختتام پر صاحب صدر کے بیان میں ہوتا ہے۔ "۔۔۔ اور آپ نے جو محبت کو بے کنار کہا وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہے۔ روشنی کے رنگوں میں قوس قزاح سے اوپر اور نیچے مزید رنگ بھی ہوتے ہیں جنہیں ہم الٹرا ریڈ یا الٹرا وائلٹ کہتے ہیں اور یہی روشنی کو بے کنار بناتے ہیں۔ انہیں دیکھنے کے لئے خاص آنکھیں اور محسوس کرنے کے لئے خاص حس چاہیئے۔ اسی طرح محبت کے بھی کچھ رنگ دکھائی دیتے ہیں اور کچھ الٹرا وائلٹ اور اس سے ماورا ہوتے ہیں جنہیں ہر کوئی نہ دیکھ سکتا ہے نہ محسوس کر سکتا ہے۔ میرے نزدیک تو یہی محبت کے اصل رنگ ہوتے ہیں باقی تو سب دکھاوا ہے، روشنیوں اور رنگوں کا تماشہ۔۔۔"

کمرے میں اندھیرا تھا۔ ایسا اندھیرا جس نے آرام کرسی پر پڑے میرے وجود کے حاشیے چاٹ لئے تھے۔ فضا میں بکھری سوچیں موج در موج میرے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کے الفاظ کی بازگشت کا ایک شور مچا تھا۔۔۔ "میرے نزدیک تو یہی محبت کے اصل رنگ ہوتے ہیں باقی تو سب دکھاوا ہے، روشنیوں اور رنگوں کا تماشہ۔۔۔" تو گویا اس کی محبت الٹرا وائلٹ ہے جسے اول تو میری نگاہ کھوجی دیکھ نہ پائی اور جب بتائے جانے پر معلوم ہو ہی گیا تو میرے پاس وہ حس ہی نہ تھی جو اسے محسوس کر پاتے۔ لیکن ایک سوال اس گھپ اندھیرے کو بھی سائے کی طرح بھرے ہوئے تھا: کیا اسے معلوم ہے کہ الٹرا وائلٹ روشنی جسم کو جلا دیتی ہے؟

◆◆◆

میرے یار کی یار

اظہر جاوید

ترجمہ: حنیف باوا

"بات سنو۔ مجھے بھی اپنے ساتھ پاکستان لے چلو۔"

"چلو۔ اٹھو پھر چلیں۔"

"میں مذاق نہیں کر رہی۔ کبھی Serious بھی ہو جایا کریں۔"

"میں تو تمہیں دیکھ کر پہلے روز ہی سیریس ہو گیا تھا۔ تو بس سمجھ نہیں رہی۔"

"تو بہت باتونی ہے۔" وہ زور سے ہنسی، اپنے رنگین ہونٹوں پر مزید رنگ بچھایا اور اپنی خوبصورت آنکھوں کو مٹکا کر اور خوبصورت کیا۔ وہ مزید قریب ہو گئی اور جب میں نے اپنے بازوؤں کے گھیرے کو اور تنگ کیا تو اس نے آہستہ سے سسکاری بھرتے ہوئے کہا۔

"نہیں ___ اور کچھ نہیں۔ ابھی میں بہت کمزور ہوں۔ میرا ابھی کوئی ارادہ نہیں۔ میں نے تجھے بتایا ہے کہ میں تمہیں سوری کی امانت سمجھتا ہوں ___"

"پھر وہی بات۔" اس نے قدرے چڑ کر اور جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ ایسے موقعوں پر وہ پنجابی کو چھوڑ کر انگریزی میں گفتگو کرنے لگتی ہے جس سے اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ "اور میں تجھ پر مرتا ہوں۔" اب وہ ایسے ہنسی کہ جس میں نہ کوئی غصہ تھا اور نہ ہی کوئی روناپن!"

"تو قابو میں آنے والا نہیں۔ چل اٹھ میں تجھے ناشتے کے لئے لے چلوں۔"

دلی کے غالب انسٹی ٹیوٹ میں تمام سہولتیں موجود ہیں لیکن کھانے پینے کے لئے باہر جانا پڑتا ہے۔ میں انسٹی ٹیوٹ کا مہمان نہیں تھا۔ اسی لئے انھوں نے میرے لئے کسی خاص قسم کے تکلف سے کام نہیں لیا تھا اور مسئلہ بھی صبح کے ناشتے کا ہی ہوتا ہے۔ دوپہر کو میں کھانا نہیں کھاتا اور شام کے وقت یا تو کہیں دعوت کا اہتمام ہوتا ہے یا پھر کسی ہوٹل میں کھانا کھانے کے بعد باقی کی آدھی رات آرام سے گزارنے کے لئے اس مہمان خانے میں آ جاتا تھا۔

وہ میرے یار کی یار تھی۔ تھی میں نے اس لیے کہا ہے کہ اس کے انتقال کو دو سال کا عرصہ ہونے کو ہے۔ سوری میرا یار خوبصورت بھی بہت تھا۔ اور اطالیہ میں رہنے والے اردو کے بڑے ادیبوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ شاعری بھی اس کی بڑی عمدہ ہوتی تھی اور کہانیاں بھی وہ منفرد انداز سے لکھتا تھا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لئے وہ ڈرامے اور فیچر ایسے آسانی سے لکھتا تھا جیسے اس نے اپنے قلم کو ان کے بارے میں پہلے سے ہی سنوار رکھا ہو۔ وہ بہت بڑا افسر تھا۔ میرے ساتھ متعارف ہونے سے دو ایک سال پہلے اس نے اپنی مرضی سے ریٹائرمنٹ

لے لی تھی۔ وہ بیوروکریٹ کم اور تک چڑھا تھا۔ یاروں کا یار بھی ___ بے شک اس کے سامنے کوئی بڑے سے بڑا لکھاری یا کوئی شخص ہوتا۔ اگر اسے کوئی بات اچھی نہ لگتی یا اختلاف ہوتا تو فوراً بات منہ پر دے مارتا۔ اسی عادت پر اس نے جھگڑے بھی پال رکھے تھے لیکن اس میں جو خوبیاں تھیں ان کی وجہ سے لوگ اسے چھوڑ بھی نہیں سکتے تھے۔

سوری کے ساتھ میری پہلی ملاقات دہلی کافی ہاؤس میں ہوئی تھی۔ شاید دہلی میں میرا یہ دوسرا چکر تھا۔ کسی مشاعرے سے ہو کر اپنی عادت کے مطابق دہلی میں رک گیا تھا ___ اس وقت ساقی، دلیپ سنگھ اور بیج سنگھ دوستی کا سبب بنے تھے۔ ساقی صاحب اپنے کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ دلیپ بذات خود بڑا افسر تھا۔ صرف بیج سنگھ ہی فارغ پھر رہا تھا۔ پہلے سال دہلی کی سیر کرانے کے بعد کافی ہاؤس کے گروپ کے سامنے مجھے کہنے لگا "یار ___ تو تو بالکل ہی ہمارے جیسا ہے۔"

"کیا ___ تیرا مطلب ہے کہ میں بھی سکھ ہوں ___؟" میں نے بھی جملوں کے تسلسل کو ٹوٹنے نہیں دیا ___

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے ___" بیج اتنے زور سے ہنسا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا اور ساتھ والی میزوں سے اٹھ کر بیچم ___ ہردیو، گورچرن اور بلا راسنگھ کاہل اور نہ جانے کون کون تھے جو بھاگ کر پہنچے۔

"کیا بات ہے، بیج؟ مسٹر پاکستان سے کوئی نیا لطیفہ لے کر آئے ہیں ___؟"

بیج جو اپنی ہنسی کو بریک لگا چکا تھا، دوبارہ پھر اسی رفتار سے ہنسا اور کہنے لگا۔

"لطیفہ نہیں ___ سکھ لے کر آیا ہے ___" ایسے ہی تو دری طرح تیز جملوں اور برجستہ لطیفوں کے دوران سوری سے ملاقات ہوئی تھی ___ بیج نے تعارف کروایا اور سوری ایستادگی کی حالت میں کہنے لگا "نہیں یار ___ میرا ٹینج ذرا ڈھیلا رہا ہے۔ وہاں پر میرا موجود ہونا ضروری ہے۔ فنکاروں کے مکالمے غور سے سننے پڑتے ہیں اور ان کی غلطیوں کو درست کرنا پڑتا ہے۔"

"اور ہماری غلطیوں کو کون ٹھیک کرتا ہے؟" میں ویسے ہی باتوں میں مداخلت کرتے ہوئے بے تکلف ہو گیا تھا ___ سوری نے میری طرف دیکھا، مسکرایا اور چلا گیا۔ اس کی پیشانی پر کوئی بل نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس نے میرے مذاق کرنے پر کچھ کہا۔ اس سال اس سے ملاقات پھر نہیں ہوئی۔ جب ہم دوبارہ ملے تو ایسے محسوس ہوا جیسے ہم جنم جنم کے ساتھی ہوں ___ اور سوری نے میرے سامنے ہی نہیں بلکہ سارے دہلی کے اہل قلم کے روبرو بار بار یہ اعلان کیا کہ وہ مجھ سے عشق کرتا ہے۔ سچی بات ہے ___ مجھے بھی ایسے لگتا تھا جیسے اس کا اندرانی کے ساتھ اتنا عشق نہیں ___ "اندرانی ___ اندرانی کون ___؟" یہ وہ خاتون ہے جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے۔ اور جو مجھے پاکستان جانے کے لئے منتیں کرتی تھی ___ سوری صبح سے شام تک میرے ساتھ رہتا تھا ___ اور شام کے وقت میرا اس کے ہمراہ رہنا مشکل ہو جاتا تھا۔ شام کے چھ بجتے ہی سوری کا بدن ٹوٹنے لگتا۔ دہلی میں شراب کی کوئی ممانعت نہیں لیکن کھلی جگہوں اور عام ریسٹورنٹ میں پینا منع ہے۔ شام کے وقت ادھر ادھر سے چھ سات شرابی جمع ہو جاتے اور پینے پلانے کے لئے جگہ ڈھونڈتے۔ بیج اور سوری کی بات کچھ اور تھی۔ جیم اور دیگر بھی فوراً بے تکلف ہو جاتے اور میرے ہوٹل کے کمرے یا غالب انسٹی ٹیوٹ کے مہمان خانے کی جانب بوتلیں ہاتھوں میں لئے چل پڑتے تھے۔ میں اگر کبھی کترا جاتا بھی تو وہ خود ہوٹل کے استقبالیہ سے چابی لے کر میرا کمرہ کھول لیتے تھے۔ مجھ کو ایسے وقت میں اپنے ہی شعر یاد آتے ہیں۔ بیج ویسے ہی کھل کھلا کر ہنستا رہتا ہے اور سوری قدرے گمبھیر ہو جاتا تھا ___ اس کا دل چاہتا تھا کہ جو بھی ہو میں اس کے سامنے بیٹھا رہوں۔ ایک روز سوری نے ایسے ہی کچھ سہواً سے بات کی جیسے کہہ رہا ہو کہ اندرانی، گلزار، قزلباش یا پروفیسر گوپی چند تجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔

امرائی مجھے کیسے جانتی ہے۔ میں نے حیرت سے کہا۔ سوری نے اسی طرح کوئی تیکھا جواب دیے بغیر کہا۔

"تیرا کیا خیال ہے۔ تیرے پاکستان جانے سے ہم تجھے بھول جاتے ہیں؟ نہیں! ہر روز شام کے وقت میں اور امرائی تیری ہی باتیں کرتے ہیں۔ وہ تو اب تجھے رنج اور دلیپ سے بھی زیادہ چاہنے لگی ہے۔ میں حیرانی سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ اور اس نے اسی طرح عام سے لہجے میں کہا چھوڑ، اب زیادہ حیرت میں مت ڈوب۔ کچھ حیرانی شام کے لئے بھی رکھ لے۔

شام کے وقت سوری مجھے لے کر پریس کلب پہنچا وہ پہلے ہی وہاں پر موجود تھی۔ سانولی سی رنگت چھریرا بدن۔ باتیں کرتی ہوئی آنکھیں اور بھرے بھرے ہونٹ ۔۔۔ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا ۔۔۔ تو مجھے اس کا ہاتھ کچھ بے جان سا لگا ۔۔۔ بعد میں پتا چلا ۔۔۔ وہ بہت بیمار رہی ہے اور کل ہی وہ ہسپتال سے آئی ہے۔

"تو نے سچ کہا تھا" امرائی نے سوری سے گفتگو کرتے ہوئے کہا۔ "ہو بہو تو اپنی تصویر جیسا ہے۔"

بات کچھ میرے پلے نہ پڑی۔ اس نے ہنستے ہوئے میری جانب دیکھا۔ میں نے کہا ۔۔۔ "تیری آنکھیں بے حد خوبصورت ہیں۔" وہ قہقہہ لگا کر ہنسی اور کہنے لگی "اس نے بھی پہلی ملاقات میں یہی بات کی تھی" ۔۔۔ "میں نے اپنا وار جاری رکھا۔

"کیا میں یہ سمجھوں کہ میرا کام پکا ہو گیا ہے ۔۔۔؟" "پکا ۔۔۔ سوری نے کہا ۔۔۔ لیکن دیکھنا کہیں کنارہ کش نہ ہو جانا۔ اور وقت آنے پر مکر بھی نہ جانا!"

سوری نے وسکی کا گھونٹ حلق میں اتارتے ہوئے مجھ سے پہلے جواب دے دیا ۔۔۔ نہیں کرتا ۔۔۔ اب تک اس نے جو بے شمار عشق کیے ان سے اس نے کبھی انکار نہیں کیا ۔۔۔"

میں جانتی ہوں ۔۔۔ امرائی نے بڑے یقین سے کہا ۔۔۔ "میں نے رنج اور دلیپ سے اس کی بہت باتیں سنی ہیں۔"

میں ترنت اس کی جانب دیکھے جا رہا تھا اور وہ تین سال بعد مجھے پتا چلا کہ وہ کیوں میرے بارے تحقیق کرتی رہی ہے۔

اس سال میں نے چھتے روز بھی دہلی میں قیام کیا۔ اس کے ساتھ ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ وہ میرے قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی اور میں شاعروں کے مذاق کے علاوہ اسے سوری کی امانت اور اپنے یاری کی یاد ہی سمجھتا رہا۔ جس روز میں نے پاکستان آنا تھا۔ کافی ہاؤس کی چنڈال چوکڑی کے علاوہ جو یار بیلی ایئرپورٹ پر الوداع کہنے آئے ہوئے تھے ان میں وہ بھی شامل تھی۔ سوری تو جذباتی شخص تھا ۔۔۔ وہ تو میرے شعر سن کر زار و قطار رونے لگتا تھا۔ اس جدائی کے وقت بھی اس کی آنکھوں سے آنسو اس کے رخساروں پر گر رہے تھے اور دلیپ نے مجھے کہنی مارتے ہوئے کہا "وہاں پاکستان میں رونے پیٹنے والے کم تھے کہ یہاں پر بھی ایک اور چھوڑے جا رہا ہے۔ میں نے حیرت سے دیکھا تو دلیپ نے کہا ۔۔۔ "ادھر امرائی کی طرف بھی دیکھ لیں وہ سوری سے بھی زیادہ آنسو بہا رہی ہے ۔۔۔"

اگلے برس میں دہلی گیا تو وہ مزید (پختہ) ہو گئی تھی۔ لاجپت نگر کے بازار سے شاپنگ کرنے کے لئے میرے ساتھ چل پڑی اور کہنے لگی۔ "لو! میں اپنے معشوقوں کے لئے تحفے میں خود خریدتی ہوں" ۔۔۔ میں نے ڈھیٹوں کی طرح کہا ۔۔۔ "ایسا نہ کہہ میرا تیرے سوا کون ہے اس دنیا میں ۔۔۔"

"بک بک نہ کر ۔۔۔ یہ اتنی ڈھیر ساری اشیا کس کے لئے خریدی جا رہی ہیں ۔۔۔؟"

"بال بچوں کے لئے اور کس کے لئے" ۔۔۔ میں نے چہرہ سامنے بنا کر جواب دیا ۔۔۔ "زیادہ چالاکیوں سے کام مت لے ۔۔۔"

میں نے تیج اور دلیپ سے تیرے بارے میں سب کچھ جان لیا ہے۔ "تو تو کہتا تھا۔ میں غریب ہوں ۔۔۔ تیج نے تیرا گھر اور تیرا دفتر سب کچھ دیکھ رکھا ہے۔ "وہ کہتا ہے تو وہاں کا بہت مالدار آدمی ہے ۔۔۔ میں نے پیچھا تیرے ساتھ جاؤں گی" "یہ بات کہتے ہوئے سر بازار اس نے میرا منہ چوم لیا ۔۔۔ میرے جیسے بندے کے لئے یہ سراسر غیر مانوس اور الگ سا واقع تھا۔ میں بدحواس سا ہو گیا اور غصہ کرنے لگا۔

"کیا کر رہی ہو ۔۔۔ میں بدنام ہو جاؤں گا ۔۔۔"

وہ کھل کھلا کر ہنستے ہوئے بل پہ بل کھانے لگی اور ہنسی کی حالت میں وہ سڑک پر بیٹھ گئی جیسے اسے دمے کا دورہ پڑ گیا ہو ۔۔۔ میں گھبرا گیا۔ وہ ہنسے اور کھانسے جا رہی تھی اور میں چوروں کی طرح ادھر ادھر دیکھے جا رہا تھا کہ بھرے بازار میں لوگ کیا سوچیں گے ۔۔۔ لیکن انڈیا میں ایسی باتیں اچنبھی نہیں ہوتیں۔ میں نے اسے سنبھالا اور اس نے ہنستے ہوئے کہا" بے ایمان تو ہو گئیں گا ۔۔۔ کہتا ہے کہ میں بدنام ہو جاؤں گا۔ تجھے یہاں جانتا کون ہے؟

"آؤ کہیں پہ جا کر چائے پیتے ہیں ۔۔۔ اور تو نے کچھ کھانا بھی ہے ۔۔"

وہ اسی طرح میری بانہوں میں اپنا ہاتھ ڈالے ہوئے میرے کندھے کے ساتھ لگ کر چلنے لگی ۔۔۔ قریب ہی ایک ریستوران تھا۔ کھانے پینے کی اشیا کا آرڈر دینے سے پہلے اس نے کہا ۔۔۔ بل میں دوں گی ۔۔۔ "میرے اندر پھر ایک جملہ کلبلایا لیکن میں نے اپنے ہونٹ بند رکھے کہ کہیں بات کسی اور طرف نہ نکل پڑے ۔۔۔

"دیکھو اندرانی ۔۔۔ تمہیں یاروں دوستوں نے بتایا ہے ۔۔۔ میری دوستیاں بہت ہیں لیکن میرا عشق ہمیشہ کسی ایک کے ساتھ ہی ہوتا ہے جو مجھے توڑ کر رکھ دیتا اور پھر میں برسوں تک کسی نئے عشق کے ہونے سے پہلے اسی ایک کے ہجر میں نظمیں اور غزلیں لکھتا رہتا ہوں ۔۔۔ ویسے میں چلتے پھرتے میں بھی عشق کر لیتا ہوں۔ ایسے عشق یہاں دہلی میں بھی ہیں سوری کو معلوم ہے ۔۔۔ لیکن تو نے تو سوری کی امانت ہے۔ میرے یار کی یا ڈسی مذاق اپنی جگہ لیکن میں تیرے بارے میں اس سے آگے کچھ بھی سوچ نہیں سکتا ۔۔۔ اس روز غالب اکیڈمی لوٹ میں بھی یہ بات میرے ایمان کا حصہ رہی۔ تو بیماری اور کمزوری کے بارے میں بات نہ بھی کرتی تو میں نے پھر بھی حد سے آگے نہیں گزرنا تھا۔ بے شک تو اس روز سوری سے پوچھے بغیر آئی تھی ۔۔۔ لیکن اگر اسے معلوم بھی ہوتا تو اس کی سوچ ہمارے بارے میں منفی ہر گز نہ ہوتی کیونکہ اسے ہم دونوں پر پورا بھروسہ ہے ۔۔۔

اس نے میری بات کو درمیان میں ٹوکتے ہوئے کہا۔ سوری کے ساتھ میری کمٹ منٹ نہیں ۔۔۔ یہ بات میں اس کے روبرو بھی کہہ سکتی ہوں ۔۔۔"

"بے وقوف نہ بن اتنے برسوں کی یاری کے بعد کسی کمٹ منٹ کی ضرورت نہیں رہتی ۔۔۔ اور نہ کوئی اعلام یا اقرار نامے لکھے جاتے ہیں ۔۔۔ اس نے پھر میری بات کو ٹوکا۔ "ہم آپس میں شادی نہیں کر سکتے ۔۔۔" "شادی تو میں تیرے ساتھ نہیں کر سکتا ۔۔" "کیوں ۔۔۔ اس لئے کہ میں تنہا ہوں ۔۔۔ ؟" "تنہا تو بقول بلونت سنگھ دلی دوزرن ہوتی ہے۔ لیکن جیتے جی بندہ شادی کی حماقت ایک بار ہی کرتا ہے۔

اندرانی ہنسنا چاہ رہی تھی لیکن بچوں کی طرح کھل کھلا کر کہنے لگی" ۔۔۔ مجھے نہیں معلوم ۔۔۔ تو مجھے اپنے ہمراہ لے چل ۔۔۔ میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے دبایا اور کہا۔۔۔ بات سن۔۔۔ اگر یہ سب کچھ مشکل بھی ہو تیرا وجود۔۔۔ اگر پاکستان جانا مشکل بھی ہو جب بھی میں اپنے پیار کو دھوکہ نہیں دے سکتا۔۔۔ تیری روح کی بے چینی کو میں سمجھتا ہوں۔۔۔ یہ فیصلہ میرے لئے نہیں۔ ویسے بھی یہ روح بے کل ہے اور یہ بے کل ہی رہے گی۔ تیری شادی ہوئی اور ٹوٹ گئی۔۔۔ سوری بھی تو جیسے تیسے نبھائے چلا جا رہا ہے۔۔۔ اس کے گھر والے اور تیرے گھر والے تو کیا ساری دنیا جانتی ہے۔ تم دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ تم دونوں کے لئے ایک دوسرے کے بغیر رہنا بھی دشوار ہے۔ اس قسمت کا کھیل سمجھ کر اسی طرح گزر بسر کرتے رہو۔ چل ہاتھ ملا اور ساتھ ہی پیار کی سوغات بھی دے مجھے!"

وہ پہلے ہنسی اور پھر رونا شروع کر دیا۔ تو کتنا ظالم ہے۔ کتنی مشکل بات کو کتنی آسانی سے کہہ گئے ہو۔ ٹھیک ہے تو مجھے چھوڑ کر چلا جائے گا اور اپنی گوری محبوباؤں میں رس بس جا۔۔۔ لیکن میں تمہیں نہیں بھول پاؤں گی۔۔۔ اور نہ ہی دل سے نکال سکوں گی۔۔۔"

"دل سے تو تجھے میں بھی دور نہیں کر سکتا۔ فی الحال تو میں تجھے ریستوران سے نکالنا چاہ رہا ہوں۔۔۔ اس نے پیار سے پانی سے بھری نظروں سے دیکھا۔ بعد ازاں ہنستے ہوئے کرسی سے اٹھ کر میری طرف بڑھی اور پھر میرا ماتھا چوم لیا۔

بل والی پلیٹ اٹھاتے ہوئے بیرا قدرے حیران ہوا۔۔۔ پہلے اس نے اس کی طرف دیکھا پھر میری طرف پھر اس نے ٹپ سے دس روپے اٹھا کر جیب میں ڈالتے ہوئے کہنے لگا۔

"ٹھینک یو میڈم" میں نے بھی آگے بڑھ کر اندرانی سے کہا۔۔۔ "ٹھینک یو میڈم"

"کمینے ہو کہیں کا" اس نے روتے ہنستے ہوئے کہا اور ریستوران سے مجھ سے پہلے باہر نکل گئی۔ مجھے کافی ہاؤس اتار کر وہ گھر چلی گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ پھر بیمار نہ پڑ جائے۔ اسے شاید کینسر تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی تو تھی لیکن میں اپنے پیار سے دھوکہ کیسے کرتا؟

اس شام پریس کلب میں جب سوری وہسکی کے دو جام پی چکا تو میں نے اسے جے۔ آر۔ ایم سے پوری بات سے آگاہ کیا۔۔۔ اپنی طرف سے میں نے اس سے وعدہ لیا کہ وہ اندرانی سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ لیکن مجھے یہ یقین تھا کہ وہ رہ نہیں سکے گا۔ وہی بات ہوئی۔۔۔ اس نے شاید گھر پہنچتے ہی اندرانی کو فون کیا۔۔۔ اور دوسرے روز شام کے وقت جب میں ہوٹل سے واپس گیا تو کاؤنٹر والے نے مجھے بتایا کہ محترمہ آئی تھیں۔ وہ مجھے یہ دے گئی ہیں۔ وہ خوشبو والی شیشی تھی جو میں نے اسے تحفے میں دی تھی اور ساتھ ہی انگریزی میں لکھا ہوا ایک رقعہ تھا۔ "پھر اس تحفے کی بھی کیا ضرورت ہے بھلا۔۔۔" لیکن وہ یک ٹکڑا ٹکڑا سا تھا۔ مزید ایک سال قلانچیں بھرتا ہوا گزر گیا۔۔۔ میں چنڈی گڑھ جا اور مجھے سے مشاعرے کر کے دلی واپس آیا تو وہیں کافی ہاؤس کے لطیفے اور سوری کا پہلے سے بھی بڑھ کر پیار۔۔۔ وہ چار روز کے بعد سوری مجھے کہنے لگا۔

"انکار نہیں کرنا۔۔۔ اندرانی تجھے یاد کر رہی ہے۔۔۔ شام کا کوئی پروگرام نہ ترتیب دے لینا پریس کلب کے لئے۔"

ہم جب پریس کلب پہنچے تو اندرانی وہاں پہلے سے ہی موجود تھی۔ وہ حسب سابق خوشی سے ملی۔۔۔ واقعی اس کی صحت اب اچھی نہیں تھی۔ لیکن وہ نکھری ہوئی بھی تھی۔۔۔ میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا۔

"تیری آنکھیں تو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہو گئی ہیں۔"

"خدا کا واسطہ۔۔۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر میرے آگے کرتے ہوئے کہا۔۔۔ میں نے ابھی بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا ہے۔ پھر

کوئی دعا کرتے جانا۔''

میں بھی قدرے حیران ہو گیا ـــ ہفتہ دس دن ـــ پندرہ بیس دن۔ جتنے جتنے روز بھی میرا دہلی میں قیام رہا ـــ اس نے بھی فاصلے کو قائم رکھا جو میں نے اپنے اور اس کے درمیان پیدا کیا تھا۔ پھر ـــ اگلے برس میں گیا تو سوری نے بتایا کہ اندرانی بہت بیمار ہے اور اسپتال میں داخل ہے ـــ اسی دوران ایک مشاعرہ بھی ہو رہا تھا۔ ہم تینوں سوری، ایک شاعرہ اور میں اُسے اسپتال میں ملنے کے لیے گئے۔ سوری نے بڑے دکھ سے مجھے بتایا کہ ڈاکٹر مایوس ہو چکے ہیں۔ اسپتال میں ہمیں دیکھ کر وہ خوش تو ہوئی لیکن ساتھ ہی وہ جیسے بجھ سی گئی تھی۔ مجھے بعد میں خیال آیا کہ اس شاعرہ کو ساتھ نہیں لے جانا چاہیے تھا۔ اس کی ماں پلنگ کے ساتھ لگی بیٹھی تھی۔ میں نے جاتے ہی کہا۔ ''بھلا زندگی بھی موت سے بیمار ہو سکتی ہے۔''

ایک پھیکی سی ہنسی اس کے ہونٹوں پر آ گئی۔ ''تم پھر وہی باتیں کر رہے ہو۔'' اس نے اپنی ماں کی طرف دیکھا ـــ ماتا جی ـــ یہ پاکستان سے آئے ہیں۔ میں نے آپ سے ذکر کیا تھا ـــ''

ماتا جی نے ایک بھرپور نظر سے میری طرف دیکھا اور پھر شاعرہ کے ساتھ باتوں میں مصروف ہو گئی۔ شاعرہ نے کیمرہ نکالا اور کہا۔ ''میں نے آپ کے ساتھ ایک تصویر بنوانی ہے۔'' ''اور مجھے بھی۔'' اس نے اسی طرح ہلکے پھلکے انداز سے بات کی۔ اندرانی نے کہا۔ ''میں نے نہ تو منہ دھویا ہے اور نہ ہی بالوں میں کنگھی کی ہے ـــ کل سہی ـــ'' ''آپ کل بھی آئیں گے نا ـــ؟''

لیکن کل کب آنے دی۔ بھلا کل بھی کبھی آتی ہے۔ کبھی کل نہ دوسرا روز آیا ہے۔ نہ کسی کل اور کبھی کسی کو نصیب ہوا ہے۔

پاکستان واپس آنے پر تلمیذ کا مجھے خط ملا۔ سوری کی اندرانی اور آپ کی بھی ـــ پرلوک سدھار گئی۔ سوری کا برا حال ہے۔

میں نے سوری کو خط لکھا، فون کیا۔ اس کی جانب سے کوئی جواب نہ آیا۔ اسی طرح دو چار ماہ گزر گئے کہ ایک روز دہلی سے سوری کے بچپن کے دوست ''خوشی'' کی چٹھی آئی۔

''ہمارا اور تمہارا سوری بھی ہم سے منہ موڑ گیا ہے ـــ''

دو سال گزر گئے ہیں ـــ پاکستان اور انڈیا کے تعلقات بہت خراب ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے میرا انڈیا جانا نہ ہو سکا ـــ سوچتا ہوں ـــ شاید یہ کوئی اچھی بات ہی ہو ـــ اگر میرا ہندوستان جانا بھی ہو گیا تو وہاں میں کس سے ملوں گا؟ وہاں نہ ہی میرا یار ہے اور نہ ہی میرے یار کی یار؟

◆◆◆

پیرزادہ ... قاضی کی کتاب قرآنی کہانیاں کے بعد اب

مزید قرآنی کہانیاں

چھپ گئی ہے ـــ گلیکسی پرنٹرز ـــ قیمت-/300 روپے

ملنے کا پتہ: 30-P ، ڈی بلاک ... لاہور کینٹ، لاہور

غزلیں

سید مشکور حسین یاد

O

ہمیں ملال دیا ہے کچھ اس ادا کے ساتھ
کہ لامکان کیا ہے غم زمانہ نے

غم زمانہ نے بھی ہمیں نہیں چھوڑا
شریک شان کیا ہے غم زمانہ نے

بس ایک لمحے میں کر ڈالا جو بھی کرنا ہے
کمال آن کیا ہے غم زمانہ نے

ہم اس کی خاص توجہ میں آنے والے ہیں
ہمیں نشانہ کیا ہے غم زمانہ نے

اگرچہ پھر بھی نہ ہم آ سکے بیان میں یاد
بہت بیان کیا ہے غم زمانہ نے

OOO

جلیل عالی

O

سب سے جدا یکتا ہو جائیں
یہ نہ کہیں تنہا ہو جائیں

اوروں کو خوش کرتے کرتے
جانے کیا سے کیا ہو جائیں

کیوں پیچھے بھاگے بھاگے
کھیل زمانے کا ہو جائیں

دل ہو شاد تو دنیا کے
سارے تیر خطا ہو جائیں

سر میں شر کا سودا ہو تو
دیواریں رستہ ہو جائیں

اس کے دھیان میں ساری سوچیں
سجدے قبل ادا ہو جائیں

آنکھیں تو اک اشک ندامت
پھیلیں تو دریا ہو جائیں

ریزہ ریزہ بکھرے جس جس کے
رو لیں تو صحرا ہو جائیں

کیا حاصل اتنا ہو کر بھی
کس خاطر کتنا ہو جائیں

OOO

آصف ثاقب

O

اک حقیقت میں تمہیں ہم تو بنا بیٹھے ہیں
ہم اسی لاگ سے تقدیر بنا بیٹھے ہیں

ہم بھلا اپنی شکستوں کو چھپاتے کیسے
لوگ ہر کھیل کی تصویر بنا بیٹھے ہیں

کھیلنے والوں کی مہارت پہ بڑی حیرت ہے
آپ اعراب سے تحریر بنا بیٹھے ہیں

خون پانی سے وہ بچوں میں جو رنگ بھریں
شاخساروں سے کئی تیر بنا بیٹھے ہیں

چلیے آنکھوں کی روانی پہ اتر آئیں گے
جب بھی تیر کو ہم ''دیر'' بنا بیٹھے ہیں

کچھ جاتا ہے تو کتنی کا قرینہ ہے یہاں
آئنے آپ کو ہم تیر بنا بیٹھے ہیں

ہم جو دیکھیں بڑی محبت کی نظر سے دیکھیں
اپنے اس گاؤں کو کشمیر بنا بیٹھے ہیں

یار ثاقب کی طرح اہل ہنر ہیں کتنے
اک زمانے کو دلگیر بنا بیٹھے ہیں

OOO

سید ریاض حسین زیدی

O

انکشافِ ذات کی تصویر ہے
خلعتِ مژگاں کی یہ تحریر ہے

بزم بیدار تھا شب سے دیا
جاں فشانی صبح کی تنویر ہے

انقلابات کے جواہر کھل اٹھے
کارگہ پاسباں تقدیر ہے

آنکھ محرومِ تماشا ہو تو پھر
بے بصر کو ہر کوئی تعزیر ہے

بے حس لفظوں سے بے کیفی ہوئی
بے ادب اسلوب کی تشہیر ہے

خانۂ دل میں اندھیرا ہو گیا
صورتِ حالات پھر تشہیر ہے

مفلسی نے مصلحت کی راہ لی
کاغذی پر عدل کی زنجیر ہے

اوہام انہدامِ ذات میں
منہدم ہر صورتِ تصویر ہے

ماننا لینا کارِ مشکل ہو گیا
جس علم دم شمشیر ہے

بات کہنے سے بھی عاری ہے جہاں
یہ ریاض اب آپ کی توقیر ہے

OOO

سعود عثمانی

O

سفیدی اور سیاہی کو ضم کیا گیا ہے
یہ بات الگ ہے مجھ میں قلم کیا گیا ہے

میں خود کو ڈھونڈتا کیوں تو کہیں یہ جھوٹ نہ ہو
کہیں کہیں مری مٹی کو نم کیا گیا ہے

یہ قطعہ سر ہے کوئی تیغِ معرکہ تو نہیں
یہ بار مجھ سے بہت بار کم کیا گیا ہے

چلا رہا ہوں میں پتھر سے جہاز خشکی پر
لوازمِ سفر کو پھر سے قلم کیا گیا ہے

چراغ ڈال دیا ہے کنارِ شب میں نے
بہت قلق ہوا دن تمام دم کیا گیا ہے

میں ایسے عہدِ منافق میں رہ رہا ہوں جہاں
خوشی چھپا کے جنازوں کا غم کیا گیا ہے

یہ میں جو اپنے عدو کا حلیف ہوں تو یہ غم
بہت کیا گیا ہے پھر بھی کم کیا گیا ہے

OOO

حسین مجروح

O

خوشی تھی پچھلے ماہ تو جا بجا نکل پڑے
اور یوں کہ مٹی کے نہ ماتھے پہ بل پڑے

حاجت بڑی بلا ہے اگر حوالے پہ ٹھہر کر
پاؤں ہمارے ہم سے تو جوتے ہی چل پڑے

دل پہ خیالِ یار کا احرام باندھ کر
ہم پا پیادہ حجِ دل کو نکل پڑے

دیکھی گئی نہ بھیڑ سو ہم نے اٹھا لیے
بازارِ آرزو میں تھے جتنے بھی چل پڑے

پھسلن زیست تھی ترکِ تعلق کے باغ میں
لیکن ہمارے خواب اچانک سنبھل پڑے

مجروح گھر سے نکلے تھے روزی کی چاہ میں
بیکار مل گئی تو وہیں پہ پھسل پڑے

OOO

حسن عباسی

O

ایک دو اور ایک گلاب
مٹھی بھر ہیں میرے خواب

پھول کے اندر تیرتا ہے
ہلکے پانی کا تالاب

آئینے توڑ کے رستہ نکلا
اندر چہروں کا سیلاب

ان آنکھوں کی جھیلوں تک
اڑ کر جائے آپ آب

گر گر خود ہی ٹوٹ گئی
بوتل میں تھی تیز شراب

بچے کی چنچل بجو کی
کھلتے گئے حیرت کے باب

خوشبو کی چاہت کی تتلی
پھول دعا کے ہیں شاداب

وہ چڑھی تو اور بڑھتے
عشق ہزارہ ہزارہ سراب

بیٹھے ہیں چپ چاپ حسنؔ
کہتے دریا ہی آب

OOO

مراقؔ مرزا (انڈیا)

O

نکل چکا ہوں زمیں کے تمام خانوں سے
ہے میری ذات کا رشتہ اب آسمانوں سے

یہ ارضِ خواب ہے پرواز کی ہے آزادی
کوئی کسی کو نہیں روکتا اڑانوں سے

وہ چند لوگ پہنچ پائیں گے ستاروں تک
گزر گئے ہیں جو دھرتی کے امتحانوں سے

ہمیشہ وقت یہاں ایک سا نہیں رہتا
کہ اڑ چکے ہیں ان اجڑے آشیانوں سے

حیات شہر خموشاں میں دیکھیے جا کر
ملے گی روشنی کچھ قبر کے مکانوں سے

اگا لو تم ہی کوئی چاند اس زمیں پہ مراقؔ
اجالے اترے نہ جس پر کبھی زمانوں سے

OOO

رشیدہ عیاںؔ (امریکہ)

O

سوختہ جاں، حزیں، خاک بسر آئے گا
تیرا دیوانہ اگر لوٹ کے گھر آئے گا

غسل کر کے جو لہو سے ترے گھر آئے گا
نوکِ خنجر پہ سجا کے وہ سر لائے گا

چارۂ ذوقِ منصوری ہو کہ ہو ختم امید
فیض سے مرشدِ برحق ہی پہ آئے گا

دل، تجھے نورِ ریاضت کی تمنا ہے، تو پھر
شمع کی شکل اترنے تن سے یہ سر جائے گا

گر طبیعت کی مراحل سے نہ باہر نکلا
کیسے عشقِ حقیقت، نہ نظر آئے گا

قطرہ قطرہ یہ جمع روزِ ازل سے کی ہے
جانے کوزہ الفاظ نہ بھر جائے گا

چشمِ مشتاق سے یاقوت کے موتی برسے
ما سوا تیرے نہ کچھ اور نظر آئے گا

قید کی بزم میں اٹھا جو کیا راز نیاز
مثلِ منصور کی دار اترا سر جائے گا

آتشِ عشق سے جل جائیں گے جب سارے حجاب
تب عیاںؔ جلوۂ محبوب نظر آئے گا

OOO

مرزا احمد نور طائرؔ

O

آپ سے ملنا تھا، ہوئی تھی پذیرائی بھی
کاش! ہو جاتی بہت پہلے شناسائی بھی

ساعتِ ہجر کا قبضہ ہے عجب سے جاں پر
تیری یادوں کا سہارا بھی ہے تنہائی بھی

سلسلے پیار کے جس سے رہے وابستہ وہ
میری جاں بھی ہے، جاناں بھی، ہرجائی بھی

جیتے صحرا سے پکارے ہے تجھے پیاس مری
آزمائش میں ہے اب دستِ مسیحائی بھی

عشق جب حدِ تحیّر سے گزر جاتا ہے
اس کی منزل پہ ریاضت بھی ہے رسوائی بھی

ہم بھی ان یادوں کی تقریب منا لیں طائرؔ
رقص شب زاد بھی ہے درد کی شہنائی بھی

OOO

ڈاکٹر ایوب ندیم

O

زندگی، زندگی پہ بھاری ہے
پیار کی ضرب کتنی کاری ہے

دیکھ کر اشک اس کی آنکھوں میں
کتنی بازی بھی میں نے ہاری ہے

آتے جاتا ہوں "لاری" کی طرح
وہ جو اک شخص "اختیاری" ہے

اس کو دیکھا تھا اک نظر اور بس
مجھ پہ اب تک خمار طاری ہے

مسکرا کر چھپا لیے آنسو
میں نے یوں زندگی گزاری ہے

آخرش ایوب مل گیا سورج
تیرگی روشنی پہ بھاری ہے

دل کے حجرے میں کون ہے ایوبؔ
ذکر کس کا زباں پہ جاری ہے

OOO

آفتاب خان

O

مزید رکھ نہیں سکتا سنبھال کر چلے
وہ عہدِ ماضی کے قبر سے بحال کر چلے

میں اہلِ ظرف ہوں خیرات کیسے قبول کروں
یہ جا رہا ہوں، ہوا میں اچھال کر چلے

یہ لگ رہا ہے کہ درد کی یہ اک لڑی
سڑک پہ آنے کی کانوں میں ڈال کر چلے

تمہارے سر سے غریبی کا بوجھ اترے گا
ادا سے ہاتھ کہیں سے نکال کر چلے

امیر لوگ ہواؤں میں صرف کاغذ ہیں
میں لے کے آیا تھا نے میں ڈال کر چلے

غلام ان سے معیشت کا اب چلے گا یہاں
جو بحثوں میں سجائے ابال کر چلے

جب آفتابؔ نے اپنی نظر سے کام لیا
تو رکھ دیے سبھی سکوں میں اچھال کر چلے

OOO

نیر رانی شفق

O

کہیں ہوگی کسی دن تو خوشی اپنے مکانوں میں
کبھی تو روشنی آئے گی میرے آشیانوں میں

محبت بانٹنے والوں کا یہ انجام آخر کیوں
خدایا رو گئی تنہا میں کیوں میرے جہانوں میں

مری بے خیالی گم ہر تو اس قابل نہیں یا رب
یہ کیسی روشنی ہے میرے سجدوں کے نشانوں میں

تو چاہے تو برا کر دے میرے کل تمنا کو
کبھی یکجا بھی کی میرے خدا تیرے زمانوں میں

وہ کھڑے ہیں مری خاموشیوں میں سرمدی نغمے
وہی گونجیں گے اک دن اب محبت کے ترانوں میں

اداسی درد و غم اور رقص کرتی وحشتیں ہر سو
کہاں سے آ گئے مہمان یہ میرے مکانوں میں

یہ چھپے ہیں گھر میں تو بڑا یہ عشق کے قصے
یہ عکس حسن ہے میرا کبھی کی داستانوں میں

اڑیں گے روشنی بن کر یہ میری خاک کے ذرے
ملیں گی تیرا تاباں شفق سارے زمانوں میں

OOO

اسلم سحاب ہاشمی

O

چلو غم کی ذرا حالت سنواریں
خوشی کو غم کے شیشے میں اتاریں

یہ لمحہ بے رخی پہ مشتمل ہے
چلو ماضی میں کچھ لمحے گزاریں

میں اپنی ذات کے حجرے میں تنہا
مگر قربت کی حاجت ہیں ہماریں

کوئی صحرا میں دریا گم ہوا تھا
چلو تو خال و خد اس کے نکھاریں

پگھلنے لگ پڑی ہے، برف دیکھو
مری گرمی سے پیاری آبشاریں

سحاب اس کو جو دیکھیں خواب میں بھی
بلائیں اس کی ہم، صدقے اتاریں

OOO

آسناتھ کنول

O

وہ اگر پاس وفا رکھے تو
سر پہ چاہت کی ردا رکھے تو

میں اسے سونپ دوں ساری دنیا
وہ اگر لب پہ دعا رکھے تو

دور ہی جائیں گے اندھیرے کافور
طاق الفت پہ دیا رکھے تو

کھل کے بکھریں گے رموز ہستی
تیرگی میں بھی ضیا رکھے تو

واسطہ چھوڑ دے اپنا ہجر میں
وہ نگاہوں میں حیا رکھے تو

بوجھ شبنم کا کوئی اٹھ جائے
گل پہ گر دست صبا رکھے تو

OOO

امر مہکی

O

ایسے بدلتے ہوئے دن رات سے ڈر لگتا ہے
ہر گھڑی شہر کے حالات سے ڈر لگتا ہے

دل کہیں، جاں کہیں، جسم کہیں، روح کہیں
ٹوٹ کے بکھری ہوئی ذات سے ڈر لگتا ہے

کون ہے؟ پہلے کبھی دیکھا نہیں ہے اس کو
اجنبی شخص کی حرکات سے ڈر لگتا ہے

چند لمحوں میں جو بہروپ بدل لیتے ہیں
ایسے لوگوں کے کمالات سے ڈر لگتا ہے

کیا تجھے اپنے کرم کا وہ صلہ کیا مانگیں!
مہربانوں کی عنایات سے ڈر لگتا ہے

تمہیں ملنا ہے تو ہم دن کے اجالے میں ملیں
رات کی پہلی ملاقات سے ڈر لگتا ہے

آنکھیں کہتی ہیں کہ ہے دل میں تلاطم برپا
چپ زبانوں کی شکایات سے ڈر لگتا ہے

اب کے برسی تو کبھی کچھ نہ بہا لے جائے
آگ کی رچی ہوئی برسات سے ڈر لگتا ہے

پھونک ڈالے نہ کہیں اپنا گھر ہی امرؔ
دلِ وحشی کے خیالات سے ڈر لگتا ہے

OOO

ارشد محمود ارشد

O

عدو سمجھتا ہوں جس کو اسی کا یار بھی ہوں
چھپا ہوا ہوں زمانے پہ آشکار بھی ہوں

لبادہ اوڑھ کے رکھتا ہوں میں روایت کا
خیال دشت کا اک شہر بے مہار بھی ہوں

میں اپنے آپ سے کر سکتا ہوں دغا بازی
اور ایک وصف ہے مجھ میں وفا شعار بھی ہوں

وہ ایک شخص کہ جس سے ہوں کچھ گریزاں بھی
اسی کے واسطے کچھ کچھ میں بے قرار بھی ہوں

تُو ذات کو میری تو جانتا ہے مگر
کسی کے سامنے میں سب سے پر وقار بھی ہوں

یہاں زمانے پہ اس نے مجھے یوں رکھا ہے
کہیں ہوں میں جو پیادہ تو شہسوار بھی ہوں

یہ میرا دین یہ مذہب غرور ہے ارشدؔ
عمل یہ دیکھ کے اپنے میں شرمسار بھی ہوں

OOO

وصف وفا (امریکہ)

O

کی ہے اس نے ایک گزارش شام ڈھلے
چھوٹی سی اپنی فرمائش شام ڈھلے

پھول ہیں، رقص، ساغر، ساون کی بوندیں
کتنی پیاری ہے یہ سازش شام ڈھلے

خواب، تمنا، خوشبو سے ہیں آنکھوں میں
جیسے ہو اب کوئی نمائش شام ڈھلے

رنگ فضا میں بکھرے تیرے آنے سے
برسے جیسے دھوپ میں بارش شام ڈھلے

ہاتھوں میں ہیں ہاتھ تمہارے قسمت سے
مجھ پہ رب کی ہے نوازش شام ڈھلے

مانگے آپ وہ بات وفا کی مانے نہ
چاند ستاروں کی سفارش شام ڈھلے

OOO

یاد نگاری

عاشق صبر طلب

(2013-2001)

……12……

ڈاکٹر رشید امجد

ہمارے نصاب ساز یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ جدید مضامین کی وجہ سے انہیں خارج کیا گیا ہے لیکن ہم حساب بھی پڑھتے تھے، کیمسٹری بھی اور فزکس بھی۔ فالتو مضامین تو اب مطالعہ پاکستان اور اسلامیات کی صورت میں بوجھ ہیں۔ حالانکہ مطالعہ پاکستان کو تاریخ اور لازمی اسلامیات کو اسلامیات میں ضم کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے زمانے میں بھی اسلامیات بطور لازمی مضمون دسویں تک موجود تھا۔ اصل معاملہ یہ ہے کہ ہم تاریخ اور جغرافیہ پڑھانا ہی نہیں چاہتے کہ اس سے ہمیں اپنے ماضی اور دوسروں کے ماضی کا حال معلوم ہوگا۔ ہمارے ماضی کا تصور تخیلاتی اور پدرم سلطان بود پر منحصر ہے۔ حقیقت معلوم ہوگی تو برسوں سے برسر اقتدار اشرافیہ کا بت دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گا۔ اچھے مستقبل کے لیے ماضی کی پہچان اور حال کی جدوجہد ضروری ہے۔ ہمارے پاس یہ دونوں نہیں تو پھر کیسا مستقبل؟

ادب میں کھیلوں کی طرح وکٹری سٹینڈ نہیں ہوتے کہ نمبر ایک، دو اور تین کا تعین کیا جا سکے۔ ایک عہد میں کئی بڑے لکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی نمبرنگ نہیں کی جا سکتی۔ منٹو، غلام عباس، ممتاز مفتی، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی میں سے کس کو نمبر ایک اور کس کو نمبر دو کہا جا سکتا ہے۔ یہ سب بہت اچھا لکھنے والے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اعلیٰ درجے کے افسانوں کے ساتھ بہت ہلکے افسانے بھی لکھے ہیں۔ جس طرح میر کے چھے دیوانوں میں اچھے سے اچھا اور برے سے برا شعر موجود ہے۔ ہر لکھنے والے کے یہاں اچھی بری تخلیقات موجود ہوتی ہیں۔ کسی بھی لکھنے والے کا معیاری گراف ایک جیسا نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی ایک کو دوسرے پر فوقیت دینا ذاتی پسند و ناپسند ہو سکتا ہے، ادبی معیار نہیں۔ یوں بھی کسی کے ادبی مرتبے کا تعین وقت کرتا ہے، دوست احباب نہیں۔ پوری اٹھارہویں صدی کی تنقیدی چھلنی میں سے صرف ایک شاعر میر اٹھارہویں صدی کا نمائندہ بنتا ہے۔ اسی طرح انیسویں صدی کا نمائندہ غالب ہے جس کے اثرات بیسویں صدی پر بھی ہیں۔ بیسویں صدی اقبال کی ہے۔ گویا تین صدیوں کی نمائندگی تین شاعر کرتے ہیں۔ اقبال کے بعد جن شاعروں کو اہم سمجھا جاتا ہے ان میں جوش، فیض، راشد، مجید امجد اور میرا جی ہیں۔ جوش زبان کے طمطراق اور شکوہِ الفاظ سے لذت آفرینی کی وجہ سے معنی کی دنیا سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ان کی شاعری اس پرشکوہ قلعہ کی طرح ہے جس کے اندر کوئی مکین نہیں۔ میرا جی نے ہندی روایت کو اپنا کر خود کو جزیرہ بنا لیا، وہ اردو کی رواں روایت سے کٹ گئے اور اجنبی ہو گئے۔ آخر آخر ان کے یہاں واپسی کے سفر کا آغاز ہوا لیکن عمر نے وفا نہ کی اور نئے رنگ کو کوئی مبسوط صورت اختیار کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ مجید امجد کے یہاں نیا شعور خصوصاً سائنسی انکشافات کی

وجہ سے موضوعات کی بڑی وسعت ہے۔ وہ پاکستانی اردو زبان کی بنیاد رکھنے والوں میں سے ہیں لیکن بعض جگہ ابہام اور جنسیت کے تحت نئے تجربات کا شوق انہیں بھی مرکزی دھارے سے دور لے جاتا ہے۔ اب رہ گئے فیض اور راشد۔ دونوں اردو کی مرکزی روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔ دونوں کے یہاں فارسی مزاج بھی موجود ہے۔ دونوں کے موضوعات میں بہت حد تک یکسانیت بھی ہے۔ دونوں سامراج دشمن ہیں لیکن دونوں کا فکری کینوس الگ الگ ہے۔ فیض کی سامراج دشمنی طبقاتی تضاد تک محدود ہے۔ ان کی ترقی پسندی کا مرکزی نکتہ غیر طبقاتی سماج کی تشکیل اور اس کا خواب ہے جبکہ راشد کی سامراج دشمنی مشرق و مغرب کے درمیان تضاد کی صورت ابھرتی ہے اس لیے ان کا فکری کینوس فیض سے بہت بڑا اور وسیع ہے۔ فیض کی شاعری میں کوئی بڑا فلسفیانہ سوال نہیں۔ وہ سیدھے سادے انداز میں عوامی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن ان کے پاس ایک ایسا سلیقہ ہے جو انقلاب اور رومان کا اس طرح امتزاج کرتے ہیں کہ خواص و عوام دونوں کے پسندیدہ شاعر ہیں۔ راشد ان کے برعکس زیادہ بڑے فکری شاعر ہیں ان کے سوال بھی بڑے ہیں۔ وہ بھی اردو کی مرکزی شعری روایت سے جڑے ہوئے ہیں۔ فارسی کا مزاج بھی ان کے ہاں موجود ہے، بلکہ کسی قدر ضرورت سے زیادہ بھی ہے۔ لیکن ان کے یہاں ایک معنوی ابہام ہے۔ یہ معنوی ابہام ہر بڑے ادب میں ہوتا ہے۔ غالب اور اقبال اس کی مثالیں ہیں۔ دونوں کو عام سطح پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ تو پھر راشد کے ساتھ کیا ہوا؟ ایک تو ان کی تدفین کی صورت حال، جس کی اب مکمل تردید ہو چکی ہے اور دوسرا ان کے موضوعات کی گھمبیرتا، تیسرے ان کی شخصیت کا متکبرانہ پہلو، چوتھے ان کی زندگی کے آخری دور کی "صاحبیت"، اس لیے وہ عوامی سطح پر مقبولیت حاصل نہیں کر سکے۔ پانچویں انہوں نے غزل کی بجائے نظم کو اپنایا۔ غزل جس طرح ہمارے مزاج کا حصہ ہے نظم تمام تر وسعت کے باوجود ابھی تک ہمارے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہو سکی۔ اس لیے وفات کے کافی عرصہ بعد تک نقادوں کی توجہ حاصل نہ کر سکے پھر جانے کیا ہوا کہ ان پر سیمیناروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور کئی نامور نقادوں کی ان پر کتابیں بھی آگے پیچھے آ گئیں۔ اس میں ایک بڑا کردار ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری کا ہے۔ انہوں نے راشد پر پی ایچ ڈی کی تھی۔ گذشتہ دو ایک برسوں میں ان کی مختلف حوالوں سے راشد پر تین چار کتابیں آ چکی ہیں تو یہ سلسلہ شروع ہو گیا۔ فیض کو اشرافیہ اور ترقی پسند تحریک کے دوستوں کی اتنی حمایت حاصل ہے کہ جب راشد پر تواتر سے سیمیناروں کا سلسلہ شروع ہوا اور ان کے کلام پر کئی عمدہ تنقیدی کتابیں آ گئیں اور یہ سلسلہ جاری ہے تو فیض کے دوستوں نے محسوس کیا کہ راشد کو فیض پر ترجیح دی جا رہی ہے۔ چنانچہ انہوں نے حکومت وقت سے کہہ کر دو ہزار گیارہ کو فیض کا سال قرار دے دیا اور یہاں تک کہ ایوان صدر میں فیض کی تقریب منعقد کی۔ سال منوانے اور ایوان صدر میں تقاریب سے کسی کو چھوٹا یا بڑا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ صرف اور صرف وقت ہے جو اس طرح کے فیصلے کرتا ہے۔ یوں بھی بیسویں صدی کا نمائندہ شاعر اقبال ہے، اسی طرح جیسے اٹھارہویں صدی کا میر اور انیسویں صدی کا غالب نمائندہ ہے۔ بلکہ غالب تو بیسویں صدی پر بھی اپنے فنی اور فکری اثرات رکھتے ہیں، خود فیض ان سے متاثر ہیں۔ سودا کے علاوہ فیض پر جس شخص کے سب سے زیادہ اثرات ہیں وہ غالب ہیں۔ یوں بھی یہ سارے شاعر، بشمول فیض، راشد، مجید امجد، میرا جی اور جوش، اقبال کی صدی کے شاعر ہیں۔ اب رہا یہ کہ اقبال کے بعد کس شاعر کو زیادہ اہم سمجھا جا سکتا ہے تو میرے خیال میں وہ راشد ہیں۔ جی سی یونیورسٹی لاہور کے راشد سیمینار میں اپنے صدارتی کلمات میں میں نے جب یہی بات کی تو کئی دوستوں نے برا منایا۔ تقریب کے اختتام پر ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری نے میرے کان میں کہا! "شکر کریں فیض پسندوں نے آپ کا کان دھر لیا ورنہ مجھے تو ڈر تھا کہ آپ کی اس بات پر ہنگامہ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا: "میں ان کا شکر گزار ہوں لیکن میری بات کسی ذاتی تعصب کی بنیاد پر نہیں۔ میں نے تو جو محسوس کیا اس کا اظہار کر دیا۔ میں غلط بھی ہو سکتا ہوں۔"

⦿

میرے ہم عصر افسانہ نگار دوستوں کو بھی یہ ہوکا لگا ہوا ہے کہ وہ اس عہد کے سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں اور انہیں وکٹری سٹینڈ پر کھڑا کر کے سونے کا میڈل پہنایا جائے۔ اس کے لیے وہ طرح طرح کے جتن کرتے ہیں، گروپ بندیاں کرتے ہیں، مذاکرے کرتے ہیں، لیکن انہیں اس کا احساس نہیں کہ ایک عہد کے سارے اچھے لکھنے والے ایک جیسے ہوتے ہیں، آگے پیچھے ان میں سے کسی کو ایک نمبر یا دو نمبر نہیں کہا جا سکتا۔ اسی طرح جیسے ہمارے سینئرز میں منٹو، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، عصمت چغتائی اور راجندر سنگھ بیدی وغیرہ میں سے کسی کی نمبر تک نہیں کی جا سکتی ہے اور پھر ہم سے ذرا پہلے تو قرۃ العین حیدر جیسی بہت بڑی لکھنے والی اپنے تمام فکری اور فنی کمالات کے ساتھ موجود ہے۔ یہ تو سامنے کی صورت ہے، پھر ہم کیا اور ہماری اوقات کیا؟

⦿

پاکستان میں جمہوری ادوار کا دورانیہ دو سے چار اور مارشل لائی حکومتوں کا دس سال کے لگ بھگ ہوتا ہے۔ اس کے بعد جونہی صورت حال خراب ہونے لگتی ہے، چہرہ بدل دیا جاتا ہے۔ ہر حکمران امریکی مفادات کا ایجنڈا پورا کرتا ہے۔ لیکن بعد میں حالات کے زیر اثر اور عوامی دباؤ پر کچھ امریکی مخالف اقدام کرتا ہے اور رخصت کر دیا جاتا ہے۔ مشرف دور کا آغاز بھی حسب معمول خوش آئند وعدوں سے ہوا لیکن اقتدار کی طوالت کے شوق نے انہیں بھی وہی ہتھکنڈے استعمال کرنے پر مجبور کر دیا جو ہر حکمران کرتا ہے۔ ان کے اقتدار میں پہلی بڑی دراڑ اس وقت پڑی جب چیف جسٹس کو رخصت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کا ردعمل آہستہ آہستہ ایک بڑی عوامی تحریک میں بدل گیا۔ وہ لانگ مارچوں اور دھرنوں کے بعد عدلیہ بحال ہو گئی۔ اگر کوئی مخلص عوامی جماعت یا لیڈر ہوتا تو یہ تحریک ایک بڑے انقلاب کی بنیاد بن سکتی تھی، لیکن یہ بھی چہروں تک ہی محدود رہی۔

آزاد عدلیہ کی یہ تحریک جو ایک بڑے انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی تھی، چند لوگوں کی بحالی تک محدود ہو گئی۔ پاکستان میں جب بھی کوئی ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو خفیہ ہاتھ اس کے نتائج کو بدل دیتے ہیں۔ 1957ء میں جب قیوم خان کے جھنڈے تلے عوام جمع ہونے لگے تو 1958ء کا مارشل لا آ گیا۔ 1968ء کی تحریک کے نتیجے میں بھٹو اقتدار میں تو آ گئے لیکن صرف آٹھ ماہ بعد ہی جب ابھی نوے ہزار فوجی بھارت کی قید میں تھے، بلوچی قومی بغاوت ہوئی جو اگرچہ ناکام ہو گئی لیکن بھٹو جیسے شخص کے ہاتھ بھی بندھے رہے۔ یہ اور بات کہ ان کی بڑی شخصیت نے اس صورت حال میں بھی کچھ گنجائش نکال لی۔ 1977ء کی تحریک تو تھی ہی عوام دشمن کہ اس کے بعد ضیاء جیسا شخص اقتدار میں آیا۔ اس بار بھی یہی ہوا۔ اتنی بڑی تحریک چند لوگوں کی بحالی کی تحریک بن گئی۔ آزاد عدلیہ وجود میں آ گئی۔ اس آزاد عدلیہ نے نظام بدلنے والے احکامات تو نہیں دیے، البتہ بدعنوانیوں کے معاملات ضرور سامنے آئے لیکن عدلیہ کے فیصلوں پر نیم دلی سے عمل ہوا۔ چرچا زیادہ ہوا، نتیجہ کم نکلا۔ عدلیہ کی اس تحریک میں جو لوگ پیش پیش تھے، جو پیچھے تھے، سب اسی پرانے نظام کا حصہ تھے۔ سو آزاد عدلیہ کا بہت بڑا بورڈ ضرور آویزاں ہوا لیکن ایک عام آدمی کے حالات اسی طرح رہے۔ ڈاکٹر نوازش علی نے ایک بار کہا تھا: "حکومتی اقدامات کے نتیجے میں

اگر عام آدمی کے بجٹ میں سو روپے کا فرق بھی پڑ جائے تو ہم اسے مثبت کہیں گے ورنہ سب لفاظی ہے۔'' آزاد عدلیہ کے دعوے دار اس بات کا جواب دینے سے قاصر ہیں کہ اس تحریک کے نتیجے میں جو لوگ بحال ہوئے ہیں، ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد کیا ایسے ہی لوگ ان کی جگہ لیں گے۔ یہ تو افراد کا معاملہ ہے، نظام تو نہیں بدلا۔ ان قد آور لوگوں کی جگہ پہلے جیسے لوگوں کے آنے کو کون روک سکتا ہے۔ مجموعی طور پر نچلی سطح پر پاکستان کا عدالتی نظام کس سطح پر پہنچ گیا ہے، اس کے بارے میں ڈاکٹر عزیز ابن الحسن نے ایک لطیفہ سنایا کہ ایک کیس میں دلائل دیتے ہوئے وکیل نے جج سے کہا، جناب عالی! میں نے دلائل مکمل کر لیے ہیں، اس سلسلے میں مزید دلائل مثل کے صفحہ نمبر 342 پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اور کتاب جج صاحب کی طرف بڑھا دی۔ انھوں نے متعلقہ صفحہ کھولا۔ وہاں پانچ پانچ ہزار کے پانچ نوٹ پڑے تھے۔ جج نے سنجیدگی میں سر ہلایا اور کہا، دلائل ٹھیک ہیں لیکن اس طرح کے چھ اور دلائل بھی ہو جائیں تو مناسب ہے۔ یہ لطیفہ ایک طنز ہی نہیں، ہماری صورت حال کا بھرپور تجزیہ ہے۔ اس طرح کے دلائل ہر سرکاری دفتر میں اب سے مضبوط دلائل مانے جاتے ہیں۔

⊙

اچھا لباس اور اچھا کھانا ہمیشہ میری ترجیح رہے ہیں لیکن رنگوں کے ملاپ یعنی کلر میچنگ کا مجھے سلیقہ نہیں۔ اکثر رخسانہ ہی میرے کپڑے صبح غسل خانے کے باہر رکھ دیتی ہے۔ اگر کبھی وہ ادھر ادھر ہو اور میں کوئی بے ڈھنگا کلر میچنگ پہن لوں تو وہ ٹوک دیتی ہے اور اصرار کر کے پینٹ کے ساتھ کی شرٹ پہننے پر مجبور کرتی ہے بلکہ الماری میں سے شرٹ نکال کر ناشتہ کرتے ہوئے میرے سر پر سوار ہو جاتی ہے۔ ملتان کے زمانے کی بات ہے، رخسانہ کی طبیعت خراب تھی، اس لیے میں نے اسے جگایا نہیں۔ لہٰذا شلوار قمیص پہن لی اور ناشتہ کر کے یونیورسٹی چلا گیا۔ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے پاس پہنچا تو ڈاکٹر روبینہ شہناز اور ایک رفیق کار بشریٰ عباس سامنے سے آ رہی تھیں۔ روبینہ نے دیکھتے ہی کہا کہ ''ڈاکٹر صاحب! آج بھابھی گھر پر نہیں تھیں؟'' میں نے پوچھا ''کیا مطلب؟'' کہنے لگیں، ''آپ نے دو مختلف رنگوں کی شلوار قمیص پہن رکھی ہے۔'' اب جو دیکھا تو واقعی شلوار اور قمیص الگ الگ رنگوں کی تھی۔ اس دن متحدہ امارات سے ایک وفد نے آنا تھا اور گیارہ بجے ملاقات طے تھی۔ میں نے کہا، ''اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں گھر جا کر تو وقت پر واپس نہیں آ سکتا۔'' بشریٰ عباس بولیں، ''لیکن یہ تو ٹھیک نہیں۔'' میں نے کہا، ''اب کیا ہو سکتا ہے!'' یہ کہہ کر میں اپنے دفتر چلا گیا۔ بشریٰ عباس بہت ہی نفیس خاتون ہیں۔ ان کے شوہر محمد عباس ہمارے ڈائریکٹر لائبریری ہیں۔ بشریٰ عباس نے میری نگرانی میں ایم فل کا مقالہ لکھا تھا، اب پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھ رہی ہیں۔ تھوڑی دیر بعد وفد سے میٹنگ کی فائل منگوانے کے لیے روبینہ کو بلوایا تو معلوم ہوا کہ وہ اور بشریٰ یونیورسٹی سے باہر گئی ہیں۔ مجھے تعجب ہوا کہ بتائے بغیر چلی گئی ہیں اور ابھی میٹنگ کے سلسلے میں کئی باتیں طے کرنا تھیں۔ کوئی گھنٹہ بھر بعد دیکھا تو دونوں چلی آ رہی ہیں۔ روبینہ کے ہاتھ میں شاپنگ بیگ ہے۔ کہنے لگیں، ''میں اور بشریٰ آپ کا سوٹ لینے گئی تھیں۔ صبح صبح دکانیں کھلی ہی نہیں۔ ایک دکان کھل رہی تھی، ہم سفید رنگ کا جوڑا لے آئی ہیں، آپ واش روم میں جا کر جلدی سے بدل لیں۔''

اس طرح کی محبتوں کا مظاہرہ ملتان میں اکثر ہوتا رہتا تھا۔ میں نے یہ ماحول بنانے میں بڑی محنت کی تھی اور اس سلسلے میں میرے آئیڈیل ڈاکٹر انوار احمد تھے، جنھوں نے زکریا یونیورسٹی، ملتان کے شعبۂ اردو میں ایسا ہی ماحول پیدا کیا تھا، جو ان کے ریٹائر ہونے اور جاپان جانے تک موجود رہا۔

⊛

ہمارے تعلیمی اداروں میں جہاں مخلوط تعلیم ہے اب ماحول بہت خراب ہوتا جا رہا ہے۔ ''جنسی ہراس'' کے قصے زبان زدِ عام ہیں۔ ان میں کچھ قصور ایسی خواتین کا بھی ہے جو اپنی ترقی یا نمبروں کے لیے مرد اساتذہ کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں اور مرد اساتذہ میں بھی ایسے لوگ کم نہیں جو اپنی خراب تربیت کی وجہ سے ساتھی خواتین اور طالبات کو بلیک میل کرتے ہیں۔ چند ہی دن پہلے کسی نے بتایا کہ لاہور کی ایک درس گاہ میں صدر شعبہ نے ایک کنٹریکٹ استاد کو اپنے کمرے میں بلا کر دروازہ بند کر لیا۔ خاتون نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہیں تو صدر شعبہ نے جواب دیا ''تم چھ ماہ کے کنٹریکٹ پر ہو جو اب ختم ہونے والا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس کی تجدید ہو جائے۔''

سرسید کالج کے زمانے میں انتظامت میں ایک ایسے ڈپٹی آ گئے جو عورتوں کے رسیا تھے۔ ایک خواتین کالج کی پرنسپل جو خود کو ترقی پسند کہلوانے میں فخر محسوس کرتی تھیں اور ان کے شوہر بھی ایک مشہور کمیونسٹ سمجھے جاتے تھے، ان ڈپٹی صاحب کو کالج میں بلواتیں اور کسی کنٹریکٹ والی استاد کو ان کے ساتھ اپنے دفتر کے پچھلے کمرے میں بھجوا دیتیں۔ ایک خاتون جانے کو تیار نہیں تھیں انھوں نے دھکا دے کر اسے کمرے میں دھکیلا اور دروازہ بند کر دیا۔

نمل میں اس طرح کا ماحول نہیں تھا اور اس کا سہرا ڈاکٹر عزیز احمد خاں کے سر تھا، جو کہتے تھے ہم بھی مرد ہیں اور جذبات رکھتے ہیں لیکن ہمارا پیشہ ہمیں بہت سے کام کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ پیغمبروں کا پیشہ ہے اور اپنا ایک تقدس رکھتا ہے۔ لیکن جیسا میں نے کہا، مخلوط تعلیمی اداروں میں یہ وبا اب عام ہے۔ تعلیمی ادارے کیا، جہاں بھی خواتین مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں وہاں مرد انھیں ہراساں کرنے میں ذرا نہیں چوکتے۔ جامعات میں تو اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اورینٹل کالج کے ابتدائی دور میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے کلاس روم میں پردہ لگوایا ہوا تھا جس کے ایک طرف لڑکے اور دوسری طرف لڑکیاں بیٹھتی تھیں۔ اس ساری احتیاط کے باوجود خود اساتذہ لڑکیوں کی بجائے ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے تھے۔ سنا ہے اسی زمانے میں ایک بہت ہی خوبصورت خاتون کے مقالے کا نگران بننے کی خواہش میں ہمارے یہ بزرگ ایک دوسرے سے لڑ پڑے تھے۔

خود کو عقلِ کل سمجھنے والے ہمارے صاحبانِ عالیشان بعض اوقات ایسی باتیں کرتے ہیں کہ وہ لطیفے بن جاتی ہیں۔ جب میں واہ میں تھا تو ایک بار وہاں کے چیئرمین کالج کے دورے پر آئے اور میری کلاس میں آ گئے۔ میں میر پڑھا رہا تھا۔ بولے ''آپ اردو میں پڑھا رہے ہیں؟'' میں نے کہا ''اردو تو اردو ہی میں پڑھائی جائے گی۔'' انھیں میری بات سمجھ نہ آئی۔ چند لمحوں بعد جب انھیں احساس ہوا تو ان کا موڈ خراب ہو گیا اور وہ دورہ ادھورا چھوڑ کر چلے گئے۔

سرسید کالج میں ایک بار راولپنڈی کے کور کمانڈر آئے اور کہا کہ کوئی ایسا طریقہ اپنائیں کہ سارے پاکستان کے کالجوں میں ایک وقت میں ایک ہی موضوع پڑھایا جا رہا ہو۔ انھیں بتایا گیا کہ یہ ممکن نہیں تو ناراض ہو گئے۔ نمل کے زمانے میں فوزیہ اسلم کا ڈیفنس ہو رہا تھا۔ اتفاق سے ایک ٹیم معائنے کے لیے آئی ہوئی تھی، عزیز احمد خاں نے انھیں بھی بلا لیا۔ مقالے کا موضوع تھا ''اردو افسانے میں ہیئت و تکنیک کے تجربات''۔ سوال جواب ہو رہے تھے اور ڈیفنس ختم ہونے والا تھا کہ عزیز احمد خاں نے ٹیم کے سربراہ کو، جو ایک جرنیل تھے، کہا کہ ''آپ بھی کوئی سوال کرنا چاہتے ہیں تو کیجیے۔'' جرنیل صاحب نے کہا ''آج کے اخبار میں چھپا ہے کہ پاکستان ایک ناکام ریاست ہے۔ میں مقالہ نگار سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اپنے مقالے میں اس پر بھی کوئی روشنی ڈالی ہے؟'' ڈاکٹر سہیل عباس نے بتایا کہ ان کے

مقالے "اردو میں اصلاحِ سخن کی روایت" کے بارے میں اس وقت کے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے، جو ایک جرنیل تھے، پوچھا، "اصلاحِ سخن پر تو آپ نے بات کی ہے، کیا اصلاحِ معاشرہ پر بھی کوئی تبصرہ کیا گیا ہے؟" اس طرح کی صورتِ حال جامعات کے ایڈوانس اسٹڈیز کے بورڈ میں بھی پیش آتی ہیں جہاں اصل مضمون کا تو ایک شخص ہوتا ہے دیگر لوگ مختلف مضامین سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک بار ایسے ہی ایک صاحب نے کہا: "یہ کلامِ راسخ کا تجزیہ کیا موضوع ہے۔ یہ تو نام ہی غلط ہے، کلام راسخ کیا ہوتا ہے؟" انھیں بتایا گیا کہ یہ ناول کا نام ہے۔ انھوں نے کہا: "بے شک ہو لیکن ہے تو غلط۔" مجھے یاد آیا برسوں پہلے جب میں نے حلقہ اربابِ ذوق کے ایک اجلاس میں اپنا افسانہ "بے دار آدم کے بیٹے" پیش کیا تو ایک خاتون بولیں: "یہ تو نام ہی غلط ہے، اسے آدم کے بیدار بیٹے ہونا چاہیے۔"

میں ایک بار ایک کالج میں مہمانِ خصوصی کے طور پر گیا۔ اس کے پرنسپل ایک ریٹائرڈ بریگیڈیئر تھے۔ جلسہ ختم ہوا تو چائے پیتے ہوئے انھوں نے مجھ سے پوچھا: "پروفیسر صاحب! ہمارا تعلیمی نظام اس طرح زوال پذیر کیوں ہے؟" مجھے ان کے بارے میں معلوم نہیں تھا کہ ان کا تعلق کس کور سے ہے۔ میں نے کہا: "جب توپ چلانے والے تعلیمی اداروں کو چلائیں گے تو یہی حال ہوگا۔" یکدم ان کا موڈ بگڑ گیا اور وہ کچھ کہے بغیر دوسری طرف چلے گئے۔ بعد میں ایک اور نے مجھے کہا: "آپ بھی کمال کرتے ہیں!" میں نے پوچھا: "کیا ہوا؟" بولے، "ان کا تعلق توپ خانے سے ہے۔"

◉

ایچ ای سی نے اگرچہ کئی ایسے اقدامات اٹھائے ہیں جن کی وجہ سے اساتذہ کچھ کام کرنے اور مطالعہ کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں لیکن ابھی یہ حال ہے کہ اساتذہ کی اکثریت اپنے انھی نوٹس پر اکتفا کرتی ہے جو انھیں ان کے اساتذہ لکھایا کرتے تھے۔ ایم اے کرنے کے بعد انھوں نے اپنے مضمون پر کوئی کتاب پڑھنے کی زحمت نہیں کی۔ ڈاکٹر انوار احمد نے، جب وہ زکریا یونیورسٹی میں صدر شعبہ اور بطور ڈین تھے، ایک مہم بنائی تھی کہ ایم اے اور ایم فل / پی ایچ ڈی کے تمام طلبہ کو دس دس کتابیں الاٹ کر دیتے تھے کہ وہ اپنے کورس ورک کے دوران ان پر جامع تبصرے لکھیں۔ یہی تبصرے ان کی اسائنمنٹس شمار ہوں گی۔ اس بہانے ہر طالب علم کم از کم دس کتابیں پڑھ لیتا تھا۔ میں نے [illegible] میں یہ طریقہ رائج کرنے کی پوری کوشش کی اور مجھے ڈاکٹر عزیز احمد خان کی تائید بھی حاصل تھی لیکن اساتذہ نے اسے ناکام بنا دیا کہ اس طرح انھیں خود بھی کتابیں پڑھنا پڑتی تھیں۔ ڈاکٹر انوار احمد ایک متحرک شخصیت ہیں۔ ان کی خوبی یہ نہیں کہ ہر وقت کام کرتے رہتے ہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ جوہر شناس ہیں اور اپنے ساتھیوں میں بھی کام کرنے کا جذبہ اور رویہ پیدا کر دیتے ہیں۔ زکریا یونیورسٹی میں بھی ان کی ٹیم تھی اور جی سی یونیورسٹی فیصل آباد میں بھی انھوں نے اسی طرح کی ٹیم بنائی تھی۔ اب وہ مقتدرہ قومی زبان کے چیئرمین بن کر آئے ہیں تو آتے ہی انھوں نے ایسی ٹیم بنانے کا کام شروع کر دیا ہے، جس کا پہلا اظہار مقتدرہ قومی زبان کی ویب سائٹ کا بننا ہے۔ جس کے لیے محبوب گیلانی، منصور رشید اور ڈاکٹر سہیل عباس نے رات دن ایک کر کے چند ہی روز میں اس کا افتتاح کر دیا ہے۔ ان حضرات نے یہ کام صرف خلوص کی بنیاد پر کیا ہے اور کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ محبوب گیلانی کو تیرہ مہینے پہلے مقتدرہ سے فارغ کر دیا گیا تھا اور ڈاکٹر سہیل عباس کی ڈیپوٹیشن ختم کر دی گئی لیکن ڈاکٹر انوار احمد کی محبت نے ان سے بھرپور کام لے لیا۔

◉

اسلام کا نام لینے والوں کا تصورِ اسلام قبائلیت اور ملوکیت کی پیداوار معاشروں تک محدود ہے۔ یہ لوگ اسلام کی پابندیوں کا ذکر

تو زور و شور سے کرتے ہیں۔ رسومات اور عبادات پر زور دیتے ہیں لیکن اسلام کی برکات، وسعت قلبی، احترام انسانیت اور مساوات کی بات نہیں کرتے۔ ضیاء کے دور میں جب نصاب کو اسلامی بنانے کا کام شروع ہوا تو ایسی ایسی مضحکہ خیز صورتیں پیدا ہوئیں کہ اب وہ لطیفے بن گئی ہیں۔ غلام جیلانی اصغر نے بتایا کہ انہیں وفاقی وزارت تعلیم کی طرف سے فون آیا کہ اس سلسلے کا ایک اجلاس ہو رہا ہے وہ اس میں شرکت کریں۔ جب وہ اسلام آباد پہنچے تو انہیں بتایا گیا کہ دوسرے دن صبح سب نے خانس پور جانا ہے جہاں شام تک نصاب کو اسلامی بنانے کا کام ہوگا اور رات کو سرکاری ضیافت ہے۔ دوسرے بہت سے اساتذہ کے ساتھ جیلانی صاحب خانس پور پہنچے۔ ہال میں ایک لمبی میز پر درسی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ کہا گیا کہ ان کے کمرے مخصوص ہیں، وہ جتنی کتابیں چار بجے تک دیکھ سکتے ہیں اٹھالیں اور اپنے کمروں میں جا کر انہیں اسلامی قالب میں ڈھال دیں۔ جیلانی صاحب نے دو کتابیں اٹھالیں۔ ایک شخص رجسٹر میں اندراج کر رہا تھا، انہوں نے اندراج کرایا اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ بتانے لگے کہ چار بجے تک میں بمشکل انہیں پڑھ سکا اور جہاں جہاں ضروری تھا نشاندہی کر دی۔ چار بجے جب سب چائے کے لیے ہال میں جمع ہوئے تو ایک شخص نے کتابیں اکٹھی کیں اور سب کو چیک دیے۔ جب اسلام آباد واپسی کے لیے بس روانہ ہوئی تو راستے میں ان کے ساتھ بیٹھے ایک شخص نے پوچھا ”آپ کا چیک کتنے کا ہے؟“ جیلانی صاحب نے بتایا تو وہ شخص بولا ”اتنا کم! آپ نے کتنی کتابیں دیکھی ہیں؟“ جیلانی صاحب نے کہا ”دو، وہ بھی بڑی مشکل سے۔“ وہ شخص بولا ”میں تو دس کتابیں لے گیا تھا۔“ جیلانی صاحب نے حیرت سے پوچھا ”اتنے کم عرصے میں آپ نے دس کتابیں دیکھ لیں؟“ وہ شخص بولا ”اس میں کیا دیکھنا تھا۔ بس جہاں گڈ مارننگ تھا وہاں السلام علیکم کر دیا۔ جہاں بائی بائی تھا وہاں خدا حافظ لکھ دیا اور کیا کرنا تھا!“

ڈاکٹر انوار احمد نے بتایا کہ انہوں نے اسی طرح کی اسلامائزیشن کی ایک رپورٹ دیکھی ہے جس میں ریویو کرنے والے نے لکھا تھا کہ حساب کی ایک کتاب میں درج ہے: ”نفیسہ کے پاس چار پنسلیں ہیں، رضیہ کے پاس تین پنسلیں ہیں، بتائیں پنسلوں کی کل تعداد کتنی ہوئی؟“ اس پر ریویو کرنے والے صاحب نے لکھا کہ کلاس میں لڑکے بھی ہوتے ہیں ان کے سامنے لڑکیوں کے نام لینا نامحرم کے سامنے نام لینے کے مترادف ہے اس لیے لڑکیوں کے ناموں کی بجائے ایک لڑکی اور دوسری لڑکی کر دیا جائے۔

ضیاء کی اسلامائزیشن اسی طرح کی تھی۔ یاروں نے لمبا مال کمایا، لیکن بعد میں یہ صورت حال بدتر ہوتی گئی۔ اب صورت یہ ہے کہ مولوی عبدالحق کے خاکے ”نام دیو مالی“ کی آخری دو سطریں نصابی کتب سے حذف کر دی گئی ہیں، کیونکہ ان میں لکھا تھا کہ نام دیو مالی بھی جنت میں جا سکتا ہے۔ بلوچستان کے نصاب سے مرثیہ نکال دیا گیا ہے۔ لوک کہانیوں تک میں ترامیم کر دی گئی ہیں۔ جو قوم اپنے ماضی کے ورثے کو اپنانے کے لیے تیار نہیں اور اسے غیر اسلامی سمجھتی ہے اس سے زیادہ بدنصیب قوم کون ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری کوئی لسانی اور ثقافتی پالیسی نہیں اور ہماری کوئی پہچان نہیں۔ ہم بے چہرہ، بے نام لوگ ہیں جو اپنے آباؤ اجداد پر بھی تنقید کرتے ہیں، انہیں برا اور کافر کہتے ہیں۔

ضیاء دور میں سنسر تھا، ہر اخبار اور رسالے کو اشاعت سے پہلے مواد سنسر کرانا پڑتا تھا۔ اس سلسلے میں بھی جو کچھ ہوتا تھا وہ بھی لطیفوں سے کم نہیں۔ ایک جریدے کا مواد جب سنسر شپ کے لیے پیش کیا گیا تو سنسر افسر نے ایک کہانی کے بارے میں کہا: ”کہانی تو بالکل ٹھیک ہے لیکن یہ جملہ کہ ’وہ ننگے پاؤں کمرے میں داخل ہوگئی‘ قابل اعتراض ہے۔ اس میں سے ننگے کا لفظ نکال دیں۔“

(جاری ہے)

◆◆◆

یاور حیات، تجھے ہم کس پھول کا کفن دیں

مستنصر حسین تارڑ

بالآخر بیچارگو بے وجہ قرار آ گیا۔ یاور حیات مر گیا۔ مجھے بھی قرار آ گیا کہ میں بہت دنوں سے اس کی موت کا منتظر تھا۔ ٹیلی ویژن ڈرامہ کا آخری ستون بھی ڈھے گیا اور اچھا ہوا کہ اب ہم اس کے کھنڈروں میں کھڑے ہو کر ٹیلی ویژن کے سنہری دور کا جی بھر کے ماتم کر سکتے ہیں۔ اچھا اس لیے بھی ہوا کہ وہ ایک مدت سے فراموش شدہ اور گمنام حالت میں بیمار پڑا تھا۔ سسک سسک کر مر رہا تھا اور کسی نے اس کی خبر نہ لی۔ ٹیلی ویژن بیوروکریسی کے اصطبل میں بندھے درجنوں ہاتھی اپنے عالی شان دفتروں میں لاکھوں روپے عوامی خزانے سے ہڑپ کرتے ہوئے اور ان کے سردار سرکار کے دربار سے مراعات شدہ گدھے اور ٹٹو جن میں سے بیشتر ٹیلی ویژن کے ہجے بھی درست طور پر نہیں کر سکتے مسلسل ہنہنا رہے ہیں اور انہیں کچھ خبر نہ تھی کہ ٹیلی ویژن کا آخری شہزادہ یاور حیات جس نے ایک ڈاکومنٹری میں شاہ جہان کا کردار ادا کیا تھا جو فرانس کے کین فلم فیسٹیول میں نمائش کی گئی تھی اور دیکھنے والوں کا کہنا تھا یہ والا شاہ جہان تو ممتاز محل والے شاہ جہان سے کہیں بڑھ کر خوش شکل اور دل نشین ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ اس شاہ جہان نے ٹیلی ویژن کے لیے متعدد تاج محل تخلیق کیے۔ میں اس کی موت کا اس لیے بھی منتظر تھا کہ جیسے وہ سسک سسک کر مر رہا تھا ایسے میری اس دور کی یادیں بھی سسک رہی تھیں۔ شکر ہے وہ مر گیا اور یوں مجھے بھی قرار آ گیا کہ میری سسکتی ہوئی یادوں نے بھی دم توڑ دیا۔ ان دونوں کو یاور اور میری یادوں کو ایک گہری قبر میں دفن کر دو تاکہ ٹیلی ویژن پر یہ احسان اس مردہ گھوڑے کے ماس پر پلنے والے مجاور بھی اس کے جنازے میں شریک ہوں۔ اس کے بارے میں تعریفی بیان دیں اور پھر کسی نائب سے پوچھیں کہ یہ یاور حیات آخر تھا کون۔ یہ تو کبھی مجھ سے ملنے کے لیے ہیڈکوارٹر نہیں آیا کرتا تھا تو میں اس کی کچھ مدد کر دیتا۔ یہ لوگ جب بیمار پڑتے ہیں تو کیوں گھسٹتے ہوئے ہمارے در پر آ کر مدد کی فریاد نہیں کرتے۔ ابھی ہمیں اطلاع کریں گے تو ہم ان کے لیے دوا دارو کا بندوبست کریں گے ہاں۔ ہمیں الہام تو نہیں ہوتا کہ وہ سسک سسک کر مر رہے ہیں۔ بھلا کوئی شاہ جہان بھی کاسہ لیس درباریوں سے فریاد کرتا ہے۔

پاکستان کا ہر وہ شخص جو بجلی کا ایک بلب بھی جلاتا ہے اسے بجلی کے بل کے ساتھ ٹیلی ویژن کے لیے پینتیس روپے کا ایک جگا ٹیکس مجبوراً ادا کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ یہ ایک قومیت کا جگا ہے جو مسلمانوں پر نافذ کر دیا گیا ہے اور اس کے عوض آپ کو کیا ملتا ہے۔ ایک بد رنگ ٹیلی ویژن سکرین۔ عجیب گناہوں سے ڈھلکے ہوئے مردہ چہرے۔ ہمہ وقت حزب مخالف کی ہجو کرنے والے غیر معروف صحافی اور ایسے ڈرامے جنہیں دیکھنے سے ابکائی آتی ہے لیکن یہ جگا ٹیکس ہیڈکوارٹرز اور تمام سٹیشنوں پر بیکار بیٹھے ڈائریکٹر حضرات اور پروڈیوسر صاحبان کے پیٹ بھرتا ہے۔ اور وہ نہیں جانتے کہ ٹیلی ویژن کے جس کھنڈر پر وہ دربار سجائے بیٹھے ہیں اس میں سینکڑوں اداکاروں، موسیقاروں، پروڈیوسروں، میک اپ کرنے والوں، حالات حاضرہ پر معتدل تبصرہ کرنے والوں، اور ڈرامہ نگاروں کا لہو ہے۔ یہ ان کی جدوجہد اور تخلیقی

کاوشوں سے تعمیر کردہ ایک تاج محل تھا جو ڈھے چکا ہے۔ اور اب اس کھنڈر میں بھانت بھانت کے خوشامدی الو بولتے ہیں۔ محمد نثار حسین، خواجہ نثار حسین، نصرت ٹھاکر، مصلح الدین، ریاض الحق، شہزاد خلیل، شعیب منصور، اقبال انصاری، ایوب خاور، خالد محمود زیدی، کنور علی شاہ اور درجنوں نابغۂ روزگار لوگوں کی وقف کردہ زندگیاں ہیں۔ —— میرا گمان ہے کہ ہر شب اس بربادے اس ویرانے اس کھنڈر میں، جمیل فخری، طاہرہ نقوی، سلیم ناصر، عظمیٰ گیلانی، شفیع محمد، لاشاری، خالدہ ریاست، مغل سبحان، آفتاب احمد، اسماعیل شاہ، محمد یوسف، محمود علی، طاہرہ واسطی، خیام سرحدی اور ایسے بہت سے بے مثال اداکاروں کی روحیں بھٹکتی ہیں۔ اور اب ان میں یاور حیات کی روح بھی شامل ہو گئی ہے جو ان سے کہتی ہوگی ”جمن جی —— میں تم سب کے بغیر بہت تنہا رہ گیا تھا۔ آؤ ملا کے ان اندھیروں میں ایک ڈرامہ گئے وقتوں کی یاد میں تخلیق کرتے ہیں۔ یا پھر کچھ انتظار کرتے ہیں اگرچہ انتظار بھی یہاں ہیں پہ تارڑ کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ بھی آنے والا ہوگا —— جیسے اس نے میرے لیے ٹیلی ویژن کا پہلا ڈرامہ سیریل ”پرواز“ لکھا تھا اس سے ایک اور ڈرامہ ”قافی وادی“ ہم کا لکھوائیں گے —— جمن جی کچھ انتظار کر لیتے ہیں“۔ پس منظر موسیقی کے لیے میاں شہریار جو موجود ہیں“۔ —— ٹیلی ویژن کی چار شہزادیوں میں سے ایک طاہرہ نقوی جس کے حسن کے چرچے تھے اور دوسری خالدہ ریاست میں سے ہیروئن کے لیے کس کا انتخاب کریں۔ عظمیٰ گیلانی نے کینسر کو شکست دے دی ہے اس کے آنے میں ابھی کچھ دیر ہے لیکن جمن جی وہ جو ہم سب کی محبوب اور راج دلاری تھی، اس کے عشق میں کون مبتلا نہ ہوا تھا، روحی بانو، وہ تو شہر لاہور میں ایک بوڑھی گم شدہ اور پاگل عورت ہو گئی ہے —— پہچانی نہیں جاتی —— وقت نے اس پر کیا ستم کیا ہے کہ لوگ مسکراتے بھیک دیتے ہیں۔ وہ بھی آ جائے تو اچھا ہے۔ یہاں وہ پھر سے وہ بھولی شکل والی، دل کو موہ لینے والی لڑکی ہو جائے گی اور اس کے حسن کے چراغ ملا کے ان اندھیروں کو بھی روشن کر دیں گے —— ہیروئن وہی ہوگی —— اور اس تارڑ کے لکھے ہوئے ڈرامے ”قافی وادی“ کا ایک نہیں دو ہیرو ہوں گے، شفیع محمد اور خیام سرحدی —— جمن جی یہ ڈرامہ ایک شاہکار ہوگا“۔ ایک بار لاہور سے راولپنڈی جاتے ہوئے ریل کار کے سفر کے دوران ایک شاہانہ تیکھے نقش و نگار اور سیاہ آنکھوں والی خاتون مجھے ملی تھی ...... ”تارڑ صاحب میں یاور حیات کی امی ہوں“ —— یاور حیات اپنی ماں کے عشق میں مبتلا تھا۔ ان کو یاد کرتا تو اس کی دل نشین آنکھوں میں نمی آ جاتی تھی —— ہم پہروں دنیا کے بڑے عظیم ہدایت کاروں کے بارے میں باتیں کرتے رہتے —— انگمار برگمین اور کوروساوا کے بارے میں باتیں کرتے رہتے، یاور کے ڈراموں میں ان دونوں کی اثر انگیزی جھلکتی تھی۔ یاور حیات کے بعد اب میں ڈاکٹر انور سجاد اور عبدالقادر جونیجو کے لیے فکرمند ہوں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ یقیناً ٹیلی ویژن پر حکمران ہاتھیوں، گدھوں اور خچروں کو ان کی بھی خبر نہ ہوگی کہ وہ کون ہیں۔

یاور حیات، میرے جمن جی، تو اس ظالم نومبر کے مہینے میں ہم سے جدا ہوا —— ہمارے پاس تیرے کفن کا کچھ سامان نہیں

تجھے ہم کس پھول کا کفن دیں
تو جدا ایسے موسموں میں ہوا
جب درختوں کے ہاتھ خالی تھے

(بشکریہ ”نئی بات“ 06-11-2016)

◆◆◆

منیر نیازی اور میں......

اظہر جاوید

منیر نیازی سے میرا تعلق اس زمانے سے ہے جب وہ "سات رنگ" پرچہ نکالتے تھے۔ اس کے بعد وہ لاہور آ کر فری لانسنگ کرنے لگے۔ میں اس وقت سرگودھا میں مقیم تھا اور ایک ہفت روزہ "ضرب مجاہد" چھاپا کرتا تھا۔ ادب سے تعلق کے باعث میں نے اس پرچے میں ادبی صفحات بھی رکھے تھے۔ منیر نیازی بڑی چاہت سے قلمی تعاون کرتے۔ ایک بار وہ ایڈیٹر کے نام خط لکھنے بیٹھے تو پروفیسر شجاع نے کہا جو بھی لکھنا ہے جلدی لکھیں۔ اس پر منیر نیازی نے کہا جو تحریر بھی چھپے گی ظاہر ہے وہ میرے نام کے ساتھ ہی چھپے گی۔ اس لیے میں احتیاط اور آرام سے ہی لکھوں گا۔ منیر نیازی نے پہلی بار فلم "شہزادی" کے لیے گیت لکھے۔ یہ فلم زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ انہوں نے روزنامہ "زمیندار" کے لیے باقاعدہ کالم بھی لکھے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب میں سرگودھا سے لاہور آ چکا تھا۔ میری ہمیشہ خواہش رہی کہ انہیں پہلے سلام کروں لیکن مرحوم نے کبھی اس کا موقع ہی نہیں دیا اور ہمیشہ خود ہی پہل کرتے رہے۔ وہ فلمی پرچے "ڈائریکٹر" کے ایڈیٹر بنے تو اپنی محنت سے اسے اچھا پرچہ بنا دیا۔ میں نے ملاقات پر کہا کہ آپ نے تو "ڈائریکٹر" کو "شمع" دہلی کی طرح خوبصورت بنا دیا ہے۔ انہوں نے بڑی محنت سے اسے چھاپا۔ منیر نیازی سالہا سال تک بہت خوش مزاج رہے۔ تقریباً ہر بات سے بھرپور انداز میں گفتگو کرتے رہے۔ یہ بالکل اپنی شاعری کی طرح۔ پچھلی تقریباً دو دہائیوں سے وہ آدم بیزار اور کم آمیز ہو گئے تھے۔ ناپسندیدہ شخصیت سے مل کر ان کی تیوری چڑھ جاتی۔ انہوں نے ریاض شاہد کی فلم "سسرال" کے لیے گیت لکھے۔ مصلح الدین ان کے ڈائریکٹر تھے۔ اس فلم کا گانا "جس نے میرے دل کو درد دیا اس شکل کو میں نے بھلایا نہیں" بہت مشہور ہوا۔ یہ گانا مصلح الدین کے دفتر میں کمپوز ہوا۔ کسی نے کہا "شکل میوزک کا لفظ نہیں"۔ مصلح الدین نے کہا دیکھنا اس کی پوری شکل ابھرے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جس زمانے میں منیر نیازی سٹوڈیو جاتے تھے ان دنوں یوسف خان نئے فلموں میں ہیرو آنا شروع ہوئے تھے۔ اکثر پروڈیوسروں نے منیر نیازی کو ان کی خوبصورتی کے پیش نظر ہیرو آنے کے لیے کہا مگر یہ ان کا مزاج نہیں تھا اس لیے نہیں مانے۔ منیر نیازی کی ایک پنجابی نظم کا مفہوم یوں ہے کہ آج بہت عرصے بعد "وہ" گلی مجھے ملی ہے۔ اس نے اپنے بیٹے کا نام میرے نام پر رکھا ہے۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے اب بھی بہت پیار کرتی ہے۔ احمد فراز نے اس کے بعد ایک شعر کہا کہ اب وہ میرے نام پر بچوں کے نام رکھ رہی ہیں۔ یہ ایک ادبی حوالہ ہے اس لیے ضرور یاد رکھا جانا چاہیے کہ احمد فراز نے منیر نیازی کے بعد اسی خیال کا شعر کہا۔

منیر نیازی بہت خوش پوش انسان تھے۔ بے کاری اور بے روزگاری کے دنوں میں بھی وہ صاف ستھرے رہتے۔ آخری برسوں میں انہوں نے سفید کپڑے پہننا شروع کر دیے تھے۔ وہ بہت اچھی خوشبو استعمال کرتے۔ میری ان سے ایک خاص قسم کی بے تکلفی تھی۔ چند ماہ پہلے ایک مشاعرے میں میری ان سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بازو پھیلا کر ایک شاعرہ کو جھپی دی۔ میں نے قریب جا کر کہا "نیازی صاحب! میرے گلے بھی مل لیں"۔ ہنس کر کہنے لگے "میں نے اسے گلے نہیں لگایا بلکہ تمہیں گلے مل لیتا ہوں"۔ جس طرح منیر نیازی کی شاعری میں دلکشی تھی اسی طرح وہ گفتگو میں بھی اچھے جملے تخلیق کرتے اور انہیں بیان کرتے تھے۔ شاہ امرتسری اور اے حمید انہیں کہتے آپ

گھر سے فقرے سوچ کر آتے اور دوستوں میں استعمال کرتے ہوں۔ ان کا یہ جملہ بہت مشہور ہوا "بعض سر صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ ان پر ٹوپی پہنی جائے اور ایسا ہی سر احسان دانش کا بھی ہے۔" لفظ "شکریہ" کا استعمال پہلے انہیں کے ساتھ مخصوص تھا بعد میں یہ زبان زد عام ہوا۔ یہ ان کی معصومیت تھی کہ ایک بار داتا گنج بخش کے مزار پر جا کر دعا مانگی "یا اللہ! تو اپنے فضل سے میرے اور سید علی ہجویری کے گناہ معاف فرما دے۔" ادبی حلقوں میں ان کی زیادہ دوستی ریاض شاہد، آغا طالش، تنویر نقوی اور اظہر برکی سے تھی۔ جمشید نقوی کی ایک فلم میں منیر نیازی کی ہی غزل بہت مشہور ہوئی "زندہ رہیں تو کیا ہے جو مر جائیں ہم تو کیا" معاشرتی بے حیائی کا احساس ان کے اندر بڑا گہرا تھا۔ ریاض شاہد اور خلیل قیصر نے فلم "شہید" بنائی تو منیر نیازی کی غزل "اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو" بڑی مشہور ہوئی۔ منٹگمری جو اس وقت ساہیوال بن چکا تھا کے سینما بورڈوں پر ان دنوں جو تحریر لکھی گئی وہ کچھ یوں تھی "منیر نیازی منٹگمری والے"

زمیندار اخبار کے لیے کالم لکھنے کے زمانے میں وہ اپنے شاعر ساتھی منظور قریشی کے ہمراہ زمیندار کے دفتر سے نکل کر میکلوڈ روڈ سڑک پر آنے کے بجائے گلیوں سے واپس جاتے۔ منظور قریشی نے چند روز بعد ایسا کرنے کی وجہ پوچھی۔ منیر نیازی نے کہا دیکھو قریشی! جب ہم گلیوں سے گزرتے ہیں تو کھڑکیوں، بالکونیوں سے خوبصورت چہرے ہمیں یا اوروں کو دیکھتے ہیں تو کتنا اچھا لگتا ہے۔ منظور قریشی نے کچھ عرصہ بعد گلیوں کی طرف جانے سے انکار کر دیا تو منیر نیازی نے ہنستے ہوئے کہا "یار قریشی! بات دراصل یہ ہے کہ میں سڑک کی طرف اس لیے نہیں جاتا کہ میں نے اس طرف سگریٹ پان کے کھوکھے والے کا ادھار دینا ہے۔"

یہ یادیں، یہ باتیں ایک خوبصورت اور ہر لحاظ سے شاعر کی ہیں جو فنی طور پر تو زندہ رہیں گے لیکن جسمانی طور پر اب ہمارے درمیان موجود نہیں۔ آخر میں ایک روایتی مگر بالکل درست بات یہ ہے کہ منیر نیازی جیسا شاعر اب دوبارہ کبھی نہیں آئے گا۔

(پرانے کاغذات سے بازیافت ـــ روزنامہ "ایکسپریس"، ملتان، 28 دسمبر 2016ء)

◆◆◆

ڈاکٹر انور سدید

"اردو ناول کے جسد میں تازہ روح پھونکنے کا سلسلہ شروع ہوا تو نقادوں نے تخلیقی ناول کے مختلف پہلوؤں پر نئے انداز میں روشنی ڈالنے پر توجہ دی۔ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب "اردو ناول کے رنگ" بھی ایک ایسی ہی کاوش ہے جس میں انہوں نے بہت سے ناول نگاروں اور ان کی کتابوں کی ان خصوصیات کا جائزہ پیش کیا ہے جو انہیں منفرد بناتی ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید ہمہ جہت ادیب ہیں اور تنقید کے علاوہ تخلیقی نثر یعنی افسانے اور انشائیے کے رموز سے بھی واقف ہیں اور ان کی وسعت نظر نے ان کے تنقیدی جائزوں کو مقام اعتبار عطا کیا ہے۔"

(نجم الحسن رضوی)

سفر نامہ

عراق اشک بار ہیں ہم

.......7.......

سلمیٰ اعوان

چیک پوسٹ سے گزرنے اور ہوٹل تک کے راستے میں اردگرد کے منظروں کی جگہ آج میرے ساتھ ایک سوچ تھی۔ رات کے سنگ خوف، ڈر اور مایوسی کے جو عناصر چھپے ہوئے ہوتے ہیں اس وقت وہ سب مجھ پر غالب تھے۔

اس وقت میں چادر اوڑھ رہی تھی کہ سایہ بدلوں کی طرح ہوٹل کے مرکزی دروازے سے اندر گھستے ہی میرا سامنا مروان سے نہ ہو۔ شاید کہیں ڈر تھا کہ وہ مجھے منع کرے گا۔ روکے گا۔ وہ حسب معمول اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُٹھ کر اپنے چہرے پر مسکراہٹ بکھیری اور چاہا کہ میں ٹھہر کر اسے دن بھر کی کارگزاری سناؤں۔ مجھے رکے بغیر آگے بڑھ جانا اچھا نہیں لگا۔ اور جب باتیں شروع ہوئیں تو صدر سٹی جانے والی بات بھی ہو گئی۔ مروان نے تفکر سے مجھے دیکھا اور کہا۔

"وہاں جانے کی غلطی مت کریں۔ بغداد کا خطرناک ترین علاقہ جہاں ہر وقت گیارہویں عراقی آرمی ڈویژن گردش میں رہتی ہے۔ نگرانی کی لمبی Seperation Walls نے اسے باقی بغداد سے الگ کر رکھا ہے۔ چیک پوسٹوں پر تھکے اوجڑتے ہیں۔ سب سے زیادہ جانی نقصان وہاں ہوتا ہے۔ آئے دن بم دھماکے ہوتے ہیں۔"

جب اس کے پاس سے اٹھی تو جیسے دم بخود سی تھی۔ جیسے سہمی سہمی سی۔ بندہ کتنا بھی دلیر کیوں نہ ہو سڑکوں پر، چوراہوں پر اپنے وجود کو ٹکڑوں میں کٹے پھٹے تو نہیں دیکھنا چاہتا۔

کمرے میں بڑھیاں حسب معمول باتوں میں مصروف تھیں۔

"جانے کہاں کہاں کی آوارہ گردی کرتی آ رہی ہے۔" ان کے چہروں پر بجا میرے لئے یہ پوسٹر چسپاں تھا۔"

"جہنم میں جاؤ" میں نے بستر پر لیٹتے ہوئے لعنت بھیجی۔

ساری رات انہی خدشات کی گھمن گھیریوں میں گئی۔

صبح سویرے اٹھ کر عالی مقام جناب ابو موسیٰ کاظم کے مزار کی جانب بھاگی کہ کمرے میں تو جنگ پر جنگی چڑھی ہوئی تھی۔ جائے نماز جوتیوں والی جگہ پر بچھا کر "چنگی آں یا مندی آں صاحب تیری بندی آں" جیسا من پسند راگ الاپنا تو بڑا نکھیا کام لگا۔ چلو وہاں تقدس بھرا ماحول تو ہوگا اور دوری بھی نہ تھی۔ وہ بچھا گوں والا معاملہ تھا۔ سو نماز کے بعد پھیلی ہتھیلیوں پر صاحب جی آ کر بیٹھ گئے اور بندی ان کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

"اب اس اتھری بندی کا تجھے ہی دھیان کرنا ہے۔ وہاں وہ سامی نامی یا ان کے مقامی چیلے چانٹے ریڈ کر دیں۔ بگڑی جانوں اور پاکستانی دہشت گرد کے نام پر سیدھی ابو غریب Abu-Ghraib کی سلاخوں کے اندر۔"

اور ہاں تو رلو رکھنے کی طرح سارا دن پھرتی ہوں۔ وقت تھوڑا ہے اور ہاہا پڑا ہوا ہے۔ اب تجھے تو معلوم ہی ہوتا ہے کہ بھوں نے کہاں کہاں پھنسانا ہے تو وہاں نہیں لے جانا مجھے۔ دیکھ نا پیچھے بچے چھوڑ کر آئی ہوں۔ انہیں تو میری یکھواتی شاید جاوت ہو۔ پر مجھے تو بیٹا رکھنے والا دیں گے۔ بعد بعد کر باتیں کریں گے۔ بڑی شوقین تھی ایلو ویچرس بننے کی۔ بوٹی بوٹی ہو گئی ہوگی انھی تھیلوں پہ۔ جنازے کا بھی بٹوارہ کر دیا۔

تو خوف کا کلیجہ ترس ترس ہو گیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں نے باہر دیکھا تھا۔ نیلے آسمان کا دامن داغ دھبوں سے پاک تھا۔

دھوپ شعلے بھڑکاتی آگ کی مانند بھڑکیلی اور گرم تھی۔ رات کے آنچل سے بندھے اندھیرے میں پلتا ڈر، خوف، نا امیدی اور مایوسی کہیں نہیں تھی۔ دن کی روشنی امید اور حوصلے میں ڈھلی سڑک پر میرے ساتھ ساتھ رواں دواں تھی۔

گاڑی سرپٹ بھاگے گئی تھی۔ ایمہ (Aimma) برج سے اعظمیہ کے علاقے میں داخل ہوئے۔ المغرب سکوائر AL-Maghrib Square سے مڑے۔ دائیں جانب کیب پاشا اور بائیں جانب المغرب کی آبادیوں کو دیکھتے آگے بڑھتے گئے۔ کہاں کا ڈر اور کیسا خوف؟ میں بغداد کو دیکھ رہی تھی۔ آبادیوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔

کھجور کے درختوں سے سجی کشادہ سڑکوں اور خوبصورت پانچ منزلہ چھ منزلہ عمارتوں کے فلیٹوں کو دیکھتے ہوئے ہم مختلف آبادیوں سے گزرتے گئے۔ بغداد کا یہ مضافات بہت سی چھوٹی بڑی بستیوں میں گھرا ہوا ہے۔ یہاں ایسے علاقے بھی تھے جو نچلے متوسط طبقے کے تھے۔ ہمارے ہاں کی قصباتی جگہوں جیسے جہاں دھول مٹی اڑتی ہے۔ بچے اسی دھول مٹی میں کھیلتے ہیں اور یک دو منزلہ گھر اپنی غربت کا رونا روتے ہیں۔

گلی کی وائرنگ تاریں کہیں چھوٹی چھوٹی گلیوں کے مکانوں کے میٹروں کو اور کہیں دیواروں کو چھوتی بے ہنگم انداز میں گھروں کے اندر داخل ہوتی ہیں۔ وہ گلیاں جو میں پیچھے چھوڑ کر آئی تھی ان کی حالت انتہائی ابتر، بیچوں بیچ گندے پانی سے بھری نالیاں جو آگے جا کر کیچڑ سے بنی تھیں جہاں شاپر اڑتے اور مرغولوں کی طرح فضا میں بکھرتے عجیب سے تاثرات کو جنم دیتے تھے۔

تموز Tammuz سے آگے امام علی سٹریٹ سے انجیلہ میں داخل ہوئے۔ یہاں سے آگے صدر سٹی کا علاقہ تھا۔ مختلف سڑکوں کے تیز رفتاری سے موڑ کاٹتے ہوئے اخلاق کی حسب معمول کمنٹری جاری تھی۔

صدر سٹی بغداد کے مضافات کا وسیع و عریض علاقہ جو 1950ء میں عبدالکریم کے زمانے میں تعمیر ہوا۔ یہ صدام سٹی تھا۔ ایک نام اس کا Tuwara District بھی ہوا۔ اب یہ صدر سٹی ہے۔

یہ شیعہ اکثریت کا علاقہ ہے۔ پہلے یہاں ایک دو سنیوں کے محلے بھی تھے مگر آہستہ آہستہ وہ لوگ گھروں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔

علاقہ ملا جلا تھا۔ بہت خوبصورت گھروں اور پارکوں والا اور ماٹھا سا بھی۔ گرین زون پر زیادہ تر حملے یہاں سے ہوئے اور مزاحمت

موثر ترین بھی اسی علاقے سے ہوئی۔ یہیں اتحادی افواج کا بصرہ پر قبضہ اور اس کی بربادی تھی۔ بصرہ میں شیعہ آبادی کثرت میں ہے۔ دوسرے مقتدیٰ الصدر گروپ کا ترجمان اخبار Al-Hawza کا بند کرنا تھا۔

''یہ صدر سٹی کی سب سے بڑی مارکیٹ جمیلہ مارکیٹ ہے۔'' اخلاق کے ہی اشارے پر میں نے ال امام علی جنرل ہسپتال کو دیکھا۔

مجھے تو علیحدگی والی دیوار کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ نہ میں نے عراقی یا امریکی سپاہیوں کو دیکھا تھا۔ اخلاق ہنس پڑا تھا۔ ہم اس دھرتی کے باشندے ہیں چور راستوں کا اگر ہمیں علم نہیں ہوگا تو پھر کن کو ہوگا؟ یہ خوبصورت علاقہ تھا۔

گھر کے سامنے بڑا خوبصورت پارک تھا۔ ہرے رنگ کا بڑا سا گیٹ تھا۔ بیل bell بجانے کا فائدہ نہ تھا کہ بجلی نہیں تھی۔ یہ من و عن لاہور کی کسی پوش آبادی کا منظر تھا۔ دستک پر کوئی گیارہ بارہ سالہ لڑکا ہاتھوں میں بھولے گیٹ کا پٹ تھامے وہی استقبالیہ کیفیات آنکھوں میں لیے نمودار ہوا۔

بہت کشادہ صحن تھا۔ جس کی مشرقی دیوار کے ساتھ کھجور کا چھوٹا سا درخت تھا۔ دن بیچے کی ڈھلتی سرخی دھوپ آنگن کے صرف ایک حصے پر براجمان تھی۔ صحن میں لگی تار پر مردانہ کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ کمرے میں داخل ہونے سے قبل میری نظریں چوبی والی سمت والے دروازے کی طرف اٹھ گئیں جو کھلا تھا۔ ایک نظر کی تاکا جھانکی نے بہت خوبصورت کشادہ سے آنگن اور اس میں ایک دو منزلہ گھر کا نظارہ پیش کیا تھا۔

ایک معمر مرد باہر نکلا تھا۔ چہرے پر میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ اھلاً وسھلاً کہتا ساتھ میں بتاتا کہ گھر میں ایک مہمان آیا ہوا ہے جس سے ملنا خوشگوار ہوگا۔ اندر کمرے میں داخلہ ہوا۔ بجلی نہ ہونے کے باوجود کمرہ کچھ اتنا گرم نہ تھا۔ پنکھا چلتا تھا شاید یو پی ایس کی مہربانی تھی۔ میں نے بیٹھنے کے ساتھ کمرے میں دیکھا۔ گہرے سرخ خوش رنگ پھولوں سے بنے قالین پر ایک جانب دو میٹرس اوپر نیچے دھرے تھے۔ دوسری طرف صوفہ پڑا تھا اور قالین پر ایک ادھیڑ عمر کا مرد جو ہمارے اندر داخل ہوتے ہی کھڑا ہو گیا موجود تھا۔

پچاس پچپن کے پیٹے میں جس نے استقبال کیا تھا وہ بصیر الانی پہلے آرمی میں کرنل تھا۔ وہاں سے صدام کی خفیہ ایجنسی میں بھیجا گیا۔ جنگ کے دنوں میں گرین زون میں تھا۔ سچا اور کھرا عراقی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا انسان بھی تھا۔ لوگوں کی دلالی میں منہ کالا کرنے اور کوئی بڑا ہاتھ مارنے کی بجائے سادگی سے اپنی جگہ کھڑا گردش لیل و نہار دیکھتا تھا۔ بزدل تھا۔ قناعت پسند تھا۔ ساتھی کچھ کہتے تھے۔ چپ چاپ سن لیتا تھا۔ جب کالی اور وحشی ماتھوں کے پیچھے وزنی بوٹ دڑ دڑ کرتے قیمتی اشیاء کو روندتے ٹھوکریں مارتے محل میں داخل ہوئے تو وہ کھڑا ادھر ادھر دیکھتا اور صرف یہ سوچتا تھا کہ وہ جاہ و جلال، وہ دبدبہ، وہ کروفر سب کیسے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے ہیں۔ یہاں پر وہ دم نہیں مار سکتا تھا۔

اس کی یادوں میں اتحادی فوجوں کے وہ لوگ بھی تھے جو گھروں میں جاتے، برآمدوں میں کھڑے ہوتے تو ٹھٹک ٹھٹک جاتے۔ ان کی آنکھوں میں امنڈتی حیرتیں اور ان کے رکتے قدم یہ بتاتے تھے کہ ان کی سوچیں کیا ہیں! مسلم دنیا کے ایک سربراہ کا اس درجہ کروفر، ایسی شاہانہ طرز زندگی! ایسا تو اس کا بھی نہیں جو دنیا کا بادشاہ ہے اور جس کی فوجیں یہاں مار دھاڑ کرتی آئی ہیں۔

اس گھر کے دوسرے بندے کا نام فارس مہدی تھا۔ امریکہ سے ایروناٹیکل انجینئرنگ میں تربیت یافتہ۔ پہلے جماعت الاخوان

میں شامل مزاحمت کی تاریخ مرتب کر رہا تھا۔ بعد میں القاعدہ میں شامل ہو گیا۔ روس امریکہ جنگ میں جہاد کے جذبوں سے لدا پھندا پاکستان پہنچا تھا۔ پشاور حیات آباد میں تین ماہ کے ٹریننگ کورس میں شامل ہوا۔ آئی ایس آئی کے چند افسروں کے نام بھی اس نے لیے جن سے اس کی دوستی تھی۔

میں نے دلچسپی اور حیرت سے اسے جو کل کا ہیرو، آج کا زیرو اور مارا ہوا وحشت گرد تھا کو دیکھا تھا جس نے اچھی جگہ پر بیٹھ کر میرے دشمن کی بات کی تھی۔ وہ کسی حوالے سے بھی تھی مجھے اچھا لگا تھا۔ شیعت اور سنی کی بحث کے بغیر۔ یوں شکوک و شبہات کی پرچھائیں ہی میرے دماغ سے اٹھ کر میری آنکھوں میں آ گئی تھیں۔ شیعہ آبادی کی اکثریت والے علاقے میں القاعدہ کا یہ سرگرم کارکن کیسے؟ اور سوال ہونٹوں پر بھی آ گیا تھا۔

جواب میں سلطے کو جھٹلا دو یوں تھا کہ وہ تو خود شیعہ مسلک سے ہے پر شیعہ سنی اتحاد کا بہت بڑا علمبردار ہے۔ اس کا دشمن صرف امریکہ ہے۔ حلیے بدلنے میں اسے کمال حاصل ہے۔ بصیر الحالی کو تو گویا اور کی طرح مانتا ہے۔ ممکن نہیں کہ بغداد آئے اور ملے بغیر چلا جائے۔ رات کو کوئی گیارہ بجے آیا تھا۔ میرے لیے یہ بھی ایک خوشگوار اور مسرت آمیز بات تھی کہ وہ انگریزی اچھی بولتے تھے۔ عراقی پڑھی لکھی قوم جس کے پڑھے لکھے والے بھی انگریزی کا استعمال بخوبی کر سکتے ہیں۔

عراقی فوج کے بارے میں جو میری معلومات تھیں ان ہی کی روشنی میں میرا سوال ہوا۔ بصیر الحالی نے میرے تاثرات اور اندازوں کی نفی کی۔

''سہولیات ٹیکنالوجی اور انتہائی جدید ہتھیاروں سے لیس عراق میں داخل ہونے والی فوج تقریباً پونے تین لاکھ تھی۔ اس کا بھلا ایک ایسی فوج سے مقابلہ کیونکر ممکن تھا جو سلیقے اور تربیت کے لحاظ سے بہت کمتر تھی۔ خلیجی جنگ نے بھی خاصا نقصان پہنچایا تھا۔ تاہم پھر بھی اگر غداری جیسا اہم عنصر نہ ہوتا تو بغداد آنے والوں کو فوری سبق مل سکتا تھا۔

میں آج تک اس بات کا تجزیہ نہیں کر سکا کہ صدام کو آخر اپنی کس فوجی قوت پر ناز تھا؟ جنگ سے کافی پہلے عراق کے فوجی تجزیہ نگاروں نے اپنی رپورٹوں میں بھی یہ واضح کر دیا تھا۔

مجھے وہ میٹنگز یاد ہیں۔ سینئر عراقی فوجی افسروں کے ایک جنرل نے کہا ''سی آئی اے کے پاس ہماری فوج کے بارے میں بہت اہم معلومات ہیں۔ فوج میں خرید و فروخت ہو رہی ہے۔ ہماری منصوبہ بندیاں، تیاریاں، احتیاطی انتظامات اس معیار کے نہیں ہیں جو ایک بڑے دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔

دبے لفظوں میں ایک کرنل نے یہ اظہار بھی کر دیا۔ ''آپ عراق سے محبت کرتے ہیں۔ اس محبت کا تقاضا آپ کی حکومت سے علیحدگی ہے۔'' عراق بچ سکتا تھا۔ پر ہٹ دھرمی اور ذاتی انا بیچ میں آ رہی تھی۔ تو پھر یہی کچھ ہونا ہے جو ہمارے ساتھ ہوا۔

کمرے میں قہوہ لانے والا بھی ایک عمر رسیدہ آدمی تھا۔ اسے کو سلیقے سے قالین پر رکھتے ہوئے وہ ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ پلیٹ میں جو کھجوریں تھیں وہ سیاہی مائل جامنی سی تھیں اور بصرے سے آئی تھیں۔ بصرے کا نام سنتے ہی لاشعور میں گونجتی آوازیں یلغار کرتی سامنے آ گئی تھیں۔ یہ بھی یادوں کی صدائیں۔ بصرے کی کھجوریں۔ کھجوریں بڑی رسیلی تھیں۔ تکوں سے بھرا خوشبودار اتنا تازہ صوبی بھی تھا۔

◆◆◆

(جاری ہے)

تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیسا!
تبت سنو کا روزانہ استعمال

تجزیاتی مطالعہ

کیا راون مرے گا؟

وحشی سعید (انڈیا)

مہابھارت کی بساط بچھ گئی۔ دریودھن کو اپنی جیت کا یقین اپنی زندگی سے بھی زیادہ تھا۔ دوسرے دن جب سورج سوا نیزے پر ہوگا، یدھ کی ابتدا ہوگی۔ اپنی اس جیت کے تصور سے سرشار ہو کر جو کہ اس سے کوسوں دور تھی، وہ اپنے خیمے میں چلا گیا جہاں نیند اور خواب کے درمیان جھگڑا جاری اس کے سامنے تھا۔

"دریودھن تمہارا سروناش نشچت ہے۔ اس لیے کہ تمہارا اہنکار اپنی حدود کو پار کر کے پاپ کی سرحد میں داخل ہو گیا ہے۔ تم نے چاپلوسوں کی ایسی فوج پال رکھی ہے جو تم کو وہی سناتے ہیں جو تم سننا چاہتے ہو۔ مہابھارت کی رن بھومی پر اکٹھا ہو جو تم نے اور تمہارے چاپلوسوں نے سجائی۔ تمہارے چاپلوس ایک ایک کر کے قتل ہو رہے ہیں اور اب صرف تم ہو اور تمہارا پاپ نما اہنکار۔"

اس سے پہلے کہ دریودھن کرشن سے کچھ کہتا، ہوائی جہاز دنیا کے مصروف ترین شہر لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ کی زمین کو چھو گیا۔ اکانومی کلاس سے ایک گندمی رنگ کا میانہ قد ادھیڑ عمر آدمی دوسرے مسافروں کے دوش بدوش نکلا۔ امیگریشن افسر بولا "آج کل آپ کا آنا جانا لگا ہوا ہے۔ Welcome to London" پاسپورٹ پر ٹھپہ لگا۔ وہ سیدھا گیٹ کی طرف نکلا۔ کندھے پر چھوٹا سا بیگ اور ہاتھ میں ایک سوٹ کیس لیے وہ ٹیکسی پر سوار ہوا جو وٹن (Whitton) ٹیوب اسٹیشن پر رکی۔ اس وقت سورج ڈوب رہا تھا۔ وہاں سے پیدل چلتا ہوا قدیم پرنس البرٹ پب کے سامنے رک گیا۔ پب کے کالے چوکیدار نے گندمی رنگ کے آدمی کو حیرانی سے دیکھا۔ "باہر کے لگتے ہو لیکن آپ کو کیسے معلوم کہ پب اسی وقت کھلتا ہے۔" "تم نئے چوکیدار ہو اور میں پرانا گاہک۔"

سنٹرل لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ کا سب سے بڑا اور نامی اسٹور سیلفرج جہاں دنیا کی سب نایاب اور قیمتی چیزوں کا کاروبار ہوتا ہے۔ اس شخص نے دو تحفے لیے۔ ایک میں پرانی شراب کی وہ بوتل تھی جو 1857 یعنی ہندوستان کے غدر کے زمانے میں بھری گئی تھی اور دوسرے میں اسی زمانے کی نایاب رولکس کی گھڑی جو اب بھی وقت کا احساس دلا رہی تھی۔ دونوں تحفے ہاتھوں میں تھامے وہ سفید فام شخص ٹیکسی میں سوار ہوا اور چوبیس گھنٹے کے بعد وٹن (Whitton) اسٹیشن پر اتر گیا وہاں سے کالے رنگ کی ٹیکسی میں سوار ہوا اور کچھ دیر کی مسافت کے بعد ٹیکسی پب کے سامنے رک گئی جہاں رونق اپنے عروج پر تھی۔ بار کاؤنٹر پر گندمی رنگ کا آدمی وہسکی کی چسکی لے رہا تھا۔ سفید فام نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "کیسے ہو؟" "پہلے آپ بتائیے کہ ایسی کیا بات ہوگی کہ مجھے اتنی جلد بلایا۔" سفید فام شخص نے مسکراتے ہوئے دونوں تحفے کھول دیے۔ "تمہیں انہیں کی تلاش تھی نا چھو لے!" "واقعی ہوے۔ آپ نے کمال کر دیا۔ کیا وقت رک گیا۔" "چھو لے۔ ہم نے کبھی وقت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔" "کیا ضروری ہے کہ ہر بار آپ کی جیت ہوگی؟" "جب تک کرشن ارجن کے ساتھ ہے جیت ہوگی اور ہم نے یہ ممکن بنایا ہے کہ کرشن ہمارے ساتھ ہی رہے۔" "کیا ضروری ہے کہ بار بار رن بھومی سجائی جائے اور

ہزاروں لاکھوں لوگوں کا قتل ہو۔"

"کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے اور ہم یہاں ایک دوسرے کو اخلاقیات کا فلسفہ سمجھانے کے لیے نہیں ملے بلکہ نئی رن بھومی کی بساط کو ترتیب دینے کے لیے۔" "مجھے اس بڑے کینوس میں میں کہاں فٹ کر رہے ہیں؟" "یہ تمہیں بتا دیا جائے گا۔" گندمی رنگ آدمی سوچنے لگا کہ وہ کیسا لمحہ رہا ہوگا جب رن بھومی میں کرشن نے ارجن سے کہا ہوگا "اے ارجن، وہ تمہارے سامنے دریودھن کھڑا ہے، بھائی نہیں شترو ہے۔ اپنا بان سنبھالو اور شترو پر نشانہ سادھو۔" ارجن کے ہاتھوں میں لرزہ طاری ہو گیا ہوگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ رہا ہوگا۔ اس نے زندگی کے ایسے موڑ کی کلپنا بھی نہیں کی ہوگی کہ اپنے بھائیوں کو دشمنوں کے روپ میں سامنے کھڑا پائے گا۔ وہ جو کل تک چھپا چھپی کا کھیل کھیلتے تھے آج ۔۔۔!

"ارجن تم ایسے یودھا ہو جو سچائی کے لیے لڑتا ہے تمہارے ہاتھوں میں لرزہ کیسے؟ انصاف پر جان نچھاور کرنے والے یودھا ہو کرتویہ نبھاؤ۔"

لندن کے ایک پارک میں وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ نہ وہ ارجن تھا نہ کرشن لیکن ایک جنگ کی تیاری چل رہی تھی جس کی بساط کاروباری تھی۔

"بڑے! کیا اس جنگ کی نوعیت انصاف پر ہے؟۔۔۔"

"چھوٹے! نوعیت کو چھوڑو اور اصل مدعے پر آؤ۔ باتوں کا وقت نہیں عمل پر دھیان دو۔" چھوٹے نے دستاویز کا بنڈل اٹھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہماری اگلی ملاقات دو گھنٹے بعد ہوگی Progressive Report کے ساتھ۔ ہو سکے تو 1857ء کی کچھ اور نایاب چیزیں بھی میرے لیے۔۔۔" "ضرور۔" کرشن رن بھومی میں ارجن کے ساتھ تھا۔ ارجن اب تک بس ونیشل میں تھا لیکن اسی وقت ریگستان میں بمبار جہاز شعلے اگل رہے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں انسانوں کو موت کی نیند سلایا جا رہا تھا۔ جہاز کے کپتان باتیں کر رہے تھے۔ "نمبر ایک۔ میری بمباری کی مشین بہت بہترین کام کر رہی ہے۔" "نمبر دو۔ میری مشین تمہاری مشین سے آگے ہے۔"

"تم بھی اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرو گے کہ ہم بہتر اسلحہ بناتے ہیں۔" "جو بھی ہے، استعمال تو دونوں ہی ہوتے ہیں۔"

جب دونوں بحث کر رہے تھے اس لمحے امریکہ، یورپ اور آسٹریلیا کی شیئر مارکیٹوں میں ایسا اچھال آیا کہ شیئر مارکیٹوں کے بڑے بڑے پنڈت انگشت بدنداں رہ گئے۔ ایشیا اور افریقہ کے شیئر مارکیٹ منہ کے بل گر گئے۔ سنٹرل لندن کے نیم تاریک اسٹریٹ کے ایک مہنگے بار میں ایک سفید فام مہنگی اور بہترین وہسکی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ کچھ دیر بعد قیمتی سوٹ میں ملبوس ایک کالا آدمی بار میں داخل ہوا۔

"کیسے ہو؟" "میں ٹھیک ہوں۔ افریقہ کی وہ قدیم مورتی دستیاب ہوئی جس کی مجھے تلاش تھی؟" "تمہاری فرمائش پوری ہوگی۔" سفید فام نے وہسکی کالے آدمی کے سامنے بڑھائی۔ کالے آدمی نے وہسکی کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ان دستاویزوں کو سنبھال لیے۔" "We need results" یہ کہتے ہوئے سفید فام مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے بار سے نکل کر اپنی کار میں غائب ہو گیا۔ اسی لمحے سیتا ہرن ہو گیا۔ لکشمن زخمی ہو گیا۔ ہنومان سنجیونی لے کر آ رہا تھا۔ رام نے اپنا بان سنبھالا اور راون پر نشانہ سادھا۔

"کیا راون مرے گا؟"

◆◆◆

کیا راون مرے گا؟

افسانہ نگار: وحشی سعید (انڈیا)

تجزیہ نگار: ڈاکٹر اشرف آثاری

وحشی سعید کا افسانوی بیانیہ بالعموم تمثیلی، تلمیحی یا پھر اشاراتی یا استعاراتی ہوتا ہے۔ ابتدا سے ہی ان کا انداز اظہار روز ازل علامتی رہا ہے۔ علامت نگاری ایک فن ہے جو آسان نہیں ہے جس کو یہ سمجھ میں آ گیا تو آ گیا نہیں تو پھر۔۔۔۔!!!

علامتی افسانہ نگار، داخلی دنیا کے محسوسات و مشاہدات کے اظہار کے لیے عام مستعمل، گھسی پٹی، فرسودہ اور گھسے پٹے مروجہ الفاظ و تراکیب و استعارات سے گریز کرتا ہے اور منطقی الفاظ و تراکیب اور جدید طرز گفتگو کو منفرد و مخصوص بناتا ہے اور بات کرنے کے لئے چن چن کر الفاظ کا انتخاب کر لیتا ہے۔

وحشی سعید کے ہاں دیو مالائی قصوں، کہانیوں کے علامتی کردار، واقعات اکثر نظر آتے ہیں جنھیں وہ اپنی کہانی میں مناسب مقامات پر برجستہ طور پر اس طرح کھپاتے رہتے ہیں کہ ان کا لاینفک حصہ معلوم ہوتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کرداروں کے نام اور مکالموں پر ان کی خاص توجہ رہتی ہے۔ اردو علامتی افسانے کے تعلق سے اگر بات کی جائے تو کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، منٹو، یہاں تک کہ جوگندر پال، انور سجاد، بلراج مینرا، شوکت حیات وغیرہ متعدد افسانہ نگاروں کے افسانوی ادب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے ہاں بھی علامت اور علامتی بیانیہ اکثر رہے ہیں۔ طوالت کے خوف سے افسانوں کا نام گنانا یہاں ممکن نہیں ہے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے ادوار کے بعد بھی تخلیق ہونے والے افسانوی ادب میں، تلمیحی اور استعاراتی یا پھر علامتی انداز، اردو فکشن نگاری میں نہ صرف زندہ تھا اور زندہ ہے، بلکہ آج بھی مقبول ہے اور اس کے آئندہ زندہ رہنے کے امکانات بھی موجود ہیں۔ اس کی شکل و صورت اور نوعیت کے بارے میں ابھی کچھ کہنا شاید قبل از وقت ہوگا کہ کوئی علامت نگاری، انحراف والی انکار والی یا بغاوت والی یا پھر لاشعوری یا ابہام والی علامت نگاری یا پھر نعم البدل کی تلاش والی زندہ رہے گی!!۔

افسانہ تخلیق کرتے وقت وحشی سعید کی اولین ترجیح علامتی افسانے کو ہی ملتی ہے ان کا زیر تجزیہ تازہ افسانہ ''کیا راون مرے گا؟'' بھی ایک علامتی افسانہ ہی ہے۔ افسانے کی ابتدا مہابھارت کی بساط بچھا کر ہوتی ہے اور اس رزمیے کے اہم کرداروں، کرشن، دریودھن، ارجن وغیرہ جیسے کلیدی کرداروں کے باہمی مکالموں سے، یدھ، سرد وال کے قلعوں، لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ، امیگریشن افسر، پاسپورٹ، وشن سیکس، انگلش، پرنس البرٹ پب، مقبول الدین کی آکسفورڈ اسٹریٹ، سیاہ فام شخص جیسے لوگوں، جیمز بل اور مقامات وغیرہ کا ذکر بھی ہوتا ہے۔ کہانی کی شروعات اساطیری انداز میں ہوتی ہے اور یہاں تیسری دنیا کے مختلف ممالک کی آپسی رسہ کشی دکھاتی ہے۔

دنیا کے دو سپر طاقتوں کے مابین اپنے عروج کو پہنچنے والی آپسی رسہ کشی، اس وقت لگ بھگ ختم ہو گئی جب ان میں سے ایک حریف مکمل طور پر بکھراؤ کا شکار ہو کر کمزور ہو گیا۔ دیگر چھوٹے چھوٹے ممالک جو ان دو صف اول کے حریفوں کی وجہ سے تقسیم ہو چکے تھے۔

ایک نئی اور عجیب قسم کی صورتِ حال سے دوچار ہونے لگے کہ پوری دنیا کی سیاست مکمل طور پر تبدیل ہو گئی۔ حریف ممالک کے درمیان آپس میں رسہ کشی، سرد جنگ اختتام کو پہنچی لیکن سابقہ کمیونسٹ بلاک کے ساتھ وابستہ ممالک اپنی بقا و دوام کی فکر کرنے لگے۔ امریکن بلاک یا سپر پاور اس کے حمایتیوں کی ترجیحات بھی تبدیل ہو گئیں۔ امریکن بلاک سے وابستہ ممالک کے اذہان پر پوری طرح سے واحد سپر طاقت نے اپنے پر پھیلانے شروع کر دیے۔ تمام تر انسانی، اخلاقی اقدار کو ایک طرف رکھ کر آنکھ بند کر کے مشرقِ وسطیٰ میں اسرائیل اور اس کی من مانیوں کی غیر مشروط سپورٹ جاری رکھتے ہوئے، اقوامِ متحدہ کو بھی ایک عضوِ معطل بنا دیا گیا کہ اس عالمی ادارے سے عام لوگوں کا اعتماد ہی اٹھ گیا۔ وحشی سعید کے زیرِ تجزیہ افسانے کو اس تناظر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

وحشی سعید کے زیرِ تجزیہ افسانے میں ان کے باطنی و داخلی افتخار کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے جس کو موصوف اپنے دلکش علامتی پیرائے میں منظرِ عام پر لاتے ہیں اور اس افسانے کی فضا اگرچہ داستانوی ہے جو ان کا محبوب ترین طرزِ تحریر ہے لیکن ان کے شعور میں گرد و پیش میں رونما ہونے والے واقعات رہتے ہیں۔ اساطیری انداز میں لکھے گئے قدیم و جدید کے اس امتزاج والے افسانے کا ہر کردار علامتی لگتا ہے۔ کردار نگاری اور افسانے کی جزئیات نگاری اور وحدتِ تاثر پر افسانہ نگار کی خاص توجہ رہتی ہے۔ وحشی سعید کا مطالعہ و مشاہدہ بہت وسیع ہے۔ ان کے ہر افسانے میں کوئی نہ کوئی نیا تجربہ نظر آتا ہے۔ یہ اپنے آپ کو دہراتے نہیں۔ ان کے ہاں زندگی کی معنویت منفی نہیں، مثبت ہے۔ ان کی کہانیاں بالکل صاف ستھری اور بے جا ابہام سے پاک ہوتی ہیں۔ یہ دو ٹوک انداز سے گریز کرتے ہیں اور ان کا لہجہ حساس اور سنجیدہ ہوتا ہے اور ہمیشہ اپنے ضمیر کی آواز کو ادا کرتے ہیں۔ انداز بیان فلسفیانہ ہوتا ہے جس میں سادگی اور تہہ داری بھی ہوتی ہے۔ موضوع تک رسائی اور بحران کا ٹریٹمنٹ ان کے قاری کو بور نہیں ہونے دیتا۔ وحشی سعید کی "کیا راون مرے گا؟" کہانی بھی اس پس منظر میں لکھی گئی ایک کہانی ہے۔ اس کہانی میں رام اور لکشمن جیسے کردار بھی ہیں جو نیکی یا بھلائی کی علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور ہنومان جیسے کردار بھی ہیں جو وفاداری اور اطاعت کی علامت کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور راون جیسے کردار بھی ہیں، جو بدی یا برائی کی علامت کے طور پر لئے جاتے ہیں۔ دیگر کردار بھی اپنے اپنے علامتی تناظر میں آتے ہیں۔ وحشی سعید کہانی کے اختتام پر قاری سے پوچھتے ہیں "کیا راون مرے گا؟" اس استفہامیہ سوال کا جواب بھی اسی افسانے میں چھپا ہے کہ جب تک دنیا قائم و دائم ہے جب تک برائی کے ساتھ اچھائی، بدی کے ساتھ نیکی اور پاپ کے ساتھ پن بھی جاری رہے گا۔ بلکہ ایک ہی تصویر کے دو رخ بن کر دنیا میں موجود رہیں گے کہ سیتا ہرن بھی ہوتا رہے گا لکشمن زخمی بھی ہوگا۔ ہنومان سنجیونی بھی لاتا رہے گا اور رام اپنا بان سنبھال کر راون پر نشانہ بھی سادھے گا لیکن راون نہیں مرے گا اور اگر مرے گا بھی تو نہ جانے اور کتنے راون پیدا ہوتے رہیں گے۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ افسانے کے اختتام پر یہ جملہ کہ "اسی لمحے سیتا ہرن ہو گیا۔ لکشمن زخمی ہو گیا ہنومان سنجیونی لے کر آ رہا تھا رام نے اپنا بان سنبھالا اور راون پر نشانہ سادھا۔" اس بات کی طرف واضح اور غیر مبہم اشارہ ہے کہ بدی اور نیکی کی یہ ازلی وجود آدم سے جاری ہے اور جاری رہے گی رام اور راون یا نیکی اور بدی دریا کے دو متوازی کنارے ہیں جو قیامت تک متوازی ہے اور متوازی رہیں گے اور ایک دوسرے میں ضم نہیں ہوں گے۔ کہانی کے اس اختتامی جملے سے رام اور راون کے ایک ہو جانے کا قطعی کوئی اشارہ نہیں ملتا ہے ہاں اس آخری جملہ "کیا راون مرے گا؟" جو اس افسانے کا عنوان بھی ہے اپنے اندر اندیشوں، وسوسوں اور استفسار کی ایک پوری کائنات لئے ہوئے ہے۔

◆◆◆

طنز و مزاح

فنا فی الزوجہ

ایس ایم معین قریشی

شادی وہ ادارہ ہے جس میں داخل ہوتے ہی مرد اپنی برسوں سے کمائی اور سو فیصد اصلی "بیچلرز ڈگری" سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے جبکہ عورت فوری طور پر ایک عدد جعلی "ماسٹرز ڈگری" ہتھیا لیتی ہے۔ اب ظاہر ہے، بڑی ڈگری چھوٹی پر غالب آجاتی ہے کیونکہ، بقول ایک سابق صوبائی وزیر اعلیٰ، ڈگری تو ڈگری ہے ___ چاہے اصلی ہو یا نقلی!

گھر کی سطح پر اس سامراجی صورت حال نے شوہروں کو ایک ایسے مظلوم، محروم اور (عملاً) مرحوم گروہ میں تبدیل کر دیا ہے جس کا واحد وظائف ایک خالی بٹوہ ہے، جو بلا معاوضہ خدمت کے جذبے سے لبالب بھرا رہتا ہے اور جو ایک طرف سے طبل جنگ بجاتی "سپر پاور" اور دوسری طرف سے راگ ملہار گاتے ہوئے بچوں کے نرغے میں گھرا ہوتا ہے۔ اس گروہ واحدہ کے شب و روز گویا مشقت سے عبارت ہیں۔ اس کے لیے کوئی وقت، کوئی رعایت اور کوئی شکایت نہیں۔ وہ قائد اعظم کے اس قول زریں کا بول بالا کرتا رہتا ہے کہ "کام، کام اور صرف کام" جبکہ بیوی انگریزی کے "کام" (CALM) کے حربے لوٹتی ہے۔ آسکر وائلڈ جیسا حق پرست بھی اس صنفی استحصال کی تاب نہ لا کر چلا اٹھا تھا "عورتوں کی تاریخ بدترین ظلم کی ایسی داستان ہے جس کی دنیا میں نظیر نہیں ملتی۔ یہ طاقتور پر کمزور کے مظالم کی داستان ہے۔ یہ وہ داستان ہے جس کا کوئی انت نہیں۔" اس معروضی تبصرے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ اس مسکین کا سامنا کس خونخوار سے پڑا ہوگا۔

کسی کنوارے کے نقطہ نظر سے شادی زندگی کا ایک خوشگوار، آرام بخش اور کیف آور باب ہوتا ہے۔ وہ بے چارہ NO LIFE WITHOUT WIFE (بیوی بنا زندگی نہیں) کا دلفریب تصور ذہن میں لیے ہوئے اپنے پیروں پر "کلہاڑا" مار بیٹھتا ہے۔ وہ کتنا خوش ہوتا ہے کہ اب ع زندگی اپنی گزر جائے گی آرام کے ساتھ۔ لیکن اس سانحے کے بعد اسے پتا چلتا ہے کہ ع زندگی نام ہے مر مر کے جیے جانے کا۔ خاتونِ خانہ (خراب) اسے لعنت ملامت اور طعن و تشنیع کا نشانہ بنائے رکھتی ہے۔ وہ غریب زیادہ کام کرتا ہے تو اس پر الزام لگتا ہے کہ بیوی کو وقت نہیں دیتا۔ کم کام کرتا ہے تو حرام خور (پنجابی میں ہڈ حرام) قرار پاتا ہے۔ اگر اس کے سر میں درد ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نکالا جاتا ہے کہ بیوی سے بیزار ہو چکا ہے۔ اگر فریق ثانی سر پر پٹی باندھے تو اس کی وجہ کام کی زیادتی ہوتی ہے۔ اگر وہ کبھی جھوٹے منہ کسی وقتی مصلحت کے باعث اپنی "شریک حیات" کے چہرے مہرے کی تعریف کر دے تو محض حسن کا پجاری کہلائے اور اگر ایسا نہ کرے تو تہمت لگے کہ کسی اور کے چکر میں ہے۔ اس کے لیے ہر وقت ایک طرف کنواں تو دوسری طرف کھائی ہے۔ ع ہے پست بہت بندۂ "مجبور" کی اوقات۔

اپنی منکوحہ کی غیر مشروط فرمانبرداری اور اپنی خوشی سے رضاکارانہ دست برداری کا نام ہے کامیاب شوہر کے محاورے میں "زن

مرید'' کہا جاتا ہے۔ جو لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ شادی کے بعد انہیں اپنے ذاتی کاموں کے سلسلے میں بیرونی امداد حاصل ہو جائے گی اور ان کے سارے مسائل حل ہو جائیں گے وہ بہت ''بلی بنے'' ہیں۔ شادی خود ایک مسئلہ کشمیر ہے جو طول کا شکار رہتا ہے۔ دو بچھڑی دوست کافی عرصے بعد کہیں ملے۔ ایک نے دوسرے کو دیکھتے ہی نعرہ لگایا'' کیا کہنے! اعلیٰ قمیص، نفاست سے استری شدہ پینٹ، اشارے مارتے ہوئے جوتے! مجھے یقین ہے کہ تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ ہیں نا؟''

''ہاں یار'' دوسرے نے مردہ دلی کے ساتھ تصدیق کی ''اور یہی وہ تین کام تھے جو اس نے مجھے سب سے پہلے سکھائے۔ ویسے تم بتاؤ کیا اب تک چھڑے ہو؟'' دوسرے نے ہاں میں سر ہلایا تو پہلے نے مشورہ دیا'' تم کو بھی شادی کر لینی چاہیے۔ یہ ایک سماجی فریضہ ہے۔ بھلا یہ بھی کوئی زندگی ہوئی کہ انسان ہمیشہ خوشیوں میں مست رہے۔''

زن مرید وہ خود گرفتہ اور ازکار رفتہ انسان ہے جو اپنے بنیادی انسانی حقوق اپنی گھر والی اور اس کے گھر والوں کے نام رہن رکھ دیتا ہے۔ پھر وہ ریموٹ کنٹرول والے روبوٹ کی طرح اشاروں پر حرکت کرتا ہے۔ بیوی سے اس کا تعلق آقا اور غلام والا ہوتا ہے۔ گذشتہ روز ایک ''نافی الزوجہ'' اپنی بپتا سنا رہے تھے۔ کہنے لگے کہ میرے سسر نے گھر کے لان میں ایک سولہ سنگ لگوانے کے لیے ٹھیکیدار بلوایا۔ اسے حکم دیا گیا کہ وہ 15 فٹ بلند لی وی دوہری چوڑائی سے کچھ فاصلہ رکھ کر لگے۔ ٹھیکیدار نے ماحول کا جائزہ لے کر معذرت کر لی کہ دوار اونچا بھی ہے اور جھول بھی رہا ہے۔ میں اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔'' کوئی بات نہیں'' سسر نے بے فکری کا اظہار کیا'' میں یہ خدمت اپنے داماد سے لے لوں گا۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے تو ہم نے انہیں کریدا'' پھر کیا ہوا؟'' بولے'' مرتا کیا نہ کرتا۔ اللہ کا نام لے کر اوپر چڑھ گیا اور سرخرو ہو کر لوٹا۔''

''اس میں سرخرو ہونے والی کیا بات ہوئی؟'' ہم حیران تھے۔ انہوں نے وضاحت کی'' دراصل تاروں نے چہرے کو زخمی کر دیا تھا۔'' اتنا کہہ کر وہ رکے اور پھر یہ کہہ کر خود کو تسلی دی'' جس کی روح زخمی ہو وہ ایسے چھوٹے موٹے زخموں کی پروا نہیں کرتا۔''

ہم نے ان سے کہا'' اس ''سسر'' کی بات چھوڑیے یہ بتائیے کہ بیگم کے ساتھ تمہارے کیسے تعلقات ہیں؟'' جواب آیا'' ان میں اور مجھ میں مکمل ہم آہنگی ہے۔'' ''ماشاء اللہ'' ہم نے اس کیفیت کو سراہا اور پوچھا'' یہ ہم آہنگی کس طرح پیدا ہوئی؟'' ان کے فکر انگیز جواب نے خوشگوار خانگی تعلقات کے ایک حتمی اصول کا تعین کر دیا۔ ان کا کہنا تھا'' نہ میں ان کے معاملات میں دخل دیتا ہوں۔۔۔ اور نہ اپنے معاملات میں۔''

منطق، دلیل، ثبوت، شہادت اور تجزیہ، بیوی کی عدالت عالیہ میں ان سب کا داخلہ ممنوع ہے۔ تنازع خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو فیصلہ ہمیشہ مرد کے خلاف آتا ہے کیونکہ غلطی بھی ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے۔ صرف ایک صورت میں اس کا موقف درست تسلیم کیا جاتا ہے جب وہ کہے'' واقعی میں غلطی پر تھا۔'' یہی وجہ ہے کہ وہ اندیشہ شوہر کچھ بھی منہ سے نکالنے سے پہلے دو بار سوچتے ہیں۔ ایسے ہی ایک مخصوص شوہر کا بچہ ایک روز خوشی سے چہکتا ہوا اسکول سے گھر آیا'' ابو، ابو، مجھے اسکول کے ڈرامے میں ایک کردار مل گیا ہے۔'' ''شاباش'' باپ نے ہمت بڑھائی'' کیا کردار ہے؟'' بچے نے بتایا'' ابو، میں ہیرو لڑکے کے باپ کا کردار ادا کر رہا ہوں۔'' یہ سن کر باپ کا چہرہ مرجھا گیا۔ انہوں نے صابر ہونے کی تلقین کی'' بیٹا! اپنی مس سے کہو تم کو کوئی بولتا ہوا کردار دیں۔''

ایک ہزار میں ایک مرد اپنی مردانگی کی لاج رکھتے ہوئے گھر میں قاہرانہ مرتبے پر فائز ہوتا ہے۔ بقیہ 999 محض MOST OBEDIENT SERVANTS (انتہائی ادنیٰ درجے کے اطاعت گزار نوکر) ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک رفیق کار نے بتایا کہ ایک روز دفتر سے گھر لوٹتے وقت انہوں نے ایک خوبصورت کھلونا خریدا۔ گھر پہنچ کر انہوں نے سب بچوں کو جمع کر کے اعلان کیا "یہ کھلونا اسے ملے گا جو امی کا سب سے زیادہ کہنا مانتا ہے، ان کا ہر کام کرتا ہے اور انہیں جواب نہیں دیتا۔" بچے یہ سن کر سکتے میں آ گئے۔ آخر ان میں سے ایک نے یہ کہہ کر سکوت توڑا "یہ بات ہے تو ابو اسے آپ ہی رکھیے۔"

بیوی کی غیر مشروط اطاعت کا مطلب مالی طور پر اس کے زیر نگیں رہنا ہرگز نہیں ہے۔ نہ ہی یہ رجحان کسی خاص خطے تک محدود ہے۔ برطانیہ کی ایک بڑی کارپوریشن کے صدر نے ایک صبح اپنے سوٹ کو استری کرتے ہوئے بیوی کو یہ کہہ کر شرمندہ کرنے کی کوشش کی "میں شرط لگاتا ہوں اس وقت میں اس شہر کا واحد تاجر ہوں جو اپنے سوٹ کو استری کر رہا ہے۔"

"شاید یہ بات ٹھیک ہے" بیوی نے اتفاق کیا "لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ کل رات تم یہ فریضہ انجام نہیں دے سکے تھے۔"

وہ تو خیر تاجر تھا۔ ایک رپورٹ کے مطابق امریکی صدر بارک اوباما جو دنیا بھر میں ہیرو بنے پھرتے ہیں، اپنے گھر میں محض زیرو ہیں۔ وہاں صرف ان کی بیوی مشل کی مشعل جلتی ہے۔ 'ریڈرز ڈائجسٹ' کی ایک حالیہ اشاعت میں صدر امریکہ کی گھریلو زندگی کے بارے میں ایک فیچر شائع ہوا ہے۔ اس کی ایک تصویر میں موصوف ناشتے کے برتن دھوتے دکھائے گئے ہیں۔ اوباما صاحب ہم سے بھی گئے گزرے نکلے۔ ہم اپنا ناشتہ خود تیار کرتے ہیں لیکن برتن دھونے کے روادار نہیں۔ آخر مردانگی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ تاہم شیدایان وفا کے لیے یہ بات نہایت قابل اطمینان ہے کہ ان کی بیویاں ان پر ہر وقت، ہر جگہ اعتماد کرتی ہیں۔ اس لیے کہ وہ ہر وقت، ہر جگہ ان کے ساتھ رہتی ہیں۔

◆◆◆

ماہنامہ "تخلیق" ستمبر 2016ء۔ ایک جائزہ

تجزیہ نگار: خاقان ساجد

اردو کا معتبر اور معیاری ادبی جریدہ "تخلیق" مجھے آج موصول ہوا۔ "تخلیق" جب بھی آتا ہے اس کے بانی مدیر جناب اظہر جاوید کی یاد خوشبو بن کر میرے قلب و ذہن کو مہکا دیتی ہے۔ کیا ہی باغ و بہار شخصیت تھی۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے اور درجات بلند کرے۔ ان کے صاحبزادے سونان اظہر جاوید بھی بہت سویٹ آدمی ہیں۔ "تخلیق" انھیں ورثے میں ملا۔ والد کی اس امانت کو انہوں نے جس ذمہ داری سے سنبھالا اور اپنی جوان فکری محنت سے اسے جو نئی رفعتیں عطا کیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ شمارہ ستمبر کے لائق مطالعہ مندرجات، عمدہ سرورق اور بروقت اشاعت پر میں سونان اظہر جاوید کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

جائزے

بحرِ تجلیات کا شناور ——— ریاض ندیم نیازی

حسن عسکری کاظمی

عہد موجود میں نعت نگاری کی فروغ پذیری کا مرحلہ جاں فزا، نظر نواز و روح پرور ہے اور نعت نگاروں کو صفِ شعرا میں منفرد مقام عطا کیے جانے کے حوالے سے خوش آئند ہے اور یہ بھی امید کی جا سکتی ہے کہ نعت نگاری کے فیوض و برکات کے نتیجے میں ایک صالح معاشرہ معرضِ وجود میں آئے گا جس کے افراد اپنی صبح و شام زندگی میں صرف اور صرف حضور نبی پاک، ان کی آلِ اطہار اور اصحابِ باوفا کی پیروی کو شعار بنانے پر فخر و مباہات کرتے دکھائی دیں گے۔ پاکستان میں جہاں حافظ مظہر الدین سے علامہ سید محمد ریاض الدین سہروردی تک، حفیظ تائب سے احمد ندیم قاسمی تک، حافظ لدھیانوی سے مظفر وارثی اور شہزاد احمد سے، خالد احمد تک کہکشاں نظر آتی ہے وہاں راجہ رشید محمود، امین راسخ چغتائی، خورشید رضوی، وحید الحسن ہاشمی، قاضی عطاء اللہ، جلیل عالی، نجیب احمد، ریاض زیدی، منظر پھلکی، اعجاز کنور راجہ، اسلم کولسری، عباس تابش، ڈاکٹر عاصی کرنالی، ریاض حسین چودھری، رفیع الدین ذکی قریشی، لطیف ساحل، شہناز مزمل، نورین طلعت عروبہ، رخشندہ نوید، واجد امیر، ناصر بشیر، سرور نقشبندی، عمران نقوی، شہزاد مجددی، تبسم قادری، ارسلان احمد ارسل، عارف رضا اور بہت سے دوسرے شعرائے نعت نگاری میں عقیدت کی جلوہ سامانیوں سے اردو شعر و ادب میں نئے ابواب رقم کیے اسی طرح مرکز سے دور ژوب (بلوچستان) سے ایک مردِ قلندر، شہرت سے بے نیاز اور حرص و ہوس سے پاک، ریاض ندیم نیازی نے نعت نگاری میں امکانات سے بھرپور دامنِ مدحت میں نئی روائف کے درخشندہ ستارے ٹانک کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور بحرِ تجلیات کی امواج پر "کشتیِ حرفِ ثنا" کھینے میں ریاضت سے کام لیا کہ وہ شعرائے مدحت نگاراں میں نمایاں نظر آنے لگے، وہ اپنا تعارف بھی اس حوالے سے پیش کرتے ہیں کہ وہ اول و آخر حمد نگار اور نعت نگار ہیں:

میں ندیمؔ حمد گو ہوں، میں ندیمؔ نعت گو ہوں — بڑی معتبر ہے دیکھو مری شاعری کی صورت
میں نبیؐ لکھتا رہوں، خیر البشرؐ لکھتا رہوں — ان کی مدحت کو بہ اندازِ دگر لکھتا رہوں
عمر بھر میں حمدِ رب اور مدحتِ آقاؐ ندیمؔ — بخش دے مولا جو لکھنے کا ہنر لکھتا رہوں

نعت کہنے کے لیے پہلو میں دلِ گداختہ اور چشمِ بینا کا ہونا ضروری ہے یہ وصفِ خاص کہ طہارتِ قلب و نظر نعت نگاری کا نشانِ امتیاز ہے ریاض ندیم نیازی کا آئینۂ دل حضور نبیؐ محترم کی محبت کا عکسِ جمیل ہے اور ان کی آواز میں لحنِ داؤدی کی جھلک سماعتوں میں رس گھولتی ہے بحرِ عقیدت کا بھرپور اظہار ان کی گفتگو میں اس طرح ہو رہا ہے کہ عشقِ رسالت مآب اور مودتِ آلِ اطہار ان کے رگ و پے میں خون کی طرح رواں دواں رہتی ہے:

لیتا ہے احترام سے آقاؐ کا نام دل — پہچانتا ہے عظمتِ عالی مقام دل
خاطر میں جب سے لاتا نہیں بادشاہوں کو — جب سے ہوا ہے سرورِ دیں کا غلام دل

آج ہم دنیا میں اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ ہم حقیقی معنوں میں وہ طرزِ عمل اختیار کریں جو خوشنودیِ محبوبِ خدا کا سبب بن سکتا ہے۔ یہی وہ طرزِ احساس ہے جو ریاض ندیم نیازی کے ہاں بیشتر نعتوں میں قاری کے لئے تمام تر توجہات کا تقاضا کرتا ہے۔

اتباعِ رسولؐ لازم ہے ہونا چاہو اگر خدا سے قریب
چاہتے ہو جو عمر بھر توحید تم رہو ذاتِ مصطفیٰؐ سے قریب

کاش ہم سب بڑوں سے ان کی وابستہ رہیں ان کا اسوہ ان کی سنت باغِ جنت کا گلاب

ردائف پہلی نعت میں احتیاط لازم ہے۔ شعوری طور پر ایسے مضامین تلاش کئے جاتے ہیں جو ردیف سے مطابقت رکھتے ہوں اور شاعر نعت کی مشکلات میں جہاں ایک طرف اضافہ ہو جاتا ہے وہاں شعر کی مجموعی فضا میں الفاظ کی دروبست کا اہتمام اور حسنِ مضمون پر نظر رکھنے کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ ریاض ندیم نیازی نے حرِ تجلیات میں جہاں ایک طرف حمد میں ردیف کو نبھایا وہاں دوسری طرف نعت میں یہ احتیاط برتی کہ روایتی نعت نگاری سے دامنِ مدحت کو وسیع تر بنایا البتہ ایسا بھی ہوا کہ دبستانِ وارثیہ کی پیش کش کو قبول کرتے ہوئے انہیں اس پابندی سے واسطہ پڑا اور یہ سوچنا پڑا ہوا کہ

ع اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

خصوصاً ایسی ردائف جیسے چراغ، ارتقا، یقین، آنکھوں، پھر، ضرور اور التجا وغیرہ سے عہدہ برآ ہونا آسان کام نہیں۔ اس قسم کی روایتی بندشوں سے آزاد رہنا بھی ضروری ہے تاکہ فکر و نظر کو عقیدت کی میزان میں رکھ کر نئے گوشوں کا ادراک بھی شاعر کے لئے مہمیز کا کام دے۔ ریاض ندیم نیازی نے تقریباً ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل نعتوں کا مجموعہ نذرِ قارئین کیا اس مجموعے میں ہمعصر نعت گو شعرا اور ناقدین کی آرا کی بدولت قاری کو ان کے مقام و مرتبے سے آگہی حاصل ہوئی سب سے اہم بات جو پہلی نظر میں قاری کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی ہے۔ وہ یہی ہے کہ احترامِ آدمیت کا تصور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ حضور پر نور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور ان کا گھرانہ ہر اعتبار سے عالمِ انسانیت میں اپنی انفرادیت بحال رکھے ہوئے ہیں، آج بھی دنیا میں امن و سلامتی اسی صورت میں قائم رہ سکتی ہے کہ اولادِ آدم دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھے، دوسروں کے لیے وہی چاہے جو اپنے لیے پسند کرے۔ ریاض ندیم نیازی نے کمال ہنرمندی کے ساتھ حرِ تجلیات میں کششِ مدحتِ محمد و آلِ محمدؐ روا رکھی اور مضامین کے گل بوٹے رنگا رنگ سے ہماری چشمِ تمنا کے روبرو تزئین آرائشِ فردوسِ بریں کا اہتمام کیا۔ یقیناً دنیا اور آخرت میں اس نیک عمل کا صلہ بصورت رضائے الٰہی اور خوشنودیِ محمد و آلِ محمدؐ ملے گا۔

- دلکشی دونوں جہان کی ہے محمدؐ کے طفیل آپؐ کے جلوے کراں سے تا کراں آراستہ
- مسکراتے ہیں سرِ شاخِ علی و فاطمہؓ اور کھلے ہیں کربلا میں گلشنِ آقا کے پھول
- جو بات ان کے لبوں سے نکلی دلوں میں سب کے اتر گئی ہے ہر ایک لفظ ان کا دلنشیں ہے نہیں ہے ان سا خطیب کوئی

◆◆◆

"آواز"......نئی آواز

مسلم شمیم

حسین مجروحؔ کا دوسرا شعری مجموعہ "آواز" میرے نزدیک مکمل کشید کی آواز ہے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "کشید" تقریباً چودہ برس قبل شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل تخلیقات اور زیر نظر مجموعے میں شامل تخلیقات اپنے جمالیاتی محاسن و خصوصیات کے اعتبار سے تخلیق اولیں کہلانے کی مستحق ٹھہرتی ہیں۔ فکر و فن اور جذبہ و احساس کو نئے دروبست اور پیکر میں پیش کیے جانے کا ادراک مجموعہ کلام کا مطالعہ عطا کرتا ہے۔ "کشید" کا سرنامہ شعر:

امید ایسی چڑیا جس جا بھی گھر کرے ۔۔۔ دامن کو بے مراد تو باطن کو تر کرے

"آواز" کے پس ورق پہ درج یہ شعر:

جو سمت کو آ رہی تھی، وہ لپٹی ہے پاؤں میں ۔۔۔ بارش کے بعد خاک کی سیرت بدل گئی

مذکورہ دونوں اشعار میں حسین مجروحؔ کی تخلیقیت کی رواں دواں لہریں ایک جیسی ہونے کے ساتھ ساتھ معنوی جہات کی نشان دہی بھی کرتی ہیں اور ان کے شعور و ادراک کے عمل ارتقا کی ترجمان ہیں۔ حسین مجروحؔ عصرِ زندگی کے ان حقائق سے بخوبی آگاہ ہونے کے ساتھ ان کے محرکات سے بھی باخبر ہیں۔ وہ آج کے انسان کو درپیش دکھ اور مصائب و آلام کا ادراک بھی رکھتے ہیں اور احساسِ کرب بھی۔ وہ انسانی معاشرے کو درپیش نئے خطرات و مسائل کا علم بھی ان کے پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ رکھتے ہیں۔ ان کا جہانِ فکر و دانش وقت کے ساتھ وسیع تر ہوتا گیا ہے اور ان کی دروں بینی کیفیتی اور کمیتی ہر دو اعتبار سے وسیع اور زیادہ متنوع دکھائی دیتی ہے:

افق کے دل سے لہو پہ یہ انکشاف ہوا ۔۔۔ کہ گھر جلانے سے آب و ہوا بدلتی ہے

عجب روانی دریائے خوف ہے، مجروحؔ! ۔۔۔ کہ پاٹ خشک ہے اطراف میں چڑھا ہوا ہے

زیر نظر مجموعہ "وقت" کے نام منسوب ہے۔ یہ انتساب بڑی معنویت کا حامل ہے بلکہ پورے اوراق و صفحات میں مرقوم اور محصور موضوعات و مندرجات کا آئینہ نما ہے۔ اسی زمرے میں "کوک" کا آخری پیرا گراف بھی پڑھا جانا چاہیے:

"جبر و قدر کے کھٹ راگ سے قطع نظر شاعری فطرت کی دیوار نہیں ہوتی کہ ٹکرانے کے خوف سے منتظر ہو کر رہ جائے، اسے تو پوری زندگی سے معاملہ ہوتا ہے، یعنی وہ جسے ہم بسر کرتے ہیں اور وہ جو ہمیں گزارتی ہے۔ وقت اور کائنات کی تفہیم تو شاعری کا اہم اقلیم ہے ہی، واقعہ یہ ہے کہ آدمی کے ٹوٹنے جڑنے کا ماجرا بھی شاعری کے لازم وظائف میں شامل ہے۔" حسین مجروحؔ نے اپنی یہ بات اس فقرے پہ ختم کی ہے: ""آواز" کو اسی میزان پر تولیے گر

"محبت کا سرمایہ کار"۔ "وقت کے دام" کا انتساب ناقابلِ اعتنا نہیں ہے ــــ وقت جو ازل سے ابد کو محیط کیے ہوئے ہے، جس کی ابتدا اور انتہا کی کوئی بات نہیں کی جا سکتی وقت جو اپنے دامن میں ماضی و حال اور مستقبل کے تمام ادوار کو سمیٹے ہوئے ہے، اپنے اندر جلووں کی کہکشائیں بسائے ہوئے ہے۔ "آواز" کو میں مذکورہ انتساب کے تناظر میں نئی آواز کہتا ہوں۔ زیرِ نظر مجموعے کی تمام تر تخلیقات وقت کی سحر کاریوں اور جلوہ سامانیوں کو اپنے دائرۂ اثر میں محصور کیے ہوئے ہیں جن کا اطلاق مجموعے میں شامل ہر دو اصناف یعنی غزل و نظم پر یکساں ہوتا ہے۔ ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

مجروحؔ! عاشقی بھی ہے تاریخ کی طرح — راوی بدل گیا تو روایت بدل گئی

ان دو مصرعوں میں عشق کا بیان تاریخ کے حوالے سے ہے، گویا تاریخ میں محفوظ و مرقوم کیے گئے واقعات، حادثات اور سانحات عہد بہ عہد نظرِ ثانی کے مراحل سے دوچار ہوتے آئے ہیں۔ مذکورہ مصرعوں میں "عاشقی" کو وسیع تر تناظر میں دیکھا اور سمجھا جانا چاہیے۔ زیرِ نظر مجموعے کی نظموں میں جو تاریخی شعور اور تاریخی تناظر قارئین کو دورانِ مطالعہ نظر آتے ہیں، وہ حسین مجروح کے یہاں فکر و دانش اور کتابِ بصیرت و بصارت کے ابواب تصور کیے جانے چاہئیں۔ اس مرحلے پر ان کی متعدد نظمیں براہِ راست معنویت کا حوالہ ابھرتی ہیں۔

زیرِ نظر مجموعے کی ایک ابتدائی نظم جس کا عنوان ہے "کئی طرح جن نذر رقار" کچھ یوں ہے:

ہم کہانی ہوئے / ان کے موسموں کی کہانی جنہیں / زندگی نے / قصیدوں سے خارج کیا / وہ دہ اور موسم کہ جن کے ہرن / گھر کی دھوپ میں / آ رہی ہوئے / جن کی آنکھوں میں چلتے ہوئے عاشقے / بے یقین راستوں میں قتولی ہوئے / اب کہاں جائیں ہم؟ / داستانوں کی پر پیچ گلی میں / کوئی راہ داری ہماری نہیں / کسی زرد موسم کی چوکھٹ پہ ہم نے / کوئی جز اتاری نہیں / ہم کہاں جائیں جو حسن جوانی لیے / اور رنگی ہوئی سانس والی / زباں کی روانی لیے / جو سوالوں کی وحشت کو سمجھی نہیں / اور پرچھائیوں سے گزرتی گئی / انگلیوں کا وظیفہ بدلتی نہیں / ہم جو موجود ہیں / آنجہانی ہوئے / وقت کی ریت میں دفن ہوتی ہوئی / ایک ندی کی آنکھوں کا پانی ہوئے / ہم کہانی ہوئے /

"آواز" میں نظموں کا غلبہ ہے بلکہ پلڑا بہت بھاری ہے۔ نظموں کے موضوعات بھی مختلف اور منفرد ہیں اور ان نظموں کی فضا میں زندگی، حقائق، مسائلِ زیست اور معاملاتِ خیر و شر سے بھی مزین ہیں اور ماورائی آوازوں کی گونج اور صدائے بازگشت سے قارئین کو اپنے حصار میں محصور رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں دل دردمندی کی دھڑکنیں بھی جادو جگاتی ہیں اور ادراک و شعور کے در وا کرنے کا فریضہ بھی انجام پاتا نظر آتا ہے۔ تخلیق کار کہیں کبیر داس کی طرح گرد و پیش میں پھیلی ہوئی دکھوں کی چادر میں لپٹی فکر کو اپنی تخلیقات کا عہد نامہ قرار دیتا ہے اور کہیں گوتم بدھ کی طرح ان دکھوں سے نجات پانے کی جستجو میں سرگرم ہو کر نروان کے حصول کا خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر کی تلاش بھی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

ان نظموں کی طلسماتی فضا میں قارئین کے کھو جانے کے امکانات روشن تر نظر آتے ہیں۔ شاعری میں تخیل کی پرواز اور تصور کی آئینہ گری کو اساسی حیثیت حاصل ہے اور محض موزونیت روحِ شاعری نہیں ٹھہرتی۔ حسین مجروح کے یہاں ان کی نظموں میں تخیل کی پرواز کی حدیں غیر متعین ہیں اور تصور کی صورت گری بھی لا محدود اڑان میں سرگرمِ عمل نظر آتی ہے۔ نظموں کا سرسری مطالعہ قاری کو بار بار تمام تر توجہ اور غور و فکر کے ساتھ حصولِ تفہیم کے لیے مجبور کرتا ہے۔ حسین مجروح کی نظموں کا مطالعہ گویا ہم قاری کو سوچنے پر آمادہ کرتا رہتا ہے اور جہاں

معنی سے روشناس کرانے کا فریضہ بھی انجام دیتا رہتا ہے۔ قاری کو چونکانے اور حیرت کدے میں گھیرے رکھنے کا بھرپور التزام بھی ان تخلیقات میں پایا جاتا ہے۔

حسین مجروح کی تخلیقات سنجیدہ اور گہرے مطالعے کی متقاضی ہیں۔ سرسری اور روا روی میں ان نظموں سے آشنائی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ ان نظموں کی دنیا بیسویں صدی کی دنیا نہیں بلکہ اکیسویں صدی کی دنیا ہے جس کے عشرے صدیوں پر بھاری ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے کی تخلیقات خصوصیت کے ساتھ نظموں کے حوالے سے قاری کو ان کی تفہیم میں اس قسم کے Challenge سے واسطہ پڑتا ہے اور کہیں کہیں نارسائی کے صدمات سے بھی دوچار ہو سکتا ہے۔ "آواز" کی نظمیں جدید سے آگے کی جدید تر صنفِ سخن کے زمرے میں آتی ہیں۔ یہاں مختلف اسلوبِ بیاں کو اظہار کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ یہ نظمیں غیر پابند صنف کی نظمیں ہیں جو آزاد نظم کی اصطلاح سے موسوم کی جاتی ہیں۔ اس نوعِ سخن میں کلیدی اہمیت خیال اور خیال کی نغمگی کی ہے۔ نثری نظم جس میں سرے سے وزن و بحر اور موزونیت کا تصور ہی نہیں ہے، وہاں بھی خیال کی خوبصورتی اس صنفِ سخن کا جواز قرار پاتی ہے۔ اس باب میں جناب علی سردار جعفری کا کہنا ہے کہ نثری نظم کی صنف کو سرے سے رد کرنا غلط ہے۔ ان کے نزدیک نثری نظم کے ساتھ انصاف اسی وقت ہو سکتا ہے جب تخلیق کار کی عملِ تخلیقیت درجۂ اولیٰ یعنی Perfection کے معیار پر پوری اترتی ہو۔ اس صنفِ سخن میں بھی خیال کی نغمگی کی شرط کو لازمی عنصر قرار دیا گیا ہے۔ حسین مجروح کی نظمیں نثری نظم کے قبیلے کی نہیں ہیں بلکہ آزاد نظم کی صنف کے سارے لوازم و شرائط پر پوری اترتی ہیں۔ جہاں خیال کی نغمگی اور آہنگ کی عمل داری قاری کو عالمِ سرشاری سے ہم کنار رکھتی ہے۔ ان نظموں کا آکشن خصوصیت کے ساتھ میری نظر میں بڑی معنویت کا حامل ہے۔ یہ آکشن صرف جدید تر ہی نہیں بلکہ نئے جہانِ معنی کی نشان دہی سے بھی عبارت ہے۔ ان نظموں میں ابھرنے والا منظرنامہ ادب کے افق پر نئے چاند، سورج اور ستاروں کی جلوہ گری کا سامان بہم کرتا ہے۔ ان نظموں میں روایتی اور پیش پا افتادہ استعارات، تلمیحات و تشبیہات نظر نہیں آتیں بلکہ یہ سب یکسر تازہ تر ہم عصریت کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ دیومالائی کرداروں جیسے پدمنی اور زلیخاؤں کے ذکر کے ساتھ عہدِ جدید کے چہرے اور پیکر بھی قارئین کی نگاہوں میں آیا جاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ جناب مجروح کی بلند آہنگی جہاں حسین مجروح کے مزاج کا حصہ ہے، وہیں یہ بلند آہنگی نئی سج دھج کے ساتھ ان کی پوری شاعری میں جھلکتا [illegible] نظر آتی ہے۔ ان کی خوش کلامی میں سرخوشی کا عنصر نہیں اور زیرِ لب اظہار کے بجائے ان کے قہقہوں کی گونج ان کی شخصیت کے تنوع میں اضافے کا سبب ٹھہرتی ہے۔ تخلیق کار کی شخصیت کا عکس اس کی تخلیقات ہوتی ہیں سو "آواز" کی نظموں اور غزلوں میں یہ ہمہ آہنگی قارئین کو ہر مقام پر نظر آئے گی۔

حسین مجروح نے تخلیقِ غزل کے مراحل میں یقیناً پوری سنجیدگی اور عرق ریزی سے کام لیا ہوگا مگر کہیں بھی مجھے ان کے ہاں وہ میکینیکل پروسس نظر نہیں آیا جو شعر بنانے اور مصرع سازی کے لیے ضروری بتایا گیا ہے۔ میں اس بات کا قائل ہوں کہ شاعری کے لیے مراقبے اور مجاہدے کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر بنیادی بات یہ ہے کہ شاعری بطونِ ذات کا اظہار ہے جس کے لیے جذبہ و احساس کے اظہار میں خلوص و صدق کے عناصر کی کارفرمائی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ شاعری کو Devine Madness بھی کہا گیا ہے، اور اس ضمن میں غالب کے ہاں

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں　　غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

علامہ اقبالؔ کے ہاں

بات جو دل سے نکلتی ہے، اثر رکھتی ہے　　　　پر نہیں، طاقتِ پرواز مگر رکھتی ہے

شاعری کا یہ منصب شعر بنانے، مصرع سازی اور اس ضمن میں توڑ جوڑ کی بات مجھے کچھ عجیب لگتی ہے۔ شاعری میں تخلیقیت کے مراحل اور تقاضوں کی کاریگری اور ہنرمندی سے تعلق روحِ تخلیق سے متصادم ٹھہرتا ہے۔ اچھی بات یہ ہے کہ حسین مجروحؔ نے فنی دروبست پر بھرپور توجہ دی ہے اور ان کی پوری شاعری میں یہ فنی دروبست کچھ اس طور عملِ تخلیق میں شامل ہے کہ جس کے نتیجے میں جذبہ و احساس کی تپش کے ساتھ فکر و شعور کی بلند پروازیاں ان کی تخلیقات میں بصارت کی کثیر الجہتی پر دال ہیں۔ بہرحال ان کے ہاں مصرع سازی اور شعر بنانے کا مشینی عمل کہیں نظر نہیں آتا۔

نظم و غزل، ہر دو اصنافِ سخن میں حسین مجروحؔ سفرِ ارتقا میں سرگرم شعر نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں میں مجھے اختر الایمان، ن۔ م۔ راشد اور مجید امجد کی تخلیقات میں لوئی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ وہ کلاسیکی روایات سے یکسر منحرف نظر نہیں آتے مگر وہ ان کے حصار میں مقید بھی نظر نہیں آتے۔ وہ جدید روایاتِ سخن کو جدید تر دائروں میں لانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ انھوں نے متعدد مشکل اور نامانوس ردیف کے ساتھ بڑی کامیاب غزلیں کہی ہیں جن میں سے چند غزلوں کے مطلعے نذرِ قارئین کرنا بے محل نہیں ٹھہرتا:

- دل جو گردابِ خط و خال میں جا پہنچا ہے　　　　اک بگولا ہے کہ بھونچال میں جا پہنچا ہے
- خوشبو بکھیرتی ہوئی، گاتی ہوئی ہوا　　　　اس کی گلی سے لوٹ کے آتی ہوئی ہوا
- کشتی ہے غم کی اور کنارا ہے آنکھ کا　　　　وحشت میں جو نمک ہے، وہ سارا ہے آنکھ کا
- رابطہ کچھ نہیں خوشبو کا یہاں پھول کے ساتھ　　　　تخت ہو جیسے خفا اپنے ہی معزول کے ساتھ

ان غزلوں میں ردیف جس طرح برتی گئی ہے، اسے کمالِ ہنرمندی نہ کہنا کم نظری اور ذہنی بخل سے کام لینے کے مترادف ہے۔ یہ ساری غزلیں سیر حاصل بھی ہیں اور حسنِ غزل کی تمام تر آسائشوں سے سجی ہوئی بھی اور جذبہ و احساس کی تپش اور فکر و خیال کی رعنائیوں سے بھی مالا مال ہیں۔ ان غزلوں میں صنفِ غزل کا سفرِ ارتقا بہتر طور پر قارئین کو نظر آئے گا اور "تنگنائے غزل" کی کسی کو شکایت نہیں ہوگی۔ غرض یہ کہ حسین مجروحؔ اپنے زیرِ نظر شعری مجموعے "آواز" میں اپنے پہلے شعری مجموعے "کشید" سے بہت آگے کے ہمالیائی مراحل اور منازل طے کر کے اپنی ایک پہچان کے ساتھ کاروانِ شعر میں ایک بڑے اور نمایاں منصب کے ساتھ گامزن دیکھے جائیں گے ایک لالٹین کے ساتھ:

ہوائے شوق سرِ شام جب بھی چلتی ہے　　　　تو دل کے طاق میں اک لالٹین جلتی ہے

"لالٹین" یہاں نئی لفظیات کی نمائندگی کرتی ہے، وہیں یہ روشنی کی علامت بھی ہے۔ حسین مجروحؔ نے آشوبِ وقت کے اندھیروں کے شعریت سے بھرپور تخلیقی بیان میں اپنے جہانِ فکر و فن کو اندھیروں کے حصار سے بہت دور رکھا ہے۔ "آواز" جسے میں نے نئی آواز کہا ہے، وہ دراصل روحِ عصر کی ترجمان اور ضمیرِ وقت کی آواز ہے۔ اپنی ایک نظم کے دو مصرعے نذرِ حسین مجروحؔ ہیں:

ضمیرِ وقت کی آواز دل گرفتہ ہے　　　　قبیلہ اس کا بھی سقراط کا قبیلہ ہے

◆◆◆

''جرسِ بے صدا'' پر تجزیاتی نظر

پروفیسر محمد جلیل الرحمٰن

میرے نزدیک ''جرسِ بے صدا'' احساسِ کرب کی ایک صدا ہے۔ Poetry belongs to the realm of literature یعنی شاعری اقلیمِ ادب کی ایک صنف کا نام ہے۔ ادب کا کینوس اتنا وسیع ہے کہ کوئی بھی Branch of knowledge (برانچ آف نالج) اسے محیط نہیں کر سکتی۔ خصوصاً جدید گلوبل ویلج کے تصور نے ادب کی حدود کو لامحدود کر دیا ہے۔ آج چہرہ ارض کے کسی خطہ پر ابھرنے والے نقش میں اتنی کشش پائی جاتی ہے کہ بلا تامل اسے افسانے اور شاعری کا مرکزی نکتہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ طبعی علوم (Natural Science) یا معیاری علوم (Norvative Science) میڈیکل اور انجینئرنگ سائنسز میں آئے دن نئے انقلاب کا رونما ہونا ادب کے دامن کو وسیع تر کرنے کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کیا اس سے ادب کے معیار اور وقار میں بھی اضافہ ہوا ہے؟ — یہ سوال اتنا اہم ہے کہ ادب کے ذی شعور نقادوں کو امید سے بالاتر کر رکھ دیا ہے۔ انسانی نفسیات کا المیہ یہ ہے کہ ''احسن تقویم'' کا شرف حاصل کرنے والا حضرت انسان فطری لحاظ سے کمزور، حاسد، ظالم، جلد باز اور جاہل بھی ہے۔ وہ طاقتی حادثات و واقعات سے متاثر ہو کر اپنی ذاتی توانائیاں اسی کے لیے مخصوص کر دیتا ہے یوں ادبی اصناف اسی احساس کی نذر ہو جاتی ہیں — ادب حقیقی معنوں میں قلبی احساسات کی ترجمانی کا نام ہے۔ ادب دل کے دھڑکنے کی قلمی تصویر ہے — یہ کسی تحریک، نفرت یا گروہ کی ترجمانی سے منسلک نہیں ہو سکتا — تقسیمِ ہند کے مابعد جب ادب کی ہر صنف پر فسادات کے رنگ نمایاں ہونے لگے اور ادیبوں کی سوچ کرب کی چادر میں لپٹ گئی، تو پروفیسر حسن عسکری کو کہنا پڑا کہ ادب کی موت واقع ہو گی۔

شاعری کا دوسرا تصور یہ بھی ہے کہ ''شاعری جزویست از پیغمبری'' یعنی شاعری کا مقام اتنا ارفع ہے کہ اسے پیغمبری کا جزو قرار دیا جا سکتا ہے بلاشبہ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں کہ ایک شعر سے ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی جو پند و نصائح کے دفتر کھولنے سے نہیں ہوتی

بوئے جولیاں آید ہمیں　　یاد یار مہرباں آید ہمیں

رودکی کے اس مشہور قصیدہ کو سن کر شہزادہ فوراً بخارا کی جانب چل پڑا تھا۔ حالانکہ اس سے قبل وہ اپنے مشاغل میں اس قدر مصروف تھا کہ وہ بخارا کی جانب مڑ کر بھی نہیں دیکھتا تھا — شعر کی تاثیر اور افادیت بہر حال ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

لیکن ہمارے بزرگ شاعر جوہر نظامی نے یہ شعر کہہ کر اس پر خطِ تنسیخ پھیر دیا۔

کیا ملا ہم کو شاعری کر کے　　خاک چھانی پیمبری کر کے

میں اسی نظریے کے تحت جب آفتاب راہی کی شخصیت اور فن کا تجزیاتی مطالعہ ان کے شعری تخلیق ''جرسِ بے صدا'' کے ذریعے کرتا ہوں تو مجھے ہرگز کسی عرق ریزی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ بڑی آسانی ہوتی ہے مجھے ان کے پورے خانوادے کی کتاب زندگی کے ورق ورق پڑھنے کی سعادت حاصل ہے۔ راہی آفتاب اکیلا آفتاب نہیں بلکہ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' شاعرانہ مزاج اور ادبی ذوق

اس خاندان کی وراثت ہے۔ آفتاب کے والد گرامی ممتاز الشعراء جو ہر الطافی کے شاعری کے مجموعے "لوحِ محفوظ" اور "دھیمے سُر" مستند اہمیت کے حامل ہیں ان کے بڑے بھائی حسن اختر جلیل کی شعری تخلیق "مقتل میں چراغ" کو مقبول حیثیت حاصل ہے۔ ان کے دوسرے بھائی مظفر حسن منصور کی شعری تخلیق "اک دورِ محبت بیت گیا" کو بڑی پذیرائی ملی۔ "جرسِ بے صدا" کے فنی محاسن کی تلاش میں پہلی دستک جو دل پر محسوس ہوتی ہے۔ وہ نام کی خوبصورتی ہے۔ کسی شعری تخلیق کا اس قدر خوبصورت اور پرکشش جاذب نام میری نظر سے نہیں گزرا۔ یہ انتہائی گہرے وجدانی احساس و کیفیت کی ترجمانی ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ لوگ فن کی تفہیم و تجزیے اور معیار کا مقام اپنے ذوق کے مطابق کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات حتمی ہے کہ تخلیقی عمل میں شعورِ حسن کا مرکزی عنصر ہے۔ حسن تخلیقی ادب میں عصری اور فکری شعور کے احساس کا نام ہے۔ ماہی عہد سے الگ کسی فن پارے کی اہمیت کا معیار و قدر طے نہیں کی جا سکتی اور کسی فن پارے کا اصل معیار ہی احساسِ حسن ہے جو اس کی تکمیل کرتا ہے۔

شاعری کا معیار رضیہ آفتاب نے حسن و خوبی برقرار رکھا ہے شاعر کا حساس دل کلی کے کھلنے کی مسکراہٹ اور دل کے ٹوٹنے کی آواز بھی محسوس کر سکتا ہے۔ جسے عام انسان درخورِ اعتنا بھی نہیں گردانتا۔ خوبصورت اشعار سے لطف اٹھائیے ۔

برق نے مسکرا کے دیکھ لیا   شاخ پر میرا آشیانہ بھی
سست رو ہے میرا مقدر بھی   برق رفتار ہے زمانہ بھی
آپ جس راہ سے گزرتے ہیں   اس طرف ہے غریب خانہ بھی

عصرِ جدید کے تہذیبی تغیّر افسردگی، بے چینی، مایوسی و احساسِ تلخ اقدار ہیں جو ہر فنکار کے دل و دماغ کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ اس کے دباؤ سے اس کی روح گھائل ہو جاتی ہے احساسِ کرب انگڑائی لے کر جاگ اٹھتا ہے۔

لیکن جدید نظریے کے مطابق کرب کا احساس انسان کو کندن بنا دیتا ہے زندگی کے مخفی ترین گوشے صرف لذتِ کرب سے عیاں ہوتے ہیں شاید شرحِ صدر بھی اس درد کے وصف سے حاصل ہوتا ہے۔ جسے رضیہ آفتاب یوں بیان کرتے ہیں ۔

درد مندی کا تقاضا ہے یہی   درد کو سینے میں پلنا چاہیے

میرا راتوں کو اٹھ کر بیٹھ جانا جاگتے رہنا   کہ جیسے خوف سا آنے لگا ہو اس زمانے میں

وقت کا یہ دستور رہا ہے   سولی پہ منصور رہا ہے
میرے دل کا حال نہ پوچھو   اکثر چکنا چور رہا ہے

لذتِ کرب کا وصف یہ ہے کہ جب یہ احساس اپنے عروج پر پہنچتا ہے۔ تو درد کی چبھن ختم ہو جاتی ہے یعنی "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا"۔ یا پھر "مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں" اس کیفیت کو رضیہ آفتاب یوں رقم کرتے ہیں ۔

اب مجھے کچھ برا نہیں لگتا   ظلم بھی ناروا نہیں لگتا
چار جانب کھڑی ہیں دیواریں   قید سے دل رہا نہیں لگتا

میرے خیال میں ہر حساس فن کار اس منزل پر جلد ہی پہنچ جاتا ہے۔ کسی نے کہا تھا "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ساز" یعنی اگر زمانہ تیرے ساتھ مطابقت نہیں کرتا تو تو زمانے کے ساتھ مطابقت اختیار کر۔ لیکن اسے شرفِ انسانیت کی نچلی سطح قرار دیا گیا ہے۔ اعلیٰ سطح یہ کہتے ہیں "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز" یعنی اگر زمانہ تیرے ساتھ مطابقت نہیں کرتا تو زمانے کے ساتھ لڑ جا۔ لیکن آج کے دور میں یہ ناممکن سا محسوس ہوتا ہے۔ معاشرتی گھٹن اختلافِ رائے کو برداشت نہیں کرتی بلکہ اختلافِ رائے رکھنے والے انسان کا جینا حرام کر دیتی ہے۔ یوں ایک شریف انسان آگے بڑھ کر برائی کو کیسے روک سکتا ہے اسے ہر لمحہ اپنے دامن کو داغ سے بچانے کی فکر رہتی ہے۔ یوں رضیہ آفتاب ایک شریف انسان اور باکمال شاعر کے طور پر یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ:

غیر مجھ سے گلے نہیں ملتا — جا بجا بھی سرا نہیں ملتا
اب تو اپنے بھی غیر لگتے ہیں — کوئی بھی آشنا نہیں ملتا
پارسائی بھی ہے ریاکاری — اب کوئی پارسا نہیں ملتا

◆◆◆

ماہنامہ "تخلیق" ستمبر 2016ء۔ ایک جائزہ

تجزیہ نگار: ابنِ عاصی

خوبصورت اور دیدہ زیب ٹائٹل سے مزین جناب سونان اظہر کا ماہنامہ "تخلیق" ستمبر 2016ء میرے سامنے موجود ہے۔ سونان اظہر نے "کچھ باتیں" کے تحت نہایت شاندار انداز میں ہمارے دل کی بات کی ہے۔ اردو ادب کے لیے جذبے کو دوستی سے فراموش کرنے کا شکوہ کیا ہے جس سے ان کے اندر کا ایک دردمند ادیب ابھر کر آیا ہے اور ان کے اس ادارتی نوٹ کو پڑھ کر خاکسار کو ان کے والد اظہر جاوید کی یاد آ گئی۔ آگے چل کر سونان نے اردو ادب کی بے بسی اور بے کسی کی کہانی سنائی ہے۔ لیکن اس کی حیثیت کیا ہے؟ ہماری حد درجہ اور انگریزی پرست بیوروکریسی ہمیں قیامِ پاکستان سے لے کر آج تک اچھی طرح سے ستاتی آ رہی ہے اور اب سپریم کورٹ نے بھی اردو زبان کے حق میں آواز اٹھائی۔ سونان نے ہر کسی کو شرم دلانے کی سعی کی ہے لیکن بھلا نقار خانے میں طوطی کی کون سنتا ہے؟ مگر جلد سونان اظہر نے اپنا فرض ادا کیا۔ سونان نے ایک خوش خبری سنائی ہے کہ بہت جلد وہ احباب سے مل کر اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے "تخلیق ادبی فورم" تشکیل دے رہے ہیں اور اسی طرح "تخلیق ایوارڈ 2016ء" کا اعلان بھی کرنے لگے ہیں۔ میں انہیں پیشگی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ ڈاکٹر انور سدید کی آپ بیتی "دن ڈھل چکا" سے کون لطف اندوز نہیں ہوا۔ مرحوم میرے پسندیدہ لکھنے والوں میں سے تھے۔ امجد اسلام امجد، ڈاکٹر سعید یاروں اور ڈاکٹر جواز جعفری نے بھی خوب رنگ جمایا۔ افسانوں میں رشید امجد، نیلم بشیر اور آمنہ مفتی نے متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ غزلوں میں سعود عثمانی، گستاخ بخاری اور منظور حسین یاد کی غزلیں پسند آئیں۔ ماہنامہ تخلیق 47 سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے اور اس نے معیار برقرار رکھا ہے جو اچھی بات ہے۔ امید ہے سونان اظہر مستقبل میں بھی اس معیار پر کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے۔ قیمت فی شمارہ /150 — صفحات 160۔

طارق حبیب کا اوّلین مجموعۂ نظم 'ملامت'

اخلاق عاطف

1980 کی دہائی کے آخری برسوں میں خوشاب کے باسی، اپنی انیس بیس سال عمر سے زیادہ پختہ شعر کہنے والے ایک نوجوان کی عمدہ شاعری نے خوشاب اور اس کے پڑوسی اضلاع کے سینئر شعرا کی مہربان توجہ اور خوش ذوق سخن فہموں میں خاص پذیرائی حاصل کی تھی۔ تواتر شعر کہنے کے علاوہ ادب کی ترویج کی لگن سے سرشار اس نوجوان نے کالج کے زمانہ طالب علمی میں ہی اپنے شہر کی نمائندہ ادبی تنظیم بزمِ فکر و فن کے سیکرٹری کی ذمے داریاں بہ حسن انجام دینے کے ساتھ خوشاب سے پہلے سہ ماہی ادبی مجلے 'شبیہ' کا اجرا بھی کیا تھا۔

ماں کی ممتا بھری چھاؤں کو اپنی قیمتی متاعِ حیات جاننے والے اس نوجوان شاعر کو مزید حصولِ تعلیم کے شوق کی تکمیل کے لیے جب خوشاب سے لاہور جانا پڑا تو میں جانتا ہوں کہ اس نے ممتا کی مہربان چھاؤں سے دوری، مجبوری کی کس شدت کے ساتھ گوارا کی تھی۔ خوش قسمتی سے وہاں ڈاکٹر صاحب زادہ معین نظامی کی مشفق فکر، رہنمائی نے اس نوجوان کو کسی قدم پر بھی ڈگمگانے نہیں دیا۔ نتیجتاً کم بہتر گھریلو معاشی حالات کے پیش نظر یہ نوجوان اپنی تعلیمی کفالت کے لیے بڑی محنت سے جز وقتی ملازمتیں بھی کرتا رہا اور ایم اے اردو کی فرسٹ کلاس ڈگری کے حصول میں بھی سرفراز ہوا تھا۔

اسی دوران اس نوجوان کا کنبہ خوشاب سے لاہور منتقل ہو چکا تھا اور یہیں 1997ء کے اوائل میں اسے ممتا کی راحت بھری چھاؤں سے دائمی جدائی کا صدمہ بھی سہنا پڑا تھا۔ وصیت کے مطابق جس کا مدفن سرگودھا میں بنایا گیا۔ بعد ازاں یہ نوجوان اپنے اہل خانہ کے ساتھ مستقلاً سرگودھا میں آ بسا تھا۔ محض چند برسوں میں ہی یہ نوجوان سرگودھا کی ادبیات کا اہم حصہ اور یہاں کی ادبی تہذیب کا سرگرم کردار بن چکا تھا، اور اب جب کہ اس کے بالوں میں کہیں کہیں کپاس بھی اتر آئی ہے تو آج وہ یونی ورسٹی آف سرگودھا کے شعبۂ اردو سے وابستہ محقق استاد، اسسٹنٹ پروفیسر طارق حبیب کے نام سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ طارق حبیب نے چند سال قبل مشتاق احمد یوسفی کے فکر و فن پر تحقیقی کام بھی کیا تھا جو 'یوسفیات' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہو کر اہلِ نقد و نظر سے خاصی پذیرائی حاصل کر چکا ہے۔ یہ کتاب یوسفی صاحب کے بارے میں پہلی مکمل تصنیف کا درجہ بھی رکھتی ہے۔ اس کے بعد ن۔ م۔ راشد پر طارق حبیب کی تحقیق و تالیف و ترتیب 'کشفِ ذات کی آرزو کا شاعر' منظرِ عام پر آئی اور اب حال ہی میں طارق حبیب کا اولین مجموعۂ نظم 'ملامت' کے نام سے اشاعت پذیر ہوا ہے، جس کی اولین خوبی ڈاکٹر معین نظامی کا لکھا ہوا فلیپ ہے۔ مثال پبلشرز فیصل آباد کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والے 144 صفحات پر مشتمل اس مجموعہ میں (نعت و غزل کے دو دو انتخابی اشعار اور شعیب احمد کے لکھے منظوم تاثرات کے علاوہ) طارق حبیب کی بتیس طویل و مختصر نظمیں زمانی ترتیب سے شامل ہیں۔ میں جانتا ہوں، کسی کتاب پر لکھتے ہوئے اس مضمون کے ابتدائیے میں کہی گئی باتیں غیر ضروری ہوتی ہیں، لیکن اس مجموعۂ نظم پر بات کرتے ہوئے میں یہ باتیں اس لیے غیر مناسب نہیں سمجھتا کہ ملامت میں شامل ہر نظم کے اختتام پر درج تاریخ سے واضح

ہے کہ یہ نظمیں اگست 1994ء سے فروری 2015ء کے دوران تخلیق ہوئی ہیں اور یہ وہی برس ہیں جن کے ذکر سے اس مضمون کی ابتدا کی گئی اور اس ابتدایے کی سچائی کی گواہی طارق حبیب کی متعدد نظموں کے مندرجات سے بھی ملتی ہے۔ جیسے کہ 'یہ نظم ہمیشہ تمہاری رہے گی' (ص 16) کے ایک اقتباس میں اپنی بکھری ہوئی سوچ اور آسودہ معاشی حالات کی تصویر کھینچتے ہوئے کہتے ہیں—

"یہاں میں / جامعہ پنجاب میں اردو میں ایم اے کر رہا ہوں / اولڈ کیمپس ہاسٹل کے روم نمبر فلاں میں / سگرٹوں کے ادھ جلے ٹکڑوں، کتابوں / اور بہت کچھ ادھوری (حالانکہ مکمل) سی (غزلوں اور نظمیں جن میں زیادہ ہیں) کی صحبت اور گھٹن میں بکھرا پڑا ہوں اور کچھ اپنے ہی جیسے دوستوں کے ساتھ مستقبل کے بارے میں Planning کرتا رہتا ہوں / ہمارا گھر / جو اب ہم نے کرائے دار کے ہاتھ بیچ ڈالا ہے / ہمارے تو روز بچے کی ضمانت ہے۔"

ماضی سے جڑی محرومی کے دنوں میں شدید ذاتی تنہائی کے شکار اپنے احساسات کو نظم 'اسباب میں رکھی ہوئی سیپ' (ص 68) میں اس طور منظوم کرتے ہیں—

"میری ماں / میرے تیسرے بھائی (جو مجھ سے چھوٹا بھی تھا اور بڑا بھی) / اس کی انگلی پکڑ کر جو آگے گئے تھے / انھیں جا ملی تھی / یہاں شہر میں / شہر والوں کی نفرت سے / بریدہ ملطون سے کوئی بھی پیچھے نہیں رہ گیا تھا / اگر صرف میں تھا"

پردیس کے تجربات، حساس لوگوں کو حالات کا سامنا اور زیادتی برداشت کرنے کے جتن کس کس طرح سکھاتے ہیں، نظم Death Certificate (ص 77,78,79) ان کے بہترین پیرایے کی مثال ہے۔ اس نظم کے بعض مصرعوں میں وہ اپنے ایک دیرینہ دوست سے ہم کلام ہیں۔ نمونے کے طور پر یہ دو اقتباس دیکھیے—

"ریاض احمد / ہمیں راتوں کو سڑکوں کی جو پیمائش کی عادت ہے / تو اس کا یہ نہیں مطلب کہ ایل ڈی اے ہمیں تنخواہ دیتا ہے / ہمارا شوق ہے ہم چلتے جاتے ہیں" / "ریاض احمد / یہاں تھک کے تھکن پر تعلق ٹوٹ جاتے ہیں / ہمارے دوستوں کو یہ بتا دینا / ہمارے ساتھ چلنے میں اگر کوئی قباحت ہو تو پھر آگے نہیں جانا / یہاں اگلے قدم پر جو عدالت ہے / وہاں پہ صرف الزام و سزا کے طور پر تو اک صلیب ملتی ہے / جس پہ ساری عمر جینا اور مرنا ہے"

چند نظموں کے متذکرہ اقتباسات، طارق حبیب کے برسرِ روزگار ہونے سے پہلے کے برسوں کی سرگزشت کے غماز تو ہیں ہی لیکن ان سے نمایاں ہونے والا ہم کلامی و خود کلامی کا اسلوب اس مجموعے کی تمام نظموں میں موجود ہے۔ خود کلامی کی ایسی ہی کیفیت میں طارق حبیب نے نظم 'پلا' کسی شے خود کلامی کے حوالے سے ایک منفرد کاوش کہا جا سکتا ہے۔ یوں تو (ص 90-94) پر موجود اس نظم کی سبھی لائنیں قابلِ فکر و توجہ ہیں مگر آخری سات لائنوں سے پہلے کی یہ چند لائنیں اس شان دار نظم کی جان ہیں—

"کئی بار میں نے کہا / یہاں کتنے زہر کے گھونٹ ہیں / جو میرے حبیب پیتے نہیں / یہ جگہ تمہارے لیے نہیں / یہ گھر مرا گھر نہیں / یہاں کوئی اہلِ نظر نہیں / چلو اس دیار سے اٹھ چلو
کئی بار اٹھ کے چلا بھی میں مگر اُسے طلسم ہوش کر گیا / مجھے بڑھ کے جانا بھی نہ دے سکا"

طارق حبیب کے اس مجموعے کی دیگر نظمیں بھی کئی خوبیوں کی حامل ہیں، جن میں تخلیقی جوہر کی چمک بھی نمایاں ہے، جیسے کہ ہمارا

رہ جاتا ہے۔ ’’دیا کیا‘‘ (ص 58-57) ’’یہ عشق نہیں آساں‘‘ (ص 74) ’’بے خلی‘‘ (ص 138) اور ’’تمنا‘‘ (ص 139) ایسی تخلیقی نظمیں ہیں جن کے تفصیلی تفہیم و تجزیے کی توقع ہم اس کاوش کا مطالعہ کرنے والے دیگر اہل نقد و نظر سے رکھتے ہیں۔

فقیر کی دل نواز کیفیت سے سرشار نظم ’’اب اور کیا کہوں‘‘ (ص 97) کا ذکر میں خاص طور پر کرنا چاہوں گا جو اہل فقر کے مزاج کی غماز ہے۔ طارق نے بھی فقر کے دل نواز لہجے میں تفہیم دیتے دوست سے ذرا بے تکلف ہونے کی دلچسپ جسارت یوں کی ہے:

’’خدایا! تو ہمیشہ خوش رہا کر / جب تجھے مخلوق کی تنظیم کا بھی اہتمام کرنا ہے / مسلسل کام کرنا ہے / کئی اثبات کے سارے عناصر برسرِ پیکار رکھنے ہیں / ہزاروں دکھ ہزاروں سکھ / ہزاروں ولولے تیار رکھنے ہیں / یہ عالم دو جہاں کے سارے جھنجھٹ / سوچ دے ہم کو / ہمیں تو مرنے جانا ہے / خدایا! تو ہمیشہ خوش رہا کر‘‘

بہ ایں ہمہ میں سمجھتا ہوں خود کلامی و ہم کلامی اور واقعاتی انداز بیان سے آراستہ طارق حبیب کے اس منفرد مجموعہ نظم کو صوفیوں، مرشدوں، آقاؤں اور بابوں کے دل نواز تذکروں، عطر و صندل کی سوندھی سوندھی خوشبوؤں، قلندری خانقاہوں کے ملنگوں اور دعاؤں، فورٹ ولیم تحریک اور قصہ چہار درویش کی مثالوں اور غالب، میر، اقبال، مجید امجد اور ن۔ م۔ راشد کے حوالوں نے تصوف، تاریخ، نفسیات اور شاعری کی ایک معتبر منظوم دستاویز بھی بنا دیا ہے، جس کی موجودگی میں عید کے چاند کی جستجو رکھنے والے ’’رویت ہلال کمیٹی‘‘ کے کسی فیصلے کے ضمن میں انتظار کی صلیب پر نہیں لٹکیں گے۔

مجموعی تاثر کے اعتبار سے ’’ملامت‘‘ ایسا مجموعہ نظم ہے جس میں طارق حبیب، شعبان المعظم کی پرنور پندرہویں شب کی التماس انگیز ساعتوں میں خالق و مالک کے حضور تمام تر ملازمتوں کے ساتھ حاضر، اپنے مقسوم کے خساروں کا اعتراف کر کے امان کی ساعت سے محروم رہنے کے باوجود گزارتے ہوئے خالق و مالک کی لامحدود رحمتوں پر کامل یقین کے ساتھ کرم و عافیت کا طلب گار ہے۔ میں طارق حبیب کے حسن طلب پر آمین کہتے ہوئے اس کے فکر و فن کی مزید سرفرازی کی دعا کے ساتھ ’’ملامت‘‘ کو اردو نظم کے منظرنامے پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ الحمدللہ کہ اس عمدہ مجموعہ نظم کی اشاعت کے بین السطور مجھے طارق حبیب کے خساروں میں خاص کمی کا مصدق اشارہ بھی نظر آیا ہے۔

◆◆◆

نیا سلسلہ دوستوں سے رابطے کا

نمبر شمار	نام قلمکار	فون نمبر	پتہ خط و کتابت
1-	افتخار مجاز	0300-4328713	E-515، فاطمہ بلاک علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور
2-	جمیل عالی	0346-5297071	St.16، چکلالہ سکیم III،
3-	صوفی بیدار	0300-4421190	پنجاب آرٹس کونسل، 53۔ شادمان، لاہور
4-	مسعود ملتانی	0321-8478070	19۔ ریٹائرڈ سٹیشن، مال روڈ، لاہور
5-	محمود شام	0321-8210736	A-262، بلاک 3، گلشن اقبال، کراچی

میرزا ادیب مشاہیرِ ادب کے خطوط کے آئینے میں

ملک اشرف ذکی

مولوی عبدالحق کے مطابق خطوط دلی جذبات کا روزنامچہ اور اسرارِ حیات کا آئینہ اور صحیفہ ہوتے ہیں۔ یہ ایک بے ساختہ عمل ہے بقول ڈاکٹر خورشید اسلام" خط میں نہ اصول کی ضرورت ہے نہ خیال کی اور نہ موضوع کی" ممتاز کالم نگار جناب مشفق خواجہ کہتے ہیں "قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ادبی سرمائے کی حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا غالب پہلا دانشور ہے جس نے خطوط کو مکالمہ بنا دیا۔ نجی خطوط کی اشاعت کو فروغ بھی مرزا غالب کے عہد سے ہی ملنا شروع ہوا"

میرزا ادیب کو والدین کی طرف سے نام دلاور علی ملا۔ آپ 14 اپریل 1914ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ اسی شہر لاہور میں 1999ء میں منوں مٹی کے نیچے سو گئے۔ آپ نے اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ سے میٹرک پاس کیا۔ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں داخلہ لیا اسلامیہ کالج کے میگزین "کریسنٹ" میں ادیب کے قلمی نام سے شاعری شروع کی۔ بعد ازیں "ادبِ لطیف" کی ادارت پر فائز ہوئے۔ "ادبِ لطیف" کے سالنامے میں آپ کی تحریر کردہ رومانی داستان "صحرا نورد کا خط" کے عنوان سے شائع ہوئی تو اسے ملک گیر پذیرائی حاصل ہوئی۔ شاعری مکمل طور پر چھوڑ کر اپنی تخلیقی افسانہ نگاری کی طرف منعطف کر دی۔ کچھ وقت "مصور"، "ہمایوں" اور "حسن پرست" لاہور کی ترتیب و تدوین بھی کی۔ ریڈیو پاکستان لاہور سے تعلق قائم کیا۔ آپ نرم طبیعت اور معتدل مزاج تھے۔ ریڈیو پاکستان لاہور میں بطور سٹاف آرٹسٹ اور پاکستان رائٹرز گلڈ میں بھی کام کیا لیکن ادبیت و وقیع لکھنے لکھانے کو دی۔ مشاہیرانِ ادب کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ اپنی وفات یکم اگست 1999ء سے کچھ عرصہ قبل شدید علالت تک قائم رکھا۔ خطوط نگاری آپ کی ادبی شخصیت کی ایک اہم جہت ہے۔ متعدد معاصرین کو ان کی تخلیقی زندگی کے آغاز میں آپ نے اپنی مدیرانہ شفقت سے نوازا۔ میرزا ادیب فطرتاً منکسر المزاج تھے اور اپنے خلوص سے احباب کے دلوں کو مسخر کر لیتے۔ اپنے ادبی کام کو کبھی حرفِ آخر تصور نہیں کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے علم و دانش کے معترف تھے۔ جدید انشائیہ کی صنف معروف کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مشفق خواجہ ان کے فن کے مداح اور بے تحاشا قدردان تھے۔

محترمہ ادا جعفری اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں "میرزا ادیب فن اور شخصیت" پڑھ رہی ہوں اور خوش ہو رہی ہوں مبارکباد"

"آپ یقین کریں ہم دونوں (میں اور بانو) آپ سے بہت محبت کرتے ہیں "مٹی کا دیا" دیکھ رہا تھا کہ واقعات کے حوالے سے زندگی کے اور بہت سے دریچے وا ہوئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوبصورت ذہن اور سعید روح عطا کی ہے" (اشفاق احمد)

اظہر جاوید اپنے خط میں لکھتے ہیں "جشن فرید کے سلسلے میں شبِ روز ہوٹل ملتان میں آپ کے کمرے میں مجھے بھی ٹھہرنے کا اعزاز ملا۔ رات کو دیر تک جاگنے کے باوجود آپ صبح بہت سویرے بیدار ہوئے اور تحریر و تصنیف کا کام کرنے لگے"

بابائے ادب جناب ڈاکٹر انور سدید میرزا ادیب کے نام اپنے خط میں رقمطراز ہیں "شہرت تو زنِ فاحشہ ہے جو کسی کے ساتھ وفا

نہیں کرتی جو اس سے زیادہ وہ توقعات کرتے ہیں انہیں زیادہ وہ کیش کرتی ہے۔ کیا حق تلفی پر بھی خاموش ہو جانا ضروری ہے؟ آپ کا تجربہ زیادہ ہے اس لئے آپ سے رہنمائی کی درخواست کرتا ہوں"

محترمہ بانو قدسیہ کہتی ہیں "میرزا صاحب کی شخصیت اور فن کو بیان کرنے کیلئے نقطۂ آغاز اخلاص ہے۔ ان کی شخصیت میں خلوص اور تحریر میں بڑی سچائی اور اخلاص ہے" جب تک ہماری تہذیب باقی ہے، متوسط طبقہ موجود ہے، غریبی اور نارسائی کے مسائل باقی ہیں میرزا کی کہانیاں قابل توجہ رہیں گی۔ انہیں اپنے کلچر سے اتنی محبت ہے کہ موتیے کا پھول دھاگے میں پرو کر ہی قاری کے گلے میں ڈالتے ہیں جو اس استاذ سے منتقل ہے وہ ہے "سحر انور دے خطوط"

محترمہ بشریٰ رحمٰن میرزا صاحب کے نام اپنے خط میں کہتی ہیں "آپ ادب کے ایک دیوہیکل ہیں آپ ان عظیم انسانوں میں سے ہیں جو ہمیشہ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، حوصلہ افزائی کرنے میں آپ کا کوئی ثانی نہیں، یہ آپ کی عظمت ہے"

دانش دہلوی اپنے خط میں کہتے ہیں "آدمی فنا ہو جاتا ہے مگر اس کے نیک کام زندہ رہتے ہیں آپ بھی قلم کے دھنی ہیں"

میرزا ادیب کے نام اپنے خط میں جعفر شیرازی کہتے ہیں "میں نے جو کچھ ادب میں کمایا وہ آپ اور مولانا صلاح الدین احمد کی مدد سے ہے میں آپ کو اپنا عظیم ترین محسن سمجھتا ہوں"

جمیل ملک اپنے خط میں رقمطراز ہیں "آپ نے ادب کو life blood دیا تھا وہ آپ نے دیا ہے۔ آپ کا تخلیقی کام تو آپ کی زندگی میں ادب عالیہ (کلاسیک) کا مقام حاصل کر چکا ہے۔ اس میں آپ کی عظمت ہے۔ شہرت تو آنی جانی چیز ہے"

ڈاکٹر جمیل جالبی اپنے خط میں میرزا ادیب کو لکھتے ہیں "آپ کے خطوط سے بہت طویل عرصہ زندہ رہنے اور کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے معاشرہ سفاک اور بے ضمیر ہو گیا ہے اور اسی لئے ساری اقدار ختم ہو گئی ہیں نہ کسی کی کوئی عزت ہے اور نہ رتبے کے مطابق اس کا احترام۔ آپ جیسے لوگ کہاں ہیں؟"

جمیل الدین عالی اپنے خط میں رقمطراز ہیں "زندگی بڑی بے غیرت ہے۔ سب کچھ دیکھنا اور پھر جینا پڑتا ہے"۔

حنیف فوق لکھتے ہیں "اللہ آپ کا زور قلم زیادہ کرے اور لوگوں کو ذوق عطا کرے کہ آپ کی تحریروں کی صحیح قدر شناسی کر سکیں"

میرزا صاحب کے نام لکھے گئے اپنے خطوط میں ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی یوں اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کرتے ہیں "آپ نے اردو ادب کی جو خدمت کی ہے وہ اگر ہم چاہیں بھی تو فراموش نہیں کر سکتے۔ آپ نے اردو ادب کی تحریباً ہر صنف میں اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ اللہ آپ کو حوصلہ، ہمت، ولولہ اور توفیق عطا فرمائے۔ نہ تو کتابوں کو چھاپنے کیلئے کوئی آسانی ہے بہت سخت جان ادیب ہی زندہ ہیں۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں ہو رہی۔ آپ نے زندگی کو جو معنی دیئے اور جس انداز سے وہ لے رہے ہیں اور معنی مسلسل کی روایت قائم کی ہے وہ تاریخ کا حصہ ہے جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔ آپ کی زندگی کے تجربات اور مشاہدات اتنے سحر انگیز ہیں کہ پڑھنے والا کھو جاتا ہے۔ میرزا صاحب آپ اردو کے ستون ہیں۔ آپ نے کم از کم دو نسلوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا ہے۔ آپ ایک لحاظ سے میرا آئیڈیل ہیں میں آپ کو سلام کرتا ہوں۔ آپ کو شاید علم نہیں آپ میں کتنی کشش ہے۔ آپ مجسم خلوص ہیں۔ آپ کسی کو دکھی نہیں دیکھ سکتے۔ آپ کا دل تو دشمنوں کیلئے بھی نرم ہے۔ میں نے "مٹی کا دیا" میں جس شخص کو تلاش کیا وہ تو عجیب و غریب شخص ہے۔ اس نے زندگی بھر خوشیاں تقسیم

کی ہیں اور خود ڈیپریشن کا مریض بن گیا اس پہ بھی خوش ہے۔ شاید یہی اس کی وہ عظمت ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ آپ نے اتنا لکھا ہے کہ کئی نسلوں نے آپ کی کتابوں سے لکھنا پڑھنا سیکھا ہے۔ آپ نے نسلوں کی آبیاری کی ہے"

خورشید رضوی اپنے خط میں رقم طراز ہیں "میں آپ کا شکریہ کن الفاظ میں ادا کروں؟ آپ کے قلم سے نکلی ہوئی یہ چند سطور ایک ایسی مہک رکھتی ہیں جو زندگی میں کم کم ہی میسر آتی ہیں"

خاطر غزنوی لکھتے ہیں "آپ کا ڈرامہ "خاک نشین" میں نے بورڈ آف سٹڈیز پشاور یونیورسٹی کے رکن کی حیثیت سے ایم۔ اے اردو کے کورس میں رکھوا دیا ہے۔

رضا ہمدانی لکھتے ہیں "آپ کتنے معصوم اور اچھے ہیں"

شان الحق حقی رقمطراز ہیں "میرے دل میں آپ کی بڑی عزت ہے اور آپ کی ذاتی و ادبی شخصیت سے گہرا لگاؤ ہے"

شفیق الرحمن کہتے ہیں "آپ نے نئے اور پرانے معاشرتی مسائل کو بڑے دلچسپ اور جاندار انداز میں لیا ہے اور یہ ایک منجھا ہوا veteran ہی کر سکتا ہے۔ یہ پختگی آپ کی تحریروں میں ہمیشہ نمایاں رہی ہے"

شہزاد احمد اپنے خط میں لکھتے ہیں "جس زمانے میں آپ ادب لطیف کے مدیر تھے روایت کچھ مختلف تھی لوگ رسالوں کا نوٹس لیتے تھے اب صرف ٹی۔ وی کا نوٹس لیا جاتا ہے۔ کتاب اور رسالہ آہستہ آہستہ غائب ہوتے جا رہے ہیں"

صفدر محمود صاحب رقمطراز ہیں "آپ کا خط شاید میرے ڈائریکٹر کے نجی پتے پر تھا انہوں نے خود ہی جواب دے دیا۔ بہر حال معذرت! ڈاکٹر جسارت بریلوی لکھتے ہیں "آپ اس دور کے اہم ادیب ہیں"

عبدالعزیز خالد لکھتے ہیں "آپ کا نام دوام کے جریدۂ ادب پر ثبت ہے"

جناب قدرت اللہ شہاب خط میں تحریر کرتے ہیں "ہمارے ملک میں ڈرامہ آج جس منزل تک پہنچا ہے یہاں تک اسے پہنچانے میں آپ کے ڈراموں کا انتہائی اہم کردار ہے۔ ممتاز مفتی صاحب کو آپ کا سلام پہنچا دیا ہے وہ بھی آپ کے مداحین میں سے ہیں۔ آپ ایک ماہر اور عظیم ادیب ہیں۔ "مٹی کا دیا" ایک منفرد دیا ہے جس میں دھرتی کا دیا ہمیشہ اپنی مدھم مگر روشن لو دیتا رہے گا۔ انشاء اللہ"۔ "صحرا نورد کے خطوط" تقریباً چالیس برس بعد اب دوبارہ پڑھنے کا مزہ ہے کہ اس طرح پرانے بادہ خواروں جیسے ہم جیسے لوگ ایک پیچھے سے جام میں کوئی نایاب واگین ڈال کر اسے گھونٹ گھونٹ آہستہ آہستہ ختم کرتے ہیں"

محترم حکیم سعید صاحب رقمطراز ہیں "آپ کی گراں قدر اور مسلسل ادبی خدمت سے میں ناواقف نہیں ہوں آپ نے بڑی یکسوئی، اخلاص اور محبت کے ساتھ ادبی تخلیق سے اپنے آپ کو وابستہ رکھا ہے۔ اردو کی ثروت میں اضافے کے لیے اپنی زندگی وقف رکھی۔ اسی (80) کتابیں تصنیف و تالیف کیں جو یقیناً جان کھپائے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ہر تخلیق کیلئے خون جگر صرف کرنا پڑتا ہے۔ اس کی جتنی قدر کی جائے کم ہے۔

جناب مشفق خواجہ لکھتے ہیں "مٹی کا دیا" سے بازیافت زندہ رہنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ آپ ہمارے ادب کی آبرو ہیں آپ نے جس رفتار اور جس اعلیٰ معیار کے ساتھ ہمارے ادب کو باثروت بنا دیا ہے اس کی مثالیں کم کیا بالکل نہیں ہیں۔ "مٹی کا دیا" ایک فرد کی داستان

حیات بھی ہے اور اس میں ہماری تہذیب و معاشرت کے بہت سے ایسے پہلو بھی نظر آتے ہیں جنھیں فراموش کر دیا گیا ہے۔ یہ آپ بیتی گویا کھوئے ہوؤں کی جستجو ہے اور میرزا ادیب نے اپنی ذات کے حوالے سے پورے ایک دور کی موقع نگاری کی ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے اور زندگی پر اعتبار قائم ہوتا ہے"

(ڈاکٹر وزیر آغا رقمطراز ہیں) "میرے دل میں آپ کا بے حد احترام ہے۔ میں آپ کی ہر تحریر کو تبرک سمجھتا ہوں"

موضوع کی اہمیت کے حوالے سے تشنگی برقرار ہے۔ طوالت آڑے آ رہی ہے معزز قارئین سے معذرت کے ساتھ ختم کر رہا ہوں۔

◆◆◆

بسمل صابری "پانی کا گھر" سے "روشنیوں کے رنگ" تک

(اظہر جاوید)

"پانی کا گھر" سے "روشنیوں کے رنگ" تک نئی روپ، نئی انداز اور ایک اچھوتا پن، بانکپن اور رنگ بکھری ہوئی ملے گی۔ بسمل صابری شعر کہتی ہیں تو شاعری انھیں اپنے حصار میں لے لیتی ہے۔ میں ان کے آغاز شعر سے اس مقام اور مرتبے تک رفیق ہوں، شاہد ہوں یہ اعتراف کرنا بہت ضروری ہے کہ وہ بہت مشہور اور مقبول ہیں۔ شہر شہر، نگر نگر، بستی بستی، ملک ملک ان کی دھوم ہے چرچا ہے۔ وہ سامعین کے دل میں اُترتی ہیں، سوچوں میں گھل مل جاتی ہیں اور دیر تک چھائی رہتی ہیں۔ ان کے قارئین بھی ان کے گرویدہ اور مداح رہتے ہیں۔ وہ ترنم سے پڑھیں یا تحت اللفظ ادا کریں ماحول ان کی ذات کا حصہ بن جاتا ہے ان کی شاعری حوالے اور اجالے کی طرح دمکتی چمکتی رہتی ہے۔ کچھ شعر پڑھیں تو اچھے لگتے ہیں۔ مگر بہت تھوڑا عرصہ آپ کے ساتھ رہتے ہیں۔ کچھ شعر ایسے ہوتے ہیں جو خود کو پڑھ جاتے ہیں دل و جاں میں اُتر جاتے ہیں اور پھر ہمیشہ ہمیشہ آپ ہی کے ساتھ رہتے ہیں۔ بسمل صابری کے شعر ایسا ہی جادو کرتے ہیں اور بسمل صابری ایسی ہی جادوگر شاعرہ ہیں۔ میں اب عمر کی آخری دہلیز پر کھڑا ہوں لیکن جن چیزوں نے مجھے زندہ رکھا ہوا ہے۔ جن کے سہارے میں جینا چاہتا ہوں ان میں بسمل صابری جیسے چند دوستوں کی کاملہ شاعری بھی ہے۔

بسمل صابری نے دوسری کئی شاعرات کی طرح مقبول ہونے کی شعوری کوشش کی ہے، نہ کسی ازم نہ کسی نعرے کا سہارا لیا ہے۔ مقبولیت خود اُن کے پاؤں چھونے چلی آئی ہے۔ اُن کے شعروں میں سادگی کا حسن اور جذبوں کا بانکپن ہے۔ احساس کا وہ کرب جو پہلے اس کے اردگرد بکھرا ہوا تھا اور شعروں میں در آتا تھا اب اس کی زندگی میں گھل گیا ہے اور اس کی شاعری کو عجب الفاظ انگیز درد دے رہا ہے۔

وہ عکس بن کے مری چشم تر میں رہتا ہے   عجیب شخص ہے پانی کے گھر میں رہتا ہے

اس ضرب المثل کی خالق بسمل صابری اب یوں اظہار کر رہی ہے

دامن پہ جس کے ہم نے تماشا ہوا بھی   اس شخص کے قدم کا نشاں ہی نہیں رہا

اس شعر سے اس شعر تک کے سفر میں بسمل صابری کو کرب کی کن منزلوں سے گزرنا پڑا ہے یہ اہل دل ہی جان سکتے ہیں۔ میں بھی ایک نیاز مند کی طرح ان کے سفر کی کٹھنائیوں اور رعنائیوں کا شیدا رہا ہوں اور ان کی شاعری کا شیدا!

تبصرے

تنقیدی تھیوری کے سو سال (غیر مطبوعہ)

مصنف : ڈاکٹر وزیر آغا مبصر: ڈاکٹر انور سدید

صفحات : 248 قیمت : -/400 روپے ناشر : سانجھ پبلشرز، لاہور

زیرِ نظر کتاب "تنقیدی تھیوری کے سو سال" کے پیش لفظ میں جناب شاہد شیدائی نے لکھا ہے:

"وزیر آغا کی تنقید گزشتہ چھ دہائیوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ جس میں انہوں نے (دیگر موضوعات کے علاوہ) تنقیدی تھیوری کے ہر گوشے پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی مشرقی دانش کی باریکیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔"

شاہد شیدائی کی یہ بات اس لیے اہم ہے کہ اردو کے بیشتر نقاد مغرب کے دانشوروں سے اتنے متاثر ہیں کہ ان کے تصوراتِ فکر و نظر کو ہی اردو میں پیش کر کے اولیت کا عمامہ اپنے سر پر باندھ لیتے ہیں۔ اس کے برعکس ڈاکٹر وزیر آغا مغربی مفکرین کے گہرے مطالعے کے بعد ان کے بنیادی نکات پر عمیق نظر ڈالتے اور پھر مشرقی دانش کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے اپنے فیصلے مدلل انداز میں پیش کرتے ہیں۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ انہوں نے ساختیات، پس ساختیات، روسی فارملزم، سٹرکچر اور اینٹی سٹرکچر، ساخت شکنی، نسوانی تنقید اور تنقیدی تھیوری جیسے مشکل موضوعات پر لکھتے ہوئے اپنے تنقیدی اسلوب کی بنیاد سادہ، آسان اور عام فہم زبان پر رکھی اور بحث کو اس انداز میں ابھارا کہ ہر شخص مفہوم سے آشنا ہو جائے۔

زیرِ نظر کتاب ڈاکٹر وزیر آغا کی 101ویں سالگرہ پر شائع ہوئی ہے لیکن وہ اس کی ترتیب و تدوین وفات (7 ستمبر 2010) سے پہلے، اپنی زندگی میں کر چکے تھے۔ اور اب یہ کہنا درست ہو گا کہ وزیر آغا نے تنقید کے میدان میں جو قدم "مسرت کی تلاش" (جنوری 1954) سے رکھا تھا، اس کے ارتقا کی آخری کڑی یہ کتاب "تنقیدی تھیوری کے سو سال" ہے۔ اور قریباً ساٹھ سال کے درمیانی عرصے میں ان کی معرکہ آرا کتابیں "اردو شاعری کا مزاج" — "تخلیقی عمل" — "نظم جدید کی کروٹیں" — "تصورات عشق و خرد، اقبال کی نظر میں" — "اردو ادب میں طنز و مزاح" — "امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر" "تنقید اور احتساب" — "نئے تناظر" — "تنقید اور مجلسی تنقید" — "دائرے اور لکیریں" — "دستک اس دروازے پر" — "معنی اور تناظر" — "نئے مقالات" — "تنقید اور جدید اردو تنقید" — "غالب کا ذوقِ تماشا" اور "مجید امجد کی داستان محبت" شائع ہوئیں اور تسلیم کیا گیا کہ مولانا الطاف حسین حالی کے مقدمہ شعر و شاعری کے بعد وزیر آغا کی نظریاتی مباحث پر مبنی کتابوں نے اردو ادب کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ چنانچہ انہیں وفات کے بعد عہد ساز مصنف قرار دیا گیا اور ہند و پاک کی یونیورسٹیوں میں ان پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کے متعدد مقالات لکھے گئے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔

وزیر آغا کی نئی کتاب ''تنقیدی تھیوری کے سو سال'' کی اہمیت یہ ہے کہ اس میں انہوں نے مغرب کے جدید نظریوں پر بحث کی ہے۔ یہ کتاب تین حصوں ''تنقیدی تھیوری کی ساخت'' ''امتزاجی تنقید'' اور ''تخلیقی عمل کے ابعاد'' پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں تنقید کی تہذیب ماہیت ''امتزاجی شعور کی ساخت'' ''حقیقت اور فکشن'' ''رولاں بارت کا فکری نظام'' ''لغت کھلتی ہے'' ''کھاری تھیں'' اور ساخت شکنی وغیرہ سترہ مضامین شامل ہیں۔ موضوع کے لحاظ سے ہر مقالہ خود مکمل ہے اور اپنے مطالب و معانی مختلف انداز میں کھولتا ہے۔ لیکن مغرب کی جدید فکری تحریکوں کی رو ان سب میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس لحاظ سے یہ مضامین ایک زمانی فکری سلسلے سے جڑے ہوئے ہیں اور وزیر آغا ان سب پر اپنا اختلافی یا اثباتی زاویہ نظر ابھارتے اور معانی و مفاہیم کا نیا در کھولتے نظر آتے ہیں۔ دوسرا حصہ ''مغربی تنقید کے سو سال اور امتزاجی تنقید'' ''امتزاجی تنقید کا سائنسی اور فکری تناظر'' اور ''امتزاجی تنقید کے چند عملی اور نظری پہلو'' پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین امتزاجی تنقید کی نظریاتی جہت متعین کرتے اور تنقید کے ایک نئے دبستان سے متعارف کراتے ہیں۔ تیسرے حصے میں چار مقالات ''تخلیقی عمل اور اس کی ساخت'' ''تخلیقی عمل کا مرحلہ وار سلسلہ'' ''تخلیقی عمل مفکرین کائنات کے حوالے سے'' اور ''تخلیقی عمل اقبال کے حوالے سے'' پر مشتمل ہے۔ مقالات کے عنوانات ہی ظاہر کرتے ہیں کہ وزیر آغا نے ان موضوعات پر بڑی یکسوئی سے فکری نظر ڈالی ہے اور مغربی ادب کے مطالعے کی روشنی میں اپنے آزادانہ نتائج اخذ کر کے نقادوں کے لیے متعدد راہیں کشادہ کر دی ہیں۔ مجھے یقین ہے اب کا سنجیدہ مطالعہ کرنے والے باذوق اصحاب اس کتاب کی پذیرائی خوش ذوقی سے کریں گے اور فخر کریں گے کہ وزیر آغا کی صورت میں ایک چنگاری ہمارے خاکستر میں بھی تھی جس کا فیض جاری کتابوں کی صورت میں موجود ہے۔ یہ فکر انگیز کتاب 248 صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت 400 روپے۔ ملنے کا پتہ۔ ساجد پبلشرز 2/42۔ تیرنگ روڈ۔ لاہور

مارکسزم اور آج کی دنیا

مصنف : ڈاکٹر وزیر آغا   مبصر : نسیم جاوید

صفحات : 232   قیمت : -/400 روپے   ناشر : شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

انسان کی پیدائش سے لے کر آج تک جتنے مذاہب اور فلسفے سامنے آئے ہیں انہوں نے انسان کے مسائل کا حل ہی پیش کیا ہے اور انسانی زندگی کو انصاف کے راستے پر چلانے کے لئے اصول و ضوابط وضع کئے اور احسن نظام دیا ہے۔ مگر تمام نظام وقتی ثابت ہوئے اور انسان آسائشوں کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر انہیں ناکام بناتا چلا گیا ہے۔ اس طرز عمل نے ہمیشہ مادیت پرستی کو بڑھاوا دیا ہے۔ انیسویں صدی میں بھی مادیت پرستی کارل مارکس (May5,1818–March14,1883) کو سامنے لائی۔ کارل مارکس کے اقتصادی اور سیاسی نظریات کو اس کی زندگی میں پذیرائی نہیں ملی، پھر جب 1904ء میں برطانیہ میں سوشلسٹ پارٹی قائم ہوئی اور عالمی سطح پر سوشلسٹ تحریک شروع ہوئی تو اس کی بنیاد مارکس کے فلسفے کو بنایا گیا، پھر مارکسزم یعنی ازم نے دنیا میں سوشلسٹ بلاک قائم کر دیا تھا۔

مارکسزم کیا ہے؟ اسے سمجھنا اور سمجھانا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ مادیت پرستی سے ابھرنے والے سیاسی اور اقتصادی مسائل کا احاطہ

کرتا اور ان کا حل بتاتا ہے۔ اسلم گورداسپوری ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ انہوں نے ایک کٹھن مضمون کا انتخاب کیا ہے۔ کارل مارکس کے فلسفے کو بیان کرنا ہی کوئی آسان کام نہیں ہے اس پر آج کی دنیا کے مسائل کو لے کر ان کے جواب مارکسزم میں تلاش کر کے انہیں سامنے لانا اسی صورت ممکن ہے جب مارکس کے فلسفے پر عبور حاصل ہو۔ اسلم گورداسپوری نے یہی ثابت کیا ہے کہ فلسفے پر ان کی گرفت ہے۔ بات صرف فلسفے کو سمجھنے اور بیان کرنے تک نہیں بلکہ اصل کمال سمجھانے میں ہے اور اس پر بھی اسلم گورداسپوری پورا اترے ہیں۔ ایک دقیق مضمون کو انہوں نے بہت سہل زبان میں بیان کر دیا ہے۔ "مارکسزم اور آج کی دنیا" 232 صفحات کی اس کتاب کی قیمت چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ اسے لاہور کے شرکت پرنٹنگ پریس نے شائع کیا ہے۔

خواب گر (ناول)

ناول نگار : الطاف فاطمہ   مبصر: آفتاب خان

صفحات : 272   قیمت : -/800 روپے   ناشر: جمہوری پبلیکیشنز

الطاف فاطمہ معتبر ترین اور معتبر کہانی کار ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ کافی عرصے سے گوشہ گمنامی میں زندگی گزار رہی ہیں لیکن ان کا حالیہ ناول "خواب گر" ایک بار پھر انہیں شہرت کے ایوانوں تک لے آیا ہے۔ یہ ناول ایک ایسے نوجوان کی کہانی ہے جو عمر بھر خواب دیکھتا رہتا ہے اور یہ کہانی قیام پاکستان سے قبل شروع ہو کر اسی کی دہائی تک پھیلی ہوئی ہے۔ جیت (افغانستان) کے رہنے والے اس نوجوان نے زندگی میں بہت سے نشیب و فراز دیکھے۔ پہاڑی بستیوں سے اتر کر میدانی علاقوں میں تلاش رزق کے لیے آنے والے دوسرے بہت سے نوجوانوں کی طرح اس ناول کا مرکزی کردار ابراہیم بھی لڑکپن میں باپ کا ہاتھ بٹانے کے لیے بلند و بالا چوٹیوں سے نیچے اترتا ہے اور بیرا گیری کی ملازمت اختیار کرتا ہے۔ یہ انگریز حکومت کا دور ہے اور اس کا واسطہ بھی انگریزوں سے پڑتا ہے جو اس پر مہربان بھی ہیں اور یوں کہانی مختلف دلچسپ موڑ لیتی ہوئی ابراہیم کے بیٹے سے لے کر پوتے تک آ جاتی ہے اور اس طرح کیا کیا واقعات رونما ہوتے ہیں اور کیا کیا کہانیاں جنم لیتی ہیں اس کا اندازہ ناول پڑھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔

الطاف فاطمہ نے نہ صرف ناول کے لیے ایک عمدہ پلاٹ کا انتخاب کیا ہے بلکہ ان کے گرد بنائے گئے کرداروں کے ذریعے بھی بہت کچھ بیان کر گئی ہیں۔ جس میں تاریخ کا کڑوا سچ بھی شامل ہے۔ اور کہانی کا چٹخارہ بھی موجود ہے۔ اس پر الطاف فاطمہ کا سادہ اور دلفریب انداز تحریر قاری کو ناول کے صفحات سے ادھر ادھر بھٹکنے کا ذرا سا بھی موقع نہیں دیتا اور قاری ناول کے کرداروں کے ساتھ ساتھ کسی پہاڑی ندی کی طرح رواں دواں رہتا ہے۔ یہی اس ناول کی خوبی ہے کہ اپنے ساتھ آپ کو بہا کے لے جاتا ہے اور آپ ناول کا آخری صفحہ پڑھ کر ہی دم لیتے ہیں۔ ناول بہت کم لکھا جا رہا ہے اس لیے الطاف فاطمہ کا یہ ناول تازہ ہوا کا جھونکا بھی ہے اور بہترین ناولوں میں ایک شاندار اضافہ بھی ہے۔ خاص طور پر نئی نسل کو اس ناول کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے کیونکہ جہاں یہ ناول ذہنوں میں بہت سے سوالات ابھارتا ہے وہاں یہ بہت سے سوالات کے جوابات بھی دیتا ہے۔

میریاں نظماں

شاعر : حنیف باوا | مبصر : آفتاب خان

صفحات : 112 | قیمت : -/200 روپے | ناشر : مثال پبلشرز فیصل آباد

حنیف باوا بنیادی طور تے پنجابی دے کہانی کار نیں تے ۔ بہت سوہنیاں کہانیاں لکھدے نیں جہدے وچ پنجاب دی رہتل دی نکھر آندی اے تے لوکاں لوکاں کہانیاں دے نال نویں نویں تے تریکے بنے کرداروں دی اپنا دکھ وکھاندے نیں ۔ اوہناں دیاں کہانی دیاں چھ کتاباں چھاپے چڑھ چکیاں نیں تے شاعری دی ایہہ پہلی کتاب سامنے آئی اے ۔ حنیف باوا دیاں ایہہ نظماں وی اوہناں دیاں پنجابی کہانیاں وانگوں زمین نال جڑیاں ہویاں نیں تے ایہناں نظماں دے موضوعات بہت وکھرے تے نویں انداز نال سامنے لیائے گئے نیں ۔ ایہناں نظماں وچ بیان کیتا فلسفہ ساڈے اج کل دے دکھاں دی کہانی اے تے ساڈے اگلی حالات دے آئے ہوئے کمسن بچھڑن والے لوکاں دے بارے آکھے گئے اکھر نیں جنہاں وچ ہنجواں دے چیتاں دی چھل رہے نیں تے محبت دے چھلاں دی خشبو دی کھڑی ہوئی اے ۔ اوہناں دی اک چھوٹی جئی نظم ''دھرواہ'' سنو

کوڑ چوا کھیہ اڈاوے اپنے ای سر تے پاوے اڑ چوا ہتھ کھیہ اڈاوے اڈ اپنے سر تے نی کے رکھے وچیاں دے ہر پاوے / حنیف باوا نے ہجرت تے بے تکبیر جثہ تے دی نظماں کہیاں نیں تے سلطان باہو دی سرچیا اے ۔ نالے اج دی سڑدے بلدے موضوعات وچ پشاور سکول والا دہشت گردی والے واقعے تے وی اپنی نظم آکھ کے اپنا حق ادا کیتا اے ۔ اینج ایہہ کتاب وچ چھوٹیاں وڈیاں تقریباً 41 نظماں شامل ہوئیاں نیں ۔ جنہوں پنجابی زبان پڑھن والیاں واسطے کے تحفے توں گھٹ نہیں ۔

تصانیف ابراہیم جلیس توں کا جائزہ

مصنف : ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم | مبصر : آفتاب خان

صفحات : 240 | قیمت : -/600 روپے | ناشر : مقبول اکیڈمی اردو بازار لاہور

ابراہیم جلیس سے میرا پہلا تعارف ان کی فلموں کے حوالے سے ہوا اور پھر بعض فلمی اخبارات میں ان کے فلمی مضامین اشاعت کرر کے طور پر اور افسانے ادبی رسائل میں اشاعت مکرر کی وجہ سے پڑھنے کا موقع ملا لیکن ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کو ان کی تمام کتابوں تک رسائی حاصل ہوگئی اور اس طرح انہیں پہ زیر تبصرہ کتاب مرتب کرنے کا موقع حاصل ہو گیا اور انہوں نے ان تمام کتب کا مطالعہ کر کے نہایت عرق ریزی سے ان پر جامع تبصرے تحریر کیے بلکہ ابراہیم جلیس کی ادبی خدمات پر مقالہ تحریر کر کے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی ابتدا یہ تمام مضامین اور جائزے اسی مقالہ کے لیے تحریر میں لائے گئے جس میں تبسم صاحب نے ابراہیم جلیس کی 36 کتابوں پر تفصیلی رائے لکھی

ہے۔ ابراہیم جلیس نے ہر طرح کا ادبی کام کیا۔ مضامین، افسانے، سفرنامے، مزاحیہ کالم وغیرہ تحریر کیے اور ہر صنف کی الگ الگ کتاب شائع ہوئی۔ عبدالرشید تبسم نے ہر کتاب میں شامل مضمون یا افسانے کا مفصل جائزہ دیا ہے۔ اگر افسانوں کی کتاب ہے تو اس میں شامل ہر افسانے کا خلاصہ یا کوئی اہم پیراگراف درج کر کے اس پر تبصرہ کیا ہے اسی طرح ہر مضمون یا سفرنامے کی کتاب کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر کتاب پڑھ کر اس پر تبصرہ لکھنے کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے اور یقیناً ان چھتیس کتابوں پر رائے زنی میں بھی کئی ماہ لگ گئے ہوں گے۔ کتاب کے آخر میں ابراہیم جلیس کی فلموں کا جائزہ لیا گیا ہے اور ہر فلم پر الگ تبصرہ کیا گیا ہے۔ جس جس فلم کی کہانی کا خلاصہ، اداکاروں کے نام اور کردار، موسیقی اور نغمات وغیرہ کا تفصیلی ذکر ہے۔ اس طرح اس کتاب میں ابراہیم جلیس کے تمام کام کا جائزہ لیا گیا ہے اور اسے ڈاکٹر عبدالرشید تبسم نے بہت محنت سے مرتب کر کے اپنی کتابوں کے قرینے میں ایک اور ہیرے کا اضافہ کر لیا ہے۔

◆◆◆

"تخلیق" مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہے

کراچی	**سٹی پریس بک شاپ** (پروپرائیٹر : اجمل کمال) مدینہ سٹی مال آفس نمبر 316 تھرڈ فلور کراچی (0300-8259082)
لاہور	**ایسٹ بک ڈپو** (پروپرائیٹر : محمد علیم) 6-B مال روڈ لاہور (0320-4343588)
لاہور	**اظہار سنز** (پروپرائیٹر : سید محمد علی انجم رضوی) 19 اردو بازار لاہور (0300-4106357)
لاہور	**سنگ میل پبلی کیشنز** (پروپرائیٹر : افضال احمد) 25۔ شاہراہ پاکستان، لوئر مال، لاہور (0300-8470143)
لاہور	**سلطان نیوز ایجنسی** (پروپرائیٹر : محمد آفتاب) اکبر مارکیٹ، 1۔ میو ہسپتال روڈ، لاہور
فیصل آباد	**شمع بک ڈپو** (پروپرائیٹر : محمد اکمل) بیرون بھوانہ بازار، فیصل آباد (0300-6670134)
گوادر	**قندیل نیوز ایجنسی** (پروپرائیٹر : شبیر شاکر) پیشکان ضلع گوادر، بلوچستان (0322-3761579)

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ محترم سہوان اظہر جاوید!

آپ نے "تخلیق" کی محبتوں سے سرفراز کیا۔ بہت مہربانی۔ آپ نے غزل تو ازراہِ عنایت شائع کی مگر نام کے ٹکڑے کر کے درمیان سوالیہ نشان لگا دیا۔ جو چند الفاظ آپ نے معذرت کی ہے مگر مجھے افسوس ہوا ہے۔ اس کی وجہ بھی ہے۔ میں برسوں سے تخلیق میں لکھ رہا ہوں۔ اظہر جاوید مرحوم نے مجھے ہمیشہ عزت دی۔ بخوشی تخلیق میں میری تحریریں شائع کیں۔ آپ کے پاس ریکارڈ موجود ہے۔ آپ رسالوں میں کم وبیش ہر جگہ دیکھ سکتے ہیں۔ میرے اس کہے کو شکایت نہ جانیے گا محبت گنیے۔ میں تو چپ چاپ جا رہا ہوں۔ میرزا ادیب کی تحریر سے سرور سا ملا۔ آپ جانتے ہیں میرزا ادیب کا بقول ے "فین" ہوں۔ میں ان کی کتابیں مضامین وغیرہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے پڑھتا ہوں۔ ظفر اقبال سے متعلق حسن عسکری کاظمی کا مضمون خوب ہے۔ کاظمی صاحب کی یہ خصوصیت جو انھوں نے شاعر سے برتی ہے نہایت اچھی ہے اور لائق تحسین ہے۔ ظفر اقبال الفاظ کی گہرائیوں سے رعنائی کے جوہر نکالتے ہیں۔ ان کی غزل میں موجود تصوراتی فاصلے اور ابعاد دیکھے جانے اور محسوس کیے جانے کے لائق ہیں۔ ظفر اقبال کو عہدِ موجود کے کسی بڑے شاعر کے مقابلے میں نہیں کھڑا کیا جانا چاہیے۔ اس شاعر کو جمالیات کا انوکھا دلربا اور "دل خوش کن" نمائندہ سمجھا جانا چاہیے۔ وہ اپنی شعری عادات کی رعنائی اور برنائی (جوانی) سنبھالے بالکل الگ تھلگ "تنہا" کھڑا ہے۔ اظہر جاوید، احمد ندیم قاسمی سے جو نسبت رکھتے تھے وہ انٹرویو سے کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اظہر جاوید کا "جزایہ" دل کو لگا۔

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

﴿2﴾ عزیزم سہوان اظہر جاوید!

ستمبر 2016ء کا "تخلیق" نظر نواز ہوا۔ بے حد خوشی ہوئی کہ ماشاءاللہ یہ روز افزوں اور مندرجات کے معیار میں ماہ بہ ماہ اضافہ ہو رہا ہے۔ میں آپ کی مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہوں۔

"پہلی بات" کے تحت آپ نے درست لکھا کہ "ثقافت کے لئے خوشامدی پٹواری اور فصلی بٹیروں کو نوازنے کے ساتھ ساتھ ریاست ان اصل اور سچے ادیبوں پر بھی توجہ دے جو ملک وقوم کا سرمایہ ہیں۔" میں آپ کی آواز میں اپنی آواز ملاتا ہوں لیکن میرے بھائی، مردہ دلاں پر کلام نرم ونازک بے اثر۔ انور سدید صاحب پر میرزا ادیب کا مضمون "اردو ادب کا جمال آفریں مستری" واقعی ایک دلچسپ تحریر ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر مبارک علی نے اپنے مضمون میں اسلامی تاریخی ناولوں اور دینی کتب سے معاشرے کو پہنچنے والے "نقصانات" کو بڑے رقت انگیز لہجے میں اجاگر کیا ہے۔ مضمون آج کے ان چند گنے چنے اہلِ قلم کی سوچ کا عکاس ہے جو اپنی خود ساختہ دانش کے بوجھ تلے دبے کراہ رہے ہیں۔ مضمون کے آخر میں جب ڈاکٹر صاحب نے لکھا "اس کتاب ("بہشتی زیور") میں عورت کو بطور غلام عادی ہونے کی ہدایات اور نصیحتیں درج ہیں"

تو شاید ان کا قلم بھی ان کے ساتھ زار و قطار رونے لگا ہوگا۔ تاہم "تخلیق" کی اسی اشاعت میں ڈاکٹر اجمل نیازی کے سفرنامے "سورج کے رُخ پر" میں صفحہ نمبر 95 پر یہ پڑھ کر ڈاکٹر مبارک نے پہلے سکہ کا سائنس نیا ہوگا کہ "دنیا بھر میں سب سے بڑا باقاعدہ سرکاری طور پر قائم کیا گیا ریڈ لائٹ ایریا اس شہر (ایمسٹرڈیم) میں ہے جہاں حسینائیں شوکیس میں ستوری بنی کھڑی ہوتی ہیں اور شوکیس میں پڑی قابل فروخت اشیا کی طرح ان پر "پرائس ٹیگ" چسپاں ہوتے ہیں۔ "اب بھلا "بہشتی زیور" (اور دیگر اسلامی کتب) کے "دقیانوسی" مصنفین عورت کی اس "عزت افزائی اور قدر شناسی" کا تصور کیسے کر سکتے تھے؟ "تخلیق اور ایم خلیق" پر مسلم شمیم صاحب کا مضمون بہت بھرپور ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی آپ بیتی کا باب "دن ڈھل چکا تھا" پر لطف ہے۔ "شکستہ جذبے" (یمین احمد)، "بڑی دیر ہوگئی" (اظہر جاوید / حنیف باوا) اور "عاشق صبر طلب" (ڈاکٹر رشید امجد) دلچسپ تحریریں ہیں۔ "عراق اشک بار ہیں ہم" (سلمیٰ اعوان) میں مصنفہ کے قلم سے لکھنے والی غلطی نے مزہ کرکرا کر دیا۔ شعری تخلیقات میں بعض اشعار ایسے پڑھنے آئے کہ میں نے انہیں اپنی ڈائری میں نوٹ کیا۔ آخر میں پورے خلوص اور مکمل تحقیق کے بعد اس شمارے میں درج چند غلط اشعار کی اصلاح کر رہا ہوں۔ متعلقہ فاضل ادیب کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر مجھ سے کوئی لغزش سرزد ہوئی ہے تو میری اصلاح کر دیں۔ میں ان کا تہ دل سے ممنون رہوں گا۔ درست اشعار یوں ہیں:

جن سے مل کر زندگی سے عشق ہو جائے وہ لوگ — آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں
(سرور بارہ بنکوی، صفحہ 16)

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا — آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک
(اقبال، صفحہ 19)

سرہانے میرؔ کے کوئی نہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے
(میر، صفحہ 118)

صفحہ نمبر 22 پر شعر تو درست لکھا ہے (دیوار کیا گری...) لیکن شاعر کا نام سید احسن صہباؔ چھپ گیا ہے جبکہ یہ سید علی صبا کا شعر ہے۔

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (کراچی)

﴿3﴾ سلطان اظہر جاوید!

زیر مطالعہ و تبصرہ ماہنامہ "تخلیق" لاہور کا یہ شمارہ جلد 47 شمارہ 9 بابت ستمبر 2016ء جسے اعزازی طور پر مدیر سلطان اظہر جاوید نے عنایت کیا ہے جس میں "پہلی بات" مدیر کا اداریہ، حمد و نعت، مضامین، آپ بیتی، منظومات، افسانے، غزلیں، یادنگاری، سفرنامے، انٹرویو، طنز و مزاح، جائزے، پنجابی رنگ، آفتاب خان کے تبصرے، انجمن خیال اور "تخلیق" کو موصول کتب و رسائل کا ذکر بھی کچھ سلسلے ہیں۔ مرزا ادیب، اظہر جاوید اور ڈاکٹر انور سدید کی یادگار تحریریں، ڈاکٹر مبارک علی، مسلم شمیم، امجد اسلام امجد، حنیف باوا، نسیم احمد بشیر اور رشید امجد کی یادنگاری و افسانہ قابل ذکر ہیں۔ جیسا کہ بالکل ہم نے ماہنامہ تخلیق لاہور بانی مدیر اظہر جاوید 1969ء تا 2012ء کے شمارے بابت ماہ ستمبر 2016ء کا ذکر گزشتہ موصول نہ ہو سکنے والے "انور سدید نمبر" کے اجمالی تعارف کے ساتھ کروایا۔ آج رواں ماہ کی اشاعت پر

ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ قارئین تخلیق و ہم دردوں سے حسب سابق ان حالات کی بابت آگاہی دیتے ہوئے ادارہ اس عزم کا اظہار کر رہا ہے کہ دم ہے تو "تخلیق" پیہم رواں رہے گا اور یہ "علامت" "عصریہ" "تقاضے" اور "طلوعِ افکار" جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا (انشاء اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔ زرِ سالانہ 750 روپے مع ڈاک خرچ اتنی بڑی رقم نہیں کہ جس میں گھر بیٹھے آپ کو سال بھر کے شمارے مع کسی خاص نمبر کے ملتے رہیں۔ ہم نے بسم اللہ کر دی ہے فیس بک پر بھی التماس کر رہے ہیں از راہِ کرم ادبی پرچوں کی حسب توفیق مالی و علمی، ادبی سرپرستی کیجیے کہ ادب و آگہی کی شمع فروزاں کرنے والوں کو ان کی محنت کی اجرت نہیں جریدے کی بقا کی تمنا و آرزو ہے اور ہمیں بھی ان رسائل کی ایک فہرست اس شمارے کے صفحہ 160 پر موجود ہے جن کو اردو ادب کے اہم رسائل میں شمار کیا جاتا ہے اور "ادبِ لطیف" (جس کے مدیر 1985ء سے اظہر جاوید رہے) و "تخلیق" سمیت ان کا علاقہ قارئین بھی دیکھ رہے ہیں۔ علاوہ ازیں تخلیق کی جانب سے ایک خوش آئند اقدام یہ کیا گیا ہے کہ "قارئین کی پُر زور فرمائش پر رسالہ "تخلیق" اب فیس بک پر بھی Monthly "Takhleeq" Page کو لائک کر کے شمارہ دیکھا جا سکتا ہے۔ اپنی پسند کی تحریریں ڈاؤن لوڈ کی اور معلومات حاصل کی جا سکتی ہیں۔

'پہلی بات' اداریہ میں ماضی کی معروف ہستی الطاف فاطمہ کی گوشہ نشینی کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور ملالہ فنڈ، ترکوم، مصلحت اندیشیوں کے خلاف احتجاج بھی ریکارڈ کروایا گیا ہے۔ قارئین کو یوم آزادی و عید الاضحیٰ کی پیشگی مبارک باد بھی دی گئی ہے۔ سماجی و اخلاقی گراوٹ کا ادب و ثقافت میں عمل دخل اور 'ادبی قیادت' کی صورت حال کو اجاگر کیا گیا ہے نیز حکومت کی جانب سے اعزازی تمغہ ملنے والوں کو دام مبارک باد بھی دی گئی ہے۔ انور سدید پر لکھی گئی میرزا ادیب کی ایک تحریر اردو ادب کا ایک جمال آفریں مستری نوشتہ خاص ہے۔ یکی تمیں انور سدید کی قسط وار آپ بیتی کا باب 'دن ڈھل چکا تھا' اظہر جاوید کا احمد ندیم قاسمی سے لیا گیا انٹرویو جب وہ مجلس ترقی ادب سے وابستہ رہے، ان کی پنجابی کہانی 'باری دیر ہو گئی' مترجم حنیف باوا پڑھنے کے بعد ڈاکٹر انور سدید کی رائے کی تائید کی جا سکتی ہے کہ 'اظہر جاوید کی ہر کہانی ان کی اپنی زندگی کی ایک پرت ہے۔ نامہربان تجربوں کی یہ کہانیاں اظہر جاوید کی داستانِ حیات کے اوراق ہیں' 'کہانیاں' کے عنوان سے ہی نیلم احمد بشیر، جب کہ محمد اسلم، خالدہ حسین جوشی، طارق بلوچ صحرائی، آمنہ مفتی، محمد طارق علی، یاسین احمد اور ڈاکٹر رشید امجد کے افسانے اور انہی کی یادنگاری بھی خاصے کی تحریریں ہیں جو شائع کہیں اور نہ پڑھی گئی ہوں۔ مسلم شمیم کا صاحبِ کتاب 'قلم طلیق ابراہیم طلیق پر شخصی و ادبی تناظر میں' اور ڈاکٹر مبارک علی کا مختصر مضمون 'کتابوں کی بابت' معدودے تحریروں کے زمرہ میں آتے ہیں۔ افسانے اور دیگر مضامین، شاعری، کتب و رسائل کے جائزے مع تبصرۂ کتب نیز 'انجمنِ خیال' تخلیق کے وہ سلسلے ہیں جن کا ہم جیسے قاری لکھاری کو انتظار ہوا کرتا ہے کہ ساتھ ہی پروین شیر کینیڈا سے نثار احمد صدیقی کا مکالمہ، ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی اور نجم الحسن رضوی کی مزاحیہ تحریریں "قلم اور قینچی" جس میں انسائیکلوپیڈیائی قسم کی کتابوں کی ترتیب، اشاعت اور حکومت سے انعامات لینے والے پیش پیش ہیں کچھ فکریہ ہیں۔ جائزے کتابوں، صاحبانِ کتاب اور 'تخلیق' کے انور سدید نمبر کے ہمیں بہت کچھ معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی انوار ادب بیاد انور سدید کتاب کی اشاعت اور آفتاب خان کے اس پر نیز دیگر کتب پر تبصرے عمدہ ہیں۔ امید ہے کہ تخلیق نگاروں، دل دادگانِ شعر و ادب کی معاونت اور دلچسپیاں برقرار رہیں گی اور 47ویں سال سے پہلے یہ اپنی نصف صدی کی اشاعت پر ایک یادگاری شمارہ جاری کرنے کا اہل ہو سکے گا کہ جس پر لکھنے والے تشکر (اش اش) کریں گے۔

برصغیر کے اردو جرائد میں تخلیق کو ایک اہم ادبی جریدہ مانا گیا۔ اظہر جاوید نے ''ادب لطیف'' کی ادارت بھی کی اور اپنے جریدے میں نئے پرانے پاک و ہند کے بھی اردو قلم کاروں کے ساتھ ماں بولی پنجابی میں ادب تخلیق کرنے والوں کو بھی نمایاں جگہ دی جس کے باعث یہ عالمی اردو مراکز میں بھی پہنچا۔ دسمبر کے پہلے دن 1928ء میں سرگودھا کے مقام میانی میں محمد انوار الدین المعروف ڈاکٹر انور سدید نے آنکھ کھولی۔ ان کے والد کا نام امام الدین تھا۔ اسلامیہ پرائمری اسکول سرگودھا اور مڈل گورنمنٹ ہائی اسکول (ورنیکلر) سے پاس کرنے کے بعد ڈی جی خان گورنمنٹ اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ دانش گاہ پنجاب سے اردو ادبیات میں ماسٹرز اور پھر اردو ادب کی تحریکیں لکھ کر مقالے پر ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ محکمۂ آب پاشی میں بطور انجینئر خدمات سرانجام دیتے رہے اور بالآخر سبکدوش ہوئے۔ ان کا ادبی صحافت میں ایک اہم مقام رہا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے ساتھ اوراق میں نیابت کے علاوہ ادبی جریدہ اردو زبان بھی برس ہا برس تک شائع کرواتے رہے۔ برصغیر کا شاید ہی کوئی ادبی جریدہ ایسا ہو جس نے ان کی نثر، تخلیقی مضامین، تبصرے اور اہل قلم کے انٹرویوز نہ شائع کیے ہوں۔ ڈاکٹر انور سدید کے ہم عصر استاد دانشور خواجہ محمد زکریا نے اردو ادب کی مختصر تاریخ کو موضوع بناتے ہوئے تنقیدی تاریخ پیش کیے اور کہا کہ انور سدید کی متفرق، منتشر تحریروں کو یکجا کیا جائے۔ ان کے کام پر کئی پی ایچ ڈی مقالہ جات لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے تاکہ اردو ادب کے قارئین ان کی ''بے مثال ادبی خدمات سے آگاہ ہو سکیں''۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم، راغب شکیب، نجم الحسن رضوی، حسن عسکری کاظمی، ڈاکٹر سعادت سعید، سرفراز سید، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش، نذیر فتح پوری، شاہد شیدائی، اخلاق عاطف، مظفر حسین منصور، اشرف ڈی، ملک مقبول احمد، ڈاکٹر سکندر حیات میکن، شاہد بخاری، قمر زمان، سلمیٰ اعوان، قمر ریاض، سلمان اظہر جاوید، انور مسعود، بشریٰ اعجاز، ڈاکٹر زاہد حسن چغتائی، خالد شہزاد ہاشمی، اظہر سلیم مجوکہ، تنویر قیصر شاہد، جمیل آذر، شفیع ہمدم، محمد علی چراغ کے مضامین و تاثرات کے ساتھ ہی منظوم خراج تحسین پیش کرنے والوں میں حنیف باوا (پنجابی)، انشر طراز، پروین شیر، شجاعت راہی، توقیر مشتاق، میمونہ احمد اور ریاض ندیم نیازی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ خطوط کے حصے میں بھی احباب نے ڈاکٹر انور سدید کی بابت ہی اظہار خیال کیا ہے۔ یہ ایک یادگار نمبر ہے جس کو مقالہ نگار حوالے و استفادہ پیش نظر رکھتے رہیں گے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی کتاب ''انوار ادب بیاد ڈاکٹر انور سدید'' شائع ہو گئی ہے جس پر آفتاب خان نے ستمبر کے شمارے میں تبصرہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ''تخلیق'' کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا کرے۔ یہ پرچہ ادبی پرچوں میں ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔

انور جاوید ہاشمی (کراچی)

﴿4﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

ماہنامہ ''تخلیق'' بابت ماہ ستمبر 2016ء مل چکا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ''ادب اور ادب کی ترویج'' کے لیے ماہنامہ ''تخلیق'' بہت ہی قابل رشک کردار ادا کر رہا ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر انور سدید تو دلوں کی دھڑکن کی طرح تھے اور وہ مختلف سنائی دیتی رہے گی۔ محترم جناب منور عثمانی صاحب نے بے حد محنت اور جانفشانی سے صفحہ در صفحہ ڈاکٹر انور سدید نمبر میں شائع شدہ مضامین پر تبصرہ بعنوان ''تخلیق کا انور سدید نمبر'' صفحہ 124 سے 129 تک تحریر فرمایا ہے۔ منور عثمانی صاحب نے اشرف ڈی کے مضمون کو ڈاکٹر انور سدید سے بھی محبت کرنے

والوں کی ترجمانی قرار دیتے ہوئے اشرف ذکی کے دلی جذبات کو دہرایا ہے کہ "میں شدت سے محسوس کر رہا ہوں کہ وہ شجر جو تناور بھی تھا اور انتہائی گھنے اور خوشگوار سائے کا حامل بھی، اب ہم اس کے سکون آور سائے سے محروم ہو گئے ہیں۔"

محترم جناب ظفر اقبال صاحب نے پرانی رومانوی شاعری سے کسی حد تک اختلاف کرتے ہوئے غزل کو نیا رنگ اور آہنگ بخشا ہے۔ جناب محترم حسن عسکری کاظمی صاحب نے سمندر سے قطرہ نکال کر "ظفر اقبال کی غزل۔ ثروت مندی" کے عنوان سے بے حد خوبصورت مضمون تحریر کیا ہے۔ میں صرف ایک خوبصورت شعر ان کا تحریر کر رہا ہوں۔

شور کیسے اس گھر کے آنگن میں ظفر کچھ روز اور گنبد دل کو کسی دن بے صدا کر جاؤں گا

پچھلے شمارے میں محترمہ صوفیہ بیدار جیسی بیدار بخت اور بیدار دماغ والی خوبصورت عورت نے "جھٹکے دار" زبان میں بہت ہی اعلیٰ افسانہ "سلطے کی لات" تحریر کیا تھا جس کا ذائقہ ابھی تک زبان پر تازہ ہے۔ مگر اس دفعہ بھی دو طارق صاحبان نے بہت ہی اعلیٰ افسانے تحریر کئے۔ پہلا "شمشان گھاٹ کی دلہن" محمد طارق علی نے اور دوسرا "خود گزیدہ" طارق بلوچ صحرائی صاحب نے۔ دونوں افسانے دامن دل کھینچتے ہیں۔ محترم محمد طارق علی نے اپنے افسانے کے تانے بانے ہندوستان سے بنے ہیں۔ ایک بے بس عورت جس کا خاوند بیٹی کو چھوڑ کر بھاگ گیا مگر اس بے بس عورت نے ہمت نہیں ہاری اور زندگی کرنے کے لئے ایک چھوٹی سی دکان بنا لی مگر اسے اپنی بیٹی کے مستقبل کا فکر کھائے جا رہا تھا۔ پاکستان سے گئے ایک NGO کے طاہر نے ہر طرح کوششیں کیں اور یہ ایک پاکستانی کا اعزاز تھا۔ مگر معاشرے میں پھیلی برائیوں کو اب روکنا مشکل تر ہوتا جا رہا ہے اور پھر اس نے اپنے ایک عزیز دوست جو کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے آیا تھا اس کا بھیانک روپ دیکھا۔ فلم نگری ہو، پروڈکشن ہاؤس ہوں، کیٹ واک ہو وغیرہ وغیرہ۔ وہاں نئی آنے والیوں کا خوب استعمال کیا جاتا ہے۔ ماریہ (مرینہ) اس کی بڑی بیٹی ہے۔ کم سے کم کپڑوں میں اسے نچایا گیا۔ اور پھر وہ قسمت آزمائی کے لئے ممبئی فلم انڈسٹری کا رخ کرتی ہے۔ چند ماہ تو کچھ روپے اس کی بوڑھی بے بس ماں کو پہنچائے جاتے رہے اور پھر بند ہو گئے۔ یہاں پاکستانی طاہر کا پھر مثبت کردار ابھر کر سامنے آتا ہے اور پتہ چلا لیا جاتا ہے کہ وہ بردہ فروشوں کے ہاتھ لگ گئی۔ فلم کی ہیروئین کے بجائے جسم فروشی کے دھندے پر لگا دیا گیا اور بری طرح استعمال کیا گیا۔ جب طاہر وہاں پہنچے تو بہت دیر ہو چکی تھی اور کسی فلم میں دلہن کا کردار ادا کرنے کے بجائے کسی شمشان گھاٹ کی دلہن بننے والی تھی۔ افسانے کی بنت بہت بہترین ہے اور چشم کشا ہے۔ شاباش محمد طارق علی۔

اب معذرت کے ساتھ ڈاکٹر اجمال بلا کے سفرنامے کے بارے میں چند معروضات۔ بلاشبہ ڈاکٹر اجمال بلا کی تحریریں کافی بلا ہوتی ہیں مگر جنرل احسان کی ترجمانی لگا کے انہیں بہت کچھ اور کہنے اور لکھنے سے روک دیا۔ یہ قوم بے حد مخلص ہے اور جیسا کہ انہوں نے تحریر کیا یہ ملک سطح سمندر سے نیچے ہے اور قوم نے اپنے ملک کو بچانے کے لئے بے حد مضبوط بند بنا کر سمندر کی بے لگام موجوں کو لگام دے رکھی ہے۔ آزاد خیال اور لبرل اس قدر کہ جن چیزوں کو ہم برائی سمجھتے ہیں وہ انہیں بڑے سلیقے سے اپنائے ہوتے ہیں۔ کاش ڈاکٹر بلا "ٹرینٹی" لائف سائل کے بارے میں کچھ روشنی ڈال دیتے مگر "ٹرینٹی" لائف سائل کے لئے شاید یکس شاہی کا بھی وہاں ہونا ضروری ہے اور جیسا کہ انہوں نے کہا "اور بہت کچھ"۔ یہ الگ ایسا تو ہے مگر ان کا باقاعدہ میڈیکل چیک اپ ہوتا رہتا ہے۔ ہنستی مسکراتی "ہنوں" سے میرا قوم۔

طنز و مزاح کے سلسلے میں ''قینچی اور قلم'' جسے نجم الحسن رضوی نے تحریر کیا وہ ادبی دنیا کی ایک بھیانک سچائی ہے۔ دوسرا بعض ایسے پبلشرز بھی موجود ہیں جنہیں کہا جائے کہ فلاں موضوع پر کتاب یا ناول چاہیے تو بس آپ کی جیب میں بھاری بھرکم رقم ہونا ضروری ہے وہ آپ کی مشکل منٹوں میں حل کر دیں گے، اور آپ کتابوں کے ڈھیر لگاتے جائیں۔

محترمہ سلمیٰ اعوان کا سفرنامہ تو ہمیشہ کی طرح معلومات سے بھرپور ہوتا ہے۔ جناب اظہر جاوید کے افسانے ''بڑی دیر ہو گئی'' نے ایک بار پھر اپنے ہونے کا ثبوت دیا۔ ہم اسی لئے ڈاکٹر انور سدید اور اظہر جاوید کو مرحوم نہیں لکھتے کہ وہ تو ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ اور کاش محترمہ ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ اپنی تازہ کتاب ''پھول، خوشبو اور ستارہ'' تبصرے کے لئے نہ بھیجتیں۔ اپنے دکھ اپنے سینے میں پوشیدہ رکھنا چاہئیں۔

مرزا احمد نور طائر (چکوال)

﴿5﴾ محترمی التسلیم!!

''تخلیق'' کا ڈاکٹر انور سدید نمبر دیکھا۔ بہت خوب ہے۔ تمام مضامین نے بھی اچھی واقفیت کرائی۔ انور سدید اردو کے بہت ہی خاموش خادم رہے ہیں اور ادب کی مختلف تصویروں کو اپنے مضامین میں خوب سے خوب تر اتارا ہے۔ ادارہ ''تخلیق'' کی جانب سے تعارف نامہ جو دیا گیا ہے وہ معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ انور سدید پر بہت سارے مضامین اس شمارے میں یکجا کئے گئے ہیں۔ پھر بھی تشنگی کا احساس ہوتا ہے۔ انور سدید پر بہت سارے اچھوتے گوشے ہیں جن پر قلم اٹھانا ضروری ہے۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں چل رہی ہے ورنہ ان سے کئے گئے انٹرویو پر میں قلم اٹھاتا۔ پھر بھی یہ آپ سے وعدہ ہے کہ میں اظہر جاوید اور ڈاکٹر انور سدید پر بھرپور مکمل مضمون لکھوں گا۔ ممکن ہے کہ وہ کتابی شکل اختیار کر لے۔

''تخلیق'' اس اعتبار سے اردو دنیا کا واحد رسالہ ہے جس نے ڈاکٹر انور سدید کی بہت ساری تخلیقات شائع کی تھیں۔ اس کے لئے آپ کے والد محترم اظہر جاوید اور آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ''اوراق'' میں شائع ہونے والی ان کی پہلی نظم عالمی سطح پر پسند کی گئی تھی۔ یہ نظم حالات حاضرہ (اس زمانے کی) پر اتنی اچھی اور صحیح تصویر کشی کی گئی تھی جس کا جواب نہیں۔ ویسے ڈاکٹر انور سدید کی ہر تخلیق پڑھنے والوں کو ایک نئے زاویے سے معلومات و احساس کراتا رہا ہے۔ جس سے کوئی اردو قاری و ادب نواز انکار نہیں کر سکتا۔ زیر نظر شمارہ میں افسانے بھی معیاری نظر آئے۔ منظومات کے حصے بھی ٹھیک ٹھاک تھے۔ مجموعی اعتبار سے عالمی سطح کے رسالوں میں اس رسالے کی پہچان الگ سی ہے!

نثار احمد صدیقی (انڈیا)

﴿6﴾ محترمی سونان اظہر جاوید!

چند روز قبل ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ! عید الاضحیٰ مبارک ہو۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی ادبی دلچسپی کی بہت ساری

چیزیں موجود ہیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ کے ہاں ''پرانے کاغذات'' بھی کیا چیز ہیں۔ کریدکرید کر ایسی انمول تحریریں لا لاتے ہیں جنہیں پڑھ کر جس بہاں پھڑک اٹھتی ہے۔ انہی دستاویزات میں سے ''اردو ادب کا بہاؤ آفریں مسترقی'' بھی خاصے کی چیز ہے۔ ایک مرحوم ادیب جیسنتہ کے دوسرے ادیب روزگار کے بارے میں کیا خیالات رہے یہ جان کر مسرت ہوئی۔ میری پہلی (شاعری کی) کتاب ''آگہی سراہوئی'' پر میرزا ادیب نے جو کچھ لکھا وہ میری شعری زندگی کی تاریخ بن گئی ہے۔ ڈاکٹر جواز جعفری نے کلاسیکل موسیقی کے ایک راگ کی تفصیل میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی موضوع پر گرفت کا پتہ دیتا ہے۔ یہ سلسلہ اپنی پہلی قسط سے ہی قاری کی دلچسپی کا باعث بن گیا ہے۔ اگلی قسط کا انتظار رہے گا۔

مرحوم ڈاکٹر انور سدید کی تحریر تو اب تبرک کے طور پر نظر سے گذرا کرے گی۔ آپ بیتی کا یہ حصہ بھی شاید اگلی قسطوں کی پیش گوئی کررہا ہے۔ یٰسین احمد بہت دن بعد تخلیق میں ابھرتے ہے۔ ''مشت خاک ہے'' اُن کے افسانوں کا یاموڑ ثابت ہوگا۔ اظہر جاوید کا احمد ندیم قاسمی سے انٹرویو ادبی تاریخ کا ایک باب ہے۔ پڑھ کر اطمینان ہوا۔ مجموعی طور پر گوناں گوں دلچسپی کا حامل یہ شمارہ یقیناً آپ کے حلقہ احباب میں بھی پسند کیا جائے گا۔ مبارک ہو۔ نظم ''یوم پاکستان'' کی اشاعت کا شکریہ!

غالب عرفان (کراچی)

﴿7﴾ محترمی وکرمی!

سونان اظہر جاوید نے اعزازی کاپی تازہ شمارہ ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور برائے ستمبر 2016ء رجسٹرڈ ڈاک سے عنایت فرمائی۔ گزشتہ 47 سال سے اس کی اشاعت ہورہی ہے جبکہ محترم اظہر جاوید کو بچھڑے چوتھا سال ہے مگر ان کے ہونہار صاحبزادے نے اپنے والد کی وراثت کو قائم رکھا ہوا ہے اور ان کا عزم ہے کہ انشاءاللہ اسے ''علامت''، ''معاصر''، ''تقاضے'' اور ''مطلوع افکار'' کی صف میں شامل نہیں ہونے دیں گے۔ یقیناً سونان اظہر کے اس عزم کا ثبوت ''اظہر جاوید نمبر'' اور ''ڈاکٹر انور سدید نمبر'' کے ساتھ ساتھ تازہ شمارہ ہے۔ تیر جہاں، تاشی ظہیر، نارنگ ساقی اور جاوید منظور جیسے لوگ یوں بھی تو ''تخلیق'' سے جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ ''تخلیق'' کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ کچھ شمارے براہ راست مجھے بھیجے گئے جبکہ کچھ پروفیسر علی حیدر ملک اور ادارے۔ خیام کی وساطت سے زیر مطالعہ رہے ہیں۔ اس لئے میرے لئے ''تخلیق'' کوئی نئی چیز نہیں۔ اس میں شامل مواد میں جو عرق ریزیاں بھائی اظہر جاوید کیا کرتے تھے وہ بھی معلوم ہے اور اب ان کے لائق فرزند سونان اظہر اور ان کی ٹیم جو کچھ کررہی ہے اس سے بھی آشنا ہوں۔

''پہلی بات'' میں جشن آزادی کی مبارکباد کے ساتھ ساتھ عیدالاضحیٰ کی پیشگی مبارکباد بھی۔ تیر جہاں کے فون سے جو بات چلی وہ ہماری عمومی بے حسی تک لے گئی کہ الطاف فاطمہ جیسی شخصیت خاموش اور تنہا زندگی بسر کررہی ہیں اور اس ضمن میں مدیر نے اپنا احتجاج ریکارڈ کروادیا ہے۔ اس کے علاوہ کرپشن کا جو سلسلہ ہمارے معاشرے کے تمام ہی شعبوں میں در آیا ہے اس سے ادب کیونکر الگ ہوسکتا ہے۔ مدیر نے اس کی نشاندہی بھی کی ہے۔ کتابوں کی اشاعت، رسائل وجرائد کی اشاعت میں خطرناک حد تک کمی واقع ہوئی ہے وہیں بڑا مسئلہ انہیں حاصل کرنے کے متمنی لوگوں تک اس کی ترسیل کو بھی ناممکن بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ڈاک خرچ ان کتابوں اور رسائل و

ادب کی ترسیل میں نہ صرف بیرونِ ملک بلکہ ملک میں بھی اختیار سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ شاید ادارے حکمرانوں اور پالیسی سازوں کو ادب سے زیادہ ہوں اور اپنی ضروریات تک محدود کر دیا ہے جس کا ذکر بھی مدیرہ نے کیا ہے۔ ان تمام مشکلات کے باوجود "تخلیق ایوارڈ" گزشتہ چار سالوں میں یعنی 2012ء میں شفیع ہمدم، 2013ء میں ڈاکٹر انور سدید، 2014ء میں بانو قدسیہ، 2015ء میں نیر جہاں کو دیا گیا ہے جسے باضابطہ ادبی کمیٹی منظور کرتی ہے اور احباب کو بھی دعوت دی جاتی ہے کہ وہ بھی اپنی طرف سے نام پیش کریں۔

پرچے میں حمد و نعت کے علاوہ پانچ مضامین ہیں اور تمام ہی قابلِ ذکر ہیں۔ ڈاکٹر مبارک علی کا مضمون خاصے کا ہے جس کے اختتام پر ادارے کی طرف سے نوٹ بھی شامل ہے تا کہ کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو۔ ڈاکٹر انور سدید کی آپ بیتی "جو دن اجل چکا تھا" کے عنوان سے ہے۔ تشنگی کا احساس دلاتی ہے۔ منظومات کے حصے میں تمام ہی معتبر اور معتبر شعرا اور اساتذہ شامل ہیں جن کی تعداد 11 ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد عزیزی فوقیہ مشتاق کو پڑھنے کا موقع ملا۔ خواہش ہے کہ گلزار کی صنف تروینی پر ابتدائی طور پر میں نے یاور امان اور فوقیہ مشتاق کو ہی سنا تھا۔ ممکن ہو تو آئندہ شمارے کے لئے کچھ تروینی ضرور بھیجیں۔ افسانوں کی ترتیب میں 10 افسانے شامل ہیں۔ تمام ہی عمدہ تخلیقات ہیں۔ مجھے نیلم احمد بشیر کا افسانہ "کہانیاں" زیادہ پسند آیا۔ 17 شعرا کی غزلیں شامل ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کی یادنگاری کا سلسلہ عمدہ ہے۔ دو سفرنامے اور دو انٹرویو کے ساتھ ساتھ دو طنز و مزاح کے حوالے سے عمدہ تحریریں ہیں۔ ڈاکٹر معین قریشی اور بھائی نجم الحسن رضوی (اللہ انہیں صحت کاملہ عاجلہ مستمرہ و الدائمہ نصیب فرمائے) پڑھ کر لطف آ گیا اتنا شستہ اور بھرپور مزاح کم کم ہی پڑھنے کو ملتا ہے۔

جائزے کے عنوان سے 7 مضامین شامل ہیں جو بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ عزیزی آفتاب خان نے 10 کتابوں کا تعارف و تبصرہ عمدگی سے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ "انجمن خیال" کے ذیل میں 13 اہلِ علم کے خطوط ہیں جن میں بیشتر نے "ڈاکٹر انور سدید" نمبر کے حوالے سے بہت کچھ تحریر کیا ہے جو یقیناً اس نمبر کی کامیابی کی دلیل ہے اور آخری صفحہ یعنی صفحہ نمبر 160 پر ملکی و غیر ملکی کتب و رسائل کی وصولی کی رسید ان کے مدیران کے فون نمبر کے ساتھ دی گئی ہے۔

ابنِ عظیم فاطمی (کراچی)

(8) سونان بیٹے، دعائیں ہزار!

امید ہے کہ مع الخیر ہو گے۔ ماشاءاللہ تمہاری کارگزاریاں دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہوں۔ میرے بھائی اظہر جاوید نے جو فصل بوئی تھی، اب ماشاءاللہ رو بہ بہار ہے یعنی تخلیق ——— اپنی تمام جہات میں اپنے مشمولات میں ——— اپنے انتخاب میں ایک نمایاں حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہر بار اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ جس کو عروج عطا فرمائے وہ جاوید بھی ہو جاتا ہے۔ خداوند عالم اسے قائم و دائم رکھے اور نظرِ بد سے بچائے رکھے۔ آمین! میں اپنی تخلیقات کو بھی زندۂ جاوید رکھنے کے لئے "تخلیق" کی نذر کرتی رہتی ہوں۔ اب تو عالم یہ ہے کہ کبھی ہفتوں بستر مجھے پکڑ لیتا ہے (یا میں تکیہ پکڑ لیتی ہوں) اور کبھی پھر قلم کی لاٹھی میرے ہاتھ میں منتقل ہو جاتی ہے تو پھر ہفتوں دن رات لکھا کرتی ہوں۔ کیسی بے اعتدالی آ گئی ہے اس عمر میں؟

بیٹے جان اللہ تمہیں اپنی ''رحمت پہلو'' سعدیہ اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم رکھے۔ کچھ کلام ''تخلیق'' کے لئے ارسال کر رہی ہوں۔۔۔ جب جب موقع ہو ''تخلیق'' میں شائع کرتے رہنا۔

رشیدہ عیاں (امریکہ)

﴿۹﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

امید ہے کہ آپ بمع ماہنامہ ''تخلیق'' کے ادارتی و اشاعتی امور سے وابستہ تمام احباب بہ فضلِ ربِ کائنات خیر و عافیت سے ہوں گے۔ تخلیق کا گزشتہ شمارہ کوئی دس پندرہ یوم قبل موصول ہو گیا تھا جس میں ناچیز کی ایک غزل بھی شاملِ اشاعت ہے۔ آپ کی محبت اور کرم فرمائی کے لئے ممنون ہوں۔ حسبِ روایت اس شمارے کے مندرجات بھی ''تخلیق'' کے ادبی معیار و مزاج کے شایانِ شان ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد، نیلم احمد بشیر اور کلدیپ جوشی کے افسانوں کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ یہ افسانے مجھے بے حد پسند آئے۔ دیگر افسانوں کا مطالعہ ابھی باقی ہے۔ شعری حصہ بھی بصیرت افروز ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کی تحریر ''عاشق صبر طلب'' اور ڈاکٹر ابدال بیلا کا سفرنامہ ''سورج کے دیش پر'' بھی پسند خاطر ہیں۔

مراق مرزا (انڈیا)

﴿۱۰﴾ محترم سونان اظہر جاوید!

دل کش اور دیدہ زیب سرورق کے ساتھ ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ ستمبر 2016ء موصول ہوا۔ ہر بار ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ موصول کر کے دلی خوشی ہوتی ہے۔ اب کی بار سرورق میں تخلیقی رنگوں کی مہارت اپنے کمال پر نظر آئی ہے۔ تخلیق کے انور سدید نمبر پر Feed Back آپ کو موصول ہوا ہے اس پر آپ یقیناً مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ''تخلیق'' کا انور سدید نمبر ایک معتبر حوالے کے طور پر زندہ رہے گا۔ یہ بات عیاں ہے کہ آپ اس علمی و ادبی پرچے (تخلیق) کو خلوص نیت کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ آپ کی اسی نیک نیتی کی بدولت ہر بار اس میں نایاب اور نادر تحاریر مل جاتی ہیں جو قارئین اور اردو ادب کے لیے ایک زندہ سرمائے سے کم نہیں۔ موجودہ شمارے میں میرزا ادیب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرزا ادیب کی یہ بات سو فیصد درست ہے کہ اردو ادب کے تاج محل کا ایک جمال آفریں معمار انور سدید ہے۔ مسلم شمیم کا مضمون تخلیق اور اہم تخلیق کی کثیر الجہات علمی و ادبی زندگی کے ساتھ شخصی زاویوں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ جناب حسن عسکری کاظمی نے چھوٹی بحروں میں غزل لکھنے میں کمال مہارت رکھنے والے عہد حاضر کے نامور بلند قامت غزل گو شاعر ظفر اقبال کی غزلیہ ثروت مندی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ کاظمی صاحب نے ظفر اقبال کی غزلیہ کائنات میں فکر و فن کے گوشے روشن کیے ہیں۔ کلاسیکی موسیقی کے حوالے سے ڈاکٹر جواز جعفری نے دھرپد کے حوالے سے اہم معلومات اور انکشافات پیش کیے ہیں۔ ''دن ڈھل چکا تھا'' کے عنوان سے انور سدید کی تحریر بھی تخلیقی کاوشوں کو ظاہر کرتی ہے۔ نایاب تحریروں کی بازیافت کے حوالے سے سونان اظہر جاوید خوش نصیب مدیر ہیں۔ میرے خیال میں تو ان کی کامیابی کی وجہ اپنے والد کے اس علمی و ادبی جریدے کے ساتھ وابستگی اور عقیدت ہے۔ نظموں میں امجد

اسلام امجد، ارمان نجمی، غالب عرفان اور سلیم آغا کی نظمیں بہت خوب محسوس ہوئیں۔ افسانوں کی کائنات میں ڈاکٹر رشید امجد، نعیم احمد بشیر اور آمنہ مفتی نمایاں ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کی آپ بیتی میں تجسس اور حیرت کا انداز موجود ہے اور ہر قسط قاری کی توجہ اپنی جانب مبذول کرتی ہے۔ احمد ندیم قاسمی کا انٹرویو بھی اظہر جاوید کی مروتوں کا ایک انداز ہے۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کا شگفتہ اسلوب قارئین کے چہروں کو بشاش کر رہا ہے۔ "بچے دو، دو ہی اچھے" ظرافت سے بھرپور ہے۔ "تخلیق" کے انور سدید نمبر پر مسعود عثمانی اور سید مبارک علی شمسی نے کیا خوب تجزیہ پیش کیا ہے۔ دونوں احباب نے "تخلیق" کے "انور سدید نمبر" پر بھرپور انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ حسب معمول انجمن خیال (خطوط) "تخلیق" میں پوری سج دھج سے نمایاں ہے۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن (سرگودھا)

(11) محترمی سونان اظہر صاحب!

ستمبر 2016ء کا "تخلیق" نظر نواز ہوا۔ یہ شمارہ دراصل تخلیق کے انور سدید نمبر کے حوالے سے احباب کی آرا کا خوب صورت گلدستہ ہے۔ احباب نے اپنے اپنے انداز سے انور سدید نمبر کو جس طرح سراہا ہے، انور سدید صاحب کی روح کو یقیناً سکون پہنچا ہوگا۔ ادب اور ترویج ادب کے حوالے سے حکومتی رویوں پر دل گرفتگی جناب اظہر جاوید کے اداریوں سے بھی نمایاں رہی، اسی طور پر آپ کے لکھے اداریوں میں بھی وہی اسلوب نمایاں ہے۔ محب وطن ادیبوں کا یہ شکوہ بہرحال بجا ہے مگر حکمران تو حکمران ہوتے ہیں۔ ادب اور ادیب ان کی ترجیحات کے چوکھٹے میں شامل نہ کبھی ہوئے، نہ ہوں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی کا مضمون "کتابیں جنہوں نے دنیا بدل ڈالی" ڈاکٹر صاحب کی اسی مثبت سوچ کا آئینہ دار ہے، جس کی حمایت کرتے ہوئے ہم اکثر ڈر جاتے ہیں (جیسا کہ مضمون کے آخر میں ایک سطر بریکٹ میں آپ کو بھی لکھنا پڑی) لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ اسلامی تاریخی ناولوں، جاسوسی سلسلوں اور جنسی زیادتی کاوشیں فکری طور پر منتشر برصغیر کے مسلمانوں کے لیے مدہوش رہنے کا سامان ہی تو تھیں کہ جنہوں نے ہماری دنیا تو کیا بدلنا تھی، ہمیں فرسودہ روایات و خیالات کا اسیر بنائے رکھا ہے۔ حسن عسکری کاظمی نے ظفر اقبال کی ثروت مند غزل کا جائزہ خوب پیش کیا۔ ڈاکٹر رشید امجد، محمد طارق علی، کلدیپ جوشی اور محمد اسلم کے افسانوں میں معاشرتی حقائق کی دلچسپ جھلکیاں موجود ہیں۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی صاحب نے طنزیہ مزاحیہ تحریر "بچے دو ہی اچھے" کے بین السطور کچھ سنجیدہ باتیں سلیقے کے ساتھ ہمیں سمجھانے کی عمدہ کوشش کی ہے۔ پنجابی رنگ میں سلیم شہزاد اور حنیف باوا کی کاوشیں خوب ہیں۔ آفتاب خان کے تبصروں میں، تھوڑے لفظوں کے ساتھ زیادہ کچھ کہہ جانے کا ہنر نمایاں ملتا ہے۔ مسعود عثمانی، خالد اقبال یاسر، گستاخ بخاری، حسن عباسی، عراق مرزا، پرتپال سنگھ بیتاب، آفتاب خان، نذیر رانی، شفق کی غزلوں کے اشعار میں زندگی کی رمق نظر آتی ہے۔ جب کہ اسلام امجد، امجد عبدالعلی، ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش اور جواز جعفری کی نظمیں احساسات کے ہمہ جہت مدوجزر کی ترجمان ہیں۔ خدا کرے "تخلیق" کے سفر میں آپ کے حوصلے بلند رہیں، آمین!

اخلاق عاطف (سرگودھا)

﴿12﴾ عزیز گرامی قدر جناب سونان اظہر جاوید!

ماہنامہ "تخلیق" ستمبر 2016ء اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ میری نظم "یادِ ڈاکٹر انور سدید" اور مراسلہ شاملِ اشاعت فرمانے پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ آپ کا اداریہ بعنوان "تخلیقی بات" ہمیشہ کی جان دار اور توانا نظر آیا ہے کیونکہ آپ ہمیشہ نہایت اہم مسائل پر قلم اٹھاتے ہیں اور قارئین کی توجہ مبذول کراتے رہتے ہیں مثلاً اپنے تئیں اس موضوع پر حکومتِ وقت کو اپنا احتجاج ریکارڈ کرا کر وہ اصل اور سچے ادیبوں پر توجہ دے جو ملک و قوم کا سرمایہ ہیں۔

اس کے علاوہ وہ یہ کہ اردو زبان کو قومی سطح پر نافذ کرنے کا حکم صادر کر کے عدالتِ عظمیٰ نے 1973ء کے آئین کے آرٹیکل (1) کی طرف حکومت کی توجہ مبذول کرا کے اپنا فرض ادا کیا اور اس سلسلے میں آپ نے نہایت اہم اقدام اٹھانے کا مشورہ بھی دیا یعنی اردو زبان کی قومی حیثیت کا اعلان کیا جائے اور اس کے نفاذ میں رکاوٹ ڈالنے والے ارکانِ اسٹیبلشمنٹ کی جواب دہی کی جائے۔ سرکاری ملازمتوں کے تمام امتحانات اردو زبان میں لیے جائیں اور انگریزی کو اختیاری مضمون کی حیثیت دی جائے۔ آپ کا اشارہ کہ حکومتِ وقت اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے ٹھوس اقدام نہیں کر رہی بلکہ شد و مد سے انگریزی میڈیم تعلیمی اداروں کا قیام عمل میں لا رہی ہے نہایت اہم اور بجا ہے۔ دیگر بڑی رکاوٹوں میں ایک یہ بھی ہے کہ حکومت نے ادبی کتب اور رسائل کی ترسیل کی بک پوسٹ کی شرح ڈاک میں اضافے کے ساتھ ساتھ رجسٹری فیس میں بھی اضافہ کر دیا ہے جو بیرونِ ملک اردو کے فروغ میں ایک رکاوٹ ہے۔ یہ اطلاع بھی نہایت قابلِ قدر ہے اور یقیناً ہر سطح پر سراہی جائے گی کہ تخلیق بہت جلد ادبی فورم تشکیل دے رہا ہے جس کا بنیادی مقصد مالی طور پر کمزور ادیبوں کی کتب کی اشاعت اور ان کی عزتِ نفس کو مجروح کیے بغیر ان کی مالی امداد کرنا ہے۔

"تخلیق" نے ایک مستقل کالم وفیات اور علالت کے لیے بھی قائم کر رکھا ہے جو نہایت ضروری اور اہم اقدام ہے اور اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ یہ تمام جرائد کا فرضِ منصبی ہے جو مشاہیر کے رشحاتِ قلم کو جگہ دیتے اور منظرِ عام پر لاتے ہیں۔ "تخلیق" کے معمول کے عنوانات کے تحت حمد، نعت، مضامین، آپ بیتی، منظومات، افسانے، غزلیں، یادنگاری، سفرنامے، انٹرویو، طنز و مزاح، جائزے، پنجابی رنگ، آفتاب خان صاحب کے تبصرے اور "انجمن خیال" وغیرہ پہلے ہی آپ کے کڑے انتخاب اور معیار کی وجہ سے نہایت قابلِ تحسین ہیں۔ مختصر یہ کہ ایوانِ تخلیق کی بنیادوں سے لے کر اس کے فلک بوس میناروں تک جن معماروں کی محنتِ شاقہ اور خونِ جگر شامل ہے وہ بلاشبہ نہ صرف برصغیر بلکہ عالمی سطح پر اپنا اپنا ایک مسلمہ معیار و مقام رکھتے ہیں اور وہ کسی توصیف و تعریف کے ہرگز محتاج نہیں۔ ان کے ناموں کا فرداً فرداً تذکرہ کرنے کے لیے وافر وقت درکار ہے۔ بہرحال "تخلیق" کی تمام تر ترقی اور کامرانیوں میں نمایاں حصہ اس کے بانی اظہر جاوید کا اور ان کے بعد ان کے فرزند ارجمند جناب سونان اظہر جاوید صاحب کا ہے جو اپنے والد کے مشن کو آگے لے کر چلے اور چل رہے ہیں۔ وہ یقیناً مبارک باد کے بھی مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و تندرستی اور عمرِ طویل عطا فرمائے تاکہ وہ اردو ادب کی خدمت اور آبیاری تا دیر کر سکیں۔ آمین!

رشید آفرین (سیالکوٹ)

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اس لئے تمام رسائل اور کتب کے نام اس لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ تیر تک خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ: سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ اطراف کراچی مدیر اعلیٰ: محمود شام 0321-8216736	ماہنامہ شاداب لاہور مدیر: ڈاکٹر کنول فیروز 0301-4123707
ماہنامہ ارژنگ لاہور مدیر: حسن عباسی 0300-4489310	ماہنامہ سپوتنک لاہور مدیر اعلیٰ: آغا امیر حسین 0300-8440444	ماہنامہ روشنائی کراچی مدیر: احمد زین الدین 0321-2011595
ماہنامہ ادب لطیف لاہور چیف ایڈیٹر: صدیقہ بیگم 0300-8479444	ماہنامہ سفیر [illegible] مدیر: ڈاکٹر شیخ محمد اقبال 0300-4489399	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر: شاہد علی خان 0301-4001844
ماہنامہ اردو ڈائجسٹ لاہور مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی 042-35290738	ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر: عمران منظور 0300-8438043	ماہنامہ قومی زبان کراچی مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان 02134973296
ماہنامہ انشاء کلکتہ انڈیا مدیر: ف س اعجاز 0091-3322354616	ماہنامہ شاعر ممبئی انڈیا مدیر: افتخار امام صدیقی 0091-932451517	رسالہ انتساب انڈیا ایڈیٹر: سیفی سرونجی 0091-942564177
دوماہی نگینہ سری نگر کشمیر ایڈیٹر: وحشی سعید 09419012800	ماہنامہ شاعری کراچی مدیر: سہیل غازی پوری 021-3628911	ماہنامہ [illegible] مدیر: [illegible] ساقی 09260083535
ہفت روزہ [illegible] اسلام آباد مدیر: عبدالوحید 0333-5144348	ماہنامہ ہمدرد نونہال مدیر: سعدیہ راشد 042-36620949	ماہنامہ قومی زبان کراچی مدیر: ڈاکٹر ممتاز احمد خان 0336-6890843

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1-	[illegible] اردو ادب	[illegible]	11-22094419	[illegible] اردو ادب دہلی	400/-
2-	ڈاکٹر [illegible]	ڈاکٹر ہارون الرشید	042-37238241	مقبول اکیڈمی لاہور	4,500/-
3-	خواب گر	الطاف فاطمہ	042-36314140	جمہوری پبلیکیشنز لاہور	800/-
4-	[illegible]	ارشد [illegible]	0091-11-23211540	ایجوکیشنل پبلشنگ [illegible]	200/-
5-	[illegible]	[illegible] الدین	091-520144	سنگ میل پبلی کیشنز لاہور	450/-
6-	[illegible]	محمد [illegible]	0331-2533426	[illegible] کراچی	60/-
7-	[illegible]	ڈاکٹر [illegible]	0322-9068902	[illegible] مطبوعات لاہور	200/-
8-	ہمارے [illegible] صاحب	ڈاکٹر [illegible]	0321-5442882	بک کارنر	999/-
9-	[illegible] کے درمیان	[illegible] محمود	0321-2990235	[illegible] مطبوعات	300/-
10-	[illegible]	ابن عاصی	0300-6068284	[illegible] پبلشرز	100/-

Winter Family Festival
HOT DeLivey DeAls 50% Less Than MeNu PriCe
options
AN EXOTIC RESTAURANT
LAHORE
RS : 999
Family Fun Deal
Large Pizza of Choice, Exotic Club Sandwich, Crispy Plain Fries, 1.5 Ltr Coke.
Good For 4 Persons
RS : 119
MaMa'S Break Time
Exotic Chicken Handi, Special Tawa Chicken, Chicken Biryani, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke.
4
RS : 1399
Grand Slami'N Deal
Exotic BBQ Platter, Chicken Karahi Half, Chicken Biryani, Salad Bowl, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke.
Good For 4 Persons
RS : 1
MonSter MeaL
Chicken Roast Full, 6 Reshmi Kebab, Chicken Handi, 3 Naan, 3 Roti, Raita, Salad, 1.5 Ltr Coke.
6
ONLY FOR
No Tax Applies
Delivery/Takeaw
DELIVERY HOT LINES 0333-2800935 0333-140444
STARBUCKS COFFEE
BUY "1" GET "ONE" FREE
AVAILABLE INSIDE CAFE WITH THIS VOUCHER
OPTIONS SPECIAL ICE-CREAM
BUY "1" SCOOP GET "ONE" FREE
AVAILABLE INSIDE CAFE WITH THIS VOUCH

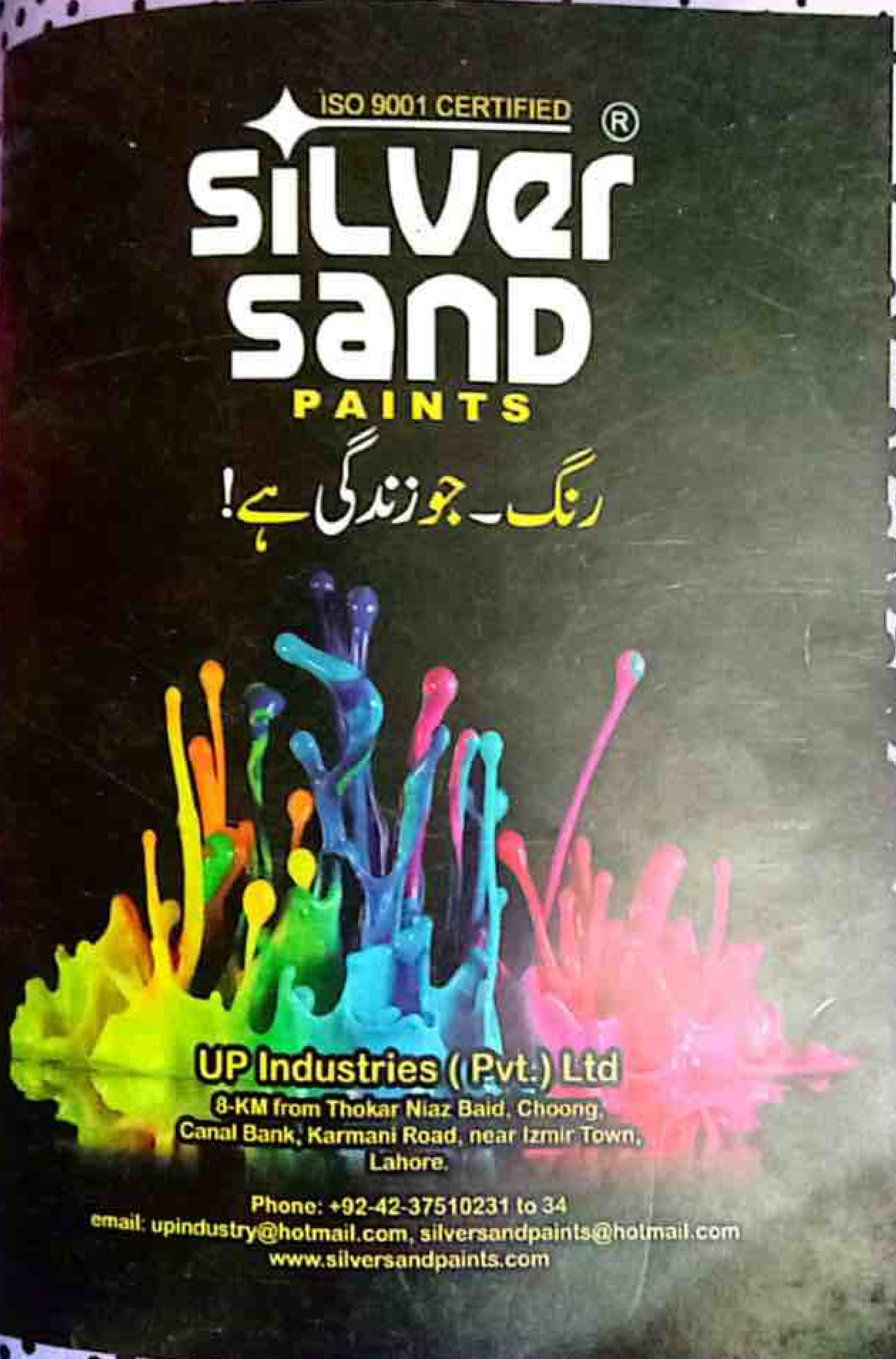
ISO 9001 CERTIFIED
Silver Sand ®
PAINTS
رنگ۔ جو زندگی ہے!
UP Industries (Pvt.) Ltd
8-KM from Thokar Niaz Baid, Choong,
Canal Bank, Karmani Road, near Izmir Town,
Lahore.
Phone: +92-42-37510231 to 34
email: upindustry@hotmail.com, silversandpaints@hotmail.com
www.silversandpaints.com

تخلیق

یادگار خاص نمبر

CamScanner

Brighto
Inspired by Nature
Brighto
STAIN FREE
EASY WIPE
اب دیواریں رہیں
صاف شفاف
بِنا رنگ اُڑائے!
Brighto PAINTS
brighto.paints
Toll Free 08000-1973
www.brightopaints.com

CamScanner

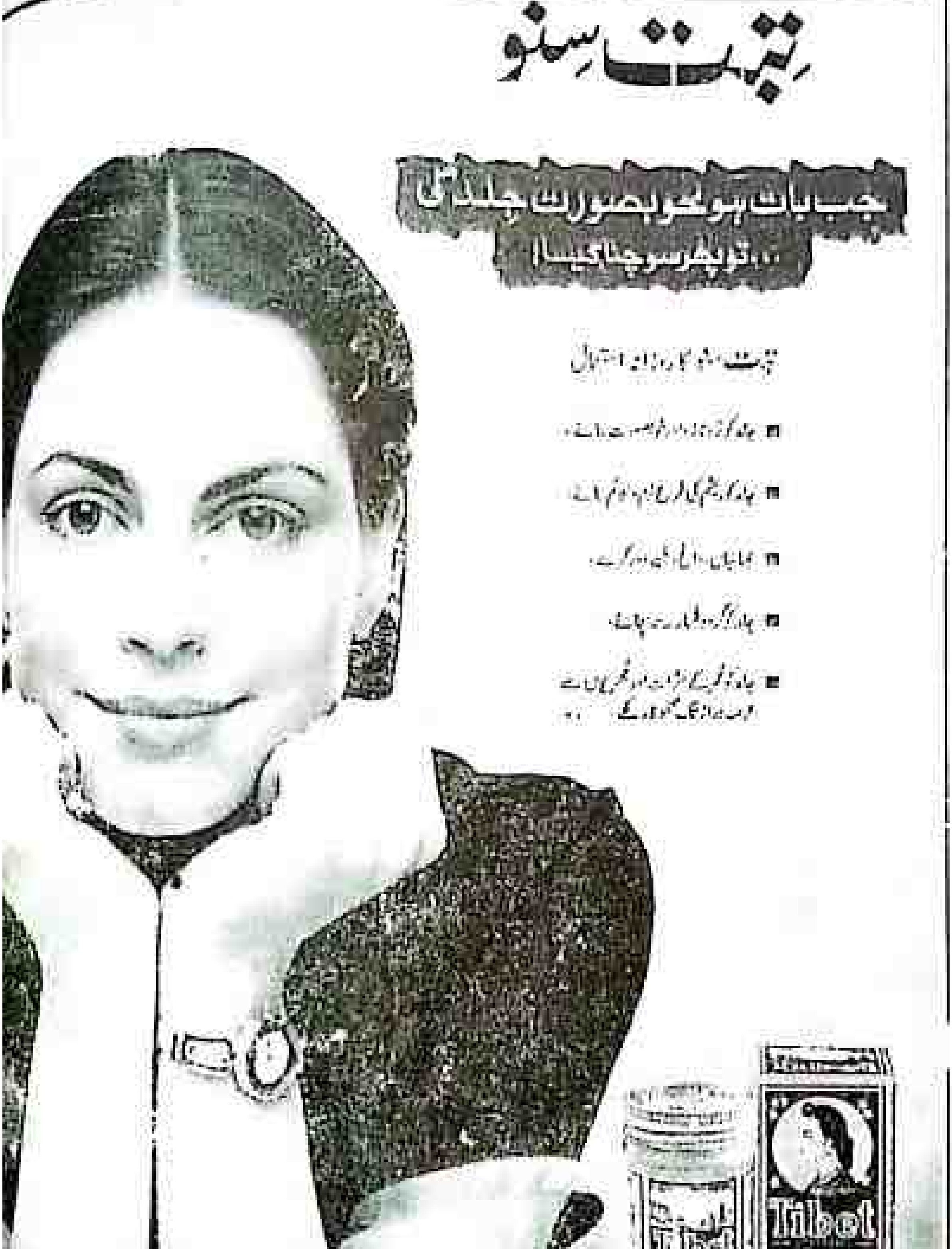
تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیسا!
Tibet
تبت سنو - ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

HERE'S A CHANCE OF A LIFE TIME
BRING OPTIONS EXPERIENCE TO YOUR TO
Own Something More THAN A RESTAURANT
BECOME FRANCHISE Of Pakistan's Best Restaura
THE OPPORTUNITY
This could be your opportunity to enter into today's most growing hospitality industry with complete help from reliable and experienced PARTNER.
THE BRANDS
Today's TOP brands under one roof are now in your reach. World's most wanted brands have been brought together to be your OPTIONS.
THE COMMITMENT
We are seeking highly ambitious and committed people having access to required capital with bur desire to be their own BO
Ideal Franchisee
•Someone who has the required capital but has been waiting all along for th most successful and profitable opportunity to arrive.
•Someone who has understanding and strongly believes in franchise syster
•Someone who owns a restaurant at good location which didn't work out for some reason and they feel that now is the right time to convert to a success franchise concept.
•Someone who can value the managment system & pay 2.5 Million Franchis Fee plus royalty and marketing fee for complete ongoing system and posse or have access to total minimum liquid cash bet 15 to 20 Million.
•Someone who has the most suitable purpose built location in a park / soci community/ mall / enclave or office complex and want unique and innovativ food concept to enhance the value of the surroundings.
IF YOU THINK THATS YOU . CHECK OUT YOUR OPTIONS !!!
Most Awarded
Most Celebrity Visited
Best Rated
Most Visible
4 BRANDS
ONE FRANCHISE FEE
INVESTMENT FROM
Rs:15 TO 20 MILLION
GET IN TOUCH : UAN: 111-OPTION PH: 0423-5777491 MOB: +92345-100
/OptionsThemeRestaurant
HEAD OFFICE: Royal House - 22 Main, Gulberg, Lahore
WATCH FRANCHISE VIDEO
ISO

CamScanner

silver sand
PAINTS
رنگ۔ جو زندگی ہے!
UP Industries(Pvt.)Ltd
Jhugian Sialan, Sui Gas Road, Behind
Firdous Flour Mills, 13-Km Shiekhupura Road
Lahore Pakistan
Ph# 04237164254,55
Godown Ph# 04237164252
Email:silversandpaints@hotmail.com
www.silversandpaints.com

CamScanner

بیرون ممالک اور اندرون ادبی دنیا میں مسلسل 48 سال سے سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادبی رسالہ ماہنامہ "تخلیق" لاہور پاکستان

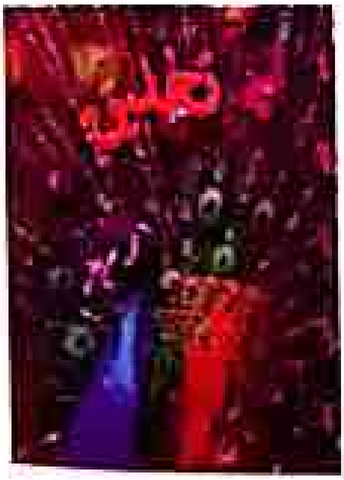

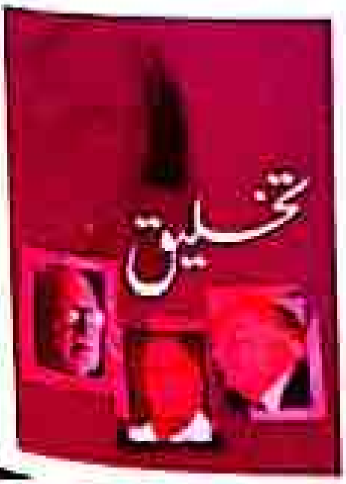

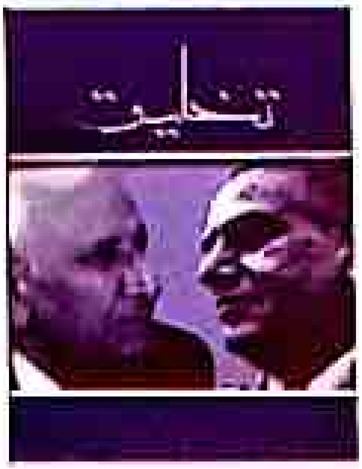

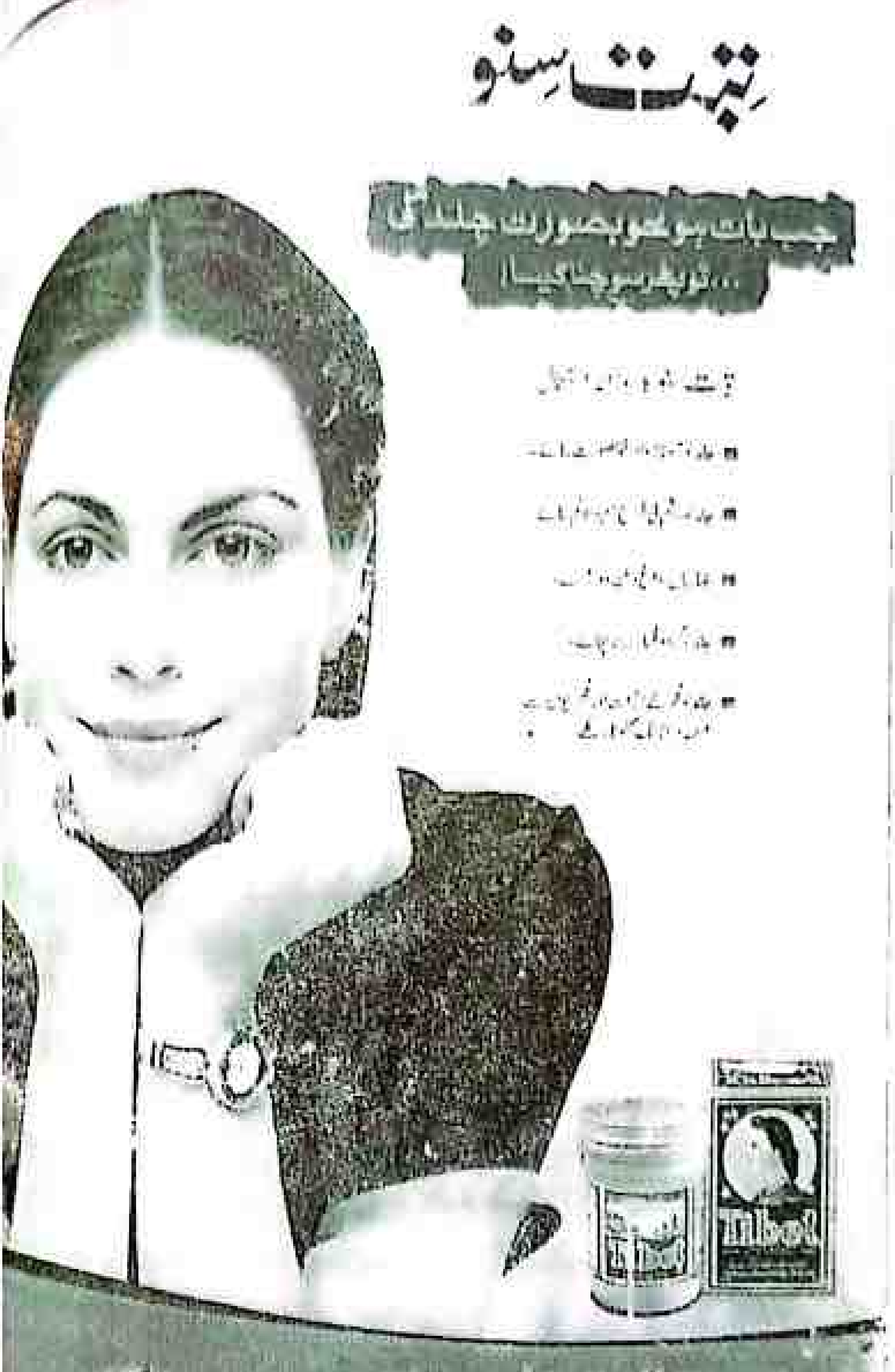
تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیا!
Tibet
تبت سنو - ایشیاء کی مشہور ترین بیوٹی کریم

[illegible] تقریبات میں سٹیج Conduct کرتے ہوئے [illegible]
کر دیتے ہیں۔ اردو کے علاوہ پنجابی زبان میں بھی لکھتے ہیں، وہ پنجابی میں اخلاق احمد [illegible]
کیفیت ہوتی ہے۔ [illegible] ادبی صحافتی زندگی کی ابتدا میں [illegible]
اشاعت کے لئے تیار ہے۔ [illegible]
ہم سے [illegible] اکرام رانا صاحب کے مداح ہیں۔ [illegible]
جمیل اطہر کے علاوہ ظہور عالم شہید اور [illegible]
اور ریکارڈ کرنے کا موقع ملا، سرکاری ٹیلی ویژن کے ملازم تھے اس لئے ساری عمر پابندیوں میں [illegible]۔ پاکستان ٹیلی ویژن میں
تقریباً ساڑھے 33 برس خدمات کی انجام دہی کے بعد ریٹائر ہوئے تو کئی ٹیلی ویژن چینلز اور اخبارات نے ملازمت کی آفر کی مگر وہ باقی
زندگی لکھنے پڑھنے اور پڑھانے میں گزارنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس لئے ان دنوں جہاں وہ ادبی صحافت میں بہت سرگرم ہیں وہیں وہ اپنی
[illegible] گزرے دنوں کی یادداشتیں لکھنے میں مصروف ہیں، دیکھیے! ان کی یہ تخلیق کب منصۂ شہود پر آتی ہے؟

کتابوں کی دنیا کے باسی، مطالعہ کے عادی افتخار مجاز ایک اور کام جو بہت شوق اور رغبت سے کرتے ہیں، وہ ادبی محافل میں
شرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو نام اور مقام عطا کیا ہے، اس پر رب کریم کے حضور سجدۂ شکر بجا لانے والے افتخار مجاز کو شدید ذہنی اور دلی قلق
ہے کہ ان کی خوشیاں دیکھنے والے والدین دنیا میں نہیں، تاہم وہ کہتے ہیں یہ عزت، یہ وقار، یہ اقدام اور یہ اچھے دن جو آج مجھے میسر ہیں،
سب والدین کی دعاؤں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کا فیض ہے۔

◆◆◆

The Social Lounge... Dining should be fun... Soooo Fresh...

options COFFEE & MORE

options AN EXOTIC RESTAURANT

options BAKERS & DELIGHTS

Best Fun Dining Restaurant in Pakistan

Declared by Consumer Choice Awards

8 Aibak Block Garden Town,
Lahore. Ph: 042-35941909

Do-Burj Plaza, Koh-e-Noor,
Faisalabad. Ph: 041-8714909

CamScanner

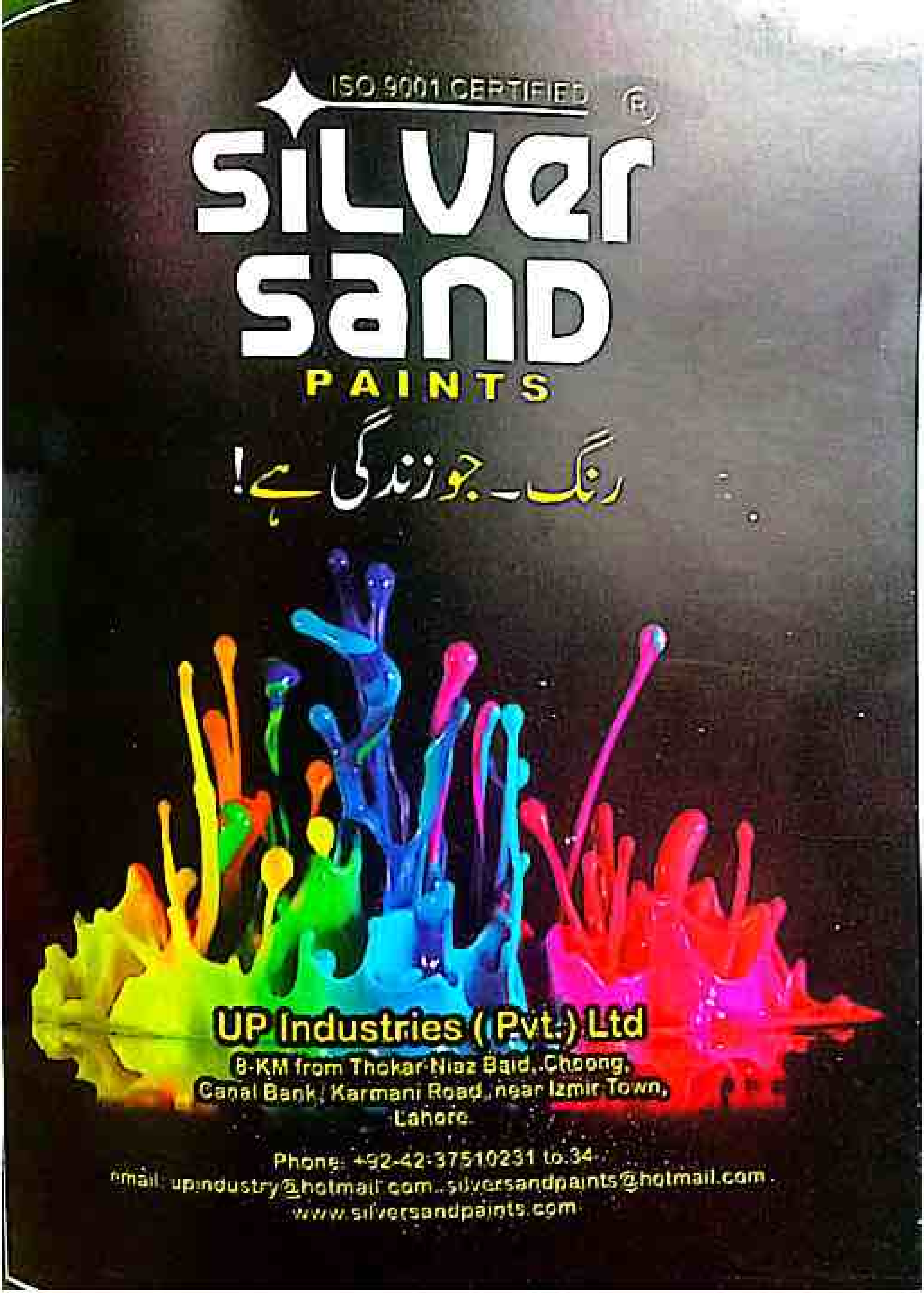
ISO 9001 CERTIFIED
®
silver sand
PAINTS
رنگ۔ جو زندگی ہے!
UP Industries (Pvt.) Ltd
8-KM from Thokar Niaz Baig, Choong,
Canal Bank, Karmani Road, near Izmir Town,
Lahore.
Phone: +92-42-37510231 to 34
mail: upindustry@hotmail.com, silversandpaints@hotmail.com
www.silversandpaints.com

CamScanner

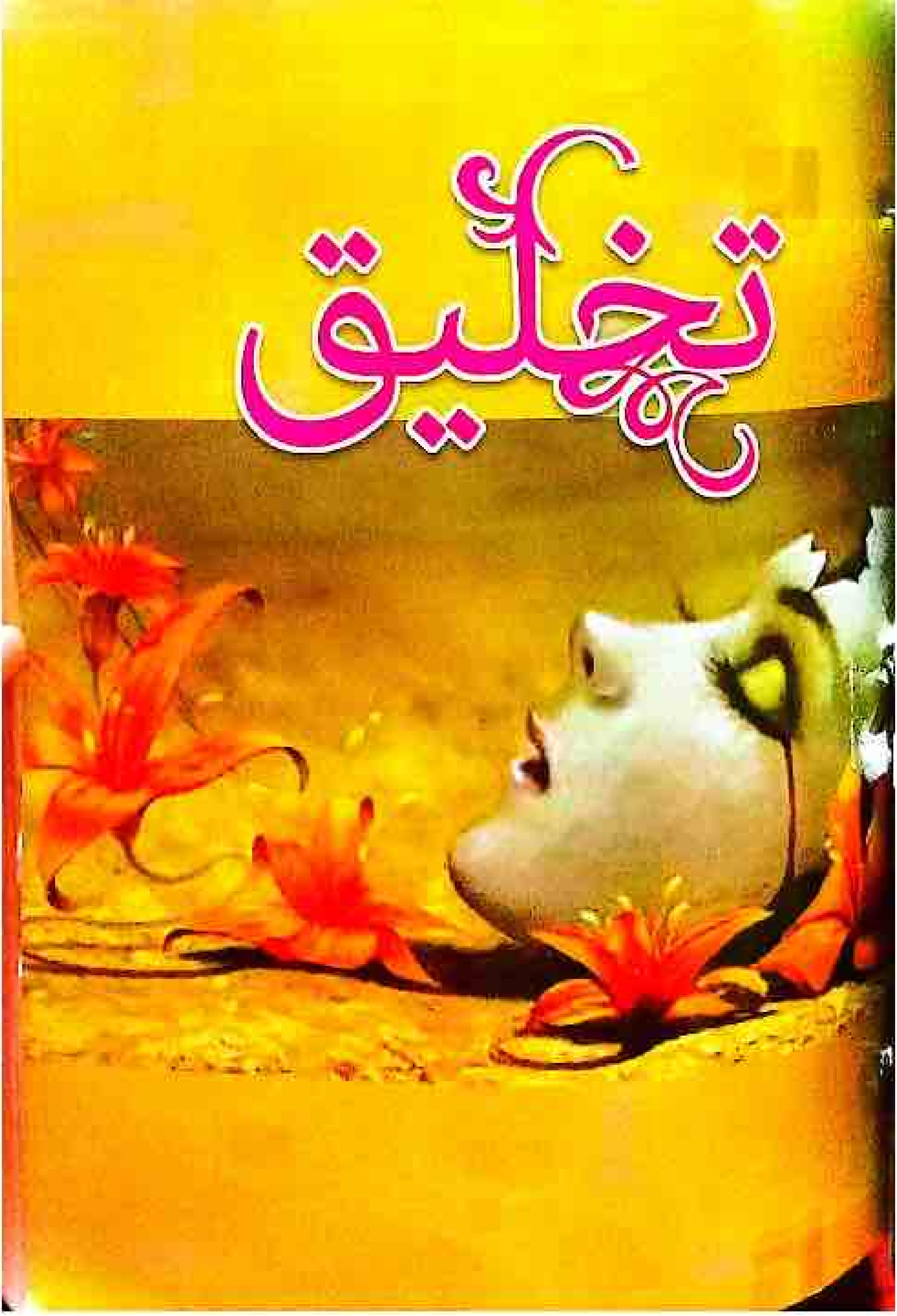

CamScanner

Since 1978
Silver Sand
PAINTS
رنگ ۔ جو زندگی ہے!
Silver Sand
SYNTHETIC ENAMEL
Silver Sand
Silver Sand
UP Industries(Pvt.)Ltd
Jhugian Sialan, Sui Gas Road, Behind
Firdous Flour Mills, 13-Km Shiekhupura Road
Lahore Pakistan
Ph# 04237164254,55
Godown Ph# 04237164252
Email:silversandpaints@hotmail.com
www.silversandpaints.com

CamScanner

Winter Family Festival
HOT DeLivey DeAls 50% Less Than MeNu PriCe
option
AN EXOTIC RESTAU
LAHORE
RS : 999
Family Fun Deal
Large Pizza of Choice, Exotic Club Sandwich,
Crispy Plain Fries, 1.5 Ltr Coke.
4
RS : 11
MaMa'S Break Time
Chicken Biryani, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke.
RS : 1399
Grand SlamiN Deal
Exotic BBQ Platter, Chicken Karahi Half,
Chicken Biryani, Salad Bowl, 2 Naan, 2 Roti,
1.5 Ltr Coke.
4
RS : 16
MonSter Meal
Chicken Roast Full, 6 Reshmi Kebab, Chicken
Handi, 3 Naan, 3 Roti, Raita, Salad, 1.5 Ltr Coke.
ONLY FOR
&
DELIVERY HOT LINES 0333-2800935 0333-14044
STARBUCKS COFFEE
BUY "1" GET "ONE" FREE
Coffee
AVAILABLE INSIDE CAFE WITH THIS VOUCHER
OPTIONS SPECIAL ICE-CREAM
GET "ONE"

CamScanner

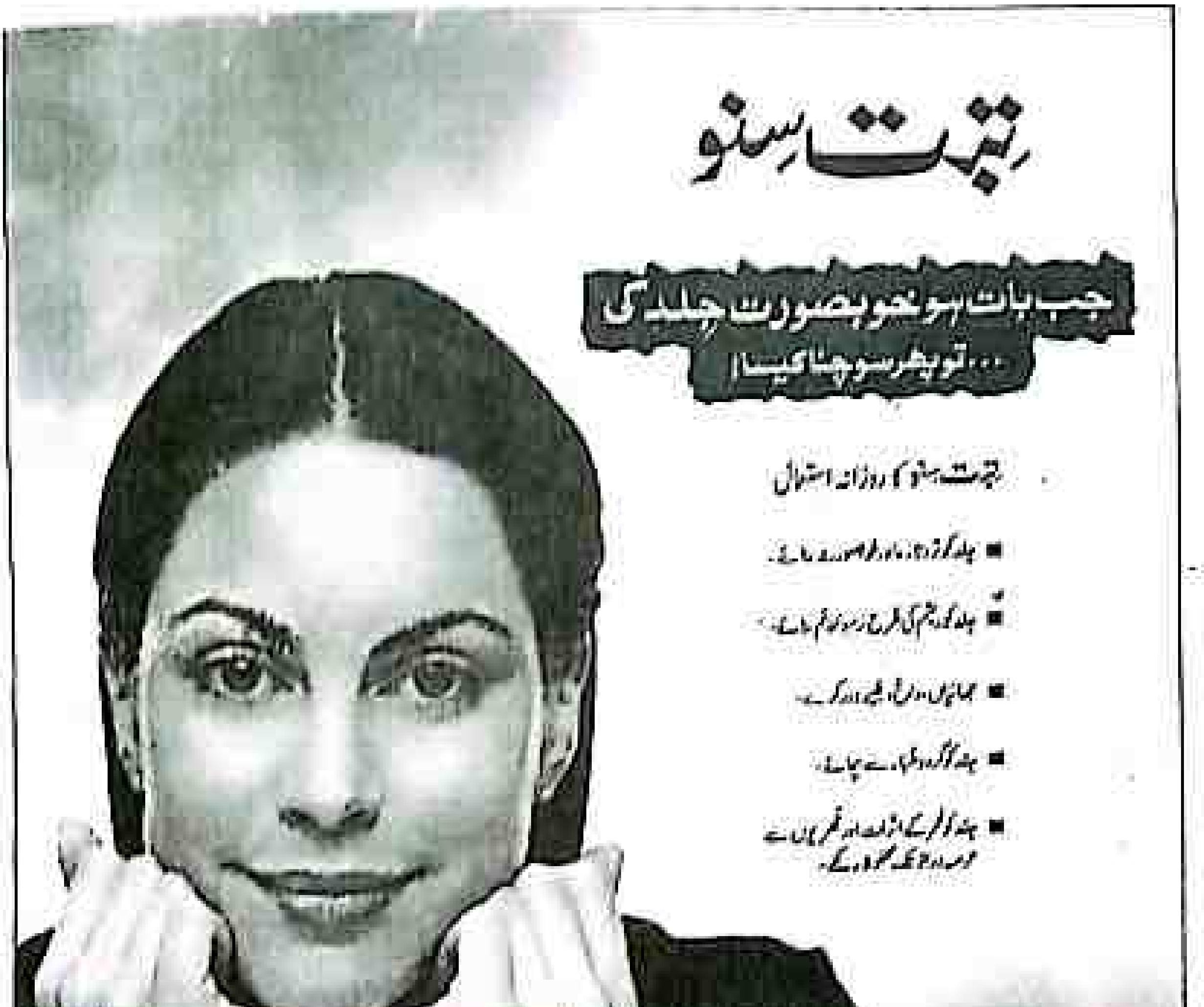
تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
... تو پھر سوچنا کیسا!
تبت سنو۔ ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

POLANI'S
GROUP OF TRAVEL COMPANIES

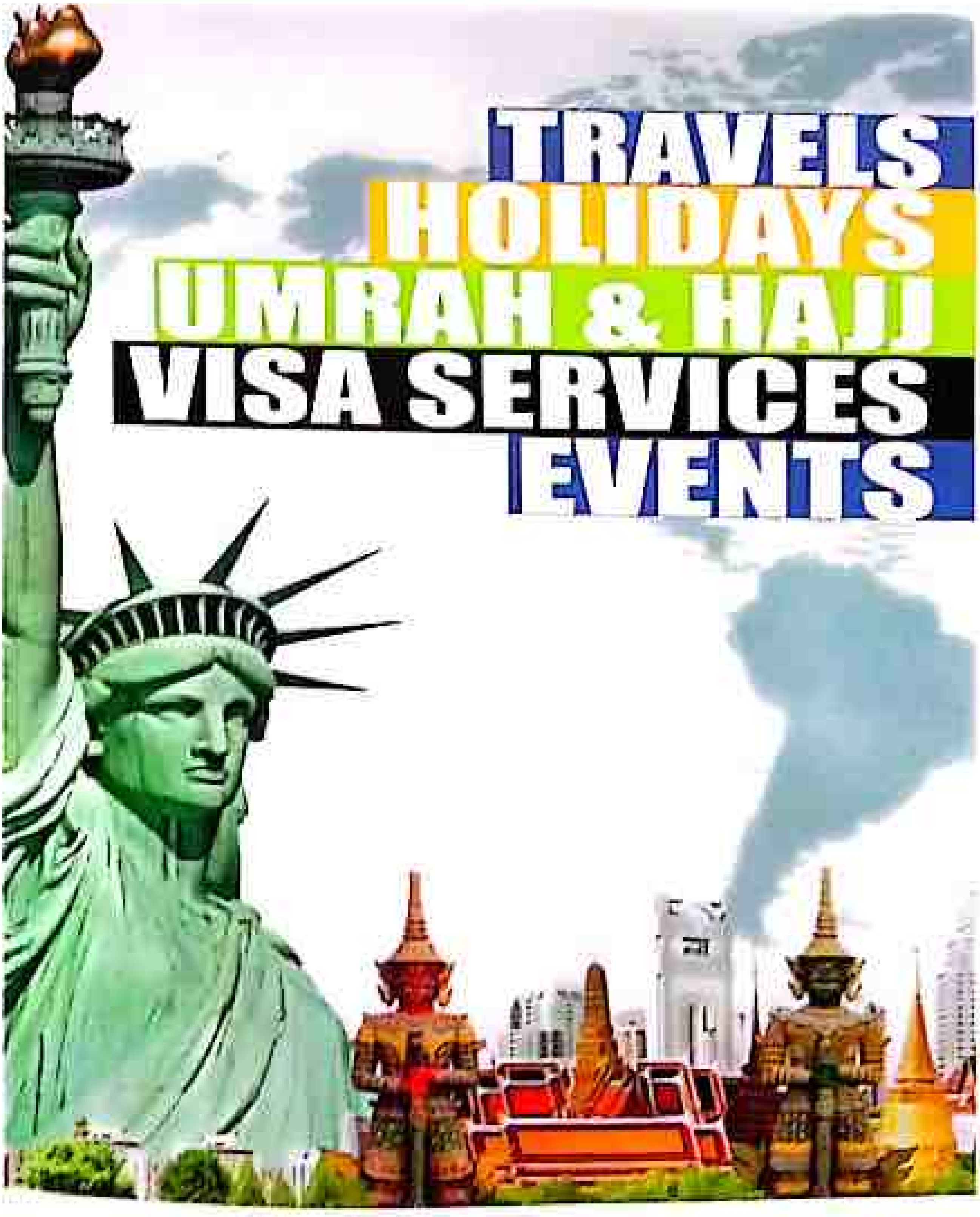

FOR FURTHER DETAILS PLEASE VISIT OUR OFFICE

102-105, Muhammadi House,
I.I. Chundrigar Road, Karachi – Pakistan
T: +92 21 32444777-19
info@polanisgroup.com | www.polanisgroup.com

CamScanner

تخلیق

یادگار خاص نمبر

CamScanner

Since 1978 ®

Silver Sand
PAINTS

رنگ۔ جو زندگی ہے!

UP Industries(Pvt.)Ltd
Jhugian Sialan, Sui Gas Road, Behind
Firdous Flour Mills, 13-Km Shiekhupura Road
Lahore Pakistan
Ph# 04237164254,55
Godown Ph# 04237164252
Email:silversandpaints@hotmail.com

CamScanner

Winter Family Festival
HOT DeLivey DeAls 50% Less Than MeNu PriCe
options
AN EXOTIC RESTAURA
LAHORE
RS : 999
Family Fun Deal
Large Pizza of Choice, Exotic Club Sandwich, Crispy Plain Fries, 1.5 Ltr Coke.
Good For 4 Persons
RS : 119
MaMa'S Break Time
Exotic Chicken Handi, Special Tawa Chicken, Chicken Biryani, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke
RS : 1399
Grand Slam'N Deal
Exotic BBQ Platter, Chicken Karahi Half, Chicken Biryani, Salad Bowl, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke.
Good For 4 Persons
RS : 169
MonSter MeaL
Chicken Roast Full, 6 Reshmi Kebab, Chicken Handi, 3 Naan, 3 Roti, Raita, Salad, 1.5 Ltr Coke
ONLY FOR FREE HOME DELIVERY & TAKEAWAY
DELIVERY HOT LINES 0333-2800935 0333-14044
STARBUCKS COFFEE
BUY "1" GET "ONE" FREE
AVAILABLE INSIDE CAFE WITH THIS VOUCHER
OPTIONS SPECIAL ICE-CREAM
BUY "1" SCOOP GET "ONE"

تبت سنو

ممتاز شاعر اور ''ماہنامہ تخلیق'' کے مدیر

اظہر جاوید

کی مطبوعات جن پر انہیں ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' دیا گیا

جناب اظہر جاوید اردو اور پنجابی کے ممتاز ادیب، مشہور شاعر اور معروف صحافی ہیں، آپ جنوری 1938ء سرگودھا میں پیدا ہوئے
اس وقت لکھنا شروع کیا جب ابھی آپ سترہ سال کے تھے۔ سرگودھا میں اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کے دوران آپ نے بعض ہفت روزہ
مجاہد اور رفیق) کی ادارت کی۔ آپ نے سینئر شاعر جناب الطاف مشہدی کی مدد سے ہفت روزہ ''خلوص'' کا آغاز کیا۔ اس کے بعد آپ نے
میں ادبی صفحے کے انچارج کے طور پر شمولیت اختیار کی لیکن جلد ہی آپ نے ادبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر کالم لکھنے شروع کر دیے
کے طور پر ادبی جریدے ''تخلیق'' کی بے لوث ادارت کرتے رہے۔ بطور شاعر اور ادیب بڑی تعداد میں آپ کی کتابیں شائع ہوئی ہیں
تنظیموں کی جانب سے متعدد بین الاقوامی انعامات ملے ہیں۔

CamScanner

Brighto
Inspired by Nature
Brighto
STAIN FREE
EASY WIPE
اب دیواریں رہیں
صاف شفاف
بِنا رنگ اُڑائے!
brighto.paints
Toll Free 08000-1973
www.brightopaints.com
Brighto
PAINTS

CamScanner

یادگار خاص نمبر

مسلسل اشاعت
48
واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصہ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 48 — مارچ 2017ء — شمارہ : 3 — CPL نمبر 96

قیمت : 250 روپے ——— 750 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر —— ہندوستان کے لیے 1,200 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor)
Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt. (Ph : 04237187500 - 04236671007)
موبائل فون: 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

تنویر جہاں (امریکہ) —— فوزیہ مشتاق (امریکہ) —— نارنگ ساقی (انڈیا) —— جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جانِ آفریں کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43 ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آپڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود — میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رواں رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''معاصر''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (انشاء اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔ ''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کے مضامین کے انتخاب کے لیے ''تخلیق پینل'' تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، ہاشمی ظہیر، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف 1,200 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

U.S.A.
Nayyar Jahan
2740 South Barrington
AVE Los Angles
C.A. USA
Ph : 0013102960303
Email: Zjhanat@hotmail.com
urdu@urdu-markaz.com

U.S.A.
Fopin Mushtaq
5-Industrial Cantt
River Side Roslle
Island
Ph:001-40177284
Email: [illegible]@gmail.com

INDIA
K.L. Narang Saqi
L-4-Connaught Circus, New
Delhi-110001, India
Ph: 0091-41517818
Email: narangsaqi@gmail.com

PAKISTAN
Javed Manzoor
78-Islam Block, Azam Garden,
Multan Road, Lahore
Ph: 04237541232
Cell : 0300-8448327
Email: [illegible]@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ — خورشید بیگ میلسوی — 6
نعت رسول مقبولؐ — سعود عثمانی — 6
نعت رسول مقبولؐ — سید ریاض حسین زیدی — 6

''تخلیق'' ایوارڈ 2016ء

کھڑکی میں بیٹھے وقت کی گواہی — حسین مجروح — 7

اظہر جاوید کی پانچویں برسی

رپورتاژ — سرفراز سید — 9

مضامین

ایک انقلابی دانشور — ڈاکٹر مبارک علی — 14
''زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے'' — ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم — 16
کچھ بشریٰ رحمان کے بارے میں — اقتدار ساجد — 19

رپورتاژ

ادبیات پاکستان — محمد حفیظ — 21

گوشۂ اظہر جاوید

اظہر جاوید اور تخلیق — حسن عسکری کاظمی — 24
اظہر جاوید کی یاد میں — شیخ خالد — 27
ایک خط (بیگم سلمیٰ کی کہانی) — اظہر جاوید — 29
نظم زاد — سونان اظہر جاوید — 32

گوشۂ ڈاکٹر انور سدید

غالب — سب اچھا کہیں جسے — ڈاکٹر انور سدید — 35
ڈاکٹر انور سدید — ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم — 37

تھوڑا سا اگر کہوں — مرزا احمد نور طاہر — 41
ڈاکٹر انور سدید — اے۔ خیام — 43

یادِ رفتگاں

مرقعِ مہر و وفا — بشریٰ رحمٰن — 45
قدسیہ صوفی — ابصار عبدالعلی — 49
کوچۂ قاتل اور خستگانِ آرزو — شکیل اختر — 51
اعزاز احمد آذر — افتخار مجاز — 55
حسن تجمل عثمانی — اظہر جاوید — 60

منظومات

ستیہ پال آنند، جلیل عالی، سعید سرہانی، قیصر نجفی، یونس صابر — 65
محمود شام، شہزاد نیر، توقیر مشتاق، محمد عثمان، یوسف وفا
آسناتھ کنول، آفتاب خان، امجد بابر، شہناز پرویز مفتی — 68

افسانے

اندراج — محمد حامد سراج — 69
پو پھٹے — آغا گل — 73
جو حکایتی — یسین احمد (انڈیا) — 81
یہ سوہا گنگل فون — ممتاز راشد لاہوری — 85
جو تیرے احد جانا — شعلہ بیگھری (کینیڈا) — 87
گم شدہ — اظہر جاوید — 91

غزلیں

جلیل عالی، آصف ثاقب، مظہر ایوبی، ریاض حسین زیدی — 93
ابصار عبدالعلی، حسن عباسی، ڈاکٹر جواز جعفری، نسیم سحر
نذیر فتح پوری، کرشن پرویز، مظفر حسن منصور، رشیدہ آفرین
سعدیہ سیفی، شاہین زیدی، نثار رانی، شفق، سید انور ہاشمی
طاہر منظور، عاصم بخاری، قیصر اقبال، امر مکنی، فرخ محمود — 99

یادنگاری

ماشی مہر طلب — ڈاکٹر رشید امجد — 100

سفرنامے

ایورسٹ کا بیس کیمپ — فرخ سہیل گوئندی — 107

عراق اشک بار ہیں ہم — سلمیٰ اعوان — 117

طنز و مزاح

یہ ایک پوسٹ — ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی — 121

جائزے

رفیع گمنام — حسن عسکری کاظمی — 123

دکھ ایک چڑیا ہے — سلیم آغا قزلباش — 127

پنجابی ٹھمری — اخلاق عاطف — 133

اخبارات کے تراشے

تخلیق ہستاریہ تقریب — صوفی بیدار — 135

تخلیق کاروں کی تعریف — فرخ سہیل گوئندی — 136

پنجاب رنگ

سلیم شہزاد، سرفراز سید، حمزہ شاہد — 139

تبصرے

گندن چیرے — ملک اشرف ذکی — 140

شہر بہ شہر میں — نجم الحسن رضوی — محمد علی چراغ

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم — آفتاب خان

ماضی اور حال (3) — آفتاب خان

حرف آغاز — آفتاب خان

تبصرے — آفتاب خان

رنجیدہ ماضی — تنویر جاوید — 145

انجمن خیال

سید منظور حسین یاد، آصف ثاقب، حامد سراج، مسلم شمیم — 146
آغا گل، عذرا اصغر، تنویر ظہور، سید ریاض حسین زیدی
خاقان ساجد، محمد طارق علی، احسان بن مجید، ملک اشرف ذکی
زریں یاد، دردانہ نوشین خان، ڈاکٹر سکندر حیات، مرزا احمد نور طاہر — 159

تخلیق کو موصول رسائل اور کتب

ملکی اور غیر ملکی — 160

سرورق

ایس خالد

ناشر: سونان اظہر جاوید

طابع: بیدار سرمدی

قانونی مشاورت: لطیف احمد قریشی

مطبع: گیلیکسن پرنٹرز گلشن راوی لاہور

مقام اشاعت

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I,
Islam Nagar, Walton Road, Lahore -Cantt

(ادارتی کے حقوق محفوظ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پہلی بات

ہر بار جب "پہلی بات" لکھنے بیٹھتا ہوں تو خیالات و واقعات کا ایک ریلا دماغ میں گردش کرنے لگتا ہے۔ ان خیالات و واقعات کو جمع کرنا مشکل لگنے لگتا ہے کیونکہ میں وہ ادیب نہیں کہ جس کے سامنے الفاظ قطار اندر قطار ہاتھ باندھے ہمہ وقت کھڑے رہتے ہیں نہ ہی کوئی شاعر کہ جس پر الہامات کی بارش ہوتی رہتی ہے۔ مجھ جیسے طالب علم کے لیے اپنے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر تحریر کرنا مشکل امر ہوتا ہے۔ ہر بار یہ سوچتا ہوں جو کہنا چاہتا تھا اس کا اظہار موثر انداز میں نہیں کر پایا۔ ہر بار اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے۔ 15 فروری کو ابو کی برسی کی سالانہ تقریب کا انعقاد کیا جس میں شعبہ ادب، صحافت، ٹیلی ویژن اور دیگر شعبہ جات سے منسلک دوست احباب نے شرکت کی جن کا میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔ ان تمام میڈیا والوں کا بھی جنھوں نے پروگرام کی کوریج کی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اس شاندار تقریب میں ادب کے نامور روشن ستارے اسٹیج پر جلوہ افروز تھے لیکن پھر بھی مجھے کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کمی ڈاکٹر انور سدید کی اور محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ کی جو سال 2016ء کی تقریب میں اسی اسٹیج پر اپنی تمام تر شان و شوکت کے ساتھ اسٹیج پر براجمان تھے۔ بانو قدسیہ صاحبہ 4 فروری 2017ء کو ہم سے جدا ہو گئیں۔ "داستان سرائے" کی ادبی داستانیں خاموش ہو گئیں۔ بانو قدسیہ سراپا محبت تھیں۔ ان کے دم سے ادبی دنیا میں رونق تھی۔ ان کے گھر کے دروازے ہر وقت ادیب اور ادب کے لیے کھلے رہتے تھے۔ نئے لکھنے والوں کے لیے ان کا گھر ایک ادبی درس گاہ تھا۔ بانو قدسیہ صاحبہ کی وفات سے 2 دن قبل ان کے بیٹے اثیر سے بات ہوئی تو انھوں نے بتایا امی بیمار ہیں اور ICU میں داخل ہیں۔ دعا ان کی زندگی کے لیے دعا کرتا رہا اور اثیر سے لمحہ بہ لمحہ رابطے میں رہا۔ 4 فروری کی شام اثیر کی کال آئی۔ انھوں نے بانو قدسیہ صاحبہ کی وفات کی خبر دی۔ میں فوراً ان کے گھر ماڈل ٹاؤن روانہ ہوا۔ جنازہ کے بعد جب قبرستان روانہ ہوئے تو والد صاحب اور ڈاکٹر انور سدید کی بہت یاد آئی۔ بانو قدسیہ صاحبہ کو بھی قبر میں اتارنے کا شرف حاصل ہوا۔ میں خود کو خوش قسمت مانتا ہوں کہ ادب کے درخشاں ستاروں کو لحد میں اتارنے کا شرف حاصل ہوا۔ بانو قدسیہ صاحبہ کو عقیدت مندوں کے ہجوم میں اشفاق احمد صاحب کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ یہ ادب کے وہ درخشندہ ستارے ہیں جو تاقیامت ادب کے افق پر چمکتے رہیں گے۔ ان کا نام ہمیشہ قائم رہے گا اور ان کے کام سے ادب کے طالب علم مستفید ہوتے رہیں گے۔

"تخلیق" کی سالانہ تقریب میں سابقہ روایات کو برقرار رکھتے ہوئے طارق اصغر صاحب کو اس سال کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ "تخلیق ادبی ایوارڈ" پیش کیا گیا۔ طارق اصغر گزشتہ 35 سے زائد سال کے عرصے سے ادب کے شعبہ سے وابستہ ہیں۔ ایک شکایت کہیں یا عرض ہم ادبی حلقے کے لوگ تعریف کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں۔ میری عرض ہے کہ تمام احباب جو اس بات سے متفق ہیں کہ "تخلیق ادبی ایوارڈ" ظہیر جاوید [illegible] ادبی خدمات کے عوض دیا جاتا ہے۔ طارق اصغر صاحب کو تخلیقی طور پر مبارک باد دیں گے اور اس میں بخل سے کام نہیں لیں گے۔

آپ تمام احباب کی محبتوں اور کوششوں سے تخلیق نے [illegible] ہے۔ یہ دن بدن "تخلیق" کی طلب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لکھاری اپنی تحریروں کو تخلیق میں شائع کروانا اعزاز سمجھتے ہیں۔

موجودہ شمارے میں سال 2016ء اور رواں سال 2017ء کے آغاز میں ہم سے جدا ہو جانے والے ادبی ستاروں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ خصوصاً ڈاکٹر انور سدید جن کی پہلی برسی 20 مارچ 2017ء کی ہے پر خصوصی گوشہ شامل کیا گیا ہے۔ انتظار حسین، عبداللہ حسین، [illegible]، بانو قدسیہ، اصغر گوشہ یہ ایسے نام ہیں جو بظاہر تو اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے ہیں پر ہمارے دلوں میں ہمیشہ موجود رہیں گے۔ ان کا کام ان کا نام انھیں تاقیامت زندہ رکھے گا۔ دعا ہے رب ذوالجلال ان سب کو آخرت میں بھی اتنی پذیرائی دے جو دنیا میں ان کا مقدر تھی۔ اللہ ان سب کے درجات بلند فرمائے۔ آمین!

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

•••

حمد

اس نے رعدِ شکر کی برسات میں رکھا ہوا ہے
مجھ کو مصروفِ مناجات میں رکھا ہوا ہے

وہی دیتا ہے اندھیروں میں اجالوں کی نوید
جس نے خورشید کو ظلمات میں رکھا ہوا ہے

جس قدر ظرف ہے اتنا ہی دیا ہے اس کو
اس نے ہر شخص کو اوقات میں رکھا ہوا ہے

ظلمت و نور میں رکھا ہے تفاوت جس نے
اس نے اک ربط بھی دن رات میں رکھا ہوا ہے

زندگی بھی تو امانت ہے اسی کی آخر
موت کو جس نے مری گھات میں رکھا ہوا ہے

وہی بے حوصلہ ہونے سے بچاتا ہے مجھے
جس نے انسان کو خطرات میں رکھا ہوا ہے

تہی داماں ہوں، تہی دستِ ہنر ہوں خورشید
اس نے اک وصف مرے ہات میں رکھا ہوا ہے

خورشید بیگ میلسوی

OOO

نعت

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

سعود عثمانی

OOO

نعت

رحمتیں آ گئیں آپؐ جب آئے
معجزے آپؐ کے ساتھ آئے

تھام لے جو بھی آپؐ کا دامن
سب جہانوں کی نعمتیں پائے

مشعلِ راہ انؐ کے نقشِ قدم
ان کی تنویر — راہ دکھلائے

سیدھے جاتے ہیں منزلوں کی طرف
راستے آپؐ نے جو سمجھائے

ہے جو تسخیرِ کائنات کا فن
اس کے راز آپ ہی نے سکھلائے

جس طرف آپ آنکھ بھر دیکھیں
ابر رحمت اسی طرف چھائے

"روضۂ حسینِ رسالتؐ" ہے وہ روشنی
جس طرف آپؐ کے قدم آئے

سیّد ریاض حسین زیدی

OOO

کھڑکی میں بیٹھے وقت کی گواہی

حسین مجروح

عذرا اصغر ہمارے ادبی افق پر اس وقت نمودار ہوئیں جب بیانیہ افسانہ بہت سے روشن اور اندھے موڑ کاٹ کر اضمحلال کی سطح کو چھونے لگا تھا اور بیانیہ افسانے کے اکہرے پن کی عمومی محدودیت کو علامت، تجرید اور "لاکہانی" کے حربوں سے رفع کرنے کی شعوری کاوشیں اردو افسانے کے بدلتے ہوئے منظرنامے میں نئی رنگ آمیزی کر رہی تھیں۔ بدلتے موسموں کی اس یلغار میں عذرا اصغر نے اپنے ہنر کا دیا پرانے مگر آزمودہ روغن سے ہی جلانے پر اصرار کیا (گو کہ اس گدلی کاوش میں بھی وہ اپنے حصے کا تیل ڈالنے کی ذمہ داری سے غافل نہیں رہیں)۔ کہانی پن کی افضلیت پر ان کا اصرار گزشتہ چھتیس چالیس برس کے افسانوی سفر میں اس قدر مستحکم اور متحرک رہا ہے کہ اب ان کا شمار بیانیہ افسانے کی نمائندہ ترین لکھاریوں میں کیا جا سکتا ہے۔

ایسا بھی نہیں کہ بیانیہ پن کی اقلیم میں انہوں نے افسانے کی عمارت کو ساختی پائیداری اور اس کے دروبست کو معنیاتی عمق عطا کرنے والے عناصر سے اغماض برتا ہو۔ ضرور ہے کہ ان کی بیشتر کہانیوں کا سیاق سفید پوش اور درمیانے شہری طبقات کی روزمرہ زندگیوں، ان کے کرداری تضادات اور شریفانہ اطوار سے لپٹی ہجرتی قربانیوں، خود فرضی پر ندامت گزاریوں اور کھینچاتانیوں سے مرتب ہوتا ہے اور یوں ان کی فنی شناخت کا انسلاک اردو افسانے میں سماجی حقیقت پسندی کی اس درخشاں روایت سے ہوتا ہے جس نے گزشتہ صدی کی تیسری چوتھی دہائی میں پریم چند کے طرزِ افسوں سے اردو افسانے میں نمود کیا تھا اور جسے ترقی پسند تحریک کی مقصدیت سے بھرپور لپک نے جدید اردو افسانے کا روشن ترین چہرہ بنانے میں اپنا بیشتر قیمتی زرگل وار دیا تھا۔ تاہم عذرا اصغر کی افسانوی کائنات کا بغور مطالعہ کرنے پر قاری اور نقاد پر (قاری پر زیادہ اور نقاد پر کم) کھلتا ہے کہ ان کا بیانیہ سادہ ضرور ہے، سپاٹ ہرگز نہیں۔ اکہرے پن کی تہمت سے بچتے ہوئے انہوں نے اپنے بیشتر افسانوں میں جہاں تہاں علامتوں سے ٹانکے مکالموں کی معنویت اور واقعیت کے عقب سے جھلکتی دردمندی کی مدد سے کہانی پن کے حتمی دیار کو ثروت مند کرنے میں کنجوسی نہیں برتی اور اسی "ملاوٹ" کے باعث عذرا اصغر کے افسانے محض قرأت کی آسودگی پر منتج نہیں ہوتے بلکہ قاری کے ذہنی افق کو وسعت و بالیدگی کا اہتمام کرتے بھی نظر آتے ہیں۔

کہنے کو عذرا اصغر نے ناولوں اور یادنگاری سے بھی علاقہ کیا ہے لیکن ان کے ہنر کا اصل جوہر افسانے میں تصویر ہوا ہے۔ سامنے کی زندگی سے چنے ہوئے کرداروں اور روزمرہ کی معاشرت کے گرد بنے ہوئے ان افسانوں میں کہانی پن کا ناشکستہ رشتوں کی ٹوٹ پھوٹ اور اقدار کے انہدام کا ہجرا نمایاں تر ہے لیکن یہ تجزیاتی اظہار تو ان کی فنی صداقت کی بابت اصولی نظر کا شاخسانہ قرار پائے گا کہ عذرا اصغر کی افسانوی دواقداری ٹوٹ پھوٹ محض ایک ادھ کھلی کھڑکی ہے جس کے اس پار بہتر زندگی اور بہتر انسان کا امکانیہ لو دیتا ہوا محسوس ہوتا ہے...... "کچی مٹی کی عورت"، "تعبیر ڈھونڈنے والے"، "خواب دیکھتی آنکھیں"، "یادِ سمار"، "پیاز کا چھلکا" اور "دہشت گرد" ایسی کہانیاں اسی ادھ کھلی کھڑکی سے ذات کے اندھے کنوئیں میں آبشار کی طرح گرتی ہوئی روشنی کی لکیریں ہیں جن کا انتخاب یہیں انسانی تو

کہیں طمانیت کا حاشیہ بناتا ہے لیکن ایک مخصوص انداز میں زندگی کرنے اور اسے اپنانے کا زاویہ بھی بہم کرتا ہے۔ واضح رہے کہ مذکورہ بالا کہانیوں کو صرف مثال کے طور پر ہی نشان زد کیا گیا ہے ورنہ عذرا اصغر کے ہاں بہت سی اور کہانیاں بھی روشنائی کو روشنی کے درجے پر فائز کرتی ہیں۔

رشید امجد نے عذرا اصغر کو مشرقی تہذیب کی علمبردار افسانہ نگار کہا ہے لیکن یہ "تمغہ" پورے طور پر دلالت نہیں کرتا۔ ضرور ہے کہ عذرا اصغر کی بیشتر کہانیوں کا تار و پود مشرقی اقدار کے تانے بانے سے استوار ہوا ہے اور یہ بھی درست ہے کہ ان کے ہاں اظہار کی شائستگی اور پلاٹ سے لے کر کرداروں کی پرداخت تک تہذیب کی روپہلی رو مسلسل کارفرما رہتی ہے لیکن ان کے افسانوں کا مجموعی تاثر اور زیریں لہر کے طور پر ہونے والی گردش میں دہشت کرتی بے اطمینانی اور نارسائی ایسے زاویے ہیں جو انہیں تہذیبی اطوار کی نمائندگی سے اوپر اٹھا کر زندگی کے اولتے بدلتے مناظر اور آدمی اپنی پیچیدہ مشینوں کے پاش کے منصب پر متمکن کرنے میں جھجک محسوس نہیں کرتے۔

افسانوں کی بنت میں عذرا اصغر کہانی کے پلاٹ اور واقعاتی تال میل کو فوقیت دیتی ہیں۔ کرداروں کی ذہنی پرداخت اور ان کے شخصی و نفسی میلانات کی حیثیت ان کے ہاں عموماً ثانوی ہوتی ہے۔ رہا معاملہ مکالموں کا جو بیانیہ افسانے کی بے رنگی اور (بعض صورتوں میں بے توفیقی) کو رفو کرنے کے لئے بیشتر افسانہ نگاروں کے ہاں امرت دھارا قسم کے شے ہوتے ہیں عذرا اصغر کے افسانوں میں مکالمے بھی پلاٹ اور واقعات کے نوازی پتنگ پر کے کاوشیوں کی طرح ہوتے ہیں جن سے ایک لگا کر ان کا افسانہ "کاہے ستا تا" کا ہے اٹھا ہے"۔

سو بندا افسانوں کے پہلو بہ پہلو انہوں نے ایک تاثری یک پہلو افسانچے بھی خوب تحریر کیے ہیں۔ جیسے "تجارت" "محبت" "وعدہ" "آنسو" وغیرہ۔ وہ چاہتیں تو ان افسانچوں کی لسی میں پانی ڈال کر ان "ست ماہوں" کو باآسانی رنگی افسانے کے بیچ من میں منقلب کر دیتیں لیکن بڑے اچھے افسانہ طراز کی طرح انہیں بھی یہ آموختہ ازبر ہے کہ اچھے افسانے کی پہچان اس کے آغاز سے نہیں اختتام بلکہ اختتامیہ سے ہوتی ہے۔ جبھی تو افسانہ ہو کہ افسانچہ ایک طرح کی کفایت لفظی عذرا اصغر کی کہانیوں میں ہمیشہ سے بڑے کار لاتی ہیں۔ اور یہ احتیاط ان کے طویل افسانوی سفر میں ہمیشہ ان کے ہمرکاب رہی ہے جو تخلیقی پیچ و خم رزمی کی جاریہ فضا میں اچھنبے سے کم نہیں۔

آدھی درجن سے کچھ اوپر افسانوی مجموعوں کی خالق ہونے کے باعث عذرا اصغر اپنے کام میں منجھ گئی ہیں اور اب کہانی بھی اپنے بھید بھاؤ اپنے عشوے اور ادائیں ان پر منکشف کرنے میں جھجک سے کام نہیں لیتی۔ سو افسانے کے "وقت سوئی" میں وہ مرحلہ آن پہنچا ہے کہ وہ اچھی کہانیوں کا تعاقب چھوڑ کر بڑی کہانی کو اپنی آرزو کا وظیفہ کریں کہ اچھی کہانیاں تو وقت کی سوزن نے ان کے افسانہ طراز آنچل پر وافر تعداد میں ٹانک دی ہیں لیکن اردو افسانے کا سنجیدہ قاری ان کے سوز دروں سے ان کی وحدت کے پار دیکھنے والی آنکھ سے "کم از کم ایک بڑی کہانی ___ آنکھ میں لو دیتی ایک جگنو لاجونتی ___ ایسی کسی کہانی کا شدت سے منتظر ہے اور اگر وہ یہ کام ایک سے زیادہ بار کر پائیں تو ___ میرے منہ میں گھی شکر۔

(نوٹ۔۔ ادبی برادری کی طرف سے سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ملنے پر عذرا اصغر کو مبارک باد)

◆◆◆

رپورتاژ

اظہر جاوید۔ یادوں اور دعاؤں کی پانچویں تقریب

سرفراز سید

عزیز سونان اظہر نے اپنے عظیم رحمت جسمت والد اظہر جاوید کو دو طرح سے زندہ رکھا ہوا ہے۔ ایک تو یہ اظہر جاوید کی تخلیق ماہنامہ "تخلیق" کو اسی شان بان سے زندہ رکھا ہے بلکہ اس میں اہم اضافے بھی کئے ہیں، دوسرے یہ کہ اظہر جاوید کو ابدی سفر پر روانہ ہوئے چھ برس ہو گئے ہیں۔ سونان ہر سال 14 فروری کو اظہر کی یاد میں ایک اچھی جگہ پر ایک بڑی یادگار تقریب کا اہتمام کرتا ہے۔ لاہور اور دوسرے شہروں میں اظہر جاوید کے دیرینہ رفقا اور نامور ادیبوں، شاعروں سے انفرادی طور پر رابطے قائم کر کے انہیں تقریب میں بلاتا ہے۔ یہ سب کے سب آتے ہیں۔ اظہر کی باتیں کرتے ہیں، وہ تو پہلے ہی زندہ ہے، یہ لوگ اسے مزید زندہ کر دیتے ہیں۔ ویسے تو بڑے نامور لوگوں کی طرح اظہر جاوید کے نام کے ساتھ بھی مرحوم کا لفظ نہیں لکھا جاتا۔ وہ تو مرحوم ہوا تو انہوں کی رفاقت اور یادوں سے محروم ہوا۔ میری اپنی اظہر جاوید سے تقریباً 40، 42 برس کی رفاقت رہی۔ اسے ابھی نہیں جانا چاہیے تھا مگر وہ بھی اپنے ہی انداز کا جوگی تھا۔ ہنستے کھیلتے، باتیں کرتے، قہقہے لگاتے اچانک اٹھا اور کہیں چلا گیا۔ اس کے بہت اچھے بیٹے سونان اظہر نے اسے مرحوم نہیں ہونے دیا۔ اس کا اپنا اچھا خاصا کاروبار ہے وہ اس کے ساتھ اظہر جاوید کے ورثے "تخلیق" پر بھی بھرپور توجہ دیتا ہے۔ اظہر جاوید نے اپنا دفتر لاہور شہر کے وسط، پرانی انارکلی میں بنایا ہوا تھا۔ سونان کو اپنے کاروبار کے باعث "تخلیق" کا دفتر کافی دور واشن روڈ پر لے جانا پڑا ہے مگر اس میں بھی اظہر جاوید کے دفتر کی طرح ادیبوں، شاعروں کا مشغلہ لگا رہتا ہے۔

سونان اظہر نے اس بار، پانچویں برسی پر بھی شہر بھر کے ادیبوں، شاعروں کو ایک بھرپور تقریب میں اظہر جاوید کے ساتھ لا بٹھایا۔ یہ ایک بھرپور تقریب تھی۔ اس کی صدارت ممتاز استاد، ادیب اور شاعر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے کی۔ سٹیج پر ان کے ساتھ بشریٰ رحمان، عابد حسن منٹو، امجد اسلام امجد، الطاف حسن قریشی اور ڈاکٹر مبارک علی بھی موجود تھے۔ حسین مجروح نے تقریب کی نظامت اور آغاز کیا۔

شرکا میں مجھ سمیت ماہنامہ "الحمرا" کے مدیر شاہد علی خان، قاضی جاوید، بخت اور بہت سے دوسرے حضرات اور کثیر تعداد میں خواتین بھی موجود تھیں۔ تقریب میں معروف افسانہ نگار عذرا اصغر کو ان کی مسلسل بھرپور خدمات پر سالانہ تخلیق ایوارڈ دیا گیا۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے صاحب قلم افراد کو شیلڈیں اور گلدستے پیش کیے گئے۔ تقریب کے اہتمام میں سونان کی رفیقہ حیات سعدیہ شامل تھیں۔ تقریب میں کثیر تعداد میں مقررین نے اظہر جاوید کی شخصیت، زندگی اور ادبی خدمات پر بھرپور خراج تحسین پیش کیا۔ یہاں اس تقریب کی مختصر روداد پیش کی جا رہی ہے۔

تقریب کا آغاز کرتے ہوئے حسین مجروح نے کہا کہ سونان نہایت قابل تحسین انداز میں رسالہ "تخلیق" کو آگے لے جا رہا

ہے، ہم سب نے اس کام میں اس کی بھرپور معاونت کرنا ہے۔ تقریب کی ابتدا میں سوہان اظہر جاوید نے ممتاز ادیبہ عذرا اصغر کو پانچواں سالانہ ''تخلیق ایوارڈ'' اور صدیہ سوہان نے گلدستہ اور چادر پیش کی۔

محترمہ عذرا اصغر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا ادبی ایوارڈ ہے۔ سرکاری ایوارڈ تو حکومت سفارشوں سے دیتی ہے لیکن سوہان نے بغیر کسی سفارش کے میری حوصلہ افزائی کی ہے۔ میں سوہان اور ادارہ ''تخلیق'' کی تاحیات شکرگزار ہوں۔ اس کے بعد دوسرا اعزاز UP انڈسٹریز کے ڈائریکٹرز جاوید منظور اور طاہر منظور کو تخلیق کی خصوصی معاونت پر پیش کیا گیا جسے کاشف بشیر خان (ستارا ایشیا) اور سوہان اظہر نے خود پیش کیا۔ اظہار خیال کے سلسلے کا آغاز کرتے ہوئے افتخار صاحب نے سب سے پہلے اظہار خیال کا عندیہ ظاہر کیا۔ انھوں نے اظہر جاوید کے لیے ایک غزل پیش کی جس کا ایک شعر یوں ہے

کسی تنہائی کے صحرا میں نہ پیاسا مر جاؤں — جانے والا میری آنکھوں میں نمی چھوڑ گیا

امجد اسلام امجد نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ لاہور سے تخلیق ایسے ادبی رسالے کی مسلسل 48 سال سے اشاعت بہت بڑی بات ہے۔ اظہر جاوید نے بخارین افسانوں کا اردو میں ترجمہ کیا جو کہ بہت بڑی بات ہے۔ ان کے کام کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ شاہد علی خان اور سوہان اظہر نے بشریٰ رحمان کو ایوارڈ اور گلدستہ پیش کیا۔ بشریٰ رحمان نے کہا کہ آج کی مہکتی پھولوں سے لدی ستاروں بھری شام جس شخص کے لیے منعقد کی گئی ہے اس کی خدمت میں سلام پیش کرتی ہوں اور ہم سب اظہر جاوید کے ممنون بھی ہیں کہ وہ ہمارے درمیان تخلیق جیسا رسالہ اور سوہان جیسا بیٹا چھوڑ کر گیا ہے۔

الطاف حسن قریشی نے کہا کہ تقریب میں آکر بے حد خوشی ہوئی۔ سوہان بیٹے نے اس کام کو خلوص کے ساتھ جاری رکھا ہوا ہے۔ جس معاشرے میں بشریٰ رحمان، عذرا اصغر، احسان دانش، فیض احمد فیض، اظہر جاوید ایسے لوگ موجود رہیں گے معاشرہ زندہ رہے گا اور ''تخلیق'' کے ساتھ آگے بڑھتا رہے گا۔ ابصار عبدالعلی اور سوہان اظہر نے عابد حسن منٹو کو ایوارڈ اور گلدستہ پیش کیا۔ عابد حسن منٹو نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ وقت اظہار خیال کا نہیں شکریہ کا وقت ہے۔ میں شکریہ ادا کرتا ہوں اظہر جاوید اور سوہان کا کہ ہمارا معاشرہ اور بین الاقوامی فضا تقاضا کرتے ہیں اچھے اور معیاری جرائد کا اور تخلیق بین الاقوامی سطح کا معیاری جریدہ ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔ سوہان اسے جاری رکھیں۔

تقریب کے اختتام سے پہلے آخری ایوارڈ اور گلدستہ صاحب صدر ڈاکٹر خواجہ زکریا کو پیش کیا گیا جو کہ سوہان اظہر ایڈیٹر ''تخلیق'' نے خود پیش کیا۔ تقریب کے صدر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے کہا کہ ''تخلیق'' کی بہت بڑی بات نئے لکھنے والوں کو متعارف کرانا ہے۔ اظہر جاوید نے مجھے بھی شاعری پر مائل کیا۔ میری شاعری کا سارا اعزاز اظہر جاوید کو حاصل ہے۔ یہاں آج اچھی اور معیاری گفتگو ہوئی ہے جو بہت معیاری ہے۔ سوہان کا شکرگزار ہوں کہ وہ ایسی معیاری تقریبات اور تخلیق کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے۔ عذرا اصغر کو تخلیق ادبی ایوارڈ دینا بہت عمدہ فیصلہ ہے۔ تخلیق نے گزشتہ 4 برس سے جو بھی ادبی ایوارڈ دیا ہے وہ قابل اور لائق تحسین لوگوں کو غیر جانبداری سے دیا ہے۔ سوہان طویل عرصہ تک ادب سے دور رہے لیکن پھر بھی وہ ایک بہت اچھے منتظم اور مدیر ہیں۔

ابصار عبدالعلی نے سوہان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ اظہر جاوید ہم سب کا دوست تھا۔ وہ ایک عظیم انسان تھا کہ اپنے پیچھے بہت سی ادبی روایات چھوڑ گیا جنھیں سوہان بخوبی نبھا رہا ہے۔ اسلم گورداسپوری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ یہ پاکستان اکیڈمی آف

لیٹرز سے جاری تقریب ہے جس میں کوئی حکومتی یا سیاسی شرکت نہیں۔ یہ خالصتاً ادبی تقریب ہے جو صرف ادب اور اظہر جاوید کے نام پر منعقد کی گئی ہے۔

اظہر جاوید کے دیرینہ رفیق کار ڈاکٹر کنول فیروز کو ان کی اعلیٰ ادبی خدمات پر ریحان اظہر، میجر پی ٹی وی اطہر نے ایوارڈ اور صحت یابی پر سوہان اظہر اور سعدیہ سوہان نے گلدستہ پیش کیا۔ ڈاکٹر کنول فیروز نے کہا کہ اظہر اور میں نے 15 سال کی عمر سے اکٹھے شاعری اور صحافت شروع کی۔ میرا اور اظہر جاوید کا سن پیدائش بھی ایک ہے اور ہم دونوں کے پوتوں کی عمر بھی اب 8،8 سال ہو گئی ہے جو کہ خود اپنے آپ میں دوستی کی ایک زندہ مثال ہے۔

ناصر بشیر نے کہا کہ مجھے آج بھی اظہر جاوید کی مشفقانہ دعائیں یاد آتی ہیں جو ہر وقت اپنے احباب کے لیے ان کی زبان و دل سے جاری رہتی تھیں۔ ڈاکٹر اختر شمار نے کہا کہ اظہر جاوید کے لیے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر خواجہ زکریا کے بعد اظہر جاوید کو میں اپنا استاد مانتا ہوں۔ انھوں نے بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو متعارف کروایا۔ میری پہلی غزل بھی "تخلیق" میں شائع ہوئی۔ اظہر صاحب کی محبتوں کا یہ عالم تھا کہ جب میری والدہ کی وفات ہوئی تو اظہار افسوس کے لیے جو فون کال سب سے پہلے موصول ہوئی وہ اظہر جاوید کی تھی۔

افتخار مجاز نے کہا کہ اظہر میرے بھائی جان تھے۔ وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھی بہت پیار کرنے والے انسان تھے۔ ان کے بعد "تخلیق" کو سوہان اظہر نے سنبھال رکھا ہے۔ ہم سب آج یہاں اظہر جاوید کے نام پر اکٹھے ہیں۔ یہ اعزاز بھی اظہر جاوید کی تربیت کو جاتا ہے جو اس نے اپنے بیٹے کی کی ہے۔ ایثار رانا نے کہا کہ سوہان جیسا بیٹا اظہر جاوید کی عظیم تخلیق ہے جو ان کے "تخلیق" کو آگے لے کر چل رہا ہے۔ نوید چودھری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ سوہان باوقار اور تسلسل کے ساتھ اظہر جاوید کی عظیم روایات کو آگے بڑھا رہا ہے یہ بڑی بات ہے۔ اظہر کا نام تا قیامت زندہ رہے گا۔ ڈاکٹر عمرانہ مشتاق نے کہا کہ اظہر ادب کی دنیا میں اتنی بڑی شخصیت ہے کہ آج اس کے نام پر ادبی ستارے یکجا جمع ہیں۔ فرخ محمدی نے کہا کہ جس معاشرے میں ادب جنگ، تلوار، گھوڑا، انتقام، نشہ، یلغار جیسے ادب کو فروغ دے رہا ہے ایسے میں اظہر جاوید کا "تخلیق" اپنے نام کی طرح امن اور محبت کو فروغ دے رہا ہے۔ ادبیات کے کالم میں جنگ، بغاوت اور تلوار کا ذکر ہے جبکہ "تخلیق" ایسے ادبی جریدے کا یہ خاصا ہے کہ آج الطاف حسن قریشی اور عابد حسن منٹو اکٹھے بیٹھے ہیں۔

منور سلطانہ نے کہا کہ اظہر کی "تخلیق" سوہان اظہر اپنی محنتوں سے آج ہم سب کو اظہر جاوید کی طرح یاد آتے ہوئے ہے۔ سلمیٰ اعوان نے سوہان اظہر کو بہت سی دعائیں دیں۔ خصوصی شرکت پر گلوکار شوکت علی کو ایوارڈ اور گلدستہ دیا گیا جسے کاشف بشیر خان اور سعود عثمانی نے پیش کیا۔ شوکت علی نے بچھڑے ہوئے دوستوں کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ آج مجھے ریاض نور اور اسلم کولسری بھی بہت یاد آ رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ جوش صاحب کے جنازے سے واپسی پر میرے ساتھ اظہر جاوید اور سوہان اظہر دونوں تھے۔ میں نے سوہان سے کہا کہ "پترا ایہو جئے کرماں والے ہو گئے کہ توں بعد وچ تو اپنے پیو دا ساتھ نہ چھڈیں" تے اج میں فخر نال کہندا ہاں کہ سوہان اپنے باپ کی میراث "تخلیق" اور اس کے دوستوں کو ساتھ لے کر چل رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ میرا کچھ دن پہلے ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ گلے میں تکلیف ہے، بولا نہیں جاتا لیکن مجھے آنا تھا اپنے دوست اور اس کے بیٹے کی محبت میں۔ میں آج اس محفل میں شریک ہوا ہوں۔ شوکت علی نے اظہر جاوید کی غزل کے دو بول سنائے۔

دن بھر کی بے ترتیبی کو پوچھنے والا کوئی تو ہو
رات کو گھر جب دیر سے آؤں، روٹھنے والا کوئی تو ہو

صدیوں سے میں دل کی دولت لے کر رہ میں بیٹھا ہوں　　　اشراقوں کی بستی میں لوٹنے والا کوئی تو ہو

ان کے بیٹے ——— نے اظہر جاوید کی غزل کو خوبصورت انداز میں گا کر پیش کیا۔

محبت جب گریزاں ہوں، فضائیں روٹھ جاتی ہیں　　　ہم ایسے کم نصیبوں سے دعائیں روٹھ جاتی ہیں
دلوں کی بے بسی ایسا بھی ایک موسم دکھاتی ہے　　　بہاریں منہ چھپاتی ہیں، ہوائیں روٹھ جاتی ہیں
اسے یہ بھی نہیں معلوم اظہر یوں بھی ہوتا ہے　　　ذرا کٹ ساتھ پڑتی ہے، ادائیں روٹھ جاتی ہیں

ایوارڈ پروگرام کے منعقد کرانے میں خصوصی تعاون و معاونت پر آپٹمز ریسٹورنٹ کے سی ای او جناب قیصر رفیق کو ایوارڈ اور گلدستہ ڈاکٹر یاسمین اکبر اور امجد اسلام امجد نے پیش کیے۔ قیصر رفیق نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اظہر جاوید کا نام "تخلیق" نے زندہ رکھا ہے اور یہ زندہ رہے گا۔ اس سلسلے میں آپٹمز ہمیشہ معاونت کرتا رہے گا اور فن و ادب کی خدمت میں اپنا حصہ ڈالتا رہے گا۔

صوفی بیدار نے کہا کہ "تخلیق" ہمیشہ تقریب کے عروج پر ختم ہوتی ہے۔ "تخلیق" تقریب کو روکنے کا واحد راستہ ہے۔ اظہر جاوید زندہ ہیں۔ میں دنیا میں جہاں بھی گیا اظہر جاوید اور "تخلیق" کا نام سنائی دیا۔ اظہر جاوید کا رویہ صوفیانہ تھا۔ وہ اپنی ذات کو پس پردہ رکھ کر دوسروں کو نمایاں کرتے تھے۔ ہم کبھی اظہر جاوید کو نہیں بھول سکیں گے۔

آفتاب خان نے جو تقریب کے منتظمین میں شامل تھے نے تمام احباب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جو محبتیں مجھے اظہر جاوید سے ملیں سونان اظہر بھی اسی طرح مجھے نوازتے ہیں۔ نوید چودھری صاحب خصوصی طور پر تشریف لائے اور کہا جب اظہر جاوید بیمار تھے تو محمود شام سے میں رابطے میں تھا وہ اظہر جاوید کی صحت کا مجھے بتاتے رہتے۔ سونان نے "تخلیق" کو نقطہ عروج پر پہنچا دیا۔

عقیل اختر نے کہا کہ "تخلیق" اور تخلیق کاروں کا شکریہ۔ "تخلیق" میں کبھی کوئی ایسی تحریریں نہیں چھپیں جو غیر معیاری ہوں اور اب یہ معیار سونان اظہر قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اظہر جاوید اچھے آدمی تھے ان کا کام اچھا تھا جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج ہم اس عظیم انسان کو یاد کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ مسعود عثمانی نے کہا کہ یہ میرا اعزاز ہے کہ آج نامور لوگوں کے درمیان میں ایک نامور ادیب کو یاد کر رہا ہوں۔ بلاشبہ سونان کا تعلق براہ راست ادب سے کبھی نہیں رہا لیکن یہ بڑی بات ہے کہ وہ نیک جذبے اور ثابت قدمی سے پرچے کی اشاعت کو جاری رکھتے ہوئے اپنے باپ کے نام کو روشن کر رہے ہیں۔ راقم (سرفراز سید) نے انڈیا سے ڈاکٹر کیول دھیر کا تعزیتی پیغام دیا اور کہا کہ کیول دھیر جب بھی بھارت سے آتے اظہر جاوید کے دفتر پہنچتے۔ سرفراز سید نے اظہر جاوید کے لیے اشعار پڑھے:

ایک لوٹ ایسے بچوں کا جو سبز رتوں میں چاک ہوئے　　　اک قصہ شہر کے پھولوں کا جو فصل گل میں خاک ہوئے
کچھ باتیں ایسے خوابوں کی جو بیچ سفر میں ٹوٹ گئے　　　کچھ یادیں ایسے ہاتھوں کی جو بیچ بھنور میں چھوٹ گئے
ہم دشت طلب میں ٹھہر گئے تم قریہ جاں کے پار گئے　　　یہ بازی جان کی بازی تھی تم جیت گئے ہم ہار گئے

حسین مجروح نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور پھر حاضرین اسٹیج کو دعوت دیتے ہوئے مہمانان خصوصی کے اعزاز میں تیار کردہ ایوارڈ پیش کیے۔ سب سے پہلے ڈاکٹر مبارک علی کو ایوارڈ پیش کیا گیا۔ ایوارڈ اور گلدستہ اسلم گورداسپوری اور سونان اظہر نے پیش کیے۔ ڈاکٹر مبارک علی نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ کسی بھی معاشرے میں تخلیق ایسے ادارے کا قیام بہت بڑی بات ہے جس نے دانش اور فن کی تخلیقات کو عام کر کے بہت خدمات انجام دی ہیں۔

تقریب کے اختتامی کلمات کے لیے سوہان اظہر کو دعوت دی گئی جنھوں نے حسین مجروح کو بہترین نظامت پر گلدستہ پیش کیا۔ ان کا ساتھ سرفراز سید نے دیا۔ سوہان اظہر نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میرے لیے والد صاحب کی وفات کے بعد سال کا آغاز دکھ سے ہوتا ہے۔ پہلے تو 4 جنوری والد صاحب کا یوم پیدائش پھر 4 فروری میں والدہ صاحبہ کی وفات اور 14 فروری والد صاحب کا یوم وفات پھر 20 مارچ میں میرے بزرگ میرے محترم استاد رحمانا ڈاکٹر انور سدید کی وفات۔ سوہان اظہر نے کہا کہ حکومتی ادارے جو ادب کے فروغ اور ادبی تقاریب کے نام پر قومی خزانے کو لوٹ رہے ہیں وہ ادب کی خدمت نہیں کر رہے۔ ادب اور ادیب کو تباہ کر رہے ہیں۔ آج کے دور میں ادبی رسائل جن میں روشنائی، اردو ڈائجسٹ، الحمرا، ادب لطیف، نیرنگ خیال، شاداب، نوادر اور تخلیق جیسے ادبی رسائل ادب کی ترسیل و ترویج کے سلسلے میں اپنا فعال کردار ادا کر رہے ہیں مگر صد افسوس حکومتی سطح پر ایسے کسی ادبی جریدے کو کسی قسم کا تعاون حاصل نہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ کے لیے ایک سوال چھوڑ رہا ہوں کہ اگر ایسے تمام ادبی رسائل بند ہو گئے تو ہزاروں لکھنے والے کہاں جائیں گے؟ کیونکہ تمام شاعر ادیب اتنے مالی طور پر مستحکم نہیں ہوتے کہ اپنی کتابیں چھپوا سکیں۔ انھوں نے تمام حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ تقریب کے اختتام پر شاندار ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔

تقریب میں شامل ان اہم شخصیات کے علاوہ دیگر احباب جو شامل تھے ان میں ممتاز راشد لاہوری، اسلام عظمی، تسنیم منظور، شاہین زیدی (ایڈیٹر نوادر)، تہمینہ (افشاں رانی گجراتی)، خالد شریف، ڈاکٹر اکبر یاسمین، اصغر عجمی، آمنہ سوہان، عقیلہ سوہان، سعدیہ سوہان، رعنا عمران، سحر حنیف، صائمہ اشتیاق، رشید طراز، خلیل اختر، شاہد علی خان، شاہد قادر (سابق ڈائریکٹر وزیر اعلیٰ شکایت سیل)، شیخ علی، شوکت فہمی، منظور علی بٹ (صدر انجمن تاجران لبرٹی) نے شرکت کی اور اس تقریب کی کوریج نجی ٹی وی چینل ستارہ ایشیا، سٹی 42 اور لاہور HD چینل نے کی۔

◆◆◆

معروف کہانی کار اور شاعر فیروز بخت قاضی کی کہانیوں اور نظموں کا نیا مجموعہ

جھرنے

شائع ہو گیا ہے

ملنے کا پتہ: 30-P ڈی ایچ اے لاہور کینٹ (موبائل: 0302-6672557)

مشہور افسانہ نگار، ناول نگار آغا گل کا نیا ناول

فسانۂ جنات

شائع ہو گیا ہے

ملنے کا پتہ: مہرو پبلی کیشنز کوئٹہ (موبائل: 0333-7832323)

مضامین

ایک انقلابی دانشور

ڈاکٹر مبارک علی

برطانوی نژاد تھومس پین (Thomas Paine) کا تعلق دانشوروں کے اس حلقے سے تھا جو اپنے ملک اور قوم سے بالاتر ہو کر عوام کے حقوق کے لئے آواز بلند کرتے ہیں، ناانصافی کے خلاف جدوجہد کرتے ہیں اور لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کر کے انہیں جدوجہد کے لئے تیار کرتے ہیں اور یہ اپنے نظریات کے ساتھ ساتھ عملی طور پر سیاسی تحریکوں میں شامل ہو کر براہ راست عوام کے حقوق کے لئے اپنی زندگیوں کو بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ تھومس پین ایک ایسا ہی دانشور تھا جس نے خلوص اور سنجیدگی کے ساتھ امریکہ اور فرانس کے انقلابوں میں حصہ لیا اور اپنی تحریروں سے لوگوں کے ذہن کو بدلا جب وہ 1774ء میں امریکہ پہنچا ہے تو یہ وہ وقت تھا کہ جب امریکہ کی تیرہ کالونیز برطانیہ کے خلاف آزادی کی جدوجہد میں مصروف تھیں۔ ان کو شکایت تھی کہ برطانیہ ان کے ذرائع کا استعمال کرتا ہے۔ ان پر بے جا ٹیکس لگاتا ہے اور ان کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ لیکن اس جدوجہد میں امریکہ کے عوام کی ایک بڑی تعداد ایسی تھی کہ جن کی برطانیہ سے وفاداری قائم تھی اور اب بھی وہ برطانوی بادشاہ کو اپنا سربراہ مانتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ جنگ اور خونریزی کے بجائے کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیا جائے کہ جس کی وجہ سے ان کے تعلقات میں خرابی نہ آئے۔ بادشاہ سے وفاداری کے باعث آزادی کی جدوجہد میں اتحاد کی کمی تھی۔ جذبہ اور جوش بھی مدھم تھا لہٰذا اس موقع پر تھومس پین نے 1776ء[1] میں کومن سینس (Common Sense) لکھی۔ اس میں اس نے بادشاہ کے ادارے پر تنقید کرتے ہوئے بتایا کہ یہ قطعی طور پر اس لائق نہیں کہ اس کا احترام کیا جائے۔ اس نے ولیم فاتح کی مثال دیتے ہوئے لکھا کہ وہ فرانس کا ناجائز شخص تھا جو اپنے غنڈوں کے ساتھ 1066ء انگلستان پر حملہ آور ہوا اور زبردستی اس کا بادشاہ بن بیٹھا۔ اس نے ثابت کیا کہ شاہی خاندان اور اس کے وارث پسماندہ اور گرے ہوئے ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ لہٰذا ایسے بادشاہ سے وفاداری کے بجائے اس سے بغاوت کرنی چاہئے۔ کتاب شائع ہوتے ہی بے انتہا مقبول ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ سے وفاداری کی روایت ختم ہو گئی اور لوگ آزادی کی جنگ میں پوری شدت سے شریک ہوئے۔ اس وجہ سے امریکہ کے سیاسی لیڈروں نے تھومس پین کی تعریفیں کیں اور اس کی خدمات کو سراہا۔ تھومس جیفرسن (Thomas Jefferson) جو بعد میں امریکی صدر ہوا اور اس سے بے حد متاثر تھا اور اس نے تھومس پین کے اس قول کو اپنی تحریر اور تقریر میں کئی بار دہرایا کہ "مردہ لوگوں کو زندہ پر حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں"۔ لیکن جب امریکہ کے اعلان آزادی اور دستور کو لکھنے کے لئے 55 نمائندے جمع ہوئے تو اس موقع پر تھومس پین کو کوئی دعوت نہیں دی گئی اس کی وجہ اس کے انقلابی نظریات تھے۔

1789ء میں جب فرانس میں انقلاب آیا تو یورپ کے روشن خیال دانشور اس سے بڑے متاثر ہوئے اور انہوں نے امید کی کہ ان کے ملک بھی قدامت پرستی سے نکل کر جدید خیالات کے تحت تبدیل ہوں گے۔ لیکن انگلستان میں فرانسیسی انقلاب کے خلاف اس کے حکمران طبقے میں سخت ردعمل تھا۔ اس کا اظہار "ایڈمنڈ برک" نے اپنی کتاب فرانسیسی انقلاب پر تاثرات "Reflection on the

"French Revolution" میں کیا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ انقلاب میں فرانس کے مضبوط اور منظم سیاسی و سماجی اداروں کو ختم کر کے ملک کو بدامنی اور انتشار میں مبتلا کر دیا۔ تھومس پین نے 1794ء میں اس کا جواب دیتے ہوئے "حقوقِ انسانی" (Rights of Man) شائع کی۔ اس کتاب میں انقلاب کی حمایت کرتے ہوئے وہ عوام کے حقوق کی بات کرتا ہے۔ کیونکہ انگلستان کا حکمران طبقہ فرانسیسی انقلاب سے خوفزدہ تھا کیونکہ تھومس پین کی کتاب ان کے مفادات کے خلاف تھی اس لئے اس پر غداری کا مقدمہ چلایا گیا لیکن وہ بھاگ کر فرانس چلا گیا جہاں انقلابی حکومت نے اس کا خیر مقدم کیا اور فرانسیسی زبان نہ جاننے کے باوجود اسے نیشنل کنونشن کا رکن منتخب کر لیا گیا۔ فرانسیسی انقلاب کا یہ وہ مرحلہ تھا جسے دہشت کا دور کہا جاتا ہے۔ یہ 1792ء سے 1794ء تک رہا۔ اس عرصے میں انقلاب دشمنی کے جرم میں ایک بڑی تعداد کو قتل کیا گیا۔ تھومس پین بھی اس سازش کا شکار ہوا اور اسے سزائے موت دے دی گئی۔ یہ اس کی قسمت تھی کہ جس دن اسے سزا دی جانے والی تھی اسی دن فرانس کے انقلابی رہنما روبس پیئر (Robes Pierre) کا زوال ہوا اور وہ قید سے آزاد ہو گیا۔ فرانس میں رہتے ہوئے اس نے 1794ء عیسوی میں ایج آف ریزن (Age of Reason) (عقل و دلیل کا زمانہ) شائع کی۔ یہ کتاب روشن خیال فلسفے کی روایت پر لکھی گئی تھی۔ اس نے مذہب پر تنقید کرتے ہوئے ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھا اور اس بات پر زور دیا کہ عقل اور دلیل کو عقیدے پر فوقیت حاصل ہے۔ جب فرانس میں نپولین نے انقلابی حکومت کو ختم کر کے اقتدار پر قبضہ کیا تو تھومس پین کے لئے اب فرانس میں کچھ کرنے کو نہیں تھا اس لئے 1802ء میں وہ پھر امریکہ چلا آیا۔

لیکن اس بار امریکہ بدل چکا تھا۔ اب یہ ایک آزاد ملک تھا لیکن جس انقلاب کے لئے تھومس پین نے جنگِ آزادی میں امریکہ کی حمایت کی تھی وہ مقاصد پورے نہیں ہوئے تھے۔ غلامی کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ عورتوں کو ووٹ کا حق نہیں ملا تھا۔ اقتدار پر دولت مند لوگوں کا قبضہ تھا۔ اس لئے تھومس پین کا خیر مقدم نہیں ہوا۔ اس کے مذہبی خیالات کی وجہ سے عوام میں اس کی مقبولیت نہیں ہو سکی۔ 1806ء عیسوی میں وہ غربت اور مفلسی کی حالت میں اس دنیا سے رخصت ہوا۔ اس کے جنازے میں صرف چھ افراد موجود تھے۔ امریکی سوسائٹی اس کی وفات سے بے خبر رہی۔ یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دانشور کے خیالات اور افکار سے فائدہ اٹھا کر اسے فراموش کر دیا جائے۔ یہ تھومس پین کے ساتھ ہوا کہ امریکہ کی جنگِ آزادی کے وقت اس نے عوام کے ذہن کو بیدار اور ان میں جدوجہد کا جذبہ پیدا کیا۔ اس وقت امریکہ کے اہم سیاسی لیڈروں نے اس کی تعریف اور توصیف کی۔ لیکن جب وقت گزر گیا اور انہیں کامیابی ہو گئی تو انہوں نے تھومس پین کو نظر انداز کر کے بھلا دیا۔ اس نے فرانسیسی انقلاب کی حمایت کرتے ہوئے اپنے وطن کی مخالفت کی جس کی وجہ سے اس پر غداری کا مقدمہ چلا۔ فرانس میں وہ موت کے ہاتھوں بال بال بچا۔ زندگی بھر کی جدوجہد کے نتیجے میں اسے غربت اور مفلسی کے علاوہ کچھ نہیں ملا۔ یہ ضرور ہے کہ اس نے اپنے نظریات کا جو ورثہ چھوڑا وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا آنے والے دانشور اس سے سبق حاصل کریں گے؟ موقع پرستی کو اپنائیں گے یا محرومی کے باوجود روشن خیالی کی تحریک کو جاری رکھیں گے۔

◆◆◆

انسانوں پر بھروسہ کر بھی لیا جائے تو وقت اور حالات پر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وقت اور حالات وہ تیز ہیں جو ہر جذبے ہر رشتہ بدل دیتے ہیں۔ (اشفاق احمد)

"زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے"

2016ء میں نامور دانش ور، شاعر، ادیب اور صحافی ہم سے بچھڑ گئے!

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

انقلاب ہمیشہ دانش وروں کے اذہان میں پروان چڑھتے ہیں۔ قلم تلوار سے تیز چلتا ہے۔ قلم کی قوت پھول کی پتی سے زیادہ نرم اور سنگلاخ چٹانوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتی ہے۔ پاکستان کا قیام قلم کی دانشوری اور مسلمانوں کی جاں بازی کا ثمر ہے۔ کائنات کی اٹل حقیقت موت ہے جس سے کسی کو فرار حاصل نہیں۔ جو یہاں سے زمیں آیا اسے ایک دن زیرِ زمیں جانا ہے۔ وہ لوگ جو قلم کی عصمت و حرمت کا خیال رکھتے ہیں وہ حیاتِ جاوداں پا لیتے ہیں۔ شعوری انقلاب کے لیے محنت کرنے والے اہلِ قلم ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن ذہنوں سے نہیں اُترتے۔ اپنے اکابر کو یاد رکھنا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ یادِ رفتگاں کو زندہ و پائندہ رکھنے میں بہت سے لوگوں کا کردار ہے۔ ایس ایم شاہد، ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ، عقیل عباس جعفری، زاہد حسین انجم، ڈاکٹر زاہد حسن چغتائی، ڈاکٹر انور سدید، اظہر جاوید، شاہد علی خان، ڈاکٹر وزیر آغا، ملک مقبول احمد اور ایسے بہت سے احباب اپنے محسنین کے کندن چہروں کو کبھی فراموش نہیں کرتے۔

2016ء میں بہت سے دانش ور ہم سے بچھڑ گئے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن، اخبارات و رسائل و جرائد اور دیگر ذرائع اطلاعات سے جو ادبی اہلِ قلم ہمیں داغِ مفارقت دے گئے، وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ 2016ء نے ابھی انگڑائی لی تھی کہ 4 جنوری کو شعبہ عربی جامعہ کراچی کی صدر، ماہر لسانیات محترمہ ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب ہم سے بچھڑ گئیں۔ عربی زبان و ادب کے لیے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔ نسرین انجم بھٹی نے ادب و صحافت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ [illegible] کا شعبہ بھی ان کی دسترس میں رہا۔ 26 جنوری کو ہم سے بچھڑ گئیں۔ نسرین انجم بھٹی کی خدمات کا دائرہ ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ [illegible] کے ممتاز شاعر ساجد خلیل 27 جنوری کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اسی روز پنجابی کے ممتاز شاعر غلام مصطفیٰ بسمل نے سفرِ آخرت اختیار کیا۔ افسانہ نگار اعظم خان نے 28 جنوری کو افسانوی دنیا سے منہ موڑ کر حقیقی دنیا کا سفر شروع کیا۔ انتظار حسین کا نام دنیائے ادب میں محتاجِ تعارف نہیں۔ 1935ء میں یو پی کے ضلع بلند شہر کے گاؤں ڈبائی میں پیدا ہونے والے انتظار حسین تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آ گئے۔ ہجرت کا کرب اور دکھ ان کے اندر سرایت کر گیا وقتاً فوقتاً یہ دکھ اور کرب مختلف صورت میں صفحۂ قرطاس میں نمودار ہوتا رہا کبھی افسانوں کی صورت میں اور کبھی کسی ناول کی صورت میں۔ افسانوی مجموعوں میں "گلی کوچے"، "کنکری"، "آخری آدمی"، "شہرِ افسوس"، "کچھوے"، "خیمے سے دور"، "خالی پنجرہ"، ناول اور داستان "چاند گہن"، "دن اور داستان"، "بستی"، "تذکرہ"، "آگے سمندر ہے" شامل ہیں۔ "بستی" کو [illegible] ادبی انعام برائے ناول دیا گیا۔ ڈراموں میں پی ٹی وی کے لیے "فطرت کے پردے میں"، "پانی کے قیدی"، [illegible] کے لیے "خوابوں کے مسافر"، "اسٹیج ڈراما" شامل ہیں۔ انتظار حسین 2 فروری کو ہم سے بچھڑ گئے۔ معروف شاعر و ادیب عارف منصور نے 7 فروری کو ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ اردو ادب

میں جن خواتین کا نام سرِفہرست ہے ان میں فاطمہ ثریا بجیا صفِ اول میں شامل ہیں۔ ریڈیو، اخبارات اور ٹیلی ویژن کے لیے ان کی تحریریں قومی شعور اجاگر کرنے کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ وہ 10 فروری کو ہم سے بچھڑ گئیں۔ 11 فروری 2016ء کو ماہرِ تعلیم، ماہرِ لسانیات اور بہترین مقرر ڈاکٹر احسن اختر ناز کا سفرِ آخرت شروع ہوا۔ 22 فروری کو ممتاز ادیب کاشف زبیر راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ ممتاز نقاد، شاعر، انشائیہ نگار، ادیب، محقق، کالم نویس، تجزیہ نگار ڈاکٹر انور سدید ادب کا کوہِ گراں تھے۔ ڈاکٹر انور سدید نے 4 دسمبر 1928ء قصبہ میانی بھلوال ضلع سرگودھا میں آنکھ کھولی۔ ان کے ادبی سرمایہ میں "اقبال کے کلاسیکی نقوش" "اقبال شناسی اور ادبی دنیا" "اقبال شناسی اور اوراق"، اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش۔ الہ آباد 1983ء، لاہور 2006ء، انشائیہ اردو ادب میں 1985ء، اردو ادب میں سفرنامہ 1989ء، اردو ادب کی تحریکیں اشاعت ہفتم 2004ء، ہجرہ ایوارڈ یافتہ۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ 1990ء، پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ 1992ء، وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام (تالیف) 1985ء، مقالات (تالیف) 1992ء، اردو افسانہ عہد بہ عہد 1996ء، نئے ادبی جائزے 1988ء، کچھ وقت کتابوں کے ساتھ 1994ء، دلی دور ہیں (سفرنامہ)، غزل کے رنگ 2009ء، پرندہ سفر میں 2009ء، انور سدید کے نوادیدہ افسانے (مرتب: ذوالفقار احسن)، بیسویں صدی کی اردو شاعری۔ کتب جار 2012ء، نقوشِ رفتگاں 2010ء، سعید صورتیں 2009ء اور بہت سی کتب۔ ڈاکٹر انور سدید اتوار 20 مارچ کو آسودۂ خاک ہو گئے۔ نامور صحافی، ادیب، براڈ کاسٹر اور محبِ وطن قلم کار آغا خالد سلیم 11 اپریل کو انتقال کر گئے جب کہ اگلے روز یعنی 12 اپریل کو ترقی پسند ادیب، مقرر، کالم نگار رضیہ ستار رند نے سفرِ آخرت شروع کیا۔ ممتاز اردو شاعر ارشد صابری 20 اپریل کو رحلت فرما گئے۔ ممتاز دانش ور، صحافی ظفر اسحاق انصاری 24 اپریل کو انتقال کر گئے جب کہ اس کے اگلے ہی روز یعنی 25 اپریل کو سندھ کے ممتاز شاعر اور کالم نویس صادق علی امداد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ 15 جون ڈاکٹر اسلم فرخی کا یومِ وفات ہے۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نفاذِ اردو کی تحریک کے روحِ رواں تھے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان کے لیے ان کی خدمات قابلِ ستائش ہیں۔ انھوں نے اردو کی خدمت کے لیے ملک کے کونے کونے کا دورہ کیا۔ وہ مرتبہ سرگودھا بھی تشریف لائے۔ 18 جون کو ڈاکٹر حبیب مشیر ہم سے بچھڑ گئے۔ تحقیق اور تنقید میں وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ صاحبِ اسلوب ادیب تھے۔ ممتاز صحافی اور کالم نویس مرزا احسن اختر 23 جون کو داغِ مفارقت دے گئے۔ شاعر، ادیب اور محقق احسن سلیم 25 جون کو دنیا سے کوچ کر گئے جب کہ 27 جون کو ممتاز شاعر ظفر علی خان نگہی اردو ادب کو تنہا کر گئے۔ افسانہ نویس اور داستان نگار شاہد جہانگیر شاہد نے یکم جولائی کو ہم سے منہ موڑ لیا۔ اسی طرح 3 جولائی کو ممتاز ادبی شخصیت ذکاء الرحمن رحلت فرما گئے۔ 6 جولائی کو ممتاز دانش ور، ادیب، محقق ڈاکٹر رضوان علی ندوی راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ معروف ادیب، ڈرامہ نگار، ہدایت کار، ریڈیو اناؤنسر، براڈ کاسٹر اور اخبارات سے وابستہ آغا ناصر 12 جولائی کو انتقال کر گئے۔ ان کا شمار پاکستان ٹیلی ویژن کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل کئی کتابیں لکھیں جب کہ اسی طرح کی ایک اور ممتاز شخصیت محمد احمد سبزواری نے 15 جولائی کو سفرِ آخرت اختیار کیا اور اسی روز ممتاز شاعرہ عابدہ کرامت نے دنیا سے منہ موڑ لیا۔ امریکہ میں مقیم ممتاز اردو شاعر اعجاز گل 16 جولائی کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ درویش صفت ادبی شخصیت، ڈرامہ نگار، داستان نگار علی محمد المعروف علی بابا 76 سال کی عمر میں 9 اگست کو انتقال کر گئے۔ وہ سندھی ٹی وی ڈراموں کے ممتاز اور صاحبِ اسلوب رائٹر تھے۔ ضیائے ادب، ممتاز شاعر و ادیب آفتاب ضیا 10 اگست کو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ریڈیو، ٹیلی ویژن اور قلم سے وابستہ عنایت آزاد 19 اگست کو دنیا سے آزاد ہو گئے۔ 20 اگست پیغام آفاقی کا یومِ وفات ہے

انھوں نے ادبی دنیا میں کئی یادگار تحریریں چھوڑیں۔ عالمی شہرت یافتہ صحافی، کالم نویس نظریۂ پاکستان کونسل کے چیئرمین زاہد ملک کیم ستمبر کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے امین تھے۔ انگریزی اخبار "پاکستان آبزرور" کے چیف ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے صحافت کی دنیا میں اپنا منفرد مقام پیدا کیا۔ پشتو زبان کے ممتاز شاعر رحمت علی راہی 3 ستمبر کو اس دنیا سے آزاد ہو گئے۔ مشہور پنجابی دانش ور، کہانی کار، اردو پنجابی زبان کے شاعر، ماہر تعلیم پروفیسر ریاض احمد شاد نے 13 ستمبر کو دنیا چھوڑ دی۔ پنجابی اور اردو کے ایک اور ممتاز شاعر پروفیسر حسین سحر 15 ستمبر انتقال کر گئے۔ اردو، بلوچی زبان کے ممتاز ادیب عبداللہ جمال دینی 84 سال کی عمر میں 19 ستمبر کو آخرت کا سفر اختیار کیا۔ انھوں نے تمغۂ حسنِ کارکردگی اور ادبی اعزاز کمالِ فن بھی حاصل کیا۔ ممتاز شاعر، ادیب، مترجم، محقق، دانش ور، ماہر غالبیات، مشتاق علی خان المعروف پرتو روہیلہ 29 ستمبر کو داغِ مفارقت دے گئے۔ انھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے پر بہت سے اعزازات حاصل کیے۔ جن خواتین نے جدید اردو شاعری میں نام پیدا کیا ان میں نزہت انجم بھی شامل ہیں۔ صحافت اور ادب میں ان کا اہم مقام رہا وہ 15 اکتوبر کو انتقال کر گئیں۔ معروف ادیب مشتاق شیدا 19 اکتوبر کو انتقال کر گئے۔ شاعری اور تصنیف و تالیف کی اہم شخصیت اصغر علی شاہ نے 20 اکتوبر کو رحلت فرمائی۔ سرائیکی کے ممتاز شاعر نذیر احمد فیض 22 اکتوبر 2016ء کو دنیا سے جدا ہو گئے۔ 2016ء شاعروں پر بھاری رہا کئی شاعر یکے بعد دیگرے ملکِ عدم کوچ کر گئے۔ جن میں ثاقب انجان 24 اکتوبر، اسلم کولسری اور نصیر احمد 7 نومبر، رؤف رضا 2 دسمبر، سعید قیس 13 دسمبر، نسیم کوثی 20 دسمبر، صوفی عبدالرشید 26 دسمبر بطور خاص قابلِ ذکر ہیں۔ 25 نومبر 2016ء بروز جمعہ ممتاز شاعر، نثر نگار، نقاد، انشائیہ نویس، ماہر تعلیم شفیع ہمدم ہم سے بچھڑ گئے۔ ان کے کئی انشائی مجموعوں کو پذیرائی ملی۔ ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انور سدید، حنیف باوا اور ملک مقبول احمد نے ان کے فن پر بہت سے مضامین تحریر کیے۔ یاد رہے کہ معروف ادیب، صحافی، انور قدوائی 23 دسمبر جب کہ افسانہ نویس رفعت نے 24 دسمبر کو ہم سے منہ موڑ لیا۔ اوکاڑہ کے گاؤں سے تعلق رکھنے والے درویش صفت ممتاز شاعر اسلم کولسری 7 نومبر کو انتقال کر گئے ان کے انتقال سے پاکستان کے دبستانِ شاعری میں خلا پیدا ہو گیا۔ ان کے شعری مجموعوں میں "کاش" "نخل" "برسات" "جیون" "ویرانہ" اور "پنچھی" بہت مقبول ہیں۔ ادبی دنیا کے مذکورہ احباب کو ایک لڑی میں پرونے کا سہرا جناب عقیل عباس جعفری کے سر ہے ان کی معاونت سے اس مضمون کی تکمیل کا خواب پورا ہو سکا۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ فلاں شاعر و ادیب کے انتقال سے ایسا خلا پیدا ہوا جو کبھی پر نہ ہو سکے گا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ فنکار کبھی نہیں مرتا۔ اس کی تخلیقات، اس خلا کو پر کرتی رہتی ہیں جو ان کے انتقال سے پیدا ہوتا ہے۔ 2016ء میں بلند پایہ ماہرینِ تعلیم، دانش وروں اور تحقیق کاروں کا ہم سے بچھڑنا ایک علمی، ادبی اور قومی نقصان ہے۔ یہ عظیم لوگ ہماری آنکھوں سے پنہاں ہوئے ہیں لیکن ان کی تحریریں ہمیں نہ صرف ان کی یاد دلاتی رہیں گی بلکہ عصرِ حاضر کے محققین مستقبل کے لیے ان کی تحریروں سے فیض حاصل کرتے رہیں گے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومین کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہمیں ان کے فن و ادب سے استفادہ کا موقع فراہم فرمائے۔

◆◆◆

زندگی کبھی کبھی ایسی ٹھوکریں مارتی ہے کہ انسان سیدھا سجدے میں جا گرتا ہے۔ (اشفاق احمد)

کچھ بشریٰ رحمٰن کے بارے میں

اعتبار ساجد

عام لوگوں پر عام انداز میں لکھا جا سکتا ہے لیکن خاص لوگوں پر لکھنا بڑی احتیاط کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس کا تجربہ جون ایلیا مرحوم کے انٹرویو کے دوران ہوا۔ جونہی آغاز روایتی انداز میں کیا، وہ بھڑک اٹھے۔ آگ بگولہ ہو گئے۔ تعلق پرانا تھا لیکن انہوں نے سب کچھ پس پشت ڈال دیا۔ کہنے لگے۔ "بس بدبخت، تمہارا کو یہ معلوم نہ ہو کہ کسی شخصیت کی مسٹیری کو کس پیچ کس سے کھولا جا سکتا ہے اسے کچھ لکھنے لکھانے کی ضرورت نہیں۔" اس سے ملتا جلتا تجربہ قرۃ العین حیدر، عبداللہ حسین اور مجتبیٰ حسین کے حوالے سے بھی ہو چکا ہے لیکن ان کے رویوں میں ٹھہراؤ اور اپنائیت تھی۔ جون بھائی اپنی وضع کے آدمی تھے۔ بھڑکتے جلدی تھے ٹھنڈے دیر میں تھے۔ واقعی کمپلی کیٹڈ مسٹیری تھے۔ ان کے مکتوم کو عام انداز میں سمجھا نہیں جا سکتا تھا۔ یہی مشکل آپا بشریٰ رحمٰن کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے پیش آ رہی ہے۔ مدتوں سے ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک تو انہیں اس بات کا فطری غصہ تھا، دوم فون پر بھی رابطے میں کمی رہی۔ یہ بھی کوتاہی ان کے لئے اس لئے قابل اعتراض ہوگی کہ وہ بہر لحاظ سے بڑی ہیں۔ اور ناراض ہونے کا پہلا حق بڑوں کو حاصل ہوتا ہے۔ مکتوم ان کا بھی اتنا آسان نہیں کہ با آسانی سمجھ میں آ سکے۔ تاہم ان کی کیمسٹری تھوڑی بہت اس لئے سمجھ میں آتی ہے کہ وہ صندل، گلاب اور شہد کے علاوہ کالی مٹی میں گندھی ہوئی ہے۔ بہت کم ایسے ادیب ہوں گے جو بولتے ہوں تو موتی رولتے ہوں۔ لکھتے ہوں تو جواہر ٹانکتے ہیں۔ آپا بشریٰ رحمٰن میں بحمداللہ دونوں خوبیاں موجود ہیں۔ بولتی بھی خوبصورت ہیں لکھتی بھی خوبصورت ہیں۔ ناول کی صنف میں آپا بانو قدسیہ مرحومہ کے بعد عالمی ادب میں لے دے کر بشریٰ آپا ہی نظر آتی ہیں جن کے موضوعات تو متنوع ہوتے ہی ہیں انداز بیاں اتنا دلکش ہوتا ہے کہ کتب بیزار لوگ بھی پڑھنے اور داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ان کی کوئی کتاب کوئی افسانہ ایسا نہیں ہے جسے مقبولیت حاصل نہ ہوئی ہو۔ عام طور پر ادیبوں کی کتابیں پبلشرز چھاپتے ہیں اور منافع کماتے ہیں۔ رونا خسارے کا روتے ہیں۔ اس جھنجھٹ میں پڑنے کی بجائے آپا نے سیدھا شریفانہ طریقہ اختیار کیا کہ اپنی خوبصورت کوٹھی میں اپنا اشاعتی ادارہ خود قائم کیا۔ اسٹاف کو خود منتخب کیا اور بڑے سہل اور سچے طریقے سے لکھتی بھی رہیں، چھپواتی بھی رہیں اور ان کا عملہ بڑے منظم اور باوقار انداز میں ان کتب کی ترسیل و تقسیم کے حوالے سے سرگرم عمل رہا۔ انہوں نے حساب کتاب کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ ہمیشہ دھیان کام کی طرف رکھا۔ ہمارے آج کے ادیب کا مسئلہ یہ ہے کہ اول تو اسے کوئی پبلشر دستیاب نہیں ہوتا۔ ہو بھی جائے زرِ نقد حاصل کئے بغیر اچھی سے اچھی کتاب چھاپنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اسے ادب یا ادیب سے نہیں، اپنے کاروبار اور اپنے منافع سے دلچسپی ہوتی ہے۔ کوئی ادیب یا شاعر معروف ہو جائے تو یہ اس کی خوشامد بھی کریں گے۔ رائلٹی بھی دیں گے۔ اور منافع بھی کمائیں گے۔ نیت میں کھوٹ آئے گا تو کتاب کے کریڈٹ پیج کو تبدیل اس لئے نہیں کریں گے کہ جو بھی سال اشاعت اور ایڈیشن نمبر درج کریں گے، رائلٹی دینی پڑ جائے گی۔ لہٰذا کرتے یہ ہیں کہ کتاب چھاپتے رہتے ہیں۔ [illegible] اور سال

اشاعت وہی رکھتے ہیں جہاں سے نیت میں فتور پیدا ہو۔ آپا یہ بات جانتی تھیں۔ پارلیمنٹ کی مجلس عاملہ ممبر رہ چکی ہیں سیاست کے داؤ پیچ سمجھتی تھیں تو ادب کے یہ ادارے کیوں نہ سمجھتیں۔ یہی وجہ تھی کہ اپنا مکتبہ الگ بنایا۔ اور میدان سیاست کی طرح میدان ادب میں بھی بنا الگ ڈال کر دیا۔

اپنا رستہ الگ بنانے کو تو قبیلے سے جدا ہوئے ہیں ہم

لوگ گروہوں اور گروپوں میں مدغم ہو کر اپنی بقا کا سامان پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تجربہ اور مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ ایک ہزار کالے کوؤں میں اگر دو چار مزید کالے کوے شامل ہو جائیں تو وہ اپنا رہا سہا تشخص بھی کھو بیٹھتے ہیں۔ لیکن جو بلبلیں اور کوئلیں الگ الگ ٹہنیوں پر جدا جدا چہچہاتی ہیں وہ اپنا تشخص برقرار رکھتی ہیں۔ اس نکتے کو بشریٰ آپا سمجھتی ہیں اس لئے ان کی چہکار اور کوک مختلف ہے۔ سمندر میں لاکھوں مچھلیاں ہوتی ہیں، ان پر کوئی خاص توجہ اس لئے نہیں دی جاتی کہ یہ عام مچھلیاں ہیں، لیکن جب ڈولفن، وہیل یا شارک سطح سمندر پر نمودار ہوتی ہے تو سب کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے۔ یہی فرق ہے عام مچھلیوں اور خاص مچھلیوں میں۔ یہی فرق ہے عام آدمیوں میں اور خاص آدمیوں میں۔ خاص آدمی ہم اسے نہیں مانتے جو شاندار بنگلے میں رہتا ہو۔ عالی شان گاڑی اور باوردی شوفر، بھاری بینک بیلنس اور سطح غربت سے نیچے زندگی بسر کرنے والے کروڑوں افراد کے درمیان کو وہ امارت پر زندگی بسر کر رہا ہو۔ خاص آدمی وہ ہے جو خصوصی اہمیت، قابلیت اور اہلیت کا حامل ہو۔ یہ سب خصوصیتیں بفضل تعالیٰ آپا بشریٰ کو حاصل ہیں اس لئے وہ سب کو اچھی لگتی ہیں۔ ان کا اچھا لگنا ان کی ذاتی صفات کی بنا پر ہے، انکساری، دردمند، شفیق، مہربان اور گداز دل رکھنے والی خاتون کی وجہ سے ہے۔ چند ایک ادیب خواتین ہیں جن کا ہم بھی احترام کرتے ہیں، ان کے سامنے بھی، ان کے پیٹھ پیچھے بھی۔ مثلاً سلمیٰ اعوان، عذرا اصغر، شاہین زیدی، پروین ملک، شاہدہ دلاور، فرحت پروین، عفت علوی اور ڈاکٹر صغریٰ صدف۔ یہ وہ خواتین ہیں جو اپنے رکھ رکھاؤ، شائستگی، وقار اور متانت کی وجہ سے عزت حاصل کرتی ہیں۔ دیگر بھی شاعرات اور لکھنے والیاں بھی ہمارے نزدیک واجب الاحترام ہیں لیکن ذکر بشریٰ آپا کا ہے۔ جو ہمارے نزدیک اس لئے زیادہ محترم ہیں کہ دنیاوی جاہ و منصب کی جملہ منازل طے کر چکنے کے بعد ان کے اندر کی آپا زندہ ہے۔ ممتاز مفتی نے ''آپا'' کو اپنے نفسیاتی تجزیاتی نقطہ نظر سے افسانے کی شکل دے کر اسے افسانوی دنیا میں یادگار بنا دیا تھا۔ ہماری دراز میں کوئی نفسیاتی آلہ نہیں ہے۔ چہرے پر دو آنکھیں اور کھوپڑی میں ایک دماغ ہے۔ اس سے دیکھنے، سننے، لکھنے اور غور کرنے کا کام لیتے ہیں۔ وزیر اعلیٰ نواز شریف کے دور میں پنجاب اسمبلی میں بلبل پنجاب کا خطاب ملا تھا۔ اس پر بشریٰ رحمان نے اسمبلی میں بھرپور اظہار تشکر کیا تھا۔

◆◆◆

اگر کوئی کسی کے تخیل میں آ جائے لیکن زندگی میں نہ آئے تو کیا تمہارا خیال ہے وہ گھر ایک بسا ہوا گھر رہ جاتا ہے، شاید نہیں۔ آنکھیں بند کر کے جب کوئی عورت کسی اور کا چہرہ یاد کرتی ہو لیکن آنکھیں کھول کر کسی دوسرے کا ساتھ بھگتی ہو تو اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہو گیا ہے۔ (امرتا پریتم)

ادبیاتِ پاکستان عالمی ادبی کانفرنس۔ ایک تاثر

سحر حفیظ

چوتھی عالمی ادبی کانفرنس بالآخر منعقد ہوئی اور اپنے پیچھے مثبت اور منفی اثرات چھوڑ گئی۔ "زبان ادب معاشرہ" کے عنوان سے اس کانفرنس کا اہتمام اکادمی ادبیات پاکستان نے کیا تھا جو اہل قلم کے لیے سب سے بڑا سرکاری ادارہ ہے۔ یہ کانفرنس اس سے قبل دو بار ملتوی ہو چکی تھی۔ 5 جنوری تا 8 جنوری 2016 اس چار روزہ منعقدہ کانفرنس پر بہت گفتگو کی جا سکتی ہے۔

اکادمی ادبیات کے چیئرمین قاسم بگھیو کی اس عہدے پر تعیناتی بھی ایک سوالیہ نشان تھی لیکن لوگ چونکہ ان سے واقف تھے اس لیے ان کی سربراہی میں اکادمی کی کارکردگی کا انتظار تھا۔ یہ کانفرنس اس لحاظ سے ایک اہم سنگ میل اور امتحان کی حیثیت رکھتی تھی۔ ادبی ورثہ کا نیا ڈویژن جس کے تحت اکادمی اور دیگر ادارے کام کر رہے ہیں۔ ایک بیدار مغز صاحب قلم ادیب عرفان صدیقی صاحب کی زیر سربراہی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عرفان صدیقی صاحب نے ان تمام اداروں کو متحرک اور فعال بنانے میں اپنا کردار ادا کیا ہے اور وہ اس منصب کے بجا طور پر اہل ہیں۔ لیکن مسئلہ اکادمی کی اپنی کارکردگی کا ہے جس نے موجودہ کانفرنس میں کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس اجتماع نے ادیبوں کی میل ملاقات ملنے کا باہمی ربط وضبط اور ادب کی موجودہ صورت حال کے تجزیے کا موقع فراہم کیا۔ اس کے ساتھ مقالات اور مذاکروں کا بھی بہت اچھا انتظام کیا جس میں کافی حد تک عنوان کی رعایت سے مختلف گوشوں پر بات کی گئی لیکن یہ چند مثبت پہلوؤں میں سے ایک تھا جبکہ منفی پہلوؤں کی تعداد کافی زیادہ ہے۔

حیران کن طور پر نفاذ اردو اور قومی زبان کو سرکاری اور دفتری زبان کے طور پر رائج کرنے کو بالکل نظر انداز کیا گیا اور یہ بے نیازی قصداً تھی۔ قاسم بگھیو صاحب کے بارے میں اہل قلم کا یہ تاثر پہلے سے ہے کہ وہ قومی زبان کو اس کا حق دینے اور اس بارے میں بات کرنے سے گریزاں رہتے ہیں اور اس معاملے میں ان سے کوئی توقع نہیں رکھی جا سکتی۔ وہ اپنے اس گریز کو تکنیکی دشواریوں کی آڑ میں چھپاتے ہیں لیکن اہل قلم کا بجا طور پر یہ سوال اور تقاضا ہے کہ قومی اور پاکستانی زبانوں کو ان کے جائز اور آئینی حقوق دلانے میں آخر کیا چیز مانع ہے؟ پاکستانی زبانوں کے فروغ کے ساتھ ساتھ اردو کی حق تلفی ہرگز نہیں ہونا چاہیے جبکہ عدالت عظمیٰ اس بارے میں واضح حکم جاری کر چکی ہے۔ پاکستان کے تمام اہل قلم ادیب شاعر اور دانشور یہ جاننے کا حق رکھتے ہیں کہ سپریم کورٹ کے فیصلوں پر کس حد تک عمل ہوا ہے؟ اس بارے میں کیا عملی اقدام اٹھائے گئے ہیں اور ثمرہ سامنے کیوں نہیں آ رہے؟ اگر اس پر کام جاری ہے تو اس کی رفتار کیا ہے؟ اور یہ آخر کب تک مکمل ہوگا؟ "زبان ادب اور معاشرہ" میں اس کانفرنس میں ایسا کوئی سیشن کیوں نہیں رکھا گیا جو قومی زبان اس کے ادب اور معاشرے میں اس کے فروغ پر گفتگو ہو۔ یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔ اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی کہ کانفرنس کی قراردادوں میں سرے سے اس کا ذکر ہی موجود نہیں تھا۔ قاسم بگھیو صاحب سے چند اہل قلم نے یہ قرارداد شامل کرنے کا مطالبہ کیا تو انھوں نے شدت سے اس کی مخالفت کی اور یہ طرز عمل اس عہدے پر فائز شخص کے لیے نامناسب تھا۔

کانفرنس کے لیے منتظمین کے اپنے بیان کے مطابق ایک کروڑ دس لاکھ کی رقم دی گئی تھی۔ یونی ورسٹیوں اور کالجوں کے جن نو وارد اساتذہ اور طلبا کو مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی گئی تھی ان سے فی کس 10,000 روپے رجسٹریشن فیس لی گئی تھی اور ان کے قیام اور سفری اخراجات کا ذمہ اکادمی ادبیات نے نہیں لیا تھا۔ سو اندازاً اس رقم سمیت ایک کروڑ تیس لاکھ روپے کی رقم کانفرنس کے انعقاد کے لیے دستیاب تھی۔ (یہ رقم اس پچاس کروڑ کے وعدے کے علاوہ ہے جس کا وعدہ اور اعلان وزیر اعظم نے افتتاحی تقریب میں کیا)۔ بنیادی بات یہ ہے کہ کیا ان وسائل سے مکمل فائدہ اٹھایا گیا اور کیا یہ رقم اس کانفرنس میں خرچ ہوتی نظر آئی۔ اکثر شرکا کا جواب نفی میں ہے۔ ڈاکٹر ناظر شہزاد کے مطابق "اکادمی ادبیات اسلام آباد کے اپنے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق صوبہ پنجاب سے 87، سندھ سے 51، خیبر پختون خوا سے 30، بلوچستان سے 25، گلگت، سکردو اور آزاد کشمیر سے 14 جبکہ فاٹا سے 8 اور راولپنڈی / اسلام آباد سے کل 232 ادیبوں، شاعروں کو دعوت نامے جاری کیے گئے۔ کل ادیبوں، شاعروں کی تعداد 447 بنتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان شاعروں، ادیبوں کی بھی ہے جنھوں نے ذاتی اثر و رسوخ اور سفارشیں استعمال کیں اور انہوں نے بعد از اں اپنے نام شامل کروائے" جبکہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقط 447 ادیبوں پر دیا جائے کہ فقط 900 کے قریب افراد کی رہائش اور طعام میں ایک کروڑ تیس لاکھ روپے کا خرچ آیا جبکہ ابھی وہ رقم الگ ہے جو لوگوں سے رجسٹریشن کے نام پر جمع کی گئی جبکہ اصحاب علم و دانش کا احوال یہ تھا کہ انھیں رہائش کے لیے گھٹیا ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا۔

جو اہل قلم کسی سرکاری ادارے کے سربراہ ہیں ان کا ہوائی ٹکٹ اکادمی ادبیات نے نہیں دیا یہ ٹکٹ ان کے اپنے اداروں نے مہیا کیا۔ اسی طرح ظاہر ہے کہ راولپنڈی اسلام آباد کے اہل قلم کو قیام اور سفر خرچ دینا نہیں پڑا۔ چنانچہ اس طرح اندرون ملک کے مختلف شہروں سے ہوائی ٹکٹ دے کر بلائے جانے والے اہل قلم زیادہ نہیں رہ جاتے۔ لہٰذا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اندرون ملک مندوبین کے سفری اخراجات پر بہت رقم صرف نہیں ہوئی ہوگی۔ بیرون ملک سے اہم مندوبین میں ڈاکٹر خلیل طوق آر (ترکی) کو چھوڑ کر کوئی خاص ادبی شخصیت شریک نہیں تھی۔ لبنان، چین، مالدیپ، انڈیا وغیرہ سے جو مندوبین شریک تھے ان کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں تھیں اور نہ ان کی گفتگو اور تقاریر توجہ حاصل کر سکے۔ قیام کے لیے مخصوص افراد کو چھوڑ کر جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ چیئرمین قاسم بگھیو کے قریبی افراد ہیں باقی مندوبین کو عام طور پر نامناسب ہوٹلوں میں ٹھہرایا گیا۔ لاہور سمیت قریبی شہروں سے جن لوگوں میں مندوبین کے سفر کا انتظام کیا گیا وہ بدترین سفری بہترین مثال تھیں۔ کیا کوئی تصور کر سکتا ہے کہ سفر کے آغاز سے اختتام تک لاہور سے اسلام آباد تک کا سفر تیرہ گھنٹے میں طے ہو سکتا ہے۔ لیکن ان مندوبین کے ساتھ ایسا ہی تھا۔

اسی حوالے سے محترمہ نیلم احمد بشیر کہتی ہیں کہ "تیرہ گھنٹے کے اذیت ناک سفر کے بعد سب کو ننھی منی ٹولیوں کی صورت میں مختلف ہوٹلوں میں اتار دیا گیا ہم خوش نصیبوں کے حصے میں جو ہوٹل آیا تھا اس کا نام غالباً روز گارڈن تھا۔ ہم حضرت سعادت سعید، اختر شمار صاحب اور چند دوسرے صوبوں کے ادیبوں کے ساتھ اسی ہوٹل کے مستحق ٹھہرے۔ اندر پہنچے تو لگا کسی قلعہ جان میں آ پہنچے ہیں۔ ٹوٹے ہوئے بوسیدہ دروازے، بدبوئیں، نہ پانی نہ تولیہ نہ صابن، کا کوئی اور سامان ... گندگیاں تھیں اور ہم تھے دوستو۔"

"اختر شمار صاحب نے موقع کا فائدہ اٹھا کر اس واردات کے ثبوت کے طور پر گندے باتھ روم اور کمروں کی تصاویر بھی کھینچ لیں تاکہ انھیں بطور ایک سزا کے، وہ ہمیشہ یاد رکھ سکیں۔ سونے پہ سہاگہ یہ ہوا کہ محترمہ شاہدہ دلاور نے بھی اپنے باتھ روم کے کاکروچوں کو علی الصبح

چہل قدمی کرتے دیکھ کر لگے ہاتھوں ان کا بھی ایک فوٹو شوٹ کروا لو اور ہمارے پذیرائی کرنے والے ٹولے میں شامل ہو گئیں۔"

اردو ادب کی اصل خدمت ادبی رسائل کر رہے ہیں جو اپنے رسائل سے ہزاروں لکھنے والوں کو موقع فراہم کرتے ہیں۔ ادارہ "تخلیق" عام ادبی رسائل کے مدیروں کو دانستہ طور پر کانفرنس میں نظر انداز کرنے پر پر زور مذمت کرتا ہے اور ان تمام ادبی اداروں کی کارکردگی کو از سر نو جانچنے کی درخواست وزیر اعظم میاں نواز شریف اور وزیر اعلیٰ پنجاب میاں شہباز شریف سے کرتا ہے جو ادب اور اردو زبان کے فروغ کے نام پر لاکھوں کروڑوں کی لوٹ مار میں سرگرم عمل ہے!

انتظامی معاملات میں بدنظمی صاف ظاہر تھی۔ چیئر مین قاسم بگھیو کئی اہم سیشنز کی نظامت خود کرتے نظر آتے۔ اسٹیج سے مائیک پر اپنے ماتحت عملے کو ڈانٹ ڈپٹ اور سرزنش نے منتظمین پر سربراہ اکادمی ادبیات کا اچھا تاثر نہیں چھوڑا۔ انہیں یہ سب کرنے کے بجائے تقسیم کار کرنی چاہیے تھی اور اہل افراد کو کانفرنس کے ضروری انتظامات کا ذمے دار بنانا چاہیے تھا۔ جیسا کہ ایسے اجتماعات میں ہوا کرتا ہے کافی لوگ جو موجود ہونے چاہئیں تھے کسی وجہ سے شامل نہیں تھے۔ اور ان لوگوں کی بھی اچھی خاصی تعداد تھی جن کی شمولیت سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس حوالے سے محترمہ کلیم احمد بشیر کہتی ہیں: "ہر سیشن میں وہی مخصوص نمایاں چہرے اسٹیج پر بیٹھے تھے جنھیں ہزاروں بار دیکھا اور سنا جا چکا ہے۔ لگتا ہے پاکستان میں ان کے علاوہ اور کوئی قلمکار، دانشور، تخلیق کار ہے ہی نہیں۔"

ادبی رسائل کے مدیران کا ادب کے فروغ میں بہت بڑا کردار ہوا کرتا ہے اور سچ یہ ہے کہ یہ کام سراسر قربانی دے کر ہی انجام دیا جا سکتا ہے۔ مدیران ادبی جرائد میں شاید ہی کسی مدیر کو اس کانفرنس میں شامل کیا گیا ہو۔ حالانکہ مکالمہ، شہرزاد، تخلیق، الحمرا، لوح سمیت دیگر وقیع ادبی جرائد کا ادبی کانفرنس سے براہ راست تعلق ہے۔ ہماری تجویز ہے کہ آئندہ ایسی کانفرنس میں ادبی رسائل کے کردار پر مستقل گفتگو ہو اور ان مدیران کی بھرپور شمولیت یقینی ہونی چاہیے۔

اب آتے ہیں ان تعلیمی اور ادبی سیشنز کی طرف جو اس کانفرنس کا بھرپور حصہ تھے۔ ان میں بہت سے سیشنز وقیع تھے اور ان میں بھرپور مضامین پڑھے گئے اور اچھی گفتگو کی گئی لیکن حاضرین کی کمی شدت سے محسوس کی گئی۔ عام یونیورسٹیز اور کالجز کے طلبا و طالبات کثیر تعداد میں ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے اہل قلم سے استفادہ کر سکتے تھے لیکن بظاہر منتظمین نے ان کی شرکت پر توجہ ہی نہیں دی چنانچہ اکثر سیشنز میں حاضری اوسطاً 15 سے 20 لوگوں کی تھی۔

لیکن اس کی داد ڈاکٹر قاسم بگھیو کو دینی چاہیے کہ وہ بار بار اس کا اعلان کرتے رہے اور کوشش کرتے رہے کہ کانفرنس محض میل ملاقات اور خوش گپیوں کا وسیلہ بن کر نہ رہ جائے۔ وہ ہوٹل کی لابی میں گھوم پھر کر فارغ بیٹھے ادیبوں شاعروں کو سیشنز میں شرکت پر آمادہ کرتے رہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کانفرنس ایک اچھا قدم تھا جسے بہتر منصوبہ بندی اور اچھی انتظامی مہارت کے ساتھ بہت بہتر بنایا جا سکتا تھا۔ اکادمی ادبیات ایک سرکاری ادارہ ہے اس لیے کانفرنس پر جو اخراجات آئے ان کا آڈٹ لازماً ہونا چاہیے اور وہ رپورٹ شائع بھی ہونی چاہیے تاکہ معلوم ہو سکے کہ کیا واقعی حقیقی اخراجات اتنے ہی تھے جتنے بتائے گئے ہیں۔ ایسی کانفرنسز بہرحال فائدے سے کبھی خالی نہیں ہوتیں۔ اور یہ کانفرنس بھی بدنظمی کے باوجود ثمرات سے بالکل خالی نہیں تھی۔

◆◆◆

گوشۂ اظہر جاوید

اظہر جاوید اور تخلیق —— سونان کا آئینہ

حسن عسکری کاظمی

شخصیت ایک آئینہ ہے جس میں آدمی کا سراپا ہی نہیں بلکہ اس کی قامت فکر و نظر بھی تمام تر حسن و قبح کے ساتھ جلوہ نما ہوتی ہے۔ اس آئینے میں آدمی کی ظاہری اور باطنی جہتوں کا سراغ ملتا ہے۔ ہر آدمی اپنی مخفی صلاحیتوں کا اتنا ہی ادراک رکھتا ہے جتنا کوئی غواص سمندر کی گہرائی میں جا کر موتی نکال لانے کی توفیق رکھتا ہے۔ ہم زندگی گزار کر صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹا دیے جاتے ہیں یا خود اپنا نام و نشاں مٹانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں کہ ہم نے ورق زندگی پر اپنے دستخط کرنے کی زحمت نہیں کی۔ ہم اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار نہ لا سکے، ہمارا ہونا یا نہ ہونا ایک جیسا رہا۔ مگر وہ لوگ بھی ہیں جو اپنے ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اور اپنی شخصیت کو زمانے کی دست برد سے محفوظ رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اپنی شبانہ روز محنت اور خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ اپنی معاشی ناآسودگی اور مرکز سے دوری کا رونا نہیں روتے۔ وہ اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ

ع زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

وہ کسی صورت شکست تسلیم کرتے ہیں نہ ہتھیار ڈالتے ہیں۔ ایسے افراد معاشرہ کا زرخیز ذہن رکھتے ہیں اور اپنی ذات کے سمندر کے وہ غوطہ خور ہوتے ہیں جو تہ سے موتی نکال لاتے ہیں یہ الگ بات ہے کہ جوہری کی دکان سے انھیں وہ قیمت نہیں ملتی جس کی امید رکھتے ہوئے وہ اپنی توانائیاں صرف کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں جذب و شوق اور ریاضت کا عالم وہی رہتا ہے۔ یہی صورت احوال کسی تخلیق کار کی زندگی میں در آتی ہے تو وہ اپنی مٹی کو اٹھا کر چومتا ہے اور نقل مکانی کا ارادہ باندھ لیتا ہے۔ ہمارے پیارے اظہر جاوید نے اپنی جنم بھومی کی آب و ہوا، کھیتوں، پگڈنڈیوں اور گھنے درختوں، حد نظر تک سرسبز و شاداب نظاروں اور جواں سال مٹیاروں کے لہراتے آنچلوں، لوک گیتوں اور محبت میں گندھے ہوئے لہجوں کی کھنک سے دست بردار ہونا قبول کیا۔ سرگودھا سے لاہور کا سفر طے کرنا آسان تھا لیکن ذاتی سفر میں کچھ دشواریاں ایسی بھی آئیں جنھیں اظہر جاوید عبور کرتے ہوئے اجنبی ماحول میں اپنے ماضی کو یاد کرتا اور گوشۂ تنہائی میں خود کلامی سے دل کا غبار نکالتا کہ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ اس نے وقت گزرنے پر اپنے بچوں کو بتایا تو وہ حیران ہوئے۔ اس نے کہا کہ شکر ہے نقل مکانی نہیں دیکھی تم نے لاہور کی خوبی یہی ہے کہ جو یہاں آیا وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ لاہور کی مٹی کو پاؤں پکڑ لیتی ہے آتے ہیں۔ اظہر جاوید ہمیشہ کے لیے یہیں کا ہو کر رہ گیا بلکہ یوں کہا جائے کہ لاہور کا پانی موافق آ گیا اور عہد جوانی تخلیق کی نذر کر دیا۔ لاہور کے مرکز میں بھگوان سٹریٹ کو وہ شہرت ملی کہ اظہر جاوید کا یہ معتبر حوالہ بن گئی کہ یہاں جو آیا اسے "جی آیاں نوں" کہتے اظہر جاوید کے چہرے پر شادمانی اور آنکھوں میں جلوہ سامانی کا منظر دیدہ دیکھنے کو ملتا۔

کیا دور تھا۔ وہ مجلس یا اکٹھ بھرے اچھا اتا تھقہے لگاتا رہتا۔ ہر پیکر حسن و جمال کے منہ سے پھول جھڑنے کا تماشا دیکھتا۔ افسانہ لکھتا پنجابی اور اردو کے محاوروں کا برمحل استعمال کرتا۔ لطائف سناتا یا کسی کے سنائے ہوئے لطیفے پر لطیفہ پیش کرتا تو سب اظہر جاوید کی حاضر جوابی پر سر دھنتے۔ اس کی شکل و صورت یونانی دیوتاؤں جیسی تھی، تیکھے نقش و نگار، گھنے بال جو زلف گرہ گیر کی طرح اس کے چہرے کو اور بھی جاذب نظر بنا کر رکھتے۔ اس کی آنکھیں روشن اور ان پر کمان دار ابرو، کشادہ پیشانی اور تہ دار لہجے میں رس گھولتی سماعت کے در کھولتی دل میں اتر جاتی، وہ جتنا شاعروں اور ادیبوں میں ہر دل عزیز تھا اس سے بڑھ کر نوجوان شاعرات کا محبوب تھا۔ اس میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو صنف لطیف کے دلوں کو موہ لیتی رہی۔ ڈاکٹر کنول فیروز نے ایک بار لکھا کہ جسمانی طور پر اظہر کو ہم سے جدا ہوئے چار برس ہو گئے لیکن ہماری سوچ میں ہمارے خوابوں، خیالوں اور دل کی دھڑکنوں میں آج بھی زندہ ہے" وہ اپنے دوستوں کی ملاقات "لکھنے والیوں" سے اکثر کرواتا۔ تقریب کی صدارت کے لئے بہت مستحق ادیبوں سے اور تقریب میں شرکت کے لئے جواں سال شاعروں، شاعرات اور خواتین قلمکاروں کو مدعو کرتا ان میں بشریٰ رحمان، کشور ناہید، عبدالعزیز خالد، آغا سہیل، میمونہ انصاری، سلیم اختر، حسن رضوی، مسعود اشعر، سعادت سعید، الطاف فاطمہ، راحت نقوی، مقبول دہلوی، عذرت الطاف، صابر لودھی اور فرخندہ لودھی اور بہت سے دوسرے ادیب شریک ہوتے جب کہ صدارت بیگم حجاب امتیاز علی، اشفاق احمد، بیگم الطاف فیض، منو بھائی اور سجاد باقر رضوی جیسے ثقہ ادیبوں سے کروانے کی طرح ڈالی۔ ڈاکٹر انور سدید نے اظہر جاوید کی شوخ طبیعت، سرمست و سرخوش انداز کا ذکر کرتے ہوئے لکھا "میری کم عقلی، کم نظری دیکھئے کہ میں ایک لمبے عرصے تک اظہر جاوید کو محض "ہری چگ" سمجھتا رہا اور رسالہ "تخلیق" کو ایسا گلشن قرار دیتا جہاں تتلی، بلبل اور سنہری کلیاں جرس تحیر کی صدا کو سنے بغیر بھی اڑتی چلی آتی تھیں۔ اس دور میں ہر بوالہوس نے حسن پرستی اختیار کر رکھی تھی اور بعض بڑے رسائل کے مدیران جز وقتی عورت گیروں کے کچے پکے افسانے چھاپتے تو رسالہ اور کیک لے کر ہوٹل میں پہنچ جاتے اور افسانے کی تحسین میں اپنے جذبات کی تسکین فرماتے۔ لیکن اظہر جاوید کا اسلوب اشاعت ایسا تھا کہ گویا یہاں تتلیاں انتظار کرتیں اور بھنورا گلی میں قدم پہنچ جاتیں اور افسانے کی اشاعت پر شہرت کے آسمان پر پرواز کرنے لگتیں تو اظہر جاوید سے اپنا احسان تمام کرتا۔"

اظہر جاوید کو دوستی نبھانے، دوست بنانے اور دوستی کا حق ادا کرنے میں ہمیشہ پیش پیش پایا۔ وہ لاہور کے گلی کوچوں، بازاروں، ہوٹلوں اور خصوصی صحبتوں کی مکمل آگہی رکھتا اور دوسرے شہروں اور ملکوں سے آئے ہوئے مہمان دوستوں کو وہ سب جگہ دکھاتا جہاں ہماری ثقافتی زندگی روز مرہ کی چہل پہل اور رہن سہن مہمان کی دلبستگی اور دل جمعی میں برابر اضافہ کرنے کا سبب تھی۔ وہ ہر لحظہ دوسروں کو خوش رکھتے اور "تخلیق" میں چھپنے والوں سے رابطے میں رہنا پسند کرتا۔ "تخلیق" اس کا پہلا اور آخری عشق تھا جسے معیار اور مقدار میں ہم عصر جریدوں پر فوقیت حاصل رہی۔ احمد ندیم قاسمی نے "تخلیق" کی سلور جوبلی میں کرسی صدارت سنبھالی اور فرمایا "تخلیق" معیار کے اعتبار سے کسی طرح بھی "فنون" سے کم نہیں بلکہ بعض امور میں یہ "فنون" سے بلند تر ہے" اظہر جاوید کا عجز و انکسار دیکھئے اس نے فوراً کہا کہ میں آپ کا اوقیانوس مند ہوں ایسا نہ کہیے۔ "فنون" آپ کی زیر ادارت شائع ہوتا ہے جب کہ "تخلیق" مجھ جیسے عاجز کی ادارت میں ایک ایسا جریدہ ہے جو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا سیکھ رہا ہے لیکن حقیقت وہی ہے جو احمد ندیم قاسمی کے لب اظہار پر تھی۔ اظہر جاوید نے کسی سرمایہ دار کی معاونت قبول نہیں کی۔ وہ کسی حکومت کی امداد کا طلب گار نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں عذرا اصغر کا یہ کہنا ہے کہ "اگرچہ اظہر کو "تخلیق" کے مالی وسائل نے ہمیشہ پریشان رکھا، دوست بھی ان کے بہت کام آئے لیکن وہ خود بھی سوالی نہیں بنے" "تخلیق" کا اجرا 1969ء میں ہوا، وہ دن اور

آج کا دن یہ جریدہ آب وتاب سے اسی طرح طلوع ہوتا چلا آرہا ہے کہ اس میں پہلی بات سے انجمن خیال تک موضوعات کے انبار بہار بے خزاں کی طرح قارئین کی چشم ودل کشا میں سما جاتے ہیں۔ وہ حمد ونعت، منظومات، افسانے، غزلیں، دعا کے، یادنگاری، سفرنامے، انٹرویوز، علاوہ مزاح، جائزے، دیباچہ، رنگ، تبصرے اور بہت کچھ ہمارے ذوق مطالعہ کی تسکین کا سبب بنتے ہیں۔

اظہر جاوید کا یہی نظریہ اس کے طرز احساس کا آئینہ ہے کہ ''جن نظریات کا آپ پرچار کرتے ہیں اور ورد کیے بیٹھے ہیں وقت آنے پر یا اگر حکومت وقت میں آپ کی اہمیت ضروری ہو تو آپ اپنے نظریات سے دست کش ہو جائیں، ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ جب لوگوں کی اکثریت چمک کے پیچھے بھاگ رہی ہو تو ایک جنازہ اصولوں کی بات کرتے ہوئے مجھے کبھی سا لگتا ہے تو ان جیسا ہو جا سکتا اور تو ہی اپنی بات منوائی جا سکتی ہے پھر تلملانے سے فائدہ؟ مجھے معلوم ہے کہ اس طرح پیچھے چلتے چلتے میں بہت پیچھے رہ گیا ہوں، میں شہرت، ناموری اور دنیاداری کے لحاظ سے تجارہ رہ گیا ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ دل شانت رہتا ہے۔''

اظہر جاوید کی خوش لباسی، گفتگو میں پھول جھڑنے اور جملہ اچھالنے کی ادا جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے والی نئی نسل کے دل میں گھر کرنے کا بہانہ بن گئی۔ محبت ایک جذبہ بے نام ہے اس کا آغاز یک طرفہ اور کبھی دو طرفہ ہوتا ہے۔ جذب، سرمستی، سرشاری اور سپردگی میں وہ سب کچھ ممکن ہے جہاں عقل وخرد سے دامن چھڑا کر آدمی تعلق خاطر کا اظہار کرتا چلا جاتا ہے خصوصاً بعض اوقات جب آنسوؤں کی طرف سے پہل ہو جاتی ہے جس کا جواب مشتاق انداز میں دنیا میں خوش فہمی کا شاخسانہ قرار پاتا ہے۔ یہ مواقع کئی بار آئے اور گزر گئے اور اظہر جاوید کو ''غم عشق کرتے ہوئے'' سے تخلیق کا ایک اور دروا کرنے کا خیال آیا۔ دل پر اختیار کہاں ہوتا ہے۔ ع دل بے اختیار میں نہ دل پہ اختیار ہے
آخر وہی ہوا کہ اس کا ہاتھ دل پر آ گیا۔ سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں، وہ اپنا سرمایہ ادب سونان کے حوالے کر گیا۔

''ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جان آفریں کے سپرد کر دی'' ادھر اس جریدے کی اشاعت کو عملی تقاضوں کے عہدہ سے کی صورت سونان اظہر جاوید نے کسی تعطل کے بغیر قارئین کی خوش فہمی سے ممنون کیا۔ اس نے اس ذمہ داری کو حرز جاں بنایا اور اظہر جاوید کی امانت سمجھ کر صوری اور معنوی اعتبار سے جاذب نظر بنا دیا۔ اس نے نئے اور پرانے قلمکاروں کی کہکشاں سجانے اور تخلیق سے اپنی وابستگی برقرار رکھنے کا عملی ثبوت فراہم کیا۔ سونان اظہر کی خوبی کردار یہ ہے کہ اس نے اپنا رابطہ بحال رکھا اور تخلیق کی ادبی حیثیت کے برقرار رکھنے کی خاطر تخلیق ایوارڈ کی طرح ڈالی۔ ہر سال یہ تخلیق ایوارڈ تقریب پذیرائی میں نامور ادیب یا شاعر کو دیا جاتا ہے۔

سونان اظہر جاوید کشادہ دل، ملنسار اور منکسر المزاج آدمی ہے اسے بڑوں کا ادب کرنا سکھایا گیا ہے۔ اس نے اظہر جاوید کے دوستوں کی تلاش کی۔ ''تخلیق'' کی درخشندہ ادبی روایت کو آگے بڑھایا۔ یہی وہ کارہنر ہے جو اس نے اپنے مشفق والد سے اخذ کیا۔ نتیجہ اس کامیابی اور کامرانی میں اس کی رفیقہ زندگی سعدیہ سونان کا اہم کردار ہے کہ ہر مرحلے میں وہ اس کی ہم قدم رہی۔ تخلیق کی مثال گلشن کی سی ہے جس میں سدا بہار شجر سایہ داری کی سی ہے کہ جسے دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈک پاتی ہیں اور جس پر گل اطراف تخلیق صبح وشام کھلتے ہیں جس کی خوشبو سے مشام جاں معطر رہتا ہے۔ آخر میں عزیزم سونان اظہر کے اس منفرد کارنامے کو دیکھتے ہوئے ایک شعر تخلیق کے روشن مستقبل کی نذر:

نشان آمد فصل بہار ہے کہ نہیں
وہ دیکھو پانی کی رنگت بھی سبز ہونے لگی

◆◆◆

''اظہر جاوید کی یاد میں''

شمع خالد

اظہر جاوید صاحب سے میری نیاز مندی تو خط کے ذریعے بہت عرصے سے تھی۔ اور خط کے جواب میں ان کی موتیوں جیسی لکھائی دیکھ کر میرے ذہن میں ایک بے حد وضعدار اور دبنگ قسم کے آدمی کا تصور آتا تھا۔ لیکن تخلیق میں چھپنے والے خطوط سے اندازہ ہوا کہ وہ سیدھے سادے قلندرانہ مزاج رکھنے والے انسان تھے۔ شمس نعمان اور ان کے درمیان خط و کتابت میں ان کے جو خط تخلیق میں شائع ہوتے تھے۔ اس میں شمس نعمان انھیں درویش، قلندر اور صوفی قرار دیتے تھے۔ شمس نعمان سے میں نے ایک دن پوچھ ہی لیا کہ بھائی کہ درویش اور صوفی قلندر والا معاملہ کیا ہے۔ تو انھوں نے حیرت سے مجھے کہا کہ آپ کبھی اظہر جاوید صاحب سے نہیں ملیں تو مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ صدر ضیاء الحق کے استقبالیہ میں اظہر اور صبا لکھنوی اپنے اپنے رسائل کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے۔ ضیاء الحق آتی دلچسپی سے ان کی باتیں سن رہے تھے کہ میں نے مناسب جانا کہ یہ کوئی ذاتی معاملات ہیں۔ اس لیے میں وہاں سے ہٹ گئی لیکن جب شمس نعمان نے حیرت انگیز انداز میں مجھے پوچھا تو مجھے لگا کہ وہ مجھے پوچھ رہے ہوں کہ میں آج تک اتنے بڑے آدمی سے ملاقات سے کیوں محروم ہوں۔ لہٰذا جب میں لاہور گئی تو میں نے ''تخلیق'' فون کیا۔ ٹیلی فون کی دوسری جانب سے بے حد گھمبیر آواز میں کہا گیا ''اظہر'' تو میں نے کہا کہ میں آپ کی نیاز مندی کے لئے حاضر ہونا چاہتی ہوں۔ تو پوچھا آپ کہاں سے آ رہی ہیں؟ جب میں نے بتایا کہ اسلامیہ پارک سے تو انھوں نے کہا کہ یہ تو نزدیک ہے۔ اور مجھے راستہ سمجھا دیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں تھوڑا سا سوچ رہی تھی کہ احمد ندیم قاسمی کے ساتھ جو ان کی یاری یا ناراضی ہو رہی ہے اس کے بارے میں بات کروں؟ یا ادب کے بارے میں؟ بہرحال پرانی انارکلی کا چوراہا پار کر کے میں اس گلی تک جا پہنچی جہاں اظہر صاحب کا دفتر تھا۔ چک اٹھا کر دیکھا تو پینٹ کوٹ میں ملبوس شخص بیٹھا نظر آیا۔ سرخ و سفید رنگ، اونچا قد، اور درمیانہ جسم۔ مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے۔ چھوٹے سے دفتر میں ہر وہ چیز بڑے سلیقے سے اپنی جگہ پڑی تھی۔ اظہر صاحب خود اٹھے اور پردہ گرا کر گئے اور پانچ منٹ بعد وہ کپ چائے لیے ہوئے داخل ہوئے۔ میں نے حیرت سے پوچھا اظہر صاحب چائے آپ نے بنائی ہے۔ تو وہ کہنے لگے اس دفتر میں چپڑاسی، کمپوزر، کاپی پیسٹ کرنے والا اور چائے بنانے والا میں ہی ہوں۔ تو میں حیرت سے انھیں دیکھتی رہ گئی۔

یونس جاوید داخل ہوئے۔ اظہر صاحب نے بڑی گرم جوشی سے میرا تعارف کروایا۔ لیکن یونس جاوید صاحب نے مجھے کوئی خاص لفٹ نہ کروائی۔ اظہر جاوید صاحب کی میز پر کچھ انڈین رسالوں کی طرف سے موصول شدہ خط پڑے تھے۔ میں نے کہا اظہر صاحب میں بھی اپنے رسالے بھجوانا چاہتی ہوں۔ تو انھوں نے کمال مہربانی سے کہا کہ میں بھجوا دوں گا۔ یوں میں جب بھی لاہور جاتی تو ایک سلام انھیں پیش کرنے کے لیے اظہر صاحب کے دفتر بھی جاتی۔ ایک دفعہ جب میں ان کے دفتر گئی تو میں نے ان سے کہا ''اظہر صاحب میری کتاب آ رہی ہے کیا آپ اس کی رونمائی کی تقریب میں آئیں گی۔'' اظہر صاحب نے کہا تم بے فکر ہو جاؤ۔ کتاب کی

تقریب بھی میں کروادوں گا۔

یوں کچھ میری مصروفیات رہیں کہ میں کتاب کی تقریب لاہور میں نہ کروا سکی۔ اسی عرصہ میں عذرا اصغر کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ میں نے فوری طور پر اصغر مہدی پر ایک مضمون لکھ کر بھجوا دیا۔ دو تین شماروں کے بعد میں نے عذرا کو فون کیا کہ مہدی بھائی پر لکھا مضمون شائع نہیں ہوا۔ تو عذرا آپا مجھے کہنے لگی تم اظہر کو فون کر لینا وہ تم سے سخت ناراض ہیں۔ میں بہت حیران ہوئی اور میں نے فون کیا، اظہر بھائی آپ مجھ سے ناراض ہیں۔ تو انھوں نے کہا ناراض نہیں دکھی ہوں کہ تم مضمون تو تخلیق کو بھیجتیں مگر چار رسالوں کو بھیجتیں۔ مجھے اظہر بھائی کی معصومیت پر بے حد پیار آیا۔ تو میں نے دل میں سوچا کہ ہم سارے تخلیق کار بچے ہوتے ہیں بڑے فلسفے تو بیان کر لیتے ہیں۔ اظہر صاحب جیسے پُر خلوص انسان کے لیے میری یہ تھوڑی سی غلطی انھیں دکھی کر دے گی۔ یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔

◆◆◆

''تخلیق'' مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہے

کراچی	**سٹی پریس بک شاپ** (پروپرائیٹر : اجمل کمال) مدینہ سٹی مال آفس نمبر 316 تھرڈ فلور کراچی (0300-8259082)
لاہور	**ایسٹ بک ڈپو** (پروپرائیٹر : محمد علیم) 6-B مال روڈ، لاہور (0320-4343588)
لاہور	**اظہار سنز** (پروپرائیٹر : سید محمد علی انجم رضوی) 19 اردو بازار، لاہور (0300-4106357)
لاہور	**سنگ میل پبلی کیشنز** (پروپرائیٹر : افضال احمد) 25۔ شاہراہ پاکستان، لوئر مال، لاہور (0300-8470143)
لاہور	**سلطان نیوز ایجنسی** (پروپرائیٹر : محمد آفتاب) اکبر مارکیٹ، 1۔ میو ہسپتال روڈ، لاہور
فیصل آباد	**شمع بُک ڈپو** (پروپرائیٹر : محمد اکمل) بیرون بھوانہ بازار، فیصل آباد (0300-6670134)
گوادر	**قندیل نیوز ایجنسی** (پروپرائیٹر : شبیر شاکر) پیڈکان ضلع گوادر، بلوچستان (0322-3761579)

ایک خط

(چیکوسلوواکیہ کی کہانی)

ہیرینا فرانکووا

ترجمہ: اظہر جاوید

یاد ـــ اس کی یاد مجھے بہت بے چین رکھتی ہے۔ میں اسے کچھ لکھنا چاہتی ہوں، کوئی خوشگوار سی بات۔ مگر جب بھی قلم کاغذ تھام کر خط لکھنا چاہا نہ جانے کیوں، کچھ بھی نہیں لکھ پاتی۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔ یوں لگتا ہے ذہن کی تختی بالکل صاف ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے بہت سی سوچیں کلبلا رہی ہوتی ہیں۔ میں طے کرتی ہوں کہ ان سب کے متعلق اسے لکھوں گی۔ اسے بتاؤں گی۔ لیکن جونہی ان سوچوں اور باتوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا چاہتی ہوں، خط کا روپ دینا چاہتی ہوں، ذہن بالکل آئینے کی طرح صاف ہو جاتا ہے اور میں کچھ بھی تو نہیں لکھ پاتی۔

کالج جاتی ہوں تو سبھی سہیلیاں کہتی ہیں ''تم اگر کسی کو چاہتی ہو تو اسے اپنا بنا لینے میں دیر کیوں کر رہی ہو مگر ـــ؟'' مگر میں کیا کروں۔ سویرے جب دودھ لینے جاتی ہوں تو اس وقت سب کچھ بہت عجیب سا لگتا ہے۔ چھوٹے قصبے یا شہر کی گلیاں تو ایک سی ہوتی ہیں۔ یکساں اور اکتا دینے والی۔ ایک ہی جیسے چہرے بار بار سامنے آتے ہیں۔ اگر لحاظاً یا مروت میں ان کی طرف مسکرا دیکھیں تو یقیناً وہ عجیب عجیب سے مطلب نکالنے لگیں۔ سب سے پہلے جنرل سٹور پر تمباکو بیچنے والی لڑکی سے ملاقات ہوتی ہے۔ وہ اس طرح بھوکی نظروں سے سب کو دیکھتی ہے، جیسے جنگلی آدم خور۔ وہ میری طرف دیکھتے ہی پھٹ پڑتی ہے۔ ''ہیلو، مس۔ تم ٹکٹ لینے کب آ رہی ہو؟'' پھر ڈاکٹر صاحب ملتے ہیں۔ انھوں نے یوں داڑھی بڑھا رکھی ہے اور ایسی خوش فہمی رکھتے ہیں کہ مجھے اس داڑھی کے پیچھے چھپا لیں گے۔ وہ چھوٹتے ہی پرانا جملہ دہراتے ہیں۔ ''ہم دونوں زرد ہوتے جا رہے ہیں؟ کہیں ہم دل کے عارضے میں تو مبتلا نہیں؟'' اس کے پاس صرف کلوروفارم کی بو ہے، جہاں ایک پل رکنا بھی محال ہوتا ہے۔ میں فوراً کھسک جاتی ہوں مگر ایک مبہم و ملائم مسکراہٹ کے ساتھ ـــ؟

ڈیری میں کام کرنے والی لڑکی کا جسم مکھن اور پنیر سے بنا لگتا ہے۔ سفید اور صحت مند۔ جب وہ برتن میں دودھ انڈیلتی ہے (اور یوں ہولے سے اور کوملتا سی لاتی ہے کہ برتن سے وہ دودھ بھی پھسلتا ہوا لگتا ہے) کہ اس وقت اس کے چہرے پر ایک ابدی مسکان نظر آتی ہے، وہ مجھے چھیڑتی اور کریدتی ہے۔ ''بہت خوش لگ رہی ہو؟ کیا بات ہے؟ اسے خط تو نہیں لکھ کے آ رہی ہو؟ تمہارے چہرے پر روشنائی بھی ہے!'' ''ہاں خط تو لکھا ہے۔'' میں دھیرے سے جواب دیتی ہوں۔ ''اپنی ماں کو خط لکھ کے آ رہی ہوں، وہ بہت پریشان رہتی ہیں۔'' پھر میں چالاکی سے اس کے چہرے پر اپنی بات کا ردعمل ڈھونڈتی ہوں اور کھسکتے ہوئے دل ہی دل میں کہتی ہوں۔ ''ہونہہ۔ تم سمجھتی ہو، میں تمھیں دل کی بات بتاؤں گی!'' وہ بھی بڑی کائیاں ہے۔ راز کی بات کھوج کرتی ہے۔ ''تم کہتی ہو تو مانے لیتی ہوں۔''

میں چپ رہتی ہوں۔ اسے کچھ بھی تو نہیں بتا سکتی۔ اس بات کا تعلق اس سے جو ہے۔

دوپہر کے وقت میں دریا پر نہانے کے مقام پر چلی جاتی ہوں۔ وہاں ایک ایسی گھپ چپ سی جگہ بھی ہے، جس کا میرے خیال میں کسی اور کو پتہ نہیں۔ وہاں جھاڑیوں نے ساحل کو بالکل چھپا رکھا ہے۔ میں نرم گھاس کے بستر پر لیٹ جاتی ہوں اور میرے کانوں میں پانی کی جلترنگ سی بجنے لگتی ہے۔

میں بہتے پانی سے باتیں کرتی ہوں۔ "تم جا رہے ہو!" ___ پھر اپنی چھوٹی سی ہتھیلی سے بڑی سی لہر کو روکنے کی سعی کرتی ہوں۔ ہتھیلی اور لہروں کے ٹکراؤ سے چھوٹے چھوٹے بلبلے ابھرنے لگتے ہیں۔

"دیکھ!" میں اپنے سے ہی مخاطب ہوں۔ "اگر تم نے پڑھنے میں دل نہ لگایا تو دیکھو، اس بلبلے کی طرح ٹوٹ جاؤ گے۔ سمجھے؟" پانی سے کوئی جواب نہیں آتا۔ اوپر کھلے آسمان پر کبوتر اڑ رہے ہیں۔ وہ بھی میری طرف توجہ نہیں دیتے۔ میری بات نہیں سنتے اور اپنے میں مگن اڑتے چلے جاتے ہیں۔ میں انہیں پکارتی رہتی ہوں اور وہ مجھ سے دور دور اپنی اڑان میں کھوئے ہوئے ہیں۔

"یہ کبوتر بھی بالکل تمہاری طرح ہیں" میری خود کلامی جاری ہے۔ "تم بھی تو اپنے فضول ماڈلوں پر وقت ضائع کرتے رہتے ہو اور پڑھائی پر توجہ نہیں دیتے۔ تمہارے ماڈل تو ان کبوتروں کی طرح اڑ بھی نہیں سکتے۔ کیوں وقت برباد کرتے ہو؟ کتابوں کو دوست بناؤ اور علم حاصل کرو۔" کبھی کبھار کوئی بھٹکا ہوا کبوتر میرے پاس کنارے پر اتر آتا ہے۔ وہ یوں میری طرف دیکھتا ہے، جیسے ہم دونوں عجیب سے ہوں۔ میں گھبرا کر اسے اڑا دیتی ہوں۔ "جاؤ، تمہاری دوستی بھی بڑی بری ہے۔" دریا کنارے کی جھاڑیوں میں کہیں کہیں کوئی پھول ہے۔ سفید دمکتے ستاروں کی طرح کے بڑے بڑے پھول۔ ___ ایک پھول توڑ کر میں اپنے بالوں میں اڑس لیتی ہوں۔ پھر سوچتی ہوں ___ بالوں میں پھول سجانے کا کیا فائدہ ___ جب پاس کوئی یہ کہنے والا بھی نہ ہو۔ "یہ کیا بات ہے، اس جنگلی پھول کو مسل دو، آؤ ہم مل کر تیریں۔"

اکیلے تیرنا کتنا بے مزہ لگتا ہے۔ پانی کا رویہ ایسا ہوتا ہے، جس طرح اکیلے پا کر یہ بھی کوئی شرارت کرے گا۔ میں ڈر سی گئی! یہ پانی اجنبی تو نہیں۔ میں اسے سالوں سے جانتی ہوں۔ اوپر سے لے کر تہہ تک۔ یہ کہاں خاموش ہے، اور کس جگہ شدت میں آ جاتا ہے۔ اس کے ہر مزاج سے واقف ہوں۔ میں اس کے دامن سے لپٹ سکتی ہوں اور اس کی لہریں میرے بدن سے اٹھکھیلیاں کرتی رہیں گی مگر اب ___ اب میری ہمت نہیں پڑ رہی کہ اس میں اتروں۔ میں کنارے پر ہی رہی۔ کوئی ساتھ ہو تو پانی سے خوف بھی نہیں آتا۔ کوئی سہارا دینے والا جو ہوتا ہے۔ میں نے پانی میں تیرنے والے ایک شخص کو خدا حافظ کہا اور چلی آئی۔ میں نے اسے، اس کی پشت پر بنے ہوئے نقش و نگار کو بھی غور سے نہیں دیکھا اور ___ میں اس بات کے متعلق بھی اس کو کچھ نہیں لکھ سکتی۔ ستار کوہ کے محافظ کے گھر کو جانے والا راستہ بہت خوبصورت ہے۔ شاید اسے خط میں یہ لکھنا مناسب رہے گا۔

اس راستے پر بھیڑ بالکل نہیں ہوتی مگر یہاں بھی کوئی نہ کوئی آشنا چہرہ نظر آ ہی جاتا ہے۔ اس راستے میں بندر اکثر دوڑتے رہتے ہیں اور جب یہ کسی راہگیر کی آہٹ پا لیں یا انہیں آتا دیکھ لیں تو اور تیز بھاگنے لگتے ہیں۔ کچھ ندی سے ملے کھیتوں میں خرگوش کلکڑے مار رہے ہوتے ہیں۔ ارد گرد سے بے نیاز وہ اپنی مستی میں گم ہوتے ہیں۔ میں تالی بجا کر انہیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہوں۔ وہ بھاگ جاتے ہیں لیکن پھر اپنی پہلی جگہ پر آ جاتے ہیں۔ وہ مجھ سے باتیں کرتے ہیں اور اپنی بے زبانی کی زبان میں کہتے ہیں "ہم نے تم پر احسان کیا ہے،

اب بھی اور تنگ مت کرنا۔"

تم وہ درخت دیکھتے ہو کیا ہیں ..... ؟ آؤ ..... بہت دور میں ایک جزیرے سے درخت کو دیکھ رہی ہوں۔ اور پھر راہوں میں پیلے دھبے بھی تو ہیں۔ سورج پیلے پتوں میں سے جھانک رہا ہے۔ جب درخت ہلتا ہے تو سورج کا تھال ڈولتا ہوا لگتا ہے۔ پھر سب کچھ گھل مل جاتا ہے۔ یونہی چلتے چلتے ایک فاصلے پر وہ مجھے نظر آ گیا۔ کیا یہ وہی تھا ..... ؟ یا کوئی اور بھی ہو سکتا ہے ..... ؟ میں نے خود سے سوال کیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اب بھی پیلے پیلے دھبے ناچ رہے تھے۔ ہاں ..... بالکل وہی ..... بالکل ..... میں نے اپنے آپ کو یقین دلایا۔ میں اسے وہیں درخت کے پاس ملوں گی۔ مگر وہ وہاں نہیں تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ میرا وہم تھا یا سراب تھا۔ سورج اپنے شغل میں مصروف تھا۔ میں جھنجھلا گئی۔ میں ٹوٹ پھوٹ گئی۔ ہر وقت مجھے تمہاری ہی آہٹ محسوس ہوتی رہتی ہے۔ تمہارے قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے کہ تم آ رہے ہو۔ یہ تم ہو۔ لیکن کیا تم ایک بار بھی نہیں آ سکتے؟

وامیک۔ تمہیں خبر ہے کہ عشق بچوں کی طرح تتلی کی تان پر ناچ لیتی ہے؟ اور کیا تم جانتے ہو کہ پرندہ ساکن رہ کے بھی پرواز کر سکتا ہے؟ تم ہنستے ہو۔ یہ نہ کہنا کہ تم نہیں جانتے۔ تمہیں سب کچھ معلوم ہے۔ پھر تم گھر جاتے ہو اور چچی تمہارے انتظار میں کھڑی ہوتی ہے۔ ارے یاد آیا ..... چچی کے حوالے سے تمہیں خط لکھا جا سکتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔

چچی گول مٹول سی بالائی اور چاکلیٹ سے بنے ہوئے کیک کی طرح ذائقے دار عورت ہے۔ مسکراہٹ ہر گھڑی اس کے چہرے پر رقصاں رہتی ہے۔ مجھ سے مل کر تو اس کی مسکراہٹ اور بھی ذرا ہو جاتی ہے۔ "یہ کیسی محبت ہے۔" وہ مجھے کہتی ہے۔ "تم اسے کوئی دلچسپ سا خط نہیں لکھ سکتیں۔ ان خطوں کو ایک نظر دیکھو۔ جو میں نے تمہارے چچا کو لکھے تھے۔" اس نے مسکراتے ہوئے خطوں کا ایک بنڈل مجھے تھما دیا۔ ان خطوں میں اصلی جذباتیت کی فراوانی ہے۔ یوں لگا جیسے ابکائی آ جائے گی۔ "لیکن چچی ..... !" "میں کہتی ہوں۔" اسے میں نے ایسا خط لکھا تو وہ سمجھے گا۔ میں پاگل ہو گئی ہوں۔"

"تم لوگ بہت پاگل لوگ ہو۔" چچی لمبا سانس لے کر کہتی ہے۔ "تم نوجوانوں میں تو احساس نام کی کوئی شے ہی نہیں ہے۔"

واہ ..... یہ بھی کوئی لکھنے والی بات ہے۔ اچھا ..... پھر بھی میں خط لکھوں گی۔ ایک عام سا خط ..... میں بیٹھ جاؤں گی لکھنے کے لئے ..... اور ذہن میں سوچ کی جو بھی پہلی لہر آئے گی، اسے خط میں اتار دوں گی۔ میں نے جنرل سٹور کی تہہ کو پیچھے والی، انسانوں کو کھا جانے والے پودوں جیسی لڑکی سے کاغذ اور ذرا کم تر ریشے اور خط لکھنے لگی۔

"ہیلو۔ وامیک۔ تم کیسے ہو۔ میں ٹھیک ہوں اور خوش بھی۔ تم آنا چاہو تو اچھی بات ہے۔ نہ آنا چاہو تو آنا کچھ ایسا ضروری بھی نہیں۔ یہاں پر تیراکی کے لئے ایک بہت عمدہ جگہ ہے۔ مجھے جواب دینا اور لکھنا کہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا پڑھائی میں دلچسپی لیتے ہو ..... ؟ تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ مجھے بالکل خط لکھنا نہیں آتا۔ کیسا بے تکا خط ہے ..... اس لئے ختم کرتی ہوں۔ ..... اولینا"

مابعد تحریر ..... ہاں یاد آیا ..... میں کام کے لئے لگنے والے کیمپ کا شدت سے انتظار کر رہی ہوں۔ تم وہاں جاؤ گے ..... جا رہے ہو نا ..... ؟

◆◆◆

جنم دن

سوناں اظہر جاوید

"بیٹا میرے پاس تمھیں دینے کے لیے کچھ بھی نہیں میں تو نہ تمھاری کفالت کر سکا اور نہ ہی تمھیں کوئی اچھی نوکری دلوا سکا۔" آج میں پھر دفتر تخلیق میں شکوے شکایات کے انبار لیے ابو کے سامنے بیٹھا تھا مگر یہ بھی سچ ہے کہ 63 سال کی عمر میں جب انھیں پہلا ہارٹ اٹیک ہوا تو ہم باپ بیٹا ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے پہلی بار مجھے انھیں ہمیشہ کے لیے کھو دینے کا ڈر محسوس ہوا اور شاید ابو کے دل میں دبی میری محبت بھی اسی دن کا انتظار کر رہی تھی میں نے اپنے دل کی ہر بات ابو سے کرنی شروع کر دی جس میں زیادہ تر شکوے شکایات تھے۔

ان کی طرف سے کوئی مالی اعانت نہ حاصل ہونے کا شکوہ، اتنے بہت سے تعلقات کے باوجود مجھے اچھی سرکاری نوکری نہ دلوا سکنے کی شکایت وغیرہ وغیرہ۔ اب احساس ہوتا ہے کہ وہ باتیں جو میں ابو سے کرتا تھا سب بے معنی تھیں شاید وہ عمر ہی ایسی تھی جس عمر میں لڑکوں کو احساسات سے زیادہ اپنا مستقبل سنوارنے کی دھن لگی رہتی ہے۔

ابو بھی تو تمام دن دوسروں کی مشکلات اور دکھوں کو تحمل سے سنتے اور ان کا حل تلاش کرنے میں گزارتے تھے۔ صبح شام دفتر تخلیق میں لوگوں کی محفل سجی رہتی ہر ایک اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے چلا آتا۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔

لیکن انسان کا دل کب تک غموں کا بوجھ برداشت کر سکتا ہے اور ابو جیسے حساس آدمی کہ جو دوسروں کی پریشانیوں کو بھی اپنی پریشانی سمجھتے ہیں آخر کب تک ہمارے دکھوں کو سنتے اور سہتے آخر ان کے دل نے ہار مان لی اور وہ اس دنیا سے چلے گئے۔ طویل عرصے کی جدائی کے بعد ابو سے ملاقات ہوئی جب میں نے اپنی تعلیم مکمل کر لی تھی اور میرے کیریئر کی ابتدا تھی۔ ماں نے سب کچھ ہونے کے باوجود مالی مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ سب کچھ انھوں نے خود کمایا ہے کئی سال بچت کر کے یہ پیسے جمع کیے ہیں۔ اب تم بھی نوکری کرو اور اپنا مستقبل خود بناؤ۔ یہ جو کچھ میرے پاس ہے یہ میرے بڑھاپے کا سہارا ہے۔ نہ مجھے تم سے کوئی امید ہے نہ تمھارے باپ سے تھی۔ میں جھنجھلا سا گیا تھا میں نے کہا "تم اب جاؤ اپنے باپ سے، تم ماؤں نے ساری عمر تم لوگوں کے لیے کیا کیا ہے؟" کتنی عجیب بات ہے منت و مرادوں سے حاصل ہونے والی اولاد کو میاں بیوی آپس کی رنجشوں میں فراموش کر دیتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کو دکھ دینے میں دراصل اپنی اولاد کو دکھ دینے لگتے ہیں۔ اس وقت ماں کی باتیں بری تو بہت لگیں لیکن اپنا مستقبل سنوارنے کی لگن اور بڑھ گئی آج سوچتا ہوں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ آج میں اپنی محنت کے بل بوتے پر اپنا کاروبار چلا رہا ہوں اور اللہ کے کرم سے پرسکون زندگی گزار رہا ہوں۔

اس وقت تو ماں کی باتوں سے دل برداشتہ ہو کر باپ کے پاس آیا تھا۔ وہاں وہ ہر آنے جانے والے کے دکھ درد اپنے دل میں سمو رہے تھے۔ میں نے بھی شکوہ کیا "ابو آپ کے دفتر کے باہر جھنڈے والی سرکاری گاڑیاں ہر وقت کھڑی رہتی ہیں اتنے اونچے عہدوں والے لوگوں سے آپ کا رابطہ ہے۔ پھر آپ میرے لیے کچھ کیوں نہیں کرتے؟" وہ میری بات تحمل سے سنتے رہے کبھی غصہ کیا نہ درمیان میں ٹوکا اور میں جذبات میں ہمیشہ ہی کچھ زیادہ بول جاتا تھا۔ اس میں میرا بھی کوئی قصور نہیں میرے پاس تو صرف ماں باپ ہی تھے۔ جن سے میں

اپنے دل کی بات کرتا۔ میری بات کے جواب میں ابو کہتے "بیٹا یہ جو سرکاری بندے ہیں نا کہ میرے دوست کیوں نہیں یہ تب تک میرا کام نہیں کریں گے جب تک انھیں مجھ سے کوئی مفادات ہو اور میں غریب آدمی ہوں میرے پاس عزت اور بھرم کے سوا کچھ نہیں۔ بیٹے میں آپ کے لیے دعا کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔" اور مجھے تو اس وقت دعا کی اہمیت کا اندازہ بھی نہیں تھا بس ایک جنون تھا جو ہر وقت دماغ پر سوار رہتا کہ پیسہ کمانا ہے اپنا مستقبل بنانا ہے۔

ماں باپ کے درمیان جھگڑے کیوں ہوتے تھے؟ کیوں ابو ہمیں چھوڑ کر الگ ہو گئے؟ ان سوالوں کا جواب ماں باپ سے نہ ملا۔ ماں سے ہر وقت کے طعنے، باپ کی دوری یہ سب باتیں مجھے احساس کمتری میں مبتلا کر رہی تھیں۔ غصہ اور جنون بڑھنے لگا تھا۔ پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے یا ان دعاؤں کا اثر ہے جو ابو مجھے دیتے تھے۔ میرا غصہ میرا جنون مجھے غلط راستے پر نہیں لے کر گیا اور آج میں کامیاب بزنس مین ہوں۔ اب سوچتا ہوں تعلقات سے فائدہ اٹھانے کا گر اگر ابو کے پاس ہوتا تو وہ خود اپنے رسالے کے لیے نہ کچھ کرتے کہ جو ان کا اوڑھنا بچھونا تھا ان کی زندگی ان کی اولاد جس کی پرورش انھوں نے دل و جان سے کی تھی آج تخلیق میں اشتہارات کی بھرمار ہوتی آج ان کی یہ اولاد تخلیق اپنے پیروں پر کھڑا ہوتا۔ ابو نے سچ کہا تھا یہ دنیا مفادات کا گنج ہے جہاں ہر شخص اسی دوسرے انسان کی مدد کرتا ہے جس سے امید ہو کہ بدلے میں وہ بھی اس کے کسی کام آئے گا۔ لیکن صد شکر کہ ابو نے اپنی عزت اپنی ذات کا بھرم قائم رکھا۔ اپنے دم پر تخلیق کی آبیاری کی اور اپنا مقام بنایا جہاں بہت سے خوبصورت دلوں والے دوست ان کے ساتھ رہے اور آج میرا بھی ساتھ دے رہے ہیں۔

آج میں فخر سے کہتا ہوں میں نے اپنے نوکری اور بزنس کے تمام سالوں میں اتنا نام مقام اور عزت نہیں کمائی جتنی ان دو سالوں میں "تخلیق" کی ادارت کے دوران کمائی اور مجھے احساس ہوا کہ دنیا میں اب بھی بے لوث محبت کرنے والے دوست موجود ہیں۔

آج 4 جنوری بدھ کا روز صبح حسب معمول آنکھ کھلی اٹھا تو موبائل پر آنے والی مسیجز کو چیک کرنے لگا۔ موبائل پر جب تاریخ پہ نظر پڑی تو نگاہ بے اختیار ابو کی تصویر پر چلی گئی آج ابو کا جنم دن تھا۔ میرا روز کا معمول ہے کہ آفس کی سیٹ پر بیٹھتے ہی نظر ابو کی تصویر پر چلی جاتی ہے پر آج نگاہ تصویر پر ہی ٹھہر گئی آنکھیں نم ہو گئیں اور ابو کی محبتوں اور یادوں کے محل، دل نے یادداشت کے گوشوں سے نکل کر نگاہوں کے سامنے مجسم صورت اختیار کر لی۔ ہر منظر واضح اور شفاف تھا۔ بہت دیر اسی کیفیت میں رہا پھر بیوی کے پکارنے پر کہ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے واپس حقیقی دنیا میں آ گیا۔ نگاہ پھر سے ابو کی تصویر کا طواف کرنے لگی یہ وہی تصویر ہے جسے تقریباً نصف صدی تک ابو نے اپنے دفتر میں اپنی کرسی کے اوپر دیوار پر لگا رکھا تھا۔ میں نے بھی ان کے دفتر سے یہ تصویر لا کر اسی جگہ سجائی ہے کہ میری ہر صبح انھیں دیکھ کر شروع ہوتی ہے۔

وقت کسی کے لیے نہیں رکتا آج ابو کو ہم سے جدا ہوئے 8 سال ہو گئے۔ میں بمشکل ناشتہ کر کے بوجھل قدموں کے ساتھ اپنے دفتر آ گیا تمام دن عجیب بے چینی سے گزرا۔ ہر وقت ایسے محسوس ہوتا رہا جیسے ابو آس پاس ہوں۔ فون کی گھنٹی بجی تو میں اس طرف متوجہ ہوا فون پر رواجوں کو نبھاتی ہوئی منور سلطانہ موجود تھیں۔ اداس لہجے میں کہنے لگیں [illegible] آج اصغر جاوید کا جنم دن ہے۔ میری پچھلے دس سال سے یہ عادت تھی کہ میں ان کے جنم دن پر انھیں کال ضرور کرتی تھی پر اب وہ نہیں تو تم ان کی نشانی ہمارے درمیان موجود ہو اس لیے میں نے تمھیں کال کی ہے اور یہ ہے منور سلطانہ پچھلے 8 سال سے ابو کے ہر جنم دن پر مجھے کال کرتی ہیں۔ فون بند ہوا تو میں سوچنے لگا کیسے وضعدار لوگ ہیں جو اب بھی اصغر جاوید کو یاد رکھے ہوئے ہیں جبکہ آج کے اس مادی دور میں لوگ اپنے عزیز و اقارب کو ان کی موت تو دور ان کی

زندگی میں بھی پیار کرنا پسند نہیں کرتے اور خوشی بھی ہوئی کہ اگر میں کسی دفعہ ابو کا ختم دن بھول بھی گیا تو منصور سلطانہ مجھے بھولنے نہ دیں گی۔

دوپہر میں ابو کی قبر پہ چلا گیا۔ دل کو جانے کیوں قرار نہیں تھا۔ آج ابو شدت سے یاد آ رہے تھے۔ دل رو رہا تھا۔ ابو اب میں کس سے اپنے دل کی بات کروں میں کہاں جا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کروں آپ کے پاس آتا ہوں تو اب آپ صرف میری سنتے ہیں کوئی حرف تسلی بھی تو نہیں ہے اب آپ کے پاس میرے لیے۔ دیکھیں ابو اب میری آپ کے لیے شکایات میں ایک اور اضافہ ہو گیا ہے۔ آنسو تھم نہیں رہے تھے بہت دیر آنسوؤں کے ذریعے دل کا بوجھ ہلکا کرتا رہا۔ آنسو قبر کی مٹی میں سوتے رہے پھر اچانک ایک خیال آیا عجیب بات ہے پر اسی دوران ابو کی قبر کے گرد اپنے لیے بھی جگہ تلاشتا رہا کہ مجھے بھی کہیں اپنے والد کے پہلو میں جگہ مل جائے فاصلہ قبروں کے درمیان اگرچہ کم ہے لیکن کون جانے کس کے لیے کون سی جگہ مختص ہے۔

ابو آپ کی امانت تخلیق کو میں دل و جان سے سنبھالے ہوئے ہوں پتہ نہیں میں اس کو صحیح پروان چڑھا رہا ہوں یا نہیں؟ آپ دعا کریں کہ میں بھی اپنی آخری سانس تک اسے آپ ہی کی طرح سنبھالے رکھوں۔ اب میں بھی آپ ہی کی طرح اس کے لیے جو بن پڑ رہا ہے کر رہا ہوں۔ میں نے آپ اور آپ کے رسالے کا نام مٹنے نہیں دیا۔ ابو آپ کو سن کر خوشی ہوگی کہ دوست احباب کہہ رہے ہیں کہ تخلیق ترقی کر رہا ہے۔ اس کی پہچان بین الاقوامی پرچے کی حیثیت سے ہونے لگی ہے اور سب سے بڑی بات تخلیق نصف صدی کا پرچہ بننے جا رہا ہے۔ ابو سچ ہے آپ بھی تو ڈاکٹر انور سدید کی ہر بات کو اہمیت دیتے تھے۔ آپ ان سے پوچھ لیں وہ بھی آپ کے پاس آ گئے ہیں۔ انھوں نے تخلیق کو بین الاقوامی پرچہ قرار دیا اور ان کی لکھی تحریریں، کالم اور تبصرے آج بھی تخلیق کے صفحات پر موجود ہیں اور میرے دورِ ادارت کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ اب تو آپ کے رقیب بھی تخلیق کو سراہنے لگے ہیں۔ ابو دیکھیں میں نے آپ کے اس ڈر کو رفع کر دیا کہ جو آپ کو لگتا تھا کہ آپ کے بعد "تخلیق" بند ہو جائے گا۔ میں نے اسے بند نہیں ہونے دیا اور اس روایت کو مضبوط کیا ہے کہ اگر کوشش اور لگن سچی ہو تو مدیر کے جانے کے بعد بھی اس کی جلائی ہوئی شمع نسل در نسل جل سکتی ہے۔

ابو آپ کے سرہانے کھڑا ہوں دیکھیں آپ کے اس نکمے بیٹے نے آپ کا سر جھکنے نہیں دیا۔ تخلیق کا جو دوپہلا تھا آپ کے سر کا تاج تھا اسے آپ کے مخلص دوستوں نے آپ کے جانے کے بعد آس اور امید کے ساتھ میرے سر پر رکھا میں نے اسے گرنے نہیں دیا۔ ابو مجھے فخر ہے کہ میں آپ کا بیٹا ہوں آپ نے جس خودداری سے تخلیق کو چلایا آج میں بھی ایسے ہی چلا رہا ہوں نہ آپ نے اس کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا نہ میں نے ہاتھ پھیلا کر تخلیق کی شان میں کمی آنے دی ہے۔ اور جانے کتنی دیر میں ابو سے باتیں کرتا رہا اگر مغرب کی اذان مجھے واپس دنیا میں نہ لے آتی۔ موذن پکار رہا تھا اللہ اکبر اللہ اکبر اور میرے دل میں سکون اترتا جا رہا تھا مجھے اپنی تمام شکایات کا جواب آپ سے مل گیا تھا ابو سچ ہے کہ اگر اللہ نے آپ کو اپنے پاس بلا لیا ہے تو اللہ موجود ہے وہ بہت بڑا ہے جیسے اس نے آپ کی رہنمائی اور مدد کی ویسے ہی میری بھی کرے گا۔ موذن حی علی الفلاح پکار رہا تھا میں نے ابو کو اللہ حافظ کہا اور نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ قبرستان سے نکل پڑا۔ جاتے جاتے مڑ کر پھر کہا ابو آپ کو آپ کا ختم دن مبارک ہو میں آپ کا اور آپ کے تخلیق کا معیار کبھی خراب نہیں ہونے دوں گا میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کے تخلیق کو اور تابناک بناؤں گا۔ اور پھر میں بھی فلاح کی تلاش میں مسجد کی طرح چل پڑا۔

◆◆◆

گوشۂ انور سدید

غالبؔ...... سب اچھا کہیں جسے

ڈاکٹر انور سدید

مرزا اسد اللہ خان غالبؔ نے ہندوستان میں اس دور میں آنکھ کھولی جب مغلوں کا اقتدار زوال آمادہ ہو چکا تھا۔ اور اس خاندان کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر برائے نام شہنشاہ کشورِ ہندوستان تھا لیکن پورے ملک میں حکم کمپنی بہادر کا چلتا تھا۔ مغلیہ سلطنت کا درخشاں آفتاب غروب ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک بدیشی ستارہ اکنافِ ہند میں خورشیدِ تاباں بنتا جا رہا تھا۔ ایک چمن تاراج ہو رہا تھا تو ایک اور گلشن آراستہ ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے رسالہ ''اوراق'' لاہور کے 1967 کے ایک شمارے میں ''عہد ابو ظفر — بہادر شاہ ظفر'' کا جائزہ لیا تو لکھا:

''ایسٹ انڈیا کمپنی نے آغاز کار سے لے کر اس زمانے تک اپنے تجارتی مفادات کے تحفظ کے لیے جو ساکھ بھی حاصل کر لی تھی، اس کے اثرات کلکتہ سے نکل کر دلی اور اس کے نواح کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔''

اس قسم کے متزلزل ماحول میں عوام ہی نہیں خواص کے اعصاب بھی کمزور پڑ جاتے ہیں اور راسخ وفاداریاں بھی متزلزل ہونے لگتی ہیں۔ ریاکاری سکۂ رائج الوقت بن جاتی ہے اور تحفظِ ذات کے لیے ہر اس بات کو قبول کیا جانے لگتا ہے جو بالعموم افواہوں کی زائیدہ ہوتی ہے۔ لیکن اس پر رائے عامہ کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ تاہم اس طریقِ عام کو اس دور کا باصفت انسان شعوری طور پر قبول نہیں کرتا۔ اسد اللہ خان غالب بھی اس دور کے انسانوں کے سیلاب میں ایک عام فرد ہوتا تو سانس کی آمد و شد جاری رکھنے اور نان و نمک کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے شاید اول الذکر رستہ ہی اختیار کرتا۔ شاہ نصیر کی تقلید کرتا یا پھر ابراہیم ذوق کی ڈگر پر چلتا اور بہادر شاہ ظفر اور ولی عہد کے لیے غزلیں بناتا۔ لیکن روشِ عام کے مطابق آرام کے اسباب تلاش کرنا..... غالب کو منظور نہیں تھا اور شاید یہ غالب کا مقصودِ نظر بھی نہیں تھا۔ اس لیے جب مشکلات نے آواز دی تو غالب نے ان کے استقبال میں مسرت اور سرخوشی کی کیفیت محسوس کی۔ اور مسرت کی یہ لہر غالب کے اشعار میں سماتی چلی گئی:

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا دل — جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر
دیا یار میں بھی جتانے آتشِ رشک — ہلاکِ جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لیے

ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ مرزا غالب کی زندگی پر نظر ڈالیے تو یہ شروع سے آخر تک ایک ٹیڑھی لکیر نظر آتی ہے (مقالہ — غالب کی شخصیت) اور اسے ابتدا سے ہی معاشرتی سطح پر کون کون سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ والد کی وفات کی وجہ سے یتیمی کا صدمہ سہنا پڑا۔ پرورش کی ذمہ داری چچا نصر اللہ خان نے سنبھالی تو بارِ امانت اٹھانے والا اچانک ہاتھی سے گر کر فوت ہو گیا۔ سرکار انگلشیہ نے جاگیر واپس لے لی اور غالب کی پنشن مقرر کر دی جو سقوطِ دہلی کے بعد بند کر دی گئی کہ غالب کے تعلقات قلعۂ معلی سے تھے۔ قمار بازی کے

عقدے میں گرفتاری عمل میں آئی اور غالب جو پیر کا عہد روزگار تھا سراپا ب ہوا۔ ان سب پر مستزاد جوان سال بیٹے زین العابدین عارف کی وفات کا غم تھا۔ 1857ء کا معرکۂ رستخیز غالب کو ذاتی کرب عظیم میں مبتلا کر گیا غالب نے درد کی تمام چوٹیں اس طرح برداشت کیں کہ درد کا حد سے گزرنا دوا بن گیا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے تھے

حقیقت یہ بھی ہے کہ آخر عمر کار کی دی ہوئی مصیبتوں کے علاوہ میرزا غالب کی بہت سی مشکلات اس کے احساس برتری سے پیدا ہوئی تھیں۔ خاندانی بلندی، آبائی شجاعت، اجدادی ثروت اور بزرگوں کے کارنامے اس دور کے زوال پذیر دلی میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ مرزا غالب کے لیے اس کے چچا نصراللہ خان کی پنشن منفعت سے کہیں زیادہ عالی عزت اور خاندانی حقوق کی بازیابی کا مسئلہ تھا۔ کلکتہ میں ناکامی ہوئی تو اپنی عرضداشت ملکہ وکٹوریہ تک پہنچائی۔ 1857ء کے معرکۂ رستخیز میں ہزیمت کو دل سے قبول نہیں کیا اور خلوت نشینی اختیار کر لی۔ دہلی کالج کی ملازمت اس لیے قبول نہ کی کہ اس سے غالب کے موجودہ اعزاز میں فرق آتا تھا۔ مرزا غالب نے اپنی آمدنی کی چھوٹی سی موم بتی کو دونوں سروں سے جلائے رکھا — غم مرگ — غم فراق اور غم موت تو تھا ہی — مفلسی کا غم لاحق ہو گیا لیکن یہ یقین قائم رہا:

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرماں روائے کشورِ ہندوستان ہے

غالب کی ہمتوں میں پستی کبھی نہیں آئی۔ پیہم مشکلات غالب کی مقاومت میں اضمحلال پیدا نہیں کر سکتیں۔ وہ مشکلات کا سامنا کرتا ہے اور اپنی خودمندی اور بے نیازی کو عاشقانہ وقار سے بحال رکھتا ہے۔ شمع خانہ روشن کرنے کے لیے برق تلاش کرتا ہے اور صعوبتیں جھیلنے کے لیے عمر خضر مانگتا ہے۔

اسد بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
کہ مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

جگر تشنۂ آزار تسلی نہ ہوا
جوئے خوں ہم نے بہائی بن ہر خار کے ساتھ

غالب زندگی کی ہموار شاہراہ کو چھوڑ کر پیچیدہ پگڈنڈی پر چلنے کا عادی نظر آتا ہے اور اسی سے غالب کی مشکل گوئی نے جنم لیا جس پر اعتراض ہونے لگے تو مرزا نے سہل ممتنع کا وہ انداز اختیار کیا جس پر ہر شاعر قادر نہیں ہو سکتا۔ لیکن غالب کی سادگی میں معنویت کی گہرائی زیادہ ہے۔ اور اس کا تجربہ ہر دور کے انسان کو اپنا تجربہ محسوس ہوتا ہے۔

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یا رب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

زندگی اس حال میں گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اس نوع کے اشعار میں غالب رواں وقت سے بعید چلا جاتا ہے اور وہ ہر دور کے انسان کا ترجمان بن جاتا ہے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اکیسویں صدی میں ہمارے ایک اہم نقاد نے غالب کو اپنا لازمانی معاصر قرار دیا۔ بالفاظ دیگر، غالب ایک ایسا شاعر ہے جو انیسویں صدی میں زیر طور چلا گیا تھا لیکن جسے آج بھی سب اچھا کہتے ہیں۔ اور جس کے سامنے وقت نے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔

(نایاب غیر مطبوعہ تحریریات کا نوادرات سے بازیافت)

◆◆◆

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

پاکستان کی ادبی دنیا کے افق پر وہ احباب جو قوسِ قزح کی طرح مختلف رنگوں میں پاکستان کی ادبی شناخت ہے ان میں عالمی شہرت یافتہ نقاد، انشائیہ نگار، محقق، شاعر، دانش ور، کالم نویس، سوانح نگار، ادیب، مدیر، مبصر، تجزیہ نگار اور ماہرِ اقبالیات ڈاکٹر انور سدید کا نام سرِ فہرست ہے۔ انھوں نے ادب کی تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی۔ اُن کا حلقۂ احباب نہ صرف پاکستان میں بلکہ بیرونِ پاکستان بھی بہت وسیع رہا۔ ان کا تخلیقی سرمایہ سب کے لیے سرمایۂ تحقیق ہے۔

ڈاکٹر انور سدید نے 4 دسمبر 1928ء قصبہ میانی بھلوال ضلع سرگودھا میں آنکھ کھولی۔ یہ علاقہ بہادروں، تحریکِ پاکستان کے کارکنوں، محنت کشوں اور ہنرمندوں کے حوالے سے ملک بھر میں مقبول ہے۔ ان کے والد مولوی امام دین علاقہ کی نیک نیت اور شریف النفس شخصیت تھے۔ پرائمری تعلیم اسلامیہ پرائمری سکول سے حاصل کی۔ گورنمنٹ ہائی سکول ڈیرہ غازی خان سے مڈل جب کہ 1944ء میں گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 سرگودھا سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اسلامیہ کالج لاہور میں بھی زیرِ تعلیم رہے۔ محکمۂ آب پاشی میں آب پاشی کرتے ہوئے ادب کی گل پاشی کی طرف راغب ہوئے۔ 1949ء میں انجینئرنگ کا ڈپلومہ طلائی تمغہ کے ساتھ حاصل کر لیا۔ 1961ء میں ایس ڈی او ہوئے۔ مزید برآں ڈھاکہ سے آئی ایم ای کر کے 1970ء میں نظامِ انہار کے منتظم ہوئے۔ انھوں نے ایم اے اردو پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پنجاب یونی ورسٹی سے قابلِ مثال کامیابی کے ساتھ پاس کیا کہ ریگولر اور پرائیویٹ طالب علموں کو شکست دیتے ہوئے وہ گولڈ میڈل حاصل کیے۔

1979ء "اردو ادب کی تحریکیں" مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ یاد رہے کہ ڈاکٹر وزیر آغا ان کے نگران تھے جب کہ ڈاکٹر سید عبداللہ اور شمس الدین صدیقی ممتحن تھے۔ پی ایچ ڈی کی تکمیل کے بعد ڈاکٹر انور سدید کے اعزاز میں ایک تقریب "دل کشا ہوٹل" سرگودھا میں منعقد ہوئی جس کا احوال الگ کتاب میں موجود ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے اتنے لاتعداد صفحات پر بکھیرے کہ کئی قلم چلتے چلتے دم توڑ گئے لیکن صفحات کی صحرا نوردی مکمل نہ کر سکے۔ پیرانہ سالی کے باوجود لفظ ان سے التجا کرتے تھے کہ وہ اپنے قلم سے صفحات کی پیاس بجھاتے رہیں۔

انھوں نے ادب کی آبیاری کے علاوہ پنجاب کی سرزمین کے بہت سے علاقوں کو سیراب کرنے کا فریضہ ایمان داری اور دیانت داری سے ادا کیا۔ سول انجینئرنگ ڈپلومہ گورنمنٹ سکول آف انجینئرنگ پنجاب، رسول ضلع منڈی بہاؤالدین سے گولڈ میڈل حاصل کر کے اپنی فنی اور انتظامی صلاحیتوں پر مہر ثبت کی۔ انھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف انجینئرز ڈھاکہ سے سول انجینئرنگ ڈگری کورس مکمل کیا۔ 3 دسمبر 1988ء کو انھوں نے بحیثیت ایگزیکٹو انجینئر محکمۂ آب پاشی پنجاب اپنی ملازمت کا دورانیہ مکمل کیا۔ 3 دسمبر 1988ء کو وہ سرکاری ملازمت سے آزاد ہو کر ادبی دنیا کی حاکمیت کرنے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں ادب کے بہت سے محاذوں پر کام کرنا پڑا۔

تصانیف :

☆ اقبال کے کلاسیکی نقوش۔ اقبال شناسی اور "ادبی دنیا"۔ اقبال شناسی اور "اوراق"۔ اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش۔ ملتان آباد 1983ء؛ لاہور 2006ء۔ انشائیہ اردو ادب میں۔ 1985ء۔ اردو ادب میں سفرنامہ 1989ء۔ اردو ادب کی تحریکیں اشاعت پنجم 2004ء۔ مجید امجد ایک مطالعہ۔ اردو ادب کی مختصر تاریخ۔ 1990ء۔ پاکستان میں ادبی رسائل کی تاریخ 1991ء۔ میر انیس کی اقلیم سخن (بھارت) 1985ء۔ غالب کا جہاں اور 1989ء۔ اختلافات 1975ء۔ فکر و رسے مضامین 1988ء۔ نئے ادبی جائزے 1989ء۔ شیخ اردو کا سفر 1989ء۔ برجستہ تنقید 1991ء۔ موضوعات 1991ء۔ اردو افسانے کی کروٹیں 1992ء۔ اردو نثر کے آفاق 1998ء۔ اردو شاعری کا دیار 1999ء۔ جدید اردو ادب کے ارباب ارجمند 2007ء۔ مولانا صلاح الدین احمد ایک مطالعہ 1990ء۔ وزیر آغا ایک مطالعہ 1985ء۔ شام کا سورج (تالیف) 1985ء۔ پاکستان کا ایک اہل جلیل حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدروی۔ 2002ء۔ ڈاکٹر ایس پی ڈی ٹی کا (انشائیے) 1989ء۔ آسمان میں پتنگیں (انشائیے) 1994ء۔ غالب کے نئے خطوط (طنز و مزاح) 1982ء۔ دلاور فگاریاں (سوانح) 1990ء۔ محترم چہرے (خاکے) 1989ء۔ قلم کے لوگ (خاکے) 1992ء۔ ادیبان رفتہ (خاکے) 2006ء۔ دو محبتیں شیام کے نام (تصوف) 1976ء۔ وزیر آغا کے خطوط انور سدید کے نام (تالیف) 1985ء۔ مکالمات (تالیف) 1992ء۔ اردو افسانہ عہد بہ عہد 1996ء۔ نئے ادبی جائزے 1988ء۔ یکوقت کتابوں کے ساتھ 1994ء۔ دلی دور نہیں (سفرنامہ)۔ غزل کے رنگ۔ 2009ء۔ پرندہ سفر میں، 2009ء۔ انور سدید کے خوابیدہ افسانے (مرتب۔ ذوالفقار احسن)۔ بیسویں صدی کی اردو شاعری۔ کتب چار، 2012ء۔ نقوش رفتگاں، 2010ء۔ سعید صورتیں، 2009ء۔

اسلوب :

ان کی تحریروں کے سامنے مخالفین کے غباروں سے ہوا نکل جاتی اور حقیقت بے نقاب رہتی۔ سرگودھا سے لاہور جانے کے بعد بھی ڈاکٹر انور سدید نے ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر و فن پر تحقیقی مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ "اوراق" کا معیار بہتر سے بہتر بنانے میں ڈاکٹر انور سدید گہری دل چسپی کا مظاہرہ کرتے۔ پروفیسر سجاد نقوی اور ڈاکٹر وزیر آغا ان کے مشوروں کو بہت اہمیت دیتے۔ مجھے کئی ایسی محافل یاد ہیں جن میں ڈاکٹر وزیر آغا کو ڈاکٹر انور سدید کی صلاحیتوں کا برملا اظہار کرتے سنا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کہا کرتے تھے "جتنے زیادہ الفاظ انور سدید نے لکھے ہیں اتنے کسی اور کو لکھنے کا اعزاز حاصل نہیں ہوا۔" اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ڈاکٹر انور سدید لفظوں کی حرمت کے امین ہیں۔ مجید نظامی بھی ڈاکٹر انور سدید کی صلاحیتوں کے بہت معترف تھے۔ روزنامہ نوائے وقت میں ان کے مضامین، تبصرے اور کالم پڑھنے والے بھی انھیں داد دیے بغیر نہ رہتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ڈاکٹر انور سدید حق گوئی اور بے باکی کی چلتی پھرتی تصویر ہیں۔ وہ کلمۂ حق بلند کرنے میں کبھی مرعوب نہ ہوتے۔ استاد محترم ڈاکٹر خورشید رضوی نے ان کی حق گوئی اور بے باکی کے بارے میں لکھا ہے:

> "انور صاحب نے بے دھڑک بات کہنے کی جس جرأت کا اظہار کیا ہے، وہ خاص مشکل چیز ہے۔ ذاتی گفتگو میں انھوں نے خود کو بنیادی طور پر سادہ اور دیہاتی قرار دیا تھا جو چھپا کر بات کہنے اور اپنے حقیقی جذبات کو مخفی رکھنے پر قادر نہیں ہوتا۔ یہ بات ان کے حوالے سے بالکل درست ہے۔ وہ اپنی بنیادی سرشت اور فطرت کے اعتبار سے صاف گو آدمی ہیں جو اپنے دلی جذبات کے اظہار سے خود کو باز نہیں رکھ سکتا۔ انھوں نے اپنے نام کے ساتھ "سدید" کا جو

> اضافہ کیا ہے وہ بھی اس بنیادی رجحان کی نشاندہی کرتا ہے اور یہ لفظ انھوں نے قرآن حکیم سے اخذ کیا ہے اور جس آیت کریمہ سے لیا ہے وہ یہ ہے "قولوا قولا سدیدا" (سیدھی اور کھری بات کرو) اپنے قلمی نام کے طور پر اس لفظ کا انتخاب ان کی ابتدائی مذہبی تربیت اور دیانت دارانہ صاف گوئی کی خواہش کا پتہ دیتا ہے۔"

اردو ادب کی تحریکوں کی طرح ڈاکٹر انور سدید بھی اپنی ذات میں ادب کی ایک ایسی تحریک ہیں جن کے بغیر اردو تنقید، تاریخ ادب، انشائیہ اور افکار وزیر آغا کی ترویج مکمل نہیں سمجھے جاتے۔ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر وزیر آغا کا تعلق پھول اور خوشبو جیسا رہا۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی ساٹھ ویں سالگرہ کے موقع پر ڈاکٹر انور سدید نے خوب صورت کیک کے ساتھ پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب "وزیر آغا۔ ایک مطالعہ" بھی پیش کی۔ 18 مئی 1982ء کو منظر عام پر آنے والی یہ کتاب سات ابواب پر مشتمل ہے۔ تخلیقی زاویے — تجزیاتی زاویے — تنقیدی زاویے — شخصی زاویے — صحافتی زاویے — انتخاب — حاصل مطالعہ

جنوری 1989ء میں ڈاکٹر انور سدید نے اظہار عقیدت کا ایک اور مظاہرہ "شام کا سورج" مرتب کی۔ 678 صفحات پر مشتمل یہ کتاب مکتبہ فکر و خیال لاہور سے شائع ہوئی جس میں ڈاکٹر وزیر آغا کے فکر و فن اور مختلف کتابوں کے حوالے سے اہل علم و دانش کے بہت سے مضامین شامل ہیں۔ ادبی دنیا میں ایسے معرکے اور خلوص کی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں کہ جب ایک ہم عصر شاعر و ادیب دوسرے کی علمی و ادبی قدر و منزلت کا اعتراف کرے۔ اسے حق دوستی اور حق شاگردی کی انمول مثال کہا جا سکتا ہے۔ پاکستان کی ادبی دنیا میں ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کی دوستی ضرب المثل ہے۔ جس طرح سرگودھا کے شاہین فضائے بسیط سے گزرتے ہوئے پوری دنیا میں اپنی ہوا بازی اور شہبازی کا لوہا منوا چکے ہیں۔ اسی طرح شعبہ ادب سے سرگودھا کے شاہین صفت شعراء و ادباء نے سیرت نگاری، تنقید، انشائیہ، شاعری، اقبالیات، لسانیات، ادبیات، اخلاقیات، پاکستانیات، سیاسیات اور ساختیات کو دنیا کے کونے کونے میں پہنچایا ہے۔ معروف ادبی مجلہ ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر اظہر جاوید سے انور سدید کا گہرا تعلق رہا۔ اظہر جاوید کا کمال ہے کہ انھوں نے باصلاحیت افراد کو متعارف کروانے میں کبھی بخل سے کام نہ لیا۔ انھیں جو بھی نو آموز ملتا وہ اسے متعارف کروانے کی بھرپور کوشش کرتے۔ اظہر جاوید 4 جنوری 1938ء کو پیدا ہوئے اور 14 فروری 2012ء کو اپنی حیات مستعار جان آفریں کے سپرد کر دی۔ اظہر جاوید نے کم عمری میں ہی قرطاس و قلم سے رشتہ جوڑ لیا۔ سرگودھا اور لاہور کے درمیان ان کی شخصیت رابطہ لائن ثابت ہوئی۔ سرگودھا میں ہفت روزہ "ضرب مجاہد" اور ہفت روزہ "رفیق" کی ادارت کرتے رہے۔ شاعر شباب سید الطاف مشہدی کے ساتھ مل کر ہفت روزہ "خلوص" بڑے خلوص کے ساتھ نکالتے رہے۔ مختلف اخبارات و رسائل میں تجربہ کشید کرتے ہوئے انھوں نے 1969ء میں ماہنامہ "تخلیق" جاری کیا۔ اظہر جاوید نے اپنی زندگی کا آخری ماہنامہ "تخلیق" 2012ء کا پہلا شمارہ اپنے دست محبت سے دوستوں کو ارسال کیا، وہ جرأت مند قلم کار تھے۔ ان کی حسی لطافت کو سفیر محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ حسن اتفاق کہ عوام الناس 14 فروری کو یوم محبت کے طور پر مناتے ہیں اور اسی روز خلوص و محبت کا پھول اپنی لطافت دوستوں کے لیے چھوڑ گیا۔ انور سدید اور اظہر جاوید کا تعلق چولی دامن کا تھا۔ "اظہر جاوید نمبر" میں انور سدید نے "شمع محروم اظہر جاوید" کے نام سے مضمون لکھ کر اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے انتقال سے بزم دوستاں اجڑ گئی۔ مرزا ادیب، انور، اظفر سرحدی، ڈاکٹر وزیر آغا، جوہر نظامی، عبد الرشید اشک، غلام حسین قیصر، انور گوندل، پرویز بزمی، ریاض احمد شاد، شاکر کنڈانی، رفعت ترابی اور ایسے ہی اہل سخن کے ساتھ اظہر جاوید وابستہ رہے۔ صحافت، ادب

اور ادبی سیاست میں اظہر جاوید نے اپنے اصول وضع کر رکھے تھے۔ ان اصولوں کی پاس داری میں ڈاکٹر انور سدید اور اظہر جاوید کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انور سدید اور اظہر جاوید کی مشترکہ عادت خلوص بانٹنے میں مصروف رہی۔ آج دونوں ہم سے جدا ہیں لیکن ان کے ادبی نقوش زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے دنیا کے ان تمام ممالک میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا رنگ جمایا ہے جہاں جہاں اردو زبان بولی جاتی ہے یا سمجھی جاتی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ان کا پیچھا کرتے ہوئے، ان کی صلاحیتوں کے منظر اور پس منظر کی بوقلمونی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ ادبی سطح سے میرا ذاتی اغراض و مقاصد سے بالاتر ہو کر ڈاکٹر انور سدید نے اردو ادب کو عالمی سطح تک متعارف کروانے میں قابل ستائش اور قابل تقلید کام کیا۔

حلقۂ یاراں میں ان کے الفاظ پھول کی پتیوں کی صورت نظر آتے تھے لیکن ادبی مخالفین کے لیے ان کے لفظوں میں بارودی انداز محسوس ہوتا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید ادبی محسنین کو کبھی فراموش نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا جب 7 ستمبر 2010ء کو ہمیں داغ مفارقت دے گئے تو انور سدید بول اٹھے ''کاش! وزیر آغا کے بجائے میں چلا جاتا۔'' ادب دوستی اور احسان مندی کی ایسی مثالیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ 20 مارچ 2016ء کے بعد عالمی سطح پر انور سدید کی فکری جولانیوں کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا وہ نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکتا۔ ان کی ادبی خدمات ایک روشنی کی طرح ہیں اور یہ روشنی ہر سو پھیل رہی ہے۔ ڈاکٹر انور سدید ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک ادبی تحریک کا نام ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کا ایک زمانہ معترف ہے۔ 87 سال 3 ماہ اور 16 دن بالائے زمین رہنے کے بعد ادب کا یہ چراغ زیر زمیں روشن ہوا۔ ان کی رحلت کے ساتھ اردو ادب کا ایک باب بند ہو گیا۔ اب ان کی تخلیقات انھیں زندہ رکھنے کے لیے ''انوار ادب'' ہیں۔

◆◆◆

نیا سلسلہ دوستوں سے رابطے کا

نمبر شمار	نام قلمکار	فون نمبر	پتہ خط و کتابت
-1	اے۔ جی	0302-2704654	مین بازار 3، عثمان نگر، چوک غازی آباد، امام بارگاہ لاہور
-2	ڈاکٹر امجد پرویز	0300-4075789	A-25، شاد مان کالونی-1، لاہور
-3	فخر زمان	0321-4935528	C-178، ماڈل ٹاؤن، لاہور
-4	جلیل عالی	0300-5240087	سٹریٹ 16، چکلالہ اسکیم-3، راولپنڈی
-5	مرزا حامد بیگ	0300-4389515	225۔ ٹیپو بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

تجھ سا مگر کہوں جسے ایسا کوئی نہیں

مرزا احمد نور طاہر

شاعر، کالم نگار، افسانہ نگار، ادیب، محقق اور تبصرے و تجزیے کرنے والا 88 سالہ اردو ادب کا روشن ستارہ غروب ہو گیا جس سے اردو ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پُر کرنا ممکن تو شاید نہ ہو مگر بے حد مشکل ضرور ہے۔ "ماہنامہ تخلیق" لاہور نے ڈاکٹر انور سدید نمبر شائع کیا ہے اور سرورق پر دو گہرے دوستوں کے فوٹو انتہائی خوبصورتی کے ساتھ چھاپے ہیں اور مرنے کے بعد ان کو یکجا کر دکھایا ہے۔ سونان اظہر جاوید کا ڈاکٹر انور سدید خاص ایڈیشن شائع کرنا قابلِ صد ستائش کارنامہ ہے۔

میں جب بھی مرحوم و مغفور ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں سوچتا ہوں، لکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور ان کے بارے میں معتبر آرا کا مطالعہ کرتا ہوں تو عقل حیران ہوتی ہے۔ ہماری طرح مضافات میں پیدا ہونے والا جسے مسلسل تعلیمی اداروں میں زیادہ پڑھنا نصیب نہ ہوا اس نے اپنے لئے خود ہی ایک نئی راہ نکال لی اور سول انجینئر تک سکول سے سول انجینئر کا ڈپلوما حاصل کر کے محکمہ انہار میں سروس اختیار کر لی۔ جب روٹی روزی کا معقول بندوبست ہو گیا تو پھر انہوں نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ سروس دیانت داری سے کی اور فالتو وقت میں مسلسل امتحانات دیتے رہے اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ انور سدید ڈاکٹر انور سدید بن گئے۔ آنے والی نسل کے لئے یہ کشش کا سبب ہے۔ محنت پھل ضرور لاتی ہے۔ شاعری اور افسانہ نگاری تو انہوں نے شروع شروع میں ہی نہ صرف اختیار کر لی تھی بلکہ متعدد ادبی رسائل میں چھپنے بھی لگے مگر ڈاکٹریت کرنے تک کے سفر نے ان کے مطالعہ، مشاہدہ اور پرکھنے کی صلاحیت کو وسیع و عمیق کر دیا۔ نتیجہ کے طور پر جب ان کے تحقیقاتی مقالے اور تبصرے شائع ہونے شروع ہوئے تو ہر طرف ان کی شہرت کی دھوم مچ گئی۔ اس کے باوجود ان کی عاجزی اور انکساری کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنی ساری زندگی پانچ مرلہ کے مکان میں بسر کر دی۔ وفات سرگودھا کے ہسپتال میں ہوئی۔

کیا یہ معجزہ نہیں کہ اس قدر ریٹائرڈ سالی میں بھی وہ بہت زیادہ لکھتے تھے اور کئی کئی دن آرام نہ کرتے تھے۔ سال کے تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں مگر ایک سال انہوں نے چار سو سے زیادہ کتب و رسائل پر تبصروں کا ریکارڈ قائم کیا۔ اسی لئے کہا جاتا تھا کہ ڈاکٹر انور سدید سوتے کب ہیں اور کھاتے کب ہیں؟ بعض لوگ بڑھاپے کو وبالِ جان سمجھتے ہیں مگر صاحبِ نظر بڑھاپے کو اس انداز میں سوچتے ہیں بقول ڈاکٹر پروفیسر منصور جعفری:

میرے شعروں میں ہے انسان کے دل کی دھڑکن   فن بڑھاپے میں ہی کہتے ہیں جواں ہوتا ہے

انہوں نے ہزاروں کتابوں اور رسائل یا ان میں مضامین پر تبصرے کئے ہیں مگر کسی کی دل شکنی نہیں کی تو ان کی اپنی اکیاسی کے قریب تصنیفات ہیں جو اردو ادب کا خزینہ ہے مگر غرور کو انہوں نے پاس پھٹکنے بھی نہ دیا ورنہ تو

جس کو دیکھو وہی فرعون نظر آتا ہے   کیا میرے عہد کے لوگوں کو خدا یاد نہیں

"ماہنامہ الحمرا" لاہور کے سرخیل تھے اور جب میں نے چند سال قبل کالم نگاری چھوڑ کر اس جریدے میں شمولیت اختیار کی تو

انہیں اپنی کتابیں بھیجیں اور بعد ازاں تفصیلاً ان کے ادب سے مکمل تعارف کروایا اور جب فون کیا تو ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ پھر مسلسل ہر روز فون پر رابطہ رہا اور وہ میرے منتظر رہتے اور بعد میں مجھ پر لکھے گئے مضامین پر خوبصورت الفاظ و انداز میں رائے دیتے رہے جو میرے لئے اعزاز کی بات ہے۔ وہ ہمیشہ میری رہنمائی فرماتے رہے اور کتابوں کی نشان دہی کرتے رہے جو میں منگواتا رہا اور میرے لئے سرمایہ حیات ثابت ہوئیں۔

میں ماہنامہ "تخلیق" کے ساتھ بھی وابستہ ہوں اس لئے سونان اظہر جاوید کے بارے میں بتاتے رہتے تھے مگر خاص بات یہ کہ ڈاکٹر انور سدید کی ماہنامہ "تخلیق" کے بانی عظیم شاعر اور ہر دلعزیز شخصیت اظہر جاوید سے پکی یاری تھی۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ جب بھی تقریب ہو تو سونان اظہر جاوید آتے ہیں اور مجھے گود میں اٹھا کر کار تک لاتے ہیں اور اسی عزت و احترام کے ساتھ چھوڑ بھی جاتے ہیں۔

"ماہنامہ تخلیق" کے ڈاکٹر انور سدید نمبر میں معزز، مشہور و معروف ادیب و مورخ لکھاریوں بعد (کالم نگار) نے اتنا کچھ لکھا ہے کہ باقی تو کچھ بچا ہی نہیں۔ ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش نے کہا " لے گئی ہے ساری خوشبو چھین کر ٹھنڈی ہوا اور جناب لطیف قریشی امریکہ سے لکھتے ہیں "منافقوں کی دنیا میں ایک کھرا آدمی۔"

ماہنامہ تخلیق کے ایڈیٹر اور لکھاریوں نے ڈاکٹر انور سدید کو ایک سے بڑھ کر خوبصورت نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ یہ سب کریڈٹ ایڈیٹر ماہنامہ تخلیق جناب سونان اظہر جاوید کو جاتا ہے۔ خود سونان اظہر جاوید کا مضمون "کون ڈاکٹر انور سدید؟" خاصے کی چیز ہے۔ اس خاص نمبر کو شائع کرنے میں ایڈیٹر تخلیق سونان اظہر جاوید نے رات دن محنت کی اور آج اس ماہنامے کی سج دھج نرالی ہے۔ منفرد بات یہ ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں تمام تر چھوٹی بڑی معلومات ان کی کتب خصوصی نمبر میں شامل کی گئی ہیں۔ تمغہ امتیاز کے علاوہ بے شمار اعزازات ان کی جھولی میں پڑے مگر انکساری میں فرق نہ آیا اور نہ اپنے نام کے ساتھ یہ "لاحقے" لائے۔ ایڈیٹر ماہنامہ تخلیق نے نہ صرف ڈاکٹر انور سدید کو "تخلیق" کی تحریروں میں زندہ جاوید کر دیا بلکہ اپنے والد گرامی کے دوست، بھائی کو بھی زندہ جاوید کر دیا۔ ویلڈن سونان اظہر جاوید!

اب ڈاکٹر انور سدید سرگودھا کی سرزمین میں آسودہ خاک ہیں۔ بظاہر تو ہم سے بچھڑ گئے ہیں مگر کیا وہ بچھڑ چکے ہیں؟ انہیں ہرگز نہیں۔ وہ اپنی تصنیفات میں زندہ ہیں اور جدا ہونے کے باوجود وہ ہم سے جدا نہیں کیونکہ وہ ہماری سوچوں، خوابوں، خیالوں اور دل کی دھڑکنوں میں زندہ ہیں اور رہیں گے۔

◆◆◆

ترک محبت کا مشورہ دینا بہت آسان ہوتا ہے لیکن اس پر عمل درآمد کرنے سے پہلے انسان لوگوں کے دہکتے فرش پر ننگے پاؤں آن کھڑا ہوتا ہے۔ محبت سے بچتا اور بھاگو تو وہ تنہائی آپ کے تعاقب میں آتی ہے۔ تھک ہار کر کہیں بیٹھ جاؤ تو وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہے۔ اپنے دل میں اس کی قبر بناؤ تو ہر روز پہلے خود مرنا پڑتا ہے۔ (بانو قدسیہ)

ڈاکٹر انور سدید۔ چند باتیں

اے خیام

"روزِ قیامت میرے اعمال کی پرسش ہوگی تو میں اپنی ساری کتابیں اللہ میاں کے حضور پیش کروں گا اور کہوں گا یہی میرا نامۂ اعمال ہے۔"

"اور اگر اللہ میاں نے یہ نامۂ اعمال قبول نہ کیا تو؟"

"نہیں مرزا صاحب، اللہ میاں بدذوق نہیں ہیں۔ وہ کوئی متعصب اور تنگ نظر نقاد بھی نہیں جنھیں صرف اپنوں کی تحریریں ہی پسند آتی ہیں اور دوسروں کی تحریروں میں سو سو کیڑے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ میری عبادت قبول کر کے مجھے داخلِ بہشت ہونے کی اجازت دے دیں گے۔"

یہ مکالمہ ہے ڈاکٹر انور سدید کا میرزا ادیب سے۔ جس طرح میرزا ادیب سر سے پاؤں تک ادیب ہی ادیب تھے، ڈاکٹر انور سدید اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے باوجود ہمہ دم ادیب تھے۔ ادب ان کے لیے عبادت کا درجہ رکھتا تھا اور اسی لیے وہ اپنے نامۂ اعمال میں تحریر اپنی کتابیں پیش کرنے کا تصور رکھتے تھے۔

ڈاکٹر انور سدید نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا، تقریباً بیس سال کی عمر میں۔ لیکن پیشہ ورانہ تعلیم کے حصول کے سبب اس میں خلل پڑا۔ پھر اردو ادب کی محبت نے پیشہ ورانہ ڈگری سے ہٹ کر ایم۔اے کرنے کی طرف راغب کیا جس میں انھوں نے امتیازی کامیابی حاصل کی۔ پھر ڈاکٹریٹ کرنے کا ارادہ کیا اور پی ایچ ڈی کی ڈگری بھی حاصل کی۔ 4 دسمبر 1928ء کو سرگودھا ضلع کے چھوٹے سے شہر میانی میں پیدا ہونے والے محمد انوار الدین نے جب انور سدید کی شخصیت اختیار کی تو اپنے ابتدائی ادبی سفر میں افسانہ نگاری سے بہت آگے نکل گئے جب کہ ان کے افسانوں نے اس وقت کے انتہائی معیاری رسالوں "ادبِ لطیف" اور "ہمایوں" میں اپنے لیے جگہ بنا لی تھی۔ انھوں نے ایک انتہائی معتبر نقاد کی حیثیت سے خود کو اردو ادب میں زندہ جاوید کر دیا۔ انشائیے بھی لکھے اور انشائیے کی تنقید بھی لکھی۔ شاعری کی تو ایک نیا اور مختلف زاویہ نظر سامنے آیا۔ ہزاروں کی تعداد میں کتابوں پر تبصرے لکھے، سالہا سال تک ہر سال کا ادبی جائزہ لکھا۔ کئی اخباروں اور رسالوں مثلاً "نوائے وقت"، "تحریر"، "زندگی" کے ادارے میں شامل رہے، "قومی ڈائجسٹ" میں ایک طویل مدت تک مستقل لکھتے رہے۔ "اردو زبان" ان کی ادارت میں تقریباً اٹھارہ سالوں تک شائع ہوتا رہا۔ "اوراق" جیسے اعلیٰ معیار کے رسالے میں شریک مدیر رہے۔ وہ جو کچھ پڑھتے اس کے بارے میں ضرور لکھتے۔ ماہنامہ "الحمرا" میں وہ ان کتابوں پر تبصرے لکھتے جو ان کے مطالعے میں آتیں۔ "تخلیق" لاہور کے ہر شمارے میں ان کی تحریریں دیکھی جا سکتی ہیں۔ انھوں نے خاکہ نگاری بھی کی اور "قلم کے لوگ" جیسی تصنیف منظرِ عام پر آئی اور [illegible]۔ خاکہ نگاری کے فن پر تاریخی اور تنقیدی کتاب بھی لکھی۔ "دلی دور ہے" ان کا یادگار سفرنامہ ہے اور محض سفرنامہ ہی نہیں لکھا، "اردو ادب میں سفرنامہ" کے نام سے اس فن پر تاریخی اور تنقیدی کتاب بھی لکھ ڈالی۔ تحریف نگاری کی طرف آئے تو "دلاور

نگاریاں" اور "غالب کے نئے خطوط" جیسی کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ادبی تاریخ نگاری کی تو "اردو ادب کی مختصر تاریخ" لکھ ڈالی جس کے اب تک لاتعداد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ "اردو ادب کی تحریکیں" ان کی ایک لازوال کتاب ہے جس کے، میری معلومات کے مطابق، نو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید نے 80 سے زیادہ کتابیں تصنیف کیں، تمام کتابیں گہرے تنقیدی، تاریخی اور تحقیقی شعور کی حامل ہیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ کیا ایک شخص تن تنہا اتنا کام انفرادی طور پر کر سکتا ہے۔ یہ سوال اکثر میرے ذہن میں اٹھتا رہا۔ ایک ملاقات میں، میں نے اپنی اس حیرت کا اظہار کیا تو مجھے دیکھ کر مسکرائے، پھر بولے۔

"تمام ایام چالیس صفحے روزانہ پڑھنا اور پانچ صفحے روزانہ لکھنا میرا معمول ہے۔ میں نے اسے اپنی عادت بنالی ہے۔ فجر کے وقت اٹھتا ہوں اور میرے لیے لکھنے کا وقت وہی ہوتا ہے۔ رات میں پڑھتا ہوں۔ تم بھی یہی عادت اختیار کر لو تو سال میں صرف ایک افسانہ لکھنے پر اکتفا نہیں کرو گے۔"

ایک ملاقات میں، میں نے ان سے پوچھا کہ یہ جو ایک گروپ سے آپ کی چپقلش رہتی ہے تو آپ کو یہ وقت کا ضیاع نہیں لگتا، آپ کے پاس تو بہت کام ہیں کرنے کے لیے۔ کہنے لگے۔ "کوئی ہماری طرف پتھر پھینکے گا تو جواب تو دینا پڑے گا"۔

ظاہر ہے جب ان کی طرف کوئی پتھر پھینکتا تھا تو ان کا روایتی راجپوتی خون جوش تو مارتا ہوگا لیکن میں نے کبھی ان کی تحریر میں رقابت نہیں دیکھی۔

وہ "نوائے وقت" میں تبصرے اور کالم کافی طویل عرصے تک لکھتے رہے۔ ان کی کئی تحریریں ان دنوں ایسی شائع ہوئیں جنھوں نے پڑھنے والوں کو عجیب گومگوں کی کیفیت میں گرفتار کر دیا۔ ان تحریروں میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی تعریف و توصیف کے پل باندھے جاتے تھے اور قاسمی صاحب کے تئیں اپنی احسان مندی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید سے پھر ملاقات نہیں ہو سکی کہ اس کا جواز دریافت کرتا۔ لیکن سجاد نقوی صاحب ہمارے مخمصے تاڑ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ سجاد نقوی صاحب ضرور اس پر کچھ روشنی ڈال سکیں گے۔ انھوں نے جو بات بتائی اس نے ہمیں مزید حیرت زدہ کر دیا۔ کہنے لگے کہ یہ سب کچھ آپ غلط سمجھیں۔ ہوا یہ تھا کہ "نوائے وقت" کے مالکان کو قاسمی صاحب نے ایک خط لکھا تھا کہ انور سدید کو ملازمت سے نکال دیا جائے۔ وہ خط انور سدید صاحب کو دکھا دیا گیا تھا لیکن ان کی ملازمت وہاں برقرار رہی۔ البتہ شکر گزاری اور احسان مندی کے اظہار سے انھیں کوئی نہ روک سکا۔

فی زمانہ انور سدید جیسے لوگ کم پیدا ہوتے ہیں۔ وہ ہر لکھنے والے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ جب انھوں نے سال کا ادبی جائزہ لکھنا ترک کر دیا تو شفیق احمد شفیق نے یہ کام شروع کیا۔ انور سدید صاحب نے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی تھی۔ اپنے مضامین میں وہ لکھنے والوں کی بہت بڑی کھیپ کے نام لیا کرتے تھے۔ یہ ان کی حوصلہ افزائی کا طریقہ تھا۔ لوگ ان جیسے نقاد کی تحریر میں اپنا نام دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور ان کا حوصلہ بڑھتا تھا۔

تقریباً ساٹھ سالوں تک ڈاکٹر انور سدید کا سورج ادبی دنیا پر چمکتا دمکتا رہا اور 20 مارچ 2016ء کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ لیکن اپنی کتابوں کے ذریعہ جو روشنی انھوں نے پھیلائی ہے اس میں کبھی کمی نہیں آئے گی۔

●●●

یادِ رفتگاں

مرقعِ مہر و......وفا...... بانو قدسیہ!!

بشریٰ رحمٰن

داستان سرائے میں داخل ہوتے ہی اس نے مائیک میرے آگے کر دیا۔ اور بولا___ ''کیا آج داستان سرائے ویران ہو گئی ہے اپنے خیالات کا اظہار کریں۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر سارے ہجوم کی طرف دیکھا اور کہا۔ جس گھر سے وہ اٹھے اور بچے انسان اٹھ کر چلے جاتے ہیں، وہ گھر کبھی ویران نہیں ہوتا۔ اچھی اولاد اپنے ماں باپ کے گھروں کو اور روایات کو زندہ رکھتی ہیں___ اس گھر میں ادب نوازی کا جو کام ہوا ہے وہ اس داستان سرائے کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ویسے اس دنیا کو بھی تو سرائے ہی کہتے ہیں۔

سرائے دنیا سے کوچ کی جا ہر ایک کو خوف دم بدم ہے

اور روزانہ سینکڑوں لوگ اٹھ جاتے ہیں۔ تو کیا دنیا ویران ہو جاتی ہے؟ وہ تو آباد رہتی ہے___

اس میں کوئی شک نہیں کہ محترمہ بانو قدسیہ ایک عظیم ادیبہ تھیں۔ اردو ادب میں ان کا نام سنہری الفاظ میں لکھا رہے گا۔ اور آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کرتی رہیں گی۔ اصل بات یہ ہے کہ ادیب کتنا بھی قد آور یا جغادری کیوں نہ ہو۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ وہ بطور انسان کیسا تھا___

انسانیت کے جن اصولوں کا پرچار وہ اپنی تحریر میں کرتی تھیں اس کی جھلکیاں ان کی ذاتی زندگی میں نظر آتی تھیں یا محض سب دکھاوا تھا؟ اس لحاظ سے میں بانو آپا کو ایک اعلیٰ پائے اور اعلیٰ کردار کی حامل ایک عظیم خاتون کہتی ہوں۔ جتنا میں نے ان کو دیکھا اور پڑھا ہے___ ان کو گھر کے اندر اور محفلوں کے اندر دیکھا ہے۔ ان کے پاس بیٹھ کر ان کی باتیں سنی ہیں۔ ان کو جناب اشفاق احمد کے زیر سایہ محفلوں میں آتے دیکھا ہے___ ہماری نسل نے بانو قدسیہ کا ادب پڑھتے ہوئے آنکھ کھولی۔ ہمارے لئے وہ ہمارے بچپن میں بھی آئیڈیل تھیں___ پھر تو ان سے ملنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ واقعی آئیڈیل عورت بن جانے کے لئے ہی بھیجی گئی تھیں۔ اور جب میں اپنی شادی کے بعد ان سے ملی تو وہ ہمارے لئے ایک رول ماڈل ثابت ہوئیں۔

ان کی ادبی فتوحات پر بات کرنے کے لئے ملک میں بہت سے نقاد موجود ہیں۔ یونیورسٹیاں ان پر تحقیقی کام کرتی رہیں گی۔ انہوں نے ناول، افسانے، ڈرامے لکھے۔ ڈراموں میں ان کے لکھے ہوئے ڈائیلاگ زندگی کے بہت قریب ہوتے تھے۔ ہر ڈائیلاگ میں زندگی کا ایک فلسفہ بیان کرتی تھیں۔ ڈائیلاگ انہیں کہتے ہیں۔ جو ہمیشہ یاد رکھے جائیں۔ آج کل ٹی وی پر سینکڑوں ڈرامے چل رہے ہوتے ہیں۔ مگر کسی کا بھی کوئی ڈائیلاگ ایک محاورہ بن کے گلی نہیں جاتا نہ زبان زد عام ہوتا ہے۔ یہ خوبی اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے ڈراموں میں تھی۔

جس نے زندگی کو برتا ہوتا ہے۔ وہی لفظوں میں زندگی کو بیان کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

آپا قدسیہ کی سب سے بڑی خوبی جس کی میں قائل ہوں۔ وہ یہ ہے کہ ادب کی ایک بہت ہی قد آور اور بھرپور شخصیت کے ساتھ وہ رہتی تھیں۔ ایک زمانہ جناب اشفاق احمد کا مقلد تھا۔ اپنے گھر میں ہمیشہ وہی وہ چھائے نظر آتے تھے۔ آپا قدسیہ کو کوئی کمپلیکس نہیں تھا۔ آپا قدسیہ نے ان کے سامنے سے ہٹنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ وہ ان کے سایہ سایہ چلتی تھیں۔ جھکی جھکی رہتی تھیں۔ ان سے ایک انچ آگے نہیں ہوتی تھیں ___ دھیمے دھیمے لہجے میں بولتی تھیں۔ اپنی خاتونی حیثیت پر فخر کرتی تھیں۔ اگرچہ ادب کی دنیا میں ہمیشہ یہ بحث چلتی رہتی تھی کہ دونوں میں سے کون بڑا ادیب ہے۔ اس بحث کو ناپسند کرتی تھیں۔ حالانکہ قدرت نے انہیں ایک دریا سا اعتماد بخشا تھا۔ میاں بیوی ایک ہی پیشے میں ہوں تو مسابقت ضرور ہوتی ہے ___ پھر ہمارے ہاں مرد کو چونکہ ہر لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ اس لئے گھر کے اندر کی حکمرانی کو وہ اپنا پیدائشی استحقاق مانتا ہے۔ آپا قدسیہ نے گھر میں مسابقت و مطابقت کی فضا پیدا ہی نہیں ہونے دی ___ گھر میں وہ مشہور و معروف بانو قدسیہ بن کر نہیں رہتی تھیں۔ وہ ایک بیوی ہوتیں جو پتی ورتا بن کر شوہر کا حکم بجالاتی ہے۔ گھر کے سارے کام کرتی ہے۔ شوہر کی ہاں میں ہاں ملاتی ہے۔ اپنی تحریروں کو موضوع نہیں بناتی۔ کوئی تعریف کرے تو بات ٹال جاتی ہے ___ جہاں بانس کا جنگل ہوتا ہے وہاں کوئی اور پودا یا درخت اپنا قد کاٹھ نہیں نکال سکتا۔ مگر وہ بانس کے طویل قامت درخت کے پیچھے سے شاخ صندل کی طرح باہر نکل گئیں ___ اپنی خوشبو پھیلا دی یوں کہ خود بانس کو بھی پتہ نہ چلا ___

ادیب کتنا بھی عظیم الشان ہو، اگر اس کا اخلاق اچھا نہ ہو تو وہ انسانیت کی معراج پر نہیں پہنچ پاتا۔ غرور، تکبر، نخوت دوسروں سے نمایاں نظر آتا، دوسروں کو ہمیشہ اپنے سے ہیچ سمجھتا ادیب کو کوتاہ قد بنا دیتا ہے۔ جس طرح آج کل بعض ادیب اور شاعر خود اپنی خوبیوں میں رطب اللسان رہتے ہیں اور کسی کو اپنے مقابل کا نہیں مانتے۔ کئی مثالیں ہیں ہمارے سامنے۔ بانو قدسیہ اس بدعت سے پاک تھیں۔ وہ کبھی گفتگو میں یا بحث میں اپنے آپ کو بڑا ادیب نہیں کہتی تھیں۔ ان کے پاس بیٹھنے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ کسی چھوٹے بڑے کی برائی نہیں کرتی تھیں، نفی نہیں کرتی تھیں۔ ہر ایک کی تعریف کرتی تھیں۔ ہر ایک کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔

وہ ایک بہت ہی مہربان مہمان نواز خاتون تھیں۔ وہ اپنے گھر میں آئے ہر چھوٹے بڑے کی تواضع کرتی تھیں۔ کئی یتیموں بے سہاروں کے سر پر انہوں نے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ بناوٹ نہیں کرتی تھیں۔ سادگی میں ان کی کوئی مثال نہیں ہے۔ ہم سب عورتوں کو بناؤ سنگھار اور فیشن ایبل ملبوسات کا شوق ہوتا ہے۔ آپا قدسیہ کا وہی سادہ لباس تھا۔ سر پر دوپٹہ تھا۔ جوانی میں بھی میک اپ سے بے نیاز چہرہ تھا۔

میرے ساتھ ان کے تعلق خاطر کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ ویسے تو میں نے کالج کے زمانے میں ان کو پڑھا تھا۔ اور ان سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ مگر جب میری شادی ہوئی تو رحمن صاحب نے بتایا کہ وہ کئی بار ان کے گھر بھی رہے ہیں۔ جن دنوں ان میاں بیوی نے "داستان گو" رسالہ نکالا تھا۔ ان کا وہاں بہت آنا جانا تھا۔ یہ مجھے ان کی اولین شادی شدہ زندگی کی باتیں بتایا کرتے تھے۔ اور یہ بھی بتاتے تھے کہ لکھنے کے ساتھ ساتھ آپا قدسیہ گھر کا سارا کام کرتی تھیں۔

جب شادی کے بعد میرے میاں مجھے ان کے گھر لے گئے۔ تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور دعائیں دیں اور کہا تم ہماری بہو ہو ___ "میں نے کہا میں آپ کی بہو نہیں بلکہ آپ کی ایک ادنیٰ پرستار کے طور پر ملنے آئی ہوں ___

میرے گھر میں جو ادبی محفلیں ہوتی تھیں۔ ان میں بھی دونوں میاں بیوی شوق سے آتے تھے۔ اپنے افسانے بھی پڑھتے تھے۔

اور میرے پکائے ہوئے کھانوں کی بہت تعریف کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب اشفاق احمد اور محترمہ بانو قدسیہ ہمارے اسلاف اور خاندانی روایات کا چلتا پھرتا مرقع تھے۔ رواداری، وضع داری، مروت داری دونوں کا خلاصہ تھا۔

دونوں ہی بے مثال تھے۔ دونوں ہی باکمال تھے۔ ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے میرے میاں کا ان کے ہاں آنا جانا کم ہو گیا تھا۔ آپی قدسیہ جب کسی محفل میں ملتیں۔ یہ ضرور کہتیں۔

میرے نالائق پتر دا کیہ حال اے؟ (میرے نالائق بیٹے کا کیا حال ہے)

تو میں ہنس ہنس کر کہتی۔ اپنے رنگ میں مست ہیں۔

وہ کہتیں ___ بشریٰ تو اینوں ٹھیک نہیں کیتا۔ (بشریٰ تو نے اسے ٹھیک نہیں کیا)

میں ہنس کر کہتی۔ جسے آپ جیسی ماں ٹھیک نہیں کر سکی اسے کون ٹھیک کر سکتا ہے؟

اس پر وہ بھی ہنس پڑتیں۔ میرا ہاتھ ہاتھ میں لے کر چوم لیتیں اور کہتیں۔ ''جیندی رہو، جیوندی رہو'' مگر یہ کہنا نہ بھولتیں کہ اس نالائق سے کہو مجھے آ کر مل جائے۔

اشفاق احمد صاحب نے ساری دنیا کو محبت سے تسخیر کیا اور بانو قدسیہ ___ ''گرتو شمع کرے جو تسخیر یہ عالم سارا ___ کا مرقع بن گئیں'' مرد خواہ ادیب ہو خطیب ہو یا عام آدمی وہ عورت کی پوری کی پوری توجہ مانگتا ہے۔ مگر زبان ہلائے بغیر مانگنا چاہتا ہے۔ بہت سی شادیاں اس لئے ناکام ہو جاتی ہیں کہ عورت کو اس کی یہ ادا سمجھ میں نہیں آتی۔ یا اس کو اس خود غرضانہ عمل سمجھتی ہے ___

آپی قدسیہ نے اپنے بے شمار افسانوں، ناولوں اور ڈراموں میں مرد کی اس جبلت کی طرح طرح سے اظہار کیا ہے۔ اور خود بھی اس کی جیتی جاگتی تصویر تھیں۔ گھر سے نکلتے وقت خان صاحب کو کیا کیا یاد دلانا ہے۔ ان کی عینک، قلم اور کوٹ کب ساتھ لے کے چلنا ہے۔ یا کسی محفل میں انہیں کب احساس دلانا ہے کہ سردی بڑھ رہی ہے مفلر لپیٹ لیں۔ ان کو کوئی دوائی کب دینی ہے۔ ان کی پسند کے کھانے پکا کر کھلاتے ہیں۔ مہمانوں کے آ جانے سے خود ہی اٹھ جانا ہے۔ تو شمع میں لگ جانا ہے ___

جب وہ بات کر رہے ہوں تو چپ رہنا ہے۔ انہوں نے ٹوک دیا تو محسوس نہیں کرنا ہے۔

وہ ایک قسم کی خان صاحب کی روز مرہ ڈائری تھیں۔ جس کے اندر سب کچھ لکھا لکھایا مل جاتا ہے۔

میاں بیوی میں کئی باتوں پر اختلاف ہو جاتے ہیں۔ یہ سب نیچرل ہے۔ مگر وہ اپنا اختلاف بڑے دھیمے لہجے میں ریکارڈ کراتی تھیں۔ اور تقاضا نہیں کرتی تھیں۔

ادب برادری میں ہم ان کو ایک آئیڈیل کپل کہہ سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہ دونوں ہی اعلیٰ پائے کے ادیب تھے۔ دونوں ہی نے اپنا اپنا زمانہ پایا تھا۔ دونوں کے لاتعداد مداح تھے۔ پھر بھی آپی قدسیہ اپنا قد چھوٹا رکھتی تھیں۔ جو آج ہم سب کو بہت بڑا نظر آ رہا ہے۔

''داستان سرائے'' ___ میں ان کی محبتوں اور چاہتوں کی داستان ہر اینٹ پر لکھی رہے گی۔ انسان جب پردہ کر جاتے ہیں تو اینٹیں بولنے لگتی ہیں۔ مقالہ بولنے لگتے ہیں۔ کتابیں بولنے لگتی ہیں۔ صدیاں بولنے لگتی ہیں۔

تقو بھائی (اشفاق احمد) میں بھی یہ عادت تھی کہ وہ ہر چھوٹے بڑے کو خوش خلقی سے ملتے تھے۔ اور ان کی خوبیوں کو تلاش کر لیتے تھے۔ جس زمانے میں میرے گھر میں ''بزم ہم نفساں'' کی ادبی تنظیم کے اجلاس ہوتے تھے۔ تو دونوں میاں بیوی شوق سے آتے اور

باری باری اپنا افسانہ سناتے تھے۔ شفقت بھائی خاص طور پر میرے پکائے کھانوں کی تعریف کرتے تھے۔ میں اگر کسی محفل میں ان دونوں کو بیٹھا دیکھ لیتی۔ تو فوراً ان کے پاس جا بیٹھتی تھی۔ آپی تو فوراً کہتیں، بشریٰ تو پھر اکیلی آ گئی ہے۔ میرے نالائق بیٹے کا کیا حال ہے۔

جب شفقت بھائی کہتے۔ بشریٰ دیکھ لے، سسر ہمیشہ بہو سے محبت کرتا ہے اور ساس کو اپنے بیٹے کا ہی خیال آتا ہے۔ تو میرے پاس بیٹھی رہ آرام سے۔ اس پر ہم ایک فیملی کی طرح ہنستے اور باتیں کرتے تھے۔

ایک بار ایک محفل میں شفقت بھائی کی انگلی کا ناخن ادھڑ گیا۔ فوراً میری طرف دیکھ کر بولے___

گڑیا! تیرے پاس نیل کٹر ہے___؟

آپی بولیں۔ خاں صاحب کمال کرتے ہیں۔ اب وہ نیل کٹر پرس میں ڈال کر پھرتی ہے۔

شفقت بھائی بولے___ نہیں یہ بہت انتظاموں والی لڑکی ہے۔ میں نے اس کا گھر دیکھا ہے۔ اس کے پاس ضرور نیل کٹر ہوگا۔

میں نے کہا دیکھتی ہوں شفقت بھائی۔ اللہ میری لاج رکھنے والا ہے۔ میں نے ان کے سامنے پرس کی تلاشی لینی شروع کر دی۔

حسن اتفاق کچھ عرصہ پہلے میں امریکہ سے ایک چابیوں کا چھلا لائی تھی (Key Ring) اور اس کے ساتھ ایک ننھی سی قینچی اور منا سا نیل کٹر لگا ہوا تھا۔ جس پر میرا ابھی دھیان نہیں گیا تھا___ میں نے نکال کر انہیں دیا اور کہا شفقت بھائی! اللہ نے میری لاج رکھ لی۔

نیل کٹر پکڑ کے انہوں نے آپی قدسیہ کی طرف دیکھا اور کہا، دیکھا میں نہ کہتا تھا یہ بہت انتظاموں والی ہے۔

ان کے اتنی سی بات کہہ دینے سے میرے اندر ایک صدی کا حوصلہ بڑھ گیا___۔

وہ دونوں مختلف بھی نظر آتے اور مشترک بھی لگتے تھے___ کون کس سے سیکھ رہا ہے! پتہ نہیں چلتا تھا۔ مگر یاد رکھیں زیادہ وہ سیکھتا ہے جو پیچھے چلتا ہے اور جھک کے چلتا ہے۔

آپی بانو قدسیہ سراپا ہمارے اسلاف کی نمائندہ تھیں اور قوموں کے اعلیٰ اخلاق کی حامل تھیں___ وہ ایک ایسی روشنی تھیں جو جتنی زیادہ تقسیم ہوتی ہے اتنی زیادہ بڑھتی ہے۔

ہم ان کی یادوں پر پھول چڑھا رہے ہیں۔ وہ ایک نیک و پارسا بی بی تھیں___ وفا شعار خدمت گزار بیوی تھیں۔ بے مثال اور شفیق ماں تھیں۔ ایک مہمان نواز گھر گرہستن تھیں___ ہمدرد اور ہمدم نواز تھیں___

اس برصغیر کے اردو ادیبوں میں ایک نمایاں مقام رکھتی تھیں___ انہوں نے ایک بھرپور زندگی گزاری اپنی پذیرائی اپنی آنکھوں سے دیکھی___

باری تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اپنے سرتاج کے پہلو میں سکون و عافیت کے ساتھ اپنے جوار رحمت میں رکھے۔ آمین ثم آمین۔

عشق کچھ معشوق کے مرنے سے مر جاتا نہیں روح میں غم بن کے رہتا ہے مگر جاتا نہیں!

(اقبال)

◆◆◆

قدسیہ صوفی

ابصار عبدالعلی

2017ء کے آغاز میں ہی، 2017ء کا سب سے بڑا صدمہ اردو اور پنجابی ادب کے قارئین کو بانو آپا کی وفات کی صورت میں سہنا پڑا۔ یہ چند برسوں کا نہیں، صدیوں آگے کا روگ ہے۔ بانو قدسیہ اردو ادب کے صفِ اول کے ان چند ناول نگاروں میں ممتاز اور بہت زیادہ پڑھی اور پسند کی جانے والی مصنفہ ہیں جنھیں اردو ادب کی آبرو کہا جاتا ہے۔ ان کا ناول "راجہ گدھ" ہی ان کی پہچان تھیں ان کی کہانیاں، اور ریڈیو ٹیلی وژن ڈرامے بھی بہت مقبول ہوئے۔ یہ گراف ان کی وفات کے بعد مزید اوپر جائے گا۔ ہم رفتگان کی نسبتاً زیادہ قدر کرتے ہیں۔

1975ء کے دوران ریڈیو پاکستان کے مقبول پروگرام "ملاقات" میں مجھے ریڈیو آرکائیوز کے لئے بانو آپا کا ایک گھنٹہ دورانیے کا انٹرویو ریکارڈ کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ اس انٹرویو میں دیگر معاصرین کی آراء کے ساتھ ان کے نامور شوہر اشفاق احمد صاحب کی رائے بھی ریکارڈ کی گئی۔ میں نے اشفاق صاحب سے سوال پوچھا" آپ دونوں ہی ڈراما بھی لکھتے ہیں اور کہانیاں بھی۔ کون بہتر لکھتا ہے۔ آپ یا محترمہ بانو قدسیہ؟" اشفاق احمد، جو خود صاحب طرز کہانی کار ہیں اور انھیں اس کا زعم بھی تھا، بولے " قدسیہ میرے جیسے ڈرامے تو نہیں لکھ سکتی۔ ہاں کہانیاں مجھ سے بہتر لکھتی ہے۔ عورت ہے ناں۔" پھر کچھ رک کر بولے " عورت ہے ناں۔ عورت شک کرتی ہے اور شک سے اچھی کہانی جنم لیتی ہے۔" اشفاق صاحب کے اس تاثر پر بحث ہو سکتی ہے۔ اسے تسلیم یا رد بھی کیا جا سکتا ہے لیکن اس تاثر میں اشفاق صاحب کا بڑا اعتراف یہ واضح تھا کہ بانو قدسیہ، اشفاق احمد سے زیادہ اچھی کہانیاں لکھتی ہیں۔

بانو قدسیہ کی تمام تحریروں خصوصاً ان کے ڈراموں کی خاص بات یہ ہے کہ ان کے ڈراموں میں بھی ادبی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ ان کے کردار اپنی مٹی سے جنم لینے والے، اپنی دھرتی سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں لیکن وہ دنیا سے کٹے ہوئے بھی نہیں ہوتے۔ ان کی کہانیاں اور ڈراموں کے کردار، عملی تجربے سے گزرتے ہوئے آج کے عہد کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے ناولوں، کہانیوں اور ڈراموں کے مجموعوں کے ساتھ دیگر تصنیفات کی تعداد تقریباً 29 ہے۔ بانو قدسیہ کا اردو ادب کو عطا کردہ یہ وہ تخلیقی سرمایہ ہے جو ادب سے پیار اور کتاب سے دوستی رکھنے والوں کی توجہ کا مرکز اور ان کے ذوقِ مطالعہ کا تقاضا بنا رہے گا۔

بانو آپا میں ان کی زندگی کے دوسرے حصے کے بعد صوفی ازم کا رنگ جھلکنا شروع ہو گیا تھا۔ وہ درویش صفت سی ہو گئی تھیں۔ ان کا دھیمی اور دھیمی آواز میں محبت اور اپنائیت سے بات کرنے کا قرینہ، اپنوں اور غیروں کو ان کے قریب لے آتا تھا۔ بانو آپا کی تصنیف "مرد ابریشم" کے مرد درویش قدرت اللہ شہاب نے ان کو اور ان کے شوہر اشفاق احمد کو صوفیت کے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ جس کے بعد اشفاق صاحب نے گیسری رنگ کا کرتا پہننا شروع کر دیا اور داڑھی رکھ لی اور بانو آپا نے سر پر رکھا ہوا دوپٹے کا آنچل سر سے سرکنے نہیں دیا۔ اشفاق صاحب انہیں قدسیہ ہی کہا کرتے تھے۔ یہ طرزِ تخاطب بانو آپا سے احترام آمیز محبت کا حوالہ بنتا ہے۔ اشفاق صاحب اور بانو

آپا گزشتہ سے تاحال پیوستہ دو ایسی ہستیاں تھیں جو اکائی کی صورت 'داستان سرائے' میں بستی تھیں۔ اکثر معاملات میں ان کی سوچ بھی یک رنگی نظر آتی تھی۔ خارجی طور پر یہ کیفیت ان کی ہینڈ رائٹنگ میں جھلکتی تھی۔ دونوں کی ہینڈ رائٹنگ میں حیرت انگیز مماثلت تھی۔ اتنی کہ لاہور ٹیلی وژن پر اشفاق صاحب کے ڈرامے کا مسودہ آتا اور نام پر نظر نہ جائے تو دھوکہ سا ہو جاتا تھا۔

برسوں پہلے ہیر اور رانجھا کی شخصیات کا جو تاثر ذہن پر ہوتا ہے وہی تاثر لے کر جب میں جھنگ میں پہلی بار ہیر اور رانجھا کے مزار پر گیا تو میری سوچ کا تاج محل دھڑام سے زمین بوس ہو گیا تھا۔ ان کی قبروں کے کتبوں پر لکھا تھا مائی ہیر اور بابا رانجھا۔ مگر اب جب میں بابا اشفاق احمد اور مائی قدسیہ صوفی کی قبروں پر جاؤں گا تو مسمار شدہ تاج محل دوبارہ تعمیر ہو جائے گا۔ مجھے اس کا یقین ہے۔ سچی بات کرنے والے بابا اور مائی ہی ہوتے ہیں جیسے بابا اشفاق احمد اور مائی قدسیہ بانو۔

یہ 1977ء کی بات ہے۔ پاکستان نیشنل سنٹر نے میرے ٹیلی وژن اور ریڈیو ڈراموں کے مجموعے 'شہ رگ' کی پذیرائی کے لئے فیض احمد فیض کی صدارت میں ایک نشست کا اہتمام کیا۔ میں حیران تھا کہ اس نشست میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، وزیر آغا، میرزا ادیب اور جمیلہ ہاشمی جیسی نابغۂ روزگار ہستیاں تو بروقت آ گئیں۔ بانو آپا کو بھی اظہار خیال کرنا تھا۔ وہ نہیں آ سکیں لیکن انہوں نے اپنا عہد نبھایا اور اس طرح نبھایا کہ اپنا مقالہ عین وقت پر بھجوا دیا جسے ذوالفقار تابش نے پڑھ کر سنایا۔ دوسرے دن کوئی دس بجے کے قریب بانو آپا کا فون آیا۔ بولیں ''ابصار میں نہیں آ سکی۔ کیسے آتی اسری اللہ کے سفیر آ گئے تھے۔ لفظ 'عارف' کا مفہوم جاننا چاہتے تھے۔ وقت درکار تھا۔ تو میں کس طرح آتی۔'' میں نے فوراً ان کی بات کاٹی کہ ان کے منہ سے معذرت کا لفظ نہ سن سکوں۔ میں نے کہا بانو آپا آپ کو پتہ نہیں چلا۔ آپ تو آ گئی تھیں۔ آپ میرے گھر میرے بک شیلف کی کتابوں میں سب سے اوپر موجود ہیں۔ آپ کے مقالے کا شکریہ۔''

لفظ 'سرائے' عارضی قیام کی علامت ہے۔ بانو آپا اور اشفاق صاحب کے گھر کا نام 'داستان سرائے' ہے۔ یقیناً اس سرائے میں بانو آپا کا قیام عارضی تھا۔ یہ مدت 4 فروری 2017ء کو ختم ہو گئی۔ مگر ان کے تخلیق کردہ ادب کی مدت ختم نہیں ہوئی۔ وہ لامحدود ہے۔ یہ چند برسوں کا نہیں صدیوں آگے تک کا اعتبار ہے۔ یہ اعتبار قائم رہے گا۔

◆◆◆

اشفاق احمد

میں نے زندگی میں چند باتیں سیکھیں۔

- ○ ماں باپ کے علاوہ کوئی وفادار نہیں ۔۔۔
- ○ عزت صرف پیسے کی ہے انسان کی نہیں ۔۔۔
- ○ غریب کا کوئی دوست نہیں ہوتا ۔۔۔
- ○ انسان جس شخص کے لئے دل سے مخلص ہو وہ دھوکہ دیتا ہے ۔۔۔
- ○ لوگ اچھی سیرت کے بجائے اچھی صورت کو ترجیح دیتے ہیں ۔۔۔
- ○ ہم لوگوں سے جب تک لڑتے ہیں جب تک ہمیں ان سے پیار کی امید ہوتی ہے جس دن وہ امید ختم ہو جاتی ہے تو لڑنا بھی ختم ہو جاتا ہے۔

کوچۂ قاتل اور رخسانہ آرزو

طفیل اختر

''ضروری تھا کہ ہم دونوں طوافِ آرزو کرتے''

بخدا یہ مقام تشکر ہے کہ وہ اس کی پناہ میں چلی گئی۔ جس کے زیرِ سایہ اسے ایک دن جانا ہی تھا۔

12 جنوری کا دن، نہ جانے 14 جنوری کی شب۔ احاطہ درگاہ حضرت شاہ ابو المعالی (چوک دلی محمد روڈ) — جس سے ملحق خانوادۂ سجادہ نشینان دربار شاہ غلام محی الدین المعروف سید نور (فلمی مصنف و ہدایت کار) — جہاں رہائش پذیر ہونے سے رخسانہ نور نے اول و آخر انکار کیا تھا۔ مگر یہاں آ کر اور وہ کامل حضرت شاہ ابو المعالی کا اسے تا قیامت اپنی پناہ میں رکھنا ہے ایک شاہ نے نکاح کا انتقال مضطرب و بے قرار رکھا اور وہ یقیناً بڑے حضرت کو منظور نہ ہوا

میری اس تحریر کی اونچ نیچ، زیر و بم اور ناہمواری پڑھنے والوں کو بتائے گی کہ میری حالت اس وقت کیا ہے۔ میں ''تخلیق'' کے سوہان اظہر کو انکار نہیں کر سکا، ورنہ اس کام کے لئے پہلا ٹیلی فون مجھے ''سینما'' کے عمر خطاب خان کا موصول ہوا تھا ''طفیل اختر بھائی! مجھے رخسانہ سید نور کا مرثیہ چاہیے۔'' میں نے جواب دیا تھا ''عمر! ابھی ایک سطر لکھنے کی بھی خود میں سکت نہیں پاتا ہوں، ماہ دو ماہ بعد کوشش کروں گا۔'' 1974 کی بات ہے۔ میں نے گلبرگ مین مارکیٹ کے ''دھنک'' کے آفس میں اسے دیکھا تھا۔ وہ ایڈیٹر سرور سکھیرا سے ملنے آئی تھی۔ وہ دھان پان سی، بہت صاف شفاف، قمیص شلوار اور دوپٹے میں ملبوس۔

اس کے جانے کے بعد پتہ چلا کہ پنجابی یونیورسٹی میں ایم اے جرنلزم کی طالبہ ہے۔ توقیر ناصر اور حفیظ طاہر کی کولیگ۔ چند دن پہلے ایک فیچر کے سلسلے میں محمود احمد مودی (آج کل ایڈیٹر اخبار جہاں کراچی) اس سے ملے تھے اور اس کے اس شوق کے پیشِ نظر کہ وہ شعر کہتی ہے اور کبھی مصرعہ بھی سیدھا کر لیتی ہے، مودی میاں نے اسے ''دھنک'' آنے کی دعوت دی تھی۔

بعد ازاں دو مرتبہ وہ توقیر ناصر کی بائیک پر کوئی تحریر دینے آئی۔ اور ایک دن مدیر سلمی دھنک تا یونیورسٹی اپنی بائیک پر اسے چھوڑنے گیا تھا

''دھنک'' میں میرا شعبہ فلم اور ٹی وی کا تھا۔ توقیر ناصر ٹی وی میں ایکٹنگ شروع کر چکا ہوتا تو شاید میرے روم میں جھانکتا تو اس کے ہمراہ رخسانہ آرزو بھی جھانک لیتی اور مجھ سے اس کا تعارف ہو جاتا — لیکن نہیں ہوا

مگر پاک ٹی ہاؤس میں ندیم سلیمی اور ڈولز از عالم کی موجودگی میں وہ مجھ سے ملی، اچھی لگی۔ بلکہ بہن سی لگی۔ بالکل فرحت کی طرح۔ جو فلم رائٹر اور ڈائریکٹر حفیظ احمد کی زوجہ ہیں — اس کے لئے حفیظ احمد نے اچانک مجھ سے ایک دن پوچھا ''طفیل اختر! چند دن پہلے تم نے میرے ساتھ فرحت کو دیکھا تھا۔ وہ تمہیں کیسی لگی؟ میں نے یک لخت کہا'' وہ دیکھنے میں بالکل بہن لگی ہے۔'' حفیظ احمد نے اس سے شادی کر لی اور اگلے برسوں میں وہ دونوں چار بچوں کے والدین بنے۔

رخسانہ آرزو ایم اے کرکے ''جنگ'' میں فیچر رائٹر بن گئی۔ ہمراہ خالدہ یوسف تھی۔ جسے خواتین کا صفحہ ملا۔ خوب یاری ہوتی۔ پھر موقع ملنے پر رخسانہ آرزو نے ''پیماک'' کے شعبۂ اطلاعات میں فاروق ضمیر کی معاون کے طور پر بھی ملازمت کی۔ ہوٹل امبیسیڈر کی نیم چھت میں آفس تھا۔ جہاں میں رخسانہ آرزو سے ''محور'' کے لیے مضامین لینے بھی جاتا تھا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب لاہور کے رتن سینما میں جاوید فاضل کی ہدایات میں اور سید نور کی تحریر میں عزیز ''دولت'' ریلیز ہوئی۔ رخسانہ آرزو نے سید نور کو ٹیلی فون کیا ''شادی ہی اوبلیز اس شرط پر دیکھی ہے کہ اس کے باکس میں خالدہ یوسف اور میرے ساتھ آپ بھی ہوں گے۔''

بس ''آپ بھی ہوں گے'' نے کام کر دیا۔ بات دہلیز سے آگے بڑھ گئی۔ ترکس بلاک میں پانچ مرلہ کا گھر 404 خرید لیا گیا۔ اس میں فرنیچر سجایا۔ خفیہ طور پر شادی کا پروگرام بنا۔ مجھے لاعلم رکھا گیا۔ عرفان کھوسٹ نے اپنی دکان ''سلطانہ'' پر اچانک مجھ سے پوچھا ''خلیل بھائی! رخسانہ آرزو اور سید نور کی شادی پر بارات کے ساتھ چل رہے ہیں؟'' میں حیران ہوا ''رخسانہ اور نور کی شادی؟'' عرفان کھوسٹ نے کاؤنٹر کی دراز سے شادی کا کارڈ نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں چپ کا چپ رہ گیا۔ اس امر کا تھوڑا سا ملال ہوا۔ پھر سوچا ان دونوں کا معاملہ ہے۔ مجھے ملول ہونے کا کیا حق ہے۔

میں بنیادی طور پر عبدالکریم روڈ کا رہائشی رہا۔ عرفان کھوسٹ راوی پارک سے اور سید نور عقب درگاہ حضرت شاہ ابوالمعالی میں مقیم۔ عرفان کھوسٹ نے تعلیم بھی جاری رکھی اور اپنے والد کے شعبے میں ریڈیو، اسٹیج، ٹی وی اور فلم سے وابستہ رہے۔ سید نور نے صحافت کا راستہ اختیار کیا۔ روزنامہ ''کوہستان'' میں بچوں کے صفحے کی انچارج سلمیٰ تبسم کے معاون کے طور پر کام کیا۔ والد میکلوڈ روڈ کے ایک سینما میں بکنگ کلرک تھے۔ بیٹا سکرپٹ رائٹر بننا چاہتے تھے۔ انہیں دیکھ کر سید نور کا بھی رتن ہوٹل میں ''مت کدہ'' اور ''فلم ڈائجسٹ'' سے منسلک ہو کر نگار خانوں میں رپورٹنگ کے لیے جانے لگے۔ باری سٹوڈیوز کے ایک فلور میں افتخار ملک کی پنجابی فلم ''دھلیاں'' کے سیٹ پر سید نور کو تالی کھینچتے ہوئے دیکھا۔ وہ افتخار ملک کو اسسٹ کر رہا تھا۔ سال 1961 تھا — آج (2017) سے 56 سال پہلے۔ یاسمین، اسلم پرویز، ناصرہ، زینت اور منور ظریف نے اس میں کام کیا تھا۔

سید نور بعد ازاں جاوید فاضل وغیرہ کے ساتھ ایس سلیمان کا بھی معاون رہا۔ پھر پی این آر کی ''سوسائٹی گرل'' 1976ء میں سکرپٹ لکھا اور بحیثیت مصنف آگے بڑھنے لگا۔ ''دھلیاں'' اور ''سوسائٹی گرل'' کا درمیانی فاصلہ 15 سال کا ہے۔ پھر وہ 1976ء سے 2017 تک اکتالیس سال بنتے ہیں۔ جن میں درجنوں فلمیں ہیں۔ رخسانہ اور صائمہ ہیں۔ پروڈکشن ہاؤس ہے۔ سٹوڈیوز ہیں۔ ڈسٹری بیوشن آفس ہے۔ دولت اور شہرت ہے۔

مجھے ''دادا'' کا لقب رخسانہ نور نے ہی بخشا تھا۔ اسی عہد میں مرحوم سلمیٰ بھی مجھے ''بابا'' کہنے لگا تھا۔ جو رائج نہ ہو سکا۔ دادا جب سے اب تک مقبول ہے۔ انڈیا میں ہدایت کار کمل رائے کو کمل دا، اور اشوک کمار کو دادا منی کہا جاتا ہے۔ جبکہ پاکستان میں ہدایت کار نظر الاسلام دادا کہلاتے تھے۔ فلمی جرنلزم میں میرے نام کے ساتھ ''دادا'' رخسانہ نور کی ایجاد ہے۔

باتوں باتوں میں ایک سہ پہر گھر 404۔ ترکس بلاک میں رخسانہ نور نے مجھ سے کہا ''دادا! میرا پہلا شعری مجموعہ ''الہام'' چھپ

پینٹنگ میں چند سال سے اشاعت کے لئے تیار پڑا ہے۔ مگر وہ ادارہ اب پینٹنگ معطل کر چکا ہے۔ مسودہ کاپیاں اور رخت یزدانی کا ڈیزائن کردہ سرورق مظفر محمد علی کے دسترس میں ہے۔ انہیں کچھ ادائیگی کر کے یہ چیزیں لے لیتے ہیں اور خود چھاپ لیتے ہیں۔ 500 کی تعداد پہ کتنا خرچ اٹھے گا؟" میں نے اندازاً سے بتایا "پچیس ہزار کے لگ بھگ۔" وہ سوچ میں پڑ گئی۔ خرچ اخراجات کے معاملے میں وہ بہت سوچ بچار کی عادی تھی۔ میں نے کہا "رخسانہ! آدھے آدھے خرچ کر لیتے ہیں۔ آدھی کتاب تم لے لینا آدھی میں بانٹ لوں گا۔" وہ مان گئی اور اسی وقت بارہ ہزار پانچ سو کا چیک کاٹ کر اس نے مجھے دے دیا۔

دوسرے دن میں مظفر محمد علی سے ملا۔ "الہام" کی مسودہ کاپیاں اور سرورق اس سے لے لیا۔ سرورق بلیک اینڈ وائٹ تھا۔ رخسانہ نور کو دکھا کر پوچھا "ٹائٹل میں رنگ نہیں بھریں گے؟" اس نے کہا "سفید سے اچھا کیا ہے۔ مجھے یہی پسند ہے۔" رخسانہ کی ہر پسند کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے چند دنوں میں "الہام" چھاپ لی اور ایک روز 404 میں پہنچا دی۔ سید نور گھر میں موجود تھے۔ ورق گردانی کر کے بولے "رخسانہ! میرے نام انتساب کہاں گیا؟"

"اوہ! شادی میں بھول گئی۔" اس جواب سے سید نور تھوڑے سے خفا ہوئے اور اپنے کام سے باہر نکل گئے۔"

"واہ! مجھ سے یہ کیا ہو گیا؟"

"واقعی نور سے تم نے کہا تھا؟"

ہاں آن امیر اختیاں ہے میں نے کہا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"یار اب کر لیتے ہیں۔" میں نے رخسانہ کو تسلی دی۔ اور دوسرے ہی روز پہلا ورق دوبارہ چھپوا کر کتاب میں چسپاں کروا دیا گیا۔

"اپنے شوہر کی نذر زندگی، چاہت، وفا اور یہ "الہام" بھی!"

رخسانہ نور کی ضد پوری کرتے ہوئے میں نے انہی دنوں میں "الہام" کے دو فلیپ گلزار اور امجد اسلام امجد سے لکھوا لیے۔ بیک ٹائٹل پر رخسانہ نور کی زندگی کی سب سے اعلیٰ تصویر بلیک اینڈ وائٹ میں تعارفی تحریر کے ساتھ شائع کی تھی۔

"رخسانہ نور۔۔۔ تخلیق اور تعمیر کے دو جہانوں میں پلی ہوئی مگر دونوں میدانوں میں ڈلی ہوئی ایک فنکارہ تھی۔ وہ شروع سے، جب وہ پنجاب یونیورسٹی میں پڑھتی تھی اور "دستک" میں لکھتی تھی تو اپنے ہونے (بلکہ دوسروں سے الگ ہونے) کا احساس دلاتی تھی۔ وہ آج بھی ویسی ہی تھی۔ "پتنگ" میں تصویر زلفی صفت میں کہانیاں اور نغمات ۔۔۔ اور تم تنہا اداس لمحوں میں شاعری ۔۔۔ مختصر، چند سطری مگر بے حد ذاتی خیالات کی پکڑ، جکڑ باکمال۔ جیسے برسات کی بھیگی راتوں میں جگنوؤں یا بہار کی صبحوں کو تتلیوں کو ہاتھوں کے حصار میں لینے کی کوشش۔ اس پر کبھی حیرت ہوتی ہے، کبھی اس پر ترس آتا ہے۔ وہ بے بسی کے سمندر میں اپنے ہونے اور نہ ہونے کے بیچ کبھی ڈوبتی، کبھی ابھرتی ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کسی دن اسے مجبور کروں "گریا تیری ذات کا تعارف تیری شاعری سے بڑھ کر کوئی نہیں۔"

رخسانہ کا خاندانی نام رخسانہ ثروت صدیقی تھا۔ صدیقی وہ اپنے والد کی نسبت سے لگاتی تھی۔ سیالکوٹ کے کالج میں جب وہ ایف اے بی اے کی طالبہ تھی تو شعر کہنے لگی۔ وہیں پاکستان نیشنل سنٹر میں کبھی کبھار ادبی تقریب میں جانے لگی اور ایک شام اپنی ایک غزل اس نے ڈائریکٹر نیشنل سنٹر جناب اطہر احمد آذر کو بغرض اصلاح دکھائی۔ انہوں نے نوک پلک درست کر دی اور پوچھا "تم تخلص کیا کرتی ہو؟" اس نے شرما کر کہا "میں نام لکھتی ہوں۔" آذر صاحب نے مشورہ دیا "ایک مصرعے میں تم نے لفظ آرزو باندھا ہے۔ کیوں نہ شاعری

میں تم رخسانہ آرزو لکھا کرو۔"

اس نے اس دن سے مشورہ مان لیا اور نہ صرف شعری تخلیقات میں بلکہ نثر نگاری میں بھی رخسانہ آرزو بن کر اخبار و جرائد میں شائع ہونے لگی۔ یہاں تک کہ جس لمحہ اس نے نور کی آرزو کی تو پھر تادمِ مرگ اس کی آرزو صرف سید نور ہی رہے۔ "الہام" اکتوبر 1997 کو شائع ہوئی تھی۔ صفحات 128 اور اشاعتی ادارہ پرائم ٹائم پبلی کیشنز لاہور۔ دیباچہ حفیظ طاہر نے تحریر کیا۔ جس میں رخسانہ نور کو مشورہ دیا کہ اگر وہ زندگی کے باقی طلاطم لمحوں سے کچھ وقت مسلسل نکالے تو آپ اور ہم بہت جلد ایک منجھی ہوئی شاعرہ سے ملیں گے۔"

رخسانہ نور نے پہلے مجموعہ کی اشاعت پر ہی مجھ سے کہہ دیا تھا کہ "دادا! میرا دوسرا مجموعہ "الہام کے بعد" کی فائل تیار ہے۔ اس کے لئے بھی تیار ہو جائیے۔" مگر 1997 تا 2016 تک اس کی اشاعت ممکن نہ ہوئی۔ جبکہ "الہام" کے دو ایڈیشن مختلف رنگوں کے ٹائٹل کے ساتھ اردو بازار میں چھپ کر فروخت ہوتے رہے۔ نیز اس کی اردو، پنجابی فلمی شاعری کی کتاب "آ پیار دل میں جگا" میری سانجھ سے شائع کر دی۔ جسے وہ اپنے ساتھ امریکہ بھی لے گئی۔ "الہام" کے ضمن میں ایک بات یہ بھی ہوئی کہ پرائم ٹائم پبلی کیشنز نے اپنے حصے کی دو سو پچاس کاپیاں تین سال میں فروخت کیں۔ جبکہ رخسانہ نور پشاور کی ایک تقریب میں مہمان خصوصی تھی تو وہاں کے شہریوں نے از راہ محبت و احترام "الہام" کی ایک کاپی پچیس ہزار میں نیلام کر کے یہ رقم رخسانہ نور کو پیش کر دی۔

رخسانہ نور نہ صرف مناسب حد تک سوشل تھی، بلکہ بھرپور گھرداری کے ساتھ ساتھ فیلی پروڈکشن ہاؤس کو بھی اپنے دیور سید قاسم کے تعاون سے چلاتی رہی۔ کارپوریشن اور پرائیویٹ ٹی وی چینل پر بھی خود کو مصروف کر لیتی تھی۔ اس کی بچیوں نور العین، قرۃ العین اور ماہ نور نے اچھی تعلیم حاصل کی اور بیٹا بھی توجہ سے حصول علم میں مصروف تھا۔ اس کی خواہش محمد شاہ تجمل نور کو باپ کی طرح بابا جی کے میدان میں آگے بڑھنے اور نام کمانے کی تھی۔

رخسانہ نور زندگی سے تو تنگ جنگ اٹھاون سال لڑی۔ وہ 17 نومبر 1957 کو پیدا ہوئی تھی۔ اس کا انتقال 12 جنوری 2017 کو ہوا۔

زندگی کے آخری چند سال اس نے سرطان سے لڑتے ہوئے بھی گزارے۔ وہ زخمی ہو کر گرتی تھی اور پھر حوصلہ کر کے سیدھی ہو جاتی تھی۔ گویا اس کی لڑائی اسے مسلسل نڈھال نہیں کر سکتی تھی۔ اس طرح ہم اسے بزدل نہیں کہہ سکتے۔ اس کے انتقال پر مجھے فون کر کے اے آر گل نے سوال کیا "دادا! رخسانہ نور کو کیا روگ تھا؟" میں نے بتایا "اس کے تن کو سرطان تھا اور من کو سوتن کا جلاپا تھا۔ پتہ نہیں اس کی جان کس روگ نے لی؟ میرا ذاتی خیال ہے کہ محبت سے بڑھ کر جان لیوا کوئی جذبہ نہیں۔ یہی ہیر کی جان لیتا ہے۔ اسی نے صاحباں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اسی نے سسی کو تھلوں کی ریت چٹائی، یہی سوہنی کو چناب کی طوفانی لہروں میں بہا کر لے گیا اور اسی نے دنیا سے رخسانہ نور کو چھین لیا۔ شکست آرزو تو ہونی ہی تھی اسے یہ مشورہ کب قبول ہوتا تھا۔ جا اور محبت کر لیکن!

◆◆◆

محبت کا سبق بارش سے سیکھو جو پھولوں کے ساتھ ساتھ کانٹوں پر بھی برستی ہے۔ (بانو قدسیہ)

اعزاز احمد آذر ـ یادیں اور باتیں

افتخار مجاز

میری دانست میں کوئی ایسی بڑی شخصیت، جس سے آپ متاثر بھی ہوں اور جس کی قربت اور سایۂ محبت بھی آپ کو میسر ہو، اس کے بارے میں کچھ کہنا اور لکھنا بے حد مشکل ہوتا ہے کیونکہ ایک تو قربت کے باعث اس شخصیت کی زندگی کے کئی پہلو اور کئی شیڈز SHADES لکھنے والے کی نظروں سے اسی طرح اوجھل ہوتے ہیں جیسے کسی بلند و بالا عمارت کے بالکل نیچے اور ساتھ کھڑے ہو کر اس کا درست طور پر نظارہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسے مکمل طور پر دیکھنے کے لئے دیکھنے والے کو چند قدم، پیچھے یا ذرا فاصلے تک سرکنا پڑتا ہے۔ تبھی اس عمارت کا اوپر سے نیچے تک بھرپور جائزہ لیا اور اسے دیکھا جا سکتا ہے اور دوسرے محبت اور جذبات میں مغلوب ہو کر لکھنے والا اپنی ممدوح شخصیت کے خال و خد اور روز و شب کو درست طور پر دیکھ ہی نہیں پاتا، جیسے شاعر نے کہا (مگر ذرا تصرف سے عرض کروں گا)

تو نے کچھ بھی تو دیکھنے نہ دیا — اے مری چشمِ تر "محبت" میں

اپنے بھائی اعزاز احمد آذر کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے میں متذکرہ بالا صورت حال سے ہی دوچار ہوں۔ مجھے ان سے قربت، محبت اور عقیدت بھی بہت تھی اور میں ان کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے شدتِ جذبات سے بھی مغلوب ہوں۔ شعر و ادب بلکہ فنونِ لطیفہ، براڈکاسٹنگ، کوپیئرنگ، ڈرامہ نگاری، گفتگو اور طرزِ خطابت (وغیرہ وغیرہ) میں وہ کیسے تھے اور کس مقام پر فائز تھے؟ اس تناظر میں، میں خود کو کسی سند کے اجراء کا اہل نہیں پاتا۔ اپنے نظریات، عقائد، سوچ، فکر و عمل، رویے، عمومی سماجی و معاشرتی زندگی میں وہ کیسے تھے میں آپ سے صرف یہ شیئر کروں گا۔ مرحوم دانشور اور سینئر شاعر جناب شہزاد احمد نے آذر بھائی کی شاعری پہ لکھتے ہوئے انہیں محبت کے نرم، کومل اور لطیف جذبوں کا شاعر قرار دیا تھا۔ شہزاد صاحب جیسے قد آور لکھنے والے کی یہ رائے یقیناً مستند اور صائب ہے۔ لیکن میری دانست میں شہزاد صاحب نے آذر بھائی کو جن جذبوں اور جذبات کا ترجمان شاعر قرار دیا ہے وہ ان کے تخلیقی اور شاعرانہ اظہار کی محض ایک جہت ہے۔ ان کی شاعری میں جہاں مذہب (حقیقی دینِ اسلام) اہل اللہ، اہلِ بیت، ہم آہنگی اور عشقِ رسول کی آئینہ داری کے عناصر ملتے ہیں وہیں مٹی کی محبت کے ساتھ ساتھ اسلامی تہذیب کی بازیافت بھی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری (غزلوں، نظموں اور نعتوں) میں بھی اخلاقی اور روحانی قدروں کے مٹنے کا ماتم شدت سے کیا ہے۔ اس تناظر میں ان کا لہجہ اور انداز بیان بہت تلخ اور الگ نظر آتا ہے۔ اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے میں ان کی شاعری سے کئی مثالیں پیش کر سکتا ہوں۔ مگر آپ محض ایسی چند حوالوں کو دیکھیے ناقدین کے مطابق ان کی شاعری میں احتجاج، ہنگامیت، ہیجان، بغاوت عروج پر دکھائی دیتی ہے۔

ظلم کی جب تک رہے گی حکمرانی دیس میں — کم رہے گی جب تک اپنی شادمانی دیس میں
جب تلک ہے اک قیامت زندگی دیس میں — گونجتی ہر دم رہے گی ہر طرف اپنی پکار

شاہِ مرداں شیرِ یزداں قوتِ پروردگار ۔۔۔ لافتیٰ الا علی لا سیف الا ذوالفقار

شہر میں تقسیم دستاروں کی تھی کل ہر طرف ۔۔۔ یہ کیا میں نے کہ اپنا سر بچا کر لے گیا

وہ ساری خوشیاں جو اُس نے چاہیں اُٹھا کے جھولی میں اپنی رکھ لیں ۔۔۔ ہمارے حصے میں عذر آئے جواز آئے اصول آئے!!

پسے ہوئے محروم طبقوں کے لیے اُن کی آواز بن کر رہنگ انداز میں اظہار ان کی شاعری کے ابتدائی دنوں سے ہی واضح ہو جاتا ہے۔ یہاں میں ان کی شاعری، مزاج اور رویے کے حوالے سے کچھ دلچسپ واقعات آپ کی نذر کروں گا۔ جس سے آپ کو ان کی شاعری عمومی زندگی اور شخصیت و کردار کے ساتھ ساتھ فکر و سوچ کے انداز کا بھی اندازہ ہوگا۔ یہ غالباً سات/1965 کی بات ہے جب اُن کی عمر 22/23 برس کے قریب تھی تاہم ایک پسماندہ علاقے شاہدرہ میں ان کی پہچان ایک پڑھے لکھے نوجوان اور شاعر کے طور پر ہو چکی تھی۔ اس وقت میری عمر 12/13 برس تھی اور میں شاہدرہ کے ایک مقامی سکول میں چھٹی جماعت کا طالب علم تھا۔ ہمارے والد گرامی علاقہ کی مسجد کے بانی اور مسجد کمیٹی کے صدر تھے۔ ایک روز روایت کے مطابق عشاء کی نماز کے بعد مسجد کے سامنے واقع میدان میں مذہبی تبلیغی جلسہ تھا۔ جس میں اُس عہد کے ممتاز علماء صاحبزادہ فیض الحسن، مولانا محمد عمر اچھروی، مولانا محمد بخش مسلم اور پیر کبیر علی شاہ سمیت بہت سی دیگر شخصیات بھی مدعو تھیں۔ جلسہ اپنے پورے عروج پر تھا کہ اس دوران سٹیج سے آذر بھائی کو نظم پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ آذر بھائی بگلے ڈون پر آئے اور اپنے مخصوص انداز میں گرج اور دھنک لہجے میں پنجابی زبان میں ایک نظم پڑھنا شروع کی۔ جس کا مجھے صرف ایک ہی شعر یاد رہ گیا ہے۔

تینوں کُن تک وسیا کیوں لگیں او عزوروں دیا بارا ۔۔۔ ویلے تے میری روز کے نے گئی جس دا کیا دھارا

باقی اشعار بھی اسی مضمون کے تھے۔ ابھی انہوں نے دو تین اشعار ہی پڑھے تھے کہ سٹیج پر متمکن علماء کا ضبط اور برداشت جواب دے گیا اور ایک ساتھ کئی علماء کی آوازیں بلند ہوئیں "روکو، روکو، بند کرو اس کو یہ رب سے شکوہ کر کے کفر کر رہا ہے" اور پھر انہیں (آذر بھائی کو) کافر اور ملحد کا سرٹیفکیٹ دیتے ہوئے سٹیج سے نیچے اتار دیا گیا۔ آذر بھائی کی نظم اور اس کے نفسِ مضمون کو جس طرح سمجھے بغیر ان کی تضحیک کی گئی، اُس سے وہ دل برداشتہ نہیں ہوئے بلکہ اس رویے اور واقعہ نے ان کے نظریات، عقائد، سوچ اور فکر کو پوری شدت کے ساتھ مہمیز عطا کی اور ان کی شاعری میں محروم طبقوں اور پسے ہوئے لوگوں کی بے بسی اور کسمپرسی پر احتجاج کا رنگ اور نمایاں ہوتا گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے متذکرہ واقعہ کے اگلے روز مقامی علماء کا ایک دس بارہ رکنی وفد ہمارے گھر والد صاحب سے شکوہ اور شکایت کے لیے آیا، جن کی گفتگو کا مرکزی نقطہ اور استدلال یہ تھا کہ یہ (آذر بھائی) اقبال (علامہ محمد) کی راہ پر چلتے ہوئے رب سے شکوہ کر کے کفر کا اظہار کر رہا ہے۔ رب سے یوں گستاخانہ (خدانخواستہ اور نقلِ کفر کفر نباشد) خطاب کر کے دائرہ اسلام سے خارج ہو رہا ہے۔ اور ایسے لوگ واجب القتل ہوتے ہیں لہٰذا اسے روکیے، سمجھائیے۔ جیسے بھی شاعر اللہ کی ناپسندیدہ مخلوق ہے بالخصوص، ذاتی بالحق کے حامل (بعض) علماء کے ایسے رویوں اور واقعات سے تذکرے سے بھری پڑی ہے تاہم واجب القتل کا عندیہ دینے والے علماء نے یہ کبھی نہ دیکھا کہ یہی شاعر جسے وہ دائرہ اسلام سے خارج اور پتہ نہیں کس کس حوالے سے معتوب قرار دے رہے تھے، وہ جب حضور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لکھتا ہے تو کہتا ہے کہ:

نعت لکھاں تے لکھاں میں کی آقا — حرف حرف اتے قلم رکے جاندی!!
تیری نعت دا جشنوں آغاز ہوندا — میرے فن دی حد اوتھے مک جاندی!!

اس سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ شاہدرہ ہی میں اس وقت پیش آیا، جب علاقہ کی ایک ممتاز سماجی شخصیت میاں حمید علی مرحوم نے اپنے فارم ہاؤس "دیوگاراں" میں غریب، نادار اور مستحق افراد کی امداد کے لئے ایک بہت بڑی تقریب برپا کر رکھی تھی یہ صدر جنرل محمد ایوب خان کا عہد تھا، وفاقی وزیر محمود ہارون، فضل الٰہی چوہدری کنونشن مسلم لیگ کے صدر اور میاں غلام قادر (مسلم لیگی راہنما اور وزیر تعلیم شجاع الرحمن کے دادا اور جب لاہور کے میئر میاں شجاع الرحمن کے والد) مہمانان خصوصی کے طور پر مدعو تھے آذر بھائی کو یہاں بھی ایک نظم پڑھنے کی دعوت دی گئی۔ انہوں نے تقریب کے موضوع اور اس کے مقصد کو ملحوظ رکھتے ہوئے نظم شروع کی، جو حضرت علامہ اقبال کو مخاطب کرتے ہوئے کچھ یوں شروع ہوتی ہے۔

اے خالق آزاد ریاست کے مصور — آ دیکھ حقیقت ہے بھلا تیرا تصور
لیکن جو تیری آنکھ بھی نم ہو تو نہ کہنا — اور خواب کی تعبیر سے غم ہو تو نہ کہنا
آ دیکھ تیرے خواب نے کیا رنگ جمایا — آ دیکھ جدا جسم سے ہوتے ہوئے پایا
آزاد ریاست کے مکینوں کو ذرا دیکھ — اور بٹتی ہوئی جرم ضعیفی کی سزا دیکھ

ادھر آذر بھائی اپنے عجیب والہانہ انداز اور کرب آمیز لہجے میں نظم پڑھ رہے تھے ادھر صدر ایوب خان کے لائے ہوئے جشن عشرہ ترقی منائے جانے کے دنوں میں سٹیج پر تلملا رہے تھے، بے چینی سے کرسیوں پر پہلو بدل رہے تھے جب آذر بھائی ان اشعار پر پہنچے۔

مرقد سے پرے تیرے وہ بازار سجا ہے — افلاس جہاں کوڑیوں کے مول بکا ہے
بیٹھی وہ دریچے میں ہے اک حوا کی بیٹی — تذلیل پہ مجبور ہے تقدیر کی بیٹی
سمجھ کے یہ سائے ہیں خرافات کا منظر — بھرپور طمانچہ ہے یہ تہذیب کے منہ پر
مفلس کا تو جیون ہے یہاں قابل تعزیر — محنت کے بھی پاؤں میں ہے سرمائے کی زنجیر
اے شاعر مشرق! یہ تیرے خواب کی تعبیر

تو سٹیج پر بیٹھے زعماء سے مزید برداشت نہ ہو سکا، اور کچھ تقریباً ایک ہی وقت میں آذر بھائی پر گرجنے اور برسنے لگے تقریب کے منتظم میاں حمید علی نے آگے بڑھ کر آذر بھائی سے تقریباً مائیک چھین لیا۔ مجھے یاد آ رہا ہے کہ مذکورہ تقریب میں میاں نواز شریف وزیر اعظم پاکستان کے مشیر اور سپیشل اسسٹنٹ ڈاکٹر آصف کرمانی کے والد سید احمد سعید کرمانی بھی موجود تھے جو غالباً ان دنوں وزیر خزانہ یا وزیر اطلاعات و نشریات مغربی پاکستان میں تھے۔ بہر طور یہاں ان حکومتی زعماء نے جب اپنی تقاریر کیں تو بطور خاص آذر بھائی اور ان کی نظم کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں ایسا گمراہ باغی اور نہ جانے کیا کیا قرار دیا جو خود تو بغاوت کے راستے پر چل ہی رہا ہے، اپنے ارد گرد کے نوجوانوں کو بھی بگاڑ اور معاشرے کو خراب کر رہا ہے۔

اسی تقریب میں ہونے والی بدمزگی کے باعث اس گمراہ باغی اور خودسر نوجوان شاعر اعزاز احمد آذر کا داخلہ تقریبات میں تقریباً

بند کر دیا گیا تاہم اس دوران 1965ء کی پاک بھارت جنگ کا آغاز ہو گیا، پوری قوم یکجا ہو گئی، شاعروں، ادیبوں کے قلم بھی دشمن کے خلاف برسرِپیکار ہو گئے۔ اس موقع پر آذر بھائی نے پنجابی زبان میں بھی ایک بہت ہی جذبات انگیز، خوبصورت، من کو موہ لینے والی نظم ''شہید دی بھین'' کہی یہ نظم سات بہنوں کے اکلوتے کنوارے، غیر شادی شدہ بھائی کی بہن کے ان جذبات کی آئینہ دار اور عکاس ہے جو اس کی شادی اور بھابھی کی آمد کے رنگین سپنے دیکھ رہی ہے مگر جنگ کے باعث اس کے فوجی بھائی کو محاذِ جنگ سے بلاوا آ جاتا ہے اور پھر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر محاذ پر چلا جاتا ہے، جہاں داد شجاعت دیتے ہوئے وہ وطن پر قربان ہو جاتا ہے انسانی جذبوں سے معمور یہ نظم اتنی جذباتی تھی کہ خود آذر بھائی اسے پڑھتے ہوئے آبدیدہ ہو جاتے اور سامعین پر رقت طاری ہو جاتی، سسکیاں آہوں میں بدل جاتیں، بہن کہتی ہے۔

توں ڈولیاں بھین نوں چھڈ کے کدی اج بھرا نہیں کر دے — اج میں تے اینہ وی چاہندی پئی کدی شہید نہیں مر دے

تیرے ہال میں گلاں کر دی تیری ساہنے رکھ تصویر — میں اپے وی تیری بھین آں توں اپے وی میرا ویر

میں تے خوش حال میریا ویرا کدوں پائی آں مین وین — میتوں ایہہ فخر کجھ گھٹ اے میں اک شہید دی بھین

آذر بھائی کی یہ نظم اتنی مقبول اور پسند ہوئی کہ افواجِ پاکستان کی طرف سے محاذِ جنگ پر لے جائے جانے والے ادیبوں، شاعروں کے وفد میں آذر بھائی بھی ہمیشہ شامل رہے، مختلف شہروں میں جشن بسنت اور بعد ازاں یوم دفاع کے سلسلے میں منائی جانے والی تقریبات میں آذر بھائی کو یہی نظم سنانے کے لیے بلایا جاتا رہا۔ اب اسی نظم کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ ملاحظہ کیجئے، 6 ستمبر 1966 کو پہلے یوم دفاع کے سلسلے میں لاہور میں ایک تقریب ہوئی جس میں ایوب خان کے وزیر محمود ہارون مہمانِ خصوصی تھے، یہاں آذر بھائی سمیت دو دوسرے شعراء، منیر کاظمی (اے راہِ حق کے شہیدو ــــ) اور ڈاکٹر رشید انور (جنگ کھیڈ نہیں ہوندی زنانیاں دی) کو میڈلز دیے گئے، آذر بھائی جب مہمانِ خصوصی محمود ہارون سے اپنا اعزاز وصول کرنے سٹیج پر گئے تو انہوں نے آذر بھائی کو پہچانتے ہوئے کہا، کیا تم وہی پنجابی شاعر نہیں ہو....؟''

میں نے اس مضمون اور ان سطور کے آغاز میں تذکرہ کیا تھا کہ میں یہاں صرف آذر بھائی کی شخصیت، کردار، رویے، مزاج اور سوچ و نظریات کے حوالے سے بات کروں گا۔ اب اسی تناظر میں معروف دانشور، ماہر تعلیم، ادیب اور سابق ڈائریکٹر جنرل نیشنل بک فاؤنڈیشن ڈاکٹر انوار احمد کا بیان کردہ یہ واقعہ ملاحظہ کیجئے۔ یہ عہد ضیاء الحق کا قصہ ہے کہ مارشل لاء ـــ حکومتی جبر اور سختیاں اپنے عروج پر تھیں آذر بھائی تب پاکستان نیشنل سنٹر ملتان میں نئے نئے تعینات ہوئے تھے ان دنوں ریڈیو ٹیلی ویژن سے ایک اعلان نشر ہوا کرتا تھا کہ ـــ اسلام آباد میں اذان کا وقت ہو گیا ہے دوسرے شہروں کے رہنے والے اپنے اپنے مقامی وقت کے مطابق نماز ادا کریں۔ ڈاکٹر انوار احمد نے بتایا کہ مجھے معلوم ہوا کہ ایک نوجوان شاعر ادیب اعزاز احمد آذر ملتان نیشنل سنٹر میں ڈائریکٹر کے طور پر چارج لے چکا ہے۔ ارادہ تھا کہ کسی روز ملنے جاؤں گا۔ مگر مصروفیات اور دوسری ترجیحات آڑے آتی رہیں، ایک روز ایک صاحب نے بتایا کہ وہ گزشتہ روز نیشنل سنٹر کی تقریب میں گئے، جہاں ڈائریکٹر اعزاز احمد آذر نے ان جملوں کے ساتھ تقریب کا آغاز کیا، حاضرین، ملتان نیشنل سنٹر میں خوشامد کا وقت ہو گیا ہے باقی شہروں کے رہنے والے اپنے اپنے مقامی وقت کے مطابق خوشامد کریں، انوار احمد کہتے ہیں کہ میرا یہ سننا تھا کہ اسی لمحہ اس نوجوان کی

زیارت کو پہنچ گیا۔ معروف ادیب اور افسانہ نگار میجر غلام نبی اعوان انہی دنوں ملتان میں مارشل لاء ڈیوٹی پر تھے، وہ بتاتے ہیں کہ جب آذر بھائی سے شناسائی بھی نہ تھی۔ آذر صاحب کے خلاف مارشل لاء ملتان ڈویژن کے دفاتر میں مسلسل درخواستیں آ رہی تھیں، جو مجھے مارک ہوتی تھیں ایک روز ازخود انکوائری میں فائل بغل میں دبائے ان کی انکوائری کے لیے نشتر میڈیکل کالج جا پہنچا۔ حسن اتفاق ملاحظہ ہو اس وقت مشاعرہ میں کوئی تقریب ہو رہی تھی جس کی کمپیئرنگ اعزاز احمد آذر کر رہے تھے، میں خاموشی سے پچھلی نشستوں پر بیٹھ گیا۔ آذر صاحب جس طرح بیٹھے تھے انداز، درست زبان و بیان، عمدہ گفتگو اور خوبصورت لہجے میں ـــــ تقریب کو آگے بڑھا رہے تھے، میرے دل میں فوری طور پر ان کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو گیا، لیکن منصبی فرائض تو مجھے بہرطور ادا کرنے تھے، چنانچہ میں نے بہت دیانت، احتیاط اور سنجیدگی سے تمام معاملات کی انکوائری کی، کئی مرتبہ انہیں مارشل لاء ہیڈکوارٹر پیشی کے لیے بلایا، جبکہ ایک مرتبہ ملتان زون کے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تاجا جنرل اعجاز عظیم کے روبرو بھی انہیں پیش ہونا پڑا۔

وہ بھی آذر صاحب کی شخصیت، علمی فکری گفتگو اور انداز سے بے حد متاثر ہوئے، جس کا عملی اظہار انہوں نے یوں کیا کہ جب صدر ضیاء الحق ملتان میں بلدیاتی نمائندوں اور سماجی شخصیات کے کنونشن سے خطاب کے لیے آئے تو کمشنر ملتان سعید مہدی کے توسط سے انہوں نے ہی آذر بھائی کو جلسہ کی کمپیئرنگ کے لیے مدعو کیا اس جلسہ کی کمپیئرنگ کے حوالے سے خود آذر بھائی نے بھی اپنی یادوں کے جھلے وہ منظر کھا لکھتے ہیں آج بھی یادوں کے چلمن سے انہیں بہت دلچسپ واقعات لکھے ہیں تاہم انہیں یہاں دہرانے کا مقام و موقع نہیں۔

اعزاز بھائی مجھ سے دس سال بڑے تھے، میں نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی ہے اور حافظے میں ان کے حوالے سے جو کچھ محفوظ پاتا ہوں اس تناظر میں مجھے وہ لمحہ وصال تک ہمیشہ منفرد اور باعث اعزاز ہی نظر آئے، علم و ادب کا پیکر، محفلوں میں گندھے ہوئے اعزاز بھائی عجیب من موہنی، دل فریب شخصیت کے حامل کمال کے داستان گو بھی تھے فنون لطیفہ کا وہ کون شعبہ ہے جہاں وہ جا ہو بن کر نہیں چمکے مگر آپ میرے پاس ان کی یادوں اور یادوں میں بہنے والے آنسوؤں کے سوا کچھ بھی تو نہیں، ایک واقعہ میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں، مختصراً آپ کی نذر پھر سے کر رہا ہوں۔ دیکھیے وہ کتنا عظیم محبت کرنے والا بھائی اور انسان تھا!!!

1982 کی بات ہے آبا جی کا انتقال ہو گیا تو میں دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا ایسے میں آذر بھائی نے مجھے سینے سے لگایا، سر پر ہاتھ رکھا اور کہا، پگلے! تم کیوں روتے ہو باپ تو ہمارا مرا ہے تمہارا باپ تو تیرے پاس کھڑا ہے آخر میں آذر بھائی کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے اور مجھے اجازت دیجیے۔

پھولوں کے زخم کانٹوں کے نشتر سمیٹ لے ۔۔۔ دنیا سے موت کے بھی منظر سمیٹ لے

مجھ کو اہتمام سے کوئی بھی اگر کام نہ ہو ۔۔۔ پھر تو کچھ اور ہو آذر بھی میرا نام نہ ہو

◆◆◆

ایک ہزار قابل انسان مر جانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ایک "احمق" کے صاحب اختیار ہو جانے سے ہوتا ہے۔
(مولانا جلال الدین رومی)

جشن قتیل شفائی اور میں نیازمند

اظہر جاوید

دبئی کا ٹریڈ سنٹر اور جشن قتیل شفائی کا منظر — دمکتے چہروں اور مہکتے قہقہوں سے ہال بھرا ہوا ہے — دو تین ہزار خواتین و حضرات کرسیوں پر براجمان جبکہ سینکڑوں لوگ دیواروں کے ساتھ لگے کھڑے ہیں — سٹیج پر شاعروں کا پر شکوہ مجمع — ایک کونے میں سلیم جعفری اپنے پاکستانی ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے — فوٹو گرافر تصویریں لینے کو جب ویڈیو کیمرے حرکت میں آنے کو بے قرار — سامعین گوش بر آواز اور شعرا اپنی بیاضوں اور کاغذوں پرزوں کو سنبھالنے میں مصروف — عجب سماں ہے — آوازیں ہیں مگر شور نہیں — اضطراب ہے مگر کوئی گڑبڑ نہیں — وقت چل رہا ہے، لیکن لگتا ہے اسی سال کے اندر رک گیا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک اہل قلم وہاں موجود ہے — صحافی ہیں — حضر ہیں — ابلاغ کے سارے ذرائع ہیں۔ آڈیو ویڈیو کی آنکھیں پوری طرح تیار ہیں، ایک ایک لمحہ قید کیا جا رہا ہے مگر اس سارے ماحول کی جو شان ہے، جو کیفیت ہے اور جو خوشبو ہے اسے نہ قلم گرفت میں لا سکتے ہیں نہ ابلاغ کا کوئی اور ذریعہ قابو کر سکتا ہے۔ سلیم جعفری اس سے پہلے دسیوں تقریبات منعقد کر چکے ہیں، قتیل شفائی کے ساتھ سینکڑوں ایسی شامیں اور راتیں منائی گئی ہیں، مگر آج تو وہ سلیم جعفری کے لفظوں میں برات کے دولہا ہیں — جو خوشی قتیل شفائی کے نیازمندوں کے چہروں پر کھلی ہوئی ہے اور جس مہک خود ان کی آنکھوں میں ہے وہ حرف دیتی ہے — اسے لفظوں میں سمویا ہی نہیں جا سکتا — سلیم جعفری لفظوں کے جادوگر ہیں — قتیل شفائی قادر الکلام شاعر ہیں — وہ بھی اگر کوشش کریں تو اس کیفیت کو، اس کیف کو، اس سرشاری کو لفظوں کا جامہ نہیں پہنا سکتے — یہ محسوسات کی گھڑیاں تھیں — لطف میں ڈوبے رہنے کے پل تھے — ان سطروں میں اس جشن کا جتنا احوال بیان ہوگا، اسے پڑھنے والے اپنے اپنے جذبات کے ساتھ دس یا بیس سے ضرب دے لیں تو شاید کچھ حق ادا ہو جائے۔

اردو زبان کے ممتاز شاعر قتیل شفائی کے جشن کی تقریب کا دبئی میں اہتمام تھا۔ 28 مئی کی شام اس کے لئے مخصوص تھی اور پاک و ہند کے نامور شاعر شرکت کے لئے مدعو کر لئے گئے تھے — مگر یہ ایک شام تک یا ایک رات تک محدود جشن نہیں تھا — یہ 4 جون تک چلا — اس آخری دن دبئی میں گلوکارہ اقبال بانو کی محفل موسیقی تھی مگر آج کی رات سلیم جعفری پھر اعلان کر رہے تھے کہ یہ تقریب بھی دراصل جشن قتیل شفائی ہی کی ایک کڑی ہے — آج بھی دبئی کا ٹریڈ سنٹر ہی مرکز تھا — اور جشن قتیل کی خبریں اتنی عام ہو چکی تھیں کہ قتیل شفائی کا سب سے چھوٹا بیٹا نوید قتیل جو معروف گلوکار ہے اور جس کے دو کیسٹ ای ایم آئی اور شالیمار والے ریلیز کر چکے ہیں، اقبال بانو سے پہلے قتیل کا کلام سنا کر دلوں میں اترتا جا رہا تھا — گویا آج بھی دھڑکنوں میں قتیل شفائی ہی کے نام کی لرزش تھی۔

ایک زمانہ تھا کہ دبئی یا متحدہ عرب امارات کا نام دولت کے حوالے سے پہچانا جاتا تھا — اب یہ ادب و ثقافت کی پہچان ہے۔ اور جس طرح پاکستان کی کرکٹ ٹیم کی فتوحات میں سے عمران خان کا نام خارج نہیں کیا جا سکتا، اسی طرح وہاں کی ادبی، شعری اور ثقافتی

تقریبات کا ذکر آتے ہی ایک ہی نام کوزے کی طرح ابھرتا ہے اور وہ ہے سلیم جعفری۔ عمران خان سے اس کی مماثلت یوں بھی ہے کہ جس طرح کرکٹ گراؤنڈ میں عمران آخری گیند تک لڑ کر فتح دبوچ لیتا ہے مگر اس کے چہرے پر ایک پل کو بھی تفکر یا پریشانی کی سلوٹیں نہیں ابھرتیں اسی طرح سلیم جعفری جب کوئی تقریب برپا کرتا ہے۔ جشن کا اہتمام کرتا ہے تو رات کے آٹھ بجے سے لے کر صبح کے چار بجے تک اس کی آنکھوں میں تازگی، اس کے چہرے پر شگفتگی اور اس کے لہجے میں برجستگی رقصاں رہتی ہے۔ ہزاروں لوگوں کے ہجوم کو سنبھالنا نازک مزاج شاعروں کی ناز برداری کرنا اور شہر کی بڑی بڑی شخصیات کو ان کے مرتبے کے مطابق خوش آمدید کہنا اور پھر کسی ایک کو بھی شکایت کا موقع نہ دینا۔ یہ سب کوئی معمولی کام نہیں۔

کہا جاتا ہے، صرف پاک و ہند ہی نہیں، جہاں جہاں اردو زبان پہنچی ہے وہاں وہاں قتیل شفائی کا نام اور کلام پہنچا ہے۔ ایسے مقبول شاعر کا جشن ہو تو سماں ہی عجیب ہوتا ہے۔ سلیم جعفری نے ہندوستان سے جگن ناتھ آزاد، خمار بارہ بنکوی، کیلاش بہاری طرز، والی آسی، نور اندوری، رئیس رامپوری، حبیب ہاشمی، خواجہ جواں حیدرآبادی، نواز دیوبندی اور منظر بھوپالی کو بلایا ہے اور پاکستان سے امید فاضلی، پیرزادہ قاسم، پروین روحیلہ، اظہر جاوید، انور شعور، سحاب قزلباش، سورج نرائن اور صابر ظفر مدعو کئے گئے۔ مقامی شاعروں میں سے صرف دو ہیں۔ وہ بھی شاید پاسنگ کے لئے۔ تسلیم عابدی اور شہود جاوید۔ اردو اکادمی دہلی کے سیکرٹری اشتیاق عابدی خاص طور پر اس تقریب میں شرکت کے لئے آتے ہیں اور اپنے ساتھ اکادمی کی کتابوں کا تحفہ سلیم جعفری کے لئے لاتے ہیں۔ اور ان سے سب سے ہٹ کر ایک اور شخصیت ہے جو قتیل شفائی کی دوستی کا بھرم رکھنے اور اپنی اردو نوازی کا ثبوت دینے کے لئے اپنی سو مصروفیات چھوڑ کر آئی ہے۔ یہ شخصیت ہے ممتاز اداکار، فلم ساز، ہدایت کار اور ممبر پارلیمنٹ جناب سنیل دت۔ آنے سے ایک روز پہلے وہ ایک معمولی سے حادثے کا شکار بھی ہوگئے۔ غسل خانے میں پھسل جانے سے ان کی ران کے پٹھے کھنچ گئے تھے۔ چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ مگر ان کا قتیل شفائی اور سلیم جعفری سے وعدہ تھا۔ وہ پہنچے اور تقریب میں نہایت خوبصورت خطاب بھی کیا، ایسا خطاب جس میں نظموں جیسی خوبصورتی اور غزلوں کی سی نغمگی ہوتی ہے۔ انہوں نے اسی بات کو تقویت دی جو ابتدا میں قتیل شفائی نے کی تھی کہ ایسی تقریبات سے جہاں دونوں ملکوں کے لوگوں میں بھائی چارہ اور محبت بڑھے گی وہیں ہماری سرحدیں مضبوط تر ہوں گی۔ سنیل دت نے شستہ اردو میں شگفتہ باتیں کیں۔ ابتدا میں سلیم جعفری نے بتایا سنیل دت نے عمران خان کے کینسر ہسپتال کے لئے یہ بھی چیلنج کی ہے کہ وہ امرتسر سے پیدل چل کر لاہور تک آئیں گے اور راستے میں جھولی پھیلا کر چندہ مانگتے آئیں گے اور وہ سب کچھ اس کینسر ہسپتال کی نذر کر دیں گے۔ سلیم جعفری شاعر نہیں مگر اسے ان معنوں میں "شاعر گر" کہا جا سکتا ہے کہ جب وہ کسی شاعر کو کلام سنانے کے لئے بلاتا ہے تو اس کا تعارف اتنے سچے تلے انداز میں اور اس بے ساختگی سے کرواتا ہے کہ نہ صرف شاعر کا اپنا اعتماد بڑھتا ہے بلکہ سامعین میں اس کے شعر کا اعتبار بھی جم جاتا ہے۔ دبئی کا ٹریڈ سنٹر شاید دبئی کی سب سے بلند عمارت ہے اور اس کا ہال انتہائی وسیع۔ ہال کی مناسبت سے سٹیج بھی انتہائی طویل و عریض اور اس پر بیٹھنے والے شاعروں کا روایتی ٹھاٹھ۔ گاؤ تکیے لگے ہوئے، سفید چادریں بچھی ہوئیں اور مائیک سجے ہوئے۔ سٹیج کے پیچھے ایک مختصر سی انتظار گاہ۔ جہاں سب شاعر بیٹھے ہیں۔ ایک ایک شاعر کا نام پکارا جاتا ہے وہ تالیوں کی گونج میں سٹیج پر "جلوہ فگن" ہوتا ہے۔ اب سٹیج سیکرٹری سلیم جعفری، شاعروں اور سامعین کے درمیان زیادہ "حائل" نہیں رہنے دیتا۔ جگمگاتے ہوئے یہ لمحے جو مشاعروں کی روایت کو مستحکم کرتے ہیں۔

صدرِ مشاعرہ جگن ناتھ آزاد قرار پاتے ہیں اور سلیم جعفری شاعروں اور سامعین دونوں کو یقین دلاتے ہیں کہ ایسی زندہ جاوید شعری محفلوں میں تقدیم و تاخیر کا زیادہ نوٹس نہ لیا جائے۔ کہیں بھول چوک ہو جائے تو اسے درگزر کریں اور شعر کے بانکپن کو سراہیں۔

قتیل شفائی کچھ گفتگو کرتے ہیں۔ دبئی میں قائم ہونے والے جشن کی روایات کا ذکر کرتے ہیں۔ سلیم جعفری کی کوششوں اور محنتوں کو سراہتے ہیں اپنے ساتھی شعرا اور سامعین کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور ایک نہایت سچا اور جذباتی سا جملہ کہتے ہیں کہ آج بے مثال تقریب اور اس جشن دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے، جیسے میری شاعری کا پچاس سالہ سفر مکمل ہو گیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد قتیل شفائی کی شعری ریاضت، عظمت، شہرت اور ان کی محنت اور محبت کی تعریف کرتے ہیں۔ پھر مشاعرے کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے، اور ہر شاعر کے ساتھ اور درمیان میں جو کچھ سلیم جعفری کہتا جا رہا ہے، اگر اس سب کو رقم کیا جانے لگے، تو یہ پوری ایک ضخیم کتاب کی متقاضی ہے۔ اب سب شاعروں کا ایک ایک شعر تبرک کے طور پر پیش ہے مگر اس سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ جشن قتیل شفائی کے سلسلے میں چار مشاعرے باقاعدہ ہوئے۔ ایک دو چھوٹی نشستیں بھی ہوئیں۔

جشن قتیل شفائی کا پہلا مشاعرہ 28 مئی کو دبئی میں منعقد ہوا۔ 29 مئی کو یہ دبئی ہی کی ٹیم نے ابوظہبی کے پاکستان مرکز میں اور 30 مئی کو العین کے انٹرکانٹی نینٹل میں مشاعرہ ہوا۔ 31 مئی کو دبئی میں مقیم داؤدی بوہرہ لوگ ایک ادبی مشاعرہ منعقد کرتے ہیں۔ یہ بھی جشن قتیل ہی کا حصہ ہے۔ ایک نشست متحدہ عرب امارات کی بہت بڑی کمپنی العظیم جس کے بیسیوں پراجیکٹ ہیں، کے مینیجنگ ڈائریکٹر کے گھر پر منعقد ہوئی۔ کچھ چھوٹی بڑی اور بھی تقریبات ہوئی ہیں، مگر تفصیل بیان کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن سا لگ رہا ہے۔ ایک ایک شعر ملاحظہ کریں:

طاقِ دل تجھ پہ شناسائی کے روشن تھے دیے ۔۔۔ اور اب ترکِ مراسم کا دھواں باقی ہے
تسلیم عابدی (ابوظہبی)

یہ آئینہ ہے صداقت بیان کرتا ہے ۔۔۔ کہ اس کے آگے اداکاریاں نہیں چلتیں
منظر بھوپالی (بھارت)

ہزار سانحے پردیس میں گزرتے ہیں ۔۔۔ جو ہو سکے تو ذرا ہم سے رابطہ رکھنا
صابر ظفر (پاکستان)

لوگ کہتے ہیں عبادت کو بھلا رکھا ہے ۔۔۔ اپنے سجدوں میں تمھیں ہم نے سجا رکھا ہے
سیماب قزلباش (پاکستان)

صرف اس کے ہونٹ کاغذ پر بنا دیتا ہوں میں ۔۔۔ خود بنا لیتی ہے ہونٹوں پر ہنسی اپنی جگہ
انور شعور (پاکستان)

کسی بھی شام کو اڑتے پرندوں سے کبھی پوچھیں ۔۔۔ کہ کیا لطف دیتا ہے پلٹ کر اپنے گھر جانا
ظہیر جاوید (پاکستان)

رات بھر لڑتی رہی اندھی ہوا سے روشنی — صبح طوفاں کے مقابل اک دیا رکھا گیا

سورج نرائن (پاکستان)

کیسے مہتاب مری فکر کے گہناتے ہیں — اک گھڑی کو مری آنکھیں، مرا چہرہ دیکھو

پرتو روہیلہ (پاکستان)

ان کے بعد قتیل شفائی کی باری تھی — ان سے اتنا سنا گیا — اتنا سنا گیا کہ شاید خود قتیل صاحب کو بھی سنانے کے مزہ آیا ہوگا۔ شعر سنانے سے پہلے انھوں نے مختصر سا خطاب بھی کیا۔ اور ایک بات — جو بتانا ضروری تھی۔ مشاعرے کے منتظم اور کراچی یونیورسٹی کے پرانے طلبا کی انجمن یونیورسٹی گریجویٹس کے صدر سلیم جعفری نے ایک یہ اعلان بھی کیا کہ ہر سال ایک فراموش کردہ مرحوم شاعر کا مجموعہ بھی یہ انجمن شائع کیا کرے گی۔ اس برس قابل اجمیری مرحوم کی کلیات چھاپی گئی ہے۔ قابل مرحوم کے فرزند ظفر قابل اس کلیات کے ساتھ یہاں موجود ہیں۔ اس کلیات کی فروخت سے جو رقم ملے گی وہ اسی جواں مرگ شاعر کے پسماندگان کو دے دی جائے گی۔ مشاعرے کے دوران وقفے وقفے سے سلیم جعفری موقع محل کی مناسبت سے قابل اجمیری کے شعر بھی پڑھتے رہے — اب کچھ شعر قتیل شفائی کے اور آخر میں صدر مجلس جگن ناتھ آزاد کے —

پتھر کے روپ میں اک زندہ طلسم ہے — شفق میں دھوپ ملائیں تو اس کا جسم ہے
وہ معجزات کی حد تک پہنچ گیا ہے قتیل — غزل کوئی بھی لکھوں اسی کا اسم ہے
نہ کوئی خواب ہمارے ہیں نہ تعبیریں ہیں — ہم تو پانی پہ بنائی ہوئی تصویریں ہیں
گستاخ ہواؤں کی شکایت نہ کیا کر — اڑ جائے دوپٹہ تو دھنک اوڑھ لیا کر
آؤ کوئی تفریح کا سامان کیا جائے — پھر سے کسی واعظ کو پریشان کیا جائے
مفلس کے بدن کو بھی ہے چادر کی ضرورت — اب کھل کے مزاروں پہ یہ اعلان کیا جائے

کئی غزلوں کی فرمائشوں بے پناہ تالیوں اور بے شمار تحسین کے ریلے میں انہوں نے اپنا مشہور زمانہ گیت سنایا —

گھنگرو ٹوٹ گئے

اور اب آخر میں صدر مجلس کے چند شعر — مگر خیال رہے یہ یادداشت صرف دہلی کی ہے — ابوظہبی اور العین کے مشاعروں کا سماں الگ تھا۔ کمال کی بات یہ ہے کہ یہ مشاعرے رات دس بجے شروع ہو کر صبح 4 بجے ختم ہوتے تھے مگر ان تینوں شہروں کی خواتین و حضرات اس وقت تک دلچسپی سے بیٹھے رہتے اور پوری دلچسپی سے مشاعرے میں شریک ہوتے — اپنی داد کے ساتھ — اپنی فرمائشوں کے ساتھ۔

جگن ناتھ آزاد (بھارت) کے شعر۔ اور پھر خدا حافظ —

ویرانے میں کرتے ہیں جو گھر کی حمایت — جو لوگ گھر کو گھر نہیں کہتے
گھر وہ ہے جہاں موج مسرت کی ہو رقصاں — اینٹوں کے ہر انبار کو ہم گھر نہیں کہتے

◆◆◆

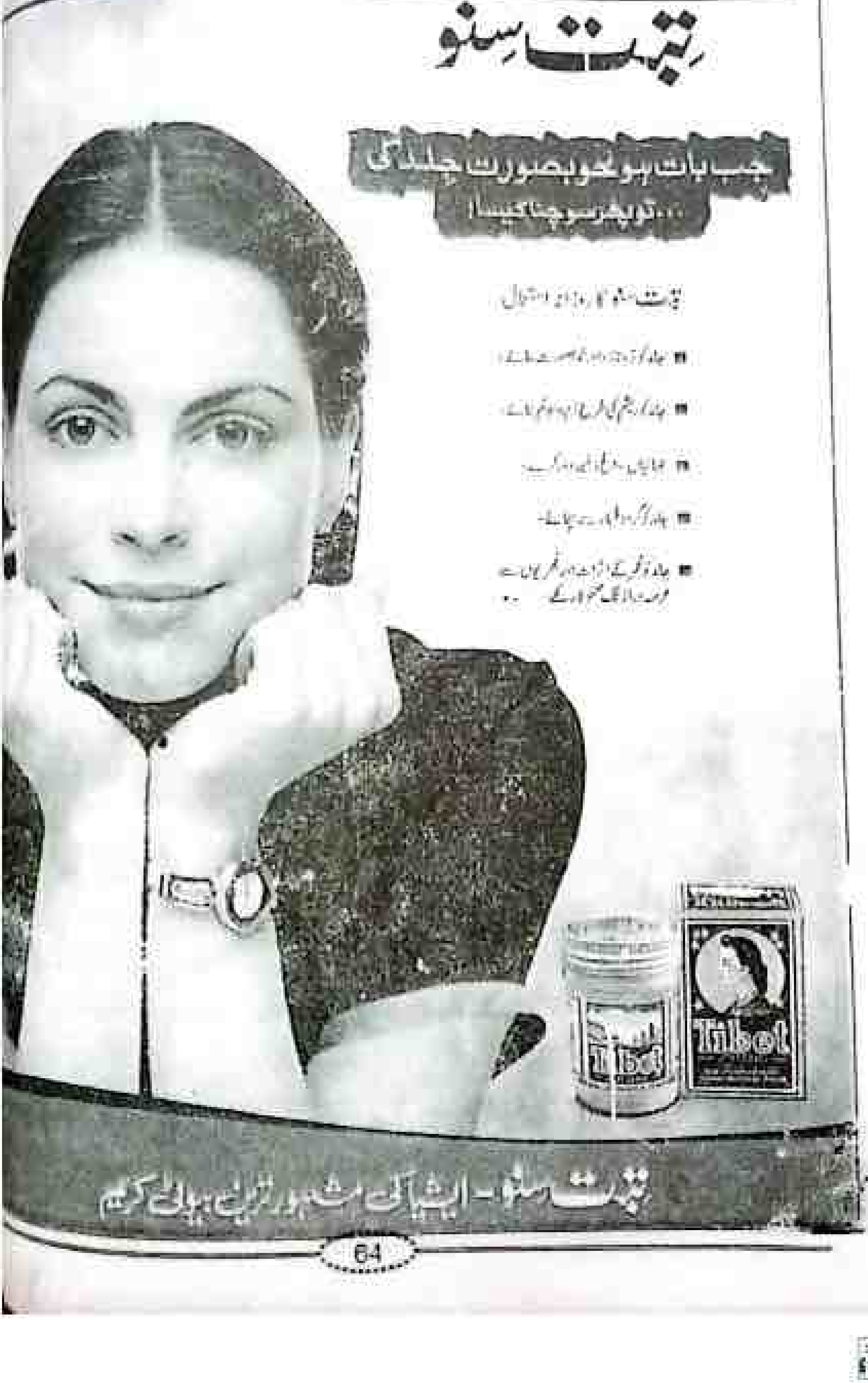
تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیسا!
Tibet
تبت سنو۔ ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

منظومات

ستیہ پال آنند (امریکہ)

قضا کار

[illegible]

○○○

جلیل عالی

کھیل جاری رہے

[illegible]

آگ جلتی رہے

کھیل جاری رہے

[illegible]

کھیل جاری رہے

[illegible]

تم جلتے رہو

ہم جلتے رہیں

[illegible]

کھیل جاری رہے

[illegible]

کھیل جاری رہے

○○○

سیفی سرونجی (انڈیا)

ایک نظم

وہ کوئی قافلہ سالار تو نہ تھا
لیکن جانے کیوں
ایک بھیڑ ہر وقت
اس کے ارد گرد
جمع رہتی تھی
جو اس کے ایک اشارے پر
جان دینے کو تیار تھی
اس نے اپنی زہریلی باتوں سے
لوگوں کے ذہنوں کو
زہر آلود کر دیا تھا
لیکن اچانک ہی اس پر
زوال آ گیا
اور وہ
گمنامی کے پردے میں
روپوش ہو گیا
اور اس کے تمام حواری
گلی در گلی [illegible]
تلاش میں سرگرداں تھے

○○○

قیصر نجفی

زمینی خدا

ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے
نیند رات بھر مری
اور آنکھ آنکھ میں
ایک خوف رہ رہا
کروٹیں بدلتا ہے
ایک ورد ادا ہوا
سانپ ان کے چلتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے
نیند رات بھر مری

اور جو گزرتے شب
لوگ میرے شہر کے
ہر طرف بچھے ہوئے سے
گرتے پڑتے چلتے ہیں
کتنے بے بضاعت ہیں
کیسے بے سلامت ہیں
جب بھی سوچتا ہوں میں
ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے
نیند رات بھر مری

رات بھر یہ سرگوشی
منتظر ہواؤں کی
ہیں گرفت میں ابھی
زمین کے خداؤں کی

جن کو ہے اداؤں کا
خوں شراب ناب ہے
ان کے ہی نصیب میں
رنگ ہے شباب ہے
اور ہمارے واسطے
نیند ہے نہ خواب ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتی ہے
نیند رات بھر مری

OOO

یونس صابر

تخلیق

بڑی ایذا اٹھائی ہے جاوید آکر جس چاہا
صابر بچی بچی وہ تو ٹوٹ پھوٹ ہی چاہا
آج تخلیق ہے تیرا لکھا ہوا یہ
میرے سوچنے میں بھولا چاہو زندہ ادا

OOO

محمود شام

شہید کا لہو

شہیدوں کا لہو رائیگاں کیوں
زمیں خاموش چپ ہے آسماں کیوں
نکلتے ہیں جواں جب خواب لے کر
لہو میں ڈوبتی ہیں بستیاں کیوں

OOO

شہزاد نیر

یکتائی کے جنگل میں بھٹکتی تنہائی

میں تنہا ہوں
مرے پہلو میں تو خواب عورت بھی اکیلی ہے
اسی جنگل بڑی عورت کے پہلو میں
اپنے خواب کی کس گدگدی سے نیند میں ہنستا ہوا
بچہ بھی تنہا ہے
بھرے گھر سے بھرے گھروں میں یہ گھر بھی تنہا ہے
گھروں سے گھر جڑے ہیں پھر بھی دنیا میں
یہ گھر اپنی جگہ تنہا یونہی ہی اکیلی ہے
حدود مشترک پہ بستے ہیں
اک دوسرے کے ہجر میں پھر بھی
زمیں پہ ملک تنہا ہیں
کشش کی ادھیائی کے لیے مخلوق دوریں کو جوڑ گئی ہیں
خلا ہی تو کرے یہ بکھری سی تیلی اکیلی ہے
عجب اک ادھرے ہے اور تہہ آنکھ دیکھی گئے ہے
اثر کرتے ہوتے رات
اک ایسے تنہائی مرجو ہے کہ
خواب میں کھوئی ہوئی عورت
مرے بچے پاپا سے میں بھی اکیلا ہوں
کہ سوچوں کا اک اس کا اپنا جنگل ہے جہاں یہ
روز وحشت تنہا
یہ اس کا عدم اک اپنا صحرا ہے جہاں میں روز وحشت تنہا
زمانہ در سفر پھیلا ہوا ہستان ہے جس میں
کہ یکتائی تنہا ہیں

OOO

فوزیہ مشتاق (امریکہ)

مشترکہ مفاد

آؤ اب مل کے جھوٹ بولتے ہیں
تم جو میرے بن ادھورے ہو
میں کیوں تم چھوڑ کر جاؤ گے
ایک پل بھی نہیں رہ سکوں گی میں
اس لئے کہ یہ جانتی ہوں میں
جھوٹ بولیں گے تو بچا لیں گے
اپنے اس ٹوٹے گھروندے کو
اس گھروندے میں بستے بچے کو
اور اب مل کے جھوٹ بولتے ہیں

OOO

نجمہ عثمان (لندن)

تمہاری آنکھیں

بہت دنوں سے تمہاری آنکھوں نے
مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا ہے
یہ بولتی تھیں
تو میرا سارا وجود تم میں سمانے لگتا
مجھی کو مجھ سے چھڑانے لگتا
میں ایک مدت سے
اپنے سارے وجود میں یوں سمٹ رہی ہوں
کہیں سے اندر بکھر رہی ہوں
تمہاری آنکھیں جو مجھ سے بولیں
تو اپنا سارا وجود
خود سے جدا کروں میں

OOO

وصف وفا (امریکہ)

فون فرینڈ

بتاؤ کون ہو کیسے ہو دل میں کیوں اترتے جا رہے ہو
تمہاری آواز کا جادو
تمہارے لہجے کی نرمی
تمہاری باتوں کی حدت
اور انداز لفظوں سے
ایک صورت بن گئی اپنے تصور میں
تمہاری آواز اب سنتے نہیں ہیں
دیکھتے ہیں ہم
تمہاری آواز
اور لفظوں کا جادو
میری طبیعت
اور رنگوں کا ہجوم بے کراں ہے
تمہیں دیکھا نہیں ہے
تمہاری صورت روز و شب میرے
نہیں ہوتا نہیں ہے
تم ہی تم ہو چار سو میرے
بتاؤ کون ہو کیسے ہو؟
ہو کوئی حقیقت یا سراب اک خوبصورت ہو
کہ اک دل میں ہے
تم سامنے آؤ تو پھر کیا ہو
تمہاری آواز کیا ہو اور کیسے ہو
تو کیا ہو
بتاؤ کون ہو؟
کیسے ہو؟

OOO

آسناتھ کنول

حویلی

اب بالکل خالی
ویران اور سنسان حویلی
کی مانند ہوں
جہاں رات کو الو بولتے
اور چمگادڑ اڑتے ہیں
جہاں مکڑیوں نے
ویب جالے تان رکھے ہیں
دھول سے اٹی ہوئی
راہداریاں
جن پر کسی کے قدموں کے
نشان نہیں
غیر مرئی آوازوں کا شور
کائی زدہ دیواریں
حسرت سے اپنی شکستگی کو دیکھتی ہیں
ٹوٹے ہوئے کواڑ آہیں بھرتے ہیں
بے چین
لوگ کہتے ہیں اس حویلی پر
آسیب کا سایہ ہے
شاید وہ ٹھیک کہتے ہیں
کسی کے سال خوردہ
پیکر کے پیچھے
محبت کی لاش
اب بھی اپنے وارث کی
منتظر ہے

OOO

آفتاب خان

رخسانہ نور کے لیے ایک نظم

تیسرا کردار

خواب چنتی ہوئی
وہ اک لڑکی
گھر سے نکلی، لیے قلم کاغذ
آرزو نام رکھ لیا اپنا
کتنے صفحات
کورے کاغذ کے
اور پھر اک مکالمے میں آ کے
تھم گیا
دل کا ایک شہزادہ
جس کو سمجھی اسے شریک سفر
وقت کٹنے لگا خوشی سے
مگر
اور تھا کچھ لکھا کہانی میں
ایک دکھ اور تھا جوانی میں
سامنے
حسن کی بجلیاں تھیں
اور میاں
وقت کا کہانی کار
کردار کھو جاتا ہے
وہ بھول جاتا ہے
یہاں
ساتھ چلتا ہے زندگی بھر کون
خواب چنتی ہوئی وہ اک لڑکی
بکھر گئی تھی
ایک دن اس کی بیٹی
گھر سے صدمے چھپا کے بیٹھ گئی
اپنے اندر کی خود سے لڑنے لگی
لڑتے لڑتے ہی
مر گئی آخر
عشق زندہ وہ کر گئی آخر
خواب چنتی ہوئی
وہ اک لڑکی
کاش!
تو بھی جان لیتی کبھی
وہ مرا عشق مر کا حق ہے

OOO

امجد بابر

میرے ہونے کا معمہ

ہجر پیہم
روح کی تلخی
اعمال کا قصیدہ رہ جاتا ہے
خواب کھلی حالت میں
کسے جہاں کا اذیت خانہ رستا ہے
موت کا ذائقہ رس بھری کستوری ہے
شراب کی لذت
شہد کی مہک
من و ملک کی زیارت گہہ ہے
لوگوں کے صحرا میں
تمہاری ذات کا راز کہاں چھپا ہے؟
کہیں کھلتا ہے
کہیں کھلتا ہے
میری تنہائی کی گتھی

OOO

شازیہ مفتی

اور ہم رہ گئے

رکھ دیں پاؤں میں تھیں
اور کاسہ میں ہاتھ میں
سنبھل کر چل رہے تھے ہم
اچانک
وقت کا منہ زور گھوڑا
بدک کر دوڑ اٹھا
گرا کر روند ڈالا
طنابیں کھنچ گئیں
ہمارے ہاتھ میں جو تھا سب ہی کھو گیا
تمنا گئی
محبت
تو اصل
وفا گئی
ہمارے ہاتھ کی ریکھا گئی
یادیں
اور ہم رہ گئے

OOO

افسانے

اندراج

محمد حامد سراج

مختصر تعارف

محمد حامد سراج 21/ اکتوبر 1958ء خانقاہ سراجیہ ضلع میانوالی میں پیدا ہوئے۔ اب تک 4 افسانوی مجموعے، ایک ناولٹ ''آشوب گاہ'' اور چند دوسری تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ماں کے موضوع پر اردو ادب کا طویل ترین خاکہ جس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، ''میّا'' کے نام سے تحریر کر چکے ہیں جسے 2006ء میں پیش رفت انٹرنیشنل کے پلیٹ فارم سے رشید احمد صدیقی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ریلوے اسٹیشن پر وہ اسے لینے آئی۔

ریلوے اسٹیشن کی پرشکوہ عمارت کے سامنے مڑتی تارکول کی سڑک پر جب اس نے کار برگد کے گھنے درخت کے پاس سے دائرے میں گھمائی تو موچی پر اس کی نظر پڑی۔ یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ ریلوے کا قلی اس کی سرخ قمیض، پانی بھرنے والے ماشکی کی چمڑے کی مشک، بھکاری، کچھ بھی اہم نہیں تھا اور اس لمحے جب وہ اپنی رو میں ریلوے اسٹیشن کے سوا اردگرد کی ہر چیز سے بیگانہ تھی مکمل بے گانہ! ٹرین آنے میں دیر تھی وہ بنچ پر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ پھر بے چینی میں اٹھ کر ریلوے کے ایک سرے سے دوسرے تک ٹہلنے لگی۔ اسے ٹرین پر ضرور آنا تھا، بائی روڈ آجاتا، ایک سے ایک سروس ہے جو وقت بچاتی ہے۔ کنجوس کہیں کا، کرایہ مجھ سے لے لیتا۔ آلے وہ، تو پوچھتی ہوں۔ اوہو... وہ تو ''جہلم'' سے آ رہا ہے۔ ''انجن'' ابھی ٹرین رکی ہوگی۔ پہاڑوں کے درمیان ایستادہ انگریزی عہد کے پرشکوہ ریلوے اسٹیشن اوہ... وہاں سے تو واقعی کوئی بس سروس نہیں چلتی۔ اس کی نظر سگنل پر پڑی۔ سگنل ڈاؤن تھا اور دور سامنے ٹرین دکھائی پڑ رہی تھی۔

عادل اس کی سگی پھوپھی کا بیٹا تھا۔ پچھلی بار جب وہ ''جہلم'' سے آیا تو وہ دل میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ عادل میں ایسی کوئی بات نہ تھی جو اس ایسی لڑکی کو اپنی جانب کھینچ لیتی اس سے ایک دو ایسی باتیں سرزد ہو گئیں کہ وہ خود حیرت زدہ رہ گئی کہ یہ کیا ہوا۔ اس روز صبح اس نے جینز کی پینٹ پر سبز کرتا پہنا ہوا تھا اور بستر پر دراز تھی۔ کمرے میں اور کوئی نہیں تھا۔ عادل کنگھی کی تلاش میں ڈریسنگ ٹیبل تک آیا اور آہستہ خرامی سے کہ شاید اس کی آنکھ نہ کھل جائے لیکن اس وقت وہ بھونچکا رہ گیا جب وہ سرعت سے اٹھی اور اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کے ہونٹ چوم لئے اور اسی سرعت کے ساتھ بستر پر لیٹ گئی۔ وہ ایک لمس اسے بہا لے گیا۔ اسے کنگھی تو کیا اپنے بال سنوارنا بھی یاد نہ رہے۔ اس دل تھا کہ قابو سے باہر، دھک دھک... عجیب لڑکی ہے۔ کوئی دیکھ لیتا تو قیامت آ جاتی۔ ساری زندگی کی عزت مٹی میں مل جاتی۔ ماموں دیکھ لیتے ممانی اف... میرے خدا یہ جینز پہننے والی لڑکیاں اتنی بے باک... لیکن اس بے باک ابھرتی ''کناروں تک اچھلتی

جوانی نے اسے امیر یا غریب سے بالاتر کر دیا۔ (العطش) اپنے نقوش چھوڑ گیا۔ وہ رات میں اپنے بستر پر لیٹی تو اس کے بدن میں درد کروٹیں لے رہا تھا۔ میٹھا میٹھا سا۔ اس نے موبائل آن کیا۔ تیز ڈور بیل سائیں سائیں اور لطف اندوز ہونے لگی۔ اور خود کلامی میں کھو گئی۔ یہ جو میرا "کزن" اچھرہ سے آیا ہے۔ چینڈو سا ہے۔ اس کے ساتھ سیکس انجوائے کیا جا سکتا ہے۔ کیا یاد کرے گا۔ ایک زمانہ تھا لڑکے لڑکیوں کے پیچھے پھرا کرتے تھے اب ہمارا دور ہے۔ عادل محبت وحیت کا کیا روگ پالنا، انجوائے کیا اور آگے چل دیے۔ اور اسی رات اس نے "موقع" پکڑا اور اس کے کونے میں عادل کو پا محمد کر اسے اپنے بدن کے نشیب و فراز کی قوسیں شمار کرنے دیں۔ اور آج وہ پھر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ کیونکہ پچھلے دنوں کی ملاقات میں قوسیں ٹوٹنے سے بچ گئی۔ اس نے اسے اپنی محبت کا مکمل یقین دلایا۔ عادل حیران اور خوش تھا کہ کیا اسے بھی اتنا ٹوٹ کے چاہا جا سکتا ہے

وہ ٹرین سے اتری تو وہ سرشار ہو گئی۔ اسے اپنی چھوٹی سی کار میں بٹھایا۔ گیئر لگاتے ہوئے اس کی ٹانگ پر چٹکی لی۔۔۔

"پھپھو کو بھی ساتھ لے آتے نا۔۔۔۔"

"ان کے گھٹنوں میں درد رہنے لگا ہے اب وہ سفر سے گھبراتی ہیں۔ اور تم مجھ سے کیوں گھبراتے ہو۔۔۔ کھا جاؤں گی کیا۔ محبت کی ہے تم سے عادل صاحب۔۔۔ آئی سمجھ۔۔۔ ہاں۔۔۔ کچھ سمجھ آ رہی ہے۔۔۔ بس یار ہم ایک شہر میں ہوتے تو مزہ آ جاتا۔۔۔ اتو آ جاؤ۔۔۔ نہ۔۔۔ روکا کس نے ہے۔۔۔؟"

ممکن نہیں نا۔۔۔ توبہ بی بی۔۔۔ بابا کے بعد گھر کا بوجھ میرے کندھوں پر ہے۔۔۔ اچھا چھوڑو۔۔۔ دیکھنا کوئی موچی نظر آئے تو گاڑی روکنا۔"

کیوں۔۔۔ خیریت۔۔۔؟"

"میری جوتی ٹوٹ گئی ہے۔ مرمت کرا لوں۔۔۔"

"اف خدایا! اتنے غریب تو نہیں ہو"

"لیکن اتنا امیر بھی نہیں ہوں۔۔۔"

"میں تمھیں نئی جوتی لے دیتی ہوں۔ اصلی برانڈ کی۔۔"

"مجھے فضول خرچی پسند نہیں"

"اب کی بار تو ضرور لے کے دوں گی۔ آخر تم میری پھوپی کے بیٹے ہو اور غلطی سے میں تمہاری محبت میں بھی مبتلا ہو گئی ہوں۔"

"وہ بعد کی بات ہے ابھی موچی ضروری ہے۔" برگد کے نیچے ایک موچی نظر پڑا اسے مجھے۔۔۔ اس نے بریک پر پاؤں رکھا۔ وہ سامنے۔۔۔"

"تم بیٹھو میں جوتی مرمت کرا کے آیا"

"مہمان ہو میرے۔۔۔ میں مرمت کرا لاتی ہوں نا۔۔۔"

"ہم پینڈو لوگ ہیں۔ عورتوں سے جوتی مرمت کرانا معیوب سمجھتے ہیں"۔

"لیکن عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں"

"یہ۔۔۔یہ۔۔۔کیا بات ہوئی۔۔۔؟"

"مذاق کر رہی ہوں۔۔۔پاگل۔۔۔ اصل بات کی ہے تمہاری نہیں"

گھر داخل ہوتے ہی سب نے پرتپاک انداز میں ملے اس نے سامان کھولا اس میں سے گاؤں سے لائے گئے تحائف نکالے۔ ثوبیہ کے لیے رنگین پراندہ، گھر والوں کے لیے میٹھی پنجیری کے ساتھ ماموں کے لیے ململ کا کرتا اور لٹھے کی شلوار۔۔۔!

"بابا۔۔۔ ابھی ہمارے گاؤں زندہ ہیں۔ شہروں میں تو انسان معدوم ہو گئے ہیں۔" ثوبیہ کے بھائی نے کہا

"زیادہ فلاسفر بننے کی ضرورت نہیں ہے" ثوبیہ بولی

رات کے کھانے کے بعد وہ عادل کو گھمانے پھرانے کے لیے نکلی۔ تیز روشنیوں کے درمیان اس نے ایک مارکیٹ کی پارکنگ میں کار پارک کی۔ اور اسے ساتھ لے کر ایک "شو سٹور" میں داخل ہوئی۔

"سنو۔۔۔ آج مجھے بھی ہے۔ اس برانڈ کے جوتے بہت مہنگے ہیں۔ چھوڑو یہ اسراف ہے۔"

"یہ کوئی اسراف نہیں۔ بس میں اپنی پسند کی جوتی لے کر دے رہی ہوں اور تم نے پہننی ہے۔"

"ظاہر ہے جوتا پہنا ہی جاتا ہے۔"

رات گئے تک گھومنے کے بعد وہ واپس لوٹ رہے تھے تو ثوبیہ نے کہا۔ "رات میں ہمت کر کے تمہارے بستر تک آ جاؤں گی۔ ڈر کے چیخ نہ پڑنا۔"

"اتنا بزدل بھی نہیں ہوں لیکن۔۔۔۔"

"یہ "لیکن" ہی تو بزدلی کی علامت ہے اور عورت کبھی بزدل مرد کو پسند نہیں کرتی"

"یار۔۔۔ تیری میری شادی نہیں ہو سکتی۔۔۔؟ ہمارے معاشرے کے رسم"

"اب بھی کون سا معاشرہ کا ہے۔۔۔ مجھے بیوی سمجھ لینا" "ہونے اور سمجھنے میں بڑا فرق ہے"

رات سرک رہی تھی۔ وہ بھی سرکتے سرکتے عادل کے پہلو سے جا لگی۔ اصل قدرتی لباس میں۔ قوس و قزح کے زاویے نشیب و فراز کا طلسم۔۔۔ ابھی قوس ٹوٹی نہیں تھی کہ گھنٹی بجنے پر وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اپنے کمرے کے باتھ روم میں تھی۔ جانے کوئی جاں بلب مریض تھا یا کون تھا کیوں کہ اس کا باپ ڈاکٹر تھا لیکن اس کی رات کا حسن غارت کر گیا۔ موبائل سکرین کے سہارے رنگین منظر فوت گئے۔ وہ بھوکی شیرنی کی طرح ایک بار پھر اٹھی لیکن خوف نے اسے جکڑ لیا۔ باپ کی عزت اور اس کے اندر کا حیوان دست و گریباں ہو گئے۔ حیوان رات گھومتا عادل کے دروازے تک آیا لیکن اندر سے کنڈی لگی تھی۔ پلٹ کر وہ باتھ روم میں آئی اور نل شاور کھول دیا۔ اپنے ہی حیوان کے ہاتھوں جلتی رہی اپنا بدن ادھیڑتی رہی۔ تیز گرم سانسوں کے درمیان وہ آہستہ آہستہ سرد پڑ گئی۔ صبح ناشتے کے بعد عادل نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کی اچانک واپسی پر اس کے ماموں نے حیران ہو کر پوچھا "خیر ہے۔۔۔ بیٹا۔۔۔؟"

جی ماموں۔۔۔ کئی کام ادھورے چھوڑ آیا ہوں۔ اس کے اندر ایک جنگ جاری تھی۔ وہ ہار جیت کے فیصلے کا انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اسے "اگر" "مگر" کھینچ رہا تھا۔ کیوں۔۔۔۔؟

اسے خود معلوم نہیں تھا۔ وہ اڑ کر اپنے گاؤں پہنچنا چاہتا تھا۔ اپنے گاؤں اپنی پناہ گاہ، اپنے گھر وہ بچ بچا کر آ گیا تھا۔ اس نے ازین

پگڈنڈی اور گھر کی راہ لی۔ دریا کے سوال سے جب ٹرین گزر رہی تو اس نے قیمتی پراڈا کا جوتا دریا میں پھینک دیا۔

وہ اگرو اسٹیشن پر اترا تو شام اتر رہی تھی۔ وہ پہاڑی پگڈنڈی پر افتاں و خیزاں ہانپتا گھر پہنچا۔ رات میں مکمل اور بھرپور نیند لی۔ دیواروں پر دھوپ ٹھہری تھی۔ وہ گھر سے نکلنے لگا تو اس کی ماں نے اسے پکارا "بیٹا۔۔۔ میری بات سنتے جاؤ"

"جی۔۔۔ ماں" "میں نے تمہارے ماموں سے بات کی تھی رشتے کی نفیسہ کے لئے۔۔۔!"

"جی۔۔۔!!"

"میں سوچ رہی ہوں۔۔۔ ہمت کر کے خود جاؤں اور رشتہ طے کر آؤں"

"لیکن ماں۔۔۔؟"

"لیکن کیا؟ بس میرا فیصلہ ہے۔۔۔"

"ماں۔۔۔ میں آپ کے سامنے سر اٹھا سکتا ہوں اور نہ بے ادبی کا سوچا ہے کبھی لیکن میں نفیسہ سے شادی نہیں کر سکتا"

"کیا کمی ہے اس میں۔۔۔! خوبصورت ہے، پڑھی لکھی، تعلیم یافتہ، نیک، سمجھی ہوئی اس کے ماں باپ نے کون سی کمی چھوڑی ہے اس کی تربیت میں۔۔۔!"

"ماں۔۔۔ نہیں ماں۔۔۔!" "آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں" "بس بس۔۔۔ زیادہ باتیں نہ بنا۔۔۔"

"میں دریا کے سوال میں ڈوب مروں گا جو آپ نے مجبور کیا"

"ہائے ہائے۔۔۔ اللہ نہ کرے۔ ایسی باتیں تو نہ کر میرا بیٹا۔۔۔ چل جیسی تیری رضا"

"بس کہہ دیا ماں۔۔۔ مجھے شادی نہیں کرنی"

وہ چپ چاپ گھر سے نکلا پہاڑی پگڈنڈیاں ناپتے ایک ویران سی پہاڑی پر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے سامنے پھیلے ان گنت سوالوں کے گتھل کھولنے کی کوشش کی لیکن تھک ہار کے بیٹھ رہا۔ نفیسہ کے ساتھ سارے منظر اسے عذاب دینے لگے۔ وہ وہاں سے بھی کچھ کہنے کی حالت میں نہیں تھا۔ اس کے اندر ایک ہی وقت میں کئی بے لباس عذاب گھوم رہے تھے۔ شہر سے واپسی پر اس کا موبائل غلطی سے نفیسہ کے موبائل کے ساتھ تبدیل ہو گیا۔ ماڈل اور برانڈ ایک ہونے کی وجہ سے۔۔۔!! اس نے ویڈیو کلپ کھولے تو اس کا سر چکرانے لگا نفیسہ کے ویڈیو کلپ دیکھ کر جو مختلف لڑکوں کے ساتھ تھے۔۔۔؟؟؟

اس کے بعد قصہ گو کا کہنا ہے نہیں معلوم اگر "میں" وہ درخت ہے کہ نہیں۔ وہ نوجوان کہاں چلا گیا۔۔۔؟ کیا وہ گھر واپس لوٹا۔۔۔؟

"اس کے بعد تاریخ میں "تہذیب" کے نام داستان کا کہیں اندراج نہیں ملتا"

◆◆◆

اظہر جاوید کی ہر کہانی ان کی اپنی زندگی کی ایک پرت ہے۔ ناصریان تجربوں کی یہ کہانیاں اظہر جاوید کی داستانِ حیات کے اوراق ہیں۔ (ڈاکٹر انور سدید)

پُو و بندغ

آغا گل

مختصر تعارف

آغا گل 19 / نومبر 1951ء ہرنائی بلوچستان میں پیدا ہوئے۔ 23 کتابیں فکشن پر لکھیں۔ 12 افسانوی مجموعے اور 3 ناولٹ منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ناول ''دشت وفا'' اور افسانوی کتاب ''دوسری بابری مسجد'' کو خوب پذیرائی ملی۔ 2012ء میں شائع ہونے والی افسانوی کتاب ''پرندہ'' کو 2017ء میں بلوچستان حکومت نے بہترین کتاب کے ایوارڈ سے نوازا۔

دھوپ میں سلگتی جیل کسی مکار گدھ کی مانند بولان کے پہاڑوں میں پنجے جمائے گرسنہ نظروں سے معاشرے کو دیکھ رہی تھی کہ کب اچک لے۔ جیل بھی انسان کی طرح باہر سے اجلی اجلی لگتی ہے۔ دو چار قیدیوں کو حکم دیا جاتا کہ وہ بیرونی دیواروں کو چونا کر دیں۔ قیدی بڑے بہادر کی طرح اپنا نام خود ہی پیش کرنے لگتے۔ بیڑیوں میں جکڑے جیل کی تنگ اور پست وادی میں وہ قدیم عبرانیوں کی طرح سفید ٹوپیاں پہنے باہر نکلتے۔ تو انہیں عجیب طمانیت ہوتی کہ چند گھنٹوں کے لئے ہی سہی وہ انسانی معاشرے کا حصہ تو بن گئے ہیں۔ وہ بچوں کی سی دلچسپی اور تجسس سے جیل کی باہری دیوار دیکھتے اور خوش ہوا کرتے کہ کبھی وہ بھی اسی انسانی معاشرے کا حصہ بن جائیں گے۔ چودہ برس بعد، تین برس بعد یا پچاس برس بعد، حتیٰ کہ جسے مختلف دفعات کے تحت ڈھائی سو برس قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی، وہ بھی سال گننے لگتا۔ دیوار پیروں میں بیڑیاں ڈلوا کر تحقیر سی محسوس کیا کرتا تھا۔ ان کے گاؤں میں گدھوں کے اگلے کھروں میں رسہ ڈال دیا جاتا تھا کہ وہ اچھل کود کرکے دور نہ نکل جائیں۔ مگر کبھی کسی نے زنجیریں نہ ڈالیں۔ گدھوں کو ہتھکڑیاں بھی نہیں لگائی جاتیں۔ دراصل گدھوں کے ہاں سردار، معتبر، میر اور چوہدری نہیں ہوا کرتے۔ جو گدھوں کو بتاتے رہیں کہ ہزاروں ہزار برس پہلے وہ کہاں سے آئے تھے۔ ان کا Origin کیا ہے؟ اور یہ کہ وہ الگ الگ گروہ، قوموں، قبیلوں سے ہیں۔ لہٰذا ان کے مفادات جدا جدا اور نظریات الگ الگ ہیں۔ گدھوں کی بے شمار نسلیں اور ان گنت قسمیں ہیں، مگر سبھی مل جل کر رہتے ہیں۔ بس وہ گدھے کے گدھے ہی رہتے ہیں۔ گدھوں سے زیادہ بوجھ انسانوں کو اٹھوا دیا گیا۔ نظریوں کا، نظریات کا، عقیدوں کا، جغرافیائی حدود، عقیدہ، معاشرہ، قوم، گروہ، خاندان کتنی ہی چیزوں سے بیک وقت ذہنی وابستگی رکھنی پڑتی ہے۔

جیل کو چونا کرتے ہوئے باقی قیدیوں سے گپ شپ بھی ہوا کرتی ورنہ تو سبھی اپنی اپنی بارکوں میں بند رکھے جاتے تھے۔ جیل اور آزاد معاشرے میں اتنا ہی فرق ہے کہ جیل میں دیواریں نظر آتی ہیں اور معاشرے میں دیواریں طلسم ہوش ربا کی طرح نظر نہیں آتیں۔ جیل میں محسوس ہوتا ہے کہ طاقتوروں نے انہیں الگ الگ بارکوں میں، چکیوں اور پھانسی گھاٹوں میں بند کر رکھا ہے۔ جبکہ معاشرے میں یہ سب کچھ غیر محسوس ہے۔ شہروں کو فضا سے دیکھا جائے تو بس دیواریں ہی دیواریں ہیں اور کیا ہے۔ چاند سے بھی صرف دیوار چین ہی نظر

آتی ہے۔ انسانی معاشرہ اور معاشرت تو دکھائی نہیں دیتی۔ جیل کو چونا کرتے ہوئے بار بار پاؤں میں بیڑیاں الجھاتے ہوئے دینار کی الجھن ختم ہوگئی۔ جیسے یونیورسٹی جاتے ہوئے وہ گزری باتوں کو سوچ لیا کرتا تھا۔ بڑی بے تکلفی سے وہ چوہدری بوٹا کے سامنے بیٹھ جاتا جو لنک سے بیڑی میں ریسٹ لگا دیتا، پھر دوسری بیڑی میں۔ چوہدری بوٹا میانوالی جیل سے ٹرانسفر ہو کر آیا تھا۔ اور لوہار خانے میں اس کی سیدھی چیزیں بنتے کے علاوہ قیدیوں کو بیڑیاں لگانا، پھر انہیں پر دوبارہ اتارنا اس کے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ جیل میں پاکستانی زبان بولی جاتی تھی جس میں پشتو، بلوچی، براہوی، پنجابی، سرائیکی، اردو اور پوٹھواری کے علاوہ بھی ان گنت بولیاں شامل تھیں۔ یہ زبان آسان بھی تھی اور عام فہم بھی لہذا سو کے لگ بھگ بنگالی قیدی بھی یہی زبان بولنے لگے تھے۔ دینار دیواروں پہ چونے کی کوچی پھیرنے کے دوران بنگالیوں سے بھی گپ شپ مارا کرتا۔ اسے بڑا ترس بھی آیا۔ بیچارے کہاں سے آن لگے جلتے صحراؤں میں۔ بنگال میں سب کچھ ہے روٹی نہیں ہے۔ سارے کے سارے بنگالی مسلمان دو قومی نظریے والے Bread Winners تھے۔ جو روٹی کمانے کے جرم میں یہاں پکڑے گئے تھے۔ کلکتہ سے والٹن، پنڈی سے ملتان سے، ہلوٹ سے اور جانے کہاں کہاں سے۔ وہ مقامی مزدوروں کی نسبت معاوضہ بھی کم ہی لیتے اور حضوری بھی کیا کرتے۔ مگر پاسپورٹ ایکٹ میں دھر لئے گئے۔ اسلام میں تو پاسپورٹ ایکٹ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ورنہ تو ابن بطوطہ ہندوستان میں ہی امیگریشن کرتا رہ جاتا۔ دینار اس پہ بہت کڑھتا رہا۔ اقبال تو نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر یعنی پان اسلام ازم کا درس دیتا رہا۔ اس کے نام پر اکیڈمی بھی ہے۔ مگر اس کی سنتا کوئی نہیں۔ وہ چاہت مٹی کی چیز ہے تھے، کچے تصوروں میں بیٹھا رہتا ہے جیسے دارالحکومت میں ورد ہو یا فکر کردہ ہے۔ بیٹا ہے طالبانیہ کا وفادار ریاست قرار دیا جا چکا ہے حق تک کیوں کر ادا کرے۔

بنگالیوں کا نہ تو کوئی ملاقاتی آیا۔ نہ ہی کوئی ان کا پرسان حال تھا۔ جیل کے سیاہ گیٹ کی طرح ان کی آنکھیں بے جان ہو چکی تھیں۔ شاید انہوں نے دن گنتے بھی چھوڑ دیے تھے۔ قیدی کچھ نہ کچھ پس انداز کر کے بنگالی قیدیوں کی ضرورتیں پوری کر دیا کرتے۔ اپنی ضروریات مثلاً ایکٹ کے تحت چائے کی پتی یا صابن وغیرہ کو انہوں نے گھٹا دیا تھا۔ حالانکہ جیل میں تو صابن کا خرچہ بڑھ جاتا ہے خصوصاً نوجوانوں کا۔ قیدی تو یوں بھی غربت کے مارے ہوئے تھے۔ بے بس اور غریب لوگ ہی تو جیلوں میں بند ہوا کرتے ہیں۔ پرانے قیدی بھی قسمیں کھا کھا کر باتیں کرتے تھے کہ انہوں نے کبھی کوئی امیر اور با اثر قیدی نہیں دیکھا۔ جیسے کسی نے کسی جل پری کو دیکھا ہو یا بھوت کو۔

دینار چونکہ یونیورسٹی سے جیل میں آیا تھا اس کے خیالات انقلابی تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ بنگالی قیدیوں کو کسی طور پر ان کے وطن پہنچا دیا جائے۔ مگر بظاہر اس کی کوئی صورت نہ تھی۔ دینار دراصل سردار کے بیٹے کا ہم عمر تھا۔ سردار نے جب اپنے بیٹے کو کالج بھجوایا تو ساتھ ہی علاقے کے بہت سے نوجوانوں کو بھی بھجوا دیا تا کہ ان کی پارٹی کی ایک شاخ Student wing کے طور پہ کام کرے۔ علاقے میں بڑی دھوم مچی۔ سردار کی نیک نامی میں بھی اضافہ ہوا کہ غریبوں کے بچوں کا بھی خیال رکھتے ہیں۔ طلباء نے بھی سردار کے اشارے پہ بیان بازی شروع کر دی۔ اپنے ہی علاقے میں بسنے والے ایک قبیلے کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا۔ حالانکہ ہزاروں برس کا ساتھ تھا۔ سینکڑوں برس پرانی وفاداریاں تھیں۔ جو پل دو پل میں بکھر گئے۔ کئی بار کالج میں دونوں قبیلوں کے درمیان جھڑپیں بھی ہوئیں۔ تعلیم نے ان پر واضح کر دیا کہ حقوق یافتہ طبقہ قدیم رومیوں کی طرح انتشار پیدا کر کے حکومت کرنے کے اصول پہ کارفرما ہے۔ یہ قبائلی دشمنیاں اور عداوتیں نظام کو مستحکم بنانے اور زندہ رکھنے کے لئے ہیں۔ طلباء کی ہمدردیاں ختم ہونے لگیں حتیٰ کہ دینار نے بھی سردار کے خلاف بغاوت کر دی۔

''ہمارے حقوق یہ ہیں کہ ہمیں بجلی، پانی، ملازمت اور تعلیم ملے۔ ہمارے علاقوں میں سڑکیں ہوں۔ ہماری فلاح کام کرنے میں ہے ہڑتال کرنے میں نہیں۔ حکومت کا ساتھ دینے میں ہے۔ بغاوت اور شورش میں نہیں ہے۔''

سردار بڑبڑاتے ہوئے ''تم کل کے بچے ہو اور تم کیا جانو کہ مخالف قبیلوں کو کچلنے میں ہی ہماری فلاح ہے۔''

''سردار صاحب! گستاخی معاف۔ آپ ائیر کنڈیشنڈ گھروں میں رہتے ہیں۔ آپ کے بیٹے ملک کے اعلیٰ تعلیمی اداروں یا غیر ممالک میں پڑھتے ہیں۔ کسی سردار کے بیٹے کو لاٹھی چارج میں کبھی ڈنڈے نہ لگے۔ کبھی کوئی عوامی تحریک میں گرفتار نہیں ہوا۔ ہم سڑکوں پر ڈنڈے کھاتے ہیں، جیلوں میں جاتے ہیں۔ اور کوئی مر جائے تو آپ کا منشی جا کر تعزیت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سردار صاحب کو اس کی موت کا دکھ ہے۔ قبیلہ ایک بہادر جوان سے محروم ہو گیا ہے۔''

سردار جانتے تھے کہ مساوات کا جنون رفتہ رفتہ متعدی مرض کی طرح وبا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ دینار نے تو ان کے لئے کام کرنے سے انکار کر ہی دیا تھا۔ جواباً انہوں نے دینار کا خرچہ بند کر دیا۔ دینار نے پارٹ ٹائم ملازمت کر لی۔ لہٰذا یہ وار بھی خالی گیا۔ ایک روز پولیس نے ہاسٹل پر چھاپہ مار کر اس کے کمرے سے اسلحہ برآمد کر لیا۔ پولیس کے موقف کے مطابق وہ مخالف قبیلے کے خلاف انتقامی اور پرتشدد کارروائی کرنے کی سازش مکمل کر چکا تھا۔ یہ اسلحہ کہاں سے آیا، دینار نہیں جانتا تھا۔ مگر وہ عدالت میں اپنا دفاع بھی نہ کر سکا۔ اس نے دوران مقدمہ ضمانت کی کوشش بھی نہ کی۔ کیونکہ مخالف قبیلے کے سر پھرے نوجوان اس حرکت پر دینار کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے۔ سردار کے ایما پر کوئی بھی مدد کو آگے نہ بڑھا۔ حتیٰ کہ ایک رحم دل جج نے سردار کے کہنے پر فقط پانچ برس بامشقت کی سزا سنادی ورنہ قانون کی کتابوں میں تو عمر قید کا حقدار ٹھہرایا گیا۔

جیل میں چند ہی ماہ گزار کر دینار کو احساس ہوا کہ جیل عام معاشرے سے بہتر ہے۔ اگر پابندیاں نہ ہوں تو گوارا ہے۔ مذہبی، لسانی اور گروہی تعصبات بھی نہ تھے۔ قیدی آٹھ گھنٹے مشقت کرتے۔ نہ جلسے، نہ جلوس، نہ دھماکے، نہ جنس کی دوڑیں۔ کبھی ایک دوسرے کے ساتھی۔ براہوی بیمار ہے تو پشتون اس کا سر دبا رہا ہے۔ پنجابی قیدی کی والدہ کی موت کی خبر ملی تو بلوچ فاتحہ خوانی کروا رہا ہے۔ بنگالی کے پاس وطن خط بھیجنے کے پیسے نہیں تو کوئی ہزارہ بیرون ملک ڈاک کے لفافے منگوا کر دے رہا ہے۔ شام میں بھی اپنے اپنے انداز میں عبادت کرتے ہیں۔ عبادات کے انداز جدا جدا ہے۔ کوئی کسی کو ٹوکتا بھی نہیں۔ شہروں کی نفرت اور عداوت ختم ہو چکی تھی۔ دینار سوچا کرتا کاش سارے شہر جیلیں بن جائیں۔ قیدی اپنے بچوں کی، عزیز و اقارب کی باتیں کیا کرتے۔ تسبیحاں بانٹتے۔ قرآن حکیم ایک دوسرے کو پڑھاتے۔ پڑھنا لکھنا سکھاتے۔ ایک دوسرے کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں میں شامل ہوا کرتے۔

دینار نے چوری چھپے بنگالی قیدیوں کے بارے میں اخباروں میں خبریں بھی لگوائیں۔ جیل سے باہر تو میدان حشر کا منظر تھا۔ ان خبروں کو کون پڑھتا۔ قیدی آسانی سے ٹل بھی نہ سکتے تھے۔ مگر ان کی مشترکہ ہمدردیاں بڑھتی گئیں۔ بڑے لوگوں کے دل بھی بڑے ہوا کرتے ہیں۔ ایک روز سردار کا منیجر ملنے آیا اور دینار کو یہ خوش خبری سنائی کہ سردار صاحب نے اسے معاف فرما دیا ہے اور چاہتے ہیں کہ برخورداروں کی طرح پارٹی کی ذمہ داریاں سنبھالے۔ یونیورسٹی میں دوبارہ داخلہ لے لے۔ صوبے میں پڑھے لکھے نوجوانوں کی کمی ہے۔ چلتے چلتے اس نے سردار کی جانب سے ایک معقول رقم دینا چاہی۔ مگر دینار نے انکار کر دیا۔

''کوئی بات نہیں بیٹا پھر آؤں گا۔'' منیجر نے حوصلہ نہ ہارا۔ ''لاٹھی مارنے سے کیا پانی جدا ہوتا ہے۔ سردار صاحب تمہیں اولاد کی طرح

چاہتے ہیں اگلے مہینے پھر سہی۔"

دینار کے ملاقاتی آتے تو اس کے لئے کچھ نہ کچھ لے آیا کرتے۔ چونکہ دینار کا تعلق غریب گھرانے سے تھا۔ چند سو روپیہ ایک دو ماہ بعد اسے مل جایا کرتا۔ دیزا میں سسٹم کے ذریعے قیدیوں نے فیصلہ کیا کہ ہر قیدی کچھ روپیہ پس انداز کرے گا اور جیسے تیسے کرایہ پورا کر کے دو ان بنگالی قیدیوں کو وطن بھجواتے رہیں گے۔ نہ ان کا ملک کرایہ دینے کی حامی بھر رہا تھا نہ ہی یہاں کوئی ایسا فنڈ تھا جس سے کرایہ دیا جا سکے۔ جیل کی اپنی مالی حالت خراب تھی۔ مرمت کے پیسے نہ تھے۔ یہ جیل 1927ء میں قائم کی گئی تھی۔ تب سے اسی حالت میں چلی آ رہی تھی جو انگریز یہ دراصل میں چھوڑ گئے تھے۔ بنگالی قیدی چونکہ محض نظر بند تھے اور کچے قیدی Unconvicted کی قانونی تعریف کے زمرے میں آتے تھے لہٰذا نہ تو ان سے باقاعدہ مشقت بھی لی جاتی جس کے عوض معافی ملتی اور قید کا عرصہ کم ہونے لگتا نہ ہی انہیں وردی ملتی۔ کیونکہ وردی تو پکے قیدیوں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔ بنگالیوں کا یہ مقدر کہاں! غالب کی طرح اپنے ہی لباس میں ٹانکے لگایا کرتے۔ بنگالیوں کو خبر ہو چکی تھی کہ سارے قیدی انہیں وطن بھجوانے کے چکر میں ہیں اور درپردہ کچھ کوششیں ہو رہی ہیں۔ کچھ حوصلہ ہوا تو ہوا مگر ابوالفضل ہمت ہار بیٹھا۔ جانے کہاں سے ڈی۔ ڈی۔ ٹی ہاتھ آ گئی۔ ایک ہی سانس میں ڈبہ خالی کر دیا۔ کچے احاطے میں ہنگامہ مچ گیا۔ بے ہوش ہونے سے پہلے اس نے سپاہیوں سے دبی آواز میں معذرت کی۔

"بھائی آپ نے اماکے معاف کریں۔ ہم ہی بڑا ہلکا سی لیم۔" پھر بنگالیوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "بھائی آپ نے اماکے معاف کریں ہم اب تو ماکے پرویشے لاگلا چھیڑ سے جاتی ہی۔"

ابوالفضل نے کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا پوری طاقت سمیٹ کر چھ کے چھ کلمے ورد کرتا چلا گیا۔ تا آنکہ بے ہوش ہو گیا۔ جیل میں خبر پھیلی تو قیدی غصے سے اکھڑ گئے۔ بنگالیوں کی حمایت میں انہوں نے کام چھوڑ دیا۔ ہسپتال کے ڈاکٹر نے جان توڑ کوشش شروع کر دی۔ جیلر کے لئے دو محاذ کھل گئے۔ ابوالفضل کی زندگی بچانا اور قیدیوں کو قابو میں رکھنا۔ بڑی سفارشوں سے اسے یہ زرخیز جیل ملی تھی۔ کیسے ہاتھ سے جانے دیتا۔ دن ڈھل گیا۔ ابوالفضل کی حالت مزید بگڑ گئی۔ ادھر قیدیوں نے بند ہونے سے انکار کر دیا اور اپنی اپنی بارکوں کے باہر دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ بعض قیدیوں نے خون دینے کی پیشکش بھی کی۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی۔ ڈپٹی جیلر نوجوان تھا ذرا سا جذباتی بھی تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ جیلر کے پاؤں اکھڑ جائیں۔ تا کہ سونے کی چڑیا کچھ عرصہ اسے ہی مل جائے۔

"کیوں نہ سختی سے کام لیا جائے۔ آپ حکم دیں تو بیٹا مار مار کر ایک ایک بیرک کے قیدیوں کو بند کر دیا جائے۔"

جیلر گرگ باراں دیدہ تھا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ سارے مارشل ریسز (Martial Races) کے لوگ ہیں۔ ہزاروں برس سے دوسروں کے لئے لڑتے چلے آ رہے ہیں۔ ہماری ساری تو مشقتیں ہیں جنگجو۔ میں حیران ہوں کہ سیاستدانوں نے کیسے انہیں بزدل اور کمزور بنا رکھا ہے۔ نرمی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ورنہ ان کا ردعمل تباہ کن ہو سکتا ہے۔ اب یہ ہے کہ آنے والے مہینوں میں ان کی یکجہتی توڑنے کی کوشش کرتے رہنا۔"

تجربہ کار اور ٹھنڈے دماغ کے افسروں کو بارکوں میں بھیجا گیا۔ جنہوں نے ایک ایک احاطے میں پہنچ کر نرمی سے قیدیوں کو سمجھایا۔ دلاسا دیا۔ تب کہیں قیدی رام ہوئے۔

"کون ان بنگالی قیدیوں کو وطن پہنچائے گا؟" ایک عمومی سوال اٹھتا۔ "اللہ" وہ آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہتے جیسے وہ اوپر کے فلیٹ میں رہتا ہو۔ اللہ کی حفاظت۔ پھر بھی خاموش اور مطمئن ہو جایا کرتے۔ قیدی اپنی اپنی بارکوں میں بند ہونے لگے۔ بارکوں سے تلاوت اور دعاؤں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ تمام زبانوں، تمام بولیوں میں ابوالفضل کی سلامتی کی دعا مانگی جا رہی تھی۔ جیلر تھا زیرک انسان۔ جانتا تھا کہ ابوالفضل کی موت پر آگ بھڑک اٹھے گی۔ قیدی مشتعل ہو کر اس سپاہی پر بھی پل پڑیں گے۔ جو بے چارہ مچھروں کو مارنے کے لئے ڈی ڈی ٹی لایا تھا۔ اسے کیا پتہ تھا کہ مچھر کے بجائے انسان مر جائے گا۔ مچھر تو ویسے ہی دندناتے پھرتے تھے۔

جیلر نے سپاہی دوڑائے۔ جو کہتے پھرتے کہ موت و زیست اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ بس ابوالفضل کا وقت آسان ہو جائے۔ تمام قیدی بھرپور جوش انداز میں زندگی کی دعا مانگ رہے۔ تھے مگر بھول کر ابوالفضل کی مشکل کٹنے کی دعا مانگنے لگے۔ بڑے ہسپتال لے جاتے تو بڑی بدنامی ہوتی۔ انکوائری شروع ہو جاتی۔ وہیں جیل کے ہسپتال میں کوششیں جاری رکھیں۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی کہ ابوالفضل نے آنکھیں پٹپٹائیں۔

"ہم ای کو تھالی۔ ای روشنی کیسے موں لگے ہے" اس نے نحیف آواز میں پوچھا۔ اس کی آواز ایک بجلی سی سرسراہٹ سے زیادہ نہ تھی۔ ڈاکٹر کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔ "تم جیل میں ہو۔ صبح ہو رہی ہے۔" ابوالفضل نے با آواز بلند کلمہ شہادت پڑھا۔ مگر یہ آواز اتنی بلند بھی نہ تھی کہ جیل کی دیواروں سے باہر نکل سکتی۔ ایک لمحے کو وہ کپکپایا پھر وہ ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔ پورے احاطے میں خبر ہوئی تو بنگالی آپس میں لپٹ لپٹ کر رونے لگے۔ مقامی کہلانے کے لئے ضروری ہے کہ اس صوبے میں زمین ہو۔ اگرچہ ابوالفضل غیر قانونی تارکین وطن کے زمرے میں آتا تھا تاہم اسے زمین الاٹ کر دی گئی۔ چھ فٹ لمبی اور چار فٹ گہری۔ جہاں وہ بغیر پاسپورٹ کے بھی رہ سکتا ہے۔ دینار بہت آزردہ تھا۔ کہ یوں تو سبھی بنگالی ایک ایک کر کے زیر پٹے رہیں گے۔ ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ کسی کے پاس اس کا حل نہ تھا۔ زبانی ہمدردی سے کیا ہوتا ہے۔ ایک روز دینار کو حل مل ہی گیا۔ اس روز وہ بہت ہی مسرور تھا۔ "اب سارے بنگالی قیدی وطن واپس پہنچ جائیں گے۔"

قیدی بہت خوش ہوئے۔ "کیوں کیسے حل نکل گیا۔"

"ہمیں" دینار بدستور مسکراتا رہا۔ "قاکمیت کے ساکن اور گھٹے گھٹے ماحول میں ہمیں پو (ریشم کا کیڑا) بن کر پیدا ہوا۔ سرداروں نے وقت کو ہزاروں برس سے روک رکھا ہے۔ تم جانتے ہو کہ ٹھہرے ہوئے پانی کو جوہڑ کہتے ہیں اور جوہڑوں میں صرف "پو" ہی پیدا ہوا کرتے ہیں۔ پھر میں نے کایا پلٹی اور ارتقاء کے ذریعے بندرغ (انسان) بن گیا۔ اب میں دوبارہ کایا کلپ کے ذریعے پو بن جاؤں گا۔"

کوئی قیدی کچھ نہ سمجھ سکا۔

"بھائی ذرا آسان زبان میں بات کرو۔"

"آسان زبان میں یہ کہ میں بندرغ سے پو بننے چلا ہوں۔" سارے قیدی ہنسنے لگے۔ وہ ہنسی میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا کرتے تھے۔ آخر ملنساری تو بہت بڑی چیز ہے۔ ہنسی ہی کے ذریعے ہی تو جیل کاٹی جاتی ہے۔

کہاں تو دن تیزی سے گزر رہے تھے۔ کہاں وقت ہی سست سا پڑ گیا۔ جیل کے گھنٹے بجتے رہے۔ نہ خوشگوار رومانس جیسے Death Knell۔ جیسے ڈوبتے جہاز کے آخری S.O.S۔ جیسے ریگ پٹڑیوں میں بے چارہ مددگار ڈوب رہا ہو۔ ہزار کلومیٹر کی تنہائیوں میں اکیلا!! پھر

ایک روز فیجو آیا۔ وہ جیلر کے کمرے میں اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ سامنے تازہ مہکتی ہوئی سبز چائے دھری تھی۔ ایسی مہکتی چائے کہ صرف رئیسانی ہی بنا پاتی ہیں۔ دینار مؤدب سا آ کر کھڑا ہو گیا۔ جیل کے قانون کے مطابق اس نے اٹینشن والی پوزیشن بنائی اور سوالیہ نظروں سے فیجو کو دیکھنے لگا۔

"آنکھیں نیچی کرو" جیلر دھاڑا۔ "ورنہ آنکھیں نکال دوں گا" دینار نے نظریں زمین پر گاڑ دیں۔

"آخر تم کب تک جیل میں سڑتے رہو گے۔ سردار صاحب معاف کر رہے ہیں تو اس موقع کا فائدہ اٹھاؤ۔"

دینار نے فوراً آمادگی ظاہر کی "مگر سردار صاحب نے ہی تو پانچ برس قید دلوائی ہے۔"

"دینار بیٹا!" فیجو حلاوت سے بولا "وہی عدالتیں ہیں۔ وہی سردار صاحب۔ اس پانچ کے آگے ایک یا پھر دو کا ہندسہ بھی تو جڑ لگایا جا سکتا ہے۔ کیوں جیلر صاحب!" "اس میں کیا شک ہے۔ قیدیوں کو اکسانا، بغاوت کرانا، غیر ملکی جاسوسوں کی مدد کرنا یا پھر جیل چوکی کو توڑنا۔" "ٹھیک ہے جناب۔ میں فیجو صاحب سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔" جیلر نے فراخدلی سے اجازت دے دی۔ وہ عام ملاقاتوں والے حصے میں آ گئے۔ "میں سردار صاحب کے لئے کام کروں گا۔ نفرتیں پھیلاؤں گا۔ توڑ پھوڑ اور ہڑتالیں کراؤں گا۔ پروفیسروں کو بے عزت کروں گا۔ مگر قتل و غارت نہیں کروں گا۔" "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ شکر ہے تم نے میرے سفید بالوں کی عزت رکھی۔" پھر بہت دیر تک فیجو اسے دنیا کے نشیب و فراز سمجھاتا رہا۔ فیجو نے جیب سے نوٹوں کی گڈی دینار کے ہاتھ پر رکھ دی جو سردار صاحب نے اسی مقصد کے لئے بھجوائی تھی۔

"یہ تین ہزار روپیہ رکھ لو۔ سردار صاحب نے تمہارے ہی لئے بھجوایا تھا۔" پھر فیجو نے ہزار ہزار کے دو نوٹ کھینچ لئے "یہ تمہارے بوڑھے ماما کا خرچہ ہے۔ سردار صاحب سے ذکر نہ کرنا۔"

دینار سپاہی کے ہمراہ واپس جیل کے اندر لوٹا تو مسرور اور مطمئن تھا۔ وہ یوں سینہ تانے چل رہا تھا کہ مانو وہ ہی سب سے بڑا فاتح ہے۔ بچے قیدیوں کے احاطے سے گزر کر وہ بنگالی قیدیوں کے احاطے کے سامنے رک گیا۔ مضبوط فولادی سلاخوں والے دروازے کو تھام کر اس نے پکارا "فریدالدین او فریدالدین ادھر آ ذرا۔" فریدالدین بارک کے برآمدے میں فرش پر بیٹھا نہایت ہی انہماک سے تلاوت کر رہا تھا۔ اس نے دینار پر نگاہ ڈالی ادب سے قرآن حکیم بند کیا۔ ایک بوسہ دیا اور کھڑکی میں رکھ کر تیز قدموں سے چلتا سلاخوں والے دروازے کے پاس آ گیا۔

"کیا بات ہے دینار بھائی! اچھے تو ہو؟" "جی ہاں فریدالدین۔ میں اچھا ہوں۔ یہ تم کیا بک بک کرتے رہتے ہو۔ بہاریوں کے خلاف نفرتیں پھیلاتے رہتے ہو۔ یاد رکھنا تمہاری گردن توڑ دوں گا۔" فریدالدین پژمردہ ہو گیا۔ "بھائی ہم تو اپنی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ پھر بھی میں معافی چاہتا ہوں۔"

دینار گرجا۔ "جاؤ آخری دفعہ معاف کر دیا ہے۔ لاؤ ہاتھ ملاؤ۔" دونوں ہاتھوں سے دینار نے فریدالدین سے ہاتھ ملائے اور ہاتھ ملانے میں چپکے سے ہزار ہزار کے اٹھارہ نوٹ فریدالدین کے ہاتھوں میں دے دیئے۔ دینار نے سرگوشی کی۔

"ایسے بنگالیوں کو وطن بھجوا دو جو باقیوں کے لئے کچھ کام کر سکیں۔ ابھی کل چھ ہزار کا اور آتا ہے۔"

"تم نے اتنی بڑی رقم کہاں سے لی؟" فرید الدین کی آواز کانپ گئی۔ "میں نے ایک بہت بڑا سودا کیا۔ کچھ بیچ دیا ہے۔" فرید الدین پر شادی مرگ طاری ہو گئی۔ پھر سارا آنسو اس کی آنکھوں سے لپٹ گئے۔ حیرت انگیز طور پر نہ وہ گرے، نہ وہ بہے۔ جیسے سمندروں کا پانی کوئی گول دائرے سے لپٹا رہتا ہے۔ گرتا بھی نہیں، چھلکتا بھی نہیں۔ جانے من کی کوئی گرہ بندھی تھی جس نے آنسوؤں کو چھلکنے نہ دیا۔ سپاہی لاتعلقی سے بیزاری جتانے کی کوشش میں نا کام رہا تو جھلا کر متوجہ ہوا۔ "دینار! تم میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے۔ چلو اپنی بیرک میں۔ تم نے آتے ہی قوم پرست، سردار کو بے عزت کر رہے ہو اور دھونس جماتے ہو کمزور بنگالیوں پر۔" سپاہی نے لوہے کے جنگلے میں ہاتھ ڈال کر زور سے فرید الدین کو پرے دھکیل دیا۔ جس سے وہ گرتے گرتے بچا۔

"چلو دینار۔" سپاہی نے آنکھیں دکھائیں۔ دینار کو یوں لگا اچانک وہ بہت ہلکا ہو گیا ہے۔ چاہے تو جست بھر کر جیل کی دیواروں کو پھلانگ سکتا ہے۔ چاہے تو پہاڑوں کی چوٹیوں پر جا سکتا۔ اس کے موڈ کی تبدیلی پر سپاہی بھی حیران رہ گئے۔

اس رات وہ بہت دنوں بعد گہری نیند سویا۔ اس نے سپنوں کا شہر آباد دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ بنگالی قیدی لمبی گردنوں والے سفید پرندوں میں منقلب ہو گئے۔ انہوں نے ایک الوداعی نظر اس پر ڈالی۔ ان پرندوں کی آنکھوں میں تشکر تھا اور وطن پہنچنے کی مسرت تھی۔ وہ بنگال روانہ ہو گئے، دریاؤں کے وطن میں جہاں ان کی بیوی بچے، بوڑھے والدین اور محبت کرنے والے دل ان کے منتظر تھے!! پھر دینار نے دیکھا اس کے گاؤں کے آس پاس جو جوہڑ ہیں جو بکھرے پڑے ہیں۔ ابلتے ہوئے دلدل ہیں۔ جو جوہڑوں میں کلبلاتے ڈوب ابھر رہے ہیں۔ جوہڑوں کی سڑاند سے دماغ پھٹا جا رہا ہے۔ یہ ایک دوسرے کو کھا رہے ہیں۔ کھا کھا کر موٹے ہوتے ہیں تو اژدہا کی طرح لوٹ لوٹ کر پھٹنے لگتے ہیں۔ اس نے گندے جوہڑ میں اپنے آپ کو کلبلاتے دیکھا۔ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا ماتھا پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔ ہونٹ سے وہ بے یقینی کرتے کو تھا۔ وہ خواب تھا یا حقیقت یہ ہوش تک ہے۔ میں پرندہ ہوں یا بندر؟ کیا تم جنہیں ہم خواب سمجھتے ہوں وہی ہماری اصل زندگی ہو؟ آخر میں کیا ہوں؟ وہ جھلا سا گیا۔ اگلے روز سہ پہر میں جب ملاقات کے اوقات ختم ہو جاتے ہیں اسے گیٹ پر بلایا گیا۔ وہاں تو خاموشی پڑی تھی۔ چاق و چوبند سپاہی مستعد کھڑے تھے۔ جیل کا بڑا گیٹ اسے کسی سائیکلوپس کی طرح گھور رہا تھا۔ اسے جیلر کے دفتر میں داخل ہونے کا اشارہ کیا گیا۔ وہ اجازت لے کر اندر داخل ہوا اور قانون کے مطابق نظریں زمین پر گاڑ دیں۔ جیلر کاغذوں میں الجھا ہوا تھا۔

دینار کو دیکھ کر ذرا مسکرایا۔ "جاؤ بھاگ نکلو، میں نے تمہیں آزاد کیا۔" دینار کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ جوہڑ کی سڑاند جاتی رہی۔

"مگر میری سزا..." "کیا سزا اور کیا جزا۔ سردار صاحب نے جیل والوں پر رہائی کے احکامات جاری کروا دیے ہیں۔ یہ لو۔"

دینار نے نہایت ادب سے بڑھ کر کاغذ لے لیا۔ کاغذ کا حقیر سا ٹکڑا جس نے اس کو بند کر دیا تھا۔ کاغذ کا ایک اور ٹکڑا اسی سائز کا جو آج اسے آزاد کر رہا تھا۔ انسان بھی کاغذوں کا غلام ہے۔ حتیٰ کہ آخر میں اپنے آپ کو بھی بیچ ڈالتا ہے۔ یوں لگا جیسے کوہ میں طغیانی آ گئی ہو، بولان کناروں کو کاٹتا ابل آیا ہو۔ چٹانوں کے ٹوٹنے کا قیامت خیز شور کم ہوا تو دینار نے دیکھا اس کے ہاتھ میں آزادی کا پروانہ ہے۔ اور وہ جیل کی وردی میں جیلر کے سامنے کھڑا ہے۔ دینار نے پہلی بار جیلر سے التجا کی "سر میں اسی لباس میں باہر نکل جانا چاہتا ہوں۔"

"اس کی وجہ؟" جیلر کو استعجاب ہوا۔ "میں قیدیوں کا سامنا نہیں کر سکتا۔"

"جیلر اچھے موڈ میں تھا۔" جاؤ ایک وردی قربان اسیری نشانی سمجھ کر رکھ لینا۔ کبھی دوبارہ سزا ہوئی تو ساتھ لیتے آنا۔"

دینار جیل کے دیو قامت دروازے کا چھوٹا دروازہ کھلتے ہی یوں باہر نکل آیا جیسے پولیس سائیکلوں کے پیچھے سے فرار ہوا تھا۔ باہر آزادی ناچتی تھی۔ گرم ہوائیں ریت کے ذروں اور ٹیک مال کی طرح جیل کی دیواروں پر بکھیر رہی تھیں۔ جیسے وہ ہوا ان سے جیل کا وجود ہی مٹا دینا چاہتی ہوں، جیسے دیواروں کی سنگینی کو ختم کر کے اس کا پاپ دکھا دینا چاہتی ہوں۔ باہر شور تھا، ہنگامہ تھا۔ جو جرم میں پلتے کیڑوں کی طرح انسان ایک دوسرے کو سوچے سمجھنے کی الجھن میں تھے۔ خواہشات کے گرداب میں چکر کھاتے انسان۔ جیل کے اندر کیسا سکون تھا۔ نہ عقیدوں کا جنون نہ قومیتوں کا آسیب۔ نہ ہی Cut Throat Competition جس نے انسانوں کو قصائی بنا رکھا ہے۔ جیل کا گیٹ ایک فلٹر ہے۔ یہ سب کچھ جیل کے گیٹ سے نہیں گزر سکتا۔ جانے لوگ پھر اپنے گھروں پر جیلوں کے گیٹ کیوں نہیں لگا لیتے۔ اس فریب کو لاکھوں زہر کھا کر جی رہے ہیں۔ اگلی نسلوں میں کیا پھانسا کریں گے؟ جیل میں بھی پریشان حال تھے ایک دوسرے کی مدد کے طالب۔ ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار۔

کاش خالق جیلر ہوتا اور ساری دنیا ایک جیل ہوتی۔ جہاں یہ دل پر کوئی سردار کسی کو نہ پکڑ سکتا۔ سامنے جو نگاہ دوڑائی تو دور رشتوں کے پیچھے سردار کا شمیر احسن لیے کھڑا تھا۔ جیسے کوئی فرشتہ ویل کر ڈاکٹر فاؤسٹ کو لینے آیا ہو۔ دینار پلٹ پڑا۔ اس نے جست بھر کر جیل کا چھوٹا دروازہ کھٹکھٹانا چاہا۔ بے جان بے حس لوہا ایک کھٹکا جو انسان کے گناہوں سے پہلے ہی بیاہ ہو چکا تھا۔ دینار ہتھیلیوں سے دروازہ پیٹنے لگا۔

"دروازہ کھولو۔ دروازہ کھولو۔" آواز پہچان کر دربان نے دروازہ کھول دیا۔ دینار بھاگ کے اندر آیا۔

"کیا بات ہے دینار۔ ہوش میں تو ہو۔" سپاہی بگڑ گئے۔

"میں جیل میں رہنا چاہتا ہوں۔ حکم نامہ واپس لے لو۔" دینار شور مچانے لگا۔

"یہ جیل ہے ہوٹل نہیں۔ باہر نکلنے سے اندر آنا زیادہ مشکل ہے۔" شور سن کر جیلر اپنے دفتر سے باہر نکل آیا۔ خلاف توقع وہ اچھے موڈ میں تھا۔

"بھاگ جاؤ ورنہ ابھی وردی واپس لے لوں گا۔"

جیلر کا اشارہ پاتے ہی دربانوں نے زور دار دھکوں سے دینار کو باہر نکال پھینکا۔ دینار کپڑے جھاڑتا جانے کس سے گفتگو کرنے لگا۔

O God / If thou with not have mercy on my Soul
Impose some end to my incessant pain / Let Faustus live in a hell thousand years
A hundred thousand, and at last be saved / O, no need is limited to damned Souls!

آزادی کا پروانہ وحشی ہوا میں لے اڑیں۔ دینار غائب اور آ بے گھر کی جانب۔ ریتی اور شور ان کے پہاڑوں میں جہاں وہ ہم جا سوتی ہے۔ شمیر یہ سارا منظر دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے بڑھ کر دینار کو سنبھالا دیا۔ اس کی وردی جھاڑی اور خوش دلی سے کہا۔

"دیر ہو رہی ہے آؤ دینار چلو چھوٹی جیل سے بڑی جیل میں۔"

(نوٹ:۔ شیطان کے ساتھ جاتے ہوئے ڈاکٹر فاسٹس کا آخری فقرہ۔)

◆◆◆

جودھا بائی

یٰسین احمد (انڈیا)

مختصر تعارف

یٰسین احمد 25 ستمبر 1946ء کو حیدرآباد دکن، انڈیا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے 5 افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ جن میں پہلا افسانوی مجموعہ "گمشدہ آدمی" پانچواں مجموعہ "سایوں بھرا دالان" ہے۔ دیگر مجموعے بھی پذیرائی کی سند حاصل کر چکے ہیں۔

سنگھ اولادِ نرینہ سے محروم تھا جس کے احساس نے اس کو ایک شدید اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ شادی ہوئے پندرہ سال سے زائد عرصہ ہو چکا تھا۔ دونوں لڑکیاں شادی کے قابل ہو چکی تھیں۔ سنگھ نے نہ فیملی پلاننگ کی تھی اور نہ مانعِ حمل کے لئے دواؤں کا استعمال کیا تھا۔ مگر وہ مایوس بھی نہیں تھا۔ ٹھکرائن تیسری اولاد کے جنم کے قابل تھیں۔ پوری امید تھی کہ اولادِ نرینہ اس کے نصیب میں ہے۔

میں تو چپ رہتا لیکن درانی کو اس کی خوش مزاجی خاموش رہنے نہیں دیتی۔ مزاحیہ لہجے میں کہتا "یقیناً ٹھکرائن ایک لڑکے کی ماں بنے گی لیکن اس وقت جب وہ "دادا" بن جائے گا۔ کتنا دلچسپ نظارہ ہوگا جب بھابی راجیہ کی ہسپتال میں ایک طرف اپنی اولاد کو لیں گے اور دوسری طرف اپنا نواسا۔۔۔۔۔

ہم تینوں بے تکلف دوست تھے۔ ہماری دوستی کئی دہائیوں پر نہیں برسوں پر محیط تھی۔ ادب سے لگاؤ نے ہم تینوں کو ایک مثلث میں جکڑ دیا تھا۔ سنگھ کا پورا نام ٹھاکر سروپ سنگھ تھا۔ لیکن اکثر ٹی ایس سنگھ کے نام سے اپنا تعارف کراتا جہاں نام لکھنا پڑتا وہیں نام لکھتا ٹی ایس سنگھ۔ ہم بھی سنگھ کہتے کبھی کبھی ٹھاکر اور اس کی بیوی کو میں بھابی کہتا لیکن درانی ٹھکرائن کہتا۔ فیملی روابط تھے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا لگا رہتا۔ ممکن ہے اولادِ نرینہ کی خواہش ٹھکرائن کے دل میں مچلتی رہتی ہو لیکن میں نے کبھی بھی بھابی کو اپنی اس کمی پر فکرمند دیکھا اور نہ سنا۔ وہ اپنی بیٹیوں کے ساتھ اپنی دنیا میں مست رہتی تھیں۔ یہ سنگھ ہی تھا کہ اکثر واویلا کرتا رہتا۔ کرایہ کے مکان کے بالائی حصہ پر رہائش تھی۔ نچلے حصہ میں اس کے مالک مکان کا قبضہ تھا۔ ہمارے متعلقہ محکمے میں مکان خریدنے یا تعمیر کرنے کے لئے قرض دینے کا اعلان ہوا۔ میں نے سنگھ سے کہا: "قرض کے لئے درخواست دے دو۔ جو رقم کرایہ کی صورت میں جاتی ہے اس سے قرض کی ادائیگی ہو جائے گی اور ایک ذاتی مکان کے مالک بھی بن جاؤ گے۔"

"کس کے لئے جائیداد رکھوں؟ لڑکیاں تو ایک دن اپنے گھر چلی جائیں گی۔"

سنگھ کے لہجے میں جو دکھ تھا وہ ہم سے چھپ نہ سکا۔ لمحہ بھر کے لئے ہمارے اطراف خاموشی مسلط ہوگئی۔ ایسے ہی موقعوں پر

درانی کی شوخیانہ فطرت پھڑک گئی تھی۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”ہم دونوں میں سے کسی ایک کا لڑکا گود لے لو۔“

”مسلمان ہو کر پرورش کروں یا راجپوت ۔ ۔ ۔ ۔ ؟“ شاید سنگھ سنجیدہ تھا۔

”شہزادہ سلیم بنا کر۔“ درانی نے فوراً جواب دیا۔ ”جودھابائی نے بھی یہی کیا تھا۔“

میں محفل کی باتیں محفل میں چھوڑ جانے کا عادی ہوں۔ لیکن سنگھ کا معاملہ بالکل برعکس تھا۔

اتوار کا دن تھا۔ ہم سنگھ کے مکان میں تھے۔ اتنے میں بھابی چائے لے کر کمرے میں آئیں۔ اُن کے چہرے پر غصہ آمیز سنجیدگی دیکھ کر میں تاڑ گیا کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ ہمارا اسلام کا جواب بھی انہوں نے سر کی ایک جنبش سے دیا تھا۔ چائے ہمارے ہاتھوں میں تھما کر وہ پلٹیں۔ دروازے تک گئیں اور پھر مڑیں مجھ سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ”بھیا میرے چار بھائی ہیں ہر بھائی کو دو دو تین تین لڑکے ہیں اگر میں نے کسی لڑکے کو گود لینا چاہا تو؟ ساتی سے لے سکتی ہوں۔ میں کیوں کسی مسلمان کا بچہ گود لوں گی۔“

ہم پر یکلخت سکتہ چھا گیا۔ مذاق میں کہی گئی ایک بات اتنی گمبھیرتا سے یہاں تک پہنچ جائے گی ہمارے گمان میں نہ تھا۔ بیوی کا لہجہ دیکھ کر سنگھ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ میں نے فوراً چائے کی پیالی سنگھ کے ہاتھ میں تھما دی۔ اگر ایسا نہ کرتا تو دونوں میاں بیوی میں نوک جھونک چھڑ گئی تھی۔ سنگھ گوشت خور تھا۔ جھٹکا، مچھلی اور ماس کھاتا تھا۔ لیکن ٹھنڈے مزاج کا تھا۔ بیوی شاکاہاری تھی۔ سبزیوں کے سوا کسی اور چیز کو ہاتھ نہ لگاتی گھر خون میں کرتی تھی۔ کبھی میاں بیوی میں نوک جھونک ہوتی تو جیت ٹھکرائن کی ہوتی۔ دونوں بیٹیاں دیوار کی بلیاں بنی رہتیں کبھی ماں کی طرف تو کبھی باپ کی طرف۔ ٹھکرائن کی عدم موجودگی میں درانی سنگھ کا مذاق اڑاتا تو جواب ملتا۔

”کیا کروں چار بھائیوں کی اکلوتی بہن ہے۔ ہاں ڈرتا ہوں ایک بھائی فوج میں ہے تو دوسرا پولیس میں تیسرا آئی ڈی میں تو چوتھا وکیل۔“ سنگھ اپنے سالوں سے مرعوب تھا اور نہ بیوی سے ڈرتا تھا مصلحت پسند تھا۔ اس کی یہی مصلحت پسندی پندرہ سالہ ازدواجی زندگی کی کامیابی کا راز تھی۔ دوسری طرف ٹھکرائن کی وفاداری اور محبت پر رتی برابر بھی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ حالانکہ بھابی سبزیاں کھاتی تھیں لیکن شوہر کے لئے مٹن، چکن، فش اور جھینگے کا سالن بناتی تھیں۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اس کے بغیر شوہر کے حلق سے ایک لقمہ بھی نہیں اترتا تھا اور اس وقت ٹھکرائن کی حالت قابل دید ہوتی۔ ہاتھوں پر دستانے ہوتے ناک اور منہ پر کپڑا بندھا ہوا ہوتا۔ شوہر کی خوشنودی ان کو ہر حالت میں عزیز تھی۔

ٹھکرائن فطرتاً نیک عورت تھیں اور ہمدرد بھی۔ لیکن مذہب کا معاملہ آتا تو یکدم کٹر پسندی پر اتر آتیں۔ سال میں جتنے بھی مذہبی رسوم آتے ہیں وہ ٹھکرائن کو ازبر تھے۔ ان رسومات کی ادائیگی کے وقت ٹھکرائن کی شخصیت یکدم بدل جاتی۔ آئے دن گھر پر بھجن ہوتا۔ ست نارائن کتھا چلتی۔ سری رام نومی، نوراتری، ہنومان جینتی، ستیا میا پوجا، دیپاولی، دسہرہ، تلسکرات پر گھنٹوں بلکہ دو دو تین تین دن تک پوجا پاٹ چلتا رہتا۔ اس وقت گھر کا ماحول یکدم پوجا گھر بن جاتا تھا۔ بے شمار مورتیوں سے کمرے کا ایک گوشہ سجا دیتیں۔ اگر بتیوں اور کافور کے دھوئیں سے کمرہ بھرا بھرا رہتا۔ پوجا پاٹ کے ان دنوں میں اپنا بستر پلنگ پر نہیں فرش پر لگا دیتیں۔ وہ خود بھی نیچے سوتیں سنگھ کو بھی وہیں سونا پڑتا یا پھر اس چھوٹے سے کمرے میں بستر لگ جاتا جس کو انہوں نے ڈرائنگ روم بنا رکھا تھا۔ شوہر کی درازی عمر کے لئے کڑوا چوتھ پر برت رکھتیں۔ اماوس کے دنوں میں سورج ڈوبنے سے پہلے ہی کھانا پکا ہوا کھا لیتیں۔

سنگھ ان تمام چیزوں سے بہت دور تھا۔ بیوی ماتھے پر ایک آدھا تلک کبھی کبھی لگا دیتیں تو خاموش رہتا لیکن پانچ دس منٹ بعد ماتھے کا ٹیکہ نظر نہ آتا۔ دسہرے کے تیوہار پر میں، درانی اور دفتر کے دو تین احباب اس کے خصوصی مہمان ہوتے۔ سنگھ خود اپنے ہاتھ سے خصوصی کھانے بناتا۔ ٹھکرائن ڈرائنگ روم میں پروس دیتیں۔

سنگھ کو ہمارے گھر کے پکوان بہت پسند تھے۔ رمضان میں وہ درانی کے ہاں چلا جاتا۔ عید قرباں کے موقع پر میرے گھر آ جاتا۔ میں اکثر پوری فیملی کو مدعو کرتا لیکن ٹھکرائن کوئی نہ کوئی بہانہ بنا کر ٹال جاتیں۔ ایک دفعہ آئیں تو صرف شوہر کے ساتھ بیٹیاں ساتھ نہیں تھیں۔ میری بیوی نے پکوان کا بہت اہتمام کیا تھا لیکن ٹھکرائن نے کھانے پینے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔ میری بیوی نے بہت اصرار کیا تو کہہ دیا ان کا اپواس ہے۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ ان سب کے جانے کے بعد میری بیوی نے کہا۔ "آپ نے خواہ مخواہ بھابی کو مدعو کیا۔ آج برت رکھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اصل میں وہ مسلمانوں کی بنائی ہوئی چیزیں کو نہیں کھانا چاہتیں۔"

میں خاموش رہا۔ حالانکہ میں نے بھی اس بات کو بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔ سنگھ سے میری دوستی تھی اور اس دوستی کو میں ان عورتوں کی تنگ ذہنیت پر قربان نہیں کر سکتا تھا۔ ویسے بھی بھابی سے مجھ کو کبھی شکایت نہیں رہی۔ میں ان کی زندگی کے پس منظر سے واقف تھا۔ تین ساڑھے تین سال کی تھیں ماں باپ چل بسے تھے۔ بھائیوں نے پرورش کے لئے ایک عورت کے حوالے کر دیا جو کٹر دھارمک تھی دھرم پرچارک تھی۔ چھوٹی عمر میں بھابی کو جو سبق سکھایا گیا تھا آج بھی وہی یاد تھا۔ مگر جب دھرم کے اس دائرے سے باہر نکلتیں تو بھابی بڑے کھلے دل و دماغ کی محسوس ہوتیں۔ ہمارے ساتھ ہندی فلمیں دیکھتیں، سینما ہال کی کینٹین سے مرنڈا یا کوکا کولا کی بوتلیں لے کر پیتیں اور چاٹ پاپ کورن کھاتیں۔ لطیفے سناتیں اور دل کھول کر قہقہے لگاتیں اور اس وقت ہم کو ایسا محسوس ہوتا جیسے ہمارے درمیان کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے۔ میں اور سنگھ RTC سے وابستہ تھے۔ کنڈکٹری سے اس کی ملازمت شروع ہوئی تھی لیکن ترقی ملی تو ٹکٹ چیکر بن گیا۔ ڈیوٹی صبح آٹھ بجے شروع ہوتی اور دو بجے ختم ہو جاتی۔ دو بجے سے میری ڈیوٹی شروع ہوتی اور آٹھ بجے ختم ہو جاتی۔ ڈیوٹی ختم ہو جانے کے بعد وہ اکثر بہت دیر تک میرے ساتھ رہتا۔ چائے یا کافی کا دور چلتا اور تعطیلات میں نئی فلم دیکھنے کا پروگرام بنتا۔

مارچ کے آخر میں سنگھ نے ایک ہفتے کی چھٹی لے لی۔ وہ سائی بابا کے درشن کے لئے شرڈی جا رہا تھا۔ مجھ کو معلوم ہوا تو میں حیران رہ گیا۔ بھابی تو اکثر مندروں میں جایا کرتی تھیں۔ سنگھ کو ساتھ چلنے کے لئے مجبور کیا کرتی لیکن وہ چھٹی نہ ملنے کا بہانہ بنا لیتا تھا۔ آج سنگھ پوری فیملی کے ساتھ شرڈی جا رہا تھا۔ میرا حیرت زدہ ہونا غیر فطری نہیں تھا۔ وہ شرڈی چلا گیا۔ ایک ہفتے بعد لوٹا تو بے حد مسرور دکھائی دیا۔

ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد مجھ سے ملا تو مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ "شرڈی میں ایک سادھو سے ملاقات ہوئی تھی، اس نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا ہے کہ عنقریب ایک لڑکے کا باپ بننے والا ہوں۔"

اتفاق سے درانی مجھ سے ملنے وہاں آ گیا تھا۔ وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "فتح پور چلے جاتا تھا اکبر نے وہیں پر سلیم کو مانگا تھا۔"

ماہ مارچ گزر گیا۔ گرمیاں ختم ہو گئیں۔ موسم برسات آیا۔ خشک مقاموں پر سبزہ اگنے لگا۔ سنگھ کی زندگی میں شادابی کے آثار نظر آئے۔ ٹھکرائن امید سے تھیں۔ سنگھ کے گھر کے قریب سرکاری دواخانہ بھی تھا اور ویلفیئر ہسپتال بھی۔ لیکن سنگھ کسی قسم کا رسک لینا نہیں

چاہتا تھا۔ اس نے ٹھکرائن کے چیک اپ کے لئے ایک سوپر اسپیشلٹی ہسپتال کا انتخاب کیا تھا۔

تین چار مہینے گزر گئے۔ ٹھکرائن میکے چلی گئیں۔ لڑکیاں باپ کے ساتھ رہیں۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی تھی یہ ٹھکرائن ہی جانتی تھیں۔ ممکن تھا جوان بیٹیوں کی موجودگی میں ماں بننے میں شرم جھجک محسوس کر رہی تھیں یا پھر میکے میں چار بھابیاں میسر تھیں۔ وہاں پورا آرام مل سکتا تھا۔ ایک دن شام کے وقت سنگھ اس وارڈ آ گیا جہاں میری ڈیوٹی چل رہی تھی۔ کافی برہم دکھائی دے رہا تھا آتے ہی از خود بول اٹھا۔ "سالی انڈا بھی کھانے کو تیار نہیں۔ گھاس پتے چبانے سے کیا خون آئے گا۔"

سارا غصہ بیوی کی وجہ سے تھا۔ اس دن بیوی کو چیک اپ کے لئے دواخانہ لے گیا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ ٹھکرائن کے جسم میں خون کی کمی ہے۔ میں نے اس کو سمجھایا کہ دنیا میں پچاس فیصد سے زیادہ لوگ ماس نہیں کھاتے۔ انڈا مچھلی کو بھی نہیں چھوتے اور وہ صحت مند زندگی گزار رہے ہیں۔ دوائیں، بہترین ٹانک، پھل اور سبزیوں کے استعمال سے ٹھکرائن کے خون میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ میرے سمجھانے پر اس کا غصہ اور پریشانی کچھ کم ہوئی۔ ڈلیوری کے دن قریب آ رہے تھے۔ سنگھ کی حواس باختگی بڑھتی جا رہی تھی۔ بھابی کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی تھی۔ ایک دن ان کو دواخانے میں داخل کر دیا گیا۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ دواخانہ پہنچا۔ وہاں بھابی کے بھائی اور بھابیاں سب موجود تھے۔ وہ سب پریشان تھے۔ ڈاکٹر کا مشورہ تھا کہ بھابی کو فوراً خون چڑھانا ضروری ہے۔ نقاہت اور کمزوری خون کی کمی کی وجہ سے ہے۔ سب خون دینے کے لئے تیار تھے۔ لیکن گروپ کسی کا نہیں مل رہا تھا۔ اگر کسی کا گروپ مل رہا تھا تو وہ میری بیوی تھی۔ میری بیوی بہت دیر تک سوچ میں غلطاں رہی اور مجھ سے بولی۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں خون دینے کے لئے تیار ہوں۔" میرے لئے خوشی کی بات تھی کہ آڑے وقتوں پر بھابی کے کام آ رہی تھی۔ میں نے اجازت دے دی۔ مگر میری بیوی پھر کچھ سوچنے لگی۔ کچھ لمحوں کی تاخیر کے بعد بولی۔ "کہیں بھائی کو اعتراض تو نہیں ہوگا؟" میرا پارہ یکدم چڑھ گیا غصے سے بولا۔ "بلڈ بینک سے جو خون منگایا جائے گا اس پر کسی مذہب کا نام نہیں لکھا ہوتا۔"

میری بیوی خون دینے کے لئے راضی ہو گئی۔ پھر خون دینے کا عمل شروع ہوا جو چار پانچ گھنٹوں تک چلتا رہا۔ اس کے بعد دواخانے سے باہر نکلے تو میری بیوی ہلکی سی نقاہت محسوس کر رہی تھی لیکن چہرہ غیر معمولی فخر و انبساط سے تمتما رہا تھا۔ ٹھکرائن پر غنودگی طاری تھی اس لئے اس سے ملے بغیر ہم گھر چلے آئے۔

ایک ہفتہ نہیں گزرا بھابی ماں بن گئیں۔ لڑکا ہوا۔ بالکل نارمل طریقہ پر۔ آپریشن یا سیزرنگ کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ سنگھ کی مسرت کی انتہا نہ تھی۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ پھولوں کا گلدستہ اور مٹھائی لے کر دواخانہ پہنچ گیا۔ روم میں پاؤں سے گردن تک چادر اوڑھے بھابی لیٹی ہوئی تھیں اور بچہ پالنے میں سو رہا تھا۔ میری بیوی نے مٹھائی اور پھولوں کا گلدستہ ایک طرف رکھ کر پالنے میں جھانکا اور بے ساختہ 'ماشاء اللہ' کہا اور پھر بھابی کو مبارک باد دی۔ بھابی کے سوکھے سوکھے لبوں پر شکریہ کا لفظ آیا تھا۔ چادر سے ایک ہاتھ باہر نکال کر میری بیوی کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ کرسی کھینچ کر میری بیوی پلنگ کے قریب بیٹھ گئی۔ بھابی نے اپنے ایک ہاتھ سے میری بیوی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس وقت ٹھکرائن کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے وہ آہستہ آہستہ کہہ رہی تھیں۔ "سلیم کی صرف ایک ہی ماں تھی، جودھا بائی۔ لیکن میرا بیٹا بڑا خوش نصیب ہے اس کو دو دو مائیں مل گئیں۔"

◆◆◆

نیا موبائل فون

ممتاز راشد لاہوری

مختصر تعارف

ممتاز راشد لاہوری 25 نومبر 1953ء کو مزنگ لاہور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے اب تک 13 شعری اور 13 نثری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ شاعری کے مجموعے "کلیات ممتاز راشد" اور نثر کے مجموعے "لاہور کے پیارے گیت" کو بہت پذیرائی ملی۔ ممتاز راشد لاہوری ادبی رسالے "خیال و فن" (سہ ماہی) کے مدیر ہیں۔

لاہور کی ایک بڑی اور قدرے جدید آبادی کی بڑی سڑک سے کوئی آدھ کلومیٹر اندر ایک گلی میں میرا گھر ہے۔ اس طرف ایک چھوٹی سڑک جاتی ہے۔ میرا بڑی سڑک کی طرف پیدل جانا بہت کم ہوتا ہے۔ زیادہ تر اپنی سواری کے ذریعے ہی آمد و رفت رہتی ہے۔ مگر اس روز فرصت تھی تو ویسے ہی میں ادھر پیدل چلا گیا اور فٹ پاتھ سے گزرتا ہوا دکانوں کا رک رک کر جائزہ لینے لگا۔ ایک فوٹو گرافر کی دکان کے بیرونی شیشے پر ایک سفید کاغذ چپکا ہوا تھا جس پر ہاتھ کی تحریر سے درج تھا:

"80 روپے میں پاسپورٹ سائز کے چھ فوٹو صرف پندرہ منٹ میں"

یہ بہت مروجہ ریٹ سے تقریباً چالیس فیصد کم تھا۔ مجھے اپنی تصویروں کی کوئی فوری ضرورت تو نہیں تھی مگر سوچا کہ بنوا لیتا ہوں کبھی کام آ جائیں گی۔ دکان کے اندر گیا تو کاؤنٹر پر بیٹھے فرد نے بتایا کہ اندر متصل کمرے میں کوئی صاحب فوٹو بنوا رہے ہیں۔ آپ ذرا انتظار کر لیں۔ قریب ہی چار کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک پر میں بیٹھ گیا۔ اتنے میں عام سے حلیے کے پانچ افراد اندر آئے۔ ان کے لباس میلے کچیلے تھے۔ چہروں پر پسینہ بھی تھا اور تھکان بھی۔ ان میں سے ایک نے فوٹو بنوانے کے ریٹ پوچھے اور پھر رعایت مانگی۔ انکار پر باہم مشورہ کرنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک نے کہا کہ ہم ایک کمپنی میں یومیہ مزدوری کرنے والے ہیں۔ کمپنی نے کارڈ بنوانے کے لیے فوری طور پر سب کے فوٹو مانگے ہیں۔ ہمارے کچھ ساتھی تھوڑی دیر پہلے مینٹل کٹ سے پچاس پچاس روپے کے فوٹو بنوا کر گئے ہیں اور آپ اسی اسی روپے مانگ رہے ہیں۔ ہم پانچوں کے فوٹو بننے ہیں، کچھ رعایت کریں، ہمیں زیادہ معیاری فوٹو نہیں چاہئیں۔ دکاندار نے کچھ سوچ کر کہا کہ چلو ساٹھ ساٹھ روپے لے لوں گا۔ اب وہ پانچوں پھر باہم مشورہ کرنے لگے۔ ایک بولا کہ وہ پچاس پچاس روپے والی دکان مون مارکیٹ کے پاس ہے۔ چلو وہیں چلتے ہیں۔ یہ کوئی ڈیڑھ کلومیٹر دور تھی۔ میں نے سوچا کہ اب یہ بیچارے فی کس دس روپے کی معمولی بچت کے لیے اتنی گرمی میں پیدل وہاں جائیں گے۔ ابھی میں کچھ کہنے ہی کو تھا کہ وہ پانچوں باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھے تو دکان دار نے سوچا کہ پانچ گاہک ہاتھ سے جا رہے ہیں اور پھر وہ پچاس پچاس روپے فی کس پر راضی ہو گیا۔ میں نے ابھی بھاؤ تاؤ نہیں کیا تھا مگر چونکہ یہ

سارا معاملہ میرے سامنے ہوا تھا۔ اس لیے وہی رعایتی ریٹ مجھے بھی مل گئے۔ اندر کے کمرے میں فوٹو گرافر فارغ ہوا تو پہلے میری باری آئی کہ ان پانچوں سے پہلے میں ہی آیا تھا۔ اندر جا کر شیشے کے سامنے ذرا بال سنوارے۔ پاس ہی دو تین کوٹ اور ٹائیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ کوٹ ٹائی کے ساتھ فوٹو اچھا آتا ہوں۔ ٹائی لگا کر کوٹ پہنا تو میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ پتلون کی جیب سے فون نکال کر سنا، فون گھر سے تھا کہ کب پہنچیں گے۔ میں نے بتایا کہ آدھ گھنٹے تک آ رہا ہوں اور فون بند کر کے جلدی سے کوٹ کی جیب میں رکھ کر فوٹو اتارنے والے اسٹول پر جا بیٹھا کہ فوٹو گرافر پہلے ہی میرا منتظر تھا۔ فوٹو بنوا کر باہر آیا اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا۔ دکان کے ایک کونے سے شیشے کی دیواروں والے چھوٹے سے کیبن میں ایک ملازم اتری ہوئی فوٹو سے پرنٹس بنانے کے عمل میں مصروف تھا۔ وہ پانچوں مزدور بھی باری باری اندر کے کمرے میں جا کر فوٹو بنوانے لگے۔ کچھ دیر میں میرے فوٹو پرنٹس بن گئے تو ادائیگی کر کے میں دکان میں سے باہر نکلا اور قدرے تیزی سے گھر کی طرف چلا۔ کوئی ایک منٹ بعد ہی مجھے پیچھے سے زوردار آواز آئی ــ بھائی صاحب ــ ذرا رکیے ــ میں نے پلٹ کر دیکھا تو انہی پانچ مزدوروں میں سے ایک بھاگتا ہوا میری طرف آ رہا تھا۔ قریب آ کر سانس بحال کرتے ہوئے اس نے پوچھا ''آپ کا موبائل فون تو گم نہیں ہوا؟'' ــ میں نے جیب ٹٹولی تو واقعی غائب تھا۔ میں نے اسے ہاں میں جواب دیا تو اس نے کہا ''کوئی نشانی؟'' ــ میں نے دو تین نشانیاں بتائیں تو اس نے فون میرے حوالے کر دیا۔ میں کچھ حیران سا تھا۔ اس سے پوچھا کہ اس کے پاس کیسے آ گیا؟

''جی میں فوٹو اتروانے دکان کے اندر گیا تو کوٹ پہنتے ہوئے اس کی جیب سے ملا ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ انعام دینا چاہا مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا اور لوٹ گیا۔ فون ملنے پر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ فوراً ذہن میں آیا کہ گذشتہ ماہ ہی تو یہ قیمتی فون دوبئی سے میرے بھتیجے نے تحفے میں بھیجا تھا۔ مقامی طور پر اس کی قیمت کوئی اٹھارہ ہزار روپے معلوم ہوئی تھی ــ ایک سرد سی لہر ذہن میں دوڑ گئی ــ یقیناً یہ مکمل طور پر اتنے بڑے نقصان سے بچنے کے حوالے سے تھی۔ چند منٹ دیر ہو جاتی تو میں روڈ سے اپنے گھر کی چھوٹی سڑک پر مڑ جاتا اور گھر کی ٹیڑھی گلیوں میں گم ہو جاتا ــ یہ بیچارا اور محسن محنت کش چاہتا بھی مجھے ڈھونڈ نہ پاتا ــ ذرا سی بے احتیاطی سے اتنے بڑے نقصان کے تصور نے ایک کپکپی سی طاری کر دی تھی ــ پھر یہ خیال آیا یہ بندہ خاموشی سے میرا فون اپنے ساتھ بھی تو لے جا سکتا تھا ــ پھر یہ خیال آیا کہ یہ بندہ تو دس روپے کی بچت کے لیے اتنی شدید گرمی میں ڈیڑھ کلومیٹر دور جانے والا تھا اور اب مجھے اٹھارہ ہزار روپے کا موبائل فون لوٹا کر گیا ہے ــ اس کے ساتھ ہی مجھے دو اور چہرے یاد آئے ــ ایک اس خوش پوش اور سمارٹ نوجوان کا جس نے دو ماہ پہلے پستول دکھا کر میرا موبائل فون چھین لیا تھا ــ دوسرا چہرہ اپنے اس دوست کا ذہن کے پردے پر ابھرا جو ایک روز بحث کے دوران دلائل دے رہا تھا کہ موبائل فون چھیننے کی وارداتیں غربت کی وجہ سے ہو رہی ہیں ــ میں نے پسینے میں ڈوبے ہوئے میلے کپڑوں والے ان پانچ مزدوروں کو یاد کرتے ہوئے ان کی عظمت کو سلام کیا اور گھر کی جانب مڑنے والی چھوٹی سڑک پر ہو لیا۔

◆◆◆

مرد بھی کیا عجیب شے ہے۔ بیوی میں طوائف جیسی ادائیں اور طوائف میں بیوی جیسی وفاداری تلاش کرتا ہے۔

(سعادت حسن منٹو)

جو خریدا نہ جا سکا

شعلہ چنگیزی (کینیڈا)

مختصر تعارف

محمد ہاشم شعلہ 22 جولائی 1936ء کو پونہ انڈیا میں پیدا ہوئے۔ 1951ء سے 1961ء تک حور، زیب النساء، بانو اور شمع ایسے رسالوں میں لکھتے رہے۔ 1996ء میں افسانہ "عشق پر زور نہیں" پر "شمع" رسالے کی جانب سے اول انعام حاصل کیا۔

لاتعداد مشکلات اور طویل جدوجہد کے بعد کالجوں اور یونیورسٹی کے لیکچرار اور پروفیسر صاحبان کی آخر کار سنی گئی۔ حکومت نے بادل ناخواستہ تھوڑی ہی کا سہی سکیل پر نظر ثانی کرتے ہوئے ان کے تنخواہ کے سٹرکچر پر اضافہ کر دیے تھے۔ جس کی وجہ سے پروفیسر ڈاکٹر ابرار احمد کے مالی حالات قدرے بہتر ہو گئے تھے۔ بہر حال وہ اب بھی اپنی چادر تک پاؤں پھیلا کر رکھنے کی خاطر خاندان میں ہونے والی بہت سی چھوٹی پارٹیز اور دیگر اس قسم کی دعوتوں کو نظر انداز کر دیتے تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے کافی سے زیادہ رشتہ دار نالاں بھی تھے۔ دوست احباب سے بھی رابطہ واجبی سا رکھا ہوا تھا۔

بڑی بیٹی ہائی اسکول میں آ گئی تھی۔ چھوٹا بیٹا مڈل کلاس میں تھا۔ بوڑھے ماں باپ ساتھ تھے۔ جن کو کھانے سے زیادہ دوائیوں اور ڈاکٹروں کی نگہداشت کی ضرورت رہتی۔ ان کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ اس مد میں نکل جاتا تھا۔ شہر کی گنجان آبادی میں آبائی گھر تھا۔ جس کی وجہ سے کرایے سے بچے ہوئے تھے۔ وہ کافی خستہ حال ہو چکا تھا۔ مرمت طلب تھا۔ لیکن نہ تو وہ اس کی مرمت کروا سکتے تھے۔ اور نہ ہی اسے چھوڑ سکتے تھے۔ کیونکہ اس کو بیچ کر اس رقم سے کہیں اور دوسرا گھر خرید نہیں سکتے تھے۔ پروفیسر ابرار سمجھدار اور زمانہ ساز انسان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس گھر میں وہ زیادہ دیر نہیں رہ سکتے۔ ان کی بیٹی جوان ہونے والی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کے مستقبل کے بارے میں بہت فکرمند رہتے تھے۔ یہی حال ان کی بیوی عامرہ کا تھا۔ وہ ہر وقت اس محلے سے نکل جانا چاہتی تھی۔ ان کا بیٹا بھی ارد گرد کے ماحول کی وجہ سے لاابالی ہوا جا رہا تھا۔ اس کو آوارہ اور تھیٹر کا خبط سوار ہونے لگا تھا۔ جو دونوں ماں باپ کے لیے جان لیوا باعث ہو رہا تھا۔ جس گلی میں ان کا گھر تھا، وہ گلی ذرا کشادہ تھی۔ تھوڑے حالات بہتر دیکھے تو عامرہ نے میاں سے زندگی کی پہلی فرمائش کر ڈالی۔ آپ قسطوں میں ایک چھوٹی کار خرید لیں۔ یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ ابرار احمد کو اپنی سماعت پر اعتبار نہ آیا۔ انہوں نے عامرہ سے کہا۔ پھر بولو تم کیا کہہ رہی تھیں۔ بولو۔ بولو۔ ابرار احمد نے دہرایا۔ چودہ سال ہو گئے تھے۔ عامرہ نے کبھی کسی چیز کی فرمائش نہیں کی تھی۔ اور آج وہ ایک فرمائش لیے اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ہاں۔ ہاں میں کہہ رہی ہوں۔ ایک چھوٹی کار خرید لو۔ یہ ہماری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ کسی نہ کسی طرح قسط ادا کر ہی دیا کریں گے۔ پروفیسر صاحب کار کے قائل ہو گئے۔ لیکن قسط کی ادائیگی کے بعد گھر کے اخراجات کو پورا کرنے میں پھر تنگی

ہونے لگی۔ وہ کبھی کبھی سوچتے کہ ڈگری نہ لیتے تو بہتر تھا۔ لیکن اب ان کو ڈگری کی افادیت کا احساس ہو چلا تھا۔ اس تذبذب کے عالم میں جاب بدلنے کی وہ خواہش جس کو وہ بہت سے انٹرویو دینے کے بعد ترک کر چکے تھے۔ جس کی وجہ صرف اور صرف اچھی ملازمت کے لئے استاد اور تجربے کی نہیں۔ سفارش کی ضرورت ہے۔ اور جہاں کہیں میسر بھی ہوئی تو وہ بڑی سفارش کے آگے ڈھیر ہو گئی۔ وہ خواہش پھر سر اٹھانے لگی تھی۔ لیکن ان کو ہر سو اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا۔

وہ خود وہ سوچتے کہ میرٹ پر تو ان کو جاب ملنے سے رہی۔ کیونکہ ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی ایسے لوگوں کو پسند کرتی ہیں۔ جن کے حکومتی اداروں میں تعلقات ہوں۔ واقفیت ہو۔ جن کے ذریعے وہ اپنی کمپنی کے لئے کام نکلوا سکیں۔ ابرار احمد کے پاس ایسے تعلقات نہیں تھے۔ لہٰذا یہ جاب بدلنے کا سلسلہ اب ان کی سوچوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو تسلی دیتے کہ انشاء اللہ حالات ضرور بدلیں گے۔ کوئی نہ کوئی حکومت تعلیم کے سلسلے میں ٹھوس قدم اٹھائے گی۔

لیکن دو دور حکومت دیکھنے کے بعد پروفیسر ابرار احمد کو اب یہ احساس ہو چلا تھا۔ کہ حکومت کی نظر میں تعلیم کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ان کی نظر میں ڈگری کا ہونا ضروری تھا۔ چاہے وہ جعلی ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس جعلی ڈگری کے ساتھ ایک بڑی سی سفارش یا پھر ایک بڑا لفافہ آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچا دے گا۔ اور دوسری صورت میں اگر آپ کسی بڑی ہستی کے منظورِ نظر ہیں۔ تو آپ کو فوراً ڈگری عطا کر دی جائے گی۔ نہ کسی تعلیمی قابلیت کی ضرورت۔ نہ کسی جعلی ڈگری کی۔ ان تمام حالات نے پروفیسر ابرار احمد کو بھی کافی بددل کر دیا تھا۔ جس شعبہ کو وہ تقدس کی نظر سے دیکھتے چلے آرہے تھے۔ اب ایک آنکھ نہ بھانے لگا تھا۔ انہیں کسی راستے کی تلاش تھی۔ جو ان کی مشکلات کو دور کر دے۔ لیکن تلاشِ بسیار کے باوجود وہ راستہ ان کو نہیں مل رہا تھا۔ ان کے ساتھی پروفیسر جن کی عمریں تعلیم دیتے صرف ہو چکی تھیں۔ وہ سب بھی بے بسی کا شکار تھے۔ کہاں جائیں۔ کس سے شکایت کریں۔ نظام کو کیسے ٹھیک کریں۔ کون کرے گا۔ کب ہوگا۔ یہ سوالیہ نشان سب کی نگاہوں میں گھومتے نظر آتے تھے۔ حکومت کی طرف سے کبھی کبھی کوئی لپ سروس ہو جاتی۔ ایک امید بندھتی اور پھر کچھ عرصے بعد ٹوٹ جاتی۔ یہ کھیل مسلسل چل رہا تھا۔ ان سب کو یقین ہو چلا تھا۔ کہ یہ کھیل اسی طرح چلتا رہے گا۔ اس کا حل کسی کے پاس نہیں ہے۔ اور نہ ہی کوئی نکالنا یا ڈھونڈنا چاہتا ہے۔ اور ان سب کو ایجوکیشن کے اس فرسودہ نظام میں ہی کام کرتے رہنا ہوگا۔ پروفیسر ابرار احمد نے سوچا وہ ابھی عمر کے اس حصے میں ہیں۔ جہاں اب بھی وہ جاب بدلنے کا چانس لے سکتے ہیں۔ تو کیوں نہ کوشش کر لی جائے۔ وہ ایک بہت ہی سہانی صبح تھی۔ پروفیسر ابرار احمد جلدی کالج اسی غرض سے آگئے تھے۔ کہ وہ آرام سے بیٹھ کر اپنے سی۔ وی کو کوئی شکل دے لیں۔ اور پھر کہیں قسمت آزمائی کی جائے۔ وہ اس کام میں مصروف تھے۔ کہ ان کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اندر آجاؤ۔ دروازہ کھلا ہے۔ پروفیسر صاحب نے لیپ ٹاپ سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔ اندر داخل ہونے والا ان کا فورتھ ایئر کا اسٹوڈنٹ سجاد اختر تھا۔ جو مقامی ٹیکسٹائل مارکیٹ کی ایک بہت بڑی کمپنی کے مالک کا بیٹا تھا۔

سر جی۔ السلام علیکم کہتے ہوئے وہ ان کی ٹیبل کی دوسری طرف کرسی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

وعلیکم السلام۔ ابرار احمد نے جواب دیتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ کیوں۔ خیریت تو ہے۔ تم اتنے حواس باختہ کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ۔ وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور بجائے اس کے کہ وہ ابرار احمد کے سوال کا جواب دیتا۔ اس نے ابرار احمد سے پوچھا۔

سر جی۔ آج بارہ بجے کے بعد آپ کا کوئی دوسرا پیریڈ تو نہیں ہے نہ۔ ہاں کیوں۔ کیا بات ہے۔ ابرار احمد غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ میرے ڈیڈی آپ سے آج دوپہر کو ملنا چاہتے ہیں۔ اس نے جواب دیا۔ خیریت۔ ابرار احمد حیرت زدہ ہو گئے۔ آپ

کے والد کو مجھ سے ایسا کیا کام آن پڑا۔

یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ ہاں انہوں نے کہا ہے۔ کہ اگر آپ ان کے ساتھ کام کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ تو میں آپ کو آواری ہوٹل میں۔ اس نے ایک نئے ریسٹورنٹ کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ڈیڈی کے پاس ڈراپ کردوں گا۔ کیا کام ہے۔ اور وہ کیا چاہتے ہیں۔ یہ آپ کو وہی بتائیں گے۔ مجھے بھی نہیں معلوم۔ سجاد نے جیسے اپنا رٹا ہوا سبق سنا دیا۔ میری سمجھ سے باہر ہے۔ انہیں مجھ سے ایسا کیا کام ہو سکتا ہے۔ ابرار احمد بڑبڑائے۔ بہر حال میں ملنے کو تیار ہوں۔ ٹھیک ہو سر۔ اب میں ان کو اطلاع دے دیتا ہوں۔ اور آپ کو ساڑھے بارہ بجے کے قریب پک کر لوں گا۔ وہ اپنا موبائل اٹھا کر نکل گیا۔ یہ میرے ڈیڈی شیخ انعام اللہ اختر ہیں۔ سجاد اختر نے ایک چار کول کلر سوٹ میں ملبوس چوڑے ڈیل ڈول والی شخصیت سے تعارف کروایا۔ جو پچاس اور پچپن کے پیٹے میں بڑی اچھی صحت کے مالک تھے۔ یہ پروفیسر ابرار احمد کے لئے اور بھی حیران کن تھا۔ وہ تو سمجھے ہوئے تھے۔ کہ ان کے سامنے کوئی شلوار قمیص میں ملبوس بڑے سے پیٹ والا ہندو کاروباری بندہ کھڑا ہوگا۔ یہاں تو معاملہ ہی دوسرا تھا۔ آیئے۔ آیئے۔ پروفیسر صاحب۔ شیخ صاحب نے بڑی خوش دلی سے کہا — سجاد آپ کی بہت تعریف کرتا ہے۔ اور مجھے بھی آپ سے ملنے کی بڑی تمنا تھی۔

اچھا ڈیڈی میں چلتا ہوں۔ ممی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔ یہ کہتے ہوئے سجاد نکل گیا۔ یہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا۔ ابرار احمد کی سمجھ سے باہر تھا۔ بیٹھئے۔ شیخ صاحب نے پروفیسر صاحب سے کہا۔ اور خود بھی کرسی پر براجمان ہو گئے۔ باتیں کھانے کے دوران ہوتی رہیں گی۔ بیرا جوس کے گلاس اور کچھ عمدہ قسم کے ایپی ٹائزر ٹیبل پر رکھ کر چلا گیا۔ جس کے لئے شاید پہلے سے آرڈر دیا ہوا تھا۔ جی۔ پروفیسر صاحب۔ شیخ صاحب نے کہا۔ یہاں کا انار کا تازہ جوس بہت ہی عمدہ اور لذیذ ہوتا ہے۔ لیجئے نوش فرمایئے۔ انہوں نے گلاس ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ شکریہ۔ پروفیسر صاحب نے گلاس ان سے لیتے ہوئے کہا۔ جوس پیتے ہوئے شیخ صاحب تھوڑی دیر تک خلاؤں میں گھورتے رہے۔ جیسے وہ اپنے خیالات یکجا کر رہے ہوں۔ ہاں انہوں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ایس۔ ڈی۔ ایچ گروپ آف کمپنیز کا مالک ہوں جو شیخاں دی ہٹی کی پیداوار ہے۔ آج سے ستر۔ اسی۔ برس پہلے میرے والد صاحب کی جہاں آج میرا گروپ آف کمپنیز کا پلازہ کھڑا ہے۔ ایک کونے میں دوکان ہوتی تھی۔ باقی سارا کاروبار ہندو ساہوکاروں کا تھا۔ اس وجہ سے والد صاحب نے یہ نام رکھا تھا۔ تاکہ مسلمان گاہک ان سے سامان خریدیں۔ وہ اکیلے دوکاندار تھے۔ جو ان ہندوؤں سے ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے۔ مجھے وہ پڑھانا چاہتے تھے۔ آٹھویں جماعت تک تو میں نے پڑھائی کر لی تھی۔ لیکن اس کے بعد میرا پڑھائی میں بالکل دل نہیں لگتا تھا۔ مجبوراً والد صاحب نے اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔ 19 برس کا ہی ہوا تھا۔ کہ والد صاحب نے اپنے چھوٹے بھائی کی بیٹی سے میری شادی کر دی۔ میری شادی کے دو سال بعد ہی والد صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ اور وہ انتقال کر گئے۔

ریشماں بڑی اچھی بیوی تھی۔ جب میرا بڑا بیٹا بارہ برس کا۔ دوسرا نو برس کا۔ اور تیسرا سات برس کا تھا۔ اچانک ریشماں کو تیز بخار ہو گیا۔ محلے والیاں ڈاکٹر کی کلینک لے گئیں۔ بڑا بیٹا دوڑتا ہوا گیا دوکان پر مجھے اطلاع دینے پہنچا۔ دوائی سے بخار میں کوئی کمی نہ آئی۔ ٹھنڈے پانی کی پٹیاں بھی رکھیں۔ اور اسے لے کر ہسپتال دوڑے تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ یا یہ کہ اللہ کی طرف سے وقت پورا ہو چکا تھا۔ ریشماں کیا گئی۔ گھر کا سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ بچے پہلے ہی سے پڑھائی سے باغی تھے۔ ماں کے جانے کے بعد بالکل ہی آزاد ہو گئے۔ مجبوراً میں ان کو دوکان پر ساتھ لانے لگا۔ وہاں پتہ چلا کہ ان میں کاروباری جراثیم تو مجھ سے بھی کہیں زیادہ ہیں۔ اور اب تو ماشاءاللہ وہ سب

بھی بڑے بڑے کاروبار کے مالک ہیں۔ پروفیسر صاحب بڑے انہماک سے سن رہے تھے۔ ویٹر نے جوس کے خالی گلاس دیکھے تو آ کر پوچھا، سر کھانا لگا دیا جائے۔ تو پروفیسر صاحب چونک گئے۔

شیخ صاحب بولے۔ بھئی پروفیسر صاحب کو مینیو کارڈ دے کر ان کی بھی پسند پوچھ لیں۔ ویسے میں نے تو سی فوڈ کے لئے کہا ہے۔ جس میں شرمپز، مچھلی، اور لوبسٹرز وغیرہ ہیں۔ اور ساتھ میں ورائٹی آف سیلڈ۔ سی۔ یہی چلے گا۔ پروفیسر صاحب نے کہا۔ ویٹر نے فوراً کھانا سرو کر دیا۔ فایاب میری دوسری بیوی جو سجاد کی والدہ ہیں، وہ ہیں تو ایف۔ اے۔ لیکن یہ سب کچھ کیا، انہوں نے کیا" "کیا"! پروفیسر صاحب کے منہ سے اچانک نکلا۔ جی ہاں۔ شیخاں دی ہٹی سے ایس۔ ڈی۔ ایچ گروپ آف کمپنیز کا قیام۔ اس کام میں بڑی برکت ثابت ہوئی۔ ہم نے جو چاہا اللہ نے ہمیں دیا۔ کام اب بہت پھیل گیا ہے۔ بینکوں سے لین دین زیادہ ہو گیا ہے۔ دوسرے ملکوں کا سفر۔ ان سے خط و کتابت۔ سرکاری محکموں میں آنا جانا۔ ان سب کاموں کو پہلے فایاب مینج کر لیتی تھی۔ لیکن اب مشکل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اور اسی سلسلے میں، میں نے آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی ہے۔ میں بھلا اس میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ پروفیسر نے حیرانی سے شیخ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ آپ ہمیں جوائن کر لیں۔ شیخ صاحب نے بڑی سادگی سے اپنا مدعا بیان کر دیا۔

پروفیسر صاحب کا کھانے کی طرف بڑھتا ہاتھ یکدم رک گیا۔ ان کی سمجھ نہیں آ رہا تھا کیا کہیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے شیخ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے حواس یکجا کرنے لگے۔ ان کو خاموش دیکھ کر شیخ صاحب خود ہی بول پڑے۔ پروفیسر صاحب میں آپ کو اپنی ایس۔ ڈی۔ ایچ گروپ آف کمپنیز میں ڈائریکٹر جنرل (ڈی۔ جی) کی پوزیشن پر لینا چاہتا ہوں۔ میں نے آپ کو یہ سب کچھ اس لئے بتایا ہے۔ کہ ہمیں بھروسے مند اور بزنس کو سمجھنے والے کی ضرورت ہے۔ اور آپ دونوں باتوں پر پورا اترتے ہیں۔ سیلری جو بھی آپ کو حکومت سے مل رہی ہے۔ ہم آپ کو اس سے دوگنی دیں گے۔ غالباً آپ کو لاکھ یا سوا لاکھ ماہانہ مل رہا ہے۔ ہم آپ کو ڈھائی لاکھ ماہانہ دیں گے۔ گاڑی اس کے علاوہ۔ سروس کنٹریکٹ پانچ سال کا ہوگا۔ باقی باتیں بعد میں فائنل کر لیں گے۔ ہم چاہتے ہیں آپ ہمیں جلد از جلد جوائن کر لیں۔ ایک ستر کروڑ کی ڈیل ان دو تین مہینوں میں فائنل کرنی ہے۔ پروفیسر ابرار احمد کا ذہن گھوم گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ کہ اب سے کچھ دیر پہلے والی بظاہر مہذب "معمولی پڑھی لکھی ہوئی شخصیت کے اندر چھپا ہوا کاروباری انسان اتنا عقلمند اور زیرک ہوگا۔ جو اب تک تو اپنی بیوی کے ناتواں کاندھوں پر بیٹھا اپنا کاروبار بڑھاتا چلا گیا۔ جب وہ کاندھے چھوٹے پڑ گئے تو نئے اور توانا کاندھوں کی تلاش شروع کر دی۔ آج سے ستر۔ اسی برس پہلے کے جان باز چھوٹے سے دوکاندار کا جانشین آج اتنا طاقتور ساہوکار بن گیا تھا۔ کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق آدمی اس کی قیمت لگا کر اسے نوکری کی آفر دے رہا تھا۔ تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اس کے تجربے اور علم سے فائدہ اٹھا سکے۔ پروفیسر صاحب کو ایک جھرجھری سی آئی۔ ان کے ذہن میں ایک کوندا لپکا۔ انہوں نے سوچا ایجوکیشن کا وہ فرسودہ نظام اس سودے باز دنیا سے کہیں بہتر ہے۔ جہاں وہ اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ وہ اطمینان سے کرسی سے اٹھے۔ انہوں نے شیخ صاحب سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ آپ کے اس شاندار لنچ اور آفر کی قدر کرتا ہوں۔ مگر افسوس ہے میں اپنے آپ کو اس آفر کے قابل نہیں سمجھتا۔ امید ہے آپ میری اس جسارت کو معاف کر دیں گے۔ شیخ صاحب کچھ کہنا چاہتے تھے۔ لیکن پروفیسر ابرار احمد تیزی سے ریسٹورنٹ کے خارجی دروازے کی طرف بڑھتے چلے گئے۔

◆◆◆

گم شدہ منزل

اظہر جاوید

ترجمہ: حنیف باوا

مختصر تعارف

اظہر جاوید 4 جنوری 1938ء راولپنڈی (پاسپورٹ پر سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے "رابعہ بصری" (اردو زبان میں پہلی طبع زاد کتاب) "بلغارین افسانے" ترجمہ بلغارین زبان کی کسی بھی غیر ملکی زبان میں پہلی کتاب تحریر کی۔ پنجابی کہانیوں کی کتاب "بڑی دیر ہوگئی" ان کی منفرد کہانیوں کی کتاب ہے۔ شاعری کا مجموعہ "ہم عشق کرنے ہوتا" شائع ہوا۔ 42 سال تک باقاعدہ "تخلیق" کی اشاعت کرتے رہے۔

تین برس ایک عمر ہوتی ہے۔ ان برسوں میں نہ جانے کتنا پانی ان پلوں کے نیچے سے گزر گیا۔ متعدد بار پت جھڑ کا موسم آیا اور پھلوں کی رت کئی بار آئی۔ وقت کنوئیں کی ٹنڈوں کی طرح چکر کاٹتا رہا جیسے گاڑی پر بیٹھے ہوئے فرد کو یہ بالکل پتا نہیں ہوتا کہ کون سی ٹنڈ کس وقت اپنا پانی پھینک کر چلی گئی ہے۔ میں بھی شہر آ کر یہ بھولتا گیا کہ میرا کونسا ہم عمر اور دوست کہاں چلا گیا اور گاؤں سے شہر جانے والی سڑک کے ساتھ والے کھیت میں چھپی ہوئی دوشیزہ اوکس کے انتظار میں ہوگی اور کیا کسی کو آج بھی میری چاہت ہوگی؟ کیا اس پٹنے کے بہانے اب کون کھیتوں کے چکر لگاتا ہوگا۔ کبھی اپنے چھوٹے بھائی کے پیٹ کے درد کے بہانے۔ کبھی بہن کے بخار کے لئے میری ماں سے دوا کی گولیاں مانگنے اس کے پاس آتا ہوگا۔ پر میری ماں تو شہر آ گئی تھی پیچھے تنہا میرے نانا نانی رہ گئے تھے۔ اب تو یہ تمام لوگ اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ پہلے نانا پھر نانی بھی۔ ان کے غم میں میری ماں بھی۔ میری ماں بھی بڑی بھلی تھی۔ تمام زندگی لوگوں کے دکھوں پر رو رو کر ہلکان ہوتی رہی۔ شاید یہاں ان کا اپنے دکھوں کے چھپانے کا بہانہ تھا۔ اپنے پڑوس کے زمینداروں کے گھر والے ہوں یا مزارعوں اور کمیوں کے افراد ہوں تمام انھیں باجی کہتے تھے۔ بے شک زمینوں کے مالک میرے نانا اور نانی تھے لیکن ان سب کے کام میری ماں اور ان کی باجی ہی آتے تھے۔ لیکن آج تو وہ بھی نہیں رہی۔

تیس سال بیت گئے ہیں، میرا بچپن، لڑکپن، جوانی اور جوانی کی حدود پار کرتا ہوا بڑھاپے کی طرف گامزن ہو گیا ہے۔ سر میں چاندی اگ آئی ہے۔ میرے بچے بڑے ہو گئے ہیں اور میں مزید مصروف ہو گیا ہوں۔ مجھے اتنی بھی فرصت نہیں کہ میں پیچھے مڑ کر دیکھ سکوں میں تو ایک چھوٹے بچے کی طرح ایڑیاں اٹھا کر دیوار کے اس پار اپنے آنے والے وقت کو دیکھنے کی کوشش میں رہتا ہوں۔ مجھے یہ تو معلوم ہے کہ واپڈا ہاؤس کی جگہ پہلے کون سی بلڈنگ ہوا کرتی تھی۔ اور یہاں کے ایک ہوٹل میں ناچنے کے لئے کون کون سی ایکٹرس آتی تھی۔ جہاں واپڈا تعمیر ہو گیا ہے یہاں پہلے اخبار کا دفتر ہوتا تھا لیکن میں یہ بھول گیا ہوں کہ کیسے ہمارا ہمراز احمد صادق جاوید مجھے مل جاتا کہ سکھایا کرتا تھا۔ رحمان مصلی دائی کے ساتھ چارہ کاٹنے اور ٹوکے سے کترا کرنا سکھاتا تھا بابا جو پہلے حجام کا کام کرتا تھا اور اب زمینداروں کے ڈیروں پر یا گاؤں کی

دکانوں پر بیٹھ کر دن گزار رہا تھا اور کیسے میرے سامنے ان دنوں کی باتوں کا ذکر کیا کرتا تھا۔ جب انگریزوں کی پلٹن میں نائیوں کا کام کرتا تھا۔ ماسی جو کچھ تو پڑھ پھونک کر آتی تھی اور طوفان کو روک لیتی تھی اور مجھے بڑے مزے سے کہتی تھی کہ بیٹے کبھی کوئی خدمت تو بتا لیکن میں باتوں باتوں میں اسے ٹال دیتا۔ بعد ازاں وہ مجھے کہنے لگی۔ ''میں تمہارے دل کی بات بھانپ گئی ہوں۔ تو کوئی چنتا نہ کر۔ ستو دھل کر تیرے پاس آ جائے گی۔'' اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا وہ منہ میں کچھ بڑبڑ کرتی اور کچھ پڑھتی ہوئی اور دیا نے کے پاس سے گزرتی ہوئی راہوں کے احاطے کی جانب چلی گئی۔ کچھ ہی روز بعد جب ستو نے بھولپنے میں خود ہی بتا دیا کہ اس نے مجھ تک پہنچنے کے لئے کس قدر کوشش کیں اور ماسی برکتے کی بھی منت سماجت کی۔ اسے ایک روپیہ بھی دیا اور میں ماسی برکتے کو دونوں ہاتھوں پر پرکھتی کر رہ گیا۔ سچی بات ہے کہ یوڈی کلون، لپ سٹک، روج اور پاؤڈر کی خوشبوؤں میں بچی کھانی کے تیل اور بالوں میں لگے ہوئے تازہ مکھن کی واشنا کو بالکل بھول چکا تھا رکشوں اور ماحول کے شور شرابے میں بیلوں کے گلوں میں کھڑکتی گھنٹیوں کی آواز بالکل دب کر رہ گئی ___ ڈیزل اور پٹرول کے دھوئیں میں جوان فصلوں کی مہک بھول چکی تھی۔ اور میں کچھ اور کا اور ہی ہوتا گیا تھا۔ میں گاؤں سے ایسے نکل آیا تھا جیسے کوئی بھاگی ہوئی عورت اپنے میکے واپس نہیں آتی۔ جب سن پینسٹھ کی جنگ میں مالو شہید کی خبر ملی تو پتا چلا کہ اس کی لاش گاؤں میں پہنچ چکی ہے۔ اس وقت پل دو پل کے لئے میرا اکیلا دل تو آیا۔ لیکن پھر شہر کی رونقوں نے مجھ پر اپنا جال پھینک دیا۔ چند لمحوں کے لئے مجھے وہ دن یاد آئے جب ہم نہر کے پاس کے تازہ ہل چلائے ہوئے کھیت میں کبڈی کھیلا کرتے تھے۔ بے شک مالو مجھ سے کافی بڑا تھا۔ لیکن پھر بھی میں اسے مار گراتا تھا اور جب وہ کبڈی ڈالنے ہمارے پالے کی طرف آتا تو میں اسے ایسی قینچی ڈالتا کہ وہ بے بس ہو جاتا اور تمام لوگ اسے بھیڑا ہوا کہہ کر چھیڑتے لیکن آخر وہ وطن کی محبت میں اپنا کھیل کھیل کر شہادت کی بازی جیت گیا کہ میں نے جانا کہ بھیڑا تو اصل میں میں تھا۔

آج تیس برسوں کے بعد گاؤں جا رہا ہوں بس میں بیٹھے ہوئے کو یہ تمام باتیں یاد آ رہی ہیں۔ جیسے جیسے میں گاؤں کے نزدیک پہنچ رہا ہوں دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی ہے۔ نہ جانے کیا کچھ یاد آ رہا ہے۔ گاؤں کی باتوں کے ساتھ کبھی شان کر کے شہری یاد گھرا جاتی ہے اور پھر سینما کے بدلتے ہوئے سین کی طرح گاؤں کی یادیں سامنے گھومنے لگتی ہیں۔ خدا خدا کر کے سفر کٹا اور اب میں بس سے نیچے اتر کر گاؤں کی طرف چلنے لگا ہوں۔ عجیب حالت ہے کبھی پاؤں منوں بھاری لگنے لگتے ہیں اور کبھی میں ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ گاؤں والی نہر سے مستورات اور لڑکیاں پانی بھر کر آ رہی ہیں۔ یہ کون ہے۔ وہی قد و قامت، وہی چال ڈھال ___ آنکھیں سب کچھ وہی ہے۔ میں آگے بڑھا اور اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر رک گئی اور حیران ہونے لگی۔ میں نظر بھر کر اسے دیکھتا رہا اور پھر گویا ہوا۔ تو نے مجھے پہچانا نہیں؟ وہ کچھ کچھ ہی ہوگی۔ چند لمحے خاموش رہی اور پھر گھڑے سمیت سر کو جنبش دی۔ میں بولا۔ اپنا سب ساتھا اور قرا اپنول چڑانے میں مشتوں کا لڑکا ہوں۔ تیس برسوں کے بعد گاؤں آیا ہوں۔ وہ میری بات سن کر چپ چاپ حیرت میں ڈوبی کھڑی رہی۔ میں نے پھر جلدی سے کہا۔ تو زبری تو نہیں۔ نہیں، برکتے کی بیٹی؟ اب وہ مسکرائی۔ اسی جانے پہچانے انداز میں جو آج بھی میرے ذہن کو جھنجھوڑ گیا تھا کہنے لگی ___ ''میں برکتے کی نواسی ہوں ___ زبری کی بیٹی۔ اب ہکا بکا اور حیران و پریشان ہونے کی میری باری تھی۔ میں ایک دفعہ پھر سوچوں اور یادوں میں بہہ کر برسوں کی مسافت طے کرنے لگا۔ وہ دور ہولی وہاں سے جا چکی تھی۔ نہ جانے کتنے لمحے بیت گئے تھے کہ میری جوان بیٹی نے جو کہ آج پہلی بار گاؤں آنے پر ادھر ادھر کے نظاروں میں کھوئی ہوئی تھی۔ میرا بازو ہلا کر کہنے لگی ___ ابو ___ چلو نا راستے ہی میں رک کے رہ گئے ہیں ___ '' اور مجھے ایسا لگا کہ میں ابھی تک راستے ہی میں کھڑا ہوں ___ وقت نہ جانے کہاں سے کہاں چلا گیا ہے ___ ؟

◆◆◆

غزلیں

جلیل عالی

O

اپنا چاند بچاتے ہوئے مارا جاؤں
شب کسی بام کنارے ہی اتارا جاؤں

ہم دل سے ہی کبھی یار بلا کر دیکھے
اس کی آواز پہ میں سارے کا سارا جاؤں

دل تو اس جنبشِ ابرو کی طرف دیکھتا ہے
ہو اگر جاں سے بھی جانے کا اشارہ جاؤں

لاکھ مرجھائیں خزاؤں کی ہوائیں مجھ کو
اس کی اک موجِ محبت میں بہارا جاؤں

یہ جو احوال بگاڑے ہی چلے جاتے ہیں
کیا عجب ہے کہ اسی طور سنوارا جاؤں

بس عالیؔ یہ اعزاز بہت ہے مجھ کو
میں ترے چاہنے والوں میں شمارا جاؤں

OOO

آصف ثاقب

O

نجانے کس طرف ایسے بھٹکتے جا رہے ہیں
مرے بچے بہکتے اور بھٹکتے جا رہے ہیں

میں بیٹھا کب رہا ہوں شعر گھر کو یاد کر کے
مرے الفاظ جنگل میں بھٹکتے جا رہے ہیں

میں کتنی احتیاط ان پہ کرتا جا رہا ہوں
مگر شعلے محبت کے بھڑکتے جا رہے ہیں

کوئی چارہ کرو اے دوستو اپنی وفا کا
یہ زخم بے وفائی اب تو پکتے جا رہے ہیں

ترے موسم کا دوری میں یہ کیسا سامنا ہے
پرندوں کے پرے پہ چہکتے جا رہے ہیں

کوئی انجان سے غم پیش آ جائیں نہ ثاقبؔ
گھنے جنگل میں پردیسی بھٹکتے جا رہے ہیں

OOO

منظر ایوبی

O

جان دے سکتے ہیں، غداری نہیں کر سکتے
سچے عاشق ہیں اداکاری نہیں کر سکتے

میری تہذیب کے وارث ہیں یہ بچے، سو کبھی
دشمنوں کی بھی دل آزاری نہیں کر سکتے

کٹ چکی ہیں سروں کی کئی فصلیں ہم سے
اب کسی جنگ کی تیاری نہیں کر سکتے

بے دھڑک زیست گزارا مرے اچھے لوگو
چاہنے والے ریاکاری نہیں کر سکتے

قصرِ شاہی میں پہنچنے سے بھلا کیا حاصل
ایک فرمان بھی گر جاری نہیں کر سکتے

کیسی افتاد پڑی ہے یہ قبیلے پہ مرے
لوگ اک دوسرے کی غم خواری نہیں کر سکتے

اپنے ہی لوگوں سے ہے جس کا حوالہ پیچھے
اپنے کم ظرف سے ہم یاری نہیں کر سکتے

یہ خبر بھی کسی دشمن نے اڑائی ہو گی
بستی والے مرے غداری نہیں کر سکتے

OOO

سید ریاض حسین زیدی

○

یاد اس کی ابھر ابھر آئے
روپ گیا نکھر نکھر جائے

بے حجابی کمال لیں اس کا
پردہ داری بھی جس سے شرمائے

کوئی صورت ہو رابطہ جاں کی
جان جاناں! تری تجھ ہو جائے

پریشانی میں کون جاتا ہے
کوئی پیاری سے کب اتر جائے

بے قراری فزوں رہے یا رب!
اک تمنا جو روز تڑپائے

ہم اظہار رابطہ روکے
نہ جو منجدھار سے نکل آئے

حسن سے تیر، حق بھی رکھتا ہے
وار کھل کر وہ عشق سے پائے

زوج کو کیسے عافیت ہو نصیب
جان نازک کدھر سے بچ پائے

○○○

ابصار عبدالعلی

○

حق کی آواز تو رستے ہی میں تھم تھم جائے
آرزو ہے یہی، حاکم تھک تھم جائے

درد جوری ہو گواہوں میں تو مقتل میں لہو
خود گواہی ہے، اٹھ جائے، وہیں جم جائے

ہو عیب کے لئے ایک ہی، سب کی آواز
سب کی آواز، ہر اک کان میں باہم جائے

درِ منصف پہ وہ جاتا رہے، امید کے ساتھ
تو کبھی انصاف لے کر آئے، نہ ماتم جائے

اپنے اک تازہ جہاں کے لئے، میری بھی صدا
کن فکوں کی طرح، جائے، دمادم جائے

ظلم گہرا ہے بہت، اپنا پتہ دیتا نہیں
زخم تاحشر اٹھائے کہاں مرہم جائے

بس اک خطا پہ کہاں سے یہاں لاکر پھینکا
جہاں خطا ہی خطا اب کہاں آدم جائے؟

○○○

حسن عباسی

○

آنسوؤں میں کہیں رہو گے تم
جانے والے کہیں رہو گے تم

مجھ سے ملنے میں ایک خرابی ہے
پھر کسی کے نہیں رہو گے تم

اب یہ دریا اترنے والے نہیں
چشم تر میں نہیں رہو گے تم

جتنی دوری ہوئی ہے تم میں جناب!
یونہی ایسے حسین رہو گے تم

ہم نے تم سے وفا نہیں کر لی
حسن والو حزیں رہو گے تم

جب تھکے ہیں یہ دھوپ جیسے دن
ساحلو! دل نشیں رہو گے تم

○○○

ڈاکٹر جواز جعفری

○

خواہش بام و زوال مسترد کرتے ہوئے
میں کبھی چہرہ نہیں تھکتا مدد کرتے ہوئے

کل مجھے گردوں لے گئے ہیں چہروں کے چراغ
آنکھ بھر آتی ہے ذکر خال و خد کرتے ہوئے

بے روزن میرا حجرہ جانب اوج کمال
یار مجھ سے پیار کرتے ہیں حسد کرتے ہوئے

زندہ رکھا میں نے مردہ شہر میں اپنا ضمیر
عمر گزری ہے مجھے نیک و بد کرتے ہوئے

کس قدر شوق حساب عہد رفتہ تھا اسے
روز پڑتا خود بھی دو پیں اور رد کرتے ہوئے

کم نسب لفظوں کو لوگ پر اتنا نہیں
میں غزل کہتا ہوں لفظوں کو سند کرتے ہوئے

موت کی دنیا سے باہر بھی ہے اک دنیا جواز
مجھ پہ یہ عقدہ کھلا سیر ابد کرتے ہوئے

○○○

نسیم سحر

○

اس اذیت بھری گھٹن سے نکل
وقت کے تنگ پیرہن سے نکل

اپنی موجودگی کو وسعت دے
دے کے گل بن کے تو چمن سے نکل

خاک کے ساتھ خاک مت ہو جا
خاک ہوتے ہوئے بدن سے نکل

اپنے ہالے میں مت مقید ہو
تو اگر چاند ہے گہن سے نکل

اپنی تنہائیوں کو وسعت دے
ناشناسوں کی انجمن سے نکل

تیرے جانے کا کچھ پتہ نہ چلے
یوں سے اتنے بانکپن سے نکل

تیرگی سے عداوت کے لئے
روشنی بن کے ہر کرن سے نکل

واقعی ہے تو مجھ میں زندہ ہو
واہمہ ہے تو تن بدن سے نکل

اعتماد اپنے لئے نئی راہیں
کل کے فرسودہ فن سے نکل

اب تو تخلیق کر نسیم اپنی
اب تو اپنے ادھورے پن سے نکل

○○○

نذیر فتح پوری (انڈیا)

○

دوسرا اور داغ رکھ آیا
چاند پہ اک چراغ رکھ آیا

جیسا چاہے تو ویسا پھیلا دے
کورے کاغذ پہ داغ رکھ آیا

خواب دکھلا کے موسم گل کا
اس کی آنکھوں میں باغ رکھ آیا

واسطہ رکھنا وہ شعر پڑھ کے مجھے
میں غزل میں سراغ رکھ آیا

وہ مجھے سوچتا رہے گا نذیر
اس کے دل میں دماغ رکھ آیا

○○○

کرشن پرویز (انڈیا)

O

روز یہ دنگے فسادات کہاں تھے پہلے
اتنے بگڑے ہوئے حالات کہاں تھے پہلے

کل تلک پیار محبت سے رہا کرتے تھے
زہر میں ڈوبے بیانات کہاں تھے پہلے

کوئی کرسی کوئی دولت کے لیے مرتا ہے
اتنے بکتے ہوئے جذبات کہاں تھے پہلے

ہر طرف آج تو رہبر پہ اٹھی ہے انگلی
سب کے لب پہ یہ سوالات کہاں تھے پہلے

جس کو دیکھو وہ حکومت کا گلہ کرتا ہے
لب پہ یوں حرفِ شکایات کہاں تھے پہلے

بھوکے ننگے بھی ہیں آج کروڑوں والے
اس قدر کشف و کرامات کہاں تھے پہلے

اب تو ہر موڑ پہ مے خانے کھلے ہیں پرویزؔ
شہر میں اتنے خرابات کہاں تھے پہلے

OOO

مظفر حسن منصور

O

سوچتا رہتا ہوں میں اسے حسرت آوارگی
اس نے کیوں ڈالی ہے مجھ پہ تہمت آوارگی

"پھول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار"
ہے مرا حسنِ تخیل بہجت آوارگی

میں نہیں جاتا گلستاں میں کہ میرے واسطے
تیرے کوچے کی ہوا ہے رحمت آوارگی

تم مٹاؤ گے کہاں تک میری بدنامی کے داغ
میری قسمت میں لکھی ہے شہرت آوارگی

جانے کیا پنہاں ہے جس کو ڈھونڈتے ہیں اہلِ دل
جستجو کہیے اسے یا فطرت آوارگی

کس قدر ہم کو غریبانِ وطن کا ہے خیال
مفلسوں میں بٹ رہی ہے دولت آوارگی

پرورش پائے نہ یوں منصورؔ احساسِ جمال
شعر کے پردے میں تحریک آوارگی

OOO

رشید آفریںؔ

O

اب کہاں وہ بہار کا عالم
چار سو ہے غبار کا عالم

ہیں نقش ہر گل پہ اک کشش
خواب ہے رنگ و بار کا عالم

سرفرازوں کو کھا گیا سورج
ہر قدم ریگ زار کا عالم

بچ بچا ہے یا گماں خود سے
اوج پہ خلفشار کا عالم

خود آزمی ہے ہر آئینہ بھی
رائگاں ہے حصار کا عالم

قتل گاہوں میں اب ہوا ہمکتی
موسم سازگار کا عالم

چشم پیاسے جوئے خون جاری
جس طرح آبشار کا عالم

حبس ماحول کا قفس ہی باتیں
جیت میں بھی ہے ہار کا عالم

اب گماں میں کسی کے آیا تھا
اس دو خاندار کا عالم

آسماں جیسے جھول جائے گا
آج کے اس دیار کا عالم

آفریں کون کر سکا محسوس
اک دل داغ دار کا عالم

OOO

سعدیہ سیٹھی (امریکہ)

O

دیواریں تو گر گئی ہیں اور اب در نہیں رہا
کس سے کہوں میں جا کے مرا گھر نہیں رہا

اک زخم جو کسی کو چھپاتے ہوئے لگا
مدت ہوئی ہے زخم وہی بھر نہیں رہا

تعبیر جس کی مر بھی چکی خاک ہو چکی
وہ خواب میری آنکھ میں کیوں مر نہیں رہا

یہ دل دھڑک رہا مرا زور زور سے
لیکن دماغ کام ذرا کر نہیں رہا

لگتا ہے الٹے سیدھے دن بھی کبھی کبھی
جیسے کہ میرے شانے پہ اب سر نہیں رہا

اتنا اندھیرا دیکھا ہے اس نے گلی گلی
اب سعدیہ کے دل میں کوئی ڈر نہیں رہا

OOO

شاہین زیدی

O

اب تلک اس کو بھلایا بھی نہیں
اپنی یادوں کا بھلایا بھی نہیں

وہ محبت کرتا ہے مجھ کو بے وفا
میں نے دل اس سے لگایا بھی نہیں

خامشی سے لوٹ آئی ہوں مگر
کچھ سبب اس کو بتایا بھی نہیں

کرب کی لہروں کو دل میں پال کر
ضبط میں نے آزمایا بھی نہیں

کربلائیں راستوں میں آ گئیں
سر مگر میں نے اٹھایا بھی نہیں

OOO

نیر رانی شفق

O

کہیں ہوگی کسی دن تو خوشی اپنے مکانوں میں
کبھی تو رقص میں آئیں گی میرے آشیانوں میں

محبت بانٹنے والوں کا یہ انجام آخر کیوں
خدایا رو گئی تنہا میں کیوں میرے جہانوں میں

مری یہ چاندنی کم کر تو اس قابل نہیں یا رب
یہ کیسی روشنی ہے میرے بچوں کے مکانوں میں

تو چاہے تو ہرا کر دے مرے گلشن تمنا کو
نہیں کچھ بھی کمی میرے خدا تیرے خزانوں میں

یہ گھر سے ہیں مری خاموشیوں میں سرمدی نغمے
انہی کو ہم کہیں گے اک دن سب محبت کے ترانوں میں

اداسی درد و غم اور رقص کرتی وحشتیں ہر سو
کہاں سے آ گئے مہماں یہ میرے مکانوں میں

یہ چھپے ہیں گھر میں تو یہ تو یہ عشق کے قصے
یہ عکس حسن ہے میری کہانی کی داستانوں میں

اڑیں گے روشنی بن کر یہ میری خاک کے جگنو
انہی کی تیرہ شبوں میں شفق اسلاف کے زمانوں میں

OOO

طاہر منظور

O

بے مروت ہے، بے وفا، وہ ہے
تنگ دل اور کج ادا وہ ہے

جو مری منزلوں کا ساتھی تھا
دو قدم ساتھ بس چلا وہ ہے

میرے دل کے قریب تھا جو کبھی
دور مجھ سے چلا گیا وہ ہے

سر تسلیم خم ہے کہتا ہوں
میری چاہت کی انتہا وہ ہے

مجھ کو خوش کن گمان رہتا ہے
میرے بارے میں سوچتا وہ ہے

یہ عداوت ہے، یا محبت ہے
میرے دشمن کا آشنا وہ ہے

چشم پرنم کو بھینچ لیتا ہوں
آنسوؤں میں بسا ہوا وہ ہے

عمر بھر کی مری ریاضت کا
مسکراتا ہوا صلہ وہ ہے

وہ مرا ذکر بھی ہے، فکر بھی ہے
میرے ہر راز میں چھپا وہ ہے

شعر طاہر کے پڑھ کے لگتا ہے
کاوشیں اچھی کر رہا وہ ہے

OOO

سید انور جاوید ہاشمی

O

سر قرطاس ابھرتی گرم جوشی شکریہ تیرا
مرے ہم راہ رہتی اے شوخی شکریہ تیرا

خیالوں میں کسی کے غیب سے مضمون لاتی ہے
مرے خامہ کی اے لے فروشی شکریہ تیرا

غزل آواز میں آرام سے رہتا ہوں میں
ہر بزم سخن حلقہ بگوشی شکریہ تیرا

یہ اعجاز محبت ہی ہے خواہشوں کی آرزوؤں کی
سفر کرتی ہوئی خانہ بدوشی شکریہ تیرا

بہت لازم تھا جینے کے لیے روشن کیا جب
جہان سارا میں میری سخت کوشی شکریہ تیرا

OOO

پروفیسر عاصم بخاری

O

ایک نہ ایک دن ضرور آتا ہے
شاعری سے شعور آتا ہے

کارخانوں سے کون کہتا ہے؟
علم و دانش سے نور آتا ہے

ظرف سے گر ملے زیادہ تو
[illegible] غرور آتا ہے

شعر گوئی کے واسطے کہتے ہیں
رفتہ رفتہ شعور آتا ہے

شعر سے دل دماغ کو عاصم
لگتا تو یہ ہے سرور آتا ہے

OOO

تصور اقبال

O

رخ ہوا کا میری جانب تھا میں جلتا کس طرح؟
اک دیا بن کر ہوا کے ساتھ چلتا کس طرح؟

اک ستارے کی طرح میں کہکشاں میں ہی رہا
میں بھلا سورج کی صورت روز ڈھلتا کس طرح؟

ایک دن سوچا تھا اس کو ختم کر ڈالا اسے
عمر بھر وہ آستیں کا سانپ پلتا کس طرح؟

وہ جو نکلے پاؤں چلتے چلتے اک دن راہ میں
خود بخود کانٹا وہ پاؤں سے نکلتا کس طرح؟

رو پڑے گا آرزو وہ میری حالت دیکھ کر
وہ مجھے اک پھول کی صورت مسلتا کس طرح؟

ہم بھی اس کو چاہتے ہیں بے زباں ہرگز نہیں
پھر بیاں اپنا تصور وہ بدلتا کس طرح؟

OOO

امر مہکی

O

کچل کچل کے جو رے درد کو ہوا دی ہے
کہ زخم کھا کے بھی دل نے تجھے دعا دی ہے

کبھی کبھی تو مجھے بھولنا بجا تھا مگر
یہ کیا کہ تو نے مری شکل ہی بھلا دی ہے

تو اپنی دھن میں مگن ہے تجھے خبر ہی نہیں
کسی کے دل نے تڑپ کر تجھے صدا دی ہے

غم حیات اگر جرم کچھ نہیں ہے تو پھر
تمام عمر مجھے تم نے کیوں سزا دی ہے

کہ جل رہا ہے بدن بے مروتی سے مجھے
تجھے بھی تو نے کیا ہے یہ بے رخی سکھا دی ہے

کسی بھی دکھ میں امر حوصلہ نہ ہارا تھا
غم فراق نے دیوار دل ہلا دی ہے

OOO

فرخ محمود

O

جو تیری چاہتوں کو چھو نہ پائے
کبھی وہ راحتوں کو چھو نہ پائے

رہے گردش میں ساغر کی طرح ہم
مگر اس کے لبوں کو چھو نہ پائے

کہاں سے لاؤں صحرا کی صعوبت
کبھی ہم بارشوں کو چھو نہ پائے

ملی نہ اس لیے بھی کامیابی
کبھی ہم حادثوں کو چھو نہ پائے

سخن ان کا چمک سکتا نہیں ہے
کبھی جو رتجگوں کو چھو نہ پائے

دلوں کو چھو سکیں گے شعر وہ کیا
کبھی جو ساحلوں کو چھو نہ پائے

انہیں احساس کیا آسانیوں کا
کبھی جو مشکلوں کو چھو نہ پائے

قلم کا سر جھکانے والے فرخ
کبھی پھر عظمتوں کو چھو نہ پائے

OOO

یادیں

عاشقی صبر طلب

(2013-2001)

......13......

ڈاکٹر رشید امجد

جعلی ڈگریوں اور نمبر بڑھ جانے کا معاملہ نیا نہیں یہ سلسلہ عرصہ دراز سے چل رہا ہے۔ اب چونکہ سیاسی لوگ اس میں ملوث ہو گئے ہیں اس لیے میڈیا میں آ گیا ہے۔ یہ نوے کی دہائی کا ذکر ہے کہ ایک دن ایک صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ کی مدد کی ضرورت ہے میں نے پوچھا کیا بات ہے کہنے لگے بیٹے کے نمبر کچھ کم لگتے ہیں داخلہ میں دقت ہو گی۔ اس زمانے میں انٹری ٹیسٹ شروع نہیں ہوئے تھے اور پروفیشنل اداروں میں داخلہ صرف نمبروں کی بنیاد پر ہوتا تھا جہاں ایک ایک نمبر کی اہمیت تھی۔ میں نے کہا ''اب کیا ہو سکتا ہے'' بولے ''آپ کے کالج کے ایک صاحب ہیں جو نمبر بڑھوانے کا کام کرتے ہیں۔ لیکن ایک نمبر کے دو ہزار مانگتے ہیں میں چاہتا ہوں دس نمبر بڑھ جائیں۔ بیس ہزار بنتے ہیں (اس زمانے میں بیس ہزار بڑی رقم تھی) آپ ذرا یہ معلوم کر دیں کہ کوئی فراڈ تو نہیں۔'' دوسرے دن وہ صاحب کینٹین میں مل گئے۔ میں نے بات کی تو بولے ''آپ بے فکر رہیں گارنٹی دیتے ہیں'' میں نے پوچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے'' بولے ایسا فول پروف انتظام ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا تفتیش کار بھی اسے نہیں پکڑ سکتا'' میں نے کہا ''کچھ بتاؤ تو سہی'' بولے ''چھوڑیں یہ آپ کی دردِ سر نہیں''

کچھ دنوں بعد وہ صاحب ایک تقریب میں ملے، کہنے لگے ''کام ہو گیا تھا آپ کا بھی شکریہ۔''

میں نے پوچھا ''داخلہ ہو گیا'' بولے ـــــ ''آسانی سے، بیٹے کو انجینئرنگ میں داخل کیا ہے۔''

ایک عرصہ بعد کالج کے کسی ساتھی نے کچھ لوگوں کو کھانے پر بلایا۔ وہ رفیق کار بھی جو یہ کام کرتے تھے مدعو تھے۔ واپسی پر کہنے لگے ـــــ ''مجھے گھر چھوڑ دیں۔'' راستے میں میں نے پوچھا ''یہ تو بتاؤ یہ کام ہوتا کیسے ہے؟''

بولے ـــــ ''چھوڑو تم کس جھنجھٹ میں پڑتے ہو۔''

میں نے اصرار کیا تو کچھ دیر خاموش رہے پھر کہنے لگے ''زبردست طریقہ کار ہے جب ہمارے پاس کوئی حاجت مند آتا ہے تو ہم اسے کہتے ہیں کہ جن دو پرچوں میں نمبر جتنا کم ہیں ان کی ری چیکنگ کی درخواست دے دو۔ (اسی درخواست نتیجہ نکلنے کے بعد ایک مقررہ مدت میں دینا ہوتی ہے ری چیکنگ میں سوال کی دوبارہ مارکنگ نہیں تھی صرف ٹوٹل چیک کیا جاتا ہے) درخواست موصول ہونے کے بعد سٹرانگ روم سے دونوں پرچے نکالے جاتے ہیں''۔

میں نے کہا ''یہ کیسے ممکن ہے سٹرانگ روم کیسے کھلوایا جا سکتا ہے'' وہ ہنسے اور بولے ''اس معاملہ میں اوپر سے نیچے تک بہت سے لوگ شامل ہوتے ہیں۔''

"پھر" میں نے پوچھا۔

بولے "متعلقہ پرچوں کے نمبر دیکھے جاتے ہیں۔ عام طور پر ہر سوال دس نمبر کا ہوتا ہے جس سوال کے نمبر مثلاً بھی 5-6-7 یا 8 ہوتے ہیں ان کے ساتھ ایک کا اضافہ کر دیا جاتا ہے مثلاً 5 کو 6، 15 کو 16 وغیرہ۔ صرف سرخ پنسل سے ایک لگا ہوتا ہے اور پرچے دوبارہ اپنی جگہ پر رکھ دیے جاتے ہیں۔ وقت مقررہ پر ری چیکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوتا ہے جس میں تین چار لوگ شامل ہوتے ہیں بورڈ کے اپنے لوگ یا باہر کے لوگ۔ کمیٹی اسٹرانگ روم سے پرچے نکلواتی ہے اور کمیٹی کا سیکرٹری پرچہ ری چیک کر کے بتاتا ہے ٹوٹل میں دس نمبر کم ہیں۔ تسلی کے لئے بورڈ کا ہر ممبر چیک کر کے تصدیق کرتا ہے اور کمیٹی فیصلہ کرتی ہے کہ دس نمبر بڑھا دیے جائیں سب کام قانونی طریقے سے ہوتا ہے متعلقہ طالب علم کو Duplicate مارک شیٹ جاری ہو جاتی ہے۔

یونیورسٹیوں کی سطح پر جعلی ڈگریوں کا کام بھی ہوتا ہے اس کے دو تین طریقے ہیں پہلے ایجنٹوں کے ذریعے معاملات طے ہوتے ہیں پہلا طریقہ یہ کہ جعلی ڈگری کا خواہاں فارم داخلہ بھرتا ہے جب یہ فارم ایگزامینیشن برانچ میں پہنچتا ہے تو وہاں فارم سے فوٹو ہٹا کر ایسے شخص کی فوٹو لگا دی جاتی ہے جس نے اصل امتحان دینا ہے۔ رول نمبر جاری ہو جاتا ہے جب امتحان ختم ہو جاتے ہیں تو فارم پر پرانی تصویر دوبارہ لگا دی جاتی ہے اس صورت میں امتحان اصل امیدوار کی بجائے دوسرا شخص دیتا ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ امیدوار کا سنٹر ایسی جگہ بنایا جاتا ہے جہاں نقل کرنے کا بندوبست ہوتا ہے اور امیدوار سارے پرچے حل کرتا ہے بلکہ اسے نقل کرائی جاتی ہے۔ بعض پیشہ ور لوگ سپرنٹنڈنٹ بننے کے بعد باقاعدہ حصہ مقرر کرتے ہیں دور دراز کے علاقوں میں سپرنٹنڈنٹ بننے کے لئے زیادہ رقم دینا پڑتی ہے ایک صاحب نے بتایا کہ ایسے ہی ایک دور دراز علاقے میں میری تقرری ہوئی۔ میں ایک دن پہلے وہاں پہنچا شام کو علاقے کے دو تین معززین ملنے کے لیے آئے۔ بولے "آپ کو کسی بھی شے کی ضرورت ہو تو بلا تکلف بتا دیں۔ آپ کے کھانے پینے اور رہائش کا اعلیٰ انتظام کیا گیا ہے۔ پھر ان میں سے ایک نے ایک لفافہ میز پر رکھ دیا۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے بولے آپ کی خدمت میں تھوڑا سا نذرانہ ہے۔ ہماری روایت ہے اگر کوئی انکار کرے تو ہم اسے اپنی توہین سمجھتے ہیں میں نے کہا لیکن مجھے کرنا کیا ہے۔ وہ ہنسے۔ کچھ نہیں آپ بس اسٹیج پر بیٹھیں ہمارے لوکل لوگ خود ہی سب کچھ کر لیں گے۔

بڑے بڑے نجی اور صاحبان عالیشان کے زیر انتظام تعلیمی اداروں میں اجتماعی نقل کروائی جاتی ہے پروفیسر غلام سرور جو میرے پرانے ساتھی اور بعد میں سرسید کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے بتایا کہ ایک بار بورڈ کے چیئرمین نے فون کیا کہ بھائی ذرا فلاں کالج کا چکر لگا آؤ۔ میں نے پوچھا ـــــ "کیا معاملہ ہے" چیئرمین نے کہا "دو دن پہلے میں سنٹر دیکھنے گیا تو سکول کا گیٹ پندرہ منٹ بعد کھولا گیا۔ میں نے گیٹ کیپر کو بتایا بھی کہ میں چیئرمین ہوں سنٹر چیک کرنا ہے۔" اس نے کہا "پرنسپل سے پوچھ کر گیٹ کھلے گا۔ پندرہ منٹ بعد گیٹ کھولا گیا۔ پرنسپل نے معذرت کی کہ وہ واش روم میں تھے۔ سرور صاحب نے بتایا کہ دو تین دن بعد میں وہاں گیا گاڑی باہر کھڑی کر کے اندر چلا گیا۔ آتا جاتا رہتا تھا اس لئے گیٹ کیپر نے روکا نہیں اندر سنٹر کا یہ حال تھا کہ ہر طالب علم نے کتاب کھولی ہوئی تھی۔" پریکٹیکل کی صورت حال اس سے بھی بدتر ہے۔ میڈیکل گروپ میں اس کے نمبر 75 اور پری انجینئرنگ میں پچاس ہیں (اب اس میں کچھ تبدیلی کر دی گئی ہے) جس طالب علم کے پورے نمبر آ جائیں اس کے کل نمبروں کا خود تصور کر لیں۔

پریکٹیکل پڑھنے والوں میں اکثریت پیشہ ور لوگوں کی ہے۔ خود کالج والے ان کے قیام و طعام کا شاندار بندوبست کرتے ہیں۔ بعض ریجنل اداروں میں تو ان کے لیے فائیو سٹار ہوٹلوں جیسی رہائش مہیا کی جاتی ہے۔ آخری دن قیمتی تحائف سے نوازا جاتا ہے۔ میں نے ایک بار بورڈ کے ایک صاحب سے پوچھا کہ آپ اچھے لوگوں کو ممتحن کیوں نہیں مقرر کرتے۔ بولے ''پہلے تو ایسے لوگ ممتحن بننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ دوسرے یہ کہ پیشہ ور لوگ بورڈ کے نچلے عملے سے ملے ہوتے ہیں۔ ممتحن بننے کا لیٹر تو جاری ہو جاتا ہے لیکن ڈسپیچ نہیں ہوتا۔ آخری دن ہنگامی صورت پیدا ہو جاتی ہے تو نچلا عملہ بتاتا ہے کہ فلاں صاحب کی طرف سے کوئی جواب ہی نہیں آیا فلاں صاحب ہیں جنھیں مقرر کیا جا سکتا ہے۔

ڈگریوں کا ایچ ای سی سے تصدیق کروانا بھی ایک طرفہ تماشا ہے۔ ایچ ای سی یونیورسٹیوں کے مہیا کردہ ریکارڈ کی بنیاد پر ڈگری کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کے پاس اپنا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ اب اگر یہ تصدیق یونیورسٹیوں کے مہیا کردہ ریکارڈ کی بنیاد پر ہوتا ہے تو خود یونیورسٹیوں کو اس کا اختیار دے دیا جائے۔ ایچ ای سی کی چودھراہٹ کے کیا معنی ہیں۔ یہ صرف پیسے کمانے اور طالب علم کی جیب پر ڈاکہ ڈالنے کے مترادف ہے۔ ہمارے ملک میں لوگوں کو زچ کرنے کے نت نئے طریقے ڈھونڈے جاتے ہیں یوں لگتا ہے کوئی خفیہ سیل قائم ہے جہاں ہر لمحے یہ سوچا جاتا ہے کہ لوگوں کو کس طرح زچ کیا جائے۔ ان کے مسائل بڑھائے جائیں تاکہ انھیں کچھ اور سوچنے کی مہلت نہ ملے۔ اگر ان کے چھوٹے چھوٹے مسائل حل ہو گئے تو پھر وہ حکمرانوں سے حساب مانگنے لگیں گے۔ اس لیے انھیں مسائل کے بھنور سے نکلنے ہی نہ دیں۔

ایک بار میں نے مرشد سے پوچھا ''ہمارے مسائل کا حل کیا ہے؟''

اس نے کہا ''یہاں جلادوں کی ایک ایسی جماعت کی ضرورت ہے جن کے دل نہ ہوں لیکن دماغ ہوں۔''

تربیت کے بغیر تعلیم کے کوئی معنی نہیں لیکن تربیت کی بات کہیں نہیں کی جاتی۔ کسی بھی سیاسی جماعت کے منشور میں قوم کی تربیت کی شق موجود نہیں۔ تربیت کے بغیر بڑی سے بڑی ڈگری کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ سڑک (ٹریفک) سے لے کر گھر اور دفتر تک ہر جگہ تربیت کی ضرورت ہے۔ تعلیم و تربیت میں سے تربیت کو نکال دیا جائے تو تعلیم کا دائرہ ایسا ہی محدود ہو گا جیسے ہمارے یہاں ہے۔ سعدی نے کہا تھا گدھے پر کتابیں لاد دینے سے گدھا عالم نہیں ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو میرا گدھا دنیا کا سب سے بڑا عالم ہوتا کہ اس پر ہر وقت کتابیں لدی رہتی ہیں۔

ساٹھ ستر کی دہائی میں پرائیویٹ تعلیم حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ میٹرک کے بعد پہلے ادیب فاضل یا منشی فاضل کرنا پڑتا تھا جس کے بعد آگے کا راستہ کھلتا تھا اسے وایا بٹھنڈا کہا جاتا ہے۔ خود میں میٹرک کے بعد گھریلو حالات کی وجہ سے تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور ملازمت کرنا پڑی۔ بعد میں استاد غلام رسول طارق کے کہنے پر ادیب فاضل کیا اور ایف اے اور بی اے میں انگریزی کے پرچے دے کر ایم اے میں باقاعدہ داخلہ لیا۔ اب جامعات کی تعداد گنی نہیں جا سکتی۔ طرح طرح کی سہولتیں موجود ہیں۔ اکثر کلاسیں شام کے اوقات میں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ہر کوئی اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتا ہے لیکن نتیجہ کیا ہوا۔ دو نمبر کام کا سلسلہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ ڈگریاں بکتی ہیں۔ کھلم کھلا اور یہ سب ایچ ای سی کے زیر سایہ ہو رہا ہے۔ یہ کام دنیا بھر میں ہوتا ہے لیکن شاید اتنے بڑے پیمانے پر نہیں۔ ایک صاحب نے بتایا وہ برطانیہ گئے ہوئے تھے۔ جن صاحب کے یہاں ٹھہرے تھے انھوں نے ایک صبح ان سے کہا کہ لندن جانا ہے، آپ بھی چلیں۔ راستے میں انھوں نے پوچھا ''لندن میں کیا کام ہے'' وہ صاحب بولے 'ایک یونیورسٹی خریدنا ہے' یونیورسٹی صرف ایک کمرے میں تھی۔

ہائر ایجوکیشن کمیشن کے حوالے سے میرے ذاتی تاثرات کچھ اچھے نہیں۔ ممکن ہے بہت سے لوگ میرے خیالات سے اتفاق نہ کریں۔ اٹھارہویں ترمیم کے بعد مختلف محکموں کے صوبوں کی منتقلی کا معاملہ آیا تو حسبِ معمول ہماری سیاسی جماعتوں نے اسے سیاسی مسئلہ بنا دیا۔ ڈاکٹر انوار احمد نے مجھ سے پوچھا کہ جماعت اسلامی کیوں ہائر ایجوکیشن کمیشن کے مرکز کے پاس رہنے کے لیے احتجاج کر رہی ہے۔ میں نے کہا: "اس لیے کہ مرکز اسے صوبوں کو منتقل کرنا چاہتا ہے۔ اگر پیپلز پارٹی کی حکومت یہ کہتی کہ اسے صوبوں کو منتقل نہیں کیا جائے گا تو جماعت اسلامی اور دوسری سیاسی جماعتیں یہ نعرہ لگاتیں کہ اسے فوراً منتقل کیا جائے، ورنہ آئین کی خلاف ورزی ہوگی۔"

قطع نظر میرے تحفظات کے ایچ ای سی کے بہت سے مثبت پہلو بھی ہیں۔ اول یہ کہ اس نے جامعات میں ریسرچ کلچر پیدا کیا اور اسے فروغ دیا ہے۔ دوسرا یہ کہ جامعات کے اساتذہ میں ایک مثبت مقابلے کا شعور پیدا کیا ہے۔ تیسرا یہ کہ جامعات میں اساتذہ کی ملازمتوں، ترقیوں اور دیگر معاملات کے لیے ایک معیاری سسٹم متعارف کرا کے اس پر عمل کرایا ہے۔ چوتھے یہ کہ بی ایس، ایم ایس اور پی ایچ ڈی کے داخلوں کے معیار کو بلند کر کے ان کے نصابات میں بھی مثبت اور معیاری تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔ یہ اس کے ایسے مثبت پہلو ہیں جن سے انکار ممکن نہیں۔ میرے اعتراضات مالیات میں شفافیت کے حوالے سے ہیں، دوسرے ایچ ای سی کے بعض اراکین کا متکبرانہ رویہ۔ میرے خیال میں تدریس سے متعلق تمام شعبے تدریسی نظام ہی کا حصہ ہوتے ہیں اور چونکہ تدریس پیغمبرانہ شیوہ ہے اس لیے انکساری اور عجز اس کے بنیادی عناصر ہیں، ورنہ یہ سارا شعبہ بے برکت ہو جاتا ہے اور جیسا کہ ہمارے ہاں ہے۔

قبل از اسلام کی عرب عجم چپقلش اب اپنے عروج پر ہے اور اس بار میدانِ عمل پاکستان ہے۔ سعودی عرب اور ایران دونوں پیسے کے زور پر یہاں ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں لیکن سعودی عرب کا پلڑا اس لیے حاوی ہے کہ بعض مذہبی تنظیمیں اور اشخاص نظریاتی طور پر خود کو سعودیوں کے نزدیک محسوس کرتے ہیں۔ ان کا تصورِ اسلام بھی سعودیوں کا سا ہے کہ اسلام کی روح کی بجائے روایات و رسومات پر زور دیا جائے۔ چادر و چار دیواری کے اندر جو چاہیں کریں، باہر سب ٹھیک ہونا چاہیے۔ یعنی عبا کے نیچے سگرٹ اور ٹیلی وژن جائز ہے۔ پیچھے کہیں ذکر آیا ہے کہ کیسے سعودیوں کے پیسے سے مسجدیں تعمیر کر کے وہاں اپنے مرضی کے گماشتے اور مولوی رکھے گئے ہیں جو اسلام کی وہ تشریح کرتے ہیں جو درباری علماء کرتے تھے۔ تعلیمی اداروں پر دسترس کی کوشش بھی جاری ہے۔ انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی تو سعودیوں کی سرپرستی سے یہاں ایک ایسا مضبوط گروپ موجود ہے جو ان کا پروردہ ہے۔ شیخ محمد ملک ریکٹر ہوئے تو انہوں نے آہستہ آہستہ جامعہ کے تشخص کو بدلنے کی کوشش کی۔ وہ اپنی تقریروں میں عرب حکمرانوں کے خلاف گفتگو کرتے تھے لیکن گفتگو کی مہارت اور لفظوں پر گرفت کی وجہ سے وہ آخر میں تلخ سچائیوں کو شیرینی میں بدلنے کا فن جانتے ہیں اس وجہ سے اس گروپ کی آنکھوں میں کانٹوں کی طرح چبھنے کے باوجود ان کے خلاف کوئی اقدام نہ اٹھایا جا سکا۔ جامعہ میں ہر سال ثقافتی ہفتہ منایا جاتا ہے۔ جس میں مسلمان ممالک کے سفیروں میں سے کسی کو مہمان خصوصی کے طور پر بلایا جاتا ہے۔ اس بار (2012ء) سعودی سفیر کو دعوت دی گئی لیکن مصروفیت کی وجہ سے انہوں نے معذرت کر دی چنانچہ ایرانی سفیر کو دعوت دی گئی جو انہوں نے قبول کر لی۔

ایرانی سفیر اس طرح کے ہر موقع پر آگے بڑھ کر اپنی جگہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ سعودی سفارت خانے کو جونہی معلوم ہوا کہ ایرانی سفیر آ رہے ہیں تو انہوں نے ملک صاحب کو فون کر کے کہا کہ سعودی سفیر افتتاح کے لیے آئیں گے۔ ملک صاحب نے کہا کہ اب تو ایرانی سفیر کو کہا جا چکا ہے۔ دعوت نامے بھی چھپ گئے ہیں۔ سعودی سفارت خانے نے کہا کہ آپ دعوت نامے ضائع کر دیں۔ بات آگے بڑھی تو کہا گیا کہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ سعودی عرب کا کیا مقام ہے۔ ملک صاحب نے اپنی دانشوری میں کہہ دیا کہ سعودی سرزمین تو

ہمارے لیے مقدس ہے لیکن سعودی حکمران دوسرے مسلم حکمرانوں کی طرح برابر ہیں۔ اس بات کا اتنا برا منایا گیا کہ معاملہ صدرِ مملکت تک پہنچ گیا۔ سعودی سفیر نے دھمکی دی کہ اگر ملک صاحب کو نہ ہٹایا گیا تو وہ پاکستان سے چلے جائیں گے چنانچہ ملک صاحب کو ایوان صدر میں بلا کر کہا گیا کہ محفوظ راستہ اختیار کرتے ہوئے وہ ماہ کی چھٹی پر چلے جائیں اور وقتی طور پر قائد اعظم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو یہاں کا اضافی چارج دے دیا گیا۔ مجھے تو شبہ ہے کہ یہ سارا کام ایک منصوبے کے تحت کیا گیا ہے یہاں جو لابی ملک صاحب کے خلاف تھی ان کا سعودیوں سے گہرا رابطہ ہے۔ اس لیے اس میں بعید نہیں کہ یہ سب کچھ طے شدہ طریقے سے کیا گیا ہو۔

سعودیوں کا پاکستانی اداروں میں کتنا اثر و رسوخ ہے یہ اس کی ادنیٰ سی مثال ہے۔ ملک صاحب کے چھٹی پر جانے کے بعد جامعہ کے یہ چانسلر جو سعودی ہیں اور کئی سالوں سے ادھر نہیں آئے تھے اپنے خصوصی طیارے میں اسلام آباد آئے۔ جامعہ کا دورہ کیا اور ہر تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ جامعہ کا وہی تشخص برقرار رہے گا جو ابتدا میں تھا اور اب تو جامعہ کا صدر بھی سعودی عرب سے آ گیا ہے۔ اس لڑائی میں وقتی طور پر قدامت پسند گروپ کی فتح ہوئی۔ یہ گروپ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو شروع سے یہاں ہیں اور جن کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اسلام کا مقصد معاشی ترقی نہیں بلکہ انسان سازی ہے۔ میں نے ایک میٹنگ میں اس رائے کا اظہار کرنے والے پروفیسر صاحب سے یہ پوچھا کہ معاشی ترقی کے بغیر انسان سازی کیسے ہو سکتی ہے؟ اور یہ جو حدیث ہے کہ غربت میں ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اس کے کیا معنی ہیں؟" اس جامعہ میں ایسے لوگ ہیں جو اسلام کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو مذاق کا باعث بنتی ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے دباؤ پر مین روڈ کی دونوں طرف کی فٹ پاتھوں کو لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے الگ الگ کر دیا گیا ہے۔ یعنی ایک طرف صرف لڑکیاں اور دوسری طرف صرف لڑکے چل سکتے ہیں۔ ایک میٹنگ میں ایک پروفیسر، جو کمپیوٹر سائنس کے شعبے کے صدر ہیں، نے کہا کہ فٹ پاتھ تو الگ ہو گئے ہیں لیکن کچے راستوں کا بھی بندوبست ہونا چاہیے جہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ گزرتے ہیں۔

فتح محمد ملک کے جانے کے بعد وہ کھیل جو مجھے یہاں لانے سے شروع کیا گیا تھا مکافاتِ عمل سے گزر کر اپنے انجام کو پہنچا۔

میں نے اپنے سفر کا آغاز معمولی سی ملازمت سے کیا تھا۔ سرسید کالج میں دس سال لیکچرار رہے پروفیسر رہا۔ عمل میں پروفیسر اور صدر شعبہ رہا۔ اسلامی یونیورسٹی میں صدر شعبہ اور پھر کلیہ زبان و ادب کا ڈین رہا۔ یہ میرے کیریئر کی انتہا ہے۔ ادبی حوالوں سے بھی مجھے میرے کام سے زیادہ شناخت ملی۔ مجھ پر میری زندگی ہی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا گیا۔ ایم۔ فل کے اب تک چار مقالے لکھے جا چکے ہیں اور ایم۔ اے کی سطح کے مقالے تو درجنوں میں ہیں۔ سو دنیاوی حوالوں سے مجھے ایک کامیاب شخص سمجھا جائے گا لیکن کیا زندگی صرف یہی ہے۔ اگر یہ کامیابی ہے تو یہ ہر وقت میرے اندر کیا ٹوٹتا رہتا ہے۔ مجھے کس ان دیکھے کی تلاش کیوں ہے۔ موت سے ڈر بھی لگتا ہے لیکن موت کے بعد کی صورتِ حال کو جاننے کا شوق بھی انتہا پر ہے۔ کامیابی اور ناکامی کیا ہے؟ اطمینان اور سکون کیا شے ہیں؟ بظاہر سب کچھ پا جانے کے بعد بھی کچھ نہ پا سکنے کا احساس کیا ہے؟ یہ سارا تماشا کیا ہے اور اس تماشے میں میری حیثیت کیا ہے۔ تماشا گری، تماشائی کی یا خود تماشے کی۔ میرا سفر ختم ہو گیا ہے یا ابھی باقی ہے۔ ایک دریا کو پار کرنے کے بعد اگلا دریا کون سا ہے۔

اک اور دریا کا سامنا تھا منیر مجھ کو　　　میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

اس سے دریا کے سفر کا شوق اور لذت؟ کیا اس کے بعد بھی کوئی اور دریا ہے۔ ہر دریا کے بعد ایک دریا .... زندگی کا تسلسل کیا شے ہے۔ ڈی این اے تو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ایک جنم کے بعد دوسرا جنم اور جنموں کا ایک تسلسل۔ وقت ہر جگہ ہے۔ اپنی نئی نئی صورتوں میں

مکاں بھی ہے جو بدلتا رہتا ہے۔ تو زماں و مکاں سے کہیں چھٹکارہ نہیں۔ میں کسی ایک زمانے کا رشید امجد نہیں، رشید امجد تو ایک ڈی این اے ہے، جس سے ایک کے بعد ایک رشید امجد پیدا ہوتا رہے گا، لیکن ہر رشید امجد اپنا تسلسل ہونے کے باوجود دوسرے سے الگ ہوگا۔ کس بھی میرا قصہ ہے کہ ایک ہی ڈی این اے سے بار بار جنم لینے کے بعد بھی کیا میں اپنے "میں" کے ساتھ موجود رہوں گا۔ اگر مجھے اس سوال کا جواب مل جائے تو میں ابھی دوسرا جنم لینے کے لیے تیار ہوں۔

انسانی ڈی این اے کے مالیکیولز میں پائی جانے والی معلومات کو لکھنے کے لیے تقریباً دس لاکھ صفحات چاہئیں۔ کسی عمل کا اتفاقی حادثے کے نتیجے میں وجود میں آنا ممکن نہیں۔ تو پھر تقدیر میں قدرت کی کیا حیثیت ہے۔ پھر یہ بھی کہ انسانی ڈی این اے کی ساخت مشترک ہونے کے باوجود ہر ڈی این اے کے مالیکیولز نہ صرف شکل و صورت بلکہ مزاجوں اور صلاحیتوں میں مختلف ہوتے ہیں۔

بنیادی نوع کی کچھ صورتیں یکساں ہوتی ہیں مثلاً انسانی وجودی جزیات لیکن اس کے اظہار اور رویے مختلف ہوتے ہیں اسی وجہ سے ایک جیسا وجودی ڈھانچہ رکھنے کے باوجود ہر انسان کسی نہ کسی سطح پر دوسرے سے مختلف ہے۔ یہ اختلاف شخصی وجود کی علامت ہے تو اجتماعی تخلیق کا اظہار بھی۔ انسان بھی شاید بیج کی طرح پاگل بھی ہے اور فضاؤں میں آزاد بھی لیکن اس حوالے سے تقدیر میں جبر کا پہلو زیادہ نمایاں ہے، تو قدر کیا ہے۔ پاگل ہو کر فضاؤں کی مصنوعی آزادی کیا معنی رکھتی ہے؟ ہر کسی شخص کے ڈی این اے کے خواص انفرادی ہوتے ہیں۔ یہ کتنا پراسرار اور مشکل تخلیقی عمل ہے جب ماں کے پیٹ میں پرورش پانے والے لوتھڑے میں روح پھونکی جاتی ہے تو اس کی تقدیر بھی ساتھ ہی رقم ہو جاتی ہے۔ یہ در اصل ڈی این اے کا وجود میں آنا ہے۔ ڈی این اے میں موجود معلومات ہمیشہ محفوظ رہتی ہیں بلکہ کبھی کبھی ان کا اظہار بھی ہو جاتا ہے۔ کیا خواب، الہام، رویا اسی کی صورتیں ہیں؟ لیکن ہر شخص ان تجربات سے نہیں گزرتا، صوفی ان خصوصیات کو پانے کے لیے جس ریاضت اور مکاشفے سے گزرتا ہے اس کی صورت کیا ہے؟ میں جو کبھی کبھی خود کو دوسروں سے بالکل ہی مختلف محسوس کرتا ہوں اور ان چھوٹے چھوٹے پراسرار تجربوں سے گزرتا ہوں تو کیا یہ صرف میری اس نوع کی دلچسپیاں ہیں یا میرے ڈی این اے میں میری یہ صفت شامل کر دی گئی ہے؟ میں جو ہر لمحے مضطرب رہنے کی تمنا رکھتا ہوں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ "اس" نے میرا ڈی این اے بنایا ہی اس طرح ہے کہ اضطراب میری فطرت کا حصہ ہے۔

اور بیش ہر وقت دعا مانگتا تھا ـــ "اے خدا مجھے مضطرب رکھ کہ تیری جستجو کرتا رہوں" میں بھی یہی دعا مانگتا ہوں۔ اس دعا کی توفیق اسی نے تو مجھے عطا کی ہے، تو توفیق بھی اس کا عطیہ ہے۔ اگر مجھ سے کوئی اچھا کام ہو جائے، کسی کا بھلا ہو جائے تو یہ اسی کی عطا کردہ توفیق ہے جو اس نے میرے ڈی این اے میں ڈال دی تھی۔ کیا مکان کے بغیر زمان کا کوئی وجود ہے۔ اولیت اور دوام کسے حاصل ہے؟ "وقت کو برا نہ کہو کہ وقت خود خدا ہے"۔ زمان اگر خود خدا نہیں بھی تو اس کی صفت ضرور ہے۔ پھر مکان کے کیا معنی ہوئے؟ بگ بینگ تھیوری کے مطابق پہلے مکان وجود میں آیا، لیکن صوفیا کے نزدیک زماں تو ہمیشہ سے تھا اور رہے گا۔

ع ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ازل بھی ایک طرح سے زمان ہی ہے۔ وہ مکان سے ماوراء ہے اور ابد زمان کے سفر کا اختتام ہے جس کے بعد وہ کیفیت ہوگی جس میں نہ زماں ہوگا نہ مکاں۔ میرا قصہ یہ ہے کہ میں کہاں اور کس صورت میں ہوگا؟ ہوں گا بھی کہ نہیں!! اگر نہیں تو پھر یہ میں کیا کر رہا ہوں اور کس کے لیے؟ ستارے روشنی اور حرارت خارج کر رہے ہیں اور ایک وقت آئے گا جب کائنات کا درجہ حرارت یکساں ہو جائے گا۔ پھر

حرارت اور توانائی کا عمل رک جائے گا۔ یہ کائنات کی حرارتی موت ہوگی۔ تو کیا پھر تخلیق کا یہ عمل شروع ہوگا؟ "وہ" تو فنا اور موت سے ماورا ہے۔ زمان سے بھی ماورا ہے تو وہی ہے ہمیشہ قائم رہنے والا۔ میں کیا اور میری حیثیت کیا؟

ہماری یہ دنیا اصل نہیں، یہ ایک آزمائش گاہ ہے۔ اصل کام کہیں اور ہوتا ہے جسے آزمائش کے لیے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ سائنس دانوں کی اکثریت کہتی ہے کہ زمین کی عمر امینوایسڈز (AminoAcids) کے وجود کے لیے اس لیے ناکافی ہے کہ ان کے ارتقا کے لیے اس عمر سے کہیں زیادہ عرصہ درکار ہے۔ ترکی کے دانشور محمد فتح اللہ گولن سوال کرتے ہیں کہ "کیا یہ ارتقائی عمل کسی دوسرے جہاں میں ہوتا رہا اور اپنی تکمیل کے بعد ہماری زمین پر منتقل ہوگیا؟" سچائی کیا ہے؟ مرشد نے کہا تھا کہ "اسے دیکھنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک باہر سے دوسرے اس کے اندر اتر کر۔ باہر سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ آدھا سچ ہے۔ اندر اتریں تو ازل کے نقطے پہ جا کھڑے ہوتے ہیں۔ تم آدھا سچ جاننا چاہتے یا اشیاء کے اندر اتر کر ان کے باطن کو سمجھنا چاہتے ہو"۔ میں نے کہا "میں ان کے اندر کی یاترا کرنا چاہتا ہوں"۔

مرشد ہنسا "تو پھر آخر تمہاری ملاقات تمہارے اپنے آپ سے ہو جائے گی۔" مجھے منطق الطیر یاد آگئی۔ میرا سفر اچانک درمیان میں سے کہیں شروع ہو جاتا ہے۔ کم از کم شعور تو یہی بتاتا ہے اور درمیان میں کہیں ختم۔ لیکن مرشد کی انگلی پکڑ کر میں کئی بار اس مقام پر پہنچا ہوں۔ جہاں میری ملاقات خود مجھ سے ہوئی ہے۔ حلاج کی گونجدار آواز سنائی دیتی ہے "انا الحق"

مجھے تین بار جزوی موت کا تجربہ ہوا۔ جس دوران میں چند لمحوں کے لیے زمان و مکاں سے ماورا ہو گیا۔ کیا واقعی زمان و مکان سے ماورا ہوا جا سکتا ہے یا یہ زمان و مکاں کی کوئی بدلی ہوئی صورت ہے۔ ایک بار میں، جہانگیر عمران، جواد حیات اور انوار فطرت کرنل مقبول حسین کے ہاں کھانا کھا رہے تھے۔ کرنل مقبول بڑے نفیس ذوق کے مالک ہیں۔ وہ تین ماہ بعد دوستوں کو اکٹھا کرتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کی غیر ملکی وسکی اور کلاسیکی موسیقی۔ ہم جرعہ کشی میں موسیقی سنتے ہوئے وہ موسیقی کے بارے میں اپنی پسند ناپسند کے بارے میں بھی گفتگو کرتے جاتے ہیں اور کسی کا گلاس خالی نہیں ہونے دیتے۔ اس کے بعد کھانا۔ اس روز بھی یہی ہوا۔ خوش گپیوں کے بعد ہم کھانے کے لیے ڈائننگ روم میں آئے۔ کھانا کھاتے ہوئے وقت میں ایک دو منٹ کے لیے غائب ہو گیا۔ بعد میں انوار فطرت نے بتایا کہ "اچانک چمچ آپ کے ہاتھ سے چھوٹ کر پلیٹ میں گرا اور آپ کا سر کرسی سے جا لگا۔ ہم گھبرا کر آپ کی طرف بڑھے۔ آپ کا سارا جسم برف کی طرح ٹھنڈا تھا۔ نبض گم تھی"۔ فطرت ہومیو ڈاکٹر بھی ہیں، کہتے ہیں "سارے جسم کو ٹٹول کر میں نے گلی میں سر ڈال دیا اور میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ابھی ہم سوچ ہی رہے تھے کہ کیا کریں کہ دفعتاً آپ کے جسم میں حرکت ہوئی۔ جسم کی حرارت اپنی جگہ آگئی اور آپ نے آنکھیں کھول کر پلیٹ میں گرے چمچ کو اٹھا لیا۔ البتہ آپ کی آنکھوں میں ایک عجب طرح کی ویرانی اور خالی پن تھا جو تقریباً پانچ چھ منٹ کے بعد زائل ہوا"۔ میری اپنی یہ کیفیت کہ مجھے بالکل احساس نہیں کہ یہ کیا ہوا اور میں زمان و مکاں کی کس حالت میں تھا۔

دوسری بار اسی طرح کی صورت حال بادامی باغ کی سبزی منڈی کے باہر پیش آئی۔ اتوار کو میں اور رخسانہ ہفتہ بھر کی سبزی اور پھل لینے صبح صبح ہی یہاں آتے تھے۔ حسن، حسین گھر میں ہی تھے۔ ہم نے ہفتہ بھر کی سبزی وغیرہ خریدی۔ اس زمانے میں میرے پاس کلٹس تھی جسے میں خود ہی چلاتا تھا۔ سامان پچھلی سیٹ پر رکھ کر میں اپنی سیٹ پر بیٹھا اور چابی لگانے لگا۔ اس کے بعد مجھے معلوم نہیں کیا ہوا۔

(جاری ہے)

سفرنامے

ایدرنے کا اُجڑا محل

فرخ سہیل گوئندی

ترکی کی سرزمین مختلف تہذیبوں کی وارث ہے۔ یہ اعظم ایشیا اور یورپ کا سنگم اور بحیرۂ روم کی وساطت سے افریقہ سے ملحق یہ خطہ ارض تہذیبی اثرات کی ایک مختلف شناخت رکھتا ہے۔ اور بحیرۂ کوہ قاف کے پہلو میں واقع ہونے کے سبب اس رنگا رنگی کی نوعیت ہی بدل جاتی ہے۔ یہ اثرات لوگوں کے رہن سہن سے لے کر تہذیب و تمدن، فکر و فلسفے اور لوگوں کے رنگ و حسن تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اناطولیہ کی سرزمین سے لے کر تراکیا (تھریس) تک۔ ترکی کے پہاڑوں، میدانوں میں پھیلی ہوئی شہری بستیوں سے لے کر آثار، کھنڈرات اور آباد شہروں تک۔ یہی وہ جستجو ہے جو مجھے اس تہذیبی سنگم میں بار بار جانے پر مجبور کرتی ہے۔ تاریخ، تہذیب اور سرزمین کو جاننے کی تشنگی کبھی کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ یہ کام جنون کے بغیر ممکن نہیں۔ وقت اور سرمائے کے ساتھ ساتھ مطالعہ بھی درکار ہوتا ہے۔ ایسے جنون کی تکمیل کے لیے، جب مطالعے کے ساتھ مشاہدہ مل جائے تو جو تسکین ہوتی ہے، وہ بیان سے باہر ہے۔

ترکوں کا ایدرنے اور یونانیوں کے ایدریانوپل کی تاریخ ہزاروں سالوں تک پھیلی ہے۔ بازنطینی دور سے بھی پہلے آباد یہ بستی، بلغاریہ اور یونان کی سرحدوں کو چھوتی تھی۔ عثمانیوں نے 1363ء سے 1453ء تک اسے اپنا دارالخلافہ بنائے رکھا۔ فاتح استنبول، سلطان محمد ثانی کا 30 مارچ 1432ء کو یہیں جنم ہوا۔ فتح استنبول کے سبب ہی اس عثمانی سلطان کو فاتح سلطان کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ اس نوجوان عثمانی سلطان نے بیس سال کی عمر میں قسطنطنیہ کو فتح کر کے مشرقی رومن امپائر کی بساط لپیٹ دی۔

ایدرنے، ترکی کے مشرقی تراکیا کا اہم ترین شہر ہے۔ اس بستی کے حسن، تاریخ اور کہانیوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں اسے ایک بار پھر دیکھوں۔ پہلی مرتبہ میں نے اس شہر کو استنبول سے ٹرین کے ذریعے صوفیہ جاتے ہوئے رات کے وقت عبور کیا تھا۔ 1983ء میں جب بلغاریہ اشتراکی نظام کا علمبردار تھا۔ رات کے اندھیرے میں ٹرین کی کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی کہ کسی طرح اس کی ایک جھلک دیکھ لوں۔ تین دہائیوں قبل رات کو طلسماتی روشنی کا عکس آج بھی میرے ذہن پر ثبت ہے اور پھر ٹھیک تیس سال بعد 2013ء میں بذریعہ بس بلغاریہ جاتے ہوئے اس شہر میں قیام۔ اس مختصر قیام نے میری جستجو کی پیاس مزید بڑھا دی۔ ایدرنے کو مزید دیکھنے، سونگھنے، چھونے اور جاننے کی خواہش نے مجھے اس شہر کی باقاعدہ سیاحت پر مجبور کر دیا۔ اور یوں ہم دونوں (میں اور ریما) اس شہر کی جانب روانہ ہوئے۔ 1983ء اور 2016ء، تینتیس سالوں میں دنیا بدل گئی، لیکن ایدرنے کی سیاحت کی پیاس میں کمی آنے کی بجائے بڑھ چکی تھی۔

استنبول سے اپنے ایک ترک دوست ایمراہ کے ہمراہ ان کی گاڑی پر ایدرنے روانہ ہوئے۔ ایمراہ، بلند ایجوت کے نوجوان دوستوں میں شمار ہوتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں بلند ایجوت نے اس نوجوان کو خود فون کر کے ملاقات کے لیے اپنے

دفتر دعوت دی۔ ایمراہ نے ایک اخباری مراسلے میں جناب بلند ایجوت مرحوم اور اُن کی پارٹی کے حوالے سے تحریر لکھی تھی۔ اور یوں ایک کمسن نوجوان کو بلند ایجوت نے اپنی پارٹی (ڈیموکریٹک لیفٹ پارٹی (DSP) کے یوتھ ونگ کا انچارج بنا دیا۔ ایمراہ نے چند روز پہلے ہی مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی میں سیکولرازم کے موضوع پر اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ مکمل کیا ہے۔ اب وہ ہمارا دوست ہے کہ اس نے بلند ایجوت مرحوم کی میز پر میری کتاب دیکھی اور برسوں اس کی خواہش رہی کہ ایجوت صاحب کے اس پاکستانی دوست سے ملا جائے۔ ایدرنے جانے کے لیے جب میں نے ایمراہ پر اپنا ارادہ ظاہر کیا تو اس نے کہا کہ میں آپ دونوں کو ایدرنے اپنی گاڑی پر چھوڑ آؤں گا۔ استنبول سے ایدرنے تک گاڑی میں سفر درحقیقت ایک یادگار محفل تھی۔ کچھ وقت ہمارے ساتھ گزارنے کے بعد ایمراہ نے ہمیں ہوٹل اتار دیا۔ ایدرنے میں قیام کے لیے ریحانہ نے پانچ ستارہ ہوٹل نہایت کم نرخ پر ہوٹل بکنگ ڈاٹ کام سے بک کیا تھا۔

ہم وہاں پہنچے تو موسم گرما میں یورپ کے اس بلقانی خطے میں بارش بغیر اطلاع کے آ گئی۔ اس اچانک بارش کا لطف اور دریائے مریشا کے کنارے عثمانی دور کے پل سے ملحقہ کیفے میں بیٹھنا اپنی الگ یادیں چھوڑ گیا۔ تیز ہوا کے سبب پانی کی لہریں کیفے میں بیٹھے لوگوں کو چھونے لگیں اور یوں اس اچانک جل تھل نے کیفے کی پرسکون فضا میں ہلچل مچا دی۔ دریائے مریشا کنارے کیفے کا پرسکون ماحول یکدم بدل گیا۔ دریا تیزی سے بہہ رہا تھا۔ بلقان کے اس خوب صورت ترین دریا کنارے اگست میں یورپ کی شدید بارش ایک منفرد تجربہ تھا۔ موسلادھار بارش نے کیفے میں بیٹھے لوگوں کو بھگو دیا۔ ترکی کی سرحد کے اندر خود کو یونان اور بلغاریہ کی سرحد سے چند میل کے فاصلے پر محسوس کرنا ایک منفرد احساس تھا۔ دریائے مریشا پر قائم جدید کیفے، قدیم عثمانی پل اور اس کے نیچے پانی کے تیز بہاؤ کے ساتھ ساتھ میرے دماغ میں اس بستی کی تاریخ کے اوراق تیزی سے پلٹ رہے تھے۔ ہزاروں سال پرانا ایدرنے۔ یونان، بلغاریہ، روس اور ترکی نے بڑے معرکے کیے اس شہر میں۔ سرد جنگ کے زمانے میں سرمایہ دارانہ دنیا کا بلغاریہ کی سرحدوں کو چھوتا کارنر تھا ایدرنے۔ کیفے میں گرم گرم ترک قہوہ (ترک کافی دودھ کے بغیر) کا ایک ایک شاٹ ایسا لیا کہ میرے تو چاروں طبق روشن ہو گئے۔ ریحانہ کی صبح تو ہوتی ہی اس ترک قہوے سے ہے جسے بلقانی/عرب کافی کہتے ہیں۔ ہر صبح میں اخبارات پڑھتے اور موسیقی سنتے چائے کے تین سے چار کپ پیتا ہوں تو عرب کافی کی دل گداز خوشبو سے سارا کمرا مہک جاتا ہے۔

بارش نے ہمیں بھی کیفے سے جلدی بھاگنے پر مجبور کیا۔ اب مجھے ایدرنے کی تراکیا یونیورسٹی کیمپس کا وہ حصہ دیکھنا تھا جہاں ایدرنے کا قدیم ریلوے سٹیشن تراکیا یونیورسٹی کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔ ایدرنے کا پرانا ریلوے سٹیشن اپنی اصل حالت میں تراکیا یونیورسٹی کی ادب وفنون فیکلٹی قرار دے دیا گیا ہے اور یہیں پر معاہدہ لوزان کی یادگار بھی بنائی گئی ہے۔ لوزان شاہراہ، دریائے مریشا عبور کرنے کے بعد جن گلیوں سے گزرتی ہے، وہ ترکی کی اناطولیائی تعمیر سے کہیں مختلف ہیں۔ ایک خاص یورپی طرز ہے ان گلیوں کا۔

جب ہم تراکیا یونیورسٹی کے کیمپس پہنچے تو ہر طرف کیفے ہی کیفے تھے مگر کوئی ایسا کیفے نہ تھا جو خالی ہو۔ مرد وزن یوں بیٹھے چائے، کافی، مشروبات سے لطف اندوز ہو رہے تھے جیسے آج کا سب سے اہم کام ہی ان کا یہاں بیٹھ کر بحث کرنا ہے۔ ریلوے سٹیشن پر قدیم بھاپ کا انجن اور ریلوے ٹریک ابھی تک موجود ہے۔ ایدرنے کا قدیم ریلوے سٹیشن واقعی اس قابل تھا کہ اسے تراکیا یونیورسٹی کی ادب وفنون فیکلٹی میں بدل دیا جائے۔ یہاں وہاں اور فیکلٹی کے لان میں لگے درخت اور پھول میرے جیسے ظلمانہ سیاح کو مست کر دینے کے لیے کافی تھے۔ اور یوں وہ شام یادگار رہے گی۔ ایمراہ کو ہمیں ہوٹل اتار کر واپس استنبول جانا تھا۔ لیکن کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ

ایدرنے آئیں اور ایدرنے کی مشہور زمانہ کلیجی نہ کھائیں۔ ایدرنے کی تین چیزیں ترکی میں بہت مشہور ہیں۔ جی ار (جگر) ترک گ کو Pronounce نہیں کرتے۔ ایدرنے کے پہلوان اور ایدرنے کے خانہ بدوش۔

شہر مرکز پہنچے جہاں ایک ہی نام سے کئی جی ار (جگر) فرائی کی دکانیں تھیں۔ ''آئدن جی ار''۔ جیسے ہمارے ہاں بھی ایک سردار مچھلی والا تھا مگر اب لاہور کی ہر گلی میں سردار مچھلی فروش آپ کو مل جائے گا۔ دائیں، بائیں، ہر طرف آئدن جی ار۔ رش سے اندازہ تو ہو گیا کہ پہلا اور اصلی آئدن جی ار والا کون ہے کہ وہاں فرلانگ بھر لمبی قطار بھی تھی۔ اور ہم تھے بھوک سے کھانوں کے متلاشی۔ ہم نے ایمرا سے کہا کہ کیا فرق ہوگا ترک دیے کی کلیجی اور اس کو فرائی کرنے میں اور یوں ہم نے ایک جی ار فرائی فروش کی دکان میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا۔ ترک دیے کی لمبی لمبی کلیجی Crumbs کا کر کر سے تیل میں یوں تلی گئی تھی کہ وہ کلیجی کم اور فرنچ فرائی زیادہ لگ رہی تھی۔ ہر غیر صحت بخش فوڈ کی طرح یقیناً لذیذ ہوتی ہے۔ ایدرنے کی جی ار بھی لذت میں واقعی منفرد تھی۔ تین سال بھر کے لیے کولیسٹرول کا ذخیرہ تھا ایک پلیٹ میں، اور ہم تینوں نے ایک ایک پلیٹ تیل میں تلی کلیجی اڑائی۔ واللہ واقعی لاجواب تھا۔ اور ساتھ بھرپور قسم کی لمبی لمبی سبز مرچیں بھی جو اسی طرح تیل میں فرائی کی گئی تھیں۔

ایمرا کو شام ڈھلے واپس استنبول جانا تھا اور وہ ہمیں ہوٹل اتار کر واپس استنبول روانہ ہوا۔ ہمارے ہوٹل کی کھڑکی سے یونان میں کھڑے درخت صاف دکھائی دے رہے تھے کیوں کہ مسافت چند ہی کلومیٹر تھی۔ جب بھی بڑے ہوٹل میں قیام کا موقع ملا، اس کا اپنا ہی ایک لطف ہوتا ہے، شاندار سروس اور مختلف سہولیات۔ چھٹی منزل پر واقع کمرے کے جب ایدرنے میں ہر طرف پھیلے درختوں کا نظارہ اور پرسکون گلیاں اور شاہراہیں۔ جہاں سے کوئی دھکم پیل یا مارا ماری برپا ہو۔ ایدرنے کی زندگی میں اطمینان کی عکاس ہے۔ فضا صاف ستھری، آبادی یا فضائی آلودگی ندارد۔ شہرِ اطمینان ہے ایدرنے۔ اس شہر میں سینکڑوں سالوں تک بڑی طاقتوں اور تہذیبوں کا ٹکراؤ ہوتا رہا۔ ایدرنے کے حسن کے کئی مظاہر ہیں، سرزمین، عمارات، مکین، کھیت کھلیان اور رنگا رنگی آثار۔ کچھ وقت آرام کے بعد ہم پھر نکلے ایدرنے کی تلاش میں۔ طے پایا کہ اسی کیفے چلیں جو شہر مرکز میں واقع ہے اور تین سال قبل 2013ء میں ہم نے وہاں ایک یادگار شام گزاری تھی۔

لنجا کیفے۔ اس کے چاروں اطراف شاہراہیں ہیں۔ چوک کے اندر واقع باغیچے میں لنجا کیفے ترک روایات کا امین ہے۔ یہاں لوگ چائے، کافی، راکی، بیئر، ہلکی پھلکی ترک فوڈ کھانے کے علاوہ Tavla (ٹاولا) بھی کھیلتے ہیں، شیشہ پیتے ہیں اور خوب محفل جماتے ہیں۔ لنجا کیفے کے عین سامنے عثمانیوں کی اولین تعمیر کردہ جامع اولو ہے جس کی تعمیر 1414ء میں ہوئی۔ ایک طرف مشہور زمانہ جامع سلیمیہ، ساتھ ہی قدیم بند بازار، اور جا بجا بکھرے عثمانی دور کے آثار اور یورپی طرز کی عمارات۔ ہوٹل سے شہر مرکز جاتی دولموش (منی بس) پکڑی اور بالکل لنجا کیفے کے سامنے اتر گئے۔

ایدرنے میں سورج غروب ہو چکا تھا۔ مغرب میں ہونے کے سبب سورج دیر گئے ڈھلتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، یہ بالکل غلط تصور ہے۔ زمانہ رکتا نہیں، تھمتا نہیں، وقت کے ساتھ ہر چیز بدل جاتی ہے، یہ تو آپ ہیں جو گزرے وقت کو تلاش کرتے ہیں۔ خود کو ٹھیک تین سال بعد لنجا کیفے میں پاکر گزرے وقت کو چشم تصور میں لانے کا لاجواب لطف آیا۔ میں نے ترک چائے اور رہمانے کافی (ترک قہوہ) کا آرڈر دیا۔ شہر کی ٹریفک رواں تھی، ہماری طرح نہیں کہ موت کا کنواں چل رہا ہو۔ جس

مہذب انداز میں سڑک پر ٹریفک گاڑیاں رواں تھیں، اسی طرح پیدل چلنے والے فٹ پاتھوں پر آ جا رہے تھے۔ فٹ پاتھوں پر نابینا لوگوں کے لیے پیلے رنگ کے نشانات اور ان پر ابھرے گول چھوٹے چھوٹے دائرے جن سے اندازہ لگا کر نابینا لوگوں کو چلنے کی سہولت میسر تھی۔ ہماری طرح نہیں کہ جہاں شہروں کے اندر بڑے بڑے فلائی اوورز، انڈر پاس، اور تیز ترین ٹرین رواں رہے ہیں مگر پیدل چلنے والوں کے لیے فٹ پاتھ تعمیر ہونا بند ہو گئے ہیں، جو ہیں وہ بھی مٹتے جا رہے ہیں۔ پیدل چلنے والے کہاں چلیں، یہ ہماری نام نہاد شہری ترقیاتی منصوبہ بندیاں کرنے والوں کے ایجنڈے میں ہی نہیں۔ ترکی کی جدت کے عمل میں ایسا نہیں۔ وہاں ترقی زندگی کے ہر شعبے میں ہے اور ہر جگہ ہے۔ دیہات اور شہر جدید شہری سہولیات سے برابر استفادہ کر رہے ہیں۔

ہم کیفے تنہا میں دیر گئے تک بیٹھے رہے۔ شفاف ہوا اور پُرسکون فضا میں یکدم اذان کی صدا گونجی، اللہ اکبر، اللہ اکبر۔ اذان دینا ترکوں پر ختم ہے۔ ان کی خوش الحانی بے مثال ہے۔ اس لیے کہ اتاترک کے سیکولر ترکی میں کوئی بھی اس وقت تک مؤذن نہیں بن سکتا تھا جب تک کہ اس نے خوش الحانی کا کورس نہ کیا ہو اور مساجد کے نظام سے اذان تک سب یکسر ریاست کی ذمہ داری میں ہوتا ہے۔ کیفے کے سامنے واقع مسجد، جامع اولو اپنی ہی تاریخ رکھتی ہے۔ اولو جامع جہاں عثمانی دور کی اولین مساجد میں شمار ہوتی ہے، وہیں اس کی ایک اور منفرد پہچان ہے کہ اس کی دیواروں میں خانہ کعبہ سے لائے گئے پتھر اور اینٹیں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ جامع اولو کے گنبد قدیم تعمیرات میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان گنبدوں کی تعمیر بازنطینی گرجا گھروں سے ملتی جلتی ہے۔ عثمانی فن تعمیر میں بازنطینی فن تعمیر رچا بسا ہے۔ آج کے جدید فن تعمیر میں بھی یہ تسلسل بڑی شدومد سے پایا جاتا ہے۔ آیا صوفیہ سے لے کر ترکی کے کسی گاؤں تک کی مساجد میں یہ شان اور روش شامل ہے۔ اولو جامع ترکوں کے لیے کس قدر پرکشش تھی، اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ بیشتر ترک سلطان جنگوں پر روانہ ہونے سے پہلے فتح کی دعا کے لیے یہاں حاضری دیا کرتے تھے کہ اس کی دیواریں خانہ کعبہ سے لائے پتھروں سے بنی گئی ہیں۔

ایدرنے میں تین بند بازار ہیں۔ قدیم ترین بازار 1454ء میں تعمیر ہوا۔ اس کے بعد دو مزید۔ ایک آراستہ (بند) بازار، سلیمیہ جامع کے نیچے ہے جو ہر لحاظ سے معروف بازار ہے۔ کیا صفائی ستھرائی ہے ان بند بازاروں کی! ہمارے کسی باذوق گھر کا ڈرائنگ روم ہی اس قدر صاف ہو سکتا ہے۔ جدید بند بازار بھی کوئی تین صدیاں پرانا ہے۔ اس کی چھتوں سے سورج کی روشنی چھلکتی ہے، نیلے اور سرخ رنگ دار شیشے روشن بند بازار میں رنگینیاں پھیلا دیتے ہیں۔ بازار میں زیادہ تر کپڑے، عورتوں کے زیر جامے، قسم قسم کی ٹوپیاں، فیلٹ ہیٹ اور سب کچھ فروخت ہو رہا تھا۔ ایک ہیٹ رینا کے لیے خریدا اور اپنے لیے بلند ابھرت کیپ جو ہاؤ کیپ سے ملتی جلتی ہے۔ بازار میں زیتون اور اس کے تیل کی فروخت قابل دید ہے اور قسم قسم کے خوشبودار مقامی صابن۔ یہ صابن پھلوں اور پھولوں کی شکل میں بنائے جاتے ہیں۔ ایدرنے کا ایک خاص تحفہ مختلف اقسام کے خوشبودار صابن بھی ہیں، جیسے لیونڈر، زیتون، لیموں، تربوز، خربوزے، چنبیلی، گلاب، خوبانی سمیت مختلف پھلوں اور پھولوں کی خوشبو والے صابن۔

شہر کے وسط میں موجود شاہراہ پیدل چلنے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ دونوں جانب دکانیں اور کہیں بیٹھنے کے لیے بنچ بھی رکھے ہیں۔ ریستوران والوں نے سڑک کے بیچ اپنے گاہکوں کے لیے قرینے سے میز کرسیاں بھی سجا رکھی ہیں۔ اور ذرا فاصلے پر

فوارے بھی، جن میں جل پری کا فوارہ رات کی روشنیوں اور پانی کے حسن کے امتزاج کے ساتھ مسحور کر دیتا ہے۔ ترک زندہ قوم ہیں اور اپنے لیڈر کو زندہ تصور کرتے ہیں۔ اتاترک قوم کے لیڈر ہی نہیں باپ (اتا) تھے۔ اسی لیے کوئی گلی یا شاہراہ ایسی نہیں جہاں اس غازی کی یادگار نہ ہو۔ اسی شاہراہ کے آغاز میں دشمن کو للکارتا اتاترک کا مجسمہ اور پیچھے بازار ایک دیوار پر بڑی سی پینٹنگ ہے جس میں گھوڑے پر سوار اپنی ملت کا دفاع کرتے اتاترک کو دکھایا گیا ہے۔ اس کے ہمراہ فوج اور عوام جن میں مرد، عورتیں، اناطولیہ کے کسان اپنے ہاتھوں میں خوشۂ گندم اور بندوق اٹھائے دکھائے گئے ہیں۔

ایدرنے میں عثمانی اور یونانی فن تعمیر جا بجا باہم ملا دکھائی دیتا ہے۔ ایک ایک مرلے پر قائم دو تین منزلہ دکان اگر عثمانی طرز پر ہے تو دوسری دکان یا عمارت کا طرز تعمیر یونانی ہے۔ اس شہر میں یونانیوں کی ایک بڑی تعداد صدیوں آباد رہی جو جنگ آزادی کے بعد آبادی کے تبادلے کے معاہدے کے تحت یونان چلی گئی۔ عثمانی اور یونانی طرز تعمیر کے مابین ایک واضح فرق چونکا دینے والا ہے۔ عثمانی طرز تعمیر والی عمارت میں چھجہ لازمی ہے جبکہ یونانی طرز تعمیر میں چھجہ نہیں ہوتا۔ ترکی میں طرز تعمیر عثمانی ہو، جدید، یونانی یا آرمینی، جھروکہ جا بجا ملے گا۔ جھروکے پھولوں کی کیاریوں سے لدے ہوں گے اور وہاں بیٹھے ترک قہوہ (کافی) کی چسکیاں لیتے اہلِ مکان۔ اس شہر میں یونانیوں کے علاوہ یہودیوں کی بھی کثیر آبادی تھی جو اب زیادہ تر مستقل طور پر اسرائیل میں آباد ہو چکی ہے۔ شہر میں ابھی بھی ایک سینیگاگ موجود ہے جہاں یہودی آزادی سے عبادت کرنے کا پورا حق رکھتے ہیں۔ ترکی کے سماج میں مذہبی اور فرقہ وارانہ تنازع سرے سے موجود نہیں۔ عثمانی دور اور بعد میں جدید ترکی میں بھی مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو مکمل مذہبی آزادیاں حاصل ہیں۔ ترکی میں آباد یہودیوں کا تعلق ہسپانیہ سے ہے۔ جب سقوطِ غرناطہ ہوا تو مسلمانوں کے ساتھ ساتھ یہودیوں کو بھی تین آپشنز دیے گئے۔ مذہب تبدیل کر لو اور مسیحی ہو جاؤ، ملک چھوڑ دو یا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اور یوں مسلم ہسپانیہ سے نقل مکانی کرنے والے یہودیوں نے سلطنت عثمانیہ کے علاقوں میں پناہ لی۔ عثمانیوں نے ان کے جان و مال کا تحفظ کیا اور بعد میں جدید ترکی میں بھی ایسا ہی ہوا۔

ایدرنے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شہرِ اسرار ہے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اس شہر کا اپنا ہی ایک سحر ہے۔ یہاں کے پہلوان اور خانہ بدوش اس شہر کی پہچان تو ہیں، اس شہر کی ایک اور پہچان مختلف ممالک کے درمیان تنازعات بھی ہیں۔ روس، یونان، بلغاریہ اور ترکی، سب ہی اس شہر کے حصول کے لیے لڑتے رہے۔ ہر زمانے میں اس شہر کو میدانِ جنگ میں بدل دیا گیا۔ کئی بار اس شہر کا محاصرہ ہوا اور تاریخ میں سولہ بڑی جنگیں اس شہر میں برپا ہوئیں۔ جنگی تاریخ کے ماہر جان کیگن کے بقول، ''یہ دنیا میں تنازعوں کا سب سے بڑا گڑھ ہے۔'' جب عثمانی سلطنت کا زوال ہوا تو اس شہر نے ایک بار پھر جنگوں کی تباہ کاریاں دیکھیں۔ اس کے آثار اب بھی موجود ہیں۔

ہم نے پورا ایک دن شہر سے باہر ان آثار کی تلاش میں لگا دیا جو کبھی اپنے جاہ و جلال کے باعث دنیا میں شناخت رکھتے تھے۔ اس میں عثمانی سلطان بایزید دوم کا کلیہ سرِفہرست ہے جو اپنے وقت کا اہم تعلیمی، تہذیبی، ثقافتی اور طبی مرکز تھا۔ ایک ہی جگہ قائم اس کمپلیکس کو عثمانی دور میں کلیہ کہا جاتا تھا۔ سلطان بایزید دوم نے 1512ء ۔ 1481ء تک اس سلطنت پر حکمرانی کی۔ اس صوفی منش

سلطان نے آج سے سینکڑوں سال قبل کلیہ جیسا کمپلیکس تعمیر کر کے جو انسانی سہولیات فراہم کیں، وہ آج کے سیاحوں کے لیے حیرانی کا باعث ہیں۔

تاریخ کی تلاش میں ہم شہر کے وسط سے پیدل ہی چل پڑے۔ دھوپ شدید تھی اور مجھے بخار کے آثار بھی محسوس ہو رہے تھے۔ جوں جوں شہر پیچھے چھوڑتے چلے گئے، تاریخ کی تلاش کا جنون بڑھتا چلا گیا۔ ایدرنے کی آبادی دریا کنارے ختم ہو گئی تو وہاں پانچ سو سال قدیم مسجد ہمارے سامنے تھی جہاں آج بھی حکم اذان لا الہ الا اللہ دن میں پانچ بار جاری ہوتا تھا اور ساتھ ہی ایک سرائے کے کھنڈرات تھے۔ سڑک کنارے بلغاریہ کی جانب سنگِ میل نصب تھے۔ انگریزی، ترک، بلغاری اور یونانی زبان میں اشارے اس بات کا ثبوت تھے کہ اس شاہراہ سے اردگرد کے ان ممالک کے لوگ اپنے معمول کے مطابق یہاں کا سفر کرتے تھے۔

میں نے ریحانہ سے پوچھا، چلو گی مزید پیدل؟ اس نے کہا، جہاں تک کہو گے چلوں گی۔

مسجد اور ان کھنڈرات کی تصاویر لیں تو ہمارے سامنے دریائے تنجا تھا۔ دریا پر صدیوں پرانا پل جس پر ابھی بھی ٹریفک رواں دواں تھی۔ عثمانیوں نے اپنی تعمیرات کے ذریعے تینوں براعظم، ایشیا، افریقہ اور یورپ پر اپنے انمٹ اثرات چھوڑے ہیں۔ ان تعمیرات میں عثمانی جس قدر ماہر تھے، اسی قدر جدید ترک بھی۔

ایدرنے کو ہم جیسے جیسے دھوپ میں آہستہ آہستہ پیچھے چھوڑتے چلے گئے۔ سڑک پر ہم دونوں ہی تھے، اکا دکا کاریں آ جا رہی تھیں۔ ہمارے دائیں جانب دریا اور بائیں جانب کھلیان تھے اور اوپر کچھ بلندی پر ایدرنے کی مضافاتی آبادی تھی۔ تقریباً پون گھنٹہ چلنے کے بعد کلیہ کی مسجد کے مینار، گنبد اور وسیع و عریض عمارت چمکتی دکھائی دینے لگی۔ راستے میں ہم دو مرتبہ سستائے اور پھر چل دیے۔ کلیہ پہنچنے پر جو خوشی تھی، اس کا اپنا لطف، لیکن دھوپ کے چلنے سے تھکاوٹ بھی محسوس ہو رہی تھی۔ طے کیا کہ اندر جانے سے پہلے بڑے دروازے کے سامنے واقع کیفے میں بیٹھ کر تازہ دم ہوا جائے۔ مقامی طلبا اور ترکی کے دوسرے شہروں سے بھی سیاحوں کی ایک مناسب تعداد وہاں موجود تھی۔ سستانے اور ٹھنڈا پانی پینے کے بعد کلیہ کے اندر داخل ہوئے۔ ہمارے استقبال کے لیے سلطان بایزید دوم کا مجسمہ آویزاں تھا۔ سلطان بایزید دوم عثمانی تاریخ میں ایک صوفی اور نہایت روشن خیال سلطان جانے جاتے ہیں۔ ان کا زمانہ عثمانی تاریخ کا یادگار زمانہ کہلاتا ہے۔ علم دوست، فن اور فنکاروں کا مداح، انسانیت اور امن کا علمبردار سلطان بایزید۔ اس کلیہ کی اپنے وقت میں تینوں براعظموں میں دھوم تھی کہ اس طب خانے (دارالشفا) میں اپنے وقت کے حوالے سے مختلف طریقہ علاج رائج تھے، جس میں خصوصی طور پر نفسیاتی مریضوں کا علاج موسیقی، خوشبو اور پانی کی آوازوں سے کیا جاتا تھا جو آج کی جدید دنیا میں پانچ سو برس بعد رائج ہوا۔ یورپ بھر سے بڑے بڑے نامور لوگ علاج کی غرض سے یہاں آتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ کلیہ میں موجود ہسپتال 1488ء سے 1877-78ء تک مسلسل خدمتِ خلق کے فرائض انجام دیتا رہا۔ 1877-78ء میں روس ترکی جنگ کے وقت تک جب اس شہر نے جنگ کی ناقابلِ فراموش بربریت کو اپنے یہاں برپا ہوتے دیکھا۔

سیاحت کا کاروبار تو کوئی ترکوں سے سیکھے۔ تنظیم اور روشن خیالی ان کے سیاحتی کاروبار کی کامیابی کی بنیاد ہے۔ سیاحت کی مارکیٹنگ بھی ان پر ختم ہے۔ بس کچھ آ جائیں، ان کی Presentation ترکوں پر ختم ہے۔ آثار یونانی دور کے ہوں یا عثمانی،

بازنطینی، تھریس، عثمانی یا جدید ترکی کے، یہ سب کے سب اپنے آپ کو اس سرزمین پر برپا تمام تہذیبوں کا وارث گردانتے ہیں۔ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ وہ تاریخ کو اپنے عقیدے کے دائرے تک محدود نہیں رکھتے۔ اسی لیے تو دنیا بھر کے سیاح ترکی دوڑے چلے آتے ہیں۔ اور سب سے اہم وہ سیاحوں کو وہ تمام سہولیات، تحفظ اور آزادی فراہم کرتے ہیں جس کے لیے سیاح ان کے ہاں آتا ہے۔ سیاحوں کی آمد ان کے ایمان کو ڈگمگاتی نہیں بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی آمد باران رحمت ہے۔ ان کی معیشت کی مضبوطی کا پہلا سبب یہ سیاحت ہی ہے۔ اسی لیے تو ترکی کے تمام ساحلی کناروں پر آپ کو دنیا بھر کے سیاح آزادی کے ساتھ تعطیلات مناتے نظر آتے ہیں۔ کلیسا کی تاریخ اور تفصیل بیان کرنے کے لیے مختلف زبانوں کے ڈیجیٹل ہیڈ فون بھی دستیاب تھے اور گائیڈ بھی۔ سلطان بایزید کا یہ کلیسا آج بھی اپنی اصلی حالت میں موجود ہے جسے ترک حکومت نے کروڑوں ڈالرز لگا کر اصل حالت میں برقرار رکھنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ اگرچہ سارا کلیسا اب میوزیم میں بدل دیا گیا ہے لیکن سارے میوزیم میں دارالشفا، کتب خانہ، باورچی خانہ، درس گاہ سمیت تمام شعبہ جات میں اسی طرح Presentation کی جا رہی تھی جیسے پانچ صدیاں قبل صوفی منش سلطان کی روشن خیالی اور جدت پسندی کے باعث یہ کلیہ لوگوں کے علاج، تعلیم، فن، موسیقی اور کھانوں کے لیے مصروف عمل تھا۔

کلیسا سے نکلے تو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن ہمیں قدیم عثمانی محل کے آثار دیکھنے تھے جو یہاں سے سات آٹھ کلومیٹر دور واقع ہیں۔ باہر نکلے تو کلیسا کے ساتھ سڑک کنارے ایک ویران قبرستان دکھائی دیا جس کے کتبوں سے مدفون لوگوں کی زندگیوں اور زمانے کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا تھا۔ بائیں جانب صاف ستھرے گھر اور پرسکون گلیاں، بکھرا دھیرے دھیرے جاتے دکھائی دیے۔ ترکی کے شہر اور قصبات میں پاکستان کے شہروں جیسی نہ بھیڑ اور آبادی کے بے ہنگم ہجوم نہیں ہوتے۔ اور نہ ہی بھاری ٹریفک۔ ریحانہ نے تھکاوٹ کے باوجود حوصلہ مندی کا مظاہرہ کیا اور میرے لیے یہ مہم جوئی زندگی بھر کا اثاثہ ثابت ہوئی تھی۔ آج پیدل چلنا اور تھکاوٹ، ممکن ہے، کچھ عرصے بعد اس نعمت سے محروم ہو جانا فطری عمل ہے۔ زندگی کے ان دنوں جب آپ چلنے پھرنے کے قابل ہوتے ہیں، گاڑیوں اور سواریوں پر جہاں گردی ایک عیاشی ہے، سیاحت نہیں۔

ہم چلتے رہے۔ سڑک کنارے انار اور سیبوں کے پیڑ ایستادہ تھے۔ مگر مجال ہے کوئی ان کو توڑے۔ ایک تو قدرت کا حسن اور دوسرے کسان کا مال جس کا سرمایہ یہ پیڑ اور ان کا پھل ہے، جنہیں وقت سے پہلے توڑنا، چوری اور قدرت کے حسن کو مسخ کرنے کے برابر ہے۔ سڑک کنارے پھل دار درختوں کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر اتروانا ہی بڑی خوشی تھی جو ہم نے بھرپور طریقے سے حاصل کی۔ ریحانہ نے کہا، چلتے رہو۔ دریا نے گویا ہمارے دائیں جانب تھا۔ بلقان کا رومانوی دریا۔ یورپ کے دریا ہمارے دریاؤں کے سامنے نہریں ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ ترک دریا کو نہر ہی کہتے ہیں۔ ان دریاؤں کا پانی گدلی مٹی کے رنگ کا نہیں ہوتا بلکہ کائی کے سبب سبزی مائل ہوتا ہے۔ چلتے چلتے قدم تھکے نہیں، اس لیے کہ گوگل نقشے پر ریحانہ مسلسل میری منزل سے مجھے آگاہ کرتی رہی۔ چلچلاتی دھوپ، خاموشی، وسعت اور فاصلہ ہونے کے باوجود سلیمیہ جامع کے فلک بوس میناروں کا نظارہ ایک عجیب کیفیت سے دوچار کر رہا تھا۔ منزل کی تلاش، جستجو، جہاں گردی کا سب سے بڑا لطف ہے۔ سڑک بل کھانے لگی، دائیں، بائیں، اور پھر دائیں۔ بائیں جانب ایک کارخانہ اور ساتھ ساتھ درختوں کے جھنڈ۔ دائیں جانب دریا اور اس کے پار ایدرنے کے مکانات اور ان میں نمایاں

جامع سلیمیہ جس کے سوا کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔ گوگل نقشے کے مطابق، ہم عثمانی محلات کے کھنڈرات کے قریب تھے۔ مگر بائیں جانب درختوں کے جھنڈ کے باعث کسی نظارے کی آمد کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ سڑک اچانک بل کھاتے ہوئے بائیں جانب مڑی تو آنکھیں ششدر رہ گئیں۔

واوا ریما دیکھو وہ جسے پڑھا اور تصاویر میں دیکھا تھا میرے سامنے ہے۔ ریما کی خوشی میری خوشی میں تھی۔ یکدم بل کھاتی سڑک سے جب محل کے آثار اور دریائے تنجا کے پار کنارے پر قصر عدالت کو سامنے پایا تو ایسے لگا جیسے بائیسکوپ چلنا شروع ہو گئی ہو۔

رکو ریما! چند لمحے سہی، رکو! منزل آ گئی لیکن مجھے یہاں کھڑے ہو کر اس تاریخی کھنڈرات کو فاصلے سے دیکھنا ہے۔ پھر چلتے ہیں۔ ٹھہرو ریما! یہاں رکیں گے! اپنے سامنے دریائے تنجا، اس کے مشہور زمانہ فاتح پل جس پر ٹریفک رواں دواں تھی، قصر عدالت کا مینار، اور ایدرنے محل کے بکھرے کھنڈرات پا کر گمشدہ خزانے ملنے کی خوشی تھی۔ ایدرنے میں یہ مقام میری جہاں گردی اور خوشی کا مرکز تھا جہاں اب ہم کھڑے تھے۔ سڑک کے اس موڑ پر عثمانی دور کی سبیل ابھی تک مسافروں کی پیاس بجھانے کے کام آ رہی تھی۔ سبیل کیا تھی، یقیناً کسی محل کا مینار ہو تھی! تعمیر کا فن عثمانیوں پر ختم ہے۔ لیکن یاد رکھیں کہ یہ فن عثمانیوں نے بازنطینیوں سے ہی لیا جن کو شکست دے کر اسی سرزمین پر انہوں نے اپنی حاکمیت قائم کی۔

دوپہر کے وقت شجر کا سایہ اور منزل کو پانا، تسکین کا ایک انوکھا احساس۔ سستانے کے بعد ہمیں محل کے بکھرے کھنڈرات دیکھنا تھے۔ محل کا ایک بڑا دروازہ ابھی قائم تھا جسے یقیناً تاریخی وراثت کے تحفظ کے سبب بحال کیا گیا تھا اور اس کے سامنے عظیم الشان شاہی باورچی خانہ (مطبخ امیر) جس کو مکمل طور پر بحال کر دیا گیا ہے۔ یہ قدیم شاہی باورچی خانہ ایک طویل عمارت ہے جسے مکمل طور پر دوبارہ تعمیر کر دیا گیا ہے۔ چلو ریما، سب سے پہلے سرائے (محل) چلتے ہیں۔ ویرانے میں چھپے محل کے کھنڈرات، اجڑی بکھری تعمیرات کی طرف۔

ترکی زبان میں محل کو سرائے کہتے ہیں۔ ایدرنے محل کو عثمانی دور میں "سرائے جدید امیر" کہتے تھے۔ چھیاسی ایکڑ پر پھیلا یہ عثمانی محل، سلطان مراد دوم کے عہد میں 1451ء میں تعمیر ہونا شروع ہوا۔ اس محل کی تکمیل سلطان محمد فاتح کے دور میں ہوئی۔ سلطان سلیمان عالیشان کے زمانے تک اس کی تعمیر میں اضافہ ہوتا رہا اور وقت کے تقاضوں کے مطابق جدت آتی رہی۔ 1718ء تک یہ محل عثمانی سلطان کی رہائش گاہ تھا۔ انہی برسوں میں زلزلے اور آتش زدگی کے واقعات نے اس کی تباہی کا عمل تیز کر دیا۔ سلطان محمود دوم (1808ء۔1839ء) نے اس کی مرمت و بحالی کا بیڑا اٹھایا۔ مگر اس بدقسمت عثمانی محل کے مقدر میں اب کھنڈرات میں بدلنا ہی لکھا تھا۔ جب روسی افواج نے ایدرنے پر قبضہ کیا (1829ء) تو اسے فوجی کیمپ کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد پھر (1868ء۔1873ء) یہ زوال پذیر محل بحال کرنے کی کوشش کی گئی اور تعمیرات کو بحال کیا گیا۔ بدقسمت محل زمانے کے تغیرات کا مقابلہ کرتے ہوئے بدحال ہو چکا تھا مگر 1877-78ء میں روس۔ترکی جنگ کے دوران اس کو اسلحہ ڈپو کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا تو گورنر نے جنگی حکمت عملی کے تحت اس کو دھماکوں سے اڑوا دیا کہ اگر ایدرنے، روسیوں کے قبضے میں جائے تو کہیں اسلحے کا یہ ذخیرہ روسیوں کے ہاتھ نہ لگ جائے۔

یہ اجڑا محل صدیوں کی تاریخ بھی رکھتا ہے اور گواہ بھی۔ اس محل میں بہتر سے زائد عمارات اور سوا سو سے زائد کمرے تھے۔ اٹھارہ حمام، آٹھ مساجد، سترہ دروازے اور دالانوں میں باغیچوں کی تیرہ کوٹھڑیاں تھیں۔ عروج کے وقت اس اجڑے محل میں بھی چوتیس ہزار شاہی خاندان اور ان سے متعلق لوگ آباد تھے اور ان کی خدمت اور سرکار کے انتظام و احکامات بجا لانے کے لیے چھ ہزار سے زائد ملازمین اور متعدد ادوار میں عثمانیوں کے حرم کدے بھی تھے جہاں بلقان اور روسی خطوں سے لائی جانے والی سنہری بالوں والی کنیزیں رہا کرتی تھیں۔

اجڑا عثمانی محل ہمارے سامنے تھا۔ ہم ایدرنے محل کے بڑے دروازے پر سے کھنڈرات کے اندر داخل ہوئے۔ شاہی دروازہ اپنے محل کی عظمت رفتہ کا مکمل ترجمان تھا۔ اسے "باب ماسعادہ" کہا جاتا تھا۔ بازنطینی، سلجوقی اور عثمانی فن تعمیر کا امتزاج۔ ہر طرف اجڑے محل کے بکھرے کھنڈر تھے اور ہم دونوں کے سوا وہاں اور کوئی نہ تھا۔ ایدرنے محل کے کھنڈرات میں ایک تعمیر کے آثار سب سے زیادہ توجہ کا مرکز تھے۔ اسے جہاں نما محل کہا جاتا تھا۔ پتھر اور لکڑی سے بنا یہ سات منزلہ محل، ایدرنے محل کی اہم ترین عمارت تھا۔ یہ 1450-51ء میں تعمیر ہوا۔ جہاں نما محل کے شاہی کمرے سے ایکڑوں پر پھیلے ایدرنے محل سے سلطان چاروں طرف نظارہ کیا کرتا تھا۔ اس کی ایک منزل میں کتب خانہ تھا جہاں دنیا بھر سے جمع کی گئی کتابیں سلاطین کے مطالعے کے لیے موجود تھیں۔ اور ایک منزل پر مسجد۔ اجڑی سات منزلیں جہاں کچھ دیواریں اور ایک دو منزل تک ابھی تک کھڑی تھیں۔

ہم ایک کنویں کے قریب کھڑے تھے جہاں سے شاہی محل کو پانی مہیا کیا جاتا تھا۔ اس کنویں کے گرد صدیوں پرانی پتھر کی بڑی بڑی سلیں ابھی تک موجود تھیں۔ کنویں سے چلے اور جہاں نما محل کی دیواروں کو چھوا۔ جہاں کبھی پُرشکوہ عمارت تھی، اب وہاں کوئی ذی نفس دکھائی نہیں دیتا۔ بس ہم ہی تھے۔

ایکڑوں پر پھیلے کھنڈروں کو تصاویر اور ویڈیو میں محفوظ کیا اور واپس چل دیے۔ دریائے تنجا کی طرف بائیں طرف شاہی حمام اصلی حالت میں موجود تھا۔ حمام کی روایت ترکوں، ایرانیوں اور عربوں میں رومیوں اور بازنطینیوں سے آئی۔ دریائے تنجا پر سلطان فاتح کا پل اسی طرح قائم و دائم تھا۔ اگر دونوں جانب کاروں نے گزرنا ہے تو ایک انتظار کرتا تھا۔ اس لیے کہ اس کی چوڑائی محض چند فٹ اور لمبائی دو سو فٹ ہے۔ چار محرابوں کے دریائے تنجا کا سبزی مائل پانی تیزی سے بہہ رہا تھا۔ پچھلے تقریباً چھ سو سال سے اس پل کے نیچے سے جس قدر پانی گزرا اسی طرح اس کے اوپر سے تاریخ کے بڑے قافلے گزرے۔ سلطانوں اور غیر ملکی حملہ آوروں کی فوجیں بھی۔

اب میرا اشتیاق تھا قصر عدالت کو دیکھنا جو ہر لحاظ سے اپنی اصلی حالت میں موجود تھا۔ اسے 1561ء میں سلطان سلیمان عالیشان نے تعمیر کیا۔ یہاں بیٹھ کر سلیمان عالیشان، جسے قانونی سلطان کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا، انصاف کیا کرتا تھا۔ دریائے تنجا کے دوسرے کنارے پر یہ سلجوقی اور [illegible] طرز تعمیر کا امتزاج پانچ منزلہ مینار ہے۔ اسے قصر ہمایوں بھی کہا جاتا تھا۔ وہاں پر پتھر کے دو ستون بھی اسی حالت میں کھڑے ہیں جو سلیمان عالیشان کی عدالت کے وقت فیصلے کے حوالے سے جانے جاتے تھے۔ ایک "سنگ حرمت" ہے۔ سنگ حرمت پر کھڑا سائل، سلطان کے سامنے انصاف کا طلب گار ہوتا تھا۔ اور دوسرا پتھر کا ستون "سنگ عبرت"۔

''سنگِ عبرت'' پر موت کی سزا سنا دیے جانے کے بعد مجرم کا سر رکھ دیا جاتا تھا تاکہ لوگوں کے لیے نشانِ عبرت بنے۔ قصرِ عدالت کے پیچھے پھیلا خوب صورت جدید باغ اور وہاں پر موجود ایک جدید سٹیڈیم جہاں اب فٹ بال کے بڑے میچز ہوتے ہیں اور ترک گلوکار وقتاً فوقتاً اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ دوسری جانب دیکھا تو ادرنہ کے سرخ کھپریل کی چھتوں والے گھر اور ان کے بیچ سلیمیہ جامع کے آسمان کو چھوتے مینار۔

واپس دریا عبور کیا اور اب ہمیں بلقان جنگوں کی یادگار پر جانا تھا۔ شہیدوں کی یادگار، شہیدوں کے نام ہر طرف کندہ تھے اور ایک چبوترہ بنا ہے اور ساتھ ہی سرخ ہلالی پرچم لہرا رہا ہے۔ ترکوں کی آزادی اور قومی وقار کا نشان یہ پرچم پورے ترکی میں نظر آئے گا۔ میں نے کبھی اسے میلا نہیں دیکھا۔ ترکی کا پرچم میلا ہونے سے پہلے ہی تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ پرچم کا تقدس ترک قوم کے کردار کا نمایاں خاصا ہے۔

بلقان جنگوں کی یادگار۔ 1912-13ء کی جنگِ بلقان میں ادرنہ کا محاصرہ ہوا اور ترک شکست و ریخت سے دوچار ہوئے۔ اس دوران اس شہر پر جو قیامت برپا ہوئی، وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی خونیں داستان ہے۔ دریائے تنگا کنارے ''گمنام سپاہی'' کا مقبرہ بھی ہے۔ یہاں پر ایک سو ترک شہید فوجی افسران اور چار سو شہید فوجی جوانوں کے نام کندہ ہیں جو جنگِ بلقان میں ادرنہ کے دفاع میں دیگر ہزاروں ترکوں کے ہمراہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔ بلغاریہ نے جب ترکوں کی پانچ سو سالہ غلامی کے خلاف بغاوت کی تو اس نے درحقیقت سلطنتِ عثمانیہ کے کھوکھلے نظام کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ مارچ 1913ء میں ادرنہ کے زوال کے وقت بلغاریہ فوج نے اس اجڑے عثمانی محل کو ترک جنگی قیدیوں کے قید خانے میں بدل دیا۔

اجڑا محل اور اس کے کھنڈرات، زوال پذیر سلطنتِ عثمانیہ کے سپاہیوں کے لیے Death Chamber ثابت ہوئے۔ یہاں سردی سے ٹھٹھرنے، بھوک اور مختلف بیماریوں سے مر جانے والے ترک سپاہیوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ آج یہاں جنگِ بلقان کا ایک سپاہی مجسمے کی شکل میں دفاع کرتا دشمن کو للکارتا کھڑا ہے۔ ادرنہ کا زوال ترک تاریخ کا سیاہ باب ہے۔ لیکن اس زندہ قوم کی جرأت اور استقلال بھی قابلِ دید ہے کہ ادرنہ کو انور پاشا نے ایک مرتبہ پھر فتح کیا۔ اسی لیے وہ سلطان محمد فاتح کے بعد خود کو فاتح کہلوانا پسند کرتا تھا۔ ادرنہ کے اجڑے عثمانی محل کے پہلو میں دریائے تنگا کنارے یہ یادگار، زندہ قوم کو اس کی تاریخ سے آگاہ کرنے کے لیے ہے۔ ایک عظیم سلطنت کے مشکل دنوں کی یادگار۔ اجڑے محل کے کھنڈرات میں گھومتے گھومتے شام ہونے لگی۔ تاریخ کو سمجھنے کا جو لطف ہے، وہ تاریخ کو محض پڑھنے میں کہاں حاصل!

اجڑے محل کے لمس سے آباد دنوں کی تاریخ کا احساس۔ محل جو اب کھنڈر ہے۔ اور کھنڈرات اپنی تاریخی عظمت کی کہانی بیان کرتے رہیں گے۔ عروج و زوال کی کہانی۔ فتح و شکست کی کہانی۔ انسانی عظمت و بربریت کی داستانوں کے گواہ اجڑے محل کے کھنڈرات۔

دیکھا شام ہونے لگی ہے، چلو واپس آباد ادرنہ کی طرف!

(فرخ سہیل گوئندی کی غیر مطبوعہ تصنیف ''ترکی ہی ترکی'' میں شامل ایک نیا باب)

◆◆◆

عراق اشک بار ہیں ہم

8

سلمٰی اعوان

بغداد کا ادبی چہرہ

ڈاکٹر نضال جعفر سے ملنا بھی دلچسپ اور خوبصورت یادیں دینے والا تجربہ تھا۔ مگر اس سے بھی پہلے ایک اور سرور کن تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ کرنل بصیر الکائی کے گھر سے چلے تو دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ سیدھی شفاف سڑک پر گھنٹہ بھاگتی گاڑی کوئی پندرہ منٹ میں شہدا برج پر آگئی۔

موسم کی شدت حسبِ معمول اپنی انتہائے عروج پر۔ تقریباً پانچ بجے تک ڈھائی تین گھنٹے کا یہ درمیانی وقفہ ہر روز مجھے کسی نہ کسی مسجد میں نماز پڑھنے اور آرام کیلئے گزارنا ہوتا تھا۔ عراق کے بعد مشرق وسطیٰ کے مولویوں کی بہت شکر گزار تھی کہ انہوں نے مسجدوں کا ایک حصہ خواتین کیلئے مخصوص کر رکھا ہے جو دراصل عورتوں کے ریلیکسنگ روم ہیں۔ کھاؤ، پیو، لمبی تان کر سو جاؤ۔ کانوں میں ہیڈ فون چڑھا کر گانے سنو۔

سچ تو یہ تھا کہ میں اس 1/4 حصے کو بڑے دھڑلے سے استعمال کر رہی تھی۔ تھوڑا سا آرام اور تھوڑی سی نیند جسم و جان میں تازگی بھر دیتی تھی۔ ایسے لمحوں میں مجھے ساؤتھ ایشیا کے مُلا اور دقیانوسی ملا یاد آتے جنہوں نے عورتوں پر مسجدوں کے دروازے بند کر رکھے ہیں۔ زیادہ رعب داب والے مزاروں پر جا کر دروازے سے ہی انہیں دفع دور کرتے ہیں۔

اتفاق نے مجھے شہدا برج پر مستنصریہ مدرسے کی ملحقہ مسجد الآصفیہ میں اتارا۔ دجلہ کے کنارے اس خوبصورت سی مسجد کو میں پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ لیکن ضرورت تھی کہ تھکی آنکھیں بند ہوں اور تنے اعصاب نے آرام کی خواہش کی۔ سیدھا شاید جلت پھرت کی کی تھی۔ ابھی اوپر باہر نکل آئی۔ ساتھ ہی المتنبی سٹریٹ ہے۔ المتنبی جدید وضع کی بلند و بالا عمارات کی حامل جنگلی بالکونیوں کے پیچھے ان کی ریلنگ اور ان پر رکھے گئے رنگوں اور بار کیوں میں گھرے سامان کے امتزاج سے قوس قزح کی سی دنیا کا تاثر دیتی تھی۔ دائیں آسمان کو چھوتی محراب سے ہوا کہیں کہیں عمارتوں کی بالکونیاں ایک دوسرے سے جھپیاں ڈالتے کھلکھلاتی نظر آئی تھیں۔

عراق روشن خیال قوم ہے۔ اپنے ثقافتی اور تہذیبی ورثے پر ناز کرنا جانتی ہے۔ انہیں باعزت اور قابل فخر مقام دیتی ہے۔ ماضی کے ممتاز شاعر ابو الطیب المتنبی جو بغداد کے کوچہ و بازار میں شعروں کے تاج پہنے کھڑے ہیں۔ بلا کے کوئی مرتد تھا یا پیغمبری کا دعوے دار۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کہنے میں 915 ہجری میں پیدا ہونے والا المتنبی اپنی شاعری میں یکتائے کار تھا۔ قصیدہ گوئی میں کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ تقریباً ساڑھے تین سو نظمیں اس کی داستانِ زندگی کی بہت سی پرتوں کو کھولتی ہیں۔ اپنی غیر معمولی ذہانت، حاضر جوابی، بذلہ سنجی اور کلام کی طاقت سے پوری طرح آگاہ تھا۔ ایک جگہ وہ لکھتا ہے۔

''میں وہ ہوں جس کے لکھے ہوئے کو اندھا بھی پڑھ سکتا ہے۔ میری شاعری جادوئی اثر رکھتی ہے۔ جسے بہرہ بھی سن سکتا ہے۔ جو

کام تلوار اور تیر کرتے ہیں۔ میرا کاغذ، قلم اور حرف اس سے زیادہ موثر ہیں۔" یہ شاعرانہ صلاحیتوں کی انتہا تھی یا ذات کے تکبر کا نشہ کہ جبری کا دعویٰ کر بیٹھا۔ رگ رگ میں سیاسی خواہشوں کا ہیجان تھا کہ یہ صاحب اقتدار کی مدح سرائی ضروری تھی۔ ایک بغاوت کے نتیجے میں وہ قید بھی ہوا۔ قید با مشقت بھی کاٹی اور دینی خواہشوں میں بھی ناکام ہوا۔ مگر شاعر کے طور پر کمال کو پہنچا۔ المتنبی بازار اسی شاعر کی یاد میں ہے۔ میں کتابوں کے سمندر میں غوطے کھا رہی تھی۔ یہ کتابوں کا جہان تھا۔ یہاں کتابوں کی دنیا آباد تھی۔ صاف ستھرے فرشوں پر بکھری ہوئیں تھڑوں پر ڈھیروں کی صورت پڑی ہوئیں، تختوں پر سجی ہوئیں۔ برآمدوں کے ستونوں سے لگائے عارضی چوبی شیلفوں میں دھری اور بڑی بڑی دوکانوں کی شیشے کی الماریوں میں سجی ہوئیں۔ شاندار مردوں کے پرے کہیں انہیں پھرولتے، کہیں انہیں پڑھتے، کہیں بھاؤ تاؤ کرتے نظر آتے تھے۔ کتنی دیر میں نے بھی انہیں دیکھا لیکن وہ زیادہ عربی میں تھیں۔ فرنچ میں تھیں جو میرے لیے بیکار تھیں۔ انگریزی میں جو چند دیکھیں وہ ایسی تھیں کہ میں انہیں ہمپٹ کر دیتی۔ میں چلتے چلی جاتی تھی۔ برآمدوں کے سایوں میں اور یہ بھی دیکھتی تھی کہ کہیں کہیں اس کے وجود کے کسی چھوٹے سے حصے پر، کہیں بڑے پر جیسے برص کے سے داغ ہیں۔ جلنے سڑنے کے، ٹوٹے پھوٹے ہونے کے، شکستگی کے بدحالی کے۔ ایسا کیوں ہے؟ بالکین میں یہ داغ دھبے کیوں؟ رک کر پوچھا تو جانا کہ کوئی ڈیڑھ سال قبل بم بلاسٹ ہوا تھا۔ جاہلوں نے علم کے اس مرکز کو تباہ کر دیا۔

نوجوان لڑکے نے مجھے دوکان کے اندر آنے کی دعوت دی۔ کرسی پیش کی اور بولا "یہ اندوہ ناک منظر تھا۔ کتابوں کے صفحات تاراج وری کی صورت بکھر رہے تھے۔ جلتے بازوں، جلتے انسانی گوشت اور دھوئیں کے بیاباؤں نے فضا کو وحشت ناک بنا دیا تھا۔ تخریب کاری نے صفحات کو چاٹ لیا تھا۔ بغداد اس المناک سانحے پر چیخ اٹھا تھا۔

لیکن پوری دنیا میں بکھرے عراقیوں کے پیغامات نے اس کے اندر کی روح پھونک کر اسے کھڑا کر دیا تھا۔ صفحے جو جلے تھے پھر سے زندہ ہو کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئے۔ المتنبی کی رونقیں لوٹ آئیں۔ ہم نے اس کہاوت کو سچ ثابت کر دیا کہ

Cairo writes, Beirut publishes and Baghdad reads.

میری اس خواہش پر کہ کیا وہ مجھے کسی ایسے بندے سے ملا سکتا ہے جس سے میں عراقی ادب کے حوالے سے کچھ باتیں کر سکوں۔ "ضرور ضرور" بڑا پرجوش سا لہجہ تھا۔ "آیئے" وہ مجھے ساتھ لیے چلنے لگا۔ کوئی چوتھائی فرلانگ پر ایک بہت بڑی دوکان کے اندر داخل ہوئے۔ اتنی بڑی دوکان تھی کہ میں حیرت سے تکنے لگی۔ دیکھے چلی جاتی تھی۔ لڑکا مجھے لے کر غربی سمت جہاں چند سیڑھیاں اتر کر ہم ایک تہہ خانے میں اترے۔ یہ تہہ خانہ کب تھا؟ یہ بغداد کا ادبی چہرہ تھا۔ جہاں چوبی بنچوں پر دھرے خوبصورت گدے دار کشنوں پر چند لوگ بیٹھے چائے کے کش لگاتے، بحث ومباحثے میں الجھے ہوئے دکھے تھے۔ تھوڑی گفتگو، دل لگا، صحافی اور شاعروں پر مشتمل جو ولید ال وبغدادی، علی جعفر، رسل ال قیسی، رعد جبار، دولہ کاظم، جنہوں نے پرجوش انداز میں استقبال کیا، کھڑے ہوئے، عزت دی۔ میں نے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ مناسب سہولتوں سے سجا سنورا کمرہ اس کی سامنے والی دیوار پر آراستہ بڑی سی تصویر المتنبی سٹریٹ میں بچھے صوفوں پر بیٹھے وزیراعظم نوری المالکی کے ساتھ کتب خانہ القروں کے مالک کی تھی جو بڑا نمایاں نظر آتا تھا۔ یہ سب مجھے تعارف کے وقت معلوم ہوا تھا۔ تصویر کے متعلق بھی وضاحت ہوئی تھی کہ بم بلاسٹ کے بعد حکومت اور وہ سب جنہیں کتاب سے محبت تھی۔ جنہوں نے

گہرے دکھ اور یاس کا اظہار کیا تھا۔ وہ لفظ کے تقدس اور اس کی حرمت کیلئے حکومت کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوئے۔ فوری دشمنوں سے اس کی بحالی ہوئی۔ صرف ڈیڑھ سال میں انہوں نے اس کی رونقیں لوٹا دیں۔ اور تخریب کاروں کو پیغام دیا تھا کہ تمہاری تخریب کاری نے وقتی طور پر حرف جلا ڈالے مگر دیکھو ہم نے انہیں پھر سے زندہ کر دیا ہے۔ گفتگو کے دروازے کھلنے لگے۔ ادب اور آرٹ کے حوالوں سے جب باتیں شروع ہوئیں تو وہ سب گفتگو میں یوں شامل ہوئے کہ قہوے کی چسکیاں تھیں اور باتیں تھیں۔ 1950 کا زمانہ ادب اور آرٹ کے لحاظ سے ایک طرح نشاۃ ثانیہ کا زمانہ تھا۔ ادب میں مختصر کہانیوں کے رجحان نے زور پکڑا گو ابھی تک ناول بہت کم لکھا گیا تھا۔ شاعری میں البتہ نئے رجحان سامنے آ رہے تھے۔ اس میں آزاد نظم نے زور پکڑا اور اپنا آپ منوایا تھا۔

اسی طرح فلم، مجسمہ سازی اور پینٹنگ میں نئے ٹرینڈز در آئے۔ اس میں کچھ تو یورپی اثر دخیل ہوا کچھ ترقی اور ایک نئی مملکت کے طور پر ابھرنے والے ملکی کلچر کے بارے احساسات کے اظہار میں بہت شدت آئی۔ ان بدلتے رجحانات کا بھی دباؤ تھا جو ایک دقیانوسی سوسائٹی سے ماڈرن سوسائٹی میں داخل ہوتے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ بڑے پیارے لوگ تھے۔ باتوں کے رسیا قہوے اور شے کے دھنی۔ گہرے سیاہ قہوے کی جب تیسری پیالی میرے سامنے لا رکھی گئی میں نے گھبرا کر اسے دیکھا اور خود سے کہا۔ "ارے تو میں نے کچھ تو بھی نہیں۔ سارا حلق کڑواہٹ سے بھر گیا ہے۔ ابھی چینی کی بات کیوں؟ ذائقہ تو یہ حال ہے۔ آفرین ہے ان لوگوں پر جو اسے پانی کی طرح پیتے ہیں۔" سچی بات ہے مجھے تو ان کے نام بھی یاد نہیں رہتے تھے اگر وہ خود اس کا اس درجہ اہتمام نہ کرتے کہ جو بھی گفتگو میں شامل ہوتا وہ ہر بار اپنا نام اور کام دہراتا چلا جاتا۔ جس کا فائدہ وقت کی کمی کے باوجود مجھے ہوا تھا کہ جب میں نے رات کو ڈائری میں انہیں قلم بند کیا تو وہ سب اپنے ناموں، کاموں، شکلوں اور آوازوں کی انفرادیت کے ساتھ میرے سامنے تھے اور کہیں ابہام نہیں تھا۔ پہلا شارٹ سٹوری رائٹر عبدالمالک نوری جس کا مدرسہ فکر مروجہ روایت سے بغاوت تھی۔ مختصر کہانی کے حوالے سے جس نے ادب کا یہ باب کھولا تھا اس کا لب ولہجہ علی جعفری کی نسبت زیادہ صاف، سلیس، زیادہ بہتر اور گفتگو آسانی سے سمجھ آنے والی تھی۔ عبدالرزاق جو خود بھی کئی کتابوں کا مصنف تھا، وہ عبدالمالک نوری کے حوالے سے بات کرتا تھا۔ اس کا بہترین کام نشیدالارض Nashid-al-Ard (دھرتی کا گیت) کی صورت سامنے آیا تھا۔ اس میں سوسائٹی کے پسے ہوئے طبقوں کی عکاسی تھی۔ دراصل قانون اراضی ایکٹ نے عراقی معاشرے کی لوئر مڈل کلاس کو جس طرح زرعی غلام بنا کر رکھ دیا تھا اور اعلیٰ تعلیم اور مراعات بالائی اور درمیانے طبقے کے لیے مخصوص ہو گئی تھیں۔ اس سے بے چینی، اضطراب اور جو گھٹن پیدا ہوئی اس کو نوری نے بہت خوبصورتی سے پورٹریٹ کیا۔ The South Wind میں صدیوں کے رائج معاشرتی رویوں پر احتجاج تھا۔ اسی طرح فہد التکرلی Fuad-Al-Takarli میں مصنف نے اپنے آباؤ اجداد کی رسوم پر سخت تنقید کی۔ Safirah Hafiz سمیرہ حافظ نے عورتوں پر ہونے والی سختیوں اور مظالم پر لکھا۔ اس دور میں کمیونسٹ سوچ بھی اثر انداز ہوئی۔ شاعری میں یہ زیادہ کھل کر سامنے آئی۔ جمیل صدقی الزہاوی، مہدی الجواہری، سعدی یوسف، مظفر النواب یہ سب بائیں بازو کے وہ ترقی پسند شاعر تھے۔ جنہوں نے حقیقتاً ایک عملی انقلاب کی راہ ہموار کی۔ ان کی شاعری آتش بار تھی کہ پوری عرب دنیا میں یہ شاعری گونجی۔ آزاد نظم کے شاعروں میں ایک بہت بڑا نام نازک الملائکہ کا بھی ہے۔ جس نے عورتوں کے مسائل، محبت اور عورتوں کی آزادی پر کھل کر بڑی دلیری سے لکھا۔ نازک الملائکہ سے میرا تھوڑا بہت تعارف ضرور تھا مگر رشل ال جیسی اس کا بہت مداح تھا کہ وہ عورت سے بھی زیادہ دل سے سراہتا تھا۔ بدر شاکر السیاب کا نام بھی بڑا اہم

ہے۔ اس کی شاعری کے بہت سے مرحلے تھے۔ ابتدائی دور اگر رومانوی تھا تو حقیقت پسند شاعر بن کر اس نے کمال کی شاعری کی۔ بدر کے ہاں انقلابی ذہنیت تھی۔ انہوں نے شاعری کے مروجہ اصولوں اور ان کی بندشوں سے آزاد ہو کر لکھا اور خوب لکھا۔ بدر اور نازک الملائکہ پر باقاعدہ بحث چھڑ گئی تھی۔ اسی طرح ال شعیب کے ہاں موضوعات کا تنوع تھا۔ عربوں کے اندر اپنے مستقبل بارے پائی جانے والی بے چینی اور اضطراب، ان کی جہالت، سادگی اور انہیں ملنے والے دھوکے اور ان پر مغربی تہذیب کی یلغار، شعیب نے ان احساسات کو بہت خوبصورت زبان اور ادائیگی دی۔

اگر یہاں عبدالوہاب البیاتی کا ذکر نہ کیا جائے۔ نسل ال قیسی کا لہجہ خاصا جوشیلا تھا تو عراقی شاعری کا باب ادھورا رہے گا۔ سوشلسٹ نظریے کا شاعر جس نے مظلوم اور نچلے طبقے کو مجموعی طور پر اس کے ساتھ ساتھ ابتدائی عرب ثقافت پر بھی زور دیا۔

Exile From Exile کا بھی پڑھنے سے تعلق ہے۔ آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اسے پڑھتے ہوئے کہ عربوں کو کیسے دربدر اور دیس بدر دکھایا ہے۔ صوفے کے آخری کونے پر بیٹھے اولا کا تم بھی اچھا بولنے والے انسان تھے۔ صاحب علم تھے مگر یہودیوں سے بہت متاثر لگتے تھے۔ مجھے تو گمان گزرا تھا کہ شاید یہودی ہیں۔ اور میں نے پوچھ بھی لیا تھا وہ ہنستے ہوئے بولے۔ "ہوں تو نہیں مگر متاثر ضرور ہوں۔"

Sasson Somekh اور Semach جیسے عراقی نثر اور یہودی جو اسرائیل چلے گئے تھے عربی لٹریچر پر بہت کام کر رہے ہیں۔ مہدی عیسیٰ ال صقر Issa-al-Saqr ماڈرن عراقی لٹریچر کے بانیوں میں سے ہے۔ آرٹ کے حوالوں سے بھی تھوڑی سی بات ہو گی۔ آرٹ میں تین قسم کے رجحانات ظاہر ہوئے۔ روایتی طریق کا عمل غائب۔ عام آدمی کو فوکس کیا گیا۔ دیہاتی اور شہری زندگی کی عکاسی، عراقی ثقافت قدیم اور کلاسیکل زمانوں کی۔ یہاں بھی جواد سلیم کا ذکر اور انہیں ضرور خراج پیش کرنا ہے۔ علی جعفر نے جتنی باتیں کی تھیں وہ آرٹ سے متعلق ان کی باریک بینی کو ظاہر کرتی تھیں۔ بہترین مصور اور مجسمہ ساز۔ ان کے کام میں بابل اور سمیری عہد کے موضوع زیادہ غالب رہے۔ اسی طرح Faiq حسن کا کام بہت شاندار تھا۔ انہوں نے بہت خوبصورتی سے پرانے بغدادی زندگی کو پینٹ کیا۔ یہ سب اپنے اپنے وقت کے نظام حکومت کے زیر دست تھا اور باقی تھے۔ یہ گرفتار ہوتے یا جلاوطن کر دیے جاتے یا وہ خود ہو جاتے۔ ال شعیب جو پہلے کمیونسٹ تھا، بعد میں عرب سوشلسٹ بن گیا۔ اس نے بہت مشکلیں کاٹیں۔ یہ روایتی سوسائٹی پھر تیل کی دولت، معاشی ترقی، تعلیمی اصلاحات کے نتیجے میں بدلنے لگی۔ ایک نئی تعلیم یافتہ نسل مراعات یافتہ طبقوں کی صورت ابھری اور جب اس کے مزید ترقی یافتہ بننے کے آثار ابھرے اسے جنگوں میں الجھا دیا گیا۔ اور اب جو حالات ہیں وہ سب کے سامنے ہیں۔ آپ بھی بہت کچھ جانتی ہیں۔ میں نے درمیان میں کئی بار نگاہیں اٹھا اٹھا کر گھڑی کو دیکھا تھا۔ پوچھنے پر بتایا کہ ڈاکٹر نوال جعفر سے پونے بجے کا وقت طے ہے۔

میرا موبائل بجا تھا۔ معذرت کرتے ہوئے کانوں سے لگایا۔ "میں کہاں ہوں" اطلاق پوچھتا تھا۔ اس کی موبائل پر رعید جرار سے بات کروائی جس نے اُسے بتایا۔

تصویریں بنائیں اور رخصت ہوئی۔ رات کے ڈنر پر ان کے بے حد اصرار کے باوجود میرے پاس معذرت تھی کہ میں جانتی ہی نہیں تھی ڈاکٹر نوال کے پاس سے میں کب فارغ ہوں گی؟ سچ تو یہ تھا کہ میں بہت کچھ جان پائی تھی۔

(جاری ہے)

◆◆◆

طنز و مزاح

یہ ایک بوسہ جسے تو سہل سمجھتا تھا

ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ معین قریشی

ہمارے ایک محقق قسم کے دوست احمق اور بدھو میں یوں تفریق کرتے ہیں "احمق وہ ہے جو صحیح کام غلط طریقے سے کرے اور بدھو وہ ہے جو غلط کام بھی ٹھیک طریقے سے نہ کر سکے۔" وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ احمق کو معاف کر دو کہ انسان غلطی کا پتلا ہے لیکن بدھو کو سزا دو غلط کام کی نہیں بلکہ بدھو پنے کی۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ 1977ء میں نیویارک شہر میں ایک شب 9 بجے کے قریب تاریخ کا بدترین "پاور بریک ڈاؤن" (بجلی فیل ہونے کا واقعہ) ہوا تھا اور تمام شہر پچیس گھنٹے تک تاریکی میں ڈوبا رہا۔ اس دوران شہر میں جو لوٹ مار کا بازار گرم ہوا وہ بھی اس مہذب ملک کی تاریخ کا حصہ بن گیا۔ جرائم پیشہ افراد سپر مارکیٹوں کے تالے توڑ کر قیمتی اشیا لے بھاگے۔ ہزاروں عورتوں کے پرس اور مردوں کے بریف کیس چھین لیے گئے۔ بے شمار بینکوں کا صفایا کر دیا گیا۔ مجموعی نقصان کا تخمینہ 30 کروڑ ڈالر لگایا گیا لیکن اس سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ دنیا کو تہذیب کا درس دینے والے، اقدار کے گھٹنوں کی طرح عریاں ہو کر دنیا کے سامنے آ گئے۔ اس ہنگامے میں ڈینئل نامی ایک نیگرو کسی ٹی وی کی دکان سے ایک ٹی وی سیٹ لے بھاگا۔ جب وہ گھر آیا تو اس کی ماں نے ٹی وی دیکھ کر اسے بہت لعنت ملامت کی۔ آپ سمجھ رہے ہوں گے وہ بیٹے کی چوری پر برانگیختہ تھی۔ جی نہیں اس نے بیٹے کو ڈانٹا کہ کم بخت بدھو کہیں کے بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی تو ہمارے یہاں پہلے سے موجود ہے، لانا ہی تھا تو رنگین لاتا۔ ماں کی کڑوی کسیلی باتیں سن کر ڈینئل کی بے غیرتی جاگ اٹھی۔ اس نے چوری شدہ ٹی وی بغل میں دبایا اور اسے رنگین سیٹ سے بدلنے کے لیے واپس بھاگ کھڑا ہوا۔ ابھی وہ ایک فرلانگ ہی گیا ہوگا کہ ایک پولیس والے نے ٹارچ کی لائٹ ڈال کر اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ ڈینئل کو رنگین ٹی وی تو نہیں مل سکا لیکن پولیس کی پٹائی سے اس کا جسم ضرور رنگین ہو گیا۔

وہ ایک سرد رات تھی۔ آسٹریلیا کے ایک قصبے میں ایک بیس سالہ نوجوان ایک اسٹور کے آگے سے گزرا تو اس کی نظر شیشے کے اس پار گئی جہاں قیمتی سگریٹوں کے ڈبے خانوں میں سجے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر اس کی سگریٹ نوشی کی ہڑک جاگ اٹھی۔ وہ کھڑکی توڑ کر اندر داخل ہوا اور کئی ایک ڈبے ایک رسی سے باندھ کر لے اڑا۔ جب پولیس جائے وقوعہ پر آئی تو اسے مجرم کی تلاش میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ برف پر چور کے جوتوں کے نشانات کا پیچھا کرتی ہوئی ٹھیک اس کے گھر تک پہنچ گئی اور اس کے ہاتھوں پر ہتھکڑیاں کس دیں۔ مجرم کے لیے یہ واردات دہری ہزیمت کا باعث بنی اس لیے کہ سگریٹ کے جو ڈبے اس نے چرائے تھے وہ اندر سے خالی تھے اور محض نمائشی طور پر شوکیسوں میں رکھے گئے تھے۔

ایک ولندیزی ٹھیکے دار ایک رات اپنے ٹرک پر گھر لوٹ رہا تھا کہ ایک زیر تعمیر پلازہ کے قریب اس نے دیگر تعمیراتی سامان کے

ساتھ موٹی موٹی فولادی چادریں پڑی دیکھیں۔ اس نے سوچا میرے ٹرک میں کرین نصب ہے کیوں نہ اس کی مدد سے یہ قیمتی چادریں اٹھا کر ٹرک پر رکھ لوں، کسی نے دیکھا بھی تو شبہ نہیں کرے گا اور میں صاف بچ نکلوں گا۔ وہ ایک ایک چادر کرین سے اٹھا کر اطمینان کے ساتھ اپنے ٹرک پر لادتا رہا اور اس بات کا خیال نہ رکھا کہ ایک ٹن وزنی ہر چادر کے باعث اس کے ٹرک کے ٹائر نرم مٹی میں دھنستے چلے جا رہے تھے۔ جب اس نے مال غنیمت ٹرک میں بھرنے کے بعد اپنا ٹرک اسٹارٹ کیا تو اس نے ایک انچ بھی سرکنے سے انکار کر دیا۔ بدنصیب اور بے تدبیر نکمے واردات بھرے ٹرک کو چلانے کی کوشش کرتا رہا یہاں تک کہ علی الصبح مزدور کام پر آ گئے جنھوں نے اسے دھر لیا اور ٹرک قبضے میں لے لیا۔ اس نے اپنا جرم تسلیم کرتے ہوئے خود ان سے کہا کہ پولیس کو بلا لیں۔ اس کے مشورے کے مطابق پولیس آئی اور اسے گرفتار کر کے لے گئی۔ اس عقل کے اندھے کو اتنی سی بات نہیں سوجھی تھی کہ جس طرح اس نے کرین کے ذریعے ایک ایک ٹن کی چادر اپنے ٹرک پر چڑھا کر اسے بھاری کیا تھا اسی طرح انہیں اٹھا کر نیچے ڈال کر ٹرک کو ہلکا کرتا اور رفو چکر ہو جاتا۔ کسی کی قسمت میں پھنسنا ہوتا ہے تو وہ اپنا جال خود تیار کر لیتا ہے۔

اب دیکھیے ایک نکمے مجرم کو ایک چھوٹی سی "خوشی" کتنی مہنگی پڑی۔ سر شام فرانس میں ایک چور نے جسے "موسیو G" کا نام دیا گیا اپنے شریک جرم کے ہمراہ جواہرات کی ایک دکان بند ہوتے پر وہاں کام کرنے والی ایک خاتون کا پیچھا کیا۔ وہ دونوں اس کے اپارٹمنٹ میں اس کے ساتھ زبردستی داخل ہوئے اور اسے قابو کرنے کے بعد کرسی پر بٹھا کر رسی سے باندھ دیا۔ انھوں نے اس خاتون کو دھمکی دی کہ اگر اس نے دکان کے الارم کا خفیہ کوڈ نہیں بتایا تو وہ اسے تیل چھڑک کر آگ لگا دیں گے۔ جان کسے عزیز نہیں ہوتی۔ بیچاری عورت کو ان کا مطالبہ ماننا پڑا۔ موسیو G عورت کے ساتھ چار گھنٹے تک گپ شپ میں مصروف رہا۔ اس دوران میں ان کا ساتھی دکان سے ہیرے چرا کر چمپت ہو گیا۔ جاتے جاتے اس نے موبائل فون پر موسیو G کو مشن کی کامیابی کی اطلاع دی۔ موسیو G نے عورت کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے گال پر ایک الوداعی بوسہ دیا اور اسے آزاد کر کے آرام سے چلتا بنا۔ خاتون نے فوراً پولیس کو اطلاع دی جس نے موصوف کے گال کا "متاثرہ" حصہ محفوظ کر کے اس کا ڈی این اے ٹیسٹ کرایا۔ چونکہ موسیو G کے جرائم کا ریکارڈ پولیس کے پاس پہلے سے موجود تھا اس لیے ڈی این اے کی مدد سے پولیس نے اس بوسہ باز مجرم کو اس کے ساتھی سمیت پکڑ لیا۔ یوں موسیو G کو وہ بوسہ "پانچ سال" کا پڑا۔ ہم نے اپنے ایک دوست کو یہ واقعہ سنا کر ان سے پوچھا "اس واقعے سے کیا سبق ملتا ہے؟" بولے "یہی کہ جس کام کے لیے نکلے ہو اپنی مکمل توجہ اس پر مرکوز رکھو۔ کبھی کسی جرم کے ضمنی فوائد میں مت الجھو ورنہ گرفت میں آ جاؤ گے۔" ہمارے خیال میں ان واقعات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ اہل مغرب بے شک دیگر علوم و فنون میں ہم سے آگے ہیں لیکن ارتکاب جرم کے فن میں وہ ہم سے پیچھے ہیں۔ نیز یہ واقعات اردو شاعری کے "خدائے سخن" میر تقی میر کے 300 سال قبل کہے گئے اس قول پر مہر صداقت ثبت کرتے ہیں کہ

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں　　عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

◆◆◆

انسان حاصل کی تلاش میں لاحاصل کے پیچھے دوڑتا ہے ۔۔۔ اس بچے کی طرح جو تتلیاں پکڑنے کے مشغلے میں گھر سے بہت دور نکل جاتا ہے۔ نہ تتلیاں ملتی ہیں ۔۔۔ نہ واپسی کا راستہ۔ (بانو قدسیہ)

جائزے

راجہ گدھ......تنقیدی جائزہ
(بانو قدسیہ کا تخلیقی معیار)

حسن عسکری کاظمی

ایک مسلمہ حقیقت سے انحراف یا اختلاف عارضی طور پر ہلچل سی پیدا کرتا ہے مگر اس کے اثرات تادیر نہیں رہتے۔ اختلاف رائے کا حق بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے' کسی شخص کو اس حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اطلاق ادب پر بھی ہوتا ہے' ہم کسی ادب پارے پر تنقید کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کرنے میں آزاد ہیں' ہمیں پورا حق حاصل ہے کہ ہم کسی سے اختلاف کرتے ہوئے دلائل و براہین کے انبار لگا دیں اور یہ ثابت کرنے کی مقدور بھر کوشش کریں کہ ہماری رائے میں وزن ہے جب کہ ہمیں تنقید اور تحقیق سے متعلق مکمل آگاہی ہونا ضروری ہے' ہمارے ہاں ایسے نام نہاد ناقدین بھی اپنی ڈفلی بجانے بیساکھیوں کا سہارا لے کر اپنا قد بڑھانے کی ناکام [illegible] روایت کو دہرانے میں "مشتاق" ہیں لیکن ان کا یہ منفی رویہ قطعاً قابل قبول نہیں ہو کرتا مثلاً آج بھی ایسے اس قماش کے لوگ سامنے آجاتے ہیں جو کسی بڑے شاعر، افسانہ نویس یا ناول نگار کے خلاف قلم برداشتہ کتاب مرتب کر کے دوسروں کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوشش کرتے ہیں' علامہ اقبال جیسے قد آور شاعر کی نظم نگاری یا ان کے فلسفہ فکر میں نقائص تلاش کرنا' منٹو کی افسانہ نویسی میں فحاشی اور بانو قدسیہ کے ناول راجہ گدھ میں "مسلمین" کے ایما پر کم علمی کا الزام لگانے کی خاطر "تنقیدی جائزہ" پیش کرنا ایسے اقدام ہیں جو ادب کی بنیاد پر ضرب لگانے کے مترادف ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہر عہد میں ایسے "بزعم خود افراد" مل جاتے ہیں جو دور کی کوڑی لانے میں اور اپنے "مشن" کو آگے بڑھانے میں سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔ جب انھیں آئینہ دکھایا جاتا ہے اور دلائل سے ان کے اعتراضات رد کیے جاتے ہیں تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں ادبی تاریخ گواہ ہے ایسے افراد کوچہ گمنامی میں کھڑے ہیں جو مولانا حالی، ظفر علی خان، علامہ اقبال، فیض احمد فیض، ناصر کاظمی یا احمد فراز کے خلاف زہر اگلتے رہے اسی طرح "معیار ادب" کے خالق جہاں تہاں ابھرے اصول نقد و نظر سے انحراف کے سزاوار کہلائے۔

بانو قدسیہ کے ناول راجہ گدھ کا تنقیدی جائزہ غلام حسین غازی کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے جو اس ناول کی زبردست پذیرائی اور ناول نویسی کی تاریخ میں انسانی نفسیات کے حوالے سے اعلیٰ معیاری تخلیق تسلیم کیا گیا مگر اب تیس برس گزرنے پر "رنگ اشاعت" 2017ء ناشر بک ہوم لاہور نے دھوم دھام سے چھاپی مگر بے موسم کی بارش کا قطرہ ضرور کہلایا کہ "بے تنقید" کے باب میں غلام حسین غازی نے

لکھا" اپریل 2016ء میں کچھ نوجوان کالج سٹوڈنٹس نے رجوع کیا اور بانو قدسیہ محترمہ کے مشہور ناول راجہ گدھ پر رائے مانگی (موصوف نے یہ ناول ابھی تک پڑھا نہیں تھا) ان بچے بچیوں سے مہلت طلب کی اپنی سکول لائبریری سے راجہ گدھ منگوایا اور جب پڑھنا شروع کیا تو دماغ 1981ء میں پہنچ گیا" کتاب پر دیباچہ لکھا گیا" غلام حسین غازی کے نزدیک محترمہ بانو قدسیہ کا ناول "راجہ گدھ" بالخصوص بلکہ دونوں میاں بیوی سمیت اس قبیل کے دوسرے لکھاریوں کی تحریریں بھی فکری تعطل پیدا کرنے اور ہم خود ساختہ سماج کو اپنی تحریروں کی لوری سے سلا کر حالات کا نا انصاف سے بہرہ مند ہونے کی کوشش لگتی ہے" دیباچہ نگار گل سلطان اعوان۔

غلام حسین غازی بساط نقد و نظر پر تو وارد ہیں انہوں نے اعتراف کیا ہے کہ بانو قدسیہ کو نہیں پڑھا مگر جب انہیں "مصطفین" کی طرف سے اشارہ ہوا تو ان کی تین کتابیں پڑھ ڈالیں" تاکہ جب سے انہوں نے لکھنا شروع کیا تب سے لے کر "راجہ گدھ" لکھنے تک کی تخلیقی ترقی کا کچھ اندازہ ہو سکے" وہ بانو قدسیہ کے ساتھ اشفاق احمد کے بارے میں جس رائے کا اظہار کرتے ہیں وہ بھی ان کے طرز احساس کی تفہیم اور انداز نظر کو سمجھنے میں آسانی پیدا کرتا ہے" خود آپ محترمہ اور اشفاق مرحوم آزادی کی نسلیں ہندو رسوم و رواج سے منسلک رہیں' مرحوم ہندی زبان سے نہ نکل سکے بلکہ فخر سے چالیس سال تک بیاے کی زبان میں تلقین شاہ پیش کرتے رہے' کیا انہیں جب وطن ہونے کا ادراک نہ ہوا کہ ہم ایک نئی قوم کے نمائندے ہیں؟" دیکھنا یہ ہے کہ آیا ہم اس کتاب کو تنقیدی زاویہ نظر کا مظہر کہہ سکتے ہیں یا اسے مخصوص مکتب فکری تحریک پر مرتب کی ہوئی کتاب خیال کریں گے۔ "راجہ گدھ" کا ایک موضوع حلال اور حرام رزق میں فرق ہے۔ حرام رزق سے بہت سی معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں' یہ مسئلہ بظاہر کاذبی لیکن اطلاق میں مظاہرات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ جس گھر میں مال حرام آتا ہے وہاں جسمانی اور ذہنی عوارض پیدا ہوتے ہیں' رشوت' سمگلنگ' جوا' چوری' ڈاکا اور سود سے حاصل شدہ دولت بظاہر معیار زندگی بلند کرنے میں کام آتی ہے لیکن ذریعے بے یقینی عدم اعتماد خود غرضی اور تنگ دلی جیسے سنگین مسائل خاندانی نظام کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں' نئی نسل اور پرانی نسل کے درمیان تعلق منقطع ہو جاتا ہے اسی موضوع پر لکھا گیا ناول راجہ گدھ ہمارے قارئین کے لئے زندگی میں پیدا ہونے والے منظرنامے اور ممکنہ خطرات کے نتائج سے آگاہ کرنے کے حوالے سے نشان دہی کا سبب بنتا ہے۔

غلام حسین غازی نے ایک جگہ پتے کی بات ضبط تحریر میں لا کر قاری کو ایک گروہ سے ملایا کہ "ہمیں ان بزرگ اور مرحوم ہستیوں کی سوچ، فلسفۂ زندگی اور آدرشوں پر اپنی سمجھ کے مطابق تنقید کا حق ہے مگر ان کی ذاتوں کو کسی اور طرح سے Malign کرنے کا حق ہرگز نہیں پہنچتا" اسے ایک مسلمہ حقیقت کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں کسی کے فلسفۂ حیات سے اختلاف کرنے کا حق حاصل ہے لیکن ذاتیات پر اتر آنا یا کسی شخصیت سے متعلق وہمیات کر کے اس کی ذات پر کیچڑ اچھالا جانا قابل مذمت ہے۔ غلام حسین غازی نے یہاں تک جو کچھ کہا اسے ہر با شعور آدمی تسلیم کرے گا مگر جب ان کے انداز نقد و نظر میں یہ بات بھی سامنے آئی کہ "بانو قدسیہ محترمہ نے کسی بھی جگہ اپنے والد گرامی کا نام ہی نہیں لکھا بلکہ ذکر تک نہیں کیا۔

غلام حسین غازی انگریزی ادب کے استاد ہیں انہوں نے یقیناً تنقید کے بنیادی اصول اور کسی تحریر کا ناقدانہ تجزیہ کرنے سے متعلق یہ ضرور جانا ہوگا کہ رائٹر کے پیش نظر فن کی ترسیل کا مقصود معاشرے کی اصلاح سے کہیں زیادہ موثر انداز میں جمالیاتی قدروں کو متعارف کرانا اور مثالی زندگی بسر کرنے کا خواب دیکھنا ہے وہ مصلح ہے نہ فقیہ وہ سیاست دان ہے نہ وکیل بلکہ وہ اپنی تخلیق میں رنگ بھرنے

صحت مند تفریح بہم پہنچانے، شعور و آگہی پیدا کرنے اور زندگی سے محبت کرنے کو اولیت دیتا ہے یا باہمی احترام اور دوسروں کے حقوق کا لحاظ رکھنا اس کے عظیم مشن کی تکمیل سے عبارت ہے اگر وہ کہانی کار ہے تو اسے زندگی کے حقائق کو پیش نظر رکھنا پڑے گا۔ "راجہ گدھ" کے کرداروں میں زندگی سے فرار کا رویہ اس بات کی یقین دہانی ہے کہ بڑی نسل اپنے فرائض میں کوتاہی برتتے اور نئی نسل کی تربیت کرنے میں وہ ذمہ داریاں پوری نہ کر سکی جو کسی صحت مند معاشرے کا طرۂ امتیاز کہلاتی ہیں۔ سیمی شاہ، آفتاب اور قیوم راجہ گدھ کے وہ کردار ہیں جو نفسیاتی مریض ہیں، جس طرح کسی مطب میں بیماروں کے داخلے پر کوئی پابندی نہیں اسی طرح راجہ گدھ ایک ایسی کہانی ہے جس میں ہر کردار کسی نہ کسی مسئلے سے دوچار ہے اور ان تمام کرداروں کا تجزیاتی اور تحقیقی مرقع بانو قدسیہ کے معجز نما قلم نے کھینچ کر ہمیں معاشرے کا دوسرا رخ بھی دکھا دیا جسے دوسرے فنکار دکھانے میں مصلحت سے کام لیتے رہے۔ یہ کردار ادب کے مطب میں داخل کئے گئے اور انہیں بانو قدسیہ کی باریک بین نگاہ نے اس مطب میں جگہ دے کر اپنا فرض ادا کیا۔

ہر عہد میں کلاسیکی ادب پڑھا جاتا ہے۔ قارئین میں اہل الرائے بھی ہوتے ہیں۔ چھتیس برس پیشتر "راجہ گدھ" منصۂ شہود پر آیا، اسی طرح آگ کا دریا، اداس نسلیں اور علی پور کا ایلی شائع ہوئے گویا بیسویں صدی میں جو کچھ تخلیق ہوا اس کی پذیرائی ہوئی، تنقید ہوئی اور گزرتے وقت نے مثبت یا منفی فیصلہ دیا۔ برصغیر ہند و پاک کے دانشوروں، نقادوں نے تسلیم کیا کہ "راجہ گدھ" تخلیقی شاہکار ہے۔ بانو قدسیہ پڑھی لکھی خاتون ہیں، پڑھے لکھے لوگوں سے راہ و رسم رہی، حلال اور حرام میں تمیز کرنا معیار تقویٰ کا پہلا زینہ ہے اور اسلام دین فطرت ہے جو عمل فلاح انسانیت سے متعلق ہے وہ سب اپنانے میں بھلائی ہے۔ علم فقہ کے بغیر تجارت کرنا حرام ہے مگر کون ہے جو رزق حلال کمانے کی خاطر یہ تردد کرے کہ پہلے فقہ پڑھے پھر تجارت کرے؟ اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حلال و حرام کی پہچان آسان ہے۔ آدمی کا ضمیر رہنما ہوتا ہے اور حرام سے بچنے کی خاطر دیدہ و دانستہ کام لیا جاتا ہے۔ راجہ گدھ کی خصوصیات میں بڑی اور نمایاں خصوصیت یہی ہے کہ وہ مردار کھاتا ہے۔ اسلام میں غیبت سے منع کیا گیا ہے کیونکہ غیبت معاشرے میں انتشار اور نفرت کا سبب بنتی ہے یہی وجہ ہے کہ غیبت کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے۔ اس کہانی میں راجہ گدھ کی اسی خصوصیت کے پیش نظر یہ نام رکھا گیا کہ معاشرہ کس پستی سے ہمکنار ہوا چاہتا ہے جہاں بلا تمیز حرام کاموں کی رغبت بڑھ رہی ہے۔ راجہ گدھ علامت کے طور پر آ گیا ہے ورنہ اسے ماحول دوست خیال کیا جاتا ہے۔

غلام حسین غازی کا تنقیدی جائزہ صراحت اور وضاحت میں اپنی مثال آپ ہے انہوں نے کئی سوال بھی کھڑے کئے۔ وہ کردار نگاری اور منظر نگاری میں نقائص تلاش کرتے رہے۔ سیمی شاہ جیسی آزاد خیال طالبہ جو ہم جماعت طلباء سے گھل مل کر رہی مگر طالبات سے مقاطعہ اس کی شخصیت کو چیستان بنا کر پیش کیا گیا ہے وہ اپنے گھر والوں خصوصاً اپنے باپ سے برگشتہ اور متنفر رہی، وہ گھر چھوڑ کر ادھر ادھر گزارہ کرتی رہی، آفتاب کی بے وفائی سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کر لی۔ یہ انتہا پسندی اور برگشتگی کیسے پیدا ہوئی اس کا سبب کچھ بھی ہو ایسے کردار ماں باپ کی لاپرواہی کا شاخسانہ ہوتے ہیں بانو قدسیہ کی ژرف نگاہی نے معاشرے میں پھیلی ہوئی اس خرابی کو طشت از بام کیا مگر غلام حسین غازی کی نگاہ میں "اس کردار کو بے جا طوالت دے کر نوجوان ذہنوں کو پراگندہ کرنے کے سوا اس کا کوئی مطلب نہیں نکلتا۔" بانو قدسیہ میں کمال یہ ہے کہ وہ ماہر نفسیات ہونے کے ساتھ آدمی کے اندر کو باہر لانے اور سچائی میں رسوائی سے بے نیاز ہو کر

حقائق بیان کرنے پر قدرت رکھتی ہیں پروفیسر سہیل نوجوان ہے اس کا دل بھی حسن و جمال سے اپنے طلباء کی طرح اثر قبول کرتا ہے یہ الگ بات ہے کہ جگر مراد آبادی کے بقول

حسن کی اک اک ادا پہ جان و دل صدقے — لطف کچھ دامن بچا کر ہی نکل جانے میں ہے

وہ اعتراف کرتا ہے کہ "اتنے سارے علم کے باوجود ... اتنی بے اعتنائی دکھانے پر وہ بھی شاہ میرے دل میں گھستی چلی گئی ... میرے دل میں اگر علم کا تکبر نہ ہوتا تو شاید میں اسے لے اڑتا لیکن علم تو ایک حجاب ہے" ناول میں پروفیسر سہیل کا کردار دلچسپ اور جاندار ہے لیکن غلام حسین غازی کا یہ کہنا کہ سب سے گھٹیا کردار پروفیسر سہیل بنتا ہے" شاید اسی کردار کو انہوں نے کیدو سے تشبیہ دی ہے جو ہیر وارث شاہ میں ہیر اور رانجھا کی دائمی جدائی کے لئے ادا کیا گیا۔

راجہ گدھ ... تنقیدی جائزہ میں اور بہت سے پہلوؤں پر گفتگو کی جا سکتی ہے مگر ہمارا بنیادی سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ جو عمارت مضبوط بنیادوں پر قائم ہے اسے گرا کر نئی عمارت تعمیر کرنے کا خیال آ سکتا ہے لیکن ویسی اور اس سے بہتر اور برتر عمارت تعمیر کرنا بھی اسی کو زیب دیتا ہے جو موجودہ عمارت میں نقص دکھاتا ہے" ناول تخلیق کرنا زندگی تخلیق کرنا ہے ظاہر ہے کہ یہ کار ہنر آئے تو بات بنے ورنہ بات کرنا کسے نہیں آتا۔ ایک اور دلچسپ بات جس پر ہنسی آئی وہ یہ ہے کہ غلام حسین غازی باخبر ہونے کے باوجود بے خبر نکلے کہ ایک طرف لکھتے ہیں کہ "جن روشن ضمیروں نے علم بغاوت بلند کیا ان کا ریکارڈ تو جناب حفیظ الرحمن نے کتاب لکھ کر محفوظ کر دیا" دوسری طرف رقم طراز ہیں "ہاں ایک شخص قابل ملاقات ہے جناب ڈاکٹر آغا سہیل صاحب وائس چانسلر جی سی یونیورسٹی لاہور میرے علم کے مطابق جب لاہور کے آڈیٹوریم میں راجہ گدھ کی تقریب رونمائی ہوئی تو انہوں نے سٹیج پر ہی کہا تھا کہ یہ دوغلا ناول ہے یعنی یہ ایک دماغ کی پیداوار نہیں بلکہ دو اذہان کا کرشمہ ہے اور وہ دونوں شخصیات میرے سامنے موجود ہیں" ان کی بے خبری یہ ہے کہ ڈاکٹر سہیل صدر شعبہ اردو ایف سی کالج لاہور تھے جب کہ وائس چانسلر ڈاکٹر خالد آفتاب تھے اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی میں پہلے ان کا تقرر ہوا وہ میرے شاگرد رشید تھے وہ بہترین افسانہ نگار بھی ہیں جب کہ آغا سہیل کا انتقال ہو چکا ہے" "خاک کے پردے" ان کی آپ بیتی ہے جس میں لکھنؤ کی تہذیب اور لاہور کی ثقافتی زندگی کے پر اثر مرقعے پیش کئے گئے ہیں" غلام حسین غازی سے پہلے جمیلہ اقبال نے بھی تنقید اور تنقیص کی سرحدیں خلط ملط کر دی تھیں یا تو قدسیہ جیسی قد آور ادیبہ کا مقام متعین ہو چکا۔ وہ اپنی توانائیاں خرچ کر چکی ہیں انہیں گزشتہ دنوں پی ایم ٹی وی میں بلایا گیا مگر وہ کچھ بھی نہ کہہ سکیں۔ ان کا بیٹا اسرار تھا جس نے ماں کی محبت میں اشفاق احمد خاں کو کمتر ظاہر کیا۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ وہ دونوں اپنی تخلیق کے حوالے سے ایک دوسرے سے مکالمہ کرتے اور وقت کے سفر میں ایک دوسرے کا دل رکھتے دوستوں کو گھر بلاتے۔ داستان سرائے میں کہانی نا تمام رہ گئی۔ کردار خاموش ہو گئے۔ پردوں پر ایک تصویر آویزاں ہے جو ہم سے پوچھ رہی ہے کہ آسانیاں تقسیم ہو رہی ہیں یا مشکلات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ بابا کسی ویرانے میں تنہا سر جھکائے بیٹھا ہے۔ رات ڈھلتی کو ہے ... رات ڈھلتی نہیں ... رات کیسے ڈھلے!!

◆◆◆

طاقت یہ ہے کہ انسان آنسو بہانے کی بے شمار وجوہات ہونے کے باوجود مسکرانے کو ترجیح دے۔ (اشفاق احمد)

دُکھ ایک چڑیا ہے (افسانوں کا مجموعہ)

سلیم آغا قزلباش

اکثر افسانہ نویسوں کے فن افسانہ کے رموز و علائم کا قفل کھولنے کے لیے عموماً ایک ہی کلید کافی ہوتی ہے جس کے ہاتھ آنے سے ہم ان کے افسانوں میں موجود اس بنیادی تخلیقی جوہر تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس پر انھوں نے اپنے فن افسانہ نویسی کا پورا تانا بانا بنا ہوتا ہے۔ مگر بعض افسانہ نگاروں کے تحریر کردہ افسانوں کے دروبست کو جاننے کے لیے ہمیں کنجیوں کے ایک گچھے کی ضرورت پیش آتی ہے تاکہ ہم ان کے مختلف النوع اور مختلف الجہات افسانوں کے قفل کھولنے میں کامیاب ہو سکیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کا شمار بھی میرے نزدیک انھیں موخرالذکر افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کے افسانوں کے تازہ مجموعے "دکھ ایک چڑیا ہے" کے بیشتر افسانوں کی خارجی ساخت یا بافت ایک جیسی ہے۔ مگر دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ ان افسانوں سے تشکیل پانے والا بیانیہ ہر بار ایک مختلف اور نئے رنگ یا پیکر میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

بالفاظ دیگر بنیادی کہانی کو ہر افسانے میں ایک نئے رنگ یا لہجے میں پیش کرنے کی کاوش کی گئی ہے۔ چنانچہ اس مجموعے کے افسانوں کا بین المتونی تجزیہ و مطالعہ کیا جائے تو کئی دلچسپ پہلو اور زاویے سامنے آ سکتے ہیں۔ اس سے قطع نظر مرشد، خواب، بے معنویت اور گھر میں اجنبیت کا احساس ڈاکٹر رشید امجد کے اکثر افسانوں کی پہلی سطح ہے۔ خواب کے حوالے سے انھوں نے متعدد افسانے لکھے ہیں۔ بعض افسانے ایسے بھی ہیں جن کا عنوان کچھ اور ہے مگر ان میں خواب اور خواب سفر کرنے کی کیفیت موجود ہے۔ جاگتی حالت میں ایسے لگتا ہے کہ جیسے حالت خواب میں ہیں۔ کچھ افسانوں کے عنوانات میں خواب کے حوالے سے ہیں جیسے مثلاً "خواب کے پیچھے پیچھے"، "خواب میں خواب" اور "وحشت خواب" وغیرہ۔

ان دیکھے کو جاننے کی خواہش، زمان و مکان کی گتھی، گلی اور جنگل میں راستہ گم کر دینے اور واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو جانے کی صورت حال، نیز مکشف ذات یا باطن کی سیاحی ان کے متعدد افسانوں کا مرکزی تھیم ہے۔ بعض مرشد کا کردار نہ صرف ضمیر، ہمزاد، مرد دانا اور "The other Self" کی نمائندگی کرتا ہے بلکہ پابہ سلاسل سوچ کو آزاد کرانے کی خواہش کا اعلامیہ بھی ہے۔ مجموعے کے بعض افسانوں میں ایک سفید ریش داستان گو کا کردار بھی ظاہر ہوتا ہے جو ایک طرح سے مرشد اور مرد دانا ہی کا دوسرا روپ ہے۔ وہ بھی زندگی کی بجھارتوں کو بوجھنے اور اس کے عجیب و غریب سے حاصل کردہ دانائی کو دوسروں میں بانٹنے کی سعی کرتا ہے۔ کہیں پرانی روایات کا امین بن کر نمودار ہوتا ہے اور کبھی فرد کے بچپن سے جنم لینے والے سوالوں کے جوابات فراہم کرنے کا فریضہ انجام دیتا ہے تاکہ فرد کو "خود آگاہی" کا شعور حاصل ہو سکے، اور بعض مقامات پر وہ "وقت" کا استعارہ بن جاتا ہے۔

دفتر اور دفتری زندگی اس مجموعے کے اکثر افسانوں کا مرکزی تھیم ہے۔ مگر بغور دیکھیں تو گھر، دفتر اور دفتری ماحول کی حیثیت ان افسانوں کا ایک اہم پرت ہے جس میں اس ماحول سے جڑے مسائل اور معاملات کو عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک دفتر میں کام کرنے

والے مختلف عہدوں یا درجوں کے ملازمین اور ان کے باہمی روابط کو بھی ابھارا گیا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھتے ہوئے بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک سٹیج پر بکھرے کردار ایک مخصوص فضا اور ماحول کی ناقابلِ تبدیل رت میں سے گزر رہے ہیں۔ تاہم جب سٹیج پر موجود کرداروں (جو بظاہر ایک ہی ماحول اور سماجی مرتبے کے حامل معلوم ہوتے ہیں) پر روشنی کا زاویہ مختلف انداز سے مرتکز ہوتا ہے تو ان کے نفسیاتی، جذباتی، نفسی و باطنی اور دیگر معاملات اور مسائل پر کئی گوشے اور پہلو سامنے آنے لگتے ہیں۔ دراصل زیرِ نظر مجموعے کے اکثر و بیشتر افسانوں کا خارجی ڈھانچا تو ایک جیسا لگتا ہے مگر ان میں زندگی کے مختلف مسائل و معاملات کو ہر بار کچھ ایسے نئے یا منفرد زاویے سے پیش کیا گیا ہے کہ بظاہر Type دکھائی دینے والے کردار دیکھتے ہی دیکھتے راؤنڈ (Round) یعنی خاص کرداروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ اس مجموعے کے افسانوں میں بھی افسانے کے مرکزی کردار کا مادہ پرستی اور حرام کی کمائی سے دل بیزار ہو جاتا ہے اور وہ اس سے نجات حاصل کرنے کا کوئی راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے، کبھی اسے بیوی سے اکتاہٹ اور بیزاری محسوس ہونے لگتی ہے، کبھی روزمرہ امور کی یکسانیت اور یک رنگی اس میں جھنجھلاہٹ پیدا کر دیتی ہے، کبھی کوئی دوسری عورت (جو اکثر کولیگ یا ماتحت کی صورت میں) جلوہ گر ہوتی ہے اور اس کی زندگی کے کائی زدہ تالاب میں ہلچل مچا دیتی ہے اور یوں اس کی بوریت کو دور کر کے اسے زندگی کے نئے ذائقوں سے ہمکنار کر دیتی ہے۔ اسی طرح اولاد کی تعلیم، شادی اور ملازمت کے معاملات ان افسانوں میں اجاگر ہوئے ہیں۔ خاص طور پر ملازمت سے سبکدوش ہو جانے کے بعد کی زندگی سے متعلق چھوٹے بڑے مسائل کا بھی ان افسانوں میں خوب ذکر ہوا ہے۔ میری دانست میں افسانہ نگار کا یہ خاص کمال ہے کہ وہ ایک جیسے ماحول کے پروردہ کرداروں کے بارے میں ایسے نئے نئے زاویوں اور پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے جن کے باعث ہم زندگی کے مختلف چہروں (خوبصورت اور بدصورت) سے آشنا ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ڈاکٹر رشید امجد کے زاویۂ نگاہ اور ان کے افسانوں کے موضوعات کے دائرہ کار کو جاننے کے لیے ان کے اس مجموعے کے کچھ افسانوں پر روشنی ڈالنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ افسانہ بعنوان "حسرت چشیدہ" کے مرکزی کردار نے اپنے "ضمیر" کو قبر میں اتارنے کے بجائے بے ضمیری کو قبر میں اتار دیا، کیونکہ وہ بے ضمیروں یعنی تماشائیوں کے شہر میں مدہوش ہو کر بادہ نوشی کرنا چاہتا تھا۔ فرسودہ نظام کو بدلنا اگر ناممکن نہیں تو ضروری نہیں کہ ہتھیار ہی پھینک دیے جائیں۔ اس افسانے کا کردار مروجہ نظام کے ٹھیکیداروں کا مقابلہ کرنے پر کمربستہ رہنا چاہتا ہے۔ بے بسی اور بے چارگی سے سر نہیں جھکانا چاہتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کا کردار اندر سے مردہ نہیں، زندہ ہے اور اپنے زندہ ہونے کا ثبوت نظام کی خرابیوں کی نشاندہی کر کے دینا چاہتا ہے، چاہے اس کے لیے اسے کوئی بھی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ افسانہ "دست گزیدہ" میں معاشرتی برائیوں، دوہرے معیاروں اور بے حسیوں کو علامتی انداز میں نشان زد کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ ہاتھوں پر نشان یا سفید دھبوں کے ابھر آنے کو ضمیر کی خلش یا کردار کی بددیانتی اور بداعمالی کا علامیہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف ہاتھوں ہی سے ہر طرح کے اچھے برے کام انجام دیے جاتے ہیں۔ لہٰذا افسانے کے عنوان کی معنی خیزی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ افسانہ "جادۂ موج سراب" کے مطالعے سے خاص طور پر مرشد کے ایسے مکالمات کو پڑھنے کے بعد کہ "یہاں نہ زماں ہے نہ مکاں" دھیان طبعیات کی طرف جاتا ہے جس کے مطابق اس عظیم کائنات میں ایک مقام شاید ایسا بھی ہے جہاں سب کچھ ختم ہو جاتا ہے، وہاں نہ زماں رہتا ہے نہ مکاں، فقط عدم کی حالت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کے متعدد افسانوں میں رائیگانی کا احساس نمایاں ہے اور انسان کی تمام دنیاوی کامیابیاں

اور کام رکھنے کے باوجود اسے کھانے میں دکھایا گیا ہے جس سے یہ قرآنی آیت ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ "بے شک انسان خسارے میں ہے۔" مختلف افسانے "رائیگاں کی وصول" میں زندگی اور موت کے فلسفے یا زندگی کی رائیگانی کو ایکویریم کے ذریعے بیان کیا گیا ہے۔ جس طرح ایکویریم میں مچھلیاں بند ہوتی ہیں اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی اور وجود کے ایکویریم میں مقید ہے اور ایک وقت پورا کر کے دوسری زندگی کے دائرے یا ایکویریم میں منتقل ہو جاتا ہے اور یہ تماشا جاری رہتا ہے۔ افسانہ "تصویریں اور دیواریں" کا لب لباب یہ ہے کہ والدین کے ساتھ آج کی نوجوان نسل کا رشتہ ناتا کمزور پڑتا جا رہا ہے۔ نئی نسل بوڑھے والدین کو بوجھ سمجھنے لگی ہے اور ان کی ذمے داریاں اٹھانے سے کتراتی ہے اور انھیں نوکروں یا صرف اللہ کے سہارے چھوڑ کر زیادہ دولت کمانے کے لیے دوسرے ملکوں کو پرواز کر جاتی ہے اور بوڑھے والدین پیچھے تصویروں کو دیکھتے رہنے اور دیواروں سے باتیں کرتے رہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک انتہائی اہم مسئلے پر لکھا گیا افسانہ ہے جو دل کے تاروں کو چھو لیتا ہے۔ "آسمان دیکھنے کی تمنا" کی قرأت کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ عہد حاضر کے فرد کا فطرت سے انقطاع ہو چکا ہے۔ افسانے میں پائی جانے والی تتلیاں دراصل وہ خواہشیں ہیں جن میں افسانے کا کردار جکڑا رہتا ہے مگر وہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں۔ ایک خواہش یا تتلی ختم ہوتی ہے تو دوسری خواہش یا تتلی اس کی جگہ نمودار ہو جاتی ہے۔ افسانے کا کردار دراصل آزادی کا آرزومند ہے وہ آسمان کو دیکھنے یعنی آزادی کو پانے کا خواہاں ہے مگر مادیت اور یکسانیت کی گلیوں کی گھمن گھیریوں میں پھنس جانے سے اس کا آسمان اور اجرام فلکی سے رشتہ منقطع ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانے کا کردار آزادی حاصل کرنے کے لیے بدن کی بندگی سے بھی نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔

زیر نظر افسانوں کے مجموعے کا قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں شامل افسانوں کے کئی کردار سچائی، حقیقت یا سرمدی وحدت کی پر اسراریت کے پار جانے کے متمنی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کرداروں کے اندر کا تو ہم انھیں تلاش پر اکساتا ہے نروان یا گیان حاصل کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ یہ کردار مادہ پرستی کی دوڑ سے خود کو الگ کر کے باطن شناسی پر مائل نظر آتے ہیں، چاہے اس کے لیے انھیں بھاری قیمت ہی کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ مذکورہ مجموعے کے افسانوں کے مطالعے سے یہ پہلو بھی سامنے آتا ہے کہ والدین کی خدمت گزاری، بزرگوں کے احترام اور خاندان کی وحدت کو قائم رکھنا، برصغیر پاک و ہند کے معاشرتی نظام کا ایک ایسا بیانیہ (Narrative) ہے جو معاشی، معاشرتی اور اخلاقی تبدیلیوں کے باعث خطرے کی زد پر آ چکا ہے اور اس کے متوازی کوئی دوسرا (Narrative) ابھی تک تشکیل نہیں پا سکا جو مشرق کے اس متزلزل معاشرتی نظام کو تحفظ مہیا کر سکے لہٰذا ایک تشویش ناک صورت حال پیدا ہو چکی ہے۔ اس حوالے سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ گھر (جس میں میاں بیوی ان کے بچے اور دادا دادی بھی شامل ہوتے ہیں) کی اہمیت یا مرکزیت کے بتدریج ختم ہوتے چلے جانے کا المیہ ڈاکٹر رشید امجد کے ان افسانوں میں خاصا نمایاں ہے۔ افراد خانہ کے درمیان رونما ہونے والی مغائرت جدید عہد کی میکانکی مصروفیات کا نتیجہ ہے، باہمی رشتوں کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے نیز معاشی آسودگی کے حصول کی خاطر ایک دوسرے کے جذبات، احساسات اور خواہشات کا خیال بھی نہیں رکھا جاتا، صرف مالی منفعت کو زیادہ اہمیت دی جانے لگی ہے۔ نتیجتاً خون کے رشتے سسک سسک کر دم توڑتے چلے جا رہے ہیں۔

اس مجموعے کے بیشتر افسانوں میں ایک معاشرتی مسئلے کی بار بار نشان دہی کی گئی ہے جس سے اس کی گمبھیرتا کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ مسئلہ ہے شادی شدہ اولاد کا بہتر مستقبل کی خاطر اپنا وطن چھوڑ غیر ممالک میں آباد ہو جانا۔ دوسری طرف بوڑھے والدین اپنا

وطن اپنا گھر بار چھوڑ کر کہیں اور نہیں جانا چاہتے" مگر انھیں اولاد کی خاطر مجبوراً ان کے ساتھ باہر کے ملک جانا پڑتا ہے۔ وطن چھوڑنے' عزیزو اقارب اور دوست احباب سے دور چلے جانے پر وہ شدید قسم کے جذباتی اور نفسیاتی بحران کا شکار ہونے لگتے ہیں یہی نہیں ان کی زندگی میں ایک گہری تنہائی ہونے والا خلا بھی نمودار ہو جاتا ہے جو انھیں بے چین ہونے کے علاوہ باطنی خلفشار میں بھی مبتلا کر رہا ہے۔ نئے ماحول اور نئی دنیا سے سمجھوتا کرنا اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنا ان کے لیے ایک مشکل کی صورت اختیار کر لیتا ہے جس سے ان کے روحانی کرب میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔ مجموعی طور پر اس مجموعے کے افسانوں میں فرد کی شناخت' موت کی حقیقت' گھر کی مرکزیت' یکسانیت کی زائیدہ بیزاری' ضمیر کے چوکوں' زمان و مکان کی ماہیت اور مادہ اور جسم سے آزادی پانے کی خواہش جیسے موضوعات اجاگر کیے گئے ہیں۔ جب کہ فنی و تکنیکی اعتبار سے افسانہ نگار اپنے موقف کو افسانوں میں سمونے میں بخوبی کامیاب رہا ہے۔

افسانہ "کالا تو ادی" میں بھی فرد کی بے معنویت اور مرکزی حیثیت کو کھو دینے کا المیہ بیان ہوا ہے۔ زندگی کے سکرپٹ میں جب تک وہ فعال رہا اسے اہم رول ملتے رہے مگر جب اس کا زمانہ لد گیا' ملازمت سے سبکدوش ہو گیا تو اس کا معاشرتی مرتبہ و مقام بھی گھٹ گیا اور عملی زندگی میں اس کی اہمیت اور وقعت بھی ختم ہو گئی۔ مگر توجہ طلب پہلو یہ ہے کہ افسانے کے کردار نے ناموافق صورت حال کے آگے ہتھیار نہیں پھینکے' ہار نہیں مانی اور عملی زندگی کے سکرپٹ سے نکل کر تماشائیوں کا حصہ بن گیا' یوں اس نے مختلف طریقے سے اپنی گم شدہ شناخت کو بحال رکھنے کی کوشش کی۔ افسانہ "روایت" میں ایک سماجی مسئلے کو بڑی چابک دستی سے افسانے کے پیکر میں ڈھالا گیا ہے۔ اس میں یہ پہلو نمایاں کیا گیا ہے کہ پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنے سے گھر کا شیرازہ اگرچہ نہ بھی بکھرے تو باہمی رشتوں میں دراڑیں ضرور آ جاتی ہیں۔ ایک غلط رسم کی بنیاد پڑ جاتی ہے تو اگلی نسل بھی گمراہی کا شکار ہو سکتی ہے۔ ایسے فیصلے جو ساری خاندانی اور عائلی زندگی کو برباد کرنے کا موجب بن سکتے ہیں ان سے بہت اجتناب کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ بصورت دیگر اس کا نتیجہ گھریلو انتشار کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے۔

اپنی ہستی یا وجود کی اصلیت کو جاننے کی خواہش ڈاکٹر رشید امجد کے افسانوں میں زیریں لہر کے طور پر چلتی رہتی ہے۔ اسی طرح حقیقت کائنات کیا ہے' فرد آزاد ہے یا پابند' جبر و اختیار کا مسئلہ کیا ہے' خالق یا تخلیق کار کا اپنی تخلیق کردہ ہستی یا شے سے کس نوعیت کا تعلق واسطہ ہے' انسان اپنی تقدیر بدل سکتا ہے یا مجبور محض ہے یا پھر ایک طے شدہ یا مقرر راستے پر گامزن ہے جیسے فلسفیانہ اور فکری نوعیت کے گوناگوں سوالات ان کے افسانوں کے دائرہ کار میں شامل ہیں جو قاری کو غور و فکر کرنے پر مائل کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ امثال ملاحظہ فرمایئے:

"میں کون ہوں' میں کون تھا' ہوں بھی یا نہیں' اگر نہیں تو پھر یہ کون ہے جو ابھی تک میرے وجود میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔" (عمر گریز ۔۔۔ ص نمبر 19)

"مقام کی قید ۔۔۔ یہ وقت کی قید ہی ہے" وہ اپنے آپ سے کہتا ہے۔ "انسان کی بے بسی ہی اس کا خسارہ ہے۔"
(فرصت شوق کہاں ۔۔۔ ص نمبر 33)

"وہ خود سے باہر آ کر چیزوں کو دیکھنا چاہتا تھا' وجود کے اندر رہ کر دیکھنے کی اپنی حدود تھیں اور باہر آ کر کھلی فضا میں رہ کر دیکھنے کا مزہ ہی اور تھا۔" (افسوس حاصل کا ۔۔۔ ص نمبر 44)

"زندگی کیا ہے؟ کچھ نہیں ہوتا تو آرزوئیں، تمنائیں اور خواب ہوتے ہیں، حیرتیں ہوتی ہیں، بہت کچھ مل جائے تو سب سے پہلے حیرت جاتی ہے، پھر خواب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، خواب نہ ہوں تو باقی کیا رہتا ہے۔"
(مسکرانے لمحے سے نکلی ایک افسردہ کہانی — ص نمبر 65)

"جب کچھ نہیں تھا تو دھندلکا تھا اور وہ اپنی قوت کی سرشاری اور اپنے ہونے کے احساس میں مگن تھا، پھر جانے کیا خیال آیا کہ اس نے دھندلکے میں سے روشنی پیدا کی۔ روشنی سے رفتار اور رفتار سے میں نے جنم لیا ہیں" وہ چند لمحے چپ رہا پھر بولا: "میں تخلیق کے لمحے سے موجود ہوں، بوڑھا بھی اور جوان بھی۔ اس وقت تک جب یہ سارا بکھیڑا سمیٹا جائے گا۔"
(کہانی چل رہی ہے — ص نمبر 119)

"اس نے سوچا زندگی بھی عجیب شے ہے۔ یہ دنیا بھی ایک جسیم ایکویریم ہے جس میں ہم سب مچھلیوں کی طرح ہیں، کوئی غیبی ہاتھ ہمیں کہیں اور سے نکال کر اس میں ڈال دیتا ہے اور کسی دن یہاں سے نکال کر کسی اور ایکویریم میں ڈال دیتا ہے — تو زندگی صرف یہی ہے تڑپنے یا اختیار نہ جانے پر۔"
(شام کی کہانی — ص نمبر 137)

"جب مرنے کا انجام اٹل ہے تو پھر دام رکھنے کی کیا ضرورت ہے اور یہ پہچان کے کیا معنی ہیں؟"
(ماتم ہال دیکا — ص نمبر 147)

"اور یہ الجھا ہوا ریشم کا گچھا ..... یہ عظیم گولا جس کے اندر ان گنت چھوٹے بڑے گولے ہیں۔" وہ بڑبڑایا ..... "ایک عظیم دائرہ ہے جس کے دائرے کی گولائی کی حد ہی نہیں۔"
(قیدی — ص نمبر 223)

"موت تو صرف ایک تبدیلی ہے، موت صاحب اختیار نہیں اور جب کوئی صاحب اختیار نہ ہو تو وہ کسی کو کیا فنا کر سکتا ہے؟"
(گل ہی نہ جائے — ص نمبر 235)

"طوطے کی موت" زیر نظر مجموعے کے لاتعداد افسانوں میں شامل ہے۔ اس افسانے میں طوطے کی موت علامتی اعتبار سے گہری معنویت سے مملو ہے۔ داستانی یا اساطیری قصوں میں اکثر کسی خاص ہستی کی جان طوطے کے وجود میں بند ہوتی ہے۔ جب تک طوطا زندہ رہتا ہے کوئی دوسرا اس خاص ہستی کی جان نہیں لے سکتا۔ افسانے میں بوڑھے مرد کا کردار غلطی سے طوطے کو پنجرے ہی میں بند چھوڑ کر اور گھر کو مقفل کرنے کے بعد بیوی کے ہمراہ اپنے بچوں کو ملنے (جو غیر ملک میں مقیم ہیں) بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہو جاتا ہے۔ جہاز کے اڑان بھرنے کے تھوڑی دیر بعد اچانک اسے یاد آتا ہے کہ وہ معصوم پالتو طوطے کو پنجرے ہی میں تنہا چھوڑ آیا ہے۔ اس کے بعد افسانے کے بوڑھے مرد کردار اور طوطے کا باہمی انسلاک واضح ہونے لگتا ہے۔ طوطے کے مالک کو بہرحال اتنا اندازہ تھا کہ طوطا شاید ایک ماہ تک گھر میں اکیلا پنجرے میں بند زندہ رہ پائے گا کیونکہ جو راشن پانی پنجرے کے اندر بنے پیالوں میں اتفاق سے موجود تھا وہ ایک ماہ تک چل سکتا تھا۔ آخر میں جب افسانے کے بوڑھے مرد کردار کو معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے بیٹے کے پاس آئے ہوئے ایک ماہ گزر چکا ہے اور اب شاید طوطا بھی زندہ نہیں رہا ہوگا تو اس خیال کے ذہن میں وارد ہوتے ہی اسے اچانک دل کا دورہ پڑتا ہے اور پل بھر میں اس کا دم نکل جاتا ہے۔ افسانے کے بوڑھے مرد کردار کی اچانک موت اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ ہزاروں میلوں کی دوری پر گھر کے ایک کمرے میں لٹکتے ہوئے پنجرے میں قید تنہا بھوکا پیاسا طوطا واقعی مر چکا ہے، گویا مرد کردار کی جان طوطے میں بند تھی۔ جب طوطا مرا تو بوڑھے شخص کی جان بھی قفس

عصری سے پرواز کر گئی۔ اس سے افسانے کی معنویت دوچند ہو گئی ہے۔ داستانی کہانیوں کی اس متھ (Myth) کو افسانہ نگار نے ایک نئے لبادے میں پیش کیا ہے اور اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہا ہے۔

”دکھ ایک چڑیا ہے“ — افسانوں کے اس مجموعے کا آخری افسانہ ہے۔ کتاب کا عنوان بھی اسی افسانے پر رکھا گیا ہے اور اس کا شمار بھی افسانہ نگار کے بہترین افسانوں میں ہوتا ہے۔ افسانے میں میاں بیوی کے باہمی رشتے میں ایک ایسی دراڑ کے ابھر آنے کی کیفیت کو گرفت میں لینے کی کوشش کی گئی ہے جو انسانی نفسیات، احساسات، خدشات اور جذبات کے گورکھ دھندے کی نشان دہی کرتی ہے۔ افسانے کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک دن میاں بیوی دونوں بڑے خوشگوار موڈ میں شاپنگ کے لیے باہر جاتے ہیں اور خریداری مکمل کرنے کے بعد کار میں سوار ہو جاتے ہیں۔ مگر میاں کو دوبارہ کسی وجہ سے کار میں بیوی کو اکیلے چھوڑ کر سٹور میں جانا پڑتا ہے۔ واپسی پر اس کی بیوی کار سمیت وہاں سے غائب ہوتی ہے۔ اسے اغوا کر لیا جاتا ہے۔ ایک پیر صاحب کی مہربانی سے چند گھنٹوں کے اندر اندر اس کی بیوی کی بازیابی ہو جاتی ہے۔ بیوی کے گھر لوٹ آنے پر ایک عجیب اضطراب بھری فضا جنم لے لیتی ہے۔ بیوی کئی بار شوہر کو بتاتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا وہ بالکل محفوظ رہی۔ شوہر بظاہر اس کا یقین کرتا ہے مگر اندر کہیں کوئی پھانس اٹکی رہتی ہے جو اسے بے چین کیے رکھتی ہے۔ بیوی بھی اسی تناؤ کا شکار ہے کہ شاید اس کے شوہر کے دل میں شک یا وہم گھر کر گیا ہے کہ اغوا کاروں نے کہیں اس کے ساتھ زیادتی کا ارتکاب تو نہیں کر ڈالا۔ افسانے کے آخر میں سارا ذہنی و جذباتی تناؤ میاں بیوی کے بیچ آنسوؤں کے ریلے میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ ایک نہایت حساس اور نازک موضوع پر لکھا گیا افسانہ ہے جسے مصنف نے فنی چابک دستی سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا ہے۔

آخر میں صرف اتنا کہوں گا کہ ڈاکٹر رشید امجد کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو 1960ء کے فوراً بعد اردو افسانے کے افق پر نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اہلِ ادب کی نظروں میں اہمیت اختیار کر گئے۔ ڈاکٹر رشید امجد کے افسانوں میں کہانی پن کا عنصر ہمیشہ سے کارفرما رہا ہے۔ علامتی و تجریدی افسانے کے عروج کے زمانے میں بھی انھوں نے اپنی اس روش کو برقرار رکھا۔ ان کے تحریر کردہ علامتی افسانے جن میں تجریدی انداز کی جھلک بھی موجود تھی ان میں کہانی کا ہیولا کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کا مزاج اور لب و لہجہ دیگر علامتی و تجریدی افسانہ لکھنے والوں سے الگ طرح کا نظر آتا ہے۔ ”بیزار آدم کے بیٹے“ اور ”ریت پر گرفت“ کے بعد ان کا افسانہ قدم بہ قدم آگے بڑھتا ہوا ”ست رنگے پرندے کے تعاقب“ تک چلا آیا اور وہاں سے مزید پیش قدمی کرتے ہوئے اور کئی منازل طے کرنے کے بعد ”دکھ ایک چڑیا ہے“ تک آ پہنچا۔ کم و بیش پچپن برس سے ڈاکٹر رشید امجد افسانے کے دیار کی سیاحت کر رہے ہیں اور اس سفر کا حاصل وہ ان گنت افسانے ہیں جن میں انھوں نے انسان کی خواہشوں، سیال جذبوں، چاہتوں، مایوسیوں اور خوابوں کی تصویر کشی کی ہے۔ یہی نہیں انھوں نے انسان کے اندر کی دنیا کی غواصی کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ علاوہ ازیں زمان و مکاں، جبر اور وجود، حقیقت اور خواب، حیات و ممات، ظاہر و باطن، خیر و شر اور جزو و کل کے مضامین نہ صرف ان کے فنِ افسانہ نویسی کی شعریات کا لازمہ ہیں بلکہ ان کے افسانوں میں عمودی گہرائی کا وصف پیدا کرنے میں بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ افسانے کے دیار کی سیاحت کا سلسلہ ڈاکٹر رشید امجد نے تاحال برقرار رکھا ہوا ہے اور امید ہے کہ وہ مستقبل میں بھی ہمیں مزید اعلا پایے کے افسانے پڑھنے کا موقع فراہم کرتے رہیں گے۔

◆◆◆

پنجابی نظم دی جاگرتی دا ثبوت......
سلیم شہزاد دی ''نیندر بھجیاں نظماں''

اخلاق عاطف

اپنے آل دوالے دے منظراں تے رویاں دی کوڑ تے مٹھاس نوں محسوس تے سارے ای کر دے نیں پر ایہناں نوں بیان دا ڈھنگ کسے کسے نوں آوندا اے۔ بہاول نگر دا ای شاعر سلیم شہزاد ضلعی محکمہ صحت وچ ریسورس پرسن اے تے ایس دے داری نوں دوہرے طور اُتے ادا پیا کردا اے کہ ادب نوں وی اپنیاں تخلیقی سوچاں دے سلسلے ریسورس دان پیا کردا اے۔ اردو پنجابی تے سرائیکی وچ کوئی گل نال سوچدے تے لکھدے نویں نظم مصرعے سوہنا سلیم شہزاد دا اچیچا وصف اے۔ اوس نے اپنا ایہ وصف اک واری نہیں کئی واری اُتے منوایا اے کہ اوس دے شعر پراگیاں نے اکادمی ادبیات ایوارڈ تے مسعود کھدرپوش انعام حاصل کیتے ہوئے نیں۔ سورج نوں دیوا وکھانا بہت آسان اے پر ہنیرے اندر کوئی دیوا بالنا بڑا اوکھا کارج اے۔ میں سمجھنا ہاں سلیم شہزاد اپنی شاعری راہیں اجوکے ویلے دی ترقی تے روشنی دے اوہلے لکے ہوئے دکھاں تے ہنیرے نوں دور کرن دے سلامتی جوگ کارج کر رہیا اے۔

سلیم شہزاد جاگدی اکھاں نال خاب نہیں ویکھدا تے نہ ای اوہ نیندر وچ بولن دا عادی اے پر اوہ کسی نوں کجھ سمجھاون لئی اوہدی کیفیت اپنے اُتے طاری کر لین دا فن ضرور جاندا اے۔ جنہوں اوس دے ایس فن دی اس پچھلے ورھے شائع ہون والا نظم پراگا ''نیندر بھجیاں نظماں'' پڑھ کے پتہ لگدا اے۔ 128 صفحیاں والا ایہہ نظم پراگا 'سانجھ' لاہور نے وڈھیا طباعتی انگ نال شائع کیتا اے۔ پہلے شائع ہو چکے شعر پراگیاں وانگوں سلیم شہزاد دا ایہہ نظم پراگا وی خیال تے اظہار دے نویکلے رنگاں نال سج دھج کے ساہمنے آیا اے۔ ایس پراگے دا سرناواں پڑھ کے لگدا اے جویں خاص نیندری لٹے وچ کسی خاص خاب دیاں گلاں ہوون گیاں' کسی خاص وجود نال کیتے قول قراراں دی منظوم تعبیراں ہوون گیاں' میل ملاپ تعلق یا وچھوڑیاں دے دکھ بیان ہوون گے پر سو فیصد ایسا کجھ نہیں۔ شاعر نے نیندر تے جگراتے وچکار کھلو کے اپنے کائناتی شعور دا وکھالا ایہناں نظماں راہیں انج کروایا اے کہ پڑھن والا احساس دے ڈونگھے سمندراں وچ لہہ جاندا اے۔ سلیم شہزاد نے سماجی تاریخ دیاں تلخ سچائیاں نوں انج منظوم کیتا اے کہ روحاں دیاں راہداریاں وچ چیکدے ہوئے جذبے بولن واسطے زبان منگن لگ پیندے نیں۔

ایس پراگے دی پہلی نظم ''سم راج'' پڑھ کے ای مینوں انج محسوس ہویا جویں دل دا لہو اکھیاں راہیں باہر آون دے حیلے لبھدا پیا اے۔ ماڑے لوکاں نوں ڈنگراں وانگ ورتن دے ظالمانہ رویے دی صدیاں لمی تاریخ دے ورقے پھولدی ایہہ نظم اپنی ہوند وچ صرف اک نظم نہیں پر پوری جاتی سلیم شہزاد دے شعور دا ذخیرہ ثواب دا وسیلہ اے۔

تاریخ دے ورقے تے پھیلدیاں جدوں سلیم شہزاد تخلیق دے پاروں بحث نوں سانولیّن لئی رکھدا اے تاں وی اوہ وہ ہوا انہیں پیندا سکون کھلرے ہوئے ملکر دے اکٹھ جوڑن دا تدبر کر دیاں اپنے آپ نال نوں ولاگی کرن لگ پیندا اے تے اوس دی نوں ولاگی وچ وی تاریخ دی رڈ کن ایس طرحاں نمایاں ہوندی اے۔

وکھیا جے تاریخ دے پریشان ورقیاں توں وکھی ہوئی حیرانی نوں سلیم شہزاد کنے سچے کرب نال اپنے خیالاں دی منظوم مالا وچ پروندا اے۔ ویسے تے شاعری نوں مبالغے دی کھیڈ آکھیا جاندا اے پر جد شاعر دیانتداری نوں اپنے اندر دے سچ دے تڑکے نال سوادلا کے پیش کرن والا جان دا ہووے تے لوکائی اوس نوں وکھرے طور جاندی تے پچھان لگ پیندی اے۔ سلیم شہزاد نوں اوہدی وکھری پچھان ایسے شاعری نے دتی اے۔ ہاں پر سلیم شہزاد صرف ماضی دی تاریخ دا شاعر نہیں 'حاضر ویلے دیاں اوہناں 'سیاسی' سماجی حقیقتاں دا خاصا ادراک وی رکھدا اے تے ان جھک اظہار دا حوصلہ وی اوہدے بارے مزاحمتی شاعری دے وڈے دعوے دار لکھاری وی ڈردے گل نہیں کردے۔ وڈیاں سیاسی طاقتاں نے (تخلیق امن والیاں کلیاں قوماں دے ساہجاں اندر) جویں مذہبی دہشت گردی نوں پروان چڑھان لئی مذہبی ٹھیکیدار رکھے تے استعمال کیتے نیں اوس دا ان جھک اظہار وی ایس پراگے دیاں نظماں وچ ملدا اے۔

کجھ پردھوں دوہ کوڑیاں گلاں 'علامتاں دے نال نیلے کالے پیلے لفظاں وچ ولیٹ کے سلیم شہزاد نے جویں پیش کیتیاں ایہ جتھوں وی اوس دی نظم نوں عام پرچلت اجوکی شاعری توں ڈھیر ممتاز کردا اے۔ ایہ حقیقت وی سامنے جوگ اے کہ ماضی تے حال دی تاریخ بیانی دے شوق رکھے وچ وی جدیاں سلیم شہزاد دے لوکائی نال اپنی جمی محبت جتھوں دے بھیں ہوون دی۔ اپنی لوکائی دے دکھاں وچ اوہ کیوں آپ ہی اوہ کے نہیں بھردا اوس دیاں نظماں وی اوہ کے بھردیاں تے ڈین پا ہریاں لگیں۔

تاریخ دے ورقے تے پھروڑ دا نال تے لوکائی دے دکھ بیان دے نال سلیم شہزاد دل دیاں رازاں تے رمزاں نوں بیان کردا نہیں تھکیا' کیوں جے ہر زبان دی شاعری دی مڈھلی صفت ایہی اے۔ پورے پچھے تے تھوڑی اکھراں نال سوہنیاں یاداں نوں کج سجائیں جاں دے پچھلے اکھ دی ایس پراگے وچ پڑھن نوں ملدے نیں۔۔۔

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2016 تک

ماہنامہ "تخلیق" اب تک پانچ "تخلیق ایوارڈ" دے چکا ہے

1	2012ء	جناب شفیع عقیل صاحب	(کراچی)	021-34816655
2	2013ء	جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب	(لاہور)	0334-9719278
3	2014ء	محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ	(لاہور)	0333-4221870
4	2015ء	محترمہ صغریٰ جہاں صاحبہ	(امریکہ)	001-3109870978
5	2016ء	محترمہ عذرا اصغر صاحبہ	(کراچی)	0300-8839895

اخبارات کے تراشے

تخلیق بمقابلہ تخریب .... صوفیہ بیدار

''تخلیق'' ہی وہ مضبوط راستہ ہے جو تخریب کو 'بند' باندھتا ہے۔ آج سے دہائیوں قبل یہ راستہ اظہر جاوید نے علمی ادبی جریدہ ''تخلیق'' نکال کر دریافت نہ بھی کیں تو امن کا احیا ضرور کیا۔

پورے برصغیر میں ''فنون'' کی طرح ''تخلیق'' ادب شناسی، ادب کے احیا، اور معیار کا باعث ہوا۔ تخلیق میں چھپنا گویا ادیب ہونے پر مہر ثبت کرتا تھا۔ فنون کا بھی یہی قصہ تھا۔ فنون کو سنبھالنے والوں کی آپسی تقسیم نے ایک نئے ادبی پرچے ''معاصر'' کو بھی جنم دیا جو بعد ازاں معاصر ہی کی طرح بکھر گیا۔ ادبی پرچوں کا اس دور میں چھپنا اور پروان چڑھنا گویا ویسے ہی معجزہ ہے۔ ہزار بار بحث کی گئی تجاویز دی گئیں کہ سرکار ادبی صورتحال کے ادبی پرچوں و علاقائی زبان میں چھپنے والے اخبارات کو اشتہارات میں زیادہ کوٹہ دے مگر قابل اعتنا نہیں جانا گیا لہٰذا جو ''بی وار'' اب بے ادبی کے دور میں ادبی پرچے نکال رہے ہیں ان کو تمغہ ملنا چاہئے۔ الٹا ادبی پرچے ہی تحفہ بانٹ رہے ہیں، اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔ گزشتہ دنوں اظہر جاوید کے بیٹے سونان اظہر نے تخلیق کو دوسرے ادبی پرچوں کے جانشینوں سے ممتاز کرتے ہوئے طارق اصغر ندیم سید جیسی بیسٹ سیلر لکھاری کو نہ صرف ایوارڈ دیا بلکہ ایک خوبصورت ٹھہرانے کا بھی اہتمام کیا۔ اسی طرح ''بیاض'' والوں نے بھی مثال قائم کر رکھی ہے۔ پنجابی ادبی رسالے ویسے ہی سسک رہے ہیں، لوگ اپنی جیب کے خرچوں سے رسالے اخبار نکال رہے ہیں۔

عوامی رویہ بھی یہ ہے کہ ہر شوق و ضرورت کیلئے لاکھوں بہا دیتے ہیں مگر گھر میں کتابوں اور ادبی ذوق کیلئے کوئی پرچہ، کوئی کتاب تک خریدنے پر آمادہ نہیں ہوتے بعد ازاں جب بچے بگڑ جاتے ہیں یا مغرب زدہ ہو جاتے ہیں تب واویلا کرتے ہیں اور دوستوں میں بیٹھ کر پرانی قدروں کو یاد کرتے ہیں اور دوستوں میں بیٹھ کر پرانی قدروں کو یاد کرتے ہیں جب ان اقدار کی تباہی و تنزلی کے باعث خود ہی ہوتے ہیں۔ ''تخلیق'' کا معیار کم نہ ہوا اور تزئین و آرائش میں اضافہ سونان اظہر کا کارنامہ ہے۔ علاوہ ازیں تخلیق کا ٹائٹل ہمیشہ بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ ایوارڈ والوں کے ساتھ ساتھ میری عوام سے بھی درخواست ہے کہ گھروں کی بے تحاشا الٹی سیدھی گروسری والی باسکٹ میں چار کاغذ، دو قلم اور کوئی اچھی کتاب ہی کیوں نہ خریدنے کی عادت ڈالیں۔ یہاں تو حال یہ ہے کہ تحفے میں ملی ہوئی کتابیں بھی لوگ شیلفوں میں لگانے اور پڑھنے سے زیادہ ڈیکوریشن پیس کے طور پر یا بظاہر پڑھے لکھے کہلانے جانے کے شوق میں رکھتے ہیں۔ کچھ ادیبوں نے تو یہاں تک شکایت درج کروائی ہے کہ ان کی تحفہ کی ہوئی کتابوں کو فٹ پاتھوں پر لگنے والے کتاب بازاروں میں بیچ دیا گیا۔ شناخت ان کی ایسے ہوئی، لکھنے والوں نے نہایت محبت سے کتاب کے پہلے صفحے پر اپنا نام، فون نمبر اور تحفہ وصول کرنے والوں کیلئے اچھے الفاظ لکھ رکھے تھے مگر برا ہو اس بے وفا لمحے کا جہاں محبوبوں کے خط چوراہے میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ کئی شاعروں نے تو شاعری میں ان خطوں کی حرمت کو پامال کیا۔ سب سے خوبصورت انجام بھی شاعری نے یہ کہہ کر کیا:

تیرے خط آج میں گنگا میں بہا آیا ہوں   آگ بہتے ہوئے پانی میں لگا آیا ہوں

قیامت یہ کہ برقی خط اور رقعے چلنے شروع ہو گئے۔ خط تو چھپائے نہ چھپتے تھے۔ کئی طلاقیں بے گناہ آنکھوں میں گرنے کی وجہ سے ہو گئیں۔ کیونکہ، بیڈمنٹن کی "چڑی" بھی خط لکھوانے کا باعث ہوئے جبکہ اب ایک "کلک" CLICK سے تمام محبت نامے ڈیلیٹ ہو جاتے ہیں۔ زمانوں سے ٹرکوں، بسوں، ویگنوں کے پیچھے لکھے اشعار تفریح طبع کا باعث تھے۔ مدتوں سے کوئی نیا شگوفہ نہیں مل رہا تھا۔ اچانک ہی ایک "ہائی ایس" فراٹے بھرتے ہوئے دیکھا جس کے رائٹر نے موجودہ جدیدیت کو اپناتے ہوئے نئی رومانوی کو شاعری کا حصہ بناتے ہوئے لکھوا رکھا تھا

"تیرے پیاں پیاراں نوں وی ڈیلیٹ کر ستاں"

(HIGHT OF REVENGE) یہ مصرعے پرانی روایت سے جڑے شاعروں کیلئے لمحہ فکریہ ہیں۔ جو ابھی تک کار، ٹیلیفون، موبائل ایس ایم ایس اور فرینڈ لسٹ کو اپنانے سے گریزاں لب و رخسار، زلف و کاکل اور محبوب و عاشق ہی سے باہر نہیں آ سکے۔ سچی بات تو یہ کہ بڑا شاعر ہر دور کیلئے ہوتا ہے۔ وہ صدیوں کی سچائی لیے ہوتا ہے۔

خود کو عاشق اور ہر عورت کو محبوب سمجھنے والے قلم کاروں کیلئے وارث شاہ کے یہ مصرعے Eye Opner ہیں

لے وے رانجھیا واہ میں لا تھکی   ساڈے وسدی گل بے وس ہوئی

ظالم مائیاں قاضیاں ہتھ ٹوری   تیڈی میڈڑی دوستی بس ہوئی

لفظ دوستی محبت سے کس قدر افضل ہے جسے عظیم صوفی شاعر نے برتا۔ وارث ہی وہ واحد تخلیق کار ہے جس نے عورت کو پورے وجود کے ساتھ مکمل ماضی کا مالک انسان سمجھا اور اس کے لیے ایسا خوبصورت کلام لکھا وگرنہ دلی لکھنو کے شاعر تو عورت کے خدوخال ہی سے نکل نہ پا رہے تھے جبکہ وارث نے حسن کی تعریف میں مصوری کی اور تقدس کو دوبالا کر کے خوبصورت تشبیہات کا سہارا لیا جس سے اسے بے جان مورتی سے زندہ جیتی جاگتی من مرضی کی عورت بنا ڈالا۔ انگلیاں لوراں پھلیاں کہ انگن مرگ ممولڑے چال مست ہاتھیوں جیسی آکر دن کو بیج کی زندگی سے زندگی کو جوڑا۔ جبھی تو عورت جب بھی بین ڈالتی ہے پنجاب کے بچے وارث ہی کو پکارتی ہے۔

(بشکریہ روزنامہ "نوائے وقت" 21-02-2017)

تخلیق کاروں کی تقریب .... فرخ سہیل گوئندی

15 فروری کو تخلیق کاروں کی ایک شاندار تقریب میں شرکت کا موقع ملا۔ اس سے صرف ایک دن قبل تخریب کاروں نے لاہور کو اپنی تخریب کاری کا نشانہ بنایا۔ ایسا سماج جہاں تخریب کاروں کی یہ کوشش ہو کہ وہ تخریب کے ذریعے تخلیق اور تعمیر کو روک کر اپنی رجعتی اور تخریبی سوچ کو مسلط کریں گے، ایسے میں تخلیق کاروں کی یہ تقریب اس پاکستان کا ہراول دستہ ہے جو سماج کو علامہ اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح کی فکر و فلسفے کے مطابق ایک فلاحی سماج میں بدلنا چاہتے ہیں۔ دہشت گردوں نے 14 فروری کو شاہراہ قائد اعظم پر دھماکہ کیا، یعنی قائد اعظم کی شاہراہ پر۔ ظالم دہشت گرد اسلامی دنیا کی سب سے طاقتور ریاست کو گرانا چاہتے ہیں جس کی بنیاد اسلامی دنیا کے عظیم قائد محمد علی

جناح نے رکھی۔ وہ پاکستان کو "شاہراہِ قائداعظم" سے ہٹانے کے لیے تخریب کو تعمیر کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ معمولی سے چند گروہ اکثریت کو یرغمال / زیر کرنا چاہتے ہیں۔ ایک جدید فکر کو تخریب سے مٹانا چاہتے ہیں، جو کہ ممکن ہی نہیں۔ اسی لیے اسی لاہور میں دوسرے روز تخلیق کاروں کی ایک شاندار تقریب منعقد ہوئی۔ جو قلم، فکر، دلیل، مکالمے، ادب، انسانیت اور سماجیت سے پاکستان کو "شاہراہِ قائداعظم" پر چلانے کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ تخلیق کاروں کی اس تقریب کا اہتمام معروف ادبی جریدے "تخلیق" کے بانی جناب اظہر جاوید کے بیٹے سونان اظہر جاوید نے کیا تھا۔ اظہر جاوید نے چار دہائیوں کی قبل تخلیق کا جو بیڑا اٹھایا وہ اسے تا عمر نبھاتے رہے۔ تخلیق کاروں کا جریدہ "تخلیق" پاکستان کے ادب اور تخلیق کاروں کا معروف جریدہ ہے۔ ادب، فکر اور دلیل کا جریدہ۔ ان کی پانچویں برسی کے موقع پر سونان اظہر نے ایک ریستوران میں جن تخلیق کاروں کو اکٹھا کیا، وہ اسی پاکستان کے علمبردار ہیں جو پاکستان کو فکرِ اقبال اور شاہراہِ قائداعظم پر چلانے کے لیے ہراول دستے کا کام کر رہے ہیں، جن میں عابد حسن منٹو، سلمیٰ اعوان، الطاف حسن قریشی، اسلم گورداسپوری، افتخار مجاز، شیبا زانور، عمرانہ مشتاق، نوید چودھری، ڈاکٹر کنول فیروز، ڈاکٹر اختر شمار، طفیل اختر، بشریٰ رحمن، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، صوفیہ بیدار، ناصر بشیر، حسین مجروح، تسنیم عابد حسن منٹو، ڈاکٹر مبارک علی، معروف گلوکار شوکت علی سمیت لاتعداد تخلیق کار شامل تھے۔ راقم سمیت تمام تخلیق کاروں نے جہاں اظہر جاوید مرحوم کی ادبی خدمات اور ان کے جریدے "تخلیق" کی Contribution کا ذکر کیا۔ وہاں تقریب میں شامل درجنوں تخلیق کاروں نے اپنے خیالات کے ذریعے درحقیقت تخریب کاروں کے سامنے اپنے علمی، فکری، ادبی اور نظریاتی قلم کو بلند رکھنے کا عہد کیا۔ شاباش سونان اظہر، شاباش۔ یہ تقریب اس پاکستان کی نمائندہ ہے جو حقیقی پاکستان ہے جو قلم، علم اور فکر کے ذریعے آج بھی تخلیق کاری کرتے ہیں، جو لوگوں کو ہلاک کرتے ہیں نہ ہی جنت کے حصول کے لیے پاکستان کو جہنم بنانے پر تلے ہوئے ہیں بلکہ یہ تخلیق کار اس جہان کو بھی جنت بنانے کے لیے امن اور علم و ادب کے ذریعے سرگرم عمل ہیں۔ تقریب میں ایسے لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے چار، پانچ اور چھ بلکہ سات دہائیاں جہدِ مسلسل کرتے ہوئے اس عمل کو جاری رکھا ہوا ہے۔ کتنے پیارے ہیں یہ لوگ جو لوگوں کو دہشت زدہ نہیں کرتے بلکہ لوگوں کو فکر، عمل اور سماجی رتبے کے حوالے سے طاقتور بنانا چاہتے ہیں۔

اظہر جاوید مرحوم میری جوانی ہی میں میرے دوست بنے۔ میں ایک سیاسی ایکٹیوسٹ تھا اور وہ مکمل طور پر ادبی شخصیت۔ دوستی میں چلتے چلتے معلوم ہوا کہ وہ میرے والد محمد یعقوب گوندل کے بھی دوست ہیں، اسی طرح کنول فیروز بھی۔ اظہر جاوید اور کنول فیروز کا ایک سنگ میں پوری عمر نہیں بھولوں گا کہ جب میں اور میری شریکِ حیات ریحانہ نے والد صاحب کو سرپرائز دینے کے لیے اپنے ہاں ایک ڈنر کا اہتمام کیا۔ والد صاحب، والدہ اور میرے بھائی اعجاز گوندل سارا دن پوچھتے رہے کہ آج تم نے کون سے مہمان ڈنر پر بلائے ہیں۔ جب رات کو کنول فیروز کے دیپا پر اظہر جاوید ہمارے ہاں گیٹ پر پہنچے تو والد صاحب حیران رہ گئے۔ یہ اظہر جاوید کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے سے دو سال قبل کا واقعہ ہے۔ کنول فیروز ایک درویش صفت دانشور ہیں۔ ان کا دیپا اس پاکستان کا نمائندہ تھا جو اب سوا ماتکیل ساروں کے خوابوں میں معدوم ہو چکا ہے۔ ان دونوں کا دیپا پر پہنچ کر آنا مجھے اس پاکستان کی طرف لے گیا جو امن اور تخلیق کاروں کا پاکستان تھا جسے تخریب کار زیر کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ کیا لمحات تھے اور دیا، اظہر جاوید اور کنول فیروز دیپا سے اترے اور اپنے بچپن کے دوست یعقوب گوندل سے بغلگیر ہو گئے۔ خوشی تخلیق کرنا اور خوشی تقسیم کرنا قدرت نے شاید مجھے دولت میں عطا کی ہے، یعنی دوستوں میں خوشی تقسیم کرنا۔ وہ کیا لمحات تھے۔ اور پھر تینوں دوستوں نے اپنی کہانیاں شروع کیں جن میں تینوں دوستوں نے اپنی کہانیاں شروع کیں جن

میں تینوں دوستوں کے ایک اور دوست کی کہانی مجھے کسی افسانوی داستان کی طرح یاد ہے۔ ایک بحری جہاز دارا کی تباہی کی کہانی جس میں ان تینوں کا ایک دوست بھی سوار تھا۔ بحری جہاز دارا کی تباہی کی کہانی میں نے اپنے گھر میں اپنے والد صاحب سے سن رکھی تھی۔ جہاز جو 1961ء میں گہرے سمندروں میں جل اٹھا۔ اس میں بچ جانے والے خوش نصیبوں میں ان تینوں کا ایک دوست بھی سوار تھا۔ اور پھر دور دراز کر میں نے ابا جی کے دوست کو اپنے ہاں ذریعہ موجود ہوتے دیکھا۔ ہم بہن بھائی اس سمندری جہاز میں بچ جانے والے شخص کو دیکھ کر یوں محسوس کر رہے تھے کہ جیسے ہم کسی فلم کا سین دیکھ رہے ہوں۔ اظہر جاوید مرحوم جس قدر بچپن میں ابا جی کے دوست تھے اس سے زیادہ میری ان سے دوستی ہو گئی۔ یہ دوستی ابا جی کی رحلت سے آغاز ہوئی اور ان کی آخری سانسوں تک برقرار رہی۔ جہاں وہ جریدہ تخلیق باقاعدگی سے نکالتے تھے، وہیں وہ شہر میں ادبی وسیاسی تقریبات بھی برپا کرتے تھے۔ میں ان کی تقریبات میں شامل ہوتا اور وہ میری منعقد کی گئی تقریبات میں۔ وہ تخلیق کاروں کی دوستی۔ جب پاکستان میں ایک ایسے شخص کی حکمرانی تھی جس کو آج پاکستان میں تخریب کاروں کا مرشد کہا جاتا ہے، جس نے امریکہ کے کہنے پر اس خطے میں تخریب کو تبدیلی Instrument سمجھا۔ سو ان اظہر جاوید نے اپنے مرحوم والد کے اس ادبی سفر کو بھی جاری رکھا ہے اور فکری اور تخلیقی سفر کو بھی۔ وہ جریدے "تخلیق" کو باقاعدگی سے شائع کرتے ہیں اور "تخلیق کاروں" کے اکٹھ بھی کرتے ہیں، وہ شاہراہ قائد اعظم کو تخلیق کاروں کی شاہراہ سمجھنے پر ایمان رکھتے ہیں، ان تخریب کاروں کے مقابلے میں جو شاہراہ قائد اعظم کو تخریب کاری کا نشانہ بنانے پر تلے ہوئے ہیں۔ (بشکریہ روزنامہ "نئی بات" 18-02-2017)

◆◆◆

معروف شاعر، ادیب اقتدار ساجد کی مرتبہ کتاب "کلیات ممتاز راشد لاہوری" سے انتخاب

آپ تنہائی میں کبھی ملیے

شائع ہو گئی ہے

ملنے کا پتہ: ادارہ پبلشرز، 60۔ ڈی مال، لاہور (فون نمبر: 042-36303390)

معروف ادیب فصیح الدین کی معلوماتی مضامین و کالموں پر مبنی کتاب

خامہ بہ جوش (جلد اول و جلد دوم)

شائع ہو گئی ہیں

ملنے کا پتہ: ریلمرچ لائبریری پشاور، ورسک روڈ، خیبر پختونخوا (فون نمبر: 091-5201544)

پنجاب رنگ

سلیم شہزاد

اِک صدی

اک صدی میں پار لنگھائی
اکھر جوڑ کے کے
اک صدی میں آپ پچھتائی
اکھر توڑ کے ہتھے
اک صدی میں اکھر بن کے
سوالاں وچوں لنگھیا
اک صدی نے مینوں ونگیا
اکھر چھپانے کر کے
اک صدی میں اکھر وٹے
اکھ لگانے کر کے

OOO

نظم

گھنگرو بے
نویں رت کے
لون دی چوٹی والے نیش
کھلے رو تے
تارے انگھوں
اکھ پیر
منہ زبانی
دکھے پیراں ویکھن گھروں
چاء دے بھے
پینڈے کر کے
چھانے بیٹھن گالی دے

OOO

سرفراز سیّد

اِک گوتم

اک گوتم تے اوہدی بیوا
گیان دی خاطر
دھیان دی خاطر
سدھ رشی
سونا چاندی
محل سارے
پنجھ کے سارے
جا بیٹھا سی
بوڑھ رکھ دی چھاویں
میں وی اک گوتم آں جیہڑا
ویلے دا قربان ہویا ہے
گیان دی خاطر
دھیان دی خاطر
اپنیاں گلاں دی خاطر
جگ وچ شہرت پان دی خاطر
اپنی آن تے شان دی خاطر
سدھ رشی
سونا چاندی
محل سارے
ماں سارے
دھوڑ لیاواں
ہے میں اینویں کجھ کرنا سکاں
جنگل جنگل
وانگ ہواواں
اپنا آپ گواواں
پتھراں دے ایس شہر دے اندر
آپ پتھر ہو جاواں

OOO

منزہ شاہد

میں بلبل تیرے باگاں دی

میں آتھن آتھن جوڑ کے اک پینگھ کی اوہدا
ہن آ کے بہہ جا سوہنیا تے ایہہ ٹیک چڑھا

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

ایہناں عشق چناواں دے [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

بے عقل کجھ نیں سکھیا [illegible]
[illegible]

OOO

تبصرے

کندن چہرے

مؤلف : ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم   مبصر : ملک اشرف ذکی

صفحات : 320   قیمت : -/1,200 روپے   ناشر : مقبول اکیڈمی اردو بازار لاہور

ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید نے دبستان سرگودھا کی تعمیر میں سربراہی کردار ادا کیا۔ موجودہ وقت میں یہ کردار بطریق احسن ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم سرانجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کا چھوڑا ہوا خلا مکمل طور پر پُر کرنا تو شاید ممکن نہ ہو لیکن اپنے ان گروؤں کی دی ہوئی تربیت کو ڈاکٹر تبسم پوری محنت، ہمدردی اور خلوص کے ساتھ روبہ عمل لا رہے ہیں۔ ڈاکٹر تبسم تقریباً 70 ادبی اور 27 درسی کتب اس وقت تک شائع کر چکے ہیں۔ ان میں سے کوئی کتاب کھول لی جائے تو وہ اپنی اہمیت و افادیت کی خود گواہ ہے۔ زیر نظر کتاب ''کندن چہرے'' بھی اپنی مثال آپ ہے۔ اس میں ایک جدت یہ بھی ہے کہ اس میں شامل 118 مشاہیر ادبا و شعراء کے جو خاکے پیش کئے گئے ہیں ان میں ایک صفحہ پر ڈاکٹر تبسم اور بالمقابل صفحہ پر معروف ترین ناشر جناب مقبول احمد مقبول اکیڈمی لاہور نے اپنے خیالات، نظریات اور مشاہدات مختصراً لیکن انتہائی جامع انداز میں قلمبند کئے ہیں۔ میں آخر کر میں راقم والی بات ہے لیکن میرے لئے انتہائی فخر کی بات ہے کہ ان نامور شخصیات میں مجھ جیسے معمولی لکھاری کو بھی شامل کیا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ کتاب میں میرے متعلق خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ڈاکٹر تبسم نے کہا ہے کہ میرے اور ان کے تعلق کا بنیادی ستون محترم جناب پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول ہیں جن کے ہم دونوں شاگرد رہے ہیں۔ صاحبزادہ صاحب جیسی شخصیات اور استادی شاگردی کے رشتوں کو کندن چہرے بنا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے تخلیقات و تصنیفات کے انبار لگا دیئے ہیں۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ اس بے مثل نے اپنے گروؤں کے قدم پر سر جھکا لیا اور اسے اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ سیاسی، معاشرتی، تحقیقی، تعلیمی اور ادبی میدان کے ہر گوشے میں آپ نے دلچسپی اور موثر انداز میں کام کیا کہ قاری انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔ مذکورہ کتاب میں شامل جامع خاکے قاری کو علم و ادب خصوصاً شامل ادبا و شعراء کے بہت قریب کر دینے کی صلاحیت کے حامل ہیں۔

شہرِ ہنر میں۔ نجم الحسن رضوی (فن و شخصیت)

مرتبین : رشید بٹ، عمیر الطیر   مبصر : محمد علی چراغ   قیمت : -/500 روپے   ناشر : رب پبلشرز، ٹرنس روڈ کراچی

جناب نجم الحسن رضوی کہ جو تقریباً پچاس سال سے وادیٔ ادب میں محسوس طور پر موجود ہیں، افسانہ ان کی اولین شناخت بن چکا ہے۔ بقول رشید بٹ ''وہ الفاظ میں مصوری کرتا رہا ہے۔ وہ دل کی بات اور اپنی سوچ کو الفاظ کا روپ دینا خوب جانتا ہے۔ صورت

احوال سے خوفزدہ نہیں ہوتا۔'' اس کی باتیں دل کی باتیں مانند ارژنگ اس کے نگار خانہ میں مدام رونق افروز رہتی ہیں۔

نجم الحسن رضوی اپنے افسانوں میں بنیادی طور پر انسان کی کہانی بیان کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں کے کردار اپنی تمام تر خوبیوں کے اور خرابیوں کے ساتھ وارد ہوتے ہیں۔ یہ کرداروں کو محض اظہار تفریح کے لیے نہیں بلکہ اس کے اندر کے انسان کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر صورت بھلائی اور تعمیر کے حامی ہیں اور اگر فوری طور پر اصلاح اور تعمیر نتیجہ خیز نہ ہوں تو اس کے باوجود فرد خاص کو کچھ سوچنے پر ضرور مجبور کرتے ہیں۔ اسی لیے ان کے افسانوں کے موضوعات کو وسعت اور زندگی کے جدید تر مسائل قرار دیا گیا ہے۔ اور بیان کی تازگی اور شگفتگی کا تذکرہ بھی کیا گیا ہے۔ افسانہ سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے افسانوں میں جابجا مختلف کہانیاں، قصے اور افسانچے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، وہ صحیح معنوں میں اپنے ہر کردار کی نفسیات، سماجی سے بخوبی واقف رہتے ہیں۔ مرد، عورت، نوجوان، بوڑھے اور بچے کی نفسیات کو خوب سمجھتے اور افسانوی اسلوب میں بالاستیعاب نبھاتے ہیں۔ شعوری طور پر مصنف کے اکثر افسانے انسانوں کے انسانیت سوز کرداروں کی کرشمہ سازیوں اور شرافت و نجابت کی ملمع کاریوں کے سایوں میں حیا سوز حرکات و افعال کی عکاسی بے رنگ و ڈر کرتے ہیں۔ وہ کرداروں کی ذاتی شناخت کو بھی اہمیت دیتے ہیں۔ بوقت ضرورت ہر کردار کے تکیہ کلام اور اس سے وابستہ تقلیدی انداز فکر اور لابدی و لازمی احتیاجات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ مصنف اپنی شعوری کاوشوں سے ہر کردار کے شخصی جذبات، جنسی اور شکمی تقاضوں کو فطری معیاروں اور شدت کے ساتھ بیان کرنے کا حوصلہ اور قرینہ رکھتا ہے۔ وہ اپنے کئی افسانوں میں 'پروجیکشن' یعنی فن تخیل کو بھی بروئے کار لاتا ہے اور ابلاغ کو سہل بنا دیتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ غیر محسن کے ناگزیر اثرات کو قدرتی اور امرحی، رواں دواں انداز و اسلوب میں پیش کرنے میں کوئی مزاحمت محسوس نہیں کرتا۔ اس پر مستزاد ''انہیں افسانے کی زبان لکھنی آتی ہے۔'' اور ''ان کے افسانے کا روپ سروپ عکاسی بھی ہے، تمثیلی بھی اور اشاراتی بھی۔'' نجم الحسن رضوی کے افسانوں میں قدیم روایت اور زیست کے تسلسل میں جانوروں کے کردار بھی موجود ہیں۔ دنیا بھر کے دیومالائی اور ساحری قصے کہانیوں اور داستانوں میں جانوروں کے جابجا کردار ملتے ہیں۔ دنیا کی سب سے پہلی کہانی جو تحریری صورت میں دستیاب ہوئی ہے وہ تقریباً 1400 قبل مسیح کی ہے۔ اس مصری کہانی میں گھریلو پالتو جانور بھی باتیں کرتے ہیں۔ جناب حکیم لقمان کی جانوروں کی کہانیاں اور حکایات پنج کے بعد کلیلہ و دمنہ، الف لیلوی کہانیاں، مولانا روم اور شیخ سعدی کی کہانیوں کے بعد فرید الدین عطار کی 'منطق الطیر' میں جانوروں اور پرندوں کے کردار براہ راست اور تمثیلی انداز میں بھی جانوروں پند و نصائح کے ساتھ ساتھ ان میں انسانوں کے لیے امید، جوش، جذبہ اور حوصلہ افزائی کے عناصر بھی موجود ہیں۔ نجم الحسن رضوی کی متعدد کہانیوں کے کردار بھی جانور ہیں۔ ان کے کردار انسانوں کے ساتھ اور زیر سایہ مجبوراً زندگی گزارتے والے بیل، گائے، بھینس اور مرغیاں وغیرہ تو انسانوں کے ساتھ قدرتی آفات اور حوادث کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔

نجم الحسن رضوی صاحب اپنی کہانیوں میں براہ راست اظہار کے بجائے توسیع تناظر میں اپنے ایک منفرد، ہموار و رواں اسلوب سے شر کے بھیانک سے پہلوؤں کی بدصورتیوں سے ادبی حوالوں سے بھی اجتناب کرتے ہیں۔ ان کے افسانہ ''لوڈ شیڈنگ'' کا یہ جملہ ملاحظہ ہو کہ ''جس شہر میں لوگوں کو زندہ گھر پہنچنے کی ضمانت نہ دی جا سکے، وہاں عورتیں بچے پیدا کرنے کے قابل نہیں رہتیں'' یہ ایک خوب صورت بالواسطہ ادبی سلیقہ ہے۔ اسی طرح اہل حقائق کے جلو میں وہ تصدیق صداقت اور تحسین حسن وغیرہ میں بھی بڑی بے باکی سے کام لیتے

ہیں۔ ''خوا شید تک'' ہی میں موجود ہے کہ ''عورت پورا شہر ہے جس میں نسلیں اُگتی ہیں ــــ اور زندگی کے چمن لہلہاتے ہیں ــــ اور جو شہر زندگی کی حفاظت کرنے میں ناکام رہے وہ آسیب زدہ ہو جاتا ہے''۔ نجم الحسن رضوی تخلیقی کرداروں کو اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہیں۔ وہ انسان کے کاروبار اور ان کی زندگی کے ذرائع روزگار اور حصولِ رزق کے مشاغل پر بھی غور و خوض کرتے ہیں۔ ان میں عصری مسائل بھی ہیں اور زمانہ حال کا تذکرہ بھی۔ ان کے افسانہ ''کھڑکی'' میں یوں عبارت آرائی موجود ہے کہ ''یہ سچ ہے''۔ ایک شخص نے کہا ـــ آہستہ آہستہ آدمی غائب ہوتا جا رہا ہے اور مشینیں اس کی جگہ لے رہی ہیں۔ اور اسی طرح سے اساطیری تلازموں سے نکل کر عہدِ حاضر کے مسائل و افکار سے بھی دوچار ہو جاتا ہے۔ پھر معاشرتی اور تہذیبی بلکہ مشرقی فضاؤں میں مزید نشوونما پاتا ہے۔ یوں بعض مقامات پر ''ماروی اور مرجینا'' کے کئی کردار فریدالدین عطار کی مثنوی منطق الطیر کے سیمرغ کی طرح رہنما اور مثالی قطبیر بن کر سامنے آتے ہیں۔

کتاب ''سفر ہنر میں'' مرتبین رشید بٹ اور عمیر الطیر نے نجم الحسن رضوی صاحب کے فن اور شخصیت پر باضابطہ طور پر وافر معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اس دستاویزی کتاب میں تمام اندراجات حوالہ جاتی اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم۔ شخصیت اور فن

مصنف : ذوالفقار احسن　　صفحات : 160　　قیمت : -/300 روپے

پبلشر : نقش گر راولپنڈی　　مبصر : آفتاب خان

ڈاکٹر ہارون الرشید ایک ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں جن کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ہر سال ان کی دو تین کتابیں شائع ہو کر منظرِ عام پر آ جاتی ہیں جن میں زیادہ تعداد ان کتابوں کی ہے جو انہوں نے ادبی شخصیات پر مرتب کی ہیں اور وہ کتابیں تحقیقی مقالوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے اس ہمہ رنگ ادبی کارناموں کا جائزہ لینے کے لیے ضروری تھا کہ خود ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی شخصیت پر کوئی کتاب مرتب کی جائے چنانچہ یہ کام ذوالفقار احسن نے اپنے ذمے لیا اور اس طرح زیرِ نظر کتاب شائع ہوئی۔ ذوالفقار احسن خود بھی شاعر اور ادیب کی حیثیت سے معروف ہیں اور ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انہوں نے ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے فن اور ان کی قد آور شخصیت کا بڑی باریک بینی اور عرق ریزی سے جائزہ لیا اور یہ کتاب مرتب کی ہے۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن میں ڈاکٹر ہارون الرشید احوال و آثار، تصانیف کا تعارف، ان کی شاعری کے اہم موضوعات، خصوصی مطالعہ اور اہلِ قلم کی نظر میں شامل ہیں۔ اس طرح ڈاکٹر ہارون الرشید کے حالاتِ زندگی اور ان کی تصانیف کا مکمل تعارف سامنے آ جاتا ہے۔ ذوالفقار احسن نے ان کی زندگی کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کیا۔ ذاتی زندگی سے لے کر ان کی فنی زندگی تک تمام پہلوؤں کو تفصیل سے بیان کیا ہے حتیٰ کہ انہوں نے جن جن ٹی وی اور ریڈیو پروگراموں میں شرکت کی ان کی تمام تر تفصیل بھی موجود ہے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو یہ کتاب ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی پوری شخصیت کا احاطہ کرتی ہے اور تحقیق نگاروں کے لیے بھی ایک اہم ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے لہٰذا ذوالفقار احسن اس تحقیقی کام پر مبارکباد اور ستائش کے مستحق ہیں اور ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کو بھی مبارکباد کہ ان کی زندگی میں ان پر اتنی اہم جامع اور بھرپور کتاب مرتب کی گئی ہے جس میں ان کے فن اور ذاتی زندگی کی مکمل تصویر بن کر سامنے آ گئی ہے۔

ماضی اور حال (3)

مصنف : وحشی سعید   صفحات : 158   قیمت : -/500 روپے
پبلشر : تحریک ادب سری نگر   مبصر : آفتاب خان

وحشی سعید کے افسانوں کا یہ تیسرا مجموعہ ہے اس سے پہلے بھی دو مجموعے اسی عنوان سے شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ اس مجموعے میں تیس افسانے یا کہانیاں کہہ لیں موجود ہیں۔ وحشی سعید کی یہ کہانیاں بہت گہرے مشاہدے اور معاشرے پر گہری نظر رکھنے کے باعث منفرد حیثیت کی حامل ہو گئی ہیں۔ انہوں نے باریک بینی سے اپنے اردگرد اور روزمرہ کے پھیلے واقعات کو افسانوں اور کہانیوں کا موضوع بنایا ہے اور پھر انہیں اپنے دل کش جملوں سے نیا رنگ ڈھنگ دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ یہ کہانیاں کشمیر سے بھی تعلق رکھتی ہیں اور بھارت کے مختلف شہروں کا بھی ان میں تذکرہ موجود ہے۔ اگرچہ ان میں ان شہروں کی بود و باش اور ثقافت بیان نہیں کی گئی مگر کہانیاں بہت حد تک چونکا دینے والی اور منفرد انداز لیے ہوئے ہیں اور ہر کہانی پڑھنے کے فوراً بعد اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ بعض کہانیاں فلمی اور جاسوسی انداز کی بھی ہیں ان میں سب کچھ سیدھے سادے انداز میں بیان کر دیا گیا مگر بعض کہانیاں افسانوں جیسی تہہ داری میں لپٹی ہوئی ہیں اور ان کا اختتام چونکا دیتا ہے جیسے دانت، اصلی گلاب، بیت کی یاد، تاج محل ٹوٹ گیا، معمہ وغیرہ وغیرہ۔

وحشی سعید ایک بہت خوبصورت ادبی رسالہ ''نگینہ'' بھی سری نگر سے نکالتے ہیں اور اعلیٰ ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں۔ ان کے یہ افسانے کافی عرصہ پہلے لکھے گئے تھے جو اب کتابی شکل میں سامنے آ رہے ہیں جبکہ یہ افسانے مختلف ادبی جرائد میں بھی شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔ اس کتاب میں شامل کہانیوں اور افسانوں میں سے افسانوں کو بہت زیادہ اہمیت دی جا سکتی ہے اور یہی افسانے وحشی سعید کو یہ ادبی مقام بھی عطا کرتے ہیں۔ البتہ کہانیوں پر اگر وہ توجہ نہ دیں اور آئندہ صرف افسانے تحریر کریں تو وہ ایک بہترین افسانہ نگار کے طور پر زیادہ قابلِ تحسین ہوں گے۔ ایک اور بات کہ ہماری اور سرحد پار کی اردو زبان میں کچھ فرق موجود ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سرحد پار اردو اس کی تمام تر باریکیوں کے ساتھ موجود نہیں بلکہ کچھ خامیاں زبان و بیان میں بھی ہیں اور املا میں بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ اس کتاب میں املا کی بہت سی غلطیاں ہیں (جنہیں پروف ریڈنگ کی غلطیاں نہیں کہا جا سکتا) مثلاً سیاح کو سیاہ لکھا گیا ہے اور گنج کو گنجی لکھا گیا ہے جو کہ درست نہیں ... اردو داں حلقوں کو ان قباحتوں سے بچنا چاہیے۔

حرفِ آغاز

مصنف : ڈاکٹر انجم جاوید   صفحات : 240   قیمت : -/400 روپے
پبلشر : ورد احساس پبلیکیشنز لاہور   مبصر : آفتاب خان

ہمارے معاشرے کا یہ المیہ ہے کہ جو فرد چند کتابیں پڑھ کر ان کی تشریح کرنے لگ جائے اسے عالم فاضل تصور کر لیا جاتا ہے

اور اس کی لکھی ہوئی تحریروں کو ابھی سمجھنا شروع کر دیا جاتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب مختلف مضامین اور کالموں کا مجموعہ کہی جا سکتی ہے مگر اسے پڑھنے والا یہی محسوس کرے گا یہ سب کچھ میں بہت پہلے پڑھ چکا ہوں ان مضامین میں کیا نئی بات کی گئی ہے' کوئی نیا جملہ کہاں سے ملے گا یا کوئی نئی فکر، نیا خیال کس مضمون میں سامنے آئے گا۔ دراصل یہ تمام مضامین مختلف اقوالِ زریں، احادیث نبوی، قرآن پاک کی آیات، مختلف کہاوتوں، انبیاء کرام، اولیاء کرام، مشاہیر کے مکالموں وغیرہ سے ماخوذ جملوں پر مشتمل ہیں۔ مشہور اقوال کو چند الفاظ ادھر ادھر کر کے نیا بنانے کی کوشش کی گئی ہے مگر ان میں جو تغیر کی بے بضاعتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم تیسری جماعت کی اردو کی کتاب پڑھ رہے ہیں۔ چند مضامین کے عنوان دیکھیں اسی سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ تحریر کا معیار کیا ہو گا مثلاً علم اور اخلاص، نیکی اور دنیاداری، قصہ اور برداشت، تعلیم، علم اور عمل، علم، حلم اور صبر، خوشامد پسندی، عجز، فخر اور غرور وغیرہ وغیرہ ــــ یہ وہ عنوانات ہیں جن کے بارے میں بچوں کو ابتدائی جماعتوں میں پڑھایا جاتا ہے اور ان میں سے بیشتر قرآن و حدیث کے موضوعات ہیں جن سے ہر مسلمان بخوبی آگاہ ہے لہٰذا ان مضامین کو کالموں کے طور پر اخبارات میں شائع کروانا اور پھر ان کی کتاب لانا سمجھ سے بالاتر ہے ــــ کالم یا مضمون کا تقاضا ہے کہ اس میں نئے در وا کیے جائیں اور ان تحریروں میں اتنا تخلیقی وفور موجود ہو جو قاری کو جکڑ کر رکھ لے اور وہ اس کا اول سے آخر تک مطالعہ کرنے پر مجبور ہو جائے مگر ان تمام مضامین میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی۔ کوئی بھی مضمون پڑھنا شروع کر دیں، چند سطور پڑھنے کے بعد آپ کہہ اٹھیں گے یہ کیا ہے اس میں نیا پن کیا ہے، یہ سب کچھ تو ہر انسان بہت پہلے سے جانتا ہے لہٰذا معذرت کے ساتھ عرض یہ ہے کہ یہ صرف اپنے دل کی تسلی کے لیے لکھی گئی تحریریں ہیں جن کی علمی یا ادبی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

جھرنے

مصنف : پرویز بخت قاضی   صفحات : 166   قیمت : -/400 روپے

پبلشر : گلیکسی پرنٹرز و پبلشرز، لاہور   مبصر : آفتاب خان

پرویز بخت قاضی نثر نگار کے طور پر طویل عرصے سے لکھ رہے ہیں اور ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ زیرِ تبصرہ کتاب کہانیوں پر مشتمل ہے لیکن آخر میں تقریباً پچاس صفحات پر شاعری بھی موجود ہے۔ کہانیوں والا حصہ تین ابواب پر مشتمل ہے جو واردات، واقعات اور تراجم کے عنوان سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ پہلے دو ابواب میں طبع زاد کہانیاں ہیں جو قاضی صاحب نے بہت سادگی اور عمدگی سے پیش کی ہیں۔ تراجم والے حصے میں چار غیر ملکی مشہور مصنفین کی مشہور کہانیاں شامل کی گئی ہیں۔ یہ کہانیاں کلاسک کا درجہ رکھتی ہیں، خاص طور پر بچوں کے ادب میں ریڈ شو اور جل پری نامی کہانیاں بہت مقبول ہیں۔ اسی طرح دیگر تین کہانیاں بھی خوبصورت اور سلیس زبان میں اردو میں منتقل کی گئی ہیں۔ ان کہانیوں کے مصنفین میں کیتھرائن مینسفیلڈ، ہانس کرسچن اینڈرسن، [illegible] اور سمرسٹ ماہم شامل ہیں۔

دوسرے باب "واردات" میں پانچ کہانیاں دی گئی ہیں جو زیادہ تر بیرونی ممالک میں رہائش پذیر لوگوں کے کلچر کی عکاسی کرتی ہیں۔ قاضی صاحب نے یہ پانچوں کہانیاں بھی بہت دلچسپ تحریر کی ہیں اور عام زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات عمدگی سے بیان کیے

ہیں۔ کتاب کا ایک اور باب واقعات کے عنوان سے ہے جس میں دیسی کہانیاں ہیں اور یہ کہانیاں جرائم پیشگی ہیں جن میں مختلف جرائم کے حوالے سے مقدمات اور سماعتوں کی کارگزاری بیان کی گئی ہے۔ مختلف النوع کی یہ کہانیاں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ پیرزادہ جنت قاضی کو عوامی انداز کی عام فہم اور دلچسپ کہانیاں لکھنے کا ہنر آتا ہے اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب ہیں۔ البتہ ان کہانیوں کا ادبی مقام متعین کرنا شاید ممکن نہ ہو لیکن مطالعاتی سطح پر یہ عام قاری کو متاثر کرتی ہیں۔

کتاب کے آخری صفحات منظوم تخلیقات کے لیے مختص کیے گئے ہیں جن میں زیادہ تر نثری نظمیں ہیں۔ یہ نظمیں زندگی کے مختلف شعبوں کی ترجمانی کرتی ہیں۔ تقریباً ہر موضوع پر کوئی نہ کوئی نظم لکھی گئی ہے۔ کہانیوں کی طرح ان نظموں کا انداز بیان بھی انتہائی سادہ اور عام فہم ہے اور ان میں تخلیقی تہہ داری کا عنصر ذرا کم ہے۔ مگر یہ نظمیں قابل مطالعہ ہیں اور ''تجربے'' کا مطالعہ کرنے والوں کو پسند آئیں گی۔ مجموعی طور پر یہ پیرزادہ جنت قاضی کی ایک عمدہ کوشش ہے۔ انہوں نے اپنی کہانیوں اور نظموں میں بہت سے مثبت پیغامات دیے ہیں جو عوام کی اصلاح کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

ریگ ماہی

مصنف : دردانہ نوشین خان　　صفحات : 244　　قیمت : -/300 روپے

پبلشر : القمر علی پبلشرز، رانا چیمبرز، لیک روڈ، لاہور　　مبصر: نسیم جاوید

دردانہ نوشین خان تحریری دنیا میں نووارد نہیں ہیں۔ ان کے افسانوں کے دو مجموعے ''پہلا زینہ'' اور ''ریت میں ناؤ'' آ چکے ہیں اور یہ دونوں ادبی حیثیت تسلیم کروا چکے ہیں۔ پھر ان کا ناول ''امر جال'' اور نثری نظموں کا مجموعہ ''پھولوں کی رفو گری'' ذوق اور شوق کے ایک عالم کے لئے حیرت کدہ ثابت ہوتا ہے۔ ان کا یہ کتابی سلسلہ 2002ء سے شروع ہوتا ہے اس سے پہلے تعلیم کے دوران آپ مختلف رسائل کے لئے لکھتی رہیں اور آپ نے اپنے افسانوں پر تین کے قریب ایوارڈ حاصل کئے۔ مجھے یاد ہے کہ ان افسانوں میں ایک ''زندہ دفن کی گئی'' بہت مشہور ہوا تھا۔ یہ افسانہ ''دوشیزہ'' میں شامل ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کے کئی افسانے انہیں شہرت کی بلندیاں عطا کرتے چلے گئے۔ اب ان کا افسانوں کا نیا مجموعہ ''ریگ ماہی'' آیا ہے۔ جس میں زندگی کے بہت سے ان دیکھے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ دردانہ نوشین خان کی تحریر میں الفاظ کا بہت خوبصورت بہاؤ ہے۔ آپ بڑی روانی سے انسانی زندگی اور اس کے مسائل کو الفاظ سے تخلیق ہیں، پھر آخری ایک یا دو لائنوں کو ٹیپ کا بند بنا دیتی ہیں۔ وہ جب اپنے افسانے ''محبت غیر ضروری ہے'' کو ان لائنوں پر ختم کرتی ہیں کہ ''کو ناقابلِ یقین انکار پا جانے کی گھڑیوں میں کبھی کبھی بی بی اور مائی کی نظروں میں کلام کا سمندر بہہ جاتا'' ...... تو پورے افسانے کا حاصل سمٹ آتا ہے۔ دردانہ نوشین خان کے افسانے بولتے ہیں۔ زندگی کے اس پہلو کو سمیٹتے ہیں جہاں دکھ کا چھپا ہوا بھی باہر آ جاتا ہے۔ ریگ ماہی ریت میں رہنے والی اس مچھلی کو کہتے ہیں جو اپنے پیچھے ریت میں قیمتی معدنیات کی نشاندہی کرتی ہے۔ دردانہ نوشین خان کے افسانے بھی زندگی کے ریتیلے سمندر میں سے انمول خزانے تلاش کر کے لاتے اور عبرت انگیز پیغام دے جاتے ہیں۔

◆◆◆

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ عزیز محترم سلطان اظہر جاوید صاحب! دعائیں۔

تازہ تخلیق دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ آپ سرورق ایسا عمدہ اور واضح انداز کا چھاپتے ہیں کہ اس سے صاف پتا چل جاتا ہے کہ جب سرورق ایسا ہے تو صد فی صد اندر اس سے بھی بڑھ کر عمدہ مضامین ہوں گے۔ شاباش، پھر شاباش اور شاباش ہی شاباش۔ اور یہ سرورق والی لڑکی قیامت کون سی ہے جو وقت سے پہلے آ گئی ہے۔ اسی پر الگ انداز کی شاباش دینی چاہیے۔ اور مضامین پڑھوں گا تو ان کے لئے ایک انداز کی پھر داد ہوگی۔ تو گویا آپ داد ہی داد نہیں بلکہ داد کے بھی داد ہی نہیں پر داد ہیں۔ آپ کا ایک بزرگ مشکور جب چاہا زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں پر جیتے رہو شاد رہو اور عزت کما کر آباد رہو۔ آمین!

سیّد مشکور حسین یاد (لاہور)

﴿2﴾ محترم المقام سلطان اظہر جاوید صاحب تخلیق

السلام علیکم۔ تخلیق کی شعری اور نثری کیفیت دیکھی۔ بہت اعلیٰ ورق کے سامان وہی ہیں جو تخلیق سے خاص ہیں۔ اظہر جاوید مرحوم نے رسالے کی جو روایات رواج دی تھیں آپ ماشاء اللہ انہی پر کاربند ہیں۔ آپ اپنے والد محترم کے احباب کے قدرشناس ہیں۔ تخلیق ہی تخلیق کے متنوع پہلو نمایاں ہیں۔ یہاں مطالعہ کی ہر خوشبو موجود ہے۔ فن و ادب میں محترمہ عذرا اصغر کی قدر افزائی مستحسن ہے۔ انھوں نے افسانہ نگاری میں نام پیدا کیا ہے۔ ان کے افسانے بہت پسند کیے جاتے ہیں۔ ان کی "تخلیق" کے لیے بھی لائق تحسین خدمات رہی ہیں۔ وہ اس سے بھی زیادہ اعزاز کی مستحق ہیں۔ تخلیق ہی سے کشمیری لال ذاکر کی وفات کی خبر ملی۔ کشمیری لال ذاکر اپنی نوعیت کے واحد صاحب قلم تھے۔ اردو سے ان کی محبت لازوال ہے اس کے اثرات قائم و دائم ہیں۔ آپ نے میری غزل اور خط کو اہمیت دی ہے آپ کا شکرگزار ہوں۔ انجمن خیال میں احترام باہم کے قرینے خوب ہیں۔ اس وقت میں رسالے کی روایت تابندہ ہے اس کی تابندگی آنکھوں سے دل تک جا پہنچتی ہے۔ مضمون رونق بزم یاراں مضامین میں خاصا بزم آرا ہے۔ فیض احمد فیض بڑے شاعر ہیں ان کا بڑا مقام ہے ان پر جو بات ہو وہ دل نشین ہوتی ہے۔

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

﴿3﴾ سلطان اظہر!

اللہ رب العزت نے آپ کو جہاں کمال تحریروں سے نوازا ہے وہاں آپ کا حسن اخلاق لائق ہے آپ کی تخلیق کے لئے مسلسل

محنت' تخلیقات قاروں سے رابطہ کر کے انہیں آپ جو عزت دیتے ہیں یہ آپ کی شخصیت کا خاصہ ہے۔ اسی لئے "تخلیق" زندہ ہے اور اسے قاری کی سند حاصل ہے سند اور اعزاز صرف قاری ہے۔ سوان اظہر صرف قاری۔۔۔ اس سے بڑا اور اعزاز ممکن ہی نہیں۔ اعزاز کے لئے پاگل ہونے والوں کو یہ خبر ہی کہاں ہے یا اک گمان کہ اگر قاری نے انہیں سند دے دی تو ان کی تخلیق اپنا منصب اپنا مرتبہ اپنا اعزاز پا گئی۔ میں "تخلیق" دل چسپی اور شوق سے پڑھتا ہوں پھر آپ نے ایک منظم ترتیب بنا رکھی ہے کہ تخلیق کا زر سالانہ ختم ہونے کو آئے تو آپ کے ادارے کی طرف سے فون کال آتی ہے کہ کیا آپ نے یہ سلسلہ جاری رکھنا ہے۔ آپ کا ادارہ اس بات کا بھی خیال رکھتا ہے کہ رسالہ پوسٹ کر دینے کے بعد میسج پہ مطلع کرتا ہے۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ رسالے کے انتظامات محفوظ ہاتھوں میں ہیں دعا ہے تخلیق نصف صدی کا پرچہ جلد بن جائے۔

حامد سراج (میانوالی)

﴿1﴾ مائی ڈیئر سوان اظہر جاوید!

دسمبر 2016ء کا شمارہ موصول ہوا اس ضمن میں جو آپ نے زحمت فرمائی اور محبت سے کام لیا اس کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ گذشتہ دنوں اسلام آباد میں چوتھی عالمی کانفرنس میں شرکت کر کے گھر واپس آیا تو آپ کا مرسلہ تخلیق کا مجلہ ملا اور اس کو دیکھتے ہی سفر کا تھکان جاتا رہا۔ سرورق کے حسن نے بھی متاثر کیا اور پرچے کے مندرجات نے اپنی توجہ مبذول کرائی اور صفحہ اول سے صفحہ آخر تک پہلے گویا ورق گردانی کی اور پھر کچھ تحریروں نے خصوصی دعوت مطالعہ دی۔ سو عنوان "تخلیق" میں شامل نگارشات سے استفادہ کرتا رہا۔ ایک بات میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ "تخلیق" رسائل کی فہرست میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔ مرحوم دوست اظہر جاوید نے اس جریدہ کو ایک وقیع تر ادبی حوالہ بنایا تھا اور اس کی اپنی انفرادیت متشکل کی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد آپ کی ادارت میں یہ جریدہ میری رائے میں خوب سے خوب تر کے مراحل طے کر رہا ہے اور انشاء اللہ اس کا گولڈن جوبلی نمبر شائع ہوگا اور وہ ایک یادگار شمارہ ہوگا۔ لاہور کے جریدے نقوش، فنون اور اوراق کے قبیلے کا یہ جریدہ ہے اور خود اس کی ایک تاریخ ہے اور کثیر الجہات اوصاف کا حامل ہونے کے باعث مختلف مسلک اور نظریے کے ادبی حلقوں میں یکساں مقبول ہے۔ آپ کی کاوش و کوشش قابل صد ستائش ہے۔

پیش نظر شمارہ "تخلیق" کی روایات اور معیارات کا حامل ہے اور قاری کے لئے نثر و نظم ہر دو شعبے یکساں اہمیت اور معنویت رکھتے ہیں۔ مضامین کے شعبے میں ڈاکٹر انور سدید کا مضمون "شہزاد ایک شاعر" پڑھ کر دوہرے صدمات سے دوچار ہونا پڑا۔ ڈاکٹر انور سدید نے اپنے ہم عصر ادیب و شاعر کا حسب خلوص فکر و نظر سے اپنے مضمون میں بیان کیا ہے وہ ان کی روایتی علمیت اور فکری جامعیت سے بھرپور ہے۔ اب خود ڈاکٹر انور سدید ہمارے درمیان نہیں رہے اور وہ بھی شہزاد احمد کے ساتھ عالم بالا میں ہم کلام ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کے حوالے سے "تخلیق" کا انور سدید نمبر قابل تقلید ہے اور مرحوم کو خراج تحسین پیش کرنے کا حق ادا کیا گیا ہے۔ اب جبکہ وہ نہیں رہے تو ان کی تحریریں چھپتی رہنی چاہئیں۔ آپ نے زیر نظر شمارہ میں ان کا وقیع مضمون شامل کر کے بہت اچھا سواد اہم کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کی تخلیق سے اپنی وابستگی رہی تھی کہ وہ اس کا جزو لاینفک نظر آتے تھے۔ مضامین کا شعبہ مجموعی طور پر قابل تحسین بھی ہے اور بے حد وقیع بھی۔ افسانے کے شعبہ میں

اس بار ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ شامل نہیں ہے اس کی کمی میں نے محسوس کی۔ بہر حال ان کا مضمون "عاشقی صبر طلب" ان کی موجودگی کا بھرپور تاثر دلاتا ہے۔ یہ سلسلہ خود نوشت کے شعبہ میں اضافی کی حیثیت رکھتا ہے جس میں آپ بیتی کی جھلک بھی نظر آتی ہے اور جگ بیتی کا منظر نامہ بھی پیش کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے تنقیدی شعور اور بصیرت کی جلوہ گری خوب ہے۔ "طنز و مزاح" کے شعبہ میں ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کی تحریر تمام تر معیارات کا حامل ہے۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کو میں جناب مشتاق یوسفی کے قبیلے کا رکن رکین سمجھتا ہوں۔ "تخلیق" کے خوب سے خوب تر کے سفر کے لیے دعا گو ہوں اور اس کے گولڈن جوبلی نمبر کا مجھے یقین کے ساتھ شائع ہونے کا انتظار رہے گا۔

مسلم شمیم (کراچی)

﴿5﴾ ڈیئر سونان صاحب!

(آپ ایک بہادر انسان اظہر جاوید کے بیٹے ہیں یہ خط ضرور شائع کریں)

تخلیق ایوارڈ کے حوالے سے بتاتا چلوں کہ ادب کوئی گھڑ دوڑ کا میدان نہیں کہ کون سا ادیب اول ہے اور کون سا دوم۔ روس کے ڈاکٹر گریگوری پیرلمن نے فیلڈز کا 2006 میڈل لینے سے انکار کر دیا۔ جس کے ساتھ دس ملین ڈالرز کا کیش بھی تھا۔ اس نے کہا "ایک سچے ادیب کو کسی حکومت سے انعام نہیں لینا چاہیے۔ ادیب کو عوام کے ساتھ رہنا چاہیے۔"

الفرڈ نوبیل نے پہلا نوبل ایوارڈ اپنی محبوبہ خاتون Bertha Von Sutter کو دیا جو کہ آسٹریلیا کی غریب Countess تھی۔ عمر میں بھی دس برس چھوٹی تھی۔ اسی طرح اعلیٰ ترین افسروں اور جرنیلوں نے جان کا نذرانہ پیش کیا۔ مگر انعام ملالہ یوسف زئی کو دیا گیا۔ کوفی عنان کے دور میں روانڈا اور ایشیا میں قتل عام ہوا خونوں کی ندیاں بہہ گئیں۔ مگر اسے امن کا نوبل ایوارڈ دیا گیا۔ نوبل نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو قتل کرنے کا نسخہ ایجاد کیا تھا۔ وہی امن کا انعام بانٹنے لگا۔ کوفی عنان نے افغانستان میں امریکی حملے کو جائز قرار دیتے ہوئے افغانستان میں غارت گری کی اجازت دی تھی۔ بڑے بڑے عظیم تخلیق کار ہوتے ہوئے بھی چرچل کو ادب کا نوبل ایوارڈ دیا گیا۔ ٹالسٹائی محروم رہا۔ ٹالسٹائی کی بجائے یہ انعام ایک کم معروف فرانسیسی ادیب کو دیا گیا۔ ہنری کسنجر ویت نام جنگ میں ملوث تھا۔ مگر اسے امن کا نوبل ایوارڈ دیا گیا۔ 1973ء میں ہنری کسنجر کے ساتھ امن کا نوبل ایوارڈ پانے والے لی ڈک تھو نے یہ انعام لینے سے انکار کر دیا۔ ژاں پال سارتر نے بھی انعام لینے سے انکار کر دیا۔ 1994ء میں مشترکہ طور پر یاسر عرفات، شمعون پیریز اور آئزک رابن کو امن کا انعام دیا گیا۔ جبکہ اسرائیل کی جانب سے فلسطینیوں کا قتل جاری تھا۔ بہت سی اہم شخصیات کو انعام سے محروم کیا گیا۔ جن میں سگمنڈ فرائیڈ، لیو ٹالسٹائی، مارسل پراؤسٹ، گراہم گرین، انتون چیخوف، جیمز جوائس، جوزف کونراڈ، فرانز کافکا، برتولت بریخت، جارج لوئس بورجز کو نظر انداز کیا گیا۔ افتخار عارف کو ایک کتاب پر تمغہ امتیاز دیا گیا۔ اسی طرح نواز شریف کے ہاتھ سے انعام دلواتے ہوئے چیئرمین اکیڈمی آف لیٹرز جو خود وہیں بہ ساعت پاس تھے، نے نوجوان شاعروں کے لئے کہا کہ ان کا ہر شعر منتخب ہے۔ حالانکہ غالب و میر کا بھی ہر شعر منتخب نہیں ہے۔ حمید یادینی کا تعلق ایک بااثر سیاسی گھرانے سے ہے۔ ان پر انعامات اور تمغوں کی بارش ہوتی ہے۔ جبکہ شاہ محمد مری، مبارک قاضی، محمد حسین عنقا، میر کریم امن، جان محمد دشتی کو محروم رکھا گیا۔

تخلیق کا پہلا انعام معروف سینئر افسانہ نگار دیا گیا۔ جس کے آپ کے گھرانے سے قریبی تعلقات ہیں۔ اس انعام سے بلوچستان، سندھ، کے پی کے، فقات وغیرہ کے اردو ادیب محروم رہ جائیں گے۔ لہٰذا ادبی بورڈ میں دیگر صوبوں کے نمائندے شامل کیے جائیں۔ ورنہ تخلیق ایوارڈ بھی متنازعہ ہو جائے گا۔ عبدالعزیز خالد، زاہدہ حنا نے اس تحفے سے وابستہ بے ایمانی کے باعث تمغہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ جبکہ زاہدہ حنا نے ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن سے قرض بھی لے رکھا تھا اور قرض کی ادائیگی میں دشواری ہو رہی تھی۔

نوٹ: ادارہ آپ کی توجہ اس جانب مبذول کروا رہا ہے۔ یہ تخلیق کا پانچواں ایوارڈ ہے پہلا ایوارڈ نہیں۔ اس سے پہلے شفیع عقیل، ڈاکٹر انور سدید، یا توقیر میر، نیر جہاں اور اب عذرا اصغر کو دیا جا رہا ہے۔ اور ایوارڈ کسی ایک صنف میں نہیں تمام عمر کی ادبی خدمات کے عوض دیا جاتا ہے۔

آغا گل (کوئٹہ)

«6» عزیزی سونان میاں۔ جیتے رہو۔ خوش رہو!

"تخلیق" ملنے سے پہلے تم نے فون پر "ایوارڈ" کی خوشخبری سنائی۔ حیرت ہوئی کہ "انعام" اور مجھے؟ میں نے تو کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔ مگر خبر تمہاری زبانی تھی یقین تو کرنا ہی تھا مگر ہوا کچھ یوں بقول شاعر۔ "کی خوش تو ہوا مگر آنسو نکل پڑے۔" فیصلہ تو جیوری کا ہے مگر نام تو تم نے ہی دیے ہوں گے۔ چنانچہ شکریہ کا لفظ اس محبت و توجہ کے لئے بہت چھوٹا ہے مگر کیا کیا جائے جو یاد بھی تمہارا سنا لفظ کام آتا ہے۔ "تخلیق" ملا تو خوشی دوبالا ہوگئی تم نے اچھا خاصا "گوشہ" بنا دیا میرا۔ اس کی تھوڑی سی جھلک سلمیٰ اعوان نے میرے کان میں ڈالی تھی۔ انہوں نے کہا تھا "عذرا مجھے لگتا ہے سونان تمہارے لئے بہت کچھ کر رہا ہے۔" سلمیٰ جی کا بھی بہت شکریہ کہ انہوں نے میرے لئے اچھا سا مضمون لکھا اشبہ طراز کا بھی شکریہ کہ وقت نہ ہونے کے باوجود اس نے مضمون لکھا اور مجھے ہوا تک نہیں لگنے دی۔ اس لئے اچھا ہوا۔ اس کا مبارکباد کا فون بھی آیا ایوارڈ کے لئے۔ دوسرا فون طارق علی صاحب کا موصول ہوا۔ ان کا بھی شکریہ اب اگر "تخلیق" کے معیار کے بارے میں بات کروں گی تو خوشامد کے زمرے میں شمار ہونے کا اندیشہ ہے۔ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ تم نے "تخلیق" کا معیار بلند کیا ہے گرنے نہیں دیا۔ خدا تمہارا حوصلہ قائم رکھے صحت و زندگی کے ساتھ! اجازت دو۔ میں تمہاری بے حد شکر گزار رہوں۔ تخلیق کے جشن کا بھی شکریہ ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ!

عذرا اصغر (کراچی)

«7» سونان اظہر جاوید جی!

مجھے خوشی ہے کہ آپ میرے ہمدم دیرینہ دوست اور اپنے نامور والد مرحوم اظہر جاوید کی یاد کو "تخلیق" کی شکل میں زندہ رکھے ہوئے ہیں اور معیار میں بھی کمی نہیں آنے دی۔ "تخلیق" کی اشاعت کو 47 برس بیت گئے۔ میں نے "ساتھیاں" رسالے کا اجرا مارچ 1976ء میں کیا۔ ابتدا میں چند برس صرف پنجابی زبان میں شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد دو زبانوں (اردو۔ پنجابی) میں شائع ہو رہا ہے۔ جناب اظہر جاوید کا قلمی تعاون مجھے پہلے شمارے ہی سے حاصل ہو گیا تھا۔ متعدد ادبی شخصیات سے میرا تعارف اظہر جاوید صاحب نے کرایا چنانچہ وہ شخصیات جب بھی "ساتھیاں" کے حوالے سے مجھے کوئی چٹھی لکھتے تو اظہر جاوید صاحب کو سلام لکھا ہوتا۔ ستمبر 1976ء کے شمارے

میں سید ضمیر جعفری کی نظم بھی شائع ہوئی۔ آخری سطر ملاحظہ کریں۔ ''اظہر جاوید ہوراں نوں سلام آکھنا/ اوہ ساڈا اپنا اپنا ملک ہولایا راے جو اوہدی مرضی اوہ ساڈی مرضی۔''

محترمہ عذرا اصغر کو ''تخلیق ایوارڈ'' کا فیصلہ خوش آئند ہے۔ عذرا اصغر سے میرا تعارف اظہر جاوید صاحب نے ہی کرایا تھا۔ پھر ہم بہن بھائی کے مضبوط رشتے میں منسلک ہو گئے۔ عذرا اصغر کی پیدائش دہلی میں ہوئی۔ ان کی مادری زبان اردو ہے۔ اس کے باوصف مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ عذرا اصغر صاحبہ نے میری درخواست پر پنجابی میں کہانیاں لکھیں جو ''ساتھاں'' میں شائع ہو چکی ہیں۔ عذرا اصغر چند برس ''تخلیق'' کی معاون مدیرہ بھی رہیں۔ ''تخلیق'' کی ایک روایت پنجابی حصے کی رہی ہے جو ''پنجاب رنگ'' کے نام سے شائع ہوتا رہا ہے۔ پنجابی حصے کی وجہ سے ''تخلیق'' کا پنجابی ادب میں ایک مقام بنا تھا آپ نے ختم کر دیا ہے۔ دسمبر کے ''تخلیق'' میں آپ نے اظہر جاوید کی پنجابی کہانی کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے جسے حلیف اوانے اردو روپ دیا۔

آپ نے ''پہلی بات'' میں لکھا ''انہوں نے ادب کو بے توقیر اور سیاست دانوں نے ملک کو بے توقیر کیا'' آپ کے اس فقرے سے میں سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ عذرا اصغر کے ''تعارف نامہ'' میں تاریخ پیدائش 22 دسمبر لکھی ہوئی ہے۔ بہتر ہوتا سن بھی لکھ دیا جاتا۔ اسی شمارے میں عذرا اصغر کی صاحبزادی شہر طراز کا مضمون شائع ہوا ہے جس میں وہ لکھتی ہیں۔

''زندگی کے ماشاءاللہ ستر سال کے لگ بھگ سالوں کو دیکھتے ہوئے اگر میں بچی ہونے کے ناتے عذرا اصغر کے ماضی میں جھانکوں تو یہی سوال کرتی ہوں آخر ''ماں جاتی کیا تھیں؟'' اس فقرے میں ان کی عمر کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ویسے میں بھی ماشاءاللہ اس سال (2016ء) ستر برس کا ''بابا'' ہو گیا ہوں۔ میرے احباب نے میری 70ویں اور ''ساتھاں'' کی 40ویں سالگرہ ایک ساتھ منائی۔

تصوف اور صوفیانہ رنگ میں ادیب طارق بلوچ صحرائی کے افسانے ''تخلیق'' میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ گزشتہ شمارے میں ''خود گزیدہ'' اور دسمبر کے شمارے میں ''بھولا'' پڑھ کے سوچ کے کئی در وا ہوئے۔ ایک فقرہ ہے: ''ان نئے شہروں میں ''بھولے'' نہیں ہوتے سب زیرک اور ہوشیار ہوتے ہیں'' اللہ کرے نیا سال آپ کے لیے خوشیاں لائے!

تنویر ظہور (لاہور)

4/8 محترم عزیزم سوبان اظہر جاوید صاحب!

السلام علیکم: کہا جاتا ہے کہ بہتر وارث وہ ہوتا ہے جو اپنے اسلوب کی روشن روایات کو فروغ بخشے اور ان کی حسن آفرینی اور فکر افروزی پر کوئی حرف نہ آنے دے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اس معروف جریدے کی لاج رکھی ہے۔ جناب اظہر جاوید کی تخلیقی اور خداداد صلاحیتوں کے اظہاریوں میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ میں برسوں سے تخلیق کا شیدائی ہوں اور خدشہ تھا کہ مرحوم کے پردہ کرنے کے بعد کہیں تخلیق کی آب و تاب ماند نہ پڑ جائے لیکن شکر ہے جو پرچہ بھی منصہ شہود پر آتا ہے، وہ خوب تر ین کا معیار برقرار رکھتا ہے۔ میں معترضین کی بے پرکی اڑائی ہوئی بلکہ خواہ مخواہ کی بات ہوئی در غلطی کو رد کرتا ہوں کہ تخلیق کسی مخصوص ادبی گروپ سسٹم کو فروغ دے رہا ہے۔ میرے خیال میں آپ نے مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں غیر جانبداری پر آنچ نہیں آنے دی۔ عذرا اصغر پر سلمیٰ اعوان کی گفتگو معیاری تھی ـــــ لہٰذا اگر

عذرا اصغر کو تخلیق ایوارڈ 2016ء کو ہے تو حقدار بہ حق رسید والی بات ہے۔ محترمہ ان دل پھولا نہ کریں اور معیاری ادب کی تخلیق میں یکسر کارکن کا مظاہرہ کریں نہ کہ سیت کو لی کا ... امین راحت چغتائی کی نعت مزہ دے گئی ... ماشاء اللہ فنی پختگی میں بھی یہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر انور سدید (مرحوم) نے شبیر احمد کی یادیں تازہ کی ہیں۔ وہ ان توصیفی کلمات کے حقدار بھی تھے۔ آخری نعت پر جناب امین راحت چغتائی نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر میرے ذاتی تحفظات ہیں وہ روحانی شاعر ہیں اور منظر نگاری اور ترنم ریزی کی خوبیوں سے متصف۔ نعت گوئی ان کا ایسا وصف نہیں جسے بطور خاص سراہا جائے اور خواہ مخواہ ورکزِ یہ واقعت گو حضرات میں انہیں کوئی نہ کوئی نمبر ضرور دیا جائے۔ تحسین جاوید روتق پدم فیض احمد فیض ... لکھتے وقت ٹھوس حقائق اور وہ انکشاف کو انک ملحوظ خاطر رکھے ہیں۔ میرے خیال میں فیض پر یہ مقالہ نہایت معرکۃ آرا اور ہر لحاظ سے معلومات افزا ہے۔ اگر تحسین جاوید مزید محنت کریں تو یہ مبسوط کتاب فیض کے حوالے سے نہایت مستند گردانی جائے گی۔ ڈاکٹر جواز جعفری کا خدا بھلا کرے، وہ کلاسیکی موسیقی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر جواہر آب دار (نکات) میں کامیاب ٹھہرے ہیں

غزلوں اور نظموں کا حصہ نہایت وقیع ہے۔ شروع میں نعت اور حمد کے مضامین ولولہ انگیز ہیں اور ان کی شروعات کا سہرا آپ کے سر ہے کہ اظہر جاوید مرحوم اس سمت بوجوہ پیش رفت نہ کر سکے تھے۔ آپ کے پرچے میں محترم غلام یحییٰ اعوان کی غیر حاضری کھٹکتی ہے۔ وہ قدرے علیل ہیں۔ لیکن ان کا دم ہر اعتبار سے غنیمت ہے۔ خدا کرے وہ صحت مند ہوں۔

سیّد ریاض حسین زیدی (ساہی وال)

محترمی سونان اظہر جاوید صاحب۔

السلام علیکم۔ "تخلیق" کی آمد آمد بہار سے کم خوش کن اور مسرت آگیں نہیں ہوتی۔ اس بار مگر میری مسرت و شادمانی دوچند ہو گئی۔ سرورق پر گلاب چہرہ حسینہ کے سر پر گلہائے رنگا رنگ کا تاج سجا تھا۔ وہ تتلی خاصی باذوق تھی جو گلبدن کے معطر شانے پر جا بیٹھی۔ پھول اسے سچ معلوم ہوئے! مصور کو داد دیتا ہوں۔

"اپنی بات" میں گروہ بندی سے اظہار بے زاری کر کے آپ نے گویا میرے دل کی بات کہہ دی۔ زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے۔ جب زمانہ تغیر و تبدل کی زد پر ہوتا ہے تو سماجی اقدار بھی بدلنے لگتی ہیں۔ گلوبل ویلج میں تو یہ عمل بہت تیزی سے ہو رہا ہے۔ ایسے میں ادیبوں کا کام تو یہ ہے کہ مثبت اقدار کی طرف معاشرے کے افراد کی رہنمائی کریں مگر وہ خود منفی رویوں اور منفی قدروں پر عمل پیرا ہیں ... ماتم کیا جائے!

اس بار شاعری، مضامین اور افسانے خوب سے خوب تر ہیں۔ افسانوں میں بطور خاص عطیہ سید، عذرا اصغر، شمع خالد، طارق بلوچ صحرائی، وردہ نوشین خان اور اظہر جاوید کے افسانے پسند آئے۔ شمع خالد کا افسانہ دل گداز اور تاثر انگیز ہے مگر موضوع پٹا ہوا ہے۔ کتابوں سے وابستہ دکھ، ان کی ناقدری، کتابیں بچھڑنے پر لاوارثوں میں بانٹ دینا ... یہ ہر دوسرے ادیب کی ذات سے وابستہ دکھ ہیں جنہیں متعدد مصنفین نے اپنی کہانیوں اور افسانوں میں برتا ہے۔ عطیہ سید کا افسانہ "اور وہ پورا ہو گیا" سب سے زیادہ دل کو بھایا مگر کاش انہوں نے لکھنے کے بعد اس کی کڑی ایڈیٹنگ کی ہوتی۔ افسانے کی ابتدا میں انہوں نے لکھا ہے کہ جب وہ (مرکزی کردار) ہسپتال سے فارغ ہوا تو اس کی جیب میں آٹھ آنے اور آشرت کا ٹکٹ تھا ... مگر آگے کے متن میں انہوں نے یہ جملہ رقم کیا ہے۔ "اس نے جیب میں پچاس

روپے ہونے کے باوجود "کمالیا" پچاس پیسے (آٹھ آنے) اتنے قلیل وقت میں پچاس روپے میں کیسے بدل گئے؟ یہ راز مصنف کو معلوم ہوگا یا انہیں جو لندن میں آف شور کمپنیاں بناتے اور پراپرٹی کا کاروبار کرتے ہیں۔۔۔۔!

خاقان ساجد (راولپنڈی)

﴾10﴿ مکرمی سلطان اظہر جاوید!

آپ کو اور "تخلیق" کو نیا سال بہت بہت مبارک! سن 2016ء کا "آخری تخلیق" اپنی بصری و معنوی رعنائیوں کے ساتھ ملا حسب دستور اس بار بھی مدیران کا وژن کا مظہر۔ ایس خالد کا بنایا ہوا سرورق بے حد جاذب نظر ہے۔ مندرجات میں مجموعی طور پر زندگی کی اچھی مرقع نگاری ملتی ہے اور اداریے میں تو آپ نے کھلے ڈلے انداز میں اپنے دل کی باتیں ظاہر کیں۔ یہ ایسی باتیں جن کا کم و بیش آج کے ہر ادبی پرچے کے مدیر کو سامنا ہے۔ تمام روزنامے ہوں یا ہفتہ وار رسائل و جرائد ہوں ان میں کوئی نہ کوئی "مافیا" سرگرم نظر آتا ہے۔ اگر کوئی شاعر ہے تو صاحب نظر نہیں نثر نگار ہے تو اس کے مشاہدے و بصیرت والی آنکھیں بند ہوتی ہیں اور بہت سے قلم بدست حضرات ایسے ہیں جو پھولی ہوئی ناک کے [illegible] نظر آتے ہیں ان کے اپنے اپنے گروپس ہیں جن میں ہر کوئی "حاجی اور قاضی" ہے جو اپنے گروپ سے باہر والے "ہر کجھ" یا کم معروف [illegible] کے ویری ہیں۔ جیسے [illegible] میں وہ چھپا نظر آتا ہے [illegible] ہیں۔ ایسے میں اداریے میں درج آپ کا یہ سوال کہ "ہم کب تک گروپ بندیوں میں بٹے رہیں گے اور اس کا حاصل کیا ہے؟" اپنی جگہ بامعنی ہے اور برموقع بھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ کس طرف سے کیا جواب آتا ہے اگر جواب نہ آئے تو خاموشی بھی بہت "لاجواب اور پُرمعنی ہوگی۔" زیر تبصرہ پرچے میں عذرا اصغر صاحبہ کا چھوٹا لیکن عمدہ گوشہ خوب تھا ان کی ذات اور فن کو خوبصورتی سے محیط کئے ہوئے اور اسی کے ساتھ ان کے لئے "تخلیق ایوارڈ" کا اعلان برموقع ہے اور ان کی خوبصورت پذیرائی بھی۔ مرحوم اظہر جاوید کے دور میں عذرا اصغر صاحبہ "تخلیق" سے بطور مدیرہ کافی عرصہ منسلک رہیں اور اس کی آبیاری میں انھوں نے اپنا حصہ ڈالا اور عمدگی سے ڈالا۔ حصہ مضامین میں "اختر کی نعت"۔۔۔ ایک مطالعہ" (امین راحت چغتائی) پڑھ کر لطف آیا۔ مرحوم نہ صرف میرے پڑوسی تھے بلکہ وہ ہفت روزہ "ہلال" کے مدیر اکرام قمر مرحوم کے بڑے بھائی تھے۔ احقر ان دنوں اسی پرچے میں بطور نیوز ایڈیٹر کام کرتا تھا۔ اختر صاحب وہاں بھی کبھار آتے تو ان سے سلام دعا کی سعادت حاصل ہوجاتی تھی۔ دوسرا مضمون "کل صابری" (ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم) مختصر لیکن جامع ہے۔ افسانوں میں نیلم احمد کا "منتخب کردہ ہے جہاں" اپنے عجیب سے انجام کے ساتھ متاثر کن ہے۔ "بدلتا ہے رنگ" (عذرا اصغر) اور "بے مہاری سے بے چارگی تک" (دردانہ نوشین خان) مختلف موضوعات والی اچھی خوبصورت تحریریں ہیں۔ خاکسار کے افسانے کو پسند کرنے پر مرزا احمد رضا کا بہت شکریہ!

محمد طارق علی (راول پنڈی)

﴾11﴿ محترم سلطان اظہر!

ایک روز پہلے [illegible] کے ساتھ "تخلیق" برائے دسمبر موصول ہوا ممنون ہوں۔ "پہلی بات" کی سطور گواہ ہیں کہ آپ بھی ایسے ہی مسائل سے دوچار ہیں جن سے اکثر ادبی رسائل کے مدیر ہوتے ہیں۔ مدیر وہ شخص ہوتا ہے جس کے پاس ہر رنگ تخلیقات پہنچتی ہیں اور ان

کی اشاعت کے لیے مدیر کس مرحلے سے گزرتا ہے، وہی جانتا ہے۔ ادبی گروہ بندی ادب کے لیے کبھی نیک شگون نہیں رہی۔ ''تخلیق ایوارڈ 2016ء'' محترمہ عذرا اصغر کو دیا جانے کا خوش کن خبر ہے۔ ابدال بیلا، محمد غلام نبی اعوان اور ظفر اقبال کے لیے دعائے صحت اور مرحومین کے لیے دعائے مغفرت۔

خالد اقبال یاسر کی حمد، فدائے عمر بیدل، امین راحت چغتائی اور عشق سروقی کی نعتیں رسالے کا بہترین آغاز ہیں۔ ''تعارف نامہ'' میں محترمہ عذرا اصغر کے قلمی سفر کا اندازہ ہوا۔ ''فن و ادب'' کے عنوان سے علی اعوان اور شہر طراز کے مضامین بھی محترمہ عذرا اصغر کے فن اور شخصیت کے حوالے سے ہیں۔ ''اختر کی نعت ایک مطالعہ'' امین راحت چغتائی نے اختر ہوشیارپوری پر مضمون لکھ کر اپنی عقیدتوں کا اظہار کرتے ہوئے مرحوم کے فن نعت پر سیر حاصل گفتگو کی ہے، جس کی دلچسپی آغاز تا اختتام قائم رہتی ہے۔ افسانوں میں ''عنم کدہ ہے جہاں'' ''بدلتا ہے رنگ'' ''بے مہاری سے بے چارگی تک'' ''میں ادبی منافقت کا قائل نہیں ہوں'' ''میر سے یاری'' یا اچھے افسانے ہیں۔ غزلیں اور نظمیں متوجہ کرتی ہیں۔

احسان بن مجید (اٹک)

(12) محترم مہمان اظہر جاوید!

رب کریم آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، عزت و عظمت عطا فرمائے! آپ کے پیارے ابو کے ساتھ گزرے خوبصورت لمحات زندگی کا اثاثہ ہیں۔ آج کل لوگ اقدار کو ثانوی حیثیت میں لے آئے ہیں اور مالی مفادات اولین ترجیح بنتی جا رہی ہے۔ اس وقت خوشی کی کوئی حد نہیں رہتی جب ''تخلیق'' ہاتھوں اور نگاہوں کی زینت بنتا ہے۔ آپ نے بھی اپنے بابا کی طرح ''تخلیق'' کو اپنا کر ایک مشکل راہ کا انتخاب کیا ہے۔ خالق و رازق کائنات آپ کو زندگی کے ہر شعبہ میں شاندار کامیابیاں عطا فرمائے! یہ بات انتہائی باعث فخر ہے کہ برادرم اظہر جاوید کی غیر موجودگی میں بھی آپ نے اپنی مسابقتی جہد سے ''تخلیق'' کا معیار کسی بھی طرح نیچے نہیں آنے دیا۔

''پہلی بات'' سے لے کر ''اگر میں خیال'' تک تمام عنوانات کے ذیل میں شامل تحریریں انتہائی خوبصورت اور موثر ہیں جو قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کی صلاحیت کی حامل ہیں مجھے کہیں بھی جھول نظر نہیں آیا۔ کہیں بھی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ محترم یاور حیات اور جناب اسلم کولسری کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے خاندان کے افراد کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ہم ان کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ کشمیری لال ذاکر کی روح کو شادمانی اور سکون عطا ہو۔ حمد، نظم اور غزل ہر دو بہت جاندار ہیں۔ شہزاد نیر کی ''آئے چشم و ردا تنہا'' اور توقیر مشتاق کی نظم ''شام ہوئی'' بہت دلکش ہیں۔ محترمہ عذرا اصغر ''تخلیق ایوارڈ 2016ء'' کی بجا طور پر حقدار ہیں۔ انہیں دلی مبارکباد۔ جلیل عالی کی غزل کا ہر شعر دل میں اتر جانے والا ہے۔ خصوصاً یہ اشعار

سر میں سفر کا سودا ہو تو   دیواریں رستہ ہو جائیں
کہیں تو ایک اشک ندامت   چھلکیں تو صحرا ہو جائیں

آصف ثاقب کا شعر:

خون پانی سے وہ پردوں میں ہرا رنگ بھریں   شاخساروں سے گھر تیر بنا لیتے ہیں

سید ریاض حسین زیدی:

منصفی نے مصلحت کی راہ لی — کاغذی ہر عدل کی زنجیر ہے

رشیدہ عیاں:

چشمِ مشتاق سے یاقوت کے موتی برسے — ماسوا تیرے نہ کچھ اور نظر آئے گا

مرزا احمد نور طاہر:

عشق جب حدِ تحیر سے گزر جاتا ہے — ایسی منزل پہ ریاضت بھی ہے رسوائی بھی

آشا ناتھ کنول:

ہو ہی جائیں گے اندھیرے کافور — طاقِ الفت پہ دیا رکھے تو

امر مشتی:

دل کہیں، جان کہیں، جسم کہیں، روح کہیں — ٹوٹ کے بکھری ہوئی ذات سے ڈر لگتا ہے

افسانے بہت خوبصورت ہیں۔ شیخ خالد کے "روئی" نے بہت متاثر کیا۔ بقول شیخ خالد "میرے بعد یہ کتابیں بھی گل سڑ کر زمین میں لیٹ جائیں گے تو پھر آخر ہم لکھتے کیوں ہیں؟ یہ زندگی جو ہمیں بھی آہستہ آہستہ خستگی کا شکار کر کے روئی کر رہی ہے ہم بھی بغیر محسوس کئے دھیرے دھیرے روئی کے گٹھڑے میں تحلیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔" طارق بلوچ صحرائی کے افسانے "بھولا" میں بہت سے جملے ایسے ہیں جنہیں بطور حوالہ پیش کرنے کو جی چاہتا ہے مثلاً "جس گھر، جس گاؤں میں کوئی "بھولا" نہ ہو وہاں رحمت نہیں آتی۔ پھر ایسے گھر اور گاؤں شہر بن جاتے ہیں۔ شہر پلازوں کے قبرستان کو کہتے ہیں۔ جب ہری بھری فصلوں کی جگہ دکانیں اور پلازے بن جائیں تو وہاں سے خواب اور پرندے ہجرت کر جاتے ہیں" "ماں نے صحیح کہا" "میں نے رب کا رزق ہر جگہ دیکھا ہے سوائے گوداموں کے۔ فطرت کے ساتھ رہا کرو، فطرت کا کام ہی نوازنا ہے۔ رب کی رحمتوں کو ماپنے کی کوشش نہ کیا کرو وہ ہمارے اندازے ہماری سوچ سے بہت آگے اور لامحدود ہے" "تخلیق" میں شامل افکار و نگارشات پہ کہنے کے لیے بہت کچھ ہے لیکن خوف طوالت ذہن پہ مسلط ہے۔ بہر حال یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ اگر موجودہ شمارے میں صرف مستنصر حسین تارڑ کا مضمون "یادِ رحیات ہم تجھے کس پھول کا کفن دیں" اپنے دامن میں لئے ہوتا تو بھی میرے ذوق کی تسکین کے لئے کافی ہوتا۔ تشنگی کا احساس قطعاً نہ ہوتا۔ مستنصر حسین تارڑ ہم بھی اس دکھ میں آپ کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ جب اخلاقی اقدار مر ہی جاتی ہیں تو صرف لیلیٰ و مجنوں کے اصطبل میں ہی نہیں ہر ادارے میں ایسے ہی واقعی گدھے اور خچر بندھے نظر آتے ہیں شاید یہ جس سے بڑا کوئی گناہ نہیں۔ ایک نظم اور ایک غزل ارسال ہیں۔ معیار پر پورے اتریں تو شامل اشاعت کر لیں۔

ملک اشرف ذکی (چکوال)

﴿1﴾ آداب!

تم نے تخلیق کو دوبارہ تخلیق کیا مبارک ہو سلمان اظہر جاوید کا ہونہار بیٹا اللہ ترقی اور خوشیاں دے آمین! سلامت رہو! عطیہ سید کا افسانہ "اور وہ پورا ہو گیا" دیپک کنول کی "محبوب کی آزادی" طارق بلوچ صحرائی کی کہانی "بھولا" سب اچھی اور دل کو چھو لینے والی کہانیاں

ہیں۔ حنیف باوا کی انتقادی گرد ہٹے ہوئے میرے یار کی یاد' کمال لکھا حق ادا کر دیا اظہر جاوید سے دوستی کا۔ وحشی سعید صاحب "کیا ادون مرے گا" آپ کوشش جاری رکھیں کسی دن مر جائے گا مجھے آپ کی تحریروں سے محسوس ہو رہا ہے۔ کسی اجنتا کے غاروں میں ایک شخص جو دیومالائی تصور میں کھویا ہے اجنتا' دیومالائی دیوداسی اور مورت جو بے حد خوبصورت ہے۔ دونوں کہانیاں کہیں آپ کی تخلیق تو نہیں۔ میاں یا تھ بلا رکھو ورنہ تصورات کی دنیا ہی کی غلام بے کھو جاؤ گے۔ تیمر بہت بہت مبارک ادبی یادرے۔ نارنگ ساقی صاحب نے کشمیری لال ذاکر کا بتایا بہت دل اداس ہوا، ہم سب نے جانا ہے لیکن خلا پورا نہ ہوگا۔ آپ سب سے ملنے کو بہت دل کرتا ہے۔ اظہر جاوید کے جانے کے بعد سب بچھڑ گئے۔ تیمر ہمارا سومان ہے ہم کو اکٹھا کرنے کے لیے بہرحال کوششیں کرتا رہتا ہے ہم سب کو تخلیق کا میرے کرشن کنہیا اظہر جاوید کا شکریہ ادا کرنا چاہیے جنہوں نے ہمیں ایک مالا میں پرو دیا اور ہم سب کو جوڑ گئے۔ اور سومان ان کے نقش قدم پر چل رہا ہے ہر ایک کو یاد رکھے ہوئے ہے۔ دعا ہے یہ محفلیں یونہی سدا رہیں ختم نہ ہوں سب آباد رہیں۔ ڈھیروں دعائیں۔ تمہاری آنٹی!

زریں پنا (لاہور)

﴿14﴾ محترمی سومان اظہر جاوید!

السلام علیکم۔ تخلیق دسمبر 2016ء پر تبصرہ پیش خدمت ہے۔ عذرا اصغر صاحبہ کو تخلیق ایوارڈ کی مبارک باد! سلمیٰ اعوان اور شبہ طراز نے عذرا اصغر کے فن و ادب پر اچھے مضامین لکھے۔ شبہ طراز اپنے مضمون میں برمحل تذکرہ لکھتی ہیں "میرے خیال میں انسانوں سے وعدہ لینے والا رب داتے ہاتھ میں تحریروں کا پلندہ دیکھے گا تو سب سے زیادہ خوش ادیب طبقوں سے ہوگا (شکر ہے کہ انہوں نے شاعر ہرگز نہیں لکھا ورنہ جنت اور کراوڈ ہو جاتی) اور اگر ادیب کا اعمال نامہ اور زندگی گزارنے کا ڈھب درست نہیں ہوگا تو شاید جنت کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔" میں بھی چونکہ ایک چھوٹی موٹی ادیب ہوں لہٰذا اب کشادگی کا حق رکھتی ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ادب برائے مقصدیت ہوا مقصد بھی ارفع، منفعلا اور اخلاقی ہو؟ بصورت دیگر داتے ہاتھ میں محض تحریروں کا پلندہ ہو تو کافی نہیں ہے۔ ادیب بیچارا دو طلا ہوتے ہو تحسین کا بھوکا ہوتا ہے اچھا اور سچا کام کرنے پر بھی نظر انداز اسے دکھی نہ کرے؟ انسان ہے فرشتہ تو نہیں۔ تخلیق کے افسانوں کو پڑھا۔ نسیم احمد کا تحریر کردہ افسانہ "منظم کندہ ہے جہاں" جس میں باپ جو نام سیاسی جماعت سے وابستہ ہو کر ناجائز کام کرتا اور روپیہ کماتا ہے۔ ماں اپنی ڈاکٹر بیٹی کو بھی نہیں بتاتی کہ پیسہ کہاں سے آتا ہے بلکہ ہر دفعہ ہنس کر ٹال دیتی اور کہتی ہے "تم کو کوئی تکلیف ہو تو بتاؤ!" مگر کہرے کی ماں کب تک خیر منائی "ایک دن پولیس چھاپہ مار کر باپ کو گرفتار کر لیتی ہے اور قابل گرفت مواد بھی ہاتھ لگ جاتا ہے۔ اس سب کے بعد ڈاکٹر بیٹی اپنی استدعا کو آگ لگا دیتی ہے مگر یہ غیر منطقی اختتام قاری کے دل میں اس کے لئے ہمدردی پیدا نہیں کرتا۔

حنیف سید کا افسانہ "اور وہ پورا ہو گیا" ایک مفلس مگر بڑا لکھاری جو شراب اور جوئے کے ہاتھوں مکمل طور پر برباد ہو چکا ہے صحت ختم ہو گئی ہے۔ ادیب بننے کا شوقین طاہر اس کے آخری وقت میں یہ پیشکش کرتا ہے کہ وہ اپنے غیر مطبوعہ افسانے اس کے حوالے کر دے (بعوض دسکی اور کباب) لیکن یہاں یہ سوال ہے کہ طاہر غیر مطبوعہ افسانوں کو بھی اسی ادیب کے نام سے چھپوانا چاہتا ہے اس سے وہ روپیہ تو کما سکتا ہے مگر ادب میں نام کیسے کما سکتا ہے؟ کیا لوگ آج منٹو کے سو افسانے "عصمت چغتائی کے مشہور افسانے" وغیرہ وغیرہ کی طرح کی کتابیں نہیں چھپواتے؟ اس سے منٹو اور عصمت چغتائی کا ہی نام زندہ رہتا ہے۔ معلوم چھپوانے والے پر تو کوئی غور ہی نہیں کرتا۔ میں نے افسانے کے ان جملوں پر بار بار غور کیا کہ شاید مجھے سمجھنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے ۔۔۔ طاہر کہتا ہے۔

"مجھے مادی اور روحانی دونوں فائدے ہوں گے۔ میں لوگوں سے کہوں گا کہ آپ مرتے وقت اپنے غیر مطبوعہ افسانے میرے حوالے کر گئے ہیں اس طرح میں ان کے مجموعے چھپوا کر بیچ سکوں گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی تسکین ہوگی کہ میری تحریریں شائع ہوگئیں چاہے میرے نام سے نہیں آپ کے نام سے ہوں۔ آپ کا نام اتنا بڑا ہے کہ لوگ ہاتھوں ہاتھ لیں۔"

عطیہ سید نے افسانہ لکھ کر نظر ثانی نہیں کی ورنہ وہ اس امر پر غور کرتیں کہ نام اسی ادیب کا رہے گا تو ظاہر کس طرح ادیب مشہور ہو جائے گا؟ عذرا اصغر کے افسانہ "بدلتے رنگ" میں بابا جو منافع خور ظاہر دار ہے اپنی بیٹی فائزہ کو ایک نیک شریف انسان جمیل کا دیا پسند بیاہ لاتا ہے یوں تو فائزہ عبا چنتی ہے اس کے گھرانے میں مرد داڑھیاں رکھتے اور اونچے پائنچے کی شلواریں پہنتے ہیں مگر وہ کاروبار میں ملاوٹ، بے ایمانی، جھوٹ خوب کرتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایسے لوگ، ایسی مثالیں بہت ہیں افسانے کے اختتام میں بہو فائزہ سسر سے اجازت لئے بغیر اپنے باپ کے ساتھ حج پر جاتی ہے جو منافع کیسوں حج پر جا رہا ہوتا ہے۔ سسر ناراض ہوتا ہے کہ اس سے اجازت نہیں لی۔ بیٹا کہتا ہے کہ میں نے اسے اجازت دی ہے۔ افسانہ میں باقی سب کردار سچ سامنے لائے گئے ہیں لیکن اختتام میں بیٹے کی بات درست ہی تو ہے۔ اسلام میں شادی سے پہلے بیٹی باپ کی اجازت اور شادی کے بعد شوہر کی اجازت کی پابند ہوتی ہے۔ سسر سے اجازت یا ذکر یا اطلاع معاشرتی سماجی اخلاق ہے۔ شیخ خالد کا افسانہ "ردی" بے نیاز وقت کے ہاتھوں پرانے متروک اور ردی بن جانے والے انسان کا ازلی دکھ ہے۔ طارق بلوچ صحرائی کا افسانہ "بھولا" با معنی خوبصورت جملوں میں پرویا ہوا نگینہ کا تانا بانا ہے اس میں کہانی نہیں ہے مگر کہانیوں کا سفر ہے۔ "الفراد ایلیٹ" پڑھتے ہوئے میرے افسانہ "کاکروچ" کی مصنوعی مہمان داری کی منظر نگاری یاد آ گئی۔ افسانہ نگار نے اس طرح کی مہمان نوازی کو خوب بیان کیا جہاں صرف طعام اور سلیقہ ہی پورے نمبر نہیں لیتا بلکہ جملہ بازی، مکالمے، بحث برائے بحث جتانا، دلائل کی بازی، مباحثہ جیتنے اور ہارنے والوں کے قہقہے بھی فل بنا فل مارکس ہوتے ہیں۔ اظہر جاوید کی کہانیاں سچ بیتیاں ہوتی ہیں۔ وہ اپنے اندر کشش رکھتی ہیں۔ "کیا راون مرے گا" وحشی سعید کی کتاب پر یک وقت دو تبصرے چھپے ہیں یہ بھی تعجب کی بات ہوتی ہے۔

تخلیق ایوارڈز از 2012 تا 2016ء میں ایوارڈ یافتگان کے ساتھ شہر (لاہور، کراچی) مذکور ہیں، محترمہ عذرا اصغر کے نام کے ساتھ (لاہور، کراچی) کی بجائے پاکستان کیوں لکھا ہے؟ پاکستان ایوارڈ اکیڈیمی کی تقریب تقسیم ایوارڈ میں محترم سونان اظہر جاوید سے ملاقات ہوئی۔ تبسم تو کفایت سے خرچ کرتے ہیں۔ لطیفہ ارضی پر مسرت جسم و روح کا واجب صدقہ تبسم ہے۔

دردانہ نوشین خان (مظفر گڑھ)

﴿15﴾ جناب سونان اظہر!

ماہنامہ تخلیق لاہور سے شائع ہونے والے ادبی رسائل و جرائد میں ایک معتبر شناخت کا حامل ہے۔ جناب اظہر جاوید (صدارتی اعزاز حسن کارکردگی) کی ادارت میں شائع ہونے والا یہ ادبی رسالہ 48 سال سے علم و ادب میں اپنا بھرپور کردار ادا کر رہا ہے۔ اظہر جاوید کی وفات کے بعد آپ نے عمر کی اس شمع کی تابانی میں کمی نہیں آنے دی۔ گزشتہ چند برسوں سے ماہنامہ "تخلیق" کی ادارت آپ جس سلیقے سے نبھا رہے ہیں وہ اپنے والد محترم سے وابستگی کا ایک واضح اظہار ہے۔ آپ نے "تخلیق ادبی ایوارڈ" کا ایک سلسلہ شروع کر رکھا ہے جو اس رسالے کے لیے ایک روشن باب ہے۔ آپ نے نو وارد لکھاریوں کے ساتھ ساتھ وفات پانے والے نامور اہل قلم کی ادبی خدمات کو

اجاگر کرنے پر زور بھی دیا ہے۔ آپ کا اداریہ (پہلی بات) بھی حق و صداقت کا علم بلند کرتا نظر آتا ہے۔ حیرت یہ ہے کہ والد محترم کی وفات سے قبل آپ ادب سے اتنا وابستہ نہ تھے مگر جب سے "تخلیق" کی ادارت سنبھالی ہے کبھی یہ گمان نہیں گزرا کہ سونان اظہر جاوید کوئی غیر ادبی شخصیت یا غیر ادبی رویوں کے مالک ہیں۔

دسمبر 2016ء کا "تخلیق" جاذبِ نظر سرورق کے ساتھ میرے سامنے ہے۔ "تخلیق" کے اس شمارے کا سرورق کسی ماہر فنکار کی تخلیقی بصیرتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ حسبِ روایت آپ نے اپنے اداریے پہلی بات میں ادب کی توقیر اور تحریر پر زور دیا ہے۔ محترم خالد اقبال یاسر کی لکھی ہوئی حمد اور سیکل سروجی کی لکھی ہوئی نعت میں خاص قربت ہے۔ زیرِ نظر شمارے میں "تخلیق ادبی ایوارڈ 2016" نامور افسانہ نگار، محترمہ عذرا اصغر صاحبہ کو دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور بڑے اختصار سے ان کا تعارف نامہ بھی پیش کیا ہے۔ افسانوی ادب کی پارکھ محترمہ سلمیٰ اعوان نے عذرا اصغر کے افسانوں اور ناولوں کو اپنے ذاتی تعلق کی چلمن سے دیکھا اور بیان کیا ہے۔ عذرا اصغر پر لکھا گیا یہ مضمون ایک حوالے کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ اسی طرح عذرا اصغر کے ذاتی اور شخصی احوال پر بیٹی شہ طراز نے اپنی ماں کو جو خراج پیش کیا ہے وہ بھی قارئین کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ شہ طراز نے اپنے دل کی عمیق گہرائیوں سے عذرا اصغر کے حوالے سے ذاتی معلومات بہم پہنچا کر قارئین پر احسان کیا ہے۔ عذرا اصغر کی کئی پرتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک بیٹی نے اپنی محبت کا اظہار کچھ یوں کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

> "اگر میں بیٹی ہونے کے ناطے عذرا اصغر کے ماضی میں جھانکوں تو یہی سوال کرتی ہوں کہ "ماں آخر چاہتی کیا تھیں ۔۔۔؟" اور اس کا جواب میرے پاس یہی ہے کہ ایک بے چین روح کے پاس توانائی کا ڈھیر ہو اور وہ اسے صرف کرنا چاہے تو اس توانائی سے معاشرتی برائیوں کا انہدام بھی بن سکتا ہے لیکن اگر اسی توانائی کو مثبت انداز میں استعمال کیا جائے جیسا کہ عذرا اصغر نے کیا تو سورج کی طرح روشنی کی کرنیں بکھیری جا سکتی ہیں جو زندگی کی نمو کا موجب ہوتی ہیں۔"

ڈاکٹر انور سدید اور ماہنامہ تخلیق کا حسین سنگم ہے۔ آپ نے بھی اس رشتے کو انور سدید کی وفات کے بعد بھی قائم رکھا ہوا ہے۔ اس شمارے میں "شہزاد احمد ۔۔۔ ایک شاعر ایک دانشور" کے عنوان سے انور سدید کا مفصل مضمون شامل ہے۔ جو ڈاکٹر انور سدید نے شہزاد احمد کی وفات پر لکھا تھا۔ یہ مضمون شہزاد احمد کی ادبی و علمی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کی نجی زندگی کا بھی ترجمان ہے۔ اختر ہوشیار پوری مرحوم کی نعت نگاری کے حوالے سے امین راحت چغتائی نے بڑے اختصار کے ساتھ مختلف پہلو اجاگر کیے ہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے محترمہ سیکل صابری کی اردو شاعری پر اظہار خیال کیا ہے اور انھیں پاکستانی شاعرات میں اہم مقام دیا ہے بلکہ ان کے بقول وہ اردو شاعری کی راج دلاری ہیں۔ تسنیم جاوید کا مضمون انفرادی نوعیت کا ہے۔ انھوں نے "فیض احمد فیض ۔۔۔ رونق بزم یاراں" میں فیض پر تعارفی، ادبی، معلوماتی اور تجزیاتی طور پر قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے فیض کی زندگی، بزم یاراں، بزم شعراں بالخصوص بزم لاہور کے حوالے سے نادر معلومات اور انکشافات کیے ہیں۔ یہ مضمون فیض احمد فیض کی ہمہ جہت شخصیت کی ایک روشن مثال ہے۔ ڈاکٹر جوہر جعفری کا اہم مضمون بھی اس شمارے کا حصہ ہے جس میں انھوں نے دھرم پور سے نیپال تک کے سفر کا احوال بیان کیا ہے۔ تنویر کشور ودکرم اور کے ایل نارنگ ساقی نے اردو زبان کے معمار اور معروف فکشن نگار، کشمیری لال ذاکر کی وفات پر اپنے ذاتی خیالات و تاثرات کو قلم بند کیا ہے اور ان کی افسانوی خدمات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

منظومات میں پروین شیر، بشریٰ رحمان، شہزاد نیئر، بی بی زینت قاضی اور سید مبارک علی شمسی نے اپنی فکری و فنی صلاحیتوں کو وا کیا ہے۔ مبارک علی شمسی کی نظم "پانی تحریر کرتا ہے" فکر اور قرینے سے لکھی گئی نظم ہے۔ جمیل حیات اور توقیر احمد شائق نے بھی اپنے اپنے منفرد رنگ شاعری کو خوب صورت لفظوں کا روپ دیا ہے۔ افسانوی کائنات بھی زیر نظر شمارے میں اپنے جوبن پر نظر آتی ہے۔ صفیہ سید (اور وہ چراغ رو گیا)، عذرا اصغر (بدلتا ہے رنگ)، ڈیک کنول (محبوب کی آزادی) اور شیخ خالد (روپ) کے افسانوں میں زندگی کی رعنائی اور فنی باریکیوں کی روشنی زیادہ چمک کرتی نظر آتی ہے۔ ناول کی کہکشاں بھی پورے آب و تاب کے ساتھ چمک رہی ہے۔ مسعود عثمانی، حسن عباسی، رشیدہ عیاں، اور آفتاب خان، غالب نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کی آپ بیتی "عاشقی صبر طلب" کی بارہویں قسط اس شمارے میں شامل ہے جو حسب روایت علم و ادبی مباحث اور فکری رویوں کی عکاس ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد نے عمیق کیفیتوں میں یادوں کی جو شمعیں روشن کی ہیں قارئین ان سے استفادہ کرتے رہیں گے۔ مستنصر حسین تارڑ نے PTV کے ایک شہزادے یاور حیات پر ایک خراجِ [illegible] مضمون قلم بند کیا ہے۔ اسی طرح منیر نیازی کی وفات پر لکھا گیا اظہر جاوید کا مضمون "منیر نیازی اور میں" منیر شناسوں کے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ سلمیٰ اعوان کے سفرنامے (عراق اشک بار ہیں ہم) کی ساتویں قسط بھی حسب روایت اسلوب کی جاذبیت اور عراق کے حوالے سے کئی اور اہم معلومات کا ایک مرقع ہے۔ محترم ایس ایم معین قریشی کی شگفتہ شخصیت، عہد حاضر میں اپنے لطیف اسلوب کی بدولت خاصی مشہوری حاصل کر چکی ہے۔ قریشی صاحب زندہ دلی، لطافت اور انسانی فکری اور مزاجوں سے بخوبی آشنا ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "منطق، دلیل، ثبوت، شہادت اور قطعی یہ بیوی کی عدالت عالیہ میں ان سب کا داخلہ ممنوع ہے۔ تنازع خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، فیصلہ ہمیشہ مرد کے خلاف آتا ہے کیونکہ غلطی بھی ہمیشہ اسی کی ہوتی ہے۔"

ماہنامہ تخلیق کی بدولت قارئین نئی کتب سے واقفیت اور ان کے مندرجات سے آگاہی بھی ہر شمارے میں حاصل کرتے ہیں۔ زیر بحث شمارے میں جناب حسن عسکری کاظمی، مسلم شمیم، پروفیسر جلیل الرحمٰن، اخلاق عاطف، ملک اشرف ذکی، ڈاکٹر انور سدید، ظہیر جاوید اور آفتاب خان نے مختلف کتب پر اپنی اپنی تنقیدی و تجزیاتی نگاہ دوڑائی ہے۔ آخر میں "انجمن خیال" بھی عروج پر نظر آتی ہے۔ علمی و ادبی شخصیات کے خطوط ماہنامہ "تخلیق" کے نقد و نظر میں اہم کردار کے حامل ہیں۔ ماہنامہ تخلیق دسمبر 2016ء اپنے مختلف رنگوں اور ادبی چاشنی کے ساتھ نمایاں ہے۔ سونان اظہر جاوید آپ نے وراثت میں ملے ہوئے "تخلیق" کی تخلیقی سرگرمیوں اور ادبی قد میں خوب اضافہ کیا ہے۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن (شاہ پور)

﴿16﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید صاحب!

"ماہنامہ تخلیق" نظر نواز ہوا۔ سرورق پر آرٹ ورک قابل دید ہے۔ "پہلی بات" میں بہت کچھ پڑھا مگر پھر بھی یاد دہانی کراؤں گا کہ جو میں نے ڈاکٹر انور سدید پر مضمون لکھ کر بھیجا تھا وہ ابھی تک نہیں چھپا۔ سب سے پہلے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محترمہ عذرا اصغر کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہیں 2016ء کا "تخلیق ایوارڈ" کے لئے نامزد کیا گیا ہے جو انہیں فروری 2017ء میں ملے گا۔ حق بحق دار رسید۔ ان کی ساری زندگی ادب پروری میں گزری ہے جیسے ادب ان کے لئے اوڑھنا اور بچھونا ہو۔ کتابوں کے کیا کیا خوبصورت نام اور کالم نگاری سے لے کر ناول نگاری، یادنگاری، افسانہ نگاری اور کہانیوں کے تانے بانے بنتی رہیں۔ یقیناً وہ اس ایوارڈ کی حقدار تھیں۔ محترمہ سلمیٰ اعوان نے

سونے پہ سہاگے کا کام کیا اور محترمہ عذرا اصغر پر بہت ہی پُر اثر اور مکمل مضمون لکھ کر حق ادا کیا اور کیا بات ہے محترم عذرا اصغر کی ہونہار اور اسی میدان کی شہسوار بیٹی شبہ طراز کی کہ بہت ہی انوکھا اپنی ماں سے سوال کر دیا اور جواب بھی دے دیا۔ دراصل بچہ جب شکمِ مادر میں ہوتا ہے اور ایک مخصوص وقت پر "اس میں روح پھونکی جاتی ہے اور اس کا دل دھڑکنا شروع ہو جاتا ہے تو وہ اپنی ماں کی آواز کو سنتا ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق اس کی پرورش ہوتی ہے سوچ کو ماں کی طرف سے وراثت میں بہت کچھ ملتا ہے پھر وہ میدانِ عمل کے مطابق اپنے پسندیدہ میدان میں اترتا ہے۔ شبہ طراز کا لکھا اپنی ماں کے ساتھ تحریر راہی لے رنگ "پچھتا" پڑھا ہے۔ اپنی ماں سے کیسا پیارا سوال "عذرا اصغر ... آخر وہ چاہتی کیا ہیں؟ آخر وہ تو سب کچھ جانتی تھیں چنانچہ بھرپور مضمون لکھ کر آخر خود ہی جواب دے دیا کہ عذرا اصغر کے پاس بے پناہ توانائیاں تھیں۔ دو راستے تھے جن میں سے انہوں نے مثبت راستہ اختیار کر کے ہمارے راستوں میں فکر کے آئینے نصب کر دیے۔ میں ان کی دعاؤں میں شامل ہوں۔ اختر حسین کی نعت نگاری پر امین راحت چغتائی صاحب نے خوبصورت تعارفی مضمون لکھا۔ مشکل کام ہے۔ محترمہ بسمل صابری کی شاعری کو ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب نے اردو شاعری کی راج دھانی قرار دیا ہے۔ خواتین شاعرات نے بہت نام کمایا ہے۔ بشریٰ رحمن صاحبہ نے انہیں شاعرات کے لیے باعثِ فخر قرار دیا ہے۔ ان کا ایک شعر:

ایک آہٹ ہی سے ہر سو اڑی خوشبو جیسے   اب تصور نے مرے رنگ بکھیرے کوئی

صنم کدہ ہے جہاں۔ ہمارے ہاں سیاست کے مکروہ چہرے کی نقاب کشائی جیسا کہ آج کل اربوں کھربوں کی لوٹ کھسوٹ کے کیس سب کے پاس ہیں۔ اور کیا ہی پیارا افسانہ محترمہ عذرا اصغر نے لکھا ہے بدلتا ہے رنگ۔ کاش جیسے اور دلو جیسے لوگ کیسے کیسے نام اپناتے ہیں۔ بہت خوبصورت افسانہ ہے۔ محبوب کی آزادی میں معاشرتی برائیوں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ حسبِ سابق طارق بلوچ صحرائی کا افسانہ "بھولا" بھی معاشرتی برائیوں کی نقاب کشائی ہے۔ نام نہاد دانشوری سے بہتر ہوتا کہ "ہم سب بھولا ہوتے۔" محترمہ دردانہ نوشین خان افسانہ نگاری کے میدان میں خاصا مقام رکھتی ہیں ان کا افسانہ "بے مہاری سے بے چاری تک" کی بنت اور تانے بانے خوب ہیں مگر میرے مطابق سبق آموز بات یہ ہے "دوسروں پر رحم کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے"۔ "سورۃ یٰسین" اور اعظم جاوید کا "میرے یار کی یاد" خاصے کی تحریر ہے جس پر اعظم جاوید کو مہارت تامہ تھی۔ ڈاکٹر رشید امجد کی یادنگاری "عاشق میر طلب" میں نے اپنی لائبریری میں سجا رکھی ہے۔ وہ بہت اچھے افسانہ نگار بھی ہیں۔ ماہنامہ تخلیق میں افسانوں کے ساتھ کتاب شائع ہو رہی ہے۔ اس مرتبہ بارہویں قسط ہے۔ اس قسط میں دیگر باتوں کے علاوہ انہوں نے چند برائیوں کی نشاندہی کی ہے۔ پاکستان Men dominated معاشرہ ہے مگر اب خواتین میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور اچھے جاب تلاش کرنے کا رجحان پروان چڑھ رہا ہے۔ مگر پروڈکشن ہاؤسز، ڈراموں، فلموں، فیشن شوز، ٹی وی کے مارننگ شوز، کیٹ واک، ماڈلنگ وغیرہ سب جگہ مردوں کی اجارہ داری ہے جن میں گندے ڈرامے سرفہرست ہیں۔ کروڑوں روپے کی گاڑیاں اور بنگلے ان کی کمزوریاں بن چکی ہیں۔ اور پاکستان بھارت کی نقالی کرتے کرتے مغرب سے بھی بڑھ گیا ہے۔ یورپ اور امریکی معاشرہ بنتا جا رہا ہے۔ جہاں مادر پدر آزادی ہے۔ تبصرے اور تجزیے نے طوالت اختیار کر لی ہے۔ اس لیے میں اب صرف طنز و مزاح پر مبنی مضمون "تفاؤلی الرحیم" جیسے ایس ایم معین قریشی صاحب نے لکھا ہے پر اپنی رائے دے کر ختم کرتا ہوں اجمالی، دلچسپی اور سچائی کے قریب یہ مضمون ہے مگر اس قبیل میں "زن گزیدہ" بھی آتا ہے۔ معاشرے میں زیادہ تر لوگ باہر تو بہت معزز اور مشہور ہوتے ہیں مگر بیچارے گھر میں بھیگی بلی بنے پھرتے ہیں۔

مرزا احمد نور طاہر (چکوال)

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اس لئے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ تیرگی خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ : سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ اطراف کراچی مدیر اعلیٰ : محمود شام 0321-8216736	ماہنامہ شاداب لاہور مدیر : ڈاکٹر کنول فیروز 0301-4123707
سہ ماہی دستک مری مدیر اعلیٰ : محمد آصف مرزا 03217426898	ماہنامہ سپوتنک لاہور مدیر اعلیٰ : آغا امیر حسین 0300-8440444	ماہنامہ حکایت لاہور مدیر : طارق محمود 0323-4329344
ماہنامہ ادب لطیف لاہور چیف ایڈیٹر : صدیقہ بیگم 0300-8479444	ماہنامہ چہار سو راولپنڈی مدیر مسئول : گلزار جاوید 0300-5178062	ماہنامہ اقرا لاہور مدیر : شاہد علی خان 0301-4001844
سہ ماہی بجنگ آمد لاہور مدیر : ڈاکٹر اختر شمار 0300-8457542	ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر : عمران منظور 0300-8438043	ماہنامہ ارژنگ لاہور مدیر : حسین عباسی 0300-4489310
ماہنامہ انشا کلکتہ انڈیا مدیر : ف س اعجاز 0091-3322354616	ماہنامہ شاعر ممبئی انڈیا مدیر : افتخار امام صدیقی 0091-932451517	سہ ماہی انتساب انڈیا ایڈیٹر : سیفی سرونجی 0091-942564177
ماہنامہ ماہ نو لاہور نگران اعلیٰ : شفقت جلیل 042-35941405	ماہنامہ قومی زبان مدیر : ڈاکٹر ممتاز احمد خان 02134811406	ماہنامہ سیپ کراچی مدیر : نسیم درانی 0333-2166968
ماہنامہ روشنائی کراچی مدیر : احمد زین الدین 0321-2011595	ماہنامہ [illegible] مدیر : [illegible] 042-36620949	سہ ماہی [illegible] لاہور مدیر : [illegible] 0331-4722999

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1-	آپ تنہائی میں [illegible]	[illegible] ساجد	0300-04020955	[illegible] لاہور	700/-
2-	[illegible] کے چار درویش	مسلم شمیم	021-2027202	[illegible] کراچی	350/-
3-	[illegible]	[illegible]	042-37164674	[illegible] لاہور	400/-
4-	[illegible]	ڈاکٹر محمود احمد اسیر	0322-7149735	3-S-31 [illegible] بلاک 17 سرگودھا	350/-
5-	[illegible]	[illegible]	0331-4387871	[illegible] پبلشرز [illegible] لاہور	250/-
6-	[illegible]	پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	048-37233165	پاکستان ادب اکادمی سرگودھا	1250/-
7-	125 اہل قلم	پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	042-37233165	[illegible] لاہور	1,000
8-	[illegible]	[illegible]	0302-7796970	[illegible] پبلشرز [illegible]	600/-
9-	چاک	اسلام عظمی	0336-2211044	[illegible] پبلیکیشنز لاہور	400/-
10-	[illegible]	فرخ محمود	0333-4707625	[illegible] لاہور کینٹ	400/-

HERE'S A CHANCE OF A LIFE TIME
BRING OPTIONS EXPERIENCE TO YOUR
Own Something More
THAN A RESTAURANT
BECOME FRANCHISEE
Of Pakistan's Best
THE OPPORTUNITY
This could be your opportunity to enter into today's most growing hospitality industry with complete help from reliable and experienced PARTNER.
THE BRANDS
Today's TOP brands under one roof are now in your reach. World's most wanted brands have been brought together to be your OPTIONS.
THE COMMITMENT
We are seeking highly ambitious and committed people having access to required capital with
Most Awarded
Most Celebrity Visited
Best Rated
Most Visible
Ideal Franchisee
•Someone who has the required capital but has been waiting all along for the most successful and profitable opportunity to arrive.
•Someone who has understanding and strongly believes in franchise system
•Someone who owns a restaurant at good location which didn't work out for some reason and they feel that now is the right time to convert to a franchise concept.
•Someone who can value the managment system & pay 2.5 Million Fee plus royalty and marketing fee for complete ongoing system and or have access to total minimum liquid cash bet 15 to 20 Million.
•Someone who has the most suitable purpose built location in a park / community/ mall / enclave or office complex and want unique and food concept to enhance the value of the surroundings
IF YOU THINK THATS YOU - CHECK OUT YOUR OPTIONS !!!
4 BRANDS
ONE FRANCHISE FEE
INVESTMENT FROM
Rs:15 TO 20 MILLION
GET IN TOUCH : UAN: 111-OPTION PH: 0423-5777491
HEAD OFFICE: Royal House - 23 Main, Gulberg, Lahore
www.options.pk
'SCAN THE QR TO WATCH FRANCHISE VIDEO'
ISO

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE
CPL NO. 96

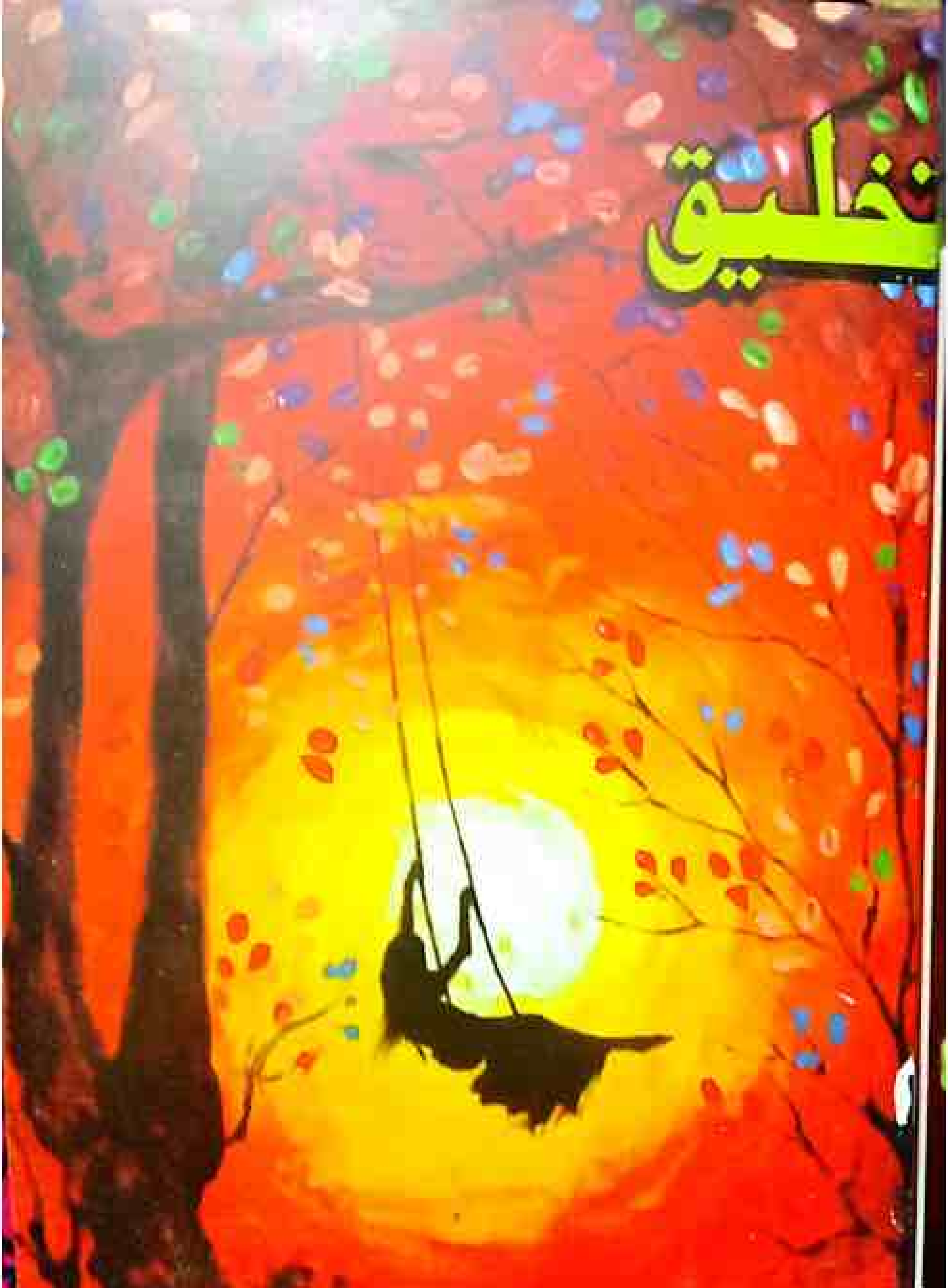

CamScanner

بیرون ممالک اور اندرون ادبی دنیا میں مسلسل 48 سال سے سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادبی رسالہ ماہنامہ "تخلیق" لاہور پاکستان (بانی

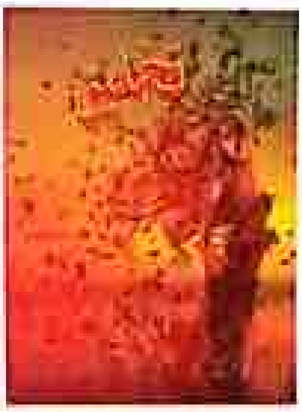

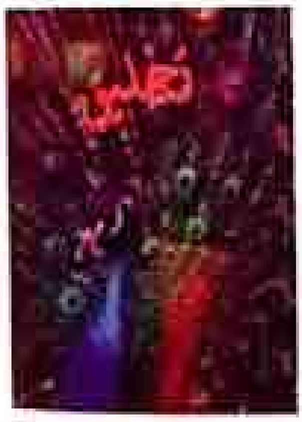

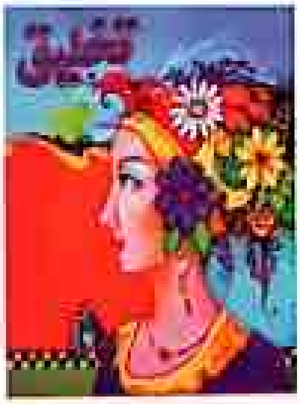

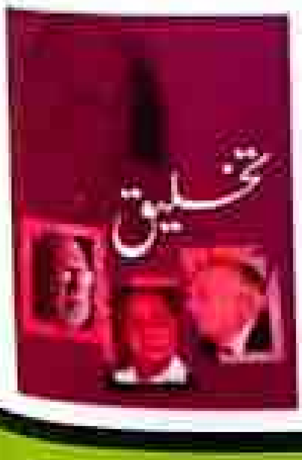

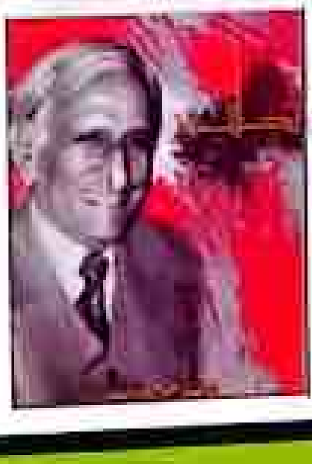

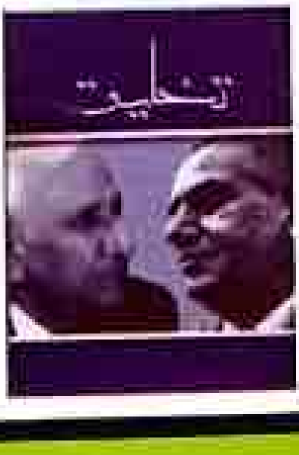

مسلسل اشاعت
48
واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصہ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 48 | جون 2017ء | شمارہ : 6 | CPL نمبر 96

قیمت : 150 روپے ——— 750 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100$ ڈالر — ہندوستان کے لیے 1,200 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor)
Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt. (Ph : 04237187500 - 04236671007)
موبائل فون: 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

تنویر جہاں (امریکہ) — فوزیہ مشتاق (امریکہ) — نارنگ ساقی (انڈیا) — جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جان آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43 ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود —— میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رواں رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''معاصر''، ''تقاضے'' اور ''نقوش''، ''افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (انشاء اللہ) جو مدیر اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔ ''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کے مضامین کے انتخاب کے لیے ''تخلیق پینل'' تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیر جہاں، ہتھی ظہیر، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف 1,200 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

U.S.A.
Nayyar Jahan
2700 South Barrington
AVE Los Angles
C.A. USA
Ph: [illegible]
Email: [illegible]@hotmail.com
urdu@urdu-markaz.com

U.S.A.
[illegible] Mushtaq
[illegible]
River Side Rodhe
Island
Ph: 001-[illegible]
Email: [illegible]@gmail.com

INDIA
K.L. Narang Saqi
L-4-Connaught Circus, New
Delhi-110001, India
Ph: 0091-[illegible]
Email: [illegible]@gmail.com

PAKISTAN
Javed Manzoor
7-Islam Block, Azam Garden,
Multan Road, Lahore
Ph: [illegible]
Cell: [illegible]
Email: [illegible]@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترتیب

پہلی بات — سلطانہ اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ — رشیدہ آفرین — 7
نعت رسول مقبولؐ — ریاض ندیم نیازی — 7
نعت رسول مقبولؐ — گلشن بخاری — 7

مضامین

کچھ انور سدید کے بارے میں — سید منظور حسین یاد — 8
جمیل الدین عالی اور ان کی شاعری — ڈاکٹر انور سدید — 13
نگارشات — ڈاکٹر محمد افضل نیازی — 18
عالم گیریت — مسلم شمیم — 21
پیدائشی مہدی۔ مہدی حسن کا — ڈاکٹر پرویز انجم — 26
مقلہ عہد میں رائج الاقتصادی — ظفر سپل — 30
ڈاکٹر محمود اسیر کا کامل رنگ — اخلاق عاطف — 36
داستان سرگودھا کا سچا وارث — ملک اشرف ذکی — 40

منظومات

اظہر جاوید، جمیل عالی، بشریٰ رحمن، پروین شیر، حسن عسکری کاظمی، سرفراز سید، نعیم احمد بشیر، توفیق شفیق، نظیر شاہد، عزیز احمد، رضا اللہ — 45
آسنہ حمد کنول، سیماب ظفر بخاری، سعدیہ شمسی، امجد بابر — 48

افسانے

برکت — ڈاکٹر رشید امجد — 49
آدھے چاند کی رات — نجم الحسن رضوی — 52
ملاح کا بھالا — محمد اعظم — 56
دم — طارق بلوچ صحرائی — 59
سپاہی قوم — بی بی بخت قاضی — 64
کچی کی آواز — سیمابی وڑ — 71
اسپ تازی — شعلہ چنگیزی — 76
بے سوال آواز — اظہر جاوید — 77

غزلیں

اظہر جاوید، جمیل عالی، آصف ثاقب، بشریٰ رحمن، نعیم احمد بشیر، اعزاز احمد آذر، مظہر اولیٰ، حسن عسکری کاظمی، ریاض حسین زیدی، ابصار عبدالعلی، مسعود عثمانی، رجاء جعفری، ابن عظیم فاطمی، کرشن پرویز، سیمی سرونگی، عراق مرزا، پرتپال سنگھ بیتاب، صوفیہ بیدار، آفتاب خان، ثمر رانی شفق، قائم منظور، پروفیسر نور کمال، سعدیہ شمسی، جاوید عباسی جاوید، صدیق شاہد مرزا — 80 تا 87

یادنگاری

عاشق میر قصب — ڈاکٹر رشید امجد — 88
غم دوراں سے پہلے — ڈاکٹر انور سدید — 95
یکجا تھیں گزرے لمحوں کی — اقبال ساجد — 103

سفرنامے

عراق اشک بار ہیں ہم — سلمیٰ اعوان — 105

یادِ رفتگاں

عبداللہ حسین — ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم — 109

روشن مثال — اعزاز احمد — حسن عسکری کاظمی — 114

دی گریٹ راوین استاد — محمد ساجد — 117

خاکہ

افتخار مجاز — ملک مقبول احمد — 119

طنز و مزاح

روشنی ہو نہ سکی — ایس ایم معین قریشی — 122

پنجاب رنگ

حسن عسکری کاظمی، نسیم احمد بشیر، منزہ شاہد — 124

تبصرے

سفرِ سفارت — اقبال راہی — 125

سمندر میں ستارہ — آفتاب خان

بے قراری سی بے قراری ہے — آفتاب خان

ادبی ڈائجسٹ — آفتاب خان

احتجاج — آفتاب خان

آسمان میری مٹھی میں — آفتاب خان

لاڑکانہ کے چار درویش — آفتاب خان

سہ ماہی "انتساب" سرونج — آفتاب خان

پتنگ لہرائیں گے — آفتاب خان

گونگے کا خواب — آفتاب خان — 133

انجمن خیال

مسلم تبسم، نسیم احمد بشیر، ڈاکٹر معین قریشی، ملک اشرف، ڈی جی سید ریاض حسین، آصف ثاقب، جمیلہ تبسم، رشید آفرین، ڈاکٹر شمیم خان، مرزا احمد نور طاہر، شفق بخیری — 134 - 143

تخلیق کو موصول رسائل اور کتب

ملکی اور غیر ملکی — 144

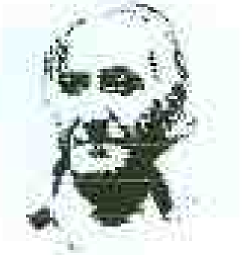

سرورق
ایس خالد

ناشر: سونان اظہر جاوید

طابع: بیدار سرمدی

قانونی مشاورت: لطیف احمد قریشی

مطبع: عکس پرنٹرز، گلشن راوی لاہور

مقام اشاعت:
H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I,
Islam Nagar, Walton Road, Lahore -Cantt

(اڈیٹنگ کے حقوق محفوظ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

تمام قارئین کو رمضان المبارک کا آخری عشرہ اور پیشگی عید الفطر مبارک ہو

پہلی بات

"تخلیق" نے اپنے سفر کے 48 برس مکمل کر لئے اور شکر الحمدللہ یہ پرچہ برصغیر کی تاریخ میں نصف صدی مکمل کرنے جا رہا ہے۔ ان 48 برسوں میں پاکستان اور پاکستانیوں پر کیا کیا قیامتیں ٹوٹیں اب ان کی کیا تفصیل دہراؤں ۔۔۔ معیشت تباہ ہو گئی اور پوری قوم ذلت آمیز احساسات سے دوچار کر دی گئی۔ کوئی ماہنامہ ہو، ہفت روزہ یا روزنامہ ۔۔۔ اس کی بقا اشتہارات سے ہوتی ہے۔ جب سارا نظام درہم برہم ہو چکا ہو تو عجیب آپا دھاپی کا عالم ہوتا ہے۔ کاروبار ٹھپ، صنعتی ادارے بدحال، خود سرمایہ دار پریشان و سرگرداں۔ ایک عام آدمی کی طرح کروڑ پتی کو بھی اندازہ نہیں کہ کل کیا ہوگا۔

ان 48 برسوں میں کئی پرچے نکلے مگر جلد حالات کا شکار ہو کر دم توڑ گئے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد مجھے بھی حالات اور واقعات نے قدم قدم پر دل شکستہ و دل برداشتہ کیا مگر میں نے عزم کے اس پرچم کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ ہاں کئی بار میں اپنے حوصلہ شکن محسنوں، مشفقوں اور دوستوں کے حسن سلوک سے کئی بار ہار گیا۔

"تخلیق" کے قرب و جوار کے لوگ جانتے ہیں کہ "تخلیق" نے اپنی زندگی سے میرے والد یا میری حیات کو کبھی نہیں سنوارا۔ ادبی پرچہ نکالنا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ میں نے کسی پر احسان نہیں کیا اور نہ کسی سے کچھ شکوہ شکایت کی۔ "تخلیق" جب تک زندہ ہے میرے والد کا نام زندہ ہے اور "تخلیق" کا ڈیرہ آباد ہے۔ آج ادبی حلقوں میں چمکنے والے کتنے ستارے "تخلیق" ادارے کی پیداوار ہیں۔ کچھ تو برملا اعتراف کرتے ہیں اور کچھ اس چمک دمک میں گم ہو گئے ہیں۔ مگر خدا کے فضل سے یہ ڈیرہ 48 سال سے آباد ہے۔ آج بھی بیرون ممالک اور اندرون ملک سے آنے والے تمام دانشور اور ادیب پہلی فرصت میں اس ڈیرے کو رونق بخشنے چلے آتے ہیں۔ آپ یقین جانیے کہ حالات کی تمام تر سنگینیوں کے باوجود "تخلیق" کو جاری رکھنے کے لئے اشتہارات تو لئے مگر صرف ذاتی تعلقات کی بنیاد پر۔ ادب کے ٹھیکیداروں اور بڑے بڑے اداروں کے سربراہان نے کبھی ان ادبی پرچوں کی آواز صاحب اقتدار تک نہ پہنچائی۔ صرف ادب کے نام پر اپنی جیبیں گرم کیں۔

دوسری طرف ان تمام ادبی پرچوں کی داستان بھی عجیب ہے۔ ہر نیا لکھنے والا بڑے نام والے پرچوں میں ہی چھپنا چاہتا ہے۔ اس لئے اب صرف چند گنتی کے پرچے زندہ ہیں۔ غیر معروف ادبی پرچوں یا نئے پرچوں کو بڑے ادیبوں سے تعاون کی بھیک مانگنا پڑتی ہے۔ ایسے جیسے وہ دانا دربار سے منسلک ہوں۔ اب تو ادب کو بھی سیاسی میدان سمجھ کر سیاسی پارٹیوں کی بنیاد پر چلایا جا رہا ہے اور سیاست کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی سختی پھیلائی جا رہی ہے، گروہ بندی کی جا رہی ہے۔ بے نام لوگوں کو نام وری بخشی جا رہی

ہے اور مسرور اصحاب کی پگڑیاں اچھالی جا رہی ہیں۔ ایوارڈ دیے نہیں جاتے اب لیے جاتے ہیں اس لئے اب یہ تمام ادبی ایوارڈز بھی اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ گزشتہ پانچ برسوں میں "تخلیق" کے اداریوں میں ادب معاشرے اور قوم و وطن کے مسائل پر میں نے دل کی بات کہنے کی کوشش کی ہے مگر لطف ہے "تخلیق" میں چھپنے والے اور باقاعدگی سے پرچہ وصول کرنے والے تمام حضرات میں سے صرف پانچ فیصد لوگ اسے پڑھ کر اپنی رائے سے آگاہ کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بعض متعلقین کو یاد دہانی کروانا پڑتی ہے کہ آپ انجمن خیال میں رائے کا اظہار کریں۔ میرا خیال ہے جب ہم سب لوگ مادہ پرستی میں اتنے الجھے ہوں کہ شعر بھی کاروباری ضروریات کے تحت کہتے ہوں تو واقعی ادبی مصروفیات نہیں ہونی چاہیے۔ میں خود بھی بہت کم ادبی تقریبات میں شرکت کرتا ہوں کیونکہ وہ تمام ادبی تقریبات ادب و فن سے تو خالی ہیں۔ ہر فرد واحد اپنی دھن میں مگن ہے۔ میری ذات کی تشہیر میری تخلیقات۔ مگر پھر بھی نہ چاہتے ہوئے چند ادبی تقریبات میں جانا پڑا۔ کچھ تقریبات اچھی بھی ہیں۔ پچھلے دنوں رشید میر صاحب نے اختر شمار کے اعزاز میں ایک تقریب الحمرا میں منعقد کی تو مجھے بھی نہ صرف دعوت دی بلکہ مہمانان خصوصی کی نشست عطا فرما دی۔ میں ان کا مشکور ہوں۔ ایک اور تقریب محترمہ بشریٰ رحمن صاحبہ کے دفتر میں اختر شمار کے اعزاز میں منعقد ہوئی۔ میں ان تمام لوگوں کا مشکور ہوں جو ~~اپنی ذات کے گھیرے سے نکل کر صرف بےلوث~~ ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ اسی طرح مسعود عثمانی صاحب بھی اکثر ادبی تقریبات کا انعقاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ تمام لوگ بغیر کسی حکومتی امداد کے ذاتی وسائل سے دوستوں کو اکٹھا کرتے ہیں۔ آج کل کے مادہ پرستی کے دور میں دوستوں کو اکٹھا کرنے والا ایک عظیم کام کر رہا ہے۔

افسوس چھوٹی بات پھر طویل ہو گئی اور پھر احساس کے اس کرب میں مبتلا رہوں گا کہ ناحق مشغلی دور کے لکھنے والے کا اتنا وقت ضائع کیا۔ ان لمحوں میں وہ کوئی کاروباری بات بھی سوچ سکتا تھا۔

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2016 تک

ماہنامہ "تخلیق" اب تک پانچ "تخلیق ایوارڈ" دے چکا ہے

1	2012ء	جناب شفیع عقیل صاحب	(کراچی)	021-34816655
2	2013ء	جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب	(لاہور)	0334-9719278
3	2014ء	محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ	(لاہور)	0333-4221870
4	2015ء	محترمہ نیر جہاں صاحبہ	(امریکہ)	001-3109870978
5	2016ء	محترمہ ظل الاعظم صاحبہ	(کراچی)	0300-8839895

حمد

اے خدا تو نے ذوالمنن تو نے جہاں پیدا کیے
انس و جاں کے واسطے کون و مکاں پیدا کیے

بحر بے پایاں بھی اور کوہِ گراں پیدا کیے
جا بجا اپنی جدائی کے نشاں پیدا کیے

آسماں کو چاند تاروں سے منور کر دیا
اور چلنے کارواں در کارواں پیدا کیے

اپنی قدرت کے شواہد کو دیا باہم فروغ
بے گیاہ بنجر زمیں میں گلستاں پیدا کیے

گل کو کی تازگی دی اور گلوں کو رنگ و بو
خوش نمائی کے لیے قدرداں پیدا کیے

کہکشاں، قوسِ قزح، رنگِ شفق، لو، سحر
کبریائی کے مظاہر خوش نشاں پیدا کیے

شکر تیرا چاہیں بھی تو کر نہیں سکتے ادا
یہ ترا فضل و کرم ہے جسم و جاں پیدا کیے

تو نے اپنی صنعت و حکمت کے تابندہ اصول
ماورائے سرحدِ وہم و گماں پیدا کیے

ہر تجسس کو ملا ہے ایک انساں سے
واسطے توحید و وحدت کے جہاں پیدا کیے

دل سے تیرا ذکر جو کرتے ہیں ہر صبح و مسا
آفریں جیسے بھی لو آسماں پیدا کیے

رشید آفرین

ooo

نعت

دیکھی تھیں ان کے شہر میں کیا کیا تجلیات
کرتا رہوں گا عمر بھر اب جن کا میں شمار

جو رحمتیں نبیؐ پہ برستی ہیں رات دن
امکان میں نہیں، کہ ہوں وہ رحمتیں شمار

عشاقِ رسولِ پاکؐ سے ملتی ہیں جو عطا
ہو سکتی ہیں بھلا وہ کہاں راحتیں شمار

اللہ نے جو دی ہیں محمدؐ کے فیض سے
کیسے کریں ندیمؔ وہ ہم نعمتیں شمار

ریاض ندیم نیازی

ooo

نعت

جمالِ محمدؐ سے یہ چشم تر ہو
مدینے کی گلیاں ہوں اور میرا سر ہو

یہ خوشبوئے "صلِ علیٰ" قلب مہکے
ہر اک سینہ مہکے معطر نظر ہو

مقدر میرا کوئی ایسا کر دے
میری شام کے مدینے سحر ہو

محمدؐ محمدؐ محمدؐ محمدؐ
اسی ورد سے زندگی کا سفر ہو

اجازت عطا ہو مجھے حاضری کی
سراپا مدینہ ہی میری نظر ہو

زباں میری مصروف "صلِ علیٰ" ہو
مری روح چاہت سدا ڈوبی ہو

معطر ہو ماحول ذکرِ نبیؐ سے
درودوں کی خوشبو سے لبریز گھر ہو

سلام محبت میں مصروف رکھنا
نبی کی عطا قربتِ سنگِ در ہو

چھپا لیں اگر اپنی گلی میں مجھ کو
تو مجھ کو زمانے کا ہرگز نہ ڈر ہو

شہِ دو جہاں مجھ کو گر دیکھتے ہوں گا
یہ گستاخ اس طرح سے نامور ہو

گستاخ بخاری

ooo

مضامین

کچھ ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں

(ڈاکٹر انور سدید کی زندگی میں لکھی جانے والی نایاب تحریر، ڈاکٹر انور سدید کے کاغذات سے بازیاب)

سید مشکور حسین یاد

میں انور سدید صاحب کو غائبانہ طور پر اس وقت جانتا ہوں جب ان کی شاعری ماہنامہ ہمایوں میں چھپتی تھی۔ یعنی یہی کوئی 1940-50 میں اور ہمایوں ہی میں میرے اشعار بھی بڑے طمطراق سے چھپتے تھے۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ یہ محکمہ انہار میں انجینئر تک کی طرف ہیں۔ ادھر میں ریونیو کی طرف تھا۔ اور میرا مشورہ ہمارے ریڈر کے طور پر تھے سنا ہے بعد میں وہ بھی تحصیلدار ہو گئے تھے۔ محکمہ انہار میں عجیب انداز کی رشوت چلتی تھی الحمدللہ میں نے کسی انداز کی بھی رشوت قبول نہیں کی۔ مجھے امید ہے کہ انور سدید بھی میری طرح کے ہوں گے یہی حسن ظن رکھتے ہوئے میں جب محکمہ تعلیم میں آیا اور میں نے ٹی وی کی ابتدا میں چھوٹے چھوٹے ڈرامے لکھے تو مجھے محسوس ہوا کہ میں بیک وقت دو کام نہیں کر سکتا۔ یعنی یا تو ٹی وی کا ہو کر رہ جاؤں یا پھر کالج میں طلبا کو پڑھاؤں۔ واضح ہو کہ ابھی امجد اسلام امجد وغیرہ ٹی وی میں نہیں آئے تھے۔ جب یہ لوگ آئے اور انہوں نے اچھے ڈرامے لکھے اور یہ لوگ ایم اے او کالج لاہور میں پڑھاتے بھی تھے تو یہ حضرات مزید قابل احترام ہو گئے۔ میں ایک جگہ امجد اسلام امجد اور عطاالحق قاسمی کی تعریف کر رہا تھا کہ دیکھو یہ حضرات کالج میں پڑھاتے بھی ہیں اور ٹی وی کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ ایک صاحب جو اس محفل میں تشریف رکھتے تھے کہنے لگے میں ایم اے او کالج کا پرنسپل رہا ہوں۔ عطا اور امجد میں امجد تو پھر بھی کبھی کبھی کلاس لے لیا کرتا تھا عطا صاحب تو کالج میں اس تنخواہ لینے ہی آتے تھے۔ میں نے ان صاحب سے کہا دیکھئے ایک تو یہ دونوں حضرات اس وقت موجود نہیں ہیں دوسرے معلم کا کلاس نہ لینا صریحاً خلاف اخلاق ہے تو اس طرح کی حرکت گناہ ہے تو ممکن ہے خیال کی جا سکتی ہے۔ لیکن مسلسل طور پر کوئی کام چور ہو سکتا ہے اور ماشاءاللہ عطاالحق قاسمی کے والد تو سنا ہے باقاعدہ عالم دین تھے۔
بہرحال مجھے ابھی تک ان ہر دو حضرات کے بارے میں حسن ظن ہی ہے ۔۔۔ مگر میں نے انور سدید صاحب کے بارے میں ایسی کوئی بات نہیں سنی۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں وہ بھی میری طرح پاک صاف قسم کے اہل کار رہے ہوں گے۔ میں محکمہ نہر میں ایک بہت ہی معمولی ریونیو آفیسر کے طور پر تھا لیکن چونکہ ایک تو میں موقع پر جا کر کام کرتا تھا دوسرے رشوت نہیں لیتا تھا اس لیے عرف عام میں میرے افسر ڈپٹی کلکٹر اور کلکٹر مہتمم صاحبان مجھ سے ایک طرح خائف ہی رہا کرتے تھے ۔۔۔ انور سدید کو یاد ہوگا رحمت علی ہمارے ایک کلکٹر ہوتے تھے وہ اپنے ماتحتوں کے علاقوں پر چھاپے مارا کرتے تھے میرے دور دراز علاقے میں بھی دو بار انہوں نے چھاپے مارے اور پھر تحریر کر گئے کہ مشکور میں تمہیں ایک شاعر سمجھتا تھا لیکن تم تو اپنے فرائض منصبی میں بھی کمال کرتے ہو۔" مجھے امید ہے کہ انور سدید کے بارے میں بھی ان کے افسر یہی خیال رکھتے ہوں گے۔ اس کے علاوہ میں نے ایک بہت معمولی ریونیو آفیسر ہوتے ہوئے کئی معرکے بھی مارے۔ ان میں سے دو

اس لئے عرض کر رہا ہوں کہ آدمی حق بھی معمولی صورت حال میں ہو وہ چاہے تو بڑے سے کام کر سکتا ہے۔ ایک تو تھا کہ 1954ء میں موضع چاندی کوٹ ضلع شیخوپورہ میں جو اس وقت کے وزیر مال محمد حسین چٹھہ کا گاؤں تھا میں نے اس میں جا کر پٹواری نے جو فصل کو ساڑھے تین سو ایکڑ مالی نقصان خراب دیا تھا اسے چیک کیا تو خرابہ صرف 12 ایکڑ نکلا۔ اس پر وزیر مال محمد حسین چٹھہ کے والد بہادل نے کہا دیکھو منظور صاحب میں آپ کی شکایت اپنے بیٹے وزیر مال سے کروں گا۔ میں نے کہا آپ ضرور ایسا کریں۔ لہٰذا موصوف کی شکایت پر اس وقت کے افسران ڈپٹی کلکٹر اور ایس ڈی او نے میری جانچ پڑتال کی لیکن جب اس میں کوئی غلطی نہ نکلی تو ان افسران نے رپورٹ کی کہ منظور نے صحیح کام کیا ہے۔ جس پر خود وزیر مال محمد حسین چٹھہ صاحب مرحوم نے میرے بنگلے پہ آکر مجھے داد دی اور کہا آپ نے بہت اچھا کیا میرے والد محترم کو آپ معاف کر دیں ...... یہ حال محمد حسین چٹھہ کی یہ بڑائی تھی ...... دوسرا معرکہ میرا یہ تھا کہ جب 1956ء میں میری تقرری ہیڈ بلوکی پر ہوئی تو میں نے اس وقت کے جی او سی لاہور جنرل اعظم کی زمین کو دیکھا تو وہاں کی زیادتیوں کی رپورٹ کی تو میرے افسران نے مجھے پھر خبردار کیا کہ یہ کیا کر رہے ہو جی او سی لاہور جنرل اعظم ناراض ہو جائیں گے ...... میں نے ان افسران کو یہی کہا کہ اگر میری کسی صحیح بات پر کوئی ناراض ہوتا ہے تو ہوتا رہے مجھے اس کی پرواہ نہیں ...... اس کے بعد ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ ملٹری پولیس کی جیپ میرے گھر آئی اور ملٹری کے آدمیوں نے مجھے کہا کہ جی او سی صاحب لاہور میں آپ کو یاد فرما رہے ہیں ...... میں ملٹری پولیس کی تحویل میں لاہور چھاؤنی پہنچا تو جنرل اعظم نے بڑے زوردار طریقے سے میرا استقبال کیا اور کہا "مسٹر آپ کو معلوم ہونا چاہیے آپ صرف جی او سی لاہور کی رہائش گاہ پر نہیں آئے بلکہ یہ قائد اعظم محمد علی جناح کی کوٹھی ہے جہاں آپ آئے ہیں ...... میں جنرل اعظم کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا ...... مجھ سے کہنے لگے "آپ اندر چلیے آپ کے محکمے کے دوسرے لوگ بھی موجود ہیں"۔ میں جب اندر آیا تو بہت حیران ہوا کہ میرے تمام بڑے بڑے آفیسر حتیٰ کہ چیف انجینئر صاحب بھی تشریف فرما تھے۔ سب ایک زبان ہو کر کہنے لگے "منظور! آپ نے یہ کیا غضب کیا کہ جنرل صاحب کی زمین کے بارے میں رپورٹ کر دی کہ اس پر outlet موگہ بڑا لگا ہوا ہے۔ زمین پر پانی بھی غلط لگا ہے" میں نے کہا میں نے جو دیکھا اس کی رپورٹ کر دی ہے۔ جنرل صاحب کی زمین پر اس کے حساب سے جو بڑا موگہ لگا ہے اس کی وجہ سے دوسرے زمینداروں کی زمینیں خشک ہو رہی ہیں۔ اتنے میں جنرل صاحب خاص طور پر میری طرف پکوڑوں کی پلیٹ کر کے بولے "منظور صاحب یہ پکوڑے خاص طور سے بیگم صاحبہ نے آپ کے لئے بنائے ہیں" اس کے بعد فرمانے لگے "منظور صاحب آپ mutual under standing کے معنی تو سمجھتے ہوں گے؟" میں نے عرض کیا جی ہاں ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔ جنرل صاحب فوراً بولے "بس تو پھر آپ میرا خیال رکھیں میں آپ کا خیال رکھوں گا" اس پر میں نے کہا "جنرل صاحب آپ بڑے آدمی ہیں آپ تو میرا خیال رکھ سکتے ہیں۔ میں آپ کے مقابلے میں چھوٹا آدمی ہوں میں آپ کا کیا خیال رکھ سکتا ہوں؟" جنرل صاحب نے کہا "آپ میرا خیال اس طرح رکھ سکتے ہیں کہ آپ کے حلقے میں ہیڈ بلوکی کے قریب ہماری زمین ہے اس کا خیال رکھیں"۔

میں نے فوراً جواب دیا "جنرل صاحب آپ کے کسی نامعقول کارندے نے آپ کی زمین پر بڑی گڑبڑ پھیلا رکھی ہے ...... خواہ مخواہ آپ کا جھوٹا نام لے کر اس نے محکمہ انہار کے چھوٹے افسروں سے موگہ بڑا کروا لیا ہے۔ میں نے اس کی رپورٹ کر دی ہے انشاءاللہ میں آپ کی زمین کا مزید خیال رکھوں گا"

جنرل صاحب بولے "واہ آپ اچھا میری زمین کا خیال رکھ رہے ہیں۔ آپ کو شکایت نہیں کرنی چاہیے تھی"۔ بہرحال میں نے جنرل صاحب کی زمین پر تاوان بھی ڈالا ..... معر کو بھی ٹھیک کرایا۔ میرے محکمے والے کہہ رہے تھے اب آپ کا تبادلہ بھی ہو جائے گا اور مزید ..... میں نے جواب دیا انشاء اللہ میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ سو ایسا ہی ہوا ..... البتہ 1958ء میں جب جنرل صاحب مارشل لاء میں ملک کے وزیر مہاجرین بنے تو اس وقت موصوف نے مجھے بلایا اور کہا کہ منظور صاحب جس طرح آپ سخت آدمی تھے کاش اس طرح تحصیل دار بھی سخت ہوتا اور میری زمین کے تاوان کی رقم مجھ سے وصول کرتا۔ اب مجھے ساری رقم ڈھائی لاکھ کے قریب یک مشت دینی پڑی ہے۔

عرض یہ ہے کہ میں نے محکمہ انہار سے متعلق وہ واقعات اس لئے بیان کئے ہیں کہ محکمہ انہار کی انجینئرنگ سائڈ پر بھی بہت رشوت چلتی تھی اور مجھے امید ہے کہ انور سدید یقیناً رشوت نہیں لیتے ہوں گے تو انہوں نے بھی اس طرح بڑے بڑے آدمیوں کو بگاڑا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں اگر آدمی اپنی جگہ صاف ستھرا ہے تو وہ بہت مضبوط بھی ہوتا ہے۔ اس میں حق گوئی کی عادت اپنے کمال پر ہوتی ہے۔ رہا انور سدید کے لکھنے پڑھنے کا میدان تو وہ اس میں بلاخوف تردید شہسوار اعظم ہیں۔ اور اس عمر میں جتنا وہ لکھتے پڑھتے ہیں کم از کم میں اپنے میں اتنی ہمت نہیں پاتا لیکن شعر کہنا آسان ہے وہ میں کہتا رہتا ہوں تحقیقی اور انشائی انداز کی نثر بھی لکھی جا سکتی ہے۔ لیکن اس عمر میں مختلف جرائد و رسائل کو پڑھنا، ادب و شعر کی کتابیں پڑھنا اور پھر بات پڑھنے تک کی نہیں ان پر کچھ لکھنا بھی یہ سب کام سرانجام دیتے ہیں یقیناً انور سدید کسی جوان سے کم نہیں۔ میرے پاس بھی خاصے مختلف قسم کے جرائد و رسائل آتے ہیں اول تو کچھ کو پڑھنے ہی کی ہمت نہیں ان پر تبصرہ کرنا تو بڑی بات ہے۔ اور انور سدید صاحب یہ بڑی بات اکثر کرتے رہتے ہیں میں تو صرف حیران ہی ہوتا رہتا ہوں اور دل ہی دل میں انہیں داد بھی دیتا ہوں اللہ انہیں جزائے خیر دے آمین!

ڈاکٹر وزیر آغا کے حوالے سے سرگودھا کے دوسرے لکھنے والے عام لکھنے والوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے اس لئے میں ان اہل قلم کو سرگودھا کا لکھاری تو لیا کرتا ہوں البتہ انور سدید اور غلام الثقلین مرحوم یہ وہ اہل قلم ایسے ہیں جن کے کام کو سامنے رکھ کر ہم ان لکھاریوں نے کو دبستان سرگودھا کا نام دے سکتے ہیں ..... بلکہ ہم اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دبستان سرگودھا سارے کا سارا انور سدید کے دم قدم سے چل رہا ہے۔

باقی میری سمجھ میں ابھی تک یہ بات نہیں آئی کہ وزیر آغا نے انور سدید پر کیا جادو کیا ہے کہ وہ ان کی طرف داری کے ادھار کھا کے بیٹھے رہتے ہیں۔ میں یہ بھی کہنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ دال میں کچھ کالا کالا ہے البتہ یہ ضرور کہہ سکتا ہے کہ دال میں کچھ زیادہ ہی سفید سفید نظر آتا ہے۔ یقیناً لڑکپن میں ڈاکٹر وزیر آغا رنگ قلاں ہوں گے اور انور سدید لڑکپن میں صرف سانولے سلونے انور سدید ہوں گے۔ آگے میں کیا عرض کروں ہاں جہاں تک لوگوں کا یہ کہنا ہے جس کی طرف خود انور سدید کئی بار اشارہ کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے ذکر نے انہیں غالباً شہرت کے اعتبار سے بہت پیچھے کر دیا۔

میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر انور سدید کا یہ احساس تو نہیں ہاں ان کی اپنے بارے میں غلط معرفت ضرور ہے ..... وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے ذکر نے ایک طرف انور سدید کی شخصیت کو نقصان ہی پہنچایا ہے۔ اگر انور سدید نے ان دونوں حضرات کا اس شدومد کے ساتھ ذکر نہ کرتے تو اس سے انور سدید کی ذات میری نظر میں زیادہ مضبوط ہوتی۔ انور سدید اپنی جگہ ایک مضبوط شخصیت کے مالک ہیں۔ مگر بلاوجہ

موصوف نے ان دونوں کو الٹ دی۔ میرے اس کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ دونوں حضرات انور سدید کے تذکرے کے محتاج تھے یا انور سدید نے بھی کبھی ایسا نہیں سوچا ہوگا۔ ویسے چونکہ احمد ندیم قاسمی صاحب کے ساتھ معاملہ مختلف انداز کا تھا اس لئے اگر تو ان مانیں بلکہ میری بات پر غور فرمائیں تو میں عرض کروں گا کہ قاسمی کے ضمن میں انور سدید خواہ مخواہ ہی الجھتے رہتے ہیں مثلاً جب قاسمی صاحب نے مجید نظامی صاحب کو یہ لکھا کہ انور سدید کو نوائے وقت سے نکال دیں لیکن مجید نظامی نے الٹی ان کی تنخواہ بڑھا دی تو انور سدید نے قاسمی صاحب کا شکریہ ادا کیا یہ شکریہ مسلسل کئی مہینے ہوتا رہا۔ اگر انور سدید کی جگہ میں ہوتا اور قاسمی صاحب میرے ساتھ یہ سلوک کرتے تو میں اسی وقت ان کے پاس جاتا اور انہیں خوب سنا کر آتا اور کہتا حضرت آپ نے تو اپنی سی کر لی نتیجہ کیا ہوا ــــ بس آپ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے نا؟ اسی طرح انور سدید میرے ضمن میں بھی انشائیہ کے ذکر پر باز نہیں رہتے۔ دیکھئے تخلیق اکتوبر 2008ء کے شمارے میں انجمن خیال میں انور سدید رقم طراز ہیں کہ منظور حسین یاد اگر ایسی بات تخلیق میں کیوں لاتے" ہیں؟ حالانکہ میں نے صاف صاف لکھا تھا کہ میں تخلیق میں یہ بات اس لئے لا رہا ہوں کہ الحمرا کے شاہد علی خان امریکہ چلے گئے ہیں دو ماہ بعد پاکستان آئیں گے اتنے میں جواب دینے میں کیوں تاخیر کی جائے مگر انور سدید صاحب نے میرا خط غور سے نہیں پڑھا۔ الحمرا میں اگر شاہد علی خان میری ہر تحریر چھاپ دیتے ہیں تو وزیر آغا کے حواریوں کی بھی تو ہر تحریر چھاپ دیتے ہیں اور پوری بات کہ شاہد علی خان یہ سب کچھ انور سدید کا لحاظ کرتے ہوئے کرتے ہیں ــــ میں انور سدید کو اس بات پر شاباش دیتا ہوں کہ وہ وزیر آغا کی کے وقت نہیں ان کے حواریوں کو بھی سہارا دینے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے۔ ورنہ غلام الثقلین مرحوم نے مجھے خود کہا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی اوراق کے لئے تو کام خوب کرتا ہے لکھنے لکھانے میں اتنا مضبوط نہیں۔ غلام الثقلین مرحوم ہی مجھے کہا کرتے تھے منظور صاحب آپ انشائیے لکھتے رہیں اور ڈٹ کر لکھتے رہیں جس طرح آپ کے انشائیے فکر انگیز ہیں اس طرح کے انشائیے اور کوئی دوسرا نہیں لکھ رہا۔ ہاں تو میں انور سدید کے بارے میں لکھ رہا تھا کہ وہ کس طرح تعصب کی بنا پر میرے انشائیوں پر داد دیتے ہوئے صرف بخل سے کام ہی نہیں لیتے اپنی بدنیتی کا بھی ثبوت دیتے ہیں اسی تخلیق کے شمارہ اکتوبر کے حصہ انجمن خیال صفحہ 154 پر لکھتے ہیں۔ میں ان کا (یعنی منظور حسین یاد کا) انشائیہ عالم شوق پڑھ کر اتنی کے پیٹے میں پر اعمال کیا ہوا تھا اب میں موصوف کو یہ بتاؤں کہ انشائیے کے بارے میں یہ بات بہت مشہور ہے کہ انشائیہ چالیس سال کے بعد لکھنا چاہیے یوں انشائیہ کو پڑھنے کے لئے اسی کے پیٹے ہی کی ضرورت ہے مگر انور سدید آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "میں ان کی (یعنی منظور حسین یاد کی) غزلیں احترام سے پڑھتا ہوں لیکن انشائیے احتراماً نہیں پڑھتا۔ میری گزارش ہے کہ جب آپ پڑھتے ہی نہیں ہیں تو پھر آپ کا یہ کہنا صدق صد درست ہے کہ میرا انشائیہ آپ کا کیا بگاڑ سکتا ہے آورنہ میری جان انور سدید! میرا انشائیہ اگر آپ غور سے اور احترام سے پڑھیں تو یقیناً آپ کو بہت فائدہ ہو۔ جمیل جعفری مرحوم نے میرے انشائیوں کا مجموعہ "بات کی اونچی ذات" پڑھ کر یہ کہا تھا کہ منظور صاحب آپ کے انشائیوں نے میری عمر کم از کم تین سال بڑھا دی۔ آگے اسی خط میں انور سدید مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ "وزیر آغا نے خیال پارے میں جو سند عطا کی ہے اسی پر اکتفا کروں۔ انور سدید ذرا اسی طرح گوش گزار فرمائیں کہ وزیر آغا مجھے کیا سند عطا کریں گے وہ تو آج تک اتنی سی بات نہیں سمجھ سکے کہ مونتانے نے "ایسے" (Essay) کا لفظ اسعی (کوشش کرنا) سے لیا تھا اور لفظ انشائیہ بھی عربی کے لفظ سے لیا گیا ہے جس کے معنی تخلیق کے ہیں۔ لہٰذا ہم اردو والوں نے جو "ایسے" کے لئے انشائیہ کا لفظ اپنایا ہے یہ لفظ ایسے سے زیادہ معنی خیز اور وسیع ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں وزیر آغا نے انشائیہ کے لفظ کو فروغ دینے میں

بہت کام کیا لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے لفظ انشائیہ کو پورے "اپنے" پر منطبق کرنے کے بجائے "پر عل اپنے" تک محدود کرنے پر زور دیا جس سے ایک طرح انہوں نے انشائیہ کا گلا گھونٹنے کی کوشش فرمائی ہے شکر ہے میں نے انشائیہ کو پورے "اپنے" کی جگہ قرار دیا اس لئے میرے انشائیے وزیر آغا اور ان کے حواریوں کے انشائیوں سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر ہیں۔ میں دوبارہ کہہ رہا ہوں کہ انشائیہ کا لفظ پورے "اپنے" کے لئے نہایت موزوں ہے اور اگر وزیر آغا "پر عل اپنے" کو اپنے سمجھتے ہیں تو وہ اس کے انشائیہ کے علاوہ اور کوئی دوسرا لفظ تلاش کریں۔ مزید حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک طرف وزیر آغا میرے انشائیہ کو اس لئے انشائیہ نہیں کہتے کہ اس میں فکری گہرائی ہے جس کی وجہ سے میرا انشائیہ سنجیدہ اور فلسفیانہ ہو جاتا ہے دوسری طرف ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں "انشائیہ کا مقصد ذہن کو تازہ دم کرنا ہے" تو کیا فکر کے بغیر ذہن تازہ دم ہو سکتا ہے؟ — میرا خیال تھا کہ وزیر آغا اور ان کے حواریوں کے سرخیل حضرت قبلہ انور سدید صاحب ایک نہ ایک دن انشائیہ کی اصل حقیقت کو سمجھ لیں گے اور جیسے ہی انشائیہ کی اصل حقیقت کو سمجھیں گے ان پر میرے انشائیوں کی اہمیت واضح ہو جائے گی۔ مگر افسوس ہے کہ ابھی تک وزیر آغا اور انور سدید اتنی بات نہیں سمجھ سکے۔ معلوم نہیں وہ کون بے خبر اور بے بصر حضرات ہیں جو وزیر آغا کی سند کو بقول انور سدید فریم کرا کے گھر میں لٹکاتے ہیں! ویسے معاشرہ میں بے وقوف لوگوں کی ضرورت تو ہوتی ہے۔ — بہر حال وزیر آغا اور بہت سے باتوں میں مجھ سے بڑے ہوں گے لیکن وہ انشائیہ مجھ سے اچھا نہیں لکھتے اسی لئے مستقبل میں ان کی جگہ مجھ سے دوسرے نمبر پر ہوگی۔ اکثر مجھے اہل دانش دسویں صدی کا سب سے بڑا انشائیہ نگار یونہی تو نہیں کہتے۔ شاعری میں ممکن ہے وزیر آغا اچھی نظم کہتے ہوں وہ غزل اتنی اچھی نہیں کہتے۔ انور سدید اکثر وزیر آغا سے اچھی اور بہتر غزل کہتے ہیں۔ اسی طرح وزیر آغا صاحب کو میرے انشائیہ پر ایک اعتراض ہے کہ وہ اصلاحی رنگ لئے ہوتا ہے۔ میں اب وزیر آغا صاحب کو کس طرح سمجھاؤں کہ اصلاح ایک بڑی چیز ہے انقلاب سے بہت بڑی — انقلاب تو درہم برہم کرنے کا نام ہے اور اصلاح ازماضی میں جو اچھی باتیں انسان کر چکا ہے انہیں سنبھالا جائے اور ناقص اور بری باتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ بہر حال تعصب کو ایک طرف رکھ کر اگر میرے انشائیہ کو دیکھا جائے تو میرے انشائیہ میں وہ سب کچھ ہے جو یہ حضرات چاہتے ہیں — مگر سمجھنے سمجھانے کی بات بھی انور سدید ہی سے کی جا سکتی ہے۔

◆◆◆

شفیع عقیل

"جن لوگوں سے زندگی میں سرسری سے تعلقات رہے ہوں، اُن کے بارے میں لکھنا یا تاثرات کا اظہار کرنا آسان ہوتا ہے لیکن جن سے برسوں سے دوستانہ مراسم اور برادرانہ روابط کا سلسلہ ہو اُن کے متعلق کچھ تحریر کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، کم از کم میرے لئے بہت مشکل ہے۔ اگر کسی کے بارے میں لکھا جائے تو ایسے کہ اپنے خدوخال کے ساتھ شخصیت کی تصویر کشی ہو۔ اس کے لئے وقت درکار ہے لہٰذا مجھے اظہر جاوید مرحوم کی مغفرت کی دعا میں شریک کیجیے۔ اللہ اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!"

جمیل الدین عالی اور ان کی شاعری

ڈاکٹر انور سدید

آزادی کے بعد اردو غزل میں جو معروف آوازیں ابھریں ان میں ناصر کاظمی، ابن انشاء، شہزاد احمد اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے ساتھ جمیل الدین عالی کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ اور اس اہمیت کا خصوص یہ ہے کہ ان شاعروں نے غزل کے مروجہ اسلوب سے ہٹ کر سوچنے اور اس قدیم ترین صنف کے علائم و رموز کو تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اس تجربے کو جو برصغیر کی تقسیم عظیم کے ساتھ منسلک ہے، جو ہجرت اور قتل و غارت گری سے پیدا ہوا تھا، غزل کے بطون میں سمونے کی کامیاب سعی کی۔ نئے علائم و رموز میں زندگی کے متنوع موضوعات آ گئے تھے اور ڈاکٹر وزیر آغا نے اس تبدیلی کی اپنی معرکہ آرا کتاب "اردو شاعری کا مزاج" میں اس لیے اہمیت دی کہ اردو غزل ایرانی مرغزاروں سے نکل کر برصغیر کی دھرتی پر چہل قدمی کرنے لگی تھی۔ انتظار حسین نے حیرت کا اظہار کیا کہ یکایک تقسیم کے فوراً بعد شاعری کا چلن کیسے بدل گیا اور محمد حسن عسکری کے حوالے سے ناصر کاظمی کی پیدائش کا مژدہ سنایا تو اس سے مسرت کا یہ پہلو بھی نکالا کہ میرا جی، ن۔ م۔ راشد اور فیض احمد فیض کے باوصف اردو غزل ابھی اتنی بانجھ نہیں ہوئی ہے کہ اس کے آنگن میں نئے پھول نہ کھل سکیں۔ چنانچہ اب جو نئے پھول کھلے ان کی خوشبوئیں الگ تھیں۔ وجہ یہ کہ ایک جیسے ماحول میں پروان چڑھنے کے باوجود یہ پھول ایک بیج سے نہیں اُگے تھے۔ ان کو ہواؤں نے مختلف تجربوں سے آشنا کیا تھا اور ان کے مشاہدوں میں بھی یکسانیت نہیں تھی۔ لیکن ان کے چاروں طرف زمانہ جو کروٹ لے رہا تھا وہ یکساں نوعیت کا تھا۔ چنانچہ دنیا سے بیگانگی کا رجحان ابھرا۔ مادی قدروں کے خلاف ردعمل پیدا ہوا۔ انسان کی داخلی تباہی اور خارجی سطح کی بے دردمندی کا احساس بیدار ہوا اور سب سے اہم یہ کہ میر تقی میر کا وہ انداز جس میں درد مندی بھی تھی اور نرم مزاجی بھی، اب ایک نئے روپ میں غزل کی وسعت میں شامل ہو گیا۔ غزل میں دوسرا امتیاز دوہے کے اسلوب سے ہوا جس کی قدیم روایت عبدالرحیم خان خاناں کے دور سے چلی آ رہی تھی لیکن انتظار حسین کے بقول اردو کی شعری دنیا میں کبیر بانی کو تج گئی تھی۔ محمد حسن عسکری نے آزادی کے بعد دوہا نگاری کی صورت جمیل الدین عالی کی شاعری میں دیکھی تو ان کی انفرادیت کا فتویٰ ان الفاظ میں دیا:

> "عالی نے ہندی شاعروں کے خیالات اور روایات کا اعادہ کرنے کی بجائے اپنا ذاتی تجربہ پیش کیا ہے۔ یعنی عالی کے دوہوں میں اسالیب بھی خود ان کے ہیں اور اکثر مضمون بھی۔ لہٰذا عالی کے دوہوں کا تلسی داس اور کبیر کے دوہوں سے مقابلہ و موازنہ کافی نہیں۔"

اور جب عالی نے غزل کہی تو اس میں دوہے کا مزاج موجود تھا۔ بالفاظ دیگر غزل پر دوہے کے اثرات عالی کی غزل میں نمایاں نظر آتے ہیں اور یہ انکشاف ہے تو اسے حسن عسکری کی تنقیدی نظر کا فیضان قرار دینا چاہیے۔

ایسے لگتا ہے وہ جیسے ہم سے بہت مایوس ہوئے   جیسے پہلے ہم وہ نہیں تھے جو اب جانے جاتے ہیں

ہاں اس پاپ گھر میں سب آتے ہیں لیکن فرق یہ ہے　　　لوگ تو چھپ کر چل دیتے ہیں، ہم پہچانے جاتے ہیں

یا تو بس تم بھا گئے اس کو یا اسے کوئی غم کھاتا ہے　　　ورنہ ہم واقف ہیں اس سے، وہ بھی ایسی تھی ہی نہیں

عالیؔ جس کا فن تھا سخن میں ایک انداز نرالا تھا　　　کچھ سخن میں ذکر یہ آیا وہ بے چڑھنے والا تھا

جمیل الدین عالی نے اپنی تخلیقی اور احساسی زندگی کا تذکرہ آپ بیتی کی صورت میں اس طرح نہیں لکھا جس طرح ڈاکٹر وزیر آغا نے اپنے فکری عمل کو اپنی نظموں سے "شام کی منڈیر سے" میں بازیافت کیا ہے۔ لیکن مجھے ان کے مختلف اخباری انٹرویوز سے اتنا معلوم ہے کہ 1947ء میں جب پاکستان بنا اور برصغیر سے انگریز رخصت ہوا تو جمیل الدین عالی کی عمر ساڑھے اکیس سال ہو چکی تھی اور وہ شاعری میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس زمانے میں مظہر انصاری دہلوی نے ان کی ایک غزل کسی دوسرے ادبی رسالے سے تراش کر لاہور کے ممتاز رسالہ "ہمایوں" میں جس کے وہ معاون مدیر تھے۔ "روحِ ادب" کے کالم میں شائع کی تو جمیل الدین عالی نے انہیں ایک خط لکھا جس میں تشکر اور ممنونیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا گیا:

> "ہمایوں" جیسے بڑے رسالے میں اس ہیچمدان کی غزل کی اشاعت کے لیے منتخب کر کے ایک نو وارد ادب پر آپ نے بہت احسان کیا ہے۔ یہ ناچیز ابھی شہرت کی ابتدائی منزل پر ہے اور جب مستقبل میں کامیابی اس کے قدم چومے گی تو وہ "ہمایوں" کے اس احسان کو ہرگز نہیں بھولے گا کہ اس نے ابتدا میں اس کی انگلی پکڑی تھی۔"

یہاں جمیل الدین عالی کے اس خط کا تجزیہ مقصود نہیں۔ تاہم یہ عرض کرنا ضروری ہے کہ عالی شاید اپنی اپنی صلاحیتوں سے آگاہ تھے۔ اور انہیں احساس تھا کہ مستقبل ان کی طرف خندہ پیشانی سے پیش قدمی کر رہا ہے۔ ان کی زندگی کا گوشوارہ اس کی پوری تائید کرتا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

جمیل الدین عالیؔ نواب سر امیر الدین والیٔ لوہارو کے ہاں یکم جنوری 1926ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ لوہارو چھوٹی سی ریاست تھی لیکن سرکارِ انگلیشیہ کے دور میں اس نے اپنی تہذیبی شان برقرار رکھی اور نئے علوم کا خیر مقدم کیا۔ جمیل الدین نے اینگلو عربک کالج دہلی سے 1944ء میں بی اے کیا اور پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا تو 1947ء میں کراچی آ گئے۔ اور وزارت تجارت میں ایک معمولی اسسٹنٹ کی حیثیت میں عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اس ملازمت پر انہوں نے ناآسودگی محسوس کی تو وفاقی حکومت میں اعلیٰ عہدہ حاصل کرنے کے لیے مقابلے کے امتحان کی تیاری کرنے لگے۔ کامیابی کے بعد انہیں 1951ء میں پاکستان ٹیکسیشن سروس میں افسر فائز کیا گیا۔ 1959ء میں ایوان صدر میں افسر بکارِ خاص لگائے گئے۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کے سیکرٹری کی خدمات کے علاوہ وزارت تعلیم میں کاپی رائٹ رجسٹرار کے عہدے پر بھی کام کرتے رہے۔ 1966ء میں سرکاری ملازمت ترک کر دی اور 1967ء میں نیشنل بینک آف پاکستان میں چلے گئے۔ اور سینئر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ کے عہدے تک پہنچے۔ وہاں سے ممبر ایگزیکٹو بورڈ کے عہدے پر ترقی پا کر پاکستان بینکنگ کونسل میں پلاننگ اینڈ

اوڈیولپمنٹ ایڈوائزر مقرر ہوئے۔ 1960 میں پاکستانی مندوب کی حیثیت میں عراق گئے اور مشرق وسطیٰ کے ممالک کی سیاحت کی۔ 1961 میں یونیسکو فیلوشپ ملی۔ اس سلسلے میں انھیں یورپ امریکہ اور مشرق بعید کے ممالک کا دورہ کرنے کا موقع ملا اور انھوں نے اپنے مشاہدات سفرناموں میں سمیٹے۔ عالی صاحب نے 1962 میں ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) میں منعقدہ ایک بین الاقوامی سیمینار میں پاکستانی مندوب کے طور پر شرکت کی۔ 1973 کے سال کو وہ مقدس ترین شمار کرتے تھے کہ اس برس انھیں حج بیت اللہ شریف اور زیارت روضہ نبوی کی سعادت نصیب ہوئی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ زندگی کی نصف صدی گزار کر ان کے دل میں نوجوان طالب علموں کی طرح یونیورسٹی کا امتحان دینے کا شوق در آیا۔ چنانچہ انھوں نے 1971 میں جامعہ کراچی سے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا لیکن قانون کی باقاعدہ پریکٹس سے گریز کیا۔ ان کا اعزاز بھی ہے کہ 1960 سے 1983 تک پاکستانی مندوب کی حیثیت میں تین مرتبہ روس اور تین مرتبہ چین گئے اور پانچ مرتبہ امریکہ کا دورہ کیا۔

جمیل الدین عالی کا دماغ خیالات و تصورات کا مخزن تھا۔ ان کے افکار کی جہات متنوع تھیں۔ مثال کے طور پر انھوں نے پاکستان میں ادیبوں کی سماجی فلاح و بہبود کے لیے "رائٹرز گلڈ" قائم کیا اور اس کے لیے وفاقی سیکرٹری قدرت اللہ شہاب کی معاونت حاصل کی جو فوجی حکمران ایوب خان کے دور میں ایوان صدر میں ایک اہم با اختیار شخصیت تھے۔ عالی صاحب 1959 میں پاکستان رائٹرز گلڈ کے روز قیام سے لے کر 1967 تک اعزازی مرکزی سیکرٹری اور 1970 سیکرٹری جنرل کے عہدے پر فائز رہے۔ اس تمام عرصے میں انھوں نے مشرقی اور مغربی پاکستان ادیبوں میں اخوت اور بھائی چارے کی فضا پیدا کرنے کی سعی جاری رکھی۔ 1951 میں انجمن ترقی اردو پاکستان کے رکن منتظمہ منتخب ہوئے۔ 1967 میں اردو کالج کراچی کے ساتھ وابستہ ہوئے اور اس کے قومیائے جانے تک معتمد اعزازی کی خدمات انجام دیتے رہے۔ مرکزی اردو بورڈ لاہور (ترقی اردو بورڈ کراچی) اور نیشنل بک کونسل آف پاکستان کی انتظامیہ کے علاوہ کاپی رائٹ ٹریبونل کے بھی اعلیٰ رکن بنائے گئے۔ جنرل ضیاء الحق نے "مقتدرہ قومی زبان" تشکیل دیا تو اس کی مجلس نظماء میں عالی صاحب کو بھی شامل کیا گیا۔ اردو یونیورسٹی کا قیام ان کی زندگی کا ایک اور کارنامہ ہے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کا خواب انھوں نے پاکستان رائٹرز گلڈ کے زمانے میں دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر ذوالفقار علی بھٹو کے دور حکومت میں سامنے آئی لیکن انھوں نے عالی صاحب کو شریک تعبیر نہ کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ ادبی معاشرے میں بے حد سرگرم اور بے حد کامیاب تھے۔ لیکن پاکستان کی قومی سیاست کے مرد میدان نہیں تھے۔ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر جماعت اسلامی کے راہنما سید منور حسن کے خلاف انتخاب لڑا لیکن ہار گئے۔ بعد میں ایم کیو ایم نے انھیں ایک نشست پر سینیٹر منتخب کرایا۔ جمیل الدین عالی کے اخباری "اظہاریے" ان کی زندگی کے آخری ایام تک روزنامہ "جنگ" میں چھپتے رہے۔ انجمن ترقی اردو پاکستان سے چھپنے والی ہر کتاب کا پیش لفظ (حرفے چند) وہ خود لکھتے تھے اور اس سے ان کے وسیع مطالعے کی خوشبو آتی تھی۔ میری ضخیم کتاب "اردو ادب کی تحریکیں" چھاپنے پر اس دور کا کوئی تجارت پیشہ ناشر آمادہ نہیں تھا۔ مشفق خواجہ صاحب نے اسے اشاعت کے لیے منتخب کیا تو اس کا "حرفے چند" بھی جمیل الدین عالی نے لکھا اور میری محنت کی نہ صرف داد دی بلکہ ہر ایڈیشن کی اشاعت کے ساتھ ہی قواعد و ضوابط کے مطابق رائلٹی کی ادائیگی کا اہتمام بھی کیا۔ میں یہ بات بھی ریکارڈ پر لانا چاہتا ہوں کہ آٹھویں ایڈیشن کی اشاعت پر عالی صاحب نے جناب جاوید منظر صاحب کو چیک دے کر لاہور بھیجا تھا۔ ان دنوں وہ جان لیوا بیماری کے دور سے گزر رہے تھے اور شاید اس قدر شدت میں مبتلا ہو گئے

تھے کہ کثیر رقم کا یہ چیک "محفوظ لاک" میں بھی گم ہو سکتا تھا۔

جمیل الدین عالی کی زندگی کا یہ گراف اول تا آخر عمودی سمت میں بڑھتا نظر آتا ہے۔ انہوں نے نوے سے زیادہ برس کی عمر پائی۔ ہندوستان سے پاکستان ہجرت کے بعد شعر و ادب کے ذوق کو بھی قائم رکھا اور سیاحت میں بھی دلچسپی پیدا کی۔ اس کا ثمر ان کے سیاحت نامے ہیں جن میں دنیا کی نامور شخصیات سے ملاقاتوں کا احوال، مناظر اور اداروں کا مطالعہ ان کی زیرک نگہی کا آئینہ دار ہے۔ وہ زندگی کے گھمسان سے گزرے اور اتنی ہنگامہ خیز زندگی بسر کی کہ اس دور کا کوئی دوسرا شاعر یا ادیب ان کی فعالیت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اہم بات یہ کہ سرکاری نوکری، بینک کی کل وقتی ملازمت، مجلے کے جزر و مد اور پاؤں میں چکر میں مسلسل مبتلا رہنے کے باوجود انہوں نے شاعر کے منصب کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ دوہے کی قدیم صنف میں ان کے جس تجدد کا ذکر اوپر آ چکا ہے اسی سے اپنا تشخص بھی قائم کیا۔ اور غزل کی کایا پلٹنے میں ایک خاص کردار ادا کیا تو جدید نظم میں بھی اپنا مقام آپ پیدا کیا۔

جمیل الدین عالی کی شاعری میں عشق بنیادی موضوع کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کے دوہوں، غزلوں، نظموں اور گیتوں میں گوشت پوست کی ناری اپنی صورت وہ پنے کی اوٹ سے دکھاتی ہے۔ یہ ایک بھرپور عورت ہے۔ رس سے بھری ہوئی اور اپنے اندر کے جذبوں سے پوری طرح آشنا۔ جمیل الدین عالی نے اس عورت پر ایک سیر حاصل نظر ڈالی اور اس سے شکتی اور شانتی حاصل کی۔ اور بعض مقامات پر تو یہ احساس ہوتا ہے کہ جمیل الدین عالی کی پریم بانی میں عورت تو محض ایک استعارہ ہے، دراصل عالی نے بھکشوؤں اور تپیا کرنے والے جوگیوں کی طرح زندگی بسر کی ہے اور ان کی روح عمودی سمت میں پرواز کر کے ذات مطلق تک پہنچنے میں کوشاں ہے۔ انہوں نے اپنے ذمے جو کام لے رکھا ہے وہ محبت کرنا ہے۔ اور وہ فیض کی اس تقسیم کبیر میں بھی کبھی داس نظر آتے ہیں۔ بھگت کبیر اور شنواوگی کے باوجود اعتراف کرتے ہیں:

کوئی کہے مجھے نانک پنتھی، کوئی کبیر کا داس
یہ بھی ہے مرا مان بڑھاوا، ہے کیا میرے پاس

اور قلندری رنگ ابھرا تو ان کی زبان پر اس قسم کے اشعار کثرت سے آنے لگے۔

اپنا کام ہے صرف محبت، باقی اس کا کام
جب چاہے وہ روٹھے ہم سے، جب چاہے من جائے

ہم نے صحرا میں بھی رہ کر یہ پکارا ہے
کتنے خیموں کے جھلکنے کی صدا آئی ہے

اور اک محفل اور ہر محفل ناریوں سے بھرپور
پاس بھی ہوں تو جان کے بیٹھیں عالی سب سے دور

اور ناری سے دور بیٹھنے کا خیال شعر میں سما گیا ہے تو اس سے باور کیا جا سکتا ہے کہ عالی عورت کی بے بسی پر آنسو بہائے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ ان کے ہاں محبوب سے گریز کی صورت نظر نہیں آتی۔ لیکن وہ معاشرے میں اس کی سربلندی کے خواہاں بھی تھے اور جب عورت کو "اس بازار" کی زینت بنایا جاتا تو عالی ساحر لدھیانوی کے انداز میں دہائی دیے بغیر نہ رہتے کہ یہ شرم و حیا کی ہم جنس، رادھا کی بیٹی، تقدیس مشرق کے ثنا خوانوں سے مدد چاہتی ہے۔ عورت کی بے حرمتی پر ان کے ہاں ایک خاص نوع کا احساس ملال پیدا ہوتا اور دردمندی کی لہر ابھرے بغیر نہ رہتی۔ یہ دردمندی ان کی شاعری کے پہلے مجموعے "غزلیں دوہے گیت" میں نمایاں ہوئی اور "لاحاصل" کے بعد "اے مرے دشت سخن" میں بھی اپنی جھلک دکھاتی رہی ہے۔

بچے گھل کی بانی آئی، رات ہمارے پاس ہونٹ پہ لاکھا، گال پہ لالی، آنکھیں بہت اداس

تیس روپے میں تین تھیں اس کے دن لیے دلال اتنا مہنگا شہر اور اس میں اس میں اتنا سستا مال

جمیل الدین عالی کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے انسان کے بنیادی گناہ کا اعتراف کیا اور اسے پہلے "گناہ" کے ساتھ قبول بھی کیا۔ چنانچہ وہ "پہلا پتھر" مارنے کی بجائے اس انسان کو تلاش کرتے ہیں جو گناہ گار نہیں ہے" لیکن گناہ کا یہ تصور انھوں نے برصغیر کی دھرتی" میں بھی مشاہدہ کیا تو پکار اٹھا: "دیکھا ان کی اس سرزمین میں ناری کہاں ہے؟" اور اپنے اسلوب خاص عالی کی کہہ رہے ہیں:

کنوارا جسم اور کنواری آتما ہے، کوئی ایسی نار او بھگوان! اب عالی مانگے نئے نئے اوتار

عالی کی فضا اگرچہ درویشانہ لہجہ رکھتی ہے لیکن اس کا وار بہت کاری ہے اور ان کا کہا دل میں ترازو ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ عالی کی شاعری میں پرانی یادوں کو زندہ رکھنے کا جذبہ بہت نمایاں ہے۔ وہ ماضی کو پوجنے کی بجائے ماضی کی روایت سے اپنا رشتہ برقرار رکھتے ہیں اور تجربے کو صرف اپنی ذات تک محدود رکھنے کی بجائے وسعت دے کر پھیلا دیتے ہیں۔ اس کروش میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان کے تجربے میں ان کا پورا عہد شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوہے اور غزلیں انسان کو اس وقت آواز دیتے ہیں جب وہ دکھ میں مبتلا اور آزار سے دوچار ہوتا ہے۔ اور اسے عالی صاحب سے مرہم حاصل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کے مقامات انھوں نے "انسانیات" کی شاعری کی ہے اور انسان کے داخل میں ایک اور مثالی انسان کا مشاہدہ کیا ہے

عالی کی باتیں مت سنتا، گھاتیں اس کی لاکھ بات کریں اقبال کی لیکن اپنی بڑھائے ساکھ

جب بھی گیت شودن کے گائے، بیچے ساتھ ضمیر اپنے لیے آزادی چاہے، سب کے لیے زنجیر

جمیل الدین عالی کی طویل نظم "انسان" میں ان کا موضوع منفرد اور لہجہ بے حد اثر انگیز ہے۔ قومی نغمہ نگاری ان کی شاعری کا ایک الگ زاویہ ہے اور اس میں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اور اب دکھ کے شدید احساس سے میں کہہ سکتا ہوں کہ جمیل الدین عالی کی رحلت سے اردو ادب کا ایک اور درخشاں ستارہ ڈوب گیا ہے۔

●●●

صحافی اظہر جاوید کی کتب پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو عطیہ کر دی گئیں

لاہور (سپیشل رپورٹر) پنجاب یونیورسٹی مین لائبریری کو صدارتی ایوارڈ یافتہ معروف شاعر و ادیب، صحافی اور ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر اظہر جاوید (مرحوم) کے ورثاء کی جانب سے ان کا ذاتی ذخیرۂ کتب عطیہ کر دیا گیا ہے، جس میں ہندو پاک سے چھپنے والی نایاب کتب اور جرائد و رسائل کی تعداد تقریباً 2 ہزار ہے۔ چیف لائبریرین چوہدری محمد حنیف کے مطابق پنجاب یونیورسٹی لائبریری کو ملنے والا یہ 28 واں بڑا ذاتی ذخیرۂ کتب ہے جبکہ چھوٹے ذخائر کی تعداد اس کے علاوہ ہے۔

(روزنامہ "نوائے وقت" / "نئی بات" لاہور 30 جون 2012ء)

نگارِ سخن

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی

بشریٰ رحمن نے امریکہ گئے ہوئے اپنے بیٹے کو اپنی تصویر بھیجی اور لکھا کہ اسے ایسی جگہ رکھنا جہاں سب کو سب سے پہلے نظر آئے اور نظروں کے سامنے رہے۔ کسی کو مت بتانا کہ یہ میری ماں کی تصویر ہے۔ کہنا کہ یہ میری محبوبہ کی تصویر ہے۔ بشریٰ جانتی ہے کہ ماں سے زیادہ محبوبہ کون ہے۔ عورت محبوبہ ہونے اور ماں ہونے کی ہمیشہ منتظر اور مستحق رہتی ہے۔ ماں اپنے بچوں کی پہلی سہیلی ہے۔ وہ شکوہ کرنے کیلئے ماں سے بڑھ کر کون ہے۔

مائے نی میں کینوں آکھاں درد وچھوڑے دا حال

ہجر وصال کی کہانی کو عنوان ماں ہی دے سکتی ہے۔ میرے ساتھ ایک گفتگو میں بشریٰ رحمن نے کہا تھا کہ میں دوسرے جنم میں بھی عورت بننا پسند کروں گی کہ ماں بننا اچھا لگتا ہے۔ اسی لئے اسے محبوبہ ہونا بھی اچھا لگتا ہے۔ محبوب لیڈر، محبوب رائٹر اور محبوب عورت بھی اور مجذوب بھی۔ وہ چند عورتوں میں سے ہے جو قلندرانہ شان رکھتی ہے۔ اندر کا اجالا اس کی آنکھوں میں کئی تجسس بیدار رکھتا ہے۔ وہ اب بھی نجانے کتنے جنموں کے بعد پیدا ہوتی ہے جیسے وہ کئی جیون جی رہی ہے۔ ہر تخلیقی آدمی کی طرح وہ کئی زندگیاں گزار رہی ہے۔ وہ کئی میدانوں میں اتری ہوئی ہے۔ کئی منزلوں پر پہنچنا چاہتی ہے۔

وہ ایک جامع حیثیات عورت ہے۔ افسانہ نگار، شاعرہ، ناول نگار، ڈرامہ نگار، کالم نگار، سفرنامہ نگار۔ وہ بکھر جاتی ہے تو نکھر جاتی ہے۔ جو نکھر جاتی نہیں وہ بکھر جاتی نہیں اس لئے شاعری بھی کی ہے۔ زندگی کے پاس سے گزرتے ہوئے سارے راستوں پر وہ چلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہمارے ملک میں مشہور و معروف اور صاحب ہنر صاحب کمال عورتوں کی جتنی بھی مختصر فہرست بنائی جائے اس میں بشریٰ رحمن کا نام شامل ہو گیا۔

وہ بھی صاحب اسلوب مقرر ہے۔ شاید ہی کوئی عورت اس کے مقابلے میں آئے۔ علمی ادبی سیاسی اور سماجی تہذیبی اور تخلیقی جس موضوع پر چاہو بشریٰ کو بات کرتے دیکھو۔ وہ ایک دل کو چھو لینے والی تاثیر اور دماغ پر چھا جانے والے تاثر کے ساتھ بولتی ہے اور سننے والوں کے اندر کئی دروازے کھولتی ہے پھر بند بھی کر دیتی ہے۔ بشریٰ کے پاس ایک مٹھاس ہے، تازگی ہے اور جذبات کو لبھانے والی ادا ہے۔ وہ ایک اعلیٰ رنگ کی خطیبہ ہے۔ وہ ایک شاندار ادیبہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جو اچھی طرح تحریر لکھ سکتا ہو وہ اچھی تقریر بھی کر سکتا ہو۔ یہ دونوں وصف ایک ساتھ ایک ذات میں کم کم بلکہ بہت ہی کم بلکہ کم سے کم اکٹھے ہوتے ہیں۔ یہ دونوں اور اس کے علاوہ کئی اوصاف بشریٰ رحمن کے جسم و جاں میں جمع ہو گئے ہیں۔ وہ حسین بھی ہے، ذہین بھی ہے۔ اندرونی اور بیرونی جمال کی تقسیم کرنے کا انداز اس کے پاس ہے۔

افسانے ناول میں تو کچھ عورتیں ہیں جن کا نام آسانی اور خوشی سے لیا جا سکتا ہے۔ یا تو قدسیہ، رابعہ حنا، خالدہ حسین، عذرا اصغر، عطیہ سید، سیما پیروز، نیلم بشیر، سلمیٰ اعوان، قیصرہ حیات کے علاوہ بھی کچھ نام ہیں جو مجھے یاد نہیں آ رہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو میں نے پڑھا

ہے اور ایک کیفیت ان کیلئے میرے دل میں ہے۔ بشریٰ رحمن کیلئے بھی ایسی ہی کیفیت میرے پاس ہے۔ اس کی دانش مجھے پسند ہے۔ ظرافت اور جرات اس کے پاس ہے یہ دونوں چیزیں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ ظرافت جو عورت کے اظہار میں ترقی ہے اور جرات نسائی جو اس کی تصویر و تحریر میں جھلکتی ہے میرے لئے بہت پرکشش ہے۔ یہ جو اس طرح جلوہ اور جنون کی صورت میں پیدا ہو تو وہ اسے لبالب بھر دیتا ہے۔ نری دلیری اور صرف دلبری بھی عجیب چیز ہے مگر دلیری اور دلبری کے امتزاج سے کسی عورت کا مزاج بنے اور وہ خوش مزاج بھی ہو تو کمال ہو جاتا ہے۔ بشریٰ تو خوش کلام ہے خوش پوشاک، خوش گفتار، اور خوش لباس ادا ہے۔ اسٹیج پر آنے سے پہلے مرحوم دلدار بھٹی کہا کرتا تھا کہ بشریٰ رحمن دکھائی بھی اچھی دیتی ہے اور سنائی بھی اچھی دیتی ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بشریٰ کی خوش لباسی نمود و نمائش تک چلی جاتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس میں بھی کچھ حرج نہیں۔ آرائش سے ایک آسائش عورت کے وجود میں وجد کرنے لگتی ہے۔ بنا سنورنا عورت کا استحقاق ہے۔ اسے الگ کر کے دیکھا جائے تو لوگ خواہ مخواہ وحشی ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ سنورتی بہت ہے۔ میرے خیال میں یہ بات بھی کچھ اوپری نہیں اپنائیت بھری ہے۔

بشریٰ رحمن ایک پوری عورت ہے۔ آدھی ادھوری عورتیں اس سے بچ بچا کے رہتی ہیں۔ وہ بھی ان کی پرواہ نہیں کرتی۔ عورت کے حوالے سے اتنی خوبیاں بشریٰ میں ہیں تو کچھ خامیاں بھی ہوں گی۔ خامیاں کبھی خرابیاں نہیں ہوتیں۔ بشریٰ رحمن نے ڈرامہ لکھا تو مستقل لکھنے والوں نے اپنی روٹین ٹوٹتی محسوس کی۔ بشریٰ رحمن کے لکھے ہوئے ڈراموں کے ذائقے نے دیکھنے والوں کو ایک مختلف ذائقے سے روشناس کیا۔ خاص کرداروں کے ارد گرد کہانی کا دائرہ بنانا آسان ہے۔ اب یہ دائرہ بھی تنگ ہو رہا ہے۔ بشریٰ رحمن کرداروں کو کھلے راستوں پر لے گئی ہے جہاں عام لوگ بھی چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ وہ جن دنوں پنجاب اسمبلی کی ممبر تھیں تو اسمبلی میں بڑی رونق تھی۔ ان کی تقریریں ایوان میں گونجتی تھیں۔ ان کی بازگشت اب بھی وہاں محفوظ ہے۔ اس نے قائم مقام سپیکر کے فرائض بھی انجام دیے بلکہ سرانجام دیے۔ مجھے خوشی سے سرخوشی اچھی لگتی ہے۔ سرمستی اور سربلندی بھی بلندی اور مستی سے کہیں آگے کی کیفیتیں ہیں بلکہ سرشاریاں ہیں۔ عورت کیلئے محسوسات زیادہ دوستانہ ہیں۔

سپیکر کے اختیارات کا صحیح استعمال بشریٰ رحمن نے کیا۔ اس نے فیصل آباد سے پی پی پی کے ممبر اسمبلی فضل حسین راہی کو ایوان سے نکال باہر کیا۔ منظور وٹو ان دنوں سپیکر تھے اور اپنے خاص سپیکر تھے مگر یہ اقدام کرنے کیلئے بشریٰ رحمن ہی کام آئیں۔ اسمبلی کے طور پر اپوزیشن اور سرکاری بنچوں نے مشترکہ طور پر بشریٰ رحمن کی کارکردگی دیکھ کر انہیں پرائیویٹ ممبرز ڈے پر تحریک پیش کر کے قادر الکلام بلبل پاکستان شیریں بیان کا خطاب دیا۔ بشریٰ نے پنجاب اسمبلی کی تاریخ میں اپنے ہونے کے کئی ثبوت ثبت کئے۔ وزیر ہونا بشریٰ رحمن کی خواہش شاید ہو گی مگر میرے خیال میں وزیر ہونا ایک اعزاز ہو جاتا اگر بشریٰ رحمن کو وزیر بنایا جاتا۔ کیا کبھی پنجاب کابینہ میں ایک وزیر بھی ایسا ہوا ہے جو پڑھا لکھا ہے۔ سچ کا دانشور ہو۔ یہاں تو ایاز امیر جیسے معزز ترین صحافی کو وزیر نہ بنایا گیا۔ اور سرکاری ممبر ہونے کی پاداش میں اس کی زبان بندی بھی کر دی گئی۔ اس نے استعفیٰ دے دیا جو منظور کر لیا گیا۔ دونوں فریقوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ بشریٰ رحمن نے سرکاری بنچوں پر بیٹھے ہوئے یادگار تقریریں کیں اور اپنی موجودگی کو سیاسی آسودگی بنا دیا۔ عابدہ حسین کا وزیر بن جانا تو سمجھ میں آتا ہے۔ اس کا وزیر نہ رہنا بھی سمجھ میں آتا ہے۔ ہمیں تہمینہ دولتانہ کے وزیر ہونے پر بھی حیرت نہیں۔ تہمینہ دولتانہ کو علم ہو گا کہ بشریٰ کو وزیر کیوں نہیں بنایا گیا۔ کیونکہ سیاسی معاملات کو سمجھنے کیلئے وہ بشریٰ رحمن کے پاس پہروں وقت گزارتی تھی۔

بہت لوگ ہیں جو اپنے زمانے میں اپنے شعبے کے خاص لوگ ہیں اور بشریٰ کے معترف ہیں۔ ایک نام تو میری آنکھوں کی دہلیز پر چمکتا ہے۔ اسے جب شہید کیا گیا تو زمین خون آلود ہوئی۔ دلوں کی زمین اشک آلودہ ہوئی۔ سب سے بڑھ کر جو عورت روئی وہ بشریٰ رحمن تھی۔ حکیم سعید جس محبت سے بشریٰ کو بیٹی کہتے تھے یہ اعزاز اس کے سارے مقامات سے اگلا مقام ہے۔ آج بھی ہمدرد شوریٰ کے اجلاس کی صدارت اسے زیب دیتی ہے کہ میں نے اسے حکیم سعید کے ساتھ یہاں بیٹھے ہوئے دیکھا ہے۔ اب وہ ان کی بیٹی سعدیہ راشد کے ساتھ بیٹھی ہوتی ہے۔ محفلوں کا سفر جاری رہتا ہے۔ حکیم سعید اندھیری رات میں تاروں کے جھرمٹ کی طرح تھے۔ کسی نے ایک ساتھ اتنے تارے ٹوٹتے نہ دیکھے ہوں گے۔ تاروں بھری رات اچھی لگتی ہے۔ بشریٰ رحمن کو پھر راتوں کو کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے ایک بار بشریٰ رحمن نے کہا تھا کہ مجھے بہاول پور کے نزدیک صحرائے چولستان میں دور تک ویرانیوں میں ڈوبی ہوئی تاروں بھری رات جیسا منظر دنیا میں کہیں نظر نہیں آیا۔ بشریٰ رحمن بہاولپور کے ایک علمی گھرانے کی چشم و چراغ ہے۔ چشم اور چراغ الگ الگ بھی پڑھے جا سکتے ہیں۔ وہ اپنے قبیلے کی آنکھ بھی ہے اور چراغ بھی اس کی تشریح کی ضرورت نہیں جو جس طرح سمجھے اس کی مرضی۔ وہ جب بھی سرائیکی میں بات کرے تو حسن و عاشق کی کہانی ماحول میں بکھرتی چلی جاتی ہے۔ خواجہ فرید کی شاعری اس کا پسندیدہ مطالعہ ہے۔ وہ خواجہ فرید اور بابا فرید میں فرق نہیں کرتی۔ اپنی تقریروں تحریروں میں خواجہ صاحب کا اکثر حوالہ دیتی ہے۔ سرائیکی اور اپنے علاقے کی سرائیکی اپنے روزمرہ میں سجاتی رہتی ہے۔ اس کے فن و شخصیت کے حوالے سے بہاولپور اور ملتان یونیورسٹی میں ایم اے اردو کرنے والوں نے مقالے لکھے ہیں۔ حیدرآباد دکن بھارت میں ایک خاتون ان پر پی ایچ ڈی بھی کر رہی ہیں۔ بشریٰ رحمن کی بات اسے خواتین کی قطار میں کھڑا کر کے نہیں کی جا سکتی وہ بہت مردوں سے آگے نکل گئی ہے۔ پروین شاکر کو صرف خاتون شاعرہ کے طور پر تو نہیں لیا جا سکتا۔ کون ہو ل لگا رہے جو قرۃ العین کے مقابلے میں آئے گا۔ امرتا پریتم نے پنجابی شاعروں میں وہ مقام حاصل کیا کہ ایک بھی شاعر کا نام اس حوالے سے نہیں لیا جا سکتا۔ بانو قدسیہ کے مقابلے میں تو اشفاق احمد کو بھی نہیں لایا جا سکتا۔ میرے خیال میں بشریٰ رحمن بھی اس دائرے کو توڑ چکی ہے۔ وہ مردوں سے آگے نکل گئی ہے اور ان کے پیچھے پیچھے بھی چلنے والی نہیں۔ اب اسے بھی صرف خاتون دانشور کے طور پر نہیں دیکھا جائے گا۔ وہ ایک شخصیت ہے اور اس لحاظ سے عورت مرد کی تخصیص کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ مقام ہم عصر عورتوں کیلئے افتخار بن جاتا ہے۔ کئی محفلوں میں بہت سے مرد بولنے والوں میں اکیلی بشریٰ رحمن سب سے مختلف ہوتی ہے۔ وہ مثال کے طور پر پیش کی جانے والی عورتوں میں سے ہے۔ وہ گھر کا خیال بھی رکھتی ہے۔ شوہروں سے نجات حاصل کرنے والیاں گھر داری کی آسودگی کو کیا جانیں۔ بشریٰ کا خیال ہے کہ وطن بھی ایک گھر ہے وہ گھر کے اندر بے گھری کے احساس کو ختم کرنے کی خواہش کو عام کرنا چاہتی ہے۔

◆◆◆

اطلاعِ عام

قارئین کی پسند اور فرمائش پر رسالہ "تخلیق" کو فیس بک پر پیش کرنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اب آپ فیس بک پر ماہنامہ "تخلیق" پیج (Monthly "Takhleeq" Page) کو Link کر کے "تخلیق" کے ہر شمارے کے حوالے سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی پسندیدہ تحریریں download کر سکتے ہیں۔

عالم گیریت اور قلم قبیلہ

(LITERATURE AND GLOBALIZATION)

مسلم شمیم

عالم گیریت یعنی Globalization کے حوالے سے بحث و تمحیص کا سلسلہ ایک عرصے سے جاری و ساری ہے۔ اس باب میں یہ سوال بھی زیرِ بحث آتا رہا ہے کہ عالم گیریت کی تحریک نے کرۂ ارض کو جس Global Village میں تبدیل کر دیا ہے، اس میں قلم قبیلہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے؟ اور یہ کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ یہی سوالات آج میرے پیشِ نظر ہیں۔ ان سوالات کی جامعیت اور وسعت تقاضا کرتی ہے کہ قلم کار اپنے عہد اور ہم عصر زندگی کے تقاضوں کی تفہیم و ادراک کے حصول کا سفر طے کرے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کو قلم کاروں سے شکایت ہے کہ وہ اپنے عہد کے تقاضوں اور رجحانات کے ادراک سے محروم ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات اور نگارشات وقت سے ہم آہنگ نہیں ہیں چنانچہ ان میں اثر پذیری کی تلاش بھی لا حاصل کا درجہ رکھتی ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی رائے پر اظہارِ خیال کرنا میرا موضوعِ بحث نہیں ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے اس نکتے پر متفق ہوں کہ عہد اور ہم عصر سماج کا ادراک رکھے بغیر قلم کا سفر اندھیرے کا سفر ہوگا۔ سو آج قلم قبیلے کا سب سے بڑا Task یہ ہے کہ وہ اس Global Village میں ابھرنے والی زندگی اور رویے، اقدار اور حسیت کا اپنے دائرۂ فکر میں جائزہ لے اور اس کا واضح ادراک رکھے، یعنی ایک عالم گیر معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے مراحل و مسائل کا مفہوم ہم پر واضح ہو جاتا ہے۔ عالمی وفاق کا نظریہ اور تصور گزشتہ نصف صدی سے مفکرین اور اہلِ دانش کے پیشِ نظر رہا ہے اور اس حوالے سے بہت کچھ لکھا اور کہا جاتا رہا ہے۔ Globalization کے تناظر میں موضوع کی معنویت آج خاص اہمیت اختیار کر گئی ہے۔ عالم گیریت کے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدہ غور و فکر کی ضرورت پر دو رائے نہیں ہو سکتیں، خصوصیت کے ساتھ تیسری دنیا کے لیے حالیہ عالم گیریت کی تحریک یعنی Move بڑے دور رس نتائج اور اثرات کی حامل ہے۔ ہندوستان کے بائیں بازو کے حلقوں میں اس کے لیے Capitalist Globalization کی اصطلاح وضع کی گئی ہے اور اسے اسی تناظر یعنی سرمایہ دارانہ عالم گیریت کے طور پر دیکھا اور پرکھا جا رہا ہے۔ سرمایہ دارانہ عالم گیریت کا تصور اور Move یقیناً تیسری دنیا کے لیے اس تناظر میں نئے خطرات اور خدشات کا آغاز ہے۔ W.T.O کے حالیہ وضع کردہ ضابطوں کا براہِ راست ہدف تیسری دنیا کی معیشت اور اقتصادی زندگی ہے۔ بالفاظِ دیگر سرمایہ دارانہ نظام ایک نیا دامِ استحصال بچھانے کی جانب گامزن ہے اور جدید نوآبادیاتی نظام کے داعی گویا ایک نئے پیکر میں از سرِ نو تیسری دنیا کو اپنے اقتصادی استحصالی شکنجے میں جکڑنے کی حکمتِ عملی کو عملی جامہ پہنانے کی سوچ میں غلطاں ہیں۔ اس ضمن میں ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے کہ W.T.O اور I.M.F کو تاریخ اور معاہدات و تعصبات سے بالاتر ہو کر دیکھنا چاہیے۔ ہر چند کہ سوویت یونین کے انہدام کے نتیجے میں دنیا Bi-Polar نہیں رہی اور Uni-Polar ہو گئی ہے اور واحد سپر پاور ریاست ہائے متحدہ امریکا دنیا کو اپنی جارحانہ پالیسیوں اور اقدامات سے خوف زدہ کیے ہوئے ہے مگر ان جارحانہ عزائم کے خلاف

عالمی ضمیر پوری طرح بیدار ہے اور خود امریکی عوام نے حالیہ انتخابات میں تبدیلی کے حق میں اپنی واضح رائے کا اظہار کر کے موجودہ جارحانہ پالیسیوں کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا ہے۔ یورپ کے عوام کی بھاری اکثریت بار ہا W.T.O کی ان پالیسیوں کو رد کر چکی ہے جن کا ہدف تیسری دنیا ہے۔ یورپین یونین ایک اقتصادی بلاک کی صورت میں عالمی اقتصادی منظر نامے میں واضح نفوذ کا درجہ رکھتی ہے۔ مشرق بعید خصوصیت کے ساتھ چین اور جاپان کی اقتصادی پیش رفت اور کامرانیاں نے عالمی اقتصادی نظام میں بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ واضح رہے کہ اقتصادی محرکات یعنی Economic Dynamics سیاسی قوت میں کلیدی اہمیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ سے قبل برطانیہ عظمیٰ سب سے بڑی طاقت یعنی اپنے عہد کا سپر پاور تھا مگر بیسویں صدی کے دوسرے نصف کے آتے آتے برطانیہ عظمیٰ صرف برطانیہ رہ گیا جس کا بنیادی سبب (Factor) اقتصادی طور پر زوال پذیری تھا۔ لہٰذا میری رائے میں یورپین یونین اور چین و جاپان کی اقتصادی توانائیاں رفتہ رفتہ آج کی Uni-Polar دنیا کو Multi-Polar بنانے میں فعال کردار ادا کریں گی اور اس طور بہتر مستقبل کا خواب قلم بند کیا جا سکتا ہے۔

یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ وقت کا سفر پیش رفت کا سفر ہے، ارتقا کا سفر ہے، تبدیلیوں اور ترقی کا سفر ہے، تبدیلیوں اور ترقی کا سفر ہے، غلامی سے آزادی کی سمت کا سفر ہے، زنجیروں کی شکست و ریخت کے مراحل کا سفر ہے، مراجعت یعنی واپسی کا سفر نہیں ہے۔ لہٰذا جو لوگ کسی عہد زریں کی واپسی کا خواب دیکھتے ہیں، وہ اصول و قانون ارتقا سے بے خبر خوش فہمیوں کی جنت میں رہتے ہیں جن کا حقیقت کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس تناظر میں آج کرۂ ارض پر جو بھی احیائی تحریکیں ہیں، وہ قانون ارتقا سے متصادم ہیں لہٰذا ان کا انجام اور مقدر معلوم ہے۔ وہ کسی معاشرے کے پاؤں کی زنجیر بن کر اس معاشرے کی ترقی میں کچھ عرصہ حائل تو ہو سکتی ہیں مگر اس معاشرے کو ماضی کے کسی عہد زریں میں واپس نہیں لے جا سکتیں۔ اسی طور پر عالم گیریت کے پردے میں از سر نو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے کا خواب دیکھنے والے احمقوں کی جنت میں رہتے ہیں۔ آزادی اور جمہوریت آج کے انسان کے شعور اور ضمیر کا جزو لاینفک ہے لہٰذا عالم گیریت کے فروغ سے خوف زدہ ہونے کی کوئی بات نہیں عالم گیریت سماجی ارتقا کے دھارے کو روکنے کے بجائے اس کے تواتر ہونے میں معاون اور کارل مارکس کے الفاظ میں (1853ء) Unconscious Tool Of History ثابت ہوگا۔ کارل مارکس نے British Rule In India کے باب میں یہ رائے زنی کی تھی۔ یہ فقرہ اس اقتباس کے تناظر میں بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے:

> "England, It Is True, Is Causing a Social Reovlution In Hindostan, Was Actuated Only By the vilest interests, and was stupid in her manner of enforcing them. But that is not the question. The question is: can mankind fulfil its destiny without a fundamental revolution in the social state of asia? If not, whatever may have been the crimes of england, she was the unconscious tool of history in bringing about that revolution."

انیسویں صدی میں نوآبادیاتی طاقتوں نے جہاں تیسری دنیا کو غلامی کی زنجیر پہنائی اور ان ممالک کے وسائل کا استحصال کیا، وہاں نوآبادیاتی نظام کے استحصالی مقاصد کے حصول نے Unconscious tool of history کا رول بھی ادا کیا اور تمام ممالک میں

جہاں نوآبادیاتی نظام کا تسلط ہوا، وہاں کا معاشرہ ایک نئے عہدِ ارتقا میں داخل ہوا۔ ایسے ممالک جو نوآبادیاتی تسلط سے آزاد ہوئے، ان کی تاریخی پس ماندگی بھی ہمارے سامنے ہے۔ ہمارا پڑوسی ملک افغانستان اس کی ایک مثال ہے۔

اس پس منظر میں عالم گیریت کے نفاذ کے باب میں ہونے والی جارحانہ کارروائیوں کے باوجود عالم گیریت انسانی معاشرے کو آگے لے جائے گی، کیونکہ آج کی اہم حقیقت وہ سائنسی اور تکنیکی انقلاب (S.T.R) ہے جس نے گزشتہ نصف صدی میں ایک اور انقلاب کو جنم دیا اور پروان چڑھایا، وہ اطلاعات کا انقلاب (Information Revolution) ہے جس نے کرۂ ارض کو واقعتاً ایک Global Village میں تبدیل کر دیا ہے اور ہم آج دھرتی کے چپے چپے پر ہونے والی تبدیلیوں اور واقعات کا مشاہدہ اسی لمحے اپنی خواب گاہ میں بھی کر سکتے ہیں۔ اس انقلاب کے نتیجے میں انسانی علم و شعور کی سرحدیں اس قدر وسیع تر ہو گئی ہیں کہ اگر ہم علم کے بحرِ بے کراں تک انسان کی رسائی پر غور کریں تو خود کو عالمِ حیرت میں پائیں گے۔ اس پس منظر اور تناظر میں فکر و شعور اور جدید حسیت (Modern Sensibility) اور رویوں کا ادب میں کس طرح اظہار ہو رہا ہے اور ہوگا، اس پر غور تو کیا جا سکتا ہے اور اس کے کچھ خد و خال کی نشان دہی بھی کی جا سکتی ہے مگر کوئی ہدف اور دائرہ کار متعین نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی لائحہ عمل اور چارٹر ترتیب نہیں دیا جا سکتا۔ سائنسی اور تکنیکی انقلاب (S.T.R) اور اس کے سایۂ عاطفت میں پروان چڑھنے والے انقلابِ اطلاعات نے انسانی تہذیب و تمدن کی وحدت کے ساتھ وحدتِ انسانی (Oneness of Mankind) کا احساس اور شعور بھی مستحکم تر کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر آفاقی انسان دوستی (Universal Humanism) کو فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ کوئی سانحہ کرۂ ارض پر کہیں رونما ہو، ساری دنیا کے انسانوں کی آنکھیں بیک وقت اشکبار ہو جاتی ہیں، کوئی خوشی کی لہر کسی کامیابی کے نتیجے میں پیدا ہو وہ بنی آدم کے دلوں کو بیک وقت گرما دیتی ہے خواہ وہ کامیابی چاند پر انسان کے قدم پڑنے کی ہو یا خلاؤں کی تسخیر میں پیش رفت کی یا کسی خطے میں آزادی کے سورج کے طلوع ہونے کی یا کسی نیلسن منڈیلا کی رہائی کی۔ جس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انسانی تہذیب و تمدن کا سفر کثرت سے وحدت کی سمت کا سفر ہے اور Unity in Diversity کی منزلیں طے ہو رہی ہیں، اسی طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کہ انسانی معاشرہ ایک Well-Knit عالمی معاشرے کی تشکیل و تدوین کے مرحلے میں داخل ہو چکا ہے، ایک عالمی وفاق ابھر رہا ہے اور انسانی اقتصادی زندگی میں Interdependence ہر ساعت بڑھ رہا ہے۔ آج دنیا کا ترقی یافتہ ترین ملک بھی باقی دنیا سے کٹ کر اپنا سفرِ ترقی جاری نہیں رکھ سکتا۔ یہی حال تمام شعبہ ہائے زندگی کا ہے۔ تہذیب و تمدن کے اس گہوارے میں ایک عالمی ثقافت (World Culture) کی پرورش ہو رہی ہے جس کا ناگزیر حصہ ہم بھی ہوں گے، ہماری ثقافت بھی ہوگی اور ہمارا ادب بھی ہوگا۔

عالم گیریت کے نفاذ کے واضح ترین نقوش عالمی اقتصادی منظر نامے میں نظر آتے ہیں۔ Economic Globalization یعنی اقتصادی عالم گیریت کرۂ ارض پر بڑی پیش رفت کر چکی ہے۔ اب یہ صورت بن گئی ہے کہ سرمایہ کاری کے نئے نئے امکانات پیدا ہوتے جا رہے ہیں۔ سرمایے کی منتقلی کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ آپ کسی بھی خطۂ زمین سے تعلق رکھتے ہوں آپ اپنا سرمایہ جب چاہیں، جہاں چاہیں منتقل کر سکتے ہیں۔ ڈالر، پاؤنڈ، یورو اور کچھ دیگر کرنسیاں عالمی کرنسی بن چکی ہیں۔ کثیر القومی کارپوریشنوں (MNCS) نے ساری دنیا کو ایک اقتصادی یونٹ کی شکل دے دی ہے۔ اقتصادی طور پر کرۂ ارض پر سیاسی و جغرافیائی سرحدیں بے معنی ہو گئی ہیں۔ گویا عالم گیریت نے اقتصادی شعبے میں غیر معمولی پیش رفت کر لی ہے۔ عالم گیریت کا نفاذ اس باب میں موثر طور پر وسیع تر دائرے میں ہو چکا ہے۔ اقتصادی حرکات کی ہمہ گیر کارفرمائیوں اور جلوہ سامانیوں سے کون واقف نہیں۔

عالم گیریت کے باب میں قلم قبیلے کی جانب سے اپنے رہنمایانہ کردار کی اہمیت اور ضرورت کا احساس اور اس کا اظہار وقت کی پکار ہے، کیونکہ عالم گیریت کے مثبت مقاصد اور مشن کی تکمیل کی راہ میں بڑے بڑے سنگِ گراں حائل ہیں اور اسے بڑے سنگین Challenges کا سامنا ہے۔ اکیسویں صدی کو امن کی صدی دیکھنے کا خواب ہنوز شرمندۂ تعبیر ہے۔ War on Terror کے نام سے کرۂ ارض پر ایک جنگ جاری ہے۔ دہشت گردی کا آئے دن مظاہرہ ہوتا رہا ہے۔ 11 ستمبر کے بعد کی دنیا نئے خطرات اور اندیشہ ہائے دور و دراز سے دوچار ہے جس کے نتیجے میں مغرب میں بھی جمہوری اداروں اور انسانی حقوق کی پامالی کا سامنا ہے۔ نسلی عصبیت جگہ جگہ سر ابھار رہی ہے اور شرفِ بشر کو مجروح کر رہی ہے۔ مسلم معاشرہ خصوصیت کے ساتھ انتہا پسندی کی گرفت میں ہے اور فرقہ واریت امن انسانیت کی روح کو مسخ کر رہی ہے۔ عبادت گاہوں میں جہاں امن اور سلامتی کی عملداری تھی، وہ عملداری نیست و نابود ہو گئی۔ اب عیدین کی نمازیں بندوق بردار سپاہیوں کے پہروں میں ادا ہوتی ہیں اور مسجدیں اور امام بارگاہیں سب سے غیر محفوظ مقامات ہو گئے ہیں۔ نعرۂ تکبیر بلند کر کے مصروفِ عبادت نمازیوں کا مساجد میں خون بہایا جانا جنت میں داخل ہونے کا پروانہ تصور کیا جا رہا ہے۔ خودکش بمبار کی فیکٹریاں آج بھی قائم ہیں اور ملک کے مختلف شہروں میں کشت و خون کا خوفناک کھیل دیکھنے کو ملتا رہتا ہے جس میں بے قصور اور معصوم شہریوں کی جانیں تلف ہوتی رہتی ہیں اور حکومتی مشنری بے بسی کا اظہار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر پاتی۔ ملکی سطح پر یہ صورت حال ہمارے معاشرے کا چہرہ خون آلودہ کیے ہوئے ہے۔ عدم تحفظ کے بھیانک سایے میں بے قلم قبیلہ یعنی محبت کا پیغامبر اس صورت حال میں کیا سوچے اور کیا لکھے؟ یہ سوالات ہمارے سامنے ہیں اور ہم قلم قبیلہ والے جو ضمیرِ وقت کی آواز اور اس کی صدائے بازگشت کو لفظوں کا پیکر دینے کی اپنی سی سعی کرتے ہیں اس کو زیادہ سے زیادہ موثر اور اثر انگیز بنانے کے لیے اپنی تخلیقات میں خونِ جگر کی آمیزش فزوں تر کرنے کی ٹھان لیں، دہشت و بربریت اور انتہا پسندی کے تقدس مآب چہروں کو بے نقاب کریں اور ان کی جگہ محبت اور انسان دوستی کے نغمات فضا میں بکھیریں۔ عالمی سطح پر تہذیبوں کا تصادم (Clash of Civilization) کا گمراہ کن نظریہ گزشتہ ایک عشرے سے حلقۂ دانش کو Confusion میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ عالم گیریت کی انسانیت کی بیخ کنی کرنے کی اس سازش کا قلم قبیلے کو سنجیدگی سے نوٹس لینا چاہیے۔ تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ تاریخ کا چہرہ مسخ کرنے کا نظریہ ہے۔ تہذیبوں کا تصادم تاریخ کے کسی عہد میں نہیں ہوا ہے، بلکہ دنیا کے مختلف خطوں میں پروان چڑھنے والی تہذیبیں عالمی تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں معاون رہی ہیں اور انسانی تہذیب کا سفر اشتراک و تعاون کا سفر رہا ہے۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں تہذیب کا سورج کرۂ ارض کے مختلف خطوں میں طلوع ہو کر عالمی تہذیب کے افق کو روشن کرتا رہا ہے اور آج بھی معاشرے کے تضادات کو طبقاتی کشمکش اور طبقاتی جدوجہد کے تناظر میں دیکھنا اور سمجھنا چاہیے قلم قبیلے سے روحِ عصر کی ترجمانی اس کی متقاضی ہے۔ یہ نکتہ واضح طور پر ذہن نشین رہے کہ تہذیبِ انسانی کی اساس علم پر استوار یعنی Knowledge-Based رہی ہے۔ معلوم تاریخِ عالم پر طائرانہ نگاہ ڈالیں تو ہم یہ دیکھیں گے تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح Writing میسوپوٹامیہ میں Sumerians نے ایجاد کی۔ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح First Alphabet کا ظہور ہوا۔ اسی عرصۂ تاریخ میں پہلے ضابطۂ قانون Code of Hammurabi کی تدوین ہوئی۔ 105ء میں چین میں TS' AI LUN نے کاغذ ایجاد کیا۔ پندرھویں صدی عیسوی کے نصف میں پچاس کی دہائی میں جرمنی میں Johan Guten Berg نے چھاپہ خانہ ایجاد کیا۔

علم اور جستجو کا سفر پندرھویں صدی میں آغاز ہو کر (Renaissance) یعنی Rebirth of Knowledge کے پرچم تلے تیز تر ہوتا گیا۔ واضح رہے کہ ہزار سالہ دورِ ظلمت (Dark Age) سے پہلے تہذیب کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ یونان کے شہرۂ آفاق

شہر ایتھنز (Athens) میں صدیوں تک چمکتا رہا تھا۔ وہ سورج یورپ پر عیسائیت کے غلبے یعنی Church کے تسلط کے نتیجے میں توہمات کے ظلمات میں چھپا رہا۔ عباسی عہدِ خلافت میں بغداد ایک عرصے تک نیا Athens بنا رہا۔ منگولوں کی یلغار نے بغداد کی تباہی کے ساتھ تہذیب کے اجالے کو بھی دفن کر دیا اور جب سے مسلم دنیا اندھیرے میں ہے۔ فکر و دانش کی دنیا سکوت و انجماد کے دائرے میں محصور ہے۔ گزشتہ چھ سو برسوں کے عہد میں جبکہ مغرب کرۂ ارض پر حیرتوں کی نئی نئی بستیاں آباد کرنے میں شب و روز مصروفِ عمل ہے اور جستجو و تحقیق کے ذریعے کامیابیوں اور کامرانیوں کے ہر روز نئے پرچم لہرانے میں پیش پیش ہے، اسے کیا کہیے کہ مسلم دنیا اس عرصے میں ایجادوں اور دریافتوں (Inventions and Discoveries) کا کوئی گوشوارہ پیش نہیں کر سکتی۔ آج تک 57 مسلم ممالک میں کہیں بھی تحقیق و جستجو (Research) کی روایت قائم نہیں ہوئی ہے۔ مسلم دنیا مغرب کی ایجادات اور دریافتوں سے بہرہ مند ہونے پر قناعت کیے ہوئے ہے اور ایجادات اور دریافتوں کے باب میں ہر قسم کی اہلیت سے محروم دکھائی دیتی ہے یورپ تو نشاۃ ثانیہ کی روشنی میں مسلسل روشنی کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ یورپ میں Reformation Movement اور صنعتی انقلاب نے تہذیبِ انسانی کے ارتقا میں ایسے کارنامے انجام دیے ہیں کہ ان کا اعتراف نہ کرنا کورچشمی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

اس تاریخی پس منظر میں ہم دیکھیں تو عالم گیریت کی پہلی لہر نشاۃ ثانیہ کے آغاز سے اٹھی کرسٹوفر کولمبس (Christopher Columbus) نے ہندوستان کے بجائے امریکا کو دریافت کیا اور چھ برس بعد 1498ء میں واسکوڈی گاما (Vasco Da Gama) کالی کٹ کے ساحل پر اترا اور اس نے ہندوستان کو دریافت کیا اس طرح خشکی کے راستوں اور تجارت کے وسیلے سے کشور کشائی اور جہاں بانی کا کام بحری راستوں کے مرحلوں کے ہاتھ آ گیا۔ عالم گیریت کی دوسری لہر اٹھارویں صدی کے وسط میں یورپ میں ظہور پذیر ہونے والے صنعتی انقلاب سے اٹھی اور نو آبادیاتی نظام کرۂ ارض کے وسیع تر حصے میں اپنی عمل داری قائم کرنے میں کامیاب ہوا۔ موجودہ عالم گیریت دراصل مذکورہ پچھلے ادوار میں ظہور پذیر ہونے والی عالم گیریت کی توسیع بھی ہے اور تسلسل بھی۔ واضح رہے کہ عالم گیریت کی اساس ہر دور میں علم اور جستجو پر استوار رہی ہے جو اس کے کامیاب سفر کی ضامن بھی ہے اور اس کی افادیت کی حامل بھی۔

عالم گیریت کے باب میں غلط فہمیوں کا ازالہ کیا جائے اور اس ضمن میں اثباتیت اور رجائیت (Positivism and Optimism) جیسے رویوں کو فروغ دیا جانا وقت کی ضرورت ہے۔ یہ بات باعثِ طمانیت ہے کہ جہاں حتمی قوتیں عالم گیریت کے فروغ میں سرگرمِ عمل ہیں اور تہذیبوں کے تصادم جیسے گمراہ کن نظریات کے ذریعے انسانی اخوت جو عالم گیریت کے سائے تلے پروان چڑھ رہی ہے، اس کی منزل کھوٹی کرنے کے درپے ہیں، وہاں اس کے خلاف مثبت قوتیں بین المذاہب مکالمے (Interfaith Dialogue) کے ذریعے انسانی برادری میں فاصلے پیدا کرنے والی کوششوں کے خلاف موثر انداز میں سرگرمِ عمل ہیں۔ یہ بین المذاہب مکالمے کی روایت معاشرے میں فرقوں اور تعصبات کی بیخ کنی کرنے، انتہا پسندی اور شدت پسندی کے خاتمے کی طرف لے جانے کی اور War on Terror کے ذریعے جارحیت کے ارتکاب کی راہیں مسدود کرنے میں کلیدی کردار ادا کرے گی۔ قلم قبیلہ اس مہم اور جدوجہد کا ہر اول دستہ ہے اور اسے اپنا تاریخی کردار ادا کرنا ہے۔ امن اور جمہوریت کا سفر عالم گیریت کی منزل سے ہم آہنگ ہے اور قلم قبیلہ امن اور جمہوریت کا حامی اور داعی رہا ہے۔

◆◆◆

پرویز مہدی۔ مہدی حسن کا ذہین شاگرد

ڈاکٹر پرویز امجد

پرویز مہدی اور میں نے آخری مرتبہ پاکستان ٹیلی ویژن کی پی ٹی وی ورلڈ چینل پر پروگرام "میری پسند" میں علیحدہ علیحدہ گائیکی کی تھی۔ یہ پروگرام ایک قابل پروڈیوسر خواجہ نجم الحسن کی تخلیق تھی اور انہوں نے اس سیریز میں ایک سو سے زائد گلوکاروں کو پی ٹی وی کے فیتے پر محفوظ کیا تھا۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے پروگراموں میں بحیثیت سامع بھی شرکت کی تھی۔ پرویز مہدی طبعاً ایک منکسار شخص تھا اور اس کی گفتگو میں حس مزاح کا عنصر بھی نمایاں تھا۔ مہدی حسن کے دیگر شاگردوں سے معذرت کے ساتھ میں اگر یہ کہوں کہ پرویز مہدی ہی خان صاحب مہدی حسن کا خالص (Genuine) شاگرد تھا تو مبالغہ آرائی نہ ہوگی۔ ویسا کیوں؟

میں نے اسے مہدی حسن کی مختلف محافل میں اپنے استاد کا سرمنڈل اٹھائے ساتھ ساتھ چلتے دیکھا اور ان کی گائیکی کو سن سن کر اپنی سرشت میں سموتے دیکھا ہے۔ اس وجہ سے پرویز مہدی نے حسن کی گائیکی کا انداز اور مہارت کو اسی وقت سے ہی اپنا لیا تھا جب وہ موسیقی کے میدان میں نوآموز تھا۔ عموماً ان حالات میں جبکہ استاد بہت نامور ہو اس کے شاگردوں کو پنپنے کا موقع دستیاب نہیں ہوتا لیکن پرویز مہدی نے اپنا نام اور علیحدہ شناخت اس وقت ہی بنالی تھی جب مہدی حسن کے فن کا طوطی بول رہا تھا۔ اس وقت شائقین موسیقی پرویز مہدی کو مہدی حسن اور غلام علی کے بعد تیسرا اہم غزل گو تسلیم کرواتے ہیں۔ میرے اس مشاہدے سے ان کے بھائی بابر علی مہدی (جو آج کل ڈیلس امریکہ میں مقیم ہیں) بھی اتفاق کرتے ہیں۔ اگر ہم پرویز مہدی کے چیدہ گانوں پر نظر ڈالیں تو اس تاثر کو مزید تقویت ملے گی۔

سب سے پہلے احمد ندیم قاسمی کی غزل "سانس لینا بھی سزا لگتا ہے / اب تو مرنا بھی روا لگتا ہے" کو ہی لے لیجئے۔ اس غزل کی دھن بھی پرویز مہدی نے خود بنائی ہے۔ غزل میں تشنگی و تلخی کے مزاج کو دھن میں برقرار رکھا گیا ہے۔ اگرچہ یہ غزل Composed / ریکارڈنگ میں بھی موجود ہے لیکن جب پرویز مہدی اس غزل کو جلسے اور بار موسیقی پر Live گاتے تو الفاظ "لگتا ہے" اور "کتنا مانوس ہوں" پر مختلف انداز میں سُروں کو بکھیرنا اور الفاظ کے معنی کو اجاگر کرنا ایک جادوئی نقش کھینچ لیتا تھا۔ یہ خصوصیات مہدی حسن سے سیکھی گئی تھیں۔ پرویز مہدی کی گائیکی کی ایک اور لازوال پیشکش احمد ندیم قاسمی کی ہی غزل "گل تیرا رنگ چرا لائے ہیں گلزاروں میں" ہے۔ ان دونوں غزلوں کا تاثر پرسکون ہے جو کہ ہماری مشرقی موسیقی کا لازمہ بھی ہے۔ پرویز مہدی کے انداز گائیکی میں اُس راگ میں غزل کی دھن بنائی گئی ہے کو آلاپ کے ذریعے متعارف کروانا پھر اگر ضرورت پڑے تو وہ بڑھت پیش کرنا پھر غزل کے ابتدائی انترے کو باقاعدہ شامل ہونا۔ اور یہی لوازمات ایک اچھی غزل کی گائیکی کا پیش خیمہ ثابت ہوتے ہیں۔ عموماً پرویز مہدی استاد ناصر علی خان کو جلسے پر سنگت کی دعوت دیتے تھے۔ اس ضمن میں ان کی گائی غزل "کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے" کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ پرویز مہدی کی گائی ہوئی غزلوں میں ایک

مقبول غزل 'ٹوٹ جائے نہ بھرم ہونٹ ہلاؤں کیسے' بھی شامل ہے۔ اس کے شاعر عدیم ہاشمی تھے۔

عدیم ہاشمی کا ذکر چلا تو ان کے متعلق کچھ گفتگو کرنا چاہوں گا۔ ایسا کرنے کی وجہ ایک اور بھی ہے کہ 1970ء کی دہائی میں مجھے عدیم ہاشمی کے ساتھ پی ٹی وی پر بہت کام کرنے کے مواقع میسر آئے۔ ان کا اصل نام فصیح الدین تھا۔ میری ان سے آخری ملاقات شاعر فرحت عباس شاہ کے ہاں ہوئی اور میں نے انہیں کوچ اسٹیشن اتارا جہاں ان کو براستہ اسلام آباد امریکہ کے لئے روانہ ہونا تھا۔ ان کی شاعری کی آخری کتاب 'بہت نزدیک آتے جا رہے ہو' ہے جو انہوں نے اپنی بیماری کے دوران پاکستان اور امریکہ کے مختلف ہسپتالوں میں تحریر کی تھی۔ عدیم ہاشمی 5 نومبر 2011ء کو عارضہ قلب کی وجہ سے فوت ہو گئے۔ ان کی شاعری کا انداز تازگی اور اپنے ماحول سے یگانگت سے ملبوس تھا۔ اس دور کے شاعر رومانوی شاعری یا قدرت کے رنگوں پر شاعری کرتے تھے لیکن عدیم ہاشمی کا جھکاؤ بغاوت کی طرف تھا جسے وہ معاشرتی و سیاسی ناہمواری کے خلاف اپنے ذاتی تاثرات سے منور کرتا تھا۔ عدیم ہاشمی اپنی کہی گئی غزل 'فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا / سامنے بیٹھا تھا میرے اور وہ میرا نہ تھا' کی وجہ سے 1960ء کی دہائی میں بحیثیت ایک اچھے شاعر کے پہچانے جانے لگے۔ اور اس پر سونے پہ سہاگہ جب پرویز مہدی نے یہ غزل گائی تو وہ بھی راتوں رات مقبول ہو گئی۔ اس غزل کو جب پرویز مہدی نے پروگرام 'میری پسند' میں 'Live' گایا تو اسے بہت پسندیدگی سے دیکھا گیا۔ پرویز مہدی کی ایک معروف غزل ایوب خاور کی شاعری 'سات سُروں کا بہتا دریا تیرے نام ہر سُر میں ہے رنگ دھنک کا میں ہے۔ اس غزل کی مقبولیت میں استعاروں سے معمور شاعری سریلے لحن اور گائیکی کا عمل دخل ہے۔ اس غزل کو سن کر واقعی سات سُروں کے بہتے دریا کا تاثر ملتا ہے۔ اس غزل کا ایک خوبصورت شعر ملاحظہ ہو:

جنگل جنگل اڑنے والے سب موسم اور ہوا کا سبز دوپٹہ تیرے نام

اس شعر کی معنویت سے مماثلت رکھتے ہوئے پرویز مہدی کی گائیکی میں الفاظ کی تکرار سُروں کے مختلف ملاپ سے واقعی یہ محسوس ہوتا ہے کہ جنگل میں سبز دوپٹہ لہراتا ہوا اپنے محبوب کا متلاشی ہے۔ اس غزل کی ایک خوبصورت ریکارڈنگ پرویز مہدی کے 1984ء کے لندن شو میں گائی گئی غزلوں میں شامل ہے۔ 1970ء کی دہائی کے اواخر میں جب میں برمنگھم یونیورسٹی انگلینڈ کا طالب علم تھا اور اتوار کی چھٹی عموماً اپنے بھائی محمد ارشد شیخ کے ہاں سال ہیتھ کے علاقے میں گزارا کرتا تھا کہ وہاں مجھے اور میرے دیرینہ دوست مشتاق ہاشمی (جو وہاں طالب تھے) کو یہ خبر ملی کہ پرویز مہدی وہاں موجود ہیں اور ایک قریبی ہال میں پرفارم کرنے والے ہیں۔ ہم بہت خوش ہوئے۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ سردیوں کا موسم تھا اور باہر برف باری سے سڑکیں راہداریاں اور مکانوں کی چھتیں سفید پوش ہوئی نظر آتی تھیں۔ جب ہم ہال میں پہنچے تو وہاں پر بہت کم سامعین نظر آئے۔ اول تو اتوار کا دن پھر صبح کا وقت اور سب سے بڑھ کر شدید سردی۔ لوگ ابھی تک رضائیوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ہم نے پرویز مہدی کو سمجھایا کہ اس کا [illegible] خشک رہا تھا اور وہ پرفارمنس سے اجتناب کرے۔ اسے ہماری بات سمجھ میں آ گئی اور وہ پھر کئی روز میرے بھائی کے ہاں مہمان رہا۔ اس وقت تو ہم بھول چکے تھے کہ ہمارے کانوں میں وہ پنجابی گیتوں نے رس گھولنا شروع کر دیا۔ یہ وہ گانے تھے۔ پرویز مہدی اور طفیل [illegible] کی آواز میں۔ بول تھے۔

1۔ جاوے پردیسیا وے دیاں کانوں لائیاں 2۔ گورے پیلے میں جاواں پرائیں

موسیقار تصدق علی خاں جو کہ شام چوراسی گھرانے کے گائیک تھے اور ریڈیو پاکستان لاہور میں میوزک پروڈیوسر بھی تھے کی دھنوں کی مقبولیت کے باعث دیکھتے ہی دیکھتے ریشماں اور پرویز مہدی کی مشہوری میں بہت اضافہ ہو گیا۔ اور اس پر سونے پہ سہاگا یہ کہ اشفاق احمد کی میزبانی میں پروگرام "میری پسند" میں جب یہ دوگانے پیش کئے گئے تو آج بھی ان گانوں کو لاکھوں لوگ یوٹیوب پر سن کر انہیں لائیک کرتے ہیں۔ طبلہ پر محمد حسین علوی کی سنگت اور سامعین میں فریدہ خانم، تصدق علی خاں، روحی بانو، سجاد کشور جیسی قد آور شخصیات کی موجودگی نے اس Episode کو مزید دلچسپ بنا دیا۔ یہ آخر الذکر گانا لا راگ ماتی میں بنایا گیا ہے وہ سوائے دکھ درد کے کوئی تاثر نمایاں کرنے سے عاری ہے۔ ان گانوں کی بدولت پرویز مہدی نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پرویز مہدی کا ایک اور شہرت یافتہ ماتی پنجابی گانا "تک چڑی والیا گھے میرے" "میرے ہاتھ وچ ونگیاں لیکاں ٹُٹیاں" ہے۔

ایک اور غزل "کیا زمانہ تھا کہ ہم روز ملا کرتے تھے" کی ویڈیو میں نے ان کی استاد نذیر خاں کی طبلے کی سنگت کے ہمراہ دیکھی۔ حسب معمول پہلے دوہڑا "کیا کہوں دل پہ قیامت سی گزر جاتی ہے اتنا تھا جو کسی آنکھ میں آنسو چھلکے" تھی غزلوں کو میر کے نام سے منسوب کیا میری خواہش تھی بھرے شہر میں تو چھپے" خوبصورتی سے نبھایا گیا ہے۔ پرویز مہدی کے چہرے پر گاتے وقت مسکراہٹ رہتی اور وہ اپنی آنکھوں سے سامعین کی پسندیدگی کو دعوت دیتے۔

منیر نیازی کی مشہور زمانہ غزل "بے چین بہت پھرنا گھبرائے ہوئے رہنا" بھی پرویز مہدی کی البم رنگِ غزل میں شامل ہے۔ یہ غزل سٹوڈیو کی باقاعدہ ریکارڈنگ کی شکل میں ستار اور سیلو کے خوبصورت امتزاج سے مزین ہے۔ یہی غزل پرویز مہدی کی آڈیو البم "غزل نواز" میں موجود ہے۔ قمر جلالوی کی غزل "جو تو یہ ہم نے کی ساقی تو تیرے خانے پہ کیا گزری جدا ہو کر ہمارے لب سے پیمانے پہ کیا گزری" بھی اسی البم کا حصہ ہے۔ ایک سوگوار کیفیت میں ادا کی گئی غزل "آنکھ جب چار اگر کھو جانے والے منتظر تھیں یہ تم چلے چلے" ساجد کی شاعری میں چلتر چال میں سنی جا سکتی ہے۔ اسی البم کے نغموں کے ہار میں ایک اور نگینہ افتخار عارف کی غزل "پھول مہکتے ہیں میرے آنگن میں صبا بھی آئی تو جو آئے تو میرے گھر میں خدا بھی آئے" اور پرویز مہدی کی ادائیگی کی شکل میں موجود ہے۔ صوتی اعتبار سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس غزل میں گائیکی کو استاد سلطان خاں کی سارنگی نے سنوارا ہے جو کوئی بھی وقفہ خالی نہیں جانے دیتے۔ یہ انداز غزل گائیکی ہندوستان میں رائج ہوئی غزلوں کا خاصا ہے۔ ایک اور غزل "اپنے سائے سے بھی اشکوں کو چھپا کر رونا جب بھی رونا ہو چراغوں کو بجھا کر رونا" سارنگی کے استعمال کے ساتھ سوگوار کیفیت اجاگر کرتی ہے۔ قارئین جناب کی اس غزل کی دھن بھی پرویز مہدی کی اپنی تجویز کردہ ہے اور ان کی البم "دی بیسٹ آف غزلز" کا حصہ ہے۔

پرویز مہدی نے بہت کم تعداد میں فلمی گانے گائے ہیں۔ نور جہاں کے ہمراہ ایک فلمی دوگانا بابا چشتی کی موسیقی میں "تک چن یا چاندا اسے" بہت مقبول ہوا۔ اداکارہ دردانہ اور اداکار اقبال حسن پر فلمایا گیا یہ نغمہ فلم چن تارا کے لئے حزیں قادری نے لکھا تھا۔ میری تلاش ایک ایسے نغمے تک پہنچی جو پرویز مہدی نے فلم شرابی کے لئے گایا تھا۔ گانے کے بول تھے "ہم بھی گئے تو کہاں گئے" یہ فلم 30 نومبر 1973ء کو پردۂ سکرین پر نمودار ہوئی اور اس نغمے کو اداکار علی اعجاز پر فلمایا گیا تھا۔ ہدایتکار و فلمساز حمید چوہدری کی اس فلم کی موسیقی بخشی وزیر نے ترتیب دی

تھی۔ دیگر گلوکاروں میں مالا، رونا لیلیٰ، مصیبہ خانم اور غلام علی شامل تھے۔ ستاروں میں علی اعجاز کے علاوہ فخرِ حبیب، ناصر جلال، منظر شاہ، ناصرہ، فانی فانی اور سینکڑوں فنکار شامل تھے۔ پرویز مہدی نے اپنے استاد کے کافی نغمے گائے ہیں۔ مثلاً وزیر افضل کی دھن "ڈھولیاں تے نئے دے" بھی پرویز مہدی نے خوبصورتی سے گایا ہے۔ پرویز مہدی کے گائے ہوئے گیتوں اور غزلوں کی ایک لمبی فہرست موجود ہے مگر مندرجہ بالا نغموں کا تذکرہ ان کی فنی مہارتوں کو اجاگر کرنے کے لیے کافی ہے۔ مجھے یہ سطور لکھتے وقت 1973ء کا پی ٹی وی پروگرام "سنگت" یاد آ رہا ہے جس میں "مجھے پرویز مہدی کو پاپ انداز کے نغمے گوانے کا شرف حاصل ہوا تھا۔ یہ ایک کامیاب تجربہ تھا۔ پی ٹی وی کی ویڈیو لائبریری میں ان کے بہت سے نغمے موجود ہیں جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان اور ہندوستان میں ریکارڈ کی گئی آڈیو البم ان کی غزلوں، گیتوں اور پنجابی نغموں پر مشتمل دستیاب ہیں۔

پرویز مہدی کا اصل نام پرویز اختر ہے۔ ان کے والد بشیر حسین راہی بھی اپنے زمانے کے مقبول گلوکار تھے۔ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ انہیں میں کئی برسوں سے جانتا تھا۔ بہت مخلص اور ملنسار شخص تھے۔ پرویز مہدی کا وصال اٹھاون (58) برس کی عمر میں 28 اگست 2005ء کو ہوا۔ پرویز مہدی کی پیدائش 1947ء کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم موسیقی اپنے والد صاحب سے ہوئی۔ بعد ازاں مہدی حسن خان صاحب کی شاگردی کے بعد پرویز مہدی کہلائے جانے لگے۔ سنا گیا ہے کہ سراج احمد قریشی سے پرویز مہدی نے ستار بجانے کی تعلیم بھی لی تھی۔ کلاسیکل گائیک چھوٹے غلام علی خاں بھی پرویز مہدی کی گائیکی کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ پرویز مہدی فیض پارک، مغلپورہ لاہور میں اپنے والد کے ہمراہ قیام پذیر تھے۔ سوگواران میں ان کی بیوی اور پانچ بچے شامل ہیں۔ وہ ذیابیطس کے مریض تھے۔ ڈاکٹروں نے انہیں روزانہ سیر کا مشورہ دیا تھا۔ کچھ دن کرتے اور کچھ دن سستی کا شکار ہو جاتے تھے۔

پرویز مہدی کا گائیکی کے میدان میں سب سے پہلے تعارف ریڈیو پاکستان میں 1968ء میں ہوا۔ وہ ہرفن مولا فنکار تھے۔ ہلکی پھلکی موسیقی کی سب اصناف میں اپنی میٹھی اور مدھر آواز میں جادو جگاتے تھے۔ ان کی آواز قدرتی طور پر مہدی حسن کی آواز سے مشابہت رکھتی تھی۔ شعوری طور پر انہوں نے اپنا استاد محترم کا رنگ بھی اپنایا ہوا تھا۔ وہ غزل، گیت، کافی اور فلمی گانے یکساں مہارت سے ادا کرتے تھے۔ یوم آزادی کے موقع پر ان کو صدر پاکستان کی طرف سے "تمغۂ امتیاز" سے بھی نوازا گیا تھا۔ پی ٹی وی، اسلام آباد کے ایک پی ٹی وی پروگرام میں باپ اور بیٹا دونوں نے شرکت کی تھی جس کی میزبان کنول نصیر تھیں۔ بشیر حسین راہی سے جب یہ پوچھا گیا کہ انہیں تھیٹر کی طرف مبذول کرنے میں کن محرکات کا عمل دخل تھا، فرمانے لگے کہ آزادی سے قبل تقریباً تمام ہیرو، ہیروئن تھیٹر میں نہ صرف کردار ادا کرتے تھے بلکہ گاتے بھی تھے۔ اسی لیے انہوں نے بھی اسی طریقہ کار کا انتخاب کیا۔

بھارتی پاپ اور لوک گلوکار دلیر مہدی، پرویز مہدی کو اپنا روحانی استاد بھی مانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ استاد مہدی حسن کی شاگردی کے باوجود پرویز مہدی نے اپنا ایک علیحدہ انداز اپنایا اور اسی انداز سے مقبولیت حاصل کی۔ ہمیں یہ قطعی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ پرویز مہدی نے تمام عمر اپنے استاد کی دلجمعی کے ساتھ خدمت کی اور شاید اپنے استاد کی دعا بھی پرویز مہدی کا نام ان کے کام کے باعث زندہ رکھے گی!

◆◆◆

مغلیہ عہد میں راسخ الاعتقادی کا اُبھار

……1……

ظفر سپل

جلال الدین محمد اکبر کے دور حکومت میں غیر معتدل آزاد روی اور نام نہاد روشن خیالی کے ابھار نے اپنی انتہائی بلندیوں کو چھوا ۔۔۔ اور یہ ہونا تھا۔ بلکہ یہ بہت ضروری تھا اس لیے کہ روح عصر اس اینٹی تھیسس (anti-thesis) کے لیے زمین ہموار کر رہی تھی اور فضا کو بنا سنوار رہی تھی، جس کا نام خالص راسخ الاعتقادی ہے۔ بلاشبہ قدرت حضرت خواجہ باقی باللہ کے استقبال کے لیے سٹیج کو سجا رہی تھی ۔۔۔ خواجہ باقی باللہ، جن کے جلو میں دو اور روشن ستاروں کو ہندوستان کے افق پر تابناکی دکھانا تھی، ایک شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور دوسرے شیخ احمد سرہندی۔

ان تینوں حضرات گرامی نے جنھوں نے ہندوستان میں تصوف کے چوتھے ستون یعنی سلسلہ نقشبندیہ کو فکری اساس فراہم کی، اس سلسلہ تصوف کو پوری فکری توانائی کے ساتھ اکبر کے بدعتی نظام کے مقابل لا کھڑا کیا۔ اس وقت تک تصوف کے پہلے تین سلسلے اپنا کردار ادا کرنے کے بعد منظر سے رخصت ہو چکے تھے ۔۔۔ سلسلہ چشتیہ اور سہروردیہ کے چراغوں میں وہ روشنی نہیں رہی تھی، جس نے دو سو سال قبل کے ہندو معاشرے کو متوجہ کیا تھا۔ قادریہ سلسلے نے بہت بعد میں دور اکبر میں اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔ مگر آزاد روی کے سیلاب کے آگے بے بس ہو گیا۔ ویسے بھی ان تینوں سلسلوں سے اس کردار کی توقع نہیں تھی جو نقشبندی سلسلے نے اپنی ملی تعمیر کی خاطر ادا کیا۔ چشتیہ، سہروردیہ اور قادریہ سلسلے کا خمیر عجم کی زمین سے اٹھا تھا ۔۔۔ چشت خراسان کی ایک بستی ہے، سہرورد بغداد سے چند میل کے فاصلے پر ایک علاقے کا نام ہے اور قادریہ سلسلے کے بانی شیخ عبدالقادر جیلانی تو رہنے والے ہی بغداد کے تھے۔ یہ درست ہے کہ ان تینوں سلسلوں میں فروعی اختلافات موجود تھے مگر ان سب سلسلوں کا طریقہ "صلح کل" اور پیغام وسیع المشربی کا تھا اور ان کے مزاج میں وہ عجمیت تھی جو بغداد کے متکلمین کو مدینہ کے محدثین سے جدا کرتی ہے۔ یہ شرع کے معاملات میں کسی حد تک آنکھیں بند کر لینے کو گوارا کر لیتے تھے اور یہ اس وقت کے ہندو سماج کے لیے ضروری تھا جہاں اسلام نے قدیم ہندو معاشرے کو اپنی طرف متوجہ کرنا تھا مگر اب تاریخ کے پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا اور اکبر کی سیاسی حکمت عملی پر مبنی "مذہبی رواداری" کے نعرے نے اسلام کو آگ کے دریا کا سامنا کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ تاریخ کے اس موڑ پر تصوف کے اس سلسلے نے پیش قدمی کی، شرع کی پابندی جس کے ماتھے کا جھومر ہے ۔۔۔ یہ سلسلہ نقش بندیہ تھا۔ اس سلسلے میں سماع کی ممانعت تھی، فرائض شرعی کو ہر حال میں اذکار و نوافل پر فوقیت حاصل تھی اور ذکر خفی ذکر جلی سے بہر طور افضل مانا جاتا تھا۔ کہنا چاہیے کہ اس سلسلے کا آئین تصوف اصحاب کبار کے طرز زندگی سے لگا کھاتا تھا۔ نہ چلہ کشی، نہ ذوق علوم، نہ ہجوم عقیدت اور نہ قدم بوسی مرشد۔

اکبر کے جدتی نظام کے خلاف راسخ الاعتقادی کی پہلی بابرکت آواز لگانے کی سعادت قدرت نے 15 جولائی 1565ء کو کابل میں پیدا ہونے والے خواجہ باقی باللہ کے نام لکھی۔ وہ آواز جس نے مذہبی بگاڑ کے خلاف جلد ہی ایک طاقت ور اور مستحکم محاذ کی صورت اختیار کر لی۔ آپ کے والد قاضی عبدالسلام جو اس وقت کے طبقہ امراء کا ایک نمائندہ تھے اہل علم بھی تھے۔ اپنے فرزند کی ابتدائی تعلیم کے بعد وہ اسے ملا صادق حلوائی کی خدمت میں لے گئے جو اس وقت ایک مشہور عالم فاضل شخصیت کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔ ملا صادق رہنے والے تو ثمرقند کے تھے مگر اکبر کے چھوٹے بھائی اور کابل کے حکمران مرزا حکیم کے کہنے پر کابل تشریف لائے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ یہیں پر خواجہ باقی باللہ ان کے حلقہ درس میں داخل ہوئے اور جب ملا صادق نے کابل کو چھوڑ کر دوبارہ ماوراءالنہر جانے کا قصد کیا تو خواجہ باقی باللہ بھی ان کے ساتھ تھے۔

علوم متداول پر بڑی تیزی سے عبور حاصل کرنے والے خواجہ باقی باللہ کو ماوراءالنہر ہی میں کچھ ایسے معاملات روحانی پیش آئے کہ ان کی توجہ حقیقت و معرفت کی طرف مبذول ہو گئی اور پھر وہ تلاش مرشد میں جا بجا بھٹکے۔

ماوراءالنہر سے واپسی کے بعد ان کا پہلا قیام لاہور میں تھا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اکبر نے بھی اپنا دربار لاہور میں لگایا ہوا تھا۔ غالباً یہیں پر آپ نے ان امرائے سلطنت کو اپنی طرف متوجہ کیا جو راسخ الاعتقادی کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ شیخ فرید نے تو آپ کی خانقاہ کے تمام اخراجات اپنے ذمے لے لیے تھے۔ ملتان کا صوبے دار قلیچ خان اور اکبر کا رضاعی بھائی مرزا عزیز کوکہ بھی آپ کی توجہ سے اکبر کے نئے نظام سے متنفر ہوئے۔

خواجہ کی اگلی منزل دہلی تھی۔ یہی وہ شہر ہے جہاں خواجہ باقی باللہ اپنے روحانی مراتب کی بلندیوں پر پہنچ گئے اور یہی وہ شہر ہے جہاں خواجہ احمد سرہندی نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی آپ کے حلقہ ارادت میں داخل ہوئے۔ اللہ جانے اس مرد قلندر کی ذات کے گرد کیسا جادوئی حلقہ تھا کہ احمد سرہندی جیسا عارف باللہ جو خود بھی عرفان ذات کی کٹھن ہی منزلیں طے کر چکا تھا اور عمر میں بھی خواجہ باقی باللہ کے برابر تھا، حج کی نیت سے گھر سے نکلا اور دہلی پہنچ کر خواجہ کے آستانے پر جبیں ٹیک دی۔

انتہائی کسر نفسی کا مظاہرہ کرنے والا یہ عجیب مرد قلندر تھا۔ اپنے واقعات اور مراتب روحانی پر پردہ ڈالنے والا۔ انہوں نے بارہا اپنے مرید خواجہ احمد سرہندی کی اس قدر تعریف کی ہے کہ کوتاہ فہم ان مباحث اور مغالطے میں پڑ گئے کہ بظاہر تو خواجہ باقی باللہ احمد سرہندی کے مرشد تھے مگر در پردہ وہ ان کے مرید۔ کم نظروں نے یہ نہ جانا کہ کتنے ہی بلند قامت مردان اللہ ایسے ہوتے ہیں جو مرید کی خوبیوں کو پہچان لیں تو ان کے سراہنے میں ان کا اپنا بلند مرتبہ بھی مانع نہیں ہوتا۔ یہ درست ہے کہ آپ کو کتبی علم میں وہ درجہ حاصل نہیں جو ان کے معتقد شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو ملا اور نہ ہی ان کو وہ زور قلم نصیب ہوا جو احیائے دین کے پرجوش نمائندے خواجہ احمد سرہندی کو عطا ہوا مگر یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ وہ کون صاحب بصیرت ہے جو ان دونوں حضرات کی پشت پر چراغ فضیلت لیے کھڑا ہے۔ خواجہ باقی باللہ بارگاہ الٰہی سے تھوڑے دن مانگ کر آئے تھے۔ وہ بہت جلدی میں تھے اور جلدی جلدی ہی انہوں نے اپنا کام بھی مکمل کر لیا۔ ابھی انہیں دہلی میں اپنا کام شروع کیے ہوئے چار یا پانچ سال ہی ہوئے تھے کہ محض چالیس سال کی عمر میں انہوں نے رحلت فرمائی اور اگلے جہان کے سفر پر روانہ ہو گئے۔

اب شیخ عبدالحق محدث دہلوی آئے اور انہوں نے اس پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیا، جسے خواجہ باقی باللہ نے بلند کر رکھا تھا۔ ہندوستان کی سرزمین کی مٹی عجیب ہے! ہزاروں آندھیاں آئیں، مگر رشد و ہدایت، علم و عرفان اور دینی تعلیم و تربیت کا چراغ کسی نہ کسی طور جلتا رہا اور آندھیوں سے لڑتا رہا۔ اکبر کا عہد تو دور در اصل دین کی تشکیل نو، تاویلات اور فقہی مباحثوں کا زمانہ ہے۔ گو اس کے ذریعے سے سیاسی قوت حاصل کرنے کی خواہش نے اکبر کے کردار کو داغدار کیا مگر نیک نیت علماء بھی موجود تھے اور علوم فقہ میں مسلسل ترقی کا عمل جاری و ساری تھا مگر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ہندوستان کو پہلی دفعہ باقاعدہ طور پر ایک نئے علم سے روشناس کرایا ـــ یہ علم حدیث ہے اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی کو بجا طور پر ہندوستان کا پہلا محدث قرار دیا جا سکتا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی 1551ء میں سلیم شاہ سوری کے دور حکومت میں پیدا ہوئے۔ ان کے آباؤ اجداد وظیفہ امراء سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ سلطان علاؤ الدین خلجی کے دور میں بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور یہاں آ کر انہوں نے اپنا تعلق دربار سے جوڑ لیا۔ یہ سارا گھرانہ طریقت کا پروردہ اور صوفیانہ وسیع المشربی پر یقین رکھنے والا تھا۔ شیخ عبدالحق کے والد شیخ سیف الدین شیخ امان پانی پتی کے مرید تھے اور وحدت الوجودی خیالات رکھتے تھے۔ صوفیانہ ذوق و شوق ان کو بھی اپنے والد سے ورثے میں ملا تھا۔ ایک دن انہوں نے اپنے والد سے پوچھا کہ کبیر مسلمان تھا یا کافر؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ موحد تھے۔ شیخ سیف الدین نے وضاحت چاہی کہ کیا موحد کا اسلام یا کفر سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔ انہوں نے ایک بار پھر ٹالتے ہوئے کہا کہ ابھی تمہیں یہ نکتہ سمجھانا مشکل ہے۔ آہستہ آہستہ خود ہی سمجھ جاؤ گے۔

سو یہ وہ فکری ورثہ تھا جو شیخ کو گھر سے ودیعت ہوا اور ان کے عزیز و اقارب چاہتے بھی یہی تھے کہ وہ فتح پور سیکری کو منزل بنائیں جو ان دنوں اکبر کا دارالحکومت تھا، روشن خیالی کا استعارہ اور برصغیر کا علمی و ثقافتی مرکز۔ یہاں ان کا قیام کوئی دس برس تو ضرور رہا ہو گا۔ یہیں ان کی ملاقات فیضی، ابوالفضل اور بدایونی جیسے اہل دربار سے ہوئی جو ان سے متاثر بھی ہوئے اور ان کی ضرور خواہش رہی ہوگی کہ شیخ اکبری دربار کی قوت میں اضافے کا موجب بنیں۔ شیخ جس فکری ورثے کے ساتھ یہاں تک پہنچے تھے منطقی طور پر تو انہیں اس ماحول میں سو فیصد جذب ہو جانا چاہیے تھا ـــ مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ دراصل فیضی، ابوالفضل اور اکبر بگاڑ کی اس منزل پر پہنچ چکے تھے کہ دینی فکری دیانت رکھنے والا کوئی شخص اس قدر آگے بڑھنے کو ایمانی خطرے سے خالی نہیں سمجھتا تھا اور یہی کچھ شیخ نے کیا۔ وہ ٹھٹکے، رکے اور پھر ذرا پیچھے ہٹ کر انہوں نے ایک بڑا فیصلہ کیا ـــ ردعمل کا فیصلہ! دربار میں موجود ایک قادری بزرگ شیخ موسیٰ پاک گیلانی کی رفاقت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور اکبری روشن خیالی کے خلاف ان کا ردعمل شدید سے شدید تر ہوتا چلا گیا۔ یہ بزرگ خود بھی نہایت راسخ العقیدہ اور سلف پرست تھے۔ روایت ہے کہ وقت نماز اکبر کے دیوان خانے میں خود ہی اذان دیتے اور نماز باجماعت کے لیے کھڑے ہو جاتے ـــ مگر شیخ عبدالحق کب تک ریاستی ستونوں سے ٹکراتے۔ بہت جلد انہوں نے خود کو بے بس پایا۔ سو انہوں نے حرمین شریفین کی جانب روانگی کا فیصلہ کر لیا اور یہ شیخ کی زندگی کا نہایت اہم اور فیصلہ کن موڑ ہے۔

شیخ عبدالحق 1587ء میں مکہ معظمہ پہنچے۔ 1590ء تک یہیں قیام کیا۔ یہاں ان کی ملاقات شیخ علی متقی جیسے نامور محدث کے راسخ العقیدہ ہندوستانی شاگرد شیخ عبدالوہاب متقی سے ہوئی، جنہوں نے شیخ عبدالحق کو علم حدیث کا تابندہ ستارہ بنا دیا۔ شیخ عبدالوہاب متقی ہی نے شیخ عبدالحق کو وہ درس دیا، جسے پڑھ کر وہ صوفی سے زیادہ عالم اور محدث بن گئے اور یہی وہ راستہ ہے جو بظاہر تو ہندوستان کی دینی فکری

سرزمین میں ایک نئی پگڈنڈی کی صورت نظر آتا تھا مگر جسے بعد میں ایک واضح شاہراہ کی صورت اختیار کرنا تھی ــــ شاہراہِ علمِ حدیث۔

شیخ عبدالوہاب متقی ہی نے اس صوفی کو سمجھایا کہ وہ فلسفۂ وحدت الوجود کی گہرائیوں کی کھوج سے مجتنب رہیں کہ یہ وہ جام ہے جس میں شکر بھی ہے اور زہر بھی اور یہ ہی وہ پل صراط ہے جس کے ایک طرف تو چمن زارِ نجات ہے اور دوسری طرف خارزارِ آزمائش۔ اور پھر شیخ ساری عمر اس سبق پر کاربند رہے۔ اپنے ایک مکتوب میں وہ خود لکھتے ہیں کہ "فصوص الحکم کے اتباع و اعتقاد میں مبالغہ کرنا چاہیے اور نہ اس کے انکار و رد میں"

شیخ عبدالحق دہلوی جنھیں بلاخوف و خطر برصغیر کا اولین محدث قرار دیا جا سکتا ہے۔ بیک وقت ایک واعظ و مفسر، فقیہ، سیرت نگار اور وسیع النظر صوفی بھی ہیں۔ انہوں نے اس وقت کی ہندوستانی فضا میں احیائے دین کے لیے ایک علیحدہ راستے کا انتخاب کیا۔ یہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف کا راستہ تھا۔ انہوں نے کوئی سو سے زیادہ تصانیف چھوڑی ہیں، جن میں ان کا بنیادی تجسس طریقت کو شریعت کے تابع رکھنا ہے یعنی غیر معتدل صوفیانہ آزادروی اور نام نہاد روشن خیالی سے اجتناب۔

صوفیانہ تربیت ان کی سرشت میں تھی اور وہ روحانی ارتقا کو مسترد نہیں کرتے تھے لیکن درس احتیاط نے ان سے کہلوایا کہ "ولایت بہرحال نبوت سے کم تر درجے کی چیز ہے۔ نبوت وہ کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وارد ہوتا ہے اور ولایت اس حدیث کا نام ہے جو براہِ راست الہام اکتساب کی جاتی ہے۔ نبی معصوم ہوتا ہے، غلطی نہیں کر سکتا۔ لیکن ولی غلطی کا ارتکاب کر سکتا ہے اگرچہ محفوظ ہوتا ہے یعنی عصمت صدورِ نیت سے پہلے ہوتی ہے اور حفاظت اس کے صدور کے بعد"۔ وہ اپنے ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں "سچی بات تو وہی ہے جس کو دین اسلام نے پیش کیا اور سیدھا راستہ وہی ہے، جس کی تلقین دین اسلام نے کی۔ اس کے علاوہ باقی راستے ٹیڑھے ہیں، جس پر چلنے والے منزلِ مقصود تک رسائی نہیں پاتے"۔

جو پیغام شیخ دینا چاہتے تھے وہ بے برکت نہیں رہا بلکہ ان کی زندگی ہی میں اس کا اعتراف کیا گیا۔ خود جہانگیر آپ کا معتقد اور معترف تھا مگر اس زمانے میں جب وہ کشمیر میں قیام پذیر تھا، اللہ جانے کن عاقبت نااندیشوں کے کان بھرنے پر آپ کو کشمیر بلوا بھیجا اور ان کے بیٹے نور الحق کو حکم دیا کہ وہ دہلی کو چھوڑ کر کابل چلے جائیں۔ اس وقت شیخ کی عمر 75 سال سے زیادہ تھی اور ظاہر ہے ضعف کا زمانہ تھا۔ آپ سخت پریشانی اور تکلیف کے عالم میں ابھی لاہور ہی پہنچے تھے کہ شاہ ابوالمعالی نے آپ کو واپس دہلی جانے کی ہدایت کی۔ چند روز بعد جہانگیر کا بھی انتقال ہو گیا اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ یہ وہی شیخ ابوالمعالی ہیں جو قادری سلسلے سے منسلک ہیں اور جن کا دامن شیخ نے آخر عمر میں تھاما۔ ابتدا میں بھی آپ نے ایک قادری بزرگ شیخ موسیٰ گیلانی سے رشتہ جوڑا تھا۔ بعد میں آپ نے خواجہ باقی باللہ کے سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کر لی لیکن خواجہ باقی باللہ کی وفات کے بعد آپ پر پھر قادری نسبت غالب آ گئی۔ سو آخر عمر میں لاہور کے شاہ ابوالمعالی کو ان کا روحانی رہنما سمجھنا چاہیے۔ شاہ ابوالمعالی قادری خود بھی حضرت موسیٰ گیلانی کے مشہور پیر بھائی شیخ داؤد شیر گڑھی کے مرید ہیں۔

شیخ عبدالحق سے اللہ پاک نے تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا لمبا کام لینا تھا، سو انہوں نے لمبی عمر پائی۔ آپ نے اکبر اور جہانگیر دونوں بادشاہوں کا عہدِ حکومت دیکھا اور شاہجہان کے عہدِ حکومت کے سولہ سال۔ 29 جون 1642ء کو آپ نے پورے نوے سال کی عمر میں وفات پائی اور آپ کو خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے مزار کے قریب دفن کیا گیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی چلے گئے۔ ظاہر ہے ان کو جانا تھا مگر وہ اپنی زندگی بھر کی محنت سے وہ آثار چھوڑ گئے جنھیں آگے چل کر شاہ ولی اللہ نے ایک واضح راستے کے خد و خال عطا کرنے تھے۔

سولہویں صدی کے برصغیر میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے صوفیانہ انداز خیالی اور عقیدے کی بے ستی کے خلاف مسند درس و تدریس پر بیٹھ کر تصنیف و تالیف کے ذریعے اپنا کردار ادا کیا۔ انہوں نے زمین تیار کی اور اس کی خوب اچھے طریقے سے آبیاری کی مگر جس پر جوش و دانش ورانہ انداز سے انہی دنوں احیائے دین اور راسخ الاعتقادی کی جڑوں کو مضبوط کرنے کا کامیاب فریضہ انجام دیا وہ ہیں شیخ احمد سرہندی، جنھیں بجا طور پر مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے۔ شیخ احمد سرہندی 26 جون 1564ء کو سرہند میں پیدا ہوئے۔ سرہند ان دنوں تو لاہور اور دہلی کے تقریباً درمیان میں ایک معمولی سا قصبہ ہے مگر اس وقت یہ کثیر آبادی کا ایک ایسا شہر تھا جو دہلی کا مقابلہ کرتا تھا۔ شیخ عبدالحق کی طرح آپ بھی صوفیانہ آزاد خیالی کا فکری ورثہ لے کر عنفوان شباب میں داخل ہوئے۔ آپ کے والد مخدوم عبدالاحد معروف وحدت الوجودی دانش ور شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے صاحب زادے رکن الدین کے مرید تھے۔ انھیں ابن عربی کی تصنیف "فصوص الحکم" اور "فتوحات مکیہ" پر خصوصی دسترس حاصل تھی اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ مشہور صوفی میاں محمد میر نے وحدت الوجود کے اسباق انھیں سے پڑھے تھے۔

ابتدائی تعلیم کے بعد شیخ احمد سرہندی مزید تعلیم کے غرض سے سیالکوٹ چلے گئے جو اس وقت کے ہندوستان میں اسلامی علوم کا گہوارہ تھا اور تشنگان علم دور دور سے اس شہر کا رخ کرتے تھے۔ ایک مورخ تو سیالکوٹ کو قدیم یونان سے مشابہ قرار دیتا ہے۔ یہ آج کے پاکستان کا وہ سیالکوٹ نہیں تھا، جہاں صرف کھیلوں کا سامان تیار ہوتا ہے ـــ جو بورژوا اور نیم بورژوا کا شہر ہے اور فکری طور پر تقریباً بنجر ہے۔ میں بارہا سوچتا تھا کہ اللہ جانے اس مٹی نے اقبال اور فیض جیسے فرزند کیسے پیدا کر دیے۔ مگر پتہ چلا کہ ہر مٹی کا اپنا اثر ہوتا ہے جو ہو سکتا ہے کہ عارضی جبر کے زیر اثر وقتی طور پر تو دب جائے مگر وہ کہیں اندر ہی اندر موجود رہتا ہے اور عناصر مسلسل متحرک رہتے ہیں اور موقع ملتے ہی اپنی تاثیر اگل دیتے ہیں۔ خیر، یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ کہنا یہ تھا کہ شیخ احمد سرہندی نے یہیں پر علوم عقلیہ اور حدیث کی کتابیں پڑھیں۔

اپنے ہم عصر شیخ عبدالحق کی طرح آپ کو بھی درباری امرا فیضی اور ابوالفضل سے میل جول کا موقع ملا۔ یہ تعلق ان کی آگرہ میں آمد کے بعد قائم ہوا۔ غالباً آپ بیس سال کی عمر میں یہاں تشریف لائے اور ایک مدت تک قیام کیا۔ ظاہر ہے ابوالفضل اور فیضی کی غیر معتدل آزاد خیالی کی وجہ سے شیخ کے ان سے تعلقات دیرپا ثابت نہیں ہو سکتے تھے سو نہ ہوئے۔

جب شیخ احمد سرہندی کو آگرہ میں رہتے ہوئے ایک مدت ہو گئی تو ان کے والد بزرگوار فرط محبت سے مجبور ہو کر یہاں پہنچے اور بیٹے کو گھر واپسی کا حکم دیا۔ وطن واپسی کے اس سفر میں آپ کا تھانیسر رکنا ہوا، جہاں حاکم علاقہ ممتاز عالم اور ادیب حاجی سلطان تھانیسری کی بیٹی سے آپ کا عقد ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس عقد کی بابت حاجی سلطان کو حضرت محمدؐ سے خواب میں اشارہ ہوا تھا۔ قرین قیاس ہے کہ یہ 999 ہجری یا اس کے لگ بھگ کوئی سال ہوگا۔

حاجی سلطان تھانیسری کا شمار دور اکبر کے ممتاز امرا میں ہوتا ہے۔ وہ اکبر کے قریب ہونے کے باوجود اس کی مذہبی پالیسی کے مخالف تھے اور ہندوؤں کے لیے دل میں کوئی نرم گوشہ نہیں رکھتے تھے۔ ان دنوں تھانیسر احیائے ہندومت کا گڑھ سمجھا جاتا تھا۔ باوجودیکہ اکبر کے نزدیک تھے مگر ہندوؤں کی طرف سے گاؤکشی کی شکایت ملنے پر ایک بار آپ کو بھکر کی جانب جلاوطن کیا گیا۔ اگرچہ معاملہ بعد میں رفع دفع ہو گیا مگر حاجی سلطان اپنی کٹر عقیدہ پرستی کی پالیسی پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ اکبر نے ان کو سخت ہندو دشمن رویے کی بنا پر آخر کار 1599ء میں پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا۔

یہ دن شیخ احمد سرہندی کے لیے غم کے دن تھے۔ سسر کی شہادت کے پچیس روز بعد آپ کے والد ماجد نے انتقال کیا۔ مگر غم کی اس

تاریک رات میں سے قدرت نے خوشی، امید اور ولایت قطب کے سورج کے طلوع کا فیصلہ کیا تھا —— ہوا یوں کہ والد کی وفات کے بعد شیخ احمد سرہندی نے حج کا ارادہ باندھا۔ گھر سے نکلے تو راستے میں دہلی پڑتا تھا۔ دہلی پہنچے تو کچھ احباب نے ان کو حضرت خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں لے گئے۔ اس ضمن سے ان کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔

کسی سے بھی یکسر تقاضا نہ کرنے والے حضرات خواجہ باقی باللہ نے شیخ احمد سرہندی کو چند دن اپنی خانقاہ میں قیام کے لیے کہا۔ یہ چند دن بڑھ کر ڈھائی ماہ میں بدل گئے۔ ایک لحاظ سے یہ کافی عرصہ تھا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ کے آثار تصرف و کشش نے اپنا کام دکھایا، یہاں تک کہ شیخ احمد سرہندی نے حضرت خواجہ باقی باللہ سے بیعت کے لیے درخواست کی، جو قبول کر لی گئی۔

اپنے اہم ترین مرشد سے تربیت پانے کے بعد شیخ احمد سرہندی نے ان ہی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے امرائے دربار، طبقۂ اشرافیہ اور شاہی فوج کے عہدہ داران کو اپنی اصلاحی کوششوں کے لیے ٹارگٹ کیا۔ انھوں نے اپنے مذہبی، سیاسی پیغام کی ترسیل کے لیے بھی ایک منفرد میڈیم کا انتخاب کیا۔ یہ مکتوبات کے ذریعے اپنے پیغام کے ابلاغ کا طریقہ کار تھا۔

صرف سماج کی اوپر والی پرتوں کو اپیل کرنا کبھی بھی مضمرات سے خالی نہیں رہا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ جہانگیر کے دربار میں ایرانی شیعہ عناصر کو اس کی بیوی نور جہاں کی وجہ سے کافی اثر و رسوخ حاصل تھا۔ یہ طاقت ور عناصر شیخ احمد سرہندی کے خلاف ہو گئے۔ اس کے علاوہ ایک اور معاملہ بھی شیخ کے دشمنوں کو یکجا کرنے کا موجب بنا اور وہ تھا انھیں مکتوبات کے ذریعے اپنے روحانی تجربات و مشاہدات کا غیر محتاط اظہار۔

تصوف کی دنیا میں اپنے مقام کے متعلق مختلف دعاوی اور روحانی مشاہدات کا بیان اگرچہ کوئی نئی چیز نہیں ہے مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ راسخ الاعتقاد حلقوں نے اس پر کبھی بھی پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا۔ حضرت مجدد سے، جو صوفی پہلے تھے اور عالم بعد میں، اپنے مکتوبات میں ایسے ہی بیانات اور مشاہدات کا اظہار ہو گیا اور ان کی وسیع پیمانے پر تشہیر بھی ہو گئی۔ مثال کے طور پر وہ اپنے ایک مکتوب میں، جو ان کے صاحب زادے خواجہ معصوم کے نام ہے، لکھتے ہیں:

”میرا گمان ہے کہ میری پیدائش سے مقصود یہ ہے کہ ولایت محمدی ولایت ابراہیمی کے رنگ سے رنگین ہو جائے۔“

ان کا ایک اور مکتوب درج ہے:

”میں اللہ تعالیٰ کا مرید بھی ہوں اور اللہ تعالیٰ کا مراد بھی۔ میری ارادت کا سلسلہ بلا واسطہ اللہ تعالیٰ سے متصل ہے اور میرا ہاتھ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ کا قائم مقام ہے۔“

یہاں تک تو ٹھیک تھا مگر اپنے ایک مکتوب (مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، مکتوب یازدہم) میں وہ اپنے ایک صوفیانہ تجربے کے بیان میں ضبط و احتیاط کی حدوں سے کہیں دور نکل گئے —— انھوں نے روحانی ارتقاء کے سفر میں مشاہداتی طور پر خود کو حضرت ابوبکر صدیق کے مقام پر، بلکہ اس سے بھی قدرے بلند پایا۔ اپنی بات کی صحیح ترسیل کے لیے میں ان کے اپنے ہی الفاظ نقل کرتا ہوں:

(جاری ہے)

◆◆◆

ڈاکٹر محمود اسیر کا قابلِ رشک ادبی تحقیقی سفر

اخلاق عاطف

کوئی پینتالیس برس پہلے محمود اسیر نے اپنا ادبی سفر بطور شاعر شروع کیا اور اسلوب و اظہار کے نئے پن سے آراستہ اس کی شاعری نے سرگودھا کے علاوہ دیگر بڑے شہروں کے ادبی حلقوں میں بھی خاصی پذیرائی حاصل کی۔ لیکن اپنے فکر و فن کی بنیاد پر آگے بڑھنے کی خواہش رکھنے والا محمود اسیر مختلف ادبی لابیوں کے ان جہاں لوگوں کے مخصوص رویوں سے ذہنی طور پر ہم آہنگ نہ ہو سکا تھا۔ اس کے ساتھ طرفہ تماشا یہ بھی رہا کہ وہ اپنے ذاتی مسائل کی گتھیاں دوستوں کے ساتھ شیئر کرنے کا خوگر نہ تھا اور یہ کہ اپنی تصویر کو اپنی ہی ذات کے فریم میں سجائے رکھنے کی اس کی خواہش کو اس وقت کے گہرے دوستوں نے بھی اس کی خود سری سمجھ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تسلسل کے ساتھ عمدہ شعر کہنے کے باوجود وہ سرگودھا کی ادبی محافل کا لازمی جزو نہیں بن سکا تھا۔ بہت ممکن تھا کہ ذاتی و ادبی حالات و واقعات کی یہ تلخیاں اسے بکھیر کر رکھ دیتیں لیکن اس دوران پروفیسر ریاض احمد شاد، پروفیسر سجاد حسین نقوی اور ڈاکٹر انور سدید کی مشفقانہ رہنمائی محمود اسیر کو ادبی تحقیق و تنقید کی مسافرت پر گامزن کر کے اسے فکری طور پر بکھرنے سے بچانے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اور اس طرح اس کا (اب تک کا) چھتیس سالہ ادبی سفر کئی یادگار تحقیقی کاوشوں سے مزین ہو چکا ہے۔

ضلع سرگودھا اور خوشاب کی ادبی و ثقافتی تاریخ اور شاعری کا انتخاب "سخنورانِ سرگودھا" ادبی تحقیق کے راستے پر محمود اسیر کا پہلا سنگِ میل تھا۔ اس اہم تحقیقی کاوش کی ترتیب و تدوین میں محمود اسیر کے ساتھ معاون کا کردار ادا کرنے کے باعث میں اس کی مخلصانہ ادبی لگن و محنت کا چشم دید گواہ ہوں۔ 1983 میں شائع ہونے والی ساڑھے چار سو صفحات پر مشتمل اس کتاب کو ضلع سرگودھا اور خوشاب کی ادبی اور ثقافتی تاریخ کے پس منظر اور پیش منظر میں ایک نہ بھولنے والی اولین کاوش کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ یہ پہلی کتاب تھی جس میں متذکرہ اضلاع کی ادبی و ثقافتی تاریخ کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اس کاوش کی اہمیت وقت کے ساتھ ساتھ یوں نمایاں ہوتی رہی کہ اس موضوع پر اب تک جو بھی ادبی تحقیقی کتاب منظرِ عام پر آئی اس کے لکھنے والے نے "سخنورانِ سرگودھا" سے استفادہ ضرور کیا اور آئندہ بھی جب کوئی محقق ان اضلاع کی علمی ادبی ثقافتی تحقیق کے زینے پر پاؤں رکھے گا تو "سخنورانِ سرگودھا" کا مطالعہ کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اس بات کا ایک ثبوت چند سال پہلے یونی ورسٹی آف سرگودھا کی جانب سے شائع ہونے والی پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول کی انگریزی کاوش 'ہسٹری آف سرگودھا' سے بھی ملتا ہے کہ جس میں جابجا 'سخنورانِ سرگودھا' کے حوالے موجود ہیں۔ اس کتاب نے سرگودھا بورڈ کے زیرِ اہتمام مقابلۂ کتب میں اول انعام کے ساتھ سندِ امتیاز بھی حاصل کی تھی۔ کوئی شک نہیں کہ محمود اسیر کی اس اولین تحقیقی کاوش کو اس علاقے کی تاریخی و ادبی ریفرنس بک کا مقام حاصل ہے۔

اس کے بعد محمود اسیر پنجاب کے ایک خادمِ اردو پر پی ایچ ڈی کا تھیسس "مولانا صلاح الدین احمد احوال و آثار" کے سرنامے سے کامیابی کے ساتھ تحریر کر کے 1995 میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حصول میں کامران ہوا تھا۔ اس مقالے کی اہمیت کے پیشِ نظر 2009 میں

اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ مولانا صلاح الدین احمد پر لکھے گئے محمود امیر کے اس مقالے کو اردو ادب کے کئی محققین و ناقدین نے ایک معتبر ادبی تحقیق قرار دیا۔ ڈاکٹر انور سدید کے بقول اس سے بہتر ادبی تحقیقی مقالہ ان کے مطالعے سے نہیں گزرا۔ اس مقالے کی انفرادیت یوں بھی تسلیم کی گئی کہ سرگودھا یونیورسٹی کی جانب سے اس کتاب پر سکالرز کو ایم اے کا مقالہ لکھنے کی اجازت دی گئی۔

2013ء میں ڈاکٹر محمود امیر کی ایک اور تحقیقی کاوش 'اوراق کی ادبی خدمات' اشاعت پذیر ہوئی۔ ماضی و حال کے ہر لکھاری کو علم ہے کہ نصف صدی تک تسلسل کے ساتھ شائع ہونے والا ادبی جریدہ 'اوراق' نہ صرف معیاری نظم و نثر کا مرجع ہوتا تھا بلکہ آج کے معتبر اردو لکھاریوں کی نگارشات کا آغاز اشاعت بھی اسی جریدے سے ہوا تھا۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ دو ادبی نسلوں کی تربیت کا اعزاز 'اوراق' کو حاصل رہا۔ مختلف ادوار میں 'اوراق' کے مدیران کی ذمہ داریاں جناب عارف عبدالمتین، ڈاکٹر انور سدید اور پروفیسر سجاد حسین نقوی نے بھی ادا کیں لیکن ڈاکٹر وزیر آغا ہی اس کے مدیر و نگران اور مدیر اعلیٰ رہے۔ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اس کتاب کو ڈاکٹر وزیر آغا کے بیٹے ڈاکٹر سلیم آغا نے خود شائع کروایا۔ 432 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں اولین شمارے سے لے کر آخری شمارے تک 'اوراق' کی علمی، فکری اور ادبی جہتوں کا محمود امیر نے مکمل احاطہ اس دل جمعی کے ساتھ کیا کہ اس کاوش کے بین السطور محمود امیر کی تحقیقی و تنقیدی بصیرتیں بھی کھل کر سامنے آ گئیں۔ اس کاوش سے پتا چلتا ہے 'اوراق' نے اردو نظم و نثر کی روایتی اصناف کے ساتھ انصاف کرنے کے علاوہ کئی نئی اصناف مثلاً انشائیہ، نیا آزاد نظم، ماہیے، ڈھولے وغیرہ کے فروغ میں بھی کشادہ نظری کو پیش رکھا۔ اس کتاب کو دنیا بھر کے ادبی سکالرز کے لیے اور پاکستان بھر کی جامعات میں ایک اہم تحقیقی کتاب ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ دس ابواب پر مشتمل اس کاوش کے آٹھ ابواب پر اب تک مختلف یونیورسٹیوں کی جانب سے ایم اے اور ایم فل کے مقالے لکھوائے جا چکے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ اس کتاب کی وقعت میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ (اسی ضمن میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اس وقت ڈاکٹر محمود امیر کا مرتب کردہ 'اوراق' کا اشاریہ زیر طباعت ہے۔ جس کی اشاعت کے بعد 'اوراق' ایسے عہد ساز جریدے کی ادبی تاریخ ہر لحاظ سے مکمل و مدون ہو جائے گی)

گزشتہ برسوں کے دوران ڈاکٹر محمود امیر کی دو اہم ادبی و تحقیقی کاوشیں 'تدریس ادب و تحقیق' اور 'تحریریات و تنقیدات' سامنے آئی ہیں۔ موضوعات اور مندرجات کے اعتبار سے یہ کتابیں مختلف مقالات کے مجموعے ہیں کہ جن کا تنوع اور پھیلاؤ اردو ادب کے محققین و ناقدین کے لیے بھی اہمیت کا حامل ہے اور یہ کاوشیں اردو ادب کے تدریسی طلبا کے لیے بھی اکسیر تحقیق کا مقام رکھتی ہیں۔

216 صفحات کی کتاب 'تدریس ادب و تحقیق' اگست 2015ء میں شائع ہوئی۔ اس میں شامل مقالات ذیلی عنوانات میں تقسیم ہیں۔ حصہ اول میں 'تدریس ادب' کے ذیلی عنوان کے تحت درج ذیل سات مقالے شامل ہیں (1) اصول تدریس میں ہونے والی عالمگیر تبدیلیاں اور تجربات (2) تخلیقی ادب کی تدریس کا انسانی کردار، تخیل، جمالیاتی ذوق کی تربیت اور ثقافتی ورثے کی شناخت میں کردار (3) نثر اور شاعری کے مراتب میں نثر کی اہمیت (4) پابند اور آزاد نظم کا فرق اور کس قسم کی نظم کی تدریس کیوں مشکل ہے (5) اردو نظم کی اقسام اور غزل کی اہمیت (6) اردو داستانوں کی تدریس اور ان کے مقاصد (7) اس خیال سے بحث کہ اگر تخلیقی ادب نہ ہوتا تو تنقیدی ادب بھی نہ ہوتا۔ حصہ دوم میں 'تفہیم تحقیق' کے ذیلی عنوان سے آٹھ مقالات شامل ہیں جن کی تفصیل کچھ یوں ہے (1) نئے حقائق کی روشنی میں

موضوع و مواد تحقیق اور اس کے اثرات (2) اصول روایت و درایت تحقیق و تدوین کی روشنی میں (3) تحقیق میں ثانوی ماخذ اور بنیادی ماخذ کے کچھے سے بحث (4) اردو تحقیق' روایات و رحجانات کی روشنی میں (5) تحقیق اور تحقیقی زبان (6) حواشی' حوالہ جات اور اقتباسات۔ تعریف' فرق اور مقاصد (7) الحاقی کلام کی نشاندہی اور تصحیح متن کے مختلف طریقوں کی وضاحت (8) معیاری تحقیقی مقالے کی خصوصیات اور جائزہ۔ اس کتاب میں شامل مقالات کی درج بالا موضوعاتی رنگارنگی ڈاکٹر محمود اسیر کی محنت کی غمازی کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ وہ اردو ادب کی مختلف جہتوں کے ماضی سے حال تک کے سفر پر گہری نظر رکھتا ہے اور تدریس، تحقیق کے ضمن میں کلاسیک اساتذہ اور حال کے معتبر اہل نقد و نظر کے متعین کردہ معیارات کو کس احترام اور وابستگی سے دیکھتا ہے۔ آج کے تعلیمی منظر میں جب ہم دیکھتے ہیں کہ غیروں کی زبان کو فوقیت دے کر اردو زبان کو ثانوی حیثیت دی جا رہی ہے تو ڈاکٹر محمود اسیر کی یہ کاوش مزید اہمیت کی حامل ہو جاتی ہے۔

"تحریکات و تنقیدات" (منظر سے پس منظر تک) ڈاکٹر محمود اسیر کی ایک اور کاوش ہے۔ جنوری 2016 میں شائع ہونے والی 304 صفحات کی اس کتاب میں شامل مقالہ جات کا حصہ اول "تحریکات ادب" (منظر سے پس منظر تک) کے ذیلی عنوان سے اور حصہ دوم "تنقیدات ادب" (منظر سے پس منظر تک) کے ذیلی عنوان سے دیا گیا ہے۔ "تحریکات ادب" میں آٹھ مقالے شامل ہیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح ہے (1) برصغیر میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے اور بعد کی سیاسی سماجی اور ادبی صورت حال (2) قطب شاہی اور عادل شاہی عہد کے اردو ادب کا سیاسی ثقافتی اور ادبی پس منظر (3) اردو میں ایہام گوئی (4) میر و سودا کی شاعری ان کے عہد کے تناظر میں (5) سلطنت اودھ کے عروج و زوال اور لکھنؤ میں تخلیق ہونے والے ادب کا تفصیلی جائزہ (6) مرزا غالب کی نثر و نظم اور ان کے عہد کے مسائل و مصائب (7) سرسید کی نمایاں خصوصیات کے حوالے سے مولانا الطاف حسین حالی کی تخلیقات کا اجمالی جائزہ (8) اردو ادب پر پاکستان کے سیاسی حالات کے اثرات۔ "تنقیدات ادب" میں درج ذیل مقالات شامل ہیں (1) علی گڑھ تحریک کا تاریخی' سیاسی اور ادبی پس منظر (2) اردو ادب میں اسلوب بیان اور اسلوب ادب کے موضوعات پر علی گڑھ تحریک کے اثرات (3) اردو ادب میں رومانوی تحریک کا آغاز' پس منظر' مقبولیت کے اسباب اور اس تحریک کے منفی و مثبت اثرات (4) اردو کے ادیبوں اور شاعروں پر رومانوی تحریک کے اثرات اور ان کی اہمیت (5) حلقہ ارباب ذوق کے وجود میں آنے کے اسباب اور ادب برائے ادب کا جائزہ (6) ترقی پسند تحریک کی مقبولیت اور مخالفت کی نوعیت و اسباب (7) حقیقت نگاری و فطرت نگاری کا مفہوم' تاریخی پس منظر اور قیام پاکستان کے بعد ادب پر ان کے اثرات (8) وجودیت کے فلسفیانہ عقائد اور اقسام' جدید اردو نظم پر وجودیت کے اثرات۔ درج بالا عنوانات سے اس کتاب کا موضوعاتی تنوع ہمارے سامنے ہے۔ اب سے ڈیڑھ صدی پہلے غالب نے اردو زبان کے مٹ جانے پر پریشان ہونے کی بات کی تھی لیکن میں سمجھتا ہوں بطور زبان اردو کو آج اس سے بڑے چیلنج کا سامنا ہے کہ معاصر صورت حال میں اسے ثانوی سے زیادہ (ارباب فکر و دانش کی عملی توجہ جیسے) سہارے کی ضرورت ہے اور اسی ضرورت کا ادراک رکھتے ہوئے محمود اسیر نے عصر حاضر میں الیکٹرک میڈیا کی جانب سے اردو پر انگریزی زبان کی بلا تحقیق ہونے والی یلغار اور ایک بڑی ملک کی ثقافتی شورش کے قبل نظر یہ اہم مقالے تحریر کر کے کتابی صورت میں پیش کیے ہیں۔ سرسید احمد خان سے لے کر زمانہ حال کے اہم نثر نگاروں تک اردو زبان نے جیسے "فصیح" بلاغت جدید تخیل لطافت و ملاحت اور خیال کی رفعتوں کو چھوا اور نہ صرف برصغیر بلکہ پوری دنیا کے ادب کو اپنے سحر میں جکڑا' اس کتاب میں ماضی سے حال تک اردو ادب کے اس ارتقا کا سیر حاصل جائزہ دیا گیا ہے۔ قابل

تحسین بات یہ بھی کہ ان موضوعات کا عمدگی کے ساتھ احاطہ کرنے کے باوجود محمود اسیر نے ان موضوعات پر اپنے دقیق فکری جائزے کو حتمی جائزہ قرار نہیں دیا جس سے ان کی فہم و بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے کہ بہتر سے بہترین کی گنجائش کا ادراک بھی ان کے احساس میں موجود ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ایسے دقیق موضوعات پر قلم آرائی کرنا ہی اپنی نوعیت کی ایک مختلف جسارت ہے۔ اولاً ایسے ادبی نظریات کی تفہیم و ترسیل کا حق ادا کرنے کے لیے جہاں فکری انہماک کی یک جہتی اور احساس کی ہمہ جہت گہرائی مطلوب ہوتی ہے وہاں اس ضمن میں حاضر ادبی معیار و مذاق کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس وقت اساتذہ اور طلبا کے مابین رابطے کے فقدان اور تخلیق کار و محققین کے درمیان موجود مکالمے کی کمی بھی ایسے سنجیدہ ادبی مباحث کو متوازن طور پر زیر بحث لانے میں امر مانع ہے۔ ان دونوں تحقیقی کاوشوں کے عمیق مطالعے کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر محمود اسیر نے منتخب کردہ ادبی موضوعات پر قلم آرائی کے دوران ماضی سے حال تک آتے ہوئے کلاسیک سے جدت تک کے اردو ادبی سفر کو فکری مطالعاتی گہرائی اور ناقدانہ نظر کی کشادگی کے ساتھ دیکھا ہے۔ اردو تحریکات و تحقیقات اور اردو ادب و تنقید کے ماضی و حال کے اس کٹھن ادبی سفر کی تلاش و جستجو کے بعد جو نتائج اخذ کیے انھیں اس نے ذہن پر بوجھ بننے والی دقیق نگارشی طوالت سے گریز کرتے ہوئے سلجھے ہوئے انداز سے زبان و بیان کی شستگی اور اظہار و اسلوب کی رنگا رنگی سے سجا کر ادبی قارئین کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ موضوعات اور مندرجات کے اعتبار سے یہ کاوشیں اردو ادبی محققین اور صاحبان نقد و نظر کی فکری سمت میں درست رہنمائی کی حامل ہیں اور (میرے مطالعات و ذہن کے مطابق) ہمارے عزیز تمام جامعات میں اردو تدریس کے معیار و کارکردگی کو بہت بہتر بنانے کے حوالے سے اساتذہ اور طلبا کے لیے از حد مفید و معاون بھی ثابت ہوں گی۔

اس جائزے سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر محمود اسیر کا ادبی تحقیقی سفر کامرانیوں سے عبارت ہے۔ یہاں ضمن میں یہ بھی جانتا ہوں اس کامران تحقیقی سفر کے دوران ڈاکٹر محمود اسیر کا شاعرانہ تخلیقی سفر بھی جاری رہا ہے۔ اسی دوران وہ ملازمتی ذمہ داریاں ادا کرنے کے ساتھ ساتھ عارضۂ قلب سے بھی نبرد آزما رہا اور اب اسے دیگر عوارض کا سامنا بھی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ درج بالا ادبی کاوشیں اس کے قابل قدر تحقیقی سفر کی غماز ہیں لیکن بہت ضروری ہے کہ عمر کی اس منزل پر اس کا شعری سرمایہ بھی کتابی صورت میں سامنے آ جانا چاہیے۔ ڈاکٹر محمود اسیر کی صحت سلامتی اور طویل عمری کی دعا کرتے ہوئے میں اس کے شعری مجموعہ کلام کی اشاعت کا بصد خلوص تمنائی بھی ہوں۔

◆◆◆

شاعرہ، مصورہ، ادیبہ پروین شیر کی چوتھی کتاب

بے کرانیاں

وہ انعام یافتہ شعری مجموعے "کرچیاں" اور "نہال دل پر سحاب جیسے" "ایک تحقیقی سفرنامہ" "چند سیپیاں سمندروں سے"
(تینوں دو لسانی —— اردو/انگریزی مصوری کے ساتھ) کے بعد بے کرانیاں —— دو لسانی مصور نظموں کا مجموعہ

جلد شائع ہونے والا ہے

دبستانِ سرگودھا کا سچا وارث پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

ملک اشرف ذکی

خلدِ آشیانی جناب ڈاکٹر انور سدید کی رحلت کے بعد ایک طویل عرصہ سکتہ نما سی کیفیت طاری رہی۔ اس ناقابلِ برداشت ادبی نقصان کا آسانی سے برداشت کر لینا ممکن ہی نہ تھا۔ بہرحال یہی نظامِ قدرت ہے جو اس جہانِ فانی میں آیا ہے اُسے جانا ہے۔ سدا رہے نام اللہ کا۔ غم کا یہ طویل سال بھی بیت ہی گیا۔ میرا ایک شعر ہے۔

آج اک پورا برس بیت گیا اس کے بغیر   جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

سرگودھا کی ادبی دنیا کے لئے خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا، سید اختر امام رضوی، احمد ندیم قاسمی، ڈاکٹر انور سدید، پروفیسر غلام جیلانی اصغر، پروفیسر غلام الثقلین نقوی، پروفیسر ڈاکٹر سرور کامران، عصمت ملک، عبدالرشید اشک، اظہر جاوید، شکیب جلالی، رشک ترابی، پروفیسر فاروق ملک بہت سے نام ایسے ہیں جن کی ادبی خدمات نے فی الواقع "دبستانِ سرگودھا" کو جنم دیا۔ اس دبستان کو ڈاکٹر انور سدید نے بے پناہ تقویت دی۔ مجھے یہ غم مضمحل کئے رہتا تھا کہ اس دبستان کی تابندگی وقت کے ساتھ ساتھ ماند پڑتی جائے گی۔ میں اس وقت چونک گیا جب ڈاکٹر انور سدید کے بچھڑنے کے مختصر عرصہ بعد پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی کتاب "انوارِ ادب بیادِ انور سدید" شائع ہو کر زیرِ مطالعہ آئی۔ اتنے مختصر عرصہ میں ایسی جامع کتاب کا معرضِ وجود میں آ جانا یقیناً چونکا دینے والا تھا۔ ایک امید بندھ گئی کہ دبستانِ سرگودھا لاوارث نہیں ہے۔ میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد اپنے گاؤں جھامرہ شریف ضلع چکوال میں مستقل رہائش پذیر ہوں۔ حالانکہ میری ملازمت کا زیادہ حصہ راولپنڈی / اسلام آباد میں گزرا لیکن میری محبتیں اور دلچسپیاں اور ادبی وابستگیاں سرگودھا میں بکھری پڑی ہیں کیونکہ یونیورسٹی جانے سے پہلے کالج کی تعلیم تک کا کیریئر سرگودھا سے متعلق ہے اور یہیں سے میرے ادبی دور کا آغاز بھی ہوا۔ یہیں میرے بزرگ شعراء و ادباء اساتذہ، دوستوں اور بھائیوں نے میرے ادبی ذوق کی اعلیٰ رہنمائی سے اسے جلا بخشی۔ 19 اپریل 2017ء کو ڈاکیا میرے گھر ایک خاصا بڑا رجسٹرڈ پارسل لایا۔ وصولی کے بعد کھولا تو حیرت سے ششدر رہ گیا۔ پارسل پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی اقبالیات پر یک وقت شائع ہونے والی چھ کتب (1) "بہارِ اقبال" (2) "نویدِ اقبال" (3) "موضوعاتی کلامِ اقبال" (4) "کائناتِ اقبال" (5) "ذخیرۂ اقبال" اور (6) "بیت بازی کلامِ اقبال" پر مشتمل تھا۔ میں نے مذکورہ کتب پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ میرا امرِ عجب ہونا انتہائی فطری تھا۔ دماغ میں سوال ابھرا کیا پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم بھی ڈاکٹر انور سدید کی طرح ہی کوئی جناتی شخصیت ہے۔ بظاہر یہ کام انسانی ہاتھوں کی بساط سے باہر ہی لگتا ہے۔ میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ ڈاکٹر انور سدید خود تو داغِ مفارقت دے گئے لیکن "دبستانِ سرگودھا" کا حقیقی اور سچا وارث دے گئے۔ چنانچہ میں نے دو نفل شکرانے کے، دو نفل ڈاکٹر انور سدید کی مغفرت کیلئے اور دو نفل پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید کی توفیقات میں اضافے اور ان کی صحت و سلامتی کیلئے ادا کئے۔

"کائناتِ اقبال" میں ڈاکٹر علامہ اقبال کے واقعات، مکتوبات اور اہم فرمودات شامل ہیں۔ "موضوعاتی کلامِ اقبال" میں وہ اہم موضوعات شامل ہیں جن پر علامہ اقبال نے اشعار کہے ہیں۔ "نویدِ اقبال" میں علامہ کے فکر و فلسفہ پر بحث کی گئی ہے۔ "بہارِ اقبال"

میں علامہ کے فکر وفلسفہ پر بحث کی گئی ہے۔ "بہار اقبال" میں علامہ پر لکھی گئی 50 مشہور کتب پر ڈاکٹر تبسم کے تبصرے شامل ہیں۔ "بیت بازی کلام اقبال" میں حروف تہجی کے حساب سے علامہ اقبال کے اشعار کو جمع کیا گیا ہے۔ میں نے "ذخیرۂ اقبال" کا باقاعدہ مطالعہ شروع کیا کیوں کہ ڈاکٹر علامہ اقبال کے تمام شعری ونثری تخلیقات پر ڈاکٹر تبسم نے بھرپور تبصرہ کیا ہے نہ صرف یہ بلکہ علامہ اقبال کے شاعرانہ تخیل، ان کے فکر وفلسفہ، فلسفہ خودی، فلسفہ مرد مومن، نظام خانقاہی اور دیگر موضوعات پر دیگر ادبا و مبصرین کے کلام پر بھی بہت ہی دلکش انداز میں بحث کی ہے اور انتہائی موثر اور بھرپور، لیکن مختصر اور بہت ہی جامع تبصرہ کیا ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں کچھ مزید روشنی ڈالی جائے۔

حرف اول میں جناب پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول صاحب فرماتے ہیں "پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب کو قدرت کی طرف سے یہ اعجاز عطا ہوا ہے کہ وہ نہ صرف متنوع موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں بلکہ ان پر لکھنے کا حق بھی ادا کرتے ہیں۔ وہ بڑی تیزی سے لکھتے ہیں مگر اس کے باوجود موضوعات کی تمام جزئیات پر ان کی نگاہ ہوتی ہے۔" "سرگودھا شہر کے رفتگان کے بارے میں انہوں نے جس قدر معلومات جمع کر دی ہیں وہ تاریخ کا قیمتی سرمایہ ہیں۔"

"آفتاب ادب ڈاکٹر وزیر آغا"، "انور ادیب یادِ انور سدید"، "ڈاکٹر ایوب صابر بحیثیت اقبال شناس"، "دانش صد رنگ"، "ڈاکٹر زاہد منیر عامر مفکر و اقبال شناس"، "ہمارے ایم جی صاحب"، "ابراہیم جلیس" ایسی کتب ان کی عرق ریزی اور محنت کا ثمر ہیں۔ زیر نظر کتاب "ذخیرۂ اقبال" اقبال کے تحقیقی کاموں کا گلدستہ ہے جس کی خوشبو قارئین اپنے اذہان میں محسوس کریں گے۔ یہ کتاب دراصل حضرت علامہ محمد اقبال کی تحقیق، تنقیدی، سوانحی، فکری اور تعلیمی کاوشوں کا انسائیکلوپیڈیا ہے۔" "ایسے تحقیقی کام یقیناً محبت اور عقیدت میں ہی معجزہ نما ہوتے ہیں۔ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کو عقیدت کی حد تک اقبال سے عشق ہے۔"

راقم الحروف اور پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم میں ایک بہت اہم قدر مشترک ہے یعنی ہم دونوں جناب پروفیسر صاحبزادہ عبدالرسول کے شاگرد ہیں۔ وہ ایک بے مثل استاد اور عظیم انسان ہیں۔ رب کریم نے صاحبزادہ صاحب کو پتھر کو چھو کر سونا بنانے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ ڈاکٹر پروفیسر ہارون الرشید نے ان کی وجہ سے خود کو کندن بنا لیا جب کہ راقم الحروف اشرف ذکی تھا اور اشرف ذکی ہی رہ گیا۔ لیکن اپنی اس نااہلی اور احساس کمتری کو یہ دعویٰ کر کے احساس تفاخر میں بدل لیتا ہوں کہ میں بھی شاگرد تو صاحبزادہ عبدالرسول صاحب کا ہی ہوں۔

"ذخیرۂ اقبال" میں شامل تبصرہ "بانگ درا" مارچ 1988 کی شائع شدہ ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نہ صرف ہمارے قومی شاعر بلکہ مصور پاکستان اور محسن پاکستان ہیں۔ بقول ڈاکٹر سید محمد عبداللہ انہوں نے "منتشر لفظوں کو وقار بخشا"

"بانگ درا کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا دور 1905 تک دوسرا 1905 سے 1908 تک اور تیسرا دور 1908 سے اشاعت کتاب تک۔ علامہ اقبال نے زمانہ قیام یورپ بہت ہی فارسی کتب کا مطالعہ کیا اور ایک تحقیقی کتاب کی صورت شائع کیا جسے فلسفہ ایران کی مختصر تاریخ کہنا چاہیے۔ اسی کتاب کے سبب اہل جرمنی نے ڈاکٹریٹ کا درجہ دیا۔" "بانگ درا" میں ابواب کی تقسیم سے اقبال کے ارتقائے ذہنی کو سمجھنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنی شاعری کی ابتدا غزل سے کی۔ مشاعروں میں کلام سنایا بھی۔ ارشد گورگانی، ناظم لکھنوی کے بعد کچھ عرصہ جناب داغ دہلوی سے بھی بذریعہ ڈاک اصلاح لی لیکن جلد ہی داغ نے انہیں کہا کہ آپ کو اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں۔ سن 1874ء لاہور میں اردو نظم گوئی میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اس سال مولانا محمد حسین آزاد نے ایک نئے

مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ شعرا کو نظم لکھنے کیلئے ایک عنوان دیا جاتا۔ کسی ہیئت یا بحر کی پابندی نہ تھی۔ یہ مشاعرے ایک سال سے زیادہ جاری نہ رہ سکے لیکن انہوں نے نظم نگاری کی ایک تحریک پیدا کر دی۔ 1939ء سے 1972ء تک "بانگ درا" کے 29 ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس دور میں علامہ اقبال پر وطنیت کا عنصر غالب رہا۔ مناظر فطرت کی تصویر کشی، جہد، جہد و زیست خاص موضوعات رہے۔ دوسرا حصہ بحیثیت مجموعی زمانہ قیام یورپ ہے۔ تیسرا حصہ طویل ہے۔ متنوع اسلوب کے ساتھ مشق سخن جاری رہی۔ امت مسلمہ کے عروج و زوال اور مسلمانوں کے اعلیٰ مستقبل کی تڑپ نمایاں رہی۔ "بانگ درا" علامہ اقبال کا شعری شاہکار ہے۔ آزادی، قیام ملت، خودی، وطنیت اور قومیت میں فرق، قومی جذبہ، یقین محکم، عمل پیہم، جہد و جہد اور رجائیت کا گلدستہ ہے۔ جس میں قومی تشکیل کا درس حاوی ہے۔ استعارات، تشبیہات، تراکیب اور تلمیحات اور بہترین علامات سے مزین ہے۔

وہ نمود اختر سیماب پا ہنگام صبح　　یا نمایاں بام گردوں سے جبین جبرئیل

طویل نظموں میں حسن معانی کا سمندر موجزن ہے۔ غوطہ خور جتنی گہرائی میں جائے گا صدف کی صورت قیمتی موتی حاصل کرے گا۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو　　لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی　　سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں　　انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

زوال آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن　　زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا

"بال جبریل" بہت اہمیت کا حامل شعری مجموعہ ہے۔ یہ زندگی میں جہد مسلسل اور محو پرواز رہنے کا درس دیتا ہے۔ ابلیس ایک استعارہ ہے کہ انسان احکام الٰہی کا پابند رہے۔ ابلیس حضرت جبرئیل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح　　تو فقط اللہ ھو اللہ ھو اللہ ھو

اے صبح ازل انکار کی جرأت ہوئی کیونکر　　مجھے معلوم کیا وہ رازداں تیرا ہے یا میرا

"بال جبرئیل" کا پہلا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے جبکہ دوسرے حصے میں نظمیں شامل ہیں۔ "بال جبریل" کی اکثر غزلیات میں فارسی کلام کا رنگ غالب ہے۔ نومبر 1954ء میں اس کا نواں ایڈیشن شائع ہوا۔ 1973ء میں تیسواں ایڈیشن منظر عام پر آیا۔ "بال جبریل" میں فلسفی اور موسیقیت غالب ہے۔ "ساقی نامہ"، "مسجد قرطبہ"، "ذوق و شوق"، "جاوید کے نام"، "روح ارضی آدم کا استقبال کرتی ہے" اور "فلسفہ و مذہب" جیسی عظیم نظمیں شامل ہیں۔ ان پر تفسیر ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کی کتاب "اقبال کی طویل نظمیں" قابل مطالعہ

ہے۔"بالِ جبریل" کی غزلیات کا ہر شعر معنی کا ایک سمندر محسوس ہوتا ہے۔

"ضربِ کلیم" جولائی 1936ء میں شائع ہوئی۔ سترھواں ایڈیشن 1974ء کو زیورِ طباعت سے آراستہ ہوا۔ "ضربِ کلیم" میں اہلِ مغرب کی اخلاقی بے راہ روی کو بے نقاب کیا۔ فرعونی قوتوں پر ضرب کاری لگائی۔ اقبال کا فکر و فن "ضربِ کلیم" میں پورے عروج پر نظر آتا ہے۔ ملتِ اسلامیہ کی عظمتِ رفتہ کی یاد اور فکرِ مستقبل پر مشتمل ہے۔ کوئی بھی شاعر اپنے ماحول سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ "ضربِ کلیم" انقلاب کے دروازے پر دستک ہے۔

تجھے مقام کی خوگر طبیعت آزاد ہوائے سیر مثالِ نسیم پیدا کر
ہزار چشمہ ترے سنگِ راہ سے پھوٹے خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر

ابتدائی حصے میں دعوتِ جہاد ہے۔ اسلام کے آفاقی پیغام کو شعری سانچے میں ڈھالا ہے۔

مری صراحی سے قطرہ قطرہ نئے حوادث ٹپک رہے ہیں میں اپنی تسبیحِ روز و شب کا شمار کرتا ہوں دانہ دانہ

بقول پروفیسر منور مرزا "بے مقصد شاعری یا کوئی اور فن بلکہ خود دین بھی اگر زندگی کی مثبت قدروں کے منافی ہو تو اقبال شدید تنقید کرتے ہیں" انہوں نے فن پر فنکارانہ تنقید کی ہے۔

"ارمغانِ حجاز" 1938ء میں پہلی دفعہ شائع ہوئی۔ زیرِ تبصرہ اشاعت 1999ء ہے۔ یہ اردو اور فارسی میں ہے۔ "ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" پر شور کیا ہوتا ہے؟ کے مطالعہ کے بعد شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ علامہ اقبال مغرب زدہ معاشرے، سرمایہ دارانہ نظام نیز مسلمانوں کی اخلاقی پستی سے سخت نالاں ہیں۔ امتِ مسلمہ کو ایک زندہ قوم کی صورت زندہ رہنے کا مخصوص پیغام اس کا مرکزی نکتہ ہے جس کا حصول محض کتابوں سے نہیں بلکہ عمل سے ہے۔ حضرت امام حسینؓ والا عمل کہ جان اللہ کی راہ میں قربان ہو جائے لیکن طاغوت کے سامنے سرنگوں نہ ہو جس قوم کا لہو گرم رہتا ہے وہ حق حاکمیت کی حامل ہوتی ہے۔ موت سے خوفزدہ قوم غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جاتی ہے۔

عبث ہے شکوۂ تقدیرِ یزداں تو خود تقدیرِ یزداں کیوں نہیں ہے

یہ تو ہے علامہ اقبال کی ذاتی تخلیقات کے بارے میں لیکن اپنے گرو جناب ڈاکٹر انور سدید کی طرح پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے اقبالیات پر بھی انتہائی اہم کتب پر انتہائی جامع تبصرہ بھی کیا ہے۔ طوالت آڑے آ رہی ہے۔ بہر حال کم از کم ان کے نام نظر انداز کرنا "ذخیرۂ اقبال" کے حوالے سے زیادتی ہوگی۔ کلیات باقیاتِ شعرِ اقبال (ڈاکٹر صابر کلوروی)، تعلیمات و ارشاداتِ اقبال (ڈاکٹر اکبر قریشی) جوئے شیر (داؤد منظر) تضمیناتِ اقبال (تبسم و عزیز) ۔ جوئے رواں (طاہر حمید تنولی) موضوعاتِ اقبال (محمد شریف بقا) ۔ ابتدائی کلامِ اقبال (بہ ترتیب ماہ و سال، ڈاکٹر گیان چند) باقیاتِ اقبال (سید عبدالواحد معینی)، تلمیحاتِ اقبال (سید عابد علی عابد) بانگِ درا (بہ اعتبارِ زمانہ) (عروبہ سرور صدیقی)، تشبیہاتِ اقبال (پروفیسر نذیر احمد انور)۔ مطالبِ اقبال (مقبول انور داؤدی)، فرہنگِ اقبال (تسنیم امروہوی) علامہ اقبال کی اردو نثر، شذرات، سوانحی خاکے (یادداشتیں، ملاقاتیں اور گفتگو)۔ اقبال کے خطوط پر بھی خوبصورت مختصر لیکن انتہائی جامع تبصرہ کیا ہے۔ "ذخیرۂ اقبال" کے مطالعے سے راقم الحروف بصدقِ دل اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم فی الواقع "دبستانِ سرگودھا" کا حقیقی اور سچا وارث ہے۔

◆◆◆

تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیسا!

منظومات

اظہر جاوید

خواب اور پیار

اس نے خط میں لکھا ہے
خواب دیکھتے رہنا ۔۔۔۔ پیار سوچتے رہنا
مہربان لڑکی کو
کیا بھلا میں بتلاؤں
کیسے اس کو سمجھاؤں
ان تمام برسوں میں
خواب ہی تو دیکھے ہیں
پیار ہی تو سوچا ہے
خواب جن کی تعبیریں
آج تک نہیں پائیں
پیار جس کی تقدیریں
ہاتھ میں نہیں آئیں
آرزو کی راہوں میں
بے بسی کی باہوں میں
خواب ہی پگھلے ہیں
خواب ہی تو پگھلے ہیں
سوچنا مقدر ہے
سوچ کی تپش میں ڈھلتے ہیں
سوچ ہی سے جلتے ہیں

OOO

جلیل عالی

کیا کہتے ہو

تم کہتے ہو
سوچ نئی ہو گی
شاید لفظ پرانی کینچلی ہے
[illegible]
اس سے اور خرابی ہے
دیکھو!
کیسے جیون بھری تنہائی کی
بیگانی راہ میں
[illegible]
لیکن ان میں
سوچ خیال کی ایک پہچان ہے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کتنا اجلی آرزو ہے
صبح سے شام ہوئے بیٹھی ہے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
مشکل آسان کرے

OOO

بشریٰ رحمٰن

میری سوتن؟

سوتن تھی میری کون؟ یہ الجھن کی پہیلی
[illegible]

کچھ ہوش میں آ جاتے ہیں ہونٹوں سے لگا کر
کچھ جوش میں آ جاتے ہیں تم ایک لگا کر
کچھ اور طلب کرتے ہیں [illegible]
کچھ بہکتے ہیں [illegible] اسے سر پہ چڑھا کر

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] کوٹھی میں کہیں ہے
[illegible] طلبگار کہیں ہے
[illegible] ممنوع کہیں ہے
جس گھر میں یہ گھستی ہے وہاں چین نہیں ہے

گھائل کو یہ غم سے بھلے آزاد کرے گی
دل شاد کرے گی کبھی ناشاد کرے گی
[illegible] فریاد کرے گی
[illegible] برباد کرے گی

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
سوتن تھی میری کون؟ یہ الجھن کی پہیلی!!

OOO

پروین شیر (امریکہ)

آسمانی انگلیاں

زمیں کے سینے پہ سانپ جیسے یہ راستے
یہ ہزار پیچ ندیاں پگڈنڈیاں
یہ آسمانوں کی انگلیاں
جن کے ہر اشارے پہ چلتی ہے
یہ زندگی
یہ خطر راستوں پہ چلتی
رواں دواں ہے
ہوائیں لچکیلے پروں کو پھیلائے
اڑے جاتی ہیں دور نیلم کے پتھروں پہ
سروں کو ٹکراتی رہتی ہیں در بدر
بکھر کے واپس زمیں پہ آ کر
یہ غرق ہوتی ہیں
پھر دلوں کے سمندروں میں
یہ جال راستوں کے
جن میں ابھی دوڑتی ہیں سانسیں!

OOO

حسن عسکری کاظمی

نقطہ

حرف میں نقطہ کہاں سے آیا
نقطہ حرفوں سے بنا، نقطہ بنایا کس نے
کون تھا جس نے حرف یہ جوڑ دیا
نقطہ میں معنی و مفہوم کا سرمایہ
عطا ہے کس کی
شاعری، فلسفہ یا کوئی بھی ہو مضمون
اپنے اظہار میں ہے نقطہ کا محتاج اگر
نقطہ اک زندہ حقیقت ہے کوئی کیا جانے
سانس لیتا ہوا ہر لفظ ہے بیدار اگر
زندگی نقطہ کی ایجاد سے پہلے بھی یہاں تھی لیکن
پھر بھی
آدمی خالق الفاظ ہے تو یہ جانا اس نے
وہ بدلتی ہوئی ہر طرح پہلے تو فقط تھا
پھر وہ جذبات سے مطلوب
کسی اور طرح سے بنا
اس کی آواز میں شامل ہوا لہجہ جس میں
فکر و تخیل، ہنر کو بھی سیکھا اس نے
اک یہی نکتہ سمجھتا ہے مجھے
حرف میں نقطہ کہاں سے آیا
نقطہ حرفوں سے بنا، نقطہ بنایا کس نے؟

OOO

سرفراز سید

کب عہد وفا ہو گا

کب عہد وفا ہو گا اے جان وفا جاؤں
کب درد کی شاخوں پر الفت کی گھٹا جاؤں

امید کے زخموں سے کب خواب رہا ہوں گے
اترے گا جو خوابوں سے کب راز ترا جاؤں

مٹی میری دھرتی کی رنگوں کو ترستی ہے
ابھرے گا ہتھیلی پر کب رنگ حنا جاؤں

کب آئیں گے صبر سے شمشیر بکف قاتل
آزاد نہیں ہو گی کب خلق خدا جاؤں

اک عہد ستم کل تھا اک عہد ستم اب ہے
کوئی دست دعا جاؤں کوئی دست شفا جاؤں

جب کچھ بھی نہ تھا، حالات ہی ایسے تھے
کچھ غیر کا موسم تھا کچھ تم بھی خفا جاؤں

OOO

نیلم احمد بشیر

اندر باہر

اندر اندر خوف سا رہتا ہے
باہر باہر سے میں ہنستی رہتی ہوں
اندر ایک سمندر سا رہتا ہے
باہر سے اک دنیا جیسے [illegible] ہے
اندر اندر اک گلزار رہتا ہے
باہر سے میں کتنی شیریں لگتی ہوں
اندر سے تلخی، محرومی کی دنیا ہے
باہر سے سب اچھا ہے کا منظر ہے
کئی برسوں سے جیتے جیتے
اب بھی تلخیوں کی دنیا لگتی ہے

OOO

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

کیا تم میری ماں ہو؟

جانے کیوں ایسا لگتا ہے
میں بچپن کا وہ بچہ ہوں
جب انڈے سے باہر نکلا
تو میری ماں کھانا لینے
گئی ہوئی تھی
مجھے تو یہ بھی علم نہیں ہے
میری ماں کیسی لگتی ہے
سو ایک اک سے پوچھ رہا ہوں
ہر صورت میں اپنی ماں کو
ڈھونڈ رہا ہوں

OOO

شہزاد نیر

محوِ آئینہ داری

یہ سراب مجھے کھلا نہیں
کسی روز مجھ کو بتا بھی دو کہ کہاں ہو تم
کسی رنگ، بو کہ نظر میں ہو
مرے پاس ہو کہ مری نگاہ کی پیاس ہو
کسی روز خود سے الگ پڑو
مجھے دیکھ لو
ابھی مجھ میں نے جرأتِ شوق ہے
اسی وہم حسن تک اک نظر
یہ بڑی دقتوں سے اٹھائی تھی
اور تم نے آ کے گنوا دیا

تو وصالِ حسن [illegible] ہے
کہ جو دیپ تم کو عزیز ہے
اسے دیکھنے سے دوام ہے
جو چمن پہ پھولوں کے رنگ ہیں
یہ کہیں کے باغ سے آئے ہیں
سو گداز حسن کی عرض ہے
رہو محو اپنے جمال میں
مگر آئینے کو گھما دو نا

OOO

مرزا احمد نور طائر

اُجڑے گھر

مرے بچپن میں جو کبھی پھول سے کھلے ہوئے،
وہ کدھر گئے؟
وہاں میوہ دار، بور دار درخت تھے لگے ہوئے،
وہ کدھر گئے؟
انہیں پانی دینا کوئی بھول گیا
یا انہیں اوقات کے سلسلے نے
ان کا نام و نشاں مٹا دیا
انہیں اپنے ہی گھر کو ڈھا دیا؟
کئی ظلم و ستم کی ہے داستاں
کیا اپنے ہی گھر کو ویراں ویراں
جب [illegible]
اور یادیں [illegible] کو کھانے لگے
پھر کوئی نہیں ہوتا یاد رو کر
بس اپنے نصیب کی بات کر

OOO

آسناتھ کنول

برف

گم ہیں یہ قلم اور کاغذ اور میں
سوچ کا پایہ دیکھے ہوئے حرفوں میں
جذبوں کی بستی گھر اور گرتی یادوں کی ڈالوں
لفظوں کے بکھرے زرد پھول اکٹھے کروں
دل کی آنکھیں کھول کے دیکھوں
نئے الفاظ نئے جملے نئے انداز نئے تلاش کروں
کچھ بہت آہی لفظوں کو اپنے تخیل میں تحریر کروں
کچھ حقیقت بھی کچھ افسانہ بھی
کوئی دل آویز تحریر ہی
اک کہانی، شعر، داستان کوئی
نظم، غزل، شہ پارہ کوئی
کچھ تو لکھوں کہ جو امر ہو جائے
میں جو لفظوں سے کھیلتی تھی بہت
آج سوچوں کے اک بھنور میں گھری
دائروں میں کہیں الجھی ہوئی سی
ذہنی لہریں ہیں جو ٹھٹھری ہوئی
خیال کے ساحلوں پہ ایستادہ
کشتیاں ڈانواں ڈول جاتی ہیں
الفاظ ساری ہیں کھو دیتے ہیں
یہ جو ہمدم بھی ہیں سہارا بھی
وقت کی چادروں میں لپٹے ہوئے
قطرہ قطرہ پگھلتے جاتے ہیں
مدتیں ہو گئی ہیں کچھ لکھے الفاظ پر دن ہیں یہ تھم گئے ہیں
کنول؟
ارے یہ کیوں برف برف گئی ہے!

○○○

سیماب ظفر بخاری

زمیں نے دائروں کو رنگ بدلتے دیکھا ہے

زمیں نے دائروں کو رنگ بدلتے دیکھا ہے
کمال "کن" جہاں فن میں ڈھلتے دیکھا ہے!

ادا کے ضرب یہ جو بہتے ہیں رنگ تراش
کمال حسن نے بولتی تلک کو آن لیا

خیال یار تصور میں جاوداں ٹھہرا
شبیہ ان کے کسی سنگ پہ آستاں ٹھہرا

جمال فکر محبت کا ترجماں ٹھہرا
بیاں نے قلم چھوڑا کہ الفاظ نہیں

خیال "عقل" روشن کی آشنائی ہے
یہ نقش حرف تو دلوں کی اک مثال نہیں

جمال قدرت و رعنائی تراشیں
معیار حرف و نحو استعارے تشبیہیں

حسین الفاظ میں ڈھلی کہ ورق کہیں [illegible]
یہ نقش "شعر" عشق ہوئے ہیں [illegible]

○○○

سعدیہ سیٹھی (یو۔ کے)

محاسبہ

روز وہ ایک آ کرتے ہے
توڑنے سے کیا حاصل
آنسوؤں کی اطاعت تو
سچ کی روح تو ٹھہری
یہ گرے آ ہو جاتی
سامنے کے داغوں کو
عکس اسیر کرتا ہے

○○○

امجد بابر

حیرت ہے

اک اپنی ذات کی گتھی پر
آنکھوں کے صحرا میں
لب تپتے ترتے خوابوں پر
کائنات میں بہتے دریاؤں
لمحہ لمحہ ٹھہرے
نیلے سمندر میں بارش کی رم جھم پر
ہر سیاہ راتوں کی ظلم رہی ہے
تخلیق شعر و عبرت کے قفل ریتی پر
یادوں کے بازار میں چلتے پھرتے
سایوں کے کاغذ اوراق کی اجنبی حالی پر
ایک دکھ کام محبت کی بربادی پر
حیرت ہے

○○○

افسانے

برکت

ڈاکٹر رشید امجد

مختصر تعارف

ڈاکٹر رشید امجد 5 مارچ 1940ء کو سری نگر (کشمیر) میں پیدا ہوئے۔ چودہ افسانوی مجموعے "عام آدمی کے خواب" کے نام سے کلیات میں شائع ہوئے۔ اس کے بعد "دُکھ کی چھایا" کے نام سے 2016ء میں ایک مجموعہ شائع ہوا۔ 2006ء میں حکومت پاکستان کی طرف سے پرائڈ آف پرفارمنس کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ رشید امجد کے افسانے سماجی سیاسی شعور کے ساتھ ساتھ گہری فلسفیانہ معنویت رکھتے ہیں۔ کہانی بیان کرنے کا مخصوص انداز اور اسلوب کی شگفتگی ان کی انفرادی پہچان ہے۔

گھر میں ہر چیز موجود تھی مگر برکت نہیں تھی۔

دو کنال کے گھر میں آٹھ بیڈ روم دو بڑے لاؤنج اور اوپر تلے دو کچن تھے۔ گھر کے مکینوں کے علاوہ چار ملازم، خانساماں، ڈرائیور، کام کرنے والا اور مالی۔ پورچ میں پانچ گاڑیاں کھڑی ہوتیں۔ ڈرائیور گھر کی پچھلی گاڑی کے لئے تھا۔ سب کے کمرے الگ الگ تھے۔ ہر کمرہ میں ٹی وی تھا۔ رات دیر تک جاگنے کے بعد صبح سب جز بز کر اٹھتے۔ لباس ٹھیک کرتے، بھاگم بھاگ نیچے ڈائننگ روم میں آتے۔ جلدی ایک دو توس منہ میں ٹھونستے اور چائے کی پیالی خالی کر کے اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف بھاگتے۔ یہ عجیب افراتفری کا سماں ہوتا۔ کسی سے کوئی بات کرنا بھی ہوتی تو بھاگتے دوڑتے۔

"دیر ہوگئی — دیر ہوگئی"۔

وہ، جو اس گھر کا بڑا تھا بہت کڑھتا — "جلدی کیوں نہیں سوتے؟"

یہ روز کا جملہ تھا جس کا جواب کبھی نہ آتا۔ دو بیٹوں کی شادیاں ہو چکی تھی، دو لڑکیاں ابھی کنواری تھیں۔ سب جاب کرتے تھے۔ بیٹوں کی شادیوں کو دو دو سال ہو چکے تھے لیکن گھر میں بچوں کی چہکار نہیں تھی۔

کئی بار بیوی سے پوچھا۔

وہ گلی میں سر ہلا کر رہ جاتی — "کہتے ہیں اتنی جلدی نہیں"

وہ جھنجھلا جاتا — "دو دو سال ہو گئے، اب بھی جلدی نہیں!"

بیوی کہتی — "ان کی مرضی"

سوچتا جس باغ میں پرندے نہ ہوں اس کی خوشبو اور رنگ کس کام کے۔ پرندوں کی چہچہاہٹ ہی تو باغ کی رونق ہے اور جس گھر

میں بچوں کی کلکاریاں نہ ہوں ۔۔۔ "دوپہر کو تو سب باہر ہی ہوتے۔ صرف دونوں میاں بیوی ہی کھانا کھاتے لیکن رات کے کھانے پر بھی کھانے کی میز کی کرسیاں عام طور پر خالی ہوتیں۔ آگے پیچھے آتے اور کھانا کھا کر اپنے کمرے کی طرف دوڑتے ۔۔۔ کسی کا کوئی ٹی وی پروگرام کسی کی میٹ پر مصروفیت۔ کبھی اتفاق سے اکٹھے بھی ہو جاتے تو ہر ایک کی نظریں ہاتھ میں پکڑے موبائل پر ہوتیں۔ شاید یہ بھی احساس نہ ہوتا کہ ساتھ کون بیٹھا ہے۔" "یہ تو اب عام بات ہے" بیوی کہتی ۔۔۔ "مارکیٹ جاتی ہوں تو وہاں عورتیں خریداری کر رہی ہوتی ہیں اور موبائل کان سے لگا ہوتا ہے۔"

یہ تو اب عام تھا۔ اسے یاد آتا ایک زمانہ تھا کہ کسی بس سٹاپ پہ سفر کرتے ہوئے کہیں بھی دو شخص اکٹھے ہوتے تو رسمی گفتگو شروع کر دیتے لیکن اب جہاں دیکھو ہر شخص اپنے موبائل کے ساتھ گم ہے دوسروں سے کٹا ہوا ہے۔ لمبا سفر بھی گفتگو کے بغیر گزر جاتا ہے۔

خیال آتا پہلے تو ایسا نہیں ہوتا۔ جوں ہی سیٹ پر بیٹھتے۔ ساتھ بیٹھے ہوئے سے سلام دعا شروع ہو جاتی۔ دفتر جاتے ہوئے بس کے سفر کے دوران اس کے کئی دوست بنے تھے جن سے اب بھی دوستی کا رشتہ قائم تھا لیکن اب یہ حال ہے کہ ایک گھر میں رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔ یاد آتا کہ اس کا اپنا گھر کتنا بھرپور تھا۔ ایک بڑا اور اس کے ساتھ دو چھوٹے کمرے تھے چھوٹا سا باورچی خانہ۔ بڑا کمرہ ہی استعمال میں رہتا تھا۔ چھوٹے کمرے صرف سونے کے لئے تھے۔ صبح سب بڑے کمرے میں اکٹھے ہوتے دری پر آمنے سامنے بیٹھ جاتے۔ ماں اور بہنیں ناشتے کی پلیٹیں ایک ایک کے سامنے رکھتیں۔ عام طور پر پراٹھا اور رات کا سالن۔ چھٹی والے دن باہر سے پوریاں یا کلچے چنے آ جاتے۔ سب کو دن کا ناشتہ دے کر ماں اور بہنیں بھی ان کے ساتھ بیٹھ جاتیں۔ ناشتہ کرتے ایک دوسرے سے مذاق ہوتا، گھر کی کوئی بات ہوتی۔ پھر سب آگے پیچھے کاموں پر اور بچے سکول جانے کے لئے نکل پڑتے۔ دوپہر کو بچے اور ان کی مائیں اکٹھے کھانا کھاتیں۔ مرد صبح اپنا کھانا ساتھ لے جاتے تھے لیکن رات کے کھانے پر پھر سب اکٹھے ہوتے۔ دری پر سفید چادر بچھا دی جاتی اور کھانا لگ جاتا۔ کھانے کے دوران ہر کوئی اپنے دن کی کہانی سناتا۔ گھر میں ایک ہی ٹی وی بڑے کمرے میں تھا۔

تب اتنے ڈھیر سارے چینل بھی نہیں تھے۔

ڈرامے کے بعد خبریں سننے تک سب ہال میں رہتے پھر جیسے جیسے نیند آتی سونے کے لئے چلے جاتے اور ٹی وی بند کر دیا جاتا۔

"لیکن اب" وہ سوچتا ۔۔۔ "بے شمار چینل ہیں، ہر ایک کا اپنا اپنا پسندیدہ پروگرام ہے، اور اپنا اپنا کمرہ بھی ہے۔"

نیچے والے لاؤنج میں میاں بیوی اکیلے ہوتے ۔۔۔ اسے خبروں کا شوق، بیوی کو ڈرامے پسند تھے۔ وہ چینل بدلتا تو دونوں میں اختلاف پھر اس نے اپنے بیڈ روم میں ٹی وی دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ اکیلا لاؤنج میں اپنے پروگرام دیکھتا۔

"کیا ترقی ہوئی ہے؟" اسے خیال آتا ۔۔۔ "میاں بیوی بھی اب مل کر ٹی وی نہیں دیکھتے"۔

گھر میں ہر چیز تھی مگر برکت نہیں تھی ۔۔۔ ایک عجیب سا سناٹا تھا۔ لگتا تھا سب اس گھر میں رہ رہے ہیں اور نہیں بھی رہ رہے۔ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں اور علیحدہ علیحدہ بھی۔

"لگتا ہے اس گھر میں آدمی نہیں روبوٹ رہتے ہیں" اپنے اس خیال پر خود ہی ہنسی آ گئی۔

"ہر روبوٹ کا ایک پروگرام سیٹ ہوتا ہے"

جدید دور میں ہر آدمی کے اندر بھی ایک پروگرام سیٹ ہے جس میں عمل ہے لیکن جذبہ نہیں" "وہ محفلوں کے دن کیا ہوئے" بار بار

خیال آتا۔

ایک بڑا کمرہ تھا، کھلونوں سے لبالب۔ باتیں تھیں کہ ختم ہونے ہی میں نہ آتی تھیں۔ وہ ابھی ساٹھ کا تھا مگر لذتوں سے بھرا ہوا۔ اور اب — صبح میز پر طرح طرح کے جام، مکھن، جیم اور قسم قسم کی ڈبل روٹیاں مگر لذت نہیں تھی۔

وہ کہتا تو بیوی چڑ جاتی — "اپنی اوقات نہیں بھولتے تم"

"شاید" وہ اثبات میں سر ہلاتا — "رات کے سالن کے ساتھ روکھی روٹیوں میں جو مزہ تھا وہ ان مہنگی چیزوں میں نہیں۔"

آدمی بھی کیا چیز ہے، کچھ نہ ہو تو بہت کچھ کی تمنا کرتا ہے۔ بہت کچھ مل جائے تو کچھ نہ ہونے والے زمانے کو یاد کرتا ہے۔

"لیکن کچھ نہ ہونے والا زمانہ محبتوں کی خوشبوؤں سے تو معطر تھا" وہ اپنے آپ سے کہتا۔ "پھولوں کی چہکار نہ ہو تو باغ کے رنگ کس کام کے؟"

اتنا بڑا گھر، سجا سجایا۔ مہنگے بیڈ، صوفے، قالین، سب چیزیں مہنگی لیکن ان میں بان کی چارپائیوں اور لکڑی کی کرسیوں والا سکون نہیں۔ کیا انہیں کی نیند آتی تھی۔ اب ان قیمتی سپرنگوں والے گدوں پر رات کروٹیں لیتے گزر جاتی ہے۔

بہت سوچتا — سوچتا رہتا — "آخر خرابی کیا ہے؟ — اس کے ساتھ کیا ہاتھ ہوا ہے؟"

کتنی محنت سے اس نے یہ گھر بنایا تھا، بچوں کی نوکریاں، اچھی شادیاں — پیسے کی ریل پیل۔

وہ زمانہ یاد آتا کہ مہینے کی تاریخ کے بعد پہلی کا انتظار شروع ہو جاتا۔ کام کرتے کرتے، برتن دھوتے دھوتے ماں اور بہنوں کے ہاتھ مرجھا گئے تھے لیکن چہرے دمکتے تھے۔ اب ہر کام ملازم کرتے ہیں، ہاتھ ریشم کی طرح ملائم لیکن چہروں پر رونق نہیں یہ راز کیا ہے، ہمارے ساتھ ہوا کیا ہے؟

ہر لمحے کی سوچ — "ہوا کیا ہے"

پھر ایک دن صبح میز پر اکیلے ناشتہ کرتے اسے معلوم ہو گیا کہ ہوا کیا ہے؟

اپنے آپ سے کہا — "وہ گھر تھا اور یہ مکان ہے۔ وہاں آدمی رہتے تھے۔ یہاں روبوٹ رہتے ہیں۔"

◆◆◆

پروین شیر

"— پروین شیر کا زیادہ تر سروکار انسان کے دکھ اور انسانی تہذیب کی ناکامیوں سے ہے۔ ان کے کلام میں گرمی ہے اور تصویروں کے رنگ بھی گرم ہیں۔ بقول میر: رنگ گل سو کا دور دن سینہ گرم طلب ہیں ایسے رنگ" **(پروفیسر شمس الرحمن فاروقی)**

"— انفرادی تجربے اور اظہار کی مختلف صورتیں رومانیت کی تہہ سے پیدا ہوئی تھیں۔ پروین شیر کی نظموں میں ان کا رومانی اور شاعرانہ انداز حاوی رہتا ہے۔ ان کی شاعری مدھم راگ کی شاعری ہے — ایک کیفیت ہے بے نام سی اور ایک نشہ ہے بتدریج گہری ہوتی ہوئی۔" **(پروفیسر شمیم حنفی)**

آدھے چاند کی رات

نجم الحسن رضوی

مختصر تعارف

نجم الحسن رضوی 23 اپریل 1944ء کو ہندوستان کے شہر اعظم گڑھ کے موضع دیوگاؤں میں پیدا ہوئے۔ چار سال کی عمر میں والدین کے ساتھ 1947ء میں پاکستان آ گئے اور بالائی سندھ کے شہر سکھر میں بچپن اور جوانی کی منزلیں سر کیں۔ لکھنا نوعمری سے شروع کیا۔ پچاس سال سے زیادہ عرصے سے حرف و حکایت کی دنیا سے منسلک ہیں۔ اب تک ان کی دس کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں دیگر کتابوں کے علاوہ افسانوں کے آٹھ مجموعے، دو ناول، اور دو طنز و مزاح کے انتخاب شامل ہیں۔ افسانوں کے مجموعے "ہاتھ بیچنے والے" کو اکادمی ادبیات کی جانب سے ہجرہ ایوارڈ دیا گیا اور ناول "ماروی اور مرجینا" کو جنگ یو بی ایل ایوارڈ ملا۔ انھیں قطر کی انجمن فروغ اردو ادب کی جانب سے 1998ء میں جیم جعفری انٹرنیشنل ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ آج کل وہ امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں مقیم ہیں۔

اتنے عرصے کے بعد وہ آج پھر میرے بستر پر میرے پاؤں کے پاس بیٹھی تھی۔ چنبیلی اور موتیے کی خوشبو میں لت پت اسی پرانے صحن میں میرے پلنگ پر جہاں میں ہلکے رنگ کی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا تو وہ اسی پرانی رسانیت سے بولی، ''لیٹے رہو، آدھی رات ہے اور آدھا چاند۔ سب کچھ ویسا ہی ہے کچھ نہیں بدلا!'' وہ میرے رشتے کے ایک ماموں کی بھانجی تھی اور ہم تقریباً بارہ سال ایک ہی گھر میں ساتھ رہے تھے جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کی بیوہ امی میرے ابا کو پسند آ گئی تھیں۔ مگر ان سے نکاح کرنے پر ابا کے خلاف کوئی ہنگامہ نہیں ہوا کیونکہ امی بھی یہی چاہتی تھیں۔ وہ بیمار رہتی تھیں اور انھیں گھرداری کے مسائل سے نمٹنے کے لئے ایک منتظم خادمہ کی ضرورت تھی اور وضع دار خاتون نے نئے گھر کو اتنی اچھی طرح سنبھالا کہ بارہ سال بڑی تیزی سے گزر گئے۔ اتنی تیزی سے کہ ہم دونوں آپس میں لڑتے جھگڑتے جوان ہو گئے۔ اس کا پہلا نام محبوبہ تھا جو اس کی امی نے رکھا تھا جو اسے سخت ناپسند تھا۔ سب بچے ویسے بھی اسے باجی ملغوبہ کہتے تھے۔ آخر اس نے لڑ جھگڑ کے ہائی اسکول میں اپنا نام حبیبہ لکھوا لیا۔ میں نے اسے چھیڑنے کی خاطر پوچھا'' مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہیں اپنا پرانا نام اتنا ناپسند ہے؟''

''کیوں نہ ناپسند ہوتا، جب تم جیسے مسخرے مجھے محبوبہ کہہ کے پکارتے تو مجھے اچھا لگتا؟'' وہ بڑی منہ پھٹ تھی اور ہم دونوں چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھی کبھی ایک دوسرے کو معاف نہ کرتے اور ایک اور جنگ چھڑ جاتی۔ بچوں نے اس کا جو نام رکھا تھا میں نے بھی اسے قبول کیا، یعنی ملغوبہ! وہ سچ مچ میں بہت ساری چیزوں کا ملغوبہ تھی۔ اسکول کے زمانے میں بیت بازی اور مباحثوں کی ٹیموں کی کپتان

اور گھر میں یکن کوئی۔ بے حد حاضر جواب! بس امی اس کی خوبیوں کو نئے زمانے کی لعنتوں میں شمار کرتی تھیں۔ ''کسی لڑکی کو اتنا تیز طرار اور زمانہ پرست نہیں ہونا چاہیے!'' وہ مخصوص تیز انداز میں کہتیں۔ اور کوئی ان سے اختلاف نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی اپنی امی بھی نہیں۔ وہ گھر کے معاملات کی خاموش تماشائی تھیں۔

میری حبیبہ سے روز آدھی رات کو ملاقات ہوتی تھی۔ شبینہ کالج اور پھر ایک اخبار میں پارٹ ٹائم نوکری۔ گھر پہنچتے پہنچتے بارہ ایک بج جاتے تھے۔ سب لوگ سو چکے ہوتے۔ بس حبیبہ ہی جاگتی رہتی وہ میرے لئے گھر کا کسی قلعے کے پھاٹک جیسا مضبوط دروازہ کھولتی اور مجھے سائیکل سمیت سامنے کی سیڑھیوں چل کے اندر آنے کا راستہ دیتی۔

''کھانا کھا لیں عزمی بھیا، میز پر ابھی گرم کر کے رکھا ہے۔'' وہ کہتی۔ کبھی کبھی بھوک نہ ہونے یا کسی دوست کے ساتھ پیٹ پوجا کر لینے کی وجہ سے میں انکار کر دیتا تو وہ ٹھنک کے کہتی، ''مت کھاؤ، بعد میں افسوس ہوگا یہ جان کر کہ اگر ہنڈیاں اچھی پکی ہوں تو وہ دستر خوان پر چغتائی کی بنائی ہوئی مغل حسیناؤں کی انگلیوں سے زیادہ خوبصورت لگتی ہیں یا یہ کہ آج اگر تم نے کھانا نہیں کھایا تو شاہی مرغ صبح تک تمھارے سرہانے بانگ دیتا رہے گا۔ امی نے خاص طور پر تمھارے لئے پکایا ہے!''

''تمھاری امی نے یا میری امی نے؟''

''تمھاری امی کیا پکاتی ہیں، سوائے خیالی پلاؤ کے؟'' وہ ہنستی۔

''اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔'' میں چڑ جاتا۔ ''کسی دن وہ تمھاری امی سے ناراض ہو گئیں تو دیکھنا باورچی خانے پر کیسا قبضہ جماتی ہیں، خدا کا شکر ہے اب تک انھیں اس کا خیال نہیں آیا!''

حبیبہ اب بھی میرے پاؤں کے پاس بیٹھی تھی۔ ''امید ہے تم نے کھانا کھایا ہوگا، کہو تو گرم کروں!'' وہ پھر بولی۔ میں کروٹ لے کے سیدھا لیٹ گیا۔ ''تم اس وقت کیسے ٹپک پڑیں، آدھی رات کو؟'' میں نے پوچھا۔

''تمھیں بھی تو اپنے نزول کا یہی وقت پسند ہے!'' وہ ہنسی۔

میرے روز روز آدھی رات کو گھر آنے پر سب گھر والے مجھے برا بھلا کہتے مگر حبیبہ کہتی، ''مجھے آدھی رات، آدھا چاند اور آدھا کھلا ہوا پھول سب اچھے لگتے ہیں۔ خوبصورت چیزوں کو مکمل ہوتے دیکھنا خود ایک بڑا خوبصورت تجربہ ہے!''

میں کہتا، آدھی خوبصورت چیزیں بھی تو بے قرار رکھتی ہیں۔ میں جب بھی آدھا چاند دیکھتا ہوں سوچتا ہوں یہ مکمل ہونے میں اتنی دیر کیوں لگاتا ہے! یکبارگی پورا چاند نکل آئے۔''

وہ ہنستی، ''یہ قدرت کے اصولوں کے خلاف ہے، ہر کام کا ایک وقت اور ہر آغاز کا ایک انجام معین ہے۔ اسی لئے میں اپنے لئے آدھے چاند کو بھی پورا چاند سمجھتی ہوں!''

اور یہ بات ہم دونوں کو پتہ تھی کہ ہمارا آدھا چاند آدھا ہی رہے گا، کبھی پورا نہیں ہوگا کیونکہ حبیبہ ظلّو خالہ امی کی ناپسندیدہ ترین شخصیت تھی۔ حبیبہ ہنس کے کہتی، ''یہ تو اچھی بات ہے کہ ہم دونوں کو معلوم ہے کہ ہمارے شادی نہیں ہو سکتی۔ خواہ مخواہ کی پریشانیوں سے بچ گئے!''

"کیسی پریشانیاں؟" میں نے سوال کیا۔

"ارے بھئی وہی۔ دو دیکھو لیے کے شرمانا، رنگین خواب دیکھنا، خواہشوں کے جال بننا!" وہ بولی۔ "اب تو گدگدی بھی نہیں ہوتی، ویسی جیسی ایکبار تمھیں بچپن میں ہوئی تھی۔"

وہ بھی عجیب واقعہ تھا۔ میری عمر سات آٹھ سال رہی ہوگی کہ ایک بار سردی کی وجہ سے میرے سینے میں درد اٹھا۔ امی نے لیپ کی ایک بوتل نکال کے حبیبہ کو دی اور کہا کہ "اسے میرے سینے پر مل دے۔" حبیبہ نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھ میرے سینے پر گھمائے تو بدن میں عجیب سی گدگدی ہوئی۔ میں نے چلا کے کہا، "اللہ کرے تیرے بھی درد اٹھے!"

"کیوں، میرے کیوں؟" وہ بولی۔

"پھر میں گدگدی کروں گا!" میں نے کہا۔

اور اب وہ کہہ رہی تھی کہ۔۔۔

ہمارے باغ میں گلاب کے پودے بہت تھے۔ ایک دن وہاں سے گزرتے ہوئے مجھے لگا جیسے ایک بڑے سے گلاب نے مجھے پکارا ہو۔ میں نے دیکھا، ایک گلاب واقعی ایسا تھا کہ اسے ٹہنی پر چھوڑنا برا لگا۔ میں گلاب لئے ہوئے اندر آیا تو حبیبہ سامنے کھڑی تھی۔

میں نے گلاب اس کی طرف بڑھایا۔ "تمھارے لئے لایا ہوں کیونکہ تمھیں پھول پسند ہیں، لیکن کسی غلط فہمی کا شکار مت ہونا!"

حبیبہ نے پھول کے دو ٹکڑے کر دئے۔ "میں صرف آدھا پھول اپنے پاس رکھوں گی!"

کچھ دن اور گزرے تو عجیب اتفاق ہے کہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کے لئے رشتے ڈھونڈنے کا کام شروع کر دیا۔ حبیبہ نے کہا، "میرا خیال ہے کہ تمھارے لئے فوزیہ ٹھیک رہے گی۔ ٹھیکیدار صاحب کی بیٹی، پڑھی لکھی ہے اور خوبصورت بھی۔ سنا ہے اس کے ابا بھی بڑے دل والے ہیں۔ ایکبار انھوں نے تمھارا خیال لے لیا تو سمجھو یار، وہ تمھارے لئے نیا کاروبار شروع کر دیں گے!"

میں چپ رہا تو اس نے کہا، "چلو فوزیہ نہیں پسند تو شگفتہ کو دیکھو کیسی ہنس مکھ لڑکی ہے۔ ذرا دیر پاس بیٹھو تو پوری محفل جاگ اٹھتی ہے۔ اور اگر وہ نہیں تو صبیحہ کو دیکھو۔ بڑی باوقار اور باشعور۔ تمھارے گھر کے لئے بہترین منتظم ثابت ہوگی۔ سنتے ہیں کہ محترمہ کھانے پکانے کی بھی ماہر ہیں۔ پھر تو مزے آ گئے، آدھی رات ہو یا آدھا دن بہترین کھانے تمھیں کھانے کو ملیں گے، بہت خوش رہو گے!"

میں نے کہا، "میں ہر وقت خوش رہ سکتا ہوں بغیر شادی کئے! میرے لئے تم جو لڑکیوں کا جمعہ بازار سجانے کی کوشش کر رہی ہو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے یہ سلسلہ بند نہیں کیا تو میں بھی شہر کے ان تمام قابل ذکر اور برسر روزگار نوجوانوں کی فہرست دکام بابا کے حوالے کر دوں گا جو تمھارے لئے آسمان سے تارے توڑ کے لا سکتے ہیں!"

مگر دکام بابا کو اپنی ذمے داریوں کا احساس تھا۔ حبیبہ کے لئے انھوں نے ایک رشتہ فوراً ہی ڈھونڈ لیا۔ مہینے بھر میں اس کی رخصتی بھی ہوگئی۔ اس کے میاں اسکول میں ریاضی پڑھاتے تھے۔ اتفاق سے محلے کا سب سے شریر لڑکا جاوید ان کا بھانجا نکلا جو بابا سے خفیہ ٹیوشن پڑھنے آتا تھا۔ شادی کے بعد مجھے اس کے ذریعے حبیبہ کی خیریت ملتی رہی مگر کچھ دنوں بعد وہ لوگ حیدرآباد چلے گئے۔ مگر وہاں

سے بھی جاوید کبھی کبھی پیغام بھیجتا رہا۔

"باجی مظلوبہ کے یہاں ننھا مہمان آیا ہے جس کا نام انھوں نے 'زرینہ' رکھا ہے۔ کہتی ہیں اس کے ابا کو آدھی کلیاں بہت پسند تھا۔"

"باجی مظلوبہ اب گھر سے باہر نہیں نکلتیں!"

"باجی مظلوبہ نے اپنے گھر میں اسکول کھول لیا ہے!"

پھر بہت دنوں تک کوئی خبر نہیں آئی۔ میری بھی شادی ہو گئی۔ بیوی بھی قسمت سے اچھی ملی۔ شادی کی تقریب میں حبیبہ نے مجھے مبارک باد دی۔ "بھابھی بہت اچھی ہیں۔ مجھے اطمینان ہوا۔" وہ بولی۔ "مجھے ڈر تھا کہ کوئی چھمک چھلو تمھارے پلے نہ پڑ جائے اور تمھاری کومل روح کو کوئی صدمہ نہ پہنچے!"

حبیبہ کے خدشات کے برعکس مجھے جو بیوی ملی وہ بہت سمجھدار اور نیک سیرت تھی۔ دو پیارے بچے بھی ہوئے اور زندگی اتنے آرام سے گزری کہ وقت کا پتہ ہی نہ چلا۔ کئی سال گزر گئے۔ مجھے اپنا پرانا شہر چھوڑ کے کراچی جانا پڑا اور تلاش روزگار کے جال میں الجھ کر روز و شب دھیرے دھیرے ہوئے۔ اچھی زندگی بھی دھند کی طرح ہوتی ہے جس میں گزرا وقت چھپ جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہ ہوا۔ گزرے وقت کی ہر نشانی مٹ گئی۔ مگر اس وقت وہ میرے پاس بیٹھی تھی۔

"دیکھو میں تمھارے لیے کیا لائی ہوں؟" حبیبہ نے کوئی چیز اس کی طرف بڑھائی۔ میں نے دیکھا گلاب کا آدھا پھول تھا۔ بولی: "اسے اپنے پاس رکھنا!"

میں نے آدھا گلاب لے کر اس کی طرف دیکھا تو وہ جا چکی تھی۔ کمرے میں صبح کی روشنی نے قبضہ جما لیا تھا اور کھلی کھڑکیوں سے اندر آنے والی صندلی ہوا پردوں کے ساتھ ایسی چھیڑ خانی کر رہی تھی کہ لگ رہا تھا کہ جیسے بے شمار پرندے اپنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے کمرے میں گھس آئے ہوں۔ میں اپنے کراچی کے گھر میں تھا جہاں اس وقت آدھی رات تھی نہ آدھا چاند!

ناشتے کی میز پر اخبار پڑھتے ہوئے اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ٹیکسٹ میسج تھا۔ جاوید کی طرف سے: "کل شام باجی مظلوبہ وفات پا گئیں۔ وہ بہت دنوں سے بیمار تھیں!"

◆◆◆

دن ڈھل چکا تھا اور پرندہ سفر میں تھا	سارا لہو بدن کا رواں مشت پر میں تھا	(وزیر آغا)
اکبر تھا اس جہان میں "اک بے نوا فقیر"	اپنی خودی کا نقش دکھا کر چلا گیا	(انور سدید)
سب سے پہلا پتھر اکبر اس نے مجھ کو مارا تھا	برسوں جس کی عزت کی تھی، جس کا عقیدت مند رہا	(اکبر جاوید)
کام و نمود سے تو رہے بے نیاز ہم	گم نامیوں میں ڈوب کے شہرت تلاش کی	(اکبر جاوید)

ملاح کا بھاڑا

محمد اسلم

مختصر تعارف

محمد اسلم: 6 جنوری 1943ء ملتان میں پیدا ہوئے۔ "مری کا دریا" (جاپانی ناول) کا اردو ترجمہ "ادبِ لطیف" میں اشاعت پذیر ہوا۔ انگریزی کے نامور افسانہ نگاروں کے افسانوں کا اردو ترجمہ کر چکے ہیں۔ ترجمے کے فن پر عبور حاصل ہے۔

حدِ نگاہ تک پھیلے ہوئے کپاس کے کھیتوں کے درمیان کچے، ناہموار گرد سے اٹے راستے پر گاموں کا تانگہ دوڑ رہا تھا۔ تانگے میں جتی گھوڑی کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور نتھنوں سے نکلنے والا سانس بھاپ کی شکل اختیار کر رہا تھا۔ تانگے کا ایک پہیہ ٹوٹا ہوا تھا جسے گاموں نے پرانے کپڑے کے ٹکڑوں اور رسیوں کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ جب ٹوٹا ہوا حصہ زمین کی طرف آتا تو "کھڑپ" کی آواز کے ساتھ تانگہ ایک طرف کو جھکتا اور سواریوں کی پسلیوں پر زور پڑتا۔ تانگے کی اگلی سیٹ پر دودھو، اس کی بارہ سالہ بیٹی زینب اور بیوی ست بھرائی چک نمبر 362/RL میں والے پیر صاحب کے پاس دودھو کیلئے تعویذ اور دم کرانے جا رہے تھے۔ پچھلی سیٹ پر تین سواریاں رستے کی تھیں۔ سردی سے بچنے کیلئے دودھو نے کمبل کی بکل دوہرا اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ جبکہ اس کی بیٹی اور بیوی نے ایک موٹی چادر میں سردی سے پناہ لے رکھی تھی۔ گرد سے بچنے کیلئے انہوں نے سر اور منہ ڈھانپ رکھے تھے۔

منگل کا دن تھا اور پیر صاحب کا ڈیرا مریدوں سے اٹا پڑا تھا۔ ست بھرائی زینب اور دودھو کے ساتھ ایک طرف بیٹھ گئی۔ لال سرخ پیر صاحب آنکھوں میں سرمہ لگائے، رنگین، منقش پایوں والے پلنگ پر گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے لکڑی کی درمیانے سائز والی مستطیل میز رکھی تھی جس پر غرض مندوں کو تعویذ دینے کیلئے قلم دوات رکھے تھے۔ مسلسل بخار اور تانگے کے دھکوں کی وجہ سے دودھو یہاں تک پہنچتے پہنچتے تھک چکا تھا۔ وہ ڈیرے میں بچھی دری کے ایک طرف لیٹ گیا۔ باری آنے پر ست بھرائی پیر صاحب کے پلنگ کے پاس جا کر بیٹھی اور دودھو کی طرف اشارہ کر کے آنے کا مقصد بتایا۔ پیر صاحب نے ایک اچٹتی نظر دودھو پر ڈالی اور کاغذ کے ٹکڑے پر ٹیڑھے ترچھے حروف لکھ کر تعویذ ست بھرائی کو پکڑا دیا اور دودھو کی طرف پھونک ماری۔ ست بھرائی نے پانچ کا نوٹ میلے کچیلے دوپٹے کے پلو سے کھول کر پیر صاحب کی نذر کیا اور دودھو اور زینب کو لے کر ڈیرے سے باہر آ گئی۔ دھپ کی آواز سن کر صحن میں شیشم کی چھاؤں تلے کھجور کی پتیوں سے بنی چارپائی پر لیٹے دودھو نے بغیر غلاف کے میلے چیکٹ سرہانے سے سر اٹھا کر آواز کی جانب دیکھا۔ ست بھرائی آس پاس کے کھیتوں سے بھینس کیلئے گھاس پھونس کا گٹھڑا اٹھا کر لائی تھی۔ زینب جھونپڑی سے نکل کر گٹھڑی کی طرف لپکی۔

ست بھرائی اٹھائیس تیس سال کی، سانولی رنگت، گول چہرے اور تیکھے نقوش والی عورت تھی۔ اس کے ننگے پاؤں کیچڑ میں لت پت تھے اور جوتے کا استعمال نہ ہونے سے پھٹی لکیروں سے لگتے تھے۔ اس نے پھولدار لون کا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا جس کے نقش بوٹے وقت اور گرد کی تہوں میں معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ اس کے کھچڑی بال اس بات کے گواہ تھے کہ اسے سر دھوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ اس کے

ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور بڑی بڑی آنکھوں میں ویرانی تھی۔ میلے کچیلے دوپٹے پر لگنے والی مٹی کو جھاڑتے اور اس سے منہ پر آئے پسینے کو پونچھتی اس کی چارپائی کی طرف آئی اور اس کی ادوان پر بیٹھ گئی۔ وزن اٹھائے ڈیڑھ مربع چلنے سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔ ذرا درست ہوئی تو بولی۔

”گاموں کہہ رہا تھا گردیزی کی سائیکل واپس جا رہا ہے“

وہ خاموش رہا۔

وہ بے بسی سے سب جمرائی کو دیکھے جا رہا تھا۔

”تمہیں میری بات کیوں نہیں سمجھ آتی۔ اب تو باڑہ بھی دو ایک دن کا رہ گیا ہے“ کوئی جواب نہ پا کر وہ جھلا اٹھی۔

”گردی تو تم نے اپنی مرضی ہے۔ میں ایسے ہی جھونکے جا رہی ہوں“ اور وہ بڑبڑاتی ہوئی جھونپڑی کی طرف چل پڑی۔

وہ تیس بتیس سال کا جوان تھا لیکن بیماری نے اسے پچپن سال بوڑھا بنا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں زرد ویرانی تھی۔ چہرے کی ہڈیوں کو گوشت چھوڑ چکا تھا۔ مختصر میلی کچیلی سی دھوتی میں سے اس کی پنڈلیاں سوکھے گنے کی مانند جھانک رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں جنہیں وہ وقفے وقفے سے سلور کے گلاس میں تعویذ والے پانی میں انگلیاں ڈبو کر تر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پچھلی کپاس کی چنائی تک وہ اچھا بھلا تھا۔ پھر اسے ہلکا بخار آنے لگا، پیٹ خراب رہنے لگا اور آخر میں بھوک ختم ہو گئی۔ کمزوری بڑھی تو گاؤں کے ڈاکٹر اللہ دتہ سے، جو ایک سال قبل شہر میں ایک ڈاکٹر کے کلینک پر کمپاؤنڈر کے طور پر کام کر کے آیا تھا، دوائی لی گئی۔ تعویذ بھی ساتھ ساتھ چلے۔ بابا جھنڈے شاہ کے مزار کی مٹی بھی چاٹی گئی لیکن افاقہ ہونے کی بجائے مرض بڑھتا گیا۔ پھر سب جمرائی اسے ساتھ والے چک میں بنیادی صحت کے مرکز میں لے گئی جہاں ڈاکٹر نے اسے ڈسٹرکٹ ہسپتال لے جانے کو کہا۔ وہاں اس کے خون کے ٹیسٹ سے پتہ چلا کہ وہ کالے یرقان میں مبتلا ہے۔ ڈاکٹر نے سب جمرائی کو اللہ سے دعا کرنے کو کہا اور اسے نسخہ تھما دیا۔ اور جب وہ نسخہ میڈیکل سٹور پر لے گئی تو معلوم ہوا کہ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ بیچنے سے بھی دوائی کی قیمت پوری نہیں ہو سکتی تھی اور یوں سب جمرائی کرائے بھاڑے پر تین چار سو روپے برباد کر کے گاؤں واپس آ گئی اور دھوگی زندگی چارپائی تک محدود ہو کر رہ گئی۔

وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا۔ ماں بچپن ہی میں مر گئی۔ باپ مرا تو سید غضنفر علی گردیزی کے رقبے سے تین ایکڑوں کی بٹائی پر کاشت اسے ورثے میں ملی۔ یوں وہ تین سال سے یہ کاشت کر رہا تھا۔ لیکن پچھلی گندم کی بوائی پر بیماری کے باعث وہ زمین پر ہل نہ چلا سکا۔ بچا کھچا اناج ختم ہو چلا تھا اور اب ان کی زندگیوں کی ڈور اس لاغر بھینس سے بندھی تھی جو وقت گھاس پھونس کے بدلے انہیں دودھ دے رہی تھی۔

جھونپڑی سے تقریباً ڈیڑھ دو مربعے دور، سایہ دار اور پھلدار درختوں میں گھرے ایک شاندار ڈیرے میں، پچاس سالہ، سرخ و سفید، سید غضنفر علی گردیزی، اعلیٰ قسم کے بان سے بنے پلنگ پر، گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے براجمان تھے۔ گاؤں میں ابھی بجلی نہیں آئی تھی لیکن گردیزی صاحب نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر سے گزرتی بجلی کی تاروں کو ڈیرے تک کھنچوا لیا تھا۔ جس کی معیت میں تھوڑے تھوڑے فاصلوں پر لگے سائلنٹ فین وہاں موجود لوگوں کو ٹھنڈی ہوا دے رہے تھے۔

ڈیرے میں موجود لوگوں میں اکثریت علاقے کے بااثر لوگوں کی تھی اور باقی لوگ زراعت میں استعمال ہونے والی مشینری کیلئے

ہائی سپیڈ ڈیزل، پیٹرول اور موبل آئل سپلائی کرنے والے کھاتے دار تھے۔ یہ لوگ دیواروں کے ساتھ بچھی کرسیوں پر بیٹھے تھے جبکہ مسخروں جیسی شکل والا منشی، آنکھوں میں سرمہ لگائے، پلنگ کے پاس بیٹھا تھا اور ملاقاتیوں اور گردیزی صاحب کے درمیان رابطے کا کام کر رہا تھا۔ گردیزی صاحب کے پاس شہتوتوں سے بھری ایک پلیٹ رکھی تھی۔ وہ مہمانوں سے بات کرتے ہوئے پھل سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

منشی کو اچانک ڈیرے کے کھلے دروازے پر دھو نظر آیا۔ اس نے گردیزی صاحب کے کان میں کچھ کہا اور پھر اسے اشارے سے اندر بلا لیا۔ وہ اندر آیا تو یوں ہانپ رہا تھا جیسے کئی میل کا سفر کر کے آیا ہو۔ اس کا زرد چہرہ بے رونق اور سیاہ ہو رہا تھا۔ منشی نے اسے ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کو کہا۔ اور روزمرہ کی کارروائی جو دھو کے آنے سے تعطل کا شکار ہوئی تھی، دوبارہ شروع ہوئی۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد جب ملاقاتی رخصت ہو گئے تو منشی دھو سے مخاطب ہوا۔

"کیسے آئے ہو؟" "سائیں کو سلام کرنے —— میں بہت بیمار ہوں" "وہ تو سائیں دیکھ رہے ہیں۔ اور کچھ؟" "جی، تھوڑا سا اناج مل جائے —— ہمارے دانے ختم ہو گئے ہیں" "جناب اس کی طرف پہلے ہی کھاتے کی رقم ہے" منشی نے گردیزی صاحب کو اطلاع دی۔ دھو گردیزی صاحب کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"تم تو بیمار ہو —— یہ سب کیسے واپس کرو گے؟" گردیزی صاحب نے لب کشائی کی۔

"ٹھیک ہو جاؤں گا جی —— آپ کی پائی پائی لوٹا دوں گا سائیں" دھو گھگھیایا۔

منشی ایک بار پھر اپنا منہ گردیزی صاحب کے کان کے نزدیک لے گیا۔

"تم بیٹی کی شادی کیوں نہیں کر دیتے؟" گردیزی صاحب نے سوال کیا۔

دھو بے بسی کی تصویر بنا ہوا تھا۔

"سائیں ابھی تو وہ دس بارہ سال کی ہے ——"

"تو کیا ہوا —— شادی کے بعد جوان ہو جائے گی" گردیزی صاحب نے ارشاد فرمایا۔ دھو کو اپنا سر چکراتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ جواب دیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا اور سلام کر کے باہر آ گیا۔ جہاں سے بھرائی اسے گھر لے جانے کیلئے موجود تھی۔

اگلی صبح جب گردیزی صاحب شہر کو روانگی کیلئے تیار ہو رہے تھے منشی نے انہیں دھو کے مرنے کی اطلاع دی۔ دھو کی جھونپڑی گردیزی صاحب کے راستے میں پڑتی تھی۔ وہ منشی کے ہمراہ وہاں پہنچے۔ گردیزی صاحب کی گاڑی دیکھ کر میت پر آئے گاؤں کے لوگ تعظیماً کھڑے ہو گئے اور ان کے لئے شیشم کے نیچے پڑی میت کی چارپائی تک کا راستہ چھوڑ دیا۔ جیسے ہی گردیزی صاحب کی نظر نے چارپائی کا احاطہ کیا وہ منشی کی طرف دیکھ کر غصے سے بولے۔

"ہائے بے حس لوگ ہو۔ اناج کا چھاج کہاں ہے؟ ہم نے بھی ایک دن مرنا ہے"

گردیزی صاحب پلٹے اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے تاکید کی۔

"میں جا رہا ہوں۔ فوراً ڈیرے سے چھاج لا کر رکھو"۔

تھوڑی ہی دیر میں گردیزی صاحب کے حکم کی تعمیل ہو گئی اور منشی نے گودام سے بھری چنگیر لا کر دھو کی چارپائی کے نیچے رکھ دی۔

◆◆◆

دُم

طارق بلوچ صحرائی

مختصر تعارف

2 اگست 1967ء کو رسالہ خورد میں پیدا ہوئے۔ سات کتابیں لکھیں۔ دو افسانوی مجموعوں کو خوب پذیرائی ملی۔ کتاب "سوال کی موت" کو پی۔ایل۔ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ "گونگے کا خواب" اس وقت پاکستان میں سب سے زیادہ بکنے والی کتاب ہے۔ بانو قدسیہ صاحبہ کی زندگی کی آخری تحریر اسی کتاب کا دیباچہ ہے۔

انسان بھی عجیب ہے عمر بھر بیساکھیاں بناتا رہتا ہے اور خود چلنا بھول جاتا ہے۔ وقت کے قبرستان میں کچھ لوگ تابوت کی مانند ہوتے ہیں جن کے در اور دل کسی صدا اور دستک سے نہیں کھلتے۔ دروازوں کو ہمیشہ کھلا رہنا چاہیے، جانے والوں کے لیے بھی اور آنے والوں کے لیے بھی۔ سنت رب بھی یہی ہے۔ جب کوئی رب سے مایوس ہو جاتا ہے تو آسمان والا بھی اس سے ناراض ہو جاتا ہے پھر اس کے اندر سے محبت کی نعمت واپس لے لی جاتی ہے اور پھر ایسا شخص تمام عمر دوسروں کی خامیاں تلاش کرتے اور کڑھتے ہوئے گزار دیتا ہے۔ غلام قوموں کا بھی عجیب مزاج اور مقدر ہوتا ہے ان کے دلوں کے برتن نفرتوں کا تیزاب رکھنے کی وجہ سے کھردرے اور بدنما ہو چکے ہوتے ہیں۔ رحمت خداوندی ہمیشہ بے عیب اور محبت کے پھولوں سے مہکتے برتنوں میں آتی ہے۔ یہاں غربت راج کرتی ہے خوشیوں میں غربت، رویوں میں غربت، لہجوں میں غربت، دلوں میں غربت اور ظرف میں غربت۔ یہاں عمر بھر کی کمائی میں بھی ایک مزار اور نہیں ملتا۔ یہاں اکثریت آپ کو چالاک ملے گی اور چالاک شخص سے بڑا کوئی بے وقوف نہیں ہوتا۔ ان کے کان کاسے میں گرنے والے سکوں کی جھنکار کے منتظر رہتے ہیں اور شاید کاسے میں پڑے ان سکوں کی وجہ سے وہ اس میں زندگی کا میٹھا شہد ڈال کر پینے کی لذت سے محروم رہ جاتے ہیں۔ بابا کہتے ہیں زندگی کا جام پینے کے لیے تمہارے پاس ایک ہی کاسہ ہے اگر اس کو سکوں سے بھر دو گے تو پھر پیاسے رہ جاؤ گے۔ یہاں کوئی قرض ادا کرنے والا نہیں ہوتا اسی لیے تو اکثریت کو حقوق نہیں ملتے۔ ان کی زندگیاں کتاب، علم اور روشنائی سے خالی ہوتی ہیں ان کے ہاتھ میں قلم کی بجائے عقیدے کا خنجر ہوتا ہے اسی لیے یہاں انسانیت لہولہو پھرتی ہے۔ یہاں لفظ قرطاس پر اترنے سے گریزاں رہتے ہیں۔ شاعری، اشعار اور غالب مرنے لگتے ہیں لائبریریوں کی جگہ گھر گھر محلے کھلنے لگتے ہیں اور پھر زندگی کی شاعری میں قلم اور سوچ، لفظ اور معانی، خواب اور خوشبو، روشنی اور اجالا، رنگ اور دھنک، جو جمالیات کے استعارے ہیں، ہجرت کرنے لگتے ہیں۔ ادب جو جمال کو دیکھنے، پرکھنے اور محسوس کرنے کے ذوق کی تربیت کرتا ہے مفلسی کی قبا پہنے کسی درگاہ میں پڑا رہتا ہے۔ یہاں محبتیں ہجر اوڑھ لیتی ہیں۔ کئی دیپ کے فاقوں سے مرنے لگتے ہیں اور آنکھ میں ٹھہرے ہوئے لوگ اجل کی جھیل کے ٹھہرے ہوئے ٹھنڈے یخ پانی کی تہہ میں اتر جاتے ہیں۔ غلام قوموں سے علم اٹھا لیا جاتا ہے۔ جہاں علم کی

پیاس مر جائے تو وہاں خون کی پیاس بھڑک اٹھتی ہے۔ میں لفظوں کی دیکھ بھال کرنے والا شخص تھا مگر میرا باپ ہمیشہ گہرے چپ کی بکل لئے پھرتا تھا۔ وہ کہتا تھا جہاں شور ہوگا وہاں شعور نہیں ہوگا۔ وہ بہرہ کر دینے والی خاموشی کا قائل تھا وہ کہتا تھا بحث مباحثے، فضول گفتگو اور شور بندے کو اندر سے خالی کر دیتا ہے اور جو اندر سے خالی ہو جائے وہ فٹ بال کی طرح جوتے کی نوک پر دھر لیا جاتا ہے۔ کیونکہ فٹ بال بھی اندر سے خالی ہوتا ہے۔ جوتا بھی اندر سے خالی ہوتا ہے اسی لیے پاؤں میں پہن لیا جاتا ہے۔ وہ کہتا تھا جہاں لاشوں کی بے حرمتی ہو جہاں ضمیر نہ کانپتے ہوں وہاں زمین کانپ جایا کرتی ہے۔ میری روح کی کیمسٹری بھی عجیب ہے جب زندگی اونٹوں کے قافلے کی طرح سیدھی قطار در قطار اور خاموشی سے چل رہی تھی اور جب منزل پر پہنچانے کی ذمہ داری قافلہ سالاری ہوتی تھی مجھے اس وقت بھی کارواں والوں سے قسمیں لینے کی عادت تھی۔ مجھے بھولنا نہیں آتا میری یاد ایڑیاں نہ بھی رگڑے میرے اندر درد کے چشمے پھوٹتے رہتے ہیں۔ زندگی میں مجھے دو چیزیں کبھی نہیں بھولیں۔ گاؤں میں ہماری زمینوں پر لگے ایک سرسبز شیشم کے پیڑ سے لپٹی ہوئی وہ ایک کاسنی بیل جو مجھے ایک لمحے کے لیے وجود سے عدم میں لے جاتی تھی اور دوسرا بھورے رنگ کا وہ کتا جو ہمیشہ بھونکتے ہوئے چیختے ہوئے اپنی دم کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہوا گھومتا رہتا تھا مگر کبھی وہ اپنی دم کو نہ پکڑ سکا تھا میں اس وقت بہت چھوٹا تھا میرے دودھ کے دانت ابھی لڑکپن کی اذیت سے نا آشنا تھے۔ میں جب بھی بابا سے پوچھتا یہ کتا ایسا کیوں کرتا ہے؟ جب یہ اپنی دم نہیں پکڑ سکتا تو چلاتا اور گھومتا کیوں رہتا ہے؟ اس کو سمجھ کیوں نہیں آتی۔ بابا مسکراتے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ معافی کے انداز میں جوڑ لیتے اور خاموش ہو جاتے۔

اس دن شام نے گہرے سیاہ بادلوں کی نے پی رکھی تھی اس رات میں تاریکی کے شانوں پر سر رکھ کر بہت رویا تھا اس رات بھی میں ہار گیا تھا ہمیشہ کی طرح اس شام میں کئی ہفتوں کے بعد اپنے والدین سے ملنے چند دن میں ان کے گھر پہنچا تھا اس دن وہ دونوں بہت اداس تھے۔ میری ماں کی عمر کی کلائیوں سے جوانی کی چوڑیاں کب کی اتر چکی تھیں اس کے بالوں میں چاندی اتر آئی تھی اس کے برف چہرے پر درد کی نیلی رگیں ابھر آئی تھیں جھریوں نے چہرے کو فتح کر لیا تھا۔ اور میرا باپ بھی عمر کے اس حصے میں تھا جہاں لوگ جھوٹی اچھی نیند کی خواہش لئے فقط نیند کی رسم پوری کرتے ہیں ورنہ حقیقتیں انسان کو سونے نہیں دیتیں۔ اس عمر کے حصے میں کارواں سے بچھڑ جانے کا ڈر کا لگا رہتا ہے۔ اس عمر میں ذرا سی کسی کی بے رخی زخم بن جایا کرتی ہے۔ وہ دونوں علم والے تھے عمل والے، وہ عمل نہیں دیتے، خوشی ملے تو بھی خاموشی سے شکر ادا کرتے ہیں دکھ کا پہاڑ بھی گر جائے تو چیخ و پکار نہیں کرتے۔ اس دن دونوں کی آنکھیں ویران تھیں، جب میں نے ان کا حال پوچھا تو ماں بولی بیٹا تم شہری ہے راستہ بھٹک میں گم ہو چکے ہو اور اللہ کسی کو انتظار کا دکھ نہ دے۔ بیٹا خاموشیاں تعلق نگل جایا کرتی ہیں۔ میں نے بابا کی طرف دیکھا وہ مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولے تمھاری زباں سے گرے تو تلے الفاظ اب بھی گاؤں کی حویلی میں پیپل کے درخت کے نیچے گرے پڑے ہیں۔ بیٹا زہر احساس بھی ہوتا ہے پتہ نہیں کیا اوقات ہے۔ بیٹا موت تک زندہ رہنے میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے۔ اور پھر میں ہار گیا میرے ساتھ بھی عجیب ایسا ہے۔ میری جیت بکھرنے کے بعد ہار نے نگلی ہے۔ میری ہر کامیابی کینچلی کی طرح اتر جاتی ہے۔ اس دن مجھے لگا میں کسی بڑے شہر کی مصروف ترین شاہراہ کے درمیان اکیلا تنہا گرد آلود درخت ہوں جس پر شور اور آلودگی کی وجہ سے کوئی پرندہ بھی اپنا آشیانہ بنانے کو تیار نہیں۔ اس دن مجھے اپنے محسوس ہوا میں ہاتھ میں آئینہ لئے خود سے چھپ رہا ہوں اور اپنی بے رنگی چھپانے کے لیے سیاہ شب کا منتظر ہوں۔

اور پھر میں یادوں کے جنگل میں کھو گیا۔ اداس خاموش، گم صم یادیں، پرانے گیتوں جیسی بھولی بسری یادیں، سیلن زدہ یادیں یہ اس دور کی بات ہے جب ہم گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ساتھ میں گھروں کی چھتیں ٹپکا کرتی تھیں اور گھر کے پرانے برتن کچھ نہیں ہونے دیا کرتے تھے۔ اس دور میں در و دیواروں سے آباد اور زندہ تھے۔ گھروں کو جانے والی پگڈنڈیاں آہٹوں سے زندہ تھیں۔ محلے آباد تھے راستے آہٹوں کے عادی تھے۔ دستک دینے والے بھی بہت تھے اور دستک سن کر دوڑ کر آنے والے بھی بہت تھے۔ اس وقت سرخ گلابوں کے موسم میں کانٹے پھول نہیں اگا کرتے تھے۔ اور لوگ آج کی طرح تعلق کو پرانا کر کے پھینکا نہیں کرتے تھے۔ یہ وہ راتوں میں بھی کلائیاں اجڑی نہیں رہتی تھیں۔ لوگ محبت ناموں پر آواز سے دستخط کیا کرتے تھے۔ وہ دوستوں کے بیل دیکھ لیا کرتے تھے اور غم کو ماتم نہیں بننے دیا کرتے تھے۔ ہر آدمی صرف اپنے حصے کے خواب دیکھتا تھا اسی لیے تو نیند سے خیمے آباد تھے۔ لوگ ایک دوسرے کے اس طرح محتاج تھے جیسے تتلی سانسوں کا محتاج ہوتا ہے۔ اس دور میں کوئی مسافر سفر کرتا ہوا کسی آبادی میں پہنچتا تھا تو رات قیام کے لیے جو بھی در کھٹکھٹاتا تھا اس گھر کا باسی اسے اپنے گھر کی خوش بختی تصور کرتے ہوئے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اسے مہمان بناتا تھا اور اسے اللہ کی رحمت تصور کرتے ہوئے اس کی خوب خاطر مدارت اور مہمان نوازی کرتا تھا۔ اسی لیے تو لوگوں کی عمریں لمبی ہوا کرتی تھیں کیونکہ جتنا وقت آپ مہمان نوازی کو دیتے ہیں اتنا وقت آپ کی زندگی کا بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس دور میں لوگوں کی ضرورتیں اور خواہشات کم ہوا کرتی تھیں۔ بابا کہتے تھے میری روحانی عمر کئی صدیوں کی ہے مگر تیری ماں کی روحانی عمر شاید یک جگ سے بھی پہلے کی ہے۔ لوگ زندگی کو انعام سمجھ کر شکر گزاری سے بسر کرتے تھے لوگ جانتے تھے یہ کائنات عشق کی نسبت سے ملی ہے اسی لیے تو زندگی کے ساز میں سوز بہت ہے۔ کبھی کبھی بچہ معذور بھی پیدا ہوتا تھا مگر کبھی بھی روحانی و اخلاقی طور پر اپاہج پیدا نہیں ہوتے تھے۔

پھر ایک دن میں نے گاؤں چھوڑ کر شہر جانے کی ضد شروع کر دی۔ میری ماں کی آنکھوں میں برسات برسنے لگی۔ بابا بولے بیٹا شہر جا کر کیا کرو گے؟ میں نے بھی پڑھائی کے دوران کچھ عرصہ شہر میں گزارا ہے۔ شہر تو زمانوں کا کرب لیے نڈھال یادوں کے ساتھ ضعیف محلوں میں بنی رہتے ہیں۔ مجھے وہ زندگی پسند نہیں آئی۔ جب میں نے ضد کی تو بولے بیٹا جو وقت کی اصطبل سے پھسل جائے تو اسے بے چہرہ آوازیں بہت تنگ کرتی ہیں اور دور تک اس کا پیچھا کرتی رہتی ہیں۔ تم نے دیکھا ہے ہماری زمینوں پہ اگے شیشم کے سبز پیڑ کے ساتھ لپٹی کاسنی بیل کتنی بھلی لگتی ہے۔ بیل اور اس کے پھولوں کے چہروں پر کتنا پرسکون تبسم ہے۔ اطاعت میں جو راحت ہے وہ فتح میں بھی نہیں۔ شہروں میں ہر شخص نے انا کی دستار پہنی ہوئی ہے اور وہ دوسروں کے جھکنے کا انتظار کر رہا ہے۔ آسمان امیر وقت کی کرسی سے بندھا ہے مگر شہروں میں کسی کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ سفر زندگی کا رس نچوڑ لیتا ہے۔ یہاں ہر لمحہ ہر کوئی سفر میں رہتا ہے۔ مگر کوئی بھی سفر کی دعا پڑھتا نظر نہیں آتا۔ یہاں ہر شخص کے چہرے پر کوئی نہ کوئی مرثیہ لکھا ہوا ہے۔ یہاں شہر کے لوگ سومنات مزاج ہیں اور کسی نامعلوم غزنوی سے خوف زدہ پھرتے ہیں۔ یہاں لوگ پیکر اگاتے ہیں اور قامت کے چھٹنے کی خواہش کرتے ہیں۔ یہاں کی کہانیاں اپنا عنوان خود تلاش کرتی پھرتی ہیں۔ یہاں محبت کی شاعری متروک ہو چکی ہے اور لوگ اپنی عریانی چھپانے کے لیے دوسروں کو ننگا کر دیتے ہیں۔ یہاں حسن کو جس کی جتنی ضرورت ہوتی ہے لوٹ کر لے جاتا ہے۔ یہاں نفسا نفسی کا عالم ہے۔ یہاں تنہا سا بھی اجنبیت بن کر پھرتا ہے۔ کسی صوفی، سالک کے الہام کی طرح یہاں انسانیت نظر نہیں آتی اور لوگ یہاں فقط جینے کے سرطان میں مبتلا ہیں۔ امن اور سکون یہاں مسافروں کی طرح

رہتے ہیں۔

پھر میں کئی دن تک سوچتا رہا، میرے ساتھ بھی عجیب المیہ ہے میں دیر تک سوچوں تو میرے سامنے سے شیشم کے ساتھ لپٹی کاسنی بیل میری نظروں سے ہٹ جاتی ہے اور میرے سامنے بھورے رنگ والا وہ کتا آ جاتا ہے جو اپنی دم کو پکڑنے کی ناکام کوشش میں گھومتا اور بھونکتا رہتا ہے۔ جب والدین شہر آنے کے لئے راضی نہ ہوئے تو میں ان سے جھگڑا کر کے شہر آ گیا یہاں آ کر میں نے بہت سے کاروبار کے ہر جائز و ناجائز ذرائع سے میں نے بے حد دولت اکٹھی کی یہاں میں نے ایک بہت بڑا گھر تعمیر کروایا، دنیا جہاں سے اس کی تعمیر کے لئے اشیاء منگوائیں۔ اس کی لکڑی برازیل سے ٹائلیں ناروے سے اور دوسرا بہت سا سامان امریکہ اور یورپ سے منگوایا تو میرے گھر کو دیکھنے لوگ دور دور سے آیا کرتے تھے۔ کچھ سالوں کے بعد میرے والدین بھی زمین مزارعوں کے حوالے کر کے میری خاطر میرے گھر کے ساتھ تیسرے مکان میں منتقل ہو گئے تھے میں ہر مہینے کچھ دیر کے لئے ان سے ملنے ضرور جاتا تھا اگرچہ میری بیوی کو ان سے ملنا پسند نہیں تھا مگر میرے بچے دادا دادی کے دیوانے تھے۔

میرے پاس زندگی کی ہر نعمت موجود تھی مگر میرے ساتھ وہی ایک المیہ تھا میری حیت کچھ عرصہ کے بعد ہارنے لگی تھی۔ میرے اندر ایک عجیب سی بے چینی شروع ہو جاتی تھی میں شوق سے خریدی ہوئی چیزوں سے اکتانے لگتا تھا۔ انہی چیزوں سے مجھے بو آنے لگتی تھی جو کبھی مجھے بے حد محبوب ہوتی تھیں۔ کچھ عرصہ بعد ہی میں نیا رنگ کرواتا تھا نئی ٹائلیں لگواتا تھا ان کے پودے بدلتا تھا مگر کچھ عرصہ بعد مجھے انہی چیزوں سے گھن آنے لگتی تھی۔

مجھے اپنے والدین سے اختلاف تھا وہ وقت کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکے تھے ان کو مال و دولت سے کوئی محبت نہ تھی میں نے ایک دن بابا سے کہا مجھے لگتا ہے آپ میری کامیابی اور دولت سے خوش نہیں ہیں اسی لئے تو چپ رہتے ہیں اور میرے گھر نہیں آتے۔

بابا بولے بیٹا مجھے خاموش ہی رہنے دو میں نے لب کھولے تو تم اپنے ہی تعفن سے مر جاؤ گے۔ دولت سے تم سامان تو خرید سکتے ہو مگر سکون نہیں، چاند سے مرعوب نہیں ہوا کرتے اس کی روشنی مستعار لی ہوتی ہے۔ سنو صبا کا وجود کانوں سے منسلک ہو جاتا تو کسی کو خوشبو کی آواز سنائی نہ دیتی شبنم کی گریہ زاری اور ہواؤں کے نغمے سنائی نہ دیتے۔ بدلی رت نے ایک دن بہار سے کہا کوئی بھی کہیں بھی ہمیشہ نہیں ہے۔ سنو پہلے پہل دنیا میں گہرا اندھیرا تھا اور اندھیرا ہی اندھیرا لوگ سردی سے ٹھٹھرتے رہتے تھے پھر اس نے پتھر سے پتھر کو رگڑ کر آگ جلانا سیکھ لیا یہ اس کی پہلی دنیاوی کامیابی تھی پھر اس کی ہر دنیاوی کامیابی اس کو پتھر کا بنا جاتی ہے۔

میں وہاں سے چلا آیا پھر کئی مہینے اپنے والدین سے ملنے مصروفیات کے باعث نہ جا سکا۔ وقت گزرتا رہا۔ مجھے میرا گھر برا لگنے لگ گیا ہر چیز سے نفرت ہونے لگی تھی پھر وہ المیہ میری حیت کچھ عرصہ کے بعد باسی ہونے لگتی تھی۔ دل بے چین تھا اور عجیب طرح کی بے سکونی تھی۔ کبھی مجھے لگتا مرکز بدل گیا ہے محور وہی ہے کبھی لگتا محور بدل گیا ہے مگر مرکز وہی ہے کبھی کبھی مجھے لگتا میں ہجر اور وصال کے درمیان کا ایک لمحہ ہوں پھر مجھے اس کاسنی بیل کے چھوٹے چھوٹے پھول یاد آتے جو سرسبز شیشم کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور پھر مجھے وہ کتا یاد آ جاتا جو اپنی ہی دم کو پکڑنے کی ناکام کوشش میں بھونکتا اور گھومتا رہتا تھا۔ پھر میں کچھ دنوں کے لیے گاؤں چلا گیا گاؤں کی صبح کسی دوشیزہ کی طرح کتنی حیادار ہوتی ہے کھیتوں کھلیانوں میں فطرت ہر لمحہ مسکراتی رہتی ہے۔ میں سوچنے لگ گیا ہم بھی کتنے ظالم ہیں۔ ہم اخلاقی، ذہنی اور روحانی

لاپتہ پیدا کر رہے ہیں۔ گاؤں میں ہماری حویلی خالی تھی۔ مکان مکینوں کے بغیر قبرستان ہوتا ہے اور پھر میں واپس شہر لوٹ آیا۔

اس شام خلاف توقع عجیب بات ہوئی میری بیوی جو میری اس حالت پر پریشان تھی میرے پاس آئی اور بولی مجھے لگتا ہے ہم امی ابو سے زیادتی کر رہے ہیں ان کی خدمت اور دیکھ بھال ہمارا حق بنتا ہے ہمارے بچے بھی دادا دادی کو بہت یاد کرتے ہیں مجھے ان کے پاس لے چلو میں ان سے معافی مانگنا چاہتی ہوں اور ان سے درخواست کرنا چاہتی ہوں کہ وہ ہمارے پاس رہیں۔

آج خلاف توقع بابا کی گاڑی گلی میں نہیں تھی ہم دونوں بچوں سمیت والدین سے ملنے ان کے گھر پہنچے میں نے ماں کے پاؤں چھوئے اور ان سے معافی کی درخواست کی ماں رونے لگ گئی اس کی سسکیاں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں ماں بولی میں تمہیں صرف اس شرط پر معاف کر سکتی ہوں جب تمہارا باپ تمہیں معاف کر دے میں بابا کے پاؤں میں لیٹ گیا اور روتے ہوئے کہا اور سسکتے ہوئے بولا بابا مجھے معاف کر دو مجھے سکون نہیں ہے میری بیسٹ ہارٹس بولنے لگ جاتی ہے میرے اندر اداسی اور خوف نے ڈیرا ڈال لیا ہے۔ میرے اندر بے چینی حد سے بڑھ گئی ہے مجھے معاف کر دیں۔ شاید مجھے سکون مل جائے۔ بابا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے انہوں نے مجھے اٹھا کر گلے لگایا اور بولے بیٹا اداسی اور خوف سے پکی آزادی کے لئے صدقہ دینا پڑتا ہے اور اس کا صدقہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا ہے جب ٹوٹے ہوئے دلوں میں رہتا ہے۔ زندگی کے سفر کی منزل رضائے الٰہی ہے۔ اور اس سفر کی کامیابی سکون ہے۔ سکون صرف سکون پانے Guilt free زندگی گزارنے اور اللہ کے ذکر میں ہے اور ذکر کیا ہے؟ یہ احساس کہ عمل کرتے وقت یہ یاد رکھنا کہ نہ صرف وہ ہمیں دیکھ رہا ہے بلکہ اس عمل کے لئے ہم جواب دہ بھی ہیں یہی ذکر ہے۔

بابا میں نافرمان رہا آپ دکھ سہتے رہے بابا آپ نے مجھے سمجھایا کیوں نہیں؟ میں نے سوال کیا؟

بیٹا ہمارے سوہنے رسول کا ارشاد ہے کہ جب فرشتے اللہ رب العزت سے کہتے ہیں تیرا بندہ دنیا کے میلے میں گم ہو گیا ہے تیرے بلانے پر بھی تیری طرف رجوع نہیں کر رہا تو تو ان کو عذاب کیوں نہیں کرتا؟ رب مسکراتا ہے فرشتو! میں ان کو کیسے چھوڑ دوں ان کا میرے سوا ہے ہی کون؟ بیٹا اگر آپ فرائض پورے کریں گے تو آپ کے حقوق چل کر آپ کے گھر پہنچیں گے۔ جب میں کاشتکاری کرتا تھا تو مصنوعی کھاد اور کیڑے مار دوائیوں کا بے جا استعمال کر کے منافع کے لالچ میں تو مری صحت کے ساتھ کھیلتا تھا اسی لئے تم نافرمان تھے۔ پھر میں نے زمینوں پر قدرتی طریقے سے کاشت کی اور اس کی مخلوق کی صحت کا خیال کیا تم میں بہت تبدیلی آئی مگر پھر بھی کچھ فاصلہ باقی تھا پھر مجھے یاد آیا میں اپنی گاڑی گلی میں کھڑی کرتا تھا جس سے لوگوں کو گزرنے میں تکلیف ہوتی تھی یہ مخلوق رب تعالیٰ کا کنبہ ہے جو اس کو ناراض کرے گا وہ خود خوش کیسے رہے گا آج میں نے گاڑی اپنی گیراج میں کھڑی کر دی تھی اور آج ہی تم میرے پاس چلے آئے۔ بیٹا یہ جو دنیا ہے کتے کی دم کی طرح ہے اس کو پکڑنے کی خواہش اور کوشش میں صرف چیخ و پکار اور تھکن ہی ہے یہ دم کبھی دنیا دار سے پکڑی نہیں جا سکے گی۔ بیٹا میری ایک نصیحت ہے رحمت العالمین کی سنت پر عمل کرتے ہوئے اس کی مخلوق کی رحمت بن جاؤ۔

میرے والدین کے میرے گھر شفٹ ہونے سے پہلے ہی میرے دل کو سکون کی دولت مل گئی تھی اور میرے یادوں کے گلشن میں صرف شبنم سے دھلی ہوئی سفید پھولوں والی کاسنی بیل تھی کیونکہ میرے اندر کا کتا اپنی دم پکڑنے سے تائب ہو چکا تھا۔

◆◆◆

سبا کی قوم

پیروز بخت قاضی

مختصر تعارف

پیروز بخت قاضی موجودہ بھارت کے مشرقی پنجاب بٹالہ میں پیدا ہوئے۔ ترجمہ نگاری، افسانہ نگاری اور خاص طور پر قرآنی واقعات کو کہانی کے انداز میں بیان کرنے پر دسترس حاصل ہے۔ 11 کتابوں کے مصنف ہیں: "جدید سیاسی تصورات"، "نیا کھاتا"، "انوکھی کہانیاں"، "انگریزی کہانیوں کے تراجم میں"، "جھروکے" کے نام سے خاکوں کی کتاب "کانچ کی چیخ" افسانوی مجموعے، "جھرنے" یادداشتیں وواقعات اور شاعری کی کتاب "قرآنی کہانیاں"، "مزید قرآنی کہانیاں"، "ڈراپید ریلنڈ تک" ان کی اہم کتب ہیں۔

"سلیمانؑ نے پرندوں کا جائزہ لیا اور کہا" کیا بات ہے کہ میں فلاں ہدہد کو نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا وہ کہیں غائب ہو گیا ہے؟ میں اسے سخت سزا دوں گا یا ذبح کر دوں گا، ورنہ اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہوگی۔" (النمل 27:20-21)

حضرت سلیمانؑ کو اللہ تعالیٰ نے بڑی نعمتوں اور طاقتوں سے نوازا تھا۔ ان کے حصار میں جن وانس اور پرندوں کے لشکر بھی شامل تھے۔ انہیں جانوروں کی بولیوں کا علم بھی دیا گیا تھا اور ہواؤں پر دسترس بھی عطا کی گئی تھی۔

"کچھ زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ اس نے آ کر کہا "میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں۔ میں سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں۔ میں نے وہاں ایک عورت دیکھی جو اس قوم کی حکمران ہے۔ اس کو ہر طرح کا سروسامان بخشا گیا ہے۔ اور اس کا تخت بڑا عظیم الشان ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اور اس کی قوم اللہ کی بجائے سورج کے آگے سجدہ کرتی ہے۔" (النمل 27:22تا24)

سبا جنوبی عرب کی مشہور تجارت پیشہ قوم تھی جس کا دارالحکومت مارب تھا جو موجودہ یمن کے دارالسلطنت صنعاء سے 55 میل بجانب شمال مشرق واقع تھا۔ اس کا زمانہ عروج معین کی سلطنت کے زوال کے بعد تقریباً 1100 ق م سے شروع ہوا اور ایک ہزار سال تک یہ عرب میں اپنی عظمت کے ڈنکے بجاتی رہی۔ پھر 115 ق م میں جنوبی عرب کی دوسری مشہور قوم حمیر نے اس کی جگہ لے لی۔ عرب میں یمن اور حضر موت اور افریقہ میں حبش کے علاقے پر اس کا قبضہ تھا۔ مشرقی افریقہ، ہندوستان، مشرق بعید اور خود عرب کی جتنی تجارت مصر وشام اور یونان وروم کے ساتھ ہوتی تھی وہ زیادہ تر انہی سبائیوں کے ہاتھ میں تھی۔ اسی وجہ سے یہ قوم قدیم زمانہ میں اپنی دولت کے لئے نہایت مشہور تھی بلکہ یونانی مؤرخین تو اسے دنیا کی سب سے زیادہ مالدار قوم کہتے ہیں۔ تجارت کے علاوہ ان کی خوشحالی کا بڑا سبب یہ تھا کہ انہوں نے

اپنے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر ایک بہترین نظام آب پاشی قائم کر رکھا تھا جس سے ان کا پورا علاقہ جنت بنا ہوا تھا۔ ان کے ملک کی اس غیر معمولی سرسبزی و شادابی کا ذکر یونانی مؤرخین نے بھی کیا ہے اور سورۂ سبا میں قرآن مجید بھی اس طرف اشارہ کرتا ہے:

> "سلیمانؑ نے کہا "ابھی ہم دیکھے لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے، میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے، پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔"" (النمل 27:27-28)

> "ملکہ بولی "اے اہلِ دربار میری طرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے۔ وہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن و رحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے۔ مضمون یہ ہے کہ "میرے مقابلے میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔" (خط سنا کر) ملکہ نے کہا "اے سردارانِ قوم میرے اس معاملہ میں مجھے مشورہ دو، میں کسی معاملہ کا فیصلہ تمہارے بغیر نہیں کرتی ہوں۔" انہوں نے جواب دیا "ہم طاقت ور اور لڑنے والے لوگ ہیں۔ آگے فیصلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ آپ کو کیا حکم دینا ہے۔" ملکہ نے کہا کہ "بادشاہ جب کسی ملک میں گھس آتے ہیں تو اسے خراب اور اس کے عزت والوں کو ذلیل کر دیتے ہیں۔ یہی کچھ وہ کیا کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں۔" (النمل 27:29 تا 35)

> "جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمان کے پاس پہنچا تو اس نے کہا "کیا تم مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا گیا ہے۔ تمہارا ہدیہ تمہی کو مبارک رہے۔ (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والے کی طرف۔ ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے۔"" (النمل 27:36 تا 37)

> "سلیمان نے کہا "اے اہلِ دربار تم میں سے کون اس کا تخت میرے پاس لاتا ہے قبل اس کے کہ وہ لوگ مطیع ہو کر میرے پاس حاضر ہوں؟" جنوں میں سے ایک قوی ہیکل نے عرض کیا "میں اسے حاضر کر دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں۔ میں اس کی طاقت رکھتا ہوں اور امانت دار ہوں۔" جس شخص کے پاس کتاب کا ایک علم تھا وہ بولا "میں آپ کی پلک جھپکنے سے پہلے اسے لائے دیتا ہوں۔" جونہی کہ سلیمان نے وہ تخت اپنے پاس رکھا ہوا دیکھا، وہ پکار اٹھا "یہ میرے رب کا فضل ہے تاکہ وہ مجھے آزمائے کہ میں شکر کرتا ہوں یا کافرِ نعمت بن جاتا ہوں۔ اور جو کوئی شکر کرتا ہے اس کا شکر اس کے اپنے ہی لئے مفید ہے، ورنہ کوئی ناشکری کرے تو میرا رب بے نیاز اور اپنی ذات میں آپ بزرگ ہے۔"" (النمل 27:38 تا 40)

سفارت ملکہ کا ہدیہ واپس لے کر پہنچی اور جو کچھ اس نے دیکھا اور سنا تھا وہ عرض کر دیا۔ ملکہ نے ان سے حضرت سلیمانؑ کے جو حالات سنے ان کی بنا پر اس نے یہی مناسب سمجھا کہ خود ان کی ملاقات کے لئے بیت المقدس جائے۔ چنانچہ وہ شاہی ساز و سامان کے ساتھ

سبا سے فلسطین کی طرف روانہ ہوئی اور اس نے دربار سلیمانی میں اطلاع بھیج دی کہ میں آپ کی دعوت خود آپ کی زبانی سننے اور بالمشافہ گفتگو کرنے کے لئے حاضر ہو رہی ہوں۔ جب وہ بیت المقدس کے قریب پہنچ گئی تو حضرت سلیمان کے حکم سے اس کا تخت پلک جھپکنے سے پہلے حاضر کر دیا گیا تھا۔

"سلیمان نے کہا "انجان طریقے سے اس کا تخت اس کے سامنے رکھ دو، دیکھیں وہ صحیح بات تک پہنچتی ہے یا ان لوگوں میں سے ہے جو راہ راست نہیں پاتے۔" ملکہ جب حاضر ہوئی تو اس سے کہا گیا کہ تیرا تخت ایسا ہی ہے؟ وہ کہنے لگی یہ تو گویا وہی ہے، ہم تو پہلے ہی جان گئے تھے اور ہم نے سر اطاعت جھکا دیا تھا (یا ہم مسلم ہو چکے تھے) (42-41:27)

"اس سے کہا گیا کہ محل میں داخل ہو۔ اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اترنے کے لئے اس نے اپنے پائنچے اٹھا لیے۔ سلیمان نے کہا یہ شیشے کا چکنا فرش ہے۔ اس پر وہ پکار اٹھی "اے میرے رب (آج تک) میں اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتی رہی، اور اب میں نے سلیمان کے ساتھ اللہ رب العالمین کی اطاعت قبول کر لی۔" (44-43:27)

یہودی ربیوں کی روایات میں حضرت سلیمانؑ اور ملکہ سبا کا قصہ اپنی بیشتر تفصیلات میں قرآن سے ملتا جلتا ہے۔ ہد ہد کا غائب ہونا، پھر آ کر سبا اور اس کی ملکہ کے حالات بیان کرنا، حضرت سلیمان کا اس کے ذریعہ سے خط بھیجنا، ہد ہد کا عین اس وقت وہ خط ملکہ کے آگے گرانا جبکہ وہ آفتاب کی پرستش کو جا رہی تھی، ملکہ کا اس خط کو دیکھ کر اپنے وزراء کی کونسل منعقد کرنا، پھر ملکہ کا ایک قیمتی ہدیہ حضرت سلیمان کے پاس بھیجنا، خود یروشلم پہنچ کر ان سے ملنا، ان کے محل میں پہنچ کر یہ خیال کرنا کہ حضرت سلیمان پانی کے حوض میں بیٹھے ہیں، اور اس میں اترنے کے لئے پائنچے چڑھا لینا، یہ سب ان روایات میں اسی طرح مذکور ہے جس طرح قرآن میں بیان ہوا ہے۔

مگر ہدیہ وصول ہونے پر حضرت سلیمان کا جواب، ملکہ کے تخت کو اٹھوا منگانا، ہر موقع پر ان کا خدا کے آگے جھکنا اور آخر کار ملکہ کا ان کے ہاتھ پر ایمان لانا، یہ سب باتیں بلکہ خدا پرستی اور توحید کی ساری باتیں ہی ان روایات میں ناپید ہیں۔ سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ ان ظالموں نے حضرت سلیمانؑ پر الزام لگایا ہے کہ انہوں نے ملکہ سبا کے ساتھ معاذ اللہ زنا کا ارتکاب کیا اور اسی حرامی نسل سے بابل کا بادشاہ بخت نصر پیدا ہوا جس نے بیت المقدس کو تباہ کیا۔ (جیوئش انسائیکلوپیڈیا، جلد 11، صفحہ 443) اصل معاملہ یہ ہے کہ یہودی علماء کا ایک گروہ حضرت سلیمان کا سخت مخالف رہا ہے۔ ان لوگوں نے ان پر توراۃ کے احکام کی خلاف ورزی، غرور حکومت، غرور عقل و دانش، زن مریدی، عیش پرستی اور شرک و بت پرستی کے گھناؤنے الزامات لگائے ہیں۔ (جیوئش انسائیکلوپیڈیا، جلد 11، صفحہ 439 تا 441) اور یہ اسی پروپیگنڈے کا اثر ہے کہ بائبل انہیں نبی کی بجائے محض ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور بادشاہ بھی ایسا جو معاذ اللہ احکام الٰہی کے خلاف مشرک عورتوں کے عشق میں گم ہو گیا، جس کا دل خدا سے پھر گیا اور جو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کی طرف مائل ہو گیا۔ (1-سلاطین 11:1-11)۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے بنی اسرائیل پر کتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے اکابر کا دامن خود ان کی پھینکی ہوئی گندگیوں سے صاف کیا۔

یہ تو تھے ملکہ سبا کے حالات، اس کا حضرت سلیمانؑ سے رابطہ اور پھر ان کے ہاتھ پر قبول اسلام۔ لیکن قوم سبا جو صدیوں تک

زبردست قوم رہی ہے اور جس کا ملک سرسبز و شاداب اور خوشحال رہا ہے۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں کہیں کہیں ٹکڑوں میں ملتا ہے اور پھر یہ قوم منتشر ہو گئی اور اس کے مختلف قبیلے اپنا وطن چھوڑ کر عرب کے مختلف علاقوں میں چلے گئے۔ غسانیوں نے اردن اور شام کا رخ کیا۔ اوس اور خزرج کے قبیلے یثرب میں جا بسے۔ خزاعہ نے جدہ کے قریب تہامہ کے علاقے میں سکونت اختیار کر لی۔ ازد کا قبیلہ عمان میں جا کر آباد ہوا۔ دیگر قبائل بھی نکلنے پر مجبور ہوئے حتیٰ کہ سبا کے نام کی کوئی قوم ہی دنیا میں باقی نہ رہی۔ صرف اس کا ذکر افسانوں میں رہ گیا۔

مختلف تاریخی ذرائع سے ملنے والی معلومات کے مطابق اس قوم کی مختصر تاریخ کچھ یوں ہے کہ:۔

تاریخ کی رو سے "سبا" جنوبی عرب کی ایک بہت بڑی قوم کا نام ہے جو چند بڑے بڑے قبائل پر مشتمل تھی۔ ایک روایت کے مطابق سبا عرب کے ایک شخص کا نام تھا جس کی نسل سے عرب میں کئی مشہور قبیلے پیدا ہوئے۔ بہت قدیم زمانے سے دنیا میں عرب کی اس قوم کا شہرہ تھا۔ 2500 ق م میں اُور کے کتبات اس کا ذکر سابوم کے نام سے کرتے ہیں۔ اس کے بعد بابل اور اشور کے کتبات میں اور اسی طرح بائبل میں بھی کثرت سے اس کا ذکر آیا ہے۔ یونان اور روم کے مورخین اور جغرافیہ نویس تیسری صدی ق م کے وقت سے مسیح کے بعد کی کئی صدیوں تک مسلسل اس کا ذکر کرتے چلے گئے ہیں۔ اس قوم کا وطن عرب کا جنوب مغربی کونہ تھا جو آج یمن کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے عروج کا دور گیارہ سو برس قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت داؤدؑ اور سلیمانؑ کے زمانے میں ایک دولت مند قوم کی حیثیت سے اس کا شہرہ آفاق میں پھیل چکا تھا۔ آغاز میں یہ ایک آفتاب پرست قوم تھی۔ پھر جب اس کی ملکہ حضرت سلیمان (965–926 ق م) کے ہاتھ پر ایمان لے آئی تو اغلب یہ ہے کہ اس کی غالب اکثریت مسلمان ہو گئی تھی لیکن بعد میں نہ معلوم کس وقت اس کے اندر شرک اور بت پرستی کا پھر زور ہو گیا اور اس نے المقہ (چاند دیوتا) اور عشتر (زہرہ) ذات حمیم اور ذات بعدان (سورج دیوی) ہوبس، حرمتم یا حریمت اور ایسے ہی دوسرے بہت سے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ المقہ اس قوم کا سب سے بڑا دیوتا تھا اور اس کے بادشاہ اپنے آپ کو اسی دیوتا کے وکیل کی حیثیت سے اطاعت کا حقدار قرار دیتے۔ یمن میں بکثرت کتبات ملے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا ملک ان دیوتاؤں اور خصوصاً المقہ کے مندروں سے بھرا ہوا تھا اور ہر واقعہ پر ان کے شکریے ادا کیے جاتے تھے۔

آثار قدیمہ کی تحقیقات کے سلسلے میں تقریباً تین ہزار کتبات فراہم ہوئے ہیں جو اس قوم کی تاریخ پر اہم روشنی ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ عربی روایات اور رومی و یونانی تاریخ کی فراہم کردہ معلومات کو ملائیں تو درج ذیل ادوار کا پتہ چلتا ہے:۔

1- 650 ق م سے پہلے کا دور: اس زمانے میں بادشاہ کا لقب مکرب تھا جو انسانوں اور خداؤں کے درمیان واسطہ سمجھا جاتا تھا۔ ان Priest-King کا پایہ تخت صرواح تھا جس کے کھنڈر خریبہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس دور میں مارب کے مشہور بند کی بنا رکھی گئی اور وقتاً فوقتاً مختلف بادشاہوں نے اسے وسیع کیا۔

2- 650 ق م سے 115 ق م تک کا دور: بادشاہوں نے مکرب کا لقب چھوڑ کر ملک کا لقب اختیار کر لیا یعنی حکومت میں مذہبیت کی جگہ سیاست اور سیکولرازم کا رنگ غالب آ گیا۔ صرواح چھوڑ کر مارب کو دارالسلطنت بنایا گیا اور اسے غیر معمولی ترقی دی گئی۔ یہ مقام 3900 فیٹ کی بلندی پر صنعاء سے 60 میل جانب مشرق واقع ہے۔ اس کے کھنڈر شہادت دیتے ہیں کہ یہ کبھی متمدن قوم کا مرکز تھا۔

3- 115ق م سے 300 عیسوی تک کا دور: اب سبا کی مملکت پر حمیر کا قبیلہ غالب ہو گیا جو قوم سبا ہی کا ایک قبیلہ تھا اور تعداد میں دوسرے تمام قبائل سے بڑھا ہوا تھا۔ اس دور میں مارب کو اجاڑ کر ریدان پایۂ تخت بنایا گیا جو قبیلۂ حمیر کا مرکز تھا۔ بعد میں یہ شہر ظفار کے نام سے موسوم ہوا۔ آج کل ایک مدور پہاڑی پر اس کے کھنڈر ملتے ہیں۔ اسی زمانے میں سلطنت کے ایک حصے کی حیثیت سے پہلی مرتبہ لفظ یمنت اور یمنات کا استعمال شروع ہوا اور رفتہ رفتہ یمن اس پورے علاقے کا نام ہو گیا جو عرب کے جنوب مغربی کونے پر عسیر سے عدن تک باب المندب سے حضر موت تک واقع ہے۔ اسی دور میں سبائیوں کا زوال شروع ہوا۔

4- 300ء کے بعد آغاز اسلام تک کا دور: یہ قوم سبا کی تباہی کا دور ہے۔ اس میں مسلسل خانہ جنگیاں ہوئیں۔ بیرونی قوموں کی مداخلت شروع ہوئی، تجارت برباد ہوئی، زراعت نے دم توڑا اور آخر کار آزادی تک ختم ہو گئی۔ پہلے ریدانیوں، حمیریوں اور ہمدانیوں کی باہمی نزاعات سے فائدہ اٹھا کر 340ء سے 378ء تک یمن پر حبشیوں کا قبضہ رہا۔ پھر آزادی بحال ہوئی مگر مارب کے مشہور بند میں رخنے پڑنے شروع ہو گئے۔ یہاں تک کہ 450ء یا 451ء میں بند کے ٹوٹنے سے وہ عظیم سیلاب آیا جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ اگرچہ اس کے بعد ابرہہ کے زمانے تک اس بند کی مسلسل مرمتیں ہوتی رہیں لیکن جو آبادی منتشر ہو چکی تھی وہ پھر جمع نہ ہو سکی اور نہ آبپاشی اور زراعت کا نظام دوبارہ بحال ہو سکا۔ 523ء میں یمن کے یہودی بادشاہ ذونواس نے نجران کے عیسائیوں پر وہ ظلم و ستم برپا کیا جس کا ذکر قرآن مجید میں اصحاب الاخدود کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں حبش کی عیسائی سلطنت یمن پر انتقاماً حملہ آور ہو گئی اور اس نے سارا ملک فتح کر لیا۔ اس کے بعد حبشی وائسرائے ابرہہ نے کعبے کی مرکزیت ختم کرنے اور عرب کے پورے مغربی علاقے کو رومی حبشی اثر میں لانے کے لئے 570ء یا 571ء میں (نبی ﷺ کی پیدائش سے چند روز قبل) مکہ معظمہ پر حملہ کیا اور اس کی پوری فوج پر وہ تباہی آئی جسے قرآن مجید میں اصحاب الفیل کے عنوان سے بیان کیا گیا ہے۔ آخر کار 575ء میں یمن پر ایرانیوں کا قبضہ ہوا اور اس کا خاتمہ اس وقت ہوا جب 628ء میں ایرانی گورنر باذان نے اسلام قبول کر لیا۔

قوم سبا کا عروج دراصل دو بنیادوں پر قائم تھا۔ ایک زراعت دوسرے تجارت۔ زراعت کو انہوں نے آبپاشی کے ایک بہترین نظام کے ذریعہ سے ترقی دی تھی جس کے مثل کوئی دوسرا نظام آبپاشی بابل کے سوا قدیم زمانے میں کہیں نہ پایا جاتا تھا۔ ان کی سرزمین میں قدرتی دریا نہ تھے۔ بارش کے زمانے میں پہاڑوں سے برساتی نالے بہہ نکلتے تھے۔ انہی نالوں پر سارے ملک میں جگہ جگہ بند باندھ کر انہوں نے تالاب بنا لیے تھے اور ان سے نہریں نکال نکال کر پورے ملک کو اس طرح سیراب کر دیا تھا کہ قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق ہر طرف ایک باغ ہی باغ نظر آتا تھا۔ اس نظام آبپاشی کا سب سے بڑا مخزن آب وہ تالاب تھا جو شہر مارب کے قریب بلق کی درمیانی وادی پر بند باندھ کر تیار کیا گیا تھا مگر جب اللہ کی نظر عنایت ان سے پھر گئی تو پانچویں صدی کے وسط میں یہ عظیم الشان بند ٹوٹ گیا اور اس سے نکلنے والا سیلاب راستے میں بند پر بند توڑتا چلا گیا، یہاں تک کہ ملک کا پورا نظام آبپاشی تباہ ہو کر رہ گیا۔ پھر کوئی اسے بحال نہ کر سکا۔

تجارت کے لئے اس قوم کو خدا نے بہترین جغرافیائی مقام عطا کیا تھا جس سے اس نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ایک ہزار برس سے زیادہ مدت تک یہی قوم مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت کا واسطہ بنی رہی۔ ایک طرف ان کی بندرگاہوں میں چین کا ریشم، انڈونیشیا اور مالابار کے گرم مصالحے، ہندوستان کے کپڑے اور تلواریں، مشرقی افریقہ کے زنگی غلام، بندر، شتر مرغ کے پر اور ہاتھی دانت پہنچتے تھے اور

دوسری طرف یہ ان چیزوں کو مصر اور شام کی منڈیوں میں پہنچاتے تھے جہاں سے روم اور یونان تک یہ مال روانہ کیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خود ان کے علاقے میں لوبان، عود، عنبر، مشک، مُر، قرفہ، قصب الذریرہ، سلیخہ اور دوسری ان خوشبودار چیزوں کی بڑی پیداوار تھی جنہیں مصر و شام اور روم و یونان کے لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔

اس عظیم الشان تجارت کے دو بڑے راستے تھے۔ ایک بحری اور دوسرا بری۔ بحری تجارت کا اجارہ ہزار سال تک انہی سبائیوں کے ہاتھ میں تھا کیونکہ بحر احمر کی موسمی ہواؤں، زیر آب چٹانوں اور لنگر اندازی کے مقامات کا راز یہی لوگ جانتے تھے اور دوسری کوئی قوم اس خطرناک سمندر میں جہاز چلانے کی ہمت نہ رکھتی تھی۔ اس بحری راستے سے یہ لوگ اردن اور مصر کی بندرگاہوں تک اپنا مال پہنچایا کرتے تھے۔ بری راستے عدن اور حضر موت سے مارب پر جا کر ملتے تھے اور پھر وہاں سے ایک شاہراہ مکہ، جدہ، یثرب، العلا، تبوک اور ایلہ سے گزرتی ہوئی پٹرا تک پہنچتی تھی۔ اس کے بعد ایک راستہ مصر کی طرف اور دوسرا راستہ شام کی طرف جاتا تھا۔ اس بری راستے پر، جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے، یمن سے حدود شام تک سبائیوں کی نوآبادیاں مسلسل قائم تھیں اور شب و روز ان کے تجارتی قافلے یہاں سے گزرتے رہتے تھے۔ آج تک ان میں سے بہت سی نوآبادیوں کے آثار اس علاقے میں موجود ہیں اور وہاں سبائی و حمیری زبان کے کتبات مل رہے ہیں۔

پہلی صدی عیسوی کے لگ بھگ زمانے میں اس تجارت پر زوال آنا شروع ہو گیا۔ مشرق اوسط میں جب یونانیوں اور پھر رومیوں کی طاقتور سلطنتیں قائم ہوئیں تو شور مچنا شروع ہوا کہ عرب تاجر اپنی اجارہ داری کے باعث مشرق کے اموال تجارت کی من مانی قیمتیں وصول کر رہے ہیں اور ضرورت ہے کہ ہم خود اس میدان میں آگے بڑھ کر اس تجارت پر قبضہ کریں۔ اس غرض کے لئے سب سے پہلے مصر کے یونانی الاصل فرمانروا بطلیموس ثانی (285-246 ق م) نے اس قدیم نہر کو پھر سے کھلوایا جو سترہ سو برس پہلے فرعون سسوسترِیس نے دریائے نیل کو بحر احمر سے ملانے کے لئے کھدوائی تھی۔ اس نہر کے ذریعہ سے مصر کا بحری بیڑا پہلی مرتبہ بحر احمر میں داخل ہوا لیکن سبائیوں کے مقابلے میں یہ کوشش زیادہ کارگر نہ ہو سکی۔ پھر جب مصر پر روم کا قبضہ ہوا تو رومی زیادہ طاقتور تجارتی بیڑا بحر احمر میں لے آئے اور اس کی پشت پر انہوں نے ایک جنگی بیڑا بھی لا کر ڈال دیا۔ اس طاقت کا مقابلہ سبائیوں کے بس میں نہ تھا۔ رومیوں نے جگہ جگہ بندرگاہوں پر اپنی تجارتی نوآبادیاں قائم کیں۔ ان میں جہازوں کی ضروریات فراہم کرنے کا انتظام کیا اور جہاں ممکن ہوا وہاں اپنے فوجی دستے بھی رکھ دیے حتیٰ کہ ایک وقت وہ آ گیا کہ عدن پر رومیوں کا فوجی تسلط قائم ہو گیا۔ اسی سلسلے میں رومی اور حبشی سلطنتوں نے سبائیوں کے مقابلے میں باہم ساز باز بھی کر لیا جس کی بدولت بالآخر اس قوم کی آزادی تک ختم ہو گئی۔

بحری تجارت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد بری تجارت سبائیوں کے پاس رہ گئی۔ مگر بہت سے اسباب نے رفتہ رفتہ اس کی کمر بھی توڑ دی۔ پہلے نبطیوں نے پٹرا سے العلا تک بالائی حجاز اور اردن کی تمام نوآبادیوں سے سبائیوں کو نکال باہر کیا۔ پھر 106ء میں رومیوں نے نبطی سلطنت کا خاتمہ کر دیا اور حجاز کی سرحد تک شام اور اردن کے تمام علاقے ان کے مضبوط ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس کے بعد حبش اور روم کی متحدہ کوشش یہ رہی کہ سبائیوں کی باہمی کشمکش سے فائدہ اٹھا کر ان کی تجارت کو بالکل تباہ کر دیا جائے۔ اسی بنا پر حبشی بار بار یمن میں مداخلت کرتے رہے یہاں تک کہ آخر کار انہوں نے پورے ملک پر قبضہ کر لیا۔

اس طرح اللہ تعالیٰ کے غضب نے اس قوم کو انتہائی عروج سے گرا کر اس گڑھے میں پھینک دیا جہاں سے پھر کوئی مغضوب قوم

بھی سرتیں نکال لی ہے۔ ایک وقت تھا کہ اس کی دولت کے افسانے سن سن کر یونان و روم والوں کے منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ اسٹرابو لکھتا ہے کہ یہ لوگ سونے اور چاندی کے برتن استعمال کرتے ہیں اور ان کے مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور دروازوں تک میں ہاتھی دانت، سونے، چاندی اور جواہر کا کام ہوا ہوتا تھا۔ پلینی (Pleny) کہتا ہے کہ روم اور فارس کی دولت ان کی طرف بہی چلی جا رہی ہے۔ یہ اس وقت دنیا کی سب سے مالدار قوم ہیں۔ ان کا سرسبز و شاداب ملک باغات، کھیتیوں اور مواشی سے بھرا ہوا ہے۔ آرٹی میڈ ورس کہتا ہے کہ یہ لوگ عیش میں مست ہو رہے ہیں اور جلانے کی لکڑی کی بجائے دار چینی، صندل اور دوسری خوشبودار لکڑیاں جلاتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے یونانی مورخین روایت کرتے ہیں کہ ان کے علاقے کے قریب ساحل سے گزرتے ہوئے تجارتی جہازوں تک خوشبو کی لپٹیں پہنچتی ہیں۔ انہوں نے تاریخ میں پہلی مرتبہ صنعاء کے بلند پہاڑی مقام پر وہ فلک شگاف عمارت Skyscaper تعمیر کی جو قصر غمدان کے نام سے صدیوں تک مشہور رہی ہے۔ عرب مورخین کا بیان ہے کہ اس کی بیس منزلیں تھیں اور ہر منزل 36 فیٹ بلند تھی۔ یہ سب کچھ بس اسی وقت تک رہا جب تک اللہ کا فضل ان کے شامل حال رہا۔ آخر کار جب انہوں نے کفران نعمت کی حد کر دی تو رب قدیر کی نظر عنایت ہمیشہ کے لئے ان سے پھر گئی اور ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔

◆◆◆

معروف افسانہ نگار، شاعر اور ادیبہ صوفیہ بیدار کا نیا شعری مجموعہ

تاراج

شائع ہو گیا ہے ——— قیمت:/500 روپے

ملنے کا پتہ: ماورا پبلشرز، 60۔ مال روڈ، لاہور

(فون: 042-36303390-36304063, 0300-4020955)

معروف شاعر، ادیب پرتپال سنگھ بیتاب کے فن و شخصیت پر نیا مجموعہ خالد کرار کے قلم سے

فن و شخصیت ...... پرتپال سنگھ بیتاب

شائع ہو گیا ہے ——— قیمت:/430 روپے

ملنے کا پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ، انڈیا (091-9419180824)

سچ کی آواز

سیما پیروز

مختصر تعارف

سیما پیروز 6 جون 1946ء کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ اب تک ان کے 5 افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ شام کی سرگوشی (1989) روشنی کی تتلیاں (1996) کانچ کی پیالی اور محبت (2004) طوفان کے بعد (2010) اور پنجابی کہانیوں کا مجموعہ سچا رشتہ (2016) ان کی بہترین کتب ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے عوض انھیں "پیامِ تخلیق تسلسل ایوارڈ" اور "رشید اختر ندوی" ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ارشد کی وفات کے بعد ثروت کو چار و ناچار اکلوتے بیٹے کے پاس لاس ویگاس امریکہ جانا پڑا۔ ثروت نے لاہور کو چھوڑنے کا کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ بیٹا عدیل ایم۔ بی۔ اے کے سیکنڈ سمسٹر تھا جب اچانک ارشد رات کو اچھے بھلے سوئے اور صبح اٹھنا نصیب نہ ہوا۔ وہ اتنی خاموشی سے چلے گئے کہ پاس سوئی ثروت کو بھی مطلق خبر نہ ہوئی۔

ثروت مہینوں دکھ کے اتھاہ سمندر میں ڈوبی رہی۔ لیکن کالج کی ڈیوٹی نے اسے کافی سنبھالا۔ زندگی ایک ڈگر پہ چل رہی تھی۔

کہ اچانک عدیل نے ایم۔ بی۔ اے کے بعد امریکہ جا کر مزید پڑھنے کی رٹ لگا دی۔ ماموں، چچا، تایا سب نے بہتیرا سمجھایا۔ کہ "اکیلی ماں کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔" کافی شرم دلائی اسے اس کے فرائض سے آگاہ کیا۔ پر وہ بھی ایک ہی ڈھیٹ تھا۔ "دادی ہیں نا ماما کے پاس، اور پھر ان کی کالج کی مصروفیت ہے۔ چند سالوں کی بات ہے۔ میں یہ گیا اور یہ آیا۔"

ثروت نے خاموشی سادھ لی۔ عدیل جانتا تھا کہ ماں دکھی اور ناراض ہے۔ پر عدیل نے سو سو طریقوں سے گھیر کے ماں کو منا ہی لیا۔ آخر ماں تھی بیٹے کے آگے ہار گئی۔ عدیل کے آنے کے سال لمبے ہی ہوتے چلے گئے۔

"عدیل آخر کب ختم ہوگی تمہاری پڑھائی ——!! انتظار کر کر کے میری تو آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔" وہ فون پر رو پڑی۔

"بس ماما صرف دو سال اور۔"

سالوں بعد عدیل ڈگری اور امریکی شہریت لے کر لوٹا۔ پھر اس نے کہاں پاکستان ٹکنا تھا۔ بہر حال دنیا کے دکھاوے کو پورا ایک سال اِدھر اُدھر درخواستیں اور انٹرویو دینے کے بعد جب کوئی ڈھنگ کی جاب نہ ملی تو اسے واپس جانے کا بہانہ مل گیا۔ جب وہ انٹرویو دے کر آتا ثروت بہت پُر امید ہوتی۔ لیکن جب کال نہ آتی تو دفتر سے ہی پتہ چلتا کہ وزیر اعلیٰ کا کوئی رشتہ دار سیکرٹری صاحب کا کوئی سفارشی اس پوسٹ پر رکھ لیے گئے ہیں۔"

کئی دن پاکستان اور یہاں کے سسٹم کو خوب کوسا۔ ڈیڑھ سال ذلیل و خوار ہونے کے بعد اس نے امریکہ واپس جانے کا فیصلہ کیا۔ ثروت نے بہت روکا۔ "عدیل میں تو تمہاری شادی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کب تک لنڈورے پھرتے رہو گے۔" "ماما میں چار پیسے کمانے کے قابل ہو جاؤں تو گھر بسانے کا سوچوں۔ آنے والی کیا روزہ رکھے گی۔ مجھے ابھی شادی وادی نہیں کرنی۔"

"بیٹا! تھوڑا اور انتظار کر لو۔ انشاءاللہ نوکری مل جائے گی۔" ثروت نے منت بھرے انداز میں کہا۔

"اور کتنا انتظار کروں؟ ڈیڑھ سال سے ذلیل و خوار ہو رہا ہوں۔ یہاں ایجوکیشن اور ٹیلنٹ کی کوئی قدر نہیں۔ یہاں رشوت اور سفارش چاہیے۔ وہ دونوں میرے پاس نہیں۔" "تم یہاں رہنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے نوکری نہیں ملی۔" ثروت رونے لگی۔

"ماما اب آپ مجھ پر الزام لگا رہی ہیں۔ اگر میں رہنا نہ چاہتا تو واپس ہی نہ آتا۔" وہ منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد ثروت اور دادی دونوں اداس رہیں۔ گھر جیسے خالی سا ہو گیا تھا۔

ایک روز دادی بھی چل بسیں۔ عدیل دادی کی وفات پر آیا تو ماں سے ضد کرتا رہا۔

"ماما پلیز —— آپ میرے ساتھ ہی چلیں۔ یہاں اکیلی کیا کریں گی؟"

"نہیں بیٹا میں اب اس عمر میں جا کر کیا کروں گی۔ ویسے بھی ابھی میری نوکری کے چند سال باقی ہیں۔"

ثروت نے نیچے کرائے دار رکھ لیے اور خود اوپر کی منزل میں شفٹ ہو گئی۔ کالج سے آنے کے بعد شام میں امریکن سکول کے دو چار بچوں کی ٹیوشن رکھ لی تھی۔ اس طرح اس کا ٹائم اچھا پاس ہو جاتا تھا۔ روپے پیسے کی تو کوئی کمی نہیں تھی۔ بس تنہائی کا روگ تھا۔ جس کا کوئی مداوا نہیں تھا۔ سارا دن اور شام تو مصروفیت میں گزر جاتی پر رات کاٹنی مشکل ہو جاتی۔ جب سے چوریاں، ڈاکے اور قتل و غارت گری شروع ہوئی تھی۔ رات اس کی جاگتے ہی گزرتی۔ ذرا سی آہٹ پر چونک کر اٹھ جاتی اور کمرے میں ہی درود شریف اور آیات کا ورد کرتی رہتی۔ صبح کی اذانوں کے ساتھ اسے ذرا سکون ملتا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ایف۔ سی۔ کالج میں کانٹریکٹ پر پڑھانے لگی۔ سال میں ایک بار چند ہفتوں کے لیے عدیل چکر لگاتا۔ تو ثروت کی گویا عید ہو جاتی۔ ثروت اسے شادی کا کہہ کہہ کر تھک گئی تھی۔ ہر سال اس کے آنے سے پہلے لڑکیاں دیکھ چھوڑتی۔ وہ آتا تو ریجیکٹ کر کے چل دیتا۔ کوئی اسے موٹی لگتی تو کوئی انجان ہوتی۔ کسی کے ساتھ اسے لگتا کہ اس کی ذہنی مطابقت نہیں ہو سکتی۔

ثروت کی دوست اور کولیگ کی بھانجی، انتہائی حسین، گوری چٹی، بادامی آنکھیں، لمبے بال اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ نیچلی بھی سلجھی ہوئی تھی۔ غرض یہ کہ دنیاوی لحاظ سے ایک لڑکی میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ سب اس میں موجود تھیں۔ عدیل صاحب آئے وہ چار بار لڑکی سے ملے اور جانے سے پہلے یہ کہہ کر انکار کر گئے۔ "لڑکی تو اچھی ہے پر ذرا عمر رسیدہ لگتی ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟ —— تم سے پورے سات سال چھوٹی ہے۔ اپنی عمر تو دیکھو پورے پینتیس سال کے ہو چکے ہو۔ ثروت کا غصے کے مارے جیسے دماغ بھک سے اڑ گیا۔ "پچھلی دفعہ ایک بائیس سال کی لڑکی تم نے یہ کہہ کر رد کر دی تھی کہ بالکل بچی سی ہے —— شرم کرو —— مجھے کہاں کہاں ذلیل کرواؤ گے۔" اگلے سال ثروت پہلی بار بیٹے کے پاس گئی تو اسے بیٹے کی شادی نہ کرنے کی وجوہات سامنے آ گئیں۔

ایک کیسلو، لونگ لوگیر ...... بیٹے کے کرتوت دیکھ کر مارے صدمے کے اس کا دل جیسے بند سا ہو گیا۔ ثروت کوئی کمزور سی عورت نہیں تھی۔ اس کے والد کمشنر رہ چکے تھے۔ وہ ہوم اکنامکس کالج سے بی۔ ایس۔ سی کرنے کے بعد گیٹی سے ایم۔ ایس۔ سی کر کے آئی تھی۔ اچھی خاصی کھلے ذہن کی عورت تھی۔ لیکن جو کچھ امریکہ میں بیٹے کا ماحول دیکھا وہ دیکھنے میں آ گئی۔ وہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا تھا۔ امریکی بچوں کا تو کیا ذکر ان کا تو یہ کلچر ہے۔ وہاں کے جم پل پاکستانی مسلمان لڑکے لڑکیوں کو دیکھ کر ثروت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ امریکہ سے بہت رنجیدہ اور دل گرفتہ واپس آئی تھی۔

اگلے سال مارچ میں ثروت کو ہارٹ اٹیک ہوا جان تو بچ گئی پر ڈاکٹروں نے بائی پاس تجویز کیا تھا۔ عدیل آیا اور زبردستی ثروت کو ساتھ لے گیا۔ وہاں اس کا بائی پاس ہوا۔ سال بھر سے وہ بیٹے کے پاس تھی۔ ماں کے آنے سے عدیل بہت سنبھل گیا تھا۔

عدیل نے کچھ عرصے سے کسی پاکستانی لڑکی سے شادی کی رٹ لگا دی تھی۔ ویسے تو یہ ہے راستہ چلتے لوگ اور چیزیں مل جاتی ہیں لیکن جب ڈھونڈنے نکلو تو عام معمولی چیز بھی مشکل سے ملتی ہے۔

ایک روز ہیلووین ڈے پر ثروت کی ڈور بیل بجی۔ وہ بڑی حیران ہو کر دروازے پر گئی۔ کیونکہ وہاں پر لوگ ایک دوسرے سے کم ہی ملتے ہیں۔ جس علاقے میں بیٹا رہتا تھا وہاں دور دور دو چار گھر پاکستانیوں کے تھے۔ راستہ چلتے یا پھر کسی مال میں شاپنگ کرتے نظر آ جاتے تو ہیلو ہائے ہو جاتی۔ گھروں میں آنے جانے کے لیے لوگوں کے پاس شاید وقت ہی نہیں تھا۔ دروازہ کھولا تو ایک بزرگ اپنے پوتے پوتیوں کے ساتھ کھڑے تھے۔ ثروت نے بچوں کو ڈھیر سارے چاکلیٹ اور ٹافیاں دیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ یوں ان سے راہ و رسم ہو گئی۔ ان کا ایک بیٹا اور بیٹی تھی۔ بیٹا شادی شدہ تھا۔ بیٹا ان کی بہو امریکن تھی بقول ان کے اچھی تھی۔

دونوں میاں بیوی صبح جاب پر چلے جاتے اور دادا دادی بچوں کی دیکھ بھال کرتے۔ بڑے دونوں بچے ہائی سکول میں تھے۔ دو سال کی چھوٹی بچی گھر پر دادی کے پاس ہوتی تھی۔ وہ بچی بھی سنبھالتی تھیں اور کھانا بھی بناتی تھیں۔ بیٹی بھی کہیں جاب کرتی تھی۔ ثروت نے بیٹی کے بارے میں پوچھا تو ماں نے ایک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری۔

ایک روز ثروت گزرتے ہوئے مسز جواد کا حال پوچھنے چلی گئی۔ ان کے میاں سے پتہ چلا تھا کہ ان کی بیوی بیمار ہے۔

ثروت کے بیٹھے ہوئے ہی ایک قدرے فربہ اندام عورت نما لڑکی گھر میں داخل ہوئی۔ ڈارک میں تنگ گھٹنوں پر سے پھٹی ہوئی جینز، انتہائی واہیات اور گہرے گلے کی تیز گلابی ٹی شرٹ اور تنگ سی لباس عجیب وحشت کدہ لگ رہی تھی۔ شکل اس کی اچھی خاصی تھی لیکن حلیہ تیکرز والا بنا رکھا تھا۔ ''کیسی ہیں ممی ......'' ماں نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ وہ کندھے اچکا کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

اس کے جانے کے بعد ماں پھوٹ پڑی۔ آنسوؤں کی دھاریں اس کے مرجھائے ہوئے گالوں پر تواتر سے بہہ رہی تھیں۔

''دیکھا تم نے ثروت ...... اس کم بخت کا حلیہ ...... کون کہہ سکتا ہے کہ ایک مسلمان لڑکی ہے۔ وہ کون سا منحوس دن تھا جب میں سسرال والوں سے اور جواد پاکستان سے جان چھڑا کر خوابوں کی جنت میں آئے تھے۔ جواد اور میں دن رات پیسہ کمانے کی مشین بن گئے۔ بچوں کو ڈے کیئر میں ڈال کر ہم مطمئن ہو گئے۔ ہم نے چند سالوں میں وہ ساری آسائشیں حاصل کر لیں جن کی تمنا میں ہم پاکستان سے لے کر آئے تھے۔ امریکہ ایسے آئے کہ پھر پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ہمارے والدین جب تک زندہ رہے دو چار سال کے بعد چکر لگتا رہا۔ کبھی میں

چلی جاتی اور کبھی جوا۔ والدین کی وفات کے بعد پاکستان کو ہم بھول بھال گئے۔ پاکستان میں تو کبھی نماز روزہ کر لیتے تھے۔ امریکہ آ کر تو سب کچھ بھول گیا۔ ہم اپنے خوابوں کی جنت میں بے انتہا خوش تھے اور مادی آسائشوں کے گھوڑے پر سوار سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ وقت گزرتا رہا۔ جب دم لینے کو رکے تو دنیا ہی بدلی ہوئی تھی۔ بیٹا تو جلدی سنبھل گیا پر بیٹی ہاتھوں سے نکل گئی ہے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ بچوں کا اتنا قصور نہیں۔ غلطی ساری ہماری اپنی ہے۔ آج ہمارے بچے مذہب سے کوسوں دور ہیں۔ ہم نے کون سا انہیں اپنے مذہب کی تعلیم دی اور اپنی ویلیوز سکھائیں۔

اب کچھ کہو تو وہ سنتے ہی نہیں۔ کہتے ہیں "مذہب کیا چیز ہے؟ ہم انسانیت پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم کسی مذہب کو نہیں مانتے۔"

"ہم اپنا بویا ہوا ہی کاٹ رہے ہیں۔"

ان کے گھر سے آ کر ثروت کئی دن بے چین رہی۔ کئی راتیں اس نے جاگ کر کاٹیں۔ "کیا اسی جنت کے لیے پاکستان سے لوگ ان ملکوں میں آتے ہیں؟ مادی آسائشیں تو وہ بے شک حاصل کر لیتے ہیں جسم کو مختلف پرفیوم و ملبوسات سے سجا لیتے ہیں۔ لیکن اپنی روح کو زخمی کر لیتے ہیں۔" "کتنا گھاٹے کا سودا کرتے ہیں یہ لوگ ـــ آج ان ملکوں کے اپنے نوجوان بھی کتنے بے سکون اور بے چین ہیں۔ روحانیت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ دل کے سکون اور چین کے لیے کبھی ہپی ازم اور کبھی ہندو یوگیوں کے جنتر منتر میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔"

ثروت کو جانے کیوں اس لڑکی "کیلی" سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ آج کل وہ زیادہ تر گھر پر ہی ہوتی تھی۔ بہت اداس اور پریشان تھی۔ اس کا سکھ بوائے فرینڈ اسے چھوڑ کر فلپائن کی لڑکی کے پیچھے چلا گیا تھا۔

ثروت سے اس کی دوستی اس حد تک ہو گئی تھی کہ وہ کبھی کبھار ثروت کے گھر بھی آنے لگی تھی۔ وہ جب بھی آتی ثروت کسی نہ کسی کام میں مصروف ہوتی یا پھر نماز پڑھ رہی ہوتی یا تلاوت کر رہی ہوتی۔ جب تک ثروت نماز پڑھتی یا تلاوت کرتی رہتی کیلی خاموشی سے بہت غور سے اسے دیکھتی رہتی۔ "آنٹی آپ کیا پڑھتی ہیں نماز میں"۔ اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

"اللہ تعالیٰ کا کلام"۔ ثروت اسے ساری نماز کا ترجمہ پڑھ کر سناتی۔

کبھی کبھی قرآن شریف میں سے کوئی نہ کوئی آیت کا ترجمہ سناتی۔

کیلی غور سے سنتی رہتی کوئی سوال جواب نہ کرتی۔

ایک روز وہ آئی تو ثروت سلائی مشین رکھے اپنی قمیص شلوار سی رہی تھی۔

"آنٹی پلیز ـــ مجھے بھی ایسا ڈریس سی دیں"۔

ثروت پاکستان سے کافی سارے سلک اور کاٹن کے سوٹوں کا کپڑا لے گئی تھی۔ ثروت نے اسے ڈریس اور قمیص سی کر دی۔

"او کیلی ـــ یہ لو تمہارا ڈریس۔ چاہو تو باتھ روم میں جا کر تبدیل کر سکتی ہو۔" ثروت کے لہجے میں ایسی خوشی تھی۔ جیسے اپنی بیٹی کے لیے سیا ہو۔

کیلی باتھ روم سے نیا لباس پہن کر نکلی تو بہت اچھی لگ رہی تھی۔ ثروت نے اس کے گلے میں سکارف نما دوپٹہ ڈال دیا۔

"چلو اب آئینے میں دیکھو اپنے آپ کو—"

"یہ میں ہوں آنٹی— آنٹی ثروت مجھے یقین نہیں آ رہا— یہ تو کوئی اچھی سی لڑکی ہے۔" اس نے شرما کر ثروت کی گود میں منہ چھپا لیا۔ "کون کہتا ہے— ؟ تم اچھی لڑکی نہیں ہو۔ تم بہت اچھی لڑکی ہو۔"

"ممی اور پاپا— ممی ہر وقت مجھے گالیاں اور کوسنے دیتی رہتی ہیں۔ اور پاپا تو مجھ سے بات تک نہیں کرتے۔ کتنے بُرے ہیں دونوں! — کاش آپ میری ماں ہوتیں— " گُلّی کی آواز دکھ سے بوجھل تھی۔

"ایسے نہیں کہتے— وہ تمہارے ماں باپ ہیں۔ اور ماں سے زیادہ پیار کرنے والی ہستی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تمہارے بھلے کے لیے روک ٹوک کرتی ہیں۔ زندگی کی جس ڈگر پر تم چل رہی ہو۔ ہمارا دین اور کلچر اجازت نہیں دیتے۔" گُلّی گم صم کھڑی تھی۔

کئی روز سے گُلّی غائب تھی۔ ثروت نے سوچا "شاید ناراض ہوگئی ہے مجھے اسے کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ کسی دن اس کے گھر جاؤں گی۔" ایک دن گُلّی آئی تو پریشان اور خوفزدہ سی تھی۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ میں کچھ پکڑا ہوا تھا۔

"گُلّی کیا ہوا— ؟ اتنی خوفزدہ کیوں ہو— ؟ اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے"— ؟

"قرآن شریف ہے"—

"کہاں سے لائی ہو— ؟"

"پرانے سامان سے اٹھا کر لائی ہوں۔"

"استغفراللہ— " ثروت کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ گُلّی نے مفلر میں لپٹا قرآن شریف ثروت کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔

میں اپنی دوست کے ہاں سے واپس آ رہی تھی۔ کسی نے پرانا سامان سڑک پر ڈھیر کیا ہوا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی کراکری، پرانی کتابیں، تصویریں اور نہ جانے کیا الم غلم۔ میں ان چیزوں کو سرسری نظر سے دیکھتی پاس سے گزر گئی۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے مجھے کسی نے پکارا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو کوئی نہیں تھا۔ میں چل پڑی تو دوبارہ مجھے کسی نے پکارا۔ میں پرانے سامان کے ڈھیر کے پاس گئی تو ردی کتابوں کے اوپر قرآن شریف پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا اور اپنے مفلر میں لپیٹ دیا۔ کیونکہ آپ ہمیشہ قرآن مجید کو کپڑے میں لپیٹ کر رکھتی ہیں۔"

"آنٹی! آپ یقین کریں گی مجھے اس کتاب نے پکارا تھا۔"

ثروت کا منہ بے یقینی سے کھل گیا۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی— آپ میرا یقین کریں۔"

ثروت حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"میں جتنی بھی بری سہی پر میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"مجھے یقین ہے میری بچی— تم جھوٹ نہیں بول رہیں۔"

ثروت نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

◆◆◆

اسپ تازی

شعلہ چنگیزی (کینیڈا)

مختصر تعارف

محمد ہاشم شعلہ 22 جولائی 1936ء کو پٹنہ انڈیا میں پیدا ہوئے۔ 1951 سے 1961 تک زیب النساء، بانو اور شمع ایسے رسالوں میں لکھتے رہے۔ 1996 میں افسانہ "عشق پہ زور نہیں" پر شمع رسالے کی جانب سے اول انعام حاصل کیا۔

سیل فون کی گھنٹی نے اسے بیدار کر دیا۔ یہ صبح صبح کون ہے جو مسلسل فون پہ فون کیے چلا جا رہا ہے۔ وہ جھلائی ہوئی فون پر لپکی۔ گھڑی پر نظر پڑی تو شام کے ساڑھے سات بج رہے تھے۔ یعنی وہ صبح چار بجے سے اب تک سوتی رہی ہے۔ نمبر پر نظر پڑی تو اسے محسوس ہوا کہ اس نمبر سے رات کو اس کے شادی کے ہونے والے فنکشن میں بھی دو تین دفعہ کال کی گئی تھیں۔ لیکن اس نے ریسو نہیں کی تھیں۔ اس نے بددلی سے سیل فون آن کر کے کان سے لگایا۔ اور ہیلو کہا۔ اس نے سنا دوسری طرف سے کسی نے کہا۔ "شکر ہے۔ تم نے فون تو اٹھایا۔ شہلا میں نیویارک سے قمر جہاں بات کر رہی ہوں۔ کل شام سے تمہیں فون ملا رہی تھی۔ چار بار فون کیا لیکن تم نے ریسو نہیں کیا۔" "ارے قمر تمہیں میرا شادی کا کارڈ مل گیا۔ کب آ رہی ہو؟ یہاں تو آج چھ سات دنوں سے شادی کے فنکشن شروع ہو چکے ہیں۔ روز ہی ڈھولک گانے بجانے کی محفلیں چل رہی ہیں۔ بڑے فنکشن تو شادی کے دو ہفتے پہلے شروع ہوں گے۔ تمہارا کیا پروگرام ہے۔"

"میرا کیا پروگرام ہے۔ دوسری طرف سے حیرت زدہ آواز میں دہرایا گیا۔ میں نے تمہیں سمجھانے کے لیے فون کیا ہے۔"

"ہاں۔ ہاں بتاؤ کیا بتانا چاہتی ہو۔" "تمہیں پتہ تو معلوم ہے۔ کہ ارجمند گردیزی کی شادی میری بیسٹ فرینڈ راحیلہ خان سے ہوئی تھی۔ اور اس نے شادی کے پندرہ دن بعد ہی طلاق لے لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔ کہ ارجمند لنگڑا لولا گھوڑا ہے۔ وہ بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ اور نہ اس پر سواری ہو سکتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم نے ہاں کیسے کر دی۔ سوچو تم کیا کرنے جا رہی ہو۔ میں نے تمہیں اس لئے فون کیا کہ شاید تمہیں پتہ نہ ہو۔ اب بھی موقع ہے ارادہ بدل لو۔" "نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ سب کچھ معلوم ہے۔ لیکن تم شاید یہ نہیں جانتیں کہ لنگڑے۔ لولے گھوڑوں کے اردگرد اسپ تازی بھی فراٹے بھرتے نظر آتے ہیں۔ جو آپ کو فارم ہاؤسز۔ فائیو اور سیون سٹار ہوٹلز میں کثرت سے دوڑتے بھاگتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک سے ایک طرار اور سرکش۔ کچھ سرپٹ دوڑتے اور کچھ دلکی چال چلتے۔ شادی کے بعد میرے سر پہ چھتر چھایا ہوگی۔ اور اس اصطبل کی کل بھی میرے پاس ہوگا۔ لولے لنگڑے گھوڑے کے منہ پر میرے ہی لگام ہوگی۔ جب اور جہاں جی چاہا برق رفتار تیز طرار گھوڑے پر زین ڈالی۔ سواری کی۔ نہ کوئی سوال کرنے والا اور نہ کوئی جواب دینے والا۔" قمر جہاں کو لگا۔ جیسے شہلا تاج نے خود کو نہیں اس کو برہنہ کر دیا۔ اس کے ہاتھ سے سیل فون دبیز قالین پر گر پڑا ایک چکر سا آیا اور وہ سر پکڑ کر زمین پر بیٹھ گئی۔

◆◆◆

بے سوال باتیں

تحریر: اظہر جاوید

ترجمہ: حنیف باوا

مختصر تعارف

اظہر جاوید 4 اکتوبر 1938ء راولپنڈی (بامسپورٹ سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے "رابعہ بصری" (اردو زبان میں پہلی طبع زاد کتاب)" بلغارین افسانے "ترجمہ بلغارین زبان کی کسی بھی غیر ملکی زبان میں پہلی کتاب تحریر کی۔ پنجابی کہانیوں کی کتاب "بڑی دیر ہو گئی" کی منفرد کہانیوں کی کتاب ہے۔ شاعری کا مجموعہ "ہم عشق کرنے والا" شائع ہوا۔ 42 سال تک باقاعدہ "تخلیق" کی اشاعت کرتے رہے۔

میں نے اسے فون کیا تو بڑی دھیمی آواز آئی۔ ''ہیلو'' — میں نے گھڑی پر نظر ڈالی دیکھا۔ ابھی آٹھ ہی بجے تھے۔ ''کیا بات ہے۔ سو رہی تھی کیا'' کہنے لگی۔ ''نہیں رو رہی تھی۔ میں نے بات کو مذاق میں اڑانے کے لئے کہا۔ ''کیا امی نے مارا ہے؟'' اس نے آہ بھری تو کہا۔ ''امی نے کیا مارنا تھا ان کی تو میں ایک ہی بیٹی ہوں۔'' اب میں نے مذاق کو جانے دیا اور ہمدردی جتاتے ہوئے پوچھا۔ ''خیر تو ہے؟'' اس کی آواز ابھی تک گھٹی گھٹی اور سوئی سوئی سی تھی۔ ''خیر کیا ہونا تھی۔ ایک گھنٹہ پہلے اس کی آواز سنی تھی تو ابھی تک رو رہی ہوں میں نے'' اس نے منہ آواز والے کا نام پوچھا اور نہ ہی کی اور تفصیل میں گیا۔ بلکہ جان بوجھ کر بات کو کسی اور طرف موڑ دیا تا کہ اس کی توجہ بٹی رہے۔ نہ جانے اس میں میں کامیاب بھی ہوا تھا یا نہیں لیکن فون بند کرنے کے بعد سوچوں کے طویل بہاؤ میں بہہ گیا۔ مجھے یہ لڑکی پہلے سے بھی کچھ زیادہ عجیب اور دلچسپ لگی۔ عجیب کچھ اس وجہ سے کہ اس روز تو وہ کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔ دلچسپ اس لئے کہ آج وہ اپنی پوری سچائی کے ساتھ اپنے جذبوں کا اظہار کر بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ ابھی میری ابتدائی ملاقاتیں تھیں۔ وہ ہوٹل کسی اور کے ساتھ بیٹھی تھی ایسے جیسے وہ لڑکی نہیں بلکہ ان کی ہی کوئی ہم ساتھی ہو۔ کچھ دیر بعد وہ اٹھ کر میری میز پر آ گئی اور کہنے لگی۔ ''چائے نہیں لیں گے؟'' — میں نے ہنس کر کہا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ حق میرا ہے، ویسے بھی یہ فرض مردوں کے لئے ہی مخصوص ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ خود تو آپ چائے پیتی نہیں اور صبح مجھے مار رہی ہو!'' — ''وہ میری بات سے ہنسی۔ ''اچھا آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے نہیں پیتی!'' — اور پھر باتیں ادھر ادھر سے ہوتی ہوئیں اس کی ذاتی زندگی تک پہنچ گئیں۔ میں نے کبھی کسی کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی جتنی بات کوئی اپنے بارے میں بتا دے وہی اچھی ہوتی ہے۔

اس نے بتایا کہ کچھ مہینوں تک اس کی شادی ہونے والی ہے لیکن وہ شادی نہیں کرے گی'' — میں ہنس پڑا اور اس نے کہا ''اس

میں ہنسنے والی کوئی بات ہے''۔۔۔ میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔ ''بی بی۔۔۔ میری عمر آپ سے زیادہ ہے اور میں اب تک سینکڑوں بار یہ فقرہ سن چکا ہوں۔ لڑکیوں کو آخر اپنے گھر جانا ہوتا ہے اور وہ ایسے محسوس کرتی ہوئی دوسری جانب چل پڑتی ہیں۔ اور پھر وہ آتی بھی اور یہ احساس ہو جاتی ہیں کہ وہ پھر اپنی گزشتہ زندگی کی جانب نہیں دیکھتیں۔ وہ ہنستے ہنستے ہی سنجیدہ ہو گئی اور کہنے لگی۔'' میں کچھ اور طرح کی ہوں۔ مجھے مرد سے نفرت ہے'' چائے کی پیالی میرے ہاتھ سے چھوٹتے بچی تھی اور مجھے ایسا لگا کہ جیسے اس نے مجھے تھپڑ مار دیا ہو۔ میں اس کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ میری آنکھوں میں کئی سوال تھے اور اس کی آنکھوں میں اب پہلے جیسی چمک تھی اور نہ ہی چہرے پر معصوم سی مسکان۔۔۔

اب وہ ایک دوشیزہ کی بجائے ادھیڑ عمر کی عورت لگ رہی تھی'' آپ سوچتے ہوں گے کہ میں زیادہ وقت بحث میں گزارتی ہوں۔ اور اب بھی میں آپ کے پاس بیٹھی ہوں۔ یہ سب باتیں فراری باتیں ہیں۔ زندگی سے فراری، حالات کی دی ہوئی مشکلات سے فرار اور اپنے گھر کے واقعات سے فراری۔۔۔

اس کے لہجے میں اب تلخی آ گئی تھی اور میری چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس نے نہ تو میرے سوال کا انکار کیا اور نہ ہی اپنی بات کو ٹوٹنے دیا۔ وہ کہتی رہی۔۔۔ تمھیں کیا پتا ہے۔ میرے والد نے میری ماں کو اسی وقت چھوڑ دیا تھا جب اسے پتا چلا کہ اس نے بچی کو جنم دیا ہے۔ پھر میں جب سات آٹھ سال کی تھی تو جب میں نے اپنے والد کی شکل دیکھی تو اس وقت اس نے میرے سر پر ہاتھ نہیں دھرا تھا۔ میری ماں کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ اس نے نوکری کی۔ تپتے دن اور ٹھنڈی راتیں اس نے مجھے سینے سے لگا کر گزار دیں۔۔۔ اور آپ بتائیں کہ میرے ذہن و دل میں کسی مرد کے بارے میں کیا سوچ ہو گی۔۔۔؟

اب وہ مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی اور میں جسے اپنی بات اور گفتار پر ایمان ہے اور اپنے تجربوں اور مشاہدوں پر فخر ہے۔ اس وقت اندر سے خالی اور تنہائی اوڑھے بیٹھا تھا۔ مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں اور وکیل کو کہاں سے آگے بڑھاؤں۔؟ میں نے اسے دیکھا۔ نہ تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے نہ کسی دکھ کا سایہ۔ یہ کیسی لڑکی ہے؟۔۔۔ میری سوچوں نے سوال کیا۔۔۔ لڑکیاں تو دکھ کی بات بعد میں کرتی ہیں پہلے رو پڑتی ہیں۔ میں نے اپنے اوپر بزرگی کو طاری کیا پھر آہستہ سے بات کو آگے بڑھایا۔

''بی بی۔۔۔ آپ نے سچ کہا ہے۔ یہ بڑا دکھ ہے'' اسے بھولنا اور اس سے دور رہنا کچھ ممکن نہیں۔ دنیا میں ایسے ہی برے اور بھلے لوگوں کا آنا جانا ہے۔ لیکن ایک بندے کا انتقام دوسرے سے کیوں لیا جائے۔ اور خود سے ہی سزا کو طویل کیوں کیا جائے؟'' آپ دکھی ہیں۔ آپ کی ماں بھی مظلوم ہیں لیکن یہ بھی سوچیں کہ انھیں خوشیوں کی ضرورت ہے۔ زندگی کا کتنا لمبا سفر انھوں نے اس امید پر گزار دیا کہ وہ اپنے سکھوں کو آپ کی خوشیوں میں تلاش کریں گے۔ اپنے لیے نہیں ان کے لیے سوچو؟

اتنے میں پہلی بار اس کے چہرے سے نفرت کی بجائے دکھ کی جھلک ابھرتی تھی۔ اس نے مجھے کسی اور ہی انداز سے دیکھا اور کہنے لگی۔ امی کی خوشیوں کے لیے ہی تو میں ٹوٹ ٹوٹ رہی ہوں۔ اس شادی کے لیے تو میں حامی بھر لی ہے لیکن آگے کیا ہو گا یہ تو معلوم نہیں۔ کچھ پتے نہیں چلتا۔ اس کی آواز بیٹھ گئی اور ہم دونوں بے سوال اور لاجواب ہو کر رہ گئے نہ بتانے کے لیے اس کے پاس کچھ باقی بچا اور نہ ہی مجھے کچھ پوچھنے کی ضرورت رہی تھی۔ پھر نہ جانے کون آ گیا اور دوسری باتوں میں ہی ہماری گفتگو دب کر رہ گئی۔

اتنے دنوں کے بعد فون پر اس کے رونے کی بات سن کر بہت سی کہانیوں نے آنکھ کھولی۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا کہ وہ کون

ہے جس نے اُن کی سوچ کا دھارا بدل کر رکھ دیا ہے۔ اور اس کی روح میں سے فرقوں کے انبار کھرچ کر وہاں پیار کے پھول بچھا دیے ہیں۔ ایسی باتیں نہ پوچھنے کی ہوتی ہیں اور نہ بتانے کی۔ پیار کا بہاؤ تو تیزی سے بند توڑ کر لے جاتا ہے۔ جتنی چاہیں دیواریں کھڑی کر لیں لاکھ بند باندھیں طوفان روکنے سے بھی نہیں رکتے۔ دلوں کے ملاپ کے لیے ایک اچھی سے بہانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ نہ سوچیں کام آتی ہیں اور نہ ہی اصول ساتھ دیتے ہیں۔ لیکن ظالم جدائی کے ہزار روپ ہیں جو کسی نہ کسی بہانے اشکوں کی سوغات دے جاتی ہے۔ کبھی کوئی مجبوری۔ کبھی سماج کی مشکلات، کبھی اصولوں کی فصلیں۔ پتہ کیا بات ہے کہ پیار ہو جاتا لیکن جدائی کی ذمہ داری خود پر عائد ہوتی ہے۔ نہ جانے ان کے مابین کون سی دراڑ آ گئی ہے اور کوئی مجبوری کے کانٹے بکھر گئے ہیں۔

میں سوچوں کے چکر میں پھنس گیا ہوں۔ سوچتے ہوئے نہ جانے مجھے کتنی کہانیاں یاد آ رہی ہیں۔ دل بے وجہ بھر آیا جس سے آنکھیں آنسوؤں سے تر ہو گئی ہیں۔ آواز بھی بھرا گئی ہے۔ شکر ہے اس وقت مجھے کسی کا فون نہیں آیا۔ کوئی پوچھتا تو میں کیا جواب دیتا۔۔۔؟

◆◆◆

معروف ادیب **ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم** کے قلم سے روشنی بکھیرتا ڈاکٹر محمد اقبال کے فن اور شخصیت پر مبنی 6 کتب کا خوبصورت تحفہ شائع ہو گیا ہے

اقبال کے فکر و فلسفہ پر کتاب — **نویرہ اقبال**

اقبال کے فکر و فن پر لکھی گئی 50 کتابوں کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ — **بہار اقبال**

اقبال کی نظم و نثر ایک تعارف — **ذخیرۂ اقبال**

موضوعات کے اعتبار سے اقبال کے اشعار کا مجموعہ — **موضوعاتی کلام اقبال**

حروف تہجی کے اعتبار سے اقبال کے اشعار کا حسین مجموعہ — **بیت بازی کلام اقبال**

اقبال کے تخلیقی سفر کا ارتقاء، فرمودات، واقعات اور مکتوبات کے آئینے میں — **کائنات اقبال**

ملنے کا پتہ: بک کارنر جہلم (0544-614977) — نظریہ پاکستان اکادمی، سرگودھا (048-3711717)

غزلیں

جلیل عالی

اظہر جاوید

O

رات کا چین، سکون صبح کا کھونے والا
مر گئے ہم تو ہمیں کون ہے رونے والا

وہ خدا ہے جو سمندر میں بھی بچا لیتا ہے
کشتیاں کون ہے ساحل پہ ڈبونے والا

تیرا غم تھا تو مسرت کی تمنا تھی ہمیں
اب یہ حسرت، ہو کوئی غم میں پرونے والا

سب تعلق کبھی ٹوٹے ہیں انا جیتے گی
کر گیا خاک کی آغوش میں سونے والا

کھو گئی رات میں جو کوئی تو شبنم کی طرح
داغ دامن طلب پیار سے دھونے والا

میں وہی ہوں مرا سب کچھ ہی اسی سے یارو!
تم میں کیا کوئی نہیں خار چبھونے والا

جسم کی قید تھی کس کو کا احساس نہیں
روح میں کوئی تو ہو مجھ کو سمونے والا

آج کی رات کی طور تھا لے اظہر
ہو رہے گا جو ہے کل صبح کو ہونے والا

OOO

جلیل عالی

O

نہ جانے کون سے جرمانے اتارتی رہی ہے
یہ زندگی ہمیں قسطوں میں مارتی رہی ہے

ادھر ادھر کی بہت خاک چھانتے پھرے ہیں
پھر ہمیں پھر ہمیں قسمت پکارتی رہی ہے

بھٹک رہی ہے تجلی نوا دلوں کے غاروں میں بھی
وہ جستجو جو ستارے اتارتی رہی ہے

کہ حقیقت لیے ہوئے جہاں کی خبر
ازل سے وقت کی عظمت نکھارتی رہی ہے

ہمارے سر سے بلائیں کہاں گئی ہوتیں
یہ اپنی ماں کہ جو صدقے اتارتی رہی ہے

اک اور رنج، بیاباں اک اور، یہ خزاں
وہ پھونکتی رہی ہے یہ بہارتی رہی ہے

جہاں میں تھے ہی نہیں جب تو کیا پتہ پاتی
تھا کہ نام ہمارا پکارتی رہی ہے

اک اپنی روح کے حلقہ میں رہتے ہیں اس سے ورنہ
پکارتی رہی ہے یہ سنوارتی رہی ہے

کہاں کسی سے کبھی راز دل کہا عالی
یہ شاعری کہ ہمیں اشتہارتی رہی ہے

OOO

آصف ثاقب

O

کہاں اپنا ستم سہہ جانے والا
مرا آنسو، کھلا کہہ جانے والا

مرے اوراق تم پڑھتے رہو گے
میں لکھتا ہوں، لکھا رہ جانے والا

مسافت تیری نگری سے کہاں ہو
مسافر ہوں کہیں رہ جانے والا

تھکا جاوید پر ٹھہرا ہوا تھا
یہاں صحرا ہے اب ڈھہ جانے والا

بلا لیتا ہے مجھے شب میں اندر
کہ دروازہ کھلا رہ جانے والا

تمہارے سامنے اقدم کھڑا ہے
"حق حق" کہتا کہہ جانے والا

تیری موجوں کا رخ دیکھے کا ثاقب
کہیں جذبات میں بہہ جانے والا

OOO

بشریٰ رحمٰن

O

میری ساری خوشیاں لے لو، سحر و شام دے دو
میری ہر خوشی کے بدلے غمِ مدام دے دو

میری عمر بھر کی جاں بھی لے لو حسنِ اماں بھی لے لو
جو نہ ختم ہو ابد تک، وہ الم کی شام دے دو

جو مقصود ہو [illegible] رکھے [illegible] قیام
وہی اک تصور دے دو وہی اک قیام دے دو

نہ تو تمنا، نہ تو امید، نہ ہی چارہ گر کی حاجت
بس یہ کہو، ملامت مجھے خالی جام دے دو

یہ بہاروں کی رت ہے یہ گلزار رتوں کا موسم
میری آرزو [illegible] دوام دے دو

میں جو پھول چن رہی ہوں وہ تمہارے نام کے ہیں
مجھے سارے پھول لے لو مجھے اپنا نام دے دو

OOO

نیلم احمد بشیر

O

کہانی لکھتے لکھتے خود افسانہ بن گئی ہوں میں
زمانے بھر کی تہمت کا نشانہ بن گئی ہوں میں

میرے دل میں سمٹ آئے ہیں آنسو تیرے صدمے کے بھی
ذرا سا توڑ کر دیکھو، خزانہ بن گئی ہوں میں

چھلکے سرخ آنکھوں میں کہاں سے سانپ آ نکلا
خود اپنی موت کا رنگیں بہانہ بن گئی ہوں میں

بڑا بے چین رہتا ہے [illegible] کہتی ہے
کہ یادوں میں بسا [illegible] بن گئی ہوں میں

بہت مصروف ہوتی تھی، بہت ہی دار ہوتی تھی
اڑے طائر تو ویراں آشیانہ بن گئی ہوں میں

بہت تنظیم ملتی ہے مجھے اپنی ہی محبت سے
غزل یا نظم تھی، [illegible] بن گئی ہوں میں

OOO

اعزاز احمد آذر

O

میں ادھر گیا جہاں راہ میں وہیں ایک اہم فقیر تھا
مجھے حوصلہ [illegible] وہاں تیرا [illegible] تھا

مرے دوستو، مرے ساتھیو، مجھے شہر سے کہیں لے چلو
میں اسیرِ حسن مدام ہوں میں محل ہوا کا اسیر تھا

جو چلا گیا ہے ہوا تو کیا [illegible] تھا
[illegible] روز کی بات ہے اس سلطنت کا امیر تھا

[illegible] ہوا [illegible] سب سے اہم [illegible] تھا
[illegible] جس کا نام ضمیر تھا

[illegible] تھا
[illegible] تھا

ارے آذر [illegible] تھا
[illegible] تھا

OOO

حسن عسکری کاظمی

منظر ایوبی

O

خوش تھے ہم کہ بڑھ کے یہ ایک دن جواں ہو گا
یہ کہاں تھا اندازہ، کون، کب، کہاں ہو گا

گردشیں زمانے کی ساتھ ساتھ چلتی ہیں
جس زمیں پہ چھوڑو گے سر پہ آسماں ہو گا

کتنے خون کے دریا ہم عبور کر آئے
آخری پڑاؤ اب دیکھئے کہاں ہو گا

زندگی کے میلے میں اب کے ہم بچھڑ گئے تو
جانے ہم کہاں ہوں گے جانے وہ کہاں ہو گا

دو دلوں کے بارے میں جرم و بے گناہی کا
اب جو فیصلہ ہو گا سب کے درمیاں ہو گا

موسموں کے ہاتھوں میں باگ ڈور ہو جس کی
غم کا قافلہ وہ شخص میر کارواں ہو گا

ان رتوں کی ہیں اب سے منتظر مری آنکھیں
میں کسی پہ جب کوئی مجھ پہ مہرباں ہو گا

OOO

حسن عسکری کاظمی

O

ایک تصویر پرانی نہیں دیکھی تم نے
میری بھرپور جوانی نہیں دیکھی تم نے

میں نے بچوں کو بتایا تو وہ حیران ہوئے
شہر بے نقش مکانی نہیں دیکھی تم نے

راہِ جنگل پہ لئے گھر سے نکلا تھا مجھے
صبحِ ہجرت کی نشانی نہیں دیکھی تم نے

موج در موج نظر آیا سفینہ میرا
میرے دریا کی روانی نہیں دیکھی تم نے

در و دیوار پہ لرزاں رہا طاری ہر دم
میری آشفتہ بیانی نہیں دیکھی تم نے

کھول کر دیکھتے اوراقِ محبت تم بھی
سرِ ورق دیکھا، کہانی نہیں دیکھی تم نے

عشق کر کے بھی حسن کار جو ہوس مرا اس سے
یہ غمِ خوں فشانی نہیں دیکھی تم نے

OOO

سید ریاض حسین زیدی

O

یاد اس کی ابھر ابھر آئے
روپ کیا نکھر نکھر جائے

بے حجابی کہاں تھی اس کا
پردہ داری بھی جس سے شرمائے

رائیگانی میں کون جاتا ہے
کوئی پتھر سے کب اتر جائے

بے قراری لہروں میں رہے پیاسا
آگ تنہا جو روز تڑپائے

سر اٹھا راستہ رہ گئے
یہ جو منجدھار سے نکل آئے

روح کو کیسے عافیت ہو میسر
جان نازک کمر سے ٹھہ پائے

OOO

ابصار عبدالعلی

O

اک ذرا آنکھ سی مجھ پہ یہ عنایت کرتے
تھی اگر مجھ سے رقابت تو مجھ سے شکایت کرتے

یہ اثر جو تمہیں آج ہے، ہمیں بھی آتا ہے
اپنا دل اپنے ہی سینے میں امانت کرتے

عشق میں مرتبہ کچھ اپنے بڑھاتے اپنا
مقتدی قیس کو کرتے جو امامت کرتے

ہم اسے عیب نہیں بلکہ ہنر ہی کہتے
لے کے دل تم جو امانت میں خیانت کرتے

یہ بہانے جو بناتے ہو تو پہلے تو نہیں
کچھ لکھیں آج تم ان میں ذرا جدت کرتے

یوں تمہاری بھی وفاؤں کا بھرم رہ جاتا
رسم دنیا سے اگر تم بھی بغاوت کرتے

OOO

سعود عثمانی

O

یہ وہم وہ ہے جو ہر آدمی کا ہوتا ہے
وگرنہ کون یہاں میں کسی کا ہوتا ہے

وہ راستہ جو محبت کا یا سیاست کا
نکالنے والا سفر واپسی کا ہوتا ہے

بڑا کمال ہے خود کو سنبھال کر رکھنا
مگر جو ذائقہ آوارگی کا ہوتا ہے

یہ اک تیر بھی دہلیز سے روشنی تو ملی
کہ سب سے تیز سفر جسم ہی کا ہوتا ہے

کمال یہ ہے کہ تو میری جان ہے لیکن
کہاں تجھ پہ کسی اجنبی کا ہوتا ہے

ہر اک کو دوست بنانا منافقت ہے سعود
کسی کا ہوتا نہیں جو سبھی کا ہوتا ہے

OOO

ڈاکٹر جواز جعفری

O

تمام عمر ہی خواہش مستور کرتے ہوئے
ہمیں کبھی یہ نہیں لگتا عدو کرتے ہوئے

ہے رواں میرا ستارا جانب اوج کمال
یار مجھ سے پیار کرتے ہیں حسد کرتے ہوئے

زندہ رکھا ہمیں نے مردہ شہر میں اپنا ضمیر
عمر گزری ہے تمیز نیک و بد کرتے ہوئے

کس قدر اخلاق صاحب عہد رفتہ تھا اسے
روح اخلاق بھی دو یوں رد و کد کرتے ہوئے

کم نسب لفظوں کو نوک خامہ پہ لاتا نہیں
میں غزل کہتا ہوں لفظوں کو سند کرتے ہوئے

موت کی دنیا سے باہر بھی ہے اک دنیا جواز
بھید یہ مجھ پہ کھلا سیر ابد کرتے ہوئے

OOO

ابن عظیم فاطمی

O

محبتوں کا درخشاں نشان اردو ہے
ہماری، آپ کی سب کی زبان اردو ہے

ہر ایک گوشۂ عالم ہے اس سے وابستہ
شعور و فکر کا روشن جہان اردو ہے

نہ اس کی ذات نہ مذہب نہ قوم ہے کوئی
جو اس سے پیار کرے اس کی جان اردو ہے

ہیں میرؔ و غالبؔ و اقبالؔ و مومنؔ و بیدلؔ
یہ اس کی شان ہیں اور ان کی شان اردو ہے

گزر گئیں کئی صدیاں مگر ہو تک تک
نظر کو بھاتی ہے ایسی جوان اردو ہے

ملے ہیں حالیؔ و جوشؔ، ظہیرؔ، مصحفیؔ و شادؔ
وہ دلنواز وہی بھاگوان اردو ہے

عظیمؔ شعروں میں کیوں کر بیاں سب کو کرے
جہاں میں جس کی ہے اونچی اڑان اردو ہے

OOO

کرشن پرویز (انڈیا)

O

دنیا میں ہے ہندو، مسلمان ایک رہے ہیں
لیڈر، وزیر، افسر، دیوان ایک رہے ہیں

آج ہے جب الیکشن، ہوتا عجیب منظر
بٹنے کی وقت کچھ ووٹر دھان ایک رہے ہیں

دل میں اگر ہے چاہت، ہے جیب بھی بھاری
آدمی غریب ہو تم، شمشان ایک رہے ہیں

جب سے زمیں کی قیمت پہنچی ہے آسماں پر
مرنے لگی تو کیا ہیں، شمشان ایک رہے ہیں

پنڈت بچا نہ ملا، کیا بشپ کیا گرنتھی
اب حکم مانتے، فرمان ایک رہے ہیں

لیڈر کا مشغلہ ہے جلسے جلوس کرنا
جنتا بھی بچھڑ گر لو انسان ایک رہے ہیں

پیسے کی دوڑ میں ہیں پرویزؔ سارے شامل
کیا دھرم، ذات، مذہب، بھگوان ایک رہے ہیں

OOO

سیفی سرونجی (انڈیا)

O

بہت ہنسا ہوں یقیناً ہنسی رلائے گی
یقیں جانتا ہوں مجھے یہ خوشی رلائے گی

مجھے عزیز ہے ہر لمحہ تیری قربت کا
مگر یہ ڈر ہے تری دوستی رلائے گی

مجھے خبر نہ تھی اک تیرے ساتھ چلنے سے
قدم قدم پہ مجھے زندگی رلائے گی

خدا کے واسطے گھر میں اندھیرا رہنے دو
وگرنہ مجھ کو بہت روشنی رلائے گی

سنا ہے آنکھ سے سیفیؔ لہو ٹپکتا ہے
تمام عمر تجھے شاعری رلائے گی

OOO

مراقؔ مرزا (انڈیا)

O

نکل پڑا ہوں زمیں کے فگار خانوں سے
ہے میری ذات کا رشتہ اب آسمانوں سے

یہ ارض خواب ہے، پرواز کی ہے آزادی
کوئی کسی کو نہیں روکتا اڑانوں سے

وہ چند لوگ پہنچ پائیں گے ستاروں تک
گزر گئے ہیں جو دھرتی کے امتحانوں سے

ہمیشہ وقت یہاں ایک سا نہیں رہتا
کہ دل لگے ان اجڑے آشیانوں سے

حیات شہر خموشاں میں دیکھنے جا کر
ملے گی روشنی کچھ قبر کے ٹھکانوں سے

اکیلا تم ہی کوئی چاند اس زمیں پہ مراقؔ
اجالے اترے نہ جس پر کئی زمانوں سے

OOO

پرتپال سنگھ بیتابؔ (انڈیا)

O

آج جلتا ہے کسی روز سے رونے والا
کاٹنے والا وہی ہے جو ہے بونے والا

سوچ کہتی ہے کہ ماحول بدل سکتا ہے
ظلم کہتا ہے یہاں کچھ نہیں ہونے والا

حادثے ہیں کہ خوشی سے گزر جاتے ہیں
اور الم کوئی نہیں آنکھ بھگونے والا

زندگی پھر بھی یوں ہم پہ نہ ہوتی نازل
ہم سے اب اور تو کچھ نہیں ہونے والا

یہ آنکھیں اس سے خوشی ہو جو کسی کو حاصل
مر بھی ہم جائیں اگر ہو کوئی رونے والا

خواہشیں اپنی ادھوری ہی رہیں گی بیتابؔ
کہاں کوزے میں سمندر ہے سمونے والا

OOO

صوفیہ بیدار

O

ہمیشہ رہتا ہے قائم تغیرات میں بھی
وہ میرے دل میں ہے اور پوری کائنات میں بھی

پلٹ رہی ہوں میں اوراق اپنی ہستی کے
سزا میں بھی ہے وہ موجود اور نجات میں بھی

الگ کتاب کے الفاظ میں نہیں موجود
وہ اسم ذات مکمل ہے بات بات میں بھی

اسے طلب ہو محبت کی ذرہ جانے کیوں
نبی کا عشق میسر ہوا ہے ذات میں بھی

رضا میں راضی ہوں اس کی میں صوفیہ بیدار
وہ دیت میں بھی ہے موجود میری بات میں بھی

OOO

آفتاب خان

O

جو اہلِ علم کو بے حد پسند ہوتا ہے
وہی عزیز کتابوں میں بند ہوتا ہے

کمک جو دل کو ملے حاصلِ محبت ہے
مقامِ عشق اسی سے بلند ہوتا ہے

کسی کسی کو تڑپ دوسروں کی تڑپائے
ہر ایک فرد کہاں دردمند ہوتا ہے

جو دل کے بیچ اگاتا ہے فرقتوں کے بیج
وہ دوستو، دوست نہیں شر پسند ہوتا ہے

اسی کے کام سنورتے ہیں خود بخود ہر دم
جو دوسروں کے لیے فکرمند ہوتا ہے

اس آفتاب کو سورج کبھی کا پھول سمجھ
جو بادلوں میں سرِ شام بند ہوتا ہے

OOO

نیر رانی شفق

O

کہیں بھی چھوٹ جائیں گر سہارے پھر نہیں ملتے
بھنور میں ڈوب جائیں تو کنارے پھر نہیں ملتے

اڑا کے لے گئیں پتے کبھی رنگیں ہوائیں تھیں
بچھڑ جائیں عدم میں جو پیارے پھر نہیں ملتے

لیے ہاتھوں میں دعا کا گزارا خوف میں کٹتی
جو چھوٹے ہاتھ سے دعا کے غبارے پھر نہیں ملتے

بکھر کر چاند تاروں کو جہاں میں روشنی کر لو
اگر بکھریں خلاؤں میں ستارے پھر نہیں ملتے

وہ بجھ جائیں کہیں چھپتے ہیں دیکھا ہے صدیوں سے
وہ بچھڑے ہوں کہ ٹوٹے ہوں شرارے پھر نہیں ملتے

خزاں کے ہاتھ آ جائیں شفق دل کے اگر موسم
محبت کی بہاروں کے اشارے پھر نہیں ملتے

OOO

طاہر منظور

O

کوئی منظر حسیں دیکھو ہمیں بھی یاد کر لینا
کسی کے ساتھ جب نکلو ہمیں بھی یاد کر لینا

ہمیں بھی پانیوں سے پیار ہے تم بھی تو ہو شیدا
سمندر میں قدم رکھو ہمیں بھی یاد کر لینا

تم اپنے ساتھ گزرے وقت کا اپنی جوانی کا
کوئی قصہ کبھی لکھو ہمیں بھی یاد کر لینا

جنہیں تیری ضرورت ہے جنہیں میری ضرورت ہے
تم ان کے پاس جب بیٹھو ہمیں بھی یاد کر لینا

کبھی تم رات کو اٹھ کر اچانک بیٹھ کر طاہر
کسی کے بارے میں سوچو ہمیں بھی یاد کر لینا

OOO

سعدیہ سیٹھی (یو۔کے)

O

ہنر جو ہوتی کہ آتی ہے پتھروں پہ نمو
تو ہم تمنا کے دامن چور چور کر لیتے

جو تم پکارتے اس پار سے ہمیں اک بار
یقین ہے ہم بھی سمندر عبور کر لیتے

سفر میں سعدیہ جو ملتی آگہی ادراک
تو وحشت سے بھی حصول شعور کر لیتے

OOO

پروفیسر نور کمال شاہ

O

نفرت سے دکھاوا ہے تیرے پیار کے پیچھے
مطلب سا چھپا کیا تیرے کردار کے پیچھے

مجھ سے جو تعلق ہے بناوٹ پہ ہے مبنی
انکار نمایاں تیرے اقرار کے پیچھے

دشمن میرے اپنے ہیں، کہاں غیر سے شکوہ
کس کس کو ذرا دیکھ تو ہتھیار کے پیچھے

اب کس پہ اعتماد کریں، کون سچا ہے؟؟
ہر کون سا مخلص رہا دستار کے پیچھے

بے چین مرا جسم، مری روح بھی گھائل
ہیں قید ازل سے در و دیوار کے پیچھے

دنیا کے مجھے رکھا، مری زیست کا حاصل
مائل بھی ہے تیرے سنگھار کے پیچھے

OOO

جاوید عباس جاوید

O

فراز کوہ سے آتی ہوئی آواز سنتا ہوں
پرندوں کے پروں کی طاقت پرواز سنتا ہوں

مجھے تو آج تک مٹی کی دیواریں نہیں بھولیں
بہت چرچے تھے تعمیر کے انداز سنتا ہوں

پہاڑوں سے پرے آباد ہیں جانے نگر کتنے
کہیں پر ہیں مقابل جبر و دمساز سنتا ہوں

بہت ہی مضطرب، خود غرض اور بیزار ہے انساں
کوئی ملتا کہیں ہے ہمدم و دمساز سنتا ہوں

بجا ہے اب صف چاراں پہ ہم بے درد ہے جاوید
کہیں شفقت نہیں کرتی نگاہ ناز سنتا ہوں

OOO

صدیق شاہد

O

فروغ بزم تمنا وہ گھر تو اب بھی ہے
کہ ایک رشتہ دیوار و در تو اب بھی ہے

ہوائے عیش و طرب جو لپیٹ گئی دل سے
سفر کٹھن سہی، شوق سفر تو اب بھی ہے

ابھی زمانہ غالب میں جی رہے ہیں ہم
کہ کم سخن ہی اہل ہنر تو اب بھی ہے

تمازت غم دنیا سے کھلا جاتا ہے
مگر یہ سایۂ غم معتبر تو اب بھی ہے

ہوا چلی ہے تری قربتوں کی جنت سے
مگر یہ بھرا ترے غم کا نگر تو اب بھی ہے

اٹھانے شہر بہت زہر ناک ہے، لیکن
امید فردا دلوں کی، سپر تو اب بھی ہے

مذاق نغمہ و شعر اور تخیل ہے شاہد
کہ کچھ بھی اہل نظر تو اب بھی ہے

OOO

یاد نگاری

عاشقِ صبر طلب

(2013-2017)

......14......

ڈاکٹر رشید امجد

رخسانہ نے بتایا کہ گاڑی تو سٹارٹ ہو گئی لیکن ساتھ ہی میرا سر سٹیرنگ پر جا گرا۔ میرا سارا جسم برف کی طرح ٹھنڈا ہو گیا۔ اس نے رونا شروع کر دیا۔ ایک کرنل صاحب اور ان کی بیگم ساتھ والی خالی جگہ پر گاڑی پارک کر رہے تھے۔ رخسانہ کی رونے کی آواز سن کر وہ فوراً آئے۔ مجھے چھوا اور بیوی سے بولے "تم بہن کو لے کر اپنی گاڑی میں آؤ۔ میں انہیں لے کر ہسپتال جا رہا ہوں۔" پھر انہوں نے شاید کسی طرح مجھے ساتھ والی سیٹ پر شفٹ کیا۔ سی ایم ایچ قریب ہی تو تھا۔ وہ مجھے ایمرجنسی میں لے گئے۔ رخسانہ مسلسل رو رہی تھی اور دونوں میاں بیوی اسے کہہ رہے تھے۔ "بہن گھبرائیں نہ۔ اللہ بہتر کرے گا"۔

اس دوران رخسانہ نے حسن، حسین اور سعدیہ کو بھی فون کر دیا۔ مجھے ہوش آیا تو میں بیڈ پر تھا اور حسن، حسین، سعدیہ اور احسن میرے پاس کھڑے تھے۔

ڈاکٹر نے پوری طرح چیک کیا۔ ای سی جی بھی کرایا پھر بولا "بالکل ٹھیک۔ فکر کی کوئی بات نہیں"

اس سارے عرصے میں کرنل صاحب اور ان کی بیگم ایمرجنسی میں رہے۔ اور مسلسل رخسانہ کو تسلی دیتے رہے۔

ان چند لمحوں میں میرے ذہن کی سکرین خالی رہی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہوا۔ اس دوران میں کس حالت میں تھا، کہاں تھا؟

تیسری بار اسی طرح کی صورت عمل میں آئی۔ ایک بجے یونیورسٹی بند ہو جاتی تھی۔ شام کی کلاسیں ساڑھے تین بجے شروع ہوتی تھیں۔ اس دن میری شام کی کلاس تھی۔ تمام لوگ چلے گئے۔ وہاب قاصد عصر نماز پڑھنے چلا گیا اور جاتے جاتے پانی کا گلاس میز پر رکھ گیا۔ میں شام کے لیکچر کے لیے کچھ دیکھ رہا تھا کہ اچانک سب کچھ غائب ہو گیا۔ حواس بحال ہوئے تو میرا سر میز پر ٹکا ہوا تھا۔ عینک نیچے جا گری تھی۔ چند لمحوں بعد حواس بحال ہوئے تو پانی کے چند گھونٹ پیے عینک اٹھائی۔ یہ چند لمحے میں کہاں، کس کیفیت میں رہا۔ مجھے ان کا علم نہیں۔

موت کیا ہے ایک غنودگی، اس غنودگی کے دوران اچھے برے خواب ہی اعمال کے حساب ہیں۔ خوابوں میں جو اذیت یا خوشی ہوتی ہے وہ ہوتی بھی ہے اور نہیں بھی کہ خواب کے دوران اسے محسوس کیا جاتا ہے لیکن آنکھ کھلتی ہے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ صرف خواب میں گزرے واقعات کا احساس باقی رہ جاتا ہے۔ تو کیا خواب بھی ڈی این اے میں ہوتے ہیں۔ جب بھی انسان اس قابل ہو گیا کہ اس نے اپنے پورے ڈی این اے کو ڈی کوڈ کر لیا تو شاید اسے اپنی موت اور زندگی پر قدرت حاصل ہو جائے گی لیکن زمان و مکان تو پھر بھی موجود

ہوں گے۔ ان تین تجربوں میں جو یکساں نوعیت کے تھے میں کس کیفیت سے گزرا مجھے اس کا شعوری احساس نہیں۔ کیا میں ان چند لمحوں کے لیے زماں کی گرفت سے نکل گیا تھا، لیکن زماں تو مستقل ہے، زماں کی کئی صورتیں اور پرتیں ہیں، تو موت کے بعد ہم صرف ایک صورت سے نکلتے ہیں اور کسی دوسری صورت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بلیک ہول کے بارے میں پہلے یہ خیال تھا کہ جب کوئی شے اس کے اندر چلی جاتی ہے تو ٹائم لیس (Timeless) ہو جاتی ہے لیکن مکاں تو بہر حال وہاں بھی ہے، اور یہ کہ بلیک ہول سے کوئی شے باہر نہیں نکلتی، اب نقطۂ نظر یہ ہے کہ بلیک ہول سے بھی اشیا باہر نکل سکتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جب کوئی شے بلیک ہول میں داخل ہو کر باہر نکلے گی تو وقت کی صورت کیا ہوگی۔ کیا وہی وقت ہوگا جب شے اندر گئی تھی یا صدیاں بیت گئی ہوں گی، وقت ختم ہو جائے گا یا رواں رہے گا۔ قبر بھی ایک بلیک ہول ہے۔ قبر میں جو بھی جائے گا اس نے کبھی نہ کبھی باہر بھی آنا ہے۔ اس دوران قبر میں وقت ساکن لیکن باہر رواں دواں رہتا ہے۔ حدیث کا مفہوم ہے کہ قیامت کے دن جب مردے قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو طویل عرصہ گزرنے کے باوجود کوئی یہی کہے گا کہ میں تو ابھی قبر میں اترا تھا اور اگلے ہی لمحے باہر آ گیا ہوں۔ قیامت کے دن ہر شخص اپنے ڈی این اے سے دوبارہ پیدا کیا جائے گا تو کیا وقت ڈی این اے کے اندر ساکت ہو جاتا ہے۔

ان سوالوں کے جواب کس کے پاس ہیں، مرشد بھی یہاں پہنچ کر چپ ہو جاتا ہے!

16 دسمبر ہماری قومی تاریخ کا ایک المیاتی دن تھا کہ اس دن پاکستان دولخت ہوا۔ سال بھر بعد ہی ہر 16 دسمبر کو اس حوالے سے چند مضامین اخبارات میں چھپ جاتے تھے۔ اس المیے کے ذمہ داروں کے حوالے سے کچھ باتیں بھی ہو جاتی تھیں لیکن طالبان نے ہم پر جو ظلم کئے ان میں سب سے بڑا ظلم 16 دسمبر کو آرمی پبلک سکول پشاور کو نشانہ بنانا تھا۔ سو سے زیادہ بچے شہید ہو گئے، کئی اساتذہ بھی شہید ہوئے۔ اس افسوسناک صورت حال نے قومی تاریخ کے المیے کو پس پشت ڈال دیا۔ اب ہر سال قومی تاریخی المیہ کی بجائے آرمی پبلک سکول کے شہدا کو یاد کیا جاتا ہے۔ جو دو چار مضمون المیہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے شائع ہوتے تھے وہ بھی ختم ہو گئے۔ پتہ نہیں طالبان منصوبہ سازوں کو علم تھا کہ نہیں کہ وہ آرمی پبلک سکول کو نشانہ بنانے کے لئے جس تاریخ کا انتخاب کر رہے ہیں اس کے کیا معنی ہیں۔ 16 دسمبر کو جو تھوڑی بہت قومی شرمندگی ہوتی تھی وہ بھی گئی۔

اختلافات میں قتل کرنا تو اب جیسے اس عمل کا حصہ ہو گیا ہے۔ یہ آج نہیں ہوا پہلے بھی ہوتا تھا لیکن اب میڈیا کے ذریعے سامنے آنے لگا ہے۔ اسی طرح وڈیروں اور جاگیرداروں کی بربریت بھی کوئی نئی چیز نہیں۔ اب صرف یہ ہوا کہ میڈیا کے ذریعے یہ سامنے آنے لگا ہے۔ موبائل فون کے کیمرے نے بھی کمال کے کام دکھانے شروع کر دیے ہیں۔ سب کچھ پہلے بھی ہوتا تھا لیکن سامنے نہیں آتا تھا۔ میڈیا کی وجہ سے ایسا کوئی بھی واقعہ کچھ دیر بعد ہی سامنے آ جاتا ہے لیکن اس کے بعد کیا ہوتا ہے، اس کا کوئی فالو اپ نہیں ہوتا۔ ملزموں کو سزا ملتی بھی ہے کہ نہیں اس کا علم نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے سکینڈل سامنے آتے ہیں۔ ایک دو دن تذکرہ ہوتا ہے پھر مکمل خاموشی۔ ملوث لوگوں کا کچھ بنا بھی کہ نہیں یہ معلوم نہیں ہوتا۔ پھر یہ بھی کہ خیر سے ہماری قومی یادداشت بہت ہی کمزور ہے۔ ہم ووٹ دیتے وقت پچھلی ساری باتیں بھول جاتے ہیں۔

مشرف حکومت کو میڈیا کی آزادی کا کریڈٹ دیا جاتا ہے، لیکن کبھی کسی نے نہیں سوچا کہ میڈیا کی یہ آزادی اظہار رائے کے لئے

تھی یا اس کے بھی کچھ مقاصد تھے؟ آج میڈیا "پوری طرح" آزاد ہے لیکن ہو کیا رہا ہے کہ صاحبان عالیشان کے حوالے سے تو کوئی بھی تنقید نہیں ہوتی۔ مقدس گائے کا احترام لازمی ہے پگڑیاں اچھلتی ہیں تو سیاستدانوں کی۔ میڈیا کی آزادی کی حدود کہاں سے شروع ہو کر کہاں ختم ہو جاتی ہیں۔ میڈیا کی آزادی کے گیت گانے والوں کو اس حوالے سے بھی سوچنا چاہیے۔

میں پہلی بار ایم۔ اے کے کانووکیشن میں اورینٹل کالج آیا تو میری ملاقات خواجہ زکریا، تبسم کاشمیری اور سہیل احمد خان سے ہوئی۔ یہ تینوں میرے نام سے واقف تھے۔ خواجہ صاحب سے دو ایک بار پہلے بھی مل چکا تھا۔ کچھ ہی عرصہ بعد تبسم کاشمیری جاپان چلے گئے۔ تھوڑا بہت رابطہ رہتا۔ چھٹیوں میں لاہور آتے اور اتفاق سے میں بھی وہاں ہوتا تو بڑی محبت سے ملتے اور اکثر کھانا کھلانے لے جاتے۔ اس دوران انہوں نے اپنا ناول اور شعری مجموعہ بھی بھجوایا۔ وہ ایک مہربان دوست ہیں۔ خالص کشمیری ہیں اور کھانا کھلانے کے شوقین۔ میں نے پہلے کہیں لکھا ہے کہ کشمیری کھانے سے زیادہ کھلانے کے شوقین ہوتے ہیں۔ دوست نوازی کا یہ طرہ تبسم کے سر پر خوب سجتا ہے۔ وہ جاپان سے لوٹے تو ان سے تعلقات کا سلسلہ بڑھ گیا۔ فون پر بھی گفتگو ہوتی ہے اور جب بھی لاہور جاؤں وہ مجھے ضرور مدعو کرتے ہیں۔ کبھی اپنے گھر کبھی ڈیفنس کلب میں۔ اس قربت میں سیج آصفہ کا بھی اہم کردار ہے۔ وہ بھی ڈیفنس میں رہتا ہے اور تبسم اسے 'بابا جی' کہتے ہیں چنانچہ اب میں نے بھی سیج کو 'بابا جی' کہنا شروع کر دیا ہے۔ ہماری ہر نشست میں بابا جی کی گفتگو یاں خالص ادبی موضوعات میں شگفتگی پیدا کر دیتی ہیں، یہاں بھی سیج کو غصہ آ جائے تو وہ بحث میں ضدی والا سیج بن جاتا ہے۔ اپنی بات پر اڑنا اس کی فطرت ہے۔ تبسم کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ "تاریخ ادب" ان کا اہم کام ہے جس کی دوسری جلد پر آج کل کام ہو رہا ہے۔ "دریافت" اور "تخلیقی ادب" میں ان کا اہم کام ہے جس کی دوسری جلد پر آج کل کام ہو رہا ہے۔ لوگوں نے بھی بے پناہ تعریف کی۔ خصوصاً 57ء کی جنگ آزادی اور" میں نے اردو ادب کی تاریخ کیسے لکھی" جیسے مضامین نے ان پرچوں کے معیار کو مستحکم کر دیا۔

تبسم دوستوں کے دوست ہیں۔ میں نے کالج چھوڑنے سے پہلے ان سے بھی مشورہ کیا۔ کہنے لگے۔ "ویسے تو تم جو سمجھتے ہو کرو لیکن میرے خیال میں یہ فیصلہ درست نہیں۔"

یہی مشورہ مجھے ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے بھی دیا تھا۔ بہرحال میں اسلامی یونیورسٹی میں آ گیا۔ معین الدین عقیل کے جانے کے بعد 'معیار' میرے پاس آ گیا۔ میں نے تبسم کاشمیری کو فون کیا کہ کچھ اچھے مقالے بھجوائیں۔ کہنے لگے دو چار دن دے دو میں یاد کرتا ہوں۔ عباس چغتائی کے پاس مولانا محمد حسین آزاد کے سفر ترکستان کی فائل تھی جسے کئی لوگ حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ کسی کو فائل دکھانے پر بھی تیار نہیں تھے۔ چار پانچ دن بعد تبسم صاحب کا فون آیا کہ "آج آزاد والی فائل سکین کرا کے ٹی سی ایس سے بھجوا دی ہے۔ پیکٹ میں میرا مضمون اور دو اور مضامین بھی ہیں۔"

"معیار" کا پانچواں شمارہ چھپا تو تحقیقی حلقوں میں شور مچ گیا۔ میں نے پوری فائل چھاپ دی تھی۔ اس موضوع پر عباس چغتائی کا تعارف اور خود تبسم کا پنڈت من پھول پر مضمون بھی شامل تھا۔ سب سے پہلا فون علی گڑھ سے قاضی افضال حسین کا آیا۔ کہنے لگے "اتنا اچھا پرچہ بھی تم سے ہی توقع تھی۔" قاضی افضال حسین سے میرے تعلقات عرصے سے تھے۔ پہلی بار پنڈی آئے تو مجھے فون کیا۔ وہ سٹیلائٹ ٹاؤن میں اپنے کسی عزیز کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں تلاش کرتے پہنچ گیا۔ اسی شام فتح محمد ملک نے انہیں کھانے پر مدعو کیا مجھے بھی بلا لیا۔

اس کے بعد وہ ایک ادبی کانفرنس میں جس کا اہتمام بزمِ فکر گروپ نے کیا تھا، اسلام آباد آئے۔ وہ تین دن ان سے کانفرنس اور نشستوں کے بعد ملاقاتیں رہیں۔ ان سے تیسری ملاقات علی گڑھ میں ہوئی جب انہوں نے سارک افسانہ کانفرنس میں مجھے بھی بلایا۔ میں پی آر کا بندہ نہیں ہوں اس لیے مجھے باہر کیا اکثر اپنے ملک میں بھی نہیں بلایا جاتا۔ ان کا مجھ پر ایک اور احسان بھی ہے کہ انہوں نے اپنی نگرانی میں مجھ پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھوایا۔ میں نے شکریہ ادا کیا تو بولے "ارے بھائی آپ کمال کے افسانہ نگار ہیں۔ یہ آپ کا حق ہے" اگلی بار علی گڑھ ہی میں ایک کانفرنس میں انہوں نے مجھے پھر دعوت نامہ بھجوایا اور اصرار کیا کہ ضرور آؤں۔ انہی دنوں حسن کی شادی کی تاریخیں تھیں۔ قاضی صاحب نے میری وجہ سے سیمینار کی تاریخ تبدیل کی لیکن میں نہ جا سکا۔ فون پر ان سے مستقل رابطہ ہے۔ جب بھی درخواست کرتا ہوں وہ "معیار" کے لیے مقالہ بھیج دیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی نئی کتاب "تحریر اساس تنقید" چھپی تو انہوں نے بھجوائی۔ میں نے مشورہ دیا کہ اجازت ہو تو اس کا پاکستانی ایڈیشن چھپوا دیں۔ مان گئے اور ڈاکٹر سہیل عباس نے مثال پبلشرز سے چھپوا دیا۔ میں نے عابد سے کتابیں لے کر سات آٹھ پیکٹ انہیں بھیجے۔ پیکٹ ملے تو اسی دن فون آیا "بھئی آپ یہ کیا کر رہے ہیں۔ اتنے ٹکٹ لگا کر پیکٹ بھجوا رہے ہیں"

میں نے کہا "آپ کی محبت کے سامنے ان کی کیا حقیقت ہے" بولے "لیکن میں اتنی کتابیں کروں گا کیا"

میں نے کہا۔ "دوستوں کو تحفہ دیجیے" ہنسنے لگے۔

بات تبسم کاشمیری کی ہو رہی تھی کہ "معیار" کے لیے انہوں نے جو مواد بھجوایا اور اگلے شماروں میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا اس نے مجھے اس حد تک سرخرو کر دیا کہ عقیل صاحب اعتراض نہیں کر سکتے کہ پرچے کا تحقیقی معیار گر گیا ہے۔ میرا جب بھی لاہور جانا ہوتا ہے تبسم ایک شام علیحدہ کر دیتے ہیں۔ سیج اور کبھی سعادت سعید کو بھی بلا لیتے ہیں۔ جب تک وزیر آغا زندہ تھے۔ میں پہنچتے ہی ان کی طرف جاتا اور پھر وہاں سے تبسم مجھے لے لیتے یا میرے پاس اپنی گاڑی ہوتی تو میں خود پہنچ جاتا۔ اب آغا صاحب نہیں تو لاہور جاتے ہی میرا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ جس کام سے آیا ہوں اس سے فارغ ہو کر تبسم اور سیج سے ملوں۔ تبسم بہت اچھے جدید شاعر ہیں اور ان کے شعری مجموعے چھپ بھی چکے ہیں۔ ناول نگار بھی ہیں لیکن اب وہ تنقید و تحقیق کی طرف چلے گئے ہیں۔ اورینٹل کالج کے احباب میں سے جس شخص سے قریبی تعلق ہوا وہ محمد فخر الحق نوری ہیں۔ نوری صاحب بھی کچھ عرصہ جاپان میں رہے ہیں۔ ان کے آنے سے خواجہ زکریا کے بعد ایک عرصہ بعد ایک اہل شخص صدر شعبہ بنا ہے۔ فخر الحق نوری نے راشد پر جس تحقیقی کام کا آغاز کیا تھا اسے اتنی لگن سے جاری رکھا کہ راشد کا نام جو دھندلا گیا تھا ایک بار پھر اپنی تابانی کے ساتھ سامنے آ گیا ہے اور راشد کی تفہیم پر از سرِ نو گفتگو ہونے لگی ہے۔ فخر الحق نوری عمدہ شاعر بھی ہیں اور جنونی محقق و نقاد بھی۔ اورینٹل کالج میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر سے بھی دوستانہ اور برادرانہ تعلق ہے۔ جدید نقادوں میں ان کا نام بہت اہم ہے۔ لاہور میں اشرف سلیم ہمیشہ میرا گائیڈ ہوتا ہے۔ چندی گڑھ کی شب گردیوں میں بھی ہمارا ساتھی تھا۔ لاہور جاؤں تو سب سے پہلے اشرف سلیم سے رابطہ کرتا ہوں۔ لاہور کے بعد میں جن شہروں میں بہت آیا گیا ہوں وہ ملتان اور فیصل آباد ہیں۔ ملتان میں ڈاکٹر روبینہ ترین اور ان کے میاں ظفر ملک ہمیشہ منتظم رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عقیلہ اور ان کے میاں جاوید بھی بڑے خلیق لوگ ہیں۔ قاضی عابد سے تو دلی تعلق ہے۔ ان سے وہ باتیں بھی کر لیتا ہوں جو ڈاکٹر انوار سے بھی نہیں کر پاتا۔ عامر سہیل جب تک ملتان میں تھا قاضی عابد اور اس نے مجھے ملتان کی گلیوں اور بازاروں کی خوب سیر کرائی۔ اب وہ سرگودھا یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا صدر ہے۔ سرگودھا میں سلیم آغا قزلباش بھی ہے جس نے اپنے عظیم باپ کی روایات کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ احترام اور محبت سے مجھے ہمیشہ یاد رکھتا ہے اور باقاعدہ فون کرتا رہتا ہے۔

فیصل آباد میں جی سی یونیورسٹی میں بھی بہت آنا جانا رہا۔ اس وقت سے جب ڈاکٹر آصف اعوان صدر شعبہ تھے پھر افضال احمد آ گئے اور اب ڈاکٹر طاہر تونسوی، آصف اعوان، شبیر قادر اور سعید احمد بہت محبت کرنے والے لوگ ہیں۔ ارشد اویسی، میمونہ بھائی بھی بہت احترام کرتے ہیں۔ پروین کلو تو خیر بیٹی جیسی ہے وہ بھی سعدیہ کی طرح میرا بڑا خیال رکھتی ہے۔ وزیر آغا اور قاسمی کی تاریخ کے دوران طاہر تونسوی سے دور کا تعلق ہی رہا لیکن اب یہ تاریخ ادبی تاریخ کے صفحات میں گم ہو گیا ہے تو طاہر تونسوی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ بظاہر کھردرا یہ شخص اندر سے بڑا ملائم ہے۔ سلیم اختر کا شاگرد ہے۔ ایسا شاگرد کسی کسی کو نصیب ہوتا ہے۔ آصف اعوان اور شبیر قادری بڑے نفیس انسان ہیں۔ ارشد اویسی بھی فون پر باقاعدہ رابطہ رکھتے ہیں۔ رابعہ سرفراز بھی بہت احترام کرتی ہے۔ یہ سب لوگ اب جدید محقق اور نقاد ہیں ان کی وجہ سے جی سی یونیورسٹی کا شعبہ اردو، اردو کے اہم شعبوں میں شمار ہونے لگا ہے۔ فیصل آباد میں نئے افسانے کا ایک اہم نام طاہرہ اقبال بھی ہے جس سے دو ایک بار ملنا ہوا ہے البتہ فون پر رابطہ رہتا ہے۔

کئی مذاکروں اور مضامین میں یہ بات وثوق سے کہی جا چکی ہے کہ پاکستان میں بجلی کی پیداواری گنجائش استعمال سے تیس چار ہزار میگاواٹ زیادہ ہے لیکن آئی پی پیز اور دیگر بجلی پیدا کرنے والے اداروں کو ضرورت کے مطابق گیس اور تیل فراہم نہیں ہوتا یا ادائیگی نہیں ہوتی جس کا نتیجہ یہ کہ اگر کوئی سٹیشن آٹھ یونٹ کا ہے تو اس کے صرف دو یونٹ کام کر رہے ہیں۔ ملک میں گاڑیوں کے لیے سی این جی کا منصوبہ بھی غلط تھا۔ نیوزی لینڈ میں یہ منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ وہاں یہ ساری مشینری بے کار پڑی تھی۔ منصوبہ سازوں نے اپنے کمیشن کے لیے اس کی خریداری کی۔ یوں بھی زیادہ سی این جی سٹیشنز حکمران طبقے کے گماشتوں کے ہیں۔ ان میں زیادہ پیسہ بلیک منی کا ہے۔ یہ لوگ کھلم کھلا گیس چوری بھی کرتے ہیں۔ ہمارے لوگوں کی عقل بھی ایسی ہے۔ سی این جی آئی تو لوگوں نے پیٹرول ٹینک نکلوا دیے۔ ٹیکسیوں میں بھی اکثر یہی ہوا۔ چنانچہ جب سی این جی کی لوڈشیڈنگ شروع ہوئی تو گاڑیاں خصوصاً پبلک ٹرانسپورٹ تقریباً بند ہونے لگی۔ سی این جی سٹیشنوں کے مالکان ہیں بھی طاقتور چنانچہ بات بات پر ہڑتال کی دھمکی دیتے ہیں۔ اگر سی این جی گاڑیوں کے لیے کم از کم پبلک ٹرانسپورٹ کے لیے بند کر دی جائے تو بجلی کا بحران بڑی حد تک کم ہو سکتا ہے۔

ایران سے بجلی امریکہ نہیں آنے دیتا۔ بھارت کی سرحدیں ہمارے ساتھ جڑی ہوئی ہیں وہاں سے آسانی بجلی آ سکتی ہے اور بھارت اس کی پیشکش بھی کر چکا ہے لیکن ہماری مذہبی جماعتیں اس کی مخالف ہیں۔ جماعت الدعوۃ کا تو نعرہ ہی ہے کہ "انڈیا سے ناتا رشتہ کیا، انتقام"

الّوؤں کے مارے ہم لوگ کی تقدیر کبھی نہیں بدلے گی، دراصل ہم اسے بدلنا ہی نہیں چاہتے۔ ہر کام کو مقدر ہی سمجھ کر توکل اپنا ہماری گھٹی میں پڑ گیا ہے کہ مزاحمت کا جذبہ ہی نہیں رہا۔ جو لوگ ہماری ذلتوں کا سبب ہیں ہم انہیں ہی پھر منتخب کرتے ہیں اور اپنے کندھوں پر بٹھا کر ایوان اقتدار میں چھوڑ آتے ہیں۔ انتخابات تو اب دولت مندوں کا کھیل ہے جس میں نچلے درجے کے لوگ حصہ ہی نہیں لے سکتے۔ مشرف دور میں یونین کونسل کے ایک الیکشن میں ایک انگوٹھا چھاپ چوہدری صاحب نے بہت پیسے خرچ کر دیے۔ جیت گئے۔ ایک دوست مبارکباد دینے گئے اور کہا۔۔۔ "چوہدری صاحب یونین کونسل کا چیئرمین منتخب ہونے پر مبارک قبول کیجیے لیکن آپ نے بہت پیسے خرچ کر دیے" چوہدری صاحب بولے۔۔۔ "اے جو کروڑ خرچ ہوئے ہیں لیکن بھائی اس یونین کونسل کا بجٹ بھی تو دس کروڑ ہے"۔

یہاں کوئی احتجاج نہیں ہوتا جو تحریکیں چلتی ہیں ان کے پیچھے خاص مقاصد ہوتے ہیں۔ چھوٹے موٹے جو احتجاج اور جلسے جلوس

ہوتے ہیں ان کے پیچھے بھی سیاسی گروہ بندیاں ہیں۔ بجلی نہیں، پانی نہیں، مہنگائی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی لیکن اپنے طور پر جدوجہد کرنے کے سوا کوئی ردِعمل نہیں۔ سیاسی جماعتیں احتجاج کرواتی ہیں اور قائم سے اتفاق ہیں۔ ایک طرف عام آدمی بنیادی چیزوں سے محروم ہو گیا ہے اور دوسری جانب یہ حال ہے کہ کوئی نیا ریستوران کھلتا ہے تو میز کے لیے انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ایک طبقہ وہ ہے اور ایک طبقہ عام لوگوں کا۔ درمیان میں کچھ درمیانے طبقے کے لوگ ہیں جو ہاتھ پیر مار کے کچھ حاصل کر لیتے ہیں اور اوپر والے طبقے کی نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کماؤ دکھاوا ہی عمل کی فکر کرے؟

مذہب میں سے عمل نکل جائے تو مذہب صرف ایک فلسفہ رہ جاتا ہے۔ ہماری تمام تبلیغی کوششیں اور جماعتیں صرف عبادات کی ورزش پر زور دیتی ہیں نماز کے بعد کی مسنون دعاؤں کا ذکر ہوتا ہے لیکن نماز کے بعد کے مسنون عمل پر بات نہیں کی جاتی۔ یہ بھی زوال کی ایک شکل ہے کہ اسلام جیسا متحرک مذہب مباحث تک محدود ہو گیا ہے۔ جگہ جگہ اب خواتین کی ایسی مجالس بھی منعقد ہونے لگی ہیں جن میں جوڑے بدل بدل کر خواتین شرکت کرتی ہیں۔ انہیں درست عربی پڑھنے کے طریقے، نماز کے آداب اور دیگر باتوں پر لیکچر دیا جاتا ہے لیکن حقوق العباد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جاتا۔ ہم نے اعمال اور عبادات کو الگ الگ کر دیا ہے۔ شارٹ کٹ جزا کے طریقے ڈھونڈنے لگے ہیں۔ یہ سب کچھ کسی منظم سازش کے تحت ہو رہا ہے یا ناواقفی میں، اس کا تجزیہ کون کرے گا؟

بے عملی اور تن آسانی کی کشش آدمی کو حد درجہ راغب کرتی ہے تو عیاشی زوال کا دروازہ کھولتی ہے جو افراد کو ہی نہیں قوموں کو بھی گمنامی کی کھائی میں دھکیل دیتا ہے۔ تاریخ کا گورکن ایسی قبریں تیار رکھتا ہے۔ ذرا قبرستان کی طرف دیکھیں جو بے بسی اور خسارے میں ہونے کی داستان سناتے ہیں تو تاریخ کے قبرستان کی قبریں ان تمام اقوام کی داستانِ عبرت سناتی ہیں جو اپنی بے اعمالیوں کی وجہ سے اپنے آدرش بھلا بیٹھیں۔ بغداد کے آخری دنوں کے ایک بادشاہ اپنی دو کنیزوں مہ ماہ اور شماما کے ایسے اسیر ہوئے کہ کاروبارِ سلطنت سے بے نیاز ہر لمحہ ان کی صحبت سے شاد کام رہنے لگے۔ ایک دن وہ دونوں کو سامنے بٹھا کر ان کے منہ میں انگور کے دانے پھینک رہے تھے۔ ایک دانہ کنیز کی سانس کی نالی میں جا پھنسا اور وہ مر گئی۔ بادشاہ سلامت اس سے لپٹ گئے اور باوجود سمجھانے کے تین دن اس سے لپٹے رہے۔ بالآخر انہیں زبردستی جدا کیا گیا کہ لاش سے تعفن اٹھنے لگا تھا۔ یہی حال دوسروں کا تھا۔ رہے عام آدمی تو ان کی حیثیت اور خواہش کیا! سو چنگیز خان آ گیا۔ ہماری حالت بھی اب یہی ہے۔ عام آدمی لمحہ بہ لمحہ مر رہا ہے، دلدلوں کے گرداب میں گردن گردن ڈوب چکا ہے لیکن مزاحمت کی استطاعت ہی نہیں۔ اس خطہ میں شاید کبھی تھی ہی نہیں، یہاں تو تھوڑی مزاحمت کے بعد قبولیت ہی کی روایت ہے۔ رہے حکمران تو وہ بھی اپنی مہ ماہ اور شماما کی زلفِ معنبر یار کے ایسے اسیر ہیں کہ نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہی نہیں، تو پھر کیا ہم بھی کسی چنگیز خان کا انتظار کر رہے ہیں؟ تاریخ کا گورکن کس کا منتظر ہے؟

سن دو ہزار میں جب میں نے "تماشا ہے سب" لکھنے کا آغاز کیا تو میں زندگی کے بارے، خصوصاً پاکستان کے مستقبل کے بارے میں بڑا پرامید تھا۔ سرسید کالج سے ریٹائرمنٹ کے باوجود میرے ارادے اور امنگیں تازہ تھیں۔ نثر میں مجھے ان کے اظہار کے بھرپور مواقع ملے۔ نثر کے دس سال میری زندگی کا بہترین زمانہ ہیں۔ دو ہزار گیارہ میں جب میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں آیا تو صدر شعبہ کے بعد مجھے کلیہ زبان و ادب کا ڈین بھی بنا دیا گیا۔ یہ میرے کیریئر کا سب سے اونچا مقام ہے۔ ان بارہ سالوں میں جہاں میں نے دنیاوی حوالوں سے بہت ترقی کی، افکار، احساسات اور غور و فکر کے حوالے سے میرا سفر تیزی سے جاری رہا اور آج جب میں اس کتاب کے آخری صفحات لکھ رہا ہوں، میرے سامنے مایوسیوں اور اداسیوں کی گہری دھند کے سوا کچھ نہیں۔ ان میں میرے ذاتی المیے بھی ہیں اور مجموعی صورت حال

بھی، روشنی کی کوئی کرن دور دور نظر نہیں آتی۔ دنیا بھر میں ٹیکنالوجی سے معاشروں کو فائدہ ہوا ہے، خصوصاً تعلیمی ترقی نے زمین پر گرے ہوؤں کو بلندیوں سے آشنا کر دیا ہے لیکن ہماری توہم پرستی، بد قسمتی خود غرضی ہونے کے تصور اور پیر و مرشد سلطان ہو کے تصورات ہمیں بتدریج پیچھے دھکیل رہے۔ اس وقت ملک میں سو سے زیادہ ٹی وی چینل موجود ہیں لیکن یہ سب معاشرے کو آگے لے جانے کی بجائے پیچھے دھکیل رہے ہیں۔ ان سو چینلوں میں سے ایک تہائی کھانے پکانے کی ترکیبیں بتانے والے ہیں۔ ایک تہائی مذہبی اور باقی ڈرامے اور خبروں کے ہیں۔ یہ سارے چینل دیکھنے والوں کو کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرنے کی تربیت دے رہے ہیں کھانے پکانے والے چینل کھانے پکانے کی نت نئی ترکیبیں بتا رہے ہیں۔ گھر میں بھی عورتیں یہ ترکیبیں سن کر نئی نئی اشیاء منگواتی ہیں۔ مذہبی چینلوں کا حال یہ ہے کہ وہ توہم پرستی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی جیبیں خالی کرانے پر لگے ہوئے ہیں۔ ایک دوست نے بتایا کہ میں اس طرح کا ایک چینل دیکھ رہا تھا، سبز عمامہ باندھے ایک بزرگ لوگوں کو ان کے مسائل کا حل بتا رہے تھے۔ کالیں آ رہی تھیں اور وہ انہیں سن کر کال کرنے والے کی مشکلات کے لیے وظیفے بتا رہے تھے۔ دوست نے بتایا کہ میں نے بھی یونہی کال کر دی، اتفاق سے کال مل گئی۔ ٹی وی پر بیٹھے بزرگ نے نام، والدہ کا نام اور کچھ اور باتیں پوچھیں، پھر کچھ غور کرنے کے بعد کہا کہ کسی نے آپ پر جادو کیا ہے۔ یہ وظیفہ کریں اور فون نمبر بتاتا ہوں۔ پروگرام کے اختتام پر ان کا فون آیا کہ میں نے آپ کے حالات پر مزید غور کیا ہے آپ جادو کے بہت سخت اثر میں ہیں اس کا توڑ کرنا ضروری ہے۔ میں تو فی سبیل اللہ یہ کام کرتا ہوں ہاں البتہ کچھ اشیاء کے لیے دس ہزار روپے کا خرچہ ہوگا۔ پوچھا "کیسی اشیاء" بولے "کالا بکرا، زعفران، ایک کھوپڑی وغیرہ تو آپ ایسے کریں کہ فوراً اس پتے پر ایزی پیسہ کے ذریعے دس ہزار بھجوا دیں۔"

اس طرح کے چینل یہی کام کر رہے اور گھروں میں بیٹھی ان پڑھ بلکہ پڑھی لکھی عورتیں بھی خاوندوں سے چوری چھپے سے ان کو رقم بھجوا رہی ہیں۔ ڈرامے والوں چینلوں پر سوائے محبت کے موضوع کے کوئی موضوع نہیں۔ خصوصاً ناجائز رشتوں سے محبت، خاوند کی موجودگی میں کسی اور کو چاہنا، بیوی کی موجودگی میں اس کی بہن سے تعلقات، جوان لڑکیوں کا ماں دوری سے عشق کا اعتراف۔ رہے نیوز چینل کے اکثر اینکر پرسن کسی نہ کسی جماعت کے گماشتے ہیں۔ مار دھاڑ کی خبریں، روز ہی کوئی نہ کوئی بری خبر ہوتی ہے، دھماکے، ٹارگٹ کلنگ اور اگر کسی دن اس طرح کی کوئی خبر نہ ہو تو روڈ حادثوں اور زمینی جھگڑوں میں مارے جانے والوں کے اعداد و شمار۔ سوائے مایوسی کے کچھ نہیں۔ پوری قوم اس وقت شدید نفسیاتی وبا اور ذہنی پریشانی میں ہے۔ اچھی خبر کب ملے گی، میں اب ستترویں سال میں ہوں، کتنا عرصہ اور رہ گیا ہے، اچھی خبر کیا اگلے جہان میں ملے گی۔

(جاری ہے)

◆◆◆

مشفق خواجہ

اکبر جی! "آپ کے مجموعۂ کلام کا لکھا ہوا" آپ کا اپنا ابتدائیہ پڑھ کر پذیرائی فرمائش (گزارش) پھر دہراتا ہوں۔ آپ
"ایسا آپ نہ لکھ چھوڑیں حضرت۔"

غمِ دوراں سے پہلے

انور سدید

منڈی بہاؤالدین کے چھوٹے سے اسٹیشن سے جب پاکستان ریلوے کی مسافر بردار گاڑی ڈبہ گاڑی کی ایک لمبی "سیٹی" سن کر ہانپتی ہانپتی اپنی اگلی منزل کی طرف رینگنے لگتی تو انجینئرنگ سکول موضع رسول کی طرف جانے والی ریل کی پٹڑی پر "جتھا راہی" طالب علموں کا بوجھ اٹھائے آہستہ آہستہ چلتی نظر آتی۔ ریل کی آواز کا نوحہ آس پاس کے دیہاتوں تک جا پہنچتا۔ اور لوگ سمجھ جاتے کہ انجینئرنگ سکول کے طلبا موسم گرما کی تعطیلات سے واپس آ گئے ہیں۔ اپنے اپنے گھروں کو بادل نخواستہ چھوڑ کر آنے والے طلبا راہی پر مستقبل کے رہگذر کی تلاش میں گم متدی سے بیٹھے نظر آتے۔ طالب علم — جو لاہور، لائل پور، ملتان، سرگودھا جیسے زندگی سے بھرپور شہروں کو چھوڑ کر ایک موہوم مستقبل کی آس لگائے انجینئرنگ سکول کی الگ تھلگ قیدی فضا میں رہنا کا رانہ جارہے ہوں۔ طلبا سے لدی پھندی راہی، جسے وہ "راہی مین" ہاتھ سے دھکیلتے ہوئے اور ریلوے لائن پر دوڑاتے ہوئے واڑہ برج پر جو جہلم اور جہلم کینال پر واقع تھا پہنچتی تو شیشم کے درختوں کی اونچی پھنگوں کے پیچھے سے گھور اندھیروں میں ڈوبی ہوئی سکول کی کالونی کا کھنڈ نما عمارت سر ابھارتی اور پتھر کے ان سنگین بتوں میں زندگی کے آثار پیدا ہونے لگتے۔

واڑہ برج سے راہی شیڈ تک کا فاصلہ لمحوں میں طے ہو جاتا اور راہی ایک لمبی کراہ کے ساتھ سلاخ دار پھاٹک کے سامنے رک جاتی جو سکول کا صدر دروازہ تھا۔ پھاٹک کے عین سامنے گھنے درختوں کے بیچوں بیچ ایک لمبی سڑک کسی دوشیزہ کے گھنیرے سیاہ بالوں میں افشاں کی طرح چمکتی نظر آتی۔ یکہ دوست طلبا راہی پر آنے والوں کا استقبال والہانہ انداز میں کرتے اور پھر اپنے کندھوں پر بوجھل سامان اٹھا کر اور ایک دوسرے کا حال آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھتے ہوئے چلنے لگتے۔ کبھی جب سال اول کے طلبا آتے تو اس سڑک کو دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ایک غیر مرئی چمک پیدا ہو جاتی۔ لیکن سال بھر کے بعد انجینئرنگ کی تعلیم کا بوجھ اور واقعات کی گرد اس چمک کو مٹا دیتی تو اس کی جگہ ایک یاس آمیز حسرت آنکھوں میں جا گزیں ہو جاتی اور اس سڑک کو دیکھ کر ان کے دل کی گہرائیوں میں مسرت و بہجت کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوتا۔ انجینئرنگ سکول رسول کی فضا محنت کے جذبوں سے رنگی ہوئی تھی۔ لیکن طلبا تو طلبا ہوتے ہیں۔ مسرت کے متلاشی، بہجت کے جویا، آرام اور سکون کے طلب گار اور راحتوں کے خواہش مند۔ سکول کی اس خاموش طلسمی فضا میں، صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی اور مست ہوا میں طلبا کی آنکھوں میں جب نیند کے گھور سا خمار طاری رہتی ہوتی تو اروڑ وقار ان گھڑ اپنا صور اسرافیل لے کر نازل ہو جاتا صبح کی یہ "دیوالی" رات کے سکون کو پاش پاش کر دیتی اور طلوع صبح کی خبر دیتی۔ سکوت کی فضا پر قضا کا ہاتھ دراز ہو جاتا اور لان میں معطر پھولوں کی خوشبو میں سوئے ہوئے طلبا مجبوراً انگڑائیاں لے کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ کچھ طلبا منہ میں کیکر کی شاخ سے بنایا ہوا داتن دانتوں میں دبائے اور بائیں ہاتھ میں کالی کا لوٹا لیے بہت افلاطون جاتے دکھائی دیتے۔ کچھ اپنے کندھوں پر تولیے ڈالے غسل خانوں کی طرف چل پڑتے۔ بعض جلدی جلدی صبح کی نماز اپنے کمرے میں ادا کرنے کے بعد قرآن کریم کی تلاوت کے لیے بیٹھ جاتے کہ تعلیم کی مشکل منزل آسان ہو اور ان پر انجینئرنگ

کے کسی سرکاری محکمے میں ملازمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ ہمارا رویہ دیکھتے ہی وہ جلدی جلدی چہروں پر پھیرے مارتے نظر آتے۔ ادھر شمیر نائی اپنے عمل میں سرگرم اور مصروف نظر آتا۔ ابھی کسی طالب علم کے منہ پر صابن کا جھاگ اڑا رہا ہے، ابھی وہ اس جھاگ کو استرے سے صاف کر رہا ہے اور پیچھے سے چہرہ "کلین شیو" نکال رہا ہے۔ کسی طالب علم کی ٹھوڑی پر خون کا سرخ چھوٹا نکل آتا تو شمیر نائی اس کی روشنی جلدی سے صابن کے جھاگ میں گم کر دیتا۔ اس کا ہاتھ اس لطافت سے چلتا کہ بیٹھے بیٹھے نیند آ جاتی۔ استرے کی تیز دھار آب رواں کی لہر محسوس ہوتی۔ کئی سست مزاج طلبا تیاری کے عمل پر بھی (جسے "تیاری" سے موسوم کیا جاتا تھا) اپنے بستروں سے نہ اٹھتے تو شمیر نائی ان کی حجامت سوتے سوتے ہی بنا ڈالتا۔ رات سوتے وقت جن چہروں پر بال اگے ہوتے صاف نظر آتے تھے، صبح وہ طلبا اٹھتے تو اپنا چہرہ کلین شیو دیکھتے۔ ایسے میں اروڑ دھان حاضری کا آخری بگل پھونک دیتا اور اس کے ساتھ ہی پی ٹی ماسٹر احمد دین کی زناٹے دار آواز ابھرتی — "رن اپ ریئر رن اپ ریئر (Run up Rear)۔ یعنی پیچھے آنے والے لڑکو دوڑ کر آگے آؤ۔ یہ آواز فضا کے سکوت کو چیرتی ہوئی آتی اور صبح صادق کے کنوارے اجالوں میں کھو جاتی اور سب طلبا ہیریئر کی طلیشیو وردی میں لمبی قطاروں میں کھڑے ہو جاتے۔ پی ٹی ماسٹر احمد دین اس فضا کا بااختیار شہنشاہ تھا۔ اس کے احکام فضا میں گونجتے گئے۔ لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ کی مترنم آوازیں پاؤں کی متوازن چاپ کے ساتھ ابھرنے لگتیں اور پی ٹی ماسٹر احمد دین کی وہ شاہی انگریزی جس کی تمام ورزشی اصطلاحات اس کی اپنی وضع کردہ تھیں ابھرتیں۔ بعض لڑکے استہزا ایہ قہقہے بھی لگاتے لیکن پی ٹی ماسٹر ان طنزیہ قہقہوں کو خاطر میں لائے بغیر کہے جاتا:

"فیل (File) میں ڈونٹ لاف (Don't laugh)، ورنہ سخت سزا"

"رول نمبر تھارٹی تو، ہم اپنی "آئی" (eye) سے دیکھتا، خود بھی "لافتا" ہے۔ اور دوں کو بھی "لفاتا" ہے، ویری بیڈ، ویری بیڈ، بیک بیٹھ"

پریڈ میں کسی کو سست گام دیکھ کر پریفکیٹ (Prefect) کو حکم نازل ہوتا:

"ساجد بلیز، جس کا "ٹا" سست اتفاقات ہے اپنے "چیٹ" سے اٹھاتا"

"فیلی میں کون کوئزل (quereil) کرتا۔ ساجد بلیز دیکھیں گے" اور جب ساجد بلیز کو بیکنڈ ایئر کے طلبا خاطر میں نہ لاتے تو پی ٹی ماسٹر کو غصہ آ جاتا:

"ہم تم کو اٹھا کے پریفکیٹ "اتھارٹی" (Authority) دیا ہے، یہ بلیز" کبھی کبھی ایک طویل حکم وارد ہوتا:

"ایٹ دی آرڈر آف تھری بیک فور ریئر فارورڈ موڈو ویلیٹ، سیکنڈ ان سٹریٹ اینڈ فارم کلم آف سیکشن"

طلبا پی ٹی ماسٹر کا یہ لمبا حکم سنا ان سنا کر دیتے، لیکن "کلم آف سیکشن" پر جدھر جس کا جی کرتا، ادھر گھوم جاتا۔ اس پر بیزار بھری ڈانٹ ابھرتی۔

غلطی — سب لوگ کا غلطی، ہم خود نمونہ دے گا۔ ماسٹر احمد دین آنکھیں بند کر کے ڈیمانسٹریشن دینے لگتے۔ ادھر پچھلی قطاروں کے شریر طلبا ہنسی مذاق میں مصروف ہو جاتے۔

پی ٹی ماسٹر احمد دین انجینئرنگ سکول رسول کا سب سے پرانا رکن تھا۔ اس کی لوح دماغ پر برسوں کے پرانے طالب علموں کے نام اور رول نمبر کندہ تھے۔ وہ ایک ایک لڑکے کو اس کے نام اور رول نمبر سے پہچانتا تھا۔ پرانے طلبا امتحان لینے کے لیے اپنا رول نمبر پوچھتے اور وہ ان پر زور دار لہجے بغیر ایک لمحے میں بتا دیتا۔

محمد انوار الدین، رول نمبر سیونٹی ایٹ۔ ایسٹ ہوسٹل ڈارمیٹری نمبر سیون"

اور اس کے ساتھ اس طالب علم کی شرارتوں کا رجسٹری ٹیپ بھی کھول دیتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس رہائشی سکول میں ضبط و نظم کی جو مثالی صورت نظر آتی تھی اسے قائم کرنے میں پی۔ ٹی۔ احمد دین کا بہت حصہ تھا۔ اس کی طبیعت میں آہن کی سختی تھی۔ لیکن جہاں طلبا کے نفع نقصان کا سوال پیدا ہوتا وہ یکسر موم ہو جاتا اور اس کے فیصلے کی میزان طالب علم کے فائدے کی طرف جھک جاتی۔ اس کے قلم سے آج تک کسی طالب علم کو ایک نمبر کا جرمانہ بھی نہیں ہوا تھا۔ طلبا سرکشی پر اتر آتے تو وہ خاموشی اختیار کر لیتا۔ حالات سازگار ہوتے تو بھی (اخلاقاً) لیکن سرزنش کرتا۔ کبھی طنز و مزاح سے بھی کام لیتا۔ اور اس طرح اپنا حکم منوا لیتا۔ خندہ روئی اس کی عادت تھی۔ لیکن طلبا نے کبھی اسے کھلے بندوں سگریٹ پیتے ہوئے نہیں دیکھا۔ سکول میں احمد دین کی اجارہ داری تھی۔ پھر جب صوبیدار غفاری نے آ کر رضا کارانہ اجارہ داری کی تو پی ٹی ماسٹر احمد دین کی کنپٹی پر بال سفید ہو گئے۔ بھلا وہ ادارہ جہاں وہ سالہا سال سے حکومت کر رہا تھا اس پر کسی اور کی اجارہ داری وہاں کیسے قبول کرتا۔ اس کا دل غم سے چیخنے لگا لیکن حکم کی تعمیل اس کے خمیر میں شامل تھی۔ وہ تندہی سے کام کرتا رہتا لیکن حرف شکایت زبان پر نہ لاتا۔ ادھر صوبیدار غفاری تھا جس کی سرشت میں انتقام کی خو تھی۔ طلبا کو معمولی سی بات پر بھی جرمانہ کرنے سے گریز نہ کرتا اور ہرگز یہ خیال نہ کرتا کہ ایک نمبر کا جرمانہ بھی طالب علم کے آخری نتیجے پر اثر انداز ہو سکتا تھا۔ کئی دفعہ طلبا کا جوان خون سرکشی پر آمادہ ہو جاتا اور وہ سزا یا جرمانے کا خوف دل سے یکسر مٹا کر کچھ کر گزرنے کے منصوبے بنانے لگتے لیکن پی ٹی ماسٹر احمد دین کو جونہی علم ہوتا تو وہ طلبا کے بپھرے ہوئے جذبات پر شبنم ڈال دیتا۔ کسی کو خبر ملنے سے پہلے معاملہ سلجھ جاتا۔

اساتذہ میں ملک محمد افضل مقبول ترین استاد تھے۔ ان کا مضمون "ڈرائنگ" تھا۔ ٹیکنیکل علوم کی زبان خطوں، قوسوں، دائروں اور زاویوں سے تشکیل پاتی ہے۔ ملک افضل بلیک بورڈ پر شکل اس طرح بناتے کہ ان کا اپنا مافی الضمیر تیکنیکی انداز میں طلبا کے دل میں اتر جاتا۔ اور طلبا اس تیکنیکل تصور کے تمام مطالب اپنے دل میں محفوظ کر لیتے۔ طلبا کو جہاں ذرا سی مشکل پیش آتی تو ہاتھ کھڑا کر دیتے۔ ملک محمد افضل وہیں رک جاتے اور انگریزی چھوڑ کر اردو، پنجابی، ملتانی، پشتو، غرض جس زبان میں بھی مسئلہ طلبا کو سمجھ میں آتا وہی زبان بولنے لگتے۔ کبھی لڑکوں کے موڈ کو بوجھل دیکھتے تو اپنا موضوع چھوڑ کر لطیفوں پر اتر آتے۔ اور لمبا چوڑا وسیع و عریض ڈرائنگ ہال قہقہوں سے معمور ہو جاتا۔ امتحان ہوتا تو ملک محمد افضل کے پرچے میں لڑکے نمبروں کے ڈھیر سے بھر لاتے اور خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ کئی دفعہ تو کئی مایوس ہو کر دریائے جہلم میں ڈوب مرنے والوں کو انہی کے دیئے نمبروں نے خودکشی سے بچا لیا۔ لباس کا جو ذوق ملک محمد افضل کو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا وہ ذوق بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ ملک افضل اپنی خوش پوشی کا معیار گرنے نہیں دیتے تھے۔ ان کی پتلون کی کریز کبھی خراب نظر نہیں آئی۔ ٹائی کی گرہ کبھی ڈھیلی نہیں دیکھی اور فیلٹ کا زاویہ کبھی بدلا ہوا نہیں پایا۔ ہنستے مسکراتے سکول کے ہال میں داخل ہوتے اور مشکل ترین ڈرائنگ ہنسی ہنساتے ہوئے ذہن نشین کرا دیتے۔

بابا غنی صاحب نہایت شریف النفس استاد تھے۔ اپنے مضمون سول انجینئرنگ پر پوری قدرت رکھتے تھے لیکن ان کا چہرہ ایک کڑوی متانت میں لپٹا رہتا تھا اور طلبا ان سے ہر وقت خائف رہتے تھے۔ ان کے قریب آنے کی خواہش کے باوجود طلبا ان سے دور بھاگتے تھے۔ ان کے چہرے پر جتنی کڑوی متانت تھی، لہجے میں اتنی ہی شیرینی تھی۔ انگریزی خالص پنجابیوں کی طرح بولتے تھے۔ ایک ایک لفظ اپنی مکمل حرکات کے ساتھ ان کی زبان سے ادا ہوتا چلا جاتا اور وہ گھنٹوں اپنے مخصوص انداز میں الفاظ کو چبا چبا کر اپنے تھکے لہجے میں

بے تکان بولتے چلے جاتے اور جب سکولوں کے پڑھے ہوئے لڑکوں کو انہیں سمجھنے میں ذرا دقت نہ ہوتی۔ جب میں اس سکول میں داخل ہوا تو قمی صاحب کی عمر ڈھلنے لگی تھی۔ ریٹائرمنٹ کا لمحہ قریب آ رہا تھا۔ گئی عمر اپنے آثار رفتہ رفتہ واضح انداز میں کم کر رہی تھی لیکن چلنے تو جوانوں جیسا دم خم قائم رکھنے کی کوشش کرتے۔ کبھی ادائی پر جگہ نہ ملتی تو منڈی بہاؤ الدین کی طرف پیدل چل پڑتے اور آٹھ دس میل کا فاصلہ طے کرنے پر بھی نہ تھکتے۔ ان کے ساتھ چلنے والے نوعمر طلبا ان کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے سکتے۔ اس وقت محسوس ہوتا کہ ان کی بوڑھی سوکھی ٹانگوں میں ابھی کتنا کس بل تھا۔ ایک اور ڈرائنگ ٹیچر ماسٹر غلام حسین تھے۔ وہ غیر دنیادار اور درویش مزاج۔ سکول کی داخلی سیاست سے بے نیاز، اپنے کام سے کام رکھنے والے استاد جو اپنے حال میں ہمہ تن مستغرق رہتے تھے۔ وہ فطری طور پر خاموش طبع تھے۔ لیکن کبھی کبھی ان کے باطن سے ابال اٹھتا تو وہ سبز جھنڈا ہاتھ میں لے کر نکلتے اور "جیئم شاہ پادشاہ زندہ باد" کا نعرہ لگاتے ہوئے دونوں ہوسٹلوں کا چکر لگاتے اور طلبا کو نیک مسلمان بننے کی تلقین کرتے اور پھر مسجد میں جا کر گوشہ نشین ہو جاتے لیکن اگلی صبح سکول میں وقت پر پہنچ جاتے اور کلاس لینے میں کبھی کوتاہی نہ کرتے۔

مسٹر داؤد بھی سکول کے مخلص اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ہر طالب علم کی ذہنی اور فکری استعداد کو پہچانتے تھے اور اس کے مطابق راہنمائی کرتے تھے۔ سکول کے ہنگاموں سے انہیں کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کی زندگی کا محور ان کا کالونی سے سکول تک محدود تھا۔ جمعہ کی نماز سکول کی مسجد میں ادا کرتے تھے اور امام صاحب کا خطبہ اگلی صف میں بیٹھ کر سنتے تھے۔ اس طلبا کی انتظامیہ کمیٹی کے سیکرٹری کا انتخاب ہوتا تو داؤد صاحب بھی انتظامی رکن کی حیثیت میں پوری گھن گرج کے ساتھ حصہ لیتے۔ ایک مرتبہ سکول کی مسجد کمیٹی کے سیکرٹری کا انتخاب پوری توسل کا انتخابی معرکہ بن گیا۔ طلبا میں سیاسی جماعتوں جیسی صورت پیدا ہو گئی۔ خطرہ پیدا ہو گیا کہ پارٹی سپرٹ کہیں فساد کا رنگ اختیار نہ کر جائے۔ ایسے میں داؤد صاحب نے ماہر شاطر کی طرح ایسے حالات پیدا کر دیے کہ سیکرٹری کا انتخاب بلا مقابلہ طے پا گیا اور سکول کے سیاسی مطلع پر سازشوں کے جو بادل پھیل گئے تھے، وہ چھٹ گئے اور مختلف حلقوں کی رنجشیں بھی ختم ہو گئیں۔

انہیں دنوں انجینئرنگ سکول رسول میں ایک نئے ماسٹر کنز مرزا ریاض آئے۔ لمبا تڑنگا سوکھا سڑا جسم، بڑھے ہوئے بال، جنہیں فلش کی اونچی ٹوپی بھی پوری طرح ڈھانپ نہ سکتی تھی۔ لمبی نوکیلی ناک کے بانسے پر اٹکی ہوئی موٹے موٹے شیشوں کی عینک، جہاں سے آنکھوں پر سایہ کیے رکھتی۔ معلوم ہوا کہ وہ سال اول کے طلبا کو تخمینہ نگاری (Estimating) پڑھائیں گے۔ سکول میں چونکہ نووارد تھے اس لیے شریر طلبا نے انہیں اپنی لپیٹ میں لینا چاہا۔ وہ بلیک بورڈ پر کسی عبارت کا نقشہ کھینچتے، ان کا منہ تختہ سیاہ کی طرف ہوتا اور یار لوگ کمرے کے سنگی فرش پر پاؤں گھسیٹنے لگتے۔ ریاض صاحب غصے سے مڑ کر دیکھتے تو موت جیسا سکوت کمرے پر طاری ہو جاتا۔ دوبارہ تختہ سیاہ کی طرف رجوع کرتے تو ایک مشترکہ قہقہہ بلند ہو جاتا۔ جیسے کمرے کی چھت اڑ جائے گی۔ واپس مڑ کر دیکھتے تو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لڑکے اس انہماک اور سکون سے عبارت گرگا کا خاکہ بنانے میں مصروف ہوتے کہ سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز آتی۔ ایک روز ریاض صاحب معاملہ بھانپ گئے۔ "بس کرو لڑکے" پڑھنے کے موڈ میں نہیں ہو تو میں چلا جاؤں؟" طلبا خفیف تو نہ ہوئے لیکن کوئی جواب بھی نہ دیا۔ ریاض صاحب نے بڑے دکھ سے لہجے میں کہا: "کچھ پڑھ لو، کچھ سیکھ لو نہ سمجھو گے تو نقشے میں جا کر پچھتاؤ گے، چڑیاں کھیت چگ جائیں گی اور لوگ گالیاں بھی دیں گے کہ کس کم بخت نے انہیں انجینئرنگ پڑھائی ہی نہیں"۔

ایک دفعہ کچھ شریر لڑکے کہیں سے ایک گرگٹ پکڑ لائے۔ ریاض صاحب جب اپنے لیکچر کے کلائمکس (Climax) پر پہنچے اور پوری کلاس پر سکوت طاری نظر آتا تھا تو اچانک اوپر کے ٹیوب سے یہ چوں چوں کرتا ہوا نکلا اور ریاض صاحب کے سامنے سے ہوتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس دن پہلی مرتبہ ریاض صاحب کی آنکھوں میں حسرت بھری عاجزی کے نقوش پیدا ہوئے اور وہ کلاس چھوڑ کر چلے گئے۔ اگلے روز ریاض صاحب آنکھوں میں خون لیے ہوئے کلاس کو خطاب کر رہے تھے۔ غصے کے باوجود ان کے لہجے میں شفقت بھری سرزنش تھی۔ چند لڑکوں کو معمولی جرمانہ ہوا۔ باقی سب بچ گئے۔ طلبا کے عدم تعاون کے ان حوصلہ شکن حالات کے باوجود ریاض صاحب کو لڑکوں کا مستقبل عزیز تھا۔ وہ جبیں پر بل لائے بغیر تدریس میں مصروف رہتے تھے۔ اور آخر ان کے خلوص کے آگے لڑکوں کو سپر ڈالنا ہی پڑی۔ اپنی غلطی کا احساس ہونے پر لڑکوں نے ندامت کا اظہار کیا اور ریاض صاحب سکول کے مقبول ترین استاد شمار کیے جانے لگے۔

سطح پیمائی (Survey) کے شعبہ میں ایک نادر روزگار شخصیت مشتاق صاحب کی تھی۔ انہوں نے ہندوستان سے لے کر ایران و توران تک کی سطح پیمائی دانوں پر کرا ڈالی تھی۔ آلہ سطح پیما کو ٹھوکر لگاتے تو آلہ سیٹ (Set) ہو جاتا۔ مشکل سے مشکل مسئلہ چٹکی بجا کر حل کر ڈالتے۔ علم مثلث (Trignometry) ان کی انگلیوں کی پوروں پر ثبت تھا لیکن جب کلاس میں آتے تو نظم و ضبط ختم ہو جاتا۔ وہ بے تکان انگریزی بولتے اور کوئی زبان میں گالیاں بھی بولتے چلے جاتے۔ نوٹس لکھواتے تو طوفان میل کی رفتار سے ان کی زبان چلتی اور طلبا کا قلم ان کا ساتھ نہ دے سکتا تو شور اٹھ کھڑا ہوتا۔ اور جو لڑکا کبھی پھنستا تو مشتاق صاحب ناراض ہو جاتے اور روٹھ کر کلاس چھوڑ دیتے۔ لیکن پریکٹیکل کے پیریڈ میں غصہ چھٹا ہوا نظر آتا اور وہ ہر ایک سے شفقت سے پیش آتے۔ ان کا مزاج برسات کا موسم تھا۔ خدا جانے کب گرم ہے، کب برسے۔ ان کی زبان اور ذہن کی سوئی تھی جو کبھی کاڑھے میں ہوتی، کبھی کوآب میں۔ اگلے بنچوں پر لڑکے اونگھتے رہتے اور پچھلے بنچوں پر شطرنج کی بساط بچھی رہتی یا تاش کی گڈیاں پھینٹی جاتیں۔ ایسے میں کبھی ان پر انگریزی گالیوں کا دورہ پڑ جاتا تو محفل کشت زعفران بن جاتی۔ ان کی گالیاں لڑکوں کے لیے ہنسی کے گول گپے تھے۔ بے تکلفی کی یہ نہایت کہ لڑکے اپنی شادی کے مسائل بھی ان کے سامنے پیش کر دیتے کہ والدین سے ان کی سفارش کریں اور پسند کی جگہ پر شادی کرا دیں۔ مشتاق صاحب لڑکی کے باپ کے پاس پہنچ جاتے اور لڑکے کے مزاج سے اپنی شناسائی کا حال بیان کرتے۔ اور احتیاط کا مشورہ دیتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کی طے کی ہوئی شادیاں بڑی کامیاب ثابت ہوئیں۔ ایک لڑکی میرے لیے بھی تجویز کی تھی لیکن جب میں نے بتایا کہ میری والدہ نے میرے چچازاد بشیر احمد کی شادی کے بعد ان کے ہاں ہونے والی پہلی لڑکی سے میری منگنی طے کر دی تھی تو وہ سن کر حیرت زدہ ہو گئے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ مشتاق صاحب کی تدریس کا عالم یہ تھا کہ جھومتے جھامتے کلاس میں داخل ہوتے۔ جہاں سے جی چاہتا سطح پیمائی پر لیکچر شروع کر دیتے۔ امتحان ہوتا تو مشکل ترین پرچہ سیٹ کرتے۔ لڑکے کہتے "یہ تو آپ نے ہمیں نوٹس میں لکھوایا ہی نہیں؟" جواب دیتے "تم کلاس میں شطرنج یا تاش کا شغل کرتے رہے ہو گے۔ جاؤ، دوسرے ساتھیوں کے نوٹس دیکھو۔ وہ ایک دفعہ لڑکوں نے کمرۂ امتحان سے واک آؤٹ کیا۔ لڑکوں کی کمپارٹمنٹ مکمل ہو جاتی تو انہیں سپلیمنٹری امتحان دینا پڑتا۔ اس وقت مشتاق صاحب کے لکھوائے ہوئے نوٹس ہی کام آتے۔

ماسٹر ابوالحسین صاحب کو لڑکوں نے بگاڑ کر ابوالہول بنا دیا تھا۔ کبھی اشتیاق صاحب تعطیل پر ہوتے تو ان کی سطح پیمائی کی کلاس ابوالحسین صاحب لیا کرتے تھے۔ انگریزی روانی سے نہ بول سکتے تھے۔ اس پر مستزاد ان کا عجیب و غریب لہجہ اور غلط سلط تلفظ۔ لڑکوں کو ایسا

موقوف ادب۔ ابوالحسین کے بیان کی تکمیل پکڑ لیتے اور نئے نئے سوالات سے انہیں چدھر یا پتے گھمانے لگتے۔ ان کے پیریڈ میں لڑکے ٹک شاپ میں بیٹھ کر سگریٹ پھونکا کرتے یا ورکشاپ کے سامنے ہوا خوری کرتے نظر آتے۔ آخری پانچ سات منٹوں میں وہ اپنے لیکچر کا خلاصہ بیان کرتے تو سب لڑکے حاضر ہوتے اور ایک ایک لفظ دل میں اتار لیتے۔ رانا محمد احمد انجینئرنگ سکول رسول میں چند مہینوں کے لیے آئے اور انہیں محکمہ آبپاشی میں اعلیٰ ملازمت مل گئی تو اس سکول کو خیر باد کہہ گئے لیکن ان چند ماہ میں ہی لڑکوں میں اپنی مقبولیت کی جاوداں یادگار چھوڑ گئے۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ اشفاق صاحب کی ناکامی میں رانا محمد احمد کی مقبولیت نے اور پھر ان کے استعفے نے بھی ایک خاص کردار ادا کیا تھا۔ طلبا سب اساتذہ کو رانا احمد جیسا استاد دیکھنا چاہتے تھے جو فطری طور پر ممکن نہیں تھا۔ مجھے یاد ہے کہ رانا احمد ہمیں رسول سکول سے فارغ ہونے اور کسی تعمیراتی محکمے میں ملازمت حاصل کر لینے کے بعد اے۔ ایم۔ آئی۔ ای کرنے کا مشورہ دیتے تھے کہ سب انجینئر کے عہدے سے ترقی کا راستہ کھل جائے۔ خود انہوں نے بھی اقدیات یا امتحانات پاس کیے تھے۔ رانا محمد احمد کی جگہ میر اسلام صاحب آئے تھے۔ لیکن وہ اس منصب کو سنبھال نہ سکے۔ قد و قامت ان کا ٹھگنا تھا۔ مزاج میں ایک خاص قسم کی کسالت تھی۔ ان کی باتیں ٹھمری کے بول محسوس ہوتیں۔ جب تک اس سکول میں رہے ٹوٹکیوں اور ڈراموں کا دور دورہ رہا۔ ایک شب کی محفل انہوں نے عنایت حسین بھٹی کے ساتھ قائم کی جس پر والس پرنسپل ملک مولیٰ نے انہیں چارج شیٹ کر دیا تھا۔ لیکن عنایت حسین بھٹی کو گجرات سے بلانے والا طالب علم الطاف احمد صاف بچ گیا۔ بہت عرصے کے بعد مجھے پتہ چلا کہ الطاف ملک کے معروف پنجابی افسانہ نگار حسین شاہ کے عزیز تھے لیکن اب وفات پا چکے ہیں۔

انجینئرنگ سکول رسول میں جو عزت و وقار اسحاق صاحب کو حاصل تھا، اس کی حسرت بے شمار اساتذہ کو تھی۔ اسحاق صاحب کا احترام سب طلبا دل و جان سے کرتے تھے۔ بلاشبہ وہ ایک منفرد قسم کے استاد تھے۔ ان کی شخصیت کے نقوش سب سے علیحدہ تھے۔ چہرے پر فکر انگیز خاموشی اور متانت لیکن لہجے میں بلا کی شیرینی اور گہرائی۔ وہ "ایڈوانسڈ میتھ" (Advanced Math) جیسا مشکل مضمون پڑھاتے تھے۔ لیکن ان کا طریق اتنا سہل تھا کہ طلبا کے ذہن میں اترتے چلے جاتے تھے۔ اسٹیج پر کھڑے ہو کر لیکچر نہیں دیتے تھے بلکہ گفتگو کرتے تھے۔ اور تدریس کے دورانیے میں اس طرح کھو جاتے کہ دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی۔ گرما کی دوپہروں میں برقی پنکھوں کی ہوا آنکھوں میں نیند کے خوابوں سا خمار اتار دیتی لیکن پروفیسر اسحاق آتے تو نیند اڑ جاتی۔ طلبا یوں ٹکٹکی باندھ کر انہیں دیکھتے اور سنتے کہ پلک تک نہ جھپکتی۔ جب اس سکول سے رخصت ہو کر بہاولپور صادق ایجرٹن کالج میں گئے تو سب طلبا انہیں رخصت کرتے وقت اشکبار تھے۔ یوں پڑھانے کو تو خانہ پری کے لیے کئی لوگ آئے لیکن وہ لطیف جو اسحاق صاحب کی زبان میں تھی کم کم لوگوں میں نظر آئی۔ نثار صاحب ہمیں ٹرگنومیٹری (Trignometry) پڑھاتے تھے۔ اس کی نسبت سے ان کا نام "تھیٹا" (Theta) مشہور تھا۔ ان کی جگہ حنیفا صاحب آئے تو انہیں بھی یہ نام وراثت میں ملا۔ حنیفا صاحب بھی اس سکول میں تھوڑے دن ہی لگے اور کوئی نئی ملازمت ملتے ہی سکول چھوڑ گئے۔

آغا شیریں جان ورکشاپ کے انچارج تھے۔ ان کی مست قلندرانہ طبیعت سب کے لیے معمہ تھی۔ آبنوسی رنگ اور سیاہ گھنگھریالے بال اور چوڑی چکلی چھاتی کے ساتھ وہ لڑاکا ... بالکل افریقہ کے حبشی لگتے تھے جو مسلمان ہو کر انجینئرنگ سکول رسول میں آ گیا تھا۔ غصے میں آتے تو آہنی ماڈل مسترد کر دیتے۔ چوبی ماڈل کی دھجی بکھیر دیتے۔ طبیعت جو دوستانہ مائل ہوتی تو وہ لوہا لے سینے سے ہاتھ مار کر خود ہی ماڈل تیار کر دیتے۔ طبعاً نہایت منکسر۔ سلام کا جواب "رحمت اللہ و برکاتہ" تک التزام سے دیتے۔ کسی طالب علم کو ان کے سامنے

اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر بال درست کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیوں کہ اس سے ان کے اپنے تنفر یا لیکچر یا والوں کی توہین کا پہلو نکلتا تھا۔ ان کی ایک نرالی عادت یہ بھی تھی کہ کبھی کسی لڑکے کو امتحان میں فیل نہیں کرتے تھے۔ کسی کی دست کاری اچھی نہ ہوتی تو امتحان کے ایام سے پہلے اسے زیادہ وقت کام کرنے کا موقع دیتے تا کہ وہ کامیاب ہو جائے۔ یہ الفاظ لکھ رہا ہوں تو میرے دل سے ان کے لیے دعا نکل رہی ہے۔ صوفی اللہ دتہ صاحب حال مست قال مست بزرگ تھے۔ ہر بات کے آخر میں وضاحت کے لیے "یعنی" استعمال کرتے اور بات کا نیا سرا پکڑ لیتے۔ غلام سرور صاحب فوجی دل و دماغ کے مالک اور ضابطوں کی پابندی سختی سے کراتے تھے۔

ملک موسیٰ صاحب سکول کے وائس پرنسپل تھے۔ ان کے کڑے نظم و ضبط کے قصے رخصت ہو جانے والی سینئر جماعت نئی کلاس کو وراثت کے طور پر پیش کر کے جاتی تھی۔ طبیعت بھر آہنی کہ لچک کا نشان دور دور تک نظر نہ آتا تھا۔ جس طرف سے گزرتے طلبا سہم جاتے اور کمروں میں پناہ ڈھونڈنے لگتے، یا ایستادہ بت کی طرح "تختہ ہو جاتے"۔ "باادب، باملاحظہ، ہوشیار، نگاہ روبرو ..... ملک موسیٰ صاحب کی سواری آ رہی ہے!" کی آواز اندر کا چوبدار سناتا۔ سکول کے بڑے بڑے چودھری ان کی چشم و ابرو کی تیوریوں کا سامنا نہ کر سکتے۔ اپنے مضمون میں اس قدر طاق کہ جب سینٹری (Santory) انجینئرنگ کا درس دیتے تو کمرے سے بو کے بھبکے اٹھنے لگتے۔ انہوں نے تقسیم ہند کے وقت ہندوستان کے صوبہ بہار کے فسادات اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اس لیے ان کی طبع آہن موم ہو چکی تھی۔ کسی پر بھولے سے بھی سختی نہ کرتے۔ لیکن گردش حالات دیکھیے کہ پرنسپل صاحب نے انہیں Hydrology (ہائیڈرولوجی) پڑھانے پر مامور کر دیا۔ ہر چند یہ موضوع ان کے لیے نیا بھی تھا لیکن جوہر کھلے تو تسلیم کرنا پڑا کہ وہ ہر میدان میں طاق اور انجینئرنگ کے ہر موضوع پر حاوی تھے۔

جناب مرتضیٰ ملک پتھر دل انسان تھے اور کوئی انہیں جھک نہیں لگا سکتا تھا۔ ہر چند سکول کے دونوں ہوسٹلوں (Hostels) کے مدارالمہام تھے اور طلبا سے ان کا دن رات کا واسطہ تھا لیکن چہرے پر غصے کی بجلی ہر وقت چمکتی رہتی۔ کلاس میں کسی کو آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے کی مجال نہیں تھی، نہ وہ کسی کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے تھے۔ لیکچر کے بعد ضمنی سوالات پوچھنے کی اجازت تو خارج از امکان تھی۔ سوال پر ایسی تیوری چڑھ جاتی کہ سائل کو جان بچانی مشکل ہو جاتی۔ اپنی اصل زندگی میں تو وہ خاصے بذلہ سنج تھے۔ بعض محفلوں میں ان کے سنائے ہوئے لطیفے باہر پہنچ جاتے تو طلبا ہنس ہنس کر دوہرے ہو جاتے اور پوچھتے کیا یہ لطیفے واقعی مرتضیٰ صاحب نے بیان کیے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ مرتضیٰ صاحب طلبا میں مقبولیت حاصل نہ کر سکے۔ اور وہ سب کے لیے اجنبی ہی رہے۔

محمود الحسن صدیقی دوسری طرف مرتضیٰ صاحب کی منفی تصویر کے برعکس مثبت جہت کے استاد تھے۔ مرتضیٰ صاحب چلچلاتی دھوپ تھے تو صدیقی صاحب شجر سایہ دار تھے۔ وہ ہمیں سول انجینئرنگ پڑھاتے تھے۔ اپنے لیکچر کی پوری تیاری کر کے آتے۔ گزشتہ روز کے لیکچر کا اعادہ کرتے۔ اور پھر نیا سبق دیتے۔ طلبا کی مشکلات دل جمعی سے سنتے اور ان کا حل بھی فراہم کرتے۔ امتحان ہوتا تو پرچہ اس انداز میں مرتب کرتے کہ ہر کسی کو آسان نظر آتا۔ نمبر دینے میں سخت تھے لیکن اس کی شکایت بھی کبھی کسی نے نہیں کی۔

یونس چودھری صاحب نے کبھی کسی کو جرمانہ نہیں کیا لیکن طلبا ان سے نالاں ہی رہے۔ وہ بے نامی سی چیز جسے لطیف کا نام دیا جاتا ہے ان کے مزاج سے متعلق تھی۔ جس سست رفتاری سے کلاس میں آتے تھے اس سے کئی گنا تیز رفتاری سے نوٹس لکھواتے تھے۔ کبھی وضاحت کی درخواست کی جاتی تو ایک تیکھا کڑوا سا جواب ملتا اور وضاحت کی درخواست اپنی طبعی موت مر جاتی۔ لیبارٹری کے انچارج مسٹر

لطیف تھے۔ وہ اس صحرا میں مرغزار کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ نہ ہوتے تو کنکریٹ (Cncrete) کا مضمون کچھ مشکل ہو جاتا۔ ہندوستان سے ایم آئی کرنے کے بعد انہیں اعلیٰ ملازمت مل گئی تو سکول چھوڑ گئے۔ انجینئرنگ سکول رسول میں سب سے برگزیدہ شخصیت خان بہادر عبدالرحمان کی تھی۔ وہ سکول کے ہردلعزیز پرنسپل تھے۔ انگریزی دور میں انجینئرنگ کے محکمے میں ہندو اقتدار کے خلاف سینہ سپر رہے۔ مسلمانوں کے حقوق کے لیے ہر جگہ علیحدہ قومیت کا پرچم بلند کر دیتے۔ ہندو چیف سے لے کر ہندو چپڑاسی تک سب ان کو اپنا کھلا دشمن تصور کرتے تھے۔ سازشی دماغوں نے ان کی ترقی کی راہ میں روڑے اٹکائے اور ان کے مستقبل کے ستارے اندھیروں میں کھو گئے۔ لیکن وہ ان مشکلات کا مقابلہ جوانمردی سے کرتے رہے اور اپنے ارادوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے اور کامیابی سے ہمکنار کرنے میں کوشاں رہے۔ ان کے عزم و استقلال کو ہندو کا سازشی ذہن پامال نہ کر سکا۔ ان کی جوانی کا موسم تو رخصت ہو چکا تھا لیکن سکول میں آتے تو عزم و حوصلہ دو چند نظر آتا۔ انجینئرنگ سکول فوجی ضابطوں کے مطابق ایک نیم تعلیمی ادارہ تھا۔ قواعد و ضوابط کی گراں پابندیوں میں مکمل طور پر ایک "قید خانہ" تھا۔ خان بہادر عبدالرحمان نے پابندیوں میں نرمی پیدا کی اور تعلیم کا معیار بلند تر کر دیا۔ استاد اور طالب علم کے مابین انس، محبت اور اپنائیت پیدا کی۔ ان کے پیش نظر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا انجینئرنگ کالج تھا۔ جہاں وہ کئی برسوں تک پرنسپل کی خدمات انجام دے چکے تھے اور خان بہادر کے خطاب سے سرفراز ہوئے تھے۔ وہ انجینئرنگ سکول رسول کو بھی علی گڑھ بنانا چاہتے تھے۔ بعض تنگ نظر ان کی کشادہ دلی پر ناک بھوں چڑھاتے اور ان کے منصوبوں پر منفی پروپیگنڈہ شروع کر دیتے۔ چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ وہ سابق انگریز پرنسپل کے رائج اور جامد نظام کو کلیۃً تبدیل نہ کر سکے لیکن اب تبدیلی کی طرف قدم ضرور بڑھ چکا تھا۔۔۔

یہ شب انجینئرنگ سکول رسول میں خوشگوار فضا خان بہادر عبدالرحمان نے پیدا کی تھی۔ وہ طلبا کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ کسی لڑکے کی تکلیف پر ان کا دل ڈوبنے لگتا۔ سکول کی رہائشی ڈسپنسری میں اس کے علاج کی خود نگرانی کرتے۔ لڑکے کے والدین کو ان کے بیٹے کی بیماری کی خبر تک نہ ہوتی۔ ہماری کلاس اس سکول میں تشکیل پاکستان کے بعد پہلی کلاس تھی۔ مقابلے کا امتحان 1947 کے اوائل میں ہوا تھا۔ منتخب ہندو طلبا داخلے سے پہلے ہی ہندوستان چلے گئے۔ پنجاب کے پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں یکدم سب انجینئروں کی کمی پیدا ہو گئی۔ اس لیے ہمارا کورس جو دو سال پر مشتمل تھا پہلے کم کر کے ڈیڑھ سال کیا گیا۔ پھر گرمیوں کی تین ماہ کی تعطیلات منسوخ کر دی گئیں۔ کورس کی تکمیل پر ہماری کلاس کو رخصت کرنے لگے تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بولے "رسول سکول کی یہ پہلی "میڈ ان پاکستان" (Made In Pakistan) کلاس ہے۔ آپ نے یہاں کم عرصہ صرف کیا ہے لیکن آپ کی تعلیم میں اساتذہ نے کمی نہیں کی بلکہ پہلے سے زیادہ محنت سے پڑھایا ہے۔ میں آپ سے توقع کرتا ہوں کہ آپ پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں اپنی عملی زندگی کے دوران محنت اور دیانت سے کام کریں گے اور سکول کی سابقہ روایات کو روشن کریں گے۔ رسول سکول کی اس کلاس نے اس خلا کو بڑی کامیابی سے پر کیا جو ہندوؤں کی نقل مکانی سے پیدا ہو گیا تھا۔ ان سب انجینئروں کو بی آر بی، جہلم، کینال اور راوی سائفن کی تعمیر کے متبادل منصوبوں پر تعینات کیا گیا۔ مثلاً کالا باغ اور تربیلا ڈیم کے سروے کی تکمیل کرائی گئی۔ اس کلاس کے بعض سب انجینئر ایگزیکٹو انجینئر کے عہدے پر پہنچے اور چوہدری منظور حسین اور میاں محمد انوار الدین ریٹائر ہوئے تو سپرنٹنڈنگ انجینئر کا گریڈ حاصل کر چکے تھے۔ خان بہادر کا خواب پورا ہو چکا تھا۔

◆◆◆

کچھ باتیں گزرے لمحوں کی

......1......

اعتبار ساجد

اظہر جاوید صاحب "سنے" کے نہیں "میں" کے آدمی تھے۔ بے انتہا مسحور کن لطیفوں کی پھلجھڑیاں چھوڑنے والے، خوشبو جیسے ان کے تعاقب میں رہتی۔ تعاقب میں تو اور بھی "چیزیں" رہتی تھیں لیکن سر دست ہم خوشبو ہی تک محدود رہیں تو اچھا ہے۔ "چیزوں" کا ذکر بعد میں کریں گے اور یہ بھی بتائیں گے کہ ایک مرتبہ انہوں نے ڈیٹ کو انگریزی میں "چیز" کیسے کیا اور اردو کی کونسی چیز انہیں حاصل ہوئی۔ ضیا ساجد بلا کا جملے باز اور قیامت کا لکھاری تھا۔ وہ ہمارا بھی گہرا اور بے تکلف دوست تھا، اظہر صاحب کا بھی۔ "دھنک" میں "سمرن چوہدری" کے نام سے لکھے ہوئے افسانے کیا شائع ہوئے ملک بھر میں دھوم مچ گئی۔ چھوٹے میاں تو چھوٹے میاں، بڑے میاں سبحان اللہ۔ ہمارا وہ اس لئے لکھنا پڑا کہ "دھنک" کے ایڈیٹر سرور سکھیرا کی معرفت سمرن چوہدری کو ڈھیروں ڈھیر جو خطوط ملتے تھے ان میں غالب اکثریت بڑے ادیبوں کی ہوتی تھی۔ یہ راز تین چار افسانے چھپنے اور ادبی دنیا میں خاصی ہاہاکار مچ جانے کے بعد ایک دن ضیا ساجد نے پرانی انارکلی میں چلتے چلتے مجھ پر افشا کر دیا کہ سمرن چوہدری کے پردے میں وہ بذات خود بقلم خود موجود ہے۔ ساتھ ہی اس نے کچھ خطوط بھی دکھائے جو سمرن چوہدری کے نام بڑے بڑے ادیبوں نے لکھے تھے اور کیا شاندار رومینٹک انداز سے لکھے تھے۔ افسوس اب وہ بڑے ادیب لوگ اس دنیا میں نہیں رہے لہٰذا ان کا تذکرہ اچھے ہی انداز میں کرنا چاہیے۔ البتہ ہمارے ایک بے تکلف بزرگوار سرور سکھیرا زندہ ہیں۔ زیادہ تر یورپ اور امریکہ میں رہتے ہیں کبھی کبھار پاکستان آتے ہیں تو ہم سے ضرور ملتے ہیں۔ نہایت نفیس، خوشبودار اور صندل جیسے آدمی ہیں۔ آج کل آئے ہوئے ہیں۔ پچھلے سے پچھلے سال جب آئے تھے تو بڑی بے تکلفی سے بتا دیا کہ یار، پہلے تو جب ڈاک سے سمرن چوہدری کا افسانہ موصول ہوا تو اسے پڑھ کر میں اسے چھاپنے اور سمرن سے ملنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ کمبخت گلبرگ میں میرے ہی دفتر میں حسن نثار اور طفیل اختر کے ساتھ کام کرتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے لفافے کے پیچھے اپنا کوئی ایڈریس نہیں لکھا تھا۔ ہینڈ رائٹنگ بھی بہت بدل بدل یا باریک اور نسوانی انداز کی تھی۔ اگر وہ لفافے کے پیچھے اپنا پتہ لکھ دیتا تو میں فی الفور اسے اپنے دفتر میں معقول مشاہرے پر ملازمت کی آفر کر دیتا۔ لیکن وہ تو پہلے ہی سے دھنک میں ملازم تھا۔ بڑی گڑبڑ ہوتی۔ اللہ نے بچا لیا۔ سرور سکھیرا صاحب تو اس معاملے میں بھی شامل ہیں۔ کیونکہ اس وقت تک ہم غیر شادی شدہ تھے اور بلوچستان کے ایک دور دراز کے کالج میں لیکچرار تھے۔ افسانے ہی اس قسم کے ہوتے تھے کہ رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔

نثار اکبر آبادی پاک ٹی ہاؤس کی بڑی باقاعدہ آئٹم تھے۔ عروض بھی جانتے تھے۔ کلام ترنم سے پڑھتے تھے۔ ملازمت ریلوے میں کرتے تھے۔ لہٰذا جتنے افسروں کی اولادوں کی شادی بیاہ یا ختنے کا وقت آتا تو سہرے اور رخصتیاں انہی سے لکھوائی جاتیں۔ ایک مرتبہ تو ایک افسر نے اپنے صاحبزادے کی رسم ختنہ کے موقع پر ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو آزمانے کی ٹھانی۔ اتفاق سے یہ کئی روز سے علیل تھے۔

اللہ نے علالت کی وجہ سے انہیں اس کام سے محفوظ رکھا ورنہ مروت کا مارا وہ مظلوم شاعر یہ کام بھی طوعاً و کرہاً کر ہی دیتا۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ اب بھی پورے پاکستان میں ایسے قادر الکلام شعرا موجود ہیں جو اس قسم کے کام خشوع و خضوع سے کر رہے ہیں۔ اس معاملے میں ہم زیادہ انکشاف کے موڈ میں اس لیے نہیں ہیں کہ ہمیں معلوم ہے بعض شعرائے کرام کی معاشی مجبوریاں انہیں اس ناگوار کام پر مجبور کرتی ہیں۔ بعض دل کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔ بعضوں کو مروت مار جاتی ہے۔ لہٰذا چلنے دیں جو کام چل رہا ہے۔ حساب کتاب اللہ نے لینا ہے ہم نے تھوڑی لینا ہے۔ ہم کون؟ خواہ مخواہ پرے دفع کریں ان فضول باتوں کو۔ کام کی بات کرتے ہیں اصغر جاوید کی ایک خوبی جو ہم نے بطور خاص نوٹ کی وہ یہ تھی کہ کسی کی تعریف منہ پر نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر ہماری تعریف تو کبھی ہمارے سامنے نہیں کی حالانکہ بہت پیار کرتے تھے۔ چھوٹا بھائی کہتے تھے۔ ایک روز ضیا ساجد نے بتایا کہ یار، اظہر صاحب تمہارے شعری مجموعے "پذیرائی" کی بہت تعریفیں کرتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں تمہاری شاعری کا ذکر ضرور آتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں۔ شکر ہے خدا کا پڑھا لکھا ہے۔ لیکچرار ہے۔ اچھے خاندان سے ہے۔ بات چیت بھی ڈھنگ سے کرتا ہے اور لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ بلوچستان میں ہے لاہور میں نہیں ہے یہاں ہوتا تو اقبال ساجد نے اس کا داخلہ بند کرا دینا تھا۔ میں نے ضیا ساجد کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے جو کچھ کہا تھا وہ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے کہا تھا "اقبال ساجد نسل نو کا سب سے بڑا اور سب سے مضبوط حوالہ ہے۔ میرا اس سے کوئی مقابلہ نہیں۔ میں ہر لحاظ سے اس کی بڑائی تسلیم کرتا ہوں۔ وہ شاعر نہیں جن ہے جن"۔ افسوس کہ اقبال ساجد اس دنیا کو بہت جلد چھوڑ گیا مگر وہ زندہ رہتا تو آج برصغیر پاک و ہند کے بہت سے قد آور شعراء کے چراغ گل ہو چکے ہوتے۔ باتیں تو بہت ساری ہیں۔ لیکن سلمان بضد ہے کہ تاخیر نہ کریں پرچہ تقریباً پریس میں جانے ہی والا ہے۔ ایک دن بھی آپ نے مضمون لکھنے میں تاخیر کی تو پھر آپ کی خیر نہیں۔ میں اظہر صاحب سے نہیں ڈرتا تھا کیونکہ وہ مجھ سے پیار کرتے تھے البتہ سلمان سے بہت ڈرتا ہوں کیونکہ میں اس سے پیار کرتا ہوں۔ اور جس سے پیار کیا جائے اس کی ناراضی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

بات پیار محبت کی چل ہی پڑی ہے تو ایک واقعہ بھی یاد آ گیا۔ ایک رات میں، اظہر غوری، ضیا ساجد اور اصغر جاوید پرانی انار کلی میں ایک مشہور قدیمی ہوٹل کی بیرونی میزوں میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ گپ شپ چل رہی تھی۔ ایک خاتون سامنے سے گزریں تو ہم کسی لطیفے پر ہنسنے کے مراحل میں تھے۔ وہ کچھ دور تو خاموشی سے چلتی چلی گئی جیسے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پھر کافی آگے جا کر تیزی سے میری طرف آئی۔ کسی کو اس نے کچھ نہ کہا۔ صرف انگلی کھڑی کر کے مجھ سے بات کی "یہ تم مجھ پر ہنس کیوں رہے تھے؟" میں گھبرا گیا۔ بڑی مشکل سے اوسان بحال کر کے کہا آپ پر نہیں ہم تو لطیفے پر ہنس رہے تھے۔ اس نے بڑی بے تکلفی سے پاس پڑی ایک کرسی کھینچی۔ میں سمجھا اب یہ مجھ پر حملہ آور ہونے والی ہے لہٰذا فوراً دفاعی پوزیشن میں آ گیا۔ مجھے حیرت اس وقت ہوئی جب وہ ہمارے قریب ہو کر اطمینان سے بیٹھ گئی اور بڑے اشتیاق سے بولی مجھے بھی سناؤ۔ اظہر غوری اس زمانے میں صوفی نہیں بنا تھا، داڑھی اب رکھی ہے۔ کہنے لگا بی بی! وہ لطیفہ آپ کو سنانے والا نہیں ہم عورتوں کا احترام کرنے والے لوگ ہیں۔"

◆◆◆

سفر نامہ

عراق اشک بار ہیں ہم

.......9.......

سلمیٰ اعوان

میجر ڈاکٹر عمال جمعہ۔ عراق نیشنل ایسوسی ایشن فار ہیومن رائٹس کی سربراہ کی تلخ و شیریں باتیں

بغداد کی مشہور زمانہ الرشید سٹریٹ کی بغلی گلیوں میں جہاں قدیم صاحب ثروت خاندانی بغدادیوں کے خوبصورت گھر تھے جن کا تعمیری انداز دمشق اور حلب کے گھروں جیسا ہی تھا۔ سیاہ گیٹ سے اندر قدم رکھتے ہی مجھے کشادہ آنگن میں فوارہ موتی برساتے نظر آیا۔ میرے بیچوں بیچ اس سبز گھاس کے قطعوں، پھولوں، وسیع و عریض آنگن میں جگہ جگہ دھرے نسوانی مجسموں نے میری آنکھوں میں خوشی بکھیر دی تھی۔

چونکہ وقت طے تھا اس لئے ملازم سیدھا نشست گاہ میں لے آیا۔ نشست گاہ کشادہ و اونچی چھت کے ساتھ ریلنگ والی تھی۔ صوفے پر بیٹھنے کی بجائے میں نے دیواروں پر آویزاں اس خاندان کے بڑوں کی تصویریں دیکھنی شروع کیں۔ ابھی پہلی تصویر سے دوسری پر ہی پہنچی تھی کہ ڈاکٹر عمال پاس آکر کھڑی ہو گئیں۔ میں نے فوری توجہ کی۔

کیا دلکش عورت تھی۔ گردن تک کٹے سنہری بالوں، بلاتی آنکھوں، شہابی رنگت اور دراز قد۔ کوئی چالیس40 یا پینتالیس45 کے پیٹے میں کھڑی۔ مختصر سا تعارف تو کرنل عیسیٰ البانی کی وساطت سے ہو ہی چکا تھا۔ انہوں نے تصویروں میں میری دلچسپی دیکھتے ہوئے مجھے بتانا شروع کیا۔

شاہ فیصل اول کے ساتھ ان کی کابینہ میں ڈاکٹر عمال کا پردادا۔ ایک وجیہہ سے نوجوان پر انگلی رکھتے ہوئے انہوں نے مجھے بتایا تھا یہ شاہ غازی شاہ فیصل کا بیٹا ہے۔

بیسویں صدی کی تیسری، چوتھی اور پانچویں دہائیوں کا بغداد اپنے کلچر، ماڈرزم اور خواتین کے حوالوں سے بہت شاندار سا تھا۔ انتہائی دلکش، طرحدار اور ماڈرن خواتین۔ شاہ فیصل کی والدہ ملکہ اور یہ ڈاکٹر عمال کی پردادی۔ تاریخ عراق کا بدترین انسان نوری السعید اور اس کی [illegible] بیوی۔ کیا حسین چہرے تھے۔ ان کے پہناوے، بالوں کے سٹائل۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں کسی میوزیم میں کھڑی بغداد کی تہذیبی زندگی کو ماہ و سال کے آئینے میں گزرتے دیکھ رہی ہوں۔

پھر میری نظریں ایک تصویر پر جم گئی تھیں۔ کیا چہرہ تھا۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویر مگر حسن پرانی تصویر سے ہی چھوٹ چھوٹ کر باہر نکل رہا تھا۔ میری آنکھوں سے چھلکتے حسن کو خراج پیش کرتے میرے جذبات ڈاکٹر عمال پر پوری طرح ظاہر ہوئے تھے۔ جب میں نے

استفہامیہ انداز میں انہیں دیکھا تھا۔

"شہزادی عزا ہے۔ شاہ فیصل کی بیٹی۔ اپنے یونانی خانساماں کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔ عیسائی ہوگئی تھی۔"

شاہ غازی کے ساتھ اس کے دادا کی تصویر جو ابھی پانچ چھ سال کا خوبصورت لڑکا تھا۔ 1956 کی پارلیمنٹ میں شاہ فیصل دوم کے عین ساتھ اس کا دادا جو اب ایک گھبرو رعنا جوان کا روپ دھارے چہرے پر سنجیدہ سی مسکراہٹ بکھیرے کھڑا تھا۔

اگلا منظر نامہ بڑا مختلف تھا۔ بادشاہت کے خاتمے کے بعد عبدالکریم قاسم کی حکومت کا بڑا معتقد اور سرگرم رکن کے طور پر تصویروں میں نمایاں تھا۔ حسن البکر اور صدام کے ساتھ دونوں باپ بیٹا بیٹھے تھے۔ باپ بعث پارٹی میں شامل ہو کر صدام حکومت کا حصہ بنا۔ صدام کی فیملی سے قربت اور فیملی تعلقات کا اندازہ ہوتا تھا۔ صدام کی دونوں بڑی بیٹیوں کی ڈاکٹر نوال کے ساتھ بھی تصویریں تھیں۔ باپ بھائیوں اور خاندان کی ماضی کی سرکردہ سیاسی شخصیتوں اور بدلتے وقت کے ساتھ نئے چہروں کے ساتھ تعلق نے مجھے پاکستان کی اشرافیہ یاد دلائی تھی۔

ایسی ہی ہر چڑھتے سورج کو پوجنے والی۔

"میں انقلابی ذہن کی مالک تھی اور ہوں۔ اپنے خاندان کی اس ہر نوالے بسم اللہ کو میں نے کبھی پسندیدہ نظروں سے نہیں دیکھا۔" ڈاکٹر نوال صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں۔

صوفے پر پاس پاس بیٹھے تو پہلی بات پاکستان کے حوالے سے ہوئی۔ ایسے تو دونوں کے دکھ مشترکہ ہیں۔ صدام کے بارے میں بات ہوئی تو انہوں نے دو ٹوک لہجے میں کہا۔

"میں صدام کی کبھی حامی نہیں رہی۔ مجھے سخت اختلاف رہا ہے اس کی پالیسیوں سے۔ مگر اس میں کچھ اعلیٰ پایہ کی خوبیاں بھی تھیں۔ وہ لبرل اور ماڈرن تھا۔ عراقی عورت کی آزادی اور اس کی اعلیٰ تعلیم کیلئے کوشاں۔ ملک کے ہر ضلع میں بی ایف آئی ڈبلیو تنظیمیں بنائیں۔ جنہوں نے عورتوں کی سیکنڈری لیول اور اعلیٰ تعلیم کیلئے بہت کام کیا۔

عبدالکریم قاسم کے زمانے سے صدام تک اس کا تسلسل کسی نہ کسی صورت جاری رہا۔ صدام کے مخالفین اکثر اس پر اعتراض کرتے تھے کہ وہ یہ سب بکھیڑ بازیاں بعث پارٹی اور حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کیلئے کر رہا ہے مگر یہ درست نہیں۔ عرب ممالک میں عراق سب سے پہلا ملک تھا جس نے سو فی صد شرح خواندگی کا اعزاز حاصل کیا اور جس کی پارلیمنٹ میں خاتون منتخب ہوئی۔ آج بہت ساری خواتین سیاست میں سرگرم ہیں۔

اس کی شخصیت کا یہ پہلو بھی بڑا روشن تھا کہ وہ صاحب کردار تھا۔ شراب اور شباب دونوں سے اسے پرہیز تھا مگر بڑا تند مزاج تھا۔ اس ضمن میں ہر اٹھنے والی ہر آواز کا گلا گھونٹنا اس کیلئے ضروری تھا۔ اس میں وہ اپنی اور غیری تمیز نہیں کرتا تھا۔ ذاتی مخالفت میں اس نے اپنوں کو بھی نہیں بخشا حتیٰ کہ خونی رشتوں کو بھی۔ اپنے دامادوں اور بیٹے تک کو نہ چھوڑا۔ اودے حسین صدام کا بڑا بیٹا۔ بڑا رعنا جوان تھا۔ قصے حسین بھی شہزادہ تھا۔ دونوں بیٹے امریکیوں کے خلاف مزاحمت میں مارے گئے۔ اودے حسین کی کہانی نے لرزا دیا۔

میرے تو سارے وجود نے تھرتھری لی تھی۔ صدام کے گہرے دوست اور اودے کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ دوست مارا گیا۔ صدام کو معلوم ہوا۔ پہلے تو بیٹے کو مار مار کر اس کا بھرتہ بنایا۔ اسپتال پہنچایا پھر عدالت میں گھسیٹا۔ ماں نے بیٹے کو بچانے کیلئے کوشش کی تو

اسے خاتون اول کے سارے اعزازات سے محروم کر دیا۔ ساجدہ اُسکی چچا زاد، بچپن کی ساتھی، راز دار، بیٹیوں کی ماں، زندگی کے ہر اُتار چڑھاؤ میں اس کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑی۔ اسے سزا دی۔ دوسری بیوی سے شادی کی اور سمیرا خاتون اول بن گئی۔

دونوں بیٹیوں رانعہ اور رغد کی شادیاں اپنے سگے بھتیجوں سے کیں۔ سُسر اور دامادوں کے درمیان کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔ دونوں داماد اپنی بیویوں کے ساتھ امریکہ چلے گئے جہاں وہ ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ انہیں واپس لانے میں شاہ اردن نے بڑا کردار ادا کیا۔ بیچارے بغداد آئے تو پہلا کام دونوں کو قتل کرنے کا ہوا۔

تاہم عام سا عراقی تو دہلوں کے خاندان سے۔ قبیلہ بھی بڑی حد تک ختم ہو گئی تھی۔ مجال تھی کہ مخالفت میں ان کی طرح جو ایک لفظ بھی ان جائے۔ بیچاری عام پبلک کس گنتی میں!

مردوں کو چھوڑ، سکول جانے والی لڑکیاں بھی انتہائی بے ہودہ روایات۔ صدام کی پہلی بیوی ساجدہ کی چھوٹی بہن انعم خیر اللہ رہبت القدومہ Rahibat al Taqdomah کر کیتھولک کانونٹ میں پڑھتی تھی۔ بھولے سے کسی مذہبی مسئلے پر ایک ہماری انتہائی قریبی ملنے والی کرد قبیلی کی لڑکی سے اختلاف ہوا تو لڑکی کو سبق سکھانے کیلئے سیکرٹ سروس والوں سے اغوا کرا دیا۔ خیر چند دنوں بعد لڑکی واپس آگئی۔

ابو غریب کا جیل خانہ جسے اب سنٹرل جیل کا نام دے دیا گیا ہے۔ یہ بغداد کے مغربی مضافات میں کوئی تیس کلومیٹر پر 1950 میں برٹش انجینئروں نے بنائی تھی۔ صدام نے اسے مزید وسعت دی اور اپنے گھناؤنے مقاصد کیلئے استعمال کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جیلیں اس نے بھی بھر رکھی تھیں۔ ابو غریب جیل میں ہی کوئی دس ہزار لوگ ہونگے۔ ان جیلوں میں تشدد ہوتا تھا۔ پھانسی گھاٹوں پر گردنیں بھی کٹتی تھیں۔ مگر یہ جیلیں بدمعاشی کے اڈے ہرگز نہیں تھیں۔ عورت پر کہیں زیادتی ہو، اسے برداشت نہیں تھا۔

امریکہ نے جب عراق کے جنگی تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کے بارے شور مچایا اور کہا کہ یہ ہتھیار ابو غریب جیل میں رکھے گئے ہیں۔ صدام نے جیل کے دروازے کھول دیئے۔ اور قیدیوں کو جو کسی نہ کسی جرم یا کسی نہ کسی سازش میں گرفتار تھے سبھوں کو آزاد کر دیا۔ یہ لوگ جب مارچ جیلوں سے نکلے تو امریکہ کا ساتھ دینے کی بجائے ان کے نعرے تھے۔

''ابو صدام ہمارا خون اور ہماری روحیں تم پر قربان ہوں گی۔''

ابو غریب جیل میں عراقی عورتوں پر امریکیوں کے ریپ اور Abuse پر جب بات ہوئی ڈاکٹر نمال نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا تھا۔

اس جمہوریت کے علمبرداروں نے جو ہمیں آمریت سے آزاد کروانے آیا تھا۔ اس نے قید خانوں کو Taboo بنا دیا ہے۔ اس ملک میں جہاں عورت کی عزت اور وقار میں ہی معاشرے کی جان ہے۔

خوبصورت عورتوں کے شوہروں کی پکڑ دھکڑ، ان کا گھروں کے اندر سے اغوا، ان کی عصمت دری، بعد میں کہیں انہیں جلانے کہیں پھینکنے، کہیں زندہ صورت جیلوں میں ٹھونسنے، کہیں ان کی دوسرے ملکوں میں سمگلنگ۔ بچے کہیں، مائیں کہیں اور شوہر کہیں۔ جب میں رپورٹیں بنانے کیلئے مختلف علاقوں میں جاتی تو ایسی ایسی ہولناک تصویریں میرے سامنے آتیں کہ مجھے لگتا تھا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ عام عراقی عورت تو یوں بھی اپنے بارے میں کوئی خبر دینا خود پر ہونے والے کسی ظلم کو دلیری سے عریاں کرنے کو پسند نہیں کرتی کہ قبائلی

روایات کا اسیر معاشرتی اعتبار سے بے حد حساس ہے۔ پیچھے رہ جانے والے خاندان کو حقارت بھری نظروں کے تیروں سے چھلنی کر دیتا ہے۔

شیعہ مسلک سے تعلق کے باوجود مجھے موجودہ حکومت کا رویہ قطعی پسند نہیں۔ امریکی ان کے مونڈھوں پر سوار ہیں۔ عورتیں اس تشدد کا زیادہ نشانہ بنیں اور بن رہی ہیں۔ ابھی بھی جیلوں میں بے شمار ہیں جنہوں نے مزاحمت کی اور مقامی پولیس اہلکاروں اور امریکی فوجیوں کو قتل کیا۔

البتہ مقامی پولیس کے بیچ لیلیٰ کے لوگوں نے اپنے پرانے غصے نکالے۔ مقامی عدالتوں نے انصاف نہیں کیا۔ یوں بڑے اور بہت ڈھنگ مظالم کے راستے ہموار ہوئے۔

ان واقعات کا ٹی وی چینلوں اور اخبارات کے ذریعے دنیا بھر میں چرچا اس انداز میں ہوا نہیں جیسے یہ واقعات اپنی سفاکیوں کے ساتھ پیش آئے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کے کارندے بھی اس تہہ پر جا کر حالات کے دامن میں نہیں اتر سکے۔ میں نے چند تصاویر جو انہیں دکھائیں وہ تو حیران پریشان رہ گئے۔ ننگی عورتوں کے پیر اٹھواتے، خود دائروں میں کھڑے ہو کر قہقہے لگاتے، چیختے رونے گاتے، ریپ کرتے، لاشیں جلاتے انسانی وحشت اور بربریت کی انتہا ہے۔ یہ جیلیں امریکیوں کے کالے کرتوتوں کا پاس ورڈ ہے۔

عراق کے مشہور شیلابی خاندان کی میڈیکل میں پڑھنے والی بچی کے ساتھ گینگ ریپ اور افراد خانہ کے قتل پر اصرار ساتے جو کچھ ہوا وہ لرزا دینے والی داستان ہے۔ گینگ ریپ کے دوران بچی مر گئی۔ اس کی لاش کو جلا دیا گیا۔ امریکی سپاہیوں کا چوتھا ساتھی جسے اس بچی کو گھر میں نہانے کا موقع نہ ملا تھا اس نے اس واقعے کی موبائل پر فلم بنا کر اوپر پہنچا دی۔

شیعی حکومت کا تو لہ انگشت بدنداں تھا اور ہر صورت مجرموں کے کورٹ مارشل پر مصر تھا مگر امریکن فوجی افسر اس لرزہ خیز واردات کو غیر موثر بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ گرینڈ جیوری نے کیمپ لبرٹی میں کیس کی سماعت میں کہا کہ آخری فیصلہ امریکی جنرل کرے گا کہ کورٹ مارشل ہونا چاہیے یا نہیں۔

مقتولہ کے وکیلوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر کیس کو مضبوط کر دیا تھا کہ بچارے ملزمان تو دہشت گردی کی مریضانہ حالت میں تھے۔ ان کی بٹالین کے متعدد ساتھی عراقی مزاحمت کاروں کے خودکش حملوں میں مارے گئے تھے وہ تو نارمل اخلاق یافتہ جنسی مجرموں کی فہرست میں ہی نہیں آتے ہیں۔

اب مجھے بتاؤ کہ اس کے باپ بھائی جو اینٹی القاعدہ تھے کیوں کر نہ القاعدہ میں شامل ہوتے۔ آپ انہیں تخریب کار اور دہشت گرد کہتے ہیں۔ یہ تو آپ خود بناتے ہیں۔

اللہ میرے اندر سے بین کرتی آوازیں نکلیں۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

(جاری ہے)

◆◆◆

یاد رفتگاں

عبداللہ حسین

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

اردو ادب میں کچھ اہلِ قلم ایسے بھی ہیں جنھوں نے انگریزی ادب میں بھی اپنا مقام پیدا کیا۔ ان میں عبداللہ حسین کا نام محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ انگریزی اور اردو ناول نویسی میں انھوں نے غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ نامساعد حالات میں بھی وہ ادبی دنیا تسخیر کرتے رہے۔ ان کی تخلیقات مقصدیت کے گرد گھومتی ہیں۔ ناول نویسی کے شہرت یافتہ شاہکار عبداللہ حسین 14 اگست 1931ء میں راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام محمد خان تھا۔ زمیندارہ کالج گجرات سے گریجویشن کی۔ 1950ء میں کیمیکل انجینئرنگ کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کینیڈا چلے گئے۔ حصولِ تعلیم کے بعد کچھ عرصہ لیبیا میں سیمنٹ کا کاروبار کیا۔ پھر لندن جا کر ملازمت کرنے لگے۔ فکرِ معاش میں سرگرداں رہے لیکن علمی و ادبی ذوق میں کمی آنے نہ دی۔ عبداللہ حسین کو تاریخی واقعات اور کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اسی شوق نے انھیں شاہراہِ ادب پر گامزن کیا۔ عبداللہ حسین کے ناول یہ ہیں۔ "اداس نسلیں"، "واپسی کا سفر"، "نشیب"، "باگھ"۔ جب کہ انگریزی میں آپ کا ناول Migrant اور افسانوی مجموعے بھی شائع ہوئے۔ ان کی تخلیقات کے تراجم بنگالی، ہندی، ہنگری اور پنجابی زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ ان کا ناول "اداس نسلیں" شائع ہوتے ہی بہت مقبول ہو گیا۔ یہ ناول پچیس سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا جب وہ داؤد خیل کی سیمنٹ فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ اس ناول پر 1965ء میں آدم جی ادبی انعام ملا۔ عبداللہ حسین کا ناول "اداس نسلیں" (1962ء) کا شمار بھی ان ادبی شہ پاروں میں کیا جاتا ہے جو غیر ملکی استعمار کاروں کی ریشہ دوانیوں اور ان کے نتیجے میں اس خطۂ ارض پر ہونے والی فکری، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

"اداس نسلیں" پہلی بار 1962ء میں شائع ہوا جب کہ اس کو لکھنے میں ناول نگار کو پانچ سال کا عرصہ لگا۔ اس ناول کی تحریر کا آغاز عبداللہ حسین نے 1956ء میں کیا جب کہ 1961ء میں یہ مکمل ہوا۔ "اداس نسلیں" کی کہانی کا دورانیہ تقریباً ایک صدی کے عرصے پر محیط ہے۔ اس ناول کے زمانی پھیلاؤ کے حوالے سے مختلف آرا سامنے آتی ہیں۔ بعض ناقدین کے خیال میں اس ناول کی کہانی 1913ء تا 1947ء جب کہ بعض کے نزدیک 1914ء تا 1947ء کے واقعات پر مشتمل ہے۔ عبداللہ حسین 4 جولائی 2015ء کو دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔

"اداس نسلیں" کی کہانی جس دور کی ترجمانی کرتی ہے، سیاسی اور سماجی حوالے سے یہ دور برِعظیم پاک و ہند میں خاصی کش مکش کا تھا۔ 1857ء میں مغل حکومت کے خاتمے کے بعد غیر ملکی سامراج نہ صرف اس علاقے پر مکمل طور پر قابض ہو چکا تھا بلکہ رفتہ رفتہ قبضے کے ساتھ ساتھ یہاں کی سماجی اور ثقافتی اقدار میں تبدیلی کا عمل شروع کر چکا تھا۔ صدیوں سے رائج سماجی نظام کی شکست و ریخت سے تشکیل پانے والی فضا میں مقامی باشندگان مختلف گروہوں اور طبقات میں تقسیم ہونے لگے تھے۔ ان میں سے ایک طبقہ وہ تھا جو غیر ملکی استعمار کاروں کا دستِ راست بنا ہوا تھا۔ ان کا کام ان بدیسی آقاؤں کی خوشنودی کے لیے ہونا جس کے عوض مراعات حاصل کر کے خود کو دوسروں سے اعلیٰ سمجھا

جاتا تھا۔ دوسرا طبقہ وہ تھا جو تمام تر شکست و ہزیمت اور زوال کے بعد اپنی قدیم مذہبی اور سماجی اقدار پر کاربند رہنے پر مصر تھا۔ ان کے نزدیک اس خطہ کے عوام کی فلاح کے لیے سامراجی طاقتوں سے نجات ضروری ہے۔

1857ء کی جنگ میں انگریزوں کے خلاف مسلمانوں نے بھرپور حصہ لیا۔ جنگ کی ناکامی کے بعد وہ ان کے لیے انتقامی صورت حال کا موجب بنا۔ جس کی وجہ سے اعلیٰ ملازمتوں سے لے کر تعلیم، سیاست حتیٰ کہ معاشرے میں قابل عزت مقام حاصل کرنے کے دروازے ان پر بند ہونے لگے۔ اس صورت حال نے ان باشندگان میں سیاسی، سماجی اور فکری حوالے سے ایک کشمکش کو جنم دیا۔ یہ کشمکش آگے چل کر 1947ء کی تقسیم ہند کا موجب بنی۔ دوسری طرف اس عرصہ میں ہونے والی دو عالمی جنگوں نے عالمی سطح پر خاصی ہلچل پیدا کی۔ ان جنگوں کی وجہ سے طبقاتی امتیازات علاقائی سطح سے اٹھ کر عالمی سطح پر چھاتے نظر آنے لگے۔ ''اداس نسلیں'' میں بھی عبداللہ حسین نے اسی سماجی، سیاسی اور فکری کشمکش کی عکاسی کی ہے۔

''اداس نسلیں'' کی کہانی کا جائزہ لیا جائے تو یہ ناول چار حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ برٹش انڈیا، ہندوستان، بٹوارہ اور اختتامیہ کے عنوانات سے اس ناول کو تقسیم کیا گیا ہے۔ ناول کا آغاز ایک گاؤں روشن پور کے تعارف سے ہوتا ہے۔ یہ گاؤں دو سرحدوں پر واقع ہے۔ دہلی اور پنجاب کی سرحدیں اس گاؤں کے وقوع کو متنازعہ بناتی ہیں۔ دہلی کا گروہ جو کہ عمر رسیدہ کسان احمد دین کی سربراہی میں ہوتا ہے۔ اس گاؤں کو دہلی جب کہ دوسرا گروہ جو رام سنگھ کی سربراہی میں مدعی ہوتا ہے کہ یہ گاؤں پنجاب میں واقع ہے۔ روشن پور کے تعارف کے بعد عبداللہ حسین ''اداس نسلیں'' کے جس کردار کا تعارف کرواتے ہیں، وہ روشن علی خان ہے۔ جو کہ ایک معمولی اہل کار ہوتے ہیں لیکن غدر کے دوران ایک زخمی انگریز افسر کی جان بچانے کے عوض میں جاگیر، خلعت اور آغا جیسے لقب سے نوازے جاتے ہیں یوں ان کا شمار طبقہ اشرافیہ میں ہونے لگتا ہے۔ انگریز سرکار کی طرف سے وسیع و عریض جاگیر حاصل ہونے کے بعد روشن آغا زمین کا کچھ حصہ اپنے دیرینہ دوست مرزا احمد بیگ کو عطا کر دیتے ہیں۔ مرزا احمد بیگ وہ کردار ہے جس کی نسل سے ناول کا ہیرو نعیم سامنے آتا ہے۔ مرزا احمد بیگ کا بیٹا نیاز بیگ باغی سرگرمیوں کے باعث گرفتار کر لیا جاتا ہے جب کہ اس کا بیٹا نعیم یہاں پر بھرپور انداز میں سامنے آتا ہے اور ناول کی کہانی نعیم کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہے۔ جنگ عظیم کے دوران نعیم باپ کی گرفتاری کی وجہ سے خاندان پر لگنے والے داغ کو دھونے کے لیے فوج میں بھرتی ہو جاتا ہے کیوں کہ عام طور پر کہا جانے لگا تھا کہ مرزا احمد بیگ کی گرفتاری کے بعد اس کی نسل کا کوئی فرد سرکاری ملازمت کا اہل نہیں رہا۔ یہاں بھی روشن محل ایک خاندانی جاہ و جلال کی علامت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ روشن آغا خود کو انگریز سرکار کا وفادار ثابت کرنے کے لیے ہر وہ کام کر گزرتے ہیں جس میں سرکار کی خوشنودی نظر آئے۔ روشن محل میں ہونے والی تقاریب میں انگریز افسران جس طرح شرکت کرتے ہیں اور روشن آغا سے جس طرح مراسم سامنے آتے ہیں تو آبادیاتی عہد میں عام آدمی کے لیے ان کا تصور بھی محال ہے۔

عبداللہ حسین نے ''اداس نسلیں'' کی کہانی کو جن واقعات سے ترتیب دیا ہے وہ نوآبادیاتی استعمار کاروں کی ریشہ دوانیوں سے لے کر تقسیم ہند پر مشتمل ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ناول تین نسلوں کی کہانی ہے۔ تین نسلوں کے ساتھ ساتھ اس ناول کی کہانی تین ادوار پر مشتمل نظر آتی ہے پہلا دور نوآبادیاتی دور حکومت، دوسرا جدوجہد آزادی جب کہ تیسرا دور آزادی ہند کے فوراً بعد کے واقعات پر مشتمل ہے۔

نوآبادیاتی دور کے واقعات کو اداس نسلیں کی کہانی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس دور کی سیاسی اور سماجی صورت حال کی عکاسی نظر آنے لگتی ہے۔ نوآبادیاتی استعمار کاروں نے برصغیر پاک و ہند پر قبضہ کرنے کے بعد یہاں اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے جو

حربے استعمال کیے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اس خطے کے باشندگان میں سے ایک ایسا طبقہ تشکیل دے دیا جائے جس کے اپنے مفادات انگریز سرکار سے وابستہ ہوں۔ یہ وہ طبقہ تھا جو معاشرے میں خاصے اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ "اداس نسلیں" میں عبداللہ حسین ہمیں سب سے پہلے جس کردار سے متعارف کرواتے ہیں وہ ایسے طبقے کا ہی نمائندہ کردار ہے۔ روشن آغا جو کہ روشن محل اور روشن پور کا مالک ہے۔ یہ ایسا کردار ہے جو ہر حال میں خود کو استعمار کاروں کا وفادار ثابت کرتا ہے۔ دوسری طرف اس دور میں ایک ایسا طبقہ سامنے آتا ہے جو استعمار کاروں کے خلاف کام کرتا ہے۔

مقامی باشندگان کے طرزِ زندگی میں بھی تبدیلی آنا ایک فطری عمل تھا کیوں کہ جب طبقہ اشرافیہ کی زندگیاں کسی نئی ڈگر پر چل پڑیں تو نچلے طبقے کے لوگوں کے طرزِ عمل میں بھی تبدیلی جنم لے سکتی ہے لیکن یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ استعمار کاروں کے تمام تر حربوں کے نتیجے میں بھی یہاں کے لوگوں کے ذہن سے قومیت اور وطن پرستی کا جذبہ ختم نہ ہو سکا تھا۔ خاص طور پر کسان اور مزدور طبقہ جو استعمار کاروں کی پالیسیوں سے سب سے زیادہ متاثر ہوا تھا اس طبقے کے افراد میں قومیت اور وطن پرستی کا جذبہ خاص طاقت ور تھا۔ جنگ عظیم کے دوران عالمی سطح پر ہلچل ہونے کے باوجود اس طبقے کو اپنا وطن ہی عزیز تھا یہی وجہ ہے کہ روشن محل میں ہونے والی تقریب میں موجود طبقہ اشرافیہ کے بعض لوگوں کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ یہ مزدور اور کسان طبقہ عالمی کی بجائے علاقائی صورت حال کا زیادہ تجربہ رکھتا ہے۔ تمام تر ہتھکنڈوں کے باوجود ان کے ذہن سے دھرتی کی قدر روائی اور قوم و وطن کی محبت کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ "اداس نسلیں" سے اقتباس ملاحظہ ہو:

> "میرے ملک کے یہ چھوٹے چھوٹے لوگ نہ ذہین ہیں نہ روحانی بزرگ۔ ان سے اگر کہا جائے کہ دنیا کی بہتری کے لیے آؤ تو وہ اپنا گندم بونا جاری رکھیں گے لیکن اگر کہا جائے کہ ہند کے لیے، اپنے فلاں بھائی، فلاں بہن کے لیے آؤ تو دیکھنا سنز پیسنٹ — یہ لوگ جو کھیتوں میں اور سڑکوں پر اور گلیوں میں کام کرتے ہیں، گو ذہین اور روحانی نہیں مگر عقل مند ضرور ہیں۔ وہ اپنے گاؤں، اپنی زمینوں، اپنے ماں باپ اور بچوں کے نام پر ضرور آئیں گے۔"

عبداللہ حسین نے "اداس نسلیں" میں نوآبادیاتی دور کی تشریح مختلف زاویوں سے کی ہے۔ کہیں وہ استعمار کاروں کی ریشہ دوانیوں سے پردہ اٹھاتے نظر آتے ہیں تو کہیں ان ریشہ دوانیوں کے اثرات کا افراد و معاشرہ کی زندگیوں پر مشاہدہ کرتے نظر آتے ہیں۔ نوآبادیاتی استعمار کاروں نے جہاں جہاں نوآبادیات قائم کیں وہاں کے باشندوں کے ذہن میں ایسا تصور رائج کرنے کی کوشش کی کہ وہ استعمار کاروں کو سابقہ حکمرانوں کی نسبت نجات دہندہ سمجھنے لگیں۔ اس تصور کو رائج کر کے دراصل استعمار کار، استعمار زدگان طبقہ کے ذریعے اپنے مفادات کا حصول چاہتے تھے اور وہ اس مقصد میں کامیاب بھی رہے۔ انگریزی سامراج نے اس علاقے کی نہ صرف دولت کو لوٹا بلکہ جب ضرورت پڑی تو جنگ میں جھونکنے کے لیے افرادی قوت بھی یہاں سے ہی حاصل کی گئی۔ اس کے حصول کے لیے اس طبقہ کو استعمال کیا گیا جو استعمار کاروں کا دست راست تھا۔ دوسری طرف جنگ میں جھونکے جانے والے افراد کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ یہ جنگ کس مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔

> "خیمے میں سے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ اٹھی۔ درمیان میں دو لڑکے باتیں کرنے لگے"
> ""لڑائی کہاں ہو رہی ہے؟" / "پتہ نہیں" / "لڑائی ہو کہاں رہی ہے۔ یہاں""

سامراجی طاقتوں نے جس خطے پر بھی قبضہ کیا وہاں جلد یا بدیر جنگ کے خطرات ضرور لاحق ہوئے۔ سامراجی ریشہ دوانیوں نے

بغاوت کے عناصر کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر خطے کی اپنی اقدار، ثقافت اور رواج ہوتے ہیں جب زمینی قبضہ کے بعد ثقافتی اور سماجی سطح پر تسلط و رسالت کا عمل شروع کیا جائے تو لازمی طور پر بعض افراد ایسے سامنے آتے ہیں جن کا نقطہ نظر اپنی اقدار کی بحالی ہی ہوتا ہے۔ حکمران وقت کی طرف سے اقدار کی پامالی کی صورت میں بغاوت کے عناصر معاشرے میں رواج پانے لگتے ہیں جس کا نتیجہ جنگ کی صورت میں نکلتا ہے۔ اداس نسلیں کی کہانی میں جنگی حالات کو جس طرح بیان کیا گیا ہے اس کے ساتھ سماجی سطح پر بہت سے تغیرات سامنے آتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح کرتا چلا جاؤں کہ اداس نسلیں میں جس جنگ کا احوال بیان کر کے کہانی تشکیل دی گئی وہ باقی عناصر کی طرف سے مسلط نہیں کی گئی تھی بل کہ عالمی استعماری قوتوں کی اپنے اپنے مفادات کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر مسلط کردہ جنگ تھی لیکن اس میں کام کرنے والی زیادہ تر جانیں انہی جوانوں کی تھیں جن کو نوآبادیاتی علاقوں سے زبردستی جنگ میں جھونکا گیا تھا۔ اس مقصد کے لیے انھیں فکری طور پر تیار کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آلہ کاروں کے ذریعے زبردستی فوج میں بھرتی کروایا گیا تھا۔ عبداللہ حسین نے ان تمام واقعات کو "اداس نسلیں" میں بیان کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اقتباس میں دیکھیے کہ یہاں کے باشندوں کو جنگ کے لیے تیار کرنے کے لیے کس طرح ذہنی طور پر تیار کیا جاتا تھا:

"اپنے ملک، اپنی حکومت کی حفاظت کرنے کا فرض ہر فرد پر عائد ہوتا ہے۔ جنگ تمھارے ملک اور تمہاری حکومت کو تباہ کرنے پہنچی ہے۔"

"جنگ انگلستان کو دھمکی دے رہی ہے۔ انگلستان کو دھمکی دے رہی ہے، میرا مطلب ہے آپ کی حکومت۔ حکومت برطانیہ کو بچانے کے لیے آپ کی ضرورت ہے۔"

"اپنے ملک" "اپنی حکومت" "آپ کی حکومت" یہ وہ خوش نما الفاظ ہیں جن کے ذریعے استعمار کار مقامی باشندوں کے ذہنوں میں خود کو ایک نجات دہندہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ یہاں کے غریب اور کسان لوگ عالمی نہیں بل کہ علاقائی محبت کے حامی ہیں۔ یہ لوگ دنیا کے لیے کچھ کریں نہ کریں اپنے وطن اور اپنے بہن بھائیوں کے لیے ضرور آگے آئیں گے۔ افراد معاشرہ کی نفسیات کی یہ کامیاب عکاسی "اداس نسلیں" میں ملتی ہے۔ یہی وہ نسل ہے جو حقیقی معنوں میں محروم اور اداس ہے کیونکہ پرائی جنگ میں جھونکے جاتے ہیں۔ جب ان کو یہ بھی نہیں پتہ ہوتا کہ جنگ کہاں ہو رہی ہے اور وہ کس مقصد کے لیے لڑ رہے ہیں۔

"تمھیں پتہ ہے ہم کیوں لڑ رہے ہیں؟" اچانک مہندر سنگھ نے پوچھا

"جرمنوں نے حملہ کیا ہے"—"کہاں؟" "روشن پور پر؟"—"یہاں—"

"یہ ہم یہاں کیوں ہیں؟ ہم کس لیے آئے؟"—"جرمن انگریزوں کے دشمن ہیں اور انگریز ہمارے مالک ہیں۔ بس"

"ہمارے مالک روشن آغا ہیں۔ میں اتنا جانتا ہوں"—"انگریز روشن آغا کے مالک ہیں۔ چناں چہ"

ہندوستان کا معاشرہ صدیوں تک اسلامی تہذیب و تمدن کا گہوارہ رہا۔ آقا اور مالک کے جو اسلامی تصورات اس معاشرے میں رائج تھے، وہ استعمار کاروں کے مفادات کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ تھے۔ اسی وجہ سے استعمار کاروں نے جب یہاں قدم جمائے تو انھوں نے افراد معاشرہ کی ذہنی تربیت ایسے غلط طریقے شروع کی کہ ان کے ذہن سے آقا اور مالک کے اسلامی تصورات مٹتے چلے گئے اور غلامانہ ذہنیت کی تہہ در تہہ سے روز تر ہوتی چلی گئی۔ صرف یہی نہیں بل کہ استعمار کاروں نے ایسے ہتھکنڈے استعمال کیے کہ یہاں کے

باشندوں کو اپنی ثقافت اور روایات فضول نظر آنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ استعمار کاروں نے اس خطۂ ارض کے لوگوں کی ذہنی تربیت اس طرح کی کہ وہ یہ جانتے ہوئے کے باوجود بھی پرائی جنگ میں خوشی سے [illegible] تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس ذہنی تربیت نے افراد و معاشرہ کو ظلم کی چکی میں مزید پسنے کے لیے تیار کر دیا تھا۔ عبداللہ حسین اداس نسلیں میں اسی ذہنی تربیت جو اصل میں ذہنی پسماندگی تھی، کے اسرار و رموز سے پردہ اٹھاتے ہیں۔

''اداس نسلیں'' میں عبداللہ حسین نے برطانوی استعماریت کے جو گہرے اثرات غریب عوام اور خاص طور پر کسان طبقے پر پڑتے ہیں ان کو نمایاں کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ مظلوم اور غریب کسانوں کی املاک کو ہتھیانے انھیں اپنے املاک سے محروم کر دینے کے عمل میں بھی استعمار کاروں نے ان جاگیرداروں اور امراء کو استعمال کیا۔ جن کا معاشرے میں بھی خاصا اثر و رسوخ تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حکومت برطانیہ کے بھی منظور نظر تھے۔ عبداللہ حسین کی ناول نگاری کا تخلیقی دور زیادہ تر ناولٹ نگاری پر مشتمل ہے۔ اس دور میں عبداللہ حسین کا صرف ایک ناول ''باگھ'' سامنے آیا جب کہ دو ناولٹ ''نشیب'' اور ''واپسی کا سفر'' کے علاوہ دو ناولٹ ''قید'' اور ''رات'' شائع ہوئے۔ اس دور میں ''اداس نسلیں'' سے ہٹ کر عبداللہ حسین نے نئے موضوعات اور نیا اسلوب سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

عبداللہ حسین کے ہاں طویل ناولوں کے ساتھ ساتھ ناولٹ لکھنے کا رجحان بھی عام ملتا ہے۔ ناولٹ اردو ادب کی ایک جدید صنف ہے، جس کی طوالت افسانے سے زیادہ اور ناول سے کم ہوتی ہے۔

اس دور میں شائع ہونے والے ناولٹ ''نشیب'' کی کہانی کا جائزہ لیجیے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ''نشیب'' میں عبداللہ حسین نے انتہائی اختصار مگر جامعیت کے ساتھ نو آبادیاتی سماج کے رویوں اور مختلف اداروں کے حوالے سے معلومات قاری تک پہنچائی ہیں۔ یہ سلسلہ ابھی رکا نہیں ہے۔ امریکی [illegible] اس کی عملی شکل ہے۔ آج طاقت کے بل بوتے پر دنیا پر حکمرانی کے خواب دیکھے جا رہے ہیں۔

یہ کیسا خواب دیکھا جا رہا ہے   یہ کیا تعبیر ہوتی جا رہی ہے

نو آبادیاتی نظام کے خلاف ممتاز انگلش ٹیچر اور شاعر پروفیسر غلام جیلانی اصغر نے عبداللہ حسین سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

> ''عبداللہ حسین نسل نو کو اپنا انفرادی تشخص برقرار رکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ نسل نو کی صلاحیتوں کا معترف ہے لیکن ان کی اداسی کو بھی فطری سمجھتا اور جانتا ہے۔ وقت ایک سا نہیں رہتا نشیب و فراز زندگی کے ساتھی ہیں۔ وقت کو ثبات حاصل نہیں ہے۔ عبداللہ حسین نے نثر سے وہ کام لیا ہے جو اکثر علامہ محمد اقبال شعروں سے لیا کرتے تھے۔ عبداللہ حسین کا اسلوب بھی مقصدیت کے گرد گھومتا ہے۔ اس کا ہر عمل ایک مثبت دائرے کی پکار ہے جو اس نے نسل نو کے گرد کھینچ رکھی ہے۔''

''نشیب'' کی کہانی بنیادی طور پر ایک قتل کے واقعے کے گرد گھومتی ہے۔ وہ قتل ایک مرد مظفر کے ہاتھوں اس کی بیوی کلثوم کا ہے جو وہ اپنی بیوی کو بدچلنی کے شبہ میں موت سے ہمکنار کرتا ہے۔ اس قتل کے پیچھے عبداللہ حسین نے محبت کا اصول جذبہ بھی جھلکتا دکھایا ہے کہ مظفر اپنی بیوی کلثوم سے اس حد تک محبت کرتا ہے کہ کسی اور کا ہو جانا اس کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔

◆◆◆

روشنی مثال ـــــ اعزاز احمد آذر کا حرفِ لازوال

حسن عسکری کاظمی

اردو شاعری میں جتنی بھی اصناف برتی گئیں ان میں سے بیشتر کا تعلق عقائد اور تعلیم دین سے ہے۔ اردو زبان کے علاوہ دنیا کی دوسری زبانوں کی کلاسیکل شاعری میں بھی بیشتر سرمایہ عقائد اور مذہبی رسوم پر ہی ہے۔ دراصل اولادِ آدم کے خمیر میں یہ بات شامل ہے کہ وہ کسی نہ کسی عقیدے کو اپنائے اور دوسروں کو اپنا ہم عقیدہ بنائے۔ ہمیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ عقیدہ درست ہے یا غلط یا مبہم ہے۔ اردو شاعری میں آغاز سے آج تک اور آئندہ بھی شعرا اپنے عقیدے میں یقین رکھتے ہوئے اپنے مذہبی پیشواؤں کے واقعات زندگی، ان کے کردار و افعال، سیرت و صورت، حیات و موت کو اپنی شاعری میں سرفہرست رکھنا پسند کریں گے۔ صرف مسلم شاعروں پر موقوف نہیں بلکہ غیر مسلم شعرا بھی نظریاتی حق جوئی، احترام عقائد اور اپنے مذہبی رہنماؤں کے کارناموں کو منظوم خراج عقیدت پیش کر کے روحانی طور پر اپنا اطمینان چاہتے ہیں، گولکنڈہ اور بیجاپور کی ریاستوں میں حکمرانوں کا یہی چلن رہا۔ اس طرح غیر مسلم شاعروں میں چکبست اور راجندر سنگھ بیدی نے مذہبی شاعری میں نام کمایا اور عہد موجود میں کرشن کمار طور نے نعت گوئی اور منقبت نگاری سے اردو زبان کو مالا مال کیا۔ چکبست نے اردو مسدس یا مرثیے کی ہیئت میں رام چندر اور سیتا کے واقعات اور ان کی سیرت و کردار کو موضوع سخن بنایا اور بیدی نے نعت اور منقبت کہہ کر اعلان کیا کہ محسن انسانیت سے انہیں بھی محبت ہے، اسی طرح شہید اعظم ان کے لئے بھی مشعل ہدایت ہیں۔

عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں   صرف مسلم کا محمد پہ اجارہ تو نہیں

اور منقبت میں شیخ عالم مشعل دیتا ہے ارباب دین حسین کہہ کر یہ ثابت کیا کہ عظیم المرتبت ہستیاں عالم انسانیت کے لئے قابل فخر ہیں۔

اردو شعرا نے حمد، نعت، سلام، منقبت اور دوسری متصوفانہ شاعری میں کمالات اور قدرت سخن کا ثبوت پیش کیا۔ اس کی تفصیل سے قطع نظر اعزاز احمد آذر کے مجموعہ کلام "روشنی مثال" میں ایسی امثال موجود ہیں جو ان کے عقائد اور دینی شغف کا بین ثبوت ہے۔ ان کے اس مختصر مجموعہ شاعری میں وہ سب کچھ یکجا کر دیا گیا ہے جو ان کی مذہبی شاعری کے حوالے سے حسن اعزاز نے دو ذاتی قطعات کے ساتھ شائع کرنا ضروری خیال کیا۔ یہ قطعات پنجابی زبان میں لکھے گئے:

کدی کدائیں آ جاندے سن   دو گھڑیاں دے آ کے لگے
ہن او اتھرو وی سک گئے نیں   ساہ لیندے وی مشکل ہو گئے
تیرے باجھوں اج لگدا اے   جیہڑے پچھلے کے او گئے اوہو
میرے سارے کم مک گئے نیں   ساری عمر دا حاصل ہو گئے

(حسن اعزاز)

ایک شفیق اور مہربان ہستی کے فراق میں یہ انتساب معانی سے پُر ہے۔ اور کتاب کا آغاز حسن اعزاز کے طرزِ احساس کی انفرادیت کا آئینہ ہے۔

اعزاز احمد آذر ایک ایسے قلمکار اور خوش گفتار شخصیت کا سرمایہ ہے جس نے دوستوں میں رہ کر دوستوں کے دل جیتے اور فراخ دلی کے ساتھ ان کی تحریروں کو جانچا، پرکھا اور اپنی رائے کے اظہار میں صحت مند رویہ اختیار کیا۔ اسی طرح اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت نشریاتی اداروں میں ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کو متعارف کرایا۔ ان کی زندگی ادبی سرگرمیوں کے فروغ دینے میں صرف ہوئی خصوصاً جب وہ کیپٹل سنٹر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان تمام مصروفیات کے باوجود ان کے اپنے تخلیقی کارنامے ظہور پذیر ہوئے۔ اردو اور پنجابی زبان کو وسیلہ اظہار قرار دے کر کئی شعری مجموعے اور تنقیدی اور تحقیقی کام نذرِ قارئین کئے۔ یہ حمدیہ نعتیہ اور سلام اور منقبت کا مجموعہ "روشن مثال" جس کے تمہیدی کلمات افتخار مجاز نے ترتیب دیے ہماری آنکھوں میں نور و فور اور دیدۂ بینا میں عرفان و آگہی کے شش جہات سامنے لا کر ہماری عقیدت کو سہ چند کرنے کا سبب بنا ہوا ہے۔

اعزاز احمد آذر کی نعت نگاری میں عجز و انکسار، سوز و گداز اور دلِ دردمند کی پکار پائی جاتی ہے۔ وہ بارگاہِ رسالت مآب میں حضوری کے پُر نور لمحوں میں ایک فقیر بے نوا بن کر سر جھکائے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا لہجہ صاحبِ صدق و صفا عاشق کی طرح کانوں میں رس گھولتا ہے۔ ان کی نعت ہم عصر شعرا میں اپنی پہچان الگ رکھتی ہے۔ وہ حفیظ تائب کے اسلوب کا آئینہ ہیں مگر وہ عرضِ مدعا میں اپنا اندازِ اظہار جداگانہ رکھتے ہیں۔

مجھے نعلین سے اپنے لپٹ جانے دے اے آقاؐ — میں صدیوں کا سفر کر کے تری چوکھٹ پہ پہنچا ہوں
زمیں کے ایک ذرے کو بلندی آسمانی دے — مجھے اذنِ حضوری دے بہ راہِ مہربانی دے
فقط اتنی سی رحمت ہاتھ رکھ دے میری آنکھوں پر
میرے آقاؐ مرے ہونے کی ہی مجھ کو نشانی دے

اعزاز احمد آذر کے پہلو میں ایسا دل مضطرب تھا کہ وہ ہر لمحہ مصروفِ عمل رہتے رہے۔ تخلیقی عمل میں انہیں مثبت اندازِ نظر اور فلاحِ انسانیت عزیز رہی۔ "روشن مثال" میں نعتوں کے ساتھ نعتیہ نظمیں عجب کیف و سرور کی حامل ہیں۔ اعزاز احمد آذر کی عقیدت پسند طبیعت کے پیشِ نظر یہ کہنا لازم کہ جہاں ایک طرف تخیل اور جذب و شوق کا ہونا لازمی ہے وہاں حزم و احتیاط اور سوزِ دروں اور دل و نظر کا باوضو ہونا ضروری ہے اس لئے وہ جانتے ہیں کہ اعلیٰ معیاری نعت خامۂ مژگاں کو خونِ جگر میں ڈبو کر اور ہمہ تن خضوع و خشوع اور یکسوئی کے ساتھ کہی جاتی ہے۔ یہ وہ تخلیقی عمل ہے جسے تائیدِ ایزدی کی سندِ اعتبار حاصل ہوتی ہے۔

اپنی بانہوں میں چھپا لے اے سہارے میرے — ایک مدت سے ہیں گردش میں ستارے میرے
خاکِ پا تیری چُن کر ہوں میں نکلا گھر سے — کہکشاں کیوں نہ بھلا صدقے اتارے میرے
جس موسم میں کوئی تازہ ہوا کا جھونکا — کام بگڑے ہوئے تُو نے ہی سنوارے میرے

اعزاز احمد آذر کشادہ نظر، حق شناس اور دینِ اسلام کے محسنوں سے محبت رکھنے والے ایسے فردِ منفرد ہیں کہ وہ اپنی عقیدتوں کا

مرکزِ محور، عالمِ اسلام کے خیر خواہوں اور جاں نثاروں کے ذکر کو عبادت خیال کرتے ہیں۔ خصوصاً سید العہد اولواب، رسولِ مقبول، جگر گوشہ بتول اور دلبندِ علی حضرت امام حسین علیہ السلام سے بے پناہ محبت کرنے والے ہیں۔ انھوں نے مجالس مسالمہ کے انعقاد کا اہتمام کیا، نظامت کے فرائض انجام دیے اور خود بھی سلام بحضور امامِ عالی مقام پیش کرنے کی سعادت حاصل کی۔ اس مجموعے میں جو سلام شامل ہیں، ہر شعر قاری کے دل میں ترازو ہو جاتا ہے اور آنکھوں میں شبنمی آنسو تیرتے دکھائی دیتے ہیں۔

وہ جو کربلا کی زمین ہے، وہ صداقتوں کی امین ہے ۔۔۔ وہ کڑکتی دھوپ وہ تشنگی، وہ بلکنے والوں کی بے بسی
ہے گواہ تیغِ ستم گراں، وہاں سر کٹے تھے جھکے نہیں ۔۔۔ مگر ایسا صبر کہ اس گھڑی کسی لب پہ شکوے گلے نہیں

اعزاز احمد آذر نے "شامِ غریباں" کا منظر نامہ رقم کیا جو حزنیہ شاعری میں اپنی مثال آپ ہے، یہ نظم نو اشعار کا مرقع ہے جس میں درد و غم اور حسرت و یاس کو اپنے لہو کی روشنائی سے جاذبِ نظر بنا دیا ہے۔

اے وقت ٹھہر، سن، کوئی مانوس صدا ہے ۔۔۔ یہ شامِ غریباں ہے، لہو بول رہا ہے
رکتے نہیں اک پل کو بھی تاریخ کے آنسو ۔۔۔ وہ ظلم جو خیمۂ افلاک ہوا ہے
کچھ یاد نہیں مجھ کو بجز یادِ سکینہ ۔۔۔ اس غم میں ہر اک غم ہی مجھے بھول گیا ہے

"روشن مثال" میں حمد سے آغاز ہوا کر زمیں پہ سبز و قطب پتارے / جہاں بھر کے یہ سب نظارے / 7 اپنی شہکار ہے خدایا اور آخری حصے میں پنجابی کلام میں نعت، کافی اور بجھارتی یا شامل کر کے جو حسن اعزاز نے یہ خوشگوار فریضہ انجام دیا کہ اعزاز احمد آذر کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت سے "فرزندِ ارجمند" ہونے کا ثبوت پیش کیا جو حسن اعزاز کے لیے باعثِ اعزاز ہے۔ "روشن مثال" کا سرورق دیدنی ہے کہ صاحبِ کتاب کا چہرہ اپنے قارئین اور سامعین کی نگاہوں میں سما جاتا ہے اور دلوں میں "روشن مثال" کا مطالعہ کرنے کا اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ حسن اعزاز اپنے والد گرامی کی شخصیت اور فن کا عکسِ جمیل ثابت ہوا اور آخر میں افتخار مجاز کی یہ رائے مستحکم ہے کہ ان کے لفظ لفظ، حرف حرف، مصرعے مصرعے اور شعر شعر میں ان کی گہری عقیدت بھی دھڑکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں اور اکثر اوقات تو یوں بھی لگتا ہے جیسے وہ اپنے قاری کا ہاتھ تھامے اسے قدم بہ قدم اپنے ساتھ لیے جا رہے ہیں۔ ان کے شعروں میں تازہ کاری بھی ہے اور شگفتگی بھی ان کے شعروں میں لطافت کا ایک جہاں ہے جو ان کی نعت نگاری میں آباد ہے۔

◆◆◆

معروف ادیب، شاعر، تجزیہ نگار **حسن عسکری کاظمی** کا نیا مجموعۂ نعت

شہرِ نبوت

شائع ہو گئی ہے ——— قیمت -/300 روپے

ملنے کا پتہ: G-46، ادارہ مطبوعہ منظر، فوڈ سٹریٹ، اردو بازار، بھاٹی چوک لاہور (04237361215, 03454320072)

دی گریٹ راوین استاد ——— پروفیسر صابر لودھی

محمد ساجد

پروفیسر صابر لودھی 12 دسمبر 1933ء کو ہوشیار پور (مشرقی پنجاب، ہندوستان) کے ایک گاؤں مہاجری یا بدھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد عبدالستار خان متحدہ ہندوستان کے زمانے میں ایک سکول میں استاد تھے۔ ان کی کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ پروفیسر صابر لودھی، حضرت علاؤالدین صابر پیا کے کلیاری کی دعا سے پیدا ہوئے اور اس کے ایما پر آپ کا نام محمد صابر علی رکھا گیا۔ یوں محمد صابر علی خان لودھی، زمانے میں پروفیسر صابر لودھی کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان کا بچپن ہوشیار پور میں گزرا۔ قیام پاکستان کے بعد ضلع مظفر گڑھ میں رہائش اختیار کی۔ انھوں نے 1950ء میں گورنمنٹ ہائی سکول علی پور ضلع مظفر گڑھ سے میٹرک پاس کیا۔ انٹرمیڈیٹ کا امتحان 1952ء میں گورنمنٹ انٹر کالج مظفر گڑھ اور 1954ء میں بی۔اے ایمرسن کالج ملتان سے پاس کیا۔

شعر و ادب سے دلچسپی ان کو اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی، لاہور لے آئی۔ اس زمانے میں اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر وقار عظیم اور ڈاکٹر عبادت بریلوی جیسے بلند پایہ اساتذہ پڑھاتے تھے۔ پروفیسر صابر لودھی نے 1956ء میں اسی درس گاہ سے ایم۔اے اردو کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ ان کے تھیسز کا عنوان ''اردو ادب میں مثنوی کا ارتقا'' تھا۔ 1958ء میں اسی مادر علمی کے شعبہ فارسی سے ایم۔اے فارسی کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا۔

1958ء میں ہی اٹچیسن کالج لاہور میں بطور اردو لیکچرر پروفیسر صاحب کی تعیناتی ہوئی۔ 59-1958ء میں پنجاب پبلک سروس کمیشن کا امتحان دیا اور پنجاب بھر میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔ 1959ء میں میونسپل کالج اوکاڑہ میں اپنی تدریسی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ 1961ء میں میونسپل کالج اوکاڑہ سے تبادلہ کروا کر گورنمنٹ ڈگری کالج مظفر گڑھ میں چلے گئے۔ 1961ء میں ہی پروفیسر صابر لودھی، گورنمنٹ کالج، لاہور جیسی شاندار روایات کی امین درس گاہ میں وارد ہوئے۔ اسی سال گورنمنٹ کوئین میری کالج، لاہور کی چیف لائبریرین فرخندہ لودھی سے شادی کی۔ یوں اردو ادب میں نئی ادبی جوڑی کا اضافہ ہوا۔ وہ اپنی شخصیت اور اپنے انداز گفتگو کے سبب راوینز میں چھائے رہے۔

1966ء میں پروفیسر صابر لودھی جنرل سیکرٹری، ویسٹ پاکستان لیکچرار ایسوسی ایشن منتخب ہوئے اور صدر ایوب خان کے خلاف چلنے والی بحالی جمہوریت کی تحریک میں بھرپور حصہ لیا۔ ویسٹ پاکستان لیکچرار ایسوسی ایشن کے بینر تلے اولڈ کیمپس کے صدر دروازے کے باہر بھوک ہڑتالی کیمپ لگا ہوا تھا جہاں پروفیسر صاحب اور ان کے رفقا ایوب خان کے خلاف نعرے لگاتے تھے۔ اس کے استعفیٰ کے ساتھ یہ کیمپ بھی ختم ہو گیا۔ 1974ء میں پروفیسر صاحب کو اسسٹنٹ پروفیسر اور 1986ء میں ان کو ایسوسی ایٹ پروفیسر کا گریڈ ایوارڈ ہوا۔ انھوں نے 1986ء میں علمی، ادبی اور فکری میگزین مجلہ راوی کے نگران کے طور پر کام شروع کیا اور مجلہ راوی کے بہترین نمبر نکالے جن میں نمایاں تر راوی کا صدی نمبر بھی شامل ہے۔

وہ تینتیس سال تک گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور پروفیسر آف اردو (اردو ادب) کو پڑھاتے رہے اور 12 دسمبر 1994ء میں ریٹائر ہو گئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور جیسی وطن عزیز کی عظیم الشان درس گاہ میں اتنے سالوں تک تعلیمی و تدریسی فرائض سرانجام دینا کوئی آسان کام نہ تھا کیونکہ اس ادارے میں کم علم اور عام استاد کا پڑھانا خاصا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ 1994ء میں ہی پروفیسر رفیع الدین ہاشمی صاحب، پروفیسر صابر لودھی کو اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو میں بطور جز وقتی استاد لے گئے۔ بعد ازاں ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا نے ان کے دورانیے میں اضافہ کر دیا۔ 2013ء میں پروفیسر صاحب کو جز وقتی استادی کی ملازمت سے ہٹا دیا گیا۔ اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ اردو کے بدلتے ہوئے ماحول اور حالات و واقعات نیز تھیں دن کی اہلیہ نے ان کے لیے بہت مشکلات پیدا کر دی تھیں۔ یوں اس نابغہ روزگار شخصیت کو گھر بیٹھنا پڑا۔ فرخندہ لودھی کی وفات (5 مئی 2012ء) نے ان کو پہلے ہی تنہا کر دیا تھا۔ دل کے روگ نے ان کو آن گھیرا اور وہ اس روگ کے ہاتھوں 30 دسمبر 2014ء بروز منگل شب اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ان کی سوانح عمری "ہمارے بعد" جو کہ ضمیر کاظمی کی کے شعر سے ماخوذ تھا، نامکمل رہ گئی۔ ان کی فقط پانچ اقساط ماہنامہ "الحمرا" میں چھپ پائی تھیں۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ انھوں نے ایک قلمی نام "ابن اسمٰعیل" اختیار کیا اور "ادب بے ادب" کے عنوان کے تحت انشائیہ کالم لکھے جن میں چاپلوسی کرنے والے ادیبوں کی خوب درگت بنائی۔ انھوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے وابستہ رہنے والے افسانہ نگاروں کے بہترین افسانوں کو "راوی افسانے" کے عنوان کے تحت مرتب کیا اور خود ہی اس انتخاب کے لیے ایک زبردست مضمون بعنوان "راوی کی موجیں" لکھا جو کہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ انھوں نے ایک انشائیہ "انتظار کا موسم" لکھا جس کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ ڈاکٹر انور سدید نے اس انشائیے کو اردو ادب کے بہترین انشائیوں میں شمار کیا ہے۔ ان کی زندگی کی آخری تحریر میری کتاب "داستان الیون۔ حقیقت سے اردو افسانے تک" پر لکھا گیا دیباچہ ہے جو میں نے بڑی محبت سے لکھوایا تھا اور انھوں نے بڑی محنت کے ساتھ لکھا تھا۔

تحقیق اور تنقیدی لحاظ سے ان کا کام بکھرا پڑا ہے۔ چند مضامین میں تلاش کر پایا ہوں ان کی تفصیل کچھ یوں ہے تنقید کا جمالیاتی دبستان، ہومر ـــــ ایک مطالعہ، مولانا روم (شخصیت اور فن)، شیکسپیئر کی شاعرانہ عظمت، سارتر اور فلسفہ وجودیت، احمد فراز ـــــ رومان سے مزاحمت تک، شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کا بہت سا تحقیقی اور تنقیدی کام سامنے لانے کی ضرورت ہے اور یہ ان لوگوں پر فرض اور قرض ہے جن کے پاس ان کا کام پڑا ہے کہ وہ اس کو سامنے لائیں۔

ان کی ایک ہی کتاب "بھلایا نہ جائے گا" 2012ء میں شائع ہوئی جو خاکوں پر مشتمل تھی ایک عجیب و غریب بات جو ان کی زندگی سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے، وہ تین یا تینتیس کا ہندسہ ہے۔ وہ 1933ء میں پیدا ہوئے۔ میٹرک سے ایم اے تک ان کا رول نمبر تینتیس رہا۔ پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں ان کی نمبر تین پوزیشن آئی۔ وہ 30 دسمبر کو فوت ہو گئے۔ وہ تین یا تینتیس کو اپنا لکی نمبر قرار دیتے تھے۔ ان کے راو عزیز شاگردوں کے بقول "گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ اردو ادب میں ایسے استاد بہت کم رہے ہیں جو طالب علموں کا دل جیت [illegible] لیتے تھے اور کلاس روم میں چھا جاتے تھے۔ پروفیسر صابر لودھی ان میں سے ایک تھے۔"

آخر کار کہنا پڑتا ہے کہ" ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم"

◆◆◆

خاکہ

افتخار مجاز

ملک مقبول احمد

آپ سن کر حیران ہوں گے کہ افتخار مجاز کو جب تک قریب سے ملنے اور ان سے بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا تو میں انہیں سرور مجاز مرحوم کا صاحبزادہ سمجھتا رہا۔ ایک دن اردو کے معروف شاعر اعزاز احمد آذر مقبول اکیڈمی پر تشریف لائے تو کہنے لگے کہ افتخار مجاز کو اپنی اکیڈمی کی کتابیں بھجوائیں، ان دنوں وہ پی ٹی وی پر کتابوں کی رونمائی کر رہے ہیں۔ میں ان کا نام سن کر یہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔

وہی "افتخار مجاز جو سرور مجاز مرحوم کے بیٹے ہیں"۔ میری بات سن کر اعزاز احمد آذر ہنس ہنس کر دوہرے ہو گئے۔ جب ہنسی رکی تو بولے۔ "افتخار مجاز میرا چھوٹا بھائی ہے"۔

میں نے اپنی شرمندگی کا اظہار کیا تو بولے۔ "آپ ہی نہیں، اکثر لوگ یہی سمجھتے ہیں"۔

لیکن اسی شام پی ٹی وی سے ایک ٹیلی فون آ گیا۔ دوسری طرف سے کوئی صاحب مہذب انداز میں کہہ رہے تھے۔

"ملک مقبول احمد صاحب سے بات ہو سکتی ہے؟" میں نے جواب دیا۔ "میں مقبول احمد ہی بول رہا ہوں"۔

دوسری طرف سے آواز آئی "میں افتخار مجاز ہوں۔ اعزاز احمد آذر صاحب کا چھوٹا بھائی" میں نے صبح کے واقعہ کا ذکر کیا تو سن کر ہنسنے لگے اور پھر بولے۔ "کئی لوگ تو مجھ سے یہ بھی پوچھتے ہیں کہ میرا اسرار الحق مجاز سے کیا رشتہ ہے؟" پھر ہم دونوں دیر تک ہنستے رہے۔

اس کے بعد ان سے تواتر سے ملاقاتیں ہونے لگیں اور میں اپنے ادارے کی کتابیں انہیں پی ٹی وی پر تبصرے کے لئے بھیجنے لگا۔ ان کی بڑی خوبی یہ دیکھی کہ جب تبصرہ ریکارڈ ہو جاتا اور اس کے نشر ہونے کی تاریخ مقرر ہو جاتی تو مجھے اس کی اطلاع کر دیتے کہ فلاں دن تبصرہ ٹی وی پر دیکھیں۔ اب میں اعتراف کرتا ہوں کہ افتخار مجاز نے ملک میں "کتاب کلچر" کو فروغ دینے میں اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ "انٹرنیٹ" اور "ویب سائٹ" کے فروغ سے کتابوں کی طرف لوگوں کی رغبت کم ہو گئی ہے۔ لیکن افتخار مجاز اس خیال کو قبول نہیں کرتے اور کہتے ہیں۔ میڈیا پر کی ہوئی باتیں ہوا میں اڑ جاتی ہیں۔ انٹرنیٹ اور ویب سائٹ کی وجہ سے دنیا کی تمام اہم لائبریریاں ہمارے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی ہیں۔ لیکن "پرنٹ میڈیا" اور کتاب کی مقبولیت پر اثر نہیں پڑا اور نہ پڑے گا۔ ثبوت کے طور پر وہ بتاتے کہ جن کتابوں پر وہ تبصرے نشر کرتے ان کے بارے میں ناظرین کے سوالات اور خطوط کثرت سے آنے لگتے اور بہت سے ناشرین نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ پی ٹی وی کے تبصرے کے بعد کتاب کی مانگ بڑھ جاتی ہے۔

ان کا اصلی نام افتخار احمد ہے۔ شاعری کے میدان میں آئے تو اپنا تخلص مجاز اختیار کیا۔ تاریخ پیدائش 15 دسمبر 1953ء ہے۔ گویا فاروق آباد ضلع شیخوپورہ میں پیدا ہونے والا یہ بندۂ مجاز جو دراصل بندۂ حقیقت ہے اپنی زندگی کی اب تک 63 بہاریں دیکھ چکا ہے۔ تین بھائیوں میں ان کا آخری نمبر تھا۔ اس لئے سب کا لاڈلا بن گیا۔ ایم اے او کالج میں ایف ایس سی میں داخلہ لیا۔ لیکن امتحان آرٹس کا دیا۔ ان کی ادبی تربیت عارف عبدالمتین پروفیسر نصیر شادانی اور ارشد گیلانی نے کی۔ ان دنوں ایم اے او کالج لاہور میں امجد اسلام امجد اور عطاء الحق

تاثیر بھی اردو فیکلٹی سے وابستہ تھے۔ بی اے اسلامیہ کالج سول لائنز سے کیا جہاں ڈاکٹر اسرار تقوی، یوسف جمال انصاری اور دلدار پرویز بھٹی ان کے استاد تھے۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، وارث میر، ڈاکٹر مہدی حسن اور مسکین حجازی سے ایم اے میں صحافت و ابلاغ عامہ کی تعلیم حاصل کی۔ لیکن انہوں نے ایک ایم اے پر اکتفا نہیں کیا، بعد میں سیاسیات اور اردو میں بھی ایم اے کر لئے۔ گویا افتخار مجاز ''ٹرپل ایم اے'' ہیں۔ عملی زندگی واپڈا میں افسر تعلقات عامہ کی حیثیت سے شروع کی لیکن پی ٹی وی میں آ گئے اور ترقی کی منازل طے کرنے لگے اور کنٹرولر کرنٹ افیئرز کے عہدے پر پہنچ گئے۔ تاہم دسمبر 2013ء کو پی ٹی وی لاہور سے بحیثیت کرنٹ افیئرز لاہور کے طور پر ریٹائر ہوئے۔ شعر و ادب سے ان کا تعلق دیرینہ اور مستقل ہے۔ اس لئے ریٹائرمنٹ کے بعد زیادہ وقت میسر آنے پر ہمہ وقت لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ مختلف اخبارات و جرائد کے لئے کالم نگاری زمانہ طالب علمی سے کر رہے ہیں۔ اسی کالم نگاری کی بنا پر زمانہ طالب علمی میں ایم اے صحافت کے دوران انہیں Best Student Journalist (بہترین صحافی طالب علم) کا اعزاز ملا اور سالک ٹرافی کے حق دار ٹھہرائے گئے۔ اس کے علاوہ بھی انہیں بے شمار ایوارڈز، ٹرافیاں اور شیلڈیں مل چکی ہیں۔ کتابوں کے رسیا ہیں اور ہمیشہ کہتے ہیں کہ کتاب میری پہلی اور آخری محبت ہے۔ گھر کی ایک پوری منزل کتابوں کی لائبریری پر مشتمل ہے جس میں تقریباً ۱۲ ہزار کے قریب کتابیں موجود ہیں۔ ان کے اسی شغف کی بنا پر احباب نے ان کے گھر کو ''کتاب کدہ'' کا نام دے رکھا ہے۔ افتخار مجاز کتابوں کے حوالے سے اپنی محبت کا تذکرہ بہت دلچسپ پیرائے میں کرتے ہیں، لکھتے ہیں غالب سے کسی نے کھانے میں رغبت کے حوالے سے پوچھا تو غالب نے جواب دیا: آم ہوں، بہت سے ہوں اور میٹھے ہوں۔ مجاز صاحب کہتے ہیں مجھ سے کوئی میری خواہش پوچھے تو بتاؤں کتابیں ہوں، بہت سی ہوں اور اچھی ہوں۔ ایک روز افتخار مجاز سے گفتگو ہو رہی تھی، کہنے لگے حالانکہ آپ کے اعتبار سے ہم پر زکوٰۃ کی وصولی ممنوع ہے، لیکن اگر کوئی کتابوں کی زکوٰۃ ادا کرے تو میں خوش دلی سے وصول کر لیتا ہوں۔ ذاتی زندگی میں افتخار مجاز مشرق کی اخلاقیات اور دینی قدروں پر عمل کرنے اور انہیں فروغ دینے والے انسان ہیں۔ وہ ادبی معاشرے میں بے ادبی دیکھتے ہیں تو کڑھتے ہیں اور بزرگ ادیبوں کو متوجہ کرتے ہیں کہ اس ادبی بے راہروی کا تدارک کریں۔ مجھے بتانے لگے کہ انہیں واہیات قسم کے گمنام خطوط ملتے ہیں، جن کا مقصد صرف گندگی پھیلانا ہوتا ہے اور مجھے شاید اس لئے بھیجے جاتے ہیں کہ میں ان خطوط میں مذکورہ ادیبوں کے بارے میں اپنی رائے بدل لوں اور یہ رائے کسی طرح ٹی وی پر بھی نشر ہو جائے۔ لیکن افتخار مجاز اس معاملے میں بہت محتاط ہیں۔ گمنام خط پڑھتے ضرور ہیں، لیکن اس کا اثر نہیں لیتے اور اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے ہیں۔ ادبی معاشرے میں یہ تاثر پھیلا ہوا ہے کہ میڈیا گلوکاروں اور موسیقاروں کو ٹی وی پر بہت اہمیت دیتا ہے لیکن بڑے بڑے ادیبوں کے ساتھ بھی میڈیا سوتیلی ماں کا سلوک کرتا ہے۔ اس ضمن میں افتخار مجاز کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ٹی وی پر کئی پروگرام ادیبوں پر کرائے اور ان کے فن کی تحسین کی۔ کتابوں کے تبصروں کو بھی ''ڈاکیومنٹری'' کی صورت دی۔ مصنف کی تصویر کے ساتھ متن کی نمائش اور بعض مناظر کی ڈرامائی تشکیل بھی کی گئی۔ کسی ادیب کی وفات کی خبر ملی اسے پورے ملک میں بار بار نشر کرواتے اور ٹی وی ٹیم کو آخری رسومات کی ''کوریج'' کے لئے بھیجتے۔ افتخار مجاز کی ان خدمات کا اعتراف ضروری ہے اور میں ان کی کشادہ دلی، کشادہ نظری کو تسلیم کرتا ہوں۔ اللہ انہیں صحت مند زندگی دے اور ان کی خدمات کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ آمین

ان کا اصرار ہے کہ یہ تحریر کے آدمی نہیں، اگر سٹیج، مائیک یا کیمرے پر ہوں تو سننے، دیکھنے والوں کو اپنے سحر میں لے لیتے ہیں۔ یہ ان کا عجز ہے کہ من آنم کہ من دانم سے بات شروع کرتے ہیں، مگر بولتے ہیں تو مطالعہ، علم، آگہی، تدبر، فراست یکجا ہو کر مشام جاں کو معطر

کر دیتے ہیں۔ تقریبات میں سٹیج Conduct کرتے ہوئے حاضرین کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور وہ کئی ادوار سے ولی وی پنجابی زبان میں بھی لکھتے ہیں۔ رومانی شاعری اور اتفاق احمد پر لکھتے ان سے ولیوں کا مجموعہ "..." پنجابی کی ... ہیئت ہوئی ہے۔ اردو کے علاوہ پنجابی ... کے لیے تیار ہے۔ اپنی صحافتی زندگی کی ابتدا میں رومانی افسانے والے احباب بتاتے ہیں اور ... ہم سے اشاعت کے لیے تیار ہے۔ ... اکرام رانا صاحب کے مداح ہیں۔ کسی ادارے سے وہ ان کی صحبت ... جمیل اطہر کے علاوہ مجید عالم شہید اور اکرام رانا صاحب کے مداح ہیں۔ ... اور وقار ریکارڈ کرنے کا موقع ملا۔ سرکاری ٹیلی ویژن کے ملازم تھے اس لیے ساری عمر پابندیوں میں رہ کر کام کیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن میں تقریباً ساڑھے 33 برس خدمات کی انجام دہی کے بعد ریٹائر ہوئے تو نجی ٹیلی ویژن چینلز اور اخبارات نے ملازمت کی آفر کی مگر وہ باقی زندگی لکھنے پڑھنے اور پڑھانے میں گزارنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ اس لیے ان دنوں جہاں وہ ادبی صحافت میں بہت سرگرم ہیں وہیں ادبی کی دنیا میں گزرے دنوں کی یادداشتیں لکھنے میں مصروف ہیں۔ دیکھیے! ان کی یہ تخلیق کب منصۂ شہود پر آتی ہے؟

کتابوں کی دنیا کے باسی، مطالعہ کے آدمی افتخار مجاز ایک اور کام جو بہت شوق اور رغبت سے کرتے ہیں، وہ ادبی محافل میں شرکت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو نام اور مقام عطا کیا ہے، اس پر رب کریم کے حضور سجدہ شکر بجا لانے والے افتخار مجاز کو شدید ذہنی اور دلی قلق ہے کہ ان کی خوشیاں دیکھنے والے والدین دنیا میں نہیں، تاہم وہ کہتے ہیں یہ عزت، یہ وقار، یہ اقدام اور یہ بھلے دن جو آج مجھے میسر ہیں، سب والدین کی دعاؤں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق کا فیض ہے۔

◆◆◆

طنز و مزاح

روشنی ہو نہ سکی......

ایس۔ ایم۔ معین قریشی

صاحبو! آپ نے کبھی غور کیا، جتنا کوئی ریسٹورنٹ اندر سے تاریک ہوگا اتنا ہی مہنگا ہوگا۔ بعض اوقات تو اعلیٰ درجے کے ریسٹورنٹ میں تاریکی کی حد سے بیٹھنے کی جگہ تلاش کرنی پڑتی ہے۔ یہی کچھ ہمارے لوگوں کے ساتھ ہوا۔ ایک دن ہوا کہ راستہ ٹٹولتے ہوئے کچھ "اور" ٹٹولنے لگے یا کسی گاہک سے ٹکرا گئے اور پھر اس نے ایسے ایسے الفاظ اور محاورات استعمال کیے جو صرف ہماری اسمبلیوں ہی میں سننے کو ملتے ہیں۔ ہم کو ہوٹلوں میں آنے جانے کا تجربہ بہت کم ہے۔ ہم یا تو گھر کے آدمی ہیں یا پھر وقت بچا تو ___ گھر والی کے ایجنٹ؟ سامان سے کرے، بجٹ میں لگے۔ ہم اکثر سوچتے تھے کہ ہوٹل مالکان جو باہر کی سج دھج پر بے تحاشا رقم خرچ کرتے ہیں وہ اندر روشنی کے معاملے میں آ کر اتنے کنجوس کیوں ہو جاتے ہیں کہ چند ضروری لائٹوں کا خرچہ بھی بچا لیتے ہیں؟ آخرکار ہم نے اس کا سبب اپنے ایک پرانے دوست سے پوچھا جن کا اصل نام تو اللہ دتہ ہے لیکن جب سے وہ ایک ہائی کلاس ریسٹورنٹ کے مالک بنے ہیں خود کو اے۔ ڈی کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ اے ڈی صاحب نے مشورہ دیا کہ یہ جاننے کے لیے ہمیں ان کے ہوٹل آنا ہوگا۔ لہٰذا ہم نے ایک روز اندرونِ خانہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسی سے ذرا تاخیر سے گھر لوٹنے کی اجازت طلب کی اور اے ڈی کے ہوٹل میں جا دھمکے۔

ہم نے دیکھا کہ ہوٹل کے دو حصے ہیں۔ گراؤنڈ فلور کو انھوں نے عوامی سیکشن کا نام دے رکھا تھا۔ یہاں روشنی بھی تھی اور رونق بھی۔ یہ کھلا اور ہوادار حصہ کم قیمت تھا۔ اس کے ایک کونے سے سیڑھیاں چڑھ کر ہم وی آئی پی وارڈ... ہمارا مطلب ہے وی آئی پی سیکشن میں داخل ہو گئے۔ یہ حصہ مہنگا تھا اور اس کے اندر رکھتے ہی یوں معلوم ہوا جیسے ہم وہ ہیں جن کے بزم میں آتے ہی تمام چراغ احتراماً (یا احتجاجاً؟) روشنی سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔ ادھر ادھر چھوٹے چھوٹے رنگین بلب جگنوؤں کی طرح چمکتے نظر آ رہے تھے۔ دیواروں پر جو روشنی کے شیڈز تھے ان کا رخ چھت کی طرف کر کے انھیں احتیاط سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ہم نے حیران ہو کر مسکراتے اے ڈی سے سوال کیا: "آپ اس حصے میں بھی نیچے جیسی روشنی کا بندوبست کیوں نہیں کرتے؟"

اے ڈی نے برملا جواب دیا "میرا دماغ خراب ہوا ہے جو یہاں روشنی کر کے اپنے گھر میں اندھیرا کر لوں؟" ہم نے ان سے درخواست کی کہ وہ اپنے اس بیان پر کچھ روشنی ڈالیں کہ یہاں روشنی کرنے سے وہاں کیسے اندھیرا ہو جائے گا؟ پھر جو انھوں نے اندھیرے کے فضائل بیان کرنے شروع کیے تو تھوڑی دیر بعد ان پر کسی الیکٹرک کے ایجنٹ کا گمان ہونے لگا۔ فرمانے لگے "اول تو اندھیرا تخلیہ پیدا کرتا ہے جہاں بیٹھنے والے جوڑے "باہمی اشتراکِ عمل" سے ایک دوسرے کے دردِ دل کا مداوا کرتے ہیں۔" ہم نے انھیں بیچ میں ٹوکا "آپ کا مطلب ہے یہاں بیٹھ کر وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل!"

(سید محمد خاں رند)

"استغفراللہ" اے ڈی نے جھلا کر کہا "یہ ڈوورا ئیاں آپ میرے ہوٹل میں کہاں سے لے آئے؟ بھائی میرا مطلب ہے کہ وہ جو کسی فلمی یعنی غیر علمی شاعر نے کہا تھا۔ وہ دلوں نے زندگی بھر ساتھ رہنے کی قسم کھائی ہے... اسے "اندھیرا" گوارا رہتا۔ اس قسم کی باتیں!" ہم حیران تھے لیکن ہماری حیرانی کو نظرانداز کرتے ہوئے اے ڈی صاحب نے اپنا بیان جاری رکھا۔ بولے "دوسرا فائدہ یہ ہے۔ اس تاریکی میں آنے والے گاہک کی شناخت گم ہو جاتی ہے۔ روشنی طبقاتی تفریق کو اجاگر کرتی ہے جب کہ یہاں بیٹھنے والوں کے بارے میں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان میں کون محمود علی ہے اور کون ایاز خان ہے۔ یہ جو پہلی اور دوسری منزل کے نرخوں میں فرق ہے، اس کا کچھ حصہ اس شناخت کی پردہ پوشی کی عکاسی کرتا ہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکے تو ہم نے اپنے تجسس کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی خاطر پوچھا "اور کوئی فائدہ؟" موصوف نے ہمارا کندھا دباتے ہوئے کہا "یہ اندھیرا بہت سے ایسے چہروں کا بھرم رکھ لیتا ہے جنھیں کوئی روشنی میں دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ لہٰذا یہاں آپ اپنے جمالیاتی ذوق کو مجروح کیے بغیر تھوڑی دیر کے لیے بڑی آسانی سے رومانٹک ہو سکتے ہیں۔"

ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن مسٹر اے ڈی نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا "یہ تاریکی نفسیاتی طور پر آپ کا اسٹیٹس بلند کر دیتی ہے۔" "وہ کیسے؟" ہم نے وضاحت چاہی۔ "وہ ایسے" اے ڈی صاحب نے سمجھایا "کہ جب آپ اپنے کسی ہمدم کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنی شروع کرتے ہیں تو نیچے بیٹھے ہوئے بچھڑے احساس محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ پھر جوں ہی آپ کی نظر ان کے حسرت بھرے چہروں پر پڑتی ہے، ایک دم آپ کی خودی بلند ہونے لگتی ہے۔ اس بلندی کی قیمت ادا کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوتا ہے؟"

وہ ایک وکیل کی طرح اپنا کیس پیش کر رہے تھے۔ دفعتاً ہمیں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں قریب ہی دو جوڑے نظر آئے جو سر جوڑے کھسر پھسر میں مصروف تھے۔ ہم نے نہ چاہتے ہوئے بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انھیں دیکھا۔ جب ان کی جنس کے بارے میں ہمارا اندازہ یقین میں بدل گیا تو ہم نے اے ڈی صاحب کو الگ لے جا کر آہستگی سے کہا "آپ کے سارے نظریات باطل ثابت ہوئے۔ ذرا ان جوڑوں کو دیکھیے دونوں طرف مرد ہیں۔" فرمانے لگے "نیچے آؤ" ہم نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ ویسے بھی تاریکی اب ناقابل برداشت ہوتی جا رہی تھی۔ نیچے پہنچ کر انھوں نے اپنی بات یوں مکمل کی "وہ لوگ تاجر ہیں اور تجارتی مذاکرات میں منہمک ہیں۔ بعض قسم کے کاروبار کے لیے اسی قسم کا ماحول مناسب ہوتا ہے۔ اسی لیے تو اسے کالا دھندا کہا جاتا ہے۔ سمجھے؟" ہم ان کی طویل تقریر سے اکتا چکے تھے اس لیے فوراً ان سے اتفاق کر لیا۔ تاہم انھوں نے مزید کہا "ایک آخری بات اور، اوپر بیٹھنے والے گاہک بڑے متحمل مزاج، صابر اور فراخ دل ہوتے ہیں۔ جب کہ نیچے والے بے حد نازک مزاج، چڑچڑے اور تنگ دل ہوتے ہیں۔ کھانے پینے کی ہر چیز میں کیڑے نکالتے ہیں۔ فرنیچر کو گھٹیا قرار دیتے ہیں۔ ویٹر بھی ان سے نالاں ہیں۔ اوپر والوں کو جو کچھ دو وہ خوشی خوشی کھا لیتے ہیں۔ دراصل وہ کھانے سے زیادہ ہلکے پھلکے رومانٹک ماحول میں دلچسپی رکھتے ہیں اور اسی کی بھاری بھرکم قیمت ادا کرتے ہیں۔"

ہم نے اپنے علم میں اس "بے فضول" اضافے کے بعد ان سے اجازت طلب کی تو انھوں نے روک کر کہا "اب تاریکی بھی باعث منافع ثابت ہو رہی ہے۔ اس صنعت کے ماہرین ماحول کو اور زیادہ "آفت" بنانے کے لیے غاروں کی صورت میں ہوٹل بنا رہے ہیں۔ زیادہ تاریکی، زیادہ تنہائی اور مالکان کے لیے زیادہ آمدنی۔ چلو گے کسی غار نما ہوٹل میں؟" "نہیں" ہم نے واپس لوٹتے ہوئے کہا "ہم اس وقت کا انتظار کریں گے جب ہوٹل آبادیوں کے اندر بنائے جائیں گے۔"

◆◆◆

پنجاب رنگ

حسن عسکری کاظمی

O

اساں تے اپنی جند گنوائی تیتھوں وچھڑ گئی
آکھدے تیری بے پروائی تیتھوں وچھڑ گئی

دل دا شیشہ صاف اے سارا اوہ وی صاف
ویکھ لے توں اے عشق برائی تیتھوں وچھڑ گئی

ساڈے پنڈ دی مٹی وی توں اے رنگی وی توں
توں پئی جاپے ساں دی چائی تیتھوں وچھڑ گئی

سدھراں دے ایں گھے چپ چپیتے
اپنے سورج کسے دی پائی تیتھوں وچھڑ گئی

اوہلی پڑھدیاں تیتھوں ویکھیا اوہلے ہو کے
اکھاں ویکھاں رت وگائی تیتھوں وچھڑ گئی

رساں وی توں اوہ وی رنگ پکا کیہا
پیار وی کیہا، توڑ نبھائی تیتھوں وچھڑ گئی

پکے گھر اک دن ہے آئی میں نہ پچھیا
یار نہ تیتھوں میری آئی تیتھوں وچھڑ گئی

OOO

نیلم احمد بشیر

اخبار

اج اخبار پڑھیا
اس کے بچھڑ اوہدے کے پڑھیا
بچھڑیا رات ورقے
کی توں کیکی دوہرا
سب کجھ وکدا
دل میرا کے ڈٹھا ای
اسے تکو تی
علم ادب سیاست قلم
بچھدا ایں لاکا
ودے ودے اشتہار
بادل دی تصویر
لیڈر دی تقریر
کتنا دے قتل، بردہ
سب کجھ دی موجود
سب میں بے گھر ہویا
دل میرا اکتا دیا
کجھ نئیں
کا کیندا دے گیں
دہشت گردی دی سب خبراں تے چپ ہوئیاں گئیاں

OOO

منزہ شاہد

شام سلونا

حق عشق دا ویلا چلدا
جھکھڑ دا زور نہ چلدا

اساں ایہناں تیک بجھاواں
ایہ ہتھ رہ الاں دا

میرے شام نوں انج نہ آکھو
تیرا جگ سب نوں بخشدا

النوں ہووے قدمیں جیچے
اس دا ہاگ بلدا

تیتھی میرا راہواں مل کے
ویکھو شام کدوں تے کے الدا

OOO

تبصرے

سفر اسفار (سفرناموں کی روداد)

مصنف : **ممتاز راشد لاہوری** **مبصر : اقبال راہی** (مدیر "تارکین وطن" لاہور)

صفحات : 304 قیمت : -/350 روپے ناشر : خیال وطن پبلشرز

ممتاز راشد کا نام دنیائے ادب کے عصری دور میں چہار دانگ عالم پہ چھایا ہوا ہے۔ جب وہ قطر میں برسرِ روزگار تھے تو اپنے سہ ماہی ادبی رسالہ "خیال وطن" (لاہور، دوحہ) کی اشاعت کے ساتھ ساتھ سال دو سال میں اپنی کوئی نہ کوئی کتاب سامنے لے آتے تھے۔ اپریل 2014ء میں 37 سال بعد مستقلاً اپنے شہر لاہور میں واپسی کے بعد سے ان کی کتب اور تیز رفتار سے سامنے آ رہی ہیں۔ پہلے راوی پبلشرز لاہور نے ان کے چھیالیس افسانوں کا مجموعہ "دل زدہ" شائع کیا۔ پھر ان کے چھ شعری مجموعوں کا انتخاب "آپ تنہائی میں بھی بیٹھے" (مرتبہ: اقبال راہی) ماورا بکس لاہور نے شائع کیا۔ پھر علمی پبلیکیشنز نے ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ "خوش گمان" شائع کیا اور اب مئی 2016ء میں ان کے تقریباً چالیس اسفار کی روداد پر مشتمل تین سو سے زائد صفحات کی کتاب "سفر اسفار" آ گئی ہے۔ ان دو برسوں میں انھوں نے "خیال وطن" کے دو ضخیم خصوصی نمبر "پردیس نمبر" اور "علامہ شبلی نمبر" بھی شائع کیے ہیں اور اس رسالے کے عمومی شمارے بھی۔ دو دو سال میں اپنی ادبی تنظیم "ادارہ خیال وطن لاہور" کے زیر اہتمام پچاس سے زائد ادبی تقریبات بھی منعقد کر چکے ہیں۔ پتہ نہیں وہ یہ سب سرگرمیاں کس طرح منظم کرتے ہیں۔ ان کی حالیہ کتاب "سفر اسفار" ہیچ بیک جلد کے ساتھ آئی ہے۔ سرورق پر قطر کی ایک خوبصورت کثیر المنزلہ عمارت کی تصویر ہے اور ہوائی جہاز گزر رہا ہے۔ بیک ٹائٹل پر دائیں طرف ان کی رنگین تصویر کے پیچھے ان کے رسالہ "خیال وطن" کے درجن بھر خصوصی نمبروں کے نام اور بائیں طرف ان کی شائع شدہ تیئیس اور زیر ترتیب سات کتابوں کے نام ہیں۔ سرورق کے اندر خلیج کی ریاستوں کی تین عدد رنگین تصاویر ہیں۔ انتساب انھوں نے سفرناموں کے شائقین اور قارئین کے نام کیا ہے۔ قولِ لفظ "میرے سفرنامے" میں انھوں نے اردو کے کئی سفرناموں کا ذکر کیا ہے اور اپنے اس سفرنامے کا پس منظر بھی لکھا ہے۔ دیباچہ نگاروں میں اسلام عظمی، وقیس احمد، محمد اکرم نعیم اور پروفیسر ظہیر بدر ہیں۔ یہ سب غیر ممالک کے سفر کر چکے ہیں، اس لیے ان کے دیباچے ممتاز راشد لاہوری کی اس کتاب "سفر اسفار" کا عمدہ تجزیہ کرتے نظر آتے ہیں۔ میں نے بھی اس کتاب کا ایک دیباچہ لکھا تھا جو تاخیر کا شکار ہو گیا مگر پھر بھی اسے اس کتاب کے آخر میں جگہ مل گئی ہے، میں نے اس میں ممتاز راشد کی دیگر ادبی فتوحات کا جائزہ بھی لیا تھا۔ اس کتاب کے آخر میں ان کا پانچ صفحات کا مضمون "لاہور کے سفرنامہ نگار" ہے، اس میں انھوں نے تقریباً چالیس سفرنامہ نگاروں اور ان کے سفرناموں کا ذکر کیا ہے۔ "سفر اسفار" کے ان کے اپنے چالیس مضامین بڑے متنوع انداز کے ہیں۔ ان میں خلیج کے ساتھ آٹھ اور پاکستان کے بھی اتنے ہی شہروں کے اسفار کی رودادیں لکھی گئی ہیں۔ سعودی عرب کے شہروں میں مکہ، مدینہ، ریاض، جدہ اور طائف کا احوال بھی ہے اور کویت، بحرین اور قطر کے

اسفار کا ذکر بھی۔ بحرین کے تو ساتھ آٹھ دوروں کی روداد ہے۔ اسی طرح متحدہ عرب امارات کی سات ریاستوں میں سے انھوں نے چھ کا سفر کیا ہے اور بڑی تفصیل سے یہ روداد لکھی ہے۔ پاکستان کے شہروں میں سے انھوں نے کراچی، لاہور، فیصل آباد، راولپنڈی، کھاریاں اور احمد پور سیال کے اسفار کی روداد یں شامل کی ہیں۔ حج اور عمروں کے اسفار کے علاوہ ان کے باقی سفر مشاعروں اور دیگر ادبی تقریبات کے حوالے سے ہیں اس لیے ان رودادوں میں کئی شہروں کی ادبی فضاؤں کی عکاسی ملتی ہے۔ انھوں نے ان شہروں کی عمومی صورتحال بھی بیان کی ہے اور خاص خاص مناظر بھی ہیں مثلاً بحرین کے ہوٹلوں اور ریاست قطیوں کے رنگین مناظر بھی۔ ان کے بعض دورے نجی حوالوں سے تھے یعنی شادی بیاہ وغیرہ مگر ان مصروفیات سے ہٹ کر وہ اپنے قاری کو اور بھی کئی طرح کے منظر دکھاتے ہیں۔ ممتاز راشد لاہوری کی یہ کتاب اس صنف ادب کی کتب میں ایک اہم اور خوبصورت اضافہ ہے۔ ان کی نثر صاف ستھری، رواں دواں اور بے عیب ہے۔ کتاب بھی پروف کی اغلاط سے مبرا ہے۔

راشد جیسے لکھنے والے مل جاتے ہیں لیکن کم کم

سمندر میں ستارہ

شاعرہ : عمرانہ مشتاق **مبصر : آفتاب خان**

صفحات: 248 قیمت : 450 روپے پبلشر: یو ایم ٹی پریس، لاہور

ڈاکٹر عمرانہ مشتاق ادبی افق میں آٹھ دس برس قبل وارد ہوئی ہیں اور انھوں نے اپنی مسلسل محنت اور فنی مہارت کی بنا پر ایک مقام بنا لیا ہے اور اس دوران ان کی متعدد کتابیں بھی شائع ہو چکی ہیں جو شاعری کے علاوہ کالموں پر بھی مشتمل ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ''سمندر میں ستارہ'' ان کا حال ہی میں شائع ہونے والا شعری مجموعہ ہے جس میں غزلیں اور نظمیں دونوں شامل ہیں۔ عمرانہ مشتاق کا شعری اسلوب اور شعری مضامین خالصتاً اپنے ہیں۔ ان کا اپنا ایک نظریۂ شاعری ہے جس میں رومان کی آنچ بھی ہے مگر اس سے زیادہ سماجی رویے، معاشرتی نشیب و فراز اور عہدِ حاضر کا کرب ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک پُر امن معاشرے کا خواب دیکھتی ہیں جہاں ہر کسی کو یکساں انسانی حقوق حاصل ہوں۔ اور کسی کو دولت یا اس کے عہدے کی بنا پر برتری حاصل نہ ہو۔ ان کی بیشتر شاعری ایسے ہی خوابوں اور خیالات سے بھری ہے اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دوسرے شاعروں کی طرح قوم کو ایک راستہ دکھا رہی ہیں۔ ان کے لیے ایک سمت متعین کر رہی ہیں جو پُر خار راہوں سے گزر کر امن و آشتی اور پھولوں سے پُر امن میں کھلی ہوئی سرسبز وادی میں لے جاتی ہے۔ اس کتاب سے چند مختلف ذائقوں کے اشعار دیکھیں۔

اک ساتھ اٹھاتے نہیں کیوں نور کی دیوار — چپ چاپ بھی دیپ جلا کیوں نہیں دیتے

عبادت کیا فقط اس کا اگر دیدار کرنا ہو — ضروری ہے کہ پہلے آنسوؤں سے تم وضو کرنا

بے تیغ بھی رہی ہوں مگر سر بلند ہوں — یہ افتخارِ ذات ہی عورت کی ڈھال ہے

اے کاش عہدِ میر میں ہوتا مرا جنم — وہ بات "اب بھی" میں کہاں جو "کبھو" میں تھی

ان چند اشعار سے ان کے سارے شعری نظریے کا علم نہیں ہو پاتا لیکن یہ بات طے ہے کہ ان کی شاعری میں ایک واضح نظریہ اور مقصدیت موجود ہے اور یہی کسی شاعری کی کامیابی ہے کہ اس کا اپنا شعری وژن ہو ورنہ آج کل کے بیشتر شاعر کسی نظریے اور مقصد کے بغیر تکی بے تکی مار رہے ہیں۔ "سمندر میں ستارہ" کی غزلیں ہمارا موجود و عہد و ماضی بھی ہیں اور مستقبل کا راستہ بھی۔ ان غزلیات کو اسی تناظر میں رکھ کر پڑھا جائے اور سمجھا جائے۔ البتہ معذرت کے ساتھ عرض ہے کہ اس کتاب میں شامل نظمیں بچوں کے معیار کی حامل ہیں کیونکہ آج کی نظم بہت آگے چلی گئی ہے۔ اس لیے اب اقبال، شمیم، کوکب وغیرہ پر لکھی گئی نظمیں بچوں کو تو متاثر کر سکتی ہیں بڑوں کو نہیں۔ خاص طور پر شاعروں کو تو بالکل نہیں۔

بے قراری سی بے قراری ہے (کہانیاں)

مصنف: عزیز جبران انصاری — **مبصر: آفتاب خان**

صفحات: 192 — قیمت: 400 روپے — ناشر: جبران اشاعت گھر، اردو بازار کراچی

ہر کہانی کار معاشرے میں بسنے والے کرداروں کو اپنی اپنی نگاہ سے دیکھتا اور بیان کرتا ہے۔ دراصل کہانی بیان کرنے کا انداز ہی کہانی کو دوسروں سے الگ اور جداگانہ حیثیت دیتا ہے ورنہ معاشرے میں پائے جانے والے تمام انسان مختلف المزاج ہوتے ہوئے بھی اکثر انسان ہم مزاج بھی ہوتے ہیں اور نیکی بدی، شرافت، بدمعاشی یہ وہ صفات ہیں جو اکثر لوگوں میں ایک جیسی ہی پائی جاتی ہیں۔ اس لیے کہانی کار اپنے آپ کو منفرد انداز دینے کے لیے یا تو کرداروں کا مزاج بدلتا ہے یا پھر کہانی کے تانے بانے میں نئے رنگ کے پیوند لگاتا ہے۔ عزیز جبران انصاری نے بھی اپنی کہانیوں کا ایک اسلوب بن کر اس کے دائرے میں اپنی کہانیوں کو مقید کیا ہے جن میں معاشرے پر طنز بھی ہے، معاشرے میں موجود کرداروں کی خوبیاں اور خامیاں بھی نظر آتی ہیں اور ہر کردار کی الگ الگ نفسیات بھی بیان کی گئی ہیں لہٰذا ان سب نے مل کر عزیز جبران انصاری کی کہانیوں کو صد درجہ قابلِ مطالعہ بنا ڈالا ہے۔

اس کتاب میں اکیس کہانیاں یا افسانے کہہ لیں موجود ہیں جن میں چند انشائیے بھی ہیں اور ان میں طنز و مزاح کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ وہ چھوٹے چھوٹے جملوں سے اپنے کرداروں کی نفسیات ظاہر کرتے ہوئے کہانی آگے بڑھاتے ہیں اور اس کی رفتار اس قدر تیز رکھتے ہیں کہ قاری خود بھی کہانی کے ساتھ بہتا چلا جاتا ہے اس لیے بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ عوامی کہانیاں ہیں اور انہیں ہر طرح کے لوگ پڑھ کر لطف حاصل کر سکتے ہیں۔

ادبی ڈائجسٹ

مدیر: ضیاء حسین ضیاء **مبصر: آفتاب خان** صفحات: 130

قیمت: 150 روپے ناشر: ادبی ڈائجسٹ پبلشرز۔۔۔ گلستان جوہر کراچی

برصغیر پاک و ہند اور اردو کی دیگر بستیوں سے سینکڑوں ادبی رسائل و جرائد نکلتے ہیں اور اس میں عہد موجود کے نامور اور نوآموز شعراء اور ادباء کی تخلیقات شامل کی جاتی ہیں مگر زیر نظر ادبی ڈائجسٹ کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں موجودہ دور کے حیات شاعروں ادیبوں کی کاوشوں کی بجائے زندہ جاوید رہ جانے والے ماضی کے نامور تخلیق کاروں کی تحریروں کا انتخاب شائع کیا جاتا ہے اور پیشانی پر یہ جملہ رقم کیا گیا ہے کہ "زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا انتخاب"

اس کتابی سلسلے کا 13 واں شمارہ زیر نظر ہے جس میں اپنے فن سے ادبی دنیا کو مہکانے والے جید ادیبوں کی تخلیقات آرٹ پیپر کے سفید اوراق پر شفاف آئینے کی طرح جگمگا رہی ہیں۔ حرم خلیق کی نعت سے آغاز ہوتا ہے اس کے بعد اعظم قریشی کا مضمون قمر جمیل دستار و طلعت، اور ڈاکٹر عقیلہ بشیر کا مختصر مضمون خدیجہ مستور کے ناول کے نسوانی کردار ایک مطالعہ شامل ہیں۔ بعد ازاں رئیس امروہوی کا حسن کلام اور قمر ہاشمی، ریاض احمد کی نظمیں ہیں۔ اس کے بعد کہانیوں کے صفحات ہیں اور ان پر چار بڑے ادیبوں کی کہانیاں دعوت مطالعہ دے رہی ہیں جن میں خواجہ احمد عباس، جیلانی بانو، صغیر ادیب اور قدسیہ انصاری کے قلم کی جولانیاں بکھری ہوئی ہیں۔

آخر میں سات شاعروں کی ایک ایک غزل موجود ہے۔ ان شاعروں میں احمد فراز، نفیس فریدی، امین راحت چغتائی (یہ حیات ہیں) اظہر جاوید، خورشید احمد، یوسف جمال، اختر سعیدی شامل ہیں۔ ابتداء میں احوال کے عنوان سے اداریہ بھی دعوت فکر دیتا ہے کہ آج کے ادبی منظر نامے میں ماضی کی طرح کے معتبر اور سکہ بند لکھنے والے نظر نہیں آتے یا مستقبل میں نظر آئیں گے۔ اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔

بلاشبہ یہ ایک منفرد ادبی رسالہ ہے جس میں اتنے قابل قدر اور مسلم لکھاریوں کی تخلیقات شامل کرنا ضیاء حسین ضیا صاحب کا عمدہ کارنامہ ہے جس پر وہ تحسین کے مستحق ہیں۔ یقیناً اتنے بڑے انتخاب کے لیے کافی عرق ریزی کرنی پڑتی ہے اور ضیاء حسین ضیا اس کٹھالی سے گزر رہے ہیں۔

امتزاج

شاعر: اعتبار ساجد **مبصر: آفتاب خان**

صفحات: 144 قیمت: 270 روپے پبلشر: قلات پبلشرز، جناح روڈ کوئٹہ

اعتبار ساجد کا شمار عہد حاضر کے چند بڑے شاعروں اور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انہیں شعر و ادب کے میدان سے منسلک ہوئے نصف صدی سے زائد عرصہ گزر چکا ہے اور ان کی شعر و نثر کی کم از کم ساٹھ کتب منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں شاعری، ڈرامے، افسانے، ناول اور بچوں کی کہانیاں بھی شامل ہیں۔ ان کا ایک شعری مجموعہ "مجھے کوئی شام ادھار دو" بیسٹ سیلر بکس میں گنا جاتا ہے اور اس کے بے شمار

ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ان کا یہ نیا شعری مجموعہ "امتزاج" حال ہی میں شائع ہوا ہے جس میں بہت ساری غزلوں کے ساتھ چند ایک نظمیں بھی شامل ہیں۔ اعتبار ساجد کی غزل جیسی آنچ اور نکیلے سروں کی طرح نرم و نازک، چلبلی، شوخ و چنچل اور پر اثر ہے۔ وہ بھاری بھر کم اور پر شکوہ الفاظ و بندش سے اجتناب کرتے ہوئے عام فہم اور سادہ الفاظ کا چناؤ کر کے غزل کو ایسا روپ عطا کرتے ہیں جو سیدھا قاری کے دل میں اتر جاتا ہے۔ جہاں انہیں ضرورت محسوس ہوتی تراکیب، استعارہ، تشبیہات وغیرہ کا سہارا بھی لیتے ہیں مگر شعروں کو اتنا گنجلک نہیں کرتے کہ وہ قاری کے سر سے گزر جائیں۔ اسی لیے ان کی شاعری عوام الناس میں مقبول ہے۔

یہ تکلّفے، یہ عبارات، یہ غلط کیا ہے ۔۔۔ جو تم سمجھی ہو تو اس شعر میں دھرا کیا ہے

سبھی کر رہے ہیں مجھ سے مرے غم کا مول بھاؤ ۔۔۔ کوئی ایسا ہو کہ جس کو ہوں عزیز میرے گھاؤ

شہر میں برسا ہے تو، صحرا کو پانی چاہیے ۔۔۔ تجھ کو اے بے دید بادل! شرم آنی چاہیے

اس کی پازیب میں شاید ہیں دلوں کے گھنگھرو ۔۔۔ اترے آج تو بالائے زمیں کھنکے ہیں

اعتبار ساجد کی شعری فضا بھی اپنی ہے اور طرزِ ادا بھی اپنی ہے۔ انہیں اپنے پرائے کے دیئے ہوئے دکھ سکھ بھی یاد رہتے ہیں اور دوستوں کی دی ہوئی محبت بھی۔ علاوہ ازیں ان کی اپنے عہد پر بھی گہری نظر ہے جس کا اظہار ان کی شاعری میں جا بجا نظر آتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری سات رنگوں کی دھنک یا کہکشاں ہے۔ "امتزاج" بھی اسی سلسلے کا ایک پڑاؤ ہے اور ان کے اس سفر میں ابھی بہت سی منازل ان کی منتظر ہیں، وہ اپنے خلوص کی پختگی سے ہر نئی منزل پر قدم جمائے کھڑے ہوں گے۔

آسمان میری مٹھی میں (انڈیا)

مصنف: وحشی سعید **مبصر: آفتاب خان**

صفحات: 196 قیمت: 500 روپے ناشر: تحریک ادب، وارانسی، انڈیا

وحشی سعید کے متعدد افسانوی مجموعے شائع ہو کر پذیرائی حاصل کر چکے ہیں اور انہیں اس دشت کی سیاحی کرتے ہوئے چار دہائیوں سے زیادہ گزر چکی ہیں۔ ان کے اس حالیہ مجموعہ میں نہ صرف افسانے شامل ہیں بلکہ ان افسانوں پر مختلف ادیبوں اور نقادوں کا لکھا ہوا تجزیہ بھی شامل کیا گیا ہے اس طرح نہ صرف افسانے کا لطف لیا جا سکتا ہے بلکہ اس پر کیا گیا تبصرہ پڑھ کر افسانے کی مزید کئی جہتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ وحشی سعید کے افسانے لکھنے کے مختلف انداز ہیں۔ کبھی وہ کہانی نما افسانہ لکھتے ہیں، کبھی بیانیہ اور اس مجموعے میں شامل ان کے اکثر افسانے علامتی اور تجریدی انداز کے ہیں جن میں ماضی کے کرداروں کو حال کے انسانوں کے ساتھ ضم کر کے ایک منفرد انداز تحریر

سامنے لایا گیا ہے۔ اس انداز تحریر سے بعض اوقات قاری کے لیے ابلاغ کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن وحشی سعید کے افسانوں کے مطالعہ میں یہ دشواری پیش نہیں آتی کیوں کہ انہوں نے اپنے افسانوں کے لیے جو علامتی کردار منتخب کیے ہیں وہ بہت مشہور اور رائج العام ہیں اور اکثر کردار ماضی کے قصے کہانیوں کا حصہ ہونے کی بنا پر عوام کو ذہن نشین ہیں۔ یہ افسانے اپنے اندر بھرپور مطالعاتی کشش رکھتے ہیں۔ اور کوئی بھی افسانہ شروع کر کے آخر تک پڑھے بغیر نہیں رکھا جا سکتا۔ ان اٹھارہ افسانوں میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ملک کے آخری بادشاہ نورکا نور کہاں ہے؟ کیا راون مرے گا؟ کب آئے گا وہ حقرا مان، یہ شہر نجات دہندہ، شہنشاہ، قاتل مکوڑ، یا اب گھر کا طوطا وغیرہ۔

ان افسانوں کے نہ صرف موضوعات چونکا دینے والے ہیں بلکہ جزئیات نگاری اور مکالمہ نگاری بھی حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ کرداروں کے مکالموں میں انتہائی تخلیقی جوہر شامل کر کے انہیں بے حد منفرد بنا دیا گیا ہے چند افسانوں میں سے منتخب مکالمے ملاحظہ کریں۔

1۔ "شہر خاص کا صرف شہر جدید میں گم تھا۔ دل سہت رہا تھا۔ ذرتی لینڈ میں جہاز اغوا ہو رہے تھے اور موسیٰ کی قوم جو اس کا انتظار نہ کر سکی۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھٹک رہی تھی" (نور کا نور کہاں ہے؟)

2۔ "آسمان اتنا بڑا نہیں کہ میری مٹھی میں نہ آ سکے" (آسمان میری مٹھی میں)

3۔ "اس قوم نے ہم کو سب کچھ دیا، رتبہ، طاقت اور دولت لیکن ہم نے اس قوم کو کیا دیا؟" (کب آئے گا وہ حقرا مان)

4۔ اگر تم میں یقین ہو تو تم جھوٹ کے سامنے میں بھی سچ کا حوصلہ لاؤ گے" (قاتل ... مقتول ... ؟)

الغرض اس کتاب میں شامل تمام افسانے مکمل ذہنی بیداری اور گہرے مشاہدے کے بعد تحریر کیے گئے ہیں جن میں انتہائی تخلیقی تنوع پایا جاتا ہے اس لیے وحشی سعید کا شمار اہم افسانہ نگاروں میں کیا جانا ضروری ہے۔

لاڑکانہ کے چہار درویش

مصنف: مسلم شمیم **مبصر: آفتاب خان**

صفحات: 150 قیمت: 350 روپے پبلشرز: نقش دلی پبلشرز، جناح روڈ کراچی

مسلم شمیم ایک نظریاتی ادیب اور شاعر کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں اور ان کی بیشتر کتابیں نظریاتی ہیں جن میں سب سے مقبول کتاب "نظریات کا تصادم" ہے۔ اسی طرح ان کی تمام تر شاعری بھی نظریاتی ہے اور وہ کمٹڈ ہونے کی بنا پر انجمن ترقی پسند مصنفین کے مرکزی صدر بھی ہیں۔ مذکورہ بالا کتاب میں بھی انہوں نے اپنے ان دوستوں اور نظریاتی لوگوں کا ذکر کیا ہے جو ترقی پسند عزائم کے حامل تھے اور کمیونزم کے پرچارک ہونے کی وجہ سے وہ عام لوگوں، کسانوں، مزدوروں اور کچلے ہوئے انسانوں کے مسائل حل کروانے کی جدوجہد میں پیش پیش تھے۔ کتاب کے ہیرو یعنی چہار درویشوں کے ناموں میں کامریڈ سید جمال الدین بخاری، کامریڈ حیدر بخش جتوئی، کامریڈ مولوی نذیر حسین جتوئی اور کامریڈ سوبھو گیان چندانی شامل ہیں اور انہیں چاروں کی داستان حیات، کارنامے، خیالات اور ان کی سیاسی جدوجہد اس کتاب میں بیان کی گئی ہے۔ یہ اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہے۔ پہلا ایڈیشن 2013 میں شائع ہوا۔

مسلم شمیم کی زندگی کا بیشتر حصہ چونکہ لاڑکانہ میں گزرا اس لیے ان چاروں شخصیات سے ان کے ذاتی اور نظریاتی مراسم تھے اور یہ سب ایک دوسرے کو بے حد عزیز رکھتے تھے۔ مسلم شمیم نے اپنے ان چاروں دوستوں اور کی مختصر مگر جامع کہانی کتاب کے چار ابواب میں بیان کر دی ہے جس میں ان کی ابتدائی زندگی نظریاتی وابستگی کا آغاز اور ان کے پیش نظر صعوبتیں برداشت کرنے کی کہانی اور غریب لوگوں کی حمایت میں کی جانے والی جدوجہد کا بھی تفصیلی ذکر ملتا ہے علاوہ ازیں حیدر بخش جتوئی کے شاعر ہونے کی بنا پر ان کی چند نظمیں بھی اس کتاب کا حصہ ہیں۔

ان چاروں درویشوں کے حالات زندگی سے جہاں ان کی ذات کے بارے میں آگہی ہوتی ہے وہیں مسلم شمیم نے سندھ دھرتی پر مظلوم انسانوں پر ہونے والے مظالم کا بھی مکمل ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان چاروں درویشوں اور ان کے ساتھیوں نے ہاریوں پر ہونے والے ظلم کے خلاف بھرپور آواز اٹھائی اور طویل جدوجہد کی جس کی بنا پر انہیں جیل میں جانا پڑا مگر ان کے پائے استقامت میں لرزش نہ آنے پائی اور وہ اپنے مشن میں مصروف کار ہوتے ہوئے آخر زندگی کی بازی ہار گئے لیکن کسی باطل قوت سے شکست تسلیم نہ کی۔

مسلم شمیم نے یہ کتاب مرتب کر کے نہ صرف حق دوستی ادا کیا ہے بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے ان چاروں درویشوں کی داستان حیات میں محفوظ کر دی ہے اب نئی نسل بھی ان کے نظریات اور ان کے آدرشوں کی روشنی میں کسی درست سمت کا انتخاب کر سکتی ہے۔

سہ ماہی "انتساب" سرونج (انڈیا)

مدیر: سیفی سرونجی **مبصر: آفتاب خان**

صفحات: 248 قیمت 100 روپے (انڈین) رابطہ سیفی لائبریری، سرونج۔ انڈیا 464228

بھارت سے بہت کم رسائل پاکستان آتے ہیں اور اس طرف سے بھی ادھر بہت کم جاتے ہیں وجہ صرف ایک ہی ہے کہ دونوں طرف ڈاک خرچ بہت زیادہ ہے۔ عام سے کتابی سائز پر مشتمل دو ڈھائی سو صفحات کے جریدے کو بھیجنے کے لیے تین چار سو خرچ ہو جاتے ہیں جو کوئی بھی ادبی رسالہ برداشت کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پھر دونوں طرف سے کچھ سرپھرے مدیران ایک دوسرے کی طرف اپنے جرائد ارسال کرتے رہتے ہیں انتساب بھی ایک ایسا ہی رسالہ ہے جو کسی نہ کسی طرح کہیں نہ کہیں نظر آ جاتا ہے۔ مرحوم اظہر جاوید بھارت سے آنے والے اکثر ادبی رسائل پڑھنے کے بعد راقم الحروف کو دے دیتے تھے ان میں انتساب بھی شامل ہوتا تھا۔ اسی طرح انتساب سے پرانی آشنائی بھی ہے۔ زیر نظر شمارہ انتساب کا شمارہ نمبر 104 ہے اور اس طرح اسے شائع ہوتے 34واں سال ہو گیا ہے اس کے سرپرست نثر اکروال، مدیر آفاق سیفی اور ترتیب کار سیفی سرونجی ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس میں نامور لکھاریوں کی تحریریں اور شاعروں کی شاعری موجود ہے۔ مضمون نگاروں میں پروفیسر عبدالقدوس جاوید، حافظ کرناٹکی، طارق بخشی، ڈاکٹر ایچ مالوی، سلطان اظہر جاوید، مراق مرزا، خورشید کاظمی، ڈاکٹر عفت شاہ، ڈاکٹر فرخانہ معراج، احمد معراج اور سیفی سرونجی وغیرہ نے مختلف ادبی موضوعات پر قلم فرسائی کی ہے۔ افسانوں میں ناصر بغدادی، ڈاکٹر علی عباس امید، وکیل نجیب کے افسانے شامل ہیں جبکہ دستی سعید کا خصوصی گوشہ ترتیب دیا گیا ہے۔

شاعری میں بیرونی ممالک کے شعرا رامون ایمن۔ یوین شیر، یعقوب تصور، وصی عرفانی، نیلم جوگن کا کلام بھی شامل ہے۔ اور بھارت کے سرکردہ شاعروں کی شاعری میں جگمگا رہی ہے ان شاعروں میں غلام مرتضیٰ راہی، مہدی پرتاب گڑھی، شاہد عزیز، انور سلیم، محمد شاہد پٹھان، شارق عدیل، معید رحمانی، اختر کاظمی، ڈاکٹر مہتاب عالم، بدر مہدی، جمال قدوسی، بشیر احمد بشیر، قیامت انجم، ساجد پریمی، زبیر گورکھپوری، ناصر شاہی وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ کتابوں کی دنیا میں ایک درجن سے زائد کتابوں اور رسالوں پر تبصرے کیے گئے ہیں ان میں چند تبصرے متین ندوی، ظہیر حسن ظہیر، ڈاکٹر مظفر سروقی کے ہیں جبکہ سات کتابوں پر سیفی سرونجی کے کیے گئے تبصرے شائع ہوئے ہیں۔

انتساب کے آخری صفحات پر کچھ ادبی تقریبات اور خطوط کو جگہ دی گئی ہے۔ اس طرح تقریباً دو سو صفحات کا یہ شمارہ مطالعے کے شوقین کی ذہنی بالیدگی کا سبب بنتا ہے جس کے لیے اس جریدے کی ٹیم مبارکباد کی مستحق ہے کہ وہ اس غیر منافع بخش سرگرمی کو اردو ادب کی خدمت کے طور پر سرانجام دے رہی ہے۔ مختلف ممالک میں اس کے نمائندے بھی موجود ہیں۔ پاکستان کے لیے سید معراج جامی اور مسعود تنہا اس کے نمائندہ ہیں۔

بیجنگ فیر ملاں گے

مصنف: حمید رازی **مبصر: آفتاب خان**

صفحات: 80 قیمت: 200/روپے پبلشرز: پنجابی مرکز، لاہور

حمید رازی پنجابی زبان کے لکھاری کار ہیں اور ان کی بعض کتب بھی شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب سفرنامے پر مشتمل ہے جو انہوں نے چین کا کیا تھا۔ چین کے سفرناموں کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور کافی مقبول بھی ہیں۔ مگر یہ زیر نظر کتاب پنجابی زبان میں لکھی گئی ہے۔ پنجابی ہمارے ملک کی بہت پیاری اور میٹھی زبان ہے مگر بولنے کی حد تک۔ لکھنے پڑھنے والوں کے لیے یہ زبان قدرے مشکل بھی ہے اور خاص طور پر نئی نسل تو اردو بھی مشکل پڑھتی ہے چہ جائیکہ پنجابی پڑھنا پڑ جائے۔ اگر یہ کتاب اردو زبان میں لکھی جاتی تو اس کی اہمیت دو چند ہو جاتی پھر بھی غنیمت ہے کہ راقم کو یہ زبان پڑھنے میں دشواری پیش نہیں آتی اور اکثر کتابیں پنجابی کی پڑھنے کا موقع ملتا رہتا ہے اس لیے یہ کتاب پڑھ کر بھی لطف اٹھایا۔ مصنف حمید رازی کا انداز تحریر سادہ مگر دلچسپ ہے۔ انہوں نے چین جا کر وہاں جس جس مقام پر بھی جانے کا موقع ملا اس کا خوب نقشہ کھینچا ہے اور ہر جگہ ہر چیز کا تاریخی پس منظر بھی بیان کر دیا ہے۔ مصنف نے بیجنگ میں قیام کے دوران وہاں کی ثقافت، رہن سہن، لوگوں کے رویوں اور خرید و فروخت کے تجربات کا ذکر بھی کیا ہے اور چین کے قابل ذکر مقامات کی تفصیل بھی بیان کی ہے مثلاً دیوار چین، دو ہاں ہو بے میوزیم، پھر میوزیم اور یاسے پاگمے ٹی وی ٹاور ، پھر ٹی وی ٹاور وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔

اگرچہ یہ زیادہ طویل سفرنامہ نہیں اور اکثر چیزوں اور مقامات کا سرسری سا ذکر کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود اس سفرنامے سے چین اور اس کے شہر بیجنگ کے بارے میں بنیادی اور ضروری باتوں کا علم ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگلی بار اگر حمید رازی چین گئے تو زیادہ تفصیلی اور "بھروان" سفرنامہ اردو میں تحریر کریں گے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ فیض یاب ہو سکیں۔

گونگے کا خواب

مصنف: طارق بلوچ صحرائی **مبصر: آفتاب خان**

صفحات: 190 قیمت: 500/- روپے پبلشر: سنگ میل، لاہور

یہ طارق بلوچ صحرائی کا دوسرا افسانوی مجموعہ ہے جس میں 23 افسانے شامل ہیں۔ ان کے افسانے ایک عرصے سے ادبی رسائل میں پڑھنے کا موقع مل رہا ہے اور اس کتاب کے بھی افسانے پڑھ کر بھی یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ایک خاص اندازِ تحریر ہے جو ان سے شروع ہو کر انہیں پر اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ وہ اندازِ تحریر یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں بیانیہ زیادہ ہوتا ہے، کہانی کہیں کہیں ملتی ہوتی ہے اور یہ چھوٹے چھوٹے جملوں اور بیانیے سے اپنی تخلیقی فضا قائم کرتے ہیں جو بہرحال متاثر کن ہے اور اس تحریر کے بہاؤ میں قاری کو اس بات کا قطعاً احساس نہیں ہوتا کہ وہ کوئی افسانہ پڑھ رہا ہے، کہانی پڑھ رہا ہے یا کسی انشائیے کا مطالعہ کر رہا ہے۔

طارق بلوچ صحرائی اپنے تخلیقی بیانیے سے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو آشکار کرتے ہیں اور پھر خود ہی چند جملوں میں پیدا ہونے والے مسائل کا حل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ وہ افسانے کے اختتام پر ایک آدھ جملہ یا مکالمہ ایسا لکھ دیتے ہیں جو پورے افسانے پر بھاری ہوتا ہے اور اسے افسانے کا مرکزی خیال بھی کہا جا سکتا ہے۔ چند مختلف افسانوں کے مکالمے ملاحظہ کریں:

(1) "دنیا کبھی بازار میں نہیں بکتی، جاؤ۔۔۔ اپنے رب سے اخلاص اور جنون کے سکوں سے قربِ الٰہی خریدو۔۔۔ رب دنیا جھونگے میں دے دیا کرتا ہے۔" (جھونگا)

(2) "بیٹا یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو رات کی تاریکی میں اپنے آنسو رب کے حضور پیش کرتے ہیں اور دن کے اجالے میں اپنی مسکراہٹ کے پھول اس کی مخلوق کے آگے نچھاور کرتے رہتے ہیں۔" (خوبصورت تاج)

(3) "بہاؤ کے ساتھ بہنے والے تنکوں اور محبت کے بغیر زندگی کا کوئی عنوان نہیں ہوتا۔" (بلا عنوان)

(4) "بابا مجھے انسانوں کے جنگل میں چھوڑ کر مت جاؤ، یہاں سارا شہر امن کے پرندے کا شکاری ہے۔" (قافلہ سالار)

اس طرح کے مکالمے ان کے ہر افسانے کے ہر پیراگراف میں موجود ہیں اور وہ کہانی کو پس پردہ رکھ کر یا غیر ضروری سمجھ کر اپنے قلم کی آنچ سے مکالموں کی شمع روشن کرتے ہیں جس سے ان کے افسانوں میں ہمارے دیہاتوں کی رہتل بھی سامنے آتی ہے اور مضافات سے جڑے شہروں کی چکا چوند میں بھٹکنے والوں کے خوابوں کی کرچیاں بھی بکھری دکھائی دیتی ہیں۔ لہٰذا یہ افسانے نظر انداز کرنے کی بجائے نظر نواز کرنے کے قابل ہیں۔

◆◆◆

انسانوں پر بھروسہ کر بھی لیا جائے تو وقت اور حالات پر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ وقت اور حالات وہ چیز ہیں جو ہر جذبہ ہر رشتہ بدل دیتے ہیں۔ (اشفاق احمد)

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ مائی ڈیئر سوہان اظہر جاوید۔

''تخلیق کا یادگار خاص نمبر چند دن قبل ملا تھا۔ میں اس دورانیے میں دو سانحات سے دوچار ہوا میرے دو چھوٹے بھائی یکے بعد دیگرے اللہ کو پیارے ہو گئے ان سانحوں کے معاملات سے دوچار ہونا فطری بات تھی۔ ''تخلیق'' کا پیش نظر شمارہ واقعی ''یادگار خاص نمبر'' ہے۔ سرورق سے اس کی خصوصیت کی جلوہ گری شروع ہوتی ہے اور ورق گردانی کے ساتھ اس کی جلوہ گری کا دائرہ وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اس بار آپ کے اداریے ''پہلی بات'' نے بڑی دیر تک مجھے گھیرے رکھا۔ دوسرے پیراگراف میں ڈاکٹر انور سدید اور محترمہ مرحومہ قدسیہ بانو کے حوالے سے آپ نے بات شروع کی اور بانو قدسیہ کے تخلیقی منصب کا چند سطروں میں جن خیالات اور احساسات کا اظہار کیا ہے اور ان کی مجموعی شخصیت کی بڑی دلکش تصویر کشی کی ہے وہ میرے نزدیک بڑی متاثر کن ہے۔ اس شمارے کے تین تصویری گوشے اس شمارے کے روشن ترین صفحات ہیں۔ تخلیق ایوارڈ کی تصویری جھلکیاں، اظہر جاوید کی پانچویں برسی کی تقریب کی تصاویر اور ماہنامہ تخلیق کی جانب سے مہمانان خصوصی کی پذیرائی کی تصاویر نگاہوں میں بسی ہوئی ہیں۔ ان تصاویر میں ارباب فکر و دانش کی ایک کہکشاں سجی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ دیگر خصوصیات کے علاوہ پیش نظر یادگار خاص نمبر کا یہ حصہ خاص کہلانے کا بھرپور استحقاق رکھتا ہے۔ اس کی پیش کش میں جو سلیقہ شعاری دکھائی گئی ہے وہ قابل تحسین و توصیف ہے۔

زیر نظر شمارے کے مضامین میں اظہر جاوید کی پانچویں برسی کی تقریب کا رپورتاژ سرفراز سید کی ایک متاثر کن تحریر ہے اور پانچویں برسی کی تقریب کا یہ بیانیہ مرحوم اظہر جاوید کے باب میں معنویت اور قدر و منزلت کا حامل ہے۔ ڈاکٹر ہارون رشید کا مضمون ''زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے'' پڑھ کر 2016ء کے دوران ادبی منظر نامے سے روپوش ہونے والوں کی ایک بڑی جامع فہرست پیش کی گئی ہے اور اس مضمون کے قاری کو صاحب مضمون کا شکر گزار ہونا منطقی بات ہے کیونکہ اس فہرست میں کتنے ایسے گراں قدر نام شامل ہیں جو میری طرح بہتوں کے علم میں نہیں آئے ہوں گے۔ اس شمارے میں دو گوشے یعنی گوشہ اظہر جاوید اور گوشہ انور سدید میں شامل تحریریں صاحبان تحریر کی بصیرت و بصارت کی نمائندگی کرتی ہیں جن کے باعث مرحوم اظہر جاوید اور ڈاکٹر انور سدید کے کثیر الجہت ادبی کارناموں سے قارئین کو واقفیت کے ساتھ ساتھ سامان بالیدگی حاصل ہوتا ہے۔ مدیر ''تخلیق'' سوہان اظہر جاوید کی تاثراتی تحریر ''قلم دان'' اور اے خیام کا ڈاکٹر انور سدید کو خراج تحسین قابل توجہ بھی ہے اور ادبیت کا حامل بھی۔ غرض یہ کہ پیش نظر یادگار خاص نمبر کے نثری اور شعری حصے میں شامل تحریروں اور تخلیقات کا مطالعہ قارئین کے ذوق ادب اور ادراک و شعور کے فروغ میں معاون ثابت ہوگا اور حاصل مطالعہ قرار پائے گا۔

میں پہلے بھی لکھ چکا ہوں کہ تخلیق اردو جرائد کی اس فہرست سے تعلق رکھتا ہے جس کا حوالہ تاریخ ادب میں ناگزیر ٹھہرتا ہے اور یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ تخلیق کا یہ سفر جاری ہے اور سونان اظہر جاوید اس ورثے کو وسیع تر کر رہے ہیں جو انہیں مرحوم اظہر جاوید سے حاصل ہوا تھا۔

مسلم شمیم (کراچی)

﴿2﴾ عزیزی سونان اظہر۔

بہت آداب و دعائیں! آپ کا خوبصورت تخلیق ملا۔ ٹائٹل سے لے کر سبھی کچھ دل پذیر۔ اظہر صاحب کی یاد زندہ رکھنے کا اس سے بہتر طریقہ کیا ہو سکتا ہے۔ تحریریں معیاری شاعری دل گداز۔ آپ کا مضمون ''ختم دن'' پڑھ کر یہ خیال مستحکم ہو گیا کہ اظہر صاحب آپ میں زندہ و پائندہ ہیں۔ کیا خوب تحریر ہے۔ اب کی بار میں بھی اپنا حصہ ڈال رہی ہوں۔ امید ہے تخلیق میں جلدی شامل ہو سکے گا۔ بہت شکریہ

نیلم احمد بشیر (لاہور)

﴿1﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید۔

دسمبر 2016ء کا ''تخلیق'' نظر نواز ہوا۔ ''پہلی بات'' کے تحت آپ نے ادارتی پالیسی کے بارے میں اپنا موقف جس مدلل انداز میں پیش کیا ہے اسے پڑھ کر اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ مجھے آپ کا یہ جملہ بہت پسند آیا ''جب ادب میں سیاست در آئے اور سیاست سے ادب (تہذیب و شائستگی) دور ہو جائے تو معاشرے اور قوم کی پہچان اور شان ختم ہو جاتی ہے۔'' اس جملے میں ادبیت بھی ہے اور طنز کی لطیف کاٹ بھی۔ محترمہ عذرا اصغر کا 2016ء کا ''تخلیق ایوارڈ'' ملنا نہایت خوش آئند اقدام ہے۔ میں انھیں اور آپ (دونوں) کو دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اسے کہتے ہیں حق بحقدار رسید۔ موصوفہ کے فن اور شخصیت پر سلمیٰ اعوان صاحبہ کا مضمون مختصر ہونے کے باوجود وقیع ہے۔ اس موضوع پر بشریٰ طراز کا مضمون بھی لائق ستائش ہے کہ یہ گہری فکر کی گواہی ہے۔ ''شہزاد احمد'' (ڈاکٹر انور سدید) میں ہمارے عہد کے ایک مسلم الثبوت ادیب، شاعر اور ادبی صحافی کو بجا طور پر خراج عقیدت پیش کیا گیا ہے۔ ''اکمل صابری''(ڈاکٹر ہارون الرشید) بھی فکر انگیز مضمون ہے۔ ''فیض احمد فیض'' (اظہر جاوید) بہت پر لطف رہا۔ مولانا عبدالباری آسی (شارح غالب) کے حوالے سے یہ جملہ لاجواب ہے کہ وہ ''غالب کے ہر شعر کی شرح کے بعد لکھتے ---- میں نے بھی کہا ہے۔'' آج کل ہمارے کالم نگار شاعروں کا بھی یہی وطیرہ ہے کہ وہ تحریر میں اپنے ہی حوالے دیتے رہتے ہیں۔ آنجہانی کشمیری لال ذاکر پر نصر کشور وکرم اور کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی کے مضامین بھی خوب ہیں۔ نارنگ صاحب واقعی اردو کے محسن و مربی ہیں اور بڑے کام کرتے ہیں۔ ان کی مرتب کردہ ''کلیات اکبر'' خاصے کی چیز ہے۔

افسانے میں سب نہیں پڑھ سکا لیکن جو پڑھے ہیں ان میں ''صنم کدہ'' (یاسمین احمد) ''اور وہ پیدا ہو گیا'' (عطیہ سید) ''بدلتا ہے رنگ ---- !'' (عذرا اصغر) اور ''زوئی'' (شمع خالد) پسند آئے۔ خوشی ہوتی ہے یہ جان کر کہ ماشاء اللہ شمع خالد کا ادبی سفر تیزی سے طے

میں بھی سست رفتاری سے جاری ہے۔ "عشیر نیازی اور میں" مرحوم اظہر جاوید صاحب نے دلچسپ یادیں شیئر کی ہیں۔ حسین مجروح کے دوسرے شعری مجموعے "آواز" پر مسلم شمیم صاحب کا تنقیدی مضمون لائق ستائش ہے۔ حسین مجروح اور مسلم شمیم دونوں اردو ادب کے درخشاں ستارے ہیں۔ اخلاق عاطف صاحب نے طارق حبیب کے مجموعہ کلام "ملامت" کا بڑی عرق ریزی سے جائزہ لیا ہے۔ شعری حصے کی تخلیقات بھی متاثر کن ہیں۔

یہ خط ختم کر رہا تھا کہ آپ کا ارسال کردہ "تخلیق" کا "یادگار خاص نمبر" (مارچ 2017ء) موصول ہوا۔ بے حد شکریہ۔ اب مزید بات چیت اسے پڑھ کر ہوگی۔

ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ معین قریشی (کراچی)

(4) محترم سونان اظہر جاوید صاحب۔ سلام مسنون

"تخلیق" کا یادگار خاص نمبر موصول ہوا۔ شکریہ۔ سچ تو یہ ہے کہ "تخلیق" کا ہر شمارہ میرے لیے یادگار اور خاص نمبر ہوتا ہے۔ اتنی یادیں لے کر آتا ہے۔ تقریباً نصف صدی کی یادوں کا احاطہ کئے ہوئے۔ مکمل خلوص پہ مبنی دوستی، حالات و واقعات کی ایک خوبصورت فلم چلنے لگتی ہے۔ سینکڑوں یادیں رقص کناں ہوتی ہیں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی ایک خط میں لکھ چکا ہوں کہ "تخلیق" کے پہلے شمارے سے لے کر کچھ عرصہ تک باقاعدگی سے بھرپور شمولیت رہی ہے۔ اس کے بعد ایک طویل سکوت۔ جسے اب میں اپنی نااہلی پہ محمول کرتا ہوں۔ صرف یہ نہیں کہ "تخلیق" میں لکھنا بند کر دیا بلکہ بہت ساری وجوہات غلط یا درست ہے کی بنا پر مکمل طور پر طویل عرصہ ادب ہی سے ہٹ گیا۔ لکھنا لکھانا بند۔ یقیناً یہ ایک غلط فیصلہ تھا بہرحال "Done is deone which cannot be undone"۔ پھر کسی کے اصرار بلکہ ضد کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو ترتیب دینے لگا۔ اپنی استعداد کے مطابق کچھ عرصہ سے پھر "اظہر جاوید" کے ساتھ ہم کلام ہونے لگا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے ایک دوسرے کو اپنے دکھ درد بتا رہے ہیں۔ اظہر جاوید کے بے مثل لطائف اور ان کے سنانے کا منفرد انداز پھر سے جنم لے چکا ہے۔ میرے لئے یہ کیا کم ہے تمہاری کامیابیوں اور کامرانیوں کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ تمہارے عظیم والد کا ایک عظیم خواب تھا جسے "تخلیق" کی صورت میں انہوں نے حقیقت کا روپ دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے یہ سب ممکن ہوا۔ یہ ان کی لگن، محنت لیکن سب سے بڑھ کر ان کے بے پایاں خلوص کا حاصل ہے جو بہرحال انہیں رب کریم نے عطا کر رکھا تھا۔ اظہر جاوید کی ساری زندگی عدم کے اس شعر کی مکمل ترین تصویر ہے۔

اے عدم جرم گناہ کر لیکن ۔۔۔ دوستوں سے ریا کی بات نہ کر

اظہر جاوید فرشتہ نہیں ایک انسان تھا۔ کبھی خود کو فرشتہ بنا کر پیش نہیں کیا۔ یہ اس کی فطرت اس کے مزاج سے قطعاً متضاد ہوتا۔ اظہر جاوید کے کسی انداز کسی رویے پہ تو کسی کو اعتراض ہو سکتا ہے لیکن اس کے خلوص پہ آج تک نہ کوئی انگلی اٹھی ہے نہ انشاء اللہ آئندہ اٹھے گی۔ تعلقات کو بطریق احسن نبھانا اس کی گھٹی میں تھا اس کی فطرت تھی۔ دولت بھی اظہر جاوید کے لئے اہمیت کی حامل نہیں رہی۔ اس نے جو رستہ اپنایا، زندگی گزارنے کا جو انداز اختیار کیا اس کا ایک ایک لمحہ گواہ ہے۔ "تخلیق" کے اجراء کا عمل بھی اس کا مکمل عکاس ہے۔ یہ کی

طرح بھی مالی فائدہ کا سبب نہیں تھا۔ اس راہ میں کئی مشکل مقام بھی آئے لیکن وہ مرد قلندر ہمیشہ اپنی دھن پہ چلا رہا۔ زندگی بھر کہیں آنکھیں نیچی نہیں کیں۔ ''تخلیق'' اس کا عظیم ورثہ ہے جو آپ تک منتقل ہوا۔ یہ ادبی افق کا وہ ستارہ ہے جسے ایک سہارے کا سہارا تھا۔ آپ نے اس کو خوش دلی سے قبول کیا اور رب کریم کی مہربانی و نوازشات سے اپنے عظیم والد کی روح کو ایک ''سکھ'' کی حیثیت سے ہمیشہ شاداں و فرحاں رکھا۔ اسی بنا پہ ہمیشہ آپ کے لئے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔

ملک اشرف ذکی (چکوال)

﴿5﴾ محترم عزیزم سونان اظہر جاوید صاحب

السلام علیکم۔ کہا جاتا ہے کہ بہتر وارث وہ ہوتا ہے جو اپنے اسلاف کی روشن روایات کو فروغ بخشے اور ان کی حسن آفرینی اور خیر افروزی پر کوئی حرف نہ آنے دے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اس مطرح کی لاج رکھی ہے۔ جناب اظہر جاوید کی تخلیقی اور خداداد صلاحیتوں کے اظہاریوں میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ میں برسوں سے تخلیق کا شیدائی ہوں اور خدشہ تھا کہ مرحوم کے پردہ کرنے کے بعد کہیں تخلیق کی آب و تاب ماند نہ پڑ جائے لیکن شکر ہے جو پرچہ بھی منصۂ شہود پر آتا ہے وہ خوب سے خوب تر ہی کا معیار برقرار رکھتا ہے۔ میں حمد حسین کی بے پرکی اڑائی ہوئی بلکہ خواہ مخواہ کی واہی ہوئی درفنطنی کو رد کرتا ہوں کہ تخلیق کسی مخصوص ادبی گروپ سسٹم کو فروغ دے رہا ہے۔ میرے خیال میں آپ نے مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں غیر جانبداری پر آنچ نہیں آنے دی۔ عذرا اصغر پر سلمیٰ اعوان کی گفتگو معیاری تھی۔ عذرا اصغر کو تخلیق ایوارڈ 2016ء ملا ہے تو حقدار بحق رسید والی بات ہے۔ محرومین دل چھوٹا نہ کریں اور معیاری ادب کی تخلیق میں فکر کاری کا مظاہرہ کریں نہ کہ سینہ کوبی کا۔ امین راحت چغتائی کی علالت حزن دے گئی۔ ماشاءاللہ فنی پختگی میں بھی یہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر انور سدید (مرحوم) نے شہزاد احمد کی یادیں تازہ کی ہیں۔ وہ ان توصیفی کلمات کے حقدار بھی تھے۔ اختر کی نعت پر جناب امین راحت چغتائی نے جو کچھ لکھا ہے اس پر میرے ذاتی تحفظات ہیں۔ وہ رومانی شاعر ہیں اور منظر نگاری اور ترنم ریزی کی خوبیوں سے متصف ہیں۔ نعت گوئی ان کا ایسا وصف نہیں جسے بطور خاص سراہا جائے اور خواہ مخواہ گزیدہ نعت گو حضرات میں نہیں کوئی نہ کوئی ''نمبر'' ضرور دیا جائے۔

فیض احمد فیض پر لکھتے وقت ٹھوس حقائق اور اختلاف کو الف طور خاطر رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں فیض پر یہ مقالہ نہایت معرکہ آرا اور بڑا اعتبار سے معلومات افزا ہے۔ سلیم جاوید مزید محنت کریں تو یہ مبسوط کتاب فیض کے حوالے سے نہایت مستند گردانی جائے گی۔ ڈاکٹر جواز جعفری کا خدا بھلا کرے وہ کلاسیکی موسیقی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر جواہر آب دار نکالنے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔

غزلوں اور نظموں کا حصہ نہایت وقیع ہے۔ شروع میں نعت اور حمد کے مضامین دل انگیز ہیں اور ان کی شروعات کا سہرا آپ کے سر ہے کہ اظہر جاوید مرحوم اس سمت بوجوہ زیادہ توجہ مبذول نہ کر سکے تھے۔ آپ کے پرچے میں محترم غلام نبی اعوان کی غیر حاضری کھٹکتی ہے۔ وہ قدرے علیل ہیں۔ لیکن ان کا دم بڑا اعتبار سے غنیمت ہے۔ خدا کرے وہ صحت مند ہیں!

سیّد ریاض حسین زیدی (ساہی وال)

﴿6﴾ محترم از جاں سونان اظہر جاوید صاحب

السلام علیکم۔ تخلیق کی تازہ کاری، شگفتگی دیکھی نہیں جاتی۔ آپ نے عظیم شاعر ادیب مدیر اظہر جاوید کی روایات کو اور ''خوش قدم'' کیا ہے۔ اب کے بھی رسالے کی تحریریں ''حسن پیش کاری'' کا نمونہ تھیں۔ میرا رابطہ نمبر کوئی بھی نہیں۔ آپ جانتیں ہیں ثقل سماعت کا مارا ہوا ہوں۔ اونچا سنتا ہوں۔ میری وجہ سیل فون نہیں۔ کہتے کہ ان سے ''کان پڑی'' آواز سنائی ہی نہیں دیتی۔ اس پر طرہ یہ کہ بدخطی بھی ڈراتی ہے کہ کہیں کمپوزنگ نہ تاک جھانک کھینچ لے۔ ہر چہار ماہ تخلیق کے مطالعے سے لفظ و معنی کی رونق ہو جاتی ہے آپ رسالہ بھیجتے ہیں۔ مہربانی آپ کی۔ آپ حسن ادارت کا کنواں کھودتے ہیں پیاس ہم بجھاتے ہیں۔ آپ کی محنت اور محبت ''تخلیق'' کو چار چاند لگاتی ہے۔ رسالے کا شعور پری اور طرز و ادا حسن بھاتے ہیں۔ آغا گل کا افسانہ اپنے مسائل اور انداز کا واحد افسانہ ہے۔ افسانہ نگار کے اندر کی انجمن لفظ لفظ ''پہونچ'' لگاتی ہے۔ آغا گل منفرد افسانہ نگار ہیں۔ ان سے میرا سلسلہ مراسلت چلا تھا۔ ان کی تحریر میں کوئی کوئی آب و دانا چلتی رقم ہوتی ہے۔ ملک اشرف ذکی صاحب نے اپنے خط میں میرا بھی ایک شعر لکھا ہے۔ ان کی عنایت ہے۔ میں انہیں رسالوں میں دیکھتا رہتا ہوں۔ انہیں خیال کے تیور خوش گوار ہیں۔ گفتگو میں احترام و عزت ملحوظ خاطر ہو تو طبیعت پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ بدخطی کے باوجود میری غزل کی کمپوزنگ بالکل ٹھیک ہوا ہے!
خیر اندیش!

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

﴿7﴾ سونان اظہر جاوید

السلام علیکم۔ اس سے پیشتر مئی 2016ء میں ایک ''ستائش نامہ'' میں ڈاک کر چکی ہوں۔ میرا خیال ہے وہ ہم پاکستانیوں کی طرح راستے بھٹک کر کسی کونے کھدرے میں اونگھ رہا ہوگا۔ تخلیق کا تازہ شمارہ ''یادگار خاص'' ''میری روح فرسا تنہائی کا'' وفادار ساتھی ہے۔ صحت بحال نہ ہونے کی وجہ سے قسطوں ہی میں پڑھ پا رہی ہوں۔ تصویری ایوارڈ 2016ء کی تصویری جھلکیاں میرے پیش نظر ہیں۔ اللہ اللہ تو پر دو سونان اظہر میری دل نشین دوست عذرا اصغر کو 55 سالہ ادبی خدمات تخلیق ایوارڈ پیش کر رہے ہیں۔ عذرا اصغر تہذیب و شائستگی کا دوسرا نام — دستور وفا کی آئینہ دار۔ ان کا ہر عمل سچا اور کھرا ہے اور باتوں میں تازہ پھولوں کی بھینی بھینی مہکار ہے۔ مجھے ضیا سرحدی یاد آ رہے ہیں۔ ''لگ باتیں کریں اور باتوں سے خوشبو آئے۔ درد پھولوں کی طرح مہکے اگر تو آئے۔''

میں خطہ پوٹھوہار کے ایک خوبصورت گاؤں ''پھول گراں'' کی پروردہ ہوں۔ ادیبہ ہوں نہ شاعرہ، بس دیکھے خدا کی لازوال محبت میں سرشار رہتی ہوں۔ اسی طرح ان دیکھے اور دیکھے ہوئے انمول تخلیق کاروں کی پرستار ہوں۔ ان کی صمیم قلب سے شکرگزار رہوں۔ احسان مند ہوں کہ وہ اپنی دل پذیر، دل کش اور دل نواز تحریروں سے میری تشنہ روح کی آبیاری کرتے ہیں۔ مجھے طمانیت قلب اور سکون عطا کرتے ہیں۔ میرا دل ان کی چاہت و محبت کی لازوال محبت سے مالا مال ہے۔ پاؤ ماں کیس کا خطرہ نہ احتساب کا خوف! ''محبت بھری ادبی پھوار'' سے میرے چاروں طرف آسودگی ہی آسودگی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد تصنع و بناوٹ سے پاک، مجسم جدو ادب، اخلاق حسن کا مرقع، آسمان ادب کا روشن روشن مینارۂ نور، قابل رشک ہیں وہ طالب علم جو ان کی ذات گرامی سے منسلک رہے۔ ''عاشق صبر طلب'' کی تیرھویں قسط پڑھ کر

میرے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور میں تخلیق کو اپنی گود میں لئے آنسو بہاتی رہی۔ دکھ بھرے، ندامت سے لبریز آنسو۔

علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے "روزِ حساب جب میرا پیش ہو دفترِ عمل آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر"

افتخار مجاز! میں آپ کی انسان دوستی اور بے لوث محبت کو سلام پیش کرتی ہوں۔ خلد آشیاں اعزاز احمد آذر کو میں نے نہیں دیکھا، لیکن فون پر جب بھی اُن کی تحریر کو سراہتی یا اظہر ادی کی "محفلِ احباب" میں اُسے توصیفی کلمات سے نوازتی تو اظہارِ تشکر کر کے میرے دل میں اپنی قدر، عزت اور محبت اور بڑھا لیتے۔۔۔ ہائے افسوس ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے! آسمانِ ادب کا ماہِ کامل، اردو ادب اور شعر و شاعری کی معراج اعزاز احمد آذر معراج شریف والے دن ہم سے بچھڑ گیا۔ اظہر ادی کی محفل احباب میں میں نے اس کا آخری خط پڑھا، لکھا تھا۔۔۔ "میرے پاؤں میں اظہر اٹھا کر پڑھنے کی سکت نہیں رہی بمشکل یہ سطور لکھ رہا ہوں۔" فون پر میں نے فوراً رابطہ قائم کیا۔ گھبرائی آواز میں شیخ سے پوچھا کیا اعزاز ہسپتال داخل ہے؟ "اعزاز احمد تو معراج والے دن اس دنیا سے رخصت ہو گیا" رقت بھری آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔۔۔ میں خاموش ہم بخود۔۔۔ اللہ کی رضا پر راضی!

"گلشن کی بہاروں میں، رنگین نظاروں میں۔۔۔ جب تم مجھے ڈھونڈو گے، آنکھوں میں نمی ہوگی۔۔۔ محسوس تمہیں ہر دم پھر میری کمی ہوگی۔" اللہ اکبر!

اظہر جاوید کی پانچویں برسی۔۔۔ زمین کھا گئی آسمان کیسے کیسے

محبت و احترام میں ڈوبی ہوئی صرف دو ملاقاتیں، جگنوؤں، سرسبز میں محبت کے جگنوؤں سے حسنات آرزو۔ طفیل اختر کی دلگیر، اثر پذیر تحریر کے ہمراہ انکشافات، برسات کی بھیگی راتوں میں جگنوؤں، بہاری جگنوں کو تتلیوں و حصار میں لینے کی کوشش کرنے والی رخسانہ نور، سیدہ نور کے پھیلائے گھور کالے اندھیرے میں گم ہو کر امر ہو گئی۔ سچی اور کھری محبت کا بے ساختہ پن دیکھئے۔۔۔ "اپنے شادی کی غزر۔۔۔ زندگی، چاہت، وفا اور یہ "الہام" بھی۔ شادی بلکہ "گمراہی" کی طرف کیا صلہ ملا؟"۔۔۔ "تن کو سرطان اور ذہن کو سوکن کا جاپا" یہ دیار بے مہر بے مہرے ہے ہم۔ کہانی محبت کی زندہ رہے گی!

انور سدید، گلشن ادب کا باغبان۔۔۔ خلوص و محبت کی نورانی قندیل۔۔۔ دکھی لوگوں کا مسیحا، اب خاک بسر ہے لیکن ان کی جگمگاتی پُر تاثیر تحریریں زندہ و تابندہ ہیں۔ ان کی شب و روز کی محنت شاقہ اور سچی لگن کا یہ لازوال صلہ ہے۔ "حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا" تخلیق کے تمام تخلیق کار، مرصع موتیوں کی انمول لڑی ہیں۔ سب کے لئے میری محبت بھری دعائیں۔

جمیلہ شبنم (اسلام آباد)

(8) محترمی و مکرمی جناب سونان اظہر جاوید صاحب!

سلام مسنون! ماہنامہ تخلیق لاہور کا مارچ 2017ء کا شمارہ بعنوان "یادگار خاص نمبر" ملا۔ اس کا تخلیقی نوعیت کا سرورق دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ آپ نے اپنے والد مرحوم جناب اظہر جاوید کی وراثت کو قائم رکھتے ہوئے یقیناً اپنا حق ادا کر دیا ہے۔ اور انشاءاللہ تخلیق ہمیشہ جاری رہے گا۔ اور دیگر جرائد کی طرح مدیرانِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ دم نہیں توڑے گا۔ اللہ کریم اس مشن میں آپ کی ضرور مدد

فرمائیں گے اور آپ کو تمام رفیقانِ تخلیق اور معاونینِ تخلیق کا تعاون حاصل رہے گا۔

جناب اظہر جاوید صاحب کی برسی کی بھرپور تقریب 13 فروری کو منعقد ہوئی جس کا ذکر کرتے ہوئے آپ نے اردو زبان و ادب کے نامور اور روشن ستاروں کے نام لئے جو سال 2016ء میں قارئین تخلیق سے جدا ہوئے اور آپ نے ان تمام ہستیوں کے لئے درجات کی بلندی کی دعا بھی کی۔ اس وقت مجھے یاد آیا کہ میں نے آپ کو سیالکوٹ کے معروف شاعر جناب تاب اسلم کے انتقالِ پُرملال کی اطلاع ایک خط مورخہ 20 فروری 2017ء کے ذریعے اس التماس کے ساتھ کی کہ آپ کی وساطت سے تخلیق کے تمام قارئین کو دعائے مغفرت کے لئے درخواست کی جائے۔ یہ عمل کارِ ثواب تھا لیکن مجھے بے شمار ادبی شخصیتوں میں تاب اسلم کا نام نظر آیا۔ پھر اس بات کا ذکر یوں بھی کر دیا مگر یہ کوئی شکوہ نہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کو میرا اطلاعی خط نہ ملا ہو۔ خیر چھوڑیئے اس بات کو۔ تخلیق ایوارڈ کے سلسلے کی 2016ء کی تقریب کی تصاویر نہایت اہم ہیں جو اس کو یادگار بنانے میں مدد معاون ہیں۔ جناب اظہر جاوید صاحب کی پانچویں برسی کی تقریب بھی نہایت بھرپور اور پُرخلوص رہی اور شرکاء کی تصاویر اور مہمانانِ خصوصی کی پذیرائی کی تصاویر قارئین تخلیق کے لئے بیش قیمت دستاویز کے طور پر ان کے دلوں میں محفوظ رہیں گی۔ جناب سرفراز سید نے اپنے رپورتاژ بعنوان "اظہر جاوید ـــ یادوں اور دعاؤں کی پانچویں تقریب" میں نہایت دلکش انداز میں برسی کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے جس سے تمام تقریب کی گویا فلم چلتی ہوئی نظر آتی ہے وہ یقیناً اس رپورتاژ کے لکھنے پر داد و تحسین کے مستحق ہیں اللہ تعالیٰ انہیں صحت اور تندرستی عطا فرمائے تاکہ وہ اردو ادب کی ضرورت تادیر فرماتے رہیں۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا مضمون "زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے" ان نامور دانشوروں، شاعروں، ادیبوں اور صحافیوں کے بارے میں جو 2016ء میں ہم سے بچھڑ گئے ایک مکمل اور صحیح معلومات اور مختصر حالات زندگی کے ساتھ ایک جائزہ ہے انہوں نے جہاں اہل ادب کی برادری سے اپنے قریبی اور گہرے تعلقات کا ثبوت بہم پہنچایا ہے وہاں تخلیق کے قارئین کو بھی صحیح اور مصدقہ معلومات فراہم کی ہیں جس کے لئے ہم سب قارئین ان کے شکر گزار ہیں۔ اعتبار ساجد کا مضمون "کچھ بشریٰ رحمٰن کے بارے میں" اور گوشہ اظہر جاوید میں حسن عسکری کاظمی کا مضمون "اظہر جاوید اور تخلیق ـــ سلطان اظہر کا آئینہ" اور شیخ خالد کا مضمون "اظہر جاوید کی یاد میں" بھی نہایت اہم اور معلومات افزا ہیں جو اردو ادب کے طالب علموں کے لئے تاریخ ادب اردو کے ابواب کی صورت ان کے علم و فہم کو جلا بخشتے رہیں گے۔ ایک ناول (چیکوسلواکیہ کی کہانی) ہیرا فراگمو جس کا ترجمہ جناب اظہر جاوید مرحوم نے کیا تھا ان کے ترجمہ نگاری کے فن میں مکمل دسترس رکھنے کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے اور یہ قارئین کو اظہر جاوید کے فن کے ایک اور پہلو یا جہت سے روشناس کراتا ہے۔ جناب سلطان اظہر جاوید کا مضمون بعنوان "بچپن" بظاہر ایک یادنگاری کا نمونہ ہے لیکن یہ ہر قاری کے لئے مشعلِ راہ ہے، بچوں کے لئے بھی اور ماں باپ کے لئے بھی۔ بچپن میں فطری شکوے شکایتیں اور ماں باپ کی بظاہر تلخ لیکن حقیقت افروز اور حکیمانہ گفتگو جو بچوں کو جب سمجھ آ جائے تو ان کی زندگی سنور جاتی ہے۔ سلطان اظہر جاوید صاحب نے نہایت ایمانداری اور کھلے دل سے اپنے ماں باپ سے کی ہوئی اور سنی ہوئی باتوں کا ذکر کیا ہے جو ان کے لئے بعد ازاں سودمند اور راہنما ثابت ہوئیں اور جن سے تخلیق کا ہر قاری بھی خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ تخلیق کے اس "یادگار رفتگاں نمبر" میں گوشہ انور سدید میں ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کا مضمون "ڈاکٹر انور سدید" اور مرزا احمد نور طاہر کا "قصہ سا مگر یوں تھے ایسا کوئی نہیں" اے خیام کا "ڈاکٹر انور سدید ـــ چند یادیں" یادِ رفتگاں میں بشریٰ رحمٰن کا "مرقع مہر ـــ وفا ـــ بانو قدسیہ" ابصار عبدالعلی کا "قدسیہ صوفی" افتخار مجاز کا "اعزاز احمد آذر ـــ

یادیں اور باتیں' اظہر جاوید کا ''جشن قتیل شفائی اور میں نیاز مند'' یہ تمام مضامین اردو زبان و ادب میں معتبر حوالے ہیں اور تخلیق کے آج کے 'یادگار خاص نمبر' کی اہمیت اور افادیت کے سلسلے میں ایک بیش قیمت تحریریں ہیں۔

معمول کے ابواب میں حمد و نعت تخلیق کے روایتی معیار پر پورا اترتا ہے معاونین میں جناب خورشید بیگ میلسوی' مسعود عثمانی اور سید ریاض حسین زیدی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ باب افسانہ میں محمد حامد سراج' آغا گل' یسین احمد (انڈیا) ممتاز راشد لاہوری' شعلہ چنگیزی (کینیڈا) اظہر جاوید (ترجمہ حنیف باوا) یادوں کے باب میں ڈاکٹر رشید امجد' سفرنامہ میں فرخ سہیل گوئندی اور سلمیٰ اعوان' علاوہ مزاح میں ڈاکٹر ایس۔ ایم معین قریشی' جائزے میں حسن عسکری کاظمی' سلیم آغا قزلباش' اخلاق عاطف کا ''پنجابی نظم دی جاگرتی دا ثبوت'' اخبار کے تراشے کے زیر عنوان صوفیہ بیدار' فرخ سہیل گوئندی سب کے سب اپنی جگہ پر خوب رہے اور اپنا اپنا حق ادا کیا۔ پنجاب رنگ میں سلیم شہزاد' سرفراز سید اور صغریٰ شاہد کی نظمیں بھی لاجواب ہیں تبصرے اور انجمن خیال بھی اپنی مثال آپ ہیں۔ اب رہی غزلوں کی بات تو اس میں تخلیق کی بہترین مثال پیش کرتے ہوئے جلیل عالی' آصف ثاقب' ریاض حسین زیدی' ابصار عبدالعلی' ڈاکٹر جواز جعفری' تسنیم سحر' سعدیہ سیفی' نیر رانی شفق' تصور اقبال وغیرہ نے بھی بہت متاثر کیا۔ یہ سب اہل قلم اور دوسرے دانشور یقیناً تخلیق کا مرتبہ دنیائے ادب میں بلند سے بلند تر کر رہے ہیں آپ کو اور تخلیق کے رفقاء کار اور قارئین کو بھی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ غزل ''اب کہاں وہ بہار کا عالم'' شامل اشاعت فرمانے پر آپ کا شکر گزار ہوں۔ یہ غزل تو گزشتہ دو ایک ماہ سے آپ کے دفتر میں موجود تھی جب کہ آپ کے حکم کی تعمیل میں ایک عدد حمد باری تعالیٰ اپنے خط مورخہ 26 جنوری 2017ء کو روانہ کر دی تھی۔ جو آپ کے دفتر میں یقیناً موجود ہوگی تاہم وہی حمد دوبارہ ملف ہذا ہے امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ خدا حافظ والسلام' مخلص

رشید آفریں (سیالکوٹ)

(۱) مکرمی سونان اظہر جاوید۔

السلام علیکم۔ یادگار خاص نمبر میرے سامنے ہے۔ محترم منشا اصغر کو تخلیق ایوارڈ کی مبارکباد' اس دعا کے ساتھ کہ اب یہ ایوارڈ لاہور' کراچی' لاہور سے آگے چلے۔ ''ادبیات پاکستان عالمی ادبی کانفرنس' ایک تاثر'' محمد حنیف نے لکھا کہ اکادمی کی کارکردگی نے موجودہ کانفرنس میں کوئی اچھا تاثر نہ چھوڑا۔ اکادمی کی کارکردگی ہمیشہ اپنے پسندیدہ حلقے تک رہی ہے اور رہے گی۔ اکادمی ادبیات کے دفتر کے ٹیلیفون نمبر زیر سلسلہ بھی آرڈرز رسالہ ترسیل رسالہ' اشاعت تحریر فون کرتے رہنے کے بعد ہر دفعہ آپ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ آج اتوار ہی ہوگا۔ کرپشن و کام چوری کی عمدہ مثال اکادمی ادبیات ملتان میں اکادمی کا دفتر کھلنے کا کہہ کر بھی چند 'سیاسی' ادیبوں کو ہوا ہے۔ انور سدید مرحوم اور بانو قدسیہ مرحومہ پر لکھے گئے تمام مضامین اچھے ہیں' کچھ مضامین ذاتی تاثرات اور ملاقاتوں کی یادداشتوں اور کچھ ادبی کام کے تجزیے پر مشتمل ہوتے ہیں۔ رخسانہ نور کی یاد میں طفیل اختر کے تاثرات ''کوچہ قاتل اور رخسانہ آرزو'' دکھ کی داستان ہے۔ شہزاد نیئر کی نظم ''یکتائی کے جنگل میں مطلق تنہائی'' انسان کے سب کے ساتھ ہوتے ہوئے بھی ازلی بنیادی تنہائی کی نظم ہے۔ افسانہ نگاروں کے افسانوں کے ساتھ مختصر تعارف کا سلسلہ افسانہ سے زیادہ لکھنے والے پر فوکس کرتا ہے اور اس کی ضرورت نہیں۔

شعلہ چنگیزی کا افسانہ "جو نہ ریٹائر ہو سکا" کا اختتام غیر حقیقی اور اتفاقیہ ہے۔ ساری عمر عسرت کا رونا رونے والا اور حالات بہتر کرنے کے لئے کوشش کرنے والا پروفیسر کاروباری آدمی کی طرف سے اس کی دیانت اور محنت کی صلاحیتوں کی بنیاد پر دی گئی ڈائریکٹر جنرل کے عہدے کی پیشکش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ جب کہ اسے یہ عہدہ سفارش یا رشوت کی بنیاد پر نہیں مل رہا۔ یہاں یہ بھی واضح کر دوں کہ پروفیسر جو کہ اتنے غریب نہیں ہوتے جتنی منظر کشی کی گئی ہے۔ افسانہ نگار پروفیسر کی عظمت کی جو دھاک بٹھانا چاہتا تھا اس میں ناکام رہا۔ یٰسین احمد کا افسانہ "جو دھاوبلی" شانتا کا ہاری عورت کو مسلمان عورت کا بلڈ لگتا ہے جو اس کی جان بچا لیتا ہے یوں وہ انسانیت پر ایمان لے آتی ہے۔ "یہ ایک بوسہ جسے تو سہل سمجھتا ہے" ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ معین قریشی کا لطائف سے بھرپور طنز و مزاح نامہ تھا۔ حسن عسکری نے راجہ گدھ کا تنقیدی جائزہ دیا بلکہ غلام حسین ساجد کے لئے گئے تنقیدی جائزہ کا جائزہ دیا۔ میں نے سنا تھا عرفان احمد خان ناول راجہ گدھ پر بڑی تنقید کر رہا ہے۔ بہرحال کتاب تو نسلوں زندہ رہتی ہے کتاب لکھنے والے محدود مدت کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔ کتاب پر تائید و تنقید کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ میرے افسانوی مجموعہ "ریگ ماہی" پر ظہیر جاوید کا تبصرہ لکھنے پر شکریہ!

دُردانہ نوشین خان (مظفر گڑھ)

﴿10﴾ محترم و مکرم جناب سلطان اظہر جاوید صاحب۔

مدیر "ماہنامہ تخلیق" لاہور۔ السلام علیکم! امید ہے آپ سب بخیریت ہوں گے۔ بے حد خوبصورت اور معیاری تخلیق کا "یادگار خاص" نمبر اس بار دو دن پہلے مل گیا تھا، ورنہ آپ درست آئے۔ مجھے تو یاد نہیں تھا کہ آخر کار برسی کے موقع پر ڈاکٹر انور سدید نمبر میں میرا مضمون لگنے کا بے حد شکریہ۔ میں نے 17 سال کالم نگاری کی ہے۔ عنوانات ہمیشہ مصرع ہوتے تھے اسے برقرار رکھا اور سچ تو ہے کہ ڈاکٹر انور سدید جیسے مخلص انسان کم کم ہوتے ہیں تبصرہ آپ کے کہنے کے مطابق طویل لکھتا رہا۔

مرزا احمد نور طائر (چکوال)

﴿11﴾ عزیز سلطان اظہر جاوید!

چھ ہفتے کی طویل مسافت کے بعد "تخلیق" دسمبر 2016ء کا شمارہ میرے پاس پہنچا۔ اس کے ہمراہ ادبی تقریبات کی تصاویر اور اخبار کے تراشے۔ جو بذات خود اپنے اندر اتنا کچھ مواد لئے ہوئے ہے کہ اس کے لئے ایک خاص کسوٹی کی ضرورت ہے۔ اخباروں میں تخلیق اور جناب اظہر جاوید (مرحوم لکھنے کو جی نہیں چاہتا) کا فن زندہ ہے اور ان کا لگایا ہوا پودا تناور درخت بن چکا ہے۔ لہٰذا وہ خود زندہ و تابندہ ہیں۔ تراشے اس بات کی گواہی کرتے ہیں۔ آپ کی "پہلی بات" مجھے نصف صدی سے بھی پیچھے لے گئی۔ مجھے "پاک ٹی ہاؤس" کے شب و روز یاد آ گئے۔ افسوس تو اس بات کا ہے جن گروپ بندیوں کا ذکر آپ آج کر رہے ہیں، یہ لعنت اس وقت بھی موجود تھی۔ وہ تو بھلا ہو مدیر "شمع" لاہور کا جس نے میرے ہاتھ سے میرے ادبی سفر کے پہلے دس سالوں ہی میں قلم چھین لیا اور یوں میں اس دنیا سے دور ہوتا چلا گیا لہٰذا اس سلسلہ میں زیادہ نہ لکھ سکوں گا۔ آپ کی ہمت اور کاوشوں کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آپ نے 2012ء کا

2016 پانچ سال مسلسل ''تخلیق ایوارڈ'' کا انعقاد کیا۔ قابل تعریف یہ اعزاز ہے جو آپ کو آپ کے والد بزرگوار کی بے لوث ادبی خدمات کے طفیل ودیعت ہوا ہے۔ اللہ آپ کو ثابت قدم رکھے۔ آمین!

جریدہ کے مندرجات سچے موتی ہیں۔ ہر سیکشن اپنی جگہ مکمل اور مفصل معلومات فراہم کرتا ہے۔ ''فن و ادب'' میں سلمیٰ اعوان اور شہ طراز نے عذرا اصغر کے ادبی سفر اور حالات زندگی کو بڑے جامع انداز میں بیان کیا ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ''مضامین'' میں ڈاکٹر انور سدید، امین راحت چغتائی، ڈاکٹر ہارون الرشید، نسیم جاوید، ڈاکٹر جواز جعفری، نند کشور وکرم (انڈیا) اور سارنگ ساقی (انڈیا) سب کی تحریریں سیر حاصل آئینے اور توشہ خاص ہیں۔ ہر افسانہ ایک منہ بولتی تصویر ہے۔ نیلم احمد کا ''صنم کدہ ہے جہاں'' موجودہ دور کی عکاسی کرتا ہے۔ ہم جن گہرائیوں میں گرتے جا رہے ہیں۔ ان سے نکلنا ہوگا۔ طلعت سید کا ''اور وہ پیدا ہو گیا'' ایک حقیقت ہے۔ جس سے منہ نہیں موڑا جا سکتا اور عذرا اصغر کا ''بدلتا ہے رنگ'' وہ سچائی ہے بیان کرنے سے ہم گریزاں رہتے ہیں۔ جریدہ کا مطالعہ ابھی جاری ہے۔ اس لئے باقی مندرجات کے بارے میں کچھ تحریر نہیں کر سکتا لیکن اس پہلے شمارہ سے اس بات کا اندازہ ہو گیا ہے۔ اس جریدہ کی آبیاری بڑے روشن ذہن اور محنت کش ہاتھوں سے کی گئی ہے۔ جس وجہ سے بنیادیں بڑی گہری اور عمارت بڑی عظیم ہے اور اب کمان ایک ایسے نڈر اور حوصلہ مند جوان کے ہاتھوں میں ہے جس میں جدوجہد کرنے اور نامساعد حالات میں اپنے لئے راستہ بنا لینے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔

شعلہ چنگیزی (کینیڈا)

﴿12﴾ عزیزم سونان جی آداب

دو دن پیشتر آپ کا ارسال کردہ ''تخلیق'' مارچ 2017ء ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ ''تخلیق'' دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی اور اظہر جاوید صاحب سے متعلق مضامین پڑھ کر ان کی یاد تازہ ہوگئی۔ آپ نے جس محنت و صلاحیت سے ان کے لگائے گئے اس پودے کو سینچا ہے، اس کی جتنی بھی ستائش کی جائے وہ کم ہے۔ مجھے یاد ہے ''تخلیق'' کے اظہر جاوید نمبر کے موقع پر انہوں نے کچھ مایوسی کا اظہار کیا تھا کہ شاید ان کے بعد ان کے خون جگر سے سینچا یہ ماہنامہ زندہ رہے گا بھی یا نہیں۔ مگر آپ نے اسے جاری رکھ کر صرف ان کی یادگار کو قائم و دائم ہی نہیں رکھا بلکہ بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش بھی کی ہے۔ اس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں اور آپ نے ان کا حقیقی وارث ہونے کا ثبوت بھی دیا۔

دعا کرتا ہوں کہ اظہر صاحب کی یہ یادگار ہمیشہ ترقی کی منازل طے کرتی رہے۔

نند کشور وکرم (انڈیا)

●●●

> اگر کوئی کسی کے تخیل میں آ جائے لیکن زندگی میں نہ آئے تو کیا تمہارا خیال ہے وہ گھر ایک بسا ہوا گھر رہ جاتا ہے۔ شاید نہیں۔ آنکھیں بند کر کے جب کوئی عورت کسی اور کا چہرہ یاد کرتی ہو لیکن آنکھیں کھول کر کسی دوسرے کا منہ دیکھتی ہو تو اس سے بڑا جھوٹ اور کیا ہو گیا ہے۔ (امرتا پریتم)

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اسی لئے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ تیرگیٔ خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ: سلطان رشک 0333-5692523	سہ ماہی عطا مدیر: محمد عطاء اللہ خان گنڈہ پور 0308-5089866	ماہنامہ شاداب لاہور مدیر: ڈاکٹر کنول فیروز 0301-4123707
ماہنامہ سپوتنک لاہور مدیر اعلیٰ: آغا امیر حسین 0300-8440444	ماہنامہ حکایت لاہور مدیر: عارف محمود 0323-4329344	ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور چیف ایڈیٹر: صدیقہ بیگم 0300-8479444
ماہنامہ چہار سو راولپنڈی مدیر مسئول: گلزار جاوید 0300-5176062	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر: شاہد علی خان 0301-4001844	سہ ماہی بجنگ آمد لاہور مدیر: ڈاکٹر اختر شمار 0300-8457542
ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر: عمران منظور 0300-8438043	ماہنامہ ارژنگ لاہور مدیر: حسین مجاہد 0300-4489310	ماہنامہ روشنائی کراچی مدیر: احمد زین الدین 0321-2011595
سہ ماہی انتساب انڈیا ایڈیٹر: سیفی سرونجی 0091-942564177	ماہنامہ انشاء کلکتہ، انڈیا مدیر: ف س اعجاز 0091-3322354616	ماہنامہ شاعر ممبئی، انڈیا مدیر: افتخار امام صدیقی 0091-932451517

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
-1	آسمان میری مٹھی میں	وحشی سعید	0091-9419012800	گلوبک ادب سری نگر	500/-
-2	عروض اور تقطیع	عزیز جبران انصاری	0300-9312919	جبران اشاعت گھر، اردو بازار کراچی	500/-
-3	پریم پال اشک (فن اور شخصیت)	خالد کرار	0091-098826113	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس	430/-
-4	اوراق کا اشاریہ	ڈاکٹر محمود احمد اسیر	0300-6668284	مثال پبلشرز، فیصل آباد	500/-
-5	ذرِ حقیقت (تحقیقی مجموعہ)	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	048-3711717	تحریک پاکستان اکادمی، سرگودھا	500/-
-6	موضوعاتی کلام اقبال	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	0544-614972	بک کارنر، جہلم	600/-
-7	کائناتِ اقبال	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	0544-614977	بک کارنر، جہلم	480/-
-8	بیت بازی کلام اقبال	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	0544-614977	بک کارنر، جہلم	380/-
-9	پیامِ استقلال	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	042-37324164	اقبال اکیڈمی لاہور	700/-
-10	بہارِ اقبال (علامہ اقبال پر لکھی گئی 50 کتابوں کا تحقیقی مطالعہ)	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	048-3711717	تحریک پاکستان اکادمی، سرگودھا	1,000/-
-11	نویدِ اقبال (اقبال کے فکر و فلسفہ پر اہم مضامین)	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	048-3711717	تحریک پاکستان اکادمی، سرگودھا	1,000/-
-12	دنیائے اقبال (اقبال کا تصورِ حیات و کائنات)	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	0544-614977	بک کارنر، جہلم	800/-

◆◆◆

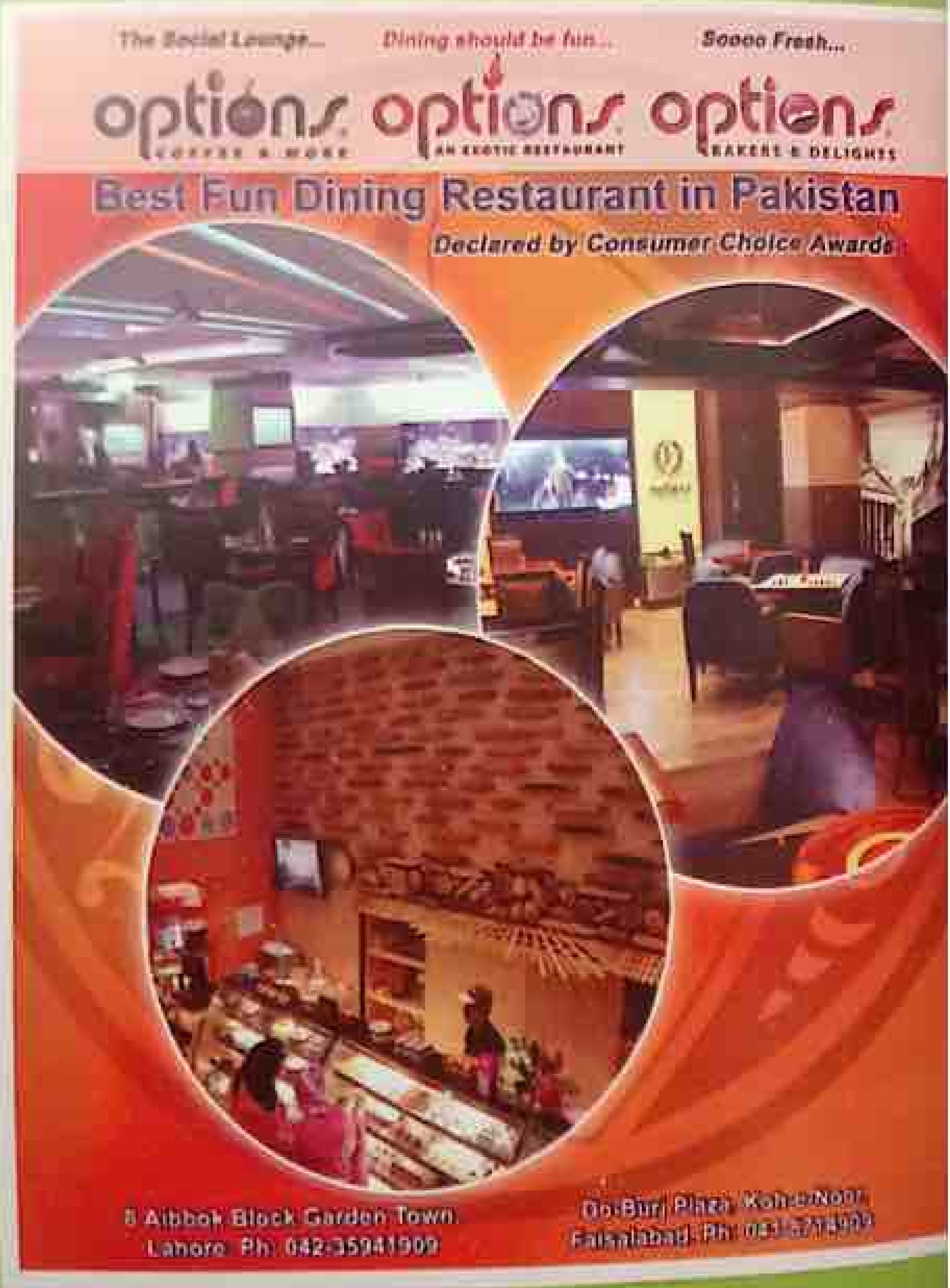

The Social Lounge...
Dining should be fun...
Soooo Fresh...
options
COFFEE & MORE
options
AN EXOTIC RESTAURANT
options
BAKERS & DELIGHTS
Best Fun Dining Restaurant in Pakistan
Declared by Consumer Choice Awards
8 Aibbak Block Garden Town
Lahore Ph: 042-35941909
Faisalabad

CamScanner

MONTHLY TAKHLEEQ
CPL NO 96
ISO 9001 CERTIFIED
Silver Sand
PAINTS
رنگ ــ جو زندگی ہے!
UP Industries (Pvt.) Ltd
Lahore
Phone: +92-42-37510231 to 34

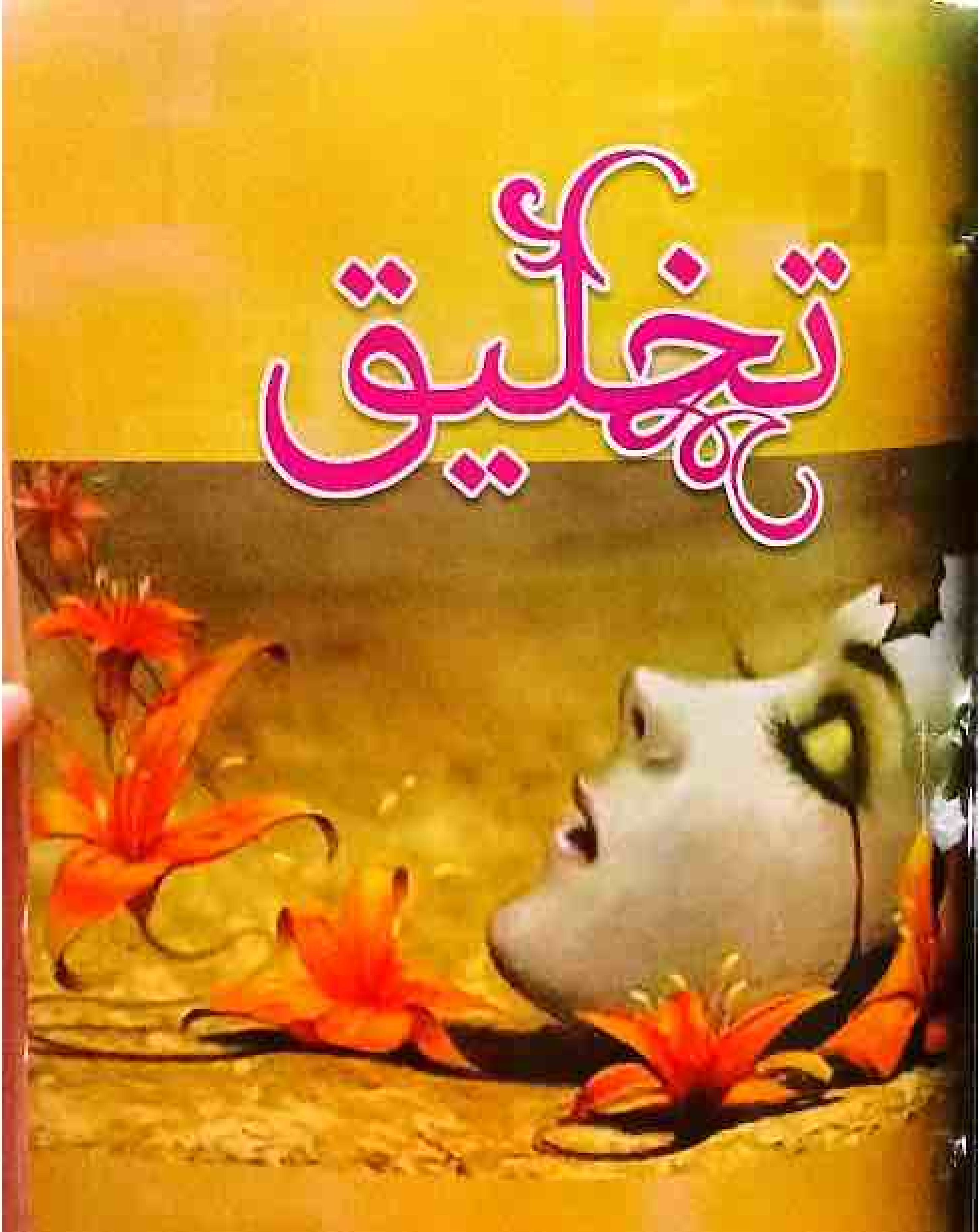

CamScanner

ممتاز شاعر اور "ماہنامہ تخلیق" کے مدیر

اظہر جاوید

کی مطبوعات جن پر انہیں "پرائیڈ آف پرفارمنس" دیا گیا

جناب اظہر جاوید اردو اور پنجابی کے ممتاز ادیب، مشہور شاعر اور معروف صحافی ہیں۔ آپ جنوری 1938ء، سرگودھا میں پیدا ہوئے
اس وقت لکھنا شروع کیا جب ابھی آپ سترہ سال کے تھے۔ سرگودھا میں اپنی زندگی کے ابتدائی ایام کے دوران آپ نے بعض ہفت
مجاہد اور رفیق) کی ادارت کی۔ آپ نے سینئر شاعر جناب الطاف مشہدی کی مدد سے ہفت روزہ "خلوص" کا آغاز کیا۔ اس کے بعد آپ
میں ادبی صفحے کے انچارج کے طور پر شمولیت اختیار کی لیکن جلد ہی آپ نے ادبی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر کالم لکھنے شروع کر دیے
کے طور پر ادبی جریدے "تخلیق" کی بے لوث ادارت کرتے رہے۔ بطور شاعر اور ادیب بڑی تعداد میں آپ کی کتابیں شائع ہوئی ہیں
تنظیموں کی جانب سے متعدد بین الاقوامی انعامات ملے ہیں۔

تبت سنو

Winter Family Festival
HOT DeLivey DeAls 50% Less Than MeNu PriCe
options
AN EXOTIC RESTAURANT
LAHORE
RS : 999
Family Fun Deal
Large Pizza of Choice, Exotic Club Sandwich, Crispy Plain Fries, 1.5 Ltr Coke.
Good For 4 Persons
MaMa'S Break Time
Exotic Chicken Handi, Special Tawa Chicken, Chicken Biryani, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke.
RS : 1399
Grand Slami'n Deal
Exotic BBQ Platter, Chicken Karahi Half, Chicken Biryani, Salad Bowl, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke.
Good For 4 Persons
MonSter MeaL
Chicken Roast Full, 6 Reshmi Kebab, Chicken Handi, 3 Naan, 3 Roti, Raita, Salad, 1.5 Ltr Coke
ONLY FOR FREE HOME DELIVERY & TAKEAWAY
DELIVERY HOT LINES 0333-2800935
STARBUCKS COFFEE
BUY "1" GET "ONE" FREE
AVAILABLE INSIDE CAFE WITH THIS VOUCHER
OPTIONS SPECIAL ICE-CREAM
BUY "1" SCOOP
GET "ONE"

CamScanner

Since 1978
Silver Sand
PAINTS
رنگ۔ جو زندگی ہے!
UP Industries(Pvt.)Ltd
Jhugian Sialan, Sui Gas Road, Behind
Firdous Flour Mills, 13-Km Shiekhupura Road
Lahore Pakistan
Ph# 04237164254,55
Godown Ph# 04237164252
Email:silversandpaints@hotmail.com
www.silversandpaints.com

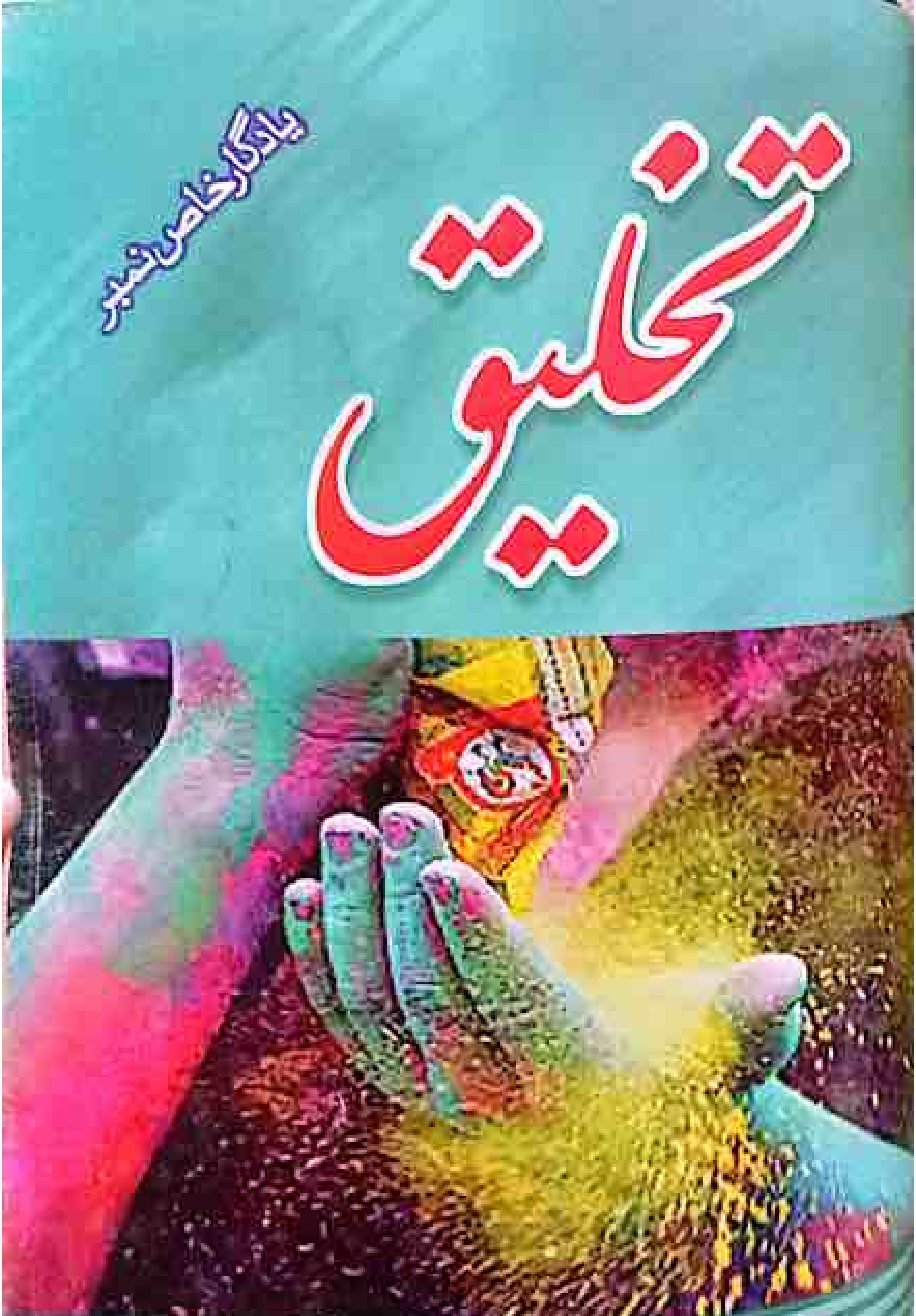

CamScanner

POLANI'S
GROUP OF TRAVEL COMPANIES

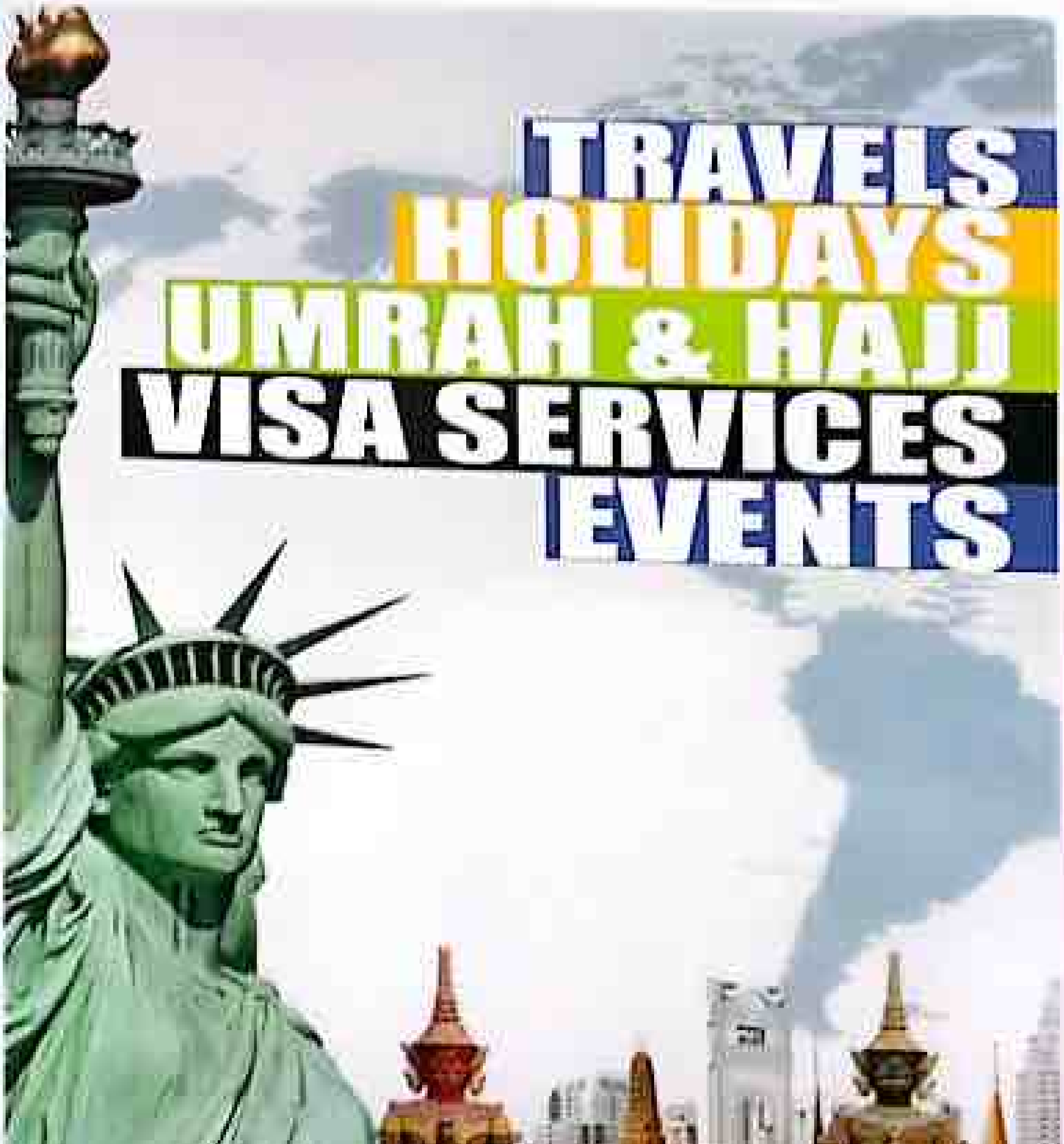

FOR FURTHER DETAILS PLEASE VISIT OUR OFFICE
102-105, Muhammadi House,
I.I. Chundrigar Road, Karachi – Pakistan
T: +92 21 32444777-19
info@polanisgroup.com | www.polanisgroup.com

CamScanner

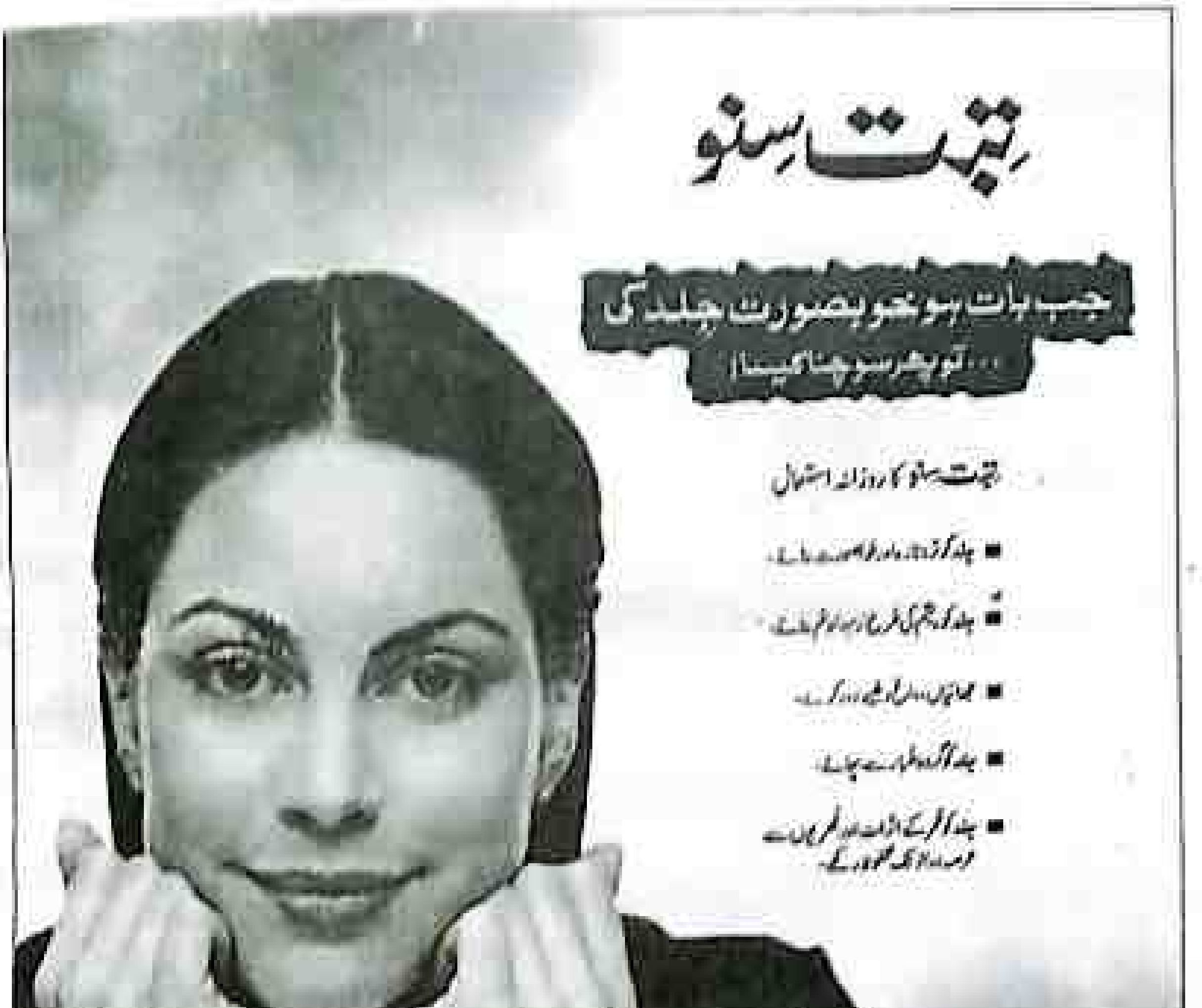
تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
...تو پھر سوچنا کیسا!
تبت سنو کا روزانہ استعمال
تبت سنو۔ ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

Winter Family Festival
HOT DeLivey DeAls 50% Less Than MeNu PriCe
option
AN EXOTIC RESTAU
LAHORE
RS : 999
Family Fun Deal
Large Pizza of Choice, Exotic Club Sandwich, Crispy Plain Fries, 1.5 Ltr Coke
4
RS : 11
MaMa's Break Time
Exotic Chicken Handi, Special Tawa Chicken
Chicken Biryani, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke
RS : 1399
Grand SlamiN Deal
Exotic BBQ Platter, Chicken Karahi Half, Chicken Biryani, Salad Bowl, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke
4
RS : 16
MonSter Meal
Chicken Roast Full, 6 Reshmi Kebab, Chicken Handi, 3 Naan, 3 Roti, Raita, Salad, 1.5 Ltr Coke
ONLY FOR
DELIVERY HOT LINES 0333-2800935 0333-14044
STARBUCKS COFFEE
BUY "1" GET "ONE" FREE
Coffee
AVAILABLE INSIDE CAFE WITH THIS VOUCHER
OPTIONS SPECIAL ICE-CREAM
GET "ONE"

CamScanner

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE
CPL NO. 96

CamScanner

مسلسل اشاعت
48
واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی اعزاز حسن کارکردگی)
عرصۂ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 48 | ستمبر 2017ء | شمارہ : 9 | CPL نمبر 96

قیمت : 150 روپے ——— 750 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100$ ڈالر — ہندوستان کے لیے 1,200 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor)
Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt. (Ph : 04237187500 - 04236671007)
موبائل فون: 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

نصیر جہاں (امریکہ) ——— فوزیہ مشتاق (امریکہ) ——— نارنگ ساقی (انڈیا) ——— جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جان آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43 ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود — میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رواں رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''صریر''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (انشاءاللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔ ''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کے مضامین کے انتخاب کے لیے ''تخلیق پینل'' تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، ہاشی ظہیر، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی) ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف 1,200 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

U.S.A.	U.S.A.	INDIA	PAKISTAN
Nayyar Jahan	[illegible]	K.L. Narang Saqi	Javed Manzoor
2740 South Barrington	[illegible]	C-4-Connaught Circus, New	78-Islam Block, Anum Garden,
AVE Los Angles	[illegible]	Delhi-110001, India	Multan Road, Lahore
C.A. USA	Island	Ph: [illegible]	Ph: [illegible]
Ph: [illegible]	Ph: [illegible]	Email: [illegible]	Cell: [illegible]
Email: [illegible]	Email: [illegible]		Email: [illegible]
[illegible]			

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترتیب

پہلی بات — سلطان اظہر جاوید — 5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ — امین راحت چغتائی — 7
نعت رسول مقبولؐ — قیصر نجفی — 7
نعت رسول مقبولؐ — آصف ثاقب — 7

مضامین

جنرل ضیاء الحق — ڈاکٹر انور سدید — 8
مغلوں کا آغاز — امین راحت چغتائی — 10
قدامت پرستی اور — ڈاکٹر مبارک علی — 16
بارے کچھ موازنہ عقل و عشق کے! — ڈاکٹر اظہر وحید — 18
لاہور کے چند معروف قہوہ خانے — ڈاکٹر جواز جعفری — 20
ہندکو زبان کے صوفی شاعر — ناصر علی سید — 33
مغلیہ عہد میں رائج الاقتصادی — ظفر سیال — 36

منظومات

ستیہ پال آنند، پروین شیر، حسن عسکری کاظمی، کرامت بخاری، اخلاق عاطف، شعلہ چنگیزی، مشرق صدیقی، سیفی سرونجی، امر مہکی، کرن اجالا — 41 تا 43

افسانے

گوریچ — آغا گل — 44
اب نہیں جینا — نسرین احمد (اطیل) — 53
ریس کورس روڈ — محمد علی طارق — 58
گمرہ — علی اکبر عاطق — 63
خوابوں کا جال — شیخ خالد — 68
محبت، موت اور حیات — شبیر طراز — 71
پرانی چیز — اظہر جاوید — 73

غزلیں

ستیہ پال آنند، آصف ثاقب، خالد اقبال یاسر، سرفراز سید، حمیدہ شاہین، ایوب ندیم، سیفی سرونجی، کرشن کمار طور، فراق مرزا، نسیم سحر، مرزا احمد نور طاہر، منظر بخاری، ناصر علی سید، شجاعت علی راہی، اسلم سحاب ہاشمی، طاہر منظور، تیمور ربانی شفق، تسنیم سید، آسناتھ کنول، سعدیہ صفدر، زیب اللہ نعیم، عاصم بخاری، انور جاوید ہاشمی، ضیاء اللہ طاہر، آفتاب خان، ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ، شازیہ مفتی، کرشن پرویز، پروین قیصر، فرخ محمود، اسد رضا سحر — 78 تا 86

یادنگاری

عاشق صبر طلب — ڈاکٹر رشید امجد — 87
کشمیری لال بھی چلے گئے — سرفراز سید — 92

سفرنامے

عراق اشک بار ہیں ہم — سلمیٰ اعوان — 94

موسیقی

ناہید نیازی ایک منفرد آواز — ڈاکٹر امجد پرویز — 99

نئی کہانیاں

قدرت کا فیصلہ — ادارہ "تخلیق" — 109

گستاخ عبادت — ادارہ "تخلیق" — 110

طنز و مزاح

موصوف اور موصوفہ — ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی — 112

تپ — ڈاکٹر محسن مگھیانہ — 114

انشائیہ

اقتدار کے بعد کی زندگی — صوفیہ بیدار — 116

خاکہ

محسن راحت چغتائی ہمہ — لطف مقبول احمد — 121

جائزے

یادوں کا جشن — پروفیسر حسن عسکری کاظمی — 124

عزیز جبران انصاری کے — نسیم سحر — 129

ماہنامہ "تخلیق" کا ایک جائزہ — ڈاکٹر اشرف (انڈیا) — 132

تبصرے

وفا نوری نثر تحقیق — انور جاوید ہاشمی — 134

خاک گردی — انور جاوید ہاشمی

حسین راج کے تاریخی ڈرامے — انور جاوید ہاشمی

تتلیاں لگتے ہیں — انور جاوید ہاشمی

اظہر جاوید کی یادیں — خالد عبداللہ — 136

انجمنِ خیال

ستیہ پال آنند، محسن راحت چغتائی، ڈاکٹر معین قریشی، سلطان سکون، آصف ثاقب، ناز گل، نسیم سحر، نجم الحسن رضوی، عذرا اصغر، عزیز جبران انصاری، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، اخلاق عاطف، محمد علی طارق، مرزا احمد نور طاہر، مظہر بخاری، ڈاکٹر سکندر مگیمیں، زیب اللہ فہیم، رشیدہ آفریں، خالد عبداللہ، شفیع اللہ تار، جمیل حیات، ڈاکٹر محمد اقبال صمصام، اسد رضا سحر — 137–159

تخلیق کو موصول رسائل اور کتب

ملکی اور غیر ملکی — 160

سرورق

ادارہ 'تخلیق'

ناشر: سونان اظہر جاوید

طابع: بیدار سرمدی

قانونی مشاورت: لطیف احمد قریشی

مطبع: نکسن پرنٹرز، گنج بخش روڈ، لاہور

مقامِ اشاعت:

H. No. E/12, Shezan Villas, Phase-I, Islam Nagar, Walton Road, Lahore -Cantt

(ایڈیٹنگ کے حقوق محفوظ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ٥

تمام قارئین کو گذشتہ عید الاضحیٰ مبارک ہو

پہلی بات

قطرہ قطرہ، ریزہ ریزہ اور روز گزرتے ایک سال پورا ختم ہونے کو آ گیا۔ ستاروں کا حال بتانے والے جو برسوں کے آنے سے پہلے پیش گوئیاں کرتے تھے کہ یہ سال اچھا ہے اب انھوں نے بھی اپنا کہا چھوڑ دیا ہے۔ کل کیا ہوگا؟ یہ نہ تو گزرے کل میں کسی کو خبر تھی نہ آنے والے کل کو ہوگی۔ اور ہم ایسے سب لوگ آج کا دن ہی گزار لیں صبح سے شام کر لیں تو یہی غنیمت ہے۔ اچھے آج اور اچھے کل کی امید میں ہم اپنی اپنی زندگیاں جیسے بیتے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگ تو کاش کی خلش دل میں لیے آگے جہاں چلے گئے ہیں اور کچھ ہم ایسے کاش کی امید لیے ساتھ لگائے جیے جا رہے ہیں۔ تم امید پر دنیا قائم ہے۔

"تخلیق" کے ہر شمارے میں نئے دوستوں کا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ جتنا تحریری مواد شائع ہوتا ہے اتنا ہی ریکارڈ میں موجود رہتا ہے۔ یہ سب کچھ کر کے بھی جب "تخلیق" اشاعت کے مراحل سے گزر رہا ہوتا ہے تو میرے دل میں ایک سوال جنم لیتا ہے۔ کیا اس طرح سے میں صحیح معنوں میں ادب کی خدمت کر رہا ہوں یا نہیں؟ رسالہ بہت سارے کٹھن مراحل سے گزر کر آپ کے ہاتھوں میں پہنچتا ہے۔

تحریر تو ضروری مراحل ہیں جن کا ذکر کرنا اہم نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ "تخلیق" کا رسالہ تخلیق عام آدمی بھی اظہار کرتا رہتا ہے۔ لوگ محبتوں کے لیے ترس رہے ہیں۔ کوئی اچھی بات لکھنے پڑھنے سننے کے لیے ہر ہاتھ، آنکھ اور کان منتظر ہے۔ میرے اندر آس پاس حالات، سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا دوسرے ممالک افریقہ، یورپ، امریکہ دیکھیں تو ہر طرف دہشت گردی میں ایک ہیجان ہے۔ اظہار کا ایک سیلاب ہے۔ سب لوگ بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر اس کوشش میں ہیں یا اس انتظار میں ہیں کہ کوئی سننے والا تو ہو جو ان کے اضطراب کو جواب کرنے والا تو ہو۔

ہم لوگوں میں اضطراب و ہیجان کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہر انسان اپنی اصل کو بھولتا جا رہا ہے۔ جو وہ کام جانتا ہے اس کے لیے موزوں ہے تو وہ اس کا اہل ہے پر لالچ اور طمع اسے اس کام کو کرنے کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے ہی یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ "کوا چلا ہنس کی چال اپنی چال بھی بھول گیا"۔ جس ملک میں ایکٹر، سیاستدان اور ڈاکٹر ملکی معاملات پر رائے دیں، فلمی اداکار بھی ٹی وی ٹاک شو میں سیاست پر بحث کریں اور ہم پر بھی فلمی اداکارائیں اپنی شاعری کے مجموعے شائع کروا دیں، کھیلوں سے وابستہ لوگ جب اپنا شعبہ چھوڑ کر سیاست کو اپنا لیں تو کیوں نہ سیاستدان بھی سیاست چھوڑ کر کاروبار کی طرف رجوع کریں۔ غرض ہر انسان سب کچھ پا لینے اور سب کچھ کو مٹھی میں کر لینے کی دھن میں شاید ایک کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر پا رہا۔ اسی نفسا نفسی کے عالم میں جو جنونی لوگ ہیں وہ کتاب اور قلم سے رشتہ توڑ کر چھپ گئے ہیں۔ اہل قلم دوستوں کی پرانی فہرست دیکھتا ہوں تو بہت سے بڑے بڑے نام نظر آتے ہیں جو لکھنا پڑھنا یا ملنا بھی چھوڑ گئے ہیں۔

میں روز دفتر "تخلیق" جاتا ہوں تو پہلے ہی میرے میز پر ڈاک اور کتابوں کا ڈھیر ہوتا ہے۔ کتابوں کی روز افزوں بڑھتی ہوئی تعداد دیکھتا ہوں تو دل خوش ہوتا ہے کہ ادب کے میدان میں کام ہو رہا ہے مگر جب تصویر کا دوسرا رخ دیکھتا ہوں تو ان میں سے بے شمار لکھاری وہ ہوتے ہیں جن کا ادب سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں جو شعری مجموعہ یا افسانوی مجموعہ کسی سے لکھوا کر شائع کروا لیتے اور خود کو شاعروں ادیبوں کی فہرست میں شامل کر کے فخر محسوس کرتے ہیں جبکہ اصل میں تو نہ وہ شاعر ہوتے ہیں نہ ادیب۔ یہ لوگ دو نمبر ہیں جو ادب اور ادیب دونوں کے تشخص کو مسخ کر رہے ہیں۔ ایسے شہرت کے بیماروں کو ادب بیچنے والے ادیب بھی معاشرے کے چہرے پر بدنما داغ ہیں۔ پچھلے دنوں بشریٰ رحمٰن صاحبہ سے ٹیلی فون پر بات کا خیال ہوا تو انھوں نے بہت خوبصورت بات کی کہ "سو سال میں نے اپنی زندگی میں بے شمار اس طرح کے شعرا اور ادبا کو آتے دیکھا ہے۔ جنھوں نے شہرت کے لیے شارٹ کٹ کا راستہ اختیار

کیا لیکن یہ لوگ جس تیزی سے منظرِ عام پر آئے اسی تیزی سے گمنامی کے سمندر میں غرق بھی ہو گئے۔ ان لوگوں نے اب سستی شہرت کے رسیا لوگوں نے ادب کو اتنا بے ثبات کر دیا ہے کہ اپنے مسلک، روایت کی پاسداری اور سچ و تنقید کی پہچان پر ایمان ڈانواں ڈول ہو رہا ہے۔"

میں سلام پیش کرتا ہوں ہر اس ادیب و شاعر پر جس نے ادب کے فروغ و ترقی اور اردو زبان کی ترویج کے لیے اپنا تحقیقی وقت اور سرمایہ صرف کیا اور کئی عشروں میں ادب کی خدمت کی اور کر رہے ہیں۔ ایسے ہی ایک ادیب ایک جیون تپسیا سے سرگودھا جیسے چھوٹے سے شہر میں بیٹھے یہ اور معیاری ادب تخلیق کر رہے ہیں۔ ان کا تحقیقی کام ادب میں تحقیق کے نئے در وا کر رہا ہے۔ نئے موضوعات اور تحقیق سے ادب کو متمول کرنے والے **ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم** جن کے بغیر سرگودھا کی ادبی تاریخ اب نامکمل ہے۔ اس زرخیز شہر نے پہلے ڈاکٹر وزیر آغا اور سید جیسے تخلیق کار اور اب ڈاکٹر ہارون الرشید جیسے تخلیق کار کو جنم دیا ہے۔ اللہ ڈاکٹر ہارون صاحب کو سلامت رکھے جو جیون ادیب ہیں اور خالصتاً ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ انھیں نہ شہرت کی تمنا ہے نہ کسی اعزاز کا لالچ اور نہ کسی سرکاری عہدے کی حسرت۔ وہ بغیر کسی لالچ کے اپنی محنت سے اپنا کام سرانجام دے رہے ہیں۔

سرحد پار ہمسایہ ملک بھارت میں تخلیق کی پذیرائی میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ بھارت سے آنے والے بہت سے پرچے تخلیق میں اشاعت شدہ تحریروں کو اپنے پرچوں میں دوبارہ شائع کر رہے ہیں۔ اس ضمن میں **وششٹ سعید صاحب** کا مشکور ہوں جو سہ ماہی **"نگینہ"** کے ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے تخلیق کی ادبی تحریروں کی تحسین اور تصاویر اپنے پرچے کے تازہ شمارے میں شائع کر کے اور تخلیق کے گزشتہ شمارے پر جامع تبصرہ کر کے اپنے ادب دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کے علاوہ بھارت سے آنے والے دیگر رسائل جن میں **انتخاب، شاعر، احتساب، نگینہ، رہنمائے تعلیم جدید، سرسبز اور غالب نامہ** شامل ہیں ان کے مدیران کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جو باقاعدہ رسائل بھجواتے اور اپنے اپنے طور پر بھارت میں تخلیق کے فروغ کے لیے اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

ملک میں تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے۔ سیاست اور سیاسی قیادت بدل رہی ہے۔ ایک حکمران جاتا ہے تو دوسرا آ جاتا ہے۔ حلقہ 120 کے انتخابات کی تیاری ہو رہی ہے جس کے نتائج پر پوری قوم بلکہ ملک کے مستقبل کا فیصلہ منحصر ہے۔ ایک زمانہ بیت گیا قوم کو کبھی روٹی کپڑا مکان پر رکھا جا رہا ہے۔ ووٹ دینے والے کو گداگر اور خود کو فرشتہ ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتا ہے۔ یہ لوگ درحقیقت قوم کے مسائل کے حل کے لیے نہیں اپنی ذات کی پرواہ اور بہتری کے لیے اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ قوم پریشان ہے کہ کوئی حکمران تو ایسا آئے جو ہم مجبوروں کے درد کو سمجھے۔ ہمیں صرف تخلیق ہی نہیں زندگی کی گلی بھی دے۔ جب یہ شمارہ آپ کے ہاتھ میں آئے گا تو نہ جانے کون کون سی تبدیلی رونما ہو چکی ہو گی۔ شاید ایسی تبدیلی جو قوم کے لیے ہو گی نہ ملکی حالات کی بہتری کے لیے اور نہ ہی عام آدمی کی فلاح کے لیے۔ یہ تبدیلی بجلی کی طرح ایک مخصوص گروہ اور مخصوص طبقوں کے لیے ہو گی۔ عام آدمی تو صرف عام آدمی ہے جو خاص حکمرانوں کی نظر میں بھی عام ہے۔ جو صرف ووٹ دینے والی مشین ہے جسے اختیار نہیں کہ اپنی مرضی سے ووٹ کی طاقت کو استعمال کرے۔ اسے روٹی کے چند ٹکڑوں یا معصوم بچوں کے بہتر مستقبل کے خواب دکھا کر ووٹ لیا جاتا ہے لیکن وہ عام آدمی ہر بار بھول جاتا ہے کہ اس کے آبا و اجداد سے بھی یہی وعدہ کیا گیا تھا۔ اب اس سے بھی یہی وعدہ ہو رہا ہے اور جانے اس کے بچوں سے بھی یہی وعدے کیے جائیں۔ یہ وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو جائے لیکن میں بحیثیت عام انسان اپنے ملک کے حکمرانوں سے تو مایوس ہو گیا ہوں پر اللہ سے نا امید نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں اور ہم بھی اپنے ملک پاکستان کو ترقی یافتہ اور روشن دیکھیں گے انشاء اللہ۔

یہ سب کب ہو گا؟ اے اللہ ملک پاکستان کی عوام پر کب مہربان ہو گا؟ کیا ہم اس تیس اور تیس سیاست و حکمرانی سے نجات حاصل کر سکیں گے؟ کیا عوام متحد ہو کر اپنی تقدیر بدلنے کے لیے کوششیں کرے گی؟" ایسے بہت سے سوال دل و دماغ میں گردش کرتے ہیں اور کبھی کبھی بے یقینی اور نا امیدی کے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیتے ہیں۔ خدا اس قوم کی تقدیر نہیں بدلتا جو اپنی تقدیر خود نہیں بدلنا چاہتی۔ کیا ہم اپنی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں؟

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

حمد

جوہر آئینہ

میں آئینہ تو ہوں لیکن
عکس اس میں میرا ہے،
کہ آئینہ بھی آخر میں سے باہر نہیں کچھ بھی
جو صورت اس میں جلوہ گر ہے
وہ تیری عطا ہے ورنہ کیا ہے!
ذرا سا سوچتا ہوں پھر تو یوں محسوس ہوتا ہے
وہی نقش حقیقت ہے وہی نقاش فطرت ہے
کہ نقش ذات نقش عین وخلاق ازل سے
ماسوا کیا ہے!

مگر کچھ ماسوا بھی ہے
کہ تخلیق عناصر، کائنات رنگ و بو میں وہ جلا
کب تھی؟
جو وہ اول تصویر پر صفات مطلق و منعکس کرتی،
کبھی پیدا و مشتق اور کبھی پیدا مرتعش،
یہی اک ربط کم گشتہ تو ہوتا ہے
وہ جو کمال "کن" کی صورت ہو گیا ظاہر
اسی سے تیرے انوار و جمال جاں فزا کی
چہرہ عالم میں
ترا ہی نور ہے اب شاہد و مشہود کچھ کہیں
اسی سے روشنی تجسیم کے اسرار آتے ہیں،
اسی سے حقیقت خاک ہے امر آئینہ کہلائے،

امین راحت چغتائی

OOO

حمد

رونق روئے عرف ہے حسن خیال کے سبب
حسن خیال ہے ترے ذکر جمال کے سبب

جز تیرے کائنات میں اپنا حبیب ہے کہاں
قلب آئنہ التفات سے جو عرض حال کے سبب

وحشی و طیور اے خدا سبھی ہیں مدح خواں ترے
کرتے تجھیں ثنا تری اپنے کمال کے سبب

صد شکر اپنے بندوں میں شامل تجھیں ہم اے خدا
اثبات جو کریں ترا صدق و قال کے سبب

چاہے جو تو، تو ذرے سے پھوٹیں شعاعیں مہر کی
چاہے جو تو، تو چاند بھی چھوٹے ہلال کے سبب

کیا کیا عطا میں دو تجھیں کیا کیا ہوتیں نہ تھیں
آپ اپنی صدمہ مر گئیں تیرے جلال کے سبب

اب نہ ہو اٹھا لے سر اپنی بھی لے مر گئی
نقش و نیں یاد شانتیں اس اقبال کے سبب

کرنا اس کے ذکر کی اب تو زباں میں حمد ہے
قیصر زباں گنگ ہے رنج و ملال کے سبب

قیصر نجفی

OOO

نعت

اس پہ شیدا ہے سبز گنبد کا
کیا اقتدا ہے سبز گنبد کا

گھر محمدؐ کا شان والا ہے
بول بالا ہے سبز گنبد کا

سر پہ رکھیں ردا محمدؐ کی
ہم پہ سایا ہے سبز گنبد کا

تکتے آنکھوں میں بھر گیا پانی
وہ نظارا ہے سبز گنبد کا

اس کی چاہت میں ہم بکھرتے ہیں ہم
وہ چاہا ہے سبز گنبد کا

جو بھی آنسو پلک پہ روشن ہو
وہ اجالا ہے سبز گنبد کا

دل میں جاں کا سہارا ہوا ثاقب
یہ حوالہ ہے سبز گنبد کا

آصف ثاقب

OOO

مضامین

جنرل ضیاء الحق کا فوجی شب خون —— چند واقعات

ڈاکٹر انور سدید

(ڈاکٹر انور سدید کی زندگی میں لکھی جانے والی نایاب تحریر ان کے پرانے کاغذات سے بازیافت)

پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو —— ایک ''مشکوک'' عدالتی فیصلے کے تحت تختۂ دار پر اس شخص کے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق چڑھا دیے گئے، جسے خود بھٹو نے سنیارٹی کے اصول کو توڑ کر پاک فوج کا کمانڈر انچیف بنایا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم کردار تھا جس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا تو بے شمار ان کی کہانیوں کا موضوع بن گیا، جنہیں عوام کا کمزور حافظہ بھلا بھی دے تو ہر سال ان کی برسی پر یہ کہانیاں پھر یاد کرا دی جاتی ہیں اور مردہ بھٹو پھر زندہ ہو جاتا ہے۔

اس تمہید کے بعد میں یہاں ایک صحافی کی اس روایت کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں جو ایک انگریزی اخبار میں چھپی ہے۔ انکشاف کیا گیا ہے کہ پھانسی کے بعد وزیراعظم بھٹو کی میت کو ان کے آبائی گاؤں بھیجا جا رہا تھا ان کا طیارہ پرواز کے دوران تکنیکی خرابی کا شکار ہو گیا اور اسے واپس چکلالہ لانا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس صحافی کی رائے میں اگر یہ طیارہ اسی تکنیکی خرابی کے باعث جنرل ضیاء الحق کے طیارے کی طرح فضا میں ہی تباہ ہو جاتا تو بھٹو کی پھانسی کی خبر پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پردہ پڑ جاتا۔ ان کی موت حادثاتی شمار ہوتی اور کوئی یقین نہ کرتا کہ اس سابق وزیراعظم کو پھانسی دی گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہوتا یا کر دیا جاتا تو تاریخ کا دھارا بھی بدل جاتا۔

کہا جاتا ہے کہ ضیاء الحق جب میجر جنرل تھے تو اپنے اعلیٰ افسران کی اجازت کے بغیر مصر کے دارالحکومت قاہرہ گئے تھے۔ ان کے اس دورے کے انتظامات امریکہ کے خفیہ ادارے سی آئی اے نے کیے تھے۔ قاہرہ میں ان کی ملاقات دنیا کی مشہور ستارہ شناس خاتون جین ڈکسن سے ہوئی جس نے ضیاء الحق کے ہاتھ کی لکیروں کا مشاہدہ کرنے کے بعد پیش گوئی کی کہ ''آپ ایک دن اپنے ملک کے صدر بنیں گے''۔ کہا جاتا ہے کہ اس پیش گوئی کے لیے بھی جین ڈکسن کو سی آئی اے نے ہی مامور کیا تھا جو بھٹو کو اقتدار سے محروم کرنے کی سازش تیار کر چکے تھے۔ ضیاء الحق نے اس پیش گوئی کی ذہنی طور پر پذیرائی کی اور قومی حالات و واقعات کے تغیر و تبدل میں اپنی صدارت پر ہمیشہ نظر رکھی۔

ہم سب اس حقیقت کو جانتے ہیں کہ ضیاء الحق 1977ء میں فوج میں ایک جونیئر میجر جنرل تھے۔ چیف آف آرمی سٹاف کے عہدے کے لیے ان کے انتخاب کی سفارش کرنے میں اردن کے شہنشاہ، پاکستان کے اٹارنی جنرل یحییٰ بختیار، وزیر قانون حفیظ پیرزادہ اور بیگم نصرت بھٹو پیش پیش تھیں۔ جب انتخاب کا عمل جاری تھا تو وزیراعظم بھٹو کو جنرل ضیاء الحق کی فائل بھیجی ہی نہیں گئی تھی کیوں کہ وہ اوسط درجے کے فوجی افسر اور گربہ مزاج مشہور تھے۔ بھٹو نے وزارت دفاع سے ان کی خفیہ فائل خود طلب کی تھی اور پھر اپنا فیصلہ اس خیال سے صادر

کر دیا کہ یہ مسکین طبع، درویش مزاج، مذہب پسند اور کمزور فوجی جرنیل ان کے لیے کبھی خطرہ نہیں بنے گا۔ ذوالفقار علی بھٹو کے اس تاثر کو جنرل ضیاء الحق نے ہمیشہ قائم رکھا اور بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹنے کی شب بھی ضیاء الحق نے بھٹو کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا تھا۔ اور بھٹو نے بعض خبریں ملنے کے باوجود ضیاء الحق پر اعتماد کیا تھا۔

اس ضمن میں کہا جاتا ہے کہ بھٹو سے غداری کی بھنک جب ڈائریکٹر آئی۔ بی راؤ عبدالرشید کے کان میں پڑی تو انہوں نے بھٹو کو یہ بتانے میں تاخیر نہ کی، ان کی حکومت کا تختہ 15 جولائی 1977ء کو الٹنے کی سازش ہو رہی ہے۔ اس دور میں بھٹو آئی۔ ایس۔ آئی کے چیف جنرل جیلانی پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ جنرل جیلانی نے دوبارہ کروا دیا اور بھٹو کو ضیاء الحق کی وفاداری کا اس طرح یقین دلا دیا کہ انہوں نے راؤ رشید کی رپورٹ ضیاء الحق کو بھجوا دی کہ وہ ان کے منصوبوں سے شناسا تھے۔ جنرل ضیاء نے یہ رپورٹ ملنے پر راؤ رشید کے پاس گئے اور انہیں یقین دلایا کہ وہ اپنے محسن کے خلاف کسی قسم کے اقدام کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ راؤ رشید شرمندہ ہو گئے اور انہوں نے ضیاء الحق کے جذبات بھٹو تک پہنچانے کا وعدہ کر لیا۔ اب ایک اور واقعہ سنیے۔

جب پی این اے کی تحریک عروج پر تھی اور مذاکرات کی کامیابی کے آثار ظاہر ہو رہے تھے تو 2 جولائی 1977ء کو بھٹو نے کور کمانڈرز کی ایک میٹنگ طلب کی۔ معینہ وقت پر کور کمانڈرز اس میٹنگ کے لیے ایوان وزیر اعظم میں نہ پہنچے تو بھٹو کے ملٹری سیکرٹری نے جنرل ضیاء سے وعدے کے باوجود عدم تعمیل کا سبب پوچھا تو انہوں نے افسوس کا اظہار کیا کہ وہ اس میٹنگ کا پروگرام کور کمانڈرز کو بتانا بھول گئے تھے اور وہ گھنٹہ قبل سب کے سب اپنے اپنے ہیڈ کوارٹرز پر چلے گئے ہیں۔ اس اطلاع کی چیکنگ جب آئی۔ بی نے کی تو معلوم ہوا سب کور کمانڈرز ضیاء الحق کے گھر پر موجود تھے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ بھٹو کی منتخب حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش سے کور کمانڈرز واقف تھے تاہم ملتان اور کوئٹہ کے کور کمانڈرز اس منصوبے کے حق میں نہیں تھے۔ 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق کا یہ خدشہ یقین میں بدل گیا کہ ذوالفقار علی بھٹو ان کی جگہ نیا سی این سی مقرر کرنے والے ہیں۔ اس وقت جین ڈکسن کی پیش گوئی ان کے افق خیال پر چمکی اور انہوں نے بھٹو کو وزارت عظمیٰ سے معزول کرنے اور مارشل لا نافذ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور عمل میں تاخیر نہ کی۔

ایک دلچسپ انکشاف یہ ہے کہ ضیاء الحق کے اس قابل نفرت پروگرام سے برطانوی ہائی کمشنر متعینہ اسلام آباد بھی واقف تھے۔ چنانچہ جب 5 جولائی کو صبح ایک بج کر 45 منٹ پر ایوان وزیر اعظم میں بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تو برطانوی ہائی کمشنر نے اسلام آباد میں فوج کی نقل و حرکت پر نظر رکھی تھی اور اس کے دفتر کا سٹاف اہم شاہراہوں پر نگرانی کرتا ہوا بتا دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف راولپنڈی میں "آپریشن فیئر پلے" کی کامیابی پر ایک دینی جماعت کے سربراہ کا تار اسی رات ایک بج کر 47 منٹ پر موصول ہو گیا تھا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ جماعت بھی اس واقعے کی پیشگی خبر رکھتے تھے۔ اس قومی المیے میں سب سے بھیانک کردار جنرل جیلانی نے ادا کیا جو ذوالفقار علی بھٹو کو یقین دلاتے رہے کہ ضیاء الحق کا جمہوری عمل کے تحت منتخب لیڈر کے خلاف فوجی شب خون کا کوئی منصوبہ نہیں تھا۔ بعد میں جنرل ضیاء الحق نے جنرل جیلانی کو انعام سے نوازا اور انہیں پنجاب کا گورنر بنا دیا۔ لیکن تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ جمہوریت پر وار کرنے والے سب جرنیل اور ان کے معاونین پاکستان قوم کے مجرم ہیں اور تاریخ نے انہیں میر جعفر اور میر صادق کے ساتھ کھڑا کر دیا ہے اور وہ ہمیشہ رو سیاہ رہیں گے۔

◆◆◆

منگولوں کا آغاز

امین راحت چغتائی

الطائی کے پہاڑوں کے مشرق میں منگولیا کی سطح مرتفع پر ایسے قبائل آباد تھے جو اپنے کاہل ہمسایوں کو اپنا شکار بناتے رہتے تھے۔ منگولیا ترکوں اور منگولوں دونوں قبائل کا وطن تھا۔ تاریخ میں دونوں قبائل آپس میں گھلے ملے رہتے تھے اور دونوں کی زبانوں میں بھی ایک دوسرے کے بعض الفاظ گھل مل گئے تھے۔ منگولیا کے لوگ نئی نئی چراگاہوں کی تلاش میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ یہ دراصل خانہ بدوش قبائل کو حرکت میں رکھنے کا بہترین علاقہ تھا۔ وسیع سبزہ زاروں کے انتہائی سرے پر واقع تھا۔ یہاں سے یورپ تک رسائی ممکن تھی۔ گھوڑ سوار قبائل تیزی سے ان چراگاہوں کو تلاش کر لیتے تھے۔ جنوب میں رہنے والے قبائل نسبتاً زیادہ آسودہ سمجھے جاتے تھے۔ منگولیا سے ترکوں کا ظہور ایک آہستہ اور غیر منصوبہ بند عمل کا نتیجہ تھا۔ ترک قبائل یا منگول سے جب کسی نئے علاقے کو اپنی تحویل میں لیتے تو تاریخ کا حصہ بن جاتے۔ وہ فرار قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں یا گروہوں سے یا کسی اور سے۔ لیکن منگولوں کا اپنے وطن سے اچانک نمودار ہونا ایک مختلف داستان ہے۔ ان کی توسیع پسندی اور ایشیا کے طول و عرض میں پھیلنے کا تعلق تیرھویں صدی عیسوی کی ابتداء سے جوڑا جاتا ہے۔ اور اس توسیع کا انحصار بھی ایک عسکری نابغہ شخص پر ہے جو پیدا تو تموجن کے نام سے ہوا تھا لیکن تاریخ اسے چنگیز خان کے نام سے جانتی ہے۔

دنیا کی کوئی تاریخ اپنی ابتدا اور انجام میں اتنی مختلف نہیں رہی۔ جتنی چنگیز خان کی ہے۔ وہ 1167ء کے لگ بھگ پیدا ہوا تھا۔ مشرقی سبزہ زاروں کے خانہ بدوش قبائل میں سے ایک قبیلہ منگولوں کا بھی تھا اور اس قبیلے کا سردار چنگیز خان کا باپ تھا جسے زہر دے کر مار دیا گیا تھا۔ اس وقت تموجن کی عمر آٹھ سال تھی۔ قبیلے کے زعما نے چنگیز خان کی بیوہ ماں اور بچوں کو قبیلے سے خارج کر دیا۔ جس کے پاس کھانے پینے کے لیے جنگلی پودوں، چھوٹے جانوروں اور بعض اوقات چوہوں کے سوا اور کچھ نہ تھا اور پھر وہ وقت بھی آیا کہ جب 1227ء میں اس کی وفات ہوئی تو وہ کیسپین سے لے کر چین کے مشرقی ساحل تک کا حکمران تھا۔ وہ بہت عالی حوصلہ شخص تھا۔ اسے اپنے قبیلے کا سردار بننے کے لیے زندگی کے ابتدائی پچیس سال صرف کرنا پڑے۔ وہ اپنے قبیلے کے سرکش افراد سے بھی نبرد آزما رہا۔ منگولوں کے دوسرے قبیلوں سے بھی لڑتا رہا۔ یہی نہیں۔ وہ ہمسایہ قبائل میں بھی داد شجاعت دیتا رہا حتیٰ کہ عمر عزیز کے چالیس سال بیت گئے اور پھر اس نے 1206ء میں تموجن کی بجائے چنگیز خان کا لقب اختیار کر لیا یعنی وہ سب سے بڑا سردار بن گیا جس کے نتیجے میں وہ اب اپنے زیر نگیں سارے قبائل کو لشکر کشی کا حکم دے سکتا تھا۔ اس نے 1209ء میں شمالی چین سے اپنی مہمات کا آغاز کیا اور 1215ء میں بیجنگ کو تسخیر کر لیا۔ لیکن اس کی اصل مہم کا رخ تو 1219ء میں مغرب کی جانب ہو گیا۔ 1220ء میں اس نے سمرقند و بخارا کو تسخیر کر لیا۔ تسخیر کیا تباہ و برباد کر دیا۔ پھر وہ جنوب کی طرف یلغار کرتا ہوا ہندوستان میں داخل ہو گیا لیکن دریائے سندھ تک پہنچ کر پھر پلٹا۔ 1223ء میں اس کی فوج کیسپین کے گرد گھوم کر کاکیشیا (Caucasus) کے پہاڑوں سے ہوتی ہوئی کریمیا اور جنوبی روس کے شہروں کو لوٹتی اپنی ہوس کی پیاس بجھاتی اور اپنے ناقابل تسخیر ہونے کا

اعلان کرتی رہی۔ اس یلغار میں اہم ترین بات منگول افواج کی سرعت رفتار تھی جس نے نفسیاتی جنگ کا بھی کام دیا۔ جنگ میں لڑنے والے گھوڑوں کی تربیت کا بھی بڑا دخل تھا۔

1167ء سے 1227ء کے دوران میں چنگیز خان اور اس کی افواج کی کامیابیوں کی کئی وجوہ بیان کی گئی ہیں۔ اس میں کوئی اعلیٰ ہتھیاروں کا دخل نہیں ہے چراگاہوں میں پلنے والے خانہ بدوش سپاہیوں کی گھوڑ سواری کی روایتی مہارت نے اہم کردار ادا کیا۔ وہ اپنے گھوڑوں پر سوار اپنے دشمن کے قریب پہنچ کر گھوڑوں کو آن واحد میں تنگ گھاٹیوں پر کھڑا کرتے۔ سرعت سے حملہ کر کے پلٹتے اور اپنی سابقہ حالت (پوزیشن) پر آ جاتے اور پھینکے ہوئے تیروں کی زد پر آ کر دشمن ڈھیر ہو جاتا۔ منگولوں کی شہ سواری کی مہارت اپنی فوج کو حلقہ عملی سے مربوط رکھتی۔ وہ دو دو سو میل روزانہ کی رفتار سے سفر کرتے۔ اپنے دوستوں تک پیغامات پہنچانے کے لیے تربیت یافتہ کبوتروں کو بھی استعمال کرتے۔ لیکن جنگ میں وہ "نفسیاتی ہتھیار" ان کے بہت کام آتے۔ یہ تھے اپنی وفاداری کا اقرار اور دشمن کو لرزہ بر اندام کرنے کا فن۔ دشمن کے قبیلے کا جو جنگجو چنگیز خان کی فوج سے پوری شجاعت سے لڑتا ہوا شکست کھا جاتا۔ اسے منگول سردار داد شجاعت دیتا۔ اسے منگول فوج میں شامل ہونے پر اکسایا جاتا۔ اور صرف بزدل اور غدار کو سزا کا مستحق ٹھہرایا جاتا۔ دشمن کی زمینوں پر رہنے والے کامل الوجود لوگوں کے لیے اس کے قواعد کچھ اور ہو جاتے۔ یہاں عیاری کی حوصلہ افزائی کی جاتی۔ منگول سپاہی شہروں اور قصبوں میں گھس جاتے۔ مخبروں کو تلاش کر کے انہیں رشوت دی جاتی۔ وہ لوگوں میں منگولوں کے آنے کی دہشت پھیلاتے اور کہتے کہ اپنا انتخاب کر لو۔ انتخاب صرف یہ ہوتا کہ ان سے لڑو یا اطاعت کر لو۔ ایسی خبریں تیزی سے سفر کرتیں۔ اگر کوئی شہر یا قصبہ بہادری سے مدافعت کرتا تو وہاں کے لوگوں کو سر عام قتل کر دیا جاتا۔ انہیں شہری دیوار کے باہر منگول فوج کے سامنے لایا جاتا۔ پھر انہیں منگول سپاہیوں کے سپرد کر دیا جاتا۔ وہ اپنے دشمن کو قتل کر کے اس کے دونوں کان کاٹ کر اپنی کارروائی دکھانے کے لیے اپنے انچارج کو پیش کر دیتے۔ منگول دستوں کی پیش قدمی سے پہلے بدقسمت شہر میں ان کا خوف پہنچ جاتا۔ منگولوں کے جاسوس انہیں بتاتے کہ اگر جلد ہتھیار ڈال دو گے تو ممکن ہے تم پر رحم کھا کر معاف کر دیا جائے۔ عام طور پر شہریوں کو آمادہ کرنے کی ضرورت پیش ہی نہ آتی۔ وہ شہر کے دروازے کھول دیتے۔ منگول سپاہی شہر کو خوب لوٹ کر آگے بڑھ جاتے۔

چنگیز خان 1225ء میں اپنی مغربی مہم سے "سیراب" ہو کر منگولیا لوٹ آیا۔ اب اسے شمالی چین پر پھر حملہ آور ہونا تھا۔ دن بھر شکار کھیل کر واپس آتے ہوئے اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر سے گر کر زخمی ہو گیا۔ اس کی علالت نے طول کھینچا۔ آخر انہی زخموں کے باعث وہ 1227ء میں فوت ہو گیا۔ چنانچہ چنگیز خان کے افراد خاندان اور قریلتائی (پارلیمان) میں اکٹھا ہوئے جس میں نئے خان (1229ء) کا انتخاب کیا گیا۔ چنگیز خان کا دوسرا بیٹا اوگادائی (Ogudai) منتخب ہو گیا۔ اسے چنگیز خان اپنی زندگی ہی میں اپنا وارث قرار دے چکا تھا۔ اس نے زمام اقتدار سنبھالتے ہی قراقرم کو اپنا دارالسلطنت بنایا اور اس کی شان و شوکت پر بھی توجہ دی تاکہ باہر سے آنے والا اس سے متاثر بھی ہو اور مرعوب بھی۔ 1253ء میں رومن کیتھولک مذہب کا ایک نمائندہ ولیم آف روبوگواس (William of Rubuguis) قراقرم آیا تو یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا کہ شہر کے ارد گرد دیواریں بنی ہوئی ہیں اور اندر مستطیل رقبے پر کشادہ محل ہے۔ سڑکوں پر اینٹوں سے مکانات بنے ہوئے ہیں۔ بارہ شمانی خانقاہیں ہیں، دو مساجد اور ایک نسطورین کرسچین چرچ بنا ہوا ہے۔

چنگیز خان کی تو ساری عمر جنگ وجدل میں گزری۔ لیکن اس کا بیٹا اوگادائی اپنے دارالسلطنت میں بیٹھ کر مہم جوئی کے لیے

احکامات جاری کرنے کو ترجیح دیتا تھا۔ اور منگول افواج اس کے مرکزی احکامات کے تحت چین کو اپنے زیر نگیں لانے کی مساعی میں پوری طرح مصروف تھیں۔ ادھر وہ کوریا کو فتح کر چکی تھیں اور مغرب میں بھی حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہی تھیں۔

اوگدائی نے 1235ء میں اپنے بھتیجے باتو کو ہدایات جاری کیں کہ وہ اپنے زیر نگیں علاقے کو یورپ کی طرف بڑھائے۔ چنگیز خان نے اپنی سلطنت کا انتہائی مغربی علاقہ اپنے بڑے بیٹے جوچی کو دے رکھا تھا۔ وہ چنگیز کی زندگی میں اس سے ذرا پہلے فوت ہو گیا اس کے بعد اس کا بیٹا باتو اس علاقے کا حکمران بنا۔ اس نے 1236ء میں شمال سے روس کی طرف پیش قدمی کی اور 1237ء میں باتو اور اس کی فوج نے والگا کے شمالی علاقوں کے قبائل پر قابو پالیا۔ اس وقت کے روس میں کئی خود مختار چھوٹے چھوٹے علاقے تھے جو سامان حرب کی کمی کے باعث کسی بیرونی حملے کی تاب نہ لا سکتے تھے اور آسانی سے تسخیر کیے جا سکتے تھے۔

منگول افواج کی زبردست فتوحات کو دیکھ کر روس نے انہیں زولوتایا اوردا (Zolotaya Orda) "لشکر زریں" کا نام دے رکھا تھا۔ اسی کو انگریزی میں "Golden Horde" کہا جاتا ہے۔ یہی وہ لشکر تھا جس نے 1237ء میں روس پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد تقریباً دو صدیوں تک اسے مغلوب کیے رکھا۔ منگول حکمران باتو خان لشکر کشی کے دوران میں جو خیمہ استعمال کرتا تھا وہ سنہری رنگ کا ہوتا تھا اس لیے یہ "گولڈن ہورڈ" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ منگول لشکر نے ماسکو کو 1238ء میں اور کیف (Kiev) کو 1240ء میں تہس نہس کر دیا اور دیگر قابل ذکر شہروں کو بھی اپنی دسترس سے بچنے نہ دیا۔ اس کے بعد لشکر نے جنوبی علاقوں کی راہ لی مگر روس پر اس کے اثرات 1237ء سے 1395 تک قائم رہے۔

دسمبر کے مہینے میں خبر پہنچی کہ خان اعظم اوگدائی قراقرم میں وفات پا گیا ہے۔ چنانچہ لشکر کے سردار باتو خان اور دیگر منگول امراء کے لیے قوریلتائی میں شرکت ضروری ہو گئی کیونکہ اسی پارلیمان نے آئندہ کے خان اعظم کا فیصلہ کرنا تھا۔ چنانچہ باتو خان ہنگری سے اپنی فوج واپس بلا کر دارالسلطنت روانہ ہو گیا۔ یہاں سے روس کے "راجوں مہاراجوں" کو قابو میں رکھنا آسان تھا۔ انہیں ٹیکس جمع کرنے کا کام سپرد کر دیا گیا۔ اس کے عوض انہیں اپنے علاقوں پر "آزادانہ حکمرانی" کی اجازت تھی۔ لیکن شرط یہی تھی کہ وہ اپنے علاقے سے زیادہ سے زیادہ ٹیکس اکٹھا کر کے باتو خان تک پہنچائیں۔

باتو خان نے 1243ء سے والگا کے علاقے میں اپنا دارالحکومت ایک مقام پر بنایا تھا جس کا نام اسی کے نام کی رعایت سے "سرائے باتو" رکھ دیا گیا تھا۔ اس کے بھائی برکے (Berke) کو 1255ء میں قیادت منتقل ہوئی تو وہ اپنے لشکر سمیت مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ اس کے دارالحکومت کا نام "سرائے برکے" رکھا گیا۔ یہ مقام جدید وولگوگراد کے مشرق میں واقع ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وسطی ایشیا کی روایت کے مطابق مساجد اور عامۃ الناس کے لیے مخصوص شفاخانوں کا مرکز بن گیا۔ اس شہر کی آبادی چھ لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔ یہ 1395 تک برقرار رہا۔ پھر تیمور نے آ کر اسے تباہ کر دیا۔

چنگیز خان کی نسل میں پہلے اوگدائی، خان اعظم کہلایا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا گیوک (Guyuk) خان اعظم بنا۔ لیکن اس کے خان اعظم بنائے جانے پر اس کے دوسرے شہزادوں نے خاصا احتجاج کیا۔ اوگدائی کی وفات 1241ء میں ہوتی ہے۔ اس کے بعد چار سال اس کی بیوہ توری گین (Toregene) اس وقت تک حکمران رہی جب تک کہ حکمران کے بارے میں قطعی فیصلہ نہیں ہو گیا۔ اور وہ

انجام کار 1246ء میں گیوک کے حق میں فیصلہ کروانے میں کامیاب ہو گئی۔ لیکن دو سال بعد وہ بھی وفات پا گیا۔ اس کے بعد ایک بار پھر نیا انتخاب عدم اتفاق کی نذر ہو گیا۔ اس عرصے کے لیے گیوک کی بیوہ اوغل خانمش (Oghul Khamish) کو بطور ریجنٹ قبول کر لیا گیا۔ آخر کار منگو (Mangu) کو خانِ اعظم بنانے کا فیصلہ ہو گیا۔ وہ چنگیز خان کے چھوٹے بیٹے تولوئی (Tului) کا صاحبزادہ تھا۔ منگو کو بعض اوقات انگریزی میں (Mongke) بھی لکھا جاتا ہے اس نے اپنے دو بھائیوں کو مشرق و مغرب کے وسیع خوشحال علاقے کو بھی منگول مملکت میں شامل کرنے کا کام تفویض کر دیا۔ منگول لشکر نے چین کے شمالی صوبوں کی طرف توجہ کم دی۔ تاہم اس نے مغرب کی جانب روس کی چراگاہوں سے ملحقہ علاقے کو فتح کر لیا "اور لشکرِ زریں" کا جھنڈا گاڑ دیا۔ بعد میں منگول افواج نے چین کے کچھ حصول علاقوں، فارس اور مشرقِ وسطیٰ میں بھی پیش قدمی کی۔

1252ء میں منگو نے اپنے بھائی قبلائی خان کو منگول سلطنت کی مشرقی سرحدوں کی کمان سپرد کر دی اور 1255ء میں ہولاگو (Hulagu) کو جو قبلائی سے دو سال چھوٹا بھائی تھا ہدایت کی کہ وسطی ایشیا سے اسلامی میلانات کی روک تھام پر توجہ دے۔

قبلائی خان نے چین کے مغربی پہاڑی علاقوں کے ذریعے جنوبی حصے پر دباؤ ڈالنا شروع کیا۔ وہ زیچوان (Szechwan) اور یونان (Yunnan) کے علاقوں تک پہنچنا چاہ رہا تھا۔ لیکن 1259ء میں خانِ اعظم منگو خان کی موت نے اس کی توجہ کو منتشر کر دیا۔ امرائے دربار نے قبلائی خان کو نیا خانِ اعظم منتخب کر لیا۔ یہ امراء و معززینِ دربار قبلائی کے ساتھ چین میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ لیکن قراقرم میں قبلائی کا ایک اور چھوٹا بھائی آرک بوگ (AriqBoge) بھی اسی منصب کا دعویٰ دار بن بیٹھا۔ قبلائی نے 1264ء میں اپنے بھائی کو شکست دی۔ اب وہ ساری منگول سلطنت کا حاکم تھا۔ اور چین پر پوری توجہ دینے میں آزاد تھا۔ چنانچہ 1267ء میں اس نے قراقرم سے اپنا دارالسلطنت بیجنگ میں منتقل کر لیا جس کی حالت اس وقت بہت خراب تھی۔ کیونکہ اس کے دادا چنگیز خان نے 1215ء میں اسے بری طرح تباہ و برباد کر دیا تھا۔ لیکن قبلائی خان نے اسے اپنی رہائش کے شایانِ شان تعمیر کر لیا۔ اس کی دیواریں 24 میل لمبی اور پچاس فٹ اونچی ہیں۔ منگول اسے خان بالق (Khanbaliq) یعنی "شہرِ خان" کہتے تھے۔ یورپ والوں نے اپنے لہجے کے مطابق اسے کمبالک (Cambaluc) کا نام دے دیا۔ قبلائی نے اپنی اس نئی طاقت کی بنیاد پر اپنے آپ کو ایک نئے خاندانی نام سے موسوم کر لیا۔ اور اسے "خاندانِ سنگ" (Song Dynasty) کہا جانے لگا۔ قبلائی کے ایک نیا خاندانی نام اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اب اپنے آپ کو "محض آوارہ، وحشی منگول" کہلانے کی بجائے، ایک نئے خاندان کا شہنشاہِ چین کہلوانا پسند کرتا تھا۔ اسی سال کے دوران میں اس نے چینی زبان میں اپنا نیا خاندانی نام تایوان (Tayuan) رکھ لیا۔ جس کا معنی ہے "اصل ماخذ"۔ اور چنگیز خان کو بعد از وفات چینی زبان میں (Tai Tsu) یعنی جدِ اعلیٰ کہا جانے لگا۔ ان نئے چینی ناموں کا قبلائی کی حکمرانی پر اچھا اثر پڑا۔ واقعہ نگار 1279ء سے نئے کیلنڈر کا آغاز کرتے ہیں یعنی چین کے ایک ایسے شاہی خاندان کا آغاز جو باہر سے آیا ہوا ہو۔ لیکن قبلائی خان یقیناً ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اُسے باہر سے آئے ہوئے خاندان کا شہنشاہ نہ کہا جائے۔ چنانچہ وہ چین کے اشرافیہ کا دیا ہوا نظم و نسق اپنا لیتا ہے۔ اس فرق اتنا تھا کہ وہ اہم عہدوں کے لیے 'اپنی' 'باہر سے آئے ہوئے' لوگوں کا انتخاب کرتا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی وہ اپنا رویہ نرم رکھتا ہے۔ وہ کسی بھی سابقہ چینی بادشاہ کے مقابلے میں زیادہ طاقتور حکمران تھا۔ حتیٰ کہ مغرب کے جو علاقے منگولوں کے زیرِ نگیں تھے ان پر بھی اپنا اختیار کم سے کم استعمال کرتا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ وہ

منگولیا، تبت، مانچوریا، کوریا اور پورے چین کا جنوبی حصہ چین تک مطلق العنان حکمران تھا۔ اس عرصے میں جاپان کے خلاف اسے صرف دو مہمات بہت مہنگی ثابت ہوئیں۔ یہ 1274ء اور 1281ء سے تعلق رکھتی ہیں۔ قبلائی کا 1264ء میں خان اعظم بننا اس کی زندگی میں پھر چیلنج نہیں ہوا۔ لیکن اب خان اعظم کے اختیارات بے معنی ہوتے جا رہے تھے۔ اب نہ تو وہ چنگیز خان کے عہد کی فوجی رفتار کی سرعت رہی تھی، اور نہ ہی پورا اور اسا سلطنت صرف ایک آدمی چلا سکتا تھا۔ اب اس کے پوتے تین دور دراز علاقوں میں خود مختار حکمران بن کر حکومتیں چلا رہے تھے۔ قبلائی کی سلطنت تو بلاشبہ بہت شاندار تھی۔ لیکن دوسرے حکمرانوں کی سلطنتیں بھی کچھ کم شان نہیں رکھتی تھیں۔ قبلائی کے دو عمزاد باتو اور برکے نے روس میں "منگول زریں" کے لیے اپنا وطن بنا رکھا تھا اور قبلائی کے اپنے چھوٹے بھائی ہولاکو نے فارس اور میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق) میں اپنی منگول سلطنت قائم کر رکھی تھی۔ ہولاکو نے جنوری 1256ء میں آمو دریا کو عبور کیا۔ یہ فارس کے اسماعیلی حشیشین کو ختم کرنے کی ایک مہم تھی۔ پورے علاقے کو حشیشیوں نے خوف زدہ کر رکھا تھا۔ یہ باطنی اسمٰعیلی فرقے کے لوگ تھے۔ جب ان کا مقابلہ منگولوں سے ہوا تو ان کی جنگی حکمت عملی سے یہ نا واقف تھے۔ لہٰذا ان کے ایک ایک قلعے کو منگولوں نے چن چن کر تباہ کر دیا حتیٰ کہ "قلعہ الموت" بھی ختم ہو گیا۔ حالانکہ یہ ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ ان کا خاتمہ کر کے ہولاکو 1257ء کے اواخر میں فارس سے زیادہ متمول علاقے کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ اسلامی تہذیب کا مرکز عراق تھا۔ یہاں سے مسلمانوں کا خلیفہ معتصم باللہ حکومت کرتا تھا۔ جنوری 1258ء میں اس نے منگولوں کا سد باب کرنے کے لیے اپنی مسلمان فوج بھیجی۔ ہولاکو کے لشکر نے اس کا صفایا کر دیا۔ مزید یہ کہ ہولاکو نے خلیفہ کو حکم دیا کہ وہ اس کے روبرو پیش ہو اور بغداد کی چہار دیواری کو مسمار کر دے لیکن جب خلیفہ نے اس کی پرواہ نہ کی تو ہولاکو نے شہر کا محاصرہ کر لیا اور بغداد کو تباہ کر دیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ تقریباً آٹھ لاکھ کے لگ بھگ افراد ہلاک کر دیے گئے اور خلیفہ کو بہت توہین آمیز طریقے سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

خلیفہ کے وزیر مؤید الدین علقمی کی تجویز پر ہولاکو نے خلیفہ کو نمدے میں لپیٹ کر ستون سے باندھ دیا اور لوگوں کو حکم دیا کہ اسے ٹھوکریں ماریں۔ چنانچہ اسے ٹھوکریں مار مار کر مار دیا گیا۔ خلیفہ پست ہمت اور نظام مملکت چلانے کے شعور سے عاری تھا۔ اور علقمی علویوں کی حکومت قائم کرنا چاہتا تھا لیکن ہولاکو نے اس کی ایک نہ چلنے دی۔ "تاریخ اسلام" کے ممتاز مورخ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی اپنی تاریخ کی جلد دوم صفحہ 616 پر بیان کرتا ہے کہ جنگ میں علقمی نے ایک کروڑ آٹھ لاکھ مسلمان شہید کروا دیے۔ گویا بغداد تباہ ہو گیا۔ دریائے دجلہ پہلے مسلمانوں کے خون سے سرخ ہو گیا۔ پھر جب اس میں شاہی کتب خانے کی نایاب کتابیں پھنکوائی گئیں تو دجلہ کتابوں کی سیاہی سے سیاہ ہو گیا۔(1)

منگول سلطنت تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں دنیا کی سب سے بڑی سلطنت تھی۔ مشرقی یورپ سے بحر جاپان تک۔ شمال میں سائبیریا تک، مشرق میں برصغیر ہندوستان، انڈونیشیا اور مغرب میں عرب تک اس کا عمل دخل تسلیم کیا گیا ہے۔ منگول سلطنت اپنے وطن منگولیا کے مختلف قبائل کے اتحاد سے چنگیز خان کی قیادت میں قائم ہوئی تھی اور 1206ء میں اسے بلا شرکت غیرے تمام منگولوں کا حکمران تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اور یہ سلطنت چنگیز خان اور اس کی اولاد کی سرکردگی میں بڑی تیزی سے پھیلی۔ پھر "جنگ استحقاق" میں چنگیز خان کے پوتوں کے ہاتھوں بکھرتی چلی گئی۔ پوتوں میں سے ہر کوئی اپنے آپ کو جائز وارث سمجھتا تھا۔ وہ اوگدائی کی اولاد ہو یا چغتائی کی یا تولوئی

(1) یہ روایت بھی ہے کہ ہولاکو (ہلاکو خان) نے بغداد کی ساری لائبریریاں جلا کر راکھ دریا میں بہا دی تھی۔

کی۔ عزائم سب کا گرم تھا۔ 1260ء میں عین جالوت (Ain Jalut) کی جنگ میں پہلی بار منگول افواج کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ پہلا موقع تھا کہ میدان جنگ میں منگولوں کی پیش قدمی روک دی گئی تاہم منگول مختلف دوسرے محاذوں پر اپنی شجاعت کے جوہر دکھاتے رہے اور پھر 1299ء میں وادی الخزندار (Wadi-ul-Khazandar) میں فیصلہ کن فتح پانے کے بعد جغرافیائی اور سیاسی اسباب کے پیش نظر پیچھے ہٹ گئے۔ 1294ء میں قبلائی خان کی وفات کے بعد منگول سلطنت چار چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گئی اور ہر ریاست کے اپنے جداگانہ مقاصد ومفادات تھے۔ شمال مغرب میں لشکر زریں تھا۔ وسط میں چغتائی کی حاکمیت تھی۔ جنوب مغرب میں ایل خانی اور مشرق میں یعنی آج کے بیجنگ سے یوآن خاندان چین پر حکومت کر رہا تھا۔ 1304ء میں تین ریاستوں نے یوآن خاندان کو شکست دے کر واپس منگولیا بھجوا دیا۔ جبکہ لشکر زریں اور چغتائی ریاست کا وجود کچھ اور عرصے تک برقرار رہا۔

سلطنت کے قیام سے قبل کا حال: 907 تا 1125ء دسویں صدی عیسوی سے منگولیا، تیمور یا اور شمالی چین پر لیاؤ خاندان (Liao dynasty) کی حکومت چلی آ رہی تھی۔ 1125ء میں Jinsyasty نے جس کا بانی Jurchen تھا اس کو شکست دے کر منگولیا میں Liao کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ ''جن خاندان کے حکمرانوں کو ''زریں بادشاہ'' کہا جاتا تھا۔ انہوں نے 1130ء میں بڑی کامیابی سے خماگ منگول کنفیڈریشن (متحدہ ریاست) سے مزاحمت کی۔

ان دنوں خماگ منگولوں کا سردار تموجن، چنگیز خان کا دادا خابول خان (Khabul Khan) تھا۔ منگول سطح مرتفع کے مالک ان دنوں پانچ طاقتور منگول قبیلے تھے۔ ان کی کنفیڈریشن کا نام خان لگ (Khanlig) تھا اور اس میں جو قبیلے شریک تھے ان کے نام یہ ہیں۔ خیرید Khereid، خماگ منگول (Khamag Mongol)، نائمان (Naiman)، مرجد (Murgid) اور تاتار (Tatar)۔ ''چین قبیلے'' سے بٹنے والے حکمرانوں کی پالیسی ''پھوٹ ڈالو اور حکمرانی کرو'' والی تھی۔ مختلف قبیلوں میں تنازعات کی حوصلہ افزائی کرتے۔ خاص طور پر تاتار اور منگول آپس میں الجھتے رہتے۔ ادھر مختلف قبیلے آپس میں لڑتے رہے ادھر خابول کا جانشین امباغی (Ambaghai) منتخب ہو گیا۔ تاتاروں نے انہیں دھوکا دیا اور ان کے سردار کو جورچن (Jurchen) کے حوالے کر کے سزائے موت دلوا دی۔ منگولوں نے سرحد پر حملہ کر کے اس کا بدلہ لے لیا۔ جورچن نے جوابی حملہ کیا لیکن 1143ء میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر 1147ء میں جن قبیلے کو اپنی پالیسی تبدیل کرنا پڑی۔ اور اس نے منگولوں کے ساتھ ایک معاہدۂ امن تحریر کیا اور کئی قلعے خالی کر دیے۔ دریں اثنا منگولوں نے تاتاروں سے اپنے خان کی موت کا بدلہ لینے کے لیے ان پر اپنے حملے جاری رکھے۔ آخر 1161ء میں جن اور تاتاروں کی فوج نے منگولوں کو شکست دے دی۔ تاہم تیرھویں صدی عیسوی میں منگول سلطنت کے قیام میں گھوڑوں اور دیگر مویشیوں نے بھی اہم کردار ادا کیا مگر جنگ وجدل میں سدا نام کس کا رہا۔

◆◆◆

اطلاع عام

قارئین کی پرزور فرمائش پر رسالہ ''تخلیق'' کو فیس بک پر پیش کرنے کا انتظام کر لیا گیا ہے۔ اب آپ فیس بک پر ماہنامہ ''تخلیق'' پیج (Monthly "Takhleeq" Page) کو Link کر کے ''تخلیق'' کے ہر شمارے کے حوالے سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں اور اپنی پسند کی تحریریں download کر سکتے ہیں۔

قدامت پرستی اور برطانوی راج

ڈاکٹر مبارک علی

1857ء کی جنگ آزادی کے بعد برطانوی حکومت نے ہندوستان پر حکومت کرنے کی نئی بنیادیں رکھیں۔ اس بغاوت سے انہوں نے بہت کچھ سیکھا۔ مثلاً کمپنی نے اپنے دور میں اس بات کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان کے قدیم رسم و رواج کو تبدیل کیا جائے اور جدید اصلاحات کا نفاذ کیا جائے مگر ان کی ان کوششوں کا ردعمل سخت مخالفت میں ہوا۔ اس لئے کمپنی کی حکومت کے خاتمے کے بعد جب ہندوستان براہ راست تاج برطانیہ کے تحت آیا تو حکومت کے نئے عہدیداروں کا رویہ کمپنی کے دور سے مختلف تھا یعنی ہندوستان کی رسم و رواج اور روایات کو نہیں چھیڑا جائے گا اور نہ ہی ہندوستان کے لوگوں سے قریبی تعلقات و روابط رکھے جائیں گے یعنی حکمرانوں اور رعایا کے درمیان فاصلہ رکھا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزوں میں نسل پرستی کے جذبات گہرے ہوئے اور یہ کہ سفید فام اقوام دوسری نسلوں سے زیادہ افضل اور برتر ہیں۔ انیسویں صدی کا یہ وہ وقت تھا کہ جب یورپ میں نسل پرستی کے نظریات عروج پر تھے اور ان نظریات کو اس لئے استحکام مل رہا تھا کیونکہ یورپی اقوام نے ٹیکنالوجی کی مدد سے ایشیا اور افریقہ کے ملکوں پر قبضے کر لئے تھے وہ سفید فام اقوام کی برتری سمجھتے تھے۔ چنانچہ نسل پرستی کے یہ جذبات انگریز حکمرانوں کے بہت گہرے تھے اور وہ ہندوستانیوں کو اپنے سے کمتر اور نااہل سمجھتے تھے۔ نسل پرستی نے ان میں رعونت اور غرور پیدا کر دیا تھا۔ اس طرح نسل پرستی ان کی حکومت کا ایک اہم بنیادی عنصر تھا۔ دوسرا اہم ادارہ جس نے انہیں قوت اور طاقت دی تھی اور ان کے اقتدار کو مضبوط کیا تھا وہ فوج کا ادارہ تھا۔ 1857ء سے پہلے فوج میں عام فوجیوں کی تعداد شمالی ہندوستان کے علاقوں سے ہوتی تھی۔ لیکن اس بغاوت کے بعد فوج میں تعداد پنجاب اور نیپال کے گورکھا فوجیوں کی ہوگئی۔ حکومت کے بجٹ کا ایک بڑا حصہ فوج پر خرچ کیا جاتا تھا اور ہندوستان کی اس فوج نے نہ صرف ہندوستان میں برطانوی اقتدار کو تحفظ دیا بلکہ یہ لوگ ہندوستان سے باہر برما، چین، جنوبی افریقہ اور پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں مشرق وسطیٰ اور یورپ میں بھی لڑے۔

ہندوستان کے انتظامی امور کے لئے آئی سی ایس کا ادارہ قائم کیا گیا۔ اس میں امیدواروں کو سخت امتحان پاس کرنے کے بعد عملی میدان میں آنا پڑتا تھا۔ ابتداء میں یہ امتحانات لندن میں ہوتے تھے۔ امیدوار کو انگریزی کے ساتھ ساتھ لاطینی زبان میں بھی امتحان دینا ہوتا تھا۔ لہٰذا اگر کوئی ہندوستانی امتحان میں شریک ہونا چاہے تو اسے اپنے خرچے پر لندن جانا پڑتا تھا۔ ان مشکلات کے باوجود رابندر ناتھ ٹیگور کے چھوٹے بھائی نے جب آئی سی ایس کا امتحان پاس کر لیا تو انگریزی حکومت اس قدر پریشان ہوئی کہ اس نے بائیس سال سے عمر گھٹا کر اٹھارہ سال کر دی تاکہ کوئی ہندوستانی اس میں شریک نہ ہو سکے۔ خاص طور سے جب بنگالیوں نے یہ مطالبہ کیا کہ مقابلے کے یہ امتحانات ہندوستان میں ہوں تو اس کی مخالفت شمالی ہندوستان کے لوگوں نے کی۔ جن میں سرسید بھی شامل تھے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بنگالی یہ امتحان پاس کر کے ان پر حکومت کریں۔ آئی سی ایس کے یہ افسران جب انتظامی عہدوں پر کام کرتے تھے تو یہ وسیع اختیارات کے مالک ہوتے تھے۔ ان کی تنخواہیں بمقابلہ دوسرے یورپی ملکوں سے بہت زیادہ تھیں اس کے علاوہ مراعات اور سہولتیں علیحدہ تھیں اس لئے ان میں بدعنوانی و کرپشن بالکل نہیں تھی۔ کلکٹر یا ڈپٹی کمشنر اپنے علاقے کے انتظامی امور کا ذمہ دار ہوتا تھا اور ساتھ ہی اس علاقے کے رسم و رواج اور

روایات کو تحریری شکل میں لکھوا تا تھا جو اب تک ہمارے پاس تحریری شکل میں محفوظ ہیں۔

برطانوی حکومت نے 1857ء کے بعد یہ فیصلہ بھی کیا کہ زمینداروں اور جاگیرداروں کی سرپرستی کی جائے گی اور ان کی مدد سے رعایا پر حکومت کی جائے گی۔ لہٰذا برطانوی دور میں پیروں، سجادہ نشینوں، برہمنوں اور جاگیرداروں کی بڑی اہمیت ہو گئی۔ حکومت نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اب ہندوستان کی ریاستوں کو جن میں نواب اور راجہ حکمران ہیں اسی طرح رہنے دیا جائے گا اور انہیں برطانوی حکومت میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان برطانوی علاقے اور چھ سو کے قریب ریاستوں کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ یہ چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں جو اپنے داخلی امور میں خود مختار تھیں مگر خارجی پالیسی میں برطانوی حکومت کے ماتحت تھیں۔ ریاست کے حکمرانوں اور بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں کو اپنے کنٹرول میں کرنے کے لئے برطانوی حکومت نے کئی طریقے وضع کئے تھے مثلاً ان کی وفاداری کو مضبوط رکھنے کے لئے انہیں خطابات دیئے جاتے تھے۔ وائسرائے یا کمشنر کے دربار میں ان کی نشستوں کے ذریعے ان کے سماجی درجے کا یقین ہوتا تھا۔ حکومت نے دہلی کے اندر شان و شوکت والے دربار بھی منعقد کرائے جہاں نوابوں، راجاؤں اور مہاراجاؤں کو بلایا جاتا تھا۔ جو اپنی پوری شان و شوکت اور اہتمام کے ساتھ آتے تھے اور حکومت سے اپنی وفاداری کا اظہار کرتے تھے۔ یہ ریاستی حکمران اپنی ریاستوں میں خود مختار تھے مگر انگریز ریذیڈنٹ ان کی نگرانی کرتا رہتا تھا اور جب جانشینی کا مسئلہ پیش آتا تھا تو اس میں ریذیڈنٹ کی مرضی شامل ہوتی تھی کہ کس امیدوار کو نیا حکمران بنایا جائے۔ چونکہ یہ ریاستی حکمران برطانوی حکومت کی سرپرستی میں تھے۔ ان کی آپس کی جنگیں بھی ختم ہو چکی تھیں۔ زرعی آمدنی کی وجہ سے دولت مند بھی تھے لہٰذا یہ اپنا زیادہ وقت سیر و شکار اور عیاشیوں پر صرف کرتے تھے جیسا کہ فریڈم ایٹ مڈ نائٹ کے مصنف Dominique Lappier نے لکھا ہے کہ برطانوی حکومت نے ان کی عیاشیوں کی خفیہ دستاویزات بنا رکھی تھیں مگر 1947ء میں آزادی کے بعد جاتے ہوئے انہوں نے ان دستاویزات کو جلا دیا۔

ریاستی حکمرانوں اور زمینداروں نے برطانوی حکومت سے اپنی وفاداری کا اظہار کئی طرح سے کیا مثلاً جب فوج میں بھرتی کا سوال پیش آیا تو انہوں نے اپنے علاقوں سے نوجوانوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کرایا۔ حکومت کی خوشنودی کے لئے انہوں نے فوجی اخراجات کے لئے عطیے اور رقومات دیں۔ اس وجہ سے ان کے اور برطانوی حکومت کے تعلقات ہمیشہ خوشگوار رہے اور انہوں نے برطانوی حکومت کے خلاف چلنے والی آزادی کی جدوجہد میں کوئی شرکت نہیں کی۔ بلکہ اس کے برعکس ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت قائم رہے۔ چونکہ برطانوی حکومت نے ہندوستان کے قدامت پرست اداروں کو مضبوط کیا اور انہیں تحفظ فراہم کیا۔ اس لئے یہ ابھرتے ہوئے اور جدید تعلیم یافتہ طبقے سے خوش نہیں تھے۔ جس میں قوم پرستی کے جذبات تھے اور جو آزادی چاہتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے ایک وائسرائے لارڈ کرزن نے ایک وقت میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں کو بند کر دیا جائے کیونکہ یہ حکومت کے مخالف پیدا کرتی ہیں، بعد ازاں یونیورسٹیوں کو بند تو نہیں کیا گیا مگر ان میں داخلے کی شرائط کو سخت کر دیا گیا۔

1947ء میں آزادی کے بعد ہندوستان نے برطانوی حکومت کے تسلسل کو توڑتے ہوئے ریاستوں کا خاتمہ بھی کیا اور جاگیرداری کو بھی ختم کیا۔ مگر پاکستان میں اس تسلسل کو قائم رکھا گیا۔ ریاستوں کا خاتمہ تو 1970ء کی دہائی میں ہوا مگر جاگیرداروں، پیروں اور وڈیروں اور سجادہ نشینوں کو اسی طرح سے بااختیار بنا کر رکھا گیا۔ جس کی وجہ سے آج پاکستان میں نہ تو عوامی جمہوریت ہے اور نہ ہی عوامی حکومت اور اقتدار، برطانوی حکومت کے اس ورثے کو ہم آج بھی تحفظ دیئے ہوئے ہیں۔

◆◆◆

بارے کچھ موازنہ عقل و عشق کے!!

ڈاکٹر اظہر وحید

اہلِ ایمان کو یہ عشق، عقل کو ایک قید، قدغن اور کیدو کی صورت میں دیکھتے ہیں ۔۔۔ اور علما و عقلا ان کا مطلب عقل، عشق کو ایک اندیشۂ نقضِ امن، موجبِ فسادِ خلق سمجھتے ہیں۔ عقل اور عشق کی اس تقسیم نے انسانی فہم و شعور کو تقسیم کر رکھا ہے۔ ہمارے واقعہ و ادب میں عقل و عشق کے اختلاف کا اس قدر غلغلہ اٹھا کہ الاماں!! ایسے میں فکر و شعور کے راہی کو ہر قدم پر ایک دوراہا نظر آیا ۔۔۔ وہ مخمصے میں رہا کہ دستارِ عقل کی فضیلت سنبھالے یا پھر چادرِ عقل کا ماتم کدہ ویران کرتا ہوا قیس کی ہمراہی میں وادیٔ جنوں کی راہ لے۔ روایت یہی ٹھہری کہ ہر سخن ور کی منطقِ سخن عقل پر چاند ماری سے شروع ہوئی اور عشق کو منزہ و معصوم من الخطا لکھنے پر مکمل ہوئی۔ اربابِ سخن نے محبوب سے بڑھ کر عشق کی شان میں قصیدے لکھے اور عقل کی ہجو میں قلم شیدہ کیے ۔۔۔ لیکن آج روایت سے بغاوت کرتے ہوئے ہم نے قصد کیا ہے کہ ایوانِ عدل میں میزانِ سخن کے روبرو عقل کے وکیل بن کر حاضر ہوں گے اور عقل پر پھبتیاں ملامت کی بابت صفائی میں کچھ کہیں گے۔ عقل اور عشق کا تضاد اس وقت ابھر کر سامنے آتا ہے جب عشق آنِ واحد میں تسلیم کی بارگاہ میں کھڑا نظر آتا ہے ۔۔۔ اور عقل ابھی بحث و تجسس کا بچھونا چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتی۔ عقل بے دلیل قدم نہیں اٹھاتی ۔۔۔ اور عشق بے دلیل ہونے کے سبب برق رفتار ہو جاتا ہے۔ عقل منطق کی زمین پر دلائل کے جھاڑ جھنکار میں راستہ بناتے ہوئے چلتی ہے ۔۔۔ اور چلتے چلتے کئی بار گر جاتی ہے ۔۔۔ عشق کی رفتار دیکھیے! عشق ایک ہی جست میں جس قصے کو طے اور تمام کرتا ہے، عقل اپنی تجزیاتی جہات کے تحت اسے زمین و آسمان کی طرح بیکراں سمجھنے پر مصر ہے۔ عقل، وجود کا متلاشی ۔۔۔ عشق، تکثیرِ لاموجود!! عقل تعینات کے پیچھے بغیر حقیقت کی کوئی عبارت نہیں پڑھ سکتی ۔۔۔ اور عشق ہر اِک تصنیف ہی سے مختلف مصنف آنک لیتا ہے۔ عقل سنتی ہے، دیکھتی نہیں ۔۔۔ عشق دیکھتا ہے، سنتا نہیں!! سرمایۂ عقل ۔۔۔ دلیل، منطق اور کتاب ۔۔۔ اور عشق کا یہ کہنا کہ میاں عاشق و معشوق کیا حساب!! عقل کا اسلوب تشکیک، تردید، تجدید، تحقیق، ابہام ۔۔۔ عشق، یقین، تصدیق، تعریف، توصیف اور طواف!! عقل کی بساط آرزوئے فقط جستجو ۔۔۔ اور حاصلِ جستجو بس ایک اذنِ حاضری ۔۔۔ عشق کی ابتدا حضوری، انتہا تقرب! عقل، کرب ۔۔۔ عشق، تڑپ! عقل، مجبور، مقہور، رنجور ۔۔۔ عشق، مقرب، مقبول، مسرور! عقل، کوشش اور کشاکش ۔۔۔ عشق، کشش اور کشائش! عقل، خوگرِ کثرت ۔۔۔ عشق، شیدائے وحدت! عقل، تقسیمِ حیات و ممات کی ابتلا میں مبتلا ۔۔۔ عشق پیامِ وحدت، یکسو، یکجا! عقل، محقق ۔۔۔ عشق، مستغرق! عقل، مباحثہ ۔۔۔ عشق، مکالمہ! عقل، کلام ۔۔۔ عشق، ہم کلام! عقل، دو بدو ۔۔۔ عشق، رو برو!! عقل مجاز کی حقیقت سمجھنے میں مصروف ۔۔۔ عشق، مجاز اور حقیقت کی ترتیب سے بے نیاز! عقل کا اثاثہ یادداشت ۔۔۔ عشق کا سرمایہ یاد!! عقل ترتیب ۔۔۔ عشق ترتیل! عقل اسیرِ زمان و مکان ۔۔۔ عشق طائرِ لامکاں! عقل زمین و آسمان کے حصار میں مجبور و محصور، زیرِ فرمان ۔۔۔ عشق سلطان ۔۔۔ اقطار السمٰوات والارض سے باہر نکلنے کا اعلان!! عقل ساحری کہانی ۔۔۔ عشق قربانی کی داستان! عقل، من و تو ۔۔۔ عشق، تو ہی تو!! عقل روایت ۔۔۔ عشق رویت! عقل تقریر ۔۔۔ عشق تحریر۔ عقل کتاب تلاش کرتی ہے ۔۔۔ عشق کتاب رقم کرتا ہے۔ عقل تقلید ۔۔۔ عشق تحقیق! عقل مجبوریوں کا کوہِ گراں ۔۔۔ عشق

تیشۂ فرہاد! عقل ' وادیِ گمان میں سرگرداں ___ عشق ' یقین کا گلستاں!! عقل ' رنگیں سواری ہے ___ عشق ' آسمانی! عقل ' حدیثِ نفس ___ عشق ' حدیثِ دل! عقل ' بے مدد کی اڑان ہے ___ عشق ' لامکاں کی خبر لاتا ہے۔ عقل کی حد خبر تک ___ عشق کا قدم حدِ نظر تک! عقل ' حواس کی محتاج ___ عشق ' ہوا، ہوس اور حواس سے بے نیاز! عقل ' نیازِ پیشِ آرزو ___ عشق ' بے نیازِ آرزو۔ عقل کا دائرہ صفات تک ___ عشق کی قوس ذات تک!! عقل کی انتہا سدرۃ المنتہیٰ ___ عشق ' قاب قوسین او ادنیٰ۔ عقل ' خوشامد پسند ___ عشق ' ملامت پسند!! عقل ' ارادہ تا بہ نیت در کسب ___ عشق ' مذکر، مذکور!! عقل ' مصروف ___ عشق ' مشغول! عقل ' منقول ___ عشق ' مشہور! عقل ' مفتون ___ عشق ' مفتن! عقل ' مجاہدہ ___ عشق ' مشاہدہ! عقل ' یقین ___ عشق ' عین!! عقل ' چراغِ راہ ___ عشق ' منزلِ بے نام!! عقل کا وجود ازل سے پہلے نہیں تھا اور ابد کے بعد بھی نہ ہوگا ___ حضرتِ عشق ہر ازل سے پہلے، ہر ابد کے بعد ___ ابد الآباد تک قائم و آباد ___ نہ کسی زوال کا ڈر، نہ عروج کی حاجت!!

اوہ! ___ یہ کیا ہوا؟! عقل نے ہر کس و ناکس کو یونہی سرِ راہ دکھا دیا؟ ___ کیا عشق کے روبرو عقل کا ہر قصیدہ یونہی ہیچ ہوا؟ ___ میں درمیان درمیان عقل ' عشق کا بیان ذی شان کیسے جاری ہوا!! الغرض عشق پابندِ فصلِ گل و لالہ کہاں ___ بہار ہو کہ خزاں ' عشق کی جاری ہے اذاں۔ عقل کو نیند اور نسیان لاحق ہے ___ عشق کو نیند آتی ہے نہ اونگھ! عشق تکبیرِ مسلسل ___ عشق کی نماز قائم با جماعت تکبیرِ اولیٰ ___ عقل ' فقاموا کسالیٰ۔ عقل ' سہو بلکہ سجدۂ سہو ___ عشق ' شکر بعد شکر! عقل ' گلۂ شکوہ و شکایت ___ عشق ' سراپا شکر، سپاس، تشکر!! عشق ' قطرۂ اشکِ ندامت، حرفِ توبہ ___ عشق ' الحمد ___ تو ہی تو ہے ___ بمصداق ''میں الحمد و اورد کیا یعنوں خطیا استغفار'' عقل جب عروج حاصل کرتی ہے تو خود کو عقلِ کل سمجھنے لگتی ہے، گویا معراجِ عقل ' عقلِ کل الا اللہ ہے ___ اور عشق ' الا اللہ محمد الرسول اللہ۔ کمالِ عقل ' تجسیم سے تجرید کی طرف ہجرت ___ عشق ' تجرید بصورتِ تجسیم دیکھنے کی قدرت!! عقل ' انا و لا غیری ___ عشق ' لیس فی جبتی!! عقل ' شور ___ عشق ' شعور! عقل ' آوازِ جرس ___ عشق ' ہم عنانِ محمل!! عقل ' جرأتِ عشق پر خندہ زن ___ عشق ' تو شوخیِ حسن میں شعلہ زن! عقل ' لحیہ ___ عشق ' حضور! عقل کا پیوند خاکی ___ عشق کا پیرہن نوری! عقل اگر محرمِ راز بھی ہو تو اس کا مقام حریمِ ناز سے باہر ہے۔ عشق ' حریمِ لامکاں کا رازداں ہے۔ عقل محرمِ محفلِ جہاں ___ عشق کا ہے یہاں، نگاہ ہے وہاں!!

درحقیقت عقل اور عشق میں کوئی تضاد نہیں۔ عقل اور عشق دونوں درجہ ہائے شعور ہیں۔ ایک بلند درجہ ہے، دوسرا اس سے کم! کمتر درجۂ شعور اگر بلند تر درجے کو تسلیم کرلے تو اس کا اپنا درجہ بلند ہو جاتا ہے۔ درجے تضاد ختم کرنے سے بلند ہوتے ہیں۔ عقل اگر عشق کی قیادت اور سیادت تسلیم کرلے تو وجہِ سعادت تک پہنچتی ہے ___ بصورتِ دیگر عنوانِ شقاوت! ایسی عقل جسے راہِ تسلیم میں کوئی دقت پیش نہ آئے ' عقلِ سلیم کہلاتی ہے۔ دراصل عشق کا دوسرا نام قلبِ سلیم ہے۔ قلبِ سلیم اور عقلِ سلیم میں کوئی تضاد نہیں ___ ہر ایک کا اپنا کام، کلام اور مقام ہے۔ عشق بادشاہ تخت نشیں ہے، عقل وزیرِ باتدبیر ہے۔ عقل کا فرضِ منصبی مشاورت اور معاونت ہے ___ مسابقت اور مبارزت نہیں۔ کامل عقل اور کامل عشق کے درمیان کوئی تضاد نہیں، صرف اختلاف ہے ___ اور وہ بھی فقط رائے کا ___ رائے کا اختلاف باعثِ رحمت ہوتا ہے، صرف ضد اور انا اس رحمت کو زحمت میں بدلتی ہے۔ اختلاف کا احترام نہ کیا جائے تو اختلاف افتراق میں بدل جاتا ہے ___ اور افتراق ' احتراق میں۔ جھگڑا صرف گمان گزیدہ عقل اور بد تراشیدہ عشق کے درمیان ہے۔

◆◆◆

لاہور کے چند معروف قہوہ خانے

ڈاکٹر جواز جعفری

لوہر، لوہاور، لیہاور، لہانور، لوہور، لوہ کوٹ، لہاور، لوہور یہ وہ نام ہیں جن سے مختلف زمانوں اور مختلف اوقات میں شہر لاہور موسوم ہوتا رہا۔ لاہور کی بنیاد کب پڑی؟ اس سوال کا جواب دینا خاصا مشکل ہے۔ البتہ مسلمانوں کی ہندوستان پر یلغار سے بہت پہلے لاہور ایک اہم مقام کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔ پرانوں کی کہانیوں کے ابتدائی سلسلے کے ساتھ اس کا تعلق، راجپوتانہ کے وقائع نگاروں کی شہادات، کشمیر کے روزنامچے اور آس پاس کے علاقے سے دریافت ہونے والے سکے لاہور کی قدامت اور سیاسی اہمیت کے ثبوت کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ بعض مورخین کا قیاس ہے کہ لاہور کی بنیاد دوسری اور چوتھی صدی عیسوی کے درمیان رکھی گئی۔ پھر اس دور میں اس شہر نے ثقافتی و سیاسی اہمیت اختیار کی۔ (1)

قدیم لاہور شہر موجودہ جائے وقوع پر آباد نہیں تھا۔ یہ شہر اچھرہ گاؤں کے آس پاس یعنی موجودہ لاہور سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ شاید اسی لیے پرانی دستاویزات میں اچھرہ کو اچھرہ والا لاہور کہا جاتا تھا۔ ایک اور روایت کے مطابق محمود غزنوی کے حملے کے وقت قدیم لاہور خستہ حالت میں تھا۔ شہر دو حصوں میں تقسیم تھا ایک حصے کو کھوڑا اور دوسرے کو رڑا کہا جاتا تھا۔ کھوڑا وہ تھا جہاں آج کل ٹکسالی دروازہ موجود ہے اور بلند جگہ پر واقع ہونے کے باعث اسی کے نام سے مشہور ہے جبکہ رڑا وہ علاقہ کہلاتا تھا جہاں ان دنوں مسجد وزیر خاں واقع ہے۔(2) ہندی دیومالائی قصوں میں لاہور کا بانی ہندوستان کی عظیم رزمیہ داستان رامائن کے ہیرو مہاراجہ رام چندر کے بیٹے لو یا لوہ کو مانا جاتا ہے۔ صاحب خلاصۃ التواریخ بھی اس قول کی تائید کرتا ہے کہ لاہور اور قصور شہر مہاراجہ رام چندر کے بیٹوں لوہ اور کش نے (بالترتیب) آباد کیے مگر شیخ احمد زنجانی نے اپنے رسالے تحفۃ الواصلین (جو 435ھ میں سلطان مسعود غزنوی کے عہد میں لاہور ہی میں لکھا گیا) خلاصۃ التواریخ سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ لاہور کو راجا پرتھی سے، جو پانڈوں کی اولاد تھا، آباد کیا البتہ راجا بکرماجیت کو اس شہر کو ایک بار پھر آباد کرنا پڑا۔ اس کے بعد سند پال جوگی تخت نشین ہوا تو اس نے لاہور کا نام اپنے نام پر سند پال نگری رکھ دیا۔ راجا دیپ چند نے اپنے زمانۂ اقتدار میں پنجاب کا علاقہ اپنے بھتیجے لوہار چند کے حوالے کر دیا چنانچہ لوہار چند نے سند پال نگری بدل کر اس کا نام اپنے نام پر لوہار پور رکھا جو کثرت استعمال سے لاہور بن گیا۔ (1) مختلف روایات کے مطابق البیرونی نے اسے لہاور، شیخ المشائخ نظام الدین بدایونی دہلوی نے ”فوائد الفوائد“ میں لہانور اور حضرت امیر خسرو نے اپنی تصنیف ”قران السعدین“ میں پہلی بار اسے لاہور کے نام سے موسوم کیا۔ ان کا شعر ہے:

از حد سامانہ تا لاہور ہیچ عمارت نہ بجز در قصور

اس شعر سے ملنے والی گواہی سے یہ امر ظاہر ہوتا ہے کہ آٹھویں صدی آتے آتے یہ شہر لاہور کے نام سے پکارا جانے لگا تھا۔

مغلیہ عہد سے قبل پنجاب کا دارالحکومت دیپالپور تھا مگر شہنشاہ ظہیر الدین بابر اور ہمایوں بادشاہ کے عہد میں پنجاب کے پایہ تخت ہونے کا تاج دیپالپور کے سر سے اتار کر لاہور کی پیشانی کی زینت بنایا گیا۔ لاہور کو جغرافیائی اعتبار سے یہ اعزاز حاصل رہا کہ یہ ایک ایسے علاقے کے طور پر جانا جاتا ہے جو تاریخی طور پر بڑے بڑے لشکروں کی گزرگاہ رہا۔ یہ شہر مختلف نسلوں سے ہجرت کر کے اس علاقے میں وارد ہونے والی قوموں کا مسکن رہا اور یہی وہ شہر ہے جہاں بڑے بڑے حکمرانوں کی قسمت کے فیصلے ہوتے رہے۔

لاہور شہر اپنے میلوں ٹھیلوں، تاریخی حویلیوں، شاندار باغوں، بزرگان دین کے مزاروں، تعلیمی اداروں، سینما گھروں، مذہبی و ثقافتی تہواروں، اہل علم کی محفلوں، قدیم لائبریریوں، لذیذ کھانوں، پہلوانی کے اکھاڑوں اور تاریخی دروازوں کے لیے ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔ علاوہ ازیں یہاں کے شعرا، ادبا، علما، پہلوان، موسیقار، فنکار، سیاستدان، رقص، سنگ تراش، مصور، ایسے دانشور، صحافی اور ہنر مند پوری دنیا سے اپنے فن کا لوہا منوانے میں کامیاب ہوئے۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی کتنا ہی ہنر مند کیوں نہ ہو اگر لاہور نے اس کے فن پر مہر تصدیق ثبت نہیں کی تو وہ کمال کی بلندیوں تک نہ پہنچ پایا۔ اس کے برعکس جس ہنر مند کو اہل لاہور نے سند عطا کر دی وہ دنیا کے ہر کونے میں سرخرو ہوا۔ لاہور کو علمی و ثقافتی حوالے سے اس بلند معیار پر پہنچانے کے لیے لاہور کے ہنر مندوں، تخلیق کاروں اور اہل علم نے عہد بہ عہد کام کیا۔ لاہور ایک ایسا تہذیبی شہر ہے جو گذشتہ کئی صدیوں سے اپنے علمی و ثقافتی معیارات کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ ان کے معیارات کے فروغ کے لیے مختلف شخصیات، انجمنوں اور اداروں نے دن رات کام کیا۔ ان ثقافتی اقدار کے فروغ کے لیے ایک طرف اہل علم اور ان کی ذاتی محفلوں نے نہایت اہم کردار ادا کیا جو نہ صرف مل بیٹھنے کا ذریعہ بلکہ خیالات کے تبادلے کا بھی اہم وسیلہ تھیں، دوسری طرف بیسویں صدی کے دوران منظر عام پر آنے والی وہ انجمنیں اور تنظیمیں ہیں جنہوں نے علم و ادب کے فروغ اور ثقافتی اقدار سازی کے لیے قوت متحرکہ کا کردار ادا کیا جبکہ تیسری طرف لاہور کے وہ قہوہ خانے تھے جو صبح سے لے کر رات گئے تک اہل علم کے وجود سے آباد رہتے تھے۔ ایسے قہوہ خانے لاہور سمیت شنگھائی، دلی، بغداد، سمرقند، بخارا، قرطبہ، قاہرہ، غرناطہ، دمشق، شیراز، اصفہان، ماسکو، لندن، پیرس، فرینکفرٹ، واشنگٹن اور بہت سے دیگر شہروں میں موجود رہے ہیں جن کا اپنا خمیر نہ صرف تہذیب و ثقافت سے اٹھا بلکہ یہ شہر دنیا کو علم و ادب اور تہذیب کے معیارات بھی فراہم کرتے ہیں۔ ایسے قہوہ خانے دنیا کے جس بھی شہر میں ہوں گے وہ اہل علم کے درمیان قدیم و جدید خیالات کی نشر گاہوں اور معاشرے میں مکالمے کے فروغ کے کیٹیلسٹ سنٹرز کا کام دیں گے۔ پیرس کا وہ قہوہ خانہ جہاں ژاں پال سارتر اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا اس کی زیارت کے لیے ہزاروں سیاح آج بھی پیرس کا رخ کرتے ہیں۔

گذشتہ صدی کا لاہور آج سے قدرے مختلف تھا۔ آبادی نہ صرف کم تھی بلکہ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اور پارسیوں پر مشتمل تھی اور سبھی بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ جگہ جگہ باغات تھے اور بیشتر گھروں کے باہر پھولوں کی بیلیں دکھائی دیتی تھیں۔ لاہور کی مال روڈ پر بھی کبھار کوئی موٹر گزرا کرتی تھی۔ لوگ مال روڈ پر واک کے لیے آیا کرتے۔ اصل شہر تو والڈ سٹی (فصیل کے اندر) تھا مگر کرشن نگر، شام نگر، سمن آباد اور ماڈل ٹاؤن جیسے چند محلے بھی وجود میں آ چکے تھے۔ لوگ فارغ البال تھے اور ان کا بیشتر وقت قہوہ خانوں میں گزرتا تھا۔ ان قہوہ خانوں میں عام لوگوں کا داخلہ ممنوع نہ تھا مگر چند قہوہ خانے ایسے بھی تھے جن میں ہر وقت ادیبوں، شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ ہم خیال ادیبوں کے گروہ نئے قہوہ خانوں کی تلاش میں رہتے جیسے ہی کوئی نیا قہوہ خانہ کھلتا تو اسے آباد ہونے میں ذرا بھی دیر نہ لگتی تھی۔ قہوہ خانوں

کی رونقوں کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس زمانے میں لوگوں کے اندر ادب کا ذوق پایا جاتا تھا اور ادیبوں، شاعروں کو ہیرو سمجھتے تھے۔ چنانچہ لوگ چائے پینے کے بہانے ان قہوہ خانوں کے چکر لگاتے تاکہ اپنے پسندیدہ ادیبوں شاعروں کو دیکھ سکیں اور ان سے چند باتیں بھی کر سکیں۔ دنیا کے ہر شہر میں قہوہ خانے درمیانے طبقے کی زندگی کا لازمی جزو ہوا کرتے ہیں۔ اگر یہ قہوہ خانے بند کر دیے جائیں تو گویا یہ عمل دانشور طبقے کی بچی کچی خوشیاں بھی ختم کر دینے کے مترادف ہوگا۔ پریشانیوں سے بھری زندگی میں قہوہ خانے اہل قلم کی آخری پناہ گاہ ہیں۔ قہوہ خانے کسی بھی معاشرے کی تہذیبی زندگی کا نشان بھی ہیں اور وہاں کا پیمانہ بھی۔ کسی معاشرے میں قہوہ خانوں کی موجودگی اس کی ذہنی بلوغت کے معیار کا پتہ دیتی ہے۔ پچھلی صدی میں لاہور میں ایسے درجنوں قہوہ خانے تھے جہاں اس شہر کے دل و دماغ جمع ہوتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ لاہور شہر کی علمی اور ثقافتی تاریخ ان قہوہ خانوں کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ قہوہ خانے مختلف ادبی گروہوں کے لیے وقف ہوا کرتے تھے۔ بہت سے ایسے بھی تھے جن میں ہر طرح کے ادیب آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ ان ادیبوں کے تبادلۂ خیالات کے نتیجے میں نہ صرف نئے نئے موضوعات پر شاندار گفتگو میں سننے کو ملتیں بلکہ کئی مختلف ادیبوں اور نظریاتی گروہوں کے درمیان بڑے بڑے مباحثے، مناظرے بپا ہوتے اور معارکے بھی دیکھنے کو ملتے تھے۔

یہ انگریزی عہد کے عروج کا زمانہ تھا۔ انگریز برصغیر میں صرف ہتھیار لے کر نہیں آئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنی تاریخ، تہذیب، کھانے، مشروبات اور آداب معاشرت بھی لائے تھے۔ انہی مشروبات میں سے چائے بھی ایک مشروب تھا۔ برصغیر میں انگریزوں ہی نے چائے کو فروغ دیا۔ اس سے قبل مقامی آبادی قہوہ (جو عربی زبان کا لفظ ہے۔ یہ ایک طرح کا بیج ہوتا ہے جسے پانی میں جوش دے کر پیتے ہیں) استعمال کرتی تھی اور قہوہ خانہ ایسی دکان ہوتی ہے جہاں لوگ قہوہ پیتے اور گپ شپ اڑاتے ہیں۔ قہوے کے ساتھ گپ شپ یا تبادلۂ خیالات ایک لازمی امر ہے۔ گویا قہوہ خانے انسان کی ذہنی ترتیب کے مراکز تھے اور لاہور ان قہوہ خانوں کے حوالے سے خاصا خود کفیل تھا۔ گذشتہ صدی کے ربع اول میں انگریزوں نے عوامی سطح پر چائے اور بسکٹ کو باقاعدہ متعارف کرانا شروع کر دیا تھا۔ بسکٹ کو تو عوام میں جگہ بنانے میں خاصی دیر لگی مگر چائے کو قہوہ خانوں، اہل علم کے حلقوں اور اشرافیہ کی محفلوں میں بار پانے میں زیادہ دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ شروع میں چائے کو عوام میں متعارف کرانے کے لیے مختلف کمپنیوں کو ٹی سٹال لگوانا پڑے۔ کیونکہ ان پڑھ عوام میں چائے کے خلاف اندر ہی اندر ایک پراپیگنڈہ مہم بھی جاری تھی جس کے توڑ کے لیے چائے کی کمپنیوں نے مختلف سلوگنوں کا سہارا بھی لینا شروع کر دیا تھا۔ اہل لاہور کو چائے کا عادی بنانے کے لیے انڈیا ٹی سیس بورڈ نہ صرف لوگوں میں مفت چائے تقسیم کرتا تھا بلکہ لوگوں میں چائے کے حوالے سے پائے جانے والے شبہات کو دور کرنے کے لیے مختلف مقامات پر اس قسم کے سلوگن بھی آویزاں کراتا تھا مثلاً "چائے ملیریا کو دور بھگاتی ہے۔ چائے پینے سے ملیریا نہیں ہوتا، گرم موسم میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے" وغیرہ وغیرہ۔ یہ سلوگن ہر قہوہ خانہ کے باہر آویزاں کیے جاتے تھے۔ اس مہم کے نتیجے میں ان قہوہ خانوں میں چائے خوب مقبول ہو رہی تھی۔ چائے کا کپ یا کٹورہ (مٹی کا کوزہ) دو پیسے میں دستیاب تھا جس میں شکر استعمال ہوتی تھی جبکہ گڑ کی چائے کی قیمت ایک آنہ (چھ پیسے) ہوا کرتی تھی۔

لاہور میں جگہ جگہ قہوہ خانے موجود تھے مگر ہم یہاں ان قہوہ خانوں کا تذکرہ کریں گے جن میں شاعر، ادیب اور دانشور بڑی تعداد میں اٹھتے بیٹھتے تھے اور ان قہوہ خانوں کے تذکرے ریڈیو، اخبارات اور ٹی وی تک پہنچ چکے تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے یہ قہوہ خانے اور شاعر

ادیب لازم و ملزوم تھے۔ ادیب، شاعر ان قہوہ خانوں میں اس قدر کثرت سے بیٹھتے تھے کہ ان قہوہ خانوں کا ادبی تشخص پوری طرح قائم ہو چکا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ ان قہوہ خانوں کے بغیر لاہور کی ادبی تاریخ مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ ان کے نام یہ ہیں :

1۔ عرب ہوٹل : پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے درمیانی عرصے میں اہل قلم کی سب سے زیادہ توجہ عرب ہوٹل نے کھینچی۔ یہاں ادب، صحافت اور سیاست کا خوبصورت امتزاج دیکھنے میں آیا۔ اپنے عہد میں یہ لاہور کے اہل قلم کی سب سے پُر رونق نشست گاہ تھی۔ عرب ہوٹل بے شمار ادیبوں اور صحافیوں کے لیے جائے اماں تھا۔ ایسے ادیب جن کے گھر اسی علاقے میں واقع تھے وہ عام طور پر اس ہوٹل کو ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ عرب ہوٹل لاہور کے مشہور اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) کے سامنے واقع تھا۔ بقول اے حمید یہ ہوٹل عرب امارات سے ہجرت کر کے لاہور آنے والے دو عربی النسل بھائیوں نے بنایا تھا۔[4] عرب ہوٹل آج کی طرح کا کوئی خوبصورت ریستوران نہ تھا بلکہ ایک دکان کی طرح تھا۔ ایک طرف لکڑی کی پانچ چھ کرسیاں، درمیان میں بڑی میز، سامنے والی دیوار کی طرف بھی دو تین کرسیاں، ہوٹل کے پیچھے تنور جہاں ہر وقت تازہ روٹیاں لگا کرتی تھیں اور دوسری طرف کچن واقع تھا۔

اس زمانے کے ادیبوں اور صحافیوں کی ایک پوری کہکشاں تھی جو اس ہوٹل کے آسمان پر چمکا کرتی تھی۔ ن۔ م۔ راشد، اختر شیرانی، حفیظ ہوشیارپوری، مظفر حسین شمیم، کرشن چندر، مولانا صلاح الدین احمد، پروفیسر علیم الدین سالک، سید عبداللہ اور ایم۔ ڈی تاثیر یہاں کے مستقل بیٹھنے والوں میں سے تھے جبکہ کبھی کبھار آنے والوں میں مولانا ظفر علی خان بھی شامل تھے۔ جہاں تک صحافیوں کا تعلق ہے ان میں چراغ حسن حسرت تو خیر اس قافلے کے میر کارواں تھے اور اس زمانے میں "زمیندار" میں فکاہیہ کالم لکھا کرتے تھے ان کا بیشتر وقت اسی ہوٹل میں گزرتا تھا۔ ان کے علاوہ عاشق حسین بٹالوی، باری علیگ (جو ہوٹل کی ساتھ والی گلی میں رہائش پذیر تھے اور خود کو کمیونسٹ ادیب کہلوانا پسند کرتے تھے) عبداللہ ملک، میری چند چاولہ، حکیم محمد حسن قریشی، حسن اختر گیلانی یہاں کے مستقل بیٹھنے والوں میں سے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل کے عرصے تک عرب ہوٹل لاہور کی ثقافتی زندگی کا مرکز بنا رہا۔ اس ہوٹل کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں بیشتر مسلم اخبارات کے دفاتر ریلوے روڈ پر مرکوز ہوا کرتے تھے۔ زمیندار، احسان، سیاست، شہباز، انقلاب، آزاد اور کئی دوسرے اخبارات انہی مقامات سے شائع ہوتے تھے۔ اسی لیے بڑے بڑے صحافی عرب ہوٹل ہی کا رخ کرتے تھے۔ ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے ساتھ ساتھ فیروز الدین اور کرم سنگھ مان جیسے سوشلسٹ تنظیموں کے کمیونسٹ راہنما بھی علم سیاست کے داؤ پیچ اسی ہوٹل میں بیٹھ کر آزمایا کرتے تھے۔ معروف بھارتی صحافی گوپال متل اس زمانے کے عرب ہوٹل کی یاد تازہ کرتے ہوئے اسے لاہور کے آڑے ترچھوں کا اڈا قرار دیتے ہیں۔ یہاں بیٹھنے والے ادیب، شاعر اور صحافی ایسے اداروں میں کام کرتے تھے جہاں تنخواہ قلیل تو تھی ہی مگر وقت پر بھی نہ ملتی تھی اور کبھی کبھی ایک دو ماہ کا فاقہ بھی ہو جاتا تھا۔ یہ اہل قلم ہر حال میں اپنے حال میں مست رہتے اور اپنی زندہ دلی پر غم کی پرچھائیں نہ پڑنے دیتے تھے۔[5] عرب ہوٹل غریب نواز تو تھا ہی مگر یہاں بیٹھنے والے اہل قلم میں بھی ایک طرح کا بھائی چارہ تھا۔ اگر کسی کی جیب میں پیسے نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سگریٹ، پان اور کھانے سے بھی محروم رہ جائے گا۔ یہاں بیٹھنے والے ادیب قلندر صفت تھے۔ کبھی کوئی کتاب لکھ دی، کسی کتاب کا ترجمہ کر دیا اور کسی رسالے کے لیے افسانہ یا مضمون لکھ دیا۔ ان کا اوڑھنا بچھونا قناعت تھی۔

عرب ہوٹل پہلی جنگ عظیم سے لے کر تقسیم ہندوستان تک لاہور کی ثقافتی سرگرمیوں کا محور بنا رہا۔ بڑے بڑے علمی و ادبی مباحث

نے جنم لیا۔ ادب اور صحافت کے جدید رجحانات یہیں پروان چڑھے۔ قیام پاکستان اور جنگ عظیم دوم دو ایسے واقعات تھے جن کے نتیجے میں عرب ہوٹل کی رونقیں ماند پڑ گئیں۔ چراغ حسن حسرت اس ہوٹل کی ادبی زندگی کے روح رواں تھے مگر جنگ کے بعد کی کساد بازاری نے انہیں سرکاری ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا۔ باری علیگ لاہور چھوڑ کر رنگون روانہ ہو گئے۔ ن۔م۔ راشد عرب ہوٹل سے اٹھ کر ملتان چلے گئے، اختر شیرانی ٹونک اور حفیظ ہوشیار پوری اور کرشن چندر دہلی سدھار گئے۔ یوں ایک عرصے تک لاہور کی ادبی زندگی کی ترجمانی کرنے والا عرب ہوٹل ویران ہو گیا بلکہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی ریلوے روڈ اور سرکلر روڈ کا پورا علاقہ پس منظر میں چلا گیا۔ بچے کچے صحافی، شاعر اور ادیب عرب ہوٹل سے اٹھ کر کافی ہاؤس، لارڈز ہوٹل اور میٹرو ہوٹل چلے آئے جہاں بیٹھ کر وہ عرب ہوٹل میں گزری زندگی کے یادگار دنوں کو یاد کرتے تھے۔

2- میٹرو ہوٹل: میٹرو ہوٹل جس عمارت میں واقع تھا یہ میلا رام بلڈنگ کہلاتی تھی۔ میلا رام لاہور کا ایک بڑا ہندو سرمایہ دار تھا اور اس کے نام سے لاہور میں بہت کچھ موجود تھا۔ داتا دربار کے قریب میلا رام ٹیکسٹائل ملز ہوا کرتی تھی۔ شمیر روڈ پر میلا رام کا احاطہ تھا اسی احاطے میں قیام پاکستان کے بعد لٹے پٹے پناہ گزین آ کر ٹھہرے۔ بھاٹی دروازہ کے اندر اس کی کوٹھی جہاں داتا دربار کے قریب لال کوٹھی تھی (جہاں اب حزب الاحناف ہے) آج جہاں واپڈا ہاؤس ہے یہ بھی میلا رام کی بلڈنگ کہلاتی تھی۔ اس کے پہلے فلور پر منٹگمری ٹائپ رائٹر کا آفس تھا۔ پرانی وضع کی اسی جہازی بلڈنگ میں روزنامہ مغربی پاکستان کا دفتر تھا۔ اوپر جانے کے لیے چوڑے قدموں کی سیڑھیاں چڑھتی تھیں۔ میٹرو ہوٹل اسی عمارت میں واقع تھا۔[6] میٹرو ہوٹل کے سامنے وکٹوریہ مجسمہ (ملکہ کا مجسمہ) تھا جس کے ارد گرد خوبصورت درختوں کا جھنڈ ہوا کرتا تھا۔ ایوب خان کے زمانے میں یہ درخت کٹوا دیے گئے اور ملکہ کا مجسمہ عجائب گھر کی زینت بنا دیا گیا۔ میٹرو ہوٹل کے سامنے الفلاح بلڈنگ ہے جہاں کبھی لیبر کورٹ ہوا کرتی تھی۔

میٹرو ہوٹل شہر کے تین چار بڑے ہوٹلوں میں سے ایک تھا اور فلیٹیز اور نیڈوز کی طرح انگریزی وضع کا ہوٹل تھا۔ دوسری منزل پر رہائشی کمرے تھے، گراؤنڈ پر ریستوران اور ڈانسنگ فلور تھے، جہاں شام کو اعلیٰ ہی اینگلو انڈین اور افسر انگریزی دھنوں پر رقص کیا کرتی تھی۔ ہوٹل کے خوبصورت لان کے باغیچے میں پنجاب اسمبلی کی عمارت کی طرف گارڈینیا کی سرسبز دیوار کے ساتھ کرسیاں بچھی رہتی تھیں جہاں شاعر، ادیب، صحافی اور دانشور بیٹھ کر باتیں کیا کرتے تھے۔ یہاں محفل جمانے والوں میں چراغ حسن حسرت، حمید اختر، حنیف رامے، مظفر اصفہانی، وقار انبالوی، ظہیر عالم شہید، انتظار حسین، اے حمید، ابن انشاء اور حسن عسکری سمیت بہت سے دوسرے ادیب اور صحافی شامل تھے۔ میٹرو ہوٹل کی شاموں اور اس سے وابستہ یادیں تازہ کرتے ہوئے اے حمید کا کہنا ہے کہ: اسمبلی ہال کے بالمقابل اور واپڈا ہاؤس کی عظیم الشان بلڈنگ کے پیچھے میٹرو ہوٹل کی لاش دفن ہے۔ اس مدفن میں کہیں چراغ حسن حسرت کے لطیفوں کی پھلجھڑیاں، کہیں محمود اختر کیانی کے قہقہوں کی گونج، کہیں باری علیگ کے طنزیہ جملوں کے نشتر اور کہیں ابن انشاء کے گفتگو کے بکھرے پڑے ہیں۔ واپڈا ہاؤس کے اس اہرام جدید کے تہ خانوں میں پرانی یادوں کی ممیوں کے تابوت ہیں۔ ان تابوتوں کے سرہانے بجھے ہوئے سگریٹوں کی راکھ اور موتیے کے پھولوں کے مرجھائے ہوئے ہار پڑے ہیں۔[7] عرب ہوٹل کے ویران ہو جانے کے بعد میٹرو ادیبوں کی نئی جائے پناہ تھا۔ اب یہاں بیٹھ کر ادب، صحافت، سیاست، فنون، تاریخ اور ثقافت پر مباحث ہوتے اور اے حمید سے کرنل، انور جلال شمزا (مصور)، معین نجمی، انتظار حسین

تک نے اپنے علم کے موتی بکھیرے۔

میٹرو ہوٹل میں داخلے کے لیے گارڈنیا کے ایک محرابی دروازے سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ ڈریس کوڈ کی شرط لازمی تھی۔ شروع میں پتلون اور ٹائی پہننا لازمی تھی مگر بعد ازاں شلوار اور واسکٹ پہننے والوں کو بھی داخلے کی اجازت مل گئی۔ دروازے سے اندر جاتے ہی دائیں طرف وسیع و عریض ڈائننگ ہال تھا اور بائیں طرف گارڈنیا کے قد آدم پودوں کی باڑ جس نے ہوٹل کے لان کو تین اطراف سے گھیر رکھا تھا۔ باڑ کے ساتھ موتیے کے پھول تھے اور درمیان میں گول فرش جس پر شام کو اکثر رقص کیا کرتی تھی۔ گول فرش کے گرد میزیں لگی ہوتیں جن پر بیٹھے لوگ چائے اور رقص سے لطف اندوز ہوتے۔ ان دنوں لاہور کے ہوٹلوں میں دخترِ رز پر پابندی نہ تھی۔ فلیٹیز، سٹیفلز اور میٹرو جیسے ہوٹلوں میں یہ سہولت عام تھی۔ جب شراب پر پابندی لگی تو یار لوگوں نے نئے نئے طریقے ایجاد کر لیے اب شراب بوتلوں کی بجائے چائے کی کیتلیوں میں فراہم کی جانے لگی۔ اگر کبھی چھاپہ پڑتا تو ہوٹل انتظامیہ ایک دو روز کے لیے احتیاط کرتی۔ اس کے بعد دوبارہ لنگر جاری ہو جاتا۔ میٹرو ہوٹل میں دو سوانی مجسمے بھی رکھے گئے تھے۔ شہر میں جب فحاشی کے خلاف مہم زوروں پر ہوتی تو ان نیم عریاں مجسموں کو بڑی بڑی چادروں سے ڈھانپ دیا جاتا۔ میٹرو ہوٹل نہ صرف ادیبوں کے بیٹھنے کی جگہ تھی بلکہ ادیبوں کی بعض تحریروں میں یہ ہوٹل پس منظر کا کام بھی دیتا۔ اے حمید کے مشہور افسانے "ڈالیاں چمن کی" میں یہی میٹرو ہوٹل نظر آتا ہے۔ اگرچہ اس زمانے کے ادیبوں کی آمدنی محدود تھی مگر پھر بھی یہ ادیب میٹرو میں بیٹھنے کی عیاشی کرتے تھے۔ کرسمس اور نیو ایئر جیسے موقعوں پر میٹرو میں داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہوا کرتا تھا مگر بقول انتظار حسین، ادیب لوگ ان نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے لیے کئی روز پہلے ایڈوانس بکنگ کرا لیتے تھے۔ یہ ہوٹل رات دیر تک کھلا رہتا لیکن اسٹیج کے آخری جلوہ دکھانے کے ساتھ ہی محفل اجڑنے لگتی۔ اس کے ساتھ ہی ناصر کاظمی، انتظار حسین اور اے حمید اٹھ کھڑے ہوتے۔ ان کی اگلی منزل انارکلی کی نکڑ پر واقع ایک خستہ سا چائے خانہ ہوتی تھی۔ کبھی کبھی چائے کے پرستاروں کا یہ مختصر سا قافلہ موچی دروازے کے قریب واقع منزل ہوٹل کی طرف بھی چل پڑتا تھا جو حضرت احسان دانش کے ایک شاگرد نے اپنے ہی چائے کے طلب گاروں کے لیے کھول رکھا تھا۔

3۔ چائنیز لنچ ہوم : کافی ہاؤس اور چائنیز لنچ ہوم کی دیوار مشترک اور دروازے ساتھ ساتھ کھلتے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب چائنیز لنچ ہوم، پاک ٹی ہاؤس کی ہمسری کرتا نظر آتا تھا۔ یہاں اکثر خوش خوراک ادیب اور صحافی بیٹھے نظر آتے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یہاں کے نان اور سری پائے پورے لاہور میں مشہور تھے اور یہاں کی چائے بھی پاک ٹی ہاؤس سے کم خوش ذائقہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے یہاں شاعر، ادیب، صحافی، دانشور حتیٰ کہ استاد امانت علی خان جیسے کلاسیکل گائیک بھی بیٹھا کرتے تھے۔ نہ صرف استاد امانت علی خان کی ادیبوں سے قریبی دوستیاں تھیں بلکہ میرا جی ڈے پر ہر سال کوئی بڑا استاد گائیک ادیبوں کے جلسے میں موسیقی بھی پیش کیا کرتا تھا۔ یوں تو یہاں ہر طرح کے ادیب شاعر بیٹھا کرتے تھے لیکن باقاعدہ بیٹھنے والوں میں استاد امانت علی خان، شورش کاشمیری، حمید اختر، عبداللہ ملک، احسان دانش، میر خلیل الرحمٰن، سعادت حسن منٹو، حنیف رامے، آغا بیدار بخت، شاکر علی (مصور)، انور جلال شمزا (مصور)، سیف الدین سیف، حبیب جالب، ناصر کاظمی اور صلاح الدین احمد جیسے نمایاں لکھنے والے شامل ہیں۔ چائنیز لنچ ہوم میں یوں تو کئی آتے جاتے تھے لیکن ایک شاعر ایسا بھی تھا جس کا نام چائنیز لنچ ہوم کے ساتھ لازم و ملزوم ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ شاعر لدھیانہ سے ہجرت کر کے آنے والے ایم۔ حسن لطیفی تھے۔ قیام

پاکستان سے قبل ان کا تعلق ایک خوشحال گھرانے سے تھا۔ ان کی تعلیم لندن اور پیرس میں ہوئی تھی اور صحافت میں ڈاکٹریٹ کر رکھی تھی۔ انگریزی اور فرانسیسی نہ صرف روانی سے بولتے تھے بلکہ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادب پر دسترس بھی رکھتے تھے۔ چائے کا زبردست ذوق رکھتے تھے۔ طبیعت درویشی کی طرف مائل تھی اور عام طور پر خاموش رہنا پسند کرتے تھے۔ اخبارات میں لکھنے کے بعد انھیں جو کچھ ملتا اس میں سے کھانے کے بعد جو کچھ بچتا اس کی روٹیاں لے کر غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد کے زمانے تک چائنیز لنچ ہوم کو زبردست ادبی اہمیت حاصل رہی۔ یہاں ہر وقت ادیبوں، شاعروں، صحافیوں، فوٹو گرافروں، مصوروں، وکیلوں اور پروفیسروں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ اس ہوٹل کی فضا کشادہ، روشن اور صحت مند تھی۔ مبارک احمد نے اپنا حلقہ الگ کیا تو انھیں اسی ریستوران نے پناہ دی۔ اس کے علاوہ یہاں مظفر علی ندیم ایک عرصے تک حلقہ تصنیف ادب کے اجلاس منعقد کرتے رہے اور پنجابی ادبی پرواری تنقیدی نشستیں بھی اسی ریستوران میں ہوا کرتی تھیں۔ اسی کی دہائی میں جب ہم لوگوں نے ادبی حلقوں میں آنا جانا شروع کیا تو چائنیز لنچ ہوم اگرچہ موجود تھا مگر اس کی ادبی رونقیں ماند پڑ چکی تھیں۔ دراصل اس قہوہ خانے کی ساری رونقیں کافی ہاؤس اپنے ساتھ لے گیا۔ کافی ہاؤس پر تالا پڑا تو چائنیز لنچ ہوم بھی ویران ہو گیا۔ اب یہاں ادیبوں سے زیادہ وکلاء، پی ڈی اے اور پاپولیشن کے ملازموں کی یونینز کے عہدیدار بیٹھا کرتے تھے۔ ادیبوں اور صحافیوں کے مرتے بچھڑنے شروع ہوئے تو انہوں نے چائنیز لنچ ہوم میں بیٹھنا ترک کر دیا۔ ان کا اگلا ٹھکانہ لارڈز اور ڈین ہوٹل تھے۔ جب بڑے ادیبوں نے چائنیز لنچ ہوم سے منہ موڑ لیا تو بقول میر "آثر اجاڑ دیا اس کا قرار پایا"۔

4۔ **کافی ہاؤس** مال روڈ پر واقع سابق ولسن مارکیٹ کے چوک سے آپ ریگل کی طرف چلیں تو مال روڈ کی ذیلی سڑک کے شروع ہی میں بائیں ہاتھ کونے میں ہی لائنٹ بلڈنگ جی پی او کے سامنے ہے۔ انگریزی کی ادبی کتابوں کی دکان کرشنا بک ہاؤس تھی۔ اس تاریخی عمارت میں دو ریستوران ساتھ ساتھ واقع تھے۔ ان میں سے ایک چائنیز لنچ ہوم اور دوسرا کافی ہاؤس تھا۔ ساتھ ساتھ ہونے کے باعث انتظار حسین چائنیز لنچ ہوم کو "کافی ہاؤس کا ضمیمہ" قرار دیتے ہیں۔ کافی ہاؤس کی شہرت اور مقبولیت اپنی جگہ مگر یہاں فون نہیں تھا اس لیے شاعر، ادیب فون کی سہولت سے فائدہ اٹھانے کے لیے چائنیز لنچ ہوم پر تکیہ کرنے پر مجبور تھے۔ ایک اور مشکل بھی تھی کہ کافی ہاؤس رات 9 بجے بند ہو جاتا تھا سو کافی ہاؤس کے نشہ باز چائے کے لیے چائنیز لنچ ہوم سے وابستہ رہنے پر مجبور تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں قہوہ خانوں میں بیٹھنے والے ادیب تقریباً مشترک ہی تھے۔

لاہور کے دو مشہور قہوہ خانے یعنی انڈیا کافی ہاؤس اور انڈیا ٹی ہاؤس دو سکھ بھائیوں کی ملکیت تھے۔ دونوں خوب چلتے تھے اور دونوں کی شاخیں دہلی میں بھی موجود تھیں۔ (۸) ان دونوں قہوہ خانوں کا ستارہ عروج پر تھا اور دونوں ہی ادب کی تاریخ میں امر ہو چکے ہیں۔ بظاہر کافی ہاؤس ایک کاروباری جگہ تھی مگر ادیبوں کی یہاں موجودگی نے اسے شہر کے ہزاروں قہوہ خانوں سے منفرد بنا دیا تھا۔ ایک طرف استاد امانت علی خان اپنے پرستاروں کے ہمراہ چائے پیتے نظر آتے تو دوسری طرف سعادت حسن منٹو اپنے چاہنے والوں کے درمیان گھرے ہوئے پائے جاتے۔ یہاں ملک بھر سے اہل قلم جمع ہوتے۔ کوئی ادیب کہیں سے بھی چلتا، کافی ہاؤس میں چند لمحے بسر کرنے کی تمنا اسے کشاں کشاں یہاں لے آتی۔ لاہور کے نامور وکلا، ممتاز ادیب، شاعر، ناقدین اور پنجاب یونیورسٹی اور دوسرے کالجز کے ادبیات کے

اساتذہ و طلبا کا ہر وقت تانتا بندھا رہتا۔ چراغ حسن حسرت، باری علیگ، مجید نظامی، علاؤ الدین کلیم (استاد)، اعجاز حسین بٹالوی، شاکر علی (مصور)، حبیب جالب، فیض، صوفی تبسم، پطرس بخاری، سید عابد علی عابد، ڈاکٹر تاثیر، حفیظ جالندھری، احسان دانش، راشد، شہرت بخاری، سلیم شاہد، اقبال ساجد، ڈاکٹر سہیل احمد خان، مظفر علی سید، ناصر کاظمی اور بہت سے دوسرے قلمی ستارے کافی ہاؤس کے آسمان پر ہالہ کیے رکھتے۔ کافی ہاؤس کی یہی وہ رونق تھی جس سے اس زمانے کے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں ادیبوں کے ساتھ ایک کپ کافی پینے کی خواہش کا اظہار کر دیا اور بعد ازاں ایک روز وہ اس اعزاز سے سرفراز ہونے کے لیے واقعی کافی ہاؤس آ پہنچے۔ وزیر اعظم دیر تک ادیبوں اور شاعروں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف رہے۔

اس کے بعد جلد ہی یہ محفلیں اجڑنے لگیں۔ انڈیا کافی ہاؤس کے نام سے آغاز کرنے والے اس قہوہ خانے پر کئی طرح کے برے وقت آئے۔ کئی بار یہ بند ہوا اور کئی بار اس جگہ نئے کاروبار بھی شروع ہوئے مگر ادیبوں نے اس قہوہ خانے کے چکر لگانا بند نہ کیے۔ قیام پاکستان کے بعد یہاں فرنیچر کی دکان کھلی، کچھ عرصہ اس پر تالا پڑا رہا پھر نئی سج دھج سے کافی ہاؤس کا افتتاح ہوا۔ بعد ازاں پھر بند ہو گیا اور اس جگہ ایک بینک کھل گیا اور عرصہ ہوا یہ ریستوران ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ ہمارے زمانے تک آتے آتے اس کے آثار تک مٹ چکے تھے مگر ادیبوں کے دلوں میں آج بھی کافی ہاؤس کی یادیں اسی طرح زندہ ہیں۔

5۔ ہوٹل پیراڈائیز: یہ بھی لاہور کے معروف ترین قہوہ خانوں میں سے ایک تھا۔ یہ اس جگہ ہوتا تھا جہاں آج کل کارمنس ڈرائی کلینرز کی دکان ہے۔ (9) بعد ازاں وہاں سے اٹھ کر یہ "سویرا" کے دفتر کے نیچے چلا آیا۔ "سویرا" کا دفتر ان دنوں اس بلڈنگ میں تھا جہاں بعد میں پاپولر پکچرز کا دفتر رہا۔ بیسویں صدی کے لاہور میں پیراڈائیز ہوٹل ترقی پسندوں کا سب سے بڑا اڈہ تھا۔ یہ زمانہ ترقی پسندی کے عروج کا زمانہ تھا۔ ترقی پسند ادیبوں کے دم قدم سے ادب میں زبردست تحریک تھی۔ وہ نئے خوابوں کی گٹھڑیاں سروں پر رکھے ادب میں وارد ہوئے تھے۔ وہ پرانی اور فرسودہ دنیا کو ڈھا کر اس جگہ ایک نئی، امن، مساوات اور قابل رہائش دنیا کی تعمیر کے لیے پرعزم تھے۔ ترقی پسند ادیب ہر روز نئے نئے مباحث کا آغاز کرتے۔ ان کے مخالفین ان مباحث کو آگے بڑھاتے یا پھر ان کی مخالفت کے لیے دلائل دیا کرتے۔ صفدر میر، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، احمد راہی، اختر مکی، اے حمید، قیوم نظر، عبداللہ ملک، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، سعادت حسن منٹو، شاہد احمد دہلوی، کرشن چندر، حسن لطیفی اور ابن انشا سمیت یہاں ہر مکتبہ فکر اور ہر تحریک سے تعلق رکھنے والے ادیب بیٹھتے مگر عموماً یہاں ترقی پسندوں ہی کا پلڑا بھاری نظر آتا۔ ادب میں جو ادبی معرکے ہوٹل پیراڈائیز کے حصے میں آئے وہ ٹی ہاؤس کو کہاں نصیب ہوئے ہوں گے۔ یہ قہوہ خانہ ترقی پسندوں کا گڑھ تھا اور انجمن ترقی پسند مصنفین کے چند یادگار جلسے اسی ہوٹل میں ہوئے۔ اس ہوٹل کی ایک خاص بات جو دوسرے قہوہ خانوں سے ممتاز بھی کرتی تھی وہ یہ تھی کہ یہاں بھی ادیبوں کا ادھار چلتا تھا۔ ہوٹل کے مالک نے ہوٹل کے باہر ایک عدد تختہ سیاہ آویزاں کر رکھا تھا جب کوئی ادیب دو ماہ تک بل ادا نہ کرتا تو وہ اس کا نام جلی حروف میں تختہ سیاہ پر لکھ دیتا اور یوں ادیب شرمندگی سے بچنے کے لیے فوراً بل ادا کر دیتے۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ابن انشا اور اے حمید نے ظہیر کاشمیری کے دستخط کر کے کھانا لے لیا اور ان کے نام پر خوب ہی جی بھر کر کھایا پیا۔ جب دو ماہ گزر گئے اور دو بندگان میں ظہیر کاشمیری کا نام بھی بورڈ پر آویزاں پایا گیا تو انہوں نے سارے معاملے کی تحقیق کی اور اتنا اونچا احتجاج کیا کہ پیراڈائیز کے در و دیوار لرز اٹھے۔ (10)

پیراڈائز ہوٹل کا مالک شربتی رنگ والا دبلا پتلا نوجوان تھا جس نے یوپی کے کسی شہر سے ہجرت کی تھی اور لاہور آ کر میکلوڈ روڈ پر ہوٹل پیراڈائز کھولا تھا۔ یہ ہوٹل ایک طرح سے انجمن ترقی پسند مصنفین کا دفتر تھا جہاں سارا دن دور دراز سے لوگ ترقی پسند ادیبوں سے ملنے آیا کرتے تھے۔ اس ہوٹل کی ساری رونقیں ادیبوں کے دم قدم سے تھیں۔ جب "سویرا" کا آفس میکلوڈ روڈ سے لوہاری منتقل ہو گیا تو ہوٹل پیراڈائز کی دم اکھڑ گئی کیونکہ "سویرا" کی منتقلی کے ساتھ ہی ترقی پسندوں نے بھی اپنا ٹھکانا دلی ہاؤس کو بنا لیا تھا۔ یہ قیام پاکستان کا ابتدائی زمانہ تھا۔ شروع میں بہت سے ترقی پسند ادیب اطرافِ ہند سے پاکستان چلے آئے تھے مگر یہاں اسٹیبلشمنٹ نے ان کی ناک میں ایسا دم کیا کہ بیچارے ہندوستان واپسی پر مجبور ہو گئے۔ ایسے ہی ادیبوں میں کیفی اعظمی اور ساحر لدھیانوی بھی تھے۔ ہوٹل پیراڈائز کے ویران ہونے کے بعد لاہور کے ادیبوں نے چند نئے ٹھکانے تلاش کر لیے تھے۔

6۔ **اورینٹ ہوٹل** : اگر آپ تقسیم ہندوستان سے پہلے کے لاہور کو یاد کریں تو میکلوڈ روڈ پر دونوں طرف آپ کو بڑ کے اگے ہوئے نظر آئیں گے۔ پارسیوں کے بنگلہ گھر بھی ملیں گے۔ قریب ہی تاریخی رسالے "چٹان" کا دفتر دکھائی دے گا۔ چٹان سے ذرا آگے بیڈن ولنگٹن روڈ کی طرف جانے والی سڑک پر پہلے یہاں ایک پارسی نے مترو ہوٹل بنایا تھا پھر یہیں اسی جگہ اورینٹ ہوٹل بن گیا۔ (11) قیام پاکستان کے بعد کے زمانوں میں یہ ہوٹل ادب اور ادیبوں کے حوالے سے بہت مقبول ہوا۔ یہاں بیٹھنے والوں میں غلام عباس، محمد حسن عسکری، اے حمید، انتظار حسین اور حنیف ہوشیار پوری زیادہ اہم ہیں۔ حسن عسکری ان دنوں کرشن نگر میں رہتے تھے اور انہیں قہوہ خانوں میں بیٹھنا اور ادب کے حوالے سے گفتگو کرنا بے حد مرغوب تھا۔ وہ صبح اٹھ کر پہلے گورنمنٹ کالج پہنچتے یہاں دن بھر ادب، فنون اور فلسفہ پر گفتگو ہوتی۔ ان کی اگلی منزل ریڈیو پاکستان ہوا کرتی تھی۔ ہوٹل اورینٹ درمیان میں پڑتا تھا۔ یہ زمانہ لاہور میں پیدل چلنے کے لیے خاصا سازگار ہوا کرتا تھا۔ عسکری صاحب اپنے احباب کے ساتھ ہوٹل اورینٹ پہنچتے اور یہاں دیر تک ادب کی محفل جما کرتی۔ وہ اس ریستوران سے بے حد مانوس ہو گئے تھے۔ بعد ازاں اس ہوٹل پر صحافیوں کی یلغار ہوئی، جو چائے کا آرڈر دیے بغیر گھنٹوں بیٹھے رہتے۔ اس غیر کاروباری رویے کے باعث ہوٹل اورینٹ آہستہ آہستہ ویران ہوتا چلا گیا۔

7۔ **کیفے ڈی اورینٹ** : مال روڈ پر سے ذرا آگے ریگل کی طرف یہ ریستوران واقع تھا۔ ان دنوں مال روڈ پر ہر طرف خاموشی چھائی رہتی تھی۔ کبھی کبھار کسی تانگے یا موٹر کے گزرنے سے فضا میں ارتعاش پیدا ہوتا اور اس کے بعد پھر گہری خاموشی چھا جاتی۔ ہوٹل کے نواح میں ایک ایسی دکان تھی جہاں موسیقی کے ساز مرمت کیے جاتے تھے لہٰذا وقفے وقفے سے یہاں سے سریلی آوازیں آیا کرتیں جو چائے کے ساتھ بہت بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ ابن انشاء، باری علیگ، حسن عسکری، علی سردار جعفری جیسے ادیب اور صحافی بیٹھے نظر آتے۔ اس کیفے کے کاؤنٹر پر ایک خوش شکل اینگلو انڈین لڑکی بیٹھا کرتی تھی لہٰذا بیشتر ادیبوں اور صحافیوں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ اسی کی طرف منہ کر کے بیٹھیں۔ ترقی پسند اور مخالفین کے درمیان بہت سے معرکے اسی ہوٹل سے آغاز ہوئے۔ ایک دوسرے کے خلاف کئی رسالوں کا اجرا ہوا۔ ایک ایسے ہی معرکے کے دوران صفدر میر کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ وہ محض ترقی پسند ادیب ہی نہیں باقاعدہ ممبر بھی ہیں۔

پاکستانی ادب کے سوال پر عسکری صاحب اور ترقی پسندوں کے درمیان کیا کیا معرکہ آرائیاں ہوئیں یہ تو ادب کا ہر طالب علم جانتا ہے مگر اس آگ کو بھڑکانے میں کیفے ڈی اورینٹ نے کیا کام دکھایا تھا یہ شاید بہت ہی کم لوگوں کو معلوم ہے۔ (12) کیفے ڈی

اور ساتھ والی بلڈنگ کے اندر واقع ہوا کرتا تھا۔ آج کل بلڈنگ کے اندر کئی نئی مارکیٹیں وجود میں آ چکی ہیں۔ لارڈز ہوٹل اور کیفے ڈی لا اور سٹینڈ ختم ہو چکے ہیں اور اب تو وہ لوگ بھی خال خال ہی نظر آتے ہیں جن کے دم سے ان ہوٹلوں کی رونقیں قائم تھیں۔

8۔ گلینڈ بیکری : قیامِ پاکستان کا واقعہ ایسا تھا کہ جس نے عرب ہوٹل اور اس کی شہرت کو گہنا دیا۔ مضافاتی ہونے سے بھی یہ پورا علاقہ پس منظر میں چلا گیا۔ قہوہ خانوں میں اب گلینڈ بیکری کے عروج کا زمانہ شروع ہو چکا تھا۔ مال روڈ سے انارکلی میں داخل ہوں تو الکا چوک آنے سے ذرا پہلے دائیں طرف یہ بیکری واقع تھی۔ چائے کے ساتھ ساتھ بیکری کی تازہ آئٹمز دستیاب ہونے کے باعث گلینڈ بیکری جلد ہی اس زمانے کے ادیبوں کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہاں ادبی جلسے بھی منعقد ہوتے تھے یا نہیں البتہ یہ بات ثبوت کے ساتھ کی جا سکتی ہے کہ یہ قہوہ خانہ نئے نئے مباحث کے فروغ کا سبب بنا۔ پنجاب یونیورسٹی قریب ہونے کے باعث یہاں شاعروں ادیبوں کے ساتھ ساتھ یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج کے پروفیسروں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا اور یہی لوگ ادب کے تصور سے متعلق نئے نئے مباحث اور نظریوں کے پتھر پھینکتے رہتے تھے۔ یہاں صفدر، غلام عباس، ڈاکٹر خورشید، اے حمید، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر سید عبداللہ، وقار عظیم، اشفاق احمد، ریاض قادر، شہزاد احمد، جاوید شاہین، میرا جی، منیر نیازی، ن۔م۔ راشد اور چائے کے رسیا ناصر کاظمی خوش گپیوں میں مصروف نظر آتے۔ گلینڈ بیکری شاعروں ادیبوں کے ساتھ ساتھ مصوروں کے لیے بھی ایک ٹھکانہ تھی۔ شاکر علی نے تجریدی مصوری کے نئے مباحث کا آغاز یہیں سے کیا۔ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر کافی ہاؤس تھا اس کی کشش دلوں کو زیادہ کھینچتی تھی چنانچہ آہستہ آہستہ گلینڈ بیکری میں بیٹھنے والے کافی ہاؤس کو پیارے ہو گئے۔ ان قہوہ خانوں کے علاوہ شیزان، سٹینڈرڈ، لورینگ، کیانی، پرنس اور کیری ہوم جیسے ہوٹل بھی موجود تھے جو ہر وقت اپنی آغوش ادیبوں کے لیے وا رکھتے تھے اور ادیب بھی ان ہوٹلوں کو بھی مایوس نہیں کرتے تھے۔ دوسرے نئے ہوٹل تو آباد کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

9۔ پاک ٹی ہاؤس : جو حیثیت موسموں میں بہار کے موسم کو حاصل ہے کچھ یہی مرتبہ لاہور کے قہوہ خانوں میں پاک ٹی ہاؤس کو ہمیشہ حاصل رہا۔ مال روڈ سے متصل اور نیلا گنبد کے دہانے پر وائی ایم سی اے کی عمارت کے عقبی حصے میں یہ تاریخی قہوہ خانہ واقع ہے۔ ینگ مین کرسچن ایسوسی ایشن اور ریڈ کراس کا بانی جین ہنری ڈوناں (1828-1910ء) سوئٹزرلینڈ کا رہنے والا تھا۔[13] وائی ایم سی اے کی شاخیں دنیا کے ہر علاقے اور ملک میں پائی جاتی ہیں۔ پاک ٹی ہاؤس (جو اس زمانے میں انڈیا ٹی ہاؤس کہلاتا تھا) کی انتظامیہ نے اسی ادارے سے یہ قہوہ خانہ کرائے پر لیا تھا۔ یوں تو لاہور میں ایک سے بڑھ کر ایک ریستوران ہیں مگر اس ریستوران کو خصوصی اور لازوال شہرت حلقہ اربابِ ذوق کے باعث نصیب ہوئی۔ حلقہ اربابِ ذوق اور پاک ٹی ہاؤس ہمیشہ لازم و ملزوم رہے ہیں۔ کاروباری مراکز کے وسط میں واقع ہونے کے ساتھ ساتھ گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی سے ارضی قربت نے بھی پاک ٹی ہاؤس کی رونقوں میں اضافہ کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق ایشیا کی بڑی ادبی تنظیموں میں سے ایک ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ نہ تو اس تنظیم کا کوئی باقاعدہ دستور ہے اور نہ ہی اتنی بڑی تنظیم کا کوئی اپنا دفتر ہے۔ اس پورے عرصے میں پاک ٹی ہاؤس ہی حلقہ اربابِ ذوق کے دفتر کا کام دیتا رہا۔ پاک ٹی ہاؤس کو دیکھنے اور یہاں بیٹھنے والے نامور ادیبوں اور شاعروں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پوری دنیا سے ادب دوست حضرات لاہور آتے رہتے ہیں۔

ساٹھ کی دہائی میں تو امریکہ کے معروف شعرا پال اینگل، کارولین کائزر اور Jeasse Stuart بھی حلقہ اربابِ ذوق کے جلسوں میں شریک ہوئے اور انہوں نے پاک ٹی ہاؤس کی گیلری میں بیٹھ کر نہ صرف حلقے کی کارروائی میں حصہ لیا بلکہ ٹی ہاؤس کی لذیذ چائے سے بھی لطف اندوز ہوئے۔(14)

حلقہ اربابِ ذوق کے ابتدائی زمانے میں حلقے کے اجلاس وائی ایم سی اے میں ہوا کرتے تھے جبکہ اراکین کے لیے چائے کا انتظام پاک ٹی ہاؤس میں کیا جاتا تھا۔ اس زمانے میں بیشتر ادیب صرف اتوار کی شام پاک ٹی ہاؤس آیا کرتے تھے۔ بعد ازاں جب حلقے کی تنقیدی نشستیں پاک ٹی ہاؤس منتقل ہو گئیں تو ادیب عام دنوں میں بھی پاک ٹی ہاؤس آنے لگے۔ ٹی ہاؤس کے ابتدائی آباد کاروں میں میرا جی، سیف الدین سیف، اعجاز حسین بٹالوی، احمد الطاف، ریاض احمد، ایم اے جلیس، راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، شوکت صدیقی، جگر مراد آبادی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، دیوندر ستیارتھی جیسے ادیب شامل تھے۔ قیامِ پاکستان کے ایک عرصہ بعد تک بھی اس قہوہ خانے کی پیشانی پر انڈیا ٹی ہاؤس کی تختی لگی رہی اور جب مختلف چیزوں کو پاکستانیات کے رنگ میں رنگنے کی تحریک شروع ہوئی تو ایک دن اس قہوہ خانے کے ماتھے پر بھی پاک ٹی ہاؤس کی تختی سجا دی گئی۔ ہجرت نے بھی ٹی ہاؤس کی آباد کاری میں اہم کردار ادا کیا۔ نئے آباد کار لٹ لٹا کر پاکستان پہنچے تھے لہٰذا جلد ہی ٹی ہاؤس نے انہیں اپنی پناہ میں لے لیا۔ نئے آنے والوں کا یہی اوڑھنا بچھونا تھا۔ اے حمید، ساحر لدھیانوی، یحییٰ اعظمی، ابن انشا، صفدر میر جیسے لوگ صبح آٹھ نو بجے تک اپنے گھروں سے نکل کر پاک ٹی ہاؤس آ جاتے اور رات گئے تک یہیں بیٹھے رہتے۔ ٹی ہاؤس کی زندگی میں یہ دن بھی ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اس محفل پر قیوم نظر، انور جلال شمزا اور منٹو کے قہقہے گونج رہے ہیں اور دوسری میز پر ظہیر کاشمیری، صفدر میر، منٹو، احمد ندیم قاسمی، حمید اختر اور عبداللہ ملک جمالیاتی قدروں پر بحث کر رہے ہیں۔ تیسری میز پر کالے بالوں اور چمکیلی آنکھوں والا ناصر کاظمی، سلیم شاہد، ڈاکٹر سہیل احمد خان، مظفر علی سید، انتظار حسین، انجم رومانی اور شہرت بخاری کو اپنی تازہ غزل سنا رہا ہے اور چوتھی میز پر احمد بشیر، شہزاد احمد، عارف عبدالمتین، انور سجاد، کمال احمد رضوی اور سجاد باقر رضوی ادب کے کسی نئے مباحثے پر اپنے دلائل دینے میں مصروف ہیں جبکہ سامنے والی میز پر یوسف ظفر، مختار صدیقی، اشفاق احمد، احمد راہی، منیر نیازی، ضیا جالندھری اور قتیل شفائی چائے کے دور اور خوش گپیوں میں مصروف ہیں۔ کوئی راتوں کو ویران سڑکوں کی گشت کے دوران تازہ غزلیں کہہ رہا ہے تو کوئی دن کے اجالے میں نئے افسانے کے کردار تلاش کرتا پھر رہا ہے۔ اگلی صبح جب یہ لوگ ٹی ہاؤس میں جمع ہوتے تو ایک دوسرے کے اشعار اور افسانوں پر جی بھر کر داد دیتے۔ اس ماحول میں ادیبوں کے علاوہ کچھ دوسرے لوگ بھی آیا کرتے تھے۔ بعض ٹی ہاؤس کا لذیذ کھانا کھا کر رخصت ہو جاتے تو بعض ادیبوں کے ساتھ بیٹھ کر گپ شپ بھی لگاتے۔ ٹی ہاؤس کے عروج کے ساتھ اب دوسرے قہوہ خانوں کے چراغ مدھم پڑنے لگے تھے مثلاً ناصر کاظمی کے ٹی ہاؤس اٹھ آنے سے کافی ہاؤس کی رونقیں ماند پڑنے لگی تھیں، گورنمنٹ کالج کی ادب نوازی بھی ٹی ہاؤس کی رونقوں میں اضافے کا باعث بنی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی محفل اجڑی تو ترقی پسندوں نے بھی ٹی ہاؤس ہی کا رخ کیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب دوسرے قہوہ خانوں کی ندیاں ایک ایک کر کے ٹی ہاؤس کے دریا ہی میں گرنے لگیں۔

بظاہر یہ ٹی ہاؤس کے عروج کا زمانہ ہے مگر نیلے گنبد میں ٹائروں کا کاروبار بھی ترقی پذیر ہے اور لالچی نظروں سے اس قدیم قہوہ خانے کو دیکھ رہا ہے۔ اس زمانے میں عام ادیب اس نئی یلغار کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر اے حمید نے اس زمانے میں بھی ٹی

ہاؤس کے بارے میں ایک غیر معمولی پیش گوئی کر دی تھی:

> "پاک ٹی ہاؤس چل رہا ہے مگر نہ چلنے کے برابر ہے۔ نیلے گنبد میں آٹو سپیئر پارٹس اور خاص طور پر ٹائروں کے بزنس کی یلغار ٹی ہاؤس تک پہنچ چکی ہے۔ لگتا ہے جلد ہی وہ وقت آنے والا ہے جب پاک ٹی ہاؤس کی جگہ اس کی پیشانی پر "پاک ٹائر ہاؤس" لکھا ہوا ہوگا۔" (15)

اور پھر وہ وقت آ ہی گیا جب ٹی ہاؤس کے دروازے پر تالا پڑ گیا اور ادیب بے گھر ہو گئے۔ شنید تھی کہ اسے پاک ٹائر ہاؤس میں تبدیل کیا جا رہا ہے اور اس مقصد کے لیے اس تاریخی قہوہ خانے میں ٹائر اسٹور بھی کر لیے گئے تھے۔ ٹی ہاؤس کی اس موت پر ادیبوں نے آنسو بہائے، کالم نگاروں نے درد بھرے کالم لکھے اور شاعروں نے مرحوم قہوہ خانے کے نوحے رقم کیے۔ وائی ایم سی اے کی انتظامیہ نے کورٹ کا رخ کر لیا اور یوں ٹی ہاؤس کا جھگڑا کئی سال چلتا رہا۔ اس دوران حکومتی ادارے بھی حرکت میں آتے رہے اور یوں ادیبوں کے بیٹھنے کے لیے دو تین جگہوں کا اہتمام کیا گیا۔ ان میں ایک تو ناصر باغ کے قلب میں "چوپال" سجائی گئی اور یوں حلقہ ارباب ذوق یہاں منتقل ہو گیا۔ حلقے کے علاوہ بعض دوسری ادبی تنظیمیں بھی یہاں اپنے اجلاس منعقد کرنے لگیں۔ ادھر حکومت نے لاہور آرٹس کونسل جیسی خوبصورت جگہ پر ادیبوں کے بیٹھنے کے لیے "ادبی بیٹھک" کھول دی جو اب بھی موجود ہے۔ حلقے کے "چوپال" سے ایوان اقبال منتقل ہو جانے کے نتیجے میں "چوپال" اور "ادبی بیٹھک" کے علاوہ ادیبوں کے ہاتھ بیٹھنے کا ایک تیسرا ٹھکانہ بھی میسر آ گیا لیکن ان کے باوجود ادیبوں کے دلوں سے پاک ٹی ہاؤس کی یادیں کبھی محو نہ ہو سکیں۔ "ادبی بیٹھک" کی بے روح کریہہ فضا میں رہ کر بھی ادیب اپنے بچھڑے ٹی ہاؤس، اس کے پرانے فرنیچر، اور الٰہی بخش اور رفیع جیسے سادہ کپڑوں والے ویٹروں کو یاد کر کے آہیں بھرتے رہے۔ ٹی ہاؤس کی بندش سے ادیب نہ صرف بے گھر ہوئے بلکہ ان کا ادبی مرکز بھی بکھر گیا۔ پہلے تو وہ کم از کم ہفتہ وار ہی سہی یہاں جمع ہوتے تھے ملتے ملاتے اور ایک دوسرے سے گپ شپ کیا کرتے تھے مگر اب وہ در بدر ہو گئے تھے۔

ٹی ہاؤس کو بند ہوئے جب کافی عرصہ گزر گیا تو ایک روز اچانک یہ اطلاع ادبی حلقوں میں بہت حیرت اور مسرت کے ساتھ سنی گئی کہ پاک ٹی ہاؤس کا ایک نئے رنگ و روپ سے دوبارہ افتتاح ہو رہا ہے اور پھر واقعی ٹی ہاؤس ایک نئی سج دھج کے ساتھ سامنے آیا۔ اس آبادکاری کے پیچھے حکومتی حلقوں میں موجود عطاء الحق قاسمی اور شعیب بن عزیز جیسے دوستوں کا ہاتھ ہے۔ یہ ٹی ہاؤس ہے تو پرانے والا مگر اب کی بار اس کے فرنیچر سے لے کر ویٹروں تک نئے ہیں۔ ادیبوں کو گرمی سے بچانے کے لیے جگہ جگہ ایئر کنڈیشنر بھی آویزاں ہیں اور کھانے اور چائے کی قیمت پہلے سے زیادہ مگر مہنگائی کے لحاظ سے مناسب ہے۔ حلقہ ارباب ذوق ایک بار پھر ٹی ہاؤس میں واپس آ چکا ہے۔ ادیبوں نے بھی آنا جانا شروع کر دیا ہے مگر اب بھی ادیبوں کے دلوں میں کوئی انجانا خوف سانس لے رہا ہے اور وہ ایک دھڑکے کے ساتھ ٹی ہاؤس آتے ہیں۔ اللہ کرے پاک ٹی ہاؤس کی رونقیں دوبارہ بحال ہوں اور اب کوئی ادیبوں کو بے گھر کرنے میں کامیاب نہ ہو پائے۔

موجودہ عہد دراصل ہوٹلوں اور پلازوں کا عہد ہے۔ لاہور کے بیشتر سینما ہاؤس گرا کر پلازوں میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری نے انسان کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا کہ وہ ذہنی زندگی کی طرف توجہ دیں۔ ٹی وی، ایف ایم ریڈیو، انٹرنیٹ، فیس بک اور موبائل نے ادب سمیت تخلیقی سرگرمیوں کو پس منظر میں دھکیل دیا ہے۔ آج ادیب اور شاعر ہمارے ہیرو نہیں رہے۔ ہم اس

معاشرے ہی کو گنوا رہے ہیں جس میں ادیبوں اور قہوہ خانوں کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اب وہ قہوہ خانے ہمیں خال خال ہی نظر آتے ہیں جو ہماری ذہنی زندگی کے ترجمان تھے اور جہاں سے مباحث جنم لے کر سارے ملک میں پھیلتے تھے۔ اب ان کا تعارف صرف محدود ہے۔ شاید ہمیں ذہنی زندگی کی ضرورت ہی نہیں رہی۔

حواشی :

1- لاہور (نامعلوم مورخ) ترجمہ یاسر جواد، نگارشات، لاہور، 2011ء، ص 14۔

2- تاریخ لاہور، سید محمد لطیف، تخلیقات، لاہور، 2010ء، ص 471۔

3- تاریخ لاہور، کنہیا لال، تخلیقات، لاہور، 2012ء، ص 28۔

4- لاہور لاہور اے، اے حمید، الفیصل، لاہور، 2008ء، ص 159۔

5- لاہور کا جو ذکر کیا، گوپال متل، سنگ میل، لاہور، 2004ء، ص 36۔

6- اب وہ لاہور کہاں، منیر احمد منیر، آتش فشاں، لاہور، 2011ء، ص 73۔

7- یادوں کے گلاب، اے حمید، مکتبہ عالیہ، لاہور، 2007ء، ص 34۔

8- لاہور لاہور اے، اے حمید، الفیصل، لاہور، 2008ء، ص 135۔

9- یادوں کے گلاب، اے حمید، الفیصل، لاہور، 2008ء، ص 24۔

10- لاہور لاہور اے، اے حمید، ص 6۔

11- اب وہ لاہور کہاں، منیر احمد منیر، ص 40۔

12- چراغوں کا دھواں، انتظار حسین، سنگ میل، لاہور، 2012ء، ص 31۔

13- نوبل انعام کے ایک سو تیس سال، خالد اقبال یاسر، محمد ارشد رازی، اردو سائنس بورڈ، لاہور، 2004ء، ص 33۔

14- حلقہ ارباب ذوق، یونس جاوید، مجلس ترقی ادب، لاہور، 1984ء، ص 181۔

15- لاہور لاہور اے، اے حمید، ص 135۔

◆◆◆

انمول موتی

اگر آپ واقعی اردو کی بقا کے لئے فکر مند ہیں تو اخبارات، رسائل، جرائد، کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت ڈالیں۔ (ادارہ "تخلیق")

ہندکو زبان کے صوفی شاعر۔ احمد علی سائیں

ناصر علی سیّد

ہر گزرتے ہوئے پل کے ساتھ بڑھتا ہوا اضطراب ہمیں سانس لینے نہیں دے رہا اس کی وجوہ سیاسی بھی ہیں معاشی بھی، معاشرتی بھی اور نفسیاتی بھی۔ دنیا کا عالمی گاؤں میں بدل جانا بھی انسان کے دکھوں کا مداوا نہ کر سکا اور فرد پہلے سے زیادہ اکیلا ہو گیا کیوں کہ اب معاشرہ پہلے کی طرح مربوط نہیں رہا لوگ ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے نہیں ہیں۔ آج سماج کے اندر پیدا ہونے والے بگاڑ نے انسانی رشتوں کو بے وقار کر دیا ہے۔ ہمارے بہت سے دکھوں کا مداوا بھی۔ پھر جس بے چینی اور اضطراب نے ہمارے آنگن میں ڈیرا ڈال رکھا ہے، اس سے نجات حاصل کرنے کا راستہ ہمارے صوفی شعرائے کرام کے کلام کو پڑھے، سمجھے اور اس پر عمل کیے بغیر نہیں مل سکتا۔ وہ شاہ عبداللطیف بھٹائی ہو، سچل سرمست ہو، بابا بلھے شاہ، مست توکلی، سلطان باہو ہو یا رحمان بابا یا سائیں احمد علی۔ ان کے کلام کی صحبت میں وقت گزارنا جتنا آج کے اس حبس زدہ، اضطراب، بے چینی، بے چہرگی، مایوسی اور غیر یقینی صورت حال کے شکار دور میں ضروری ہو گیا ہے شاید کبھی نہ رہا ہو اور ان صوفی شعرا کا پیغام امن و آشتی کا اور صلح و محبت کا پیغام ہے۔ ہر چند کہ ہندکو زبان ایک بہت ہی قدیم زبان ہے مگر بدقسمتی سے ایک زمانے تک اس میں لکھت پڑھت کا کام نہ ہو سکا۔ چند کتبوں پر لکھی زبانوں میں اس کے الفاظ اور عبارتیں تو ضرور موجود ہیں مگر کافی اس زبان کے شعرا کے کلام اور بصیرت سے محروم رہا اور یہ کلام سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں تک منتقل ہوتا رہا۔ ایک تکلیف دہ سچ یہ ہے کہ گزشتہ چار سالوں سے چار دہائیوں سے قبل ہندکو زبان میں کوئی ایک مستند نظم و نثر کی کتاب نہیں شائع ہوئی۔ لیکن ہندکو صوفیا کا کلام نہ صرف لوگوں کو ازبر رہا بلکہ وہ ان کے روزمرہ کا حصہ بنا رہا اور ان میں سے سرفہرست سائیں احمد علی ہیں جو اردو، ہندکو اور پنجابی تینوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ پشاور کو یوں بھی شہر ہفت زبان کہا جاتا ہے۔ اس لیے یہاں کے شعرا ایک سے زیادہ زبانوں میں شعر کہتے تھے اور کہتے ہیں۔ احمد علی سائیں کی شعر گوئی کا زمانہ 1845.50 سے لے کر اپریل 1937 تک کا ہے۔ برصغیر میں یہ ادبار کا دور تھا سائیں کو ایک سچے صوفی شاعر کی حیثیت سے اس بات کا ادراک تھا کہ یہ وقت اپنے لوگوں کی نہ صرف رہنمائی کا ہے بلکہ ان کو ڈھارس دینے کا بھی ہے، پھر معاشرہ میں پیدا ہونے والی بے چینی اور اضطراب نے فرد کو فرد سے دور بھی کر دیا تھا اور ایک دوسرے کے مقابل بھی کھڑا کر دیا تھا۔ تب بہت ضرورت تھی کہ کوئی مسیحا، کوئی نجات دہندہ ان کو حق اور باطل کی پہچان کرائے اور نفرتوں کی بجائے محبتوں کا بیج بوئے۔ یہ صورت حال کچھ یوں تھی

بہت نفرت کی فصلیں کاٹ لیں۔ بڑا ہو بیٹھے   محبت کا دلوں میں بیج اب بونا ضروری ہے

اس لیے سائیں احمد علی کی حرفیوں اور ابیات کا عمومی موضوع تصوف، اخلاقیات اور پند و نصائح کا ہے، وہ اپنے لوگوں کو امن اور آشتی کی طرف لانے اور جنگ و جدل سے دور رہنے کی نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

نہ خوف خداؤں چھوڑ کے تے .... کرنے فی تیر و تفنگ اٹھے

سے کی نیت بے سچ دا وے ڈانگا ...... جیہڑے کس کے کمراں کیوں جنگ اتے
سائیاں روز گے وقت بے گزر گیا .... آیا نے انگ تے رنگ ڈھنگ اتے

سائیں کی حرفیاں اپنے زمانے کے دکھ درد اور بے چینی کی سچی تصویریں بناتی ہیں، انہوں نے اس صنف کے تجربہ کو شعور اور اپنے لوگوں کی محبت کے جذبے کی آبیاری سے مستحکم بھی کیا اور سرسبز و شاداب بھی رکھا اور اپنے تئیں کوشش کی کہ ذاتی سطح پر اور اجتماعی سطح پر ہونے والے ٹوٹ پھوٹ کے شکار معاشرے کے پسے گئے زخموں کو اپنے شعریاں کلام سے رفو کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں:

کھرے کھوٹے نوں نگاہوں پرکھ سکوں ...... نیک وہ دی خوب پچھان رکھناں
دل نوں خواہش نہ قدر کر اوہ دی اے .... نہ کوئی نگاہ اندر قدر دان رکھناں
کے ڈر سے ای تیں ڈول سکدا .... پنجتن آیا دین ایمان رکھناں
سائیاں قدرت نے جو ہر عطا کیتا اے .... پر تاثیر میں اوہدی زبان رکھناں

سائیں احمد علی نے انسانی رشتوں کے بیچ پیچ و پیچ تانے بانے کو نہ صرف خود سمجھا بلکہ اپنے لوگوں کو بھی یاد کرایا کہ جینے کا مزہ اور لطف دوسروں کے لئے سکھ حاصل کرنے میں ہے، اس وقت سانس کی آمد و رفت عبادت بن جاتی ہے جب اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں کے لئے انسان سوچنا شروع کرتا ہے اسی طرح انہیں یہ کمال بھی حاصل رہا کہ عشق کے پیچیدہ اور ادق تجربہ کو سہولت کے ساتھ شعر کا روپ دے کر اپنے کلام کو بامعنی اور پرتاثیر کر دیتا۔ ایک طرف ماضی کی اقدار اور تہذیبی روایات کو برتتے ہوئے اس دور کے الفاظ کو نئے معانی پہنا کر اپنے کلام کو ایک وقار بخشا تو دوسری طرف اپنے دور کی نفسیاتی تہہ داریوں اور سماجی اقدار کو قدیم لغت میں ڈھال کر اپنی حرفی کو نیا رنگ ڈھنگ اور آہنگ دے کر ثروت مند بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ سائیں احمد علی ایک امی شاعر تھے مگر ان کے شعر، ان کی لفظیات، ان کی تراکیب، استعارے، علامتیں اور تشبیہات بالکل ایک الگ کہانی سناتے ہیں۔

میں شمس تے قافلے دے وچ تکے .... جناں تکتے پچھاڑ دے او دور لے گئے
جناں سر چھپائے اپنا سرتہ پائے .... جناں سر دتا او سر ضرور لے گئے
دے اک دے بوالہوس ہوس کردے .... مغز معنوی صاحب شعور لے گئے
تو بھی اس طراں لے جا سوغات سائیاں ...... جس طراں دار تے چڑھ کے منصور لے گئے

اسی طرح ان کی ایک حرفی کا ایک مصرع دیکھئے جس میں وہ محبوب کی زلفوں کی تعریف کرتے ہیں اور محبوب کے گھنگھور گھٹاؤں جیسے سیاہ گیسوؤں کی بات کرتے ہوئے محبوب کے سر کی مانگ کا ذکر تلمیحی انداز میں کرتے ہیں تو تیر ان کی لفظیات کا استعمال کرتے ہیں، ذرا دیکھئے فرماتے ہیں:

کوئی گور سکندر تے جا کوکے ...... خضر اک پئی سوہے ظلمات وچوں۔

پھر یہ تعلی بھی دیکھئے

میں کے ملک دا نہیں ...... نہ حکم نہ شاہی فرمان رکھناں

عالمگیر جہی زندگی بسر کراں۔۔۔۔۔عالمگیر جیسا قصد ان رکھاں
تیں دست منوں دشمن لغد کچے۔۔۔پے دشمن دے گو بر تھلاں رکھاں
سائیاں جدھر جاواں "بی بی" کوک کردے۔۔۔عزت آبرو وچ جہاں رکھاں

دیگر صوفی شعراء کی طرح احمد علی سائیں پشوری بھی خالق اور مخلوق کے مابین فاصلے پاٹنے میں اپنا بھرپور کردار ادا کرتے ہیں۔ اور اپنے اشعار کے ذریعے اپنے پڑھنے والوں کی اخلاقی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ اور تصوف، عشق حقیقی کے ادق مسائل و مراحل کو سادہ اور موثر انداز میں اپنے اشعار میں ڈھالتے ہیں وہ بھی قاری کی سطح پر آ کر ابتدائی سطحیں مگر رنگین لفظیات کے ساتھ اس سے مکالمہ کرتے ہیں اور بھی اس کو اپنی عالمانہ بزرگی سے آشنا کرتے ہوئے پڑھنے والے کو اپنی سطح پر لے آتے ہیں۔ مگر ہر دو صورتوں میں وہ اس دنیا کو خوبصورت بنانے اور دیکھنے کے خواہاں نظر آتے ہیں، وہ میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے کی رٹ تمام تر اپنے لوگوں کی ایک پر امن مثالی معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے لئے شعر کے ذریعے تہذیب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں زندگی کے سارے رنگ نکھرے ہوئے لگتے ہیں جنہیں وہ غالب کی طرح شگفتگی سے برتتے ہیں اور اپنے شعر کا سارا منظر نامہ امن و سکون اور محبت کے سبز اور نیلے رنگ کا کر دیتے ہیں۔ صوفی شعراء کی صف میں وہ اپنی انسان دوستی اور وحدانیت کے سچے پرچارک کی حیثیت سے اپنی پہچان کرا چکے ہیں اور شاعری میں ان کے مقام کے تعین کے لئے ان کے یہی دو مصرعے کافی ہیں۔

اتھے ہر دے گھراں خیال سائیاں اتھے کنجی نہ باد صبا دی اے

◆◆◆

ضروری گزارشات

اپنی غیر مطبوعہ تخلیقات روانہ کرتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کا خصوصی خیال رکھیں۔

(۱) تخلیقات صاف لکھی ہوں تاکہ کمپوز کرتے وقت کوئی دقت نہ آئے۔

(۲) مختلف رسائل و جرائد میں چھپی تخلیقات کی فوٹو کاپی، رسائل و جرائد کا نام کاٹ کر بھیجنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔

(۳) ناقابل مطالعہ، بکھیں یا فوٹو سٹیٹ کی ہوئی کاپیاں نہ بھیجی جائیں۔

(۴) تخلیقات پر اپنا نام، پتہ اور موبائل فون نمبر ضرور درج کریں، فوٹو گراف بھی ساتھ رکھنا نہ بھولیں۔

(۵) توصیفی مضامین اور کتابوں پر تبصرے بھیجنے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔

مغلیہ عہد میں راسخ الاعتقادی کا اُبھار

......2......

ظفر سپل

''...... نیاز و عاجزی سے توجہ کرنے کے بعد جب اس پہلے مقام سے اوپر کے مقام میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ حضرت ذوالنورینؓ کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی اس مقام میں عبور واقع ہے۔ یہ مقام بھی تکمیل و ارشاد کا مقام ہے اور ایسے ہی اس مقام سے اوپر کے دو مقام بھی جن کا اب ذکر ہوتا ہے، تکمیل و ارشاد کے مقام ہیں اور اس مقام کے اوپر ایک اور مقام نظر آیا۔ جب اس مقام پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہ حضرت فاروق اعظمؓ کا مقام ہے اور دوسرے خلفا کا بھی وہاں عبور واقع ہوا ہے اور اس مقام سے اوپر حضرت صدیق اکبرؓ کا مقام ظاہر ہوا۔ بندہ اس مقام پر بھی پہنچا اور اپنے مشائخ میں حضرت خواجہ نقش بند قدس سرہٗ کو ہر مقام میں اپنے ہمراہ پاتا تھا ...... اس مقام کے اوپر سوائے آنحضرتؐ کے اور کوئی مقام معلوم نہیں ہوتا اور حضرت صدیق اکبرؓ کے مقابل ایک اور نہایت عمدہ نورانی مقام کہ جیسا کبھی نظر میں نہ آیا تھا، ظاہر ہوا اور وہ مقام اس مقام سے تھوڑا سا بلند تھا جس طرح کہ صفہ کو سطح زمین پر ذرا بلند بناتے ہیں۔''

(مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، مکتوب یازدہم)

یہ بلا مبالغہ صوفیانہ انانیت کی انتہا تھی!

ذرا پیچھے ہٹ کر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کی وفات 1603ء میں ہوئی۔ دو سال بعد 17 اکتوبر 1605ء کو اکبر کا انتقال ہوا تو جہانگیر تخت نشین ہوا جسے باپ کے مذہبی، سیاسی منصوبوں سے اگرچہ غرض نہیں تھی مگر اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ اس کے اندر کا 'بادشاہ' مرا نہیں تھا سو حضرت مجدد کو سخت ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔

ان کے مرشد خواجہ باقی باللہ تو پہلے ہی انہیں کشفی واقعات کے اظہار سے منع کرتے رہتے تھے تاکہ لوگ غلطی میں نہ پڑ جائیں اور ان کے عقیدے سے نہ بگڑ جائیں۔ اب ان کے ہم عصر شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے ان سے دوستی، محبت اور اکرام کے باوجود ان پر اپنی تحریروں میں سخت تنقید کی۔ دراصل شیخ عبدالحق باوجود صوفی ہونے کے اپنے روحانی مشاہدات کے اظہار میں انتہائی محتاط تھے اور ان کا یہی رویہ اس مقام پر انہیں احمد سرہندی سے بلند تر بھی کرتا ہے۔

جب شیخ احمد سرہندی کو صورت حال کی نزاکت کا علم ہوا تو انہوں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا:

''میں نے اصل خط اپنے مرشد کے نام لکھا تھا اور اس سلسلے کا اصول یہ ہے کہ مرید کو جتنے بھی واقعات پیش آئیں گے

ہوں یا قسم۔ یہ تھا شاانہیں مرشد کے حضور میں عرض کر دینا چاہیے تاکہ غیر صحیح ہونے کی صورت میں ان کی تعبیر ہو سکے۔''

مگر اعتراض کرنے والے اپنے موقف کے ساتھ موجود تھے، حتیٰ کہ ان کے چند مریدین بھی احتجاجاً ان سے علیحدہ ہو گئے۔ جب انہوں نے اپنے ناراض مرید مرزا شیخ علی گیلانی کو ایک مفصل خط لکھا اور واضح کرنے کی کوشش کی کہ وہ ہرگز اپنے آپ کو حضرت صدیق اکبرؓ سے افضل نہیں سمجھتے۔

دوسری طرف دربار جہانگیر تھا جو شیخ احمد سرہندی کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا۔ دربار میں موجود کچھ عناصر نے معاملے کو مزید نمک مرچ لگا کر پیش کیا۔ سو شیخ احمد سرہندی کو دربار میں طلب کیا گیا اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ جہانگیر ان سے بے ادبی سے پیش آیا مگر آپ نے وہی جواب دیا جو پیچھے بیان ہو چکا ہے اور مثال دیتے ہوئے کہا کہ:

''آپ کسی ایک ادنیٰ آدمی کو خدمت کے لیے بلائیں اور اس سے اندرونِ خانہ اسرار کی باتیں کریں تو وہ لامحالہ پنج ہزاری امراء کے مقام کو طے کر کے پیشی تک پہنچے گا اور پھر اپنے مقام پر واپس جا کر کھڑا ہو جائے گا۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کا مرتبہ امرائے پنج ہزاری سے زیادہ ہو جائے۔''

اب اگر معاملے کی نوعیت محض مذہبی ہوتی تو جہانگیر کو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا مگر جہانگیر چونکہ اس کے سیاسی مطالب بھی اخذ کر رہا تھا اس لیے انہیں گوالیار کے قلعے میں بند کر دیا گیا۔ شیخ یہاں ایک سال تک قید رہے۔ یہ ظاہر ہے کہ سخت آزمائش کے دن تھے مگر شیخ احمد سرہندی اس بجلی سے کندن بن کر نکلے۔ انہوں نے اپنے مکتوبات میں اپنے جس ردِعمل کا ذکر کیا ہے، وہ نہایت وجد آور، دلکش اور دل ربا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: ''محبوب کی جفا اس کی مہربانی سے زیادہ دل آویز ہوتی ہے۔''

کہا جاتا ہے کہ رہائی کے بعد جہانگیر ان سے نہایت مہربانی سے پیش آیا، اپنے کیے پر معافی مانگی اور انہیں اجازت دی کہ وہ چاہیں تو گھر چلے جائیں، چاہیں تو لشکر کے ساتھ رہ کر تلقین و ہدایت کا سلسلہ جاری رکھیں۔ شیخ نے دورانِ اسیری بھی بہت سے غیر مسلموں کو مشرف با اسلام کیا تھا اور اب بھی انہوں نے مناسب سمجھا کہ لشکر کے ساتھ رہ کر اپنا مشن جاری رکھیں۔ مگر یہاں بھی نظر آتی ہے کہ جہانگیر کا بیان ذرا بھی پیچیدہ تھا اور اس نے آخر دم تک حضرت احمد سرہندی کو اپنی نظروں کے سامنے رکھا اور جب وہ لشکر سے رخصت ہو کر اپنے گھر جاتے تھے تو جہانگیر کی اجازت سے جاتے تھے۔

اب ہم شیخ احمد سرہندی کے تحقیقی فکری کارنامے کی طرف آتے ہیں اور یہ نظریہ وحدت الشہود کا اعلان ہے!

تاریخ تصوف میں نظریہ وحدت الوجود نے روزِ اول سے راج کیا ہے۔ خود شیخ شروع دن سے اسی فلسفے کے اسیر تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے کہہ دیا کہ ''—— اور اس کے بعد صرف عدم ہے'' مگر روحانی ارتقاء کے سفر میں ان پر کھلا کہ فلسفۂ وحدت الوجود روحانی سفر میں قیام کا ایک مقام تو ہو سکتا ہے، منزل ہرگز نہیں۔ جب انہوں نے فرمایا ''مقام وحدت الوجود سالک کو ابتدائے سلوک میں پیش آتا ہے، جس سے اسے گزر جانا چاہیے اور جو شخص اس سے بالاتر مقام پر عروج کرتا ہے، اس پر مقام وحدت الشہود منکشف ہوتا ہے جو شرع کے عین

مطابق ہے۔''

شیخ احمد سرہندی نے اپنے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ نظریہ وحدت الوجود محض ایک ذات کو موجود جانتا ہے اور اس کے غیر کو معدوم خیال کرتا ہے یعنی کہ ''ہمہ اوست'' یا ''ہمہ از اوست''۔ جبکہ نظریہ وحدت الشہود محض ایک ذات کو (کی طرف) دیکھتا ہے، یعنی سالک کا شہود صرف ایک ذات ہو اور اس سے کہلوائے کہ ''ہمہ از اوست''۔

شیخ احمد سرہندی جو فلسفۂ وحدت الوجود پر راسخ الاعتقاد حلقوں کے اعتراضات سے واقف تھے، اپنے نقطۂ نظر کو مذہبی جواز فراہم کرتے ہوئے کہا کہ کسی پیغمبر نے فلسفۂ وحدت الوجود کی طرف نہیں بلایا۔ سب کی دعوت وحدتِ معبود یا ایک معبود کی طرف رہی ہے۔

برصغیر کی مذہبی روحانی تاریخ میں یہ ایک انتہائی اہم اور نتیجہ خیز پیش رفت تھی۔ وہ خود ایک صوفی تھے۔ انہوں نے تصوف کا انکار نہیں کیا مگر فلسفۂ وحدت الوجود کا انکار کر کے انہوں نے تصوف کو راسخ الاعتقادی کا ہمنوا بنا دیا ـــــ وہ تصوف جو ہمیشہ سے اس کا مد مقابل رہا تھا۔ اگر بغور دیکھا جائے تو یہ نظریہ وحدت الوجود ہی تھا جو آزاد خیالی کو وجہیں فراہم کرتا تھا۔ شیخ احمد سرہندی نے نظریہ وحدت الشہود کے ذریعے آزاد خیالی کے اس حقیقی منبع پر کامیاب وار کیا۔ اس لحاظ سے انہیں مجدد الف ثانی قرار دینا ہرگز مبالغہ آمیز نہیں ہے۔

یہ غیر معتدل آزادروی اور وسیع المشربی اور روشن خیالی پر راسخ الاعتقادی کی عظیم فتح تھی!

تاریخ کے ان ایام میں جب ہندوستان میں احیائے ہندومت کی تحریک نہایت جارحانہ لب و لہجہ اختیار کیے ہوئے تھی، نظریہ وحدت الوجود اپنے اس اعلان کے ساتھ کہ تمام مذاہب سچے ہیں اور ایک ہی منزل کی طرف لے جاتے ہیں، اسلامی نظریے کا دست و بازو بننے میں ناکام رہا تھا۔ ایسے وقت میں ایک ایسے نظریے کی اشد ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو اسلامی پرچم کو دوبارہ بلندیوں پر لہرا دے۔ یہ سعادت تصوف کے سلسلۂ نقشبندیہ کا مقدر ہونا لکھی تھی سو ہوئی۔ نظریہ وحدت الشہود کا ایک سماجی، اخلاقی اور ادبی پہلو بھی ہے!

نظریہ وحدت الشہود کا ایک سماجی، اخلاقی اور ادبی پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ نظریہ وحدت الوجود انسان کو بے جا خود اعتمادی، بے جا خود پرستی اور انانیت کے معیار پر لے جا کر ''انا الحق'' کے اعلان پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ ایسے گنبدِ بے در میں محصور ہوتا ہے جہاں نام نہاد ''مکمل انسان'' کی صرف تنہائی بولتی ہے۔ اس کے برعکس نظریہ وحدت الشہود انسان کو ''انا عبدہ'' کے مقام پر فائز کر کے اس دکھ بھری دنیا کو ویسا ہی قبول کرنے کی صلاحیت عطا کرتا ہے، جیسا کہ وہ ہے اور تنہائی اور بے بسی کے لمحوں میں اسے اللہ کا ایک نہایت مضبوط نفسیاتی سہارا عطا کرتا ہے۔ یہ محض ایک فلسفیانہ بیان نہیں ہے اور نہ شیخ کے لیے تھا ـــ شیخ احمد سرہندی نے ناقابلِ تبدیل حقیقت کو قبول کرنے اور رنج و الم کا آنسوؤں اور مسکراہٹ سے بیک وقت استقبال کرنے کا عملی ثبوت فراہم کیا۔ مارچ 1616ء کے آخری ہفتے میں چار روز کے اندر اندر آپ کے گھر سے کئی جنازے نکلے۔ دراصل ان دنوں طاعون کی وبا زوروں پر تھی۔ حضرت مجدد کے اہل خانہ میں سے پہلے ان کی صاحبزادی ام کلثوم اور دو کم عمر صاحبزادے محمد فرخ اور محمد عیسیٰ اس بلا کا شکار ہوئے۔ پھر ان کے بڑے صاحبزادے خواجہ محمد صادق (عمر 25 سال) جو خود ایک بڑے عالم، صاحبِ حال صوفی اور حضرت مجدد کے جانشین تھے، لقمۂ اجل بنے۔ یہ ایسے اندوہناک اور حوصلہ شکن واقعات تھے کہ بڑے سے بڑا آدمی لڑکھڑا جاتا مگر حضرت مجدد نے جس استقامت، بلند حوصلگی اور تسلیم و رضا کا ثبوت فراہم کیا وہ اقبال ان

کے بڑے ہونے کی دلیل ہے۔ ایک تعزیت نامے کے جواب میں وہ مرزا حسام الدین کو لکھتے ہیں:

"اس مصیبت میں جو صبر و شکر حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ نے اس طلب ضعیف کو عطا کیا، وہ بڑی نعمتوں اور اعظم انعامات میں سے ہے۔"

حضرت خواجہ باقی باللہ کہا کرتے تھے کہ "میں چراغ نہیں، چقماق ہوں۔ آگ نکال دوں گا، چراغ شیخ احمد سرہندی ہیں۔" یہ چراغ گو تا دم آخر اپنی روشنی سے ایک عالم کو منور کرتا رہا مگر اسیر جبر رہا۔ آپ جہانگیری لشکر سے رخصت لے کر سرہند جاتے اور وقت مقررہ پر واپس آ جاتے۔ 1622ء میں آپ لشکر کے ساتھ ہی اجمیر شریف تشریف لائے۔ یہاں آپ نے خواجہ معین الدین چشتی اجمیری کے مزار پر دیر تک مراقبہ کیا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خواجہ نے حق مہمانی ادا کیا۔ طرح طرح کی ضیافتیں ہوئیں اور بہت سی اسرار کی باتوں کا ذکر ہوا۔"

مزار کے خادمین نے حضرت خواجہ کے مزار کا قبر پوش آپ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے عقیدت سے چوما اور فرمایا کہ یہ پارچہ حضرت خواجہ کے بہت نزدیک رہا ہے، اس واسطے کفن کے لیے بہتر ہے۔ اب ظاہر ہے، عمر زیادہ ہو رہی تھی اور ضعف بڑھ گیا تھا۔ اس لیے سفر باعث تکلیف رہتا تھا۔ سو آپ نے بادشاہ سے مکمل رخصت لی اور سرہند تشریف لے آئے۔ 10 دسمبر 1624ء (بمطابق 28 صفر 1034ھ) کو یہ بندۂ خدا اپنے فرائض کی کمال ادا آوری کے بعد دربار محبوب میں حاضر ہو گیا، وہ محبوب جس کے بارے میں آپ فرمایا کرتے تھے کہ محبوب کی جفا اس کی مہربانی سے زیادہ دلآویز ہے۔

وصال سے چند روز قبل لکھے گئے مکتوبات میں انہوں نے ایک بامعنی فقرہ بار بار نقل کیا ہے — "استغنی وے چلے"

وصال سے قبل آپ نے کثرت سے خیرات دی۔ لوگوں نے گمان کیا کہ شاید یہ دفع بلیات کے لیے صدقہ ہے مگر آپ نے حقیقت حال کے لیے ہندی کا یہ شعر پڑھا:

آج بلاوا کنت سوں سکھی سب جگ دیوال وار

[سکھی! آج ملن کا دن ہے۔ دل چاہتا ہے اس خوشی میں ساری دنیا وار دوں] (ختم شد)

◆◆◆

معروف شاعر و نقاد پروفیسر قیصر نجفی کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ

لفظ بولتے ہیں

شائع ہو گیا ہے

صفحات 224 قیمت -/400 روپے

پبلشر: اکادمی بازیافت، M-17، کتاب مارکیٹ، سٹریٹ 3، اردو بازار، کراچی

(فون: 021-32751324, 03333980987)

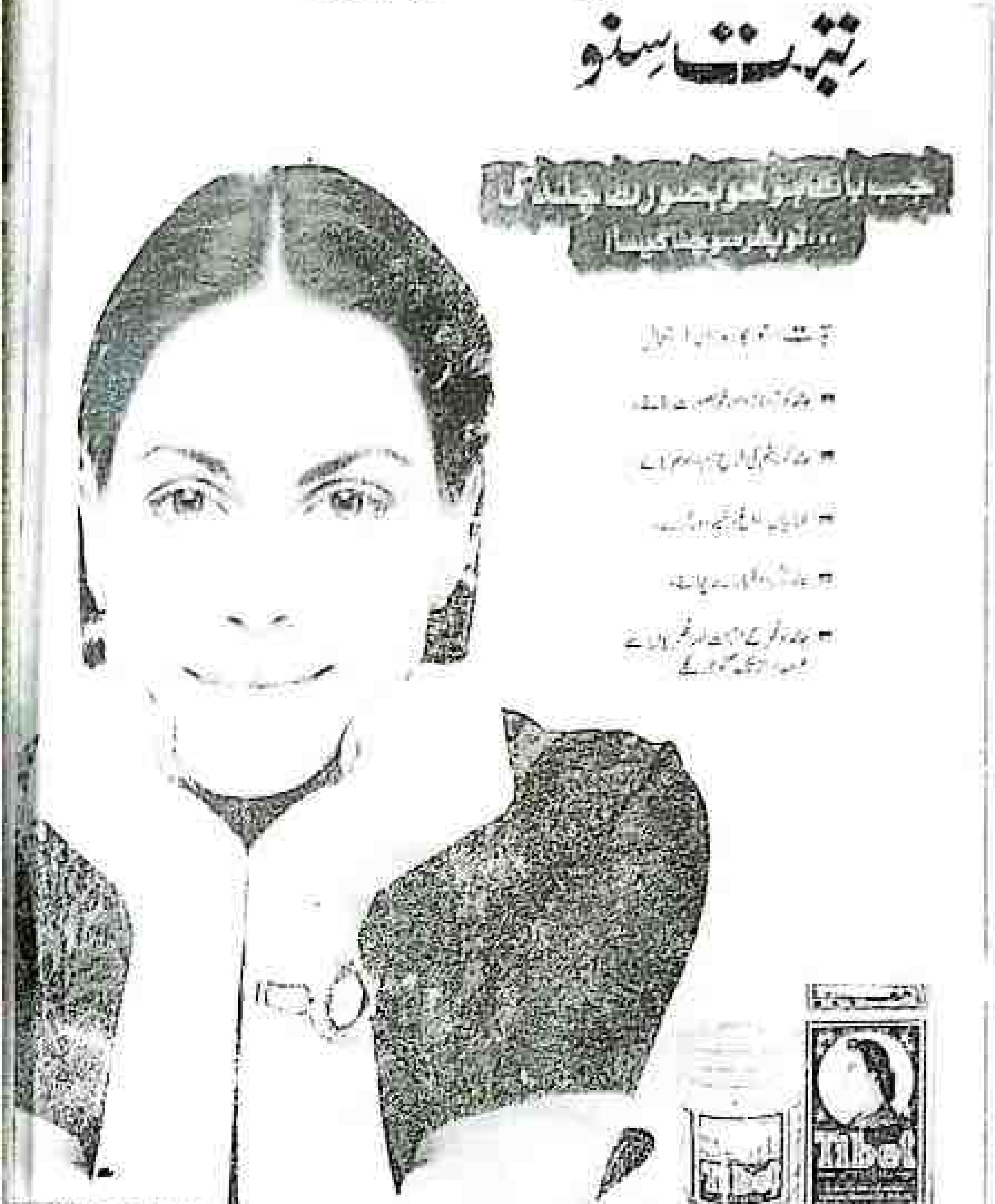
تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت چہرے کی
... تو پھر سوچنا کیسا!
Tibet

منظومات

ستیہ پال آنند

مداوا

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
کرتی
[illegible]
[illegible]
[illegible]
جاتے تھے

[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

○○○

پروین شیر

شکست

آئے جب کبھی آئینے سے
"تمہاری یہ سوکھی ہوئی انگلیاں کانپتی ہیں
نگہ سے بھی پر ہاتھوں میں اب لرزشیں ہیں
نگاہیں بھی دھندلا رہی ہیں
قدم ناتواں ہیں
بہت تھک چکے ہیں
سماعت بھی اب بے وفا ہوگئی ہے
کہ اب تم [illegible]
ذرا اپنا چہرہ بھی دیکھو تو دیکھو
مسافر! سفر کیسے پورا کرو گے"
یہ سن کر محبت سے وہ ہنس دیا اور
بہت ناز سے عزم کا اپنے
یوں اس سال بیٹے کو دیکھا
[illegible]
قوی مٹھیاں اور قدم مضبوط اور
مگر اس نے چلنا تو چاہا
لئے اور دو قدم سے
گرا گر کر
شکستہ سا اب آئینہ رہ گیا تھا!

○○○

حسن عسکری کاظمی

حرفِ تمنا

آج کا سورج کل بھی نکلے
یہ سوچ لئے
اس دھرتی پر سورج کی سب کرنیں
اور پیار بچھائیں
آتے جاتے موسم اپنا رنگ جمائیں
[illegible]
مستقبل کے بچوں کی معصوم ادائیں
آنے والی صدیوں کی [illegible]
میرے وطن کی دوشیزائیں
قوس قزح کی انگڑائی کا حسن لٹائیں
جھولا جھولیں، پینگ بڑھائیں
پاک وطن کے پاک سپاہی
سرحد سرحد ہر خطرے پر کان لگائے
پہرہ دیں گے
صدیوں بعد بھی [illegible]
پاک زمیں کی مانگ سجے گی
آنے والی نسلوں کے چہروں پہ سورج لکھا ہوگا
آج کا سورج کل بھی نکلے
یہ سوچ لئے!

○○○

کرامت بخاری

اگر تم بیچنا چاہو

اگر تم بیچنا چاہو
اور میں بھی وفا میں بھی
حسین قوموں کے رنگوں کی روایتیں بھی
بیچ آتا ہے
یہاں آواز بکتی ہے یہاں تصویر بکتی ہے
یہاں پہ حرف کی حرمت یہاں تحریر بکتی ہے
[illegible]
یہاں پہ کشتیاں ساحل پہ آ کر ڈوب جاتی ہیں
[illegible]
مگر [illegible] جاتی
یہ انسانوں کا جنگل ہے
اور اس جنگل میں جنگل کا [illegible] رہتا ہے
اگر تم بیچنا چاہو
اور میں بھی وفا میں بھی
حسین قوموں کے رنگوں کی روایتیں بھی
مرے دل میں بھی اک بازار رہتا ہے
جہاں پر شام ہوتے ہی ہجوم یاس ہوتا ہے
غموں کی بھیڑ لگتی ہے
کئی یوسف مرے بازار بکتے ہیں
اگر تم بیچنا چاہو!

OOO

اخلاق عاطف

ملکہ ترنم

[illegible]
کہ جس کے حسن فن پر [illegible] کا راج تھا
[illegible] کا تخت تھا [illegible] کا تاج تھا
کہ اس کا [illegible] سروں کی سب لطافتوں کی لاج تھا
جہاں بھر میں اس کا فن [illegible] کا مان تھا
[illegible]
[illegible] آج کھو گیا
[illegible] آج سو گیا
[illegible]
اجڑ گئی ہیں سب دھنیں، اب اس کے بعد کیا نہیں
کسے کہیں، کہاں کہیں؟
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

OOO

شعلہ چنگیزی (کینیڈا)

لڑیں گے

[illegible]

OOO

مشرق صدیقی

تجدیدِ وفا

یہ سرزمینِ پاک تقدس مآب ہے
اسلامیانِ ہند کا دیرینہ خواب ہے

لاکھوں شہید سیکڑوں ماؤں کے خون سے
دھرتی کا ذرہ ذرہ بھی آفتاب ہے

قرآن ہے ہمارے لئے اک کتاب پاک
سوچو تو یہ زمیں بھی سیکھنے کا باب ہے

ماؤں کی دعا ہے بہنوں کی ردا ہے یہ
ہر ذرہ اس کا اپنی جگہ آفتاب ہے

پہچان بھی وطن سے ہے عزّ و وقار بھی
تجدیدِ عہدِ وفا سے حسیں خواب ہے

کہسار، طرب ہیں تیری نگاہ تیز
ہے ملک سے مثال زمیں لاجواب ہے

کرتے ہیں تجھ سے عہد اے خوابوں کی سرزمیں
قربان تجھ پہ جان بھی ہے جسم سے دل بھی

OOO

سیفی سرونجی (انڈیا)

نظم

اب کے برس
بارش نے
وہ ظلم ڈھائے
کہ میرا اچھا سا
آشیانہ
تنکوں کی طرح بہہ گیا
اور میرا قیمتی سرمایہ
قیمتی کتابیں رسالے
سب ضائع ہو گئے
اور میں ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا
لیکن یہ بھی لگتا ہے
کہ آج برسوں کے بعد میں چین سے سو رہا ہوں

OOO

امر مہکی

وعدہ خلافی

اس نے کیا تھا ملنے کا
برسات کے موسم میں
رات کے پچھلے پہر
موسم ہوا، برسات ہوئی
دن ڈھلا، شام ڈھلی، رات ہوئی
ایسی رات کہ جس کی صبح نہیں ہوئی
اس کی وعدہ خلافی پہ آنکھ بہت روئی

OOO

کرن اُجالا

دوسرا رُخ

اس نے کہا مجھ سے
میں تو فقط اس کی ہوں
اس کے سوا کوئی مجھے
"تک" نہیں سکتا
اسے حق ہے کہ وہ مجھ میں
ترمیم کوئی بھی کر ڈالے
اسے حق ہے
وہ جب چاہے
میرا عنواں بدل ڈالے
میرا چہرہ بدل ڈالے
اسی کے ہاتھ میں ہے
کہ جو فیصلہ کر دے
کہ مجھ کو کیسے چھپنا ہے
چھپانے میں مزا ہے
کہ میں جاگیر اس کی ہوں

کیا پھر فیصلہ اس نے
میرا عنواں بدل ڈالا
میں جس کاغذ پہ لکھی تھی
ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اس کو
میرے ٹکڑے فضاؤں میں اچھالے
اور
نیا کاغذ منگوایا
نئی اک نظم لکھ ڈالی

OOO

افسانے

گورپچ

آغا گل

مختصر تعارف

آغا گل 19 نومبر 1951ء بروانی بلوچستان میں پیدا ہوئے۔ 23 کتابیں فکشن پر لکھیں۔ 12 افسانوی مجموعے اور 3 ناول منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ناول "دشت وفا" اور افسانوی کتاب "دوسری بابری مسجد" کو خوب پذیرائی ملی۔ 2012ء میں شائع ہونے والی افسانوی کتاب "پہرہ" کو 2017ء میں بلوچستان حکومت نے بہترین کتاب کے ایوارڈ سے نوازا۔

شیک نے ہوش سنبھالتے ہی بس دیکھا کہ بابا دور دراز شہروں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ گھر کی ساری ذمہ داری بوڑھے دادا پر آن پڑی تھی۔ دادا دن بھر اپنے حجرے میں عقیدہ تلاوت اور ذکر فکر میں مصروف رہا کرتے۔ محض باجماعت نماز پڑھنے کے لئے باہر نکلا کرتے، ورنہ تو اپنے میں مگن رہتے۔ ان کے پاس قرآن حکیم کے بہت سے نسخے تھے۔ چھپے ہوئے بھی اور قلمی بھی۔ کبھی کبھار وہ شیک کو پاس بیٹھا کر مولانا دین محمد پدروانی کا 1916ء والا نسخہ نکال لیتے، جو براہوی میں کلام اللہ کا اولین ترجمہ ہے اور نہایت شفقت سے روانی کے ساتھ براہوی ترجمہ پڑھتے چلے جاتے اور رک رک کر شیک کو مزید وضاحت سے سمجھاتے بھی رہتے۔

راتوں میں دادا باآواز بلند آیات پڑھتے، گھر کی اداس اور کبھی ٹھٹھری زندگی میں ایک نئی روح دوڑ جایا کرتی۔ بپھرے ہوئے اونٹ کی مانند سرکش ہوائیں کواڑ پہ دستک دیتیں تو ماں کا چہرہ ملول ہونے لگتا۔ اس کے ہاتھوں میں ارتعاش سا پیدا ہو جاتا۔ بلوچی کشیدہ کاڑھتی اس کی حسین مخروطی انگلیاں یکدم بے قابو ہونے لگتیں دادی چونک کر اٹھ بیٹھتی۔ جلدی سے دوپٹہ اوڑھے الاؤ ایک جانب پھیلا کر وہ ہاتھ میں لالٹین لیے برہنہ پا صحن سے گزرتی دروازے کی جانب لپکتی۔ ساتھ ساتھ شیک بھی دوڑا چلا جاتا۔ ایک اضطراب، بے چینی اور مسرت سے دادی دروازے کی زنجیر کھولتی تو ہواؤں کے ریلے سے دروازے کے دونوں پٹ بے تاب بازوؤں کی مانند کھل جاتے۔ باہر سائیں سائیں کرتے اندھیرے اور سرکش ہواؤں کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ سورگز (بید مجنوں) اور قد آور درخت ہواؤں سے الجھتے ہوتے اور زرد جھاڑیاں ہواؤں کے دوش پر ادھر ادھر سرگرداں پھرتیں جیسے انسان قسمت کے ہاتھوں ٹھوکریں کھاتا ہے۔ دور آماچ کی چوٹیوں سے گیدڑوں اور کبھی کبھار بھیڑیوں کی آوازیں آیا کرتیں۔

سورگز کے جنگل ہواؤں کے ریلے اپنے سینے پر روک لیتے "جانے یہ ہوائیں کیوں باقی ہیں، میرے بابا کی طرح وحشی

بدیس مارا مارا پھرتی ہیں۔ نہ مسکن نہ مکان" وہ اکثر سوچا کرتا "مگر انہیں نہ تو بھوک لگتی ہے اور نہ ہی پیاس۔ پولیس بھی انہیں نہیں پکڑتی۔ بابا جانے اب کہاں ہوں گے؟ شاید بھوکے، شاید پیاسے، سردی میں کانپتے کہیں ویران پہاڑی راہوں میں بڑھتے ہی چلے جا رہے ہوں گے۔"
بابا ان جانے والوں کی طرح بستی بستی قریہ قریہ گھومتے پھرتے کبھی نال میں میر غوث بخش بزنجو کے پاس کبھی زہری میں سردار دودا خان زرکزئی کے ہاں جن کا بیٹا رسول بخش ٹھیک ہی کا ہم عمر تھا۔ پھر سا تھ ہی مینگل زئی، جمال زئی اور بادینی قبائل سے ملتے ہوئے، وہ میر گل نصیر کے ہاں کلی مینگل میں جا پناہ لیتے۔ گل خان، خوبصورت چمکتی آنکھوں والا وہ بے مثل شاعر جسے آزادی افکار اور وطن دوستی کے جرم میں متعدد بار عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ جس کی زندگی کے جوان دن ملک کی مختلف جیلوں کی کال کوٹھڑیوں میں گزر گئے۔ ٹھیک کے دونوں ماموں بھی پہاڑوں میں روپوش تھے۔ چھوٹے بی اے میں تھے اور بڑے ایم اے فائنل میں کہ پہاڑوں نے انہیں نگل لیا۔ تقدیر بڑی بلوان ہے۔ کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔ ایسی طوفانی راتوں میں بابا کہاں ہوں گے؟ ماموں کس حال میں ہوں گے۔ وہ سوچ سوچ کر ہراساں ہوتا رہتا اور کسمسا کسمسا دادی کے لحاف میں پناہ لیتا۔ باہر تاریک اور بھیانک رات دالان کے گھر کے مکینوں کا دل ہلا کرتی۔ ساتھ کے کمرے میں دادا کی پُر رعب آواز بلند ہوتی رہتی۔ قرآن حکیم رحل پر رکھے سر کو ہلکا سا جھکائے وہ تلاوت کرتے ہی چلے جاتے۔ گوریچ ان کے گھر کو نرغے میں لے لیتی اور سر پٹختی رہتی۔ ٹھیک ڈرتے ہوئے خوف، عدم تحفظ اور اداسی کو دور کرنے کے لئے اپنی پوری توجہ دادا کی آواز پر مرکوز کر دیتا۔

"بکھیرنے والیوں کی قسم، جو اڑا کر بکھیر دیتی ہیں، پھر بوجھ اٹھاتی ہیں، پھر آہستہ چلتی ہیں، پھر چیزیں تقسیم کرتی ہیں۔"

"اور عاد نے بھی تکذیب کی تھی۔ سو ہمارا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا۔ ہم نے ان پر سخت منحوس دن میں آندھی چلائی اور وہ لوگوں کو اکھیڑ ڈالتی تھی۔ گویا اکھڑی ہوئی کھجوروں کے تنے ہیں۔"

"لوط کی قوم نے بھی ڈر سنانے والوں کو جھٹلایا تھا، تو ہم نے ان پر کنکر بھری ہوا چلائی۔ مگر لوط کے گھر والوں کو ہم نے پچھلی رات ہی بچا لیا، اپنے فضل سے۔"

ہوا میں ایک ایک بستی میں ڈراتی پھرتیں۔ روزی، گن تی، علی، تیری، وہ گھگی۔ کنکور، چکل، ٹالک، کوفلنٹ، پٹے، باغ اور جانے کہاں کہاں۔

ایسی ہی سرد راتوں میں دادی اسے بہت سی کہانیاں سنایا کرتی۔ گوریچ بھی شاید یہی قصے کہانیاں سننے کے لئے دیوار سے کان لگا دیتی۔ تو ان کا گھر کانپنے لگتا۔

"یہ گوریچ ہمارے گاؤں میں بار بار کیوں آتی ہے۔"

دادی اس کے بچگانہ سوالوں کا نہایت سنجیدگی اور متانت سے جواب دیا کرتی ایسے اعتماد اور اتنے یقین سے دادی بڑی ناقابل فہم کہانیاں سنایا کرتی کہ یقین سا آ جاتا۔ تمام چیزیں حقیقی محسوس ہوا کرتیں۔ جنہیں وہ دیکھ سکتا تھا۔ چھو سکتا تھا۔

دادی کہا کرتی "شمال کی جانب اگر بڑھتے ہی چلے جائیں۔ ایک تیز رفتار اونٹ پر، جو شاہ مرید کے اونٹ کی طرح جوان ہمت اور ان تھک ہو تو سالوں کا سفر طے کرنے کے بعد برف کی دنیا آتی ہے۔ وہاں زمین کا کنارہ ہے۔ زمین اور آسمان آپس میں

جا سکتے ہیں۔ بہت ہی بڑے بڑے برف کے صحرا ہیں۔ وہاں نہ صبح ہوتی ہے نہ شام، بس ایک ہی روشنی پھیلی رہتی ہے۔ یہ سرد ہوا جسے ہم گورچ کہتے ہیں۔ ان ہی بخ بستہ صحراؤں کی رانی ہے۔ گورچ اپنی آمد سے پہلے ہر سال لمبی گردنوں والے سفید پرے خوش مرغ پہلے بھجواتی ہے۔ ان کا ایسا رعب اور دبدبہ ہے کہ پودے زرد ہو جاتے ہیں۔ درختوں کے ہاتھوں سے پتے گر جاتے ہیں۔ ان ہی پرندوں کے عقب میں گورچ چلی آتی ہے۔ ساراوان اور جھالاوان پر حملہ آور ہوتی ہے پھر تاراج کرتی ہوئی جنوب میں انگلاش پر ریل پیل کرتی ہے، جہاں ہندوؤں کا ہزاروں برس پرانا مندر ہے۔ یہیں وہ اپنی بہن گمبی سے جا ملتی ہے۔ گمبی سمندروں کی رانی ہے۔ یہ رہتی ساحلوں پر ہے۔ کبھی تو اسے گمبی (نسیم بحری) کہا جاتا ہے۔

ان کی ایک نرم دل بہن ہے۔ یہ لمبے لمبے بالوں والی کوئی اسے سرگوات (پروائی) کہتا ہے، کوئی غیسارگی اور ہمارے ہاں آتی ہے تو ہم اسے گرو کہتے ہیں۔ یہ مشرق میں رہتی ہے۔ اس کی ایک بے مہر تند خو بہن ہاشی سمندروں میں رہتی ہے۔ ہاشی طوفان لاتی ہے۔ ساحلی علاقوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہے۔ ان کی ایک بہن بڑی انسان دوست ہے، اسے گوش (خوشگوار ہوا) کہتے ہیں۔ دن بھر اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ انسانی ذہن پر خوشگوار اثر ڈالتی ہے۔ اس کی چھوٹی بہن کا نام ایرت گوات (سرد مغربی ہوا) ہے۔

ملک مچل جایا کرتا "ان کے ساتھ کوئی لڑکا نہیں ہوتا؟"

"ہاں کیوں نہیں ہوتا۔ میرے ملک جیسا پیارا سا بچہ جسے لوڑ (گولو) کہتے ہیں۔ بڑا شرارتی ہوتا ہے۔ چیزیں الٹ دیتا ہے، دہقانوں کی گندم بکھیر دیتا ہے، بھوسہ دور اچھال پھینکتا ہے۔ اس دھرتی کی اصل سردار تو یہ ہوائیں ہیں۔ سب کے اپنے اپنے مزاج ہیں، اپنے اپنے علاقے ہیں۔ یہ سب زندہ ہیں، تم ان کو چھو بھی سکتے ہو، چاہو تو ان سے باتیں بھی کر سکتے ہو مگر ہواؤں کی زبان سیکھنا پڑے گی۔"

"تب اچانک دادی غمگین ہو جاتی مگر اب ہمارے مقدر میں محض گورچ ہی رہ گئی ہے۔ سرد، ظالم، بے رحم، بے مروت، انسانی جذبات کو کچلنے والی۔"

"ہوائیں بھی بابا کی طرح باغی ہیں؟" ملک سوال کرتا۔

"ہرگز نہیں۔" دادی تلملا اٹھتی "بغاوت تو غلام کیا کرتے ہیں۔"

"میرا بیٹا انسان دوست ہے، چاہتا ہے کہ ملک میں خوشحالی پھیل جائے، انصاف کا بول بالا ہو۔ سب کو اپنا اپنا حق ملے، کوئی بھوکا نہ سوئے، کسی کا حق نہ چھینا جا سکے۔"

دادی کی رواداری کا یہ حال تھا کہ چند بار اسے گھر کے آس پاس منڈلاتے ہوئے جاسوس دکھائی دیے۔ جو گورچ کے تھپیڑوں سے بے حال ہو چکے تھے تو مالی خستہ حالی کے باوجود ان کے لئے خیرو ماما کے ہاتھ چائے بھجوا دی اور ساتھ ہی پیغام بھی بھجوا دیا کہ

"امیر شاہ کے بیٹے کو گرفتار کرنے والوں کو سردی سے بچنے کا پورا انتظام کرنا چاہئے۔ یہ بھی کسی کے بیٹے ہیں۔ سردی سے نہ مارے جائیں۔ ہمارا بیٹا تو عدم تشدد کا حامی ہے۔"

مخبر کانپتے ہاتھوں سے چائے پیتے رہے اور ماما خیرو کا شکریہ ادا کیا ساتھ ہی یہ بھی کہا سمجھا کر کیا کریں ذاتی دشمنی تو ہے نہیں، محض فرض کی بجا آوری ہے۔ یہ بیچارے بھی ان میدانی علاقوں سے آئے تھے جہاں سات دریا بہا کرتے تھے، جس دیس کو سپت سندھو (سات

دریاؤں کی سرزمین) کہا جاتا تھا۔ اس کے بھی دو دریا خشک ہو کر غائب ہی ہو گئے۔ قدرت کب تک ناانصافیاں معاف کرتی۔ ان علاقوں میں اب بھی گیہوں کاشت ہوا کرتی تھی مگر اس ہریالی پر ان کا حق تھا جو اس سنہری گندم پر۔ آدم بھی دانہ گندم کی خاطر جنت سے نکالے گئے تھے۔ یہ سب بھی اسی گندم کی خاطر گھر بار چھوڑ چھاڑ کر ان بنجر پہاڑوں میں پڑے تھے اور شب و روز محنت سے وطن پرست، انقلاب دوست انسانوں کو پھندوں میں جکڑ رہے تھے۔ پیٹ بڑا بلا ہے۔ یہ پردیسی بیچارے خود بھی تو بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے خطرات میں گھیرے بیٹھے تھے۔ ہر ماہ اہل خانہ کے لئے ڈاک خانہ مستونگ سے ارجنٹ منی آرڈر بھجوایا کرتے۔

منی آرڈر فارم کے چھوٹے سے خانے میں لاکھوں باتیں لکھ دینا چاہتے اپنی اداسی، محرومی اور خاندان سے دوری کے تکلیف دہ احساس کو بھی اسی انعام کے دم منی آرڈر کر دینا چاہتے۔ مگر محض اسی پر اکتفا کرتے "یہاں پر خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب چاہتا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی ملاقات ہوگی۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں یہاں ہر طرح کا آرام ہے۔ گاؤں کے چھوٹوں بڑوں کو سلام۔ بچوں کا خاص خیال رکھنا۔ ہر نماز میں میرے لئے دعا کرنا۔"

گیہوں کے زرد خوشوں اور سنہری کھلیانوں والی دھرتی سے آنے والے سب بھوکے تھے۔ ان کے پیٹ بھی بھوکے تھے اور روح بھی پیاسی تھی ایک بار ان کے انچارج کو بچھو (بچھو) نے ڈنگ مار دیا۔ تڑپ رہا تھا کہ دادا کو خبر ہوئی۔ آس پاس اسپتال بھی نہ تھا۔ دادا کے پاس بچھو کے کاٹے کا دم تھا۔ سب لوگ اسے کشاں کشاں دادا کے حجرے میں لے آئے۔ دادا کلام اللہ پڑھ پڑھ کر پھونکتے رہے، نیلگوں دالا دست ستا کر غائب ہو گیا اور انچارج اٹھ بیٹھا۔ ہوش میں آتے ہی وہ دادا کے قدموں میں جا گرا۔ دادا نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا۔

"سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ میں مت پڑو۔ جس میں اور تم میں دشمنی تھی۔ گویا وہ تمہارا گرم جوش دوست ہے اور یہ بات ہی لوگوں کو حاصل ہوتی ہے جو برداشت کرنے والے ہیں اور ان کو ہی نصیب ہوتی ہے جو بڑے صاحب نصیب ہیں۔"

انچارج تھا غیرت مند۔ ذرا طبیعت سنبھلی، ہوش ٹھکانے آئے تو منہ لپیٹ کر چلا گیا۔ سننے میں آیا کہ کہیں اور تبدیلی کروالی ہے۔ مگر بابا کو گرفتار کرنے کے لئے ان کی کوششوں میں رتی بھر کمی نہ آئی۔

ایک روز دل دہلا دینے والی خبر آئی کہ بڑے ماموں کی ٹانگ میں گولی لگی ہے۔ وہ سوراب کے قریب خلخالی پہاڑ کے کسی غار میں زخمی پڑے ہیں۔ دونوں ماموں بھی بابا کی طرح اشتہاری تھے۔ آبادیوں میں مدد کے لئے جانا ان کے لئے یک خودکشی کے مترادف تھا۔ اس روز صبر کے بندھن ٹوٹ گئے۔ ماں گریہ و زاری کرتی ہوئی دادا کے حجرے میں چلی آئی۔ رو رو کر حال سنایا اور دادا کا دامن تھام لیا۔

"میرا بھائی خلخالی میں پڑا دم توڑ رہا ہے۔ ظالم (چچا) اسے مار ڈالے گا۔ آپ اسے بچا لیں۔"

دادا کے پرنور چہرے پر استقامت رہا کرتی تھی مگر جانے کیا ہوا کہ دادا کے چہرے پر یکایک جلال طاری ہو گیا۔ ان کا رنگ گلابی ہو گیا۔ ان کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکنے لگیں۔ وہ قبلہ رو ہو گئے۔ ان کے دونوں ہاتھ دعا کے لئے بلند ہو گئے۔ ایک لرزہ ان کے جسم پر سے گزر گیا۔ اب وہ پلٹے تو ان کے چہرے پر وہی سکون تھا۔

"جاؤ" انہوں نے اشارہ کیا "کچھ نہیں ہوگا۔ سارے ہی آ رہے ہیں جاؤ۔" دادا کے لہجے میں نصیحت آمیز شفقت تھی اور جانے

کیسے پھر شہک اچانک لپکا۔ اس نے بندوق اٹھائی، کارتوس کی پیٹی گلے میں ڈالی اور دیوانہ وار سوراب کی جانب بھاگتا ہی چلا گیا۔

ماما خیرو کی پکار پر گاؤں کے لوگ حتیٰ کہ خود خیرو بھی اس کے پیچھے دوڑ پڑے۔ نوکیلے پتھروں نے اس کی راہ روکی۔ کانٹوں نے اس کا دامن تار تار کر دیا۔ اس کی سانس پھول گئی، طاقت جواب دیتی چلی گئی مگر وہ بڑھتا ہی چلا گیا۔ حتیٰ کہ گاؤں کے جوانوں نے اسے آ دبوچا اور اسلحہ چھین اسے کشاں کشاں گھر لے آئے۔ وہ سر جھکائے چلا آ رہا تھا۔ اسے ماموں کو بچانا تھا۔ اب کیا جواب دے گا۔ ماں کو دادی ماں سمجھتی کہ وہ موقع کی تاک میں ہے۔ ماں کے احتجاج کے باوجود سر شام شہک کے ہاتھ رسی سے باندھ کر بستر میں لٹا دیا تا کہ رات کے اندھیرے سے دوبارہ لڑنے بھڑنے نہ نکل کھڑا ہو۔ ایک بچے کی بساط ہی کیا اور پھر وہ سب تو عدم تشدد کے قائل تھے۔ شہک عالم بے بسی میں چلاتا رہا ''گورپیچ تم میری مدد کرو برف برسا دو ان سب کو۔ سرد ہواؤں سے جلا کر راکھ کر دو۔''

شاید گورپیچ تک اس کا پیغام پہنچ ہی گیا۔ اس رات زناٹے دار ہوائیں چلنے لگیں۔ گورپیچ بھیڑوں کا جتھی ان کی دیوار سے آ لگی۔ کواڑ بجنے تو دادی کا ہاتھ غیر اختیاری طور پر لالٹین کی جانب بڑھا۔

شہک نے انتقامی قہقہہ لگایا "رک جاؤ دادی۔ باہر گورپیچ ہے۔ ہماری مدد کو پہنچ گئی ہے۔ دیکھ لینا صبح سب دشمنوں کی انگلیاں سردی سے جھڑ جائیں گی۔ ان کے جسم نیلے پڑ جائیں گے۔ سب مرے پڑے ہوں گے۔" شہک ہذیانی انداز میں قہقہے لگاتا چلا گیا۔

مگر صبح جو خبر آئی وہ ناقابل یقین مگر نہایت مسرور کن تھی۔ آمرانہ حکومت کی جانب سے عام معافی کا اعلان ہو چکا تھا۔ مفلوک الحال، زخمی مرد اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان پہاڑوں سے اتر اتر کر گھروں کو آنے لگے۔ ان میں سے کوئی بھی خالی ہاتھ نہ لوٹا۔ وہ اپنے ساتھ غربت افلاس، بے روزگاری اور مایوسی بھی لائے۔ بیماریوں کے دیوتے ہوئے محرومیوں کے پالے ہوئے۔ پہلے ان کا مقابلہ بندوقوں سے تھا اور اب غربت افلاس سے جو کسی بھی اسلحہ سے زیادہ خوفناک ہے۔ غربت تو سسکا سسکا کر مارتی ہے۔ خواہشات کی موت، امیدوں کی موت، جسم کی موت، روح کی موت، انا کی موت، جبکہ بندوق کی گولی تو جلد ہی محض ایک ہی موت لاتی ہے۔ پھر چلائی جانے والی ہزاروں گولیوں میں سے ایک آدھ ہی نشانے پر بیٹھتی ہے، ورنہ تو ایک لڑائی میں ہی ہمارے کے سارے حریف مارے جائیں۔

بابا کے ساتھ دونوں ماموں بھی چلے آئے۔ گھر میں رونق لوٹ آئی۔ ماموں کا علاج محمدی سے ہونے لگا۔ ان کا زخم اب تک بلا علاج رہنے کے باوجود بہتر حالت میں تھا۔ گھر خرچ اور ماموں کے علاج کے لیے دادی کے تمام زیور ایک ایک کر کے تو ماں کے زیوروں کی باری آئی۔ رات بھر جاگ کر لالٹین کی لرزتی روشنی میں بھی ماں بلوچی کشیدہ کاری کرتی، سوزن کاری کرتی جسے خیرو ماما بازار میں اونے پونے بیچ آتا اور رقم دادی کی ہتھیلی پر رکھتا۔ گھر کا سونا پگھل گیا، چاندی پگھل گئی، بابا کے بالوں میں وقت سے پہلے سلیٹی تار جھلملانے لگے۔

ادھر میر گل خان نصیر نے نیا انداز فکر اپنایا۔ انہوں نے اعلان کر دیا کہ ترقی اور بقا کے لئے جنگ اب پہاڑوں میں نہیں شہروں میں ہوگی۔ انہوں نے ٹیگور کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ شعور زمین سے گرد تو پیدا کر سکتی ہے، اناج نہیں۔ گل خان کے پرانے رفقاء کے بعد دیگر ان کا ساتھ چھوڑ گئے مگر بابا نے آمنا صدقنا کہا۔ وہ مستونگ سے کوئٹہ چلے آئے اور نظریاتی محاذ پر پہلے سے بھی زیادہ استقامت سے ڈٹ گئے۔ چونکہ ان پر مخالفت کا لیبل لگ چکا تھا، باوجود یہ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ سرکاری ملازمت نہ مل سکی۔ مجبوراً ایک پرائیویٹ کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی۔ بابا چاہتے تھے کہ سارا کنبہ مستونگ سے چلا آئے۔ شہک کسی اچھے اسکول میں پڑھے۔

مستونگ کا ہائی اسکول 1935ء میں قائم ہوا تھا۔ یہ بلوچستان کے اولین ترین ہائی اسکولوں میں سے ایک تھا مگر اب اس کا تعلیمی معیار گر چکا تھا۔ اب تو انگریزی اسکولوں کا طوطی بولتا تھا۔ انگریزوں کا بس چلتا تو بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہی ساتھ اردو زبان کو بھی بیڑیاں پہنا کر رنگون جلاوطن کر دیتے۔ مگر جو کام وہ نہ کر سکے۔ ان کے گماشتوں نے کر دکھایا۔ کالا انگریز، گورے انگریز کی نسبت کہیں زیادہ انگلینڈ کا وفادار ہے۔ سچ ہی تو کہا ہے۔ "Loyal Than The King" یہ لوگ انگلینڈ کے بادشاہ سے بھی بڑھ کر انگلینڈ کے وفادار ہیں۔ بابا کے پاس کرائے کا مکان بھی نہ تھا۔ خود بھی گل خان کے ہاں پڑے رہتے تھے۔ یہ گھر کیا تھا شاعروں، ادیبوں، دانشوروں اور نظریاتی لوگوں کی آخری پناہ گاہ تھی۔ جہاں سر چھپانے کا ٹھکانہ بھی تھا اور کھانا بھی ہر وقت تیار ملتا۔ بابا گھر آتے تو اکثر دلاسا دیا کرتے کہ جوں ہی مالی حالات سدھرے وہ کرائے کا مکان لے کر سب کو وہیں اپنے ساتھ رکھیں گے۔

چند بار ٹھیک نے کوہ چلتن اور لک پاس کی بلندیوں سے کوئٹہ شہر کو دیکھا تھا۔ دھوئیں میں ڈوبا ہوا شہر۔ مانو دھوئیں کا شہر، دھوئیں کے لوگ، ہر چیز سے دھواں لپٹا ہوا یا ہر شے دھواں دھواں۔ بابا کہا کرتے کہ یہاں ہر شے ناخالص ہے، ہر شخص گھاگ نکلا ہے، ہر روح پیاسی ہے۔ اداس آنکھوں والے بدحواس لوگ۔ بسوں کے پیچھے بھاگتے ہر روپ کے لئے ہانپتے کانپتے، دھواں نگلتے دھواں اگلتے لوگ۔ اگر ٹھیک کو پھر بھی کوئٹہ جانے کی جستجو رہا کرتی، کیونکہ وہاں اس کے بابا رہتے تھے اور میر گل خان نصیر بھی، جن سے اسے دلی عقیدت تھی۔ ان کے ہاں گل خان کی تاریخ بلوچستان کی ایک جلد پڑی تھی، جسے وہ بہت زیادہ دیکھے بغیر ہی پڑھا کرتا۔ بابا نے بتلایا تھا کہ دوسری جلد حکومت نے ضبط کر لی ہے۔ اس کا پڑھنا یا رکھنا جرم تھا۔ وہ سوچا کرتا یہ کیسا معاشرہ ہے، جہاں ہتھیار لئے پھرنا، قتل کرنا تو جرم نہیں اور محض ایک کتاب رکھنا قابل تعزیر ہے۔

حقوق کی جدوجہد ایک بے نتیجہ موڑ پر آ کر ختم ہو چکی تھی۔ یہ گوریلا جنگ محض اس لئے شروع ہوئی کہ چند لوگوں کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا تھا۔ بات حقوق کی نہیں تھی، لوگوں کے حقوق تو واضح ہیں۔ تعلیم، ملازمت کے یکساں مواقع، پانی، بجلی اور گیس ان کو پہلے بھی کہاں میسر تھے کہ اب مل جاتے؟ جن سالوں میں تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اکثریت جیل خانوں، اپنے گاؤں یا پہاڑوں میں سخت کوش تھی، سرداروں نوابوں کے بیٹے ایچی سن کالج، برن ہال یا غیر ممالک میں زیرِ تعلیم تھے۔ ان میں سے کسی کی نکسیر بھی نہ پھوٹی، زخمی ہونا تو خیر دور کی بات ہے۔ حقوق یافتہ طبقہ بدستور برسرِ اقتدار تھا۔ وہی نواب وہی سردار، معتبر اور ٹکری۔ انہوں نے بدلتے دل جلا تبدیلی کی آرزو بدل لی۔ اسی استحصالی طبقے نے نوجوانوں کو استعمال کرنے کے بعد معاشرے کی گود میں حقارت سے اچھال پھینکا تھا، جیسے خالی ماچس، جیسے سگریٹ کا ٹوٹا۔ ہزاروں نوجوان بے روزگاری، افلاس، بیماری اور کسمپرسی کی دلدل میں دھنستے چلے گئے۔

تی جان تی جان (تیری جان میری جان) نجیب جان، نجیب جان کے نعروں میں پلنے والا بلوچ اسٹوڈنٹس آرگنائزیشن کا سابقہ چیئرمین نجیب جان بلوچ اب بیزار گیری اور کوئٹہ کے درمیان ہوٹل چلاتا پھر رہا تھا۔ دوسری جانب پیٹ نہیں، کھانے کو روٹی نہیں۔ ان نعروں سے گھرانے کا پیٹ بھی کیا بھرتا۔ محمد حنیف، محمد حسنی، عبدالرحمان الگوا اور جواں سال علی محمد کرد جس نے جدوجہد کی خاطر آرام تج دیا۔ جن کے دن تفتیشیوں میں اور راتیں حوالاتوں میں گزر گئیں۔ جن کے آہنی ارادوں کے مقابل ہتھکڑیاں بھی پگھل پگھل گئیں۔ شاہ محمد شاہو، جو اب پنجاب روڈ کے ایک گھر سے پرچہ نکالتا، تعلق نعروں کا نشانہ بنا رہتا اور تحریر خوش شکل خوش گفتار ملک سیف الدین جس کی جوانی کو جیل آباد جنگل جات

گئی۔ حقیقتیں کہانیاں ہو گئیں۔ لوگ سب کچھ بہت جلدی بھول گئے۔ کچھ نوجوان پرانے رومن جوانوں کی طرح (Costna) ہاتھوں میں پڑھا کر معاشرے میں طاقت سے جگہ بنانے لگے۔ دھکم پیل، مار اماری۔

بابا کی محنت رنگ لائی۔ آخر ایک نئی آبادی میں ان کو کرائے کا مکان مل گیا۔ بابا بہت خوش خوش منتقل ہوئے۔ دادا اور دادی تو ساتھ جانے کے لئے تیار نہ ہوئے مجبوراً بابا اسی جھنجھٹ سے گھرانے کو لے کر چلے آئے۔ طبیک کو انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا۔ جیسے تیسے فیس بھی ادا کر دیا کرتے۔ سویرے سویرے سائیکل پر بٹھا کر اسکول چھوڑ آتے۔ انگریزی تہذیبی حاکموں کی زبان تھی تو حکمرانوں کی زبان سیکھائی کرتے ہیں۔ حاکموں کو کیا پڑی کہ محکوموں کی زبان سیکھیں۔ تبھی تو کئی ایک بادشاہ انگلینڈ کی انگریزی سے نابلد ہی رہے۔

گھر میں تنگی ترشی سے دن گزرتے مگر یہ کیا کم تھا کہ سب اکٹھے تھے۔ ایک ساتھ تھے۔ گریجویشن کے بعد طبیک نے ایک زرخیز محکمے میں ملازمت بھی اختیار کر لی۔ بابا احتجاج ہی کرتے رہ گئے۔ طبیک کو بس ایک ہی دھن تھی کہ وہ جلد از جلد ایک اچھا سا مکان بنا لے۔ بچپن کے کتنے ہی پیٹ کاٹنے والے سال اسی مکان کی محرومی کے باعث بابا سے دور کر گئے۔ جیومیٹریکل شکل والا ابدی خانہ جسے مکان کہتے ہیں۔ انسانوں کو بانٹ دیتا ہے۔

طبیک دل کھول کر رشوت لینے لگا۔ اڑتے اڑتے یہ خبر بابا تک پہنچی انہوں نے اشارتاً منع کیا، پھر کھلے بندوں روکا آخر سرزنش کی مگر طبیک ٹس سے مس نہ ہوا۔

”میں کسی ایسی ایمانداری پر یقین نہیں کر سکتا جس نے گھرانے کا خون نچوڑ لیا، وقت سے پہلے آپ کے بال سفید کر دیے، میری ماں کی آنکھیں کشیدہ سوزن کاری اور گلکاری کی مزدوری کرتے کرتے دھندلا گئیں۔ لالٹین کی لرزتی روشنی میں جس نے سوئی کی محنت سے ہمیں پالا۔ میرا بچپن محرومیوں میں گزرا۔ بچوں کو کھلونے ملتے ہیں۔ مجھے دکھ ملے اور آپ کو آخر کیا ملا؟ مجھے بتائیں آپ کو کیا ملا......؟“

بابا ششدر رہ گئے۔ بہت دیر وہ سکتے کے عالم رہے۔ انہیں طبیک کے خیالات جان کر دلی صدمہ ہوا تھا۔ پھر بولے:

”نظریاتی انسان ملاح کی طرح ہوا کرتا ہے۔ جو مسافروں کو تو دوسرے کنارے پر پہنچا دیتا ہے مگر خود دو پاٹوں کے بیچ میں رہتا ہے۔“

”نہیں بابا کیا مجھے آگے بولنے کی اجازت ہے؟“

بابا ٹوٹ چکے تھے مگر انہوں نے کہا ”ہاں بولو، ہم تو آزادی افکار کے حامی ہیں۔“

”نظریاتی انسان سکندر اور روفس کے باپ شمعون کی طرح ہوا کرتا ہے۔ رومن سپاہی جسے بیگار میں پکڑ کر یسوع کی صلیب جس سے اٹھواتے ہیں۔ وہ لاتعلق، بے گناہ انسان صلیب کے بھاری بوجھ تلے دبا گلگتا کی جانب بڑھنے پر مجبور ہے۔ اسی گلگتا پر آپ نے ہمارے خاندان کی بلی دی۔ نظریاتی انسان کیا ہے، زندگی کے ایک اسٹیشن کی بھیڑ بھاڑ میں پکڑا گیا بیگار کا قلی، جسے مردہ نسلوں کے بوسیدہ افکار پر مشتمل نظریات پر مشتمل بھاری بھرکم بستر بند اور ناقابل عمل خیالات کا آہنی ٹرنک اٹھوا دیا گیا ہو۔“

بابا ذرا مشتعل نہ ہوئے۔ انہوں نے شفقت سے جواب دیا

”ہمارا کلچر بڑا پاکیزہ اور Pure تھا۔ اب ہم مخلوط شہروں میں آ بسے ہیں۔ یہ ہماری مجبوری بھی ہے اور وقت کی ضرورت بھی۔

شہروں میں آباد لوگ ہی اقتدار میں رہتے ہیں۔ وہی تو Policy Makers ہوا کرتے ہیں۔ اب ہر چیز کمرشل ہو گئی ہے، ہوتی جاتی ہے۔ یہاں کتنی کھور کیسی Poluted ہوا ہے۔ ذرا آس پاس کی ہواؤں کو تو دیکھوں۔ تمہارے نظریات بھی Poluted کر کے رکھ دیئے۔"

ٹھیک کو بابا سے بڑی ہمدردی ہوتی۔ بیچارے پرانے خیالات کے انسان۔ وہ اب تک پختونوالی اور پرانی گیری پر یقین رکھتے ہیں۔ حکومت بدستور سرداروں نوابوں کے پاس تھی، انگریزوں کے پروردہ وطن کے تمام آزادی پسندوں کے قاتل!!! ان خاندانوں کے لوگ بیک وقت مختلف پارٹیوں میں رہتے۔ حکومت چاہے اسلام پسند ہو، انقلابی ہو یا اشتراکی یہی لوگ اس کے ستون بنتے اگر کل کلاں روس کا غلبہ ہوتا تو راتوں رات نام بدل کر خان سے خانا توف بن جاتے۔ وہی چند چہرے صف بہ صف روپ دھار کر بار بار اقتدار کی مسند پر جلوہ افروز رہتے، جیسے منڈلی کے مہرے جیسے تاش کے پتے۔ سیاست چند خاندانوں کی درمیان اقتدار کے الٹ پھیر کا نام ہے۔ گھر والے ٹھیک کی تنخواہ کو ہاتھ لگانے کے روادار نہ تھے۔ ٹھیک نے دیکھتے ہی دیکھتے روپیہ بنا لیا۔ شاندار مکان خرید لیا۔ وہ بھی امیروں کے علاقے میں مگر گھر کا کوئی فرد بھی اس کے ہمراہ نئے مکان میں جانے کے لئے تیار نہ ہوا۔ ٹھیک کو یقین تھا کہ یہ وقتی ضد ہے۔ آخر کار وہ سب کو منا لے گا۔ کشادہ کمرے وسیع صحن اور پھر یہ احساس طمانیت کہ مکان غریبوں کے علاقے میں بہر حال نہیں ہے۔ رشوت کا پیسہ بے ہنگم درخت کی مانند تیزی سے پھلتا پھولتا ہے۔ پرانے بادشاہ تلوار کی نوک پر خراج لیا کرتے تھے اب محبت سے رشوت لی جاتی ہے۔ ساری عظمت، خود خراج کے ٹکڑوں کی محتاج ہے۔ بھوکے ننگے کسانوں کے خون سے لال قلعہ تعمیر ہوا۔ ایک ہرن کی موت سے دل برداشتہ ہو کر نرم دل بادشاہ نے اس ہرن کی یادگار، ہرن مینار (شیخوپورہ) تعمیر کرنے کے لئے دو آبہ کے زمینداروں کو کولہو میں پلوا دیا۔ ان کا خون نچوڑ ڈالا۔ ٹھیک کو یقین تھا کہ رشوت احسن سودا ہے اور Fair Bargain ہے ایک ہاتھ دو ایک ہاتھ لو۔ میں ان کو فائدہ دیتا ہوں۔ وہ مجھے فائدہ دیتے ہیں۔ بابا کو اب تک احساس زیاں نہ تھا۔ اگر چند سری حکومت Aristorcracy قائم کی گئی تھی تو سیاست میں یہ کوئی نئی بات تو نہ تھی۔ اس کے تدارک کے لئے جمہوری طریقے تھے اسٹریٹ پاور تھی۔ قانونی چارہ جوئی کے لئے اعلیٰ عدالتیں موجود تھیں۔ مگر کیا کیا نوجوان نسل کو لاحق جنگ میں جھونک دیا۔ ان سے تو ویدک دور کے پرانے حکمران ہی اچھے تھے جو جنگ میں بھی اصولوں کی برتری قائم رکھنے کے قائل تھے۔ مہابھارت کے یدھ میں کہیں بھی اصولوں کا اپمان نہیں ہوا۔ مگر بابا اب تک ان ہی سرداروں نوابوں کے گن گاتے تھے۔

ایک روز ہمت کر کے ٹھیک اکیلا ہی نئے گھر میں منتقل ہو گیا۔ ماں نے آنسو بھری آنکھوں سے رخصت کیا۔ اسے پہلے سے یقین تھا کہ ٹھیک جو بال کی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا پھرتا پایا جا رہا ہے، اسی نے اسے شواست (کھول کر بیچنے والا گھونٹ) دیا ہوگا۔ ورنہ کوئی حسب نسب سے اس طرح پھرتا ہے؟

نئے گھر میں دوستوں کا ہنگامہ رہا، مبارکبادوں کا سلسلہ اور قہقہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ایک ایک کر کے سبھی رخصت ہوتے چلے گئے۔ سہ پہر میں وہ یکدم اکیلا رہ گیا۔ محض ایک نوکر کے سوا گھر میں کوئی بھی نہ رہا۔ بڑھتے ہوئے احساس تنہائی پر قابو پانے کے لئے وہ لان میں آ بیٹھا اور پھر گھاس پر نیم دراز گزری ہوئی زندگی پر غور کرتا رہا۔ اسے کسی طور سب کو منا کر اسی گھر میں لانا تھا۔ بابا اور ماں سے گھر میں کیسی رونق آ جاتی۔

معاً اس کی نظر گھاس میں رینگتی چیونٹیوں پر پڑی اپنی دھن میں مگن وہ چیونٹیاں اپنی بلوں میں آ جا رہی تھیں۔ ان کے اپنے گھر تھے، اپنے محلے تھے، اپنی بستیاں جانے کب سے!!! ٹھیک کو ہنسی آ گئی۔ یہ ننھی منی چیونٹیاں سمجھتی ہیں کہ یہ ان کا گھر ہے، حالانکہ یہ میرا

گھر ہے لیکن یہ چیونٹیاں تو جانے کب سے یہاں آباد ہیں۔ شاید سو برس پہلے جب انگریزوں نے چار ہزار آبادی پر مشتمل پرامن انسانوں کی بستی شال کوٹ کو فوجی چھاؤنی میں تبدیل کر دیا تھا شاید ہزاروں برس پہلے یہ سب یہاں آباد ہو گئے۔ گویا مالک تو گھر کی یہ ہو گئیں۔ مجھے تو ایک دن بھی نہیں ہوا۔ جبکہ مالک اس گھر کا میں ہی ہوں۔ دراصل اس میں چیونٹیوں کا قصور نہیں۔ ان کے ادراک کی طاقت سے بھی کہیں بڑا ہوں Perception شعور ہے۔ یہ مجھے Perceive ہی نہیں کر سکتیں۔ شعور کا دوسرا نام ہی تو ذہن ہے۔ ذہن سے وجود ہے "I think. Therefore I am" (میں سوچتا ہوں اس لئے میں ہوں) سارا فلسفہ وجودیت شعور کا ہی پرتو ہے۔

وحشت ٹھیک کے ذہن میں ایک خیال کوند گیا کوئی میری ادراکی طاقت سے بھی بہت بڑا ہے۔ ماورا ہے ادراک کی بساط سے۔ وہ بھی مجھے اس وقت دیکھ رہا ہے اور سوچ رہا ہے کہ سو پچاس برس جینے والا یہ فانی انسان اس مکان کو اپنا کہہ رہا ہے۔ حالانکہ اس زمین، اس کائنات کا خالق و مالک تو میں ہوں۔ اللہ کے ازلی ابدی وجود سے لاعلم یہ انسان جس نے ایک مکان کی خاطر خون کے رشتوں سے منہ موڑ لیا، محبت کو بیچ دیا۔ زمین تو کسی کی نہیں ہوتی۔ سب ہی زمین کے ہوا کرتے ہیں۔ اسی مٹی میں مل جاتے ہیں۔ جس کے لئے وہ ایک دوسرے کو خاک میں ملاتے ہیں۔

ٹھیک گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ گوری تو پہلے بھی کبھی کبھی دل کو مضطرب کیا کرتی تھی۔ دروازے پر دستک دے کر لوٹ جایا کرتی تھی۔ اپنی ان ہی وادیوں میں جہاں صبح و شام ملتے ہیں۔ مگر اب تو وہ دماغ میں در آئی ہے۔ دماغ مفلوج ہو کر رہ گئے ہیں۔ دل بے حس ہو گئے ہیں۔ جس باپ سے ملنے کے لئے باہر منہ دو سرد راتوں میں دروازے تک دوڑ دوڑ جاتا آج اسی باپ کو غریبوں کی بستی کی ایک کھولی میں چھوڑ آیا ہے۔ سارے انسانوں کو گوریچ نے Cold Blooded Animal بنا دیا ہے، حالانکہ انسان گرم خون والی مخلوق میں شامل ہے۔ محبت، قربانی اور جذبات والا ٹھیک زندگی میں ایک بار پھر جذباتی ہو کر دیوانہ وار اٹھا "گوریچ! تم نے مجھے مفلوج و بے حس بنا دیا اور مجھے آج تک احساس نہ ہو سکا۔ میرے بچپن کی ساتھی! اٹھو تمہارا شکریہ کرنے کی امید سے دل اب میں یہاں نہیں رہوں گا۔"

ٹھیک تیزی سے دوڑا اور ایک جھٹکے سے گھر کا دروازہ کھول دیا۔ جو گر رشوت اور بے ایمانی کی کمائی سے بنے اس مکان سے باہر نکل جائے۔ جس نے انسانی رشتوں کی پہچان تک بھلا دی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی اس کے چہرے پر گوریچ کا ایسا بھرپور تھپیڑا پڑا کہ لڑکھڑا کر وہ دو قدم پیچھے ہٹ آیا۔ اس کا وجود ہی کانپ کے رہ گیا۔ باہر قیامت خیز سردی تھی۔ شور، کہر اور دھند اور گوریچ کی چوٹ میں تھا ٹھیک کی ہمت جواب دے گئی۔ اس نے دروازہ بند کر دیا اور کمرے میں ہیٹر کے پاس آ بیٹھا۔ گوریچ زور زور سے دروازے کھٹکھٹاتی چلی گئی۔

◆◆◆

ادب دوستی

ادارہ ''تخلیق'' ان تمام دوستوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہے جو ''تخلیق'' کے فروغ کے لیے ہر وقت سرگرم عمل رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں **آغا گل** صاحب نے بلوچستان میں دو لائبریریوں کو ''تخلیق'' جاری کرایا۔ اسی طرح **ذبیح اللہ فہیم** صاحب نے آزاد کشمیر سے پانچ نئے ممبر ''تخلیق'' کے لئے بنائے۔ ادارہ تخلیق ان تمام کی کاوشوں کو سراہتا ہے اور ادب دوستی اور ادب کے فروغ کے لئے کی جانے والی کوششوں پر انہیں مبارکباد پیش کرتا ہے۔ (ادارہ تخلیق)

اب نہیں جینا مجھے

یٰسین احمد (انڈیا)

مختصر تعارف

یٰسین احمد 25 ستمبر 1946ء کو حیدرآباد دکن، انڈیا میں پیدا ہوئے۔ آپ کے 5 افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں جن میں پہلا افسانوی مجموعہ ''گمشدہ آدمی'' پانچواں مجموعہ ''سایوں بھرا دالان'' ہے۔

بائیک اس نے مکان کے سامنے روکی تھی۔ بائیک سے اتر کر تو بہت احتیاط سے جھکتے ہوئے پتلون کو اوپر کیا۔ ہونٹوں کے درمیان دبے ہوئے سگریٹ کو نکالا۔ سگریٹ پھینک دینا چاہا مگر فوراً رک گیا۔ دو تین طویل کش لے کر اس نے سگریٹ کو زمین پر پھینک دیا۔ جوتے کی نوک سے سگریٹ کو مسلا اور پھر سامنے کے بند دروازے پر نظر ڈالی۔ دروازے کی چوکھٹ سے کال بیل یوں لٹک رہی تھی۔ جیسے پھانسی لئے ہوئے مجبور بندے کی نعش۔ لٹکتے ہوئے کال بیل کو دیکھ کر وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ جیب سے رومال نکال کر کال بیل پر رکھا اور کال بیل دبادی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ فوراً کھول دیا گیا ایسے لگتا تھا کہ مکان کے مکین اس کے منتظر رہے ہوں۔ دروازہ کھولنے والا ایک مرد تھا۔ عمر تیس بتیس کے درمیان۔ معمولی سا لباس۔ سر کے بال روکھے سوکھے اور چہرے پر اضمحلال۔

آنے والے نے بھی ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا: ''میرا نام سیتو ہے۔ ڈاکٹر گھرے نے بھیجا ہے۔ آپ کا نام راجیندر ہے؟''

دروازے سے ہٹتے ہوئے وہ بولا: ''ہاں! میرا نام ہی راجیندر ہے۔ اندر آیئے۔''

سیتو اندر داخل ہوگیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا لیکن ڈاکٹر کی نفاست سے پاک۔ کمرے میں ایک جانب چھوٹا سا میز اور دو پلاسٹک کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری جانب پرانے وضع کا ایک پلنگ جس کے اسپرنگ ڈھیلے ہونے کی وجہ سے بیچوں بیچ جھول آگیا تھا۔ پلنگ پر بچھی ہوئی چادر بدرنگ تھی۔ سیتو نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا کہ ڈاکٹر صاحب کا انتخاب غلط نہیں۔ مکان کی بوسیدگی مکان کا فرنیچر وغیرہ دیکھ کر مکینوں کی معاشی حالت کا اندازہ بخوبی ہو رہا تھا۔

وہ بولا: ''میں میڈیم راجندر سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''آپ بیٹھیے میں بلا رہا ہوں۔'' راجیندر نے کہا اور اندر چلا گیا۔ چند لمحوں میں باہر آگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک ٹرے میں پانی کا گلاس اور کوکا کولا کی بوتل لے کر رادھا چلی آئی۔ وہ ایک سوتی ساڑی میں ملبوس تھی جس کے پلو سے اپنا سر ڈھانپ رکھا تھا۔ پچیس ستائیس برس کی عمر ہوگی۔ گورا چٹا رنگ اور دلکش خدوخال لیکن وہ شادابی وہ شگفتگی چہرے پر نہیں تھی جو عموماً اس عمر کی عورتوں میں ہوتی ہے۔ مگر ان کے تھپیڑوں سے ہرے بھرے گلستان بھی اجڑ جاتے ہیں۔ زندگی کی دھوپ نے اس کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔

راجیندر نے ٹیبل کو گھسیٹ کر سیتو کی کرسی کے سامنے رکھا۔ بیوی کے ہاتھ سے ٹرے لے کر میز پر رکھ دیا۔ سیتو نے گلاس اٹھایا

وہ گھونٹ پانی پیا اور کہا۔ "ڈاکٹر صاحب نے آپ سے بات کر لی ہوگی۔؟"

"ہاں!" راجیندر کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آئی۔ "انہوں نے سوچنے کے لئے دو دن کا وقت دیا تھا۔ دو دن گزرتے ہی آپ آ گئے۔"

سیتو نے وضاحت پیش کر دی۔ "دراصل پارلیمنٹ میں دو تین دن میں اس معاملہ میں ایک بل پیش ہونے والا ہے۔ نئے بل میں کیا کیا پابندیاں ہو سکتی ہیں کیا کیا نئے قوانین نافذ ہو سکتے ہیں کچھ نہیں معلوم۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے کام ہو جائے تو اچھا ہے۔" کہتے کہتے سیتو رک گیا دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کی صورت دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ سیتو نے اپنے پتلون کی جیب سے نوٹوں کے دو بنڈل نکالے اور میز پر رکھ دیے۔ نئے نئے ہزار کے نوٹ تھے۔ اچھوتے چمکتے ہوئے نوٹ۔ جیسے ابھی ابھی ریزرو بینک سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دئے گئے ہوں۔

اسی وقت ان کی اکلوتی چار پانچ سالہ بیٹی بھاگتے ہوئے کمرے میں آئی لیکن ایک اجنبی کو ماں باپ کے درمیان دیکھ کر جہاں تھی وہیں رک گئی۔ رادھا نے کہا۔ "آپ اندر جائیے ہم ابھی آ رہے ہیں۔"

وہ فوراً مڑی اور اندر چلی گئی۔ کچھ دیر کمرے میں سکوت رہا۔ پھر سیتو بولا۔ "یہ دو لاکھ روپے ہیں آپ کو ہر ماہ پندرہ ہزار روپے ملتے رہیں گے۔ نو ماہ تک۔۔۔ ڈلیوری کے بعد مزید دو لاکھ روپے آپ کو مل جائیں گے۔"

راجیندر فوراً بولا۔ "لیکن ہم لوگوں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔"

راجیندر فوراً بولا۔ "سوچ لیجئے۔ ڈاکٹر صاحب آپ سے ہمدردی رکھتے ہیں صرف ایک ہی شرط ہے سارا کام رازداری میں ہونا چاہیے۔" سیتو جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ رقم جوں کی توں میز پر رکھی ہوئی تھی۔ راجیندر بولا۔ "آپ رقم لے جائیے ہم کوئی فیصلہ۔۔۔۔۔"

سیتو نے فوراً اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "ڈاکٹر صاحب نے یہ رقم آپ لوگوں کو دینے کے لئے کہا ہے۔ اگر آپ راضی نہ ہوں تو رقم واپس کر سکتے ہیں۔ کوئی دباؤ نہیں۔ کوئی پریشر نہیں۔ جو بھی ہوگا آپ دونوں کی مرضی اور رضامندی سے ہوگا۔"

وہ چلا گیا۔ رادھا اب تک کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ میاں بیوی دونوں آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ درمیان میں رکھی ہوئی میز پر دو لاکھ روپے رکھے ہوئے تھے۔ دونوں جہاں بیٹھے تھے وہاں سے کچن نظر آ رہا تھا۔ کچن میں رکھے ہوئے آٹا، تیل، چاول اور خوردونوش کے ڈبے مہینوں سے خالی پڑے تھے۔ گھر میں کبھی اتنا وافر مقدار میں کھانے پینے کا سامان نہیں آیا تھا کہ مہینہ بھر چل سکے۔ خوشی، تفریح، مرغن غذاؤں کا تصور بھی محال تھا۔ بس اتنی کمائی تھی کہ سانسوں کا تسلسل چلتا رہے اور کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے کی نوبت نہ آئے۔

جب اس کی شادی ہوئی تھی تب حالات بڑے سازگار تھے۔ پرانے شہر میں ایک بیکری چلاتا تھا۔ بیکری کا کاروبار غیر معمولی نہیں تھا۔ لیکن اتنی کمائی ہو جاتی تھی کہ زندگی سکون سے بسر تھا۔ سرکار کے منصوبے کے مطابق میٹرو ریل ادھر سے گزرنے والی تھی۔ کام شروع ہوا تو بڑی بڑی دکانوں کے ساتھ اس کی دکان بھی زد میں آ گئی۔ سرکار سے معاوضہ ملا ضرور لیکن کاروبار کی تلاش اور پھر پہلی اولاد کی ڈلیوری میں آہستہ آہستہ سارا پیسہ صرف ہو گیا۔ شادی ہو کر صرف ایک سال ہوا تھا پہلی اولاد کی آمد آمد تھی۔ دواخانہ، ڈاکٹر، دوائیاں، اسکا خرچ اور معائنوں کے

چکروں میں روپیہ یوں بہہ گیا جیسے چھید ہوئے برتن سے پانی۔ فاقوں کی نوبت آنے سے پہلے ایک ہوٹل میں نوکری کر لی۔

ہوٹل کا مالک بڑا گھاگ تھا۔ خوب جانتا تھا کہ کس سے کیا کام لینا ہے۔ ہوٹل کے مالک نے اس کو تندور پر بٹھا دیا۔

اب تک مالک تھا اب نوکر بن گیا۔ پہلے مختار تھا اب مجبور۔ تندوری روٹی، تندوری شیرمال، تندوری کچھ بنانا خوب جانتا تھا اس لئے ہوٹل کا مالک اس سے زیادہ سے زیادہ کام لیتا تھا۔ مستزاد یہ کہ یومیہ اجرت ملتی۔ جس روز کام نہیں اجرت بھی نہیں۔ اس لئے پابندی سے نوکری کرنا ضروری تھا۔ ایک لڑکی کا باپ بن چکا تھا۔ پہلے دو جانوں کی روٹی روزی کی فکر تھی اب تین کی ہو گئی۔

دہکتے ہوئے تندور میں روٹی ڈالتے اور نکالتے وقت کبھی کبھی ہاتھ کو چرکے بھی لگ جاتے تھے جو قابل برداشت تھے۔ مگر ایک دن پیشاب میں جلن محسوس ہونے لگی۔ ابتدا میں توجہ نہیں دی۔ گھریلو نسخے آزما کر مرض پر قابو پانا چاہا۔ لیکن پیشاب رک گیا۔ شدید درد محسوس ہونے لگا تو فوراً ڈاکٹر سے رجوع ہوا۔ رادھا بھی ساتھ تھی۔ پہلی بار اسی وقت ڈاکٹر قمر سے ملاقات ہوئی تھی۔

ڈاکٹر قمر سینئر اور ماہر سرجن تھا۔ اس نے راجیندر کا معائنہ کیا مشورہ دیا کہ وہ تندور پر کام کرنا چھوڑ دے۔ تندور کی تپش اس کے اعصاب پر برا اثر ڈال رہی ہے۔ آگے اور پرابلم ہو سکتے ہیں۔ پتھری ہو سکتی ہے' گردے متاثر ہو سکتے ہے۔ دونوں میاں بیوی کے ہوش اڑ گئے۔ رادھا فوراً بولی: ''لیکن یہ تندور پر کام کرنا چھوڑ دیں گے تو کھائیں گے کیا......''

ڈاکٹر نے پلٹ کر غور سے رادھا کا چہرہ دیکھا۔ رادھا کے اس ایک ادھورے فقرے سے ڈاکٹر قمر کو ان کی معاشی حالت سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ خاموش رہا۔ ذہن میں کچھ اور چل رہا تھا۔ اس نے راجیندر کے لئے دوائیں لکھ دیں اور کچھ دوائیں اپنے کلینک سے بھی دے دیں۔ تین چار روز میں اس کی طبیعت سنبھل گئی لیکن وہ کام پر نہیں گیا۔ تیسرے دن وہ گھر سے ملا۔ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا۔ ملائمت سے گفتگو کی اور پھر ان دونوں سے ایک بات کہہ دی کہ راجیندر آپے سے باہر ہو گیا۔ رادھا نے بھی وہاں بیٹھنا مناسب نہیں سمجھا۔ گھر تے نرمی سے ان کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا: ''میری بات سے آپ مطمئن نہیں ہے۔ اچھی بھی نہیں لگی ہوگی۔ دنیا کے کچھ ممالک ایسے ہیں جہاں Surrogate کیس عام ہیں۔ ہمارے ہاں تو بہت سے کیس سامنے آ رہے ہیں۔ گجرات کے ایک مقام......''

ڈاکٹر قمر کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے بیوی کا ہاتھ پکڑا اور کہا: ''چلو چلتے ہیں۔''

وہ دونوں تیزی سے ڈاکٹر کے روم سے باہر نکل آئے۔ ڈاکٹر نے ان کو روکا نہیں مگر دو دن بعد فون کر کے پوچھ لیا: ''آپ لوگوں نے کیا سوچا؟'' راجیندر سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔ دلی میں اور اقرار میں۔ اتنا کہہ کر فون رکھ دیا کہ ''آپ ہمیں سوچنے کا موقع دیں۔'' فون بند کر کے دیکھا تو رادھا وہاں موجود تھی اور غور سے اس کو تک رہی تھی۔ دراصل ان کے حالات اس طرح جیسے ہو چکے تھے جس کی کشتی طوفان میں پھنس چکی ہوں اور وہ چپو پھینک کر اپنے آپ کو طوفانی تھپیڑوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ کام پر جانا تو بند کر دیا تھا۔ تھوڑا بہت رہا سہا زیور بھی بکنے لگا تھا۔ آج ڈاکٹر قمر کا آدمی آ پہنچا تھا۔ دیر تک وہ کمرے میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ رادھا اندر چلی گئی تھی۔ میز پر رکھی رقم جوں کی توں پڑی تھی۔ اسی وقت اس کی اکلوتی بیٹی کمرے میں چلی آئی۔ رقم کو دیکھ کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ آگے بڑھ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے رقم اٹھا لی اور سینے سے لگا کر خوش ہو کر بولی۔ ''ڈیڈی چلیے آئسکریم کھائیں گے۔ مجھ کو جوتا خرید دیجیے اسکول کا جوتا پھٹ گیا ہے۔''

اگلے دو دن بعد وہ دونوں ڈاکٹر قمر کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے معاہدے کے کاغذات ان کے سامنے رکھ دیے تھے۔ دستخط کرنے سے پہلے ان کو سمجھا دیا کہ Surrogancy آخر کیا چیز ہے۔ نو دس مہینے کا یہ عمل دشوار ہے اور صبر آزما بھی۔ اس نے کہا۔

"آپ کے بارے میں کسی کو نہیں بتایا جائے گا کہ آپ کس کے لئے Surrgate Mother بن رہی ہیں تاکہ مستقبل میں کسی قسم کی ذاتی صورت یا الجھن پیدا نہ ہو۔ تاہم اس نے بتا دیا کہ جس کے لئے وہ کام کر رہی ہے وہ شہر کا ایک دولت مند آدمی ہے۔ بیوی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔ وہ دوسری شادی نہیں کر سکتا۔ اولاد چاہتا ہے لیکن ایسی جس کی رگوں میں اس کا اپنا خون ہو۔"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آپ کو جو بھی رقم مل رہی ہے وہ مل جائے گی۔ اس کے علاوہ ڈیلیوری سے پہلے اور بعد جو اخراجات ہوں گے وہ بھی برداشت کر رہا ہے۔ میٹرنٹی ہوم، ڈاکٹر کی فیس، انجکشن، دوائیاں، ٹیسٹ، الٹرا ساؤنڈ اور دیگر مراحل پر آپ کو ایک روپیہ بھی خرچ کرنا نہیں پڑے گا۔ ہاں ابتدا میں کچھ دن میٹرنٹی ہوم میں آپ کو تنہا رہنا ہوگا۔ ایک تجربہ کار لیڈی ڈاکٹر اور دو نرسیں یہ سارا کام انجام دیں گی۔ وہاں آپ کا کوئی رشتہ دار حتیٰ کہ شوہر بھی نہیں۔ یہ عمل مکمل ہونے کے بعد آپ وہاں سے جا سکتی ہیں۔ باقی کے ایام اپنے مکان پر گزار سکتی ہیں۔"

اتنا کہہ کر ڈاکٹر یوں خاموش ہو گیا جیسے کوئی ٹیچر کلاس روم میں پورا سبق سمجھانے کے بعد پوچھتا ہے۔ "any quasion" وہ دونوں چپ رہے۔ میز پر معاہدے کا کاغذات اور قلم رکھا ہوا تھا۔ اپنی بچی کو ایک رشتہ دار کے پاس چھوڑ آئے تھے۔ راجیندر کو محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ بچی کا مستقبل بھی ہنڈولے کی مانند بڑی بڑی پینگیں لے رہا ہے۔ کبھی اس طرف کبھی اس طرف۔ کبھی تاریکی کی طرف کبھی روشنی کی طرف۔ فیصلہ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اتنی بڑی رقم کمانے کے لئے مہینوں بلکہ سال بھی لگ سکتے ہیں۔ اس رقم سے وہ ایک نئی زندگی کی شروعات کر سکتا ہے۔ اس نے آہستگی سے معاہدے کے کاغذات رادھا کی طرف سرکا دیے۔

جتنے دن رادھا میٹرنٹی ہوم میں رہی اتنے دن وہ بجھا بجھا سا رہا۔ ہر گھڑی ہر پل اعصاب پر بے چینی طاری رہتی۔ لگتا تھا جیسے کوئی تیز دھار کے ہتھیار سے اس کے جسم کو لہولہان کر رہا ہے۔ بار بار ذہن میں ایک خیال کوڑے کی طرح سلگتا رہتا تھا کہ اس نے فیصلہ کرنے میں عجلت کی ہے۔ وہ اتنا کمزور بھی نہیں تھا کہ بیوی اور بچے کا بوجھ نہ اٹھا سکے۔ تو کیوں اپنی غیرت اور خوددار بیوی کو آگ میں دھکیل دیا۔ بچی ماں کے بارے میں پوچھتی تو سمجھا دیتا کہ ماں دواخانے میں ہے اور وہاں بچوں کو جانے کی اجازت نہیں۔ کھلونے، چاکلیٹ، ٹافیاں اور نئے کپڑوں کی خوشی میں وہ سب بھول جاتی۔

رادھا دواخانے سے لوٹی تو دیکھا کہ گھر میں کافی تبدیلی آ گئی ہے۔ آرائش کا بہت سا نیا سامان خرید لیا گیا ہے۔ کچن کے خالی ڈبے کھانے پینے کی اشیاء سے بھرے بھرے نظر آئے۔ گھر کے در و دیوار نئے رنگ و روپ میں کھلکھلا اٹھے تھے لیکن اس کا اپنا رنگ کہیں اڑ گیا تھا۔ کہیں کھو گیا تھا۔ شوہر نے ایک سیکنڈ ہینڈ بائیک بھی خرید لی تھی اور اب اس بائیک پر بچی کو اسکول لے جاتا اور لاتا تھا۔ گھر آنے کے بعد دونوں میاں بیوی ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے۔ راجیندر کوتے کوتے پچھتا رہا لیکن رات آئی تو ایک مجرم کی طرح کمرے میں آیا۔ اسٹول کھینچ کر رادھا کے پلنگ کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ آنکھیں بند کئے لیٹی تھی اور جاگ رہی تھی۔ وہ خاموش بیٹھا کچھ دیر تک رادھا کو تکتا رہا اور پھر اس نے بیوی کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور سر جھکا کر سسکنے لگا۔

"مجھ کو معاف کر دو میں نے تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔"

اس کی رندھی ہوئی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔ لیکن ابلتے ہوئے آنسو آنکھوں میں نہیں رکے۔ کچھ دیر تک رادھا کے جسم میں جنبش نہیں ہوئی پھر اس نے آنکھیں کھولیں شوہر کو دیکھا زبان سے کچھ کہہ نہ سکی لیکن اپنا دوسرا ہاتھ شوہر کے سر پر رکھ دیا۔

وہ سفر شروع ہو چکا تھا جو بظاہر خوشگوار تھا لیکن دونوں کو ایک اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ رادھا کا جسم بھرنے لگا تھا اور چہرہ نکھرنے لگا تھا لیکن آنکھوں میں پھیلی ہوئی اداسی میں کمی نہیں آئی تھی شاید اس لئے کہ خودداری کا تاج محل کھنڈر بن چکا تھا اور وہ اپنے حساس ذہن کو اس کھنڈر میں بھٹکنے سے روک نہ سکی۔ وہ اندر ہی اندر گھٹ رہی تھی۔ اس کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے آخر شب کا ٹمٹماتا ہوا چراغ۔ ڈاکٹر جب بھی کال کرتا وہ چیک اپ کے لئے چلی جاتی۔ جو بھی ہدایت دیتا اس پر عمل کرتی۔ ایک حاملہ کو جن جن طبی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے وہ اس سے گزر رہی تھی۔ معاہدے کے مطابق مقررہ رقم ان کو مل رہی تھی اور یہ رقم ان کے لئے بہت بڑا معاشی سہارا تھا۔ راجیندر نے کالونی میں ایک دکان پگڑی پر لے لی جہاں وہ اپنا پرانا کاروبار نئے سرے سے شروع کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

اب تک جتنی دفعہ ڈاکٹر نے چیک اپ کیا تھا اس سے وہ مطمئن تھا۔ ماں اور اس کی کوکھ میں پلنے والا بچہ صحت مند تھا۔ کوئی پرابلم نہیں تھا لیکن جب آٹھواں مہینہ لگا اور چیک اپ کیا تو ڈاکٹر ایکدم پریشان ہو گیا۔ رادھا کا بلڈ یکسر کم ہو گیا تھا اور بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا تھا۔ وہ تشویشناک لہجے میں بولا۔ "لگتا ہے آپ ٹینشن میں رہنے لگی ہیں۔ کسی قسم کی فکر کو قریب نہ آنے دیجئے۔ ہر وقت اچھا سوچئے اچھا کھائیے اور صحت مند رہئے یہ آپ کے اور بچے دونوں کے لئے بہتر ہے۔ ورنہ نارمل ڈلیوری مشکل ہو جائے گی۔ آپریشن کرنا پڑے گا۔"

"میں آپریشن نہیں کراؤں گی۔" پہلی دفعہ وہ تیز لہجے میں چلائی تھی۔ ڈاکٹر کو خاموش ہونا پڑا۔ اس نے خون میں اضافہ کرنے کے لئے دوائیاں وغیرہ لکھ دیں۔ زچگی کی متوقعہ تاریخ سے بھی واقف کرا دیا۔ مقررہ تاریخ پر ایک نرس ایمبولنس لے کر آئی اور رادھا کو لے کر چلی گئی۔ وہ گھر پر رکا رہا۔

تین چار گھنٹے گزر گئے رادھا کے بارے میں کوئی خبر نہیں ملی۔ فون پر بھی کچھ نہیں بتایا گیا۔ پریشان ہو کر وہ شفاخانہ پہنچ گیا۔ یہ نہیں معلوم تھا کہ رادھا آپریشن تھیٹر میں ہے یا وارڈ میں۔ وہ سیدھا ڈاکٹر گرگ کے روم میں چلا آیا۔ ڈاکٹر گرگ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔

راجیندر نے پوچھا۔ "رادھا کہاں ہے؟"

جواب میں ڈاکٹر گرگ نے متاسف لہجے میں جو کہا اس کو سن کر راجیندر کا سر چکرانے لگا۔ غصے سے بے قابو ہو کر ڈاکٹر کا گریبان پکڑ لیا اور کہا۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

گریبان چھڑانے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "نارمل ڈلیوری ممکن نہیں تھی آپریشن کرنا ضروری تھا لیکن وہ آپریشن کے لئے راضی نہیں ہوئی۔ بلڈ پریشر اتنا بڑھ گیا تھا کہ دماغ کی رگیں پھٹ گئیں۔ مجبوراً ہم کو آپریشن کرنا پڑا۔ بچہ تو بچ گیا لیکن وہ بچ نہ سکی۔"

وہ سسکنے لگا ڈاکٹر نے غمناک لہجے میں کہا۔ "ایسا لگتا تھا جیسے وہ موت کو بہت پہلے ہی ذہنی طور پر اپنا چکی ہے۔ بار بار یہی کہہ رہی تھی۔ "اب نہیں جینا ہے مجھے۔""

گرگ کے گریبان پر راجیندر کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی گئی۔

◆◆◆

ریس کورس والی

محمد طارق علی

مختصر تعارف

1947ء میں پاکستان آمد کے بعد راولپنڈی میں قیام کیا۔ ایم اے تک تعلیم حاصل کی۔ صحافت سے پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز کیا۔ چند افسانے لکھنے کے علاوہ اردو میں درجنوں مضامین ترجمہ کئے۔ سرکاری ملازمت کی۔ آج کل ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ 2010ء میں ادب نگاری کا آغاز کیا۔ افسانے، تبصرہ جات، کتب، سوانح نگاری اور افسانوں کی بڑی تعداد چھپ چکی ہے جبکہ ایک مجموعہ بعنوان "مجھے تبصرہ پسند ہے" لاہور میں زیر طبع اور دوسرا زیر ترتیب ہے۔

پہاڑی شہروں میں شام میں جلدی اتر آتی ہیں۔ وہ شام بھی ایسی ہی تھی۔ اتوار کا دن تھا، کھلا کھلا سا، سارا دن بادل سورج سے لپٹے رہے اور یوں شہر سے دھوپ تقریباً غائب رہی۔ کاٹھمنڈو کی فضا میں صبح سے خنکی گھلی ہوئی تھی۔ شہر کے کاروباری حلقے ہفتہ واری چھٹی کی وجہ سے بند تھے۔ طاہر تین بجے سے اپنا امپورٹ، ایکسپورٹ کا دفتر کھولے بزنس پارٹنر کا انتظار کر رہا تھا۔ کئی کام اسی دن نمٹانے تھے۔ کئی فائلوں اور لیٹرز پر پارٹنر کے دستخط ضروری تھے تاکہ اگلے دن مختلف کمپنیوں اور سرکاری دفتروں میں جلد پیش کر کے آرڈرز لیے اور پچھلے کئی سودوں کے چیک وصول کیے جا سکیں۔

گھڑی اپنی رفتار سے چل رہی تھی اور اشوک آ کر نہیں دے رہا تھا۔ طاہر تن تنہا لیٹرز لکھنے اور ٹائپ کرنے میں مصروف تھا۔ یہ کام ضروری تھا۔ اتوار کا سارا خالی دن اپنا تھا۔ کہیں جانے کی جلدی تو تھی نہیں لیکن ہاں ذہن میں چھپا ایک خاص چہرہ اب اسے بار بار تنگ کرنے لگا تھا۔ طاہر کو یوں لگا کر جیسے وہ چہرہ اسے یاددہانی کرا رہا ہو کہ "بس چھوڑو یہ سب کچھ، اب آ جاؤ۔" "لیکن کیسے؟ مہلت بھی تو ملے۔" اس نے سوچا اور لیٹرز پر جھک گیا۔ کچھ دیر بعد طاہر نے گھڑی دیکھی، پونے چار کا عمل تھا۔ آفس بوائے نے بسکٹ اور چائے اس کے سامنے لا کر رکھ دی۔ تین چار خط تھے، ٹائپ ہو چکے تھے۔ اسی وقت اشوک آ گیا۔ خطوں پر دستخط کر دیے اور فائلیں بھی نمٹا دیں۔

''آج میرے ایک دوست کے بھائی کی شادی تھی، اس لئے تھوڑی دیر تو ہونی ہی تھی، اس کے لئے ویری سوری اور ہاں، آج اتوار ہے 'اس' سے نہیں ملو گے؟'' اشوک مسکرایا۔ ''اس سے، کس سے؟''

''ارے، کیسے بن رہے ہو، اسی ریس کورس والی سے اور کس سے؟''

''اشوک، وہ میری دوست نہیں ہے، بھلا اپنا نصیب ایسا کہاں؟ ہاں، وہ کچھ کچھ واقف ضرور ہے، صرف دو چار ملاقاتوں کے بعد اور وہ بھی صرف ریس کورس پر۔''

''دوستی کے لئے اتنا ہی بہت ہے پیارے۔ اور کیا دو چار سال کی ملاقاتوں کے بعد دوستی ہوتی ہے؟''

''نہیں میری اور اس کی عمر میں فرق ہے، گھوڑوں کی ریس کا مشترکہ شوق ہے تو کیا ہوا۔''

''یار عمر اور جگہ کو نہیں دیکھتا، پھر تم تو ویسے بھی وائف کے دیہانت کے بعد اکیلے ہو، ایک بار پھر گھر تو بسانا ہی ہوگا۔''

''نہیں تم جانتے ہو میرا ایک بیٹا ہے، جو ابھی کالج میں پڑھتا ہے، مجھے اس کا سوچنا ہے یا اپنا؟''

''جب اس کا وقت آئے گا تب سوچنا، ابھی تو اپنا گھر بساؤ۔'' دونوں مسکرائے۔

''کام ختم ہو چکا تھا'' آفس بند کر کے دونوں باہر آگئے۔ آفس بوائے نے اشفاق کی ماروتی اسٹارٹ کر دی۔

''طاہر تم کہاں جاؤ گے، گھر یا ریس کورس؟'' ''ریس کورس۔''

''چندا بھی وہیں ہوگی نا؟'' اشفاق نے آنکھ ماری۔ ''ہو سکتا ہے۔''

ماروتی چل پڑی۔ ''چندا سے تمھاری ملاقات کب اور کیسے ہوئی تھی، سچ بتاؤ!''

''یہی کوئی ڈیڑھ ماہ پہلے۔ اس روز اتوار کا دن تھا، ریس کورس میں بہت سی عورتیں اور مرد جمع تھے۔ وہ اچھے کپڑوں میں ملبوس، ریلنگ کے سہارے دوربینیں لئے کھڑے، اپنی اپنی پسند کے گھوڑوں کو دیکھ رہے تھے۔ میں بھی وہیں موجود تھا۔ ''ایورسٹ پوسٹ'' میں گھوڑوں کی ریس کا کام دیکھ رہا تھا، اور کبھی کبھی دوربین سے سامنے کا منظر بھی تک رہا تھا۔ پندرہ سولہ جاکیز اپنے اپنے گھوڑے لئے میدان میں آگئے۔ رقمیں داؤ پر لگ چکی تھیں۔ ہر گھوڑے کا اپنا نمبر تھا۔ شرطیں لگانے والوں (Punters) کا جوش و اضطراب لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔ میری دوربین کا رخ یونہی ریلنگ کے آخری کونے کی طرف ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک پتلی اور خوب صورت لڑکی سر پر ہیٹ اور آنکھوں پر چشمہ لگائے کھڑی تھی۔ وہ آنکھوں پر ہاتھوں کی اوٹ کئے ہوئے تھی، شاید اس لئے کہ دوربین اس کے پاس نہ تھی اور یقیناً اپنی پسند کا گھوڑا دیکھنے میں اسے دقت ہو رہی تھی۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا، درمیانہ قد اور جاذب نظر شخصیت، عمر تیس بتیس سال، فوراً ہی نظروں میں آ سمائی۔ ''ہیلو مس، گڈ ایوننگ، مجھے طاہر کہتے ہیں، کیا آج آپ پہلی بار یہاں آئی ہیں؟''

''اس نے چشمہ اتارا اور بہت پر اعتماد نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''نہیں میں یہاں آتی رہتی ہوں۔''

''شاید آج آپ دوربین لانا بھول گئیں۔'' ''جی ہاں، یہ بات درست ہے۔''

''تو یہ لیجئے آپ اپنی پسند کے گھوڑے کو دیکھئے، میں اپنی چوائس کو دیکھ چکا ہوں، اور ابھی چند ہی منٹ بعد ریس شروع ہو جائے گی۔ میں نے دوربین اس کی طرف بڑھا دی۔''

''تھینک یو، دراصل میں جلدی میں تھی، ہوٹل سے نکلی تو اپنے گھر سے دوربین لینا بھول گئی اور ٹیکسی میں سیدھی ادھر چلی آئی۔''

''اگر مناسب سمجھیں تو بتائیے کہ کون سا گھوڑا آپ نے پسند کیا ہے؟'' ''شہزادی'' اور آپ نے؟''

''یہ آپ کی پسند ہے تو یقیناً اچھی ہے، میں نے ''لکی'' (Lucky) کو چوائس کیا ہے، اب دیکھتے ہیں کہ کس کی قسمت

کتنا ساتھ دیتی ہے۔ آج کے ایلی بیچر نے تو اسی گھوڑے کی سفارش کی ہے۔"

"آئی نو! لیکن چندا اپنی اپنی ہوتی ہے اور ہونی بھی چاہیے۔"

"ہاں آپ نے ٹھیک کہا۔ آپ کا شبھ نام؟" "چندا پوڈیل"

"اسی وقت جاکیز بڑی پھرتی سے اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو گئے، اشارہ ہوا اور سبھی گھوڑے دوڑ پڑے۔ شپ شپ، شپا شپ، سب ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لئے بے تاب اور تیزی سے رواں دواں، میں نے چندا سے چند سیکنڈ کے لئے دوربین لے لی۔ میری چوائس یعنی "گل" وہ تین گھوڑوں سے پیچھے تھا، میں نے سر جھٹک کر دوربین چندا کی طرف بڑھا دی، آسمان کی طرف چند سیکنڈ دیکھا اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھا لئے۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی۔"

"اس وقت میرا گھوڑا دوسرے نمبر پر اور آپ کا تیسرے یا چوتھے نمبر پر جا رہا ہے، لیکن گھبرایئے نہیں، اوپر آکاش کی طرف دیکھئے، ابھی گھوڑے یہیں پیچھے ہی تو ہیں!" اس کی آنکھوں پر دوربین ٹکی تھی اور ہونٹوں پر مسکان۔

"میں تو آنکھیں اب نہیں دیکھوں گا، گل میں جان ہوگی تو آگے آ جائے گا، ورنہ پیچھے تو میرے ڈوب ہی گئے۔"

"اضطراب کے چند منٹ اور گذرے، اور پھر ریس ختم ہو گئی۔ "شیری" نمبر ون تھا، "گل" کا نمبر میں بتاؤں گا نہیں۔ چندا نے اسی وقت کاؤنٹر پر جا کر اپنا انعام وصول کیا، خاصی موٹی رقم تھی۔ میں گلے میں لٹکی دوربین جھلاتا آہستہ آہستہ آگے چلا۔ پھر کھڑا ہو گیا اور ریس کورس کے گیٹ پر رش کم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ چندا پرس میں رقم ٹھونس کر میری طرف آئی۔ "دوربین عنایت کرنے کا بہت بہت شکریہ، اور ہاں، اس ہار کو آپ دل پر بالکل نہیں لیں گے، شانت رہیے، میرے پاپا کا کہنا ہے کہ ہار کے بعد پریشان مت ہو لوگ اگلے دن روشن اور چمک دار آئیں گے میرے نئے دن میں" لگ "سچا تھی اور مسکراتی ہے، بندے میں صبر ہونا چاہیے۔"

"مشورے کا شکریہ! آپ کے پاس گاڑی ہے نہ میرے پاس، یہ بتایئے آپ کہاں جایئے گا؟"

"پانی پوکھری، مہاراج گنج روڈ پر ہے، امالین آفس کے قریب۔"

"تو آیئے، ایک ہی ٹیکسی میں چلتے ہیں، میں پانی پوکھری سے آگے سیدھا مہاراج گنج جا اتروں گا۔" جلد ہی ٹیکسی مل گئی، ہم بیٹھ گئے۔ "آپ کی سوجھ بوجھ بہت اچھی ہے، کس سے سیکھی؟"

"اپنے پاپا سے اور کس سے، ان کا کہنا ہے کہ خوب ٹھونک بجا کر گھوڑے کو دیکھو، پھر پیسہ لگاؤ، ہار دو تو اس ہار کو بھول جاؤ، جیت جاؤ تو زیادہ خوش نہیں ہونا، زیادہ خوشی آدمی کو ناکارہ بنا دیتی ہے۔"

"لیکن آپ کی چوائس "شیری" کے بارے میں کسی پترکا میں کوئی خاص ریمارکس نہیں تھے، پھر آپ نے اسے کیسے پسند کیا؟"

"وہی پاپا کا بتایا ہوا طریقہ یعنی "ٹھونک بجا کر"۔ ہر پترکا میں صحیح انفارمیشن نہیں ہو سکتی، میں تقریباً سبھی جاکیز کو جانتی ہوں، ان سے ملتی اور قریباً ہر گھوڑے کی نسل، مزاج اور ٹریننگ کے بارے میں معلومات حاصل کرتی ہوں، ریس کا گھوڑا عام گھوڑے سے مختلف ہوتا ہے، اس سے آگے بات آپ خود سوچ لیں۔"

"آپ کی جیت کی وجہ سمجھ میں آ گئی، ہاں آپ کے قادر کے مشورے دلچسپ اور زوردار ہیں۔ اور آپ لگی ہیں کہ آپ کو

ان کی کمائیڈنس حاصل ہے۔''

ٹیکسی تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

''دراصل میرے پاپا نے زندگی میں بہت محنت کی ہے، اتنی کہ جتنا آپ سوچ بھی نہیں سکتے، وہ آج کل دل کے مریض ہیں اور بستر پر دراز ہیں لیکن ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق وہ زندگی کے اس فیز کو بھی اچھی طرح انجوائے کر رہے ہیں۔''

''انھوں نے عام لائف کے مسئلوں کے بارے میں بھی آپ کو کچھ نہ کچھ مشورے دیے ہوں گے؟''

''جی ہاں بالکل۔'' ''مثلاً؟''

''لائف پارٹنر کی سلیکشن کو بھی وہ اہم سمجھتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ اسے بھی خوب ''ٹھوک بجا'' کر دیکھو، جلد بازی میں یا جذبات میں آ کر کوئی فیصلہ نہیں کرنا کہ یہ عمر بھر کا سودا ہوتا ہے۔'' چندا نے مسکراتے ہوئے صاف گوئی سے کہا۔

''میرے بارے میں کیا کہتی ہیں، کوئی خاص بات؟''

''آپ نے اپنی زندگی میں شاید کم کم سیکھا ہے، بہرحال اپنے تجربے کو اپنا راہ نما بنائیے۔''

پالی پوکھری کا اسٹاپ آ گیا۔ ان لینن ایمبیسی کے ساتھ ایورسٹ ہوٹل تھا۔ چندا وہیں اتر گئی۔

''ٹھیک ہے، کبھی ملنا ہو تو میں اسی ہوٹل میں کام کرتی ہوں، یہ میرے پاپا کا ہے، بائی!''

پھر طاہر نے کئی بار ہارنے کے بعد ریس کورس جانے کا سلسلہ تقریباً موقوف کر دیا۔ اور بھی کئی وجوہات تھیں۔ دفتری الجھنیں، مسلسل کام اور اپنے بزنس پارٹنر کے ساتھ مقامی تاجروں سے اکثر بھی کاروباری ملاقاتیں وغیرہ۔ وہ ہر وقت پریشان سا رہنے لگا۔ یہاں تک کہ اپنے نوجوان بیٹے رضا سے بھی کم کم ملتا۔ بس صبح ناشتے پر یا رات کے وقت ڈنر پر ملاقات ہو جاتی۔ کھانا پکانے اور دیگر گھریلو امور کے لیے ایک مستعد نوکرانی موجود تھی۔ مقامی کالج میں رضا کی پڑھائی ٹھیک جا رہی تھی لیکن ایک دن طاہر سے پرنسپل نے فون پر بات کی ''کل آفٹرنون میں کالج آ جائیں، رضا کے بارے میں بات کرنی ہے۔''

طاہر وقت مقررہ پر کالج پہنچا۔ پرنسپل صاحب نے کہا ''ویسے تو لڑکا ٹھیک جا رہا ہے لیکن میں کچھ دنوں سے اسے الجھا الجھا سا دیکھ رہا ہوں، کیا بات ہے؟ آپ اس کے ذاتی مسئلے کو جانیے اور دور کرنے کی کوشش کیجیے۔ لیکن اس طرح کہ اسے پتہ نہ چلے کہ آپ کو ہم نے بتایا ہے۔'' طاہر پرنسپل صاحب کی ہدایت کے مطابق رضا کی شب و روز کی مصروفیات پر غور رہا تھا۔ اس نے ایک آدھ بار پوچھا تو رضا نے بات ٹال دی۔ ''کچھ نہیں ابو جی۔''

''نہیں، تمھیں اگر کوئی مسئلہ درپیش ہے تو مجھے بتاؤ، میں تمھارا نہ صرف باپ ہوں بلکہ ماں بھی اور دوست بھی ہوں، مجھ سے شیئر کرو، مل کر حل نکال لیں گے۔''

''ابو کچھ بھی تو نہیں ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' آنکھیں زبان کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ طاہر مطمئن نہ ہوا۔ جانتا تھا کہ پرنسپل صاحب نے یونہی تو اسے کالج نہیں بلایا تھا۔ اس نے بہرحال رضا پر نظر رکھی۔ رضا کالج میں دن کی شفٹ چھوڑ کر شام کی شفٹ میں پڑھنے لگا۔ جب یہ بتائی کہ وہ دن میں کوئی کام کرنا چاہتا ہے۔ چلو یہاں تک کوئی مضائقہ نہ تھا۔ طاہر نے اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ وہ ایک ہفتے غیر حاضری کے بعد طاہر پھر ریس کورس جانے لگا۔ وہ ہر بار چندا کو ڈھونڈ لیتا اور کہتا کہ کوئی ٹپ دو۔ وہ کسی گھوڑے کا

نام لیتی، طاہر اس پر پیسہ لگاتا، وہ دو ایک بار جیت گیا لیکن اتنی ہی بار ہار بھی۔ جبکہ چندا مسلسل جیتتی رہی۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے کبھی ایسی چوائس والے گھوڑے اسے نہیں بتائے۔ طاہر نے اس سے پوچھنا چھوڑ دیا لیکن ان دونوں کی ریس کورس میں ملاقاتیں اور تھوڑی بہت گپ شپ ہوتی رہی۔ اور وہ ایسی پر دونوں دیکھتے ایورسٹ ہوٹل تک آتے۔ ایک روز طاہر نے چندا سے کہا:

"میں آج شام ڈنر آپ کے ہوٹل میں آ کر کروں گا۔"

"یو آر ویلکم"

ٹھیک آٹھ بجے طاہر ہوٹل میں تھا اور چندا استقبالیہ پر اس کی منتظر۔

"پاپا بدستور بیمار ہیں۔ ہوٹل کے مختلف معاملات میں ہی دیکھتی ہوں، بعض دفعہ خاص مہمانوں کو میں خود اٹینڈ کرتی ہوں، آپ بیرے کو اپنا آرڈر دے دیجئے، آخر میں پیش کروں گی۔"

"نہیں، بالکل نہیں، آپ میرے ساتھ ڈنر کریں گی۔" تھوڑی سی بحث کے بعد چندا نے دعوت قبول کر لی۔ کھانے کے دوران طاہر نے چندا کو مختصراً اپنا ایک کردار بتایا یعنی یہ کہ وہ پاکستان سے آیا ہے اور یہاں ایک مقامی دوست کے ہمراہ پارٹنر شپ میں امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کر رہا ہے۔

"میں اپنے فادر کی ایک ہی اولاد ہوں، وہ مجھے دیکھ کر جیتے ہیں اور میں انہیں دیکھ کر سکھ کا سانس لیتی ہوں۔ کالج میں پڑھ رہی ہوں لیکن پاپا چاہتے ہیں کہ کسی اچھے سے لڑکے سے میری شادی ہو جائے یعنی اپنی زندگی میں وہ اس فرض سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں۔ پہلے تو میں رضا مند نہیں تھی لیکن اب پاپا کی خواہش کو پورا کرنا چاہتی ہوں۔"

"کوئی من چاہا رشتہ ملا؟" طاہر کے دل میں اشتیاق کی جوت جاگی۔

"دیکھیں، میں کوشش کر رہی ہوں، مجھے بہت چالاک اور لالچی لڑکے پسند نہیں، بس کوئی سادہ اور شریف سا ساتھی ہو۔ ایک بھلا سا دکھتا تو ہے، وہ مجھ سے زمانے بھر کی باتیں کرتا ہے، لیکن شادی کی بات نہیں کرتا، جانے کیوں۔"

"وہ کون ہے اور کہاں ہے؟"

"ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہ پاکستان سے ہے اور شکل بھی کچھ کچھ آپ جیسی لگتی ہے اور ـــــ اور" اسی وقت بیرے نے چندا سے آ کر کہا: "آپ کے لئے ایک فون کال ہے۔" وہ اٹھ کر چلی گئی۔

"وہ مارا، لگتا ہے آج میرا کام بن جائے گا۔" طاہر کا دل خوشی سے ناچنے لگا۔ چند منٹ بعد چندا واپس آ گئی، کہنے لگی: "اسی لڑکے کا فون تھا، وہ ادھر ہی آ رہا ہے۔" طاہر کی امید کا پھول مرجھا گیا۔

"کیا نام ہے اس کا؟" "راجا"

تھوڑی دیر بعد لڑکا آ گیا۔ اسے دیکھ کر طاہر کھڑا ہو گیا۔ "ارے تم؟" وہ "رضا" تھا۔ تلفظ کی غلطی نے اسے "راجا" بنا دیا تھا۔

"طاہر جی، ہم دونوں ایک ہی کالج میں پڑھتے ہیں اور ہم نے ایک دوسرے کو "ٹھوک بجا کر" دیکھا ہے۔"

"تو یوں تو رضا، یہ تھا تمہارا مسئلہ، اور چندا تمہاری پرکھ کا تو ویسے بھی میں قائل ہوں۔"

◆◆◆

گرد

علی اکبر ناطق

مختصر تعارف

علی اکبر ناطق 1976ء میں اوکاڑہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اپنے ادبی سفر کا آغاز شاعری کے دو مجموعوں سے شروع کیا۔ "یاقوت کے ورق" اور "بے یقین بستیوں میں"۔ اس کے بعد ان کی کہانیوں کی کتاب "قائم دین" شائع ہوئی۔ اس کے علاوہ ان کا ناول "نولکھی کوٹھی" شائع ہوا جس کا انگریزی ترجمہ بھارت کے پینگوئن پبلشرز نے شائع کیا۔ علی اکبر سماجی بہبود کے کاموں میں بھی حصہ لیتے رہے ہیں۔

یہ ایک بہت کھلا احاطہ تھا، جس کے چاروں طرف تین منزلہ مکان اور مکانوں کی دیواریں تھیں۔ کچی اینٹوں سے اوپر تک اٹھی ہوئی اتنی بھدی تھیں کہ دیکھنے سے طبیعت پر بوجھ پڑتا۔ احاطے کے ایک کونے میں کاٹھ کباڑ کے ڈھیر، دوسری طرف پرانے ٹائر اور جلے ہوئے کوئلوں کی راکھ پڑی تھی۔ ان سے کافی دور ویلڈنگ کا پلانٹ تھا، جس کے اردگرد لوہے کے ٹکڑے اور ٹیڑھی میڑھی سلاخیں بکھرے ہوئے کوئلے سے مل کر عجیب کرختگی کا احساس پیدا کرتیں۔ اسی احاطے میں سب سے الگ بائیں جانب وہ فیکٹری تھی، جس میں کام کرتے مجھے دس دن ہو گئے۔ یہاں میں خادم علی کے توسط سے پہنچا تھا۔ اسے بس اتنا جانتا ہوں کہ لاہور کی کسی گمنام گلی میں رہتا تھا۔ ہم دونوں پندرہ دن تک اکبری منڈی کے قریب گٹا ڈھوتے رہے۔ اسی عرصے میں اس سے واقفیت ہوئی۔ اس کے بعد وہ یہاں سے چھوڑ گیا۔ ایک دن دوبارہ آیا اور مجھے یہ کہہ کر ساتھ لے گیا کہ ایک جگہ اچھی مزدوری کا مل رہا ہے، وہاں چلتے ہیں۔

یہ جگہ بادامی باغ کے پچھلی طرف نہایت گندے علاقے میں کاٹھ کباڑ اور کچرے کے ڈھیروں میں تھی۔ میرے اور خادم علی کے علاوہ یہاں سات مزدور اور تھے۔ آپ اسے چھوٹا سا کارخانہ کہہ لیں، جو بیس مربع فٹ کمرے میں نصب تین عدد چکیوں پر مشتمل تھا۔ کمرے کے آگے چالیس مربع فٹ کا مزید صحن تھا۔ صحن میں خام مال پڑا ہوتا، جسے ہم چکیوں کے ذریعے اصل مال کی شکل دیتے۔ یہ خام مال کیا تھا؟ اس بارے میں زیادہ نہیں بتا سکوں گا مگر ان میں سے دو چیزوں کو جانتا ہوں۔ ایک اکثر روہڑیوں کے درمیان سے نکلا ہوا سیاہ سکہ اور دوسرا بجھا ہوا چونا۔ یہ سکہ کس چیز سے بنتا ہے؟ اس کی مجھے خبر نہیں مگر وہ جنگل جن کے درمیان یہ پایا جاتا ہے، ریڈیو اور اسی جیسی دوسری الیکٹرک چیزیں چلانے کے کام آتا ہے۔ یہ کالے رنگ کا سکہ یا کوئلہ کہہ لیں، جسے چکیوں کے ذریعے پیسا جاتا۔ سکہ پیسنے والی بڑی چکی پانچ ہارس پاور کی موٹر کے ساتھ ایک چنگھاڑتا ہوا بھوت تھی، جو سکے کے ساتھ سماعت اور عقل بھی سلب کر لیتی۔ باقی دو چکیاں چونا اور ایک اور چیز پیسنے کے کام آتیں۔ جس وقت تینوں چکیاں چلتیں تو ان کا شور احاطے کے در و دیوار میں گونجتا۔ پسے ہوئے سکے کی گرد سانس کے ذریعے نتھنوں سے

ہو کر گردوں اور حلق تک پہنچ جاتی۔ گرد اتنی پر دار تھی کہ کام کے پہلے دو دن میں نے کئی بار قے کی اور غلام علی کی جان کو کوسا۔ کالا سیاہ اور گرد آلود کمرہ اور اس میں موجود چکیاں ایسی چڑیلیں تھیں، جس میں کام کرنے والے آکسیجن کی بجائے کالی گرد پھانکتے۔ ہم سارا دن سکوں اور چونے کو پیس کر سیاہ سیسے کی شکل میں تیار کرتے، پھر اس میں دو تین قسم کے مزید پاؤڈر ملاتے جن کے متعلق ہماری معلومات صفر تھیں۔ ایک پاؤڈر تو ایسا کہ پیکٹ کھلتے ہی بدبو کے بھبھوکے اٹھتے اور ناک بند کرنے کے باوجود سانس کو پھاڑ کر سینے میں اتر جاتی۔ ہمیں بالکل نہیں پتا تھا، ہم کیا بنا رہے ہیں؟ صبح چھ بجے کام پر کھڑے ہوتے اور شام چھ بجے تک لگے رہتے۔ سکے پیستے ہوئے سر اور جسم پر کالے رنگ کی ایسی تہیں چڑھ گئیں گویا سیاہ بھٹیوں سے نکالے ہوں۔ نہ صرف یہ کہ ہم مطلق کالے ہو چکے تھے بلکہ در و دیوار میں ایک ڈرا دینے والی سیاہی جذب ہو گئی، جیسے یہ کمرہ کبھی ہوئی دوزخ ہو۔ اس سے بڑھ کر ایک اور بات، جو فیکٹری کی نحوست میں اضافہ کرتی، وہ سکے کا وزنی پن تھا۔ اس کی موجودگی میں ہر چیز بھاری بھاری ہو گئی۔ سالم سکہ جب پس کر میدہ ہو جاتا تو وزن میں مزید اضافہ کر دیتا۔ یوں سیاہی اور وزن نے مل کر یہاں کے ماحول میں اتنا ڈپریشن پیدا کر دیا کہ سب مزدور بلا وجہ ایک دوسرے کو قتل کرنے کی کیفیت میں رہتے۔ میں ان میں نیا تھا اور چھوٹا بھی چنانچہ غلام علی کے علاوہ ہر ایک اپنا ڈپریشن مجھ پر اتارتا۔ ایسے لگتا ان سب سے جانوروں میں واحد ایک میں چوپایہ ہوں۔ اس دباؤ کے اثر میں میری ذات سمٹ کر چھوٹی ہوتی گئی، جس سے آزاد ہونے کی طاقت مسلسل سلب ہو رہی تھی۔ میں سوچنے لگا، جتنی جلدی ہو سکے اس جہنم سے نکل بھاگوں۔ اگرچہ عام معاوضے کی نسبت یہاں معاوضہ دگنا تھا مگر ایسی کالی اور بھاری چیزوں کے درمیان کام کرنا آسان نہ تھا۔

سوائے ہماری فیکٹری کے اس احاطے میں ہر چیز واضح تھی یعنی ایک طرف ٹھٹھیاروں کا کام، ایک طرف ویلڈنگ اور کوکے کی ٹال مگر ہماری فیکٹری محض ابہام تھی۔ ایسا ابہام جس کے اندر سیاہی پھیلتی جائے اور جیسے آگے بڑھیں، اندھیرے کا اژدھا نگلنے لگے۔ سیکڑوں بار پوچھنے کے باوجود نہ بتایا گیا کہ ہم کیا بنا رہے ہیں اور کیوں بنا رہے ہیں؟

احاطے میں پانی کا ایک نلکا بھی تھا، جو گھنٹوں کے حساب سے ایک بالٹی بھرتا۔ اتنا کم پانی فقط ہاتھ منہ دھونے کے کام آتا۔ سیاہ سکے کی تہیں جسم پر چڑھنے کے سبب خارش اور قریب سوئے منحوس مزدوروں کے خراٹے ایک نہ ختم ہونے والی اذیت میں مبتلا رکھتے اور میں غلام علی کو گالیاں دیتے رات کاٹ دیتا۔ مزدوروں کو ایک دوسرے کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ فقط ان میں غلام علی ذرا بہتر آدمی تھا۔ وہ اپنے حصے کا کام نپٹا کر اکثر میری مدد کر دیتا۔ خاص کر اس وقت جب سکے کی بھری ہوئی بوریاں گاڑی سے نیچے اتارنا ہوتیں۔ غلام علی کی لمبی داڑھی کے ساتھ سر پر بھاری بال تھے۔ میں کام چھوڑ دیتا مگر پہلے پانچ دن کی مزدوری فیکٹری مالک سیٹھ اسلم کے پاس تھی، جو اچانک کام چھوڑنے پر واپس جاتی چنانچہ مجبوراً رکا رہا۔

فیکٹری مالک سیٹھ اسلم چھ فٹ قد کا ایک طاقتور آدمی تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی ہوتا۔ اسے وہ ڈیوڈ کے نام سے بلاتا۔ ڈیوڈ کے گلے میں صلیب تھی، رنگت اور ہیئت کے اعتبار سے بھی کرسچن لگتا۔ مزاج میں اکھڑ پن اور شوخی ضرورت سے زیادہ تھی۔ ہر وقت بازو کی مچھلیاں اور سینے کے ابھار دکھانے کی کوشش کرتا۔ میں نے اسے کبھی سنجیدہ بات کرتے نہیں دیکھا۔ سیٹھ اسلم نے صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوتے اور کلین شیو بنائے رکھتا مگر بات کرتا تو گنوار پن نہ چھپتا۔ مزدوروں کے ساتھ اکثر ان کی بیویوں کے متعلق گھٹیا جملے کستا جنہیں مزدور

اُس کر لیتے ۔ میرے ساتھ ذکی سے پیش آتا مگر مجھے اس کے پاس کھڑے ہوئے گھن آتی ۔ اُس کے پاس ایک سفید رنگ کی اعلیٰ ماڈل کی کار تھی، جسے احاطے کے گیٹ سے اندر کر کے دور ہی کھڑی کر دیتا تاکہ سکے کی گرد سے بچی رہے۔ کار جونہی گیٹ کے اندر داخل ہوتی اسی لمحے وہ مزدور بھاگے ہوئے جاتے اور کار کی ڈِگی سے پاوڈر کے پیکٹ کارخانے لے آتے ۔ جہاں ہم کام کر رہے ہوتے ۔ فیکٹری مالک سیٹھ اسلم ڈیوڈ کے ساتھ دو گھنٹے کے لیے آتا اور اپنی موجودگی میں پسے ہوئے سکے میں یہ مختلف قسم کے پاوڈر مکس کراتا۔ ملنگ ہم مزدور ہاتھوں سے مل مل کے ایسی احتیاط سے کرتے کہ پاوڈر سکے کے ساتھ یک جان ہو جاتے ۔ سیٹھ اسلم اس مال کو تھیلے تھیلیوں میں بھر کر ایک پک اپ میں رکھواتا ، جو ہمارے پاوڈر مکس کرنے کے عرصے میں وہاں پہنچ جاتی ۔ پک اپ میں شام تک بھرا ہوتا، جسے وہ جانے کہاں سے اٹھا کر کے لاتی ۔ ہم میں سے کچھ مزدور اس سے سکہ اتار کر خالی کرتے اور تیار شدہ مال لوڈ کر دیتے ۔

سر کے بالوں میں پھنسی گرد اور چکیوں کے بے تحاشا شور کی وجہ سے دماغ پر ایک بوجھ سا تھا۔ جن چارپائیوں پر ہم سوتے ، ان کے کالے بان میں سکے کی گرد اور اس گرد میں رینگتے ہوئے کالے کھٹمل کی آبادی دن بدن ہونے والی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ بان پر چڑھی تہہ در تہہ کھٹمل سیل سے روں روں کا حبس اٹھتا اور میں اُس کے قریب جانے سے ڈرتا ۔ مگر احاطے میں بکھرا کباڑ اور گھاس پھونس کی جھاڑیاں نے جنیوں سانپ پیدا کر دیے، جو سکے اور کھٹملوں سے بہر حال زیادہ خطرناک تھے ۔ مجھے ہر حالت میں یہاں سے نکلنا تھا مگر میرے اور غلام علی کے بار بار اصرار پر بھی ہم سیٹھ اسلم سے پیسے لینے میں ناکام ہو گئے ۔ مجھ سے زیادہ فکر غلام علی کو تھی ، جس کی گردن پر میری مزدوری کا وزن بھی تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ مزدوری دبالی جائے گی ۔

سہ پہر کے وقت سیٹھ اسلم ڈیوڈ کے ساتھ احاطے میں داخل ہوا، اس نے گاڑی معمول کے مطابق دور ہی کھڑی کر دی ۔ ان کے آتے ہی چکی بند کر دی گئی۔ احاطے میں ہر طرف گرد کی سیاہ چادر چڑھ چکی تھی۔ سیٹھ اسلم کونے میں رکھی گئی کرسی پر بیٹھ گیا، جسے وہ گاڑی کی ڈِگی سے نکال کر لایا تھا اور قہقہے لگا کر کام کرتے مزدوروں کو جگتیں مارنے لگا۔ میرا کام تو بالکل ہی نہیں لگ رہا تھا بس ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ ڈیوڈ نے آگے بڑھ کر میرے کان کے پیچھے ہلکی سی چپت لگائی اور کہا، کیوں بے تیرے ہاتھوں پہ مہندی لگی ہے؟ سیٹھ اسلم نے اس بات پر ڈیوڈ کو جھڑکا۔ میں نے سیٹھ اسلم کے اس رویے سے حوصلہ لے کر کہا! سیٹھ میں واپس جانا چاہتا ہوں، میرا حساب کر دیں۔

غلام علی نے فوری تائید کی اور بولا ، ہاں سیٹھ پانچ دن سے مزدوری نہیں لی، آج حساب کر دو۔

غلام علی تمہیں کس نے وکالت دے دی؟ سیٹھ نے تمسخر اڑایا ۔

سیٹھ اسے کام پر نہیں لایا تھا ، غلام علی کام کرتے ہوئے کھڑا ہو گیا ۔ ایک اور بات ، ان کے ساتھ میں خود بھی جانا چاہتا ہوں۔

غلام علی کا جواب سن کر سیٹھ اسلم ٹھنڈا ہو گیا اور بولا، غلام علی تم تو ناراض ہو گئے، کل شام تک آپ کو اجرت مل جائے گی اور پرسوں کام پر نہ آنا۔

فیکٹری مالک کے اس جواب سے میں نے سوچا ایک دن اور اس جہنم میں سہی ۔ مغرب کے قریب وہ چلا گیا تو میں نے ایک مزدور سے پوچھا، سیٹھ کل پیسے دے دے گا؟

بڈھے مزدور نے جواب دیا، لاڑ کے! سیٹھ کو پتا چل گیا ہے کہ تم کام نہیں کرنا چاہتے ۔ جب سے مزدور ملیں گے تب آپ کو پیسے

دے گا اور اس کام پر آسانی سے کوئی نہیں آتا۔ اس کالی دنیا میں جو آتا ہے دوسرے دن بھاگ جاتا ہے۔

رات آٹھ بجے خادم علی نے مجھے اشارہ کیا، میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ گیٹ پر پہنچ کر اس نے چاروں طرف دیکھا اور نزدیک ہو کر بولا! علی فکر نہ کر، میں شوکت پہلوان کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر کل تجھے پیسے نے کر نہ دیے تو پھر شتاب سے داڑھی منڈاؤں گا۔ شوکت پہلوان یہاں کا مشہور دادا ہے۔ دو موری گیٹ کے پاس رہتا ہے۔ تو چھٹی ہو کر سو جا، میں اس سے بات کر کے آتا ہوں۔ یہ کہہ کر خادم علی باہر نکل گیا اور میں واپس اپنی چارپائی پر لوٹ آیا۔ اس کے بعد میرا دھیان فلموں میں موجود ان پہلوانوں کی طرف چلا گیا جو غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ میں خیالوں میں پہلوان کو فلمی ہیرو کے روپ میں دیکھنے لگا۔ انہی فکروں میں جانے کب نیند آ گئی۔ صبح اٹھا تو خادم علی نے مجھے بتایا کہ شوکت پہلوان سے بات ہو گئی ہے۔ اس نے رات ہی سیٹھ اسلم کی طرف بندہ بھیج دیا تھا۔ آج اس کے بندے یہاں بھی آئیں گے۔

کام شروع ہوا تو ہم بھی پیسے ملنے کی آس میں کام پر جت گئے۔ دن کا پہلا حصہ پہاڑ کی طرح کٹا۔ جسم کے داؤں راؤں پر بھی میل اور کالک سے خارش پہلے سے بھی ہو اٹھی اور بال تو کب ایک دوسرے سے جڑ کر یورپی سادھوؤں کی طرح غلیظ ہو چکے تھے۔

ساڑھے تین بجے سیٹھ اسلم فیکٹری میں آیا تو معمول کے خلاف آج اس کے ساتھ ڈیوڈ کے علاوہ دو آدمی اور تھے۔ جو دیکھنے میں ہی وحشی لگے لیکن وہ دور ہی ویلڈنگ والے کے پاس بیٹھ گئے۔ ڈیوڈ معمول کے مطابق کام کروانے لگا۔ وہ بار بار مجھے اور خادم کو غلط نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ ہماری نظریں احاطے کے دروازے کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ چھ بج گئے مگر پہلوان کے آدمی نہ آئے۔ میری طرح خادم علی کی بے قراری بھی دیدنی تھی۔ اس اضطراب میں خارش کچھ زیادہ تیز ہو گئی۔ سر کے بالوں میں سے کئی آتی جیں چڑھ گئیں کہ ناخن جلد تک پہنچنا ناممکن ہو گئے۔ کام مکمل ہو چکا تو سیٹھ اسلم نے سوائے میرے اور خادم علی کے تمام مزدوروں کو اجرت دے دی۔ ہم دونوں سیٹھ کا منہ دیکھنے لگے۔ آخر خادم علی نے کہا: سیٹھ جی ہمارا حساب؟

سیٹھ اسلم ڈیوڈ کی طرف منہ کر کے مسکرایا اور خادم علی سے مخاطب ہو کر بولا: بھئی خادم تم دونوں کا حساب تو شوکت پہلوان نے کرنا ہے، جا کر اس سے پیسے لے لو۔

خادم علی ایک دم جھینپ گیا، جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ پھر سنبھل کر بولا: سیٹھ یہ ٹھیک بات نہیں۔ ہم اتنے گند میں کام کر رہے ہیں۔ جب تو پیسے نہیں دے گا تو کسی کے پاس تو جانا پڑے گا۔ پھر ہمیں تو یہ بھی نہیں پتا یہ منڈا کون سا ہے؟

منڈا تیری بیوی کرتی ہوگی بے شرم۔ سیٹھ اسلم غصے سے بولا۔ ڈیوڈ یہ رات شوکت پہلوان کو بھی یہی کچھ بتا رہا ہے۔ ابھی اس کو بھی تو بتا دیں یہ منڈا کون سا ہے!! اس کے دل میں ارمان نہ رہے۔ بولا ذرا ٹھکوا دو دارے کو۔

سیٹھ کی آواز سنتے ہی ویلڈنگ پلانٹ پر بیٹھے دونوں آدمی دوڑ کر آ گئے۔ ادھر ڈیوڈ نے ایک تھپڑ کھینچ کر خادم علی کے کان پر جمایا۔ جواباً خادم علی نے پسے ہوئے بکے کی مٹھی بھر کر ڈیوڈ کے منہ پر دے ماری۔ بکے کی گرد سے ڈیوڈ باؤلا سا ہو گیا۔ زور زور سے کھانسنے لگا اور آنکھیں ابل پڑیں۔ اس کے بعد دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ دوسرے دونوں نے بڑھ کر ڈیوڈ کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ میں جو ابھی تک تذبذب میں تھا، فوراً دونوں ہاتھوں سے ڈیوڈ کو کے مارنے لگا۔ اس جرات پر ایک نے مجھے دبوچ لیا۔ مزدور دیوار کے ساتھ چپکے گئے

کھڑے تھے جیسے فلم دیکھ رہے ہوں۔ ڈیوڈ اور اس کے ساتھی نے خادم علی کو اپنے گھٹنوں کے نیچے دبا لیا۔

رسی پکڑو، سیٹھ اسلم نے ایک مزدور سے کہا۔ دونوں کے ہاتھ پاؤں باندھ دو ان رسیوں سے اور پانی کی بالٹی لے کر آؤ۔

ایک مزدور نے بھاگ کر رسی پکڑائی اور دوسرا پانی لینے چلا گیا۔ آن کی آن میں ڈیوڈ نے ساتھیوں سے مل کر ہم دونوں کو رسیوں سے باندھ دیا۔ کسی مزدور نے اس تمام کارروائی میں ہماری ذرا مدد نہ کی۔

ڈیوڈ نے ہمارے سر پر ایک ایک لوٹا پانی انڈیل دیا اور پاؤڈر جو ہم نے مکس کیا تھا، اٹھا کر میرے سر پر اور خادم علی کے سر، داڑھی اور مونچھوں پر مل دیا۔ تمام مزدور چپ چاپ سادھے کھڑے تھے۔ ہم اس پاؤڈر کی بدبو میں ایسے ڈوبے کہ حواس باختہ ہو گئے۔ میں دل میں پہلوان کو گالیاں دے رہا تھا اور خادم علی کو کوس رہا تھا کہ خواہ مخواہ ہمیں لے گیا۔ اب میرے لیے مسئلہ اجرت کی وصولی نہیں بلکہ اس مصیبت سے نکلنے کا تھا۔ تھوڑی منٹ یونہی بیٹھے رہے۔ میں رونے لگا تو ڈیوڈ نے دوبارہ سروں پر پانی ڈال دیا۔ اب جو دیکھتا ہوں تو سر کے سارے بال پانی کے ساتھ میری جھولی میں آ پڑے۔ میں یہ کھیل دیکھ کر حیران رہ گیا اور خادم علی کی طرف دیکھا۔ اس کے سر، مونچھوں اور داڑھی سمیت ہر شے گنجی ہو چکی تھی اور خادم علی انسان سے زیادہ ایک ٹنڈا لگ رہا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر گالیاں دینے لگا۔ سیٹھ اسلم بولا: بیٹا دیکھ لے، اچھی طرح سے میرا کارندہ کیا، یہ پاؤڈر عورتوں کے نیچے کے بال صاف کرتا ہے اور تیرے جیسے مزدوروں کے اوپر کے بال۔ اتنا کہہ کر اس نے جیب سے کچھ پیسے نکالے اور ایک مزدور کو دے کر بولا: شریفے، میرے جانے کے بعد انھیں کھول دینا اور یہ دونوں کی مزدوری دے کر لات مار کے احاطے سے باہر نکال دینا۔ آخر شوکت پہلوان ہمارا یار ہے، کچھ اس کا بھی لحاظ کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد وہ ڈیوڈ اور دوسرے ساتھیوں سمیت اپنی گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ شریفے نے ہمارے ہاتھ کھول دیے اور پیسے جھولی میں رکھ دیے۔ ہم کچھ دیر اپنے گرے ہوئے بالوں کو ہاتھ میں لے کر حیرانی سے دیکھتے رہے۔ خادم علی وقفے وقفے سے گالیاں دے رہا تھا۔ آخر پیسے پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ گنجے تو ہو گئے تھے، رہ رہ کر میرا ہاتھ اپنی تازہ ٹنڈ کی طرف جاتا، جہاں صاف میدان تھا اور محسوس ہوتا جیسے بھاری ٹوکری اتر گئی ہو۔ رات نو بجے ہم دونوں احاطے سے نکلے۔ خادم علی سے آگے آگے تھا اور میں پیچھے پیچھے۔ اچانک خادم علی رکا اور ایک طرف اشارہ کر کے بولا، وہاں سے تانگے ریلوے اسٹیشن پر جاتے ہیں۔ اتنا کہہ کر ہاتھ ملائے بغیر دوسری طرف چل دیا۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا، حتیٰ کہ وہ ایک اندھیری اور تنگ سی گلی میں غائب ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے میں نے اپنی ٹنڈ پر دوبارہ ہاتھ پھیرا اور ہلکے پھلکے سر کے ساتھ تانگے کی طرف چل دیا۔

◆◆◆

معروف افسانہ نگار، ادیب و تنقید نگار نند کشور وکرم کی شاہکار

اردو کے 100 نامور شاعر

شائع ہو گئی ہے ——— قیمت/-400روپے

ملنے کا پتہ: بک کارنر پبلشرز اینڈ بک سیلرز، جہلم (پاکستان) موبائل نمبر:0321-5440882

خوابوں کا جال

شمع خالد

مختصر تعارف

شمع خالد 3 اپریل 1947ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئیں۔ اب تک ان کے افسانوں کی 8 کتابیں پتھر لیے چہرے، گیان کا لمحہ، بے چہرہ شناسائی، بند ہونٹوں پہ بکھری کہانیاں، گمشدہ لمحوں کی تلاش، ہو کے بیچ منظر عام پر آ چکی ہیں۔ آپ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے بے شمار ڈرامے لکھ چکی ہیں۔ بچوں کی کہانیاں بھی تحریر کیں۔ اس سلسلے میں نیشنل بک فاؤنڈیشن کی جانب سے ایوارڈ ملا۔ آپ کے اعزازات میں ساؤتھ ایشین ویمن ایوارڈ (لندن)، ستارہ ویمن ایوارڈ اور گولڈ میڈل شامل ہیں۔

فراز کو امریکہ گھومتے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے ایک دن ایک بڑی عمارت کے پاس وہ کھڑا تھا یونہی ادھر ادھر نظر دوڑا رہا تھا نیو یارک کی وسعت اور بلند عمارتیں انسان کو عجیب سا احساس دلاتی ہیں اور سیاح خاص طور پر عمارتوں اور سڑکوں اور شہر کے عجیب سے نظم و ضبط کو دیکھ کر تھوڑا سا احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی سوچتے ہوئے فراز نے سڑک کے پار نظر دوڑائی تو وہاں ایک چھوٹے سے کیبن میں میکسیکو کی عجیب و غریب تصاویر نظر آ گئیں۔ اس نے وقت گزاری کے لیے اس کیبن کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کیبن کے اندر ایک شخص بیٹھا ہوا کسی لڑکی کے بازو پر Tattoo بنا رہا تھا۔ فراز دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا وہ جب بھی کسی انگریزی فلم کے ہیرو کے جسم پر یہ Tattoo دیکھتا تو اس کا دل خواہ مخواہ ہی دھڑکنے لگتا اور دل میں یہ خواہش ابھرتی کہ میں بھی بڑے ہو کر ایسے Tattoo ضرور بنواؤں گا۔ اس کو دلچسپی سے دیکھتے ہوئے فراز نے بھی فیصلہ کر لیا کہ اس خاتون کے بعد میں بھی آج اپنی ادھوری خواہش ادھورا خواب پورا کر لوں گا ویسے بھی جب جوانی سر اٹھاتی ہے تو انسان بہت سے خواب بنتا چلا جاتا ہے اور یہ خواب پھر لاشعور کی تہہ میں گم ہو جاتے ہیں۔ جوانی میں لڑکپن کے عشق کی طرح کبھی نہ کبھی ضرور سر اٹھاتے ہیں اور انسان محبوب کو تلاش کرنے میں لگ جاتا ہے۔ خواب ہر شخص دیکھتا ہے لیکن خوابوں کو حقیقت کے روپ میں بہت کم لوگ پورا کر پاتے ہیں۔ خواب یا تو بھول جاتے ہیں یا صرف یادوں میں لاشعور کی تہہ میں دب جاتے ہیں لیکن خواب مرتے نہیں بلکہ ہمارے اندر دل کے خانوں میں چپکے چپکے آباد رہتے ہیں۔ سو آج فراز بھی اپنے اس پرانے خواب کو پورا کرنے کے لیے جب اس کیبن میں آیا تو تھوڑا سا excited سا تھا۔ مائیکل نے سر اٹھاتے ہوئے کہا کہ آپ کیسا Tattoo بنوانا پسند کریں گے؟ تو فراز نے کتاب دیکھنا شروع کی جس میں مختلف جانوروں اور پرندوں کی تصویریں بنی ہوئی تھی۔ فراز نے اپنا بازو آگے کرتے ہوئے کہا کہ میرے بازو پہ یہ بچھو والا Tattoo بنا دیں۔ مائیکل خاصا باتونی سا آدمی تھا کہنے لگا آپ مجھے ہندوستانی لگتے ہو۔ فراز نے کہا نہیں یار میں پاکستان میں آیا ہوں تو اس نے حیرت سے کہا اچھا سنا ہے کہ پاکستانی لوگ Tattoo بنوانا پسند نہیں کرتے۔ فراز نے کہا ایسی بات نہیں ہے مجھے بچپن سے ہی یہ شوق تھا اس نے اپنی گن کی نیڈل چینج کی اور فراز سے باتیں کرنے لگا باتیں کرتے کرتے اس نے کوئی کمپیوٹر کی ٹیکنالوجی کے حوالے

سے کہا فراز نے ہنستے ہوئے کہا کہ تم تو کمپیوٹر کو بڑے اچھے طریقے سے جانتے ہو ایمل نے مسکراتے ہوئے کہا یہ سامنے جو بلڈنگ دیکھ رہے ہو میں اس بلڈنگ میں ہی ایم تھا یہ سافٹ ویئر کی کمپنی ہے اور دنیا میں اس کا بہت بڑا نام ہے۔ اس کو میرے ڈیڈی اور ان کے والد نے مل کر چلایا ہے۔ وہ کہنے لگا وہ تو میرے دادا ہوئے نا، اس نے کہا جیسے میں آپ کو یہ کہانی سنا ہی رہا ہوں۔ میرا باپ تو میرا باپ ہے لیکن میرا دادا میرا دادا نہیں یہ کیا بات ہوئی! وہ کہنے لگا کبھی کبھی سائنس خواب اور حقیقت کو یوں سامنے لا کھڑا کرتی ہے جیسے ان کا آپس میں کوئی میل کوئی رشتہ نہ ہو لیکن پھر بھی یہ خواب حقیقت سے یوں مل جاتا ہے جیسے سمندر انسان کے پاؤں سے لپٹ کر اسے پانی میں گھسیٹ لیتی ہے۔ میں بھی بہت بار ان پانیوں میں ڈوبا ہوں لیکن ایک خواب مجھے ہر دم یہ احساس دلاتا تھا کہ میرا ماضی میری نسل کا تسلسل کہیں اور ہے۔ بازو کو کھوجتے ہوئے کہنے لگا صاحب آپ نے کبھی ڈریم کیچر کے بارے میں سنا ہے؟ تو فراز نے کہا نہیں وہ کہنے لگا یہ جو سامنے جال لگا ہوا ہے یہ ڈریم کیچر ہی تو ہے ہمارے دیس میں ہر ماں بچہ پیدا ہوتے ہی ایک چھوٹا سا جال بنا کر اس کے سرہانے ٹانک دیتی ہے ہمارا عقیدہ ہے کہ یہ پکڑ وجال برے سے اچھے خوابوں کو مکڑی کے جال کی طرح اپنے اندر جکڑ لیتا ہے جبکہ برے خواب اس کے قریب سے گزر جاتے ہیں سو میں نے بھی اپنا خواب اسی کے اندر بند کیا تھا جو ہمیشہ زندہ ہے فراز نے ہنستے ہوئے کہا آج تو میں نے بھی اپنے خواب کو اپنے جال سے نکال کر اسے اپنے بازو پہ حقیقت کا روپ دے دیا ہے ایمل ایڈگر ایلن پو نے کہا ہے کہ۔

> Take This kiss upon the brow / and, in partingn from you now, / Thus much let me avow- / You are not wrong, who deem / That my days have been a dreami / Yet if hope has flown away / in a night, or in a day, / in a vision, or in none / is it therefore the less gone? / All that we see or seem / is but a dream withiin a dream.

ایسی بہت سی نظمیں میں Net پہ بیٹھ کر تلاش کرتا رہتا ہوں مجھے شاید اپنی تلاش تھی جو مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی آخر میں آفس سے چھٹیاں لے کر اور ٹکٹ لے کر امریکہ کی طرف نکل گیا گھومتے گھماتے میں جب میکسیکو پہنچا تو وہاں میرے دل کی دھڑکن تھم سی گئی۔ وہ علاقہ وہ سڑکیں وہاں کے لوگ سب مجھے اپنے اپنے سے لگے شاید میری پیاسی روح خوابوں میں اس جگہ بھٹکتی رہتی تھی۔ میں وہاں جا کر بے حد سکون محسوس کرنے لگا وہاں کے لوگ بے حد محبت کرنے والے لگتے تھے۔ یوں میں ہر Weekend وہیں پہ گزارنے لگا جو اریزونا کی یہ من پسند جگہ ہے اسی پراونٹ کی شکل والے پہاڑ کے نیچے پہنچ کر تو مجھے وہ جگہ بے حد جانی پہچانی لگی اور وہیں میری ملاقات اس سے ہو گئی! فراز نے سوالی نظروں کو سمیٹتے ہوئے پوچھا کیا تمہاری Girl Friend؟ نہیں یار ایک بوڑھا سا تھا جو میری لاشعور کی تہوں میں چھپا ہوا تھا مجھے لگا یہ میری پیاسی روح کی پہچان ہے چنانچہ میں اس سے ملنے ہر ہفتے جانے لگا ایک دن میں سوچ رہا تھا کہ یہ بے چینی یہ خواب مجھے کسی چیز کا اشارہ دے رہے ہیں میں جو IT Expert اور IT کا ڈی ایم کس چیز کی کھوج میں ہوں! اور پھر میں نے ایک فیصلہ کیا لیبارٹری میں جا کر اپنے جین کا ٹسٹ کروایا یہاں ٹیسٹ کی رپورٹ دیکھ کر میں حیران رہ گیا میرا دادا جو انگلینڈ سے آ کر یہاں بسا تھا۔ میں اس کا خون نہیں تھا بلکہ میں میکسیکو کے اونٹ جیسی شکل والے پہاڑ کے مالک کا خون تھا میں نے جا کر اس بابا سے بھی درخواست کی کہ وہ بھی اپنے جین کا ٹیسٹ کروائے سو میرا خواب میرا شک میرے لاشعور میں آنے والے واقعات سب حقیقت کا روپ دھار چکے تھے وہ بابا ہی میرا دادا تھا۔ سو میں نے اپنے

اپ کی فرم کو خدا حافظ کہا اور اپنا آبائی پیشہ یعنی Tattoo بنانا شروع کر دیا۔ تو یقین کریں کہ میرا یہ فیصلہ میرے تمام وسوسوں تمام بے چینیوں کا مداوا نکلا۔ لہٰذا میں اپنے خاندانی پیشے میں بہت جلد حاذق ہو گیا میری ماں مجھے بتانے لگی کہ میں اپنی پاکیزگی کی قسم اٹھاتی ہوں میں نے مسکراتے ہوئے کہا نہیں ماں میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں بلکہ میری دادی نے جس شخص سے جوانی میں عشق کیا تھا میں اس کا خون ہوں دادا سے شادی کے بعد اس نے یہ بات چھپا رکھی تھی کیونکہ ایک کروڑ پتی کے آگے ایک قوال میکسیکو کیسے اپنا محبوب مان لیتی لیکن کچھ گناہ ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کے سمندر میں ڈوبتے نہیں بلکہ جھیل کی سطح پر اگنے والے کنول کے پھول کی طرح ہوتے ہیں جو ابھر کر سامنے آجاتے ہیں۔ میں بھی کنول کا پھول ہوں لہٰذا میں اپنے دادا کی جائیداد سے کوئی وراثت نہیں لوں گا اور میں اب اپنے دادا کے پاس جاتا ہوں مجھے وہاں جا کر بے حد سکون ملتا ہے میرے دادا نے یہ جال خوابوں کو لپیٹ میں لینے والا جال مجھے بنا کر دیا ہے۔ میں نے اسے اپنے سامنے لٹکا رکھا ہے تاکہ جب میں رات کو سوؤں تو میرے اچھے خوابوں کو یہ گرفت میں لے لے تاہم جاتے جاتے ہو تم سے پہلے جو لڑکی مجھ سے Tattoo بنوا رہی تھی میرا پہلا Crush ہے۔ لیکن میں اسے پورا موقع دینا چاہتا ہوں۔ وہ بھی میری دادی کی طرح وقتی محبت کے جذبے میں بہہ کر ایک اور ناجائز کو دنیا میں لے آئی تم جانتے ہو کہ جب کوئی Love Child پیدا ہوتا ہے۔ تو اس کے ذہن اور ساخت میں لاشعوری گتھیاں اس کی زندگی میں کبھی سکون نہیں لینے دیتیں۔ لہٰذا ہم دونوں نے یہ عہد کیا ہے کہ ہم زندگی بھر ملتے رہیں گے لیکن شادی سے پہلے اپنے جسمانی تعلق نہیں رکھیں گے کیونکہ دنیا میں آنے والا ہر بچہ پوری سچائی کے ساتھ رہنا چاہتا ہے تو میں نے بھی پوری سچائی کے ساتھ زندہ رہنا شروع کیا ہے میں اپنے ماں باپ کو ملنے جاتا ہوں۔ کبھی کبھار مجھے میری ماں پر ترس بھی آتا ہے کہ اسے کسی اور کے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن میں ان کے ہاتھوں مجبور ہوں میں اپنے باپ کی کسی چیز کو نہیں اپناتا کیونکہ وہ سب کچھ دادا کی دین ہے جو میرا دادا نہیں ہے۔ فراز کا Tattoo بن چکا تھا۔ وہ بے حد حسن کے بعد جب باہر نکلا تو سوچنے لگا یہ امریکن بھی عجیب ہیں یہ کہیں خلا کو کھنگال رہے ہیں اور ادھر کی چیزیں ایجاد کرنے کے چکر میں اور کہیں خوابوں کو پورا کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہر چیز سے جدا کر کے کبھی ہپی بن جاتے ہیں اور کبھی رام رام کرتے ہوئے جنگلوں میں نکل جاتے ہیں۔ یہ اچھا خاصا پڑھا لکھا شخص کیوں اپنے آپ سے لڑ رہا ہے؟ کیا زیادہ علم جاننا ان کے حق میں زہر قاتل ثابت نہیں ہوا؟ یہ سوچ کر اس نے باہر جانے والی ایک بس کو پکڑا اور بیٹھ گیا۔

◆◆◆

ریاست جموں کشمیر کے منفرد افسانہ نگار وحشی سعید کی تخلیقات

(1) **خواب حقیقت** (2) **سڑک جاری ہے** (3) **کنوارے الفاظ کا جزیرہ**
(4) **ماضی اور حال** (افسانے) (5) **ماضی او رحال** (ناول)
(6) **پتھر پتھر آئینہ** (7) **ایک موسم خط** شائع ہو چکے ہیں

رابطہ: نگینہ ہوٹل شہنشاہ پیلس بلیوارڈ، سری نگر (کشمیر)

محبت، موت اور سیاست

شبہ طراز

مختصر تعارف

شبہ طراز 25 مئی کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ معروف ادبی جوڑے اصغر مہدی اور عذرا اصغر کی صاحبزادی ہیں۔ چھ کتابوں کی مصنفہ ہیں جن میں دو کتب "درد کا لمس" اور "آدھا خواب" افسانوی مجموعے ہیں۔ اور تین کتب شاعری کا مجموعہ ہیں۔ جھیل جھیل اداسی (نظمیں)، جگنو جلتے ہیں (ماہیے، ہائیکو) جبکہ ایک کتاب چاندنی میں رقص ہائیکو نظم پر مشتمل ہے۔ پانچ سال تک اپنے جریدے "تجدید نو" کی نائب مدیرہ کے طور پر کام کیا۔ اس کے علاوہ اردو رسائل اور کتب کے سرورق بھی بناتی ہیں۔

شہر میں دفعہ 144 لگ چکی ہے۔۔۔ گھر میں مجمع موجود ہے۔ ڈھولک کی آواز مغموم ہو کر بیٹھ چکی ہے۔ لیڈر کو پھانسی کی سزا سنائی گئی ہے۔۔۔ کل رخصتی ہے۔۔۔ کل رخصتی ہے۔۔۔ لیڈر کی بھی، دلہن کی بھی۔ دو رخصتیں قسمت کے فیصلوں سے پہلے طے کر دی گئی تھیں۔ گھر چھوڑنے سے زیادہ دکھ لیڈر کی انہونی موت کا ہو رہا ہے۔

"ارے لڑکیو! گیت گاؤ۔۔۔ موت کا دکھ بعد میں منا لینا۔ دلہن کو رخصت کرنا ہے۔ خدا خدا کر کے تو یہ خوب صورت لمحے آئے ہیں۔ پسند کی شادی ہے بھئی۔۔۔ کیسا نور ہونا چاہیے دلہن کے چہرے پر۔۔۔" بزرگ عورت کی آواز بجتے کمرے میں بچھی زرد چادر کی سلوٹوں پر سے ہو کر پھسلی اور دور تک گھسٹتی گئی۔

"ارے یہ لیڈر کی قسمت کا فیصلہ بھی ابھی ہونا تھا۔۔۔!" ایک اور آواز نے دوسری سمت سے غم کا سناٹا توڑا۔

ڈھولکی کی آواز کمرے میں پھیل گئی۔ لڑکیوں کی آوازیں آہ و زاری میں ڈھلنے لگیں۔ ابھی چند ماہ پہلے جس لیڈر کی جھلک دیکھنے کے لئے ان گنت لوگ جلوس میں دو جوش اور خوشی سے بھری ہوئی، پارٹی کے لڑکوں کے بازوؤں کی زنجیروں میں کالی کوٹھی تک پہنچی تھیں اب اسی لیڈر کی موت کا پروانہ شادی کے کارڈ کے ساتھ پڑا ہے اور اشتہار ان کے کانوں پر لٹک ہو چکے ہیں۔۔۔ اور دفعہ 144 لگ چکی ہے۔ زبان پر پابندی ہے، بیان پر پابندی ہے، اکٹھے کھڑے ہونے پر پابندی ہے لیکن گھر میں مجمع بیٹھا ہے۔۔۔ ڈھولک رک رک کر بج رہی ہے۔ آنکھوں میں خوف کے سائے ہیں اور کان سنگ ہو رہے ہیں۔۔۔ زمانے بیت چکے ہیں۔۔۔ زمانے بیت رہے ہیں۔۔۔ بستی کا ویران قبرستان آباد ہوتا جا رہا ہے۔ یہاں خاندان کے بزرگ آسودۂ خاک ہیں۔ ایک بڑا احاطہ مختص کر دیا گیا ہے۔ لیڈر اور اس کے خاندان کی قبریں بھی مزاروں کی صورت اختیار کر گئی ہیں جن پر ہمہ وقت پھولوں کی چادریں پڑی رہتی ہیں۔ فضا میں گلاب کی خوشبو بھی سنہری دھوپ اور سرمئی چاندنی کا فرش بچھے پھیلتی رہتی ہے۔ گھروں پر بھی پہرے ہیں مزاروں پر بھی پہریدار کھڑے ہیں۔ اکثروں پر پہلے قبرستان میں کچھ احاطوں کو چھوڑ کر ایک ہی طرز کی قبریں بنی ہوئی ہیں جن پر ایک ہی طرح کے کتبے لگے ہیں۔ زمین داروں کی قبروں کے علاوہ ہر قبر پر نمبر درج ہیں۔ 72,5,14,12,144,143,142,141,140۔ نمبروں سے ہی لواحقین قبر تلاش کرتے ہیں۔ لاشوں کے ڈھیر ہیں۔ اپنے،

اٹھانے کتنے چہرے ہیں۔۔۔ جوان، بچے، بوڑھے، تعلیم یافتہ، اعلیٰ عہدوں پر فائز، حقوق کی جنگ لڑنے والے، لاشیں اٹھانے والے۔۔۔ اور بین کرنے والی عورتیں ہیں۔ ان کی چادروں پر خون ہے۔ ان کے جوتے خون میں بھرے ہیں۔۔۔ انتقام ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہا ۔۔۔ '' ارے یہ تو محبت کی شادی ہے، محبت کے نغمے گاؤ دیکھو!''

یہاں خاندان بھر کی شادیوں کی دیگیں پکتی ہیں۔ آرسی مصحف اور دودھ پلائی کی رسمیں ہوتی ہیں، ڈھولک کی تھاپ پر ساری رات نو عمر آوازیں خوشیاں کشید کرتی ہیں۔ شادی محبت کی ہو یا شادی کے بعد محبت ہو پہلا قدم یہیں سے اٹھتا ہے۔۔۔۔ رخصتی یہیں سے ہوتی ہے۔ نئی زندگی کی طرف۔ دھوپ چھاؤں میں بدلتی ہے تو کبھی چھاؤں دھوپ میں بدل جاتی ہے۔ زمانہ تبدیل ہوتا ہے تو رسمیں بھی تبدیل ہو جاتی ہیں، شکلیں بھی بدل جاتی ہیں۔ اب محبت کو کوئی نہیں پوچھتا۔۔۔ کاروبار ہے اب۔ ہر چیز کی قیمت ہے۔ زندگی کی بھی قیمت ہے موت کی بھی۔ عورتیں چیخ رہی ہیں۔۔۔ سمجھ نہیں آ رہا کہ یہ خوشی کی چیخیں ہیں یا رنج کی۔ محبت کے نغمے گانے کا اختیار کسے، وہ کیا ہے؟ خوشی اور محبت سے چمکتی آنکھوں میں سماجی پابندیوں اور معاشرتی بندھنوں کے نشتر چبھو دیے جاتے ہیں اور خوشیوں کی راکھ میں محبت کی چنگاریاں دبی رہ جاتی ہیں اور ستم ہے کہ گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے غفلت کے کش لے رہا ہے۔ مرنے والوں اور مارنے والوں کے شور میں تمیز نہیں ہو پا رہی۔ جشن کی تیاری میں فاسفورس کی بو بھی شامل ہے۔ عمارتوں میں لگوائی گئی بتیوں کے تاروں میں دھڑوں کے لٹکتے چیتھڑوں کی شکل میں بدل گئے ہیں۔ سڑک پر بھی روشن چاہتوں کی لڑی جا چکی ہے۔ بستی سکڑ رہی ہے اور قبرستان پھیل رہا ہے۔

لوگوں کی چیخیں اڑ رہی ہیں، نوٹوں کی برسات ہے۔ سنسر کی کھٹ کھٹ میں ڈھولکی کی تھاپ دھیمی پڑ گئی ہے۔ لڑکیاں محبت کے گیتوں سے تھک کر کاروباری اشتہار گا رہی ہیں۔۔۔ اپھروی کی گولیوں کا اشتہار، پیٹ میں گیس کا علاج، خون کے دباؤ کا علاج، غم اور حد سے زیادہ خوشی کا علاج، تکبیر اور لالچ کا علاج۔۔۔ لاشیں پھر بھی گر رہی ہیں، کبھی گولی کھا کر کبھی گولہ باری سے کبھی ایک جیکٹ کے پھٹنے سے۔۔۔ بستیاں لوگوں سے بھر جاتی ہیں، گھر خالی ہو جاتے ہیں، کالی کوٹھی تک آتے آتے آنکھیں بھی کالی ہو گئیں ہیں اور دکھوں کا دھواں گلی گلی گھوم رہا ہے۔ بستی تو رفتہ رفتہ ویران ہو گئی ہے۔ قبرستان کے احاطے میں آخری جگہ بھی بھر چکی ہے۔ حیرت کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ غم گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے غفلت کے کش پر کش لگا رہا ہے۔ لیڈر تبدیل ہو گیا ہے لیکن قانون نہیں بدلا۔ اختیارات کی لاٹھی بے بسی کو ہانک رہی ہے، دیکھ بے سمت ہجوم ہے جس کی طرح سڑکوں پر بھاگ رہی ہے اور مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے بار بار دفعہ 144 لگائے جانے کا اعلان ہو رہا ہے۔ لفظ رو رہے ہیں، دامن پکڑ رہے ہیں، ڈھولکی کی آواز تو کبھی کی معدوم ہو چکی ہے۔ بستی سے گلیوں اور گھروں کے نمبر مٹائے جا چکے ہیں اور وقت کی گاڑی چھکڑ چھکڑ چلتی ہی جا رہی ہے۔ لگتا ہے ابھی ابھی گاڑی روانہ ہوئی ہے۔ گاڑی پر کوئی نمبر درج نہیں تھا، جانے کس سمت میں گئی ہے، یہ طے ہے کہ رخصتی ہو چکی ہے۔ گلاب کی پتیاں سڑک پر دور تک بکھری ہیں۔۔۔۔۔ رخصتی کبھی کی ہو چکی۔۔۔۔۔

'' ارے۔۔۔ یہ تو محبت کی شادی ہے، محبت کبھی نہیں مرتی۔ یہ تو زمانوں میں آباد رہتی ہے، دلوں کو شاد رکھتی ہے۔ محبت والی آنکھوں میں روشنی گھر کیے رہتی ہے، آنکھیں بند بھی ہو جائیں روشنی نہیں جاتی۔۔۔'' آخری بزرگ عورت کی محبت میں کبھی بازگشت دیواروں کے کانوں سے ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی ہے۔ لڑکیاں میڈیا کی ڈگریاں پا کر ملٹی نیشنل کمپنیوں میں دولت کو خوش آمدید کے گلدستے پکڑانے جا چکی ہیں اور آزادی کا پرچم نظریں بچا کر ادھر ادھر لہرا رہا ہے۔ لگتا ہے محبت مر چکی ہے۔

◆◆◆

پرانی چیز

اظہر جاوید

ترجمہ: حنیف باوا

مختصر تعارف

اظہر جاوید 4 جنوری 1938ء کو راولپنڈی (پاسپورٹ سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے "رابعہ بصری" (اردو زبان میں پہلی طبع زاد کتاب) "بلغارین افسانے" (ترجمہ) بلغارین زبان کی کسی بھی غیر ملکی زبان کی پہلی کتاب تحریر کی۔ پنجابی کہانیوں کی کتاب "بجھی دھوپ ہوگئی" ان کی منفرد کتاب ہے۔ شاعری کا مجموعہ "ظلم عشق کرنے ہوتا" شائع ہوا۔ 42 سال تک باقاعدہ "تخلیق" کی اشاعت کرتے رہے۔

"باباجی آپ کے پاس کوئی باریک سی تار ہے کیا؟"

وقار نے باریک کھینچتے ہوئے اپنی آواز کو بھی باریک کیا اور زیادہ عاجز بنا کر جتانے کی کوشش کی۔ اور ساتھ ہی اس نے دائیں ہاتھ کے تیسرے والی انگلی پر تھمے کو بابا دادا کی جانب سے تار کا نقشہ کھینچا۔ بات کرنے کے بعد وہ اور اس کے قریب ہی کھڑا طارق بھی منہ پرے کرکے کھی کھی کرنے لگے۔ وقار اور طارق دونوں ماموں اور پھوپھی زاد بھائی تھے۔ دونوں آٹھ آٹھ دس دس سال کے ہوں گے۔ ان کے عقب میں دوسرے اور اس کمرے کی راہداری میں ان کے اور بھی ماسی اور چچا کے بیٹے اور بیٹیاں اور ہم عمر تارا لے اور پھر باہم مل کر کھل کھلا کر ہنسنے کے انتظار میں بیتاب کھڑے تھے۔

باباجی وقار کے دادا تھے ۔۔۔ کسی دوسرے بچے کے نانا اور کسی کے کچھ نہیں لگتے تھے۔ نام تو ان کا غلام قادر تھا لیکن گھر میں تمام لوگ انھیں باباجی کہہ کر بلاتے تھے۔ محلے اور بستی کے رہائشی انھیں صوبیدار ام والے کے نام سے پکارتے تھے۔ دوسری بڑی جنگ میں وہ فوج میں بھرتی ہو کر کئی سال برما میں رہے تھے۔ وہاں کی دستیاب نہ ہونے والی کہانیاں ان کے پاس تھیں یا پھر ایک چھوٹی ٹرنک تھا جس میں نہ جانے کیا بھرا ہوا تھا۔ وہاں جہاں بھی وہ ملازمت کرتے یہ ٹرنک ان کے ہمراہ ہوتا تھا۔ ان کی بہو کو اس سے بڑی چڑ تھی۔ ابتدا میں اس نے باتوں باتوں میں اس ٹرنک کو باہر پھینکنے کا عندیہ دیا تھا لیکن اب وہ بھی بس چپ رہنے لگی تھی۔

آج کل یہ تمام لوگ مری آئے ہوئے تھے۔ باباجی، غلام قادر صوبیدار تی ام والے اور ان کا بہت بڑے عہدے پر فائز بیٹا نثار قادر جس کی لاہور میں بہت وسیع کوٹھی تھی اور وہ ایک طرح سے پنجاب کا حاکم لگتا تھا۔ مری میں بھی اس کا اپنا ایک بنگلہ تھا اور تمام بچے یہاں چھٹیاں گزارنے آئے ہوئے تھے۔ ان کے ہمراہ ان بچوں کی خالائیں، چچے، ماموں اور پھپھیوں کی اولاد بھی تھی۔ بڑوں کی طرح بچوں کو بھی ٹرنک کی حقیقت کا ادراک تھا۔ جب کبھی ان کی بہو شاہدہ نثار ان سے تکرار کرتی اور ٹرنک کو پھینکنے کا کہتی تو باباجی بول پڑتے "بیٹی اس میں

بہت سی چھوٹی چھوٹی پرانی چیزیں پڑی ہوئی ہیں نہ جانے کب کسی شے کی ضرورت پڑ جائے" شاہدہ اس بات سے مزید خشمگیں ہو جاتی اور کہتی "بابا جی کون سی چیز ہے جو بازار سے نہیں ملتی اور پھر ہمیں کس کس چیز کی کمی ہے۔ آپ نے ایسے ہی پرانی چیز کا بہانہ بنا رکھا ہے۔"

نثار بات سنتی۔ شاہدہ کم غصے اور زیادہ پیار سے گھر والے کو بولتی اور کہتی "نثار آپ بھی والد کو نہیں سمجھاتے۔ پرانی چیزوں کا اب بھلا کوئی وقت ہے۔۔۔ پرانی شے۔۔۔ پرانی شے" وہ بڑبڑ کرتی ہوئی ایک طرف ہٹ جاتی ہے اور پھر تمام قصہ خاموشی سے، ذرا … سے بول کر نکال لیتی۔ نثار جب بھی گھر ہوتا تو بیگم صاحبہ کے پیچھے پڑ جاتا اور پھر بات سے بات نکلتی ہوئی ٹرنک تک پہنچ جاتی۔ نثار بڑا شریف افسر تھا صوبے کا حاکم تھا لیکن پھر بھی باپ کا فرمانبردار تھا۔ اس نے کبھی بھی ان سے اونچی آواز سے بات نہیں کی اور نہ کبھی کسی بات پر بحث کی تھی۔ نوکروں کو بھی حکم تھا کہ اپنے تمام کام چھوڑ کر پہلے بابا جی کی بات سنا کریں۔ جب شاہدہ تھک ہار کر یا کسی ہنسی مذاق کی بات کو پکڑ کر ٹرنک تک لے آتی تو نثار قادر سوچ میں پڑ گیا کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟۔۔۔ بابا جی کا ٹرنک سے کیا لگاؤ ہے اور شاہدہ نے کیوں ضد پکڑ رکھی ہے۔

ایک روز شام کے وقت ٹیلی فون کی کالز اور ملاقاتیوں سے فارغ ہو کر نثار قادر باپ کے کمرے میں آ گیا۔ ان سے خیریت دریافت کی۔ دوادارو کی بات کے بعد بڑی معصومیت سے ٹرنک کے بارے میں پوچھنے لگا۔ صوبیدار غلام قادر اسلام والے نے ایک لمبا سانس لیا اور کہنے لگا "اچھا۔۔۔ تو تم بھی میرے ٹرنک کے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

"نہیں ابا جی" نثار نے گھبرا کر جواب دیا "ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو بچپن سے ساتھ دیکھتا آ رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس ٹرنک کی عمر مجھ سے بھی زیادہ ہے۔ یہ تو آپ کا پہلا بیٹا ہے۔" صوبیدار غلام قادر اسلام والے نے نظریں اٹھا کر بیٹے کی طرف دیکھا تو کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ "ہاں نثار بابو کہتا تو تو ٹھیک ہی ہے"۔ صوبیدار جب فوج میں تھے تو بیٹے کو بابو کہہ کر ہی بلاتے تھے۔ "بیٹا جی یہ ٹرنک سچ مچ میرا ایسا ساتھی ہے۔ پرانی چیز تو پھر پرانی ہی ہوتی ہے۔ آج کے چمڑے کے سوٹ کیسوں میں بھلا وہ بات کہاں۔ تمہیں پتا ہے کہ یہ ٹرنک لام پر بھی میرے ساتھ رہا ہے" صوبیدار صاحب نے بات کو درمیان میں چھوڑا اور کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ "آپ تمام لوگ کہتے اور پوچھتے رہتے ہو کہ اس ٹرنک میں کیا ہے؟ اسے اور دیگر پرانی چیزوں کو میں کس لئے سنبھال کے رکھتا ہوں۔۔۔ ہا۔۔۔ ہاہ۔۔۔" صوبیدار صاحب نے ایک لمبا سانس لیا۔ ہر پرانی شے بابو نثار نہ قابل توجہ نہیں ہوتی۔ کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں کام آ ہی جاتی ہے۔ بیٹا میں آپ کو بتاتا ہوں! جب میں بڑی جنگ میں گیا تھا تو ایک موقع پر جب میں جاپانیوں کا قیدی ہوا وہاں مجھے اس بات کا پتا چلا" صوبیدار اسلام والے نے بات کو روکا اور اس طرح آنکھیں بند کر لیں جیسے ابھی بھی وہ اس پنجے سے کا انتظار کر رہے ہوں۔ جاپانی … بہادر اور دلیر تھے اتنے ہی انسانوں سے پیار کرنے والے بھی تھے۔ میں ان کا قیدی تھا۔ لیکن انھوں نے مجھ سے میری بندوق اور سنگین لینے کے علاوہ اور کچھ نہ چھینا۔ اتحادی فوجی جن لوگوں کو بھی قیدی بناتے تھے انہیں اس طرح اندر بند رکھتے تھے جیسے کبوتر کے پکڑنے کے بعد بھی اسے پنجرے میں بند کر کے باہر تالا لگا دیا جائے۔ جنگ کے دنوں میں صرف گولی کی زبان بھی جاتی ہے۔ جس گروہ کا میں قیدی تھا اسے نہ تو انگریزی آتی تھی اور نہ ہی میری زبان کی سمجھ تھی۔ لیکن انسانیت کی زبان تو بالکل مختلف ہوتی ہے۔ شاید جاپانی لوگوں نے اس بات کو پا لیا تھا کہ ہم بیچارے ہندوستانی تو کرائے کے سپاہی ہیں۔ ہمارا دنیا کی سیاست سے کیا واسطہ؟ کچھ میرے جیسے بندے نوکری کی وجہ سے اور کچھ جاگیرداروں اور وڈیروں کی ضرورتوں کے لئے اور کچھ فرنگی بادشاہ کو خوش کرنے کے لئے جنگ کی آگ میں جھونک دیئے گئے تھے۔ پرائی موت مرنے کا بھلا کسے شوق ہوتا ہے نثار بیٹے" صوبیدار صاحب نے بات کرتے ہوئے … لہجے سے کہا "جس فوجی چوکی پر جاپانیوں کا قبضہ تھا، اس پر

اتحادی فوجیں متعدد مرتبہ حملہ کر چکی تھیں۔ میں بھی ایسے ہی حملے میں اپنی پلٹن سے بچھڑ کر قیدی ہو گیا تھا۔ بات دونوں جانب سے ایک جیسی تھی۔ اِدھر بھی قیدی۔۔۔ اُدھر بھی قیدی۔۔۔ اُدھر بندوق اٹھا کر مالکوں کے دشمنوں پر گولی چلانا، دوسروں کو مارنا اور خود بھی موت کا انتظار کرنا۔ یہاں یہ بات نہیں تھی۔ تمھیں بتاؤں بے فکر رہو"۔ باباجی نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ان پرانی چیزوں کو حفاظت کر رکھنے کی عادت مجھے جاپانیوں سے ملی ہے۔ ایک روز ان کی کھسر پھسر اور اجنبی زبان سے مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی خاص حرکت ہونے والی ہے۔ تمام جاپانی سپاہی اور افسر اپنے اپنے تھیلے الٹ رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ انھوں نے کیل کانٹوں اور پھل فروٹ کے خالی ڈبوں کا ڈھیر لگا دیا۔ ان کا ایک افسر میرا دوست بن گیا تھا۔ اس کے شہر میں اس وقت کے ہندوستان کے کچھ بندے روزگار کی تلاش میں پہنچے ہوئے تھے اور وہیں پر رہائش اختیار کر لی تھی۔ اس جاپانی افسر کی ان کے بچوں کے ساتھ دوستی ہو گئی تھی۔ ایسا ہونے پر وہ میرا بھی ہمدرد بن گیا تھا۔ اس افسر نے مجھے بتایا کہ آج رات ہم دشمن پر حملہ کرنے والے ہیں اور دستی بم بنانے کے لئے کیل کانٹوں اور لوہے کے ٹکڑوں کی ضرورت تھی۔ جاپانی لوگ پرانی چیزوں کو بھی ضائع نہیں کرتے بلکہ سنبھال کر رکھتے ہیں۔ ہم سب سپاہیوں کے پاس سے بکسوے تو مل گئے تھے لیکن ایک باریک سی تار نہیں مل سکی تھی جسے دستی بموں کے گرد لپیٹنا تھا۔ وہ تار پلٹن کی ایک اور سے مل گئی۔ اب رات کا منصوبہ بالکل تیار ہو چکا تھا۔

صوبیدار جی نے پانی کا گلاس پکڑا، ایک گھونٹ لیا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگے "جاپانیوں نے حملہ کیا، اتحادی فوجوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا لیکن جوابی حملے میں جاپانیوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ جب جاپانی چوکی چھوڑ کر بھاگنے لگے تو مجھے اس افسر نے زور سے دھکا دیا اور کہا "بھاگ جاؤ۔۔۔ اب موقع ہے۔ اب راستہ ڈھونڈنے میں بھی کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ غلام قادر لام والے نے بات کو ختم کرتے ہوئے کہا۔ "بس بیٹے! لام کی یادیں ہیں اور یہ پرانا ٹرنک ہے اور اس میں پڑی ہوئی ہر شے پرانی ہے اور تمہارا بابا میں بھی تو ایک پرانی چیز ہی ہوں"۔۔۔ یہ بات کرتے ہوئے بابا جی کا جیسے گلا رندھ گیا تھا اور وقار بھی جیسے اداس ہو گیا تھا۔

وقار اور طارق بابا جی سے باریک سی تار لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ جہاں ایک مکینک ٹیلی ویژن ٹھیک کرنے کے لئے آیا ہوا تھا۔ باہر برف باری ہونے لگی تھی اور مکینک واپس دکان پر نہیں جا سکتا تھا۔ بابا جی کی پرانی چیز پچھلی اور نئے زمانے کے عجوبے ٹیلی ویژن کو پھر سے کارآمد بنانے کے کام آ گئی تھی۔ ٹیلی ویژن چلا لیکن سکرین پر کچھ دھبے سے آنے لگے تھے۔ مکینک نے بچوں سے کہا۔ "آج آپ صبر کریں۔ میں کل آ کے چھت پر سے انٹینا ٹھیک کر دوں گا۔" وقار، قادر اور شاہدہ وقار دونوں میاں بیوی اسلام آباد کی وزارت سے چھٹی لے کے لیکن وہ شام کو واپس آنے کا کہہ کر گئے تھے۔ مری والے بنگلے میں اب بابا جی، رہائش، مہمان تھے۔ کچھ بچے اور باقی نوکر ان کے ہمراہ تھے۔ باہر برف ایسے گر رہی تھی جیسے میدانی علاقوں میں ساون بھادوں کی بارش برستی ہے۔ شاید کوئی کرکٹ میچ تھا کہ ٹیلی ویژن پر کوئی اور اچھا سا پروگرام آ رہا تھا۔ تمام بچے ٹیلی ویژن کی سکرین پر دھبوں سے بور ہو رہے تھے۔ تمام ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرنے لگے کہ کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ چھت پر جا کر انٹینا ٹھیک کر سکے۔ بچوں میں ہیرو بننے اور ہیرو کہلانے کا شوق ہوتا ہے۔ وقار نے جھٹ ہامی بھر دی۔ "میں نہیں ڈرتا۔۔۔ نہ برف سے اور نہ چھت پر جانے سے۔ ابھی پانچ منٹوں میں انٹینا ٹھیک ہو جاتا ہے اور ٹیلی ویژن کی سکرین بھی۔" وقار اٹھنے لگا تو طارق نے کہا "یار رہنے دو۔ اصغر خان آتے ہیں تو کہہ دیتے ہیں۔"۔ "لیکن کیوں؟" وقار نے اکڑ کر کہا۔ "میں کسی سے کم ہوں؟"

وقار چھت پر گیا۔ جب کافی دیر تک اس کی کوئی آواز نہ آئی اور نہ کوئی اس کا پتا چلا تو باقی بچوں نے زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ پرے دروازے کی طرف سے اصغر اور اس کے ساتھ برکت بھی دوڑتے ہوئے آئے۔ بچوں نے وقار کے بارے میں بتایا اور

وہ بھاگ کر چھت پر گئے وہاں وقار گرا پڑا تھا اور اس پر برف پڑے چلی جا رہی تھی۔ اصغر باورچی نے جلدی سے وقار کو اٹھایا۔ آوازیں دیں، لیکن وقار تو بالکل چپ تھا۔ اس کے سر سے بہتا لال خون بھی برف سے جم گیا تھا۔

بچوں نے شور مچایا تو بابا جی بھی اپنے کمرے سے بھاگ کر باہر نکلے۔ اصغر خانساماں کے ہاتھوں میں بے ہوش اور لہو سے لت پت وقار کو دیکھ کر لمحہ بھر کے لئے وہ بھی گھبرا گئے تھے۔ اندر سے صوبیدار غلام قادر آیا اور اس نے انھیں حوصلہ دیا۔ انھوں نے اپنا گرم لحاف وقار پر ڈالا اور برکت کو کار لانے کا حکم دیا۔ کار آ گئی۔ ایک دو نوکروں کو روتے ہوئے بچوں کے پاس چھوڑ کر بابا جی نے کار کا رخ ہسپتال کی جانب موڑ دیا۔ جاتے ہوئے انھوں نے اصغر باورچی کو زور دے کر کہا کہ جلدی سے صاحب کو اسلام آباد میں فون کر دینا۔

لگتا تھا جیسے برف نے آج ہی برسنا ہے۔ بابا جی ہسپتال پہنچے تو خوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب وہاں موجود تھے۔ انھیں جب پتا چلا کہ نثار قادر کا بیٹا زخمی ہو کر آیا ہے تو انھوں نے ہسپتال میں ہلچل مچا دی۔ جونیئر ڈاکٹروں اور نرسوں کو بلا لیا۔ جب مرہم پٹی ہو گئی، ٹیکے لگ گئے تب بھی وقار کو ہوش نہ آیا تو ڈاکٹر گھبرا گئے۔ انھوں نے چیک کیا تو پتا چلا کہ لہو بہت زیادہ بہہ گیا ہے۔ اسے تو بہت جلد خون دینے کی ضرورت ہے۔ ہسپتال میں خون موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر نے صوبیدار غلام قادر کی طرف دیکھا اور بات کرتے کرتے چپ ہو گیا۔ برکت مالی اور ڈرائیور نے ڈاکٹر سے کہا۔ ہمارا خون لے لیں۔ نرس نے چیک کیا۔ ان دونوں کا خون وقار کے خون سے نہیں ملتا تھا۔ فون کر کے گھر سے اصغر باورچی کو بلایا۔ اس کا خون کا گروپ بھی دوسرا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اسلام آباد بات ہو گئی ہے لیکن برف باری کی وجہ سے مری کی تمام سڑکیں بند ہیں۔ صاحب اور بی بی جی آ نہیں سکتے۔ ہسپتال کے فون کی گھنٹی بجی۔ پہلے نثار قادر کی اور پھر شاہدہ نثار کی گھبرائی ہوئی اور روتی ہوئی آواز آئی۔ وہ وقار کے بارے میں پریشان اور جلد پہنچنے پر زور دے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے انھیں تسلی دی اور ساتھ ہی دعا کرنے کے لئے کہا۔ آس پاس کے سب لوگوں کا جب خون چیک ہو گیا تو صوبیدار غلام قادر نے کہا کہ اس کا خون لے لیں۔ ڈاکٹر نے غور سے ان کی جانب دیکھا اور پوچھا "آپ کی عمر کتنی ہے؟" صوبیدار نے کہا "عمر کو چھوڑیں۔ یہ بچے کی زندگی کا سوال ہے۔"

ڈاکٹر نے پھر زور دے کر کہا "بابا جی۔ ہم اصولی طور پر زیادہ عمر والوں کا خون نہیں لے سکتے۔" بابا جی نے غصے اور کڑواہٹ سے منہ سے جھاگ چھوڑتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب بھاڑ میں گئے آپ کے اصول اور بڑی عمر۔ میں اسی برس کا ہوں لیکن پھر بھی میں تم سب جوانوں سے طاقتور ہوں۔ آپ خون لینے کا بندوبست کریں۔" سینئر ڈاکٹر اور جونیئر ڈاکٹر نے نرس کی طرف دیکھا۔ کھسر پھسر کی اور پھر صوبیدار سے کہا "بابا جی آپ ایک فارم پر لکھ دیں کہ اگر خون دیتے وقت آپ کو کچھ ہو گیا تو ہسپتال کا عملہ اس کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔"

صوبیدار نے پہلے سے بھی زیادہ غصے سے ڈاکٹر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "ایک نہیں دس دستخط کروا لیں" "اب بابا جی آپے سے تو تنگ آ گئے تھے۔ میرے وقار کو بچا لے ڈاکٹر —— نثار نے کہا شاہدہ پہنچے گی تو کیا کہیں گے۔ بابا جی نے وقار کا دھیان نہیں رکھا۔ جلدی کر ڈاکٹر خدا کا واسطہ جلدی کر۔" ڈاکٹر نے ضروری کارروائی کی۔ بابا جی کے خون کا گروپ وقار کے خون کے عین مطابق تھا۔ زیادہ وقت ضائع کئے بغیر ادھر سے خون بہہ کر وقار کی رگوں میں جانا شروع ہو گیا۔ خون لینے سے غلام قادر کا دل لڑکھڑانے لگا۔ نرس نے طاقت کی کوئی دوا اور دودھ کا ایک گلاس دیا۔ لیکن صوبیدار صاحب چشم پوشی سے کام لیتے رہے اور بار بار وقار کی خیریت پوچھتے رہے۔ دیوار پر لٹکتے ہوئے کلاک اور صوبیدار صاحب کے دل کی ٹک ٹک دونوں ہم آواز ہو رہے تھے۔ ادھر نثار قادر کے فون کی گھنٹی بار بار بج رہی تھی۔ آخری فون پر انھوں نے بتایا کہ بڑی سرکار کی مہربانی سے ہیلی کاپٹر مل گیا ہے۔ بس پہنچنے ہی والے ہیں۔

ڈاکٹروں کی کوشش اور خدا تعالیٰ کی نظر عنایت سے وقار ہوش میں آ گیا۔ نرس بھاگتی ہوئی آئی اور صوبے دار کو بتایا۔ ''مبارک ہو بابا جی۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وقار کو ہوش آ گیا ہے۔'' بابا جی خوشی سے اُچھل پڑے۔ ''آپ تمام لوگوں کو بھی مبارک ہو بیٹی۔'' اس کے ساتھ ہی وہ دوڑتے ہوئے وقار کے بستر کے پاس آ پہنچے۔ وقار پوری طرح ہوش میں آ چکا تھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا اور کہا۔

''بابا جی ٹیلی ویژن تو ٹھیک ہو گیا تھا۔ میں تو ویسے ہی انٹینا درست کرنے کے لئے چھت پر گیا تھا۔''

صوبے دار صاحب آگے بڑھ کر وقار کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے کہنے لگے۔ ''شکر ہے رب کا میری جان ـــ میرے بیٹے رب کا شکر ہے۔'' وقار نے سمجھا کہ شاید بابا جی ٹیلی ویژن کے ٹھیک ہونے پر شکر ادا کر رہے ہیں۔ فوراً دروازہ کھلا۔ نثار قادر، شاہدہ اور تمام بچے وقار کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ شاہدہ کی حالت تو ایسی تھی کہ اب گری کہ گری۔ نثار قادر کے چہرے پر غم سے کھچاؤ سا آ گیا تھا لیکن آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔ وقار بچ گیا تھا۔ بچے جو ابھی تک ڈرے اور سہمے ہوئے تھے اپنی ساری بپتا سنانے لگے کہ کیسے ٹیلی ویژن خراب ہوا۔ مکینک آیا لیکن ایک معمولی تار کی وجہ سے کام نہیں ہو رہا تھا۔ بابا جی نے ٹرنک میں سے تار نکال کر دی اور ٹیلی ویژن ٹھیک ہو گیا۔ لیکن سکرین پر کچھ داغ دھبے اسی طرح آ رہے تھے۔ وقار انٹینا ٹھیک کرنے کے لیے چھت پر گیا تو یہ واقعہ ہو گیا۔ ادھر ڈاکٹر اپنی کتھا بیان کر رہے تھے کہ کیسے خون کے گروپ کی مصیبت پڑی تھی۔ آخر بابا جی کا خون کام آ گیا۔

''لیکن بابا جی کہاں ہیں'' شاہدہ نے اچانک پوچھا۔ نرس گھبرائی ہوئی آئی تو ڈاکٹر سے کہنے لگی ''ڈاکٹر بابا جی کی نبض ڈوب رہی ہے۔ ان کی پیشانی پر پسینہ آ رہا ہے اور وہ سینے میں درد بھی محسوس کر رہے ہیں۔'' ڈاکٹر، نرس، نثار اور شاہدہ سب بھاگ کر بابا جی کے بیڈ کی طرف آئے اور سب سے پہلے شاہدہ نے ان کا ہاتھ پکڑ کر چیختے ہوئے کہا ''بابا جی ـــ بابا جی۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ آپ نے کیا کیا۔''

''کچھ نہیں دھی رانی۔ ایک پرانی چیز نئی چیز کے کام آتی ہی رہتی ہے۔'' صوبے دار غلام قادر کی سانس اکھڑی۔ انھوں نے ایک دو ہچکیاں لیں اور ساتھ ہی ان کا سر تکیے کی دائیں جانب ڈھلک گیا۔ ڈاکٹر دیکھتے ہی رہ گئے۔ شاہدہ نے جیسے بین شروع کر دیے۔ مجھے وقار نہیں، بابا جی آپ کی ضرورت ہے۔ ایک نہیں، میں پانچ وقار پیدا کر سکتی ہوں۔ پر بابا جی، میں آپ کو کہاں ڈھونڈوں گی ـــ بابا جی ـــ بابا جی۔ نثار قادر آگے بڑھا۔ شاہدہ کو سنبھال کر پیچھے کیا۔ نرس کو اشارہ کیا کہ اسے سنبھالے اور پھر وہ جھکا اور بابا جی کے چہرے پر بوسے دیے۔ دوسری جانب طارق، زاہد اور کمال تمام بچے آئے اور کہنے لگے۔ ''وقار ضد کر رہا ہے کہ میں نے بابا جی کے پاس آنا ہے۔''

نثار نے شاہدہ کی جانب دیکھا اور کہا۔ ''آپ ان کے پاس جائیں۔''

شاہدہ نے چہرے کو گمبھیر بنا کر آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔ ''نہیں میں نے نہیں جانا میں یہیں بابا جی کے پاس رہوں گی۔ آپ جائیں۔'' پھر بابا جی کے سرہانے سر رکھ کر زار و قطار رونے لگی۔

بابا جی میں مانتی ہوں پرانی شے بہت قیمتی ہوتی ہے ـــ بابا جی نہ جائیں ـــ بابا جی۔ ڈاکٹر نے شاہدہ کو کندھے سے پکڑا اور دوسرے بیڈ پر لٹا کر اسے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا۔ شاہدہ کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں لیکن وہ مسلسل بڑبڑائے جا رہی تھی۔

بابا جی اپنی پرانی شے ـــ پرانی شے!!!

◆◆◆

غزلیں

ستیہ پال آنند

طرحی غزل

(مصرع طرح: ہماری زندگی کیا اور ہم کیا)

یہ کیا ہے لغزشِ انسانی جسم کیا؟
ہماری زندگی کیا اور ہم کیا!

(ق)

چلو آؤ، آنند کر لو احتسابی
ترے بھی لڑکھڑائے ہیں قدم کیا؟
جہاں گم ہو گئے دشتِ فنا میں
تری بھی رک گئی تو کم کیا؟!

(ق)

جو کچھ میں لکھ چکا ہوں، لکھ چکا ہوں
یہ ارزقِ شعر ہے اب بیش و کم کیا
چھیاسی سال کا تو ہو گیا ہوں
کروں خود احتساب اب میں رقم کیا؟!

(ق)

دلاسے اور تسلے بھیجتے تھے
لکھوں میں اس سے بڑھ کر اور کم کیا
کہ ہیں اللہ سے الطاف جتنے
طلیعہ کیا، دکھ کیا، اور بہم کیا!

(ق)

اکیلی میں بھی ہے عمر اپنی
لیا گھر بار میرا تو الم کیا
مرے چھالے ہی تھا میرا اثاثہ
اگر لے بھی گیا تو اس کا غم کیا!

(ق)

ہوا کی کھیتیاں بخم دھنک
مرے سانسے میں آئے فلک و تم کیا
میں اور یہ دیا تھا کھل کے بہا
لگی سیراب کر دینے فلک و کم کیا

(ق)

قیامت کے نقوش سب ہیں ہویدا
فقط اک ہیروشیما کا الم کیا
ہوا بڑھانے پہ آتا ہی نہیں ہے
یہ سورج لے گا اب لاکھوں جنم کیا؟

یہ جو آدمی کی وحشی آگ آنند
ہوا ہے اشک کا طوفان کم کیا

OOO

آصف ثاقب

O

جانے کتنی تتلی سی ساعتیں تھیں یہاں
اب وہ جھونکے اور ملاقاتیں نہیں ہیں
ایک بچھاؤ، اک تواں کون دے گا؟
آتے جاتے کی عادتیں نہیں ہیں
چھوٹی چھوٹی ہوا چلی، تہذیب سا ہے
کیسی خوشبو بھری راتیں تھیں یہاں
آؤ بیٹھو، چشمِ گریاں، شب شام
شہرِ غم کی اب وہ تیرگی تھیں یہاں
محفلوں میں کیا اداسی چھا گئی ہے
یار کی گھڑیاں تھیں، راتیں تھیں یہاں
فلک آنکھوں میں محبت سو گئی ہے
آنسوؤں سے تو ملاقاتیں تھیں یہاں
کس طرف جائیں گے ثاقب جان لانے
ان کے نینوں کی کہیں گھاتیں تھیں یہاں

OOO

خالد اقبال یاسر

O

بوجھ اتار چکا ہوں میں
پاؤں پسار چکا ہوں میں

گھٹ جائے باقی عمر اسے
اپنی گزار چکا ہوں میں

جیتے کیا تھا کیا کیا کچھ
کیا کچھ ہار چکا ہوں میں

دل کو رکھا ہے دامن سا
جس کو مار چکا ہوں میں

دن میں ساتھ رہا جس کا
اس کو پکار چکا ہوں میں

تو بھی دکھائی دیتی ہے
جیسی نکھار چکا ہوں میں

دام اب اس کا دو مجھ کو
نقش ابھار چکا ہوں میں

کتنے ہی ادوار کے یاسر
نقش سنوار چکا ہوں میں

OOO

حمیدہ شاہین

O

آپ کے در سے آ گئے ہم تو
اس جہاں سے ورا گئے ہم تو

تو نے ایجاد سے نکالا تھا
وجہ ہستی سے جا لگے ہم تو

تو ہی سب سے الگ بنایا تھا
اب جو سب سے جدا گئے ہم تو؟

تم نے آواز میں بدل ڈالا
اب اثر جا بجا گئے ہم تو؟

اس کے جنگل میں آگ بن کے گئے
اور بے انتہا گئے ہم تو

ہم ترا دل نہیں، تری بات تھے
لوٹ کر خوش لبا گئے ہم تو

[illegible]
خود کو لگتا پیارا گئے ہم تو

جس طرح چار چاند لگ جائیں
دل جہاں بھی لگا گئے ہم تو

بیٹھتے ہی اسے نہیں آیا
داد بے بادپا گئے ہم تو

شاعری کمال چاہی اپنے
خود دیکھ پا گئے ہم تو

OOO

سرفراز سید

O

وہ دن کے چہرے رخشاں رخشاں تھے [illegible] کے تھے
[illegible] کے تھے

[illegible] کے تھے
[illegible] کے تھے

[illegible] کے تھے
[illegible] کے تھے

[illegible] کے تھے
[illegible] کے تھے

[illegible] کے حصار کھینچے
[illegible] کے تھے

[illegible] آنکھوں میں
[illegible] کے تھے

[illegible] تھیں
[illegible] کے تھے

OOO

ڈاکٹر ایوب ندیم

O

ہمارے حوصلوں تک آ گیا ہے
اندھیرا مشعلوں تک آ گیا ہے

پرندے پوچھتی تو کہتے نہیں ہیں
شکاری گھونسلوں تک آ گیا ہے

میں کانٹوں میں الجھ کر رہ گیا تھا
ترا سایہ گلوں تک آ گیا ہے

زمیں کی تشنگی اتنی بڑھی ہے
فلک بھی بادلوں تک آ گیا ہے

کہاں جگنو کریں گے اب بسیرا
زمانہ جنگلوں تک آ گیا ہے

میں اک ٹوٹا ہوا پھر اپنے پر سے
ترا ملنا کونپلوں تک آ گیا ہے

سفر ایوب اب کیسے کٹے گا
عجب سے مرحلوں تک آ گیا ہے

OOO

کرشن کمار طورؔ (انڈیا)

O

جو اپنے آپ سے کچھ کم رہا ہے
مجھے حد سے زیادہ جانتا ہے

بڑھایا ہے جہاں نے ہاتھ اپنا
جہاں پہ دائرہ اپنا بنا ہے

یہ کوشش کر کے بھی اب دیکھ لیں وہ
ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے

تماشہ ہے تو ہے اک خود سری کی
اسے ہم نے بہت دیکھا ہوا ہے

چلو یہ فیصلہ بھی آج کر لیں
وہ کیا ہم سے محبت کر رہا ہے

اسے طورؔ کچھ تو تم کہ شائق
مجھے وہ نام سے پہچانتا ہے

جہاں بھی ہے رہے بس شاد وہ تو
مرے ہونٹوں پہ آتی یہ دعا ہے

OOO

سیفی سرونجی (انڈیا)

O

جب ہارنا نصیب ہو ہر اک کھیل سے
پھر کیا ملے گا تمہیں آگے اپیل سے

گہرائیوں سے کوئی ابھر کر نہ آ سکا
کیسے بچوں گا میں تری آنکھوں کی جھیل سے

ایسا نہ ہو عذاب الٰہی برس پڑے
مت فائدہ اٹھائیے قدرت کی ڈھیل سے

مت آ ز کے آپ نہ چلیے زمین پر
دیکھا ہے دم توڑتے انسان کو کھیل سے

لڑتے ہوئے تمہیں بھی زمانہ گزر گیا
بیٹھے گئے ہیں دوستو ہم بھی طفیل سے

OOO

مراقؔ مرزا (انڈیا)

O

نکل پڑا ہوں زمیں کے انکار خانوں سے
ہے میری ذات کا رشتہ اب آسمانوں سے

یہ ارض خواب ہے پروا کی ہے آزادی
کوئی کسی کو نہیں روکتا اذانوں سے

وہ چند لوگ جو آتی پرکھیں کے مداروں تک
گزر گئے ہیں جو دھرتی کے احسانوں سے

بچھڑ وقت یہاں ایک سال تھیں رہتا
گرد میں لپٹے ان اجڑے آشیانوں سے

حیات عمر تمنا میں دیکھتے جا کر
ملے گی روشنی کچھ قبر کے ٹھکانوں سے

اٹھاؤ تم ہی کوئی چاند اس زمیں پہ مراقؔ
اجالے اترے نہ جس پر کئی زبانوں سے

OOO

نسیم سحر

O

میرے وجدان کے خوابیدہ تحیر جاگے
وہ جو گویا ہوا مجھ سے تو کئی در جاگے

میرے شعروں میں مہک اٹھے ہیں خوشبو بن کر
دیکھ کر اس کو ادا کے یہ جادو گر جاگے

وہ اسے خواب میں دیکھے بھی تو کیسے دیکھا
رات بھر سو نہ سکے جو یہ تو اکثر جاگے

ایسی کیفیت رفاقت کی دل اپنے پاتا
پھر کوئی راگ چھڑے کوئی نیا سر جاگے

بیتیاں اور بھی کرتا ہے اجاگر اپنی
ذہن کم ظرف میں جب کوئی گوہر جاگے

وقت کی سمت روی پر تو کبھی جانے گا
جانے کس وقت یہاں کیا تحیر جاگے

خوب منظر تھا مرے شہر کا شب ڈوبی کے بعد
جب سحر دام مرے خوابیدہ ہنر جاگے

مطمئن عہد جدائی میں ہوں ایسی بھی نسیم
یعنی ممکن ہے وہ قربت کا تاثر جاگے

OOO

مرزا احمد نور طاہر

O

جل اٹھا اک کی خوشبو کا دیا آج کی شام
رقص کرتی ہوئی آتی ہے ہوا آج کی شام

ایسا لگتا ہے کہ آج وہ موجود ہیں محفل میں
وہی گل، وہی خوشبو، وہی تازہ ہوا آج کی شام

عجیب گل ہے کہ پیکر یہ ترا ہے جس سے
سارے عالم کی معطر ہے فضا آج کی شام

سب پہ کی راہ میں ملتے ہوں جس بستی میں
ایسی بستی کوئی دنیا میں بسا آج کی شام

میں نے صدیوں تجھے چاہا، مری جان ہے تو
مجھ کو دے دے میری چاہت کا صلہ آج کی شام

آج کی شام تری آمد کے ہیں چرچے طاہر
روشنی شہر تمنا سے ہوا آج کی شام

OOO

مظہر بخاری

O

رہا اک غم سے دیدہ نمناک ہے
بھر گیا ہوں میں خس و خاشاک سے

دھوپ اتری ہے فصیل جسم پر
منکشف ہوتی ہوئی پوشاک سے

تیری خاطر میں زمیں پر آ گیا
چھوڑ کر آسائشِ افلاک سے

اپنے حصے کا عمل ہو گیا
کوزہ گر مجھ کو اٹھا لے چاک سے

مانجھیوں کے ساتھ کاٹا اور کا
پوچھ لو دریا کے ہر پیراک سے

یہ جب پیکر ہواؤں میں اڑوں
رزق وابستہ ہے میرا خاک سے

جانتا ہوں ایک دن مٹ جاؤں گا
میں نے لکھا ہے مقدر چاک سے

کون ہے مظہر ہمارے درمیاں
لوٹ آتی ہے صدا افلاک سے

OOO

ناصر علی سید

O

کب کہا تھا کہ مجھے وہم و گماں کھینچتا ہے
ہاں مگر تجھ سے مسلسل مری جاں کھینچتا ہے

تو کہ اس وادیٔ حیراں میں الگ مجھ سے ہوا
مجھے پربت کو جہاں زرد دھواں کھینچتا ہے

کھیل اور چاند کے حلقے میں اکیلا ہوں کھڑا
یاد ہے، تو نے کہا تھا یہ وہاں کھینچتا ہے

کن خرابوں میں محبت ہمیں لے آئی ہے
دل مجھے روکتا ہے، کار جہاں کھینچتا ہے

تیرا آئینہ نے مجھ سے یہ عجب بات کہی
چہرہ دکھتا ہے تو پھر کار زیاں کھینچتا ہے

میں تو بس ایک ہی لمحے میں یہاں کا ہو جاتا
کشتیٔ جاں کو مگر وقت رواں کھینچتا ہے

یا بگولوں میں چلا آیا تو یوں محفل میں
دیکھ دیوانے کو اب کون کہاں کھینچتا ہے

OOO

شجاعت علی راہی

O

مجھ کو جاتا ہے کدھر اور کدھر جاتا ہے
تو وہ راہی ہے جو بس گرد سفر جاتا ہے
اسپ تازی کی طرح دھول اڑاتا ہوا دل
شب کو ہر ایک سمندر میں اتر جاتا ہے
وہ دھنک ہوتی چھاتی اور دھڑکتے سانسوں کی
لیک ہونٹوں سے وہاں آگ سے بھر جاتا ہے
ہم تو رسوا سر بازار ہوا ہو ہی گئے
اب ہمیں کیا جو کوئی لوٹ کے گھر جاتا ہے
اوڑھے رہتا ہے ہوا برف کی چادر تیکھی
تیری مسکان سے اس دھوپ سے بھر جاتا ہے

OOO

اسلم سحاب ہاشمی

O

قافلہ ہے گرد صحرا میں نہاں
ہو گیا میں یوسف بے کارواں
وہ زمیں کی خاک ہو کر رہ گئے
جو کبھی بیٹھے تھے خود کو آسماں
ابتدا ہے اوج ہے انجام ہے
چار عناصر زندگی کی داستاں
کام سورج کا ہے اور یہ تشنگی
ہو رہی ہے اس سے کیوں بدگماں
اک تخیل نے جلایا ہے سحاب
یک چراغ حسن در خراب جاں

OOO

طاہر منظور

O

سفر درپیش ہے بس اب چلیں گے
تمہارے بعد دوبارہ کب ملیں گے!

بڑی مشکل سے آزادی ملی ہے
جو جی چاہے وہی اب ہم کریں گے

بہار آئے تو دوبارہ چمن میں
یہاں چاروں طرف پھر گل کھلیں گے

تمہارے دم قدم سے میرے گھر میں
خوشی کے شادیانے ہی بجیں گے

سہانی رات کے پچھلے پہر میں
رفاقت کے گیت ہم بیٹھ پڑھیں گے

بڑے ہی قیمتی ہیں وہ آنسو
محبت میں جو آنکھوں سے گریں گے

محبت تجھ سے وعدہ ہے ہمارا
تمہارا ہر ظلم ہنس کے سہیں گے

مرے بچے مرے اپنے پرائے
بھلا دیں گے سبھی جب ہم مریں گے

یہ سوچا ہے کہ آنکھوں سے طاہر
کسی کو بھی یہاں کچھ نہیں کہیں گے

OOO

نیّر رانی شفق

O

آخری عمر کی چاہت مجھے واپس کر دو
اُن کی آنکھوں کی حلاوت مجھے واپس کر دو

رنگیں لفظوں میں لپیٹے جنہیں بھیجا تھا کبھی
اُن کی باتوں کی حلاوت مجھے واپس کر دو

ہنستے ہنستے وہ جو ہو جاتی تھی تکرار کبھی
ایسے جھگڑے وہ عداوت مجھے واپس کر دو

تو نے بخشا تھا جو اس رت کو بہاروں کا فسوں
اپنے جذبوں کی کرامت مجھے واپس کر دو

''دیر آئے تو درست آئے'' کہاوت ہی سہی
اس کہاوت کی حقیقت مجھے واپس کر دو

ایک اک وصل کے لمحے کو امر کر دوں شفق
تم جو پہلی سی محبت مجھے واپس کر دو

OOO

ثمینہ سیّد

O

محبت کا شکستہ پن نظر کیا آئے باہر سے
یہ دیمک تو بدن کو چاٹتی رہتی ہے اندر سے

مری ترتیب میں صحرا اداسی کا وظیفہ ہے
مجھے کیا پیاس لے جائے گی ان ہاتھوں کے ساغر سے

مری دہلیز پہ میں منتظر اپنی نہ رہ جاؤں
میں جب سوچتی ہوں لوٹ آتی ہوں ترے در سے

تمہارے ہجر کا یہ درد سر تو مستقل ٹھہرا
مجھے لگتا ہے یہ جاں لے کے ہی جائے گا میرے سر سے

مری خاموشیوں کو چیخ بننے کا بہت ڈر ہے
کوئی آواز اٹھنے لگ پڑی ہے میرے اندر سے

ثمینہ مسئلہ یہ ہے مری قامت سے کمتر ہے
ہمیشہ پیاس پی کر لوٹ آتی ہوں سمندر سے

OOO

آشا ٹھاکر کنول

O

وہ لہروں میں روانی مانگتا ہے
سمندر ہو کے پانی مانگتا ہے

عجب ہے ارتقا کے دور میں بھی
وہ جنت جاودانی مانگتا ہے

شکستہ تن پہ اوڑھے خواہشوں کو
وہ بچپن میں جوانی مانگتا ہے

دلوں میں زندگی آنے سے پہلے
محبت کی کہانی مانگتا ہے

دلِ ناداں عجب ہے وسوسوں میں
یقیں بھی آسمانی مانگتا ہے

ترنج ہے محبت کے لیے دل
بلا سے لامکانی مانگتا ہے

کنول فنکار تھی جس میں وفا کی
وہی مٹی پرانی مانگتا ہے

OOO

سعدیہ سیٹھی (لندن)

○

عشق دریچہ عشق ہوا
عشق دیا ہے عشق ضیا
باقی کچھ معلوم نہیں
عشق قدیمی عشق نیا
سانسیں جتنے جھونکے ہیں
عشق گلشن عشق صبا
عشق یقین کی منزل ہے
عشق تجلی عشق ادا
رب سے سچا ہو جائے تو
عشق ہمیشہ عشق بقا
سعدیہ اتنا جانتی ہے
عشق محمدؐ عشق خدا

○○○

زیداللہ فہیم

○

منصب ملا تو ظرف کے سانچے میں ڈھل گیا
وہ شخص میری سوچ سے آگے نکل گیا
منظر تمام ایک سے رہتے نہیں ہمیش
چاہتوں کے ساتھ یہ سورج بھی ڈھل گیا
گل ہائے التفات و محبت ملے مجھے
میں جب کبھی بھی وادیٔ حرماں و قتل گیا
چھپ کر کیا تھا وار کبھی اک حریف نے
اس کے کرم کا فیض تھا میں بھی سنبھل گیا
ایک بار جس نے چشم عنایت سے دیکھا زید
میں اس کے پاس بارہا آنکھوں کے بل گیا

○○○

عاصم بخاری

○

جدا ہی دل رہا و دریا ہے
وفاؤں کا عجب سا سلسلہ ہے

کناروں کی طرح سے اک ندی کے
ہمارا درمیانی فاصلہ ہے

کرے وفاؤں کو اعطا بھیجے
محبت بھی کچھ ایسا حادثہ ہے

جدائی کو جو ہنس کے سہا جائے
بتاؤ کس میں اتنا حوصلہ ہے

کنویں میں بھائی ہی تو پھینکتے ہیں
یہی دستور والا قاعدہ ہے

جو ہم سے ہے مسلسل اختلاف
اسی سے دل کا اب بھی رابطہ ہے

کہیں رشتے ہیں عاصم مسئلہ تو
کہیں رشتوں کا عاصم مسئلہ ہے

○○○

انور جاوید ہاشمی

○

ہاں تصور پر گلنار آئینہ ہے
خواب میں پانی کی دیوار آئینہ ہے
باطن میں بھی سب کی صحبت رکھتا ہوں
ظاہر میں میرا کردار آئینہ ہے
محو ہوا وہ خود کو سراپا دیکھنے میں
گھبرائے ہے ابھی دوچار آئینہ ہے
پاس ہمارے ہاشمی شعر و تجلی
اور سراپا ہار سنگھار آئینہ ہے

○○○

ضیاءاللہ طاہر

○

علاج دل بیمار کیا کرتے
لمحات زندگی شمار کیا کرتے
ترک اعتبار کی مت کیا تھا
تجھ پہ اعتبار کیا کرتے
جہاں ہر شئے آتی جاتی تھی
غم حیات منتظر کیا کرتے
رشتے و پیاں سب فریب تھے
تو چشم اشکبار کیا کرتے
اقبال ہم و جاں حال تھا
ذکر گل و گلزار کیا کرتے
ہم دیوانے شہر سے طاہر
آئینہ کا ہر اظہار کیا کرتے؟

○○○

آفتاب خان

O

جو درمیاں ہے رکاوٹ، ہٹا کے دیکھ مجھے
ہوا کے زور، بدن میں چھپا کے دیکھ مجھے
ابھی میں بیج ہوں، پھولوں نے مجھ میں کھلنا ہے
یقیں نہیں تو زمیں میں دبا کے دیکھ مجھے
میں کھو گیا تو بھلا تو کسے ستائے گا
اگر غرور ہے خود پہ، گنوا کے دیکھ مجھے
سنا ہے خواب یہاں گر کے بھی پلٹتے ہیں
سو گیسوؤں میں کسی شب سجا کے دیکھ مجھے
میں تیرے جسم کی خوشبو بدن کے سو جاؤں
وصال رت میں ذرا پاس آ کے دیکھ مجھے
تھکن سے چور بدن کا غبار بیٹھ گیا
پھر ایک بار ہوا میں اڑا کے دیکھ مجھے
میں کم عقیدہ نہیں، ہاتھ پہ کروں بیعت
کوئی تو عشق کی آیت سنا کے دیکھ مجھے
ہوا کے ہاتھ حدیث، کوئی روانہ کروں
ادھر سے تو بھی گلی میں بلا کے دیکھ مجھے
تھکا دیا ہے مجھے کس اصول کی رو سے
بہت بلند ہوں، اپنی انا کے دیکھ مجھے
عجیب درد ہے، اس کا علاج تو ہے فقط
یہی دوا ہے موثر، پلا کے دیکھ مجھے
یہ میرا عشق سراپا نہ تھک میں کر جائے
میں آفتاب ہوں، نظریں تھکا کے دیکھ مجھے

OOO

ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ

O

جو نام ہتھیلی کی لکیروں میں نہیں تھا
کیوں آج فلک دل پہ وہ تحریر ہے جاناں

اس خواب کی تعبیر تو ممکن ہی نہیں تھی
آنکھوں میں مگر اس کی ہی تاثیر ہے جاناں

مانا کہ ترے ہاتھوں میں ہیں پھول ابھی تک
لیکن ترے پاؤں میں جو زنجیر ہے جاناں!

کیا جانے کسی روز بکھر جائے کہیں بھی
اس آس کی دل میں جو اک تعمیر ہے جاناں

یہ روگ کہیں مجھ کو ہی مسمار نہ کر دے
آ لوٹ کر آ تو ہی تو اکسیر ہے جاناں

یہ زخم جدائی کے کبھی سلتے نہیں ہیں
تو جان لے اپنی یہی تقدیر ہے جاناں

اس آگ کے شعلوں میں وہ پھولوں کا تبسم
اک بجھتے ہوئے عشق کی تصویر ہے جاناں

اب ان کی طلب ہی نہیں شاہینؔ مجھے تو
اک شام ہی اب تو مری جاگیر ہے جاناں

OOO

شازیہ مفتی

O

دل کا غنچہ کھلا نہیں جتنی
مل کے بھی وہ ملا نہیں جتنی

جز محبت کے اس محبت کا
اور کچھ بھی صلہ نہیں جتنی

میں تمہیں بھول جانا چاہتی ہوں
پر ابھی ہو سکا نہیں جتنی

موسمِ ہجر سے بھی آج تلک
چاک دل کا سلا نہیں جتنی

وقتِ رخصت تھا زرد سے تھے
کوئی پتا ہلا نہیں جتنی

یہ جو آنسو ہیں میری آنکھوں میں
ہے محبت کا یہ صلہ جتنی

شازیہ پھر وہ یاد آنے لگے
چل پڑا کوئی قافلہ جتنی

OOO

کرشن پرویز (انڈیا)

O

دنیا بھی ہے منڈی، انسان بک رہے ہیں
لیڈر، وزیر، افسر، دربان بک رہے ہیں

آتا ہے جب الیکشن، ہوتا عجیب منظر
ووٹوں کی بات چھوڑو، پردھان بک رہے ہیں

دل میں اتر کے جاتا، کچھ جیب بھی ہے بھاری
ڈگری خرید لو تم، شیطان بک رہے ہیں

جب سے زمیں کی قیمت پہنچی ہے آسماں پر
نالے، ندی تو کیا ہیں، شمشان بک رہے ہیں

پنڈت، پجاری، ملا، کیا پوپ، کیا گرنتھی
اب گرنتھ، وید، انجیل، قرآن بک رہے ہیں

لیڈر کا منتظر ہے جلسہ، جلوس کر لو
جتنی بھی بھیڑ کر لو، انسان بک رہے ہیں

پیسے کی دوڑ میں ہیں پرویز سارے شامل
کیا دھرم، ذات، مذہب، بھگوان بک رہے ہیں

OOO

پروفیسر فرخ محمود

O

اب کہاں لوگ بچانے والے
حق کی آواز اٹھانے والے

اپنا احسان بھی کچھ دیتے ہیں
اپنا احسان جتانے والے

روشنی تیری رہے گی روشن
سوچ کا دیپ جلانے والے

اپنی آواز سنیں گے کیسے
اس قدر شور مچانے والے

اٹھ گئے لوگ یہاں سے کب کے
عشق کا بوجھ اٹھانے والے

سوچ میں رنگ بھریں گے کیسے
سوچ کا رنگ اڑانے والے

ہو گئے رزق زمیں کا فرخ
راز کی بات بتانے والے

OOO

اسد رضا سحر

O

مجھ کو اب وصل بھی نہیں درکار
میری ہستی الگ تجھ سے ہے

بندگی میں کوئی خلوص نہیں
اپنا مطلب تو اس دعا سے ہے

عشق کی دھوم ہے مصاحب کا
لفظ یہ بھی تو خدا سے ہے

ہو گئے پیار بڑھتے لوگوں سے
واسطہ اس کا بھی حیا سے ہے

خوش ہیں ہم کو طبیب سے کیسی
اپنا مطلب صرف دوا سے ہے

OOO

یادیں

عاشقِ صبر طلب

(2013-2017)

......15......

ڈاکٹر رشید امجد

روس کا ٹوٹنا ہمارے عہد کا ایک بہت بڑا سانحہ ہے۔ اس حوالے سے بہت قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ حتمی طور پر کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ افغانستان ہے اور روس طالبان کے ہاتھوں شکست خوردہ ہوا ہے۔ یہ ایک چھوٹی وجہ ہو سکتی ہے۔ روس جیسی دنیا کی دوسری بڑی طاقت کے لئے یہ لڑائی بہت بڑی نہیں تھی۔ روس کے ٹوٹنے کے جو تجزیے سامنے آئے ہیں ان کے مطالعے کے بعد میری سمجھ میں دو باتیں آتی ہیں۔ اول یہ کہ روس کے سالانہ بجٹ میں تقریباً آدھی رقم دوسرے ممالک کی کمیونسٹ پارٹیوں کو دی جاتی تھی تاکہ دنیا میں کمیونزم لایا جا سکے۔ دنیا میں کیوبا کے سوا اور کہیں یہ انقلاب نہیں آیا البتہ روس کی معیشت بیٹھ گئی۔ دوسری وجہ بہت اہم ہے اور ہمارے لئے بھی لمحۂ فکریہ ہے۔ سی آئی اے کئی برسوں سے روس میں کام کر رہی تھی۔ گورباچوف کو چن لیا گیا، وہ ایک معمولی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی شادی ایک اہم گھرانے میں کرائی گئی۔ اس کی بیوی نے اس کی ذہنی تربیت کی۔ آہستہ آہستہ اسے پارٹی میں اہم عہدے دے کر صدر بنایا گیا۔ گورباچوف نے سب سے اہم کام یہ کیا کہ چن چن کر نااہل اور بددیانت لوگوں کو مختلف محکموں کا سربراہ بنایا۔ باقی کام ان لوگوں نے کیا اور ہر محکمہ کا بھٹہ بٹھا دیا۔ روس بغیر کسی بیرونی مداخلت کے خود ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ حالی نے کیا پتے کی بات کی تھی کہ زوال اور بداعمالی اوپر سے نیچے آتے ہیں۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہر اچھی چیز ہمارے یہاں بری بن جاتی ہے، ہم اسے خود برا بنا دیتے ہیں۔ تعلیم کا فروغ معاشرے میں رواداری، بردباری اور سمجھ پیدا کرتا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ پاکستان کی یونیورسٹیوں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا۔ اب گلی محلہ ہے لیکن شعور کی بجائے جہالت بڑھ رہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ یونیورسٹیاں کھولنا اب کاروبار بن گیا ہے۔ سرکاری یونیورسٹیوں کی حالت سب سے خراب ہے۔ رہی سہی کسر ایچ ای سی نے پوری کر دی ہے۔ یونیورسٹیوں میں سیاست، ذاتی مفادات اور جنسی ہراسانی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے۔ سمسٹر سسٹم ہمارے مزاج کے مطابق نہیں۔ اس میں سارا معاملہ استاد کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اب استاد ہمارے دور کے استادوں جیسے نہیں بلکہ ہم جیسے بھی نہیں۔ جو طلبہ استاد کے آگے پیچھے پھرتے ہیں ان کے گریڈ اچھے ہو جاتے ہیں جو اپنی انا میں رہتے ہیں مارے جاتے ہیں۔ لڑکیاں چند نمبروں اور گریڈوں کے لیے ترغیب میں آ جاتی ہیں۔ استادوں کے آپس کے اختلافات کلاسوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس وقت پاکستان کی کئی یونیورسٹیوں میں جنسی ہراسانی کے کئی کیس سامنے آئے ہیں لیکن انکوائری پر کچھ ثابت نہیں ہوتا۔ اس وقت ہمارا سارا زور اعلیٰ

تعلیم اور نیچرل سائنسز پر ہے۔ سوشل سائنسز کے مضامین خصوصاً زبان و ادب کو ہر جامعہ میں بری طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ ایچ ای سی بغیر پیشگی منصوبے کے ہمارے نظام تعلیم کو امریکی نظام تعلیم میں بدل رہا ہے۔ اس کے برعکس خود متعلقہ مشیروں کا رویہ یہ ہے، وہ ویب سے جو کچھ اتارتے ہیں اسے اپنی زمینی حقائق سے جوڑ کر دیکھنے کی بجائے من و عن نافذ کرنا چاہتے ہیں، جس سے ہمارے تعلیمی ڈھانچے کا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ بنیادی تبدیلیوں کی بجائے انتظامی تبدیلیوں کو سب کچھ سمجھا جا رہا ہے۔

اس وقت ملک انرجی بحران کے ساتھ ساتھ دہشت گردی کے عذاب سے گزر رہا ہے۔ انرجی بحران کو حل کرنے کے لیے کوئی سنجیدہ کوشش اس لیے نہیں ہو رہی کہ کمیشن نہیں ملتا۔ مجھے ایک دوست نے بتایا کہ نواز شریف دور میں متحدہ عرب امارات سے ایک شخص یہاں آیا جو اس میدان میں اربوں کی انویسٹمنٹ کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہاں ایک ماہ رہا لیکن کوششوں کے باوجود اس کی متعلقہ وزیر سے ملاقات نہ ہو سکی۔ مایوس ہو کر اس نے کسی اور ملک میں سرمایہ لگا دیا۔ انرجی بحران نے کئی صنعتوں کو بند کر دیا ہے، دہشت اور نظام کی خرابی سے تنگ آ کر کئی صنعت کاروں نے بنگلہ دیش میں کاروبار شروع کر دیا ہے۔

بلوچستان، کراچی سے قلات تک ہر جگہ بدامنی ہے۔ ایجنسیاں تو مختار اور کسی بھی سرکاری دباؤ سے باہر ہیں۔ ان کے رویوں کی وجہ سے مرکزیت کمزور ہو رہی ہے۔ میں گزشتہ سال کوئٹہ گیا تو ایک منظر مجھے کبھی نہیں بھولتا۔ ہم گیسٹ ہاؤس سے سرینا جا رہے تھے جہاں کانفرنس کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ طالب علموں کی ایک لمبی قطار دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے سیکورٹی گیٹ سے گزر رہی ہے۔ دوسرے دن بھی وہی منظر دکھائی دیا، معلوم ہوا کہ یہ طالب کینٹ سکولوں میں پڑھتے ہیں اور سکول جانے کے لیے انہیں اس سیکورٹی گیٹ سے گزارا جاتا ہے۔ میں نے منشا یاد سے کہا، سیکورٹی اپنی جگہ لیکن جنگی قیدیوں کی طرح ہاتھ اوپر اٹھوانا تو شرمناک ہے۔ ان بچوں سے یہ توقع کیسی کی جا سکتی ہے کہ وہ حب الوطنی کی بات کریں گے۔ منشا بولا "اس طرح کے منظر تو شاید مفتوحہ علاقوں میں بھی نظر نہیں آتے وہاں بھی سویلین کی حالت بہتر ہوتی ہے۔"

جامعات کی طرح میڈیا بھی پھیل گیا ہے لیکن اس کے بھی مثبت نتائج اس لیے کم ہیں کہ میڈیا میں صحافیوں کے روپ میں بھتہ خور آ گئے ہیں۔ اخبار کا رپورٹر ہونا اتنا منفعت بخش ہے کہ کئی لوگ اخبار سے تنخواہ لینے کی بجائے اخبار کو پیسے دیتے ہیں۔ ڈاکٹر سہیل عباس نے بتایا کہ ان کے ایک جاننے والے نے جو فیصل آباد کے نواح میں کسی گاؤں سے تعلق رکھتا تھا، انہیں کہا کہ مجھے کسی اخبار کا نمائندہ بنوا دو۔ سہیل نے کہا یہ کونسی مشکل بات ہے۔ میرا ایک دوست فیصل آباد کا بیورو انچارج ہے، میں اسے کہہ کر تمہیں تمہارے گاؤں کا نمائندہ بنوا دیتا ہوں۔ سہیل کہتے ہیں کہ میں اس شخص کو لے گیا اور اپنے دوست سے مدعا بیان کیا۔ وہ ہنسنے لگا اور بولا یار سہیل تم کتنے سادہ ہو، بھائی نمائندہ بننے کے لیے کم از کم لاکھ ڈیڑھ لاکھ لگتے ہیں۔ اس شخص کے سر میں نمائندہ بننے کی دھن تھی کہنے لگا۔ میں دینے کے لیے تیار ہوں پیسے لے کر بیورو انچارج نے اسے نمائندہ خصوصی کا کارڈ بنا دیا۔ سہیل نے بتایا کہ چند روز بعد وہ شخص ملا تو میں نے پوچھا، سناؤ تمہاری نمائندگی کیسے جا رہی ہے۔ وہ بولا کمال ہی ہو گیا ہے، ڈیڑھ لاکھ تو کب کے وصول ہو گئے۔ پہلے ہی دن میں موٹر سائیکل پر گاؤں جا رہا تھا کہ مجھے ایک ٹرالا نظر آیا جس پر کٹے درخت لدے ہوئے تھے۔ میں نے ٹرالے پر بیٹھے شخص سے پوچھا یہ ٹرالا کدھر سے آ رہا ہے اور کدھر جا رہا ہے؟ اس نے کرختگی سے کہا تم پوچھنے والے کون ہو؟ میں نے کہا "میں فلاں اخبار کا نمائندہ ہوں" اس شخص کا رویہ فوراً بدل گیا بولا "سر جی اپنے گھر کا پتہ بتا دیں

شام کو ایک لالہ آپ کے گھر بھی پہنچ جائے گا"۔

بجلی کے بحران اور بھتہ خوری کے لیے کراچی پر قبضے کرنے کی کوششوں نے روشنیوں کے اس شہر کو گہری تاریکیوں میں ڈبو دیا ہے۔ میرے ایک دوست قاسم بھوگیو جام شورو یونیورسٹی میں شعبہ لسانیات کے ڈین تھے۔ پڑھے لکھے نفیس شخص ہیں، دوستوں کے دوست، میری ان سے پہلی ملاقات چین کے دورے کے دوران ہوئی۔ ہم مزاجی کی وجہ سے ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ اب ان سے تعلقات کا سلسلہ چل رہا ہے۔ انہیں ایک دن گورنر ہاؤس بلوایا گیا اور بتایا گیا کہ انہیں اندرون سندھ کی ایک یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنایا جا رہا ہے۔ وہ شکریہ ادا کر کے جانے لگے تو کہا گیا وہاں فلاں شخص سے مل لیں۔ وائس چانسلر کا عہدہ سنبھال کر وہ اس شخص سے ملے۔ اس نے ان کے آنے کی مبارک باد دی اور اپنا تعاون پیش کیا۔ اٹھنے لگے تو وہ شخص بولا "یہاں سے ہر ماہ ایک خاص رقم گورنر ہاؤس بھجوانا ہوتی ہے جہاں سے اسے لندن بھجوایا جاتا ہے۔ آپ کے ذمہ اتنا حصہ ہے۔" بھوگیو نے کہا "بھائی میں تو نوکری پیشہ آدمی ہوں، میں اتنی رقم کہاں سے دوں گا"، اس شخص نے کہا، "آپ اس کی فکر نہ کریں طریقہ ہم بتائیں گے۔ دیکھیں جامعہ ابھی کرائے کی عمارت میں ہے۔ نئی بلڈنگ بننا ہے تمام مراحل طے ہو چکے ہیں فنڈز بھی آ چکے ہیں۔ آپ بسم اللہ کریں۔"

بھوگیو نے بتایا کہ میں نے دوسرے دن پوچھ گچھ کی تو معلوم ہوا کہ دو لاکھ کنال کی زمین آٹھ لاکھ میں خریدی جا رہی ہے۔ میں اگلے دن اس شخص کے پاس گیا اور کہا "بھائی بیٹوں کی شادی کر دی، بیٹیوں کی ذمہ داری سے بھی سبکدوش ہو گیا۔ اب میاں بیوی ہیں، بیوی بھی نوکری کر رہی ہے میں اب کس کے لیے منہ کالا کروں" اس پر اس شخص نے کہا "پھر مناسب ہے کہ آپ واپس چلے جائیں"۔ بھوگیو جام شورو آ گئے تو ڈین شپ بھی گئی۔ بار بار احساس ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں ہر اچھا خیال ہر اچھا منصوبہ منفی بن جاتا ہے۔ ہمارے زمانے میں ریسرچ کی حوصلہ افزائی کے لیے پندرہ سو ماہانہ ریسرچ الاؤنس ملنا شروع ہوا اس زمانے میں پندرہ سو بڑی رقم تھی۔ سن دو ہزار کے بعد یہ الاؤنس پانچ ہزار ہو گیا اور اب دس ہزار۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ لوگ اس ترغیب سے متاثر ہو کر ریسرچ کی طرف آتے لیکن کم از کم زبان و ادب کے شعبوں میں اس کا الٹا اثر ہوا یعنی لوگوں نے مقالے لکھوانے شروع کر دیے۔ کچھ ایچ ای سی کی غلط پالیسیوں اور کچھ ایسے لوگوں کی وجہ سے جو مقالے لکھنے کا کام کرتے ہیں یہ ایک کاروبار بن گیا ہے۔ لاہور میں ایسے گروپ موجود ہیں جنہوں نے موضوع، خاکہ اور مقالہ لکھنے کے معاوضے مقرر کر دیے ہیں۔ بہت اچھا مقالہ تین لاکھ میں اور میانے درجے کا دو لاکھ میں لکھا جا رہا ہے۔ یہ پڑھے لکھے لوگوں کا پیشہ ہے۔ ایک ایک باب بانٹ لیتے ہیں اور مہینے بھر میں کام مکمل ہو جاتا ہے۔ رہ گیا مقالے کا ڈیفنس تو مقالے کو ایک دو بار پڑھ کر مقالہ نگار جواب دینے کے لیے تیار ہو ہی جاتا ہے۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا "تین لاکھ میں مقالہ لکھوانے کا کیا فائدہ؟" بولا "دس ہزار مہینہ ہے اور میری نوکری کے ابھی پندرہ سال باقی ہیں۔"

کہتے ہیں کہ جدید دور میں میڈیا تبلیغ کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ مغربی ممالک میں اس سے بڑا مثبت کام لیا گیا ہے لیکن ہمارے یہاں ہر چیز منفی بنا دی جاتی ہے۔ ہمارے الیکٹرانک میڈیا میں صبح کے شو بھانڈوں اور میراثیوں کے فیشن شو بن گئے ہیں گھروں میں بھی عورتیں یہ شو دیکھتی ہیں تو کپڑوں اور آرائش و زیبائش کے سبق سیکھتی ہیں۔ خیال نہیں کہ ایسے شوز میں کبھی کسی سائنسدان، استاد، شاعر ادیب یا ایسی شخصیات کو بھی مہمان بنایا گیا ہو جس کا تعلق علم و ادب سے ہو۔ ان شوز کے میزبان بھی میراثی اور بھانڈ ہیں اور ان کے مہمان

بھی زیادہ سے زیادہ بلے باز، جن کے سٹے کی کہانیاں آئے دن منظرِ عام پر آتی رہتی ہیں۔ ایسے پروگراموں سے معاشرے میں مثبت تبدیلی آسکتی ہے لیکن ہمارے یہاں ایسے پروگرام عوام کی تربیت کی بجائے جھوٹی نمائش، آرائش، منافقت اور معاشرتی اقدار کی تباہی کا موجب بن گئے ہیں۔

ڈاکٹر کوثر محمود کی والدہ کے انتقال پر میں اور ڈاکٹر روش ندیم ان کے گھر تعزیت کرنے گئے تو باتوں باتوں میں میں نے پوچھا، والدہ کا انتقال کیسے ہوا، کیا بیمار تھیں؟ کوثر محمود بولے: ''بالکل ٹھیک تھیں۔ میں جمعہ کی رات حسبِ معمول لاہور سے آیا تو ان کے کمرے میں چلا گیا اور رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ دو بجے کے قریب میں سونے چلا گیا۔ صبح سویرے میری بیوی نے جگایا اور کہا کہ اماں بلا رہی ہیں۔ میں ان کے کمرے میں پہنچا تو کہنے لگیں ''اپنی خالہ کو بلاؤ۔'' وہ قریب ہی رہتی تھیں، میں جا کر انھیں لے آیا۔ دونوں بہنیں باتیں کرتی رہیں۔ ناشتہ کیا، پھر اماں بولیں، میں اب آرام کرتی ہوں۔ ہم انھیں سوتا چھوڑ کر دوسرے کمرے میں آگئے۔ دو تین گھنٹے بعد جگانے گئے تو وہ جا چکی تھیں۔''

میں نے کہا: ''ان کو صبح سویرے بلانے کا مطلب یہ ہے کہ انھیں کوئی نہ کوئی احساس تھا کہ وہ جا رہی ہیں۔''

کوثر محمود نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے پوچھا: ''ڈاکٹر صاحب ہماری ہر حالت ڈی این اے کے تابع ہے؟'' بولے: ''بالکل''۔

میں نے کہا: ''لیکن ہمیں بظاہر اس کا علم نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی ہماری کوئی شعوری رو ڈی این اے سے جا ملتی ہے اور ہمیں مستقبل کی کوئی ایک جھلک نظر آجاتی ہے۔'' کوثر محمود نے کہا: ''اسے آپ غیر معمولی حس کہہ سکتے ہیں۔''

ڈی این اے پر امریکہ میں جو تحقیق 1995ء میں شروع ہوئی تھی اس کے مطابق اب تک اس کی پچیس ہزار جینز دریافت کی گئی ہیں۔ اگر ہر جین کو ایک حروفِ تہجی سمجھا جائے تو اب تک پچیس ہزار حروفِ تہجی معلوم ہو چکے ہیں۔ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر ان سے جملے بنائے جائیں تو کتنے جملے ہو سکتے ہیں۔ ڈی این اے ایک عجب گورکھ دھندا ہے جو ہماری ایک ایک حرکت کو کنٹرول کرتا ہے۔ لیکن ہم شعوری طور پر اس کے عمل کے طریقۂ کار سے واقف نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ کبھی کبھار ہماری کوئی شعوری رو اس سے جا ملتی ہے۔ الہام، بشارت اور تخلیقی عمل وغیرہ اسی کے تابع ہیں۔

موت کے بعد زندگی کی صورت کیا ہے، اس کا استدلالی جواب میسر نہیں۔ بعد از مرگ زندگی اجتماعی ہے یا انفرادی ہمیں کے ساتھ، اگر میری انفرادی میں نہیں تو میری یہ ساری تگ و دو کیا معنی رکھتی ہے۔ ڈی این اے تو یقیناً موجود رہے گا لیکن اس کی فوٹو کاپی یعنی میں کہاں اور کس صورت میں ہوں گا۔ سوچتا ہوں بعد از مرگ زندگی خواب کی مانند ہے، بعض خواب خوشگوار اور مسرت آمیز ہوتے ہیں، بعض خواب ڈراؤنے اور بے چین کر دینے والے۔ ہمارے اعمال کے حساب سے خوابوں کی یہ صورتیں ہی ہمارا اگلا مرحلہ ہیں۔ کیا یہ خواب پہلے ہی سے اپنی اپنی صورتوں کے ساتھ ہمارے ڈی این اے میں موجود ہیں، اگر ہاں تو پھر:

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی

موت کا ذکر میرے کئی افسانوں میں موجود ہے۔ ڈاکٹر کوثر محمود نے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے مضمون ''رشید امجد کے

افسانوں میں موت کی خواہش' میں لکھا ہے۔

''عموماً درج ذیل وجوہات کی بناء پر کوئی شخص غیر طبعی موت کی خواہش کر سکتا ہے:

1۔ آدمی ملاقاتِ اللہ ہو اور خدا سے ملاقات کے شوق میں موت کی آرزو کرے۔

2۔ کسی عظیم اور برتر مقصد کی خاطر جیسے مذہب، وطن یا عشق کے لیے مر جانا چاہے۔

3۔ دنیا کے دکھوں اور تکالیف سے گھبرا کر مرنے کی سوچے۔

4۔ یا کسی شدید نفسیاتی دباؤ / ڈپریشن کی وجہ سے ایسا کرنے پر مجبور ہو۔''

میں نے ان سے پوچھا ''ڈاکٹر صاحب! کیا ایسا نہیں کہ موت کی خواہش ڈی این اے میں پہلے سے موجود ہو؟''

بولے ''بالکل''۔

میں نے کہا: ''تو پھر یہ انفرادی خواہش یا فعل تو نہ ہوا، یہ تو ڈی این اے بنانے والے کی مرضی ہوئی۔ جس وقت وہ ڈی این اے بنا رہا تھا تو اس کا موڈ کیسا تھا۔ چاک تو وہی ہے اور مٹی بھی وہی، جین کو زوم کر کے اس لمحے کا موڈ کوزے کی ضخامت میں اضافہ کر دیتا ہے۔''

ڈاکٹر کوزہ گھومتے چھتے لگے۔ میں نے کہا: ''پھر ہمارا کردار کیا ہے، یہ تو اس کے موڈ پر منحصر ہے، اگر ایسا ہی ہے تو انسان کیسے خسارے میں ہے؟'' یہ خسارہ تو دراصل اس کی بے بسی ہے۔''

اس بے بسی کا احساس مجھے ہمیشہ رہا ہے، اب بھی ہے۔ سفر ختم ہونے کو ہے۔ معلوم نہیں کس لمحے ہی ڈی کلک کر کے بند ہو جائے اور سکرین سفید ہو جائے۔ لیکن میں کہیں نہ کہیں موجود ہوں گا۔ اس صورت میں نہ سہی، ڈی این اے کی صورت میں، کسی کے خواب میں۔

یہ خواب کتنا طویل ہوگا، خوشگوار ہوگا یا ڈراؤنا؟

تخمینہ ناموجود میں موجودگی کا احساس!

پھر صور کی آواز گونجے گی، سوا نیزے پہ سورج ہوگا اور میرے ڈی این اے سے ایک وجود ابھرے گا، اصل یا اس کی فوٹو سٹیٹ

اس سوال کا جواب میں ساری عمر تلاش کرتا رہا، لیکن اب بھی وہیں ہوں جہاں سے سوال شروع ہوا تھا۔ (ختم شد)

(ادارہ ''تخلیق'' ڈاکٹر رشید امجد کا ''تخلیق'' کو اتنی معلوماتی اور جامع تحریر دینے پر قارئین اور ادارے کی جانب سے شکریہ ادا کرتا ہے)

◆◆◆

معروف شاعر و ادیب اور صحافی ریاض ندیم نیازی کا تازہ شعری مجموعہ

یادوں کے بھنور

شائع ہو گیا ہے — قیمت/-400 روپے

ملنے کا پتا: روئیل پبلی کیشنز، اقبال مارکیٹ، کمیٹی چوک، راولپنڈی

رابطہ شاعر: ندیم لائبریری تنی (فون: 03003701617, 03333701617)

کشمیری لال ذاکر بھی چلے گئے!

سرفراز سید

77 برس پیشتر ادبِ لطیف میں شائع ہونے والے بھارت کے اردو زبان و ادب کے بہت معروف، بہت ممتاز شاعر، افسانہ و ناول نگار، نویس و کالم نگار، ہریانہ اردو اکیڈمی کے چیئرمین کشمیری لال ذاکر 98 برس کی عمر میں چل بسے۔ ان کا انتقال پچھلے برس 31 اگست کو ہوا۔ ادھر پتہ ہی نہ چل سکا۔ بہت عرصے کے بعد اتفاقیہ پتہ چلا۔ کشمیری لال ذاکر ایک نہایت غیر متعصب، دردمند انسانیت دوست انسان! میری ان کے ساتھ ایک ہی نشست ہوئی جو دیر تک جاری رہی۔ اس کا ذکر آگے کروں گا۔ انہوں نے اردو اور ہندی میں تقریباً 130 کتابیں لکھیں۔ ان میں 100 سے زیادہ اردو میں افسانوں، ناولوں اور شاعری کے مجموعے اور دوسری کتابیں شامل ہیں۔ وہ نسلاً کشمیر کے ''احسبلی برہمن'' قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس قبیلے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عراق سے کشمیر میں آکر آباد ہوا تھا۔ کشمیری لال ذاکر ''احسبلی'' ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا کرتے تھے۔ قرآن مجید کا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا۔ بلکہ یہ کہ ایک ضخیم کتاب قرآن مجید میں مذکور چوپایوں جانوروں کے بارے میں معلومات پر مبنی شائع کی۔ انگریزی میں شائع ہونے والی اس کتاب میں مختلف جانوروں کی عادات وغیرہ کے بارے میں اپنے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ جانوروں کی زندگی اور طرزِ عمل سے ہمیں زندگی گزارنے کے ضابطوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ ضابطے ہمیں خدا تعالیٰ کے وجود اور عظمت کا احساس دلاتے ہیں۔

1919ء میں چندی گڑھ میں پیدا ہونے والے کشمیری لال ذاکر نے ایم اے انگلش کے علاوہ دوسری اسناد بھی حاصل کیں۔ متحدہ پنجاب میں محکمہ تعلیم میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر اور دوسرے اہم عہدوں پر کام کیا۔ ابتدا ہی سے اردو زبان و ادب سے گہری دلچسپی تھی۔ نوجوانی میں ہی شعر کہنے لگے۔ 1940ء میں لاہور کے قدیم اردو جریدہ ادبِ لطیف میں پہلی غزل شائع ہوئی جو ان کی آئندہ شاعری کی بنیاد بنی۔ کشمیری لال ذاکر کا نام تو بہت سن رکھا تھا مگر ان سے ملاقات چند سال قبل لدھیانہ میں ساحر لدھیانوی کانفرنس میں ہوئی۔ رات کے وقت مشاعرہ کے ہال میں ذاکر صاحب صدارت کر رہے تھے۔ مجھے ان کے ساتھ نشست پر بٹھایا گیا۔ بہت معتبر اور دکھائی دینے والی ایک بزرگ شخصیت! سر کے سارے بال سفید مگر چہرے مہرے سے بڑی عمر والی تھکن یا کمزوری دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اور ثمانہ نور ساحر لدھیانوی کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور سے گئے تھے۔ لاہور کا نام سن کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ 47ء سے پہلے لاہور بہت جایا کرتا تھا۔ مشاعرے سے فارغ ہو کر لاہور کی بہت باتیں کریں گے۔ صدرِ مشاعرہ کی حیثیت سے ان کی باری آئی تو چند ادھر ادھر کی چیزیں سنانے کے بعد اچانک میری طرف مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ سرفراز صاحب! لاہور میرے خوابوں کا شہر ہے۔ اس کی گلیوں کوچوں میں بہت گھوما ہوں مگر 47ء کے بعد وہ آسانی نہ رہی۔ اب اس کی یادیں رہ گئی ہیں۔ ایک بار دلی سے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ بہت سے شناسا چہرے غائب تھے۔ ایک مشاعرہ میں بلایا گیا۔ وہاں میں نے پڑھا کہ:

بڑی شفیق بڑی غم شناس لگتی ہیں   تمہارے شہر کی گلیاں اداس لگتی ہیں

وہ درد منتظر نگاہیں جو چھن گئیں مجھ سے
کبھی کبھی تو مجھے آس پاس لگتی ہیں

لدھیانہ میں مشاعرہ دیر سے ختم ہوا۔ صبح ناشتے کے لیے ریسٹ ہاؤس کے کینٹین میں اکٹھے ہوئے۔ مجھے انتظار حسین کے لیے کچھ کتابیں دیں۔ سردی کا موسم تھا۔ میں نے پاکستانی کشمیری شلوار پر کمبل میں بنی جانے والی موٹی اون والی اونٹ کے رنگ کی گرم واسکٹ پہن رکھی تھی۔ اس پر خوبصورت کڑھائی تھی۔ ان کی نظر واسکٹ پر پڑی۔ کچھ دیر دیکھتے رہے۔ کہنے لگے بہت خوبصورت واسکٹ ہے۔ اس نے بہت سی یادیں تازہ کر دی ہیں۔ میں آپ کو پیسے دیتا ہوں۔ مجھے کسی کے ہاتھ پاکستان سے ایسی واسکٹ بھجوا دیں۔ میں نے فوراً واسکٹ اتاری اور ڈاکٹر صاحب کو پیش کر دی۔ بہت خوش ہوئے۔ جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالنے لگے۔ میں نے ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب! محبت کی کوئی خرید و فروخت نہیں ہوتی۔ یہ چھوٹا سا تحفہ پیش کرتے ہوئے بے حد مسرت ہو رہی ہے۔ کہنے لگے کہ میں اسے مسلسل پہنوں گا محسوس ہوتا رہے گا کہ پاکستان کو اوڑھ رکھا ہے۔

چند روز کے بعد چندی گڑھ سے مجھے فون کیا کہ سرفراز صاحب آپ والی واسکٹ مسلسل پہن رہا ہوں۔ بہت سے دوستوں کو بھی بہت پسند آئی ہے! اس کے بعد بھی ڈاکٹر صاحب نے چند ایک بار فون پر بات کی۔ دکھ کا اظہار کرتے رہے کہ پاکستان آنے کو بہت دل کرتا ہے مگر عمر زیادہ ہو گئی ہے (93 سال) اب آسانی سے چل پھر نہیں سکتا۔ یہ بھی سوچتا ہوں کہ پاکستان میں آ کر کیا کروں گا؟ حمید اختر کے بعد انتظار حسین بھی چلے گئے۔ بہت محبت سے یاد کرتے تھے۔ بس اب چل چلاؤ ہے۔ بہت کام کیا ہے اب تھکن اترنی ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے ان کا فون نہ آیا۔ ایک روز ڈاکٹر کیول دھیر کا پیغام آیا کہ ڈاکٹر صاحب چلے گئے!!

ڈاکٹر صاحب نے مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھا۔ ان کی شاعری میں سوز و غم کی نمایاں کیفیات ملتی ہیں۔ چند قطعات دیکھئے:

اے غمِ دوست! ہم نے تیرے لیے
کتنے ہونٹوں کے جام توڑے ہیں
کتنی زلفوں کے سائے ملتے تھے
کتنی زلفوں کے سائے چھوڑے ہیں

درد کا جام لے کے جیتے ہیں
صبر سے کام لے کے جیتے ہیں
لوگ جیتے ہیں سو بہانوں سے
ہم ترا نام لے کے جیتے ہیں

اک بزمِ طرب سجا لیں ہم
آ! اک عشرت کا گیت گا لیں ہم
زندگی عمر کا رونا ہے
آ! اک پل بھر کو مسکرا لیں ہم

آرزو کے دیے جلانے سے
یہ اندھیرے تو کم نہیں ہوں گے
کب زمانے میں غم نہیں تھے دوست
کب زمانے میں غم نہیں ہوں گے!

ہم فقیروں کی بات کیا پوچھو
روز مرتے ہیں روز جیتے ہیں
اک پیا زہر دن کو ملتا ہے
اک پیا زہر شب کو جیتے ہیں

◆◆◆

سفر نامے

عراق اشک بار ہیں ہم

......10......

سلمیٰ اعوان

سیاسی بصارت سے محروم رہنما قوموں کے زوال کا باعث بنتے ہیں

میں جس گھر کے سامنے کھڑی تھی وہ میرے حساب سے بمشکل دس مرلے میں ہوگا۔ سیاہ گیٹ جانے کب کا پینٹ شدہ تھا۔ کھجور کا اکلوتا درخت، پودینے کی چھوٹی سی کیاری تھوڑی سی گھاس اور دیوار پر چڑھی پیلے پھولوں والی بیل دو بالشت کے لان میں نظر آتی تھی۔ مغرب سے ذرا پہلے کا کھلا کھلا سماں ان دو رویہ گھروں کی گلی پر پھیلا ویسا نہ دکھتا تھا جیسا میں باہر دیکھتی آ رہی تھی۔ مین سڑک سے اتر کر دائیں بائیں مڑتی گلیوں میں مجھے ایک بھی گھر ایسا نظر نہیں آیا تھا جس کی تازگی نے مجھے متوجہ کیا ہو۔ بہت کشادہ و خوبصورت شاہراہ فلسطین سے بیروت سکوائر میں آئے علی دریس Ali Dris کا علاقہ۔ یہاں سے چار چھوٹی سڑکیں چھوڑیں۔ پانچویں میں گھر تھا۔

بڑی سڑکوں کو چھوڑ کر اندر کی سڑکیں کچھ اتنی اچھی حالت میں نہ تھیں۔ صفائی ستھرائی بھی ایسی ہی تھی۔ کاغذوں کے ٹکڑے یہاں وہاں اڑتے پھرتے تھے۔ چھوٹے موٹے کنکر پتھر پھلوں کے چھلکے، پتوں کی ٹھلوں میں گھسے پڑے اور سفید و سیاہ شاپر کی اہم اداسیاں طبیعت پر وقت بے وقت اثر چھوڑتی تھیں۔ صدام کے زمانے میں صفائی کا معیار بہت اونچا تھا۔ چھوٹی بڑی شاہراہیں اور گلی کوچوں کی صفائی رات کو ہوتی تھی۔ صبح ہر چیز چمکتی تھی۔ میں نے حیرت سے اخلاق کی اس بات کو سنتے ہوئے کہا تھا "کمال ہے۔"

دروازہ کھلا۔ ذرا بھاری بھرکم کھلتے رنگ والا کوئی چالیس (40) یا بیالیس (42) کے ہیر پھیر میں سفید ٹوپی پہنے جو آدمی باہر نکلا تھا اخلاق سے بوس وکنار کی فراغت کے بعد میری طرف اھلاً و سہلاً و مرحبا کہتے ہوئے مصافحہ کیلئے بڑھا وہ مصطفیٰ مہدی تھا۔ سادہ سا مخلص سا اخلاق کے کالج میں اکنامکس کا استاد تھا۔ ڈرائنگ روم زیادہ بڑا نہ تھا۔ مکین کی طرح سادہ۔ صرف ایک صوفہ۔ اطراف میں رکھی چار کرسیاں، درمیان میں بڑی سی ایک تپائی۔ ہاں البتہ کمرے میں تین چیزیں بڑی نمایاں تھیں۔ کتابوں کی الماری، دیوار پر ٹنگی واحد بڑی سی تصویر اور کارنس پر دھرا ریکارڈ پلیئر۔

ایک پاکستانی خاتون کے عراق اور خاص طور پر ان سے ملنے کیلئے ان کے گھر آنے پر مشکور ہونے کا گہرا احساس ان کے لہجے میں بہت نمایاں ہو کر میرے سامنے آیا تھا۔ صاحب خانہ بھی دروازے سے تانیا اندر گئے۔ مگر ہوا یہ کہ جانے سے قبل کارنس پر دھرے ٹیپ ریکارڈ کا بٹن آن کر گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کمرہ آناً فاناً پاپ اور ماڈرنیت کی میٹھی سی خوشبو سے بھر گیا ہے۔ میں نے اخلاق کو مسکراتی آنکھوں اور ہونٹوں سے دیکھا۔ جواباً وہ بھی ہنس پڑا۔

لگتا ہے سارا عراق Give me love کے Songs of the broken hearted Baghdad کا عاشق ہوا پڑا ہے۔ ''دراصل ہمارے قدیمی کلچر کی نمائندگی کرتی اس پرانی شراب میں نئی کی آمیزش ہو گئی ہے۔ اب ایسے میں نشہ تو دوچند ہو جاتا ہے نا۔'' اس کی بات تو ٹھیک تھی۔

سچ تو یہ تھا کہ میں تو خود البموں کی کوئل کی طرح ان کی عادی ہو رہی تھی۔ آج میرا چوتھا دن تھا اور اس کے ہزار ریکارڈز میں سے چار پانچ کو لگاتار سن رہی تھی۔ سلیم داؤد Salim Dawood، سید الکردی، ہدریا انور، سلطانہ یوسف اور سید محمود۔

سلطانہ یوسف ہماری طاہرہ سید کی طرح پیارے لہجے کی گلوکارہ تھی۔ بیٹ دار آواز کہ سید محمود کی کیا بات تھی۔

تو میں اس گھر میں واپس آئی ہوں جہاں اتفاق مجھے لایا تھا۔

میرے لیے صوفے پر بیٹھنا محال ہو رہا تھا۔ کہ دیوار پر آویزاں غیر معمولی پینٹنگ جیسے مجھے قریب آنے کیلئے بلا رہی تھی۔ میں اسے دیکھنے کیلئے اس کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ کس قدر دلآویز تھی یہ۔ عراق کے دلدلی علاقے کی تھی۔ جہاں حد نظر پانیوں کا پھیلاؤ تھا۔ ان پانیوں پر اڑتے آبی پرندوں کی قطاریں تھیں۔ شام کا سورج پانیوں پر ایک طویل ترچھا راستہ بنا رہا تھا۔ ایسا فنکاری سے بھرا ہوا جیسے کسی نے سونے میں ڈھال کر سجا دیا ہو۔ کشتی میں کھڑا عراقی چوبی لانگ سے سرکنڈوں میں جانے کیا چیز کھوج رہا تھا۔ ذرا دور ایک گھر تھا۔ کیسے انوکھے سے اسٹائل کا چھوٹا سا چھپر تھا۔ یہ کیا کمال کا تھا؟

تصویر میں میری محویت دیکھتے ہوئے اسمٰعیل میرے پاس آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ بتانے لگے۔ یہ سرکنڈوں، دلدلوں، پپائرس Papyrus (ایک درخت جس کی چھال کاغذ جیسی ہوتی ہے) مٹی اور گوبر سے بنتا ہے۔

جو گھر میرے سامنے تھا اس کا باہر اور اندر آرٹ کا ایک دلآویز شاہکار تھا۔ چلو باہر سے تو بات کاری تھی سوچی پر اندرونی تو اس درجہ کمال کی کہ بے اختیار اسے دیکھتے رہنے کو دل چاہ رہا تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے سے خم کھاتی محرابیں نما دائرے بنے ہوئے دراصل اس مارش گھر کو سپورٹ دیئے تھے۔ زمین سے چھت تک ان کے درمیان لگے سرکنڈوں کی کیا دیدہ زیبی تھی۔ یہ محراب در محراب ایک وسیع و عریض سرنگ کی طرح دور تک جاتا ہوا ایسا راستہ تھا جس کے فرش پر بچھی دریوں سے بنی مضبوط چٹائیوں پر بیٹھے افراد خانہ صدیوں پرانی کسی تہذیب کا حصہ نظر آتے تھے۔ ''میں یہاں نہیں جا سکتی ہوں۔'' میرے ان چوکھی جملے میں بہت سے معانی پوشیدہ تھے۔ حالات کی ابتری کا اعتراف تھا تو وہیں اس کے ساتھ ساتھ ایک سوال بھی، حسرت، تجسس، خواہش میں لپٹا ہوا۔ شاید کہ میں نے اس مہربان میزبان کو دیکھا تھا اس امید پر کہ وہ کہے نہیں یہاں تو آپ جا سکتی ہیں۔

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مٹی جیسی شیشے کی گلاس میں بھولی سی سیٹل کی چائے دانی سے قہوہ انڈیلتے ہوئے کہا تھا جو اس بارہ سال کا لڑکا ابھی رکھ کر گیا تھا۔ ''آئیے قہوہ لیں۔''

میں نے کڑوے قہوے کا چھوٹا سا سپ لیتے ہوئے امید بھری نظروں سے پھر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''بصرہ میں تو بہت تنگی ہے۔'' لمبی سی آہ اس میں لپٹی ہوئی اسمٰعیل کے لبوں سے نکلی تھی۔

''بصرہ تو برطانیہ کی بدولت سے کمزور ہی تھا۔ اب باقی بھی مل گئے ہیں۔ انہیں بھی بہت پسند ہے۔ چپے چپے پر بیٹھے ہیں۔ ناصریہ میں بھی صورت کچھ اتنی حوصلہ افزا نہیں۔ یوں اگر چلی بھی جائیں تو راستے میں جگہ جگہ چیک پوسٹوں پر جانچ پڑتال۔ سوال جواب کے

لے سکتے۔ چیچنیا Chchaylah کا مصر سے کوئی سو کلومیٹر ہے وہاں سے پھر کشتیوں پر دلدلی علاقوں کا سفر ہے۔ سر دست جانا خطرے سے خالی نہیں۔ انہوں نے پاکستان کے بارے میں پوچھا تھا۔ کاش میرے پاس کوئی فخر سے بھرا جملہ ہوتا۔ مایوسی اور دکھ میں ڈوبے احساسات۔

"دراصل ترقی پذیر ملکوں کی قیادت اگر غیر معمولی فہم و فراست اور وژن کی مالک نہ ہو تو ملک آگے جانے کی بجائے سو سال پیچھے چلے جاتے ہیں۔ ہمارے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ جنہیں ہم وہیں نکال دے چکے ہیں وہ بد بخت پھر ہم پر حاوی ہو جائیں گے۔ عراقیوں کو ہمیشہ سے اپنے قبیلے، اپنی قوم، اپنی تہذیب، اپنی ثقافت اور اپنے ملک پر فخر رہا ہے۔"

"صدام کو اس منظر نامے پر کہاں رکھتے ہیں؟"

"دنیائے عرب کا لیڈر بننے کا شوق لے بیٹھا۔ اپنی ذات کے بت کو اٹھا دینا چاہتا تھا۔ گھروں، گلیوں، کوچوں، سڑکوں، بازاروں، چوراہوں، دوکانوں، دفتروں میں تصویریں سجا دیں کوئی کارنامہ تھیں اگر یہ ان میں نہ لگیں۔ ناصر بننے کا خواہاں تھا۔
یوں کچھ انتظامی معاملات میں بہتر تھا۔ جوڑ توڑ میں بھی ماہر تھا۔ دونوں بڑی طاقتوں سے اپنے اقتدار کو پکا کرنے کیلئے سیاست کرتا رہا۔ ان کا آلہ کار بھی بنا۔ بہر حال سیاسی دانشوری سے خالی تھا۔"

تبھی ایک اونچی لمبی گوری چٹی موٹی تازی خاتون کمرے میں آئیں۔ بڑی خوبصورت سی بچی نے ماں کا بازو تھاما ہوا تھا۔ عمر بھی کوئی آٹھ نو سال ہوگی۔ تعاقب میں بیٹا بھی تھا۔ وہ کوئی دس بارہ کا ہوگا۔ میں فی الفور ان کی طرف متوجہ ہوئی۔ میری توقع اور خیال کے مطابق وہ خوبصورت تو تھیں مگر جس حد تک ماڈرن تھیں اس کا مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ میں تو ان دنوں گلیوں بازاروں میں سیاہ عباؤں میں ڈھکی اخلاقی عورتوں کو ہی دیکھتی تھی۔ کہیں کوئی اکا دکا خواتین سادہ سے مغربی لباس میں نظر آتا تھا۔ ثمرین اسمٰعیل شوخ چھوٹے چھوٹے گلابی پھولوں والا اسکرٹ پہنے تھیں۔ ٹانگیں ننگی اور پاؤں میں عام سی چپل تھی۔ گلے میں موٹے موٹے چمکدار موتیوں والا ہار تھا جو سینے پر لوٹتا لٹکا ناف کو چھوتا تھا۔ بال شانوں تک کٹے تھے۔ خاتون حساس سی تھیں کہ اخلاق نے اطلاع دینے کی ضرورت نہیں محسوس کی۔ انہیں آج رات کسی کے ہاں کھانے پر جانا تھا۔ اب وہ اسے ملتوی بھی نہیں کر سکتی ہیں۔

"ارے آپ دل پر اسے محسوس نہ کریں۔ یہ جو آپ کی ملاقات ہوگئی ہے میرے لیے یہی بہت اہم ہے۔"

میں نے فی الفور دلداری کرنا ضروری سمجھی تھی۔ وہ مجھ سے وعدہ لینا چاہتی تھیں کہ میں دوبارہ چکر لگاؤں۔

"مجھے یہ تو وہی بات ہوگئی کہ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ آپ جتنی بار کہیں گی میں آؤں گی۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہوگی۔"

ثمرین اسمٰعیل ڈگری کالج میں اکاؤنٹس پڑھاتی تھیں۔ بہت اچھی انگریزی بولتی تھیں اور بہت خوش اخلاق بھی تھیں۔

ابھی ہی چائے پلانے کیلئے جب وہ اجازت لے رہی تھیں۔ میں نے ہاتھ تھام لیا تھا۔

"چائے تو پی لی ہے۔ چائے سے زیادہ آپ کا بیٹھنا اور باتیں کرنا ضروری۔"

"بس ابھی تھوڑی دیر میں آتی ہوں۔" کہتے چلی گئی۔ عرب علاقوں میں چائے میں دودھ ڈالنے کا رواج نہیں۔

خلیجی جنگ کیا ناگزیر تھی کیوں ہوئی آخر؟

"عراق ایران جنگ نے اقتصادی طور پر عراق کو بہت متاثر کیا تھا۔ صدام تیل کی قیمتوں پر مذاکرات چاہتا تھا مگر کویت تیار نہیں تھا۔ سعودی عرب بات کرنے کیلئے آمادہ تھا۔ کویت اوپیک OPEC کو بھی دھوکہ دے رہا تھا۔ یہ بات بھی اپنی جگہ درست تھی کہ کویتی صبا خاندان سے خوش بھی نہیں تھے۔

یہ بات تقریباً ہر عراقی کے ذہن میں ہے کہ کویت ہمیشہ سے عراق کا حصہ تھا۔ مگر دراصل کویتی شیخوں کی وساطت سے برطانیہ کے چنگل گاڑے ہوئے پڑے ہیں۔ وہ کویت کے معاملے میں بہت حساس تھا۔ عراق کی جانب سے پیش کردہ سب مطالبات کویت نے رد کر دیئے۔ اب یہاں ایک زیرک حکمران کو سوچنے کی ضرورت تھی کہ الگ سے شہادت کی پور جتا کویت اور وہ اپنی سرکشی پر اترا ہوا ہے تو کچھ دال میں کالا کالا ہے۔ یوں بھی صدام حسین پاور سے بش سینئر، جونیئر تک سبھی امریکی صدور نے حقیقی عزائم کیے اور خطرہ کر رہے ہیں۔ اوپر سے ماشاء اللہ متحدہ امارات کے شیخ خاندانوں کا طرز عمل کہ جنہیں تیل کی آمدنی نے عیاشیوں میں جکڑ کر رکھا ہے۔ ان کے ہمسایوں یا لوگوں کو دانہ دنکا میسر ہے یا نہیں گھر چھوڑ اچھے دوست کرتے جاتے ہیں بسم اللہ کہے جا رہے ہیں۔ صدام کی طرف سے امریکی سفیر اپریل گلاسپی کو باقاعدہ سندیسہ بھیجا۔ اس کے اعزاز میں دعوت سجائی۔ دونوں بیٹھے۔ گلاسپی نے امریکہ سفارت کار۔ کمرے میں تیسرا بندہ نہ تھا۔ مترجم بھی نہیں کہ خیر سے وہ خود فر فر عربی بولتی تھی۔ اس نے اطمینان سے صدام کے سارے شکوے شکایات سنے۔ سر ہلایا اور کہا وہ سمجھتی ہے سب باتیں ہے دراصل اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ چاہتا ہے کہ دونوں فریق اپنے اپنے تنازعات خود طے کریں۔ لو ان تو مل گیا۔ 2 اگست 1990 کو کویت اور تیل کی تنصیبات پر قبضہ ہو گیا۔ اس قبضے میں جو تباہی اور مار دھاڑ ہوئی وہ ایک الگ داستان۔ ہزاروں فلسطینی، ہزاروں ایشیائی، یورپی، دیگر قوموں کے لوگ خالی ہاتھ اور بے سروسامانی میں نکلے۔

اسی پر اکتفا نہ ہوا۔ سعودی عرب کی سرحد پر 60000 فوجیوں کو لا کھڑا کیا۔ یقیناً آپ کو بھی یہ معلوم ہوگا آپ کے وزیراعظم میاں نواز شریف بھی اپنے اس سرپھرے مسلم برادر کو سمجھانے بغداد گئے تھے کہ وہ کویت سے فوجیں نکال لے۔ مگر اکڑ سے بھری کھوپڑی میں کوئی بات نہیں سما رہی تھی۔ آپریشن ڈیزرٹ اسٹارم میں اپنے فوجی اور سول کوئی 85000 لوگوں کو مروا دیا۔ اور پھر کویت سے دستبرداری کا اعلان کیا۔ جنگ بندی بھی قبول کر لی۔ اسی کو کہتے ہیں نا پھر جاتے کر مرنا۔ اب اگر کہیں سیاسی، ذہنی افق کی وسعت ہوتی تو صبا خاندان کی غیر مقبولیت سے فائدہ اٹھایا جاتا اور فوری انتخابات کے ذریعے ایک حکومت تشکیل دے کر کویتیوں کی ہمدردی حاصل کر لی جاتی۔

یقین جانیے انہوں نے ناحق سے لبریز لمبی سانس لی۔ ہم نے کامیاب اور مغرب نے منہ دیکھتے رہ جانا تھا۔ مگر ایسا کیوں ہوتا؟ اپنے ملک میں جو ڈکٹیٹرشپ قائم کر رکھی ہوئی تھی اس کا کیا بنتا؟ مجھے اپنے حکمرانوں کی حماقتیں یاد آ رہی تھیں جیسے انہوں نے ملک اور قوم کو دولخت کیا اور ابھی بھی ملک کا بیڑہ غرق کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بچے نے آکر کچھ کہا تو وہ اٹھ کر اندر گئے۔ میں کتابوں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

میں انوکھی سی مسرت سے ہم کنار ہوئی تھی۔ تالا نہیں تھا۔ الماری کے پٹ میں نے کھول لیے۔ مختلف عربی شعرا سے بھرے ہوئے تھے۔ مجھے افسوس ہوا میرے پلے کیا پڑنا تھا۔ کاش میں نے کہیں قرآن ترجمے سے ہی پڑھا ہوتا تو شاید درد و سوز میں ڈوبی اس شاعری کو کچھ نہ کچھ سمجھ لیتی۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ میں ان ہستیوں سے تھوڑی بہت واقف ضرور تھی۔ دوسری زبانوں کے توسط سے ہی سہی۔ یہ میرے لیے اجنبی نہ تھے۔ احمد ابن حسین المتنبی Mutanabbi، عبدالوہاب، سعدی یوسف، مظفر النواب، جمیل صدقی الزہاوی، شام کا

انقلابی شاعر ادونیس کو جنم لینے والی شاعری کا خالق نزار قبانی اور محمد المہدی جیسے وہاں ستاروں کی طرح چمک رہے تھے۔

انقلاب بنا تا تھا۔ سعدی یوسف اور ابن الحسین انقلابی دونوں میسوپوٹیمیا کے شاعر ہیں۔ دسویں صدی کا کوئی شاعر ابن الحسین انقلابی جس کا اپنی شاعری کی طاقت اور اس کی تاثیر کے بارے میں دعویٰ تھا کہ اسے اندھے پڑھ سکتے ہیں اور بہرے سن سکتے ہیں۔

اور میں جب اس کی صداقت کے بارے میں پوچھتی تھی اسمٰعیل کمرے میں داخل ہوئے تھے اور ان کا کلام میرے ہاتھوں میں دیکھ کر بولے تھے۔ "بہت پُراثر کلام ہے۔" انہوں نے شاعری کی ہر صنف رومانوی، غزل، قطع اور مزاحیہ میں دلآویز رنگ جمائے تھے۔

اس قوم کی کیسے مٹی پلید ہوتی رہی ہے۔ اس دکھ کا اظہار اگر عام عراقیوں کے لبوں پر ہے تو ہمارے پیارے شاعروں نے بھی اپنے اور ہمارے احساسات و جذبات کو کھل کر زبان دی ہے۔ سعدی تو گزشتہ اور اس صدی کا جلاوطن شاعر ہے۔ جلاوطنی کا کرب اپنی جگہ مگر مجبوریاں ہیں۔ وطن کی یاد میں مظفرالنواب کیسا اپنے دکھ کا اظہار کرتا ہے؟

میری قسمت کسی پنچھی جیسی ہے۔ میرا دل سلطان کے محل میں گروی پڑا ہوا تو پھر بھی گوارا نہ ہوا
پرانے طلا پرندے بھی گھروں کو لوٹتے ہیں

صدام جانتا تھا اس سے۔ سعدی یوسف اور ان جیسے اوروں کی شعلہ بیانی اور باغیانہ شاعری سے الرجک تھا پھر بھی وہ انہیں لکھنے دیتا اور اعتراف کرتا تھا کہ وہ عراق کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ مشاعروں میں ان کی شرکت کا متمنی رہتا تھا۔ ان جلاوطن شاعروں کو پیغام بھیجتا تھا کہ آؤ عراق تمہارا منتظر ہے۔ مگر یہ اکیسویں صدی کا چنگیز جو ہمیں اس ظالم کے شکنجے سے آزاد کروانے آیا تھا۔ اس نے جن ناپسندیدہ افراد کی عراق واپسی پر پابندی لگائی ہے ان میں سعدی یوسف بھی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ تو اپنے شوق پورے کر چکے تھے اقوام متحدہ کی کسر باقی تھی۔ سو اس نے اقتصادی، تجارتی، دفاعی اور عسکری پابندیاں لگا کر ہمیں ایک سو سال پیچھے پہنچا دیا۔

امریکہ اور برطانیہ ہمارے تین لاکھ سے زائد معصوم بچوں کے قاتل ہیں۔ میں نے ان کی گفتگو نہیں کی۔ ہاں اسپتالوں میں جانا نہ بھولیں۔ چائے کی ٹرالی آ گئی تھی۔ چائے کے نام پر تو وہی کڑوا کسیلا قہوہ ہی تھا۔ ساتھ میں ایک پلیٹ میں کھجوریں تھیں۔ مغز اخروٹ میں گندھی ہوئی۔ کیا مزے کی چیز تھی۔

"یہ بغداد کی خاص الخاص زہدی کھجور ہے جس کی پیٹ بھرائی سورین نے گھر پر کی۔ قہوے کا کسیلا پن اور کڑواہٹ ہونٹ بھول گئے تھے۔ میرے اس سوال پر کہ دو جنگوں اور عالمی پابندیوں کے باوجود صدام نے ملک کو بہت سرعت سے اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا تھا۔ اس میں کس حد تک حقیقت ہے؟ انہوں نے طویل سانس کھینچ کر کہا تھا۔ "کہتے ہیں۔ بیوقوف دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے۔ میں اسے کریڈٹ نہیں دیتا۔ پہلے بگاڑ لو پھر پھرتیوں سے سنوار لو۔ ایک اچھا لیڈر بحران سے قوم کو سلامتی سے نکالتا ہے۔ ویسے کسی حد تک یہ درست ہے۔ صدام کی شخصیت میں بے شمار غیر معمولی عناصر تھے۔ اور مغرب کو اس پر تعجب بھی تھا اور حیرت بھی۔ شاید یہ اسی کی سزا ہے کہ اتنی پابندیوں کے باوجود انہوں نے دیکھا کہ یہ تو ابھی بھی زندہ ہے۔ اسے زمین میں گاڑ دو۔"

رخصت ہونے سے قبل میں اندر کی خاتون خانہ سے ملوں۔ وہ بیڈروم کا کمرہ۔ عراقی گھروں میں زمین پر بچھے قالینوں پر بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ بڑے سائز کے خوش رنگ قالینوں اور پھولوں نے سارے کمرے سجا رکھے تھے۔

(جاری ہے)

◆◆◆

موسیقی

ناہید نیازی: ایک مہذب آواز

ڈاکٹر امجد پرویز

ناہید نیازی کی مصلح الدین سے شادی نہ صرف مغربی پاکستان اور مشرقی پاکستان کی یک جہتی کا نشان تھا بلکہ پاکستان کے دونوں حصوں کی موسیقی کا ملاپ بھی تھا۔ ناہید نیازی ایک کامیاب گلوکارہ تھیں اور مصلح الدین ایک منفرد انداز کا موسیقار۔ ایک طرف پنجاب کا انگ اور دوسری جانب بنگال کی موسیقی کی مدھرتا۔ ان دنوں یہ بہت رومانوی بیاہ سمجھا گیا تھا حالانکہ دونوں طرف متضاد تہذیبوں کا ٹکراؤ بھی تھا۔ لیکن موسیقی کی زبان سانجھی تھی۔ دونوں تہذیب یافتہ اور تعلیم سے لبریز خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن دونوں دل سے پاکستانی تھے۔ یہ ایک خوبصورت جوڑا تھا۔ پانچ بہنوں میں سے دو عدد خوبصورت بہنیں ناہید نیازی اور ماہ رخ نیازی (فلمی نام: نجمہ نیازی) فلم انڈسٹری میں بحیثیت گلوکارائیں متعارف ہوئی تھیں۔ ماہ رخ پاکستان ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور میں بحیثیت اناؤنسر اور پروڈیوسر کے منسلک رہی تھیں۔ وہاں یہ محمد زبیر انجینئر سے رشتہ ازدواج میں بندھ گئیں تھیں۔ زبیر صاحب نے پاکستان ٹیلی ویژن کی ساری مشینری لگائی تھی اور اپنے پیشہ اور کردار کی وجہ سے بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ دونوں بہنیں سجاد سرور نیازی کی بیٹیاں ہیں۔ اس وقت سجاد سرور نیازی کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔ سجاد صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ وہ مارکونی "جس نے ریڈیو ایجاد کیا تھا" کو جا کر ملے اور ان سے پشاور ریڈیو کیلئے ایک عدد مشینری مانگی تھی۔

سجاد سرور نیازی آل انڈیا ریڈیو پشاور کے پہلے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ مارکونی کے خطاب کے علاوہ ان کی دوسری پہچان موسیقی تھی۔ 16 جولائی 1942ء کو پشاور ریڈیو اسٹیشن "10kw" سے حرین اور اسمعہ ایک نئی عمارت میں منتقل ہو گیا تھا۔ اس ریڈیو اسٹیشن کے ساتھ کئی معتبر نام منسلک رہے ہیں جیسا کہ بخاری دیو، احمد ندیم قاسمی، محسن احسان، خاطر غزنوی، فارغ بخاری وغیرہ۔ ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ چند برس قبل تک مارکونی والا ٹرانسمیٹر قابل استعمال تھا۔ سجاد سرور نیازی، میانوالی کے نیازی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ خاندانی روایات کے مطابق وہ مذہبی آدمی بھی تھے۔ وہ کرکٹر و سیاست دان عمران خان کے والد کے رشتے میں بھائی بھی لگتے تھے۔ سجاد سرور نیازی کی نظم "اک بار پھر کہو ذرا" 1930ء میں سب سے پہلے شمشاد بیگم کی آواز میں مقبول ہوئی تھی۔ اگرچہ سجاد سرور نیازی کی دیگر پسندیدہ گلوکارائیں، نور جہاں اور شاہ منگیشکر بھی تھیں لیکن متذکرہ نظم کے علاوہ شمشاد بیگم کی گائی ہوئی نعت "پیغام صبا لائی" بھی بہت مقبول ہوئی تھی۔ بعد ازاں یہ نعت گلوکارہ ونیرہ و نورکی آواز میں پاکستان ٹیلی ویژن کے لئے مقبول ہوئی۔ جب بھارتی گلوکارہ مسرت چھابڑا نے یہ نظم ریکارڈ کیا تو ناہید نیازی نے ان کی کوشش کو سراہتے ہوئے کہا "شکریہ کہ آپ نے میرے والد کی کاوش کو نئی زندگی بخشی"۔ سجاد صاحب براڈکاسٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک قابل شاعر اور موسیقار بھی تھے۔

انہوں نے 16 اگست 1969ء میں اپنی وفات سے دو ماہ قبل میرے لئے "شکوہ" اور "جواب شکوہ" کمپوز کر کے میری آواز میں نشر کیا

تھا۔ Terrorland Site نے سجاد سرور نیازی اور ناہید نیازی کے تعلق پر ایک تبصرہ کرتے ہوئے عنوان "The daughter-son" 'بیٹی بیٹا' کے تحت ناہید نیازی کا سجاد سرور نیازی کا بیٹا ہونے کی کمی کو پورا کرنے کے حوالے سے لکھا ہے۔ ناہید نیازی پاکستان کی مشہور گلوکارہ ہیں جو ایک کامیاب ایڈمنسٹریٹر، لکھاری اور برٹش انڈیا کے کامیاب موسیقار سجاد سرور نیازی کی صاحبزادی ہیں۔ نیازی کی مشہوری کا ایک سبب ان کی بنائی گئی نعت 'پیغام صبا لائی ہے' 1930ء کی دہائی میں شمشاد بیگم کی آواز میں مشہور ہوا بھی ہے۔ بدقسمتی سے بیشتر لوگ ان کی کاوشوں کو بھول چکے ہیں۔ لیکن cyberspace پر معروف ناہید نیازی نے نئی نسل کو پرانی نسل کی کامیابیوں و کارناموں سے یاد کراتے ہوئے کہا کہ مذکورہ نعت سجاد سرور نیازی نے اس وقت ریکارڈ کرائی جب وہ ایچ ایم وی (HMV) ریکارڈنگ کمپنی کے ڈائریکٹر تھے اور ابھی غیر شادی شدہ تھے۔ اس نعت نے کامیابی کے گزشتہ تمام ریکارڈ توڑ دیے تھے۔ ناہید نیازی نے کہا کہ وہ اپنے آپ کو نیازی صاحب کی اولاد ہونے پر فاخر ہیں اور ان کا نام آگے بڑھانے میں بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ بیٹا بننے کا بھی کردار نبھا رہی ہیں۔

فلموں میں آمد :

یہ کہا جاتا ہے کہ موسیقار خواجہ خورشید انور کی پاکستان آمد کے بعد ماسوائے نور جہاں کے وہ کسی اور گلوکارہ کی آواز سے مطمئن نہ تھے۔ انھوں نے اپنی فلم "زہر عشق" کے لئے مادام نور جہاں سے رجوع کیا کہ وہ اس فلم کے گانے گائیں لیکن مادام اس فلم میں مرکزی کردار بھی نبھانے کی خواہاں تھیں۔ یہ شرط خواجہ صاحب کو قبول نہ تھی۔ ان دنوں نور جہاں صرف ان فلموں کے لیے گاتی تھیں جن میں وہ کام بھی کرتی تھیں۔ خواجہ صاحب نے اپنے ترتیب دیے ہوئے گانے "موہے پیا ملن کو جانے دے بیریا" کے لیے گلوکارہ اقبال بانو کا انتخاب بھی کر لیا۔ لیکن وہ ریکارڈنگ سے مطمئن نہ تھے۔ ہندوستان میں گلوکارہ گیتا دت نے خواجہ صاحب کی دعوت کو قبول کر لیا۔ لیکن اس دور کے تنگ نظر فلمی رسائل نے اس دعوت کو تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ حالانکہ آج کل تو سرحد کے دونوں جانب فنکار اور گلوکار ایک دوسرے کی فلموں میں کام کر رہے ہیں جیسا کہ بھارت کے نصیر الدین شاہ کا پاکستانی فلموں میں کردار نبھانا اور پاکستانی گلوکاروں کا بھارتی فلموں میں گانا جیسا کہ راحت فتح علی اور عاطف اسلم وغیرہ کا۔ اس بے جا تنقید سے دل برداشتہ ہو کر گیتا دت نے پاکستان آنے کا فیصلہ ترک کر دیا۔ اب خواجہ صاحب ایک نئی آواز کے متلاشی ہو گئے۔ اس کھوج میں گیتا دت کی آواز سے قربت رکھتی ہوئی آواز "ناہید نیازی" پر ان کی نظر پڑی۔ ناہید نیازی کے والد سجاد سرور نیازی خواجہ صاحب کے دوستوں میں بھی تھے۔ مذکورہ گانے کی کئی بار ریہرسل کی گئیں اور لازوال نغمہ "موہے پیا ملن کو جانے دے بیریا" ناہید نیازی کی آواز میں ظہور پذیر ہوا۔ جس کو مسرت نذیر کی بے ساختہ کردار نگاری نے چار چاند لگا دیے۔ اس طرح پاکستانی فلم انڈسٹری کو ایک نئی آواز سے متعارف کرانے کا سہرا خواجہ خورشید انور کو باندھا جا سکتا ہے!

ناہید نیازی اور خواجہ خورشید انور :

سریلے اور جذباتی گانے "موہے پیا ملن" کے علاوہ ناہید نیازی نے فلم "زہر عشق" کے لئے ایک اور نغمہ "دکھوں کی بیوری سیاں جا کے نہیں آئے" گایا۔ ظاہر ہے خواجہ خورشید انور کی اگلی فلم "جھومر" (1959ء) کے لئے بھی پس پردہ گلوکارہ کیلئے ناہید نیازی کو چنا گیا۔ اس فلم کے لئے گایا "چلی رے چلی رے چلی رے / جوہی آس لگا کے چلی رے / میں تو دیس پیا کے چلی رے" بہت مقبول ہوا۔ گانے کے

گانے میں خصوصیت جھلکتی ہے کہ ایک پہاڑن لڑکی اپنے محبوب کو ڈھونڈنے شہر کی طرف روانہ ہے کہ وہ وعدہ کر کے واپس نہ آیا تھا۔ گانے میں بانسری کا استعمال پہاڑوں کے ماحول اور لوک رنگ کو اجاگر کرتا ہے اور ناہید نیازی کی آواز میں ہوک اور درد نمایاں ہے۔ اس فلم کا ایک اور چھوٹا گیت ''قسم ہم کو دیئے'' ہے۔ خواجہ خورشید انور نے اپنے منفرد انداز میں اس گانے میں ساز و آواز کی ہم آہنگی سے فلم کی کہانی کو آگے بڑھایا ہے۔ فلم کے گانے میں مختلف انداز موجود ہیں۔ ایک اور خوبصورت میلوڈی ''نہ کوئی جہاں میرا نہ کوئی پیار'' بھی ناہید نیازی نے خوبصورت ادا کیا تھا۔ اس گانے میں بھی بانسری کا خوبصورت استعمال کیا گیا ہے۔ میری ناقص رائے میں فلم 'جھومر' میں موسیقار خواجہ خورشید انور اور گلوکارہ ناہید نیازی اپنے فن کی بلندیوں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ دیگر گانوں میں ''اک البیلا پردیسی دل میں سما گیا'' ''مرلی بجانے والے کوئی'' ''جب یاد کسی کی تڑپائے / اور اپنے آپ دل گھبرائے / جب راتوں کو نیند نہ آئے / تو سمجھو کسی سے پیار ہو گیا'' شامل تھے۔ ایک اور گیت کا خصوصی تذکرہ لازم ہے کیونکہ اس نغمے کی شاعری ''پیا پیا پیا نہ کوک پپیہا رے'' میں بھی حسرت نظر کوئل سے گلہ کرتی ہے کہ وہ اپنی کوکو سے اس کو نہ ستائے کہ وہ پہلے ہی بہت دکھیاری ہے۔ اب وقت آیا کہ خواجہ صاحب نے اپنی دھنوں کو فلم ''ایاز'' (1960ء) کیلئے عربی موسیقی کے رنگ میں ڈھالا اور ایک خوبصورت میلوڈی ''رقص میں سارا جہاں'' ایک کورس کی شکل میں بنایا گیا۔ ناہید نیازی کے دیگر قابل ذکر گانے تھے:

کھل گئے تارے انہیں دل ہی دل میں ناچوں اور / مل گیا دل کو قرار

خواجہ صاحب نے اپنی دھنوں کے انداز کو پھر بدلا اور ایک کلب کی رقاصہ اداکارہ نیلو کے لیے نغمہ ''میں ہوں ایک پہیلی'' تخلیق کیا۔ اس گانے میں نیلو، سنتوش کمار کی فلم 'گھونگھٹ' میں اسے مدعو کرتی ہے۔ اس گانے میں جدت یہ تھی کہ سنتوش کی کولیس کی آوازیں بھی شامل کی گئی تھیں۔ اس دور میں سنتوش کمار کا ہچکچانا اور نیلو کی ادائیں، مغربی لباس میں ملبوس، کو بہت پسند کیا گیا تھا۔ اس فلم میں ناہید نیازی نے ایک اور گیت ''پیا ہے بولو بانو میں تو پیا تمہاری ہوں'' بھی گایا تھا۔ خواجہ خورشید انور نے جب نور جہاں کے ساتھ مل کر فلم 'کوئل' بنائی تو بچوں پر فلمائے گئے گانے ''رم جھم رم جھم پڑے پھوار'' کیلئے ناہید نیازی کے ساتھ نجمہ نیازی کی جوڑی ایک قدرتی چناؤ تھا۔ یہ نغمہ بہت مقبول ہوا تھا، خاص طور پر جب اس کے سازوں کے میٹھے جھولا جھولتے کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے۔

ناہید نیازی اور دیگر موسیقار:

جب میں نے ناہید نیازی کے دیگر نغموں کی کھوج نکالی تو مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ ان کے کافی نغمے یا تو میری سماعت سے نہیں گزرے تھے یا وہ جن فلموں کے لیے گائے تھے، وہ کامیاب نہ ہو سکی تھیں یا انہوں نے عامیانہ درجے کا کاروبار کیا تھا اور وہ نغمے کہیں گم ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ ریڈیو پاکستان بھی صرف وہ نغمے براڈکاسٹ کرتا تھا جو ان فلموں سے ہوتے تھے جو کاروباری اعتبار سے کامیاب ہوتی تھیں۔ ان حالات کا اس امر سے قطعی کوئی تعلق نہ ہوتا تھا کہ گانا اچھا تھا یا برا۔ اس مقالے میں مجھے بہرحال ناہید نیازی کے بیشتر نغموں کا ذکر کرنا ضروری ہے لیکن میرا یہ مشاہدہ مستند سمجھا جائے کہ ناہید نیازی نے 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں تقریباً تمام موسیقاروں کی دھنیں گائی تھیں۔ مثال کے طور پر ہیرو رتن کمار اور ہیروئن نیلو پر موسیقار بابا چشتی کی دھن میں فلمایا گیا فلم ''اللہ دین کا بیٹا'' (1960ء) کے لئے نغمہ ''بے تاب دل کے مالک آ جاؤ آنے والے'' ناہید نیازی کی آواز میں گایا تھا۔ ان دنوں رتن کمار اور نیلو کی جوڑی بہت کامیاب ہوئی

تھی۔ بابا جی اے چشتی بھارت کے نامور موسیقار خیام کے استاد تھے۔

فلم "اللہ دین کا بیٹا" کے دیگر ستاروں میں رخسانہ، ناصرہ، فضل حق، ساقی، ریحان اور لہری بھی شامل تھے۔ اس کاسٹیوم فلم کے ایک اور ناہید نیازی کے گانے "دیکھ کر چلنا راستے میں کسی کا دل" میں رخسانہ، ساقی کو دعوت دیتی ہے۔ اس گانے میں منیر حسین نے ناہید نیازی کا ساتھ دیا تھا۔ ناہید نیازی نے اس فلم کے لیے دیگر نغمے گائے تھے :

دل یہ کہے تو پاس رہے ہر دم (ایک رومانوی لے) / کہتی ہے میری ادا شرما نہیں، جام اٹھا / میں ہوں شمع، میرے پاس نہ آ۔۔۔

زندگی درد کا فسانہ ہے۔ موسیقار سہیل رعنا نے جب اپنے فلمی سفر کا آغاز کیا تو ان نے ناہید نیازی سے فلم ستارہ زیبا کے لیے فلم "جب سے دیکھا ہے تمہیں" کے لیے ایک نغمہ "یہ کیسا غم ہے" ریکارڈ کیا۔ ایک کاسٹیوم فلم "حسن کا چاند" کے لیے ناہید نیازی نے حبیب عالم کے ساتھ ایک دوگانا "پھول ہنس کے مل گئے، اشک موتی بن گئے" حبیب اور دیبا کے لیے گایا تھا۔ اس فلم کے دیگر اداکاروں میں عینا، رنگیلا اور حنیف شاہ شامل تھے۔ ناہید نیازی نے بابا جی اے چشتی کی موسیقی میں ہدایتکار شیخ دہلوی کی فلم "سلطنت" کے لیے اداکارہ نیلو پر فلمایا گیا گیت "دل سے چاہت کا بھلا دینا کوئی آسان نہیں" گایا۔ میرے مشاہدے کے مطابق اس نغمے کی دھن موسیقار رام چندر کی فلم "ساقی" کے لیے مدھوبالا پر فلمائے گئے راجندر کرشن کے لکھے ہوئے گانے "عشق میں جو بھی تمنا ہو، وہی ہونے لگا" سے ملتی جلتی تھی۔ ناہید نیازی نے ایک اچھا گیت "ہم بھی آوارہ سجنی اور تم بھی آوارہ" کہ ہدایتکار اشفاق ملک کی فلم "آخری نشان" (1958ء) میں اداکارہ وجینا شوری پر بمقابل لالہ سدھیر پر فلمایا گیا تھا۔ عرش لکھنوی کے اس گیت کی دھن مدن موہن کے فلم "بھائی بھائی" کے گیتا دت کے گانے "اے دل مجھے بتا دے" کے انداز سے مطابقت رکھتی تھی اور ناہید کی آواز بھی گیتا سے ملتی جلتی تھی۔ 1956ء کی بابا جی اے چشتی کی موسیقی میں فلم "حسن 56" کیلئے ناہید نیازی نے ایک گانا "اک بات ستاتی ہوں کسی سے نہ کہنا" گایا۔ اگرچہ ناہید نیازی نے بعد میں اس کی تردید کی کہ یہ گانا گیتا دت نے ہی گایا تھا۔ موسیقار رشید عطرے نے ناہید نیازی سے گلوکار منیر حسین کے ساتھ ایک دوگانا "بھلا تو دیا اور اپنے ہی دل میں" فلم "بے گناہ" (1958ء) کے لیے ادا کروایا۔ یہ ریحان اور تیمر سلطانہ کی فلم تھی اور اس کے نغمے نامور شاعر فیاض ہاشمی نے لکھے تھے۔ شمیم آرا، الیاس کاشمیری اور آشا پوسلے کی فلم "عالم آرا" (1959ء) کے لیے ناہید نیازی کے دو مذہبی نغمے ایک حمد "تو ہی مشکل کشا ہے اے دو جہاں کے مالک" اور ایک نعت "تیرے سوا نہیں ہے یارب کوئی سہارا" پیش کر کے داد وصول کی۔ اس فلم کی موسیقی رحمان ورما نے ترتیب دی تھی۔ ہدایتکار داؤد چاند کی اس فلم کے شاعر شباب کیرانوی اور مشیر کاظمی تھے۔ موسیقار فیروز نظامی نے ناہید نیازی کی احمد رشدی کے ساتھ جوڑی بنائی اور فلم "سولہ آنے" کے لیے ایک دوگانا "مجھے ہو گیا تجھ سے پیار، آنکھوں آنکھوں میں" لیا۔ 1950ء کی دہائی کے آخری چند برس، ناہید نیازی کے لیے مصروف ترین برس تھے۔ 1959ء کی فلم "اپنا پرایا" میں احمد رشدی اور ناہید نیازی نے "او دور سے نہ گھور، پاس آ" پیش کیا۔ موسیقار سیف چغتائی اور شاعر منیر گیلانی کی اس فلم کے ناہید کے دیگر نغمے تھے :

دل نے بنایا تجھے میت پیا / گزر گئے ہیں وہ پیار کے دن (المیہ گیت)

اس فلم کے فلم ساز بھی منیر گیلانی تھے۔ فلم کے ستاروں میں شمیم آرا، اکمال، ریحانہ، رخسانہ، لہری، طالش اور سکندر شامل تھے۔ 1959ء کا سب سے خوبصورت گانا "پیاں جی کو ڈھونڈنے چلی بجاروں میں گلی گلی جوگن بن کے" فلم "ناگن" کے لیے موسیقار صفدر حسین کی

کاوش تھی۔ یہ فلم بھی مقبول جوڑی رتن کمار اور نیلو پر مشتمل تھی۔ پھر موسیقار رشید عطرے نے نور جہاں کی فلم "تیغہ" جس کے ہدایتکار حسن طارق تھے کیلئے ایک گانا "اک دل ہے اور وہ بھی تیغہ" ناہید نیازی کی آواز میں ریکارڈ کیا۔ اس برس ناہید نیازی کے دیگر نغمے تھے:

دل چرا کے نہیں نظریں چرانا (فلم: ساتھی) / دل والے پی کے رنگ جمانے آج / ٹی بھیرا کبھی تھی آنے بھی چاہت نے (مع منیر حسین) / جھولے جھولے کھایا رے (مع منیر حسین)

اب ہم ناہید نیازی کے حوالے سے 1960ء کی دہائی میں داخل ہوتے ہیں۔ مندرجہ ذیل گیت منظر عام پر آئے۔

راہی ہیں ایک منزل کے (مع منیر حسین، فلم: بہادر) / شوق سے نظارہ کیجئے میرے میٹھے میٹھے حسن کا (فلم: ایک تھی ماں) / جی چاہتا ہے دل میں بسا لوں (فلم: دل نادان، مع منیر حسین) / بتا کس جہاں میں تو آباد ہے / دن بھی ہے رات کے بعد، اے دل سوچ میں تو کس لیے پڑا ہے (فلم: سلطنت) / بجلی بجلی ہوا / یہ رات یہ تنہائی (فلم: تلاش) / اے وطن کی زندگی، وطن کو تجھ سے پیار ہے (ملی نغمہ، فلم: عجب خان، 1961ء) / چپکے سے آکر وہ شوخ ادھر آئے چلا تو پھر کیا ہوگا (فلم: عجب خان) / کوئی کچھ تو نظر (فلم: عجب خان) / ریلا ریلا پیار رہ انکھیں بھلو را کیا ساتھ رے (فلم: عجب خان) / جہاں جاؤ گے مجھے بھی وہاں پاؤ گے (فلم: گل بکاؤلی) / یادوں کہیں رکھتی ہوں (فلم: دو راستے، 1961ء)

موسیقار تصدق حسین نے ناہید نیازی کی مادام نور جہاں کے ساتھ جوڑی بنائی اور فلم "غالب" کے لیے ایک غزل "تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوق نظر ملے" ریکارڈ کی۔ یہ فلم 1961ء میں بنی تھی اور مادام نور جہاں کی بطور ہیروئن آخری فلم تھی، جس کی ناکامی کے بعد انہوں نے صرف پس پردہ گلوکارہ رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ موسیقار سلیم اقبال کی فلم "دروازہ" موسیقی کے اعتبار سے 1962ء کی ایک کامیاب فلم تھی۔ اس فلم میں ناہید نیازی نے گانا "چمن روشن ہوا ہمارے سامنے" پیش کیا۔ ناہید نیازی نے پنجابی زبان میں بھی گانے گائے تھے۔ ان کا پنجابی موسیقی کا انداز مزید ابھر ہوا جب انہوں نے عنایت حسین بھٹی کے ساتھ مل کر فلم "منی دیاں موراں" (1960ء) کے لیے گانا "چاروں دا ایلہ" پیش کیا۔ اس فلم کا گانا "والاں دیاں میلیاں تیں، رتن ہریاں صورتاں بھاں کوں چنتے ہاں تینوں منی دیاں موراں" تو منظر عام پر آتے ہی شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا تھا۔ پنجابی گانوں کا ذکر چلا تو یہ عرض کرتا چلوں کہ ناہید نیازی نے 1969ء میں احمد رشدی کے ساتھ نغمہ "ساجنوں ہتاں نے شی شی" فلم "دیا کھی" کے لیے گایا تھا۔

اب چلتے ہیں 1962ء کی فلموں کی طرف جن کے لیے ناہید نیازی نے نغمے پیش کیے۔ موسیقار عنایت حسین نے فلم "دوشیزہ" کے لیے گلوکار فضل حسین کے ساتھ، ناہید نیازی کا دوگانا "ہر نظر سے اک نیا سوال ہو گیا" ریکارڈ کیا۔ یہ گانا بہت پسند کیا گیا۔ ہدایتکار منشب نے پیرزادہ برادرز کے سب سے بڑے بھائی سلمان کے ساتھ جب نئی اداکارہ کومل کو لے کر فلم 'قانون' بنائی تو اس فلم میں ناہید نیازی کی آواز کو استعمال کیا گیا۔ یہ فلم اداکارہ فردوس کی بھی پہلی فلم تھی۔ دیگر ستاروں میں آزاد، الیاس کاشمیری اور زیبا شامل تھے۔ موسیقار سیف چغتائی نے ناہید نیازی سے مندرجہ ذیل دو نغمے گوا لیے:

آ بھی جاؤ آنے والے دل بہت گھبرائے رے / آ جا دل گھبرائے چلے کی دعا کی تجھ کو پکارے

مندرجہ بالا نغموں کی شاعری منشب کی تھی۔ 1963ء میں فلم "کالا پانی" کے لیے سدھیر اور زرینہ کی اس فلم کے لیے ایک نغمہ "کیا

دکھلایا پیا پیار کا سپنا" گایا۔ فلم "قانون" (1963ء) کے لیے ناہید نیازی نے ایک نغمہ "رنگ بھرا دل آج بھی گائے" پیش کیا۔ جب منیر سلطانہ اور دوسری کی مشہور فلم "باجی" ریلیز ہوئی تو اداکارہ زیبا کے پس پردہ آواز موسیقار سلیم اقبال نے ناہید نیازی سے لی اور ان کی آواز کا خوبصورت استعمال کیا۔ یہ نغمہ تھا "نہ کوئی وعدہ کیا نہ کوئی کھائی قسم" یہ گانا فوری طور پر مقبول ہو گیا کیونکہ اس کی دھن اور گائیکی انتہائی سریلی تھی۔ 1963ء میں ناہید نیازی نے فلم "دلہن" کے لیے ایک گیت "مجھ سے مت پوچھ میرے دل کی تمنا ہے" ایک دوگانے کی شکل میں گلوکار سلیم رضا کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس فلم میں ناہید نیازی کا سولو نغمہ "آداب عرض ہے جناب" تھا۔

ذکر چل رہا ہے دوگانوں کا تو یہ عرض کرتا چلوں کہ ناہید نیازی کے زیادہ تر دوگانے احمد رشدی کے ساتھ گائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک 1964ء میں بننے والی فلم "نیلے پردہ" سے ہے۔ اس کے بول ہیں "آتے ہو تو آ ڈھنگ کوئی کیوں نہ کہیں"۔ بلیک اینڈ وائٹ فلموں کے دور میں جب فلم "خاموش رہو" جب فلم بینوں نے دیکھی تو اس کی کہانی اور مرکزی کردار نے ایک تہلکہ مچا دیا۔ یہ فلم تمام روایتی فلم سے ذرا ہٹ کے تھی۔ اس فلم میں ایک لڑکے محمد علی کی شادیاں کروا کے شریف لڑکیوں کو بازار میں بیٹھنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ اس دلیر مضمون کے پس پردہ مختلف صورت حالات پر ناہید نیازی کا گانا "جاگ گئے الوجا کر خاموش رہو" ایک رقت آمیز سماں پیدا کر رہا تھا۔ یعنی کہ بدی کرنے اور مجبوری میں خاموش رہنا۔ خلیل احمد کی موسیقی میں فلم "خاموش رہو" کے لیے ناہید نیازی نے دو عدد دوگانے "چا چا رے میرے ڈھول سپاہی" اور "کیا اشارہ تم نے ہم کو پیچھے پیچھے آنے کا" (مع احمد رشدی) گائے۔ شمیم آرا، حبیب، حنیف اور حسنہ کی فلم "مے خانہ" کے لیے موسیقار رشید عطرے نے موسیقی دی تھی۔ فلمساز اور ہدایتکار نخشب کی یہ فلم 4 نومبر 1964ء کو پردہ سکرین پر آئی۔ کہانی رئیس امروہوی نے لکھی تھی۔ ناہید نیازی کا گانا "اک ایسا بھی ہے دستور دل کا افسانہ" اس فلم سے تھا۔ دل کے ہاتھوں سے ہمیں درد کا نذرانہ ملا فلم "سفید خون" (1964ء) میں شامل تھا۔ فلم "ایک دل دو دیوانے" (1964ء) کے لیے ناہید نیازی نے ایک گانا "جیا گائے تارا را را رم" گایا۔ یہ سال ناہید کے لیے مصروف سال تھا اور انہوں نے فلم "کاروان" کے لیے ایک گانا "چھوڑ کے جانے والے دل توڑ کے جانے والے" گایا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ناہید نیازی کے فلم میں گائے ہوئے گانوں کی تعداد کم ہوتی گئی۔ 1965ء میں انہوں نے ایک گانا "کیا من چاہے تجھ سے بالم" فلم "کالے لوگ" کے لیے گایا تھا۔

پھر 1966ء میں انہوں نے گلوکار فضل حسین کے ساتھ فلم "پائل" کے لیے ایک دوگانا "پیاری ماں دعا کرو میں جلد بڑا ہو جاؤں" گایا۔ فلم "بدنام" اگرچہ ثریا ملتانیکر کے گانے "بڑے بے مروت ہیں یہ حسن والے" کی وجہ سے مشہور ہے لیکن ناہید نیازی نے اس فلم کے لیے ایک لوری "آج تجھ کو سناؤں لوری حالات سے چوری چوری" گائی تھی۔ 1966ء میں ہی فلم "ایف حسن" منظر عام پر آئی تو اس میں ناہید نیازی کے دو عدد دوگانے "میں بھولی بھالی تتلی اچھوتی رنگی" اور "تو تو بیری رے جو سیاں من کی بتیاں کیا جانے" گائے۔ آخر میں پرویز اور ناہید نیازی نے ایک عدد دوگانا "ابھی ابھی آئے ہو ابھی ابھی جاؤ گے" فلم "بھیا" (1966ء) کیلئے گایا۔ اسی فلم میں احمد رشدی کے ساتھ ایک گانا "پیچھے آنسو اب تو رہتا دو دل جلتا ہے آگ لگے" بھی پیش کیا تھا اور احمد رشدی کے ساتھ دوگانا "جانے مجھے کیا ہو گیا ہے" گایا۔ پھر اگلے برس 1967ء میں ناہید نیازی نے فلم "وقت کی پکار" کیلئے ایک گیت "جام ہے میرے ہاتھ میں جام ہے تیرے ہاتھ میں" ریکارڈ کیا۔ 1968ء میں ناہید نیازی نے ایک عدد نغمہ "یہ مست سہانی رات سانوریا" فلم "جان آرزو" کیلئے گایا۔ اسی برس جب فلم "مجھے

جینے دو'' منظر عام پر آئی تو اس میں ناہید نیازی کا گیت ''حسن بھی موج میں ہے'' شامل تھا۔ پھر فلم ''جنگلی پھول'' کے لیے گلوکار حبیب عالم کے ساتھ ناہید نیازی نے ایک دوگانہ ''تم کہاں لے گئے ہم یہاں'' گایا۔ اس فلم میں گلوکار احمد رشدی کے ساتھ ان کا ایک اور دوگانہ ''یہ مست نشیلی رات بھول نہ جانا'' شامل تھا۔ بدقسمتی سے یہ فلم مکمل نہ ہو سکی۔

ناہید نیازی اور مصلح الدین :

ناہید نیازی کی مصلح الدین سے شادی سے پہلے اور بعد میں چند خوبصورت اور سریلی دھنیں ہمیں سننے کو ملیں۔ دونوں کے اشتراک سے جو تخلیقات منظر عام پر آ ئیں، ان میں محبت کا عنصر شامل تھا۔ ایک ایسی دھن ''رات سلونی آئی بات انوکھی انائی جو نہ کسی سے ہم کہیں گے، رہیں گے چپ، رہیں گے ہم'' تھی۔ فیاض ہاشمی کا یہ نغمہ احمد رشدی کے ساتھ گایا گیا تھا اور 1961ء کی فلم ''زمانہ کیا کہے گا'' کے لیے شمیم آرا اور کمال پر فلمایا گیا تھا۔ ہدایتکار اقبال یوسف کی اس فلم کے فلمساز ایف۔ ایم۔ سردار تھے۔ یہ ایک مقبول نغمہ ثابت ہوا۔ احمد رشدی کے ساتھ ایک اور دوگانہ ''کیسا سفر ہے کیسے یونہی قریب رہے تھا۔ اس کے بعد فلمساز اے۔ حمید نے ایک فلم ''ہمسفر'' بنائی جس کے گانے تنویر نقوی نے لکھے۔ ایک نغمہ ''زندگی میں ایک پل بھی چین آئے نہ'' جو کہ سلیم رضا اور ناہید نیازی نے علیحدہ علیحدہ گایا تھا بہت مقبول ہوا۔ بھارتی اور ہدایتکار شوکت ہاشمی کی اس فلم کیلئے بھارتی گلوکار ہیمنت کمار نے ایک خوبصورت نغمہ ''رات سہانی ہے، سویا سویا چاند ہے، میری قسم ہے تجھ کو اک بار مسکرا دے'' گایا تھا۔ یہ ایک سریلا اور مدھر گیت تھا۔ بھارتی گلوکارہ سندھیا مکھر جی نے بھی ایک گیت ''انکھیاں چھلکیں میرا دل دھڑکے'' گایا تھا۔ ناہید نیازی نے فلم ''ہم سفر'' کے لیے گانے دیگر نغمے تھے :

یہ تم نے کیا، یہ تم نے سنا (مع سلیم رضا) / کا ہے جادو کیا ہائے کیسے آئے موسے بھر دیا / چاندوں کے گاؤں میں جگی فضاؤں میں۔

یاسمین، اسلم پرویز، بندر رنگیت سلطانہ اور جعفری کی یہ فلم 8 اپریل 1960ء کو پردہ سکرین پر جلوہ گر ہوئی۔ اس فلم سے ذرا پیچھے کی طرف لوٹتے ہیں۔ 1958ء ناہید نیازی کیلئے مصروف سال تھا۔ انہوں نے سلیم رضا کے ساتھ فلم ''آدمی'' کے لیے دو دوگانے ریکارڈ کروائے۔

اس جہاں سے دل لگا کے دیکھ لے اور / زمیں پر قدم ہے فلک پر نظر ہے

ان کے علاوہ ان کے سولو نغمے ''میرا کیا بھی مان لو، جاگ تقدیر کو جگا لوں گی سارے دکھ بھول جاؤں گی، میری محبت نے آرزو کے دیے جلائے بجھا نہ دینا اور زمانہ پیار کا اتنا ہی کم ہے پیند جانا'' تھے۔ ہدایتکار لقمان کی اس فلم کے ستارے یاسمین اور حبیب تھے۔ اس فلم کے لیے تمام نغمے ہندوستان کے مقبول شاعر مجروح سلطان پوری نے لکھے تھے۔ فلم ''دل میں تو'' 13 نومبر 1962ء کو ریلیز ہوئی۔ یہ اداکار ادیب کی پہلی فلم بھی تھی۔ اس فلم کے ہدایتکار اقبال یوسف تھے۔ ناہید نیازی نے مندرجہ ذیل نغمے گائے۔

گوری، بڑی یوں بات کیسے نہ تم ان کے بھی تو سمجھا کرو (مع احمد رشدی)

تجھے کیا خبر میری اک نظر بڑی جادوگر دانے جیسی (کورس)

13 اپریل 1963ء کو ریلیز ہوئی فلم ''دل نے تجھے مان لیا'' ایک فیملی ڈرامہ پر مبنی فلم تھی۔ اس فلم کو کراچی میں بنایا گیا تھا۔

اداکارہ زیبا، اداکار کمال کے ساتھ جلوہ گر ہوئیں۔ موسیقی مصلح الدین ہی کی تھی۔ ہدایتکار جاوید ہاشمی کی اس تصویر کے کہانی کار سلیم احمد تھے۔ ریحان، کمال ایرانی، وحید مراد اور زاہدہ اس فلم کے دیگر ستارے تھے۔ شاعر نہایت علی شاعر تھے۔ ناہید نیازی نے مندرجہ ذیل گیت گائے:

کیسا ہے یہ جہاں، ہر قدم اک غم، ہر گھڑی اک ستم　　　　کیوں حضور کیوں حضور، کیوں جب دل نے تجھے مان لیا (مع احمد رشدی)

کھڑے ہے آنچل چلتا ہے دل (مع احمد رشدی، مسعود رانا اور بشیر احمد)　　ضوالاقتدار منتظر بدرہ وبلال (کورس)

لاہور میں بننے والی فلم ''یہودی کی لڑکی'' 26 اپریل 1963ء کو ریلیز ہوئی۔ یہ بھی تبلیغی ڈرامہ فلم تھی جس نے مناسب بزنس کیا۔ فلمساز صغیر جعفری کی اس فلم کے شاعر حبیب جالب تھے۔ ناہید نیازی نے اس فلم میں نغمہ ''اے آسماں تو ان گردشوں کو'' گایا۔ اس فلم کے ستارے تھے سلطانہ، درپن، شاہنواز، مینا شوری، طالش، اجمل، ناصرہ، ساقی اور ریحانہ ایرانی تھے۔ مصلح الدین کی فلم ''شکاری'' 20 مارچ 1964ء کو ریلیز ہوئی۔ اس فلم کے ستاروں میں شمیم آرا، درپن، رخسانہ اور ہدایتکار جعفری بخاری تھے۔ ناہید نیازی اور احمد رشدی نے ایک جاسوسی فلم ''شیطے پر ہوا'' جو کہ 3 اپریل 1964ء کو ریلیز ہوئی تھی اور اس میں نیلو اور کمال ستارے تھے، کیلئے دو دوگانے گائے۔ فیاض ہاشمی کے ان دوگانوں کے بول تھے:

آتے جاتو آؤ نہ کبھی کیوں نہ گئیں / ذرا رنگ ہمیں ستاؤ نہیں

فلم ''جوکر'' (1966ء) کیلئے ان دونوں نے نغمہ ''ہر دل کی دھڑکن تمہی ہو'' گایا۔ کہانی کار علی سفیان آفاقی کی اس فلم کے ستارے رانی، کمال، زیبا، آزاد، فیضی، ریحان، لہری اور طالش تھے۔ ہدایتکار اقبال یوسف تھے۔ ایکشن فلم ''جوش'' 2 اپریل 1966ء کو پردہ سیمیں پر آئی۔ ناہید نیازی کے لیے یہ ایک بڑی فلم تھی کیونکہ اس فلم میں انہوں نے پانچ نغمے گائے تھے۔ مالا اور احمد رشدی نے بھی ایک ایک نغمہ گایا تھا۔ ناہید نیازی کے نغمے تھے:

بلما جارے جا / چھیڑ دانی کچی ہوا آ جا پیا / رات چلی ہے جھوم کے (اپنے دور کا بہت ہی پسند کیا گیا گیت) (مع احمد رشدی)

سیاں بیدردی نہ جا رے سنتا جا رے چھوڑ کے / سیاں بیدردی گھر گھر پھر کے

یہ بھی ہدایت کار اقبال یوسف اور موسیقار مصلح الدین کے فن کا نتیجہ تھی۔ اس کے ستاروں میں زیبا، سدھیر، وحید مراد، رخسانہ، اقبال یوسف، روزینہ، آزاد، اسد جعفری، کمال ایرانی، منوّر ظریف، دل، لطیف چارلی، ادیب، ساقی شامل تھے۔ شاعری کلیم عثمانی نے کی۔ فلم ''جان پہچان'' میں ناہید نیازی نے تین گانے گائے تھے:

جان، جان، جان واسطہ رام کا (شاعر ناصر کسنگھوی) (اداکارہ شاہدہ پر فلمایا گیا)

لگے نہ جیا تجھ بن جانے کیوں (اداکارہ روزانہ پر فلمایا گیا)

چھپ چھپ کر نظریں ملاتے رہو (مع احمد رشدی)، (محمد علی اور شاہدہ پر فلمایا گیا)

ماضی کے مشہور ہدایتکار ڈبلیو۔ زیڈ۔ احمد کے فرزند فرید احمد نے اس فلم میں ایران سے اداکارہ شاہدہ کو مدعو کیا تھا اور فلم کی ہدایتکاری کے فرائض بھی سرانجام دیے تھے۔ دیگر ستاروں میں دیگر ستارے ''ترنم'' شاکر اور محمد علی تھے۔ یہ فیملی ڈرامہ فلم 3 اگست 1967ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ شاعر تسلیم فاضلی تھے اور فلمساز محسن شیرازی تھے۔ فلم ''مجھے جینے دو'' 9 اگست 1968ء کو ریلیز ہوئی اور ناہید نیازی

نے اس فلم میں صرف ایک صدہ گانا گایا تھا جس کے بول تھے "حسن بھی موج میں ہے"۔ اس فلم میں رومانوی جوڑے زیبا اور محمد علی جلوہ گر ہوئے تھے اور معاون ستارے رنگیلا، زمرد، اجمل اور سلطان راہی تھے۔ ہدایتکار رزاق اور فلمساز نذیر علی تھے۔ میری متذکرہ بالا گزارشات سے شائقین موسیقی نے یہ ضرور اخذ کر لیا ہوگا کہ ناہید نیازی 1950 اور 1960 کی دہائیوں کی معروف گلوکارہ تھیں جنہوں نے اس دور کے تمام نامور موسیقاروں کی دھنیں گائیں۔ ان کے شوہر مصلح الدین نے صرف سولہ فلموں میں موسیقی دی اور ناہید نیازی نے ان کی دھنوں سے زیادہ مستفیض ہوئی۔

مصلح الدین کی وفات دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے 3 اگست 2003ء کو ہوئی۔ انہوں نے کئی خوبصورت گانے تخلیق کیے جو آج بھی شائقین موسیقی کے دلوں کو گرماتے ہیں۔ متذکرہ بالا سطور میں ہم نے ان کی مشہور دھنوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جن میں قابل ذکر دھنیں ہمسفر، دل میں کالا، دیوانہ، جوکر، جان پہچان، راہ گزر اور جوش ہیں۔ پاکستان فلم انڈسٹری میں مصروف ترین وقت گزارنے کے بعد انہوں نے پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کی طرف رجوع کیا اور 1964ء سے بچوں اور بڑوں کے لیے کئی خوبصورت پروگرام کیے۔ مصلح الدین اور ناہید نیازی کے بچوں کیلئے موسیقی کے پروگرام "چھما کی موج" اور "ٹلیوں کی مالا" اب بھی یاد کیے جاتے ہیں۔ حکومت پاکستان نے ان کو تمغہ حسن کارکردگی ایوارڈ سے بھی نوازا۔

بنگلہ دیش کے قیام کے بعد کے حالات زندگی :

ناہید نیازی اور مصلح الدین نے 1964ء سے پی ٹی وی پر کام کرنا شروع کیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے پروگرام "انڈیا" "سنگت" میں ایک قسط میں انہوں نے موسیقار خلیل احمد کی موسیقی میں ایک خوبصورت نغمہ گایا تھا۔ جس ادیب اختر احسن عابد کے گیت "جو کہ ایک پیارے ملک کے تاش کے پتے پر مشتمل تھا" میں ناہید ملکہ بن کے کھڑی ہوتی ہے اور گانا گاتے تاش کے پتے سے باہر نکل آتی ہے۔ یہ کام اس دور میں جدت پسندی پہ مبنی تھا بہت پسند کیا گیا۔ پروڈیوسر رفیق احمد وڑائچ تھے۔ پھر سانحہ 1971ء ہو گیا۔ دونوں کیلئے یہ ایک قوت امتحان تھا کہ پاکستان ٹھہریں یا بنگلہ دیش منتقل ہوں۔ میاں بیوی نے ایک تیسرے ملک یو کے کا انتخاب کیا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ اپنے خاوند کے انتقال کے بعد ناہید نیازی منظر عام پر کم نظر آنا شروع ہو گئیں۔ بنگالی زبان سیکھنا شروع کی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اس قوم کو اپنے خاوند کا ورثہ منتقل کر سکیں۔ ناہید نیازی ایک خوبصورت شخصیت کی مالک ہیں۔ نہ صرف دیکھنے میں بلکہ اپنے اخلاق کی بدولت بھی۔

ان کے اکثر انٹرویو سے آپ نے یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ وہ آزادانہ اپنی رائے کا اظہار کرتی ہیں۔ انہوں نے بیرون ممالک کے طور طریقوں سے سمجھوتہ کر لیا ہے کیونکہ ان کے بچے وہاں رہائش پذیر ہیں۔ اگرچہ انہیں پاکستان کی یاد بہت ستاتی ہے۔ انہوں نے اپنے بچوں اور ان کی اولاد سے دل لگا لیا ہے۔ وہ کبھی فوراً ہی میں اپنے بیٹے کے پاس چلی جاتی ہیں۔ اس طرح وہ اپنے بچوں کے پاس انگلستان اور امریکہ میں وقت گزارتی ہیں۔ ان کی بیٹی زرین انگلستان میں رہتی ہیں۔ اس مقالہ کے لکھنے کے وقت "وہ اپنے پوتے کو امریکہ سے انگلستان میں رہنے کیلئے کوشش کر رہی ہیں اور دسمبر 2014ء کے بعد کچھ عرصہ کیلئے امریکہ Vanish (غائب) ہو جانے کا ارادہ رکھتی ہیں۔ راس حافظ صدیقی نے امریکہ سے اپنے مراسلے میں لکھا ہے "ناہید نیازی جنہوں نے اپنے شوہر موسیقار مصلح الدین کے انتقال کے بعد

مقابلتاً محدود زندگی اختیار کی ہوئی ہے۔ جب اپنے بیٹے فیصل جو کہ سان فرانسسکو بے ایریا میں رہائش پذیر ہیں، کے پاس آئیں تو سلیکان ویلی (Sillicon valley) کے پاکستانی امریکنوں نے کسی نیک مقصد کے لیے پیسے اکھٹا کرنے (Fund Raising) کی مہم چلائی گئی تھی۔ انھوں نے یہ قبول کیا کہ ان کے خاوند کا انتقال ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ لیکن اب وہ اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کر رہی ہیں اور پاکستان واپسی کا ارادہ رکھتی ہیں۔ اس طرح ہم مستقبل قریب میں ناہید نیازی کو پاکستان واپسی پر خوش آمدید کہہ سکیں گے!

ناہید نیازی نے پاکستانی فلمی موسیقی کے سنہری دور میں اپنا مثبت کردار ادا کیا ہے۔ ان کی گائیکی کے اثاثے کو محفوظ کرنا ہمارا اولین فرض ہے۔ اگرچہ یہ کوششیں اکا دکا طریقے سے سرانجام دی جا رہی ہیں لیکن پاکستانی سینما اور اس کی موسیقی کو محفوظ کرنے کے لیے ناہید نیازی کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ امید ہے میری یہ کتاب بھی اس نیک مقصد کے حصول میں ایک مثبت اقدام ہے۔

میوزیکولوجسٹ انیس شکور کے الفاظ میں" یہ امر واضح کرنا ضروری ہے کہ 1960ء کی دہائی کی موسیقی میں ناہید نیازی ایک شاندار شخصیت تھیں۔ وہ سفید رنگت بہت دلکش شخصیت، بہت ذہین اور پاکستانی موسیقی کے سنہرے دور میں اعلیٰ کردار ادا کرنے کی مالک تھیں۔ اپنی تعلیم، پر اثر اور جاذب شخصیت کے علاوہ، خوبصورت آواز کی بھی مالک تھیں۔ وہ ہمیشہ مستقبل کی بہتری کی طرف گامزن رہیں۔ انھوں نے اپنے شوہر مصلح الدین کی موسیقی میں 1958ء میں فلم "آدمی" کے لیے ایک مقبول نغمہ "جاگ تقدیر کو جگا دوں گی" پیش کیا۔ اس گانے کی وجہ وہ خواتین گلوکاروں کی صف اول کی آوازوں میں بہت جلد شامل ہو گئیں۔ اور پہلے درجے کی گلوکارہ مانی جانے لگیں۔ لیکن جس گانے نے ان کو امر کر دیا وہ مصلح الدین کی موسیقی ہی میں فلم "زمانہ کیا کہے گا" سے احمد رشدی کے ہمراہ "رات سلونی آئی تھی"۔ پاکستانی سینما ایسی کئی کہانیوں پر مشتمل ہے جس میں بہت سے فنکار اپنے خوابوں کو حقیقت بنانے کے لیے کوشاں رہے۔ ناہید نیازی ان ناموں میں ایک نام ہے جس نے اپنے خواب کو حقیقت دینے کی خاطر بہت جدوجہد کی۔ پہلے دن سے ہی انھوں نے بہت محنت کی۔ ان کو معلوم تھا کہ ان کا یہ سفر آسان نہ تھا۔ جب ان کی فلم "دال میں کالا" کی تھیٹرز میں نمائش کی گئی تو سینما بین صرف ان کا گانا "سمجھ نہ آئے دل کو کہاں لے جاؤں ستم" دیکھنے کیلئے یہ فلم دیکھنے گئے۔ اس فلم کی موسیقی بھی مصلح الدین نے دی تھی۔ ناہید نیازی کی آواز ایسے گیتوں جیسا کہ "دل کو کہاں" کے لیے بھی موضوع ثابت ہوئی۔ دکھ، درد، محبت اور اذیت کی عکاسی ناہید نیازی کی آواز کے ذریعے مؤثر ثابت ہوئی۔ جیسا کہ فلم "دال میں کالا" کے گانوں سے ظاہر ہوا۔

ناہید نیازی کی توجہ کے باعث انھوں نے نہایت قلیل مدت میں کامیابیوں کی سیڑھیاں طے کر لی تھیں۔ بہت ہی معتبر ناموں کے حامل موسیقار ان کی آواز کو اپنی موسیقی کی کامیابی کا ضامن سمجھنے لگے تھے اور ناہید نیازی نے اپنی سریلی اور جذبات سے بھرپور آواز سے لاکھوں شائقین کے دلوں میں گھر کر لیا۔ اسی ضمن میں ناہید نیازی جنھوں نے اب ایک پرانسانہ گائیکی کا درجہ حاصل کر لیا تھا، کا احمد رشدی کا دوگانا، رات ہو گی جواں اکا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ یہ گانا فلم "دل نے تجھے مان لیا" سے تھا۔ اس کے علاوہ ایک خوبصورت دھن "حسن بھی موج میں ہے" (فلم: مجھے جینے دو) کا بھی حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ ناہید نیازی نے بہت ہی قلیل فلمی طرز زندگی میں بہت خوبصورت گانے، شائقین موسیقی کے دلوں کو گرمانے کیلئے چھوڑے ہیں!

◆◆◆

سچی کہانیاں

قدرت کا فیصلہ۔ ایک سچی کہانی

ادارہ "تخلیق"

وہ قدرت سے لڑ رہا تھا۔ بچپن میں کسی نجومی نے اسے بتایا تھا کہ وہ ستر سال کی عمر پائے گا۔ اس نے نجومی کی بات سنی اور بڑے دعوے سے جواب دیا۔ "میں تمہیں ڈیڑھ سو سال تک زندہ رہ کر دکھاؤں گا"۔ نجومی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا، تو جوان بولا: افسوس تم مجھے ڈیڑھ سو سال تک زندہ نہیں دیکھ سکو گے کیونکہ تم پہلے مر چکے ہو گے۔ نجومی مسکرایا اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ہم اگر اس کی زندگی کا تجزیہ کریں تو وہ دو حصوں میں تقسیم نظر آتی ہے۔ ایک قدرت کے فیصلوں کا انکار دوسرا موسیقی۔ وہ دنیائے موسیقی کا شہنشاہ تھا۔ یہ اپنے والد کا ساتواں بچہ تھا۔ یہ سیاہ فام خاندان تھا اور یہ بھی دوسرے سیاہ فام خاندانوں کی طرح برسوں سے جسمانی، ذہنی اور روحانی غلامی سے آزادی کی کوشش کر رہا تھا۔ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں امریکہ کے غلاموں کو تھوڑی تھوڑی آزادی ملنا شروع ہوئی تو انہوں نے سفید فام آقاؤں کے ان پسندیدہ اور محبوب شعبوں کا انتخاب کیا جن سے یہ لوگ امریکی معاشرے میں وقار بھی حاصل کر سکتے تھے چنانچہ یہ لوگ موسیقی اور رہبانیت میں جانے لگے۔ یہ لوگ پادری بن گئے اور راک موسیقی کا میدان سر کرنے لگے۔ اس دور میں اسکے بڑے بھائیوں نے بھی ایک چھوٹا سا بینڈ بنا لیا۔ یہ لوگ چھوٹے بڑے سٹیج پر بھی پرفارم کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک البم بنایا مگر وہ مقبولیت حاصل نہ کر سکا۔ اس کے والد اسے بری طرح تشدد کا نشانہ بناتے تھے جبکہ وہ اس سے ذاتی ملازم جیسا سلوک کرتے۔ اس فضا میں اس کے آئیڈیاز گھٹ گھٹ کر مرنے لگے۔ وہ تخلیق کے جوہر سے شہ رگ تک بھرا ہوا تھا اور یہ حقیقت ہے۔ ایسے لوگ زیادہ دنوں تک دوسروں کے ماتحت نہیں رہ سکتے چنانچہ اس نے بھی ایک دن بھائیوں کی غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار دیا وہ جیکسن فائیو سے الگ ہو گیا۔ اس نے اپنا پہلا البم "آف دی وال" لانچ کر دیا۔ یہ البم 1978ء میں ریلیز ہوا اور اس کی ایک کروڑ کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ اس کی زندگی کی پہلی کامیابی تھی۔ کامیابی اس کے لیے پرانی شراب ثابت ہوئی اور وہ شہرت، غرور اور تکبر کا شکار ہو گیا۔ مائیکل جیکسن کو چار چیزوں سے نفرت تھی۔ اسے اپنے سیاہ رنگ سے نفرت تھی، اسے گمنامی سے نفرت تھی، اسے عام لوگوں کی طرح ستر سال کی عمر میں مر جانے سے نفرت تھی، اور وہ اپنا گلوکار رہنا چاہتا تھا کہ ڈیڑھ سو سال کی عمر میں بھی لاکھوں لوگوں کے سامنے ڈانس کرے۔

مائیکل جیکسن کی آنے والی زندگی ان چار نفرتوں اور ان چار خواہشوں کی تکمیل میں بسر ہوئی۔ اس نے 1982ء میں دوسرا البم بنایا "تھرلر" یہ دنیا میں سب سے زیادہ بکنے والا البم تھا۔ اس کی ایک ماہ میں ساڑھے چھ کروڑ کاپیاں فروخت ہوگئیں۔ مائیکل جیکسن اب دنیا کا مشہور گلوکار تھا۔ جس نے گمنامی کو شکست دے دی۔ اس نے اس خواہش کی تکمیل کے بعد رنگ سیاہ جلد کو شکست دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پلاسٹک سرجری اور سکن بلیچنگ شروع کروا دی۔ وہ پلاسٹک سرجری کے درجنوں مراحل سے گزر گیا۔ اس نے پیسہ پانی کی طرح بہایا۔ 55 چوٹی کے پلاسٹک سرجنز کی خدمات لیں۔ 1987ء میں اس کی شکل و صورت، جلد، نقوش اور حرکات و سکنات بدل گئیں۔ سیاہ فام مائیکل

جیکسن کی جلد گوری اپنا اور نسوانی نقوش کا مالک ایک خوبصورت مائیکل جیکسن تھا۔ یوں اس نے سیاہ رنگت کو بھی شکست دے دی۔ اس کے بعد ماضی کی باری آئی اس نے اپنے خاندان سے قطع تعلق کر لیا۔ اس نے کرائے پر گورے ماں باپ بھی حاصل کر لئے۔ خود کو مشہور کرنے کے لئے ایلوس پریسلے کی بیٹی لیزا میری پریسلے سے شادی بھی کر لی۔ اس نے یورپ میں اپنے بڑے بڑے مجسمے بھی لگوا دیے۔ اس نے مصنوعی طریقہ تولید کے ذریعے ایک نرس ڈیبی رو سے اپنا بیٹا پرنس مائیکل بھی پیدا کر لیا۔ اب اس کی آخری حسرت یا خواہش کی باری تھی وہ ڈیڑھ سو سال تک زندہ رہنا چاہتا تھا۔

اس نے طویل عمر پانے کے لئے دلچسپ حرکتیں شروع کر دی۔ مثال کے طور پر وہ رات کو آکسیجن ٹینٹ میں سوتا تھا۔ وہ جراثیم، وائرس اور بیماریوں کے اثرات سے بچنے کیلئے دستانے پہن کر لوگوں سے ہاتھ ملاتا تھا۔ وہ لوگوں میں جانے سے پہلے منہ پر ماسک چڑھا لیتا تھا۔ وہ مخصوص خوراک کھاتا تھا اور اس نے مستقل طور پر بارہ ڈاکٹر ملازم رکھے تھے۔ یہ ڈاکٹر روزانہ اس کے جسم کے ایک ایک حصے کا معائنہ کرتے تھے۔ اس نے اپنے لئے فالتو پھیپھڑوں، گردوں، آنکھوں، دل اور جگر کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔ ان تمام ڈونرز نے بوقت ضرورت اپنے اعضا عطیہ کر دینا تھے۔ لیکن 25 جون 2009 کی رات اسے سانس لینے میں دشواری پیش آئی۔ اس کے ڈاکٹرز نے ملک بھر کے بہترین ڈاکٹرز کو اس کی رہائش گاہ پر جمع کر لیا۔ یہ ڈاکٹرز اسے موت سے بچانے کی کوشش میں لگ گئے۔ وہ ناکام ہوئے تو اسے ہسپتال لے گئے۔ وہ شخص جس نے ڈیڑھ سو سال کی منصوبہ بندی کر رکھی تھی جو ننگے پاؤں زمین پر نہیں چلتا تھا، جو دستانے پہن کر ہاتھ ملاتا تھا، جو روزانہ جراثیم کش ادویات گھر میں چھڑکواتا تھا۔ جس نے 25 سال تک کوئی ایسی چیز نہ کھائی جسے ڈاکٹروں نے منع کیا ہو وہ شخص 50 سال کی عمر میں صرف تین منٹ میں انتقال کر گیا۔ اس کے انتقال کی خبر گوگل پر دس منٹ میں آٹھ لاکھ لوگوں نے پڑھی۔ یہ گوگل کی تاریخ کا ریکارڈ تھا۔

مائیکل جیکسن کا پوسٹ مارٹم ہوا تو پتہ چلا اس کا جسم ڈھانچہ بن چکا تھا وہ سر سے گنجا تھا، اس کی پسلیاں ٹوٹی ہوئی تھیں، اس کے کولہے، کندھے، پسلیوں اور ٹانگوں پر سوئیوں کے بے تحاشا نشان تھے۔ وہ پلاسٹک سرجری کی وجہ سے ''پین کلر'' کا محتاج ہو چکا تھا۔ یوں اس کی آخری خواہش پوری نہ ہو سکی۔ مائیکل جیکسن کی موت ایک اعلان ہے۔ انسان پوری دنیا کو فتح کر سکتا ہے لیکن موت کو شکست نہیں دے سکتا چنانچہ کوئی سلطان ہو یا فرعون وہ دو دن مٹی کے بوجھ سے نہیں بچ سکتا۔ لیکن حیرت ہے ہم مائیکل جیکسن کے انجام کے بعد بھی خود کو لافانی انسان سمجھتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے ہم موت کو دھوکہ دے دیں گے۔ ہم ڈیڑھ سو سال مزید زندہ رہیں گے۔

گناہ یا عبادت

ہر کلچر میں کچھ لوک داستانیں ایسی ہوتی ہیں جو رسوم و رواج سے ہٹ کر انسان کو سوچنے کے نئے انداز اور زاویے دے جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک کہانی قدیم چین کی ہے۔

بادشاہ نے ایک بوڑھے شخص کو ''بھوک تا مرگ'' کی سزا دی اور اسے جیل میں ڈال دیا جب تک وہ بھوک سے مر نہ جائے۔ بوڑھے کی ایک بیٹی تھی جس نے باپ سے روزانہ ملاقات کی درخواست دی جو بادشاہ نے قبول کر لی۔ گیٹ پر بیٹی کی سختی سے تلاشی لی جاتی کہ کہیں وہ اپنے باپ کے لیے خورد و نوش کا سامان نہ لے جا سکے۔ گزرتے دن کے ساتھ بوڑھا کمزور ہونے لگا۔ خستہ حال باپ کو موت کے

قریب جاتے دیکھ کر بیٹی ایک بے بس سوال بن کر رہ گئی۔ کیا میں اپنے باپ کو چند مزید سانسیں بھی نہیں دے سکتی؟

روزانہ کی طرح بیٹی نے شیر خوار بیٹی کو گھر پر چھوڑا اور تلاشی کے مراحل سے گزر کر تاریک کوٹھڑی میں پہنچی۔ ہاتھ پاؤں زنجیروں میں قید اس کا بھوکا پیاسا باپ فرش پر نیم بے ہوش پڑا تھا۔ ڈوبتے دل کے ساتھ بیٹی نے کچھ دیر چار سمت اور گناہ کو نظر انداز کر دیا۔ پھر کسی انجان جذبے کی گرفت میں کانپتے ہاتھوں سے اپنے قریب المرگ باپ کا منہ اپنی چھاتی سے لگا دیا۔ کبھی باپ کو سنبھالتی تو کبھی دربانوں کے خوف سے دروازے کی آہٹ بن جاتی۔ ٹوٹتی سانسوں کا سہارا ایک کمزور بیٹی کی یہ آخری کوشش تھی۔

دربانوں کو تشویش ہوئی کہ اس قیدی کو بہت عرصہ پہلے مر جانا چاہیے تھا مگر وہ ابھی تک زندہ ہے۔ بیٹی پر خفیہ نگرانی سخت کر دی گئی اور پھر ایک دن دربان والوں نے بیٹی کو دودھ پلاتے ہوئے گرفتار کر لیا۔ شہر بیٹی کے کردار پر مباحث سے گونج اٹھا۔ علماء کتابوں سے گناہ کبیرہ اور عبرت ناک سزا کے حوالے ڈھونڈ لائے۔ نیکی بدی کے دیوتاؤں میں جنگ ہوئی۔ تب پہاڑوں سے اتر کر انسانیت کی دیوی نے بیٹی کے ماتھے پر مقدس بوسے دیے اور بوڑھے قیدی کو آزاد کر دیا۔ صدیوں بعد تھین کے آرٹسٹ ایتیان مریلے نے اس لوک کہانی "گناہ یا عبادت" کو تصویر کیا جو دنیا کے بڑے بڑے عجائب گھروں میں آج بھی آویزاں ہے۔

•••

تنقید نگار، ادیب اور شاعر منور عثمانی کی نئی شاہکار تخلیق

مطالعہ اسلوب کے تقاضے

شائع ہو گئی ہے ——— قیمت-/300 روپے

ملنے کا پتا: بک ہوم، 46/2، مزنگ روڈ، لاہور (فون: 042-37355325)

معروف شاعر، ادیب رشید آفرین کا مجموعہ نعتیہ کلام

حصار جنوں

شائع ہو گیا ہے ——— قیمت-/500 روپے

ملنے کا پتا: ملک پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور (موبائل: 0300-6147077)

معروف افسانہ نگار و ادیب نجم الحسن رضوی کی افسانوں کی کتاب

بوری میں بند آدمی

شائع ہو گئی ہے ——— قیمت-/400 روپے

ملنے کا پتا: کتب مارکیٹ، آفس نمبر 17، سٹریٹ نمبر 3، اردو بازار، کراچی (فون: 021-32751428)

طنز و مزاح

موصوف اور موصوفہ

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

ہم جب بھی اخبار میں کسی نوبیاہتا جوڑے کی تصویر دیکھتے ہیں اور موصوف کو سراپا ناز اور موصوفہ کو سراپا نیاز پاتے ہیں تو ہمیں اپنا استحقاق مجروح ہوتا نظر آتا ہے۔ اب سے نصف صدی قبل تک جب ہمارا عقد ''لاثانی'' ہوا تھا شادی بیاہ کو ایک خالصتاً نجی مسئلہ تصور کیا جاتا تھا اور اخبارات میں اس کی تشہیر کا رواج نہ تھا۔ مگر جمہوری تقاضوں کے پیش نظر اب دولہا دلہن بھی پبلک پراپرٹی بن گئے ہیں۔ ہم جن کی تصویریں دیکھ کر احساس محرومی کا شکار ہو جاتے ہیں بلکہ کبھی کبھی سنجیدگی سے سوچتے ہیں، کیوں نہ ''لاثانی'' کو ''ثانی'' کر دیا جائے لیکن پھر خیال آتا ہے کہ موجودہ حدود اربعہ کے ساتھ ہماری تصویر محکمہ آثار قدیمہ کے ریکارڈ کی زینت تو بن سکتی ہے، اخبارات میں شاید بطور اشتہار بھی شائع نہ ہو۔ گلیمر کے اس دور میں کون مخبری جیسی شخصیت چھاپنے کا خطرہ مول لے گا۔ اس ابتدائی احساس کے بعد ہمارے دل میں تصویر والے مرد کے حق میں ہمدردی کے گہرے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ بے چارہ دنیا سے غافل اور بے پروا کیسے جاہ و جلال کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ کسی نے اس مسکین کو دولہا دلہن کو متنبہ نہیں کیا کہ صرف دو الفاظ ''قبول ہے'' کہہ کر وہ خود اپنے گلے کا شکار ہو چکا ہے۔ اگلے روز ہم نے کسی اخبار میں ایک بے ہنگم اور فضول سے دولہا کو اپنی نازک اندام، پری چہرہ اور بظاہر شکست خوردہ دلہن کے پہلو میں فاتحانہ انداز میں بیٹھے دیکھا تو بے ساختہ زبان پر یہ شعر آ گیا۔

پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت
زاغ کی چونچ میں انگور خدا کی قدرت

کلیجے میں ایک ہوک سی اٹھی اور ہم نے بیگم سے کہا کہ ہماری شادی کا البم تو تھا اور اب ہم بھی عمر رفتہ کو آواز دیں۔ بیگم نے حسب معمول ہماری بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا لیکن جب ہم کو اس معاملے میں بہ عزم پایا تو یہ کہہ کر ہماری آرزوؤں کو خوت اور خود ہمیں بھوت کر دیا کہ تصویر پرانی ہو جانے اور کٹ پھٹ جانے کی وجہ سے پھینک دی گئی ہے۔ گویا ہماری فتح مندی کی آخری یادگار بھی ختم ہو چکی تھی۔ دراصل خواتین یہ برداشت نہیں کر سکتیں کہ مردوں کی برتری کی کوئی بھی نشانی گھر میں باقی رہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ مردوں نے اپنی شادی کی تصاویر اخباروں میں چھپوانی شروع کر دی ہیں تا کہ یہ عظیم یادگاریں بیگمات کی دسترس سے نکل کر تاریخ صحافت کا حصہ بن جائیں۔ شادی کی تصویروں کا خبط اب اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ فوٹو گرافر اور قاضی صاحب کی اہمیت ایک برابر ہو گئی ہے (واضح رہے کہ ہمارا اشارہ قاضی واجد کی طرف ہرگز نہیں ہے)۔ جب یہ تصویریں بن کر آ جاتی ہیں تو خاندان بھر کو ان کی زیارت کرائی جاتی ہے اور پھر اخبارات میں بھیجا جاتا ہے۔ اخبار ان تصویروں کو بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کرتے ہیں بلکہ بعض جریدے تو رنگین تصاویر چھاپنے لگے ہیں۔

ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ یہ تصویریں کیوں چھپتی ہیں۔ رونا تو اس بات کا ہے کہ ایک بار تصویر شائع کرنے کے بعد اخبار والے پلٹ کر اس مظلوم بے زبان کی کوئی خبر نہیں لیتے جسے عرف عام میں شوہر کہا جاتا ہے۔ تجربے کے طور پر ہی، ہماری تجویز ہے کہ کوئی صاحب دل صحافی کسی جوڑے سے اس کی شادی کے دو سال بعد ملاقات کرے اور اس وقت کی ایک تصویر بنائے۔ یہ تصویر ظاہر کرے گی کہ ازدواجی گاڑی ریورس گیئر میں چلنے لگی ہے۔ جو گردن پہلی تصویر میں اکڑی ہوئی تھی اب اپنی اصلی حالت پر آ چکی ہے۔ اس کے برعکس پہلی تصویر کی

جھکی ہوئی گردن اور شرمیلی نگاہیں اب قدرے بے باک ہو گئی ہیں۔ پہلی تصویر میں جو مونچھیں تلوار کی مانند تنی ہوئی تھیں اب اعتدال پر آ چکی ہیں۔ جاننے والے اس بات سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زیر تکمیل فلم کا انجام کیا ہوگا۔ اگلا دور پانچ سال بعد ہونا چاہیے۔ اب جو تصویر بنے گی اس میں موصوف کے نقش و نگار اور تیوروں میں تنزلی کا رجحان صاف نظر آئے گا۔ مونچھیں مائل بہ زوال ہوں گی، گردن میں خم ہوگا اور آنکھوں میں ویرانی۔ تصویر دیکھ کر بے ساختہ پیٹ لیں گے۔ ایک آہ سرد کھینچ کر کہیں گے۔

''عشق نے غالب نکما کر دیا — ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

موصوفہ اس کے برعکس پورے فارم میں نظر آئیں گی اور داغ کے اس شعر کی بھرپور عکاسی کریں گی کہ۔

''بھنویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں — کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں''

اس تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کے لیے دس سال بعد ایک دور اور کر لیجیے۔ پھر دونوں کو ساتھ بٹھا کر (اگر وہ ایک ساتھ بیٹھنے پر رضامند ہو جائیں تو) ایک تصویر اور بنا لیجیے۔ اس کا موازنہ شادی کی پہلی تصویر سے کریں۔ فرق صاف ظاہر ہوگا۔ موصوف ایک زیر تفتیش ملزم کی مانند نظر آئیں گے جب کہ موصوفہ کسی جے آئی ٹی کی سربراہ کے روپ میں جلوہ فرما ہوں گی۔ تصویر موصوف کو دکھائیں تو خود پکار اٹھیں۔

''مصور اپنی صورت مجھ سے پہچانی نہیں جاتی — میں ایسا ہو گیا ہوں یا مری تصویر بگڑی ہے''

یہ صورت حال مستقل بھی ہے اور آفاقی بھی۔ ماضی کے ایک امریکی صدر ہربرٹ ہوور نے کہا تھا کہ ہمارے ملک میں در اصل ایک ہی پولیس فورس ہے یعنی امریکی عورتیں۔ اس حقیقت کا اظہار عبدالحمید عدم نے اپنے مندرجہ ذیل قطعہ میں کیا تھا۔

''طاقتیں دو ہی ہیں زمانے میں — جن سے سارا نظام جاری ہے
ایک خدا کا وجود برحق ہے — ایک عورت کی ذات ''بھاری'' ہے

ماضی قریب میں سندھ کے سیکرٹری اطلاعات علی احمد بروہی ایک زندہ دل اور صاحب ذوق شخصیت تھے۔ مرحوم ایک مرتبہ کراچی پریس کلب کی کسی تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ اپنے دلچسپ خطاب میں انھوں نے ضمناً پاکستانی فلموں کا ذکر چھیڑ دیا اور کہا کہ ہمارا ہیرو ہر طرح ان پر قابو پا کر آخر کار ہیروئن کو حاصل کر کے اس سے شادی کر لیتا ہے۔ ایسی فلم کو طربیہ کہا جاتا ہے حالانکہ اصل المیہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اس پر ہمیں ایک لطیفہ یاد آ گیا تھا اگرچہ پرانا ہے لیکن موضوع کی مناسبت سے دہرانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ شادی کی ایک محفل میں نکاح کے بعد دولہا اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا اور ہنس ہنس کر سب سے مبارک باد وصول کر رہا تھا۔ ادھر زنان خانے میں دلہن کی رخصتی کا وقت تھا اور گھر والے زار و قطار رو رہے تھے۔ دلہن کا چھوٹا بھائی ان دو متضاد کیفیتوں کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اس نے بڑی معصومیت کے ساتھ اپنے والد سے پوچھا ''ابو! آپ رو رہے ہیں، امی رو رہی ہیں، باجی رو رہی ہیں، ان کی سہیلیاں رو رہی ہیں۔ سب رو رہے ہیں لیکن باہر دولہا ہنس رہا ہے، وہ کیوں نہیں رو رہا ابو؟'' ''آج اسے ہنس لینے دو بیٹا!'' والد نے رومال میں آنسو جذب کرتے ہوئے کہا ''ہم سب تو رو دھو کر تھوڑی دیر میں چپ ہو جائیں گے، اس غریب کو عمر بھر رونا ہے۔''

یہ عمر بھر کا رونا بے چارے شوہر کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ کہا جاتا ہے کہ صحافت تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش کرتی ہے۔ صحافت کے استاد کی حیثیت سے ہم نے خود بھی اپنے طلبہ کو ہمیشہ یہی تعلیم دی۔ بس یہ ضروری ہے کہ اخبارات میں ایک نیا کالم شروع کیا جائے اور اس میں ایسے جوڑوں کی تصاویر شائع ہوں جن کی شادی کو پندرہ سال سے زیادہ کا عرصہ ہوا ہے۔ صحافی حضرات کی آسانی کے لیے کالم کا عنوان ہم تجویز کر دیتے ہیں: دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت ''نکاح'' ہو۔

◆◆◆

پتی

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

کئی نام ایسے ہیں جو لڑکوں کے بھی رکھ لیے جاتے ہیں اور لڑکیوں کے بھی۔ ایسے میں جب تک وہ سامنے نہ آئیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ لڑکا ہے یا لڑکی جیسے رفعت، مسرت، راحت، فرحت، گل، توقیر، شمیم، نسیم، تسلیم، تاج، طلعت۔

اسی طرح سے لفظ پتی مذکر کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور مونث کے لیے بھی مگر جنس کیساتھ ساتھ معانی بھی تبدیل ہو جاتے ہیں جیسے ہندی میں پتی شوہر کو کہتے ہیں جو ویسے تو مذکر ہوتا ہے مگر مونث کے حکم پہ کام کرتا رہتا ہے تاکہ گھر میں امن و امان کی صورت حال بحال رہے۔ دوسری چائے کی پتی بھی ہوتی ہے وہ یقیناً مونث سمجھی جاتی ہے اس پتی کی وجہ سے ہی چائے چائے کہلاتی ہے۔ تاہم اگر یہ پتی پیکٹ کی صورت میں ہو تو اسے چائے کے کپ میں ڈبوئے بغیر چائے کا مزہ نہیں آتا۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے کہ یہ پتی چائے میں ایسے ہوتی ہے جیسے پتی (شوہر) کو جب تک بیوی اپنی مرضی کے حالات میں ڈبوتی نہ رہے تو گھر کی محفل کا رنگ ہی نہیں جمتا۔ شروع شروع میں جب چائے کی پتیوں کو کپ میں ڈبونے کا رواج ہوا تو کئی لوگ اس کی ہیئت کی وجہ سے اسے تعویذ بھی کہتے تھے بلکہ کئی سمجھتے بھی تھے کہ اس پیکٹ میں چائے کی پتی کے ساتھ واقعی کوئی تعویذ بھی چھپا ہوگا۔

پتی تو پھولوں کی بھی ہوتی ہے اور خوش قسمت لوگوں کی گھریلو تقریب میں آمد پر ان پر پھولوں کی پتیاں بھی نچھاور کی جاتی ہیں۔ جب دولہا بارات کے ساتھ آتا ہے تو اس پہ بھی پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جاتی ہیں مگر کئی شرارتی لڑکے اور لڑکیاں پتیاں ہاتھ میں اکٹھی کر کے پھینکتے نہیں مارتے ہیں شاید اس لیے کہ وہ اس شادی سے راضی نہیں ہوتے۔ یا شاید اس لیے کہ ان کی اپنی شادی ابھی تو ہو نہیں رہی ہوتی اور شاید اس لیے کہ وہ اصلی شرارتی ہوتے ہیں۔ پتیاں تو نچھاور ہوتے ہوتے بھی تو کئی مواقع پر خوش ہوتی ہیں اور بعض وقت غمگین بھی۔ غمگین اس لیے کہ اگر کسی ناہنجار، نااہل اور وہ غیر شخص کا استقبال ان کی جان سے کر دیا جا رہا ہو تو ایسے میں تو پاؤں کے نیچے کچلے جانے پر سخت اذیت کا شکار ہوتی ہوں گی۔ ہمارے ایک دوست کو ایک شعر باوجود ہمارے سمجھانے کے سمجھ نہیں آ رہی تھی اور یہی سمجھ کر بھی پھر سے کہا تھے کہ آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ "پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر"؟ وہ کہتے کہ پھول کی پتی تو نازک ہوتی ہے اس سے ہیرے جیسی سخت چیز کو کیسے کاٹا جا سکتا ہے۔ ہم نے کہا کہ شعر کے دوسرے مصرعے پر غور کرو کہ "مرد ناداں پہ کلام نرم و نازک بے اثر"

دوسرا مصرعہ سنتے ہی بولنے لگے کہ بھائی شاگرد ناداں پہ کلام نرم و نازک اثر کرے یا نہ کرے اب آپ اسے مار نہیں سکتے۔ یعنی شاگردوں کو "مار نہیں پیار" کا زمانہ ہے۔ ہم نے کہا کہ ہم بھی تو یہی کہہ رہے تھے کہ پیار کی بات کریں۔ کہنے لگے "لیکن پیار کی شاگرد تو بڑے ڈھیٹ ہوتے ہیں۔ وہ ڈنڈے کے بغیر سیدھے ہی نہیں ہوتے۔" ہم نے کہا کہ پھر بھی مار نہیں پیار! تاہم ہمارے کنفیوز دوست

پھول کی پتی سے ہیرے کا جگر کاٹنے کو بھی نہیں سکتے وہ کہتے "یار میں تو سازی کرتا ہوں مجھ پہ بھلا پھول کی پتی کا کیا اثر ہوگا..." ہم نے کہا "وقت یہ ثابت کرے گا۔" وہ ہماری یہ بات بالکل سمجھ نہ پائے لیکن ایک روز ہمیں ملنے آئے تو بالکل ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ تقریباً رونے والے ہو گئے تھے۔ ہم نے پوچھا "کیا ہوا ہے؟" کہنے لگے "یار وہ پھول سی لڑکی تھی اس نے ہم جیسے ہیرے کو کاٹ کے رکھ دیا — یار اب تو مجھ میں بالکل طاقت ہی نہیں رہی — اور اس پھول کی پتی کے بغیر یہ ہیرا اس کنکر کو ملتی ہے"

مگر پتی اور قسم کے بھی ہوتے ہیں۔ پہلے تو لاکھ پتی کی بڑی قیمت ہوا کرتی تھی، پھر ایک زمانہ آیا کہ کروڑ پتی بڑی کو دے پھرا کرتے تھے اور اب تو کروڑ پتی بھی ارب پتی کے آگے شرمندہ شرمندہ سے پھرتے ہیں جب کہ ارب پتی کھرب پتی بننے کے چکروں میں دن رات اداس پھرتے ہیں۔ دل والے پر تو اداسی شام کو چھانی شروع ہو جاتی ہے مگر پیسے کے پیچھے بھاگنے والوں کو دن رات یہ اداسی کھائے رکھتی ہے۔ وہ حیران ہوتے ہیں کہ جن کے گھر میں روٹی بھی مشکل سے پکتی ہے وہ سرہانے یا اینٹ پہ سر رکھیں تو چشم زدن میں نیند کے کیسے مزے لے لیتے ہیں۔ ہم نے جب پریکٹس شروع کی تو پتی کا ایک نیا مطلب سامنے آیا۔ بھانت بھانت کے لوگ ہمارے پاس آتے اور کہتے کہ ہم مریضوں کو گھیر گھار کے لایا کریں گے آپ ہمیں ہماری "پتی" دے دیا کریں۔ ہم حیرت سے ان کے چہرہ مبارک کو دیکھتے تو وہ حیرت سے ہمیں گھورتے کہ ہم کس جہان کی مخلوق ہیں! وضاحتاً کہتے "سر آج کل تو یہ پتی عام ہے اس کے بغیر کوئی کام نہیں چلتا۔ کوئی ٹھیکہ نہیں ملتا، کوئی فائل حرکت میں نہیں آتی۔ ہر کوئی اپنی پتی لیتا ہے۔ آپ جانے کس دنیا کی بات کرتے ہیں کہ 'میں اس پتی سسٹم پر یقین نہیں رکھتا'..." ہم سوچنے لگے کہ اگر یہ صاحب کوئی مریض گھیر گھار کے لائیں گے تو وہ ہماری بطور سرجن کیا خاک عزت کرے گا۔ پھر اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں اپنی سرجری پر اعتماد ہی نہیں ہے۔ وہ آگے سے دلیل دیتے کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے یہ تو ہمارے سروں چارٹر ہوتے ہیں اور یہاں ایسے ہی مارکیٹ میں چلتا ہے۔ ہم تو لفظ "مارکیٹ" سن کر ہی عجیب سا محسوس کرنے لگے کہ خدایا آخر یہ ہو کیا رہا ہے؟ آخر خدا کو بھی تو جان دینی ہے۔ جب ہم نہ مانے تو وہ ہمیں سمجھانے لگے "دیکھیں سر آپ خود سوچیں جس نے اپنی پتی لینی ہے وہ مریض کا گھر سے ہی ذہن بنا کے لائے گا کہ اس سے اچھا شہر میں بلکہ دنیا میں کوئی سرجن پیدا ہی نہیں ہوا جس کے پاس میں تمہیں لے کے جا رہا ہوں۔ سو وہ گھر سے لے کر ہسپتال پہنچنے تک آپ کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے گا۔ یوں مریض کا آپ پہ اعتماد بڑھے گا آپ سرجری کر کے پیسے لیتا۔ ہم اپنی محنت لے کر گھر واپس چلے جائیں گے۔"

ہم ان کی اس "اپنی محنت" کے بارے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو جاتے۔ نہ ہمارا دل مانتا نہ ضمیر۔ ہم نے اپنے آپ سے کہا کہ جو ہم پہ اعتماد کر کے آئے گا وہی ہمارا اصلی مریض اور اثاثہ ہوگا۔ ہم محنت کریں گے اللہ شفا دے گا اور پھر وہی مریض ہماری بغیر پتی کے مشہوری کرے گا کیونکہ اسے ہم اپنی طرف سے اچھے سے اچھا علاج مہیا کریں گے۔ جو ہم پر اعتماد کر کے ہم سے آپریشن کروانے آئے گا وہ تھوڑی بہت اونچ نیچ برداشت بھی کرے گا ورنہ جس کو گھیر گھار کے لایا جائے گا اس کا اور بھی مشکل سے تحفیف ہوگا۔ سو ہم نے پتی سسٹم نا قبول کرنے کا اپنے آپ سے عہد کیا مریضوں کے دلوں میں چلنے والی محبت ہی محبت پھر گھر دھا کیا اور اللہ تعالیٰ سے برکت ڈالنے کی استدعا کی اور پھر اللہ نے ہمیں ہمیشہ سرخرو ہی رکھا اور لوگوں کے دلوں میں محبت ڈالی۔

◆◆◆

انشائیہ

انٹرول کے بعد کی زندگی

صوفیہ بیدار

یہ جنم کوئی اور تھا اور وہ جنم کوئی اور'' کنڈلی کھلنے اور بجتے رہتے جیسا وقت'' اور اطراف دو جہاں۔ سبحان اللہ! اسی امت سے تھی جس کے لیے ہدایت وسیلہ بنانے والوں کی جگہ ''محبوب'' کو بھیجا گیا۔ اللہ اللہ! کہاں میں کہاں یہ مقام! شکر گزاری سے گلا رندھ گیا۔ اور کیا ہم اس قابل تھے کہ'' وہ تمہارے لیے اپنا ''محبوب'' بھیج! ہم تو انسان ہو کے اپنی ''محبوبہ'' کو سات ہزار پردوں میں چھپاتے ہیں اور اس نے سات پردے چاک کر دیے۔

میں ''حتمی'' زندگی کے دو حصوں کے درمیانی ''وقت'' پہ کھڑی سوچ رہی تھی، اللہ کا رحم بھی تو اپنی رضا سے جہاں میں تھیں آ گیا علت ہے کہ وہ پنجاب کی مٹی منڈیروں پہ کھڑا ایسا ہی سا نغمہ گیت الاپ رہا ہے ''لیاں نی وال جدوں بھڑے آیاں تو'' چاندنی راتوں میں پنجاب کے کھلیانوں کو تقسیم کی لکیر کھینچتے ہوئے مذہب اداسے اور نظریے۔ مسکراتی ہوئی یکساں سنہری چاندنی۔ کیا چاندنی اب اور سونے کی بالیاں جیسے لہلہاتے خوشحال کھیت پکتے پھل رس ٹپکاتے شہد پہ بڑھتے ہوئے ہاتھ کے لیے نوالہ بنتے اناج چمکتی خوشیوں کی موتیوں بھری جیب اور کپاس کی لڑی۔ سے کہیں تفاوت کیا؟؟ استغفار!

میں چاندنی کے پراسرار پردے میں اپنے دونوں اطراف کی زندگی دیکھ رہی تھی۔

وہ جو پالنے میں پڑی گڑیا کی مانند اور سنبھالتے ہوئے لکھاری ماں کے ہاتھ، ننھے ننھے قدم، چھوٹی چھوٹی غلطیاں، معاف ہوتی خطائیں، ہر وقت جیسے میں ریشم کے کمبل میں لپٹی ہوئی یہاں وہاں متحرک۔ مجھے نہیں یاد مجھے کبھی اپنی صفائی پیش کرنے کی نوبت آئی ہو دو لب میری وکالت میں رطب اللسان تھے میری خطاؤں پہ پردہ ڈالتی نگاہیں میرے حق میں دلیلیں، میری نادانیوں کے تیار شدہ جواز! دراصل میری بیٹی کو غصہ آ گیا ہوگا ... وہ کچھ اور کہنا چاہتی ہوگی ... اس کا یہ مطلب نہیں تھا، سبحان اللہ! یہ اسی عظیم ''محبوبہ'' کی تصویر تھی اور آنے والی قلقتوں کے لیے سد راہ ... ایندھن عمر بھر کا ... مقابلہ مخالفت کا اور ''شیل'' نفرت بھری زہریلی ہائیڈروجن سے بچانے والا ... جب ایک پرندہ اپنی مخلوق کے طاقت پکڑنے تک اسے ایک ''شیل'' میں پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور پروں میں طاقت پرواز اور پنجوں میں ''شیل'' توڑنے کی طاقت دیتا ہے تو نئی دنیا کے مقابل کرتا ہے ... انٹرول سے پہلے کی محبتیں انسان میں انٹرول کے بعد کی نفرت مخالفت اور دشمنیوں کا مقابلہ کرنے کا ایندھن بھرتی ہیں۔

''وقت'' کے ادھر کا سفر چلنے سے متعلق آگہی کا سفر ہے عموماً ''دنیا'' دوسرا جنم ''جسمانی طور پر'' Survive کرنے کو کہتی ہے مگر Survival کا دوسرا جنم اس روحانی، متصوف اور حیات کے جاگ اٹھنے سے شروع ہو کر جسم کے فنا جانے سے متعلق ہے ''جسم''

جس کا ایک منٹ میں ضائع ہو جاتا اور بچ جاتا ہی لوگوں کا مطمحِ نظر اور وہ جہانوں کا جنم ہے جسے وہ منقسم کرتے ہیں وہ اداروں میں!

میرا دوسرا جنم ۱۹۹۸ء میں ہوا جب میں یکلخت اڑی ہوئی چھت اور بھربھری دیواروں، بستر پر پڑے والدہ کے سیاہ دوپٹہ، قیمتی اشیاء سے خالی کمرہ میں آئی۔ مگر وہ جو خوشبو تھی اسے کمرے سے نہ کوئی اٹھا پایا تھا نہ کوئی چرا پایا تھا۔

میز جہاں سے لے کر ماں باپ کے کمرے تک کی مخصوص مہک زندہ تھی، صندوقوں سے رہ پہ (ضرورت سے بچے ہوئے) قیمتی گھڑیاں، سانس تک لینے کے آلے اٹھا لینے کے باوجود چور ــــ خوشبو ــــ نہ چرا پائے تھے ایک خاص سیاہ صندوق سے اٹھتی کپڑوں میں لپٹی مہک نہ چرا پائے ــــ مجھے قدرت پر ایک بار پھر پیار آیا ــــ اسی "چاندنی" والی عادت ــــ

ایک اثاثہ جاں ایسا ہے جو صرف میرا ہے۔ یہ بہت عجیب احساس ہے کہ میرا باپ میرے علاوہ دیگر دو بچوں کا والد بھی ہوتا بس وہ میرے لیے صرف میرا ہے میری ماں کسی کی بیٹی کسی کی بیوی یا کئی بچوں کی ماں ہو، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں میری دانست میں وہ صرف "میری ماں" ہے۔ یہ بات شاید ہر بچے کو ہوتی ہے ــــ مگر مجھے جو انمول قدرت "تحفہ" ہوئی اس سے اکا اصل "جہیز" انہوں نے مجھے اسی دیا ــــ یہ محبت کا بے پایاں ثبوت ہے ــــ عمر گزرنی نہ اسے "گھن" لگا نہ اس کی پالش خراب ہوئی بلکہ ماہ بہ ماہ یہ چمکدار ہوتا چلا گیا

میں نے بھی اس کی بہت حفاظت کی فطرت، تجہیز سے ... دیتی ہوا میں رشتوں کے زہر رنج ہوتی نظر تھی ــــ میری زندگی کے "گھے" کو ایا اب بھر گئیں گھر میں سے "نیلوں نیل" پڑے ہوئے کو داخل ... "کریانوں" کا مقابلہ جسم تک محدود رہا ــــ مگر جو "داغ" میری ماں نے دیا اس کی حفاظت مٹی کے باوجود کو رچ در رچ کر کے کی ــــ مجھے پتہ تھا میں "چن" لی گئی تھی ــــ میرا "انتخاب" ہو گیا تھا ــــ رونقوں بھرے بستر ... میں ... اور سرخ زردیوں ... میں ... بے مصرف گہری اداسی کے بادل دھک سے اڑا لے گئے ــــ

اجڑی ہوئی مانگ، کھنڈر ہوتے گھر اور "اک شیشہ" گھڑی میں دیکھتے "منڈپ" پر واپس لوٹتی باراتیں ــــ اصلوانوں کی "تکلیں" سے اونچی لاٹھی "دیکھیں" ... ہوئے اطراف زردے، دم پخت بریانیاں کر ... میں جلتے چاول منہ میں ریت بھرنے لگے ــــ

خیال کا "منڈپ" اسی وقت وقت میں سجنا شروع ہو گیا ــــ تو والدہ محترمہ بھی اسی کرب سے گزر رہی تھیں ــــ جب آئی خود پہ تو پھر ازدواج کی بات کھلی معاملہ ایں جا رسید

میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی ــــ تم ہو بیداد سے خوش اس سے سوا اور سہی

مجھے جو زندگی سے الفت کرتا تھا اس کے لیے گمان کیا کہ از خود یکجا نہیں کرنا۔ زندگی جیسے جیسے جو سبق پڑھائے گی پڑھیں گے جو سلوک کرے گی کریں گے ــــ اعتراض سے پہلے "اللہ" ہونے کا یہ حال تھا کہ میں سوچتی تنگ کرنے والوں سے بحث و مباحثہ کرنے کی کیا ضرورت ہے بس کی گلی میں "نسب" لگوا دیجیے میں ددھیال اور ننھیال کے ناموں سے پکارے جانے والے بچوں کے تجزیاتی سانچے بھی الگ ہوتے ہیں۔

ہم تھانیداروں کی "دھیتیاں" کہلاتے تھے دادا جان پولیس آفیسر ان کے بھائی خان بہادر کے لقب کے ساتھ ایس پی تھے۔ ماموں پولیس میں اکثر چوروں کو مار پیٹ پڑتی جرمے سکون سے دیکھتی ــــ یہ سارا "ہلہ" سے سلوک اور واردات کے بیرونی خول کا وقت تھا۔

کے فرصت تھی کہ اندر جھانک مارے۔ دراصل جب انسان محبت لکھ رہا ہوتا ہے جب محبت اس کی زندگی سے عملاً ''کوچ'' کر چکی ہوتی ہے ایک وقت میں یا وہ محبت کر سکتا ہے یا لکھ سکتا ہے کیونکہ محبت خیال میں داخل کر دیا ہیں کہیں خوبصورت ہو جاتی ہے ___ جیسے منیر نیازی نے کہا

محبت اب نہیں ہو گی — یہ کچھ دن بعد میں ہو گی
گزر جائیں گے جب یہ دن — یہ ان کی یاد میں ہو گی

یہ کہیں لے تھا کہ مجھے لکھنا ہے ماں کتنی رہتی اور میں رنگ برنگ دھاگوں کو کپڑے پر منتقش کرتی رہتی، کوئی پھول کی پتی خوبصورتی سے کاڑھتی تو والدہ تحسین لفظوں سے نواز جاتی کرو۔ میں کتنی لفظ اظہار کا سب سے کمزور وسیلہ ہیں مجھے رنگ اچھے لگتے ہیں وہ کہہ تو نہیں پاتے مگر اظہار کر پاتے ہیں مگر والدہ جو کہتیں ہیں وہ ہمیشہ درست ہوتا ہے۔ پھر لکھا

عمر ہے ان کو سدا لکھنے کا — یہ مقدر ہے مرے ہاتھوں کا

قلم تھاما گویا قیامت کے گریبان میں ہاتھ ڈال دیا ___ میں یہاں لکھنے پر آمادہ تھی 1991ء میں والدین سے ایک ہی ماہ میں جدائی نے دعاؤں والے سارے مقام مجھ سے چھین لیے تو یا تو یا بچے جھولی ہوتی تھی وہی تتلی نازک انگلیاں ان میں تھما قلم روایتی گھریلو عورتوں کی طرح یا ذری والدہ کے مختلف ہونے پر تقلید؟ وہ گھر بار سے دنیا چلاتی تھیں ان سے بچھڑ جانا نہ تھا؟ آنکھیں حیرت، حیران اور تخلیقی بوجھ سے ادھ کھلی تھیں مگر درمیانی کلاس کی تمام ''محبتیں'' روبرو تھیں ___ کی شعر شاعرانہیں دیکھتے ہوئے بعد از ان مجھ سے تحریر ہوئے

ہجوم غم تیری ترتیب کس طرح باندھوں — کوئی بھی کاج میرے ہاتھ سے سلوٹا نہیں!

کھلا مجھ پر یہ کہ رقص و موسیقی اور پیروں میں گھنگھروں باندھ کر رقص کی جھنکار میں ناچنا بھی اس قدر برا کام نہیں جس قدر لکھنا کسی کو گراں گزر سکتا ہے ___ ہزار بہانے لاکھوں دلیلیں اعتراض علیٰ، پاگل پن، معاشرے کا بگاڑ یہ سب عورت کے ''اظہار'' میں مضمر ہے ___ وہ تمام عورتیں نادل ہیں جو نہیں لکھتیں۔ ایک مخصوص طبقے کو میں نے دیکھا جو لکھنے والی عورتوں کے پیچھے لٹھ لے کر پڑا ہوا ہے۔

کالم نگاری راس آئی تو بہت سا تخلیقی رس اس صنف سخن کی نذر ہو گیا مگر یہ آزادترین صنف موجود دور کا سب سے بڑا تقاضا تھی اس میں پذیرائی ملی اور پیسہ بھی مگر جو سب سے بڑی دریافت حاصل ہوئی وہ تیز تیز تجزیوں تک رسائی تھی ___ یہ کھلا کہ لڑائی عورت مرد کے درمیان نہیں جھگڑا تہذیبوں کا ہے کوئی تہذیب اپنی اس تہذیب پر حملہ ابتدا ہی سے روک دیتی ہے جو اس کی طاقت میں کمی تک کا شائبہ محسوس کروائے۔ اسے کونپل ہی سے کھا دیتی ہے ہر مرد عورت کو بس تک جوتا کپڑا خرید کر تنہیں دے گا پاؤں کی جوتی کس طرح کھے گا؟ اب اگر کمانے والی عورتوں کا ذکر ہے تو وہ کما کر بھی اسی مقام پر کیسے رکھی جا سکتی ہیں اس کے نتیجے میں میں نے بہت سی عورتوں کو دیکھا جن کے شوہروں نے ان کے شناختی کارڈ سے لے کر ان کی استاد تک گروی رکھ کر پیسے بنائے۔ جب نوکریوں میں آئے تو بہت سے مردوں نے بیویوں کی تنخواہیں بڑا اور است بینکوں سے ڈرا کروانے کے لیے اے ٹی ایم کارڈ خود اپنے پاس رکھے۔ بیویوں کو خود دفاتر میں چھوڑتے ان کی پے سلپ چیک کرتے نوکری کروانے کو اپنی فراخ دلی اور آزاد خیالی گھول اور جانور کی طرح بیویوں کو آنکھ جھکنے مانگنے کے بعد ان کا معاوضہ اپنے اکاؤنٹ میں ڈال کر خود صبح بوٹ پالش کروا کر جاتے اور واپسی پر تازہ روٹی کا مطالبہ بھی! یہ وہ تہذیب تھی جس میں مرد عورت کو اپنی کموڈٹی سمجھتا ہے، جہیز بھی لیتا ہے اور زر تحریر وہ اسلوک بھی کرتا ہے اپنا نام اور شناخت کا معاوضہ مجموعی کے خون جگر کو جلا کر لیتا ہے۔

یہ سب مردوں کا طریقہ واردات نہیں ایک طبقہ پھول تو تھوڑے سے کراچی مقاصد تک پہنچتا ہے ایک طبقہ جو استطاعت رکھتا ہے وہ زیور کپڑا الغرض ہے کہ عورت لمس کو خرید تا ہے۔ گالی باپ بھائی ماں کی دے کر زرہ بطلس اتارتا ہے اسے اپنی تسکین کے لیے مذہب جوتی، گالی، کرسی، دولت جو بھی استعمال کرنا پڑے کرتا ہے عورت کو لفظ ''بیوی'' ہونے کا کہہ کر صبر کی تلقین کرتا ہے مذہب ''ماں'' کے رتبے میں قدموں تلے جنت کہہ کر تمام عمر ''یہاں بھاڑ'' رہنے پر صبر کہتا ہے مگر مرد کی جنت یہاں بھی اور وہاں بھی ۔۔۔ صوفیوں نے عورت بن کر دکھایا تھا اور عظمت کو اس تذلیل میں رہ کر نسل کی پرورش کرنا بڑا اپن کہہ دیا۔۔۔

حالت یہ کہ آج بھی دفاتر میں مرد چپڑاسی اور ڈرائیور ایک دوسرے کو عورت افسر کے ماتحت کام کرنے پر طعنے دیتے ہیں ۔۔۔ افسر مرد جو نہایت پڑھے لکھے ہوتے ہیں نوجوان کم عہدے پر آئی خواتین کو فقرے بازی میں کہتے ہیں ''آپ اگر میرے نیچے کام کر رہی ہوتیں تو میں آپ کی ترقی کروا دیتا مگر آپ کسی دوسرے شعبے کے اندر ہیں یہ محض مثالیں ہیں ۔۔۔ جو اس قدر گھناؤنی ذہنیت کے اندر ہیں۔ مجھے سٹیج ڈراموں پر قدغن لگاتے ہوئے ہمیشہ یہ شرم دامن گیر ہوئی کہ سٹیج تو گھر گھر لگی ہوئی ہے۔ دفتر وں میں بھی وہی مرد آجاتے ہیں جو گھروں میں نوجوان نوکرانیوں کو کہتے ہیں ۔۔۔ مجھ سے مانگ لیا کرو جو چاہیے، اپنی بی بی سے نہ کہو ۔۔۔ باقی تو احاطہ تحریر میں لانا بھی ناممکن! کیونکہ سٹیج ڈرامے اس قدر رقیق نہیں ہوتے کہ ان کی پھر ریہرسل اور تین گھنٹوں کی So called چیکنگ ہوتی ہے ۔۔۔ حالانکہ ریہرسل میں اداکاراؤں کو دیکھنے کے لیے وزراء امراء اور عام طبقے کے اراکین کو خصوصی اجازت ملتی ہے کہ وہ دوران ریہرسل اداکاراؤں، رقاصاؤں کو مل دیکھ سکیں ۔۔۔ تبھی تو پولیس کے چھاپے!

یہ ہے معاشرہ جو شاید کالم نگاری بنا نظر نہ آتا اور یہ بھی نہ علم کہ الزامات اور تہمتیں محض نیک اور شریف عورتوں پر بد معاشی نہ کرنے کے جرم اور غصے میں لگائی جاتی ہیں۔

اس میں یہ حکمت بھی مدتوں تک معمہ بنی رہی کہ قدرت نے انتقام کا عمل جس قدر درست کر رکھا ہے انسانوں نے نہیں رکھا کیونکہ شرافت، نیکی اور کردار کی شکست عموماً صحت کی کمزوری، بیماری اور پیچھے رہ جانے کی صورت ہی نظر آئی۔ مختلف رقاصائیں، طلاقیں کرواتیں قرات عورتیں دس دس مردوں پر یکساں حکومت کرتی عورتیں رقص کی دھن پر مردوں سے لوٹ بھی لذا صوانی رہیں اور صحت، حسن اور طاقت میں بھی ان کے کوئی کمی نہیں آئی جبکہ محلے پر بیٹھی عورت کو کم از کم اسی برس کی عمر میں تب کہیں جا کر معتبرہ کا لقب ''ماں جی'' ملا جب اس نے اپنے دانت نہیں لگوائے چہرہ وراثت نہیں کیا بڑھاپے کو قبل از وقت طاری کر لیا تو گزشتہ تہذیب کے تقاضوں کو راحت ملی گی اس وقت سے حتٰی عورتوں کو ''آنٹیاں'' کہا گیا موجودہ دور کی تمام گلیوں پر جنت لے جانے والا لفظ دور حاضر میں ''آنٹی'' بن گیا۔۔۔

انٹرول کے بعد کی زندگی میں جو لفظ سب سے پہلے خارج ہوا وہ دوستی تھا جب دوستوں کو بھی سیاق و سباق سے ہٹ کر واقعات سنانے پڑے کہ بعید نہیں ''کوٹ'' نہ ہو جائیں اور جب دوستوں نے روز کی رونق محفل بیٹھے تک کی بھی کوشش کیں تو سکول میں نرسری سے ساتھ پڑھی سہیلی کو واضح نا پڑا شمر یہ جس سے میں آج بھی روز مخاطب ہوتی ہوں۔۔۔

دوسرا بڑا فرق یہ تھا کہ زندگی مسلسل ''تھیٹر'' میں کھڑی ہو گئی مجھ میں جب بھی انٹرول سے پہلے کی لڑکی زندہ ہوتی ہے تو میں کہتی ہوں۔۔۔

کیسے کہانی درد کی میں بھول جاؤں گی   تجھ کو بھی اپنے ساتھ کٹہرے میں لاؤں گی
کیسے میں خود کو کچے گھڑے کی نذر کروں   جو ان پڑے گا مجھ سے میں دو گز دکھاؤں گی

تیسرا جو سب سے بنیادی فرق اس دوسرے نظم میں دریافت ہوا وہ ہر رشتے کو سو فیصد سے کم کی سطح پر تسلیم کر لینے کی مجبوری تھی پہلے نظم میں کہتے تھے

ملا والے تو جو اس غم پہ سمجھوتہ نہیں کرتا   محبت میں مرا دل کم پہ سمجھوتہ نہیں کرتا

مگر رشتے اور دوستیاں 30،50،60 فیصد پر جا کر بھی تسلیم کرنا پڑتی ہیں یہ وہ خلا ہے جو حقیقتاً انسان کو موت کے قریب کرتا ہے اور یہ کسی رشتوں میں سرایت کر کے آگے کے منظر بھی دکھاتا ہے۔ جیسے میں دیکھ رہی ہوں جو بزرگ بے وقت نہیں مرتا نفرت اور عدم روا سلوک کا شکار ہو جاتا ہے اولادیں تنگ کروانے اور آنکھوں کے آپریشن کے بعد منتظر ہوتی ہیں کہ اب فراغت ہو جائے۔ پیسے والے بزرگوں کے اور حالات ہوتے ہیں اور غریب بزرگوں کے اور۔ یہ چونکہ منافق خطہ ہے یہاں بزرگوں کو آرام کا کہہ کر کاروبار کی مسند سے اٹھا کر مصلے پر بٹھا دیا جاتا ہے جو بزرگ نئی شرٹ پہن کر موت سے بھاگنے کے لیے جاگنگ کرتے رہتے ہیں انہیں بہوئیں کسی نہ کسی اور طریقے سے آڑے ہاتھوں لیتی ہیں۔

سب سے بڑا راز بھی کھلتا ہے کہ اوائل عمری میں ایک تو موت بڑی اور دور لگتی ہے دوسرے موت کا خوف بھی ہوتا ہے۔ میں اکثر سوچا کرتی تھی وارث شاہ نے "جیو کا روگ" اسے ہی کہا ہے۔ زندگی کا الٹا گھڑیال بچے کی پہلی سانس ہی کے ساتھ چل پڑا ہے اور دراصل انسان کی اصل ڈیپریشن اور اداسی کی وجہ یہی ہے کہ وہ قطرہ قطرہ گھٹ رہا ہے، اصل رہا ہے، ختم ہو رہا ہے!

مگر جوں عمری اور حقیقی راز کھلا کر تنہائی، نارسائی، لاچاری، کمزوری، بیماری اور پل پل مرتی جان اور پل پل ڈوبتا دل "موت" کو اس کی محبوبہ اور نجات دہندہ بنا رہا ہے۔

◆◆◆

علمی، ادبی اور تحقیقی مجلہ...... بانی مدیر ڈاکٹر نظیر حسین زیدی

سہ ماہی نوادر

مدیرہ: بیگم شاہین زیدی کی سرپرستی میں باقاعدگی سے نکل رہا ہے

قیمت-/400 روپے ------ سالانہ قیمت-/1,600 روپے

ملنے کا پتہ: 266/E1، St No. 8، پوسٹ آفس ٹاؤن شپ، واپڈا ٹاؤن، لاہور

خاکہ

امین راحت چغتائی ۔ ہمہ جہتی ادیب

ملک مقبول احمد

امین راحت چغتائی اپنی عمر کی ستاسیویں (87) بہار سے لطف اندوز ہو رہے ہیں لیکن انہیں تصویر میں دیکھیں تو خوب صورت تراشی داڑھی کے ساتھ اب بھی جوان نظر آتے ہیں۔ اُن کا چہرہ بتاتا ہے کہ انہوں نے زندگی کو کھل کر گزارا ہی نہیں بلکہ اُن کے تجربات بھی سمیٹ رکھے ہیں اور اُنہی تجربات کو شاعری اور مضامین کے ذریعے دنیا کو لوٹا رہے ہیں۔

امین راحت چغتائی 15 اکتوبر 1930ء کو رنگون (برما) میں پیدا ہوئے۔ گھر کے دینی ماحول (سلسلہ نقشبندیہ) میں پرورش پائی۔ ایم۔ اے، بی۔ اے آنرز، ایل ایل بی تک تعلیم سے سرفراز ہوئے لیکن اپنی آزاد خیالی کو بھی قائم رکھا۔ عملی زندگی کا آغاز صحافت سے کیا۔ ابھی ایف اے میں زیر تعلیم تھے کہ "جمہوریت اور اسلام" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جو روزنامہ "زمیندار" لاہور کے ادارتی صفحے پر 24 ستمبر 1948ء کو شائع ہوا جسے بعض لوگوں نے سراہا۔

بی اے میں حصولِ تعلیم کے دوران میں راولپنڈی سے ایک مکمل روزنامہ "جدید پرواز" نکلا تو اس میں بطور سب ایڈیٹر کام شروع کر دیا جو بی اے کی تکمیل تک جاری رہا۔ اسی عہد میں انجمن ترقی پسند مصنفین میں شمولیت اختیار کر لی۔ شاعری زور و شور سے جاری تھی۔ ایل ایل بی کرنے لاہور پہنچے تو وہاں انجمن کی لاہور شاخ کے جائنٹ سیکرٹری منتخب ہو گئے جبکہ سیکرٹری کے عہدے پر [illegible] مسعود مرحوم کا انتخاب عمل میں آیا۔ راولپنڈی اور لاہور میں قیام کے دوران میں مزدور تنظیموں میں بھی کام کیا۔ تخلیقی عمل کے لیے بھی یہ عہد بہت راس آیا۔ نظم، غزل، مضمون سب کچھ لکھا۔ لاہور میں ماہنامہ "ادبِ لطیف" اور روزنامہ "امروز" اور دلی میں دو ماہی "شاہراہ" میں خوب چھپے۔ امروز واحد اخبار تھا جو ہر نظم و غزل کی اشاعت پر دس روپے ادا کرتا تھا اور ادبی و تنقیدی مضمون کی اشاعت پر بارہ روپے فی کالم کے حساب سے اجرت ملتی تھی۔ "شاہراہ" دلی میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا ترجمان رسالہ تھا۔ چغتائی صاحب کی شاعری تو نویں جماعت ہی سے باقاعدہ شروع ہو چکی تھی۔ اکثر شعرا کی ابتدا غزل سے ہوتی ہے مگر ان کی ابتدا نظم سے ہوئی۔ غزل بعد میں کہی۔ کسی سے اصلاح لینے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ایم اے کی تکمیل بھی یونہی روا داری میں ہوئی۔ کورس میں ساری کتابیں تو وہی تھیں جو ان کے زیرِ مطالعہ رہ چکی تھیں۔ 1954ء میں روزنامہ نوائے وقت نے راولپنڈی سے بھی اپنی اشاعت کا آغاز کیا تو چغتائی صاحب اس کے پہلے نیوز ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اسی عرصے میں وکالت بھی شروع کر رکھی تھی۔ نصف دن کچہری میں اور رات کا نصف حصہ اخبار میں بسر ہوتا۔ وکالت ان سے چنداں خوش نہیں تھی۔ لہٰذا چھوڑ دی۔ کم و بیش دس سال نوائے وقت راولپنڈی میں گزارے۔ پھر روزنامہ کوہستان نے لاہور سے بھی اپنے اخبار کا اجرا کیا تو چغتائی صاحب 1963ء میں بطور نیوز ایڈیٹر لاہور چلے گئے۔ اگلے ہی سال انہیں میگزین ایڈیٹر بنا دیا گیا اور پھر کم و بیش [illegible] ان کا کوئی نہ کوئی

علمی، تحقیقی یا دینی مضمون ایڈیٹر کی صورت میں اخبار کے صفحۂ اول پر شائع ہونے لگا۔ 1963ء کی ابتدا میں انھیں کوہستان کا ریذیڈنٹ ایڈیٹر بنا کر راولپنڈی بھیج دیا گیا۔ نسیم حجازی چیف ایڈیٹر تھے اور اخبار حزبِ اختلاف کا تھا۔ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کا زمانہ اسی اخبار میں گزارا۔ پھر حکومت نے دباؤ ڈال کر اخبار کو خرید لیا۔ چغتائی صاحب اخبار سے مستعفی ہو گئے۔ ان کا موقف تھا کہ جس قلم سے ایک دن حکومت کے خلاف لکھ رہے ہوں اسی قلم سے اگلے ہی روز اس کے حق میں نہیں لکھا جا سکتا۔ دریں اثنا جاپان کے سفارت خانے کو ایک پریس ایڈوائزر کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اسامی کے لئے اشتہار دیا گیا۔ چغتائی صاحب نے درخواست دے دی اور منتخب ہو گئے، جہاں 27 سال گزارنے کے بعد 1994ء میں ریٹائر ہوئے اور تصنیف و تالیف کی طرف متوجہ ہو گئے اور بلحاظ شاعری نیز علمی، ادبی اور تحقیقی موضوعات پر بارہ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ ان میں ایک نعتیہ مجموعہ بھی شامل ہے۔ جس پر حکومت پاکستان اول انعام دے چکی ہے۔ 1965ء میں پاکستان ٹیلی ویژن راولپنڈی پہنچ گیا اور امین راحت چغتائی اس کے بیشتر دینی پروگراموں سے وابستہ ہو گئے۔ ٹیلی ویژن ان دنوں چک لالہ میں آرمی کی ترک کردہ بارکوں میں قائم ہوا تھا۔ عبیداللہ علیم اردو کے اچھے شاعر اور ٹی وی کے پانچ نظر پروڈیوسر تھے اور کراچی سے آئے تھے۔ یہاں کوئی ان کا واقف نہ تھا۔ وہ سیدھے راولپنڈی ریڈیو پہنچے اور متعلقہ حکام سے دریافت کیا کہ ان کے یہاں تفسیری اور دیگر دینی پروگرام زیادہ تر کون حضرات کرتے ہیں۔ علیم صاحب کو جو نام بتائے گئے ان میں چغتائی صاحب کا نام بھی شامل تھا اور اول الذکر کو یہ نام ادب کے حوالے سے مانوس لگا۔ چنانچہ انھیں منتخب کر لیا گیا اور آئندہ ٹی وی پر اہم تفسیری پروگرام اور دیگر دینی موضوعات پر تقاریر یہی کرنے لگے۔ حتیٰ کہ جنرل ضیاء کے دور میں جب علامہ اسد اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ پاکستان میں آئے تو آئین کی تشکیل پر مشاورت کے لئے اسلام آباد آئے تو ان دونوں کے انٹرویو بھی چغتائی صاحب سے ہی کروائے گئے۔ نیز حج کے تمام پروگرام 1981ء میں چغتائی صاحب نے ہی شروع کئے اور 1994ء میں انہوں نے ہی ختم کئے۔ آخری پروگرام ساٹھ قسطوں پر مشتمل تھا۔ غالباً واحد دینی پروگرام تھا جو اتنا طویل ہونے کے باوجود فردِ واحد نے پیش کیا۔

میں نے امین راحت چغتائی کو سب سے پہلے پاکستان ٹیلی ویژن پر ہی دیکھا اور حیران بھی ہوا کہ ایک داڑھی سے صاف نوجوان قرآن کریم کی مختلف آیات کی تفسیر کر رہا تھا۔ احادیث سنا رہا تھا اور تاریخ اسلام کے واقعات بیان کر کے بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہِ راست پر لا رہا تھا۔ پھر دیکھا تو ان کے چہرے پر سفید داڑھی لہرا رہی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے امین راحت چغتائی کے دونوں چہرے اچھے لگے۔ کیوں کہ یہ دونوں چہرے ان کے باطن کی پاکیزگی کے مظہر تھے اور اس قول کی صداقت پیش کرتے تھے کہ "چہرہ دل کا آئینہ ہوتا ہے"۔

ان کا بہت تاخیر (1986ء) سے چھپنے والا پہلا شعری مجموعہ "بیدِ مجنوں" تھا۔ اس کا گرد پوش اور دو رنگی تصاویر مصورِ مشرق عبدالرحمن چغتائی کے مجموعۂ تصاویر سے اخذ کردہ ہیں۔ کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر سید عبداللہ اور پیش لفظ ثانی ڈاکٹر وزیر آغا کا تحریر کیا ہوا ہے اور دونوں فلیپ ڈاکٹر وحید قریشی اور ڈاکٹر جمیل جالبی کی آرا سے آراستہ ہیں۔ گرد پوش کی پشت احمد فراز کی رائے سے مزین ہے۔ کتاب کا کاغذ بھی اپنا الگ ایڈیشن رکھتا ہے۔ کتاب پر تبصرے جناب احمد ندیم قاسمی اور قتیل شفائی کے تحریر کردہ ہیں۔ کتاب طباعت کے اعتبار سے بھی بے حد خوبصورت تھی۔ قتیل شفائی نے "بیدِ مجنوں" کے شعری مجموعے کو اپنے عہد کا "تاج محل" قرار دیا تھا۔ اب اتنے بڑے ادیبوں کی

آرا کے بعد کسی اور تعریف و توصیف کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے۔ آج بیشتر بزرگ ادیب جب بھی امین راحت چغتائی کی شاعری کا ذکر کرتے ہیں تو ''بھید بھنور'' کا حوالہ ضرور دیتے ہیں۔

امین راحت چغتائی نظم و نثر دونوں میں رواں دواں ہیں اور تادمِ تحریر بارہ کتابیں لکھ چکے ہیں۔ چھ نثر کی اور چھ نظم کی۔ تنقیدی کتابوں میں بعض ادب کے مضامین زیرِ بحث آئے ہیں اور ''مغل کتب مصوری، سولہویں صدی عیسوی'' تو ایسا تحقیقی کارنامہ ہے جسے تادیر یاد رکھا جائے گا۔ یہ کتاب مقتدرہ قومی زبان نے شائع کی تھی۔

اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ شاہد شیدائی نے اپنے رسالے ''کاغذی پیرہن'' میں جدید اردو نظم کے منفرد شاعروں کو متعارف کرانے کا ایک نیا سلسلہ شروع کیا تھا، جس میں میراجی، ن م راشد اور مجید امجد جیسے شاعر زیرِ بحث لائے جا رہے تھے۔ شاہد شیدائی نے اس سلسلے میں امین راحت چغتائی کی نظموں کا انتخاب پیش کیا اور ان کی فنی خوبیوں کو ایک فکر انگیز مقالے کی صورت میں سراہا۔ امین راحت چغتائی کے لئے ادبی دنیا کا یہ ''ستارۂ امتیاز'' ہے۔

اردو ادب میں امین راحت چغتائی تنقید میں بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت ان کی تین کتابیں ''دلائل''، ''ردِ عمل'' اور ''مراحل'' ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ روزنامہ ''نوائے وقت'' میں ''ردِ عمل'' پر ڈاکٹر انور سدید کا تبصرہ شائع ہوا تو کئی لوگ اس کتاب کی تلاش میں مقبول اکیڈمی تک پہنچے، حالانکہ چغتائی صاحب نے یہ کتاب چھاپنے کا اعزاز کسی اور اشاعتی ادارے کو دے رکھا تھا۔ تاہم میں نے بھی ان کی کتابیں منگوا لیں اور اپنے شوروم میں فروخت کے لئے رکھیں۔ ان کی دینی کتابوں میں ''قرآن اور نظامِ کائنات'' کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔

امین راحت چغتائی ہمہ جہتی ادیب تو ہیں ہی مگر ان کے ایک ''شوقِ فراواں'' کا ذکر تو میں بھول ہی گیا۔ اس کا انکشاف تو ہم دونوں کے مشترکہ دوست جناب جمیل آذر نے کیا۔ انہوں نے بتایا کہ چغتائی صاحب کی لائبریری میں فلمی اور غیر فلمی گانوں اور بعض ریکارڈوں کا بھی ایک نایاب ذخیرہ موجود ہے، جس کی سماعت کا اہتمام ایک نہایت قیمتی جرمن ریڈیو گرام گرنڈگ (Grun dig) کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ اس ریڈیو گرام میں چھ بینڈ کا ریڈیو بھی ہے۔ چار سپیکر ہیں اور اس میں چھ ریکارڈ (LPS) اوپر نیچے رکھ کر یکے بعد دیگرے بجائے جا سکتے ہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اس وقت راولپنڈی میں یہ واحد ریڈیو گرام ہے جو ''چالو حالت'' میں موجود ہے۔ اسے اس قدر حفاظت سے رکھا گیا ہے کہ اس کی کیبنٹ کے پالش میں آج بھی اپنا چہرہ آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ پانچ سو چالیس گانوں کے کیسٹ اور چھیاسٹھ نایاب فلموں کے پورے کیسٹ بھی موجود ہیں۔ گانے سننے کے لئے دو الگ کیسٹ ریکارڈر (چھوٹے سائز کے) بھی دستیاب ہیں۔ دیگر حضرات کے لئے تو کچھ نام بھی غیر مانوس ہوں گے۔ مثلاً جوتھیکا رائے، کانن بالا، پارل گھوش، امیر بائی، درانی، فیروزہ بیگم، زہرہ بائی، خورشید، اختری بائی، سہگل، ماسٹر مدن، [illegible]، ستارہ، کانن دیوی، جگ موہن، ہیمنت کمار، کملا جھریا، کیلاش رتنا، طلعت محمود، ثریا، نور جہاں، ایس ڈی برمن، سی ایچ آتما، ملکہ پکھراج، سریندر، روشن آرا بیگم اور بڑے غلام علی۔

قصہ مختصر یہ کہ امین راحت چغتائی سے کبھی ٹیلی فون پر بات ہوتی ہے تو ان کی باتوں سے گلاب کی خوشبو آتی ہے۔ ان کا شائستہ لہجہ اور تہذیبی انکسار متاثر کرتا ہے۔ وہ انسانیت کے پاسبان ہیں اور مجھے فخر ہے کہ میں امین راحت چغتائی کے حلقۂ احباب میں ہوں۔

◆◆◆

جائزے

یادوں کا جشن

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی شاعری کا ایک ورق ماہنامہ ''البرہان'' مذہبی رسالے میں نظر سے اس وقت گزرا جب میں 1950ء میں زمیندار کالج گجرات میں سال اول کا طالب علم تھا۔ البرہان کے ایڈیٹر مولانا محمد جعفر تھے اور ان کے بعد مولانا ابرار حسین تھے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر بھارت کے شہر کرنال میں ڈپٹی کمشنر تھے وہ بحیثیت شاعر خاصے مشہور ہو چکے تھے۔ مشاعروں میں شرکت اپنی جگہ لیکن بحیثیت دوست انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انہیں اسلام اور اسلام کی عظیم ہستیوں سے عقیدت رہی چنانچہ انہوں نے نعت، منقبت اور سلام لکھ کر یہ باور کرا دیا کہ شعر کی قوت اور احترام آدمیت ہی حقیقی مذہب ہے۔ البرہان میں ان کی مسدس کا مطالعہ میرے عنفوان شباب کا انوکھا تجربہ تھا۔ مجھے کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی مسدس زبانی یاد ہو گئی صرف ایک شعری بند قارئین کی نذر کر کے بات آگے بڑھائی جائے گی۔

گلشن صدق و صفا کا لالہ رنگیں حسین　　شمع عالم، مشعل دنیا، چراغ دیں حسین
سر سے پا تک سرخیٔ افسانہ خونیں حسین　　جس پہ شاہوں کی خوشی قربان وہ تمکین حسین
مطلع نور مہ و پروین ہے پیشانی تری　　باج لیتی ہے ہر اک مذہب سے قربانی تری

ان کا ایک مختصر پہلا مجموعہ شاعری ''طلوع سحر'' غالباً 1962ء میں شائع ہوا ان میں بے نیازی اور شائستگی کا ملاپ دوسروں کی رہنمائی اور خدمت کا وسیلہ قرار پایا۔ ان کے نہایت مخلص دوست نارنگ ساقی نے ان کا سارا کلام یکجا کیا اور کلیات کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا، اس طرح ان کا کلام ضائع ہونے سے محفوظ رہا اور 1992ء میں ''کلیات سحر'' کے نام سے شائع ہو کر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی بھارت اور پاکستان کے علاوہ دوسرے ملکوں میں بھرپور پذیرائی کا سبب بنی۔

دلی میں پاکستانی ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع ہوا۔ مشاعرہ اور افسانہ سیمینار میں ڈاکٹر سعادت سعید، محسن رضوی اور میں شریک تھے۔ وہاں ناشر کاظمی سے ملاقات ہوئی وہ میرے کلاس فیلو تھے۔ شام کو ایک طرف کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی گفتگو کا رس گھلتا رہا اور دوسری طرف رات کو جامع مسجد کے سامنے ایک ہوٹل میں کھانے پر بھارت کے مشہور محقق اور نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے ہم پاکستانی قلم کاروں کی ملاقات ہوئی۔ یہ دونوں نامور ادیب ہمارے ملک خداداد پاکستان میں پیدا ہوئے، بڑے ہوئے اور تقسیم ہند کے بعد یہاں سے بھارت جا کر قلم قبیلہ میں سرخرو سے نظر آنے لگے مگر انہیں اپنی جنم بھومی نہیں بھولی۔ مہندر سنگھ بیدی کو جنوبی پنجاب اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو بلوچستان رہ رہ کر یاد آتا رہا۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی اور نارنگ اپنے بچپن اور لڑکپن کے واقعات سنا کر پرانی یادیں تازہ کرتے رہے خصوصاً مہندر سنگھ بیدی سحر نے پاکستانی ادیبوں اور شاعروں سے اپنے روابط استوار رکھے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی ''یادوں کا جشن'' لکھنے کا انوکھا تجربہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں ''یادوں کا جشن'' لکھنے میں میرے سامنے کوئی اقتصادی یا تجارتی مفاد نہیں تھا تقاضہ وہ بیتا تھا کہ ''نو واردان مکتب'' اگر

چاہیں تو ان تجربوں سے فائدہ اٹھائیں جو میں نے اپنی چوہتر (74) سالہ زندگی میں حاصل کیے۔ جوش صاحب کی ''یادوں کی برات'' سے مجھے حوصلہ ملا کہ میں بھی کچھ لکھوں لیکن یہ اعتراف کرنے میں مجھے کوئی تامل نہیں کہ ''یادوں کا جشن'' میں وہ رنگینیاں اور رعنائیاں شامل نہ کر سکوں گا۔ میں بھی آدمی ہوں اور گناہ ابن آدم کی سرشت میں ہے۔ میں کوئی ولی یا پارسا نہیں ہوں اور نہ ہی میرا دل پتھر کا بنا ہوا ہے لیکن مجھ میں جوش صاحب کی اخلاقی جرأت نہیں کہ میں اس قدر صاف گوئی سے کام لوں۔ میں چاہتا ہوں کہ باپ بیٹی بہن بھائی ماں بیٹا بھی ''یادوں کا جشن'' کا مطالعہ کر سکیں اور ایک دوسرے کی موجودگی ایسے میں ان پر گراں نہ گزرے۔''

اردو نثری ادب میں جہاں اور بہت کچھ شامل کیا گیا وہاں ہمارے اہل قلم نے اپنی حیات مستعار میں پیش آنے والے نشیب و فراز، دھوپ چھاؤں تلخ و شیریں واقعات، اپنے عادات و خصائل، نظریات و عقائد، معاملات زندگی اور اپنے گرد و پیش کے خوبصورت اور بدہیئت چہروں کی نقاب کشائی کے حوالے سے دلچسپ مرقعے اور حقائق پر مبنی نادیدہ صورت احوال کا آئینہ ہمارے روبرو رکھا جس میں عکس در عکس ایسے مناظر دیکھنے میں ملتے جنہیں ماضی کے گرد و غبار سے نکال کر متحرک، ترو تازہ اور سرسبز و شاداب بنا دیا گیا ہے۔ ہمارے نثری سرمائے میں داستان، ناول، افسانہ، تنقید، سوانح، خطوط، انشائیہ، رپورتاژ، سفرنامہ غرض بہت کچھ شامل ہے لیکن آپ بیتی جیسی ادبی صنف کی طرف اتنی توجہ مبذول نہیں ہوئی البتہ بیسوی صدی میں چند آپ بیتیاں شائع ہوئیں ان میں شہاب نامہ، جہان دانش اور یادوں کی برات کو شہرت ملی۔ خیر اس وقت بہت سی آپ بیتیوں میں سے جس آپ بیتی پر کچھ گفتگو کرنا مقصود ہے وہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کی وہ آپ بیتی یادوں کا جشن ہے جسے کے۔ ایل۔ نارنگ ساقی نے پہلے بھارت سے اور اب پاکستانی ایڈیشن بک کارنر جہلم سے بڑے اہتمام سے شائع کیا گیا ہے۔ یادگار تصاویر سے مزین ''یادوں کا جشن'' کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے نظری اور سادہ اسلوب کا آئینہ ہے۔ اس کا لکھنے والا نظم و نثر دونوں اصناف میں رواں ہے۔ بیدی صاحب نے کتنے علما، فضلا کی آنکھیں دیکھی ہیں کتنے مشاعرے بھگتائے، اچھے شعروں پر کھل کر داد دینے کی روایت میں حصہ ڈالا، مشاعروں کو عزت پاتے اور کہیں خوار ہوتے دیکھا ان کا حافظہ ''یادوں کا جشن'' پوری جزئیات کے ساتھ پیش کرنے میں معجزنما ثابت ہوا۔ اردو ادب و شاعری کے حوالے سے ان چند شخصیتوں میں سے ایک ہیں جنہوں نے زندگی کا رس نچوڑا، بڑی بھرپور زندگی گزاری۔ کنور مہندر سنگھ بیدی کا تعلق پنجاب کے ایسے برگزیدہ خاندان سے تھا کہ ان کا سلسلہ نسب سکھ مذہب کے بانی بابا گورونانک سے جا ملتا اور وہ ان کی سترھویں (17 ویں) پشت میں ہیں وہ اس اعزاز پر فخر کرتے ہیں وہ ''چہ درم سلطان بود'' کے ذیل میں لکھتے ہیں ''اپنے باپ دادا اور آباؤ اجداد پر فخر کرنا ایک قدرتی امر ہے اور جب یہ آباؤ اجداد اپنے زمانے کے مقتدر افراد ہوں تو آنے والی نسلیں ان پر جتنا بھی فخر کریں کم ہوتا ہے۔ میرا خاندان حضرت بابا گورونانک دیو جی سے منسلک ہے ـــــ ہمارے خاندان کے بھاٹ بتاتے ہیں کہ حضرت بابا گورونانک دیو جی خود شری رام چندر جی کے خاندان میں سے تھے۔ بیدی صاحب نے گورونانک دیو جی کی کچھ کرامات کا ذکر بھی کیا ہے جو دلچسپ اور حیران کن بھی ہیں۔ وہ زندگی میں ایک فعال کردار کے مالک کامرانی اور کامیابی کا زینہ طے کرنے والے جری انسان تھے یہاں تک کہ شیر کا شکار کرنا ان کے تصرفات عمل میں شامل ہے پروفیسر قمر رئیس نے بڑے کام کی بات کی کہ ''انہوں نے اپنے تجربوں سے زندگی کا عرفان اور دوسروں کے تجربوں سے عبرت حاصل کی ہے۔''

''یادوں کا جشن'' میں جو زبان استعمال کی گئی وہ یکسر تصنع سے پاک ہے پڑھتے ہوئے قاری ان کے ساتھ یا ان کی تحریر میں اس طرح حلول کر جاتا ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے وہ اس تحریر کی تہذیبی ثروت مندی میں پہلے سے کہیں موجود ہے۔ بیدی صاحب نے بظاہر

بیانیہ انداز اختیار کیا لیکن ان کا تخلیقی ذہن مرزا غالب کی طرح بات سے بات پیدا کرنے میں مشاق ہے بقول پروفیسر گوپی چند نارنگ "یادوں کا جشن" اردو کے ایک عاشق صادق اور بھرپور انسان کی زندگی کی دستاویز ہے جس میں بیدی صاحب کی قلندری اور داستان سرائی نے ہمارے عہد کے بہت سے اہم واقعات کو محفوظ کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہمہ گیر، پہلودار اور کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں کہ ہم ان کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں وہ ساہی وال (منٹگمری) کے جدی زمیندار رئیس ابن رئیس، غریبوں اور حاجت مندوں کے ہمنوا، شاعروں میں شاعر، افسروں میں افسر، شکاریات کے دلدادہ، کھلاڑی، بہترین مقرر، ریفیف کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور کی علمی ادبی اور ثقافتی ماحول کے پروردہ، ظرافت پسند، قہقہہ بار، غیر متعصب، بہترین منتظم، ادب پرور، لطائف کا مرقع، دوستوں کا دوست اور عاشق صادق ..... اسے عشق ہے تو عظیم المرتبت ہستیوں سے ہے، وہ مداح نبیؐ اور علیؑ، وہ غم گسار مظلوم کربلا ---- ان کی زندگی ایک قوس قزح کی مثال ہے جس میں رنگوں کی بہار اور روشنیوں کی پھوار ہے!

ہم کسی دین سے ہوں قائل کردار تو ہیں ہم ثنا خوان شہ حیدر کرار تو ہیں
نام لیوا ہیں محمدؐ کے پرستار تو ہیں یعنی مجبور پئے احمد مختار تو ہیں
عشق ہو جائے کسی سے کوئی چارہ تو نہیں صرف مسلم کا محمدؐ پہ اجارہ تو نہیں

وہ ہر مذہب کا احترام کرنا اپنا مسلک ظاہر کرتے ہیں، یہ عقیدہ ہر انسان دوست کا ہوتا ہے لیکن عصبیت پسند افراد اس کے برعکس عقیدہ رکھتے ہیں دنیا میں فتنہ و فساد کی بنیاد یہ ہوتا ہے کہ اپنے سوا دوسرے غلط راستے پر ہیں جب کنور مہندر سنگھ بیدی سحر سکھ دھرم رکھنے کے باوصف دوسرے مذاہب اور ان کے رہنماؤں کے بارے میں کیا اچھا نظریہ پیش کرتے ہیں "میں ایک ایسے سکھ گھرانے میں پیدا ہوا جو حضرت بابا گورو نانک دیو جی کے خاندان سے ہے بلکہ اس پر فخر بھی ہے لیکن میں نے کبھی کسی دوسرے مذہب کو نفرت یا تعصب سے نہیں دیکھا۔ میں اسلام سے محبت کرتا ہوں رسول اکرم صلعم سے عقیدت رکھتا ہوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ثنا خواں ہوں، امام الشہدا کی لاثانی قربانی کا پرستار ہوں، مجھے گوتم بدھ کے تیاگ کا بے حد احترام ہے۔ مریادا پرشوتم رام کے ایثار اور قربانی بردباری کی مثال دیتا ہوں۔ سری کرشن کی گیتا سے فیض حاصل کیا ہے، مسیح کے صبر اور استقلال سے درس لیتا ہوں۔"

حرف اول کے ذیل میں رئیس امروہوی کا تجزیاتی بیان ہے کہ مہندر سنگھ بیدی رندوں میں رند، پارساؤں میں پارسا، صوفیوں میں صوفی، لطیفہ گویوں میں لطیفہ گو، شاعروں میں شاعر، عاشقوں میں عاشق اور مدبروں میں مدبر گویا "ہر فن میں ہوں میں طاق، مجھے کیا نہیں آتا" شطرنج سے لے کر شعر اور بیت بازی سے لے کر لطیفہ بازی تک جتنی شریفانہ بازیاں ہو سکتی ہیں کنور صاحب ان سب کے دلدادہ اور سب کی خدمت پر آمادہ رہتے ہیں ان کے اسلوب زندگی اور انداز فکر کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ:

بازیچہ اطفال ہے دنیا مرے آگے ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

میں نے اپنی آپ بیتی "حاصل عمر گریزاں" کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ ہماری مشرقی روایات کی روشنی میں اس صنف کو وہی قلم کار اختیار کرے گا جو وقت گزرنے اور عالم پیری میں داخل ہونے کے بعد اپنا محاسبہ کرنے کی بجائے اپنے تصرفات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے داستان طرازی بھی کرتا رہا مہندر سنگھ بیدی کی طرح قدرت اللہ شہاب بھی ایک بیوروکریٹ تھے مگر انہوں نے زندگی میں پیش آنے والے واقعات کا چندہ قارئین کے سامنے رکھا جس میں مصلحت بینی اور وقت بسری کی تعلیم دی گئی ہے اس کے برعکس مہندر سنگھ بیدی نے کھلے دل و

دماغ کے ساتھ اور کسی مصلحت کو خاطر میں لائے بغیر سچائی اور صرف سچائی کے اظہار پر انحصار کیا ہے۔ وہ سکھ ہونے کے ناتے وہ لطائف بھی ضبطِ تحریر میں لائے جو سکھوں سے متعلق ہیں یا جو ان کی حماقت یا من گھڑت باتوں پر قہقہے برسانے کا سبب بنتے ہیں۔ وہ کسی بڑے سے بڑے رتبہ مہاراجہ، حکمران یا صاحبِ اختیار افسر سے مرعوب نہیں ہوتے، وہ شاعروں میں بیٹھ کر خوش رہتے ہیں۔ ان کے کام آتے ہیں، ان سے بے تکلف رہتے ہیں، ان کے ساتھ تصویریں کھنچوانے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ "یادوں کا جشن" میں بلیک اینڈ وائٹ تصاویر دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ بھارت اور پاکستان کے قد آور لوگوں سے راہ و رسم رکھتے تھے۔ واقعات کے بیان میں مہندر سنگھ بیدی سحر حقائق کے اظہار میں زیبِ داستان کی خاطر اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہیں کرتے۔ ان کی زبان میں شگفتگی اور سادگی کا حسین امتزاج قاری کے دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔ کتاب پڑھتے ہوئے دلچسپی اور جاذبیت قائم رہتی ہے۔ وہ خود تمہیدی کلمات میں لکھتے ہیں "جانے کب بلاوا آ جائے یا اگر زندگی باقی بھی ہو تو جو کچھ ذہن میں محفوظ ہے وہ رہے نہ رہے اس لئے جرأت ہوئی کہ جو کچھ دیکھا ہے یا کیا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دوں" انہوں نے بحیثیت آئی سی ایس افسر زندگی بسر کی اور بھارت کے مختلف علاقوں میں فرائض انجام دیے۔ وہ کھلی آنکھوں سے ہر منظر دیکھتے اور اس کی جزئیات کو اپنے حافظے میں محفوظ کر لیتے تھے کیونکہ مہندر سنگھ بیدی سحر کا ضلع ساہیوال کے بیشتر مقتدر شخصیات جیسے دیوان صاحب پاکپتن شریف، خان بہادر میاں نور احمد خان، مانیکا پیر تکی، میاں محمد خدا یار خان مانیکا، رائے بہادر لالہ گنگا رام، محمد عثمان خان فرید پور، سردار حکم سنگھ قلیانہ، سردار بابا سنگھ اور بہت سے دوسرے سرکردہ افراد کا تذکرہ کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ انہیں اپنا وہ عہدِ شباب نہیں بھولا جو یہاں بسر ہوا۔

"مجھے یہ بات بالکل کل کی طرح یاد ہے کہ جب میں اپنی پہلی تقرری پر حاضر ہونے کے لئے لائل پور جانے لگا تو علاقے کے ہزاروں لوگ مجھے دعائیں دے کر رخصت کرنے آئے۔ اچھا خاصا میلہ لگ گیا۔ وہ تین دن جشن ہوتے رہے۔ میرے آرام کے لئے گاڑے، بھینس، گھوڑی، کار، ملازم سب کا بڑی احتیاط سے اہتمام کیا گیا اور مجھے اسی طرح گلے مل کے روئے جیسے میں لائل پور نہیں عدم آباد جا رہا ہوں۔"

مہندر سنگھ بیدی نے تقسیم ملک سے پہلے اور بعد کے واقعات کو حسن ترتیب کا لحاظ رکھتے ہوئے قارئین کی نذر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا کہ میں سرکاری ملازم ضرور تھا مگر میری ہمدردی انہیں کے ساتھ تھی جو ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے تھے"۔ کے ایل نارنگ ساقی نے پاکستانی ایڈیشن میں مہندر سنگھ بیدی سحر کے بارے میں کمال تجزیہ پیش کیا ہے کہ

"یہ ایک ایسے شخص کی داستانِ حیات ہے جس نے بالکل سچ بولا ہے۔ جب ہندو مسلم فسادات نے سارے برِاعظم کو پاگل کر دیا تھا لیکن بیدی صاحب کا دل تعصب اور نفرت سے پاک تھا۔ بیدی صاحب نے اس زمانے میں دہلی میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے جو کوششیں کیں اس کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ بیدی صاحب کی انسان دوستی آج بھی خیالوں میں بسی ہوئی ہے۔ بیدی صاحب ساری عمر رجعت پرستی، رجعت پسندی اور ظلم کے خلاف صف آرا رہے اور یہ کام وہی کر سکتا ہے جو انسانیت پر مکمل یقین رکھتا ہو۔"

ان کی تحریر میں شگفتگی مزاج اور زبان و بیان کا حسن ایسا ہے کہ پڑھتے جائیے اور لطف اٹھاتے جائیے۔ شاعری، شکار، شراب اور شان بے نیازی بھی کچھ "یادوں کا جشن" میں پڑھنے کو ملے گا ہر چیز حدِ اعتدال میں ملے گی۔ ان کے عہدِ شباب کی تصویر میں آنکھیں یہ

بتا رہی ہیں کہ انہیں رضوان سرمست کی خوش بختی بھی میسر رہی ہے۔ انہیں محب وطن رہنماؤں اور خود پرست و خود پرور لیڈروں سے ملنے جلنے کے ان گنت مواقع ملے ہیں۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ

''سرمایہ داروں کی بزم ہائے نشاط میں شریک ہوا ہوں اور مفلس لوگوں کی جھونپڑیوں میں بھی وقت گزارا ہے۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر دوستوں کے ساتھ کھانا کھایا ہے۔ صدر جمہوریہ کے سرکاری اور غیر سرکاری دعوت ناموں میں بھی شریک ہوا ہوں کھیل کود کے میدان میں بھی دخیل رہا ہے۔ فنون لطیفہ سے پوری دلچسپی رکھتا ہوں۔''

مختصر یہ کہ کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور مرزا غالب میں کچھ مشترک اوصاف ہیں۔ دونوں بذلہ سنج ہیں، شاعری اور شراب سے شغف ہے، وضع دار ہیں، دریا دل ہیں، دنیا دار ہو کر بھی ریاکار نہیں، واعظ شہر کے ظاہر و باطن سے آگاہ اور شیخ کو نادان تصور کرتے ہیں، ہر شخص سے بلا امتیاز مذہب و ملت محبت کرتے ہیں، دوستوں کے درمیان مرکز نظر اور ان کے افضل کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ ایک کی آپ بیتی ''یادوں کا جشن'' میں اور دوسرے کی مکاتیب میں محافل مشاعرہ کے تذکرے دونوں کے ہاں ملیں گے۔ دونوں دہلی کی تہذیبی زندگی کے ترجمان اور ہم جلیسوں کی جان۔ وہ شاعر بھی تھے اور شاعر گر بھی۔ دونوں ہر دو مملکتوں (بھارت اور پاکستان) میں اپنی عادات و خصائل کی بنا پر ہر دل عزیز۔ البتہ غالب شناسی کا پلڑا بھاری ہے مگر خوشنودی سرشت ''یادوں کا جشن'' جس تزک و احتشام سے بک کارنر جہلم کے امر شاہد نے شائع کی ہے وہ اپنا جواب آپ ہے اور مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی ان کی حیات مستعار کی اہم دستاویز کا عکس جمیل ہے۔ وہ خود کہتے ہیں

تھے یہ بیدی سحر ہے کہ تو کس حال میں کاٹے   جینا تو حقیقت میں سزا بھی ہے جزا بھی

◆◆◆

نذیر فتح پوری کا ساہتیہ اکادمی کا ایوارڈ برائے 2017ء

اردو کے مشہور شاعر و ادیب، 80 کتابوں کے مصنف، مرتب اور سہ ماہی ادبی رسالے ''اسباق'' کے مدیر جناب نذیر فتح پوری کو ساہتیہ اردو اکادمی کی جانب سے ''ادب اطفال ایوارڈ برائے 2017ء'' سے نوازنے کا اعلان ہوا ہے۔ یہ ایوارڈ نذیر فتح پوری کی بچوں کے لیے کہانیوں کی کتاب ''میرا دوست مہان'' پر تفویض ہوا ہے۔ نذیر فتح پوری نے بچوں کے لیے چھ کتابیں قلم بند کی ہیں: 1- بچو! آؤ گیت سنائیں (دو ایڈیشن) 2- امیر تیمور 3- امیر تیمور ہندوستان میں (دو ناول) 4- میرا دوست مہان (32 کہانیاں) 5- پٹارو کی 17 کہانیاں 6- چھوٹا بچہ چھوٹی کتاب (17 کہانیاں)۔ اس مبارک موقع پر اراکین اسباق کی جانب سے نذیر فتح پوری کو دلی مبارکباد اور ان کی صحت و سلامتی کے لیے بے شمار دعائیں۔ (نذیر فتح پوری سے رابطے کے لیے: 9822516338) اراکین اسباق پونے مہاراشٹر

(ادارہ ''تخلیق'' اور پورے پاکستان کی ادبی برادری کی جانب سے نذیر فتح پوری کو مبارک ہو)

عزیز جبران انصاری کے عشقِ رسولؐ کا تیسرا مرحلہ

نسیم سحر

جناب عزیز جبران انصاری کا یہ تیسرا حمدیہ و نعتیہ مجموعہ ہے جو "حسنِ عقیدت" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ اگر میں یہ کہوں تو غلط نہ ہوگا کہ کتاب کا عنوان اسم با مسمیٰ ہے۔ اس میں عقیدت ایک ایک لفظ سے جھلک اور چھلک رہی ہے جبکہ حسنِ بیان کی خوشبو عزیز جبران انصاری کے ہر حمدیہ و نعتیہ لفظ میں چراغاں کر رہی ہے اور اپنی سرشاری کو قاری تک کامیابی سے منتقل کر رہی ہے۔

یہاں حمد و نعت نگاری کے آداب و شرائط اور حمد و نعت کی تاریخ بیان کرنے کا موقع نہیں کیونکہ اگر یہ سلسلہ چھڑ جائے تو پھر بات بہت طویل ہو جائے گی اور جناب عزیز جبران انصاری کی حمد و نعت نگاری پر بات کرنے کی گنجائش کم ہو جائے گی۔ ویسے بھی ایسی عقیدت و سرشاری میں ڈوبی ہوئی حمدیہ و نعتیہ یا منقبتیہ شاعری کے قاری کے بارے میں یہ مفروضہ بھی حقیقت ہی ہوتا ہے کہ شاعر کو ان بنیادی باتوں کے بارے میں کافی حد تک علم ہے۔ نعت کے لغوی معنی ہمارے دین اور شریعت کی اصطلاح میں رسول کریمؐ کے اوصافِ حمیدہ بیان کرنا اور ان کی شان و عظمت، ان کی سیرت و کردار، ان کے سراپا پر قلم اٹھانا ہے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی شانِ کبریائی کے بیان کو حمد اور اس کے بھیجے ہوئے پیغمبر حضرت محمدؐ کی شانِ رسالت کا بیان نعت کہلاتا ہے۔ صاحبانِ بصیرت ان دونوں اصنافِ عقیدت کے درمیان جو نازک سا فرق ہے اس سے بھی آگاہ ہیں اور اگر یہ نازک فرق ملحوظ نہ رکھا جائے تو پھر ساری عبادت و عقیدت یوں سمجھئے کہ بے فائدہ ہوگی۔

لیکن محض یہ فرق ملحوظ رکھ کر بھی حمد و نعت لکھ دینا کوئی کمال نہیں۔ معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ کچھ عرصہ قبل تک غزل کے بارے میں یہ بات دہرائی جاتی تھی کہ غزل تو منوں کے حساب سے لکھی جا رہی ہے مگر کچھ کو چھوڑ کر باقی تمام غزلیں محض قافیہ پیمائی اور قافیہ سازی کی ذیل میں آتی ہیں۔ یہاں جب بات حمد و نعت کی چلی ہے تو کہنا یہ لگتا ہے کہ کچھ عرصے سے حمد و نعت لکھنے کا رواج (بلکہ فیشن) بھی بہت فروغ پا چکا۔ لیکن غزل سے کہیں زیادہ حمد و نعت کے معاملے میں یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کیا حمد و نعت نگار کا سارا وجود اپنی حمدیہ و نعتیہ شاعری میں شامل ہے؟ اور یہ وجود شامل ہونے کی بھی شرائط ہیں۔ یہ کہ حمد و نعت نگار نے اپنی ذات، اپنے وجود، اپنی حیاتِ فانی کے ہر ہر لمحے کو اللہ تعالیٰ اور رسول کریمؐ کی دی گئی تعلیمات پر پوری طرح کاربند رہ کر گزارا ہو۔ کلام میں صداقت اور حسن صرف اسی صورت میں پیدا ہوتا ہے، ورنہ تو پھر اللہ ہی اللہ۔ آج کے بے شمار حمد و نعت گو شعراء کی طویل حمدیہ و نعتیہ تخلیقات پڑھ جائیے، آپ کو ان میں شاید فنی حسن اور بے عیبی تو مل جائے گی مگر "کیفیت" اور "سرشاری" نہیں ملے گی کیونکہ نعت گوئی اور نعت خوانی محض زبان اور قلم کا معاملہ نہیں، ایں چیزے دیگرے است!

جناب عزیز جبران انصاری سے جو لوگ ذاتی طور پر واقف ہیں اور جنہوں نے ان کی طویل زندگی کے شب و روز کو قریب سے اور غور سے دیکھا ہے، نیز ان کی غزلیں، نظمیں، افسانے، کالم حتیٰ کہ ان کا عوامی کلام بھی پڑھا ہے اور ان کی طویل تدریسی زندگی سے بھی آگاہ ہیں، وہ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی حمد و نعت بھی ان کی زندگی کی اسی راست فکری، اسلام پر کاربندی، اور خدا کی وحدانیت و نبی

اکرم ﷺ کی رسالت پر مکمل ایمان رکھنے کا ایک تسلسل ہے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ وہ حمد و نعت کی حد تک تو ایک بہت راست فکر اور راسخ العقیدہ مسلمان لگتے ہوں مگر عملی زندگی میں اس کا اُلٹ ہوں۔ انہوں نے اپنا ایک ایک لفظ لکھتے ہوئے قلم کی تقدیس کا خیال رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حمد و نعت لکھتے ہوئے ان کے ذہن و دل کے تمام تر جذبے اور محسوسات ان کے ہمنوا ہو جاتے ہیں اور ان کے شعروں میں عزیز جبران انصاری کی ذاتی و روحانی کیفیات کے عکاس بن کر ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ اپنی عملی زندگی میں بھی درویش صفت ہیں۔ روزی روٹی سے زیادہ انہیں حرمین شریفین کی زیارت کی فکر لاحق رہتی ہے اور جب بھی ان کے پاس اتنے وسائل ہو جاتے ہیں وہ اپنی صحت کی طرف سے مکمل بے نیاز ہو کر ادھر کا رخ کرتے ہیں کہ انہیں بخوبی علم ہے کہ وہاں کے انوار اپنے دل میں جمع کرنا ہی ان کے لئے باعث شفا ہے۔ عشق رسول ﷺ کی سرشاری انہیں ہر وقت انہیں اسلام کی تعلیمات کے عین مطابق زندگی بسر کرنے اور حرمت لفظ کا خاص دھیان رکھنے پر مائل رکھتی ہے۔ اپنی زندگی کے نظریے اور حمد و نعت نگاری کے بارے میں ان کے دوسرے حمدیہ و نعتیہ مجموعے "گلستانِ مدحت" میں "آدابِ مدحت رسول ﷺ" کے عنوان سے جو مقدمہ شامل ہے، اسے انہوں نے اپنے اس تیسرے حمدیہ و نعتیہ مجموعے میں بھی شامل کر دیا ہے جو حمد و نعت کے لئے رہنما اصولوں کا ایک ایسا منشور ہے جس سے کوئی سچا اور راسخ العقیدہ مسلمان اختلاف نہیں کر سکتا اور جس میں حمد اور نعت کے درمیان کی نازک مگر بے حد اہم حد فاصل کو کمال سادگی اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اگر اس کی روشنی میں عزیز جبران انصاری کی حمد و نعت کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اس پر پوری طرح خود بھی عمل کیا ہے۔ ان کی زندگی اور ان کی تحریریں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں۔ کہیں کوئی تضاد دکھائی نہیں دیتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا لکھا ہوا ہر لفظ اثر، وجدان اور عشق آفریں ہے۔ انہی کے ایک نعتیہ شعر کے حوالے سے ان کی کیفیت یوں بیان کی جا سکتی ہے:

فکرِ حبِ مصطفیٰ میں جب میں مستغرق ہوا ۔۔۔ ذہن و دل پر رحمتوں کی دیکھ لی برسات خاص

اسی طرح انہوں نے اپنے درج ذیل دو شعروں میں اپنی زندگی کا مقصد بیان کرتے ہوئے کس خوبصورتی سے اپنی درویش صفت اور دولت دنیا سے بے نیازی کا اظہار کیا ہے:

جاہ و منصب نہ مرتبہ مقصود ۔۔۔ میرے رب، حبِ مصطفیٰ مقصود
حاصلِ زندگی، [illegible] مقصود ۔۔۔ لمحہ لمحہ تری ثنا مقصود

ان دو شعروں میں انہوں نے اپنا فلسفۂ حیات تو بیان کیا ہی ہے مگر فن شاعری کے پارکھ یہ بھی آسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ان شعروں میں کس قدر اختصار کے ساتھ انہوں نے کس قدر بلاغت و فصاحت کے ساتھ اپنا اظہار کیا ہے اور یوں فنِ شعر پر اپنی مکمل دسترس کا ثبوت دیا ہے۔

حمد و نعت میں عصری شعور نہ ہو اور عصری مسائل بیان نہ ہوں تو گویا ہم محض عقیدت کا اظہار تو کر رہے ہوتے ہیں مگر اپنی اور اپنی قوم کی حالت زار کے بارے میں یکسر بے نیاز ہوتے ہیں۔ جناب عزیز جبران انصاری نے اس موضوع پر چند لفظوں میں ہمارے زوال کا سبب کیا خوب بیان کیا ہے:

مسلماں تو نام ہی امن کا ہے ۔۔۔ کیا مسخ خود ہم نے اپنا مقدر

ایک خاص بات ان کے حمدیہ و نعتیہ کلام میں یہ ہے کہ وہ اپنی حمد اور نعت کو غیر ضروری طوالت نہیں دیتے۔ جہاں بھی محسوس کرتے ہیں کہ منتخب کردہ قافیہ ردیف میں وہ اپنی بات کہہ چکے، اللہ کی تحمید اور رسول اللہ ﷺ کی ثنا کر چکے تو پھر اگر چار شعر بھی ہوئے ہوں تو پانچواں کہنے کے

لئے اپنی شعری صلاحیتوں کو آورد کی زد میں لانے سے احتراز کرتے ہیں، جبکہ جہاں ان کی طبیعت رواں ہوتی ہے اور کسی ردیف میں قافیوں کی ہم آہنگی کے ساتھ بہت کچھ کہنے کے لئے ہوتا ہے تو وہ شعری آمد کے سلسلے کو روکتے بھی نہیں۔ یہ کیفیت خاص طور پر ان کی نعت میں نمایاں ہے جہاں "کی" کی ردیف میں تو انہوں نے تین تین نعتیں بھی کہی ہیں جبکہ بعض نعتوں میں صرف چار شعر بھی ہیں۔

جناب عزیز جبران انصاری کے حمدیہ و نعتیہ کلام میں ایک اور قابلِ ذکر چیز یہ بھی ہے کہ انہوں نے ضرورتِ شعری کے تحت کسی کسی شعر میں ایک نیا لفظ یا نئی لفظی ترکیب اختراع کر کے اس خوبی سے استعمال کی کہ اب وہ اردو لغت اور اردو شاعری کا حصہ بن گئی ہے۔ مثلاً

دائمی پروردگاری راحتیں   عارضی ہیں ورنہ ساری راحتیں

میں نہیں سمجھتا کہ اس سے پہلے شاعری میں کسی نے بھی پروردگار کے لفظ میں اتنے خوبصورت طریقے سے حرف "ی" کا اضافہ کر کے پروردگاری جیسی بامعنی ترکیب بنائی ہو۔ ایسی مثالیں ان کے کلام میں کئی جگہ پائی جاتی ہیں۔ زبان و بیان پر دسترس رکھنے والا کوئی بھی اچھا شاعر ہی زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں یوں اضافہ کر سکتا ہے۔

تخلیقی صلاحیت میں جب زبان و بیان پر دسترس بھی شامل ہو جائے تو پھر شاعر کے لئے مشکل ردیفوں میں شعر کہنا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ جناب عزیز جبران انصاری کی بعض حمدیہ و نعتیہ نظموں میں ایسی ایسی مشکل ردیفیں استعمال ہوئی ہیں اور اس کمالِ فن کے ساتھ کہ اچھے اچھے حمد و نعت گو شعراء شاید ان ردیفوں پر طبع آزمائی کرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں یا اگر کچھ کہہ بھی لیں تو وہ آورد تو ہو آمد نہ ہو۔ عزیز جبران انصاری نے تو بہر صورت، کا لفظ قلم، رحیم، تو و بخود، مکمل، ہمیشہ، مسلسل، تقاضے، مقبولیت جیسی ردیفوں میں اچھوتے قافیے استعمال کر کے تخلیقی کمال کر دکھایا ہے۔ اور کہیں بھی حمد اور نعت کے درمیان کے بال سے زیادہ باریک فرق کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ اس سلسلے میں ایک مشکل ردیف کے ساتھ انہی کا ایک شعر دیکھئے

ہو شرک اگر جائے گا، بخشے گا خطائیں   کر شرک سے پرہیز تو جبران مکمل

دینِ اسلام کے مطالعہ اور امتِ مسلمہ کی موجودہ حالتِ زار پر غور کرنے والا شاعر محض حمد و نعت لکھے اور اسلام کی ہمہ گیریت اور قرآن پاک کی تعلیمات کو تمام گمراہیوں کے تدارک کا نسخۂ کیمیا نہ سمجھے تو گویا اس کی حمدیہ و نعتیہ شاعری اپنا مقصد پورا کرنے میں ناکام رہی۔ جناب عزیز جبران انصاری اپنی شاعری میں جا بجا نظامِ اسلامی کی خوبیوں کا بیان کرنے کے ساتھ ساتھ تہذیبِ مغربی کے زیرِ اثر ہمارے ملک میں نافذ کردہ نظامِ حیات کے بارے میں کہتے ہیں:

اس وقت تک ملے گی نہ ظلم سے ہمیں نجات   جب تک نہ ختم ہوں گے یہ خود ساختہ نظام

اور پھر علامہ اقبال کی پیروی کرتے ہوئے کیا خوب فرماتے ہیں

اس عالم کی ضمانت بھی قرآن تو ہے   کوئی دستور نہیں چاہئے قرآن کے بعد

مجموعی طور پر جناب عزیز جبران انصاری کے اس خوبصورت حمدیہ و نعتیہ کلام میں اقرارِ عبدیت، حبِ رسول ﷺ کی سرشاری کے ساتھ ساتھ آج کی نام نہاد روشن خیالی، گمراہی، منافقت اور دیگر بے شمار معاشرتی خرابیوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے ایک سچے مسلمان کی سی جہادی اور اجتہادی کیفیت ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنا کرم فرمائے، ان پر رسول اکرم ﷺ کی نگاہِ خاص ہو اور وہ صحت و تندرستی کے ساتھ ہمیں اسی طرح کی مزید حمدیہ و نعتیہ شاعری سے مستفید اور منور کرتے رہیں۔ آمین!

◆◆◆

ماہنامہ ''تخلیق'' (دسمبر 2016ء) کا ایک جائزہ

ڈاکٹر اشرف آثاری (انڈیا)

ماہنامہ ''تخلیق'' لاہور سے مسلسل 47 سالوں سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کا تازہ شمارہ جلد 47 شمارہ نمبر 12، دسمبر 2016ء کا شمارہ ہے۔ اس عالمی شہرت یافتہ شمارہ کے بانی مدیر مرحوم اظہر جاوید ہیں جن کو حسن کارکردگی کے صدارتی اعزاز سے بھی نوازا گیا تھا اور جو اس معیاری اردو رسالے کے سرپرست اعلیٰ 1969ء سے 2012ء تک رہے۔ 2012ء میں ان کے انتقال کے بعد دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ''تخلیق'' کے مداحوں میں ایک تشویش و تاسف کی لہر دوڑ گئی اور یہ اندیشہ ستانے لگا کہ جانے اب تخلیق کے مستقبل کا کیا ہوگا لیکن مرحوم اظہر جاوید کے بیٹے سونان اظہر جاوید جو اپنے والد محترم کی وفات کے صدمے سے ابھی ابھرے بھی نہ تھے، بڑے استقلال و ہمت کے ساتھ سامنے آ گئے۔ انھوں نے نہ صرف اپنے مرحوم والد محترم کے اس دیرینہ خواب کی آبیاری کی بلکہ اسے مزید بلندیوں کی طرف لے جانے کے لئے اپنی سعی جمیل سے اپنی جدوجہد جاری رکھی جو تا دم تحریر جوش و خروش سے جاری ہے اور آئندہ بھی انشاءاللہ جاری رہے گی۔

آج کے اس دور میں غالباً ایک اردو ادبی رسالے کو لگ بھگ پانچ دہائیوں پر محیط ایک لمبے عرصے تک مسلسل جاری رکھنا کار دارد والا معاملہ ہے وہ بھی ان حالات میں جب اردو رسائل وجرائد کے قارئین روز بروز محدود و کم ہو رہے ہیں اور حکومتی اداروں کی سرد مہری سے اس میٹھی زبان کو محصور و معدوم کرنے کی دانستہ کوششیں ہو رہی ہوں اور اسے تعصب و تنگ نظری کا شکار بنایا جا رہا ہو۔ تخلیق اور تخلیق کے کارکنان اس ضمن میں مبارکباد کے مستحق ہیں اور ان کا جذبہ اور خلوص واقعی قابل صد تحسین و ستائش ہے۔ جن میں نہ صرف اس کے مدیر سونان اظہر جاوید جی کا نام آتا ہے بلکہ امریکہ، انڈیا اور پاکستان میں اس کے نمائندگان خصوصی نیر جہاں، انجم عظیم، رشک ساقی اور جاوید منظور شامل ہیں۔

زیر نظر شمارہ میں سونان اظہر جاوید نے ''پہلی بات'' میں تخلیق سے متعلق قارئین تخلیق کے اذہان میں پیدا ہونے والے چند سوالات یا اعتراضات کا جواب دیا ہے کہ ''تخلیق'' تخلیق کاروں کے ایک مخصوص طبقے کی تخلیقات کو اشاعت میں ترجیح دیتا ہے۔ سونان اظہر جاوید اس کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بذات خود ادبی گروپ سسٹم کے سخت مخالف ہیں اور انہوں نے ہر مرحلے پر اس کی حوصلہ شکنی کی ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے وہ بجا طور پر لکھتے ہیں کہ ہندوستان میں پچھلے 47 برسوں میں بڑے بڑے اداروں کے نہایت ہی معتبر رسائل وجرائد جیسے کھلونا، بانو، شمع اور پاکستان میں علامت، افکار، عصری تقاضے، اوراق اور طلوع افکار جیسے رسائل بھی بند ہو گئے لیکن سونان اظہر جاوید ''تخلیق'' کی اب تک مسلسل اشاعت کا سہرا ان تمام احباب کے سر پر باندھتے ہیں جو اندرون اور بیرون ملک اپنی محبتوں کے دامن میں سموئے تخلیق کو ہر جگہ لئے پھرتے ہیں اور اسے ادب کے نئے قارئین سے بھی متعارف کر رہے ہیں۔ میرے خیال میں یہ واقعی مدیر تخلیق کی وسعت نظری اور فراخ دلی ہے۔

ان کا یہ گلہ بھی بجا ہے کہ اکثر اچھے اور خاصے خوش حال ادیب و شاعر بھی مفت پرچہ لینے کے متمنی ہوتے ہیں جبکہ رسائل کی لاگت اور ڈاک خرچ وغیرہ میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ انہوں نے بجا فرمایا ہے کہ "جب ادب میں سیاست در آئے اور سیاست سے ادب (تہذیب و شائستگی) دور ہو جائے تو معاشرے اور قومی پہچان اور شان ختم ہو جاتی ہے۔ ہم اسی ٹوٹ پھوٹ کے شکار ہیں۔" اسی اداریہ میں انہوں نے "تخلیق" کے سال 2016ء کے تخلیق ایوارڈ کا اعلان بھی کیا ہے اور اسے محترمہ عذرا اصغر صاحبہ کو دینے کا فیصلہ بھی سنایا ہے جو انہیں اظہر جاوید مرحوم کی چھٹی برسی کے موقع پر فروری 2016ء میں پیش کیا گیا۔ جو ایک اچھا اور غیر جانبدارانہ فیصلہ ہے۔ واقعی محترمہ عذرا اصغر صاحبہ اس کی مستحق تھیں۔

تخلیق کا زیر تبصرہ شمارہ حسب سابق ہند و پاک کی فکر انگیز اور معیاری تخلیقات کی بہار اور تخلیق کاروں کی کہکشاں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ حمد و نعت، خالد اقبال یاسر، امین راحت چغتائی، سیمل سروش، تخلیق ایوارڈ 2016ء کی روداد، تعارف و مدحِ فن و ادب، عذرا اصغر پر سلمیٰ اعوان اور شبہ طراز کے مضامین، ڈاکٹر انور سدید مرحوم، ڈاکٹر ہارون رشید تبسم جاوید، ڈاکٹر جواز جعفری، ذکا کشور و کرم حیدری ساقی کے مختلف موضوعات اور شخصیات پر فکر انگیز مضامین، منظومات میں ابصار عبد العلی، پروین شاکر، نسیم سحر، شہزاد نیر، کرشن پرویز، پرویز بخت قاضی، سید مبارک علی شمسی، غلام نبی خیال، جمیل حیات، توقیر مشتاق، شارق ہمشی کی معیاری تخلیقات۔ نامور افسانہ نگاروں یٰسین احمد، علیہ سید، عذرا اصغر، رینگ کنول، ڈاکٹر زین سالک، شیخ خالد، طارق بلوچ صحرائی، روحانہ شمشین خان، رفیع مرزا، اظہر جاوید کے متعلق تیز افسانے اور منظور حسین یاد، جلیل عالی، آصف ثاقب، سید ریاض حسین زیدی، سعود عثمانی، حسین مجروح، حسن عباسی، عراق مرزا، رشید ودھیال، مرزا احمد طور رطانی، ڈاکٹر ایوب ندیم، آفتاب خان، اسلم سحاب ہاشمی، نیئر رانی شفق، آنسہ ناہید کنول، امر ملکی، ارشد محمود ارشد، وصف وفاقی جدید اب ولہجے میں غزلیں، ڈاکٹر رشید امجد، مستنصر حسین تارڑ، اظہر جاوید کی یادنگاری، سلمیٰ اعوان کا سفرنامہ، وحشی سعید کے علامتی افسانہ "کیا راون مر گیا؟"، پروفیسر ڈاکٹر اشرف آداری کا فکر انگیز تجزیہ تجزیہ نگاری کے تحت ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کا طنز و مزاح، حسن عسکری کاظمی، مسلم شمیم، پروفیسر خلیل الرحمٰن، اخلاق عاطف، ملک اشرف ذکی کے جائزے، ڈاکٹر انور سدید، تبسم جاوید، آفتاب خان کے تبصرے اور انجمن خیال کے تحت مشاہیر قلم کاروں کے مکتوبات تخلیق کے زیر تبصرہ شمارے میں شامل ہیں اور پھر آخری صفحے پر موصولہ کتب و رسائل کی تفصیل درج ہے۔

بڑے سائز میں 160 صفحات پر "تخلیق" کا یہ شمارہ اپنے اندر ایک کائنات سموئے ہوئے ہے۔ قوس قزح کے رنگ بکھیرنے والا یہ ادبی رسالہ کسی دستاویز سے کم نہیں ہے۔ اس میں شامل تمام قلم کاروں کی تخلیقات پڑھ کر سونان اظہر جاوید کے "کھلی بات" عنوان کے تحت لکھے گئے اداریہ میں ظاہر کی گئی اس آراء کی کہ تخلیق کے ہر شمارے میں کوئی گروپ بندی ہرگز نہیں ہے اور اس میں جہاں قد آور قلم کاروں کی معیاری تخلیقات کو بھی شائع کیا جاتا ہے اور ان کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ بھرپور تائید و تصدیق ہوتی ہے۔ غالباً یہی ایک بات بھی تخلیق کی مقبولیت اور ادبی حلقوں میں اس کی ہر دلعزیزی کی ضامن ہے۔ سونان اظہر جاوید بطور خاص اردو زبان و ادب کے لئے ان مجاہدانہ خدمت و حوصلے کے لئے مبارک باد کے مستحق ہیں۔ محبان اردو زبان و تخلیق کا بھی یہ فرض اولین بنتا ہے کہ وہ ہر مرحلے پر سونان اظہر جاوید اور تخلیق کی آبیاری کریں اور اس کے قیام و دوام کے لئے آگے آئیں۔

◆◆◆

سیّد انور جاوید ہاشمی کے تبصرے

افسانوی نثر پر تحقیق (آزادی کے بعد)

محقق : ڈاکٹر سکندر حیات میکن　　　مبصر : سیّد انور جاوید ہاشمی

صفحات : 303　　　قیمت : -/500 روپے　　　ناشر : مثال پبلشرز فیصل آباد

زیر مطالعہ تبصروں میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر کے قیصر تجلی کے تنقیدی مضامین کی کتاب پر فلیپ کا ذکر آیا تھا انہی کے شاگرد ڈاکٹر سکندر حیات میکن کی تحقیق ''اردو میں ادبی تحقیق: آزادی کے بعد'' شعبہ اردو اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی لاہور سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری (2014) کے لیے پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا تھا۔ اسی مقالے کا ایک باب ''افسانوی نثر پر تحقیق: آزادی کے بعد'' میں چند اہم اور نمائندہ موضوعات کی حامل تحقیقی کاوشوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کتابی صورت میں منظر عام پر لایا گیا ہے۔ رواں سال کی یہ تحقیقی کتاب 2012 تک کی تحقیقی کاوشوں کو پانچ ابواب میں عرض تحقیق، اردو داستان پر تحقیق کا جائزہ، اردو ناول پر تحقیق کا جائزہ، اردو افسانے پر تحقیق کا جائزہ، اردو ڈرامانویسی پر تحقیق کا جائزہ اور حاصل تحقیق کو قارئین سے متعارف و آشنا کرواتی ہے۔ اس کتاب کے آخری حصے میں کتابیات (حوالہ جات) نے اس کی وقعت میں اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر انوار احمد نے اس کا فلیپ لکھا ہے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری ایک اور استاد محقق نے مقالہ نگار کی کارکردگی کو سراہا ہے۔ اس کتاب کا انتساب استاد محترم ڈاکٹر غلام عباس گوندل کی ادبی بصیرتوں کے نام کرتے ہوئے ڈاکٹر سکندر حیات میکن نے یہ بھی عرض کروایا ہے کہ ''تکمیلیت صرف خدا کی ذات کو زیب ہے۔ میرا یہ مقالہ ایک طالب علمانہ کاوش اور ایک ابتدائی صحیفہ ہے جس میں تحقیق کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔'' نثری ادب سے دلچسپی رکھنے والے نیز جامعات میں تحقیق کے لئے سرگرداں طالبان علم و ادب کے لیے یقیناً یہ ایک مفید اور کارآمد تحقیقی کتاب ہے جس سے وہ استفادہ کرتے رہیں گے۔

خاکہ گردی (خاکے)

مصنف / خاکہ نگار : نسیم سحر　　　مبصر : سیّد انور جاوید ہاشمی

صفحات : 216　　　قیمت : 400 روپے　　　ناشر : دنیائے اردو پبلی کیشنز، اسلام آباد

1941ء میں راولپنڈی میں شعر و ادب سے وابستہ گھرانے میں پیدا ہونے والے محمد نسیم ملک کو شعر و ادب کی دنیا میں نسیم سحر کے نام سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ 1960ء میں میٹرک کیا۔ ملازمت کے لیے سعودی عرب کے شہر جدہ میں ربع صدی گزارنے کے دوران ادبی پرچہ ''سحاب'' کی ادارت کے فرائض بھی ادا کرتے رہے۔ وہاں کی علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں سرگرم رہنے والے نسیم سحر کا تحریری

نعتیہ مجموعہ "یہ جو سلسلے ہیں کلام کے" 1996ء میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ پہلی اذان (1977ء)، جزیرہ سمندر (1982ء)، دریچۂ شب (1983ء)، جگنو ہے ستارے (1990ء)، راستے اجلے موسم میں (1998ء)، بس انداز (2002ء) اور چہرۂ خواب (2003ء) کے ساتھ ہی اک لطیف سرگوشی (1990ء) اور "روشن دان میں چڑیا" (1991ء)، دو ہائیکو مجموعوں نیز شاعری کی جملہ اصناف پر بھی مجموعہ "آرام ضروری ہے" کہ شاعر نے اب نثری خاکوں کا مجموعہ "خاکہ گردی" دنیائے اردو پبلی کیشنز سے طبع کروا کے پیش کر دیا ہے۔ 216 صفحات میں سرورق، اندرونی تفصیلات، فہرست، انتساب، 28 خاکوں سے پہلے "خاکہ گردی کا پہلا شکار" تبسم سحر نے قارئین سے گفتگو میں خاکہ نگاری کے حوالے سے اپنی مساعی، اب تک لکھے گئے خاکوں پر اپنا نقطۂ نظر اور دہشت گردی سے تلفظ "گردی" کو عنوان کا لاحقہ بنانے کا احوال دل چسپ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ خاکے کس نوعیت کے ہیں، اہلِ قلم اور ان کی تخلیقی سرگرمیوں میں ان کے کارناموں، کتابوں سے خاکہ گردی کا مطالعہ کرنے والے خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ زیادہ تر خاکے سعودی عرب میں قیام کے دوران وہیں کے اہلِ قلم اور شعراء کے لکھے گئے ہیں جن کے عنوانات میں طنز کے ساتھ مزاح کی چاشنی بھی ملتی ہے۔

منیر راج کے تاریخی ڈرامے

مرتب: طفیل اختر   **مبصر: سیّد انور جاوید ہاشمی**

صفحات: 280   قیمت: 500 روپے   پبلشر: پرائم ٹائم پبلی کیشنز، لاہور

اپریل 2017ء میں اسٹیج، ٹی وی، ریڈیو ڈرامہ نگار منیر راج کے پانچ تاریخی ڈراموں "پورس دی گریٹ"، "روپ متی اور باز بہادر"، "رضیہ سلطان"، "قلعہ مہتاب" اور "کالا کرسال والا" کو کتابی شکل میں طفیل اختر نے مرتب کیا ہے۔ اس کا انتساب ان لاکھوں ناظرین کے نام کیا گیا ہے جنھوں نے منیر راج اور ان کے 168 ڈراموں کو زندہ رکھا ہوا ہے۔

کتاب کے آغاز میں روزنامہ "مساوات" لاہور کے صحافی منیر راج نے اپنی صحافتی زندگی کے پچاس سالہ عہدِ حیات میں بندش، آرٹس کونسلوں کا قیام، فیض صاحب کی نگرانی و سرپرستی، آرٹ سے وابستہ فنکاروں اور دیگر کے حقوق و مسائل کے لیے جدوجہد کی بہت عمدہ لفظی تصویر کشی کی ہے۔ یہ ڈرامے جو براہ راست عوام کے لیے ریڈیو اور ٹی وی کے ناظرین کے لیے پیش کیے گئے تحریری صورت میں محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ منیر راج کی یہ دوسری کتاب ہے۔ پہلی کے بارے میں کوئی نشان دہی نہیں کی گئی البتہ تیسری (آنے والی) "منیر راج کے پنجابی ڈرامے" کی نوید دی گئی ہے جس میں وہ اپنی فن سے وابستگی کا مزید احوال پیش کریں گے۔ گزشتہ دو دہائیوں سے اب تک امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، بانو قدسیہ، اشفاق احمد اور یونس بٹ وغیرہ کے ڈراموں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ طفیل اختر نے منیر راج کی خلاقی اور ہنرمندی کا اعتراف کرتے ہوئے ان ڈراموں کی اشاعت کا اہتمام خوب کیا ہے۔

لفظ بولتے ہیں

مصنف : قیصر نجفی **مبصر : سید انور جاوید ہاشمی**

صفحات: 224 قیمت: 400 روپے اشاعت: 5 مئی 2017ء ناشر: اکادمی بازیافت، اردو بازار، کراچی

پانچ شعری مجموعوں، تحقیق و تنقید اور عملی تنقید کے دو مجموعوں کے شاعر و مبصر اور نقاد پروفیسر (ریٹائرڈ) قیصر نجفی کا اصل نام محمد رمضان ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان (صوبہ سرحد) میں 1941ء میں پیدا ہوئے۔ درس و تدریس سے پیشہ ورانہ جب کہ علم و ادب سے دلی چسپی کے سبب وابستہ رہنے والے قیصر نجفی کا شعری مجموعہ "شہرِ جاناں" (1998ء) این بی ایف اسلام آباد نے سال کا بہترین مجموعہ قرار دیتے ہوئے ایوارڈ کا حق دار بنایا تھا۔ رسائل و جرائد میں کالم اور اہلِ قلم نیز ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے حوالے سے نقد و نظر سے انھیں خصوصی شغف رہا ہے۔ 2001ء میں ان کے تحقیقی مقالے "فیض ایک رجحان ساز شاعر" کو اکادمی ادبیات نے اول انعام سے نوازا تھا۔ 2002ء میں ان کا نعتیہ مجموعہ "رب آشنا" بھی کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔ "لفظ بولتے ہیں" قیصر نجفی کے پندرہ تنقیدی و تجزیاتی مضامین پر مبنی کتاب اکادمی بازیافت اردو بازار کراچی نے شائع کی ہے۔ اس کی تقریظ میں ڈاکٹر ناصر عباس نیر نے لکھا ہے کہ "قیصر نجفی کی تنقید میں مطالعے کی وسعت صاف جھلکتی ہے۔ ان کا ادب کی تاریخ کا وسیع مطالعہ اور اس کی بصیرت نیز تنقیدی تحریروں میں قاری کی دل چسپی کا سامان وافر ہے۔" پروفیسر حسن سجاد نے بھی موصوف کی ادبی قد و قامت کا تعین کرواتے ہوئے تعارفی مضمون لکھا ہے۔ پروفیسر سحر انصاری نے لکھا ہے کہ "قیصر نجفی نے معروف ادیبوں اور شاعروں (فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی، صبا اکبر آبادی، شبنم رومانی) کے ساتھ ساتھ یکجا اپنے تحقیق کاروں کا بھی مطالعہ کیا ہے جن تک نقادوں کی نظر کم ہی پہنچتی ہے۔ تجزیاتی نظر اور تنقیدی مزاج کے حامل قیصر نجفی کا یہ مجموعہ اہلِ نظر سے اپنے حصے کی داد پائے گا۔" "لفظ بولتے ہیں" کا انتساب معروف نقاد مشفق خواجہ (مرحوم) کے نام کیا گیا ہے جنھوں نے قیصر نجفی کو نقد و نظر کی راہیں سمجھائیں۔ قیصر نجفی کو شعری کلیات اور مجموعوں پر انعامات بھی ملتے رہے ہیں۔

◆◆◆

اظہر جاوید کی یادیں

[illegible]

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ جناب سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' سے میرا تعلق اس کے جنم دن سے تو نہیں لیکن اس کے بچپن سے ضرور ہے۔ یعنی اس کے تیسرے یا چوتھے شمارے سے میں نے مرحوم و مغفور اظہر جاوید سے اپنا رابطہ عملی طور پر فعال کیا اور اپنا قلمی تعاون دینا شروع کیا۔ ہم دونوں میں کئی اقدار مشترک تھیں۔ ان میں اولین ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید کی شخصیات تھیں۔ جو مجھے بہت عزیز تھیں (اور جنہیں میں بہت عزیز تھا!) اور میرے بارے میں ان دونوں کی مثبت رائے نے اظہر صاحب کو بھی متاثر کیا۔ دوم اظہر صاحب اور خاکسار لگ بھگ ہم عمر تھے اور فون پر بھی کئی بار ایسی باتیں کر سکتے تھے جو بزرگوں یا بچوں کے ساتھ نہیں ہو سکتیں۔ (میں ان دنوں انڈیا میں تھا اور فون پر بات چیت ایک آسان عمل تھا!) لیکن ان دو امور کے علاوہ اظہر صاحب کی ہمہ جہت شخصیت (فراست، زیرکی، اولوالابصار ہونا) اور اس کے ساتھ ان کی شخصیت کے سادہ پن، خلوص اور بے ریب و ریا ہونے کی خاصیت نے مجھ جیسے طلیع الفطرت کو تو جیسے موہ لیا۔ آخری بات جس نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا وہ سرحد پار کے قلمکاروں سے ان کی دوستی تھی۔ ''تخلیق'' کا کوئی شمارہ انڈیا کے چھ سات سے لے کر دس بارہ احباب کی تخلیقات کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا تھا اور دیگر کئی پاکستانی رسائل ''تخلیق'' سے ہندوستانی قلمکاروں کے رشحات قلم نقل کر کے 'ری پروڈیوس' کیا کرتے تھے۔ اظہر جاوید صاحب کی وفات سے بہت پہلے وفات نے ہم سب کو سوگوار کر دیا۔ لاہوری ادبی رفاقتوں کے علاوہ ان کی صحت کو خدا جانے کس اندرونی خلفشار نے لگاتار گرنے پر مجبور کیا اور وہ اپنے خالق سے جا ملے۔ ان کے خاک آسودہ ہونے کی خبر مجھے کینیڈا میں ملی۔ یہ عرض کروں کہ 1985 میں انڈیا چھوڑنے کے بعد میں بوجوہ اردو کے تئیں کچھ تساہل میں مبتلا ہو گیا اور انگریزی اس کی جگہ لیتی گئی۔ انگریزی میں منقلب و منتقل ہونے نے اردو کے تئیں سست العمل ہونے پر مجبور کر دیا اور میں ان برسوں میں تخلیق کے لیے بہت کم لکھ سکا۔ اپنے دوست کی وفات کے بعد جب مجھے اس بات کا علم ہوا کہ عزیزی سونان نے ''تخلیق'' کی باگ ڈور سنبھال لی ہے تو بہت اچھا لگا لیکن پھر بھی اپنا رابطہ اس حد تک استوار نہ کر سکا کہ باقاعدگی سے ''تخلیق'' کے لیے لکھوں۔ جو شمارے میری نظر سے گزرے ہیں ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ''تخلیق'' اپنی اسی روش پر باقاعدگی سے گامزن ہے جس کو مرحوم اظہر جاوید نے اختیار کیا تھا۔ آج مجھے اس کے لیے اپنی تخلیقات بھیج کر بہت مسرت ہو رہی ہے۔

ستیہ پال آنند (امریکہ)

﴿2﴾ سونان بیٹے!

آپ کا پرچہ جس باقاعدگی سے مل رہا ہے اور میں اسی قدر بے قاعدگی سے اسے پڑھ رہا ہوں لیکن اس بے قاعدگی میں اتنی

باقاعدگی ضروری ہے کہ مجھے جو کچھ پڑھنا ہوتا ہے اُسے پڑھ لیتا ہوں۔ مثلاً ڈاکٹر رشید امجد کے افسانے اور اُن کی ''عاشقی صبر طلب'' کے تھے، مسلم شمیم اور ظفر سپل کے مضامین، جلیل عالی کی غزل اور سلمیٰ اعوان کا سفرنامہ۔ ایک 88 سالہ بوڑھے سے اب اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ رشید امجد اور سلمیٰ اعوان دو ایسے نام ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تازہ شمارے میں منظر ایوبی، حسن عسکری کاظمی اور سید ریاض حسین زیدی کی غزلیات پڑھ کر دل رک گیا۔ انھوں نے اپنی اپنی ''واردات'' کا بڑے سلیقے سے برملا اظہار کیا ہے۔

زمرۂ خطوط میں شعلہ چنگیزی کے افسانے پر ایک تنقید پڑھی جس میں تنقید نگار نے افسانے کے اختتام کو ''اختتامیہ'' قرار دیا ہے۔ ایسے الفاظ حذف کرنے کا آپ کو اختیار حاصل ہے۔ کسی کو پروفیسر کلیم الدین احمد یا اسلوب احمد انصاری (مرحومین) کی روحوں کو سرشار کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کے بارے میں تو میں اُن سب کی رائے سے متفق ہوں جو کہتے ہیں کہ سونان نے پرچے کو آگے بڑھانے کا کام کیا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ آپ کا ذوق و شوق سلامت رکھے۔ آمین۔

امین راحت چغتائی (ٹیکسلا)

3 جولائی عزیزم سونان اظہر جاوید،

السلام علیکم۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ جون 2017ء کا ''تخلیق'' نظر نواز ہوا۔ ماشاء اللہ حسب توفیق فکر انگیز شعری و نثری تخلیقات کا حامل ہے۔ ''پہلی بات'' میں آپ نے لکھا کہ ''ایوارڈ دیے نہیں جاتے، اب لیے جاتے ہیں۔'' آپ کی بات اصولاً درست ہے لیکن ایسا تو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ شاید ہی کبھی کوئی ایوارڈ ''دیا'' گیا ہو۔ یہاں تو یہ بھی ہوتا ہے کہ دینے والے خود کو ایوارڈ سے نواز دیتے ہیں۔ (اس سال بھی یہی ہوا ہے۔) ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں سید منظور حسین یاد کا مضمون دلچسپ تو ہے لیکن اس میں بیان کردہ بعض ''حقائق'' مجھے ہضم نہیں ہوئے۔ ''جمیل الدین عالی ——'' (ڈاکٹر انور سدید) نے ذہن کی آبیاری کی۔ ''عالمگیریت ——'' (مسلم شمیم) ایک وقیع مضمون ہے۔ پڑھ کر علم میں اضافہ ہوا۔ ''پرویز مہدی ——'' (ڈاکٹر امجد پرویز) ایسا ہی ہے جیسا ہونا چاہیے تھا بہترین۔ ''مطلبیہ عہد میں ——'' (ظفر سپل) ریکارڈ میں رکھنے کے لائق ہے۔ اخلاق عاطف نے ڈاکٹر محمود اسیر کی ادبی خدمات کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔ افسانوں میں ''برکت'' (ڈاکٹر رشید امجد)، ''اسپ تازی'' (شعلہ چنگیزی)، ''آدھے چاند کی رات'' (نجم الحسن رضوی)، ''ملاح کا بیٹا'' (محمد اسلم)، ''حق کی آواز'' (سیما پیروز) اور ''بے سوال باتیں'' (اظہر جاوید، طیف بابا) پسند آئے۔ (تمام نہیں پڑھ سکا)۔ ملک مقبول صاحب نے ادب کے ایک سرگرم لیکن شہرت سے گریزاں خادم افتخار مجاز کا بہت عمدہ خاکہ سپردِ قلم کیا ہے۔ جو چند مضامین خصوصی تحسین کے مستحق ہیں ان میں ''عاشقی صبر طلب'' (ڈاکٹر رشید امجد) اور ''سیاہی کی قوم'' (پیروز بخت قاضی) شامل ہیں۔ شعری کاوشوں میں اظہر جاوید، جلیل عالی، بشریٰ رحمن، کلیم احمد بشیر، اعزاز احمد آذر، اور منظر ایوبی کی غزلوں نے خاص طور پر متاثر کیا۔ جلیل عالی کا یہ شعر ہر سوچنے والے کے دل کی آواز ہے۔

نہ جانے کون سے بدلے اتارتی رہی ہے ٭ زندگی ہمیں قسطوں میں مارتی رہی ہے

ڈاکٹر ایس۔ ایم معین قریشی (کراچی)

﴿4﴾ بہت عزیز و محترم سونان اظہر جاوید صاحب سلامت رہیں!

گزشتہ ایک سال سے آپ "تخلیق" کا پرچہ مجھے بھیج رہے ہیں۔ اس عنایت کا تہہ دل سے شکر گزار بھی ہوں اور دعا گو بھی۔ جون 2017ء کا شمارہ دو تین روز پہلے موصول ہوا۔ سرورق بہار آفریں ہے اور اس کی تخلیقات بھی دلنشیں ہیں۔ اس شمارہ میں محترم ملک اشرف ذکی صاحب کا ایک مضمون محترم پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے حوالے سے ہے۔ اس میں محترم ملک صاحب نے مضمون کے آغاز کی سطور میں ڈاکٹر انور سدید مرحوم کی رحلت پر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے ذیل کا شعر اپنا شعر کہہ کر لکھا ہے۔

آج اک پورا برس بیت گیا جس کے بغیر ——— جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

دراصل یہ شعر ملک صاحب کا نہیں بلکہ احمد فراز خلد آشیانی کا ہے اور یہ غزل گیارہ اشعار پر مشتمل ہے جو فراز صاحب کے شعری مجموعہ "درد آشوب" کے صفحہ 54،55،56 پر موجود ہے۔ یہ جون 1966ء میں شائع ہوا۔ اس میں ملک صاحب نے صرف ایک لفظ "اور" کی جگہ "پورا" لکھ دیا ہے۔ جگہ کی گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے سارے شعر نہیں لکھتا البتہ مطلع اور مقطع اور مذکورہ شعر درج ذیل ہیں۔

جز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے ——— تو کہاں ہے مگر اے دوست پرانے میرے

مذکورہ شعر:

آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر ——— جس کے ہوتے ہوئے ہوتے تھے زمانے میرے

مقطع:

چارہ گر یوں تو بہت ہیں مگر اے جان فراز ——— جز ترے اور کوئی زخم نہ جانے میرے

ملک اشرف ذکی صاحب ایک بہت معروف و معروف ادیب شاعر ہیں۔ ان کو غالباً مغالطہ ہوا ہوگا۔ یہ نکتہ صرف اس لئے کر رہا ہوں کہ اسی طرح اشعار سفر کرتے کرتے غلط ناموں کے ساتھ مشہور ہو جاتے ہیں اور اصل شاعر کی روح بے چین ہوتی رہتی ہے۔ بہت معذرت!

سلطان سکون (ایبٹ آباد)

﴿5﴾ عزیز محترم سونان اظہر جاوید!

تسلیمات۔ تازہ تخلیق، مرقع حسن و خوبی، شعر و ادب کی خوب صورت جنتیں لے کر جلوہ آرا ہوا۔ سرورق کی جمال آفرینی اور مندرجات کی دل کشی نے خوب سرشار کیا۔ اظہر جاوید مرحوم کی روح اس کاوش اور کوشش سے خوش ہوتی ہوگی۔ مرحوم تخلیق کی ادبی سربلندی کے لیے خون پسینہ ایک کر دیتے تھے۔ صد شکر کہ آپ ان کے نقش قدم پر چل کر رسالے کی قدر و قیمت کو اور بڑھا رہے ہیں۔ غزل کے گلشن میں رنگ رنگ کے پھول بہار دکھا رہے ہیں۔ ان دنوں فنی و عروضی رسالہ کم ہی "اہل فن" کو حاصل ہے میں بھی اس کو پڑھ کر سوچ میں پڑ جاتا ہوں۔ کہ کیسے کہوں اور کیا کہوں۔ متفاعلن (م ت فا علن) اور تروبع مستفعلن (م ف تع لن) سے متعلق اظہارات "بزعم خود" اساتذہ کا پاؤں بھی رپٹ جاتا ہے۔ دیں ہم "نظیر و غزل" میں کئی دل کو لگنے والے اشعار موجود ہیں۔ عربی اسم کیف و کم کے اپنے تقاضے ہیں۔ قاعدے کے مطابق یہ صفت سے وجود پاتا ہے۔ مثلاً انسانی سے انسانیت، ذاتی سے ذاتیت، شخصی سے شخصیت وغیرہ شاید یہ عربی کے لفظ ہوں۔ فارسی ترکیب میں ایسا ممکن نہیں۔ یکساں سے یکسانی ٹھیک ہے یکسانیت غلط، ادا گزیدہ سے گزیدگی ٹھیک

ہے؟ اگر غیرت غلط ہے تو عالم گیر سے عالم گیری ٹھیک ہے عالم گیریت غلط۔ خوف ناک سے صرف خوف اسم ہو۔ خوفناکیت کہاں کی تک ہے؟ بھائی رشید آفریں صاحب نے اپنے خط میں مجھے بھی مذکور کیا ہے یہ ان کی مہربانی ہے میں ان کو پڑھتا ہوں اور خوش ہوتا ہوں۔ انہی سے مجھے ثاقب اسلم کے سید جاوید صاحب قلم کے سانحہ ارتحال کی خبر ملی۔ ثاقب اسلم اچھے پرانے مہربان تھے اپنے رسالے "ید بیضا" میں اس ناچیز کو بڑی عزت سے اٹھاتے بٹھاتے تھے۔

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

﴿6﴾ ڈیئر سونان۔ سلامت باشد

مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ آپ نے تخلیق کا معیار برقرار رکھا۔ اگرچہ آپ پر اسرار الخمس کی مانند الفاظ و قافیے تحریروں کی مانند نہیں آتے ہوں گے، جس کا اظہار کسر نفسی سے 'پہلی بات' میں کیا ہے۔ تاہم آپ کو لفظوں کی پرکھ اور پہچان ہے۔ "ابتداء میں کلام تھا۔ کلام خدا کے ساتھ تھا۔ خدا کلام تھا۔" کلام Logos کو بعض آسمانی صحف قرار دیا گیا ہے۔ تعمیر مرئی نہ اسرار آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں۔ کہا جاتا ہے کہ باپ اپنے بیٹے کو جاگیر اور دے سکتا ہے، مگر اپنا علم نہیں۔ ایسا علم حاصل کرنے کے لیے بیٹے کو خود محنت کرنا ہوتی ہے۔ اظہر جاوید تعلقات کی پرواہ کیے بغیر ہی معیار کو مد نظر رکھتے۔ مجھے سخت ندامت ہوئی جب میرے استاد محترم نے فرمائش کی کہ میں اظہر جاوید سے سفارش کر کے ان کی تحریر لگوا دوں۔ میں نے عرض کی کہ اظہر جاوید کا مزاج مطلق العنان بادشاہوں کا سا ہے، تخلیق اس کی فکری فنی ریاست ہے۔ کیا عجب آنکھیں نکلوا دے، چمڑی کھنچوا دے، زندہ دیوار میں چنوا دے۔ اظہر جاوید نے یاد ہو تحت کی بار ضیائی دور کے مانند تخلیق پر باہمت کے فقروں کے کوڑے مارے۔ استادانہ شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا میرے مربی تھے ان سے 1980 کی دہائی میں عرض کی کہ جو کچھ کہنا چاہتا ہوں لکھنا چاہتا ہوں لکھتا تو آسان کی موت مارا جاؤں گا۔ "ایک تنا دوسرے کنے سے یہ کہتا تھا کہ بھاگ ورنہ تو بھی مارا جائے گا آسان کی موت۔" متبسم ہوئے اور فرمایا کہ سامنے ایک پردہ تان دیا کرو Defuse کر دیا کرو۔ میرا ایک افسانہ قبل ازیں "خدا تبدیل کر لے" کوئی بھی چھاپنے پہ آمادہ نہ ہوا۔ حسین انجم، صہبا لکھنوی کے پروفیسر مجتبیٰ حسین صدر شعبہ اردو نے سرزنش کی تھی کہ تم ازکم میرے سامنے شعبہ اردو میں تو غلط اردو نہ بولو۔ پرائمری اسکول میں استاد محترم نے مجھے یہ کہتے سنا کہ "ہم اس درخت کو توڑ لائے گا" تو انہیں دل کا دورہ پڑنے لگا، موصوف کا تعلق لکھنؤ سے رہا تھا۔ فرمایا کہ تم روز مجھ سے اردو بول لیا کرو۔ جبکہ عذرا اصغر جیسی ادیبہ سے میں اب تک سیکھتا ہوں۔ زبان کا نکھار روزمرہ کا استعمال۔ یہ انعام ان ہی کو جچتا تھا۔ حق بحق دار رسید۔ مجھے بہت ہی خوشی ہوئی کہ تخلیق نے میرٹ پہ انعام دیا ہے۔

آغا گل (کوئٹہ)

﴿7﴾ محترم سونان اظہر جاوید صاحب۔ سلام مسنون۔

تخلیق باقاعدگی سے مل رہا ہے اور جب بھی ملتا ہے آپ کی محنت اور کمٹمنٹ کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے اپنے والد مرحوم اور میرے طرحدار دوست کی وفات کے بعد تخلیق میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور بتدریج اسے خوب سے خوب تر بنانے کی مساعی

میں مصروف ہیں۔ میں کافی عرصے سے اس کے لیے کوئی تخلیقات نہیں بھیج رہا تھا کیونکہ کچھ تخلیقات جو بھیجی تھیں وہ ادھر اُدھر ہو گئیں اور آپ کے آفس سے جب رابطہ کیا تو وہ لوگ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکے۔ تاہم ابھی کچھ دن قبل آپ کا خط بلکہ حکمنامہ موصول ہوا تو ''تو یہ تو ذکر'' ایک مرتبہ پھر حاضر ہوں کہ تخلیق سے میرا تعلق بہت ہی پرانا ہے۔ ابھی چند دن قبل فائلیں دیکھ رہا تھا تو اظہر جاوید کے بہت سے خطوط ملے جن پر کسی وقت لکھوں گا۔ اس وقت اپنا ایک مضمون، دو غزلیں آپ کو ارسال کر رہا ہوں، ساتھ ہی حال ہی میں شائع ہونے والی اپنی دو کتابیں بھی بھیج رہا ہوں تاکہ اگر ممکن ہو تو ان پر کسی سے تبصرہ لکھوا کر تخلیق میں شامل کر سکیں۔

تخلیق کے جون کے شمارے پر کچھ تبصرہ بھی کرنا چاہتا تھا مگر اس میں شاید کچھ وقت لگ جائے اور یہ آئندہ شمارے میں شامل نہ ہو سکے اس لیے آج کا خط یہیں تک محدود رکھتا ہوں۔

نسیم سحر (راولپنڈی)

﴿8﴾ ڈیئر سونان! اسلام مسنون!

تخلیق تازہ یعنی رسالے کا نیا شمارہ موصول ہوا اور اس کے رنگ و روپ سے بہت خوشی ہوئی۔ آپ کو دعائیں دیں گے اظہر جاوید کے جانے ہوئے اس چمن زار کو اپنے پورے اعتماد اور سلیقے سے سنبھال رکھا ہے۔ آپ کی کاوش ایسی ہے کہ اس کی وجہ سے تخلیق کی پذیرائی دنیا میں بھی زیادہ وسیع حلقوں تک رسائی ہوگی اور بین الاقوامی ادبی رابطے مضبوط ہوں گے۔ حسب توقع تازہ شمارے میں بھی وقیع نثری اور شعری تخلیقات شامل ہیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو قابل قدر اہل قلم کا تعاون حاصل ہے۔ آپ کی پہلی بات بھی بڑی اہم ہے کیونکہ ادبی معاملات میں آپ بڑی خلوص سے گفتگو کرتے ہیں۔ آپ نے پچھلے شمارے میں اظہر جاوید کے جنم دن پر جو مضمون لکھا تھا بے حد پسند آیا۔ رشید امجد نے اپنی یادنگاری سے کاغذ پر گزرے دنوں کے جو چراغ روشن کیے ہیں ان سے ماضی کی پیشانی پر لگے وہ سارے داغ دھبے نظر آنے لگے ہیں جو اب تک لوگوں کی نظروں سے چھپے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس بار بھی متاثر کیا۔ پچھلے شمارے میں عذرا اصغر کی اعزازی تقریب کا احوال پڑھا تو ان کو اور آپ کو مبارکباد دینے کو جی چاہا۔ عذرا اصغر کو اپنی ادبی پذیرائی کے لیے اور آپ کو تخلیق ایوارڈ کو معتبر بنانے کے لیے۔ نومبر میں پاکستان آنے کا ارادہ ہے، شاید لاہور کا بھی چکر لگاؤں۔ سب دوستوں سے ملنے کو جی چاہتا ہے۔ اپنا خیال رکھیے۔

نجم الحسن رضوی (امریکہ)

﴿9﴾ پیارے سونان۔ جیتے رہو۔ سدا خوش و خرم رہو!

ایک خط پہلے تحریر کر چکی ہوں لیکن دل کی تسلی نہیں ہوئی۔ تمہاری محبت کا نعم البدل شکریہ کے چار لفظ ادا نہیں کر سکتے۔ میں عجیب کیفیت سے گزر رہی ہوں۔ ایک طرف تمہارا شکریہ ادا کرنے کے لئے مناسب لفظ تلاش کرتی رہی ہوں دوسری طرف شرمندگی گھیرے رہی بلکہ گھیرے ہوئے ہے۔ اپنے بارے میں اہل علم کے مضامین دیکھ کر خوشی تو ہوئی مگر آنکھیں بھی تر ہو گئیں۔ تم نے بے لوث ہو کر اور میرے علم میں لائے بغیر پہلے ''تخلیق'' میں گوشہ چھاپا اور پھر ایوارڈ کا اہتمام کیا۔ میرے لئے یہ بہت ہی بڑی بات ہے۔ یقین کرو

یہ جو میں کہہ رہی ہوں یہ انکسار ہرگز نہیں ہے میرے دلی جذبات ہیں۔ گزشتہ پچاس برس سے زیادہ عرصے میں جو کچھ لکھا اس لکھتی رہی ہوں کبھی نہ ستائش کی تمنا کی اور نہ صلے کی امید رکھی۔ اہلِ ادب نے میری تحریریں پسند کیں اس کی خوشی ضرور رہی ہوگی۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے ایوارڈ جس طرح بانٹے جاتے ہیں ان کا احوال کون نہیں جانتا۔

ماہنامہ "تخلیق" کی طرف سے ملنے والا یہ ایوارڈ میرے لئے کسی صدارتی ایوارڈ سے بھی بڑا ایوارڈ ہے جو مجھے کسی منصب کے سبب یا کسی دباؤ کے تحت نہیں دیا گیا ہے۔ میں ان سب کرم فرماؤں کی بھی بے حد ممنون ہوں جنہوں نے میرے نام کی منظوری دی اور انتخاب کیا۔ اللہ انہیں جزائے خیر دے۔ خدا انہیں ہمیشہ شادکام رکھے۔ آمین اپنا میرے پاس انہیں دینے کو دعاؤں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ خلوص ومحبت کے ساتھ۔

عذرا اصغر (کراچی)

10 جون سونان اظہر جاوید!

جب بھی ماہنامہ تخلیق لاہور کا تازہ شمارہ موصول ہوتا ہے مرحوم اظہر جاوید میرے سامنے ہوتے ہیں ان کی یادوں کے چراغ میرے دل و دماغ کو اور تابناک کر دیتے ہیں ان کے ہونہار صاحبزادے سونان اظہر نے وہ کام کر دکھایا جو ادبی جرائد کی دنیا میں کسی مدیر کے وارثوں سے نہ ہو سکا۔ ادبی جرائد کی دنیا میں نو وارد ہونے کے باوجود سونان اظہر نے نہایت سلیقے اور باقاعدگی سے اس وقیع ادبی ماہنامے کو نہ صرف اسی تسلسل سے جاری رکھا جو اس ادبی جریدے کا طرۂ امتیاز تھا بلکہ خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہے۔ سونان اظہر کی ان کاوشوں کو دیکھ کر بے ساختہ دعائیں دل سے نکلتی ہیں۔

اظہر جاوید مرحوم فروری 2012ء کو اس جہانِ فانی سے عالمِ آشیاں ہوئے تو سچی بات یہ ہے کہ اوروں کی طرح مجھے بھی یہ فکر تھی کہ اب ہم تخلیق سے محروم ہو جائیں گے لیکن سونان نے ہمارے خدشے کو غلط ثابت کر دکھایا۔ اللہ تعالیٰ انہیں مزید ہمت اور حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین! اس وقت میرے پیشِ نظر تخلیق کا تازہ شمارہ (جون 2017ء) ہے میری کوشش یہی ہوتی ہے کہ جب بھی تخلیق موصول ہو اس پر اپنی رائے لکھوں لیکن مستقل علالت اور "بیاگ" کی اشاعت کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہوتا۔ بہر حال اس مرتبہ کچھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں اور حسبِ عادت سب سے پہلے شعری حصے پر اپنی رائے پیش کر رہا ہوں۔ شعری حصے میں ایک حمد اور دو نعتیں ہیں۔ رب ذوالجلال کی حمد وثنا رشیدہ آفریں کی ہے۔ خوبصورت انداز بیاں ہے لیکن کمپوزنگ کی غلطی نے دو مصرعوں کے حسن کو مجروح کیا۔ حسنِ مطلع میں "خدائی" کو "جدائی" بنا دیا گویا ایک نقطے نے محرم سے مجرم بنا دیا۔ ایک مصرعے میں "تو" کی بجائے "کی" نے مصرعے کو بے کیف کر دیا
"مثل تو تو تازگی دی" کی بجائے "مثل تو کی تازگی دی" ہو گیا۔

نعتیہ کلام جناب ریاض ندیم نیازی اور گستاخ بخاری کا نذرانہ عقیدت روایتی انداز لیے ہوئے ہے کاش ہم نعتیہ کلام میں اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو نظم کرنے کی طرف توجہ دیں۔ صفحہ 45 پر نظم کے تین ذائقے ہیں پہلی آزاد (مرحوم اظہر جاوید) کی خوبصورت رومانی نظم "خواب اور پیار" اظہر جاوید مرحوم کے مخصوص رومانی انداز اور سہلِ ممتنع کی مثال ہے رواں اور دلکش، دوسری نظم جلیل عالی کی "کیا کہتے ہو" نثری نظم ہے اس پر اظہارِ خیال کرنے کی ہمت نہیں۔ ہاں محترمہ بشریٰ رحمن کی پابند نظم "میری سوتن"

میں دست رسی تو ہے اور خوب ہے لیکن ایک مصرعے میں کمپوزر نے "سدا" کو "صدا" میں تبدیل کر دیا جب کہ ایک مصرعے میں خود شاعرہ سے لغزش ہوئی کہ "پناہ" کو "پنا" نظم کر دیا۔

ابلیس پنا مانگے یہ ہے ایسی ہنر ور — دو زانو چلے آتے ہیں پاس اس کے سخن ور

نظم بحر ہزج میں ہے اور زحافات کی وجہ سے اس کے ارکان ہیں مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن (بحر ہزج اخرب مکفوف)

شعر کی تقطیع اس طرح ہوگی

ابلیس (مفعول) پنا مانگ (مفاعیل) ای یہ ہ اے سی (مفاعیل) ہ نر ور (فعولن)

آپ نے دیکھا کہ لفظ "پناہ" کی بجائے "پنا" استعمال ہوا ہے اور ظاہر ہے اس طرح مصرعہ وزن سے خارج ہو جاتا ہے اگر شاعرہ اس جانب توجہ دیتیں تو آسانی سے یہ عیب دور ہو سکتا تھا لیکن ان سے سہو ہوا۔ مصرعہ یوں بھی کہا جا سکتا تھا ع

ابلیس بھی مانگے ہے پناہ ایسی ہنر ور

ابلیس (مفعول) بھی ما گے (مفاعیل) پنا ہے اِی (مفاعیل) س ہ نر ور (فعولن)

صفحہ 80 اور 81 پر اختر جاوید، جلیل عالی، آصف ثاقب، بشریٰ رحمن، علیم بشیر کی خوب صورت غزلیات ہیں لیکن اسی صفحے پر اعزاز احمد آذر کی غزل اور صفحہ 83 پر ڈاکٹر جواز جعفری کی غزلوں نے دامنِ دل کو اپنی جانب کھینچ لیا اور ان دونوں شعرا کی غزلیں کئی مرتبہ پڑھیں اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف پایا۔ ڈاکٹر جواز جعفری کی غزل کو تقطیع کے لیے منتخب کیا ہے۔ کالم کے آخر میں ملاحظہ فرمایئے گا۔ صفحہ 86 پر نیر رانی شفق کی غزل کا ایک شعر دیکھیں۔

اڑا کے لے گئیں پتے بھی، کیسی ہوائیں تھیں — پہنچ جائیں عدم میں جو پیارے پھر نہیں ملتے

شاعرہ نے لفظ پیارے بروزن چارے کی بجائے "ستارے" استعمال کیا ہے۔ اسی صفحے پر طاہر حنفی کی غزل میں "پانیوں" علاوہ ایک شعر میں شتر گربہ کا عیب نمایاں ہے۔

جنھیں تیری ضرورت ہے، جنھیں میری ضرورت ہے — تم ان کے پاس جب پہنچو! ہمیں بھی یاد کر لینا

پہلے مصرعے میں جس شخص کے لیے "تیری" استعمال کی اسی کے لیے دوسرے مصرعے میں "تم" کا استعمال، پہلے مصرعے میں "میری" اور اسی کے لیے دوسرے مصرعے میں ضمیر "ہمیں" کا استعمال ہی کلام شتر گربہ ہے۔

جناب پروفیسر نور کمال شاہ کی غزل کے ساتھ بکثرت کمپوزر نے اٹھکیلیاں کی ہیں یعنی مطلع اور پہلے شعر کے مصرعوں میں ایک لفظ "ہے" انھیں اچھا نہیں لگا اس لیے کمپوز کرنے سے گریزاں رہے اور "تو نے" کو پوری غزل میں "تیرے" ہی لکھا ہے۔ لیکن خود شاعر موصوف کا بھی کمال دیکھیں، ایک ہی شعر کے لیے دو بحریں استعمال کر گئے۔

اب کس پہ اعتبار کریں، کون معتبر؟ — سر کون سا مخلص رہا دستار کے پیچھے

دونوں مصرعے دو مختلف بحروں میں ہیں۔ پہلا مصرعہ بحر مضارع (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن) میں اور دوسرا مصرعہ بحر ہزج (مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن) اس کے علاوہ آخری شعر میں لفظ "سنگھار" (اصل لفظ سنگار ہے بروزن نگار لیکن اگر سنگھار بھی استعمال کیا ہے تو بھی غلط باندھا ہے۔ سنگار اور سنگھار کے وزن میں کوئی فرق نہیں ہے) بروزن فعول کی بجائے مفعول باندھا ہے۔

تڑپا کے مجھے رکھنا تیری (تری) زینت کا حاصل — حائل بھی جذبہ تیرے (ترے) شعار کے پیچھے

اور جاوید عباس جاوید کا مندرجہ شعر بھی توجہ چاہتا ہے انھوں نے غلط فرض میں ''ز'' کو متحرک کی بجائے ساکن استعمال کر کے مصرعہ بے بحر کر دیا۔

بہت ہی مضطرب، خود غرض اور بے زار ہے انساں — کوئی ملتا نہیں ہے ہمدم و دم ساز ملتا ہوں

حصہ نثر میں جناب نجم الحسن رضوی کا افسانہ ''آدھے چاند کی رات'' نے مزہ دیا ایک عرصے کے بعد رضوی صاحب کی تخلیق پڑھنے کو ملی ان کی علالت کی خبر سنی تھی خدا کرے بھلے چنگے ہوں۔ انور سدید کے حوالے سے منظور حسین یاد کا مضمون ''یکتا انور سدید کے بارے میں'' اچھا لطیفہ ہے یہ مضمون پڑھ کر ایک واقعہ یاد آ گیا 1980ء میں میں سکھر سے مستقل رہائش کے لیے کراچی آ رہا تھا تو بزم احباب ادب سندھ کی جانب سے مرحوم ان م نیازی کے دولت کدے پر الوداعی تقریب کا اہتمام کیا گیا اس تقریب میں دیگر احباب کے علاوہ ادبی تنظیم ''انجمن کوہ'' کے روح رواں جناب غلام سرور ہوشیار پوری نے بھی مضمون پڑھا۔ موصوف ہر دو تین جملوں کے بعد فرماتے ''جیسا کہ میرا شعر ہے۔ ان کا یہ جملہ محفل کی سوگوار فضا کو شگفتہ بنا دیتا۔ موصوف سکھر میں مثالی سامع تھے اپنے گھر پر پابندی سے مشاعروں کا انعقاد کیا کرتے تھے اور شعرا کی بڑی تواضع کرنے میں دریا دل تھے۔ آخر عمر میں خود بھی شعر کہنے لگے تھے ان میں بے بحر اشعار کے ساتھ ساتھ موزوں اشعار کی تعداد بھی خاصی ہوتی تھی۔ بقول شیخ سعدی

جمال ہم نشیں در من اثر کرد — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

موصوف ایک ایسا شعر کہہ گئے جو ان کی پہچان بن گیا وہ شعر تھا۔

سماعت چھن گئی ہے آدمی کی — میں دیواروں سے باتیں کر رہا ہوں

اللہ تعالیٰ نے انھیں عظیم سعادت بخشی۔ حج کے لیے تشریف لے گئے، وہیں دل کا دورہ پڑا اور خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ جنت المعلیٰ میں آسودۂ خاک ہوئے ~ یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا۔

سلمان اظہر نے اس مرتبہ تخلیق کو نئے انداز سے مرتب کیا ہے یعنی نثر نگاروں کی تخلیقات سے پہلے ان کا مختصر تعارف بھی پیش کیا ہے اگرچہ ادبی جرائد میں یہ کوئی نئی چیز نہیں ہے لیکن مدت سے متروک تھی اب تخلیق نے تجدید کی یہ مستحسن عمل ہے۔ یہ مبارک باد کے مستحق ہیں اس عمل سے نئے قارئین کو اہلِ قلم کے بارے آگہی ہوگی۔

عزیز جبران انصاری (کراچی)

﴿11﴾ محترم جناب سلمان اظہر جاوید!

السلام علیکم۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ کچھ عرصہ تو سلمان اپنے والد محترم کی محبت میں ''تخلیق'' کا سلسلہ جاری رکھے گا مگر جلد ہی دل چھوڑ جائے گا مگر آپ لائقِ تحسین ہیں کہ آپ نے اظہر جاوید کے نام کو زندہ رکھا ہوا ہے اور تخلیق باقاعدہ طور پر چھپ بھی رہا ہے اور ہم تک پہنچ بھی رہا ہے۔ آپ نے اس عزم کا اظہار جون کے شمارے کی پہلی بات میں بھی کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو استقامت بخشے

اور آپ اور تعلیمی ٹیمیں رہے۔ جس میں حمد، نعت، مضامین، منظومات، افسانے، غزلیں، پیروڈی نگاری، سفرنامے، یادِ رفتگاں، خاکہ نگاری، تبصرے اور انجمن خیال کے ساتھ ساتھ طنز و مزاح کا مضمون دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ طنز و مزاح کی حالت ابھی خطرے سے باہر ہے۔ پنجاب رنگ کا موجود ہونا بھی ایک نعمت سے کم نہیں ہے۔ تمام اہلِ ادب کو سلام۔ جیتے رہو۔ اللہ حافظ۔ آپ کا اپنا۔

ڈاکٹر نیاز علی محسن مگھیانہ (جھنگ)

﴿12﴾ ڈیئر سونان اظہر صاحب۔

آپ کی ادارت کا ترجمان تخلیق جب بھی موصول ہوتا ہے، ایک گونہ مسرت ہوتی ہے کہ آپ نے اظہر جاوید صاحب کی روشن کی ہوئی شمع کو بجھنے سے بچایا بھی ہے اور مزید فروزاں بھی کیا ہے۔ آپ کے عزم و حوصلے کے استحکام کے لیے دعا گو ہوں۔

جون 2017ء کے تخلیق کا نثری حصہ بہت معیاری ہے۔ رشید امجد صاحب کا افسانہ "برکت" گھر اور مکان کا فرق واضح کرنے کی کامیاب کوشش ہے۔ ان کی یادنگاری کے مندرجات یادِ شب دلچسپی کے حامل ہیں لیکن سیاسی حوالے سے بھی ان میں جن خیالات کا اظہار ہوتا ہے، وہ واضح ورطے کے احساسات کی ترجمانی کے حامل ہیں۔ نجم الحسن رضوی کا افسانہ "آدھے چاند کی رات" شکستہ احساسات کا بہترین عکاس ہے۔ "ملاح کا بیٹا" میں محمد اسلم نے ہمارے دیہی ماحول کی ایک مکروہ روایت کو سچائی کے ساتھ بیان کیا۔ شعلہ چنگیزی کا افسانہ "اسپ تازی" پڑھ کر لاشعور میں تہمینہ درانی کی معروف کتاب "میڈا سائیں" کے متعدد مندرجات گونجنے لگتے ہیں۔ "بے سوال باتیں" پڑھتے ہوئے اظہر جاوید مرحوم کا اسلوبِ تحریر تو یاد آتا ہی ہے لیکن جناب حنیف باوا کی یہ نگارشی خوبی بھی داد وصول کرتی ہے کہ اردو سے پنجابی یا پنجابی سے اردو ترجمہ کرتے ہوئے ان کی مہارت اپنے معیار کی داد بھی وصول کرتی ہے۔ خاکہ نگاری میں عموماً خاکہ کو ڈرا دیا جاتا ہے لیکن افتخار مجاز کے بارے میں ملک مقبول احمد نے لکھتے ہوئے مجازی فکری روایت کی خوب پاس داری کی ہے۔

بشریٰ رحمٰن کے بارے میں اکمل نیازی کی تحریر اس سچ کو دہراتی ہے کہ محبت و عقیدت کے اظہار میں مبالغہ آرائی نہ ہو تو اظہار کا لطف دوبالا نہیں ہوتا۔ معروف گائیک پرویز مہدی پر لکھتے ہوئے ڈاکٹر امجد پرویز نے حمد، فکری اور حقائق نگاری کا جو معیار اپنایا، حق ہے کہ امجد پرویز خود بھی گائیکی سمندر کے شناور ہیں۔ اقبال کے حوالے سے ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کی تالیفی کتب پر بات کرتے ہوئے ملک اشرف ذکی نے چالیس فیصد باتیں کتب کے حوالے سے کیں جب کہ ساٹھ فیصد نگارش اقبال کی کتب بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم اور ارمغانِ حجاز کے ابواب کی تقسیم پر مشتمل ہے۔ مجموعی طور پر اس مضمون کے مندرجات بھی اس کے عنوان "دبستان سرگودھا کا سچا وارث ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم" سے مطابقت نہیں رکھتے۔ کوئی شک نہیں کہ ہارون صاحب دبستان سرگودھا کے آج کے نمائندہ ہیں اور بہترین نمائندہ ہیں۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کا طنزیہ اسلوب اپنی مثال آپ ہے جو ان کی ہر تحریر سے از خود نمایاں ہوتی ہے۔ مقدار کے باوجود معیار نگارشی معیار آفتاب خان کے تبصرہ پائے کتب سے خوب خوب واضح ہے۔ اس مرتبہ حصہ نظم خاصا کمزور محسوس ہوا البتہ غزل رنگ میں اظہر جاوید، جلیل عالی، آصف ثاقب، نعیم احمد بشیر، اعزاز احمد آذر، مسعود عثمانی، جواز جعفری، پرتپال سنگھ بیتاب، صوفی بیدار،

اور آفتاب خان کے فکری رنگ الگ سی آب و تاب کے حامل محسوس ہوئے۔ ڈاکٹر محمود اسیر کی تحقیقی کاوشوں پر مشتمل اپنے مضمون کی اشاعت پر آپ کا از حد ممنون ہوں۔

اخلاق عاطف (سرگودھا)

﴿13﴾ محترم مولانا اظہر جاوید جی۔

ماہ جون کا ''تخلیق'' جولائی کے پہلے عشرے میں ملا۔ ناسازئ طبع کے باعث گھومتا گھومتا پڑھتا رہا۔ پرچے کی روایتی آب و تاب متاثر کن تھی۔ اداریہ حسب معمول زوردار تھا۔ خصوصاً آپ نے یہ بات بالکل سچ کہی: ''ادب کے چھوٹے اداروں اور بڑے بڑے اداروں کے سربراہان نے کبھی ادبی پرچوں کی آواز صاحب اقتدار تک نہیں پہنچائی۔'' رہی ادبی ایوارڈز کی بات تو یہ تمام ایوارڈز بھی ''اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ اب ایوارڈز دیے نہیں جاتے، لے جاتے ہیں۔''

حصہ نثر میں ایک مضمون ''جمیل الدین عالی اور ان کی شاعری'' جو ڈاکٹر انور سدید (مرحوم) نے اپنے مخصوص انداز میں لکھا شگفتہ اور معلوماتی ہے۔ ''مغلیہ عہد میں رائج اعتقادی کا ابھار'' (ظفر سیال) بھی خاصے کی چیز ہے۔ سولہویں صدی میں شمالی ہند میں تصوف کو جو توانائی ملی اس کا پُر تفصیل بیان ہے۔ اس کی اگلی اقساط کا انتظار رہے گا۔ اسی طرح ''سبا کی قوم'' (پروفیسر جنت قاضی) پُر از معلومات ہے اور طرز بیان سلیس۔ ایک اور دلکش مضمون ''عبداللہ حسین'' میں ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے بہت مہارت سے وہ تمام باتیں جو اس ناول کے لکھے جانے کا سبب بنیں مختصر انداز میں سمو دیں۔

افسانوں میں ''سچ کی آواز'' (سیما پیروز) بہت بھلا لگا۔ اس کا انجام سوچ سے مختلف ہے۔ ایک اور لازوال تحریر ''بے سوال باتیں'' محترم اظہر جاوید کی اور اصل جیسا ترجمہ حنیف باوا کا ''ایک دو آتشہ چیز'' ہے۔ ''اسپ تازی'' ایک استعارت سا مکالماتی انداز والا افسانہ کسی تبصرے کی گنجائش نہیں رکھتا۔ لاسا بھی باتیں خود کہتا رہا ہے۔

حصہ شعر میں کئی جگمگاتے نام ہیں لیکن چند نام منفرد مثلاً

رات کا چین، سکون صبح کا کھونے والا　　　مر گئے ہم تو نہیں کون ہے رونے والا
(اظہر جاوید مرحوم)

ٹک جیاؤ پہ ٹھہرا ہوا تھا　　　جان میرا ہے اب ڈھ جانے والا
(آصف ثاقب)

بہت ہنستا ہوں یقیناً تمہی رلائے گی　　　تمہیں جانتا ہوں مجھے یہ خوشی رلائے گی
(سہیل سروری)

محمد طارق علی (راولپنڈی)

﴿14﴾ مکرمی!

ماہ جون کا شمارہ بذریعہ VVP ملا۔ رقم ادا کی اور پرچہ ساتھ لے آیا۔ سرورق دیدہ زیب، خوبصورت اور موقع مناسبت کے مطابق۔ عید پر ''پینگ'' لازمی جزو ہے مگر پینگ والی کے ساتھ اس کی سکھیاں سہیلیاں جھلملا یا دکھایا جاتا تو لطف دوبالا ہو جاتا۔ ''پہلی بات'' پیرو ولائی کی طرح ہوتا ہے۔ بات سچ اور حقیقت پسندانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ قاش صد ستائش ہیں وہ لوگ (لکھاری) جن پر حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نازل ہوتی ہے۔ یہ اٹل حقیقت ہے کہ ڈاکٹر انور سدید حافظ روزگار ادبی شخصیت تھے۔ انہوں نے لکھا اور بہت لکھا جو کچھ چھپا اور جو رہا بھی بازیاب ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی ایک مضمون سید مشکور حسین یاد صاحب نے بازیاب کر کے اس نایاب تحریر کو بذریعہ ماہنامہ تخلیق قارئین کی خدمت میں پیش کیا۔ شاباش! سید مشکور حسین یاد کہ اس عمر میں بڑے معرکے سر کر رہے ہیں۔ اسی طرح خود ڈاکٹر انور سدید نے اپنی زندگی میں جمیل الدین عالی کی شاعری پر گہری تحقیق اور بصیرت افروز مضمون لکھا جس کا ادب میں بڑا مقام ہے۔ جمیل الدین عالی کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے۔

ہم نے صحرا میں بھی رو کر جو پکارا ہے کتنے چشموں کے چھلکنے کی صدا آئی ہے

ڈاکٹر اجمل نیازی کسی تعارف کے محتاج نہیں وہ اپنی تحریروں کو بہترین موقع کا روپ دینے کا ڈھنگ خوب جانتے ہیں نگار چمن میں محترمہ بشریٰ رحمن پر ہر زاویے سے جائزہ لکھا جو واقعی آدھی ادھوری لڑکیوں یا عورتوں کے لئے مشعل راہ ہے۔ مضمون عرق ریزی سے ڈاکٹر صاحب نے لکھا اور بہت سی دوسری نامور عورتوں کے ساتھ تقابل میں پیش کیا مگر بشریٰ رحمن کی حیثیت کو انھوں نے ''ایک جامع حیثیات عورت قرار دیا'' مگر دلائل کے ساتھ۔ جناب مسلم شمیم کا مضمون ہمیشہ عمیق مشاہدے، گہرے مطالعے اور پر مغز پیرایے پر مشتمل ہوتا ہے۔ ''عالم گیریت اور علم قبیلہ'' پڑھنے اور سمجھنے کے لئے کافی ہے اور علم قبیلے سے اس کا تعلق ہے۔ ڈاکٹر امجد پرویز کا مضمون ''پرویز مہدی مہدی حسن کا ذہین شاگرد'' ایک تاریخی مضمون ہے۔ محترم جناب ظفر سپل نے تاریخی واقعات کے سلسلے کا پہلا مضمون لکھا۔

ملک اشرف ذکی کا ''دبستان سرگودھا کا سچا وارث ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم'' کافی عرق ریزی سے لکھا گیا ہے اور ادب کے لحاظ سے بڑے بڑے سرگودھا سے جڑے ہوئے ہیں جن کے نام گنوائے گئے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید سال ڈیڑھ پہلے کم عمری میں وفات پا گئے مگر بستر مرگ پر بھی پڑے ہوئے میں ادب پروری کرتے رہے۔ اب بھی ادبی افق پر سرگودھا کے بڑے نام موجود ہیں مگر لگتا ایسا ہی ہے کہ اب دبستان سرگودھا کا سچا وارث ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم ہی ہے۔ منظومات کا حصہ بہت ہی پیارا ہے مگر میری نظم کے عنوان میں ''تے'' پر دو نقطے کیوں نہ ڈالے گئے۔

افسانوں کا حصہ کافی بڑا ہے اکٹھے آٹھ افسانے ہیں مگر ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ ''برکت'' زمانے کے ساتھ ساتھ پاکستانیوں میں بھی مغربیت کا عنصر شامل ہو رہا ہے۔ گھر جو مشترکہ فیملی پر مشتمل ہوتا تھا وہ اب خال خال ہے۔ جس کی وجہ سے اب گھر یقیناً مکان میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ افتخار عارف کا شعر ہے۔

اے خدا مجھے اتنا تو معتبر کر دے میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کر دے

باقی افسانے بھی اچھے ہیں مگر سیاسی قوم افسانے کے بجائے تاریخ کا باب لگتا ہے۔ جناب اصغر جاوید کا افسانہ ''بے سوال

باتیں" دامن دل کھینچتا ہے۔

غزلیات کا حصہ ایسا ہے کہ جس کی جتنی ستائش کی جائے کم محسوس ہوگی۔ مثلاً

سب تعلق، سبھی ناطے تیرا فقط بیٹے کی　　کہہ گیا خاک کی آغوش میں سونے والا
(انجم جاوید)

ہمارے سر سے بلائیں کہاں ٹلی ہوتیں　　یہ اپنی ماں" کہ جو صدقے اتارتی رہی ہے
(جلیل عالی)

تمہارے سامنے زندہ کھڑا ہے　　"سخن حق" بولا کہہ جانے والا
(آصف ثاقب)

میری بجھ جاں بھی لے لو حسن امان بھی لے لو　　جو نہ ختم ہو ابد تک وہ الم کی شام دے دو
(بشریٰ رحمٰن)

ذرا بھول کر میری یاد کو، مرے دشمنوں مجھے داد دو　　میں لڑا ہوں آخری سانس تک مرے پاس ایک ہی تیر تھا
(اعزاز احمد آذر)

سر ہتھیلی پہ لئے گھر سے نکلا تھا مجھے　　صبح ہجرت کی نکالی نہیں دیکھی تم نے
(حسن عسکری کاظمی)

ہیں میر و غالب و اقبال، مجنوں و بیدل　　یہ اس کی شان ہیں اور اس کی شان اردو ہے
(ابن عظیم فاطمی)

مگر جہاں تک وآہنگ صوفی بیدار کی غزل اور نعت شریف میں وہ اپنی جگہ بہت ہی قابل داد ہے۔

ہمیشہ رہتا ہے قائم تغیرات میں بھی　　وہ میرے دل میں ہے اور پوری کائنات میں بھی
رضا میں راضی ہوں اس کی میں صوفی بیدار　　وہ حیرت میں بھی ہے موجود میری ذات میں بھی
(صوفی بیدار)

مگر سوال انجم جاوید صاحب میں نے جو غزل بھیجی تھی وہ کیوں غائب ہے؟ ڈاکٹر رشید امجد "عاشق صبر طلب" بہت پسند ہے۔ محترمہ سلمٰی اعوان صاحبہ کا "عراق اشک بار ہیں ہم" دلچسپ سفرنامہ ہے۔ ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم نے عبداللہ حسین پر بھرپور مضمون لکھا۔ میں نے ان کا ناول اداس نسلیں پڑھا ہے۔ جناب حسن عسکری کاظمی صاحب نے اعزاز احمد آذر جیسے خوبصورت انسان پر لکھا بے شک انہوں نے حرف لازوال لکھا۔ ملک مقبول صاحب کا خاکہ افتخار مجاز قابل ستائش ہے۔

مرزا احمد نور طائر (چکوال)

﴿15﴾ محترم سوہان اظہر صاحب

سلام وخلوص! ''تخلیق'' کا شمار پاکستان کے ان چند ادبی جرائد میں ہوتا ہے جو اپنی اشاعت کے آغاز سے اپنا ادبی سفر پوری توانائی سے جاری رکھے ہوئے ہیں۔

آپ نے اپنی بھرپور مساعی کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے عظیم والد اظہر جاوید صاحب شاعر، ادیب و دانشور کے تخلیقی و تعمیری سفر کو جاری رکھا ہے۔ اردو ادب میں اس کی مثال خال خال ہی ملتی ہے۔ اظہر جاوید صاحب نے تخلیق کی اشاعت اور پروڈکشن کے سلسلہ میں لاکھ رکاوٹوں کے باوجود اس کے معیار پر سمجھوتا نہیں کیا۔ سینکڑوں معروف اور نوآموز تخلیق کاروں کو اپنے جریدے میں شائع کر کے انہیں سانس لینے، نشوونما پانے اور اپنے آپ کو منوانے کا موقع فراہم کیا۔ آج اردو ادب میں بہت سے ایسے معروف نام ہیں، جن کی ابتدائی نشوونما میں اظہر جاوید صاحب کی معاونت شامل رہی ہے۔ میری دعائیں آپ کے لیے اور تخلیق کے لیے۔

مظہر بخاری (میاں چنوں)

﴿16﴾ محترم سوہان اظہر جاوید صاحب!

سلام مسنون۔ تخلیق کا تازہ شمارہ (جون 2017ء) نظر نواز ہوا جو حسب روایت اپنے عمدہ سرورق کے ساتھ مزین تھا۔ خدا کرے کہ تخلیق کا یہ سفر اسی روانی سے جاری رہے اور سوہان اظہر جاوید اس پرچے کی ترسیل کر کے خوشی محسوس کرتے رہیں۔ ''اپنی بات'' میں ہمیشہ کی طرح اب کی بار بھی انھوں نے ایک حقیقی پہلو کی جانب توجہ مبذول کی ہے مثلاً وہ لکھتے ہیں: ''پرچہ لکھنے والا اپنے نام والے پرچوں میں ہی پہچانا جاتا ہے۔ اس لیے اب صرف چند گنتی کے پرچے زندہ ہیں، غیر معروف ادبی پرچوں یا نئے پرچوں کو بڑے ادیبوں سے تعاون کی بھیک مانگنا پڑتی ہے۔'' ع بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔ آج مجھے مرحوم انور سدید یاد آ رہے ہیں جنھوں نے کبھی لکھتے ہوئے یہ نہیں دیکھا کہ یہ پرچہ کس نوعیت کا ہے انھوں نے ہمیشہ ادبی پرچوں کی ترویج کے لیے ہمیشہ اپنا تعاون پیش خدمت رکھا۔ ادبی رسائل کی دم توڑتی ہوئی روایت کے پیچھے بھی ایک بڑا محرک ہے جو سوہان اظہر جاوید نے پیش کیا ہے۔ سید مظفر حسین یاد کا ایک نمایاں مضمون انور سدید پر استناد کا درجہ رکھتا ہے یہ مضمون ڈاکٹر انور سدید کی روشن ادبی زندگی کا ایک روشن رخ ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر انور سدید کا مضمون ''جمیل الدین عالی اور ان کی شاعری'' بہت عمدہ مضمون ہے۔ یہ مضمون عالی جی کی شاعری کی ایک خاص پرت ہے بالخصوص ان کی طویل نظم ''انسان'' کے حوالے سے ایک واضح اظہار ہے۔ ڈاکٹر محمد اجمل نیازی نے ''انکار حسن'' کے موضوع سے بشریٰ رحمن پر جو کچھ لکھا ہے وہ یقیناً قابل داد ہے۔ یہ مضمون پڑھتے ہوئے محسوس بھی ہوتا ہے یہی ایک بڑے انکار حسن کا خاصا ہوتا ہے۔ بشریٰ رحمن کی ایک نئی تصویر اس تحریر سے ابھرتی ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ ''برکت'' میں انھوں نے خالص گھریلو زندگی اور بکھرتی ہوئی حزین گھریلو زندگی کا ایک رخ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ کیا خوب افسانہ ہے جو اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی اقدار کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ آج گھر گھر نہیں بلکہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا نقشہ پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ ''عاشق صبر طلب'' اور ''غم دوراں'' جیسی تحریروں نے ''تخلیق'' کے اس شمارے کا وقار اور معیار یقینی طور پر بلند کر رکھا ہے۔ محترمہ سلمیٰ اعوان کا سفرنامہ نئے نئے انکشافات اور

جاذبیت کے اس لیے قارئین کی توجہ کا مرکز ہے۔ اسی طرح جناب حسن عسکری کا اعزاز احمد آذر کو اور محمد ساجد کا اپنے استاد محترم پروفیسر صابر لودھی کو جو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے اس کا کیا کہنا ہے۔ عظیم لوگ اپنی تحریروں اور لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں۔ اسی طرح ملک مقبول احمد نے بڑے سیدھے سادے انداز میں ''افکارِ حجاز'' کا خاکہ لکھا ہے جو حقیقی تصویر پیش کرتا نظر آتا ہے۔

سلطان صاحب! آپ نے اپنے باپ کی 2 ہزار کتب پنجاب یونیورسٹی لاہور لائبریری کو عطیہ کر کے بڑے باپ کے بڑے بیٹے ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم۔ معین قریشی کا قلم گلکاریاں بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ''تخلیق'' کے حوالے سے قریشی ہمیشہ اپنا ممکنہ جملہ پیش کرتے ہیں جو تخلیق کا حق بن جاتا ہے۔ نہ صرف مزاحیہ تحریروں میں بلکہ خطوط میں بھی وہ تخلیق کے لیے خصوصی وقت نکالتے ہیں یا ان کی ''تخلیق'' کے ساتھ خصوصی محبت ہے۔ آفتاب احمد خان نے اس شمارے میں مختلف نئی تصانیف سے قارئین کو متعارف کروایا ہے۔ ''انجمن خیال'' ہمیشہ کی طرح آباد نظر آتی ہے یہ کسی شمارے کی تخلیقی اپج کا معیار اور وقار ہوتا ہے۔ شکریہ۔ والسلام۔

ڈاکٹر سکندر حیات میکن (سرگودھا)

«17» محترم سلطان اظہر صاحب!

ماہنامہ ''تخلیق'' کا شمارہ جون 2017ء موصول ہوا۔ آپ کا اداریہ، حمد و نعت کا حصہ، مضامین، افسانے، حصہ غزل اور محفلِ احباب کا مطالعہ کیا۔ تخلیق خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا ہے۔ ٹائٹل دیدہ زیب ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں مزید ترقی دے۔ (آمین) آپ نے شکوہ کیا ہے کہ قارئین رسالہ چھپنے کے بعد اپنا تبصرہ نہیں بھیجتے۔ اس لیے ضروری جانا کہ چند گزارشات لکھ کر ارسال کروں۔ آپ نے رسالہ کے نکالنے میں جو مشکلات کا ذکر کیا ہے وہ تمام ادبی پرچوں کو درپیش ہیں۔ بعض رسالے تو بند ہو چکے ہیں۔ ان میں افکار، طلوعِ افکار، محفل اور اوراق اور دیگر شامل ہیں۔ ان جرائد کے مدیران اپنی ذاتی کوشش سے رسالے نکالتے تھے۔ ان کی لگن اور جنون تھا جو انہیں مستقل طور پر رسالہ جاری رکھنے پر آمادہ رکھتا تھا لیکن ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد ان جرائد کا اجرا مشکل ہو گیا۔ آپ نے ہمت کی اور محترم اظہر جاوید صاحب کی رحلت کے بعد ''تخلیق'' کو بند نہیں ہونے دیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تخلیق بھی باقی ہے اور اظہر جاوید صاحب بھی زندہ ہیں۔ آپ کی انہی کوششوں کی داد دینا پڑتی ہے۔ محترم رشید آفریں صاحب کی کہی ہوئی حمد بہت اچھی لگی۔ حمد ہو یا نعت رسولؐ ان میں اللہ تعالیٰ اور حضور پاکؐ کی محبت ہوتی ہے اور اس کا کرم خاص ہوتا ہے کہ حمد و نعتیات اس ضمن میں ہو جاتی ہیں۔ یہ دل کی آواز ہوتی ہے جو حرفوں کی صورت نوکِ قلم پہ آ جاتی ہے۔ ریاض ندیم نیازی صاحب کی نعت بھی اچھی ہے تاہم قافیے کے مسائل موجود ہیں۔ نعتیں، رحمتیں کا قافیہ تو درست ہے لیکن خیرتیں اور راحتیں کا قافیہ درست نہیں۔ گستاخ بخاری صاحب کی نعت عمدہ ہے۔ حضور پاکؐ سے عقیدت کا اظہار خوب ہے۔ جب وہ ان سے اپنی کملی میں چھپا لینے کی درخواست کرتے ہیں تو پھر زمان و مکان سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ عجز و انکسار سے معمور جذبات ہیں۔

سید منظور حسین یاد صاحب کی تحریر آپ نے شائع کی ہے لیکن یہ تحریر ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی وفات کے بعد شائع کی گئی ہے۔ اس تحریر میں دونوں بزرگوں کے بارے میں منفی رائے کا اظہار ہے۔ اب اس کا جواب کون دے گا؟ جمیل الدین عالی صاحب کے بارے میں انور سدید صاحب کی تحریر بہت خوب ہے۔ پسند آئی۔ عالی صاحب کا اپنا انداز تھا۔ وہ ترنم کے ساتھ اپنا کلام

پڑھتے تھے اور سماں باندھ دیتے تھے۔ شعروں کا انتخاب بھی خوب ہے جو حالی صاحب کے افکار کو واضح کرتا ہے۔

بشریٰ رحمٰن صاحبہ کے بارے میں ڈاکٹر اجمل نیازی کا مضمون عمدہ پیرایہ اظہار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بجا طور پر ان کو نگار رحمٰن کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان کے افسانے اپنے اندر ایک اصلاحی پہلو رکھتے ہیں۔ ان میں ایک تخیل ہوتا ہے اور معاشرہ میں پائی جانے والی خرابیوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اس تحریر میں دیگر افسانہ نگار خواتین کا بھی ذکر ہے۔ تاہم ایک معروف نام نیلوفر اقبال کا بھی ہے جو لکھنے سے رہ گیا ہے۔ ان کے افسانے "فنون" میں پڑھا کرتا تھا۔ ڈاکٹر امجد پرویز نے پروفیسر مہدی کے فن پر خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔ پرویز مہدی صاحب کی آواز بہت رسیلی تھی اور غزل گائیکی میں ان کا ایک مقام تھا۔ ان کا ریشماں کے ساتھ گایا ہوا دوگانا "گوریے میں جانا پردیس" آج تک اپنی آواز کا جادو جگائے ہوئے ہے۔ اس مضمون میں معروف شاعر عدیم ہاشمی کا بھی ذکر ہے۔ ان کا ایک شعر بہت مشہور ہوا:

بہت نزدیک آتے جا رہے ہو   بچھڑنے کا ارادہ کر لیا کیا؟

پروفیسر ہارون الرشید صاحب پر اشرف ذکی صاحب نے جو مضمون لکھا ہے وہ حکیم الامت علامہ محمد اقبال صاحب کے حوالے سے کافی اثر انگیز ہے۔ پروفیسر صاحب کو علامہ صاحب کے ساتھ جو محبت اور عقیدت ہے وہ "ذخیرۂ اقبال" سے ظاہر ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد صاحب نے "برکت" کے عنوان سے ایک مختصر افسانہ نما مضمون لکھا ہے جس میں ماضی اور حال کا ذکر ہے۔ پہلے ہر چیز میں برکت ہوتی تھی۔ پیار اور محبت کا دور تھا۔ گھر گھر ہوتا تھا۔ اب مکین ہیں لیکن گھر نہیں ہے۔ برکت اٹھ گئی ہے۔ یہ تحریر معاشرتی انحطاط کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ "سبا کی قوم" پیرزادہ بنت قاضی کی تحریر ہے۔ اس میں قوم سبا کے مختلف قبائل کا ذکر ہے۔ ملکہ سبا اور حضرت سلیمانؑ کے واقعے کا ذکر ہے۔ قوم سبا کے عروج و زوال کا ذکر ہے۔ معلوماتی تحریر ہے۔ "حق کی آواز" سمایہ پیرزادہ کا تحریر کردہ افسانہ ہے۔ یہ اصلاحی تحریر ہے اور پاکستانیوں کے لئے ایک سبق ہے جو بیرون ملک جاتے ہیں اور اپنے معاشرتی اقدار کو فراموش کر دیتے ہیں۔

"عاشقی صبر طلب" ڈاکٹر رشید امجد کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے ذاتی تجربات اور تعلقات کا ذکر ہے۔ پاکستان کے دو لخت ہونے کا ذکر ہے اور اس کا درد اب تک ان کے دل میں تازہ ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب سانحہ سقوط ڈھاکہ ہوا تو پورے ملک میں مایوسی اور مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی اور ایک طویل عرصہ تک قوم اس غم سے باہر نہ نکل سکی۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ غم بھی کم ہوا اور اللہ کی مہربانی سے پاکستان ایٹمی پاکستان بن گیا۔ اللہ تعالیٰ اسے قائم و دائم رکھے۔ آمین!

"غم دوراں سے پہلے" ڈاکٹر انور سدید صاحب کی تحریر ہے جو اس وقت سے متعلق ہے جب وہ رسول سکول آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی میں زیر تعلیم تھے۔ اب یہ سکول یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی بن چکا ہے۔ یہ سکول منڈی بہاؤالدین کے قریب ہے جو ان دنوں سب ڈویژن تھا اور اب ضلع بن چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کی خوبیاں اور خامیاں بیان کرتے ہیں لیکن رقم طراز ہیں کہ اساتذہ کا طلبا مذاق اڑاتے تھے لیکن کبھی انہوں نے بچوں کو سزا نہیں دی بلکہ پیار اور محبت سے پیش آتے تھے۔ ان کی مشکلات دور کرنے کے لیے ہمہ تن مصروف رہتے تھے۔ آج ایسے استاد کہاں ملتے ہیں! مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں گورنمنٹ کالج راولپنڈی میں زیر تعلیم تھا تو اکثر بچوں کے لیکچر شارٹ ہو جاتے تھے۔ داخلہ روک لیے جانے کا اندیشہ ہوتا تھا تو ہمارے استاد زیرو پیریڈ لیتے تھے اور اس طرح لیکچر پورے کر لیے جاتے تھے۔ اب ایسا نظر نہیں آتا۔ اعتبار ساجد صاحب نے مختصر تحریر میں گزرے ہوئے دنوں کے کچھ

واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ''عراق افکار'' میں ہم ''سلمیٰ اعوان کی تحریر ہے۔ سقوط بغداد کے بعد جو ظلم وستم امریکیوں نے اہل بغداد پر کیے ان کی یہ درد بھری داستان ہے۔ اس تحریر میں صدام حسین کی خوبیوں کا بھی ذکر ہے۔ محترم حسن عسکری کاظمی نے اعزاز احمد آذر اور ان کی کتاب ''روشنی مثال'' کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی نعت گوئی اور ان کی ذاتی زندگی میں عجز وانکسار کا ذکر ہے۔ اچھے اشعار کو درج کیا ہے۔ یہ تحریر کتاب اور آذر صاحب کی شخصیت پر تبصرہ ہے۔ انداز اچھا ہے۔

پروفیسر صابر لودھی صاحب پر محمد ساجد کا مضمون اور افتخار مجاز پر ملک مقبول صاحب کی تحریر اچھی لگی۔ حصہ غزل میں خوبصورت کلام پڑھنے کو ملا۔ اظہر جاوید صاحب کی غزل پڑھ کر یاد آیا کہ جب ان سے فون پر بات ہوتی تھی تو آخر میں رب راکھا کہا کرتے تھے۔ ان کے دور کے تخلیق کے شماروں کے سرورق فن کا کمال ہوا کرتے تھے۔ ان کے اس شعر نے ان کی یاد تازہ کر دی۔

سب تعلق، سبھی ناطے ہیں فقط جیتے جی ۔۔۔ کب کیا خاک کی آغوش میں سونے والا

یہ حقیقت ہے اور دل پر ایسے وارد ہوتا ہے کہ پھر نقش ہو جاتا ہے۔ جلیل عالی صاحب کی غزل تو شروع ہی اس مطلع سے ہوتی ہے :

نہ جانے کون سے بدلے اتارتی رہتی ہے ۔۔۔ یہ زندگی ہمیں قسطوں میں مارتی رہتی ہے

کیا خوبصورت شعر ہے۔ ہر دل کی کہانی ہے۔

کہانی مرگ رودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے ۔۔۔ جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

انہوں نے خوبصورتی سے یہ قافیے استعمال کیے ہیں۔ سنوارتی، پکارتی، بہارتی اور اشتہارتی۔ ان میں نیا پن ہے اور انداز خوبصورت ہے۔ آصف ثاقب صاحب کی غزل بھی کمال کی ہے۔

مرے اوراق تم پڑھتے رہو گے ۔۔۔ میں لکھتا ہوں، لکھا رہ جانے والا

یہ ایسی حقیقت ہے جس کا ادراک شاعر کو ہے۔ انسان فانی ہے لیکن تحریر زندہ رہتی ہے۔ اس کے اعمال زندہ رہتے ہیں۔ شیخ سعدی نے گلستان سعدی میں سلطان محمود کے خواب کا ذکر کیا اور پھر آخر میں یہ شعر درج کیا :

زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل ۔۔۔ گرچہ بسے گذشت کہ نوشیرواں نماند

نوشیرواں کے عدل کا ذکر باقی ہے۔ جہانگیر کا عدل بھی اسی طرح باقی ہے۔ اسی طرح : ع میں لکھتا ہوں لکھا رہ جانے والا

بشریٰ رحمن صاحبہ کی غزل ''درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا'' کے مصداق ہے۔ بجا طور پر اجمل نیازی نے انہیں نثار حسن کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اعزاز احمد آذر اب ہم میں نہیں ہیں۔ ان کا کلام ان کی یاد دلاتا رہے گا۔ ان کی غزل کے مقطع کا مصرع ثانی غالباً غلط کمپوز ہو گیا ہے۔ نجم احمد بشیر کی غزل اچھی ہے۔ شاعری دل کی آواز ہوتی ہے۔ ذاتی احساسات، مشاہدات اور ارد گرد کا ماحول شعروں میں ڈھل جاتا ہے۔ جلیل عالی صاحب نے کیا خوب کہا ہے۔

کہاں کس سے کہیں رازِ دل، کیا عالی ۔۔۔ یہ شاعری کہ ہمیں اشتہاری رہی ہے

منظر ایوبی صاحب کی غزل کا پہلا شعر کا مصرع اولیٰ درست نہیں۔ سید ریاض حسین زیدی صاحب تو خوبصورت نعت کہتے ہیں۔ ان کا کلام اکثر نظر سے گذرتا ہے۔ غائبانہ ان سے ایک تعلق محسوس ہوتا ہے۔ ان کی غزل کا مقطع خوب ہے۔ تاہم اللہ عاقبت کی ی پر تشدید ہے اور مرے

خیال میں تحریر کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مسعود عثمانی صاحب کی غزل کا مطلع خوب ہے

یہ وہم ہے وہ جو ہر آدمی کو ہوتا ہے
وگرنہ کون جہاں میں کسی کا ہوتا ہے

اس غزل کا مقطع:

ہر ایک کو دوست بنانا منافقت ہے مسعودؔ
کسی کا ہوتا نہیں جو سبھی کا ہوتا ہے

پڑھ کر سید عارف یاد آ گئے۔ ان کا ایک خوبصورت شعر ہے

حقیقت میں کسی سے بھی نہیں ہے دوستی اُس کی
بظاہر جو کسی کو بھی خفا ہونے نہیں دیتا

ابنِ عظیم فاطمی نے اردو میں غزل کہہ دی ہے اور خوبصورت ہے۔ اردو کی خدمت ہے۔ کرشن پرویز صاحب کی غزل کے چوتھے شعر میں انہوں نے ٹیچی کو یوں ہی بنا دیا ہے۔ پروفیسر نور کمال شاہ صاحب کی غزل کے چوتھے شعر کے مصرعِ اول کی بحر تبدیل ہو گئی ہے۔ سعدیہ سیفی کے تین شعر ہیں۔ دوسرے شعر میں مصرعِ ثانی میں یقیں کی بجائے یقین کمپوز ہو گیا ہے۔ اسی طرح تیسرے شعر کا پہلا مصرع میں بھی کمپوزنگ کی غلطی محسوس ہوتی ہے۔ صدیق شاہد کی غزل اچھی تھی۔

ابھی زمانہ غالب میں گم رہے ہیں ہم
کہ کم نصیبیِ اہلِ ہنر تو اب بھی ہے

ایک وقت تھا جب "اکمن" خیال میں ناصر شہزاد، شفیق شریف، اقبال بلا صاحب، قیصر تجلی صاحب اور اے۔ بی اشرف کے خوبصورت تبصرے ہوا کرتے تھے۔ ناصر شہزاد صاحب بزرگ شاعر تھے۔ ان کے گیت "تخلیق" کی زینت ہوا کرتے تھے۔ ان سے ایک بار مری میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ڈاکٹر صابر آفاقی صاحب کے اعزاز میں منعقدہ تقریب میں آئے ہوئے تھے۔ مظفر آباد سے ڈاکٹر صابر آفاقی، مخلص وجدانی، ایم ایم کلی اور راقم آئے تھے۔ کافی عرصے سے ان کو تخلیق میں نہیں دیکھا۔ اس بار "تخلیق" ملا تو خط پر پتہ تو میرا تھا لیکن نام مظفر علی راجا صاحب کا تھا جو لاہور کے وکیل ہیں۔ بعض اوقات ای میل پر رسالہ نہیں ملتا۔ اس ضمن میں دفتر والے احتیاط کریں تو بہتر ہے۔

زید اللہ فہیم (میرپور۔ کشمیر)

(18) محترمی و مکرمی جناب سونان اظہر جاوید صاحب!

سلام مسنون! ماہ جون 2017ء کا "تخلیق" کا شمارہ اپنے نہایت دیدہ زیب اور دلکش سرورق کے ساتھ موصول ہوا۔ جسے دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ میری حمد باری تعالیٰ اور نعت شامل اشاعت فرمانے پر آپ کا دلی طور پر بے حد شکر گزار ہوں۔ ویسے تو کسی بھی مجلے کی عبارت کی کمپوزنگ معمولی سی بات ہے تاہم اس ضمن میں آپ کی توجہ بھی از حد ضروری ہے۔ میری حمد کے دوسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں ایک نقطے کی وجہ سے لفظ "عطائی" کو "جدائی" بنا دیا گیا ہے۔ خیر ان معمولی لغزشوں کو ادب کے رسیا قاری حضرات خوب سمجھتے ہیں۔ اس شمارے میں آپ کا اداریہ "پہلی بات" کے عنوان سے نہایت اہم اور حقیقت افروز ہے۔ آپ کا اشارہ بڑے اداروں کے سربراہان کی اشتہارات کے معاملے میں ادبی پرچوں سے بے اعتنائی ایک طرف اور دوسری طرف یہ کہ ادب کو بھی سیاسی میدان سمجھ کر سیاسی پارٹیوں کی بنیاد پر چلایا جا رہا ہے۔ محض سیاست کی طرح ادب میں بھی منافقت پھیلائی جا رہی ہے اور گروہ بندی کی جا رہی ہے۔ ایوارڈز دیے نہیں جاتے بلکہ لئے جاتے ہیں۔ اس لئے اب یہ تمام ادبی ایوارڈز بھی اپنی اہمیت کھو چکے ہیں۔ اسی طرح ابھی نری ادبی تقریبات کا ذکر بھی

آج کے معاشرے خصوصاً نظر انداز کئے جانے والے ادبی طبقے کی دکھی رگ پر ہاتھ رکھنے کے مترادف ہے۔ چلئے زیرِ نظر "تخلیق" کے شمارے کی بات کرتے ہیں۔ قارئین "تخلیق" تو پہلے ہی آپ کے کڑے انتخاب کے مداح ہیں۔ حمد و نعت کے باب میں ریاض ندیم نیازی اور گستاخ بخاری کی نعتیں خوبصورت اور ایمان افروز ہیں۔ مضامین کے باب میں سید مقصود حسنین زیدی کا مضمون "کچھ انور سدید کے بارے میں"، اور ڈاکٹر انور سدید کا مضمون "جمیل الدین عالی اور ان کی شاعری" اور ڈاکٹر محمد اجمل نیازی کا مضمون بشریٰ رحمٰن کے بارے میں "نگارِ سخن" کے زیرِ عنوان کے علاوہ بھی تمام مضامین میں لکھنے والوں نے اپنے اپنے موضوع سے انصاف کیا ہے اور یہ تمام لوگ داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ منظومات کا باب اظہر جاوید سے لے کر امجد بابر تک ادب کے بہترین نمونے ہیں۔ افسانوں کے باب میں ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ "برکت" ہی میں پڑھ سکا جو مجھے بے حد پسند آیا۔ اس میں نئی اور پرانی قدروں کی نہایت کامیاب عکاسی کی گئی ہے۔ کیوں نہ ہو ڈاکٹر رشید امجد آج اردو ادب میں افسانے کے حوالے سے ایک بڑا نام ہیں۔ غزلوں میں بھی نہایت مستند اور منجھے ہوئے لوگ مثلاً اظہر جاوید، جلیل عالی، آصف ثاقب، بشریٰ رحمان، حلیم احمد بشیر، اعزاز احمد آذر، منظر ایوبی، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی وغیرہ شامل ہیں۔ اردو شاعری میں دلچسپی رکھنے والے تمام قارئین میں یہ بے حد مقبول اور پڑھے جانے والے شعراء ہیں۔

یادنگاری کے باب میں جناب ڈاکٹر رشید امجد کا مسلسل قسط وار مضمون بے حد اہم ہے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی اپنے آپ کو پیش آنے والے حالات و واقعات اور ملکِ عزیز کی سماجی، معاشرتی اور سیاسی ناہمواریوں کا ذکر انتہائی دیانت داری اور سچائی کے ساتھ اپنے خلوص اور رواں دواں اندازِ بیان میں کچھ اس طرح کیا ہے کہ پڑھنے والا ان تمام باتوں اور حالات کے سانچے اپنی ذات پر اور فکر و سوچ پر مکمل طور پر فٹ اور منطبق پاتا ہے۔ انہوں نے جن لوگوں کا ذکر کیا ہے وہ بھی اردو ادب میں اعلیٰ مقام رکھتے ہیں اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ جن ہستیوں سے بھی وہ ملتے جلتے رہے ان کا ذکر انہوں نے نہایت صاف گوئی اور بے باکی سے کیا ہے۔ اس وجہ سے ان کی تحریر کو چار چاند لگ گئے ہیں۔ بہر حال "تخلیق" کے دیگر ابواب سفرنامے، یادِ رفتگاں، خاکے، طنز و مزاح، پنجاب رنگ، تبصرے، انجمن خیال بھی لائقِ تحسین ہیں اور یہ ماہنامہ "تخلیق" کا قد و قامت دیگر جرائد میں بلند کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں۔ آئندہ شمارے کے لئے ایک ترانہ بعنوان "تمہارا انتظار ہے" ارسالِ خدمت ہے۔ وہ اس لئے کہ ماہِ ستمبر میں "یومِ یکجہتی کشمیر" کی آمد آمد ہے اور آج کل بھارتی ظلم و بربریت کا بھی کشمیر میں دور دورہ ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں دو ایک شہادتیں نہ ہوتی ہوں۔ میرا خیال ہے آپ بھی یہ ترانہ شاملِ اشاعت کرنا چاہیں گے۔ امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

رشید آفرین (سیالکوٹ)

(19) محترم و مہربان اظہر جاوید صاحب!

دیدہ زیب اور خوش رنگ ماہنامہ "تخلیق" مل گیا ہے۔ لیکن کل ہی ۹ جولائی کو ملا ہے۔ بیماری اور بڑھاپا کے باوجود لفافہ بڑی عجلت سے کھولا اور محبت کا تحفہ سمجھ کر قبول کیا۔ جناب عالی! ماہنامہ "تخلیق" کی تازگی اور دلکشی کے تو ہم پہلے ہی قائل ہیں لیکن "تخلیق" اب کچھ زیادہ ہی دل افروز بن گیا ہے۔ اور پیارا پیارا لگتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت، بے پایاں کرم اور آپ کی شبانہ روز محنت اور بے لوث

خدمات کا نتیجہ ہے۔ مرحوم اظہر جاوید کا لگایا ہوا پودا تناور درخت اب بن کر روشن روشن بھی لگ رہا ہے۔ ''تخلیق'' اس لحاظ سے بھی منفرد ہے کہ اس میں مستقل لکھنے والے اہلِ قلم روشن دل و دماغ کے مالک ہیں اور خلوص کے بندے ہیں۔ میں ان سب کا تہہ دل سے احترام کرتا ہوں۔ لیکن ٹائٹل بنانے والے نقاش ایسی۔ خالد صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ وہ اپنے فن پارے کا کچھ عنوان بھی تجویز کیا کریں، جو اس فن پارے کی خوبیوں کو بروئے کار لانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ جناب عالی! مطالعہ کی غرض سے سب سے پہلے محترم پرویز قاضی صاحب کا مضمون ''انبیا کی قوم'' پڑھا ہے۔ آیات کے تراجم اور تفسیری نوٹس پڑھتے ہی ایسے لگا جیسے یہ مضمون مولانا مودودی کی تحریر ہے۔ سارا مضمون پڑھ لینے کے بعد بھی یہی احساس باقی رہا کہ یہ تحریر قاضی صاحب کی تحریر نہیں ہے بلکہ مولانا مودودی کی تحریر ہے جو عالم علم و ادب میں منفرد حیثیت میں اپنی شناخت رکھتی ہے۔ اور تفہیم القرآن سے لفظ بلفظ نقل کر رہا ہے۔ ''تخلیق'' کے قارئین و ادیبوں کی خدمت میں پیش کی گئی ہے۔ جنھوں نے قرآن پاک کی آیات کے تراجم سے معمور اس تحریر کو افسانوں کے زمرے میں ڈال دیا ہے۔ جناب عالی! یہ ایک قابلِ غور حقیقت ہے لیکن ان معروضات سے کسی کی دل شکنی یا اہانت مطلوب نہیں ہے۔ ہمارا مطلب صرف حقیقتِ حال کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا ہے اور ایسا کرنا ''تخلیق'' کے قارئین کے فرائض میں شامل ہے۔

خالد عبداللہ چودھری (راولپنڈی)

﴿20﴾ ایڈیٹر صاحب!

کل ہی ڈاک سے ''تخلیق'' ملا۔ ساری رات پڑھتا رہا۔ ''تخلیق'' اپنے اندر تخلیقی تحریریں رکھتا ہے۔ سید مشکور حسین یاد اور ڈاکٹر انور سدید کے مضامین نے یادوں کے دریچے کھول دیے اور خصوصی طور پر ڈاکٹر انور سدید مرحوم کا ایک یادگار خط یاد آ گیا جو انھوں نے قاسمی مرحوم اور اظہر جاوید مرحوم کے حوالے سے تحریر کیا۔ جو آج بھی میرے پاس محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر محمد اجمل نیازی صاحب اور ملک اشرف ذکی صاحب کے مضامین نے علم میں بے پناہ اضافہ کیا۔ افسانوں میں ڈاکٹر رشید امجد صاحب، طارق بلوچ صحرائی کے افسانے عمدہ ہے۔ غزلوں میں امجد ثاقب، اظہر جاوید، آرشن پرویز، تسلیم احمد بشیر، حسن عسکری کاظمی کی تخلیقات بہترین ہیں۔ خصوصی طور پر ''پنجاب رنگ'' نے بے حد خوشی دی۔ ''پنجابی زبان سے محبت کرنا فرض ہے۔'' ''انجمن خیال'' بھی عمدہ رہی۔ گذشتہ 48 برس سے ''تخلیق'' علم و ادب کی جو خدمت کر رہا ہے وہ کمال ہے۔ خدا اس رسالہ کو پائندہ رکھے۔ آمین! میں ذاتی طور پر اس کا سالانہ خریدار بن کر بے حد فخر محسوس کرتا ہوں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید ہمت و طاقت عطا کرے کہ آپ ادب کی زیادہ خدمت کر سکیں۔

فصیح اللہ جرال (گجرات)

﴿21﴾ محترم سلمان اظہر صاحب!

''تخلیق'' کا نیا شمارہ نظر نواز ہوا۔ دیدہ زیب سرورق نے نگاہوں کو خیرہ کیا۔ ''پہلی بات'' کے تحت آپ نے جو فرمایا کہ ادب بھی اب سیاسی پارٹیوں کی بنیاد پر چلایا جا رہا ہے۔ میں اس سے متفق ہوں کہ گروہ بندی کا چلن عام ہے۔ میں یہ پرچہ خرید کر پڑھتا ہوں اور اس وقت بھی گیارہ پرچوں کا سالانہ خریدار ہوں۔ دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ چار پرچوں کے مدیران نے جن کے میں نام لینا نہیں چاہتا سالانہ

چندہ تو لے لیا لیکن مجھے پرچے روانہ نہیں کیے۔ تاہم سوہان صاحب باقاعدگی سے پرچہ روانہ کرتے ہیں۔ ان کا ممنون ہوں۔ یہ بھی سچ ہے کہ اب ایوارڈ دیے نہیں جاتے بلکہ شناسائی اور سفارش کی بنیاد پر لیے جاتے ہیں البتہ ''تخلیق ایوارڈ'' اس سے مستثنیٰ ہے کہ یہ ایوارڈ خالصتاً کارکردگی کی بنیاد پر دیا جاتا ہے۔ رشیدہ آفرین کی حمد میں اللہ کریم کے حسن سے سماں باندھا۔ مالک ارض و سما کی بے ساختگی سے کی گئی تعریف نے دل میں روحانی روشنی کو بیدار کیا۔ نعت کا مطلب آقا پاکؐ کی سیرت مطہرہ کے اوصاف بیان کرنا ہے اور وہی نعت دل و نگاہ میں جگہ بناتی ہے جس میں آقا پاکؐ کے اوصاف اور آقا پاکؐ کے اسوۂ حسنہ کو موضوع بنایا گیا ہو۔ آج کل جو نعت کہی جا رہی ہے اس میں غالب حصہ شاعری اپنی خواہشات اور التماسوں کے بیان پر مبنی ہوتا ہے۔ سید منظور حسین یاد بزرگ ادیب اور استاد ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر انور سدید کے حوالے سے بہت سی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ یہ خاصے کا مضمون ہے اور ''تخلیق'' کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے قارئین کو ہر حوالے سے ادبی چاشنی سے بہرہ ور کرتا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں ڈاکٹر وزیر آغا اور اپنا ادبی موازنہ اقتباسات کے حوالے سے عمدگی سے کیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے جمیل الدین عالی کی شاعری پر مختصر مقالہ تحریر کیا ہے۔ ایک طرف انھوں نے عالی کی زندگی کے حوالے سے مفید معلومات دی ہیں تو دوسری طرف ان کی شاعری کا جائزہ بھی عمدگی سے لیا۔ بشریٰ رحمٰن پر ڈاکٹر اجمل نیازی کا خاکہ نما مضمون بھی اچھا ہے۔ مسلم شمیم، ڈاکٹر پرویز امجد، مظہر سہیل، اخلاق عاطف اور ملک اشرف ذکی کے مضامین بھی اس بار کے تخلیق کے گوشہ مضامین کا حصہ ہیں۔ حصہ نظم کو اطہر جاوید، جلیل عالی، بشریٰ رحمٰن، پروین شیر، حسن عسکری کاظمی، سرفراز سید، نعیم احمد بشیر، توقیر مشتاق، شہزاد نیر، مرزا احمد نور طاہر، آمنہ کنول، سیماب ظفر بخاری، سعدیہ بخشی اور امجد بابر نے اپنی حسین اور دلنشیں نظموں سے مہکایا ہے۔ مجھے سب سے زیادہ افسانوں کا گوشہ بھاتا ہے اس لیے کہ میں خود افسانہ نگار ہوں۔ پہلا افسانہ نامور افسانہ نگار ڈاکٹر رشید امجد کا ''برکت'' ہے۔ افسانہ ماضی اور حال کا تقابل ہے۔ ماضی میں سہولتیں نہیں تھیں لیکن سکون تھا۔ چہروں پر نور ہوتا تھا اور اب اکیسویں صدی میں ہر سہولت موجود ہے لیکن انسان وقت کو کھو چکا ہے۔ روحانی خوشی اور سکون ناپید ہو چکا ہے۔ اب انسان کے پاس خود سے ملنے کا بھی وقت نہیں۔ اسی بات کو رشید امجد نے افسانوی پیرائے میں بیان کیا ہے۔ رشید امجد کے افسانوں کی نمایاں خوبی اختصار ہے۔ وہ سادہ اور عام فہم الفاظ میں اپنی بات قاری تک پہنچانے کا قرینہ رکھتے ہیں۔ والدین کی خواہشات کو پس پشت ڈالنے والوں کا المیہ جس درد انگیزی سے انھوں نے بیان کیا ہے درحقیقت یہ موجودہ عہد کا المیہ ہے جس سے تقریباً سبھی والدین دوچار ہیں۔ نجم الحسن رضوی کا افسانہ ''آدھے چاند کی رات'' ناکام محبت لیکن پائیدار دوستی کے رشتے میں بندھے دو صاف دل انسانوں کی روداد ہے۔ محمد اسلم کا افسانہ ''ملاح کا بھاڑا'' سرمایہ داروں کے ہاتھوں غریبوں کے جنسی اور معاشی استحصال کی کہانی سناتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس افسانے میں ایک المیہ بھی بیان ہوا ہے کہ غریب زندہ ہو تو اس کی دیکھ بھال کوئی نہیں کرتا لیکن اس کے مرنے کے بعد امیروں کو خدا اور موت یاد آ جاتے ہیں اور وہ مرنے والے کی رسمیں ادا کرنے کو شرافت تصور کرتے ہیں۔ جنسی استحصال کی تفصیل تو افسانے میں کہیں نہیں ہے لیکن بارہ سالہ زیب کی شادی کی صلاح جو کہ جاگیردار گردیزی کی طرف سے دی گئی جس کو سن کر زیب کا تیس سالہ کالے یرقان کا مریض باپ برداشت نہ کر سکا اور مر گیا۔ جس انداز میں یہ صلاح دی گئی وہ معصوم بچیوں کی طرف اشارہ کرتی گندی نظروں کی کہانی دلدوزی سے بیان کرتی ہے۔ محمد اسلم نے ملاح اور ست بھرائی کا سراپا مشاقی سے کھینچا ہے اور بیماری کے دوران گاؤں والوں کے اعتقادی تفصیل بھی دی ہے۔ المناک انجام پر مشتمل چشم کشا افسانہ ہے۔

افسانہ وہ ہے جو ابتدا ہی سے قاری کو اپنے سحر میں اس طرح جکڑ لے کہ پھر اختتام تک قاری کو اس کے ساتھ ساتھ محو سفر ہونا

جاتے ہے۔ تحقیق فلسفے میں گندھی نثر قاری کی دلچسپی ختم کر دیتی ہے۔ طارق بلوچ صحرائی کا "اُم" کا ابتدائی حصہ اگرچہ فلسفے کی گاڑھی چاشنی سے لبریز ہونے کی وجہ سے قاری کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ دوسرا یہ افسانہ کی بجائے خاکے کے ذیل میں آتا ہے۔ واحد متکلم راوی ہے اور اس میں راوی کے والدین خصوصاً باپ کو زیادہ فوکس کیا گیا ہے۔ راوی نے کئی مقامات پر اپنی ہار کا ذکر کیا ہے لیکن ہار کس وجہ سے ہوئی اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ (یہ میری ذاتی رائے ہے جس سے متفق ہونا ضروری نہیں) ایک بات جس کا تذکرہ کرنا ضروری ہے وہ طارق بلوچ صحرائی کی شاعرانہ حسن سے مملو نثر ہے۔ کئی جملے ایسے لکھے ہیں کہ منہ سے بے ساختہ داد کے کلمات ادا ہو جاتے ہیں۔ سیج وزبخت قاسمی کا "سیاہ کی قوم" افسانہ نہیں ہے، یہ مضمون ہے۔ سیماب وز کا افسانہ "سچ کی آواز" پردیس میں رہنے والے پاکستانیوں کی مشکلات اور مصائب کے ساتھ ساتھ ان کی بے سکونی کی کتھا ہے۔ پاکستان کے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام پر سیماب نے بہترین طنز کیا ہے۔ پاکستان میں سفارش اور رشوت نے کچھ نے فریب کا بیج اِدغام کر دیا ہے۔ اس صورت حال کی عکاسی سیماب نے عمدگی سے کی ہے۔ شعلہ چنگیزی کا افسانہ "اسپ تازی" مختصر مگر جامع ہے۔ نئی نسل کے خلافات بھرے اذہان کی تصویر کشی شعلہ نے عمدگی سے کی ہے۔

اظہر جاوید، تخلیق کے روحِ رواں۔ ان کا پنجابی افسانہ "بے سوال باتیں" کو اردو کے قالب میں حنیف باوا نے ڈھالا۔ انسانی بے بسی کی تصویر کھینچتا اچھا افسانہ ہے۔ غزلوں کے گوشے کو اظہر جاوید، جلیل عالی، آصف ثاقب، بشریٰ رحمن، نیلم احمد بشیر، اعزاز احمد آذر، منظر ایوبی، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، ابصار عبدالعلی، مسعود عثمانی، ڈاکٹر جواز جعفری، ابن عظیم فاطمی، زرینہ پروین، بیکل مروتی، عراق مرزا، ریحانہ تحسین حیدر، صوفیہ بیدار، آفتاب خان، نیئر رانی شفق، طاہرہ منظور، پروفیسر نور کمال شاہ، سعدیہ تسنیم سحر، جاوید عباس جاوید اور صدیق شاہد کی شاعری سے سجایا گیا ہے۔ جلیل عالی نے قوافی کو نئے زاویوں سے استعمال کیا ہے۔ بشریٰ رحمن کا شعر بہت عمدہ ہے:

جو حضورِ یار سر کو رکھے سجدہ ریز پیہم　　وہی ایک قعود ہے وہ وہی ایک قیام ہے وہ

اعزاز احمد آذر کی غزل کے تمام شعر شگفتہ اور ترنم کے حسن سے مالا مال ہیں۔ کمال خوبصورتی سے انہوں نے فقیہِ شہر پر طنز کیا ہے:

اے فقیہِ شہر وہ کیا ہوئی، یہاں سب سے اہم جو چیز تھی　　وہی جس پہ آپ کو ناز تھا وہی جس کا نام ضمیر تھا
ذرا بھول کر مری ہار کو، مرے دشمنو مجھے داد دو　　میں لڑا ہوں آخری سانس تک مرے پاس ایک ہی تیر تھا

ابن عظیم فاطمی نے اردو کی محبت میں دلپذیر شعر کہے ہیں۔ ڈاکٹر رشید امجد کا قسط وار سلسلہ عمدگی کا حامل ہے۔ ان کی نثر میں بے ساختگی کا عنصر دلچسپی کو برقرار رکھتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید اور افتخار مجاہد نے بھی عمدگی سے لکھا ہے۔ باقی سلسلے بھی بہترین ہیں۔ انجمن خیال میں نبیلہ تبسم کا مکتوب بہت عمدہ تبصروں پر مشتمل ہے۔ رشید آفرین کا مکتوب بھی تنقیدی حوالے سے اہمیت کا حامل ہے۔ لکھا طویل ہو گیا، کیونکہ تخلیق میں شامل ایک ایک تحریر پڑھنے پر اکساتی ہے۔

جمیل حیات (اٹک)

﴿22﴾ سوہنے اظہر جاوید صاحب

"تخلیق" کا تازہ شمارہ ملا۔ نیا گیٹ اپ مبارک۔ پچھلے شمارے سے یہ روایت شروع ہو چکی ہے۔ ہر تحریر کی ابتدا میں لکھنے والے کا تعارف موجود ہوتا ہے۔ سب قارئین تو پرانے لوگ نہیں ہوتے۔ نئے پڑھنے والے بھی تو ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ پرانے لوگ بھی

سب لوگوں کو جاتی ہیں۔ اس لئے لکھاریوں کا تعارف از حد ضروری ہے۔ ایسا تحقیقی مجلوں اور بین الاقوامی رسائل و جرائد میں بھی ہوتا ہے۔ احسن اقدام ہے۔ اس روش سے ''تخلیق'' کا رنگ نکھرا ہے اور اس کے اعتماد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

آپ نے ''تخلیق'' کے قارئین سے گلہ کیا ہے کہ وہ خاطر خواہ قلمی تعاون نہیں کرتے۔ بجا ہے لیکن اس سلسلے میں کچھ آپ کی طرف سے بھی پابندی ہے۔ آپ نے اپنی سہولت کی خاطر اپنے کسی گذشتہ شمارے میں کہا تھا کہ ''تخلیق'' کے لئے جو کچھ بھی بھیجا جائے کمپوز کر کے بھیجا جائے۔ نئی پود کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ کمپیوٹر، لیپ ٹاپ کا استعمال اور کمپوزنگ ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا حصہ ہے لیکن ہم جیسے پرانے لوگوں کے لئے ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ الیکٹرانک پرنٹ کا استعمال بڑے بوڑھوں کو کب آتا ہے؟ یہ تو نئے دور کے تقاضے ہیں۔ پرانے لوگوں کو تو ہاتھ میں قلم پکڑنا ہی آتا ہے۔ دل چاہتا ہے کہ تخلیق کے ہر شمارے کے لئے کچھ لکھ کر بھیجوں لیکن رک جاتا ہوں۔ کمپوزنگ کا مسئلہ آڑے آتا ہے۔ دوسرا آپ کے معیار کا خوف۔ بڑھاپے میں تو اپنے آپ پر بھی اختیار نہیں رہتا۔ ''کھلی بات'' میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے، صحیح لکھا ہے۔ اب تو ہر کام بازاری ہو چکا ہے۔ سو ہم کاروباری ہیں۔ اقدار کا جنازہ نکل چکا ہے۔ انسانیت اور اخلاقی قدریں مادی زندگی اور دولت کے انباروں میں دب چکی ہیں۔ اجلے اجلے چہرے اندر سے داغدار اور دھواں دار ہیں۔ ایسے میں اندر سے سچ کیسے نکلے گا؟ معاشرتی زندگی میں دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ فراڈ ہی فراڈ ہے۔ سچی اور اچھی باتیں لکھنے کے لئے عمل صالح شرط ہے۔ مادہ پرستانہ ماحول میں یہ چیز مفقود ہے۔ بعض لکھنے والے جو کچھ لکھتے ہیں اس سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کو اچھا بننے اور نیکی کی تلقین کرتے ہیں لیکن ان کا اپنا حال ابتر ہوتا ہے۔ وہ اپنی خوشنما تحریروں سے اپنی خباثتوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح جس طرح بلی اپنی گندگی کو مٹی سے ڈھانپ دیتی ہے۔

یہ دنیا فرعون کا اکھاڑہ بن چکی ہے جہاں صرف جادوئی سانپ ہی رینگتے ہیں۔ جب ان پر موسوی ضرب پڑتی ہے تو پھر کچھ بھی نہیں رہتا۔ آپ نے ادبی تحریکات کا بھی ذکر کیا ہے اور اپنی دلی آزردگی کا اظہار کیا ہے۔ جب لاہور جیسے شہر کی یہ حالت ہو کہ روایتیں دم توڑ رہی ہوں تو دوسرے شہروں کا کیا حال ہوگا؟ اب تو ادبی تحریکات کا انعقاد اپنی شخصیت کو کیش کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ پروپیگنڈہ اور بات کو بڑھا چڑھا (Magnify) کر پیش کرنا تحریک کا حسن سمجھا جاتا ہے۔ ہر جگہ مخصوص ٹولہ گروہ بن کر منڈلاتا رہتا ہے۔

میں نے بھی چند ادبی تحریکات کا رنگ دیکھا ہے۔ جا کر پچھتاوا ہی ہوا۔ قرآن کریم کی ایک آیت کا مفہوم ہے کہ ایسی بات کیوں کرتے ہو جس پر عمل نہیں۔ وقت کی پابندی زندہ و تابندہ قوموں کی پہچان ہے۔ وقت کی پابندی اور قدر کرنے کی تلقین کرنے والوں کو وقت کی بے قدری کرتے دیکھا۔ کانوں کو ہاتھ لگا لئے۔ آپ نے ایوارڈ کی بات کی ہے۔ اس سلسلے میں آپ کا یہ جملہ تاریخی ہے، دستاویزی ہے۔ ''ایوارڈ دیئے نہیں جاتے لئے جاتے ہیں۔'' یقیناً یہ جملہ جھوٹی شہرت کے بھوکے لوگوں اور نام نہاد دانشوروں کے دل پر ضرب عضب بن کر لگا ہوگا لیکن ایسے لوگوں کو شرم نہیں آتی اور نہ ہی ان کی غیرت اور حمیت جاگتی ہے۔

میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ زیادہ باخبر بھی نہیں لیکن اس بارے میں جب کسی باخبر آدمی سے اندرون خانہ کہانیوں کا پتہ چلتا ہے اور کچھ معلومات حاصل ہوتی ہیں تو دکھ ہوتا ہے۔ اخلاقی قدروں کا پرچار کرنے والوں، قلمکاروں کے مکروہ چہرے نظروں میں گھومنے لگتے ہیں کہ کس طرح وہ درباری بن کر، گھٹنے ٹیک کر، خوشامدیں کر کے اور انجمن ستائش باہمی کے مستقل ممبروں کے پروپیگنڈہ سے ایوارڈ

حاصل کر کے میدان کر چلتے ہیں۔ ایسی حالت میں جب وہ کسی سے ملتے ہیں تو مینڈک کی طرح ان کے نتھنے پھڑ پھڑاتے ہیں اور غرور و تکبر سے ان کے پاؤں زمین پر نہیں پڑتے۔ ان کے مقابلے میں جن لوگوں کو میرٹ پر ایوارڈ ملتے ہیں، عجز و انکساری اور مروت ان کی گفتگو اور ہر عمل سے جھلکتی ہوتی ہے۔ ہر انسان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ایوارڈ تو اس کا حق تھا جو اللہ کے فضل و کرم سے انہیں مل گیا۔ طوالت کے باعث "تخلیق" میں شائع شدہ تحریروں کے بارے میں رائے دینے سے قاصر ہوں لیکن ایک گزارش ضرور ہے۔ ہمارے ملک میں بے بات بات پر "ٹوٹو ارپچے" رکھنے والوں کو ان کے "اعمال صالحہ" کی بنا پر استثنیٰ حاصل ہوتا ہے۔ ہم جیسے پرانے سفید ریش لوگوں کو بھی ان کی کمزوریوں کے باعث کمپوزنگ سے استثنیٰ ملنا چاہیے تا کہ ہم بھی اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریریں باقاعدگی سے بھیج سکیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال صمصام (مردان)

(ادارہ "تخلیق" (ادارے کی یہ شرط ان احباب تک محدود ہے جو کمپیوٹر سے آشنا ہیں لیکن اس صورت میں بھی تمام احباب کو اپنے ہاتھ سے اپنی تخلیق تحریر کر کے روانہ کرنے پر ہی زور دیا جاتا ہے جو کہ "تخلیق" کی کئی برسوں سے روایت ہے)

«23» ادبی محترم برادر سونان اظہر جاوید صاحب مدیر ماہنامہ "تخلیق" لاہور

عرض ہے: سلام! بندۂ خاکسار خیریت سے ہے اور آپ کی خیریت، درازیٔ عمر، صحت و سلامتی کیلئے مالک کل کے ہاں سراپا دعا ہوں۔ مزید دعا گو ہوں کہ خدا تعالیٰ ماہنامہ "تخلیق" کے بانی اظہر جاوید صاحب کے درجات عالی اور متعالی فرمائے، جنت الفردوس میں مقام بلند عطا فرمائے اور ماہنامہ کی دیگر پوری ٹیم کو سلامت با کرامت تا قیامت رکھے۔ جناب عالی! میں پچھلے دنوں ایک بزرگ شاعر محمد حسین عارف کے ہاں گیا تو وہاں ماہنامہ "تخلیق" پر نظر پڑی میں نے جسارت کرتے ہوئے برائے مطالعہ ان سے یہ شمارہ طلب کیا تو یہ ان کی ذرہ نوازی کہ مجھ خاکسار کو بغیر کسی سوال جواب کے وہ شمارہ دے دیا۔ جناب عالی یہ ماہ دسمبر 2016ء کا شمارہ ہے جسے میں آج کل پڑھ کر سیر یاب ہو رہا ہوں۔ میں اشاعت کے مسلسل 47 سال گذرنے پر آپ کو دل کی عمیق گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں یقیناً ہی اس قدر عظیم رسالے نکالنا آج کل جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ میں آپ کی اس کاوش کو خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔ شمارے کے ابتداء میں جناب سونان اظہر صاحب کی طرف سے لکھی گئی "پہلی بات" کا مطالعہ کیا تو ان لوگوں پر دلی دکھ ہوا جو ادب کی آبیاری کی مخالفت میں کھڑے ہیں یقیناً ہی مہنگائی کے اس دور میں آپ ادب کی خون جگر سے آبیاری کر رہے ہیں۔ بندۂ حقیر اس مشن میں آپ کے ساتھ تعاون کی یقین دہانی کراتا ہے۔ آپ نے یہ بجا فرمایا کہ والد صاحب اپنے دورِ حیات میں نئی نسل کی تحاریر کو اس رسالے کا حصہ بناتے تھے جبکہ آپ حوصلہ افزائی کی خاطر یا ادب کے فروغ کے لئے نئے لکھاریوں کو بھی موقع دیتے ہیں۔ میں خاکسار اس احسن اقدام پر بھی آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میں خالق دو جہان کے ہاں دعا گو ہوں جس طرح والد بزرگوار اظہر جاوید صاحب نے عہد کیا تھا کہ آخری سانس تک "تخلیق" کی تخلیق کرتے رہیں گے آپ بھی اس سفر کو جاری رکھیں۔ واقعی کئی شہرۂ آفاق رسائل بند ہو چکے ہیں اور ماہنامہ "تخلیق" نصف صدی سے چھپ رہا ہے یقیناً یہ ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔

اسد رضا سحر (جھنگ)

•••

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اس لیے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ نیرنگ خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ : سلطان رشک 0333-5692523	سہ ماہی [illegible] مری مدیر اعلیٰ : [illegible] 0321-7426898	ماہنامہ سپوتنک لاہور مدیر اعلیٰ : آغا امیر حسین 0300-8440444
ماہنامہ حکایت لاہور مدیر : عارف محمود 0323-4329344	سہ ماہی نوادر مدیر : [illegible] 0333-4722999	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر : شاہد علی خان 0301-4001844
ماہنامہ انشا کلکتہ انڈیا مدیر : ف س اعجاز 0091-3322354616	ماہنامہ شاعر ممبئی انڈیا مدیر : افتخار امام صدیقی 0091-932451517	سہ ماہی انتساب انڈیا ایڈیٹر : سیفی سرونجی 0091-942564177
ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر : عمران منظور 0300-8430043	ماہنامہ روشنائی کراچی مدیر : احمد زین الدین 0321-2011595	ماہنامہ ہمدرد نونہال مدیر : سعدیہ راشد 042-36620949

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
1-	[illegible]	[illegible] رضوی	021-32751428	اکادمی بازیافت کراچی	400/-
2-	[illegible]	[illegible] رضوی	021-3236133	[illegible] کراچی	500/-
3-	[illegible]	قیصر گل	021-32751428	اکادمی بازیافت کراچی	400/-
4-	[illegible]	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	042-37324164	مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ لاہور	380/-
5-	[illegible] پاکستان	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	042-37324164	مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ لاہور	1500/-
6-	اسلام اور پاکستان	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	042-37324164	مقبول اکیڈمی سرکلر روڈ لاہور	1200/-
7-	[illegible]	انور شعور	021-32761100	رنگِ ادب پبلی کیشنز کراچی	500/-
8-	اردو کے 100 [illegible] شاعر	[illegible]	0321-5440882	بک کارنر جہلم	1500/-
9-	[illegible]	سرفراز سید	042-3732294	قریشی برادرز پبلشرز لاہور	200/-
10-	رشحات نسیم سحر (مضامین و تبصرے)	نسیم سحر	0333-6357918	[illegible] اسلام آباد	350/-
11-	[illegible]	[illegible]	042-37355323	[illegible] پبلی کیشنز لاہور	360/-
12-	[illegible] (شعری مجموعہ)	[illegible]	0331-4387871	[illegible] پبلشرز لاہور	
13-	[illegible]	[illegible]	091-5201544	[illegible] پشاور	600/-
14-	یادوں کے جگنو (شاعری)	[illegible]	051-5551519	[illegible] راولپنڈی	400/-
15-	[illegible] (مضامین)	[illegible] خان	0345-2610434	رنگِ ادب پبلی کیشنز کراچی	300/-

◆◆◆

Winter Family Festival
HOT DeLivey DeAls 50% Less Than MeNu PriCe
options
AN EXOTIC RESTAURANT
LAHORE
RS : 999
Family Fun Deal
Large Pizza of Choice, Exotic Club Sandwich, Crispy Plain Fries, 1.5 Ltr Coke.
4
MaMa'S Break Time
Exotic Chicken Handi, Special Tawa Chick
Chicken Biryani, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr
RS : 1399
Grand Slami'N Deal
Exotic BBQ Platter, Chicken Karahi Half, Chicken Biryani, Salad Bowl, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke.
4
MonSter MeaL
Chicken Roast Full, 6 Reshmi Kebab, Chicken Handi, 3 Naan, 3 Roti, Raita, Salad, 1.5 Ltr Coke.
6
ONLY FOR
DELIVERY HOT LINES 0333-2800935
BUY "1" GET "ONE" FREE
STARBUCKS COFFEE
AVAILABLE INSIDE CAFE WITH THIS VOUCHER
OPTIONS SPECIAL ICE-CREAM
BUY "1" SCOOP GET "ONE"
AVAILABLE INSIDE CAFE

CamScanner

MONTHLY TAKHLEEQ
CPL NO 96
ISO 9001 CERTIFIED
Silver Sand
PAINTS
رنگ۔ جو زندگی ہے!
UP Industries (Pvt.) Ltd
Canal Bank, Karmani Road, near Izmir Town,
Lahore
Phone: +92-42-37510231 to 34

تخلیق

یادگار خاص نمبر

CamScanner

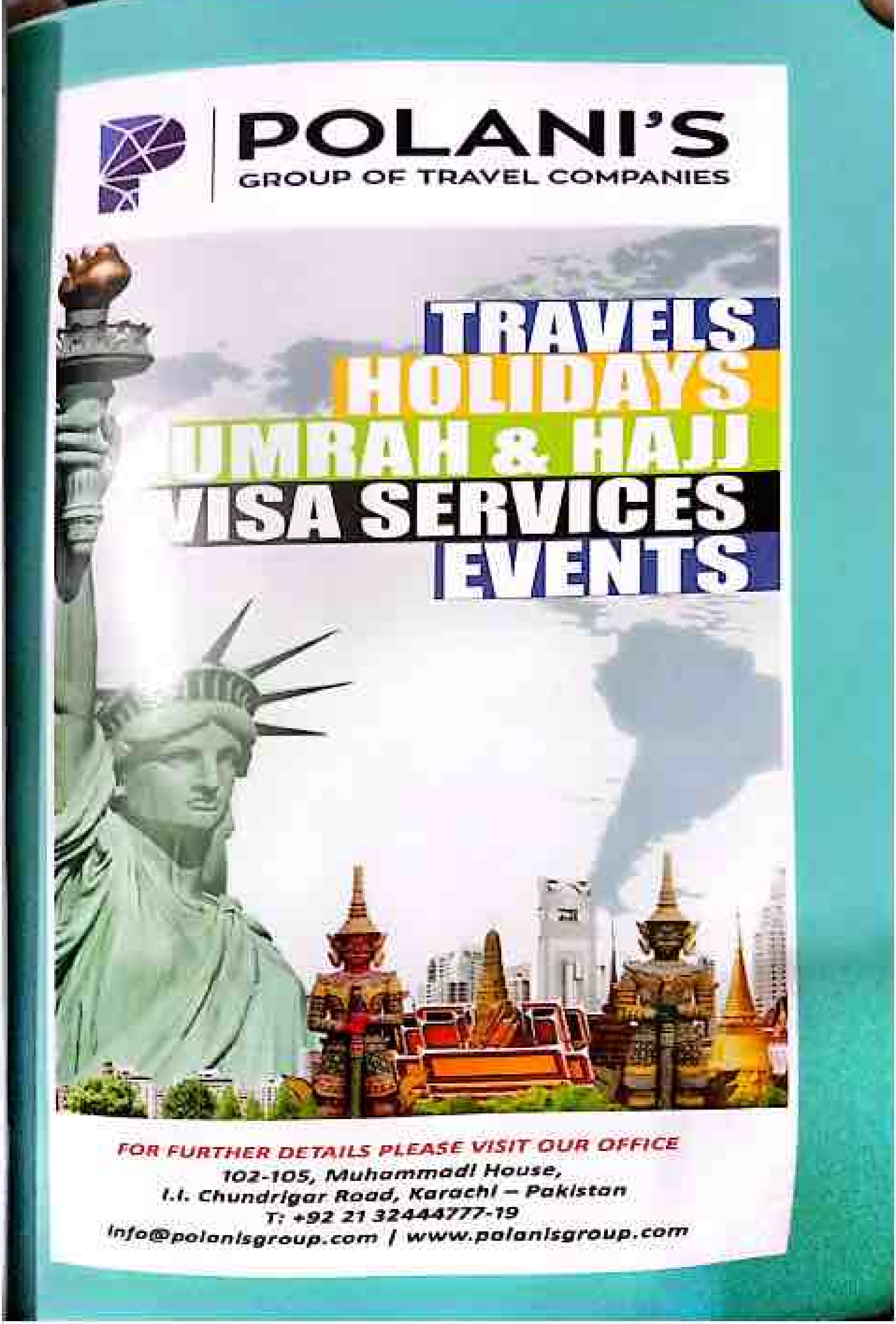
POLANI'S
GROUP OF TRAVEL COMPANIES
TRAVELS
HOLIDAYS
UMRAH & HAJJ
VISA SERVICES
EVENTS
FOR FURTHER DETAILS PLEASE VISIT OUR OFFICE
102-105, Muhammadi House,
I.I. Chundrigar Road, Karachi – Pakistan
T: +92 21 32444777-19
info@polanisgroup.com | www.polanisgroup.com

CamScanner

یادگار خاص نمبر

مسلسل اشاعت
48
واں سال

بانی مدیر اظہر جاوید
(صدارتی ایوارڈ حسن کارکردگی)
عرصہ ادارت 1969-2012ء

ماہنامہ تخلیق لاہور

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 48 — دسمبر 2017ء — شمارہ : 12 — CPL نمبر 96

قیمت : 150 روپے ——— 750 روپے سالانہ (مع ڈاک خرچ)

(بیرونی ممالک سالانہ 100 ڈالر — ہندوستان کے لیے 1,200 روپے سالانہ) (مع ڈاک خرچ)

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor)
Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt. (Ph : 04237187500 - 04236671007)
موبائل فون: 03218899007 ای میل : ajavedtakhleeq@gmail.com

نمائندگان خصوصی

تنویر جہاں (امریکہ) — فوزیہ مشتاق (امریکہ) — نارنگ ساقی (انڈیا) — جاوید منظور (پاکستان)

ماہنامہ "تخلیق" کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ "تخلیق" کو اپنی زندگی کے آخری سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 فروری 2012ء کو اپنی جان — جان آفریں کے سپرد کی تو اس ماہ کا "تخلیق" شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد "تخلیق" کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود — میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا اور سب سے پہلے ان کی یاد میں "اظہر جاوید نمبر" پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو "تخلیق" پیہم رواں رہے گا اور یہ "علامت"، "افکار"، "صریر"، "تقاضے" اور "طلوعِ افکار" جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا، (انشاءاللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک "تخلیق" کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔ "تخلیق" کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر "تخلیق" کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد و آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے "تخلیق" کے مضامین کے انتخاب کے لیے "تخلیق پینل" تشکیل دیا گیا تھا جو بڑی خوش اسلوبی سے کام کر رہا ہے۔ چند گزشتہ وجوہ کی بنا پر پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ، ہندوستان اور پاکستان میں "تخلیق" کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، ہاشمی ظہیر، نارنگ ساقی اور جاوید منظور نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لیے زرِ تعاون سو (100) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لیے زرِ سالانہ صرف 1,200 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا پتہ: H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I, Near (Toyota Cantt Motor), Islamnagar, Walton Road, Lahore-Cantt.

U.S.A.	U.S.A.	INDIA	PAKISTAN
Nayyar Jahan	Fozia Mushtaq	K.L. Narang Saqi	Javed Manzoor
2700 South Barrington	[illegible]	L-4-Connaught Circus, New	70-Islam Block, Azam Garden,
AVE Los Angles	River Side [illegible]	Delhi-110001, India	Multan Road, Lahore
C.A. USA	[illegible]	Ph: 0091-[illegible]	Ph: [illegible]
Ph: [illegible]	Ph: [illegible]	Email: [illegible]@gmail.com	Cell: [illegible]
Email: [illegible]@hotmail.com	Email: [illegible]@gmail.com		Email: [illegible]@hotmail.com
[illegible] urdu-markaz.com			

○ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

ترتیب

پہلی بات	سونان اظہر جاوید	5

حمد و نعت

حمد باری تعالیٰ	سید ریاض حسین زیدی	8
حمد باری تعالیٰ	شرق صدیقی	8
حمد باری تعالیٰ	عزیز احمد نور طاہر	8
نعت رسول مقبولؐ	منظر دیپالی	9
نعت رسول مقبولؐ	تجلی سرونجی	9
نعت رسول مقبولؐ	خالد اقبال یاسر	9
نعت رسول مقبولؐ	احسن صاحب علی	9

تخلیق ایوارڈ 2017ء

تعارف نامہ۔ حسن عسکری کاظمی	ادارہ تخلیق	10

گوشۂ حسن عسکری کاظمی

حسن عسکری کاظمی کی شاعری	سید منظور حسین یاد	13
حسن عسکری کاظمی	ڈاکٹر خورشید رضوی	14
پروفیسر محمد حسن عسکری	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	16
بہ حسنِ تخلیق کا نام حسن عسکری کاظمی	سرفراز سید	21

یادِ رفتگاں

میں کہاں تو کہاں تھا۔۔۔	حسن عسکری کاظمی	24
منظور حسین یاد۔۔۔	سرفراز سید	27
یا اللہ کب تک یوں۔۔۔	اظہر جاوید	29

مضامین

خواجہ محمد زکریا کی شاعری۔ ایک نظر	ڈاکٹر انور سدید	31
سوچ کی دکان ابھی اور سی ہے	محمود شام	33
محمد سعید قمر (خود نوشت)	محمد حامد سراج	36
ادب، ادیب اور عصری شعور	مسلم شمیم	41
(فکر اور ہجری)	سرور حسین (الف)	45

منظومات

سلیمان خمار، توقیر مشتاق، زراعت بخاری، شوزب	48
ملک اشرف ذکی، ممتاز راشد لاہوری، شمیم جہاں	49

افسانے

عشق آتش	بشریٰ رحمٰن	50
ہار	محمد سعید شیخ	56
اپنی کہانی	طارق بلوچ صحرائی	58
آتش دان اور برف کی سل	احسان بن مجید	62
زندگی، درویش اور زندہ	محمد اسلم	68
انا	جمیل حیات	71
بام کا گم ہوا	جبران علی	75
برف باری میں لپٹی ماں	اظہر جاوید	78

غزلیں

خواجہ محمد زکریا، جلیل عالی، آصف ثاقب، ڈاکٹر کنول فیروز، سلطان سکون، ابصار عبدالعلی، بشریٰ رحمٰن، ڈاکٹر ایوب ندیم، اختر شیخ، حسن عباسی، سجاد واسطی، ارشد کمال، ڈاکٹر اختری، ڈاکٹر فرحت عباس، ظہیر جاوید، احمد بخاری، اخلاق عاطف، نذیر، اشفاق، رشید حیدر، عائشہ نورین بخاری، وصف وقار، رشیدہ آفرین، مظاہر منظور، آسیہ محمد کول — 81–88

یادیں

میں کون ہوں۔۔۔!!	اظہر جاوید	89

سفرنامہ

عراق اشک بار ہیں ہم — علی اعوان — 94

موسیقی

غزل کی تیک غلام علی — ڈاکٹر امجد پرویز — 99

طنز و مزاح

"شغل" مارنا — ڈاکٹر محسن مگھیانہ — 103

آپ بیتی

تحریر زندگی — پروفیسر محمد جلیل الرحمٰن — 105

انشائیہ

ڈرونگ — پروفیسر جمیل آذر — 109

افسانہ اور تجزیہ نگاری

دستک کی واپسی — وحشی سعید (اطالیہ) — 111

دستک کی واپسی (تجزیہ) — ڈاکٹر اشرف آثاری — 113

جائزے

پیاسے شہر ترکی — حسن عسکری کاظمی — 115

مرزا حامد بیگ کے افسانے — نجم الحسن رضوی — 118

قرۃ العین حیدر کے ناول — طارق اصغر — 121

پرتو روہیلہ کی "مشکلات غالب" — حسین مجروح — 123

شاہ ولی محسن کے مجموعہ "سیپ تجلی پانے" — نسیم سحر — 127

تیرے مکان سے دل کا رستہ — ناصر علی سید — 129

تخلیقی شاعروں کی غزلیات کا — ایم ڈی ملک — 131

پنجاب رنگ

سلیم شہزاد، حسین مجروح، ڈاکٹر محسن مگھیانہ، طاہر بودلہ — 135

ضیا اللہ طاہر — 136

تبصرے قیصر تجمل کے

ماہنامہ ساقی کا کام — نجم الحسن رضوی — 137

پیٹے کل کو ایک استیل — قمر زیدی — 138

آسمان میری مٹھی میں — وحشی سعید

نارنگ ساقی کی ادبی خدمات — ڈاکٹر محمد منظور الحسن (اطالیہ)

ارشم — گلستان بخاری

حضرت بابا جان کا پیرو — پروفیسر محمد ظہیر قندیل

اے وقت مجھے آزاد کر دے — فوزیہ اعوان

یادوں کے جگنو — ریاض شاہد عالم نیازی — 142

انجمن خیال

محمود شام، آصف ثاقب، جمیل آذر، سلطان سکون، مسلم شمیم — 143
حیدر علی، حسین زیدی، انور جمال، جمیل اختر، پروفیسر محمد جلیل الرحمٰن
خالد عبداللہ، مرزا احمد نور طاہر، وحید رضا بھٹی، سما عزیز
ملک اشرف زکی اعوان، صائمہ نورین بخاری، اخلاق عاطف
پروین عزیز، بنت عاشی، رفیع الدین زکی قریشی، جبران علی، یاسر بخاری
ڈاکٹر سکندر حیات میکن، سرفراز خان آفریدی، جاوید عباس جاوید
ایم ڈی ملک، رشید میاں — 159

تخلیق کو موصول کتب

ملکی اور غیر ملکی — 160

سرورق

ادارہ "تخلیق"

ناشر — سونان اظہر جاوید

طابع — بیدار سرمدی

قانونی مشاورت — حسین مجروح

مطبع — پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور

مقام اشاعت

H. No. E/12, Sheraz Villas, Phase-I,
Islam Nagar, Walton Road, Lahore -Cantt

(ایڈیٹنگ کے حقوق محفوظ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

پہلی بات

14 فروری 2012ء والد صاحب اظہر جاوید کی وفات میرے لئے ایک سانحے سے کم نہیں تھی ایک ایسا سانحہ جس نے میری زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا والد صاحب کی تمام عمر ادب اور "تخلیق" کو پروان چڑھانے کے لیے گزر گئی اور میرا ادب سے دور دور تک تعلق نہیں تھا نہ یہ جانتا تھا کہ والد صاحب تخلیق کو کس طرح خون جگر پلا کر پروان چڑھا رہے ہیں نہ اس کی اشاعت کے مراحل سے واقفیت تھی ہاں اتنا علم تھا کہ "تخلیق" ان کے لیے ان کی اولاد کی طرح ہے وہ اپنی ذات کو پسِ پشت ڈال کر "تخلیق" کو بہر صورت شائع کرتے رہیں گے۔ اور ان کی یہی لگن اور محبت ہی تھی کہ جس نے ان کی وفات کے بعد بھی مجھے "تخلیق" کو اسی محبت اور لگن کے ساتھ جاری و ساری رکھنے کی ہمت عطا کی ادب کی دنیا میں نو وارد تھا ادب اور ادیب کی سانجھ سے نا واقف تھا لیکن والد صاحب کے دوستوں نے ہمت دی اور تعاون کا بھرپور یقین دلایا تو آج اس قابل ہوں کہ تخلیق کی مسلسل اشاعت کو جاری و ساری رکھے ہوئے ہوں۔ "تخلیق" کے حوالے سے جب والد صاحب کے دوستوں سے مشاورت کا سلسلہ شروع کیا تو سب سے پہلے مولانا ظفر علی ٹرسٹ گیا جس کے چیئرمین راجا اسد علی خان صاحب کے ساتھ اظہر جاوید صاحب کا بیشتر وقت گزرتا تھا جو والد صاحب سے عمر میں بہت چھوٹے ہونے کے باوجود ان کے اچھے دوست تھے راجہ صاحب نے مجھے حوصلہ دیا اور بھرپور تعاون کا اظہار کرتے ہوئے تخلیق کو جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور اپنی بات کو عملی ثابت کرتے ہوئے تخلیق کے ساتھ بہت تعاون کیا اور کر رہے ہیں۔ پھر ادبی دنیا کے دوستوں سے مشاورت کی تو ڈاکٹر خواجہ زکریا، ڈاکٹر انور سدید، اعزاز احمد آذر (مرحوم)، ڈاکٹر کنول فیروز، سرفراز سید، ڈاکٹر یونس جاوید، جاوید منظور، سیما پیروز، تسنیم منٹو، نیئر جہاں، محمود شام اور دیگر بہت سے دوست احباب سے مشاورت کی تو انھوں نے حق دوستی ادا کرتے ہوئے یہی مشورہ دیا کہ اظہر جاوید کے "تخلیق" کی صورت میں بنائے ہوئے محلوں کے تاج محل کو ہمیشہ قائم رہنا چاہیے۔ سو ان تمھیں وراثت میں ملے اس پیار کو یاد رکھ کر تمھیں اپنے باپ کی محبت سمجھ کر جاری و ساری رکھنا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر انور سدید جنھیں آج بھی میں والد صاحب کی طرح مرحوم لکھنے کی ہمت نہیں رکھتا کا اہم مقام ہے میری ادبی کردار سازی میں ان کا اہم کردار ہے اور آج ادبی دنیا میں جو میرا تھوڑا بہت مقام ہے یا ادارتی حوالے سے جو تھوڑے بہت رموز سے مجھے واقفیت حاصل ہے اس کے پیچھے ڈاکٹر انور سدید کا ہاتھ ہے وہ میرے استاد، دوست، بزرگ اور رہنما تھے میں نے اپنی چھ سالہ ادبی زندگی میں ان جیسا بے لوث اور مخلص انسان نہیں دیکھا۔ ڈاکٹر صاحب نے میرا ساتھ دیا اور دیگر دوستوں کی حوصلہ افزائی سے میں نے سب سے پہلے **جون 2012ء** میں **"اظہر جاوید نمبر"** والد صاحب کی وفات کے بعد تین ماہ کی قلیل مدت میں شائع کیا جس کے لیے دنیا بھر کے تمام لکھاریوں نے دل کھول کر قلمی تعاون کیا۔ اور آج چھ سال ہونے کے باوجود "تخلیق" جاری و ساری ہے۔ نئے سفر کے آغاز کے ساتھ ہی میں نے ان تمام ادیبوں اور شاعروں کی ادبی خدمات کو سراہنے کے لیے **"تخلیق ادبی ایوارڈ"** کا اجرا کیا جو ادب کی بے لوث خدمت کر رہے ہیں انھیں نہ تو حکومتی ایوارڈز کی لالچ ہے اور نہ ہی کسی قسم کا لالچ اس ضمن میں ایک جیوری تشکیل دیا گیا جس کی باہمی رضا مندی سے 2012ء میں پہلا تخلیق ادبی ایوارڈ جناب **شفیع عقیل** صاحب کو ان کی زندگی میں ہی عطا کیا گیا۔ 2013ء میں یہ ایوارڈ ڈاکٹر انور سدید کو

2014ء میں محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ کو اور اللہ کا شکر ہے کہ یہ ایوارڈز ان تمام احباب کو ان کی زندگی میں ہی عطا کیے گئے جو انھوں نے خود وصول کیے ورنہ ہمارے یہاں تو شاعروں ادیبوں کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ بعد از مرگ ہی لگایا جاتا ہے۔ اور پھر پسماندگان کو خوش کرنے کے لیے ان کو خلوص حق یا دیگر اداروں ایوارڈز سے نوازا جاتا ہے۔ یہ حسرت ہی بہترین ادیبوں شاعروں کی زندگی میں کیوں نہیں انھیں حاصل ہوتی؟ اس سوال کا جواب میں تو سمجھنے سے قاصر ہوں آپ احباب کو اگر علم ہو تو ہمیں ضرور آگاہ کیجیے گا۔ 2015ء میں یہ ایوارڈ محترمہ نیر جہاں صاحبہ (امریکہ) کو پیش کیا گیا۔ جبکہ 2016ء کا ادبی ایوارڈ محترمہ عذرا اصغر صاحبہ کو عطا کیا گیا۔ اور میں یہ بتاتے ہوئے بہت خوش ہوں کہ مجلس اور میری متفقہ رائے سے اس سال **"تخلیق ادبی ایوارڈ" 2017ء جناب پروفیسر حسن عسکری کاظمی** صاحب کو پیش کیا جا رہا ہے۔ بلاشبہ حسن عسکری صاحب اس ایوارڈ کے حقدار ہیں ادبی میدان میں ان کی کارکردگی کو ہر مقام پر سراہا جاتا ہے۔

امید ہے آپ تمام قارئین کو یہ فیصلہ پسند آئے گا اور آپ انھیں مبارکباد ضرور دیں گے۔ یہ ایوارڈ حسن عسکری کاظمی صاحب کو **14 فروری 2018ء** کو تخلیق کی سالانہ تقریب میں پیش کیا جائے گا۔ یہ ایوارڈ خالصتاً حسن عسکری کاظمی صاحب کی ادبی خدمات کو مد نظر رکھ کر دیا جا رہا ہے اس میں کسی قسم کی گروپ بندی یا ذاتی پسند و ناپسند کا دخل نہیں۔ جیسے ہی یہ فیصلہ ہوا کہ تخلیق ادبی ایوارڈ حسن عسکری کاظمی صاحب کو دیا جائے گا تو بحیثیت مدیر میرے اوپر ذمہ داری کا اضافہ ہو گیا کہ کس طرح محبت اور عزت سے ان کو خراج تحسین پیش کیا جائے ان کے لیے خصوصی گوشہ شائع کیا جائے جو ان کے شایانِ شان ہو۔ اس سلسلے میں اپنی معاون سحر حفیظ کی ذمہ داری لگائی کہ وہ تحقیق کر کے مجھے بتائے کون سے ایسے قلم کار ہیں جو حسن عسکری کاظمی صاحب کے حوالے سے بہترین انصاف کر سکیں اور ان کو خراج تحسین پیش کرنے میں تخلیق کے ساتھ تعاون کریں تو انھوں نے سید منظور حسین یاد، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب کے نام لیے۔ سحر حفیظ نے مجھ سے اجازت لے کر ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب کو کال کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ حسن عسکری کاظمی صاحب پر مضمون تحریر کر دیں تو انھوں نے کچھ ذاتی مصروفیات کا ذکر کیا اور بات ٹال دی ان کے جواب سے مجھے تھوڑی مایوسی ہوئی مگر ان کی محبت کا میں شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر بہت عمدہ مضمون تحریر کر کے ارسال کر دیا یہی ایک بڑے قلم کار کی خوبی ہے کہ اس میں احساس اور وقت کی ضرورت کو پرکھنے کا کمال جذبہ موجود ہوتا ہے۔

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم صاحب سے میری تھوڑی بے تکلفی بھی ہے اور آج تک جب بھی ان سے کسی تحریر کا کہا ہے انھوں نے نہیں کی۔ حسن عسکری کاظمی صاحب کے حوالے سے تحریر ارسال کرنے کا کہا تو جھٹ بولے آپ کے حکم کی تعمیل ہو گی ان کے یہ پیارے الفاظ جو اپنے اندر وضع داری لیے ہوئے ہیں ابھی تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اب سید منظور حسین یاد صاحب کی باری آئی تو ایک سوال پریشان کر رہا تھا کہ اس عمر میں انھیں تکلیف دی جائے یا نہیں؟ سحر حفیظ نے زور دیا کہ وہ بڑے قلم کار ہیں عمر اور بیماری کو دھیان میں رکھے بغیر ہی ادبی خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار رہیں گے میں انھیں کال کرتی ہوں۔ خیر سید منظور حسین صاحب کو کال ملائی تو فون ان کے بیٹے نے اٹھایا اور فوراً ہی منظور صاحب کو دے دیا یہ 10 نومبر کی دوپہر کا وقت تھا۔ سحر حفیظ نے سلام دعا کے بعد بتایا کہ وہ تخلیق سے بات کر رہی ہیں اور چاہتی ہیں کہ آپ حسن عسکری کاظمی صاحب پر مضمون تحریر کریں۔ جواب میں سید منظور صاحب نے کہا'' کیوں نہیں حسن عسکری میرے بہت اچھے دوست ہیں میں ضرور مضمون لکھوں گا آپ ان کی کوئی کتاب بھجوا دیں۔'' سحر حفیظ نے کہا ضرور بھجوا دی جائے گی۔ منظور صاحب استفسار کرنے لگے کہ'' آپ اظہر جاوید کے دفتر سے بات کر رہی ہیں تو کیا وہ ابھی موجود ہیں؟'' سحر نے حیرت سے کہا سر ان کی تو

وفات ہو چکی ہے اب تو ان کے بیٹے" "ہاں ہاں ان کے بیٹے عدنان ان کو میرا اسلام کہنا اور کہنا میں ضرور مضمون لکھ کر جلد بھجوا دوں گا" سحر نے کہا سر عدنان نہیں سوہان صاحب" "ہاں ہاں سوہان میں بھول گیا! اسے میرا اسلام کہنا" فون بند کر کے جب یہ بات سحر نے مجھے بتائی تو میں مسکرا دیا کیونکہ میں ان کے بھولنے کی عادت سے واقف تھا اور اسے فوراً حسن عسکری صاحب کی دو کتابیں اگلے روز لڑکے کے ہاتھ ان کے گھر بھجوانے کو کہا۔

مگر اگلے روز 11 نومبر 2017ء سوشل میڈیا پر آنے والی خبر کہ سید منظور حسین صاحب کا انتقال ہو گیا نے چونکا دیا۔ یہ خبر پڑھ کر عجیب سے ملے جلے تاثرات ابھرے۔ والد صاحب اور ڈاکٹر انور سدید صاحب کی زندگی کے آخری لمحات نظروں کے سامنے آ گئے اسی کیفیت میں دو روز گزر گئے۔ تیسرے روز حسن عسکری کاظمی صاحب کی کال آئی تو ان کا انکشاف سن کر میں حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا انھوں نے بتایا کہ منظور صاحب کے بیٹے نے انھیں بتایا ہے کہ وفات سے ایک روز قبل تخلیق سے کال آئی تھی حسن صاحب آپ پر مضمون تحریر کرنے کے لیے کہا گیا تھا فون بند ہوتے ہی والد صاحب نے آپ پر مضمون تحریر کرنا شروع کر دیا تھا ان کی زندگی کی آخری تحریر تخلیق کے لیے لکھا جانے والا وہ مضمون ہے جو وہ آپ پر لکھ رہے تھے۔ میری نظر میں سید منظور حسین یاد صاحب کی یہ آخری تحریر نایاب تحریر تھی میں نے ان کے بیٹے سید عامر رضا کو کال کی اور فرمائش کی وہ یہ تحریر "تخلیق" کو بھجوا دیں انھوں نے ہامی بھری اور اس شمارے میں وہ تحریر "تخلیق" کی زینت بنی ہے۔

اب سوچتا ہوں کہ کیسے باکمال لوگ ہیں کہ آخری سانس تک قلم اور کاغذ سے رشتہ جوڑے رکھا یہ وہ خاص لوگ ہیں جن کے لیے ادب، دوستی اور وضع داری پہلے ہے۔ ڈاکٹر انور سدید بھی جب سرگودھا ہسپتال میں بستر مرگ پر تھے میری ان سے آخری بات ہوئی تو بولے سوہان باقی باتیں چھوڑو یہ بتاؤ کہ پرچہ تخلیق پریس میں گیا کہ نہیں یہ وہ خاص لوگ ہیں جو آخری سانس تک بھی قلم سے وفا کا حق ادا کر گئے۔ اب یہ فرض اور قرض اگلی نسلوں کو ادا کرنا ہے۔ ہمیں ادا کرنا ہے۔ اللہ ہم سب کو ثابت قدم رکھے۔ آمین!

وفیات اور علالت:

چند ماہ قبل مرزا احمد نور طاہر کی زوجہ انتقال کر گئیں۔ دکھ کی اس گھڑی میں ادارہ ان کے ساتھ ہے اللہ انھیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور ان کی شریک حیات کے درجات بلند فرماتے ہوئے ان کی اگلی منزلیں آسان کرے۔ بشریٰ رحمٰن صاحبہ کے شوہر پچھلے دنوں برین ہیمرج جیسے جان لیوا اٹیک سے اللہ کے فضل و کرم سے نکل آئے اللہ انھیں صحت کاملہ عطا فرمائے اور دکھ کی اس گھڑی میں بشریٰ رحمٰن کے ساتھ ہے۔ نجمہ عثمان صاحبہ لندن میں آپریشن جیسے تکلیف دہ مرحلے سے گزر رہی ہیں۔ ادارہ تمام ادبی برادری سے ان کی صحت و تندرستی کے لیے دعا کرنے کی درخواست کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جو احباب بھی بیمار ہیں ان کو شفائے کاملہ عطا فرمائے۔ جو آج ہم میں نہیں ان کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!

رب راکھا

سوہان اظہر جاوید

◆◆◆

حمد

میں اپنے دل میں خدا جگاؤں

حساب رکھوں تو کیسے رکھوں؟

[illegible]

سید ریاض حسین زیدی

OOO

حمد

اک ذاتِ معلیٰ ہے مری ذات کے اندر
پاکیزہ، منزہ ہے مری ذات کے اندر

وہ اوّل و آخر ہے مری ذات کے اندر
وہ سب سے نرالا ہے مری ذات کے اندر

میں اس کی حضوری میں صفر ہو کے کھڑا ہوں
وہ قبلہ و کعبہ ہے مری ذات کے اندر

بس اس کے سوا کوئی نہ پائے گا وہ زاہد
کیا خوب حوالہ ہے مری ذات کے اندر

تشکیل کسی شکل میں کر نہیں سکتا
احساس کا دریا ہے مری ذات کے اندر

وہ آس ہے، امید ہے، وہ بخشنے والا
وہ ہی مرا مولا ہے مری ذات کے اندر

آنکھوں سے تو اوجھل ہے مگر دل میں بسا ہے
کیسا یہ سراپا ہے مری ذات کے اندر

بخشش کی تمنا ہے مرے رب سے مشرقؔ
تو ہی مرا ملجا ہے مری ذات کے اندر

مشرق صدیقی

OOO

حمد

ذکر خالق میں بسر کرتا ہے
دل مرا نور کو گھر کرتا ہے

کون لاتا ہے نجوم انوار؟
کون پھر شب کی سحر کرتا ہے

نور خود تو نہیں ہوتا ادراک
کوئی ذہنوں پہ اثر کرتا ہے

کام جو بھی ہیں ہمارے سارے
وہی کرتا ہے اگر کرتا ہے

در گزر کر کے گناہوں سے وہی
رحم کی ہم پہ نظر کرتا ہے

کہہ کے اللہ کی مرضی طائرؔ
چاہتا جو ہے بشر کرتا ہے

مرزا احمد نور طائر

OOO

نعت

حال جو سرخوشی مجھے حبِ نبیؐ سے ہے
گویا مرے وجود کی پہچان اسی سے ہے
دنیا کی نعمتیں ہوں کہ ہو دین کی عطا
سب کچھ تو امامؐ کی وابستگی سے ہے
الفاظ حرف و صوت ہے اپنی جگہ درست
سارا اثر کلام میں حبِ نبیؐ سے ہے
عمرِ رسولؐ خود بھی ہے اک منزلِ مراد
جنت کا راستہ بھی اسی کی گلی سے ہے
قول و عمل میں کچھ تو جھلک ہو حضورؐ کی
کس منہ سے لوگ کہتے ہیں نسبت نبیؐ سے ہے
چمکا تھا جو حرا کے افق پر سرِ تمام
منظر یہ کائنات حزیں اسی سے ہے

منظر ایوبی

ooo

نعت

رہتا ہوں اداس مدینے سے لوٹ کر
آیا نہ کچھ بھی راس مدینے سے لوٹ کر
تنہا میں ہو گیا ہوں خود اپنے ہی شہر میں
کوئی نہیں ہے پاس مدینے سے لوٹ کر
امید کی کرن بھی اب آتی نہیں نظر
دل بھی ہوا اداس مدینے سے لوٹ کر
سب چھوڑ کر چلے گئے جو ساتھ تھے مرے
رکھوں میں کس سے آس مدینے سے لوٹ کر
سیفی تمہیں حضور نے در پر بلا لیا
پا لیتے وہ وہ خاص مدینے سے لوٹ کر

سیفی سرونجی (انڈیا)

ooo

نعت

کبھی اپنے شہر مدینے کا
کبھی بھی مبارک مہینے کا

مجھے تیرے پاسداروں کی قسم
مرے جینے اوڑھنے کھینے کا

میں رہا ہوں ہادی ہوں جیسا بھی ہوں
مجھے کیا لگا اپنے جینے کا

تجھو دے مری ساری گستاخیاں
دکھا دے مرے سارے کینے کا

مجھے نہیں ان پہ ملال کوئی
مری روح کے زخم سینے کا

مرا آسماں ہے ترا پانیوں
سرِ آستاں پہ چلے سینے کا

مری بادبانی ہو جیسے بھی ہو
ہوا سے کسی بھی سفینے کا

خالد اقبال یاسر

ooo

نعت

خوشا صلی اللہ رتبہ آپؐ کا یا رسولؐ اللہ
عقیدت سے محبت سے پکارا یا رسولؐ اللہ
سہارا آپؐ کا اب تو بچانے طوفاں میں
مری کشتی کو مل جائے کنارا یا رسولؐ اللہ
نبیؐ کی اپنی رحمت اپنے سائے میں سدا رکھنا
ہوا ہے بے سہاروں کو سہارا یا رسولؐ اللہ
شافعِ محشر ہیں محمدِ عربی سب کے
چمک اٹھا مقدر کا ستارا یا رسولؐ اللہ
ہوئے ہیں آمدِ محبوب سے دو جہاں روشن
وہ کیا کرم سب پہ آپؐ کا یا رسولؐ اللہ
نہ ہوگا کوئی بھی آپ جیسا سارے عالم میں
خدا نے پاک سے قرآں اتارا یا رسولؐ اللہ
ہے آپؐ ہی کے نقشِ پا سے راستہ ملتا
ہمیں کافی ہے محشر میں سہارا یا رسولؐ اللہ
خدا نے بھی کہا اور خدا بھی لائق آپؐ کو
ہے سب کی نظر میں سب سے پیارا یا رسولؐ اللہ
کھلی اپنی امیدوں کی ادا آقا پہ کھل جائے
زمانوں میں چمکتا ہے ستارا یا رسولؐ اللہ
اسی سے تو روشن ہے خطہ نامِ محمدؐ سے
ہوا ہے نعت گوئی کا اشارا یا رسولؐ اللہ

بسمل صابری

ooo

تعارف نامہ

پروفیسر حسن عسکری کاظمی۔ ''تخلیق'' ایوارڈ یافتہ 2017ء

ادارہ ''تخلیق''

ذاتی کوائف

1- خاندانی نام : حسن عسکری کاظمی 2- خاندانی نام: سید حسن عسکری کاظمی

3- پیدائش ومقام پیدائش : 16/ اکتوبر 1931ء محلہ سادات قاضی واڑہ واہیال شہر 4- والد کا نام : سید محمد باقر کاظمی (مرحوم)

تعلیمی کوائف

1- ابتدائی تعلیم : (i) میٹرک زمیندارہ ہائی سکول، گجرات — 1950ء (ii) ایف۔ اے زمیندارہ ڈگری کالج، گجرات 1952ء

2- یونیورسٹی کے امتحانات : (i) بی اے زمیندارہ ڈگری کالج گجرات 1954ء (ii) ایم۔ اے اردو اورینٹل کالج، لاہور 1956ء

(iii) ڈپلومہ ان پبلک ایڈمنسٹریشن

ملی اور انتظامی کوائف

1- افسر تعلقات عامہ وڈیج ایڈ ڈیپارٹمنٹ، گجرات (1956-1958)

2- پبلسٹی افسر / افسر ترقیات وڈیج ایڈ ڈیپارٹمنٹ، گجرات (1958-1960)

3- لیکچرار گورنمنٹ کالج جہلم (1961-1978)

4- پروفیسر / صدر شعبہ اردو گورنمنٹ شالیمار کالج باغبانپورہ، لاہور (1978-1980)

5- صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج آف سائنس، لاہور (1980-1991)

ریٹائرمنٹ

اکتوبر 1991ء

اعزازات

1- پاکستان ٹیلی ویژن کی جانب سے پنجابی ملی ترانوں میں اول انعام (1984)

2- آ ادارہ افکار اکادمی کراچی کی جانب سے ''حرف خبر''، ''دیدۂ مشتاق''، ''لہو بولتا ہے''، ''حرف عقیدت''، ''جمال مصطفیٰ''، ''موسم بھی

جیسے ''امور'' ''مدینۂ دل بنا'' پر اول انعام

3۔ امام خمینی سیمینار تہران میں شرکت

4۔ رحمت للعالمین کانفرنس دہلی میں شرکت

5۔ محکمہ ترقی دیہات سے بہترین منتظم اور لیکچرار کا سرٹیفکیٹ

6۔ جنرل سیکرٹری حلقۂ شعرائے اہلبیت پاکستان

7۔ مونس، حلقۂ معارف ادب، لاہور

8۔ صدر، ارباب فکر و نظر، لاہور، جہلم

9۔ رکن، حلقۂ ارباب ذوق، لاہور

10۔ رکن، رائٹرز گلڈ پاکستان

11۔ جو بہار اسے اسپارٹین الاقوامی مشاعرہ میں شرکت

12۔ حبیب بینک کے زیر اہتمام کل پاکستان نعتیہ مشاعرے اور حج کیمپ کراچی مقابلۂ نعت خوانی میں بحیثیت منصف فرائض انجام دیے۔

13۔ کنوینر ترقی پسند مصنفین سید عاشور کاظمی کی دعوت پر انگلستان کے مختلف شہروں کی تقریبات میں شرکت

14۔ جشنوارہ امام علی بن موسیٰ الرضا مشہد مقدس (ایران) میں خانۂ فرہنگ لاہور کی خصوصی دعوت پر شرکت

تصنیفات

نعت

❖ سرورِ کائنات (مجموعۂ نعت) ❖ شہر نبوت (مجموعۂ نعت) ❖ جمالِ مصطفیٰ (مجموعۂ نعت) ❖ دیدۂ نم ناک (مجموعۂ نعت) ❖ آیاتِ درخشاں (مجموعۂ نعت) ❖ خیر البشر (مجموعۂ نعت) ❖ مدینۂ دل بنا (مجموعۂ نعت) ❖ قرار جاں (مجموعۂ نعت)

منقبت و سلام

❖ معصومینِ کائنات (مناقب و سلام) ❖ مولائے کائنات (منقبت امیر المومنینؑ) ❖ حرفِ عقیدت (مناقب، سلام، قطعات) ❖ جمالِ رضا (منقبت)

مرثیہ

❖ کنارِ دجلہ، الست (پانچ مرثیے)

مضامین

❖ حرفِ جنر (تنقیدی مضامین، تبصرے، خاکے) ❖ معیارِ نظر (تنقید، تبصرے اور جائزے)

سفرنامے

❖ دیارِ زینبؑ (سفرنامہ شام) ❖ تکمیلِ تمنا (سفرنامہ ایران، عراق) ❖ مشہدِ جاں میں اُجالا (سفرنامہ)

پنجابی شاعری

❖ حرفاں جتھہ سنیہا (پنجابی مجموعۂ کلام) ❖ کنیاں چھاواں (پنجابی شاعری)

آپ بیتی

❖ حاصلِ عمرِ گریزاں (آپ بیتی)

نظمیں اور غزلیں

❖ خواب دیکھا کرو (غزل، نظم) ❖ وہ ایک شخص (غزل، نظم) ❖ دشت بے صدا (غزل) ❖ خیمۂ خیال (غزل، نظم) ❖ ریزہ خواب (غزل، نظم) ❖ لہو بولتا ہے (قومی نظمیں، ملی ترانے) ❖ موسم کی ہوا سے (نظمیں) ❖ دیارِ غم (غزل، نظم)

اعترافِ عظمت

1- ماہنامہ "شام و سحر" لاہور کا حسن عسکری کاظمی نمبر (مطبوعہ مئی 2008ء)۔
2- ڈاکٹر شبیہ الحسن کی کتاب "حسن عسکری کاظمی کی تخلیقی جہتیں"۔
3- حسن عسکری کاظمی کی شخصیت اور فن پر ایم۔اے کی سطح پر تین اور ایم۔فل کے چار مقالے تحریر کیے گئے۔

ادبی کالم نگاری

1- حرفِ حق کے عنوان سے روزنامہ "دن" میں مضامین / تبصرے وغیرہ۔
2- امروز، جنگ، نوائے وقت اور مساوات کی خصوصی اشاعت میں علمی و ادبی مضامین نیز ادبی جرائد میں نگارشات۔

صحافتی خدمات

1- مدیر "پیامِ عمل" لاہور۔

تا حال ان کی ادبی کاوشیں جاری و ساری ہیں

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ یافتہ

حسن عسکری کاظمی کی شاعری

سیّد مشکور حسین یاد

نوٹ: پروفیسر مشکور حسین یاد نے یہ تحریر اپنی وفات سے ایک دن قبل مورخہ 10 نومبر 2017ء کو لکھی تھی۔ یہ ان کی زندگی کی آخری تحریر ہے جو ادارہ "تخلیق" کے لئے اور پوری ادبی برادری کے لئے نایاب ہے۔

میرا خیال تھا قلم اٹھاؤں گا اور فوراً حسن عسکری کاظمی پر ایک زوردار قسم کا مضمون لکھ ماروں گا لیکن اب قلم ہاتھ میں پکڑ کر لکھنے بیٹھا ہوں تو مجھے یوں لگا جیسے میں کچھ بھی نہیں لکھ سکوں گا اور آپ جانتے ہیں کہ یہ لکھنا کہ کچھ نہیں لکھ سکوں گا اس کا یہ مطلب ہے کہ اگر کچھ نہیں تو بہت کچھ ضرور لکھ سکوں گا کیونکہ کچھ لکھنے کی نسبت بہت کچھ لکھنا آسان کام ہے کیونکہ کچھ نہیں کی نسبت بہت بہت کچھ لکھنے میں کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ انسان اپنی مرضی سے جتنا چاہے لکھے اور چاہے تو نہ لکھے۔ تو جناب آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ حسن عسکری کاظمی اگر بہت بڑے شاعر نہیں ہیں تو شاعر ضرور ہیں اصل چیز شاعر ہونا ہے ایسا شاعر نہیں کہ ایک مصرع بھی لکھا تو خود کو شاعر سمجھنے لگے اور آپ کو معلوم ہے ایک مصرع کون نہیں لکھ سکتا۔ سچ پوچھیے تو اگر انسان کے پاس کوئی ہنر موجود ہے تو وہ شاعری ہے لہٰذا شاعر شاعری کیوں نہ کرے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمیں شاعری نہیں آتی ہم کوئی اچھا شعر نہیں کہہ سکیں گے۔ اگر ہم نے ایک شعر بھی اچھا کہہ دیا تو ہم سمجھیں گے بڑے شاعر ہو گئے۔

پھر حسن عسکری کاظمی کے ساتھ تو ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ وہ ہر روز شاعری کرتے ہیں۔ کھانے پینے سے انکار کر سکتے ہیں لیکن شاعری سے انکار نہیں کر سکتے۔ ہم نے آزمایا تو نہیں لیکن سنا یہی ہے کہ اگر حسن عسکری کو شاعری کے لیے اکیلا چھوڑ دیں تو پھر وہ رکتے نہیں دھڑا دھڑ شعر کہتے ہیں اور آپ یہ بھی جانتے ہوں گے اگر حسن عسکری دھڑا دھڑ شعر کہہ سکتے ہیں تو دنیا میں ایسا کوئی کام ہے جو ایک آدمی نہیں کر سکتا!؟ ابھی تک ایک بات طے ہے اگر ایک عام آدمی کو چھٹی دے دی جائے تو وہ اپنے تمام کام ختم کرتا نظر آئے گا جب کہ حسن عسکری کو شاعری کے علاوہ کچھ نظر نہیں آئے گا۔ لیکن پھر وہی بات کہ کچھ نظر نہ آنے کے باوصف انہیں بہت سا اچھا کلام نظر آئے گا۔

حسن عسکری کے کلام میں اللہ اور نبی پاک کی محبت ہے۔ ان کی عام شاعری بھی اس محبت سے خالی نظر نہیں آتی۔ ان کی شاعری میں موضوعات میں تنوع نظر آتا ہے جو ہم جیسے پڑھنے والوں کو بار بار پڑھنے پر اکساتا ہے۔ ان کی شاعری میں اتنا کچھ ہے کہ اظہار کے لئے کئی صفحات بھر جائیں پر ہم ان کے شاعرانہ کلام کا احاطہ نہ کر سکیں۔ کہنے کی بات تو یہ ہے کہ ابھی تک ان کو شاعری کے لیے آزاد نہیں چھوڑا گیا تو اتنا عمدہ کلام ہمیں پڑھنے کو مل رہا ہے۔ جس دن یہ آزادی انہیں حاصل ہوئی تو اس دن آپ سے بڑا شاعر کوئی نہیں ہوگا۔ ہر انسان کے لیے لکھنے کی آزادی ضروری ہے۔ آزادی کی ہزاروں قسمیں ہیں لیکن سب سے بڑی قسم یہی ہے کہ آپ کو لکھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ دنیا اس دن صحیح معنوں میں آزاد بھی ہوگی جب اسے لکھنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے گا۔

◆◆◆

حسن عسکری کاظمی

ڈاکٹر خورشید رضوی

مجھے حسن عسکری کاظمی صاحب کے قریبی دوستوں میں شامل ہونے کا اعزاز تو حاصل نہیں تاہم چونکہ وہ ایک متین مگر بے تکلف طبیعت کے مالک ہیں اور کسی بھی ملنے والے سے ایک مصنوعی فاصلہ رکھنے کے قائل نہیں اس لئے ہر ملنے والا ان کے قرب کا احساس پیدا کر لیتا ہے۔ گزشتہ دس بارہ برس سے میں بھی اس احساس کا حامل ہوں۔ ان کا اولین تاثر سنجیدگی، متانت، اخلاص، دردمندی، علم دوستی اور سخن شناسی کا تاثر تھا جس میں کبھی کمی نہیں آئی۔ عسکری صاحب کی طبیعت میں بلا کا اعتدال ہے۔ وہ اپنے خیالات ونظریات کے بارے میں مکمل ذہنی وضوح رکھتے ہیں اور ان کا اظہار کرنے میں بھی کسی قسم کی معذرت خواہی یا مفلوجیت کا شکار نہیں ہیں۔ تاہم فراخ حوصلگی، کشادہ دلی اور رواداری ان کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے چنانچہ وہ دوسروں کے خیالات ونظریات کو بھی گو وہ ان کے اپنے خیالات سے متصادم ہوں مسکراہٹ اور تحمل کے ساتھ سننے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں کسی بھی طرح کی نام نہاد "افسری" یا عموماً تعلیم وتدریس کے عظیم مشغلے سے زیادہ باعزت تصور کی جاتی ہے مگر جن روحوں میں اصابت ہوتی ہے وہ تعلیم وتعلم کو انتظامی عہدوں سے برتر اور زیادہ باعث اطمینان سمجھتی ہیں۔ حسن عسکری کاظمی صاحب نے ملازمت کا آغاز بطور تعلقات عامہ اور افسر ترقیات کی حیثیت سے کیا مگر بہت جلد وہ تدریس کی طرف آ گئے، جو ان کی روح سے زیادہ ہم آہنگ تھی اور پھر ملازمت سے سبکدوش ہونے تک مستقل اسی سے وابستہ رہے۔

جناب حسن عسکری کاظمی کی گفتگو بھی دل آویز دل نشیں ہوتی ہے اور ان کا قلم بھی مسلسل مضامین نو کے انبار لگاتا رہتا ہے۔ وہ نظم اور نثر دونوں میں ایک موثر اسلوب کے حامل ہیں۔ انہوں نے اردو کے علاوہ پنجابی کو بھی وسیلۂ اظہار بنایا ہے جس کا ثبوت ان کے دو پنجابی شعری مجموعوں "حرفاں جھٹلیا" اور "کلیاں چھاواں" کی صورت میں موجود ہے۔

کاظمی صاحب نظم اور غزل دونوں اصناف سے مناسبت طبع رکھتے ہیں۔ ریاضت نے ان کے ہاں سلاست وروانی پیدا کی ہے اور وسعت مطالعہ ان کے کلام کو پس منظر کا عمق عطا کرتی ہے۔ انہوں نے غزل میں روایت ولوازمات کا دامن مضبوطی سے تھامے رکھا ہے مگر ان کے مضامین محض روایتی نہیں ہوتے۔ ان میں ان کی اپنی سوچ اور ذاتی تجربات بولتے ہیں جو ایک اخلاقی اور فلسفیانہ رجحان لئے ہوئے ہیں۔ غزل کے چند شعر دیکھیے:

رکھے اگر مزاج قلندرانہ آدمی — سمجھیں گے ہم کہ ہو گیا فرزانہ آدمی
بوذر مزاج بندۂ جاں میں پڑا ہے — گزرے گلی صراط سے مردانہ آدمی
اپنے گلے پہ اپنا ہی خنجر چلا نہ دے — لگتا ہے یوں کہ ہو گیا دیوانہ آدمی
آیا ہے کس لئے، یہ کرتا ہے کیا حسن — ہے مقصد حیات سے بیگانہ آدمی

کہاں سے آ گیا تیشہ ہوا کے ہاتھوں میں — شجر شجر کے بدن پر ہیں ضربتوں کے نشاں
حصارِ ذات سے باہر کبھی آ کے بات بنے — کہیں کھنڈر تو نہیں اپنی عظمتوں کے نشاں
سکوں ملا نہ پرندوں کو آشیانوں میں — کہ آندھیوں نے مٹائے ہیں راستوں کے نشاں
ہمارے عہد میں آئے وہ زلزلے کہ حسن — رہے نہ سینۂ گیتی پہ پربتوں کے نشاں

نظم کی ہیئتوں میں وہ آزاد نظم کو اپنے اظہار و ابلاغ کے لئے مناسب تر پاتے ہیں جس کے مزاج اور ڈکشن سے وہ بخوبی آشنا ہیں۔ یہاں بھی ان کے ہاں بلند نگاہی اور اونچے آدرش کے نقوش جابجا ابھرتے ہیں:

چشمِ بیدار پر کھلیں اسرار / قلم / اور وہ کے دریا میں طغیانی رہے / کشتیِ عمرِ رواں کو ساحلِ بے خواب پر / یا کسی موجِ صبا کی دسترس میں چھوڑ کر / آدمی ایسے جزیرے میں کہیں اترے، جہاں / رنگ اور خوشبو کا ہو سکتے رواں

تمھاری یاد کا چہرہ مثالِ منظرِ میرے روبرو ہے / میں اب تنہا نہیں ہوں / افق پر روشنی ہے اور لہریں ہم سفر ہیں / مری کشتی شکستہ ہی سہی لیکن / مجھے اب ڈوبنے کا ڈر نہیں ہے۔

کاظمی صاحب کی شاعری کا ایک اہم حصہ ''عقیدہ و ولا'' یعنی نعت، سلام اور مرثیے میں صرف ہوا ہے۔ غالب توجہ نعت پر رہی جو ان کے ہاں بیشتر جذبۂ والہانہ سے عبارت ہے:

حشر کی دھوپ سے کیا خوف رہے گا دل میں — گوشۂ دامنِ رحمت میں جو مل جائے اماں
ان کی مدحت میں جہاں بھی سرِ مژگاں دیکھا — جذبۂ عشقِ رسالت ہے مگر دل میں نہیں
یہ بھی سرکارِ مدینہ کا ہے اعجاز حسین — میری ہر نعت پہ ہے تازہ بہاروں کا گماں

حسن عسکری کاظمی کی کلکِ گہربار نے شعر کے علاوہ نثر میں بھی گوہر افشانی کی ہے۔ انہوں نے کالم لکھے، علمی و ادبی مضامین لکھے اور سفرنامہ نگاری میں بھی وقیع کام کیا۔ ان کے مجموعہ مقالاتِ قلم ''معیارِ ہنر'' کے عنوان سے شائع ہوئے جو ادبی جائزوں اور تنقید و تبصرہ پر مشتمل تھے۔ آغاز اگرچہ غالب و حالی سے ہوتا ہے لیکن بیشتر تبصرے معاصر لکھنے والوں کے حوالے سے ہیں چنانچہ اس کتاب کو معاصر ادبی منظر نامہ کا ایک اجمالی جائزہ کہا جا سکتا ہے۔ ''مشہدِ جاں میں اجالا'' حسن عسکری کاظمی صاحب کی سفرنامہ نگاری کا بھرپور نمونہ ہے۔ کتاب ہاتھ میں لیجئے اور پڑھتے چلے جائیے۔ معلوم ہوگا کہ خود سارا سفر کر لیا۔ جزئیات کی تفصیل سے یہ آپ کو اپنا تجربہ محسوس ہونے لگے گا۔ زبان و بیان موثر اور جابجا فطری آمد کے زور سے پیدا ہو جانے والی انشاپردازی کے نمونے۔ مشہد میں امام رضا کے روضے کی وسعتوں کا ذکر خود وسعتِ بیاں کا طالب ہے۔ ایک اقتباس دیکھیے۔ کاظمی صاحب نے چند سطروں میں گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے:

''آپ کسی زاویے سے دیکھیے، ہر زاویہ دوسرے زاویے کا آئینہ ہے۔ ایک نگار خانہ ہے یا نگار خانۂ ازل کی حسن زائی کا اہتمام ہے۔ فردوسِ بریں میں ایسا ہی انتظام و انصرام ہوگا۔''

یہ جان کر دلی خوشی ہوئی کہ کاظمی صاحب کے تخلیقی و فنی محاسن کے اعتراف میں انہیں ''تخلیق ایوارڈ 2017ء'' دیا جا رہا ہے۔

◆◆◆

پروفیسر سیّد حسن عسکری کاظمی، شخصیت اور فن

ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم

فطرت جب کسی شخص پر مہربان ہوتی ہے تو اسے گوناں گوں خوبیوں سے سرفراز کر دیتی ہے۔ پروفیسر سید حسن عسکری کاظمی ایسی ہی شخصیات میں شمار ہوتے ہیں، جنھیں اللہ تعالیٰ نے لاتعداد صفات سے نوازا۔ وہ بیک وقت اردو اور پنجابی کے عظیم شاعر، صحافی، محقق، نقاد، مترجم، نعت نویس اور ادیب تھے۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی، 16/ اکتوبر 1931ء مشرقی پنجاب کے شہر انبالہ میں پیدا ہوئے۔ محلہ سادات، قاضی واڑہ، انبالہ شہر میں ان کے والد سید محمد باقر کاظمی اور والدہ سیدہ فردوس خاتون اپنی ہمہ گیر خوبیوں کی وجہ سے علاقہ میں بہت مقبول تھے۔

راقم الحروف (ہارون الرشید تبسم) کے بزرگوں کی طرح انھوں نے تحریک پاکستان میں دامے، درمے، قدمے اور سخنے حصہ لیا۔ آزادی کی دہلیز تک پہنچنے کے لیے انھیں نامساعد حالات کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ ابھی تعلیم کے مراحل سے گزر رہے تھے کہ مسلمانوں کی قربانیاں رنگ لائیں اور وہ بھی پاکستان کی آزاد فضاؤں میں پہنچ گئے۔ پاکستان معرض وجود میں آیا تو حسن عسکری کاظمی لاہور منتقل ہو گئے۔ انھوں نے زمیندار کالج گجرات اور یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں تعلیمی منازل طے کیں۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد درس و تدریس کو ذریعہ روزگار کے لیے منتخب کیا۔ اردو سے ان کا لگاؤ بہت گہرا تھا۔ زمانہ طالب علمی سے انھیں علمی ذہانت کی شمع روشن کرنے کا موقع ملتا رہا۔ اردو کی تدریس میں ان کا ایک طویل تجربہ ان کے شاگردوں کے لیے نشان منزل ثابت ہوا۔ انھوں نے شعر گوئی، شعر فہمی، نکتہ رسی اور نکتہ آفرینی کی صلاحیتوں سے اپنے شاگردوں کو بہرہ ور کیا۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی مختلف تعلیمی اداروں میں اردو پڑھاتے رہے اور مشق سخن بھی کرتے رہے۔ 1961-78ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج جہلم (1978-80ء)، گورنمنٹ کالج باغبانپورہ لاہور اور (1980-91ء) گورنمنٹ کالج آف سائنس لاہور میں اردو کے نامور استاد رہے۔ گورنمنٹ کالج آف سائنس لاہور میں تو وہ صدر شعبہ اردو بھی رہے۔ 15/ اکتوبر 1991ء میں وہ ملازمت سے ریٹائر ہو گئے اور اپنے شاگردوں کے اذہان پر اپنی قابلیت کے نقوش چھوڑ آئے۔

حسن عسکری کا علمی و ادبی سرمایہ

☆ دشت بے صدا (غزلوں کا مجموعہ) جس پر شہزاد احمد، ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر خورشید رضوی نے تحقیقی آرا سے نوازا۔

☆ تجسیم خیال (نظموں اور غزلوں کا مجموعہ) جس پر سید وحید الحسن ہاشمی، ڈاکٹر خواجہ زکریا اور ڈاکٹر انور سدید نے خراج تحسین پیش کیا۔

☆ "لہو بولتا ہے" (قومی نظمیں) ☆ "حرفاں ہتھ سلیٹا" (پنجابی شاعری) ☆ "آئینہ میں اپنی صورت" آپ بیتی

☆ سرورِ کائنات ﷺ (نعتیہ مجموعہ) جس پر ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سید خورشید رضوی اور سید وحید الحسن ہاشمی نے تبصرے کیے۔

☆ مقصودِ کائنات (مناقب اور سلام) جس پر پروفیسر منظور حسین یاد، سید وحید الحسن ہاشمی اور سیدہ عقیلہ کاظمی نے لکھا۔

☆ مقالے، مضامین اور تبصرے مختلف ادبی جریدوں میں چھپتے رہتے ہیں۔ خصوصاً ماہِ نو، الحمرا، ادب دوست، شام و سحر، تخلیق وغیرہ کے علاوہ

روزناموں کے ادبی صفحات میں گزشتہ تیس سال سے لکھا جا رہا ہے۔

☆ لیل و نہار، قندیل، پاک سرزمین، ہم لوگ، امروز (روزنامہ) کی فائلوں میں غزلیں، نظمیں اور مضامین

☆ کالم نگاری روزنامہ جنگ، نوائے وقت، مساوات اور آج کل دن لاہور میں مختلف سیاسی، ادبی، علمی معاشرتی، مذہبی اور اقتصادی مسائل پر کالم نگاری کا سلسلہ جاری ہے۔ ☆ قطعہ نگاری: مساوات میں قطعہ نگاری

☆ اداریہ نگاری پیام عمل لاہور (جناب سید وحید الحسن ہاشمی صاحب کی دمسازی طبع کے عرصے میں)

☆ منظومات کی اشاعت (غزل، نظم، نظم معریٰ، نظم آزاد) قندیل، امروز، فنون، جنگ (ادبی ایڈیشن) ادب دوست، الحمرا، شام و سحر، ایوان (پنجابی غزل، نظم)

☆ تذکرہ جلد ''الف'' (پانچ مرثیے)، ☆ ''حرف عقیدت'' (قطعات اور رباعیات) ☆ (حرف ہنر) مضامین،

☆ (سفرنامہ شام)، ''دیار حبیب'' اور سفرنامہ ایران و عراق ''تکمیل تمنا''

☆ نعتیہ کلام ''سرورِ کائنات ﷺ''، ''جمال مصطفیٰ ﷺ''، ''دیدۂ تم ناک''، ''آیات درخشاں''، ''مقصودِ کائنات ﷺ''، ''جمال رضا''، ''قرار جاں''، ''خیر البشر''، ''مدینہ دل'' اور ''شہر نبوت''

اہل بیت سے محبت ان کے خمیر میں شامل رہی۔ انھوں نے شاعری کو عاشقانہ موضوعات سے محفوظ رکھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حسن و جمال کے جلوؤں سے عاری ہیں۔ انھیں لفظوں پر عبور حاصل ہے۔ وہ شعوری اور لاشعوری طور پر عشق حقیقی کے شاعر ہیں۔ نبی پاک ﷺ اور اہل بیت سے ان کی محبت ان کے کلام کا اوڑھنا بچھونا ہے۔

مخزن اسرار ربانی، مرکز نور رحمانی، مصدر فیوض یزدانی اور قاسم برکات صمدانی نبی معظم محمد مصطفیٰ ﷺ پر غیر متزلزل ایمان کے بغیر مسلمان ہونے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ہم ایمان کی بلندیوں تک اس وقت پہنچتے ہیں جب ہمیں فخر جہاں، عرش مکاں، مبتدائے کائنات، حسن کائنات اور مقصود کائنات سے محبت کی بھی چیز سے بالاتر ہو۔ تمام مسلمان شعرائے کرام کے علاوہ کئی غیر مسلم شعرائے کرام نے بھی نعت نبی ﷺ کہنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ مدحت کے لیے اسلوب کی تلاش بے سود ہے کیوں کہ جس ذات کا ذکر خالق کائنات خود بلند کرے انسان اس ذات کی تعریف و توصیف میں کیا کہہ سکتا ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی نے کیا خوب کہا ہے۔

شان ان کی سوچیے اور سوچ میں کھو جائیے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جائیے

نعت کہنا کوئی آسان کام نہیں ہے اساتذہ نے اسے دو دھاری تلوار پر چلنے کے مترادف قرار دیا ہے وہ اس لیے کہ ایک لفظ کی لغزش و بے احتیاطی پر عمر بھر کی کمائی کے لٹ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ یہ وہ شعرا لکھتے ہیں جنھیں اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے اذن حضوری ملتا ہے۔ ورنہ ایسے کئی شعراء ہیں جو زندگی بھر ایک نعت بھی نہیں کہہ پاتے۔

نعت لکھنا اور کہنا گویا حضرت حسان بن ثابتؓ کی تقلید کرنا ہے۔ حضرت حسان بن ثابت نے حضور اکرم ﷺ کے سامنے نعت پڑھنے کی سعادت حاصل کی ہے۔ ان کی پیروی میں قیامت تک شعرا نعت کہنے کی سعادت حاصل کرتے رہیں گے۔ حسن عسکری کاظمی ایک ایسے خوش بخت شاعر ہیں جنھوں نے نہ صرف نعت گوئی میں اتنی زیادہ تخلیق کی ہیں کہ ان کے کئی شعری مجموعے منظر عام پر آ گئے

"سرور کائنات ﷺ" "جمال مصطفیٰ ﷺ" "دیدۂ نم ناک" "آیات درخشاں" "مقصود کائنات" "جمال رضا" "قرار جاں" "خیر البشر" "مدینۂ دل" اور "شہر نبوت" کے نام سے منصۂ شہود پر آ چکے ہیں۔

مجموعہ کا نام نہایت خوبصورت ہے۔ "شہر نبوت" کی ترکیب بہت بھلی معلوم ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اردو ادب میں یہ ترکیب پہلی مرتبہ سامنے آئی ہو۔ کتاب میں ایک حمد باری تعالیٰ اور کل پچھتر (75) خوبصورت نعتیں موجود ہیں۔ "شہر نبوت" کو انٹرنیشنل نعت مرکز اردو بازار بھائی چوک لاہور نے بڑے اہتمام سے زیور طباعت سے آراستہ کیا ہے۔

مجموعہ کا انتساب ملاحظہ ہو:

"رسالت مآب صاحب معراج ممدوح خدا / نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ کے / نعلین مبارک کے نام / یا احترام نبی تھا جس ام / ہمارے آقا کے پاؤں عرش علا پہ آئے / یہ کہہ کر نعلین تو اتاریں / صدا یہ آئی / اتارنے کی نہ کیجئے زحمت / چلے بھی آئیں / قدم بڑھائیں / کہ آپ کے تئیں / ہمیں ہیں پیارے!"

حسن عسکری کاظمی کا تعلق اہل بیت سے ہے۔ عشق رسول ﷺ ان کے خمیر کا حصہ ہے۔ انھوں نے عشق رسول ﷺ کے مطلع پر بیٹھ کر لفظوں کی شیرازہ بندی کی ہے وہ بڑی سہولت اور روانی سے نعت کہتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی بحریں بڑی مترنم ہیں ان میں موسیقیت بہت زیادہ ہے۔ ان کی نعتیں پڑھ کر گنگنانے کو جی چاہتا ہے صوتی آہنگ سے بھرپور ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

سدرہ مثال پایۂ کردار مصطفیٰ خلوت شعار دیدۂ بیدار مصطفیٰ

محبوب خدا سے کوئی بڑھ کر نہیں ہو گا بے مثل ہیں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہو گا

آقا کا حرف حرف بلاغت کا آئینہ خیر عمل ہے گویا وضاحت کا آئینہ

ڈاکٹر خورشید رضوی رقم طراز ہیں کہ "ادب بحیثیت جناب حسن عسکری کاظمی کا اوڑھنا بچھونا رہا ہے۔ عمر شعر و ادب کے پڑھنے اور پڑھانے میں گزری، سخن شناسی و سخنوری خمیر میں گندھی ہوئی ہے۔ "دشت بے صدا" اور "خیمۂ دل" کے عنوان سے ان کے دو شعری مجموعے قارئین ادب سے داد وصول کر چکے ہیں۔ مرصع سازی کے اس باریک کام کی مہارت بہم پہنچانے کے بعد اب انھوں نے اپنی ریاضتوں کا آب و رنگ آرائش فردوس بریں یعنی نعت ختم المرسلینؐ میں صرف کرنے کی ٹھان لی ہے۔

آپؐ کی مدحت نگاری کا ہنر اچھا لگا موسم نعت نبیؐ شام و سحر اچھا لگا

حضور اکرم ﷺ کی مدحت کے لیے ہمیشہ شاعر کو لفظوں کی عاجزی دامن گیر رہتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ حرف و معانی کا گنجینۂ حق کا طلسم ہے۔

آقا کا حرف حرف بلاغت کا آئینہ خیر عمل ہے گویا وضاحت کا آئینہ

حسن عسکری کاظمی نعت لکھتے ہوئے اپنے ماحول اور امت مسلمہ کے حالات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ امت مسلمہ دشمنوں کے نرغے سے نکل آئے۔ شاعر جب بھی کوئی ایسی بات کرتا ہے تو گویا وہ اس کے حل کے لیے تشویش کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ حسن عسکری کاظمی بھی ایسے ہی شاعر ہیں جو دنیا بھر کے مسائل اور حالات سے بخوبی آگاہ ہیں اس لیے ان کا حل بھی بوساطت رسول مقبول کے

ذریعے اسوۂ محمدؐ سے حل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

آقا ہماری آخری امید آپؐ ہیں — امت حصار ترغۂ اعدا میں آ گئی
آقا ہمیں تو شام غریباں نے آ لیا — سورج غروب ہو چکا اور رات چھا گئی

حسن عسکری کاظمی کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں: "اس عہدِ اصحور میں تخلیق اور تنقید کے معیار پر تفصیل سے گفتگو ہونا ضروری ہے مگر تخلیق کی اہمیت اور صنفِ نعت کو دوسری اصنافِ سخن کی طرح تعلیم یافتہ اور ادب کا ذوق رکھنے والے قارئین سے منوانا اسی صورت میں ممکن ہے کہ نعت گو شعرا اسلامی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ حضور نبی کریم ﷺ کے افکار و عقائد کو فطرتِ انسانی اور معاملاتِ حیات و کائنات کے تناظر میں دیکھنے کی اہلیت پیدا کریں۔ نعت گوئی کے لیے زبان و بیان پر قدرت رکھنا لازمی ہے۔ حزم و احتیاط کا تقاضا ہے کہ ممدوحِ خدا کی مدحت میں اپنی ذات کے پندار سے باہر رہ کر مودت و محبت کی راہ اختیار کی جائے۔ یہ کارِ ہنر ایسا ہے کہ عشق و سرخوشی کے باوصف متانت اور سنجیدگی مرحلۂ تخلیقِ شعر میں کارفرما دکھائی دے تو حقِ مدحت بطور ظرفِ محبت ادا ہوتا ہے۔"

نعت گوئی سے بڑا کوئی اعزاز نہیں ہے۔ وہ احباب جو اپنی ذات کو حبِ رسولؐ میں شامل کر لیتے ہیں وہ کائنات میں لامحدود ہو جاتے ہیں۔ کیوں کہ مونسِ دل شکستگاں، رحیمِ بے کساں، تاجدارِ ختمِ نبوت، فخرِ موجودات محمد مصطفیٰ ﷺ کا دامن جس نے تھام لیا وہ آقاؤں کا آقا بن گیا۔ جس کی نسبت شہرِ نبوت سے قائم ہو گئی کائنات اس کے قدموں میں آ گئی۔ پروفیسر حسن عسکری کاظمی نے حمد و نعت کا راستہ اختیار کر کے علاوہ خیال میں پل صراط طے کر لیا۔

ہماری جاگتی آنکھوں میں خواب طیبہ کا — کہاں سے لائے گا کوئی جواب طیبہ کا
یہی ہے شہرِ نبوت جو محترم ہے بہت — زمیں پہ ہے نہ فلک پر جواب طیبہ کا

ان کی ایک اہم کتاب "حرفِ معتبر" راقم الحروف کے زیرِ مطالعہ رہی۔ اس کتاب میں انواع و اقسام کے مضامین شامل ہیں۔ علمی و ادبی شخصیات، ادبی جائزے اور مسائل، عملی تنقید اور تبصرے، نیز ادبی تقریبات کی رپورتاژ کتاب کا حسن ہے۔ 328 صفحات پر مشتمل 62 مختلف رنگارنگ مضامین کتاب کی زینت ہیں۔ وہ اپنی کاوش "حرفِ معتبر" "حرفِ مختصر" میں رقم طراز ہیں کہ "حرفِ معتبر" میں ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہوئے علمی و ادبی شخصیات، تنقید و تبصرے، ادبی مسائل اور تقریبات کے حوالے سے جو سوالات اٹھائے گئے ہیں ان پر گفتگو کی جا سکتی ہے۔ ہم عصر اہلِ قلم ان مباحث پر اظہارِ خیال کر سکتے ہیں۔ ان مختصر تحریروں میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ حقائق بیان کرتے ہوئے کوئی چبھتی ہوئی بات نہ کی جائے اس کے باوجود نقد و نظر کا معیار تنقیدی اصول کو سامنے رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ فنی اور معنوی خصوصیات کو ضبطِ تحریر میں لانے اور شاعری میں تخلیقی صلاحیتوں کا محاکمہ پیش کرنے کی ضرورت مختلف صورت میں سامنے آئی۔ کسی بھی ادبی تخلیق کی مثال آبدار موتی کی سی ہے، جسے جوہری پرکھ سکتا ہے، عام آدمی صرف محظوظ ہو سکتا ہے بشرطیکہ عام فہم، سادہ و دلپذیر انداز میں اظہارِ خیال کیا گیا ہو۔ صاحبانِ علم کی شاعری محدود حلقوں میں جوت جگاتی ہے اور غور و فکر کرنے والوں کے لیے اپنی افادیت کا معتبر حوالہ بنتی ہے۔ اس گفتگو کا مقصود یہ ہے کہ شعر و ادب میں جگہ حاصل کرنے کے لیے علمی لفظیات سے زیادہ جذب و مستی تخلیقی قوت کے لیے مہمیز کا کام کرتی ہے۔ ہمارے فنکاروں نے نظم و نثر میں بہت سے معرکے سر کیے البتہ انھیں زمانے سے شکایت ضرور رہی کہ عہدِ موجود میں مطالعے کا ذوق کم ہو چکا، خصوصاً ادبی تخلیقات سے بے رغبتی اور اپنے سرمایۂ علمی سے بے نیازی عام ہے۔ یہی شکایت فیض احمد فیض کے ہاں نظر آتی ہے۔"

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازارِ سخن ہم کسے بیچنے یہ لعل و گہر جائیں گے

کتاب کے سرسری مطالعے سے حسن عسکری کاظمی کے اسلوب اور مشاہدے سے آگاہی حاصل ہوتی ہے کہ وہ ہر تحریر میں جان ڈالنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کی شخصیت نگاری اور مرقع نگاری سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ مجھے اپنی کم علمی اور کم مائیگی کا احساس ہے۔ اس لیے ممتاز دانش ور، ادیب، منظور حسین یادؔ کی تحریر سے اپنا موقف پیش کرنے لگا ہوں۔

”حسن عسکری کاظمی نے ایک مشکل کام کو آسان کر دیا ہے۔ اب تک اپنی تحریروں میں وہ جس قدر رنگا رنگ نظر آ سکتے تھے اس میں نظر آ رہے ہیں اور پھر ان کی یہ خصوصی عام انداز کی نہیں ہے کہیں اس کتاب میں مختلفوں کے رنگ ہیں تو کہیں تبصروں کی رنگا رنگی پھر مزید یہ کہ انسانی خاکوں کے ذریعے حسن عسکری کاظمی نے زندگی کے طرح طرح کے رنگوں کو چلتا پھرتا بھی دکھایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے اپنے قلم کی روانی کو جولانی کے وہ کیسے اسلوب دکھائے ہیں کہ پڑھنے والے حیران ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر یہ حیرت کوئی حیرت نہیں آپ کو فکر و نظر کے بہت سے زاویوں سے بھی مالا مال کرتی ہے۔ اس گلدستے کا ہر پھول اپنا رنگ اور اپنی خوشبو ہی نہیں لیے ہوئے ہر پھول اپنی جگہ ایک چمن تازہ کی حیثیت رکھتا ہے ایک چمن اور پھر تازہ اس میں پڑھنے والے کی بصارت ہی کا امتحان نہیں اس کے تمام حواس کو وارفتہ رہنے کی توفیق بھی حاصل ہوتی ہے۔ کتاب کو پڑھ کر دیکھیے پھر آپ کو میرے سچ کا پتا چلے گا۔“ کتاب میں شامل مضامین صرف تعریف و توصیف کے گرد نہیں گھومتے بلکہ تجزیے کے بعض آفرینی، تحقیق و تنقید، ان مضامین کا اہم جزو ہے۔ صحافت کو ادبی سانچے میں ڈھالنے کا ہنر حسن عسکری کاظمی ہی جانتے ہیں۔ انھوں نے صحافت کو ادبی چاشنی اور ادب کو صحافتی رویوں سے روشناس کروانے کا تجربہ کیا ہے۔ منہاج ادب ان کا حسن محنت ہے۔ اس قسم کی ایک رائے ممتاز سکالر آغا سہیل بھی رکھتے ہیں۔ ان کا لکھنا ہے:

”پروفیسر حسن عسکری کاظمی، ادب شناس کی حیثیت سے صحافت سے رجوع ہوئے لہٰذا ادب اور صحافت کے اس قِران السعدین نے ایک نئی مکمل روایت کی طرح ڈالی ان کے تبصرے علمی محاکمے کا درجہ رکھتے ہیں حالاں کہ اردو ادب میں بعض (نام نہاد) نقادوں نے فتویٰ بازی اور فتوے سازی کی جو روش اختیار کی وہ اردو ادب کے اصناف کے اقدار کو مسخ کر رہی ہیں۔ ادب کے منہاج کو کاظمی صاحب نے ان کے صحیح اقدار پر قائم کر دیا ہے نیز ان کے شعری مزاج اور مذاق نے اسے شعری لسانیات پر قائم کر کے علمی اور ادبی معیارات سے آشنا کیا ہے۔“

انھیں اکادمی ادبیات سمیت متعدد تنظیموں نے انعامات اور اعزازات سے بھی نوازا۔ حسن عسکری کاظمی ۱۳ جنوری ۲۰۱۴ء میں داغِ مفارقت دے گئے۔ وہ آسودۂ خاک ہیں لیکن ادب کے خاک نشینوں کو عرشِ ثریا تک پہنچنے کا ہنر سکھا گئے ہیں۔

◆◆◆

ادب دوستی

ادارہ ”تخلیق“ ان تمام دوستوں کا تہہ دل سے شکر گزار ہے جو ”تخلیق“ کے فروغ کے لیے ہر وقت سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ پچھلے دنوں **آغا گل** صاحب نے بلوچستان میں دو لائبریریوں کو ”تخلیق“ جاری کرایا۔ اسی طرح **ذبیح اللہ فہیم** صاحب نے آزاد کشمیر سے پانچ نئے ممبر ”تخلیق“ کے لیے تلاش کیے۔ ادارہ تخلیق ان تمام کی کاوشوں کو سراہتا ہے اور ادب دوستی اور ادب کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں پر انھیں مبارک باد پیش کرتا ہے۔ (ادارہ ”تخلیق“)

ہر صنفِ سُخن کا نام حسن عسکری کاظمی

سرفراز سید

میں نے پوچھا: ''عسکری صاحب کبھی بم بنایا؟''

''بم؟'' عسکری صاحب کو جھٹکا سا لگا۔ ''آپ کیا پوچھ رہے ہیں میں سمجھا نہیں؟''

مجھے یہ خیال اس لئے آیا کہ آپ اور ناصر کاظمی نے انبالہ میں بہت وقت اکٹھے گزارا۔ حسن رضوی نے ناصر کاظمی کے بارے میں پی ایچ۔ ڈی کے مقالے میں لکھا ہے کہ 1947ء کے خونریز ہنگاموں میں انبالہ میں مقیم ناصر کاظمی نے بم بنانے کی ترکیب سیکھی بلکہ غالباً بم بنانے کی کوشش بھی کی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید آپ نے بھی اس سلسلے میں دلچسپی لی ہو؟''

''ارے نہیں، میں نے بم کیا بنانا تھا۔ گھر میں ہر طرف علمی و ادبی ماحول تھا۔ اس میں بم کی گنجائش کہاں تھی؟ معاملہ یہ ہے کہ دوسری عالم گیر جنگ ختم ہو چکی تھی اور اب تحریک پاکستان زور میں آ گئی تھی۔ شروع میں تو سیاست چلی مگر پاکستان کے قیام کا اعلان ہوا تو فسادات شروع ہو گئے۔ انبالہ بھارت کا حصہ بن گیا۔ مسلمانوں پر حملے شروع ہو گئے۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لئے مختلف تدابیر اختیار کیں۔ اس وقت یہ بات سامنے آئی کہ ناصر کاظمی بم بنانے کے بارے میں سنجیدہ ہے۔ ظاہر ہے بم کے لئے لوہے کی چیزیں اور بارود حاصل کرنا پڑتا ہے۔ یہ بہت مشکل بات تھی۔ اس میں اپنے لئے بھی خطرہ ہو سکتا تھا۔ ان دنوں سوڈا واٹر کی بوتلیں عام تھیں۔ کسی نے بتایا کہ سوڈے کی بوتل میں ایک خاص چیز ڈال کر اور بوتل کو ہلا کر زور سے فرش پر پھینکیں تو وہ بم کی طرح پھٹتی ہے اور اس کی کرچیاں آس پاس کے جسموں، خاص طور پر چہروں کو بری طرح زخمی کر دیتی ہیں۔ ممکن ہے ناصر کاظمی نے ایسا کوئی تجربہ کیا ہو۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔''

''چلئے دوسری بات کرتے ہیں۔ آپ کی عمر 86 برس بلکہ ایک ماہ اوپر ہو گئی۔ مختلف علمی، ادبی اور تنقیدی موضوعات پر 32 کتابیں شائع کر چکے ہیں، مزید تین آ رہی ہیں۔ ساری کتابیں اہم ہیں۔ ان میں حمد، نعت، سلام، مرثیہ، نظم، غزل، تنقید، اخباری کالم، تبصرے، قومی ترانے اور سہرے شامل ہیں مگر سب سے زیادہ تعداد آٹھ نعتیہ مجموعوں کی ہے۔ وحید الحسن ہاشمی نے آپ کو بنیادی طور پر غزل اور نظم کا شاعر قرار دیا مگر آٹھ نعتیہ مجموعے ظاہر کرتے ہیں کہ زیادہ رجحان نعت کی طرف رہا ہے۔ کوئی خاص وجہ؟'' ''خاص وجہ؟ بات یہ ہے کہ گھر کا ماحول بہت مذہبی تھا۔ ابا جان آخری سانس بھی لے رہے تھے تو لبوں سے آواز آ رہی تھی کہ ''عالم میں تھے جو فیض کے دریا وہ کہاں ہیں؟ ... پیدا ہوئی جن کے لئے دنیا وہ کہاں ہے؟'' یہ پڑھتے پڑھتے وہ ہمیشہ کی نیند سو گئے۔ والدہ صاحبہ بھی بہت دین دار تھیں۔ اس ماحول کا اثر تو ہونا تھا۔ دین اور ایمان کا تو آغاز ہی اللہ تعالیٰ کے بعد رحمتِ دو عالمؐ سے ہوتا ہے۔ میں نے تمام ایران اور عراق میں زیارتیں بھی کی ہیں۔ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ نعت کا معاملہ یہ ہے کہ جب بھی روضۂ رسولؐ کے روبرو پہنچا، دل و نگاہ عجیب سی عقیدت اور وجدان سے سرشار ہو گئے۔ نعتوں کے آٹھ مجموعے چھپے ہیں مگر یوں لگتا ہے کہ ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔''

''اچھا عسکری صاحب! ایک بات کہ آپ کے ایک ہم نام محمد حسن عسکری کا نام حقیقت پسندانہ تنقید اور افسانوں وغیرہ کے سلسلے

میں بہت اُبھرا۔ آپ دوسری سمت میں نمایاں رہے۔ بعض اوقات قاری ان دونوں ناموں کو آپس میں خلط ملط کر دیتے رہے۔ میرے ساتھ بھی یہ مسئلہ رہا کہ آپ کی تخلیقی سرگرمیوں کو محمد حسن عسکری کے کھاتے میں اور ان کے تجزیوں اور تنقید کو آپ کے حساب میں ڈال دیا۔ اس پر حیرت بھی ہوتی رہی۔ تاہم بعد میں بات واضح ہوئی۔ محمد حسن عسکری 1916ء میں، آپ 1931ء میں پیدا ہوئے۔ عمر کا بہت فرق اور سرگرمیوں میں بہت فاصلہ تھا۔ کبھی کسی نے ایسی صورت حال کے بارے میں آپ سے سوال کیا؟"

"نہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا۔ وہ محمد حسن عسکری تھے، میرا نام حسن عسکری کاظمی تھا۔ یہ خاصا فرق تھا۔ کبھی کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا۔

لاہور میں رہنے والوں کو دوسرے شہروں اور قصبوں میں رہنا پڑے تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ آپ نے جہلم میں لیکچرار کے طور پر 18 برس گزار دیے؟" "میں جہاں بھی گیا، علم و ادب کی محفلیں میرے ساتھ ساتھ گئیں۔ گجرات میں دیہات سدھار محکمہ کے افسر کے طور پر کافی وقت گزارا۔ ادبی محفلیں منعقد کیں۔ لیکچرار ہونے کے بعد جہلم کے کالج میں بہت سے مشاعرے کرائے ان میں نوجوانوں کے علاوہ دوسرے شہروں سے چوٹی کے شعرا ناصر کاظمی، محسن احسان، سجاد باقر رضوی، انور مسعود، شریف کنجاہی، چودھری فضل حسین، صادق نسیم اور دوسرے شعرا آتے تھے۔ جہلم میں ہم نے حلقہ ارباب فکر و نظر کی ابتدا کی۔ اس کے اجلاسوں میں کوئی صدر یا سیکرٹری نہیں ہوتا تھا۔ اس میں مختلف شعبوں سے لوگ آتے اور باقاعدہ علمی، فکری، ادبی، ثقافتی و مذہبی موضوعات پر سنجیدہ مباحث ہوتے۔ انہیں بعد میں پمفلٹ کی شکل میں تقسیم کرایا جاتا تھا۔ اس کے بہت اچھے نتائج نکلے۔"

آپ نے ایک انٹرویو میں گجرات کے حسن، وہاں کی خوبصورت آنکھوں کا خاص طور پر ذکر کیا۔ ان آنکھوں نے آپ کی تخلیقی سرشاری پر کتنا اثر کیا؟" "دیکھئے! شاعر تو پھر شاعر ہے، شعر کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں ہمیشہ کاغذ اور قلم ساتھ رکھتا ہوں تاکہ کبھی اچانک کوئی کوندا سا لپک جائے تو اسے گرفت میں لے لوں۔ ایسے حالات میں خوبصورت شعر تخلیق پا جاتے ہیں۔ بہت پہلے ایک سفر کے دوران ایسے ہی عالم میں اچانک ایک شعر میرے ذہن میں آیا جس پر بعد میں پوری غزل کہی۔ شعر یوں تھا:

کسی کے پھول سے چہرے کی یاد کیوں آئی　　ہماری چشم تصور تو باوضو بھی نہیں

"کوئی خاص چہرہ یاد آیا تھا؟" "نہیں مگر کچھ چہرے ایسے ہوتے ہیں جو انسان کو انسپائر کرتے ہیں۔ میں نے ایک مدت گجرات کے خطۂ حسن میں گزاری۔ وہاں قدرت کا نکھرا حسن دکھائی دیتا ہے۔ ان لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے حسن سادہ کی قربتیں حاصل رہیں۔ وہاں کھیتوں، کھلیانوں میں، پگڈنڈیوں کے درمیان دلکش اور خوبصورت آنکھوں کے درمیان زندگی کا عہد شباب گزرا۔ مگر شاعری اپنی جگہ، حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں سے زیادہ غم روزگار، غم ذات اور غم کائنات زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے غموں نے چہروں پر لکیروں کے جال بچھا دیے ہیں۔ میں نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا کہ

خود کلامی میں گزرتی ہیں ہماری راتیں مگر　　میں کسی تخیل کا کردار ہوں، ایسا نہ تھا
دیکھ کر حیران میں اپنا سراپا رہ گیا　　آئینے میں خود کو ٹکڑوں میں کبھی دیکھا نہ تھا
میں گرفتار غم دوراں تھا پہلے بھی حسن　　جال چہرے پہ لکیروں کا کبھی پھیلا نہ تھا

کچھ باتیں گھرانے میں نمک کے طور پر۔ آپ کی شادی 1959ء میں ہوئی۔ کیسی چلی اور کیسی چل رہی ہے؟"

"الحمدللہ بہت اچھی چلی، بہت اچھی چل رہی ہے۔"

''کبھی کوئی لڑائی جھگڑا ہوا تو کس نے ہتھیار ڈالے؟''

''کوئی لڑائی جھگڑا کبھی ہوا ہی نہیں، ہتھیار کون ڈالتا؟''

آپ نے ایک بار بیگم صاحبہ کے چہرے پر نظر پڑتے ہی شعر کہہ دیے تھے، یہ واقعہ شادی سے پہلے پیش آیا یا بعد میں؟''

''یہ شادی کے بعد کی بات ہے۔ میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ انہی دنوں گجرات کے ایک مشاعرے میں شرکت بلکہ صدارت کرنی تھی۔ میں کمرے کے دروازے کھڑکیاں بند کر کے بیٹھا تھا۔ بیوی نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور وہ جو میرے دل میں تھا ان کی ایک جھلک سے یکایک صفحۂ قرطاس پر یوں اتر آیا۔

رخ سے وہ پردہ ذرا سرکا گئے — جانے کتنے آئینے دکھلا گئے
ان کے شوق دید کو دیکھا نہیں — ہم نے دیکھا تھا کہ وہ شرما گئے

قارئین محترم! یہ انٹرویو یہیں رک کر کچھ دوسری باتیں۔ یہ کہ مختلف اوقات میں نامور ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں نے محترم حسن عسکری کاظمی کی شخصیت، زندگی اور ان کے فن کے بارے مختلف تقریبات اور تبصروں میں بھرپور اظہار تحسین کیا ہے۔ ان میں انتظار حسین، ظفر اقبال، ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر سہیل احمد خان، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، سید وحید الحسن ہاشمی، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر خورشید رضوی، ڈاکٹر تبسم کاشمیری، پروفیسر منظور حسین یاد، ڈاکٹر سعادت سعید، ڈاکٹر معراج نیر، ناصر زیدی، ڈاکٹر طارق عزیز، ڈاکٹر فخر الحق نوری اور بہت سے دوسرے ساتھی ادیبوں اور نقادوں کے نام شامل ہیں۔ عسکری کے ادبی کاوشوں اور خدمات کے بارے میں تقریباً ایک جیسے خیالات ظاہر کئے ہیں کہ حسن عسکری صاحب اردو کے نمایاں شاعر، نقاد اور کالم نگار ہیں۔ انہوں نے شاعری میں حمد، نعت، منقبت، سلام، مرثیہ اور غزل میں کام کیا ہے۔ ان کے ہاں اصناف سخن میں تنوع نظر آتا ہے تاہم انہوں نے ہر صنف سخن کے تقاضوں اور ان کی ادبی تہذیب کو مد نظر رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں پختگی اور فنی دسترس کا احساس نمایاں ہے۔

جناب عسکری صاحب دیکھنے میں ۸۰ سال کے نہیں لگتے۔ ہمیشہ کی طرح چلتے پھرتے۔ خدا تعالیٰ انہیں اسی طرح رواں دواں اور سلامت رکھے۔ میں نے پوچھا کہ اس عمر میں بھی ایسی توانائی اور صحت مندی کا راز کیا ہے؟'' کیا آسان جواب دیا کہ یہ کوئی ایسی راز کی بات نہیں۔ تہجد کی نماز کے بعد فجر کی نماز، پھر قرآن مجید کی تلاوت اور پھر سیر جو کبھی نہیں چھوٹتی۔ واپسی پر سادہ سا ناشتہ، کھانا بھی سادہ، زندگی بھی سادہ۔ خدا تعالیٰ نے طویل عمر کے ساتھ بہت سی دوسری نعمتوں سے بھی نوازا ہے۔ ایک بیٹی وحدت کالج میں پروفیسر ہے، ایک ڈاکٹر ہے، دو بیٹیاں بھی تدریس سے وابستہ رہی ہیں، اب اپنے گھروں کی دیکھ بھال کر رہی ہیں۔ ایک بیٹا ایک بڑی فرم میں چیف انجینئر، دوسرا کیمیکل انجینئر ہے۔ تیسرا امیر پور تدریس کے ساتھ میرپور یونیورسٹی میں پی ایچ۔ ڈی کر رہا ہے۔ اہم بات یہ کہ مقالے کا موضوع ہے ''فیض اور ناصر کاظمی کے ذہنی فاصلے''۔ عسکری صاحب درویش قسم کے سادہ مزاج انسان ہیں۔ سادہ غذا، سادہ زندگی، ان کی شخصیت، زندگی اور فن پر مختلف یونیورسٹیوں میں ایم۔ فل کے چار اور ایم۔ اے تین مقالے شائع ہو چکے ہیں۔ سرکار دربار کو تو ان کی علمی وجاہت اور فضیلت کا علم ہی نہ ہو سکا کہ انہیں ایوارڈ حاصل کرنے کے طریقے ہی نہیں آتے مگر پاکستان، ایران اور برطانیہ کی مختلف تنظیموں اور اداروں کے بہت سے ایوارڈز اور اعزازات ان کی حقیقی قدر شناسی کے مظہر ہیں۔

◆◆◆

یادِ رفتگاں

میں کجکلاہِ تمنا تھا کامیاب رہا......
مشکور حسین یاد کی یادیں اور باتیں

حسن عسکری کاظمی

میں اپنے دوستوں کی فہرست میں پروفیسر مشکور حسین یاد کو ہمیشہ (وہ کل تک جو ہمارے درمیان تھے) صفِ اول میں دیکھتا ہوں۔ گزشتہ صدی کے نصف 1954ء میں بی اے کرنے کی دیر تھی کہ ایم اے اردو میں داخلے کی غرض سے یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کا رخ کیا۔ شعبۂ اردو میں اپنے عہد کے معروف اور قد آور ناقدین، محققین اور قابل اساتذہ میں ڈاکٹر سید عبداللہ پرنسپل، پروفیسر وقار عظیم، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، پروفیسر علم الدین سالک اور پروفیسر قیوم نظر کے اسمائے گرامی اور ان کا اندازِ تدریس ایسا تھا کہ آج تریسٹھ برس گزرنے کے باوصف وہ صورتیں اور ان کے انداز و اطوار چشمِ تصور کے روبرو ہیں۔ ہم تعداد میں اتنے کم تھے کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے یہی احوال ایم اے فائنل کا تھا اس لئے دونوں کو باہم یکجا بھی کر دیا جاتا تھا۔ ایم اے فائنل میں مشکور حسین یاد، غلام حسین ذوالفقار، اسلم کاظمی اور دو تین اور طلباء تھے اتنی ہی تعداد طالبات کی تھی۔ ایم اے سالِ اول میں میرے علاوہ صابر لودھی، افتخار احسن، عبدالشکور، اعجاز الرحمٰن، قاسم محمود اور ایک دو اور تھے اتنی ہی تعداد طالبات کی تھی۔

مشکور حسین یاد محکمہ نہر میں ملازم تھے مگر تعلیم حاصل کرنے کا جنون تھا۔ قلم سے رشتہ تشکیلِ پاکستان سے پہلے استوار ہو چکا تھا۔ وہ ابھی میٹرک میں تھے پندرہ برس کا سن تھا کہ انہوں نے ایک ادبی جریدے کی ادارت کے فرائض انجام دیے کہ سب سے کم عمر مدیر کا اعزاز حاصل تھا۔ ضلع حصار میں ان دنوں محترم انور اشفاق ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کی سرپرستی بھی حاصل رہی اور "پکار" ادبی جریدہ حلقوں میں شوق سے ہاتھوں ہاتھ خرید کر پڑھا جاتا رہا مگر آج اس کا نام و نشان نہیں ملتا شاید کسی لائبریری میں یا کسی خاندان کے کتب خانے میں دستیاب ہو جائے۔ یہیں پروفیسر مشکور حسین یاد باتیں اور اپنی بہت سی دوسری یادیں سنایا کرتے لیکن 1947ء کے واقعات کا ذکر بہت کم کیا کرتے۔ دورانِ طالب علمی میں روزانہ اپنے اشعار ضرور سناتے۔ ہم کبھی لائبریری میں اور کبھی کالج کے کسی گوشے میں جا بیٹھتے۔ ایسا بھی ہوا کہ انارکلی میں گھومتے یا ہاسٹل کے کمرے میں ادبی، سیاسی اور معاشرتی مسائل پر گفتگو کرتے۔ مشکور حسین یاد باہر سے ہنستے خوش و خرم نظر آتے، ہنسی مذاق کرتے، دوستوں میں گھل مل جاتے اور دل لگی کرتے اتنا ہی وہ اندر سے غم زدہ اور دکھ میں مبتلا پائے گئے مگر وہ اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ ان سے ایک دن میں نے کہا کہ غزل کہنا آسان ہے لیکن معیاری نثر لکھنا مشکل ہے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ نثر کی کارگزاری بھی انجام دینا ہے۔ مغرب میں Essay لکھنے کی روایت مضبوط بنیادوں پر قائم تھی مگر اردو میں مضمون تو لکھے گئے، سرسید اور شبلی کے مضامین میں بہت سے موضوعات پائے جاتے ہیں مگر Essay کے لئے قبول لفظ "مضمون" وہ معانی کے ظاہر کرتا تو اگر ایک لفظ سمجھ میں آیا جو

متبادل ٹھہرا دیا گیا۔ یہی وقت انشائیہ کو Essay کے مترادف تصور کیا گیا۔ ایک طرف منظور حسین یاد اور دوسری طرف دبستان سرگودھا کے مدار المہام ڈاکٹر وزیر آغا نے انشائیہ لکھنے کا آغاز کیا اور یوں اسی نثر اور موضوعات کی کہکشاں معرض وجود میں آ گئی اور آسان ادب کا حسن و جمال اور نئے آفاق کی وسعت کا منظر نامہ دیکھنے کو ملا۔

منظور حسین کی تخلیقی جہتوں میں شاعری اور نثر دونوں کی تخلیقی ثروت مندی دیکھنے کے لائق ہے۔ وہ شاعری کی بیشتر اصناف پر ستے میں اپنا جواب آپ ہیں۔ وہ غزل میں مختلف بحروں کا استعمال کرتے وقت معنوی اعتبار سے فلسفہ و فکر کی دنیا میں گم ہو جاتے ہیں۔ وہ مجھ سے اکثر پوچھتے کہ غزل کیسی رہی میں جواب دیتا کہ ابھی آپ کی غزل کو سمجھنے والا قاری پیدا نہیں ہوا۔ مستقبل میں صحیح مفہوم کھل کر سامنے آئے گا۔ وہ میری بات کا اعتبار کر لیتے حالانکہ ایسا نہیں ان کا شعر معنوی ابلاغ میں قاری کے مطالعے کی وسعت اور ذاتی تجربے کی ہمہ گیری کا تقاضا کرتا ہے۔ وہ مشکل پسند ہیں بلکہ ان کا بظاہر آسان شعر بھی غور و فکر کرنے پر اپنا مفہوم ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً دو تین اشعار ملاحظہ کیجیے۔

بات کی ہو جاتی ہے   اصل بات تو کرتا ہے   اپنی غلام آزادی ہے   خود کو پانے کی توقع کم ہے   کتنی بھی ہم کو ملے فرصت یاد
بات پرانی کرتے رہو   اتنی سیدھی کرتے رہو   اپنی غلامی کرتے رہو   یوں گنوانے کی توقع کم ہے   سر بچانے کی توقع کم ہے

انہوں نے زندگی اپنے ڈھب سے بسر کی۔ وہ بے دھیان ہو کر بھی باخبر رہے۔ وہ دل زدہ ہو کر بھی مسکراہٹیں بکھیرتے رہے۔ ان کی دوستی یہاں وہاں سب سے رہی۔ صاحبان علم و فضل سے گہرا تعلق زیادہ رہا۔ اکثر اپنے گھر پر ان کو بلاتے۔ علمی مجالس برپا کرتے رہے۔ ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور عالموں سے ربط و محبت قائم رہا۔ ان کے ہاں ہر مکتب فکر کے لوگ آتے جاتے رہے۔ منظور حسین یاد دینی علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ فلسفے کی کتابوں کا مطالعہ ان کے معمولات میں شامل رہا۔ ان کا جھکاؤ ملا صدرہ، علی شریعتی اور مولانا مودودی کی شرح دین کی طرف رہا اور عہد موجود کی تفاسیر میں علامہ طالب جوہری اور دینی سکالر سید عقیل الغروی اور ان سے پہلے علامہ علی نقی مرحوم سے استفادہ کیا۔ مجھے یاد ہے ان تینوں جید علماء کو اپنے گھر پر دعوت دی اور بہت سے دوستوں کو بلایا۔ ایک دلچسپ روئیداد میں ان تمام دانشوروں کا ذکر کیا گیا جو وہاں موجود تھے۔ ان دانشوروں میں انتظار حسین، احمد جاوید، پروفیسر مہدی حسن، پروفیسر رضی، لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ جعفری، خالد لطیف (سفرنامہ نگار)، ڈاکٹر جواز جعفری، پروفیسر قمر عباس، بدر زیدی، اظہر عامر، سید محمد زیدی اور چند اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوانوں کو مدعو کیا تا کہ عہد موجود کے عالمی مسائل کے علاوہ عالم اسلام کے عظیم فلسفیوں، ادیبوں اور شاعروں کی خدمات کے حوالے سے گفتگو میں شریک ہوں اور سید عقیل الغروی کے خیالات سے مستفید ہوں۔

منظور حسین یاد کی باتوں میں شیرینی اور مزاح کی چاشنی پائی جاتی تھی مثلاً کھانے کی میز کی طرف احباب کو لے جاتے ہوئے صرف ایک جملے سے محفل کو قہقہے لگانے پر مجبور کر دیا کہ دوستو! میری ایک ہی بیوی ہے چار نہیں اور اس نے یہ کھانا تیار کیا ہے آپ کو پسند آئے تو میری مجبوری سمجھئے۔ کھانا عمدہ اور لذیذ تھا سب نے تعریف کی۔ آج معاشی ناآسودگی اور کرب مسلسل نے ہمیں فلسفہ و فکر، منطق اور شعر و ادب سے بڑی حد تک بیگانہ کر دیا ہے۔ صحیح معنوں میں پڑھے لکھے اور باشعور افراد کی شدت سے کمی محسوس کی جا رہی ہے۔ علمی مجالس کا فقدان ہمارا معاشرتی المیہ بن گیا ہے۔ ہر آدمی کسی اور دھن میں مبتلا ہے۔ معیار زندگی کی طلب نے عقیدے اور فکر پر ضعف پہنچایا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ معیار زندگی کی طلب ایک جنون ہے۔ ہم سب خیمہ زن ہیں جس میں آرام و آسائش کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ کوئی مرد درویش ایسا نہیں جو ہمیں اس خیمہ زنی سے اٹھا کر کہیں دور لے جائے۔ اس دنیا کی مثال عروس کہن کی ہے جس کی طلب میں لوگ دین سے بے رغبتی برتنے کے مرتکب ٹھہرے ہیں۔ کچھ لوگ اس کے عشق میں جان سے گزر گئے اس کی چمک دمک پر ایک زمانہ جان چھڑکتا ہے اس

کی مرضی ہو تو یہ تخت شاہی پر بٹھاتی ہے اور جس پر مہربان ہو تو اور بھی اونچا اڑاتی ہے مگر یہ صاحبان فقر کو معاف نہیں کرتی۔ منظور حسین یاد کے والد گرامی سید افضال حسین محکمہ پولیس میں خدمات انجام دیتے رہے وہ عشقی منقبتوں میں مرد درویش تھے۔ منظور حسین یاد ان کی وصیت پر ہمیشہ عمل کرتے رہے کہ دنیا عارضی ٹھکانہ ہے 'ہم مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب کے اسوہ حسنہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے زندگی بسر کریں کہ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا کو ایک فاصلے پر رکھیں۔ علی کی معرفت شہادت پر قائم رہنے اور شان شجاعت سے انسلاک کا اعلان عمل ہے۔

یا علی کہہ کے کہیں بیٹھنا آسان نہیں — جسم کے اسم کی عصمت پہ ہیں قائم دائم

منظور حسین یاد کا عقیدہ مرزا غالب کے عقیدے کی بازیافت ہے۔ انہوں نے یہ عقدہ بھی حل کیا کہ علی کے نام سے سب زندگی کے راز کھلتے ہیں اور علی کے ذکر سے سب روشنی کے باب کھلتے ہیں اگر نبی محترم شہر علم ہیں تو علی باب علم ہیں اس شعر کا ان کا یہی کہنا ہے۔

علی کا نام تو علم و ہنر کا اک خزانہ ہے — علی کے نام سے تو آگہی کے راز کھلتے ہیں

ان کی منقبت نگاری اور سلام گزاری میں تغزل نے عہد موجود کے فنی اور معنوی تقاضوں کو نئے امکانات کی راہ دکھائی ہے وہ ہر سال محرم الحرام میں مجالس مسالمہ میں شرکت کرتے ان کا قلم رواں دواں رہا۔ مختلف اصناف نظم و نثر میں تخلیقی ہنرمندی کا اظہار ان کی پہچان بنا۔ ان کی تخلیقی تازہ کاری کا یہ پہلو قاری کے لئے باعث حیرت ہوگا کہ وہ ایک طرف دوستوں کی فرمائش کا لحاظ رکھتے رہے اور دوسری طرف وہ بانوے برس کی عمر میں چشمے کے بغیر لکھتے پڑھتے رہے۔ وہ مدیر ماہنامہ تخلیق کی طرف سے ان کی معاون حمر حنیفہ کا فون سن رہے تھے کہ تخلیق کے لئے ایک مضمون لکھ کر بھیجئے۔ وہ کہنے لگے تخلیق کے ایڈیٹر اظہر جاوید سے بات کرا دیں۔ وہ بڑے دوست ہیں معاون نے بتایا وہ تو مدت ہوئی انتقال کر چکے ان کے صاحبزادے سونان اظہر تخلیق کے ایڈیٹر ہیں انہیں بھولنے کی عادت ہو گئی تھی یہ 10 نومبر کا واقعہ ہے انہوں نے رات گئے مضمون شروع کیا اچانک طبیعت خراب ہو گئی وہ 11 نومبر کی صبح مضمون ادھورا چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ قلم سے ان کا رشتہ پندرہ برس کی عمر قائم ہوا موت کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اس وقت قلم ان کے ہاتھ کی انگلیوں میں شمع کی لو کی طرح نظر آیا۔ ان کی آخری تحریر اور آخری تصویر شہادت دے رہی ہے۔

اپنے ہونے کی یہ ہونے کی نشانی مانگے — دل وہ دریا ہے کہ ٹھہرے نہ روانی مانگے
ایک ہم ہیں چھپائے پھریں اپنے آلام — ایک دنیا ہے کہ اظہار زبانی مانگے

منظور حسین یاد نے ''آزادی کے چراغ'' لکھنے کے بعد آزادی زادوں کی وحشت کو اشعار کا نام دیا۔ پاکستان کی طرف ہجرت کا اعزاز اس طرح پایا کہ بھرا پرا گھر پیچھے ہوا خود زخمی حالت میں پاکستان آئے۔ بدن پر دو کپڑے تھے وہی دھوتے۔ پہنے اور سجدہ شکر بجا لائے۔

بجھ دیا وہ ہے بس وہ تاج ور ہے — مگر تاریخ اس سے بے خبر ہے
بیٹھے رہتے ہیں ہم لوگ شاداب — گواہی کو ہماری چشم تر ہے

وہ آج گوشہ لحد میں دنیا سے کنارہ کش ہو کر ابدی نیند سو رہے ہیں ان کی شخصیت شاعری اور نثر کا معیار دیکھ کر ہم انہیں کامیاب و کامران زندگی بسر کرنے والا مرد قلندر تسلیم کرتے ہیں جس نے علی سے عشق کا نصاب پیش نظر رکھا۔

یہ ایک مصرعہ تو یاد ہے حسن اس کا — ''میں کجکلاہ تنہا تھا کامیاب رہا''

◆◆◆

مشکور حسین یاد

(11 ستمبر 1925ء سے 12 نومبر 2017ء)

سرفراز سید

نومبر 1947ء لاہور کے ریلوے سٹیشن پر ایک 22 سالہ نوجوان کھڑا تھا۔ جسم زخموں سے چور تھا۔ چل نہیں سکتا تھا۔ وہ بھارت سے آنے والی ایک ٹرین سے اترا تھا۔ وہ لاہور بلکہ پورے پاکستان میں کسی کو نہیں جانتا تھا۔ اس کے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں تھی۔ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ کہاں جانا ہے؟ وہ اپنے پیچھے مظفر نگر میں اپنی والدہ، بیوی، بچی، تمام بہن بھائیوں اور عزیز و اقارب کی 135 لاشیں چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ خود بھی زخمی ہو کر گر گیا تھا۔ حملہ آور بلوائی اسے بے جان سمجھ کر چلے گئے تھے۔ یہ نوجوان مشکور حسین ملک کے سب سے مشہور گورنمنٹ کالج کا پروفیسر بنا۔ نواز شریف، شہباز شریف اور دوسرے بے شمار شاگردوں کی تربیت کی۔ ان میں سے بیشتر قومی زندگی میں نمایاں ہوئے۔ پروفیسر سید مشکور حسین نامور شاعر، ادیب، دانش ور، 20 سے زیادہ علمی و ادبی کتابوں، پانچ شعری مجموعوں کے خالق، منفرد اسلوب کے غزل گو، معروف انشائیہ نگار، نہایت شگفتہ مزاج، زندہ دل انسان، اچھے بھلے صحت مند تھے۔ 12 نومبر کو اچانک بلڈ پریشر بہت نیچے گر گیا۔ بے ہوش ہو کر کومے میں چلے گئے۔ بیٹے سید عامر رضا نے فوری طور پر ہسپتال پہنچایا مگر وہ اپنا وقت پورا کر چکے تھے۔ زندگی 11 ستمبر 1925ء کو بھارت کے شہر مظفر نگر سے شروع ہوئی اور 12 نومبر 2017ء کو لاہور میں خاموش ہو گئی۔ ایک بیٹے پاک فوج کے سابق سرجن جنرل میجر جنرل اظہر رضا زیدی برطانیہ میں تھے۔ دوسرے نامور آرتھوپیڈک سرجن منصور رضا زیدی سعودی عرب میں تھے۔ ان کے آنے پر 13 نومبر کو جنازہ ہوا اور اگلے روز قل۔ ۔۔۔ اور پروفیسر سید مشکور حسین زیدی اپنے پرانے دوستوں انجم رومانی، قیوم نظر، احمد ندیم قاسمی، قتیل شفائی اور منیر نیازی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

مشکور حسین یاد بہت سے لوگوں کو بہت عرصہ تک یاد رہیں گے، یاد آیا کریں گے۔ کتابوں کے نام بھی منفرد رکھے، جو ہر اندیشہ و انجام کے آئینے میں، بات کی اونچی ذات، اپنی صورت آپ، اصول ملاقات، حسنات سے پوچھتے ہیں، مطالعہ الفتن کے نازک مراحل، میں اردو ہوں، غالب کے نقش، وقت کا انتظار، ستم ظریف لوگ، منکات پرسش اور شعری مجموعوں کے دلچسپ نام کے ۔۔۔۔ برداشت، برداشت، عرض داشت، بہم داشت۔ ان کی تحریک پاکستان کے چشم دید واقعات پر کتاب "آزادی کے چراغ" کے بے شمار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ یہ کتاب یونیورسٹیوں اور افواج کی لائبریریوں اور نصاب میں شامل ہے۔ سرکاری سطح پر انہیں دو نمایاں تمغے، پرائیڈ آف پرفارمنس اور ستارۂ امتیاز دیے گئے۔ پاکستان میں اور بیرون ملک متعدد کانفرنسوں، مذاکروں اور مشاعروں میں شریک رہے۔

مرحوم کی ایک خاص صفت ان کی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی تھی۔ کسی بھی محفل میں ہوتے تو اسے زعفران زار بنا دیتے۔ اپنی زندہ دلی کے واقعات خود سنایا کرتے تھے۔ آخری دور میں آنکھوں کا عجیب سا مسئلہ درپیش ہوا کہ سورج غروب ہونے کے بعد بینائی بہت کمزور ہو جاتی تھی۔ صبح پھر بحال ہو جاتی۔ ایک بار بتایا کہ گھر والے شام کے بعد مجھے کہیں نہیں جانے دیتے تھے۔ ایک روز میں چپکے سے گھر سے نکلا اور بازار میں چلا گیا۔ گھر میں افراتفری مچ گئی۔ بیگم خود ڈھونڈنے نکلیں۔ بازار میں آ کر میرا بازو پکڑ کر کہنے لگیں کہ گھر چلو! مجھے آواز تو ان ہی

گئی۔ میں نے کہا کہ خاتون! میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہوا ہے۔ آپ کا گھر کہاں ہے؟ کہنے لگیں کہ اچھا چلو بتاتی ہوں کہ گھر کہاں ہے اور مجھے کہاں دیکھا تھا؟

مشکور حسین یاد نے بے شمار غزلیں کہیں۔ چند اشعار:

باتوں کے گھر سے آ رہے ہیں ہم اپنے ہی گھر سے آ رہے ہیں
خاموشیاں ہجر کے تن بدن میں ہم ہوش و خرد سے آ رہے ہیں

جس کو دیکھو خواب میں الجھا بیٹھا ہے اپنے ہی پایاب میں الجھا بیٹھا ہے
آنسو آنسو جس نے دریا پار کیے قطرہ قطرہ آب میں الجھا بیٹھا ہے

عمر گزری سفر کے پہلو میں خوب سے خوب تر کے پہلو میں

جب دیدہ بینا کا حوالہ نہیں تھا پھر کوئی دنیا کا حوالہ نہیں تھا

◆◆◆

ادبی رسائل فروغ ادب کیلئے مؤثر کردار ادا کر رہے ہیں

راجہ نیئر

قارئین کرام! ادبی رسائل ادب کو پروان چڑھانے میں مؤثر کردار ادا کرتے ہیں۔ جب سے پاکستان قائم ہوا مختلف النوع ادبی رسائل بھی وقت کے ساتھ ساتھ شائع ہونے لگے۔ معروف ادبی رسائل میں ادب لطیف، نقوش اور امروز کے ادبی ایڈیشن نے ادب کے طالب علموں کی پیاس بجھائی۔ ماہِ نو، سویرا ادبی خدمات انجام دیتے رہے۔ فنون، اوراق، تخلیق بھی تواتر سے شائع ہونے والے ادبی رسائل تھے۔ فنون اور اوراق کے ایڈیٹرز جب اس عالم فانی سے چلے گئے تو ان کو تسلسل کے ساتھ شائع کرنے کا اہتمام نہ کیا جا سکا جب کہ "تخلیق" اور "بیاض" وہ خوش قسمت ادبی رسائل ہیں جنہیں نہایت محنتی اور مخلص محبت کرنے والے میسر آئے اور انہوں نے حق محبت ادا کرنے کے لیے جو ذمہ داری اٹھائی تاحال اسے نبھائے جا رہے ہیں۔

"تخلیق" کا سفر جو محترم اظہر جاوید نے اپنی زندگی میں 43 سال تک نبھایا ان کے چلے جانے کے بعد ان کے فرزند ارجمند سونان اظہر فروری 2012 سے تاحال بخوبی ادا کر رہے ہیں۔ انہوں نے 2012ء ہی میں سب سے پہلے "اظہر جاوید" نمبر شائع کر کے اپنی صلاحیتوں کو تسلیم کروایا۔ وہ تاحال اپنے پیارے اور عظیم باپ اظہر جاوید کی زندگی بھر کی کاوشوں اور محنتوں سے قائم ہونے والے "تخلیق" کو بہت لگن اور محبت و محنت کے ساتھ تسلسل کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ وہ ان کے عرصے میں ہر سال اپنے والد گرامی کی برسی بھی منعقد کرتے ہیں اور 14 فروری کے حوالے سے تمام اہم ادیب، شاعر، نقاد "اظہر جاوید" کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ سونان اظہر جس محبت اور ذوق و شوق کے ساتھ "تخلیق" کو ایک کارواں کی صورت آگے بڑھا رہے ہیں اس پر ہم اظہر جاوید کے چاہنے والے ان کے لیے پرخلوص دعا گو رہتے ہیں۔

(بشکریہ روزنامہ "الشرق انٹرنیشنل" — 16-11-2017)

سیاست کب تک جوان بیٹوں کا لہو چاٹتی رہے گی

اظہر جاوید

اظہر جاوید کے پرانے کاغذات سے نایاب تحریر بازیافت (روزنامہ ''دن'' 11 اپریل 1997ء)

گولی شبیر بلور کو نہیں لگی، کہیں میرے دل میں گھب گئی ہے۔ میں نہیں جانتا وہ کون تھا، اس کے والد بلور کون ہیں۔ میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی نہ کبھی آئندہ کبھی ملنے کا امکان ہے۔ شبیر مرحوم سے تو ویسے ہی ناممکن ہے، حاجی بلور سے بھی اس لئے مشکل ہے کہ میں سیاست کا گھوڑا ہوں نہ سیاست کا کھلاڑی۔ مگر اس دن سے جس دن سے یہ خبر پڑھی ہے کہ ایک اور جوان بیٹا سیاست کی بھینٹ چڑھ گیا ہے، مجھے اور نہ جانے کیوں احساس میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ یوں لگتا ہے میں کرچی کرچی ہو گیا ہوں یا میرا کوئی اپنا بہت اپنا قتل ہو گیا ہے، اندھی گولی کا نشانہ بن گیا ہے۔

یہ سیاست کا پرانا چلن ہے۔ کتنے بیٹے کتنے بھائی اور کس کس کے بیٹے اور کس کس کے بھائی اس ایندھن میں جلے ہیں، اس سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ کبھی اپنے اقتدار کو بچانے کے لئے بیٹے نے باپ کو اور کبھی بھائی نے بھائی کو اس آگ میں جھونک دیا۔ کبھی اپنے لیڈر کی سیاست کو چمکانے اور اس کے لئے اقتدار کا دیپ جلانے کے لئے کس کس گمنام نے اپنا لہو دیا ہے، ہمارے کمزور حافظے اس کو بھول جاتے ہیں یا ہم جان بوجھ کر بھلا دیتے ہیں۔ یاد رکھیں گے تو ضمیر چرکے لگاتا رہے گا۔

شبیر بلور اپنے باپ حاجی غلام احمد بلور کا اکلوتا جوان بیٹا تھا۔ وہ چند دن پہلے سرحد میں ضمنی انتخابات کے دوران دوسری سمت سے آتی گولی کا نشانہ بنا اور بے شمار آنکھوں کو آنسو دے گیا۔ یہ سفاک سیاست حاجی بلور کو کیا ساری عمر چین سے بیٹھنے دے گی؟ وہ اپنی اس نشست کو حاصل کرنے کے بعد وزارت، سفارت بھی پالیں تو کیا یہ سب ان کے جوان مرگ بیٹے کا نعم البدل بن سکے گا؟ کیا شبیر کی ماں اور شبیر کی بیوہ جھنڈے والی کار میں بیٹھ کر بلک بلک کر روئیں گی نہیں؟ مگر سیاست میں مارنے والے اور جیتنے والے، ہارنے والے ان باتوں سے بے پرواہ ہوتے ہیں۔ سیاست میں کوئی رشتہ ناتا نہیں ہوتا، سیاست کے سینے میں دھڑکن والا دل نہیں ہوتا۔

عجیب اتفاق ہے جس دن سرحد میں یہ حادثہ ہوا اسی روز لاہور میں مسلم لیگ نواز گروپ کے ایک متوالے کارکن اور میاں شہباز شریف کے جاں نثار کی برسی منائی جا رہی تھی۔ یہ نوجوان بھی پچھلے سال سیاست کی نذر ہو گیا تھا۔ شاہراہ قائداعظم پر کسی اندھی گولی کا نشانہ بن گیا۔ اس روز اس کی عزیز خواتین اور پارٹی کی ورکرز سڑک پر دیئے جلا رہی تھیں۔ یہ روایتی نذرانہ عقیدت ہی نہیں، مگر بے پایاں جذبوں کی علامت تھا۔ ان چراغوں میں کھلتوں کے آنسوؤں اور بے مثال قربانیوں کا خون جل رہا تھا۔

اسی لاہور کی سڑکوں پر اسمبلی کے پیچھے ایک جمہوریت پسند آمریت کا دشمن اور بے باک اور دلیر شخص خواجہ رفیق بھی کسی ایسی ہی بے رحم گولی سے شہید ہو گیا تھا۔ آتی جاتی حکومتوں میں سے کسی نے یہ نہیں سوچا کہ وہاں ایک یادگار بہت بڑی نہ سہی، چھوٹی سی ایک ستون

اور اس پر گلی ایک تختی کے ذریعے قائم کر دی جائے۔ اب تو ان کا بیٹا بھی حکمران سیاست کا حصہ ہے۔ مگر قربانیوں کے ثمر ملنے لگیں تو سیاست کا طور طریق نہ بدل جائے۔

بہت سال پہلے جب ایوب خان کی حکومت کے خلاف عوامی ریلا آیا تھا تو اسی لاہور کی اسی مشہور و معروف سڑک شاہراہ قائد اعظم (مال روڈ) جس کی سڑکوں بیڈن روڈ اور ہال روڈ پر پولیس کی فائرنگ سے دو نوجوان طلبا شہید ہو گئے تھے۔ جذباتی لاہوریوں نے ہال روڈ کے دوسرے کنارے اور بیڈن روڈ کے وسط میں ان کے یادگاری کتبے نصب کر دیے تھے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو اپنے لاہور کے پہلے دورے پر آئے اور اپنے تاریخی جلوس اور ٹرک کے ساتھ مسجد شہداء کے قریب پہنچے تو کسی نے ان کے کان میں کچھ کہا۔ بھٹو مرحوم نے ٹرک اور جلوس رکوا دیا اور اپنے مشہور زمانہ جذباتی انداز میں کہا۔ "جب میری حکومت آئے گی تو ان شہیدوں کی شاندار یادگاریں تعمیر ہوں گی۔"

ان کی اور ان کی نورِنظری حکومتیں آئیں اور آ کر گئیں لیکن کسی نے پلٹ کر ادھر نہیں دیکھا۔ اب ان دونوں سڑکوں کی دیواروں سے وہ دونوں یادگار تختیاں غائب ہو گئی ہیں۔ شروع شروع میں، آج سے پچیس 25 سال پہلے کی بات ہے۔ میں وہاں جا کر موم بتیاں روشن کرتا رہا مگر آس پاس کے دکاندار مجھے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے اور محلے کے بچے یوں ارد گرد اکٹھے ہوتے جیسے میں پاگل ہوں۔ میں سیانا بن گیا اور وہ پاگل پن چھوڑ دیا۔

ہم سب ایسا پاگل پن جلد چھوڑ دیتے ہیں۔ ہم ان بے غرض لوگوں کو بھی بھول گئے ہیں جنہوں نے ضیاء الحق کے جبر کے خلاف خود سوزی کی تھی۔ ہم ان بے لوث لوگوں کو بھی بھول گئے ہیں جو جیلوں میں گل سڑ گئے۔ ہم ان نوجوانوں کو بھی بھول گئے جو کشمی چوک میں کوڑوں کا نشانہ بنے۔ ہم کل تک آنے والے کل تک شمیم بلوچ کو بھی بھول جائیں گے کہ سیاست کو اپنا چہرہ اجلا کرنے کے لئے کسی اور نوجوان کے خون کی ضرورت پڑے گی۔ بس! کچھ اہل دل ہوتے ہیں جو اپنی یادوں میں، اپنے آنسوؤں میں انہیں سموئے رکھتے ہیں یا پھر ان کے اپنے، بہت اپنے ہی باقی رہ جاتے ہیں جو بھاگتے بھاگتے لمحوں میں ان کی یاد میں چراغ جلا دیتے ہیں۔

◆◆◆

معروف تنقید نگار، ادیب، صحافی تنویر ظہور کی خودنوشت

میرا عہد جو میں نے لمحہ لمحہ جیا

شائع ہو گئی ہے　　قیمت-/900 روپے

ناشر: سنگ میل پبلی کیشنز، 25۔ لوئر مال، لاہور (فون نمبر:04237220100)

مضامین

خواجہ محمد زکریا کی شاعری — نقد و نظر

ڈاکٹر انور سدید

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی شاعری کی کتاب ''آشوب'' پر متعدد اہلِ قلم نے تبصرے لکھے تھے۔ اب یہ تبصرے جو دراصل تنقیدی مزاج اور توصیفی تاثرات کے حامل ہیں، محترمہ ڈاکٹر شگفتہ زکریا نے مختلف اخبارات و رسائل سے تلاش کر کے زیرِ نظر کتاب کی صورت میں شائع کر دیے ہیں۔ ڈاکٹر شگفتہ — محترمہ ڈاکٹر خواجہ زکریا صاحب کی بیگم یعنی ''نصف بہتر'' ہیں۔ لاہور میں اہلِ قلم کے چند گھرانے ایسے بھی ہیں جہاں شوہر اور بیگم دونوں ادب تخلیق کر رہے ہیں اور قلم و قرطاس کی اس خدمت میں حسنِ خانہ بھی قائم ہے۔ امتیاز علی تاج اور بیگم حجاب امتیاز، اب اشفاق احمد اور بانو قدسیہ، صابر لودھی اور فرخندہ لودھی، اورنگ زیب نیازی اور نسیم بانو اور ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اور محترمہ ڈاکٹر شگفتہ زکریا — کے گھرانے ذہن پر زور دیے بغیر مجھے یاد آ رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب کی مؤلفہ نے تو ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا صاحب کے لیے اپنے دل میں احترام، عقیدت کے علاوہ محبت کے جذبات کا اعتراف بھی کیا ہے اور آغازِ کلام کے تحت انہوں نے لکھا:

''میں چاہتی تھی کہ اس کتاب (خواجہ محمد زکریا کی شاعری۔ نقد و نظر) کو صاحبِ کتاب کی 75 ویں سالگرہ پر تحفتاً پیش کروں۔''

خواجہ محمد زکریا صاحب کی 75 ویں سالگرہ پر واقعی یہ سب سے حقیقی، گراں قدر، حسین اور معانی سے لبریز تحفہ ہے اور اس تحفے کو الفاظ و مطالب سے آراستہ کرنے کے لیے انہوں نے گلستانِ ادب سے وہ پھول جمع کیے جو ڈاکٹر انور محمود خالد، اقبال فیروز، ڈاکٹر سید شبیہ الحسن، ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر، ڈاکٹر تقدیس زہرہ، علی اصغر عباس، ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان، بریگیڈیئر (ر) حامد سعید اختر، پروفیسر منظور عزمی اور ڈاکٹر امجد پرویز اور متعدد دوسرے ادیبوں نے مضامین میں پھیلا رکھے تھے۔

''آشوب'' ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا کی شاعری کی پہلی کتاب تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعری ان کی پہلی محبت تھی جو محقق کی ''سیر رنگ'' فضا میں پروان چڑھی اور اردو کی تحقیقی فضا میں پس منظر میں چلی گئی۔ تاہم خوبی کی بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے اپنی شاعری کی محبت کو زندہ رکھا اور جب بھی آمد کا لمحہ وارد ہوتا وہ اسے ضائع نہ ہونے دیتے۔ چنانچہ اورینٹل کالج لاہور سے ریٹائرمنٹ کے بعد ان کی کتاب ''آشوب'' چھپی تو اس پر حیرت کا اظہار نہیں کیا گیا۔ ظفر اقبال جیسے شاعر نے جو صرف اپنی ذات کی عظمت میں مبتلا ہیں کہا کہ ''ان (خواجہ محمد زکریا) کے کلام میں تازگی بھی ہے اور تازگی بھی۔ معاشرے پر گہری تنقیدی نظر رکھتے ہیں اور بات کو بے تکلف ادا کرنے کا فن انہیں خوب آتا ہے'' — ظفر اقبال نے ان کے چند اشعار بھی اقتباس کیے ہیں۔ ایک منتخب شعر یہ ہے:

سوچا تھا جوانی میں آپا کو بدل دیں گے　　دنیا نے ہمیں لیکن چپ چاپ بدل ڈالا

یہ کتاب اس وقت شائع کی گئی ہے جب خواجہ محمد زکریا اپنی عمر عزیز کا رومانی دور گزار چکے ہیں اور اب جا وہ ان قدروں کے زوال کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ اس پر آشوب دور کا پورا تاثر ان کے کلام میں در آیا ہے۔ چنانچہ محترمہ شگفتہ زکریا کے گلدستے میں کانٹے بھی شامل ہیں لیکن یہ کانٹے ہمارے حکمرانوں نے ہمیں عطا کیے ہیں اور ان کی چبھن بھی ہمیں محسوس ہوتی ہے اور یہ گلدستہ نمائشی پھولوں کا گلدستہ نہیں بلکہ یہ دھرتی کے حقیقی حالات کا عکاس ہے اور قوم نے جو صورت بلا ارادہ اختیار کر رکھی ہے وہ بھی عیاں کرتا ہے۔

خوشامد اور سازش سے ترقی بے خطر کیجے — صداقت اور دیانت چھوڑیے قصے پرانے ہیں

سب اپنے اپنے فن میں ہیں بے مثل و بے نظیر — کوئی شریف ہو کہ مشرف، ہیں لاجواب

ہم نے دنیا کی کبھی پروا نہ کی — جو بھی اپنے جی میں آئی کر چلے

دفتروں کے سب عامل اپنے فن میں ہیں کامل — پیچ ڈال دیتے ہیں کام جتنا آساں ہو

مجموعی طور پر اس کتاب میں ڈاکٹر خواجہ زکریا کی کتاب ''آشوب'' پر ملک کے ممتاز اور نامور ادیبوں کے مضامین جمع کر کے ہمیں احساس دلایا ہے کہ ہمیں اپنی بداعمالیوں اور بڑے حالات کی خود خبر لینی چاہیے اور اگر تبدیلی نہ کی تو ہماری داستاں بھی نہ ہوگی داستانوں میں۔۔۔ تنقیدی تبصرہ کی یہ کتاب ایک واضح پیغام کی حامل ہے۔ سرورق پر خواجہ محمد زکریا کی تصویر ہے جس کا زیر خند معنی خیز ہے۔ کتاب طباعت اور جلد بندی خوبصورت ہے۔ ضخامت 272 صفحات۔ قیمت -/400 روپے۔ ملنے کا پتہ: سنگت پبلشرز، 25۔ سی لوئر مال، لاہور۔

◆◆◆

کچھ آپ کا بھی ادبی فرض ہے

بعض محترم حضرات اپنی تحریر کے الفاظ پر نقطے نہیں ڈالتے۔ کچھ تحریروں میں الفاظ نامکمل ہوتے ہیں۔ بعض الفاظ اور جملے اتنے شکستہ اور ٹوٹے ہوتے ہیں کہ انہیں پڑھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ تمام تحریر ہو سکے تو کمپوز کرا کر بذریعہ ڈاک بھیجئے اس سے تحریر میں غلطیوں کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی تحریر بھی انٹرنیٹ، واٹس ایپ یا ای میل سے وصول نہیں کی جائے گی۔ یہ ادارے کی پالیسی پچھلے 48 سال سے ہے۔ اس کی وصولی پر ادارے پر بوجھ ڈالا جاتا ہے۔ صرف پوسٹ کے ذریعے بھیجا اصل مسودہ ہی قابل قبول ہوگا۔ ادارہ کسی بھی تحریر کو شامل کرنے یا نہ شامل کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔ اس سلسلے میں ادارہ بتانے کا پابند نہیں کہ تحریر کن وجوہات کی بنیاد پر پینل کے معیار پر پوری نہیں اتر سکی۔ پینل کا فیصلہ حتمی ہے اور ''تخلیق'' کا تمام ادبی مشن پرچے کی روایات اور پالیسی کے دائرہ اختیار میں رہ کر اپنا کام سرانجام دے رہا ہے۔ پینل کی ادبی خدمات اور قابلیت پر کسی کو شک نہیں۔ ان شاء اللہ آپ کے تعاون سے ''تخلیق'' اب اپنی پچھلی سی اعلیٰ منزلوں کو چھو رہا ہے۔

سوچ کی کوکھ بانجھ ہو رہی ہے

محمود شام

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر ہنستا تو ہوگا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

عبدالحمید عدم کا یہ شعر برسوں سے ہم محفلوں میں پڑھتے آ رہے ہیں۔ انسان کے ہاتھوں انسانی قدروں کی شکست و ریخت پر اس سے بہتر کوئی طنز نہیں ہوگا۔ اس پر کبھی کسی حلقے سے اعتراض نہیں کیا گیا۔ لیکن ابھی 2017 میں دو تین ماہ قبل کئی شہروں سے شائع ہونے والے ایک روزنامے میں اپنے ہفتہ واری کالم میں اسے میں نے نقل کیا۔ اور اس حوالے سے آج کے پاکستانی معاشرے میں انحطاط اور بے حسی پر تبصرہ کیا۔ تو مجھے ملک کے دو تین شہروں سے بعض علمائے دین کے فون آئے کہ آپ اللہ سے توبہ کریں۔ کیونکہ اس میں خالق کائنات کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ میں نے انہیں شعر کا پس منظر سمجھانے کی کوشش کی۔ اور کہا کہ غالب، اقبال، فیض اور دوسرے بہت سے شعرا اپنی بات اس انداز میں کرتے رہے ہیں۔ اس میں طنز خالق پر نہیں ہے۔ مخلوق پر ہے۔

اس ردعمل نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اکیسویں صدی میں علم فہمی اور ادب شناسی میں پاکستانی معاشرہ آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے جا رہا ہے۔ لوگ شعر و سخن، ادب و علم۔ فن و ہنر سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ مزاج سخن نہ رہا ہے نہ حس مزاح۔ شعر کا ذوق اور مطالعہ کا اشتیاق ہی کسی تہذیب کا اثاثہ ہوتے ہیں۔ پہلے ہم اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں رہے اس کا تعین نہ ہو سکا اب ہم اپنی ذات کھو دینے کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔ ہر طرف اتنا شور و غل ہے۔ اتنا گرد و غبار ہے کہ ہم خود کو محسوس نہیں کر پا رہے ہیں۔ جب فرد اپنی ذات کا احساس نہ کر پائے۔ اپنے آپ پر اعتماد کھو دے تو پورے معاشرے کی حالت ایک ایسے بحری جہاز کی ہوتی ہے۔ جس کے کپتان کی گرفت کمزور ہو رہی ہوتی ہے۔ اور وہ لہروں کے رحم و کرم پر چل رہا ہوتا ہے۔ یا ایسے ہوائی جہاز کی جس کا ایک انجن کام کرنا بند کر دیتا ہے۔ شور و غل مچانے اور دھول اڑانے میں سب سے زیادہ حصہ برقی میڈیا کا ہے۔ پرائیویٹ ٹی وی چینل شتر بے مہار کی طرح یا ان گھوڑے کی طرح بدمست ہیں۔ جو اپنے سوار کو کہیں راستے میں گرا کر بگٹٹ بھاگ رہا ہو۔ شام سات بجے سے رات کے بارہ ایک بجے تک ہر گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے۔ ہر چینل پر ایک اینکر پرسن اور دو تین تجزیہ کار سرگرم بحث ہوتے ہیں۔ انہیں ٹاک شوز کہا جاتا ہے۔ مذاکرہ یا مکالمہ یا تبادلۂ خیال نہیں۔ اس کی کوئی ابتدا یا انتہا نہیں ہوتی۔ نہ اس کا کوئی نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے لیے کسی منصوبہ بندی یا پروگرام سے پہلے کوئی سوچ بچار نہیں کی جاتی۔ ہر پروگرام میں نام کے ریسرچر (محقق) ہوتے ہیں۔ مگر وہ صرف انٹرنیٹ کو اپنی معلومات کا سرچشمہ سمجھتے ہیں۔ بہت کم چینلوں کی اپنی لائبریری ہوتی ہے یا کتابوں سے استفادہ کیا جاتا ہے۔

معاشرے کی ایک بڑی تعداد کے ذہن ان ٹاک شوز سے تعمیر پا رہے ہیں۔ یہاں کبھی کسی فلسفی، ناول نگار، افسانہ نویس، شاعر یا نقاد کا حوالہ نہیں دیا جاتا۔ اس لیے پاکستانی ذہنوں کی ادبی آبیاری بالکل نہیں ہو رہی ہے۔ کسی پروگرام میں کسی مفکر، دانشور، ادیب یا محقق کو نہیں بلایا جاتا۔ کیونکہ یہ سب اٹکتے لہجے میں بولتے ہیں۔ یہاں مائک سے چیخنے چلانے والوں کی۔ حسرت ہی رہتی ہے کبھی کوئی محمد حسن عسکری کا

نام لے۔ ممتاز حسین کا۔ عزیز احمد کا۔ عبداللہ حسین کا۔ احمد ندیم قاسمی۔ وزیر آغا۔ انور سدید کا۔ کیا ان ہستیوں کی ریاضتیں ہمارے لیے نہیں تھیں ان میں سے کوئی انجمن ترقی پسند مصنفین کا ذکر کرے یا حلقہ ارباب ذوق کا۔

پاکستان اب جن علاقوں پر مشتمل ہے۔ یہاں کی روایت صدیوں سے جذباتیت کی ہے۔ زیادہ تر قبائلی معاشرت ہے۔ قبیلے جذباتی مزاج کے حامل ہوتے ہیں۔ کسی آئینی ضابطوں کے پابند نہیں ہوتے ہیں۔ اس خطے کی جذباتی افتادِ طبع سے بادشاہ فائدہ اٹھاتے رہے۔ پھر انگریز نے اس کو اپنا ہتھیار بنایا۔ قیام پاکستان کے بعد سیاستدانوں نے اور مذہبی لیڈروں نے اس جذباتیت کو خوب ہوا دی۔ جذبات جھاگ کی طرح ہوتے ہیں۔ چند لمحوں بعد بیٹھ جاتے ہیں۔ استحصالی قوتوں کے لیے یہی عنصر سب سے موزوں رہتا ہے۔ اس میں شے کی حقیقت کو سمجھنے کا رواج ختم ہو جاتا ہے۔ تحقیق تو دور کی بات ہے۔ مطالعہ بھی بے سود خیال کیا جاتا ہے۔

گفتگو یا تحریر کے لیے پہلے ہر کسی کا ذخیرہ الفاظ کتابوں کے مطالعے سے تشکیل پاتا تھا۔ دیوان غالب۔ کلیات اقبال۔ مولانا مودودی کی تصنیفات۔ سید سبط حسن کی کتابیں۔ احمد ندیم قاسمی کے افسانوں یا پھر فلمی مکالموں سے منتخب الفاظ ہمارے ذہن میں لغت کی طرح مرتب ہوتے رہتے تھے۔ اب فلمیں بھی نہیں بن رہیں۔ شاعری پہلے فلمی گلوکاروں۔ یا قوال گائیکوں کے ذریعے کانوں میں اترتی تھی اب گلوکار خود ہی اپنے گیت لکھتے ہیں جو محض تک بندی ہوتے ہیں۔ کتاب۔ جرائد اشیائے متروک بنتی جاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ افراد اپنے ماضی سے کٹ جاتے ہیں۔ جڑوں کی آبیاری کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہم اسی کیفیت سے دوچار ہیں۔ یہ شور جو ہم سب کے گرد چھایا جا رہا ہے۔ جس میں ہم سب گم ہو رہے ہیں۔ اس کی مزاحمت کرنے والے جو چند ایک ہیں۔ جن میں افسانہ نویس، ناول نگار، انشائیہ والے شاعر نمایاں ہیں۔ یا بعض اساتذہ ہوں گے۔ لیکن ان کی آواز کو محدود کیا جاتا ہے۔ انہیں بڑے پلیٹ فارموں پر اظہار کا موقع نہیں دیا جاتا۔ کیونکہ وہ عقل و خرد کی بات کرتے ہیں۔ بعض اعلیٰ حلقوں میں تو اعلیٰ عہدوں پر تقرری کا معیار یہی ہے کہ وہ معتبر ترین درکار ہیں جو اپنی عقل استعمال نہ کرتے ہوں۔ ایسے شور و غل سے فکر۔ فلسفہ ادب تنقید۔ تدریس اور تحقیق سب سے زیادہ زخم زخم ہوتے ہیں۔ بلکہ کہیں کہیں دم بھی توڑ دیتے ہیں۔ اس کا ایک واضح نقصان ہو رہا ہے کہ اب اردو یا دوسری قومی زبانوں پنجابی۔ سندھی۔ پشتو۔ بلوچی۔ سرائیکی۔ کشمیری ادب میں نقاد سامنے نہیں آ رہے ہیں۔ نقاد ہی ادب کا معیار جانچنے کا ایک معتبر ذریعہ ہوتے تھے۔ معیاری تنقید عنقا ہو گئی ہے۔

تہذیبوں اور تمدنوں میں صدیوں کا جو تسلسل ہوتا ہے۔ وہ بھی باقی نہیں رہتا۔ ادب سے وابستہ احباب تو اپنا رشتہ متقدمین سے جوڑے رکھتے ہیں۔ ولی دکنی۔ میر تقی میر۔ ذوق۔ غالب۔ داغ۔ اقبال۔ فیض اور نثر میں ڈپٹی نذیر احمد۔ ملا واحدی۔ پریم چند۔ کرشن چندر۔ منٹو۔ عصمت چغتائی۔ ہاجرہ مسرور۔ خدیجہ مستور۔ کنہیا لال کپور۔ فکر تونسوی۔ سب کا مطالعہ کیا جاتا ہے اس لیے ہماری ادبی روایت اب بھی تابناک ہے۔ توانا ہے مگر اظہار کے جو جدید ترین ابلاغیات وسائل ہیں۔ ٹی وی چینل۔ روزنامے۔ یونیورسٹیاں۔ مساجد۔ وہاں ادب کا داخلہ ممنوع ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے یہاں کوئی سمت نہیں نظر آتی۔ وژن نہیں ہے اور آج کل کی اصطلاح میں کوئی روڈ میپ نہیں ہے۔ میڈیا میں ان دنوں جو افراد نمایاں ہیں۔ اور جو رجحانات عام ہیں۔ ان کا ماضی کے ایڈیٹروں۔ صحافیوں اور کالم نویسوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کے لیے مولانا ظفر علی خان۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا محمد علی جوہر۔ شورش کاشمیری۔ حمید نظامی۔ ایم اے جلیس۔ شوکت تھانوی۔ شوکت صدیقی۔ احسان بی اے۔ انتظار حسین۔ مظہر علی خان۔ صفدر میر۔ امر جلیل۔ جمیل الدین عالی۔ پطرس بخاری۔ نصر اللہ خان۔ پیر حسام الدین راشدی۔ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ حالانکہ 1950۔ 1960۔ 1970۔ 1980 کے عشروں میں معاشرے کی ذہن سازی یہی کر رہے تھے۔

میڈیا سے ادبی پروگرام بالکل ختم کر دیے گئے ہیں۔ قوم کو یہ معلوم ہی نہیں ہونے دیا جاتا کہ اردو، پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی، براہوئی، کشمیری، ہندکو، پوٹھوہاری یا سرائیکی میں کوئی نیا ناول لکھا جا رہا ہے۔ کوئی نئی نظم صورتِ حال کی عکاسی کر رہی ہے۔ یا دلوں کو گرما رہی ہے۔ مشاعرے ہوتے ہیں لیکن ان کو براہِ راست نشر نہیں کیا جاتا ہے۔ ادیبوں شاعروں کے انٹرویو نہیں دکھائے جاتے۔ اخباروں میں ادبی صفحات شامل کیے جاتے ہیں مگر وہاں بھی تقابلی طرز غالب ہے، اپنے اپنے حلقے کی سرپرستی کی جا رہی ہے۔ میں کہنا یہ چاہ رہا ہوں کہ ایک جذباتی قوم کو تحقیق اور تعلیم کی طرف لے جانے کی بجائے اس کی جذباتیت کو مزید اچھالا جاتا ہے۔ پرائیویٹ یونیورسٹیوں میں بھی ادب اور فنونِ لطیفہ کا داخلہ بند ہے۔ سارا زور بزنس ایجوکیشن (کاروباری تعلیم) پر ہے۔ زبانیں، ادب، سوشل سائنسز صرف بدحال سرکاری یونیورسٹیوں تک محدود ہیں۔ یونیورسٹیوں، کالجوں میں اپنے میگزین سال میں ایک یا دو بار اشاعت کا سلسلہ برسوں سے جاری رہا ہے۔ مستقبل کے ادیب، شاعر، نقاد یہیں سے ظہور پاتے تھے۔ اب کئی برس سے ایک سناٹا ہے۔ ان مناظر اور مظاہر کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے میں شعر فہمی، ادب شناسی اور فنونِ لطیفہ سے علاقہ کمزور پڑ رہا ہے۔ وسیع النظری فرداً فرداً متاثر ہو رہی ہے۔ تحمل اور برداشت کی روایات ناپید ہو رہی ہیں۔ مذہبی شدت پسندی، مسلکی جذباتیت کا غلبہ ہے۔ سوشل میڈیا پر بھی یہی نمائش ہو رہی ہے۔

اہلِ زر اور سرکار کی طرف سے شعر و ادب کی سرپرستی کی اقدار بھی دم توڑ رہی ہیں۔ ٹی وی چینلوں پر عالمی صنعت کاروں اور کثیر القومی کمپنیوں کی طرف سے بے مقصد پروگراموں میں تو لاکھوں کروڑوں روپے کا تعاون کیا جاتا ہے۔ لیکن ادبی رسائل۔ سنجیدہ جرائد کو ہزاروں روپے کے اشتہار دینے میں بھی تامل ہوتا ہے۔ یعنی یہ صحافتی اور کاروباری حلقے بھی دل سے یہ چاہتے ہیں کہ شور و غل برپا رہے۔ قوم جذباتیت کے گرد و غبار میں گم رہے۔ فرد اپنی ذات سے بے خبر رہے۔ سوچنے والے، تخلیقی صلاحیتوں کے مالک افراد، شعر و ادب کی روایت کو تسلسل دینے والے ہمت ہارتے رہیں۔ ہر فرد اپنی جگہ مکمل ہوگا۔ اپنی صلاحیتوں اور اہلیت پر اعتماد کر رہا ہوگا، تو معاشرہ بھی اپنے آپ پر بھروسہ کر سکے گا۔ فرد اور اس کی ذات کچلی جا رہی ہے۔ کہیں مذہب کے نام پر، کہیں جاگیرداری کہیں ٹیکنالوجی کہیں عسکریت کے دباؤ میں۔ جو ذرّہ جس جگہ ہے وہیں آفتاب ہے۔ آفتاب غروب ہو چکے ہیں۔ ذرّے سڑ رہے ہیں۔ لکھنے اور سوچنے کے رجحان کی شعوری طور پر حوصلہ شکنی کی جا رہی ہے۔ حرف و معانی کی گود خالی ہو رہی ہے۔ سوچ کی کوکھ بانجھ ہو رہی ہے۔ ایسے میں تخلیق اور دوسرے ادبی رسائل کا دم غنیمت ہے۔ جہاں شعر اور نثر کی تخلیق بھی ہو رہی ہے اور لکھے بھی جا رہے ہیں۔ اس طرح فرد اپنی شناخت بحال بھی کر لیتا ہے۔

اندھیری شب ہے جدا اپنے قافلے سے ہے تو   ترے لیے ہے مرا شعلۂ نوا قندیل

◆◆◆

ضروری بات قارئین کیلئے

ماہنامہ "تخلیق" جنوری 2016ء سے اپنا دفتر چند ناگزیر وجوہات کی وجہ سے تبدیل کر چکا ہے۔ "تخلیق" اپنے کرم فرماؤں سے گزارش کرتا ہے کہ اس کا نیا پتہ اپنے احباب تک پہنچا دیں جو مندرجہ ذیل ہے:

مکان نمبر E/12، شیراز ولاز، فیز-1، اسلام نگر، والٹن روڈ، لاہور کینٹ (فون: 03218899007)

تحدیثِ نعمت [خودنوشت]

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی

...... 1 ......

محمد حامد سراج

زندگی کا آغاز اور تعلیم

سب سے پہلے خدا کو گواہ بنا کر قسم شرعی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اگرچہ اپنی ظاہری زندگی کے لحاظ سے میں دینداروں میں سمجھا جاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نماز روزہ جیسے فرائض کی ادائیگی اور معصیات سے اجتناب کا ایک گونہ اہتمام بھی نصیب ہے، لیکن ارشاد خداوندی بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ (انسان اپنے کو خود ہی خوب جانتا ہے) کے مطابق سچی بات یہ ہے کہ میرے اندر ایسے رذائل اور اللہ تعالیٰ کے اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی میں اتنی بڑی بڑی کوتاہیاں ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کی پاداش میں اس دنیا میں پینے کے پانی سے بھی محروم کر دے یا العیاذ باللہ خسف یا مسخ کا فیصلہ فرما دے تو عدل و انصاف کے خلاف نہ ہوگا، لیکن وہ رب کریم ابتدائے زندگی سے آج تک الطافات و احسانات کی بارش فرما رہا ہے اور اب تک کے قریباً ستر سالہ تجربہ کی بنا پر امید کا پورا حق ہے کہ ان شاء اللہ زندگی کے باقی دنوں میں اور اس کے آگے کی منزلوں میں بھی اس کا یہی لطف و کرم رہے گا۔ اَللّٰهُمَّ صَدِّقْ ظَنِّیْ بِكَ وَحَقِّقْنِیْ!

ایک خوشحال دیندار مسلمان گھرانے میں پیدائش

اس کے بعد میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے جس احسان عظیم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس نے مجھے ایک ایسے گھرانے میں پیدا فرما دیا، جس میں دنیوی معیشت کے لحاظ سے خوشحالی کے ساتھ اس کی توفیق سے دینداری اور طہارت بھی تھی۔ میرے والد ماجد (صوفی احمد حسین صاحب مرحوم) ایک متوسط درجے کے دولتمند تھے۔ زمینداری بھی اچھی خاصی تھی اور تجارتی کاروبار بھی خاصا وسیع تھا۔ اور اس میں اچھے کامیاب تھے۔ اس کے ساتھ ان کی آخرت کی فکر دنیا کی فکر پر غالب تھی۔ اور وہ کاروبار میں پوری مشغولی کے ساتھ "اَلذّٰکِرِیْنَ اللّٰهَ کَثِیْرًا" (اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے بندوں) میں سے تھے۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ میری دنیوی تعلیم کے خاص امکانات بلکہ بعض غیر معمولی قسم کی ترغیبات کے باوجود انہوں نے مجھے دینی تعلیم دلانے اور دین کا خادم بنانے کا فیصلہ فرمایا۔ ان غیر معمولی ترغیبات کی نوعیت بھی قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے ضلع مراد آباد کے اس وقت کے انگریز کلکٹر نے جو کسی خوش گمانی کی وجہ سے

میرے والد ماجد کا بہت قدر شناس تھا۔ ایک ملاقات میں والد صاحب سے ان کی اولاد کے بارے میں پوچھا۔ والد ماجد نے بتایا کہ خدا کے دیے ہوئے میرے پانچ لڑکے ہیں اور دو لڑکیاں۔ اس نے تعلیم کے بارے میں دریافت کیا تو اسے یہ معلوم کر کے حیرت ہوئی کہ ان لڑکوں میں سے کسی ایک نے بھی انگریزی تعلیم حاصل نہ کی ہے اور نہ کوئی کر رہا ہے۔ اس وقت (تقریباً 1915ء) میری عمر اور تعلیم کی منزل ایسی تھی کہ میرے ہی بارے میں اس طرح کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ میں پانچ بھائیوں میں تیسرے نمبر پر یعنی درمیان میں تھا۔ کوئی بارہ سال عمر تھی اور اب تک عربی فارسی کی تعلیم کے نام پر صرف وقت ضائع ہو رہا تھا۔ اس لیے کہ میں بے دلی سے پڑھتا تھا۔ ہر سال میری وہی کتابیں (میزان منشعب) نئے سرے سے شروع ہوتی تھیں۔ اور یہ محسوس کر کے کہ پڑھائی ٹھیک نہیں ہو رہی، والد صاحب اگلے سال میں مدرسہ بھی بدل دیتے تھے۔ اس لیے کہ ہمارے سنبھل میں اس وقت عربی کے تین مدرسے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ یہ چکر برسوں تک چلتا رہا۔ اور ہر سال میری تعلیم ابتدائی کتابوں کے پہلے سبق "اعلم اسعدك الله في الدارين" سے شروع ہوتی تھی۔

۱۔ مختلف اوقات میں جو اذکار ان کے مستقل معمولات میں داخل تھے، ان کی مجموعی تعداد تین ہزار کے قریب تھی۔ ایک زمانہ میں رات کو بعد نماز عشاء کھڑے ہو کر چار ہزار بار درود شریف کا معمول تھا۔ تہجد کے ایسے پابند تھے کہ میں نے ان کے انتقال کے بعد والدہ ماجدہ مرحومہ سے پوچھا کہ کیا ابا جی کا تہجد قضا ہونا آپ کے علم میں ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ جب میں شروع میں آئی تھی تو کبھی تہجد قضا ہو جاتی تھی، لیکن اس دن لازماً روزہ رکھتے تھے۔ مگر 34 سال سے تاحال کبھی قضا نہیں ہوئی۔ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے ماہ رمضان 68ھ کو ایسے حال میں انتقال فرمایا کہ ہاتھ میں تسبیح تھی اور ذکر جاری تھا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

۱۔ (از مرتب) ان کلکٹر صاحب کا نام مسٹر ڈبلیو۔ بے ای لیٹمن تھا۔ ضلع مرادآباد کی مشہور شخصیت سر رضا علی (م 1949ء) نے اپنی سوانح حیات "اعمال نامہ" میں ان صاحب کی خصوصیات میں لکھا ہے کہ "ہندوستانیوں سے خوشگوار تعلقات رکھنا اور باثر ہندوستانیوں کی عزت کرنا اپنا فرض اور سلطنت کی خیر خواہی سمجھتے تھے۔" (ص 304)

کلکٹر صاحب کی ترغیب اور والد کا فیصلہ

الغرض یہ میری عمر اور میری تعلیم کی منزل تھی۔ اس لیے کلکٹر نے بھی میرے ہی بارے میں خاص طور سے اصرار سے کہا کہ کل ہی سے اس بچے کو مقامی ہائی اسکول میں بھیج دیا جائے اور ساتھ ہی کہا کہ میں ہیڈ ماسٹر سے کہہ دوں گا کہ وہ پانچ سال میں اس کو انٹرنس کرا دے۔ اور پھر میں اس کو نائب تحصیلداری دے دوں گا۔ اس زمانہ میں نائب تحصیلداری بڑی چیز تھی۔ اس کے بعد ترقی کر کے آدمی تحصیلدار ہو جاتا تھا، اور پھر ڈپٹی کلکٹر۔ بس یہی ہندوستانیوں کی معراج تھی۔ اس سے آگے کلکٹر اور کمشنر تو انگریز ہی ہوتے تھے۔ لیکن اللہ میرے والد مرحوم کو بہتر سے بہتر جزا دے۔ انہوں نے اس درجے کی دنیاوی ترغیب کو ذرا بھی قابل توجہ نہ جانا۔ گھر آ کر یہ قصہ سنایا تو ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ ان کا کوئی ارادہ کلکٹر کے اس پُراصرار مشورے کو قبول کرنے کا نہیں ہے۔ ان کے بعض ملنے والوں کی اور گھر کے بھی بعض لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ چنانچہ ان کو راضی کرنے کی کوشش بھی کی گئی، مگر وہ کسی طرح اس بات پر راضی نہ ہوئے۔ ان کا آخری جواب یہ تھا کہ میں ان بچوں کو دینی تعلیم دلانے کی کوشش کروں گا، جس سے مجھے قبر میں اور اس کے بعد کچھ ملتا رہے۔ والد ماجد کا یہ

فیصلہ اس وقت کی اوائل کی عمر میں تو بے حد رنج و ملال کا باعث ہوا تھا مگر آج اس کی قدر کا بیان کرنے کے لیے کوئی بھی الفاظ کافی نہیں ہے۔ ان کا یہ فیصلہ ان پر تو اللہ کا بڑا انعام تھا ہی اس عاجز کے حق میں یہ اللہ کی بڑی عظیم نعمت تھی کہ انہوں نے مجھے دین کا خادم بنانے کا فیصلہ کرلیا۔

والد ماجد ہی کے اس حسن نیت کی برکت کہنا چاہیے کہ پڑھنے کے بارے میں میری بدشوقی کا مرحلہ بھی دیر سویر طے ہو ہی گیا۔ اور میں ایک اچھے محنتی طالب علم کی طرح پڑھنے لگا۔

1338ھ کی بات ہے۔ جبکہ میری عمر پندرہ سال ہوگئی تھی۔ والد صاحب کو معلوم ہوا کہ شہر کے فلاں مدرسے میں ایک نئے پنجابی استاد آئے ہیں اور وہ بہت توجہ سے پڑھاتے ہیں۔ والد صاحب نے مجھے ان کے پاس بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ یہ مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے۔ اللہ ان کو بہترین جزا دے کہ ان کی بدولت میری گاڑی اب پہلے ان سے پٹڑی پر پڑ گئی۔ اور بدشوقی و بے دلی دور ہوگئی۔ ذہن اور حافظہ بھی اللہ تعالیٰ نے بہت اچھا دیا تھا۔ اس لیے طالب علمی کے سفر کا بہت بڑا حصہ تیزی سے طے کرلیا۔ اس زمانے میں ہمارے دینی مدارس میں قدیم منطق، فلسفے اور کلام کا بڑا زور تھا۔ میں نے اس وقت ان فنون کو بھی ذوق و محنت سے پڑھا۔ بعض وہ کتابیں بھی ان فنون کی پڑھیں جو کہیں بھی مدارس میں پوری بھی پڑھائی نہیں جاتی تھیں اور اب پورے یقین و بصیرت کے ساتھ یہ رائے ہے کہ ان فنون پر زیادہ وقت صرف کرنا بالکل فضول اور وقت کی صرف اضاعت ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

بہرحال میری طالب علمی کا سفر اب بہت ہی تیزی سے طے ہو رہا تھا اس منزل پر آ گیا کہ توفیق الٰہی سے 1343ھ میں علوم دین، فقہ اور حدیث و تفسیر کی آخری اور تکمیلی تعلیم کے لیے مجھے دارالعلوم دیوبند جانا نصیب ہوگیا، جو ہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام میں اس وقت ان علوم کی تدریس و تعلیم کا عظیم ترین مرکز تھا۔ اور جہاں ان علوم کے وہ ماہر اساتذہ جمع تھے جو اپنے فن میں امتیاز و کمال رکھتے تھے اور ساتھ ہی صلاح و تقویٰ میں اسلاف کا نمونہ تھے اور یہ اللہ کا میرے اوپر بہت ہی خصوصی انعام و احسان تھا، ورنہ میرے والد ماجد جس تصوف کی لائن سے تعلق رکھنے کی وجہ سے صوفی کہلاتے تھے اور جن صوفیوں کی صحبت سے وہ متاثر ہوئے تھے وہ اگرچہ بظاہر مخلص مگر غالی عقیدوں کے لوگ تھے، اس لیے علمائے دیوبند سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ بُعد تھا۔ مگر نہ معلوم کیسے اللہ نے میرے والد ماجد کے دل میں یہ بات ڈال دی تھی کہ حدیث شریف دیوبند والے ہی اچھی پڑھاتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے مجھے دیوبند جانے کی اجازت دینے میں کوئی تامل نہ کیا۔

اس داخلے کے برکات میرے والد ماجد پر

یہ داخلہ میرے لیے تو باب رحمت کا داخلہ تھا ہی، میرے والد ماجد کے لیے بھی، اس کے ذریعے اہل حق سے عقیدت و تعلق اور اصلاح عقائد کا راستہ کھل گیا اور اس راستہ کھلنے کا بھی ایک قابل ذکر واقعہ ہے۔

وہ مکان جس میں حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام تھا اور اب حضرت کے گھر کے لوگوں کا قیام ہے، ہمارے زمانۂ طالب علمی میں اس میں مطبخ قاسمی اور کتب خانہ قاسمی تھا، جن بیچارے طالب علموں کو مدرسہ میں حجرہ نہیں مل سکتا تھا ان کو اس کے ایک خستہ سے کمرے میں رہنے کی اجازت دے دی جاتی تھی، میں انہی بیچارے طالب علموں میں سے ایک تھا۔ دونوں سال میرا قیام اسی میں رہا۔ پہلے

سال ربیع الاول کا مہینہ تھا۔ خوب یاد ہے چودھویں تاریخ تھی اور اتفاق سے جمعہ کا دن تھا۔ عشاء کی جماعت کا قرب تھا۔ میں اسی مطبخ قاسمی میں بیٹھا وضو کر رہا تھا کہ اچانک والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ مطبخ قاسمی کا پتہ پوچھتے ہوئے تشریف لے آئے۔ پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی بلکہ وہم و گمان بھی نہ تھا۔ لیکن میرا ذہن منتقل ہوا کہ یہ ربیع الاول کا مہینہ ہے۔ ان ہی تاریخوں میں پیران کلیر کا عرس ہوتا ہے۔ یہ وہاں عرس میں تشریف لائے ہوں گے۔ ان کی پیران کلیر میں عرس میں حاضری کبھی قضا نہیں ہوتی تھی اپنا پتہ دریافت کرنے پر یہی بتایا کہ میں کلیر شریف عرس میں آیا ہوا تھا۔ خیال ہوا کہ دیوبند قریب ہی ہے اس لیے وہاں سے فارغ ہو کر آ گیا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ عشاء کی جماعت کا وقت ہو چکا ہے۔ وہ باوضو تھے ہم لوگوں کے ساتھ فوراً ہی مسجد تشریف لے آئے۔ اس زمانہ میں حوض وہاں تھا جہاں اس وقت مسجد کے فرش کا آخری حصہ ہے۔ اور چونکہ مسجد میں تنگی ہوتی تھی اس لیے حوض کو لکڑی کے تختوں سے پاٹ دیا گیا تھا۔ اس پر بھی کئی صفیں ہوتی تھیں۔ ہم لوگ ایسے وقت مسجد میں داخل ہوئے کہ نماز شروع ہو چکی تھی۔ ہمیں آخری صفوں میں حوض پر جگہ ملی۔ چودھویں رات کی چاندنی کھلی ہوئی تھی اور جمعہ کا دن ہونے کی وجہ سے عام طور سے تمام طلبہ صاف سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جب رکوع یا سجدہ کا وقت ہوتا تو ہم لوگوں کو جو حوض کے اوپر بلندی پر کھڑے تھے ایسا معلوم ہوتا جیسے آسمان سے اترتے ہوئے فرشتوں کی صفیں ہیں۔ مجھے خوب یاد ہے بڑا ہی نورانی منظر تھا۔ میں والد صاحب کے بالکل برابر میں کھڑا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ والد صاحب پر اس منظر کا کچھ خاص اثر پڑ رہا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کر ہم لوگ اپنی قیام گاہ یعنی مطبخ قاسمی میں آ گئے۔ والد صاحب کی باتوں سے میرے اس احساس کی تصدیق ہوگئی کہ وہ دارالعلوم کی نماز کے اس منظر سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

صبح کو فجر کی نماز کے بعد حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کا اسی مسجد میں قرآن مجید کا درس ہوتا تھا۔ وہ اگرچہ دارالعلوم کے بڑے اساتذہ میں سے نہیں تھے عمر بھی کم تھی، لیکن اپنی صلاحیت اور قابلیت کی وجہ سے ممتاز سمجھے جاتے تھے اور طلبہ میں مقبول اور محبوب تھے۔ اس زمانہ میں ترجمہ قرآن دارالعلوم کے نصاب میں داخل نہیں تھا۔ مولانا کا یہ درس گویا پرائیویٹ اور ان کے ذاتی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا۔ بڑی وسیع نظر تھی اور خوب بولتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ درس قرآن کا حق ادا کرتے تھے۔ طلبہ کی بہت بڑی تعداد پابندی سے شرکت کرتی تھی۔ بڑا علمی نفع ہوتا تھا۔ میں نے موقع نکال کر مولانا کے کان میں اس دن عرض کر دیا کہ میرے والد صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں، وہ عرس اور قوالی کے دلدادگان میں سے ہیں۔ ان کے عقائد و خیالات اس طرح کے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کے بارے میں انہیں سخت بدگمانیاں ہیں اور ناواقفی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان دیوبند والوں کو تصوف اور بزرگان دین سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا مقصد یہ تھا کہ آج کے درس میں اس کا لحاظ فرما لیا جائے۔ حسن اتفاق سے اس دن سورۂ یوسف کا وہ مقام زیر درس تھا، جہاں یہ ذکر آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے (غلہ وغیرہ لانے کے لیے) جب اپنے صاحبزادوں کو مصر کے لیے رخصت کیا اور چھوٹے صاحبزادے حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یامین کو بھی ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تو اس وقت یہ ہدایت بھی فرمائی کہ تم سب مصر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا۔ یٰبَنِیَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَۃٍ جس کا مقصد اکثر مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ دیکھنے والوں کی نظر نہ لگے۔ تو آخر میں یہ بھی فرمایا تھا۔ وَمَآ اُغْنِیْ عَنْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَعَلَیْہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ۔ مولانا کاندھلوی نے ان آیات پر تقریر کرتے ہوئے توکل کی حقیقت اور توکل اور اسباب کے تعلق پر بھی خوب روشنی ڈالی اور

اس دن عارف رومی کے اشعار بھی اس سلسلے میں سنائے۔ اس کے علاوہ بھی کئی مضامین تصوف و معرفت ہی سے متعلق مولانا نے اس دن کے درس میں ایسے بیان فرمائے جو والد ماجدؒ کے بہت ہی حسب حال تھے۔ اس درس سے بھی والد صاحب بہت متاثر ہوئے۔ رات کی نماز میں انہوں نے جو منظر دیکھا تھا اور جو نورانی کیفیت اس مجمع میں انہوں محسوس کی اور پھر صبح کے درس میں جو کچھ سنا، اس سے ان کا ذہن ہمارے اکابر اور ہماری جماعت کے بارے میں بہت کچھ بدل گیا۔ درس سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ اٹھے تو والد صاحب نے فرمایا کہ میں یہاں کے بزرگوں کے مزارات پر جانا چاہتا ہوں۔ ہم لوگ ان کو قبرستان لے گئے۔ وہ پہلے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر مراقب ہو کر بیٹھے اور دیر تک بیٹھے رہے۔ اس کے بعد حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر مراقب ہو کر بیٹھے اور بہت دیر تک بیٹھے اور ان کے چہرے کے رنگ سے ہم محسوس کرتے رہے کہ ان پر کوئی خاص اثر پڑ رہا ہے۔ وہاں سے واپسی پر فرمایا کہ "ان حضرات کا مقام بہت ہی بلند ہے۔" اس کے بعد ہم لوگوں سے فرمایا کہ یہاں کے استادوں میں جو اللہ والے ہوں، مجھے ان کے پاس لے چلو۔ ہم سب سے پہلے حضرت میاں صاحب یعنی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے۔ حضرت میاں صاحب کی زیارت و ملاقات سے بھی والد صاحب بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد حضرت شاہ انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہما کی زیارت کی۔ ان حضرات کی زیارت سے بھی بہت متاثر ہوئے اور ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ ہر وقت ذکر میں مشغول اور صاحب نسبت ہیں۔ الغرض ہمارے اکابر اور ہماری جماعت کے بارے میں ان کو جو بدگمانیاں ہمیشہ سے تھیں، وہ غالباً اسی دن ختم ہو گئیں اور اس کے بعد تو ان پر اللہ تعالیٰ کا بہت ہی بڑا فضل ہوا۔

دار العلوم میں طالب علمی کا دور

دار العلوم میں میری طالب علمی کا دور دو سال 1343ھ تا 1345ھ ہے، یہ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کی صدارت تدریس کا آخری دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے اساتذہ کی قدر اور استفادہ کی توفیق بھی بخشی۔ حضرت استاذ کشمیری قدس سرہٗ نے ایک دن درس میں بڑی خوشی کے ساتھ فرمایا تھا کہ 17 سال کے بعد دورۂ حدیث کی جماعت میں اتنے اچھے طلباء اس سال جمع ہوئے ہیں۔ تعلیمی سال کے خاتمہ پر معمول کے مطابق سالانہ امتحان ہوا تو اس عاجز نے بخاری شریف اور ترمذی شریف سے متعلق سوالات کے جوابات اس طرح لکھے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک رسالہ تھا اور اس کا نام بھی رکھ دیا۔ نتیجہ میں بھی امتیاز حاصل رہا۔

اتنا کام امتحان کے لیے مقررہ چند گھنٹوں میں نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے خصوصی طور پر درخواست کر کے عصر کی نماز تک کے لیے وقت بڑھوایا تھا۔ دورۂ حدیث کا یہ پورا سال اس طرح گزرا تھا کہ دن رات کے اکثر اوقات میں حدیث شریف کی کتابوں ہی سے اشتغال رہتا تھا۔ علم حدیث سے جو مناسبت اس زمانہ میں حاصل ہوئی تھی وہ اللہ تعالیٰ کی بہت ہی بڑی نعمت تھی۔ پھر اس وقت سے اب تک حدیث پاک سے اشتغال اور اس کی خدمت کا شغل، کسی نہ کسی شکل میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے برابر نصیب ہے۔ معارف الحدیث کی تالیف بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ زندگی کے آخری دن تک یہ اشتغال جاری رکھے!

(جاری ہے)

◆◆◆

ادب، ادیب اور جمہوری شعور

مسلم شمیم

جمہوریت سیاست دانوں کی ضرورت ہے، مگر ہم ادیبوں، شاعروں اور اہلِ فکر و دانش کی ضرورت بھی ہے اور آدرش بھی۔ ادب کا جمہوری آدرش سے رشتہ وہی ہے جو روح اور جسم کے رشتوں کی طرح ہے، کیونکہ حریتِ فکر و نظر کا بلا شرکتِ غیرے گہوارہ اور سرچشمہ جمہوریت ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ جمہوریت عصرِ جدید کی شناخت ہے اور آج کی دنیا کے لیے ایک جامع نظریہ اور فلسفۂ حیات کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ جمہوریت ایک سیاسی انتظام کے علاوہ ایک طرزِ احساس ہے۔ جمہوری رویہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں ایک طرف معقولیت پسندی کی سند تصور ہوتا ہے تو دوسری طرف رواداری اور روشن خیالی کا معیار بھی۔ امن اور سیکولرازم بھی بہ حیثیت جمہوریت کے ناگزیر لوازم میں سے ہیں۔ ادب کی صحت مند قدروں کا فروغ جمہوریت کے بغیر خام خیالی ہے، بلکہ یہ کہنا برحق ہوگا کہ معاشرے کے لیے فلاح اور نجات کا واحد راستہ جادۂ جمہوریت ہے۔

جیسا کہ بیان ہو چکا ہے کہ جمہوریت عصرِ جدید کی شناخت ہے اور آج کی دنیا کے لیے ایک جامع عقیدہ اور فلسفۂ حیات کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ ایک ایسا عقیدہ جو زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہے اور سماج کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ جمہوریت آج ایک سیاسی اور سماجی انتظام کے علاوہ ایک طرزِ احساس بھی ہے اور ایک نظامِ فکر بھی۔ جمہوری رویہ ہماری تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں ایک طرف معقولیت کی سند تصور کیا جاتا ہے تو دوسری طرف رواداری اور روشن خیالی کا معیار۔ جمہوری مزاج کی عدم موجودگی ایک معاشرے کی پس ماندگی کا اظہار کرتی ہے۔ جمہوری روایات و اقدار کی پاس داری میں شرفِ آدمیت کی پاس داری ہے۔ جمہوریت کی جامعیت اور وسعت کا تعین کرنے کے لیے کتنے ہی سابقے اور لاحقے ضبطِ تحریر میں لائے جاتے رہے ہیں۔ مثلاً بالواسطہ جمہوریت، بلاواسطہ جمہوریت، صدارتی جمہوریت، پارلیمانی جمہوریت، وحدانی جمہوریت، وفاقی جمہوریت، عوامی جمہوریت، قومی جمہوریت، سوشلسٹ جمہوریت، جمہوری مرکزیت، اقتصادی جمہوریت، خالص جمہوریت وغیرہ۔ غرض یہ کہ جمہوریت کی ہمہ گیری اور اس کے مختلف نظری اور عملی پہلوؤں کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے جن سابقوں اور لاحقوں کے حوالے سے جو مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کیے گئے ہیں، ان کا مطالعہ بھی ذہنوں کو جلا بخشنے کے لیے ناگزیر ہے۔

جمہوریت کی مقبولیت آج اس منزل میں ہے کہ جمہوریت دشمن عناصر جمہوریت دشمنی کا فریضہ انجام دیتے وقت بھی جمہوریت کا کلمہ پڑھتے ہیں اور اپنی جمہوریت دشمنی پر پردہ ڈالنے کی غرض سے مختلف النوع اصطلاحوں کا سہارا لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پابند جمہوریت، بنیادی جمہوریت، اسلامی جمہوریت اور شورائی جمہوریت جیسی اصطلاحات انھی مقاصد اور مطمحِ نظر کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اس صدی کے بدترین آمروں کو بھی جمہوریت کو بالاعلان مسترد کرنے کی جرأت نہیں ہوئی، بلکہ انھوں نے خود کو جمہوریت کا داعی اور حقیقی محسن

اور محاذ آرائی کر کے عامہ کو دھوکا دینے اور گم راہ کرنے کی اپنی سی کوشش کی۔

جمہوریت دراصل انسانی معاشرے میں ہزاروں سال سے ہونے والے معرکۂ خیر وشر میں خیر کی فتح کی امین ہے، کیونکہ جمہوریت کی تین بنیادیں ''آزادی'' اور ''مساوات'' اور ''اپنی حکومت آپ'' گویا وحدت انسانیت اور مساوات کے اعلان نامے کا درجہ رکھتی ہیں۔ جہاں سماج میں پائی جانے والی ہر تمیز وتفریق کی جمہوریت نفی کرتی ہے، اس کے ساتھ ان تمام نظریات، عقائد، تصورات و افکار اور مفروضوں کو بھی رد کرتی ہے جن سے سماج میں نابرابری اور تمیز وتفریق کی تائید حاصل ہوتی ہے۔ جمہوریت عوام کے اقتدار اعلیٰ کی علم بردار ہے۔ جمہوریت رنگ ونسل، زبان وثقافت، مذہب وجنس، کسی اعتبار سے انسانوں کے درمیان تمیز وتفریق کے کسی استدلال کو قبول نہیں کرتی، بلکہ ان تمام تنگ نظریوں، تعصبات اور شاونزم کو، جو کسی سماجی ناانصافی اور نابرابری کا جواز فراہم کرتا ہو، ذہنی کج روی، گم راہی اور باطل قرار دیتی ہے۔ ظل اللہ، ظل سبحانی اور اس قسم کے آسمانی حوالوں سے حکمرانی کے حق کا دعویٰ کرنے والے اب دنیا میں نہیں ہوں گے۔ اگر کسی نے یہ شوق پورا کیا تو اس کو شرمندگی کے علاوہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اقوام متحدہ کا انسانی حقوق کا چارٹر جمہوری آدرش کی توثیق کی اہم دستاویز ہے اور تاریخ میں انسانی مساوات کی اصولی فتح کا روشن ترین باب ہے۔ حقوق انسانی کے اس چارٹر پر دستخط کرنے والوں میں وہ افراد اور عناصر بھی شامل ہیں جو دراصل اس کے مخالف ہیں مگر ان سے انکاری ہونا اب ان کے بس کی بات نہیں ہے۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ادب کا جمہوری آدرش اور جمہوری شعور سے تا روح اور جسم کے رشتوں کی طرح ہے۔ حریت فکر کا بلا شرکت غیرے گہوارہ جمہوریت ہی ہے۔ اظہار رائے کی آزادی اس کی تخلیقی سرگرمیوں کا سرچشمہ قرار پا سکتی ہے اس حق کے لیے ادیب روز اول سے سرگرداں اور نبرد آزما ہے۔ بیسویں صدی میں ادیبوں نے جمہوری آدرش کے لیے صرف اپنے قلم سے جہاد نہیں کیا بلکہ اس کے تحفظ کے لیے میدان کارزار میں اپنی جان کے نذرانے بھی پیش کیے۔ 1933ء میں یورپ میں فسطائیت کے فتنے نے سر اٹھایا اور تہذیب وتمدن اور جمہوری اقدار کو حقیقی خطرات درپیش ہوئے تو ادیبوں نے بین الاقوامی پیمانے پر صدائے احتجاج بلند کی اور فسطائیت کے خلاف اپنی صف آرائی کی۔ جولائی 1935ء میں پیرس کے مقام پر کلچر کے تحفظ کے لیے تمام دنیا کے ادیبوں کی کانگریس بلائی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا جب دنیا کے وہ سارے ادیب ایک تحریک کی شکل میں متحد ہو گئے جو جمہوریت، روشن خیالی، انسان دوستی اور ترقی پسندیت پر یقین رکھتے تھے۔ انھوں نے اس کانفرنس میں یہ طے کیا کہ ادیب وشاعر کو اپنے ذاتی نہاں خانوں سے نکل کر انسانوں کے اجتماعی مفاد اور تہذیب وثقافت کی اعلیٰ اقدار کے تحفظ کے لیے جمہوریت دشمن، رجعت پسند طاقتوں کے مد مقابل آنا چاہیے اور اپنے فن کو انسانیت کی خدمت کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ اس موقع پر ادیبوں کے نام جو اپیل شائع کی گئی اس میں کہا گیا:

> ''رفیقان قلم! موت کے خلاف زندگی کی ہم نوائی کیجیے۔ ہمارا قلم ان طاقتوں کے خلاف رکنے نہ پائے جو موت کو دعوت دیتی ہیں جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں، روپے کے بل پر حکومت کرتی ہیں، جو کارخانے داروں اور زر پرستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور بالآخر فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی طاقتیں ہیں جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں۔''

ہماری قومی تاریخ کے ستر سال کا بیشتر دور جمہوریت دشمن اقتدار کا دور رہا ہے۔ ملک میں جاگیردار، نوکر شاہی اور دیگر مراعات

یافتہ طبقات اپنے غیر جمہوری اقتدار اور لوٹ کھسوٹ اور استحصال کو دوام بخشنے کے لیے پاکستانی عوام کو ان کے جمہوری حقوق سے محروم رکھنے کی سازشوں میں روزِ اول ہی سے مشغول رہے ہیں، جبکہ ملک کی ترقی پسند جمہوری قوتیں ایسی مکروہ سازشوں کو شکست اور ناکام کرنے اور جمہوری اقدار کے تحفظ اور انسانی وقار کی بحالی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگاتی رہی ہیں۔ ان مصروفِ پیکار طاقتوں میں عوام دوست ادیب پوری تن دہی کے ساتھ شاملِ عمل رہے ہیں جن کی پاداش میں طرح طرح کے مصائب و آلام سے گزرنا ایک قدرتی امر تھا۔ دار و گیر اور قید و بند کی صعوبتوں کے علاوہ ایسے ادیبوں پر معاش کے دروازے بھی بند کیے گئے۔ ان کی تصانیف، رسائل و جرائد پر نہایت تواتر کے ساتھ پابندیاں عائد کی جاتی رہیں۔ حکومتی حلقوں کے باہر ان کے حلیف، مفاد پرست، موقع شناس اور تنگ نظر نام نہاد دانش ور عوام دوست ادیبوں کے خلاف نت نئے الزام تراشنے اور دشنام طرازی میں مصروف رہے ہیں۔ وہ گمراہ کن نعروں کے ذریعے جمہوریت پسند ادیبوں کو پاکستانی معاشرے میں فعال کردار ادا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ ان تمام مراحل سے سرخ رو و کامران گزرے۔ ادب اور ریاستی وفاداری کے حوالے سے وہ اپنی تحریروں میں اس عزم کا بار بار اعادہ کرتے رہے ہیں کہ ہم ریاست سے وفاداری کو عوام سے وفاداری کے پیمان کو مشروط کرتے ہیں نہ کہ حکومتِ وقت کی کاسہ لیسی سے۔

پاکستان کے عوام دوست ادیبوں، دانشوروں اور فن کاروں نے عوام کے رنج و الم اور ان کی محرومیوں سے آگاہی کو اپنی تحریروں کا نقطۂ ارتکاز بنایا۔ عوامی امنگوں کی ترجمانی کی۔ خونی آمریت کے ادوار میں جمہوری تحریک اور عوامی جدوجہد میں وہ ان کے ساتھ رہے اور اپنی تخلیقات کی کہکشاں ان کی آرزوؤں اور تمناؤں سے سجاتے رہے۔ ان ادیبوں نے سماجی شعور کے ارتقا اور معاشرتی تقاضوں کا بھرپور اظہار کیا ہے اور ادب میں سائنسی نقطۂ نظر، جمہوری اقدار اور انسان دوستی کو فروغ دیا ہے۔ انھوں نے ادب میں قنوطیت، انفعالیت، قدامت پرستی، مقصد پرستی اور زندگی کو فریبِ محض سمجھنے کے تصورات کو مسترد کیا۔ اور اس طرح ادب اور زندگی کے رشتے کو تصوری طور پر واضح کیا۔ ہمارے ملک کے باشعور ادیبوں نے مغربی استعمار کے آوردہ اور بیہودہ نظریات کے رجحانات مثلاً ہیئت پرستی، سریت، حیوانیت، فحش نگاری، جنس انتشار پسندی، ابہام پسندی، رہبانیت وغیرہ کو بے نقاب کیا۔ یہ ادیب ادب کو زندگی کا ترجمان اور معمار سمجھتے ہوئے زندگی کو خوب صورت تر دیکھنے کے خوابوں کی تعبیر پیش کرتے رہے۔ ہمارے ادیبوں اور فن کاروں نے جمہوریت کی ترقی اور فکر و خیال کی آزادی کی جدوجہد میں جو عظیم خدمات انجام دی ہیں، وہ ہمارا قابلِ فخر ورثہ ہیں۔ شہری آزادیوں کا تحفظ اور جمہوری عمل کی کامیابی کا مسئلہ ادیب اور عوام دونوں کا مشترکہ مسئلہ ہے۔ جب عوام کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ اپنے تجربے کی روشنی میں آزادی کے ساتھ اپنے لیے اجتماعی ترقی کا راستہ ڈھونڈیں اور آزادی سے اس راستے پر چلیں تو سماج میں وہ تخلیقی قوتیں فروغ پاتی ہیں جن سے ہماری تخلیقی صلاحیتوں کو تحریک ملتی ہے اور جن کی فن کارانہ ترجمانی سے ہماری کاوشیں ہی تخلیق بن جاتی ہیں، اور اگر اس کے ساتھ ادیبوں کو اپنے ضمیر اور فکر کے مطابق لکھنے اور بولنے کی بھرپور آزادی حاصل ہو تو ہم اپنی سماجی زندگی کی صحیح ترجمانی کر سکتے ہیں اور اپنی ادبی تخلیقات کی مدد سے زندگی کو سنوارنے اور نکھارنے میں حصہ لے سکتے ہیں۔

جمہوریت کا پودا ہمارے یہاں شروع سے ہی صرصر و سموم کی زد میں ہے۔ اسے پنپنے اور پھلنے پھولنے کا ماحول اور فضا اکثر و بیشتر میسر نہیں رہی، چنانچہ معاشرہ جمہوریت کے ثمرات سے یکسر محروم ہے۔ کچھ حلقے جمہوریت کو محض ایک سیاسی نظام اور نظامِ حکومت جان کر اپنے ملک میں اس کی ناکامیوں اور اربابِ حل و عقد کے ہاتھوں اس کی بے توقیری کا رونا رو کر سرے سے جمہوریت کے نظریے کی نفی کرتے

گئے ہیں۔ کچھ حلقوں نے اپنے مسائل کے لیے جمہوری عمل کو دور رس کا رجحان ترک کر کے فسطائی سیاست کی راہ اپنائی۔ تشدد اور کثرت وقتوں کی قتل و غارت انھیں دہشت گردی کی دلدل تک لے آئی ہے اور اب تک جو نتائج سامنے آئے ہیں ان سے سوائے شرمندگی اور مایوسی کے معاشرے کو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ نقصانات جو ہوئے، وہ ناقابل بیان ہی کہے جا سکتے ہیں۔ کچھ حلقے ایسے بھی ہیں جو صدیوں پرانے تجربات کو دہراتے اور ماضی بعید کے سماجی، سیاسی اور معاشی زندگی کے احیا کی بات کرتے ہیں اور سماجی ارتقا کے قوانین اور تغیر و تبدل کے ضوابط سے قطعی نابلد اور بے بہرہ ہونے کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔

ابتدائی سطور میں جمہوریت کی تعریف و تفسیر بیان کرتے ہوئے یہ بات کہی گئی ہے کہ جمہوریت ایک سیاسی فلسفے، نظریے اور نظام کے علاوہ ایک طرزِ فکر و احساس، طرزِ معاشرت اور نظامِ زندگی کا درجہ رکھتی ہے۔ جمہوریت کا آدرش شرفِ بشر سے عبارت ہے، مساوات و آزادی سے عبارت ہے۔ جمہوریت ہر قوم کے امتیاز و تفریق کی نفی کرتی ہے۔ کوئی معاشرہ جو انسانی آبادی میں کسی پیمانے اور معیار سے انسانوں کے درمیان امتیاز و تفریق کرتا ہے، وہ معاشرہ جمہوری کہلانے کا مستحق نہیں ٹھہرتا۔ یہ کہنا ناگزیر ہے کہ سیکولرزم اور جمہوریت کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور بغیر سیکولر اصولوں کو اپنائے جمہوری حکومت اور نظام کا تصور نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ سیکولرزم کے اصولوں کی پاس داری ہی سے کسی معاشرے کے تمام شہریوں کی مساویانہ حیثیت کا تعین ممکن ہے۔ کسی تفریق اور امتیاز کے ہوتے ہوئے جمہوری نظام کا دعویٰ غلط اور گمراہ کن ہے، اگر تمام شہری یکساں حقوق و مراعات نہیں رکھتے۔ مذہبی بنیادوں پر تفریق اور امتیازی سلوک روا رکھا جانا جمہوریت کی نفی ہے۔ جمہوریت ہمارے یہاں ہمیشہ آزمائشوں سے دوچار رہی ہے، بلکہ یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ جمہوریت ہمارے یہاں ہمیشہ سرِ دار رہی ہے اور بار بار اسے پھانسی دی گئی ہے مگر یہ بڑی سخت جان واقع ہوئی ہے۔ اور بات یہ بھی ہے کہ جمہوریت کا دراصل کوئی نعم البدل (Substitute) ہے ہی نہیں۔ کوئی معاشرہ چاہے جمہوریت ترک کر کے تو مختلف راستوں میں سفر کر سکتا ہے اور نہ معاشرے کے لیے فلاح و ترقی کی منزلیں ڈھونڈ سکتا ہے۔ جمہوریت کا سفر صبر آزما سفر ہے، کیونکہ جمہوریت کے سفر کا کوئی Short Cut بھی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں پوری معاشرتی، سیاسی اور اقتصادی زندگی غیر یقینیت کا شکار رہی ہے اور یہ غیر یقینیت آج کچھ سوا نظر آ رہی ہے۔ یہ غیر یقینیت جمہوری عمل سے روگردانی کا لازمی نتیجہ ہے۔ معاشرے کے ہر طبقے کا مفاد جمہوریت سے وابستہ ہے اور یہی سب کے لیے نجات اور فلاح کا راستہ ہے، لہٰذا جمہوریت کے پودے کی آبیاری سب کا فریضہ بنتا ہے۔ عالمی مسلم معاشرہ عموماً اور جنوبی ایشیا کا مسلم معاشرہ خصوصی طور پر مختلف نوعیت کی انتہا پسندی کے اندھیروں میں گھرا ہوا ہے۔ یہ انتہا پسندی بدترین فاشزم کا روپ دھار چکی ہے اور اس کا نقطۂ عروج دہشت گردی کو چھو رہا ہے۔ اس تناظر میں جمہوری آدرش کے فیوض و برکات کے حق میں رائے عامہ کا ہموار کرنا قلم کاروں کا منصب انھیں اور فرضِ منصبی ٹھہرتا ہے۔

◆◆◆

سنتا ہوں تو ہنس دیتا ہوں، جب یہ لوگ بتاتے ہیں
بُرے دنوں کے بعد ہمیشہ اچھے دن بھی آتے ہیں
(اظہر جاوید)

اختر اورینوی کے افسانوں میں سماجی و طبقاتی شعور

سرور حسین (انڈیا)

صدیوں سے قائم علوم و فنون کے اس گہوارے اور حکمت و دانش کی یہ سرزمین بہار جن جید عالموں، دانشوروں، عالی مرتبت شخصیتوں اور شعر و ادب کی ممتاز اور قد آور ہستیوں کو جنم دیتی آئی ہے ان میں اختر اورینوی کی ذات گرامی بھی قابلِ ذکر اور امتیازی کہلائے گی۔ یہ واقعہ ہے کہ دنیا کی بلند اور اہم شخصیتیں اپنے نمایاں کارناموں اور امتیازات سے ہی پہچانی جاتی ہیں۔ اختر اورینوی کی حیثیت بھی ان معنوں میں امتیازی کہی جائے گی کہ وہ زندگی کے نشیب و فراز اور حرکت و عمل پر گہری نگاہ رکھنے والے عالم اور دانشور ہی نہیں تھے، زندگی کے اس حرکت و عمل میں انسانی سماج اور تاریخ کے رشتوں کے عمل اور ردِعمل کے روپ اور اثرات کو پیش کرنے کا ہنر جاننے والے کامیاب ادیب بھی تھے۔ ان کی ادبی شخصیت ہمہ جہت تھی۔ وہ بیک وقت شاعر بھی تھے، مقالہ نگار بھی اور صحافی بھی۔ وہ تحقیق و تنقید کی خشک و خارزار وادیوں سے بھی دیوانہ وار گزرے۔ زندگی کو اسٹیج کے توسط سے پیش کرنے کا بیڑہ بھی اٹھایا اور ڈرامہ نگاری کی طرف مائل ہوئے۔ لیکن وہ شہسوار بنیادی طور پر افسانہ نگاری کے میدان کے ہی تھے اور اس راہ میں اپنے نقوش چھوڑ گئے۔

افسانہ نگاری سے رغبت کے پیچھے ان کی افتادِ طبع کا بڑا ہاتھ تھا۔ چونکہ وہ ایک حساس اور درد مند دل لے کر پیدا ہوئے تھے، لہٰذا ان کی طبیعت ان کے جذباتی ردِعمل کا اظہار بھی چاہتی تھی۔ یہ اظہار مختلف صورتوں میں راہ پا سکتی تھی۔ لیکن ان کی دھیمی اور نرم رو طبیعت کسی نعرے بازی یا ہنگامے کی متحمل بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ افسانے کا فن حسن و تحمل، بالغ نظری، باریک بینی اور نرم روی کا متقاضی ہوتا ہے۔ چنانچہ اختر اورینوی کی ہوش مند اور سلجھی ہوئی حسین طبیعت نے بجا طور پر اسے اپنے فکری و جذباتی ردِعمل کے اظہار کے لیے موزوں وسیلہ سمجھا۔

لیکن اختر اورینوی کے لیے افسانہ تفریحِ طبع کا وسیلہ نہیں تھا۔ وہ ادب برائے ادب کے بھی قائل نہیں رہے۔ وہ ادب کو زندگی کی حقیقی تصویر کشی سمجھتے تھے۔ وہ افسانے کے توسط سے زندگی کو مجسم دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ انسان کے دکھ درد، اس کی چھوٹی بڑی خوشیاں، اس کی امید و ناامیدی، اس کی کامرانیاں و محرومیاں جیسے ہر پہلو اور رنگ کی تصویر کشی کر کے قاری کے لیے غور و فکر کے مواقع فراہم کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے پیش روؤں میں نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم کی روایات سے انحراف کرتے ہوئے انھوں نے ایک طرف تخیل پرستی سے بھی خود کو دور رکھا اور دوسری طرف روایت پسندی سے بھی گریز کیا۔ وہ زندگی کی ایسی صورت کی تخلیق کرنا چاہتے تھے جو ذات و کائنات کے حسن کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہو اور انسانی فکر و عمل کا نصب العین بن کر تخلیقِ حیات کی اہمیت کو روشن کرتی ہو۔ اسی لیے انھوں نے حقیقت پسندی کے اصول کو رہنمائے فن بنایا اور مقصدیت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا۔ ان کے سامنے پریم چند کے افسانوں کی مثالیں تھیں۔ وہ پریم چند کی حقیقت پسندی سے متاثر تھے تاہم مثالیت پسندی کو فنِ افسانہ نگاری کی روح کے منافی بھی سمجھتے رہے۔

اختر اورینوی کو زندگی سے بے حد پیار تھا۔ کیونکہ خود اپنی ذاتی زندگی میں دق کے مرض کا شکار ہو کر انھوں نے موت کی دستک بہت قریب سے سنی تھی اور موت کو شکست دے کر زندگی کو جیتا تھا۔ موت کے سائے کو اپنے بہت قریب پا کر زندگی کی اہمیت ان پر روشن ہوئی تھی۔ زندگی جو انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اس زندگی پر انسان کی گرفت کس قدر کمزور ہے انھیں اس کا گہرا احساس تھا۔ لیکن ان کی دوربین نگاہوں سے وہ عناصر پوشیدہ نہیں رہ سکے جو زندگی کو انسان کے لیے تلخ، بے رونق اور ناقابلِ برداشت بنانے میں ہمہ دم مصروف ہوتے ہیں۔

اختر اورینوی نے جس وقت افسانہ لکھنا شروع کیا تھا ہندوستان پر برطانوی سامراج کا اقتدار قائم تھا۔ دیہات کی غریب رعیت

انگریزوں کے وفادار زمینداروں اور سود خوروں کے مہاجنی نظام کی چکی میں پس کر بری طرح کراہ رہی تھی۔ قحط اور دیگر قدرتی آفات کے سبب اکثر و بیشتر گاؤں کی اکثریت کو فاقہ کشی کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ شہروں کی حالت بھی کم ابتر نہ تھی۔ یہاں کی معیشت پر انگریزوں کو کچا مال فراہم کرنے والے بچولیے سرمایہ داروں کا دبدبہ تھا جن کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ ساتھ ہی گھریلو صنعتوں کے دھیرے دھیرے تباہ ہو جانے اور برطانوی مال کی درآمدات کے سبب بیکاری بڑھتی جا رہی تھی۔ اختر اورینوی کا شعور اس زمانے میں اپنی بلوغت کی سرحدوں میں قدم رکھ چکا تھا۔ وہ ایک حساس ذہن ہی نہیں سائنٹفک شعور کے بھی مالک تھے۔ چنانچہ ان حالات سے متاثر ہونا ان کے لیے ناگزیر تھا۔ ان حالات پر غور و فکر نے ہی ان پر انسانی فکر و عمل اور نفسیات کے کئی پہلو روشن کیے۔ جس میں انسانی شخصیت اور کردار پر سماج کے ساتھ اس کے رشتوں کے پیچیدہ عمل سے مرتب ہونے والے اثرات بھی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں رہ سکے۔ اپنے افسانوں میں ان اثرات کو تلاش کرنے کی انھوں نے ایماندارانہ سعی کی ہے۔ یہ رجحان ان کے افسانوں کے ابتدائی دو مجموعوں 'منظر و پس منظر' اور 'کلیاں اور کانٹے' میں اگرچہ خاص طور پر زیادہ واضح اور ٹھوس صورتوں میں سامنے آیا ہے تاہم ان کے دوسرے مجموعوں میں شامل افسانے بھی اس کی مثالوں سے عاری نہیں۔ اس سلسلے میں ان کے 'بوجھ' 'ناسپاس' 'دو راہیں' 'شکوہ واد' 'سکھ تھوڑا' 'کلیاں اور کانٹے' جیسے افسانوں کی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ذیل کے اقتباسات پر ایک نظر ڈالی جا سکتی ہے۔

"سلطنت مغلیہ ایک جھیل جاتی، پھیلتی گرتی بھربھرا رہی تھی۔ اس کی شکست و ریخت کے بعد بھی اس کے ٹکڑے بڑے ریزے ریزے ایک صدی بعد تک بھی ایک ٹوٹے ہوئے عظیم جہاز کے سمندر میں تیرتے ہوئے تختوں کی طرح سارے ہندوستان میں بکھرے ہوئے تھے اور اب تک ادھر ادھر ان کے پریشان آثار ملک میں اقتدار کی باقیات کے یادگار نظر آ جاتے ہیں۔ ہر قصبہ میں چھوٹی بڑی سرکاریں تھیں اور ان سرکاروں کی حویلیاں اور دیوان خانے تھے۔ ان حویلیوں میں بھانت بھانت کی مخلوقات رہتی تھیں اور نہ جانے کہاں سے آ جاتی تھیں......"

(افسانہ سکھ تھوڑا۔ مجموعہ کچلیاں اور بال جبریل)

"نواب علی محمد اس جنت کا پیداوار تھا۔ بارہ گاؤں کا زمیندار، روشن پور کے مندر کا سرپنچ ارام ہوا اس کا ہر طرف غلغلہ ہوتا تھا۔ مذہبی عقیدہ اور زمیندار، گویا سیوا کا علمبردار۔ اس نے کئی مندر بنوائے تھے اور گویا ان کی خاطر ایک شاندار گوشالہ تعمیر کروایا تھا۔ کس کی مجال تھی کہ جنت ہی کے ظلم کی سرتابی کرے۔ مگر بھولا کے خیال سے ہر جنس اور گوری نے پیداوار کی بڑی محنت و عبادت کی لیکن لا حاصل۔ بھلا انا کا اثر ہوا۔" (افسانہ دو راہیں، مجموعہ "منظر و پس منظر")

اوپر کے اقتباسات میں جس سماجی صورت حال کی تصویر ابھرتی ہے وہ سماج کے مختلف طبقات میں نئی صف بندی کو قائم رکھنے میں بھی معاون ہوتی تھی۔ اختر اورینوی نے اس طبقاتی تفریق اور کشمکش کا بھی باریکی سے مطالعہ کیا۔ اس مطالعے کے عمل میں ترقی پسند تحریک نے بھی ان کی بھرپور معاونت کی تھی۔ اس تحریک نے نہ صرف تخیل پسندی اور رومانیت پرستی پر ضرب لگائی بلکہ انسانی زندگی کے نصب العین کو بھی واضح کیا۔ حسن کا نیا معیار وضع کیا۔ مارکسی فکر و فلسفے کے اثرات نے انسانی اذہان کو تقدیر پرستی کی قید سے نجات دلانے اور اپنے قوت بازو پر بھروسہ کرنے میں مدد بہم پہنچائی۔ نیز فن و ادب کی مقصدیت کو بھی واضح کیا۔ یہ اسی فکر و تحریک کا نتیجہ تھا کہ ہمارا شعر و ادب جو اس سے قبل تک بادشاہوں اور نوابوں کے عشرت کدے کی لونڈی بن کر ان کے لیے محض عیش و نشاط فراہم کرنے کا ذریعہ بنا ہوا تھا اب ہمارے کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والے محنت کش عوام کے مسائل سے وابستہ ہو کر ان کے دلوں میں دھڑکنے لگا۔ اختر اورینوی نے مختلف طبقات کی نفسیات کا مطالعہ کیا۔ ان کے افسانوں کے کردار اسی نفسیات کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اختر اورینوی محض پریم چند کی روایت کی توسیع نہیں کرتے بلکہ اردو افسانے کو ایک نئے عہد کے تقاضوں سے بھی روبرو کرتے ہیں جس کی پیروی ان کے بعد کے افسانے لکھنے والے ان کے ہم عصروں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی اور منٹو وغیرہ نے بھی کی۔

اختر اورینوی نے اپنے افسانوں کے تانے بانے ہر طبقے کے کرداروں سے بنے ہیں تاہم ان کے زیادہ تر کردار متوسط طبقے کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں یہ کردار جس طرح اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ سامنے آتے ہیں اس سے اس طبقے کی نفسیات پر ان کی مضبوط گرفت کا پتہ چلتا ہے۔ ان کے افسانہ ’’جونیئر‘‘ میں جونیئر وکیل متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا ایسا ہی ایک کردار ہے جو حقیقت سے بے خبر ایک زوال آمادہ سماج میں ایک نہایت ناپائدار مستقبل کا خواب دیکھتا ہوا کچہری میں قدم رکھتا ہے۔ تصور میں وہ اپنے آپ کو آنے والے دنوں میں بہت بڑے وکیل کے روپ میں دیکھتا ہے۔ ایک دن بڑی مشکل سے کسی دلال کے ذریعہ اسے ایک موکل ملتا ہے جو محض ایک چونی کے عوض اپنی ڈیوٹ کرانے کی درخواست کرتا ہے۔ جب وکیل کو اپنا خواب ہی نہیں اپنی پوری شخصیت لرزتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ذیل کے اقتباس پر ایک نظر ڈالتے چلیں:

’’چلئے وکیل صاحب سعد یہ یا بڑی مجسٹریٹ کے اجلاس پر آتی ڈیوٹ کرا دیجئے۔ یہ رہی آپ کی فیس۔‘‘
موکل نے چونی وکیل کی طرف بڑھائی۔ وکیل مبہوت رہ گیا۔ وہ مجسم احساس درد تھا۔ ’’ارے وکیل صاحب جلدی، اجلاس اٹھ نہ جائے .... میں مختار صاحب سے اب تک کرا لیتا آتی ڈیوٹ۔ میاں نجابت مجھے یہاں لے آئے۔ چونی پر بہتیرے راضی ہیں آپ کو کیوں نہ دوں۔ آیئے چلئے۔‘‘ موکل کو اپنے کام کی عجلت تھی۔ وکیل کا یہ پہلا تجربہ تھا کہ وہ اتنا پیچھے ہٹ رہا تھا۔ اس کی شخصیت لرز اٹھی مگر حقائق کے مقابلے کے سامنے اسے جھکنا پڑا۔‘‘

(افسانہ ’’جونیئر‘‘ مجموعہ ...... منظر و پس منظر)

اوپر کے اقتباس سے جونیئر وکیل کی محض سماجی حیثیت کا ہی اظہار نہیں ہوتا بلکہ متوسط طبقے کی اس ذہنیت کا سراغ بھی ملتا ہے جو ان یہ ان سماجی طور پر نچلے طبقے کی طرف مائل بہ زوال ہونے کے باوجود اعلیٰ طبقے کے سامنے میں ترقی کے خواب دیکھنے سے گریز نہیں کرتا۔ اختر اورینوی کا تخلیقی شعور انھیں انسان اور خصوصاً سماج کے دبے کچلے مجبور طبقے کے انسانوں سے پیار کرنے کی تحریک دیتا ہے۔ یہی وہ شعور ہے جو ان کے افسانوں کو انسانی دکھ درد کی تصویر بنا دیتا ہے۔ اس درد میں ان کا اپنا درد بھی شامل ہوتا ہے ورنہ وہ یہ نہ کہتے کہ:

’’تہذیب حاضر خودکشی کر رہی ہے۔ میں جینے سے تنگ آ گیا ہوں۔ لیکن یہ تماشا کیا اتنی سادہ اور سچی ہے؟
1914-18 جنگ میں نے ڈھائی کروڑ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ 1939-45 جنگ میں نے ساڑھے چار کروڑ آدمیوں کو، اپنے اجداد کو، اپنے جگر گوشوں کو ذبح کر دیا۔ گولی ماری، جلا دیا۔ اور اس کے بعد بھی یہ جو خون جاری ہے۔ میں آہستہ آہستہ اپنی رگیں کاٹ رہا ہوں۔ خون بہتا جاتا ہے۔ میں دھیرے دھیرے خودکشی کر رہا ہوں اپنے دل و جگر میں خنجر مار رہا ہوں۔ اگر شیطان، جبرئیل سے نہیں .... مجھ سے پوچھتا تو میں بتاتا کہ قصہ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو؟ فرشتے اور شیطان تو تماشا دیکھتے رہے۔ صرف آدم کا قصہ ہی نہیں بلکہ کائنات کا مقصد بھی آدم کے خون سے ہی رنگین ہوا۔‘‘ (کہانیاں اور وال جبرئیل)

اختر اورینوی کو احساس ہے کہ دنیا اور سماج پر قابض باطل کی قوتوں کو شکست دیئے بغیر کسی مثبت تبدیلی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس احساس نے ہی ان کے افسانوں کو ہماری زندگی کی حقیقتوں کا اظہار بنا دیا۔ ان کی افسانہ نگاری اس احساس کا مبین اظہار ہے جس سے ہمارا عصری سماج آج بھی دوچار ہے۔ یہ صورت حال بجا طور پر عصر حاضر میں بھی ان کی معنویت پر اصرار کرتی ہے اور آئندہ بھی کرتی رہے گی جب تک ہمارا سماج ان مسائل سے نجات حاصل نہیں کر لیتا جو ان کی افسانہ نگاری کے محرک تھے۔

◆◆◆

منظومات

سلیمان خمار (انڈیا)

نیا جنم

کچھ دنوں سے
تم بھی
روز شام ہوتے ہی
اپنے بند کمرے میں
بلب کے قتل کرتی ہو
اور گھٹا اندھیروں کی
کوئی اندھی کھائی میں
دان کر کے سوتی ہو
پھر بھی...
تم محبت سے
روز صبح ہوتے ہی
میں نیا جنم لے کر
مسکرانے لگتا ہوں

OOO

فوقیہ مشتاق

دُکھ جانتے ہو

کیا تم ان عورتوں کا دکھ جانتے ہو
جنھیں جانوروں کی طرح cage میں
بند کر کے رکھا جاتا ہے
تاکہ انھیں ذبح کیا جا سکے
اور اس سے پہلے ان کی روحوں کو شکار کیا جاتا ہے
اور انھیں ایسا گھن چکر بنایا جاتا ہے
جس میں وہ گھومتی رہیں
کیا تم ان عورتوں کا دکھ جانتے ہو

OOO

کرامت بخاری

ہمارا کیا ہے؟

ہمارا کیا ہے
ہماری عادت ہی ہو گئی ہے
شفق کی بے تاب وادیوں میں بھٹکتے رہنا
گئی بہاروں کو یاد کرنا
غریب تر دور ساحلوں کے قصوں میں رہنا
افق میں گھلتے ہوئے رنگوں کو رستوں میں تلاش
کرنا
تمام کھوئے ہوئے جزیروں میں
خاک ہوتے ہوئے مزاروں پہ جا کے
اور اپنے گزرے ہوئے دنوں کا حساب کر کے
ملول ہونا ملول کرنا

ہمارا کیا ہے
ہماری عادت ہی ہو گئی ہے
حروف و قرطاس سے الجھنا الجھتے رہنا
خیال کی بے پناہ وسعت میں
گرد اوڑھی ہوئی مسافت کی چاپ سننا
کہیں کہیں پہ خود اپنے سائے کی سمت جا کر
تجھ کو کم کرنا
کلام کرنا
خدا کی تخلیق در پہ جو کچھ قدم ہوئے ہیں اسے سمجھنا
سخن کے ریزے میں عام کرنا
اور آنے والی نسلوں کے نام کرنا
ہمارا کیا ہے

OOO

شہزاد نیر

ٹیڑھی ترازو

مجھے علم نہیں تھا
مگر ان کے پلڑوں میں اپنی پسلی تھی
کوئی ان کے کھیل تو ہے
وہ حق تو عام کو مسرور کرتی
وہ منطق تو صدیوں کے چہرہ تھوڑے سے مسمار کرتی
وہ رد کی تو دنیا کا تقسیم کرتی
نگاہوں نے گروا لیے
مسافر وہ اپنی طرف دور سے کھینچ لیتے!

مجھے علم نہیں تھا
مگر میرے ہونٹوں سے دو ہی پھسلے تھیں
ہولی تھی تو وہ تمہیں حصہ ملاتی ہیں؟
کیا کہا...؟
تم مرے گھر میں رہتی ہو اور میری ہو!
تمہیں حق نہیں ہے کسی اور جانب کو دیکھو
تمہارے لیے صرف میں ہوں
یہ ہے ترازو کا جھولا
اگر تم ''نظر'' ہو اور میں تو صدیوں سے ''میں''
ہوں

OOO

ملک اشرف ذکی

دوسری ہجرت

حصول رزق کی خاطر طویل عرصے تک
میں اپنے گاؤں سے دوری کے غم کو سہتا رہا
حسین وادیوں، جھیلوں اور مرغزاروں کو
پہاڑ زینی لطافت میں جن کو دیکھتے ہیں
کبھی نہ نکلے مرے ذہن و دل سے وہ منظر
جہاں رہا میں، مرا گھر وہ میرے ساتھ رہے
کسی بھی طور مرے دل سے وہ رہ رہ کے
وہ کچھ کہ گھر سے کبھی انحلال نہ
غریب و سادہ مگر پیار کرنے والے لوگ
خلوص آنکھوں سے ان کی ہمیشہ رہتا تھا
دعا میں جن کی مری زیست کا حصار ہیں
وہی خلوص مجھے پھر سے کھینچ لایا ہے

جو اشک جھیل میں گرتے تھے اب بھی جاری ہیں
گلیاں کرتے ہیں رہ رہ بھی مرغزاروں میں
وہ سب حسین مناظر ہیں آج بھی دلکش
پہاڑ آج بھی گویا ہیں پاسبان ان کے
بہت ہی آج بھی دلکش ہے منظری کی لے
مگر یہ کیا کہ وہ پہلا سا اپنا پن ہی نہیں
کسی نگاہ میں پہلا سا اب وہ پیار نہیں
تنی ہوئی ہے کوئی غیریت کی چادر سی
رویے لوگوں کے تبدیل ہو چکے ہیں یہاں
پھنسے ہیں اپنے مسائل کی دلدلوں میں لوگ
وہ دیکھتے ہیں مجھے اجنبی نگاہوں سے
شناخت کھو کے بھلا کیسے جی سکوں گا میں؟
صدائے درد مرے دل میں گونج اٹھتی ہے
کہ اب تو دوسری ہجرت مرا مقدر ہے

OOO

ممتاز راشد لاہوری

قطعات

پاکستانی باغ

اپنے لہو سے جو بھی اگائے تو جائیے
دھرتی کے دامن پہ داغ نہ چھوڑیں گے
گلشن ہو چاہے وہ موسم کی لہریں ہوں
پاکستانی اپنا باغ نہ چھوڑیں گے

پرندوں کی بولیاں

ان کی جھیلوں کا لطف لیا
پنچھی دیکھے ہستیاں سیکھیں
ٹھوکریں کھائیں بچپن گئے گی
جب پرندوں کی بولیاں سیکھیں

جشنِ لاہور

ممتاز ہے ان کا ہر رنگ قدیم
ہو زندہ جذبہ لاہور ہے
ہر نظارہ ان کا ہے باعث ظہور
اک گلشن جشن لاہور ہے

آنکھ روشن

اک ایسی ہے آنکھیں کہ ہم سے ہے
دل میں جذبوں کا بھولا سا گلا
جس طرح بھی اک ساتھ ہوں
اس کا کہنا ہے زندگی ہنسا

شہزادی

ہم کیا سمجھیں گے اس شوخ کی ادائیں
ہم ہیں مزاج کے سادہ ہم ہیں اناڑی سے
اس پہ گماں ہوتا ہے اک شہزادی کا
دیتے اداؤں سے وہ تلخ بھی کوری سے

OOO

قمر جہاں (امریکہ)

پہلا قتل

کوئی شریک دروازہ توڑ کر
اور تنہائی سے گھبرا کر
اپنی بچھڑی ہے بیٹی کو
میں نے اک شب چپکے سے کہا تھا
"وہ بیٹا
اس شکتی میں ہے زیادہ نہ دل
تم تو اب کے بھی کم ہوگی
گھر کا کرایہ
بجلی کا بل
دودھ کے پیسے
فیسیں تمہاری
جانے یہ سب کیسے ہوگا"
کچھ لمحے سہمی سہمی رہی وہ
لفظ تو جیسے حلق میں اٹکے
آنکھوں میں خطرے کے بادل چھائے
کہنے سے وہ جھجک رہی تھی
وہ مجھ سے کچھ کہنے میں ڈرتی
"اب کیا ہوگا—
اب کیا ہوگا"
کتنے دن بیتے — قتل ہوئے
اس بیتے میں جانے کتنی تھیں
میں نے اس سے اس کا بچپن
بے فکری کے خواب سہانے
سب کچھ اس سے چھین لیا تھا
ان آنکھوں کو سپنوں تھیں
بھر کیسے اب تک
میری بیٹی کے چہرے کی
آن اک سوالات
دل کا یہ پوچھا کرتی ہے
اب کیا ہوگا— اب کیا ہوگا!!"

OOO

افسانے

عشقِ آتش

بشریٰ رحمٰن

مختصر تعارف

بشریٰ رحمٰن 29 اگست 1945ء میں پاکستان کے صحرائی شہر بہاول پور میں پیدا ہوئیں۔ بارہ سال کی عمر میں انھوں نے پہلا افسانہ لکھا جو لاہور کے ایک ادبی رسالے میں شائع ہوا۔ ابتدا میں بشریٰ رشید کے نام سے ان کے افسانے اطراف و پاک کے ادبی رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ شادی کے بعد بشریٰ رحمٰن کے نام سے لکھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے اب تک چالیس کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں ناول، افسانے، سفرنامے، ڈرامے، کالم اور شاعری شامل ہیں۔ یہ پہلی ادیب خاتون ہیں جن کی فی البدیہہ تقریروں کے مجموعے بھی شائع ہوتے ہیں۔ انھیں 2006ء میں صدارتی ایوارڈ ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ متعدد خطابات سے نوازا گیا: (1) اختر پاکستان (2) بلبل پاکستان (3) شان بہاول پور (4) دختر صحرا (5) ملکۂ سخن اور (6) عندلیب پاکستان۔ آپ نے بے شمار ڈرامہ سیریل بھی لکھے جن میں پارسا، لگن، لازوال، بندھن، پیاسی اور دات رسوائی کو بہت پذیرائی ملی۔

نوجوان لڑکی نے پہلے فون کیا اور پھر بس سٹاپ پر اتر گئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس تھا۔ ایک شاپنگ بیگ تھا۔ اور اس نے موبائل فون کان سے لگا رکھا تھا ـــــ سٹاپ پر اتری تو سڑک ویران تھی چوراہے کی بتیاں جل رہی تھیں۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اس نے متوحش نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ دائیں طرف سے ایک نوجوان اندھا دھند موٹر سائیکل بھگاتا ہوا نکلا__ لڑکی اسے دیکھتے ہی اس کی طرف دیوانہ وار دوڑی۔ اس نے وہیں موٹر سائیکل روک لی اور خود اتر کر کھڑا ہو گیا۔ لڑکی دوڑ کر اس کے گلے سے لپٹ گئی۔ سامان اس کے ہاتھ سے گر گیا__ لڑکے نے بھی اس کی کمر کے گرد اپنے بازوؤں کی کمند ڈال دی۔ دونوں کافی دیر ایک دوسرے سے فلمی انداز میں لپٹے رہے ـــــ وہ بس میں بیٹھے ہوئے مسافر اس منظر کو بالکل اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کسی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہو__ سواریاں چڑھا کر جب بس ان کے قریب سے گزری تو اندر بیٹھے مسافروں سے رہا نہ گیا۔ کچھ نے قہقہے لگائے کچھ نے تالیاں بجائیں اور کسی نے منہ باہر نکال کر فحش آوازیں لگائیں__

اوئے اینوں چھڈیں ناں (اوئے اب اسے چھوڑنا نہیں) اوئے قسمت کے بچے ـــــ (اوئے زور سے پکڑ)

وغیرہ ـــــ وہ دونوں یک بیک ہوش میں آ گئے۔ ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ لڑکے نے لڑکی کا زمین پر گرا ہوا سامان اٹھا

لیا۔ موٹر سائیکل پر بیٹھا' اسے پیچھے بٹھایا۔ موٹر سائیکل سٹارٹ کی۔ لڑکی اس کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی__

رات کے اندھیرے میں موٹر سائیکل ایک بلڈنگ کے تاریک برآمدے میں رک گئی۔ اندر سے ایک اور لڑکا نکل آیا۔ وہ ان دونوں کو اوپر لے گیا۔ تالا کھول کے ان کو کمرے میں بٹھایا۔ لڑکی پھر لڑکے کے ساتھ چپک کر بیٹھ گئی۔

ڈونٹ وری زنیرہ یہ میرا عزیز دوست ریحان ہے۔ اور یہ ریحان کا گھر ہے۔ جہاں میں تمہیں لایا ہوں۔

پھر اس نے ریحان کی طرف دیکھ کر کہا__ باقی سب انتظام ہو گیا ہے۔

بڑی مشکل سے ہوا ہے۔ مگر ہو گیا ہے__ جاؤ پھر بلا لاؤ__

آفتاب مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا نا؟ زنیرہ نے اس سے لپٹتے ہوئے کہا۔

میری جان انہیں نے سارا انتظام کر کے تمہیں بلایا ہے__ وہ بھی اسے لپٹاتے ہوئے بولا__

ابھی وہ محبت کے چونچلوں میں مصروف تھے کہ دروازہ ناک کر کے ریحان آ گیا۔ اس کے پیچھے ایک مولوی صاحب تھے__

ریحان نے کہا۔ مولوی صاحب ایڈی لڑکا ہیں۔ یہ فارم ہم نے پہلے پر کر کے رکھا ہوا ہے۔ آپ بس نکاح پڑھوا دیں__

دوسرا گواہ کہاں ہے__ ؟'' مولوی صاحب اس وقت کوئی دوسرا گواہ نہیں مل سکا۔ میں ہوں نا'' اگر برخوردار__

اکر مگر اور ہیز ٹوٹ کے بیچ مولوی صاحب نکاح پڑھا کے چلے گئے۔

زنیرہ سر لپیٹ کے بیٹھی تھی۔ تین بار ہاں کہنے کے بعد اس کے سارے وسوسوں کو قرار آ گیا تھا۔

ریحان نے مٹھائی کا ڈبہ ان کے آگے رکھ دیا اور بولا__

Have a nice time —میں اب چلتا ہوں۔ یہ کمرے کی چابی ہے۔ صبح ملاقات ہو گی۔

آفتاب نے چابی پکڑ لی۔ اسے سیڑھیوں تک چھوڑنے آیا اور کہا۔ ریحان میں تیرا احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا__

یار! یہ معمولی سا کمرہ ہی تو دیا ہے میں نے__

آج میرے لئے یہ کمرہ محلات سے بڑھ کر ہے۔ اچھا یار صبح آتے ہوئے بازار سے ناشتہ لے آنا۔

آفتاب اندر آیا تو زنیرہ اس گندے غلیظ کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ جیسا کہ کسی چھڑے کا کمرہ ہوتا ہے__

سوری زنیرہ__ یہاں میں کوئی عیاشی نہیں کر سکتا۔ اس لئے__

I don't mind کہہ کر زنیرہ پھر اس کی گردن سے لپٹ گئی۔ اب وہ باقاعدہ اس کی دلہن تھی۔

زنیرہ اور آفتاب کا عشق پچھلے ایک سال سے چل رہا تھا۔ آفتاب کا باپ ڈاکٹر تھا اور ڈسٹرکٹ کالج میں اسے سرکاری ملازمت ملی ہوئی تھی۔ آفتاب اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ زنیرہ ایک وفاقی وزیر کی بیٹی تھی۔ اس کے تین بڑے بھائی تھے۔ گھر کا ماحول شاہانہ تھا مگر پابندیاں بھی تھیں۔ دونوں کی ملاقات ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں ہوئی__ پھر ملاقاتیں بڑھیں اور پیار نے انگڑائی لی۔ زندگی بھر ساتھ رہنے کی قسم کھائی گئی__

پھر ایک پیار کی قسموں کے درمیان ایک حادثہ رونما ہو گیا۔ جنتی زنیرہ کے باپ نے اپنے ایک بھتیجے سے زنیرہ کی بات پکی کر دی۔ زنیرہ بہت گلی بہت شور مچایا مگر ماں نے ایک نہ سنی۔ وہ اپنی روایات سے پیچھے ہٹنے والے لوگ نہیں تھے۔ عاشق معشوق مل کر

بیٹھے اور انہیں اس مسئلے کا ایک ہی حل نظر آیا کہ خفیہ طور پر شادی کر لیں۔ کم از کم فلموں میں انہوں نے یہی دیکھ رکھا تھا ___ سو وہ ہو گیا ___ جب دولہا دلہن ایک خفیہ کمرے میں شب عروسی منا رہے تھے۔ دونوں کے والدین ہراساں و پریشان ادھر ادھر ٹیلی فون کھڑکا رہے تھے۔ پہلا موقع تھا زینیہ گھر سے غائب ہوئی تھی۔ ایک مشہور و معروف سیاست دان کے کیریئر کے لئے یہ ایک بہت بڑا حادثہ بن سکتا تھا۔ ادھر آفتاب ایک بگڑا ہوا بیٹا تو تھا ہی مگر پوری رات کبھی گھر سے غائب نہیں رہتا تھا۔ باپ تو گالی گلوچ کر کے سو گیا تھا۔ مگر سوختہ تن ماں ساری رات مصلے پر بیٹھی رہی اور رو رو کر دعائیں مانگتی رہی ___ اور بار بار اس کے دوستوں کو فون کرتی رہی۔ ریحان کا فون مسلسل بند تھا اور کسی دوست کو کچھ معلوم نہیں تھا۔

اگلی صبح باپ کے دفتر جانے کے بعد جب آفتاب عجیب تھکے تھکے اور ملامت زدہ حلیے کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ تو ماں نے دوڑ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ بیچ بیچ کر روئی ___ اپنی گذشتہ رات کی بے بسی کا قصہ سنایا۔ مگر آفتاب جیسے ہوش میں نہ تھا۔ کسی بات کا کوئی جواب نہیں دے رہا تھا ___

بس یہی کہتا جاتا ___ ماں! ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہسپتال میں رات گزار کے آیا ہوں۔ ذرا آرام کر لوں تو سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گا۔ وہ اندر جا کے سو گیا ___

وہ جب اٹھا تو باپ آ چکا تھا۔ اور اس کی ماں سے پوچھ رہا تھا۔

آ گیا وہ ناخلف' وہ نا ہنجار' میں نہ کہتا تھا۔ اس کو سر پہ مت چڑھا ___ کسی دن ماں باپ کی ناک کٹوائے گا ___ اور نہ جانے کیا کیا ___

وہ ان سنی کر کے غسل خانے میں چلا گیا۔ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن کر باہر آیا۔ تو باپ بھرا بیٹھا تھا ___

باپ نے اٹھ کر دو چار تھپڑ لگائے۔ اپنا غصہ نکالا۔ اور یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا کہ اب اگر گھر سے باہر قدم نکالا تو میں ٹانگیں توڑ دوں گا ___

مگر آفتاب کو تو شام ڈھلے سے پہلے جانا تھا۔ زینیہ نے Missed کالیں دے دے کر اس کا جینا عذاب کر دیا تھا ___

ماں نے بہت سمجھایا۔ قسمیں دیں' واسطے دیئے' مگر وہ یہ وعدہ کر کے جل دینے میں کامیاب ہو گیا۔ کہ رات سے پہلے آ جائے گا ___ دوست کو نازک حالت میں نہیں چھوڑ سکتا۔

مگر وہاں اس اکیلے اور غلیظ کمرے میں زینیہ نے رو رو کر برا حال کر لیا تھا۔ ساتھ جو غسل خانہ تھا۔ لگتا تھا صدیوں سے نہیں دھویا گیا۔ نہ گھر والا گیزر' نہ خوشبودار صابن' نہ شیمپو' نہ دھاری دار تولیے' وہ جلدی میں بس اپنے دو چار جوڑے' میک اپ کا سامان اور تھوڑے سے پیسے لے آئی تھی۔ صبح جب نہانے کے لئے باتھ روم میں گئی تو اسے بڑی کراہت محسوس ہوئی۔ پھر تھوڑی دیر بعد اس کراہت پر رات والا وصل کا سرور و کیف چھا گیا۔

جب آفتاب ادھر آیا تو وہ پھر اس کی گردن کے ساتھ لٹک گئی۔ اور اس کو قسمیں دینے لگی کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ ساری رات آفتاب اسے سمجھاتا رہا کہ اگر وہ گھر نہ گیا تو اس کے والدین اس چوری کا پتہ لگا لیں گے ___

اور وہ وہ بار بار کہتی رہی۔ اس گھر سے میں میرا دم گھٹتا ہے۔ مجھے کھانا کھلانے کے لئے باہر لے چلو__ باہر جانے میں کتنا رسک ہے__ وہ سمجھا سمجھا کر تھک گیا__ گھر جاتا تو ماں ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ جاتی۔ گھر سے نکلنے نہ دیتی۔ زنیرہ کے پاس جاتا تو وہ وحشت زدہ گندے کمرے کا رونا رونے لگتی۔

ادھر وزیر صاحب نے شور مچائے بغیر اپنی بیٹی کی تلاش میں پیسہ لگانا شروع کر دیا۔ آخر انھیں سن گن مل گئی کہ وہ یونیورسٹی میں آفتاب نام کے لڑکے کے ساتھ پائی جاتی تھی__ اور ایک ہفتے سے وہ دونوں یونیورسٹی سے بھی غائب ہیں۔ ایک دو پہر کو جب آفتاب شب وصل گزار کر گھر آ کے گہری نیند سویا ہوا تھا۔ ان کے گھر میں پولیس آ گئی اور تھر تھر کانپتی ماں کو بتایا کہ وہ لوگ آفتاب کے وارنٹ گرفتاری لے کر آئے ہیں۔ ماں نے جھٹ جھوٹ بولا کہ آفتاب تو گھر پر نہیں ہے۔

مگر وہ اندر گھس آئے اور بولے۔ سارے گھر کی تلاشی لیں گے__ انہوں نے ٹھوکر مار کے آفتاب کو جگایا اور ہتھکڑی لگا کر لے گئے۔ آفتاب صرف اپنا فون اٹھا سکا۔ اور پولیس وین میں بیٹھ کے اس نے زنیرہ کو Message کر دیا۔ اور کیا وہ باہر نہ نکلے وغیرہ__ پولیس اسٹیشن پہ پہلے تو وہ آفتاب سے بہت آرام سے پوچھ گچھ کرتے رہے کہ اس نے زنیرہ کو کہاں رکھا ہے__؟

وہ برابر انکار کرتا رہا__ مگر تا بہ کے__ جب خوب چھترول ہوگئی۔ تو فاسٹ فوڈ اور پیزا اور پیسٹری سے پلے ہوئے آفتاب کا عشق ہار گیا۔ اس نے بتا دیا کہ اس نے زنیرہ کو کہاں چھپا کے رکھا ہوا ہے__ پولیس نے زنیرہ کو برآمد کیا۔ اور روتی چلاتی زنیرہ کو گھسیٹ کے موٹر میں اٹھایا اور باپ کے گھر پہنچا دیا۔ باپ کے گھر میں اسے کوئی لعن طعن نہیں کی گئی۔ بس اس کا فون چھین کر اس کے اپنے کمرے میں مقفل کر دیا گیا۔

شام کو باپ گھر آیا تو ماں نے آفتاب کے بارے میں بتایا۔ کہ اسے پولیس لے گئی ہے۔ پہلے تو باپ اپنا غیض و غضب ماں پر اتارتا رہا۔ پھر بھی باپ تھا۔ ایک وکیل کو ساتھ لے کر تھانے پہنچ گیا۔ بیٹے کو لاک اپ میں دیکھ کر بہت پچھتایا__

یہ معلوم ہونے پر کہ اس نے ایک بڑے وزیر کی لڑکی کو اغوا کیا ہے۔ اس لئے اس کی ضمانت نہیں ہو سکتی۔ باپ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ جتنے جتن باپ کر سکتا تھا اس نے کئے۔ نہ بیٹے نے بیان بدلنے پر آمادگی کا اظہار کیا نہ اس کی ضمانت ہو سکی۔ بالآخر ماں روتی کرلاتی وزیر صاحب کے گھر جا پہنچی۔ وزیر صاحب شطرنج کے ماہر تھے۔ ماں کو اپنے کمرے میں بلا کر بولے۔

میں چاہتا تو تمہارے بیٹے کو قتل بھی کروا سکتا تھا۔ مگر میں نے ایسا نہیں کیا__ یہ میرا احسان ہے۔

حضور بندہ پرور! اسے معافی کیسے مل سکتی ہے۔ ماں گڑگڑائی۔

صرف ایک صورت میں کہ میری بیٹی کو طلاق دے دے__ اگرچہ ہم ایسے خفیہ نکاح کو جائز نہیں سمجھتے۔ پھر بھی اس کا ہونا بہت ضروری ہے۔

انہوں نے طلاق کا ایک فارم ماں کو دیا اور کہا۔ جتنی جلدی آپ دستخط کروا لیں گی اتنی جلدی آپ کا بیٹا رہا ہو جائے گا۔ مگر ایک اور شرط بھی ہے۔ آپ میری بیٹی کو بتا کر جائیں کہ آپ رشتہ طے کرنے آئی تھیں۔ اور ہم اس کو دھوکے میں رکھیں گے کہ رشتے کی بات باقاعدہ دستور کے مطابق چل رہی ہے۔

ماں نے اندر جا کر زنیرہ کو پیار کیا۔ اور خوشخبری سنائی کہ اب ہم پوری بارات کے ساتھ آئیں گے اور اسے لے جائیں گے۔

اس ملاقات کے بعد زنیرہ کا قفل کھول دیا گیا۔ مگر اس پر پوری نگاہ رکھی جا رہی تھی۔ روز شام کو اس کا منگیتر سکندر اس کے کمرے میں آ کے بیٹھ جاتا۔ یورپ اور امریکہ کی باتیں کرتا۔ خوبصورت زندگی کے قصے سناتا اور چلا جاتا__

آفتاب فون کر کر کے ہار گیا۔ کیونکہ زنیرہ کے پاس کوئی فون نہیں تھا۔ اور وہ ایک کمرے تک محدود کر دی گئی تھی۔ جہاں ایک نوکرانی ہر وقت اس کے ساتھ رہتی تھی__ نوکرانی زنیرہ کی خدمت کرتی۔ اس کے سر میں تیل لگاتی۔ اس کا پسندیدہ کھانا ٹرالی پہ لگا کے اس کے کمرے میں لے آتی۔ اس کا غسل خانہ چمکا کے رکھتی۔ جہاں روز وہ شاور لیتی الماریوں سے نئے کپڑے نکال کر پہنتی ایئر کنڈیشنر لگا کے سوتی' رات کو ٹی وی دیکھتی' روزانہ آفتاب کی ماں کا انتظار کرتی۔ اور یہ جاننا چاہتی کہ آفتاب جیل سے رہا ہوا ہے یا نہیں__ اور اس کی ماں کب بارات لے کر آئے گی__

ایک دن اس کی نوکرانی اس کے سر میں تیل لگاتے لگاتے باتیں کرنے لگی۔

باجی جی ایک بات پوچھوں__ "پوچھو حمیدہ!

باجی جی __ وہ بہت امیر لوگ ہیں __ وہ __ جہاں آپ گئی تھیں __ ہاں __ وہ بیزاری سے بولی۔

آپ تو شہزادی ہیں شہزادی۔ آپ کا کمرہ بھی شہزادیوں جیسا ہے۔ انہوں نے آپ کو اپنے کمرے میں رکھا تھا__ نہیں انہوں نے تو آپ کو __ شیش محل جیسے کمرے میں رکھا ہوگا__ شیش محل__" زنیرہ چونکی۔

اف! کتنا گندہ کمرہ تھا۔ اور بستر جیسے کبھی چادر نہ بدلی ہو۔ تکیہ کتنا چکنا تھا' چارپائی کے نیچے کتنا گند تھا__ اف باتھ روم! ہمارے سرونٹ کوارٹرز کے باتھ روم اس سے اچھے ہوں گے__ بدبو ہی بدبو تھی وہاں__

نہیں نہیں اس نے اپنے سر کو جھٹکا__ آفتاب مال ٹاؤن میں رہتا ہے۔ وہ بتاتا تھا۔ اس کا گھر بہت خوبصورت ہے__ وہ اکلوتا اس گھر کا وارث ہے__ میں نے ساری زندگی اس کمرے میں نہیں رہنا تھا__ آخر کو وہ اپنے ماں باپ کو منا کر مجھے اپنے گھر لے جاتا__

ادھر ماں جیل کی چوکھٹ پر بیٹھی بیٹے کی منتیں اور ترلے کرتی رہتی کہ وہ اس کاغذ پر دستخط کر کے نجات حاصل کر لے۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی ہے۔ ہم اس کے قابل نہیں ہیں۔ بیٹے کی ایک ہی ضد__ ماں میں نے اس سے وعدہ کیا ہے__ اس سے نکاح کیا ہے کوئی گناہ نہیں کیا۔ میں اس کو گھر لے کر آؤں گا۔ وہ میری محبت ہے۔ میرے لئے گھر بار چھوڑ کر آئی تھی۔ اتنے بڑے بنگلے کو اس نے ٹھکرایا تھا۔ میں جھوٹا پڑ جاؤں۔ میں بے وفا کہلاؤں__ نہیں ماں میں مر جاؤں گا اس کاغذ پر دستخط نہیں کروں گا۔

باپ کہتا۔ اس حرام زادے اکیسویں صدی کے مجنوں کو کہنا__ گھر سے بھاگ کے آنے والی لڑکیاں قابل اعتبار نہیں ہوتیں__

ایک مہینہ اذیت دہ ہوتا ہے۔ جیل کے اندر گزرے یا گھر کے ایک کمرے کے اندر__

باجی جی ـــ اگلے دن نوکرانی پھر اس کے کپڑے استری کرتے ہوئے باتیں کرنے لگی۔

باجی جی ـــ یہ جو آپ کے سکندر بھائی ہیں نا ـــ؟

"کون سکندر بھائی ـــ؟"

ہائے ہائے وہی آپ کے منگیتر!

"بکواس نہ کر"۔ وہ جلدی سے بولی۔

"معاف جی ـــ وہ بات میں نہیں کہہ رہی ـــ یہ دوسری بات ہے۔" زمیرہ چپ رہی ـــ

"وہ روز آتے ہیں۔ آپ کو چھپ چھپ کے دیکھتے ہیں۔ کل بڑی باجی سے کہہ رہے تھے بیگم جان میں نے زوکی کے لئے بہت خوبصورت گھر بنایا ہے۔ وہاں ہی وہاں وہ کیا نام ہے جی امریکہ میں ـــ اور کہہ رہے تھے۔ اس کو کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ وہاں پر عیش کرے گی ـــ میں وہاں نوکر کا بندوبست کر دوں گا۔ اس کو شہزادی بنا کے رکھوں گا ـــ اتنا پیار کرتے ہیں آپ سے ـــ"

بکواس بند کر زمیرہ نے تڑپ کر کہا ـــ

پھر کپڑے پکڑ کے غسل خانے میں چلی گئی ـــ چم چم کرتا باتھ، شیشے کی الماریاں، شیمپو، کنڈیشنر، رنگ برنگے صابن، قد آدم آئینہ ـــ شاور سے نکلی پانی کی ریشمی پھوار ـــ

ایک مہینہ ہو چلا تھا۔ آفتاب ضد پکڑے ہوئے تھا کہ طلاق نہیں دوں گا۔ یہ میرے عشق کی توہین ہے ـــ

وزیر صاحب نے بیٹی کو ایک دن سرزنش نہیں کیا۔ بار بار وہ اخبار میں قول دے رہے تھے ـــ ایک صبح وہ ماں کے کمرے میں گئی اور بولی۔

ماما! اگر میں خود آفتاب سے طلاق کا مطالبہ کر دوں تو کیا آپ اسے رہا کرا دیں گے۔

ماں نے حیران ہو کر بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ عشق کی آگ کی کوئی چنگاری بیٹی کے چہرے پر نہ تھی۔

ہاں اور شرط یہ بھی ہے کہ تم سکندر سے شادی کر کے امریکہ چلی جاؤ گی۔

ماما میرا موبائل لا دو ـــ

ایک مہینے کے بعد لاک اپ میں آفتاب کے فون کی گھنٹی بجی ـــ اس کے بدن کے سارے زخم پھول بن کر مسکرانے لگے ـــ

ہیلو ـــ ہیلو ـــ زمیرہ میری جان ـــ دیکھو میں اپنے وعدے پر ـــ

"شٹ اپ! میں نے سوچ لیا ہے۔ میں تمہارے جیسے گھٹیا انسان کے ساتھ ایک دن نہیں رہ سکتی۔ تم نے مجھے لاک اپ میں رکھا ہوا تھا۔ اف اتنا گندہ گھر، واش روم، بدبو اس سے تو ہمارے سرونٹ کوارٹر بہتر ہوتے ہیں۔ میں خلع کے کاغذ بھیج رہی ہوں۔ سائن کر کے آزاد ہو جاؤ اور اپنے سٹیٹس کی کسی لڑکی سے شادی کر لو! (I Hate U)

فون بند ہو گیا۔

◆◆◆

راز

کلدیپ راج جوشی (انڈیا)

مختصر تعارف

کلدیپ راج جوشی کا جنم 30 اپریل 1934ء کو مٹھڑی (ڈاکٹر گنگا رام جوشی کے ہاں) فورٹ سنڈیمن (بلوچستان) میں ہوا۔ اردو ادب سے بچپن سے ہی لگاؤ تھا لیکن لکھنا گورنمنٹ سروس سے سبکدوشی کے بعد شروع کیا۔ پہلی کہانی "راج کمار" ماہنامہ "تخلیق" فروری 2006ء میں شائع ہوئی جس کی جناب انور سدید، جناب ناصر شہزاد اور کئی قارئین کی طرف سے پذیرائی ہوئی۔ اس کے بعد متعدد افسانے اردو "آج کل" (دہلی)، تخلیق (لاہور)، انتخاب ادب (مظفر پور بہار) اور اسباق (پونہ) میں شائع ہوئے جو کافی پسند کئے گئے۔

جیسے ہی کال بیل بجی مسز آہوجہ نے تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے دروازہ کھولا تو سامنے منگلا کھڑی تھی جس کو دیکھتے ہی مسز آہوجہ بھڑک اٹھیں۔

"آج تیری وجہ سے ہم دونوں دفتر کے لئے لیٹ ہو گئے ہیں۔"

"آپ گاڑی لے کر روانہ ہو جایئے۔ اب آ ہی گئی ہے تو کام کروا کے کیب لے کر نکل جاؤں گی۔"

منگلا آہوجہ فیملی کے ہاں کوئی دو سال سے کام کر رہی تھی۔ عمر بیس کو چھوتی ہوئی۔ گیرا گندمی رنگ، کسا ہوا جسم، تیکھے نقش، لمبے سیاہ بال۔ منگلا نے آہوجہ فیملی کے علاوہ دو اور فلیٹ بھی پکڑ رکھے تھے۔ اس کی ماں بھی اسی ٹاور میں کئی گھروں میں کام کرتی تھی۔ ماں بیٹی دونوں مل کر گھر کے گذارے کے لئے اچھا کما لیتی تھیں۔ منگلا کا بھائی چوتھی کلاس میں سرکاری سکول میں پڑھتا تھا۔ منگلا اکثر کہتی "میں گھر کے حالات کی وجہ سے تعلیم حاصل نہ کر سکی لیکن میں نے مصمم ارادہ کر رکھا ہے کہ بھائی کو ہر حالت میں اچھی تعلیم دلواؤں گی۔" منگلا کا کام اچھا تسلی بخش تھا اور شکایت کا موقع کم ہی دیتی۔ سارے ٹاور میں منگلا اچھے کام کے لئے کافی مشہور تھی۔ ان سب کے باوجود کبھی کبھی منگلا کام پر آتی تو چہرہ اداس، بکھرے بال ڈھیلے ڈھالے لباس میں کام پر آتی جسے دیکھ کر ہر ایک تجسس ہوتا کہ ہمیشہ مسکرانے والی، کھلے چہرے والی منگلا آج اداس کیوں ہو جاتی ہے۔ اداسی کی وجہ سے کام بھی بے دلی سے کرتی۔ منگلا تو منگلا اس دن اس کی ماں کا بھی یہی حال ہوتا۔

آج بھی جب مسز آہوجہ نے دروازہ کھولا تو منگلا کے چہرے پر اداسی تسلط جمائے بیٹھی تھی۔ دفتر کی جلدی کی وجہ سے مسز آہوجہ نے منگلا سے کچھ نہ پوچھا، کام ختم کر کے منگلا کے جاتے ہی فلیٹ کو قفل لگا کر دفتر کی طرف روانہ ہو گئی۔ سارے راستے کیب میں بیٹھے بیٹھے مسز آہوجہ کی آنکھوں کے سامنے منگلا کا اداس چہرہ بار بار ابھر رہا تھا۔ کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ منگلا آج اداس کیوں تھی۔ کئی خدشات من میں جنم لے رہے تھے۔ "وہ آج بہت اداس تھی۔ مجھے وجہ پوچھنا چاہئے تھی لیکن دفتر کی جلدی کی وجہ سے میں کچھ بول ہی نہیں پائی۔"

شام کو منگلا کام پر آئی تو کچھ سنبھلی ہوئی تھی اور آتے ہی کام پر لگ گئی۔ مسز آہوجہ نے کئی بار پوچھنے کی کوشش کی لیکن ہر بار بات

زبان پر آ کر اٹک جاتی۔ ایسا کئی بار ہوا۔ مسکراتے چہرے، اچھا لباس پہننے والی، بالوں کو ترتیب سے رکھنے والی منگلا بہت اداس ہو جاتی۔ ان حالات میں کام پر بھی جب آتی تو بے ترتیب بال، بے ڈھنگے لباس کے ساتھ آتی۔ کام تو گھروں میں کرتی لیکن اس کے کام کرنے کے انداز سے اکتاہٹ ظاہر ہوتی۔ ادھر اس کی ماں کا بھی یہی حال ہوتا۔ بار بار پوچھنے پر ماں کہتی "آج گھر میں جھگڑا ہو گیا تھا۔ منگلا کے باپو نے ہم دونوں کو خوب مار لگائی ہے۔" مارنے کی وجہ دریافت کرنے پر دونوں خاموش رہتیں اور راز صیغۂ راز ہی رہتا۔ ذہنوں میں کئی سوال جنم لیتے۔ "دونوں دن رات محنت کر کے پیسے کماتی ہیں۔ گھر کا گزارہ چلاتی ہیں اور وہ سارا دن گھر میں ہی پڑا رہتا ہے۔ پھر یہ دونوں کیوں مار کھاتی ہیں۔" بار بار پوچھنے پر بھی ماں بیٹی بس یہ کہہ دیتیں "گھر میں لڑائی ہوئی تھی، باپو نے مارا ہے" بس اس سے آگے کچھ نہیں۔ اصلی وجہ راز ہی رہتی۔ مسز میر چند دنوں کے لئے اپنے میکے گئی ہوئی تھیں۔ چھٹی کا دن تھا۔ مسٹر میر گھر پر اکیلے ہی تھے۔ مقررہ وقت پر منگلا کام پر آ گئی اور آتے ہی اپنے کام میں مشغول ہو گئی۔ مسٹر میر نے دیکھا منگلا آج پھر اداس ہے۔ چہرے پر بے رونقی ہے۔ بال بے ترتیب ہیں اور لباس بھی ڈھیلا ڈھالا ہے۔ منگلا اپنے کام میں منہمک تھی کہ کمرے میں سے مسٹر میر نے آواز دی۔ "بیٹی منگلا ذرا ایک گلاس پانی تو پلانا" منگلا پانی کا گلاس رکھ کر جانے لگی تو میر صاحب نے اس کی کلائی پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ "بیٹی کیا بات ہے۔ آج تم اتنی اداس کیوں ہو"۔ "باپو نے کل رات پھر گھر میں لڑائی ہو گئی اور باپو نے ہم دونوں کی خوب پٹائی کی۔ بھائی نے مداخلت کی تو اس معصوم کو بھی نہیں چھوڑا۔" یہ کہتے کہتے منگلا کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ میر صاحب نے اپنے رومال سے منگلا کی آنکھیں پونچھ دیں۔ "نہ جانے وہ کیسا ظالم باپ ہے جو اتنی اچھی اور معصوم لڑکی کو آئے دن مارتا رہتا ہے۔ منگلا میں ایک دن تمہارے گھر جاؤں گا اور تمہارے باپ کی اچھی خبر لے کر آؤں گا۔" "کوئی فائدہ نہیں باپو کی عادت آپ لوگوں کی سمجھ سے باہر ہے۔" اسی دوران میر صاحب نے منگلا کو آہستہ اور قریب کھینچ لیا۔ "بیٹی کوئی زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔" "بس باپو کی ٹانگ پر آتی زور کی لاٹھی ماری نہ جانے کیسے ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی۔" "دکھاؤ تو ذرا" منگلا نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی ہی شلوار گھٹنوں تک اوپر کر دی۔

"اوہو ساری ٹانگ پر نیلے نیلے نشان پڑے ہیں۔" "تم ماں بیٹی پولیس میں رپٹ کیوں نہیں لکھوا دیتیں۔" اتنا کہتے کہتے میر صاحب نے منگلا کو اور قریب کھینچ لیا اور پیچھے سے منگلا کے کرتے کو اونچا کرتے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں سے پیٹھ کو سہلانے لگے۔ "ارے یہاں تو ساری پیٹھ ہی نیلی ہوئی پڑی ہے۔ پیٹ پر بھی لاٹھی پڑی لگتی ہے۔" ادھر میر صاحب کی انگلیاں متواتر منگلا کی پیٹھ پر بھی اور پیٹ پر بھی تیر رہی تھیں۔ عورت ذات کو قدرت نے یہ قوت احساس بخشی ہے کہ اسے چھوٹی عمر سے ہی احساس ہو جاتا ہے کہ اس کے جسم پر پڑنے والا مرد کا ہاتھ شفقت کا ہے یا ہوس کا۔ مرد کی آنکھوں میں جھانک کر ہی مرد کی آنکھوں میں جنم لیتی حیوانیت اور جنسیت کی پہچان ہو جاتی ہے۔ منگلا کو بھی ایسے ہی احساس نے آ دبوچا۔ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور للکارنے لگی۔

"چھوڑیئے بابو جی اپنی ہمدردانہ اور شفقت کے الفاظ کو۔ میں سامنے کھڑی ہوں جو آپ کرنا چاہتے ہیں کر لیں۔ جس باپ کی میں بیٹی ہوں اس نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ تو صرف منہ سے ہی بیٹی بیٹی پکارتے ہیں۔" میر صاحب کے ہاتھ کی پکڑ جو ابھی تک منگلا کی کلائی پر تھی ڈھیلی پڑ گئی۔ ماتھے پر پسینے کی بوندیں نمودار ہو گئیں اور جسم کانپنے لگا۔ منگلا نے زہر آلود نگاہوں سے میر صاحب کو دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

◆◆◆

اپنی کہانی

طارق بلوچ صحرائی

مختصر تعارف

طارق بلوچ صحرائی 12 اگست 1967ء کو ریالہ خورد میں پیدا ہوئے۔ سات کتابیں لکھیں۔ دو افسانوی مجموعوں کو خوب پذیرائی ملی۔ کتاب "سوال کی موت" کو یو۔بی۔ایل ایوارڈ کے لئے نامزد کیا گیا۔ "گونگے کا خواب" کا دیباچہ بانو قدسیہ صاحبہ کی زندگی کی آخری تحریر ہے۔

رحمت اللہ بلوچ جب اپنے دوست غلام محمد خان کو دفنانے کے بعد گھر پہنچا تو آپ کی آنکھوں میں صحرائی پیاس جیسا کرب تھا اپنی گھر والی سے بولا" نیک بخت مرحوم کے تینوں بیٹے باپ کو کندھا دے سکے نہ کسی ایک کو اطلاع ملی اور وہ کو فلائیٹ نہ مل سکی۔ جنازے میں لوگ بہت کم تھے ویسے غلام محمد خان نے دشمن بھی تو بہت پال رکھے تھے" وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا ہمارے جنازے سکڑتے جا رہے ہیں زمانہ جاہلیت میں عرب کی ایک وادی میں دو قبیلوں کے سرداروں کے درمیان کسی بات پر ٹھن گئی ہوئی دونوں قبائل کی طرف سے تلواریں نیام سے باہر نکل آئیں اس سے پہلے کہ خون کی ندیاں بہہ جاتیں اور لاشوں کا رقص شروع ہو جاتا ان میں سے ایک سردار نے تلوار نیام میں ڈالی اور بولا میں لڑائی سے دستبردار ہوتا ہوں مگر ہم دونوں میں سچا کون تھا اس کا فیصلہ ہمارے جنازے کریں گے۔

اداسیاں میرے عہد کی علامت ہیں تعبیر کے ڈر سے خواب سہمے رہتے ہیں عشق کی اس قحط سالی میں عاشق بھکاری بن گئے ہیں پُراسرار تنہائیوں نے لوگوں کو اندر سے خالی کر دیا ہے۔ تنہا مزاروں کو چپ سی لگ گئی ہے بزرگوں کے دکھ بھی بچوں کی طرح روتے ہیں۔ ہجرت کے جنون نے لوگوں کو اندر سے خالی کر دیا ہے بانسری بھی تو اسی لئے روتی ہے کہ وہ اندر سے خالی ہے۔ دادا دادی کے اندر برسات جاری تھی آنکھیں نم تھیں مگر پوتوں کی محبت انہیں رونے نہیں دے رہی تھی۔ ان کے تینوں پوتے پہلی بار پاکستان آئے تھے۔ ان کی عمریں 9 سے 14 سال تک کے درمیان تھیں ان کے ماں باپ نے بچوں کے بے حد اصرار پر بڑا حوصلہ کر کے پاکستان دادا دادی کے پاس بھیجا تھا رحمت اللہ بلوچ کے تینوں بیٹے جب سے امریکہ گئے تھے ایک بار بھی پلٹ کر اپنے وطن نہیں آئے تھے۔ سب کی شادیاں بھی امریکہ میں ہوئی تھیں۔ البتہ رحمت اللہ اور اس کی بیوی رسائی مائی امریکہ میں اپنے بچوں سے ملنے کبھی کبھار آتے جاتے رہتے تھے۔ گاؤں والے انہیں خوش قسمت تصور کرتے تھے۔ یہ بہاولپور کے قریب چولستان کا علاقہ تھا اس دن حسب معمول سخت گرمی تھی۔ سب کی نظریں آسمان پر لگی ہوئی تھیں کہیں دور بادلوں کے چند آوارہ ٹکڑے "آنکھ مچولی" کھیل رہے تھے۔ خشک ہونٹ دعا کے لئے بغیر آواز کے ہل رہے تھے۔ چولستانیوں کی صرف دو مرغوب دعائیں ہیں باران رحمت کے نزول کی دعا اور پھر "لُکھ" (صحرائی ہوا) کے چلنے کی دعا چولستان میں جتنا پانی سب سے بڑی رحمت اور سوغات سمجھا جاتا ہے یہاں اس کا واحد ذریعہ بارش ہے چولستانی بارش کے پانی کو "ٹوبھوں" اور کنڈوں میں

محفوظ کر لیتے ہیں۔ صحرا خاموشی کی زبان میں ہم کلام ہوتا ہے صحرا والوں کا گہوارہ اور دردمندوں کا مسکن ہوتا ہے۔ گہرائی سے چولستان کی پھیلی ہوئی وسعتوں پر حکمرانی کرتا ہے خاموشی کے اس راج کو ان کے اپنے بھی شکست نہیں دے سکتے۔ صحرا پیاسے کو حوصلہ دیتے ہوئے خود بھی رونے لگتا ہے۔ فطرت کو بھی وہ لوگ بہت اچھے لگتے ہیں جو دوسروں کو دلاسا اور حوصلہ دیتے ہوئے خود بھی رونے لگتے ہیں۔ صدیوں پہلے یہاں ایک بڑا دریا بہتا تھا اس دریا کا نام ہاکڑہ تھا۔ ہاکڑہ ایک عظیم دریا تھا پھر معلوم نہیں کیا ہوا دریا سوکھ گیا ساری ہریالی ختم ہوگئی بہاروں نے پودوں اور پھولوں کو رنگ رنگ کے لباس پہنانا بند کر دیے۔ درخت جو خاموش رونق ہوتے ہیں سوکھی ٹہنیوں کا غم برداشت نہ کر سکے اور وہ اس کی موت کا شکار ہو گئے۔ ریت ہی ریت باقی رہ گئی۔ اب یہاں دریا تو کب کا فنا ہو چکا مگر اس کی اجڑی ہوئی راہگزر، ویرانوں کی حیرت زدہ تنہائی صحرائے چولستان میں آج بھی نوحہ کناں ہے۔ دریا کیوں سوکھ جاتے ہیں؟ عظیم دریا ہاکڑہ کیوں صحرا بنا؟ اس بارے میں تاریخ خاموش ہے کیونکہ تاریخ بھی ہار قبول نہیں کرتی یہ صرف فتوحات لکھتی ہے۔ کسی درویش کا کہنا ہے جس دریا کے کنارے کوئی پیاسا مر جائے وہ دریا سوکھ جایا کرتے ہیں۔ حقیقت کیا ہے یہ صرف اہل دل اور اہل ذکر ہی جانتے ہیں یہ لوگ یہ بھی جانتے ہیں غلام قومیں صرف دوسروں کی جنگوں پر جھگڑتی ہیں اور تاریخ میں زندہ رہنے کے لئے آزاد ہونا پڑتا ہے۔

حضرت خواجہ غلام فریدؒ نے اپنی حیات کے اٹھارہ برس اسی صحرا میں گزارے وہ جانتے تھے صحرائی لوگ بڑے دریا دل ہوتے تھے اور صحرا بچھڑنے والوں کو ملانے والا ہے اور خود شناسی و خدا شناسی کے موتی اسی صحرا کے دامن سے چھلکتے ہیں۔ آفتاب کا شیر اپنی کچھار میں جا چکا تھا صحرا نے بھی اونٹ کی طرح اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ تمام پوتے دادا دادی کے گرد جمع تھے اور یہاں کی روایت کے مطابق بچے رات سونے سے پہلے کہانی نانی یا دادی سے سن کر سوتے تھے۔ دادی نے پہلے سب کو دودھ لا کر دیا اور پھر کہانی سنانا شروع کی۔ تمام پوتے غور سے سننے لگے۔ چلو یہ ایک چولستانی لوک کہانی ہے۔

ایک بڑھیا تنور تپانے کی غرض سے دانے بھون رہی تھی پاس ہی درخت پر ایک کوا آ کے بیٹھا تھا جونہی بڑھیا کی نظریں ٹوکری سے ہٹیں کوا تیزی سے لپکا اور ٹوکری سے ایک بھنا ہوا دانہ اٹھا کر درخت پر جا بیٹھا بڑھیا کوے کی حرکت دیکھ کر آگ بگولا ہوگئی اس نے کوے سے کہا میرا بھنا ہوا دانہ واپس دے۔ اپنی بات منوانے کے لئے منت سماجت بھی کی مگر کوا نہ مانا۔ بولا نہیں لوٹاتا کرلے میرا کیا کرتی ہے۔ اس پر بڑھیا کو بہت غصہ آیا وہ درخت کے پاس گئی کہنے لگی اے درخت! اے درخت! میرا کہا مان اپنی شاخوں کو زور زور سے ہلا کوے کو اڑا دے جھٹکے دے" میں کوے کو کیوں اڑاؤں" درخت نے جواب دیا بھلا اس نے میرا کیا بگاڑا ہے؟ بڑھیا درخت سے بھی بگڑ گئی۔ کہنے لگی اے ترکھان! اے ترکھان درخت میرا کہنا نہیں مانتا ابھی چل اور اس کو کاٹ۔ ترکھان بولا میں کیوں درخت کو کاٹوں؟ بھلا اس نے میرا کیا بگاڑا ہے؟

"دادی! یہ درخت اور کوے بھلا انسانوں سے کیسے بات کر لیتے ہیں؟ میرے ساتھ تو نہیں بولتے" چھوٹے پوتے نے سوال کیا۔

دادی اور دادا مسکرائے۔ دادا بولا ہر چیز کائنات کی ہر شے بولتی، سنتی اور محسوس کرتی ہے صرف انسان بے حس اور خود غرض ہے جو اپنے مفاد کے سوا گونگا بہرہ اور اندھا ہو جاتا ہے۔ دادی نے کہانی جاری رکھی۔

"اب کیا تھا بڑھیا کا پارہ اور بھی بڑھ گیا سیدھی کوتوال کے پاس پہنچی۔ بولی کوتوال! کوتوال! ترکھان کو قید کر لے وہ درخت نہیں کاٹتا کوتوال نے کہا" بی بڑھیا! ترکھان نے کوئی جرم کیا ہو تو میں اس کو قید کروں بلا وجہ ایسا نہ کروں گا۔" یہ سن کر بڑھیا کا غصہ اور بڑھ گیا "سپاہی" کچھ نہ

رہے" بوحیا نے غصے میں کہا "ابھی میں بادشاہ سے کہہ کر تیری نوکری ختم کرواتی ہوں" بوحیا شاہی دربار پہنچی اور کوتوال کے خلاف فریاد کی۔ بادشاہ نے بوحیا کو الٹا ڈانٹ پلا دی بادشاہ نے کہا "جب تک کوتوال اپنا کام ٹھیک ٹھاک کرتا ہے میں اسے نوکری سے کیوں نکالوں؟"

بوحیا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی، سوچنے لگی اب کیا کروں؟ کیوں نہ محل کے اندر جا کر ملکہ کو لگائی بجھائی کروں" یہ خیال آتے ہی وہ محل کے اندر پہنچی اور رو رو کر اپنی روئیداد ملکہ کو سنائی۔ بولی "اے ملکہ! اے ملکہ تم بادشاہ سے روٹھ جاؤ کیونکہ اس نے میری فریاد نہیں سنی" "دیوانی ہوگئی ہو کیا" ملکہ نے کڑک کر جواب دیا "اپنے سرتاج سے بھلا میں کیوں روٹھ جاؤں؟" "تمہارا ہی بوحیا جا اور جا کر اپنا کام کر کیوں پھرتی ہے ادھر ادھر آگ لگاتی؟" اب کیا تھا بوحیا کی ہمت جواب دینے لگی لیکن وہ ہمت ہارنے والی نہ تھی وہ ملکہ سے بدلہ لینے کی راہ سوچنے لگی۔ آخر اس کو ایک راہ سجھائی دی سیدھی دریا کے پاس پہنچی اور رو رو کر اپنی دکھ بھری کہانی سنائی۔

"اے دریا! اے دریا تو مجھ دکھیا کی مدد کر اپنا رخ ملکہ کے محل کی طرف موڑ لے تاکہ ملکہ کا محل غرق ہو جائے۔"

"پھر دریا نے کیا کہا؟" مجھلے پوتے نے بے چینی سے پوچھا۔

"سب سے بڑا ظرف اور اصول فطرت کا ہوتا ہے بیٹا اور دریا تو قانون فطرت پر چلتے ہیں یہ سب کو سیراب کرتے کرتے چلتے جاتے ہیں۔ مخلوق کی خدمت کرتے جاتے ہیں مگر صلہ لینے کے لئے رکتے نہیں ان کی منزل سمندر ہوتی ہے۔ جو "مسلسل" اور "مرکز" کی طرف سفر شاید یہ سبق ہمارے لئے بھی ہے۔

دادو نے کہانی جاری رکھی۔ "بوحیا کی فریاد سن کر دریا کا دل پسیج گیا دریا نے اپنا رخ بدل لیا دیکھتے ہی دیکھتے دریا کا پانی شاہی محل کی طرف بڑھنے لگا ملکہ نے جب طوفانی موجوں کو محل کی طرف بڑھتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ یہ بوحیا کی بددعا کا اثر ہوگا اس نے جھٹ سے بوحیا کو بلا کر کہا "میں تیرے کہے کے مطابق بادشاہ سے روٹھ جاؤں گی خدا کے لئے دریا کو روک لے وہ میرا محل تباہ نہ کرے۔"

بادشاہ کو ملکہ کے ارادے کی خبر ہوئی تو وہ بولا "رانی... رانی مجھ سے نہ روٹھو میں ابھی کوتوال کو نوکری سے نکالتا ہوں" کوتوال نے سنا تو اسے اپنی جان کے لالے پڑ گئے بولا "میں ابھی ترکھان کو قید کرتا ہوں بادشاہ کے غضب سے مجھے بچا۔" ترکھان کو خبر ہوئی تو "اس نے کہا میں ابھی درخت کو کاٹتا ہوں مجھے حوالات میں بند نہ کر۔" درخت یہ ماجرا دیکھ کر چلا اٹھا "میں ابھی کوے کو اڑاتا ہوں مجھے کاٹو نہیں" یہ دیکھ کر کوا بولا "مجھے نہ اڑاؤ میں ابھی بھنا ہوا دانہ لوٹاتا ہوں۔" کوے نے بھنا ہوا دانہ اٹھا کر بوحیا کی ٹوکری میں ڈال دیا یوں یہ چولستان کی ایک لوک کہانی اختتام کو پہنچی ہے۔

تمام بچے خوش ہو گئے تھے دادو آپ دونوں گریٹ ہیں ابو بھی آپ دونوں کو بہت چاہتے ہیں۔ رحمت اللہ بلوچ نے اپنے پوتوں کی طرف دیکھا اپنی آنکھوں میں لرزتے ہوئے موتیوں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا اور بولا "کسی کی ذات سے انکار کر کے اور اس کے وجود کو مسمار کر کے جیا بھی جائے تو کیا حاصل؟ آؤ بچو میں بھی تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔ یہ کہانی ایک اداس رحمان خان چارپائی کی کہانی ہے۔ بیٹا ہم سب کہانیوں میں رہتے ہیں ان سے نکلنے کا واحد راستہ انجام ہے۔

صحرائے چولستان کا ایک چرواہا تھا اس کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے اس نے دن رات محنت کر کے ان کو پالا اور پڑھایا لکھایا خود روکھی سوکھی کھائی تاکہ ان کو تعلیم دلائی۔ ماں باپ چاہتے تھے وہ جوان ہو کر ان کے بڑھاپے کا سہارا بنیں مگر وہ پڑھ لکھ کر امریکہ چلے گئے۔ ماں باپ ان کی راہ تکتے رہتے تھے مگر وہ کبھی نہ لوٹے پھر بیٹوں نے ماں باپ کو بھی امریکہ بلا لیا مگر وہ لوٹ آئے۔ اب بھی وہ گی

بھی امریکہ آتے جاتے رہتے ہیں گاؤں والے سمجھتے تھے کہ یہ دونوں بہت خوش قسمت ہیں ان کے بچے باہر خوشحال زندگی گزار رہے ہیں۔ مگر وہ یہ سوچا جاتا تھا کہ وہ جب تک ملک سے باہر رہیں گے سفر میں رہیں گے صحرا نشینوں کا قول ہے کہ سفر انسان کا دشمن ہے اُسے جتنی جلدی ممکن ہو ختم کر دینا چاہیے مگر اس کے بچے دنیا کی بھیڑ میں گم ہو گئے تھے۔ یہ ہجوم طاقت تو دیتا ہے مگر شناخت چھین لیتا ہے۔ صحرا کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ شناخت دیتا ہے۔ میرے بچے جب عمر ڈھل جاتی ہے تو ماں باپ زندگی کی آسیبی گھروں کے سامنے رہنے والے بچوں سے لپٹتے ہیں۔ انسان جب عمر کے دھاگے میں اپنے زخم پروتا ہے تو اولاد کی جدائی کے درد کو سب سے پہلے پروتا ہے کیونکہ صحرا نشینوں کا قول ہے صحرا کا بھولا بھی گھر نہیں آتا جب انسان صرف اپنی ذات کے لئے جینے کے سرطان میں مبتلا ہو جائے اور احساس کے منصور کو سولی پر چڑھا جائے تو دوستوں کی محفل میں بھی شب ہجراں کا گمان ہونے لگتا ہے۔

والدین امریکہ اپنے بچوں سے ملنے جاتے اور ان سے شمشی آنکھوں سے ملک واپس پلٹ آنے کی التجا کرتے اور ان سے کہتے بیٹا ماں باپ کی زندگی صرف بچوں سے ہوتی ہے۔ اولاد کی جدائی میں ماں باپ قبر میں پڑی اس لاش کی طرح ہوتے ہیں جو اپنی کفن کاٹ رہی ہو۔ مگر ان کے بیٹے ملک واپس آنے سے گریزاں تھے۔ والدین کچھ عرصہ ان کے ہاں گزارتے اور پھر چولستان اور اپنے ملک کی صدا انہیں واپس لے آتی۔ گاؤں والے اور عزیز و اقارب انہیں خوش اور نصیبوں والے سمجھتے تھے مگر وہ دونوں یہ جانتے تھے کہ وہ اس خالی چارپائی کی طرح بے وقعت اور بے فائدہ تھے جو میت کو دفنانے کے بعد قبرستان سے کسی ملازم کے ہاتھ واپس گھر پہنچا دی جاتی ہے۔ تمام بچے خاموشی اور غور سے دادا سے کہانی سن رہے تھے رحمت اللہ بلوچ اور اس کی بیوی رسالی مائی کی آنکھوں کے "ٹوٹے" گلاب بن چکے تھے۔ ہمارے پوتے نے اپنے دونوں چچازاد بھائیوں کے کانوں میں سرگوشی کی۔ یہ تو دادا کی اپنی ہی کہانی ہے۔

◆◆◆

تخلیق ایوارڈ 2012ء سے 2017ء تک

ماہنامہ "تخلیق" اب تک پانچ "تخلیق ایوارڈ" دے چکا ہے

1	2012ء	جناب شفیع عقیل صاحب	(کراچی)	021-34816655
2	2013ء	جناب ڈاکٹر انور سدید صاحب	(لاہور)	0334-9719278
3	2014ء	محترمہ بانو قدسیہ صاحبہ	(لاہور)	0333-4221870
4	2015ء	محترمہ قمر جہاں صاحبہ	(امریکہ)	001-3109870978
-5	2016ء	محترمہ عذرا اصغر صاحبہ	(کراچی)	0300-8839895

نوٹ: 2017ء کا "تخلیق ایوارڈ" پروفیسر حسن عسکری کاظمی کو دیا جا رہا ہے

آتش دان اور برف کی سِل

احسان بن مجید

مختصر تعارف

احسان بن مجید 20 فروری 1950ء کو پیدا ہوئے۔ بی اے گورنمنٹ کالج کیمبل پور (اٹک) سے 1970ء میں کیا۔ دورانِ تعلیم ہی اردو افسانے کی طرف رجوع ہوئے۔ یوں پہلی کہانی "خوشی کے آنسو" 1964ء میں روزنامہ "جنگ" کے بچوں کے صفحہ میں شائع ہوئی۔ روزگار کے سلسلہ میں ادبی مصروفیات میں طویل وقفہ آیا اور 1989ء میں افسانے نے پھر اُن کا دامن کھینچا۔ جب سے اب تک ملک کے معروف ادبی رسائل میں ان کے افسانے شائع ہو چکے ہیں۔ اب تک دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں: (1) موم کا پتھر — 2012ء (2) آنکھوں کے ساگر — 2014ء (افسانوی سفر جاری ہے۔

پلاسٹک کی نئی جوتیوں سے بھرا جھولا اپنی پیٹھ پر لادتے ہوئے اس نے اپنی بیوی سے نظریں چرائیں اور چادر سے منہ لپیٹ کر گھر سے نکل گیا۔ راستے بھر اسے یوں لگتا رہا جیسے اس کے جسم کی مٹی بھر بھری ہو کر گرتی جا رہی ہے۔ نظریں زمین پر گڑے ہوئے پون گھنٹے کے بعد مختلف گلیوں سے گزرتا وہ ایسے کھلے میدان میں پہنچ گیا جہاں شہر کا اتوار بازار لگتا تھا۔ اس نے جھولا زمین پر پھینکا اور سانسیں درست ہونے کے وقفے تک کھڑا رہا۔ میدان میں سبزی کی دکانیں، کریانہ کا سامان، کپڑوں کی دکانیں، پکوڑوں اور فروٹ کی ریڑھیاں، پان بیڑی سگریٹ اور چائے کے کھوکھے لگ چکے تھے اور ضرورت مندوں کو متوجہ کرنے کے لیے طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ جھکا، پتلی رسی سے بندھے جھولے کا منہ کھولا، ایک خستہ حال چادر نکال کر زمین پر بچھاتے ہوئے جھولا اس کے اوپر الٹ دیا۔ جوتیوں کا ایک انبار لگ گیا تھا۔ وہ پاؤں پر بیٹھ کر مختلف نمبروں کے جوڑے الگ کرنے لگا۔ اس کے پاس تمام زنانہ جوڑے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ گاؤں سے آنے والی خواتین اس سے کچھ جوڑے ضرور خریدیں گی جس سے اس کو تھوڑی بہت بچت ہو جائے گی۔ چند جوڑے الگ کرنے کے بعد وہ زمین پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا۔ گنوار کہیں کا! اس نے دائیں بائیں دیکھا لیکن یہ آواز کہیں اور سے نہیں اس کے اندر سے آئی تھی۔ وہ تو کرسی پر بھی سلیقے سے بیٹھتا تھا۔ وہ بات اب پرانی ہو چکی یہ وقت کو سلام کرنے کا ہے۔ اس نے پہلے ایسا کیوں نہیں سوچا۔ یہ خیال آتے ہی وہ کھڑا ہو کر گاہک کا انتظار کرنے لگا۔ اتوار بازار میں چہل پہل مسلسل بڑھ رہی تھی۔ لیکن مجال جو اس کے سامنے پڑی جوتیوں کی طرف منہ بھی کرتا۔ قریب کے گاؤں سے بہت ساری عورتیں سر پر بوجھ رکھے، کچھ پرانی جوتیاں پہنے پاؤں گھسیٹتی اس کی طرف آتیں تو اس کی امید بندھ جاتی لیکن وہ اس کے سامنے سے گزر کر پکوڑوں والی ریڑھی پر جا رکتیں تو اس کا جی چاہتا دہاڑیں مار کر رو دے۔ مسلسل ایک ڈیڑھ گھنٹہ کھڑا رہنے سے اس کی ٹانگیں دُکھنے لگی تھیں۔

دس روپے دو بھئی! اس کے سامنے کھڑا ہوا نوجوان بغل میں کاپی دبائے ایک رسید اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

کس بات کے! اس نے سوال کیا۔ حکومتی زمین کے اتنے حصہ کا کرایہ جس پر تم آج کاروبار کر رہے ہو! سرکاری اہل کار نے جواب دیا۔ لیکن میں تو اس وقت تک ایک جوڑا بھی نہیں بیچ سکا! اس نے جواز پیش کیا۔ اور یار تم دس روپے دو۔ بحث نہیں کرو! اہل کار کی آنکھیں پیشانی پر جا لگی تھیں۔

اس سے قبل کہ وہ اس کی مزید توہین کرتا، اس نے رسید لیتے ہوئے فوراً دس کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا لیکن اسے یوں لگا جیسے اس کی جیب سے دس نہیں، ہزار روپے چلے گئے ہوں۔ اسے اپنا چہرہ چھپتا محسوس ہوا۔ بالکل ایسے جیسے کرچیاں ہوئے آئینے میں کوئی اپنے چہرے کے کئی حصے دیکھ لے۔

اگر آج وہ ایک جوڑا بھی نہیں بیچ سکا تو!! ایک جان لیوا سا خیال اسے پریشان کر گیا۔

تو آج وہ بیوی سے گھر نہیں جائے گا، سیدھا ریلوے اسٹیشن جائے گا اور آتی ٹرین کے آگے کود کر خودکشی کر لے گا! اس نے جیسے پکا ارادہ کر لیا تھا۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس کے کانوں میں ریل کی چھک چھک اور سیٹیاں بجنے لگی تھیں۔ شام کے چار بج رہے تھے اور اکثر لوگ اتوار بازار سے خریداری کر کے واپس جا چکے تھے۔ گاؤں کی عورتیں بھی واپس چلی گئی تھیں۔ اس نے جھولا سیدھا کیا اور یہ سوچتے ہوئے جوتیاں اس میں بھرنے لگا کہ شاید کل کی شام اس کے نصیب میں نہیں ہے۔ اس نے حسرت بھری ساقی نظروں سے اپنے اطراف میں دیکھا، بہت سے مطمئن اور غیر مطمئن چہرے اس نے دیکھے لیکن ان میں اس جیسا زندگی سے مایوس کوئی نہیں تھا۔

اسے اپنے اچھے دن یاد آئے جب ابتدائی میں وہ ورکشاپ منیجر کا سیکرٹری تھا۔ کشادہ ایئر کنڈیشنڈ دفتر میں اس کی میز پر دو ٹیلی فون اور ایک انٹرکام ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ کمپنی کی گاڑی صبح دفتر لے آتی اور چار بجے واپس رہائش گاہ چھوڑ آتی۔ اس وقت اس کے نخرے دیدنی تھے۔ پھر جانے کیا ہوا۔ اچھے دن شاید چند لمحوں کا خواب تھا، اس کی آنکھ کھل گئی تھی اور اب وہ اس خواب کی بھیانک تعبیر دیکھ رہا تھا بلکہ سہہ رہا تھا۔ اگرچہ وہ ہاتھ کی لکیروں اور ستاروں کی چال پر یقین نہیں رکھتا تھا تاہم اس نے کچھ بعد میں اپنی دونوں ہتھیلیاں دیکھیں اور بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے سر کو دائیں بائیں جنبش دی اور باقی جوتیاں جھولے میں ڈالنے لگا۔ بیوی سے شرمساری کے باعث وہ کڑھ رہا تھا، اندر ہی اندر جل رہا تھا لیکن اچانک اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔ یہاں سے اٹھ کر وہ کون سا گھر جائے گا جو بیوی کی جلی کٹی سنے گا۔ جب اسے گھر نہیں جانا تو زندگی کے آخری لمحوں میں جوتیوں بھرے جھولے کا بوجھ کیوں اٹھائے، یہ سوچتے ہوئے اس نے ہاتھ میں پکڑا جوڑا واپس زمین پر رکھ دیا۔

بازار ختم ہو گیا بھائی! ایک شخص اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد مکمل ختم ہو جائے گا! اس نے زمین میں پیوست ہوتی نظریں اوپر اٹھائیں اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

تم چپلیں بیچتے ہو! وہ شخص ایک جوڑا اٹھا کر الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ جی ہاں لالہ! آپ تو بیچنے ہی کے لیے تھا! اس کے لہجے سے شکستہ دلی واضح تھی۔ ... کیا مطلب اس نے چپلوں کا جوڑا زمین پر رکھا اور اس کے چہرے پر نظریں جمادیں۔

مطلب یہ کہ صبح سے اب تک میں چپلوں کا ایک جوڑا بھی نہیں بیچ سکا۔ کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ آپ پہلے شخص ہیں جو اس وقت

میرے سامنے گاہک کے روپ میں کھڑے ہیں! لگتا تھا کہ وہ ایک جملہ بھی اور بولتا تو آنسو آنکھوں سے اتر اس کی مونچھوں میں گم ہو جاتے۔ گھبراؤ نہیں، سارے دن کی کسر اب نکل جائے گی، یہ چپلیں میری ہوئیں، قیمت بتاؤ! اس نے انتہائی اعتماد سے کہا۔

یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں! اسے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ چلو مت مارو اور یہ جھولا میری گاڑی کی ڈکی میں رکھ دو، میری بات تم سمجھ رہے ہو گے! اس کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔

لیکن سر آپ اتنی ساری...... اس سے حیرانی جذب نہیں ہو سکی تھی۔ ہاں بھئی ہاں چلو! اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

اس نے جھولا اپنے کندھوں پر رکھا تو خوش گوار سا احساس ہوا۔ چند قدم کے فاصلے پر کھڑی گاڑی کی کھلی ڈکی میں جھولا رکھا اور لمحہ بھر کے لیے رک گیا۔ اس نے واسکٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر پیسے نکالے اور گن کر بارہ سو روپے اس کی طرف بڑھا دیے۔ یہ تو بہت زیادہ ہیں جناب! تم محنتی ہونے کے ساتھ دیانت دار بھی ہو، رکھ لو اور سنو تم مجھے پڑھے لکھے لگتے ہو! اس نے سوالیہ انداز میں اس کے سراپے کا جائزہ لیا۔ آپ ٹھیک سمجھے، میں ایک ٹریڈنگ کمپنی کے منیجر کا سیکرٹری رہ چکا ہوں! اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ ڈالی۔ گڈ! کل صبح تم اپنے کاغذات لے کر روبی انٹرپرائزر کے دفتر آ جاؤ! اس نے کہا اور گاڑی سٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

آج اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے، اس کی چھاتی معمول سے بالشت بھر چوڑی ہو رہی تھی۔ آج وہ بیوی کو اچھی و خوش خبریاں سنائے گا اور پھر اس کی آنکھوں سے پیار کا سمندر موجزن ہوتے دیکھے گا، اظہار، رسید و پیار پر تی اور خوش رنگ کونپلیں پھوٹتی دیکھے گا۔ اب وہ ریلوے اسٹیشن کیوں جائے گا جہاں ایک بھیانک موت اس کی منتظر تھی۔ اس نے جاتے ہوئے گھر کے لیے کچھ چیزیں خریدیں اور بیٹی جو کتنے دنوں سے پانچ روپے کی لڈو (Ludo) کے لیے ترس رہی تھی، وہ بھی خریدی اور گھر پہنچ گیا۔ بیوی جو پہلے اسے دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھا لیتی تھی، سامان سے لدا دیکھ کر اس کی طرف لپکی، اس کے ہاتھوں سے فوراً سارے شاپنگ بیگ لے کر برآمدے میں چارپائی پر رکھے اور گھڑے سے پانی کا کٹورا بھر لائی، دیوار کے ساتھ گاؤ تکیہ رکھا اور اس وقت تک اس کے سامنے کھڑی رہی جب تک اس نے پانی پی کر کٹورا اسے واپس نہیں کیا۔ وہ اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ مطمئن چہرہ شاید عام چہروں سے مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے بیوی کی نظریں اس کے چہرے پر مسلسل ٹکی رہیں۔ بیٹی پڑوس میں کھیلنے گئی ہوئی تھی، لوٹتے ہی دوڑ کر اس کی گود میں آ رہی۔ اس نے پہلے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا، پھر چھوٹے چھوٹے ہاتھ چوم لیے۔

ابو میری لڈو! گود میں بیٹھی بیٹی نے دونوں ہاتھوں سے اس کا چہرہ تھام لیا۔ لایا ہوں بیٹے، جاؤ امی سے لے لو! اس نے بیٹی کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور وہ اچھل کر کچن میں امی کے پاس چلی گئی۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد حسب معمول بیوی نے چائے کی پیالی اس کے سامنے رکھی اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ بیٹی لڈو بچھائے اپنے خیال میں مگن تھی۔ اس نے کچھ رقم جیب سے نکال کر بیوی کو دی۔ آپ اپنے پاس ہی رکھتے اور کل کچھ اور سامان لے آتے، بس اتنا ہو گھر کا گزارہ چلتا رہے! بیوی کی آواز میں گھلی شیرینی سے اس نے اندازہ لگایا تھا کہ میاں بیوی کے پیار میں کمی کبھی نہیں ہوتی، البتہ حالات کی دھند اسے وقتی طور پر دھندلا دیتی ہے۔

نہیں تم رکھو، میں صبح ایک دفتر میں انٹرویو کے لیے جا رہا ہوں، امید ہے کام ہو جائے گا۔ تم میرے کاغذات کی فائل ڈھونڈ کر میز پر رکھ دو! اس نے بیوی سے کہا اور گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگا لی۔ خیالات اس کے ذہن کی راہداری میں آتے اور گزرتے رہے لیکن شاندار مستقبل کا خیال تو جیسے اس کے ذہن کی دہلیز پر جوتیاں اتار کر بیٹھ گیا تھا۔ تصور بھی کبھی کتنے عجوب مناظر نگاہوں کے سامنے لے آتا ہے لیکن یہ تسلسل ٹوٹتے ہی جیسے انسان کے اندر کہرام مچنے لگتے ہیں۔ صبح اٹھ کر اس نے غسل کیا، ناشتہ کیا، کپڑے بدلے۔ آج تو وہ دو رنگ ہی نہیں رہا تھا۔ اچھا، بلکہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ بچی ابھی تک سو رہی تھی۔ اس نے بچی کا ماتھا چوما اور جانے کے لیے مڑ کھڑا ہوا۔ بیوی نے فائل اس کے ہاتھ میں دی اور وہ خدا حافظ کہتے ہوئے گھر سے نکل گیا۔ مین روڈ پر پہنچ کر اس نے رکشا روکا اور صدر کے لیے روانہ ہو گیا۔ ٹھیک نو بج کر سات منٹ پر وہ لوئی انٹرپرائز کے سامنے کھڑا تھا۔ تھوڑی دیر باہر کھڑا رہنے کے بعد وہ دفتر کا صدر دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اسے یہ اندازہ لگانے میں لمحوں سے زیادہ وقت نہیں لگا کہ یہاں اس کے قدم جم جائیں گے۔ گیلری میں چند قدم چلنے کے بعد دائیں طرف پہلے کمرے میں Receptionist بیٹھی تھی۔

کیا میں اندر آ سکتا ہوں! اس نے دروازہ کھول کر اجازت چاہی۔

آئیں، تشریف رکھیں! اس کی سماعت میں کئی چوڑیاں چھنک گئیں۔

جی، آپ کو کس سے ملنا ہے! Receptionist اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

وہ دراصل ایک صاحب کل مجھے اتوار بازار میں ملے تھے اور یہاں آنے کے لیے کہا تھا!" یہی بات اسے یکدم خالی سی لگی تھی۔

یہ تو کوئی حوالہ نہ ہوا، اگر آپ کے پاس کوئی تعارفی کارڈ وغیرہ ہو! اس نے ہاتھ میں پکڑا ریسیور واپس رکھ دیا اور اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ آپ درست کہہ رہی ہیں، میں خوشی میں ان کا نام تک نہیں پوچھ سکا، تعارفی کارڈ تو دور کی بات ہے البتہ ان کا حلیہ اور گاڑی کا رنگ مجھے یاد ہے۔ درمیانی عمر، گول چہرہ، گندمی رنگ، بھاری اور آسمانی رنگ کی مرسیڈیز ـــــ اس کے خیال میں کسی شخص سے ملنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا اس کے علاوہ وہ کچھ کہتا تو غیر ضروری ہوتا۔

میں سمجھ گئی! اس نے کہا اور پھر ایک نمبر ڈائل کیا۔

رائٹ! یس سر! اور پھر اس نے اس کے متعلق اتوار بازار کے حوالے سے بات کی۔

آپ یہاں سے چند قدم آگے چل کر دائیں مڑ جائیں، بالکل سامنے آپ کا مطلوبہ دفتر ہے! اس نے ریسیور رکھنے کے بعد اس کو تفصیل بتائی۔ دفتر کے باہر مینیجنگ ڈائریکٹر لکھا دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔

مے آئی کم ان سر! اس نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر اجازت چاہی۔

آؤ بھئی آؤ، کاغذات لائے ہو! ایم ڈی نے سامنے پڑی فائل بند کر کے پرے رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

جی سر، لایا ہوں! اس نے فوراً اپنی فائل اس کے سامنے رکھ دی اور وہ کاغذات دیکھنے لگا۔ تعلیمی اور تجربے کے سرٹیفکیٹ ـــــ

تم میرے پرسنل سیکرٹری ہو گے اور تمہیں اپنے فرائض کا بخوبی پتہ ہو گا، پھر بھی میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ میری آمد و رفت، میٹنگز، اجلاس، سیمینار کی تاریخیں اور اوقات تمہارے علم میں ہونے چاہئیں۔ میرے بیرون ملک سفر کے لیے ہوائی ٹکٹ کا بندوبست

اور سیٹ کی ریزرویشن بھی تمھاری ذمہ داری ہوگی۔ اس کے علاوہ گھریلو امور کی انجام دہی بھی تمھارے ذمے ہے، ان میں بجلی اور گیس کے بلوں کی بروقت ادائیگی اور میری بیٹی کے کالج کے معاملات بھی تمھاری زیر نگرانی ہوں گے۔ مثلاً کالج کی فیس، یونیفارم، گاڑی کا پیٹرول، تیل اور مرمت وغیرہ ۔۔۔ کام اتنا زیادہ نہیں ہے تاہم محنت طلب ضرور ہے اور تم جوان ہو ذہانت بتاؤ! یہ کہہ کر اس نے اپنی آرام دہ کرسی سے ٹیک لگائی۔ کیا کہے اور کیا نہ کہے، چند لمحوں کے لیے جیسے وہ کسی اندھے کنوئیں میں گر گیا۔ خیالات ریل گاڑی کے ڈبوں کی طرح گھڑی پل میں آتے اور گزرتے رہے۔ ایسی بات تو وہ گھر ہی سے سوچ کر نہیں چلا تھا۔

تمھیں اگر مشکل آ رہی ہے تو تم اپنا وقت لے سکتے ہو، آج بتانا چاہتے ہو تو ٹھیک ورنہ کل سہی! ایم ڈی نے پھر اپنی فائل کھینچی اور کاغذات پر دستخط کرنے لگا۔

پانچ ہزار جو آج اور ابھی ہو سکتا ہے۔ وہ کل اور پھر نہیں ہوگا! اس نے یہ سوچ کر رضامندی ظاہر کر دی۔

اور دو ہزار میری طرف سے، تمھیں سات ہزار روپے ماہوار ملیں گے اور بوقت ضرورت دو تنخواہیں تم ایڈوانس بھی لے سکتے ہو۔ ہمارے اس چھوٹے سے ادارے میں ملازمین کے لیے اور سہولیات بھی ہیں۔ میرے دفتر کے بالکل سامنے تمھارا دفتر ہے۔ پہلے تم اپنا دفتر دیکھ لو، میرا تمھارے ساتھ آنا ضروری نہیں، اور پھر اکاؤنٹنٹ کے پاس چلے جاؤ، وہ تمھیں ایک تنخواہ ایڈوانس دے گا جو قابل واپسی نہیں ہوگی۔ کل سے تم ذہنی طور پر اپنی ڈیوٹی کے لیے تیار ہو کر آنا! ایم ڈی نے اسے ہدایات جاری کر دیں۔ ایم ڈی صاحب انسان تو بہت اچھے ہیں ورنہ کون افسر اپنے نئے ملازم پر عنایت کا ساون برساتا ہے لیکن بطور آدمی ان کا کردار کیسا ہے، ان کے ساتھ کام کرنے کے بعد پتہ چلے گا! اس نے دفتر سے باہر آتے ہی یہی سوچا تھا۔ اس نے جھانک کر اپنے دفتر میں دیکھا تو جیسے اس کے پاؤں اس سرزمین پر نہیں تھے جس پر وہ کھڑا تھا بلکہ کہیں اور تھے۔ چند لمحے اس سرشاری میں گزر گئے۔ یہاں کاروبار کیا ہوتا ہے جو دولت کی اتنی ریل پیل ہے، کہیں وہ کسی غلط جگہ نہ آ گیا ہو۔ اس خیال کی عمارت جتنی سرعت سے اس کے ذہن میں ایستادہ ہوئی تھی، اتنی ہی سرعت سے منہدم بھی ہوگئی۔ اسے ہر کام کی تنخواہ چاہیے، اس سے قطع نظر کہ ایم ڈی کیا کاروبار کرتا ہے اور یوں بھی چند دنوں میں اس پر سب کچھ روشن ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اکاؤنٹنٹ کے پاس پہنچا۔ وہ بھی اس جیسا جوان تھا۔ اس نے استقبالیہ انداز میں اسے کرسی پیش کی، چند منٹ تعارف میں گزرے اور پھر اس نے اس کے سامنے ایک لیجر رکھا۔

یہاں دستخط کیجیے! اکاؤنٹنٹ نے قلم اس کے ہاتھ میں دیا۔ شکریہ! اس نے کہا اور دستخط کر دیے۔ لیجیے سر! اس نے ہزار ہزار کے سات نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ اب کل ملاقات ہوگی! اس نے مسکرا کر اکاؤنٹنٹ کی طرف مصافحہ کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

آئیے! اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دونوں باہر آ گئے۔ راہداری میں چلتے ہوئے اس نے استقبالیہ کے سامنے اسے روک لیا۔

مس ریشماں! اس نے استقبالیہ میں بیٹھی لڑکی کو آواز دی اور وہ دفتر سے اٹھ کر ان کے قریب چلی آئی۔

یہ ہیں ہمارے ایم ڈی صاحب کے نئے پرسنل سیکرٹری! اس نے تعارف کرایا۔

موسٹ ویلکم! اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو اس کا چہرہ اسے دل کش لگا۔ دونوں لوٹی انٹرپرائز کے صدر دروازے سے

باہر آ گئے۔ اسے نوری انٹرپرائزز میں کام کرتے چھ ماہ ہو چکے تھے اور ہر کام خوش اسلوبی سے طے پا رہا تھا لیکن ایک بات جو اسے پچھلے دو ماہ سے کھٹکنے لگی تھی، وہ ایم ڈی کی بڑی بیٹی کا اس کی طرف ضرورت سے زیادہ جھکاؤ تھا۔ وہ مہینے میں تین چار بار مختلف بہانوں سے اسے گھر بلا لیتی اور پھر گاڑی کی بریک کا بہانہ کر کے اسے ساتھ لیتے ہوئے گھر سے نکل جاتی۔

مس ہم یہاں کیوں آتے ہیں! اس نے مسکراہٹ میں کھلا سوال کیا۔ وہ تو ٹھیک ہے مس! وہ اس سے آگے بھی کچھ کہنا چاہتا تھا۔

چلیں، لو آرگومنٹ اور اس کو ساتھ لے کر ہوٹل کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے گراؤنڈ فلور کے فیملی کیبن میں جا بیٹھی۔

مجھے ڈر لگ رہا ہے! اس نے دوسرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ کیوں؟ اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ بیٹھی۔

یہاں کوئی مجھے آپ کے ساتھ دیکھ لے گا تو میری نوکری خطرے میں پڑ جائے گی اور تھوڑا سا سمٹ گیا۔

کوئی قیامت نہیں آئے گی! اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔

لیکن مس، میں آپ کا نوکر ہوں، مالک اور ملازم کے درمیان بہت اونچی دیوار ہوتی ہے۔ آپ کی نوازشات دیوار کی اس طرف سے مجھ پر پھینکی جا رہی ہیں جنہیں میں اپنی جھولی میں خیرات سمجھ کر ڈال رہا ہوں، آپ شاید نہیں جانتیں کہ ایک حساس انسان کے لیے یہ کتنا کرب ناک عمل ہوتا ہے، میں آپ کی ہر عنایت کے ساتھ اپنا قد گھٹتا ہوا محسوس کرتا ہوں اور آج آپ نے مجھے یہاں لا کر ایک اور دھوکا لگایا ہے، یقین کیجیے میں اتنا دل برداشتہ ایم ڈی صاحب کے دفتری امور سے نہیں ہوتا جتنا گھریلو امور بالخصوص آپ کی ذمہ داریوں سے پریشان ہوتا ہوں! اور جانے اس نے اور کیا کچھ کہا۔

بس کہہ چکے آپ! اس کی نظروں نے بہت سارے سوالیہ نشان بنا ڈالے تھے۔

میں آپ نہیں "تم" ہوں اور مجھے مخاطب کرنے کے لیے یہی مناسب لفظ ہے! یہ باتیں اس نے بلا تقدم کی نہیں سوچی تھیں۔ ایک بات تو یہ کہ اس تخاطب میں میری تعلیم مانع ہے دوسرے یہ لفظ وقت کا غلام ہے۔ آپ، تم اور تو میں کچھ فرق تو ہونا چاہیے! اس کی نگاہیں مسلسل اس کے چہرے پر تھیں۔ مجھے افسوس ہے مس، میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکوں گا! اس کی نظریں دیوار پر لگی پینٹنگ پر لگی ہوئی تھیں۔

مجھے لگتا ہے جیسے الفاظ میرے جذبات کی ترجمانی نہیں کر رہے، میں الفاظ کا سہارا توڑ کر مفہوم کی سرزمین پر آتی ہوں، اس سے قطع نظر کہ آپ کی ازدواجی یا سماجی حیثیت کیا ہے، مجھے آپ اچھے لگتے ہیں، میں پیار کے لیے ترستی ایک پیاسی روح ہوں، صرف دو بول پیار کے اور کچھ نہیں! اور پھر جیسے اس کا گلا رندھ گیا۔

اس کی نظریں یک دم پینٹنگ سے ہٹ کر پھسلیں یا اس کے چہرے پر آ رکی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے بڑے بڑے آنسو پلکوں پر آ کر لرز رہے تھے اور کپکپاتے ہونٹ اس کے پُر تر جذبوں کی گواہی دے رہے تھے۔ ایک ہاتھ نے آہستہ آہستہ آگے بڑھ کر دوسرے کو گرفت میں لے لیا۔ پتہ نہیں آتش دان کے پاس پڑی برف کی سل کس وقت پانی ہوگئی۔ دونوں کی نظریں چار ہوئیں تو جیسے دنیا بھر کی گھڑیاں رک گئیں——

◆◆◆

"بندی، راجہ اور منا"

محمد اسلم

مختصر تعارف

محمد اسلم 6 جنوری 1943ء کو ملتان میں پیدا ہوئے۔ "مری کا دیا" پنجابی ناول کا اردو ترجمہ ماہنامہ "ادبِ لطیف" میں اشاعت پذیر ہوا۔ انگریزی کے نامور افسانہ نگاروں کے افسانوں کا اردو ترجمہ کر چکے ہیں۔ ترجمہ کے فن پر عبور حاصل ہے۔

ہمارا گھر جنوبی پنجاب میں جی ٹی روڈ کے کنارے ایک نیم شہری آبادی "غریب آباد" میں تھا۔ بستی کی آبادی کا بیشتر حصہ سڑک پار بستی سے تین چار فرلانگ کے فاصلے پر بنے، چمڑا رنگنے کے کارخانوں میں مزدوری کرتا تھا۔ بستی کے مکینوں میں چار خاندان ہندوؤں کے تھے جو توتے والے، نیچے والے، ٹھاکر داس اور رام چند کے ناموں سے جانے جاتے تھے۔ مسلمان، ہندو ایک خاندان کی طرح ایک دوسرے کی بیاہ شادی، مرنے جینے میں شریک ہوتے اور عید، دیوالی، میلاد و دسہرے کی تقریبات مل کر مناتے۔

جب میں چار سال کا تھا۔ میرا دن بستی کے کنارے، کھیتوں سے پہلے، محلے کے حلوائی رام چند کے چھپر والے گھر میں گزرتا۔ اس کے دو بیٹے نندا رام اور رگھا رام میرے ہم عمر تھے۔ میں ان کے ساتھ کھیلتا اور پکوڑے اور مٹھائی کھاتا۔ سڑک کے کنارے ٹھاکر داس کی ہٹی تھی جہاں میں اپنی بڑی بہن کے ساتھ سودا سلف خریدنے کے لئے جانے کی ضد کرتا۔ اس دکان پر جانے کی ایک کشش ٹھاکر داس کے بیٹے کی تین پہیوں والی سائیکل تھی جس پر موقع پاتے ہی میں سواری کی کوشش کرتا۔

زندگی کی گاڑی ایک ڈھنگ سے چل رہی تھی۔ پھر اچانک میرا گھر سے باہر نکلنا بند کر دیا گیا۔ میرے ماں باپ کی باتیں کھسر پھسر تک محدود ہو گئیں اور ان کے چہروں پر سراسیمگی جھلکنے لگی۔ ایک دن میرے والد نے ماں کو چھت پر بلایا تو میں بھی پیچھے پیچھے چلا۔ چھت کی تین فٹ کی منڈیر پر سے افق پر دھواں دکھائی دیا۔ امی تو استغفار کرتی اتر گئیں البتہ والد نے مجھے گود میں لے لیا۔ اب میں گھر سے تین فرلانگ کے فاصلے پر شمالی محلے میں گھروں سے آگ کے شعلے اور دھواں اٹھتا دیکھ سکتا تھا۔ نہ ہی میں نے کوئی سوال کیا اور نہ والد نے مجھے کچھ بتایا۔

اس شام میرا والد ماں سے کہہ رہا تھا۔ "ٹھاکر داس کہتا ہے اسلم کے لئے سائیکل لے جاؤ، لیکن میں نے انکار کر دیا ـــ میں نے اسے کہا اللہ کرے گا وہ جلد واپس آ جائیں گے ـــ" اگلے دن میرا والد اپنے ساتھی کا ذکر کرتے ہوئے میری ماں کو بتا رہا تھا۔ "اللہ دتہ ملیا ایسے (ڈیرہ غازی خان) سے لوگ بلوا رہا ہے۔ آج کل خوب کمائی کر رہا ہے ـــ رات کہیں سے چکی کی دو بوریاں اٹھا کر لایا ہے ـــ" میری ماں خوف کی علامت بنی میرے والد کی باتیں سنتی رہی۔ دن گزرتے گئے۔ میرے ذہن سے رگھا رام، نندا رام اور ان کے گھر کے پکوڑے اور مٹھائی محو ہو گئے۔ اب میں سودا سلف کے لئے اپنی بہن کے ساتھ سڑک کے اس پار مرادوں کی ہٹی پر جانے لگا اور ٹھاکر داس کے بیٹے

کی سائیکل بھول گیا۔

میرا گھر سے باہر نکلنا بند ہوا تو میں نے چھت پر جانا شروع کر دیا جہاں سے میں ساتھ والے محلے میں گھروں سے آگ اور دھوئیں کے بادل اٹھتے دیکھ سکتا تھا اور ہمارے گھر کی فضا اداس ہوتی گئی۔ ایک دن دوپہر کو میں مردانی بیٹھک سے واپس آیا تو میں نے چارپائی پر ماں کے ساتھ بیٹھی، اٹھارہ بیس سال کی گوری چٹی، ایک اجنبی لڑکی کو دیکھا۔ اس کے کپڑے میل سے اٹے تھے۔ اس کے گھنے بالوں والا سر ننگا تھا اور وہ ننگے پاؤں تھی۔ وہ رو رہی تھی اور میری سراسیمہ ماں اسے ٹوٹی پھوٹی اردو میں چپ کرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں گھبرا کر گھر سے باہر آ گیا جہاں گلی کے دوسرے طرف ہماری "بیٹھک" تھی۔ یہ عام گھروں کی سطح سے تین فٹ اونچے دو مرلے کے ٹکڑے پر کچی دیواروں اور سرکنڈوں کی چھت پر مشتمل ایک کوٹھڑی تھی۔ جو گاہے بگاہے کسی مہمان کی خاطر داری کے لئے استعمال ہوتی یا سردیوں میں گائے بھینس باندھنے کے کام آتی۔ وہاں مجھے والد کے ساتھ ایک گھنگھریالے بالوں اور مناسب قد و قامت والا بیس بائیس سالہ اجنبی بیٹھا دکھائی دیا۔ کپڑے اس کے بھی میلے تھے لیکن اس کے پاؤں میں چپل تھی۔ یہ رجب تھا اور اجنبی لڑکی "بندی" کا خاوند تھا۔

میں نے اس اجنبی جوڑے کے بارے میں ماں سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ ہندوستان سے پاکستان آتے ہوئے ان کا بچہ کہیں کھو گیا تھا اور وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے ہماری بستی میں آ گئے تھے۔ اگلے تین چار روز بستی کی عورتیں ان پناہ گزینوں کو دیکھنے ہمارے گھر آتی رہیں۔ بستی کے مکینوں کی اکثریت کی طرح میرا والد بھی ایک مزدور شخص تھا۔ میری ماں سلائی کڑھائی کرتی اور یوں ہمارے گھر کی روٹی کا بندوبست ہو رہا تھا۔ لیکن آج سے رجب اور بندی ہمارے مہمان اور دال روٹی میں ہمارے حصہ دار بن گئے تھے۔ ان کے لئے کوٹھڑی وقف ہو گئی۔ آنے والے دنوں میں رجب دن چڑھے کہیں نکل جاتا اور بندی میری ماں کے پاس بیٹھی بہکی بہکی باتیں کرتی اور ماں اسے دلاسے دیتی رہی۔ شام کو رجب تھکا ماندہ لوٹتا تو بندی اسے دیکھتے ہی چیختی: "منا کہاں ہے؟ منا کیوں نہیں لائے؟" اور غم سے نڈھال رجب کے کندھے سے لگ کر کوٹھڑی میں چارپائی پر جا گرتی۔ پھر بندی غائب ہونے لگی اور رجب منے کے ساتھ اس کی تلاش میں سرگرداں۔ وہ دن میں تین چار مرتبہ گھر آ کر بندی کے بارے میں پوچھتا اور اسے نہ پا کر کسی اور طرف نکل جاتا اور شام تک اسے کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ لاتا۔ جاڑا آتے آتے گھر میں خوف کی فضا تو چھٹنے لگی لیکن بندی کی وحشت بڑھ رہی تھی۔ گاہے بگاہے میری ماں اور بہنیں صحن میں لگے ہینڈ پمپ کے چاروں طرف چارپائیوں سے پردہ کر کے اسے نہلاتیں۔ اس کے کپڑے بدلتیں اور اسے باہر جانے سے روکتیں لیکن وہ آنکھ بچا کر گھر سے نکل جاتی اور جب تک رجب اسے ڈھونڈ کر لاتا اس کے کپڑے غلاظت سے لتھڑ چکے ہوتے۔ میری ماں اسے سمجھاتی: "بندی گھر میں رہا کر ۔۔۔ دیکھو رجب تمہارے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔۔۔" اور وہ میری ماں کی طرف بٹر بٹر دیکھتی جاتی۔

وقت کا پہیہ گھومتا رہا اور بندی کی وحشت کے ساتھ اس کا گھر سے غائب رہنا بڑھتا گیا۔ رجب جو پہلے منے کو تلاش کرنے رفیوجی کیمپوں کی خاک چھانتا تھا اب ادھر سے مایوس ہو کر بندی کی تلاش میں رہنے لگا۔ پھر ایک دن رفیوجی کیمپ کے پاس کسی عورت کے ٹرک سے کچلے جانے کی خبر بستی میں پہنچی۔ رجب میرے والد کے ساتھ مردہ خانے پہنچا اور وہاں بندی کی خون میں لتھڑی لاش پہچان لی۔ ضروری کارروائی اور لکھت پڑھت کے بعد بندی کی تجہیز و تکفین کر دی گئی۔ قبرستان سے واپسی پر رجب بہت خاموش تھا اور میرے والد کے دلاسوں کے باوجود پھوٹ پھوٹ کر روئے جا رہا تھا۔

اب رجب "فارغ" ہو چکا تھا۔ منا تو نہ ملا۔ بیوی بھی چلی گئی۔ اگلے ہی دن سے رجب میرے والد کے ساتھ دیہاڑی لگانے کے

کارخانے، مزدوری کے لیے جانے لگا۔ وہ علی الصبح کام پر جاتا اور شام گئے لوٹ کر اپنے آپ کو کوٹھڑی میں بند کر لیتا۔ وہ دکھی تھا لیکن ابھی جوان تھا۔ اس کے سامنے پوری زندگی پڑی تھی۔ ایسے کیسے گزرے گی؟ میری والدہ نے ساتھ والے محلے کے اپنے جیسے گھر کی لڑکی صغراں، رابعہ کے لیے پسند کی اور وہ میرے والد کے اصرار پر شادی پر آمادہ ہو گیا۔ شادی کیا تھی ایجاب و قبول کی رسم ہوئی۔ دلہن کے لیے میری والدہ نے چار پانچ جوڑوں کی بری تیار کی تھی۔ اور نکاح میں شرکت کرنے والے مہمانوں کے لیے میر والی سے چنوں والے چاولوں کی دیگ تیار کرائی گئی تھی۔ شادی کے ایک سال بعد رابعہ کے ہاں بیٹا ہوا۔ اللہ نے آتے منے کا بدل دے دیا تھا۔ رابعہ اپنے غم بھلا کر بیٹے سے دل بہلاتا اور ایک نئی زندگی کی شروعات سے اس کی دنیا میں ایک خوشگوار تبدیلی آنے لگی اور کوٹھڑی منے کی کلکاریوں سے آباد ہو گئی۔

کارخانے میں ہفتہ وار چھٹی جمعہ کو ہوتی تھی۔ ایک جمعہ رابعہ بازار گیا تو واپسی پر اس نے صغراں کو خبر سنائی۔

"آج مجھے ہندوستان میں ساتھ والے گاؤں کا حنیف ملا تھا۔ وہ اگلے مہینے اپنے رشتہ داروں کو ملنے ہندوستان جا رہا ہے۔۔۔"

"پھر؟" بیوی نے پوچھا۔

"دل کرتا ہے میں بھی جاؤں۔۔۔ بڑی بہن سے مل لوں گا۔۔۔"

صغراں نے کچھ جواب نہ دیا۔ لیکن جب یہ بات والد نے سنی تو اس نے کہا

"لیکن ادھر جانے کے لیے ویزہ ضروری ہوگا۔"

"حنیف کہہ رہا تھا بارڈر پر ویزا لگ جاتا ہے" رابعہ نے جواب دیا اور میرا والد لاجواب ہو کر خاموش ہو گیا۔ رابعہ نے ہندوستان کے سفر کے لیے کارخانے میں "اوور ٹائم" لگانا شروع کر دیا اور یوں ایک ماہ میں اس نے اتنی کمائی کر لی کہ اس کے اپنے اندازے کے مطابق، یہ رقم اسے منزل تک لے جانے کے لیے کافی تھی۔ رابعہ کے ہندوستان جانے کے بعد صغراں، اپنے میکے جا کر خاوند کی واپسی کا انتظار کرنے لگی۔ دن مہینوں اور مہینے سالوں میں بدلنے لگے۔ شہر میں حنیف کے گھر کا سراغ لگا کر ان کا اتا پتہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اس کے گھر والے بھی اس بارے میں لاعلم اور پریشان تھے۔ جب انتظار تکلیف دہ حد تک طویل ہو گیا اور سرحد پار سے کوئی خبر نہ آئی تو صغراں کے والدین نے علاقے کے عالم دین 'مولوی محمد سرور' سے فتویٰ لے کر اس کا دوسرا نکاح کر دیا۔

اور پھر ایک دن ڈاکیے نے ہمارے گھر ایک مسلی ہوئی چٹھی ڈالی۔ جب میں آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ سکول سے واپس آیا تو مجھے چٹھی دکھائی گئی۔ یہ رابعہ کی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ رابعہ اور حنیف بارڈر پار کرتے ہوئے پولیس کے ہتھے چڑھ گئے تھے اور ناکافی کاغذات کی بنیاد پر انہیں جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے منا بہت یاد آتا ہے اور وہ اس کے بارے میں فکرمند تھا۔ پھر جہاں اس نے میرے والد کو منے اور صغراں کا خیال رکھنے کو کہا وہاں اس نے یہ بھی امید ظاہر کی کہ وہ جلد رہا ہو جائے گا کیونکہ وہ بے گناہ تھا۔

خط کا مضمون ختم ہوا تو نیچے تاریخ ڈالی گئی تھی۔ یہ تحریر دس سال پیچھے کی تھی!

ماں رابعہ کی ہندوستان روانگی کے بعد سے پریشان رہتی تھی۔ ہر نماز میں اس کی واپسی کی دعا کرتی۔ خط کے مندرجات سن کر اور دکھی ہوئی وہ شام کو گھر کے پچھواڑے پیر نظام دین کی درگاہ کے لیے دیوں کا تیل بھجوایا کرتی۔ رابعہ اور منا ہماری زندگی کا حصہ بن چکے تھے۔ ماں جب تک زندہ رہی، رابعہ کے نام کے دیے جلتے رہے!

◆◆◆

دُعا

جمیل حیات

مختصر تعارف

جمیل حیات 2 مئی 1977ء کو ضلع اٹک کے گاؤں اکھوڑی میں پیدا ہوئے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے اردو ادب میں پی ایچ۔ ڈی کی۔ افسانوی مجموعہ "زیرِ زمین بجھا ہوا نقطہ" زیرِ طبع ہے۔ افسانوں اور ناول پر دو کتابیں تحقیقی و تنقیدی حوالے سے اشاعت کی منتظر ہیں۔

ویسے تو ذاتیں اور قومیں اللہ تعالیٰ نے پہچان کے لیے بنائی ہیں۔ اس لیے اگر کسی کا تعلق چھوٹی ذات سے ہے تو یہ اس کے لیے باعثِ تحقیر نہیں ہے تاہم اگر کام بھی اس کے گھٹیا ہوں تو پھر یہ لمحۂ فکریہ ہے۔ دیما بھی ایک ایسے ہی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا جن سے تعلق رکھنے والے مرد حضرات کا کام مفت کی روٹیاں توڑنا، دن بھر اکھیلا رہنا، بیوی کی کمائی پر عیش کرنے کے ساتھ ساتھ لڑنے اور چوپال پر بیٹھ کر ماتھے تاکنے کے لوگوں چائے کے پیالے پی کر تخیل میں چیڑی موچھوں کو بل دے کر گاؤں کے کتوں، بھینسوں اور بیلوں کی خصوصیات پر سیر حاصل بحث کرنا تھا۔

دیما خود کوئی کام نہیں کرتا تھا۔ اس کی بیوی سندس قریبی شہر میں کسی بڑے صاحب کے بنگلے پر کام کرتی تھی۔ یوں اسے کپڑے، جوتے اور کھانے پینے کی چیزیں وافر مقدار میں مل جاتی تھیں۔ اس لیے ہر گزرتے لمحے دیما کسی اتھرے بیل کی طرح تندخو اور منہ زور ہوتا جاتا تھا۔ سندس کو دیمے سے اگر شکوہ تھا تو یہی کہ وہ جان مار کر روزی روٹی کا بندوبست کرتی تھی تو دیما بے فکر ہو کر وہ کمائی جوئے اور چرس کی نذر کر دیتا تھا۔ یہ کہنا بھی محال تھا کہ اس کو کسی کی نظر لگ جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ کبھی بھی جوا نہیں جیتا تھا کیونکہ اس کی صورت بھی ایسی تھی کہ چشمِ بد دور کی جگہ اس کو فٹ کیا جا سکتا تھا۔ جب سندس اس کو پیسے دینے سے انکار کرتی تو وہ اسے پیٹنا شروع کر دیتا۔ اگرچہ سندس بھی اس کے قبیلے سے تھی تاہم اس کی سانولی رنگت میں بھی ایسی کشش تھی کہ گھر کی مالکن اسے جو کچھ دیتی تھی تو وہ عیدا سے بخشش کھلے دل سے دیتا تھا۔ اس لیے گزر اوقات آسانی سے ہو رہا تھا۔ یہ اور بات کہ جتنا وہ کماتی تھی اس سے زیادہ وہ جوئے میں دیما ہار جاتا تھا۔ اس لیے ادھار بڑھ رہا تھا اور پھر اس کی اولاد بھی......

دیمے کی صبح تقریباً دس بجے ہوتی تھی۔ جب کوئی نہ کوئی "ہماری بھائی" اس کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتا۔ وہ اٹھتا، منہ ہاتھ دھوئے بغیر ناشتہ کرتا اور پھر جاگتی آنکھوں سے کئی خواب دیکھتے وہ دولت کمانے نکل پڑتا۔ یہ اور بات کہ ہمیشہ ہار کر آتا۔ اب تو وہ چرچا سا ہونے لگا تھا۔ اس دن بھی وہ حسبِ معمول ہار کر گھر کی طرف افسردگی سے آ رہا تھا تو چند باریش نوجوانوں نے جن کی قیادت ایک ادھیڑ عمر کا باریش شخص کر رہا تھا، اس کا راستہ روک لیا۔ انہوں نے نہایت شائستگی سے یک زبان اسے سلام کیا جس کا اس نے نہایت ہی جاہلانہ انداز میں جواب

دیا۔ ''وعلیکم''

''جناب! ہم تبلیغ کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ آپ کے محلے کی مسجد میں قیام ہے۔ اللہ کے پسندیدہ دین کے بارے میں گفتگو کرنی ہے۔ اگر آپ وقت نکال کر مغرب کی نماز ادا کرنے مسجد میں آئیں تو نماز کے بعد بیان ہوگا۔ انشاءاللہ آپ کو فائدہ ہوگا۔'' دیبے کو لفظ ''فائدہ'' کچھ مانوس سا لگا۔ اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔ گھر پہنچا تو اس نے کھانا کھایا اور پھر کچھ سوچنے کے بعد گھر سے نکلا۔ زمانوں سے اس نے نماز نہیں پڑھی تھی۔ اب تو وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ مغرب کی نماز میں کیا کیا پڑھا جاتا ہے اور رکعتیں کتنی ہوتی ہیں۔ بالآخر اس نے سوچا کہ چلے جاتے ہیں۔ ان کی بھی سن ہی لیتے ہیں۔ چنانچہ مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوتے ہی اس کے قدم خود بخود مسجد کی طرف اٹھنے لگے۔

نماز مغرب کے بعد مولانا محمد دین خطاب کرنے کے لیے منبر پر بیٹھ گئے۔ دیبا آخری صف میں بیٹھا تھا۔ مسجد نمازیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ لوگ مولانا محمد دین کا خطاب سننے کے لیے آئے تھے جن کی شعلہ بیانی اور طرزِ ادا کا دور دور تک شہرہ تھا۔ ان کا آج کا خطاب عقائد کی درستگی پر تھا جس کی ذرا سی بھی سمجھ دیبے کو نہیں آئی لیکن ایک بات اس کے دل میں بیٹھ گئی۔ مولانا کہہ رہے تھے ''چوبیس گھنٹوں میں ایک لمحہ ایسا ہوتا ہے جو قبولیت کا ہوتا ہے اس لیے مایوسی کفر ہے بس دعا مانگتے رہنا چاہیے کہ وہ جو غفور الرحیم ہے، جو سمیع ہے، جو بصیر ہے وہ ضرور سنتا ہے اور دیکھتا ہے۔'' دیبا جس نے آج بھی نماز دوسروں کو دیکھ کر ادا کی تھی اب پچھتا رہا تھا کہ وہ تو نام کا ہی مسلمان رہ گیا تھا۔ اس لیے اس نے سوچا کہ اب اچھے کام بھی کرے گا۔ مولانا کی بات اگرچہ اس کے دل میں بیٹھ گئی تھی تاہم اس وقت وہ کچھ اور سوچ رہا تھا۔

سندس ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ دیبے کا معمول تھا کہ وہ رات ایک بجے سے پہلے گھر نہیں لوٹتا تھا اس لیے سندس نے اگر پارٹ ٹائم کوئی موکل بھگتانا ہوتا تھا تو وہ دس سے گیارہ بجے کے دوران یہ کام کرتی تھی۔ دیبے سے اس کا بیاہ ہوئے تین سال ہوئے تھے اور بیاہ سے بھی پانچ سال پہلے سے وہ اپنے اس کردار کو بخوبی نبھا رہی تھی۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا جب بے احتیاطی یا نا سمجھی کی وجہ سے وہ غلطی کی قیمت چکانے کی پوزیشن میں آ گئی تھی لیکن بھلا ہو ڈاکٹر سلطانہ کا جو اندھوں میں کانی رانی تھی۔ اس نے دائیوں کا کورس کیا ہوا تھا اور اس پڑھے لکھے اور عقل سے بھرے ہوئے گاؤں میں کلینک کھول کے ڈاکٹر سلطانہ بن کے خدمتِ خلق کر رہی تھی۔ جس کا اجر اسے دنیا میں ہی زرِ نقد کی صورت میں مل رہا تھا۔ سندس کی ''عزت'' بچانے میں اس کا بنیادی کردار تھا۔

دیبے کے گھر میں سوائے اس کی بیوی سندس کے اور کوئی نہیں تھا۔ اس لیے بھی اس کو آزادی تھی۔ یہ شکر کی بات تھی کہ گھر ان کا ذاتی تھا۔ پہلے ایک کمرہ تھا۔ سندس کے اس گھر میں آنے کے بعد اب دو کمرے مزید بن گئے تھے۔ بیرونی امداد کے باوجود وہ دو کے دو ہی رہے تھے۔ اس دن جب خلافِ معمول دیبا رات آٹھ بجے ہی گھر واپس آ گیا تو سندس کو بڑی حیرت ہوئی۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ شاید کوئی چیز گھر میں رہ گئی ہو اس لیے دیبا واپس آ گیا ہے لیکن جب دیبے نے اسے بتایا کہ آج وہ عبادت کرے گا تو سندس کو جیسے چکر سے آ گئے۔ اس نے چارپائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا کہ کہیں گر ہی نہ جائے۔ دیبے نے چادر اٹھائی کیونکہ گھر میں اس وقت مصلیٰ یا جائے نماز کو ڈھونڈنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ دیبے نے سندس سے کہا کہ وہ اسے کل رات آٹھ بجے تک ''ڈسٹرب'' نہ کرے۔ اب تو اسے یقین آ گیا کہ دیبے نے چرس میں بھنگ ملا کر پی لی تھی جس کی وجہ سے نشہ دوآتشہ ہو گیا تھا۔ بہرحال اس نے کندھے اچکائے۔ دیبے کے دوسرے کمرے میں

جانے کے بعد اس نے موبائل اٹھایا اور کسی کا نمبر ملانے لگی۔

داستان گو کا کہنا ہے کہ معلوم نہیں یہ مولانا کے جادو اثر لیکچر کا کمال تھا یا دیپے کے قرض خواہوں کے تقاضے۔ بہر حال جو بات بھی تھی اتنی متاثر کن ضرور تھی جس نے دیپے جیسے کاہل اور سست الوجود کو بھی عبادت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ انسان شروع ہی سے تجارت کرتا آیا ہے اور یہ بات بھول گیا ہے کہ مشینری کا خالق، اس کے الٹ پھیر سے واقف ہوتا ہے۔ انسان بھی ایک مشین ہی تو تھا جس کی باگیں کاسب تقدیر نے اپنے قابو میں رکھی تھیں۔ دیپا چادر بچھا کر دعا مانگنے میں محو ہونے ہی والا تھا کہ اسے یاد آیا کہ اس نے وضو تو کیا ہی نہیں تھا۔ اپنی اصل سے مجبور ہو کر اس نے خود کو پانچ سات گالیوں سے نوازا اور پھر وضو کرنے چلا گیا۔ داستان گو بتاتا ہے کہ یہ دسمبر کی ٹھٹھرتی راتیں تھیں۔ جاڑا عروج پر تھا۔ چنانچہ وضو کرتے ہوئے دیپے کو اپنی نانی کی نانی بھی یاد آ گئی۔ واپس کمرے میں آ کر خود کو گرم کرنے میں اسے کم از کم ایک گھنٹہ لگا۔ اپنی جبلی اور فطری عادت سے مغلوب اور مجبور ہو کر اس نے اس کام سے دستبردار ہونے کا بھی سوچا لیکن پھر قرض خواہوں کے مکروہ اور مغضوب چہرے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ چنانچہ اس نے نہایت دھیمی آواز میں دعا مانگنی شروع کر دی: "یا اللہ! مولوی صاحب کہہ رہے تھے کہ تو پچھلی گھڑیوں میں ایک بار ضرور دعا سنتا ہے۔ یا اللہ! میری دعا بھی سن۔ مجھے دس لاکھ روپے کہیں سے بھی بھیج دے۔ خدایا! کہیں سے بھی دس لاکھ روپے بھیج دے۔۔۔۔۔۔ بھیج دے۔۔۔۔۔" دیپے نے دعا کے شروع میں ہی مولوی صاحب کا نام حوالے کے طور پر دے کر اپنی جہالت کا ثبوت بھی دے دیا تھا کہ اسے خود اس بات پر یقین نہیں تھا جس کے لیے اس نے اتنے پاپڑ بیلے تھے۔ رات بھیگتی رہی۔ دیپا دعا مانگتا رہا۔ سندس نے پہلے تو سونے کی کوشش کی۔ پھر تجسس اس پر غالب آ گیا کہ دیپے کو عبادت کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ اس نے تو زندگی میں کبھی نماز نہیں پڑھی، نہ روزہ رکھا۔ زکوٰۃ دینے کی بجائے لینے میں پیش پیش رہا۔ ٹھیک طرح سے کلمہ بھی نہیں آتا۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ چنانچہ اس نے کمرے سے نکل کر دیپے کے کمرے کے دروازے سے کان لگا دیے۔ اگرچہ سردی اتنی زیادہ تھی کہ جیکٹ اور سویٹر پہنے اور گرم چادر اوڑھنے کے باوجود اس پر کپکپاہٹ طاری تھی تاہم وہ دروازے سے لگ کے کھڑی رہی اور دیپے کی دعا سنتی رہی۔

صبح اٹھ کر ناشتہ تیار کرنے کے بعد سندس نے خود ناشتہ کیا۔ دیپے کا ناشتہ مخصوص جگہ پر رکھا۔ دیپے کی ماں بھی ناشتہ کر چکی تھی اور سندس کے یہ بتانے کے بعد کہ دیپا رات سے عبادت میں مصروف تھا، رونے دھونے اور کوسنے دینے شروع کر چکی تھی کہ اس کے دیپے پر کسی چڑیل کا سایہ ہو چکا تھا حالانکہ دیپا خود جن کی طرح تھا اور چڑیلیں بھی اس سے دور ہی بھاگتی تھیں۔ سندس تو کام پر چلی گئی اور دیپے کی ماں نے محلے میں جا کر دہائی دینا شروع کر دی کہ کسی نے اس کے کڑیل جوان بیٹے پر تعویذ کر دیے تھے۔ وقت گزرتا گیا۔ دیپے کے دوستوں رفیقوں کو جب اس کے وقت بے وقت چیخنے پر تکلیف ہوئی تو وہ صورت حال کا جائزہ لینے اس کے گھر پہنچے۔ وہاں مجمع لگا ہوا تھا۔ "اٹھ او دیپے بھایا! بھاپا پڑ گیا! دیپے نے شاید گھر پر ہی جوا کرانا شروع کر دیا تھا۔ بھاگ بھایا! بھورے نے جیسے ہی بھیڑ دیکھی فوراً بھانے کو توجہ دلائی لیکن بھانے کو پاس کھڑے کالے نے دلاسہ دیا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ دیپا رات سے عبادت میں مصروف ہے۔ کالے نے بتایا کہ یہ مولوی صاحب کے خطاب کا اثر ہے۔ جب کالے نے انہیں یہ بتایا تو پاس کھڑے کئی لوگ یہ سن رہے تھے۔ جہاں بھورے اور بھانے نے حیرت میں سر ہلایا وہیں لوگوں کے منہ حیرت کی زیادتی سے کھل گئے تھے۔ کئی لوگ مسجد کی طرف دوڑے تاکہ مولوی صاحب کے ہاتھ اور پاؤں چومنے کی سعادت حاصل کر سکیں جنھوں نے کرامت اس زمانے میں دکھا دی تھی جب کہ بھانے اور بھورے کے مطابق مولوی صاحب نے

ان کے یار کو۔۔۔۔۔۔ خیر بات جنگل میں آگ لگنے والی آگ کی طرح پھیل گئی۔ وہی مولوی صاحب تھے جن کے بارے میں ان لوگوں کی زبانیں یہ کہتے نہ تھکتی تھیں کہ کھانے کو اچھا خاصا مل جاتا ہے اس لیے تو یہ لوگ گھر سے باہر رہتے ہیں اور اب وہی لوگ صرف دیپے کے عبادت کرنے کی وجہ سے سارا کریڈٹ مولوی صاحب کو دے رہے تھے اور دیپا ثانوی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ جب مولوی صاحب کو یہ علم ہوا کہ ان کے جوش خطابت کی تاب نہ لا کر ایک جواری عبادت میں محو ہو گیا ہے تو ان کی آنکھیں فرط عقیدت سے چھلک پڑیں۔ ''یا اللہ لاج رکھنا۔'' شام کو جب منڈی کے کام سے فارغ ہو کر گھر پہنچی تو اس کے گھر کے باہر بہت بڑا ہجوم تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ''کہیں بھوک اور پیاس کے مارے وہ ہی۔۔۔۔۔'' اس سے آگے وہ نہ سوچ سکی کہ دیپا جیسا بھی تھا اس کا شوہر تھا۔ وہ بھیڑ چیرتی ہوئی راستہ بناتی گھر کے دروازے کے پاس پہنچی۔

رات نو بجے سے لے کر دوسرے دن رات آٹھ بجے تک جانے کتنے لمحے آئے جو دیپے کو اپنے ساتھ بہالے جاتے کیونکہ جس قبیلے سے اس کا تعلق تھا وہ جلد بازی کے لیے مشہور تھا۔ پھر بھوک اور پیاس نے ستایا بھی بہت۔ لیکن اس نے پہلی بار خود سے کیا عہد نبھایا کہ وقت پورا کرنا ہے اس لیے بیٹھا رہا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا دیپے کی بے چینی بھی بڑھتی گئی۔ ساتھ ساتھ دعا مانگنے کا انداز بھی تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔ پہلے لہجہ عام تھا۔ پھر سوچا کہ جب ایک کام کے کرنے کا ارادہ کر ہی لیا ہے تو اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ آہ وزاری سے کام لینا چاہا لیکن آنسو نہ آئے۔ خیر منت ترلہ جاری رکھا، خوشامد بھی کی۔ شور بھی مچایا۔ آخر میں جب بھوک نے ستایا تو رونے بھی لگا۔ پھر باقاعدہ اس کے رونے اور چیخنے چلانے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ لوگوں کو حیرت اس بات پر تھی کہ اپنی جبلت کے برعکس تقریباً تئیس گھنٹے وہ بھوک اور پیاس سے بے نیاز کس طرح رہا تھا؟

دعا قبول نہیں ہو رہی تھی۔ جب تین منٹ باقی رہ گئے تو حوصلہ ٹوٹ گیا۔ دیپا ہمت ہار گیا تو شکستہ دل کے ساتھ بولا ''مولوی صاحب بھی لارا ہی لگا رہے تھے۔'' چنانچہ جب وہ مقررہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے ہی دروازہ کھول کر باہر نکلا تو مولانا محمد دین نے بھی شرمندگی سے بچنے کے لیے سر جھکا لیا۔ وہ اس بات کے قائل تھے کہ اگر دعا قبول نہیں ہوئی تھی تو اس میں بھی کوئی حکمت تھی۔ جانے دیپے نے کیا مانگ لیا تھا؟ شاید اس نے جو مانگا تھا وہ اس کے لیے بہتر نہیں تھا۔ سب کی نظریں دیپے پر تھیں۔ جب وہ لوگوں کے درمیان پہنچا تو اپنے گھر کی طرف دیکھ کر بلند آواز سے چیخا ''جو میں نے مانگا وہ نہیں دیا تو جس کمرے میں بیٹھ کر میں مانگتا رہا ہوں اس کو ہی گرا دے۔'' یہ دعا اس کی فطری جبلت کو ظاہر کر رہی تھی۔ جب انسان مایوسی کی انتہا کو پہنچتا ہے۔ جب کوئی بہت بہت بڑا صدمہ پیش ہوتا ہے تو پھر یا تو انسان اسی کا ہو جاتا ہے جس سے بچھڑا ہوتا ہے۔ یا پھر اپنے سب سے بڑے دشمن کے نزدیک ہو جاتا ہے کیونکہ وہی تو ہے جو ایسے ہی کسی مقام پہ دوست سے جدا کرنے کے لیے وار کرنے کو موجود ہوتا ہے۔ بے شک اس کے جال سے نکلنا بہت ہی مشکل اور ہمت والوں کا کام ہے۔

جوں ہی دیپے کی دعا کے الفاظ مکمل ادا ہوئے اسی وقت زمین ہلی۔ لوگوں نے گرنے سے بچنے کے لیے ایک دوسرے کو تھامنا شروع کیا۔ پھر ایک دھماکہ ہوا۔ جس کمرے میں بیٹھ کر دیپا تئیس گھنٹے اور چالیس منٹ دس لاکھ روپے مانگتا رہا تھا وہ اس کی خواہش اس کی دعا کی تکمیل کے لیے چھت اور دیواروں سمیت زمین بوس ہو گیا۔ ابھی چوبیس گھنٹے پورے ہونے میں پانچ منٹ باقی تھے۔

◆◆◆

نام کا گوتم بدھ

جبران علی

مختصر تعارف

جبران علی 4 نومبر 1988 کو چیچہ وطنی میں پیدا ہوئے۔ زمانہ طالب علمی میں ہی افسانہ نگاری کا آغاز کر دیا تھا۔ مختلف موقر ادبی جرائد میں ان کی تحریریں اشاعت پذیر ہوتی رہتی ہیں۔ حلقۂ ارباب ذوق چیچہ وطنی کے سرگرم رکن ہیں اور اب تک بیس سے زائد افسانے تحریر کر چکے ہیں جو بہت جلد کتابی شکل میں منظر عام پر آنے والے ہیں۔

اس نے مجھے دیکھ کر چھوٹتے ہی کہا "یہ کیا تم گوتم بدھ کی طرح چپ چاپ بیٹھے رہتے ہو، شاید تم آدم بیزار ہو" غصہ اس کے چہرے پر جھلک رہا تھا اور زبان میں کڑواہٹ تھی۔ وہ مجھے ہمیشہ اسی نام سے مخاطب کرتی۔ میں کچھ کہنے کی بجائے چپ رہتا وہ میری خاموشی کو دیکھ کر اور چڑ جاتی۔ ایک دن میں نے زچ ہو کر کہا "میں گوتم بدھ نہیں ہوں، تم بھی پاگل ہو جو مجھے گوتم بدھ کہتی ہو۔۔۔ کہاں میں اور کہاں گوتم بدھ؟ جس نے دنیا کو غم سے نجات دلانے کے لیے جنگلوں، ویرانوں اور بیابانوں کا رخ کیا اور سوکھ کر ہڈیوں کا پنجر بن گیا اور کہاں میں جسے اپنی ہی ذات سے فرصت نہیں۔ وہ حیرت سے بیچ میں کاٹ کھانے والی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "تم گوتم بدھ نہیں ہو تو پھر تم میں گوتم بدھ کی روح حلول کر گئی ہے۔" وہ ایسا مجھے چڑانے کے لیے کہتی اور میں سچ میں چڑ جاتا۔

سرسبز پہاڑوں میں گھرا ہوا یونیورسٹی کا کیمپس تھا جس میں رونق تھی زندگی کی رفتار کافی تیز تھی۔ حسین اور مسکراتے ہوئے چہرے ہر طرف روشوں پر محوِ خرام ہوتے۔

کیمپس سے ملحق کینٹین کے سامنے دو، دو رنگ میز اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ ہر طرف دو، دو یا چار چار کی ٹولیاں بیٹھی تھیں۔ کوئی چائے پی رہا تھا اور کوئی سینڈوچ پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ میں اکیلا بیٹھا تھا۔ جب ساتھ کی ٹیبل پر بیٹھے لڑکے اور لڑکیوں کے ٹولے نے اس کا ذکر چھیڑا کہ وہ بہت مغرور، شوخ و شنگ اور خود سر ہے۔ تب اس کے خلاف باتیں سننے کے باوجود اسے دیکھنے کا تجسس ہوا۔ جب پہلی بار دیکھا اسے دیکھ کر لگتا تھا وہ واقعی ہر کسی کی پہنچ سے باہر ہے جس میں جاذبیت تھی، چہرے پر شگفتہ پھولوں جیسی تازگی تھی۔ اس کے لبوں کا عجب تناؤ تھا جیسے ہر وقت مسکرا رہے ہوں۔ اس پر مستزاد وہ ننھا سا سیاہ تل جو اس کے لب کے کونے پر تھا۔ اس سیاہ تل نے میری کتنی ہی راتوں کی نیندیں اڑا ڈالیں۔ وہ ہمیشہ چاند بن کر میرے خوابوں میں چمکتا رہا۔

کیمپس میں رہتے ہوئے اس سے کئی بار میرا سامنا ہوا وہ اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتی اور گزر جاتی پھر بعد میں اس نے بتایا کہ اس ایک نگاہ میں ہی مجھے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ میری ہر وقت کی افسردگی نے اسے میری طرف متوجہ کر دیا تھا۔ وہ کہتی تم میں باقیوں کی نسبت انفرادیت ہے۔

میں جہاں بھی ہوتا وہ مجھے ڈھونڈتی ہوئی میرے پاس آ پہنچتی۔ اور آتے ہی باتیں کرنا شروع کر دیتی۔ چپ ہونے کا نام ہی نہ لیتی۔ جیسے کسی نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا ہو۔ اپنے گھر کی ساری باتیں مجھے بتاتی جاتی۔ وہ ہر کام جو گھر میں کیا ہوتا پوری تفصیل سے بتاتی۔ پھر آس پاس پڑوس کی محلے کی الف سے یے تک۔ میں چپ چاپ بیٹھا اس کی باتیں سنتا رہتا۔ میرے رویے میں روکھا پن، بے رخی اور بے اعتنائی ہوتی۔ میں اس سے بالکل لاتعلق سا رہتا جیسے میرا اس سے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ اس کا وجود میرے لیے بے معنی ہو۔ میں جتنا زیادہ سنجیدہ اور اختصار پسند تھا اس میں اتنا ہی چنچل پن، شرارت، چہکار، قہقہے اور شوخیاں تھیں۔ اس کا چنچل الہڑ پن ہر لحاظ سے شوخی پر اکساتا۔ جب کسی دن میں یونیورسٹی نہ جاتا تو اگلے دن میرے یونیورسٹی داخل ہوتے ہی مجھے آن لیتی "چھٹی کیوں کی تھی؟" پروفیسر بھی چھٹی کا اتنی سختی سے نہ پوچھتے جتنا وہ پوچھتی۔ میں شرارت سے کہتا "کیوں تمہیں کیوں بتاؤں تم میری کیا لگتی ہو؟" تب وہ سوچ میں پڑ جاتی شاید اس بات کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میرا یہ سوال اسے بے کل سا کر دیتا۔

ایک دن یونیورسٹی میں، میں بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی "کیا میں تم سے ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا "ہاں پوچھو" "تم سے کسی نے محبت کی ہے؟" میں حیران ہوتے ہوئے کہا "تم بھی عجیب لڑکی ہو لوگ تو پوچھتے ہیں کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے اور تم پوچھتی ہو کیا تم سے کسی نے محبت کی ہے۔" اپنے چہرے پر مسکراہٹ چھپاتے کہتی "نہیں پلیز تم بتاؤ نا؟" "اب بھلا مجھے کسی کے دل کا کیا پتہ؟؟" "کس کو مجھ سے محبت ہوئی ہے اور کس کو نہیں" میری طرف دیکھتے ہوئے کہتی "چلو یہ بتاؤ اگر کوئی تم سے محبت کرے تو کیا تمہیں پتہ چل جائے گا؟" میرے جواب دینے سے پہلے ہی آہستہ سے بولی "شاید نہ پتہ چلے ہے نا؟" میں نے بے پروائی سے کہا "ہاں ہوسکتا ہے نہ پتہ چلے۔" اس کے بعد وہ مایوس سی ہو گئی میں جانتا تھا وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور مجھ میں بناوٹ ڈھونڈتی ہے۔ اس وقت پتہ نہیں کیوں مجھے اس میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ میرا قرب پانے کے لیے جتنا تڑپتی میں اس سے اتنا ہی دور بھاگتا۔ وہ چاہتی تھی میں اس سے مستقبل کی باتیں کروں شادی کے لیے کہوں لیکن دوستوں نے مجھے سمجھا دیا تھا کہ "ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی" ایسی خوبصورت چیز کو پانے کا کیا فائدہ جس کے پا لینے کے بعد بھی کھو جانے کا خدشہ ہے۔

وہ جب بھی میرے پاس آتی تو مجھے یہ خدشہ ہوتا کہیں وہ اپنی محبت کا اظہار نہ کر دے۔ یہ تلوار ہر وقت کیمپس میں رہتے ہوئے میرے سر پہ لٹکی رہتی۔ اقرار میں کر نہیں سکتا تھا اور اگر انکار کیا تو بیچاری کا دل ٹوٹ جائے گا۔ دراصل میں اس کا نرم و گداز دل توڑنا نہیں چاہتا تھا۔

کیمپس میں ہماری کلاس کے آخری دن چل رہے تھے ایک ہفتے بعد ہم فارغ ہو رہے تھے۔ سارے کیمپس پر سراسیمگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ قریباً وسط سردیوں کے دن تھے۔ کئی دنوں سے سورج نے زمین کو اپنا چہرہ نہیں دکھایا تھا۔ ہر چیز پورا دن دھند کی لپیٹ میں رہتی۔ درخت اپنے پتوں سے سارا دن آنسو ٹپکاتے رہتے۔ وہ قریباً آخری ہفتہ موسم کی طرح اداس رہی۔ میرے پاس آ کر تو بیٹھ جاتی لیکن پہلے کی طرح چہک کر باتیں نہ کرتی۔ بس ایک آدھ بات کر کے خالی نظروں سے زمین کو گھورتی رہتی۔ بکھری ہوئی پریشان لٹیں اور آنکھیں متورم رہتیں جیسے دل کھول کر نچوڑی ہوں۔ پھر وہ دن بھی آیا جو کیمپس میں ہمارا آخری تھا۔ سارا دن سٹوڈنٹس گروپوں میں بے مصروف رہے۔ میں ایک کونے میں تنہا بیٹھا تھا۔ کیمپس سے رخصت ہونے سے کچھ دیر پہلے میرے پاس آئی۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کی گلابی آنکھیں نم زدہ تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ بولتی میں نے پوچھا ''کیا تم رو رہی ہو؟'' وہ اپنی عینک اتار کر آنکھیں صاف کرتی ہوئی بولی ''نہیں تو ...... وہ اس آنکھ میں کچھ پڑ گیا تھا''۔ آنکھیں صاف کر کے کہنے لگی ''شاید اب ہم کبھی نہ مل سکیں''۔ ''ہاں شاید'' میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے اتنا بھی نہ کہا کہ ''اگر انسان زندہ ہو تو کہیں نہ کہیں مل ہی جاتا ہے''۔ کہنے لگی تمہارے لیے ایک چیز خریدی تھی۔ میرے پوچھنے سے پہلے پرس سے نکال کر کہا ''یہ دیکھو'' ..... اس کے ہاتھ میں لائٹر تھا اس کو میرا سگریٹ پینا ذرا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اگر کبھی مجھے سگریٹ پیتا دیکھ لیتی جب تک میں سگریٹ بجھا نہ دیتا وہ جان نہ چھوڑتی۔ میں نے پوچھا ''تم تو ہی مجھے سگریٹ پینے سے روکتی ہو پھر لائٹر کیوں دے رہی ہو؟'' کہتی ''یہ اس لیے دے رہی ہوں جب بھی تم سگریٹ سلگانے کے لیے اس کو جلاؤ گے تو تمہیں میں یاد آؤں گی۔ جب تم سگریٹ نہیں پیو گے صرف مجھے یاد کرو گے۔ اس کی اس بات پہ میں مسکرا دیا۔ چہرے پہ مصنوعی مسکراہٹ سجا کر کہتی ''خدا حافظ کوئٹہ تم بدھو'' اور چل دی۔

اس کے بعد کئی سال گزر گئے وہ مجھے کہیں نہیں ملی۔ اب میرے پاس اس سے کرنے کو ہزاروں باتیں تھیں مگر وہ نہ تھی۔ ماضی نے میرے دل کو مسلنا شروع کر دیا۔ اس کا خیال ہر وقت ذہن میں کالے سانپ کی طرح کنڈلی مارے ڈستا رہتا۔ اب میں ہر وقت اس کے قرب کے لیے اپنے اعصاب کے ساتھ جنگ کرتا رہتا ..... میں نے اسے ہمیشہ یاد رکھا۔ جب بھی بازار میں چلتا نقاب میں ملفوف ہر چہرے کو دیکھتا شاید ان میں سے کوئی چہرہ اس کا بھی ہو کوئی معجزہ ہو اور وہ مجھے سامنے سے آتی دکھائی دے جائے۔ تنہائی کتنا بڑھ گئی تھی۔ زندگی میں اب وحشت تھی، ویرانیاں تھیں، ظلمتیں تھیں اور اس کی پرانی یادیں تھیں۔ میں نے اُسے سرد رات کی تاریک راتوں میں تاریک کنج میں تنہائیوں میں بیٹھے یاد کیا ہے۔ اس کے ساتھ بیتے ہوئے سحر انگیز لمحات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ میں ہر وقت خیالوں کی گھٹن میں رہتا۔ اب میں واقعی کوئٹہ بدھو کی طرح ہو گیا تھا نہ کچھ کھانے کا ہوش اور نہ پینے کی فرصت۔

میں نے گلیوں، بازاروں، چوراہوں، باغوں غرض ہر گوشے میں اسے تلاش کیا، مایوسی کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہ آیا۔ میں نے سوچا وہ مجھے کوئٹہ بدھو کہہ کر خوش ہوتی تھی چلو اب کوئٹہ بدھو بن جاتا ہوں اور ویرانیوں کا رخ کرتا ہوں شاید میری بے قرار روح کو تسکین مل جائے اور اس کا کہا بھی پورا ہو جائے۔

ایک سرد سی شام ویران راستے پہ اجڑی ہوئی عمارت کی دیوار کے ساتھ میں نے اُسے ٹیک لگائے بیٹھا دیکھا۔ جو دنیا سے بے نیاز چپ چاپ بیٹھی ہوئی خالی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کا جسم اب پہلے کی طرح [illegible] نہیں رہا تھا۔ وقت تو پھر وقت ہے پتھر پر بھی اپنے نقوش چھوڑ دیتا ہے وہ تو پھر ایک نازک سی لڑکی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے اس کے رتجگوں کی خبر دے رہے تھے اور وہ مرتعش آنکھیں جو کبھی خوشی سے تمتمانے لگتیں۔ آج گرداب میں پھنسی کشتی کی طرح ہچکولے کھا رہی ہیں اس کی آنکھوں میں مستقبل کی کتنی ہی آرزوئیں اور حسین خواب ہوں گے جو میں نے کرچی کرچی کر دیے تھے۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرے دل کو دھچکا لگا۔

مجھے لگا وہ مجھے آج بھی اسی نام سے پکارے گی جیسے کئی برس پہلے کیمپس میں پکارتی تھی مگر وہ کیسے پکارتی، وہ تو اب خود کوئٹہ بدھو بنی بیٹھی تھی۔

◆◆◆

برف باری میں بیٹھی ماں

اظہر جاوید

ترجمہ : حنیف باوا

مختصر تعارف

اظہر جاوید 4 جنوری 1938ء کو راولپنڈی (یا بھیرہ سرگودھا) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے "راجہ اعظمی" (اردو زبان میں پہلی مرتبہ (اردو کتاب) "بلغاریہ افسانے" (ترجمہ) بلغاریہ زبان کی کسی بھی غیر ملکی زبان کی پہلی کتاب تحریر کی۔ پنجابی کہانیوں کی کتاب "بڑی دیر ہو گئی" ان کی منفرد کتاب ہے۔ شاعری کا مجموعہ "غم عشق گر نہ ہوتا" شائع ہوا۔ 42 سال تک باقاعدہ "تخلیق" کی اشاعت کرتے رہے۔

میں صبح دفتر پہنچا تو میرے پڑوس میں رہنے والی ایک عورت بڑی پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "آج دیر لگا دی ہے میں کافی دیر سے انتظار کر رہی ہوں۔ جلدی سے دفتر کھولیں اور ٹیلی فون کے ذریعے معلوم کریں کہ کل رات سے گھر نہیں آیا..." ایک منٹ میں کی گئیں اتنی باتوں کا بوجھ اٹھا کر میں بھی پریشان ہو گیا اور مجھے بات کو سمجھنے میں بہت دیر لگی۔ اس نے جیسے غصے سے اور گلہ کرتے ہوئے کہا۔ "منہ کیا دیکھ رہے آپ جلدی کریں میرا اکیلا بچہ بگڑا جا رہا ہے..."

مجھے یہاں اس دفتر میں آئے ہوئے پندرہ سولہ سال ہو گئے ہیں۔ میرے دفتر اور اس گھر کا تعلق صرف اتنا ہے کہ ان کے مہمان میرے اس دفتر میں چلے آتے ہیں اور میرے ملنے والے ان کی دہلیز عبور کر جاتے ہیں۔ یہ بھاگوان مجھے اپنا بیٹا کہتی ہے اور میری طرح کے نہ جانے کتنے فضول لوگوں کو اس بھلی عورت نے اپنا بیٹا اور بیٹی بنایا ہوا ہے۔ کسی کا گھر بسا رہی ہے، کسی کی بیوی کے لئے اسپتال میں راتیں گزار رہی ہے اور کسی کے دکھوں کو اپنا غم سمجھ کر برداشت کر رہی ہے۔ اللہ کے فضل سے اس کی اپنی اولاد بھی بہت ہے۔ یہ تمام میرے سامنے جوان ہوئے ہیں اور گوگو ابھی کل تک کسی بچے سے چوٹی لے جاتا اور کبھی تمام دن میرے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ اب اللہ کے فضل سے وہ جوان ہو گیا ہے اور خود کما رہا ہے لیکن یہ جوانی بھی کتنی منہ زور ہوتی ہے اور بچے اس قدر کم عقل اور جذباتی ہوتے ہیں کہ بڑوں کی نصیحتوں کو پلے باندھنے کی بجائے ان کا الٹا مطلب نکالتے ہیں۔

میرے سر پر چاندی اگ آئی ہے اور میں جوانی اور نوجوانی کی تمام حدیں عبور کر چکا ہوں اور میرے لہو میں اٹھنے والی کھلبلی اور ہیجان ہونی کر گزرنے والا بلبلا اب پھٹ چکا ہے۔ اب اگر کوئی بلند آواز سے بولتا بھی ہے تو میں اس قدر تسلی سے آنکھ اٹھا کر اس کی جانب دیکھتا ہوں جیسے جگالی والا کوئی گدھا آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتا ہے۔ میرا دروازہ کھولتے اور میز تک پہنچتے تک اماں اپنی کہانی اسی طرح سناتی رہیں۔ وہ مجھے کہہ رہی تھی کہ اس کو ٹیلی فون کر کے کہیں کہ وہ میرا کلیجہ ٹھنڈا کر لائیں۔ میں نے تو اس کے تمام دوستوں سے پوچھ گچھ کر لی ہے۔ جگہ جگہ دھکے کھائے ہیں۔ بات تو کچھ بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس دکان سے واپس لوٹا تو اس کے بڑے بھائی نے اسے کچھ زیادہ بھلا کہا کہ

تو کام پر دھیان دینے کی بجائے فضول خرچی زیادہ کرتا ہے۔ وہ بھائی کی اس بات پر آگے سے بولنے لگا۔ میں نے اس کی اس گستاخی پر ایک تھپڑ رسید کر دیا۔ اس کے بعد اس نے چپ سادھ لی ۔۔۔ پھر ادھر ادھر گھومتا رہا۔ بہن سے لے کر روٹی کھائی اور گھر سے نکل گیا۔ میں تمام رات سوئی نہیں۔ کسی نے بتایا کہ مزنگ میں ایک تعویذ دھاگے والا ہے۔ میں بھاگتی ہوئی اس کے پاس گئی۔ کسی نے کہا شاہدرے میں ایک مائی فال نکالتی ہے۔ میں وہاں سے بھی تسلی خوار ہو کر آئی ہوں ۔۔۔ بیٹا جی! کچھ کریں۔ میرا دل بیٹھے جا رہا ہے۔ میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔

ماں جی کے ارد گرد بلکتی بیٹیاں کھڑی تھیں۔ ان کی سوجی ہوئی آنکھیں مجھے سب کچھ بتا رہی تھیں۔ میں نے خود کو بڑی مشکل میں گھرا ہوا پایا۔ مجھے ابھی تک یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماں کو کیسے تسلی دوں اور بہنوں کے اشکوں کو کیسے روکوں۔ آخر میرا تجربہ اور انسانی نفسیات میرے کام آئی۔ میں نے کہا کہ ماں جی میں ابھی ٹیلی فون بھی کرتا ہوں اور اخباروں میں اشتہار بھی دیتا ہوں۔ آپ حوصلہ رکھیں۔ آپ نے بہت سے تعویذ گنڈوں سے بھی کام لیا لیکن میری ایک بات آپ ضرور مانیں کہ کل پرسوں تک گھر آ جائے گا۔" اس کی بہن جو ابھی تک گم صم اور فکر اور پریشانی کے سمندر میں ڈوبی ہوئی تھی فوراً بولی "بھائی جان کیا آپ کو ملا تھا کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟" ماں نے میری طرف ایسے دیکھا جیسے میں اس لئے جھوٹ بول رہا ہوں تاکہ انھیں تسلی ہو جائے۔ میں نے ارد گرد رقص کرتی ہوئی دکھ کی چادر کو کھینچا اور تھوڑا سا ہنس کر گویا ہوا" نہ مجھے ملا تو نہیں لیکن یقین ہے کہ وہ پرسوں تک گھر آ جائے گا۔"

انھوں نے پھر مجھے اجنبی نظروں سے دیکھا اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دفتر سے باہر آ گئے۔ جیسے ہی انھوں نے دفتر کو چھوڑا میں سوچوں کے بہاؤ میں آ گیا۔ تیس سال پہلے میں بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ بچپنے سے نکل کر شباب میں قدم رکھ رہا تھا۔ ذہن میں کچھ عجیب سی حرکات عمل میں لانے کا شوق اور بڑوں کی باتوں کو نہ ماننے کا جذبہ سر ابھار رہا تھا۔ ایسا لگنے لگا تھا جیسے ہوائیں بھی مجھ سے راستہ پوچھ کر گزرتی ہوں اور سورج کو بھی میرے تابع ہو کر اپنی مسافت طے کرنی چاہیے۔ آج بھی میں ان دنوں اور ان سوچوں کو ذہن میں لاتا ہوں تو ہنس پڑتا ہوں۔ میرا بیٹا جو کہ مجھ سے بھی ابھی وہ چار سال چھوٹا ہے مجھے ابھی سے اجنبی لہجے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ہے "ابو آپ اس بات کو نہیں جانتے۔"

میں تیس برس پہلے کی بات کرنے لگا تھا۔ نہیں معلوم کہ میری ماں نے کون سی بات پر مجھے ڈانٹا تھا اور میرا جوانی کا چڑھا ہوا خون عروج جوش میں آ گیا تھا۔ میں کچھ کہے سنے بغیر گھر سے نکلا، سٹیشن پر پہنچا اور نزدیک ترین سٹیشن کوئٹہ کا ٹکٹ کٹا لیا۔ اس وقت ہم سرگودھا میں رہائش پذیر تھے۔ مجھے اتنا معلوم تھا کہ وہاں میری خالہ رہتی ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو میں اس کے ہاں چلا جاؤں گا۔ اور پھر وہ چھوٹا سا حادثہ وہیں پر وقوع پذیر ہوا جس نے میری زندگی کی سوچیں بدل کر رکھ دی تھیں۔ کوئٹہ پہنچے ہوئے مجھے کئی روز گزر گئے تھے۔ میری خالہ یہی سمجھی تھی کہ میں اسے ملنے یا سیر کرنے کے لئے آیا ہوں۔ دن کے وقت میں بازاروں کا چکر لگاتا۔ کبھی ہنہ جھیل کی طرف نکل جاتا، کبھی اوڑک کی سیر کرتا، کبھی تمام دن جناح روڈ پر واقع ایرانی ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پیتا، گانے سنتا۔ فروٹ مارکیٹ کے کونے پر کے تھانے کے ساتھ ایک سفید برقعے والی بڑھیا بیٹھی ہوتی۔ اس کا ٹھکانہ دوسروں سے الگ ہی ہوتا۔ نہ تو وہ خیرات کے لئے آواز لگاتی اور نہ ہی اوروں کی طرح مانگنے کے لئے اللہ رسول کا واسطہ دیتی تھی۔ میں آتے جاتے ہوئے اسے دیکھتا اور کبھی کبھی اسے آنہ دو آنے دے دیتا۔ اس روز برف باری ہو رہی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار برف گرتی ہوئی دیکھی تھی اور میرا دل چاہتا تھا کہ باہر نکلوں اور برف باری کے مزے لوٹوں۔ جس ہوٹل میں چائے پی رہا تھا وہاں ہر روز آنے کی وجہ سے میری تھوڑی بہت جان پہچان ہو گئی تھی۔ جب برف پڑنے لگی تو چھابڑیوں والے، قلفی اور فالودے والے تمام کے تمام لوگ ادھر ادھر چھپنے لگے تھے۔ کچھ لوگ ہوٹل میں بھی آ گئے تھے۔ میری میز کے پاس آ کر بیٹھے

ڈھابے والے نے بلند آواز سے کہا "تو بھی وہ مائی ابھی تک وہیں بیٹھی ہوئی ہے۔" میں نے ہوٹل کے شیشوں سے باہر نظر دوڑائی تو دیکھا واقعی وہ مائی ٹھٹھرتی بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کا سفید برقعہ برف باری سے مزید سفید ہو گیا تھا۔ کوئٹے کی سردی اور اوپر سے برف باری — میں گرم ہوٹل میں ہوتے ہوئے بھی لرز گیا تھا۔ میرے ارد گرد بیٹھے ہوئے لوگ مائی کے بارے میں کچھ اچھی باتیں نہیں کر رہے تھے۔ ان کا وہی رویہ تھا جو اکثر مردوں کا عورتوں کے بارے میں ہوتا ہے۔ میں نے اپنے جان پہچان والے بیرے کو بلایا اور پوچھا کہ اصل بات کیا ہے۔ وہ تھوڑا شریف تھا کہنے لگا "یہ لوگ ہیں ویسے ہی بک بک کرتے رہتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس مائی کا بیٹا اس سے بچھڑ گیا ہے اور یہ اس کے انتظار میں یہاں بیٹھی رہتی ہے۔" مجھ پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ میں نے چائے کے پیسے دیے اور باہر نکل کر مائی کے پاس چلا گیا۔ اُسے سلام کیا۔ اس نے بڑا نرم سا جواب دیا۔ میں نے پاس بیٹھ کر بات شروع کی۔ "ماں جی! آپ اس برف باری میں یہاں بیٹھے ہیں" — اس نے مجھے ٹالنے کی کوشش کی اور کہا۔ "جا بیٹا برف پڑ رہی ہے۔ بیمار ہونے سے بچ جا۔" میں پھر گویا ہوا۔ "ماں جی آپ نے مجھے بیٹا کہا ہے تو پھر آپ اپنا دکھ بھی مجھے بتائیں۔ لوگ نہ جانے کیا کچھ کہے جا رہے ہیں۔" شاید وہ غم میں تھی یا پھر میری یہ بات اس پر اثر کر گئی تھی، وہ اپنا دکھ سنانے لگی۔ وہ ٹوٹی پھوٹی آمیزہ اردو زبان میں بات کر رہی تھی۔ کہنے لگی "بیٹے دو سال ہو گئے ہیں میں اور میرا اکلوتا بیٹا اپنے گاؤں سے شہر آئے تھے۔ بڑا پیارا بیٹا تھا وہ میرا۔ نہ جانے اس روز اسے کیا ہوا۔ کہنے لگا ماں تو اکیلی گھر چلی جا میں فلم دیکھ کر آؤں گا۔ میں نے اُسے منع کیا لیکن اس کی ضد میں اور اضافہ ہو گیا۔ میرے منہ سے دو چار سخت الفاظ نکل گئے وہ کرماں والا منہ زور بیٹا مجھ سے لڑ جھگڑ کر چلا گیا۔ میں یہاں پر کھڑی اُسے آوازیں دیتی رہی۔ شام تک انتظار کیا پھر میں روتی چلاتی ہوئی گھر آ گئی۔ لیکن وہ نہیں آیا — کئی روز کے انتظار کے بعد میں گاؤں سے یہاں آ گئی اور اب ایسے لگتا ہے جیسے صدیاں بیت گئی ہوں اس کی راہ دیکھتے ہوئے۔ وہ مجھے یہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ یہیں پر واپس آئے گا۔ وہ تو اتنا پیارا اور شریف تھا کہ شہر آ کر وہ مجھے ایک پل کے لئے دور نہیں ہونے دیتا تھا۔ اسے کشش تو ضرور ہوتی ہو گی بیٹا۔ مجھے پوری امید ہے کہ رب سچا اسے ضرور لے کر آئے گا۔"

مجھے صاف محسوس ہوا کہ برقعے کے اندر اس کے آنسو گر رہے ہیں۔ اس کی آواز بھرا سی گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا اس نے مجھ سے پوچھا "بیٹا کہاں کے رہنے والے ہو اور کون ہو۔" اس کے لہجے میں اس قدر ممتا بھری ہوئی تھی کہ میں پگھل سا گیا اور اسے ساری بات صاف صاف بتا دی۔ اس نے اپنے برقعے سے ہاتھ باہر نکالا اور میرے سر پر رکھا اور کہنے لگی۔ "کیسے بیٹے ہو بد نصیب ماؤں کے ساتھ ایسا نہیں کرتے۔ جا اپنے گھر چلا جا۔ تم نہیں جانتے کہ کتنی کرماں ماری بیچاری مائیں کیسے برف باری میں ٹھٹھرتی اور کڑی دھوپ میں جلتی ہوئی اپنے بیٹوں کا انتظار کرتی رہتی ہیں۔ جاؤ میرے بیٹے اپنے گھر چلے جاؤ۔"

ایک پل کے لئے مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری ماں کسی چوراہے پر بیٹھی ہے اور کوئی اس کے آگے آنہ دو آنے پھینک کر چلا جاتا ہے اور کوئی اس کی جھولی میں طرح طرح سوچوں کے کھوٹے سکے ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ میں جلدی سے خالہ کے گھر پہنچا۔ سامان اٹھایا اور اپنے گھر آ گیا۔ میں ان تمام برسوں میں لوٹ کر کوئٹہ نہیں جا سکا لیکن میرا ایمان ہے کہ اس کا ضدی بیٹا واپس آ گیا ہو گا۔ ماؤں کی دعائیں رائیگاں نہیں جاتیں۔ وہ تو عرش کے کنگرے ہلا کر رکھ دیتی ہوں گی۔ اسی لئے تو میں نے اپنے پڑوس کی ماں جی سے کہا تھا کہ فکر نہ کریں وہ جلدی واپس آ جائے گا۔ وہی ہوا کہ بچہ تیسرے روز شام کے وقت گھر لوٹ آیا۔ ماں جی سمجھتی ہیں کہ یہ کسی تعویذ دھاگے نے کام دکھایا ہے۔ خود میرا احترام کرتی ہے کہ بھائی جان کا کہا ہوا پورا ہوا ہے لیکن مجھے پتا ہے یہ صرف ماں کی دعا تھی جو روح کی گہرائی سے پوری سچائی کے ساتھ باہر آئی تھی جو کہ کھینچ کر واپس لے آئی تھی۔

◆◆◆

غزلیں

جلیل عالی

O

کس دن ہوائے زخم نیا گل کھلا نہیں
کس شب پہ چمکیں اشک چراغاں ہوا نہیں

اک سحر ہے کہ دور کہیں رہتا ہے ساتھ ساتھ
اک وہم ہے کہ آج بھی دل سے گیا نہیں

گو آج ان سے ہیں تری مجھ ہو گئی
لیکن ترے خیال کا تارا بجھا نہیں

دیکھا ترا سلوک رہا جو ہمارے ساتھ
اس کا کوئی جواز ترے پاس تھا نہیں

کیسے ہو اپنے آپ سے اس کا مقابلہ
اعدا جو بھول کر بھی کبھی دیکھتا نہیں

ان کو بھی اپنی دشت نوردی کا زعم ہے
وہ لوگ جن کے پاؤں کو کانٹا چبھا نہیں

عالی تمام شہر کے کام اس کے ہاتھ میں
یہ شخص شہر بھر میں کسی کام کا نہیں

OOO

خواجہ محمد زکریا

O

لیڈر کا آج سانحہ ارتحال ہے
پر غم نہ کیجیے کہ یوں اس کی ڈیل ہے

برکت ہے اپنے ملک کی جو ملک سے ان کے پاس
دنیا بھر رزق ہے ولایت کا مال ہے

گرواں قوم قوم کی کرتے ہیں روز و شب
بے فکر مال قوم کا ان پہ حلال ہے

چھوڑا سا ان کے رہ گیا بھرا ہوا تمام
خوش وہ ہیں آج جن کی بہت موٹی کھال ہے

حد سے زیادہ فہم و فراست کا ادعا
حد سے زیادہ فہم و فراست کا کال ہے

مجبور ہو کے کرتے ہیں کتنے یہ اعتراف
مخلص وفا کا شہر کی منڈی میں کال ہے

OOO

آصف ثاقب

O

ایک دریا ہو گئے ہو تم
میری آنکھوں سے ہو گئے ہو تم

کون دل کو بچائے شعروں میں
میرے لفظوں میں سو گئے ہو تم

مجھ کو کانٹوں میں اب اگاتے ہو
پہلے پھولوں میں بو گئے ہو تم

دل سے اس کا اٹھنا مشکل ہے
کیسا کانٹا چبھو گئے ہو تم

مجھ کو اشکوں میں دیکھ لیتا تھا
گہرے غم میں ڈبو گئے ہو تم

اس جہاں میں دکھائی دو ثاقب
چاند تاروں میں کھو گئے ہو تم

OOO

ڈاکٹر کنول فیروز

○

شمع کی طرح سے، پروانہ بنا دیتے ہیں
سارے ماحول سے، بیگانہ بنا دیتے ہیں

جب تری یاد کی، دلہن سجنے لگے آ کے
آج تو دل کو، صنم خانہ بنا دیتے ہیں

ان کی آنکھوں کو، محبت کا نشہ آتا ہے
جس کو چاہیں، اسے دیوانہ بنا دیتے ہیں

ہم سے ملتے ہوئے، دیکھو سوچنا لازم ہے تجھے
لوگ ہر بات کو، افسانہ بنا دیتے ہیں

رند سرمست ہیں ہم، جب بھی نظر دوڑاتے ہیں
ہم تری آنکھ کو، پیمانہ بنا دیتے ہیں

ان کی گفتار، نگاہوں کے سوالوں کی قسم
اک نظر، دیکھ کے مستانہ بنا دیتے ہیں

جب بھی آتا ہے ہمیں شام غریباں کا خیال
ہم کنول دل کو، عزا خانہ بنا دیتے ہیں

○○○

سلطان سکون

○

کہاں یہ بزم میں بیٹھوں مری بھی جا کوئی ہے
مجھے بھی پاس بٹھاؤ جو آشنا کوئی ہے

تجھی سے ہے مری جو بھی دعا کوئی ہے
مرے خدا مرا تیرے سوا بتا کوئی ہے

بچھڑ کے اس سے وہ ویراں گھر ہے دل میرا
نہ کوئی چاپ نہ دستک نہ اب صدا کوئی ہے

یہ فیصلہ ہے مرا پھر بھی جی رہا ہوں میں
نہ غم گسار نہ ہمدم نہ ہم نوا کوئی ہے

کہاں وہ لوگ جو دکھ بانٹتے تھے مل کے کبھی
اور اب تو حال بھی رسماً ہی پوچھتا کوئی ہے

جو پاس تم نہیں ہے تو گھر کے تمام کمروں میں
نہ ڈھونڈتا نہ مجھے آ کے دیکھتا کوئی ہے

یہ سچ ہے ایک عمل کا صلہ تو ہے جیتے
جو دکھ اٹھاتے رہے ان کی بھی جزا کوئی ہے

نہیں نہیں نہیں اپنا نہیں کوئی سکون
بھلا یہ لوٹ کے اب کس کو چاہتا کوئی ہے

○○○

ابصار عبدالعلی

○

جانا کدھر تھا اور کدھر نکل پڑے ہیں ہم
ہونا کہاں تھا اور کہاں پر کھڑے ہیں ہم

سر کرنا چاہتے ہیں زمانے کی چوٹیاں
کوہ زیاں کے قدموں میں لیکن پڑے ہیں ہم

آیا جو وقت ہم پہ تو سوچا نہیں تم نے
کس کس سے تمہارے لئے جا کر لڑے ہیں ہم

کیا ہے آگہی سے فکر کی یا فیصلے ہیں غلط؟
خود پاک سرزمیں کے پیچھے پڑے ہیں ہم

دونوں ہی اک مقام سے آگے نہ بڑھ سکے
پہلے جہاں کھڑے تھے وہیں پہ کھڑے ہیں ہم

یہ زعم کر رہیں ہم ہیں امین، ہم ہی امین ہیں
صادق بھی فقط ہم ہیں، اسی پہ اڑے ہیں ہم

سر پر کھڑا ہے فلک ہمارا جھکیں کیا
''لا حاصل ہے کہ تحقیق'' میں پڑے ہیں ہم

○○○

بشریٰ رحمٰن

○

تمہارے گھر میں کوئی اور شخص رہتا ہے
وہ کب کا جا بھی چکا تو لبوں پہ یہ کیا ہے!

تمہارے اصل کی راحت سے عیب نہیں
تمہارے گھر کے صحن سے تمام رہتا ہے

ہمارے دل کا یہ صحرا جسے پسند نہیں
وہ شخص تم کے کمرے پلنگوں میں رہتا ہے

ہمارے ہاتھ میں قسمت نے لکھ دیا کوئی اور
ہمارے دل میں مگر اور کوئی رہتا ہے

○○○

ڈاکٹر ایوب ندیم

○

آخرش فیصلہ تو ہونا ہے
کس کو پانا ہے، کس کو کھونا ہے

سارے آنسو سنبھال رکھے ہیں
تیری ہی یاد کو پرونا ہے

اس لیے دل ہے دل کو آزادی
پیار ہو جائے، جس سے ہونا ہے

کیسا شکوہ کہاں کی محرومی
کاٹنا ہے وہی، جو بونا ہے

کیوں لبِ جو ابھی سے آ بیٹھے
کس کی یادوں کو دل سے دھونا ہے

کھیلتے کھیلتے ہی ٹوٹ گیا
زندگی کیا ہے؟ اک کھلونا ہے

کس نے لکھا ہے مرے مقدر میں
جتنا کم ہے، زیادہ رونا ہے

جاگنا ہے تو چار دن، ایوبؔ!
سونا ہے تو مدام سونا ہے

○○○

اصغر مہدی

○

سورج ڈوبا شام ہوئی پھر اندھیاری
دل کے اندر اندر ابھری ہے زاری

عشق کی منزل دل ہے، دل کی منزل موت
کس کو راس آئی ہے دل کی بیماری

میں تو تیری رسوائی سے ڈرتا ہوں
اپنی باتیں ہو نہ جائیں اخباری

آج اسی کے حاشیے برداروں میں ہیں
کل تک جس کو کہتے تھے وہ بازاری

کوئی تو انصاف کرو بستی والو
کوئی تو الزام لگاؤ معیاری

آنکھیں کور ہوئی ہیں دل تو روشن ہے
منزل سامنے ہو تو کیسی دشواری

ان کاروں کا سرمایہ کیا ہے
پھٹے پرانے کپڑے خالی الماری

یوں تو سیدھے سادے لگتے ہو اصغرؔ
لیکن باتیں کیوں کرتے ہو دو دھاری

○○○

حسن عباسی

○

جیسے باد بہاری آتی ہے
یاد ایسے تمہاری آتی ہے

پھول سڑکوں پہ کھلنے لگتے ہیں
جب بھی اس کی سواری آتی ہے

تھوڑا آنگن ہے اس لیے شاید
چاندنی ڈھیر ساری آتی ہے

ان راہوں میں ہے گھر اس کا
ہر قدم پہ کیاری آتی ہے

وہ مسافر کبھی نہیں آیا
روز گاؤں میں لاری آتی ہے

کھیل ہو جاتا ہے تمام حسنؔ
میری جس وقت باری آتی ہے

○○○

جبار واصف

○

مجھے کوئی ایسی غزل سنا کر میں رو پڑا ہوں
ذرا "بے سے بے وفائی" کے سُر لگا کر میں رو پڑا ہوں

مرے حبیب تجھ کو مری طرف سے یہ اذن ہے
مرا آج اتنا تو دل دکھا کر میں رو پڑا ہوں

یہ جو خاک لوح کے سوا رہی ہے مری جبیں
یوں پلک پلک کے اسے بچا کر میں رو پڑا ہوں

مرے خود کشی کے خیال پر مرے حال پر
مری بے بسی مجھے یوں ہنسا کر میں رو پڑا ہوں

تجھے علم ہے مرا کوئی تیرے سوا نہیں
مجھے آ کے اپنے گلے لگا کر میں رو پڑا ہوں

میں جہاں سرائے میں سرِ بزم چراغ ہوں
مری لو کو اتنا نہ آزما کر میں رو پڑا ہوں

مرا بخت، میرا نصیب تجھ سے جدا نہیں
مجھے دے تو ایسی کوئی دعا کر میں رو پڑا ہوں

یہ جو عشق کی یہ مثال ہے، یہ وبال ہے
اسے یوں نہ دیکھ کے مسکرا کر میں رو پڑا ہوں

مرا نام تو نے رکھا تھا واصفؔ یاد ہے
اسی نام سے مجھے پھر بلا کر میں رو پڑا ہوں

○○○

کرشن کمار طور (انڈیا)

○

تجھ سے ہے آرائشِ افکار جدھر دیکھتے ہیں
وہی ہم ہیں وہی بازار جدھر دیکھتے ہیں

عشق میں خود سے نکلنا بڑا مشکل ٹھہرا
کوئی بھی اب نہیں دلدار جدھر دیکھتے ہیں

وقت کی کوئی بھی کل سیدھی نہیں لگتی ہے
دیکھتے ہے [illegible] ہے کار جدھر دیکھتے ہیں

یہ الگ ہے کوئی صورت نہیں بچنے پاتی
ہم کو دکھتی ہے وہی دیوار جدھر دیکھتے ہیں

عشق تو اپنے میں کم یاب ہوا جاتا ہے
لگ رہے ہیں اب نئے کردار جدھر دیکھتے ہیں

آنکھ کے آگے سے پھیلی ہوئی اک نیلگوں شام
ایک پانی کی ہے دیوار جدھر دیکھتے ہیں

ہم سمجھتے تھے کہ یوں ختم ہو گی جس سے اے طورؔ
ہے نمایاں وہی آزار جدھر دیکھتے ہیں

○○○

رفیع الدین ذکی قریشی

ڈاکٹر جواز جعفری

○

خواہش نام و نشاں مسترد کرتے ہوئے
میں کبھی چپ تو نہیں کتنا عدد کرتے ہوئے

گل کیے گردوں نے کیسے کیسے چہروں کے چراغ
آنکھ بھر آتی ہے ذکر خال و خد کرتے ہوئے

ہے روایت میرا ستارہ جانب اوج کمال
یار مجھ سے پیار کرتے ہیں حسد کرتے ہوئے

زندہ رکھا میں نے مردہ شہر میں اپنا ضمیر
عمر گزری ہے تمیز نیک و بد کرتے ہوئے

کس قدر شوق حساب عمر رفتہ تھا اسے
رو پڑا خود بھی وہ میری داد و ستد کرتے ہوئے

کم نسب لفظوں کو نوک خامہ پر لاتا نہیں
میں قبول ایسا ہوں لفظوں کو سند کرتے ہوئے

موت کی دنیا سے باہر بھی ہے اک دنیا جواز
جیسے یہ مجھ پر کھلا سیر لحد کرتے ہوئے

○○○

○

ترک شوق ضروری ہے
چپ رہنا مجبوری ہے

ہاں وہ ہیں تو رک جاؤ
اس کی بات ادھوری ہے

آنکھیں وقف گریہ ہیں
دل رہن مجبوری ہے

خاکی ہے پر تو نہیں
ناری ہے یا نوری ہے

چاک احساس میں دل
اک تیغ کافوری ہے

عشق چھپانے چھپ نہ سکے
یہ ایسی کستوری ہے

اس سے دل جب تک نہ ملے
قرب میں بھی اک دوری ہے

مرنا بھی ہے مجبوری
جینا بھی مجبوری ہے

پر تو جلنے ہی جلنے
یہ کیسی مستوری ہے

صبح وصال آنے کی ذکی
دور ابھی صبوری ہے

○○○

ڈاکٹر فرحت عباس

○

کوئی دن کائنات ہونے تک
ہم قفسیوں کی بات ہونے تک

امکاں کے سفر حوالوں سے
لمحے عشق نجات ہونے تک

لازوال آگہی آتے ہی
زندگی بے ثبات ہونے تک

ہو تعلق کبھی رہا ہی نہیں
اس تعلق پہ بات ہونے تک

امتحاں کے سہل ہونے سے
تشنگی کی حیات ہونے تک

روشنی پر یہ کیا عذاب آیا
شام سے قبل رات ہونے تک

امتحاں ختم ہو گئے مشکل
اور مشکل حیات ہونے تک

ان کے جلووں کا ہے کرم فرحت
ہر نظر ساتھ ساتھ ہونے تک

○○○

ظہیر جاوید

O

ابھی تلک یہ اُسے موسم گلوں کی رنگت بتا رہی ہے
مگر وہ آئے ہیں دور سے کل کی مثل رہی ہے
حجاب ان کا اٹھا اٹھا سا حجاب ان کا کھلا کھلا سا
وہ اک نگاہِ شرر ان کی بڑا [illegible] رہی ہے
وہ میرے پہلو میں ہو کے بیٹھے ہیں بادلوں کی دھڑکن بڑھا رہے ہیں
ادھر کے حالات پوچھتے ہیں وہ آگ دل میں لگا رہی ہے
یہ پانیوں میں خلال کرتا وہ بیتے لمحوں کی یاد آئی
شراب جیسے کی لذتیں تھی وہ چاند چہرہ دکھا رہی ہے
ظہیر وقت رواں پہ دیا سوال کرنا بھی مظہری
چراغ سارے یہ جلا دئیے پون گلی کے بجھا رہی ہے

OOO

ریاض ندیم نیازی

O

کب سے فضائے شعر و سخن میں جمود تھا
آؤ ہو میں تو نغمۂ جاں کا ورود تھا
کاغذ پہ تصویر ہے وہ سارا نکال کر
چھایا بھی میرے کاسۂ سر میں سرود تھا
آئی نظر نہ دشت کے پاس کوئی بھی کہیں
شعلہ بنا تو شمع کے اطراف دود تھا
تھا انتہا کا وہ بھی حقیقت پسند کچھ
میں بھی کب آشنائے رسوم و قیود تھا
کچھ روز دوستوں میں رہا کر اس کے بعد
میں تھا ندیم اور نہ میرا وجود تھا

OOO

اخلاق عاطف

O

خود اپنے شوق کی شدت سے ہم وضو کر کے
چلے ہیں اذنِ محبت کی آرزو کر کے

نہ ہم کلام ہوئے تیری بزم میں تجھ سے
گر لوٹ آئے ہیں خود سے ہی گفتگو کر کے

کھلا نہ ہم پہ طلاحت کا راز کوئی بھی
کہ ہم نے دیکھے ہیں سب چاک بھی رفو کر کے

ہم اپنے فن کی لطافت پہ ناز کرتے ہیں
ترے جمال کی تجسیم ہو بہو کر کے

بہار کو نہ ہوا کچھ بھی ندامت سے
نسیم کو ترے آنچل کے روبرو کر کے

بڑی ہوا تھی حدیث کی صداقت سے
جو معتبر ہوا عالم کی آبرو کر کے

یزیدیت کا [illegible] 72 نے عاطف
حسین کو سر صحرا لہو لہو کر کے

OOO

نیر رانی شفق

O

پیمان وفا کے باندھ کے جانے کدھر گیا
صحرائے ہجر میرے لیے بن سنور گیا

میری نگاہ شوق میں جھلک چلی گئی
اس کا بھی شوق میرا دل پہ اثر گیا

اک شوخ سی نگاہ جو رخ پہ تھی رکی
عارض پہ اک حسین سا غازہ اتر گیا

اس کی کتاب شوق کا سادہ ورق تھی میں
میرا بھی عشق دیکھ کے اس کو سنور گیا

منزل کی چاہتوں میں قدم رقص میں رہے
یہ کار عمر رائیگاں کا یہ سفر گیا

چھایا تھا مہرباں سا بادل جو دھوپ میں
موجِ صبا چلی تو وہ بھی ادھر گیا

کچھ شام سے لپٹ کے شفق رات بھر رہی
کل تک تھا اب کے یاد سے دل کا گھر گیا

OOO

رشیدہ عیاںؔ (امریکہ)

○

خود ہی تو پڑھے تھے غم، اب ملال کیا کرتی
طریقِ عشق تھی، فکرِ مآل کیا کرتی

زباں بندی کے دستور کا رواج ہے عام
تو بن زباں تھی عرضِ حال کیا کرتی

صدائے خامہ سہارا اگر نہ بن جاتا
تو بزمِ غیر کو میں ہم خیال کیا کرتی

ازل سے بھرا رہا ہے وہ دامنِ حاجات
میں بھرتی ہوں، سو کوئی سوال کیا کرتی

حصارِ آتشِ ماحول سے گزر ہی گئی
زمانے والوں سے میں قیل و قال کیا کرتی

ترے حضور تھی لب بند و چشم و گوش بند
وہ جبر تھی کہ کچھ عرضِ حال کیا کرتی

بچھائی کانٹوں میں راہیں نئی بنائی ہیں
کسی کی راہ پہ چلتی، کمال کیا کرتی

خوں کے بحر سے موتی تو کچھ نکالے ہیں
اب اور کارِ جہاں بے مثال کیا کرتی

○○○

صائمہ نورینؔ بخاری

○

رنگ صد تو بہار سے آگے
ہیں یہ کس شاخسار سے آگے

وقت آگے بڑھا ہے اس کے
وقت آگے انتشار سے آگے

انقلاب حیات کی صورت
چادر تار تار سے آگے

ساتھیوں کی صدائیں سنتی ہوں
کوچ ہوں میں قطار سے آگے

جانے کس موڑ پر کھڑی ہوں میں
جانے کس رہگزار سے آگے

اس تک جانا اختیار کیا
پھر ترے اختیار سے آگے

میں ہوں خلاف پانیوں کی ندی

بہنے کے کوہسار سے آگے

○○○

وصفؔ وفا (امریکہ)

○

تھام کر ہاتھ مرا پھول کلائی کر دی
سرمئی شام مری اس نے گلابی کر دی

اتنا پاگل ہی نہیں تھا کبھی اس کے آگے
اس نے قدموں میں مرے ہجر طرازی کر دی

چھوڑ کر جانے کا دکھ تھا پلٹ آیا اور
ہاتھ رکھ کے مرے کاندھے پہ تلافی کر دی

اس کو دیکھا ہے تو لگتا ہے کہ دیکھا ہی نہ تھا
اس نے روشن مری آنکھوں کی سیاہی کر دی

○○○

○

نہ اتنے بے کل و بے تاب کیسے
محبت میں ادب آداب کیسے

ابھی تو نیند سے جاگی نہیں میں
مرے لمحے ہیں پھر بے خواب کیسے

محبت ہے مری نس نس پہ جاری
یہ آنسو ہو گئے زہراب کیسے

نہ پوچھو وہ آشفتہ نوائی
وجود غم نہیں اسباب کیسے

○○○

رشید آفریں

O

نہ رنگ گل سے ہوا تھا نہ ان شرر سے ہوا
جو حال دل کا ہوا ہے وہ اک نظر سے ہوا

بھٹک رہا ہوں میں یوں جنگلوں میں ابھی
مرا نباہ نہ منزل نہ راہگزر سے ہوا

فلک پہ جا کے بھی منقوش طاقت پرواز
مگر زیاں جو ہوا زور بال و پر سے ہوا

بچا کے دل کو بھی امید وصل ساحل سے
فروغ میری انا کو مگر بھنور سے ہوا

لکھی تھی تیرے مقدر میں کیا کمی اے دل!
مگر نصیب اگر آگہی سنگ در سے ہوا

رچا ہے فطرت انساں میں لغزشوں کا ثمر
زوال آدم و حوا بھی شجر سے ہوا

نہیں تھا خدشہ دل آفریں کے شیشے کو
کبھی شکستہ ہوا بھی تو شیشہ گر سے ہوا

OOO

طاہر منظور

O

مجھے تم سے محبت بھی بہت ہے
مجھے تیری ضرورت بھی بہت ہے

غزل حسن کا شہکار ہے تو
لطافت بھی نزاکت بھی بہت ہے

نگاہیں پھیر لینے کی بھی جاناں
مجھے تم سے شکایت بھی بہت ہے

محبت کے علاوہ چارہ گر کی
مرے دل پر عنایت بھی بہت ہے

مرے پیارے یہاں اندر ہی اندر
محبت میں تجارت بھی بہت ہے

مرے محبوب کی عادت میں شامل
محبت بھی شرارت بھی بہت ہے

ہمارے حکمرانوں کے دلوں میں
عداوت بھی خیانت بھی بہت ہے

مجھے اوراق سے مانگے ہے طاہر
مری آنکھیں لکھی قسمت بہت ہے

OOO

آسناتھ کنول

O

اک بہانہ دل ناداں سے بنا لوں تو چلوں
یہ ذرا آتش تر و خشک بجھا لوں تو چلوں

دل دریچے میں ادھر سے وہ جو پھر چلنے لگے
ان میں حسرت کا پھول کھلا لوں تو چلوں

درد اتنا ہے کہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے اب
چشم گریاں میں کوئی رنگ سجا لوں تو چلوں

ستارے گھر سے چلے ہیں پلک پلک ہمدم
اپنی پوروں میں ذرا ان کو چھپا لوں تو چلوں

اب اداسی کے لیے کون یہاں آئے گا
قریہ جسم سے میں روح نکالوں تو چلوں

دشت احساس کے چند وہ سپنے اندھیاروں میں
ان چراغوں کی ذرا لو یہ جلا لوں تو چلوں

آس بھی خالی گھر جیسے ہے پلٹ آئی ہے
اب کے اس ہجر کا سامان اٹھا لوں تو چلوں

OOO

یادیں

میں کون ہوں......؟

اظہر جاوید

ساحر لدھیانوی کا ایک مصرع ہے ۔۔۔ ع کہ جیسے عمر کی زندگی نہیں گزری

غور کریں، تو ہم سے بیشتر لوگ صرف عمر ہی کاٹتے ہیں، زندگی نہیں گزارتے۔ زندگی جو رنگوں اور امنگوں سے بھری ہو، جو بہاروں اور مہکاروں کے جلو میں ہو۔ ایسی زندگی جس میں مسرتیں ہوں، حسرتیں نہ ہوں۔ مگر زندگی اور زندگی کے نشیب و فراز اور اونچ نیچ کو تو اوپر والا اپنے ہی انداز میں لوحِ محفوظ پر لکھ چکا ہوتا ہے اور انسان ساری عمر تدبیر اور تقدیر کے پھیر سے نہیں نکلتے۔ زندگی میں جو چاہتے ہیں، وہ ہوتا نہیں اور جو ہو جاتا ہے، وہ ہم نے چاہا نہیں ہوتا۔ ہونی اور انہونی کا کھیل اپنے ڈھنگ سے چلتا رہتا ہے۔ انسان ایک پتلی کی طرح ہے جس کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور یہ دنیا ایک پتلی گھر ہے۔ جس میں ہر پتلی کو کوئی نہ کوئی کردار ادا کرنا ہے اور یوں صبح سے شام کرتے زندگی تمام ہو جاتی ہے۔ محتشب جارچوی کا ایک شعر ہے ۔۔۔ ع

ہم نے اک زندگی کی خواہش میں آج تک زندگی گزاری ہے

جب زندگی عمر گزر چکی ہو، بچے بڑے ہو گئے ہوں تو پیچھے مڑ کر گزرے ہوئے دنوں میں جھانکیں تو واقعات کی ایک عجیب جھلمل سی نظر آتی ہے۔ دکھ اور سکھ گڈمڈ ہوتے نظر آتے ہیں۔ خوشیوں کا کانٹا اور غموں کی آنچ دونوں جھک جھک کر رہے ہوتے ہیں۔ کبھی خوشیوں کا پلڑا بھاری لگتا ہے، کبھی غموں کا۔ اور انسان فیصلہ نہیں کر پاتا کہ وہ دونوں کا جشن منائے یا سوگ۔ یہ نتیجہ نکالنا بھی مشکل ہوتا ہے کہ پایا کیا ہے اور کھویا کیا۔ پھر اگر مجبور انسان کے شام و سحر کا فیصلہ بھی کسی اور کے ہاتھ میں ہو تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو ہوا اس میں اس کا کتنا دخل تھا؟ یا دوسروں نے کیا کیا مجھ پر بہت کچھ کر ڈالا۔

آج پل پل کرتے ہوئے وقت کے اس مقام پر کھڑی میں بھی سوچ رہی ہوں کہ زندگی نے مجھے کیا دیا۔۔۔ میں پورے وثوق اور ایمان سے کہہ سکتی ہوں کہ میں نے پل پل اور قدم قدم پر زندگی کو خراج دیا ہے۔ زندگی کا وہ قرض بھی چکایا ہے، جو مجھ پر واجب نہیں تھا مگر اپنے پیاروں نے مجھ پر ٹھونس دیا تھا۔ اور میں کبھی رو کر اور کبھی ہنستے ہنستے زندگی کا ساتھ نبھاتی رہی۔ ذمہ داریاں پوری کرتی رہی۔ اور وہ فرض بھی ادا کئے جنہیں ادا کرنے پر نہ مجھے کسی نے تھپکی دی نہ شاباش کہا۔ جو جس کے لئے کیا، اس نے اسے اپنا حق سمجھ کر وصول کیا۔ کوئی حرفِ تسلی تو دور کی بات ہے، یوں منہ موڑ دیا، جیسے میری نیاز مندی میں، میری خدمت گزاری میں کوئی کمی رہ گئی ہو۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔ کیا ہوں۔ یہ سوال اکثر ذہن و دل میں کلبلاتا رہتا ہے۔ اللہ کا فضل ہے، بہت شہرت، بڑی عزت اور بہت بلند مقام ملا۔ تحسین اور تنقید کی بوچھار ہوتی رہیں، پیروں میں رکتی رہیں۔ مگر کبھی نہ غرور سے گردن اکڑائی نہ کبھی اپنے حسن و جوانی پر اترائی۔ یکسو خوش اخلاقی گھٹی میں پڑی تھی۔ کچھ مزاج انکسار رہی۔ یوں دوست بنتے رہے اور رفاقتوں کا ہجوم اکٹھا ہوتا رہا۔ یہ وہ سوال تو اسی طرح کلبلاتا رہا۔۔۔ میں کون ہوں۔۔۔؟

ماں نے بتایا تھا، میں شملہ میں پیدا ہوئی۔ والد کا تعلق لکھنؤ کے قریب ایک ریاست بسمنڈی سے تھا۔ نواب سردار خلیل اللہ خان ___ مہاراجہ پٹیالہ کی انہیں قربت حاصل تھی۔ انہوں نے ہی سردار کا خطاب دیا اور میرے والد مہاراجہ کے وزیر تعلیم رہے۔ میرے نانا اور والدہ وغیرہ وزیرپور کے ایک گاؤں دھرم کوٹ کے رہنے والے تھے۔ مجھے نہیں پتا، ماں کہتی تھیں کہ وہ خوش حال زمیندار تھے۔ ننھیال والے دہلی میں آ بسے، وہیں والدہ کی شادی سردار خلیل اللہ خان سے ہوئی۔ والدہ نے بھی تفصیل تو نہیں بتائی، نہ میں احترام کی وجہ سے پوچھ سکی، لیکن اتنا معلوم ہوا کہ یہ محبت کی شادی تھی ___ میں نے والد کو صرف ایک ہی دفعہ دیکھا، وہ لکھنؤ رہے، والدہ دہلی میں ___ پھر جب ہم کراچی پہنچے، تو ایک دفعہ انہیں دیکھ پائی اس کے بعد حسرت ہی رہی۔ کئی بار انڈیا گئی مگر ان کا ٹھور ٹھکانہ معلوم ہوتا تو ملاقات ہوتی۔

میں بہت چھوٹی تھی۔ بالکل ایک دھندلے خواب کی طرح یاد ہے کہ چاروں طرف آگ اور خون کا طوفان تھا۔ کہیں ادھ جلی، کہیں جلی لاشیں تھیں، کہیں بے حال مردے پڑے تھے۔ ایک خوف کا عالم تھا۔ ایک دہشت اور وحشت کا سماں تھا۔ پھر پتا نہیں کیسے ہوا کیا ہوا کہ ہم لٹتے پٹتے کراچی آ گئے۔ یہاں کی یادیں بھی بڑی تلخ اور بڑی الم ناک ہیں۔ ویران سے گھر میں حیران پریشان بچیں لوگوں کا کنبہ، بڑے چھوٹے، عورتیں بچے، سبھی بے بسی اور کس مپرسی کا شکار تھے۔ گھر کے مرد ابھی تک ماضی میں جی رہے تھے اور خوابوں کی آس لگائے بیٹھے تھے۔ انہیں کام کرنے میں عار محسوس ہوتی تھی، اور محنت مشقت کی عادت نہیں تھی۔ گھر کیسے چلتا تھا، مجھے کچھ بھی یاد نہیں البتہ جب میں ذرا ہوش سنبھالنے کے سن میں پہنچی تو ساتھ ہی اس احساس نے قوت پکڑی کہ مجھے خود ہی کچھ کرنا ہوگا ___ کچھ بننا ہوگا ___ میں بھی اسلامیہ گرلز ہائی سکول میں پڑھتی تھی۔ آگے بڑھنے کی خواہش رکھنے والی بچیوں کی طرح میں بھی ڈاکٹر بننا چاہتی تھی۔ ارادے کب کسی کے پورے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر بننے کا ارادہ اپنی جگہ، لیکن موسیقی، رقص اور علم تو کم عمری ہی میں میرے شوق کا حصہ بن چکے تھے۔ میں ابھی لی مارکیٹ کراچی کے یکو اسلامیہ گرلز سکول میں نویں جماعت کی طالبہ تھی، کہ ایک اور انقلاب نے ہمارے گھر کو اتھل پتھل کر دیا۔ پتا نہیں تقدیر میری زندگی میں کوئی شدید موڑ لا کر میری منزل متعین کرنا چاہتی تھی۔ یا اسے بھی بدنصیبی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ تقدیر اور تدبیر کی جنگ تو ازل سے جاری ہے۔ کچھ فیصلے اوپر ہو چکے ہوتے ہیں اور انسان کو اسے قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ قرضوں تک گھر کا سلسلہ کب تک چلتا ہے اور پھر جب آمدنی کا کوئی بھی ذریعہ نہ ہو ___ ہمارے کنبے پر چھ سو روپے کا قرض چڑھ چکا تھا۔ مکان کا کرایہ بھی اس میں شامل تھے۔ آج چھ سو روپے بڑے معمولی لگتے ہیں لیکن آج سے چار پانچ دہائیاں پہلے یہ بہت ___ بہت بڑی رقم تھی۔ اور قرض چاہے آج بھی چھ سو کا دینا ہے لینے والا تو ہر حربہ استعمال کرے گا اور پھر یوں ہوا ___ میں سکول سے آئی تو دیکھا، ہمارے گھر کا سارا سامان باہر پڑا ہے اور اہل خانہ ایک بار پھر بے چارگی کی علامت بنے، سامان کے ساتھ ڈھیر ہیں ___ میں کیا کرتی ___ میں بھی تو ان کے ساتھ مل کر رو سکتی تھی۔ پھر بھی گئے گزرے زمانے میں بھی بگڑے بھلے ہو جاتے ہیں۔ کسی خدا ترس نے وہ ادائیگی کی اور خود کھڑے ہو کر سارا سامان گھر میں رکھوایا۔ سامان ___؟ اجڑے ہوئے لوگوں کا سامان کیا ہوگا؟! کچھ ٹوٹی پھوٹی چارپائیاں اور کرسیاں ___ کچھ بوسیدہ لباس اور بے قفل بکس۔ آج بھی اتنے برس گزرنے پر مجھے وہ خدا کا بندہ یاد آ رہا ہے، جس نے ہمارے خاندان سے ترس لی تھی کہ زندگی کے کسی بھی مقام پر اس کا نام سامنے نہیں لایا۔ ہماری دعائیں تو ہمیشہ ہمیشہ اس کے لئے فلک کو چھوتی رہتی ہیں اس کے لئے اس کی آل اولاد کے لئے۔

زندگی کے سفر میں اور بھی اچھے لوگ ملے۔ اور ان سے بھی بار بار واسطہ پڑا جو اچھے نہیں تھے۔ ساری عمر یوں لگا کہ خون کے رشتے اپنی اپنی غرضوں کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ انہیں اس سے کیا کوئی مرے کوئی جیئے ـــــ حیرت کی بات ہے، اگر حافظہ ساتھ دے اور گنتی شمار کروں تو زیادہ زخم انہوں ہی سے ملے۔ کئی بار کیا متعدد بار غیروں نے ـــــ ان غیروں نے جن کے ساتھ خون کا رشتہ نہیں تعلق کا رشتہ تھا، انہوں نے ساتھ دیا، ہاتھ تھاما اور ڈانواں ڈول ہوتے اور لڑکھڑانے سے بچا لیا۔

جب نوبت ترقی تک پہنچی اور آگے دور دور تک اندھیرا ہی اندھیرا نظر آنے لگا تو میں نے وقت سے خود آزما ہونے کا عزم کر لیا۔ اس عرصے میں اپنے شوق کی تکمیل کے لئے رقص کی تربیت لے رہی تھی۔ یوں سمجھئے بالکل نوعمری میں۔ ایسی عمر جس میں لڑکیاں بالیاں گڑیا پٹولے کھیلتی ہیں، مجھے رقص کی تربیت لینا پڑی کہ اس سے آمدنی کا وسیلہ اور پیٹ کی روٹی پانی کا حیلہ بنے گا۔ بھوک سے مرنا اور مسلسل لڑتے رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ یہ بھی بھرے پیٹ والے نہیں جان سکتے۔ سو تحریریں لکھ لیں، دسیوں تقریریں کر لیں، مگر غربت کی تلخی اور بھوک کی تڑپ کا احساس تک نہیں لیا جا سکتا۔ استاد غلام حسین پٹیالے والے جنہیں مہاراجہ پٹیالہ نے شاہی استاد کے لقب سے نوازا تھا اور نواب جونا گڑھ نے شاہی استاد زنان خانہ کا خطاب دیا تھا۔ ان سے سبق کی ابتدا کی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جہاں جہاں سے فن کی طلب ملتی رہی سیکھتی گئی۔ مہاراج استاد شادو خان، جستی شکل، میڈم آزوری سے کتھک اور رفیع انور سے بھارت ناٹیم سیکھا۔ دیبو کمار نے منی پوری کے انگ بھاؤ سکھائے اور استاد صدیق سماٹ نے ڈانس میں پختگی کے گر بتائے۔

یہ جتن، لگن اور مشکل کا زمانہ پتہ نہیں کیسے گزرا؟ ویسے آج یہ جملہ میں جس آسانی سے لکھ گئی ہوں، جب وہ دن گزر رہے ہوں گے اور ہم سب کنبے والے جیسے تیسے گزر بسر کر رہے ہوں گے وہ وقت کاٹنا تو کیا، آج یاد کرنے سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ بیتے دنوں اور یادوں کی ایک پٹاری ہے۔ ایک مسکین سی ہستی کی پوٹلی ہے۔ جس میں سے جو جو کچھ جیسے جیسے نکلتا آیا، پیش کرتی رہوں گی۔ کس سن میں کیا ہوا، کوئی واقعہ پہلے یاد آ گیا، اور اس کا سن کہیں بعد میں آتا ہوگا، تو اسے کوئی روزنامچہ یا ڈائری کی تحریر نہ سمجھیں۔ ایک عورت کی زندگی میں جدوجہد، ایک فنکار کی حیات کے نشیب و فراز اور زمانے کے دیئے ہوئے اچھے اور تلخ تجربات کی داستان ہے۔ یہ نہ اس میں کوئی رنگ ڈال کر اسے اچھالوں گی، نہ اس کے پیچھے رہ گئے ہیں پر آپ کوئی کڑی تنقید کریں۔ میں سمجھتی ہوں یہ میرا اکھاڑہ سا بھی ہے اور گلشن ہے۔ اس میں کئی لڑکیوں اور عورتوں کے لئے کوئی سبق بھی پوشیدہ ہو۔ خدا کے فضل سے میں نے بہت عروج دیکھا ہے۔ راجے مہاراجے، نواب، وڈیرے، حکمران، بادشاہ اور شہنشاہ ـــــ کس کس سے آمنا سامنا نہیں ہوا، مگر نہ جب غرور آیا، نہ اب کوئی پچھتاوا ہے۔ یہ ٹھیک ہے، میں بھی بقول غالب ـــــ ؎

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں

دکھ جھیلے ہیں، غم پائے ہیں۔ اپنے طور پر محبت بانٹنے کی کوشش کی ہے مگر ہو سکتا ہے، کچھ لوگوں کو مجھ سے بھی شکایات رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے کیا ہوا ہے ـــــ؟

ہم سب لوگ اپنی اپنی خواہشوں کے اسیر ہوتے ہیں۔ کبھی جانتے بوجھتے کبھی ان جانے میں کسی دوسرے سے توقعات رکھ لیتے ہیں، امید باندھ لیتے ہیں اور لاشعوری یا شعوری طور پر اسے اپنا حق سمجھنے لگتے ہیں، اور دوسرے کے لئے اسے پورا کرنا فرض خیال کر لیتے

ہیں۔ ایسے شخص تو لٹنے سے بے وجہ شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔

کچھ تو ماں کی تربیت، کچھ استادوں کی تعلیم، کچھ زمانے کے مشاہدوں نے مجھ میں استغنا، توکل اور قناعت پیدا کر دی ہے۔ اس میں بچپن کی غربت اور فاقوں کا کمال بھی ہے۔ ایسا وقت بھی آیا کہ میں ہیروں سے لدی پھندی رہی۔ کراچی کے مشہور زمانہ ہونے کے بیوپاری عبداللہ بھٹی نے محاورۃً نہیں اصلتاً مجھے ترازو میں بٹھا کر سونے میں تولا، اور یہ بات بھی پال کی آتی ادبی چلی اور کم وزن ہو پلڑے میں زیادہ سونا چڑھ جاتی نہیں۔ اس وقت بھی گردن میں بل نہیں آیا تھا، اور آج بھی۔ جب کبھی کبھی بجلی کا بل دینے اور میٹر کے کٹ جانے کی دھمکی ملنے پر کسی دوست سے ادھار لیتے ہوئے، اپنوں سے پرائے سے شکوہ نہیں کرتی، پریشان نہیں ہوتی۔ وہ آنسو آتے ہیں آنکھ سے پوچھ کر پھر زندگی کی تنگ و دو میں جٹ جاتی ہوں۔

ان سارے گزرے برسوں میں زندگی نے کیا کیا جلوے دکھائے۔ فن کی دنیا میں ایسے ایسے تجربے ہوئے کہ بیان کرنے لگوں تو طلسم ہوش ربا تصنیف ہو جائے۔ کون کون ملا — کیسے کیسے لوگ قدردان اور مداح ہو کر "فریفتگان" میں شمار ہوئے، وہ نام تو کب قلم پر آ جائیں، تو خوف فساد خلق کا امکان پیدا ہو جائے۔ غزل کے شعر کی طرح، کچھ کہی، کچھ ان کہی ہی رہنے دوں گی۔ عورت ہونا بھی تو ایک مشکل ہے مرد تو پرچھائیوں سے بھی ناتا جوڑ کر آپ بیتی لکھتے ہیں، اور دھوم مچا لیتے ہیں، عورت آدھا سچ بھی کہتے ہوئے سو بار سوچتی ہے۔ اور پھر اسے تہہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ کملا داس، امرتا پریتم، تسلیمہ نسرین جیسی بظاہر نڈر عورتوں نے بھی تو آدھے سچ بولے۔ میں بے چاری کس گنتی شمار میں۔

عورت تو ہر رشتے میں سوالوں کی بوچھاڑ میں رہتی ہے۔ رقص کرنے والی ہو، گلوکارہ، اداکارہ — شاعرہ یا ادیبہ ہو — کچھ بھی ہو عورت ہونا ہی اس پر کئی پابندیوں اور جکڑ بندیوں کا قفل چڑھا دیتی ہے۔ کہتے ہیں، تصوف کے مسلک میں آلکیف سب سے کٹھن مرحلہ ہے۔ میں اسے دوسرے معنوں میں لیتی ہوں، کہ شک اور عورت تو شاید جڑواں بہنیں ہیں۔ مرد، اس کا رشتے میں کوئی بھی ہو — باپ، بھائی، بیٹا، شوہر یا چاہنے والا — ہر وقت اس کی ناک پر شک کی مکھی بیٹھی رہے گی۔ معاف کیجئے، عورت جائے نماز پر بھی بیٹھی ہو تو — مرد کا شک اسے پھر بھی حصار میں لئے رکھتا ہے۔ اور ہم فن کاروں کا معاملہ تو یہ ہے — اک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے۔

ابھی میں نے غزل کے شعر کی مثال دی تھی۔ یہاں سے ملکۂ غزل مختار بیگم یاد آ گئیں۔ انہیں آغا حشر والی مختار بیگم بھی کہتے ہیں اور اہل شوق داری امرتسر والی بھی۔ وہ عظیم فن کار اور بے حد ہمدرد خاتون تھیں۔ انہوں نے زندگی میں بہت سرفرازی دیکھی مگر افسوس موت کے وقت وہ اپنوں میں نہیں تھیں۔ کیا پتا میرا بھی انجام کیا ہو! میں نے ٹیلی ویژن کے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ میرا انجام بھی پروین بوبی جیسا ہو گا۔ تب میرے کئی بے نیاز اپنوں نے بہت ناک بھوں چڑھائی تھی۔ لیکن جیتے جی کون دیکھتا ہے کہ راجوں مہاراجوں کو تڑپانے اور آغا حشر جیسے بے مثال شخص کو بہلانے والی مختار بیگم کی زندگی کے آخری دن کیسے گزرے تھے — ؟

مختار بیگم بہت پیار والی تھیں۔ انہوں نے مجھے بیٹی بنا رکھا تھا، انہوں نے نصیحت کی کہ رقص کے ساتھ ساتھ گائیکی میں مہارت کرو۔ وہ کہتیں ڈانسر کے لئے سر میں ہونا بہت ضروری ہے۔ اس سے رقص بھاؤ میں مدد ملتی ہے۔ وہ اکثر مجھے رقص کرتے ہوئے سمجھاتیں کہ ٹھمری پر کیسے رقص کیا جاتا ہے اور غزل پر کیسے۔ وہ میری ماں جیسی تھیں اور استاد بھی۔

جب زمین پر پاؤں ٹکانے اور ہاتھوں سے اظہار دکھانے کا تھوڑا سا سلیقہ آیا تو ان دنوں کراچی میں دو ہی بڑے ہوٹل ہوتے تھے۔ بیچ لگژری اور میٹروپول۔ وہ زمانہ تہذیب اور شائستگی کا زمانہ تھا۔ تب پاپ میوزک ظہور میں آیا تھا نہ رقص کے نام پر اچھل کود متعارف ہوئی تھی۔ چوڑی دار پاجامہ، انگرکھا اور دوپٹہ یہ ڈانسر کا لباس ہوتا تھا۔ تبدیلیاں آتی رہتی ہیں اور آ بھی گئیں مگر مجھے اس کا دکھ نہ جھیلنا پڑا۔ میرے ساتھ بھی میری ہم عصر ایک سینوا الاتھی ___ وہ بھی کتھک ڈانسر تھی۔ اللہ کے فضل سے ابھی زندہ ہے اور آج کل بھی لاہور میں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی کسی سکول کے بچوں کو رقص سکھا دیتی ہیں۔

آپ سے سچ کہتی ہوں۔ وہ زمانہ تو وحشتوں اور اوچھے لوگوں کا نہیں تھا۔ کیسے کیسے معزز لوگ رقص دیکھنے آتے تھے اور وہ اتنا دیکھنے ہی کی حد تک رہتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو، نبی بخش زہری، اکبر بگٹی اور دوسرے بہت سے مہذب لوگ قدردان ہوتے تھے۔ بھٹو بھرپور جوانی تھی۔ شوخ لباس اور چہکتی ہوئیں ادائیں ___ ہوٹل میٹروپول میں میرے رقص کے ابتدائی دن تھے۔ ایک آئیٹم ختم ہوا۔ میں کمرے میں آئی۔ سازندے بھی تھے۔ کر دوسرے آئیٹم کے لئے لباس تبدیل کرتا اور سازندوں سے معمولی مشورہ کرتا تھا۔ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ بڑی نرم اور مدھم دستک۔ دروازہ کھولا تو دیکھا ذوالفقار علی بھٹو کھڑے ہیں اور بے ساختہ داد دینے آئے ہیں کہ میرے ہاں میں یہ ممکن نہیں تھا۔ ایسی وضع داری اور رکھ رکھاؤ اب کہاں ___؟

زندگی کے دھارے میں بہتی رہی۔ کبھی بھنور، کبھی ساحل ___ کبھی لہروں سے ٹکرا، کبھی موجوں سے کھیلا۔ زندگی ایک سمندر ہے کہ جس کا اب تک دوسرا کوئی کنارا کبھی پایا ہی نہیں۔ سوچا جائے تو فن کار شاید ساری عمر کنارا پاتے ہی نہیں۔ میں جو اب بنیادی طور پر ڈانسر نہیں رہی کیا میں نے کنارا پا لیا ہے ___ نہیں، ابھی تک ایک گرداب ہی سے سامنا ہے۔ کبھی کوئی اوپیرا تیار کروایا، کسی بیلے کی ریہرسل کروائی، کوئی جلوہ پیش کروایا۔ میں بچیوں لڑکیوں اور لڑکوں کو تال میں رکھنا اور کہیں جھول نہ آنے دینا، یہ کسی آزمائش سے کم تو نہیں ہوتا ___

(نایاب تحریر اظہر جاوید کے پرانے کاغذات سے بازیافت)

◆◆◆

سلسلے محبتوں کے

بین الاقوامی دوستوں کے رابطے کے لئے چند معروف لکھاریوں کے فون نمبرز اور پتے

-1	عزیز جبران انصاری	0300-9312919	جبران اشاعت گھر، 102۔ عائشہ منزل، اردو بازار، کراچی
-2	آغا گل	0303-3850099	H-20 گل باغ ہاؤسنگ سکیم، ہاکی گراؤنڈ، کوئٹہ
-3	فصیح الدین (پی ایس پی)	0313-5954055	ماڈل ہاؤس تخت بائی مردان، KPK
-4	خالد بزاز	0300-4830309	D-28، ارحمن سٹریٹ، اسلامیہ پارک، پونچھ روڈ لاہور
-5	ناصر بشیر	0333-4339350	ہاؤس نمبر 8، سٹریٹ نمبر 36، رام نگر سنت نگر، دیو سماج روڈ لاہور

سفرنامہ

عراق اشک بار ہیں ہم

……11……

سلمیٰ اعوان

(دنیائے اسلام کا ایک مقدس ترین اور زائرین سے بھرا کربلا شہر)

تو آج کربلا کے لیے روانگی تھی۔ رات کو ہوٹل آنے پر نسرین سے پتہ چلا۔ میں نے فکرمندی ہو کر اپنے آپ سے کہا تھا۔

''کل دن کا تو کوچ کا پروگرام ہے اور میری بغداد کے لیے طلب کی تشفی ہونے میں نہیں آ رہی ہے۔ ابھی تو ڈھیر ساری چیزیں باقی ہیں۔ آج کا آدھا دن تو گل ہی ہو گیا۔ ورنہ کافی کچھ دیکھا جا سکتا تھا۔''

اخلاق پر بھی تھوڑا سا غصہ آیا۔ صبر بھی نہ ہو سکا۔ اسی وقت موبائل بجا دیا۔ بیٹے سے بچے کا لہجہ سکون بھرا تھا۔

''جانے کا پروگرام ان کے ساتھ رکھیے۔ زیارات اور شہر کو دیکھیے۔ پھر مجھے فون کر دیجیے۔''

اس نے میرے لہجے میں کچھ چھپے، کچھ کھلے تفکرات محسوس کر لیے تھے۔

''آپ اطمینان سے سو جائیے اب۔ ان کے ساتھ جو کچھ دیکھ سکتی ہیں اسے دیکھیے۔ باقی میں ہوں نا۔'' چلو تسلی ہو گئی۔

باتھ روم میں پانی نہیں تھا۔ ترقی یافتہ ملکوں میں اپنے وطن کے ساتھ موازنوں کی صورت جو آئینے سے تعلق ہیں ان میں یاس کی قلت زیادہ ہوتی ہے۔ عراق جیسے جنگ اور دہشت گردی کے مارے ملک میں مماثلت کے رنگوں میں کوفت، دکھ اور جھنجھلاہٹ جیسی کیفیات کا تاثر زیادہ واویلا ہو کر اذیت کا باعث بن رہا تھا۔

سونا تو سویرے سویرے ہی برہم ہو گیا تھا۔ کچھ نکالنے کیلئے پرس کھولا تو پچیس ہزار دینار کا نوٹ غائب۔ اب پورے پرس کی شامت آ گئی تھی۔ پر وہاں ہوتا تو ملتا۔ سو فیصد شک کا گمان ساتھ والی پر تھا۔ مگر گھر اور باہر ایسے معاملات میں تماشے کرنے سے مجھے ہمیشہ چڑ سی رہی ہے۔ اپنی مرحومہ ماں کی اس بات سے مجھے سو فیصد اتفاق رہا ہے کہ کھیسہ اپنا سانبھو تے چور کے نوں نہ آکھو۔ (یعنی اپنی جیب کی حفاظت کرو اور چور کو کچھ نہ کہو)

پھر میری پھٹکار کا رخ خود میرے اپنے اوپر مڑا۔ ''کیا تھا جو خود اپنے ہاتھ سے دے کر نیکی کما لیتی۔ پر وہ تیرے مقدر میں ہوتی تب نا۔''

بس تو ہوٹلوں کو بیٹھے دکھا کر جب رات کو گھوڑے بیچ کر سوتے ہو تو سرہانے رکھے پرس میں کوئی بھی آسانی سے ہاتھ ڈال کر کچھ بھی نکال سکتا ہے۔ چلو دفع کرو۔

بغداد، کربلا، کوفہ اور نجف اشرف کے شہر دراصل میسوپوٹیمیا کے علاقے ہیں۔ دجلہ و فرات سے مستفیض ہونے اور ان کی زرخیزی سے بھرپور فائدہ اٹھانے والے۔

صبح تھی تو کیا سورج حسب معمول غبار آلود تھا۔ گاڑی کے شیشوں سے پردہ ہٹا کر چہرہ شناسی کرتی تو ویرانیوں کے جھنڈ نظر آتے۔ ذرا بغداد سے نکلے تو شارع اللہ کا بڑا سا بورڈ دیکھا۔ سڑک بن رہی تھی۔ ساتھ ہی خوبصورت قبیلوں کا سلسلہ تھا اور گرد کا بھرا پڑا تھا۔ راستے میں جابجا چیک پوسٹیں۔ ریت کی بوریوں سے بنی حد فاصل دیواریں۔ کچے پکے گھروں پر مشتمل بستیاں اور چوراہوں پر لگے بورڈوں پر ان کے نام درج تھے۔ چند دکانوں پر مشتمل بازار۔ کہیں تربوزوں کے ڈھیر سجائے اور بیچے تو خربوزے کے اور کہیں کھجوروں کے چھپے سلسلے آپ کی توجہ کو کھینچے چلے جاتے تھے۔

ایک تو جگہ جگہ چیک پوسٹوں کا سیاپا۔ گاڑی رک جاتی۔ پولیس کا پورا جتھا چیکنگ کے جدید ترین آلات کے ساتھ اندر آتا۔ پہلا مرحلہ تو گھور گھور کر دیکھنے کا ہوتا یوں جیسے القاعدہ کے لوگ ہوں۔ عراقی نخلستان دیکھنے کا بھی اپنا مزا ہے۔ بلکہ یہ مصیبت کا باب وا کرتے تھے کوئی حسب سے حضرت عون کے مزار کی بات کرتا تھا۔ مدینہ و کربلا سے غازیوں کیلئے راستے بنائے گئے تھے۔ ان دو رویہ راستوں کی خشکی نظر پر گراں گزر رہی تھی۔ اطراف گوڑے کیا راستے لدے پھندے ہوئے تھے۔ اب جابجا افسوس اور دکھ کی آہوں سے فضاؤں کو غم آلود کرنے کا فائدہ؟

بلکہ یہ کربلا میں ہوں کا ادا کیسی کسمپرسی کی تصویر دکھتا تھا۔ کھجوروں کے جھنڈوں کی کہیں کہیں چھدری چھاؤں میں کھڑے سوزوکیوں کیلئے بھاؤ تاؤ ہوتے دیکھتے حشر ہوگیا تھا۔ سوزوکیوں میں بیٹھ جاؤ، آؤ جاؤ والا معاملہ تھا وہی بغداد والی صورت۔ ریڑھیوں میں سامان کی لدالدائی اور "چلو پیدل مارچ کرو۔" اب تھکنے والی بات تھی نا۔

دھوپ کربلا کی گلیوں میں اتری ہوئی تھی۔ ویرانی کا تصور ساتھ ہم سے پہ بکھرا ہوا نظر آیا تھا۔ مکانوں کی خستگی اور کہنگی بھی بڑی نمایاں تھی۔ بجلی کی تاروں کے بے ہنگم پھیلاؤ سے بھی کوفت ہو رہی تھی۔ درختوں کی شجرکاری ضرور تھی مگر کثرت کہیں نہ تھی۔ یہ شہر پوری دنیائے اسلام کیلئے مقدس ترین جگہ کی زیارت کیلئے آنے والوں کا ایک نہ ختم ہونے والا تانتا۔ اسے تو خوبصورتیوں کا مرقع بنا چاہیے تھا۔ اس کے ویرانوں کو نخلستانوں میں بدل دینا چاہیے تھا۔ تیل کے ذخائر سے مالا مال ملک اور زائرین سے بھی لبالب بھرا ہوا۔

ہم ایک طویل بازار سے گزر رہے تھے۔ دو رویہ عمارات سے گھرا ہوا کشادہ سڑک والا بازار جو قرآن پڑھتے ہوئے سید صاحبزادہ مقدس تک جاتا تھا۔ بازار، اس میں بنی دو منزلہ، ایک منزلہ، سہ منزلہ عمارتیں اور گاڑیوں کی کثرت تھوڑی سی خوشی دیتی تھیں کہ ان کا حال احوال بہتر نظر آتا تھا۔

ہوٹل فندق الجنائن قلب روضہ عالی امام میں گھسا ہوا تھا۔ دو چھلانگیں مارو اور مرکزی گیٹ پر پہنچ جاؤ۔ میں نے بھوچکی سی ہو کر وسیع و عریض رنگ برنگی دیواروں پر عظیم المرتبت حضرت امام حسینؓ کی دیوہیکل صورت تصویروں کو دیکھا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے جلوے بھی وہاں بکھرے ہوئے تھے۔ تصورات نے جھٹکا کھایا تھا۔ اب اس پر بھی شکر گزاری ہوئی کہ کہیں ان عظیم ہستی کا پیکر نہیں تراش لیا گر نہ تو ہم جیسے مارے جاتے۔ اب تو اپنی مرضی ہے جیسی مرضی تراش لیں۔

کمرے سے ہٹے تھے۔ شکر تھا کہ لوگ پیار تھے اور اے سی آن تھے۔ جی چاہتا تھا لیٹوں اور سو جاؤں۔ مگر میں سو نہیں سکتی تھی۔ مجھے مائع کی شکل میں ہر طور تین چار گلاس اپنے اندر اتارنے تھے۔ سو آنکھیں اور باہر نکلی۔ ہوٹل کی پچھلی گلی سے ایک اور بازار میں داخل ہوئی۔ حلب لیا ہوٹل کی واپس آئی تو ہوٹل کے مالک آغا یاس علی سے بیٹا پانے کی۔ پاس بیٹھی اور پوچھا۔

''آغا آپ کیا سوچتے ہیں؟؟''

''میری تو دلی تمنا ہے کہ امریکہ یہیں جم کر بیٹھ جائے۔ میرا تو کاروبار ٹھپ ہوا پڑا تھا۔ ایرانی زائرین پر پابندیاں تھیں۔ کمروں میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے۔ اب دیکھو کتنے سے کتنا اچھلتا ہے۔ مجال ہے جو میرے تین ہوٹلوں میں سے کسی ایک میں چھوٹا موٹا سا کمرہ بھی دستیاب ہو۔ ہاؤس فل۔

میرا اندر پانی کی کمی سے تڑپ رہا تھا۔ آغا کی ان جی جلانے والی باتوں پر مزید تڑپنے لگا۔ فوری اٹھنے میں سلامتی درکار تھی۔ کوریڈور میں چلتے ہوئے سست سی چال کے ساتھ ساتھ چہرے پر بھی جھلاہٹ تھی اور لہجے میں بھی۔ ''ارے یہ آغا کمبخت تو میں وطن میرے مرحوم ابا جیسا ہے جنہیں آزادی تو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ روز و کروڑ گھنٹے مارے گورے یاد آتے رہتے۔

''بڑا امن تھا ان زمانوں میں۔ ارے اکیلی عورت چاہے سونا لے لے گہنے سے پشاور جاتی۔ مجال ہے جو اسے کوئی ذرا ڈر ہوتا۔ میاں جی کا کاروبار کتنا بڑھا ہوا تھا! گھر میں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی تھیں۔'' میں تو سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھی۔ شکر تھا کہ انہوں نے یہ آج والا زمانہ نہ دیکھا۔ پہلے ہی چل بسے۔

دودھ اور سوڈے نے چلتے چلتے پیٹ کو ٹھنڈا کر کے رکھ دیا۔

ابھی تو تازہ دم تھی۔ کربلا کی شام خوبصورت تھی۔ سنہری کرنیں اگر چہار سو سونا بکھیرتی تھیں تو میرے بلند مرتبت عالی امام کے روضہ مبارک کا گنبد بھی نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ روضہ مبارک کے اندر شیشے کی جھلملاہٹوں، روشنیوں اور زیبائشی کام کی کوئی انت نہ تھی۔ نقاشی اور مینا کاری میں رنگوں کا امتزاج نگاہوں کو کھینچے لیے جاتا تھا۔ ہم نے بھی عقیدتوں اور محبتوں کو کیسے زر و جواہر میں لپیٹ لیا ہے۔

یہاں آہ و زاریاں تھیں۔ سسکیاں تھیں۔ خاموش آنسوؤں کے ساتھ چاہتوں اور محبتوں کے نذرانے تھے۔

جالیوں تک میری کہاں رسائی تھی؟ کیسے جگہ۔ بنائی نہیں جاتی۔ کسی انجانے ہاتھ نے پیچھے پکڑ کر تھام لیا۔ علی اصغر اور علی اکبر بھی وہیں آرام فرماتے ہیں۔

تو یہاں صدیوں پہلے صحرا تھا۔ جس نے میرے عرب کے راج دلارے کا خون پیا اور سیراب ہوئی اور اب رہتی دنیا تک اسے ظلم و جبر کے خلاف ڈٹ جانے کی کہانی سناتے رہنا ہے۔ محبتوں کے نذرانے پیش کیے۔ مغرب ادا کی اور حضرت عباس کے روضہ مبارک کی طرف چلی۔ روضہ مبارک سے پہلے بڑا وسیع و عریض میدان تھا۔ خوش رنگ قالینوں پر عورتوں، مردوں، بچوں کے جمگھٹے موجیں مار رہے تھے۔ پیدل چلتے چلتے تھے اور ایک میلہ ٹھیلے کا سا سماں تھا جو طبیعت کو شگفتگی دیتا تھا۔

خواتین کے ایک گروپ کے پاس بیٹھ گئی۔ زبان کا مسئلہ بڑا اہم تھا۔ تاہم پتہ چلا کہ ترکمانی فیملی تھی۔

میری آنکھوں میں یقیناً واقفیت کے رنگ ہوں گے۔ قریب بیٹھے مرد نے فوراً توجہ کی تھی۔

عراق میں سنی تقریباً بیس فیصد، شیعہ ساٹھ، کرد پانچ سے سات فیصد، ترکمانی 2 سے تین اور باقی اقلیتیں جن میں عیسائی، یہودی، آرمینین، یزیدی اور اشوری ہیں۔ ترکمانی لوگ سنی عقیدے کے حامل زیادہ اربل Arbil اور کرکوک Kirkuk میں رہتے ہیں۔ ترکمانی بولتے ہیں جو ترکش زبان کی ہی ایک شکل ہے۔

جنگ کے بارے میں میرے سوال پر مروے امریکہ کیلئے جس نفرت کا اظہار کیا اس سے کہیں زیادہ صدام کیلئے تھا۔ اور تو اپنی قوموں کیلئے بھی اس کی گوہر افشانیاں عروج کی تھیں۔ "یہ جو کرد ہیں نا کچی بات ہے ان کا تو نہ دین، نہ ایمان۔ کبھی کسی کے پیچھے بھاگتے ہیں کبھی کسی کے۔ خودمختاری اور آزاد علاقہ کردستان انہیں پھر بھی نہیں ملے گا۔ چاہے اسرائیل کے تلوے چاٹیں، چاہے امریکہ کی تلخی چاپلوسیاں کریں۔ اور یہ سنی تو سو فیصد اینٹی امریکن، شیعہ 50% پچاس فیصد پرو امریکی اور پچاس فیصد اینٹی امریکی۔ نتیجتاً پورے ملک کی باگ ڈور سنبھال کر بیٹھ گئے ہیں اور سنیوں کا ناک مار رہے ہیں۔ 50% پچاس فیصد شیعوں نے پہلے امریکیوں کو رگڑا لگایا۔ پھر امریکیوں کو سمجھ آگئی۔ اب دونوں کو لڑوا کر ایک دوسرے کا ناک مار رہے ہیں۔ کرکوک پر اتنی شدید بمباری ہوئی تھی کہ دیہاتوں کے دیہات تباہ ہو گئے۔ موت گلیوں میں ناچتی تھی اور بچوں بوڑھوں سے اسپتال بھر گئے تھے۔

یہ تو ظالم ہیں ہی۔ اندر خانے جانے ہم سے کن صدیوں کے بدلے لے رہے ہیں۔ مگر یہ شام کے مسلمان ہمارے ہمسائے ہمارے ماں جائے حکمران کیسے خود غرض اور اپنے مفادات کے حصاروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ اردن کو دیکھیں۔ ان بڑے قبیلوں کا پھیلا جال ہمیں مارنے کیلئے انکا سامان بھی اپنے راستوں سے بھیجتا تھا اور ہمیں زندہ رکھنے کیلئے اپنے کاروباری طبقے سے خورد و نوش اور دیگر اشیاء کی تجارت بھی کروا رہا تھا گویا پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔

قریب بیٹھی ایک دوسری فیملی بھی ہماری باتیں سن رہی تھی۔ بڑی نازک اور خوبصورت سی خواتین تھیں جن کے گورے چٹے خوبصورت بچے انگلش میڈیم سکولوں میں پڑھتے اور انگریزی سمجھتے اور تھوڑی تھوڑی بول بھی سکتے تھے۔ یہ بچے افنان، محمد علی اور فریال تھے۔ ساری فیملی انڈین فلموں کی عاشق۔ ہندو کو پسند کرنے والی، ایشوریا رائے، امیتابھ بچن، شاہ رخ خان، سلمان اور عامر خان کی دیوانی۔

بچوں نے ان کے بارے میں سوال کر کر کے پاگل کر دیا تھا۔ میں بھی اس پیاس کو بجھانے میں ناکام تھی کہ مصری ہندی فنکاروں سے کون سی مصری معلوماتی رفاقت تھی۔ وحید مراد، صبیحہ، شمیم آرا، یا سنتوش کماری کی بات ہوتی تو یقیناً شرابور کر دیتی۔ یہ ان ہندو والوں پر غصہ آرہا تھا۔ کمبخت ماروں نے کیا یورپ، کیا مشرق وسطی، کیا وسطی ایشیا سب جگہوں پر اپنی فتوحات کے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں۔ استنبول کے بازاروں میں ان کے ناموں کی پکاریں ہیں۔ مصری دور افتادہ جگہوں پر رہنے والوں اور تاجکوں میں ان کے عاشق صادق۔ ایشوریا رائے کے ذکر پر تو چہرے شمعوں پر گلے گلابوں کی طرح کھل اٹھتے ہیں۔ کہیں سمرقند، بخارا میں ان کے کارناموں کی دھوم ہیں اور جنوب مشرقی ایشیا کے شرق تیمور تو ان کی مٹھی میں ہیں ہی۔ ہماری شرمیلی انصاری، شہناز شیخ اور مرینہ خان کے بھی ڈھیر سے عاشق پیدا ہو جاتے اگر ہمارے سفارت خانے کچھ کام کرنے والے ہوتے۔ پر انہیں اپنے پیٹوں کے کنویں بھرنے سے فرصت ملے تو یہ ملک و قوم کا سوچیں۔

اب چلی کربلا کو حضرت عباس علمدار کو سلام کرآؤں۔ چار آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرآؤں۔ مرکزی گیٹ پر بڑی گھمسان کا رن پڑا ہوا تھا۔ عقیدت مند آگے بڑھنے کی کوشش میں ایک دوسرے کا ملیدہ کرنے میں دل و جان سے مصروف تھے۔ اس یوں لگا جیسے ایک قدم

آگے بڑھا تو حسن کی پریوں اور جنی فیاروں کے پاؤں میں تیسہ بن جاؤں گی۔ "یہ بھی ہے۔ واپس چلی تھی۔ رات گہری ہوگی تو دیکھوں گی۔"

ہوٹل کے ریسپشن پر کافی لوگ تھے۔ سوچا ذرا بات تو کروں۔ جنگ کے حوالے سے پوچھا۔

"جنگ بدھوں سے نہیں جیتی جاتی۔ دشمن بھی وہ جس کی جنگی ٹیکنالوجی کا زمانہ معترف۔ اس زون کا انچارج صدام کا بیٹا قصے حسین تھا۔ مخالف جنرل سعد علی ہمدانی کربلا ریجن کو ٹیکل کر رہا تھا۔ دونوں میں ٹھن گئی تھی۔ قصے حسین یہاں سے توجہ شمال کی جانب موڑنا چاہتا تھا جبکہ ہمدانی کے خیال میں ایسا کرنا غلطی تھی۔ امریکی فوجیوں نے کشتیوں میں فرات کو عبور کیا اور ہمارے سروں پر آموجود ہوئے۔"

"آپ کی ہمدردیاں کن کے ساتھ تھیں؟" میں نے پوچھا تھا۔

"یقیناً حملہ آوروں کے ساتھ۔"

مجمع میں سے اکثریت کی آوازیں تھیں۔ سچی بات ہے ایسی صاف گوئی پر ہنسی چھوٹ گئی۔

"کمبخت ڈکٹیٹر تھا۔ بدترین ظالم تھا۔ سفاک تھا۔ انسانی جذبات سے عاری شخص تھا۔ ہمیں ماتم کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ عزاداریوں کی محفلیں نہیں سج سکتی تھیں۔ سوز خوانی نہیں ہوتی تھی۔ ماتمی جلوس نہیں نکل سکتے تھے۔ ہمارے کاروبار پر جھاڑو پھیرا ہوا تھا۔ وہ ہمارے عقیدے کا دشمن تھا۔ اس نے ہم پر جانے کب تک مسلط رہنا تھا؟"

بارہ تیرہ کے مجمع میں سے صرف دو آوازیں تھیں جن میں ایک جس نے اسے سراہتے ہوئے کہا تھا۔ "تو اب دیکھ رہے ہو ان انتہا پسند دہشت گرد ٹولوں کی کارروائیں۔ کیسے انہوں نے ہمارے شکنجے کس دیئے ہیں کہ باہر نکلو تو واپسی کا پتہ نہیں ہوتا۔ اس نے کم از کم ان بھیڑیوں کو نکیل تو ڈال رکھی تھی۔"

"کڑوا سچ تو یہ ہے کہ شیعہ سنیوں کی پرانی دشمنیاں اور عداوتیں بھی ایک طرف، عربوں اور کردوں کے درمیان دبے ہوئے نسلی فسادات بھی پوری شدت سے جاگ گئے ہیں۔ تیل کے وسیع ذخائر سے مالا مال شمالی کرد علاقوں اور کم وسائل کے حامل مرکز کے درمیان علاقائی اور معاشی کھینچا تانی بھی بہت بڑھ گئی ہے۔ چلو وہ ظالم تھا پر جب امن تو تھا۔ ڈنڈے کے زور پر دبے ہوئے تھے۔"

دوسرے نے بوجھل آواز میں کہا تھا۔ "دنیا کا سب سے بڑا اگر کوئی احمق ہے تو وہ بدبخت امریکہ ہے۔ یہ اس نے ہمیں صدام سے نجات نہیں دلوائی۔ اس نے ہماری نسلوں کا بیڑہ غرق کیا۔ بدترین اقتصادی پابندیوں کا شکار کیا۔ کیا اس کا شکار صدام یا اس کی آل اولاد ہوئی؟ نہیں ہم غریب لوگ اور ہمارے بچے دوا میں نہ ملنے کے سبب مرے اور اپاہج ہوئے۔ "1988 میں ایران نواز کردوں کے دیہاتوں پر جس طرح زہریلی گیس کی بارش کی گئی اس کے پیچھے کس کی آشیرباد تھی۔ 1990 اور 1991 میں شیعوں کو کچلا گیا۔ ایسا کرنے میں کس کی شہ تھی؟ ایران عراق جنگ کے پس منظر میں بھی امریکہ اسرائیل عزائم تھے۔ جیمز بیکر کا بیان تو ابھی بھی ریکارڈ پر ہے۔

"ہم خوش ہیں دو مسلمان ملک ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں۔ ان کی کمزوری ہماری مضبوطی ہے۔" سچی بات ہے دونوں ملکوں کے سربراہوں کو ڈوب مرنا چاہیے تھا۔ گالیوں کی ایک بوچھاڑ بری۔ بش، ٹونی بلیئر، رمز فیلڈ، کولن پاول، کونڈولیزا رائس سب کو اس میں نہلایا۔ خود تو اپنی محفوظ پناہ گاہوں میں بیٹھے ہیں اور ہمیں جہنم میں سڑنے چھوڑ دیا۔ موجودہ حکومت کیا ایک نامزد حکومت ہے؟ کیا یہ جمہوری ہے؟ ایک کٹھ پتلی حکومت اور وہ بے غیرت اپنی کاروباری بدمعاشوں کا پیٹ بھر رہا ہے۔"

◆◆◆

(جاری ہے)

موسیقی

غزل گائیک غلام علی

...... 1 ......

ڈاکٹر امجد پرویز

سب سے پہلے یہ عرض کرتا چلوں کہ غزل گائیک غلام علی" مشہور زمانہ کلاسیکل گائیک بڑے غلام علی خاں اور کلاسیکل گائیک چھوٹے غلام علی خاں سے علیحدہ "ایک منفرد شخصیت کے حامل ہیں۔ اس مضمون میں جہاں ہم غزل گائیک غلام علی کی شخصیت اور ان کے کام کا احاطہ کریں گے وہاں اس سے پیشتر عظیم کلاسیکل گائیک بڑے غلام علی خاں کا بھی مختصراً ذکر کریں گے جن کے ناموں میں مماثلت ہے اور ان کے ناموں پہلے بڑے اور چھوٹے لگا کر ان کی شناخت کی گئی ہے۔ ایک عمر گزر رہی ہے جب سے میں ذاتی طور پر غلام علی کو جانتا ہوں ہم دونوں بھائی کی طرح ہیں۔ مارچ 19 اور 2014.10 کی درمیانی شب وہ پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن کے پروگرام "نصف صدی کا قصہ" میں مہمان خصوصی تھے۔ اس پروگرام کا انعقاد پاکستان ٹیلی کارپوریشن اپنے چیدہ فنکاروں" کی پی ٹی وی کے لئے خدمات کو رقم کرنے کے لئے" کیا کرتا تھا۔ غلام علی کے پروگرام میں مہمانوں میں مجھے بھی اپنے تاثرات پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ دیگر مہمانوں میں پی ٹی وی کے سابقہ ڈائریکٹر پروگرام فرخ بشیر" موسیقار سجاد حسین" بھارتی گلوکار ہنس راج ہنس اور گلوکارہ [illegible] شامل تھے۔ تمام مہمانوں نے یہ باور کرایا کہ غلام علی نہ صرف ایک مشاق گلوکار ہیں بلکہ ہارمونیم اور طبلہ پلیئر بھی ہیں۔ ان کی گلوکاری کا سُروں کا اتار چڑھاؤ ان کے ہارمونیم بجانے کے ساتھ مطابقت رکھنا منفرد ہی کی ایک اچھوتی مثال ہے۔

گلوکار غلام علی کی ابتدائی زندگی کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئیں اس سے یہ پتہ چلا کہ ان کی پیدائش 1940ء میں ضلع سیالکوٹ میں ڈسکہ کے قریب "کالے کی" نامی گاؤں میں ہوئی تھی۔ عارف محمود کی تحقیق کے مطابق غلام علی کی پیدائش 1941ء میں ہوئی تھی۔ غلام علی کا تعلق ایک موسیقی کے خاندان سے ہے۔ ان کے والد بھی گلوکاری کا شوق رکھتے تھے۔ گلوکاری کے علاوہ وہ سارنگی نواز بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ موسیقی کی ابتدائی تربیت غلام علی نے اپنے والد سے ہی حاصل کی۔ اپنی دنیوی تعلیم سے غلام علی کے والد مطمئن نہ تھے اور وہ چاہتے تھے کہ ان کا فرزند کسی بڑے گائیک یعنی کہ بڑے غلام علی خاں کا شاگرد بنے۔ لہٰذا غلام علی کو بڑے غلام علی خاں کی خدمت میں حاضری دینے کے لئے پیش کیا گیا تاکہ ان کی شاگردی کی سعادت نصیب ہو سکے۔ بڑے غلام علی خاں کافی کے دورے پر تھے اور اپنے مصروف وقت کی وجہ سے ایسا کرنے کے لئے ہچکچاہٹ کا اظہار تھے اس لئے کچھ دیر ہوگئی۔ لیکن جب انہوں نے غلام علی سے "ٹھمری سیاں بولو تنک موری رہو نہ جائے" سنی تو انہوں نے گلے لگا کر انہیں اپنی چھاؤں تلے جگہ دے دی۔ غلام علی ابھی کم عمر تھے بقول ان کے شاید وہ پندرہ برس کے تھے۔ استاد بڑے غلام علی خاں پٹیالہ گھرانے کی گائیکی کے علمبردار تھے۔ شروعات میں وہ خواتین گلوکاروں کے ساتھ اسٹیج پر بحیثیت سارنگی نواز کام

کرتے تھے اور اس کردار کے نبھانے میں کوئی عار نہ سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے مرحوم انکل کالے خاں کی بنائی ہوئی دھنیں بھی گایا کرتے تھے۔

وہ پٹیالہ گھرانے کے دو نامور اساتذہ اختر حسین خاں اور عاشق حسین خاں کے شاگرد تھے۔ دریں اثنا بڑے غلام علی خاں کی کلکتہ میں پرفارمنس کی دھوم مچ گئی تھی۔ استاد بڑے غلام علی خاں کی مشہوری اور عزت کی وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے چار بڑی گائیکی کی تکنیک یعنی پٹیالہ، قصور، اللہ دیا، بہرام خانی، اور دھرپد گائیکی، بے پوری گائیکی اور گوالیار گائیکی کے بجائے، اپنے اندر سمیٹ کر منفرد گائیکی کا ایک مرکب تیار کر لیا تھا۔ اور وہ بڑے کی تینوں سپتک اپنی آواز سے آسانی چھو لیا کرتے تھے۔ آواز بغیر کسی ظاہری کوشش کے تمام سروں پر خوبصورتی سے ٹھہرتی تھی۔ اور تمام تانوں پر ان کو دسترس حاصل تھی۔ اس تمام ہنر مندی (Craftmanship) کے باوجود استاد بڑے غلام علی خاں کی آواز میٹھی تھی اور کسی بھی تناؤ کا شکار نہ تھی۔ وہ راگ کی گائیکی غیر ضروری طور پر لمبا کرنے سے اجتناب کرتے۔ ان کے تجربے کے مطابق غیر ضروری طور پر آلاپ اور دلمپت والے حصوں کو کھینچنے سے سامعین اکتاہٹ کا شکار بھی ہو سکتے ہیں اور چونکہ ان کی گائیکی عوام کے لئے ہوتی تھی تو وہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لطف کے پہلو بھی نمایاں کرتے۔ اور اس کوشش میں اگر انہیں اپنی موسیقی میں راگ داری کے اندر رہتے ہوئے بھی کچھ تبدیلی لانا پڑتی تو وہ ایسا کرنے سے پرہیز نہ کرتے۔ ریڈیو پاکستان لاہور میں تمام عمر گزارنے کی وجہ ایک کہانی میرے کانوں سے گزری کہ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی بے تکلفی سے جناب زیڈ اے بخاری کے دروازے کو کھولا تو جناب افسر نے ناراضگی کا اظہار کیا اس پر خاں صاحب ناراض ہو گئے کہ افسر تو آتے اور جاتے رہیں گے لیکن بڑے غلام علی خاں ایک ہی مرتبہ دنیا میں آئیں گے۔ اس کہانی میں کتنی صداقت ہے معلوم نہیں! خاں صاحب ریڈیو پاکستان کے باغ میں بیٹھ گئے کہ اگر کسی نے ریکارڈنگ کرنی ہے تو وہ وہاں آ جائے اور اپنے مائیکروفون بھی ساتھ لے آئے!

غزل گائیک غلام علی نے کہا کہ استاد بڑے غلام علی خاں نے انہیں ریاضت کے لئے اپنے چھوٹے بھائیوں استاد برکت علی خاں، استاد مبارک علی خاں اور استاد امانت علی خاں کے سپرد کر دیا۔ استاد بڑے غلام علی خاں سے "استاد، شاگرد" کے تعلق کے باعث غلام علی کے والد نے ان کا نام بھی غلام علی رکھا تھا۔ غزل گائیک غلام علی اپنے نام کے ساتھ استاد کا لقب لگانے سے پرہیز فرماتے ہیں۔ یہ اطلاع غلام علی نے پی ٹی وی کے منعقد کردہ پروگرام میں میزبان عمار مسعود کو بتلائی۔ یہ امر صریحاً غلام علی کی انکساری کو واضح کرتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ غلام علی سادہ طبیعت شخص ہیں۔ ان کی خوراک میں گوشت یا نان نوش کرنے سے پرہیز ہے۔ وہ سادہ روٹی اور شوربہ کھانا پسند کرتے ہیں۔ اس امر کا مشاہدہ میں نے اس وقت کیا جب غلام علی نے میری پروڈکشن آڈیو البم "نوشیوا" (اوریجنل ساؤنڈ انجینئر یہ منظم یو کے ای ای اوحم ایوب کے لئے) غزلیں ای ایم آئی، شاہ دین بلڈنگ، دی مال لاہور میں ریکارڈ کروائیں۔ لنچ اور ڈنر میں ان کو سادہ خوراک نوش فرماتے دیکھا۔ اسی البم کے لئے غلام علی کی گائی ہوئی غزلیں میں نے بھی گائیں۔ اس البم میں ہم نے جدید غزل کو شعراء حسن رضوی، اسحٰق حسن، محسن کاظمی، ناصر کاظمی، باصر کاظمی، زاہد فخری، نصرت مرزا، آغا ذوالفقار خاں، جمشید مسرور، نصیر احمد ناصر کی غزلیں پیش کیں۔ یہ قصہ موجودہ صدی کے احوال کا ہے۔ غلام علی حقیقت پسند شخص ہیں۔ سادہ لباس تن زیب کرتے ہیں۔

حالانکہ اب ان کی عمر سات دہائیوں سے تجاوز کر چکی ہے لیکن وہ اپنے فن کے مظاہرہ کے لئے پوری دنیا میں سفر کرتے ہیں۔

اپنے ساتھیوں سے متضاد غلام علی نے اپنی آمدنی کو ضائع نہیں کیا اور اس کی معقول Investment کی ہے۔ اگرچہ غلام علی نے برصغیر کے نامور موسیقاروں کی دھنیں گائی ہیں لیکن وہ خود بھی اپنی کئی غزلیں کمپوز کر کے گا چکے ہیں۔ ناصر کاظمی چونکہ ان کے پسندیدہ شاعر ہیں اس لئے ان کے کلام کو ادا کرنے میں انہوں نے خاص توجہ دی ہے۔ غلام علی نے یہ بتایا کہ ناصر کاظمی کی ایک غزل ''دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی'' جس کی دھن موسیقار الطاف حسین نے بنائی تھی، انہوں اور گلوکارہ تصور خانم نے پی ٹی وی کے ایک پروگرام میں گائی جس میں ایک ہی غزل ایک گلوکار اور ایک گلوکارہ پیش کیا کرتے تھے۔ یہ غزل فوری طور پر مشہور ہو گئی۔ اور غلام علی اس غزل کو اپنی ہر کنسرٹ میں پیش کرتے ہیں۔ اس غزل کے مقطع میں لفظ ''لہر'' پر غلام علی مختلف سروں کے ملاپ سے خاموشی اور شور کا امتزاج پیش کرتے کہ لہروں کا تصور اس کی ہر شکل میں واضح ہو جاتا ہے۔ یہ امر مندری سامعین کو مسحور کر دیتی ہے جس سے ان کی سنگیت مہارت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اسی غزل کی ریکارڈنگ خواجہ نجم الحسن کے 1980ء کے پی ٹی وی کے پروگرام ''میری پسند'' میں بہت مقبول ہے۔ اگرچہ غلام علی نے زیادہ تر غزلیں اپنے باپ رفیق حسین کی دھنوں میں گائی ہیں لیکن یہ دھنیں ایک راگ یا مختلف راگوں کے امتزاج سے بنی ہوتی ہیں۔

شائقین موسیقی کو تو یہ علم ہو گا کہ ایک راگ کی بنیاد لطیف انداز میں سائنسی طریقے سے سروں کی بات ہے۔ جمالیاتی پہلوؤں کو مدنظر رکھ کر ترتیب دی جاتی ہے۔ راگ کی آروہی (چڑھتی مرتبہ کے سُر) اور آروہی (واپس کے سُر) کو اساتذہ نے سات، چھ یا پانچ سروں میں آروہی یا امروہی میں تجویز کر کے مختلف میل اور ایک خاص ترتیب سے باندھ کر اپنے تاثر کے اعتبار سے صبح سورج چڑھے سہ پہر یا رات کے وقت ادا کرنے کی تجویز دی ہے۔ غلام علی کا انداز گائیکی ٹھمری گائیکی سے قریب تر ہے۔ وہ گانے وقت ردھم بھی لے سے بھی کھیلتے ہیں چونکہ خود طبلہ ماسٹر بھی رہے ہیں۔ یہ بھی مشاہدہ کیا گیا ہے کہ وہ گیت یا غزل کی میلوڈی میں ایک ''بیاڈ'' (Odd) سر لگا کر آسانی سے اصل میلوڈی کی طرف واپسی کر لیتے ہیں۔ یہ مہارت شائقین کے لئے ایک دلچسپ سماں باندھ دیتی ہے۔ یہ کیفیت ہمارے نامور لوک فنکار طفیل نیازی بھی پیش کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل چند غزلیں اور گیت غلام علی کے کمالات کی عکاسی کرتی ہیں:

◆ اے حسن لاابالی ذرا آنکھ تو ملا ◆ اپنی دھن میں رہتا ہوں میں بھی تیرے جیسا ہوں ◆ اپنی تصویر کو آنکھوں میں لیا عرض غم سے بھی فائدہ تو نہیں (رئیس وارثی) ◆ یہ دل یہ پاگل دل میرا کیوں بجھ گیا آوارگی (محسن نقوی) ◆ بہاروں کو چمن ◆ دل جلانے میرا مسکرائے ہیں وہ ◆ دل دھڑکنے کا سبب یاد آیا (ناصر کاظمی) ◆ برسن لاگی وہ تو بدریا تورے بن لاگے نہ مورا جیا (ٹھمری) ◆ چمکتے چاند کو ٹوٹا ہوا تارا بنا ڈالا ◆ چھپ چھپ کے پی ◆ چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے (حسرت موہانی) ◆ فاصلے ایسے بھی ہوں گے یہ کبھی سوچا نہ تھا ◆ ہدف غم نہ کیا سنگ ملامت نے مجھے (رئیس وارثی) ◆ ہیر وارث (کلام: ہیر رانجھا، موسیقی: خواجہ خورشید انور) ◆ ہم تیرے شہر میں آئے ہیں مسافر کی طرح ◆ ہم تو کتنوں کو مہ جبیں کہتے ہیں ◆ ہم کو کس کے غم نے مارا یہ کہانی پھر سہی (مسرور انور) ◆ ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے (اکبر الہ آبادی) ◆ اتنی مدت بعد ملے ہو ◆ جن کے ہونٹوں پہ ہنسی پاؤں میں چھالے ہوں گے (کمپوزر اور پروڈیوسر: خالد اصغر) ◆ کبھی کبھی میں مجھے ◆ کبھی دیوار ہوں ٹھوکر نہ لگانا ◆ کیسی چلی ہے اب کے ہوا ◆ کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا (ابن انشا) ◆ کل رات بزم میں جو ملا ◆ کہتے ہیں مجھے عشق کا افسانہ چاہیے (قمر جلال آبادی) ◆ کھلی جو آنکھ ◆ خوشبو جیسے تلاش کرتی ہے ◆ خوشبو جیسے لوگ ملے ◆ کیا ہے پیار جسے ◆ کوئی ہم نفس نہیں ہے ◆ میں نظر سے پی رہا ہوں (قمر جلال آبادی) ◆ محفل میں بار بار

(آغا سلیم) ◆ میرا کیا تھا تیرے حساب میں ◆ نی چھئے دیے بند کلیے (پنجابی فلمی گانے) ◆ اے اپنے فرزانہ کی نظر تھی وہ جو میرا واقف حال تھا (زاہد فخری) ◆ پابند رسم و رسم وفا میں بھی نہیں ہوں (محسن حسین) ◆ یہی باتیں کرو جو باتیں ہوتی ہیں (حسن کاظمی) ◆ تیری جب بھی کمان میں آیا (نصیر احمد ناصر) ◆ یہ گراں تنہائیوں کا سلسلہ رہ جائے گا (نصیر احمد ناصر) اور بھی بہت سے دوسرے

آگے بڑھنے سے پہلے میں غلام علی کے فلموں میں گائے ہوئے گانوں کا تذکرہ کرنا چاہوں گا۔ موسیقار صفدر حسین نے ان کی آواز میں خوبصورت دھنیں پیش کیں۔ ہدایت کار وحید مرزا نے 1972ء میں فلم "نغمہ" بنائی۔ اس فلم میں وارث لدھیانوی کا اداکار شاہد (اور رویزینہ) پر فلمایا ہوا غلام علی کا گیت "سو بلیا او سے تک تیرا اجری سویرا" آج بھی اتنا ہی مقبول ہے جتنا کہ اس فلم کے ریلیز ہونے کے وقت تھا۔ وحید مرزا نے ایک اور نغمہ "نی چھئے دیے بند کلیے" اداکار شاہد پر فلمایا لیکن اس مرتبہ ان کے ساتھ ہیروئن نغمہ تھیں۔ ڈاکٹر بخاری ایک مشہور موسیقیت دان لکھتے ہیں کہ غلام علی اور نور جہاں نے تین عدد سرائیکی نغمے بھی ریکارڈ کئے تھے۔ اگر سرائیکی فلمی موسیقی پہ نظر دوڑائیں تو سب سے پہلے گلوکارہ ناہید نیازی نے سپوت پنجاب بابا جی اے چشتی کی موسیقی میں فلم "آبرو" (1961ء) کے لئے گانا گایا تھا۔ اس فلم کے ستاروں میں بہار، اکمل، زینت اور اے۔ شاہ، ہدایتکار یوری شامل تھے۔ بنیادی طور پر یہ ایک پنجابی فلم تھی جو فلمساز شیخ عطاء الرحمن نے کشمیر تھیٹرز لمیٹڈ کے جھنڈے تلے بنائی تھی۔ اور یہ سینما گھروں میں 27 جنوری 1961ء کو پیش کی گئی تھی۔ لیکن پہلی مکمل سرائیکی فلم "دھیاں نمانیاں" کا سہرا مشہور اداکار، گلوکار، فلمساز اور ہدایتکار عنایت حسین بھٹی کے سر جاتا ہے۔ 27 دسمبر 1973ء کو ریلیز ہونے والی اس فلم کے ستاروں میں عنایت حسین بھٹی، خانم، ساقی، اسد بخاری، اقبال اور آغا حسین شامل تھے۔ موسیقی عاشق حسین کی تھی اور گانے عنایت حسین بھٹی، نور جہاں، افشاں اور سلطانہ صدیقی نے گائے تھے۔

اس فلم نے سرائیکی، سندھ، پنجاب اور پوٹھوہار علاقوں میں کامیابی حاصل کی تھی۔ اس فلم کو ندیم پکچرز (بھٹی صاحب کے فرزند ندیم عباس) کے جھنڈے تلے بنایا گیا اور بطور ہدایتکار بھی بیٹے کا نام استعمال ہوا تھا۔ اس فلم کی کامیابی سے دیگر سرائیکی فلمیں بنانے کے لئے فلمسازوں کی حوصلہ افزائی ہوئی۔ دوسری اکلوتی اور سرائیکی فلم "سانجھ ساڈے یار دی" ہے۔ جو ہدایتکار سرور چوہدری اور فلمساز ساجد خان کی یہ فلم 21 اپریل 1974ء کو نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ ستاروں میں راج ملتانی، ساقی، خالد محمود اور سیما شامل تھے۔ موسیقار غلام حسین شبیر موسیقار تھے۔ یہ جوڑی ریڈیو پاکستان کے موسیقار کالے خان اور ماسٹر صادق پیانو نواز کے شاگرد شبیر حسین پر مشتمل تھی۔ انہوں نے غلام علی اور نور جہاں کی آوازوں کو بہت خوبصورتی سے اس فلم کے لئے استعمال کیا۔ غلام علی کی آواز ایک اور سرائیکی فلم "ہاشو جٹ" کے لئے استعمال کی گئی۔ دیگر گلوکاروں میں مسعود رانا، مالا، تصور خانم، افشاں اور نگینہ خانم کی آوازیں شامل تھیں۔ ندیم پکچرز کی ایک اور فلم "رب دا روپ" تھی۔ فلمساز ندیم عباس اور ہدایتکار کیفی تھے۔ ستاروں میں عنایت حسین بھٹی، خانم، انجمن، شاہدہ، رحیم، ریاض اور بہار شامل تھے۔ موسیقار صفدر حسین تھے۔ 6 جون 1975ء کو نمائش کے لئے پیش کی جانے والی اس فلم کے گلوکاروں میں عنایت حسین بھٹی کے علاوہ افشاں اور مالا شامل تھے۔ مندرجہ بالا گزارشات میں غلام علی کے حوالے سے ہم نے سرائیکی فلموں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ غلام علی کے گائے ہوئے کئی اور پنجابی نغمے ہیں جو بہت ہی مشہور ہو گئے۔ مثلاً ایک نغمہ ہے "پیار دا امیروں ہوندی کی جد اپنی جدوں وی امیر ماہی رسیا" یہ ایک چنچل نغمہ ہے جس میں سُر اور تال آپس میں بہت خوبصورت ملاپ پیش کرتے ہیں اور میں نے اس کو غلام علی سے Live سنا تھا۔

(جاری ہے)

◆◆◆

طنز و مزاح

"شو" مارنا

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

اس نے اچانک شور مچا دیا۔

"سانپ آیا ۔۔۔ سانپ آیا ۔۔۔"

سارے گھر والے کمروں سے نکل کر صحن میں آ گئے۔ وہ بھی کمرے سے باہر نکلا تو دوسروں نے بھی شور مچانا شروع کر دیا۔

"سانپ ۔۔۔ سانپ" وہ غصے سے بولا "میں سانپ نہیں، سانپ اندر ہے" یہ شور و غوغا سن کر اس کی گلی میں ساتھ والے گھروں کے لوگ بھی بھاگ آ گئے۔ ایک نے کہا، "چاچا نصرت کیا ہوا؟" دوسرے نے کہا "بھائی نصرت کیا ہوا؟"

"یار میرے کمرے میں سانپ ہے ۔۔۔ اتنا لمبا ۔۔۔ کوڑی والا ۔۔۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔

"تو تو سانپ سے ڈرنے والا نہیں تھا پھر آج کیوں شور مچا رہا ہے ۔۔۔"

"یار مجھے لگتا ہے سانپ بہت زہریلا تھا۔ ایسا سانپ ۔۔۔ اتنا لمبا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ جب تک میں نے "سوٹا" اٹھایا وہ بھاگ کر میرے نئے ریفریجریٹر پر چڑھ گیا۔ میں اس کی طرف لپکا تو ایک دفعہ تو اس نے فریج کے اوپر بیٹھ کے میری طرف پھنکار ماری۔ لگتا ہے وہ بہت سیانا تھا اسے پتہ تھا کہ نصرت علی نے نیا نیا فریج خریدا ہے اس پہ سوٹا نہیں مارے گا۔ پھر مجھے اسے کیا خیال آیا کہ چپ چاپ سے فریج کے پیچھے سے اترا اور غائب ہو گیا ۔۔۔ میں نے فریج کے پیچھے دیکھا تو فریج کا وارنٹی کارڈ تو گرا پڑا تھا مگر کوڑی والا سانپ غائب ہو گیا۔ میں نے اسے کافی ڈھونڈا پھر تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ وارنٹی والا کارڈ اور فریج کی کاپی اٹھائی اسے سنبھال کر رکھ لیا کیونکہ دکاندار نے کہا تھا ایک سال کے اندر اندر فریج میں کوئی خرابی ہوئی تو ہم تمہیں دوسرا فریج دے دیں گے ۔۔۔" "شکر ہے سانپ جاتے ہوئے نئی فریج کا وارنٹی کارڈ ساتھ نہیں لے گیا چاچا ۔۔۔" ساتھ کھڑے اصغر علی نے مذاق سے کہا شاید اسے پتہ چل گیا تھا کہ چاچا نصرت سانپ کا صرف ڈرامہ کر رہا ہے اصل میں تو سارے محلے والوں کو وہ اپنا نیا فریج دکھانا چاہتا ہے۔ ویسے چاچا نصرت کا [illegible] کے لائق تھا۔ آخر باقی محلے والے بھی تو ایسے ہی شوخیاں مارا کرتے ہیں۔ پہلے پہل تو اس کے چند کلاس فیلو جب دوبئی گیا تھا تو واپسی پر جاپانی ٹیپ ریکارڈر، کیمرہ اور وی سی آر لایا تھا تو فیاض کے ابے نے پورا پنڈ اکٹھا کر لیا تھا اور سب پہ رعب جمایا تھا۔ پھر جب بھی فیاض دوبئی سے واپس آتا تو محلے بھر کو چائے ضرور پلاتا تھا تو اس کا سارا خاندان شوخیاں مارتا رہتا تھا۔ یہ تو خیر اب دور کی بات تھی ہے۔ دیہاتوں اور بعض پرانے شہروں میں شادیوں کے رواج میں ایک یہ بھی شامل ہے کہ صحن میں چارپائیاں بچھا کر اس پہ دلہن کے سارے کپڑے سجا کے دکھائے جاتے تھے بلکہ نہ صرف کپڑے ہی نہیں باقی جہیز کے سامان کی بھی نمائش کی جاتی تھی تا کہ سب لوگ دیکھ لیں اور حسد کریں کہ انہوں نے اتنا زیادہ جہیز دیا ہے۔ اس نمائش کو دیکھنے کے لئے پورا پنڈ اکٹھا ہو جاتا تھا۔ اب تو خیر اللہ بھلا کرے چوروں اور ڈاکوؤں کا کہ ان کے ڈر سے یہ رسم ماند پڑتی جا رہی ہے۔ کچھ تو کہتے ہیں کہ دنیا میں سب لوگ حسد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کوئی امیر نہ ہو۔ یہ صرف دنیا سے "ڈکیتی" سوچ رکھنے والے چور اور ڈاکو ہی ہیں جو دوسرے لوگوں کے امیر ہونے کی دعا مانگتے رہتے ہیں تا کہ ان کا اپنا

سلسلہ پائے روز کا سامنے پڑ جائے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ نئی بائیسکل خریدتے تھے تو اسے چکا اور "لشکا" کے رکھتے تھے۔ آگے اس کے "ڈائنمو" لگا ہوتا تھا جس کا دوسرا اصل پہیے سے گھستا تھا تو سامنے لگی لائٹ روشن ہو جاتی تھی۔ سائیکل کے آگے ایک ٹوکری بھی لگوائی جاتی تھی تاکہ ضروری سامان اس میں رکھا جا سکے۔ ایک سواری نہایت شان سے سائیکل کے ڈنڈے پہ اور ایک پیچھے کیریئر پہ بھی بٹھائی جا سکتی تھی۔ ایک اچھی روایت تھی کہ سائیکل کے پچھلے مڈگارڈ پہ "ریفلیکٹر" بھی ہوتا تھا تاکہ رات کو چمک اٹھے اور حادثے سے بچا جا سکے۔ آگے پیچھے حسب فرمائش یا حسب ذوق پلاسٹک کے پھول بھی لگائے جاتے تھے۔ یوں نئی سائیکل والے محلے میں بڑے طمطراق سے گزرا کرتے تھے۔ پھر اس کی عزت پہ زوال آیا تو وہی عزت موٹر سائیکل کو ملی۔ موٹر سائیکل کو دوڑتے چلانے والوں کی بھی دھج نرالی ہوگئی۔ ففٹی سی سی، "ستر" سی سی، ایک سو پچیس سی سی اور پھر ایک سو "ستر" سی سی کی تو کیا ہی بات تھی۔ ابھی موٹر سائیکل کی عزت زوروں پہ تھی کہ پیچھے کی طرف سے ہوا نکل گئی اور اب کاروں کا زمانہ آ گیا۔ یہاں بھی لوہا منوانے اور شو مارنے کے بہترین مواقع کا تعلق کار کی "سی سی" سے تھا۔ اس میں موجود اے سی اور پھر آٹو میٹک دروازے اور اب گیجٹ کا زمانہ آ پہنچا ۔۔۔ سو شو مارنے کو اللہ تعالیٰ نے ہزار نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ آپ نئے کپڑے پہن کے باہر نکلیں اور آپ سے کوئی پوچھے بھی نہ کہ یہ کہاں سے لئے ہیں تو دکھ تو ہوتا ہے نا۔ آپ بن سنور کے باہر نکلیں اور سارا دن گزر جائے تو کوئی ان کی تعریف ہی نہ کرے تو مجبوراً خود ہی بتانا پڑتا ہے کہ یہ نئے کپڑے میں نے فلاں بڑے شہر کے فلاں بڑے سٹور سے خریدے ہیں۔ یہ انسانی فطرت ہی تو ہے کہ ہر بندہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی نئی چیز کی تعریف کی جائے۔ اس کی پذیرائی ہو تاکہ اس کے "پیسے پورے" ہوں ۔۔۔ کا ہر کسی لوگوں کو معلوم بھی ہوتا ہے کہ اس نے نئی چیز خریدی ہے مگر "شریکے سے" کی جلن سے وہ نظر انداز کرتے ہیں جس سے انسان کا دل دکھتا ہے اور دوسرا بھی یہی چاہتا ہے کہ یہ پتہ لگے کہ نئی چیز خرید کر اور خوشی مار کر وہ دوسرے کو امپریس کرے گا۔ تبھی ایسے بھی بھلے مانس دنیا میں موجود ہیں جو ماحول کو خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسرے کی معمولی سی خوشی کو بھی اپنی ہی خوشی سمجھتے ہیں۔ وہ کسی کی پرانی چیز کی بھی تعریف کر کے نئی بنا دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں اور ٹھیک کہتے ہیں کہ یوں کوئی خرچہ بھی نہیں ہوتا اور دوست بھی خوش ہو جاتے ہیں۔

تعریف کی تمنا رکھنا اور بات ہوتی ہے اور شیخی بگھیرنا اور۔ لیکن یوں بھی ہوتا ہے کہ محض زور شور کے لئے لوگ اس چیز پہ بھی اتراتے دکھائی دیتے ہیں جو ان کے پاس سرے سے موجود ہی نہیں۔ اس کی بھی مختلف اقسام ہیں۔ پہلے زمانے میں جب دال بہت سستی اور گوشت بہت مہنگا ہوا کرتا تھا تو ہمارے کئی دوست ہوٹل سے دال کھا کے نکلتے اور باہر آ کر دانتوں میں خلال کر رہے ہوتے تھے کہ لوگ سمجھیں وہ گوشت اور بالخصوص مرغ مسلم کھا کے باہر نکلے ہیں۔ دوسری طرح کے وہ لوگ بھی ہیں کہ کوئی چیز دس ہزار میں خریدیں گے اور بتائیں گے کہ یہ پچاس ہزار میں خرید لائے ہیں۔ جب دوسرا دوست ہنستے ہوئے یہ بتائے گا کہ یہ تو میں نے خود دو ہزار میں خریدی ہے تو وہ حیرت زدہ رہ جائیں گے کہ پھر یقیناً تم نے نقلی چیز خریدی ہوگی۔ تیسری قسم کے لوگ مانگی ہوئی چیز کو اپنا بتا کر سینہ پھلائیں گے اور کبھی اصلی مالک بھی یہ حرکت دیکھ لے تو حیران ہو کر تماشہ تو بھی اس کا نہیں چھوڑا۔ چوتھی قسم کے وہ لوگ بھی ہیں جو کسی اور کی جائیداد یا کوٹھی کے سامنے تصویر کھنچوا کے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ان کے باپ کا مال ہے بلکہ باپ کا نہیں ان کا اپنا مال ہے۔ اب بھلا مزید قسمیں ہم کیا گنوائیں کہ جیسے انسان کی خواہشیں لامحدود ہیں ویسے ہی ان کی قسمیں لامحدود ہیں۔

چاہے اور سراہے جانے کی تمنا کسے نہیں ہوتی مگر یہ ستائش کی حد کو پہنچ جائے تو مناسب نہیں لگتا۔ آگے بڑھنے کی تمنا بھی لازم ٹھہری اور اللہ کا شکر بجا لانا بھی شخصیت میں عاجزی اور وقار کا باعث بنتا ہے۔

◆◆◆

آپ بیتی

تکرارِ تمنا

(سفرِ حیات کا ایک منظر)

پروفیسر محمد جلیل الرحمٰن

جی۔سی۔ لاہور کی مسحور کن فضا میں اتنی کشش گرفت ہے کہ اس کی خوشبو سے عمر بھر زندگی مہکتی رہتی ہے۔

اس کے دامن کو چھو کے دیکھا تھا ۔۔۔ عمر بھر اب مہک نہیں جاتی

کہتے ہیں کہ لاہور لاہور ہے۔ یہ سچ ہے مگر اس میں سے جی سی کو نکال دیا جائے باقی کیا رہتا ہے؟ ۔۔۔ اے صبا ایں ہمہ آوردہ تست۔

ایم۔ اے کے دو سال تو پلک جھپکنے میں بیت گئے۔ اب جدائی کا تصور سوہان روح تھا۔ دل و دماغ دہائی دینے لگے۔ ''اب روانی لی تو مر جائیں گے'' مرنا کسے گوارا ہوتا ہے۔ مزید قیام کے لئے کئی ''عذر معقول'' تراشے گئے۔ ہمارے بزرگوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں بہانہ برائے قیام کے لئے جو جواز ''تخلیق'' کئے تھے۔ وہ ہمیں خوب از بر تھے۔ اسی معتبر حوالے سے شعبہ فلسفہ کے صدر محترم پروفیسر ڈاکٹر حمید الدین کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ توقع سے بڑھ کر پذیرائی ملی۔ کمال شفقت سے ایک سال مزید اس علمی فضا سے مستفیض ہونے کا موقع عنایت فرما دیا۔۔۔ اب راز کھلا کہ کیوں اولڈ راوینز آئے دن یہاں گھومتے نظر آتے ہیں۔ وہ زندگی بھر یہاں کی گرفت بلکہ کشش ثقل سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ ہوا یہ کہ ایک برس بھی پر لگا کر اڑ گیا اب کیا کیا جائے۔

ہیہات اجتماعات الفی واہم کہ مرغ جوانی کے آمد کے رفت!

خوش قسمتی کہئے۔ اسی دوران گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں قسمت آزمانے کا پروانہ مل گیا۔ وہاں کی زمستانی ہواؤں کے تھپیڑوں سے خوف زدہ تھے۔ لیکن قہر درویش بر جان درویش۔ وہاں پہنچے اور 2 مارچ 1964ء کو تعلیمی درسگاہ میں داخل ہو گئے مگر قدرے مختلف روپ میں کہ اب اولاد سے سرپرستی کی وجہ فضیلت تھی۔ طلباء ''سر'' کہہ کر مخاطب ہوتے تو ہم حیرت سے انہیں اور کبھی خود کو دیکھتے۔

نہیں معلوم کہ یہ ران پا کبازاں پہ کیا گزرتی ہے۔ ''ہم تو جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے'' کی روایت پر قائم ہیں۔ پورے آٹھ سال کمال ذوق و شوق سے رسم بندگی نبھائی۔ انتا کہ لگا کر تے ہی چلے گئے۔ مگر بھی جی سی کی چاہت کی پیاس نہ گئی۔ فاصلے کم ہو رہے محسوس ہوتے اور ہر ماہ عید چاکان وطن سے آ ملتے۔ آخر کیم جنوری 73ء کی یخ بستہ شام کو احباب خاص کشم کشم کہہ رہے تھے۔ ہمارا بس چلتا تو آپ کو مستقل روک لیتے۔ We will miss you very badly۔ ہم بھی کانپتے ہونٹوں سے الوداع کہہ کر ریل میں سوار ہو گئے۔

جو ہر آبادی پُرسکون فضا میں ربع صدی زندگی کے تمام رنگ دیکھے پہاڑ، دریا، صحرا اور جنگل اس ماحول کا بے نظیر خاصہ ہیں۔ قلب و نظر کی تسکین اور روح و ذہن کی تطہیر کے تمام لوازمات فراواں میسر ہیں ۔۔۔ لیکن دل سے ہوک سی اٹھتی کہ جی۔ سی لاہور سے دوری

کیوں؟" اور ہم ابتدائی تشدید کرتے وہاں پہنچ جاتے۔

کئی ماہ و سال خاموشی سے گزر گئے۔ "پھر یوں ہوا کہ زندگی خود ہی قریب آ گئی۔"

صدر شعبہ فلسفہ پروفیسر شاہد حسین کا مراسلہ پروفیسر سعید صاحب کی معرفت ملا۔

If you are interested in G.C. Then please see me immediately. You are needed here to teach M.A. classes.

(اگر آپ جی سی میں دلچسپی رکھتے ہیں تو مجھے فوراً ملیے۔ یہاں ایم اے کی کلاسوں کو پڑھانے کے لئے آپ کی ضرورت ہے۔) میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ تمنا بر آئی۔ فوراً ملاقات کی۔ آمادگی کا اظہار کیا۔ دفتری کارروائی کا آغاز ہوا۔ ذہنی تیاری مکمل ہونے لگی اور بوجھ آیا دل سے اترنے لگا۔

فیصل آباد سے برادر محترم قبلہ محمد جمیل الرحمٰن تشریف لائے۔ فرمانے لگے "بابا بیٹا اپنے پاؤں پر کلہاڑی کیوں مارتے۔ یہاں تم جنت میں رہ رہے ہو۔ بچوں کی تعلیم کا اس سے بہتر انتظام کہیں نہیں ملے گا۔ لاہور میں تم ذرا ایبر بن جاؤ گے۔ جس روز تمہاری چھٹی ہوگی بچوں کو بھی چھٹی کرنا پڑے گی۔" میں نے حکم کی تعمیل کی اور ارادہ بدل دیا — بلاشبہ ان کا مشورہ میرے حق میں بہت مستحسن تھا۔ بچوں نے بورڈ اور یونیورسٹی میں امتیازی حیثیت سے اعزازات حاصل کیے۔ الحمدللہ!

زندگی اپنی ڈگر پر چلتی رہی۔ یہاں تک کہ شعبہ فلسفہ کے پروفیسر سعید احمد کی ریٹائرمنٹ کی تاریخ 19 اپریل 1990 قریب آ گئی۔ صدر شعبہ پروفیسر شاہد حسین نے حفظ ماتقدم کے طور پر ایک بھرپور .D.O آر 3 اپریل 1990 کو پرنسپل اور سیکرٹری کو لکھا کہ ان کی ریٹائرمنٹ سے قبل مجھے ڈیپارٹمنٹ میں متعین کر دیا جائے۔ اس کی نقل مجھے بھیج دی۔ بڑے زوردار الفاظ میں تائید کی گئی تھی۔ لکھا تھا:

"Mr. Mohammad Jalil-ur-Rehman is an old Ravian and has an excellent academic record and 25 years meritorious service at his credit. He has written a number of philosophical research papers which have been published in journals. He will prove himself to be an asset for the college in general and to the department in particular. He is very much needed here to teach M.A. classes."

پرنسپل خالد آفتاب خان سے ملاقات ہوئی۔ اپنی کتاب "تہذیبی احساس" پیش کی۔ خوش ہوئے۔ پوچھنے لگے "Was Iqbal a poet or philosopher?" عرض کیا: "What if a man is poet and a philosopher at the same time" آپ کو کیا اعتراض ہے؟ کہنے لگے Ok۔ آپ اب آ رہے ہیں؟ عرض کیا فوراً نہیں کچھ عرصہ بعد حاضر ہو جاؤں گا۔ کچھ مسائل ہیں۔ گرمی کی تعطیلات میں حل ہو جائیں گے لیکن معلوم نہ تھا۔ عمر کے ساتھ نئے مسائل جنم لیتے ہیں۔ مسائل ختم نہیں ہوتے۔

25 فروری 1995ء کی صبح کو پروفیسر ڈاکٹر جاوید ندیم کا خط ان الفاظ میں موصول ہوا کہ "ڈاکٹر آصف اقبال گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن میں بطور پرنسپل جا رہے ہیں۔ صدر شعبہ فلسفہ کے اصرار پر لکھ رہا ہوں۔ آپ کی علمی اور فکری کاوشوں کے پیش نظر آپ کی

یہاں بڑی ضرورت ہے۔ آپ کی مادرِ علمی کا آپ پر حق ہے۔ آپ نے بہت پرنسپلی نبھائی ہے۔ اب آئیں اور درس و تدریس شروع کریں۔"

6 مارچ 1993ء کو صدر شعبہ فلسفہ پروفیسر شاہد حسین نے پرنسپل کے نام دوسرا Reminder بھیج دیا۔ اس کی کاپی مجھے ارسال کر دی۔

"On the transfer of Professor Asif Iqbal I would like to recommend Prof. M. Jalil-ur-Rehman as his substitute. His transfer to this department may kindly be taken on urgent basis as we are already short of teaching staff. His excellent biodata in enclosed here with."

17 جولائی 1996ء کو پروفیسر جاوید عظیم نے دوسرا مراسلہ ارسال کیا کہ اب مرزا اطہر بیگ بھی کالج آف ایجوکیشن میں چلے گئے ہیں۔ آپ کی کمی بہت محسوس کی جا رہی ہے۔ ہمارا خلوص اور محبت آپ کے ساتھ ہے۔ دل چاہتا ہے آپ فوراً آ جائیں۔ امید ہے آپ غور کر رہے ہوں گے کیونکہ ایسی خوشگوار شخصیت بہت ہی کم ہو سکتی ہے۔"

17 جولائی 1996ء کو ہی پروفیسر طفیل سالک کا گرامی نامہ ملا: "گورنمنٹ کالج لاہور آپ کی مادرِ علمی ہے۔ آپ کی یہاں بے حد ضرورت ہے۔ یہاں پر ہر روز آپ کی باتیں ہوتی ہیں۔ کئی لوگ صرف آپ کے آنے پر متفق ہیں۔ آپ نے بہت پرنسپلی کر لی۔ اس لئے میری گزارش ہے باقی وقت اپنی مادرِ علمی کی آغوش میں گزاریں۔ صدر شعبہ کی شدید خواہش ہے کہ آپ ایم۔ اے کی تدریس سنبھالیں، ہم سب منتظر ہیں۔"

احباب کی چاہتیں اور صدر شعبہ کی محبتیں اتنی توانا تھیں۔ جب ان کے ساتھ اپنے ارمان بھی شامل ہو گئے تو ان کو بے اعتنائی سے نظر انداز کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ طے کر لیا کہ اب کی بار لاہور ضرور جائیں گے۔

پرنسپل خالد آفتاب نے بخوشی ایک طویل تحریر D.O. کی شکل میں سیکرٹری تعلیم یوسف کمال کے نام 16 مارچ 1995ء کو لکھی اور مجھے فرمایا "اب آپ جلدی کیجئے آ جائیں۔" میں اطمینان سے جوہر آباد واپس آیا۔ ایک خلش سی تھی کہ اس D.O. کا متن معلوم نہیں۔ اپنے P.A. اللہ نواز کو سیکرٹریٹ بھیجا۔ وہ اس کی فوٹو کاپی لے آیا۔ حیران کن انکشافات ہوئے۔ میری تعلیمی اور انتظامی صلاحیتوں کی بے جا تعریفیں اور پروفیسر شاہد حسین کی بھرپور کردار کشی۔ D.O. کا مقصد یہ تھا کہ پروفیسر شاہد حسین کو فوراً یہاں سے نکال دیا جائے اور مجھے ان کی جگہ متعین کر دیا جائے۔" D.O. کا عنوان یہ تھا:

"Withdrawal of Prof. shahid Hussain from Govt. College, Lahore."

یہ ایک طویل تحریر تھی اور بڑی تفصیل سے واقعات درج تھے۔ میں یہ خط پڑھ کر سکتے میں آ گیا۔ سوچ در سوچ حال اور درپیش خیال!

اگر ایسا ہو جائے تو میں اپنے دوستوں کی نظروں میں گر جاؤں گا جو مجھے گوارا نہیں۔ دوست ہی میری زندگی ہیں۔ چنانچہ لاہور جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

محبت ترک کی میں نے گریباں سی لیا میں نے　　زمانے اب تو خوش ہو جا زہر یہ پی لیا میں نے

سال بہت یاد آئے۔ پروفیسر ڈاکٹر جاوید شعبہ سیاسیات کے صدر نے میرے کان میں پروفیسر شیر محمد گریوال سے شکایت کی کہ جمیل صاحب کیوں نہیں آئے" جواب ملا "جمیل صاحب" یہ ساری گپ شپ نہیں کرتے یہ اس کی سرشت میں نہیں۔"

(ان دنوں پرنسپل خالد آفتاب اور پروفیسر شاہد حسین کے درمیان شکر رنجی عروج پر تھی۔ یہ کئی اخبارات کی شہ سرخیوں میں نظر آ جاتی۔ اہل نظر و فکر اس صورت حال سے بہت آزردہ خاطر تھے) مگر ڈراما بھی ختم نہیں ہوا۔

جوہر آباد میں اصحاب ثلاثہ کے ایک رکن جنہیں عالم ارواح سے عالم تجسیم یعنی دھرتی پر اترنے کی جلدی تھی۔ مجھ سے پہلے آئے مگر درجات کے حصول میں پیچھے رہ گئے۔ حسد کی آگ بجھانے میں کامیاب ہوئے۔ سیکرٹری تعلیم شیر اوقیصر فلسفہ کے طالب علم ہیں۔ مجھے بلایا۔ میرے ساتھ ڈاکٹر عبدالخالق تھے نہایت ادب واحترام سے پیش آئے، چائے سے تواضع کی اور ایک بار میری Choice کے مطابق 12 فروری 1998 کو ڈی۔ سی میں بطور پروفیسر چارج کر دیا۔ احباب بہت خوش تھے مگر پرنسپل صاحب سخت برہم۔ کہنے لگے "جب میں نے بلایا تھا آئے نہیں، اب بالا بالا ٹرانسفر کروا لیا" عرض کیا اپنی مرضی سے ٹرانسفر نہیں ہوا ایک صاحب کی درپردہ شرارت آڑے آئی۔ عنقریب اپنی مرضی کا سٹیشن لوں گا چنانچہ چند ماہ بعد 12 مئی 1998 کو اپنے آبائی شہر فیصل آباد گورنمنٹ کالج ستیانہ روڈ میں بطور پرنسپل چارج سنبھال لیا۔ میں اپنے مقام سے باخبر ہوں۔ مجھے بے تاب روح عطا کی گئی ہے۔ میں کہیں بھی ہوں خود کو اپنی مادر علمی کی آغوش میں محسوس کرتا ہوں۔ مجھے یہیں سکون ملتا ہے۔ مجھے اس سے محبت ہے۔ اس کے در و دیوار بانہیں پھیلا کر مجھ سے لپٹ جاتے ہیں۔

واماندگی شوق تراشے ہے پناہیں — دیر و حرم آئینہ تکرار تمنا

(غالب)

●●●

معروف ادیب، شاعر، ڈرامہ نگار ڈاکٹر ایوب ندیم کا نیا مجموعہ کلام

رات ڈھلتی نہیں

شائع ہو گیا ہے — قیمت -/300 روپے

ملنے کا پتہ: سنگت پبلشرز، 25۔ بی لوئر مال لاہور (موبائل نمبر: 0334-9737112)

معروف شاعر، نعت گو، ادیب سید لیاقت حسین گیلانی کا نعتوں کا مجموعہ کلام

نعت میری زندگی ہے

شائع ہو گیا ہے — قیمت -/300 روپے

ملنے کا پتہ: اعجاز انٹرنیشنل پبلی کیشنز، C-40، اردو بازار لاہور (0313-6282898)

انشائیہ

زرد رنگ

پروفیسر جمیل آذر

بارش برسنے کے بعد جب مطلع صاف ہو جاتا ہے تو آسمان پر قوسِ قزح اپنے دلفریب رنگوں کے آنچل میں نمودار ہوتی ہے جو دیکھنے والوں کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ فطرت قوسِ قزح کے متنوع رنگوں سے انسان کو خوشی عطا کرتی ہے۔ بچے فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ متنوع رنگوں کی بنی اس پینگ کو دیکھ کر وہ خوشی و حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ تالیاں بجاتے ہیں۔ اس پینگ یا دھنک کو دیکھ کر بچے ہی نہیں ہر کہ و مہ خوش ہوتا ہے۔ اس دھنک میں نمایاں رنگ سرخ، سبز، نارنجی، زرد، جامنی اور نیلا نمایاں ہوتے ہیں۔ ان رنگوں میں جو حسن ابھرتا ہے وہ میری نظر میں زرد رنگ ہوتا ہے۔ زرد یا پیلا رنگ مسرت و شادمانی کی علامت ہے۔ اس رنگ میں شاہانہ آن بان ہے یہی رنگ قوسِ قزح میں سب سے زیادہ دلفریب ہے۔

زرد رنگ بچپن ہی سے میرے من کو بھاتا ہے۔ یہ رنگ آسمان پر بنی قوسِ قزح کے اندر حیرت انگیز طور پر اپنی طرف کھینچتا تھا اور اب بھی اس پختہ عمر میں میری متجسس نگاہیں پیلے رنگ ہی کی طرف ہو جاتی ہیں۔ میں اس کے ساتھ اپنی وابستگی کا جائزہ لینے لگتا ہوں۔ میرے بچپن کے پرائمری سکول میں جو ہمارے گاؤں کے بیرونی علاقہ میں دو کچے کمروں یا کوٹھوں پر مشتمل تھا گیندے کے پیلے پھول مختلف کیاریوں میں لگے عجیب بہار دیتے تھے۔ اگرچہ پھول توڑنا منع تھا مگر میں پھر بھی ایک آدھ پھول توڑ کر اپنے ہاتھ میں مسلتا اور اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

موسمِ سرما کے وسط میں جب کھیتوں میں سرسوں پھولتی ہے تو ہر طرف زرد رنگ اپنی بہار بکھیرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین نے پیلی چادر اوڑھ لی ہے اور رقص کر رہی ہے۔ آپ اس منظر کو دیکھ کر خود بھی رقص کرنے لگتے ہیں۔ صوفیانہ رقص، سنجیدہ، لیکن روح پرور! ایسے پرفضا ماحول میں شادی بیاہ کے موقع پر دوشیزائیں مہندی سے اپنے ہاتھ پیلے کرتی ہیں۔ زرد رنگ اپنی انفرادیت کا اظہار کرتا ہے، بچیوں کی خوشیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ رنگ اپنے اندر روحانیت اور الوہیت کا نور رکھتا ہے۔ قبرستان میں مومنین جا کر اپنے عزیز و اقارب کی قبروں پر گیندے کے پھول بکھیرتے ہیں، ان کے لیے اپنی عقیدت کا اظہار اور دعائے مغفرت کرتے ہیں۔

یہ صوفیا اور اولیا کرام کا محبوب رنگ ہے۔ بزرگانِ دین روحانی محافل میں زرد رنگ کی پگڑی سے اپنے سروں کو سجاتے ہیں اور وجد و سرور میں آتے ہیں۔ روحانی ترفع میں شرابور ہو جاتے ہیں۔ تمام رنگوں کا اپنا اپنا رنگ ہے۔ شادی بیاہ کے کھانوں میں جہاں قورمہ، کباب اور پلاؤ وغیرہ ہوتے ہیں وہاں زردہ اپنے جلوؤں میں پستہ، بادام اور ناریل لے کر اپنی شیرینی بکھیرتا ہے۔ آپ اگر ان کھانوں میں سے زردہ نکال دیں تو دعوت بے مزہ اور پھیکی ہو جاتی ہے۔ یہ زردہ ہی ہے جو کھانے کے لطف کو دوبالا کرتا ہے۔

دیہات کے مکھیا، سردار اور نواب اپنے وقار اور رعب کو قائم رکھنے کے لیے اپنے سروں پر زرد رنگ کے پگڑ باندھتے ہیں۔ اس رنگ میں شاہانہ آن بان اور شان و شوکت ہوتی ہے۔ گاؤں کے لوگ جہاں ان کے مرتبے کی وجہ سے انہیں عزت بخشتے ہیں، وہاں ان کے زرد رنگ پگڑ کا بھی نہایت عقیدت و خلوص سے احترام کرتے ہیں۔ زرد رنگ ہماری ثقافت کا جزو لاینفک ہے۔ بزرگانِ دین کے عرس میں پیلا رنگ روحانیت کا نور بکھیرتا ہے۔ حیرت ہے کہ بدھ مت کے پیروکار تو پیلے رنگ کی چادروں سے اپنے تن کو ڈھانپتے ہیں، ان کے نزدیک، یہ رنگ امن و آشتی کی علامت ہے، وہ تو کسی انسان، جانور حتیٰ کہ کیڑے مکوڑوں کو مارنا بھی پاپ سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بھکشو کے نام سے پکارتے ہیں مگر حیرت ہے کہ آج کا بھکشو ظالم اور دہشت گرد بن گیا ہے اور اپنے پُرامن مذہب سے منحرف ہو گیا ہے۔ ہائے افسوس!

موسم خزاں میں درختوں کے پتے پیلا رنگ اوڑھ کر فضا اور فرشِ ارض پر اپنی الگ بہار دکھاتے ہیں جو حسنِ نظر کو فرحت بخشتے ہیں۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیلے پتے طلائی اوراق میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ زرد رنگ حسن و جمال کا اصول شباب کا رنگ بن جاتا ہے!!

◆◆◆

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والے رسائل

(تخلیق کو ملنے والے رسائل اور کتب کی تعداد کافی زیادہ ہے اس لیے تمام رسائل اور کتب کے ناموں کو لسٹ میں شامل کرنا ممکن نہیں)

ماہنامہ تیرگی خیال راولپنڈی مدیر اعلیٰ: سلطان رشک 0333-5692523	ماہنامہ شاداب لاہور مدیر: ڈاکٹر کنول فیروز 0301-4123707	ماہنامہ ادب لطیف لاہور چیف ایڈیٹر: صدیقہ بیگم 0300-8479444
ماہنامہ حکایت لاہور مدیر: عارف محمود 0323-4729344	سہ ماہی نوادر مدیر: بیگم شاہین زیدی 0333-4722999	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر: شاہد علی خان 0301-4001844
ماہنامہ انشاء کلکتہ انڈیا مدیر: ف س اعجاز 0091-3322354616	ماہنامہ شاعر ممبئی انڈیا مدیر: افتخار امام صدیقی 0091-932451517	سہ ماہی انتساب انڈیا ایڈیٹر: سیفی سرونجی 0091-942564177
ماہنامہ بیاض لاہور ایڈیٹر: عمران منظور 0300-8438043	ماہنامہ الحمرا لاہور مدیر: شاہد علی خان 0301-4001844	ماہنامہ ارژنگ لاہور مدیر: حسین عباسی 0300-4489310
سہ ماہی نگینہ انڈیا ایڈیٹر: وحشی سعید 9419012800	ماہنامہ اطراف کراچی مدیر: محمود شام 033-17806800	ماہنامہ اردو ڈائجسٹ مدیر: ضیاالرحمٰن ضیا 0300-2211187
سہ ماہی غنیمت مدیر: اکرم کنجاہی 0300-2380660	ششماہی سانجھاں لاہور مدیر: تنویر ظہور 0300-4426314	سہ ماہی شاعری مدیر: سہیل غازی پوری 021-36328911

افسانہ

ارسطو کی واپسی

وحشی سعید (انڈیا)

مختصر تعارف

وحشی سعید اصل نام محمد سعید ترہ 16 نومبر 1944ء کو ناؤ کدل سری نگر کشمیر میں پیدا ہوئے۔ 1970ء کی دہائی سے باقاعدہ ادبی سفر کا آغاز کیا۔ 8 کے قریب افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''سڑک جا رہی ہے'' ''کنارے اقتدار کا جزیرہ'' ''خواب حقیقت'' ''ماضی اور حال'' (تین جلدیں)، ''آسمان میری مٹھی میں'' ''پتھر پتھر آئینہ'' شامل ہیں۔ ان کی ادبی خدمات کے صلے میں متعدد ایوارڈز سے نوازا گیا ہے جس میں اردو فاؤنڈیشن ایوارڈ اور گلشن اردو ایوارڈ شامل ہے۔ سہ ماہی ''نگینہ'' کی مسلسل کئی سال سے باقاعدہ ادارت کر رہے ہیں۔

جہاں سقراط کے سفر کا اختتام ہوا، وہیں سے ارسطو کا سفر شروع ہوا۔ سقراط نے نظامِ حکومت اور زندگی کے بہترین اوصاف سے یورپ کو واقف کرایا، اسی وراثت کی ارسطو نے پیروی کی۔ سقراط سچائی کا علمبردار تھا۔ ارسطو ایک ایسا مفکر تھا، جس نے سیاست کو تنگ و تاریک گلیاروں سے نکال کر، عالمی منظر پر ایک نئی پہچان دی۔ ارسطو یونان کے بادشاہ سکندر کا مشیرِ خاص تھا۔ سکندر کو سکندر بنانے میں ارسطو کا کلیدی رول تھا۔ رات کاٹے جانے کو نا لمحہ رہا ہوگا، جب میں ارسطو کو تاریخ کے اوراق میں ڈھونڈ رہا تھا۔ میری یہ کھوج ایک ایسے دھماکے کی نذر ہو گئی جس نے ساری کائنات کا دل دہلا کے رکھ دیا۔ ہر طرف چیخوں اور آہ و بکا کا سماں برپا ہو گیا۔ یوں محسوس ہوا کہ شاید ہم زندگی کے انتہائی سفر پر روانہ ہو گئے۔ دھماکے کے بعد گولیوں کی برسات شروع ہو گئی فوجیوں کے جوتوں کی ٹاپوں سے ہزاروں کی سڑکیں چیخوں سے اٹل پڑیں۔

پھر اچانک آوازوں کا سمندر سیلاب بن کر ابھرا...... ''...... کیا ہوا؟!!'' دھماکہ بھی خاموش ہو گیا۔ فوجیوں کے جوتوں کی ٹاپوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ لوگوں کی چیخیں سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ وہ ایک دوسرے سے یہ معلوم کر رہے تھے کہ کس کو پکڑا گیا...؟

فاتح عالم سکندر کی فوج جب ہندوستان کی سرحد پر پہنچی تو سکندر کی فاتح فوج کے سامنے وہ ہندوستان تھا، جس کا ذکر تواریخ کی کتابوں میں کچھ یوں کیا گیا تھا کہ دنیا میں اگر کوئی ملک سونے کی چڑیا کہلاتا ہے تو وہ ہندوستان ہے۔

بکتر بند گاڑی ایک عام شہری کے سامنے رک گئی۔ فوجیوں نے اس کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ شخص دہشت میں پڑ گیا اور وہ خود سے سوال کر رہا تھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟!''

اس سے پہلے وہ اپنے اس سوال کا جواب ڈھونڈتا، فوجیوں نے اس عام شہری کو بکتر بند گاڑی کے سامنے باندھ دیا۔ اور اس عام شہری کے گلے میں ایک تختی آویزاں کر دی۔ ''دہشت گرد''۔

مفکر ارسطو نے سکندر کو اٹھارہ سال کی عمر میں جو پہلا سبق سکھایا تھا وہ یوں تھا۔ "سکندر! تم اب فوج کے ایک مکمل کمانڈر بن گئے ہو اور اب تم قلیل مدت میں دنیا کو فتح کرنے والے سب سے بڑے فاتح عالم بننے والے ہو۔ لیکن سکندر اعظم بننے کے لئے ننگے پاؤں تپتے ہوئے ریگستان سے گذرنا ہوگا۔ مقدونیہ کے بادشاہ، تم جب فاتح عالم ہوں گے تمہیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ انسانوں اور انسانی اقدار کو کبھی پامال نہ ہونے دینا۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ تمہارے دشمن کی پسپائی تمہارے انا کو غرور میں نہ ڈال دے۔"

ارسطو کا یہ سیاست کا سبق، سکندر کے لئے کسی مقدس کتاب کے اقوال سے کم نہ تھا۔ اس کے فوجیوں نے ہندوستان کو فتح کیا۔ راجا پورس کو گرفتار کیا اور زنجیروں میں جکڑے ہوئے پورس کو سکندر کے سامنے پیش کیا گیا۔ سکندر اپنے جاہ و جلال کے ساتھ تخت یاقوت پر بیٹھا ہوا تھا۔ دربار سجا ہوا تھا۔ سکندر کے دربار میں درباریوں کے علاوہ فوج کے اعلیٰ کمانڈر بھی تھے۔ سکندر، پورس سے اپنی گرجدار آواز میں مخاطب ہوا۔

"بتا راجا پورس تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟"

راجا پورس نے اپنی آواز میں ٹھہراؤ لا کر جواب دیا۔ "جو ایک بادشاہ کو دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرنا چاہئے!"

فوج کے کمانڈر، درباری جو سکندر کے دربار کی رونق بنے ہوئے تھے ایک دوسرے کے چہرے کے تاثرات پڑھنے لگے۔ ان سب کی متفقہ رائے تھی کہ اب سکندر، پورس کا سر قلم کر دینے کا حکم دیں گے۔ لیکن سکندر، سکندر تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ ان سوچوں کے بیچ میں سکندر کو محسوس ہوا کہ ارسطو اس کے سامنے کھڑا ہے۔

"میرے سب سے بڑے اور عزیز شاگرد سکندر! تمہیں تواریخ نے ایک سنہرا موقع فراہم کیا ہے۔ اب تک تم صرف فاتح عالم تھے اب تم سکندر اعظم بننے والے ہو۔ شرط یہ ہے کہ انسانی اقدار کو پامال نہیں ہونے دو گے۔"

سکندر اپنے تخت سے کھڑا ہو گیا اور بلند و بالا آواز میں بول پڑا۔

"سپاہیو۔۔۔! راجا پورس کو زنجیروں سے آزاد کر دو مقدونیہ کا بادشاہ ہندوستان کے راجا سے بغل گیر ہوگا!"

وہ عام شہری جس کو فوجیوں نے بکتر بند گاڑی کے سامنے والے حصے پر باندھ دیا تھا اسے سنسان شہر کی گلیوں اور سڑکوں پر گھما رہے تھے۔ وہ فوجی اپنی اس فتح پر ناچ رہے تھے۔ بگل بجا بجا کر اپنی جیت کا اعلان کر رہے تھے۔

سکندر اعظم نے ہندوستان کو فتح کیا اور اس نے ہندوستان راجا پورس کو واپس لوٹا دیا۔ سکندر اعظم نے جب اپنے وطن واپس لوٹنے کا سفر شروع کیا تو راجا پورس نے تشکر بھری آنکھوں سے سکندر اعظم کو الوداع کیا۔

ارسطو کا شاگرد، مقدونیہ کا شہنشاہ، سکندر اعظم انسانی تواریخ کا ایک ناقابل فراموش حصہ بن گیا۔

وہ صبح بھی کالی تھی۔ وہ شام بھی سیاہ تھی۔ جس نے ایک عام شہری کو انسانی ہیر بنتے ہوئے دیکھا۔ جس فوجی نے انسانیت کو پامال کیا۔ اس فوجی کو اس کے کمانڈر نے بہادری کے تمغے سے نوازا۔

سکندر اعظم اپنے وطن مقدونیہ پہنچنے سے پہلے ہی دار فانی کو کوچ کر گیا۔

ارسطو نے اپنے عظیم شاگرد سکندر اعظم کی موت پر آنسو نہیں بہائے۔ کیونکہ سکندر اعظم انسانی تواریخ میں امر بن چکا تھا۔

کئی ہزار سال گذر گئے جب ارسطو کی واپسی ہوئی لیکن اس ارسطو کی آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی تھیں۔

◆◆◆

تجزیہ نگاری

ارسطو کی واپسی

وحشی سعید (انڈیا)

تجزیہ نگار : ڈاکٹر اشرف آثاری

زیر تجزیہ افسانہ 'ارسطو کی واپسی' وحشی سعید کا تازہ ترین علامتی افسانہ ہے۔ اس افسانے میں بھی بازگوئی کی تکنیک کا استعمال کیا گیا ہے۔ بازگوئی کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدیم اساطیری مواد کے دوبارہ تخلیقی استعمال کو بازگوئی کہا جاتا ہے۔ بازیافت یا بازتخلیق کی روایت قدیم و جدید ادب میں موجود ہے اور مقبول بھی ہے۔ ماضی کی تلمیحات سے استفادہ تلمیحی حوالوں یا اشاروں کے روپ میں اردو ادب کی تقریباً تمام اصناف ادب میں موجود رہی ہیں اور آج بھی ہیں۔ کسی بھی واقعے کی ذہن میں بازگشت کو منظر فکری، فنی اور معنوی ارتباط یا تلمیحی استعمال کی روایت بہت پرانی ہے۔

کسی واقعے یا روایت کا جزوی یا کلی حوالہ اگر نظم یا نثر میں آجائے تو اس میں تمثیل و حکایت اور داستان طرازی کا رنگ غالب آجاتا ہے اور تخلیق میں اصل موضوع کی معنویت دوبالا ہو جاتی ہے یا پھر اسے آرائش خیال کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے اور اگر پہلے ہی سے تخلیق کا موضوع داستانی یا حکایتی نوعیت کا ہو تو اس کی تمثیلیت کے ساتھ ساتھ اس کی فنی اور فکری نوعیت بدل جاتی ہے اور معاملے کی حیثیت مزید اہمیت و افادیت اختیار کر لیتی ہے۔ بات 'ارسطو کی واپسی' کی چل رہی ہے۔ افسانے کی شروعات "جہاں سقراط کے سفر کا اختتام ہوا وہیں سے ارسطو کا سفر شروع ہوا" کے جملے سے ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے اس ابتدائی سطر یا جملے سے ہی اس کے تمثیلی یا حکایتی انداز بیان یا پھر بازگوئی کا آغاز ہوتا ہے۔ سقراط، بقراط، ارسطو، افلاطون سب قدیم یونانی مفکرین ہیں۔ صدیاں گزر جانے کے باوجود بھی اب تک ان کی زندگی و اقوال مثالی بنے ہوئے ہیں۔ زیر تجزیہ افسانہ کے افسانہ نگار نے اس بار ارسطو اور اس کے شاگرد۔۔۔ اور فاتح عالم سکندر اعظم کے واقعے کو اپنے افسانے کے اصل پلاٹ کے ساتھ داستان طرازی کے لئے منتخب کیا ہے۔

وحشی سعید افسانے کے دوسرے پیراگراف میں سقراط، ارسطو اور سکندر کی دنیا سے لوٹ کر اپنے گھر کے بیڈ روم میں آجاتے ہیں۔ جب تاریخ کی کتابوں میں ارسطو کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک زوردار دھماکے سے پوری کائنات جیسے دہل جاتی ہے اور رات کا سناٹا چیخوں اور آہ و بکا کی نذر ہو جاتا ہے اور گولیوں کی دن دناہٹ میں اسے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ زندگی کا آخری سفر ہے۔ پھر جب دوبارہ خاموشی لوٹ آتی ہے اور ہنگامہ اور شور شرابا سرگوشیوں کا روپ دھارن کر لیتا ہے تو افسانہ نگار افسانے کا رخ دوسری جانب موڑ دیتا ہے۔ قبل از مسیح کے ہزاروں سال پرانے اس واقعے سے دفعتاً پھر افسانہ نگار عصر حاضر میں ایک ایسے ہولناک پیش آنے والے واقعے کی طرف آجاتے ہیں جب کشمیر میں ہندوستانی فوج کے ایک آفیسر نے ایک نہتے نوجوان دیہاتی کو اپنی بکتر بند فوجی گاڑی کے سامنے رسیوں سے باندھ کر انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کیا۔ وحشی سعید ارسطو کی اس نصیحت کی طرف آجاتے ہیں جو اس نے سکندر اعظم سے کی تھی، جس کا پہلا سبق یہ تھا کہ "فوج کے ایک کامل کمانڈر ہو بہت جلد فاتح عالم بننے جا رہا تھا۔ اسے یاد رکھنا ہوگا کہ وہ انسانوں اور انسانی اقدار کو کبھی پامال نہ ہونے دے گا

اور دشمن کی پسپائی اس کی انا کو غرور میں مبتلا نہ کردے۔" "سکندر اعظم نے ہندوستان کو فتح کیا۔ راجا پورس کو زنجیروں میں جکڑ کر سکندر اعظم کے حضور پیش کیا گیا۔ سکندر نے تمام درباریوں کی موجودگی میں شکست خوردہ راجا پورس سے دریافت کیا کہ اب اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" راجا پورس نے کسی گھبراہٹ کے بغیر ہی جواب دیا "جو ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کے ساتھ کرتا ہے" دربار میں موجود درباریوں کا خیال تھا کہ راجا پورس نے اس جرأت مندانہ جواب سے فاتح عالم سکندر اعظم کے غیض و غضب کو دعوت دی۔ لیکن سکندر اعظم نے ان کے اندیشوں کے برعکس یہ حکم صادر کیا کہ راجا پورس کو باعزت آزاد کر دیا جائے کہ اسے اپنے استاد ارسطو کی نصیحت یاد آجاتی ہے کہ "تم انسانی اقدار کو پامال نہیں ہونے دو گے" پھر سکندر اور پورس آپس میں بغل گیر ہو جاتے ہیں۔

اس منظر کے بعد پھر پردہ کھسکتا ہے اور پھر اسی عام دیہاتی کی بات کو آگے بڑھایا جاتا ہے جسے فوجی انسانی ڈھال بنا کر جکڑ بند گاڑی کے آگے باندھ کر سنسان و ویران گلیوں اور سڑکوں پر گھما کر اپنی فتح کا جشن مناتے ہیں۔ سکندر اعظم جب وطن واپس لوٹنے لگا تو راجا پورس نے تشکر بھری نظروں سے اسے وداع کیا اور اس طرح سے مقدونیہ کا بادشاہ تو تاریخ کے صفحات پر ایک ناقابل فراموش فاتح عالم بن گیا اور رہتی دنیا تک انسانی ہمدردی اور اخلاقی بلندی و وسیع القلبی کی انمٹ داستان رقم کر گیا۔ اور پھر —— وہ دن آگیا جس دن کی صبح و شام سیاہ تھی، جو دن انسانی تاریخ پر ایک سیاہ دھبہ بن کر آیا۔ جس دن ایک عام نہتے، بے قصور اور معصوم شہری کو اس کے جرم بے گناہی پر انسانی ڈھال بنایا گیا اور تمام تر اخلاقی اصول و اقدار کو پامال کیا گیا۔ یہ ناپسندیدہ فعل انجام دینے والے فوجی کی نہ صرف پیٹھ تھپتھپائی گئی بلکہ اسے انعام و اکرام، اعزاز اور تمغۂ جرأت سے بھی نوازا گیا۔ اور انسان کو ذلیل و خوار اور انسانیت کو رسوا کیا گیا۔

"ارسطو کی واپسی" افسانے کا اختتام بہت خوبصورت انداز سے کیا گیا ہے جو اس افسانے کا حاصل ہے۔ ارسطو نے اپنے عظیم شاگرد سکندر اعظم کی موت پر آنسو نہیں بہائے کیونکہ سکندر انسانی تاریخ کا امر حصہ بن چکا تھا۔ کئی ہزار سال گزر چکے جب ارسطو کی واپسی ہوئی لیکن اس ارسطو کی آنکھیں خون کے آنسو بہا رہی تھیں۔ افسانے کی ان آخری سطور میں صدیوں پہلے کی انسانی اقدار کا موازنہ موجودہ دور کی انسانی اقدار سے کیا گیا ہے اور ان کی اس قدر شکست و ریخت اور پامالی پر کچھ کہے یا فتویٰ صادر کئے بغیر ہی انسانی عقل و شعور کو کریدتا ہوا ایک سوالیہ نشان لگایا گیا ہے جو اس افسانے کا لب لباب ہے۔ وہ اس لئے بھی کہ سکندر اور پورس کا واقعہ زبان زد ہر خاص و عام ہے اور اس گھسے پٹے رٹے رٹائے تاریخی واقعے کو موجودہ سیاسی حالات کے ساتھ، جن سے پوری کشمیری قوم گزر رہی ہے، مربوط کرنا ہی افسانہ نگاری ہے اور اسی کو افسانوی زبان میں بازگوئی بھی کہتے ہیں۔

◆◆◆

ریاست جموں کشمیر کے منفرد افسانہ نگار وحشی سعید کی تخلیقات

(1) **خواب حقیقت** (2) **سڑک جاری ہے** (3) **کنوارے الفاظ کا جزیرہ**

(4) **ماضی اور حال** (افسانے) (5) **ماضی اور حال** (ناول)

(6) **پتھر پتھر آئینہ** (7) **آسمان میری مٹھی میں** شائع ہو چکے ہیں

رابطہ : نگینہ ہوٹل شہنشاہ پیلس بلیوارڈ، سری نگر (کشمیر)

جائزے

سیاحت نامہ ترکی ــــ مقبول سفرنامہ

حسن عسکری کاظمی

سفرنامہ یا سیاحت نامہ ضبطِ تحریر میں لانے کا مقصد قارئین کو صرف محظوظ کرنا نہیں بلکہ اپنے مشاہدوں اور تجربوں سے ان کی معلومات میں اضافہ کرنا ہوتا ہے اس میں شک نہیں کہ سفرنامہ لکھنا گویا گزرے ہوئے واقعات کو زندہ رکھنا ہے اسی طرح نادیدہ مناظر سے قاری لطف اندوز ہوتا ہے اور چشمِ تصور کی بدولت سیاحت میں شریک ہو جاتا ہے اچھا اور دلچسپ سفرنامہ وہی کہلاتا ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری یوں محسوس کرے کہ وہ بھی سفر پر نکلا ہوا ہے۔ اب وہ زمانہ گیا جب مسافر کو گھر یاد آتا اور وہ کسی درخت کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر اپنی غریب الوطنی پر آنسو بہانے پر مجبور ہو اب سفر کرنا جان جوکھوں میں ڈالنا نہیں بلکہ لطف سفر اٹھانا ہے البتہ جب کسی خاص مقصد کے پیشِ نظر کیا جاتا ہے تو مقصد سفر سے پہلوتہی نہیں کی جا سکتی چنانچہ سیاحت نامہ ترکی کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری ابتدا میں ہی باخبر ہو جاتا ہے کہ ملک مقبول احمد کا مقصد سفر عالمِ اسلام کی عظیم المرتبت ہستی حضرت ایوبؓ انصاری کے روضۂ اطہر کی زیارت اور مغرب اور مشرق کے سنگم پر واقع ترقی یافتہ ملک ترکی میں وہاں کے معاشرتی حالات کو بچشم خود دیکھنا تھا۔ ملک مقبول احمد نے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ

> ''اگر میرے سامنے حضرت ایوبؓ انصاری کی زندگی جنھیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میزبانی کا عظیم شرف حاصل تھا، نہ ہوتی تو میرے اندر وہ روحانی تڑپ پیدا نہ ہوتی جو مجھے کشاں کشاں استنبول جانے پر اکساتی تھی۔''

ان کا سیاحت نامہ اسلامی تاریخ کا وہ آئینہ ہے جس میں ہم مختلف ادوار کی جھلکیاں دیکھ سکتے ہیں وہ سفرنامے کو بیانیہ بنا کر قاری کو مسلمانوں کے درخشاں ماضی میں لے جاتے ہیں حضرت ایوبؓ انصاری وہ جاں نثار صحابی اور سچے عاشقِ رسولؐ ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں ان کے فضائل کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ ملک مقبول احمد نے کمال عقیدت سے ان کی میزبانی کا ذکر ہی نہیں کیا بلکہ یہ تاریخی واقعہ بھی بیان کیا کہ حضور پرنور حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ داخل ہونے سے پیشتر فرمایا کہ میری اونٹنی جس کے گھر کے سامنے بیٹھے گی وہی میرا میزبان قرار پائے گا حضرت ایوبؓ انصاری کی تمنا پوری ہوئی اور اونٹنی ان کے دروازے کے آگے بیٹھ گئی۔

ملک مقبول احمد نے اپنے سیاحت نامے کو سادہ، سلیس اور رواں دواں انداز میں تحریر کیا جس میں کہیں تصنع کا دخل نہیں انہوں نے اس کتاب کے ہر باب میں حسنِ ترتیب کا لحاظ رکھا اور مختلف عناوین سے قاری کو مطالعہ کرنے کی ترغیب دلائی۔ سادگی میں پرکاری اور بیانیہ طرزِ نگارش میں فطری اسلوب ان کی شناخت بن گیا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے سچ کی بات کی کہ ''مجموعی طور پر یہ سیاحت نامہ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی روایت سے منسلک ہے لیکن اس میں جدید ترکی کا وہ چہرہ بھی دیکھا جا سکتا ہے جو بیسویں صدی کی پہلی جنگ عظیم

کے بعد مسلسل تغیر کی زد میں رہا ہے اور اب بھی نئے تحرک و حرارت کو عمل میں لا رہا ہے۔''

''سیاحت نامہ ترکی'' میں ملک مقبول احمد استنبول ایئرپورٹ پر آمد کے حوالے سے جو منظر کشی کرتے ہیں اور جو صورت احوال سامنے آتی ہے اسے بے کم و کاست بیان کرنا ضروری خیال کرتے ہیں مثلاً

> ''میں نے ہوائی جہاز کی کھڑکی سے باہر جھانکا۔ میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ استنبول مسجدوں کا شہر ہے۔ جدھر نظر جاتی تھی مسجدوں کے گنبد اور مینار نظر آتے تھے میں دور سے دیکھ رہا تھا لیکن احساس یہ تھا کہ یہ بلند و بالا مینار اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعلان کر رہے ہیں۔''

وہ عمر رواں کی اسی بہاریں لوٹنے کے بعد یہ سفرنامہ رقم کر رہے ہیں، وہ جوش جوانی اور رگوں میں خون کی روانی اب کہاں؟ مگر خیال ضرور آیا کہ ''اگر میں عالم شباب میں ان مقامات کی اور رومان پرور خطۂ ارض پر جاتا تو اس سیاحت نامے میں کئی رومانوی مقامات اور واقعات آتے جو افسانے سے کم نہ ہوتے ——— میرے اندر وہ ولولہ بھی نہیں رہا تھا جو نوجوانوں میں ہوتا ہے البتہ ایک چیز ذہن ضرور ہے جو اجنبی سرزمینوں کو دیکھ کر سوچتا ہے، حیرت زدہ ہوتا ہے اور اللہ کا شکر بجا لاتا ہے جس نے یہ کائنات بنائی اور ہمیں دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں۔''

سرزمین ترکی قدیم تہذیب کا گہوارہ ہے، ظاہر ہے کہ اس کی تاریخ میں سکندر اعظم کا ذکر بھی موجود ہوگا۔ ملک مقبول احمد نے سیاحت نامے کو معلومات سے بھرپور بنا کر اس کی مقصدیت کو پیش نظر رکھا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قدیم ترکی سے متعلق کہاں سے حاصل معلومات اکٹھی کی گئیں اور انھیں مستند بنانے کے لیے حوالے ضروری ہیں مگر اس سلسلے میں قاری بے خبر رہا اور اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ملک مقبول احمد وغیرہ علم ترکی کی قدیم تاریخ سے وابستہ ہے جسے اس سیاحت نامے میں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کا یہی خیال ہے کہ ''میری دانست میں حال ماضی کی بنیاد پر استوار ہوتا ہے اور ہمیں ماضی کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔''

ملک مقبول احمد صاحب ذوق اور صاحب ثروت ہیں، وہ مع اہل و عیال گھر سے روانہ ہوئے۔ ان کے برخوردار ڈاکٹر ارشد مقبول جہاں گرد ہیں۔ وہ ہر سال کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی ملک کاروبار کے سلسلے میں جاتے رہتے ہیں، وہ خود بھی سیاحت کا شوق رکھتے ہیں ترکی کا سفر اور وہاں پیش آنے والے واقعات میں ان کے مشاہدوں نے رنگ بھرے، وہاں اہم تاریخی مقامات کی سیر کی، توپ کاپی محل، میوزیم، سلطان احمد پارک، نیلی مسجد اور گرینڈ بازار دیکھا۔ سیاحت نامے کا یہ باب دلچسپ ہے، یہاں ان کا قلم گل فشانی کرتا اور ماحول کی طلسماتی تصاویر کھینچتا نظر آتا ہے۔

> ''لڑکیاں ساحل سمندر پر بے لباس پھرتی ہیں، کھلنڈرے لڑکے اور خاص طور پر بوڑھے یہاں ریستوران سے دیدہ بازی کرتے ہیں اور فنجانوں میں شراب ڈال کر پیتے ہیں جس کی یہاں ممانعت نہیں۔''

ایک کاروباری ہونے کے ناتے انھوں نے قالین بافی کا تذکرہ کیا اور اتنی تفصیل کے ساتھ قالین کے معیار سے متعلق معلومات فراہم کیں کہ یا وہ شاید! استنبول سے انطالیہ بحیرۂ روم کے کنارے جنوب کی طرف کا سفر بھی سیاحت ترکی میں شامل ہے یہ استنبول سے جہاز کی مسافت سے ایک گھنٹے کے فاصلے پر ہے۔ بزرگ سیاحت نگار نے لذت کام و دہن کا ذکر خوبصورت لفظوں میں کیا ''ساحل سمندر پر چھوٹے چھوٹے بے شمار ریستوران ہیں جہاں جائیے 'کافی' پر بیٹھ جائیں 'تلی ہوئی مختلف اقسام کی مچھلی کی خوشبو آپ کو دعوت خورد و نوش دیتی

ہے۔ ان ریستورانوں میں رنگا رنگ کے پروگرام برپا ہونے لگتے ہیں۔ سیاح ان ریستورانوں میں بیٹھ کر سمندر پر تیرتی کشتیوں، بجروں اور جہازوں کا ہی نظارہ نہیں کرتے بلکہ نیم برہنہ نگار ہائے قد کر کے منظر سے بھی لطف اندوز ہوتے ہیں۔" مزید لکھتے ہوئے اسی منظر کی صراحت یوں کرتے ہیں کہ چشم تصورات دیکھ کر ملک مقبول احمد کے دل کا احوال بھی پڑھ سکتی ہے۔ "یہاں غیر ملکی سیاح مرد جانگیہ یا نکر پہنے اور عورتیں سوئمنگ سوٹ یا محض بکنی پہنے سمندر کی اٹھکیلیاں کرتی موجوں کے ساتھ بھاگ دوڑ اور رنگ رلیاں کر رہی ہیں۔ یہ بندہ بھی اس آبی موج میلے سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہ رہ سکا لہٰذا اس نیل گوں سمندر میں چند ڈبکیاں لگا کر زندگی کا بھرپور ثبوت دیا۔ یورپی خواتین اپنے نہایت مختصر سے لباس میں جو نہ ہونے کے برابر تھا ہر کس و ناکس کو دعوت نظارہ دے رہی تھیں۔ ایسے میں دل پر قابو پانا قدرے مشکل ہوتا ہے اور انہیں دیکھے بغیر خواہ حیرت سے کیوں نہ ہو بندہ بشر رہ نہیں سکتا۔ ویسے بھی اس وسیع و عریض سمندر کا نظارہ آنکھیں بند کر کے تو نہیں کیا جا سکتا اس خوبصورت دلکش جگہ سے آنے کو کس کافر کا جی چاہتا ہے۔"

ملک مقبول احمد نے ظاہر اور باطن کی سچائی کو کہیں چھپایا نہیں۔ وہ ایک طرف زاہد عابد اور پابند شریعت ہیں۔ اسلام کی محبت ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے۔ وہ ایسے دینی ماحول کے پروردہ نیک آدمی ہیں کہ دوران سفر میں کہیں ایک آدھ مرتبہ نماز قضا ہوئی تو اس کا ذکر بھی کر دیا۔ اسی طرح سے وہ اپنے خاندان کے ہر فرد سے بے پناہ محبت کرنے والے ہیں کہ اس سفری تجربوں میں انہیں بھی شریک دکھا۔ وہ سنجیدہ طبع ضرور ہیں لیکن مزاح سے کہیں نہ کہیں کام لینے سے نہیں چوکتے۔ وہ جس ہوٹل میں ٹھہرے وہاں فریج میں مختلف اقسام کے مشروبات، چاکلیٹ اور بسکٹ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ وہاں قیام پذیر حضرات جب چاہیں ان میں سے چیزیں نکال کر اپنے کام و دہن کی ضیافت کر سکتے ہیں لیکن ہوٹل سے جاتے وقت ان کی قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے۔ اب ہوا یہ کہ ملک صاحب اور ان کی اہلیہ محترمہ نے ایک بوتل کھولی مشروب کے ایک دو گھونٹ پیے دونوں بدمزہ ہوئے۔ بوتل رکھ دی مگر کاؤنٹر پر معلوم ہوا کہ اس میں بئیر تھی اس وقت کہیں قریب ہی ان کا پوتا بابر بھی کھڑا تھا۔ اس نے اس بات کو سن لیا۔ "وہ بڑا شرارتی ہے جب ہم دوسرے ہوٹل میں چلے گئے تو اس نے پوری فیملی میں شور مچا دیا کہ دادا ابو 'پی' کر آئے ہوئے ہیں۔"

ملک مقبول احمد نے اسے سفرنامہ یا سیاحت نامہ کہہ کر قاری کو آمادۂ سفر ضرور کیا۔ ان کی تحریر میں تاریخی واقعات اور سرزمین ترکی میں ہونے والے نشیب و فراز، سلطنت عثمانیہ کا آغاز و انجام، عثمان غازی کا خواب، عروج و زوال اور یادِ قسطنطنیہ فتح وغیرہ اور موجودہ ترکی اور سیاسی کشمکش سے متعلق بہت کچھ آ گیا ہے مگر جو لطف خود ان کے مشاہدات اور دوران قیام کے صبح و شام کی تفصیلات سے حاصل ہوا وہی پورے سفرنامے کی جان ہے کہ آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے وہ اپنے دل میں موجزن جذبے بے اختیار کے اظہار میں آزاد ہو جاتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ

> "میں نے ترکی کی سیاحت میں اپنی ذات کے اندر کی سیاحت کی اور ذات کے باہر کی بھی ترکی کے حال کی بھی اور ترکی کے ماضی کی بھی۔ اس سیاحت نامہ کے لکھنے میں اگر میری مدد اور رہنمائی میرا بیٹا ڈاکٹر ارشد نہ کرتا تو میں شاید یہ کام نہ کر سکتا۔"

◆◆◆

مرزا حامد بیگ کے افسانے: کھوئے ہوؤں کی جستجو

نجم الحسن رضوی (امریکہ)

مرزا حامد بیگ کی کتاب 'جاگتی بانی کی عرضی' کے سرورق پر ایک قدیم حویلی کے منقش دروازے کی تصویر ایسا استعارہ بن گئی ہے جس سے ان کے افسانوں میں عہد گزشتہ کی بازیافت اور یادگار کرداروں کی حیات نو کی خبر ملتی ہے۔ اس دروازے کے پیچھے ان کی کہانیوں کی وہ دنیا آباد ہے جس میں گزرے موسموں کی یادیں اور بھولی ہوئی آوازیں قاری کو کبھی حیران و پریشان اور کبھی افسردہ اور ملول کرتی ہیں۔

افسانے کی ساخت میں تین چیزیں اہم ہوتی ہیں: خیال، پلاٹ اور طرز بیان۔ خیال سے مراد وہ مرکزی تصور ہے جو جس کی بنیاد پر کہانی کا ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے اور پلاٹ واقعات کی ترتیب اور کرداروں کے جذبات اور احساسات کے اظہار کے نتیجے میں تشکیل پانے والا وہ منظرنامہ ہے جس کے ذریعے کہانی آہستہ آہستہ اپنے اسرار کھولتی ہے۔ طرز بیان یا طرز ادا خالص انفرادی خوبی ہے جس سے لکھنے والے کی مہارت، اور زبان و بیان کے برتاؤ میں اس کی نفاست اور جدت طرازی کا پتہ چلتا ہے۔ مرزا حامد بیگ صاحب طرز ادیب ہیں جنھوں نے اپنے افسانوں میں زبان کے تخلیقی استعمال پر زور دیا ہے اور اپنی نثر میں اردو کے ساتھ پنجابی اور پوٹھوہاری کے الفاظ ضرورت کے وقت بڑی بے تکلفی سے استعمال کیے ہیں۔ اصل میں انھیں موضوع سے زیادہ کہانی کے پیرایۂ اظہار اور اس کے مجموعی برتاؤ سے دلچسپی ہے لہٰذا موضوعاتی تنوع کے بجائے ان کی اسلوبیاتی بوقلمونی ہمیں متاثر کرتی ہے۔ دیکھا جائے تو ان کی کہانیوں کا موضوع ایک ہی ہے یعنی گمشدہ زمانوں اور بھولی بسری صداؤں سے 'یا' اس کائنات کی تشکیل نو جسے ہم کہیں چھوڑ کے آگے نکل آئے ہیں۔ ان کے ایک افسانے 'نعم نامہ' کا یہ اقتباس ان کی کہانیوں کی عام فضا کی تصویر پیش کرتا ہے۔

''جب وحشت تھی اور کسی طور چھٹنے پہ نہیں آتی تھی۔ رات دن ایک ہو گئے تھے، ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ سنگ سیاہ کی جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی گزرگاہ کے دونوں اطراف میں پھیلے ہوئے پہاڑی سلسلے کی ان گھاٹیوں میں سے فصیل سر ہوائیں تیروں کی طرح سنسناتی ہوئی گزر رہی تھیں۔'' مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں وحشت بھی ہے جسے فضیل جعفری نے 'معنویاتی ابہام' کا نام دیا ہے اور وقت کی بدلتی ہوئی وہ کیفیت بھی جسے سجاد باقر رضوی نے ''حال سے ماضی کی طرف سفر اور پھر حال میں پورے ماضی کے احساس'' سے تعبیر کیا ہے اور اگر ہم سنگ سیاہ کی جگہ جگہ سے اکھڑی ہوئی اس گزرگاہ پر چل کے ان کی تخلیقی دنیا میں داخل ہوں تو پتہ چلے گا کہ ان کے افسانوں پر 'جاگتی بانی کی عرضی' میں افسانہ نگار کا یہ فقرہ صادق آتا ہے کہ ''یا ہم گزشتہ ہوتی ہوئی قدیم یادوں کا تصویروں کا قصہ'' ''حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کی تحریریں ہمارے لیے منظر بہ منظر پرانی یادوں کا تصویری قصہ کھولتی جاتی ہیں۔ مغل ماضی کی یادگار صورتیں، دریا کنارے شکستہ حویلیاں، پرانے مجرے اور غلام گردشیں، مغلوں کا گھڑ دوڑ میدان اور پٹھانوں کے سپاہیوں کی کوٹھریاں۔ اگرچہ مرزا حامد بیگ مغل ماضی کی بازیافت میں خصوصی دلچسپی رکھتے ہیں جس کا ثبوت ''گمشدہ کلمات''، ''مغل سرائے'' اور ''قزاقوں کی رات'' جیسے افسانوں سے ملتا

ہے مگر قدیم معاشرے، پرانے ماحول اور ماضی کی دھند میں کھوئے اُن کے لوگوں کی جھلکیاں بھی ان کی کہانیوں کا حصہ بنتی ہیں۔ ان میں ''شیروں کی چھاتی والا'' ''لیڈ میں چلنے والا لڑکا'' بھی شامل ہے جو سوتے میں بھی ہوا کے بین سن لیا کرتا تھا، ''گمشدہ کلمات'' کا قبیلے کا کاہن بھی جو بیتی ہوئی صدیوں کی کھوج میں تھا۔ ''مٹی کا رنگ'' کا کریم سے اترا ہوا وہ مرد بھی جو لوگوں کی بے حسی کا شکار ہے، ''بابا نور محمد کا آخری بیت'' کا بابا نور محمد جس نے چاندی کا پاپوش اتار دے کر ایک روٹی حاصل کی تھی اور جو اپنے چیار رشتوں کی وجہ سے افسانہ نگار کے ذہن میں اب تک زندہ تھا اور ''جاگی بائی کی موتی'' کے رلیا رام بھی جنھوں نے جاگی بائی کے کوٹھے پر صرف ایک رات گزاری تھی مگر اس رات کی یاد نے ضمیر کی دھوپ بن کے بے حسی اور بے گلی کے اس برف زار کو پگھلا دیا تھا جو برسوں سے ان کے وجود پر چھایا ہوا تھا۔

مرزا حامد بیگ نے اگرچہ باقاعدہ مصوری نہیں کی مگر ان کے افسانوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ لفظوں سے بھی تصویریں بنا سکتے ہیں۔ ان کے افسانے ''انتظارگاہ'' میں ایک پرانی بستی کی تصویر دیکھیے: ''آبادی کے لوگ لوہا کوٹتے، بان کی ٹپیاں بناتے، چاک گھما کر کوزے تراشتے، کولہو میں سرسوں پیلتے اور کپڑا کاتتے والی کھڈیوں کو متحرک رکھنے میں جتے رہتے اور بیکار اور ناکارہ بوڑھے دن بھر بیٹھے تمباکو پیتے رہتے۔'' مختلف سرگرمیوں میں مصروف لوگوں کے علاوہ ان کی کہانیوں میں ساحلی سواروں، تیغ سواروں اور عیار رفتار گھوڑوں اور گھوڑیوں کے بیان نے بھی گزرے زمانے کے ذکر میں صداقت کا تاثر پیدا کیا ہے۔ ان کی کہانی بھی خط مستقیم پر سفر نہیں کرتی۔ وہ واقعے ٹکڑوں میں بیان کرتے ہیں، حال، ماضی اور پھر ماضی ملا حال۔ وقت ان کے نزدیک ریت کے اس گھروندے کی مانند ہے جو تصور کے ہاتھوں میں پھیلتا سکڑتا رہتا ہے۔

''یار ہم کتنی دیر کھیلتے رہے ہوں گے، جب تاش کھیل کر اٹھے ہیں تب کیا وقت تھا؟ کہیں ہمارے ساتھ بھی ایسا تو نہیں ہو رہا کہ باہر کی طرف دوپہر ہو اور ہم سمجھ رہے ہوں کہ شام ہو گئی۔'' ''تھکاوٹوں کی رات''

فضا بندی، منظر سازی اور ماحول کی فنکارانہ تشکیل مرزا حامد بیگ کے افسانہ نگاری کے خصوصی اوصاف ہیں۔ وہ اپنی کہانی فلمی تکنیک کے مطابق منظروں کی مدد سے بیان کرتے ہیں۔ موسم اور قدرتی مناظر انھیں منظر سازی میں پوری مدد دیتے ہیں۔ ماگھ، پوہ، ساون، بھادوں، اساڑھ اور کاتک کا ذکر ان کے افسانوں میں بار بار ملتا ہے۔ موسموں کا بیان ان کی کہانیوں کی بنت میں ایسے لگتا ہے جیسے چادر میں کڑھے ہوئے نقش و نگار۔

''شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے اور وہ دونوں تھکے اندھیرے میں دھندلاتے ہوئے متحرک دھبوں کی طرح چپ چاپ بڑھے چلے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ فٹ پاتھ پر سفیدے کی قطار میں بجتی ہوئی ہوا کی سرسراہٹ اب صاف سنائی دے رہی تھی۔'' ''مقتل سرائے'' ''وہ ایسی ہی ایک شام تھی اور میرے دروازے پر گرتے ہوئے پتوں کے ڈھیر لگے تھے۔'' ''دھوپ کا چہرہ''

''سنتے آئے ہیں کہ پوہ کے دنوں میں بچھڑے پاؤں کی آوارہ ٹولیاں دلوں میں دراڑیں ڈال دیتی ہیں۔ سیٹیاں بجاتی ہوئی ہوا میں چیخ نہیں سنائی دیتی اور بجلی کی چمک برچھی کی لپک کو نگل جاتی ہے۔''

''اس نے موسلا دھار بارشوں کی ترچھی باڑ سے بچی ہوئی تہہ در تہہ موٹی چادریں اوڑھ لیں۔ اب وہ بیٹھا تھا اور اس کی پیشانی سے نیچے گرتی ہوئی سر کے بالوں کی بنی ہوئی سرخی رسیاں جھول رہی تھیں۔ وہ بیٹھا رہا اور دونوں جانب کی قطاریں اور گھمرے ہوئے سر کنڈے گرتے ہوئے شدید موسموں کے پیچھے دھندلا گئے۔'' ''نیند کے ماتے'' مشاہدے کی گہرائی، جزئیات کے تفصیلی بیان اور لفظوں میں

مصوری کی مہارت سے مرزا حامد بیگ کی کہانیوں کے ماحول اور کرداروں میں زندگی کی حرارت پیدا ہوتی ہے۔ افسانے ''دل کے موسم'' میں ایک پرانی حویلی کی تصویر دیکھئے۔ ''اس مکار کے داہنے گال پر تل ہے۔ اس کے ہونٹ یاقوتی رنگ کی انگوٹھی اور بول ترشے ہوئے نگینے۔ جب بات کرتی ہے تو یاقوتی ہونٹوں کے نگینے اپنے رنگ بدلتے ہیں۔ اس کمرے میں چاندنی بچھی ہے، گاؤ تکیے دھرے ہیں۔'' اسی طرح ''ایک یادگار مخطوطہ'' میں سائیکل پر کرتب دکھانے والا بازیگر یوں ہمارے سامنے آتا ہے: ''وہ مجمع کے بیچ، پانی سے غرارے کرتا ہوا دھیرے دھیرے چل رہا ہے۔ اس کی سیاہ قمیص کی ایک آستین ہوا میں آگے پیچھے جھول رہی ہے جس کے اندر دایاں بازو کہنی پر سے کٹا ہوا ہے۔''

انفرادی اسلوب اور ندرت خیال کے علاوہ مرزا حامد بیگ کے یہاں انسان دوستی اور کھوئی ہوئی اعلیٰ اخلاقی قدروں کا احساس نمایاں ہے۔ ان کے افسانوں سے پتہ چلتا ہے کہ جبر اور ظلم و ستم کسی ایک زمانے کے لئے مخصوص نہیں۔ ظالموں اور مظلوموں کی نسلیں ہر زمانے میں موجود ہوتی ہیں اور مظلوموں کے مجرے بھی۔ انھوں نے جہاں ''گمشدہ کلمات'' کے پرانے زمانے کے بڑے مرزا مغل کو یاد رکھا ہے جو حسن کے شکاری تھے، وہاں نئے زمانے کے ان حاکموں اور تخت والے لوگوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جن کے نزدیک انسانی جان و مال کی کوئی قیمت نہیں۔ انھوں نے بڑے مرزا مغل کی جو تصویر کھینچی ہے وہ کچھ یوں ہے۔

''اس کے گھر تلے آگ نے جب جوانی کی پہلی انگڑائی توڑی ہے تو خدا مغفرت کرے، بڑے مرزا مغل نے اسے اکیلے میں دوسری انگڑائی نہیں لینے دی۔'' ''گمشدہ کلمات'' اپنے افسانے ''معتوب'' میں مرزا حامد بیگ نے اپنی ایک خونی یاد کچھ اس طرح بیان کی ہے۔ ''ان دنوں دن تھے جب میں نے پہلی بار نہر کے گدلے پانی میں تیر کر آتی ہوئی کٹی انسانی لاشیں دیکھیں۔'' پھر اس کے بارے میں اپنے با اختیار والد صاحب کا بیان اس طرح رقم کیا۔ ''ایک روز رات کو والد صاحب قبلہ نے تھانے دار کی وردی اتار کر کھونٹی پر ٹانگتے ہوئے فرمایا۔ یہ ملعون تھے ہی اس قابل۔ ان کا کون ہے رونے والا لیکن میرو پولیس نے اپنی حدود سے انھیں اس طرف ہانک کر ہمیں مشکل میں ڈال دیا۔ یہ ہموں کے باقاعدہ ہوتے اور آتی بہت سی سوکھی ٹہنیاں ہم تک نہ جھکتے تم تو آگے جانے سے رہتے، کتے کے پلے!''

مرزا حامد بیگ ان افسانہ نگاروں میں شامل ہیں جو 1970ء کی دہائی میں سامنے آئے جب اردو افسانے کے افق پر تجرید اور علامت کے بادل چھائے ہوئے تھے اور بعض صورتوں میں بے جا جسم، بے رنگ اور بے مزہ تحریریں سکہ رائج الوقت بنی ہوئی تھیں۔ مرزا حامد بیگ نے نام نہاد جدیدیت کے اس دور میں خود کو اس سیلاب بلا سے محفوظ رکھتے ہوئے اپنے لئے افسانہ نگاری کی وہ راہ منتخب کی جو بے معنویت کے جنگل سے نکل کے معنویت کے نئے سبزہ زاروں کی طرف لے جاتی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے جدید بیانیے باشعور قاری کو الجھاتے نہیں اور اس کے باوجود کہ ان کی معنویت تک رسائی کے لئے اسے انھیں وہی کرنا پڑتا ہے جو ٹکڑوں میں بٹے ہوئے کسی تصویری معمے کو حل کرنے کے لئے کیا جاتا ہے۔ مرزا حامد بیگ کے افسانے ماضی اور حال کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے کے بعد سمجھ میں آتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں کوئی گہرا فلسفہ یا سمجھ میں نہ آنے والا گنجلک خیال نہیں ملتا۔ وہ تہذیبی انحطاط اور انسانی عالمت زدگی کی کہانیاں لکھتے ہیں جنھیں ان کے طرز بیان نے قابل مطالعہ بنا دیا ہے۔ مجموعی طور پر ان کے افسانوں پر ''ساقرِ لی مواد'' میں ان کا لکھا ہوا یہ فقرہ صادق آتا ہے: ''کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ، مجھے اس سے غرض نہیں۔ بیان و انداز ہے اور کہانی مرغوب!''

◆◆◆

قرۃ العین حیدر کے ناول "آخرِ شب کے ہمسفر"

عذرا اصغر

قرۃ العین حیدر اردو ناول نگاری اور افسانے کا بہت بڑا نام ہے۔ اتنا بڑا کہ بہت نامور اور انعام یافتہ ناول و افسانہ نگاروں میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتا ہے۔ ایسے ہی جیسے ہیرا بے شمار خوبصورت اور قیمتی نگینوں کے درمیان جگمگاتا اور اپنی الگ حیثیت قائم رکھتا ہے۔

بیسویں صدی پر قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری اور ناول نویسی کے انمٹ نقوش ثبت ہیں اور شاید یہ گزرتی صدی بھی انہی کی صدی کہلائے۔ کہنے کو "میرے بھی صنم خانے" قرۃ العین کا ابتدائی دور کا ناول ہے لیکن سنجیدہ ادب کے قارئین کے ذہنوں میں ان کے اسی ناول سے ان کے نام کی اردو ادب پر مہرِ قبولیت ثبت ہو چکی تھی۔ "آگ کا دریا" نے تو انہیں شہرت کے بام تک پہنچا دیا۔ "آگ کا دریا" سے متاثر ہو کر بعد میں آنے والے کئی دوسرے ناول نگاروں نے ان جیسا لکھنے کی کوشش بھی کی اور ان کی اسلوب گری کو سامنے رکھ کر ناول لکھے بھی۔ مگر "آگ کا دریا" کے درجے کو عبور نہیں کر پائے۔

تذکرہ نویسوں کا اپنی جگہ یہ کہنا درست ہے کہ قرۃ العین حیدر کا ذہن بہت وسیع ہے یا تھا۔ انہوں نے بلاشبہ دنیا میں گھوم پھر کر اپنی آنکھوں سے اور کھلے ذہن کے ساتھ اس جہان کا مطالعہ کیا تھا۔ خطۂ زمین پر بسنے والی قوموں کی روشنی اور زندگی کے اندھیروں کو اپنے باطن میں اتارا تھا۔ وہ بے شک اعلیٰ تعلیم یافتہ، مہذب خاتون تھیں مگر تعلیم یافتہ ہونا، ڈگریاں حاصل کر لینا کسی لکھنے والے کو اسلوب گر نہیں بناتا۔ اس کے لیے ذاتی اور خداداد صلاحیت کے علاوہ ذہنی رسائی، وسیع مطالعہ اور گہرا مشاہدہ درکار ہے۔ قرۃ العین حیدر ایسی قلم کار تھیں جن پر معاشرتی ذمہ داریاں اور بندشیں اس طرح عائد نہیں تھیں جس طرح ہمارے برصغیر کی دوسری خواتین لکھنے والیاں ان مخصوص پابندیوں میں گھری ہیں۔ قرۃ العین حیدر اپنے افعال میں پوری طرح خود مختار اور آزاد تھیں۔ وہ ہمہ وقت قلم کار تھیں۔ زندگی کی اس سہولت کو انہوں نے بحسن و خوبی استعمال کیا اور اردو ادب میں اپنے نام کا سکہ چلایا۔ قرۃ العین حیدر کی فن اسلوب گری کی انفرادیت مسلّم ہے جس کی نقل یا پیروی ممکن نہیں اور جب تک اردو ادب میں کوئی منفرد طرزِ نگارش متعارف نہیں ہوگا قرۃ العین حیدر کی انفرادیت قائم و دائم رہے گی۔ حزن ان کی تخلیقات کا ایک بہت اہم عنصر ہے۔ یہ ایسا تاثر ہے جس کی وضاحت لفظوں میں شاید ممکن نہ ہو سکے۔ وہ اپنی نگارشات میں بالواسطہ غم انگیزی کی کیفیت پیدا نہیں کرتیں بلکہ لفظوں سے ترتیب دیے گئے جملے فقرے پڑھنے والے پر ایک سحر انگیز غم آمیز کیفیت از خود طاری کر دیتے ہیں۔ جیسے بہار کے موسم میں لاتعداد پھولوں کے جھرمٹ میں بیٹھ کر انسان ایک لطیف کسک کا احساس کرتا ہے۔ مثال کے طور پر "آخرِ شب کے ہم سفر" کا یہ اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

"کھانے کے بعد دیپالی باہر برآمدے میں جا کھڑی ہوئی اور افق پر تیرتے ہوئے چاند کو دیکھنے لگی۔ ریحان تڑ و یک کے پیچھے سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔ رات کا اندھیرا سیلاب کی طرح بڑھا چلا آ رہا تھا۔"

ایک اور پیراگراف دیکھیے۔ "زندگی کا ایک اور دن ختم ہو گیا۔ ایک انمول دن گزر گیا۔ ایک شعر چھا جا چکا" ریحان نے آہستہ سے اپنے آپ سے کہا۔ پھر اس نے مڑ کر دیپالی کو آواز دی اور وہ اپنے کمرے میں گھس گیا۔"

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ قرۃ العین حیدر کسی بھی کیفیت کو بالواسطہ انداز میں بیان نہیں کرتیں بلکہ جملوں کی ترتیب سے احوال بتاتی ہیں۔ یہ دیکھئے! ''دوسرے دن وہ دیگر طلبا سے کٹ کر گاؤں میں گئے۔ کسانوں اور مچھیروں سے باتیں کرتے رہے اور رات گئے واپس آئے۔ راستے میں دیپالی کی ساری ایک جھاڑی میں الجھ گئی۔ ریحان اس کی مدد کرنے کے لئے زمین پر دو زانو بیٹھ گیا۔ کانٹے نکالتے ہوئے اس نے دفعتاً سر اٹھا کر پوچھا: ''ساری پر یاد آیا۔ تمہاری چوری کا پتہ چل گیا؟''

''جی ہاں۔'' وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور چاند کی روشنی میں ساری کے چاک میں گرہ لگانے کی کوشش کرنے لگی۔

''مجھے ان ساریوں کے بکنے کا بڑا رنج ہوا تھا۔'' ریحان نے کہا۔

''میں نے سوچا تھا جو لڑکی اتنی قربانی دے سکتی ہے ...!''

''میں نے کیا قربانی دی ہے؟'' دیپالی نے جھنجھلا کر بات کاٹی۔

''کیوں۔ کیا میں نہیں جانتا کہ لڑکیوں کو اپنی ساریوں اور گہنوں سے کتنی وابستگی ہوتی ہے۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے آہستہ سے کہا: ''امی کے پاس بھی وہ بالوچری کی ساریاں تھیں۔ جب وہ بیاہ کر آئی تھیں تو میری دادی اماں نے ان کو دی تھیں۔ وہ ساریاں میں تم کو دوں گا دیپالی۔'' دیپالی سکتے میں رہ گئی۔ اس کے ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ گئے۔ وہ گھبرا کر پتھر سے اٹھی۔ ''کیوں۔ کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟'' ریحان نے پریشانی سے دریافت کیا۔ ''کچھ بھی تو نہیں ـــــ گھر چلیے۔''

وہ اونچے نیچے ٹیلوں کو اور جھاڑیوں کو پھلانگتے کچھ تیزی سے کی طرف روانہ ہو گئے۔ دیپالی نے اب پھر ایک دم چپ سادھ لی تھی۔

قرۃ العین حیدر کے ناولوں کی فضا اتنی مانوس اور جانی پہچانی ہوتی ہے کہ پڑھنے والا اس میں خود کو موجود پاتا ہے۔ وہ منظر نامہ صرف پڑھ ہی نہیں رہا ہوتا اس کو پردہ سکرین پر دیکھ بھی رہا ہوتا ہے۔

قرۃ العین حیدر کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ہائی سوسائٹی کی کہانیاں لکھتی ہیں مگر مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ جس کلچر کو وہ اپنے ناولوں اور افسانوں میں پیش کرتی ہیں وہ یوپی کا ایک مخلوط کلچر ہے۔ کلاسیکل کلچر ـــــ متحدہ ہندوستان کا وہ آبادیاتی انجام کہ جس کو یوپی کا جاگیردار طبقہ اپنانے کی کوشش میں غلطاں تھا اور اپنے بچوں کو جدید انگریزی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے انہیں کانونٹ میں پڑھاتا تھا۔ اس طبقے کے ساتھ ساتھ انہوں نے اس وقت کے نوکر پیشہ طبقے کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے۔ خود ان کا تعلق مذکورہ بالا طبقے سے تھا۔ وہ ایک نامور سرکردہ خاندان کی فرد تھیں اور اس کے بارے میں نہایت باریک بینی سے اپنے تجربات اور مشاہدات کو قلمبند کرتی رہیں۔ ان کا مشاہدہ بے حد وسیع رہا ہے۔ ان کا خمیر ادب کی سوندھی مٹی سے گندھا تھا۔ ادب ان کی غذا، ان کے خون میں شامل تھا۔

''آخر شب کے ہم سفر'' میں رنگ آمیز رومینس کی آنچ بھی ہے اور حقیقت کی دلگدازی بھی اپنے عروج پر ہے۔

مذکورہ ناول کا تانا بانا تحریک 1942ء کا دوران مطالبہ پاکستان، تقسیم ہند اور قیام بنگلہ دیش کے تناظر میں بنایا گیا ہے۔

قرۃ العین حیدر کا ادبی سطح پر برابر اعتراف کیا جاتا رہا ہے۔ اور جانے کب تک کیا جاتا رہے گا۔ وہ ایک عہد ساز ادیبہ تھیں۔ انہیں ادب کے مروجہ ناقدانہ پیمانے سے کبھی ناپا گیا ہے نہ ناپا جا سکتا ہے۔ وہ خود بیشک خاک ہو گئیں مگر ان کا نام تا ابد زندہ و تابندہ رہے گا۔ قرۃ العین حیدر ایسی ہر دلعزیز ادیبہ ہیں جن کے بارے میں ان کے قارئین نے ایسا سوچا بھی نہ تھا کہ وہ سفر آخرت پر روانہ ہوں گی۔

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

◆◆◆

پرتو روہیلہ کی "مشکلاتِ غالب"

حسین مجروح

قدرت اپنے معمولات سے انحراف کرتی ہے تو عجب دلبرانہ ستم ڈھاتی ہے۔ یوں نہ ہوتا تو کیا قاسم جان کا ۔۔۔ میرزا اسد اللہ خان ۔۔۔ قلموں سے جہل کرتا، علاؤ الدین بچے، پانچوں عیب شرعی، اپنے عہد کی ذہنیت سو برس پرے، یعنی اجتہادی دانش کو اپنے ہنر اور اپنی تخلیقی فکر کا وظیفہ خوار نہ کر پاتا۔ آخر کیا معاملہ ہے کہ سلوک و شہود کی گرہیں کھولنے والا اور ہر نئے تر ذوق میں نئے احساس کا پیوند لگانے والا، غالب اپنے عہد کو منکشف نہ ہوا لیکن اپنی طبعی موت کے بعد بجھتے ہوئے ہر دن کے ساتھ روشن تر ہوا جاتا ہے۔

دراصل غالب کی مشکلات، اس کے مخاطب کی مشکلات سے کہیں سوا تھیں۔ آپ نے غور فرمایا میں نے قاری کی جگہ "مخاطب" کی مشکلات کو مذکور کیا ہے۔ وہ اس لیے کہ غالب، قاری پر قناعت کرنے والا اور اسے شناخت کا محور بنانے والا شاعر ہے ہی نہیں۔ اس کے مقابل کو زمانہ اور کائنات ہیں۔ ہر لحظہ تخلیقی اور ہر آن پھیلتی کائنات۔ اس کا میڈیم تنگنائے غزل تھی جس میں نئی شعری حسیات اور نئے خیالات کا بار اٹھانے کی ذمہ داری قدرت نے اس صدی ؟؟ اور گستاخی کو سونپ دی تھی۔

غالب کی مشکلات، ذاتی ہوں کہ شعری، اس کی تقویمی عمر کا اندوختہ تھیں لیکن اس کے قاری اور مخاطب کی مشکلات وہاں سے آغاز ہوئیں جہاں موت، غالب پر آسان ہوئی۔ غالب تو نامانوس و مخصوص کی شاعری فرما کر موجودے سبکدوش ہوا لیکن اردو غزل کا قاری پھنس گیا۔ روایتی غزل نے تو اظہار کے چاروں اطراف درسیت اور دل پذیری کی دیواریں کھڑی رکھی تھیں۔ کوئی روزن تھا نہ روشن دان۔ اوپر کا آسمان بھی صنائع بدائع کی گرد سے ڈھکا ہوا۔ ایسے میں شارحین کی بن آئی۔ تاہم بیشتر شارحین وہ مقدرین کا شعری "استحسان" اور ذہنی ارتقا، اس لپک سے عاری تھے جو غالب ایسے عبقری کی وژن اور اظہار سے خاص تھی۔ چنانچہ تشریح و تفہیم کے نام پر ایسی دور از کار موشگافیاں، غالبیات کے ہاتھ کا کھلونا بنیں کہ غالب زندہ ہوتے تو جنت عزت کی تلاش کرتے۔ (یہ الگ بات کہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے بچنے کیلئے غالب مقبرے کی ساعت کے دوران بھی ان "شارحین" سے ملک عدم کر لیتے)۔

قاری آپ کی نسل تک آتے آتے تفہیم غالب کے باب میں ایک گروہ اور پیدا ہو گیا (گویا ان کی مشکل پسندی اور شعری نامانوسیت قاری کی مشکلات کو کم نہیں کرتی تھیں)۔ فارسی دانی اور فارسی خوانی کی وہ طرح جو غالب کے زمانے اور ماحول کا روزمرہ تھی، انگریزی عمل داری کے باعث کار فضول ٹھہری۔ ادھر غالب کی اردو شاعری میں فارسی تراکیب و "تجاوزات" کا وہ عالم کہ بسا اوقات ایک آدھ اردو لفظ کے سوا سب فارسی کہ غالب ہی کے الفاظ میں گویا اردو محض پاپوش تھی۔ اس پر ستم یہ کہ شعری مرکبات و تشکیلات اور جدید و فلسفیانہ مضامین کی برداشت کی بابت اردو کا دامن بھی ابھی کشادہ اور تربیت یافتہ بھی نہیں تھا۔ یوں غالبیات کے ذیل میں شرح کی طرح استوار ہوئی۔ اور ہم ایسے کم فہموں کو یہ توفیق ارزانی ہوئی کہ حضرت پرتو روہیلہ ایسے "عجیب الطرفین" عالمانہ تالیف "مشکلات غالب" کو مضمون

کریں۔

جہاں تک پرتو صاحب کے لئے میں نے ''عجیب الطرفین'' کا صیغہ استعمال کیا ہے تو محض عبارت آرائی مقصود نہیں۔ عجیب الطرفین تو وہ پیدا ہوتے ہیں لیکن عجیب الطرفین میں آدمی کا کیا کمال یہ تو قدرت کی عطا ہے جسے نواز دے۔ البتہ عجیب الطرفین کے سارے نمبر تو آدمی کو ملتے جاتے ہیں۔ ددھیال اتر پردیش کے تجارت دار، سسرال پختون خواہی نوابین، معاش افسر شاہی سے منسلک۔ صاحب کے مدارج میں درجہ اولی کو چھو لینے والے لیکن متقی ایسے کہ اکثر ایسے کماؤ محکمے میں ساری عمر بتا دینے کے باوصف ابھی تک سے اپنا اولا بنگلہ ہی لے آئے۔ وہ بے کے شاعر اور ایسے خود سند کے عالموں کو عاجز کریں۔ پشتو ان پر فریفتہ اور فارسی کے یہ شیفتہ اور شیفتہ بھی ایسے کہ اہل فارس بھی مداحی کریں۔ خوبصورت اتنے کہ قطار ہو جائیں۔ شفیق اس قدر کہ اگلی شرافت کے نمونے یاد آ گئیں۔ اب ایسے مختار علی خان کو عجیب الطرفین نہیں تو کیا کہیے گا۔

وہ بے غزل اور نظم کو ثروت مند کر چلے کے بعد پرتو صاحب نے ہمارے ہاں کی ایک معدوم ہوتی ہوئی ادبی اور تہذیبی روایت کو تازہ کیا ہے اور کیا عمدہ روایت ہے فارسی شعر و ادب کی روایت۔ غالب ہماری آپ کی طرح ان کا محبوب ہے لیکن ہم میں سے بیش تر کی محبت تالیاں بجانے والے تماشائی کی سی ہے جبکہ پرتو صاحب کی غالب اور فارسی سے محبت اس مرد کار کی محبت ہے جو بارش سے بھیگے ہوئے میدان کو کھیل کے لائق بناتا ہے۔ ''مشکلات غالب'' کو ہی لیجیے۔ آسان اور چالو نسخہ تو یہ تھا کہ پرتو صاحب مشکل اشعار کی سیدھے سبھاؤ نثر کر دیتے، زیادہ تردد کرتے تو انہی اشعار کی خلاصہ نما تشریح کتاب کی مشتری میں پیش فرما دیتے۔ یوں چونکہ گنتی نے چاکری اور رنگ بھی چوکھا آتا لیکن سہل اور سیدھا کام روہیلوں کو راس نہیں آتا۔ معاملہ شاہ و تیموری کی آنکھیں نکالنے کا ہو یا شعر غالب کی آنکھ سے سرمہ چرانے کا؟ روہیلوں کی دقت پسندی آگہی سے خاص ہے۔

سو خوبیوں کی ایک خوبی اس کتاب میں یہ ہے کہ غالب سے حد درجہ محبت رکھنے کے باوصف پرتو صاحب کسی مقام پر نہ صرف یہ کہ مرعوبیت کا شکار نہیں ہوئے بلکہ جہاں تہاں بن پڑا ستائش کے پہلو بہ پہلو بعض اشعار میں اپنے ممدوح کے شعری اشکالات حتی کہ سطحیت تک کی نشاندہی سے بھی پہلو تہی نہیں کی۔ بانگی ملاحظہ ہو: ''مصرع خانۂ عاشق مگر ساز صدائے آب تھا'' کی بابت جناب پرتو لکھتے ہیں کہ شعر میں سیلاب اور آب، آہنگ، صدا، ساز کی رعایتوں کے علاوہ اور کوئی خاص مضمون نہیں۔ سیلاب کی رعایت سے خانۂ عاشق کو جل ترنگ بنانا محض مضمون آفرینی کی بے معنی کوشش ہے۔ یا پھر مصرع ''اڑنے سے پیش تر بھی مرا رنگ زرد تھا'' کی شرح کرتے ہوئے یوں گرفت کرتے ہیں:

''اس ابہام نے نفس مضمون میں جو خلل پیدا کر دیا ہے یعنی اڑنے سے پہلے رنگ زرد تھا، کی صورت زائل نہیں ہوتا۔''

مصرع ''شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا'' کی بابت یوں رائے زنی کرتے ہیں ''حسب معمول پورا شعر رعایت لفظی کا تانا بانا ہے۔ سو رعایت پسندی کے اس گورکھ دھندے سے صرف ایک بے جان سا مضمون برآمد ہوتا ہے۔'' غالب ہی کے ذیل میں ایک سخن گسترانہ اس نوع کا بھی اس کتاب کو زیب ہے۔ ''غالب کے تین چوتھائی اشعار میں مبالغہ، اغراق کی منزلوں پر نظر آتا ہے۔''

اس کتاب کا ایک اختصاص اس کا شرحی طریق کار ہے۔ سب سے پہلے تو انہوں (پرتو روہیلہ) نے ہر منتخب شعر کو سادہ لفظوں

میں منتج کیا ہے۔ پھر اس شعر کی تشریح کے ضمن میں "معاصر و سابق شارحین" کے اتفاق سے استفادہ و تقابل کرتے ہوئے اپنے آزادانہ تنقیدی ذہن کو استعمال کیا ہے۔ چنانچہ کسی ایک شعر کی بابت وہ طباطبائی کی تاویل پر صاد کرتے ہیں تو اگلے ہی شعر میں طباطبائی کی نسبت اثر لکھنوی کی رائے کو زیادہ موثر گردانتے ہیں۔ بعض اشعار کی ذیل میں یوں بھی ہوا ہے کہ انہوں نے جزوی طور پر یا کلیتاً جملہ شارحین کی بدمذاقی اور دور افتادگی کو ناقابل اعتنا سمجھتے ہوئے اپنی آزادانہ رائے یا تشریح کو ترجیح دی ہے۔ ادب کے ایک سچے طالب علم اور نقاد کا علمی منہاج بقول ارسطو اس امر کا متقاضی ہے کہ "دلیل مجھے جس طرف لے جائے گی، میں ادھر چلا جاؤں گا۔"

زیر نظر کتاب کا ایک روشن پہلو اس کا علمی سبھاؤ اور اس کی زبان ہے۔ چونکہ پرتو صاحب کا فارسی شعریات سے بھی گہرا علاقہ ہے لہٰذا اس کتاب میں جا بجا فارسی شعراء کے ہم مضمون یا ہم کیفیت اشعار بھی مذکور ہیں جن سے کتاب کی علمی ثقاہت میں خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے اور جن کی قرأت سے ہم پر کھلتا ہے کہ غالب کے بعض اشعار، جو ہماری ستائش کو یا افراط عزیز ہیں، دراصل بیدل یا نظیری کی دین ہیں۔ اس میں غالب کی سبکی کا کوئی پہلو ہرگز نہیں کہ اس اقلیم میں تو بسا اوقات محض انداز بیاں تبدیل ہو جانے سے شعر تازہ ہو جاتا ہے۔ رہا اس کتاب کی زبان کا معاملہ تو اس حقیقت سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ہے اور غزل کی مشق سخن، شاعر کے اظہار میں خاص طرح کی ملاحت اور دل پذیری آفرینش کرتی ہے اور یہ سے مؤلف و شارح فارسی ادبیات و شعریات کا شناور بھی ہو تو سبحان اللہ۔ سو اس زبان کی بظاہر اشتقاق تکلف در حقیقت جو بڑی خاصیت اس کی زباں ہے۔ صفحوں کے صفحے پڑھ جائیے، مجال ہے کہ تھکان یا بوریت کا احساس ہو۔ یہ خوبی تشریح و تنقید (وہ بھی غالب کی) ایسی تر کتابوں میں عنقا ہوتی ہے لیکن پرتو صاحب کی تخلیقی اور رواں نثر نے اس ہفت خواں کو قاری کے لئے "فالودہ" کر دیا ہے۔

محاسن "مشکلات غالب" کا ایک نمایاں تر زاویہ مؤلف کا متوازن انتخابی رویہ ہے۔ پرتو صاحب اس ضمن میں کسی انتہا سے کام نہیں لیتے کہ وہ غالب کے مداح ہی نہیں عاشق بھی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ ادب کے ایک زیرک و دیانت دار پارکھ بھی ہیں۔ سو اس کتاب کی تحریر و تشکیل میں انہوں نے دو متوازی دھاروں کو ایک ہی دریا کا پانی بنانے میں کمال ہنر مندی کا ثبوت دیا ہے اور تخلیقی یا استرادی انجادوں سے گریز کرتے ہوئے اپنی طالب علمانہ فکر کو بہر طور تقدیم کیا ہے۔ آپ ان کی اختیار کردہ تشریحات و آراء سے اختلاف کر سکتے ہیں (کئی مقامات پر راقم کو بھی ہے) لیکن اس امر کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ غالب سے حد درجہ عقیدت رکھنے کے باوصف ایسے مرید ہرگز نہیں جو ہر شعری ذائقوں میں پڑی جوؤں کو عقیدت مند مریدیاں کیے جانے پر اصرار کرتا ہو۔

مبارک ملامت کے اس شور میں، چند ایک حرف و سپاس بھی یہاں تحریر میں آ جائیں تو مضائقہ نہیں۔ بعض مشکل اشعار کی تشریح میں پرتو صاحب، کیفیت و مزاج شعر سے اس درجہ سرسری گزرے ہیں کہ میر صاحب بھی جہان سے کیا گزرے ہوں گے مثلاً

ع بس کہ غالب ہوں اسیری میں بھی آتش زیر پا

ایسے شعر کو سرکاری کام کی طرح نپٹا دیا گیا ہے۔ ہم ولاۃ اور کارروائی ڈالنے کے انداز میں۔ جو اس شعر کی معنی آفرینی اور مضمون سے تغافل کے مترادف ہے۔ جبکہ

ع "محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا"

جیسے تیز تاکم وبیش شعر کی تشریح و تاویل میں، صفحوں کے صفحے، رو سیاہ کیے گئے ہیں۔ اسی طرح یہ ’’جلوہ از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے‘‘ والے شعر میں انہوں نے چشتی، مہر اور نیاز کی اختلافی آرا پر ہی انحصار کیا ہے حالانکہ اصول شرح کے موجب اگر سابقوں میں تضاد والے بہتر موثر کوائف رائے یا استخراج سے قاری کو لازماً آگاہ کرنا چاہیے۔ اسی کتاب میں پرتو صاحب نے تین چار جگہ بعض شارحین غالب کے اجتماع کو ولادت سے نسبت دی ہے جو غیر فصیح ہی نہیں نامناسب بھی ہے کہ لفظ ’’تولد‘‘ اساسی طور پر تفکر کا استعارہ ہے اور سازش کو مترشح کرتا ہے۔ اسی طرح یہ ’’عدم سے بے دلالہ چاہیے ذری بے وفائی کا‘‘ والے شعر کی نسبت یہ قول صادر کرنا کہ ’’یہ شعر غالب کی فضولیات کی باقیات میں سے ہے‘‘ ’’یاس یگانہ‘‘ کی چنگیزیت کو تو روا ہو سکتا ہے، پرتو روہیلہ کی متانت علمی کو نہیں۔

مذکورہ بالا شرحی اور انحصاری تسامحات سے قطع نظر ’’مشکلات غالب‘‘ غالبیات کے پہلے سے موجود وسیع ذخیرے میں ایک انتہائی قابل ذکر اضافہ ہے۔ ایک ایسا اضافہ جو اپنا رکی چمک دمک اور امتیازی کو وسعت بخش کرتا ہے بلکہ آئندہ کام کرنے والوں کیلئے تازہ ہوا اور روشنی کو بھی بطریق احسن بہم کرتا ہے۔

●●●

معروف افسانہ نگار، شاعرہ سعدیہ سیٹھی کا نیا مجموعہ کلام

تنہائیاں

شائع ہو گیا ہے

ملنے کا پتہ: نستعلیق مطبوعات، F/3، الفیروز سنٹر، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور (فون: 0300-4489310)

معروف ادیب، شاعر، تنقید نگار امین راحت چغتائی کی تنقید، تخلیق اور مطالعہ پر مبنی کتاب

مراحل

شائع ہو گئی ہے

قیمت-/500 روپے

ملنے کا پتہ: گلریز فیز 5، ڈاک خانہ چک لالہ ایئر فیلڈ راولپنڈی (فون نمبر: 051-5509103)

شاہ دل شمس کے جو آنسو بہہ نہیں پاتے

نسیم سحر

نوجوان شاعر شاہ دل شمس کا پہلا مجموعہ کلام ملا۔ عموماً کسی نئے شاعر کی کتاب پڑھنے کے بارے میں میری قوتِ برداشت جلد جواب دے جاتی ہے خاص طور پر جب وہ اس کی پہلی کتاب ہو، چنانچہ اکثر شروع کی چند تخلیقات پڑھنے کے بعد کتاب کو پھر کسی وقت پڑھنے کے لئے شیلف میں رکھ دیتا ہوں، اور پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہیں رہتی۔

لیکن اسے شاہ دل شمس کی شاعری کا کمال ہی سمجھیے کہ میں نے ایک ہی نشست میں اس کی پوری کتاب پڑھی اور اکثر اشعار پڑھ کر میں چونکا بھی کہ ایک نیا شاعر اپنے ساتھ نئے موضوع اور نیا انداز بیان بھی لے کر آیا ہے، اور اس کے شعر صرف مشاعروں میں نہیں، کاغذ پر بھی زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کا عنوان میرے اس جذبے کی ترجمانی کرتا ہے کہ شاہ دل شمس کے جو آنسو بہہ نہیں پاتے وہ شعروں میں ڈھل جاتے ہیں، اور یہ تو آپ سب جانتے ہیں کہ آنسو تو پونچھے بھی جاتے ہیں، خشک بھی ہو جاتے ہیں مگر جو آنسو شعروں میں ڈھل جاتے ہیں وہ ہمیشہ تر و تازہ رہتے ہیں اور محض دو آنکھوں تک محدود نہیں رہتے۔ لکھنے والے کے آنسو، پڑھنے اور سننے والوں کی آنکھ سے بھی بہتے ہیں اور ان کے دل کی داستان بھی کہتے ہیں۔ یوں وہ شعر بھی زندہ رہتے ہیں اور اپنے تخلیق کار کو بھی زندہ رکھتے ہیں۔ میرے بہت پیارے دوست اور البیلے شاعر رانا مظفر آبادی نے شاہ دل شمس کی شاعری میں امید و امکانات کی نشاندہی کی ہے۔ شاہ دل شمس کی شاعری کا انداز تیز و شاداب خطۂ آغاز لیے کہ رانا مظفر آبادی کی پیشین گوئی یہ حقیقت نظر آتی ہے۔

فکر و خیال کی نعمتوں کے ساتھ جب جمالیاتی رنگ بھی شامل ہو جائے اور فنی چابکدستی بھی، تو انوکھے اور تخلیقی انداز کے شعر وجود میں آتے ہیں، اگرچہ بقول غالب "آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" مگر متاثر کن فن کے بغیر یہ خیال میں آئے ہوئے مضامین دوام نہیں پاتے۔ صنائع بدائع، تشبیہ، استعارہ، رمز و کنایہ، مضمون آفرینی، یہ تمام خصوصیات کسی کی شاعری میں نکھار پیدا کرتی ہیں۔ شاہ دل شمس کی شاعری میں یہ تمام خصوصیات کلی طور پر یا جزوی طور پر موجود ہیں۔

غم میں ترے کبھی کبھی روتے ہیں اہتمام سے — یوں بھی ہوا ہے بے سبب اور بے خبر بھی رو دیے
تا عمر رہے ڈوب گناہوں کے نشے میں — مرتے سے گنگا میں نہانے چلے آئے

شاہ دل شمس نے اپنے پیش لفظ میں کہا ہے کہ وہ زیادہ فکری، مزاحمتی اور فلسفیانہ شاعری کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کتاب میں جو رومانوی شاعری شامل ہے وہ ان کی نو عمری کی لکھی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ انہیں اپنی شاعری کو اپنے قدرتی بہاؤ سے زبردستی ہٹا کر دوسری طرف لے جانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، اور اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہیے کہ فکری، مزاحمتی اور فلسفیانہ شاعری میں بھی جب تک رومانوی اور جمالیاتی رنگ نہ ہو، اس میں نکھار، جاذبیت اور تاثیر پیدا نہیں ہوتی یعنی "مئے نہیں ہے یا وہ ساغر کے بغیر"۔ شعری زبان میں

جو کچھ کہا جاتا ہے اس میں "شعریت" تو ہے وہ اس سے اور "گر یہ نہیں تو بابا، پھر سب کہانیاں ہیں"۔ اس نے نظمیں بھی کہی ہیں اور طویل دو مختصر بحروں میں غزلیں بھی کہی ہیں جو اپنی جگہ اچھی ہیں۔ تاہم مجموعی طور پر میرا تاثر یہ ہے کہ چھوٹی بحر اس کا اختصاص ہے اور جب اس میں سہل ممتنع بھی شامل ہو جاتا ہے تو پھر کیا ہی کہنے۔ مختصر بحر اور سہل ممتنع میں کہے ہوئے اس کے چند شعر پیش کر کے میں اسے اپنا یہی رنگ اپنے جمالیاتی اور روحانوی رچاؤ کے ساتھ برقرار رکھنے کی دعا دیتا ہوں:

مجھ میں خود داری خاک آئے بھلا — حکمراں بھیک مانگتے ہیں مرے
اپنی قسمت ہی جل گئی گویا — ایک تصویر کے جلانے سے
کون سنتا ہے جو بھی کہہ لو تم — تن پہ کپڑے ہوں جب پرانے سے
یہ ہوا ہے کمال رونے سے — گھٹ گیا ہے ملال رونے سے
ہماری ناؤ بھی ہے — کنارے پہ نہ پانی پہ

◆◆◆

تبصرہ "تخلیق" پر ——— نسیم سحر

لاہور۔ "تخلیق" ادیب، شاعر اور صحافی اظہر جاوید مرحوم کی یہ خوبصورت نشانی ان کے انتقال کے بعد چند برسوں سے ان کے صاحبزادے سونان اظہر جاوید بڑی سعادت مندی کے ساتھ مسلسل پروان چڑھا رہے ہیں اور یکجان کی اپنی کاوش اور یکجا اظہر جاوید کے ساتھ دوستی کے ناطے تقریباً سبھی معروف ادیب اسی تواتر اور محبت کے ساتھ تخلیق میں لکھ رہے ہیں جیسا کہ وہ اظہر جاوید کی زندگی میں کیا کرتے تھے۔ تازہ شمارے میں سونان اظہر جاوید کا ایک بڑا دلیل افروز اداریہ "پہلی بات" شامل ہے جس میں موجودہ سیاسی صورت حال پر دکھ کا اظہار تو ہے مگر پاکستان کی بقا اور استحکام کے حوالے سے مایوسی نہیں۔ حمد و نعت میں امین راحت چغتائی، قیصر نجفی اور آصف ثاقب چھائے ہوئے ہیں۔ مضامین میں مغلوں کی تاریخ (امین راحت چغتائی) لاہور کے چند معروف قہوہ خانے (ڈاکٹر سجاد جعفری) اور ہندکو زبان کے صوفی شاعر احمد علی سائیں (ناصر علی سید) کا قابل ذکر ہیں۔ نظموں اور غزلوں میں ڈاکٹر ستیہ پال آنند، حسن عسکری کاظمی، کرامت بخاری، بشریٰ سرمدی، آصف ثاقب، خالد اقبال یاسر، شجاعت علی راہی، نرش کمار شاد، مظہر بخاری اور دیگر بہت سے شعراء کا کلام شامل ہے۔ افسانوں میں محمد طارق علی، علی اکبر ناطق، شیخ خالد، شبیر طراز اور اظہر جاوید مرحوم کے افسانے شامل ہیں۔ یادنگاری میں ڈاکٹر رشید امجد کی دلکش تحریر جبکہ سفرنامے میں سلمیٰ اعوان کے سفرنامے کی قسط شامل ہے۔ طنز و مزاح میں ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی اور ڈاکٹر محسن مگھیانہ کے جانے پہچانے اسماء شامل ہیں۔ جائزوں اور تبصروں میں مختلف کتابوں پر تبصرے شامل ہیں جبکہ انجمن خیال میں تقریباً 28 صفحات پر ادیبوں اور شاعروں نے گزشتہ شمارے پر اپنی آرا کا اظہار کیا ہے۔ پرچے کی قیمت 150 روپے ہے۔ رابطہ 03218899007۔

(بشکریہ روزنامہ "پاکستان" اسلام آباد—23 اکتوبر 2017ء)

تیری مُسکان سے دل دھوپ سے بھر جاتا ہے

ناصر علی سیّد

میں نے پہلی بار ان کا ایک افسانہ پڑھا جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا بس اتنا یاد ہے کہ اس افسانے کا نام شاید سہ یا چہار لفظی تھا اور اس میں ایک لفظ ''دھوپ'' تھا۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ اس افسانے کی کہانی کیا تھی، کیونکہ وہ افسانہ میری نظر سے دوبارہ نہیں گزرا۔ جس ادبی جریدہ میں شائع ہوا، عجیب بات مجھے اس کا نام بھی یاد نہیں کیونکہ وہ صرف دو ہفتوں تک میرے پاس رہا کہ سو صفحات پر پھیلا ہوا وہ افسانہ نمبر مجھے اپنے سکول کی لائبریری کو واپس کرنا تھا کہ اس سے زیادہ دن کوئی کتاب اپنے پاس نہیں رکھی جا سکتی تھی۔ میرے سکول میں عربی کا ٹیچر لائبریری انچارج تھا، جو مجھ سے از حد نالاں تھا کہ میں ایک تو اتنے کتابیں ایشو کروانے کی ''زحمت'' انہیں دیا کرتا تھا، خیر بات افسانے کی ہو رہی تھی، جس کی بہت سی باتیں میں بھول گیا تھا تاہم مجھے دو باتیں یاد رہ گئیں ایک تو افسانہ نگار کا نام کہ جو ''کشمیری لال ذاکر'' تھا اور دوسری بات اس افسانے کا آغاز جو کچھ یوں تھا، یا شاید جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا۔

''وہ ابھی ابھی میرے ہاتھوں کو بوسہ دے کر ریل میں سوار ہو کر واپس چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر تو میں ریلوے سٹیشن پر چپ چاپ کھڑی دور تک ریل کو دیکھتی رہی۔ دل بھر آیا تھا، اچانک میں نے اپنے ہاتھ کی پشت کو دیکھا اور جس جگہ اس نے بوسہ دیا تھا اس جگہ کو گیلا کر کے آہستہ سے پھونک ماری تو ٹھنڈک کی ایک لہر جیسے میرے پورے بدن میں پھیل گئی'' یہ پیراگراف اس لئے بھی یاد رہ گیا کہ میں نے اسے جب کئی بار پڑھا اور پھر اپنے ہاتھ کی پشت پر زبان پھیر کر پھونک مار کر اس ٹھنڈک کو انجوائے کرتا جو اس افسانے کے کردار نے محسوس کی تھی۔ سکول کے زمانے کو پیچھے چھوڑے اب ایک زمانہ ہو گیا۔ مگر اس افسانے نے میری ترجیحات میں کہانی کو ہمیشہ اوپر ہی رکھا۔ مگر پھر کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت چغتائی، انتظار حسین اور احمد ندیم قاسمی سمیت عمدہ اور معتبر افسانہ نگاروں کی ایک پوری کھیپ نے اپنے سحر میں جکڑ لیا، ما تو یہ ہمارے افسانے کے جھومر ستارے کہلائے جن کے پیچھے بہت سے اچھے اور عمدہ افسانہ نگار چھپ گئے، پھر افسانے نے گزرتے وقت کے ساتھ جہاں کئی چولے بدلے وہاں ہر زمانہ اپنے ساتھ اپنے ستارے بھی لے کر آیا۔ اس لئے کم کم کشمیری لال ذاکر کا خیال آیا جہاں جن دنوں وہ ہریانہ اردو اکیڈمی کے چیئرمین تھے، کبھی کبھی ان کی غزلیں پڑھنے کو مل جاتیں۔ اور اب تو بہت عرصے سے ان کے بارے میں کچھ سنا نہ پڑھا۔ یہ سب مجھے یوں یاد آیا کہ جب کچھ دن پیشتر سونان اظہر جاوید کی ادارت میں شائع ہونے والے خوبصورت ادبی جریدے ''ماہنامہ تخلیق'' لاہور کا تازہ شمارہ ملا اور فہرست پر نظر ڈالی تو دل دھک کر کے رہ گیا۔ فہرست میں یاد رفتگاں کے گوشہ میں سرفراز سید کا مضمون تھا ''کشمیری لال بھی چل بسے'' خیال گزرا کہ کوئی اور بھی ہو سکتے ہیں کہ فہرست میں ''ذاکر'' کا لفظ موجود نہ تھا جلدی سے صفحہ 92 نکالا وہاں عنوان پورا تھا۔ ان کے بچھڑنے کا دکھ اور بھی گہرا ہو گیا جب علم ہوا کہ ''کشمیری لال ذاکر 98 برس کی عمر میں گزشتہ سال 31 اگست کو بچھڑ گئے تھے۔

بریکنگ نیوز میں سانس لینے والے ہم کتنے بے خبر نکلے کہ ایک بڑے شاعر اور افسانہ نگار کے بچھڑنے کی خبر ہمیں ان کی پہلی برسی کے بھی بعد ملی۔ ماہنامہ تخلیق میں سرفراز سید کے مختصر مگر اجمالی اہم معلوماتی مضمون میں کشمیری لال ذاکر کے بہت سے خوبصورت اشعار بھی شامل ہیں۔

لوگ جیتے ہیں سو بہانوں سے ہم تیرا نام لے کے جیتے ہیں
اک نیا زخم دن کو ملتا ہے اک نیا زخم شب کو سیتے ہیں

سلطان اظہر جاوید نے تخلیق کے اس تازہ شمارے کا اداریہ بہت ہی دلسوزی سے لکھا ہے میں اس کے لکھے ہوئے اداریے ہمیشہ توجہ سے پڑھتا ہوں کیونکہ یہ بھاری ذمہ داری اس پر اچانک آ پڑی تھی جو اس نے محض اپنے ممتاز و معروف والد اظہر جاوید کی محبت میں قبول کی تھی اور خیال تھا کہ نوجوانوں کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں جلدی وہ اسے بند کر کے کسی کے حوالے کر کے کاروبار میں کھو جائے گا مگر بہر حال یہ سودا ہمیشہ سے خسارے کا رہا ہے مگر ہر نئے شمارے کی ساتھ سلطان اظہر جاوید کی دلچسپی تخلیق کے ہر صفحہ پر نظر آنے لگی اور یقین سا ہونے لگا کہ یہ ہونہار بروا اپنے والد کا مشن آگے بڑھائے گا۔ اب کے بھی اداریہ خاصے کی چیز ہے جتنا ارد گرد کی بے چینی اور اضطراب سے مملو ہو کر اس نے لکھا ہے۔ اس شمارے میں افسانوں کا انتخاب بھی لاجواب ہے خصوصاً علی اکبر ناطق، شبہ طراز، شیخ خالد اور اظہر جاوید کی کہانیاں چونکا دیتی ہیں۔ مضامین میں ڈاکٹر جواز جعفری کے مضمون لاہور کے چند معروف قہوہ خانے نے عجب لطف دیا۔ اب کے اس حصے میں تاریخ کا عمل دخل زیادہ رہا۔ بہت کچھ نیا پڑھنے کو مل سکتا ہے۔ ستیہ پال آنند کی بعض نظمیں تو میرے لئے ریت بن جاتی ہیں اور ان ملاقاتوں کی یاد دلاتی ہیں جب ٹولیڈو میں ڈاکٹر امجد حسین کے گھر ہم نے کئی شب و روز اکٹھے گزارے تھے۔ باقی نظمیں بھی عمدہ ہیں۔ غزلوں میں بھی عمدہ انتخاب کیا گیا ہے اور غزلوں میں ایک قطعہ بند طرحی غزل ''ستیہ پال آنند'' کی بھی ہے۔ ہے نا انوکھی بات! ستیہ جی یہ کیا؟ خیر مستقل سلسلے بھی خوب ہیں اور انجمن خیال میں تو احباب کے خطوط میں بحث مباحثہ اور تبصروں سے گھر آنگن میں احباب کی بیٹھک کا سا لطف آتا ہے۔ گلے شکوے بھی ہوتے ہیں اب کے ڈاکٹر محمد اقبال بھصام کے خط میں مزے کی باتیں ہیں۔ ''یہ نیا فرعون کا اکھاڑہ بن چکی ہے جہاں جادوئی سانپ رقص دیکھتے ہیں۔'' انہوں نے ادبی نشستوں کے بند ہونے کی شکایت کی ہے۔ ایسا اکثر سننے میں آتا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی منہ نہیں موڑا جا سکتا کہ ہر شہر میں یہ نشستیں ہوتی ہیں شاید کچھ دوست بوجوہ شریک نہ ہو سکتے ہوں۔ بہر حال تخلیق کا تازہ شمارہ اپنے خوبصورت سرورق کے ساتھ متقاضی ہے کہ اسے احباب اپنے قلی کتاب گھروں کے لئے حاصل کریں پونے دو سو صفحات پر مشتمل یہ اہم ادبی دستاویز صرف ڈیڑھ سو روپے کے عوض، فون نمبر 0321-8899007 پر مدیر ماہنامہ تخلیق لاہور سے رابطہ کر کے منگوایا جا سکتا ہے۔ بات دھوپ سے شروع ہوئی تھی تو تخلیق کے اس شمارے میں برف کی رتیں کے شاعر دوست عزیز شجاعت علی راہی کی غزل کے اس شعر کے ساتھ اجازت۔

اوڑھے رہتا ہے سدا برف کی چادر لیکن تیری مسکان سے دل دھوپ سے بھر جاتا ہے

◆◆◆

شاعرہ، مصورہ، ادیبہ پروین شیر کی چوتھی کتاب

بے کرانیاں

دو انعام یافتہ شعری مجموعے ''کرچیاں'' اور ''نہال دل پر سحاب جیسے'' ایک تخلیقی سفرنامہ ''چند سیپیاں سمندروں سے'' (تینوں دو لسانی ۔۔۔ اردو، انگریزی مصوری کے ساتھ) کے بعد بے کرانیاں ۔۔۔ دو لسانی مصور نظموں کا مجموعہ جلد شائع ہونے والا ہے

'تخلیق' شمارہ نمبر 9 کی غزلیات کا عروضی تجزیہ

ایم ڈی ملک

اس شمارے میں کل 30 غزلیات شامل ہیں۔ ان سب غزلیات کے تمام شعروں کو بحرنما (Behar Numa) پر تقطیع کے ذریعے پرکھ کر جو نتائج اخذ کیے گئے ان کی مکمل تقطیع دکھانے کی بجائے یہاں جگہ کی کمی کے باعث ہر غزل کے صرف پہلے شعر کے پہلے مصرعے کی تقطیع کے عروضی تجزیے کا رزلٹ ہی دکھایا جا رہا ہے۔ غزل کے باقی اشعار کے ہر ہر مصرعے کو بالکل اسی طرح بحرنما پر پرکھا جا سکتا ہے۔ 28 غزلیں عروضی لحاظ سے بالکل درست ہیں۔ غزل نمبر 26.24.23.21.16.11.10.7 سے متعلق کچھ observations ان کے نوٹ میں موجود ہیں۔

نمبر شمار	شاعر کا نام	غزل کے پہلے شعر کا پہلا مصرع اور (تقطیع)	بحر کا نام اور (ارکانِ بحر)	بحرنما کا میرٹیل نمبر
1-	ستیہ پال آنند	ہے یہ بے شخص انسانی جسم کیا (وہ یہ بے ش خص ان سا نی ج سم کا)	بحر ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن)	11/15
2-	آصف ثاقب	جانے کیوں کھلی ہی رہتی آنکھیں ہیں (جان کو یہ ل اس ر ہ تے ان کہے)	بحر رمل مسدس سالم (فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن)	3/3
3-	خالد اقبال یاسر	یہ بھی آ جا ... رہا ہوں میں یہ بی آ ج ر ق کا ہد ے	بحر متقارب مثمن محذوف بے ماقف محذوف مسکن (فعلن فعولن فعولن فع)	1/48
4-	سرفراز سید	وہ جن کے چہرے دھواں دھواں تھے وہ لوگ تم وال کے تھے وہ جن کے چہ رے دھا واں تھے وہ لوگ شہ رے م وال کے تے	بحر متقارب سولہ رکنی مقبوض اثلم (فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن فعول فعلن)	1/95
5-	حمیدہ شاہین	آپ کے در سے تو لگے ہم تو آ پ کے در س آ ل گے ہم تو	بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مسکن (فاعلاتن مفاعلن فعلن)	18/25
6-	ڈاکٹر ایوب ندیم	ہمارے حوصلوں تک آ گیا ہے ہما رے حو صلوں تک آ گ یا ہے	بحر ہزج مسدس محذوف مفاعیلن مفاعیلن فعولن	11/15
7-	حسینی سرنجی (الطبع)	جب ہارا نصیب ہو ہر کمال سے جب ہا ر ن ص ب ہو ہ ر ک م ل ل سے	بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن)	19/17

نوٹ: غزل کا مصرع نمبر 8 کوشش کے باوجود اس فورم میں حل نہ ہو سکا

8۔	کرشن کمار طور (انڈیا)	جدا اپنے آپ سے کچھ کم رہا ہو ن پ ے ا پ سے کچ کم ر ہا ہو	بحر ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن)	11/15
9۔	عراق مرزا (انڈیا)	نکل پڑا ہوں زمیں کے نگار خانوں سے ن کل پ ڑا ہ و ز می ک ے ن گا ر خا نو سے	بحر مجتث مثمن مخبون محذوف مقطوع (مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن)	21/14
10۔	نسیم سحر	میرے وجدان کے نوادرہ تحیر جاگے ے ر وج دا ان ک نا دی ر ت ح ی ر جا گے	بحر رمل مثمن مخبون محذوف مسکن (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن)	13/41
11۔	مرزا احمد نور طاہر	جل اٹھا آس کی خوشبو کا دیا آج کی شام جل ا ٹ ھا آ س کی خ و ش ب و ک دیا آ ج کی شام	بحر رمل مثمن مخبون مقصور (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلان)	13/41
نوٹ: غزل کے مصرع نمبر 2 میں الو کے اور ہجر کے درمیان لفظ لایا (ا ے) کم ہے یہ کمپوزنگ کی وجہ سے شائع رہ گیا ہو				
12۔	مظہر بخاری	رنج و غم سے دیدہ نمناک سے رن ج غم سے دی د ے نم نا ک سے	بحر رمل مسدس محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن)	13/13
13۔	ناصر علی سید	آپ کیا جانا کہ مجھے وہم و گماں کھینچتا ہے آپ ک یا جا نا ک م ج ھے وہ م گ ما ک ھی چ تا ہے	بحر رمل مثمن مخبون محذوف (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن)	13/40
14۔	شجاعت علی راہی	مجھے کیا جانا ہے کدھر اور کدھر جاتا ہے مج ک جا نا ہ ک د ھر او ر ک د ھر جا تا ہے	بحر رمل مثمن مخبون محذوف مسکن (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن)	13/41
15۔	اسلم سحاب ہاشمی	قافلہ ہے گرد صحرا میں نہاں قا فل ہے گ ر د ص ح را مے ن ہا	بحر رمل مسدس محذوف (فاعلاتن فاعلاتن فاعلن)	13/13
16۔	طاہر منظور	سفر در پیش ہے بس اب چلیں گے س ف ر د ر پے ش ہے بس اب چ لے گے	بحر ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن)	11/15
نوٹ: غزل کے مصرع نمبر 13 میں سے اور میرا کے درمیان لفظ (یہ) کم ہے یا کمپوزنگ کی وجہ سے شائع رہ گیا ہو				
17۔	ثمر راہی تشنہ	آخری عمر کی چاہت مجھے واپس کر دو آ خ ری ع م ر ک چا ہ ت م ج ھ وا پس کر دو	بحر رمل مثمن مخبون محذوف مسکن (فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن)	13/41
18۔	تہمینہ راؤ	محبت کا قلعہ تو پہ نظر آتا ہے باہر سے م حب بت کا ق ل ع تو پ ن ظ ر آ تا ہ با ہ ر سے	بحر ہزج مثمن سالم (مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن)	11/1
19۔	آسنا محمد کنول	دو لہروں میں روانی کا تماشا ہے و ل رو سے ر وا نی کا ت ما شا ہے	بحر ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن)	11/15
20۔	سعدیہ سلیمی (انڈیا)	عشق دریچہ عشق ہوا عش ق د ری چ ہ عش ق ہ وا	بحر متقارب مثمن محذوف بے لا حذف مسکن (فعلن فعولن فعلن فعل)	1/47

-21	ضیاء اللہ فہیم	منصب ملا تو ہجر کے سائے میں ڈھل گیا من صب م لا تو ہج ر کے سا ئے م ڈھل گ یا	بحر مضارع مثمن اخرب مکفوف محذوف (مفعول فاعلات مفاعیل فاعلن)	19/17
-22	عاصم بخاری	یہ اس دل برباد و ویراں ہے ب اس دل ر با د و ی را ہے	بحر ہزج مسدس محذوف (مفاعیلن مفاعیلن فعولن)	11/15
-23	انور جاوید ہاشمی	پیش تصویر پر گفتار آئینے پہ ہے پے ش ت صو ر پر گف تا ر آ ئی نے ہے	بحر متقارب یا دو رکنی محذوف یا زحافات محذوف / مسکن (فعلن فعولن فعلن فعلن فعلن فع)	1/78
-24	ضیاء اللہ طاہر	علاج دل بیمار کیا کرتے ع لا ج دل بی ما ر کا کر تے	بحر ہزج مسدس مکفوف محذوف (مفاعیل مفاعیل فعولن)	11/65
-25	آفتاب خان	جو درمیاں ہے وہ کدورت ہٹا کے دیکھ مجھے ج در م یا ہ و ک دو رت ہ ٹا ک دے ک م جھے	بحر مجتث مثمن مخبون محذوف (مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن)	21/13
-26	ڈاکٹر محمد شاہین محسن	جو ہم تھے کبھی کی لکیروں میں بھی تھا جو ہم و تے کی ک ل کی روں م بھی تھا	بحر ہزج مثمن اخرب مکفوف محذوف (مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن)	11/61
نوٹ: غزل کے مصرع نمبر 8 میں جو ایک تجویز کے الفاظ میں شاید کوئی کمپوزنگ کی غلطی ہو				
-27	شاذیہ مفتی	دل کا غم تو کھلا نہیں لگتی دل ک غم تو ک لا ن ہی لگ تی	بحر خفیف مسدس مخبون محذوف مسکن (فاعلاتن مفاعلن فعلن)	18/25
-28	گرشن پرویز (انڈیا)	دنیا تجھ سے جدا ہی انسان بیک رہا ہے دن یا ت جھ سے ج دا ہی ان سان بیک رہا ہے	بحر مضارع مثمن اخرب	19/2
-29	پروفیسر فرخ محمود	اب کہاں لوگ بلانے والے اب ک ہا لو گ ب لا نے وا لے	بحر رمل مسدس مخبون محذوف مسکن (فاعلاتن فعلاتن فعلن)	13/49
-30	اسعد رضا اکبر	مجھ کو اب وصل بھی نہیں درکار مج ک اب وص ل بی ن ہی در کار	بحر خفیف مسدس مخبون مقصور مسکن (فاعلاتن مفاعلن فعلان)	18/25

شاعر یا قاری اگر خود کسی غزل کو پرکھنا چاہیں تو پلے سٹور پر انگریزی میں Behar Numa لکھ کر اس ایپ "بحر نما" کو تلاش کریں اور استعمال کرنے سے پہلے ہدایات کو غور سے پڑھیں۔

(نوٹ: قارئین کو حق ہے کہ وہ اس تجزیے پر اپنی رائے کا اظہار کھل کر مجلس خیال میں خط لکھ کر کر سکتے ہیں۔ ادارہ "تخلیق")

◆◆◆

مرد بھی کیا عجیب شے ہے، بیوی میں طوائف جیسی ادائیں اور طوائف میں بیوی جیسی وفاداری تلاش کرتا ہے۔
(سعادت حسن منٹو)

تبت سنو
جب بات ہو خوبصورت جلد کی
... تو پھر سوچنا کیسا!
تبت سنو کا روزانہ استعمال
Tibet
تبت سنو - ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم
TS45/2K14

پنجاب رنگ

سلیم شہزاد

نظم

آ وے سوہنا
زلف تیری دا
بدل گج کے
صدق عشق دا
کردا مجرے
[illegible]
[illegible]

نظم

[illegible]
لیکھے لکھے
چوڑی [illegible] ہووے
چوڑی [illegible]
چوساں چنگے
لیکھا لکھ ہووے

اک مکوڑے دی سدھر

کرنی دا کوئی پاسا ہووے
رزق مکوڑے کھاون
کھاون کھاون
تھکے ہو کے
کرنی دے بہہ جاون

○○○

حسین مجروح

فرشتیاں دی مکسوٹ

ہر شے وکدی اے
[illegible]
[illegible]
[illegible]
"[illegible]"
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
ہر شے وکدی اے

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

○○○

ڈاکٹر محسن مگھیانہ

O

ایسے لوگ وی ہوندے نیں
ٹُٹ کے پیار وی روندے نیں

ہوتی اکھیں خواب بھرے نیں
اُجڑ اُدھڑوں پلدے نیں

ملّاں ورگے اُچے جبیاں دے
چار بگولے اُٹھدے ہوندے نیں

تھلوں اُٹھاہرے کھٹدے آکھن
قورے کی کجھ بولدے نیں

وچ طوفاناں جھلا کھل چلائے
اج وی یار وی ہوندے نیں

محسن میرے اتھے تیرے
من دی گنگی دھوندے نیں

OOO

طاہرہ سرا

O

ہس ہس آکھن کوئیں پالے اکھاں نوں
لگ جاون تے کون سنبھالے اکھاں نوں

قورے کی رکھیا اے اوہدے چیتے وچ
دل ہووے تے اکھراں والے اکھاں نوں

پھلوں اکھاں ہون حوالے اکھاں دے
ویکھوں اکھاں وین حوالے اکھاں نوں

جین اکھاں، اکھاں وچ گھر گیا
ایویں تے کجھ ملے اجالے اکھاں نوں

سارے نقشے سر تے کول ہو گئے نیں
اکھاں ہی لگے روگ پالے اکھاں نوں

طاہرہ کالی اکھیں وسدے رہندے نیں
منظر ہووے ویکھے بھالے اکھاں نوں

OOO

ضیاء اللہ طاہر

O

میرے دل تے جید وسا اے
اجڑی وستی پھیر وسا اے

رو میں تے تھک گیا ہاں
میتوں وی کوئی راہ دکھا اے

یار تیرے دا ورثی گرد
[illegible] لبھے تے میں بچا اے

راہواں تکیاں، رہبر کوئی ناں
اکھیں وچ کوئی سرمہ پا اے

جھولی میری اے خالم خالی
تے دا کوئی صدقہ پا اے

طاہر بھیا نظم کا وچ صحراواں
عشقی اوہدی تتّی بیٹے لا اے

OOO

تبصرے قیصر نجفی کے

ہمارا ابد معاشی کا نظام

مصنف : نجم الحسن رضوی

صفحات: 216 قیمت: 500 روپے پبلشر: رب پبلشرز (10 مبر یزیں اسٹریٹ، 6 بانس روڈ کراچی

کہتے ہیں حسِ مزاح دانش مندی کی علامت ہے۔ فی الوقت ہمارے آگے یہ نادر حس / جس شخصیت کی دانش مندی کی چغلی کھاتی نظر آتی ہے، وہ نجم الحسن رضوی ہیں۔ جن کے تخلیقی شعبے میں افسانہ اور ناول کے ساتھ طنز و مزاح کا اندراج دیکھ کر ہم قدرے ٹھٹکے تھے، کیونکہ وہ ہمارے نزدیک ناول سے شعبہ کی جیسی رہے، اور اب ان کی طنز و مزاح سے معمور کتاب ''ہمارا ابد معاشی کا نظام'' نظروں سے گزری ع آئے تیرے میرے بیچ پیار اک دیا سے یا ہے! اردو ادب طنز و مزاح کے حوالے سے تہی دامن تو نہیں کم مایہ ضرور ہے۔ مزاحیہ ادب کی تاریخ چند ناموں میں سمٹ کر رہ گئی ہے۔ اس ناقابلِ رشک صورتِ حال (بلکہ کہئے المیہ) میں اردو افسانہ اور ناول کا ایک مشہور طنز و مزاح نگاروں کے کارواں میں اپنے تمام تر تخلیقی طمطراق کے ساتھ نظر آجائے تو ڈھارس بندھانے کے لئے کافی ہے۔ اس موقع پر ہم نجم الحسن رضوی کے افسانہ اور ناول پر اظہارِ خیال سے گریز کرتے ہیں کہ یہاں ہمارے پیشِ نظر صرف ان کی مزاح نگاری ہے۔ تاہم ان کے ان تخلیقی شعبوں سے صرفِ نظر بھی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان کی افسانہ نگاری پر شیخ محمد علی کی مختصر و جامع رائے سے دو ایک جملے پیش ہیں۔

> ''وہ ہیئت اور اسلوب کے نئے نئے تجربات کے قائل ہیں، مگر بیرنگی ہیئت اور تازہ اسلوب گنجینۂ معنی کا طلسم اور ترسیلِ معنی کا اہم ہے۔ جدتِ طبع اور سلاست اظہار ان کے یہاں سوتیلی نہیں زندہ ہیں۔ خیال انگیزی اور معنی آفرینی کی دھن میں وہ یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرتے کہ وہ کہانی کہہ رہے ہیں۔''

نجم الحسن رضوی اردو کے معدودے چند ممتاز مزاح نگاروں کے درمیان اپنے پورے قد کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ بالخصوص مستقل اور مقبول پیروڈی نویسوں کا انہیں اہم پلہ قرار دینے میں ناقدین نے ہرگز تامل سے کام نہیں لیا۔ بلاشبہ رضوی صاحب کا مضمون ''ہمارا ابد معاشی کا نظام'' طنز و مزاح کا ایک شاہکار ہے۔ جو شگفتہ نگاری کا صاف ستھرا اور طنز تخلیقی اجابت کا خوشگوار لباس پہنے ہوا ہے۔ نجم الحسن رضوی کے مزاح میں لفظیات کا اساسی کردار ہے۔ ان کا تو ہر مزاح لفظوں کی بیچوں میں نمو پاتا ہے ''سرگزشت'' کے نام سے ان کی تحریروں سے بھی آسانی سے نہیں گزرا جا سکتا۔ ''سرگزشت'' کے مشمولات بعض حوالوں سے دستاویزی اہمیت کی حامل ہیں۔

بیتے کل کا اک اک پل (جلد اول)

مصنف : نذیر فتح پوری (انڈیا)

صفحات: 194 قیمت: 200 روپے پبلشر: اسباق پبلی کیشنز

کسی بھی زبان کے کثیر الجہات قلمکار معدودے چند ہوتے ہیں۔ اردو زبان بھی اس حوالے سے استثنا نہیں۔ اردو کے کثیر الجہات قلم کاروں میں شامل ایک نام نذیر فتح پوری کا ہے۔ جن کی ہمہ گیر تخلیقی توانائی متحیر کن ہے۔ اسے جناتی قوت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نذیر فتح پوری سے ہماری پرانی یاد اللہ ہے۔ ہم ایک زمانے سے ان کی متنوع تخلیقات کی ادبی قدر و قیمت کے قائل ہیں اور انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن آج ان کی خودنوشت "بیتے کل کا اک اک پل۔ جلد اول" نے ہمیں ان کے مداحین میں شامل کر دیا ہے۔ سوانح نگاری ایک مشکل لیکن خودنوشت مشکل ترین فن ہے۔ اس فن کی اساس اخلاص نیت اور صداقت بیان پر رکھی گئی ہے اور یہ دونوں اوصاف فی زمانہ ناپید نہیں تو کم یاب ضرور ہیں۔ "بیتے کل کا اک اک پل۔ جلد اول" نے ہم سے جس نذیر فتح پوری کا تعارف کرایا ہے وہ ایک نیک طینت، شریف النفس، راست باز، مخلص اور منکسر المزاج انسان ہے۔ ہر کس و ناکس سے محبت کرتا ہے۔ عزت نفس پر آنچ نہیں آنے دیتا اور اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کا ہرگز روادار نہیں۔ اس کی نمایاں شخصی وصف صلہ رحمی ہے۔ شاید یہی وہ وصف ہے جس نے بچپن کی ان شفیق ہستیوں کی یادوں کو طاق نسیاں نہیں ہونے دیا جن کی آغوش محبت کا گہوارا آج بھی اپنے حصار میں لئے ہوئے ہے اور وہ ماضی کی بھول بھلیوں میں دیوانہ وار انہیں ڈھونڈا کرتا ہے۔ "بیتے کل کا اک اک پل۔ جلد اول" ایک خودنوشت ہے جو نذیر فتح پوری کے عہد طفلی کا احاطہ کرتی ہے۔ ایک تو یہ اسم با مسمٰی ہے کہ اس میں واقعتاً ان کے بچپن کا ایک ایک پل جیتا لگتا ہے۔ دوسرے یہ صرف نذیر کا نہیں ان کے وطن مالوف کا بھی بیتا کل ہے۔ جس کی معاشرت کے تمام تر رنگ سمٹ کر سامنے آگئے ہیں۔ خودنوشت جہاں اخلاص نیت اور صداقت بیان کا تقاضا کرتی ہے، وہاں پیرایہ اظہار کے دلچسپ ہونے کی بھی متقاضی ہے۔ "بیتے کل کا اک اک پل۔ جلد اول" ہر دو مطالبات پر پوری اترتی ہے۔

آسمان میری مٹھی میں

مصنف : وحشی سعید (انڈیا)

صفحات: 194 قیمت: 500 روپے پبلشر: تحریک ادب

وحشی سعید کے افسانوی مجموعے "آسمان میری مٹھی میں" کے بارے میں ہمارا پہلا تاثر یہ ہے کہ یہ مجموعہ اسم با مسمٰی ہے۔ بیشک اردو افسانے کا آسمان سمٹ کر وحشی سعید کی مٹھی میں آگیا ہے۔ یہ مجموعہ اس اعتبار سے بھی منفرد قرار پاتا ہے کہ اس میں شامل ہر افسانے کا

ایک مطالعاتی تجزیہ بھی شامل اشاعت ہے۔ قبل ازیں ہمارے مطالعے میں صرف ایک کتاب ''ستیہ پال آنند کی تیس نظمیں'' آئی ہے جس کی ہر نظم ایک تنقیدی جائزے کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ وحشی سعید کے افسانوں کے تجزیہ کاروں میں دو ایک بڑے لکھاریوں کے نام بھی شامل ہیں، جو ہمارے نزدیک وحشی سعید کی افسانہ نگاری پر سندی حیثیت رکھتے ہیں — وحشی سعید روایتی اور علامتی ہر دو اصناف افسانہ کی مسند بلند پر متمکن ہیں۔ انہیں روایت کے ساتھ ساتھ تجرید و علامت کا بھی مکمل شعور ہے۔ جس کا مظاہرہ انہوں نے متنوع اسلوبیاتی قرینوں سے کیا ہے اور یہی متنوع ان کا فنی اختصاص ٹھہرا ہے۔ ان کے یہاں بعض افسانوں میں واقعات کی لہر 'تجسس' کا تجسس اور انجام میں افسانویت کا رنگ و آہنگ پیدا کرنے کی شعوری کاوش کا احساس ہوتا ہے۔ گویا حقیقت کو افسانہ بنانا وحشی سعید کا فنی آدرش ہے۔ وہ حقیقت سے ماورا ایک دنیا کے تصور آباد کرتے ہیں اور یہی خیال دیا ان کی اہم افسانہ ہے۔ بہر طور ان کے افسانوں کی اساس انسان اور زندگی کے مسائل پر رکھی ہے۔ ان مسائل کا کینوس وسیع ہے۔ وہ کہیں ظلم ہوتا نہیں دیکھ سکتے اور ہر ظلم کے خلاف نعرہ زن ہونے کے بجائے اس کی کرب ناکیوں کی نفسیاتی پرتیں کھولنے میں زیادہ یقین رکھتے ہیں — افسانے میں موضوع پر مکالمے کا اہتمام کرنا وحشی سعید کا خصوص ہے۔ ایسے مواقع پر وہ ایک افسانہ نگار سے زیادہ دانشور محسوس ہوتے ہیں۔ تمثیل نگاری کہانی کاری میں ایک کڑی آزمائش ہے۔ وحشی سعید نے اظہار کے اس ادق اسباب میں تفہیم کے ساتھ ساتھ اثر آفرینی کے پہلو بھی نکالے ہیں۔

نارنگ ساقی کی ادبی خدمات

مصنف : ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن (انڈیا)

صفحات: 112 قیمت: 200 روپے پبلشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

ڈاکٹر محمد محفوظ الحسن ایک علمی و ادبی شخصیت ہیں اور کثیر التصانیف مصنف کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا تعلق ہندوستان کے صوبہ بہار سے ہے، جو ایک مردم خیز خطہ ہے۔ ہم کئی ایسی علمی و ادبی ہستیوں کو جانتے ہیں جنھوں نے اس خطے میں جنم لیا، تو بھی نامی گرامی ہوئے اور جنم بھومی کو بھی ہمارے بلند تر کر دیا۔ فی الوقت ہمارے پیش نظر ڈاکٹر محفوظ کی کتاب ''نارنگ ساقی کی ادبی خدمات'' ہے۔ جس کے ابتدائیہ ''پیش گفتار'' میں رقمطراز ہیں۔

> ''نارنگ ساقی سے نہ تو میرے گہرے روابط ہیں اور نہ ہی کوئی ذاتی ملاقات اور نہ ہی دیرینہ تعلقات ہیں۔ تین چار سال قبل نارنگ ساقی کی ایک کتاب ''خوش کلام میاں قلم کاروں کی'' نثار احمد صدیقی نے پڑھنے کو دی اس پر اظہار خیال کرنے کی بھی فرمائش کی۔''

گویا زیر تبصرہ کتاب 'نارنگ ساقی کی ادبی خدمات' ایک فرمائشی ارمغان تنقید و بیاں ہے' مگر تخلیقیت کی اصل روح سے سرشار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے نارنگ ساقی ایسی بھاری بھرکم ادبی شخصیت کی تخلیقی دانش کی وقت نظر سے پرتیں اتاری ہیں اور نقد و نظر کی ریاست در

ریاست قائم کر دی ہے۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ ''نارنگ ساقی کی ادبی خدمات'' میں اردو ادب کے دو بڑے نام ایک دوسرے سے اس طرح ہم آغوش ہیں کہ دوئی اکائی میں ڈھل گئی ہے۔ شاید نارنگ ساقی کے عرش میں اترتے وقت ڈاکٹر مخمور لالہ کے ضمیر فن میں یہ بات رہی ہو۔ ع تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ارحم

مصنف : گستاخ بخاری

صفحات: 180 قیمت: 300 روپے پبلشر: مثال پبلشرز رحیم سینٹر پریس مارکیٹ امین پور فیصل آباد

''ارحم'' کہنہ مشق شاعر گستاخ بخاری کا حمدیہ مجموعہ ہے۔ موصوف بسیار گو اور زود نویس شاعر ہیں۔ ان کے کوئی درجن بھر شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں، جن میں غزل، نظم، حمد، نعت، سلام وغیرہ کی اصناف شعر و سخن پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ پیش نظر حمدیہ شاعری کے مجموعے میں شاعر نے غزل کا فارمیٹ (Formate) اپنایا ہے اور زیادہ تر سہل ممتنع پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ یہ اسلوب شعر ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ اس کے لئے طویل ریاضت و مجاہدہ کے ساتھ ساتھ رموز فن شعر گوئی سے کماحقہٗ آگاہی از بس ضروری ہے۔ جبکہ لفظ کا مزاج شناس ہونا اس پر مستزاد ہے۔ ہمارے یہاں مذہبی شاعری رسمیاتی قیود کی مرہون ہے اور یہ تو ایک معلوم بات ہے کہ 20 ویں صدی کے آخری ربع تک حمد و نعت سے دواوین کا آغاز محض ایک روایت کے طور پر کیا جاتا رہا ہے۔ بحمد اللہ اب زمانہ حمد، نعت، سلام، مرثیے اور دیگر اصناف سخن کی سی اہمیت حاصل ہے اور آئے دن مذہبی شاعری بالخصوص حمد و نعت کے متعدد مجموعے منظر عام پر آتے ہیں۔ گستاخ بخاری کے حمدیہ مجموعے ''ارحم'' کو ہم اسی ذیل میں دیکھتے ہیں۔ قبل ازیں بخاری صاحب کا ''تفسیر لا الٰہ'' کے نام سے ایک اور حمدیہ مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ''ارحم'' میں حمد کے علاوہ مناجات کے کچھ نمونے بھی ملتے ہیں۔

ہم کسی اور کو خاطر میں نہیں لاتے ہیں صرف اللہ ہی سے، اللہ کی قسم مانگتے ہیں

معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو

مصنف : پروفیسر محمد ظہیر قندیل

صفحات: 295 قیمت: 600 روپے پبلشر: کیڈٹ کالج حسن ابدال

محمد ظہیر قندیل کیڈٹ کالج حسن ابدال کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ وہ شاعری، کالم نگاری، تحقیق، ڈرامہ، افسانہ غرض شعر و ادب کی کئی اصناف سے شغف رکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات ملک کے مختلف ادبی رسائل و جرائد میں شائع ہوتی ہیں۔ انہوں نے اعزازی

شمشیر یافتہ کیپٹن اسفند یار بخاری شہید کی سوانح حیات ''معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو'' کے نام سے تحریر کی جس کا دوسرا ایڈیشن ہمارے پیش نظر ہے۔ پاک فوج ایک عرصے سے دہشت گردوں کے خلاف برسرپیکار ہے۔ دہشت گرد وطن دشمن عناصر کے آلہ کار ہیں اور ملک کی سلامتی کے لئے خطرہ بنے ہوئے ہیں۔ 18 ستمبر کو علی الصبح دہشت گردوں نے بڈھ بیر ایئر بیس کیمپ پر حملہ کر دیا۔ سارا ملک ایک تشویشناک صورت حال سے دوچار ہو گیا۔ اس بزدلانہ حملے کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے کیپٹن اسفند یار بخاری نے رضا کارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کر دیں۔ اور پھر پاک فوج کی شاندار روایات پر عمل پیرا ہوتے ہوئے شجاعت و پامردی اور ایثار و قربانی کا وہ نمونہ پیش کیا' جس کی مثال صرف پاک فوج کی تاریخ میں ہی مل سکتی ہے۔ کیپٹن اسفند یار بخاری شہید ''معرکہ بڈھ بیر کا ہیرو'' کے مصنف پروفیسر محمد ظہیر قندیل کے شاگرد تھے۔ پروفیسر صاحب نے شہید کیپٹن کی زندگی کے جس رخ کو بھی پیش کیا ہے اس کے پس منظر میں صرف استادانہ شفقت ہی نہیں محقق' ان کی حب الوطنی بھی جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ ایک ایسے صاحب قلم ہیں' جنھیں جذبات نگاری میں بطور خاص ملکہ حاصل ہے۔ وہ اپنی ہی نہیں دوسروں کی ذہنی و قلبی کیفیات کی تصویر کاری پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ ہم یہ اعتراف کرنے میں متامل نہیں کہ زیر تبصرہ کتاب ان کی محنت شاقہ کا حاصل ہے۔

اے وقت مجھے آزاد کر دے

شاعرہ : فوزیہ اعوان

صفحات: 240 قیمت: 300 روپے پبلشر: مکتبہ شاداب لاہور

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ اب ہمارے یہاں بھی' کم و بیش ہر شعبۂ حیات میں عورت اور مرد شانہ بشانہ مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں۔ گویا آج کی عورت نے اپنی نفسیات کے بارے میں تمام تر مفروضوں کی قلعی کھول دی ہے اور عملی طور پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ عورت میں بھی وہ ذہنی صلاحیت اور عقلی توانائی موجود ہے' جو صرف مرد کا خصوصی کروائی جاتی رہی ہے۔ یہ باتیں ہم نے رواروی میں کر دی ہیں' ہمارا اصل مقصد فوزیہ اعوان کے شعری مجموعے ''اے وقت مجھے آزاد کر دے'' کے بارے میں اظہار خیال ہے۔ فوزیہ کے مزاج میں بچپن ہی سے پڑھنے کا رجحان کارفرما تھا' جبکہ شعر و ادب سے انہیں خصوصی رغبت تھی۔ شعر گوئی ان کے فطری رجحان کی عملی صورت ہے۔ ہر چند ان کی شاعری فنی جمال کا وہ پیرایہ نہیں رکھتی ہے' جس کی آغوش میں معیارات پرورش پاتے ہیں۔ البتہ خود کو شاعرہ باور کرانے میں کامگار رہی ہیں اور ہمارے نزدیک شاعر تسلیم ہونا ہر شاعر کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔ فوزیہ اعوان نے بیک وقت غزل اور نظم آزاد میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزل اور نظم بالخصوص آزاد نظم کا دامن چھا جا ہے اور ''اے وقت مجھے آزاد کر دے'' میں یہی شعور بروئے کار لایا گیا ہے۔ فوزیہ کا میلان طبع نظم آزاد کی طرف نسبتاً زیادہ ہے۔ ان کی بعض نظمیں مختصر و جامع ہیں اور فکری اعتبار سے سراہے جانے کے قابل ہیں۔ بعض دیگر شاعرات کی طرح فوزیہ اعوان کے یہاں بھی عورت سے عورت تک دیکھنے کا فطری رجحان ملتا ہے۔ تاہم موضوعات میں تنوع نے ان کے شعری کینوس کو وسعت بخش دی ہے۔

یادوں کے بھنور

شاعر : ریاض ندیم نیازی

صفحات 208 قیمت 400 روپے پبلشر: رنگ ہاؤس پبلی کیشنز، راولپنڈی

"یادوں کے بھنور" ریاض ندیم نیازی کی غزلیہ شاعری کا مجموعہ ہے جسے انہوں نے اپنے شعری سفر کا پہلا پڑاؤ قرار دیا ہے۔ مجموعے کا نام ہی چغلی کھاتا ہے کہ اس میں مشمولہ غزلیں عشق و محبت کے جذبات سے عبارت ہیں اور عالم شباب کی ان یادوں سے مملو ہیں جو دائرہ حیات میں طوفانی لہریں بن کر مدوجزر کی سی کیفیت پیدا کر دیتی ہیں۔ ہر چند حقیقی مضمون آفرینی کے اعتبار سے ندیم کی غزل کی بھی وہی منہاج ہے جس پر روایتی غزل رواں دواں تھی۔ لیکن ڈکشن میں وہ یقیناً روایت سے دامن کش نظر آتے ہیں۔ انہوں نے حتی المقدور علامت، تشبیہ، استعارہ، تمثال وغیرہ وضع کرنے میں تازہ کاری سے کام لینے کی سعی کی ہے جو ہمارے نزدیک ان کی غزل گوئی کے امکانات کی ایک بشارت ہے۔ ندیم کی یہ کاوش فقط غم جاناں پر مرتکز نہیں ہے۔ اپنے عہد کی صورت حال کے گرد گھومتی ہوئی بھی دکھائی دیتی ہے۔ ان کے کلام میں عصری آگہی اور جدیدیت کے واضح شواہد ملتے ہیں۔ ریاض ندیم نیازی کے سوانحی خاکہ میں ان کی نعت گوئی کے حوالے سے خوشگوار معلومات درج ہیں۔ انہیں بحیثیت نعت گو انعامات سے بھی نوازا جاتا رہا ہے۔ ایک غزل گو (اہل علم جانتے ہیں) نعت نگار بھی ہو تو نعت کی اثر آفرینی کو دوچند کر دیتا ہے۔ ندیم سے ہماری بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ ہمیں قوی امید ہے کہ ان کی فکر و فن کا فردا زیادہ روشن ہوگا۔

◆◆◆

رپورٹ

محترمہ نجمہ عثمان کی ادبی خدمات

ثمن شاہ

29 مئی 2016ء کو پارک شاہ ادبی فورم کے زیر اہتمام سالانہ عالمی مشاعرہ کے انعقاد کے موقع پر پارک شاہ ادبی فورم کی جانب سے انگلینڈ میں عرصہ دراز سے مقیم معروف افسانہ نگار اور خوبصورت شاعرہ محترمہ نجمہ عثمان صاحبہ کو ان کی اردو زبان کے فروغ اور اردو درس و تدریس میں ایک طویل عرصے سے خدمات انجام دینے پر خراج تحسین پیش کرنے کے لیے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ محترمہ نجمہ عثمان کی پیدائش علی گڑھ میں ہوئی۔ 1990ء سے 2005ء تک ہیملٹن کالج میں لیکچرار کی حیثیت سے کام کیا۔ لندن یونیورسٹی کے امتحانات سے منسلک 2003ء تا 2012ء چیف ایگزامنر اور چیف ایگزامنر کے عہدے پر اپنی خدمات انجام دیتی رہیں۔ محترمہ نجمہ عثمان افسانہ نگاری، شاعری کے علاوہ دوسرے اصناف ادب میں بھی کام کرتی رہیں۔ ریڈیو کے لیے "میں بھی دل میں کیوں رکھوں" کے عنوان سے نجمہ عثمان کے حوالے سے کام شائع ہو چکے ہیں۔ جنہیں بہت سراہا گیا۔ نجمہ عثمان کے شعری مجموعے 1989ء میں "شاخِ حنا" شائع ہوا۔ 1999ء میں "کڑے موسموں کی زد پر" 2013ء میں "خیال کی خوشبو" اور 2008ء میں "ہوا سے بچھڑی شاخ" جیسے خوبصورت مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جنہیں ادبی حلقوں میں بے حد پذیرائی حاصل ہوئی۔ ادب کی اس خدمت کے لیے برطانیہ کے ادبی حلقوں میں محترمہ نجمہ عثمان کا نام ہمیشہ عزت و احترام سے لیا جاتا رہے گا اور اردو زبان کی آبیاری کر کے جو شجر آپ نے لگائے وہ پھل دیتے رہیں گے اور سایہ دیتے رہیں گے۔

انجمنِ خیال (خطوط)

﴿1﴾ سوہان اظہر جاوید!

"تخلیق" ہر بار دیکھتا ہوں۔ اظہر جاوید کی یادیں تازہ ہوتی ہیں اور ایک ولولہ تازہ بھی میسر آتا ہے۔ یقین جانئے بہت خوشی ہوتی ہے۔ آپ نے "تخلیق" کو پہلے سے زیادہ دلکش، خوب صورت اور وقیع بنا دیا ہے۔ دسمبر 2017ء میں کراچی میں کتاب میلہ ہوگا۔ اس کی مناسبت سے ماہنامہ "اطراف" "کتاب نمبر" شائع کر رہا ہے۔ اس بار ہم باقاعدگی سے شائع ہونے والے ادبی رسائل کے بارے میں بھی مضامین شائع کرنا چاہتے ہیں۔ "تخلیق" بھی اظہر جاوید کی تخلیق ہے اور آپ بھی اظہر جاوید کی تخلیق ہیں۔ "تخلیق" کے بارے میں ایک تاثراتی مضمون تصویروں کے ساتھ ارسال کریں تاکہ "اطراف" کے کتاب نمبر میں اسے شامل کیا جاسکے۔

محمود شام (کراچی)

﴿2﴾ عزیز سوہان اظہر جاوید صاحب!

تسلیمات! تمام گمشدگان کی صورت میں بھی "کہیں سے" لوٹ کر گھر آیا تو "تخلیق" کی محبتیں کواڑ تھامے سواگت کو کھڑی تھیں۔ دل و جاں کی خلوت و حاضری سے مطالعے کا لطف اٹھایا۔ آپ نے میرے کلام اور خط کو عزت بخشی ہے۔ خدا آپ کو "تخلیق" صحت سلامت رکھے۔ مضامین کے خیالات و اظہارات متلاطم ہیں، ہندکو زبان کے صوفی شعراء کے ذکر سے فخر محسوس ہوا۔ ہندکو میں پائے کی شاعری ہوئی ہے۔ افسانے "تخلیق" کی روایت کے عین مطابق ہیں۔ آغا گل افسانے میں تخیل اور حقیقت کو آمیز کر کے حیرت زدہ کر دینے کا فن جانتے ہیں۔ ان سے میرا سلسلہ مراسلت بحال ہوا ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ برقرار رہے۔ اظہر جاوید کی کہانی کے اثرات دیکھا ہیں۔ افسانوں کی "رونق" سے ہی شاد و آباد رسالہ "تخلیق" نثری تحریریں اپنے اختصاص کی روایت سے شائع کرتا ہے۔ سلمیٰ اعوان کے سفرنامے ایک مدت سے پڑھ رہا ہوں۔ "عراق اشک بار ہیں ہم" ایک پراثر تخلیق ہے۔ ان کی سطریں دامنِ دل کو چھو کر گزرتی ہیں۔ ان کی گفتگو کا بے ساختہ پن "حمزہ مسکاری" کے لیے جادو اثر ہے۔

شاعری کے باب میں یہی کہنا ہے کہ یہاں نظمیں بھی خوب ہیں اور غزلیں بھی۔ ذبیح اللہ فہیم میرے پرانے دوست ہیں انھیں "تخلیق" میں موجود پا کر مسرت ہوئی۔ اچھے اور پائے کے سخن وروں کی "جمع آوری" آپ کی ادارت کا مستحسن قرینہ ہے۔ انجمن خیال کا جو مزہ ہے وہ کہیں اور نہیں۔ آپ نے اظہر جاوید مرحوم کے حسن سلوک اور حسن ارتباط کی خوش گواریوں کے سامان بہم کر رکھے ہیں۔ احباب کے "ادب" کی عظمت سرشار کر دیتی ہے۔ سب کی سلامتی کے لیے دعا کرتا ہوں۔ کمپوزنگ کے لیے خاص توجہ کی استدعا ہے۔

آصف ثاقب (بوئی ہزارہ)

﴿3﴾ عزیز القدر سلطان اظہر!

خوش رہو اور سدا خوش رہو۔ آپ کا مرتب کردہ "تخلیق" ستمبر 2017ء موصول ہوا۔ جستہ جستہ تحریریں پڑھ کر لطف آیا۔ ڈاکٹر رشید امجد کا یادنگاری میں "عاشق صبر طلب"، "ملکی اعوان کا سفرنامہ" "عراق اشک بار ہیں ہم" اور موسیقی کے سلسلے میں: ڈاکٹر امجد پرویز کے مضامین دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ ملک مقبول احمد صاحب کا خلوص و محبت سے محترم امین راحت پر لکھا خاکہ نہایت عمدہ اور نشاط انگیز ہے۔ چغتائی صاحب واقعی ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ وہ شاعر، ادیب اور محقق تو ہیں ہی، لیکن فلمی گیتوں کے رسیا بھی ہیں۔ ان کے پاس کلاسیکل فلمی گانوں کا وافر ذخیرہ ہے۔ جن گائیکوں کے ریکارڈز ان کے پاس موجود ہیں ان میں سہگل، کانن بالا، پرمل گھوش، امیر بائی، زہرہ بائی، خورشید، اختری بائی، آہنگی، ماسٹر مدن، دینا ناتھ، ستارہ کانپوری، جگموہن، ہیمنت کمار، کمل جھریا، مکیش، طلعت محمود، ثریا، نور جہاں، ایس ڈی برمن، ملکہ پکھراج، سریندر کور، روشن آرا بیگم اور بڑے غلام علی وغیرہ شامل ہیں۔ اس خزانے کو چغتائی صاحب بہت سنبھال کر رکھتے ہیں۔ ملک مقبول احمد صاحب ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ جب وہ ٹیلی فون پر بات کرتے ہیں "تو ان کی باتوں سے گلاب کی خوشبو آتی ہے۔" ای پی پے میں امین راحت چغتائی کا منظوموں کے آغاز کے بارے میں عمدہ مضمون ہے جو نہایت معلومات افزا ہے۔ انہیں اتنے عمدہ مضمون پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ صوفیہ بیدار کا انشائیہ "اعتزال کے بعد کی زندگی" کا مطالعہ فکر عطا کرتا ہے۔ عمدہ انشائیہ ہے۔ آپ "تخلیق" کو محنت اور لگن سے نکالتے ہیں۔ مبارک باد! نسیم سحر اور جلیل عالی کا کلام فکر انگیز ہے!

پروفیسر جمیل آذر (راولپنڈی)

﴿4﴾ بہت عزیز و محترم سلطان اظہر جاوید صاحب!

"تخلیق" ستمبر 2017ء موصول ہوا۔ بہت شکریہ بہت دعائیں! آپ کی محبت اور اعلیٰ ظرفی ہے جو نہایت تسلسل کے ساتھ "تخلیق" کی ترسیل جاری رکھی ہوئی ہے۔ طبیعت کچھ لکھنے پر آمادہ نہیں ہو رہی۔ مطبوعہ تخلیقات بھجوانا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگرچہ ضروری نہیں کہ مطبوعہ تخلیقات جملہ قارئین نے پڑھ رکھی ہوں۔ تاہم ایک غزل ارسال خدمت ہے۔ اگر مناسب سمجھیں شامل اشاعت فرمالیں۔ دوسری وجہ مرحوم سید شوکت واسطی کے اس شعر سے ظاہر ہے:

شوکت ہمارے ساتھ عجب حادثہ ہوا ہم رہ گئے ہمارا زمانہ چلا گیا

اب شاعری ہم سے (مجھ سے) بہت آگے نکل گئی ہے۔ اب کچھ لکھتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔

سلطان سکون (ایبٹ آباد)

﴿5﴾ عزیز گرامی قدر سلطان اظہر جاوید!

ماہ ستمبر 2017ء کا شمارہ ماہنامہ "تخلیق" کی روایات اور معیارات کا بھرپور حامل دو روز قبل موصول ہوا اور جب سے زیر مطالعہ ہے۔ شمارے کے مضامین اور شعری حصے کو جدید و کی یکساں ترجمان اور تابندگی قرار دیا جا سکتا ہے۔ مضامین کا شعبہ میری نظر میں وقیع ترین ہے۔ خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر مبارک علی کا مضمون "قدامت پرستی اور برطانوی راج" ان کی دانش وری اور تاریخ شناسی پر

وال ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا مضمون جنرل ضیا الحق حقائق پر مبنی چشم کشا ہے۔ امین راحت چغتائی کا مضمون مقولوں کا آغاز ایک بڑی اہم تاریخی حقائق پر مبنی تحریر ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کا قسط وار مضمون اپنی معنویت اور اہمیت کے تناظر میں لائق مطالعہ ہے۔ آغا گل کا افسانہ ''کوریج'' کا ذکر نہ کرنا ادبی دیانت و ادب سے انحراف کہلایا جانا چاہیے۔ طنز و مزاح کا شعبہ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کا شعبہ خاص ہے۔ ان کو نہ پڑھنا قاری کے لئے ممکن نہیں ہے۔ ان کے مزاح میں معنویت یعنی تعمیری طنز میں بیداری متاثر ہوتی ہے۔ پیش نظر شمارے میں حسب روایت ''دامن خیال'' (خطوط) وقیع اور فکر انگیز تحریروں سے مزین ہے۔

مسلم شمیم (کراچی)

6 [illegible] محترم و عزیزم سونان اظہر جاوید!

کہا جاتا ہے کہ بہتر وارث وہ ہوتا ہے جو اپنے اسلاف کی روشن روایات کو فروغ بخشے اور ان کی حسن آفرینی اور خیر افروزی پر کوئی حرف نہ آنے دے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ نے اس معروضے کی لاج رکھی ہے۔ جناب اظہر جاوید کی تخلیقی اور خداداد صلاحیتوں کے اظہاریوں میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔ میں برسوں سے تخلیق کا شیدائی ہوں اور خدشہ تھا کہ مرحوم کے پردہ کرنے کے بعد کہیں ''تخلیق'' کی آب و تاب ماند نہ پڑ جائے لیکن شکر ہے جو پرچہ بھی منصۂ شہود پر آتا ہے، وہ خوب سے خوب تر ین کا معیار برقرار رکھتا ہے۔ میں صرف تحسین کی بے پر کی اڑائی ہوئی بلکہ خواہ مخواہ ادبی پالیسی ہوئی ورد فطنی کو رد کرتا ہوں کہ ''تخلیق'' کسی مخصوص ادبی گروپ سسٹم کو فروغ دے رہا ہے۔ میرے خیال میں آپ نے مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں غیر جانبداری پر آنچ نہیں آنے دی۔ عذرا اصغر پر علی اعوان کی گفتگو معیاری تھی۔ اگر عذرا اصغر کو تخلیق ایوارڈ 2016ء ملا ہے تو حق بہ حق دار رسید والی بات ہے۔ تحریں دل کو چھو لینے والی اور معیاری ادب کی تخلیق میں نگر کاری کا مظاہرہ کریں نہ کہ سیدھی کوئی کا۔ امین راحت چغتائی کی نعت مزہ دے گئی۔ ماشاءاللہ فن پختگی میں بھی یہ اپنی مثال آپ ہے۔ ڈاکٹر انور سدید (مرحوم) نے شہزاد احمد کی یادیں تازہ کی ہیں۔ وہ ان توصیفی کلمات کے حقدار بھی تھے۔ اختر کی نعت پر جناب امین راحت چغتائی نے جو کچھ لکھا ہے اس پر میرے ذاتی تحفظات ہیں۔ وہ رباعی شاعر ہیں اور منظر نگاری اور رقم ریزی کی خوبیوں سے متصف، نعت گوئی ان کا ایک وصف جس سے بطور خاص سراہا جائے اور خواہ مخواہ برگزیدہ نعت گو حضرات میں انہیں کوئی نہ کوئی ''نمبر'' عطا کر دیا جائے۔ ظہیر جاوید نے رفیق روم میاں فیض احمد فیض لکھتے وقت ٹھوس حقائق اور واقفانہ کوائف کو ملحوظ خاطر رکھے ہیں۔ میرے خیال میں فیض پر یہ مقالہ نہایت معرکۃ الآرا اور ہر اعتبار سے معلومات افزا ہے۔ اگر ظہیر جاوید مزید محنت کریں تو یہ مسودہ کتاب فیض کے حوالے سے نہایت مستند گردانی جائے گی۔ ڈاکٹر جواز جعفری کا خدا بھلا کرے، وہ کلاسیکی موسیقی کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر کر جو علم آپ وار لکتے میں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ غزلوں اور نظموں کا حصہ نہایت وقیع ہے۔ شروع میں نعت اور حمد کے مضامین ولولہ انگیز ہیں اور ان کی شروعات کا سہرا آپ کے سر ہے کہ اظہر جاوید مرحوم اس سمت بوجوہ پیش رفت نہ کر سکے تھے۔ آپ کے پرچے میں محترم غلام نبی اعوان کی غیر حاضری کھٹکتی ہے۔ وہ قدرے علیل ہیں لیکن ان کا دم ہر اعتبار سے غنیمت ہے۔ خدا کرے وہ صحت مند ہیں۔

سیّد ریاض حسین زیدی (ساہیوال)

47 سلام اظہر جاوید جی!

وقفے کے بعد ستمبر 2017ء کا "تخلیق" ملا۔ مطلب یہ کہ اس سے قبل دو تین پرچے ارسال نہیں کیے گئے۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں کہ دو تین ماہ پہلے مجھے طارق بلوچ صحرائی نے فون کیا کہ آپ نے "تخلیق" میں میرا افسانہ پڑھ لیا ہوگا، اپنی رائے سے مطلع کریں۔ میں نے کہا مجھے "تخلیق" نہیں مل رہا، البتہ فیس بک پر ٹائٹل دیکھ لیتا ہوں۔ اس نے اپنا افسانہ فوٹو کاپی کرا کے مجھے بھجوا دیا۔ جس طرح کہ محترمہ عذرا اصغر نے اپنے لیٹر میں "تم" کا صیغہ استعمال کیا ہے، اسی طرح میں بھی تمہیں "آپ" کے بجائے "تم" ہی لکھوں گا کہ اظہر جاوید صاحب میرے بڑے بھائی جیسے تھے۔ "تخلیق" دیکھ کر اور پڑھ کر خوشی ہوتی ہے کہ تم نے معیار برقرار رکھا ہے بلکہ ٹائٹل اور طباعت کے حوالے سے اسے مزید بہتر کیا ہے حالانکہ صفحہ نمبر 2 پر تم نے لکھا ہے "ادبی صحافت کے میدان میں نووارد ہونے کے باوجود..."

میں نے اظہر جاوید صاحب سے ذاتی موضوعات یا ان کی فیملی کے بارے میں بھی گفتگو نہیں کی تھی مگر مجھے اندازہ تھا کہ صحافت اور ادارت کی طرف وہ تمہیں نہیں لائے تھے۔ میرا خیال ہے، تعلیم سے فراغت کے بعد تم بزنس کی طرف چلے گئے۔ یہ جو تم نے صحافتی اور ادارتی تجربہ حاصل کیا، یہ خداداد ہے اور پھر تم اس سلسلے میں محنت بھی بہت کر رہے ہو۔ 1976ء سے میں "ساتھیان" رسالہ شائع کر رہا ہوں۔ یہ میری زندگی جیسا ہے (اس وقت میری عمر 70 برس ہے) "پاکستان" اور میں ہم عمر ہیں۔ میری پیدائش اگست 1947ء کی ہے۔ میرے ماشاءاللہ تین بیٹے ہیں۔ تینوں میں سے کسی کو بھی ادب، صحافت، شاعری سے دلچسپی نہیں۔ بلکہ وہ میری تحریریں بھی نہیں پڑھتے۔ (اس وقت تک میری 30 کتابیں چھپ چکی ہیں) ایک بیٹا انجینئر، دوسرا اکاؤنٹنٹ اور تیسرا انجینئر ہے۔ لہٰذا میرے دنیا سے کوچ کر جانے کے بعد یہ پرچہ بھی کوچ کر جائے گا۔

بڑا بیٹا انجینئر فیض تنویر (فیض احمد فیض کی سالگرہ کے دن پیدا ہوا تھا اس مناسبت سے اس کا نام فیض رکھا گیا) صرف اتنی معاونت کرتا ہے کہ وہ پرچے کی کمپوزنگ اور پیج میکنگ کر کے رائٹنگ پیپر پر میٹر نکال کے مجھے دے دیتا ہے۔ اس سلسلے میں تمام انتظام اس نے گھر میں کیا ہوا ہے۔ تمہارا اداریہ "پہلی بات" بھی کمال کا ہے۔ ادبی کے ساتھ ساتھ سیاسی مسائل اور حالات حاضرہ کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے، جو عمدہ بات ہے۔ اداریے میں تم نے لکھا ہے "بے شمار لکھاری وہ ہوتے ہیں جن کا ادب سے دور دور تک کوئی تعلق نہیں جو شعری یا افسانوی مجموعے کسی سے لکھوا کر شائع کرواتے اور خود کو شاعروں، ادیبوں کی فہرست میں شامل کر کے فخر محسوس کرتے ہیں جبکہ اصل میں تو نہ شاعر ہوتے ہیں نہ ادیب۔ یہ لوگ وہ ناسور ہیں جو ادب اور ادیب دونوں کے تشخص کو مسخ کر رہے ہیں۔" عطاء الحق قاسمی نے بھی اپنے ایک کالم (مطبوعہ 29 ستمبر) روزنامہ 'جنگ' میں لکھا تھا "مطلب تو شعر کوئی چیز ہی نہیں۔ شاعری کا پورا مجموعہ مناسب نرخوں پر لکھنے والے ماہرین ہمارے درمیان موجود ہیں۔ وہ ایک ہفتے میں ڈیڑھ سو صفحات کا شعری مجموعہ تیار کر کے "شاعر" کے حوالے کر دیتے ہیں اور پھر یہ شاعر سالہا سال شہروں شہروں اور ملکوں ملکوں مشاعرے پڑھتا نظر آتا ہے۔"

"تخلیق" شمارہ ستمبر 2017ء کے ٹائٹل کے اندرونی صفحات پر جناب اظہر جاوید کی مطبوعات جن پر انہیں پرائڈ آف پرفارمنس دیا گیا کے سرورق اور نیچے مختصر تعارف شائع کیا گیا ہے۔ ایک فقرہ ہے "آپ نے ادبی، سیاسی موضوعات پر کالم لکھنے شروع کر دیے" دو تین سطروں میں اخبارات کا ذکر ہو سکتا تھا جن میں اظہر جاوید صاحب لکھتے رہے مثلاً "امروز" میں "محفل محفل" کے "لوگو" سے 1979ء اور اس کے بعد تک، روزنامہ "جمہور" میں 1973ء اور بعد تک، روزنامہ "حریت" کراچی میں "نگار راوی" کے "لوگو" سے

1976ء اور بعد تک اور ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی میں 1994ء اور بعد تک "راوی کنارے" کے "کو کو" سے لاہور کی ادبی ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں اظہر جاوید صاحب کالم لکھتے رہے۔ "تخلیق" کے صفحہ 134 پر سید انور جاوید ہاشمی کے تبصرے شائع کیے گئے ہیں۔ سرخی میں ان کا نام شائع کر دیا گیا۔ میرا خیال ہے (ممکن ہے یہ خیال غلط ہو) ہر کتاب کے نام کے ساتھ مبصر سید انور جاوید ہاشمی شائع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

(ادارہ آپ کی تمام تجاویز کو مدِنظر رکھتے ہوئے ان سے استفادہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا)

تنویر ظہور (لاہور)

﴿8﴾ سونان میاں، جیتے رہو!

"تخلیق" شمارہ ستمبر 2017ء موصول ہو گیا۔ یاد آوری کا شکریہ! میری شائع کردہ کتاب "مظہر راج کے تاریخی دارالے" پر مبصر جناب انور جاوید ہاشمی کا مختصر مگر جامع تبصرہ نظر سے گزرا۔ آپ دونوں کا شکر گزار ہوں۔ یہ رسالہ اور کتاب پوری آپ دونوں کے درویش ہونے کی دلیل ہے۔ آپ مجھ پر ہمیشہ مہربان رہے۔ میری بیوہ اور بچوں کے لئے دلی دعائیں۔ آپ سب ایک اچھے آدمی اور ادیب و شاعر کی یادگار ہیں۔ دنیا اسی لئے تو کچھ کچھ پیاری لگتی ہے۔

طفیل اختر (لاہور)

﴿9﴾ محترم سونان اظہر صاحب!

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ آپ کی عنایت ہے کہ "تخلیق" باقاعدگی سے مل جاتا ہے۔ ہماری کوتاہی اور کوتاہ نظری کے باوجود۔ اس ماہ کا شمارہ ابھی مکمل دیکھ نہیں سکا۔ دو ایک مضامین اور چند نظمیں، غزلیں پڑھ سکا ہوں۔ جناب کرامت بخاری کی نظم "اگر تم پوچھنا چاہو" کیا خوب ہے۔ ہر مصرعہ اتنا دلکش و رواں ہے کہ دل ٹھہر جاتا ہے اور نظر وہیں رک جاتی ہے۔ یہ نظم بار بار پڑھی۔ ڈاکٹر جواز جعفری کا مضمون "لاہور کے چند معروف قہوہ خانے" لاہور کا پورا تاریخی Revival ہے۔ ماضی کے نقوش خوب اجاگر کرتے ہیں۔

پروفیسر محمد جلیل الرحمٰن (لاہور)

﴿10﴾ محترم جناب سونان اظہر صاحب!

خوش رنگ ماہنامہ "تخلیق" مل گیا ہے۔ آپ نے مرحوم اظہر جاوید کے بارے میں "نوائے وقت" میں چھپنے والے میرے چند جملوں کو اہمیت دی اور اپنے ماہنامہ "تخلیق" میں انہیں شائع کر کے اس احقر کیلئے باعثِ عزت بنایا۔ میں آپ کا از حد ممنون ہوں۔ یہی شیوہ مرحوم اظہر جاوید کا تھا۔ جناب عالی! آپ کو خط لکھنا باعثِ شرف ہے اور ماہنامہ "تخلیق" کے قارئین کی پسندیدہ روایت ہے کیونکہ ایسے جامع خطوط کسی دوسرے رسالے میں شائع نہیں ہوتے۔ ان خطوط میں اظہارِ خیال کی جدت کام کرتی ہے اور مصنفین کے خیالات کی قارئین تک رسائی کو آسان بناتی ہے جبکہ ماہنامہ "تخلیق" کے جملہ مشمولات قارئین کے ادبی ذوق میں اضافہ کا باعث بنتے ہیں اور لذتِ احساس سے لطف اندوز ہونے کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

بعض مستقل عنوانات جیسے "عراق اتنے یار ہیں ہم" اور "عاشقی صبر طلب" بہت دلچسپ اور چشم کشا واقع ہوتے ہیں۔ میں ان مضامین کو بڑی دلچسپی سے پڑھتا ہوں۔ بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ میں عراق میں گھر رہا ہوں۔ یہ محترمہ سلمیٰ اعوان کی انتہائی کامیابی ہے لیکن ڈاکٹر انور سدید مرحوم کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے ضیا الحق کو سمجھنے کی مناسب کوشش نہیں کی۔ اور عام روایتی سمجھداروں کی طرح اپنے خیالات کو تحریر کر ڈالا ہے۔ ایک بڑا ادیب کسی بھی شخص کو کوسنے نہیں دیا کرتا اور اس کے معاملات کو قابل نفرت نہیں کہتا۔

جناب امین راحت چغتائی کا مضمون "مقبولوں کا آغاز" خاصا دلچسپ ہے اور پسند کی چیز ہے جبکہ یہ ایک تاریخی اور درست روزنوشت تحریر ہے۔ حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول لکھنے والوں نے اپنے دلوں کی گہری کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ ہم ان کی ان روحانی کیفیات کا دل سے احترام کرتے ہیں جبکہ محترم آصف ثاقب کا یہ شعر تو بہت دل آویز ہے۔

اس کی چاہت میں ہم مجذوب ہیں ہم — وہ جھلکتا ہے سبز گنبد کا

جناب حالی تمام غزلیں بھی اپنے حسن بیان اور اثر پذیری میں بے مثال ہیں۔ ان تمام شعرا نے "تخلیق" میں اپنا خاص مال باندھ رکھا ہے۔ محترم آصف ثاقب کی غزل آج سے ستر سال قبل کے احساسات کی یاد تازہ کرتی ہے جب خوشیوں کے دن اور محبت کی راتیں اس معاشرے کی زینت ہوا کرتی تھیں۔ لیکن سب کچھ ہوتے کے باوجود اب ویسا نہیں ہوتا۔ کچھ ایسے ہی احساسات ہیں جو ڈاکٹر نجمہ شاہین کھوسہ کی غزل میں کارگر ہیں۔ ان کا یہ شعر ان پرانی کیفیات کو لوٹ آنے کی ترغیب دیتا ہے۔

یہ روگ کہیں مجھ کو ہی مسمار نہ کر دے — آ لوٹ کر آ تو ہی تو اکسیر ہے جاناں

جناب حالی ان تمام مشمولات کی ندرت اور تازگی سے قارئین سکون محسوس کرتے ہیں اور آپ کی ہمت اور محنت کی دل سے قدر کرتے ہیں۔ والسلام!

خالد عبداللہ (راولپنڈی)

﴿11﴾ محترم سلطان اختر!

ستیہ پال آنند صاحب کو نہیں جانتا مگر یہ جانتا ہوں کہ جناب جمیل یوسف صاحب نے ظفر اقبال کی بے ڈھنگی غزلیات پر شدید تنقید کی تھی۔ ظفر اقبال کو اس عمر میں (87) کچھ یاد ہی نہیں رہتا۔ اس نے کسی اور غزل کا حوالہ دیا جس پر تنقید کی گئی تھی، یہ وہ نہ تھی۔ بہر حال ان کی ناشائستہ تحریریں "تخلیق" کے قابل نہ تھیں۔ دونوں کو پھر پذیرائی نہ ملی۔ اس مرتبہ اس نے خم ٹھونک کے بیرے سے جو ستیہ پال آنند ہے "تخلیق" اور "الحمرا" دونوں میں شدید تنقید کا نشانہ بنوایا حالانکہ چند روز پہلے تک وہ الحمرا کی بڑی تعریف کر چکے ہیں۔ اس عمر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ دونوں کو جناب کی ادا وقار اردیتے ہیں۔ اس قسم کے فنکاری برسے تو پانچ قسم کے ہیں۔ میں نے یاد کروایا ہے۔ اپنے کالموں میں میری چار پانچ مرتبہ تعریفوں کے پل باندھ چکے ہیں مگر اب ستیہ پال آنند کے ساتھ ساتھ مجھے بھی رگڑا دینے کی کوشش کی۔ مگر یہ ہرگز نہ لکھا کہ اگر کوئی شعر یا مصرع وزن میں نہیں ہے تو درست کیا ہے؟ اور جو بہت ہی خوبصورت اشعار تھے ان کو پی گئے۔ ایسے لوگوں سے نہ دوستی اچھی نہ دشمنی اچھی۔

مرزا احمد نور طائر (چکوال)

﴿12﴾ سوہان جی!

بہت دیر سے آپ کو خط لکھنے کا سوچ رہا تھا لیکن موقع ہی نہ ملتا تھا۔ جب سے ہمارا یار اظہر جاوید فوت ہوا ہے بہت کم محفلوں میں جانا ہوا ہے۔ ہماری دوستی اس وقت سے رہی ہے جب میں سکول / کالج کے ابتدائی سالوں میں بچوں کے مضامین لکھا کرتا تھا اور عزیز اثری صاحب اور ان کے پاس روزنامہ ''امروز'' جاتا رہتا تھا۔ ساتھ ہی ''پاکستان ٹائمز'' میں بھی لکھا کرتا تھا۔ یہ 1965ء سے 1970ء کے درمیانی برسوں کا ذکر ہے۔ پھر کالج کے تعلیمی دور ہی میں مجھے پاکستان رائٹرز گلڈ کا رکن اور حلقہ ارباب ذوق کا رکن بنایا گیا۔ 1973ء میں میں گورنمنٹ کالج کے ادبی جریدے ''راوی'' کا ایڈیٹر بنا تو ذرا معتبر کہلایا۔ پھر کتابوں پر پاکستان ٹائمز میں تبصرے کرتا تھا اور سچ لکھنے کی وجہ سے خاصا معتوب رہا۔ اس زمانے میں اظہر صاحب نے ''امروز'' میں اپنے کالم میں جلتی کو آگ دکھا دی۔ پروین شاکر کی شاعری کے مجموعے پر میرے تبصرے نے ہلچل مچا دی تو اظہر صاحب نے اس کو اور اچھال دیا اور یوں پروین (جو مجھ سے سول سروس میں جونیئر تھی یہ بعد کی بات ہے) ناراض ہو گئی۔ پھر قاسمی صاحب نے ''فنون'' کے دفتر میں ''صلح کرائی کہ'' جب وحید نے جو لکھا ہے اس کا جواب نہیں لکھ سکتی تو بات تو سچ ہے مگر ... '' معافی تلافی ہو گئی۔ پھر تو کراچی میں اپنی تعیناتی کے دوران اس سے بڑی دوستی رہی! اظہر صاحب کے ساتھ میں اکثر پاکستان ٹائمز اور بعد ازاں ''ڈان'' میں ادبی کالم اور مضامین نگار اور پاپ فیچر کے مصنف ''اشفاق نقوی'' کے ہاں ماڈل ٹاؤن جاتے اور سالگرہ مناتے تھے۔ انہوں نے میرے افسانوں کو انگریزی میں ترجمہ کر کے ''پاکستان ٹائمز'' میں شائع کیے تھے۔ بعد ازاں انگلینڈ میں بھی مکرر شائع ہوئے۔ اب ''فیس بک'' کی نئی دنیا وجود میں آئی ہے تو کئی لوگوں کو آپ کے ارد گرد دیکھتا ہوں جنہیں اظہر صاحب ''ہیں اجوبہ'' کہا کرتے تھے تو آپ کو مطلع کرنے بیٹھ گیا کہ ان سے ہوشیار رہیے گا۔ اظہر صاحب کا میرے افسانے پر خوبصورت تبصرہ جو انہوں نے 39 برس قبل 8 جولائی 1978ء کو ''امروز'' میں لکھا تھا اس کی فوٹو کاپی بھیج رہا ہوں۔ 11 فروری کو مجھے کراچی لٹریچر فیسٹیول میں ''بیسٹ یو بی ایل لٹریری ایوارڈ'' سے نوازا گیا۔ اس کی بھی ایک کاپی منسلک ہے۔ ایک یادگار تصویر ''ماہ نو'' کے دو جلدوں والے کسی خاص شمارے میں کشور ناہید نے شائع کی تھی جس میں ڈاکٹر محمد سلیم اختر کو پی ایچ ڈی ملنے پر ان کی طرف سے دعوت میں ہم پانچ چھ دوست گرین ریسٹوران کے سامنے میکلوڈ روڈ پر کھڑے ہیں۔ ان میں میں اور اظہر ساتھ ہیں۔ ایک ان کی حلقہ ارباب ذوق میں میری کھینچی ہوئی تصویر بھی خاصی مشہور ہوئی تھی کیونکہ ایک طرف شعیب بن عزیز اور دوسری جانب اظہر کی ٹانگیں نمایاں تھیں۔ ''ٹانگ وہ ٹانگ جس کو فخر پاک بیٹھے کہتے ہیں۔'' ہم نے بڑی آوارہ گردیاں کیں۔ کبھی پیدل، کبھی میرے اسکوٹر پہ۔ بعد ازاں جب باکار ہو گئے تو کار میں۔ یادیں ہیں کہ چلی آتی ہیں! امید ہے بخیریت و عافیت ہوں گے۔

وحید رضا بھٹی (لاہور)

﴿13﴾ پیارے سوہان۔ سلامت رہو!

تازہ ''تخلیق'' نظر نواز ہوا۔ ''تخلیق'' پہلے بھی معیاری پرچہ تھا۔ پر اب تم نے اسے جس بلندی پر پہنچا دیا ہے وہ تمہاری اپنے والد اور پرچے سے بے پایاں محبت کا ثبوت ہے۔ ''تخلیق'' دیکھتی ہوں تو اظہر جاوید اپنی مخصوص شگفتگی اور مسکراہٹ کے ساتھ میرے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں اور کہتے ہیں ''بی بی جان ---- دیکھا میرا بیٹا کتنا ہونہار ہے۔ اس نے ''تخلیق'' کو کیا رنگ و روپ دیا، کیسا نکھار

دیا ہے۔ ''اکبر جاوید کی روح اپنے لگائے ہوئے پودے کو پھلتا پھولتا دیکھ کر بہت خوش ہوتی ہوگی۔ تمام تخلیقات انگوٹھی میں جڑے نگینے کی طرح ہیں۔ سب سے پہلے اپنی پہلی ترجیح: افسانے پر بات کروں گی۔ افسانے بھی لائق مطالعہ ہیں۔ آغا گل کا ''گورینج'' ان کے مخصوص مسائل، ماحول اور دلکشی کے ساتھ بہت عمدہ اور بہتر لکھا ہوا افسانہ ہے۔ یٰسین احمد کا ''اب نہیں جینا مجھے'' بہت دل گداز افسانہ ہے۔ موجودہ زمانے کی سائنسی ترقی خدا جانے انسان کو کدھر لے جائے گی؟ D.N.A.، اجزا، ایمبریو وغیرہ سائنس کی اس قدر ترقی سے بعض اوقات مجھے خوف آتا ہے۔ محمد طارق علی کا ''ریس کورس والی'' دلچسپ افسانہ ہے اور کلائمکس تو بالکل غیر متوقع ہے۔ شیخ خالد اور شیر طراز دونوں کے افسانے عمدہ ہیں۔ اکبر جاوید کا ''پرانی چیز'' دل کو چھونے والی کہانی ہے۔ حنیف باوا نے ترجمہ بھی بہت عمدہ کیا ہے۔ یہ تقریباً ہر بچھڑے ہوئے گھر کی کہانی ہے۔ بیچارے بوڑھے لوگوں کو لوگ بوجھ سمجھ کر برداشت کرتے ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری کا ''لاہور کے چند معروف قہوہ خانے'' بہت ہی دلچسپ اور معلوماتی مضمون ہے۔ یہ ان قہوہ خانوں کا جو حشر ہوا وہ پڑھ کر دل کو تکلیف ہوئی۔ زندہ قومیں اپنی تاریخ کو محفوظ رکھتی ہیں۔ لاہور ایک تاریخی شہر تھا۔ لیکن اس کا اب جو حلیہ بگاڑا گیا ہے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ پیرس بھی پرانا تاریخی شہر ہے۔ مجال ہے جو انہوں نے ایک اینٹ بھی ادھر ادھر کی ہو۔ سارا میٹرو سب وے سسٹم انڈر گراؤنڈ ہے۔ شانزے لیزے جہاں اپنے وقت کے مشہور شاعر، ادیب، مصور اور فنکار بیٹھا کرتے تھے، اسی حالت میں موجود ہے۔ ان کے میوزیم، ڈرامہ گھر اور محلات اپنی اصل صورت میں موجود ہیں۔ ایک اپنا لاہور ہے۔ باہر نکلو تو پہچانا نہیں جاتا۔ جگہ جگہ لوہے اور سیمنٹ کے بڑے بڑے پل دیکھ کر لگتا ہے سارا لاہور اہرام مصر بنا دیا گیا ہے۔

ڈاکٹر رشید امجد کی ''عاشقی صبر طلب'' انتہائی دلچسپ داستان حیات ہے۔ ڈاکٹر امجد پرویز کا ناہید نیازی پر لکھا ہوا مضمون بہت پسند آیا۔ کتنے ہی پرانے گانے، موسیقار، سنگر، ایکٹر اور فلمیں! کیا کچھ بھولا بسرا یاد آ گیا۔ سلمیٰ اعوان کا ''عراق اشک بار ہیں ہم'' پڑھنے کے لائق تحریر ہے۔ ہمیشہ اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ سفرنامہ لکھنے کا سلمیٰ کا اپنا انداز ہے۔ وہ قاری کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ کہیں کہیں پنجابی الفاظ کا تڑکا بہت مزہ دیتا ہے۔ پچھلے شمارے میں میرے افسانے ''سچ کی آواز'' کی پسندیدگی کے لئے میں ڈاکٹر ایس معین قریشی، محمد طارق علی، نذیر اللہ قیم اور جمیل حیات صاحبان کی مشکور ہوں۔ پرچے کی کامیاب اشاعت اور دن دوگنی رات چوگنی ترقی پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ شاد رہو آباد رہو!

سیما پیروز (لاہور)

۱۴ مئی — محترم سلمان اظہر جاوید!

کچھ ذاتی معاملات کے تحت U.K. جانا پڑا۔ رابطہ منقطع ہوا۔ واپسی پر گھر کے پتہ پر موصول شدہ ''تخلیق'' ملا۔ ابھی بہت تھوڑے حصہ کا مطالعہ ہو سکا ہے۔ وقت اگلی اشاعت کیلئے کم ہے۔ لہٰذا غیر حاضری سے معذرت اور نئے شمارے میں شمولیت کیلئے حاضر ہو رہا ہوں۔ ''پہلی بات'' کے مطالعہ سے ایک عجیب سا تاثر ابھرا ہے۔ ''ہر انسان اپنی اصلیت کو بھولتا جا رہا ہے۔ سب کچھ پا لینے اور سب کچھ خود ہی کر لینے کی دھن میں شاید ایک کام بھی ڈھنگ سے نہیں کر پا رہا۔'''' سستی شہرت کے رسیا من چلوں نے ادب کو تماشا ثابت کر دیا ہے کہ اپنے مسلک، روایت کی پاسداری اور سچ و غلط کی پہچان پر ایمان ڈانواں ڈول ہو رہا ہے۔ ''ایک مجنون لکھاری سرگودھا سے

چھوٹے شہر میں بیٹھنے والے ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم کے بغیر سرگودھا کی ادبی تاریخ نامکمل ہے۔ ''مجھے خط پڑھ کر یوں محسوس ہوا جیسے قادر مطلق نے میرے محترم بھائی اظہر جاوید کو نئی زندگی عطا کر دی ہو۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

ملک اشرف ذکی اعوان (چکوال)

﴿15﴾ جناب محترم سوہان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کی خوب صورت سی دنیا سے کچھ عرصہ دوری کی وجوہات میں ہرگز ''ناراضی'' شامل نہیں۔ مجھے دو تین پرچے تخلیق کے نہیں ملے اور کچھ افسانوں کی کتاب مرتب کرنے کی وجہ سے مصروفیت رہی۔ آپ سے وعدہ ہے کہ ایک تازہ اور مکمل مضمون کی تیاری کے ساتھ اگلی بار ذرا اچھی طرح حاضری ہوگی۔ فی الحال تازہ افسانوی مجموعے ''بے چہرہ لوگ'' کی دو جلدیں ''تخلیق'' کے لیے ارسال کر رہی ہوں۔ تبصرہ کتب میں جناب اظہر جاوید اور ڈاکٹر انور سدید کے بعد ایک خلا اور تشنگی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ اس مرتبہ جناب سید انور جاوید ہاشمی صاحب کے تبصرے عمدہ رہے۔ ''تخلیق'' کے لیے تازہ غزل ارسال کر رہی ہوں۔ امید ہے پسند آئے گی۔ ابھی ستمبر ''تخلیق'' کا مطالعہ جاری ہے۔ ''تخلیق'' میری ادبی درس گاہ ہے۔ میں نے اس فورم سے بہت اچھا لکھنے والے عمدہ اور عمدہ لکھنے والے عمدہ ترین کی سیڑھی پر چڑھتے ہوئے دیکھے ہیں۔ ''تخلیق'' جناب اظہر جاوید کی ادبی استقامت کا نمونہ تھا اور آپ کی کاوشوں سے رہے گا۔ بہت سی نیک تمنائیں اور ترقی و کامیابی کی دعاؤں کے ساتھ!

صائمہ نورین بخاری (ملتان)

﴿16﴾ ڈیئر سوہان اظہر صاحب!

ایسا پہلی بار ہوا کہ ''تخلیق'' کو بھیجے گئے مضمون کا بیک اپ اور ہارڈ کاپی بیک وقت گم ہوئی ہوں۔ مضمون کے ساتھ ڈاکٹر محمود اسیر کی 2 عدد کتابیں بھی تھیں جن کا تذکرہ اس مضمون میں بھی شامل تھا۔ خیر، ایسا ہو جاتا ہے ڈھیر ساری چیزوں میں سے ایک آدھ کا ادھر ادھر ہو جانا کوئی تعجب خیز نہیں۔ اب حسب ہدایت متذکرہ مضمون آپ کو ای میل بھی کر چکا اور اب ہارڈ کاپی مع ایک اور کتاب کے جس کا ذکر بھی اسی مضمون میں موجود ہے آپ کو پوسٹ کر رہا ہوں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ ڈاکٹر محمود اسیر شدید علیل ہیں۔ میں چاہتا ہوں وہ ''تخلیق'' میں شائع شدہ یہ مضمون ضرور پڑھ لیں۔ اس لیے آئندہ اشاعت میں شامل کرنے کی استدعا ہے۔

سوہان ڈیئر! اللہ کا بے حد شکر ہے کہ 45 برسوں سے وابستگی ادب کے دوران وزیر آغا، قاسمی صاحب، انور سدید، اظہر جاوید، ڈاکٹر خواجہ زکریا ایسی بڑی ادبی ہستیوں کے سامنے میں رہ کر بہت کچھ سیکھا اور سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے جتنی کی بات کی تو تکلیف محسوس نہ ہوئی پھر بھی جتنی اپنے تکلفات، نئے لکھنے والوں کی نگارشات کو پرکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ ساٹھ برس کی عمر کو پہنچتے ہوئے اب ہمیں کیا ضرورت پڑی کہ یا جیہ محض کسی کی فرمائش پر کچھ لکھیں ——— خدا نے چاہا تو آپ کو سلامت رکھے۔ آپ اور تخلیق، اظہر جاوید صاحب کی نشانی ہونے کی وجہ سے ہمیں بہت عزیز ہیں۔

اخلاق عاطف (سرگودھا)

﴿17﴾ عزیزم سوہان اظہر جاوید صاحب

''تخلیق'' کا تازہ شمارہ بابت ستمبر 2017ء نظر نواز ہوا۔ ماشاء اللہ حسب سابق عمدہ مضامین اور افسانوں کا گلدستہ ہے۔ امین راحت چغتائی کا مضمون ''منگولوں کا آغاز'' ڈاکٹر جواز جعفری کا مضمون ''لاہور کے چند معروف قہوہ خانے'' اور ظفر سپل کا مضمون ''مغلیہ عہد میں راسخ الاعتقادی'' پڑھ کر لطف اندوز ہوا ہوں۔ افسانوں میں آغا گل کا ''گورنج'' یٰسین احمد کا ''اب نہیں بیٹا'' محمد طارق علی کا ''ریس کورس والی'' اور اظہر جاوید کا ''پرانی بیخ'' خاص طور پر پسند آئے۔ ڈاکٹر رشید امجد کی یادنگاری ''عاشقی صبر طلب'' کی آخری قسط شائع ہونے پر یہ معلوماتی اور عمدہ تحریر اپنے اختتام کو پہنچی ہے۔ موسیقی کے حوالے سے ڈاکٹر امجد پرویز نے اس مرتبہ ناہید نیازی پر بڑا معلوماتی مضمون لکھا ہے۔ طنز و مزاح کے زیر عنوان ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی اور ڈاکٹر محسن مگھیانہ کی شگفتہ تحریریں پڑھ کر طبیعت شاد کام ہوئی۔

''دامن خیال'' میں معلوماتی اور ستائشی خطوط بھی پڑھے۔ میں ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی صاحب، محمد طارق علی صاحب، مرزا احمد نور طائر صاحب، ذبیح اللہ فہیم صاحب، جمیل حیات صاحب اور خالد عبداللہ چودھری صاحب کا شکرگزار ہوں جنہوں نے قوم سبا کی کہانی پڑھ کر پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ یقیناً یہ افسانہ نہیں ہے بلکہ تاریخی واقعات پر مبنی کہانی ہے۔ مدیر ''تخلیق'' نے اپنے مختصر تعارف میں میری جن کتابوں کا ذکر کیا تھا ان میں ''قرآنی کہانیاں'' اور مزید قرآنی کہانیاں کا ذکر بھی موجود تھا۔ میں نے اپنی کتاب کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ قرآنی کہانیوں کی کتاب نہیں بلکہ کتاب الہدیٰ ہے۔ البتہ اس میں سابقہ قوموں، پیغمبروں یا دیگر شخصیات کا تذکرہ کر کے قرآن کے قاری کو فلاح کی راہ دکھائی گئی ہے۔ مختلف سورتوں اور پاروں میں بکھرے واقعات کو اکٹھا کر کے میں نے کہانیوں کی صورت میں پیش کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ اپنے الفاظ کم سے کم شامل کروں اور قرآنی آیات کے ترجمہ کو کہانی کی صورت میں ترتیب دوں۔ اپنے پیش لفظ میں یہ بھی تحریر کیا ہے کہ قرآنی آیات کا وہ ترجمہ استعمال کیا گیا ہے جو سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے کیا ہے۔ خالد عبداللہ چودھری صاحب یا کوئی اور صاحب اگر ان ''قرآنی کہانیاں'' اور ''مزید قرآنی کہانیاں'' کا مطالعہ کرنا چاہیں تو مجھ سے یہ دونوں کتابیں منگوا سکتے ہیں۔

پیروز بخت قاضی (لاہور)

﴿18﴾ محترم سوہان اظہر جاوید صاحب!

امید ہے آپ بفضل رب العالمین عافیت سے ہوں گے۔ ماہنامہ ''تخلیق'' ماہ ستمبر 2017ء کا موصول ہوا۔ اس کو پڑھا اور محسوس ہوا کہ ماہنامہ نہایت پُرمغز اور نظم و نثر میں انتہائی معیاری ہے۔ اردو زبان و بیان سے پوری طرح آراستہ و پیراستہ ہے۔ ہر مضمون اپنے اندر چاشنی اور معنویت لئے ہوئے ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا مضمون بعنوان ''ضیاء الحق کا جب خون'' پڑھا جس میں حقائق کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ بہت سے خفیہ احوال سے پردے اٹھائے گئے ہیں۔

ڈاکٹر جواز جعفری صاحب کی تحریر ''لاہور کے چند معروف قہوہ خانے'' پڑھ کر پرانی یادیں یاد آ گئیں اور کئی آنجہانی ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں سے ملاقات ہو گئی جو یادداشت سے محو ہوتے جا رہے ہیں۔ ناصر علی سید صاحب نے ہندکو زبان کے صوفی شاعر ''احمد علی سائیں'' سے بھی بہت خوب انداز سے متعارف کرایا۔ ظفر سپل کا ''مغلیہ عہد میں راسخ الاعتقادی کا ابھار'' بھی خوب ہے اور انہوں نے

بھی اپنی معیاری تحریر میں تحقیقی حقائق کو ضابطۂ تحریر میں لانے کی کامیاب سعی فرمائی ہے۔ صفحاتِ نظم بھی پڑھے اور لطف آیا۔ خاص طور پر کرامت بخاری کی آزاد نظم "اگر تم پوچھنا چاہو" نے بھی محظوظ کیا۔ علاوہ ازیں پورا مجلہ پُر تاثیر اور پُر لطف ہے۔ اللہ سے دعا گو ہوں کہ اسی طرح ماہنامہ ادب کا خوبصورت گلدان بنا رہے۔

رفیع الدین ذکی قریشی (لاہور)

﴿19﴾ محترم و مکرم جناب سلطان اظہر جاوید صاحب!

سب سے پہلے "تخلیق" کا ماہ جون اور ستمبر 2017ء کے شمارے ایک ساتھ بھیجنے کا بہت بہت شکریہ۔ وصول ہوتے ہی یک دم کھول کر دیکھا تو دونوں شمارے خوبصورت سرورق سے مزین تھے جنہیں دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ شمارہ میں موجود مضامین، افسانے، غزل اور طنز و مزاح پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ سبھی بہت معیاری ہیں۔ شمارے کے آخر میں انجمن خیال دیکھ کر دل اور بھی خوش ہو گیا۔ بہت کم شماروں میں ایسا ہوتا ہے کہ کوئی حصہ خطوط کے لیے مختص کیا جائے۔ سب سے نمایاں بات جو ماہنامہ "تخلیق" کو باقی جرائد سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ ہر افسانے سے پہلے افسانہ نگار کا تعارف ہے جس سے نئے لکھنے والوں کو کافی حد تک آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ "تخلیق" میں شائع ہونے والی ہر تحریر معیاری ہے جس سے نئے لکھنے والوں کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ میں سلطان اظہر جاوید صاحب کو ادب دوستی اور ادب کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں پچھلی بار کی طرح شمارہ باقاعدگی سے ملتا رہے گا۔

جبران علی (چیچہ وطنی)

﴿20﴾ عزیزم سلطان اظہر جاوید صاحب

آداب۔ گزشتہ ماہ احباب سے اردو ادب کے جرائد بارے استفسار پر ملکی اور غیر ملکی بے شمار نام موصول ہوئے لیکن جب بہترین جرائد کا کہا گیا تو انتخاب کے بعد چند نام ہی سرفہرست تھے جن میں "تخلیق" بھی شامل تھا۔ مجھے تخلیق کے نام میں ایک کشش محسوس ہوئی تو میں نے "تخلیق" کا انتخاب کیا حالانکہ اس سے پہلے نہ تو میں نے آپ کا پرچہ پڑھا تھا اور نہ ہی مجھے اس کے بارے خاص معلومات تھیں۔ چند روز قبل 2017ء کا چھٹا شمارہ مع اخباری تراشوں اور تصویری جھلکیوں کے موصول ہوا تو ماہنامہ کی شخصیات کو سمجھنے میں مدد ملی۔ جب میں نے ماہنامہ "تخلیق" کو وصول کر کے اس کا مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ اس پرچے بارے کوئی بھی رائے قائم کرنے سے قاصر ہوں کیونکہ جہاں ڈاکٹر انور سدید، بانو قدسیہ، ڈاکٹر امجد پرویز، منشا قاضی صاحب اور پروفیسر الف سین جیسی شخصیات "تخلیق" بارے رقم طراز ہیں وہاں مجھ ایسے ادنیٰ کی کسی بھی طرح کے حوالے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اس تمام صورت حال کے پیش نظر اتنا کہنے کی جسارت ضرور کروں گا کہ "ماہنامہ "تخلیق" کو کسی حوالے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ یہ اپنا حوالہ خود ہے۔"

سلطان صاحب! میں یہاں رسمی خطوط سے ہٹ کر لکھنا چاہوں گا کیونکہ یہ تبصرے کا موقع محل نہیں ہے۔ تمام تخلیقات پر سیر گفتگو ممکن نہیں ہے لیکن مدعا بیان کرتے ہوئے اگر کہیں بات طویل ہو جاتی ہے تو اس کی پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔ "پہلی بات" کو جب میں

نے اداریے کے تناظر میں پڑھا تو مجھے احساس ہوا کہ اظہر جاوید صاحب کا لگایا ہوا یہ پودا اگر وقت کی تند و تلخ ہواؤں کا دیدہ دلیری سے مقابلہ کرتے آج تناور درخت ہوا ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اظہر جاوید صاحب کے بعد اسے سینچنے والے ہاتھ مخلص رہے ہیں۔ میرے نزدیک حمد اور نعت کا سیکشن روایتی ہرگز نہیں ہے اور نہ ہی یہ محض کسی اظہار ادبی عقیدت اور محبت کے اظہار تک محدود ہے بلکہ یہ ایک ہمہ گیر تاریخ اور ثقافت کی عکاس ہے۔

اے خدائے ذوالمنن تو نے جہاں پیدا کیے — انس و جاں کے واسطے کون و مکاں پیدا کیے

بعد ازاں مضامین کا سلسلہ جب چلتا ہے تو تمام تحریریں جاندار معلوم ہوتی ہیں اور ڈاکٹر انور سدید و ڈاکٹر امجد پرویز کے مضامین متعلقہ شخصیات بارے ہمہ گیر معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر اجمل نیازی کا اسلوب نہایت خوشگوار رہا جس میں قاری کو اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر اجمل نیازی کا "نگارشن" خوبصورت مضمون ہے۔ مسلم شمیم کا "قلم قبیلہ اور عالمگیریت" بالکل الگ نوعیت کا مضمون ہے۔ جس میں ایک سسٹم کے ساتھ اور تخلیقی انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔ یہ مضمون اپنے اندر ایک جہان لئے ہوئے ہے۔ "قلم قبیلہ اور عالمگیریت" سنجیدہ قاری کے لئے ایک عمدہ تحریر ہے جس پر بات کر کے ادب کو نئی چیزوں سے متعارف کرایا جا سکتا ہے۔ منظومات کے سیکشن میں "خواب اور پیار"، "آسمانی انگلیاں"، "نقطہ" اور "زمین نے دائروں کو رقص میں دیکھا ہے" الغرض تمام منظومات نے میرے گرد ماحول کو معطر کرتے ہوئے خوشگوار بنا دیا۔ افسانوی سیکشن میں "آدھے چاند کی رات"، "طارق کا جہاز"، "حق کی آواز"، "سپہ سالاری" اور "بے سوال باتیں" تمام کی تمام خوبصورت تحریریں تھیں۔ پروین بخت قاضی کا افسانہ "سبا کی قوم" مجھے افسانہ کم بلکہ دولت زیادہ معلوم ہوا باوجودیکہ تاریخ کو کہانی کا رنگ دے کر ادب میں بہترین اضافہ کیا ہے۔ ڈاکٹر رشید امجد کا افسانہ "درگت" ایک خوبصورت تحریر ہے حالانکہ اس میں مکالماتی رنگ ہے اور تو اس بھی کہانی ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اسے اس قدر خوبصورتی سے نبھایا ہے کہ میں اسے افسانہ ہی کہوں گا۔ یوں تمام تحریریں خوبصورت تھیں لیکن مجھے طارق بلوچ صحرائی کے "دَم" نے نہایت متاثر کیا۔ صحرائی صاحب نے افسانے میں کہانی کو داخل کرنے کے باوجود افسانہ تحریر کیا اور افسانے قطعاً مرتے نہیں بلکہ محو ہوتے ہیں۔ صحرائی صاحب کو پڑھنے کے بعد مجھے انہیں مزید پڑھنے کی خواہش ہے۔

سب تعلق ہی ناطے ہیں فقط جیتے جی — بہہ گیا خاک کی آغوش میں سونے والا

اظہر جاوید، بشریٰ رحمن، احسن عسکری کاظمی، مسعود عثمانی، صوفیہ بیدار، سعدیہ شمیمی اور تمام احباب کی تخلیقات حصہ غزلیات میں ایک خوشگوار احساس لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ ع وہ راستہ جو محبت کا پایا حسن کا تھکانے والا سفر واپسی کا ہوتا ہے۔ یادنگاری، سفرنامے، یاد رفتگاں، خاکے اور طنز و مزاح سمیت تمام تحریریں پرچے کی خوبصورتی کا باعث بن کر معیاری تحریریں ہیں۔ طنز و مزاح میں وہ برجستگی نظر آئی جس سے مزاح پیدا ہوتا ہے اور بات سے بات نکل کر قاری کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ بن کر چھلکتی ہے۔ معین قریشی صاحب کے لئے ڈھیروں داد اور تحسین۔ — آفتاب خان کے تبصرے واقعی میں خوبصورت تھے جن کو پڑھنے کے بعد کتاب پڑھنے کی آرزو ضرور رہتی ہے۔ آخر میں "تخلیق" کی تمام ٹیم کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جو اردو ادب کے قاری کو معیاری تخلیقات فراہم کر رہے ہیں اور جب میں نے یہ جائزہ حاصل کیا تو مجھے اپنے انتخاب پر فخر ضرور محسوس ہوا اور واقعی میں نے تخلیق کے بارے جیسا سوچا تھا اسے ویسا ہی پایا۔

پارس بخاری (ڈیرہ غازی خان)

﴿21﴾ محترم سوہان اظہر جاوید صاحب!

تخلیق کا تازہ شمارہ حسبِ سابق ملا۔ ایک خوشگوار مسرت ہوتی ہے۔ ماہ ستمبر 2017ء کا تخلیق دیدہ زیب سرورق کے ساتھ موصول ہوا۔ ماشاء اللہ آپ نے تخلیق کو جس تواتر کے ساتھ برقرار رکھا ہوا وہ قابلِ ستائش ہے۔ دوسری طرف پہلی بات میں آپ کے دل سے نکلی ہوئی تحقیقیں قاری کی توجہ کو مبذول کرتی ہیں۔ یہ آپ کو خوش بختی اور محبت شائق ہے کہ ہر شمارے میں کچھ نایاب تحریریں آپ دستخط لگاتے ہیں جس کی وجہ سے پرچے کا تخلیقی وقار اور معیار حسبِ معمول بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ اب کی بار بھی ڈاکٹر انور سدید کے پرانے کاغذات سے بازیافت ہونے والی تحریر جس میں جنرل ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت کا تختہ الٹا تھا۔ یہ مضمون تاریخ کے روشن پہلو واضح کرتا ہے۔ امین راحت چغتائی نے بھی تاریخی حجروں سے مغلوں کے آغاز و ارتقا پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک اہم مضمون ڈاکٹر مبارک علی کا ہے جس میں انھوں نے 1857ء کے بعد برطانوی راج اور قدامت پرستی کے ضمن میں چند نمایاں پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ "لاہور کے چند معروف قہوہ خانے" بھی قارئین کی توجہ کو جذب کرتا ہے۔ علم و ادب کے مرکز شہر لاہور میں قہوہ خانوں کی اہمیت اور روز بروز دم توڑتے ہوئے قہوہ خانے ادب سے دوری کا سبب ہے۔ ناصر علی سید نے ہندکو زبان کے صوفی شاعر احمد علی سائیں کو عام فہم اسلوب میں متعارف کروایا ہے۔ ہر بار تخلیق میں اچھے افسانے قارئین کی پسندیدگی کا سامان پیدا کر دیتے ہیں۔ محمد طارق علی کا "رنگیں کورٹ والی" ایک منفرد اور اہم پہلو لیے افسانہ ہے۔ جبکہ علی اکبر ناطق نے "کرد" میں مختلف حقیقتیں دکھائی ہیں۔ اس شمارے میں نظمیں اور غزلیں بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی ہیں بالخصوص تسنیم حسن، اظہر بخاری، کرشن کمار طور، سلمیٰ سرور، شہیدہ سید، آسناتھ کنول، شازیہ مفتی اور پروفیسر فرخ محمود کی تخلیقی اور فکری سطح خاصی بلند نظر آتی ہے۔ عاشق میر طلب میں ڈاکٹر رشید امجد نے بعض شبہات اور شکوؤں کا جو نقش کھینچا ہے اس پر حیرت ہوتی ہے۔ رشید امجد نے اپنی زندگی کا تلخ تجربہ ان سطور پر پیش کیا ہے۔ محترمہ سلمیٰ اعوان کے سفرنامے کی دسویں قسط بھی عراقی تاریخ اور جغرافیے سے مزین نظر آتی ہے۔ محترمہ سلمیٰ اعوان نے اپنے مشاہدات اور احساسات کو خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ادارہ تخلیق کی جانب سے پہلی کہانی "قدرت کا فیصلہ" نے میری توجہ کو مرکوز کر دیا۔ بلاشبہ موت ایک تلخ حقیقت ہے اور انسان کسی بھی صورت موت کو شکست نہیں دے سکتا۔ مائیکل جیکسن کی موت ایک اعلان کے ساتھ ساتھ ایک کھلا سبق بھی ہے۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی اپنے نمکین جملوں سے مسکراہٹیں بکھیرتے نظر آتے ہیں "موصوف اور موصوفہ" میں انھوں نے بہت عمدہ طنز کیا ہے۔ ادب کی خلوص نیت سے خدمت کرنے والے ملک مقبول احمد نے امین راحت چغتائی کے ادبی کارناموں سے شناسائی کروائی ہے۔ آخر میں میں انجمن خیال اپنے پورے جوبن پر نظر آتی ہے جو کسی شمارے کی کامیابی کی روشن دلیل ہوتی ہے۔ شکریہ!

ڈاکٹر سکندر حیات میکن (سرگودھا)

﴿22﴾ محترمی سوہان اظہر جاوید۔ آداب!

میں نے تخلیق کو ایک تازہ "تخلیق" اسکلی ذریعے سے بھیجی تو جب ادارے کی طرف سے مجھے اطلاع موصول ہوئی کہ ہم یوں وصول نہیں کرتے۔ "ذوقِ تخلیق مجھے کیسے ستم آتے ہیں۔" خیر آپ کا رابطہ نمبر بروقت تمام حاصل کرنے کے بعد اپنی تحریر بذریعہ پوسٹ

ارسال کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تخلیق کا شمارہ باد کے گھوڑے پر چاروں کی مسافت طے کر کے ہمارے ہاتھوں میں مچل رہا ہے۔ شمارہ تخلیق اپنی تخلیقات کی کاٹ چھانٹ اور انتخاب میں دیگر شماروں سے نہ صرف ممتاز ہے بلکہ ضخامت، طباعت اور مشمولات کی تقابت اس پہ مستزاد ہے۔ مجلہ تخلیق سے دلی وجذباتی وابستگی کی وجہ سے جناب آصف ثاقب کی غزل دیکھ کر دلی طمانیت ہوئی کہ ان جیسے وسیع غزل گو آپ کے ہم رکاب ہیں۔

مرے اوراق تم پڑھتے رہو گے — میں لکھتا ہوں، لکھا رہ جانے والا

مشکور حسین یاد، انور سدید اور اجمل نیازی صاحب کے مضامین اور دیگر غزلوں کا سرسری مطالعہ کر پایا ہوں۔ کچھ مصروفیت کی بنا پر مطالعے کے حسب خیال کی باگ موڑ رہا ہوں۔ خدا کرے تخلیق کا گلشن سرسبز باغ و بہار رہے۔

سرفراز خان آفریدی (میانوالی)

﴿23﴾ محترم مہربان اظہر جاوید صاحب!

السلام علیکم! اکتوبر 2017 کا شمارہ وصول ہوا۔ سرورق پر شکستہ جیسی مدفون حسینہ اور اس کے ساتھ زمین پر کھلے ہوئے خودرو پھول کئی زمانوں کی رومانوی داستانیں بیان کر رہے تھے۔ سرورق کی پشت پر تخلیق کے خالق اظہر جاوید کی کتابوں کی تصاویر اور مختصر ادبی تعارف پڑھ کر ان کی طویل ادبی جدوجہد کا احساس ہوتا ہے۔ ایک صفحہ تخلیق کے بارے میں آپ کے عزائم اور تخلیق کے قارئین کی حوصلہ افزائی سے بھرپور تعارف موجود ہے جو میرے جیسے نئے قارئین کے لئے پڑھنا امید افزا اور معلوماتی ہے۔

سب سے پہلے مضامین کا مطالعہ کیا۔ امین راحت چغتائی نے مغلوں کی تاریخ، فتوحات، عادات، عروج و زوال کے بارے میں دلچسپ تاریخی حقائق بیان کئے ہیں۔ اسی طرح سے ڈاکٹر مبارک علی نے برطانوی راج میں قدامت پرستی کے حوالے سے زمینوں کی تقسیم اور جاگیرداروں کی اصلیت سے پردہ اٹھاتے ہوئے تجزیاتی امور کے بارے میں بیش قیمت معلومات دی ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری صاحب ہر قسم کے فنون لطیفہ کے بارے میں تحقیقی کام کرتے ہیں۔ کبھی ادبی موضوعات پر کتابوں کے حوالے سے بات کرتے ہیں، کبھی موسیقی کے اسرار و رموز بیان کرتے ہیں، کبھی تاریخی و ثقافتی عنوان پر لکھتے ہیں۔ اس بار انہوں نے لاہور شہر کے ادبی قہوہ خانوں پر تحقیق کی ہے۔ ان کی تحقیق کا بڑا حوالہ اے حمید مرحوم ہیں۔ اے حمید لاہور شہر کی چلتی پھرتی ثقافت، تہذیب اور تاریخ تھے۔ ان کا انداز بیان اور منظر نگاری گذرے ہوئے وقت کو سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ افسوس کہ ان کی ادبی اور تاریخی تحریروں کے بارے میں کوئی خاص کام نہیں ہو رہا ہے۔ جواز جعفری نے اے حمید مرحوم کی یاد تازہ کر دی ہے۔ اسی طرح سے ڈاکٹر امجد پرویز نے گلوکارہ ناہید نیازی اور ان کی گلوکاری کے بارے میں بہت معلوماتی اور رومانی مضمون لکھا ہے جس میں پرانے دور کے گانوں کا حوالہ ہے۔ مضمون پڑھ کر بچپن اور جوانی میں سنی آوازیں کانوں میں رس گھولنے لگیں۔

حصہ شاعری میں حمد و نعت کا انتخاب معیاری تھا۔ منظومات میں حسن عسکری کاظمی کی ''حرف تمنا'' کرامت بخاری کی ''اگر تم دیکھ پاؤ'' مشرق صدیقی کی ''تجدید وفا'' اور کرن اجالا کی ''دوسرا رخ'' بہت پسند آئیں۔ باقی نظمیں بھی بڑی محنت سے لکھی ہوئی اور دعوت فکر دینے والی تھیں۔ حصہ غزل میں تیس شاعروں کی غزلیں لگائی گئی ہیں۔ آصف ثاقب، خالد اقبال یاسر، ڈاکٹر ایوب ندیم، عراق مرزا، انور راحمد

طاہر، ناصر علی سید، عاصم بخاری، ڈاکٹر نجمہ شاہین اور پروفیسر فرخ محمود کی غزلیں متاثر کن تھیں۔ حصہ شاعری میں کمپوزنگ کی غلطیوں سے اشعار میں بدمزگی آجاتی ہے اور بات شاعر کی غلطی پر آتی ہے اس لئے شاعری کی کمپوزنگ پر خصوصی توجہ دی جائے اور کسی کہنہ مشق شاعر سے پروف ریڈنگ کرائی جائے تو بہتر ہوگا۔ جنرل ضیا الحق کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید کی نادر تحریر میں اُس دور کی بہت سی اہم سیاسی وقومی نوعیت کی باتوں کا انکشاف ہوا ہے اور ماضی میں ہمارے سیاسی اور قومی اکابرین کی ریشہ دوانیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ اسی طرح سے ڈاکٹر رشید امجد کے مضمون ''عاشق صبر طلب'' میں ہماری جامعات اور تحقیقی کاموں کے ماحول کا پول کھولا گیا ہے اور ملکی سیکورٹی صورتحال کے تناظر میں عدم تحفظ اور انسانی ذلت کا مسئلہ بھی اجاگر کیا گیا ہے۔ آخر پر ڈی۔ این۔ اے، موت اور پھر روحانیت اور قیامت۔ ڈاکٹر صاحب کا مضمون واقعی معلوماتی اور متنوع ہے۔ سلمیٰ اعوان نے دوران قیام عراق کے سیاسی نظام اور صدام حسین کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے عراقی ثقافت، ماحول، شاعری اور موسیقی کے بارے میں بھی بیش قیمت معلومات دی ہیں۔

افسانوں میں علی اکبر ناطق کا ''کمرہ''، شیخ خالد کا افسانہ ''خوابوں کا جال'' اور اظہر جاوید کا ''پرانی چیز'' بہت اچھے اور متاثر کن تھے۔ مجموعی طور پر رسالے کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں زیادہ تر ماضی کی عکاسی اور پرانے ادوار پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس چیز کی کمی محسوس ہوئی کہ حال اور مستقبل کی عکاسی کم کی گئی ہے اور زیادہ تر ماضی کے افسانے دہرائے گئے ہیں۔ تحریروں کا انتخاب اور لکھنے والوں کی علمیت قابل تعریف ہے۔ تخلیق ایک شمع ہے جسے 48 سال قبل اظہر جاوید مرحوم نے روشن کیا، اب جبکہ اس کی گولڈن جوبلی میں صرف دو سال باقی ہیں اس کا معیار اور بھی بہتر بنایا جائے تاکہ ایک ہی قسم کے مصنفین اور شعراء کے غلبے کا تاثر نہ ملے۔

جاوید عباس جاوید (بھکر)

24 جون ۔ ایڈیٹر سونان اظہر سدا سلامت رہیں!

السلام علیکم! ''تخلیق'' کے بھی شمارے بروقت ملے، مطالعہ بھی کیا لیکن بوجہ ''ہجمِ خیال'' سے غیر حاضر رہا۔ تاہم شعری ذوق رکھنے والوں کو شاید یہ جان کر خوشی ہو کہ راقم نے گزشتہ چند سالوں کی محنت سے علم عروض کی ایک ایسی موبائل فون ایپلیکیشن (ایپ) بنوائی ہے جس کی مدد سے علم عروض سے دلچسپی رکھنے والے اہل ذوق افراد اپنے اینڈرائڈ موبائل فون پر شعر کی تقطیع یا تقطیع کو ٹائپ کر کے شعری بحر با آسانی معلوم کر سکتے ہیں۔ اس ایپ کی کارکردگی کو دیوان غالب اور متعدد دیگر شعراء کے کلام پر آزمانے کے بعد پلے سٹور پر (Behar Numa) کے نام سے اہل ذوق کے مفت استعمال کے لیے جاری کر دیا گیا ہے۔ امید ہے کہ ہماری یہ کاوش عروض کے طالب علموں کو پسند آئے گی۔ اس ایپ کا مفصل طریقہ کار ایپ کی ہدایت میں دیا گیا ہے۔

میری اس غیر حاضری کے دوران محترم انور سدید بھی رحلت فرما گئے۔ ادب کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں پچھلی چند دہائیوں سے اس نابغہ روزگار ادیب کا ممنون رہا ہوں۔ تقریباً پچیس سال قبل میرا اُن سے رابطہ ''تخلیق'' اظہر جاوید کی وساطت سے ہوا لیکن ان سے بالمشافہ ملاقات صرف ایک ہی ہوئی اور وہ بھی اظہر جاوید مرحوم کے چالیسویں پر۔ اگرچہ انور سدید کی شخصیت پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے تاہم راقم کے نزدیک انور سدید ایسے بے لوث ادیب تھے جن کے قلم نے دریا کی سی روانی سے چلتے ہوئے علم وادب کے ایسے ایسے گلی سمندر تخلیق کیے جن سے علم کے پیاسے مدتوں تک علمی پیاس بجھاتے رہیں گے۔ ان کے تبصرۂ کتب، سالانہ ادبی

جائزے اور رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے ادبی خطوط بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ ان کے زرین خیالات کے بغیر ''تخلیق'' کی انجمن خیال اب کتنی سونی سونی سی لگتی ہے۔ اللہ ان کو غریق رحمت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

اب آتے ہیں شمارہ نمبر 11 کی تحریروں سے متعلق مختصر سے تاثرات کی جانب۔ سچ لگتی کہوں کہ اس شمارے کے ٹائٹل میں دکھائی گئی حسینہ نازکی کا شکستہ سا سر اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی طرح بہتا ہوا خون ناحق دیکھ کر دل بھر آیا۔ کھلی بات میں آپ نے قوم کی شعوری بیداری کے لیے بڑا اہم سوال اٹھایا ہے کہ کیا واقعی ہم اپنی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں۔ اگر جواب ہاں میں ہے تو بحیثیت قوم ہمیں اس کارِ خیر کے لیے کمر کسنا ہوگی۔ حمد و نعت شانِ کبریائی اور محمدؐ کی مدح سرائی کا حق ادا کرتی نظر آئیں۔ جہاں تک مضامین کا تعلق ہے، جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کے متعلق ڈاکٹر انور سدید کے خیالات ان کی رحلت کے بعد منظر عام پر آئے۔ شاید اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔ امین راحت چغتائی کا مضمون مغلوں کا آغاز۔ شاید میں ان کی کتاب ردِ عمل میں پہلے ہی پڑھ چکا ہوں۔ ''مغلیہ دور میں رائج الاعتقادی کا ابھار'' کی دوسری قسط میں بھی ظفر ہیل نے بڑے فلسفیانہ انداز میں اس دور کے اکابرین اسلام کے رائج عقائد کو اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر مبارک، ڈاکٹر اظہر اور ناصر علی سید کے مضامین اگرچہ مختصر مگر خاصے معلوماتی ہیں۔ ڈاکٹر جواز جعفری نے لاہور کے قہوہ خانے کے عنوان سے ماضی کی ادبی بیٹھکوں کے منظر نامے بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیے ہیں۔ افسانوں میں آغا گل نے ''گورچ'' میں انسانی خون کے سفید ہونے کی کہانی بڑے دل پذیر انداز میں بیان کی ہے۔ نجیبہ احمد کے افسانے ''اب تمہیں جینا مجھے'' کی کہانی بڑی کامیابی سے قاری کو اپنی گرفت میں لیتے دکھائی دی۔ محمد طارق علی کا افسانہ ''دلیس کورس والی'' بہترین انداز میں کلائمکس کی طرف بڑھتا ہے اور اگر اس کے اختتام کے متعلق یہ کہا جائے کہ یہ تھوڑی جلدی میں دیا جاتا رہے تو شاید غلط نہ ہوگا۔ علی اکبر ناطق اگر دیں سماج کی ناانصافیوں کو بڑی چابکدستی سے اجاگر کرتے ہیں۔ شیخ خالد کا افسانہ تواریوں کا جال (D.N.A.) کی پرتیں اپنے خوبصورت انداز سے کھولتا ہے جس سے نوجوانوں کی قیمت لاشعوری ترتیب ہوتی نظر آتی ہے۔ شیر طراز کا افسانہ ''محبت، موت اور بہ سمت'' کا بیانیہ انداز بڑا اچھوتا ہے۔ وہ برجستہ اور چھوٹے چھوٹے مکالموں میں بڑی گہرائی اور گیرائی کی باتیں کرتی ہیں۔ پرانی چیز میں اظہر جاوید مرحوم نے بابلام والے کے صندوق کی کہانی کو پنجابی میں بڑے طلسماتی انداز میں بیان کیا تھا۔ حنیف باوا نے اس کا بڑا خوبصورت اردو ترجمہ کر کے جی خوش کر دیا۔ 'عاشق صبر طلب' کی آخری قسط پڑھ کر دل مغموم ہوا۔ ہماری ادبی صبر طلبی کا اصل امتحان تو اس وقت شروع ہوگا جب اگلے شمارے میں ہم ڈاکٹر رشید امجد کا خوبصورت تخلیقی سلسلہ منقطع پائیں گے۔ سرفراز سید نے کشمیری لال ذاکر کو جن خوبصورت الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔ سلمیٰ اعوان کے سفرنامے کی قسط مسحور کن انداز سے جاری اور ساری ہے۔ ڈاکٹر امجد پرویز نے ڈبیدنیازی کے حالات زندگی اور انداز گائیکی کو بڑے نفیس اور شگفتہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اچھوتا انداز نگارش شائقین موسیقی کے دلوں کو رباب کے تاروں کی سی ملائم آواز کی طرح چھوتا محسوس ہوتا ہے۔ ادارہ ''تخلیق'' کی نئی کہانیاں قاری کو ورطہ حیرت میں ڈالتے ہوئے نامحسوس طریقے سے تربیت کا فریضہ بھی سرانجام دیتے دکھائی دیں۔ ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی کا موصوف اور موصوفہ میں مزاح کا انداز لبوں پر مسکراہٹیں بکھیرنے میں کامیاب دکھائی دیا۔ جب کہ ڈاکٹر محسن مگھیانہ کا تیکھا طنزیہ انداز نگارش تیکھے انداز میں ایک ایسی معاشی بے اعتدالی کو اجاگر کرتا ہے جو اب معاشرے کا ناسور بنتی جا رہی ہے۔ صوفیہ بیدار نے اعتدال کے بعد کی زندگی میں،

زندگی کے کئی تلخ اور شیریں پہلوؤں کو بڑے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ تاہم یہ تحریر انشائیہ کہلا سکتی ہے یا نہیں کیا کہتے ہیں انشائیہ نگار اس مسئلے کے۔ ملک مقبول احمد، امین راحت چغتائی کے خاکے میں ان کی شخصیت کے کئی نئے پہلو سامنے لانے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ نسیم سحر نے عزیز جبران انصاری کے صنفِ نعت رسول کا تیسرا مرحلہ کے عنوان سے ان کی حمدیہ اور نعتیہ شاعری کے محاسن بڑے حسن بھرے انداز میں اجاگر کیے ہیں۔ ڈاکٹر اشرف آثاری کا "تخلیق" کے گزشتہ شمارے کا جائزہ بڑا جاندار اور شاندار تھا۔ انجمن خیال میں، ستیہ پال آنند، امین راحت چغتائی، سلطان سکون، آصف ثاقب، آغا گل، عزیز جبران انصاری، اخلاق عاطف، مرزا احمد نور طاہر، ڈاکٹر شکیلہ رفیق، حیات ملکن، رحمت اللہ ندیم، رشیدہ آفرین اور جمیل حیات کے خطوط میں جابجا تنقیدی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

ایم۔ ڈی۔ ملک (راولپنڈی)

﴿25﴾ سونان بیٹے، دعائیں ڈھیر!

امید ہے کہ مع الخیر ہو گے۔ ماشاءاللہ تمہاری کارگزاریاں دیکھ کر خوش ہوتی رہتی ہوں۔ میرے بھائی اظہر جاوید نے جو فصل بوئی تھی، اب ماشاءاللہ رو بہ بہار ہے۔ یعنی تخلیق ـــــ اپنی تمام جہات میں، اپنے مشمولات میں، اپنے انتخاب میں ایک نمایاں حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہر بار اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ اللہ جس کو عروج عطا فرمائے وہ جاوید بھی ہو جاتا ہے۔ خداوند عالم اسے قائم و دائم رکھے۔ اور نظرِ بد سے بچائے رکھے۔ آمین! آمین! اپنی تخلیقات کو بھی زندہ و جاوید رکھنے کے لیے "تخلیق" کی نذر کرتی رہتی ہوں۔ اب تو عالم یہ ہے کہ کبھی ہفتوں بستر مجھے پکڑ لیتا ہے (یا میں کھٹیا پکڑ لیتی ہوں) اور کبھی پھر قلم کی لاٹھی میرے ہاتھ میں متمکن ہو جاتی ہے تو پھر ہفتوں دن رات لکھا کرتی ہوں۔ کیسی بے اعتدالی آ گئی ہے اس عمر میں؟ بیٹے جان! اللہ تمہیں اپنی "لطف پہلا" سعدیہ اور بچوں کے ساتھ خوش و خرم رکھے۔

رشیدہ عیاں (امریکہ)

﴿26﴾ عزیزم سونان اظہر جاوید!

میں یہ مکتوب "انجمن خیال" میں شمولیت کے لیے لکھنے بیٹھا ہی تھا کہ میری نظر جناب ستیہ پال آنند صاحب کے خط (صفحہ 137) پر چلی گئی۔ جناب آنند صاحب نے جو کچھ لکھا ہے میں اس سے سو فیصدی متفق ہوں۔ میرا تعلق "تخلیق" سے 1990ء سے ہے جس کے لیے میں اپنے دوست مرحوم کیول سوری اور جناب عارف ساقی صاحب کا ممنون ہوں۔

"یادیں" کے تحت جناب ڈاکٹر رشید امجد صاحب کی سلسلہ وار تحریر "عاشقی صبر طلب" شروع سے ہی بڑی دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں اور محظوظ ہوتا رہا ہوں۔ چودھویں قسط (جون 2017ء) پڑھتے پڑھتے میں اداس سا ہو گیا اس احساس سے کہ یہ معلوماتی دلچسپ تحریر اختتام تک پہنچنے والی ہے۔ جس کی تصدیق ستمبر 2017ء کی آخری قسط سے ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب کو اس تحریر کے لیے بہت بہت مبارک! ڈاکٹر صاحب سے درخواست ہے کہ وہ مستقبل قریب میں کوئی اور سلسلہ وار تحریر شروع کریں جو "تخلیق" کے صفحات کی زینت بنے۔

کلدیپ راج جوشی (انڈیا)

•••

ماہنامہ 'تخلیق' کو موصول ہونے والی کتب (یکم اکتوبر تا دسمبر 2017ء تک)

نمبر شمار	کتاب کا نام	مصنف	رابطہ نمبر	پبلشرز	قیمت
-1	مراحل (تنقید، تحقیق اور مطالعہ)	امین راحت چغتائی	051-5509103	[illegible] پبلی کیشنز، راولپنڈی	500/-
-2	نوائے اردو	پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	048-3711717	پاکستان ادب اکادمی، سرگودھا	1050/-
-3	ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	ڈاکٹر ہارون الرشید تبسم	042-37324164	مقبول اکیڈمی اردو بازار لاہور	1000/-
-4	[illegible]	ریاض ندیم نیازی	042-36303390	ماورا بکس، دی مال لاہور	500/-
-5	[illegible]	[illegible]	042-37220100	سنگ میل پبلی کیشنز، لوئر مال لاہور	900/-
-6	پاکستانی ادب 2012 (شاعری)	ڈاکٹر [illegible]	051-9269714	اکادمی ادبیات، اسلام آباد	300/-
-7	بے چہرہ لوگ (افسانے)	صائمہ نورین بخاری	042-37324164	مقبول اکیڈمی اردو بازار لاہور	700/-
-8	[illegible]	ایوب ندیم	0333-4207468	[illegible] پبلشرز، مال لاہور	500/-
-9	[illegible]	[illegible]	0300-4020955	ماورا بکس، دی مال لاہور	500/-
-10	اردو شاعری پر تحقیق (آزادی کے بعد)	ڈاکٹر [illegible]	0300-6668284	مثال پبلشرز، فیصل آباد	500/-
-11	[illegible]	[illegible]	0300-6147077	[illegible] پبلی کیشنز، سیالکوٹ	500/-
-12	[illegible]	[illegible]	0300-4489310	تخلیق مطبوعات، لاہور	500/-
-13	نعت میری زندگی	سید ریاست حسین گیلانی	0313-3628898	[illegible] پبلی کیشنز، لاہور	300/-
-14	[illegible] (شعری مجموعہ)	سہیل غازی پوری	021-36328911	[illegible] کراچی	400/-
-15	گلستانِ نعت	محمد خان چشتی	0300-7681230	چشتی کتب خانہ، فیصل آباد	400/-
-16	[illegible]	ڈاکٹر محمد اقبال صمصام	091-2580309	[illegible] پبلشرز، پشاور	400/-
-17	[illegible] (مزاحیہ مضامین)	[illegible] خان	0345-2610434	رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی	300/-
-18	تم محبت کا استعارہ ہو	[illegible]	0300-4489310	تخلیق مطبوعات، اردو بازار لاہور	400/-
-19	[illegible]	[illegible]	0301-4123707	مکتبہ شاداب، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور	250/-
-20	[illegible]	ڈاکٹر اکرم عتیق	0300-6110512	[illegible] پبلشرز، اردو بازار لاہور	150/-
-21	[illegible]	[illegible]	057-2603789	[illegible]	600/-
-22	[illegible]	[illegible]	042-37811436	مکتبہ شاداب، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور	300/-
-23	[illegible] کی ادبی خدمات	ڈاکٹر محمد [illegible]	091-0971775969	[illegible] پبلی کیشنز، دہلی 95	200/-
-24	[illegible]	[illegible]	0091-0822516338	[illegible] پبلی کیشنز، [illegible] 32	200/-
-25	[illegible]	[illegible] سعید	009419012800	[illegible] 19000	500/-
-26	[illegible]	[illegible] رضوی	621-32636133	[illegible] کراچی 74200	500/-
-27	ارم	[illegible] بخاری	0300-6668284	مثال پبلشرز، فیصل آباد	300/-
-28	[illegible]	ریاض ندیم نیازی	051-5551519	[illegible] راولپنڈی	400/-

Winter Family Festival
HOT DeLivey DeAls 50% Less Than MeNu PriCe
options
AN EXOTIC RESTAURANT
LAHORE
RS : 999
Family Fun Deal
Large Pizza of Choice, Exotic Club Sandwich, Crispy Plain Fries, 1.5 Ltr Coke.
4
RS : 1199
MaMa'S Break Time
Exotic Chicken Handi, Special Tawa Chicken, Chicken Biryani, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke.
4
RS : 1399
Grand Slami'N Deal
Exotic BBQ Platter, Chicken Karahi Half, Chicken Biryani, Salad Bowl, 2 Naan, 2 Roti, 1.5 Ltr Coke.
Good For 4 Persons
MonSter MeaL
Chicken Roast Full, 6 Reshmi Kebab, Chicken Handi, 3 Naan, 3 Roti, Raita, Salad, 1.5 Ltr Coke.
6
ONLY FOR
&
DELIVERY HOT LINES 0333-2800935 0333-140444
BUY "1" GET "ONE" FREE
STARBUCKS COFFEE
AVAILABLE INSIDE CAFE WITH THIS VOUCHER
OPTIONS SPECIAL ICE-CREAM
BUY "1" SCOOP GET "ONE"
AVAILABLE INSIDE CAFE

CamScanner

MONTHLY TAKHLEEQ LAHORE